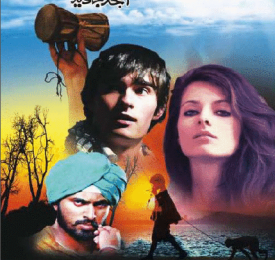


PART 1

قلندرات

امجد جاوید



قلندر ذات کا داستان گو

ایک دن اچانک مجھے احساس ہوا کہ امجد جاوید کم ہو گیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ نہیں، وہ کم ہونے جا رہا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا، وہ تہہ بلی کے ایک انہونے عمل سے گزر رہا تھا، جس کا ادراک مجھے اس وقت ہوا جب میں اور فرحت عباس شاہ اس کے شہر حاصل پور میں گئے۔

رات بھر اس کی تان قلندر کے گرد گھومتی رہی، اور فرحت عباس شاہ کے ساتھ اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین برس کے بعد جب قلندر ذات کا پہلا حصہ میرے سامنے آیا تو مجھے اس وقت کا امجد جاوید یاد آ گیا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اس کی اپنی ذات میں بھی تہہ بلی آئی ہے، یا تو دریا، سمندر کے ساتھ آ ملا ہے یا پھر سمندر کی تہہ میں کوئی طوفان ہے، یا پھر خاک ببری کا نسخہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

”قلندر ذات“ کا موضوع، سنگلاخ راستے کا سفر اور صحرا میں پیاس کی مانند ہے۔ جیسے کہ اس داستان میں ہے کہ..... ”قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شکرگزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بند زریچہ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔“ امجد جاوید نے اسے جس طرح نبھایا وہ تو آپ اسے پڑھ کر بخوبی اندازہ کر لیں گے۔ تاہم میں اگر داستان کو اسی اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں، جو ان کی کتابوں کی اشاعت کے وقت مجھے ہوتا ہے۔ مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

گل فراز احمد

اس کہانی کی کہانی

یہ کہانی مجھے کیسے ملی؟

ہوا یوں کہ مجھے چولستان کے دور افتادہ علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس صحرا نوردی کا مقصد کچھ اور تھا۔ کہانی یا اس سے متعلق کسی دوسری معلومات کی تلاش میں سرگرداں ہرگز نہیں تھا۔ اسی صحرا نوردی میں وہ جگہ ہمارے راستے ہی میں آئی تھی۔ ایک چھوٹی سی بستی سے ذرا ہٹ کر درختوں کا ٹھنڈ تھا۔ اس کے ساتھ ہی گوپا (مقامی انداز کی جھونپڑی) بس کے آگے کچے ٹھڑے پر خس کی مٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ درختوں کے نیچے چار پائیاں دھری ہوئیں تھیں۔ قریب ہی ایک لٹا ہوا تھا۔ اچھی خاصی صاف ستھری جگہ تھی، جیسے صحرا میں کوئی نخلستان ہو۔ صحرا میں یہ نظارہ دلفریب تو تھا ہی لیکن سراب لے جیسی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہاں دو ہنگی فور و ہیل جیپیں، تین چار کاریں اور چند موٹر سائیکل کھڑے تھے۔ اس ماحول کو دیکھ کر ہمارے گائیڈ نے صلاح دی

”کیا خیال ہے کچھ دیر آرام کرنا چاہیں گے؟“

”یہاں.....؟“ میرے دوست نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”جی..... اور اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو ایک ایسے بندے سے ملوؤ جو اپنی ذات میں بہت عجیب شے

ہے۔“ گائیڈ نے مسکراتے ہوئے کہا

”کون ہے وہ بندہ؟“ مجھے تجسس ہوا

”سمجھیں اس چولستان کا تھنہ ہے۔ باقی آپ مل کر ہی اندازہ لگا سکیں گے..... اگر اس کے پاس وقت ہوا

مہر اللہ یار نام ہے اس کا۔“ گائیڈ نے میرے تجسس کو مزید ہوا دے دی۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ گائیڈ نے

گازی روکادی۔ کچھ دیر بعد ہم اس گوپے کے اندر تھے۔

وہ اُدھیز عمر کے تنومند انسان تھے۔ گہرا سا نولارنگ، سفید ٹرٹا، نیلی دھوتی، سفید رنگ کا پگڑ۔ گلے میں نسواری

رنگ کا پرتا، شخصیت داڑھی، بھاری مونچھیں اور بڑی بڑی نشلی آنکھیں۔ انہوں نے ہماری طرف گہری نگاہوں سے دیکھا۔

گائیڈ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔

”آپ ہیں مہر اللہ یا رخاں.....“

وہ بہت تپاک سے ملے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم ان کی باتوں میں غل ہوئے ہیں۔ تبھی انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”آپ چند منٹ بیٹھو، میں ان سے اپنی بات مکمل کر لوں تو گپ شپ کرتے ہیں۔“

ہم باہر درختوں کے جھنڈ میں آکر بیٹھ گئے۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے بعد مہر اللہ یا رخاں ہماری پاس آگئے۔ وہ ہمیں لے کر گوپے میں چلے گئے۔ تعارف، تمہیدی باتوں اور جدید مشروبات سے تواضع کرنے بعد انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

”آپ کوئی بات پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں ان کے چہرہ پڑھنے کی صلاحیت کا معترف ہو گیا کیونکہ میرے اندر ایک نہیں کئی سوال ”اہل“ رہے تھے۔ میں نے ان سے یہ سوال کیا

”اس دور افتادہ علاقے میں، جنگل اور پیابانوں میں دو طرح کے لوگوں کا ڈیرہ ہوتا ہے۔ وہ یا تو چور ہوتے ہیں یا بھر درویش..... آپ کیا ہیں؟ جو اس طرح کے لوگ آپ کے پاس.....“

وہ کلکھلا کر ہنس دیئے پھر چند لمحے بعد بولے۔

”بیٹا، میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں چور یا سادہ، ہاں مکرراتا جانتا ہوں کہ کس رچھ کو کہاں سے پکڑتا ہے، کس بندر کو کیا اشارہ دیتا ہے اور کس کتے کو کیا ڈالنا ہے۔“

”مطلب آپ جانور.....“ میں نے سمجھنے کے پوچھا تو وہ بخجیدگی سے بولے

”نہیں بیٹا! انسان بھی ایسے جانوروں والی خصلت رکھتے ہیں، جیسے منافق سانپ سے بھی زہریلا ہوتا ہے۔ جیسے کتا ایک دفعہ کسی در سے کھالے تو وہ وفا بھاتا ہے، مگر بعض آدمی برس برس ایک جگہ کھاتے رہنے کے بعد بھی کسی انسان کو کاٹ لیتے ہیں، وہ انسان کتوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں،“

”مہر صاحب یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ، انسان تو اشرف المخلوقات ہے اور اسی کو آپ ایسے کہہ رہے ہیں؟“

”وہ سنا ہے بابا جی مجھے شاہ نے، کتے تیتھوں اُتے، یا بھر میاں محمد بخش نے کہا، بیکرتے انگوڑ چڑھایا،“ یہی کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ ”سورۃ التین کو سمجھا ہے آپ نے۔۔۔“

”آپ اسے سمجھا سکتے ہیں ذرا تفصیل سے؟“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا

”ہاں، مگر اس کم وقت میں نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کوڑے پھر بولے ”آج رات میرے مہمان بن جاؤ، ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔ پھر جب تک تمہارا دل چاہے رہو ادھر“

اور میں رات وہاں پر رہا۔ کہانی تو مجھے مل گئی۔ لیکن میں پہلی بار اس ”قلندر ذات“ سے متعارف ہوا، جس نے میری سوچ ہی کو نہیں، خیالات میں بھی غلام برپا کر دیا۔ میں ”قلندر“ کے بارے جاننے کے لئے تین سال تک سرگرداں رہا ہوں۔ ہر اس جگہ حاضری دی جہاں سے مجھے اس بارے علم کی ذرا سی بھی امید تھی۔ الحمد للہ میری مراد پوری ہوئی۔ اب اس کی کیا تفصیلات ہیں، میرے سوال کا جواب کیا ملا۔ یہی ”قلندر ذات“ کا موضوع ہے۔

میں شکر گزار ہوں جناب حافظ محمد عباس صاحب کا کہ انہوں نے میری توجہ اس موضوع کی طرف دلائی اور اس کا کافی حوصلہ دیا۔

میں شکر گزار ہوں اپنی بہن محترمہ رخسانہ بشیر صاحبہ کا، جو محترم جناب سید سرفراز احمد شاہ صاحب تک رسائی کا باعث بنیں۔ جنہوں نے بہت سارے عقدے حل کئے۔

میں شکر گزار ہوں جناب عمران احمد قریشی صاحب کا، کہ انہوں نے اس داستان میں بھرپور دلچسپی لی اور اپنے اتر بریدے ”نئے افق“ میں اہتمام سے شائع کیا۔

میں شکر گزار ہوں اپنے مربی، دوست اور بھائی جناب گل فراز احمد صاحب جنہوں نے ”قلندر ذات“ کو کتابی صورت میں شائع کر کے اس سلسلے کو نئی زندگی دی۔

میں شکر گزار ہوں، ملک محمد حسین صاحب کا جنہوں نے اس سلسلے کو لکھنے اور لکھتے رہنے کے لئے مہینہ کا کام لیا۔ جناب حکیم اقبال کا جنہوں نے تصور سے حقیقت کے سفر کا ادراک دیا۔ جناب فرحت عباس شاہ کا، جن کے ذریعے مجھے اک ”خاک نشین“ سے ملنے کا موقع ملا۔ حافظ محمد اصغر کا، جس سے خاصی بحث رہی۔ اپنے بچوں من قاطمہ، ہلال، احمد جمال اور عازنہ قاطمہ کا جن کا وقت بھی میں نے اس داستان کو دیا۔

اگر آپ کو اس داستان سے کچھ بھی اچھا لگے، تو عرض ہے، میرے لئے دل سے دعا کر دیجئے گا۔ رب تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

امجد جاوید

وہاں کافی طوائفیں ناچ رہی تھیں۔ سبھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ تاہم میری نگاہ ایک سرو قد طوائف پر جم کر رہی۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ تیز روشنی میں دکھ رہی تھی۔ جوانی تو جیسے اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ سینہ و رمل گورا بدن اس کے دل میں سے چھلک رہا تھا۔ بہت حد تک عیاں اور تھوڑا بہت نہاں گورا بدن تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ کھلے ہوئے گیسوؤں میں دل پہرہ چمکتے چمکتے کافی حد تک پسینے میں بھیگی ہوئی۔ سب سے بے نیاز، فلمی گیت کی لے پر جنونی انداز میں ناچ رہی تھی۔ شاید مجھے اس میں انفرادیت اس لیے دکھائی دے رہی تھی کہ وہ بس محورِ رقص تھی۔ خود ساختہ ادائیں نہیں دکھا رہی تھی۔ وہ ہر ادا سے ادا فاصلے پر تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے نقوش دیکھے مگر اس کے حسن کو محسوس نہ کر سکا۔ جیسے اس کے بدن کی ہر ادا میں میرے سامنے تھیں لیکن وہ ساری بھول بھلیاں ابھی اوجھل تھیں جن میں کوئی گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ میری نگاہ اس پر مرکب رہ گئی۔ فقط میں ہی نہیں وہاں پر موجود زیادہ تر لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عورت جو کچھ ڈھکی اور کھلیاں ہو جس کے بدن کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہوا، اتنے بڑے جھوم میں اعتماد اور بے نیازی سے اپنے فن میں ڈوبی ہوئی ایسی حسینہ کسی بھی مرد کے دل میں اتر جائے تو یہ ایک فطری سی بات ہوتی ہے۔ اس وقت وہ سرو قد طوائف زادی دھان سے اتری ہوئی پری ہی دکھائی دے رہی تھی۔ خود میں نے اپنے من میں اس کی کشش کے بارے میں لہر اٹھتی ہوئی دھان لی تھی۔

رات جس قدر گہری ہوتی جا رہی تھی، پنڈال میں اسی قدر جوش و مستی چھا رہی تھی۔ امیر زادے اپنی امارت کے شان و شوکت پر سواتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان امیر زادوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ سب ان محورِ رقص طوائفوں کے ساتھ تھے۔ زمین کے اس ٹکڑے پر یہ محفل گرم تھی جبکہ آسمان پر چاند پوری آفتاب سے چاندنی کی ٹھنڈک لٹا رہا تھا۔ ان اور تین راتیں لگنے والا یہ میلہ بڑا ہی رنگین ہوا کرتا تھا۔ اس میلے میں شرکت کے لیے پورا علاقہ سال بھر انتظار کرتا تھا بلکہ اس کے لیے بھرپور تیاریاں بھی کی جاتی تھیں۔ تقریباً پچاس گاؤں اور ان کے درمیان چھوٹی بڑی بستیوں کے لوگ، جوان مختلف کھیلوں کے لیے تیار ہوا کرتے تھے۔ انہی نو جوانوں کے درمیان مقابلے ہوتے جو جیت جاتا وہ اپنا پانچواں پانچواں کے لیے مزید محنت کرتا اور جو ہار جاتا وہ جیتنے کی خواہش میں سخت سے سخت محنت سے گزرتے۔ یوں پورا علاقہ ہندوؤں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہر دھڑے کی سرپرستی کوئی نہ کوئی امیر زادہ کرتا۔ سبھی اپنے اپنے نو جوانوں اور شہرہ داروں کو مخصوص توجہ دیا کرتے تھے۔ اس لیے علاقے میں بہت سارے گھر اور شہرہ زور جو ان نکلا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مقامی کروانے کے لیے علاقے کی ایک انجمن بنی ہوئی تھی جو نہ صرف امن و امان برقرار رکھتی بلکہ انعام و اکرام کے لیے لڑتی تھی۔ یہ انجمن خاصے مضبوط لوگوں کی تھی، سبھی ان کا حکم مانتے تھے۔

پاکستان بننے سے بھی کہیں پہلے اس میلے کی ابتدا انجانے کب ہوئی تھی۔ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا بس ایک حد تک یہ ایک بزرگ جسے لوگ مسافر شاہ کے نام سے جانتے تھے وہ اس میلے والے میدان کے ایک کونے میں کچھ گھر تھے۔ جہاں اب ایک پختہ ٹھہرا بنا ہوا تھا۔ وہیں ایک برگد کا درخت تھا۔ جس پر معلوم نہیں کتنے برس گزر چکے تھے۔ ان بات یہ تھی کہ اس پورے علاقے میں کہیں کوئی برگد کا درخت نہیں تھا۔ میلے والے میدان میں جنگلی جھاڑیاں لگی تھیں۔ بنانے کب اس جگہ کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ اگر کوئی وہاں منت مان لے تو اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ مسافر شاہ نے اپنے قیام کے دوران بہت سارے لوگوں کو فیض یاب کیا تھا۔ عوام اس برگد کے درخت کو بڑے عقیدے سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ درخت مسافر شاہ نے لگایا تھا۔ لوگ اس درخت پر منت کا رنگین دھاگہ پھیل پھیل دیتے تھے اور پتھر اچکا تھا۔ مجھے جہاں تک معلوم تھا اس ٹھہرے کو شاہ زیب کے پڑا دادا نے پختہ کروایا تھا۔ اس ٹھہرے والے بھی کھدوایا اور اس ٹھہرے کے ارد گرد چار دیواری کا حصار بھی بنادیا۔ عمومی طور پر سارا سال وہ میدان

وہ میلے کی آخری رات تھی۔ میں نے مسافر شاہ کی ٹھہرے کی چار دیواری کے ساتھ اپنی بایک روک کر بند کر دی۔ وہاں کافی اندھیرا تھا لیکن مسافر شاہ کے ٹھہرے کی کمر پر روشن دیو کی روشنی، اس اندھیرے کو چیر رہی تھی۔ رات کی سیاہ تاریکی میں وہ ٹٹماتے ہوئے دینے زندگی کی علامت معلوم ہو رہے تھے۔ میرے دائیں جانب وہ کھلا میدان تھا، جہاں میلہ اب اوجڑ چکا تھا۔ وہاں لگی ہوئی عارضی دکانیں ختم ہو چکی تھیں۔ کچھ سیٹ لی گئی تھیں اور کچھ سیٹیں جاری تھیں۔ کافی فاصلے پر سینکڑوں لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ جہاں سے تیز روشنی کے ساتھ جا بجا نصب اسپیکروں سے فلمی گیت کی آواز ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس مجمع کے پنڈال میں طوائفیں رقص کر رہی ہیں۔ میں نے بایک کو لاک نہیں کیا، ویسے ہی دیوار کے ساتھ لگا کر اتر آیا۔ میں نے لاشعوری طور پر اپنی ”ڈب“ میں موجود بسل کو ہاتھ سے محسوس کیا اور ایک سنسنی خیز لہر کے ساتھ اس مجمع کی جانب بڑھ گیا۔

اگرچہ ان طوائفوں کا ناچ دیکھنے علاقے کا کوئی بھی بندہ جاسکتا تھا لیکن میں اپنے گاؤں کے سردار شاہ دین کے اکلوتے بیٹے شاہ زیب کی خصوصی دعوت پر وہاں گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے مجھے وہاں کیوں بلوایا ہے۔ میں مجمع کو چیرتا ہوا پنڈال میں جا پہنچا جو لوگوں سے کچھ اچھے بھر ہوا تھا۔

وہاں عام لوگ تو تھے ہی، لیکن علاقے کے امیر زادے اپنی انفرادیت کو دھڑا کر دھڑا کر کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی انفرادیت جتانے کے لیے خاص اہتمام کیا ہوا تھا۔ شامیانے میں کرسیاں قطاروں میں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں سبھی اپنے لائسنس اور مصاحبوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ایک طرف جہاں اپنی طاقت کا اظہار تھا تو دوسری طرف کسی بھی ناگہانی افتاد سے بچنا جاسکتا تھا۔ میں ایک ہی نگاہ میں سارے پنڈال کا جائزہ لے کر اس جانب بڑھ گیا جہاں شاہ زیب بیٹھا ہوا تھا۔ میری آمد پر اس نے مجھے چونک کر دیکھا، جیسے میرے وہاں آ جانے کا یقین کر رہا ہو۔ اس کے لبوں فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ تبھی اس نے اپنے ایک مصاحب کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا تو میں وہاں جا بیٹھا۔ ہم دونوں میں محض مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ کیونکہ ہم دونوں ہی اپنی وہاں پر موجودگی کے بارے میں جانتے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری آمد پر شکریے کا اظہار کیا پھر ان طوائفوں پر نوٹ برسانے لگا۔ جو وہاں ان کے سامنے محورِ رقص تھیں۔ دوسرے امیر زادے بھی ایسے ہی شغل میں مصروف تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان امیر زادوں کے درمیان نوٹ برسانے کا مقابلہ چل رہا ہے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں اپنے جگری یا رافضاق عرف چھا کا کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے اپنی مخصوص منڈلی کے ساتھ دکھائی دے گیا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور میری توقع کے مطابق اس کے چہرے پر حیرانی پھیل گئی تھی۔ بلاشبہ وہ میری آمد پر حیران تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اپنے جذبات کا احساس دلایا تو میں سکون سے محفل کی طرف متوجہ ہو گیا، جواب گرم ہو چکی تھی۔

وہاں کافی طوائفیں ناچ رہی تھیں۔ کبھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ تاہم میری نگاہ ایک سرو قد طوائف پر جم کر رہی۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ تیز روشنی میں دمک رہی تھی۔ جوانی تو جیسے اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ سینہ و رمل گور بدن اس کے اس میں سے چھلک رہا تھا۔ بہت حد تک عیاں اور تھوڑا بہت نہاں گور بدن تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ کھلے ہوئے گیسوؤں میں اس کا ہرہ چمکتے چمکتے کافی حد تک پسینے میں بھیگی ہوئی۔ سب سے بے نیاز فلمی گیت کی لے پر جنونی انداز میں ناچ رہی تھی۔ شاید مجھے اس میں انفرادیت اس لیے دکھائی دے تھی کہ وہ بس محور رقص تھی۔ خود ساختہ ادا میں نہیں دکھا رہی تھی۔ وہ نے ذرا فاصلے پر تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے نقوش دیکھے مگر اس کے حسن کو محسوس نہ کر سکا۔ جیسے اس کے بدن کی ام تر وادیاں میرے سامنے تھیں لیکن وہ ساری بھول بھلیاں ابھی اوجھل تھیں جن میں کوئی گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ میری نگاہ اس پر ٹپک کر رہ گئی۔ فقط میں ہی نہیں وہاں پر موجود زیادہ تر لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عورت جو کچھ دکھائی اور دیکھا عیاں ہو جس کے بدن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہوا اتنے بڑے ہجوم میں اعتماد اور بے نیازی سے اپنے فن میں ڈوبی ہوئی ہو ایسی حسینہ کسی بھی مرد کے دل میں اتر جائے تو یہ ایک فطری سی بات ہوتی ہے۔ اس وقت وہ سرو قد طوائف زادی امان سے اتری ہوئی پری ہی دکھائی دے رہی تھی۔ خود میں نے اپنے من میں اس کی کشش کے بارے میں لہر اٹھتی ہوئی اس کی تھی۔

رات جس قدر گہری ہوتی جا رہی تھی، پنڈال میں اسی قدر جوش و مستی چھا رہی تھی۔ امیر زادے اپنی امارت کے نشے میں مخمور ٹوٹ برساتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان امیر زادوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ سب ان محور رقص طوائفوں کے ہاتھ مست تھے۔ زمین کے اس ٹکڑے پر یہ محفل گرم تھی جبکہ آسمان پر چاند پوری آفتاب سے چاندنی کی ٹھنڈک لٹا رہا تھا۔ تین دن اور تین راتیں لگنے والا یہ میلہ بڑا ہی رنگین ہوا کرتا تھا۔ اس میلے میں شرکت کے لیے پورا علاقہ سال بھر انتظار کیا کرتا تھا بلکہ اس کے لیے بھر پور تیاریاں بھی کی جاتی تھیں۔ تقریباً پچاس گاؤں اور ان کے درمیان چھوٹی بڑی بستیوں کے کئی نوجوان مختلف کھیلوں کے لیے تیار ہوا کرتے تھے۔ انہی نوجوانوں کے درمیان مقابلے ہوتے جو جیت جاتا وہ اپنا واز بچانے کے لیے مزید محنت کرتا اور جو ہار جاتے وہ جیتنے کی خواہش میں سخت سے سخت محنت سے گزرتے۔ یوں پورا علاقہ چند دھڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہر دھڑے کی سرپرستی کوئی نہ کوئی امیر زادہ کرتا۔ کبھی اپنے اپنے نوجوانوں اور شہرہ آفاقوں پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ اس لیے علاقے میں بہت سارے گھروں اور شہرہ زور جو ان کا لگا کرتے تھے۔ اس کے درمیان مقابلے کروانے کے لیے علاقے کی ایک انجمن بنی ہوئی تھی جو نہ صرف امن و امان برقرار رکھتی بلکہ انعام و اکرام کے بھی نوازتی تھی۔ یہ انجمن خاصے مضبوط لوگوں کی تھی، کبھی ان کا حکم ماننے تھے۔

پاکستان بننے سے بھی کہیں پہلے اس میلے کی ابتدا نجانے کب ہوئی تھی۔ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا بس ایک اہانت تھی کہ ایک بزرگ جسے لوگ مسافر شاہ کے نام سے جانتے تھے وہ اس میلے والے میدان کے ایک کونے میں کچھ مسموم نمبرے تھے۔ جہاں اب ایک پختہ ٹھہرا بنا ہوا تھا۔ وہیں ایک برگد کا درخت تھا۔ جس پر معلوم نہیں کتنے برس گزر چکے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس پورے علاقے میں کہیں کوئی برگد کا درخت نہیں تھا۔ میلے والے میدان میں جنگلی جھاڑیاں اکا کرتی تھیں۔ نجانے کب اس جگہ کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ اگر کوئی وہاں منت مان لے تو اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مسافر شاہ نے اپنے قیام کے دوران بہت سارے لوگوں کو فیض یاب کیا تھا۔ عوام اس برگد کے درخت کو بڑے احترام سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ درخت مسافر شاہ نے لگایا تھا۔ لوگ اس درخت پر منت کارنگیں دھاگہ اندھتے تھے۔ پہلے پہل وہ ٹھٹھا کچا تھا۔ مجھے جہاں تک معلوم تھا اس ٹھٹھے کو شاہ زیب کے پڑدادا نے پختہ کر دیا تھا۔ اس نے ساتھ ایک کنواں بھی کھدوایا اور اس ٹھٹھے کے ارد گرد چار دیواری کا حصہ بھی بنا دیا۔ عمومی طور پر سارا سال وہ میدان

وہ میلے کی آخری رات تھی۔ میں نے مسافر شاہ کی ٹھٹھے کی چار دیواری کے ساتھ اپنی بائیک روک کر بند کر دی۔ وہاں کافی اندھیرا تھا لیکن مسافر شاہ کے ٹھٹھے کی ٹکڑ پر روشن دیو کی روشنی، اس اندھیرے کو چیر رہی تھی۔ رات کی سیاہ تاریکی میں وہ ٹٹماتے ہوئے دیپے زندگی کی علامت معلوم ہو رہے تھے۔ میرے دائیں جانب وہ کھلا میدان تھا، جہاں میلہ اب ابڑ چکا تھا۔ وہاں لگی ہوئی عارضی دکانیں ختم ہو چکی تھیں۔ کچھ سمیٹ لی گئی تھیں اور کچھ سیٹی جا رہی تھیں۔ کافی فاصلے پر سینکڑوں لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ جہاں سے تیز روشنی کے ساتھ جا بجا نصب اسپیکروں سے فلمی گیت کی آواز ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس مجمع کے پنڈال میں طوائفیں رقص کر رہی ہیں۔ میں نے بائیک کو لاک نہیں کیا، ویسے ہی دیوار کے ساتھ لگا کر اتر آیا۔ میں نے لاشعوری طور پر اپنی ”ڈب“ میں موجود پمپل کو ہاتھ سے محسوس کیا اور ایک سنسنی خیز لہر کے ساتھ اس مجمع کی جانب بڑھ گیا۔

اگرچہ ان طوائفوں کا ناچ دیکھنے علاقے کا کوئی بھی بندہ جاسکتا تھا لیکن میں اپنے گاؤں کے سردار شاہ دین کے اکلوتے بیٹے شاہ زیب کی خصوصی دعوت پر وہاں گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے مجھے وہاں کیوں بلوایا ہے۔ میں مجمع کو چیرتا ہوا پنڈال میں جا پہنچا جو لوگوں سے کچھ اچھے بھر ہوا تھا۔

وہاں عام لوگ تو تھے ہی، لیکن علاقے کے امیر زادے اپنی انفرادیت، کروفر اور طمطراق کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی انفرادیت جتانے کے لیے خاص اہتمام کیا ہوا تھا۔ شامیانے میں کرسیاں قطاروں میں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں کبھی اپنے لاؤ لشکر اور مصاحبوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ایک طرف جہاں اپنی طاقت کا اظہار تھا تو دوسری طرف کسی بھی ناگہانی افتاد سے بچنا جاسکتا تھا۔ میں ایک ہی نگاہ میں سارے پنڈال کا جائزہ لے کر اس جانب بڑھ گیا جدھر شاہ زیب بیٹھا ہوا تھا۔ میری آمد پر اس نے مجھے چونک کر دیکھا، جیسے میرے وہاں آ جانے کا یقین کر رہا ہو۔ اس کے لبوں فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ تبھی اس نے اپنے ایک مصاحب کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا تو میں وہاں جا بیٹھا۔ ہم دونوں میں محض مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ کیونکہ ہم دونوں ہی اپنی وہاں پر موجودگی کے بارے میں جانتے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری آمد پر شکرے کا اظہار کیا پھر ان طوائفوں پر ٹوٹ برسانے لگا۔ جو وہاں ان کے سامنے محور رقص تھیں۔ دوسرے امیر زادے بھی ایسے ہی شغل میں مصروف تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان امیر زادوں کے درمیان ٹوٹ برسانے کا مقابلہ چل رہا ہے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں اپنے جگر یار اشفاق عرف چھا کا کودیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے اپنی مخصوص منڈلی کے ساتھ دکھائی دے گیا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور میری توقع کے مطابق اس کے چہرے پر حیرانی پھیل گئی تھی۔ بلاشبہ وہ میری آمد پر حیران تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اپنے جذبات کا احساس دلایا تو میں سکون سے محفل کی طرف متوجہ ہو گیا، جواب گرم ہو چکی تھی۔

کردے وہی یہ مقابلہ جیت جائے جاتا، ورنہ سامنے والے کے نوٹ ختم ہو جانے تک یہ مقابلہ جاری رہنا تھا۔

میں اس سرود طوائف زادی میں کھویا ہوا تھا جو ہمارے سامنے ناچ رہی تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے اسے اپنا ہوش ہی نہیں ہے۔ وہ مست الست حالت میں تھی۔ اس کے ساتھ دوسری چند طوائفیں بھی تھیں مگر اس کا جنون بالکل منفرد تھا۔ اسے کوئی ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ شاہ زیب کے سامنے سے ہٹتی ہی نہیں تھی چند طوائفیں پیر زادہ وقاص کے سامنے تھیں۔ مگر لوگوں کی توجہ ان پر نہیں تھی۔ یوں پورا پنڈال اس سرود قد حسینہ کی طرف متوجہ تھا۔ شاہ زیب نے اس کی مستی اور جنونی کیفیت کے پیش نظر اپنے دونوں ہاتھوں میں نوٹ پکڑے اور اٹھ کر نوٹ دار نے لگا۔ جس پر پنڈال میں ہاؤ ہو کا شور مچ گیا۔ پیر زادہ وقاص کے سامنے ناچنے والی طوائفوں کو ہر کوئی بھول گیا۔ مجمع سمٹ کر اس سرود طوائف زادی کے ارد گرد جمع ہونے لگا۔ یہ پیر زادہ وقاص کے لیے بڑی ہتک کی بات تھی۔ ایک پارگی اس کی طرف سے ایک نوجوان اٹھا اور بڑی تیزی سے آ کر اس سرود طوائف زادی پر نوٹ برسائے لگا۔ کوشش یہی تھی کہ وہ اس حسینہ کو اپنی جانب متوجہ کر لے یا پھر اسے مائل کر کے اپنی طرف لے جائے۔ شاید اس طرح ہاتھ سے جاتا ہوا میدان وہ مار لیں۔ مگر وہ سرود قد حسینہ سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ اسی جنونی انداز سے ناچتی رہی کہ جیسے اسے اپنے ارد گرد کا ہوش ہی نہیں ہے۔ اس نوجوان کو جب اپنی کوشش رائیگاں جاتی ہوئی دکھائی دی جو بلاشبہ شرمندگی کا باعث تھی۔ تب اس نوجوان نے سرود طوائف زادی کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اسے اس جانب لے جانے کی کوشش کرنے لگا جس طرف سے وہ آیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کوئی طوائف کو ہاتھ لگائے۔ یہی وہ لمحات تھے جب میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ جس مقصد کے لیے شاہ زیب نے مجھے دعوت دی تھی یا پھر یہاں آنے کا نادیہ بلاوا تھا، وہ وقت آن پہنچا ہے۔

بلاشبہ میرے لیے امتحان کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ کیونکہ شاہ زیب کے حواری اور مصاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چلتا ہوا گیت اچانک رک گیا تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جس کے ساتھ ہی اس سرود طوائف زادی کو ہوش آ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے ارد گرد دیکھا پھر حیرت اور غصے سے اس نوجوان سے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔ تبھی شاہ زیب کی آواز گونجی۔

”اُونو جوان! ایسا نہ کرو۔۔۔۔۔۔ مقابلہ کرو مقابلہ۔۔۔۔۔۔ نوٹ اگر کم پڑ گئے ہیں تو مجھ سے لے لو لیکن مقابلہ کرو یہ جو تم لرہے ہو میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڈیاں اس نوجوان کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو صبح ہونے کا انتظار کرو اور مقابلہ کرو۔“

شاہ زیب کی آواز کیا گونجی پورے پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ جبکہ میرے بدن میں وہی سنسناہٹ ہونے لگی تھی اور ہر شے کو اپنا شکار مل جانے پر ہوتی ہے۔ میرے جڑے بھنچ گئے تھے پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ پیر زادہ وقاص کی طرف چند لوگ اٹھے وہ انتہائی غیظ و غضب میں تھے۔ ان کے پیچھے بہت سارے لوگ بڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ میدان میں ہال ہند منٹ پہلے تک طوائفیں ناز و انداز کے ساتھ محور قص تھیں۔ وہی اب میدان کا کارزار بن گیا تھا۔ ایک ہجوم ایک طرف کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ اسی دوران پیر زادہ وقاص کی طرف سے کسی نے ہوائی فائر کر دیا۔ فائر کی آواز نے اعصاب کے تار ہلا دیے۔ ممکن ہے اس کا مقصد یہی رہا ہو کہ لوگ ڈر جائیں اور خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں۔ تبھی قریب کھڑے شاہ زیب نے میری جانب دیکھا اور کہا۔

”جمال! جس کے پاس بھی اسلحہ ہو وہ یہاں سے بچ کر نہ جائے۔ باقی میں سنبھال لیتا ہوں۔“

جیسے ہی اس کے لفظ میرے کانوں میں پڑے اس لمحے میرا اسلحہ میرے ہاتھوں میں تھا اور میں اس کا سیفٹی کچ کاٹا تھا۔ وہاں کسی کو قتل کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ جو بھی اسلحہ چلانے کی کوشش کرتا اسے اس طرح زخمی کر دیا جائے کہ وہ اسلحہ نہ

خالی رہتا۔ راہ چلتے مسافر اس برگد کے درخت تلے کچھ دیر آرام کرتے۔ کنویں سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے اور اپنی راہ لیتے۔ ارد گرد کے غریب لوگ جنگلی جھاڑیاں کاٹ کر لے جاتے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اتنے بڑے میدان پر کسی جاگیر دار یا سردار کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ میلہ شروع ہونے سے چند دن قبل کھمبیوں کی مانند رونق ابھرنے لگتی۔ پہلے دکانیں سجے لگتیں پھر دور و نزدیک سے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے فنکار جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ تھیر، موت کا کنواں بازی گرنٹ باز، بہروپے، جادوگری اور شعبہ بازی کے کمالات دکھانے والے سنیاسی، حکیم، پتھر بیچنے والے عورتوں کے ہار سنگھار اور بچوں کے کھلونے فروخت کرنے والے اور نجانے کون کون سے حلوائی آ جاتے۔ ہر کوئی اپنے فن کا مظاہرہ کرتا اور داد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی رقم کمالے جاتا۔

اس میلے میں ایک بڑا میدان مختلف مقابلوں کے لیے مختص تھا۔ میلے کے دنوں سے پہلے ہی امیر امراء اپنے اپنے شہزادوں، فنکاروں اور نوجوانوں کے ساتھ وہاں ڈیرے ڈال لیتے۔ مختلف مقابلے ہوتے، شرطیں لگتیں، انعامات ملتے، جیتنے ہارنے کے نجانے کتنے منظر دیکھنے کو ملتے اور پھر آخری رات اس میدان میں طوائفیں آ جاتیں۔ تب رنگین مزاج لوگ اس ماحول کو رنگین تر کر دیتے۔ رات کے آخری پہر تک سماں بندھا رہتا۔ امیر زادوں میں نوٹ برسانے کا مقابلہ چلتا۔ جس کے پاس نوٹ ختم ہو جاتے یا وہ حوصلہ ہار جاتا وہ چپکے سے اپنی ہار تسلیم کرتے ہوئے نکل جاتا۔ محفل کے اختتام تک نوٹ لٹانے والے کی واہ واہ پورا سال علاقے بھر میں گونجتی رہتی۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ وہاں پر آنے والی طوائفیں ایک ہی خاندان سے ہوتی تھیں۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی پشت میں سے کون سی طوائف پہلے یہاں آئی تھی۔ یہ بات بھی روایت کی طرح مشہور تھی کہ جب مسافر شاہ کا یہاں قیام تھا ان دنوں ایک طوائف کا گزر یہاں سے ہوا تھا۔ وہ بڑی بے بس اور غریب تھی۔ نہ اس کے پاس خوب صورتی تھی اور نہ دولت، وہ جب یہاں سے پلٹ کر گئی تو اس کی قسمت ہی بدل گئی۔ دوبارہ جب وہ یہاں آئی تو مسافر شاہ نے نہیں تھے۔ وہ رات بھر یہاں ناچتی رہی۔ پھر اس کے خاندان سے طوائفیں یہاں آنے لگیں۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ یہیں ایک رات یہاں مجرا کرتی تھیں۔ پھر اس کے بعد سال بھر وہ کہیں بھی کوئی محفل نہیں سجاتی تھیں۔ اب یہ بات درست تھی یا غلط کسی نے بھی تحقیق نہیں کی تھی۔ میلے کی آخری شام ڈھلتے ہی وہ لوگ آ جاتے۔ رات بھر محفل رنگین کرتے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی واپس لوٹ جاتے۔ وہ لوگ کبھی کسی کے مہمان نہیں رہے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا آیا تھا۔ پہلے میں ہر سال میلہ دیکھنے آتا تھا لیکن چند سال ہوئے ادھر نہیں آیا تھا۔ اس بار شاہ زیب کی خصوصی دعوت پر چلا آیا تھا۔ وہ اگر دعوت نہ بھی دیتا تو میں نے اس بار میلے میں ضرور آنا تھا۔

اس وقت رات گہری ہو گئی تھی۔ وہ سرود طوائف زادی پسینے میں شرابو تھی۔ اس کا سیاہ لباس بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا۔ جس قدر اس کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ تماش بین اسی قدر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ مجھ سے ذرا فاصلہ پر شاہ زیب بھی اپنے سامنے نوٹوں سے بھرا تھیلا رکھے ہوئے تھا۔

اس دفعہ اس کا شمار ہی عجیب تھا۔ میلے کے ان تین دنوں میں اس کی سرپرستی میں نوجوانوں نے سب سے زیادہ انعام جیتے تھے۔ ان شہہ زوروں، محافظوں، نوجوانوں اور گاؤں کے لوگوں کے درمیان وہ کھل کر ان طوائف زادیوں کو داد و تحسین سے نواز رہا تھا۔ کچھ طوائفیں تھک ہار کر بیٹھ گئی تھیں۔ جس طرح کچھ امیر زادے اپنی ہار تسلیم کر کے وہاں سے چلے گئے تھے اس وقت شاہ زیب کے سامنے ایک اکیلا پیر زادہ فیروز کا بنیا، پیر زادہ وقاص ہی ڈٹا ہوا تھا۔ یہی دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے پاس نوٹ ختم ہی نہیں ہو رہے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ باقی بچی ہوئی طوائفیں انہی دونوں کے درمیان بٹ کر رہ گئی تھیں۔ لاشعوری طور پر یہی وہ فیصلہ کن لمحات تھے۔ جو سبھی طوائفوں کو اپنے سامنے ناچنے پر مجبور

چلا سکے۔ اب یہ کڑے امتحان والی بات تھی کہ اتنے بڑے جہوم میں فائر اس طرح کیا جائے کہ سامنے والا محض زخمی ہو۔ شاہ زیب کو معلوم تھا کہ میرا نشانہ کس طرح ”نچا“ ہے اور مجھے بھی اپنے فن پر ناز تھا۔ اس لیے میں نے پہلا نشانہ ہی اس بندے کا لیا جس نے ہوائی فائر کیا تھا اور اس فائر کا رد عمل دیکھ رہا تھا۔ ایک دھماکے کے ساتھ پیر زادہ وقاص کے پاس ایک چیخ ابھری۔ تب تک میں اپنی جگہ تبدیل کر کے نسبتاً اندھیرے میں اونچی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو مزید بندوں کا نشانہ لیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ وہاں باپل جی گئی۔ کچھ دیر پہلے جہاں جوش بھرے نعرے اور جوانی سے بھر پور نکمیں نعرے بازی ہو رہی تھی اب وہاں خوف میں لپٹی ہوئی چیخیں اور جان بچانے کی فکر میں لوگوں کی بھگدڑ تھی۔ دونوں حریفوں کے لوگ ستم گھاٹھے جبکہ میں یہی دیکھتے ہوئے اندھیرے میں ہو گیا کہ مخالف فریق میں سے اسلحہ کس کس کے پاس ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کس حریف کا پلہ بھاری پڑ رہا ہے۔ مجھے تو اپنا کام کرنا تھا۔

پیر زادہ وقاص کے ارد گرد چند محافظ تھے۔ ان کے پاس مختلف ماڈل کی گنیں تھیں۔ میں اگر انہیں ہی نشانہ بنالیتا تو نہ صرف پیر زادہ کی ہوائی جہاز بلکہ وہ فائر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جتنی جلدی ہو جاتا اتنا ہی فائدہ مند تھا۔ دشمن کے بارے میں جب یہ یقین ہو جائے کہ وہ وار کرے گا تب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر وار کر دو ورنہ اس نے تو وار کرنا ہی ہے۔ دشمن کو موقع دینا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ پیر زادہ وقاص کے حصار کو خوف زدہ کر دینا صرف اور صرف سچے اور سچے نشانے ہی سے ممکن تھا۔ میری پہلی نگاہ میں وہ شخص آیا جو اپنی گن کو بولٹ مار چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا میں نے اس پر فائر جھونک دیا اگلے ہی لمحے وہ چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کے کندھے کو چیر گئی تھی۔ پھر میں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کے چہروں پر حیرت کس قدر ہے۔ وہ گولی کی سمت ہی متعین کرتے رہ گئے اور میں نے اس کے حصار پر اپنا میگزین خالی کر دیا۔ یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے تھے اس لیے انہیں سمت کا اندازہ ہو گیا۔ ابھی ایک گول سنسناتی ہوئی آئی اور میرے قریب سے گزر گئی۔ اگر میں نے عادت کے مطابق جگہ تبدیل نہ کی ہوتی تو بلاشبہ وہ گولی میرے بدن میں پیوست ہو جاتی۔ میں نے میگزین بدلا اور جگہ بدل کر فائر کرنے لگا۔ ان دیکھی موت کا خوف زیادہ ہوتا ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی اسلحہ بردار ڈھیر ہو گئے تو ان میں مقابلے کی سکت نہ رہی۔ ان دیکھی گولیوں کا شکار وہیں گر کر ترپنے لگے تو پیر زادہ وقاص میں دم نہیں رہا۔ میں نے دیکھا وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان میں سے نکلتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور چاہا کہ اسے زخمی کر دوں مگر نجانے کیا سوچ کر اس کے قریب کھڑے بندے پر فائر جھونک دیا۔ وہ بندہ چیخ مار بھاگتا ہی الٹ گیا۔ ابھی اس کا خوف دیدی تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا پتا ہی نہ چلا کہ وہ کدھر گیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میرا پورا دھیان اس طرف تھا کہ گولی کسی کو بھی ایسی جگہ نہ لگے جس سے وہ مر جائے صرف انہیں زخمی کر کے دہشت زدہ کرنا تھا اور وہ ہو گئے۔ پیر زادہ وقاص کو میں خوف زدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنے سردار کو وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھ کر اس کے حواری بھی تتر بتر ہونے لگے۔ جس کے جس طرف سینگ سمائے وہ اس طرف نکل گیا۔ خوف کی اس فضا میں دونوں طرف سے ہی لوگ زخمیوں کو اٹھا کر بھاگنے لگے۔ گاڑیاں اشارت ہونے لگیں اور اندھیرے میں لوگ بھاگنے لگے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے دورانے میں وہ میدان ایک الم ناک انجام کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بس چیخ و پکار خوف و ہراس اور زخمیوں کی کراہیں تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی مر گیا ہے یا نہیں لیکن یہ میدان بھی ہمارے گاؤں کے لوگوں نے مار لیا تھا۔ میں دور کھڑا شاہ زیب کے چہرے پر پھیلی عجیب سی فاتحانہ مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ لوگ اپنے اپنے زخمیوں کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میں تیز قدموں کے ساتھ اندھیرے میں اس سمت بڑھ گیا جدھر میری بایک کھڑی تھی۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ کوئی اسے اٹھا کر نہیں لے گیا تھا۔ میں نے پہل اپنی ڈب میں رکھنے سے پہلے اس کا میگزین دیکھا اسے نکال کر دوسرا لگایا۔ پھر آؤں کر بایک نکال کر وہاں سے چل دیا۔ اندھیرے

میں ذرا فاصلے پر بایک کی روشنی میں برگد کا درخت مسافر شاہ کا تھڑا اور اس کے قریب کھڑے چند لوگ ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں میں آئے اور پھر میں اپنے گاؤں جانے والے راستے پر ہویا۔

میلے والے میدان سے میرا گاؤں ”نورنگر“ دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تمام راستا کچا تھا۔ راستے میں کھیت پڑتے تھے۔ کچھ تھوڑا سا چٹیل میدان تھا۔ پھر نہر کا پل اس سے آگے کی سڑک پر تقریباً ایک میٹر دور میرا گاؤں تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ جو سواری پر تھے وہ نکل چکے تھے۔ جو پیدل تھے وہ اس راستے سے گاؤں جا رہے تھے۔ جتنے زخمی تھے وہ سب لے جائے جا چکے تھے۔ میں ان سب لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک پگڈنڈی والا راستا اپنایا تاکہ کسی کی بھی نگاہوں میں آئے بغیر گاؤں پہنچ جاؤں۔ یہ محض احتیاط تھی میرے راستے میں کوئی بھی دشمن گھاٹ لگا کر بیٹھا ہو سکتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میدان میں بہت سارے لوگوں نے مجھے فائر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ یہ تو صبح ہی معلوم ہونا تھا کہ کس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ میں پوری توجہ سے پگڈنڈی پر بایک لیے جا رہا تھا۔ چاندنی میں ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں پوری طرح محتاط تھا۔ جو راستا میں نے اپنایا تھا ممکن ہے اس پر بھی کوئی دشمن حملہ آور ہو سکتا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹ بند کی ہوئی تھی اور چاندنی ہی میں اندازے سے بایک لیے جا رہا تھا۔ ورنہ دور ہی سے پتا چل جاتا کہ کوئی بایک لیے جا رہا ہے۔ میرے سارے حواس جاگ رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک ہیولے پر پڑی جو ذرا فاصلے پر تیزی سے ایک کھیت میں گھس گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا میری نگاہوں سے بچنا چاہتا تھا یا میری تاک میں تھا جو جتنا محتاط ہوتا ہے اس کا لاشعور اسے اتنا ہی دھوکہ دیتا ہے۔ لمحہ بھر میں کئی سوال میرے ذہن میں در آئے میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ میری توجہ بٹ گئی۔ ایک طرف مجھے پگڈنڈی کا خیال کرنا تھا تو دوسری جانب مجھے اس ہیولے پر بھی نگاہ رکھنی تھی۔ میں اس کے قریب سے بھی گزر کر اس کے وار سے نہیں بچ سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ ایک سے زیادہ لوگ ہوں۔ میں نے اچانک بایک روکی اور کھال میں کھڑی کر دی۔ پھر تیزی سے اتار کر اس جگہ فصل میں گھس گیا جہاں میں نے ہیولہ دیکھا تھا۔ میں فصل میں گھستے ہی دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں جو کوئی بھی مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہوتا وہ رد عمل میں ضرور کچھ نہ کچھ کرتا۔ میں نے پہل نکال کر اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا کسی بھی متوقع آہٹ کو سننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ چند لمحوں تک کچھ نہ ہوا۔ ویسا ہی سناٹا رہا۔ ابھی میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ میری نگاہوں کا دھوکا تو نہیں ہے۔ میں اس پر غور کر رہا تھا کہ مجھے خود سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لمحے سے بھی کم وقت میں لشکارا محسوس ہوا۔ یوں جیسے کوئی جگنو چکا ہو۔ پھر یہ چمک بار بار ہونے لگی۔ میں سر کتا ہوا آگے بڑھنے لگا تاکہ جان سکوں کہ یہ لشکارا کس کا ہے؟ پھر اچانک میں ٹھٹک گیا۔ وہ کوئی عورت تھی۔ بکھری ہوئی زلفیں شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سیاہ لباس اور سفید گردن کے پاس زلفوں کے درمیان کان میں پڑا جھمکا چاندنی میں جگنو کی طرح ٹٹمار ہاتا تھا۔ میں نے مزید غور سے دیکھا تو خوش گوار حیرت میرے اندر پھیل گئی۔ وہ سرو قد طوائف زادی تھی۔ وہی جو کچھ دیر پہلے پنڈال میں جنونی انداز سے محور قص تھی۔ وہ یہاں چھپی ہوئی تھی۔ بھکڑ میں جس کا منہ جدھر آیا وہ اس طرف نکل گیا۔ وہ بھی اس طرف نکل آئی ہوگی۔ میں نے اس کے یہاں ہونے پر مزید غور نہیں کیا بلکہ سر کتا ہوا محتاط انداز میں کوئی آواز نکالے بغیر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ڈر یہی تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی چلائے نہ لگ جائے۔ میں نے ایک دم سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس افتاد پر پھل کی مانند میرے ہاتھوں میں تڑپی اور پھسلنے کے لیے بے تحاشا پھلنے لگی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ گھوم کر میرے سینے سے آگئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کا دل کتنی زور سے دھڑک رہا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نگاہ میرے ہاتھوں میں سیاہ پہل پر پڑی۔ تب اس کی ساری زور آزمائی دم توڑ گئی۔

”ڈرو مت“ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں تم محفوظ ہاتھوں میں ہو۔“ میرے کہنے پر وہ ایک دم سے ساکت ہو گئی۔

میں نے اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو وہ گھگھکیا۔ ہونے انداز میں بولی۔

”ک..... کک..... کون ہوتا؟“

”میں اگر تمہیں اپنا تعارف کرا بھی دوں تو کیا تم مجھے پہچان لو گی۔ ہاں یہ جان لو کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“

”لیکن..... دوست..... بھی تو نہیں ہو.....!“ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ یہاں کیوں چھپی ہوئی ہو؟“ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”مجھے میرے لوگوں تک پہنچا دو، وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔“ اس نے کافی حد تک خود پر قابو پاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہاں میدان میں تو اب کوئی بھی نہیں ہے۔ جس کا جھرمٹا ہوا وہ ادھر نکل گیا ہے، جیسے تم یہاں پر ہوا اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو چلتے ہیں، خود ہی دیکھ لو۔“ میں نے چاندنی میں اس وحشت زدہ ہرٹی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ساتھ لگی دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے لبوں پر لگی لپ اسٹک اس کے دائیں گال تک پھیل گئی تھی۔ اس کا سینہ دھونکی کی مانند چل رہا تھا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ وہ میرے کس قدر قریب ہے۔ اس لیے ذرا سا کسمسا کر وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ مگر اس کے بدن کی ملائمت میرے بدن سے لپٹ گئی۔ کافی حد تک عیاں اور تھوڑا بہت نہاں چاندنی میں نہایا ہوا بھیگا بدن میرے سامنے تھا۔ مجھے یوں دیکھتا ہوا پا کر وہ خود میں سینے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ تب میں نے اس کا دھیان بنانے کے لیے پوچھا۔

”یہیں کھڑی سوچتی رہو گی یا چلو گی میرے ساتھ۔“

”تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میدان میں کوئی نہیں ہے۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”تو پھر چلو میرے ساتھ گاؤں، صبح دیکھیں گے تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟“ میں نے کہا اور اس کا رد عمل اس کے وحشت زدہ چہرے پر دیکھا۔ جہاں بے یقینی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں نے چند لمحے اس کا انتظار کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اپنا ہٹل واپس ڈب میں رکھا اور کچھ کہے بنا پلٹ کر فصل سے باہر آ گیا۔ میں نے ایک طرف گری ہوئی بانیک کو اٹھایا۔ میں نے لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ٹھیک اگر نہیں تو کون سا میرا اس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسے چھوڑ کر اپنی راہ لوں گا۔ میں اس کی وجہ سے اپنی راہ کھوئی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بانیک اشارت کر کے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بت بنی وہیں ساکت کھڑی تھی۔

”اگر آنا ہے تو آ جاؤ، میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے گیسر لگا دیا۔ اس نے پھر بھی حرکت نہ کی تھی۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی اور بانیک بڑھادی۔ اگرچہ یہ غلط حرکت تھی کہ میں اس کو یوں دیرانے میں تنہا چھوڑ کر چلا جاتا مگر وہ مجھ پر اعتماد کرتی تھی نا، اب میں اس کی منت سماجت کرنے سے تو رہا، بھاڑ میں جائے مجھے کیا۔ میں ابھی چند گز کے فاصلے پر گیا ہوں گا کہ وہ چیختے ہوئے بولی۔

”ٹھہرو..... ٹھہرو خدا کے لیے ٹھہرو.....!“ اس نے خوف بھری ہڈیانی صدا لگائی تھی۔ میں رک گیا تو وہ بھاگتی ہوئی میرے قریب آئی اور بانیک پر پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے یسر لگا کر بانیک بڑھادی۔ وہ میرے ساتھ چپک کر یوں بیٹھ گئی کہ اس کے بدن میں ہونے والی لرزش کو میں بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ تب میں نے پوچھا۔

”اب کیا ہوا.....؟“

”بس تم چلو۔“ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میں استہزاء سے انداز میں بولا۔

”تو پھر یوں کرو کہ مجھے مضبوطی سے پکڑ لو۔ راستا بہت دشوار ہے۔“

”اب اس سے زیادہ کیا مضبوطی سے پکڑوں۔“ اس نے تلخ انداز میں کہا تو میرا قبضہ نکل گیا۔ اس کا بدن گھٹا۔ ایک عجیب لذت انگیز مہک تھی جو مجھے مدھوش کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ میں چند لمحے تو اس کے سحر میں رہا۔ پھر سر جھٹک کر راستہ دیکھنے لگا۔ وہ خوف سے لرزتا ہوا بدن لیے مجھ سے چمٹی ہوئی تھی اور میں گاؤں تک پہنچ جانے کے لیے بے تاب تھا۔ جب میں نہر کا پل پار کر کے پکی سڑک پر آیا تب بھی وہ مجھ سے یونہی چمکی رہی۔ میرے ذہن میں سوال ٹھوکریں مارنے لگا کہ وہ اتنی ہی خوف زدہ ہو گئی ہے کہ اب تک اس کا خوف دور نہیں ہوا یا محض میرا امتحان لے رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں ”کیوں“ میرے دماغ میں چپک کر رہ گیا۔

میں نے اپنے گھر کے سامنے بانیک روک دی۔ لوہے کا بیرونی گیٹ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہارن دیا تبھی اس نے بڑے اعتماد سے پوچھا۔

”ہم کہاں آ گئے ہیں؟“

”یہ میرا گھر ہے اور یہاں میرے علاوہ فقط میری ماں رہتی ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ کھیت سے گھر تک کے سفر میں اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر گاؤں میں آ جانے کے باعث اس کا اعتماد بحال ہو جانا فطری بات تھی۔ جن کے پاس سواری تھی، وہ بہت پہلے آچکے تھے اور پیدل آنے والے ابھی تک آ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ بھی زخمی ہوئے تھے۔ اس باعث گاؤں میں تھوڑی بہت ہلچل بھی تھی۔ چوک سے گزرا تو وہاں بھی کافی لوگ جمع تھے۔ پورے علاقے کے لیے میرے خیال میں یہ رات بھاری تھی۔ جس کسی کا زخمی نہیں ہوا ہو گا وہ سوچتا ضرور ہو گا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اندر سے بولٹ کھلنے کی آواز آئی اس کے ساتھ ہی گیٹ کھل گیا۔ ماں نے پہلے مجھے دیکھا پھر جیسے ہی اس کی نگاہ میرے پیچھے بیٹھی اس سرودند طوائف زادی پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ استعجاب اتر آیا۔

”کون ہے یہ؟“ اماں نے خشکیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کڑک انداز میں پوچھا۔ اماں کا اس طرح پوچھنا بڑا تھا۔ اس حسینہ کا لباس میری اماں کی نگاہوں میں نہیں بچنے والا تھا۔

”اماں! یہ ایک ناپنے والی طوائف ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے چھپ رہی تھی۔ میں اسے تحفظ دے کر یہاں لے آیا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چلی جائے گی۔“ میں نے صاف لفظوں میں ساری صورت حال بتادی کیونکہ میری ماں ہی وہ دنیا کی واحد ہستی تھی جس کے سامنے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور نہ ہی میں نے جھوٹ بولنے کی کبھی کوشش کی تھی۔ میں نے سچ بتا کر اماں کی طرف دیکھا۔ اماں اس سرودند طوائف کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ پھر نجانے اس کے من میں کیا آیا اس نے گیٹ کا ایک پٹ دا کرتے ہوئے کہا۔

”چل آ جا اندر۔“

میں بانیک لیے اندر چلا گیا۔ وہاں میں نے بانیک روک کر بند کر دی تو وہ نیچے اتر آئی۔ دو میٹر یہاں چڑھنے کے بعد بڑا سارا صحن تھا اور پھر اس سے آگے والاں تھا۔ اماں ہمارے پاس سے گزر کر اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں۔ میں الاں میں گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ تبھی اماں کمرے میں سے نکلی اس کے ہاتھوں میں ایک زنا نہ جوڑا تھا جو وہ اس طوائف زادی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”جاؤ پہلے نہا کر یہ کپڑے پہنو پھر کوئی بات کرتے ہیں۔“

تبھی میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا سیاہ لباس کہیں سے پھٹ چکا تھا۔ پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ اس کی گوری پنڈلیوں پر پڑی خراشوں سے خون رس کر سوا کھ چکا تھا۔ وہ جوڑا پکڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تو اماں نے دیوار کے

ساتھ بڑے اپنے سلیپروں کی جانب اشارہ کیا تو وہ انہیں پہن کر اس جانب بڑھ گئی جدھر غسل خانہ تھا۔ تبھی میں نے اماں کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔

”اماں بڑی سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔“

”کھانا موجود ہے جب تک وہ نکلتی ہے میں گرم کر دیتی ہوں۔ تو بھی اپنا حلیہ ٹھیک کر جا کے لگتا ہے اس بار میلے میں کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔“ آخری فقرہ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں اماں لڑائی ہو گئی تھی کافی بندے زخمی ہو گئے ہیں۔ اصل میں یہ بھڑا.....!“

”تم نے کتنے بندوں کو زخمی کیا ہے کوئی مرا تو نہیں؟“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”پتا نہیں، صبح پتا چلے گا۔“ میں نے گول مول بات کرنا چاہی۔ ”وہ شاہ زیب کی جان کو آئے تھے میں نہ ہوتا تو شاید وہ آج زندہ نہیں بچتا..... بس اسی وجہ.....!“

”مجھے معلوم ہے ناک تو مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ اماں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اماں پھر مت پوچھو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ میں نے سر کھجاتے ہوئے آہستگی سے کہا تو وہ میری طرف چند لمحوں دیکھتی رہیں پھر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور گیٹ بند کرنے کے لیے چلا گیا۔ صحن کے کونے میں بنے ہاتھ روم میں نہانے کی آواز جھن کر رہی تھیں۔ میں نے ان پر توجہ نہیں دی بلکہ باہر والے کمرے میں چلا گیا۔

میں تازہ دم ہو کر آیا تو دالان میں پڑی چار پائیوں پر اماں نے کھانا رکھ دیا تھا۔ وہ سرو قد طوائف زادی ایک دوسری چار پائی پر ٹانگیں لٹکا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر دیہاتی عورتوں کا لباس خوب بیچ رہا تھا۔ بلب کی پیلی روشنی میں وہ بھیگی بھیگی خاصی پرکشش لگ رہی تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اس کے پاس دھری دوسری چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نام تو میرا سوئی ہے اب تم جس نام سے چاہو پکار لو۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ تو ایک لمحے کے لیے اس کا سادہ سادہ سا بغیر میک اپ کا چہرہ مجھے پرکشش لگا۔ دل چاہا کہ اسے غور سے دیکھوں لیکن اماں کا احساس کرتے ہوئے میں نے جلدی سے ایک روٹی نکال کے چنگیر میں رکھی، اس پر ذرا سا سالن رکھا اور اطمینان سے کھانے لگا۔ جی بھر کے کھانے کے بعد میں نے کچن کی طرف دیکھا۔ اماں پیالوں میں چائے ڈال رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ چائے لے کر آ گئیں۔

”اے لڑکی کھانا کھا لیا تو نہ؟“ اماں نے سوئی کے سامنے پڑی خالی چنگیر کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

جی۔ ”وہ سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے منمنائی تو اماں نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ چاہیے پڑا اور وہاں اس کمرے میں میرے ساتھ آ کر سو جانا۔ جو باتیں بھی کرنا ہوں وہ صبح کر لینا۔“

”جی اچھا۔“ اس نے پھر منمنانے والے انداز میں کہا اور پیالہ پکڑ لیا۔ میں اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میری نگاہوں سے پنڈال میں ناچنے والی وہ طوائف زادی گم ہو چکی تھی۔ جس کے نقوش دیکھنے کی خواہش میرے دل میں اٹھی تھی۔ اب وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔ اس وقت وہ ایک دیہاتی الہڑٹیا رکھائی دے رہی تھی۔ بھیکے ہوئے سیاہ گیسو بڑی بڑی کاجل بھری زندگی سے بھرپور۔ ”کھیں بھرے بھرے گال ستواں ناک میں سونے کی ہلکی سی تار تھی۔ رُس بھرے گلابی ہونٹ، جن کی ہلکی ہلکی کیریں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔ شفاف گردن بھاری سیدہ اور پتلی سی کمر دھنچا مجھے خیال آیا کہ اس کی پنڈلیاں زخمی تھیں۔“

”اماں نے دوا دی تھی وہ لگا لگی تھی میں نے.....!“ وہ اچانک بولی تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے تو میری نگاہیں

پڑھ لیں میں ابھی اس حیرت سے لگا نہیں تھا کہ وہ بولی۔ ”لڑکپن سے جوانی تک یہی سیکھا ہے کون کس نگاہ سے ہمیں دیکھتا ہے۔“ اس کے لہجے میں اعتماد اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تبھی میں نے خوش گوار انداز میں پوچھا۔

”اچھا ہے تم نے مجھے بتا دیا خیر۔ اب جاؤ اور جا کر اماں کے پاس سو جاؤ۔“

”دل تو چاہتا ہے کہ ابھی جا کر سکون سے سو جاؤں مگر مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”ہاں اجنبی جگہ پر ایسا ہوتا ہے۔ مگر تم اماں کے پاس جا کر لیٹو گی تو نیند آ جائے گی۔ اب تم میرے گھر میں ہو کسی بھی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے تمہیں۔“ میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”بات یہ نہیں ہے میرے ساتھ کے لوگ نہ جانے کہاں ہوں گے۔ ان کے ساتھ کیا بیٹی؟ وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ پتا نہیں وہ لوگ اس وقت کہاں ہوں گے؟“ وہ ایک ہی سانس میں تیزی سے کہہ گئی۔

”صبح ہونے میں چند گھنٹے ہیں۔ تم آرام کرو، دن نکلے ہی سب معلوم ہو جائے گا۔ میں تمہیں خود ان کے پاس چھوڑ آؤں گا۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میری چائے ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے خالی پیالی وہیں رکھ کر اٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں میں ایسا بہت کچھ تھا جس کے بہت زیادہ مفہوم نکالے جاسکتے تھے۔ مگر میں کوئی ان پڑھ دیہاتی نوجوان تو نہیں تھا جو اس کی نگاہوں کو نہ سمجھ پاتا۔ وہ انہی اداسوں ہی سے تو دوسروں کو لوٹ لینے کا ہنر جانتی تھی۔ میں نے ایک ہلکی سی مسکان کے ساتھ اس کی نگاہ کا سحر خود پر سے توڑا اور باہر والے کمرے میں جا کر لمبی تان کر سو گیا۔

مجھے یہی لگا کہ جیسے ایک جھپکی سی آئی ہے، آنکھ کھلی تو صبح کا ملگجا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ سورج ابھرنے میں ابھی وقت تھا۔ دالان کے پاس اماں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی اور سوئی اماں والے کمرے میں چار پائی پر بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور معمول کے مطابق ڈیرے پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ دعا مانگتے ہوئے اماں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر دعا مانگنے لگی۔ میں نے بایک اٹھائی اور ڈیرے کی جانب چل دیا۔ جہاں بھیدہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

بھیدہ چاہے میرا ملازم تھا لیکن میں نے اسے ڈیرے کا مالک بنایا ہوا تھا کہ وہ جو چاہے سو کرے۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ پرائمری تک میرے ساتھ پڑھا تھا۔ پھر غربت کی وجہ سے نہ پڑھ سکا اور نہ کچھ کر سکا۔ اب جبکہ وہ جوان ہو گیا تو میں نے اس کے معاملات کی ذمہ داری لے لی۔ وہ ہی نہیں میں بھی بے فکر ہو گیا تھا۔ ہم اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ ڈیرے پر حویلی کا خاص ملازم فخر آ گیا۔

”بولو کیا بات ہے؟“ میں نے ڈیرے کے صحن میں پڑی چار پائی پر اسے بٹھا کر اس کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

”تمہیں سردار شاہ دین نے حویلی بلایا ہے۔“ اس نے اپنا پیغام دے دیا۔

”اتنی صبح صبح، خیریت تو ہے نا۔“ میں نے پوچھا۔

”سردار جی تو ساری رات سوئے ہی نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے پیغام دینے کا کہہ کر گئے ہیں شاید ان کا یہ خیال ہو کہ تم کسی اور طرف نہ نکل جاؤ دن چڑھے آ جانا۔“ اس نے تفصیل سے سمجھا دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں یہاں سے گھر جاتے ہوئے آ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں اپنے کام میں لگ گیا۔

پیغام دے کر فخر چلا گیا۔ مجھے امید تھی کہ بھیدہ کوئی تبصرہ کرے گا مگر خلاف معمول اس نے کوئی بات نہیں کی بلکہ اپنے کام میں مگن رہا۔ جبکہ میں دھیرے سے زیر لب ہنس دیا۔ میں نے ایک رات پہلے خواب دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ اسی خواب کی تعبیر کی شروعات ہیں۔ شاہ دین جیسے بندے کا مجھے بلانا، انتہائی معنی خیز تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ

میں ایک جنگل میں ہوں۔ ہر طرف سے خوف ناک آوازیں آرہی ہیں۔ یکا یک مختلف جانور میرے سامنے آگئے۔ ان میں سے کئی مجھ پر حملہ کرنے لگے۔ میں ان سے لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ میں لہولہان ہو گیا۔ اچانک جنگل جلنے لگا۔ وہ سب جانور ڈر کے مارے بھاگنے لگے کچھ میرے پیچھے لگ گئے۔ میں جنگل سے نکلنے کی کوشش میں لہولہان ہو رہا تھا۔ پھر اچانک میں جنگل سے باہر آ گیا۔ سبھی جانور جنگل ہی میں رک گئے۔ تبھی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اس خواب کا ایک ایک لمحہ مینے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ میں چند لمحے اس کے سحر میں رہا اور پھر اٹھ کر اپنے کام میں لگ گیا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں امرتسر کے راجہ ساہی ایئر پورٹ پر ایئر انڈیا کا سفید اور سرخ رنگ کا طیارہ لینڈ ہو چکا تھا۔ مسافر سیڑھی کے ذریعے اتر رہے تھے۔ ان میں جہاں سنگھ عرف جسی بھی شامل تھا۔ جیسے ہی اس کے بھارت کی سرزمین پر قدم پڑے، اس کے اندر نفرت کا الاؤ دہکنے لگا۔ اس دہکتی ہوئی نفرت نے ایک بار تو اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اٹھائیس برس پہلے جو چنگاری اس کے بدن میں آن پڑی تھی، وقت نے اسے الاؤ بنا دیا تھا۔ وینکٹور سے امرتسر تک کے طویل سفر نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ذہن میں خنجر کی مانند پیوست یہ سوال اسے لہو ہو کر رہا تھا کہ اس کا دیس کون سا ہے؟ بھارت کا پنجاب جہاں وہ پیدا ہوا تھا یا پھر کینیڈا کا وینکٹور جہاں اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس کی فضاؤں میں پرورش ہوئی اور ایک سنہرا مستقبل اس کا منتظر تھا یا پھر دونوں جگہیں ہی اس کا دیس نہیں ہیں اور وہ محض ایک بے وطن مسافر ہے۔

ایمگریشن کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب وہ اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ باہر آیا تو بھارت کی ہواؤں میں اس نے پہلا طویل سانس لیا۔ یہ ہوا جو اس کے سینہ میں اتری تو اسے اپنے اندر مزید آگ بھڑکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ ان ہواؤں میں اپنے اجداد کے لہو کی مہک محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دوران خون بڑھ گیا۔ غصہ دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے کچھ دیر اس کی یہی حالت رہی تو دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اس نے خود پر قابو پانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ انہی لمحات میں اس کے کانوں میں آواز گونجی۔

”جہاں سنگھ جسی جی ست سری اکال“ کہاں کھوئے ہوئے ہو۔“

اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے خوبزادہ جوان انوجیت سنگھ دھولوں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے سر پر گہرے نیلے رنگ کی پگڑی، چمک دار شرٹ اور سیاہ پتلون کے ساتھ تلے والا سنہری گھسہ پہنا ہوا تھا۔ جہاں سنگھ نے اسے صرف تصویروں ہی میں دیکھا تھا اور ایسا ہی انوجیت کے ساتھ بھی تھا۔ دونوں ہی پہلی بار مل رہے تھے جبکہ بہت پہلے وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ ان کی ملاقات کا ذریعہ کمپیوٹر بنا تھا۔ پھر فون پر رابطے نے ان کے درمیان گہرا ہی نہیں انوث تعلق قائم کر دیا تھا۔

”سری اکال انوجیت۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا مگر اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو نہ رکھ پایا۔ جسے انوجیت نے محسوس کرتے ہوئے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے جہاں؟ تو بہت جذباتی ہو رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جہاں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”ہاں انوجیت میں واقعی ہی جذباتی ہو رہا ہوں۔ تم میرے محسوسات نہ برازہ نہیں کر سکتے شاید۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے ہاتھ چمڑا لیے۔

”چل چلتے ہیں ہمارے پاس بہت وقت ہے ہاتھیں کرنے کے لیے۔“ انوجیت نے اس کا سوٹ کیس اور بیگ لیے اس کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔ دونوں پارکنگ میں گئے کچھ ہی دیر بعد وہ نئے ماؤں کی فور وہیل جیپ میں اتر پورٹ کے

احاطے سے نکلے ہوئے امرتسر شہر کی جانب چل پڑے۔

”اچھا بتا پہلے بریک فاسٹ کھائے گا یا.....!“ انوجیت نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تاکہ جہاں خود ہی بتا دے کہ اس کا پروگرام کیا ہے۔

”ابھی کچھ دیر پہلے جہاز میں ناشتا کیا ہے ابھی کچھ بھی کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے۔ تو سیدھا شری دربار صاحب لے چل پھر اس کے بعد سب کچھ دیکھتے ہیں۔“ جہاں سنگھ نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ انوجیت نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چند لمحے پہلے والا جہاں نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کی بجائے فطری نرمابھٹ تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے اپنا سارا دھیان ڈرائیونگ پر لگا دیا۔

ہوٹل کے سامنے پارکنگ میں گاڑی لگانے کے بعد وہ دونوں بائیں طرف سے دربار صاحب کی جانب بڑھنے لگے۔ اس طرف کا داخلی دروازہ پار کرتے ہی سامنے پر کرما (مقدس راستا جو تالاب کے ارد گرد ہے) سرودو (مقدس تالاب) اور ہرمندر صاحب تھا۔ دائیں جانب اکال تخت اپنی پوری آب و تاب سے دکھائی دے رہا تھا۔ چمکتی ہوئی دھوپ میں ہر وہ منظر واضح دکھائی دے رہا تھا جو اس نے فلموں اور تصویروں ہی میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ نکتی رنگ کا جھنڈا صاحب نیلے آسمان میں لہرا دیا تھا۔ وہ اس سارے منظر کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اندر اتارنے کی کوشش میں تھا۔ کیونکہ سکھ پنٹھ کے مطابق یہی وہ مقام ہے جسے وہ اپنا روحانی مرکز مانتے ہیں اور روح کی غذا یہیں سے لیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں آ کر وہ روحانی سکون محسوس کرتا جس کی وہ توقع کر رہا تھا لیکن جائے شانت ہو جانے کے اس کے اندر موجود الاؤ کے بھڑکنے کی آواز مزید بڑھ گئی۔ وہ چونک کر اپنے آپ پر حیران ہونے لگا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہونے لگا ہے؟ اس نے گھوم کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ اسے ہر طرف سکون دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس کے اندر یہ نہ سمجھ میں آنے والی منفرد بے چینی کیوں درآئی ہے؟ سامنے تالاب کا نیلا چمکتا ہوا پانی، ہرمندر صاحب کا ملائی رنگ اور اکال تخت کا سفید اور زرد رنگ چمک رہا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ کچھ تالاب میں نہا رہے تھے۔ ہر طرف مکون تھا لیکن اس کے اندر جو ابھٹا کیوں اٹھا، کیوں اس کے اندر آگ بھڑکنے لگی تھی۔

وہ ہرمندر صاحب کی جانب رخ کیے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں تبھی اس کے کانوں میں گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ گونجی اس نے فوراً ہی گہرا کر آنکھیں کھولیں اور یا گلوں کی مانند ارد گرد دیکھنے لگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر طرف ویسا ہی سکون تھا، گولیوں کی تڑتڑاہٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے چین وہ کیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے لگا ہے۔ اس نے پھر اسی کیفیت کو محسوس کرنے کے لئے دوبارہ آنکھیں بند کی تو نہ صرف گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں بلکہ لوگوں کی ہذیبی انداز میں چیخ و پکار بھی سنائی دینے لگی۔ ایک ایسے کہرام کی آواز اس میں بے گناہ لوگوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں بلکہ کانوں میں پڑنے والی آوازوں پر دھیان دینے لگا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ چنچنے چلاتے لوگ، عورتوں اور بچوں کی کراہیں، توپوں سے گولے داغنے اور پھٹنے کی آوازیں۔ اچانک اس کی بند آنکھوں کے سامنے جو اندھیرا تھا وہ ہٹ گیا اس کی جگہ منظر ابھر آیا۔ پر کرما پر گری ہوئی لاشیں، موت کے منہ میں جاتے ہوئے سسکتے، سڑتے مچلتے جسم، خون ہی خون وہ پر کرما جو دودھ سے دھویا جاتا ہے، وہ خون سے رنگ ہو گیا تھا۔ شفاف تالاب کا پانی خون سے گدلا ہو چکا تھا، مچھلیاں حیران تھیں کہ انسانی لاشیں کیسے تیر رہی ہیں؟

کیم جون، بیسا کھی کے تہوار کا دن، گورو گو بند سنگھ کے خالصہ کا دن، جس دن اس نے سکھ پنٹھ کو حتمی صورت دی تھی۔ ہر سکھ کو سکھ اور ہر سکھ کو کور کا خطاب دیا تھا۔ یہ اجتماع اس دن کی یاد میں تھا۔ اس دن سکھوں کا سب سے بڑا اجتماع ہمارا صاحب میں ہوتا تھا۔ بھارت کے علاوہ پوری دنیا سے سکھ آتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی مذہبی

عقیدے کے لیے آتے۔ ساری قیام گاہیں بھرتیں ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ جبکہ یہ منظر تین جون انیس سو چوراسی کے بعد کا تھا۔ سکھ پنٹھ کے پانچویں گرو راجن کی شہادت کا دن، جب اندرا گاندھی حکومت نے دربار صاحب پر فوج کشی کی تھی۔ ہر طرح کی دستیاب گنوں آرٹری آرٹ فوج توپ خانہ اور ٹینک تک چڑھا دیے۔ نیوی کے غوطہ خوروں کے ساتھ ایسے ٹرڈپس کو بھی آزمایا گیا جو بے رحمی سے قتل کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے ان بے گناہ سکھوں پر بے ہند کے نعرے لگاتے بھارتی فوجیوں نے برہمنی ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی بربریت کا وہ مظاہرہ کیا جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا اور اسی اجتماع میں جہاں سنگھ کا باپ سردار کلندر سنگھ بھی آیا ہوا تھا۔ پھر وہ کبھی لوٹ کر واپس نہیں گیا۔ نہ اس کی لاش ملی اور نہ ہی کوئی آتا پتلا۔ کیونکہ دربار صاحب کے جاں بحق بے جان لاشوں کو کچرے کی مانند کسی انجان ویرانے میں لے جا کر آگ لگا دی گئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی جہاں کے دماغ میں نفرت کا لاوا تر تڑانے لگا۔ وہ اس قدر بے چین ہو گیا کہ اس کا وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ نجانے کیوں اسے سکون ملنے کی بجائے نفرت کی آگ مزید بھڑک اٹھی تھی۔

”جہاں! تو خیریت سے تو ہے نا۔“ انوجیت کی بھنبھناہٹ بھری آواز اسے کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ اسے بات سمجھنے میں چند لمحے لگے۔ تبھی اس نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں انوجیت۔“

”تو پھر یہ تمہاری حالت ایسی کیوں؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو جہاں نے کہا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے، چل انوجیت..... آ..... چلیں واپس.....!“ اس نے اضرائی انداز میں انوجیت کا ہاتھ

پکڑتے ہوئے کہا۔

”واپس؟“ انوجیت کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے شدید حیرت سے پوچھا۔ ”یا زابھی تو آئے ہو، ابھی تو ادھر اکال

تخت..... اور ادھر لنگر خانہ..... ہر مندر صاحب..... ان سب کی.....“

”نہیں نا، ابھی نہیں..... تم چلو واپس، پھر کبھی سہی..... چلو۔“ اس نے سختی سے یوں کہا کہ ایک لمحے کو انوجیت کو لگا

کہ جہاں سنگھ ڈر گیا ہے یا پھر وہ خوف زدہ ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ دونوں پر کمر مار کھڑے تھے۔ انوجیت کو برا تو لگا لیکن

اس کا اظہار نہ کر پایا۔ جہاں نے پلٹ کر اسی دروازے کا رخ کر لیا تھا جدھر سے وہ آئے تھے۔ انوجیت نے ایک لفظ نہیں

کہا مگر اس کے چہرے پر جو تاثر پھیلا ہوا تھا اس میں کئی سوالوں کی بخت موجود تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کہیں وہ ہر مندر

صاحب کا اہمان تو نہیں کر رہا ہے۔ جہاں نے قدم بڑھا دیے تھے۔ اس لیے انوجیت کو بھی واپس پلٹنا پڑا۔ وہ دونوں

خاموشی سے پارکنگ تک آئے۔ گاڑی لی اور اس میں بیٹھ گئے انوجیت نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اب بتاؤ کہاں جانا ہے؟“ اس کے لہجے میں غصہ چھلک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نرم سی آواز میں انجن

جاگ اٹھا۔

”سیدھے پنڈ جانا ہے۔“ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی بڑھادی۔ وہ آہستہ رومی سے رش والے علاقے سے گاڑی لے کر چلا۔

امر ترشہر سے نکلے ہوئے ان کے درمیان خاموشی رہی۔ تاہم شہر کے کنارے تک آ جانے پر اس نے پوچھا۔

”جہاں گاؤں جانے کے لیے دورا سے ہیں۔ ایک ترن تارن اور کدور کی طرف سے اور دوسرا جالندھر کی طرف سے بتا کس طرف سے چلیں۔“

کرنا اچھا لگا تھا۔ اسے خود پر چھائی ہوئی حالت خاصی کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”یار وقت تو دونوں طرف سے ایک جیسا ہی لگے گا۔“ اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ جہاں چاہتا تھا

کہ وہ مزید باتیں کرے اس لیے پوچھا۔

”تو بتا یہ دونوں راستے کیسے ہیں پھر ان میں سے کوئی ایک چن لیں گے۔“ اس پر انوجیت نے لمبا ہنکارا بھرتے

ہوئے کہا۔

”یہاں سے جالندھر تک بہت اچھی سڑک ہے کارپنٹ روڈ، سفر تھوڑا زیادہ ہے یہی کوئی پچاس کلومیٹر کے لگ

بہگ لیکن سکون سے پہنچ جائیں گے۔ پھر جالندھر سے مغرب کی طرف سیدھی سڑک اوگی کو جاتی ہے لیکن وہ اتنی اچھی نہیں

یعنی جالندھر سے اوگی تک کا سفر۔“

”اور دوسرا راستا؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ترن تارن تک سڑک ٹھیک ہے پھر ذیلی سڑکوں سے تلونڈی چوہدریاں کے قریب نہر پار کر کے بابا جوگی روڈ“

بھردہاں سے کھٹوان روڈ سے.....!“

”یار وہ پہلے والا سیدھا راستا ٹھیک ہے۔ چاہے اس میں زیادہ وقت لگ جائے گا۔ مگر یقیناً تو ہے نا کہ ہم پہنچ

آسانی سے جائیں گے۔“ جہاں کے لہجے میں تازگی ابھر آئی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے خیر سناؤ..... پر شادے بارے کیا خیال ہے؟“ انوجیت نے گاڑی جالندھر کی جانب بڑھاتے

ہوئے کہا۔

”یار کسی بھی ڈھابے پر روک لینا۔“ جہاں نے کہا اور سکون سے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ

جالندھر ہائی وے پر چڑھ گئے۔ کارپنٹ روڈ کے باعث انجن کی آواز مدہم تھی۔ ابھی انوجیت نے پوچھا۔

”جہاں! ایک بات پوچھوں۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس کی جانب دیکھ کر گھبر لہجے میں بولا۔

”انوجیت! ایک بات نہیں، تم پر وہ بات پوچھو جو تمہارے ذہن میں ہے۔ مجھے تیری بڑی ضرورت ہے اس لیے

میں نہیں چاہتا کہ میرے بارے میں تمہارے ذہن میں کوئی بھی الجھن رہے۔“

”شاید میرے ذہن میں کوئی سوال نہ آتا جہاں مگر دربار صاحب میں جو تمہارا رویہ تھا نا اس نے وہ سارا تاثر ختم

کر دیا جو میرے ذہن میں تمہارے لیے تھا۔ تم وہ نہیں ہو جس کی دوستی میرے ساتھ نیٹ چڑھوئی تھی۔“ اس کے لہجے میں

وہی حد تک جذباتی پن تھا۔

”نہیں انوجیت میں وہی ہوں اور جتنا میں نے تمہیں بتایا ہوا ہے وہ جھوٹ نہیں حقیقت ہے۔ اب سنو میں نے

”میں یہی بتایا ہے نا کہ میرا تعلق اوگی سے ہے لیکن یہ اب تک نہیں بتایا کہ میرا تعلق کس خاندان سے ہے۔ میرا سارا

خاندان انیس سو چوراسی کے سکھ ہولو کاسٹ میں تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ ہم یہ جانتے ہو کہ میں پہلی بار بھارت آیا ہوں۔ لیکن

تمہارے اوگی پنڈ میں میری حویلی میری زمینیں اب بھی میری راہ تک رہی ہیں کہ میں ہی اپنے خاندان کا آخری فرد بچا

ہوں۔“

”تم پیدا تو یہیں اوگی میں ہوئے..... تو.....!“ انوجیت نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں میں یہیں اوگی میں پیدا ہوا لیکن میں نے شعور و نیکو در میں سنبھالا۔“ یہ کہہ کر جہاں چند لمحے خاموش رہا

”میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔ ممکن ہے اس میں تمہارے لیے کوئی نئی بات ہو جہاں بھی تمہیں لگے کہ یہاں

الجھن ہے تو مجھ سے پوچھ لینا۔“

”ٹھیک ہے کہو۔“ اس نے سڑک پر نگاہیں جمائے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جب شری دربار صاحب پر اندرا حکومت نے فوج کشی کی تھی میرے باپ میری پیدائش پر مانی گئی مننت اُتارنے سیوا کار کے لیے وہیں دربار میں موجود تھے لیکن ساکا (سانحہ) چوراسی میں ہی میرے دو تائے ایک چاچا ان کی بیویاں بچے اور میری ایک پھوپھو سمیت سب کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ اس گاؤں اوگی میں انہیں مارا گیا اور انہیں جلایا گیا۔ میری ایک پھوپھو گئی تھی جو ساتھ والے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ اس نے آ کر مجھے سنبھالا۔ میں اس وقت محض ایک سال کا تھا شاید گوشت کا ایک بے ضرر ٹوکھا سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پھوپھو اپنے شوہر کے ساتھ مجھے دینکودر لے گئی۔ وہیں نے میں شعور سنبھالا۔“

”تمہاری پھوپھو نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ سب کیسے ہوا؟“ انوجیت نے پوچھا۔

”اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھارتی فوج اور اندرا حکومت نے مل کر سکھ قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ جس طرح انگریزوں نے مسلمانوں کو مذہبی طور پر نقصان پہنچانے کے لیے ”مرزائی“ تخلیق کیے تھے۔ بالکل اسی طرح سکھوں کو ختم کرنے کے لیے مذہبی طور پر ”نرنکاری“ سکھ تخلیق کیے۔ جنہیں چالکیہ سیاست امرت دھاری سکھوں پر مسلط کر رہی تھی۔ دوسری جانب امرت دھاریوں کو ختم کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا۔ انہیں کاٹ کاٹ کر پھینکا گیا“ انہیں زندہ جلایا گیا۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسا ہی تھا؟ یا فقط تمہاری پھوپھو ہی کا خیال تھا۔“ انوجیت نے چپکٹی آنکھوں سے پوچھا۔

”اب تک میں نے جو بھی ذرائع ابلاغ میں پڑھا۔ معلومات لیں تیرے جیسے نیٹ دوستوں سے گپ شپ کی۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن انوجیت صرف ہمارے خاندان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اوگی میں اور کوئی پورا خاندان اس قدر بے رحمی سے نہیں مارا گیا۔ ہمارا خاندان ہی کیوں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے میری پھوپھو نے نگاہیں چرا لیں اس لیے میرے دماغ میں یہ بات نوجوانی ہی سے تھی کہ میں اس حقیقت سے پردہ چاک کروں گا۔ میری پھوپھو نے مجھے کبھی یہاں بھارت آنے کی اجازت نہیں دی، مگر اب وہ ”پوری“ ہو گئی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

”اوہ! بہت افسوس ہوا۔“ انوجیت کے لہجے میں بھی دکھ تھا۔

”ہاں! انوجیت وہ میری پھوپھو ہی نہیں میری ماں بھی تھیں میرا باپ بھی وہی میری دوست میری محسن میرا سب کچھ تھیں۔“ جہاں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”ان کی کوئی اولاد ہوئی۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں! دو بیٹے اور ایک بیٹی مجھے بڑا بھائی مانتے ہیں۔ اپنا سارا کاروبار انہی کے سپرد کر کے آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا۔ ”میں نے دینکودر میں پڑھا۔ اپنا بزنس شروع کیا اور آج پچیس سال بعد ایک مضبوط بزنس انہیں دے کر یہاں آ گیا ہوں انوجیت میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی کہ مجھے کوئی ایسا بندہ مل جائے جو اوگی پنڈ کا ہو۔ وہاں تو مجھے کوئی نہیں ملا۔ صرف تم میرے نیٹ فرینڈ بنے جو اوگی سے تعلق رکھتا تھا۔“

”اور تمہاری مجھ پر نوازشات کی وجہ یہی تھی کہ تم یہاں پر.....!“ اس نے کہنا چاہا مگر جہاں نے بات کا نٹے ہوئے کہا۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا انوجیت میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤ میں نے جو کچھ بھی

کہا تمہیں اپنا دوست بنانے کے لیے کیا۔ یہ تم پر کوئی احسان نہیں بلکہ میری مجبوری تھی۔ اب تم اسے جو سمجھو۔“ اس کے لہجے میں شرمندگی کی ہلکی سی بھی رمت نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے اعتقاد تھا۔

”مجھے اچھا لگا جہاں کہ تم نے صاف صاف کہہ دیا۔ اب یہ یقین رکھنا کہ میں تمہارا دوست ہوں۔ جتنا چاہے مجھ کا اعتقاد کر لینا۔“

”میں شکریہ نہیں کہوں گا انوجیت۔“ جہاں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہنا بھی نہیں چاہیے۔“ وہ دھیرے سے بولا پھر تیزی سے پوچھا۔ تم اب اوگی میں کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”چچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم میں نے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا۔ اب یہ حالات ہی بتائیں گے۔“ وہ ایسے بولا جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔ اسے دربار صاحب میں اپنی کیفیات یاد آنے لگیں۔ اسے یہ یاد تو ہو گیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے لیکن یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کن حالات میں اس نے کیا کرنا ہوگا۔ دربار صاحب سے اسے اشارہ مل گیا تھا۔ انہیں امرتسر سے نکلے تقریباً پون گھنٹہ ہو گیا تھا۔ تبھی سڑک کنارے ایک ڈھابے کی طرف گاڑی ڈالتے ہوئے انوجیت نے کہا۔

”چل یار پرشاد تو ٹھیک پھر دیکھی جائے گی۔“ جہاں سٹکھ مسکرا کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

تارکول کی سیاہ سڑک نے گاؤں اور حویلی کے درمیان حد فاصل قائم کر دی تھی۔ یہ سردار شاہ دین کی حویلی اور لوگر الگ الگ دکھائی پڑتے تھے۔ سڑک کے دائیں جانب آبادی والے گاؤں میں زندگی کی جدید بھولتیں میسر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سڑک کے بائیں جانب کافی آگے جا کر حویلی تھی۔ تارکول کی بڑی ساری سڑک تقریباً ڈیڑھ فرلانگ فاصلہ طے کر کے حویلی تک پہنچاتی تھی۔ اٹھارہ ایکڑ رقبہ پر حویلی کی چار دیواری تھی۔ جبکہ رہائشی حصہ چار ایکڑ پر تھا۔ جس کے ارد گرد ہر اقلعت باغ اور ملازمین کے رہائشی کوارٹر تھے۔ ایک طرف اصطل تھا جواب جدید ماڈل کی گاڑیوں کا گیراج بن چکا تھا۔ میں نے درمیانی سڑک سے حویلی والی سڑک پر بائیک موڑی تو سفید پینٹ کی ہوئی حویلی مجھے دھوپ میں چمکتی ہوئی اٹھائی دی۔ آہنی گیٹ بالکل سیاہ تھا۔ جو کسی قلعے کا گیٹ ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔ میں نے گیٹ کے پاس بائیک روکی تو پھر لہار نے مجھے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ میں بائیک سمیت اندر چلا گیا۔

حویلی کے عقب میں سبز لان کے ایک کونے میں بڑی ساری چھتری تلے سردار شاہ دین کے ساتھ شاہ زیب اٹھا ہوا تھا۔ ان کے سامنے دھری میز پر چائے کے نفیس برتن تھے۔ میرے اور ان کے درمیان پتھر کی ایک روش تھی۔ ابا میں نے ایک طرف بائیک کھڑی کی اور ان کی جانب بڑھ گیا۔ وہ دونوں بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جس سے نجانے مجھے کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ میرے منتظر تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور بڑے مودب انداز میں اٹھ اٹھا۔ تب سردار شاہ دین نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

”بیٹھو۔“ اس کا اشارہ قریب رکھی کرسیوں میں سے ایک کی طرف تھا جو مجھ سے دفعت کے فاصلے پر رکھی ہوئی تھی۔ ”ابا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ سردار مجھے اپنے برابر بیٹھنے کے لیے کہے۔ اس لیے میں نے بڑے مودب انداز میں کہا۔

”نہیں سردار جی، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، آپ حکم کریں۔“

”جب میں تمہیں کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہہ رہا ہوں تو بیٹھ جاؤ۔“ اس نے قدرے الجھتے ہوئے کہا۔

”سردار جی اس کرسی پر بیٹھنا بہت آسان ہے مگر بیٹھ کر اٹھنا بہت مشکل ہے۔ وہ تھوڑی دیر جو میں اس کرسی پر گزاروں گا، اس کی لذت میرا دماغ خراب کر دے گی۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ میں نے اسی ادب سے کہا تو وہ

مسکراتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولا۔

”جمال! میں جانتا ہوں کہ وقت نے تجھے ڈھال کر تلوار بنا دیا ہے۔ تم چمک بھی گئے ہو لیکن ابھی تیز دھار ہونے میں تمہیں کچھ وقت لگے گا۔“

”میں جانتا ہوں سردار جی! جہاں تلوار بن گیا ہوں وہاں دھار لگنے میں اب کتنا وقت لگے گا۔ خیر آپ حکم کیجیے۔“ میں نے اپنے لہجے کو باادب ہی رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد بولا۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہے نا جمال کہ میں نے ہمیشہ فنکاروں کی قدر کی ہے۔ نٹ بازوں سے لے کر تیرے جیسے ماہر نشانہ بازوں تک نے اس حویلی سے ہمیشہ قدر پائی ہے۔ رات میلے والا معاملہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرے گاؤں کا لڑکا بھی اتنا بڑا فنکار ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو روپے والے نوٹوں کی ایک گڈی میز پر برتنوں کے ساتھ رکھ دی۔

”یہ لڑکیہ تمہارا انعام ہے اٹھا لو۔“

اس کے یوں کہنے پر میرے اندر ایک گولا اٹھا۔ جس سے مجھے تو ہین کا احساس ہوا۔ میں انعام اور معاوضے کے درمیان فرق کو سمجھتا تھا لیکن سامنے پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈی نہ انعام اور نہ معاوضہ، یہ وہ چارہ تھا جو کسی کو ذہنی غلام بنانے کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ میں سردار شاہ دین کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”سردار جی اتنی بڑی رقم؟“

”نہیں! یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔ تمہارے شایان شان تو اس سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ گڈی اٹھا کر جیب میں ڈالو پھر میں تم سے وہ کچھ کہوں جو میں نے تمہارے بارے میں سوچا ہے۔“ وہ بہت کانیاں تھا۔ قدم بہ قدم آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میرا رد عمل ہی اسے آگے بڑھنے میں مدد دیتا۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور کوئی ڈیل کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ میرے جیسے بے اوقات بندے کے لیے تو اس کے پاس سوچنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ میں نے ایک لمحے میں سوچا اور آگے بڑھ کر گڈی اٹھالی۔ پھر ادب سے بولا۔

”جی سردار جی حکم۔“

”تجھے معلوم ہی ہے کہ شاہ زیب نے چودہ جماعتیں پڑھ لی ہیں۔ تم دونوں ایک ساتھ ہی تو کالج پڑھتے رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے اب لاہور یونیورسٹی بھیج دوں۔ تم بھی اس کے ساتھ پڑھنے کے لیے وہیں داخلے لو! سارا خرچہ حویلی ہی سے ہوگا۔ وہاں تم اس کے ساتھ رہو گے۔ اس کے لیے معقول ماہانہ رقم بھی ملے گی جاؤ! تیاری کر لو! کل تم لوگوں نے یہاں سے نکلنا ہے۔“ اس نے بڑے سکون سے اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ ابھی میں خود پر قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔

”مطلب! مجھے وہاں شاہ زیب کا باڈی گارڈ بن کر رہنا ہوگا۔“

”ہاں! ایک تو ہماری دشمن داری بہت ہے، یہ تجھے معلوم ہے! دوسرا یہ وہاں فقط پڑھنے ہی نہیں جا رہا بلکہ میں اسے وہاں سے سیاسی طور پر ابھارنا بھی چاہتا ہوں۔ جیسے ہی یہ یونیورسٹی پڑھ لے تب تک کم از کم صوبے کے لوگ تو اسے جانتے ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بڑے خنک لہجے میں کہا۔ ”پھر.....! تجھے بھی تو ابھی تیز دھار بننا ہے۔ تمہارے لیے بھی یہ سنہری موقع ثابت ہوگا۔“

”گو مجھے وہاں پر شاہ زیب کا ملازم بن کر رہنا ہوگا جس کے عوض اتنی نوازشات مجھ پر کی جا رہی ہیں۔“ اس بار میرے لہجے میں کٹنگی کی ہلکی سی رنق در آئی تھی۔ اس پر سردار نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑے ٹھہرے ہوئے

انداز میں کہا۔

”تم اسے جو مرضی نام دے لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں مسکرا دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ میں نے بڑے سکون سے وہ گڈی دوبارہ میز پر رکھ دی اور بولا۔

”یہ تو قدرت کی تقسیم ہے نا سردار جی کہ آپ کے پاس دولت کا شمار نہیں لیکن مجھے جو میرے رب نے دیا ہے وہ آپ کے پاس نہیں۔ آپ شاہ زیب کے لیے اپنی دولت سے نجانے کتنے گاڑ خرید سکتے ہیں۔ میرا فن اس جیسے گھٹیا فنوں کے لیے نہیں ہے۔ مجھے اپنے فن کی قدر کرنا آتا ہے اور باقی رہی میرے تیز دھار ہونے کی بات تو وقت سب کچھ بنا رہا ہے اور کوئی حکم ہے میرے لیے؟“ اس بار میں نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تو وہ مسکرا دیا اور بڑے طمان سے بولا۔

”تم میں سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ تمہارا خون بہت گرم ہے۔ یہ تجھے کچھ بھی نہیں سوچنے دیتا۔ جاؤ! آج سارا دن میری آفر پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا۔ بات سمجھ میں آجائے تو حویلی آ جانا اپنی تیاری کر کے.....!“

اس سے پہلے کہ میں فوری طور پر انکار کر دینے کے لب کھولتا اچانک شاہ زیب نے تیزی سے کہا۔ ”یہ کیسی باتیں چل پڑی ہیں۔“ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”یار کیا تم نے مزید آگے نہیں پڑھنا۔ ہم کل تک اگلے پڑھتے آئے ہیں اگر اب ایک ساتھ داخلے لے لیں گے اور ساتھ میں رہیں گے تو اس میں برائی کیا ہے۔ تم نہ بننا میرا ہاں! گاڑ، دوست بن کر رہ سکتے ہو میرے ساتھ۔ دوسرے لوگ تھوڑے ہیں اس کام کے لیے۔“

”شاہ زیب! چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر..... بات تو ایک ہی ہے۔ سنو! میں سردار صاحب کی امان سے انکار کرتا ہوں۔“

”برخوردار! تم بہت بڑی آفر ٹھکرا کر محض کنویں کے مینڈک رہنا چاہتے ہو جبکہ میں تجھے آسمان تک پہنچانے کی امان دے رہا ہوں۔“ سردار نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”سردار جی! مجھے ابھی آسمان پر نہیں جانا! ابھی زمین پر بہت سارے کام ہیں اللہ حافظ۔“ میں نے ان دونوں پر اہم لگا ڈالی جو میری طرف ہی دیکھ رہے تھے میں نے مزید کچھ سے بغیر اپنے قدم واپسی کے لیے بڑھادیے۔ رہائشی عمارت کی طرف آتے ہوئے راستے میں میری بایک کھڑی تھی۔ میں نے وہ اشارت کی تو اس کی آواز نے خاموشی کو چیرا۔ میں اپنے آپ کو پرسکون کرتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ماں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ وہ اس وقت صحن میں لگے نیم کے درخت تلے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے سبزی کی ٹوکری تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری چار پائی پرسونی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بایک کھڑی کر کے اہل گاہنے لگا تو ماں نے کہا۔

”اوئے جمال! ادھر بات سن! تجھے خیریت تو ہے نا۔“

میں رک گیا اور وہیں کھڑے کھڑے بولا۔

”کوئی بات نہیں ماں سب ٹھیک ہے تو مجھے ناشتا دے بعد میں اس کے ساتھیوں کا اتنا پتا معلوم کرنے جاؤں! ان کا مل گیا تو ٹھیک ورنہ اسے شہر کے بس اڈے پر چھوڑ دیتا ہوں خود چلی جائے گی۔“

”حویلی والوں نے تجھے کیوں بلایا تھا۔“ اماں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں اماں کے پاس جا

اٹھا اور ہاں کی ساری روداد سنادی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

”اچھا کیا تو نے سردار کو انکار کر دیا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

”ماں! کیا تجھے میرا انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ تڑپ کر بولیں۔
 ”دیکھ جمالے! میں نے تجھے اس وقت بھی نہیں ڈرایا تھا جب تو میری چھاتی سے لگ کر دودھ پیتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ میں نے آج تک نہ تجھے ڈرایا ہے اور نہ کبھی تیرا حوصلہ توڑا ہے لیکن ابھی ان سرداروں کے ساتھ تیری دشمنی سے تیری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔“ ماں نے کہا تو سوئی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”ان کی دوستی کون سا سکون لینے دے گی ماں، کیا تجھے اپنے بیٹے پر بھروسہ نہیں تو یہ وہ ہو کر بھی میری پرورش کرتی رہی اور میں تجھے ناامید کر دوں گا۔“ میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے بس تیری فکر ہے کیونکہ یہ دنیا بڑی ظالم ہے پتر۔“ ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ماں! جب تک تیری دعا ہے نا مجھ پر کوئی آغچ نہیں آسکتی۔ چاہے ساری دنیا میری مخالف ہو جائے اور تو نے مجھے جو بنانا تھا بنادیا۔ اب میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا بننا ہے اور کیا کرنا ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک یہی ایک سبق تو سیکھا ہے میں نے۔“ میں نے حتمی انداز میں کہا تو ماں نے دلار سے کہا۔

”میرے لعل! میں تجھے بہت بڑا آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔“ ان کے لہجے میں متناگھٹی ہوئی تھی۔

”اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ میں کسی کی نوکری کروں یا کسی کا غلام بن جاؤں۔ یہ سردار تو انسان پر انسان کی حکومت چاہتے ہیں۔ جسے میرا ضمیر کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ میری قسمت میں جو ہوگا میں بن جاؤں گا۔ چل چھوڑ اس قہے کو۔ مجھے ناشتا دے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو ماں اٹھ گئیں۔ سوئی ایک تک مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ تبھی میں نے اس سے پوچھا۔

”ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے سوئی۔ تیرے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ تو اس طرف کیسے آ گئی۔“

”میں.....!“ اس نے سوچتے ہوئے کہا جیسے یاد کر رہی ہو پھر بولی۔ ”میں اس وقت تم لوگوں کے قریب تھی جب فائرنگ شروع ہوئی۔ اسی بھکڑ میں کسی نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے کر نکل کھڑا ہوا۔ وہ کوئی دیہاتی بندہ تھا۔ اس کے پیچھے چند لوگ تھے۔ شاید وہ مجھے مال غنیمت سمجھ رہے تھے یا..... پتا نہیں کچھ ایسا تھا کہ مجھے خوف آ گیا۔ میں پوری قوت لگا کر اس سے اپنا بازو چھڑایا اور جھڑمنا آیا ادھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دور تک میرے پیچھے آئے تھے۔ میں اندھا دھند بھاگتی ہوئی فصلوں میں چھپ گئی۔ مجھے ان کا تو پتا نہیں کدھر گئے لیکن اتنی دیر میں تم آ گئے۔“ اس نے اپنی بات کہی تو میں نے پوچھا۔

”تجھے مجھ پر اعتبار آ گیا یا مجبوری میں ڈر کر.....!“

”میں نے اگر تمہیں وہاں پنڈال میں فائر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی تیرے ساتھ نہ آتی۔ اس وقت مجھ کسی پناہ کی ضرورت تھی۔ سو میں تمہارے ساتھ یہاں آ گئی۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

”اچھا تو ایسے کر اپنی تیاری پکڑ میں ناشتا کر لوں تو تجھے چھوڑ آؤں۔“

”کہاں..... کہاں چھوڑ کے آؤ گے..... میرے ساتھی مل گئے ہیں؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”پتا کرتے ہیں مل گئے تو ٹھیک ورنہ تجھے شہر کے بس اڈے پر چھوڑ دیتا ہوں کسی بس میں بیٹھ کر چلی جانا۔“

”کیا تو مجھے دو چار دن ماں جی کے ساتھ نہیں رہنے دے گا۔ آخر میں نے چلے ہی جانا ہے آج نہیں تو چند دن بعد.....!“ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا تو میں مسکرا دیا اور عام سے لہجے میں بولا۔

”چل زیادہ فلمی ڈیٹا لاگ مت مار میں خواجواہ کی کوئی الجھن نہیں پالنا چاہتا۔ چل اٹھ جا۔“ میں نے کہا تو

اٹھ گئی۔

اس وقت اماں نے میرے سامنے ناشتا رکھ دیا تھا، جب چھاکا گیٹ سے اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ اترا اٹھا۔ وہ میرے قریب پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”پتا ہے رات کتنے بندے زخمی ہوئے ہیں۔ دونوں طرف سے لگ بھگ اٹھارہ بندے شدید زخمی ہیں۔ اب ٹایدان میں دو چار بندے مر بھی جائیں۔“ اس نے خبر سنائی اور بڑے سکون سے ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”یہ مرنے والے بندے کن کے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بھیرزا وہ وقاص کے اپنے بندے تو بہت کم زخمی ہوئے ہیں۔“ اس نے نوالا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو ناشتا کر کے تیار ہو جا شہر چلتے ہیں وہاں زخمیوں کا بھی پتا کر لیں گے اور اس کو بھی چھوڑ دیں گے۔“ میں نے دالان میں کھڑی سوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یار رات تو بڑی خوب صورت لگ رہی تھی یہ..... اسے بلانا پاس ذرا قریب سے دیکھوں۔“ اس نے مذاق سے کہا۔

”ابھی تیرے ساتھ بٹھا دوں گا، دیکھتے رہنا اسے، چل تو ناشتے کی طرف دھیان دے۔“ میں نے مکھن پر اٹھنے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔

اس وقت ہم ناشتا کر کے چائے پی رہے تھے کہ سوئی دھیمی چال سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آئی اور بڑے آہنی سے لہجے میں بولی۔

”یہاں گاؤں میں کوئی فون ہے کہیں سے میں کال کر سکتی ہوں؟“

”ہاں چوک میں ہے اچھو کر پانے والے کے پاس کیوں کے کرنا ہے فون؟“ میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تیرا معاملہ نہیں ہے جمال! اب میں چلی جاؤں گی، تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے چھاکے کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اجنبی بن کر ہماری بات سن رہا تھا۔ تب میں نے کہا۔

”چل بول کیا ہے تمہارا نمبر میں وہاں فون کر دیتا ہوں ہاں تجھے چوک میں نہیں لے جاسکتا؟“

”میں ابھی لکھ دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لائے قدموں اندر کی طرف چلی گئی جبکہ چھاکے نے بغیر واپس چلا گیا۔ وہ ہم چکا تھا کہ میں نے اسے اب ہر حال میں یہاں سے بھیج دینا ہے اور پھر ہمیں شہر بھی تو جانا تھا، وہیں کسی بس میں بٹھا کر اس سے جان چھڑوا لیتا تھی۔

میں گلی میں نکل کر پیدل ہی چوک کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ابھی چند قدم ہی بڑھا تھا کہ سامنے سے ایک ٹارنک کی کھلی چھت والی جیب آنا فانا گلی میں داخل ہوئی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ میرے پاس آن رکی۔ جس سے دھول

ایک مرغولا اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دھول ہٹتی کسی نے زور سے پکارا۔

”اوائے جمال تو یہی ہے نا۔“

جیب میں چھ لوگ سوار تھے۔ ان کی شکلیں میرے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ ان کا یوں میرا راسخا روکنا خطرے کا عالم نہیں تھا۔ میری نگاہوں میں سردار شاہ دین کو کیا گیا انکار محسوس کیا۔ سردار یہ کب چاہتے ہیں کہ ایک ایسا آدمی جس نے اپنی میں پرورش پائی ہو غریب ہو دولت اس کے منہ پر مار کر اس کے حکم سے سرتابی کرے۔ سردار سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گاؤں میں رہنے والے اس کے زیر تسلط لوگ اس کے حکم سے انحراف کر دیں۔ میں نے بغاوت کی تھی۔ اب اس کی سزا تو ملائی۔ اس وقت تک دھول کی دھند چھٹ چکی تھی کہ ایک کالے بھنگمٹھنے نے دوبارہ پوچھا جو پھر سیٹ پر بیٹھا ہوا ان کا ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لہجے اور انداز میں جو اکڑ پڑا تھا وہ مجھے بہت برا لگا۔ اس لیے میں نے بھی بڑے انداز

”اُدے، تجھے کس جمال کی تلاش ہے۔“

”جورات میلے سے لڑکی اٹھا کر لایا ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ تو ہے۔ چل۔! وہ لڑکی ہمیں دے دے ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اسی اکھڑ پن سے حکم صادر کیا۔

اس وقت فوراً ہی میرے ذہن نے سوچا کہ اسے کیسے معلوم کہ لڑکی میرے پاس ہے۔ میں نے پہلے کبھی اسے یہاں نہیں دیکھا۔ بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ سوئی نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ پھر یہ کون ہے؟

”کون..... کیسی لڑکی..... تو ہوش میں تو ہے کیا بک رہا ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں کہا تو وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ ایسے نہیں مانے گا، چل اس کے گھر چل، وہاں سے لڑکی لے آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ سورا کیا کرتا ہے؟“ اگلے ہی لمحے ڈرائیور نے جیب بڑھا دی۔ وہ میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ چند لمحوں میں وہ میرے گھر کے سامنے تھے۔ میں تیزی سے مڑ کر ان کی جیب کے سامنے آ گیا۔ مگر ان میں سے کوئی اُتر نہیں تھا۔ میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”اُدے رکو کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

”بڑا بے وقوف ہے تو، ابھی تجھے بتایا ہے..... خیر..... چل جلدی سے لڑکی نکال لا باہر ورنہ پھر ہم تو نکال ہی لائیں گے اسے۔“ اس کے لیڈر نے استہزائیہ انداز میں کہا تو خون میرے دماغ میں ٹھوکر مارنے لگا۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے تھل سے پوچھا۔

”تو میرے ہی گھر کے سامنے کھڑا مجھے دھمکی دے رہا ہے۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ تو جدھر سے آیا ہے ادھر ہی واپس چلا جا۔ میں نہیں جانتا کہ تو کس کا سہارا ہے جیسے ہی مجھے معلوم ہوا میں خود جا کر اس گھنیا حرکت کے بارے میں پوچھ لوں گا۔“

میرے یوں کہنے پر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر تضحیک آمیز انداز میں میری طرف دیکھ کر دوبارہ قہقہہ لگایا۔ پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ جیب سے اترنے لگا۔ مگر میں اسے کب موقع دیتا اس سے پہلے کہ اس کا پاؤں زمین پر پڑتا۔ میں نے چشم زدن میں پسٹل نکالا اور اس کی پینڈلی پر فائر کر دیا۔ میں نے اپنی جگہ تبدیل کی اور دوسری طرف پہلو میں آ کر اس کے کاندھے میں فائر جھونک دیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے اپنا اسلحہ سیدھا کرتے میں نے پورا میگزین ان پر خالی کر دیا۔ یہ سب آدھے منٹ کے دورانے میں ہوا۔ مجھے میگزین بدلنا تھا۔ میں اچانک ہی سامنے والے گھر میں داخل ہو گیا۔ میں نے تیزی سے میگزین نکالا اور بدلتے ہی دیوار پر چڑھنے لگا چند لمحوں میں دیوار کے اوپر سے باہر دیکھا۔ ان کی حالت نازک تھی۔

”جس نے بھی حرکت کی وہ اپنی زندگی سے جائے گا۔ پر ہاتھ رکھ کر جیب سے نیچے اتر آؤ۔“

جس وقت میں یہ کہہ رہا تھا، ان میں سے ایک سیانے نے اپنا دایاں ہاتھ قریب پڑی گن کی طرف بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کر الٹ گیا وہ کبھی سہم گئے۔ شاید انہیں اس قدر فائر ہونے کی توقع نہیں تھی۔ وقت سے پہلے ہو جانے والا اندازہ ہی انسان کو یا تو فتح سے ہمکنار کر دیتا ہے یا مات اس کے مقدر میں ہوتی ہے۔ ان کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے یہی خیال کیا ہو کہ وہ ایک چیونٹی کو مسلنے کے لیے جارہے ہیں۔ وہ لیڈر بھی میری جانب پھٹی پھٹی مگر دردناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر رکھا ہوا ہاتھ خون سے تر ہو چکا تھا۔ فائرنگ کی

آواز سے گلی کے دروازے کھل کر بند ہو گئے تھے۔ میں نے پسٹل کی نال سے انہیں جیب سے اترنے کا اشارہ کیا۔

”اب بتاؤ، تم میں سے پہلے کس نے مرنا ہے؟“

میرے یوں کہنے پر دوسروں کے تو چہروں پر رنگ آ کر گزر گئے مگر ان کا لیڈر اپنے حواس میں تھا اس نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جمال، تو بھاری پڑ گیا ہے، ہمیں جانے دے۔“

”ٹھیک ہے یہ بتا دو کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے میں تجھے جانے دوں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا تو وہ چند لمحے تذبذب میں پھر اپنی پشت پر موجود ساتھیوں کی آہ نکاس کر بولا۔

”پیر زادہ وقاص نے.....!“ اس نے کہا تو میں ایک دم سے چونک گیا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ سوئی میرے پاس ہے۔ یہی سوال میں نے اس سے کیا تو وہ بولا۔

”یہیں اس گاؤں سے پتا چلا ہے اس لڑکی کے ساتھ والے پیر زادہ کے پاس ہیں۔“ اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ اس کی آواز اب ڈوبنے لگی تھی یا وہ ڈرا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ، اسے کہنا کہ لڑکیوں کے ساتھیوں کو یہاں بھیج دے میں لڑکی انہیں دے دوں گا اور ہاں، اسے بتا دینا میں نے لڑکی کو اغوا نہیں کیا بلکہ وہ میرے ساتھ خود آئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے مجھے شدید غلطی کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دور جا کر اسلحے کے بل بوتے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں نے ان کے ہر بندے کو زخمی کیا تھا۔ میں اگر اس وقت ان پر رحم کرتا تو ممکن تھا کہ وہ مجھے جان سے مار دیتے۔ وہ فطری طور پر سیدھے ہوئے ہی تھے کہ میں نے کہا۔

”جیب چھوڑ پیدل جاؤ یہاں سے۔ دس تک گنتی گنوں گا..... پھر جو بھی نشانے پر چڑھا میں اسے مار دوں گا۔ ایک.....!“ میں نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ فوراً ہی ان میں ہلچل مچ گئی۔ میرے پسٹل تاننے کی دیر تھی۔ وہ طوعاً کرہاً جیب سے اترے اور تیزی سے واپس گلی میں چل دیے۔ حالانکہ ایک سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں جان بوجھ کودھیرے دھیرے گن رہا تھا۔ سات آٹھ تک پہنچا تھا کہ وہ گلی سے نکل گئے۔ میں جب تک دیوار سے نیچے آ گیا گلی میں سے کئی مرد اور عورتیں نکل آئے۔ میں نے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ میرا ذہن اس وقت تیزی سے یہی سوچ رہا تھا کہ پیر زادہ وقاص تک سوئی کے بارے میں معلومات کیسے پہنچیں؟ کیا گاؤں میں اس کا کوئی خبر ہے یا پھر خبری پر کسی کو مامور کر دیا گیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب کا یہ وقت نہیں تھا۔ اس وقت میں شدید خطرے میں تھا۔ پیر زادہ وقاص کو دھری چوٹ دے چکا تھا۔ ان بارہ گھنٹوں میں اس کے کئی بندے زخمی کر دیے تھے۔ وہ ایسا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ خاموش بیٹھا رہتا۔ اب اس کا نملا ایسا نہیں ہونا تھا کہ جسے میں روک سکتا۔ میں نے تیزی سے جیب کی تلاشی لی، سارا اسلحہ ایک جگہ اکٹھا کیا پھر اسے اٹھا کر کمر کی جانب پلٹا ہی تھا کہ گیٹ کی جھری سے سوئی دکھائی دی جو مجھے دیکھ رہی تھی۔ گلی میں موجود کسی بھی مرد یا خاتون نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے گیٹ کھولنا چاہا مگر اس سے پہلے سوئی نے کھول دیا۔

”مجھے لینے آئے تھے وہ.....؟“ اس کے لہجے میں خوف سے زیادہ تجسس تھا۔ جبکہ کچھ فاصلے پہ کھڑی اماں دکھ

میرے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں، تجھے لینے..... تیرے سارے سگی ساتھی ان کے پاس ہیں۔“ میں نے اسے جواب دیا اور تیزی سے زیر ہیاں چڑھتا چلا گیا۔ میں نے اوپر والے کمرے پر پڑے تالے کو مخصوص انداز میں دبایا تو وہ کھل گیا۔ یہ میری خاص فنیک تھی۔ اس تالے کی چابی نہیں تھی۔ دروازہ کھول کر میں نے اسلحہ ایک طرف رکھا۔ دروازہ بند کیا اور نیچے آ گیا۔ اماں اب افسردہ اور حیرت زدہ سی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تو کیا سمجھتا ہے کہ یہ پیرزادے تھے..... سردار شاہ دین کی چال بھی تو ہو سکتی ہے۔“ ماں نے دھیرے سے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا سوئی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”دیکھو میری وجہ سے خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ وہ اب بھر پور حملہ کر سکتے ہیں۔ مجھے بتا دو کہ وہ پیرزادہ کدھر رہتا ہے میں خود چلی جاتی ہوں وہاں۔“

”بکواس مت کرو۔“ میں نے انتہائی غصے سے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”یہ میرے مزاج کے خلاف ہے کہ کوئی زبردستی مجھ سے کچھ چھین لے یا جو میں نے کہا ہے ویسا نہ ہو۔ میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ وہ تجھے یہاں سے آ کر لے جائیں تو لے جائیں۔“

”اس کا مطلب ہے میں اب تمہاری قیدی ہوں؟“ اس کے لہجے میں خوف کے ساتھ تشویش جھلک رہی تھی۔ وہ میری بات کے کچھ اور ہی معنی لے بیٹھی تھی۔ تب میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کوئی یوں دھونس جما کر تمہیں مجھ سے لے جائے ایسا ممکن نہیں، تیرے نگلی ساتھی آ جائیں تو لے جائیں تمہیں..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”پتر! میرا من نہیں مانتا کہ پیرزادہ ایسا کر سکتا ہے تم ایسے کرو جاؤ اور اس سے رابطہ کرو تم پر سارا معاملہ کھل جائے گا۔“

ماں کا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے سوئی سے کوئی بات نہیں کی اور باہر نکل گیا۔ میرا رخ پھر سے اچھو کر جانے والے کی دکان کی طرف تھا۔ میں نے جاتے ہی پیرزادہ وقاص کا نمبر ملانے کے لیے کہا۔ وہ علاقے کا معروف آدمی تھا۔ ایسے سارے لوگوں کے نمبر اس کے پاس ہوتے تھے۔ اس نے نمبر ڈائل کر کے ریسپور مجھے تھما دیا۔ دوسری جانب رنگ بجنے لگی۔ چند گھنٹیوں کے بعد فون ریسپو کر لیا گیا۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب سے پیرزادہ وقاص کی آواز ابھری تو میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نوگر گاؤں کا جمال بات کر رہا ہوں۔ ابھی کچھ بندے بھیجے تھے میری طرف تو نے کیا وہ واپس پہنچ گئے ہیں تیرے پاس؟“

”ابھی تک تو میں نے کوئی بندہ نہیں بھیجا تیری طرف۔ اگر بھیجتا تو وہ تجھے لے کر میرے پاس آ جاتے، تم یوں فون پر بات نہ کرتے۔ ویسے ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ ایک طوائف تیرے پاس ہے۔ تصدیق ہوتے ہی بھیج دوں گا بندے۔ اچھا کیا تو نے فون کر لیا۔ بتاؤ وہ ہے تیرے پاس؟“

”ہاں وہ میرے پاس ہے جو بندے تو نے بھیجے تھے میں نے انہیں زخمی کر کے واپس تیرے پاس بھیج دیے ہیں۔ جھوٹ کیوں بولتا ہے مرد ہے تو بچ بول۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”کہنا میں نے نہیں بھیجے اگر میں اپنے بندے بھیج دیتا نا وہ لڑکی لے کر ہی آتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر تجھے کیسے پتا چلا؟ انہوں نے تو یہ بتایا ہے کہ اس لڑکی کے نگلی ساتھی تیرے پاس ہیں اور باقی رہی بندے بھیجنے کی بات تو اپنا یہ شوق بھی پورا کر لے۔ میں تیرے انتظار میں ہوں۔ خود آنا ان کے ساتھ۔“ میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا تو اس نے کافی حد تک محل بھرے لہجے میں کہا۔

”دیکھ جمال! میں تیرے جیسے ہیرے کی قدر کرتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو میرے ساتھ اونچی آواز میں بات کرے۔ تیرے جیسے کئی فنکار میرے ڈپرے پر پڑے ہوئے ہیں لیکن میں اسے شہر زوری نہیں مانتا۔ وقت جس

کے ہاتھ میں ہو، وہی شہر زور ہوتا ہے اور وہی طاقت ور..... میرے ساتھ دھیسے لہجے میں بات کرنا اصل بات کیا ہے؟“

”وہی جو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

”تو سن اس لڑکی کے سارے ساتھی میرے ڈپرے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس لڑکی کے انتظار میں، مجھے کہا گیا ہے کہ دوپہر سے پہلے وہ ان تک پہنچ جائے گی۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ کیسے، لیکن یہ غلط بات ہے کہ میں نے کوئی بندے تمہارے طرف بھیجے ہیں۔“

”تو پھر تو بھی سن! تیرا نام لے کر چھ بندے میرے گھر پر حملہ کرنے آئے تھے۔ تاکہ اس لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں۔ میں نے تم سے اس لیے پوچھا ہے کہ سازش کرنے والے نامزدوں والا کام کب سے کرنا شروع کر دیا ہے؟“

میرے لہجے میں انتہائی درجے کی نفی تھی۔

”اچھا کیا! اچھا کیا تو نے مجھے بتا دیا۔ میرے بندے مرنے جاتے لیکن لڑکی ضرور لاتے۔ تم نے اپنی باتوں میں خود ہی اشارہ دے دیا ہے کہ سازش کرنے والا نامزد کون ہے۔ میں اسے خود دیکھ لوں گا۔ اب تو دیکھ تجھے کیا کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے ہنس دیا تو میں بھی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

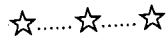
”وقت جس کے ہاتھ میں ہو گا فیصلہ اسی کے حق میں ہو جائے گا۔ وہ لڑکی میرے پاس ہے اس کے ساتھ بھیج دو! میں لڑکی انہیں دے دوں گا۔ حملہ آوروں کی جیب میرے گھر کے باہر کھڑی ہے، دیکھتا ہوں وہ جیب کون لے کر جاتا ہے۔“

”چلو! طے ہوا لڑکی کے ساتھی تیرے پاس آ جاتے ہیں لیکن انہیں ان کے ٹھکانے تک بحفاظت پہنچانا اب تیری ذمہ داری ہوگی۔ ہے تم میں اتنا دم؟“

اس نے بڑا خوب صورت پینتر ابد لا تھا۔ اس نے اتنے اچھے انداز میں مجھے دھمکی دی کہ میں ایک بار تو جھوم اٹھا اس نے میرے حوصلے کو چیلنج کر دیا تھا۔

”میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں پیرزادہ وقاص.....!“

”مجھے تم سے یہی امید تھی لو پھر کرو انتظار! بھجور ہا ہوں انہیں۔ رب رکھا۔“ اس نے جوش سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میرے ہاتھ میں ریسپور میں ٹوں ٹوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے بے دھیانی میں ریسپور رکھا اور سوچ میں پڑ گیا وہ کیا ٹھیل کھینا چاہتا تھا۔



جالندھر شہر کے باہر ہی انوجیت نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس کا سارا دھیان ڈرائیونگ پر تھا۔ وہ پھر دھل رہی تھی۔ جب انوجیت نے اپنی جیب میں سے سیل فون نکالا اور نمبر تلاش کر کے پیش کر دیا۔ لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے کہا۔

”جی ہم جالندھر سے اوگی کے راستے پر ہیں۔۔۔ بس آپ دیکھ لیں کتنی دیر لگے گی۔۔۔ ہاں۔۔۔ بس پہنچ کر اطلاع دیتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ جس پر جہاں نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ حالانکہ اندر سے تمس ابھرا تھا۔ چاہے گاؤں اس کا اپنا تھا لیکن وہاں پر اس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا اور اس انوجیت سے بھی تو وہ آج ملا تھا۔ چاہے پچھلے دو برسوں سے رابطہ تھا۔ آگے حالات کیا ہوتے ہیں۔ اس کا اسے خوف نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اتنا مصلہ کر کے وینکوور ہی سے نہ آتا۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی طویل ہو گئی۔ چونکہ انوجیت کا یہ رستہ دیکھا بھالا تھا۔ اس لیے وہ تیز رفتاری سے گاڑی بھاگتے جا رہا تھا اور اس کی ساری توجہ سڑک پر تھی۔ یوں جہاں نے بھی اسے ہاتوں میں لگانا

مناسب نہیں سمجھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی جب انوجیت نے اپنی طویل خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

”لے بھی، جیساں سنگھ جی، وہ سامنے جوگاؤں نظر آ رہا ہے نا، وہی تیری منزل ہے۔ تیرا پنڈاؤگی۔“

اس نے دیکھا ہرے بھرے کھیتوں کے سرے پر سے آبادی شروع ہوتی تھی لیکن اس کا دوسرا کنارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”ارے یہ تو کافی بڑا گاؤں ہے۔“

”اویار، تقسیم ہند کے وقت اس پنڈ کی تین نمبرداریاں تھیں اور تین پنچوں پر ایک سرخ تھا۔ اب تو اتنی آبادی ہو گئی ہے چاہے اس پنڈ کو تحصیل کا درجہ دے دو۔ تم خود دیکھ لینا۔“ اس کے لہجے میں کافی حد تک تفاخر تھا۔

”ہاں وہ تو دیکھوں گا سب کو ہی دیکھوں گا۔“ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ شاید انوجیت نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ورنہ وہ اس کے لہجے پر چونکتا ضرور۔ اس وقت انوجیت نے گاڑی سڑک کنارے کھڑی کر دی تھی۔ جبکہ گاؤں ابھی فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا۔ اس سے پہلے کہ جیپال اس سے رکنے کی وجہ پوچھتا وہ خود ہی اپنی طرف سڑک کے دائیں جانب ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ دیکھو وہ بڑی ساری کونھی، کھیتوں کے درمیان۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“ جیپال نے سرخ اور سفید دو منزلہ خوب صورت کونھی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک پختہ راستا سڑک سے کونھی تک جا رہا تھا۔ سبز کھیتوں کے درمیان چمکتی ہوئی دھوپ میں وہ گھر بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ بھی انوجیت نے کہا۔

”یہ وہ گھر ہے جہاں میں رہتا ہوں۔“

”اچھا ہے۔“ جیپال سنگھ نے دل سے تعریف کی۔

”اب بتا پہلے گھر جانا ہے یا سیدھے وہاں جاؤ گے جہاں تمہارا آبائی گھر تھا، بولو۔“ اس نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ جیپال چند لمحوں کے لیے حیران رہ گیا۔ بھی اس نے پوچھا۔

”تو میرے آبائی گھر کے بارے میں کیسے جانتا ہے جبکہ میں نے تجھے کبھی نہیں بتایا۔“

”یہ سب کچھ میں نہیں میری بے بے بتائے گی۔ بس تو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈال۔ تجھے سب پتا چل جائے گا۔“ انوجیت نے اس قدر اپنائیت سے کہا کہ وہ مزید سوال نہ کر سکا۔ اس لیے بڑے سکون سے بولا۔

”تو پھر انوجیت جیسے تمہاری مرضی۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس کا عندیہ یہ پتا تھا کہ انوجیت نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پیش کر کے رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر کچھ لمحوں بعد۔

”جی، ہم پہنچ گئے ہیں اور حویلی کی طرف جائیں گے پہلے، پھر واپس آ کر باتیں ہوتی رہیں گی۔“

اس پر جیپال کچھ نہیں بولا اس نے طے کر لیا تھا کہ دیکھیں انوجیت کیا کرتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد انوجیت نے وہ فرلانگ بھر فاصلہ طے کیا اور گاڑی گاؤں کے داخلی راستے پر ڈال دی۔ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک چوراہے میں آ گیا، جو کافی کشادہ تھا۔ چوراہے کے درمیان میں ایک برگد کا درخت تھا۔ جس کے ارد گرد گول پختہ ٹھکانا ہوا تھا اور وہاں پر کافی سارے مختلف عمر کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گاؤں کی ”ستھ“ (چوپال) تھی۔ ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر انوجیت نے گاڑی روک دی۔ پھر اترتے ہوئے بولا۔

”اس گاؤں میں ایسی چھ اور ستھ ہیں لیکن سب سے پرانی یہی ہے۔ یہیں سارا دن یہ بوڑھے اور فارغ لوگ اپنا

وقت گزارتے ہیں دیکھو! کوئی تاش کھیل رہا ہے، کوئی کٹوری اور کچھ۔۔۔“

”مطلب یہ گاؤں کا کلب ہے۔“ جیپال نے کہا اور دوسری جانب سے اتر گیا۔ دوسری بار اس گاؤں کی مٹی اس کے پاؤں تلے آئی تھی۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا بالکل انوکھا۔ بھارتی پنجاب کا حقیقی رنگ۔ وہ رنگ جو اس نے پہلے اس نے کبھی فلموں یا تصویروں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سنا ہی تھا کہ پنجاب کا علاقہ بہت امیر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ چاہے بھارتی پنجاب ہو یا پاکستانی پنجاب، علاقہ امیر ہے لیکن وہاں کے بیشتر سے زیادہ لوگ غریب ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف وہی لوگ ہیں جو سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط ہیں اور دوسرے لوگوں کا حق غصب کر جاتے ہیں۔ یہ سیاست بھی بڑا بے غیرتانه کھیل ہے۔ جس کھیل کی بنیاد ہی منافقت ہو۔ اس میں انسانی فلاح کا پہلو کہاں سے آ سکتا ہے۔ اب معلوم نہیں اس نے یہاں کے اور کتنے رنگ دیکھنا تھے۔ یہ تو قسمت اور زندگی پر منحصر تھا کہ وہ اس کا ساتھ دیتی بھی یا نہیں۔ وہ ان لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ سارے جو کچھ بھی کر رہے تھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس نے دور ہی سے ہاتھ جوڑ کر سب کو فتح بلائی اور انوجیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اس کی پشت کی جانب ایستادہ بڑی ساری حویلی کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ ہے تمہاری آبائی حویلی جیپال۔! اٹھائیس برس سے یہ ویسی کی ویسی ہے۔“ انوجیت نے کہا تو جیپال کے دل پر ایک گھونسلہ لگا۔ اس نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے اس بد قسمت حویلی کو دیکھا جس کے سارے مکین اٹھائیس سال پہلے قتل کر کے جلا دیے گئے تھے۔ اس حویلی کی حالت اپنی خاموش زبان سے خود ہی بتا رہی تھی کہ اس پر اور اس کے مکینوں پر کیا قیامت گزری ہوگی۔ اٹھائیس برس پہلے اٹھنے والے دھوئیں سے جو سیاہی آئی تھی وقت نے اسے مزید سیاہ کر دیا تھا۔ نجانے کتنے ساون اور کتنی بارشیں ہوئی ہوں گی۔ مگر اس حویلی کی قسمت میں سیاہی ہی رہی۔ جلا ہوا پھانک بند تھا۔ شاید لوگوں نے پانی ڈال کر آگ بجھائی ہوگی۔ لوہے، پیتل کے کندوں کے درمیان میں سے اندر کا بھیا تک پن دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی اس نے بھیگتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”انوجیت، کیا کبھی کوئی اس حویلی کے اندر نہیں گیا؟“

”نہیں جیپال سچ پوچھو تو لوگ اس حویلی کے اندر جانے سے ڈرتے ہیں۔“ انوجیت نے دکھی لہجے میں کہا۔ تب اس نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ کیوں؟“

”یہ حویلی سن چوراہے کے منے میں مکمل ہوئی تھی اور اسی مہینے سب لوگ اس میں آ کر رہنے لگے تھے۔ جولائی میں یہ سانحہ ہو گیا اور لوگ اس حویلی کو منحوس خیال کرنے لگے اور اب تک کرتے ہیں۔“

یہ سن کر جیپال مزید کچھ نہیں بولا بلکہ اسے خود پر قابو پانے میں کئی لمحے لگ گئے۔ پھر اس نے اپنی ہمت جمع کی اور دھکیل کر پھانک کو کھولا۔ ذرا سی چڑچاہٹ کے بعد وہ کھلتا چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں گند بھرا پڑا تھا۔ وہ چٹا چلا گیا۔ آگے صحن میں بھی حالت ویسی ہی تھی۔ صرف ایک سرسبز درخت کھڑا تھا۔ نیم کا سرسبز درخت جس کے پتے اٹھائیس برس سے گر رہے تھے اور ان سے صحن میں سرانڈ بسی ہوئی تھی۔ وہ صحن پار کر کے طویل برآمدے میں آ گیا۔ سیاہ کمرے اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ پھر اس کی آنکھوں کے سارے منظر ڈوب گئے۔ یہیں اس حویلی میں یہاں صحن برآمدے اور ان کمروں میں اس کا باپو ماں، تائے تائیاں چاچا چچی ان کے بیچ، اور پچو پچی..... سب زندہ رہے تھے اور اب..... ایک دم سے کہرام زدہ چیخ و پکار اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ہوائیں بین کرنے لگیں۔ دیواریں ماتم کناں ہونے لگیں۔ اس آہ و بکا میں وہ بی کڑا کر کے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے اندر نفرت کا الاؤ پوری قوت سے ترترانے لگا تھا اور وہ لمحات کسی تیل کی مانند اسے

”ٹھیک ہے۔“

جیسے ہی کجیت کو اپنی سفید کار میں ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئیں۔ انوجیت اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ ہسپال اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا تو اس نے جیب بڑھادی۔ ان کا رخ تھانے کی طرف تھا۔

☆.....☆.....☆

میں بے چینی سے پیرزادہ وقاص کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تک اس کی طرف سے آنے والے لوگوں کو آ جانا چاہیے تھا۔ چھاکا تیار ہو کر آیا تو اسے بدلی ہوئی صورت حال کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس نے فوراً ہی اپنے چند دوستوں کو اکٹھا کر لیا۔ وہ سب گھر کے باہر مختلف جگہوں پر پھیل گئے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹا جاسکے۔ جبکہ میں صحن میں ٹھنلے لگا۔ اماں اور سوہنی بھی صورت حال سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں دو تین بار چھت پر سے ہو کر آ گیا۔ میرے گھر کی چھت سے دور تک سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس بار جب میں چھت پر گیا تو مجھے ایک ہائی ایس وین آتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے اس پر شک ہوا۔ ایسی وینیں ہمارے علاقے میں نہیں چلتی تھیں۔ میں نے تیزی سے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ پھر خود ہی اتر کر گلی میں آ گیا جہاں میری بایک پہلے ہی سے کھڑی تھی۔ چھاکے وغیرہ نے گلی میں کھڑی ہوئی جیب کو دھکا لگا کر گلی کے کنارے لگا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہائی ایس گلی میں داخل ہوئی اور پھر میرے دروازے کے سامنے آن رکی۔ اس میں کافی ساری عورتیں اور مرد تھے۔ ان عورتوں کے چہرے شناسا تھے۔ ایک مونسا محض باہر نکلا اور بڑے مودب لہجے میں بولا۔

”وہ..... جی..... سوہنی..... آپ کے پاس.....!“

”وہیں ٹھہرو! ابھی بلاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پلٹ کر گیٹ میں آ گیا۔ سوہنی نیم کے درخت تلے اماں کے ماتھ کھڑی تھی۔ میں نے وہیں سے ہانک لگاتے ہوئے کہا۔ ”آ جاؤ! سوہنی تمہارے لوگ تجھے لینے کے لیے آ گئے ہیں۔“ میرے یوں کہنے پر وہ اماں کے گلے لگ گئی۔ پھر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی باہر کی جانب چل پڑی تب میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”رک جاؤ۔“ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اماں سے کہا۔

”اماں اس کے وہ کپڑے جو یہ پہن کر یہاں آئی تھی وہ تو دے دو اسے۔“

اماں کو جیسے ہوش آ گیا وہ پلٹی اور چند منٹوں میں ایک بڑا سا راشننگ بیگ لاکر سوہنی کو دے دیا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے میری جانب لپکی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی دیگن میں موجود لوگوں کی جان میں جان آ گئی۔ وہ سوہنی میرے سامنے کھڑی میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز یوں تھا کہ جیسے میرا چہرہ اپنی آنکھوں میں جذب کر رہی ہو۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”جمال میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گی اور تیرا انتظار کروں گی جب چاہے آ زمالینا۔“

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ ”جاؤ! یہ ڈائلاگ بازی مت کرو جانے والے کہاں پلٹ کر دیکھتے ہیں۔“ مگر وہ میرا دل دیکھنے اور میری بات سننے بغیر دیگن کی طرف بڑھی اور اس میں سوار ہو گئی۔ جب تک وہ مونسا شخص میرے قریب ہوا اور وہ دُوب لہجے میں بولا۔

”پیرزادہ صاحب کا پیغام ہے کہ آپ انہیں فون کر لیں۔“

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پلٹ کر پینٹر سٹ پر جا بیٹھا۔ تب تک میں بھی اپنی بایک پر بیٹھ چکا تھا۔ اماں نے بڑھتے ہی میں نے اپنی بایک بڑھادی۔ پھر جس وقت وہ چوک پار کر رہے تھے تب تک چھ موٹر سائیکلیں دیگن

مزید بھڑکا رہے تھے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں ہر خلیہ نفرت میں بھیگا ہوا تھا۔ جس میں انتقام رچ بس گیا تھا۔ نفرت اور انتقام دونوں مل کر اس کا جسم پھاڑ دینے کو تھے اور وہ خود کو ٹوٹ جانے سے بچا کر اپنے آپ پر قابو پارہا تھا۔ ان لمحات میں اگر وہ خود پر قابو نہ رکھ پاتا تو ساری زندگی کی ریاضت ضائع ہو جانے والی تھی۔ ایسے وقت میں جبکہ وہ خود کو سنبھال رہا تھا۔ اس کی پشت پر ایک نرم سا ہاتھ آن ٹھہرا۔ اسے لگا جیسے بھڑکتی ہوئی آگ پر ساون کی رم جھم پھور پڑنے لگی ہے۔ وہ چونک گیا اس نے آنکھیں سے مڑ کر دیکھا۔ لگا ہوں میں مامتا، چہرے پر مونٹے نقوش، کھلتے ہوئے رنگ میں سے جھلکتا خلوص، سر پر موتیارینگ کا آنچل لیے فرہ مائل بزرگ سی خاتون اسے پر شوق لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”پتر جہاں! میں انوجیت کی بے بے ہوں، تیری پھوپھو کچھ جیت کوری گہری سہیلی کجیت کور۔“

”کجیت کور.....! آپ۔“ جہاں لنگھنے حیرت سے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ نام اس نے اپنی

پھوپھو سے بار بار سنا تھا۔

”ہاں پتر! تو چل میرے ساتھ گھر وہیں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ میں اس لیے یہاں آئی ہوں تو جتنی دیر یہاں ٹھہرے گا اتنا ہی.....!“ یہ کہتے ہوئے کجیت کور کا اپنا گلارندہ گیا۔

جہاں نے چند لمحے کجیت کور کے چہرے پر دیکھا جو شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ اس کے گلے لگ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بہت دنوں کے بعد اپنی پھوپھو سے مل رہا ہو۔ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہری جانب چل دیے۔ صحن میں پھیلے ہوئے نیم کے درخت طرف دیکھتے ہوئے کجیت کور نے کہا۔

”صرف یہی بچا ہے تیری طرح..... تیری اور اس کی عمر ایک جتنی ہے غور کر پتر جہاں! اس درخت کو پالنے والا دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے، پر رب تو ہے پالنے والا! دیکھ جسے کوئی نہیں پالتا رب اس کو پھل دینے والا بنا دیتا ہے۔ اسے کسی نے نہیں تراشا، پر رب نے اس کو کس قدر سبز و شاداب کر دیا ہے۔ میری یہ بات پلے باندھ لے پتر۔“

ان جذباتی لمحوں میں جہاں نے کجیت کور کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”پھوپھو وعدہ کریں آپ مجھے وہ سب کچھ سچ بتا دیں گی جو میں نہیں جانتا۔“

”ہاں پتر میں سب کچھ بتا دوں گی مگر ایک وعدہ تم نے بھی مجھ سے کرنا ہے۔“

”ایسا کوئی وعدہ مت لینا پھوپھو جسے میں پورا نہ کر سکوں۔“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”چل پھر چھوڑ! بعد میں بات کریں گے آؤ چلیں۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولیں اور باہر کی جانب چل

دیں۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باہر تک آ گیا۔

باہر لڑائی کا ٹھنڈا لگ چکا تھا۔ ہر کسی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کلوندرنگھ کا پتر اور اس حویلی کا مالک آ گیا ہے۔ وہ سب اسے دیکھنے کے مشتاق تھے۔ جہاں لنگھ کر ان سب کو دیکھنے لگا۔ وہ سب مختلف عمر کے مرد اور عورتیں جو ان کے لڑکیاں تھیں۔ تب انوجیت نے اپنی بے بے سے کہا۔

”بے بے تم چلو! میں جہاں کے ساتھ تھانے سے ہو کر آتا ہوں۔“

”تھانے! مگر کیوں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ تم غیر ملکی پاسپورٹ پر ویزا لگا کر بھارت آئے ہو پھر کچھ بھی ہو۔ تھانے میں رپورٹ تو کرنا ہوگی۔ کیونکہ تم غیر ملکی ہو۔ شاید تمہیں اس ملک کا شہری بھی تصور نہ کیا جائے کہ تمہارے پاس اب کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تمہارا تعلق اس ملک سے ہے۔“ انوجیت کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ جیسے وہ اس کے بارے میں نہ کہہ رہا ہو بلکہ اپنی قوم کا نوحہ پڑھ رہا ہو۔ اس پر جہاں نے طویل سانس لی اور سکون سے کہا۔

”ابھی اپنی گلی میں مت جاؤ ادھر پولیس آئی ہوئی ہے۔ تیرے گھر کے سامنے کھڑی ہے نا وہ چیپ۔“
 ”پولیس مگر وہ کیوں؟“ میں نے تجس سے پوچھا، حالانکہ میرے لاشعور میں کہیں تو کہ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ وہ جب بھی بنی، میرے گلے میں پھندا بننے کی وجہ بنے گی۔ اب وہ پھندا بنتی ہے یا نہیں لیکن اس سے یہ تصدیق ہو جاتی تھی کہ حملہ آوروں کا تعلق کن سے تھا، پیرزادہ وقاص یا سردار شاہ دین؟

”پتا نہیں وہ چیپ کو گھیرے کھڑے ہیں۔ تیری اماں نے تو کہا ہے کہ وہ آئے گا تو اس سے پوچھ لیں۔ وہ آنے والا ہی ہے۔ میں یہاں تیرے انتظار میں کھڑا تھا کہ تجھے بتادوں۔“ اس نے احسان جتانے والے انداز میں کہا تو میں نے اسے جواب نہیں دیا بلکہ آگے بڑھ گیا۔ میں بھی شدت سے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ چیپ کس کی ہے۔

گلی میں پولیس والے کھڑے تھے دو پولیس دین ایک چیپ اور جدید ماڈل کی دو کار بھی تھیں۔ میں نے بے دھڑک اپنی بانیک ان کے پاس روک دی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ الارٹ ہو گئے۔ میں نے دودھ کا برتن اتارا ہی تھا کہ مجھے لگا جیسے وہ میرے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر ایس ایچ او نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں نے اس دوران اس کے سینے پر لگے بیج پر اس کا نام افضل رندھاوا پڑھ لیا تھا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔

”تم جمال ہو اور یہ گھر تمہارا ہے۔“

”ہاں میں ہی جمال ہو اور یہ میرا ہی گھر ہے، خیریت.....!“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا

”ہم تجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں، چلو ہمارے ساتھ.....!“ وہ بڑے رعب سے بولا۔

”کیوں؟ مجھے گرفتار کرنا ہے؟“ میں نے تجس سے پوچھا۔ ابھی لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ پشت سے میری گردن پر زوردار گھونسہ پڑا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ میں ایک دم سے بھنا گیا۔ لاشعوری طور پر جو دودھ والا برتن میرے ہاتھ میں تھا میں نے گھما کر اندازے سے ایک بندے کے سر پر دے مارا۔ اگلے ہی لمحے گئیں اور درانقلیں میری طرف سیدھی ہو گئیں۔ افضل رندھاوا نے انتہائی سرعت سے اپنا ریوا لور نکال لیا۔

”خبردار حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کئی پولیس والے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ دودھ والا برتن میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنے لوگ تھے۔ میں مزاحمت میں فقط اتنا بچاؤ کر رہا تھا کہ کوئی ضرب نازک جگہ پر نہ لگے۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا، وہ نجانے کتنے تھے جو مجھے پیٹتے رہے۔ میں بے دم سا ہونے لگا۔ مجھے کچھ بھی سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں مجھے کسی نے کمر سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا۔ اگلے ہی لمحے کئی ہاتھ میری طرف بڑھے۔ انہوں نے کسی بوری کی مانند پولیس دین میں مجھے پھینک دیا۔ تب مجھے اپنے سر پر شدید چوٹ کا احساس ہوا۔ پھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

”نام؟“

پولیس چوکی میں تعینات موٹے سکھ آفیسر نے اپنے سامنے کھڑے جہاں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے طنز آمیز

لہجے میں پوچھا۔

”جہاں سکھ۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”باپ کا نام؟“ اس نے یوں حقیر آمیز لہجے میں پوچھا جیسے باہر سے آنے والے کسی سکھ کے باپ کا کوئی

نام نہیں ہوتا۔

”آنجہانی..... کلوندر سکھ.....“ اس بار پھر اس نے لہجے کو پرسکون رکھا تھا۔

”یہاں کس کے پاس آئے ہو اور کیوں؟“ اس بار پولیس آفیسر کے لہجے میں شک کا زہر گھلا ہوا تھا۔
 ”میں یہاں اپنے گھر آیا ہوں۔ اس گاؤں میں میرے آباؤ اجداد کا گھر ہے۔ جو، اب بھی موجود ہے۔ میں انہیں پیدا ہوا ہوں اور اب.....“ جہاں نے جذباتی لہجے میں کہنا چاہا تو اس کی بات کاٹ کر آفیسر بولا۔
 ”لیکن یہ سب تیرے ان کاغذات میں نہیں لکھا ہوا اور نہ ہی یہ میرے سوال کا جواب ہے۔ میں نے جو پوچھا

”وہ بتاؤ.....“ موٹے آفیسر نے انتہائی حقارت اور ہنک آمیز لہجے میں اُکاتتے ہوئے کہا۔ اس پر جہاں نے گہری سانس لی اور سمجھوتہ کرنے والے انداز میں بولا۔

”میں انوجیت سکھ کے پاس آیا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔“ اس نے ذرا فاصلے پر بیٹھے انوجیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی سرد پن اُتر آیا تھا۔

”کتنے دن کا پروگرام ہے؟“ آفیسر نے یوں کہا جیسے اس کی پہلے والی بات کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

”جتنے دن کا دیر ہے اب جس کی مدت میں جب چاہے بڑھا سکتا ہوں۔ یہ بات میرے کاغذات میں درج ہے۔“ اس بار لہجے میں سرد پن کے ساتھ طنز بھی اُتر آیا تھا۔ موٹے آفیسر نے ذرا سی آنکھیں موند کر اس کی جانب دیکھا اور فاصلے میں بولا۔

”ٹھیک ہے، مگر تمہاری جتنی بھی مودمنٹ ہوگی اس کی اطلاع یہاں تھانے میں ہونی چاہیے۔“

”مطلب؟ میں اس آزاد ملک میں بھی آزاد نہیں ہوں؟“ وہ آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”آزادی ہمیشہ پابندیوں کے ساتھ ملتی ہے مسٹر جہاں سکھ۔ ہر ملک کے قانون کی پاسداری کرنا پڑتی ہے اور ام قانون کی حکمرانی ہی کے لیے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب تمہارے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوا کہ تم..... دہشت گرد نہیں ہو۔ بس قدر یہ جانس ہے کہ تم یہاں امن و امان سے رہ کر واپس چلے جاؤ گے، اتنے ہی چانس یہ بھی ہیں کہ تم کسی دشمن ملک کی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہو۔“ سکھ آفیسر نے حقارت طرز اور اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہو آفیسر، ہر قوم، ہر ملک، ہر حکمہ اور ہر بندے کا اپنا ایک تاثر بھی ہوتا ہے۔ اس کی اپنی قومی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ اس کے اپنے آباؤ اجداد کا ورثہ بھی ہوتا ہے۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کیسا ہے؟ آپ جبکہ ایک غیر ملکی اور مشکوک آدمی بنانے پر نکل ہی گئے ہیں تو سنو..... آپ سے ملنے کے بعد بھارت، پنجاب اور خصوصاً سکھ قوم کے ہمارے میں جو میرا تاثر تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔“ اس کے لہجے میں بھی نفرت عود کر آئی تھی۔

”کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ ایک دم ہتھے ہی سے اکھڑ گیا۔ اس لیے وہ ہی کے لہجے میں بولا۔

”وہی جو تم سمجھ گئے ہو۔ نیا سوال بولو۔“ اس بار جہاں سکھ باوجود کوشش کے اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے صاف لفظوں میں وہی کہہ دیا جو اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ پولیس آفیسر چند لمحے سوچتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اس جگہ آمیز لہجے میں اس کے کاغذات سمیٹ کر واپس دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں کوئی سوال نہیں، ادھر جاؤ میرے اسٹنٹ سٹ پال کے پاس، اس کے پاس جا کر فارم پُر کرو اور اس پر

”اس کے چلے جاؤ۔ مگر! میری ہدایت کو ذہن میں رکھنا، اب جاؤ۔“
 جہاں نے بمشکل خود پر قابو رکھا، اپنے کاغذ پکڑے اور اپنی جانب دیکھتے ایک پولیس کانسٹیبل کی طرف دیکھا، اس کی طرف آفیسر نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے پاس انوجیت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا، کانسٹیبل سٹ پال نے اس کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹھے۔“

”شکر یہ۔“ اس نے کہا اور انہ جیت کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب تک ست پال نے دراز میں سے ایک فارم نکال کر اس کے سامنے رکھا اور بڑے آرام سے بولا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے اس آفیسر کا سو بھا (مزاج) ہی ایسا ہے۔ طبیعت کا کچھ گرم ہے ویسے یہ اندر سے بہت اچھا آدمی ہے۔ آپ یہاں ضروری معلومات لکھ کر دستخط کر دیں۔“

جہاں سنگھ نے ایک نگاہ میں وہ معلومات پڑھیں اور پھر جلدی جلدی سب لکھ کر اپنے دستخط کر دیئے۔ دوبارہ ایک نگاہ ڈال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔

”لیں۔“

کانشیل نے ایک نگاہ فارم پر ڈالی اور پھر واپس رکھتے ہوئے ہنس کر بولا۔

”آپ اپنے ساتھ سکاچ و ہنسی تو لائے ہوں گے۔“

”نہیں میں نہیں لایا، مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ جہاں سنگھ نے چونک کر کہا تو انوجیت بولا۔

”وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔“ پھر کانشیل سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم آؤ ذرا میرے ساتھ باہر۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاں سنگھ بھی باہر جانے کے لیے لپکا تو کانشیل بھی ان کے پیچھے ہی آ گیا۔ انوجیت نے اپنی جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنے آفیسر کو سمجھا دینا کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے مہمانوں کے ساتھ بات ذرا تمیز سے کیا کرے۔ اگر نہیں سمجھتا تو اسے بات کرنا سکھا دیں گے ہم۔۔۔۔۔ اب جاؤ۔“

کانشیل نے نوٹ جیب میں ڈالے اور واپس پلٹ گیا۔ انوجیت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جہاں سنگھ کو سمجھایا تو دونوں گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

”یار مجھے بہت غصہ آ رہا ہے اس پر۔۔۔۔۔“ جہاں سنگھ نے کہا۔ جب وہ تھانے کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔ پھر جب گاڑی میں بیٹھ چکے تو انوجیت نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے نئی سے کہا۔

”تیرا کیا مطلب ہے مجھے اس پر پیارا آ رہا ہے۔“

”تو پھر انہیں رشوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”رشوت میں نے کون سی رشوت دی ہے میں نے کون سا کوئی ناجائز کام کروایا ہے۔ تم سمجھو جہاں سنگھ یہاں جائز کام کے لیے بھی رقم دینا پڑتی ہے۔ سمجھ لو یہ بھی غنڈہ نکس ہے۔ یا بھتہ ورنہ یہ جائز کام کبھی اتنا مشکل بنا دیتے ہیں کہ بس۔۔۔۔۔“ انوجیت نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”آئندہ۔۔۔۔۔! تم نے کسی بھی معاملے میں یوں رقم ضائع نہیں کرنی میں خود چاہوں گا کہ یہ میرے کام کو مشکل بنائیں۔“ جہاں سنگھ نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ انوجیت نے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا۔“ جہاں سنگھ نے کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔ اس پر انوجیت خاموش ہو گیا۔

اس وقت سورج غروب ہونے میں تھوڑا ہی وقت تھا جب وہ پولیس چوکی سے نکلے۔



میرے حواس بیدار ہوئے تو میں ایک اندھیرے کمرے میں تھا۔ پھر کچھ دیر بعد مجھے روشنی کا احساس ہونے لگا۔ مجھے اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا تو دیکھا کہ کچھ پولیس والے کھڑے تھے اور میں فرش پر چت لیٹا ہوا تھا۔ ایک پولیس والے کے ہاتھوں میں پانی کی بوتل تھی جس سے وہ پانی میرے چہرے پر پھینک رہا تھا۔ باوجود خواہش کے میں اپنے

ہاتھوں کو حرکت نہیں دے سکا۔ میں نے اپنی طرف سے چیخ کر کہا تھا کہ مجھ پر پانی مت پھینکو۔۔۔۔۔ لیکن میرے لبوں سے ایک لفظ تک ادا نہیں ہو پایا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں پتھر کا بن گیا ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے ہوش آنے لگا۔ یہاں تک کہ مجھ ارد گرد کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

”اوائے ہوش نہیں آیا۔۔۔۔۔ اس بہن۔۔۔۔۔“ کسی نے کرحش انداز میں پوچھتے ہوئے نہایت غلیظ انداز میں گالی دی۔ تبھی میرے قریب ہی سے آواز آئی۔

”بس آ ہی گیا ہے جی۔“

”تو لے آؤ پھر اسے۔۔۔۔۔“ اتنا کہنے کے بعد گالیوں کی ایک لمبی فہرست تھی جسے برداشت کرنا انتہائی ناممکن تھا۔ میرے بدن میں آگ بھڑک گئی۔ میرے ہوش کرنے پر انہوں نے مجھے زبردستی اٹھایا اور چند قدم کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے افضل رندھاوا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کرسی کی فیک چھوڑ کر بولا۔

”اوائے (۔۔۔۔۔ گالی) اب جلدی سے بگ دے ڈکیتی کا مال کدھر ہے؟“

میں اس وقت تک پورے حواس میں آ گیا تھا اس لیے اپنا آپ چھڑواتے ہوئے بولا۔

”تیری بہن کے گھر پر ہے، چیز کی کمی تھی، وہ پوری کی ہے۔“

میرے اس طرح کہنے پر وہ بری طرح چونک گیا۔ حیرت سے چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بجائے بھڑکنے لے اسی کرحش لہجے میں یوں بولا جیسے میں نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔

”جیب تیرے گھر کے باہر سے برآمد ہو گئی ہے یہ میرے سامنے چوہدری حفیظ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے بیٹے گاڑی چھینی تھی۔ جو مال۔۔۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا مگر میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”اگر کوئی تیری بیوی میرے گھر کے سامنے لا کر چھوڑ دے تو کیا اسے بھی میں نے اغوا کیا ہے؟“

”اوائے زیادہ سیانہ بن اور اپنی زبان قابو میں رکھ۔ ورنہ تیرے بدن کا ہر سوراخ بولے گا کہ مال کہاں ہے۔“ اس نے غصے میں سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ میں رُخ پھیر کر اس چوہدری حفیظ کو دیکھنے لگا جو بڑے ٹھٹھے سے لڑی پر براجمان تھا۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ اور میرے گھر سے باہر جیب تک کیسے پہنچا؟ یہ سوال

میرے ذہن میں گونج کر رہ گئے۔ تب تک افضل رندھاوا نے کہا ”اتنی ٹھکانی کے بعد تجھے عقل آ جانی چاہیے ورنہ رات بھر میرے جسم کے ریشے تک اُدھر جائیں گے۔“

”اوائے سن اوائے رندھاوے۔۔۔۔۔ اس جیب پر چھ حملہ آور، اسلحہ سمیت مجھے قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں نے ان بزدلوں کو مار بھگایا۔ یہ جیب ان لوگوں نے وہاں چھوڑی اور بھاگ گئے۔ مجھے نہ کسی ڈکیتی کا پتا ہے اور نہ میں

’کی مال کے بارے میں جانتا ہوں۔ یہی سچ ہے اور یہی میرا بیان ہے۔ اب تو جو چاہے کر لے میرا بیان بکری رہنا ہے لیکن

ہمارے ہمارے اپنی اتنی ہی اوقات دکھانا جتنی تو بعد میں برداشت کر سکے۔“ میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں غصے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے ت وہ انتہائی لطف میں بولا۔

”تو بول کہاں سے رہا ہے مجھے تو اتنا بے وقوف نہیں لگتا کہ تجھے یہ معلوم ہی نہ ہو تو کہاں کھڑا اور کس سے بات

کر رہا ہے۔ تو میری اوقات دیکھنا چاہتا ہے تو پھر دیکھ میں دکھاتا ہوں تجھے اپنی اوقات۔“ یہ کہہ کر اس نے چوہدری حفیظ کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری صاحب! آج آپ جائیں میں ذرا اسے بات کرنا سکھالوں، کل آپ تشریف لائیں میں جیب آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”ج بہتر.....!“ وہ اٹھتے ہوئے بولا، تبھی اس نے دوسرے کمرے میں موجود اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا اور تھانے سے نکلتا چلا گیا۔ تبھی افضل رندھاوا نے اپنے قریب کھڑے پولیس والوں سے کہا۔

”اُوئے لے جاؤ اسے اور چھترول کر کے سمجھاؤ کہ بولتے کیسے ہیں۔ آج رات کوئی ڈکیتی، کوئی مال برآمد کروانے کی ضرورت نہیں ہے مرتا ہے تو مر جائے..... میں سنبھال لوں گا۔“

”کیوں تمہارے ہاں مردوں کے ساتھ رشتہ جوڑتے ہیں۔ کون سا رشتہ دے گا مجھے؟“ میں نے انتہائی نفرت سے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ میں اسے جس قدر غصہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا، میری ہر کوشش بے کار جا رہی تھی۔ وہ میرا ارادہ بھانپ گیا تھا یا قدرتی طور پر وہ کچھ نہیں کر رہا تھا جو میں نے کہا تو واقعتاً غصے میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور پوری قوت سے مجھے پھنسا مارنے کے لیے لپکا، یہی وہ موقع تھا جس کے لیے میں کوشش کر رہا تھا۔ اس کا دائیں ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا، بائیں ہاتھ کی پٹینی ہوئی مٹھی کر کے پیچھے تھی، وہی ایک لمحہ تھا، میں نے آگے بڑھ کر اس کے ریوالتور پر ہاتھ ڈال دیا، دوسرا ہاتھ اس کی مٹھی والے بازو پر ڈالا اور چشم زدن میں گھوم کر اس کی گردن میں بازو حائل کر دیا۔ وہ ایک دم سے ٹھنک گیا اور پھر وہیں ساکت ہو گیا۔ میں نے ریوالتور کے وزن سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ خالی نہیں ہے۔ بس سیفی کیچ نہیں ہٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ریوالتور لاکر سیفی کیچ ہٹایا اور سر دلچے میں بولا۔

”یہ ہے تیری اوقات..... اب چل وہیں لے چل جہاں سے تو مجھے لایا تھا، ورنہ تو مرے گا ہی باقی کا مجھے پتا نہیں۔“

”دیکھ گولی نہیں چلانا میں..... تجھے لے چلتا ہوں..... چل.....“ اس نے تیزی سے کہا اور باہر جانے کو تیار ہو گیا۔ قریب کھڑے سپاہی اس صورت حال سے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک تیزی سے باہر کی جانب بھاگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ کر بھاگا تھا۔ چاہے انتہائی غصے میں ہی سہی، مگر میں خواہ خواہ خود کو مجرم ثابت کر رہا تھا۔ میرا لشعور مجھے ایسی حرکت کرنے سے باز رکھ رہا تھا۔ مگر وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں ذرا سی بھی کمزوری دکھاؤں۔ بعد میں جو ہوتا وہ میں بھگت لیتا۔ اس وقت جو انتہوں نے مجھے ذلیل کر کے پڑا تھا، اس نے میرا دماغ گھما کے رکھ دیا تھا۔ میں رندھاوا کو قابو کیے جب اندرونی کمرے سے باہر برآمدے میں آیا تو پورے تھانے میں لوگ ہم دونوں کا تماشا کر رہے تھے۔ ان میں پولیس والے بھی تھے اور سویلین بھی۔ کچھ جذباتی پولیس والوں نے اپنی گتیں سیدی کیں اور کچھ غیر ارادی طور پر ہماری جانب لپکے مگر افضل رندھاوا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں برآمدے کی دو چار سیڑھیاں اتر کر صحن عبور کرتا اور پھر باہر نکل جاتا تھا، میں آگے پیچھے دو گایاں تیزی سے آن رکیں۔

سفید رنگ کی کار میں سے شاہ زیب باہر نکلا۔ وہ میری جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میری توجہ بٹی اور شاید اس پر افضل رندھاوا نے میری گرفت کو ڈھیلی محسوس کیا۔ اس لیے میرا بازو اپنی گردن سے ہٹانے کی تیزی سے کوشش کی۔ میں نے اسے مزید دبا دیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ یہ لمحوں میں ہوا تھا۔ دوسری گاڑی فوراً چیل جیپ تھی جس کے شیشے کا لے تھے۔ اس میں سے پیرزادہ وقاص باہر نکلا۔ وہ میری طرف انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ تبھی شاہ زیب نے اونچی آواز میں کہا۔

”چھوڑ دے جمال اسے..... میں آ گیا ہوں..... اب یہ تجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“

میں نے افضل رندھاوا کو چھوڑنے میں ذرا سا توقف کیا تھا۔ شاید اس لیے پیرزادہ وقاص پر سکون مگر بھاری لہجے

”اب چھوڑ بھی دے یا رنہ رندھاوا اپنا ہی بندہ ہے۔“

میں نے ایک دم سے اسے چھوڑا تو وہ کھانسنے لگا۔ میں نے ریوالتور کے چیمبر میں سے گولیاں نکالیں اور خالی ۲۰ اور اس کے ہولسٹر میں ڈالنے کی بجائے اس کی جانب بڑھا دیا۔ جسے اس نے آرام سے پکڑ لیا، اس کے انداز میں شرمندگی کا بھر پور تاثر تھا۔ میں باہر کی جانب نہیں لپکا بلکہ واپس مڑا اور ایس ایچ او کے کمرے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آ گئے۔ اس بار رندھاوا کی جرات نہیں ہوئی کہ وہ میری جانب ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھے۔ میرے دائیں جانب پیرزادہ وقاص اور بائیں طرف شاہ زیب آ کر بیٹھ گئے۔

”کیوں پکڑ کر لائے ہو اسے؟“ شاہ زیب نے بظاہر سکون سے پوچھا تھا لیکن اس کے لہجے میں سے غصہ چھلک رہا تھا۔

”گاڑی برآمد ہوئی تھی اس سے چند دن پہلے ڈکیتی ہوئی تھی اور اس.....“ رندھاوا نے کہنا چاہا مگر اس کی بات ٹٹنٹے ہوئے پیرزادہ وقاص نے پوچھا۔

”یہ بتایا کس نے کہ گاڑی اس کے گھر کی سامنے کھڑی ہے.....؟“

”وہ چوہدری حفیظ..... ابھی کچھ دیر پہلے یہاں تھا۔ اس نے بتایا تو میں نے چھاپہ مارا، اور گاڑی مل گئی۔“ رندھاوا نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہ اس وقت تک کافی حوصلہ پکڑ چکا تھا۔

”یہ تصدیق کیے بغیر کہ گاڑی اس نے چرائی ہے یا نہیں، تم اسے پکڑ کر یہاں تھانے میں لے آئے ہو، اور وہ بھی اس قدر ذلیل کر کے..... کیوں..... اس کا جواب دو.....“ شاہ زیب نے غصے میں کہا۔

”سچ کیا ہے وہ بولو انسپکٹر..... یہ بچوں جیسی باتیں مت کرو ورنہ مجھے اور شاہ زیب کو یہاں دیکھ کر تمہیں سمجھ مانا جائیگا کہ یہ علاقہ تمہارے لیے عذاب بن جائے گا۔“ پیرزادہ وقاص نے سخت لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”دیکھئے، ابھی آپ اسے لے جائیں۔ میں آپ کو بعد میں بتا دوں گا۔“

رندھاوا نے یہ لفظ بہت مشکل سے کہے تھے۔ شاید اس کے اندر ہی اندر کچھ اور لاوا پک رہا تھا یا پھر وہ لاف کے باعث بات نہیں کر پار رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ اذیت محسوس کر رہا تھا، میں نے اس کی اذیت میں اٹھال کرنے کی خاطر کہا۔

”دراصل یہ جو ہمارا سسٹم ہے نا، اس میں بے چارے پولیس والے بھی کیا کریں جاگیرداروں، وڈیروں، سیاسی اہلکاروں اور سرکاری افسروں کی حفاظت کرتے کرتے، ان میں غلامی کی عادت آ چکی ہے۔ یہ طاقت کی زبان سمجھتے ہیں یا ان کی انہیں صرف غریبوں پر تشدد اور مظلوموں پر ظلم کرنا آتا ہے..... ورنہ یہ مجھے میرے گھر کے سامنے سے یوں ذلیل لے نہ لاتا، پتا نہیں اس نے کس کی غلامی کی ہے رندھاوا بول دے، کس کی غلامی کی ہے تو نے.....؟“ میرے لہجے میں طرکی کاٹ کچھ زیادہ ہی آگئی تھی۔ میرا اگلا ہوا زہر برداشت کرتے ہوئے اس نے منہ سے کہا۔

”تیری طرح جو خواہ خواہ اپنی جرات دکھاتے پھرتے ہیں نا، جب ان کی چمڑی ادھڑتی ہے تو پہچانے نہیں جاتے۔ ان دو معزز لوگوں کی وجہ سے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ اب اپنی زبان کو لگام دے۔“ افضل رندھاوا نے اپنی مزید برائی برداشت نہیں کر سکا، تبھی پیرزادہ وقاص بولا۔

”میرے سوال کا جواب نہیں دیا انسپکٹر، تم نہیں جانتے، تیری خاموشی سے علاقے میں کتنی بڑی الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ اس کے یوں کہنے پر رندھاوا نے خود پر قابو پاتے ہوئے پیرزادہ وقاص کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ مجھ پر یقین کریں گے؟“

”کروں گا۔“ اس نے ایک دم سے کہا۔

”تو پھر نہیں.....! مجھے میرے اعلیٰ آفیسر کا فون ملا۔ یہ جیپ جو اس کے گھر کے سامنے سے ملی ہے یہ ملک سجاد کے بیٹے کی ہے۔ وہی ملک سجاد جو اس وقت وفاقی وزیر ہے۔ چوہدری حفیظ اس کا بھیجا ہوا بندہ تھا۔ اب میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا کیا نہیں۔ میں نے افسر کا حکم مانا ہے۔ چند دن پہلے ڈپٹی میں یہ گاڑی جیمین گئی تھی، جو میں نے برآمد کی ہے۔ درمیان کی کہانی کیا ہے میں نہیں جانتا۔“ وہ تذبذب بھرے انداز میں بولتا چلا گیا تھا جس پر شاہ زیب بولا۔

”تو پھر اپنے اس اعلیٰ افسر کو رپورٹ کرو اور اس سے پوری کہانی سمجھاؤ“ کیونکہ اس گاڑی پر چھ مسلح افراد اس پر قاتلانہ حملہ کرنے آئے تھے اور دوسری بات..... اپنے اعلیٰ افسر کو یہ سمجھا دو..... جمال کو ہاتھ لگانے سے پہلے حویلی سے اجازت لینا ہوگی.....“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ بھی پیرزادہ وقاص بھی اٹھ گیا۔ ہم تینوں باہر محن میں آگئے۔ میری حالت خاصی خراب تھی۔

”چلو ہسپتال چلتے ہیں۔“ پیرزادہ نے کہا۔

”نہیں“ میں گھر جاؤں گا۔ میں اپنی چوٹوں کا علاج خود کروں گا۔“ میں نے کہا تو شاہ زیب نے کار کا گیٹ کھول دیا۔

بھی پیرزادہ بولا۔

”شاہ زیب..... مجھ پر کسی قسم کا شک مت کرنا“ میں منافقوں کی طرح سیاست نہیں کرتا۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کی ولدیت میں کچھ شک ہوتا ہے۔ میں میدان کا بندہ ہوں۔ ہار جیت اپنی جگہ زندگی رہی تو تیرے ساتھ مقابلہ کرتا رہوں گا۔ مگر جمال کے بارے میں میری کوئی سازش نہیں ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا۔“

”میں تم پر یقین کرتا ہوں وقاص! بس یہ جیپ والے معاملے میں تعاون کر دو ورنہ میں جمال کا شک دور نہیں کر پاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مہانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ پورے تھانے کے لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میرے بدن میں ٹیسس اٹھ رہی تھیں اور میں جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہ رہا تھا۔ رات تیزی سے سر پر آ رہی تھی اور میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ دونوں نہیں ہیں تو پھر تیسرا کون ہے؟



وہ پھر وہیں پر آ گئے جہاں سے انوجیت نے اپنا گھر دکھایا تھا۔ گاڑی پکی سڑک سے اتر کر پختہ راستے پر چل پڑی، کچھ ہی فاصلے پر وہ سرخ اور سفید حویلی نما کوٹھی دکھائی دے رہی تھی، جہاں سنگھ کا دماغ ابھی تک گرم تھا۔ اسے پولیس چوکی میں آفیسر کی باتیں بہت بری لگی تھیں مگر، اس کے ساتھ ہی لاشعوری طور پر اس کے دماغ میں بہت سارے سوال طے لینے لگے تھے۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ اسے اس منہ پر سوچنے کا موقع مل گیا کہ یہاں بھارت میں اس کی حبشیہ کیا ہے؟ ہر سوال اپنی توجہ چاہ رہا تھا لیکن وہ وقت نہیں تھا کہ اس پر سوچ سکتا۔ وہ پوری توجہ سے اس پر غور کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر بہت قریب آ گیا تھا۔ جیسے ہی گاڑی گیٹ کے سامنے رکی چونکدار نے گیٹ کھول دیا۔

”اوئے تو نے ہارن تو دیا نہیں اور.....“ جہاں سنگھ نے یونہی کہا۔

”یار! اندر ہمارا انتظار ہو رہا ہے اور جس راستے سے ہم آئے ہیں وہ چھت سے صاف دکھائی دیتا ہے۔“

”اوہ..... تم بھی کہوں.....“ جہاں کے چہرے پر بشارت اتر آئی تھی۔

کوٹھی کے اندر بڑا سالان تھا جس کے گرد ایک سیاہ سڑک بڑے سارے پورچ سے ہو کر دوسرے گیٹ تک

گئی تھی۔ انوجیت نے گاڑی پورچ میں روکی تو سیاہ داخلی دروازہ کھل گیا، جس کے درمیان کلجیت کور کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ان کی جانب بڑھا، کلجیت کور نے کٹوری میں پڑا تیل دروازے کے دونوں جانب ڈالا اس کی نذر اتاری اوج پھر تھال قریب کھڑی لڑکی کو تھا کر جہاں کو گلے لگا لیا۔

”آپتر.....! دھن بھاگ ہمارے کہ تو نے اس گھر میں اپنا قدم رکھا۔“

پھر وہ راہداری کی جانب چل پڑے۔ ڈرانگ روم میں کچھ لوگ موجود تھے۔ جن میں کچھ مرد اور زیادہ خواتین تھیں۔ وہ سب بڑی عمر کے تھے۔ اس نے سب کو ہاتھ جوڑ کر فتح بلانی، جس کا سبھی نے جواب دیا۔ پھر اس نے مرد حضرات سے ہاتھ ملایا، خواتین سے پیار لیا، تبھی کلجیت کور نے کہا۔

”ادھر آپتر.....! ادھر بیٹھ میرے پاس.....“ ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بیٹھے ہی کلجیت کور نے کہا۔ ”یہ سب تیری آمد کا نکر بہت خوش ہوئے تھے۔ یہ سب تیرے باپ اور ماں کے ملنے والے ہیں۔ شاید اس ملاقات میں تو ان کے نام بھی یاد نہ رکھ سکے مگر یہ تیرے لیے یہاں پر ہیں۔ ہم سب تیری آمد پر بہت خوش ہیں۔ ایک خواب تھا جو پورا ہوتا ہوا لگتا ہے۔“

”بہت شکریہ جی آپ سب کا۔ آپ سب میرے والدین کے ملنے والوں میں سے ہیں تو میرے لیے اتنے ہی محترم ہیں جتنے میرے والدین۔ اس عزت افزائی پر میں آپ کا احسان مانتا ہوں۔“ جہاں سنگھ نے پھر سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ بھی ایک بزرگ سے شخص نے کہا۔

”اور دیکھ بھئی کا کا.....! تو نے دیکھو دور سے بھارت تک کا ایک طویل سفر کیا اور صبح اتر سر پہنچا پھر یہاں تک تو نے ایک لمبا سفر کیا۔ تو ایسے کرفریش ہو جا، پھر کھانا کھا کر آرام کرنا۔ تو بھی یہاں اور ہم بھی یہاں ملتے رہیں گے۔ باتیں ہوتی رہیں گی۔“

سبھی نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ انہی لمحات میں اندر کی جانب سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ دراز قد، کوئل سی، گلابی گوارنگ، جس پر ہلکے کاسنی رنگ کے شلوار اور ہاف سلیو قمیص خوب چر رہی تھی۔ کھلے گلے میں لمبا سا مہین آنچل اداوں جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ سیاہ دراز گیسواس کی کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ سفید نازک سا جوتا پہنے وہ بڑے انداز سے مہوئے چھوٹے قدم اٹھاتی، ہاتھ میں ٹرے پکڑے چلتی چلی آ رہی تھی۔ جہاں ایک لمحے کے لیے اسے دیکھ کر مہبوت ہو کر رہ گیا۔ کیا بھرپور حسن تھا۔ اگرچہ اس مہجبین کے نقوش جیسے تھے مگر اس کے بدن کی طرح ہر خط اس طرح مناسب تھا کہ سن خود بخود چھلک رہا تھا۔ پنجاب کا حسن، موٹی آنکھیں، جو کاجل کی مانند سیاہ پھونرتھیں، بھاری پلکیں، جیسکی تلوار ناک، پتلے، ریلے ہونٹ اور دائیں گال میں ڈمپل، وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی تو جدید پرفیوم کی مہک نے ایک دم اسے فریش کر دیا۔ وہ اسے اتنے قریب سے دیکھ کر نہال ہو گیا تھا۔

”یہ لسی جی آپ کے لیے۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو جہاں کو ہوش آ گیا۔ اس نے سامنے پڑے ہوئے بڑے سارے پیٹل کے گلاس کو دیکھا جو لبالب لسی سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے یوں اٹھایا جیسے حکم مان رہا ہو۔ پھر گلاس ہونٹوں سے لگا کر اس وقت الگ کیا جب خالی ہو گیا۔

”یہ ہر پریت کور ہے..... اپنے انوجیت سے کچھ ہی سال چھوٹی۔“ کلجیت کور نے تعارف کرایا۔ جہاں کو اس تھا کہ سبھی نگاہیں اسے دیکھ رہی ہیں سبھی ہر پریت نے کہا۔

”آئیں..... میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں.....“

”چلو.....“ جہاں سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ آگے آگے جاری تھی اور جہاں کے ذہن میں نجائے کیوں صحرا

میں پھرنے والی ہرنی کا تصور ابھر رہا تھا۔ چنچل سی ہر پریت کو اس کے من میں ایک دم سے سا گئی تھی۔ وہ سبز حیاں چڑھ کر دوسری منزل تک گئے اور پھر ایک کمرے میں داخل ہو کر ہر پریت بولی۔

”لو جی، جیسی سنگھ جی یہ ہے آپ کا کمرہ فی الحال فریش ہو جائیں۔ ضرورت کی ہر چیز یہاں موجود ہے۔ پھر ہم اگر ضرورت محسوس ہو تو بہت سارے نوکر ہیں یہاں پر آواز دے لیں۔“

”تمہیں..... تمہیں آواز دے لوں، تم ان کی ہیڈ ہو۔“ جہاں سنگھ نے شرارت سے کہا۔

”اودہ ہمیں اپنا نوکر ہی سمجھ لیں تو بڑی بات ہی جی، آپ آواز دے کر تو دیکھیں جی۔“ ہر پریت نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا تو جہاں ایک دم سے ٹھٹھک گیا۔ ہر پریت اسے بڑی ذہین اور متمل مزاج لگی تھی۔ اسے لگا کہ شاید اسے مذاق نہیں کرنا چاہیے تھا تب وہ بولا۔

”سوری، ہر پریت میں تو مذاق میں.....“

”اودہ جی، جیسی جی، ہمیں آپ کا مذاق بھی اچھا لگتا ہے۔ آپ فریش ہو جائیں، باتوں کے لیے بڑا وقت ہے جی، میں چلی، آپ جلدی آجائیں، مہمان کھانے پر آپ کا انتظار کریں گے۔“

یہ کہہ کر وہ مزید کوئی بات سننے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ جبکہ جہاں کافی دیر تک اس کی سادگی پر اس کے بات کرنے کے انداز میں معصومیت اور اس کے حسن میں کھویا رہا۔

کھانے کا اہتمام کونگھی کے بانئیں لان میں کیا گیا تھا، جو کافی بڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سیدھا راستہ جاتا تھا جس کے ایک جانب سوئمنگ پول اور دوسری جانب لان ٹینس کورٹ تھا۔ آگے پھر ایک لان اور اس کے بعد ملازمین کے کمرے تھے جسے ایک دیوار کے ساتھ الگ کیا ہوا تھا۔ کھانے پر زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ بس اس کے سفر اور وینکور کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ہر بندے نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے ہاں آنے کی بھد شوق دعوت دی۔ کھانے کے بعد گھر میں سناٹا چھا گیا۔ انوجیت مہمانوں کے ساتھ مصروف رہا اور یہی حال ہر پریت کو رہا تھا۔ آخری مہمان کے رخصت ہوتے ہی انوجیت کو اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

”چل پتر..... اب جا اپنے کمرے میں اور سکون سے جا کر سو جا۔ تو بہت تھک گیا ہو گا، آرام کر۔“ وہ بڑے خلوص اور مامتا بھرے لہجے میں بولی۔

”نہیں پھوپھو جی، مجھے ابھی نیند نہیں آئے گی۔ ہم ابھی کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے کلجیت کو ر کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ہر پریت اور انوجیت دونوں وہیں آ گئے۔ شاید انہوں نے جہاں کی بات سن لی تھی۔ اس لیے ہر پریت بولی۔

”چلیں بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”ابھی تو اتنے ملازم تھے یہاں۔“ جہاں نے بے ساختہ کہا۔

”لیکن خاص مہمانوں کے لیے خاص سیوا اپنے ہاتھوں سے کی جاتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تو چلو مجھے یہ تو معلوم ہوا کہ میں خود کو اس گھر کا فرزند نہیں، بس مہمان ہی سمجھوں۔“ اگرچہ یہ بات جہاں نے یونہی مذاق میں کہی تھی لیکن کلجیت کو ر نے تڑپ کر کہا۔

”نہ پتر.....! نہ ایسے نہ کہو۔ تو اس گھر کا فرد ہی نہیں، بلکہ اس گھر کا مالک بھی ہے۔ یہاں بیٹھ، میں تجھے سمجھا دوں۔“

”پھوپھو جی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ جہاں نے تبس سے پوچھا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ہر پریت تو جا اور جوتی سے چائے لانے کو کہہ دے۔“ کلجیت کو ر نے کہا جس پر وہ بولی۔

”جی، ابھی کہہ آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی، کلجیت کو ر چند لمحے جہاں کے چہرے پر پھر انوجیت کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ تقریباً تیرا ہم عمر ہے۔ کوئی چند ماہ زیادہ ہوگی، تیری پھوپھو سکھ جیت کو ر اور میں دونوں ایک ہی آگن میں کھیتی رہیں۔ سبھی وہ ہمارے گھر ہوتی یا میں اس کے گھر، سارا دن یونہی گزر جاتا، پھر ایک دن میرے باپو نے ہم دونوں کو پکڑا اور اس پنڈ اؤگی کے اسکول میں چھوڑ دیا، جہاں اور بہت سارے بچے پڑھتے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور ہم نے جوانی میں قدم رکھا۔“

”یہ آپ دونوں کے آگن کہاں تھے.....؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہی، جس حویلی میں ٹوا بھی گیا تھا، یہ پہلے کچا گھر ہوتا تھا، تیرے دادا کے زمانے میں، اور اس کے ساتھ والا گھر امارا تھا، پھر میرے باپو نے گاؤں سے باہر نیا گھر بنوایا تو ہم نے وہ گھر تیرے دادا کو دے دیا تھا تا کہ گاؤں میں کھلی اور اچھی دلی بن جائے۔“ کلجیت نے بتایا۔

”اچھا تو پھر.....!“ جہاں نے پوچھا۔

”پھر.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی، جیسے حوصلہ جمع کر رہی ہو۔ چند لمحے یونہی خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”سن

ہر.....! وہ باتیں بھی سن لیں جو تو نہیں جانتا۔“

”ہاں پھوپو.....! تو آج ہی بتا دے مجھے.....“ وہ تیزی سے بولا۔

”وہ بڑا کالا دن تھا، جب ہم دونوں میں اور سکھ جیت کھیتوں کی طرف سے واپس آ رہی تھیں۔ اس دن سرخج کا بیٹا رویندر سنگھ اپنی کار پر شہر کی طرف جا رہا تھا، وہ بہت عرصے سے چند ہی گڑھ میں رہ رہا تھا، وہیں پڑھتا تھا، چھٹیوں میں ہی یہاں آتا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر اپنی کار روک لی، ہمارے تو ذہن میں بھی نہیں تھا کہ یہ کار ہمارے لیے بھی رک سکتی ہے۔ ہم نے ہی ہم قریب گئیں، وہ اپنی کار سے باہر نکل آیا، اور بڑے بڑے انداز میں سکھ جیت کو دیکھنے لگا۔ ہم چپ چاپ وہاں سے گزر جانا چاہتی تھیں کہ اس نے سکھ جیت کا بازو پکڑ لیا اور ساتھ ہی اس نے کوئی فضول بات کی، جسے سکھ جیت برداشت نہیں کر سکی۔ اس نے گھما کے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ شاید اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ سرخج کے بیٹے کو ایسے رد عمل کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ اس نے دست درازی کرنا چاہی، لیکن سکھ جیت اس کے قابو کہاں آنے والی تھی، اور پھر میں اس کے ساتھ تھی، ہمارے شور مچانے اور مزاحمت کی وجہ سے ارد گرد کے قریب کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ ہماری جانب دوڑے، لیکن تب تک رویندر وہاں سے کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شاید معاملہ وہیں رفع دفع ہو جاتا، اگر دو باتیں نہ ہوتیں۔“

”کون سی؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔ اس دوران ہر پریت وہاں آ کر انوجیت کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔

”ایک تو ارد گرد لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا، اور دوسرا بازو کے قریب سے سکھ جیت کو ر کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ اڑی طور پر گھر میں پوچھ گچھ تو ہونی تھی کہ یہ کیا ہوا؟ تب سکھ جیت نے گھر جاتے ہی ساری بات اپنے باپو کو بتادی۔ وہ شدید غصے میں آ گیا مگر اس نے خود پر قابو رکھا، اور بات کرنے سرخج کے پاس چلا گیا۔ اب بھائیوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا لیکن باپو انہیں روک کر گیا تھا کہ میرے آنے تک کوئی کچھ نہ کرے۔ پھر دو پہر ڈھل گئی۔ باپو واپس نہ آیا تو بھائیوں کو اس کی لگ رہی۔ تیرا باپ کلندر سنگھ اس کا پتا کرنے کے لیے گھر سے نکلا، مگر جلد ہی دونوں باپ بیٹا واپس آتے ہی دکھائی دے۔“ کلجیت کو ر سانس لینے کے لیے رک گئی تو جہاں مضطرب ہو کر رہ گیا۔ تبھی وہ پھر بولی۔ ”سرخج نے باپو کی بات ماننے

کی بجائے انہیں بے عزت کر دیا تھا کہ تو میرے پتر پر الزام لگاتا ہے۔ شام تک پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی۔ کچھ لوگوں نے سرخی کو بتا بھی دیا کہ رویندر نے غلط کیا ہے، مگر اس نے اپنے پتر کو برا نہیں کہا بلکہ یہ کہہ دیا کہ کچھ جیت ہی غلط تھی جس نے خواہ مخواہ الزام لگایا۔

”سکھ جیت کے بھائیوں نے کچھ نہیں کیا۔“ جہاں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں پتر..... اوہ تو چاہ رہے تھے کہ ابھی کے ابھی جائیں اور رویندر سمیت سرخی کو بھی مار دیں لیکن باپ نے عقل مندی کی اور انہیں اندر بیٹھ کر انہیں سمجھایا۔ وہ خاموش ہو گئے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سانس لینے کے لئے رُکی۔

”وہ کیوں خاموش ہو گئے پھوپھو.....“ وہ تڑپ اٹھا۔ اس دوران ہوتی چائے لے کر آگئی تھی۔

”بتا رہی ہوں پتر!“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہوتی کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”تم جاؤ اور جلدی سے کام سمیٹ لو چائے ہر پریت بنا لے گی۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ ہوتی نے ادب سے کہا اور اٹھ کر قدموں واپس پلٹ گئی۔ جہاں سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

”باپو اگلے دن ہی صبح ساتھ والے گاؤں چلا گیا۔ تاکہ سکھ جیت کی جہاں منگنی ہوگئی تھی، انہیں کہہ دے کہ وہ سکھ جیت کو بیاہ لے جائیں۔ ان کا لڑکا جلدھر میں سرکاری نوکری کرتا تھا۔ انہوں نے چند دن ہی میں سکھ جیت کو بیاہا اور وہ اپنے گھر کی ہوگئی۔ اب سارے بھائی انتظار کرنے لگے کہ کب رویندر گاؤں میں آتا ہے، سکھ جیت سے دست درازی کرنے کے ٹھیک دو ماہ بعد رویندر گاؤں آیا تو سارے بھائیوں نے مل کر رویندر کو پکڑ لیا۔ مجھے بھی ساتھ لیا اور اس جگہ چلے گئے جہاں رویندر نے دست درازی کی کوشش کی تھی۔ وہاں لے کر انہوں نے رویندر کو اتارا، اتار کر اس کے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ دونوں ہاتھ توڑ دیئے۔ پھر اسے لے جا کر گاؤں کے چوراہے پر پھینک دیا۔“

”سرخی نے کوئی رد عمل.....؟“ اس نے پوچھتے ہوئے اپنے سامنے پڑا چائے کا گلاس اٹھا لیا۔

”اس نے اپنے بندے بھیجنے کی بجائے پولیس بھیج دی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی تیرا باپ کو گوند رینگھ تھا نے چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر یہ قبول کیا کہ رویندر کو اس نے مارا ہے۔ سرخی نے اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے پولیس بھیجی لیکن وہ کسی کو پکڑے بغیر واپس چلی گئی۔ تیرے دادا نے تو سب کچھ پہلے ہی سوچا ہوا تھا۔ ایک دن بعد تیرے باپ کو ضمانت ہوگئی وہ گھر آ گیا۔ اب عدالت میں مقدمہ ہی چلتا تھا۔ دوسری طرف دادا نے سرخی کو دمکی لگا دی تھی کہ اب اس کی باری ہے اسے یونہی مارنا ہے اور گاؤں کے چوراہے میں اپنا جگر کے پھینکنا ہے۔ بات بڑھ گئی، گاؤں کا گاؤں دادا جی کی طرف ہو گیا۔ یہاں تک کہ سرخی کو مقدمہ واپس لے کر معافی مانگنا پڑی اور معاملہ وقتی طور پر دب گیا۔ بہر حال رویندر کو پابجوں کی طرح بنا کر انہوں نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔“

”پھر کیا ہوا۔“ اس نے پوچھا۔

”تقریباً ایک سال تک کوئی بات نہیں ہوئی اور سن چوراہی کی بیساکھی آگئی۔ میری شادی بھی ہوگئی تھی اور میں اس گاؤں میں رہ رہی تھی۔ تیرے باپ کی شادی بھی ہو چکی تھی اور تو پیدا ہو چکا تھا۔ اس برس تیرا باپ دربار صاحب تیری منت اتارنے گیا تھا اور پھر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ اندرا حکومت نے بہت بڑا ظلم کر دیا تھا۔ تیرے سارے گھر والے تیرے باپ کی تلاش میں تھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سکھ نو جوانوں کو پھر پکڑ کر مارا جا رہا تھا۔ کوئی اس ڈر سے بھی باہر نہیں نکلتا تھا کہ پتا نہیں واپسی ہو بھی یا نہیں۔ یہاں تک کہ اندر گاندھی کا قتل ہو گیا۔ پھر جو سکھوں پر بھاری آئی وہ یاد کر کے ہی رو گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”کیا بھاری پڑی؟“ اس نے تجسس سے پوچھا

”ہم سن رہے تھے کہ گھر گھر تلاشیاں لی جا رہی ہیں۔ لوگوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ انہی دنوں میں اچانک ایک رات اس گاؤں کو بھی فوج نے گھیر لیا۔ مجھے اس وقت یقین ہوا جب وہ ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور انوجیت کے باپ کو پکڑ کر لے گئے۔ اس وقت انوجیت اس دنیا میں آنے والا تھا۔ میری حالت اتنی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر میں ہمت کر کے باہر نکلی تاکہ اپنے باپ کو بتا دوں۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ میرے باپ اور بھائیوں سمیت سب کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ پھر میں تم لوگوں کے گھر کی طرف گئی تاکہ تیرے دادا سے مدد لوں۔ مگر وہاں بھی سارے گھر کے مردوں کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ تیری ماں چاچی تانیاں رو رہی تھیں۔ اچانک گاؤں کے باہر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم تڑپ اٹھیں کہ بچانے کیا ہو گیا ہے۔ حیرتی ماں اور تانی تیار ہو گئیں کہ جا کر معلوم کرتی ہیں۔ اس نے تجھے میری گود میں دیا اور وہ دونوں پتہ کرنے چل پڑیں۔ ہم تینوں ابھی دالان پار کر کے باہر والے پھاٹک سے نکلی ہی تھیں کہ سامنے سے ایک جتھہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم فوری طور پر تو نہ سمجھ سکیں لیکن وہ تیرے باپ اور دادا کو غلیظ گالیاں نکال رہے تھے۔ اس وقت بچانے کیوں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جو بلی برآمد آ رہی ہے۔ میں تجھے لے کر سامنے والے گھر میں کھس گئی۔ تیری ماں اور تانی واپس پلٹ کر پھاٹک بند کرنے لگی تھیں، لیکن نہ کر سکی۔ فائرنگ ہوئی اور دونوں وہیں ڈھیر ہو گئیں پھر میں دیکھ تو کچھ نہ سکی لیکن حویلی سے فائرنگ کی آوازیں، چیخ و پکار ابھرتی رہی۔ پھر حویلی کو آگ لگا دی گئی۔ مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے اندر تھے سب کو ہلا دیا گیا، حویلی کو آگ لگے سب نے دیکھی لیکن کسی نے آگ بجھانے کی ہمت نہیں کی۔ میں پریشان تھی تو بلک رہا تھا میں واپس گھر چلی گئی۔ وہیں تمہیں اپنی گود میں سمیٹ کر واہ گرو کیا کرتی رہی۔ اس سے مدد مانگتی رہی۔“

”پھر کیا ہوا!“ جہاں نے ہولے سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا، گاؤں سے جتنے بھی مرد پکڑ کر وہ لے گئے تھے انہیں گاؤں سے باہر سڑک پر لے جا کر گولی مار دی تھی۔ ان پر دہشت گرد ہونے کا شک تھا۔ اس میں انوجیت کے باپ بھی.....“ کلجیت کور کہتے کہتے رک گئی، پھر کافی دیر تک اس سے بولا نہیں گیا۔

”سوری پھوپھو.....!“ جہاں سنگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس دوران کلجیت کور نے خود پر قابو پالیا تھا۔ اس لیے خود کو سنبھال کر بولی۔

”وہ رات قیامت کی رات تھی، میرے گھر کے صحن میں میرے شوہر کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ میری گود میں انہا بچہ اور خود میں میری ماں کے گھر میرے باپ اور بھائیوں کی لاشیں، حویلی جل کر دھواں دے رہی تھی، وہاں سب ختم ہو چکے تھے۔ گاؤں کے کئی گھروں میں یہی قیامت ٹوٹی تھی۔ کون کس کو سنبھالتا، صبح ہوئی تو گاؤں کے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ مجھے یاد رہا تو بس سکھ جیت کور کا چہرہ وہ آئی تو اس نے سب کچھ سنبھال لیا۔ اس کا شوہر بہت سمجھدار بندہ تھا۔ اس نے سب کی آخری رسومات ادا کیں اور تجھے لے کر اپنے گاؤں چلے گئے۔“ اس وقت کلجیت کور یوں ہو گئی جیسے اب اس سے بولنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس کی آنکھیں بھیک گئی تھیں۔ تبھی انوجیت بولا۔

”بے بے..... آگے بتاؤ نا، اب جہاں کے سارے سوالوں کا جواب دو۔“

”بتاتی ہوں پتر.....!“ اس نے یوں کہا جیسے اپنے اندر کی ساری ہمتیں جمع کر رہی ہو۔ ”پھر سکھ جیت کور اپنے شوہر کے ساتھ چند دن بعد آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کینیڈا جا رہے ہیں اور پھر میرا ان سے بہت عرصے تک رابطہ نہ ہوا۔ لیکن سکھ جیت کور کے سر نے میری بڑی دیکھ بھال کی، اس نے مجھے اپنی بیٹی بنالیا، میں رہی تو یہیں آؤ گی پنڈ میں لیکن میرا لہال وہی کرتے رہے۔“

میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ میری ماں میرے سر ہانے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ کھانے کو مانگا تو وہ کچن میں چلی گئی اور میں منہ ہاتھ دھو کر واپس چار پانی پر آ بیٹھا۔ میں کھانا کھا چکا تو ذہن کو ذرا سکون ملا، تب پھر وہی نکلون میرے ذہن پر حاوی ہونے لگی جسے میں نے جھٹک دیا۔ خواہ مخواہ دماغ کھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ جب تک ان تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا، میں اندھیرے ہی میں تھا۔ میں ٹامک ٹوئیاں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ انہی لمحات میں سوئی چھم سے میرے خیالوں میں اتر آئی۔ اس کے چہرے کے نقوش بولتی ہوئی آنکھیں، لفظوں کو مٹھاس بخش دینے والے ریلے ہونٹ اور جذبات کو گدگدا دینے والا تراشیدہ بدن میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ چند دن مزید یہاں رہنا چاہتی تھی مگر کیوں.....؟ یہ احساس جسم میں ایک لذت آگئی لہر دوڑا دینے کے لیے ہی کافی تھا۔ میں سوئی کے خیالوں میں گم تھا کہ کسی کے آنے کی آہٹ پر میں نے دیکھا۔ دروازے کی چوکت میں اشفاق عرف چھا کا کھڑا تھا۔ وہ میری جانب عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”اوائے آچھا کے..... ادھر کیوں کھڑا ہے ادھر آ بیٹھ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس بیٹھ رہی آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ تب میں نے پوچھا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟“

”میں یہ دیکھ رہا ہوں جمال کہ تو کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ زندگی میں پہلی بار پولیس تیرے گھر پر آئی اور تجھے پکڑ کر لے گئی۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے اس دن تو نے بندے زخمی کر کے بھاگے وہ سوئی تیرے گھر میں تھی۔ یہ اتنا سب کچھ ایک ہی دن میں ہو گیا۔ یہ کیا ہے سب.....؟“

”پار تیرے سامنے ہی ہے سب کچھ.....“ میں نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ بڑے گھمبیر لہجے میں بولا۔
 ”نہیں..... میں مانتا ہی نہیں..... کوئی ایسا چکر ہے جسے تو ہمیں بتانا ہی نہیں چاہتا۔ تو اب اتنا خود سر ہو گیا ہے کہ دوستوں کو بھی نظر انداز کر دیا؟“ وہ ایک ہی سانس میں گلے شکوے کر گیا تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ یہ چھا کا تو ایسا نہیں تھا۔ یہ مجھ سے کیوں بدظن ہو رہا ہے؟ میں نے چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
 ”اوائے نہیں اوائے چھا کے.....! تجھے بتائے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کرتا، یقین جانو مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی کہ سب ہو کیا رہا ہے؟“

”نہیں سمجھ آتی تو کسی سیانے بندے سے بات کر لیتے ہیں۔ کسی دیوار ہی سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی عقل کی بات آ جاتی ہے دماغ میں۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔
 ”اب تجھ سے زیادہ سیانا بندہ دوسرا کون ہے میری جان۔ لیکن کیا کروں بات کرنے کا وقت ہی نہیں دیا ظالموں نے۔“

”میں تو اتنا جانتا ہوں جمال، بچپن سے لے کر اب تک پہلی بار تو نے مجھ سے ہٹ کر مجھے بتائے بغیر کچھ کیا ہے اور تو اس حال کو پہنچ گیا ہے۔ میں کچھ نہ کچھ تو کرتا تا تیرے لیے۔“ اس نے چند لفظوں میں میری اوقات میرے سامنے رکھ دی۔ بچپن سے لے کر اب تک کے نجانے کتنے واقعات چشم زدن میں میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ جب چھا کے نے میرے لیے اپنی جان کی بازی تک لگا دی تھی۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر آہستہ آہستہ اختصار کے ساتھ اسے ساری بات بتادی۔

”اب بتا“ میں تجھے کس وقت یہ ساری باتیں بتاتا۔“

”پھر پھو پھو سکھ جیت کور سے آپ کا رابطہ کب ہوا؟“ جہاں نے بہت سوچ کر سوال کیا۔
 ”کوئی تین چار سال بعد وہ خود تو یہاں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن اپنی ساری زمین اور جائیداد میرے نام کرنا چاہتی تھی ہمارے درمیان یہ تکرار سال بھر چلتی رہی۔ میں نے اس کا جو کچھ تھا یہاں پہلے ہی سنھالا ہوا تھا اس میں سکھ جیت کے سر نے میری بہت مدد کی چند سال پہلے ان کا دیہانت ہو گیا ہے۔“ کلجیت کور کا کافی حد تک سنہل گئی تھی۔
 ”لیکن انہوں نے مجھ سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔“ جہاں نے کہا۔

”وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم کبھی بھی بھارت واپس آؤ۔ وہ تم سے یہ سب کچھ چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ ادھر میری کوشش بھی تھی کہ جس کی امانت ہی اسے مل جائے۔ پتر.....! یہ گھر یہ زمینیں تمہاری ہیں۔ تم ان کے مالک ہو۔ ہم تو شخص امانت سنھالے بیٹھے ہیں۔ میں نے ہی انو جیت سے کہا تھا کہ وہ کسی طرح تم سے رابطہ کرے۔ یہ اس رابطے کا نتیجہ ہے کہ تم یہاں پر ہو۔“

یہ سب سن کر جہاں نے سکھ کچھ دیر خاموش رہا پھر بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔
 ”ایک سوال ہے پھو پھو.....! فوج نے گاؤں کے مرد مارے وہ سمجھتے تھے کہ یہ خالصتان کے حامی ہیں اور فوج کے نزدیک دہشت گرد ہیں۔ لیکن گاؤں کے دوسرے گھروں کو جلایا نہیں گیا۔ اس بے دردی سے ان کے گھروں کو تباہ نہیں کیا گیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نہیں مارا گیا۔ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں؟“

”سرنچ کی وجہ سے۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔ ”سا کا چوراسی کے بعد لوگوں نے اپنی دشمنیاں بہت نکالیں۔ سرنچ نے فوج کو گاؤں میں موجود ان لوگوں کے نام بتا دیئے جو کسی نہ کسی حوالے سے خالصتان تحریک کے حامی تھے۔ یہ فوج اور حکومت کا سرچوں پر دباؤ بھی تھا۔ لہذا جہاں انہوں نے خالصتان کے حامی سکھوں کے نام بتائے وہاں ان لوگوں کے نام بھی بتا دیئے جن سے وہ کسی نہ کسی حوالے سے دشمنی رکھتے تھے۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے۔ حکومت نے وقتی طور پر تو قابو پالیا مگر سکھ نسل کو پکڑ کر رکھ دیا۔ یہ اب تک سنہل نہیں پائے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا پھو پھو.....! اب آپ آرام کریں۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ اچانک ہی جہاں اٹھ گیا تو باقی سب بھی اٹھ گئے۔ اس وقت جہاں کو خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔



ساری رات میرے بدن سے ٹیسس اٹھتی رہیں۔ رات گئے بدن ٹھنڈا ہونے پر کئی جگہوں سے درد اُگ آیا تھا۔ میری ماں دیسی ٹوٹے آزماتی چلی جا رہی تھی۔ درد کی ہر اٹھتی ہوئی ٹیس کے ساتھ میرے اندر نفرت الٹی جا رہی تھی۔ شاید میں اپنے غصے پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں کس کی منافقت کا شکار ہوا ہوں۔ پیرزادہ وقاص ستاہ زیب یا پھر ملک سجاد؟ میرے سامنے نکون تھی اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ان تینوں میں سے کون ہو سکتا ہے۔ پہلے دو کے بارے میں تو پھر بھی سوچا جا سکتا تھا، لیکن یہ تیسرا کون ہے؟ کیا وہ کوئی بلا شخص ہے کہ سامنے آئے بغیر ہی اتنا کچھ میرے ساتھ ہو گیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ میری اس کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ پھر ایک سوچ اور بھی تھی کہ کیا یہ ملی بھگت سے گھڑی ہوئی کوئی کہانی تو نہیں؟ وہ منافقین جن کے بارے میں شک ہوتا ہے وہ ایسی ہی سازشیں کرتے ہیں۔ نجانے کتنے سوال تھے جو مجھے ذہنی اذیت دے رہے تھے۔ اور یہی ذہنی اذیت میری قوت ہمتی پس۔ اب رہی تھی۔ میرے اندر ایسا آتش فشاں اکٹھا ہو رہا تھا کہ جس پر پھٹتا وہاں تباہی لازمی تھی۔ چاہے میں نہ رہتا یا پھر ماسنے والا تم ہو جاتا۔ ہمارے گاؤں کا واحد پسنر کرم علی مجھے کچھ دوائیاں دے گیا تھا۔ جن سے مجھے تھوڑا فرق پڑا تھا۔ صبح دن چڑھے وہ شہر سے اعلیٰ قسم کے انجکشن اور دوائیاں لے کر آیا۔ اس نے جلدی جلدی مجھے لگائے تو بہت زیادہ سکون محسوس ہوا۔ ساری رات کا جاگا ہوا اور کچھ

”تیری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تو شاہ زیب کی دعوت پر کسی کو بتائے بغیر اکیلا گیا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس دفعہ پہلی بار میلے میں لڑائی ہوئی ہے، مطلب شاہ زیب کے دماغ میں کچھ تھا، جو وہ اپنا لشکر تیار کر کے وہاں گیا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ میں تو ان کے ساتھ نہیں گیا۔ مجھے ضرورت ہی نہیں ان کی چاکری کرنے کی۔ میں حیران ہوں کہ تو نے کس مقصد کے لیے اس کی دعوت قبول کی۔“ چھاکے کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

اس کی حیرت بجاتھی۔ میرا شاہ زیب کی دعوت قبول کر لینے میں اپنا مقصد تھا۔ مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنا مقصد چھاکے ہی کو کیا اپنے سامنے کچھ بھی بتا سکتا تھا۔ میرے مقصد کی کامیابی اسے راز ہی میں رکھنے سے تھی۔ یہی میری قوت تھی اور یہی مجھے بنانے سنوارنے اور میری تربیت کر دینے والی ان دیکھی طاقت تھی۔

”بس یونہی یار! اس نے مجھ سے کہا اور میں نے ہاں کر دی۔ پھر میں چلا گیا۔ اب دیکھو اگلے ہی دن ان کا مقصد سامنے آ گیا۔“ میں نے چھاکے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”یار جس طرح پولیس والوں کے بارے میں مشہور ہے نا کہ ان کی دوستی بھی بری اور ان کی دشمنی بھی بری۔ اس طرح ان جاگیرداروں، وڈیروں اور سیاست دانوں کی دوستی دشمنی دونوں ہی بری ہیں۔ یہ انسان کھا جاتے ہیں۔ دوٹوں کی سیاست کرتے کرتے یہ انسانوں کی قسمت سے کھیلنے لگتے ہیں۔ کیا تجھے نہیں پتا۔“ اس نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ تب میں نے اسے تھوڑا اٹھنا کرنے کے لیے کہا۔

”چل یار غلطی ہو گئی۔ معاف کر دے۔ اب بتا باقی کدھر ہیں۔ آئے نہیں۔“ میں نے اس سے دوستوں کے بارے پوچھا۔

”اب نہیں آئیں گے وہ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے اپنے گھروں کو گئے ہیں۔ تب سبھی باری باری کئی چکر تیرے گھر کے لگا چکے ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر تکیا اپنی رانوں میں دبا کر بولا۔ ”جمال.....! غور کیا ہے تو نے وہ جیب لے کر آنے والے بندے کون تھے؟“

”مجھے تو سردار شاہ دین پر شک ہے۔ اس نے باہر سے بلہا کر یہ بندے مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ میں ان کی بات مان لوں اور شاہ زیب کے ساتھ اس کا باڈی گارڈ بن کر لاہور چلا جاؤں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”مگر میرا دل نہیں مانتا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خاموش پا کر وہ کہتا چلا گیا۔ ”میں یہ مانتا ہوں کہ سردار شاہ دین ایک منافق سیاست دان ہے۔ اس سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ گھنٹیا سے گھنٹیا کام بھی کر سکتا ہے لیکن اپنی ہی بوہ میں اور کم از کم تیرے ساتھ ایسی دشمنی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں ایسا نہیں کر سکتا؟ وہ سیاست دان ہی نہیں ہوتا جو اپنے مخالفین کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکے۔ اس نے میری صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی ناکامی پر سوچا ہوگا کہ یہ کسی دن اس کے خلاف بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔ سو اس نے فوراً ہی.....“

”تم غلط ٹریک پر سوچ رہے ہو..... تمہاری بندے پر کھنے کی صلاحیت کدھر گئی یا؟ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ سردار شاہ دین اس وقت تک مخالف کو کچھ نہیں کہتا جب تک وہ اسے نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہو جائے اس کی یہ خوبی ہے جسے ماننا چاہیے آج نہیں تو کل آئے والا وقت بتا دے گا کہ یہ حملہ شاہ دین نے نہیں کروایا۔“ اس نے جیزی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ تب میں نے تجسس سے پوچھا۔

”تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟“

”سوچ.....! اور جتنا چاہے سوچ لے اس حملے کے پیچھے نہ سردار شاہ دین ہے اور نہ ہی میرا زادے ہیں تیرا اگر

کوئی ہے تو اس کا سراپا پتا میلے کے اس پنڈال میں ہے چونکہ یہ سب میرے دھیان میں نہیں تھا۔ اس لیے میں بھی تمہاری طرح اندھیرے میں ہوں۔ تو سوچ اور وہ سراپا تلاش کر..... پھر اس تیسرے تک پہنچ جانا مشکل نہیں ہوگا۔“ چھاکے نے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں چونک گیا۔ اس کی بات سو فیصد درست تھی۔ میرے دل کو لگی تھی۔ پہلے میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ ایک دم سے وہ میلہ اس میں سجا ہوا پنڈال میری نگاہوں کے سامنے واضح ہو گیا۔ چند لمحے غور کرتے رہنے کے باوجود مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تب میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یار مجھے نہیں لگتا کہ وہاں کچھ ہو۔ یہ جو ہنگامہ وہاں پر ہوا ہے اس میں کسی کی کیا منصوبہ بندی تھی۔ شاہ زیب اگر اپنا لاؤ لشکر بنا کر لے گیا تھا تو یہ کون سا نئی یا انوکھی بات تھی۔ ہر سال ایسے ہی ہوتا ہے۔ اس بار اس نے مجھے دعوت دی اور.....“

”اور تیری وجہ یہی سے وہ وہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ وہ وہاں سے کب نکلا؟ زخمی کون اٹھا کر لایا؟ تجھے تو یہ تک معلوم نہیں کہ بندے کتنے زخمی ہوئے ہیں۔“ اس نے بھڑکتے ہوئے کہا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”خیر.....! میں نہیں ہبتا کہ تو ابھی اپنے دماغ پر بوجھ ڈال سکوں سے، تنہائی میں بیٹھ کر ایسے کسی تیسرے کے بارے میں سوچ۔ یہ ہنگامہ وہاں سے شروع ہوا ہے تو ان حملہ آوروں کا سراغ بھی تجھے دیں سے ملے گا۔“ چھاکے نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا پھر بات بدل کر وہ تھا نے میں ہونے والے واقعہ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا، ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ کرم علی ڈپنسر آ گیا۔ اس نے میری طبیعت پوچھی۔ میں نے اسے بتایا تو بولا۔

”ابھی تیرے صرف ایک انجکشن مزید لگنا ہے۔ دوائی کھا کر وہ انجکشن لگوا لے۔ صبح تک تو بہت بہتر ہو جائے گا۔ باقی یہ اندرونی چوبیس ہیں۔ پوری طرح ٹھیک ہونے میں چند دن تو لگیں گے۔“

”چل پھر لگا دے انجکشن، دوائی میں کھا چکا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

”اندھر چل، وہاں لگا تاہوں۔ انجکشن لگنے کے بعد تجھے نیند آ جائے گی۔“

”تو بے فکر ہو جا، میں ادھر ہی ہوں۔ دروازے لگا کر چھت پر سو جاؤں گا۔ تو جا اندر۔“ چھاکے نے کہا تو میں اٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں واقعہ بے فکر ہو گیا تھا۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ چھت پر سوئے گا نہیں بلکہ پوری رات جاگ کر پہرا دے گا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ حسب معمول اماں جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ پرندے ہمارے تھے۔ گاؤں میں صبح سویرے ہونے والی روایتی معمولات کی دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اٹھ کر صحنہ ال میں ٹہلنے لگا۔ تبھی اماں جائے نماز پر سے اٹھ گئیں۔ میں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر میں ماں نے لسی کا گلاس مجھے ٹھمایا اور بولیں۔

”چل اٹھ کر نہالے میں تیرے کپڑے نکال دیتی ہوں تازہ دم ہو کر ناشتہ کرنا۔“

”چھاکا.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے گھر چلا گیا ہے۔“ ماں نے کہا اور کچن کی طرف پلٹ گئیں۔ میں نے سکون سے اُلی اُلی اور تازہ دم ہونے کے لیے ہاتھ روم میں گھس گیا۔

اس وقت میں تیار ہو کر ناشتے کے انتظار میں تھا جب پھانک کے باہر بھاری جیپ رکی۔ اس کے ساتھ ہی ایک

لیا۔ پھر اٹھ کر پھانک کی طرف بڑھا۔ ابھی میں پھانک سے چند قدم کی دوری پر تھا کہ پھانک کھلا اور سونہی اندر آ گئی۔ میں اسے پہلی نگاہ میں پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس کے تھکے تھکے حسین چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کسی سنان معبد میں لوہاں سلگ رہا ہو۔ اس نے زلفوں کو گس کر باندھا ہوا تھا۔ چٹلون پر ڈھیلا ڈھالا چپک دار کرتا پاؤں میں نازک سے لیدر سلپیر میک اپ سے بے نیاز چہرہ اور میری جانب دلچسپی سے دیکھتی ہوئی گہری آنکھیں۔

”تم.....؟“ میں نے کافی حد تک حیرت سے پوچھا۔

”کیوں؟ میں نہیں آ سکتی کیا؟ خیر.....! یہ بحث بعد میں کر لینا، لیکن میرے ساتھ کچھ لوگ ہیں انہیں باہر والے

کمرے میں بٹھاؤ۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور جواں سال لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کی مجھ پر نگاہ پڑی اور پھر دلچسپی سے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کافی سارے شاپنگ بیگ پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے تعارف کی زحمت نہیں کی۔ کیونکہ اس وقت میرا ایک دوست طیفانمودار ہوا۔ وہ پھانک میں کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے باہر والا کمرہ کھولنے کو کہا۔ وہ ادھر چلا گیا تھا تو میں دالان میں آ گیا۔ وہاں سونہی اماں سے مخاطب تھی۔

”اماں! آپ بس ادھر میرے پاس بیٹھیں۔ یہ فزی ہے نا، سب کچھ بنا لے گی! آپ فکر نہیں کرو۔“

”اسے کیا پتا کون سی چیز کہاں رکھی ہے؟“ اماں نے کہا لیکن اس دوران فزی چکن کی جانب چلی گئی تھی۔

”وہ دیکھ لے گی.....! آپ میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے اماں کو کاندھوں سے پکڑا اور اپنے قریب چار پائی پر

بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی۔ ابھی میں نے اس سے بڑے محل سے پوچھا۔

”یہ تم..... یہاں واپس کیوں آئی ہو؟“

”میں پھر یہی کہوں گی کہ کیوں؟ میں نہیں آ سکتی ہوں کیا؟“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو میں نے اس

کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آ تو سکتی ہو، مگر اس قدر جلدی پلٹ آنے میں کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی۔ میرے خیال میں تو ابھی تک تیری

تھکن بھی نہیں اتری ہوگی۔“

”یہ سچ ہے کہ ابھی تک میری تھکن نہیں اتری، مگر میں آ گئی۔ میں کیوں آئی ہوں۔ یہ بھی میں تمہیں بتا دوں گی لیکن پہلے تم دو کام کر دو ایک تو یہ کہ گاؤں سے چند مزدور منگواؤ جو ٹرک میں سے سامان اتار کر یہاں رکھیں۔ دوسرا ان لوگوں کو ناشتہ واشتہ کروا کر فارغ کر دو پھر سہولت سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس نے تیز تیز انداز میں کہا تو میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ڈرامہ کیا کر رہی ہے تم..... سیدھی بات بتا، اور یہ ٹرک میں سے سامان اتارنے والی وجہ کیا ہے؟ کس کا

سامان ہے یہ..... یہاں کیوں لائی ہو تم؟“

”اوسر کار! اتنا غصہ کیوں ہوتے ہو۔ میں یہ سامان اپنی ماں کے لیے تحفے کے طور پر لائی ہوں۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تم مزدور نہیں لا سکتے تو نہ سہی، میں خود ڈھونڈ لاؤں گی اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ مجھے کسی گاڑی میں اڑے تک چھوڑاؤ، میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں اور میرا ڈرائیور میرے ساتھ ہے۔ دوپہر ہونے سے پہلے میں واپس پلٹ جاؤں گی۔ اب کوئی ہے تمہیں اعتراض؟“ تبھی مجھے ایک دم سے ہی اس پر غصہ آ گیا۔ اس نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟ میں نے بھنا کر کہا۔

”اُوئے..... اُوئے سونہی..... تمہیں ہمارے گھر میں کسی شے کی نظر آتی ہے، ہم سادہ زندگی گزارنے والے

لوگ ہیں، پھر بھی اس گھر میں ہر سہولت میسر ہے۔ اور پھر تیرے تحفے، ہم کیوں قبول کریں۔ لے جاؤ، واپس لے جاؤ اپنا یہ ٹرک، ہمیں تیرے تحفوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تمہیں ضرورت ہے یا نہیں، میں نہیں جانتی، کیونکہ میں تیرے لیے نہیں ایک ماں کے لیے لے کر آئی ہوں اور تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ اگر اب بھی تمہیں اعتراض ہے تو میں سامان لگی میں اترا دوں گی۔ تم اسے آگ لگا دینا، اگر تم میں ہمت ہوئی تو.....“ اس بار وہ غصے میں بولی تھی، تبھی میری نگاہ چھانکے پر پڑی جو بجانے کب سے صحن میں کھڑا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایسے میں اماں نے کہا۔

”جمال۔! تیری اس کے ساتھ کیا بحث ہے تو جا اندر کمرے میں جا کر آرام کر، میں تیرا ناشتہ ادھر ہی بھجوا دیتی ہوں۔“ پھر چھانکے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”اُوئے چھانکے لے جا اسے اندر۔“ ماں کے یوں کہنے پر میں اٹھا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

میں حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں بیڈ پر لیٹا ہی سوچ رہا تھا کہ یہ سونہی آخر کر کیا رہی ہے اور یہ چاہتی کیا ہے؟ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دبے قدموں سے اندر کمرے میں آ گئی، چند لمحے مجھے دیکھتی رہی، پھر بلا تکلف میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”دیکھ جمال.....! یوں غصہ نہ کر، میں شاید پلٹ کر کبھی یہاں نہ آتی، لیکن مجھے آنا پڑا، اسے میری مجبوری سمجھ لیں یا پھر..... جو تیرا دل چاہے۔ اگر تم مجھ سے نفرت کرتے ہو یا پھر تمہارے خیال میں ہم کوئی گھٹیا مخلوق ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مجھے اس سے بالکل انکار نہیں ہے کہ میں طوائف ہوں۔ میرا وجود ہی اس سماج میں ایک گالی ہے۔ تم بھی اگر مجھ سے نفرت کرو گے تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم طوائف ہو یا نہیں، مگر جو تو ڈرامے بازی کر رہی ہے نا اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ یہ تم کر کیا کر رہی ہو، وہ کون سی مجبوری ہے جو تمہیں یہاں لے آئی ہے؟“

”یہی تو میں تمہیں بتانے کے لیے آئی ہوں، یہاں اتنا سفر کر کے تھکن اتارے بغیر۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھا اور پھر میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بڑے اعتدال بھرے لہجے میں بولی۔ ”تم اب بھی پریشان ہونا کہ جب پر آنے والے وہ حملہ آور کون تھے۔ تم اب بھی الجھے ہوئے ہو کہ اس کے پیچھے کون ہے، پیرزادہ ہے یا شاہ زیب.....؟ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ انوں ہی نہیں ہیں۔“

”تو پھر کون ہے وہ.....؟“ میں نے تیزی سے بیڈ کی ٹیک چھوڑتے ہوئے پوچھا، حالانکہ اس دوران میرے دل سے کئی جگہوں پر نہیں اٹھی تھیں۔

”وہ جو کوئی بھی ہے، تم اسے چھوڑو اس وقت اگر وہ اندھیرے میں ہے تو اسے اندھیرے ہی میں رہنے دو۔ حملہ آور بھی اس کی طرف سے تھے اور پولیس بھی اس نے بھیجی تھی۔“

سونہی نے کہا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان دیکھا وار کرنے والا دشمن اندھیرے میں تھا اور یہ اسے اب بھی اندھیرے ہی میں رکھنا چاہتی تھی۔ دشمن کا ساتھ دینے والا بھی دشمن ہوتا ہے اور وہ منافق جو سازش کر کے خود اندھیرے میں رہنے کی کوشش کرے اس کے باپ پر تو ویسے ہی شک ہوتا ہے، کیا یہ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے آئی ہے؟ میرے دماغ میں غصے کی آگ بھری لہر اٹھی۔ اور میں نے زنا سے ایک ٹیپٹر سونہی کے چہرے پر مار دیا۔ وہ الٹ لہر بند سے نیچے جا گری۔ لمحوں میں اپنا ہاتھ اٹھا اور اس کا سینٹھی کیچ ہٹا دیا۔ تبھی سونہی کی آنکھوں میں وحشت پھیل گئی۔ وہ

”تم اس کے قصیدے ہی پڑھتی رہو گی یا بات بھی بتاؤ گی۔“ میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں کہ جب میرے خاندان کی لڑکیاں یہاں آ کرنا چنے کو تیار ہو رہی تھیں تو میں نے یہاں آنے کا ارادہ کر لیا۔۔۔۔۔ ملک سجاد کو یہ بات بہت ناگوار گزری وہ قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ میں یہاں پر آؤں مگر میں نے ضد کی اور باوجود اس کے روکنے کے میں آ گئی۔ اس نے میرے پیچھے بندے بھیج دیئے کہ مجھے اٹھا کر لے جائیں اب یقیناً ان کا او نہیں چلا یا پھر ان کی ہمت نہیں پڑی وہ مجھے اغواء تو نہ کر سکے مگر جب پنڈال میں تم لوگوں کی لڑائی ہو گئی فائرنگ ہوئی تو وہاں سے نکلیں۔ قدرتی طور پر انہیں موقع مل گیا وہ مجھے گھر لے گئے چونکہ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ ملک سجاد کے بندے ہیں میں تو انہیں مقامی لوگ ہی سمجھ رہی تھی۔ ایک نے مجھے بازو سے پکڑ بھی لیا تھا اور ایک طرف لے جانے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا میں نے تو یہی خیال کیا کہ وہ مجھے مال غنیمت سمجھ کر لے جانا چاہتا ہے اس لیے میں نے اپنا ہارو چھڑایا اندھا دھند بھاگتے ہوئے فصلوں میں جا چھپی اور پھر تم مجھے مل گئے اصل غلط فہمی یہیں سے ہوئی۔“

”مطلب۔۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”میں سمجھاؤں گی تو تم سمجھو گے۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرائی اور پھر بولی۔ ”وہ ساری رات مجھے تلاش کرتے رہے تھے لیکن میں نہ ملی اور پھر دو پہر تک انہوں نے کھوج لگا لیا کہ میں کہاں پر ہوں اس میں انہوں نے پولیس کی مدد بھی لی تھی اور تیرے علاقے کے کچھ پولیس کے مخبر بھی ہیں جو اس معلومات کا سبب بنے ہیں۔ اصل کام ہے ان کو تلاش کرنا جو گھر لے بھیدی ہیں اور تیرے مخالف۔۔۔۔۔“

”تو اپنی بات مکمل کر سوتی میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔“ میں نے پھر اکتائے ہوئے کہا۔

”وہ جیب والے حملہ آور ملک سجاد ہی کے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا سامنا ماہر نشانہ باز سے ہوگا۔ وہ مار کھا گئے جس پر ملک نے پولیس کو پوری طرح استعمال کیا اور وہ تجھے پکڑ کر لے گئے۔ میں جو وہاں لاہور پہنچی اس تو مجھے ساری تفصیلات کا پتا چلا میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”بس تیرا کام ختم ہو گیا۔ اب تو ناشتہ واشتہ کر اور واپس چلی جا۔۔۔۔۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ میرے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”دیکھ جمال! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ ایک بار تو اپنے غصے کو پی جا اور مجھ پر احسان کر اے بھول جا اس واقعے کو۔۔۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔۔۔۔۔ تیرا مجھ سے وعدہ رہا میں اس سے بدلہ ضرور لوں گی اور تجھے لڑلوں گی بدلہ۔۔۔۔۔“

”میں پاگل نہیں ہوں کہ اس پر چڑھ دوڑوں گا۔ میں مان لیتا ہوں تیری بات۔۔۔۔۔ لیکن وعدہ کرو میں جو کچھ می کروں گا۔ تم میری مدد کرو گی۔۔۔۔۔“ میں نے ایک خیال کے تحت اس سے کہا تو وہ خاصی حد تک مطمئن ہو گئی پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد فری ناشتہ لے کر آ گئی۔ اس نے کافی کچھ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں سوچتے ہوئے ناشتہ لے لگا۔

ناشتہ کرنے کے کچھ دیر بعد میں صحن میں گیا تو مزدور سامان اتار کر صحن میں رکھ رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ خاموش ہو جانے کی قیمت ادا کر رہی ہے۔ تبھی میں نے جا کر سوتی سے پوچھا۔

”یہ سارا سامان کتنے کا آیا۔ یہ صوفے یہ فریج۔۔۔۔۔ یہ دوسرا سارا الیکٹرونکس کا سامان۔۔۔۔۔“

”میں نے جمع نہیں کیا بس جلدی جلدی میں لے لیا۔۔۔۔۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی۔۔۔۔۔ اندازہ تو ہوگا۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا تو اس نے چھ ہنسون میں اندازے سے رقم بتائی۔ میں نے

موت کو اپنے سامنے دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی۔ خوف کے عالم میں اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ زمین پر گری پڑی تھی میں نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے ہی ایک پاؤں اس کی گردن پر رکھا اور پٹیل کی نال اس کے سر پر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

”بولو۔۔۔۔۔ کوئی ہے وہ۔۔۔۔۔ ملک سجاد ہے؟“

”آں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ہی ہے۔۔۔۔۔ میں تجھے بتاتی ہوں نا۔۔۔۔۔“ اس نے گھکھکھائے انداز میں کہا، لیکن میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس سے پوری بات معلوم کرنا تھی، لیکن اسی لمحے اماں اندر داخل ہوئی اور تیزی سے بولیں۔

”جمال۔۔۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو تم۔۔۔۔۔ چھوڑو اسے۔۔۔۔۔ پاگل ہو گئے ہو۔“

اس حکم کے سامنے میں بے بس تھا میں نے نال اور پاؤں ہٹایا اور بیڈ پر سیدھا ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر مرتعش لہجے میں بولی۔

”میں تجھے سب کچھ بتا دیتی لیکن ذرا صبر تو کرتے۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“

”تم ایک ہی سانس میں سب کچھ بتاؤ خیریت اسی میں ہے۔۔۔۔۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”لیکن تم وعدہ کرو کہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرو گے ورنہ تمہارا غصہ تمہیں بہت نقصان پہنچا دے گا۔“ اس نے کافی حد تک اعتماد سے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

”اب تم کو اس کرو گی یا نہیں۔“

”میں ساری بات تمہیں بتا دیتی ہوں۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے اماں کی طرف دیکھا اور خجالت بھرے انداز میں بولی۔ ”اماں۔۔۔۔۔ اس سے وعدہ کرو کہ یہ جو کچھ بھی کرے گا سوچ سمجھ کر کرے گا وہ لوگ اس کی سوچ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔“

”سوئی پتر! جو یہ پوچھتا ہے وہ ساری بات اسے بتا دے یہ نہیں میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ یہ ایسا دیا کچھ نہیں کرے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا اور پھر مجھ سے ذرا سا فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ گئی چند لمحے خاموش رہی پھر میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ملک سجاد کے بارے میں تم جانتے ہی ہو جو وفاقی وزیر ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ نام سنا ہے اس کا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ تبھی اماں کافی حد تک مطمئن ہو کر باہر چلی گئی۔

”تم نے فقط نام سنا ہے اسے جانتے نہیں ہو خیر۔۔۔۔۔! میں جو یہاں آئی ہوں تو صرف اس وجہ سے کہ تمہیں سب سچ بتا دوں۔ اسے بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں۔۔۔۔۔ میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی۔ ”ملک سجاد خوشاب کے علاقے کا بہت بڑا زمیندار ہے ایم این اے کی سیٹ ان کی خاندانی سیٹ ہے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ بڑے بڑے بدمعاش قاتل اشتہاری اور نجانبانی کیسے کیسے مجرم اپنی پناہ میں رکھتے ہیں۔ انہی کے ذریعے علاقے پر اپنی دھاک جما کر رکھتے ہیں لیکن وہ جو بھی ہے میرا عاشق ہے مجھ پر جان دیتا ہے میری ماں نے مجھے اس کے ہاتھ سچ دیا ہے، لیکن ابھی اس نے میری تھ نہیں کھولی بھاری رقم کے علاوہ ایک کٹھی اور کار مجھے دی ہوئی ہے پر وہ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا میرے پاس ہوتا ہے تو مجھے ابکاٹی آتی ہے میں اس سے جان چھڑانا چاہتی ہوں اس لیے اسے قریب نہیں لگنے دیتی ماں سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ اسے سب کچھ واپس کر دے۔“

خاموشی سے سنی اور پھر اوپر چھت پر موجود کمرے میں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں نے اتنی رقم نکالی پھر کچھ زائد رقم نکال کر نیچے آ گیا۔ فزری اور سوئی اماں کے پاس ہی صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں، میں نے وہ رقم لے کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”یہ لو رقم..... اور دوسری بات نہیں کرنی، جب سامان اتر جائے تو اپنے ساتھ لائے لوگوں کو لے کر فوراً چلی جانا“

میں کچھ دیر بعد واپس آؤں تو تم یہاں پر نہیں ہونا.....“

”جمال..... یہ تم.....“ اس نے تیزی سے کہنا چاہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”خاموش..... کہنا دوسری بات نہیں کرنا“ یہ کہہ کر میں نے زائد رقم اماں کو تھاتے ہوئے کہا۔

”اس لڑکی کو دے دینا، جو اس کے ساتھ آئی ہے۔ خالی ہاتھ جائے اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا اور باہر کی

طرف چل دیا۔

باہر والے کمرے میں چھا کا کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس سے بایک نکال لانے کو کہا، وہ اندر جا کر بایک نکال لایا تو میں نے ڈیرے پر چلے کو کہا۔ ہم اپنی گلی سے نکل کر ڈیرے کی جانب چل دیے۔ میرا دماغ جب بھی سوئی اور ملک سجاد کے بارے میں سوچتا، گرم ہو جاتا، ایک طوائف کا کیا بھروسہ وہ شاید اس وقت میرے گھر میں بیٹھی ملک سجاد ہی کی وکالت کر رہی ہو، رکھیل اپنے رکھنے والے ہی کی سلامتی چاہے گی، میں یہی سوچتا رہا اور چھا کا ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں جا کر میں نے اطمینان سے ساری بات اسے بتادی، وہ ساری بات سن لینے کے بعد کافی دیر تک سوچتا رہا پھر آہستگی سے بولا۔

”جمال..... یہ تو سچ ہے کہ معاملہ کو ختم کر کے ہی دیکھا جائے، لیکن پہلے مخبروں کی خبر لیں، باقی بعد میں دیکھیں گے۔“ اس نے کہا تو مجھے کافی حد تک پرسکون ہو گیا۔ میں بھی اسی بیچ پر سوچ رہا تھا۔



صبح کی طلای کی نہیں اپنا آپ زمین پر بچھا کر رہی تھیں۔ جہاں کنگھی کی چھت پر کھڑا اور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اوائل فروری کے دنوں میں گندم کی فصل سے زمین سبز دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں کہیں کوئی دوسری فصل اپنے گہری یا کم گہری رنگت کے باعث الگ سے نظر آ رہی تھی۔ مشرق میں دور تک کھیت ہی تھے جبکہ مغرب کی جانب آوگی گاؤں تھا جو بہت زیادہ پھیلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھل گئی تھی جب سورج نہیں نکلا تھا۔ وہ بستر میں پڑا نہ رہ سکا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چھت پر چلا آیا۔ اسے پنجاب کی یہ کھلی ہوا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ بہت ساری سوچیں اس کے دماغ میں آ رہی تھیں، مگر وہ کچھ وقت کے لیے اس منظر میں کھوجانا چاہتا تھا۔ یہ منظر اس نے صرف فلموں میں یا پھر تصویروں میں دیکھے تھے۔ مگر سوچ پر قابو نہ رکھ سکا ہے؟ خیالوں پر گرفت نہیں ہو سکتی، یہی وہ عطیہ ہے جس سے انسان خود کو قوت کے ساتھ آگے ہی آگے دھکیل رہا ہے۔ خیال ہی زندگی میں رنگینیاں پیدا کیے ہوئے ہیں۔ وہ ان منظروں میں گھویا ہوا تھا مگر لا شعوری طور پر سوچتا چلا جا رہا تھا کہ بھارت کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس کے لیے حیرت ہی کے ذرہ ڈا ہوئے تھے۔ ایک ہی دن میں انکشاف در انکشاف نے اسے پوری جان سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بھارت کی سرزمین پر اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب گولڈن ٹیمپل میں تو وہ ماتھا ٹیکنے گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جو کچھ اس نے آج تک وہاں کے بارے میں سنا ہے تصویروں یا فلموں میں دیکھا ہے، وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے گا، لیکن..... اس کے ساتھ ہوا کیا؟ وہاں پر جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا، وہ خود ہی جانتا تھا۔ اس کی وضاحت وہ کسی سے کر نہیں سکتا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پھر سے اپنی کیفیت کو محسوس کرنے لگا تھا۔ انہی لمحات میں اس کے اندر سے یہ سوال ابھرا کہ آیا وہ اپنی ان کیفیات کے بارے میں کسی کو بتائے یا نہیں؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہاں مگر وہ یہ ضرور سمجھ رہا تھا کہ

فکر و ذات

61

اسے ”اشارہ“ ہوا ہے، اس نے یہاں پر کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ ایک طرح سے اسے اپنے خیالوں، خواہشوں اور امیدوں کی تائید مل گئی تھی۔ اس کے لا شعور میں کہیں نہ کہیں یہ تھا کہ جس طرح اس نے اپنا مقصد چھپا کر رکھا ہے، اس ”اشارے“ کو بھی اپنے تک رکھے اور اگر وہ گرو نے چاہا تو خود ہی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی، جس میں اس راز کو الٹا کرنا ضروری ہوگا۔

اور پھر جیسے ہی وہ گاؤں میں داخل ہوا تو انوجیت کے بارے میں انکشاف ہو گیا۔ وہ اس کے اتنا قریب بھی ہو سکتا ہے جب تک وہ اس گاؤں میں نہیں پہنچا تھا، اسے گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے قریب لوگوں کے ہاں جا رہا ہے۔ اس کی ملاقات ایسی ہستی سے بھی ہو جائے گی جس کے باعث اسے نئی زندگی ملی تھی۔ اگر اس رات کلجیت کو اپنے گھر سے اٹھ کر ان کی حویلی کی طرف نہ جاتی تب وہ بھی دوسرے سب کے ساتھ آگ میں جل گیا ہوتا۔ اگرچہ زندگی دینے اور لینے والا وہی مالک ہے جس نے پیدا کیا۔ تاہم اس دنیا میں اس رب نے اپنے بندوں ہی کے ذریعے سب کچھ کروانا ہوتا ہے۔ پھوپھو سکھ جیت نہیں چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ بھارت آئے لیکن وہ آگیا۔ انوجیت کے بارے میں وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ اس نے انوجیت کو دوست بنا کر رکھا ہوا ہے حالانکہ انہوں نے خود اسے تلاش کر کے اس کے ساتھ نیٹ دوستی رکھی ہوئی تھی۔ اپنے شیر خوارگی کے دور سے لے کر اب تک پر اگر وہ سوچے تو اس میں سے کیا نکلتا ہے کہ وہ دائرے کا پابند ہے اور پھر سے وہیں پر آ کر کھڑا ہوا ہے جہاں سے وہ اٹھا نہیں برس پہلے چلا تھا۔ اب اس کے پاس کیا تھا؟ آگ کے سوا اس کے ’ن‘ میں کچھ نہیں تھا۔ انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ، لیکن وہ لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے، جن سے اس نے بدلہ لینا تھا۔ یہ صہ کیسے ہوگا؟ یہی سوال اس کے لیے سب سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سب سے پہلے اسے ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا۔ ان لے بارے میں معلومات ہی سے وہ آگے بڑھ سکتا تھا، اس کا آغاز کہاں سے کرے؟ کیا انوجیت اس قدر بھروسے مند ادا ملتا ہے؟ کیا اس میں اتنا حوصلہ اور جرات ہوتی کہ وہ اس پر اعتماد کر کے سب کچھ بتا دے؟ کیا وہ اس کا بہترین ساتھی بنا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ.....“

”آپ ادھر ہیں میں ادھر کمرے میں دیکھ رہی تھی آپ کو.....؟“ ہر پریت کو رکی آواز نے اسے خیالوں سے باہر لایا۔ کچھ بھی اس نے گھوم کر دیکھا۔ سفید لباس میں میک اپ سے بے نیاز چہرہ، کھلی زلفوں کے ساتھ وہ سرپا ال بنی اس کے سامنے تھی۔ چونکہ وہ میڑھیاں چڑھ کر آئی تھی اس لیے ہلکے ہلکے لرزتے وجود سے وہ اپنی تیز سانسون کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ معصوم سا حسن سیدھا اس کے دل میں اترتا چلا گیا تھا۔ کچھ بھی اس نے خود پر قابو ہاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی یہ منظر دیکھنے یہاں چھت پر آ گیا تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں، میں پہلی بار یہ نظارے دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ شوشی سے بولی۔

”ویسے میرے لیے بڑی عجیب سی بات ہے کہ ان کھیتوں کے نظارے آپ کو اتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ ظاہر ہے ہم نے تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں دیکھا، مگر آپ نے نہیں۔“

”یہ تو فطری سی بات ہے ناہر پریت.....! جس کے پاس جو چیز جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اس کے لیے اتنی ہی بے اہمیت ہوتی ہے۔“ جہاں نے عام سے انداز میں کہا تو پھر وہ اسی شوشی ہی سے بولی۔

”لیکن سب چیزوں کے بارے میں ہم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً دولت..... زیادہ تر لوگ یہی چاہتے ہیں کہ ان کے پاس زیادہ ہو اور اس کی اہمیت بھی بہت ہوتی ہے۔ کسی کا پیار..... جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی اچھا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ اس نے ادا اس ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا! آپ ناشتہ کر لیں آ کر..... اور اگر آپ کو یہاں بہت اچھا لگ رہا ہے تو میں ناشتہ یہاں لے کر..... نہیں! اتنا سب کچھ یہاں لاؤ گی۔ چلتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”چلیں پھر آئیں۔“ یہ کہتے ہی وہ اگلے قدموں پلٹ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اس کے آگے آگے میز صیّاں اتر رہی تھی وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا اسے وہ ہرنی کے جیسے لگی۔ تیلی سی کڑ پکچتی ہوئی، تل کھاتی ہوئی وہ میز صیّاں اتر رہی تھی۔ وہ یونہی آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈرائنگ ٹیبل پر جا پہنچے جہاں عجیب سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

”آپتر..... بیٹھ ناشتہ کر۔“

”او.....! یہ تو آپ نے اتنا اہتمام کر لیا۔“ جیپال نے بھری ہوئی میز پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ سب ہر پریت نے کیا ہے۔“ کلجیت کو رنے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے سوچا پتا نہیں دیسی ناشتہ پسند کرے کہ نہ کرے..... اس لیے ولایتی بھی بنا دیا۔ اب جو دل کرے۔“ وہ

مسکراتے ہوئے بولی تو جیپال نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”پھوپھو.....! ادھر ویکورڈ میں پھوپھو سکھ جیت زیادہ تر یہی دیسی ناشتہ کرواتی تھی اور جس دن چھٹی ہوتی تھی تو

دیسی کھانے پکاتے رہتے اور کھاتے رہتے۔“

”ہاں دل کی بڑی اچھی تھی سکھ جیت میرے تو ساری زندگی وہ کام آئی ہے۔ اب یہی دیکھ لو جو ہم اتنے سکون

سے رہ رہے ہیں۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہے۔ اس نے.....“

”پھوپھو! یہ انوجیت کہاں ہے ابھی تک اٹھا نہیں۔“ جیپال نے واضح طور پر کلجیت کو رکی بات سنی ان سنی کرتے

ہوئے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہی۔ سمجھ گئی کہ وہ اس کی یہ بات سننا نہیں چاہتا پھر بولی۔

”اٹھ تو وہ کافی دیر پہلے سے گیا ہی وہ کسرت کرتا ہے ابھی تیار ہو کر آتا ہی ہوگا، بلا لاویر کو۔“

”جی! بے.....“ ہر پریت نے کہا اور انوجیت کو بلانے چل دی۔

ناشتہ بہت خوشگوار ماحول میں کیا گیا۔ انوجیت کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے چائے ختم کی اور

دونوں اٹھ کر باہر لان میں آ گئے۔ دھوپ خاصی چڑھ آئی تھی۔ مگر اچھی لگ نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ کرسیاں اٹھا کر پورچ

کے ساتھ دالان میں آ بیٹھے۔ اتنے میں ہر پریت بھی ان کے پیچھے ہی آ گئی۔ وہ بھی کرسی اٹھا کر انہی کے پاس آ بیٹھی۔ بھی

انوجیت نے پوچھا۔

”اچھا یہ بتا جیپال! جتنے تمہارے پاس دن ہیں ان کا بہترین استعمال کرنے کے لیے تو کیا کرنا چاہتا ہے کچھ

تو پلان ہوگا تیرے ذہن میں یا پھر.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تب وہ خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔ کچھ دیر پہلے وہ چھت پر انوجیت کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کے بارے میں مطمئن نہیں

تھا۔ اس نے تو بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اب وہ سب تو انوجیت کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اسے کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ ہر پریت

بولی۔

”جیپال.....! آپ سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو ہمیں بتاؤ ہم پلان کر لیتے ہیں

آپ بولو تو سہی۔“

تجی اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند لپکا تو وہ بولا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ میں سب سے پہلے اپنی حویلی کو ٹھیک کروں اسے پہلے کی مانند بالکل نئی بنا

دوں..... لیکن.....؟“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر چند ثانیے بعد بولا ”لیکن یہ میرے دیر، کیا اس حویلی پر میں قانونی طور پر

کوئی حق رکھتا ہوں؟ اور اگر کوئی قانونی حق نہیں رکھتا تو پھر میں کس طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ وہ حویلی اس وقت میری ملکیت ہے۔ میرے پرکھوں کی جائیداد ہے اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ اب تک اس حالت میں کیوں ہے اسے آپ لوگوں نے ٹھیک کیوں نہیں کروایا یہاں نئی کوشی بنانے کی بجائے وہاں کیوں نہیں رہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔ انوجیت بڑے سکون سے سنتا گیا پھر اسی سکون سے بولا۔

”کون کہتا ہے کہ تم قانونی طور پر اس حویلی کے وارث نہیں ہو.....؟“

”کل جب تمہارے میں بات ہوئی.....“ وہ کہنا چاہتا تھا کہ انوجیت اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”وہ غلط کہتا تھا“ کیونکہ وہ بندہ ہی ٹھیک نہیں تھا اور پھر تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ رات کسی نے اسے گولی

مار دی ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“

”مطلب مار دیا..... قتل ہو گیا وہ..... تجھے کیسے پتا.....“ جیپال نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں بھائی مار دیا..... وہ تھا ہی اس قابل.....“ انوجیت نے سکون سے کہا۔

”کیوں.....“ وہ پھر حیرت سے بولا۔

”میں تمہاری اس کیوں کا جواب دوں گا، لیکن فی الحال ہم وہ باتیں کر لیں جو تم نے کہیں ہیں۔“ وہ بولا۔

”اچھا کہو.....“ جیپال نے کہا۔

”جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہارا اندراج یہاں ہو گیا تھا۔ وہی پرانا انگریزوں والا نظام جو کیدار کے رجسٹر میں

تمہارا نام ہے جو تحصیل میں بھی درج ہے۔ تمہاری پھوپھو سکھ جیت کے شوہر یعنی تمہارے پھوپھانے وہ کاغذ بنوائے تھے جو

بعد میں بے بے کو دے دیئے تھے۔ جب تم سے رابطہ ہو گیا، تم نے آنے کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر جب تم نے آنے

کا بالکل فیصلہ کر لیا تو میں نے اس زمین کے کاغذات کی دوبارہ پڑتال کروائی، جس کے لیے پٹواری کو بہت کھانا پڑا شاید

آج کل میں وہ تم سے ملنے کے لیے آئے بھی خیر۔ شجرہ بنا تمہارے دادا کی وراثت اب تمہارے نام بول رہی ہے۔ تحصیل

دار کے سامنے صرف تمہیں پیش ہونا ہے میں نے تمام کاغذات تیار کر لیے ہیں۔ تحصیل دار کو صرف یہ درخواست گزارنی ہے

کہ تم زندہ ہوا اپنے دادا کی وراثت کے حق دار ہو۔ بس یہ ساری جائیداد تمہارے نام ہوگی، اگر تم چاہو تو اس کی شروعات آج

ہی سے کر دیتے ہیں۔“

”تم بہتر سمجھتے ہو انوجیت کہ کیا کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے یہ اب میری ذمہ داری ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے اور اب سنو کہ وہ حویلی ایسے ہی کیوں پڑی رہی۔“

”ہاں.....! وہ بتاؤ مجھے.....“ جیپال نے دلچسپی سے کہا اور انوجیت کی طرف ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ چند لمحے

خاموش رہا پھر کہتا چلا گیا۔

”جب تک سرخچ زندہ رہا، اس نے اس حویلی کو ایسے ہی رہنے دیا۔ بے بے نے ایک بار کوشش کی تھی کہ اس کی

صلاتی سترائی کروائے اسے رنگ دروغن کروادیا جائے لیکن اس نے روک دیا۔ حویلی کو رنگ دروغن کروانے کی خواہش

تمہاری پھوپھو نے کی تھی۔ انہوں نے ویکورڈ سے رقم بھی بھیجی تھی لیکن بے بے ان دنوں اس قدر قوت میں نہیں تھی کہ سرخچ

سامنا کر سکے۔ بلکہ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر بے بے نے پھر ایسا کرنے کی کوشش کی تو اس سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سر

الو نہیں رہا، لیکن اس کے پتر رو بندر سنگھ نے یہی بات بے بے کو پھر دہرائی تھی۔“

”نہیں انوجیت! مجھے یہ بتاؤ وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟“ اس نے کرغیدتے ہوئے پوچھا۔

”ان کا کہنا تھا بلکہ کہنا ہے کہ اس حویلی کو عبرت کے نشان کے طور پر اس گاؤں میں ایسا ہی رکھنا ہے تاکہ لوگوں کو

”تم غلط سمجھ رہے ہو جسپال“ ہر پریت نے تیزی سے کہا۔ ”تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے“ تم تو ان لوگوں کو بھی نہیں جانتے ہو، بلجیت سنگھ کون ہے یا رویندر سنگھ کون.....؟“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ دھیرے سے بولا۔

”تمہیں مدد چاہیے ہوگی، تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے ہو۔“ ہر پریت بولی۔

”ٹھیک.....! میں نے مان لیا، لیکن میں کم از کم تم لوگوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ تم لوگ بڑے سکون کی

زندگی گزار رہے ہو۔ تم گزارو..... میں یہ سب دیکھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے جسپال، تم ہماری زندگی کا خیال کرو، لیکن ہم تمہارے لیے ہر طرح سے حاضر ہیں اور اس کا ثبوت یہ

ہے کہ..... وہ پولیس آفیسر..... جس نے کل تمہارے میں تم سے بدتمیزی کی تھی..... اسے رات کسی نے گولی مار دی ہے اور اب

وہ اس دنیا میں نہیں رہا..... کیوں، ایسا کیوں ہوا؟“ ہر پریت نے کہا۔

”کیوں، کس نے کیا یہ سب.....؟“ جسپال نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”صرف تمہیں بتانے کے لیے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور شاید تیرے انتظار میں..... تم خود کو اکیلا مت

سمجھنا.....“ ہر پریت نے کہا تو جسپال نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ اس نے اپنی بات بھی کہہ دی تھی اور یہ بھی نہیں بتایا

کہ پولیس آفیسر کیسے قتل ہو گیا۔ وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”ہر پریت.....! اب میں یہ قطعاً نہیں پوچھوں گا کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا، لیکن اتنا ضرور پوچھوں گا کہ صرف

میرے انتظار میں..... اس سے پہلے کیوں نہیں.....؟“

”اس سے پہلے بھی بہت کچھ ہے، اور بعد میں بھی ہوتا رہے گا، یہ تو فقط ہوا تمہارے ساتھ ٹکرا کر گزری ہے کہ تجھے

احساس ہو جائے، باقی وقت خود بتا دے گا کہ آئندہ کیا ہونا چاہیے۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولی تو جسپال نے انوجیت کی

طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے انوجیت..... چلو آج ہی تحصیل دار کے عرضی گزار دیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ مخالفت کے لیے کون

ہائے آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو ہر پریت کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ انوجیت کے ساتھ وہ بھی اٹھ گئی۔ ادنیٰ پنڈی کی

لفاؤں میں ایک نیا فیصلہ ہو چکا تھا۔



میں اور جھا کا دو پہر کے بعد تک ڈیرے ہی پر رہے۔ ہم نے اپنے طور پر پورے گاؤں کے لوگ کھگال مارے

کہ ان میں مخبر کون ہو سکتے ہیں؟ ساری زندگی اسی گاؤں میں گزرنی تھی لیکن کبھی کسی کے بارے میں شک تک نہیں ہوا تھا کہ

وہ پولیس کا مخبر بھی ہو سکتا ہے۔ اب شاید ہم خود اس معاملے سے گزر رہے تھے، اس لئے ہمیں انکشاف ہوا تھا، جو بہر حال

خطرناک تھا۔ شاید پولیس تم تک نہ پہنچ پاتی اگر اس مخبر نے ہمارے بارے میں اطلاع نہ دی ہوتی۔ ہمارا ہونا بھی پھر کیا ہوتا

اگر ہم شام سے پہلے اس نادیدہ مخبر کو تلاش نہ کر لیتے۔

”چل یا راتھ گاؤں چلتے ہیں۔ یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو اس مخبر کو تلاش نہیں کیا جاسکتا۔“ جھا کے نے ایک دم

سے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ بھی بھیدے نے کہا۔

”جاؤ جاؤ..... میں سنبھال لوں گا سب کچھ..... تم جاؤ۔“

شاید اس نے ادھر ادھر پھرتے ہوئے ہماری باتیں سن لی تھیں اس لیے ہمیں ڈھیل دی تھی کہ ہم جا کر یہ کام کریں۔

”لے پھر بھیدے جارہے ہیں ہم۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو جھا کا بھی اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے سے

یہ یاد رہے کہ سر پنچوں سے مقابلہ کرنے والے کا انجام کیا ہوتا ہے اور لوگ اس سے سہمے ہوئے ہیں۔“

”ہوں تو یہ بات ہے.....“ جسپال نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا، پھر چند لمحوں بعد پوچھا۔ ”اچھا، انوجیت مجھے یہ

بتاؤ کہ سر پنچوں کا خاندان کتنا ہے اور اس وقت وہ کتنے طاقتور ہیں کہ لوگ ان سے سہمے ہوئے ہیں۔“

”رویندر سنگھ اس وقت ایم ایل اے ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت یا تو دہلی میں گزرتا ہے یا پھر امرتسر، یہاں وہ کبھی

کبھار آتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے اُدھر ہی رہتے ہیں۔ مطلب بیوی تو اُدھر ہی ہے، لیکن اس کے تین بیٹے ہیں ایک

چندی گڑھ میں اپنا بزنس کر رہا ہے، دوسرا اس کی ساتھ امرتسر ہی میں ہے، اور تیسرا یہاں زمینداری کرتا ہے، یہاں کی سیاست

دیکھتا ہے اور سر پنچ کرتا ہے، وہ اکالی دل کا بڑا سرگرم رکن ہے۔“

”مطلب سیاسی طور پر مضبوط ہیں..... اور معاشی طور پر بھی.....“ جسپال نے یونہی پوچھا۔

”یہ تو ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اچھے خاصے جرائم پیشہ بھی ہے۔ شاید تمہیں بھارتی سیاست کے بارے میں

اتنا معلوم نہیں ہے۔ یہاں جو جتنا زیادہ غنڈہ ہوگا، اتنا زیادہ ہی وہ مضبوط ہوگا۔ اس کا اتنا زیادہ ہی سیاست میں عمل دخل

ہوگا۔“

”ہوں.....“ جسپال نے ہنکارا بھرا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جسے انوجیت وہی کچھ کہہ رہا ہو جو اس کی

اپنی سوچ تھی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔ ”اگر ہم بلکہ میں اپنی حویلی کو دوبارہ سے رہائش کے لیے درست کرنا

چاہوں تو میری مخالفت کریں گے.....؟“

”بالکل کریں گے..... رویندر سنگھ کا تیسرا پتر..... بلجیت سنگھ اسے شاید معلوم بھی ہو چکا ہوگا کہ تم یہاں پر آ گئے۔

ہو اور ممکن حد تک تیری مخالفت شروع بھی ہوگئی ہوگی۔ یہ تو تجھے اس وقت معلوم ہوگا جب تم یہ ساری زمین اور جائیداد اپنے

نام کرواؤ گے۔“ انوجیت نے کافی حد تک غصے میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔ اب ساری زندگی انہی کی تو نہیں چلنی۔“ جسپال نے زہر خند لہجے میں

کہا تو ہر پریت کو رنے پہلی بار لب کشائی کی۔

”جسپال، یہ ٹھیک ہے کہ لڑنے سے پہلے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر لیا جائے، لیکن لڑائی صرف طاقت سے نہیں

جیتی جاسکتی، اس کے لیے حوصلہ بھی چاہیے ہوتا ہے، اگر ان سے مخالفت نہیں ہے تو یہ جان لو کہ تم میں اتنا حوصلہ ہے۔“ اس

نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ آپ سے تم پر اترا آئی تھی۔ جسے جسپال نے پوری طرح محسوس

کیا تھا۔ اس لیے اس نے ہر پریت کے چہرے پر دیکھا، جہاں اس کے چہرے پر سختی تھی۔ وہاں غصہ بھی چمک رہا تھا۔ شاید

اس میں کسی قدر نفرت کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ صحیح طرح سے اندازہ نہ لگا سکا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیمی سی

مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہر پریت، میں کوئی دعویٰ تو نہیں کرتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر بھارت کی زمین نے میرا خون پینا ہے تو

پی لے..... مگر میں جو سوچ لے کر آیا ہوں اس سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ تم دونوں یہ سوچ رہے ہو گے کہ میں کیا

مقصد لے کر آیا ہوں۔ تو میرے خیال میں تم دونوں بچے نہیں ہو۔“

”سمجھ گئی، تم کیا چاہتے ہو، لیکن..... کیا تم اکیلے یہ مہم سر کر سکتے ہو۔ طاقت کا توازن.....“

”میں نہیں جانتا کہ طاقت کیا ہوتی ہے۔ میں تو خود پر بھروسہ کر کے آیا ہوں۔ اپنی جائیداد اپنی زمین کا حصول

میرے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، وینکوور میں اس سے بھی زیادہ میرے پاس جائیداد ہے۔ میں یہاں صرف انوجیت

کو جانتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ کس مشکل میں نہ پڑے..... اس کے لیے مجھے الگ رہنا ہی اور اپنے طور پر.....“

نکل کر گاؤں جانے والے راستے میں تھے۔ ہم دونوں اپنے اپنے تئیں خاموش سوچ رہے تھے کہ اچانک چھاکے نے میرے پیچھے بیٹھے ہوئے چونک جانے والے انداز میں کہا۔

”اوئے.....! مجھے یہ بتا شاہ زیب اور پیرزادے کو معلوم ہو گیا کہ تو تھانے میں ہے اور وہ فوراً وہاں پہنچ گئے؟“

”بات تو تیری ٹھیک ہے یا رچلو شاہ زیب کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ گاؤں کے کسی بندے نے اطلاع دے دی ہوگی لیکن پیرزادہ تو.....“

”بندہ انہی دونوں کے درمیان ہے جمال..... وہ بندہ محض پولیس کا خبر نہیں ہے۔ ان سب کی ملی بھگت لگتی ہے۔ تو مان جا.....“

”مان گیا“ پر اس بندے تک تو پہنچ..... میں نے تیزی سے کہا۔

”سمجھو پہنچ گیا۔ اچھو کر یا نے والا..... سارے گاؤں کی خبر اس کے پاس ہوتی ہے۔ اتنی تیزی سے رابطہ صرف اور صرف فون پر ہو سکتا ہے ورنہ نورنگر سے پیرزادے کے گاؤں تک کوئی بندہ جائے اسے بتائے تو پھر تھانے تک جائے جبکہ شاہ زیب کو اس سے پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ دونوں کا ایک ہی وقت پہنچ جانے کا مطلب ہے کہ دونوں کو اطلاع ایک ہی وقت میں ملی اور آگے پیچھے تقریباً ایک ساتھ وہاں پہنچ گئے۔“ چھاکے نے پیچھے بیٹھے ہوئے تفصیل سے کہا تو میں چونک گیا۔

”بات تیری ٹھیک ہے چھاکے چل اس سے پوچھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی۔

سہ پہر ہو چکی تھی جب ہم اچھو کر یا نے والے کی دکان پر پہنچے۔ وہ دکان کے اندر کھڑا گاؤں کو منشا رہا تھا۔ جبکہ دکان کے باہر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بائیک ایک طرف لگائی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے سلام دعا کرنے لگے۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ دکان پر موجود گاؤں کو سودا وغیرہ دے لے تو پھر اسے دکان سے باہر بلانا آسان تھا۔ چند منٹ بعد ایسا ہی ہوا۔ گاؤں تک تو چلے گئے لیکن وہ دکان کے اندر ہی رہا۔ تبھی میں نے اسے بلایا تو وہ باہر آ گیا۔ جب تک وہ میرے پاس آیا تب تک میں نے اپنا بسٹل سینے میں سے نکال لیا تھا۔ میرے اس عمل سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تب ہمارا شک یقین میں بدل گیا۔

”دیکھ اچھو..... تو مجھے بچپن سے جانتا ہے۔ میں تجھے ماروں گا نہیں، لیکن زندگی بھر کے لیے اپنا بیچ ضرور کر دوں گا۔ سچ بتا دے تو میرے بارے میں کب سے اور کسے اطلاع دیتا ہے۔“ میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور گھگھایا ہوئے انداز میں بولا۔

”مجھے معاف کر دے جمال..... یقین جانو مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ سب کیا ہوا ہے، میں تمہیں ساری بات بچا دیتا ہوں..... آگے فیصلہ تم کر لینا..... میں حرف بہ حرف سچ کہوں گا۔“

”تو براؤ..... روکا کس نے ہے۔“ چھاکے نے انتہائی غصے میں کہا۔

”جس وقت تم فون کر کے گئے تھے، اس سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ایک بندے نے آ کر مجھ سے سگریٹ لیے اور یونہی باتوں ہی باتوں میں میلے کی بات کرنے لگا۔ پھر اس نے سوڈے کی بوتل کھولی اور وہی میلے کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اصل میں مجھ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ فائرنگ کرنے والا بندہ کون ہے اور اس کے ساتھ لڑکی تو نہیں آئی۔“

”تم بے وقوف تھے کہ وہ تم سے پوچھ رہا تھا اور تم بتا رہے تھے۔“ چھاکے نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

”یہ تو مجھے اب پتا چل رہا ہے نا..... ورنہ اس وقت تو وہ فائرنگ کرنے والے کی ہی تعریف کر رہا تھا، اب میں نے اکیلے تھوڑی جہال کو دیکھا تھا اس لڑکی کے ساتھ رات بہت سارے لوگ اس چوک میں تھے۔ ان سب نے دیکھا تھا۔ یہاں ایسے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ وہ بھی بتانے لگے جب اس بندے کو پکی تصدیق ہو گئی کہ لڑکی جمال کے پاس

ہے اور اس کا گھر قریب ہی ہے تو وہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور آ کر فون کیا، کوئی اتنی لمبی چوڑی بات نہیں کی، جس پر میں نے دھیان بھی نہیں دیا۔ کافی دیر بعد تم آئے.....“

”تو مجھے بتاتے کہ میرے بارے میں کوئی پوچھ رہا تھا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”میں ڈر گیا تھا کیونکہ اس وقت تک وہ جیپ پر سوار تھا..... سو.....“ بات اس کے منہ ہی میں رہ گئی اور چھاکے نے ایک زوردار تپتر اس کے مار دیا۔ وہ زمین پر جا گرا۔ تبھی وہ لرز گیا کیونکہ چھاکے نے بڑے غصے سے اسے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”پھر پیرزادے اور شاہ زیب کو فون کیوں کیا؟ جب اسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔“

”میرے تو خیال میں بھی نہیں تھا کہ پولیس آئے گی اور جمال کو پکڑ کر لے جائے گی، میرے پاس جمال کو بچانے کا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ شاہ زیب کو تو بتانا ہی تھا لیکن میں نے پیرزادے کو اس لیے بتا دیا کہ یہ جمال اس سے بھی ہائیں کر کے گیا تھا۔ میں نے تو یہی سمجھا کہ وہ بھی اس کا دوست ہے اور پھر ہوا بھی یہی.....“ اچھو نے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتا دی۔

”میں تجھے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک تو سچ نہیں بولے گا.....“ چھاکے نے یونہی اندھیرے میں تیر مارا۔

”مجھ سے جیسا چاہے حلف لے لو..... یہی سچ ہے۔“ وہ گھگھکھایا ہوئے انداز میں بولا۔

”تو پھر وہ نمبر لاؤ، جس پر اس بندے نے کال کی تھی۔“ چھاکے نے کہا۔

”وہ میں دے دیتا ہوں وہ میں نے نوٹ کر لیا تھا، ابھی دیتا ہوں۔“ اچھو نے اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو چھاکے نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ فوراً دکان میں گیا، ایک کاپی نکالی، اس میں نمبر دیکھا اور باہر آ گیا۔ پھر ایک نمبر پر انگلی رکھ کر بولا۔ ”یہ رہا اس پر کال کی تھی اس نے۔“

میں نے نمبر دیکھا، وہ کسی سیل فون کا نمبر تھا۔ اس وقت بیشتر علاقوں میں سیل فون سروس آگئی تھی۔ لیکن ابھی ہمارے علاقے میں یہ سروس نہیں آئی تھی، بس ٹاور وغیرہ لگ رہے تھے۔ سنا تھا کہ آج کل میں شروع ہونے والی ہے۔ تبھی میں نے اچھو سے کہا۔

”اچھو..... یہ نمبر ملاؤ۔“

”ابھی ملاتا ہوں۔“ وہ جلدی سے فون کی جانب بڑھا۔ پھر نمبر ملا کر ریسیور میری جانب بڑھا۔ یہ سیل جاری تھی اور پھر کچھ رنگ جانے کے بعد فون ریسیور کر لیا گیا۔

”کون.....؟“ دوسری طرف سے بھاری آواز ابھری۔

”میں جمال بات کر رہا ہوں۔ نورنگر کا جمال..... تم کون ہو؟“

”اوہ جمال.....!“ دوسری طرف سے کافی حد تک حیرت بھری آواز میں کہا گیا۔ پھر دوسری جانب سے آواز ابھری۔ ”یہ تو میں مانتا ہوں کہ تم دلیر ہو لیکن اتنی جلدی مجھے فون کر لو گے یہ بہر حال میں نے نہیں سوچا تھا۔“

”نام بتاؤ۔“ میں نے اختصار سے پوچھا۔

”نام بتایا تو شاید تیرا سانس بند ہو جائے۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ ریسیور رکھ اور بھول جا کہ تیرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ غلط فہمی تھی اس لیے تو سچ گیا۔“

”تو بھڑکیس ہی لگاتا ہے یا پھر تم میں کوئی ہمت یا حوصلہ بھی ہے یا پھر تیری فون پر ہی بد معاشی چلتی ہے۔“ میں

نے جان بوجھ کر اسے غصہ دلایا۔ جس کا فوری ایکشن ہوا۔

”اوئے زبان سنبھال کے بات کرتو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں.....؟“

”شاید بلی کھسرا..... یا پھر نیلی کھسرا..... جو اپنا نام چھپا رہا ہے، مرد تو اپنا نام ظاہر کرتے ہیں، چھپاتے نہیں۔“

میں نے پھر اسے بھڑکایا۔

”اوئے بے غیرت، مجھے ملک سجاد کہتے ہیں..... اور میں.....“ وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی بات سنی ان

سنی کرتے ہوئے کہا۔

”یوں کہو کہ تو بھڑوا ہے، پہلے اپنی عورتیں دوسروں کے گھروں میں بھیجتے ہو اور پھر انہیں بلیک میل کرتے ہو۔“

میں نے فوراً ہی گالی کا بدلہ لے لیا اور اسے مزید تپا دیا۔

”لگتا ہے تیری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔ اب انتظار کر میں تجھے خود ڈھونڈ کر تیری اس بے غیرتی کا مزہ

دیتا ہوں۔“

”ایک تو وہ مزہ دے گئی ہے جو تو نے بھیجی تھی اب ویسی ہی کوئی اور بھیجے گا یا پھر تو خود آئے گا“ اوئے بھڑوے تو

بول میں تجھے خود تلاش کر لوں گا..... میں نے کہا تو شاید وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اس لیے بغیر کچھ سنے اس نے

فورا فون بند کر دیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ریسور کرڈیل پر رکھا، پھر اچھوٹی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تو اب سمجھ لے.....“

”سمجھ گیا جی.....“ اس نے انکساری سے کہا تو میں اپنی بانیک کی طرف بڑھ گیا۔ جیسی چھا کا میرے پیچھے آ بیٹھا

تو میں نے بانیک کا رخ گھڑی کی جانب کر دیا۔

پگلی میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سوئی جا چکی ہے۔ میں نے اپنے گیٹ پر بانیک روکی تو چھا کا

اندر چلا گیا تاکہ گیٹ کھول دے گیٹ کھلا اور میں صحن تک چلا گیا۔ تہی سامنے دالان میں سوئی کو بٹھا دیکھ کر ایک دم سے غصہ

میرے دماغ کو چڑھ گیا۔ شاید وہ یہ سب کچھ سوچ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لیے اسی اطمینان سے بیٹھی رہی۔ میں نے بانیک

سے اتر کر کہا۔

”اماں! اماں کدھر ہے.....!“

”میں ادھر ہوں۔“ کچن سے آواز آئی تو میں ادھر چلا گیا۔

”بول کیا بات ہے۔“ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا۔

”یہ اب تک یہاں کیوں ہے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اب بیٹا..... میں اسے دھکے دے کر تو نہیں نکال سکتی۔ اس نے وہ سارا سامان اور گاڑیاں واپس بھیجوا دیں اور

خود یہاں بیٹھی ہے۔“ انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

”اماں.....! یہ بہت بڑی مصیبت ہے۔ اس کی وجہ سے میری ایک ایسے بندے کے ساتھ دشمنی ہو جانے والی

ہے جسے میں جانتا تک نہیں تھا۔ ابھی اس کے ساتھ منہ ماری کر کے آ رہا ہوں۔ اماں تو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں مقصد

سے ہٹ جاؤں گا۔ اگر.....“

”فضول کیوں بول رہا ہے میں اسے کہوں گی تو یہ صبح چلی جائے گی۔ تم اپنے آپ کو سنبھال کر رکھو ابویں بے

جاغصہ نہ کرو..... جاؤ اور والے کمرے میں چلے جاؤ یا پھر باہر والے کمرے میں..... اے دیھو، انہ تم.....“ اماں نے

سمجھاتے ہوئے کہا تو میں پلٹ کر باہر والے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں چھا کا پہلے ہی سے موجود تھا۔

وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے ٹھکرے آثار تھے۔ ایک بار تو مجھے لگا جیسے حالات

بہت خراب ہو گئے ہیں ورنہ اس کی حالت ایسے نہیں ہوتی تھی۔ میں اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”یار سوئی ہماری جان چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”کیوں.....؟ ویسے تم کیا سوچ رہے ہو.....“ میں نے اس کے خیالات جاننا چاہے کہ اس کے داغ میں کیا چل رہا ہے۔

”یار یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا اس سے ملنا محض ایک اتفاق تھا، تم کسی دوسرے راستے سے نورنگر واپس آتے تو شاید

وہ تمہیں نہ ملتی، یہ جو یکدم حالات بگڑے ہیں اس کی بنیاد میں فقط سوئی ہے۔ اس کی وجہ ملک سجاد نے تمہارے گھر کا راستہ

دیکھا اور پھر وہ کونسا کوئی گھریلو لڑکی ہے۔ ایک طوائف ہے جس کا قطعاً اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے وہ ملک سجاد کے کہنے

پر ہی یہاں موجود ہو؟“ چھا کے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”سوال یہ ہے کہ وہ اس کے کہنے پر اب یہاں کیوں ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”یار تم نے اس کے بندوں کو زخمی کیا ہے اور پھر تھانے میں صرف افضل رندھاوا کی ہی بے عزتی نہیں ہوئی بلکہ

ملک سجاد کی بھی تو ہوئی ہے نا کہ اس کا حکم پورا نہیں ہو سکا۔“ چھا کے نے اپنے طور پر دلیل دی۔

”میں نہیں سمجھتا چھا کے کہ اب وہ اتنی سی بات پر کوئی اتفاقی کاروائی کرے گا۔ ہاں جو کچھ ہم اب اس کے ساتھ

کر کے آئے ہیں تو اس پر اس کا ہم سے دودھ ہاتھ کرنا بنتا ہے۔ کل صبح یارات کی وقت یہ سوئی یہاں نکلتی ہے، تو اس پر شک

سیا جاسکتا تھا۔“ میں نے اپنا خیال پیش کیا تو چھا کا چند لمحوں خاموش رہا پھر بولا۔

”یار.....! کچھ لوگوں کی فطرت میں کمینہ پن ہوتا ہے۔ اپنے علاقے میں جو کہنے ہیں انہیں کیا ہم نے نہیں

دیکھا۔ سال ہا سال تک دل میں کدورت رکھتے ہیں اور وقت ملتے ہی ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتے۔ ملک سجاد جس

عورت کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے وہ ایک طوائف ہے جو اس قدر گھٹیا معیار رکھتا ہو اس سے کچھ بھی بعید ہو سکتا ہے۔ اور

دوسری بات.....! کیا تم شاہ زیب اور پیرزادے کو بالکل پاک و صاف کر دو گے؟“ میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ ان میں سے

کسی ایک کے ساتھ اس کے مراسم نہ ہوں۔“

”ہو سکتا ہے ہوں لیکن میں اتنا بتا دوں.....“ اس سے پہلے میں کچھ کہتا ہا ہر والے کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا

اور سوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی جیسے وہ اپنے غصے کو دبائے کی بھرپور کوشش کر رہی ہو۔ وہ

خاموشی سے میرے سامنے والی کرسی پر آن بیٹھی۔ ہم بھی خاموش تھے اور یہ خاموشی کچھ لمحوں ہمارے درمیان ٹھہری رہی میں

سوئی کی طرف دیکھتا رہا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ بات کرے جبکہ وہ یوں سر جھکائے بیٹھی تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر

ایک دم اس نے سر اٹھایا اور بولی۔

”جمال.....! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں معافی مانگتی ہوں کہ میں نے تمہاری باتیں اس دروازے کی اوٹ سے

سنیں میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔ مجھے خود پر افسوس آ رہا ہے کہ میں تم پر ایک فیصد کا بھی

اعتبار نہیں بنا سکی۔ میں جانتی ہوں کہ میں طوائف ہوں معاشرے کی نگاہ میں گھٹیا ترین مخلوق ہوں لیکن میں تمہیں یہ بتا دوں

کہ آج تک میرا جسم کسی مرد کے زیر تسلط نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ملک سجاد جیسے شخص کے بھی نہیں۔ میں.....“

”تم اس سے ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”یہی کہ میں نہ تو اس کی رکھیل ہوں نہ ہی اس کی پابند..... میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور میں یہاں آ کر جو

ٹھہری ہوں تو اپنی مرضی سے..... تمہارے ساتھ..... اماں کے ساتھ کچھ دن رہنے کے لیے لیکن تم دونوں کی باتیں سن

کر مجھے لگا کہ جہاں اعتبار ہی نہیں، وہاں خلوص کبھی نہیں آ سکتا۔“ اس نے آزرہ لہجے میں کہا۔

”سوئی.....! یہ خلوص، پیار اور محبت کی باتیں ہیں نا، میری سمجھ میں نہیں آتیں اور نہ ہی میں انہیں سمجھنا چاہتا ہوں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کچھ ملک سجاد سے کہا ہے، اگر اس میں زنی بھر غیرت بھی ہوئی تو اس کا بدلہ لینے ضرور آئے گا۔ اور میں بھی اس کا منتظر ہوں۔ تم یہ تو جانتی ہو کہ یہ سارا فساد تمہاری وجہ سے پیدا ہوا ہے تو شک بھی تم پر نہ کیا جائے، کیسی باتیں کرتی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

”اس میں غیرت نہیں ہے اس لیے تو میں یہاں ہوں۔ تم کچھ نہ بھی کرتے تو بھی اس نے یہاں چڑھ دوڑنا تھا، تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اسی لیے تو یہاں ہوں۔“ اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”میری زندگی کو خطرہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم.....؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، مجھ پر یقین کرو.....“ وہ روہا کی ہوتے ہوئے بولی تو میں نے چھانکے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ہر خند مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

چھا کا چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، پھر طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہم کیوں اعتماد کر لیں تم پر، کیوں یقین کریں تیرا؟“

”اس لیے کہ جو میں جانتی ہوں وہ تم لوگ نہیں جانتے۔“ وہ تیزی سے بولی تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا کہ تم کیا جانتی ہو، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم خواہ مخواہ ہم پر مسلط ہو رہی ہو اور نجانے کیوں ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ماں نے کہا ہے کہ تو صبح چلی جائے گی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ ورنہ تجھے ابھی جانا پڑتا۔ ابھی تو میرے بارے میں جانتی ہی کیا ہے؟“

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم بہادر ہو، نڈر ہو، اور غیرت مند ہو لیکن گاؤں کے سیدھے سادے ایسے نوجوان ہو جو دنیا کے چلتروں کے بارے میں نہیں جانتا۔ یہاں بڑے سے بڑا بے غیرت پڑا ہے، دھوکا، فریب، پیٹھ پر چھرا گھونپنے والے.....“

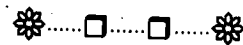
”دیکھ جہاں تک دھوکے کی بات ہے، ایک کتابھی دھوکے سے کاٹ سکتا ہے، مگر میں کتے سے بھی بدتر لوگوں کو جانتا ہوں کہ جو برس ہا برس ایک چوکھٹ سے کھاتے رہتے ہیں پھر وہیں منافقت کرتے ہیں۔ اس میں ان کا نہیں ان کی دلہیت کا تصور ہوتا ہے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں۔ منافقت کا کھیل کھیلنے والے کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا، یہ قانون فطرت ہے۔ منافق اعتماد کا خون کرتا ہے، ان باتوں کو چھوڑ، میں یہ جانتا ہوں۔ تم بولو، تم یہاں پر کیوں ہو؟“

”میں جو بھی کہوں گی، تم اسے جھوٹ ہی سمجھو گے، میں جاری ہوں، لیکن خدا کے لیے محتاط رہنا، اعتماد نہ کرنا کسی پر۔“ سوئی نے کہا اور اٹھ گئی۔ تو میں نے کہا۔

”کہو تو تمہیں شہر چھوڑ دوں.....؟“

”نہیں، کچھ ہی دیر میں گاڑی آ کر مجھے لے جائے گی۔“ یہ کہہ کر وہ جانے لگی، پھر پلٹ کر بولی۔ ”جمال، تم نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے، میں اس احسان کا بدلہ چکاؤں گی۔ کبھی میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا، تیری آواز پر سوئی دوڑی چلی آئے گی۔“ اس نے کہا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرے اور چھا کے درمیان کتنی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ اٹھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں چند لمحے اس کے بارے میں سوچتا رہا، پھر سر جھٹک دیا۔



جہاں اور انوجیت سارا دن نکور تحصیل کورٹ میں پھرتے رہے۔ وہ بہت سارے لوگوں سے ملے۔ یہ ملاقاتیں محض شناسائی کی حد تک تھیں جو دوپہر کے بعد تک جاری رہیں۔ دوپہر کے بعد وہ دونوں ایڈووکیٹ گل کے چیمبر میں چلے گئے۔ وہ بوڑھا سکھ تھا لیکن چہرے پر سرنخی اور آنکھوں کی چمک نے وہ اپنے عزائم میں نوجوانوں سے کہیں آگے دکھائی دے رہا تھا۔ انوجیت نے تعارف کرایا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”پتر.....! جی آ یاں انوں، تو وطن واپس آیا ہے تو اپنے وطن کی لاج بھی رکھنا۔ خیر یہ باتیں یہاں کرنے والی نہیں ہیں، تو انوجیت پتر ایسا کر، انہیں لے کر گھر آ جا، ابھی تھوڑی دیر بعد وہیں ساری باتیں ہوں گی۔“

”جیسے آپ کہیں۔“ انوجیت نے کہا تو وہ فون پر نمبر پیش کرتے ہوئے بولا۔

”لچ کا وقت ہو گیا ہے، ابھی نکلیں گے تو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون کی طرف توجہ کرتے ہوئے نجانے کسے کہا۔ ”دو مہمان ہیں میرے ساتھ لچ کریں گے۔ ہاں..... ابھی نکل رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کال ختم کی اور بولا۔ ”چل انوجیت اکٹھے ہی چلتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی اٹھ گئے۔

”آپ چلیں گل صاحب، ہم پہنچتے ہیں۔“ انوجیت نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔ اس دوران جہاں کچھ نہیں بولا۔ وہ پوری طرح انوجیت ہی پر اعتماد کیے ہوئے تھا۔

کبھی وہ نکور کا پوش علاقہ رہا ہوگا، لیکن ان دنوں اس علاقے کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ راستے میں سے انہوں نے کچھ پھل اور مٹھائی لی تھی۔ وہ ستر کی دھائی کی طرز پر کونھی نما گھر تھا۔ گیٹ پر کتے ہی ایک چوکیدار نے انوجیت کو دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ اس لمحے جہاں نے اندازہ کر لیا کہ ایڈووکیٹ گل اور انوجیت میں اچھے تعلقات ہیں۔ فوراً ہی انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایڈووکیٹ گل شلوکار قیص پہنے ان کے پاس آ گیا۔

”بھئی جہاں..... وہاں چیمبر میں سوکان ہیں سننے والے نجانے کون کیا ہے۔ یہاں سہولت اور سکون سے باتیں ہوں گی۔“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں کا سسٹم تو بالکل عجیب سا ہے۔ جسے میں بالکل بھی نہیں سمجھ پایا ہوں۔“ جہاں نے پرسکون لہجے میں کہا تو گل مسکراتے ہوئے بولا۔

”سمجھ آئے گی بھی نہیں، لیکن اسے بڑی جلدی سمجھا بھی جاسکتا ہے۔“

”وہ کیسے.....؟“ جہاں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”سیدھی سی بات ہے، سیدھا نظام سیدھی نگاہ ہی سے سمجھ میں آتا ہے اور الانا نظام، الٹی نگاہ سے۔ بس یہ نگاہ کا پھیر ہے۔ اس میز پر نظام کو تم سیدھی نگاہ سے دیکھو گے تو ذرا بھی سمجھ نہیں آئے گی۔ یہاں قانون روپیہ اور ضابطہ طاقت ہے، یہ صرف ادا نہیں ہیں جو سمجھ میں آتی ہیں۔“ گل نے خوشگوار انداز میں کہا۔

”تو پھر یہ سب کیسے چلتا ہے؟ جو سائل بے چارے آتے ہیں انہیں کیسے انصاف ملتا ہوگا اور.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو گل نے سختی سے کہا۔

”انصاف، وہ بھی بھارت میں، یہ ناممکن سی بات ہے پتر، لاکھوں لوگ انہیں سوچو راسی سے اب تک انصاف کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں جنہیں ان اٹھائیس برسوں میں کسی نے پوچھا تک نہیں کہ کس کے پتر، کس لے، اپ کس کے شوہر کو کیوں زندہ جلا دیا گیا۔“

”اب تک تو پھر سب کچھ ختم ہو جانا چاہیے، جہاں انصاف ہی نہیں وہاں معاشرہ کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”اس سے زیادہ اور کیا ختم ہونے والی بات ہے کہ سب لوگ بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں۔ کون سی قوم ہے جو سکون سے سانس لے رہی ہے بھارت میں اس وقت لگ بھگ ستر علیحدگی کی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ ان تحریکوں نے اپنے تربیتی کمپ قائم کر رکھے ہیں۔ یہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کوئی قوم اس وقت ہی ہتھیار اٹھاتی ہے جب انہیں اپنی بقا کا خطرہ لاحق ہو جائے۔“

”گل صاحب! آپ نے تو بھارت کا بڑا بھیا نک نقشہ پیش کر دیا۔ میں دراصل اپنے معاملے کی بات کرنا چاہتا تھا۔ انوجیت نے.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو گل نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”انوجیت نے بہت پہلے مجھ سے بات کی تھی۔ اور میں نے اس پر تھوڑا سیجورک بھی کیا ہے، سیدھی سی بات ہے پتر اگر تم کہو کہ تمہارا معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق حل ہو جائے تو یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں تمہیں مایوس نہیں کر رہا، حقیقت بتا رہا ہوں۔ میں کیا، کوئی بھی وکیل بے بس ہوگا، لیکن اگر دولت اور اس کے ساتھ طاقت استعمال کرو گے، خصوصاً اس میٹر سے نظام کے تحت میٹر چالو گے تو سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا جائے گا۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ جہاں نے حتمی انداز میں کہا۔

”تمہارے پاس صرف اتنا ثبوت ہے کہ تمہارا نام تمہارے گاؤں اڈگی کے چوکیدار کے رجسٹر میں درج تھا، جو اس نے تحصیل میں درج کروا دیا۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم سچے ہو، لیکن یہ کیسے ثابت کر پاؤ گے کہ وہ جہاں سنگھ، ٹو ہی ہو، انجہانی کلوندر سنگھ کا بیٹا ہے، تمہارا پہلا امتحان یہی ہے کہ تم اپنا ہونا ثابت کر دو، یہ ثابت کر دو کہ تم کلوندر سنگھ کے پتر ہو، جس دن تم انصاف اور قانون کے تحت یہ ثابت کر لو، تو میرے پاس آ جانا۔ میں نہ صرف تمہارا مقدمہ لڑوں گا، بلکہ تمام اخراجات خود برداشت کروں گا۔“

”آپ قانون اور انصاف سے اتنے مایوس کیوں ہیں؟ اور پھر میری راہ، میری شناخت اتنی مشکل کیوں گل صاحب.....؟“ جہاں نے کافی حد تک غصے میں کہا۔ تو گل نے انوجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسے یوں سمجھ نہیں آئے گی۔ چند دن بعد یہ خود کہے گا، خیر آؤ کھانا کھاتے ہیں، میرا خیال ہے لگ گیا ہوگا۔“ گل نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بھی اٹھ گئے۔

لچ پر وہ تینوں ہی تھے۔ گل کا پرہیزگار شاید پہلے لچ کر چکا تھا، گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ بھی ہلکی پھلکی باتوں اور ادھر ادھر کے واقعات بتاتے ہوئے لچ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ سیر ہو گئے وہ دوبارہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ تبھی انہوں نے واپسی کی اجازت چاہی۔

”دیکھو پتر! میری باتوں کا برا مت ماننا، اور نہ ہی میں تمہیں مایوس کر رہا ہوں۔ میں تمہارا سارا معاملہ ہی نہیں، مسئلہ بھی سمجھتا ہوں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ رب تجھے تیری مراد دے۔ میں ایک دو دن میں اڈگی آؤں گا، پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔“ گل نے کہا اور انہیں ہاتھ جوڑ کر واہ گرد کہتے ہوئے فتح بلائی۔ وہ اس سے اجازت لے کر جب اڈگی کی جانب بڑھے تو شام ہونے لگی۔

اڈگی پہنچے تک شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔ راستے میں جہاں نے انوجیت سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے گل کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن نجاب نے کیوں اسے وہ بندہ ٹھیک لگا تھا۔ پورچ میں گاڑی رکھ کر اس نے دیکھا، ہر پریت کورلان میں بیٹھی ہے اس نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور باریک آنچل کرسی کی پشت پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ کوئی میگزین دیکھ رہی تھی جس سے توجہ بدل کر ان کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی سے اترے تو ہر پریت بھی ان کے قریب آ گئی۔

”آپ دونوں فریش ہو کر آ جائیں میں آپ کے.....“

”نہ ہر پریت اس جہاں سے کہہ دے جو کہتا ہے، میں تو جا رہا ہوں، شاید رات دیر سے آؤں.....“ انوجیت نے کہا اور اندر کی طرف چلا گیا۔

”پھو پھو کہاں ہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہ اندر ہی ہیں، آپ فریش ہو جائیں پھر باتیں کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چل دی تو وہ دونوں بھی اس کے پیچھے لپکے۔

جہاں چھت پر کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈا سے اچھی لگ رہی تھی۔ سامنے اڈگی کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو وہاں کسی آبادی کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس گاؤں میں اس کی حویلی ہے، جو اس کے خاندان کا مقفل بنی تھی۔ اسے یہاں آ کر بڑا عجیب سا لگا تھا۔ اسے کتنی ہی دیر ہو گئی تھی یہاں کھڑے ہوئے وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا، کئی سوال اس کے ذہن میں تھے لیکن کسی ایک پر بھی وہ اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پایا تھا۔ ایڈوکیٹ گل کے ساتھ ہوئی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ لیکن ایک سوال اس کے ذہن میں اچانک اُبھر اُٹھا۔ نجاب نے اسے کیوں لگا تھا کہ ایڈوکیٹ گل اور اس سوال کا کہیں گہرا تعلق ہے۔ تبھی اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو توقع کے مطابق وہاں ہر پریت کھڑی اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے پوہنی دیکھتی رہی پھر بولی۔

”لگتا ہے آپ کو یہ جگہ بہت پسند ہے۔ آپ یہاں آ کر کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟“

”ہر پریت..... میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ شاید میں اس گاؤں کی فضاؤں سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں، یا شاید اپنے اندر کے شور کو سننے کے لیے اس پرسکون جگہ پر آ جاتا ہوں۔“

”جی جی میں جو ہوں باتیں کرنے کے لیے، مجھ سے باتیں کیا کریں نا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہاں، تم بھی ٹھیک کہتی ہو، خیر.....! میری ایڈوکیٹ گل کے ساتھ بات ہوئی، اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور.....“ یہ کہتے ہوئے وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اختصار سے باتیں بتانے لگا۔ ساری بات سن کر ہر پریت ذرا سا مسکرائی اور بولی۔

”وہ ٹھیک کہتا ہے، لیکن اس کی سمجھا بھی تمہیں نہیں آئے گی۔“

”کیوں.....؟“ وہ تیزی سے بولا تو وہ عام سے لہجے میں بولی۔

”تم ابھی اس ماحول کو نہیں جانتے، جب ماحول کو سمجھو گے تو ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں گی۔“

”اچھا، ایک بات بتاؤ، آج صبح تم نے اس پولیس آفیسر کے بارے میں بتایا تھا، وہ کیا کہانی ہے؟“

”مجھے معلوم تھا کہ تم یہی بات کرو گے.....“ وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”وہ بہت بے غیرت قسم کا پولیس آفیسر تھا اور اسے خاص طور پر یہاں لگایا گیا تھا، بہت دنوں سے لوگ اس کی تاک میں تھے رات وہ قابو آ گیا۔“

”لیکن تم تو کہہ رہی تھی کہ یہ میرے لیے پیغام تھا؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”بن گیا نا پیغام بن گیا، اور یہ جو تم نے سوچا ہے کہ ایڈوکیٹ گل کی بات اور اس قتل میں کہیں تعلق ہے تو وہ ہے..... میں تمہیں مزید نہیں الجھانا چاہتی ہوں جی، میں صاف لفظوں میں تمہیں بہت کچھ بتا دینا چاہتی ہوں آؤ..... نیچے چل کر تمہارے کمرے میں سکون سے بیٹھتے ہیں۔ وہیں باتیں کرتے ہیں۔“

”چلو.....“ اس نے کہا تو دونوں آگے پیچھے نیچے کی طرف سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر جہاں بیڈ پر بیٹھا تو ہر پریت نے ایک کرسی کھینچی اور بیڈ کے قریب بیٹھ گئی۔ پھر بڑے سکون سے بولی۔

”میں جالندھر میں پڑھتی تھی، خالصہ کالج جالندھر، وہیں ہاسٹل میں رہتی تھی۔ میں اکیلی ہی وہاں پر ایسی نہیں تھی کہ جس کا باپ اس کے پیدا ہونے سے پہلے قتل ہو گیا۔ کسی کا باپ، کسی کا بھائی، ہر ایک ایسی تھیں، جس کے گھر سے کوئی نہ کوئی قتل نہ ہوا

ہو۔ سکھوں کے لیے سن چوراسی قیامت کا سال تھا۔ میرے اندر انتقام تو تھا ہی، وہاں جا کر شعور ملا کہ ہمیں کرنا کیا ہے وہیں ہماری ایک لیڈر تھی جس کے باپ کو اس کی نگاہوں کے سامنے زندہ جلادیا گیا تھا، اس کی کہانی بڑی دردناک تھی سو ہم شعوری اور لاشعوری طور پر سکھ حریت پسند تحریک کے ساتھ جڑ گئے۔ ہم نے بہت کام کیا خالصہ پنٹھ کے لیے جس میں قوت ہمارے اندر پلنے والے انتقام سے تھی۔ یہ تحریک بہت مضبوط ہے سمجھ لو کہ گھاس کے اندر ہی اندر ایک دریا بہ رہا ہے جو کسی بھی دن شوریدہ سرلہروں کے ساتھ نمودار ہو جائے گا۔ وہ کسی جذباتی حریت پسند کی طرح کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”حکومت کو پتہ ہے.....؟“ جہاں نے پوچھا۔

”پتہ ہے ہماری گوریلا جنگ جاری ہے اور یہ پولیس آفیسر ہم نے ہی مارا ہے۔“ ہر پریت نے نفرت آمیز لہجے میں کہا تو جہاں نے گہرا سانس لے کر ہنکارا بھرا۔

”ہوں.....“

”سوال یہ جیسی جب تک تم اپنے بارے میں اپنے مقصد کے بارے میں نہیں بتاؤ گے ہم تمہاری مدد کیسے کر پائیں گے اگر تم صرف اپنی جانیدار.....“

”نہیں مجھے جانیدار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس سے کہیں زیادہ میرے پاس وینکوور میں ہے یہ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ میں سکون اور عیاشی کی زندگی وہاں گزار سکتا ہوں۔ میں یہاں پر کیوں آیا ہوں؟ صرف ان لوگوں کو جو کسی نہ کسی حوالے سے میرے خاندان کے قتل میں ملوث ہیں۔ انہیں ختم کرنے کے ذمے دار ہیں میں نے انہیں نہیں چھوڑنا۔ بس یہی میرا مقصد ہے۔“ اس نے ہر پریت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر وہ تو رویندر سنگھ خاندان ہے جس کے بارے میں نے تمہیں بتایا تھا۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”ہاں وہی، لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ مجھے یہاں کے ماحول کے بارے میں نہیں معلوم اور نہ ان لوگوں کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہوں۔ مجھے یہاں کے لوگوں کی مدد درکار ہوگی۔ لیکن میں محتاط اس لیے ہوں ہر پریت کہ میں اپنا کام ختم ہونے سے پہلے نہ مرنا چاہتا ہوں اور نہ کام ادھورا چھوڑنا چاہتا ہوں کہ کس کے ہتھے چڑھ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاؤں۔“

”تم چاہو تو میں تمہیں اپنی تحریک کے لیڈروں سے ملوا سکتی ہوں وہ تمہاری مدد.....“ اس نے کہنا چاہا تو جہاں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی نہیں..... مگر میں چاہوں گا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔“

”مطلب پلان کیا جائے.....“ ہر پریت مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تو کرنا ہی ہوگا۔“

”اوکے..... آؤ کھانا کھاتے ہیں۔ پھر پوری رات پڑی ہے باتیں کرنے کے لیے۔ بے بے انتظار کر رہی ہوں گی میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی اس نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو جہاں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر دونوں ہی مسکرا دیئے۔



حسب معمول صبح ہوتے ہی میں نے اپنی بائیک نکالی اور ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ سوئی رات ہی کسی وقت چلی گئی تھی جس کا مجھے قطعاً افسوس نہیں تھا۔ ماں نے بتایا تھا کہ قریبی قصبے سے اس نے کوئی گاڑی منگوائی تھی اور پھر اس میں چلی گئی۔ وہ خود گئی تھی، اچھو کر یا نے والے کی دکان پر فون کرنے۔ وہ چلی گئی تو دماغ پر سے ایک بوجھ اتر گیا لیکن کئی سوال چھوڑ گئی۔

اب اگر مجھے انتظار تھا تو فقط ملک سجاد کا چاہے غلط فہمی ہی میں سہی اس نے دشمنی تو پال لی تھی۔ میں بڑھ کر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اگر اس نے کچھ کہا تو اسے سبق سکھانا بنتا تھا۔ میں اس کے لیے پریشان نہیں تھا۔ میں اصل میں سازش بے نقاب کرنے کے لیے کچھ دیر خاموش رہا تھا۔ میں ڈیرے کے قریب پہنچا تو سورج کی نکلتی ہوئی کرنوں میں ایک سیاہ رنگ کی کار کو دیکھا جو گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ میں ایک دم سے چونک گیا۔

پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ بھیدہ خیریت سے ہو میں نے کار ہی کے قریب بائیک روکی اور اپنا پمفل لال لیا۔ میں نے کار کو غور سے دیکھا اس میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے فوراً ہی گیٹ کھولا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر سناٹا تھا، لیکن سب کچھ معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔ مویشی بڑے سکون سے تھے۔ تبھی بھیدہ ٹوکری میں چارہ لیے نمودار ہوا تو میری سانس میں سانس آئی۔ میں نے اشارے سے پوچھا کہ سب خیریت ہے تو اس نے سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب اشارہ لیا اور بولا۔

”ایک بندہ تمہارا اندر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔“

”کون ہے۔“ میں نے پوچھا اور اندر کمرے کی سمت بڑھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے کہا اور چارہ مویشیوں کے آگے پھینک دیا۔ میں اندر گیا۔ تو سادہ لباس میں بیٹھے ہوئے اعلیٰ رندھاوے کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس وقت وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ میں نے معافہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”جمال.....! میں اس وقت تیرے ڈیرے پر ایک دوست کی حیثیت سے آیا ہوں۔ میری باتیں سن لینا، پھر فیصلہ تو تم حال تم نے ہی کرنا ہے۔“

”آپ بیٹھیں اور جی بھر کے باتیں کریں..... اگر آپ دوست بن کر آئے ہیں تو مجھے بھی اپنا دوست ہی پائیں گے.....“ میں نے سامنے پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”دیکھو میں جو بھی ہوں لیکن آخر کار ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میری حدود ہیں جن میں رہ کر میں اپنا کام کرتا ہوں اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے افسروں کے حکم کا بھی پابند ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی، زیادتی سراسر غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ مجھے حکم دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ جو معلومات دی گئی تھیں اس میں تمہیں ایک اہل جرائم پیشہ شخص بتایا گیا تھا جس کا پورا ایک گروہ ہے خیر..... جو کچھ ہوا تمہارے ساتھ وہ اچھا نہیں ہوا میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ رندھاوا صاحب کہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ آپ اتنا سب کچھ اگلے کے بعد جبکہ نوکری کرنے، افسروں کا حکم ماننے کی مجبوری کے ساتھ معذرت کرنے کیوں چلے آئے۔ آپ نے تو اہل نوکری کی پھر یہ شرمندگی کیوں؟“

”نہیں مجھ سے غلطی ہوئی مجھے بھی اپنی پیشہ وارانہ دیانت داری نبھانا چاہیے تھی میں یہ نہیں کہتا کہ تم میری بات کا یقین لے لو میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ تم میری معذرت قبول کرو کیونکہ تم مجھے شک کی نگاہ ہی سے دیکھو گے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے کہ کوئی میرے ڈیپارٹمنٹ کا بندہ یوں معذرت کرنے آجائے یہاں تک کہ اسے کوئی مجبوری نہ ہو؟“

”نہیں میں آپ پر شک نہیں کرتا معذرت بھی مان لی اب.....؟“

میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”جمال!... اتم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا اتنی ہی سادہ ہے، جتنی تم سمجھتے ہو یا پھر جتنے تم سادہ ہو؟“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جو دلیر آدمی ہوتا ہے وہ ہمیشہ سچ پر کھڑا ہوتا ہے چاہے وقتی طور پر اسے نریبت اٹھانی پڑے۔ اس دنیا کا اصل مسئلہ منافقت ہے، منافق آدمی ہی ہوتا ہے، کبھی تم نے کسی جانور میں منافقت نہیں دیکھی ہوگی؟“ منافق انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانوں سے بدتر ہوتا ہے۔ بظاہر منافق وقتی فتح حاصل کر لیتا ہے لیکن دراصل وہ پہلے خود ہارتا ہے پھر ساری زندگی اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ کیونکہ حسد کی آگ ہی منافقت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ خیر..... کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ وہ معاشرہ پر امن ہوتا ہے جہاں منافقت نہیں ہوتی۔“ وہ گھمبیر لہجے میں کہتا چلا گیا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ اس دفع میں نے زنج ہوتے ہوئے پوچھا۔

”وہی بتا رہا ہوں دلیر اور سچا آدمی ہمیشہ منافقوں سے مار کھاتا ہے۔ اگرچہ منافقوں کی یہ وقتی فتح ہوتی ہے کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ اپنے ارد گرد منافقوں سے بچو کیونکہ ہمیشہ منافق ہی اعتماد حاصل کر کے اپنا دار کرتا ہے۔“ اس نے پہلے سے بھی سنجیدہ لہجے میں کہا تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا ہے۔ اس لیے میں نے اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے پوچھا۔

”رندھاوا صاحب دراصل میں یہ سمجھنا چاہ رہا ہوں کہ آپ مجھ سے کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ صاف لفظوں میں کہیں یقین رکھیں یہ آپ کے اور میرے درمیان ہی رہے گی۔“

”تو پھر سنو.....! یہ پیر زادوں کو اور شاہ فیملی کو اچانک ہی تم میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟“ اس نے میری جانب سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ تو میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔“

”مگر میں جانتا ہوں۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے یہی بولا۔ ”اس پورے علاقے میں تیرے جیسا بہادر رنڈر اور فنکار قسم کا کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے۔ دونوں خاندان بظاہر ایک دوسرے کے دشمن اور حریف دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر سے یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ان کی ساری پلاننگ دو باتوں پر ہوتی ہے ایک تو یہ کہ عوام کو آپس میں لڑاتے رہیں تاکہ ان کی حکمرانی قائم رہے دوسرا عوام میں سے اٹھنے والے تیرے جیسے بندے یا کوئی بھی طاقت ور گروہ کو وہ اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نہ قابو میں آئیں تو انہیں ختم کر دیتے ہیں اور یہ سارا عمل منافقت کا ہے۔ کیا تم اور میں نہیں جانتے کہ ان کے ڈیروں پر کیسے کیسے اشتہاری پڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کیوں رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ معاشرے کے عوام کے اور قانون کے مجرم ہیں۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں کہ میں ان پر ہاتھ ڈالنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا کہ سیاسی دباؤ اور گروپ بندیوں نے میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اور تم جیسے لوگ شعور نہیں رکھتے، اس لاشعوری طور پر ان کی انگلیوں پر ناپتے چلے جاتے ہیں۔“ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں رندھاوا جی! لیکن جب قانون کچھ نہیں کر سکتا تو ہم کیا کریں؟ آپ لوگ کس لیے ہیں؟ ہم اگر ہتھیار اٹھاتے ہیں تو مجرم بن جاتے ہیں ایک اور اشتہاری پیدا ہو جاتا ہے۔“

”یہی تو! یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جمال کہ اس سسٹم میں سوائے اشتہاری پیدا ہونے کے کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ جہاں انہیں یہ پیدا کرتے ہیں وہاں انہی کی حفاظتی دیوار بنا کر خود کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ کیا یہ ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے کہ یہ کتنے بڑے جرائم پیشہ ہیں لیکن سیاسی میدان میں نوراکشتی کرتے ہیں۔ خیر.....! میں تمہیں یہ بات اس لیے سمجھانے آیا ہوں کہ مجھے یہ پتا چلا ہے کہ شاہ دین تجھے اپنے پتر شاہ زیب کا باڈی گارڈ رکھنا چاہتا ہے اور پیر زادہ ایما

نہیں چاہتا، وہ تم سے لڑے گا نہیں بلکہ تم پر مزید احسان کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن خدا کے لیے تم اپنی طاقت بجا کر رکھنا۔“ اس بار اس کے لہجے میں درد تھا۔

”میں سمجھ گیا ہوں! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے یقین دلایا تھا اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال رینگ گیا۔ میں نے شدت سے یہ خواہش کی کہ کاش رندھاوا اپنے طور پر یہ خواہش مجھ سے کہہ دے۔

”اگر تم سمجھ ہی گئے ہو تو یاد رکھو وقت تمہارا ہوگا۔ میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو بتانا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو مجھے ہلکی سی ہنسی میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی اگر کوئی ضرورت محسوس کریں تو میں حاضر ہوں۔“

”عوام اور قانون کا ایک ساتھ ہو جائے تو جرائم ختم کیے جاسکتے ہیں مگر ہماری ڈیپارٹمنٹ کی کالی بھیڑیں ان جرائم کو ختم نہیں ان کی پرورش کر رہے ہیں ورنہ ان کی کمائی کیسے ہو؟ جیسے میرے ہی آفسر نے مجھے نشوونما کی طرح استعمال کر لیا۔ صرف ملک سجاد کو خوش کرنے کے لیے۔ ویسے اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

”آپ جو حکم کریں لیکن.....“ میں کہتے کہتے رک گیا

”لیکن کیا؟“ وہ تیزی سے بولا

”بس رندھاوا جی پیٹھ میں چھرا مت گھونپنا باقی آپ میری مدد کریں میں آپ کی کردوں گا! یہ تعلق تو اعتماد پر آگے بڑھے گا۔“ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس کی آنکھیں چمک گئیں۔ اس نے اپنے اندرونی جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔

”تو پھر شروعات میں کرتا ہوں۔ ملک سجاد نے اپنے کچھ بندے یہاں بھیجے ہیں تمہارے لیے اور جانتے ہو وہ اس وقت کہاں ہیں؟“

”کہاں ہیں؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”تیرے گاؤں کے حکمران شاہ دین کے ڈیرے پر..... دونوں ایک ہی پارٹی کے ہیں اور پہلے ہی ایک دوسرے کی مدد کرنے رہتے ہیں۔ آج نہیں تو کل کل نہیں تو پرسوں! کبھی بھی دن وہ اچانک تیرے سامنے نمودار ہوں گے اور.....“ وہ طرے ہوئے بولا۔

”میں وہ وقت آنے ہی نہیں دوں گا۔ آپ کی نشاندہی کرو انہیں قانون کے ہاتھ میں دینا اور اس کی پیروی کرنا میرا کام ہے.....“ میں نے عزم سے کہا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”نہ قانون کے ہاتھ نہ پیروی.....“

”مطلب انہیں دنیا ہی سے.....“ میں نے کہا تو یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا

”تو پھر ہو گیا طے..... میں ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں..... یہ تم دیکھنا.....“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، گرجوٹی سے ہاتھ ملا کر ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے مجھے سے یقین دلایا اور پھر تیز تیز قدموں سے ڈیرے سے باہر چلتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی جانے کی دھیمی دھیمی آواز آئی تو میں ہمدے کے پاس جانے کے لیے بڑھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

”ہمدے.....! ممکن ہے آج کے بعد میں ڈیرے پر نہ آ سکوں تم کسی بندے کا بندوبست کر لینا اور خیال رکھنا.....“

”اے میں دودھ لے کر جا رہا ہوں۔“

”ہاؤ.....! اور فکر نہ کرنا.....“ اس نے کہا تو میں دودھ والا برتن اٹھا کر ڈیرے سے نکل گیا۔

ساتھ لگایا، میرا ماتھا چھو ماور دھیرے سے کہا۔ ”جا.....! اللہ کے حوالے.....“ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

”ماں! میں اپنی جان ہار سکتا ہوں“ پر تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ایسے ہی آنسو تیری آنکھوں میں تھے جب میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں سے بدلہ لوں گا، پھر اب کیوں.....؟“

”نہیں پتر.....! وہ آنسو بے بسی کے تھے لیکن یہ آنسو خوشی کے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ تو اب اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اس وقت ماں باپ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتے ہیں جب ان کے بچے یہ کہہ دیں کہ ہم ساری ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ تو پریشان نہ ہو میرا پتر! اور میری فکر مت کرنا۔“ ماں نے مجھے پھر سے اپنے ساتھ لگا کر نرمی سے کہا، میں کچھ دیر ماتا کی چھاؤں میں رہا اور پھر الگ ہو کر باہر والے کمرے کی طرف چل دیا۔

میرے اندر بے چینی بڑھ گئی تھی۔ دوپہر ہونے کو آگئی تھی لیکن رندھاوا کا کوئی بندہ میرے پاس نہیں پہنچا تھا۔ جب بندے کی بے چینی عروج پر پہنچ جائے تو خیالات میں دوسرے بھی اگنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے یہ تھا کہ کہیں رندھاوا میرے ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہا۔ میں نے اپنے طور پر ایک وقت متعین کیا اور گھر سے باہر نکلنے کی ٹھان لی۔ میں نے اپنا ہسل دیکھا، اضافی میگزین اپنی جیب میں ڈالے اور باہر والا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا، ایسے میں چھا کے نے اپنی ہائیک روکی اور سیدھا میری طرف بڑھا۔ مجھے تنہا پا کر بولا۔

”رندھاوا ٹھیک کہتا ہے جمائے بندے شاہ دین کے ڈیرے پر موجود ہیں۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا۔“ میں نے خود پر بے شک قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”اپنا چاچا دیر ہے نا جو شاہ دین کے ڈیرے پر خدمت گار ہے۔ اس نے ساری تفصیل بتادی ہے۔“

”وہ تیرے کیسے قابو آ گیا اور کیا.....“

”میں نے اس کی بیٹی کی نہ صرف شادی کروائی ہے بلکہ سارا خرچہ بھی کیا تھا، تب سے وہ..... خیر.....! اس نے بتایا ہے کہ کچھ آدمی ہیں اور سارے ہی اشتہاری ہیں۔ رات کے پچھلے پھر پہنچے ہیں اور جس طرح ہم ان کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وہ بھی تیرے بارے میں اتنے ہی تجسس ہیں۔ وہ وہیں کے خدمات گاروں سے پوچھ رہے تھے۔ وہ آج باہر نکل چکے ہیں۔ کہیں بھی ہمیں پکڑنے کی کوشش کریں گے۔“ چھا کے نے پوری تفصیل بتائی تو میں نے کہا۔

”مگر ہم تو انہیں ڈیرے پر پکڑنا چاہتے ہیں۔“

”میں چاچے بیرو سے کہہ آیا ہوں وہ جب بھی واپس ڈیرے پر آئیں تو وہ ہمیں بتادے اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے جمائے۔ ان کے سوا کوئی اور نہیں ہے وہاں پر.....“ اس نے بتایا۔

”یہ ممکن نہیں ہے..... چھا کے..... ایک دم سارے وہاں سے ہٹا دیئے جائیں۔ بات دماغ کو نہیں لگتی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”میری تو یہی اطلاع ہے چاچے بیرو کے علاوہ دو خدمت گار ہیں وہاں پر..... میں نے ایک بندہ بھیجا ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے گا تو تسلی ہو جائے گی۔“

”تو ٹھیک ہے پھر انتظار کر.....“ میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچنے لگے کہ کیا کرنا ہوگا۔ میرے دماغ میں صورتحال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے میں مطمئن نہیں تھا۔ زیادہ اہم نہیں گزری تھی کہ رندھاوا کا ایک بندہ آ گیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا اور مجھے پہچان کر بولا۔

”رندھاوا صاحب نے بھیجا ہے۔ اس وقت وہ لوگ نزدیکی قصبے میں گئے ہوئے ہیں۔ نورنگر میں نہیں ہیں واپس کب

سورج کی تیز روشنی نے پورے ماحول کو چمکا کے رکھ دیا تھا۔ سرد ہوائیں اب گرمی کا چولا بدل رہی تھیں۔ میں نے دودھ کا برتن ماں کو دیا، پھر ڈنٹ کر ناشتہ کر چکا تو چھا کا آ گیا۔ تھکے نقوش والے چھا کے کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان میں کوئی بے چینی کروٹ لے رہی ہے۔ وہ خاموشی سے میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں اس قدر بے چین ہو؟“

”بس ویسے ہی یار، جب سے ملک سجاد کی دھمکی سنی ہے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ فون پر دھمکیاں تو ہر کوئی دے لیتا ہے اصل بات تو یہ ہے کہ وہ سامنا کرے۔“

”اس نے اپنے بندے بھیج دیئے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ پھر دھم سے لہجے میں بولا۔

”بات تو نہ بنی نہ یار کچھ بندوں کو آگے کر کے وہ.....“

اس نے کہنا چاہا، مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے رندھاوا سے ہونے والی تفصیل بتادی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر جب میں نے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے تو وہ بولا۔

”دیکھ لو..... بندے اگر شاہ دین کے ڈیرے پر ہیں اور ہم انہیں وہیں قابو کرتے ہیں تو معاملہ شاہ دین کی اناہن جائے گا۔ مطلب سیدھے سیدھے شاہ دین سے ٹکرانا ہوگا اور اگر کہیں دوسری جگہ آنا سامنا ہوتا ہے تو پھر یہ شاہ دین بے نقاب نہیں ہوگا۔“

”تو یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ انہیں شاہ دین کے ڈیرے پر ہی.....“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تو وہ تیزی سے بولا۔

”تو اور کیا..... اس شاہ دین کو بھی تو پتہ چلے کہ ہم سوئے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن..... اس کا فیصلہ صرف تم نے کرنا ہے کہ اس سے دشمنی نبھایاؤ گے یا نہیں۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے چھا کے کہ ہم دشمنی نبھائیں گے یا نہیں، جب دشمنی ہو ہی گئی تو کسی ایک کو تو ختم ہونا ہے، ہم نا..... اور کبھی نہ کبھی تو یہ ہونا ہی ہے..... کیوں نا ابھی سہی۔“ میں نے کہا تو اس نے حتی انداز میں پوچھا۔

”تو پھر دیکھتا کیا ہے چل اٹھ..... نکلتے ہیں۔ کرتے ہیں ان کا کچھ نہ کچھ۔“

”مجھے رندھاوا کی طرف سے نشاندہی کا انتظار ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”چل تو کر انتظار میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔“

”یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا تو میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”تو جا کہاں رہا ہے.....؟“

”میں آ کے بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر کی جانب چل دیا۔ میں چارپائی سے اٹھ ہی رہا تھا کہ ماں آ گئی۔ اس نے مجھے عجیب سی نگاہوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”جمال آ خر وہ دن آ ہی گیا، جس کا برسوں سے ہم دونوں انتظار کر رہے تھے۔“

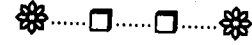
”ہاں ماں..... ایک دن تو یہ آ نا ہی تھا۔ بس تم میرے لیے دعا کرتی رہنا۔ ماں کی ابرو وہ بھی مظلوم ماں کی دعا میں بڑا طاقت ہوتی ہے اور میرا یقین ہے ماں جب تک تیری دعائیں میرے ساتھ ہیں میرا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”بس.....! اس پیدا کرنے والے کی ذات پر بھروسہ رکھنا میرے پتر۔ وہی زندگی اور موت دینے والا ہے۔ کبھی ظالم ساتھ مت دینا۔ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک تجھے کامیابیاں دے۔“ یہ کہہ کر ماں نے مجھے اپنے سینے

آتے ہیں اس بارے میں کچھ کہنا نہیں جاسکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے بندوں کی تعداد اور ان کے حلیے اور تھوڑی بہت معلومات دیں جب وہ کہہ چکا تو آخر میں بولا۔ ”زندہ ادا صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ زندہ یا مردہ جس حالت میں بھی ہوں.....“

تھانے میں..... اطلاع ہی کر دیں بس..... یا پھر..... میں آپ کے ساتھ..... اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو.....؟“ یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

”تم جاؤ باقی میں سب دیکھ لوں گا۔“ میں نے آہستگی سے کہا تو وہ تھوڑی دیر مزید بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے جو معلومات بھی دی تھیں بالکل ٹھیک دی تھیں اب رندھاوا کیا چاہتا تھا؟ واقعتاً میری مدد یا پھر اپنی خفت کا بدلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ آنے والا وقت ہی فیصلہ کرنے والا تھا۔



جسپال اور ہر پریت دونوں ہی رات دیر تک جاگتے رہے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی کہ کالج لائف سے لے کر اب تک اس نے اپنی تنظیم کے لیے کیا کچھ کیا ہے لیکن جسپال نے فقط اتنا بتایا کہ وہ مختلف شوٹنگ کلب کا ممبر رہا ہے۔ مختلف تھیٹر چلانے اور تھوڑی بہت فائٹ کی تربیت لی ہے۔ وہ بہت کچھ چھپا گیا تھا۔ وہ ہر پریت کے ذہن میں کوئی ایسا تاثر نہیں بنانا چاہتا تھا جس سے وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے اور ایسا ویسا تاثر قائم کر لے جس سے بعد میں اسے پریشانی لاحق ہو جائے۔ وہ ابھی کسی پر بھی نہیں کھلنا چاہتا تھا۔ راز وہی ہوتا ہے جو خود تک محدود رہے۔ جو خود ہی راز نہ رکھ سکے تو وہ راز پر ایسا ہو گیا۔ اس لیے وہ دوپہر کے بعد جا کر کہیں بیدار ہوا۔ پھر وہ سکون سے تیار ہو کر نیچے ڈرائنگ روم میں آیا تو ہر پریت صوفے پر آلتی پالتی مارے اس دن کا اخبار پڑھ رہی تھی جو گرد کھسی میں تھا۔ جسپال سیکھ کو وہ زبان پڑھنی نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا تو ہر پریت نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور اٹھنے لگی۔

”کدھر جا رہی ہو؟“

”بھئی کوناشے کا کہہ آؤں۔ وہ کچن میں مصروف ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سلیپر پہنے اور اندر کی جانب بڑھ گئی جبکہ وہ سیل فون پر انوجیت کے نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی کال مل گئی۔

”کدھر ہو یا؟“

”میں یہاں مہتا پور میں ہوں۔ تھوڑا کام تھا یہاں۔“ انوجیت نے ایک نزدیکی جگہ کے بارے میں بتایا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور فون بند کرنے لگا تو وہ بولا۔

”اچھا تم گھر پر ہی رہنا۔ وہ ایڈووکیٹ گل آج آئیں گے تب تک میں بھی آ جاؤں گا۔“

”اوکے..... میں گھر پر ہی ہوں۔“ اس نے کہا تو انوجیت نے فون بند کر دیا۔ تبھی فطری طور پر اس کا ذہن اس بوڑھے ایڈووکیٹ کی طرف چلا گیا جو اس پر سے بہت جذباتی لگتا تھا لیکن حقیقت میں وہ بہت ٹھنڈا انسان تھا۔ ہر پریت سے باتیں کرنے کے بعد اسے لگا تھا کہ وہ تنظیم کا کوئی اہم بندہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہر پریت واپس آ گئی۔ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

”ناشتے سے پہلے نیوز سنو گے یا بعد میں.....“

”یہ تو تم ایسے پوچھ رہی ہو جیسے تم مجھے کوئی میڈیسن دے رہی ہو۔“ جسپال نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ کھل کر ہنس دی۔ بلاشبہ اسے ہر پریت کی ہنسی جلتی تھی۔ کھنکھتی ہوئی۔ کانوں میں رس گھول دینے والی ہنسی۔ پھر اخبار کا اندرونی صفحہ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”یہ دیکھو..... اس پولیس آفیسر کے بارے میں تفتیش کے لیے خفیہ والے متحرک ہو گئے ہیں۔“

”پہلی تو یہ بات ہے مجھے یہ گرد کھسی پڑھنی نہیں آتی اور دوسری بات اس خبر سے تم لوگوں کو الارٹ ہونا چاہیے مجھے تو نہیں۔“

”ہاں..... دیکھتے ہیں ان کی تفتیش کس رخ پر جاتی ہے۔“ وہ بے خیالی کے سے انداز میں بولی پھر اس نے خبر کا متن پڑھ کر سنا دیا کسی رپورٹر نے ہادوث ذرائع سے وہ خبر دی تھی۔ وہ ناشتہ آ جانے پر اس خبر کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ وہ ناشتہ کرنے لگا تو ہر پریت اندر چلی گئی۔

اس وقت وہ دونوں کاریڈور میں آ کر بیٹھ چکے تھے۔ ہر پریت نے نیلی جین کے ساتھ ہاف سیلونی شرٹ پہن لی تھی۔ اپنے کھلے ہوئے بال پونی میں باندھ لیے تھے۔ اس کا میک اپ سے بے نیاز چہرہ تروتازہ لگ رہا تھا۔ جسپال کے اندر بڑے خوشگوار جذبے اُسے مسور کر رہے تھے۔ اگرچہ اس نے ہر پریت کے بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن اس کا ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونے سے ماحول بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ جیسے ہر منظر میں رنگ گہرے ہو گئے ہوں۔ اس نے بھرپور لگا ہوں سے ہر پریت کو دیکھا شاید پنجاب کے ماحول کی کشش تھی یا پھر آب و ہوا کا اثر کچھ تھا کہ اس کا دل اٹھل پٹھل ہونے لگا تھا۔ بات یہ نہیں کہ اس نے وینکورو میں حسن نہیں دیکھا تھا وہاں بھی پنجابی لوگوں کی بھرمار تھی اور ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھیں۔ لیکن جو کچھ وہ ہر پریت میں دیکھ رہا تھا وہ کچھ انہونی تھی ایک الگ سی جس کی اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اسے یوں گہری نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ آہستگی سے بولی۔

”جسٹی جی..... کہاں ہو؟“

”یہیں ہوں تمہارے پاس۔“ اس نے اچانک چونکتے ہوئے کہا پھر ہلکے سے مسکرا کر کوئی ایسی بات کرنا چاہتا تھا کہ اس کے جذبات کی ترجمانی ہو سکے انہی لمحات میں گیٹ واہوا اور ایک نیلے رنگ کی کار اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ بلاشبہ بننا سیکھ کو معلوم ہوگا کہ وہ کون شخص ہے اس لیے کار اندر آنے دی تبھی ہر پریت نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

”ایڈووکیٹ گل..... آ گئے۔“

کار پورچ میں روک کر وہ اتر اتر پھر انہی کی جانب بڑھ آیا واہ گرد واہ گرد کہتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو دوش کیا اور انہی کے پاس بیٹھ گیا۔

”انکل..... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ ہر پریت نے کہا تو وہ بولا۔

”اونہیں پتر..... ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر اندر کی جانب چلی گئی۔ ایڈووکیٹ گل نے ایک نگاہ جسپال پر ڈالی اور پوچھا۔

”جسپال.....! تجھے میرے آنے کے بارے میں انوجیت نے بتا دیا ہوگا۔“

”ہاں جی اس سے میری بات ہوئی ہے بتایا تھا اس نے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”وہ اچانک ہی تم سے ملنے کے لیے آنا پڑا میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم یہاں سے کہیں ادھر ادھر جاؤ وہ اصل میں کچھ باتیں کرنا بھی تیرے ساتھ۔“

”جی بولیں میں سن رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو وہ کہنے لگا۔

”وہ جس پولیس آفیسر کا قتل ہوا ہے نا اس کے لیے حکومت نے ایک تفتیشی ٹیم بنادی ہے جو اس کے قتل کی وجہ اور محرکات کی چھان بین کرے گی۔ تمہارا اس قتل سے کوئی لینا دینا نہیں ہے لیکن پتہ نہیں مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ تجھے بھی اس قتل کی تفتیش میں ذہنی اذیت دینے کی کوشش کی جائے گی۔“

”وہ کیوں انکل.....!“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ پہلے وہ بنیادی وجہ سن لو جس کے بارے میں تجھے معلوم ہے کہ نہیں خیر..... انگریز نے جہاں جہاں اور جس قوم سے بھی خوف محسوس کیا اسے کسی نہ کسی طرح متحد نہیں رہنے دیا۔ جیسے مسلمانوں میں مرزائی پیدا کر کے ایک خاص قسم کا فتنہ پیدا کر دیا اسی طرح سکھوں میں بھی نرنکاری بنا کر نہ صرف دھرم کے طور پر ان کو نقصان پہنچایا بلکہ سکھوں کو سکھوں کے ساتھ لڑانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ آج جس طرح مرزائی بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف یہودیوں والا کام کر رہے ہیں اسی طرح نرنکاری بھی ہندوؤں والا کام کر رہے ہیں۔ انگریز جو کام مرزائیوں اور نرنکاریوں سے لے رہے تھے آج وہی کام مرزائیوں سے انگریز اور نرنکاریوں سے ہندو لے رہے ہیں۔ اب تک خالصتان بن چکا ہوتا اور سانحہ 1984 پیش ہی نہ آیا ہوتا اگر یہ نرنکاری نہ ہوتے۔ اب تک سکھوں نے جب بھی متحد ہونے کی کوشش کی ہے انہی نرنکاریوں کو استعمال کیا گیا یہی امرت دھاری سکھوں کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ وہ پولیس آفیسر بھی نرنکاری تھا۔ جس کی تفتیشی ٹیم میں پانچ لوگوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جن میں تین نرنکاری پولیس آفیسر ہیں۔ ایک ہندو اور ایک کالی دل کالیڈرو بند سنگھ ہے۔ وہی روپن سنگھ جو تیرے خاندان کی تباہی کا باعث بنا تھا۔“

”گل صاحب! آپ کی ساری بات ٹھیک ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مجھے کیوں ڈنڈی اذیت دیں گے یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟“ جہاں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا تو ایڈووکیٹ گل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں.....! میں اس سوال کا جواب دینے اور اس کے تناظر میں پیش بندی کے طور پر بات کرنے یہاں آیا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم یہ مت خیال کرو کہ انہیں تمہاری یہاں آمد کے بارے میں علم نہیں جیسے ہی تم نے یہاں قدم رکھا تھا انہیں معلوم ہو گیا تھا اتنے عرصے بعد تمہاری آمد کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تمہارا جاتے ہی اپنی حویلی دیکھنا ایک بہت بڑا اشارہ تھا ہی دوسرا تم نے اگلے ہی دن درخواست گزار دی۔ جس کے رد عمل میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ وہ بظاہر دکھائی نہیں دے رہی لیکن یہاں کے گاؤں کے بچے، سرخ، تحصیل دار کے آفس اور ان کے متعلقہ لوگوں کو پوری طرح الارٹ کر دیا گیا کہ جہاں سنگھ کے اگلے قدم کے بارے میں پوری جانکاری رکھی جائے۔ وہ تمہارے راستے میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ پولیس آفیسر کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آخری بار تم ہی اس سے ملے تھے اور تمہاری اس سے تلخ کلامی ہو گئی تھی اور بس.....“

”میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر ایڈووکیٹ صاحب.....! یہ تو بہت اچھی خبر ہے کہ انہیں یعنی میرے دشمنوں کو میرے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اب مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بات سے میں خوش ہوا لیکن اس کے ساتھ تمہارا زیادہ محتاط ہو جانا بھی ضروری ہے۔“ ایڈووکیٹ گل نے کہا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان میں ایک طرح سے چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ یہی ہر پریت خود ہی رے میں لسی کے گلاس رکھے نمودار ہوئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور وہیں جا بیٹھی جہاں سے اٹھ کر گئی تھی۔ ایڈووکیٹ گل نے گلاس اٹھا تے ہوئے کہا۔

”جہاں.....! تمہارا اعتماد بڑا اچھا ہے۔ لیکن تم یہاں کی پولیس اور ان تفتیشی اداروں کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔ یہاں پر انگریز کا وہی کالا قانون چل رہا ہے۔ جسے وہ اپنی مرضی سے استعمال کیا کرتا تھا اور ان غلاموں پر اپنی حکومت بنائے ہوئے تھا۔ اس لیے احتیاط میرے پتر! بڑی احتیاط۔“

”جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ایک دم۔ اس کے ذہن میں بہت سارے سوال جنم لینے لگے تھے۔ اسے اندازہ تو تھا کہ اوگی پنڈ میں آمد کے بارے میں اس کے دشمن جان جائیں گے لیکن اتنی جلدی؟ اس بارے میں امید نہیں تھی۔ وہ ابھی کسی نئی بات کا سراغ تلاش کر رہا تھا کہ گیٹ پر کال بیل ہوئی۔ انہوں نے فطری

طور پر ادھر دیکھا تو بنتا سنگھ باہر جا چکا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ باہر سے اندر کی طرف آیا اور سیدھا ان کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ انہیں تجسس ہو گیا کہ باہر کون آیا ہوگا؟ بنتا سنگھ کو ان کے پاس آتے ہوئے چند منٹ لگے اور آتے ہی ہر پریت کو رکی طرف دیکھ کر بولا۔

”باہر ایک جیپ میں دو بندے ہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ انوجیت یا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”نام نہیں بتایا انہوں نے؟“ ہر پریت نے پوچھا۔

”ایک نے اپنا نام بتایا ہے۔ من راج سنگھ کہہ رہا ہے کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے۔“

”اوہ.....! اس تفتیشی ٹیم سے.....“ ایڈووکیٹ گل نے بے ساختہ کہا تو ہر پریت نے کہا۔

”اچھا بلاؤ لیکن ان کی جیپ باہر رہے۔“

بنتا سنگھ چلا گیا تو تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جس پر جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گل صاحب.....! آپ بالکل پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں.....“

یہ کہہ کر اس نے گیٹ کی طرف دیکھا کچھ ہی دیر بعد ایک لمبا ترنگا ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا جس نے میردن رنگ کی پگڑی اور گرے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا داڑھی اس نے سنواری ہوئی تھی۔ جو زیادہ تر سفید ہو چکی تھی۔ وہ بچے تلے قدم رکھتا ہوا ان کے پاس آ گیا اور ہاتھ جوڑ کر فتح بلاتے بولا۔

”ست سری اکال..... واہ گرو..... کی فتح“

انہوں نے جواب دیا اور ہر پریت نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا تو ہر پریت بولی۔

”جی فرمائیں.....! انوجیت تو اس وقت گھر پر نہیں ہے۔“

”آپ تو ہیں ہر پریت کورجی.....“ یہ کہہ کر اس نے دونوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”میرے خیال میں آپ ہی جہاں سنگھ ہیں جو ابھی دینکورو سے آئے ہیں۔ اور ایڈووکیٹ گل صاحب آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ آپ کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔“

”میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ گل نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”دراصل میں جس سلسلے میں یہاں آیا ہوں وہ ایک پولیس آفیسر کے قتل کے بارے میں تفتیش ہے۔ اور بہت ساری وجوہات قتل کے محرکات اور اندازے ہیں جن میں مضبوط ترین وجہ سمجھ تنظیم بھی ہے جو وقتاً فوقتاً اس پولیس آفیسر کو قتل کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ آپ کا بھی اس تنظیم سے تعلق ہے۔ انوجیت اور یہ ہر پریت بھی اس سے تعلق رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے تنظیم کے لوگ ایک جگہ ہوں تو حیرت کی کیا بات ہے؟“

”آپ کا تعارف.....“ جہاں سنگھ نے سرد سے لہجے میں پوچھا تو من راج سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”من راج سنگھ سی بی آئی سے.....! آپ شاید مجھے نہ جانتے ہوں لیکن سکھ تنظیم کے لوگ مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”آپ کے آنے کا مقصد؟“ جہاں نے پوچھا تو من راج سنگھ نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ اس پولیس آفیسر سے آخری بار ملے تھے..... اور آپ کی تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی آپ اس واقعے کو دہرا سکتے ہیں..... مطلب آپ کی تلخ کلامی کیوں ہوئی تھی؟“

”پہلی اور آخری بار.....! اس کا بات کرنے کا انداز بہت گھٹیا قسم کا تھا۔ جس کا بہر حال میں عادی نہیں تھا۔ اس لیے

مجھے غصہ آ گیا۔“ جہاں سگھ نے یوں کہا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

”پھر بھی..... کوئی بات.....؟“ اس نے کہنے کی کوشش کی۔

”چونکہ میرے لیے اتنا اہم نہیں تھا وہ شخص اس لیے میں نے ذہن میں نہیں رکھا، کیونکہ میں نے اسے ایک دوسرے بندے نے کہا تھا کہ وہ پولیس آفیسر فطری طور پر ایسا ہی ہے۔“ اس نے پھر لا پرواہی کے سے انداز میں کہا۔

”جہاں.....! آپ خود کو زیر تفتیش سمجھ گئے۔“ من راج نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔

”وجہ.....؟“ وہ بولا۔

”اس گیٹ کے پار میرا خیال کچھ اور تھا، لیکن یہاں آ کر جو میں نے سمجھا وہ کہہ دیا۔ اب اپنے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا.....“ من راج نے دھمکی آمیز لہجہ میں کہا تو ایڈووکیٹ گل نے بھی سخت لہجہ میں کہا۔

”کاغذ لیں حکومت اور خصوصاً سکھوں کے بارے میں ان کی پالیسی میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اٹھائیس سال ہو گئے۔ سن چوراسی کا انصاف نہیں ملا اور نہ ہی کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر مسئلہ حل کیا گیا ہے اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مسئلے..... آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں۔ اور ہم بھی سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایسا کیوں کہا؟“

”اگر آپ سمجھ گئے ہیں تو پھر مزید سمجھ جائیں زیادہ سمجھنا نہ پڑے..... چلتا ہوں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو جہاں نے سرد سے لہجہ میں کہا۔

”آفیسر.....! میں نہیں جانتا آپ ایسا کیوں کہہ کر جا رہے ہیں، میں میں خود چاہوں گا کہ آپ اپنے یہ لفظ یاد رکھیں کسی جگہ آپ کو یہ لفظ دہرانے بھی پڑ سکتے ہیں۔“

”میں انتظار کروں گا.....“ من راج نے اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے واپس مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گیٹ پار کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سبھی ہر پریت بولی۔

”من راج..... یہ لدھیانے کا رہنے والا ہے نا.....؟“

”ہاں وہی ہے.....“ گل نے کہا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی یہاں پہنچ جائیں گے، خیر دیکھتے ہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے گل صاحب.....! لیکن یہ یاد رکھیں میرے معاملے میں جتنی مرضی یہ دشمن رکاوٹ کھڑی کریں کام جاری رہنا چاہیے۔ آپ اپنا اکاؤنٹ اور بینک کے بارے میں معلومات مجھے دے دیں۔ رقم کی کمی نہیں ہوگی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”انوجیت کے پاس ساری معلومات ہیں، لیکن تم مت گھبراؤ۔ میں اسے دیکھتا رہوں گا۔ یہ الجھن تو اب رہے گی۔“ ایڈووکیٹ گل نے تشویش سے کہا تو جہاں خاموش رہا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر تیزی سے پورچ تک گیا اپنی گاڑی لی اور گیٹ پار کر گیا۔

”یہ پولیس آفیسر ہمارے لیے پھندا بنانے کی کوشش کرے گا۔“ ہر پریت نے مترشح لہجہ میں کہا۔

”کوئی بات نہیں، تم پریشان نہ ہو۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”آؤ..... میرے کمرے..... چلیں۔ ہوتی سے کہو ہم کھانا باہر سے کھائیں گے اور ممکن ہے گھر ڈرائیو آئیں۔“

”خیریت۔“ ہر پریت بولی۔

”بتاتا ہوں نا..... آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو ہر پریت بھی اس کے ساتھ چل دی۔

جس وقت ہر پریت اس کے کمرے میں گئی وہ اپنا لیپ ٹاپ لیے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ اور بڑی گہری نگاہوں سے اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ ہر پریت اس کے ساتھ ہی جا کر بیٹھ گئی اور اسکرین پر دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی آن لائن تھا اور وہ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ہر پریت جب اس کے پاس بیٹھ گئی تو جہاں نے پوچھا۔

”وہ کونسا اخبار تھا جس کی خبر تم نے مجھے سچ دکھائی تھی۔ وہ اخبار آن لائن ہے؟“

”ہاں ہے.....“ اس نے جواب دیا پھر مزید قریب ہو کر اس کے ساتھ لگ گئی اس کے بدن سے اٹھنے والی مسور کن مہک اس کے نھنوں سے نکل گئی اس نے سرچ میں اخبار کا نام ڈالا اور پھر وہ اخبار لے آئی جلد ہی اس کا وہ صفحہ کھول لیا جس پر خبر تھی۔ جہاں نے اس صفحے کا لنک اسے بھیج دیا جس سے بات کر رہا تھا۔ پھر کچھ دیر انتظار کا کہہ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ ہر پریت اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔

”یہ سب کیا تھا جہاں؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”یہیں پنجاب میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں میں نہیں جانتا، لیکن وہ میرے ہر طرح سے کام آتے ہیں۔ انہیں میں نے ایک ٹاسک دیا ہے کچھ دیر بعد وہ اس کا جواب دیں گے۔“ جہاں نے جواب دیا۔

”اس لیے تم میری تنظیم کے ساتھ.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

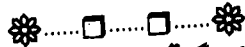
”ہاں..... میں ان سے پچتا چاہ رہا ہوں ابھی تم نے نہیں دیکھا ایڈووکیٹ گل کی وجہ سے وہ میری طرف سے اپنا خیال بدل جانے کی بات کر گیا ہے۔“

”ہوں.....“ ہر پریت نے ہنکارہ بھرا۔ تب جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا اور بولا۔ ”ہر پریت..... کیا تم میرا ساتھ دوگی۔“

”ساتھ کیا..... میں تو دل بھی دے چکی ہوں۔ جان ہے وہ بھی جب چاہے لے سکتے ہو۔“ اس نے اپنی نگاہوں میں سارے جہان کا پیار سمیٹتے ہوئے کہا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر پیار کی مہر اس کے ہونٹوں پر ثبت کر دی تو وہ شدت جذبات سے بولا۔

”ٹھیک ہے ہر پریت..... میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن آخری سانس بھی تیری امانت ہوگی۔“

اس نے کہا تو ہر پریت اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔ جہاں کو یوں لگا جیسے اس کی تلاش یہاں آ کر ختم ہو گئی ہے۔ اب تک وہ یونہی بھٹکتا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس سے الگ ہو گئی اور اس کے چہرے پر دیکھتی رہی پھر شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔ جہاں ہنس دیا۔ اچانک وہ اٹھی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ وہ کتنی دیر تک ان لذت آفریں خیالوں میں کھویا رہا۔ ان لمحات میں اسے یوں لگ رہا تھا کہ ساری دنیا خاموش ہو گئی ہے اور وہ فقط ایک گمنام جزیرے پر خاموشیوں میں ادب گیا ہے جہاں سے نکلنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا، اچانک اس کے سیل فون پر بجتی ٹون نے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس نے جلدی سے لیپ ٹاپ کھولا اور اسکرین پر نگاہیں جمادیں۔



مغربی افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی پھیل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا ہو جانے والا تھا۔ دوپہر سے لے کر شام ہو جانے تک مجھے چند جگہوں سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ کچھ مشکوک بندے میرے بارے میں پوچھتے پھر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ میرے گھر کا بھی ایک چکر لگا چکے تھے۔ میں دوپہر کے وقت ہی اپنے گھر سے نکل کر جھاکے کے پاس آ گیا تھا۔ ام نے اپنے اپنے گھر سے ضروری سامان لیا اور دلبر کے کنویں پر چلے گئے۔ وہاں پر تاش جاری تھی۔ میرے سارے

دوست وہیں جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دلبر نے کہا تھا۔

”لے بھی جمالے..... بیٹھ میرے سامنے اور لگا شرط بکرے بکرے کی، یہیں پکائیں گے، یہیں کھائیں گے۔“
”پر تیرا رجمالہ کسی اور کام سے آیا ہے۔“ چھاکے نے چارپائی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا تو ایک دم سے سب نے تاش روک دی۔ اس کے لہجے میں ہی کچھ ایسی بات تھی۔

”بول جمالے..... بات کیا ہے؟“

”کچھ مشکوک بندے آئے ہیں علاقے میں مجھے مارنے کے لیے۔“ میں نے کہا تو وہ چونک گیا اور پوچھا۔

”کون ہیں اور کدھر ہیں؟“

”میں نہیں جانتا، انہی کا تو پتہ کرنا ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تو ادھر بیٹھ، میں ساری ”سوہ“ لے کر آتا ہوں۔ چلو اوائے سب نکلو اور شام سے پہلے ان کا پتہ لے کر آؤ۔ وہ سبھی تاش چھوڑ کر اٹھ گئے تھے۔

پھر شام ہوتے ہوتے وہ واپس آنے لگے۔ دلبر نے جب ساری معلومات جمع کر لی تو کہا۔ ”بڑی حیرت کی بات ہے یار سردار شاہ دین کے ڈیرے پر وہ بندے ہیں اور تجھے مارنے کے لیے آئے ہیں۔ جمالے.....! یہ پھڈالسا ہو جائے گا۔“

”تو ڈر گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اونہیں، میں نہیں ڈرنا، بلکہ سمجھا رہا ہوں کہ.....“

”چل ٹھیک ہے پھر جاتے ہیں سردار کے پاس اس کی منت ترلا کرتے ہیں اس کے چیر پڑیں گے، مان گیا تو ٹھیک درنہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیں گے۔“ چھاکے نے جل کر کہا تو دلبر بولا۔

”اوائے جان تو ایک بار جانی ہے، سردار سے ٹکر لینے کا مطلب ہے پھر ہم سکون سے نہیں بیٹھ سکیں گے۔ یادہ ختم ہوگا یا ہم..... باقی تو جو کہے گا، میں وہی کروں گا۔“ اس نے چھاکے کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”چل ٹھیک ہے، تو کر سکون میں چلتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ غصے سے بولا۔

”یار تو کوئی اور چکر کیوں نہیں چلاتا، ہم بھی سامنے نہ آئیں اور وہ بندے بھی نہ رہیں؟“

”تو پھر سن..... پیر زادے کے جن بندوں سے تیری دشمنی چل رہی ہے ان کا کوئی ایک بندہ تیرے ہتھے چڑھ سکتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ چونکتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گیا۔ چل اٹھ نکلیں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھ کر کنویں کے پاس بنے کچے کمروں میں سے ایک کمرے میں گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ میرے چھاکے اور دلبر کے علاوہ تین بندے اور تھے۔ انہوں نے بھی ہتھیار سنبھالے اور ہم ایک جیب اور تین بایک پر نکل پڑے ہمارا رخ پیر زادے کے علاقے کی طرف تھا۔

ہمیں اپنا شکار تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ہمیں معلوم تھا کہ پیر زادہ کے علاقے میں شراب نکالنے والی بھٹی کہاں چل رہی ہے۔ وہ راستہ اگرچہ تھوڑا سا مشکل تھا، لیکن ہمارے لیے وہاں جانا انتہائی آسان تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے میں ان کے پاس کئی لوگ آتے جاتے تھے۔ ہم نے دو بایک کی ہیڈ لائٹ بجھا دی جبکہ ایک کی روشن رکھی۔ ہم بھٹی کی قریب پہنچ کر رک گئے۔ مجھ سے زیادہ دلبر تیزی دکھا رہا تھا۔ اسے بڑے عرصے بعد موقع ملا تھا کہ ان سے اپنا انتقام لے سکے۔ میں نے تیز نگاہوں سے وہاں پر موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ وہاں پر تین بندے تھے۔ ایک بھٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، دوسرا کچے کمرے کے باہر زمین پر بیٹھا ہوا لالین کی روشنی میں کچھ کر رہا تھا۔ جبکہ تیسرا چارپائی پر کرودٹ کے بل

لیٹا ہوا تھا۔

”کیا خیال ہے ذرا انتظار کر لیں؟“ میں نے دلبر سے پوچھا۔

”نہیں..... انہوں نے ہمیں آتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا، اگر یہاں رک گئے تو وہ چوکنے ہو جائیں گے۔ دلبر نے میری بات نہ مانی۔

”چلو پھر.....!“ میں نے باقی سب کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور دلبر کے ساتھ ان کے پاس چلے گئے۔ جیسے ہی ان کی نگاہ دلبر پر پڑی، چارپائی پر بیٹھا ہوا بندہ تیزی سے اٹھا اور لاشعوری طور پر اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کمرے کے باہر بیٹھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”رک جاؤ.....!“ میں نے اونچی آواز میں کہا تو وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ میں آگے بڑھا تو وہ بولا۔

”جمالے..... یہ تو دلبر کو ساتھ لے کر کیوں آ گیا ہے۔“

”پھر کیا ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

”دشمن کا دوست دشمن ہی ہوتا ہے۔ اسے لے کر چلا جا یہاں سے ورنہ.....!“ اس چارپائی والے بندے نے انتہائی غصے میں کہا۔

”ورنہ کیا کرے گا.....؟“ میں نے پوچھا تو اس نے انتہائی غلیظ گالی دیتے ہوئے کہا۔

”مار دوں گا..... تجھے بھی اور اسے بھی..... چل نکل یہاں سے.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”مگر..... میں تجھے لینے کے لیے آیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے چشم زدن میں اپنا ریوالتور نکالا اور اس کے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ وہ ڈکارتے ہوئے پیچھے کی طرف لپکا۔ میں نے جان بوجھ کر اس کا نشانہ نہیں باندھا تھا۔ فائر کی آواز سننے ہی چھاکے سمیت چاروں تیزی سے آگئے۔ انہوں نے آتے ہی تینوں کو پکڑ لیا۔ چند منٹ مارا ماری چلتی رہی۔ انہوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن زیادہ دیر نہیں بٹھہر سکے۔ کچھ ہی دیر بعد ان تینوں کو باندھ لیا گیا۔

”انہیں جیب میں پھینکو اور خیال رکھو ان کے منہ بند رہیں۔“ میں نے کہا اور بایک پر جا بیٹھا۔ میرے ساتھ ہی دلبر لکھا اور ہمارے ساتھ باقی بھی نکل پڑے۔ اب ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا تھا۔

سردار شاہ دین کے ڈیرے سے کچھ دور ہم سب رک گئے۔ میں نے راستے میں دلبر کو سمجھا دیا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ وہیں رک گیا۔ جبکہ میں اور چھاکا وہاں سے پیدل آگے بڑھے۔

ہم سے کچھ فاصلے پر ڈیرے کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ سردار شاہ دین کا ڈیرہ بھی کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔ گیٹ پار کرتے ہی بڑا سا راجن دکھائی دیتا تھا۔ ان کے اطراف میں تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے اور ایک جانب سردار شاہ دین کے مہمانوں کے لیے ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے علاوہ دوسرے متعلقہ کمرے تھے۔ کمروں کے آگے

الائن تھا۔ جن کے اوپر ”یو“ کی شکل میں چھت تھی۔

ہم ڈیرے کے پچھواڑے کی طرف سے آگے بڑھے تھے۔ چاہے بیرونے اگر درست معلومات دیں تھیں تو ان لوگوں کو

مہمت پر ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ ان کے بستر وہیں پر لگائے گئے تھے۔ اب وہاں پر کیا صورتحال تھی اس کا مجھے پکا یقین نہیں تھا۔ وہاں کچھ دوسری صورتحال کا بھی سامنا ہو سکتا تھا۔ تاہم اس وقت ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ ڈیرے کی چھت تک

نہننا تھا۔ گھپ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بہت عرصہ پہلے ڈیرے پر آیا تھا۔ پھر گاہے بگاہے ادھر سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ ڈیرے کے پچھواڑے کی مشرقی سمت میں اینٹوں کی دراڑیں چھوڑی

ہوئی تھیں۔ میں نے وہیں سے اوپر چڑھنے کا سوچا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اندازے کے مطابق اس طرف بڑھ رہا تھا۔

میرے ذہن میں اک اور بھی خطرہ تھا۔ ڈیرے میں جب سارے لوگ اپنی جگہ تک جاتے تھے تو باہر کی طرف کتے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ جو باہر کی طرف سے نہ صرف وقت سے پہلے انہیں الٹ کر دیتے تھے بلکہ چوکیدار کے لیے بہت حد تک معاون بھی ہوتے تھے۔ کتوں کے کھلنے سے پہلے پہلے میں اپنا کام مکمل کر لیتا چاہتا تھا۔ میں جیسے ہی مشرقی کونے تک پہنچا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ دراڑیں کے ذریعے چڑھنے لگا۔ اس وقت اوپر چڑھتے ہوئے مجھے اپنے وزن کا احساس ہوا۔ میں نے ہمت کی اور آہستہ آہستہ اوپر تک پہنچ گیا۔

میں نے محتاط انداز میں چھت پر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اپنے وزن کے باعث ان دراڑوں پر زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے صرف ایک اندازہ تھا کہ ذرا فاصلے پر ایک قطار میں چار پائیوں پر بستر لگے ہوئے تھے اور ان پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور چار دیواری پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ ہلکی سی دھپ کی آواز آئی۔ میں سکون سے بیٹھا رہا اور کچھ دیر تک کسی بھی رد عمل کا انتظار کرتا رہا۔ زرا دیرونی ساکت بیٹھے رہنے کے بعد اٹھا پھر اٹھ کر نیچے چھاکے کو نارنج کے جلانے اور بچانے سے اشارہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اوپر آ گیا۔ پھر دونوں طرف دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

”گلتا ہے یہاں کوئی نہیں ہے؟“

”ہیں نہیں تو آجائیں گے۔“ میں نے سرگوشی میں کہا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر محن میں جھانکا، وہ چھ کے چھ محن میں بیٹھے ہوئے تھے اور وحشیانہ انداز میں کھانے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے بھی کھانا دیکھا ہی نہیں ہے۔ ان کے قریب ہی چاچا پیر وکی خادم کی مانند کھڑا تھا۔ میں چاہتا تو یہیں کھڑے کھڑے ان کا نشانہ لے کر انہی چار پائیوں پر انہیں ختم کر دیتا۔ مگر میں کچھ اور چاہتا تھا تھا۔ مجھے اس وقت تک صبر کرنا تھا جب تک وہ اوپر نہیں آ جاتے۔ میرے ذہن کے گوشے میں یہ خطرہ بہر حال موجود تھا کہ ممکن ہے ان کے علاوہ کوئی دوسرے بھی یہاں ہوں۔ یہاں سے انہیں ختم کرنے میں سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہو جانے والا تھا۔ مجھے اب صرف ان کا انتظار ہی کرنا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے جاں گسل انتظار کے بعد ان کا رخ سیڑھیوں کی طرف ہوا۔ وہ سب آگے پیچھے چھت کی جانب بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ غافل ہو کر سونا نہیں چاہ رہے تھے۔ ممکن ہے ان میں کچھ چوکیداری بھی کرتے، لیکن میں انہیں اتنا موقع دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ پوری طرح اندازہ تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر کہاں آئیں گے۔ اس لیے میں ان کی مخالف سمت میں بالکل سامنے کی طرف اوٹ میں چھپ گیا۔ چھاکا سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان فقط چند لمحوں کی دوری تھی، پھر جو کچھ کرنا تھا وہ انتہائی تیزی سے کرنا تھا۔ تبھی چھت پر پہنچ ہوئی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اپنے بستروں پر آئے۔ ہم دم سادھے انہیں دیکھتے رہے پھر جیسے ہی وہ چار پائیوں پر بیٹھنے لگے، میں نے ایک کا نشانہ لے کر گولی چلا دی، جس وقت تک وہ کچھ سمجھتے دوسرے کے منہ سے چیخ بلند ہوئی، پھر تیسری، چوتھی..... میں نے میگزین خالی کر دیا۔ یہی حال چھاکے کا تھا۔ انہیں ہتھیار رکھ کر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملی، شاید ان کے گمان میں یہی تھا کہ اس حویلی نما ڈیرے پر کون آ کر ان پر وار کر سکتا ہے، جنہیں سارا دن باہر کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ فوراً ہی ان کی طرف پلکارا رسک تھا لیکن وہاں بیٹھے رہنا اس سے بھی زیادہ رسک تھا۔ میں نے کوئی پروانہ کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ دوسرا میگزین لگایا اور ان کی طرف بڑھا۔ کوئی تڑپ رہا تھا اور کوئی موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ میں نے ایک نگاہ ان پر ڈالی تو مجھے خود جھرجھری آگئی۔ یہ میری پہلی درندگی تھی۔

جب کوئی کسی پر ظلم کر رہا ہو تب اتنا جوش نہیں ہوتا، جتنا بدلہ لینے وقت جوش ہوتا ہے۔ مظلوم جب انتقام لینے پر اتر آئے تو پھر اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ بدلے کی آگ انسان کے اندر قوت بھر دیتی ہے اور یہ قوت اندھی ہوتی ہے۔

اس میں کون کس قدر جل جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ میں اور چھاکے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر اپنے سامنے تڑپتے ہوئے ان لوگوں کو جنہیں اگر میں ختم نہ کرتا تو وہ مجھے ختم کر دیتے۔ ہم نے چشم زدن میں فیصلہ کر لیا کہ کیا کرنا ہے چھاکا پاؤں کی طرف سے اور میں نے بازوؤں کی طرف سے ایک کو پکڑا اور ڈیرے کے پچھوڑے پھینک دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس کے کچھ بچے کچھ سانس بھی ہوں گے، وہ اتنی اونچائی سے گر کر ختم ہو جائیں گے، یکے بعد دیگرے باقی ہالوں کو بھی ایسے ہی جھلا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے ان کے ہتھیار اکٹھے کیے اور وہ بھی ایک ایک کر کے نیچے پھینک دیے۔ میں نے چھاکے کو اشارہ کیا کہ وہ نارنج سے دلبر کو کام مکمل ہو جانے کی اطلاع دے دے اور خود چھت کے کنارے ہا کر نیچے محن میں دیکھا۔ فائرنگ کی آواز سے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ نیچے پہل نہ مچی ہو۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ۱۲ چاچے بیدار کے، کوئی بھی محن میں نہیں تھا۔ وہ حیران اور پریشان اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور دراڑوں کے ذریعے نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ چھاکا مجھ سے پہلے ہی نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ پھر دھپ کی آواز کے ساتھ پتے چڑھائے تو میں سمجھ گیا چھاکا نیچے اتر گیا ہے۔ میں نے بھی اس کے قریب چھلانگ لگا دی۔

”یار! ڈیرے میں چاچے بیدار کے علاوہ کوئی بندہ ہی نہیں ہے، وہ اکیلا.....“ میں نے سرگوشی میں تیز پتھر کہا تو اس نے مہر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”سارے ملازمین ہیں، مگر وہ نشے میں دھت ہوں گے، انہیں ساتھ میں بہت کچھ ملا کر دیا ہے، تو ان کی فکر مت کر، یہاں مکمل۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اُس جانب دیکھا جہاں سے جیب آنا تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں اور اس کے گھر گھر سے اندازہ ہو گیا، جیب رکھتے ہی دلبر کے ساتھ اس کے دوسرا تھی تیزی سے اتر کر آئے۔

”وہ تیسرا کہاں ہے؟“ چھاکے نے پوچھا تو دلبر نے سرگوشی میں نارنج کی محدود روشنی میں دیکھا اور بولا۔

”ان تینوں کے پاس جو بندھے ہوئے پڑے ہیں، چل اٹھا کر انہیں جیب میں ڈال۔“

”ہم نے تیزی سے انہیں جیب میں ڈالا، ہتھیار اٹھا کر ان کے قریب رکھے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔ ہم جیب میں لٹکے ہوئے تھے لیکن ہمیں وہاں سے تھوڑا فاصلہ ہی طے کرنا تھا، جلد ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں پردہ تینوں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے دلبر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”لے بھی دلبر..... تو اپنا بدلہ لے لے۔“

ٹاپا وہ اس لمحے کا منتظر تھا، اس نے اپنا ریوا لور نکالا اور بہت قریب سے اپنے سامنے بندھے ہوئے تینوں بندوں پر خالی کر دیا۔ ہم سب ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ ناسور تھے جو ظالم کے ہاتھوں کو مزید مضبوط کرنے کا باعث بنتے تھے، اپنے جیسے لوگوں پر زیادہ ظلم کرتے۔ پھر جیسے ہی دلبر تیز تیز سانسیں لیتا ہوا پیچھے ہٹا، میں نے اپنی اندرونی جیب سے ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔

”پکھا.....؟“

”رکھ لو.....! اور یہ ذہن میں رکھنا، نہ تم نے کچھ دیکھا ہے اور نہ کیا ہے، تم جاؤ اپنے کنویں پر، اور جا کر بکرا ذبح کرو، میں.....“

اس نے بڑے سکون سے وہ گڈی پکڑی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان لاشوں کو اتار کر نیچے پھینکا۔ پھر انہوں نے ہال ہال ہمارے حوالے کی اور خود جیب پر سوار ہو کر چلے گئے، تبھی میں نے چھاکے سے کہا۔

”مکی وقت سب سے خطرناک ہے، زندہ ہوا، یہیں کہیں پاس ہے اپنی نفی لے کر..... کہیں ان کے ساتھ ہم بھی..... سمجھ.....“

ساچلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر گردوارہ تھا جسے دیکھتے ہی جہاں نے کہا۔

”اب ہمیں اس ڈائریکشن میں آگے جانا ہے، کیا تم ٹھیک طرح سے وہاں تک پہنچ جاؤ گی؟“

”تم فکر نہیں کرو جی، میں نے اس شہر میں پڑھا ہے اور میرا کالج اسی علاقے میں تھا یہاں تک فقط دس منٹ کے فاصلے پر وہ جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہوگا، بس پارک سے اگلی والی دائیں گلی میں مڑ جانا۔“ ہر پریت نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ مطمئن ہو کر ڈائریکٹ کرنے لگا۔ ہر پریت اسے دائیں بائیں مڑنے کا کہتی رہی اور وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بولی۔ ”جیسی..... اوہ دیکھو..... اوہ سامنے گھر ہے اب تم دیکھ لو اپنے حساب سے کہ پارک تک کہاں کرنی ہے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بھی ایک کار اسے کراس کرتے ہوئے آگے جا کر بائیں طرف کا اشارہ دے کر آہستہ ہو گئی۔ وہ بھی آہستہ ہو گیا۔ آگے والی کار رک گئی تو جہاں نے بھی جیپ روک دی اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ ہر پریت نے جس عمارت کی نشاندہی کی تھی وہ اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھے۔ کار سے ایک لمبا تڑنگا لوجوان برآمد ہوا۔ اس نے بلیک ڈریس چٹلون کے ساتھ سفید چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔

وہ بڑے اعتماد سے جیپ کے ڈائریکٹ سائیڈ کی طرف آیا تب تک جہاں نے شیشہ اتار لیا۔

”جوگی ہوں جہاں جی۔“

”اوہ..... تم ہو.....“ اس نے جواب دیا اور پھر ہاتھ ملایا۔

”یہاں صرف دو لوگ ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ ان میں من راج ہے کہ نہیں باقی سیکورٹی کے نام پر صرف دو بندے ہیں انہیں قابو میں کرنا کچھ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔“ جوگی نام کے اس لوجوان نے آہستگی سے عام سے انداز میں کہا۔

”اور کتنے لوگ ہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ممکن ہے دو چار ملازم ہوں..... مزید..... میں نے شام ہی کے وقت جائزہ لے لیا تھا۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”ٹھیک ہے ڈن.....“ جہاں نے کہا۔

”ڈن..... پلان میں نے آپ کو بتا دیا تھا۔“ اس نے کہا اور پلٹ گیا جہاں نے وہیں گاڑی کو موڑا اور پھر سڑک کی سائیڈ پر لگا دیا۔ پھر اپنا پستل نکال کر دیکھا، میگزین رکھے تو ہر پریت نے بھی ڈیش بورڈ سے پستل نکال لیا، تبھی جہاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دروازہ کھلا چھوڑ کے نیچے اتر آؤ۔“

”جہاں.....!“ ہر پریت نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا جس میں جذبات کھٹک رہے تھے۔ ”پتہ نہیں ہم زندگی کے ساتھ لوٹ بھی سکیں گے یا نہیں سو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ہاتھیں پھیلا دیں۔ اس نے ہر پریت کو نہ صرف گلے لگایا بلکہ اس کے ہونٹوں پر پیار کی مہر بھی ثبت کر دی۔ یہ سب چند لمحوں میں ہوا۔ کیونکہ سامنے کی تیز روشنی میں وہ نہا گئے تھے۔ کسی گاڑی نے ان کے قریب سے ٹرن لیا تھا۔ وہ ایک دم ہنس دیے اور پھر جیپ سے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے دیکھا جوگی کے ساتھ ایک اور لوجوان بھی دھیرے دھیرے جا رہا تھا۔ وہ بھی یوں چل پڑے جیسے باہر داک پر نکلے ہوں۔ اور دونوں لوجوان اس عمارت کے گیٹ پہنچ چکے تھے۔ جس وقت یہ گیٹ کے سامنے پہنچے ایک سیکورٹی گارڈ سے جوگی اندر من راج کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”صاحب تو اس وقت سو گئے ہیں آپ کو اس وقت کیا کام پڑ گیا۔“

”کوئی ضروری کام ہے تو اس لیے آئیں ہیں۔ تم انہیں اطلاع دو۔“

”آپ انہیں فون کر لیں گے صاحب اور میری بات کروادیں۔ پھر میں.....“ لفظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے کہ

”تم فکر نہ کرو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور پھر جیسے ہی میں بیٹھا اس نے ایک طرف کارخ متعین کرتے ہوئے بائیک ہوا کر دی۔

ہمارے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ ہم اس حالت میں گاؤں نہیں جاسکتے تھے۔ ہمیں ان کپڑوں سے جان چھڑانا تھی۔ میرے ذہن میں یہ پہلا اچھی طرح موجود تھا کہ ہمارے ہاں جہاں سراغ لگانے والے کھوجی ہوتے ہیں، ہاں کھوج لگانے کا کام کتوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ میں اس کھوج کورسے ہی میں ختم کر دینا چاہتا تھا کہ اگر کوئی کوشش بھی کرے تو مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ حالانکہ میں خود انہیں یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ یہ سب میں نے ہی کیا ہے۔ اب جبکہ آنکھ پھولی کا کھیل شروع ہی ہو چکا تھا تو کیوں نہ میں اسے چوہے بلی کا کھیل بنا دوں۔ میں نے بھیدے کو ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر انتظار کرنے کے لیے کہا ہوا تھا۔ سو میں نے چھاکے کو کہہ دیا کہ وہ ادھر جائے۔

جلد ہی ہم نہر کنارے جا پہنچے۔ ذرا فاصلے پر ایک برجی کے پاس بھیدہ بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ وہاں یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے پانی لگانے کے لیے وقت کے انتظار میں ہو۔ اس کے پاس ایک لائٹنگ لائٹیں اور کسی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر رک گیا۔ پھر بغیر کچھ کہے اپنے کپڑے اتار کر ایک طرف پھینک دیئے اور نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے خود کو مل کر صاف کیا جب یہ یقین ہو گیا کہ میرے کسی جگہ خون نہیں لگا تو باہر آ گیا۔ بھیدہ میرے کپڑے لیے کھڑا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے پہنے تو چھاکا بھی نہا کر نکل آیا۔ وہ بھی کپڑے پہن چکا تو بھیدے نے جلدی سے بائیک کو پانی مارا، چھاکے نے لائٹیں کا تیل ان کپڑوں پر ڈالا اور انہیں جلا دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ جل کر خاک ہو گئے جسے نہر میں بہا دیا گیا۔

”بھیدے..... چل تو اب واپس ڈیرے پر جا.....“ میں نے اتنا کہا اور جواب سے بنا آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ اب گاؤں کی طرف تھا اور میں نے گھوم کر جانا تھا۔ راستے میں شہر کو جانے والی کئی سڑک آتا تھی پھر سردار شاہ دین کی حویلی اور گاؤں کا کنارہ مجھے امید تھی کہ جب تک میں نے وہاں پہنچنا تھا حویلی میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ ہو جانا تھا۔

میں اور چھاکا ایک ہی بائیک پر تھے۔ حویلی کے سامنے پہنچ کر میں نے رفتار جان بوجھ کر آہستہ کر لی۔ مجھے لگا کہ وہاں پر کوئی پہنچ نہیں ہے ماحول بالکل پرسکون ہے۔ میں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ گاؤں کی گلیوں میں بھی وہی سنسان پن تھا جو معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ میں نے بائیک اپنی گلی کی جانب موڑ لی۔

ماں جیسے میرے انتظار میں ہی تھی۔ جب تک میں نے صحن میں بائیک کھڑی کی اس وقت تک چھاکا باہر والے کمرے میں ہتھیر رکھ آیا۔ ماں کچن میں چلی گئی اور میں اندر کمرے میں جا کر بسکون سے لیٹ گیا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو گیا ہوگا رندھاوانے کیا کیا دلبر واپس کنویں پر پہنچا تھا یا نہیں اور خاص طور پر سردار شاہ دین کو ڈیرے پر ہونے والے واقعہ کی اطلاع ملی یا نہیں۔ ان سب سوالوں کے جواب میرے پاس نہیں تھے۔ ویسے بھی شام سے مسلسل بھاگ رہا تھا۔ جس کے باعث تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے دماغ سے سب کچھ نکالا اور صبح نور کے تڑکے کا انتظار کرنے لگا۔



جس وقت جہاں نے جالندھر شہر کے ماڈل ٹاؤن والے پل سے نیچے جیپ اتاری تو ہر پریت نے دائیں جانب مڑنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں غور سے راستہ دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں سر شام ہی جالندھر میں پہنچ چکے تھے اور اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ اگر درودی روشنیوں سے راستہ روشن تھا۔ جہاں نے نیلی چین اور بلیک ٹی شرٹ کے ساتھ جوگر پہنے ہوئے تھے اور سر پر سیاہ رنگ کی پکڑی تھی۔ جبکہ ہر پریت نے وہی دوپہر والا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اس نے اپنے گیسو و سنوار کر باندھ لیے تھے۔ بس تبدیلی یہی تھی کہ اس کے پاؤں میں بھی گرے رنگ کے جوگر تھے۔ اس سڑک پر تھوڑا

ہاندھنے دیا۔ من راج ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ختم ہو گیا۔ اب اس لڑکی سے پوچھو دوسرا کہاں ہے؟“

”سنا تم نے۔“ یہ کہتے ہوئے ہر پریت نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

”اس سے کیا پوچھتے ہو میں بتاتا ہوں۔“ دروازے کی جانب سے آواز آئی تو دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک سکھ ہاتھ میں ریوا لور لیے کھڑا تھا۔ وہ لمبا ترنگا اور صحت مند تھا۔ ”یہ من راج بھی نہ..... لڑکی دیکھتے ہی پاگل ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ تمہاری بیٹی کمزوری تھے لے ڈوبے گی وہی ہوا..... غفلت کا فائدہ اٹھایا تم لوگوں نے..... پڑی رہنے دو وہ لڑکی وہیں پر۔ دونوں اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر وہیں زمین پر لیٹ جاؤ۔“

”میں ایسا نہیں کروں گا..... تم گولی چلاؤ.....“ جہاں نے سرد لہجے میں کہا تو ایک لمحے کے لیے سکھ نو وارد کے چہرے پر

”میں دلیر لوگوں کی قدر کرتا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں دلیر دشمن کو بھی چھوڑ دوں۔“

”ہونہر دلیر.....!“ ہر پریت نے طنزیہ انداز میں کہا تو سکھ نو وارد نے اس کی طرف دیکھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس سے جہاں لے فائدہ اٹھایا اس نے جھکا دی اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا وہ چشم زدن میں یوں پھسلتا ہوا اس کے قریب گیا کہ اپنی آلات تمہا کر اس کے گھٹنے پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑایا اور آگے کی طرف گرا۔ ہر پریت ہوا میں اچھلتی ہوئی اس پر آ پڑی۔ لور اس اچانک آفتاد سے سنسنبھل نہیں سکا تھا اس لئے فرش پر گر گیا۔ یہی کمزوری اسے لے ڈوبی۔ لمحوں میں دونوں نے اس کی درگت بنا دی۔

”زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“ ہر پریت نے جہاں کو احساس دلایا جو سکھ نو وارد کی دھلائی میں مگن تھا۔ تبھی وہ اس پر چڑھ بیٹھا پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے سر کو زور سے جھٹکا دیا تو نیچے پڑا وہ شخص ایک لمحے کے لیے تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ جہاں نے اٹھ کر اس پر ہنہ لڑکی کو دیکھا جو اندھے منہ پڑی دہشت سے کانپ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھا، تبھی

”مجھے کچھ نہیں کہنا..... میں ان کی ساتھی نہیں ہوں..... میں تو.....“

للا اس کے منہ ہی میں رہ گئے اور جہاں نے اس کی گردن اپنے پنجوں میں دیوچ لی۔ پھر اس وقت چھوڑا جب وہ دنیا

ہاں کی۔

”اللو.....!“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہاں سے یوں نکلے جیسے وہ لوگ دوبارہ زندہ ہو کر ان پر حملہ آور

ہاں گئے۔

اولوں پورچ میں آ کر رک گئے۔ انہوں نے بڑے دھیان سے باہر کا جائزہ لیا۔ جوگی اور اس کا ساتھی ان کے انتظار میں تھے۔ دونوں ہی سائیڈ روم سے باہر آ گئے اور پھر گیٹ سے باہر نکلتے چلے گئے۔ جہاں کے لیے راستہ صاف تھا۔ وہ لال سے نکلا اور گیٹ تک پہنچا۔ باہر پرسکون ماحول تھا۔ جوگی ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی کے پاس

”ہاں اس کے قریب گیا تو وہ بولا۔“

”اوہ کیدار تھے..... بے ہوش ہیں۔ انہیں آپ کی آمد کی خبر نہیں ہوئی۔“

”اوہ..... اب باقیوں کا پتہ کرو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چین کی جیب میں ہاتھ ڈالا پھر ہاتھ باہر نکالا تو اس میں

جوگی نے اسے اندر کی جانب دھکا دیا۔ سیکورٹی گارڈ کو شاید امید نہیں تھی کہ کوئی یوں انہیں دھکیل دے گا۔ اس لیے وہ لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے وہ سنسنبھلتا اور اپنی گن سیدھی کرتا اس کے ساتھ والے نو جوان نے اس کا گلا دیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستل اس کے سر پر دے مارا۔ وہ دونوں وہیں سیکورٹی گارڈ کو ہٹا رہے تھے جبکہ جہاں اندر داخل ہو گیا۔ پورچ چند قدم پر تھا۔ وہ دونوں تیزی سے اندر چلے گئے۔ توقع کے مطابق دروازہ لاک تھا۔ جہاں نے جیب سے ایک تار نکالی اور لاک سے قسمت آزمائی کرنے لگا۔ جبکہ ہر پریت نے وہاں کی روشنیاں بجھا دیں۔ اب وہ اندھیرے میں تھے۔ لاک کھلنے میں چند منٹ لگے تھے۔ سامنے راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ دائیں بائیں کمروں میں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جہاں نے رک کر کسی آواز کو سننے کی کوشش کی۔ تبھی انہیں ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی بہت دور سے بات کر رہا ہو آواز تو آ رہی تھی لیکن لفظوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اچانک ہر پریت نے اوپر کی جانب اشارہ کیا۔ جہاں نے سر ہلایا اور آگے چل پڑا۔

ڈرائنگ روم میں سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جاری تھیں۔ وہ دونوں آگے پیچھے محتاط انداز میں اوپر چڑھتے چلے گئے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ متوقع آواز سننے کے لیے ساکت ہو گئے۔ مگر وہاں بالکل خاموشی تھی۔ جہاں نے اپنے اعصاب کو مضبوط کیا اور خود پر چھا جانے والی جھنجھلاہٹ کو دور بھگا دیا۔ وہ سانس روکے کسی آہٹ کا منتظر تھا، تبھی ایک کمرے سے قہقہہ لگنے کی آواز سنائی دی۔ مردانہ قہقہے کے ساتھ نسوانی قہقہہ بھی شامل تھا۔ ہر پریت اور جہاں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اس دروازے تک جا پہنچے۔ جہاں نے کی ہول سے اندر جھانک کر دیکھا، پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔

”بے غیرت.....“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پھر اس نے دروازے کو چیک کیا وہ لاک نہیں تھا اور نہ ہی اندر سے بند تھا۔ جہاں نے سانس روکا، پھر طویل سانس لی اور ایک دم سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

من راج فقط ایک جاگلیے میں بیٹھ پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکی برہنہ حالت میں موجود تھی۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو حواس باختہ ہوا پھر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”مجھے نہیں لگتا تھا کہ تم اتنی جلدی کھل کر میرے سامنے آ جاؤ گے۔ خیر..... اب آ ہی گئے ہو تو سکون سے خود کو میرے حوالے کر دو.....“

”دوسرا کہاں ہے.....؟“ نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے من راج کی بات بالکل نظر انداز کر دی تھی۔ تبھی من راج نے اس کے پیچھے دیکھا اور بولا۔

”تمہارے پیچھے!“

”یہ حربہ بہت پرانا ہو چکا ہے من راج..... مجھے تو تم کسی خفیہ کے نہیں کرائے کے ٹٹو لگتے ہو۔ کھڑے ہو جاؤ۔“ جہاں سنگھ نے کہا تو وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔ لاشعوری طور پر اس نے چپل پہننے کی کوشش کی، تو اس اثناء میں اس کا ہاتھ نیچے کے نیچے سرک گیا۔ جہاں اس کے لیے پوری طرح تیار تھا، ایک لمحے سے بھی کم وقت میں وہ اس کے سر پر جا پہنچا اور اپنی کہنی اس کی گردن کی پشت پر ماری، وہ ڈکارتا ہوا زمین پر جا گرا۔ تبھی اس لڑکی نے جہاں کو پیچھے سے پکڑنے کی کوشش کی، تب تک ہر پریت کمرے میں آ چکی تھی اور اس نے گھا کر لات اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ آؤخ کی آواز نکالتی ہوئی بیڈ پر گری اور پھر بیڈ سے نیچے جا گری۔ اس دوران جہاں نے زمین پر اوڑھ بے منہ گرے من راج کی پیٹھ پر لات ماری پھر اس کی پشت پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے گردن دبا دی۔ من راج مچھلی کی مانند ترپنے لگا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے یہاں تک کہ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ دوسری طرف لڑکی اپنا پیٹ دبائے زمین پر پڑی تھی۔

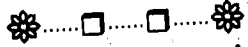
”اسے جلدی سے باندھو۔“ جہاں نے ہر پریت سے کہا تو وہ اس کے قریب پڑے ہوئے اس کے کپڑوں سے لڑکی کو

”ہر پریت.....! فائز یونہی نہیں بن جاتا، اس کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے، میں تجھے بہت کچھ سکھا دوں گا، لیکن تم ہر حالت میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو.....“

”میں تمہاری ہوں جیسی.....!“ اس نے کہا تو ایسے لحاظ میں چلتی ہوئی جیب اچانک لڑکھڑائی جس پر فوراً ہی ہر پریت نے قابو پالیا اور بریک لگا دیئے۔ تبھی وہ دونوں ہنس دیئے۔

”لاؤ..... گاڑی میں چلاتا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو ہر پریت اتر کر دوسری طرف سے سوار ہو گئی۔ جہاں نے جیب آگے بڑھا لی تو ہر پریت نے اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ لیا۔ وہ سہانے سپنوں میں کھو جانا چاہتی تھی۔ لیکن تلخ حقیقت اس کے خوابوں کو زہر آلود کیے ہوئے تھی۔

انہی لحاظ میں اس نے جہاں کا ہر طرح کے حالات میں ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔



صبح کی سحر انگیزی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ مشرق سے طلوع آفتاب کے آثار واضح ہونے کو تھے۔ جب میں اپنی بانگ لکال کر گھر سے نکلا، میں اپنے معمول کے مطابق ڈیرے کی طرف نکل پڑا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہیں پر جا کر سو جاؤں کیونکہ رات بھر مجھے اور جھاکے کو نیند نہیں آتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک ہم چھت پر جا کر باتیں کرتے رہے تھے پھر میں وہیں چار پارٹی گھیٹ کر لیٹ گیا جبکہ وہ باہر والے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں نے جا کر اسے دیکھا تھا وہ وہاں نہیں تھا۔ میرے چھت پر سے نیچے اترنے سے پہلے ہی وہ چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے من میں تجسس تھا کہ جو کچھ بھی ہم نے رات کیا اس کا رد عمل کیا ہوا؟ سردار شاہ دین کے ڈیرے پر نہ صرف فائرنگ ہوئی تھی بلکہ وہاں سے بندے اغوا کر لیے گئے تھے جن کی لاشیں دور ویرانے میں پائی گئی تھیں۔ اصل سوال یہ تھا کہ کیا سردار شاہ دین ایس کسی بھی صورت میں قبول کرتا ہے؟ یا پھر انجان بن جاتا ہے؟ وہ ملک سجاد کو کیا جواب دے گا؟ ملک سجاد کا رد عمل کیا ہوگا۔ وہ انتقام لینے کے لیے مزید طاقت استعمال کرے گا یا پھر خوف زدہ ہو کر خاموش ہو جائے گا؟ پیر زادہ کے بندے مارے گئے تھے۔ اس کا رد عمل کیا تھا؟ اور رندھاوا اس نے سارے کھیل کا کیا کیا تھا؟ جس کی بساط میں نے بچھادی تھی۔ کیا الہام اور ساتھی وہیں کنویں پر ہوں گے یا پھر کہیں ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے؟ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دلبر کے کنویں کی طرف سے ہو کر جاؤں مگر اس میں کافی حد تک رسک تھا۔ یا میرے معمول کے خلاف تھا، میں کم از کم اپنی طرف سے کوئی شک ٹھکانا نہیں چاہتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں غلطیاں گھر سے نکل کر چوک میں پہنچا تو کافی سارے لوگ جمع تھے۔ میں نے اسی ان کے قریب جا کر بایک روک دی اور اونچی آواز میں پوچھا۔

”اوائے سب خیر تو ہے نا، یہ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟“

”اوائے جمالے.....! تجھے نہیں پتہ۔ یہاں تو پورے علاقے میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔“ ایک جو شیلے نوجوان نے تیزی سے کہا تو میں نے اپنے اندر کا تجسس دباتے ہوئے لا پرواہی سے پوچھا۔

”کیا زلزلہ آ گیا تھا رات.....؟“

”اوائے، تمہیں مذاق سو جھ رہا ہے، ادھر تو بندے ایک ہی رات میں قتل ہو گئے ہیں۔“ اس نے دیدے پھیلا کر یوں کہا کہ مجھے ڈرا دینے کو ہو۔

”تو بندے.....؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”اسنے بندے کس نے مار دیئے.....؟“

”پولیس پتہ چلا۔ ان سب کی لاشیں تھانے میں ہیں۔ رات پولیس بھی ادھر پہنچ گئی تھی۔“ ایک دوسرے بندے نے معلومات دیں۔

جوگی نے وہ پکڑا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ہر پریت اپنی جیب میں جا کر بیٹھ چکی تھی۔ اس لیے جیسے ہی جہاں بیٹھا، اس نے جیب بڑھا دی۔ ان کا رخ اب اوگی گاؤں کی طرف تھا۔

جاندھر سے نکلنے تک وہ دونوں خاموش تھے۔ پھر جیسے ہی وہ رسول پور کلاں کے قریب سے گزر رہے تھے تب ہر پریت نے جیب کے اندر کی خاموشی کو توڑا۔

”کافی اچھے فائز لگتے ہو۔“

”یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو یا اپنی رائے دے رہی ہو۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ظاہر ہے اپنی رائے دے رہی ہوں۔“

”بہت شکریہ۔“ وہ اختصار سے بولا تو اس نے کہا۔

”میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم..... بہت خوبصورت ہو، تمہارے حسن میں.....“ اس نے لہجہ کو ردمانوی بناتے ہوئے کہا۔

”نا میں جی..... میرے حسن کے بارے میں نہیں میری فائٹ کے بارے میں.....“ وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

”اُو..... ٹھیک ہے، لیکن ایک بات ہے، جب انسان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہو تو صورت حال مختلف ہوتی ہے پھر نہ فائٹ دیکھی جاتی ہے اور نہ فائز..... بس پھر مد مقابل کو ختم کرنے کا سوچا جاتا ہے۔“ جہاں نے کہا تو وہ ہنسنے ہوئے بولی۔

”یہ میرا دل رکھنے کو کہہ رہے ہونا، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میں اچھی فائز نہیں ہوں، مجھے سیکھنے کا اتنا زیادہ موقع نہیں ملا۔“

”یہ ٹھیک کہا تم نے..... دراصل اسٹریٹ فائز، پروفیشنل فائز اور سیکورٹی فائز میں جتنا فرق ہے اتنا ایک مجرم اپنی الگ ذہنیت سے لڑتا ہے۔ اس کی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔“ جہاں نے سنجیدگی سے کہا تو اس نے چند لمبے سوچتے ہوئے کہا۔

”کیا تم مجھے سکھاؤ گے..... میں.....“

”نہیں.....! میں تجھے نہیں سکھاؤں گا۔“

”کیوں.....!“ وہ حیرت دکھا اور استعجاب سے بولی تو جہاں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ ایسے ملائی جیسے بدن والی لڑکی لڑتے ہوئے اچھی نہیں لگتی۔ اسے تو بس ملائیت سے چھونے کو دل چاہتا ہے تیرے اتنے خوبصورت چہرے پر اگر ایک خراش بھی آگئی تو سمجھو حسن گہنا گیا اور میں تجھے اتنی ہی خوبصورت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بالکل.....! اگر وہ چڑیل تیرے سر پر کچھ مار دیتی اور وہ دونوں تمہیں.....“ اس نے چڑ کر کہنا چاہا تو جہاں ہنس دیا۔ مگر وہ خاموش نہیں ہوئی۔ ”تم ہنس رہے ہو، تم یہ شاعری کر کے بات کو گول مت کرو بلکہ سیدھے کہہ دو کہ تم مجھے اس لائق ہی نہیں سمجھتے، کاش میں نے یونیورسٹی کے دنوں میں پوری توجہ سے سیکھ لیا ہوتا۔“

اس نے کہا تو جہاں لگھنے نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کی گردن سہلانے ہوئے بولا۔

”کوئی لڑکی اتنی جلدی سے میرے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی، جتنی جلدی تم نے بنائی ہی، میرے دل کی سب سے بڑا خوشی یہ ہوگی کہ تم میرے ہر وقت قریب رہو۔“

”میں کون سا دور رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور پھر اسٹریٹنگ سنبھال لیا۔ وہ اندر سے ہلکے لگ گئی تھی۔ جسے جہاں نے پوری طرح محسوس کر لیا تو بولا۔

”وہ تو ٹھیک ہے، پراتنی جلدی پولیس وہاں کیسے پہنچ گئی اور وہ بندے کون تھے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔
”تین بندے تو پیرزادے کے تھے اس کے گاؤں کی ساتھ والی بستی میراں شاہ میں رہتے تھے۔ باقی چھ کا پتہ نہیں چلا“
وہ کوئی باہر کے تھے۔ سنا ہے وہ سارا دن اس علاقے میں پھرتے رہے ہیں۔“

”تھانے سے کچھ پتہ چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی، وہاں سے کوئی آئے گا تو معلوم ہوگا۔“ اس نے جواب میں کہا تو میں نے بایک اشارت کرتے ہوئے کہا۔
”لو بھئی..... ہم تو اپنا کام کریں پتہ چل ہی جائے گا۔“

میں انہیں وہیں باتیں کرتا چھوڑ کر ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ میں جیسے ہی ڈیرے والی کچی سڑک پر مڑا مجھے ڈیرے کے باہر کھڑی شاہ زیب کی سفید کار دکھائی دی۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ سردار شاہ ڈین کو پتہ چل گیا ہے۔ میرے لیے یہ لمحات کسی امتحان سے کم نہیں تھے۔ میں اگر یہیں سے واپس مڑتا ہوں تو جو تھوڑا بہت شک تھا وہ یقین میں بدل جاتا اور آگے جاتا ہوں تو پتہ نہیں میرے لیے وہاں کون استقبال کرنے کے لیے کھڑا ہوگا۔ اس قدر بے یقین حالات میں شاہ زیب اکیلا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور پھر کسی بھی خطرے کی پرواہ کرتے ہوئے بایک نہ روکی بلکہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بایک اس کار کے برابر جاروکی۔

میں ہاتھ میں دودھ کا برتن لیے گیٹ کے اندر گیا تو شاہ زیب برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کافی حد تک حیرت سے پوچھا۔
”شاہ زیب تم اس وقت؟“

”تھانے جانا ہے، چلو گے میرے ساتھ۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کیوں نہیں ضرور چلوں گا تم کوئی بندہ میرے گھر بھیج دیتے“ میں تھوڑا تیار ہو جاتا ایسی حالت میں..... میں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

”یہ نہیں پوچھو گے کہ کیوں جانا ہے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔
”تھانے کوئی بندہ خیریت سے نہیں جاتا اور ایسے بے وقت..... پھر میں راستے میں سن کر آیا ہوں کہ نو بندے قتل ہو گئے ہیں۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔

”ہاں اس سلسلے میں جانا ہے، چلو گے۔“ اس نے پوچھا۔
”کہہ تو رہا ہوں، چلو۔“ میں نے جواباً تیزی سے کہا۔
”آؤ پھر میری گاڑی میں چلتے ہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے میرا رد عمل دیکھنا چاہ رہا ہو۔

”چل۔“ میں نے اس سے پہلے قدم بڑھا دیئے۔ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے بھیدے کو دودھ گھر پہنچا دیئے کا کہا اور اس سے پہلے گیٹ سے باہر تھا۔ ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ ہی کار میں بیٹھے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم تھانے کی جانب چل دیئے۔

میرے ذہن میں فقط ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سردار شاہ دین کو اس کار روائی کے بارے میں مجھ پر شک نہ ہو۔ اسے پورا یقین ہوگا شاید وہ کسی عملی کارروائی سے پہلے اعصاب کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اپنے یقین کو پختہ کر رہا تھا یا پھر مجھے کہیں لے جا کر تشدد کر کے یہ سب اگلوانے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اب جو کچھ بھی تھا میں ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ عملی طور پر میں نے سرداروں سے ٹکر لے لی تھی۔ گویا خود کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ اب جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ میں کسی بھی غیر متوقع صورتحال کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ میں اعصاب مضبوط کیے اس کے ساتھ

والی پینجر سیٹ پر بیٹھا رہا۔ شاہ زیب نے کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ انتہائی سنجیدگی سے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ جب اس نے کوئی بات نہیں کی تو مجھے بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم گاؤں کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور قصبے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں مجھے انتہائی درجے کا محتاط ہونا تھا۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔

مگر.....! کچھ نہ ہوا۔ تھانے کا گیٹ آگیا اور وہ اپنی کار سمیت اندر چلا گیا۔ افضل زندھاوا اپنے کمرے میں تھا۔ ہم کار سے نکل کر اس جانب بڑھ گئے۔ اس کے کمرے میں جب ہم داخل ہوئے تو ایک نگاہ ہم پر ڈال کر وہ کاغذات میں الجھ گیا۔ ہم چند لمحے کھڑے رہے تو شاہ زیب نے کہا۔

”بہت مصروف ہو رہا تھا صاحب۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بیٹھ گیا۔

”ہاں یار بہت۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ کاغذوں میں الجھ گیا۔ پھر اُس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں کہا۔

”تجھے کس نے کہا ہے کہ میرے آفس میں کرسی پر بغیر اجازت کے بیٹھ جاؤ۔“

”یہ میرے ساتھ آیا ہے اور میں نے اسے کہا ہے۔“ شاہ زیب نے تیز انداز میں کہا تو وہ بولا۔

”یہ آپ کے ساتھ نہ آیا ہوتا تو میں اسے ابھی اس کمرے سے دھکے دے کر نکال دیتا۔ اس کی اتنی حیثیت ہے کہ یہ میرے سامنے بیٹھ سکے۔“

”لیکن اتنی ہمت ہے انسپکٹر کہ میں نے تمہاری ”پھر کی“ گھما دی تھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تو شاہ زیب نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”اوچھوڑو دیار۔ میں کس مقصد کے لیے آیا ہوں اور تم لوگ کیا بات لے کر بیٹھ گئے ہو۔“

”آپ بولو کیا بات ہے؟“ زندھاوا نے غصے میں کہا تو اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”لاشیں کہاں ہیں؟“

”شہر بھجوا دی ہیں پوسٹ مارٹم کے لیے..... ان میں سے دو کی شناخت ابھی نہیں ہو سکی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمحے رک کر اس نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔ ”باقی آپ بتائیں گے شناخت کر لیں گے انہیں؟“

”جب باقی شناخت کر لیے گئے ہیں تو ان دو کی شناخت کا کیا مسئلہ ہے؟“ شاہ زیب نے کہا۔

”اس لیے کہ وہ آپ کے ڈیرے پر تھے۔ وہیں فائرنگ ہوئی ہے مگر لاشیں ڈیرے سے دور ویرانے میں ملی ہیں۔ ان میں سے تین بستی میراں شاہ کے تھے مقامی یہ سب کیا ہے سردار جی۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔ یہی شاہ زیب نے اس سے زیادہ طنز اور غصے میں کہا۔

”یہی تو معصہ ہے جسے حل کرنا ہے۔ اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ آپ کو کس نے ان کے متعلق بتایا آپ کب پہنچے؟ اور کسی سے پوچھتا چھ کیے بغیر وہاں سے لاشیں بھی اٹھا کر لے آئے.....؟“

”ہاں.....! یہ سوال تو بنتا ہے لیکن آپ ایسا کریں چائے پیئیں میں نے پیرزادہ وقاص کو بلوایا ہے وہ یا ان کا کوئی بندہ یہاں پر آجائے تو بات کرتے ہیں۔ میں فی الحال کاغذ مکمل کر لوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پھر سے کاغذوں میں الجھ گیا۔ بلاشبہ وہ ڈرامہ کر رہا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے کسی بندے کو چائے کا نہیں کہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں نظر انداز کر رہا ہے۔ شاہ زیب بیچ دتا بکھا تا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پیرزادہ وقاص کی سیاہ جیپ وہاں آرکی۔ وہ بس میں سے نکلا اور سیدھا زندھاوا کے دفتر میں آ گیا۔ اس نے ہمیں دیکھا، ہم سب سے مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا

تورندھاوے نے کاغذات ایک طرف کیے اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

”پیرزادہ صاحب! آپ کے تین ملازمین قتل ہو گئے۔ میں نے اس سلسلے میں آپ کو بلایا ہے۔“

”ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ہم اپنی فریاد لے کر تھانے میں نہیں آئے، بلکہ لاشیں اٹھالینے کے بعد ہمیں تھانے میں بلا کر پوچھ رہے ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں یہ اتنی تیز رفتاری کیوں؟“ پیرزادہ وقاص نے کافی حد تک طنزیہ اور غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”ابھی آپ کے آنے سے پہلے شاہ زیب نے بھی ایسا ہی سوال کیا ہے۔ تو آپ دونوں غور سے سن لیں۔ مجھے کل شام اوپر سے احکامات ملے تھے کہ علاقے میں کچھ مشکوک لوگ ہیں، انہیں پکڑ لیں، میرے مخبر بھی اطلاع دے چکے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی بھاری نفری یہاں بھجوا دی گئی۔ غور کریں، میری بات پر میں نے نہیں منگوائی، بلکہ بھیج دی گئی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کی رسائی یہاں تک ہے کہ میری اس بات کی تصدیق آپ کر سکتے ہیں۔ میں مجبور تھا اور میں نے انہیں پکڑنا ہی تھا، لیکن.....“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو شاہ زیب بولا۔

”لیکن کیا؟“

”میں جس وقت انہیں پکڑنے کے لیے ڈیرے کے قریب پہنچا تو وہاں سے کچھ دور فائرنگ ہوئی، میں نے وہ اپنے لیے الجھاوا ہی سمجھا اور ڈیرے پر گیا۔ وہاں آپ کے ملازمین نے بتایا کہ چھت پر فائرنگ ہوئی ہے۔ میں خود چھت پر گیا، وہاں آثار تو ملے مگر بندے نہیں تھے۔ میں نے فوراً علاقہ چھان لینے کا حکم دیا۔ اور یہ ساری لاشیں ایک جگہ سے مل گئیں۔“

”لیکن.....“ شاہ زیب نے کہنا چاہا مگر رندھاوے نے بچنی سے کہا۔

”لیکن، لیکن کچھ نہیں شاہ زیب! سیدھی سی بات ہے یہ دونوں گروپ آپس میں لڑ کر مرے ہیں یا پھر انہیں کوئی تیسری پارٹی مار گئی ہے۔ یہ تو خیر، تفتیش سے معلوم ہو جائے گا“ آپ لوگوں کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ جو حقیقت ہے وہ مجھے بتادیں یا پھر صلاح و مشورہ کر کے کوئی فیصلہ مجھے دے دیں، نہیں تو.....“

”نہیں تو کیا کریں گے آپ.....؟“ پیرزادے نے پرسکون انداز میں کہا۔

”میں کوئی دشمن دنیا تو نہیں ہوں، پیرزادہ صاحب، میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہی لکھ دیا ہے، ان کاغذات پر فائلوں کا پیٹ بھریا ہے میں نے، دو چار گھنٹے بعد میں نے یہ رپورٹ ڈی ایس پی صاحب کو دے دی ہے، پھر وہ جانیں اور آپ.....“ وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ چکا تو پیرزادہ بولا۔

”میری طرف سے ابھی یہ طے کر لیں کہ آپ جو رپورٹ دیں گے وہ بالکل سچ پر مبنی ہونی چاہیے۔ باقی جو تفتیش ہونی ہے اس کی نگرانی میں کر لو گا۔ اب مجھے یہ پتہ نہ چلے کہ آپ نے ڈنڈی ماری ہے اور ان مشکوک بندوں کا یہ ذکر ہی نہ کرو کہ وہ کس کے مہمان تھے۔“

”وقاص..... تم غلط سمجھ رہے ہو، وہ سچ وہ نہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔“ شاہ زیب تیزی سے بولا۔

”نہیں شاہ زیب، نہیں ایسے نہ کہو میرے تین ملازم قتل ہوئے ہیں، انہیں چھوڑ دو تم لوگوں کے ڈیرے پر اشتہاری پہلے بھی آتے جاتے ہیں، لیکن یہ کون تھے اور علاقے میں کیوں دندناتے پھر رہے تھے۔ مجھے اس سوال کا جواب دو۔“

”یہ بھی انہی اشتہاریوں کی طرح یہاں چند دن رہنے آئے تھے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”تو پھر انہیں بے لگام ہونے کی اجازت کس نے دی؟“ پیرزادہ نے پوچھا تو شاہ زیب خاموش رہا۔ پھر تیزی سے بولا۔

”ہم بھی ڈیرے دار ہیں اور یہ ساری باتیں سمجھتے ہیں۔“

”میں کہہ رہا ہوں تاکہ ہم بات کرتے ہیں، میں تجھے سمجھا دوں گا.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن پیرزادہ نے ہاتھ کے

اشارے سے اسے روک دیا۔

”بس.....! مجھے میرے سوال کا جواب دو یا پھر ان بندوں کے قتل کا حساب دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے اپنا حساب لینا آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ تبھی رندھاوے نے اس سے پوچھا۔

”تو پھر کیا کہتے ہیں؟“

”وہی جو میں نے کہا، ہم لوگ زبان رکھتے ہیں اور اپنی زبان کا پاس بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم مردوں والی زبان دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھا بھی نہیں اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا تو وہاں پر خاموشی چھا گئی۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔“ شاہ زیب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو سوچا تھا کہ آپ دونوں کو بلا کر، کوئی مشورہ کر کے ہی رپورٹ فائل کروں گا، مگر لگتا ہے پیرزادہ صاحب کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا ہے۔“

”جمال، تم کیا کہتے ہو؟“ اچانک شاہ زیب نے مجھ سے پوچھا۔

”اس سے کیا پوچھتے ہو آپ، جس بندے کو اپنی خبر نہیں، اگر آپ کا ہاتھ اس پر نہ ہوتا تو اب تک یہ نجائے کس جیل میں پڑا سر رہا ہوتا۔“ رندھاوے نے انتہائی نفرت سے کہا۔

”رندھاوہ صاحب خیال کریں کہ یہ میرے ساتھ آیا ہے۔“ شاہ زیب نے غصے میں کہا۔

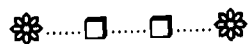
”یہی تو کر رہا ہوں، ورنہ اب تک اس کے چھتر مار کر تھانے سے بھگا دیا ہوتا۔“ اس کا لہجہ ہنوز غصیلہ تھا۔ اس وقت تک پیرزادہ اتنی سبکدستی وہاں سے چلا گیا تھا۔ تبھی شاہ زیب اٹھا اور بغیر ہاتھ ملانے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے بھی وہاں رکنما مناسب نہیں سمجھا، میری اور رندھاوے کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے چار ہوئیں تو اس نے خیف سا اشارہ کیا۔ میں جسے فوراً تو نہ سمجھ سکا لیکن اس پر غور کرنے لگا۔

ہم دونوں کار کے قریب آ گئے تھے۔ شاہ زیب کے چہرے پر انتہائی درجے کی سنجیدگی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا، پھر فوراً ہی لپک کر اندر چلا گیا۔ اس بار وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اندر نہیں گیا تھا۔ وہ نجائے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لمحے مجھے رندھاوے کی خفیف اشارے کی سمجھ آ گئی۔ میں ٹھٹھا ہوا تھانے سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چہرے پر کپڑا لپیٹ چھکا کا بانیک پر کھڑا تھا۔ میرا دل اچانک ہی خوشی سے بھر گیا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا، اور وہیں ٹھٹھے لگا، بھی اندر سے شاہ زیب کی کارنگی اور میرے قریب روک دی۔ تب میں نے اسکے پاس جا کر کہا۔

”مجھے ذرا یہاں تھوڑا کام ہے، میں وہ کر کے آتا ہوں، تم جاؤ۔“

”ایسا کام اچانک کیا پڑ گیا؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کئی دنوں سے سوچ رہا تھا مجھے کسی بندے سے ملنا ہے، تم جاؤ، میں آ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا رخ اس طرف کر لیا جہر چھا کا میری پشت پر تھا۔ شاہ زیب چلا گیا تو میں کچھ دیر مزید وہیں رکا رہا۔ پھر چھاکے کی طرف چل پڑا۔ وہ بانیک اسٹارٹ کر کے میرے پاس آیا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا تو اس نے بانیک بھگا دی۔ میں ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار ہونے والا تھا۔ یہی اشارہ مجھے رندھاوے نے دیا تھا۔ مجھے میرے سوالوں کا جواب مل گیا تھا، اب میں نے صورتحال کے مطابق اپنا آئندہ لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔



جسپال اپنے کمرے میں تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، جہاں ہری بھری فصلیں دور تک پھیلی ہوئی دھوپ میں چمک

کہا اور اپنے سامنے نیپکن درست کرنے لگی۔ کھانے کے دوران جہاں نے انوجیت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”یار.....! تم تو اتنے بڑی ہو گئے ہو، شکل ہی نہیں دکھاتے۔“

”معاملات ہی کچھ ایسے ہیں، کھانے کے بعد تفصیل سے بتاؤں گا۔“ اس نے گہرے انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔
 چند لمحے یونہی گزر گئے تو ہر پریت نے بے بے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بے بے جی، آپ جی کو اجازت دیں کہ یہ مجھے فائٹ سکھائے، میں نے صبح بتایا تھا نا۔“

”تو جان اور تیرے کام اگر جی پتر سمجھتا ہے کہ تجھے یہ سیکھنا چاہیے تو ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”ویسے بے جی، میں یہی سمجھتا تھا کہ ہر پریت کو اچھا کھانا بنانا آنا چاہیے۔ گھر داری سیکھنی چاہیے لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے اسے یہ بھی سیکھ ہی لینا چاہیے۔“ جہاں نے کہا تو انوجیت بولا۔

”جہاں.....! ابھی تمہیں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں لیکن جس طرح دن گزرتے جائیں گے، اس طرح تم یہ جان جاؤ گے کہ ہم ہی نہیں پوری سکھ قوم حالت جنگ میں ہے اور یہ جنگ ہم پر مسلط کر دی گئی ہے۔ ہر امرت دھاری سنگھ قربان ہونے کے لیے ہے۔“

”مجھے احساس ہے انوجیت۔“ جہاں نے کہا اور پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا پھر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے کھانا ختم کیا اور اٹھ کر باہر لان کی طرف چل دیے۔ بے بے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ دونوں لان میں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دھوپ تیز تھی مگر اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر انوجیت ہی نے کہا۔

”مجھے ہر پریت نے نہیں بتایا، لیکن تمہاری رات کی کارروائی کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا ہے، کہیں یہ سب کچھ تم نے جلدی میں تو نہیں کر دیا؟“

”نہیں انوجیت۔ جلدی میں نہیں، ٹھیک وقت پر کیا ہے۔ میں نے انہیں صرف یہ احساس دلانا ہے کہ میں یہاں پر اکیلا نہیں ہوں، ان پر خوف طاری کرنا تھا۔ یہ اس صورت میں ہے جب انہیں یقین ہو جائے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔“

”تمہارا منیت ورک ہے یہاں پر.....“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میرا نہیں، کسی اور کا ہے.....“ جہاں نے اختصار سے کہا۔

”پرائے بازوؤں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، اپنے بازو.....“ انوجیت نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”میں جانتا ہوں، کتے کو جب تک روٹی ڈالتے رہو وہ وفادار رہتا ہے اور جب روٹی نہ بھی ڈالو تب بھی وہ وفادار رہتا ہے، یہ جانور کی خصلت ہے، لیکن انسان اس وقت بدتر ہو جاتا ہے جب وہ روٹی بھی کھاتا رہے اور ڈس لے..... سانپ کی یہ خصلت ہے کہ وہ دودھ پلانے والے کو بھی ڈس لیتا ہے۔ یہ نیٹ ورک کوئی دھرم یا کسی مذہب کا نہیں ہے، یہ جراثیم پیشہ لوگوں کا ایک سنڈیکیٹ ہے۔ عالمی سطح پر۔“

”اور تم کہیں اس کا حصہ تو نہیں ہو؟“ انوجیت نے سرسراتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

”حصہ تو نہیں لیکن اس کے بہت قریب ہوں۔ میری وجہ سے انہوں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ بظاہر ان کی پہلی ترجیح دولت ہے، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ صرف دولت ہی کے لیے ایسا سب کچھ کر رہے ہیں۔ ان کی ترجیحات کچھ اور ہیں جنہیں میں بھی اب تک نہیں سمجھ پایا ہوں۔“

”نشیات.....“ وہ دھیرے سے بولا۔

”نہیں، میں نے اب تک کسی بندے کو نہیں دیکھا کہ وہ نشیات کے کاروبار میں ملوث ہو یا پھر خود ایسی چیزوں کا عادی

رہی تھیں۔ بظاہر وہ اس مناظر میں کھویا ہوا تھا لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ مسلسل من راج اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ بلاشبہ ان میں کھلبلی مچ چکی ہوگی۔ اپنے تئیں انہوں نے کوئی سراغ تو نہیں چھوڑا تھا لیکن جلد یاد ہیروہ اس تک پہنچ ضرور جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رویندر سنگھ یا اس کی اولاد کو اس کی اوگی پنڈ میں آمد کے بارے میں پتہ نہ چلا ہو، یقین اس وقت ہو جانا تھا جب وہ اس تک پہنچ کر اپنا آپ ظاہر کر دیتے۔ جہاں یہی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح خود اس کی جانب بڑھیں لیکن اتنی جلدی کوئی موقع ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ اس نے اپنے طور پر تو سوچا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے، اور وہ ایسا ہی کرتا اگر یہ پولیس آفیسر والا معاملہ درمیان میں نہ آ جاتا۔ ان چند دنوں میں تو یہاں کے ماحول ہی سے مانوس نہیں ہو پایا تھا۔ اب معاملہ یہ نہیں رہا تھا کہ وہ ان کی طرف سے ”کچھ“ ہونے کا انتظار کرتا، بلکہ خود آگے بڑھنا تھا۔ اس نے شہد کے چھتے میں ہاتھ تو ڈال دیا تھا۔ اب سکون کی امید رکھنا بے کار تھا اور ماحول سے مانوس ہونے کا بہانہ فضول تھا۔ سوچ کی زد جیسے ہی اس طرف گئی، اس کے من سے بڑی خوش کن سی آواز ابھری۔

”کیا واقعی تم اس ماحول سے مانوس نہیں ہوئے؟“

”یہ کیا سوال ہے؟“ اس نے سوچا۔

”یہ حقیقت ہے جہاں سنگھ جی، اگر مانوس نہ ہوتے تو ہر پریت کے سحر انگیز حسن سے یوں مات نہ کھا جاتے، وہ محض حسن کا مجسمہ نہیں، ایک خوبصورت آفت بھی ہے، گزری رات تم نے ذرا سی جھلک دیکھ لی تھی۔ اب کیا خیال ہے؟“

”ہاں.....! وہ پرت در پرت کھلتی چلی جائے گی اور مجھے حیران کر دے گی۔“

یہ سوچتے ہی وہ ان لمحات میں کھوکھڑی محسوس کرنے لگا جب چشمہ دغیبہ میں بھری ہر پریت اس کے ساتھ لگی دشمنوں سے بے برد آ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ تبھی اسے یوں لگا جیسے ہر پریت نے اس کی گردن میں اپنی بانہیں سما کر دی ہوں۔ جہاں نے انہیں بڑی نرمی سے تھام لیا تو اچانک اس پر عیاں ہوا کہ وہ کھلی آنکھوں سے کوئی خواب نہیں دیکھ رہا، بلکہ حقیقت میں وہ اس کے اس قدر قریب ہے اس کی زلفوں کا سایہ اس پر تھا اور وہ بڑی نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

”جی جی.....! کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو؟“

”تمہیں سوچ کر.....“ اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”میری اتنی کہاں حیثیت کہ مجھے سوچتے ہوئے تم ساری دنیا سے غافل ہو جاؤ، یہاں تک کہ کسی کے کمرے میں آ جانے کا بھی پتہ نہ چلے۔“

”جی، تجھے سوچ رہا تھا، جس طرح تو نے رات اس لڑکی کو مارا اور پھر.....“

”بس بس..... میں سمجھ رہی تھی کہ تم کوئی رومانٹک خیال سوچ رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رک کر پوچھا۔

”پھر کیا سوچا، مجھے فائٹ سکھانے کا۔“

”دیکھو..... بے بے سے اجازت لے کر دے تو..... تمہاری کوئی ہڈی پہلی ٹوٹ گئی تو پھر ان سے مار لوں کھائے گا۔“

جہاں نے مزاح میں کہا، تب وہ اسے دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”چلو آؤ..... ابھی اجازت لے کر دیتی ہوں، پھر اس کے بعد ہی کھانا کھائیں گے۔ چلو انوجیت بھی گھر پر ہے۔“

جہاں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ دونوں ماں بیٹا ڈانٹ مٹیل پراس کا انتظار کر رہے تھے۔

”ست سری اکال بے جی۔“ جہاں نے کہا اور میز کے قریب کرسی پر انوجیت کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”ست سری اکال پتر! واہ گرو تم پر..... کرے..... چل پتر پر شادے ٹکھ لے.....“ بے بے نے متا بھرے لہجے میں

میں کہا۔

”تم اس قدر اجنبیت سے کیوں کہہ رہے ہو میرے دوست..... اصل میں تم میرے ذاتی دوست کی حیثیت سے نہیں ایک سکھ تنظیم کے فرد کی حیثیت سے سوچ رہے ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم دھرم کی سیوا چھوڑ دو میں کہتا ہوں کہ وہ ہر مذہبی انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارے۔ لیکن ان قوتوں کا کیا کیا جائے جو یہ بھی نہیں کرنے دیتیں۔ جان لو کہ طاقت ہی بنیادی چیز ہے ورنہ دوسرے تم لوگوں کو کچل کر آگے بڑھ جائیں گے۔ تم ایک سکھ تنظیم کے فرد ہو، تم رہو لیکن میرے معاملے کو اس سے غلط ملط مت کرو۔“

”تم بھی تو ایک سکھ ہو۔ اگر تمہارے سامنے دھرم کا کوئی معاملہ آجائے تو تم کیا کرو گے؟“ اچانک انوجیت نے اس سے پوچھا۔

”یہ تو اس معاملے کی نوعیت پر ہوگا تا میرے بار میں تمہیں ایک مثال دیتا ہوں، سکھ دھرم میں دستار کی اہمیت اس قدر ہے کہ سرکٹا دیں لیکن دستار کی عزت پر آج نہ آنے دیں..... کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”بالکل ایسے ہی ہے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”اب مجھے یہ بتاؤ میں کہیں بے بس ہو جاؤں اور وہ لوگ میری دستار اتار کر مٹی میں رول دیں تو کیا مجھے آرام سے سرکٹا دینا چاہیے؟“ جہاں نے سکون سے پوچھا۔

”نہیں جہاں تک ہو سکے ان کا سرکٹا دینا چاہیے۔“ وہ جوش اور جذبے سے بولا۔

”لیکن اگر میں سرکٹا لینے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہوں بلکہ بے بس ہوں تب مجھے کیا کرنا چاہیے سکون سے اپنا سر ان کے سامنے پیش کر دینا چاہیے کہ میں اپنی دستار کی حفاظت نہیں کر سکتا۔“ جہاں نے کہا تو انوجیت الجھتے ہوئے بولا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

”جی کہ میں دھرم کے لیے کمزوری کا باعث نہ بنوں بلکہ اگر میری جان جاتی ہے تو اس سے دھرم مضبوط ہو۔ میں وہ وقت ہی نہ آنے دوں جب کوئی میری دستار کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ میں اپنے ذاتی معاملے کے لیے دھرم کو استعمال نہ کروں اور جہاں تک تمہارا سوال ہے کہ اگر دھرم کا معاملہ میرے سامنے آجائے تو میں کیا کروں گا۔ میں یہ دیکھوں گا کہ دھرم کو فائدہ کیسے ہوگا جان دے دینے سے یا اس معاملے کو نظر انداز کر دینے سے..... یہ جان لو انوجیت کہ طاقت کا غلط استعمال بھی شکست کی طرف لے کر جاتا ہے۔“

”تم تو بڑے سخت قسم کے خیال رکھتے ہو۔“ انوجیت نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہم سکھوں نے اپنی طاقت کا بے جا استعمال کیا ہے اور ہم ابھی تک ایسے معاملات میں الجھتے ہوئے ہیں جسے ہندو ہماری کمزوری بنا کر ہمیں نہ صرف مزید کمزور بنا رہے ہیں بلکہ ظلم و در ظلم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں دربار صاحب میں شہیدوں کی یادگار بنانے کا معاملہ ہے چل رہا ہے نا.....“

”ہاں! چل رہا ہے۔“ انوجیت نے کہا۔

”انہی شہیدوں کے لیے نا جو نہتے مارے گئے اندرا حکومت نے اپنی پوری طاقت لگا کر انہیں ختم کیا اب سکھ کیونٹی اپنے ہی مذہبی ادارے میں اپنے ہی لوگوں کے لیے ایک یادگار بنانا چاہتی ہے لیکن نہیں بننا پار ہے کیوں؟ پنجاب کے سکھ، پوری دنیا کے سکھ..... اسے کیوں نہیں بننا پار ہے۔“

”کانگریس حکومت نہیں چاہ رہی.....“ انوجیت نے دھیرے سے کہا۔

”میں یہ پوچھتا ہوں حکومت رو بوٹ چلاتے ہیں یا انسان.....؟“ جہاں نے جوش سے پوچھا۔

ہو۔ میرا اپنا ایک اندازہ ہے کہ وہ صرف طاقت چاہتے ہیں۔ کیوں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ جہاں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو انوجیت چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”اس پولیس آفیسر کو ہماری سکھ تنظیم نے ختم کیا ہے۔ جن لڑکوں نے اسے قتل کیا ہے وہ اب بھی اسی علاقے میں موجود ہیں۔ قتل کا کوئی سراغ ان کے پاس نہیں ہے سوائے ایک دو نمبروں کے جس پر اس پولیس آفیسر کو دھمکیاں دی گئی تھیں۔ اس بارے میں وہ لوگ کنفرم نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ نمبر کسی کے ذاتی نہیں پبلک فون ہوتے ہیں۔ جو جالندھر میں ہیں۔ خیر.....! یہ کنفرم بات ہے کہ وہ ان قاتلوں تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ چاہیں جو مرضی کر لیں۔ وہ بے سہارا لوگ نہیں ہیں انہیں پورا تحفظ ہے۔ اب یہ جو کمیشن بنا ہے اس نے کسی کے بھی گلے میں پھنسا ڈال دینا ہے۔ رویندر سنگھ نے یہ پھندا تمہارے گلے میں ڈالنا چاہا۔ اسی لیے من راج سنگھ کو ادھر بھیجا پھر جو انہوں نے چاہا وہی ہو گیا۔“

”مطلب..... وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”میرے خیال میں..... انہوں نے تم پر نگاہ بھی رکھی ہوگی اور تم ہر پریت کے ساتھ.....“

”انوجیت مجھے لگتا ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم ایسے کرو دو دن تک اپنے کمرے میں رہو تمہارا فون آف ہونا چاہیے۔ بس آرام کرو۔“ جہاں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو اس نے پوچھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا.....! اگر ایسی کوئی صورتحال ہوتی نا تو وہ جالندھر والا گھر میرے لیے چوہے دان ثابت ہوتا۔“

من راج کسی لڑکی کے ساتھ عیاشی نہیں بلکہ میرے انتظار میں ہوتا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”لیکن میری اطلاعات غلط نہیں ہو سکتیں؟“ اس نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا تو جہاں ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھتا رہا پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”ہمارے بندے بھی ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ کوئی غلط اطلاع نہیں دیتے۔“

”ٹھیک.....! میں مان لیتا ہوں پھر یوں ممکن ہے کہ تمہاری سکھ تنظیم کے لوگ نگاہ میں ہوں گے میں نہیں..... میں مانتا ہوں اور میں استعمال بھی کرتا ہوں کہ جدید ترین آلات بندے کی لوکیشن کے بارے میں معلوم کر لیتے ہیں۔ میں نے یہ آپشن ذہن میں رکھا ہے۔ اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں نے جلدی نہیں وقت پر انہیں ٹھکانے لگایا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے گرد گھیرا تک کریں میں نے ان کا حصار ہی توڑ دیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں شاید ہی ہماری ضرورت پڑے.....؟“ انوجیت نے پوچھا۔

”ایک پرانی کہوت ہے نا دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے..... اسی طرح دشمن وہ ہوتا ہے جو دھوکے سے وار کرنے اور منافق وہ ہوتا ہے جو تمہیں ختم کرنے کے لیے بڑے صبر سے وقت کا انتظار کرے اور موقع ملے ہی تمہیں ختم کرنے کی کوشش کرے۔ دھوکا وہ بھی دے گا۔ اس لیے اپنے سائے سے بھی چو کنار ہو۔ کیونکہ مصیبت کے وقت ہی دشمن کا منافقوں کا اور بے غیرتوں کا پتہ چلتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو تم اگر ان کے نیٹ ورک میں اپنے بندے داخل کر سکتے ہو تو کیا وہ تمہاری سکھ تنظیم میں نہیں ہوں گے؟“

”ایسا ممکن ہے.....“ انوجیت نے سرسراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ جان لو کہ اب کوئی راز راز نہیں ہے۔ ایک میدان جنگ ہے اور ہم لڑ رہے ہیں۔ جس کا وار چل جائے گا اور یہ ذہن میں رکھنا انوجیت میری لڑائی کسی دھرم کے لیے نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنا ذاتی انتقام لینا ہے۔ بس.....“

”مجھے تمہاری سناٹ گئی اچھی لگی میں چاہوں گا اگر تم ضرورت محسوس کرو تو مجھے ضرور کہنا۔“ اس نے یاس بھرے لہجے

”انسان ہی چلاتے ہیں۔“

”یعنی گوشت پوست کے انسان..... جو منافق ہیں، کیا انہیں کسی شے کا خوف نہیں ہے، سکھ دھرم کے لوگ انہیں اتنا بھی خوف نہیں دے سکتے..... کہ یادگار کے معاملے میں اپنی دشمنی سے باز آ جائیں..... ایک شخص سنت جرنیل سنگھ جھنڈرا والا تھا جس نے اندرا حکومت کی نیندیں اڑادی تھیں۔ آج اس جیسا ایک بھی بندہ ہوتا تو یادگار کب کی بن چکی ہوتی۔ اب سنو میں کیا سوچتا ہوں۔“

”کہو.....“ وہ بولا۔

”یادگار کے لیے میں کسی ایک بھی سکھ کا قتل نہیں چاہتا۔ مطلب اس کے لیے کوئی تحریک چلے اور سامنے سے گولیاں کھالی جائیں..... یہ بے وقوفی ہے..... بلکہ خود کو ایسا بنالیا جائے کہ وہ خوف زدہ ہو کر خود کہیں ہم اس راہ میں مزاحمت نہیں کریں گے جو سکھ قوم چاہے وہی ہوگا۔“ جہاں نے کہا تو انوجیت نے پوچھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”دو محاذوں پر لڑنا ہوگا۔ سکھ اتحاس (تاریخ) کے لیے نئی نسل کو بتانا ہوگا، اپنی خامیوں کو دور کر کے طاقت و رقوم بننا ہوگا۔ خصوصاً پنجاب کے سکھوں کو بہت مضبوط ہونا ہوگا۔ دنیا بھر کے سکھ ان کے لیے جان اور مال قربان کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔“ جہاں سنگھ نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو انوجیت کافی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

”میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو، تم جو چاہو سو کرو میں بہر حال تمہارے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔“

”اچھا، چھوڑو ان باتوں کو..... میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ حویلی کے لیے.....“

”ہاں.....! وہ میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کی تھی۔ وہ آج کل میں آجائے گا۔“ انوجیت نے کہا۔

”وہ آ نہیں جائے گا“ اسے ابھی بلاؤ، بلکہ اسے کہو کہ چند مزدوروں بھیجے میں آج ہی اس کا کام شروع کراؤں گا۔ اس کا بھی ایک مقصد ہے..... فوراً فون کرو۔“

”میں ابھی کرتا ہوں.....“ انوجیت نے کہا اور اپنے سیل فون سے رابطہ کرنے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جہاں سنگھ، انوجیت سنگھ اور ہر پریت کو راپنی جیب میں گھر سے لٹکے۔ ان کا رخ اوگی پنڈ کی طرف تھا۔ ٹھیکیدار سے بات ہو گئی تھی اور مزدور اس حویلی کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ انوجیت ڈرائیونگ کر رہا تھا اور وہ تینوں خاموش تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سڑک پر تھے اور پھر وہ تیزی سے چلتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ جہاں دوسری بار اس گاؤں میں آیا تھا۔ پہلی بار اس کے جذبات میں غصہ، بے بسی اور مات ہو جانے کا احساس تھا، اب ویسا نہیں تھا، بلکہ اس میں ہیجان، انتقام اور بھڑ جانے کا حوصلہ موجود تھا۔ شاید اسی سے ان میں کوئی بات نہیں ہو رہی تھی، سبھی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ یہاں تک کہ گاڑی ان کی حویلی کے سامنے جا کر۔ سامنے ہی کچھ مزدور کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ایک خوش پوش نوجوان سنگھ کھڑا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے انوجیت نے بتا دیا کہ یہی ٹھیکیدار ہے۔ وہ گاڑی سے اتر کر ان کی قریب گئے، ملنے ملانے کے بعد جہاں نے کہا۔

”ٹھیکیدار جی..... آپ نے کام دیکھ لیا؟“

”جی، دیکھ لیا۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”کتنے دنوں میں ہو گا یہ کام؟“ اس نے پوچھا۔

”یہی کوئی ایک ہفتہ لگ جائے گا.....“ اس نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”رقم کی پرواہ نہیں کرنی۔ سب کچھ آپ نے کرنا ہے۔ بس نیم کے درخت کا خیال رکھنا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے بڑے

نوٹوں کی دو گندیاں جیب سے نکالیں اور اس کی طرف بڑھادیں۔“ یہ رکھیں، مزید کی ضرورت ہوگی تو مل جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے جی، میں ابھی سے کام شروع کر دیتا ہوں۔“ ٹھیکیدار نے کہا تو جہاں نے ایک نگاہ حویلی پر ڈالی، جس کی خستہ حالت نے اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو مزید ہوا دے دی۔ اسے خود پر قابو پانے میں چند منٹ لگے۔ اس دوران انوجیت نے ٹھیکیدار سے کہا۔

”تمہیں جو بات پوچھنی ہو یا کچھ کہنا ہو مجھ سے رابطہ رکھنا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ تو وہ تینوں اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے واپس پلٹے تبھی ان کے قریب ایک کار آن رکی۔ جس کے رکتے ہی پنجرہ سیٹ سے ایک لمبا ترنگا جوان برآمد ہوا۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ ویسٹ کوٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر گہرے نیلے رنگ کی پکڑی سیاہ داڑھی موٹھیں اور پاؤں میں سیاہ رنگ کا جوتا پہنا ہوا تھا۔ اس دوران پچھلی نشستوں سے تین باڈی گارڈ اسلحہ لیے برآمد ہوئے۔

”بلجیت سنگھ، رو بندر سنگھ کا بیٹا، جواہر کا سرخ ہے۔“ انوجیت نے آہستگی سے جہاں کو بتایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تبھی وہ ان کی طرف دیکھتا ہوا قریب آ گیا اور ان کے پاس آ کر طنزیہ اور تحقارت بھرے لہجے میں بولا۔

”میرے بارے میں انوجیت نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا، نہیں معلوم تو پورا تعارف کراؤں.....“

”تم سے تعارف ہی کے لیے نہیں، پوری جان پہچان ہی کے لیے تو ادھر ادگی میں آیا ہوں۔ اچھا ہے تو خود ہی چل کر میرے پاس آ گیا۔ درندہ میں نے تو تجھے ملنا ہی تھا۔“ جہاں نے غراتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران گاؤں کے لوگ بھی ان کے ارد گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔

”اش کے بھی اش کے..... بڑے عرصے بعد کوئی میرے سامنے بولا ہے۔ خیر دیکھ لیتے ہیں، جتنا بولتے ہو، اتنا برداشت بھی کر لیتے ہو۔“ اس کا لہجہ هنوز تحقارت آمیز تھا تو جہاں نے کہا۔

”یہ تو وقت بتائے گا نا بلجیت، کون کیا ہے؟“

”وقت ہم نے کہیں سے لینے جانا ہے۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔

”مرد ہو تو اپنی زبان پر قائم رہنا۔ بھاگنا نہیں، آؤ، ابھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال لیتے ہیں۔“ جہاں نے اپنا ہاتھ کھول کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”مجھ تک پہنچنے کے لیے تمہیں کئی ہاتھوں سے لڑنا ہوگا۔ جبکہ.....“

”اوائے میں تمہاری بات کر رہا ہوں، بلجیت..... پر اے بازوؤں پر تو بیچو ابھی بات کر لیتا ہے۔“ جہاں نے طنزیہ انداز میں کہا تو بلجیت کے چہرے پر کئی بل آ گئے۔ بلاشبہ وہ سمجھ چکا تھا کہ جہاں اسے کس راہ پر لارہا ہے۔ اس لیے بات بدلتے ہوئے بولا۔

”وقت آنے پر تیرے ساتھ پنجہ بھی لڑاؤں گا، فی الحال تو میں سرخ کی حیثیت سے آیا ہوں، تجھے کس نے اجازت دی ہے کہ اس حویلی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کر سکے۔“

”یہ حویلی میرے پرکھوں کی ہے، جو یہاں کے بے غیرت بزدلوں کے دھوکے کا شکار ہو گئے تھے۔ دل تو کرتا ہے کہ ان بے غیرتوں کو ختم کرنے کے بعد ہی اسے ٹھیک کراؤں، مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس حویلی کا وارث یہاں آ گیا ہوں۔ اب جس میں ہمت ہے تو وہ مجھے روک لے.....“

”میں روکنے آ گیا ہوں تمہیں..... تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تم اس حویلی کے وارث ہو، اب اگر ہمت ہے تو بات کرو.....“ بلجیت نے انتہائی غصے میں کہا۔ کیونکہ جہاں نے اس کے سامنے ہی اس کے بزدلوں کو گالی دے دی تھی۔

ہو گیا تھا کہ میں شاہ زیب کے ساتھ گیا ہوں اور مجھے خطرہ ہے، بلکہ دلبر کے کنویں پر سردار شاہ دین کے لوگوں نے پوچھنا چھ کی تھی۔ وہ کتوں کی طرح ہراس بندے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، جس کا کسی نہ کسی حوالے سے کوئی تعلق میرے ساتھ نہ تھا۔ یہ میرے لیے حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ یہ تو اب کوئی راز نہیں رہا تھا کہ ملک سجاد کے بیٹھے ہوئے لوگ مجھے ہی قتل کرنے آئے تھے اور ان کے بارے میں سردار شاہ دین کی اجازت اور مرضی شامل تھی جو وہ اس کے ڈیرے پر آ کر ٹھہرے تھے۔ اب ان کا قتل نہ صرف سردار شاہ دین کے لیے چیلنج تھا بلکہ اس کے علاقے پر حاکمیت پر سوال اٹھ گیا تھا۔ اپنے علاقے میں دشمنی کچھ الگ تاثر رکھتی ہے، لیکن یہ انتہائی بری بات تھی کہ اپنے ہی علاقے کے بندے کو مارنے کے لیے کوئی دوسرا یہاں کے کسی بڑے سے تعاون لے، ملک سجاد نے تو بڑے مان اور کردار سے اپنے بندوں کو بھیجا ہوگا کہ وہ مجھے قتل کر کے چپ چاپ واپس لوٹ جائیں گے۔ لیکن اب صورت حال یہ بن گئی تھی کہ اگر وہ سردار شاہ دین اس بات کو مانتا ہے کہ وہ ملک سجاد کے بندے تھے تو پورے علاقے میں نہ صرف اس کا تاثر خراب ہوتا بلکہ نفرت بھی پھیل جاتی، ورنہ پیرزادے کے بندے مر جانے کی وجہ سے پیرزادے کے ساتھ شاہ دین کو دشمنی کرنا پڑتی۔ رندھاوا اگر مجھے بروقت اطلاع نہ دیتا تو شاید میں ان کے دھوکے میں آ جاتا۔ اب میرے ذہن میں فقط ایک ہی سوال تھا کہ رندھاوا کے کا اس میں کیا فائدہ ہے؟ تو وقت آنے پر ہی مجھے معلوم ہو سکتا تھا، فی الحال مجھے گاؤں پہنچ کر اپنے بندوں کا تحفظ کرنا تھا۔ خصوصاً دلبر کے لوگوں کا۔۔۔۔۔۔ ان میں اگر کوئی پھٹ گیا تو پیرزادے کی دشمنی مول لینی پڑ جائے گی۔ مجھے گاؤں میں داخل ہونے کے لیے شاہ دین کی حویلی کے سامنے سے ہو کر جانا تھا۔ اگرچہ وہ سڑک سے ذرا ہٹ کر تھی لیکن اس کے بندے وہیں سڑک پر بھی موجود ہوتے تھے۔ میں کسی بھی متوقع صورت حال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ مگر حویلی اور اس کے ارد گرد کہیں بھی کوئی ہچل نہیں تھی۔ میں اور چھا کا گاؤں میں داخل ہو گئے اور چوک میں اچھو کر یا نے والے کی دکان پر جا ٹھہرے، چوک میں برگد کے درخت تلے گاؤں کے بہت سارے لوگ جمع تھے۔ عموماً وہاں لوگ جمع رہتے تھے، لیکن اس دن کچھ زیادہ تعداد تھی۔ بلاشبہ وہاں پر علاقے میں ہونے والے واقعات پر تبصرہ آرائی ہو رہی تھی۔ میرے رکتے ہی لوگوں نے میری طرف دیکھا اور آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ میں نے جاتے ہی اچھو سے کہا۔

”فون ملاؤ۔۔۔۔۔۔ وہی جو تو نے مجھے دیا تھا۔“

”ابھی ملتا ہوں۔۔۔۔۔۔“ اس نے کہا، پھر دکان میں کھڑے گا ہوں کو تیزی سے نشانے لگا۔ چند منٹوں بعد اس نے وہ نمبر ملا کر مجھے دیا۔ چند گھنٹیاں جانے کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا، تو میں نے اس کی ہیلو کے جواب میں کہا۔

”ملک سجاد ہی بات کر رہے ہوتا یا اپنا فون کسی اور کو دے دیا ہے؟“

”بکواس کرو۔۔۔۔۔۔ کون ہوتا؟“

”وہی، جس کو مارنے کے لیے تم نے اپنے بندے بھیجے تھے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ جمال۔۔۔۔۔۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تو تیرے انتظار میں تھا، تو نے خود آنے کی دھمکی دی تھی۔ اب بیخبروں کی طرح بندے بھیج دیئے۔“

”لگتا ہے تو میرے ہی ہاتھوں سے بوٹی بوٹی ہوگا۔“ اس نے بھنا کر جواب دیا۔

”تو آؤ نا، کس نے روکا ہے ورنہ مجھے بتاؤ، میں آ جاتا ہوں، مرد کی زبان ہوتی ہے، بیخبرے اپنی بات سے پھرتے ہیں۔“

”لے پھر انتظار کر، میں آ رہا ہوں۔ شام سے پہلے میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“

”نہ آئے تو۔۔۔۔۔۔ اپنا پتہ بتاؤ۔۔۔۔۔۔“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون اٹھ کر دیا۔ میرا کام ہو گیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھا اور پیدل ہی چند فاصلے پر برگد کے درخت تلے موجود لوگوں کے

”بولو۔۔۔۔۔۔! کیا کروں، جس سے تمہیں یہ پتہ چل جائے کہ میں تمہاری بات نہیں مانتا۔“ اس نے بلجیت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پورا گاؤں گواہ ہے کہ تم نے میری بات نہیں مانی، تم اس حویلی کے اندر داخل ہو کر دکھا دو۔“ اس کی چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لو پھر، میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے روک لو۔۔۔۔۔۔“ جہاں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالے اور حویلی کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اسی لمحے بلجیت کے ہاڈی گارڈوں نے اپنی گنیں سیدھی کیں اور اس پر تان لیں۔ وہاں پر کھڑے ہر شخص نے اپنی سانسیں روک لیں۔ وہ جہاں کو حویلی کے ٹوٹے ہوئے پھانک کی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ تبھی ہر پریت تیزی سے اپنی جیب کی جانب بڑھی اور ڈیش بورڈ سے اپنا ہاسٹل نکال کر وہیں بیٹھ گئی۔ انوجیت اس سارے منظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھی جہاں حویلی کے پھانک کے اندر پہنچ گیا پھر وہیں کھڑے ہو کر اس نے بلجیت کو پکارا۔

”اوائے بلجیت۔۔۔۔۔۔! میں اپنی حویلی کے دروازے پر کھڑا ہوں، اس حویلی کے دروازے پر جسے بے غیرتوں نے آگ لگائی تھی اور میرے بڑوں کو زندہ جلایا تھا۔ میں یہاں کھڑے ہو کر عہد کرتا ہوں کہ میں نے بھی ان بے غیرتوں کو زندہ جلانا ہے۔ اب اگر تم میں ہمت ہے تو روک لو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دونوں جیبوں سے دو ہاسٹل نکال لیے۔ صورتحال انتہائی خطرناک ہو گئی تھی۔ شاید بلجیت کو اس کی طرف سے اس قدر مزاحمت کی امید نہیں تھی یا پھر کوئی اور بات تھی، وہ تذبذب میں کھڑا اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ انوجیت آگے بڑھا اور بولا۔

”بلجیت۔۔۔۔۔۔! اگر تم چاہتے ہو کہ یہاں کوئی خون نہ ہو، تو ابھی پلٹ جاؤ۔ ورنہ کوئی نہیں جانتا، کس کی لاش یہاں گر جائے۔“

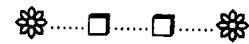
”میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔“ بلجیت نے کہا اور اپنے لوگوں کو اشارہ کر کے واپس گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ مصلحت سے کام لے کر اس ٹکراؤ سے بچ جانا چاہتا تھا۔ اسے جہاں کے اندر کی شدت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک مر جاتا تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ مصیبت تو اسے ہی ہونا تھی، سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔۔۔۔۔۔ ایسے ہی موقع کے لیے اس نے خود پر قابو پایا اور وہاں سے چلا گیا۔ آخر وہ گاؤں کا سرخ تھا۔ اتنی تو عقل تھی اس میں۔ اس نے جہاں کے اندر بھڑکنے والی آگ کی تپش کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ چلا گیا۔ تو جہاں نے ایک طویل سانس لی پھر ٹھیکیدار کے قریب آ کر بولا۔

”تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں صبح سے لے کر شام تک بیٹھیں بیٹھا کروں گا، تم اپنا کام شروع کرو۔ میں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے۔“

تبھی ٹھیکیدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”او بھاء جی، آپ فکر نہ کرو، اب ہفتے میں نہیں، صرف تین دن میں کام ختم ہوگا۔“

”اور تم یقین رکھنا، تجھے روکنے کوئی نہیں آئے گا، تم آرام سے کام کرو، تین کے چھ دن لگاؤ۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کوئی بات کیے بغیر جیب کی طرف بڑھا۔ انوجیت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو جیب چل دی۔ جہاں تیزی سے اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔



میں اور چھا کا بائیک بھگائے نورنگر کی طرف جا رہے تھے۔ چھا کا میرے پیچھے اس لیے نہیں آیا تھا کہ اسے یہ معلوم

درمیاں ایک چارپائی پر آ بیٹھا تو ایک بزرگ سے بندے نے کہا۔

”اوپر.....! ٹوٹل ہو گئے علاقے میں..... کچھ پتہ چلا کیا ہوا ہے کس وجہ سے ہوئے.....“

”چاچا.....! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ لڑائی ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے اور مرتے ہیں غریب غربا! ان کے گیٹ پر ہی غریب بندوقس لے کر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے نوجوانوں کو ان کی خدمت کرنے کے لیے بھیجتے ہو اور پھر پوچھتے ہو یہ قتل کیوں ہوئے۔“ میں نے غصے میں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”میرا کیا مطلب ہے یہ سرداروں اور پیرزادوں کی آپسی لڑائی میں مارے گئے؟“

”ممکن ہے“ میں نے کہا ہوا تھا ”نورنگر کے لوگوں نے پیرزادوں کے بندے زخمی نہیں کئے تھے جواب تک ہسپتالوں میں پڑے ہیں۔ کیا پیرزادوں نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں۔ پردہ اس بات کا ہے جو بھی مرے ہیں غریب ہی مرے ہیں۔“

”مجھے نہیں لگتا جمالے کہ یہ پیرزادوں کی لڑائی ہے چھ بندے باہر کے ہیں اپنے علاقے کے نہیں۔“ اُس نے شک بھرے انداز میں کہا۔

”اب یہ تو سردار ہی جانتا ہے ناکہ وہ بندے کہاں سے لایا تھا اور کیوں؟ یہ سوال اس سے پوچھنا چاہیے؟“ میں نے کہا تو وہ قدرے تذبذب سے بولا۔

”یہاں سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ چھ بندے کل مختلف جگہوں پر تیرا پوچھ رہے تھے۔ لگتا ہے انہیں تیرے ساتھ کوئی دشمنی تھی۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر ان چھ لوگوں کا سردار کے ڈیرے پر کیا کام؟ اس کا مطلب تو یہ ہونا کہ سردار مجھے قتل کروانا چاہتا تھا۔ چاچا.....! یہ بھی چال ہے ان سرداروں کی..... میری دشمنی ان بندوں کو بتا کر خود پیرزادوں کے سامنے سچا ہو جائے۔ میں تو کہتا ہوں گاؤں کے بڑوں کو اکٹھا کریں اور چلیں سردار کے پاس اور جا کر پوچھیں.....“ میں نے وہ بات کہہ دی جس کے لیے میں ان کے پاس آیا تھا۔

”بات تو تیری ٹھیک ہے۔“ چاچے نے سر ہلا کر کہا تو دوسرے لوگ بھی اس کے ہموا ہو گئے۔ تبھی ان میں سے ایک نوجوان نے کہا۔

”اب اگر..... یہ ریت پڑ گئی کہ باہر سے بندے منگوا کر یہاں کے بندوں کو مارا جائے تب دونوں طرف سے بندے تو ہمارے ہی علاقے کے مر رہے ہو سکتا ہے کل ہماری باری ہو۔ کیا ان بڑوں کی لڑائی میں ہم ہی غریبوں کو مرنا ہے؟“

”اب یہ سوچنا تو آپ سب کو ہے ہمیں سوچنا ہے رات بستی میرا شاہ کے تین بندے مرے کل نورنگر کے مرجائیں گے ہم غریبوں کے گھر ہی کیوں اجڑیں وہ لوگ خود کیوں نہ اس آگ میں جلیں جنہوں نے یہ آگ لگا لی ہے۔“ میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اب دیکھو.....! کتنی بڑی کینگی ہے کہ ان مرنے والے لوگوں کے بارے میں اپنے ہی گاؤں کے لوگوں سے پوچھنا چھ کر رہے ہیں انہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔ پیرزادوں سے کیوں نہیں پوچھتے۔“ ایک جو شیلے نوجوان نے غصے میں کہا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں جی! مرنا تو ہے ایک دن مگر یوں بے مقصد مرنا کم از کم مجھے گوارا نہیں۔ دیکھنا میں یہ سوال سردار شاہ دیں سے کروں گا وہ مجھے کوئی جواب نہیں دے گا بلکہ میری موت چاہے گا۔ آج میں مروں گا کل تم اور تمہارے بچے ماریں گے یہ لوگ..... فیصلہ اب آپ لوگوں کو کرنا ہے۔“ میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا اور پلٹ کر بایک کی طرف بڑھا میں

نے ادھر ادھر دیکھا وہاں چھا کا نہیں تھا تبھی اچھو کر پانے والے نے کہا۔

”چھا کا کہہ گیا ہے کہ وہ گھر سے ہو کر تمہاری طرف آتا ہے۔“

مجھے اس کا یوں اچانک غائب ہو جانا کچھ عجیب سا لگا۔ اس لیے اضطرابی طور پر میں اپنے گھر کی جانب بڑھا۔ گلی صاف تھی۔ میں نے کھلے ہوئے گیٹ کو دھکیلا اور بایک سمیت اندر چلا گیا۔ تبھی مجھے باہر والے کمرے میں چھا کا کھڑا دکھائی دیا۔ وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس طرف بڑھ گیا۔ اندر وہی کل والا بندہ بیٹھا ہوا تھا جو رندھاوے کی طرف سے مجھے ملے آیا تھا۔ میں ہاتھ ملا کر اس کے پاس بیٹھ گیا تو وہ بولا۔

”اوپر سے سختی کے ساتھ ہدایت آ گئی ہے کہ ان نو بندوں کے قاتلوں کو فوراً پکڑا جائے۔“

”رندھاوے نے کیا رپورٹ دی ہے اپنے افسروں کو؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”انہوں نے تو یہی رپورٹ دی ہے کہ یہ سرداروں اور پیرزادوں کی آپس کی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ دونوں طرف سے رندھاوا صاحب پر کوئی دباؤ نہیں وہ جو دباؤ بھی ڈالوا سکتے ہیں اوپر ہی سے ڈال رہے ہیں۔ کیونکہ ان اشتہاریوں کے سر پر ہمت تھی۔ جس کا کریڈٹ انہیں جاتا ہے۔ رندھاوا صاحب کی کوشش یہی ہے کہ اسے پولیس مقابلہ دکھایا جائے۔ ہزارے اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔“ اس بندے نے سمجھایا۔

”ایسے تو سردار بھی نہیں مانیں گے۔ ان کے ڈیرے پر فائرنگ ہوئی۔ ان کا نام بھی آئے گا؟“ میں نے کہا۔

”اسی وجہ سے وہ کسی تیسرے گروپ پر یہ سب کچھ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب دیکھیں کیا بنتا ہے۔“ اس نے کہا اور ہندو لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”رندھاوا صاحب نے کہا ہے ملک سجاد کو آپ فون کر کے دھمکی دیں۔ اسے کسی طرح یہاں لانے پر اکسائیں اور کبھی اس کے علاقے میں جانے کی غلطی نہ کریں۔ وہ آگیا تو معاملے کی نوعیت بدل جائے گی کیونکہ ہمارے ڈی ایس پی صاحب کی ان سے پرانی دشمنی ہے۔“

”مطلب تم لوگ اسے ٹریپ میں لارہے ہو۔“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ کاندھے اچکا کر بولا۔

”ایسے ہی ہوگا“ آپ کے لیے ایک اور پیغام یہ ہے کہ آج رات آپ لوگوں کے درمیان رہیں۔ کچھ بھی کریں لیکن اس میں لوگوں کے درمیان رہیں۔“

”کیوں؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر میں ملک سجاد کو فون کر دیتا ہوں اسے یہاں آنے پر اکساتا ہوں تو پھر اگر وہ آگیا تو مجھے ہی اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ اکیلا تو آنے سے رہا اور.....“

”اوہ جس وقت وہاں سے چلا اس وقت یہاں آپ کے پاس اطلاع پہنچ جائے گی۔ ہم کوئی غافل تو نہیں بیٹھے۔“ اس نے ہلکی سی جھوٹ دیا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں اب چلتا ہوں آپ محتاط رہیں۔“

”لحیک ہے۔“ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چھا کے ساتھ باہر نکل گیا۔

گھر کے اندر اماں میرے انتظار میں تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں دہل کر رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اماں کو اپنی ہاتھوں میں لے لیا اور پیار سے پوچھا۔

”اماں.....! کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”اتنی آگ ہے تیرے اندر..... اتنی نفرت..... اتنا غصہ..... نو بندے..... ایک ہی رات میں.....“ انہوں نے یوں لک لک کر کہا جیسے یہ سب کچھ کہتے ہوئے انہیں بہت دکھ ہو رہا ہو۔ تب میں نے کہا۔

”ہاں ماں..... بچپن سے اس آگ میں جل رہا ہوں..... اتنی دیر سے بھڑکتی ہوئی آگ..... اپنا کچھ تو اثر رکھتی ہے۔“
 ”میں کیسی ماں ہوں پتر.....! جس نے خود تجھے اس آگ میں دھکیل دیا۔ ماں تو اپنے بیٹے کو بڑا آدمی بنانے کے نہ صرف خواب دیکھتی ہیں بلکہ پوری جان لگا دیتی ہیں..... اب تو جس راہ پر چل پڑا ہے پتہ نہیں کب تیرا ساتھ.....“ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

”تو فکر مت کر ماں..... میں ایسے نہیں مرنے والا مردوں کا تو اپنے دشمنوں کو برباد کر کے ہی مروں گا..... تو بس میرے لیے دعا کرتی رہا کر.....“ میں نے اماں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا تو انہوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا پھر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”بیٹا..... تیرے لیے ہی تو دعا کرتی ہوں شاید اسی لیے زندہ ہوں..... چل تو بیٹھ میں تیرے لیے کھانا لاتا ہوں۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔“ میں نے کہا اور اماں سے الگ ہو کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ جب میں بائیک لے کر دلبر کے کنویں کی طرف چل دیا۔ چھا کا واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں اس کے گھر بھی گیا لیکن وہ صبح سے ہی واپس نہیں پلٹا تھا۔ میں اس وقت دلبر کے کنویں پر جا رہا تھا میں گاؤں سے نکل کر کنویں کے راستے پر تھا کہ سامنے سے دو ایک جیپ کنویں کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ ایک دم سے مجھے یوں لگا کہ اس میں بیٹھے لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ تجھے کیسے خبر ہوگئی۔ پھر خود پر ہنس دیا کہ رات بھر سے یہی سوچتا چلا آ رہا ہوں اور ایسے ہی خطرناک حالات سے گزرتا رہا ہوں۔ ایسے میں خیالات بھی شک آلود ہو گئے ہیں۔ یہ فطری سی بات ہے کہ جب انسان مخدوش حالات میں سے گزرتا ہے یا اسے کہیں تھوڑا بہت بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ بے حد چوکنا ہو جاتا ہے۔ بقا کی جنگ میں تو بی بھی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔ جس بندے کا کوئی دشمن نہ ہو وہ ایسے تجربات سے نہیں گزر سکتا، لیکن جب دشمنی ہو خطرہ محسوس ہوتا ہو یا منافقوں کو ان کے بلوں سے نکالنا ہو تو پھر فطرت ایسی ایسی صلاحیتوں سے نوازتی ہے کہ بندہ خود حیران رہ جاتا ہے۔ یہیں سے مخفی اور مثبت سوچ دو مختلف راہوں پر لے جاتی ہے۔ وہ منافق جو پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے وہ کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا اور جو اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے اور مثبت سوچ رکھتا ہے فطرت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے کہ عمل اس کی سوچ کا اظہار ہوتا ہے۔ میں انہی خیالات میں کھویا ہوا بائیک لیے جا رہا تھا میرے ارد گرد کھیت تھے اور ہری بھری فصلیں، گندم کی بالیاں ابھی آ رہی تھیں۔ میں انہی رنگوں میں الجھا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ کنویں پر پڑی۔ وہ جیپ وہیں کھڑی تھی۔ مجھے لگا کہ میرے دماغ نے خطرے کا الارم یوں نہیں بجایا۔ کچھ ہے میں نے بائیک وہیں روکی اور فصلوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ کنواں نسبتاً اونچی جگہ پر تھا۔ میرے درمیان صرف ایک کھیت کا فاصلہ تھا آگے کچے کمرے اور پھر وہ لوگ تھے دلبر اور اس کے ساتھ چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور چار بندے ان پر اسلحہ تانے کھڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا دلبر کے پاس ہی چھا کا بیٹھا ہوا تھا۔ صورتحال بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں نے اگرچہ اپنا اسلحہ نکال لیا تھا، لیکن ان پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چند لمحے مزید وہیں رکے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کسی ایک کا چہرہ تو میری طرف ہوتا کہ مجھے معلوم ہو جائے وہ کون ہیں؟ میں اگم ایک پر بھی فائر کرتا تو سامنے بیٹھے ہوئے لوگ باقی تینوں کا نشانہ ضرور بن جاتے۔ میرے لیے لمحہ قیمتی تھا۔ میں اچانک سامنے بھی نہیں آنا چاہتا تھا کہ کوئی گھبرا کر فائر ہی نہ جھونک دے۔ تبھی حملہ آوروں میں سے ایک نے کہا۔

”دلبر بتادے بتادے دلبر! ہمارے تینوں بندے وہاں تک کیسے پہنچے۔ ان کی دشمنی صرف تیرے ساتھ تھی۔“

اے کے ۱۲ فقرے سے میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ پیرزادہ کے بندے تھے۔ تبھی میں نے سام

آئے بغیر کہا۔

”میں بتاتا ہوں کہ وہ کیسے وہاں گئے۔“

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ضرور چونکے ہوں گے اور ان کا دھیان میری طرف ہوا ہوگا۔ مجھے پتہ تھا کہ چھا کے لیے اتنی مہلت ہی کافی ہوگی۔ میں چند لمحے رک کر سامنے آچا تو چھا کا اور دلبر دو بندوں پر حاوی ہو چکے تھے۔ اور باقی دونوں سے خبر دڑا ماتھے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

”اوئے چھوڑ دو ان کو..... لیکن ہتھیار لے لو.....“

چند لمحوں میں ہی ان کی گتیں چھین لی گئیں۔ وہ نہتے ہو گئے۔ میں آگے بڑھا اور ایک چار پائی پر بیٹھ گیا۔ وہ چاروں مہرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سامنے پڑی چار پائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئے۔ باقی ان کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔

”دیکھو..... اگر ہم چاہیں تو ابھی تم چاروں کو اپنا بیچ بنا کر واپس بھجوا دیں۔ اور..... بھجوا بھی دیں گے اگر تم لوگوں نے غلط بات کی تو.....“ یہ کہہ کر میں نے ایک لڑکے سے کہا۔ ”پانی پلاؤ ان لوگوں کو۔“

میرے یوں کہنے پر وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ لڑکا پانی لینے چلا گیا تو میں نے کہا۔ ”سچی بات کرنی ہے صرف سچی..... بولو کس نے بھیجا ہے۔“

”پیرزادہ وقاص نے.....“ ان میں سے قدرے ادھیڑ عمر بندے نے کہا۔

”کیوں.....؟“ میں نے پوچھا۔

”قتل ہونے والوں کی دلبر سے بھی دشمنی تھی۔ اس لیے پوچھنے آ گئے۔“

”خود آئے ہو یا پیرزادے نے بھیجا ہے؟“ میں نے پھر سے پوچھا۔

”انہوں نے ہی بھیجا ہے۔“ اس بندے نے دوبارہ کہا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”تو پھر اسے جا کر بتاؤ دلبر نے وہ بندے نہیں مارے بلکہ ان نوواردوں نے مارے ہیں اور ہم سب ان کے چشم دید گواہ ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ ادھیڑ عمر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”اب تم لوگ بچے تو نہیں ہو کہ یہ باتیں پولیس تک پہنچائی جائیں۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ میں اور دلبر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان چھ کو مارنے گئے تھے سردار کے ڈیرے پر وہاں صرف دو ہی تھے۔ باقی چار ہمیں نہیں ملے وہاں ان سے سامنا ہوا۔ ہم پناہ بازی ہوئی اور ہم نے انہیں قابو میں کر لیا۔ ان سے باقیوں کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ نزدیک سے لکڑی لٹا رہے ہیں۔ انہیں بھٹی کے بارے میں پتہ تھا، ہمیں بھی معلوم تھا، ہم جب وہاں پہنچے تو ان میں مذہبی اور زنجی حالت میں پڑے تھے۔ تمہارے تینوں لوگ مارے جا چکے ان میں سے صرف ایک زندہ تھا اسے ہم نے مارا۔ پھر سبھی کو چھوڑ کر واپس آ گئے۔“

”کیا یہ سچ ہے جمالے.....؟“ اس بندے نے پوچھا۔

”الکل سچ، سولہ آنے سچ.....“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

”ات ہضم نہیں ہوئی.....“ وہ پھر بولا۔

”تو پھر کیا لینے آئے ہو یہاں..... تمہاری دشمنی تو سردار سے بھی ہے اس کے پاس کیوں نہیں گئے۔ اس لیے کہ انہیں تم مارا مکن نہیں سکتے۔ جاؤ جا کر پیرزادے سے کہو ان بے چارے غریبوں کو نہ ستائے بلکہ ان سرداروں سے پوچھ کر

دیکھ کر بولا۔

”تیرے کہنے پر انہیں جانے دیتا ہوں۔ تیری دوستی کی کوشش بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پھر ہوگا وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔“
”مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا تو دلبر نے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنی جیب کی جانب بڑھنے لگے۔ تبھی میں نے چھاکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ان کا اسلحہ بھی انہیں دے دو۔ خالی کر کے۔“

وہ جیب میں بیٹھ چکے تھے تب چھاکا انہیں ان کا اسلحہ دے آیا۔ کچھ فی دیر میں وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ تب دلبر نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔

”کیسی تھی جیری اداکاری.....؟“

”میں اگر وقت پر نہ پہنچتا تو اب تک تم یہ اداکاری کرنے کے قابل نہ ہوتے۔“ میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا تو وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”اب کیا کرنا ہے جمال..... کہیں وہ.....“

”کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”انہیں فقط شک ہے اور یہ شک رہنے دو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ نہیں تو..... کچھ نہ کچھ تو ہوگا نیا۔“

”چل بھول جا سب کچھ بکراؤن کر لیا ہے اب پکاتے ہیں پھر سکون سے کھائیں گے۔“ دلبر نے ساری بحث کو ایک جھٹکے میں سمیٹ دیا۔ میں نے دیکھا اندر کمرے میں تازے گوشت سے سینی بھری ہوئی تھی، ہم چار پائیوں پر بیٹھ گئے تو دو چار لوگ اٹھ کر اسے پکانے کے لیے بڑھ گئے۔

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ جب کھاپی کر ہم وہاں سے چل دیے۔ میں اور چھاکا اپنی اپنی بائیک پر گاؤں واپس آ گئے۔ چوک کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کہا۔

”رندھاوے نے جو بندہ بھیجا تھا اس کی بات یاد ہے نا.....“

”کیا بات.....؟“ میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

”یہی کہ رات..... مطلب آج تم نے کہیں غائب نہیں ہونا گاؤں والوں کے درمیان رہنا ہے۔“ اس نے مجھے یاد کراتے ہوئے کہا تو میں تیزی سے بولا۔

”ہاں..... ہاں..... یاد آیا..... تو پھر.....“

”یہاں چوک میں آ جانا“ یہیں بیٹھ کر تماشا کر لیں گے کوئی.....“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔



اندھیرا چھا گیا تھا، اوگی پنڈ کی روشنیاں جگمگاتی تھیں، جب ہر پریت اور جہاں گھر سے نکلے۔ ہر پریت کی جگہ دھج دیکھنے والی تھی۔ ہلکے فیروز کی رنگ کی شلوار قمیص جس پر سنہری تلے کا کام تھا، اسی رنگ کا مہین سا بڑا آنچل، کانوں میں بڑے بڑے بندے ہلکا ہلکا میک اپ، جس میں آنکھیں بہت خوب صورت انداز میں سنواری ہوئی تھیں۔ کس کر باندھی ہوئی چوٹی سے اس کا ماتھا بڑا کشادہ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں اس وقت سرشار سا ہو گیا، جب وہ مہکتی ہوئی ان کے ساتھ پہلو میں پنجر پیٹ پر آن بیٹھی تھی۔ تبھی گیسر میں جیب ڈالتے ہوئے جہاں نے کہا۔

”آج بڑی خوب صورت لگ رہی ہو۔“

وہ چھوٹا دارو یہاں کیوں تھے اس سوال کا جواب دے دیں گے تو پھر ان کے قاتل بھی مل جائیں گے۔ یہ میرا پیغام دے دینا پیر زادے کو..... جاؤ اب۔“

”اوئے جمالے۔! انہیں یونہی جانے دے رہے ہو، انہوں نے ہم پر اسلحہ تانا ہے، تم نہ آتے تو شاید یہ ہمیں.....“ دلبر نے کہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

”دیکھو، پیر زادے وقاص کی میرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں اس سے دشمنی کرنا چاہتا ہوں، انہیں پانی پلاؤ اور جانے دو۔“

”نہیں، جمالے نہیں، میرے کنویں پر کوئی مجھ پر اسلحہ تانے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، کل کلاں کوئی ایرا غیر اسلحہ لے کر یہاں چڑھ دوڑے گا، نہیں انہیں یونہی نہیں جانے دوں گا، چاہے تو بھی میرا دشمن بن جائے۔“ دلبر انتہائی غصے میں تھا، اس نے اپنے قریب کھڑے لڑکے سے گن پکڑی اور اس کا بولٹ مار دیا۔

دلبر نے گن ان نوواردوں پر تانی ہوئی تھی۔ ہم سب حیران تھے کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے اس کی بات بالکل درست تھی کہ اگر انہوں نے کوئی پوچھ گچھ کرنی تھی تو سکون سے بات کی جاسکتی تھی۔ اب اگر انہوں نے اسلحہ تان ہی لیا ہے تو پھر گولی کھانے کا بھی حوصلہ رکھنا چاہیے تھا مگر ان کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اپنے سامنے موت کو پا کر اپنے حواسوں میں رہنے والے چند لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ عام بندہ تو لڑکھڑا کر رہ جاتا ہے۔ ان کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں ذاتی طور پر ان کا نقصان نہیں چاہتا تھا، کیونکہ اگر انہیں کوئی نقصان ہو جاتا تو میرا بنانا یا کھیل ختم ہو کر رہ جاتا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے دلبر، جیسا تم چاہو، میں تجھے منع نہیں کروں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا، پیر زادہ وقاص اچھا آدمی ہے، بندے کی قدر کرنے والا ہے، باقی تیری مرضی۔“

”چل جانے دے یا ز کیا یاد کرے گا اپنا جمال اس بار چھوڑ دے۔“ چھاکے نے دلبر کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ چھاکا چاہتا تو اس وقت وہ دلبر سے گن چھین سکتا تھا لیکن اس میں رسک بھی تھا اور بد اعتمادی بھی، دلبر نے میز می نگاہ سے چھاکے کو دیکھا اور بولا۔

”جمال صرف اپنی بات کی لاج رکھ رہا ہے، مگر میرے ڈیرے پر.....“ اس نے کوئی سخت بات کہنا چاہی لیکن میرے چہرے پر دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس لیے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”دلبر! میں نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے اور کب سے ہے، میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ پیر زادے تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ میرا شاہ بہشتی کے لوگوں کو تو نے کچھ نہیں کہا، اگر کہا ہوتا تو یہ لوگ یہاں سے زندہ سلامت نہ جاتے۔ سمجھ لے ہم آج سے ان کے ساتھ دوستی کا ہاتھ ملانے کی ایک کوشش کریں گے، اگر مل گیا تو ٹھیک، نہ ملا تب دشمنی تو ہے ہی.....“

”جمال! ان بڑے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ابھی تم نے کہا تھا کہ یہ لوگ سرداروں کے پاس کیوں نہیں جاتے، انہیں چھی طرح پتا ہے کہ علاقے میں بندے وہی مار سکتے ہیں یہ ان کے پاس کیوں نہیں جاتے، ان سے کیوں نہیں پوچھتے۔“ دلبر نے غصے میں کہا۔

”ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ سرداروں سے کیسا تعلق رکھتے ہیں۔ ہم تو اپنی بات کرتے ہیں۔ میں اب تم سے نہیں کہوں گا، اب جو تیری مرضی ہے وہ کر.....“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو دلبر نے اپنی گن ہٹاتے ہوئے میری طرف

”نا پہلے میں بد صورت لگتی تھی یا آج تمہیں کچھ ہو گیا ہے؟“ ہر پریت نے تیز لہجے میں کہا تو وہ چوکتے ہوئے بولا۔
 ”ہائیں.....! یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں..... ہری مرچیں تو نہیں چبا کر آئی ہو۔“
 ”کچھ نہیں، تم جیپ چلاؤ بس.....“ یہ کہہ کر وہ ذرا سا پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔
 ”اوئے سو ہنٹلائی تے لکھنؤ..... ہوا کیا ہے، کیوں ناراض ہو.....“ جیپال نے پھر پوچھا۔
 ”مجھے یہ بتاؤ جی! وہ بے غیرت بلجیت سنگھ دھمکیاں لگا کر چلا گیا، اور تم نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔“
 ”اتنا کچھ تو کہا ہے اسے۔“ وہ حیرت سے بولا تو ہر پریت نے نفرت سے کہا۔
 ”یہ کہنا کچھ کہنا نہیں ہے، کم از کم اس کے منہ پر کوئی ایک آدھ زخم ضرور لگتا تو بات بنتی۔“
 اس وقت تک وہ کچی سڑک پر آچکے تھے۔ جیپال نے گاڑی روک کر کہا۔
 ”میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔“
 ”پہل تو وہ کر چکا تھا اس نے آ کر دھمکیاں دیں تھیں۔“ ہر پریت نے کہا۔
 ”چل! اب چلتے ہیں۔ پہلے اس کی طرف چلتے ہیں پھر شادی میں چلے جائیں گے۔“ جیپال کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔
 ”تمہارا کیا مطلب ہے، وہ ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوگا، وہ خوشی سے کہے گا کہ آؤ اور مجھے سبق سکھا کر چلے جاؤ“
 کیا بات کرتا ہے جی! تو.....“ ہر پریت نے طنز یہ لہجے میں کہا۔
 ”دیکھ لے ہر پریت، اتنا غصہ نہ کر بڑا وقت پڑا ہے پتا نہیں کتو، دیر تک ان سے لڑنا ہے، چل ابھی مسکرا دے۔“ جیپال نے لجاجت سے کہا۔
 ”اگر نہ مسکراؤں تو.....“ ہر پریت نے معشوقانہ انداز میں کہا تو وہ بولا۔
 ”تو پھر میں، ابھی اور اسی وقت بلجیت کی طرف چل پڑوں گا، پھر دیکھا جائے گا، جو ہوگا۔“
 اس کے یوں کہنے پر ہر پریت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔
 ”میں سمجھتی ہوں کہ ابھی وقت نہیں ہے، لیکن میں کیا کروں، میرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا۔“
 ”اس کا بھی کچھ کرتے ہیں، تم بس ذرا سا مسکرا دو.....“ وہ بولا تو ہر پریت ہنس دی لیکن اس کی ہنسی میں کھٹکناہٹ نہیں تھی، جس پر جیپال نے اسے غور سے دیکھا، تب وہ بولی۔
 ”تم..... ان تک پہنچو نہیں، مگر وہ تم تک ضرور پہنچیں گے۔ میں ان کی فطرت جانتی ہوں۔ چلو، تم گاڑی چلاؤ۔“
 ”وہ تو میں چلاتا ہوں، لیکن تم کہنا کیا چاہتی ہو مجھے صاف لفظوں میں کہو۔“ یہ کہتے ہوئے جیپال نے جیپ کو گیزر لگا دیا اور ادرا کی پنڈے سے الٹ پٹی سڑک پر جانے لگا۔
 ”اصل میں تم نے بلجیت کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا اسے وہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔“ ہر پریت نے آگ اگلنے والے لہجے میں کہا تو وہ گہرے لہجے میں بولا۔
 ”میں اب بھی تمہاری منطق نہیں سمجھا۔“
 ”دیکھو.....! آج نہیں تو کل ان سے آنا سنا مانا تو ہونا ہی ہے بلکہ ان سے دشمنی کہاں ختم رہنی ہے رویندر سنگھ اس لیے کمشن میں شامل ہوا ہے اب وہ دھوکے سے اور قانونی ہتھکنڈے استعمال کر کے تمہیں بلکہ ہم سب کو پریشان کریں گے۔ وہ ایک طرف نہ صرف تمہیں قتل کرنے کی کوشش کریں گے بلکہ کسی نہ کسی ناجائز تکیس میں پھنسا کر الجھا دیں گے اور کچھ نہیں تو یہاں کا خالم ترین قانون ”ناڈا“ تم پر لگوا دیں گے اس کے بعد تو پھر شنوائی ہی نہیں ہے۔ جب تک چاہیں تمہیں اندر

رکھیں۔ ان کے ساتھ معاملہ جتنا لمبا کرو گے یہ اتنا ہی ہمیں الجھا دیں گے۔ وہ اب حملہ آور ہیں، لیکن اگر بلجیت قتل ہو جاتا تا تو وہ اپنی بقا والی پوزیشن پر آ جاتے۔“
 ”تم ٹھیک کہتی ہو ہر پریت، لیکن اگر انہیں قتل کر دیا تو پھر کیا ہے، میرے پرکھوں کا انتقام پورا ہو جائے گا، نہیں، نہیں، ہر پریت نہیں، میں ان لوگوں کو اتنی جلدی مکتی نہیں دے سکتا، مجھے میرے سب سے چلنے دو پلیز۔ دشمنی جذبات سے نہیں دل سے لڑی جاتی ہے۔“
 ”میں مانتی ہوں، مگر یہ بھی سچ ہے کہ دشمن کو زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے۔“ ہر پریت نے گہرے لہجے میں کہا۔
 ”خالم اپنی قوت کے نشے میں یہ سمجھتا ہے کہ شاید ہمیشہ وقت اسی کا رہے گا، لیکن وقت بدلتا رہتا ہے، یہی اس کی فطرت ہے، ڈونٹ وری، اپنے چہرے پر سے پریشانی اور دماغ پر سے بوجھ ہٹا دو۔ خوش دکھائی دو، ایک دم فریش کسی گلاب کی طرح.....“ جیپال نے کہا اور اشارے سے پوچھا کہ کس طرف جانا ہے۔ اس نے سیدھے چلتے رہنے کا اشارہ دیا اور پھر ذرا سا تر جھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”واقعی، ہم جب سے ملے ہیں اپنے دشمنوں کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ اپنے بارے میں بس ایک دن بات کی، وہ بھی کیا بات کی۔“
 ”میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے، اور میرے دشمن بڑے طاقت ور ہو گئے ہیں لیکن تمہارا ساتھ مل گیا میرے لیے اتنا ہی کافی ہے، تو میرا حوصلہ بن گئی ہے۔“ جیپال نے رومانوی انداز میں آہستگی سے کہا تو وہ ایک دم سے شرما گئی۔ وہ جتنی بھی بولتھی، آخر تھی تو شہر قی لڑکی، ان دونوں میں خاموشی آ گئی۔
 جیپال تیزی سے جیپ بھگائے چلا جا رہا تھا۔ تبھی سڑک کنارے ایک گاؤں کی طرف جاتے ہوئے ہر پریت نے اشارہ دیا۔ وہ اس طرف مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گاؤں کی ایک حویلی کے سامنے جا رکے۔ جسے برقی قندیلوں سے سجایا گیا تھا۔ گاڑیاں باہر ہی پارک ہو رہی تھیں۔ اس لیے انہوں نے جیپ پارک کی اور اندر کی طرف چل دیے۔
 ”ہر پریت! تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں، شادی لڑکے کی ہے یا لڑکی کی۔“
 ”لڑکی کی..... مجھے تو لگتا ہے بارات آگئی ہوگی۔“ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا اور سامنے کھڑے ایک بزرگ سے سردار سے ملے جو اس کی آمد پر ادوگی ان کے گھر آیا تھا۔
 ”بہت خوشی ہوئی، تو آیا ہے پتر، بہن گلجیت کو نہیں آئی۔“ اس نے پوچھا۔
 ”ان کی طبیعت تھوڑی اپ سیٹ تھی.....“ ہر پریت نے کہا، پھر زیادہ باتوں کا موقع نہیں ملا، وہ دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ ایک بڑے سے پنڈال کی طرف بڑھے، جہاں پہلے ہی بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر پریت نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔
 ”لگتا ہے ابھی بارات نہیں آئی۔“
 ”چلو آ جائے گی۔“ جیپال نے بھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں، نہیں، گرد و دار سے جا کر لانا ہوگا، وہ ادھر آئیں گے۔ شادی کی رسم ادھر ہی ہوگی۔“ وہ بولی۔
 ”اوکے..... اب آئیں ہیں تو..... جیپال ادھوری بات چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔“ تم بیٹھتی کیوں نہیں ہو؟“
 ”میں اپنی سہیلیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میں لڑکیوں کے ساتھ آ جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلی گئی اور وہ وہاں پر اکیلا بیٹھ گیا۔ کچھ وقت گزرا تھا اور وہ ادھر ادھر لوگوں کو دیکھ رہا تھا، کہ انوجیت کی کال آ گئی۔
 ”کہاں پر ہو؟“

”میں شادی میں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”اچھا اچھا! بس تمہاری خیریت معلوم کرنا تھی یہاں لوگوں سے ملو گپ شپ کرو۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ابھی تو اکیلا ہی ہوں ہر پریت اندر لڑکیوں میں چلی گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا تو انوجیت نے کہا۔

”ارے کوئی بات نہیں ابھی تیرے پاس کافی سارے لوگ آ جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ چند نوجوان اس کے پاس آ گئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا، وہ انوجیت کے وہ دوست تھے جو ادگی پنڈ سے تھے۔ وہ بھی گپ شپ کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو لے کر گردوارے کی جانب چل دیئے وہ سب بھی چل پڑے۔

گردوارے میں ”ارداس“ (ایک طرح کی دعائیہ محفل جو ہر خوشی اور غمی کے موقع پر منعقد کرتے ہیں) شروع ہو چکی تھی۔ دولہا اور دلہن اپنے روایتی لباس میں گیمانی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی سب لوگ آہستہ آہستہ خاموشی کے ساتھ گردوارے کے اندر بیٹھے چلے جا رہے تھے۔ گیمانی بڑے پرہوش لہجے میں گرد گرتھ کا پاٹھ کر کے اس کی وضاحت کرنے لگا۔ ہر پریت لڑکیوں میں تھی اور جہاں لڑکوں میں۔ کافی دیر تک ارداس چلتی رہی پھر دولہا اور دلہن نے گرتھ صاحب کے آگے ماتھانکا، گیمانی نے کچھ رسمیں ادا کیں اور ان کی شادی ہو گئی پھر دولہا اور دلہن تو گاڑی پر چوبلی آ گئے باقی سارے پیدل ہی چوبلی کی جانب چل پڑے جو بالکل قریب ہی تھی۔

رات گئے تک شادی والے گھر میں ہلکا سا چلتا رہا۔ شراب پانی کی مانند بہنے لگی، رقص و موسیقی کی محفل جم گئی۔ ہنسنے کھیلتے کھاتے پیتے رات خاصی گہری ہو گئی۔ جہاں کے آکر پاس جمع ہونے والے لڑکے سبھی شراب کے نشے میں دھپ تھے۔ ایک دو ہوش میں تھے۔ وہ جانے لگے تو انہوں نے پوچھا۔

”چلیں جہاں بابو۔“

”تم چلو ہر پریت آتی ہے تو میں نکلتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دیئے اور وہ ہر پریت کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چند لڑکیوں کے ساتھ نمودار ہوئی، پھر اسے دیکھ کر ان سے اجازت لے کر آ گئی۔ قریب آتے ہی بولی۔

”کیسا رہا یہ شادی کا ہنگامہ.....؟“

”اچھا تھا، میرے لیے یہاں کے کلچر کی مناسبت سے بالکل نیا..... چلیں اب.....“

”بالکل! رات بھی خاصا ہو گیا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چل پڑی۔ گیٹ پر وہ بزرگ سردار لوگوں کو دایع کر رہے تھے۔ وہ تپاک سے ملے شکر یہ ادا کیا پھر یہ پارکنگ سے جیپ میں بیٹھے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔

”ڈیس بورڈ میں میرا پہل پڑا ہے وہ نکال لو۔“ جہاں نے سنجیدگی سے کہا تو ہر پریت نے کچھ کہے بنا پہل نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ شاید یہ اس کی چھٹی حس تھی یا محض حفظ ماتقدم کے طور پر لاشعوری عمل تھا وہ دونوں محتاط ہو گئے تھے اور اسی لیے خاموش تھے رات کے وقت سڑک سناں تھی اس لیے وہ تیز رفتاری سے جیپ بھاگے لے جا رہا تھا۔ سارا راستہ کٹ گیا، پھر جیسے ہی وہ اپنے گھر کی طرف مڑنے کے لیے آہستہ ہوئے بالکل موڑ پر آ گئے ایک سفید کار کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہائی ایس وین نے راستہ روکا ہوا تھا۔ جہاں کے جڑے بھنچ گئے اسے گاڑی رونا پڑی۔ بھی بولا۔

”ہر پریت..... الرٹ ہو جا.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے بریک لگا دیئے اور ہیڈ لائٹس روشن رہنے دیں۔

”فکر نہ کرو.....“ یہ کہہ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تبھی وین کی اوٹ میں سے چند آدمی باہر نکلے ان کے ہاتھوں میں گتیں تھیں۔ تبھی ہر پریت نے پچھلی نشست پر کودتے ہوئے کہا۔ ”حوصلہ رکھنا۔“

”تو بھی فکر نہ کرو.....“

وہ تین لوگ تھے اور چوتھا وہ وین ہی کے پاس کھڑا رہا۔ جہاں نے پہل ڈیش بورڈ سے اٹھا کر اپنی ران کے پاس رکھ لیا۔ تبھی ایک نے مارچ اس کی طرف کر کے روشنی چہرے پر ڈالی پھر اونچی آواز میں بولا۔

”یہی ہے.....“

”تو نکالو باہر اسے۔“ انہی میں سے ایک نے کہا۔ جہاں نے پچھلی سیٹ پر ہر پریت کو دیکھا وہ تیزی سے ایک گن میں میگزین لگا کر گن کو سیدھی کر رہی تھی۔ وہ ہلکے سے بولی۔

”جاؤ وہ میرے نشانے پر ہیں.....“ اس نے نر روف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جہاں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی قریب آئے اور آ کر دروازہ کھولتے ہوئے ہر پریت کو دیکھ لے..... وہ ان کی جانب بڑھا تو انہوں نے گتیں تان لیں۔

”ہاتھ اوپر رکھو جہاں..... کوئی چالاکی دکھائی تو گولی مار دیں گے۔“

اس نے ہاتھ اوپر کر دیئے اور بڑے حوصلے سے ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں پوچھا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”ہم کون ہیں۔ یہ تمہیں بتانے کے پابند نہیں، لیکن ہاں چاہتے کیا ہیں یہ بتا دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا تو دوسرے نے کہا۔

”بس ایویں دو چار ہڈیاں توڑنی ہیں تیری.....“

”وہ توڑ لینا..... اگر تم میں ہمت ہوئی تو..... کیونکہ ہڈیاں توڑنے والے یوں بزدلوں کی طرح گتیں لے کر نہیں کھڑے ہوتے.....“ جہاں نے طنز یہ انداز میں کہا تو پہلے نے نہایت غلیظ قسم کی گالی بکتے ہوئے کہا۔

”اس کی تلاشی لو پھر بتاتے ہیں۔“

ان کے قریب جو خاموش کھڑا تھا وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے جیسے ہی تلاشی لینا چاہی جہاں نے نہایت تیزی سے اسے قابو کیا اور اپنا پہل نکال کر اس کی کینٹی پر رکھ دیا۔

”اسے مارنا ہے یا ہتھیار پھینکنے ہیں جلدی بولو۔“

”اوئے اسے چھوڑ..... میرے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال.....“ پہلے نے کہا تو جہاں نے سکون سے کہا۔

”گلتا ہے تو پاگل ہے یا پھر تجھے کسی پاگل نے بھیجا ہے گن پھینک۔“

”جو قابو ہو گیا، تو ہو گیا، مر جانے دے اسے.....“ دوسرے نے کہا اور گن سیدھی کی، تبھی یکے بعد دیگرے فائر ہوئے تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ گولیاں کچھ ان کے پاؤں پر اور کچھ زمین میں لگی تھیں۔ شاید انہیں گمان نہیں تھا کہ جیپ کی طرف سے بھی فائر ہو سکتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں گتیں لڑ گئیں۔ انہوں نے لاشعوری طور پر آڑ لینا چاہی۔ اتنے میں ہر پریت نے دوسری بار فائر کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی تیز جیج بلند ہوئی۔ رات کے وقت فائرنگ کی آواز بھی بہت خوفناک تھی۔ وہ ایک دم سہم گئے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ تیسری بار ہر پریت نے گولیاں ان کی ٹانگوں پر ماریں تو وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ انہیں موقع ہی نہیں ملا کہ وہ جوابی فائرنگ کر دیں۔ تبھی جہاں نے کہا۔

”اب بھی وقت ہے گتیں پھینک دو ورنہ جان چلی جائے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے قابو میں کیے ہوئے شخص کے ماتھے پر زوردار پہل کا دستہ مارا وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ نیچے گرا تو جہاں بھی فائر کرنے لگا اور واپس گاڑی کی طرف جست لگا دی۔ اس وقت وہ وین میں گھس گئے تھے جب کار کی طرف سے فائر

ہوا۔ یقیناً وہاں کوئی تھا؛ جہاں نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ ہر پریت نے ایک برسٹ ادھر مارا تو اس طرف سے ایک دم خاموشی چھا گئی۔ جہاں گاڑی کے اندر آ گیا۔ ہر پریت نیا میگزین لگا رہی تھی۔

”میں جیسے ہی کہوں؛ جیپ تیزی سے آگے بڑھا دینا۔ دین ہٹالیں تو ٹھیک ورنہ مار دینا اس میں۔“ ہر پریت نے تیزی سے کہا تو جہاں نے گیر لگا دیا۔ جیسے ہی اس نے چلو کہا، اس کے ساتھ ہی اس نے سن روف سے باہر نکل کر فائرنگ شروع کر دی۔ تبھی سامنے سے جوابی فائرنگ ہونا شروع ہو گئی۔ جہاں نے گاڑی بڑھادی، لمحوں میں وہ دین کے ساتھ جا نکلای۔ ایک دھماکے کی آواز آئی، دین الٹ گئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب تین چار گاڑیاں سڑک پر سے گزرتے ہوئے کچھ فاصلے پر رک گئیں۔ جیپ کے لیے آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ ہر پریت نے نیچے ہو کر تیزی سے کہا۔

”جیسی.....! دروازہ کھول کر سیدھے بھاگ نکلؤ میں بھی آئی۔“

جہاں نے ویسے ہی کیا چشم زدن میں اتر کر بھاگ نکلا، اس کے پیچھے ہی ہر پریت آ گئی۔ دونوں بھاگتے ہوئے گندم کے کھیت میں چلے گئے۔ دونوں آگے پیچھے آگے ہی آگے بھاگے گئے۔ کیونکہ کچھ فاصلے پر ان کے گھر کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی بھاگ کر گیٹ کے قریب گئے، انوجیت تیزی سے نکلا اس کے ہاتھ میں گن تھی۔

”انوجیت رکو.....“ جہاں نے کہا۔

”تم..... یہاں..... ہر پریت..... وہ کون تھے.....“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”پتہ نہیں.....“ جہاں نے بھی تیزی سے کہا کہ اس نے انتہائی اختصار سے اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ تبھی اس نے کہا۔

”پتہ تو کرنا ہوگا..... آؤ.....“ یہ کہہ کر وہ محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے فون نکالا، جو آن لائن ہی تھا۔ ”ادھر سے کوئی سامنے آیا کون ہے.....؟“

”کسے فون کر رہے ہو.....“ جہاں نے پوچھا۔

”وہ سڑک پر..... جو تمہیں شادی میں ملے تھے..... انہوں نے مجھے بتایا کہ.....“ یہ کہتے ہوئے وہ رک گیا۔

وہ ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اوگی پنڈ کی طرف سے چار گاڑیاں تیزی سے وہاں آن پہنچیں۔ وہ رابطے میں تھا اور ان سے پوچھ رہا تھا پھر فون ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”وہ بلجیت کے غنڈے ہیں..... ممکن ہیں وہ اب ادھر گھر پر دھاوا بول دیں جلدی پلٹو.....“ یہ کہتے ہوئے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کی طرف چلا۔ جہاں اور ہر پریت بھی مڑ گئے۔ گیٹ پار کرتے ہی اس نے گیٹ بند کیا اور بولا۔ ”تیزی سے اوپر چھت پر..... ادھر اسلحہ پڑا ہے ہر پریت بتاؤ.....“

وہ تیزی سے اوپر کی جانب چڑھتے چلے گئے چند منٹ بعد وہ چھت پر تھے۔ انہوں نے دوسری منزل کے ایک کمرے سے اسلحہ لے لیا تھا۔ وہ لوگ وین سیدھی کر چکے تھے اور شاید زخمیوں کو لے جا رہے تھے۔ انہوں نے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں سے ہر بندہ گاڑیوں سمیت چلا گیا۔ ان کی جیپ وہیں کھڑی رہی۔

”وہ تو گئے.....“ جہاں نے کہا تو انوجیت نے منتشر لہجے میں کہا۔

”کوئی پتا نہیں..... ان کا..... تم لوگ یہاں ٹھہرے رہو..... میں نیچے جاتا ہوں اور بندے بلواتا ہوں۔“

”اوئے انوجیت..... سکون کر..... کچھ نہیں ہوتا..... اور اگر جانا ہی ہے تو چائے کے دو کپ بھیج دینا جوتی کے ہاتھ۔“ جہاں سنگھ نے یوں کہا جسے وہ پکنک پر آئے ہوئے ہوں۔ تب انوجیت نے ایک گہرا سانس لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”اوئے یار! میں گھبرا گیا تھا..... لیکن پھر اتو دینا ہے۔“

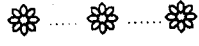
”ٹھیک ہے تو چائے بھیج۔“ جہاں نے کہا تو وہ نیچے چلا گیا۔ تبھی اس نے ہر پریت کی طرف دیکھا اور کہا۔

”تم تو بڑے کام کی چیز ہو..... ابویں کہہ رہی تھیں مجھے فائرنگ سکھا دو۔“

تبھی وہ کھلکھلا کر ہنس دی، پھر آہستگی سے بولی۔

”گرو گو بند جی کی بیٹی ہوں..... امرت “ٹھکھا“ ہوا ہے، لڑنا ہی تو میری شان ہے۔“ اس کے لہجے میں گرو گو بند جی کی بیروکار ہونے پر فخر تھا۔

”چل تجھ سے کبھی فائیٹ کر کے دیکھ لیں گے۔ لیکن ابھی تو.....“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا، وہ سمٹ کر اس کے سینے سے جا لگی۔ جہاں نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں اور یہی حال ہر پریت کا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔



چاند نکل آیا تھا، چوک میں برگد کے درخت سے ذرا ہٹ کر چار پائیاں دھری ہوئی تھیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو گاؤں کے کافی سارے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ایک طرف چھا کا اور اس کے دوست موجود تھے اس کے قریب ہی دلبر اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا تھا۔ گاؤں کے وہ بزرگ وہاں آچکے تھے جنہیں مختلف برادریوں نے چھوٹے چھوٹے فیصلوں کا حق دیا ہوا تھا۔ چونکہ وہ مخلص لوگ تھے اس لیے سب ان کی مانتے بھی تھے۔ میرے وہاں جاتے ہی لوگوں میں تھوڑی ہلچل ہوئی کیونکہ انہیں یہی معلوم تھا کہ آج جمال نے پچائیت میں بات کرنی ہے۔ میرے وہاں بیٹھے ہی ایک معمر شخص نے پوچھا۔

”ہاں بھئی جمال! کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

”میاں جی! بات یہ ہے کہ ہمارا علاقہ بڑا پر امن ہے لیکن ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اس پر امن علاقے میں اچھی خاصی گڑبڑ ہونے لگی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ میں اس گڑبڑ کا حصہ نہیں ہوں یا میرا دامن پاک صاف ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، جس کسی کا جب دل چاہے حملہ کر دیتا ہے، جب چاہے کوئی بندے مار کر چلا جاتا ہے، حد تو یہ ہے کہ پھر شک بھی اپنے ہی علاقے کے بندوں پر کیا جاتا ہے۔ انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں ہی نہیں بلکہ ذلیل بھی کیا جاتا ہے، اسلحے کی نوک پر ان سے پوچھتا چھ کی جارہی ہے، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمیں اپنے تحفظ کے لیے اب اسلحہ اٹھالینا چاہیے یا پھر اس غنڈہ گردی کا کوئی سدباب کرنا ہوگا؟“ میں نے انتہائی جذباتی انداز میں اپنی بات ختم کی تو ایک دوسرے بزرگ نے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

”میرے خیال میں تو بہت کچھ ہے بزرگو! یہ ساری صورت حال آپ بھی جانتے ہیں۔ پھر بھی آپ میرا خیال پوچھ رہے ہیں کون نہیں جانتا۔ میں نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا تو وہ بزرگ سب کی طرف دیکھ کر بولے۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن ہم جمع ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس صورت حال پر بات کریں، میں تمہاری بات سے ابتدا کرتا ہوں، اسی لیے تم سے پوچھا ہے کہ تمہارا کیا خیال ہے، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“

”تو پھر سنیں۔“ میں نے ان کی طرف دیکھ کر جذباتی انداز میں کہا۔ ”اصل میں ہم لوگ اس علاقے کے جاگیرداروں کے غلام بن چکے ہیں۔ بظاہر ہم آزاد ہیں، لیکن ذہنی طور پر اب بھی غلام ہیں۔ سفید چمڑی والے آقا گئے برسوں ہو گئے مگر یہ کالی چمڑی والے اب ہم پر مسلط ہیں۔ ان کی غلامی کرنا انہی کی چاکری کر کے، انہی کا حکم ماننا ہماری گھٹی میں پڑ چکا ہے۔ جس جاگیردار کا دل کرتا ہے وہ ان غریبوں کو اپنی ملکیت تصور کرتے ہوئے اس کی جان تک سے کھیل جاتا ہے یہ صورت

حال صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم ان جاگیرداروں کی غلامی میں ہیں۔“

”تم وہی عام سی بات کر رہے ہو جو محض نوجوانوں کو بھڑکانے کے لیے کوئی بھی کر سکتا ہے کیا ثبوت ہے تیرے پاس.....“ ایک تیسرے بزرگ نے تیزی سے پوچھا۔

”سردار شاہ دین کے ڈیرے پر آنے والے بندوں نے میرا شاہ کے علاقے کے بندوں کو مار دیا۔ مجھ پر چند دن پہلے ہونے والے حملے میں سردار شاہ دین کا ہاتھ تھا۔ وہ بندے بھی اس کے ڈیرے پر ٹھہرے تھے۔ اب اس کا مطلب آپ کو سمجھانا پڑے گا کہ سردار جب چاہے اس علاقے کے بندے مروادے اسے بندے مارنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ اور دوسری طرف پیرزادے..... آج ہی دلبر پر پیرزادوں نے آکر اسلحہ تان لیا۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ میرا شاہ والے بندوں کو انہوں نے مارا ہے؟“ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”جمال..... تم پورے ہوش سے بات کر رہے ہو یا یہ سرداروں اور پیرزادوں پر محض الزام تو نہیں۔“ ایک بزرگ نے میرے بیان کی تصدیق چاہی۔

”میں ثبوت دے رہا ہوں۔ محض الزام نہیں لگا رہا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ چھ بندے قتل ہوئے ہیں وہ کہاں ٹھہرے تھے؟“ میں نے کسی حد تک غصے میں کہا تو وہاں موجود لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے لوگ بھی حیران تھے کہ آج تک کسی نے اتنے واضح الفاظ میں سرداروں کے خلاف بات نہیں کی آج اسے کیا ہو گیا ہے؟

”ممکن ہے وہ آئیں تو سرداری کے پاس ہوں اور اپنی ہی کسی دشمنی کی وجہ سے ان کے درمیان تنازع ہو گیا ہو۔“ اس بزرگ نے کہا تو مجھے واقعتاً غصہ آ گیا۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”ممکن تو کچھ بھی ہو سکتا ہے بزرگو.....! ہم اندھے بھی ہو سکتے ہیں ہماری جانوں کو ہر وقت خطرہ بھی ہو سکتا ہے اگر دلبر پر اسلحہ تان گیا، دلبر مر جاتا، اس کے ساتھی مر جاتے یا حملہ آور مر جاتے بات تو بڑھتی دونوں طرف کے بندے مارے جاتے، سرداروں اور پیرزادوں کا کیا جاتا، مرنا تو پھر ہم غریبوں ہی نے ہے۔ بالکل اسی طرح ہم غریب لوگ کیڑے مکوڑوں کی مانند مارے جا رہے ہیں لیکن نہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ہم حوصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات کر کے میں نے اپنی موت کو دعوت دے دی ہے اس لیے میں یہاں پر اعلان کرتا ہوں کہ اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو میرے قتل کے ذمے دار صرف اور صرف یہ سردار ہوں گے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی غریب غراؤں ان کے خلاف آواز بلند کرے۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ ایک بزرگ نے بڑے ٹھہرے لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

”میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں نے اپنی آنے والی نسل کو غلامی سے بچانا ہے انہیں خوشحال دیکھنا ہے اور انہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دینا ہے تو ان جاگیرداروں سے جان چھڑانا ہوگی۔ ان کے خلاف بغاوت کرنا ہوگی، ان کے چنگل سے نکلنا ہوگا، ورنہ یہ لوگ ہمیں یونہی مارتے رہیں گے اور ہمارا پرسان حال کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے لیے جنگ لڑنا ہوگی۔“ میں نے صاف لفظوں میں اپنا مدعا کہہ دیا۔

”تم تو دیوانوں جیسی باتیں کر رہے ہو میرے پتر نہتے لوگ کیا جنگ لڑیں گے۔ ان غریبوں کی تو روٹی پوری نہیں ہوتی۔“ اس بزرگ نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”یہی تو میں آپ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اس روٹی کا حصول کن لوگوں نے تنگ کیا ہوا ہے وسائل پر قبضہ کیے ان لوگوں کے کتے بہترین راتب کھاتے ہیں اور یہاں عام آدمی روٹی سے تنگ ہے۔ یہ لکیشن کے دنوں میں اپنا دیدار کروا کے آپ سے ووٹ لے جاتے ہیں روٹی انہوں نے نہیں آپ لوگوں نے خود اپنے لیے تنگ کی ہوئی ہے خیر.....“

میرا جو آپ لوگوں سے سوال ہے اس کا جواب کیا ہے؟“

”تمہارا سوال غلط نہیں، مگر تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم کیا کریں۔“ دوسرے بزرگ نے خاصے دردمند لہجے میں پوچھا۔

”میرے پاس بڑے حل ہیں لیکن اس پر سوچ بچار کرنے کی زحمت میں نے آپ کو اسی واسطے دی ہے کہ اگر آپ کچھ نہیں کریں گے تو مجبوراً ہمیں خود کرنا پڑے گا۔ میں یونہی کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا۔ یہاں سب گاؤں والے موجود ہیں۔ پوچھیں ان سے.....“ میں نے وہاں پر موجود گاؤں کے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، تبھی کئی جو شیلے نوجوانوں نے میری ہاں میں ہاں ملائی تو ایک شور برپا ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی کہے چلا جا رہا تھا۔ سواں بزرگ نے سب کو خاموش کراتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تم نے ٹھیک بات کہی کہ ہمیں سوچ بچار کرنا چاہیے۔ سوچتے ہیں اس مشکل سے کیسے نکلنا ہے اس پر بھی سوچتے ہیں کیا تم نہیں جانتے ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہے؟“

”میں نے تو اپنی بات کہہ دی اب آپ جانیں اور آپ کا کام.....“ میں نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا، تبھی لوگ اپنے اپنے طور پر تصرہ آرائی کرنے لگے۔ ہر بندہ اندر سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنا اظہار چاہتا تھا، لیکن خوف کے باعث بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں انہیں اظہار کا موقع ملا تو ان کے اندر کی نفرت ظاہر ہو رہی تھی، وہ سبھی تنگ تھے اور خوف محسوس کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ محفوظ نہیں ہیں۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اس دوران چھا کا میرے قریب ہوا اور کان کے پاس بولا۔

”اب چل جو کام ہونا تھا وہ ہو گیا ہے؟“

میں چند لمحے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ان بزرگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ ہمارے بزرگ ہیں ہمارے لیے بہت ہی محترم میں جانتا ہوں کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے، ہم سب اس پر سوچیں اور کوئی لائحہ عمل بنائیں۔ ہم چند دن بعد پھر یہاں اکٹھے ہوں گے بڑے احترام کے ساتھ میں آپ سے یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صرف اتنا ذہن میں رکھیں ان سرداروں کی سرداری علاقے پر حاکمیت صرف ہماری وجہ سے ہے اب میں چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایک بزرگ نے کہا تو میں لوگوں میں سے باہر نکل آیا۔

کچھ فاصلے پر چھا کا چند دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں ان کے قریب پہنچا تو چھا کے نے بایک سیدھی کی، میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا تو وہ چل پڑا ذرا سا آگے جا کر اس نے بڑی گرجوٹی سے کہا۔

”رندھاوے نے بڑا کام دکھا دیا ہے یار.....“

”کیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”وہ ملک سجاد آ گیا ہے اور پتا ہے کہاں آ کے ٹھہرا ہے؟“

”اوئے سیدھی بات کر.....“ میں نے اکتاہٹ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”بات یوں ہے پیارے کہ آج شام ملک سجاد ان سرداروں کے پاس آ گیا ہے اس کے ساتھ کافی سارے بندے بھی ہیں۔ یوں سمجھو فوج ہی لے کر آیا ہے لیکن رندھاوے نے ان کے چار بندے پھڑکادیے ہیں پولیس مقابلے میں وہ سبھی اٹھاری تھے۔“

”اوہ واہ.....“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”لگتا ہے رندھاوہ یاری نبھائے گا۔ کہاں ہوا ہے یہ پولیس ملا.....؟“

”ہوا لوں کہ ملک سجاد کے آگے پیچھے بندے تھے۔ اب وہ کوئی امن کا پیغام لے کر تھوڑا آیا ہے رندھاوا ان لوگوں کے انتظار میں تھا ایک ٹولی مل گئی، انہوں نے پڑی، بس ہو گیا مقابلہ۔“

”اس کا مطلب ہے..... اب تھانے میں اچھی خاصی گہما گہمی ہوگی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اور سرداروں کا کیا حال ہوگا؟“ چھا کے نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”اب ایسے کر مجھے گھر پر اتار کر سارے دوستوں کو اکٹھا کر..... دلبر کو بھی لے اور بھیدے کے پاس ڈیرے پر چلا جا، میں بھی وہیں آتا ہوں۔ آج رات بہت محتاط رہنا ہوگا۔ سمجھو، ہمیں شکار کرنا ہے یا پھر ہم شکار ہو جائیں گے.....“

”میں سمجھتا ہوں ایسا ہی کچھ ہوگا.....“ چھا کے نے کہا اور بایک تیز کردی۔ وہ مجھے میرے گھر کے گیٹ پر اتار کر چلا گیا۔

میں گھر میں داخل ہوا تو سامنے والا ان نے اماں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میری ماں کتنی بہادر ہے، اکیلی اتنے بڑے گھر میں رہتی ہے اسے پوری طرح احساس ہے کہ میں موت کے چنگل میں ہوں، لیکن پھر بھی نہیں گھبراتی، اگر پریشان ہوتی بھی ہوگی تو اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ ہمیشہ میری ماں نے مجھے حوصلہ ہی دیا تھا۔ کبھی وقت اور حالات سے ڈرایا نہیں تھا۔ میں قریب پڑی چارپائی پر چپکے سے بیٹھ گیا اور غور سے ماں کو دیکھنے لگا، کتنی بہادر اور پر عزم تھی میری ماں، جس نے اپنے سینے میں انتقام کی آگ نہیں بجھنے دی تھی اور میں نے دودھ کے ساتھ اس آگ کی حدت کو بھی اپنے اندر اتار لیا تھا۔ میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ میری ماں نے سلام پھیرا، پھر مجھے دیکھ کر اشارے سے اپنے قریب بلایا، میں ان کے پاس جا بیٹھا تو میرے سر پر پھونک ماری جیسے اس نے مجھے اپنی دعاؤں کے حصار میں لے لیا ہو۔

”کھانا کھائے گا؟“ ماں نے پوچھا۔

”نہیں اماں، بھوک نہیں ہے تم پڑھو نماز، میں بس کچھ دیر کے لیے آیا تھا، ابھی جا رہا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا تو اماں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔

”اپنا خیال رکھنا پتر۔“

یہ کہہ کر وہ بقیہ نماز کے لیے اٹھ گئیں اور میں اوپر چھت پر چلا گیا۔ مجھے وہاں سے کچھ اسلحہ اور رقم لینی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں گھر سے اپنی بایک پر نکلا اور ڈیرے کی طرف چل دیا۔ چاند کی روشنی کچھ زیادہ تھی یا پھر مجھے لگ رہی تھی۔ دور دور سے بھی ہو لے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں گاؤں کی گلیوں سے نکلتا چلا گیا اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ میں اکیلا تھا اور مجھے معلوم تھا ملک سجاد اس وقت مجھے تلاش کرنے کے لیے اپنے بندے بھیج چکا ہوگا۔ اگر وہ اب تک مجھے تلاش نہیں کر سکے ہیں تو رندھاوا نے انہیں تھانے ہی میں مصروف رکھا ہوگا۔ اس وقت کون کیا کر رہا ہے مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات اٹکی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح پیر زادہ وقاص سے رابطہ ہو جائے تو پھر جو میں چاہتا ہوں وہی ہو جائے گا۔

میں ڈیرے پر پہنچا تو چھا کے کے ساتھ دلبر اور اس کے کئی سارے ساتھی تھے۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھے۔ میرے بیٹھے ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”یار، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے ارد گرد کی خبر ہمیں کیسے ملے گی؟“

”میں اور دلبر ابھی یہی باتیں کر رہے تھے۔ ابھی ہم یہاں ہیں اور ان لوگوں کا پتہ نہیں وہ کیا کر رہے ہیں اور کدھر ہیں؟“ چھا کے نے کافی حد تک تشویش سے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کون لوگ؟“

”وہی ملک سجاد کے لوگ؟“ اس نے جواب دیا۔

”ان کے لیے رندھاوا ہی کافی ہے، اگر ایک سوال کا جواب مل جائے تو پھر.....“ میں نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”وہ کیا؟“ چھا کے اور دلبر نے ایک ساتھ بے ساختہ پوچھا تو میں نے کہا۔

”اس وقت پیر زادوں کی کیا کیفیت ہے؟ وہ کیا کر رہے ہیں ان کی طرف سے خاموشی، سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔“

”میرا نہیں خیال کہ وہ خاموش ہوں گے.....“ دلبر نے تیزی سے کہا۔

”یہ محض خیال ہی ہے نا، تصدیق تو نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو یہ کیسے ہوگا؟“ اس نے مایوسانہ لہجے میں پوچھا تو میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

”اگر ایک بار رندھاوا سے ملاقات ہو جائے نا، تو بہت کچھ سامنے آ جائے گا، کیونکہ وہ دائی ہے پورے علاقے کی کون سا مجرم کہاں ہے اسے سب معلوم ہوتا ہے۔“

”تو چل نکل چلتے ہیں، مل لیتے ہیں اس سے، یہ کوئی بڑی بات ہے۔“ دلبر نے تیزی سے کہا، وہ خاصا بے تاب دکھائی دے رہا تھا۔

”اوائے ملنا کیا ہے اس سے، اچھو کر یا نے والے سے فون.....“ چھا کے نے کہا تو میں نے ٹوک دیا۔

”نہیں، یہ ہم بڑی غلطی کرتے رہے ہیں۔ وہ اگر ہمیں ساری بات بتا سکتا ہے تو دوسروں کو بھی سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ تو ایسا کر یہاں سب سنبھال لے، بلکہ گاؤں میں بندے چھوڑ، تاکہ معلومات ملتی رہے۔ میں اور دلبر جاتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔ پھر تیزی سے بہت کچھ طے کیا اور ہم دونوں بایک پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ ہمیں تھانے میں مل جاتا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے چھا کے کو اسلحہ اور رقم کے بارے میں سمجھا دیا تھا کہ ان کا کیا کرنا ہے وہ سمجھ گیا تھا۔ اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی، جب میں اور دلبر دونوں ڈیرے سے نکلے اور قریبی قصبے کی جانب چل پڑے۔ میں بایک چلا رہا تھا اور دلبر اسلحہ لیے میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ کچے راستوں پر میں احتیاط سے چلتا رہا، پھر جیسے ہی ہلکا سڑک آئی میں نے طوفانی رفتار سے بایک بھگایا اور تقریباً پون گھنٹے میں ہم قصبے جا پہنچے۔ تھانہ کافی حد تک سنان پڑا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی باہر کھڑے ستری سے پوچھا۔

”رندھاوا صاحب ہیں تھانے میں.....!“

”جی، نہیں، وہ چلے گئے ہیں۔“ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دلبر نے اپنا اسلحہ چھپایا ہوا تھا۔

”کہاں گئے ہیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری ملنا ہے۔“ میں نے کہا کیونکہ وہ مجھے پہچان کر مسکرا دیا تھا۔

”پتہ نہیں گشت پر ہوں یا پھر آرام کرنے کو ارٹھ پر.....“ دیکھ لیں۔“ اس نے اشارے میں جواب دیا تو میں نے تھانے کے اندر جا کر بایک رہائشی علاقے کی طرف موڑ لی۔ ہمیں رندھاوا کے کا کوارٹر تلاش کرتے چند منٹ لگے۔ میں بایک روک کر اتر اور جا کر اس کا دروازہ بجایا۔ دوسری دستک کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ پھر تیزی سے بولا۔

”جلدی سے اندر آ جا، اسے بھی لے آ اندر۔“

دلبر نے بات سن لی تھی وہ اتر اتو میں نے بایک کوارٹر کے اندر کر لی، وہ تنہا تھا اور یونیفارم میں تھا۔

”آپ کو کیسے پتا رندھاوا صاحب کہ میں ہی ہوں..... کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔“

”میں ابھی آیا ہوں، تیری پہلی دستک پر میں نے اندر سے جھانک کر تصدیق کر لی تھی کہ باہر کون ہے، مجھے تو یہ بھی معلوم

ہے کہ تیرے ساتھی کے پاس اسلحہ ہے چل اب کام کی بات کر کیوں آیا ہے؟“ اس نے تیزی سے کہا۔
 ”میں صورتحال جاننے کے لیے آیا ہوں۔ یہ کیا گیم چل رہی ہے..... اور میں.....“
 ”تجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب تیرا کام ہوتا تو تجھے بتا دیتا۔ میرا بندہ تم تک پہنچ جاتا تو بے فکر ہو جا۔“
 ”لیکن پھر بھی..... ملک سجاد.....“

”اُوئے سن..... اس کی تو بہن..... وہ اب زندہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ پیرزادوں کو یہ باور کرا دیا ہے میں نے کم
 اس گیم کا حصہ نہیں ہو۔ اس کے تینوں بندے سرداروں نے ہی مروائے ہیں اور یہ جو چار بندے مرے ہیں یہ پیرزادوں ہی
 نے مارے ہیں۔ ان دونوں کی آپس میں لگ گئی ہے۔ صبح تک دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ میں داد دیتا ہوں تیرے ذہن کی تو نے
 جو پلان کیا تھا ویسا ہی ہو رہا ہے۔“

”اگر انہوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا تو.....“ میں نے ایک خدشہ ظاہر کیا۔
 ”وہ تو ہونا ہی ہے آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں..... جب بھی انہیں معلوم ہوا کہ گیم کیا ہوئی ہے مگر یہ اس وقت
 تک سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک ملک سجاد ادھر ہے۔ کیونکہ پیرزادے یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہیں کرش کرنے کے لیے
 سرداروں نے دوسروں سے مدد لے لی ہے۔ اب ملک سجاد کا مرنا بہت ضروری ہے۔“
 ”تو پھر اسے مار دیتے ہیں۔“ میں نے یوں کہا جیسے کسی چیونٹی کو سسلنے کی بات کر رہا ہوں۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اسے مار دو گے، لیکن یہ مدعا پیرزادوں کے سر ہی پر ناچا ہے۔ تاکہ یہ دشمنی لمبی ہو جائے۔“
 ”یہ کیسے ہوگا؟ ملک سجاد تو یہاں قلعہ بند ہو گیا ہے۔ وہ تو باہر نہیں آ رہا۔“ میں نے یوں ہی بات چھوڑی حالانکہ مجھے اس کے
 بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔

”ہاں یہ تو ہے میں نے خود اسے سرداروں کی حویلی تک محدود رہنے کو کہا ہے باہر نکلنے پر میں نے اس کی ذمہ داری نہیں
 لی اس کے بندے ڈیرے پر ہیں۔ اور تجھے بتا دوں آج رات کسی وقت پیرزادوں کے بندوں نے ڈیرے پر حملہ کر دینا
 ہے اب اسیں کس کا کتنا نقصان ہوتا ہے میں نہیں جانتا۔“ اس نے لا پرواہانہ انداز میں کہا تو ایک دم سے میرے ذہن میں
 خیال رینگ گیا۔ تب میں نے کہا۔

”میں اگر ان کی مدد کروں تو.....؟“

”نہیں پھر تو معاملہ سارا سامنے آ جائے گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کچھ بھی نہیں کروں گا، لیکن اگر میں ملک سجاد کا کام کروں تو.....“ میں نے اس کو اشارہ دیا تو وہ
 سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تو نے ایسا کر دیا ہے اور پھر سرداروں کی حویلی میں..... ناممکن ہے.....“

”یہ میرا کام ہے کہ میں یہ کیسے کرتا ہوں بانی سنبھالنا آپ کا کام ہے۔ یہ میں نہیں جانتا کیسے؟“ یہ کہہ کر میں نے اٹھتے
 ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا جہاں فکر کے گہرے اثرات تھے پھر آہستگی سے بولا۔

”کیا میرا وہاں پر ہونا ضروری ہے؟“

”میں نہیں جانتا، لیکن آج رات کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم

سے بولا۔

”ٹھیک ہے اب جو ہوگا دیکھا جائے گا تو کرنا کام میں دیکھ لوں گا۔“ وہ اضطرابی انداز میں اٹھتے ہوئے بولا، میر
 نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر مڑ گیا۔ دلبر نے بانیک باہر نکالی پھر اگلے چند لمحوں میں ہم رہائش کا لوئی سے نکلتے چلے گئے۔

رات کا تیسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ چاند مغربی افق کنارے جا لگا تھا۔ چاندنی کی وہ پہلے والی آب و تاب نہیں رہی تھی۔
 میں گاؤں کے باہر آ پہنچا تھا۔ میرے ایک طرف گاؤں تقریباً آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر حویلی اور پھر اس سے آگے جا کر
 تقریباً دو کلومیٹر پر سرداروں کا ڈیرا تھا۔ اگر میں گھوم کر حویلی کے عقب سے نکلتا تو ڈیرے تک جاسکتا تھا پھر سڑک پر
 جاتے ہوئے میں حویلی کے راستے کے سامنے سے گزرتا مجھے حویلی اور ڈیرے کے درمیان رکنا تھا۔ مجھے اصل میں حیرت
 پہنچی کہ ملک سجاد نے آتے ہی مجھ پر حملہ کیوں نہیں کر دیا؟ اس سوال کا جواب تو مجھے گاؤں ہی میں مل گیا تھا کہ اس کے
 ہندے مارے گئے تھے۔ اگر رندھاوا مجھے پیرزادوں کے حملے کے بارے میں نہ بتاتا تو میرے ذہن میں کئی دوسرے خیال
 آتے چلے جا رہے تھے۔ اب پورا منظر میرے سامنے واضح تھا۔ میں نے ساری احتیاط ایک طرف رکھی اور پکی سڑک پر
 سہا چلتا چلا گیا۔ حویلی کی طرف جانے والے راستے پر کوئی نہیں تھا۔ پھر چند ہی منٹوں میں ہم حویلی اور ڈیرے کے
 درمیان جا کر کے بانیک بند ہونے سے ایک دم سناٹا چھا گیا۔

”دلبر! تو سمجھ گیا ہے نا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

”اچھی طرح.....“ وہ میرے اشاروں سے بات سمجھ گیا تھا۔

”تو نے سامنے نہیں آنا پھر جیسے ہی میں کہوں نکل جانا ہے باقی تم خود سمجھ دار ہو۔“ میں نے اپنے طور پر اسے سمجھایا اور
 ہلی سڑک کے دوسری جانب چلا گیا۔ میں نے اپنے پستل نکالے میگزین دیکھے اور پوری طرح تیار ہو گیا۔ میری جیکٹ
 میں دودھتی بم تھے جو میں خصوصی طور پر چھت سے اٹھا کر لایا تھا۔

میں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈیرے کی طرف سے ایک دم فائرنگ ہونا شروع ہو گئی۔ رات کے
 فائرنگ میں فائرنگ کی آواز بہت دور دور تک سنائی دینے لگی تھی۔ میں اپنی جگہ جمنا ہوا کہ طرف سے کتنی گولیاں چلی یہ
 نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن تقریباً تیس منٹ تک یہ فائرنگ ہوتی رہی پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد کا
 فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ میں نے اس طرف توجہ نہ دی بلکہ اب میں حویلی کے عقب میں اس راستے کو دیکھ رہا تھا جو
 اہلے اور حویلی کے درمیان انتہائی مختصر راستہ تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں سے ملک سجاد ضرور باہر نکلے گا۔ کیونکہ میں
 سرداروں کی فطرت سے واقف تھا۔ ان میں سے کسی نے نہیں نکلتا تھا۔ ملک سجاد تو آیا ہی مجھے ختم کرنے کے لیے تھا۔ لمحہ
 لمحہ پر بھاری ہو رہا تھا۔ اچانک گیٹ کھلا اور اس میں سے ہائی الیس ڈالا برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور بڑی فور و ہیل
 آئی۔ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں اور لمحہ بہ لمحہ آگے آئے لگیں۔ دلبر بانیک سمیت دوسری سمت چھپ چکا تھا اور میں
 ہری طرح تیار تھا۔ میں نے دونوں پستل نکال لیے اور فور و ہیل جیب کی روشنی میں آگے والی گاڑی کے پیچھے ٹائر کا نشانہ

لگا دیا۔ وہ ریت میں آیا میں نے فائر داغ دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور ٹائر پھٹ گیا، میں نے انتظار نہیں کیا دوسری
 گاڑی کے ٹائر کا نشانہ لیا، یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔ گاڑیاں ہچکولے کھاتی ہوئی رک گئیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس
 بج رہیں۔ یہی ان سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ ان کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ میں ایک پیڑ کے
 قریب فور و ہیل پر چڑھ گیا۔ لمبی روشنی میں ان کے ہولے دکھائی دے رہے تھے۔ میں ایک دوشا نے پر جم کر بیٹھ گیا اور پھر
 ایک ایک ایک کو مارنے لگا۔ انہیں اب تک میری پوزیشن کا اندازہ اس لیے نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ فائر ہونے کی سمت
 نہیں ہی نہیں کر پا رہے تھے۔ اور میں نے انہی چند لمحوں کا فائدہ اٹھانا تھا۔ یہاں پر دلبر نے بہت سمجھداری سے کام لیا اس
 لیے دوسری طرف سے اچانک دو فائر کیے اور اپنی جگہ تبدیل کر لی۔ وہ اب لجن کا شکار ہو گئے اچانک ان کی طرف سے
 فائر ہونا بند ہو گئی۔ اب میرے لیے یہاں نکلے رہنا بہت خطرناک تھا۔ میں تیزی سے اتر اور زمین کے ساتھ لگ کر
 چل رہا تھا۔ چند لمحوں پر پڑا رہنے کے باعث ان کی طرف سے حرکت ہوئی اور پھر سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

جائیں گے ان کی جیب رات ہی سے وہیں کھڑی تھی۔ اس وقت میں اپنی کار میں بیٹھ کر نکل رہے تھے، کلجیت کورائیں افسردہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جہاں نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور انوجیت کے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تب اس نے کار بڑھادی۔ ان کا رخ تھانے کی طرف تھا۔ راستے میں انہوں نے اپنی جیب کو دیکھا اس کا اگلا حصہ ہی ڈسٹرب ہوا تھا۔ باقی سب ٹھیک تھا۔ وہ تینوں جیب دیکھتے ہوئے خاموش رہے۔ انوجیت نے کار آگے بڑھائی جبکہ جہاں ان جگہوں کو دیکھنے لگا جو اس کی سمجھ کے مطابق رات اس نے بھاگ دوڑ میں پار کی تھی۔ عجیب طرح کا تاثر اس کے اندر پھیل گیا تھا، جس میں غصہ، نفرت اور انتقام کی شدت زیادہ تھی۔ وہ اپنے طور پر سوچنے لگا تھا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے دشمن تو اس تک پہنچ گیا ہے، یہی سوچتے ہوئے وہ تھانے کے گیٹ پر جا پہنچے۔ کار ایک طرف پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ تینوں اس پرانی سی عمارت کے اندر چلے گئے۔ انوجیت کو معلوم تھا کہ جس پولیس آفیسر سے ملنا ہے وہ کہاں بیٹھتا ہے وہ تینوں اردلی کی پردا کیے بغیر کمرے میں چلے گئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں چند دن پہلے جہاں آیا تھا لیکن اب وہاں کرسی پر ایک نیا پولیس آفیسر براجمان تھا۔ وہ ایک اسمارٹ نوجوان تھا۔ شاید اس کی پہلی تعیناتی ہی یہاں ہوئی تھی۔ اس نے ان تینوں کی طرف غور سے دیکھا اور ان کے بیٹھنے سے پہلے ہی بولا۔

”کون ہیں آپ لوگ..... اور کیسے آنا ہوا؟“

”آپ کا قصور نہیں آفیسر..... لگتا ہے آپ نے پولیس کی نوکری ابھی جوائن کی ہے۔“ جہاں نے کہا اور کرسی پر اس کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ دونوں بھی ادھر ادھر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”میں سمجھا نہیں اور نہ ہی آپ نے میرے سوال کا جواب دیا ہے۔“ اس آفیسر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”رات بھر آپ کو فون کرتے رہے، لیکن فون سن لینے کے بعد بھی کوئی ہماری مدد کو نہیں پہنچا۔“ جہاں نے قدرے اکھڑ لہجے میں کہا۔

”رات.....“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کا علم نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑی گھنٹی بجائی تو فوراً ہی اردلی آ گیا۔ ”ست پال کو بلاؤ۔“

”یس سر.....“ یہ کہہ کر اردلی واپس مڑ گیا تو وہ جہاں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”آپ بتائیں؟“

تہی جہاں نے انتہائی اختصار کے ساتھ رات والے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا پھر جب مال کہہ چکا تو اسی دوران ست پال اندر آ گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے جہاں کو فارم بھرنے کے لیے دیا تھا۔ ست پال نے ساری بات سمجھ کر کہا۔

”سر رات تھانے میں ایک بندے کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ وہ اکیلا کہاں جاتا؟“

”لیکن مجھے اب تک بتایا نہیں گیا؟“

”میں بتانے والا ہی تھا جی۔“ وہ منمناتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے، ایف آئی آر درج کرو باقی میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جہاں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”میں ابھی موقع ملتا ہوں آپ پلیز.....“

اس نے کہا تو جہاں اٹھ گیا۔ انہیں ابتدائی رپورٹ کھواتے کچھ دیر ہو گئی اس سے فراغت کے بعد وہ وہاں سے چل

اپنے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں مزید رکنے کا کاروبار۔

”آپ کیا پروگرام ہے ان کا انتظار کرنا ہے؟“ انوجیت نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

تب میں نے ایک بڑا رسک لینے کا سوچ لیا۔ میں نے دسی کم کی پن کھینچ لی اور پھر تاک کر بم ان کی طرف پھینک دیا۔ چند لمحوں بعد ہی ایک دھماکا ہوا، تیز چیخوں کے ساتھ ہی لحد بھر میں ایک اور دھماکا ہو گیا۔ آگے والی فورڈ ہیل جیب پھٹ گئی تھی۔ وہاں تیز روشنی ہو گئی، موٹا سا ایک شخص پوری قوت سے بھاگا، نجانے کیوں میرے ذہن میں یہ آیا کہ یہی ملک سجاد ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس کی تاک میں بھاگا، تین چار بندے اس کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ شاید وہی بچے تھے۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ ہو کہ دوسری گاڑی بھی پھٹ سکتی ہے اور پھر ہوا بھی ایسے ہی اچانک ہی ہائی ایس ڈالا گاڑی ایک زور دار دھماکے سے پھٹ گئی۔ میں نے بھاگتے ہوئے ان بندوں پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اس بار انہیں فائر کی سمت کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے جلدی میں پوزیشن لے لی، مگر تب تک میں دو کو ڈھیر کر چکا تھا۔ اب صرف دو بندے تھے۔ ایک وہی موٹا سا بندہ اور دوسرا اپنے حلیے ہی سے کوئی گارڈ دکھائی دے رہا تھا۔ میں کوئی لحد ضائع کیے بغیر اس گارڈ کا نشانہ لے لیا۔ جیسے ہی اس موٹے بندے کو اندازہ ہوا کہ وہ تنہا رہ گیا ہے اس نے بھاگنا چاہا، مگر میں نے اس کی ٹانگوں کا نشانہ لیا۔ وہ گر گیا، میں نے آخری میگزین بدلا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اندھیرے میں اسے سیدھا کیا اور پوچھا۔

”ملک سجاد..... اپنی آخری خواہش بتاؤ۔“

”کک..... کون ہوں تم.....“ اس نے لرزتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”تمہاری موت..... بڑے دعوے کیسے تھے نا تم نے.....“ میں نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔

”میں ہار مانتا ہوں، میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا، باقی تمہاری مرضی.....“ اس نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جاؤ.....! بھاگ جاؤ، اگر بھاگ سکتے ہو، موت کوئی سزا نہیں ہے، جب بھی تمہارے ساتھ کچھ ہوگا، تجھے میں یاد آؤں گا، جاؤ بھاگ جاؤ.....“

اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر نہیں اٹھ سکا، اس نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”مجھے بچالو.....“

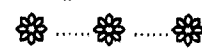
”نہیں، انسان کو بچایا جاتا ہے، سانپ کو نہیں..... جو برس ہا برس دودھ پلانے والے کو بھی ڈنک مار دیتا ہے..... اب تمہاری قسمت، میں جارہا ہوں.....“ میں نے کہا اور تیزی سے اس طرف بڑھا جہاں میں نے دلبر کو چھوڑا تھا، مجھے اندازہ ہی تھا، میں جب وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ زخمی حالت میں پڑا تھا، اندھا دھند فائرنگ میں اسے کوئی گولی لگ گئی تھی۔

”دلبر.....! اوئے دلبر..... ہوش کر.....“

”میں..... میں..... ٹھیک ہوں.....“ اس نے بڑے حوصلے سے کہا تو میں نے اسے تیزی سے اٹھالیا، اس کی گن نجانے کدھر تھی، میں نے بایک کے پاس پہنچ کر کہا۔

”حوصلہ رکھنا دلبر..... اور مجھے پکڑ کر بیٹھے رہنا، بس گاؤں تک پہنچ جائیں۔“

”تو فکر نہ کر.....“ اس نے کراہتے ہوئے کہا، میں نے اسے احتیاط سے بٹھایا، اور پھر بایک بڑھادی۔



صبح کی روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ جہاں اور ہر پریت نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ وہ کچھ دیر تک چھت پر رہے پھر نیچے کمرے میں آ گئے۔ انوجیت نے کچھ بندے بلوائے تھے، وہی رات بھر پہرہ دیتے رہے۔ انوجیت نے فون پر ہی تھانے میں اطلاع دے دی تھی مگر وہاں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ پھر ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود تھانے

رسمک نہ لینا۔“

”اوکے“ میں سمجھ گیا۔“ حپال نے تیزی سے کہا۔ پھر کچھ وقت تک ان میں آپس کی دوستوں اور فیملی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ہر پریت آگئی۔ تبھی اس نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔ چند منٹوں بعد جسمندر آف لائن ہو گیا۔ تبھی اس نے اپنا ان بکس کھولتے ہوئے کہا۔

”ہر پریت..... میں ابھی کچھ دیر بعد امر ترس جا رہا ہوں۔“

”کیوں، اکیلے ہی.....“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، اکیلے ہی کیا تم جانا چاہو گی میرے ساتھ..... اور جہاں تک کیوں کا سوال ہے وہ ہمیں ابھی بتا دیتا ہوں۔“ اس وقت تک ان بکس کھل گیا تھا اور ایک میل پر اس نے کلک کر دیا، اگلے ہی لمحے اس کے سامنے ایک صفحہ کھل گیا، جس میں تصویروں کے ساتھ رویندر سنگھ کے بارے میں تفصیلات بتائی گئی تھیں۔

”اوہ..... یہ کیا.....“ ہر پریت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”جان گئی ہو میں امر ترس کیوں جا رہا ہوں.....؟“

”یہ بھی تو دیکھو جیسی“ انتظار و نوکول اتنے باڈی گاڑ اور یہ محل نما گھر..... تم یہ سب اکیلے کیسے کر لو گے.....“ ”واہ گردو پر بھروسہ رکھو ہر پریت..... سب ہوگا، یہی تو کرنے آیا ہوں۔“ اس نے ان تصویروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی پوری توجہ اسکرین پر تھی اور اس میں دی گئی معلومات کو ذہن نشین کر رہا تھا۔

”تو پھر..... جیسی..... میں تمہارے ساتھ جاؤں گی.....“ اچانک ہر پریت نے کہا تو وہ چونک گیا۔

”کیا کہا تم نے.....؟“ وہ کسی حد تک حیرت سے بولا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر قدرے افسوس بھرے لہجے میں بولی۔

”میں نے کسی غیر زبان میں تو بات نہیں کی۔ میں نے وہی کہا ہے جو تو نے سمجھا ہے۔“

”ہر پریت، یہ کوئی بحث نہیں ہے، اور میں کسی سیر پر نہیں جا رہا، نجانے حالات کیسے ہوتے ہیں اور میں.....“ اس نے بھگانا چاہا تو وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہ بتاؤ جانا کب ہے، میں اپنے طور پر تیار ہو جاؤں۔“

”اوکے..... لیکن کلجیت پھوپھو کو تم نے خود جواب دینا ہے، میں نے نہیں۔“ اس نے ایک دم سے کہا تو وہ نے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ حپال اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دو پہر ڈھلنے والی تھی جب وہ اوگی پنڈ سے نکلے۔ کلجیت کو نے انہیں بڑی دعائیں دے کر وداع کیا تھا۔ انہیں انہیں ہالندھر تک چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں سے آگے وہ بس کے ذریعے جانا چاہتے تھے۔ وہ بیٹوں خاموش تھے اور اسی خاموشی میں وہ ہالندھر جا پہنچے۔ بس اسٹینڈ پر جب وہ سامان اتار چکے تو حپال نے انہیں انہیں سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

”چل اب تو جا، شام ہونے سے پہلے پہلے اوگی واپس پہنچ جا، اپنا اور بے بے کاہت خیال رکھنا۔“

”اور تم بھی.....“ انہیں نے گرم جوشی سے کہا پھر ہر پریت سے ملا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ امر ترس جانے والی بس تیار تھی۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا، جب وہ امر ترس پہنچ گئے۔ رستے ہی میں اسے جسمندر کے دیئے ہوئے نمبر پر کال کی تھی۔ وہاں سے ایک لڑکی نے کال ریسیو کی۔ وہ اسے جانتی تھی اور بس اسٹینڈ پر ہی ملنے کو کہا تھا۔ وہ بس سے اتر کر ارد گرد نگاہیں ڈال رہے تھے کہ حپال کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر وہی نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔ تبھی ہیلو کے جواب میں لڑکی نے کہا۔

”یہ لوگ پتا نہیں کب آئیں گے، تو حویلی کی طرف چل، دیکھیں کام کتنا مکمل ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی مکمل ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔“

تب انہیں نے کار کارخ اس طرف کر لیا، کچھ ہی دیر بعد وہ اس چوک میں پہنچ گئے، جس کے ایک کونے میں ان کی حویلی تھی اور وہاں بہت ساری مزدور کام کر رہے تھے، کچھ ہی دیر بعد ٹھیکیدار ان کے پاس آ گیا۔ وہ کچھ دیر کام سے متعلق باتیں کرتے رہے، حپال ابھی وہیں پر تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین دیکھی وہ وینکوور سے فون تھا۔ اس نے ریسیو کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”آپ کمپیوٹر کے پاس ہیں؟“

”ابھی تو نہیں؟“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر آپ فوراً کمپیوٹر پر آئیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔ اس کے دماغ میں الارم بج گیا تھا۔ سو اس نے ٹھیکیدار سے اپنی بات سمیٹی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

”اچھی جلدی۔“ ہر پریت نے پوچھا۔

”ہاں، ابھی بتاتا ہوں۔“ اس نے دور کھڑے انہیں کو اشارے سے چلنے کا کہا اور کار کی جانب بڑھ گیا۔ جس وقت وہ کچی سڑک سے گھر جانے والی کچی سڑک پر آئے تو کچھ پولیس والوں کے ساتھ پولیس آفیسر بھی کھڑا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی حپال نے کہا۔

”انہیں جیت، تم ذرا انہیں ڈیل کرنا، میرا گھر پہنچنا ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ فاصلے پر کار روک دی، انہیں نے اتر گیا تو اس نے ڈرائیونگ سنبھال لی، پھر وہاں نہیں رکھا اور سیدھا گھر چلا گیا۔ کار سے اترتے ہوئے اس نے کسی حد تک حیران ہر پریت کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم ایسا کرو چائے کی تیز پیالی بنا کر اوپر میرے کمرے میں آ جاؤ، فوراً۔“

”کیا جوتی سے نہ کہہ دوں۔“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا، تب تک وہ اندر کی جانب چل دیا تھا۔

”جو تم مناسب سمجھو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچا، لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وینکوور سے اس کا خاص دوست جسمندر سنگھ ڈھلوں آن لائن تھا۔

”ہاں بولو!“ اس نے کہا۔

”تمہیں رویندر سنگھ کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں نا۔“

”ہاں تو.....“ وہ تیزی سے بولا۔

”وہ میں نے تمہیں میل کر دی ہیں تصویروں اور نقشوں کے ساتھ..... پڑھنے کے بعد ڈیلیٹ کر دینا اور باقی میں نے امر ترس میں سارا سیٹ اپ کر دیا ہے، بس تمہیں وہاں پہنچنے کی تاریخ بتانا ہوگی، باقی سارا انتظام وہ کر دے گا۔“

”میں آج ہی انگلوں گا، اور رات کے کسی پہر وہاں پہنچ جاؤں گا، یا ممکن ہے شام سے پہلے.....“ اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا، جس میں کافی حد تک غصہ چھلک رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک نمبر بھیج دیتا ہوں، امر ترس جاتے ہی رابطہ کرنا، اور اس بندے پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنا، وہ بہت بھروسے مند ہے، تم نہیں جانتے اس کی آدھی سے زیادہ فیملی ادھر ہے، جسمندر سنگھ نے اسے پورے اعتماد سے بتایا۔“

”ٹھیک، بھیج دو نمبر.....“

”اور ہاں، یہ سب کچھ میں نے اسی سے حاصل کیا ہے، میرے پاس محفوظ ہے، جب چاہے دوبارہ بھیج دوں گا۔ لیکن تم کو،“

”آپ نے سیاہ چٹلون پر نیلی دھاری والی سفید شرٹ پہنی ہے نا؟ اور ساتھ میں کاسنی رنگ کے.....“

”ہاں..... ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”تو میں آپ کے بالکل سامنے کھڑی ہوں۔ میں نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا ہے، سفید شرٹ پر نائی.....“

”میں نے دیکھ لیا۔“ جہاں نے کہا اور سامنے کان کے ساتھ فون لگائے لڑکی کو ہاتھ سے اشارہ کیا، وہ ان کی طرف بڑھ آئی اور پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے شستہ انگریزی میں بولی۔

”میں کرن جیت کو؟ آپ مجھے کرن پکار سکتے ہیں۔ امرتسر میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔“ پھر ہر پریت سے ہاتھ ملا کر بہت پیار سے کہا۔ ”بہت خوب صورت ہیں آپ..... آئیں چلیں۔“

یہ کہتے ہی وہ کسی رو بوت کی مانند چلتی اور پھر چلتی چلی گئی، وہ اپنا سامان اٹھا کر کچھ فاصلے پر کھڑی فورڈ جیل جیپ میں جا بیٹھے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک صحت مند نوجوان بیٹھا ہوا تھا، جس کا صاف رنگ، تھکے نقوش، نگین شواہر اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ کرن اور ہر پریت پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں۔ جہاں پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تو اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کمل دیر سنگھ ہوں، آپ میرے پاس ہی آئے ہیں۔“

جہاں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”مطلب آپ میزبان ہیں۔“

”جی اور کرن مجھ سے بھی بڑھ کر آپ کی میزبان ثابت ہوگی۔“ اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر بیک مرر میں ہر پریت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ ہر پریت..... میں نا.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے گیسر لگا دیا۔

”ہاں، کیا تم جانتے ہو مجھے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے جمیندر نے بتایا تھا، خیر، اچھا ہے، میری اور کرن کی موجودگی میں جہاں کو بوریٹ نہیں ہوگی۔“

اس نے اشارے میں کہا اور پھر ہلکا سا تھک لگا کر ہنس دیا پھر جہاں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”وہ سب کمپیوٹر سے صاف کر دیا تھا نا۔“

”بالکل اور ہم نے کب.....“ وہ کہنا چاہا رہا تھا کہ کمل دیر نے کہا۔

”یہ باتیں ہم گھر جا کر کریں گے، ابھی تو آپ امرتسر کو سمجھنے اور اسے دیکھنے کی کوشش کریں، بڑا تاریخی شہر ہے۔“

”کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟“ جہاں نے پوچھا۔

”میں تو نہ جانے کب کا سمجھ چکا، اگر فقط میں نے ہی سمجھنا ہوتا تو آپ کو یہاں بلانے کی ضرورت کیا تھی۔“ اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

”چلیں گھر جا کر سمجھ لیتے ہیں۔“ اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

کمل دیر تیزی سے جیپ بھگائے لیے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پوش علاقے میں تھا۔ وہاں جدید طرز پر گھر بنے ہوئے تھے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے، یہاں امیر طبقے کے لوگ ہی رہائش پذیر ہیں۔ پھر ایک موڑ مڑنے کے بعد کمل دیر نے کہا۔

”جہاں، غور سے دائیں طرف دیکھو، رویندر سنگھ کا گھر پہچان لو گے نا۔“

”ہاں، وہ رہا سامنے.....“ اس نے ایک گھر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو کمل دیر بولا۔

”ایک نظر ہی دیکھ پاؤ گے..... ہم نے یہاں رکنا نہیں۔“

”اوکے.....!“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، لیکن اس کے اندر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی

اترے اور ندنا تا ہوا اندر گھس جائے، سامنے ہی کہیں رویندر سنگھ ملے اور وہ اپنے ہسٹل کی ساری گولیاں اس کے پیچھے میں اتار دے۔ مگر یہ محض خیال تھا، اس نے اپنا سر جھکا اور سامنے دیکھنے لگا۔

”جہاں جی.....! جودل چاہے کرنا، ہم بھی یہیں اور یہ بھی یہیں۔“ کمل دیر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ تب وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

اس پوش علاقے سے نکلنے کے بعد، کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں ابھی اتنی آہادی نہیں ہوئی تھی۔ بڑے بڑے گھر تھے، لیکن ابھی کئی زیر تعمیر تھے۔ ایک ہوکا عالم تھا، چاندنی کے ساتھ برقی قلموں سے بہت حد تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک قلعہ نما گھر کے سامنے رک گئے، جلد ہی گیٹ کھول دیا گیا تو جیپ سمیت پورچ میں جا کر۔

”یہ لیں جی، ہمارا گھر آگیا۔“ کمل دیر نے کہا اور اتر گیا۔ وہ سب بھی اتر کر اندر کی جانب چل دیے۔ پہلے پہل تو یوں لگا جیسے ان کے علاوہ کوئی ہی ہے نہیں، پھر دھیرے دھیرے کچھ ملازم اور ملازما کس نظر آنا شروع ہو گئیں، جوفظوں سے زیادہ اشارے سمجھتے تھے۔ ”یہاں کسی قسم کا بھی تکلف نہیں، آپ اپنے کمرے سے ہوائیں پھر ڈنر کرتے ہیں۔“

جہاں نے سر ہلایا تو کرن انہیں لے کر کمرے کی طرف چلی گئی۔ شاہانہ انداز میں سجایا گیا کمرہ ان کا منتظر تھا۔

”کیسا لگا تمہیں کمل اور کرن..... مطلب..... ڈبل کے.....“ ہر پریت نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا..... بہت اچھا..... باقی اس کا کام دیکھ کر.....“ جہاں نے محتاط انداز میں کہا اور پھر دواش روم کی جانب بڑھ گیا۔

نہایت پر تکلف ڈنر کے بعد جب برتن اٹھائے جانے لگے تو وہ چاروں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ کمل دیر نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا پھر ویسی ہی معلومات کا صفحہ نکال کر بولا۔

”یہ ہے رویندر سنگھ کا گھر..... آج وہ یہاں نہیں دہلی میں ہے، لیکن اس کا پتر..... ہر دیپ سنگھ آج ادھر ہی ہے، ورنہ یہ اپنے باپ کے ساتھ ہی ہوتا ہے اس کی چٹی اور بیٹا بھی یہیں ہیں۔ ابھی ہم یہاں سے کچھ دیر بعد نکلیں گے۔“

”واؤ..... ابھی.....“ ہر پریت کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو کمل اور کرن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر اسکرین پر دیکھ کر بولا۔

”یہ اس کے گھر کا نقشہ ہے۔“ پھر ایک جگہ نشاندہی کر کے بولا۔ ”یہاں سے ہم نے اندر جانا ہے، ہمارے لیے جو سب سے اچھی بات ہے وہ یہ کہ اس عمارت میں کتے نہیں ہیں۔ ہر دیپ سنگھ کو کتے پسند نہیں ہیں، اس لیے اس نے اپنی سکیورٹی پر بندے زیادہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہ عمارت میں داخل ہونے کا بہترین پوائنٹ ہے۔“ اس نے ماؤس کے تیر سے ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ پلان کی تفصیلات بتانے لگا جسے چند منٹ تک سبھی نے خاموشی سے سنا، تبھی جہاں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر کب چلنے کا ارادہ ہے؟“

”بس ابھی کچھ دیر بعد.....! مجھے ایک فون کال کا انتظار ہے۔“ کرن نے کمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوکے.....!“ وہ گرن ہلاتے ہوئے بولا تو ہر پریت اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند منٹ تک ان میں خاموشی رہی پھر بوریٹ سے اکتاتے ہوئے جہاں پلان کے مختلف پہلوؤں پر بات کرنے لگا۔ اتنے میں ہر پریت پلٹ آئی۔ اس نے بلیو جین اور سیاہ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، اپنی زلفیں کس کر پونی کی صورت میں باندھ لی تھیں۔ ٹی شرٹ کے اوپر اس نے ایک جینٹ پینٹی تھی جو سیلوولیس تھی۔ پاؤں میں گرے جا گروہ پوری طرح تیار دکھائی دے رہی تھی۔ سبھی نے ایک نگاہ اسے دیکھا، ممکن نے کوئی تبصرہ ہوتا لیکن ایسے میں کرن کا فون بج اٹھا۔ ہیلو کے بعد وہ کچھ دیر سنتی رہی، پھر اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”ہر دیپ سنگھ، اپنی چٹی اور بیٹے کے ساتھ اس وقت اوپر والے پوٹائن میں موجود ہے، وہ ان کے ساتھ بیٹھا ایک دلچسپ

انڈین فلم دیکھ رہا ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ مزید چلے گی۔
”سیکیورٹی کی کیا پوزیشن ہے؟“ مکمل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ تو وہی ہے رہائش گاہ کے سامنے کی طرف ڈرامہ کرنا ہوگا۔“ کرن نے کہا۔

”اوکے.....! آؤ چلیں۔“ مکمل نے کرسی پر ہاتھ مارے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گئے۔

وہ ایک ہی جیب میں نکلے تھے۔ لیکن دو تین چور اہوں کے بعد دو کاروں نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ انہی کے ساتھ تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ اس پوش علاقے میں پہنچ گئے۔ بھی مکمل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

”جہاں! یہاں کچھ کرنا اتنا مشکل نہیں ہے لیکن کر کے فرار ہونا بہت مشکل ہے اس لیے کسی کا انتظار کیے بغیر جسے نکلنے کا چانس ملتا ہے وہ نکل جائے۔“

سب نے سن لیا، مگر بولا کوئی نہیں، وہ کچھ فاصلے پر کھڑی سیکیورٹی گارڈز کی ایک گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ اگلے چند منٹ میں وہ اس رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ مکمل نے وہاں گاڑی نہیں روکی بلکہ سڑک کے ساتھ ہی ٹرن لے لیا اور عمارت کی پچھلی طرف جا کر رک گئے۔ اسٹریٹ لائٹ ہر جانب روشن تھی۔ انہوں نے گاڑی رکتے ہی چشم زدن میں ادھر ادھر دیکھا اور باؤنڈری وال کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ اس طرف جھاڑی نما پودے اور چھوٹے پھول دار درخت تھے۔ چند لمحے دیکے رہنے کے بعد مکمل کھڑا ہوا۔ کرن بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ مکمل نے اپنے ہاتھ جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگائے۔ کرن نے اس پر پاؤں رکھا اور خاردار تاروں کے تلے چار دیواری پر ہاتھ کو مضبوطی سے جمایا۔ دوسرے ہاتھ سے کٹر نکالا، پھر بڑی احتیاط سے لوہے کی تار کاٹ دی۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت ہو گئی۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ خاردار تاروں میں بجلی کی روکو بند کر دیا گیا ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ تار کٹتے ہی الارم بجتے تو سارا معاملہ ہی ٹھپ ہو جاتا۔ مگر کچھ نہ ہوا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اندر کی معلومات درست ہیں۔ تبھی کرن نے ہولے سے کہا۔

”اوکے..... کٹ گئی۔“

”گارڈ.....“ مکمل نے ہلکے سے پوچھا۔

”سامنے تو نہیں ہیں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”چلو پھر.....“ اس نے کہا تو کرن اچک کر اوپر اٹھ گئی۔ اسی لمحے جہاں اور ہر پریت نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہر پریت اوپر پہنچ گئی۔ اس وقت تک دونوں چار دیواری کی دوسری طرف کو گئی تھیں، جب کس نے جہاں کو اوپر چڑھنے میں مدد دی جہاں دیوار پر چپک کر لیٹ گیا اور اس نے ایک بازو سے مکمل کو سہارا دیا۔ وہ آنا فانا پیر جاتا، اوپر اٹھ گیا۔ اس سارے عمل میں ایک سے دوسرے طرف ہوئے اور وہ چار دیواری کی دوسری طرف دیک کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اسی اثنا میں دو کاروں کے ٹائروں کے چرچانے کی تیز آواز گونج اٹھی۔ پلان یہی تھا کہ رہائش گاہ کے سامنے دو کاریں آنے سامنے یوں رکیں گی جیسے حادثہ ہو جانے والا ہو پھر دونوں طرف سے لوگ اتر کر ایک دوسرے کے ساتھ متحکم ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ اسلحہ نکل آئے گا، یہی وہ وقت تھا جب ہم نے اپنے طور پر ہر دیپ سنگھ تک پہنچنے کی کوشش کرنی تھی۔

وہ رہائشی عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ اس طرف گارڈز ہونے چاہیے تھے لیکن وہ اس وقت موجود نہیں تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ادھر نہ آئیں گے۔ ایک بڑے سارے برآمدے میں اندر کی طرف ایک دروازہ تھا اس کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ بند ہی رہتا ہوگا، جس کمرے میں متوقع طور پر ہر دیپ موجود تھا اس کے ساتھ ہی ایک لوہے کا پائپ

اوپر تک جاتا تھا، جہاں تیزی سے اس پائپ پر چڑھنے لگا، جبکہ مکمل اور کرن اسی دالان میں تاریکی کا حصہ بن گئے، نیچے ہر پریت کو کھڑی تھی جہاں کو اوپر پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگا ہوگا، وہ کھڑکی تک پہنچ گیا۔ باہر کی طرف سے لوگوں کے ہلکے ہلکے شور کی آوازیں آنے لگی تھیں جو یقیناً وہاں پر بہت اونچی ہوں گی۔ جہاں نے کھڑکی میں سے دیکھا، سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ اس کے سامنے بڑے صوفے پر ایک مرد، عورت اور بچے کی گردنیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بلاشبہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے سے آواز پیدا ہوئی تھی۔ مگر یہ رسک اسے لینا تھا۔ اس کے ساتھ اندر کی طرف تو شیشہ تھا، لیکن باہر لوہے کی مضبوط جالی تھی جسے وہ فوراً کاٹ نہیں سکتا تھا۔ یہی اس کی راہ میں رکاوٹ تھی، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اندر جا کر خود اپنے ہاتھوں سے ہر دیپ سنگھ کا گلا دبا دے، پھر اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر اپنی آنکھوں سے اس کے جلنے کا تماشا کرے، اس کے پاس اپنی ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے آنا فانا شیشہ توڑ دیا۔ جس سے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا، اس کے سامنے ہر دیپ سنگھ تھا جو حیرت سے کھڑکی کی جانب دیکھ رہا تھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اور کسی پناہ میں چھپ جاتا، اس نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی، یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے، ایک فائر اس کے چہرے پر لگا تھا جس سے خون کے فوارہ ابل پڑا تھا، وہ مزید وہاں رکتا نہیں چاہتا تھا، وہ فوراً نیچے کی جانب لپکا، کھڑکی میں سے پیچھے چلانے اور کر اہوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

اس وقت تک مکمل دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کرن نے اپنا پاؤں اس کے ہاتھوں پر رکھا اور چار دیواری پر جا پہنچی، ایسا ہی ہر پریت نے کیا، پھر جہاں اور آخر میں مکمل نے اسے اوپر اٹھالیا، چشم زدن میں وہ چاروں دیوار کے پار تھے۔ رہائشی عمارت کے اندر بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ایک کھرام تھا جو اٹھ گیا تھا۔ اب ان کے پاس ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ چاروں تقریباً ایک ہی وقت میں بیٹھے تھے۔ چابی انکیشن میں تھی، مکمل نے سٹارٹ کے لیے چابی گھمائی، انجن جاگتے ہی اس نے گاڑی بھگادی۔ وہ اس پوش کالونی کا مین گیٹ بند ہو جانے سے پہلے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا، ورنہ گاڑی چھوڑ کر گلیوں اور کانوں کے راستوں میں سے نکلنا تھا اور یہ انتہائی درجے کا رسک تھا۔ وہ کالونی میں کہاں تک بھاگتے، کرن، ہر پریت اور جہاں ہتھیار لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پکڑے جانے سے زیادہ لڑنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ دو تین موڑ مڑنے کے بعد سامنے مین گیٹ تھا، مکمل نے رفتار دھیمی کر لی، رہائشی کالونی کے اس گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ بھی زیادہ تھے۔

”جہاں! ذرا سار رسک بھی نہ لینا، اگر انہوں نے روکنے کی کوشش بھی کی تو اڑا دینا۔“ مکمل نے دانت بھیجنے ہوئے کہا۔ اس کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ تبھی ان کی نگاہ گیٹ کے باہر والی طرف پڑی، جہاں ان کے پیچھے آنے والی کاروں کے لوگ کھڑے تھے۔ وہ کسی بھی ہنگامی صورتحال ہی کے لیے تھے، وہ لوگ اپنا ڈرامہ ختم کر کے کالونی سے باہر آ چکے تھے۔ اس وقت کالونی سے نکلنے والے مین گیٹ کا فاصلہ تقریباً دو گزر رہا ہوگا، جب ایک طرف بنے ہوئے سیکیورٹی گارڈز کے کہیں سے ایک شخص تیزی سے نکلا، اس کے کان کے ساتھ سیل فون لگا ہوا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

”روکو..... رکو..... اس گاڑی کو روکو.....“

مکمل نے ایک دم سے اسپید بڑھا دی، اگلے ہی لمحے وہ گیٹ سے باہر تھے۔ جس وقت وہاں موجود گارڈز سمجھتے، وہ گیٹ پار کر چکے تھے۔ جیب کو انتہائی خطرناک انداز میں دائیں جانب موڑا تو فائرنگ کی آواز آئی، دونوں سیاہ کاریں چل پڑی تھیں۔ بلاشبہ اب نہ صرف ان کا تعاقب کیا جانا تھا، بلکہ پورے امرتسر کی پولیس ان کی تلاش میں نکل پڑنے والی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ رنجیت ایونیو کے گول چکر کے پاس آ گئے، بھی مکمل نے گاڑی کو ٹرن دیا اور ایک بڑی ساری ٹاپ کے سامنے جیب روک لی، پھر ہنستے ہوئے بولا۔

”شریف لوگوں کی طرح اپنے اپنے ہتھیار چھپا کر باہر نکلو فوراً۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی بند کی اور اتر کر یوں

دکان کی جانب چل پڑا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو وہ وقت ضائع کرنے کے لیے آیا ہے اتنے میں وہ بھی اس کے پاس آگئے تو اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس شاپنگ مال کے اندر ہی اندر سے دوسری جانب نکلتا ہے۔ کرن اور ہر پریٹ الگ ہو جاؤ کسی ٹیکسی میں بیٹھو..... رابطہ ہو جائے گا۔“ وہ شاپنگ سینٹر کی اندر چلے گئے دونوں لڑکیاں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے بظاہر مطمئن دکھائی دینے والے تیزی سے دوسری طرف کے راستے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جہاں نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا ایک پولیس گاڑی ان کی جیب کے پاس آ کر رک گئی تھی۔

”کمل نکلو۔“ اس نے بے ساختہ کہا اور قدم بڑھا دیئے۔ دوسری جانب ٹیکسیاں اور رکشے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ایک رکشہ والا ان کے قریب آ گیا۔ وہ لپک کر اس میں بیٹھ گئے۔

”کدھر جانا ہے باؤ جی۔“

”جہاں اچھی سی فلم لگی ہو.....“ کمل نے تیزی سے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ یہ سنتے ہی وہ چل پڑا۔ کمل نے تیزی سے ایس ایم ایس کرن کو بھیج دیا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا وہ دونوں کسی حد تک پریشان ہو گئے۔ تبھی اس نے کرن کو فون کر دیا۔

”کدھر ہو۔“ رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

”ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل پڑے ہیں۔“ کرن نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

رکشا کچھ دیر تک چلتا رہا، تبھی کمل نے اس سے کہا۔

”اوئے یار..... کدھر لے کر جا رہا ہے کچھ بتاؤ تو.....“

”باؤ جی دوسرا شو شروع ہو گیا ہوگا میں اب تک سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کدھر لے جاؤں“

”چل پھر تو ایسا کر ہمیں کسی کھانے پینے والی دکان پر چھوڑ اور تو جا.....“ اس نے ایک قریب آتی ہوئی مارکیٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ رکشے والے نے انہیں وہاں چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ مارکیٹ میں چلے گئے کچھ دیر ٹہلنے کے بعد جہاں نے کہا۔

”اب چلیں رات گہری ہو رہی ہے زیادہ رسک نہ لیں۔“

”اب ہم نے ادھر نہیں جانا بلکہ جب تک کسی نئے ٹھکانے کے بارے میں کرن نہ بتا دے اب ہم نے ادھر نہیں جانا۔“

”وہ کیوں.....؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ ہماری جیب پکڑی گئی ہے اگرچہ وہ چوری کی تھی لیکن دودن سے وہ میرے استعمال میں تھی۔ لوگوں نے دیکھا ہے.....“ کمل نے ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ گھر.....“ جہاں نے حیرت سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”چوکیدار جانے اور وہ گھر..... ایسے کئی ٹھکانے مل جاتے ہیں وہاں سے اپنا سامان شفٹ ہو چکا ہوگا۔“

”واہ..... کیا پلاننگ ہے۔“

”پچھلے دو ہفتے سے جسمیںد ربائی جی نے میرے ذمے یہ کام لگایا ہوا ہے میں نے.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کا سیل فون بج اٹھا دوسری جانب کرن تھی اس نے کالونی اور گھر کا نمبر بتا دیا اور پہنچ جانے کو کہا تبھی فون بند کر کے بولا۔ ”لو ربائی جی ٹھکانہ مل گیا، چلیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا ایک ٹیکسی پکڑی اور وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔

وہ ایک اوسط درجے کے سرکاری ملازمین کی کالونی تھی۔ وہاں پہنچ کر لگ رہا تھا کہ جیسے یہ تاحد نگاہ بھیلی ہوئی ہے جلد ہی

وہ اپنے مطلوبہ نمبر والے دکان پر پہنچ گئے، کمل نے ٹیکسی چھوڑ دی، پھر کرن سے کفرم کیا، وہ بالکونی میں آگئی، کچھ دیر بعد وہ کمرے کے اندر تھے۔ دوسری منزل پر قدرے سکون تھا اور کافی حد تک خاموشی۔ انہوں نے جوتے اتارے اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔

”ہر پریٹ کدھر ہے؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ واپس پلٹتے ہوئے بولی۔

”کچن میں ہے، ہم نے راستے میں کچھ کھانے پینے کے لیے لے لیا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ کمل ویر کی جانب دیکھ کر بولی۔

”ہم نے یہاں نہیں رہنا اس لیے سونا نہیں، ہم نے صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکلتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

”اوکے میم صاحب۔“ کمل دیر نے کہا اور سامنے پڑائی دی چلا دیا۔ دو چار چینل بدلتے ہی اس کا مطلوبہ چینل مل گیا۔ نیوز کاسٹر پورے جوش و جذبے کے ساتھ ایک ایم ایل اے کے بیٹے کے قتل کی خبر کے ساتھ اس کی جزئیات بتا رہی تھی۔ پس منظر میں کھڑکی سے دیواری کٹی ہوئی تاریں، صوفے پر خون کے دھبے، مین گیٹ والے گاڑ کا بیان، غم زدہ بیوی اور بیہوش بچہ دکھایا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ریڈر سنگھ دکھایا گیا، وہ کہہ رہا تھا۔

”میں ابھی اس قتل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مجھے اور میرے بیٹے کو کئی دنوں سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ یہ کسی کھاڑ کو (دہشت گرد) گرد پ کی کارروائی لگتی ہے، میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ ہم بکنے والے ہیں اور نہ جھکنے والے اپنے دلش کے لیے ہم قربان ہو جانے کا جذبہ رکھتے ہیں.....“

”بند کر اس بہن.....“ جہاں سنگھ نے غصے میں کہا تو کمل ویر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹی وی بند کرتے ہوئے بولا۔

”یار.....! میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ملزموں کی تلاش کس سطح پر کی جا رہی ہے اور مزید آگے کس ٹریک پر تلاش ہوگی۔“

”تم ہماری سوچ سے بھی زیادہ۔“ جہاں نے کہا

”کیوں.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے کمیشن کے دو بندے بھی پھڑکائے ہوئے ہیں اور وہ.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ حیرت سے بولا۔

”اوہ..... اس کا مطلب ہے مجھے بھی اسی سطح پر سوچنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمبے سوچتا رہا، پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”اوہ واہ بار..... میں بھی پاگل ہوں..... جتنا پروٹوکول نظر آئے گا اتنا ہی پھنسیں گے۔ تو چل سکون سے دودن آرام کر..... پھر دیکھی جائے گی۔“

یہ لفظ کرن نے سن لیے تھے وہ کھانا لے کر آئی تھی اس لیے بولی۔

”کچھ بھی ہے یہاں سے نکلتا ہے ادھر کی عورتیں بڑی کن سوئی رکھتی ہیں فی الحال کھانا کھائیں، آؤ ہر پریٹ۔“

”لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“ جہاں نے کہا۔

”کیا.....؟“ کمل ویر نے پوچھا۔

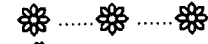
”یہیں کہ ابھی یہاں سے نکل جاؤں، ورنہ اوگی میں وہ انوجیت کو تنگ کریں گے۔ اور یہ امر تو میرے لیے چوہے دان ن سکتا ہے۔“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمبے سوچتا رہا پھر بولا۔

”کہاں جاؤ گے۔“

”نگو دریا پھر دہلی.....“ جہاں نے حتمی انداز میں کہا تو وہ بولا۔

”چل ٹھیک ہے پہلے کھانا کھا، پھر سوچتے ہیں۔“

وہ چاروں کھانے کے لیے بیٹھ گئے اور ان کے درمیان خاموشی آن پڑی۔



دلبر کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ اس کی حالت بہت نازک ہو رہی تھی اس کا ہسپتال پہنچ جانا بہت ضروری تھا۔ مگر گاؤں میں اطلاع دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے فیصلہ کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ہسپتال جانے کو ترجیح دی۔

”اوائے دلبر.....! حوصلہ رکھنا، میں تجھے ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ ذرا سا وقت لگ جائے گا۔“

”اوائے نہیں اوائے..... تو مجھے گاؤں لے چل، سمجھ کہانی مک گئی ہے، ہسپتال لے کر میری لاش.....“

”اوائے حوصلہ رکھ.....“

”نہیں..... جمالیا، نہیں..... تجھے نہیں پتہ.....“ دلبر نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا اس وقت تک میں گاؤں جانے والی کچی سڑک پر آ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہسپتال میں دلبر کو لے کر جاؤں گا۔ میں اسے بے رحمی سے بے بسی کی موت نہیں مرنے دینا چاہتا تھا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

”دلبر.....! میرے ویر بس ذرا سادہ لے..... میں تجھے ہسپتال ضرور لے جاؤں گا، میرے ویر بس ذرا سا حوصلہ۔“

”چل تو کر لے..... کوشش.....“ اس نے بے دم ہوتے ہوئے کہا اور میں نے بایک کی اسپید بڑھادی۔ میں ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا کہ سڑک کے ایک طرف مجھے کچھ موٹر سائیکل کھڑے ہونے کا شک ہوا۔ میں ٹھنک گیا، اگر دشمن ہوئے تو مجھے بھی یہیں ڈھیر کر دیں گے، اور اگر زندگی ہوئی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں نے رفتار کم نہیں کی اور زن سے ان کے پاس سے گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بایک میرے پیچھے لگ چکے ہیں۔ دلبر نے یقیناً پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اس لیے بولا۔ ”چند موٹر سائیکل والے..... ہمارے..... پیچھے..... ہیں.....“

”آنے دو..... بس تو قابو ہو کر بیٹھ.....“ میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا لیکن حیرت یہ تھی کہ ابھی تک کسی نے فائر نہیں کیا تھا۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو اب تک بایک گرا لیتا۔ بہر حال میں اپنی پوری توجہ سامنے رکھے ہوئے تھا، اور قصبے کے ہسپتال پہنچ گیا۔ میں نے بایک روکی تو دلبر ایک طرف لڑھک گیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے بایک کو ایک طرف پھینکا اور دلبر کو قابو میں کر لیا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا، جو میری مدد کرتا، میں نے اسے قابو کیا اور وہیں زمین پر لٹا دیا۔ اتنے میں موٹر سائیکلوں کی روشنی ہم پر پڑی، میں دیکھ ہی نہ سکا کہ دلبر کیسا ہے؟

”اوائے کیا ہو گیا اس کو.....“ چھاکے نے چیخ کر کہا تو میرے حواس ایک دم سے بحال ہو گئے، دشمنی والی لہر ایک دم سے ختم ہو گئی تھی۔ جس وقت تک وہ اتر کر میرے قریب آتے، میں نے اس کی ہنسی دیکھی جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔

”اوائے دیکھو یہاں کوئی بندہ ہے؟“

نورانی وہ سب ارد گرد پھیل گئے۔ ایک نے میرے ساتھ دلبر کو اٹھایا اور اسے قریب پڑے ایک بیچ پر لٹا دیا، اس کے خون سے میرے بدن پر ہچچھاہٹ ہونے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ڈپنسٹر آکھیں ملتا ہوا اندر سے نکلا، پھر یوں ایک بندے کو خون میں لت پت دیکھ کر حواس باختہ سا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے چوکیدار کو آواز دی، پتا نہیں کیا نام لیا تھا اس نے وہ بھاگتا ہوا آیا تو ڈپنسٹر نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لاؤ فوراً میر جنسی ہے۔“

وہ بھاگتا ہوا رہائشی کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ میرے اندر ایک دم سے بے چینی اتر آئی تھی، دلبر، موت اور زندگی کی دلیلیز پر پڑا تھا۔ اب ڈاکٹر آنے میں پتا نہیں کتنا وقت لگتا ہے، میں نے اس بے چینی میں قریب کھڑے چھاکے سے کہا۔

”تم وہاں کیسے.....؟“

”تمہیں آنے میں بڑی دیر ہو گئی تو میں نے تمہارے پیچھے جانے کے لیے ان کو ساتھ لیا اور گاؤں سے باہر آ گیا۔ ابھی یہاں پہنچے ہی تھے کہ حویلی کے پیچھے فائرنگ کا سن کر یہاں رک گئے، ابھی مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قصبے کی طرف جاؤں یا پھر حویلی کی طرف..... اتنے میں بایک دکھائی دی، اندھیرے میں پتا نہیں چلا کہ کون ہے، جب تو بالکل سامنے سے گزرا تو پتا چلا، بس پھر تیرے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گئے۔“

”اچھا ہو گیا..... لیکن مجھے لگتا ہے ڈاکٹر پولیس کیس کا بہانہ کر کے اس کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔“ میں نے بے چینی اور بے یقینی میں کہا تو وہ بولا۔

”پھر کیا کریں.....“

”تو کسی طرح جاؤ اور رندھاوے کو یہاں لے آ..... اسے صورت حال بتا دینا، کوئی اور ہو تو کہنا راستے میں ڈکیٹ پڑ گئے تھے۔“ میں نے سوچ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ گیا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے موٹر سائیکل کی جانب بڑھا، تب تک ڈاکٹر تیزی سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے دلبر کو ایک نگاہ سے دیکھا اور کہا۔

”مریض کو آپریشن تھینر میں لاؤ فوراً۔“

”تم نے..... جلدی آنا ہے۔“ میں نے چھاکے کو ایک دم رکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ باقی سب نے دلبر کو اٹھایا اور آپریشن تھینر میں جالتایا۔ ڈپنسٹر مسکین سنڈر لے آیا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔

”ہوا کیا ہے، اتنا خون.....“

”میں اور یہ ادھر سے اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ راستے میں ڈکیٹ پڑ گئے، بس انہوں نے گولیاں ماری ہیں، اب پتا نہیں.....“ میں نے تیزی سے کہا تو ڈاکٹر نے میری حالت پر ایک نگاہ دوڑائی، وہ تجربہ کار شخص لگتا تھا، ادھیڑ عمر تھا، اب پتا نہیں میری بات کا یقین کیا تھا یا نہیں، تاہم وہ تیزی سے اپنا کام کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دلبر کی سانس بحال ہونے لگیں تھیں۔ اس نے تیزی سے ایک کاغذ پر کچھ دوائیں وغیرہ لکھ کر دیں، اور کہا۔

”یہ کسی نہ کسی طرح لے آئیں رات اگر چہ کافی ہو گئی ہے ممکن ہے کوئی ایک دوکان ابھی کھلی ہو۔“

میں نے کاغذ کا پرچہ لیا اور اپنے دوستوں کو دیتے ہوئے کہا۔

”فوراً لے آؤ۔ دیر نہیں کرنی۔“

انہوں نے کاغذ پکڑا اور آفا فانا چلے گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دلبر کی حالت بحال ہو گئی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ تب تک ڈاکٹر اس کے ساتھ مصروف رہا۔ اتنے میں ایک پولیس والا اسے اس کی آئی وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر کے انتظار میں تھے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا اور مجھے دیکھ کر بولا۔

”بلاشبہ مریض کی یہ اپنی قوت مدافعت تھی کہ وہ اب تک زندہ ہے ورنہ خون بہہ گیا ہے، ایک تو خون کا فوری بندوبست چاہیے..... دوسرا خدشہ ہے کہ اس کے بدن میں زہر کا اثر ہو جائے..... اس لیے جس قدر جلدی ممکن ہو سکے اسے ضلعی ہسپتال میں لے جائیں۔ وہاں سہولتیں ہیں، یہاں نہیں ہیں۔“

”ایمبولینس تو ملنے سے رہی۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ خون لے لیں، تب تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور واپس پلٹ گیا۔ چھا کا آگیا تھا، تبھی مجھے پولیس والوں کا خیال آیا تو میں نے اسے ایس آئی سے پوچھا۔

”رندھاوا صاحب، وہ کہاں ہیں؟“

”پتہ نہیں جی، وہ کچھ دیر پہلے آپریشن کے لیے نکلے ہیں۔ آپ رپورٹ وغیرہ لکھوائیں چل کر تھانے میں.....“
”مجھے اس وقت گاڑی چاہیے..... جو مرلیض کو لے کر ضلعی ہسپتال جائے رپورٹ تو رندھاوا صاحب آئیں گے تو لکھواؤں گا۔“ میں نے کافی حد تک غصے میں کہا، جس پر پولیس والے نے مجھے گھور کر دیکھا، میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی، میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

”ٹھیک ہے وہ آجائیں تو لکھوا دینا رپورٹ۔“ وہ یہ کہتا ہوا واپس مڑ گیا۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ سبھی اپنا اپنا خون ٹیسٹ کروانے چل دیے تھے لیکن ہمارا ایک دوست موٹر سائیکل لے کر ہسپتال سے باہر چلا گیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اچانک کیوں نکلا ہے۔

مشرقی افق پر سرخی نمودار ہونے کو تھی، جب پوری کوشش کے باوجود دلبر کا سانس اکھڑنے لگا۔ میرا وہ دوست جو اچانک نکلا تھا، وہ ایک کار لے کر آگیا تھا، اس کا کوئی دوست قصبے میں تھا، ڈاکٹر پوری تنہی کے ساتھ اس کی زندگی بچانے میں مصروف تھا، خون بھی دستیاب ہو گیا تھا، لیکن دلبر کی سانس قابو میں نہیں آرہی تھیں۔ اچانک اس کے جسم کے سارے روم کھل گئے تھے، ایک ایک روم کانے کی مانند کھڑا ہو گیا، اور پھر اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ میرے اندر دکھ کی ایک شدید لہر سرایت کر گئی۔ مجھے وہ جیتا جاگتا دلبر یاد آنے لگا جس نے کچھ ہی دیر قبل آگ اور خون کی ہولی پھیلی تھی، میری آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

”سوری یار.....!“ ڈاکٹر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر۔ آپ نے بہت کوشش کی، لیکن اس کی زندگی نہیں تھی۔“

میں نے ہنسیکے ہوئے لہجے میں کہا تو ایک بار پھر سے میرا کاندھا تھکا کر ڈاکٹر چلا گیا۔ ہم نے انتہائی دکھ سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، پھر میں چھانکے کو اس کی نعش اٹھانے کا اشارہ کر کے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس وقت سورج نکل چکا تھا جب ہم گاؤں نورنگر واپس پہنچے۔ دلبر کے مرجانے کی اطلاع آنا فانا پورے گاؤں میں پھیل گئی، ہم نے جس وقت میت ان کے گھر جا کر رکھی تو ایک کھرام مچ گیا۔ میرے کپڑوں اور بدن پر خون جم کر رہ گیا تھا، میں نے چھانکے کا اشارہ کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

”بولو کیا بات ہے۔“ اس نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

”اس کی آخری رسومات کا اچھی طرح انتظام کرو رہا ہے کچھ.....“

”ہاں ہے.....“ اس نے جواب دیا۔

”میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔ رات کے واقعہ کی سگن لے، ملک سجاد کو میں نے رات شدید زخمی کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ کدھر ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا بھی پتا چل جائے گا“ تم جاؤ اور جلدی سے واپس آ جاؤ۔“ چھا کے نے کہا تو میں نے اپنی بانیک لی اور گھر کی طرف چل دیا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا اور میں بانیک سمیت اندر چلا گیا۔ صحن کے ایک کونے میں بانیک کھڑی کی اور لاشعوری طور پر ماں کو دیکھنے لگا، وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیں۔ میں نے دل ہی دل میں اسے اچھا خیال کیا کہ یوں خون میں لت پت کپڑے

دیکھ کر ممکن ہے وہ گھبرا جائیں، اگر چہ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ ماں صبح ہی صبح کسی کے گھر جائے، ممکن ہے دلبر کا سن کر کہیں آس پڑوس میں چلی گئی ہوں۔ میں نے جلدی سے نہانے اور کپڑے بدلنے کی سعی کی، تاکہ جب تک ماں آئے میں ان کپڑوں سے نجات لے لوں، میں نے الماری سے کپڑے نکالے اور ہاتھ روم میں گھس گیا، کچھ دیر بعد میں نہا دھو کر تازہ دم ہو گیا۔ اس وقت میں آئینے کے سامنے کھڑا کنگھا کر رہا تھا، جب چھا کا گھر میں داخل ہوا۔

”تو کیوں آ گیا ہے۔ میں ابھی آ رہی رہا تھا۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا اور کنگھا رکھ دیا۔

”وہ رندھاوا صاحب آئے ہیں۔“ وہ دور ہی سے بولا اور باہر والا کمرے کھولنے چلا گیا۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد چھا کا باہر جا چکا تھا اور ہم دونوں آٹے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

”یار.....! رات کمال کر دیا تو نے۔ اتنی جلدی کر دیا سب کچھ..... میں تو سوچ رہا تھا کہ دو چار دن لگ جائیں گے۔“
”بس دیکھ لیں، قسمت نے یلوری کی ہے..... مجھے دلبر کا بہت افسوس ہے، وہ رات میرے ساتھ تھا۔“ میں نے روہانا ہوتے ہوئے کہا۔

”خیر.....! یہ تو قسمت کی بات ہے، اب سن، وہ شدید زخمی ہے اور اسے شہر لے گئے ہیں۔ اب پتا نہیں اس کا کیا بنا ہے۔ رات میری شاہ دین سے بات ہو گئی تھی، اس نے سارا واقعہ ہی الٹ دیا ہے اور نامعلوم ڈکیتوں پر ڈال دیا ہے۔ یہی کچھ تم نے کہا۔“

”تو پھر.....!“ میں نے پوچھا۔

”پھر کیا..... وہ سب تو یہاں نہیں ہیں، شاہ دین بھی بہت ڈرا ہوا ہے، ہو سکتا ہے وہ آج دن میں کسی وقت یہاں سے چلا جائے، شاہ زیب کافی نڈر ہے، میں نے اس کی طرف سے شک و شبہ لے لیا ہے۔ پیر زادوں کے خلاف آج ان کی پکڑ دھکڑ کروں گا۔“

”ملک سجاد سے کوئی بات نہیں ہو سکی، مطلب آپ نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں نا..... خیر.....! تم اپنا بیان دے دو..... میں وقوعہ کا وقت اس سے پہلے لکھ دوں گا، جو انہوں نے لکھوایا ہے۔ اب دو چار دن کچھ نہیں کرنا، بس پیر زادوں کی پکڑ دھکڑ ہوگی تو وہ تڑپیں گے، دو دن بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ اب گیم کیا بنی ہے۔“

”لیکن ملک سجاد مر نہیں ہے نا..... اس کا مجھے افسوس رہے گا۔“ میں نے جان بوجھ کر کہا۔

”اوئے اچھا ہے یہ..... زخم چاٹے گا۔ اور ادھر نورنگر میں دلبر کا قتل بھی پیر زادوں کے کھاتے میں ڈالنے کی افواہ پھیلانی ہے۔ بس..... باقی دو دن بعد.....“ رندھاوے نے سمجھاتے ہوئے کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب چلتا ہوں..... ادھر آ کر اپنا بیان لکھوا دینا۔“

”کوئی چائے داتے تو.....“ میں نے پوچھا۔

”پھر کبھی سہی۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ میں وہیں بیٹھا چند لمحے اس صورت حال پر غور کرتا رہا، پھر اٹھ کر باہر صحن میں آ گیا۔ میرے پیٹ میں بھوک نے ہلچل مچائی ہوئی تھی لیکن اماں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ بھیدے نے ابھی تک ادھ بھی نہیں پہنچایا تھا۔ میں گرم ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ باہر جانے کے لیے بانیک نکالی، تبھی سامنے گھر والی ماسی لاراں تیزی سے اندر آئی وہ خاصی کھرائی ہوئی تھی۔

”اوجھالے..... کدھر جا رہا ہے.....؟“

”دلبر کے گھر، کیوں خیر تو ہے، اتنی پریشان دکھائی دے رہی ہے۔“

اکلا مشکل ہوگا، پھر آگے نہیں آسانی ہوگی۔ سڑک پر اتنا رش نہیں تھا، جیسے جیسے وہ شہر سے باہر جا رہے تھے، رش کم ہوتا چلا جا رہا تھا اور ان کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ڈرائیور نے رفتار کم کر دی، کچھ ہی فاصلے پر ناکہ لگا ہوا تھا، تبھی ڈرائیور نے کہا تھا۔

”صاحب گھبرانا نہیں، میں سب سنبھال لوں گا۔“

”اوکے.....!“ جہاں نے اس سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کیا، وہاں پر چند پولیس والے ہی تھے۔ یوں جیسے معمول کے مطابق ہی ناکہ لگا ہوا۔ ڈرائیور نے ان کے قریب جا کر گاڑی روک دی۔ بھی ایک پولیس والا آگے بڑھا اور ٹیکسی کے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔

”کدھر سے آرہے ہو اور کدھر جا رہے ہو؟“

”ایئرپورٹ سے..... ترن تارن جا رہے ہیں صاحب جی۔“ ڈرائیور نے معمول کے مطابق کہا۔

”مطلب فارن کی سواریاں نا.....“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو ڈرائیور جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ سپاہی بھی اس کی جانب چلا گیا۔ ٹیکسی کے پیچھے چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد وہ واپس آیا، ٹیکسی ویسے ہی اشارت تھی، اس نے گیسر لگایا اور مل دیا۔

”یہ ہے جی ہماری پولیس کا حال، چند نوٹ میں چاہے جو مرضی کرلو..... ادھر میڈیا پر آگ لگی ہوئی ہے اور ان کا سکون اچھا۔“ ڈرائیور نے اپنے طور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ پر جہاں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ اس وقت سورج نکل رہا تھا، جب وہ نکودر شہر میں داخل ہو گئے۔ جہاں کے ذہن میں تھوڑا بہت ایڈووکیٹ گل کے گھر کا اچھا یاد تھا، لیکن ہر پریت اس بارے میں جانتی تھی۔ پھر ایک جگہ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

”ہمیں یہیں اتار دو۔“

ڈرائیور نے اتنا ہی سنا اور سڑک کے کنارے گاڑی لگا دی۔ جہاں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند بڑے نوٹ نکالے، اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لو..... اسے کرایہ.....“

”ٹیکس صاحب.....! مجھے سب کچھ مل گیا ہے، آپ جائیں۔“ اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اوکے.....! مل گیا ہوگا، لیکن یہ تمہارا ناشتہ ہے جو ابھی میں نے تمہیں کروانا تھا،“ جہاں نے نوٹ اس کی جیب میں ڈالے ہوئے کہا اور گاڑی سے اتر گیا، ہر پریت پہلے ہی اتر چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا تو ہر پریت نے ایڈووکیٹ گل کو اہل مایا۔ کچھ ہی دیر بعد فون ریسیو کر لیا گیا۔

”الکل جی، میں ہر پریت..... یہاں نکودر میں..... جی آکر بتاتے ہیں نا..... ہاں میرے ساتھ جہاں بھی ہے۔ آجائیں۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں کی لوکیشن بتانے لگی۔ فون بند کر کے اس نے جہاں کو دیکھا جو غیر محسوس انداز میں اس کے دیکھ رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایڈووکیٹ گل کی گاڑی ان کے پاس آن ٹھہری، وہ پھر اسی ترتیب سے بیٹھ گئے۔ گیسر لگاتے ہوئے گل نے پوچھا۔

”ہاں ک.....؟“

”امر تسرے آرہے ہیں؟“ ہر پریت بولی۔

”کیوں.....؟“ وہ چونکا۔

”وہ بندرنگھ کے پتر ہر دیپ کو قتل کر کے.....“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اب پتا نہیں اس بات پر پریشان ہونا چاہیے یا نہیں، لیکن رات کے پچھلے پہر ایک بڑی ساری جیب ادھر آ کر رکی تھی، میں اس وقت جاگ رہی تھی، تمہاری ماں نے دروازہ کھولا تھا، وہ جیب باہر ہی کھڑی رہی۔“

”پھر.....!“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”کچھ دیر بعد جب حویلی کی طرف شدید فائرنگ ہوئی تھی، اس وقت تیری ماں اور وہ لڑکی، جو چند دن پہلے تیرے پاس آئی تھی، وہ جیب میں بیٹھ کر چلی گئیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو ماسی تم.....“ میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے گھبرا گئی، پھر تیزی سے بولی۔

”میں نے پوچھا تھا کہ اچانک اس وقت کہاں جا رہی ہو؟“

”پھر کیا کہا.....“ میں نے بانیگ سے اترتے ہوئے پوچھا تو اس نے ہاتھ میں ایک مڑاڑا کارڈ میری طرف بڑھایا اور بولی۔

”اس لڑکی نے کہا تھا کہ یہ کارڈ جمال کودے دینا۔ یہ لو.....“

میں نے وہ کارڈ تیزی سے پکڑا، اس پر کسی ڈانس پارٹی کا پتہ درج تھا۔ پشت پر ایک سیل فون نیلے رنگ کی بال پن سے گھسیٹا ہوا تھا، مجھے ایک دم سے اپنی دنیا اندھیر ہوتی ہوئی معلوم ہوئی، ایک طرف مجھے اپنی ماں پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر کیوں چلی گئی، اور دوسری طرف میں سوئی کی اس حرکت پر پاگل ہو رہا تھا، میں ایک دم سے باہر جانے کے لیے لپکا کہ اچھو کر پانے والے کی دکان پر جا کر سوئی کو فون کروں لیکن پھر ٹھنک گیا، کیا مجھے ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ ماسی مختار اں واپس جا چکی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سوئی نے ایسا کیوں کیا؟ میرا ماغ ایک دم سے ماؤف ہو گیا تھا۔



یہ خوف بھی عجیب شے ہوتی ہے۔ جس شخص کے اندر وارد ہو جائے، اس کے دشمنوں کو مزید شہہ دینے کا فائدہ دے دیتا ہے۔ کیونکہ خوف کا اظہار چہرے ہی سے نہیں عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور دشمن اس کا فائدہ اٹھالیتا ہے، یہی خوف اگر نہ رہے تو دشمن پر فتح کی طرف آخری قدم تک حوصلہ برقرار رہتا ہے اور پھر محض خوف کا تاثر کبھی کبھی منافقت کو بے نقاب کرنے میں انتہائی مدد دیتا ہے۔ منافق فقط اس وقت شہہ پکڑتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ جس کے بارے میں وہ محض عناد کے ساتھ سازش تیار کر رہا ہے، وہ خوف زدہ ہے، خوف زدہ ہونے کا یقین ہوتے ہی وہ کھل کر اپنی پوری خباثت کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے، کیونکہ منافق بنیادی طور پر بزدل ہوتا ہے، بزدلی ہی کیننگی کو شہہ دیتی ہے۔

جہاں نے ایک دم سے محسوس کیا کہ کمل ویرانجانے میں اسے خوف زدہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اسے بچانے کے چکر میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہو گیا تھا۔ وہ کھانا کھا چکے تھے، جب رات کا آخری پہر شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت تک کمل ویرنے ایک ٹیکسی کا بندوبست کر لیا تھا۔ جس کا ڈرائیور اس کا اپنا خاص آدمی تھا۔

”میں سوچ کر تو یہی آیتھا کہ کافی دن رہوں گا، لیکن کام جلدی ہو گیا، میں جلدی آؤں گا دوبارہ۔“ جہاں نے کمل ویر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میں انتظار کروں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کو دبایا پھر اس نے کرن سے ہاتھ ملایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ادھیر عمر کا اور کافی حد تک سانولے رنگ کا سکھ تھا جس کی داڑھی بخشی ہو چکی تھی۔

رات گہری ہو چکی تھی اور چاند مغربی افق کی جانب جھک گیا تھا۔ جب وہ امر تسرے نکلے، ہر پریت پچھلی نشست پر تھی اور جہاں آگے پینجر سیٹ پر اس نے پٹیل پاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کی شکل ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ خاموش طبع بندہ ہے۔ اس کی تمام تر توجہ سڑک پر تھی۔ جہاں کو بھی یہ احساس تھا کہ صرف شہر سے ہی

”یار ہر پریت.....! کہیں تم میرے ساتھ آ کر پچھتا تو نہیں رہی ہو؟“

”یہ خیال تمہیں کیسے آیا۔“ وہ کافی حد تک غصے میں بولی۔

”نبی! اتنی بھاگ دوڑ..... یہ خون قتل و غارت.....“ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں ہے جی جی! ابھی تو شروعات ہیں.....“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو جہاں نے ایک دم موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارا مجھے جتنی کہنا بہت اچھا لگتا ہے، کیا میں بھی تمہیں پریو پریتی یا.....“

”پریتے.....“ اس نے بات کاٹتے ہوئے ایک دم سے تہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

”برابان گئی ہو.....؟“

”نہیں..... نہیں..... جی نہیں، تم جو کہو.....“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”تو پھر ٹھیک ہے پریتی.....“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں پیار بھرا خلوص مہک اٹھا تھا۔ جس سے ہر پریت اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر جہاں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سو جاؤ.....! تم کافی تھک چکی ہوگی۔“

”تمہیں نیند آ جائے گی کیا؟“ ہر پریت نے دھیرے سے پوچھا۔

”کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے اور تم تو پھولوں جیسی ہو۔“ جہاں نے خمار آلود لہجے میں کہا تو وہ کروٹ لے کر دوسری جانب دیکھنے لگی جہاں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا..... نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ وہ نیند میں ڈوب گیا۔

ان کی آنکھ فون کی آواز پر کھلی۔ وہ انوجیت کا فون تھا وہ اچکا تھا اور گل ایڈوکیٹ کے پاس ڈرائنگ روم میں تھا۔ ہر پریت اس کے پاس جا کر کپڑے لے آئی اور پھر تیار ہو کر ان کے پاس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ جہاں اس سے پہلے ان کے پاس تھا۔ کچھ دیر تفصیلی باتوں کے بعد وہ تحصیل چل پڑے۔ جہاں وہ دوپہر تک رہے پھر وہیں سے وہ اوگی پنڈ کی طرف چل پڑے دوپہر ہو چکی تھی جب وہ اپنے گھر پہنچے وہاں اچھی خاصی سکیورٹی تھی۔ اعلان ہو رہا تھا کہ اسی گاؤں میں آ کر رو بندر سنگھ کے بیٹے ہر دیپ سنگھ کی آخری رسومات ادا کی جائیں گیں۔ ظاہر ہے اس پر بہت وی آئی بی لوگ آنے والے تھے۔ پولیس کی بھاری نفری ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ تاہم کسی نے انہیں نہیں روکا تھا اور وہ سکون سے گھر پہنچ گئے۔ ان کے آنے کے بارے میں کلجیت کو رک کو پہلے ہی سے خبر تھی۔ اس لیے ان کے آتے ہی کھانے کی میز سج گئی۔ پھر کھاپی کر جب وہ سکون سے بیٹھے تو کلجیت کو رک کو انہوں نے پوری روداد سنائی۔ انوجیت اور وہ چپ چاپ سنتے رہے جب وہ ماری بات سن چکی تو بولی۔

”تھانے سے ایک بندہ دوبار جہاں کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔“ اور میں نے دونوں بار نکودر کے بارے میں بتایا ہے۔“

”اس نے بتایا نہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے پوچھ رہا ہے؟“ انوجیت نے تیزی سے پوچھا۔

”میں نے خود نہیں پوچھا اس سے، یہیں سے کہلوا دیا، میں سامنے ہی نہیں گئی، انہیں شک ہے تو وہ جہاں کا پوچھ رہے ہیں۔“ کلجیت کو رک نے کہا تو جہاں نے انوجیت سے پوچھا۔

”ہو تار ہے یار۔“ انوجیت یار، وہ رو بندر سنگھ ادھر گاؤں میں آ تو رہا ہے اور کسی ہنگامے کے بغیر چلا جائے، یہ کیسے ممکن ہے اسے کچھ نہ کچھ تو احساس ہونا چاہیے۔“

”اوہ.....! تو وہ تم لوگ تھے.....“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں بات پوری نہ کی۔

”ہاں.....! ہم آپ کے پاس آئے ہیں، کل شام کے اپنے قانونی مشوروں کے لیے، وہ آپ ہمیں بتادیں۔“ جہاں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے سمجھ گیا۔

”مجھے تم پر قاتلانہ حملے اور پولیس کے روپے کے بارے میں پتا چل گیا تھا، میں نے اپنے طور پر تیاری کر لی تھی اور کچھ معلومات بھی آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہ رہا تھا، اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔“ گل نے سوچتے ہوئے بتایا۔ ”یہ جو نیا پولیس آفیسر ہے، یہ اے سی پی رن ویر سنگھ، یہ پولیس کی انٹیل برانچ سے یہاں تعینات ہوا ہے، ابھی سروس کو دو یا تین سال ہوئے ہیں، مگر ڈیپارٹمنٹ میں ”معصوم سانپ“ کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اندر سے کتنا ظالم ہے، خیر.....! اسے یہاں اس لیے لگایا گیا ہے کہ کمیشن کے دو بندے غائب ہو گئے، ان کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے، یہاں تک کہ جس کے لیے کمیشن بنا تھا، ان بندوں تک کا پتہ نہیں چلا۔“

”پھر تو اب تک وہ ہمارے گھر پہنچ چکا ہوگا۔“ ہر پریت نے تشویش سے کہا اور انوجیت کے نمبر ملانے لگی۔

”نہیں! ابھی وہاں نہیں پہنچا، میری انوجیت سے بات ہو گئی ہے، جب تمہارا فون آیا تھا۔“ گل نے تیزی سے کہا۔ تب تک ہر پریت کا رابطہ ہو گیا، اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

”ہاں بول ہر پریت.....“

”ہم انکل گل کے ساتھ ہیں، کوئی پرابلم تو نہیں وہاں۔“

”کوئی نہیں، بہر حال تم لوگ میرے آنے تک ادھر ہی رہنا۔“ اکٹھے ہی تحصیل چلیں گے۔“ انوجیت نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس پر ہر پریت قدرے پریشان ہو گئی۔ اس نے اچانک فون بند کر دیا تھا، جس کا اظہار اس نے کیا تو گل بولا۔

”اوئے پتر.....! واہ گرد مہر کرے گا، تم دل چھوٹا مت کرو۔“

”اس کا لہجہ.....“ وہ بولی۔

”او میں پتہ کر لیتا ہوں، بس گھر جانے کی دیر ہے، سکون سے پوچھتا ہوں۔“ گل نے کہا اور گلی میں گاڑی موڑ دی۔ اس کا گھر اسی گلی میں تھا۔

گھر پہنچے تو ناشتہ تیار تھا۔ مسز گل نے میز سجایا ہوا تھا۔ وہ فریش ہو کر آئے تو ناشتے کی میز پر وہ تینوں تھے۔ گل نے اپنی مونچھوں کو تادیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔

”سب سکون، سکھ اور شانتی ہے، فکر کی ضرورت نہیں، میں نے پتا کر لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے انکل، ہمیں آج تحصیل آفس میں کیا کرنا ہوگا۔“ ہر پریت نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس وہاں حاضری ڈالنی ہے، ادھر ادھر پھرنا ہے، ایک دو آفیسرز سے مل لیں گے اور بس۔“ گل نے پرسکون لہجے میں کہا اور ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔ ناشتے کے دوران وہ باتیں کرتے رہے، گل نے انہیں وہ سب سمجھا دیا جو وہ انوجیت سے طے کر چکا تھا۔ تاکہ کبھی کا بیان ایک جا رہا ہے، وہ ناشتہ کر چکے تو گل نے کہا۔ ”اب دوڑھائی گئے آرام کر لو، تب تک انوجیت بھی آ جائے گا۔“

”او کے انکل۔“ ہر پریت نے کہا تو جہاں بھی اٹھ گیا۔

ان دونوں کے لیے ایک ہی کمرہ تھا جو گیسٹ ہاؤس قسم کا تھا۔ الگ تھلگ اور پرسکون۔ ہر پریت نے انوجیت کو الیس ایم ایس کر دیا تھا کہ آتے ہوئے ان کے کپڑے لے آئے۔ اتنی دیر میں جہاں نے جاگرتا کر پھینکے اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ ہر پریت اس کے ساتھ دوسری جانب لیٹ گئی۔ تب جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ ہو جائے گا“ تم بس آرام کرو میں نہیں چاہتا کہ سکیورٹی کے نام پر تجھے پکڑ لیں۔ ان کا کوئی پتا نہیں ہے ابھی دودن پہلے ان سے تو تو..... میں میں ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے عجیب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بے بے.....! یہ اس گھر کی چار دیواری کے باہر نہ جائے۔ اس وقت دس دس کلومیٹر تک سکیورٹی پھیلی ہوئی ہے یہ وقت کسی بھی قسم کے رسک لینے کا نہیں ہے سمجھا دو اسے.....“

”اوبائی جی سمجھ گیا میں اب تقریر نہ کروں میں نیند پوری کروں گا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔
”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اس نے کہا تو ہر پریت اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جسپال نے اپنے کمرے میں جا کر سائینڈ ٹیبل سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور بیڈ پر دراز ہو کر اسے کھول لیا۔ جسمیندر سنگھ کی کئی ای میل آئی ہوئی تھیں۔ اس نے سبھی دیکھ لیں سب میں معلومات تھیں اسے گاؤں میں بیٹھے معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن وہ اسے یہاں کی خبریں بھیج رہا تھا اس نے میل کا جواب دیا اور جسمیندر سنگھ کے آن لائن ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر گزر جانے کے باوجود آن لائن نہیں ہوا تو اسے اکتاہٹ ہونے لگی اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی، یونہی ادھر ادھر کی سوچیں لے کر سوچتا رہا، تقریباً دو گھنٹے یونہی لیٹے رہنے کے بعد وہ لیٹے رہنے سے بھی تنگ آ گیا۔ وہ بالمشورہ طور پر الجھن کا شکار تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اتنی بڑی سکیورٹی کے باوجود وہ رویندر سنگھ کو بتانا چاہتا تھا کہ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ وہ ہنگامہ کرنا چاہ رہا تھا وہ کھڑکی میں کھڑا تھا اور باہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کی پشت پر نرم نرم ہاتھوں نے چھوا۔ وہ دھیرے سے پلٹا تو ہر پریت کھڑی تھی اس کی آنکھوں میں نرمی پھلائی اور چمک تھی۔ وہ چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتی رہی پھر نرم سے لہجے میں بولی۔
”کیا سوچ رہے ہو؟“

”جی بات تو یہی ہے کہ رویندر سنگھ کو.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

”میرا بھی یہی خیال تھا تم یہی سوچ رہے ہو گے، لیکن جی ہاں، وہ بھی یہیں بلاشبہ وہ بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہے ہوں گے، کیا ہم ان کے جال میں پھنس جائیں..... نہیں جی نہیں..... میرے انسٹرکٹر کہا کرتے تھے انتظار کرو جب تک کر سکتے ہو، لیکن جب وار کرو تو پھر اتنا بھر پور ہو کہ دوسرا بچ نہ سکے۔“

”تمہارا انسٹرکٹر ٹھیک کہتا ہے پریتی.....“ اس نے ایک انگلی سے ہر پریت کے لبوں کو چھوالتے ہوئے کہا۔ جس کی نرمی نے اس کے جسم میں گدگداہٹ پھیلا دی تھی۔ تبھی ہر پریت کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں۔ اس نے پیار سے اپنا سر جسپال کے کندھے سے لگا دیا تو وہ اس کے کندھوں کو پکڑ کر سہلانے لگا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کی بے چینی کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب کافی وقت ایسے بیت گیا تو ہر پریت اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”چل آ نیچے لان میں بیٹھتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں اور بڑی پیاری باتیں کریں گے۔“

”چل.....“ اس نے ایک دم سے کہا اور پھر دونوں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

اس وقت وہ دونوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کمرے سے آ کر یہاں آنے تک اور پھر چائے پینے تک میں کچھ وقت لگ گیا تھا اس دوران ہر پریت نے اپنے کالج کے قصبے سنا کر اس کے ذہن سے کافی حد تک رویندر کے خیال کو نکال دیا تھا۔ وہ دونوں قصبے لگا رہے تھے کہ ان کے چوکیدار بننا سنگھ نے آ کر ایک پولیس مین کے آنے کی اطلاع دی۔

”کیا یہ وہی ہے جو صبح سے دوبار آ چکا ہے؟“ ہر پریت نے پوچھا۔

”جی وہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”بلاؤ اسے.....“ جسپال نے کہا تو بننا سنگھ واپس پلٹ گیا۔ تبھی اس نے ہر پریت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”گلتا ہے اس گھر

قلندرات

کی نگرانی ہو رہی ہے؟“

”یہ کوئی نئی بات نہیں اکثر ہوتا رہتا ہے۔“ ہر پریت نے کہا تو وہ کا ندھے اچکا کر بولا۔

”چلیں دیکھتے ہیں۔“

کچھ دیر بعد ایک نوجوان سکھ پولیس مین ان کے سامنے تھا جسپال نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ تو اس نے پوچھا۔

”چائے پیو گے؟“

”نہیں بس میں صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا کہ آپ ان سے ایک دفعہ مل لیں۔“ وہ بولا۔

”خیریت۔“ جسپال نے پوچھا۔

”پتہ نہیں میں صبح سے دوبار آپ کا پوچھنے آ چکا ہوں۔“ اس نے احساس جتا دینے والے انداز میں کہا۔

”یار بات سن تیرے صاحب کے پاس میرا فون نمبر ہے۔ اگر ایسی ہی کوئی بات تھی تو وہ مجھے فون کر لیتا، خیر میں اسے فون کر لیتا ہوں، نمبر بتا اس کا.....“ جسپال نے اپنا فون نکالتے ہوئے کہا۔

”اس وقت تو صاحب مصروف ہوں گے بڑی وی آئی پی سکیورٹی ہے جی اس وقت.....“ اس نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس سکیورٹی میں کوئی بندہ نہیں پھڑک سکتا۔

”تو نمبر بتا، میں کوشش کرتا ہوں۔ ورنہ پھر بعد میں کر لوں گا۔“ جسپال نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو اس نے نمبر بتا دیا۔ اس نے پیش کیا چند تیل جانے کے بعد اس نے فون ریسیڈ کر لیا۔

”اے سی پی رن ویر سنگھ چٹھہ بات کر رہے ہو؟“

”ہاں..... آپ کون.....؟“

”میں جسپال سنگھ ابھی آپ کا بندہ میرے پاس آیا ہے کہہ رہا ہے صبح بھی دوبار آیا ہے آپ مجھے فون کر لیتے۔“ اس نے کافی حد تک طنزیہ انداز میں کہا۔

”اور آپ کہاں تھے؟“ اس نے پوچھا، لہجے میں ہنک آمیز غصہ تھا۔

”نکو در تھا کل سے ابھی دوپہر کے بعد آیا ہوں، کیا کوئی کام تھا بندے تلاش کر لیے آپ نے کیا؟“ پنجاب پولیس اتنی شاندار کارکردگی دکھانے لگی ہے؟“

”ابھی میں مصروف ہوں، کل ملنا اور ممکن ہوا تو آج ہی بات کروں گا۔ آپ کو کتنا آنا پڑے گا۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”میں آپ کی فون کال کا انتظار ابھی سے کرنے لگا ہوں۔“ اس نے پھر طنزیہ انداز میں کہا۔ تو رن ویر بولا۔

”اوکے..... ہوتی ہے ملاقات.....“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جسپال نے فون جیب میں واپس رکھتے ہوئے سامنے بیٹھے پولیس مین سے کہا۔

”تمہارے صاحب سے ہو گئی ہے بات..... اب تم جاؤ۔“

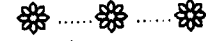
”صاحب! آپ اگر ہمارا خیال رکھو گے نا تو ہم بھی یاروں کے یار ہیں، کبھی آزما کر دیکھ لینا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بس جلدی سے ہماری جیب پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں بتا دو..... خوش کر دوں گا۔“ جسپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ بھی مل ہی جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ جو پتا اس نے پھینکا ہے، وہ ضائع چلا گیا ہے۔ شاید اس نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ کوئی بات کرے گا، مگر جیسی ایسا سب کچھ سمجھتا تھا وہ چلا گیا تو ہر پریت نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”تو وہ ملنا چاہتا ہے؟“

”ہاں.....! اور میرے اس گھر تک محدود رہنے کے بارے میں جاننا بھی چاہتا ہے۔“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا۔
”مطلب اسے ہم پر شک ہو گیا ہے.....“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”تو ہم اس کا شک رفع کر دیں گے، جیسے بھی ہوا۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا، پھر ایک ہی سانس میں سانس دھرا کپ خالی کر دیا۔ وہ کچھ دیر اپنی اپنی سوچوں میں غم رہے پھر یونہی باتوں میں مصروف ہو گئے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔



ایک طرف جہاں میں حیران تھا کہ سوئی یہاں آ کر اماں کو لے گئی ہے وہاں میں حد درجہ پریشان بھی تھا کہ اماں اس کے ساتھ کیوں چلی گئی، مجھ سے پوچھے بغیر، کوئی بات کیے بغیر وہ یوں کیسے اس کے ساتھ چلی گئی، کئی خیال میرے ذہن میں آ رہے تھے، کیا سوئی نے اماں سے جھوٹ بولا، اسے کوئی دھمکی دی یا پھر ذرا دھمکا کر لے گئی، سوئی نے ایسا کیوں کیا؟ یہی بات میرے دماغ میں تیر کی طرح کھب گئی تھی، کیونکہ یہ سب ایسے موقع پر ہوا تھا جب ملک سجاد موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ جب سے سوئی اتفاقیہ طور پر میری زندگی میں آئی تھی، تب سے انجانے میں ملک سجاد کے ساتھ دشمنی شروع ہو گئی تھی۔ عورت اور وہ بھی طوائف اس کا کیا بھروسہ، وہ ایک طرف خود کو مظلوم ثابت کر رہی تھی تو دوسری جانب ممکن ہے پیسے اور لالچ کے باعث ملک سجاد سے مل گئی ہو۔ یا پھر دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے رات بن گئے ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ کتے کا پھر بھی بھروسہ کیا جاسکتا ہے، مگر سناپ کا نہیں، میرے دماغ میں سے سب شے نکل گئی تھی اور صرف میری ماں کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے نک گیا تھا۔ میں نے گھر ویسے ہی کھلا رہنے دیا اور بائیک پر سیدھا چوک میں اچھو کر یا نے والے کی دکان پر پہنچا، اگرچہ میرے ذہن میں یہی تھا کہ یہاں سے فون نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے میری بہت بڑی کمزوری دشمنوں کے ہاتھ میں آ سکتی تھی، لیکن پتا تو پھر بھی لگ جانا تھا، ماسی مختار اس سے کہاں یہ بات چھپائی جاسکتی تھی۔ آج نہیں تو کل پورے گاؤں کو پتہ چل جانا تھا، میں نے جاتے ہی ریسپور اٹھایا تو اچھو فوراً بولا۔

”جمال بھائی فون کل سے خراب ہے، کوئی کال نہیں ہوگی، ٹھیک کر رہے ہیں، ممکن ہے ابھی ٹھیک ہو جائے۔“ اس کے یوں کہنے پر مجھے یوں لگا جیسے میری ماں، میری دسترس سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا، ممکن ہے فون جلدی ٹھیک ہو جائے اور میں کال کر لوں، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا پھر میں نے وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا، اور سیدھا دلبر کے گھر کی طرف بڑھا۔ جہاں اب تک لوگوں کا رش لگ چکا تھا۔ میری نگاہیں چھانکے کو تلاش کر رہی تھیں۔ بائیس حصے معلوم ہو گیا کہ وہ ساتھ والی بیٹھک میں پولیس والوں کے پاس بیٹھا ہے۔ میں اس جانب بڑھ گیا۔ دروازہ ویسے ہی بند تھا، میں نے کھولا اور اندر دیکھا، رندھاوے کے ساتھ دو پولیس والے گاؤں کے بزرگ اور چھانکے بیٹھے ہوئے تھے۔

”لوحی، جمال بھی آ گیا ہے۔“ ایک بزرگ نے کہا تو میں بولا۔

”میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ دو منٹ چھانکے سے بات کرنی ہے، میں نے.....“

”خیریت تو ہے، جمال.....“ رندھاوے نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید میرا چہرہ پڑھ رہا تھا۔

”بتاتا ہوں، ذرا چھانکے سے بات کر لوں۔“ میں نے کہا، تب تک وہ اٹھ کر میز سے پاس آ گیا۔ میں اسے لے کر بیٹھک سے باہر آ گیا۔

”اوئے جمالے، تاخیر تو ہے۔“ اس نے گلی میں آ کر پوچھا۔ تو میں نے ساری روداد اسے سنادی۔ پھر کہا۔
”ممکن ہے! وہ ہمیں بلیک میل کریں۔“

”دیکھ جمالے..... تو اپنے آپ پر قابو رکھ، دلبر کی تدفین ہو جانے دے، تب تک جو بھی ہوگا، وہ سامنے آ جائے گا، ورنہ پھر سوئی کو تلاش کرنا کون سا اتنا مشکل ہوگا۔“

”اگر..... اگر اس کی نیت ٹھیک نہ ہوئی تو سوئی کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔“ میں نے کہا تو اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نیت کا پتہ کیسے چلے گا.....؟ اس سے رابطہ ہوگا، یا پھر اس سلسلے میں ہم سے کوئی رابطہ کرے گا۔“
”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے زچہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ دیر تک خاموش رہ..... دلبر کو دفناتے ہی کچھ کرتے ہیں۔“ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ گلی میں پانچ چھ کاریں آ گئیں۔ ان کے درمیان ایک ہیوی فورڈ ہیل جیب تھی۔ وہ دلبر کے گھر سے ذرا فاصلے پر رک گئیں۔ میں ٹھٹک گیا۔ آنے والے پتا نہیں کون تھے۔ دوست تھے یا دشمن۔ میں انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ تیسری فورڈ ہیل جیب سے پیر زادہ وقاص باہر نکلا، اس سے پہلے کئی لوگ کاروں سے نکل آئے تھے۔ یہ سب علاقے کے مختلف لوگ تھے۔ اس نے ماحول پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور مجھ پر رک گئی، ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو وہ سیدھا میری طرف بڑھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لمحات میں مجھے کس طرح کے رد عمل کا اظہار کرنا چاہیے، وہ بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا اور لازمی طور پر اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ میں کھڑا رہا، مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا، میں نے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا تو اس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے ملو جمال، تجھ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“

”ابھی یا.....“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”آں شام تک کسی بھی وقت.....“ اس نے بھی دھڑلے سے کہا۔

”چلیں، ملتے ہیں کہیں.....“ یہ کہہ کر میں اس سے الگ ہوا، پھر دوسرے لوگوں سے ملنے لگا۔ اتنے میں رندھاوے کو اطلاع مل گئی، وہ بھی آ گیا۔ یوں گلی میں ایک ہجوم سا اکٹھا ہو گیا، دریاں بچھا دی گئیں تو سارے لوگ وہیں جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ میرے دماغ میں پیر زادے کی بات سن کر کوئی ہلچل مچ گئی تھی۔ ”کیا سوئی کا رابطہ پیر زادے سے ہے، اگر ہے تو.....“ میں مزید اس سے آگے کچھ نہ سوچ پا رہا تھا، میرے اندر سنسنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ جنازہ تیار ہونے میں تھوڑا سا وقت تھا۔ لاشعوری طور پر لوگوں کے ذہن میں تھا کہ گاؤں میں ہونے والی اس فوجی پر شاہ زیب ضرور آئے گا، مگر حویلی والوں کی طرف سے دور دور تک کسی کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کی باتوں کی ہلکی ہلکی جھنناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ وقت گزر گیا، جنازہ تیار ہو گیا اور پھر لوگ لے کر قبرستان کی طرف چل دیے۔

نورنگر کے لوگوں کے لیے پہلی مرتبہ یہ دیکھنے میں آیا تھا کہ کوئی بڑا زمیندار یوں جنازے کے ساتھ پیدل چلتا چلا جا رہا ہے۔ ورنہ پہلے تو یہی ہوتا تھا کہ وہ عین جنازہ پڑھنے کے وقت پہنچے، یا ان کا انتظار کیا جاتا یا پھر دوسرے تیسرے دن دعا کے وقت وہ لوگ اظہار ہمدردی کے لیے آ موجود ہوتے۔ میں خود پر جبر کرتے ہوئے چلتا چلا جا رہا تھا۔ میری تمام تر سوچیں سوئی اور اپنی ماں کی طرف تھیں۔ یہاں تک کہ قبرستان آ گیا۔ نماز جنازہ کے بعد لوگ دلبر کو دفنانے لگ گئے جبکہ پیر زادے نے دھڑلے سے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کھینچ دیا۔ مجھے بھی تجسس تھا، لہذا اس کے ساتھ چلتا ہوا لوگوں سے کافی دور آ گیا۔

”جمال.....! کیا تیری میری کوئی دشمنی ہے؟“ پیرزادے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”اگر میری اور سرداروں کی لڑائی ہو جائے تو تم کس کا ساتھ دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کسی کا بھی نہیں۔“ میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں.....؟“ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

”مجھے کسی کی لڑائی لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور پھر مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کبھی آپس میں نہیں لڑو گے۔“ میں نے

بیزاری سے کہا۔

”نہیں“ میں فیصلہ کر چکا ہوں جمال! آج تک بابا سائیں مجھے روکتے آئے ہیں کہ میں سردار شاہ دین کے خلاف نہ جاؤں مگر میری اس خاموشی نے انہیں شہ دی ہے اگرچہ یہ تیرا اچھا فیصلہ ہے کہ تم اس لڑائی میں نہیں آؤ گے مگر..... وہ لوگ تجھے اس طرح استعمال کر چکے ہیں کہ تجھے پتا تک نہیں چلا۔“ اس نے کسی حد تک طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ممکن ہے انہوں نے ایسا کر لیا ہو لیکن.....“

”لیکن..... شک نہیں“ حقیقت ہے یہ..... غور کرو! میلے سے لے کر اب تک کے واقعات پر..... وہ سیاسی طور پر اس علاقے سے اب پنجاب کی سطح پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے ملک سجاد جیسے کئی دوست بنائے ہیں اس نے..... بڑی مچھلی بن کر چھوٹی مچھلیوں کو نگل جانا چاہتا ہے۔ اب یہ ہماری بقا کی جنگ ہے..... ورنہ وہ ہمیں اپنا مطیع بنا کر رکھے گا یا ختم کر دے گا..... یہ ہے تمہاری اس بات کا جواب کہ میں اس سے کیوں لڑنا چاہتا ہوں.....“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”لڑو..... لیکن ہم پر تو عرصہ تک ہو گیا نا..... بقول آپ کے ہم استعمال ہو گئے وہ غریبوں کو اور آپ بھی غریبوں ہی کو اس جنگ میں جھونک دو گے.....“ میں نے غصے میں کہا۔

”یہ تو ہوگا..... جنگ میں پیادے زیادہ مارے جاتے ہیں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو سردار نے اپنی قوت نہیں بڑھائی کیا ملک سجاد اگر موت و حیات کی کشمکش سے نکل آیا تو وہ ان لوگوں سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کرے گا جنہوں نے اسے اس حال تک پہنچایا۔“

”تو کیا اسے آپ لوگوں نے مارا ہے؟“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”نہیں! ہم نے نہیں مارا! ممکن ہے تم نے مارا ہو؟ مگر..... وہ کھاتے میں تو ہمارے پڑ گیا نا! بات اب اس علاقے تک محدود نہیں رہی بہت بڑھ گئی ہے۔“

”ابھی آپ اپنی بھائی کی جنگ لڑیں سیاسی طور پر لوگوں کو بتائیں کہ انہوں نے علاقے کی عوام پر کیا ظلم کیا ہے بات تو یہیں سے بڑھ گئی نا.....“ میں نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

”تم نے اچھا کیا جو گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کر کے یہ بات ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ مجھ تک پہنچی ہے بات میں نے بھی پورے علاقے کے لوگوں کو اکٹھا کرنا ہے ایک دو دنوں میں اور سردار شاہ دین سے سوال کرنا ہے کہ اس نے ملک سجاد کو یہاں غنڈہ گردی کی اجازت کیوں دی؟“ اس نے ایک جذبے سے کہا۔

”تو میں پھر ٹھیک ہے۔ اس کے جواب پر آئندہ کار عمل کر لیں گے۔“ میں نے فوراً ہی جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے تم حق بات پر پہرہ دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں نہیں کیا میں اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ بس دو دن دو مجھے.....“ اس نے کہا اور پھر اس جانب چل پڑا جدھر دلبر کو دفنار ہے تھے۔ وہ مجھ سے الگ ہوا تو چھکا تیزی سے میرے پاس آیا میں نے اسے نکلنے کا اشارہ کیا ہم قبرستان سے نکلنے چلے گئے۔ میں دلبر کے گھر جانے کی بجائے اچھو کر یا نے والے کی دکان کی طرف چلا گیا۔ اس کا فون ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں نے کارڈ پر درج نمبر ملائے چند لمحوں بعد فون اٹھالیا گیا۔ دوسری طرف سے سوئی ہی بول رہی تھی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تو مجھے فون کرے گا۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تو میں نے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”تو یہ بتا کہ ماں کدھر ہے اور تو اسے کیوں لے کر گئی ہے؟“

”لے! اماں سے بات کر.....“ یہ کہہ کر اس نے اماں کو فون دے دیا کیونکہ اگلے ہی لمحے اماں کی آواز ابھری۔ ”کیسا ہے تو جمال؟“

”اماں! یہ تو نے کیا کیا..... اس کے ساتھ کیوں چلی آئی۔“

”ملک سجاد کے لوگ تجھے مارنے کے لیے گھر تک آ گئے تھے۔ سوئی کو معلوم تھا کہ وہ ایسا کریں گے میری جان کو خطرہ تھا وہاں! سو انہیں ٹو نہیں ملا پھر اچانک خبر ملی کہ ملک سجاد کو گولیاں لگ گئی ہیں..... سوئی مجھے اپنے ساتھ ادھر لے آئی۔“

”ادھر کہاں.....“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”لاہور..... یہاں اپنے گھر.....“ اماں نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک تو ہے نا ماں..... اس نے کوئی دھمکی.....“

”اوہ! نہیں پتر.....! تو ایسا نہ سوچ..... میں بڑے آرام سے ہوں یہاں پر۔“

”یہ ملک سجاد کے کہنے پر تو.....“ میں نے کہنا چاہا۔

”اونہیں! اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے۔ وہ تو خود ہسپتال میں ہے تو ایسا کر یہ سوئی سے پتا پوچھ لے..... پھر مجھے جب چاہے لینے آ جانا۔ میں محفوظ ہوں یہاں پر۔“ اماں نے دلا سہ دینے والے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے! دو اسے فون.....“ میں نے کہا تو چند لمحوں بعد سوئی لائن پر تھی۔

”دیکھ جمال..... مجھے تیری بہت ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اماں کو یہاں لاکر تجھے بلیک میل کر رہی ہوں۔ میں اماں ہی کو نہیں تجھے بھی بچالینا چاہتی ہوں۔ پلیز..... یہاں میرے پاس آ جاؤ جو کہنا ہے مجھے کہہ لو مگر میری بات ضرور سن لو۔“

”پتہ لکھواؤ۔“ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا پتا لکھوانا شروع کر دیا۔ لکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ درست بھی ہوگا یا غلط لیکن میں نے لکھ لیا۔ پھر میں نے کہا۔ ”دیکھ.....! اگر یہ پتا درست نہ ہوا تو.....“

”تیری سب سے بری عادت یہی ہے کہ تو کسی پر اعتماد نہیں کرتا جب چاہے چلے آنا میں تجھے یہیں ملوں گی اور سن ماں کی طرف سے بے فکر ہو جا میں نے سنبھال لیا ہے اسے۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

”اوئے تو کون ہوتی ہے میری سنبھال لینے والی دیکھ تو اماں کو لے کر ادھر آ جا ورنہ مجھے تو آنا ہی ہے..... تجھے پاتاں سے بھی نکال لوں گا۔“

”میں یہی تو چاہتی ہوں کہ تو میرے پاس ادھر آئے کل کا آتا ہے آج آ جا۔“ اس نے پھر اسی پیار بھرے لہجے میں میرا غصہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا اب اس سے مزید بات کرنا فضول تھا۔ اس لیے میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے اچھو کی طرف ایک بڑا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ رکھ پیسے! اور یہ نمبر کسی کے ہاتھ نہیں لگنا چاہیے۔“

”پیسے بھی آپ رکھو اور یہ نمبر میں ابھی یہاں سے ختم کر دیتا ہوں نہ ہو گا نہ مجھے پتا چلے گا“ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“
”تو پھر تو زندہ بھی رہے گا۔“ میں نے کہا اور نوٹ اس کے کاؤنٹر پر رکھ کر پلٹ گیا۔ چھا کا بانیک لینے چلا گیا تھا اور میں اس کے انتظار میں وہیں کھڑا ہو گیا۔

اس وقت مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ بس ذہن میں یہی تھا کہ فوراً اماں کے پاس جا پہنچوں۔ سوئی نے تو انکار کر دیا تھا کہ وہ اب گاؤں نہیں آئے گی، پیر زادہ اپنے طور پر مجھے آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں بتا چکا تھا۔ میں کسی طور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پیر زادوں اور سرداروں کے درمیان سردمہری اب غصے میں بدل چکی تھی۔ اگر یہ لاوا پھٹ جاتا ہے تو انہی دو خاندانوں کا نقصان ہونا تھا۔ لیکن اگر وہ دونوں ”اندر کھاتے“ بیٹھ کر صلح کر گئے تو پھر علاقے سے لوگ جن جن کر ماریں گے۔ تب میرا مقصد پورا نہیں ہونے والا تھا۔ میں نے ملک سجاد کو چھوڑ کر اچھا کیا تھا یا برا یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن سردار اس پورے علاقے میں ”مندنے“ ہو گئے تھے ہر دماغ میں ان کے خلاف زہر بھر چکا تھا۔ یہ میری کسی حد تک کامیابی تھی۔ میں یہی جمع تفریق کر رہا تھا کہ چھا کا بانیک لے کر آ گیا۔

”چل گھر چل.....“ میں نے کہا اور اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے بانیک بڑھادی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم گھر جا پہنچے۔ صحن میں نیم کے درخت تلے چار پائی بچھا کر بیٹھ گئے۔ تبھی میں نے سوئی سے فون پر ہونے والی باتوں کے بارے میں بتا دیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

”ایسا کر چلتے ہیں لاہور اور اماں کو لے آتے ہیں۔“ چھا کے نے کہا۔

”چل پھر..... چلتے ہیں لیکن صرف ایک مسئلہ ہے ہمارے دوست کہیں یہ خیال نہ کریں کہ ہم بھاگ گئے ہیں کہیں یا اس موقع سے دشمن فائدہ نہ اٹھالے.....“ میں نے یونہی تشویش ظاہر کی تو وہ بولا۔

”دیکھ..... ملک سجاد کا کوئی بندہ اب علاقے میں نہیں ہے پیر زادوں اور سرداروں کی لڑائی میں تو ہم ویسے ہی دخل نہیں دیں گے۔ اول تو ان کی لڑائی نہیں ہوگی اگر ہوئی بھی تو ہم نے تماشہ دیکھنا ہے اور وہ دو تین دن سے پہلے نہیں ہونے والی اور اگر تجھے زیادہ ہی فکر ہے تو پھر تم چلے جاؤ میں ادھر رہتا ہوں۔“ چھا کے نے تجویز دی۔

”تو ادھر ہی رہ یہاں گھر میں..... میں نکلتا ہوں.....“ میں نے ایک دم سے اٹھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اماں کے بغیر مجھے سکون نہیں آ رہا تھا۔

”رب راکھا۔“ چھا کے نے کہا تو میں نے بانیک اٹھائی اور نکلنے لگا تب چھا کے نے میری طرف مسکرا کر دیکھا تو میں چل دیا۔

جس وقت میں قریبی قصبے میں پہنچا تب تک سورج مغربی افق کی جانب جھک گیا تھا۔ مگر دن ڈھلنے میں کافی وقت پڑا تھا۔ میں نے اپنی بانیک ایک دوست کے گھر کھڑی کی اور اس کی گاڑی لے کر لاہور کی جانب چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ میں آدھی رات سے پہلے لاہور پہنچ جاؤں گا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا جب میں لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں پہنچا گھر تلاش کرنے میں مجھے تھوڑی سی دقت تو ہوئی لیکن میں پہنچ گیا۔ میں نے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی اور نمبر کی تصدیق کر کے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اندر سے ایک چوکیدار برآمد ہوا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر واپس مڑ کر بڑا گیٹ کھول دیا پھر اشارے سے سمجھانے لگا کہ گاڑی اندر لے آؤ۔ تبھی مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ میں یہ جال نہ ہو سوئی نے مجھے پھسانے کے لیے ایک پتا تھما دیا اور میں آنکھیں بند کر کے اندر چلا جاؤں جہاں کے چوکیدار نے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کیا تھا میں نے چوکیدار سے کہا۔

”جاؤ پہلے اپنی بیگم صاحبہ کو بلا کر لاؤ۔“

چونکہ وہ گیٹ کھول چکا تھا اس لیے نہ آگے جاسکتا تھا اور نہ کھلا گیٹ چھوڑ کر اندر پلٹ سکتا تھا۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ اندر سے سوئی برآمد ہوئی۔ میں پہلی نگاہ میں اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس نے پورا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ سر پر آنچل یوں تھا جیسے سرکارف باندھا ہوا ہو۔ صرف اس کے چہرے پر کپڑا نہیں تھا وہ دھیمے دھیمے قدم بڑھاتی ہوئی آگئی۔ پھر مجھے دیکھ کر بولی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تو نہیں آئے گا ایسے حالانکہ میں نے تجھے بالکونی سے دیکھ لیا تھا، چل آ اندر۔“ میں نے دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر گاڑی اندر لانے کے لیے لپکا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھا جہاں سامنے ہی صوفے پر اماں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ پھر مجھے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تو آج رات ہی آجائے گا تو نہیں رہ سکتا میرے بغیر۔“

”اماں.....! تو مجھے یہ پتا اس کی باتوں میں آ کر تو یہاں کیوں آگئی۔ اس نے جھوٹ بولا کہ ملک سجاد کے بندے اس رات ہمارے گھر آئے ہیں..... میں نے پتا.....“

”یاد کر یہ بات میں نے تم سے کہی تھی سوئی نے نہیں۔“ اماں نے میری تصحیح کی۔

”لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔“ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”آئے تھے پتر، مگر سوئی کو وہاں دیکھ کر پلٹ گئے۔ اس لیے تو میں یہاں آگئی ہوں۔“ اماں نے تیزی سے بتایا۔

”مگر کیوں اماں کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔“ میں نے غصے میں کہا۔

”ہے..... بھروسہ ہے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تو میرا ہر طرح سے تحفظ کر سکتا ہے لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ہی وہ ذات ہوں جو تیری کمزوری ہے۔ پتر میں تجھے کہیں بھی کمزور نہیں دیکھنا چاہتی تیرے ذمے جو مقصد ہے تو وہی پورا کر.....“

اماں نے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

”لیکن اس کے پاس کیوں..... اس پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے.....“ میں نے سوئی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”یہ باتیں بیٹھ کے بھی ہو سکتی ہیں۔“

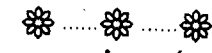
اس کے یوں کہنے پر اماں بیٹھ گئی پھر اس کے ساتھ وہ بیٹھی تو مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

”سنو جمال.....! میں نے ملے والی رات ہی اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ فیصلہ تھا کہ میں نے یہ طوائف والی زندگی ختم کر دینی ہے۔ میں لاشعوری طور پر پہلے ہی اس زندگی سے اکتائی ہوئی تھی۔ جسے بس ہلکا سا اشارہ چاہیے تھا۔ کوئی سہارا دے دے مجھے اور میں گناہوں کی اس زندگی سے چھٹکارا پا لوں۔ میں نے وہاں تمہارے پاس رہنا چاہا، لیکن تم نے مجھے نہیں رہنے دیا۔ ملک سجاد میرا بڑا عاشق بنا پھرتا ہے، لیکن تمہارے سامنے وہ کچھ بھی ثابت نہ ہوا۔ میں یہاں سے زیادہ وہاں تمہارے گاؤں میں محفوظ تھی، تم پر بوجھ نہ بنتی اپنا خود کا لیتی، مگر تو نے مجھے ذرا بھی سہارا نہیں دیا۔“

”مجھے اب تک سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو میری اماں کا اس بات سے کیا تعلق؟“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہے تعلق ہے اماں نے مجھے اخلاقی طور پر سہارا دیا، ایک جھٹکے سے میرے ذہن میں موجود گند کو نکال دیا۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ عورت ہوتی کیا ہے اب ان پر ہے، چلی جائیں گی تو میں دوبارہ طوائف کی زندگی کی طرف پلٹ جاؤں گی، مجھے

کوئی نہیں روک سکے گا، اگر اماں کو لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ.....“ سوئی نے عجیب لہجے میں کہا، جس میں غرور، محبت اور اپنے ہونے کا احساس تھا۔ وہ مجھ سے جواب مانگ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کہوں؟



سوئی کو دینے کے لیے میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اخلاقی طور پر مجھے، اس طوائف کو لازماً سہارا دینا چاہیے تھا جو ایک بہتر زندگی کی طرف آنا چاہتی تھی۔ مگر کیا یہ حقیقت تھی یا فریب، میں اسی پر سوچ رہا تھا کہ وہ ہر خند لہجے میں بولی۔

”تم ابھی اور اسی وقت اماں کو لے جاسکتے ہو میں تمہیں بالکل نہیں روکوں گی۔“

”تم صرف اور صرف مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہو طوائف رہنا یا اچھی اور عزت والی زندگی گزارنا تمہارا اپنا فیصلہ ہے، تم چاہو تو اپنی زندگی خود بنا سکتی ہو۔“ میں نے ایک کمزوری دلیل کا سہارا لیا۔ جس کے پھپھسے ہونے کا مجھے خود احساس تھا۔

”تو پھر جاؤ“ لے جاؤ، میں اپنی زندگی جیسے چاہوں گزاریوں، ملک سجاد بچ گیا تو اس کی مرضی کے مطابق اس کے اشاروں پر ناپنا چننا ہوگا، وہ نہ رہا تو کئی دوسرے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو اس کرپٹ معاشرے میں باعزت زندگی نہیں گزار سکتی۔ کون دے گا تحفظ، تم جیسا کوئی.....؟“ اس بار اس کے لہجے میں سے آگ برس رہی تھی۔ میں خاموش رہا تو کہتی چلی گئی۔

”تمہیں صرف یہی اعتراض ہے کہ اماں میرے پاس کیوں ہے، کتنا تحفظ دے سکے گی مجھے یہی نا، شاید میں تمہارے دشمنوں سے مل کر اماں کو ضمانت کے طور پر رکھے ہوئے ہوں۔ اگر تو ایسا سوچ رہا ہے تو پھر ایسا کر، مجھے لے چل اپنے پاس، مجھے رکھ لے ضمانت کے طور پر اپنے پاس، اگر کہیں بھی کوئی گستاخی کروں، تمہیں شک بھی ہو جائے کہ میں تجھے نقصان پہنچاؤں گی تو بے شک مجھے مار دینا، تم سے پھر حساب لینے والا بھی کوئی نہیں ہوگا، بولو تم کیا فیصلہ کرتے ہو، اماں کو یہاں رہنے دیتے ہو یا مجھے اپنے ساتھ لے جاتے ہو، بولو.....؟“

”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا سوئی میں تجھے کیوں رکھوں، میرا تم سے کیا لینا دینا۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ایسے نہ کہو جمال.....! میں نے تجھے اپنا سب کچھ مان لیا ہے، میں ڈرتی ہوں اس وقت سے جس میں کوئی نقصان نہ ہو جائے۔“ اس نے بھی دھیسے لہجے میں کہا، تب میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے باتوں کے جال میں پھنسا سکتی ہے، خواہ خواہ کے خلوص اور ہمدردی کے لبادے میں میری سب سے بڑی کمزوری اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے، لہذا میں نے تمام تر باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اماں سے کہا۔

”اماں.....! چلو تمہیں یہاں نہیں رہنا، ہم چلیں۔“

”پتر.....! میں تیرے کہنے پر یہاں سے چلی جاتی ہوں، لیکن سوئی کو بھی ساتھ لے چل۔ یہ بات میں تجھ سے کہہ رہی ہوں۔“

”اماں.....! تیرا حکم سر آ نکھوں پر، تو جیسا چاہے گی، دیا ہی ہوگا، کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جانے پر کیوں بضد ہو؟“ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”یہ میں تمہیں وقت آنے پر بتا دوں گی، یہ ایک راز ہے، ویسا ہی راز جو تیرے اور میرے سینے میں دفن ہے، اور جس کی آگ نے ہم دونوں کو بے چین کر رکھا ہے۔“ ماں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں بری طرح چومک گیا۔ میں نے پھر مزید بات نہیں کی، میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سو میں خاموش ہو گیا۔

”اماں.....! یہ اس وقت تک شک شبے میں رہے گا، جب تک اسے بتانہ دیا، یہ آپ کا حکم تو مانے گا، لیکن یقیناً نہیں کرے گا، بتا دیں اسے..... اس طرح یہ بھی جان جائے کہ میں طوائف زادی نہیں ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رو دی۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ کیسا راز ہے، یہ بھی اماں نے کہا۔

”تو سن لے پتر.....! یہ سوئی، سردار شاہ دین کی بیٹی ہے۔“ دھیرے سے کہے گئے لفظوں میں اماں نے گویا دھماکہ کر دیا۔ شاید میں اس دھماکے سے اتنا نہ لرزتا، جس سے جسم کٹ پھٹ جاتا ہے، میں حیرت سے سوئی کو دیکھ رہا تھا، وہ جس کا تعارف طوائفوں کے ٹولے میں ہوا تھا، وہ سردار شاہ دین کی بیٹی کیسے ہو سکتی ہے؟ اماں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ تب وہ کہتی چلی گئیں۔ ”یہ کوئی نئی یا انہونی بات نہیں ہے پتر، سردار شاہ دین جیسے جاگیردار، دولت مند عیاش، جنہوں نے جسم خریدنے کو اپنی عزت بنایا ہوا ہے، سوئی بھی اس کا نتیجہ ہے۔“

”اس کا یقین کیسے کر لیں؟“ میں نے کہا تو سوئی تیزی سے بولی۔

”بیٹی تو.....! بیٹی تو میں چاہتی ہوں کہ یقین ہو جائے، مجھے تو پورا پورا یقین ہے اور میرے پاس اس کے ثبوت بھی ہیں۔ وہ نہ صرف میں تمہیں دکھاتی ہوں، بلکہ بتاتی بھی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ میں اور اماں خاموش وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا اور بہت کچھ پوچھنا بھی چاہ رہا تھا۔ اماں کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی۔ اس کے انداز میں تیزی تھی۔ وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چند تصویریں تھیں۔ اس نے ایک تصویر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھو..... اس تصویر میں، میری ماں ہے اور سردار شاہ دین، یہ مری کی تصویر ہے اور باقی میں دیکھو..... یہ انہی دنوں کی یادگار ہیں، جن دنوں میرا اس دنیا میں آنا لکھا گیا۔“ میں نے وہ ساری تصویریں دیکھیں اور اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

”مان لیا کہ اس کے تمہاری ماں کے ساتھ اچھے دن گزرے ہوں گے، مگر تم.....؟“

اس پر وہ ذرا سا مسکرائی اور بولی۔

”دس پندرہ سال پہلے تم یہ سوال کرتے تو شاید میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا، لیکن آج اس کا ثبوت تو مل سکتا ہے ڈی این اے ٹیسٹ، جب چاہیں کروالیں.....“ اس نے کہا تو میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ ابھی میں نے پوچھا۔

”کیا سردار..... ٹیسٹ کروانے پر راضی ہو جائے گا۔“

”کبھی بھی نہیں..... سنو میں تمہیں بتاتی ہوں.....“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے سانس لینے کو رک کر پھر کہتی چلی گئی۔ ”یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میری ماں نے مجھے ملک سجاد کو بیچ دینا چاہا، ہر طوائف کی طرح وہ بھی میرے دام کھرے کرنا چاہتی تھی۔ میں ایسا ہی سمجھتی رہی، اور شاید میں ہنسی خوشی ملک سجاد کے ساتھ چلی جاتی، اس کی رکھیل بن کر، لیکن میری ماں کچھ اور ہی چاہتی تھی، وہ سردار سے انتقام لینا چاہتی تھی۔“

”کیوں.....؟“ میں نے پوچھا۔

”طوائف بھی ایک عورت ہوتی ہے۔ عورت اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہے، جسے چاہتی ہے، اس پر اپنا آپ بھٹا کر دیتی ہے، لیکن اپنی ہنک برداشت نہیں کر سکتی، سردار نے میری ماں کو بہت سبز باغ دکھائے، دولت بھی لٹائی، لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی ہے تو سردار نے بری طرح دھکا کر دیا۔ پہلی بار اسے طوائف ہونے کا طعنہ دیا، پھر اسے چھوڑ کر اپنی دنیا میں گن ہو گیا۔“ اس نے بے حد جذباتی انداز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”تم اپنی ماں کے انتقام کے بارے میں بتا رہی تھیں۔“

”وہی تو..... میری ماں نے مجھے جب ملک سجاد کے ہاتھ بیچ دینا چاہا تو ساتھ میں اسے بتا دیا کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔“ اس نے اسی لہجے میں کہا۔

”یہ بتانے کی وجہ.....؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”وہ چاہتی تھی کہ ملک سجاد مجھے صرف رکھ لے نہ رکھے بلکہ اپنی بیوی بنالے اس کے دو فائدے تھے ایک تو اسے مضبوط سہارا مل جاتا ملک سجاد کی صورت میں جب میں ان کے خاندان کی بہو بن جاتی تو وہ سردار شاہ دین کو بتاتی میری ماں کو خوف بھی تھا کہ اگر یہ راز پہلے ہی کھل گیا تو ممکن ہے سردار ہمیں مروادے۔“ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”تو پھر ایسا کیوں نہیں ہوا جو تمہاری ماں چاہتی تھی؟“

”ملک سجاد کی نیت مجھے بیوی بنانے کی نہیں تھی اسے یہ شک تھا کہ میری ماں صرف میرا ریٹ بڑھانے کے لیے ایسی بات کر رہی ہے وہ میری ماں کو رقم دے کر مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس دوران نہ صرف مجھے اپنی ماں کی اصل نیت کا پتہ چلا بلکہ ملک سجاد کی نیت کا بھی تب میری زندگی ہی بدل گئی میں نے خود اپنی پہچان حاصل کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ مجھے میلے میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میں چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح شاہ زیب مجھے حویلی تک رسائی دے دے ایک بار سردار شاہ دین کا سامنا ہو جائے۔“

”وہ تو تم اب بھی جاسکتی ہو سیدھے اس کی حویلی میں چلی جاؤ اس کی بیٹی ہونے کا دعویٰ کر دو۔“ میں نے کہا۔

”میں حویلی میں چلی جاؤں پھر واپس آ جاؤں گی.....؟ بولو.....“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”سینوں میں دبا ہوا راز منی میں دفن ہو جاتا۔“

”تو پھر تم چاہتی کیا ہو؟“ میں نے زچ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں اپنی ماں کو چھوڑ چکی ہوں ملک سجاد کچھ عرصہ اس قابل نہیں ہے کہ مجھ تک رسائی حاصل کر لے ممکن ہے وہ زندہ ہی نہ رہے میں سردار شاہ دین کی بیٹی بن کر اس کی حویلی میں رہنا نہیں چاہتی اور نہ ہی مجھے اس کی جائیداد کا لالچ ہے میں اسے مجبور کرنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے پوری دنیا کے سامنے اپنی بیٹی تسلیم کر لے..... میں اسی لیے گاؤں میں رہنا چاہتی ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے جمال کہ تو مجھے مل گیا میں تیری مضبوط بانہوں کے حصار میں رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے یہ کہہ کر اس طرح سانس لیا جیسے بہت بڑا بوجھ خود پر سے اتار دیا ہو۔ میں اس کی باتوں پر چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک دم اس سے کہا۔

”چلو.....! میرے ساتھ نورنگر چلتے ہیں لیکن یہ یاد رکھو اگر تم نے غلط.....“

”سب یاد ہے۔“ اس نے ایک دم سے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر بڑی ادا سے پوچھا۔ ”چلو؟“

”چلو.....! میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

”اب ایسے تو نہ کرو جمال کچھ کھاؤ پیو ڈرا دیر بیٹھو ابھی چلتے ہیں۔“ سونی نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو میں نے ماں کی طرف دیکھا وہ مسکرا دی تھی۔



اس وقت سورج ڈوب چکا تھا جب جمیندر کی ای میل آ گئی تھی اور جہاں اسے پڑھ کر سوچ رہا تھا کہ اس کا اسی گھر میں رہنا ہی ٹھیک ہے۔ اس وقت اوگی پنڈ میں انتہائی سخت سیکورٹی تھی۔ بہت ساری وی آئی پی شخصیات آخری رسومات میں شریک ہو کر واپس جا رہی تھیں۔ نہ صرف گوردی پولیس وہاں تعینات تھی بلکہ جالندھر سے بھاری نفری منگوائی ہوئی تھی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہاں پر دوسری خفیہ ایجنسیوں کے لوگ نہ ہوں کچھ دن قبل ہی اس نے ایجنسیوں کے دو

لوگ مارے تھے۔ جنہیں کمیشن کا حصہ بنایا گیا تھا۔ پھر ہر دیپ سنگھ کا قتل کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی۔ شک بھری نگاہیں اس پر تن گئی تھیں اس کے اندر کی نفرت تو اسے مجبور کر رہی تھی کہ جان جاتی ہے تو جائے رویندر سنگھ اپنے پر یوار کے ساتھ موجود ہے تو اسے ختم کر دینا چاہیے۔ وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھا۔ ہر پریت نے اس کے ذہن کو دوسری جانب لگانے کی بہت کوشش کی تھی اور اب وہ رات کا کھانا لگوانے کے لیے نیچے چلی گئی تھی۔ اس دوران اس نے میل دیکھی تو جمیندر سنگھ نے اسے کسی بھی طرح کے عمل سے منع کر دیا تھا اور اسے گھر تک محدود رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس نے وجہ صرف یہی بتائی تھی کہ سیکورٹی بہت سخت ہے وہ سوچتا چلا جا رہا تھا اور اسے اکٹھا ہونے لگی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر نیچے جانے کے لیے پرتولنے لگا۔

اس وقت وہ کمرے سے نکلنے لگا تھا کہ رن ویر سنگھ کا فون آ گیا۔ اسے پوری اُمید تھی کہ وہ اسے فون لازمی کرے گا اور اس نے کر دیا شاید وہ لاشعوری طور پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”ہیلو! انسپکٹر رن ویر سنگھ بولیں.....“ تھا نے حاضری لگوانے کے لیے آؤں یا پھر آپ تشریف لائیں گے۔“ اس کے لہجے میں شدید طنز تھا جیسے وہ اسے غصہ دلانے کی کوشش کر رہا ہو حالانکہ ایسا ہی کچھ دیر پہلے رن ویر سنگھ کر چکا تھا ذرا ہی دیر میں دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں گیٹ کھلاؤ تاکہ میں اندر آؤں۔“

”ابھی آیا.....“ اس نے کہا اور فون بند کر کے ہر پریت کو کال ملا دی پھر اسے رن ویر سنگھ کے آنے کے بارے میں بتا کر کہا کہ وہ اسے اندر بلوائے اس دوران وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے چلا گیا۔ اس نے دیکھا بنٹا سنگھ اندر کی جانب آ رہا تھا وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر خود ہی ڈرائنگ روم سے نکلتا چلا گیا اور کارڈ ویر میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر تک بنٹا لکھ اس کے قریب آ گیا تھا۔

”وہ جی باہر کوئی انسپکٹر رن ویر سنگھ آیا ہے۔“

”اسے اندر لے آؤ۔ اور ہاں اس کے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟“ جہاں نے بنٹا سنگھ سے پوچھا۔

”اکیلا ہی ہے جی اپنی جیب میں۔“

”بلاؤ اسے.....“ جہاں نے کہا اور واپس اندر کی طرف چلا گیا۔ وہ جس وقت صوفے پر جا کر بیٹھا تب تک ۸ پریت کے ساتھ انوجیت بھی آ گیا۔ وہ دونوں باہر سے آتے ہوئے انسپکٹر کو دیکھ رہے تھے جو بڑے اعتماد سے اندر کی طرف آ رہا تھا چند لمحوں بعد وہ آ گیا اس نے انوجیت سے ہاتھ ملایا اور ست سری اکال کہہ کر جہاں کی جانب بڑھا اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی۔

”آئیں بیٹھیں۔“ انوجیت نے کہا تو وہ پرسکون انداز میں بیٹھ گیا تو ہر پریت نے پوچھا۔

”چائے کافی یا لسی..... کیا پیئیں گے آپ..... ویسے تو ڈنر کا ٹائم بھی ہے۔“

”ایک کپ چائے..... اگر فوراً مل جائے تو..... میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ کیونکہ آپ کو ڈنر بھی کرنا ہے۔“

اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ہر پریت اندر کی جانب چلی گئی۔ تبھی جہاں نے کہا۔

”جی رن ویر سنگھ جی فرمائیں۔“

”جہاں.....!“ اس نے ایک دم سے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”تمہاری یہاں آمد کے ساتھ ہی قتل کا ایک سلسلہ

شروع ہو گیا پہلے انسپکٹر قتل ہوا جس کی جگہ میں یہاں آیا ہوں پھر اس کمیشن کے دو بندے جو اس قتل کی تحقیقات پر تھے اور اب

۴۴ سنگھ کا بیٹا ہر دیپ سنگھ..... ان سب کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق جڑا ہوا ہے۔“

”آپ کی بات درست ہے جہاں تک بلجیت کی بات ہے میں نے اس واقعہ کا نوٹس لیا ہے پھر آپ کی جیب پر فائرنگ والا واقعہ میں ان سب کو ملا کر دیکھ رہا ہوں، لیکن آپ ایک احتیاط نہیں کر رہے ہیں، اوگی سے باہر جاتے ہوئے آپ بتا کر نہیں جاتے۔“

”دیکھیں.....! میں ابھی بھارت سرکار کے مطابق غیر ملکی ہوں، میں یہاں کی شہریت ثابت کرنا چاہتا ہوں، مجھے ہر وقت کا پابند نہ کریں کہ میں آپ کو بتا کر جاؤں، مجھے پتہ نہیں کب کہاں اور کس سے ملنے کے لیے جانا ہوتا ہے۔“ جہاں نے کہا۔

”لیکن آپ کو بھارتی قانون کی پاسداری تو کرنا ہوگی، آپ چاہے غیر ملکی ہوں یا اس ملک کے شہری کی حیثیت سے رہیں۔“ رن ویر نے جھل سے کہا تو جہاں نے بھی آرام سے کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے، میں بتا دیا کروں گا، لیکن اگر کل تک آپ لوگوں نے بلجیت اور میری جیب والے معاملے پر کوئی فائل جواب نہ دیا تو میں اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر لوں گا، یہ تو میرا حق ہے نا..... اور اس کے لیے مجھے دہلی جانا پڑے گا۔“

”یہ آپ کا حق ہے، دیکھیں میں مانتا ہوں آپ کی طرف شک کی انگلی کی جارہی ہے، مگر کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ ملوث کیا جا رہا ہو اور یہ بھی ہے کہ آپ ہی نے یہ جرم کئے ہوں، کوئی بھی صورت حال ہو سکتی ہے، میں آپ کو بہترین مشورہ یہی دوں گا کہ آپ جو شک کے دائرے میں آچکے ہیں، تعاون کر کے اس دائرے کو ختم کر لیں، تو زیادہ بہتر ہے اور آپ کے لیے اچھا موقع بھی۔“

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے آپ جیسے لوگوں پر یقین نہیں، کیونکہ آپ مجھے ابھی یہاں سے لے جا کر تھانے میں بند کر سکتے ہیں، اور کوئی بھی فرد جرم لگا کر مجھے سزا دلوا سکتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو اس سے پہلے رن ویر کچھ بولتا، جوتی چاہئے لے کر آگئی، تب رن ویر سنگھ نے انوجیت کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اصل میں جہاں سنگھ جی کو پنجاب پولیس پر اعتماد نہیں، ضروری نہیں کہ سب ایک جیسے ہوں..... انہیں تعاون کرنے کے لیے کہیں۔“

”میں تعاون کے لیے ہر وقت تیار ہوں، لیکن یہ اوگی پنڈ، یہ پنجاب میرے لیے آپ جیل تو نہ بنا دیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ ثابت کریں میں اپنا دفاع کر لوں گا، میں آپ پر اعتماد کیسے کروں، بلجیت سنگھ مجھے دھمکیاں دے کر گیا، اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر دیا، اس کا آپ نے کیا کیا؟ اس لیے کہ وہ اب بھی اس پنڈ کا سر بیچ رہے ہیں، اس کا کچھ نہیں کر سکتے، کل کسی نے اس کو مار دیا تو کیا وہ میرے سر پر نہ جائے گا، ویسے آپ کی باتوں سے مجھے یہ احساس ہو گیا ہے کہ مجھے اپنے سفارت خانے کو آگاہ کر دینا چاہیے۔ اور کچھ دوسرے قانونی معاملات بھی.....“

”بہر حال ہر بندے کو اپنے تحفظ کا حق حاصل ہے، مگر ہم نے بھی قانون نافذ کرنا ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ کی طرف کوئی انگلی اٹھاتا بھی ہے تو آپ کا دامن صاف ہونا چاہیے۔“

”وہ تو ہے، اور اگر کوئی الزام لگائے گا، تو میں اس کا دفاع کروں گا، یہ میرا حق ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کوئی الزام بھی نہیں لگاتا اور شک میں رکھ کر مجھے ذہنی اذیت دی جا رہی ہے، جہاں نے جھل سے کہا تو رن ویر سنگھ نے چائے کا ایک لمبا سپ لیا اور وارننگ دینے والے انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے مسٹر جہاں! میں آپ کو بتا دوں کہ آپ پر میری نگاہ ہوگی، اور میں بلجیت سنگھ کے معاملے میں بھی پوری تفتیش کروں گا، جو ٹھیک ہوگا، وہ کروں گا، بس آپ سے تعاون چاہتا ہوں۔“

”کیسے.....؟“ جہاں نے پوچھا۔

”بظاہر ہر دیپ سنگھ کا قتل اس سے جڑا ہوا دکھائی نہیں دیتا، لیکن اس کمیشن میں رویندر سنگھ بھی تو شامل تھا۔“ وہ پرسکون انداز میں بولا۔

”اچھا تو پھر.....؟“ جہاں نے اُکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ بولا۔

”دوسری طرف اچانک ہی تمہارے ساتھ کچھ واقعات کا پیش آنا اور خصوصی طور پر رویندر سنگھ کے پتر..... بلجیت سنگھ سے تمہاری لڑائی۔“

”آپ اس سے ثابت یہ کرنا چاہ رہے ہیں کہ وہ سارے قتل میں نے کیے ہیں۔ میں ان کا الزام اپنے سر لے لوں اور آپ کے ساتھ جا کر جرم قبول کر کے پھانسی چڑھ جاؤں، آپ یہ چاہتے ہیں؟“ جہاں سنگھ نے ایک دم سے انتہائی غصے میں کہا تو رن ویر سنگھ نے بڑے سکون سے اس کی طرف دیکھا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”میں نے سنا ہے کہ تمہارے خاندان کی پہلے سے رویندر سنگھ خاندان سے چپقلش چل رہی ہے۔“

یہ سن کر جہاں نے ایک دم سے تہقہہ لگایا، پھر کچھ لمحے ہنسنے کے بعد بولا۔

”مجھے یہ بتاؤ، رویندر سنگھ جی..... میں تمہیں بے وقوف لگتا ہوں یا تم اتنے احمق ہو، پھر تم نے کوئی بھاری رشوت لے رکھی ہے، مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تجھے پولیس آفیسر بنایا کس نے.....؟ وقت اور سرمایہ ہی برباد کیا ہے.....“

آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں انتہائی درجے کا طنز تھا۔ جس پر رویندر سنگھ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں.....؟“

”اور ب کے بندے..... بلجیت سنگھ کا جب پہلی بار میرے ساتھ آنا سامنا ہوا تو کیا میں اس کے پاس گیا تھا یا وہ تڑی لگانے کے لیے میرے پاس آیا تھا۔ اس کی تفتیش کر لیتے تو معاملہ تجھ پر کھل جاتا کہ کون کیا کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر میرے آنے سے تو بھارت میں اور بہت سارے واقعات ہو چکے ہیں، ان دنوں شاید تم انسپٹر بن رہے ہو، جب پاکستانی ایٹمی دھماکہ ہوا ہے، کیا وہ واقعہ میں آپ پر ڈال دوں۔“

”میں خاندانی دشمنی کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا اور دراصل اس کا یہی پوائنٹ تھا۔

”ہاں.....! یہ بات کرو۔“ جہاں نے پرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو انسپکٹر..... اس وقت میں صرف ایک سال کا ہوگا، یا کم جب یہ واقعات ہوئے، تم بھی جانتے ہو کہ اندرا حکومت نے سکھوں کے ساتھ کیا کیا، پھر اس کے قتل کے بعد اس کے پتر راجیو گاندھی نے کیا کچھ نہیں کیا، نسل کشی کی سکھوں کی..... یہ میرے ہوش سے پہلے کے واقعات ہیں، جو میں نے فقط سنے ہیں، اس میں کیا سچائی ہے ابھی مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا تھا اصل میں، میں بھی صرف اپنی جائیداد حاصل کرنے کی فکر میں ہوں۔ وہ مجھے مل جائے تو پھر یہ دیکھا جائے گا، میں یہاں رہتا ہوں، یا نہیں رہتا ہوں، دشمنی کرتا ہوں یا نہیں کرتا ہوں۔“

”مطلب آپ کے ذہن میں دشمنی ہے۔“ رویندر مسکرایا۔

”ہاں ہے.....! کیوں نہیں ہوگی، آپ کے ماں باپ کو زندہ جلادیا جائے تو آپ کے کیا محسوسات ہوں گے؟ میں نے صرف سنا ہے، بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کو یا بڑوں کو زندہ جلادیا گیا، اور تمہارے جیسے بزدل اور رشوت خور قسم کے پولیس والے یہ تماشا دیکھتے رہے، اور حکومت وہ ہے جو آج تک ان لوگوں کو انصاف نہیں دے سکی، کیا ان حقائق کو تم لوگ تسلیم کرتے ہو؟ کیا ان کے ذہنوں سے دشمنی نکال پاؤ گے.....؟“

”آپ نگاہ رکھیں یا نہیں میں کوئی جرم نہیں کر رہا ہوں میں دیکھتا ہوں آپ کی تفتیش کہاں تک جاتی ہے۔ بہر حال! آپ جو چاہیں گے میں آپ سے تعاون کروں گا۔“ جہاں نے یوں کہا جیسے وہ مزید بات نہ کرنا چاہتا ہو رن ویر سنگھ چپ چاپ چائے پینے کی طرف متوجہ رہا جیسے ہی اس نے آخری گھونٹ حلق میں اتارا تو کپ رکھ کر کھڑا ہو گیا پھر سب کی طرف ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”بس..... میں چلتا ہوں جی اب۔“

اس پر کسی نے کچھ نہیں کہا اس نے سب کی طرف دیکھا اور باہر کی طرف لٹکتا چلا گیا کچھ دیر بعد وہ گیٹ سے پار گیا تو سبھی بیٹھ گئے۔ تب انوجیت نے کہا۔

”کوئی تبصرہ نہیں ہوگا ہر پریت جاؤ بے بے کولاؤ اور جوتی سے کھونڈ کے لیے۔“

”اوکے.....!“ وہ یوں سر ہلاتے ہوئے بولی جیسے اس کی بات سمجھ گئی ہو۔

ڈنر کے بعد انوجیت باہر نکل گیا جبکہ ہر پریت اور جہاں کافی دیر تک بے بے کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ جب اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو جہاں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ رن ویر سنگھ کے ایک ایک لفظ کو سوچ رہا تھا اسے یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ صرف دھمکانے کے لیے آیا ہے۔ یا پھر..... یہ احساس دلانے کہ اس کی ہر وقت ان پر نگاہ ہے ایسا کر کے وہ فقط نفسیاتی دباؤ دینا چاہ رہا تھا یہ تو حقیقت تھی کہ ان کے پاس کوئی ثبوت کیا ایسا کوئی سراغ بھی نہیں تھا جس کا سراپکڑ وہ اس تک پہنچ جاتے اگر ایسا ہوتا تو اب تک وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں بلکہ کسی خفیہ ایجنسی کے عقوبت خانے میں پڑا اپنے زخم چاٹ رہا ہوتا۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا دھیمی دھیمی روشنی تھی کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا آ رہی تھی کمرے کا ماحول خاصا خوشگوار تھا مگر یہ ساری خوشگواریت رن ویر سنگھ کی باتوں میں تحلیل ہو کر پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ اگرچہ یہاں آتے ہی چند دنوں میں اس نے جو کامیابی حاصل کر لی تھی یہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں تھا جو وہ سوچ کر آتا تھا رن ویر سنگھ کے خاندان کو ختم کرنا اس کا اولین مقصد تھا لیکن ہر دیپ سنگھ کو مار لینے کے بعد اس کے خلاف دائرہ بہت تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ رن ویر سنگھ کی باتوں سے چنگلی چھلکتی تھی اسے یونہی اس خطرناک اور حساس علاقے میں تعینات نہیں کیا گیا تھا اگر ویکٹور میں جمیندر سنگھ کا اسے سہارا نہ ہوتا تو شاید وہ اس قدر کامیابی حاصل نہ کر پاتا وہ جس بین الاقوامی ریکٹ سے تعلق رکھتا تھا اس کی تو خود اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ بس یہی تھا کہ وہ اس کا بہت اچھا دوست تھا جس کی جڑیں بھارتی پنجاب میں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ تب اچانک اسے خیال آیا کہ جمیندر نے جن بندوں کو اس کی مدد کرنے کے لیے کہا اور انہوں نے مدد بھی دی اگر ان میں سے کوئی پکڑا جاتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کا کمزور ترین پہلو یہی تھا۔ ”کہا ان لوگوں کو میرے بارے میں معلوم ہوگا یا نہیں؟“ یہ سوال ہی خنپال کو پریشان کر دینے والا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں کھو ہوا تھا کہ اسے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دروازے کی جانب دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے ہر پریت کھڑی تھی لیکن لگتا تھا کہ وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہے۔ اس نے نہیں ساہلے سبز رنگ کا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ جس سے اس کا گورا بدن چمک رہا تھا کھلے گیسو جس میں دائیں جانب سفید کلیوں کی ایک لڑی اس کی گردن پر کھیل رہی تھی وہ غماز آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک لمحے کے لیے چکر اکر رہ گیا۔ ہر پریت کا یہ نیا روپ اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ اس لیے وہ تجسس آمیز لہجے میں بولا۔

”ہر پریت خیریت تو ہے نا تم یوں.....“

یہ سنتے ہی وہ ایک دم سے ٹھنک گئی پھر چند لمحے ساکت رہنے کے بعد سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”واہ جی واہ سارے رومانٹک موڈ کا ستیاناس مار دیا ہے یہ بات کر کے۔“
”اوہ تو تم رومانٹک موڈ میں تھی اور یہ رومانٹک موڈ میں تم بھوتی بن جاتی ہو؟“ یہ کہتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا اس پر ہر پریت بہ مشکل اپنی ہنسی روکتی ہوئی اس کے پاس بیڈ پر آ لینی اور پھر ہنستے ہوئے مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔

”اس وقت تم بھی تو کسی گھوسٹ سے کم دکھائی نہیں دے رہے ہو منہ دیکھا ہے اپنا۔“

”کیا ہو امیرے منہ کو.....“ اس نے حیرت سے پوچھا تو سنجیدگی سے بولی۔

”یار تم نے اس رن ویر سنگھ کو کچھ زیادہ ہی سر پر سوار کر لیا ہے وہ کچھ نہیں ہے یاد رکھو۔ یہاں جرم وہی ہوتا ہے وہ ثابت ہو جائے ورنہ کوئی مجرم یہاں مجرم نہیں ہے۔“

”بات یہ نہیں ہے پریتی..... میں صرف اور صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اب جتنا وقت زیادہ ہوتا جائے گا رن ویر سنگھ کے خاندان کو مارنے میں اتنی مشکل ہو جائے گی تمہارا کیا خیال ہے خفیہ ادارے یہاں سرگرم نہیں ہو گئے ہوں گے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”یار.....! چھوڑ ان باتوں کو ان کا کام ہے انہوں نے تو کرنا ہے ہمارا جو کام ہے وہ ہم نے کرنا ہے نہ ہم انہیں روک سکتے ہیں اور نہ وہ ہمیں روک سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے کو ختم نہ کر لیں۔“ ہر پریت کے لہجے سے عزم جھلک رہا تھا۔ اس پر جہاں چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر ایک دم سے مسکراتے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”پراس سارے معاملے میں تمہارا اس طرح بھوتی بن کر آنے سے کیا تعلق.....؟“

”میں نے سوچا تم ذرا سے اچھے ہوئے ہو پریشان ہو میں ذرا جا کر تبدیلی لاتی ہوں توڑی محبت بھری باتیں کریں گے اور..... اور کچھ اچھا وقت گزریں گے سب کچھ بھول کر.....“ اس نے اپنے لہجے کو غماز آلود بناتے ہوئے کہا تو ہال ہنستے ہوئے بولا۔

”تم اداکاری بہت اچھی کر لیتی ہو کبھی فلم انڈسٹری میں کوشش کی؟“

”اوئے یار! کیا پوچھتے ہو تم نے تو ہماری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا میں نے سوچا ہوا ہے میں اگر فلم بنانے کی تو اپنی فلم ضرور بناؤں گی چاہے اس کے لیے مجھے جتنا بھی سرمایہ خرچ کرنا پڑے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے کہا تو جہاں بولا۔

”چل اٹھ اور جا کر کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آ پھر گپ شپ کرتے ہیں ممکن ہے پھوپھو یا انوجیت ادھر آئے اور.....“

”وہ دونوں گھر پر نہیں ہیں صرف جوتی ہے اور وہ کچن میں مصروف ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”وہ گھر پر نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم بھوتی بن کر آ جاؤ۔“ جہاں نے کہا تو وہ تیزی سے اٹھ کر ہنستے ہوئے باہر چلی گئی۔ وہ چند لمحے یونہی ساکت بیٹھا رہا اس نے محسوس کیا کہ ہر پریت کے یوں آنے سے غبار چھٹ گیا ہے ہال نے پھر سے لیپ ٹاپ کھول لیا۔ لیکن جمیندر ابھی تک آن لائن نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کوئی میل آئی تھی وہ پرسکون لپ ٹاپ اسکرین میں کھو گیا۔ اس کے ذہن میں اب دور دور تک رن ویر سنگھ کے بارے میں سوچ نہیں تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہر پریت آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی۔ جس میں چائے کے دو

اھرے ہوئے تھے۔ جہاں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور ایک طرف رکھ کر چائے کا گک تھام لیا۔ اس بار اس نے کاسی رنگ

کی شلوار اور سلولیس قمیص پہنی ہوئی تھی۔

”چھت پر چلتے ہو یا ہمیں رومانس چلے گا۔“ اس نے پوچھا۔

”پریتی..... تو مجھے ایک بات بتا، یہ تو نے رومانس کس شے کا نام رکھا ہوا ہے؟“

”سچ بتاؤں۔“ اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ پر جوش انداز میں کہا۔

”ہاں سچ ہی بتاؤ، جھوٹ کیوں؟“

”تو پھر سنو.....!“ یہ کہہ کر اس نے بیڈ پر آلتی پالتی ماری چائے کاگ سامنے رکھا اور بولی۔ ”انتہائی فضول گفتگو

اور مضحکہ خیز حرکات کو میں رومانس کرنا کہتی ہوں۔“

”واہ..... کیا خیالات ہیں۔“ جہاں نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ جس پر ہر پریت نے اسے پر شوق نگاہوں

سے دیکھا اور خوش ہو گئی وہ جو چاہتی تھی وہ اس نے پالیا تھا۔ پھر چند لمبے بعد بولی۔

”واہ گرو کی مہر ہے ہم لوگوں پر جو تھوڑا بہت شعور دے دیا ہے ورنہ ہم بھی عام لوگوں کی طرح یا تو نشہ کر رہے

ہوتے یا پھر گمانے بجانے والوں میں شامل ہو جاتے۔ جی! ہم لوگ نہیں بنے اس پیار کے کھیل کے لیے محبت ہم لوگوں کو

راس نہیں وہ محبت جس میں دل دے دیا جاتا ہے ہمیں تو ایک مقصد کے لیے جینا ہے اور اس مقصد کے لیے مرجانا ہے ہاں

وہ سو ہنار بجانے کیا کرتا ہے۔“

”یار! تم تو سیریس ہی ہو گئی ہو۔“ جہاں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے میرے خیالات پوچھے ہیں نا تو سچ بتا رہی ہوں۔ میرے لیے یہ جسم اور اس جسم کی لذتیں کچھ بھی

حیثیت نہیں رکھتیں یہ ایک اضافی شے ہے جس کا میرے مقصد سے کوئی لینا دینا نہیں ہاں انہیں میں اپنے مقصد کے لیے

استعمال ضرور کر سکتی ہوں۔ جس کی ابھی تک مجھے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ مجھے میرے دھرم اور ورثے کی پوری

پہچان ہے کیا تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ میرے ویرانہ جیت نے کبھی بھی مجھے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا، میں تمہارے

ساتھ تنہا ہوتی ہوں ایک بیڈ پر تمہارے ساتھ سوتی ہوں کیا تم نے مجھے جذبات کے معاملے میں کوئی عام سی لڑکی پایا ہے؟“

وہ پورے جوش سے کہتی چلی گئی تھی۔

”پریتی.....! تو پہلی لڑکی ہے جو میرے اتنے قریب آئی ہے یہ محض دل پھینک عاشق کا ڈائلاگ نہیں اور نہ میں

تمہارے سامنے جھوٹ بول رہا ہوں، وینکوور میں کسی بھی لڑکی کا حصول عام سی بات ہے گرل فرینڈ رکھنا تو ایک پالتو جانور

سے زیادہ سستا ہے میں نہیں جانتا کہ تیرا اور میرا ساتھ کب تک رہے گا، لیکن اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ جتنا وقت بھی گزرے

اچھا گزرے۔“

”واہ گرد بہت بھلی کرے گا تو فکر نہ کر اور یہ جو تیری سوچ ہے نا کہ جلدی جلدی سب کو ختم کر دوں مجھے اس

اختلاف ہے دشمن کو وقت دو جی جتنا دے سکتے ہو اس پر اعتبار نہ کر ڈالے زخم لگا دو اور پھر دیکھو کہ وہ کس اذیت میں

ہے کتا اور بندر اپنے زخم سے خود مر جاتا ہے۔ رویندر سنگھ کو زخم لگا دیا ہے وہ اب سکون سے نہیں بیٹھے گا، اور میں

بتا دوں اب بلجیت سنگھ بھی تمہارے سامنے نہیں آئے گا، کیونکہ انہیں یقین ہے کہ یہ سب کچھ تم نے کیا ہے کیسے کیا ہے؟

انہیں سمجھ نہیں آ رہی ہے۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہی انہیں سمجھ آئی چاہیے یا نہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”نہیں نا چتے رہیں وہ جب تک انہیں سمجھ آئے گی ہم بہت کچھ کر چکے ہوں گے۔“ ہر پریت نے کہا۔

جہاں کا فون بج اٹھا وہ جیسید رکی کال تھی اس نے جلدی سے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ

لمحات میں جبکہ وہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا، میں تیزی سے اٹھا اور جوتے پہن لیے۔ فخر و آرام سے جوتے پہن کر چند قدم چلا ہی تھا کہ میں اس کے برابر جا کر بولا۔

”فخر.....! سردار شاہ دین تو گھر میں ہے تو نے وہاں جھوٹ کیوں بولا۔“

میرے یوں کہنے پر اس نے طنزیہ انداز میں مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

”مجھے زیادہ پتہ ہے یا مجھے جو میں ہر وقت حویلی میں رہتا ہوں۔“

”حویلی میں رہنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم جھوٹ ہی نہ بولو، خیر.....! ایک بات تو بتاؤ فخر؟“

”بولو.....“ اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جوانی میں سردار نے خوب دولت لٹائی ہوگی، طوائفوں کے پاس بھی جاتا ہوگا۔“

”سردار صاحب نے دولت لٹائی یا طوائفوں کے پاس گیا، تمہیں اس سے کیا لینا دینا؟“ اس نے بغور میری

طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

”بہت کچھ لینا دینا ہے فخر، بہت کچھ..... اتنا کچھ کہ تم اور تیرے سردار تصور بھی نہیں کر سکتے، خیر.....! تم جاؤ اور

جا کر بڑے سردار صاحب کو میرا پیغام دے دو کہ اس کی بیٹی میرے پاس ہے اور.....“

”کیا بکواس کر رہے ہو تم..... سردار صاحب کی کوئی بیٹی نہیں، یہ تمہیں بھی معلوم ہے اور سارے.....“

”بکواس بند کر فخر، اور صرف میری بات سن۔“ میں نے اچانک ہی بھناتے ہوئے کہا تو وہ میری طرف الجھتے

ہوئے انداز میں دیکھ کر بولا۔

”کہو.....!“

”اس کی بیٹی ہے نا جائز بیٹی۔ تفصیل معلوم کرنی ہو تو ملک سجاد سے پوچھ لے..... جو اس کی بیٹی کا عاشق تھا۔ جو

تیرے سردار کا گہرا یار ہے۔ پھر بھی پتہ نہ چلے تو مجھ سے پوچھ لینا، لیکن تم نے نہیں آنا، بلکہ اپنے سردار کو بھیجنا۔“ میں نے

غصے میں کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”جمال.....! تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں..... کل صبح تک کا وقت ہے تیرے سرداروں کے پاس ورنہ..... کل یہیں جب دلبر کے

لیے پورے علاقے سے لوگ آئیں گے تو ان میں سردار شاہ دین کی بیٹی بھی آجائے گی۔ اور اگر یہاں نہ آئی تو پورے

علاقے کی پہچانیت بلا کر اس میں وہ بتائے گی کہ وہ کس طرح شاہ دین کی بیٹی ہے جاؤ اور جا کے بتاؤ اسے وقت بہت کم

ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا اور پلٹ کر بایک لینے کے لیے چل دیا۔ فخر چند لمبے وہیں خیرت میں گم کھڑا رہا پھر تیز تیز

قدموں سے چل پڑا۔

مجھے اس وقت اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ اس نے ابھی تک ملک سجاد کے بارے میں نہیں پوچھا کہ وہ اس

وقت کس حالت میں ہے۔ اسے ہوش آ گیا ہے یا ابھی تک بے ہوش ہے۔ خطرے میں ہے یا خطر سے باہر میں چاہتا تھا کہ

سوئی کے بارے میں ملک سجاد ہی اسے بتائے تاکہ اسے پوری کہانی خود بخود معلوم ہو جائے، مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے شاید

اسے وقت لگے۔ میں نے چھانے کا انتظار کیے بغیر اچھو کر یا نے والے کی دکان پر جا کر فون کرنے کا سوچا۔ دو گلیاں پار

کر کے اس کی دکان تھی۔ میں نے بایک اشارت کی اور اس طرف بڑھ گیا۔ دکان پر چند گاہک کھڑے ہوئے تھے۔ میں

نے انتظار کرنا چاہا مگر اچھو فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”جی بھائی فون کرنا ہے.....“

”وہی فون نمبر ملا دے۔“ میں نے کہا تو اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فوراً ہی نمبر ملا دیئے اور پھر ریسپور مجھے تنہا دیا۔ میں نے ریسپور کان کو لگا یا اور رابطہ ہو جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد فون پک کر لیا گیا۔ مگر دوسری جانب سے آواز ملک سجاد کی نہیں تھی۔ تبھی میں نے کہا۔

”مجھے ملک سجاد سے بات کرنی ہے۔“

”جی! ان سے بات نہیں ہو سکے گی وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں۔“ دوسری طرف اسے کافی حد تک افسردگی میں کہا گیا تو میں نے مسنوعی حیرت سے پوچھا۔

”خیر تو ہے کیا ہوا ہے انہیں۔“

”ایک حادثہ ہو گیا تھا اس میں انہیں شدید چوٹیں لگی ہیں۔ زخمی بھی ہو گئے تھے۔“

”اوہ.....! خطرے والی کوئی بات تو نہیں میرا مطلب ہے وہ ٹھیک تو ہیں نا۔“ میں نے اپنے لہجے کو جان بوجھ کر تشویش زدہ کر لیا۔

”خطرے والی بات تو ہے لیکن بہر حال اب وہ ہوش میں ہیں۔ ڈاکٹر نے بات چیت اور ملنے ملانے سے منع کر رکھا ہے دو چار دن میں ان سے رابطہ ہو جائے گا ویسے آپ کون اور کہاں سے بات کر رہے ہیں.....؟“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے فون رکھ دیا۔ مجھے مزید بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اچھو اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ اس لیے پلٹا اور بانیک کی

طرف بڑھنے لگا۔ تب اچانک بائیں جانب سے چند لوگ بڑھے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب مجھ پر چل پڑے۔ میں بس ایک نگاہ ہی انہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی تھے جو دلہرے گھر کے سامنے کچھ دیر پہلے میں نے دیکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاشیاں ڈنڈے اور ہاکیاں تھیں۔ ان میں سے کوئی چہرہ بھی نورنگر کا نہیں تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ وہ کتنے تھے بس اندازہ ہے کہ

سات سے دس تک ہوں گے۔ پہلی ہاکی کی ضرب میری پشت پر کاندھوں کے پاس لگی۔ پھر ہاکیوں ڈنڈوں اور لاشیوں کی یلغار ہو گئی۔ میں ان کے حصار میں تھا ان سے بچنے کا یہی طریقہ میرے ذہن میں آیا کہ سب سے پہلے میں ان کا حصار توڑ دوں پھر جب وہ سامنے آجائیں تو میں کچھ کر پاؤں۔ میں نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے اور ایک دم زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر

اگلے ہی لمحے ان کے درمیان سے ہو کر گلی کی جانب بڑھا میں ان کا حصار توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے میں ایک، نے لاشی مارنے کو بلند کی تو میں اس پر جا پڑا دونوں ہاتھوں کے پورے زور سے اس کی لاشی کو ایک جھک دیا۔ تب تک دو چار

ضربیں میرے لگ گئی تھیں۔ لاشی میرے ہاتھ میں آ گئی تو میرے اندر ایک حوصلہ آ گیا۔ میں چاہے اب وار کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اپنا کچھ نہ کچھ دفاع تو کر سکتا تھا چند منٹ تک میں اپنا دفاع کرتا رہا لیکن کب تک میں نے لاشی کو دائیں

ہاتھ سے بائیں میں لیا اور دائیں ہاتھ سے اپنا مسل نکالنا چاہا۔ لیکن میرے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ اچانک ہی دو چار بندوں نے مجھے بری طرح جکڑ لیا۔ میں نے ان کے حصار سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا، مگر نہ نکل سکا وہ بھی شہ

زور لگتے تھے۔ ایسے میں ایک کیری ڈبہ ان کے پاس آ گیا۔ انہوں نے آؤ پکھانا تاؤ میرے پیروں کی طرف سے پکڑ کر مجھے اٹھالیا میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ان کی گرفت سے نکلنا چاہا

مگر نہ نکل سکا۔ تب تک کیری ڈبہ کا دروازہ کھلا اور مجھے اس میں پھینک دیا گیا۔ میرے چوٹیں تو آئیں مگر میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا تب تک مسل کی نال میری گردن پر آن لگی۔

”اب زیادہ ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں..... آرام سے پڑے رہو۔ جان سے نہیں مارنا چاہتے، لیکن اگر تم نے کوئی حرکت کی تو ہم ڈمے دار نہیں.....“ ایک سخت لہجے والی آواز سنائی دی تو میں وہیں ساکت ہو گیا۔ درد جلن اور

ٹیسوں سے میرا برا حال ہو رہا تھا تبھی میں نے پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ..... اور کیا چاہتے ہو؟“

”چپ چاپ پڑے رہو ابھی پتہ چل جائے گا۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ کیری ڈبہ چل پڑا۔ مجھے شدید جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ مجھ پر اپنے پاؤں رکھے ہوئے تھا۔ میں اوندھے منہ پڑا تھا مجھے نہیں معلوم کہ ڈبے میں اور کتنے لوگ تھے۔

مجھے لگا کہ جیسے میں اپنے حواس کھو رہا ہوں لیکن میں نے خود پر قابو رکھا، نجانے کہاں کہاں سے چلتے ہوئے تقریباً آدھے گھنٹے بعد کیری ڈبہ رک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اپنے علاقے سے باہر نہیں بیٹھیں کہیں ہوں۔ تبھی اس بندے کی آواز سنائی دی۔

”اپنے پیروں پر اٹھو گے یا گھسیٹ کر لے جائیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کوشش کر کے اٹھا تو میر بدن چیخ چیخ کر احتجاج کرنے لگا۔ میں اٹھا اور کیری ڈبے سے اترنے سے پہلے نظریں اٹھا کر دیکھا میرے سامنے سردار شاہ دین کا ڈیرہ تھا۔ مجھ پر حملہ ہوتے ہی نجانے کیوں

میرے لاشعور نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ سرداروں کے بھیجے ہوئے ہی لوگ ہوں گے۔ اور وہ ڈیرہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا۔ نجانے کیوں اس وقت میرے اندر ایک اطمینان اتر آیا تھا کہ یہ کم از کم مجھے جان سے نہیں ماریں گے بلکہ تشدد کر کے مجھ

سے پوچھ کچھ ضرور کریں گے لیکن سوال یہ تھا کہ کیا فخر ذاتی جلدی حویلی پہنچ گیا تھا کیا اس نے سوتی کے بارے میں رداروں کو بتا دیا تھا ایسا ممکن نہیں تھا جب تک میں اچھو کر یا نہ والے کی دکان پر پہنچا تھا تب تک وہ حویلی نہیں پہنچ سکتا تھا مجھے

تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگے ہوں گے مگر اسے حویلی تک جانے میں آدھا گھنٹہ چاہیے تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ لوگ پہلے ہی میری تاک میں تھے۔ بھیدے کی بات سچ تھی۔ اب یہاں ڈیرے پر لا کر وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے یہ تو وہی لوگ جانتے تھے۔

میں سکون سے ڈیرے کی جانب چل پڑا۔ ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی گیٹ پار کر ڈیوڑھی عبور کی پھر صحن سے پہلے ہی دائیں طرف کے رو میں بنے ہوئے کمرے میں سے ایک کی جانب بڑھے ہم برآمدے میں سے چلتے ہوئے اس

کمرے میں گئے باقی سب پیچھے رہ گئے۔ تین بندے میری پشت پر تھے۔ سامنے ہی صوفے پر شاہ زیب بیٹھا ہوا تھا جو میری جانب طنز یہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

”مجھے بہت افسوس ہے جمال کہ تجھے یوں خاطر مدارت کر کے یہاں لایا گیا۔ ورنہ تم کہاں آنے والے تھے..... فنکار ہونا تمہیں بہت مان ہے خود پر.....“ یہ کہہ کر اس نے میری پشت پر کھڑے بندے سے پوچھا۔ ”اس کا مسل تو نکال لیا تھا نا.....؟“

”جی..... ایک ہی تھا..... اب یہ نہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ شاہ زیب نے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں نے تمہیں بہت عزت دینا چاہی تھی جمال.....! مگر تیرے جیسے بے اوقات لوگ عزت کے قابل ہی نہیں ہیں۔ تجھے تو اس دن شوٹ کر دینا چاہیے تھا جب میلے

سے اگلے دن تم حویلی میں آ کر کتے کی طرح بھونکے تھے۔ یہ میں ہی تھا جس نے تیری بابا سے وکالت کی تھی۔ میں نے بابا سے کہا تھا کہ تیرے جیسے کتے کو میں سدھار لوں گا مگر بابا سچے تھے انہوں نے کہا تھا کہ نہیں تم سانپ ہو، ڈنگ مارو گے..... اور تم نے ثابت کر دیا۔“

”شاہ زیب.....! بے اوقات میں نہیں تم ہو۔ دوسروں کے بازوؤں کا سہارا لے کر دھوکا دے کر وار کرنے والا تو کتے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ اور تم منافقت کرتے رہے پتہ ہے مرد منافقت نہیں کرتا! مجھو اکرتا ہے منافقت..... اور تیرے

جیسے کئی خواجہ سرا میرے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں تو اگر مرد کا بچہ ہے تو میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال، کتوں کے غول میں کھڑا کیوں بھونک رہا ہے۔“ میں نے اسے شدید غصہ دلانے کے لیے انتہائی طنز یہ لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے باؤلا ہو گیا، وہ بھنا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک دم سے سرد پڑ گیا۔ شاید اسے کوئی سوچ آ گئی تھی۔ اس لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہ چلتر کی اور کو دکھانا..... ابھی تیرے ساتھ بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ میں اپنے ہاتھ گندے نہیں کرنا چاہتا۔“ پھر میری پشت پر کھڑے اس بندے سے کہا۔ ”لے جاؤ اسے اور شام ہونے تک اس کا جوڑ جوڑ الگ کر دو، پھر پولیس والے خود ہی اسے پار کر دیں گے، جب تک پولیس والے نہیں آتے اس کی دھنائی ہوتی رہتی چاہیے۔“

”شاہ زیب..... میری تم سے کوئی دشمنی نہیں، لیکن تم مجھ سے دشمنی کی ابتدا خود کر رہے ہو یہ دیکھ لو..... اتنا کچھ کرنا، جتنا تم سہہ سکو.....“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے نفرت سے کہا۔

”اوائے تیری اوقات ہی کیا دشمنی کرنے والے کی..... تیرے جیسا بندہ اور ہمارا دشمن، فضول سوچ رہے ہو تم..... میں چاہوں تو ابھی تیری سانس بند کر دوں..... مگر میں نہیں سمجھتا کہ تجھ جیسے حقیر اور گھٹیا بندے کو میں ماروں، تیرے جیسے سنبولیے جب بھی سراٹھاتے ہیں، ہم انہیں کچل دیتے ہیں۔“

”شاہ زیب.....! میں تمہیں اب بھی سمجھا رہا ہوں، دشمنی مت کر، ورنہ تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ اتنا ہی بول، جتنے لفظوں کی تو قیمت ادا کر سکتا ہے۔ بہت زیادہ بول رہا ہے تو۔“ اس بار میں نے ٹھنڈے لہجے میں سکون سے کہا۔ کیونکہ اس وقت میں شاہ زیب کے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا۔

”بابا نے اس دن کہہ دیا تھا کہ میں تجھے مار دوں..... اور میری غلطی تھی کہ میں نے تجھے نہیں مارا، میں دیکھتا رہا کہ تو کرتا کیا ہے، تو نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنی اوقات سے بڑھ کر کیا ہے جمالے.....“ یہ کہہ کر اس نے مجھے لے جانے کا اشارہ کیا۔ ابھی میرے پیچھے کھڑے بندے کی گرفت مجھ پر سخت ہو گئی۔ اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا اور کمرے سے باہر لے جانے کے لیے دھکا دیا۔ ابھی میرے اندر آگ بھڑکی۔ اس سے پہلے کہ میں اس آگ میں خود جل جاتا، میں نے خود پر قابو پالیا۔ اس وقت ان لوگوں سے بھڑ جانے کا مطلب نری خودکشی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح کچھ وقت لینا چاہ رہا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دھکے دے کر وہاں کمرے سے نکالا اور باہر برآمدے میں لے آئے۔ بلاشبہ انہوں نے مجھے نہیں بند کر کے ہی تشدد کرنا تھا۔ میں ذہنی طور پر شدید سے شدید تشدد کے لیے تیار ہو گیا۔

میں زیادہ سے زیادہ وقت اس لیے لینا چاہ رہا تھا کہ اچھوکی دکان سے محض دو گلیاں پار دلبر کے گھر میں چھا کا موجود تھا اور دو گلیاں دور ہی میرا گھر تھا، سوچ چوراہے میں ان لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا اور مجھے وہاں سے اٹھا کر لے آئے۔ کیا گاؤں نورنگر میں کوئی بھی بالکل نہیں ہوئی ہوگی؟ کیا چھاکے کو معلوم نہیں ہوا ہوگا؟ ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہاں گاؤں میں پتہ چل گیا ہوگا، لیکن اس میں شک کیا جاسکتا تھا کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ میں کہاں ہوں چلتے چلتے اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ کیا مجھے تشدد سہتے رہنا چاہیے؟ اور پولیس کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ کب آئے اور مجھے لے جا کر ”پار“ کر دیں۔ کید میں اتنی آسانی کے ساتھ موت کے منہ میں چلا جاؤں گا؟ کیا رندھاوا ابھی اب تک میرے ساتھ دوہری چال چلتا آیا ہے ایک طرف اس نے اپنے آفیسر کے ساتھ مل کر ملک سجاد اور سرداروں کو بتا دیا کہ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں اور دوسری طرف اس نے مجھ سے سب کچھ کروا کر مجھے ہی نشانہ بنانے کے لیے ماحول بنا دیا۔ بلاشبہ اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا تھا۔ اس وقت پورے میرے ذہن میں یہ سوال آتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ جیسے سارا ماحول ہی میرے خلاف سازش کر چکا ہے۔ مایوسی تھی کہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ایک طرف میں نے ملک سجاد جیسے بندے کو موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا، یہ خیال آتے ہی میرے اندر ایک دم سے حوصلہ ابھرا..... میں نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی، وہ تین ہی تھے۔ باقی

لاکڑا تھا، رابطہ ہوتے ہی جہاں نے کہا۔

”یار! ان لوگوں کو مجھ پر شک ہو گیا ہے، پولیس آفیسر آیا تھا اور چھپے لفظوں میں دھمکی لگا گیا ہے۔“ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا پیارے۔“ جسمینہ نے جواب دیا۔

”وہ کیسے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ ایسے میری جان کہ اگر ثبوت ہوگا، تبھی نا، کوئی ثبوت نہیں ہے تمہارے بارے میں.....“ اس نے جواب دیا۔

”وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے..... جہاں نے اپنا ٹک اس کے سامنے رکھا۔“

”وہ لوگ بھارت میں ہوں گے تو انہیں پکڑیں گے، ان میں سے کچھ یہاں کنیڈا آ گئے ہیں اور کچھ تھائی لینڈ میں ہیں۔ انہیں پتہ تھا کہ کامیاب مہم کے بعد وہ بھارت میں نہیں رہیں گے، اس لیے پوری کوشش کر کے تمہارا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ بڑے کام کے بندے تھے اب چند دنوں تک تیرا اور میرا رابطہ نہیں ہوگا اور تو بھی سکون کر، ادھر ادھر پھر، موج کر۔“

”تمہارا کیا خیال ہی، میں سکون سے رہ پاؤں گا۔“ جہاں نے کہا۔

”یہ تو رہنا ہوگا، کیونکہ میں ابھی خود فیصلہ نہیں کر پایا کہ اب تجھے کیا کرنا ہے، میرے ساتھ یہاں کچھ مسئلے چل رہے ہیں، وہ دو چار دن لیں گے، پھر ٹھیک ہو جائے گا، بس تو نارمل رہ، زیادہ جذباتی نہ ہو۔ ہر پریت کی صورت میں تجھے بہت اچھی دوست مل گئی ہے، اس کے ساتھ اچھا وقت گزار۔“ وہ بولا۔

”ہاں.....! یہ بہت اچھی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔“ جہاں نے ہر پریت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکریہ، جسمینہ ر۔“ ہر پریت نے کمرے کے سامنے آ کر کہا۔

”نہیں پریت تم اس کی حق دار ہو۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے امید ہے کہ ہماری جلد ملاقات ہوگی۔“ اس نے کہا تو وہ پر جوش انداز میں بولی۔

”کیوں نہیں، مجھے بھی بہت شوق ہے تم سے ملنے کا۔“

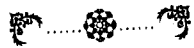
”بس تم جہاں کا خیال رکھنا، دو یا تین دن، اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ انوجیت کو بے جی کو میری طرف سے دش کرنا۔“

”جی ضرور۔“ وہ بولی۔

”اوکے جہاں! اوکے ہر پریت..... بہت ساری محبت.....“ یہ کہتے ہوئے وہ آف لائن ہو گیا..... وہ دن چند لمحے اس ماحول میں رہے، پھر جہاں نے لیپ ٹاپ بند کر کے سائینڈ ٹیبل پر رکھا اور ہر پریت کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ہوں.....! تو تم میرا خیال رکھو گی۔“

”بالکل.....“ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو جہاں نے ایک دم سے اسے پکڑ لیا۔ شاید وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے قابو میں آ گئی، جہاں نے اسے نیچے گرایا اور گہری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ہر پریت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تو جہاں نے ایک طویل مہر اس کے لبوں پر لگا دی۔



صبح کا سورج طلوع ہونے میں تھوڑا وقت تھا۔ جب میں اماں اور سوئی کو لے کر نورنگر پہنچ گیا۔ اماں آتے ہی یوں کچن میں گھس گئی جیسے وہ یہاں سے گئی ہی نہ ہو، جبکہ سوئی اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزوں اور کپڑوں کو اپنی جگہ رکھنے لگی، میں نے کارگھر کے باہر ہی کھڑی رہنے دی اور خود ہائیک لے کر ڈیرے پر چلا گیا۔ بھیدہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس

نے اپنے ساتھ ایک اور بندے کو لگایا ہوا تھا، میں گیا تو حال احوال کے بعد کہنے لگا۔

”جاندر جا کر آرام کراں میرے ساتھ یہ کام کر لیا کرے گا میں نے تجھے پہلے ہی بے فکر کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے یا رپر میں آرام گھر ہی میں جا کر کروں گا تو مجھے دودھ ڈال دے تو میں جاؤں۔“ میں نے بھی وہاں بیٹھنا مناسب خیال نہیں کیا۔

”تو چاہے جہاں آرام کر لیکن اب بہت محتاط ہو جا۔“ اس نے لاپرواہی والے انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ تب میں نے پوچھا۔

”ایسے کیوں کہہ رہا ہے؟“

”کل سے“ اور رات بھی بندے پھرتے رہے ہیں یہاں پر اب میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کے بندے تھے یا محض چور اچکے تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا تو دو چار فائر نکالے تھے میں نے پھر بعد میں سکون رہا۔“ بھیدے نے تفصیل سے بتایا اور پھر دودھ ڈالنے لگا۔ جب وہ دودھ ڈال چکا تو سیدھا ہو گیا۔

”اچھا کیا تو نے مجھے بتا دیا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”جمالے.....! یہ چھیڑ جو پڑ گئی ہے اور اس میں تو خود بھی بہہ گیا ہے اب مجھے نہیں لگتا کہ یہ چند دن کی کہانی ہوگی۔ اس لیے تیرے جو بھی ٹھکانے ہیں انہیں فوراً بدل لے۔ دشمن کا کیا اعتبار.....“ اس نے مجھے صلاح دی بے جا رہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کہانی میں نے خود شروع کی ہے اور میں نے ہی اسے انجام تک پہنچانا ہے۔ اور پھر کہانی کیا سے کیا ہو گئی ہے مگر جو اس نے مجھے مشورہ دیا تھا وہ بہر حال معقول تھا۔ میں نے سر ہلایا، دودھ کا برتن اٹھایا اور ڈیرے سے نکلتا چلا گیا۔ میں گھر پہنچا تو صحن میں دھری چار پائی پر چھکا لیتا ہوا تھا، میں نے بایک کھڑی کی دودھ کا برتن اماں کو پکڑایا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بونٹی لینا رہا تو میں نے اس کی کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا۔ ”اوئے رات نہیں سویا جو یوں مردوں کی طرح پڑا ہے؟“

”ناں.....! یہ تو پھر سوئی کو لے آیا ہے۔“ اس نے ویسے ہی پڑے پڑے کہا تو میں نے دھیمے انداز میں کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تو مجھ سے یہی سوال کرے گا آرام سے ناشتہ کرا اور پھر سکون سے بتاتا ہوں کہ میں اسے کیوں لایا ہوں۔“

”دیکھ اگر تیرا کوئی اس سے پیار محبت والا معاملہ چل پڑا ہے تو بھی مجھے ابھی بتادے میں تمہارے راستے کی دیوار نہیں بنوں گا بلکہ تجھے مشورہ دوں گا کہ تو اس کے پاس چلا جا اور کاندھے پر پرنا رکھ کے.....“ وہ غصے میں پتہ نہیں مزید کیا بلکہ مگر اس سے پہلے ہی میں نے اس کی بات کا نٹے ہوئے کہا۔

”کہو س.....! بے گایا جو میں کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرے گا۔“

”یقین تو تیرا ہی کرنا ہے جمالے.....“ اس نے اسی طرح لینے لینے جواب دیا۔

”تو چل آ پھر پہلے تجھے ساری بات بتا دوں پھر آ کے ناشتہ کرتے ہیں۔“ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں مجھے اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تبھی میں نے بھیدے کے شک کے بارے میں اسے بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”پیرزادوں اور سرداروں کی لڑائی تو چھڑ گئی ہے اس میں کوئی شک نہیں مگر سردار ابھی ہچکا رہا ہے۔ علاقے کے جو دوسرے زمیندار ہیں ان میں ایک دوہی ابھی غیر جانبدار ہیں باقی سارے ادھر یا پھر ادھر گئے ہوئے ہیں ایک بالکل سی

چم گئی ہے ممکن ہے کوئی کسی داؤ پر ہو۔“

”ظاہر ہے ہر بندے کو اپنا تحفظ کرنا ہے سیاسی معاملات تو ہیں ہی ان کی اتنی اہمیت نہیں اصل بات لوگوں کے بغاوت گردینے کی ہے یہی میں چاہتا ہوں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہمارے اس علاقے کے ہر گاؤں میں اور ہر سستی میں وہاں کے زمیندار یا جاگیردار کہہ لو اس کے خلاف کچھ نہ کچھ بندے ضرور موجود ہیں وہ خاموش ہیں کیونکہ نہ انہیں سہارا ہے نہ طاقت ہے اور نہ ہی ان کے پاس وسائل ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہوگا۔“

”یاریہ انسانی فطرت ہے کہ وہ طاقت کی طرف اپنا جھکاؤ کرتا ہے۔ انہیں کسی دوسری طرف طاقت دکھائی دی تو وہ ادھر ہو جائیں گے اس میں بڑا وقت لگے گا تو یہ مت سوچ اس منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی بڑا وقت پڑا ہے اور بہت کچھ کرنا ہوگا جب میں تجھے سستی کے یہاں آنے کے بارے میں بتاؤں گا تو پھر مجھے بتانا سمجھ لو سارا کھیل ہی بدل گیا ہے۔“ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھا کہ سستی چکن میں سے نکلی اس کے ہاتھ میں ٹرے تھا میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے اٹھ گیا تو وہ سوالیہ انداز میں بولی۔

”جمال.....! ناشتہ تو کر نو.....؟“

”میں ہاتھ دھو آؤں۔“ میں نے آہستگی سے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”تم یہیں بیٹھو میں دھلو اڑتی ہوں ہاتھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹرے چار پائی رکھی جہاں چھکا کا اب اٹھ بیٹھا تھا وہ بڑے غور سے سوئی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس بھری حیرت تیر رہی تھی۔ وہ ٹرے رکھ کر پلٹ گئی تو میں پائنتی کی طرف چار پائی پر بیٹھ گیا، بھی چھکا کا بولا۔

”یار.....! کیا جادو کر دیا ہے تو نے اس پر ایسی خدمت.....؟“

”ناشتہ کر لے پھر بتاتا ہوں ورنہ یہ کھانا پینا یہیں بھول جائے گا۔“ میں نے پھر آہستگی سے کہا تو وہ بے چین ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ دہنی آئی اور میرے ہاتھ دھلو اڑ چلی گئی۔ جب ہم ناشتہ کر چکے اور چائے کی پیالیاں خالی کر کے رکھ دیں تو میں نے باہر والے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کر کے اٹھ گیا۔ چھکا کا بھی میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔ اصرینان سے بیٹھ جانے کے بعد میں سوئی کی بتائی ہوئی بات اسے بتادی۔ توجہ کی انتہا پر بولا۔

”یہ تو غضب ہو گیا جمالے..... سوئی سردار شاہ دین کی بیٹی ہے؟“

”ہاں چھکا کے.....! غضب ہی ہوا ہے اب بتا میرا سے یہاں لانا بنتا ہے کہ نہیں؟“

”لیکن اگر یہ سب جھوٹ ہوا تو نری کہانی..... تو پھر.....؟“ وہ تشویش سے بولا۔

”تو پھر کیا ہوا ایک بار تو لپچل چم جائے گی نا.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یار سیانے کہتے ہیں کہ ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرنا چاہیے جس پر بات دینی آ جائے۔ یہ ہم کیسے ثابت کریں گے؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”یار..... ثابت جب ہو گا سو ہوگا مجھے ثابت کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے تو دیکھتا جا میں کرتا کیا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو چھکا چند لمحے خاموش رہا پھر چونک کر بولا۔

”بھیدے..... جو بندوں والی بات بتائی ہے اگر اس کا شک درست ہوا تو..... ہمیں اپنا بندوبست کرنا چاہیے۔“

”ہاں بندوبست تو ہونا چاہیے۔ اب تو بندوبست ہر وقت رکھنا ہوگا ہم صرف سرداروں کے ساتھ ہی نہیں کھیل رہے ہیں ہمیں پیرزادوں سے بھی اتنا ہی خطرہ ہے۔ اب تو علاقے کے لوگ بھی اس کھیل میں شامل ہو چکے ہیں۔“ میں

نے نکل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو چل پھر اٹھ جا دوستوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ کوئی ادھر ادھر کی خبر لیتے ہیں، کون کس کے بارے میں کیا کر رہا ہے۔ یونہی بیٹھے رہنے سے کیا ہوگا۔“ چھاکے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ تو کرنا ہے..... ابھی نکلتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کل دہر کے سوئم کی دعا ہے اس پر پورے علاقے کے لوگ آئیں گے، میرا خیال ہے تب تک نہ پیرزادے کچھ کر سکیں گے اور نہ سردار زور نہ وہ علاقے میں مزید گندے ہو جائیں گے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”یہ صرف تو سوچتا ہے نا، جس نے اپنا کام دکھانا ہے وہ دکھا جائے گا، ہو سکتا ہے ملک سجاد کے بندے آگئے ہوں..... یا سردار ہی کوئی اور کھیل کھیلتا چاہتا ہو۔ وہی جو ہم نے ان کے ساتھ کیا.....“ چھاکے نے ایک پہلو کے بارے میں توجہ دلائی تو مجھے خیال آیا۔

”یار.....! اب تک رندھاوے نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ ممکن ہے باہر ہی باہر سے معاملہ ہی کچھ دوسرا ہو گیا ہو۔“

”اس لیے کہہ رہا ہوں نہ کہ باہر نکلیں گے تو آس پاس کی خبر ملے گی۔“ چھاکا چار پائی سے اٹھ گیا۔

”ہاں وہ تو ہے چل دہر کے گھر ہی چلتے ہیں۔ وہاں باہر لوگ فاتحہ خوانی کے لیے بیٹھے ہی ہوں گے۔ وہاں سے کچھ معلوم ہو۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ دوپ چڑھ آئی تھی جو سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ چند منٹوں میں چھاکے نے میرا بایک نکالا اور ہم اس پر سوار ہو کر دلہ کے گھر کی جانب چل پڑے۔

دلہر کے گھر کے باہر کافی سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ گاؤں کے تھے اور ادھر ادھر کے علاقے سے آئے ہوئے تھے وہ بھی زمین پر بچھی ہوئی دریوں پر تھے۔ چھاکے نے ایک طرف بایک روکی میں اتر اور جا کر ان میں بیٹھ گیا۔ فاتحہ پڑھی اور پھر حسب معمول باتیں ہونے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ میری طرف بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ گاؤں سے باہر ہی کے لوگ تھے۔ چھاکا اس وقت تک دلہر کے گھر کے اندر چلا گیا تھا کیونکہ اس وقت تمام تر معاشی معاملات اس کے سپرد تھے۔ میں خاموشی سے وہاں بیٹھا رہا اور لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ وہاں یہ شکوہ موجود تھا کہ پیرزادے آکر چلے گئے علاقے کے دوسرے زمیندار بھی کسی نہ کسی طرح انہیں پرسہ دینے آئے لیکن اپنے ہی گاؤں کے سردار نہیں آئے۔ سردار شاہ دین نہیں آیا نہ ہی لیکن شاہ زیب کو ایک بار ان کے ہاں آ جانا چاہیے تھا۔ میں نے وہاں کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی کرنے کی ضرورت تھی۔ چاہے دبی دبی زبان ہی میں سہی سرداروں کے خلاف لوگ بولنا شروع ہو گئے تھے۔ لوگ آتے جاتے رہے اور میں وہیں بیٹھا رہا دوپہر ہونے کو آگئی تھی جب سرداروں کا خاص ملازم فخر دین چلا آیا۔

”کے مطابق اس نے فاتحہ پڑھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ لوگوں نے دبے دبے لفظوں میں اس سے سرداروں کے نہ آنے کا گلہ بھی کیا“ اس نے بتایا کہ بڑے سردار صاحب تو شہر میں ہیں اور وہاں بہت مصروف ہیں جبکہ شاہ زیب لاہور گیا ہوا ہے۔ اپنے داخلے وغیرہ کے سلسلے میں۔ وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق دونوں حویلی میں تھے۔ نجائے کیوں میرے دماغ میں اس کا جھوٹ ٹکٹنے لگا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟ ممکن ہے سردار شاہ دین چلا گیا ہو، ملک سجاد کی حالت خاصی خراب تھی۔ مجھے یہ سوچ آنے لگی کہ اگر فخر دین درست کہہ رہا ہے تو پھر کم از کم سرداروں کی طرف سے خطرے والی بات نہیں ہے میرے بارے میں جو لوگ پوچھتے پھرتے ہوں گے وہ کوئی اور ہوں گے، لیکن اگر فخر دین جھوٹ بول رہا ہے تو پھر مجھے کسی نئی صورتحال کے لیے پوری طرح تیار رہنا چاہیے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دم مجھے خیال سوچھا، کل آنے سے پہلے ہی پچھل چاودی جائے۔ میں فخر دین کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ گیا، انہی

”تم نے بہت اچھا کام کیا“ ایسے کرو فارم ہاؤس پر آؤ تمہارا جو بھی حساب کتاب ہے وہ کر دیتا ہوں۔“ وہ تو ہو گیا جی، انوجیت بائی جی نے تو سب صبح ہی کلیئر کر دیا تھا۔ اب بس مجھے اجازت دیں۔ یہاں کا سامان اگر خریدنا ہو تو مجھے بتادیں میں جانندھر میں آپ کی مدد کر دوں گا۔“ اس نے مودب انداز میں کہا تو ہر پریت بولی۔

”بہت شکریہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم آپ کو خود فون کریں گے۔“

”اچھا جی، چلتا ہوں، ست سرا کال۔“ ٹھیکیدار نے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ ابھی وہ سب بھی آہستہ آہستہ باہر آگئے پھر کاریں بیٹھ کر واپس کوٹھی کی طرف چل دیئے۔ راستے میں یونہی گپ شپ کرتے وہ واپس پہنچ گئے۔

موسم خوشگوار تھا اس لیے وہ بھی لان میں آ بیٹھے۔ جہاں کے ذہن میں کہیں تھا کہ بلجیت نے ابھی تک مزاحمت نہیں کی یہ خاموشی بہر حال اسے کھٹک رہی تھی۔ اگر دیکھا جاتا تو وہ ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر جمیندر سنگھ کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ یہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رویندر سنگھ سے بدلہ لیتے ہوئے اسے برسوں بیت جاتے، جب تک وہ یہاں نہیں آتا تھا وہ یہی سمجھتا تھا کہ چند دنوں میں اپنا کام ختم کر کے آجائے گا، لیکن یہاں پر آ کر اسے احساس ہوا تھا کہ رویندر سنگھ کی جزیں وقت کے ساتھ بہت مضبوط ہو گئی ہیں۔ یہ تو جمیندر سنگھ کا سنڈیکٹ تھا جس نے مدد کی ورنہ وہ ہر دیپ سنگھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایک بلجیت سنگھ ہی اسے اوگی میں الجھا دینے کے لیے کافی تھا۔

”کیا سوچ رہا ہے پتر؟“ کلجیت کور نے بڑے نرم مگر تجسس لہجے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں پوچھو.....! میں بس اوگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ جہاں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اوگی کے بارے میں وہ کیا؟“ کلجیت کور نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے اتنے دن ہو گئے یہاں آئے ہوئے، لیکن میں نے ابھی تک پورا گاؤں نہیں دیکھا، اور نہ ہی یہاں کے لوگوں سے ملا ہوں۔“ وہ اسی لہجے میں بولا تو انوجیت نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو نے ایکشن لڑنا ہے یہاں سے؟“

”نہیں، ایکشن تو نہیں لڑنا، لیکن کم از کم یہاں کے بارے میں یہاں کے لوگوں کے بارے میں بندے کو پتہ ہونا چاہیے۔“

”چلو میں بتا دیتا ہوں تمہیں آبادی اس کی تقریباً دس ہزار لوگوں کی ہے، جن میں آدھے ہندو اور آدھے سکھ ہیں۔ کچھ مسلمانوں کے ہیں، وہ لوگ جو شہر ہیں اب وہ عیسائی ہو رہے ہیں، انہوں نے اپنا چرچ بھی بنالیا ہے۔ اور پوچھو.....؟“ انوجیت نے عام سے لہجے میں بتایا۔

”ظاہر ہے ان کے نظریاتی جھکاؤ جو سیاسی ہیں وہ مذہب کے تابع ہی ہوں گے۔“ جہاں نے پوچھا۔

”ایسا ہے تو، لیکن پنجاب میں سکھوں کے خلاف پتہ نہیں کیسی کیسی ہم چلائی جا رہی ہے۔ اب دیکھو یہاں کے ہندو بالکل سکھوں کی طرح بال رکھتے ہیں، پگڑی بھی ویسے ہی پہنتے ہیں۔ مطلب ہندو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سکھ کوئی الگ سے قوم یا دھرم نہیں ہے۔ ہندومت ہی کا ایک حصہ ہے۔ خالصتان مہم میں ایک وجہ یہ بھی تھی۔“ انوجیت نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”مطلب“ خالصتان تحریک ایک سیاسی ہی نہیں، ہماری ثقافت اور مذہب کا معاملہ بھی تھا؟“ جہاں نے پوچھا تو انوجیت نے اپنی ماں کی طرف دیکھا، پھر اپنے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے نکل سے کہنا شروع کیا۔

”دیکھو.....! تقسیم ہند تک ہندو اور گاندھی سکھوں کو اپنا مخلص دوست اس لیے کہنے پر مجبور تھے کہ انہوں نے ہمارے قیام کے لیے بہت ساری قربانیاں دیں۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد ہی سکھ مجرم اور لاقانونیت کو ماننے والا گروہ قرار

کور نے اچانک کہا۔

”وہ سکھ ہی نہیں ہے جس میں دم غم نہ ہو، گرو بندگان کی تعلیمات ہی ایسی ہیں، میں مانتی ہوں کہ جنگجو مسکھ اب دکھائی بہت کم دیتے ہیں لیکن یہ بھی سوچو کہ اب لڑائی کے انداز بدل گئے ہیں۔ دس طاقتور ترین سکھوں کے مقابلے میں ایک ذہین بندہ کافی ہے۔ اور دوسری بات شاید تم تک اس کا اثر نہ پہنچا ہو لیکن خالصتان تحریک پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ یہاں سے نکل کر پوری دنیا میں سکھ پھیل گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ گرو کی مرضی تھی، کیونکہ وہاں وہاں تک دھرم پھیلا جہاں جہاں تک سکھ پہنچا۔ خالصتان تحریک ہندوستان سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ دنیا کے ہر فورم پر جہاں سکھ کو بلایا جاتا ہے وہاں وہ اپنا خیال دنیا کو دے رہا ہے۔ تم سے ہماری بحث نہیں، تم اپنا انتقام لو اور واپس دیکھو اور چلے جاؤ یا پھر یہاں رہو گے تو خالصتان کی بازگشت تمہیں سنائی دیتی رہے گی۔“ ہر پریت نے بے حد جذباتی لہجے میں یوں کہا تھا کہ جیسے وہ ایک دم ہی سے متغیر ہو گئی ہے۔ تبھی پھوپھو بھگت کور نے ان تینوں پر نگاہ ڈالی اور آہستگی سے بولی۔

”چھوڑو اس بحث کو، یہ سوچو کہ ارداس کے لیے کون سا دن رکھیں اور کس کس کو بلانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ حویلی میں اپنے سارے جاننے والوں کو بلایا جائے۔“

”بالکل ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کیا جائے۔ بہت سارا کھانا بنایا جائے اور ادگی پنڈ کے ہر گھر میں وہ کھانا پہنچایا جائے۔“ جہاں نے کہا تو انوجیت نے کہا۔

”کھانا تو بن جائے گا لیکن ہر گھر قبول نہیں کرے گا۔ ابھی تجھے بتایا ہے کہ اس ادگی پنڈ میں آدھے گھر ہندوؤں کے ہیں اس کا طریقہ کار یہ ہو سکتا ہے کہ کھانا بنا دیا جائے اور جس کا دل چاہے وہ لے جائے۔“

”اوکے، جیسے تم چاہو۔“ جہاں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو ہر پریت بولی۔

”اچھا اب میں کچھ اپنی بات کر لوں؟“

”جی، کہو۔“ انوجیت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”حویلی کے لیے تمام تر شاپنگ میں کروں گی۔ اور کل صبح سے میں جالندھر جایا کروں گی وہاں سے سامان خریدنے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ ایک دن کا کام تو ہے نہیں، میرے خیال میں پہلے تم یہ طے کر لو کہ حویلی میں کیا کیا چیز چاہیے ہوگی اور وہ کیسی ہو۔“ انوجیت نے اپنی رائے دی۔

”یہ مشورہ بھی اچھا ہے۔“ ہر پریت سوچتے ہوئے بولی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔ ”چلو آج پھر میں طے کر لیتی ہوں۔“

اس نے کا تو کلجیت کو راٹھتے ہوئے بولیں۔

”اچھا، میں ذرا بچن میں جھانک لوں، جوتی نے آج کیا بنایا ہے۔“

”میں ذرا باہر سے ہواؤں، کچھ لوگ انتظار کر رہے ہیں میرا پیغام پر پیغام آرہے ہیں۔“ انوجیت سیل فون کھتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ تو ہر پریت نے جہاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”جیسے آپ کہیں..... مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میں بنایا ہی آپ کے لیے گیا ہوں۔“ اس نے آہستگی سے مکرراتے ہوئے کہا تو ہر پریت ایک لمحے کو شرمائی اس کے چہرے پر سرنی آ گئی، پھر خود پر قابو پا کر بولی۔

”یہ کس فلم کے ڈائلاگ ہیں۔“

دے دیا گیا۔ ہندوؤں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وقت آ گیا ہے، کون آقا ہے اور کون غلام، کون حاکم ہے اور کون محکوم۔ 1950 میں آئین بنا، جس میں سکھوں کے وجود کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ یعنی انہیں تہذیبی اور ثقافتی طور پر ختم کرنے کے لیے یہ قرار دے دیا گیا کہ سکھ بھی دراصل ہندو ہی ہیں۔ اس پر سکھوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ 1966ء میں یہ تحریک اس وقت زور پکڑتی گئی جب پنجاب کی تقسیم ہوئی۔ خالصتان کا تصور تب بھی تھا اور یہ تقسیم اس تصور کو ختم کرنے کے لیے کی گئی۔ پنجاب جو خوشحال ترین ریاست تھی بد حالی کا شکار ہو گئی۔“

”تو گویا معاشی معاملہ بھی درپیش ہوا؟“ جہاں نے پوچھا۔

”سارے ہی معاملے تھے۔ ستر کی دہائی میں سکھوں کی خالصتان تحریک انھی، جس کا مقصد اپنی ایک الگ ریاست کا قیام تھا۔“ انوجیت نے بتایا۔

”کون سے علاقے شامل کرنا چاہتے تھے۔“ اس نے پوچھا۔

”پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، گجرات اور راجھستان کے وہ علاقے جہاں پنجابی بولی جاتی ہے۔ ان علاقوں پر مشتمل تھا۔“ انوجیت نے علاقے گنوائے تو وہ بولا۔

”پاکستانی پنجاب کو شامل نہیں کیا گیا، وہاں تو اپنا بہت کچھ ہے؟“

”تمہارے اس سوال پر میں اپنے لیڈروں کی بے عقلی پر ماتم کروں گا، محمد علی جناح نے اس قوم کو بہت بڑا موقع دیا تھا لیکن یہ لوگ دورانہدیش نہیں تھے۔ جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ ہمیں تحریک چلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اب تو ہم ہندوؤں کے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں۔“ انوجیت نے جذباتی انداز میں کہا۔

”اچھا تو پھر.....“ وہ بولا۔

”1978ء میں کانپور اور امرتسر میں سکھوں کے خون سے ہولی کھلی گئی۔ اور اسی کی دہائی میں خالصتان تحریک اپنے عروج تک جا پہنچی۔ تب سکھوں کو کچلنے کا منصوبہ بنالیا گیا۔ 25 مئی 1984ء کو گولڈن ٹمپل سمیت اہم گرد و اردن پر ایک لاکھ سے زیادہ فوج تعینات کی گئی۔ تین سے چھ جون تک آپریشن بلیو سٹار کے ذریعے سکھوں کا قتل عام کیا گیا۔ یہ صرف امرتسر تک محدود نہیں تھا، سکھ اندرا گاندھی کی کانگریس حکومت کے خلاف اٹھے۔ 31 اکتوبر کو اندرا مار دی گئی اور پھر سے پورے ہندوستان میں سکھوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جس میں تیرا اور میز پر یوار، سب کچھ گیا۔“

”لیکن اب صورتحال کیا ہے، سکھ قوم کے نوجوان خالصتان تحریک پر شرمندہ نہیں ہیں کیا؟ وہ اس تحریک کو ایک گھناؤنا خواب سمجھتے ہیں، میرا نہیں خیال کہ دوبارہ اس تحریک کا جنم ہوگا۔ یہ مرچکی ہے، میرا تجربہ ہے انوجیت کہ لوگ خالصتان کی بات ہی نہیں کرنا چاہتے، خوف زدہ ہیں۔ ڈرتے ہیں، انہیں اپنی جان زیادہ عزیز ہے۔“ جہاں نے یوں کہا جیسے وہ بے حد جذباتی ہو گیا ہو اور ایسے میں وہ بات کہنا نہ چاہتا ہو جو وہ کہہ رہا تھا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں نے تمہیں وہ رخ نہیں دکھایا جس میں سکھ قوم اپنی آزادی کے لیے کس طرح تیار ہو رہی ہے۔“ انوجیت نے یوں کہا جیسے وہ اسے یقین دلارہا ہو۔

”اتنا اثر تو رہے گا میری جان، تین لاکھ سے زیادہ سکھ مارا گیا ہے، ہر سکھ ایک کہانی ہے، میرا اور تمہارا پر یوار مارا گیا ہے تو آج ہم اپنے مستقبل کی پلاننگ کی بجائے انتقام لینے کی بات کر رہے ہیں، ایک پوری نسل محض انتقام کا سوچ سوچ کر دوسری قوم کی ایک نسل سے پیچھے رہ جائے گی۔ چھوڑو اس کو، تم آزاد خالصتان کے لیے کام کر رہے ہو، کرتے رہو لیکن محض ہتھیار اٹھا لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اپنا کچھ بچاؤ، اپنی شناخت، بجائے امرت دھاری سکھ اتنی تعداد میں نہیں ہو رہے جتنی تعداد میں سکھ اپنے کیس کنوارے ہیں۔ جان لو کہ سکھوں میں وہ دم غم نہیں رہا۔“ جہاں نے کہا تو قریب بیٹھی ہر پریت

”مجھے یاد نہیں۔“ جہاں نے ڈھٹائی سے کہا تو قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر بولی۔

”چلو آؤ حویلی کے بارے میں تھوڑا پلان کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے چلو۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو ہر پریت بھی اٹھ گئی۔

جہاں کو اپنے کمرے میں پہنچے تھوڑی دیر ہوئی تھی اس کے ذہن میں حویلی کے بارے میں ہی سوچ تھی کہ اچانک اس کا سیل فون بج اٹھا۔ یہ جسمیندر کی کال تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ آن لائن ہو جائے۔ اس نے جلدی سے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ آن لائن تھا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”جہاں! تم نے ابھی جالندھر جانا ہے وہاں تم ایک ریسروٹ میں رہو گے اور جاتے ہوئے تم رن ویر سنگھ کو بتا کر جاؤ گے۔ اس سے یہ بھی پوچھنا کہ تم پر حملے کے مجرم پکڑے گئے ہیں کہ نہیں۔“

”مجھے جالندھر میں کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اپنی جائیداد کے حصول کے لیے کچھ ضلعی آفیسرز سے ملنا ہے جس کے لیے تم نے وہاں کے ایک وکیل کیشو مہرہ کی خدمات لی ہیں وہ تم سے خود آ کر ملیں گے باقی باتیں وہ تمہیں خود سمجھا دیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں ابھی نکلتا ہوں۔“ جہاں نے کہا۔

”تمہیں ابھی ہی نکلتا ہوگا۔ یہ یاد رکھنا کہ تمہاری ہر پل کی نگرانی ہوگی۔ ابھی بھی تمہارے گھر کے آس پاس لوگ موجود ہیں۔“ جسمیندر سنگھ نے اسے سمجھایا۔ پھر چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ آف لائن ہو گیا۔ اب نجانے اس میں کیا راز تھا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور ہر پریت کو فون کر دیا اس نے فون پیک کر لیا۔

”خیریت تو ہے جی جی۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

”ہمیں ابھی جالندھر جانا ہے پھوپھو کو بتا دو اور خود بھی تیار ہو جاؤ۔ دس منٹ ہیں تیرے پاس۔“

”خیریت تو ہے نا؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”راستے میں بتا دوں گا ویسے خیریت ہی ہے۔ ہری اپ.....“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر رن ویر سنگھ کے نمبر ملاتے ہوئے اس نے اپنی الماری کھول دی۔ کچھ دیر بعد اس کا نمبر مل گیا۔

”جہاں جی کیسے یاد کر لیا ہمیں؟“ رن ویر سنگھ نے کافی حد تک خوشگوار موڈ میں کہا۔

”آپ کے قانون کی پاسداری کے لیے آفیسر۔ حالانکہ آپ آفیسر ہیں نہیں مگر میں آپ کو خوش کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”قانون میرا نہیں سب کا ہے بھارت ماما کے سارے لوگوں کا۔“ اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا تو جہاں طنزیہ انداز میں بولا۔

”اگر ایسا ہوتا، رن ویر سنگھ صاحب تو مجھے یہاں آ کر اتنی محنت نہ کرنا پڑتی، بلکہ آپ کو ایسے فون بھی نہ کرنا پڑتا۔“

”کیوں.....؟“ رن ویر سنگھ نے پوچھا تو وہ بولا۔

”مجھے ابھی جالندھر جانا ہے جہاں مجھے کچھ آفیسرز سے ملنا ہے چونکہ آپ نے مجھے اپنی موومنٹ کے بارے میں بتانے کے لیے پابند کیا ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔“

”یہ تو آپ اچھا کر رہے ہیں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ممکن ہے میں اس بارے میں اپنے وکیل سے مشورہ کروں کیونکہ آپ کا قانون بے چارہ اتنا اندھا ہے کہ

قلندر ذات

شاید کہیں اور ہوں اچانک میری نگاہ ایک ایسے بندے پر پڑی جس کے ہاتھوں میں دیسی ساخت کی ایک کاربین پڑ پڑی تب میں نے لمحوں ہی میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے میں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کاربین والا میرے دائیں ہاتھ پر ذرا سا آگے چل رہا تھا۔ ایک میری بائیں جانب ساتھ چل رہا تھا اور ایک میری پشت پر تھا، ممکن تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو مگر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کاربین والا کاربڈر کے ستون سے چند قدم پیچھے تھا جیسے ہی وہ ستون کے پاس پہنچا میں نے دائیں ہاتھ کو بڑھا کر اس کی گردن کو پکڑا اور چشم زدوں میں ستون کے ساتھ دے مارا اس دوران بائیں ہاتھ سے کاربین چھین لی اس اچانک افتاد پر وہ نہ سمجھ سکے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں میں نے کاربین والا ہاتھ گھمایا اور بائیں طرف چلنے والے کے منہ پر مارا اس سے پہلے کہ میری پشت پر آنے والا مجھے قابو کرتا میں ایک دم نیچے بیٹھ گیا میرے پیچھے آنے والا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میرے اوپر سے اگلی جانب گر پڑا۔ میں نے اسے وہیں دبوچ لیا اور غراتے ہوئے کاربین اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ایسے ہی پڑے رہنا اور نہ بھیجا نکال دوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے تیزی سے اس کی تلاشی لی میرا کولٹ پسل اس کی ڈب میں تھا۔ میں نے وہ نکال لیا وہ وہیں دبکا ہوا تھا میں نے انہیں قابو تو کر لیا مگر اب انہیں سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا۔ ستون سے نکلنے والا اپنے حواس بحال کر رہا تھا جبکہ دائیں جانب والا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا میں نے پسل اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”آگے چل.....!“ پھر کھڑے ہوتے ہوئے نیچے پڑے بندے کو پاؤں کی ٹھوک مارتے ہوئے کہا۔ ”چل“

”اے تو بھی اٹھ..... آگے لگ.....“

میں نے ان دونوں کو آگے لگایا یہ سب کچھ تقریباً ایک سے ڈیڑھ منٹ کے دوران ہی میں ہوا وہ میرے آگے آگے جا رہے تھے اور میں ان کے پیچھے تھا آگے ڈیڑھ میٹر تھی چند گز کے بعد گیٹ تھا جبکہ کاربڈر آگے تک تھا۔ میں اچانک ہی مڑا اور ڈیڑھ میٹر میں چلا گیا سامنے ہی دو گن بردار چوکیدار تھے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گنیں سیدھی کیں انہوں نے تو گن سیدھی کر کے ٹرائیگر دبانے لگا تھا جبکہ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے وہ بدحواس ہو کر باہر کی جانب بھاگے میں گیٹ سے گیٹ تک گیا ممکن تھا کہ وہ گیٹ پر دائیں بائیں چھپے ہوتے اور میرے باہر نکلتے ہی فائر کر دیتے میں نے پہلے دائیں جانب فائر کیے اور پھر بائیں جانب اور اگلے ہی لمحے حسرت لگا کر گیٹ سے باہر آ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا دائیں طرف والا گارڈ زمین پر پڑا ہوا تھا اور بائیں جانب والا دکھائی نہیں دیا۔ میں پھر وہاں نہیں رکا جس قدر تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگتا چلا گیا میں نے زیادہ سے زیادہ تین یا چار ایکڑ کا فاصلہ طے کیا ہوگا ڈیرے کی چھت سے فائرنگ ہونا شروع ہوئی۔ میں نے پلٹ کر ایک نگاہ دیکھا تھا ڈیرے سے کئی بندے باہر کی جانب بھاگتے ہوئے نکل رہے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے مجھے پکڑنا تھا۔ میں بھاگتا چلا گیا۔ میں کسی نہ کسی طرح پکی سڑک تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں فصلوں کے درمیان سے آگے بڑھتے رہنا چاہتا تھا۔ وہاں سے گاؤں تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اگر گھوم کر جاتا تو زیادہ وقت لگتا تھا۔

میں بغیر کے بھاگتا جا رہا تھا میرے بدن میں سخت ختم ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں جب بھٹکا مسئلہ درپیش ہو تو قوت کہاں آ جاتی ہے اب فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ میں ہانپتا ہوا پکی سڑک تک پہنچ گیا۔

جہاں یہ ممکن تھا کہ وہاں مجھے کوئی جاننے والا مل جاتا تو یہ بھی تھا کہ میرے دشمن میری تاک میں ہوں۔ اگر میں اس کی طرف جاتا تو راستے میں حویلی تھی دُرنہ شہر جانے والی سڑک تو تھی ہی مجھے ادھر جانا تھا اس وقت میں ان لوگوں کی آنکھوں سے نکلنا چاہتا تھا میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سائیں بحال کرنے لگا میری پشت پر پکی ایک اور رخ اس طرف تھا جہاں سے میں بھاگ کر آیا تھا۔ مجھے اپنی سائیں بحال کرنے میں چند منٹ لگے۔ میں درخت

کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ ارد گرد جھاڑیاں اور پودے اُگے ہوئے تھے۔ میری نگاہ کی سڑک پر تھی کہ کوئی تو جانے والا ادھر سے گزرے گا۔ تب اچانک مجھے دور سے پولیس جیپ اور اس کے پیچھے وین نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی شاہ زیب کی بات میرے ذہن میں گونج گئی کہ پولیس مجھے ”پاز“ کرنے کے لیے پہنچنے ہی والی ہے کیا رند جھادو مجھے ڈبل کر اس کو گریا یا پھر معاملہ ہی کچھ اور ہے؟ وہ سڑک پر سے لڑکے۔ اب میرے لیے وہاں پر بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں اٹھ کر پکی سڑک پر آ گیا۔ میں حیران تھا کہ مجھے تلاش کرنے کے لیے کوئی بھی نہیں نکلا ہے۔ میں سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ مجھے وہاں کھڑے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ میرے ہی گاؤں کا ایک لڑکا فیض موٹر سائیکل پر آ رہا تھا۔ مجھے یوں کھڑا دیکھ کر اس نے موٹر سائیکل روک لیا۔

”جمال بھائی! یوں کیسے کھڑے ہو خیر تو ہے؟“

”تو کہاں سے آ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا کیونکہ مجھے لگا جیسے اسے میرے اغوا کے بارے میں کوئی خبر نہیں

ہے۔ تبھی وہ بولا۔

”قصہ گیا تھا رات وہیں تھا۔“

”اچھا چل! مجھے گاؤں چھوڑ دے۔“ میں نے اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا، وہ چل پڑا۔ ابھی ہم چند قدم ہی

چلے ہوں گے کہ سامنے سے کئی موٹر سائیکلوں پر سوار مجھے میرے دوست نظر آئے۔ چھا کا ان میں سب سے آگے تھا، انہیں دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ”رک جا فیض۔“

اس نے موٹر سائیکل روک دی۔ اگلے دو تین منٹوں میں وہ قریب آ گئے۔

”کون تھے وہ؟“ چھا کے نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

”شاہ زیب.....“ میں نے دھیرے سے کہا تو چھا کا ایک دم سے بھنا گیا۔

”چل! کدھر ہے وہ.....“ میں دیکھتا ہوں اس کی سرداری۔“

”نہیں ابھی نہیں۔ ادھر ابھی پولیس ہے..... وہ ہمارے حق میں نہیں واپس چل آج شام سے پہلے پہلے انہیں

دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے کہا اور چھا کے کے پیچھے بیٹھ گیا۔

گاؤں کے چوک تک پہنچتے پہنچتے سب کو خبر ہو گئی کہ مجھ پر حملہ کرنے والے سردار شاہ دین کے بندے تھے۔

وہیں برگد کے درخت تلے کئی لوگ تھے ان میں چاچا رحمت بھی تھا جو ہمارے گاؤں کی پچاسیت کا ایک اہم رکن تھا۔ ساری

روداد سننے کے بعد اس نے کہا۔

”تو ٹھیک کہتا تھا ان کی غنڈہ گردی اب بہت بڑھ گئی ہے۔“

”ابھی تو شروعات ہوئی ہیں اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو ہمارے بچے ان کے غلام ہوں گے..... جیسے آج ہم بول

نہیں سکتے۔“

”پتر.....! تو جو بھی کہہ ہم تیری بات پر آمین کہتے ہیں۔ سرداروں کو پتہ چلنا چاہیے کہ ہم ڈگر نہیں انسان

ہیں۔“ چاچے نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”چاچا! تو نے کہہ دیا اور اب میں اس گاؤں کے لوگوں کی عزت بناؤں گا تو دیکھتا رہا اب میں کیا کرتا ہوں!

ان سرداروں کے ساتھ۔“

”تجھے اجازت ہے۔“ اس نے کہا تو گاؤں کے لوگ میری ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اس وقت دوپہر ہو گئی تھی

جب میں گھر کی طرف چلا چھا کا بہت غصے میں تھا۔ وہ مجھے دروازے پر ہی اتار کر واپس چلا گیا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو

نیم کے رخت تلے چار پائی پر اماں بیٹھی ہوئی تھی وہ آنکھیں بند کیے تیج پڑ رہی تھی۔ جبکہ سوئی والا ان میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری جانب بڑھی۔ اس کا بے ساختہ انداز دیکھ کر میں نے اماں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ میں اماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں پھر مجھے غور سے دیکھ کر جذباتی لہجے میں بولی۔

”آ گیا میرا بچہ.....“

”ہاں اماں..... بہت چوٹیں آئی ہیں۔“ میں نے کسی بچے کی طرح ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا تو وہ میرا سر تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

”چوٹیں بھی تو شیر جوانوں کو لگتی ہیں۔ چل اٹھ منہ ہاتھ دھو کر آ“ میں تجھے کھانا دوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئیں۔ تبھی سوئی قیب آ کر حیرت سے بولی۔

”اماں! دشمن اسے اغوا کر کے لے گئے تھے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا، لیکن اماں تم..... تمہارا رویہ ایسے ہے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو.....؟“

”تو کیا میں اسے ڈراؤں.....“ اماں نے کہا اور بچن کی جانب چل دی۔ میں نے سوئی کی طرف دیکھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔

”کون تھے وہ لوگ..... کچھ پتہ چلا.....“

”شاہ زیب تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں بتایا تو وہ چوکتے ہوئے بولی۔

”اوہ.....! تو میرا شک درست نکلا..... میں نے بھی سردار شاہ دین سے کہہ دیا۔“

”کیا..... کیا کہہ دیا..... تیری بات ہوئی اس سے.....“ میں نے چوکتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں نے اچھو کی دکان سے حویلی فون کر دیا تھا شاہ دین نے ہی اٹھایا تھا فون، میں نے اسے دھمکی

دیتے ہوئے کہا کہ اگر شام تک تم صحیح سلامت واپس گھر نہ لوئے تو اس کی تمام ترمذمہ داری سردار پر ہوگی۔“

”اس نے پوچھا نہیں کہ تم کون ہو؟“ میں نے آہستگی سے پوچھا۔

”میں نے بتایا اس کو کہا میں تمہاری بیٹی بول رہی ہوں جو ایک طوائف کے لٹن سے ہے۔ وہ اتنا حیران نہیں ہوا

لیکن گھبرا ضرور گیا تھا۔ اس نے نہ اقرار کیا نہ انکار.....“

”اوہ..... تو نے جلد بازی کی..... خیر کوئی بات نہیں۔ اب مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ تو پانی لاپینے کے لیے۔“

میں نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ پانی لانے کے لیے چلی گئی..... اور میں آئندہ لائے کل کے بارے میں سوچنے لگا۔



دوپہر کے بعد موسم اچھا خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ چپال رات دیر تک ہر پریت سے باتیں کرتا رہا تھا۔ باتوں

میں احساس ہی نہیں ہوا کہ رات کا آخری پہر بھی آدھا گزر گیا ہے۔ ہر پریت کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر جاگتا رہا پھر

سویا تو دوپہر کے وقت جاگا۔ وہ تیار ہو کر بیچ گیا تو پھوپھو ڈرائنگ روم میں تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

”اورب کے بندے تم یوں کیوں اکیلا چھوڑ کر سوتے رہتے ہو۔ میں تمہارے کھانے پینے کی فکر میں بیٹھی

رہتی ہوں..... اب دیکھو! نو جیت بھی اب تک نہیں آیا ہر پریت ابھی جاگی ہے اور تم.....“

”پھوپھو! یہ تو چلتا ہے لیکن آپ ہمارا انتظار نہ کیا کرو آپ کھانا لیا کرو۔“ چپال نے اس کے قریب بیٹھتے

ہوئے کہا۔ تبھی ہر پریت بھی آنکھیں ملتی ہوئی وہیں آ گئی۔

”کڈ ارنگ مام، گڈ مارنگ جسی۔“

”گڈ مارننگ کی کچھ لگتی..... اب دوپہر ہو گئی ہے، چل جلدی سے منہ دھو کے آ جا..... اور توجہ پال اس انوجیت کو تو فون کر، کدھر ہے.....؟“

”جی اچھا.....“ یہ کہہ کر وہ انوجیت کا نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد اس سے رابطہ ہو گیا، وہ گاڑی میں ہی تھا، اس نے کچھ دیر بعد آنے کا کہہ دیا، ہر پریت اخبار اٹھا کر آ گئی، وہ خبریں سناتے لگی تو چھوپو نے کہا: ”ارے چھوڑ اے، جوتی کے پاس جا دیکھ کیا کر رہی ہے۔“

”بے بے..... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں غصہ ہے؟ کچھ دیر ہی لگ جائے گی نا، پھر کیا ہوا، ابھی تو انوجیت بھی نہیں آیا۔“ ہر پریت نے کافی حد تک تحمل اور حیرت سے پوچھا۔

”وہ جوکل کا انیسٹر ہو کر گیا ہے نایہاں سے“ مجھے بہت خوف آ رہا ہے، وہ شکل ہی سے مکار لگ رہا تھا۔“ آخر کار پھوپھو نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ تب جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھوپھو جی شانت ہو جاؤ‘ کچھ نہیں ہوتا‘ بلکہ آپ تیاری کریں‘ پنڈ چلتے ہیں‘ آج سارا کام ختم ہو جانا ہے ادھر۔“

”ہاں مجھے یاد ہے، انوجیت نے بتایا تھا مجھے، چل پھر چلتے ہیں ادھر۔“ وہ ایک دم سے تیار ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد انوجیت بھی آ گیا تب تک کھانا لگ چکا تھا۔

لنچ کے بعد وہ چاروں کنوٹی سے کار میں نکلے اور اوگی پنڈ کی طرف چل دیئے۔ پچھلی نشست پر ہر پریت اور پھولپوتھی اور پنجر پر انوجیت وہ حویلی ہی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے۔

وہ حویلی اس دن والی رہی ہی نہیں تھی، جو پہلے دن جہال نے دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آج ہی مکمل ہوئی ہے ان کے انتظار میں ٹھیکیدار باہر ہی کھڑا ہوا تھا۔ جہال اس سے جا کر ملا۔ پھر وہ اندر کی طرف چلے گئے اندر سے بھی وہ بالکل نئی لگ رہی تھی۔ نیم کا درخت تراش دیا گیا تھا جو اب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بھی صحن میں کھڑے تھے۔

”رب کا شکر ہے کہ اتنے برسوں بعد اس حویلی کے بھاگ بھی جاگے۔ میں نے ارداس مانا تھی۔“ پھوپھو نے بڑے جذب سے کہا۔

”لیکن بے بے! ابھی اس حویلی کا کام پورا نہیں ہوا۔ اسے ابھی سجانا ہے، پوری طرح۔“ ہر پریت نے پرشوق لہجے میں کہا تو حیدر ہلکا ہوا۔

”میرے ذہن میں بھی ہے، ایسے کرتے ہیں کسی انٹیرنڈیکو میٹر سے بات.....“

”نہیں، خود ایک ایک چیز خریدیں گے۔ میں خریدوں گی سارا سامان اور لا کر یہاں سجاؤں گی۔“ ہر پریت نے یوں کہا جیسے وہ اپنے کسی حسین خواب میں رنگ بھر رہی ہو، تبھی جہاں نے کہا۔

”او کے.....! تم آج پلان کرلو کہ کیا کیا خریدا ہے، کل سے ہم سامان خرید لیں گے، پھر پھوپھو بھی اپنی ارداس رکھ لے..... کیوں انوجیت۔“

”زبردست.....“ وہ ہنستے ہوئے بولا، تبھی ہر پریت نے اپنا سیل فون نکالا اور حویلی کی سبھی دیواروں، کمروں اور جہاں اسے لگا کہ اس کی فلم بنانی چاہئے، اس کی ویڈیو بنانے لگی۔ وہ سب حویلی میں گھومتے پھرتے رہے۔ کافی دیر بعد وہ دوبارہ صحن میں آ گئے جہاں ٹھیکیداران کا منتظر تھا، چپال نے اسے کہا۔

قلندر ذات

177

مجھ پر حملہ کرنے والے لوگوں کو ابھی تک پکڑ نہیں سکا۔ ویسے مجھے نہیں لگتا کہ قانون اندھا ہے۔“ جیپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو آپ کو کیا لگتا ہے۔“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”کھا۔۔۔“

”کھلی آنکھوں کے ساتھ بھی اندھا بننے کا ڈھونگ کر رہا ہے۔ ورنہ اب تک وہ میرے مجرم کو پکڑ لیتا، خیر.....!“

”وہاں قیام کہاں ہوگا۔“ رن ویر نے پوچھا۔

”مجھ نہیں سمجھتا کہ آپ کی باتوں سے کیا مراد ہے؟“

نہجے نیکر، مجھ ا رہی کہ آپ وہاں کیوں ٹھہریں گے۔ زیادہ سے زیادہ بیس کلومیٹر کا سفر ہے آپ آسانی سے واپس آ سکتے ہیں روزانہ۔“ رن ویر سنگھ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہ میرا معاملہ ہے۔ اسے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ پتہ نہیں، کب کس سے اور کہاں ملاقات ہو جائے۔ مجھے تو بہر حال اپنا مقصد حل کرنا ہے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”ٹھیک ہے جاتے ہوئے تھانے سے.....“ رن ویر سنگھ نے کہنا چاہا مگر جہاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں آفیسر.....! ایسے نہیں، میں تھانے نہیں آؤں گا۔ بہت ضروری ہے تو اپنا بندہ یہاں بھیج دو۔ میں دس پندرہ منٹ بعد یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اوکے اینڈ بائی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا فون بند کر دیا۔

”دہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا تو ہر پریت اپنے بیگ کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ سوچوں میں ڈوبی ہوئی کلجیت کو ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ ہر پریت اس کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہاں نے کلجیت کو روکے پاس جا کر دھیمے سے کہا۔

”پھوپو اپنا خیال رکھنا“ میں نے انوجیت کو ذرا پریشان کیا ہے۔“

”جاپتر۔ رب تیری خیر کرے۔“ یہ کہہ کر اس نے سر پر پیار دیا، تب وہ دونوں باہر نکل گئے۔

گاؤں میں عشاء کی اذان کب کی ہو چکی تھی۔ اس وقت چھا کا چھت بر جا کر وہ اسلحہ اٹھاتا کر رہا تھا جس کی ہمیں ابھی تھوڑی دیر بعد ضرورت پڑنے والی تھی۔ میں باہر والے کمرے میں سے نکل کر محجن میں آ گیا، جہاں اماں اور سہیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں ان کے پاس جا کر رک گیا اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”ماں“ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تک تیز ہو جانے والی چھری میں اپنے دشمنوں کے گلے پر پھیر دوں، اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ میں گھر آ بھی پاؤں گا یا نہیں، لیکن میں آنے کی بھرپور کوشش کروں گا کہ مجھے ابھی تیرا مقدمہ بھی لڑنا ہے۔ آج رات بہت بھاری ہے، گزر رگنی تو سوئی کا معاملہ کل ہی حل ہو جائے گا۔“

”بیٹا.....! میری دعا میں ہر وقت تیرے ساتھ ہیں۔ میں نہیں جانتی تو نے کیا کرنا ہے کیا نہیں، لیکن اتنا یاد رکھنا، سوئی کے ساتھ میں نے وعدہ کیا ہے اور یہ وعدہ ہم نے نبھانا ہے۔“ اماں نے کہا تو مجھے یوں لگا جیسے ایک اور اہم ذمہ داری مجھ پر آن پڑی ہے جسے اب فقط میں نے ہی پورا کرنا ہے۔ ممکن ہے اس وقت میں کوئی بات کرتا، بھی اوپر منڈھیر پر چھاکے نے جھانکتے ہوئے کہا۔

”اوائے جمالے..... جلدی اوپر آ.....“

اس کے بلانے میں کچھ ایسا تھا کہ میں انتہائی تیز رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ حالانکہ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا، چھت پر پہنچا تو نہ صرف میرا سانس پھول چکا تھا بلکہ کمر میں شدید درد ہو رہی تھی۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی چھاکے نے سڑک کی جانب اشارہ کیا، جہاں کافی ساری گاڑیوں کا ایک قافلہ رکا ہوا تھا۔ اندھیرے میں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یا پھر وہ لوگ جو ادھر ادھر پھر رہے تھے ایسا ہونا معمول سے ہٹ کر تھا، مگر پھر بھی میں نے کہا۔

”ممکن ہے کوئی شادی وغیرہ، ذہن بارات کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”لیکن باراتوں کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں لوگ اسلحہ لے کر نہیں گھومتے۔ غور سے دیکھو ذرا۔“ چھاکے نے یوں کہا جیسے کسی گہرے کنویں سے بول رہا ہو۔

”تو پھر کون ہو سکتے ہیں؟“ میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ اسی لہجے میں بولا۔

”ممکن ہے ہمارا ہی کوئی دشمن ہو، ہمارا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جو اتنا بڑا والا لشکر رکھتا ہو۔“

”تو بس پھر ہو جاؤ تیار دشمن ہو گا تو دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا اور اسلحہ کی جانب بڑھاتا کہ اسے اٹھانے میں چھاکے کی مدد کروں، ایسے میں ہمارے گھر کا گیٹ بجا، میں نے تیزی سے اپنا ہٹل نکالا اور گلی کی طرف والی منڈیر پر پہنچا۔ گلی میں اندھیرا تھا اور ہمارے گھر کے باہر ایک شخص کھڑا تھا، پہلی نگاہ میں وہ پہچانا نہیں گیا لیکن ذرا غور کرنے پر میں پہچان گیا۔ وہ سرداروں کا خاص ملازم فخر تھا۔

”اس وقت اس کا یہاں کیا کام۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ اس وقت تک چھاکا منڈیر تک چلا گیا تھا۔ میں نے گیٹ کھولا تو سامنے کھڑے فخر نے کہا۔

”شکر ہے تم گھر پر ہی مل گئے ہو۔ باہر والا دروازہ کھولنا میں نے تم سے بات کرنی ہے۔“

”تم نے جو بات کرنی ہے، یہیں کرلو۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ انتہائی تحمل سے بولا۔

”دیکھو..... سردار صاحب! خود تم سے بات کرنے کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔ وہی سوئی کے بارے میں بات کریں گے اس لیے دروازہ کھولا، طینان سے لیکن چپ چپاتے ہی بات کرنی ہے۔ اس لیے.....“

”اچھا.....! گاؤں کے باہر جوشکر لے کر آئے ہو، وہ تہی لوگوں کا ہے، میں اگر تمہاری بات نہ مانوں تو تم مجھ پر..... میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کا منتہ ہوئے بولا۔

”تم نے بات ماننے پانہ ماننے کا ابھی فیصلہ کر لیا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ گاؤں کے باہر لوگ کھڑے ہیں مگر سردار صاحب یہاں گلی کی کھڑ پر اب چھوٹی گاڑی میں ہیں۔ صرف میں اور وہ ہیں۔ بات کریں گے اور چلیں جائیں گے اس میں تیرا ہمارا اور گاؤں کا فائدہ ہے۔“ فخر نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا۔

”ٹھیک ہے جاؤ لے آؤ سردار کو لیکن اگر تیرا بندہ ہوا تو پھر.....“ میں نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

میری مزید بات سے بغیر فخر تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ میں نے پلٹ کر گیٹ بند کیا تو سوئی ساتھ میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی بلاشبہ اس نے ساری بات سن لی تھی۔ میں نے باہر والا دروازہ کھولا، لائٹ آن کی اور دروازے میں کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ میرا ہٹل پر تھا کیونکہ میں نے ایک چھوٹی کارگاہ میں آتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ میرے دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں سردار کے ساتھ فخر ہی تھا، سردار شاہ دین تیزی سے میرے کمرے

میں آ گیا اور آتے ہی میری جانب ہاتھ بڑھایا، میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ بولا۔

”تجھے معلوم ہے ناکہ میں آج تک چل کر کسی کے گھر نہیں گیا۔ صرف تیرے گھر تک آیا ہوں اور تم مجھے بیٹھنے

کے لیے بھی نہیں کہو گے۔“

”سردار صاحب! اس وقت آپ میری مرضی سے نہیں اپنی خواہش سے آئے ہیں۔ جس طرح آپ آگئے ہیں اس طرح آپ بیٹھ بھی خود ہی جائیں گے۔“ میں نے اپنے لہجے کو کافی حد تک طنزیہ ہونے سے بچاتے ہوئے کہا۔ تب تک وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا، فخر، باہر کا رہی میں تھا۔ سردار چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”میں شاہ زیب کی حرکت پر شرمندہ ہوں۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اس نے جو کرنا تھا وہ کر لیا، مجھ سے جو ہوسکا، میں بھی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ فکر نہ کریں، یہ معاملہ چلتا رہے گا اب آپ سنائیں، آپ میرے گھر تشریف لائے ہیں، حکم کریں۔“ میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی چرب زبانی اور منافقت پر ایک دم سے گرمی آ گئی تھی۔

”میرے خیال میں سب کچھ غلطی میں ہو گیا۔ تمہاری طرح وہ بھی نوجوان ہے، میں چاہتا ہوں تم دونوں آپس میں صلح کر لو باقی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے گاؤں کے چوک میں بس مجھے اور شاہ زیب کو تھوڑی دیر اکیلا چھوڑ دیں۔ پھر صلح ہی صلح ہوگی ہماری۔“ میں نے سردار شاہ دین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ غصے میں آ گیا تھا۔ مگر میں اس وقت حیران رہ گیا جب وہ بولا تو انتہائی تحمل سے کہنے لگا۔

”دیکھ میں تم سے کچھ اور باتیں کرنے آیا ہوں۔ یہ شاہ زیب والا معاملہ کسی طرح ختم کرو، ہم وہ بات کریں۔“

”تو نہ کرو میں نے کہہ دیا جو کہنا تھا۔“ اچانک مجھے بھی غصے نے مجبور کر دیا کہ اسے صاف جواب دے دوں۔ ”سردار جی.....! اس نے مجھے قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا، پولیس منگوائی تھی کہ مجھے پار کر دیں۔ اور کیا یہ سب اس نے آپ کی اجازت کے بغیر کیا، اگر کیا تو بڑی نالائق اولاد ہے آپ کی اسے تو سزا ملنی چاہیے۔“

”دیکھو وہ میرا اکوٹا بیٹا ہے، میں اس کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں، میں اس کی غلطی مان رہا ہوں نا۔“ سردار نے لجاجت سے کہا۔

”سردار جی آپ نے اگر کوئی دوسری بات کرنی ہے تو کریں، مجھے معلوم ہے کہ میرے نہ ماننے سے آپ نے کیا پلان کیا ہوا ہے۔ آپ نے جو فوج سڑک پر کھڑی کی ہوئی ہے، نا، وہ میری نگاہ میں ہے، وہ فوج بھیجیں، میں نے اس کا توڑ بھی کیا ہوا ہے، میں نے بچپن سے اب تک آپ ہی کی نفسیات کو سمجھا ہے، کیوں سمجھا ہے یہ آپ بخوبی جانتے ہیں۔“

”تم گڑھے مردے مت اکھاڑو لڑکے“ تم شاید اسے میری مجبوری سمجھ کر کہ میں چل کر تیرے گھر آ گیا ہوں تو اپنی حد سے باہر ہو رہا ہے۔ اپنے آپ پر سوچ، اپنی بوڑھی ماں پر رحم کر..... تو جو مانگتا ہے، میں تجھے دے دیتا ہوں، لیکن یہ سارا تماشا ختم کرو، جو میری بیٹی ہونے کی دعویدار یعنی پھرتی ہے اسے لے کر کہیں چلا جا، اس تماشے کو زیادہ لمبا کرو گے تو کچھ حاصل نہیں ہونے والا میں.....“ وہ سمجھانا چاہ رہا تھا کہ سوئی اندر آ گئی۔ وہ پورے لباس میں تھی اور آنچل سے سر ڈھکا ہوا تھا۔ سردار نے گھوم کر اسے دیکھا اور لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ وہ بولی۔

”کتنا ظالم معاشرہ ہے تمہارا، ایک عورت کو کھلونا سمجھا اور دوسری عورت جو اس کی بیٹی ہے اس سے انکار کرتے ہو۔“

”تم جو کوئی بھی ہو، جس کسی کی بھی سازش لے کر یہاں تک آئی ہو، میں وہ.....“

”اب مجھے تیرے جیسے شخص کو باپ کہنے پر شرمندگی ہو رہی ہے، میں نے سوچا تھا کہ شاید تیرے اندر کا خون جوش مارے گا، لیکن نہیں..... ایسا نہیں ہی اپنی اولاد کو دیکھ کر تو والدین کا سن ترپ اٹھتا ہے، شاہ زیب تیرا بیٹا ہے اور میں

نہیں۔۔۔۔۔ اس نے بڑے طنز سے کہا۔

”نہیں ہونا اس لیے۔۔۔۔۔“

”تو یہ طے ہوا سردار شاہ دین کہ تم میرے باپ نہیں، مگر میں نے اپنا دعویٰ سچ ثابت کر دینا ہے، پھر تم نے مجھے جینی قبول کرنا ہے تب میں نے انکار کر دینا ہے پھر جو میں ثابت کروں گی، تم اس سے بھی انکار نہیں کر پاؤ گے۔“

”میں تمہیں زندہ ہی نہیں چھوڑوں گا۔“ سردار نے انتہائی غصے میں کہا۔

”دیکھو سردار! یہ گھنیا دھمکی کسی اور کو دینا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں ایک طوائف زادی ہوں۔ ہاں آ کر دعویٰ کروں گی اور تم اسے آن کی آن میں مار دو گے، یہ تمہاری بھولی ہے۔ میں آج کی لڑکی ہوں، سارے بندہ رفتہ رفتہ آئی ہوں۔ ملک سجاد جیسے بندے کو اگر موت کے منہ میں ڈال دیا ہے تو۔۔۔۔۔ میں اپنا تحفظ کر سکتی ہوں۔ گولی چلا کر دیکھو تم تو کیا شاہ زیب بھی نہیں رہے گا۔“ سوئی نے دانت پیسنے ہوئے کہا۔

”دیکھو تم بہت بول چلکی ہو، تمہاری زندگی اسی میں ہے کہ رات کے اندھیرے میں اسی طرف لوٹ جاؤ جنہوں نے تمہیں سازش کے تحت یہاں بھیجا ہے، چار دن جی لوگی۔“ سردار نے نہایت غصے میں گردھی آواز میں کہا تو سوئی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”یاد ہے سردار جی ایک سال قبل آپ اپنا تفصیلی چیک اپ کروانے گئے تھے لاہور آپ کے ڈاکٹر نے آپ کو خصوصی طور پر بلوایا تھا۔“

”ہاں کیوں؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”وہ میں نے ایک بڑی رقم دے کر ڈاکٹر کو راضی کیا تھا کہ آپ کو بلوائے اور آپ کا اور میرا ڈی این اے ٹیسٹ کروائے۔ مجھے بھی شک تھا کہ میں شاید آپ کی بیٹی نہ ہوں۔ میری ماں غلط بیانی کر رہی ہو۔ محض دولت کے لیے آخر طوائف ہے نا۔۔۔۔۔ میں نے کچھ عرصہ کی مہلت لی ہے اس سے میں نے اپنا آپ فروخت کیا ہے اپنی ماں کو۔۔۔۔۔ میں نے کہا، اگر میں ایک خاص عرصے تک اسے، اس کی سوچی ہوئی دولت سے دو گنا نہ دے دوں، اس وقت تک وہ مجھ پر اپنا کوئی فیصلہ مسلط نہیں کرے گی۔ ٹیسٹ نے ثابت کر دیا کہ تم میرے باپ ہو اور میں تمہاری ناجائز اولاد۔۔۔۔۔“ سوئی کہتی چلی گئی۔ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں انتہائی نفرت اتر آئی، تبھی وہ چیخا۔

”یہ جھوٹ ہے، فراڈ ہے، ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میں اسے غلط ثابت کر دوں گا۔“

”میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے غلط ثابت کرو، میں اس عذاب سے نکلنا چاہتی ہوں کہ میں کوئی شریف زادی ہوں، میڈیا حاضر ہے وہاں غلط ثابت کرو، عدالت میں غلط ثابت کرو اور یا پھر ابھی اور اسی وقت میری زبان بند کر دو، مار دو مجھے۔“ سوئی نے جی اسی طرح چیختے ہوئے کہا۔ سردار آنکھیں پھاڑے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے پھر سکون سے بولا۔

”تم اب بھی بوش کرو اور چلی جاؤ یہاں سے، خیریت اسی میں ہے۔“

”کل کا سورج کس کے لیے کیا لائے گا نہ تم جانتے ہو اور نہ میں۔۔۔۔۔ اور ابھی تم اتنے بڑے حاکم نہیں بنے کہ مجھے یہاں اس گھر سے نکال دو، جہاں تم خود سواہی بن کر کھڑے ہو جاؤ اور جا کر مجھے مارنے کے لیے بندے بھیج دو، کیونکہ میں تو یہاں آئی ہی مرنے کے لیے ہوں۔ اور سنو۔۔۔۔۔ میں یہاں کھڑی اتنا حق رکھتی ہوں کہ تمہیں یہاں سے جانے کے لیے کہہ دوں۔“

”تم حد سے بڑھ رہی ہو لڑکی۔۔۔۔۔“ سردار کو جاہل آگیا۔

”تو پھر مجھے میری حد میں رہنے دوسو درجی میں بتا رہی ہوں، کل میں میڈیا کے سامنے یہ ثابت کروں گی کہ میں سردار شاہ دین ایم این اے کی بیٹی ہوں۔ اور شاہ زیب میرا بھائی ہے۔ چاہے سگانہ سہی۔۔۔۔۔ میں جب لاہور سے چلی تھی تو سارے قانونی معاملات طے کر کے آئی تھی کہ اگر میری موت ہو جاتی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ مجھے کوئی خوف نہیں ہے، چاہے تو ابھی گولی مار دو مجھے اچھا لگے گا کہ میرے باپ نے مجھے گولی ماری ہے۔“

یہ سن کر پہلے اس میری طرف دیکھا، پھر بولا کچھ نہیں اور اٹھ کر باہر نکلتا چلا گیا۔ میں تیزی سے دروازے تک گیا۔ وہ جلدی سے کار میں بیٹھ کر نکلتا چلا گیا۔

میں باہر والے دروازے کو لگا کر پلٹا تو سوئی اندر جا چکی تھی۔ میں صحن میں گیا تو وہ اماں کو ساری روداد بتا رہی تھی۔ اسے ساری بات کہنے میں کچھ وقت لگنا تھا، لیکن مجھے یہ دیکھنا تھا کہ سڑک پر رکا ہوا قافلہ کیا کر رہا ہے؟ اس کی حرکت ہی سے میرا گلا قدم اٹھنے والا تھا۔ میں نے چھت پر جا کر دیکھا، چھا کا دھڑی نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ میں نے تیزی سے نہایت اختصار کے ساتھ ساری روداد کہہ دی، وہ چپ چاپ سنتا رہا پھر بولا۔

”اگر یہ قافلہ گاؤں کی جانب آ جاتا ہے تو تم فوراً نیچے آ جانا، میں یہ سارا اسلحہ لے کر جا رہا ہوں، اماں اور سوئی کو میں نے بتا دیا ہے کہ انہوں نے کہاں باننا ہے۔“

”کہاں۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔“

”میرے گھر کے ساتھ۔۔۔۔۔ ماسی کبریٰ کے گھر، وہ وہاں سے محفوظ مقام کی طرف چلی جائیں گی، مطلب وہاں گاڑی ہے ان کے لیے۔۔۔۔۔ قصبے میں یا شہر یا لاہور۔۔۔۔۔ جدھر بھی۔ وہ میں نے بندوبست کر دیا ہے، بس ان کو سنبھالنا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گنیں اٹھائیں اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

میں ایک لمحے کو حیران ہو گیا کہ وہ کیا کچھ سوچ کر اس کی حفاظتی تدابیر کر رہا ہے، حالانکہ میرے اندازے کے مطابق ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا تھا جہاں ایک گولی بھی چلتی۔ لیکن وہ جو کر رہا تھا، ٹھیک کر رہا تھا۔ میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو پہلے حفظ المقدم کے طور پر کچھ کرتا، بعد میں اندازوں پر انحصار کرتا۔ میں اس طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جہاں قافلہ اب بھی رکا ہوا تھا۔ شاید سردار شاہ دین ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ ایسے میں میرے کاندھے پر اک نرم سا ہاتھ آن ٹھہرا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ سوئی تھی۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”بہت جرات دکھائی تو نے، اتنی بدتمیزی کے ساتھ۔“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر لڑتی ہوئی آواز میں کہتی چلی گئی۔

”مجھے اخلاقیات پر کوئی لیکچر مت دینا جمال، وہ شخص میرے وجود کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں صرف اس لیے کہ میں ایک گند ہوں، وہ مجھے ایک گندے وجود میں اچھینک آیا تھا، مجھے میری شناخت تو اس نے کیا دینی ہے، مجھے تو یوں صاف کرنے کی بات کر رہا تھا جیسے کچرا صاف کرتے ہیں۔ وہ جرات نہیں، میرے اندر کا ہر تھا جو ہوش سنبھالنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر بھرتا رہا ہے۔ کیا قصور ہے میرا، میری تو یہ مرضی نہیں تھی کہ میں ایک طوائف کے گھر میں پیدا ہوئی، لیکن معاشرے نے میرے ساتھ جو رویہ رکھا، مجھے جس طرح ایک بچہ، کم ذات اور گندگی جانا، وہ میرے لیے لمحہ تاریک ہے، جمال، یہ نقاب ڈالے شریف زادے تو ہم۔۔۔۔۔ سبھی زیادہ گناہوں نے ہیں، ملک سجاد کو کس نے حق دیا ہے کہ وہ ایک وجود کو خریدے، یہی ناکہ اس کے پاس دولت ہے، کوئی اس معاشرے میں ایسا نہیں ہے جو اس سے پوچھے کہ اس کے پاس اتنی دولت آئی کہاں سے؟ نہیں جمال نہیں مجھے کوئی اخلاقی لیکچر مت دینا۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”اور تجھے وہ اگر قبول کر بھی لے تو یہ معاشرہ قبول نہیں کرے گا۔“

”مجھے پرواہ نہیں ہے۔ اور میں اب جینا بھی نہیں چاہتی ہوں۔ موت کا ڈر میں نے کب کا ختم کر دیا ہے۔ اور تم بھی یہ جان لو جمال! اس میں ہمت نہیں ہے کہ مجھے مار سکے۔“

”تم پہلے تو مجھے یہ کہہ چکی ہو کہ اب تک ڈر سے خاموش تھی یہ اچانک.....“ میں نے کہا چاہا تو وہ بولی۔

”تمہاری وجہ سے جمال! صرف تمہاری وجہ سے..... میں نے جب اپنے بارے میں اماں کو سب کچھ بتایا تو اماں نے بھی اپنی داستان مجھے سنادی! یقین جانو! جس دن موت کا خوف ختم ہو گیا! میں اس دن زندہ ہو گئی۔ اماں نے مجھے زندہ کر دیا! تمہارا سہارا! میرے لئے بہت بڑا حوصلہ ہے جمال۔“

”وہ دیکھ رہی ہو سامنے.....“ میں نے قافلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سردار شاہ دین کا قافلہ ہے! اس کے حکم پر بے تاب! ہمیں لمحوں میں ختم کر سکتا ہے۔ یہی قافلہ اگر دندانہا ہوا یہاں آئے اور ہم پر حملہ کر دے..... میرے پاس اتنی طاقت نہیں ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”لیکن تمہارے پاس حوصلے کی بہت بڑی طاقت ہے۔ یہ میں مانتی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے کہا۔

”جھوٹ! جیسے کہ تم نے سردار کے سامنے بولا! یہ کب تک چل سکتا ہے۔ حالانکہ.....“

”نہیں! نہیں! میں نے جھوٹ نہیں بولا جمال! جو وہاں کہاں بالکل سچ کہا ہے۔ تمہارے اس گاؤں میں میرے کچھ لوگ ہیں جو ایسے ہی کسی وقت کے لیے منتظر ہیں۔ قانونی معاملات میں طے کر کے آئی ہوں اور یہ سن لو..... میں نے پولیس کے اعلیٰ حکام سے بھی فون کر دیا ہے۔ سردار کو یہ معلوم ہے کہ یہ معاملہ پولیس کے علم میں ہے! دیکھنا یہی قافلہ ابھی پلٹ کر جائے گا! وہ جو سوچ کر آیا تھا وہ اسے نہیں ملا! طوائف زادی ہوں! مرد کی آنکھ پچانتی ہوں۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھ بادی! ماحول ایک دم سے بدل گیا۔ چند لمحے پہلے آنسو بھری جذباتیت تھی وہ ختم ہو کر رہ گئی۔ میں اس قافلے کو غور سے دیکھنے لگا جو حرکت میں آ چکا تھا! وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ اور پھر کچھ وقت بعد وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

”وہ تو گئے.....“ میں نے سرسراتے ہوئے کہا! تبھی سوئی میرے بالکل قریب ہوتے ہوئے بولی۔

”ایسا ہی ہوگا..... اور جو کل ہونے والا ہے! اس کا بھی مجھے اندازہ ہے۔ لیکن تم شاہ زیب کے ساتھ کیا کرتے ہو! اس کا میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”اس کے بارے میں تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“ میں نے کہا تو کھلکھلا کر ہنس دی! پھر میری گردن میں اپنی بانہیں جامل کرتے ہوئے بولی۔

”آج بہت خوش ہوں میں.....“

”اس لیے کہ سردار کے ساتھ تمہارا آنا سامنا ہو گیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں! میں آج تمہارے اتنے قریب ہوں۔ اب انجان نہیں بننا جمال..... زندگی کے چند حسین پل! بہت سوچ سمجھ کر اور بہت خوشی سے گزارنا چاہتی ہوں۔“

ایسے ہی لمحے میرے دماغ میں اچانک ایک خیال رچک گیا جس کے تحت میں نے اس کی کمر میں اپنا بازو ڈالتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا! پھر اس کی گردن پر دھیرے سے اپنے گال مس کرتے ہوئے کہا۔

”بس ساتھ چلنا! بوجھ مت بننا۔ چلتے چلیں جائیں گے۔“

میرے یوں لہنے پر اس نے مجھے زور سے بھیج لیا! جس کے باعث دو پہر کی لگی چوٹیں ایک بار پھر سے جاگ اٹھیں۔ اس کی گرم جوشی سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہے۔ اب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ خوشی کیسی تھی! میں نے دھیرے سے اسے الگ کیا اور بڑی نرمی سے بولا۔

”اب مجھے جانے دو! ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔“ اس نے کچھ نہیں کہا! صرف مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھتی رہی! میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا بلکہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے چلا گیا۔ پہلی نگاہ میں اماں مجھے دکھائی نہیں دی! جب غور سے دیکھا تو وہ دالان میں جائے نماز بچھائے سجدے میں تھیں۔ میں نے بائیک اٹھائی اور باہر کی طرف نکلتا چلا گیا۔ حالانکہ میرا جسم دو پہر کی چوٹوں سے ڈھک رہا تھا۔

گاؤں سے باہر ایک مخصوص ٹھکانے پر چھا کا سب دوستوں کے ساتھ تیار بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جا کر بائیک روکی تو وہ تیزی سے بولا۔

”موٹلی میں اچھی خاصی پولیس آگئی ہے۔ لگتا ہے انہوں نے بہت زیادہ سیکورٹی کر لی ہے اپنی۔“

”لیکن تو مجھے یہ بتا! رندھاوے کی کوئی خبر نہیں! اس کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”اب اس کی طرف سے شاید ہی کوئی خبر آئے! کیونکہ وہ معطل ہو گیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے! کوئی نیا بندہ آ گیا ہے یہاں۔“ میں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا۔

”لگتا تو ایسا ہی ہے! مگر مجھے پیر زادوں کی خاموشی اچھی نہیں لگ رہی ہے۔“ چھا کے نے مجھے اشارے میں بتایا تو میں نے چار پائی پر پھیلے ہوئے کہا۔

”جھوڑو! یار! کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا ہے تو کھلاؤ! بہت بھوک لگی ہے۔ کھاپی کر سوچتے ہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔“

وہ میری بات سمجھ گیا کہ اب کیا کرنا ہے! سو اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

میں اس وقت کچھ سوچنا چاہ رہا تھا! شام ہوتے ہی میں نے جو پلان کیا تھا! وہ یکسر بدل چکا تھا۔ اگر سردار شاہ دین میرے گھر نہ آتا تو میں کچھ اور ہی کرنے جا رہا تھا۔ میرا نارگٹ شاہ زیب تھا۔ میں اسے اغواء کر کے سردار شاہ دین کو نچانا چاہتا تھا۔ شاہ دین کے آنے سے اور پھر سوئی کی اس سے تلخ کلامی کے بعد جو صورتحال بنی تھی اب اس میں شاہ زیب کا اغواء بننا نہیں تھا۔ میرا اصل نارگٹ صرف یہ تھا کہ پورے علاقے کے لوگوں کے سامنے ان سرداروں سے سوال کروں کہ شاہ زیب نے مجھے اغواء کیوں کر ایا اور قتل کرنے کی کوشش کیوں کی؟ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلتا! میرا مقصد حل ہو جانا تھا۔ وہیں میں نے سوئی کا قصہ چھیڑنا تھا کہ شاہ زیب مجھے صرف سوئی کی وجہ سے قتل کرنا چاہتا ہے۔ سوئی سردار شاہ دین کی بیٹی ہے۔ یہ ثابت ہوتا یا نہ ہوتا لیکن علاقے کے لوگوں کو اک نیا موضوع مل جاتا اور مخالفین تو اس بات کو اچھا ل دیتے۔ میری سوچ اپنی جگہ رہ گئی اور ساری تیاری دھری کی دھری۔ کل دن چڑھے دہر کے ایصال ثواب کے لیے علاقے سے بہت سارے لوگ آنے والے تھے۔ انو! وہیں جو گردش کرتے کرتے واقعات کی صورت اختیار کر گئی تھیں! اس نے دہر کے قتل کو بہت سنسنی خیز بنایا ہوا تھا۔ وہاں بہت سارے لوگ اکٹھے ہونا تھے اور میری کوشش تھی کہ میں وہاں پر اپنا سوال رکھوں! شاہ زیب کو اغواء کیے بغیر میرا مقصد حل ہو رہا تھا۔

”ازیر! اب کیا کرنا ہے! ہمیں تو بتاؤ۔“ میرے ہی ایک ساتھی نے اکتاہٹ سے کہا تو میں نے چو نکتے ہوئے کہا۔

”اس وقت شاہ زیب کا اغواء بہت مشکل ہے! بہت ساری سیکورٹی ہے! ایویں خواہ خواہ بندے مروانے والی بات

پتہ نہیں وہ کیشو مہرہ کس وقت آجائے۔“ ہسپال کے کہنے پر وہ بنا کچھ کہے واش روم کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ڈانٹنگ ہال میں تھے۔ کیشو مہرہ آچکا تھا اور ان سے اپنا تعارف کرا کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک ہندو بیرسٹر تھا۔ گہرا سونا رنگ اور بال برف کی مانند سفید ہو چکے تھے۔ دراز قد اور قدرے فربہ مائل اس نے سونے کی کمائی دار عینک لگائی ہوئی تھی۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد اس نے یونہی پوچھا۔

”کمرہ آپ کو آسانی سے مل گیا نا۔ مطلب کچھ ادھر ادھر کی جرح تو نہیں کی۔“

”نہیں“ میں نے اپنا ایڈریس وہی وینکور کا ہی لکھوایا جس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔“ ہسپال نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”یہاں پر زیادہ تر شوقین مزاج لوگ آ کر ہی ٹھہرتے ہیں نا، اگر اس طرح کا کوئی رو یہ سامنے آجائے تو گھبرائیے گا مت..... وہ.....“

”میں تو اس کا ونزو والی لڑکی کے جھانپڑ لگانے لگی تھی۔“ ہر پریت نے تیزی سے کہا تو کیشو مہرہ بولا۔

”او..... تو آپ نے یہاں آتے ہی محسوس کر لیا۔ یہ تو بہر حال بھگتنا ہوگا۔ یہ جگہ ہی ایسی ہے۔ خیر.....! میں یہاں آپ سے جائیداد کے متعلق ہی نہیں دوسرے امور پر بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کروں گا۔ آپ کو دو دن یہاں رہنا ہوگا۔ دن بھر آپ میرے ساتھ ہوں گے، ہم مختلف آفیسرز سے ملیں گے۔ یہ صرف ایک دکھاوا ہے، میں نے آپ کا کیس بہت غور سے دیکھا ہے اس میں سوائے سیاسی رکاوٹوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں نے اوپر بات کر لی ہے روپیہ تو خرچ ہوگا لیکن ہم یہ معاملہ حل کر لیں گے۔“

”تازہ ترین صورتحال سے..... میں سمجھا نہیں۔“ ہسپال نے وضاحت چاہی۔

”وہی جو رویندر سنگھ اور اس کے بیٹے ہر دیپ سنگھ کے بارے میں ہے۔ آپ اس سارے منظر میں کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ کوئی ثبوت نہیں ہی، لیکن رویندر سنگھ کو پورا یقین ہے کہ آپ کسی نہ کسی حوالے سے اس معاملے میں ملوث ہو۔ وہ کمیشن کے من راج سنگھ سے لے کر ہر دیپ سنگھ تک کی کڑیاں ملارہا ہے۔“ کیشو مہرہ کہتا چلا جا رہا تھا۔ اور ہسپال کے ساتھ ہر پریت سانس روکے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ یوں روانی سے ساری باتیں کہتا چلا جا رہا تھا جیسے سب کچھ اس کی نگرانی میں ہوا ہو، ہسپال کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیشو مہرہ کے ساتھ کیسا رویہ رکھے، کہیں وہی اس کے گلے کا پھندا نہ بن جائے۔ لیکن جسمیندر سنگھ ایسا نام تھا جس نے اسے متعارف کرایا تھا۔ اس پر تو وہ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا تھا۔ تبھی ہسپال سنگھ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہے تازہ ترین؟“

”بات پنجاب پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ چکی ہے اور وہاں پر بحث و مباحثہ بھی ہو چکا ہے۔ ان کے پاس تین آپشن ہیں پہلا کہ ان نفل کے پیچھے آنکھ وادیوں کا ہاتھ ہے اور وہ دہشت گردی کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ سکھوں کی خفیہ تنظیم یہ سب کچھ کر رہی ہے کیونکہ مختلف جگہوں سے یہ شواہد مل رہے ہیں کہ بھنڈارا نوالہ کی خالصتان تحریک دوبارہ فعال ہونے جارہی ہے۔ یہ آپشن زیادہ مضبوط ہے کیونکہ بھنڈارا نوالہ کے پوسٹر لگانے کی مہم کے بارے میں سنا جا رہا ہے اور تیسرا آپشن وہ ذاتی دشمنی کو دے رہے ہیں۔ اسی تیسرے آپشن میں رویندر سنگھ نے تو آپ کے خلاف واویلا مچایا لیکن اب تک کی صورتحال کے مطابق کوئی ثبوت نہ ہونے کے باعث اور آپ کی طرف سے کسی بھی قسم کے غلط رویے کے بارے میں نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دی جارہی۔ میں چونکہ تین دن پہلے تھائی لینڈ سے آیا ہوں اور جسمیندر نے مجھے وہاں تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا اس.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن ہسپال نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”یہ پولیس والی بات جسمیندر نے بتائی ہے؟“

”نہیں..... نہیں..... اس نے نہیں..... اس نے تو مجھے تمام پس منظر بتانے کے ساتھ اب تک کی صورتحال بتائی ہے۔ آگے کیا کرنا ہے اس بارے میں بھی کچھ خدوخال ہیں میرے پاس یہ پولیس والی ساری رپورٹ تو میں نے آ کر لی ہے نا۔ اب تک پولیس کے پاس تمہارے لیے کوئی بھی منفی پوائنٹ نہیں ہے بلکہ پلس پوائنٹ ہیں کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا تمہیں خواہ مخواہ اوگی تک محدود رکھا جا رہا ہے۔ بلجیت سنگھ نے حویلی کو دوبارہ بنانے پر رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہ زور دیا جا رہا ہے کہ تم ہی اس ساری صورت حال کی وجہ ہو، جبکہ ثبوت کوئی نہیں۔“

”یہ بات تو ہوگئی مہرہ صاحب، سکھ تنظیم کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟“ ہر پریت نے الجھتے ہوئے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

”وہی گوگو کی کیفیت ہے، اگر انہیں ذرا سا بھی اشارہ مل جائے تو وہ ساری توجہ اس طرف نہ لگا دیں، آپ دیکھو اب تک ایک بھی گرفتاری نہیں ہوئی خیر.....! اب میں آپ کو مشورہ یہ دینا چاہ رہا ہوں کہ آپ اپنی ساری توجہ صرف اور صرف اپنی جائیداد کے حصول کی طرف لگا دیں، رویندر سنگھ اس راہ میں روڑے انکائے گا، یہی تمہاری بے گناہی بنے گی۔ کیونکہ دشمنی ان کی طرف سے ہوگی، تمہاری طرف سے نہیں۔ اوگی پنڈ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کریں۔ مطلب دفاعی پوزیشن میں آجائیں۔ ہو سکے تو بلجیت سنگھ کے سیاسی حریف کو اپنے قریب کریں اسے معاشی مدد دیں وغیرہ وغیرہ۔“

”اس طرح تو میرا مقصد بہت دور تک، بلکہ میری رسائی سے بھی آگے تک نکل جائے گا۔ بہت صبر کرنا پڑے گا۔“ ہسپال نے یوں کہا جیسے وہ ناکام ہو رہا ہو۔

”دیکھو..... ایک راستہ ہے نفل و غارت گردی کا۔ اس میں پولیس سے لے کر خفیہ ایجنسیاں تک آپ کے پیچھے لگ جائیں گی۔ پھر فرار کا راستہ نہیں ہوگا آپ کے پاس۔ یہ طے نہیں کہ آپ اپنا کام مکمل بھی کر لو گے یا نہیں۔ لیکن دوسرا راستہ طویل تو ہے لیکن سو فیصد امکان ہے کہ آپ رویندر سنگھ کے خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹا دو، مقصد انہیں ختم کرنا ہے۔“

مہرہ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو ہسپال نے اچانک ہی ایک سوال کیا۔

”آپ اس سارے معاملے میں دلچسپی صرف جسمیندر کے کہنے پر لے رہے ہیں یا.....“

”میرا ذاتی مقصد بھی ہے لیکن یہ کہانی پھر کسی وقت سہی اب تو ہم ملتے ملتے رہے گے، لیکن قانونی مشیر کے طور پر اس کے علاوہ ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایڈووکیٹ گل بلاشبہ سنئیر وکیل ہیں۔ بہت سمجھدار ہیں، وہ جائیداد کا معاملہ حل بھی کر لیں گے، لیکن خفیہ والے ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سکھ تنظیم کے بڑے سرگرم رکن ہیں۔ اس وجہ سے بھی وہ آپ کی راہ میں رکاوٹ آجانی تھی۔ اب بھی اور اس وقت بھی آپ کی نگرانی ہو رہی ہے، گردن موڑ کر مت دیکھنا لیکن ہمارے دائیں طرف جو جوڑا بیٹھا ہے وہ خفیہ والوں کا ہے، یہ ڈرامہ خود چایا ہے ورنہ میں آپ سے اوگی میں آ کر بات کر سکتا تھا یا میرے جیہر یا گھر میں بات ہو سکتی تھی۔“

”مطلب“ انہیں اپنا آپ دکھایا جائے کہ ہم نہایت شریف آدمی ہیں۔“ ہسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بالکل! آپ کا یہاں ہونا صرف تفرق اور میرے ساتھ لوگوں کے ساتھ ملنا ملنا ہے۔ کمرے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کرنا، ممکن ہے کوئی خفیہ کیمرہ یا مائیک لگا ہو، مطلب آپ جس قدر بہتر انداز میں ان تک اپنا پیغام پہنچا سکیں، ہو سکتا ہے یہی جوڑا آپ کے نزدیک ہونے کی کوشش کر لے یا کوئی نیا آجائے۔“ مہرہ نے مسکراتے ہوئے یوں کہا جیسے بہت دلچسپ بات بتا رہا ہو۔ اسنے میں بہرہ کھانا لگانے لگا۔

”اچھا آپ آنے والے دنوں میں خدوخال کی بات کر رہے تھے۔“ ہر پریت نے پوچھا تو مہرہ ہنس دیا اور پھر بولا۔

”اسمارٹ گرل..... میں مانتا ہوں کہ تم بہت بہادر اور ذہین ہو لیکن ابھی یہ مرحلہ طے ہو جانے والا بھی ہم دودن یہاں ہیں بہت ساری باتیں ہوں گی فی الحال تو ہمیں کھانے پر توجہ دینی چاہیے۔“

کھانے کے دوران وہ یہاں کے عدالتی نظام، جائیداد کے امور کے بارے میں باتیں جالندھر میں اپنے اثر و رسوخ اور ایسی ہی بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ ان کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ یونہی گپ شپ میں کھانا ختم ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد کیشو مہرہ اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اس کے ساتھ ڈاننگ ہال سے باہر تک آئے۔ اس دوران اس جوڑے کو انہوں نے غور سے دیکھا۔

”لو جی، پھر صبح آپ نے میرے پاس آ جانا ہے اور آنے سے پہلے مجھے فون کر دینا ہے ابھی میں کسی عدالت میں پیش نہیں ہو رہا اور یہ دودن آپ کے لیے ہیں۔“ اس نے پہلے جہاں سے ہاتھ ملایا اور پھر ہر پریت سے ہاتھ ملا کر خوش دلی سے بولا۔ ”اور تمہارا سوال مجھ پر ادھار رہا۔“

”میں منتظر رہوں گی۔“ اس نے کہا تو وہ پارکنگ کی جانب بڑھ گیا۔ اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ کمروں کی رو کی دوسری جانب ایک بڑا سارا لان تھا، سبز لان جس کے کناروں پر پھول اُگے ہوئے تھے۔ اس میں بید کی نفیس کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دور دور جوڑے بیٹھے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔ وہ بھی ایک سنسان سے گوشے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”جائے پیس یا سو ڈا.....“ جہاں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

”فی الحال تو چائے پیتے ہیں۔ نیند تو آگے نہیں آجانی باتیں کرتے ہیں۔“ ہر پریت بولی۔ اس کے لہجے میں نجائے کیوں یا سٹیک رہی تھی۔ جس پر جہاں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”خیر تو ہے تم یکدم اداس ہو گئی ہو؟“

”نہیں“ میں اداس نہیں ہوں۔“ وہ پھر اسی لہجے میں ہی بولی۔

”کہیں مہرہ کی بات کا برا تو نہیں منایا تم نے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے دکھ سے کہا۔

”تو پھر یہ تمہارا الجھ.....؟“ جہاں نے تشویش سے پوچھا۔

”جہاں! اویکھو ہم بحیثیت سکھ قوم اس ملک میں غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں جس کے لیے ہمارے بڑوں نے قربانیاں دیں۔ اس ملک میں ہمارا تاریخی قتل ہوا جس کی آزادی کے لیے ہم نے جنگ لڑی..... اب یہاں ہم محکوم کی زندگی گزار رہے ہیں کیا ہے ہماری قوم کا مستقبل؟“

”میں بتاؤں..... اصل میں کسی بھی حریت پسند قوم کو ختم کرنا ہوتا تو اس میں حریت جیسے جذبے کو مار دیا جاتا ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں میری جان ایک تو اسے لذت پرستی پر لگا دو جیسے آج کل سکھ قوم کے نوجوان سب سے زیادہ شراب پیتے ہیں عورت استعمال کرتے ہیں گندے سے گندہ گانا سنتے ہیں بلکہ سبھی تاج گانے کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ پنجاب دنیا بھر میں وہ خطہ ہے جہاں سب سے زیادہ شراب پی گئی ہے۔“ میرا نہیں! اقوام متحدہ کے ادارہ کا سروے ہے۔ سکھ قوم کو شراب میں ڈوبا جا رہا ہے پوری پلاننگ کے ساتھ۔ ہر گاؤں میں شراب بیچنے والی دکان ہے کیوں نہیں ختم کرتے..... اور دوسرا طریقہ ان پر خوف مسلط کر دو انہیں ذلیل کروانا ذلیل کرو کہ ان میں حریت کی خوبی

قلمروا

نہر ہے۔ یہ سب کچھ سکھوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور سکھ ہی اپنی جاہلیت کی بنا پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔“ جہاں بھی اچانک ہی جذباتی ہو گیا۔

”تو پھر یہ طے ہوا جہاں..... اوگی میں ہم لوگوں کے پاس جائیں گے اور اس بارے میں مہم چلائیں گے۔ انہیں اس کا شعور دیں گے۔“ ہر پریت نے جہاں کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”جذباتی انداز میں فیصلہ کر لینا بہت آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے پریتو..... لیکن ہم ایسا کچھ کریں گے کم از کم اپنی حد تک ضرور کچھ کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے طویل سانس لیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے چائے کا پوچھا تھا۔“

”چلو چل کر کمرے میں پیتے ہیں۔ اگر یہاں رومانوی جوڑا بن کر رہنا ہے تو ویسا ہی رہیں۔ ایویں خواہ مخواہ خود پرڈ پریشن طاری کیا ہوا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ہر پریت زبردستی مسکرا دی۔

وہ دونوں اٹھ کر چہل قدمی کے سے انداز میں اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ تنہی ہر پریت نے کہا۔

”جسی.....! کیا تمہیں اس کیشو مہرہ پر یقین ہے۔ کیا یہ سب کچھ ٹھیک کہتا تھا؟“

”مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں پریتو میرے لیے تو وہ جسمیندر سنگھ تھا سمجھ لو کہ اس نے اپنا سایہ دو بدو ملاقات کے لیے یہاں بھیج دیا اور میں جانتا ہوں کہ اس کے بدلے اس نے مہرہ کو نجائے لٹا بڑا فائدہ دیا ہوگا جو یہ ہمارے پاس یہاں تھا۔ باقی دیکھتے ہیں وہ دودن میں کیا کرتا ہے۔“ جہاں نے چابی دروازے میں لگاتے ہوئے کہا پھر اندر داخل ہوتے ہی روشنی ہو گئی۔ انہوں نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک بیڈ پر آ لیٹے۔ دونوں ہی ہلکے ہلکے لباس میں تھے۔ دھیمی روشنی میں ہر پریت کا ساتھ جہاں کو وہ ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔ قربت کا اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک ایک دوسرے کو سکتے رہے۔ تنہی ہر پریت نے کہا۔

”جسی.....! کبھی تم نے سوچا تھا کہ تم پنجاب آؤ گے اور میرے جیسی سر پھری لڑکی سے ملاقات ہوگی اور یوں ہم ایک ہی بیڈ پر اتنے قریب ہوں گے۔“

”میں نے سوچا تو نہیں تھا جی بات تو یہ ہے لیکن میرے لاشعور میں کہیں تھا کہ اگر مجھے کوئی لڑکی پسند آئی تو وہ پنجاب ہی سے ہوگی کیونکہ پھوپھو سکھ جیت کور نے ہمیشہ پنجاب کی لڑکی کا ایک خاکہ میرے ذہن میں ابھارا تھا جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا تم بالکل ویسی ہو بس کبھی کبھی اچھی نہیں لگتی.....“ جہاں نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ وہ چپک کر بولی۔

”جب تم یہ جین اور شرٹ پہنتی ہو اور یورپین کی طرح لگتی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا یہ بری بات ہے نہ پہنوں؟“ اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے۔“ جینج رہتا ہے لیکن سچی بات ہے تم شلوار قمیص میں بہت پرکشش لگتی ہو۔“ وہ اس کے بالوں سے کھیلتا ہوا کہنے لگا۔ ”اس کے علاوہ تمہاری باتیں بہت اچھی ہیں جس میں خلوص ہوتا ہے نور نہ وینکور میں جس لڑکی سے بھی بات کر لو اس کی ہر بات میں کہیں نہ کہیں کوئی مقصد یا لالچ ہوتا ہے۔“

”کیا وہ سب ایسی ہیں؟“

”اس میں ان کا قصور نہیں ہے وہاں ماحول ہے نا ایک مادی معاشرہ ہے جہاں صرف اپنی ذات کے متعلق ہی لاپاہتا ہے۔“ اس نے کہا تو ہر پریت وینکورو کی باتیں کرنے لگی اپنی باتوں میں وہ گم ہو کر کب سو گئے انہیں احساس ہی

صبح وقت پر تیار ہو گئے ہر پریت نے موتی رنگ کا شلوار قمیص پہن لیا تھا اور ہلکا ہلکا میک اپ کر لیا۔ جہاں بھی تیار ہو گیا۔ انہوں نے ناشتہ وہیں کرے میں منگوا لیا۔ تقریباً دس بجے انہوں نے کیٹیو مہرہ کو فون کیا تو اس نے انہیں گپتا کالونی کے پاس ایک چوک تک آنے کا کہا تاکہ پھر وہ اکٹھے ہی آگے نکل جائیں۔ جس وقت وہ دونوں لابی سے گزر رہے تھے انہیں وہ رات والا جوڑا وہیں بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ اگر مہرہ نے ان کی نشاندہی نہ کی ہوتی تو شاید وہ اسے اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر چکے ہوتے۔ دونوں نے اپنا کوئی رسپانس نہ دیا اور چلتے ہوئے پارکنگ میں جا پہنچے۔

”پریتو.....! ان دونوں کے علاوہ ہم میں کوئی دلچسپی لے رہا ہے۔“ یہ دیکھو۔“

”مجھے احساس تو نہیں ہوا ابھی میں پہلے ہی دیکھ رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اچھا..... ڈرائیونگ تم کرنا مجھے راستوں کا علم نہیں ہے۔“ جہاں نے کہا تو ہر پریت نے چابی پکڑی اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ دونوں نے غیر محسوس انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیا۔ انہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ البتہ وہی جوڑا اب باہر آ گیا تھا۔ ہر پریت نے گاڑی نکالی اور ریسروٹ سے باہر نکلتی چلی گئی۔ تبھی جہاں مسکرا دیا۔ ریسروٹ کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں آ بیٹھے تھے۔ ان کے بیٹھے ہی کار چل پڑی جو ان کے تعاقب میں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

”پریتو.....! ہمارا تعاقب شروع ہو گیا ہے۔ اب دھیان سے۔“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی کہ ہم ان کی نگاہوں سے کہیں اوجھل ہی نہ ہو جائیں۔“

”نہیں اس کی نظر ہی میں رہیں گے جو ہمیں اپنی نگاہ میں رکھنا چاہتا ہے۔“ جہاں نے کہا تو ہر پریت نے رفتار بڑھادی۔ درمیان میں مہرہ کا فون بھی آیا تو اس نے تعاقب کے بارے میں بتا کر موجودہ پوزیشن کے بارے میں بتایا۔ کچھ دیر بعد وہ گیتا کالونی کے اس چوک میں پہنچ گئے جہاں مہرہ نے انہیں بلوایا تھا۔ فون پر رابطہ کے بعد وہ کالونی کے پاس مل گئے۔

صبح کے وقت لوگوں کے دفتر جانے کا رش بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔ ٹریفک اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی لوگ اپنے اپنے معاملات اور زندگی کی دد میں شامل ہونے کے باعث سڑک پر آ جا رہے تھے۔ کافی ٹھہراؤ تھا۔ مہرہ سڑک کی دوسری جانب کالونی کے گیٹ کی طرف تھا جبکہ انہوں نے آگے کے یوٹرن سے سڑک واپس آنا تھا۔ ہر پریت بڑی احتیاط سے گاڑی موڑ کر چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔ مہرہ گاڑی سے باہر نکل کر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر پریت نے بھی گاڑی ان کے قریب جا کر روک دی۔ جہاں پہلے نکل کر مہرہ کی جانب بڑھ گیا۔ دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر دو چار رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ بولا۔

”یہاں میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ اس گپتا کالونی میں ایک شخص رہتا ہے جو یہاں کے محکمہ مال کے ایک بڑے آفیسر کا سارا معاملہ دیکھتا ہے۔ جب تو وہ کھڑک کی کتاب لے لیکن بہت پہنچی ہوئی چیز ہے۔ میری اس سے ابتدائی ملاقات تو ہو گئی تھی۔ اب آپ لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“

”اس ملاقات کا مقصد.....؟“ جہاں نے پوچھا۔

”یہ طے کرنا ہے کہ آپ اسے رقم نکلتی دو گے مطلب ذیل ہوگی۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ تبھی

جہاں نے دیکھا کہ ہر پریت بھی کار سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ چاہو ہاتھ تو آپ ہی نے کرنی ہے۔“ یہ لفظ ابھی جہاں کے منہ ہی میں تھے کہ اس نے

ہر پریت کی پشت پر موٹر سائیکل پر سوار دونوں جوانوں کو دیکھا پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان نے گن ان کی طرف سیدھی کر لی تھی۔ جہاں کے دماغ میں گھنٹیاں بج گئیں۔ اس نے چیخ کر ہر پریت کو پکارا۔

”ہر پریت..... بچو.....“

اس کی آواز تیز فائرنگ میں دب کر رہ گئی۔

فائرنگ کی آواز سے ماحول جھنجھٹا اٹھا تھا۔ جہاں کے سامنے ہر پریت تھی اچانک ہی سڑک پر گر گئی تھی اس کے پیچھے کار تھی جس میں وہ حملہ آور آئے تھے۔ پھر سڑک کے دوسری طرف دور دور سڑک پر وہ موٹر سائیکل والے تھے۔ جہاں نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے یہ تو اسے پورا یقین تھا کہ ہر پریت کو گولی لگ چکی ہے۔ اسے سنبھالنے والے وہاں پر کوئی اور ہونہ ہو لیکن کیٹیو مہرہ تو تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ حملہ آوروں کو ہاتھ سے نہ نکلے دے۔ یہ فیصلہ اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ چلتی ٹریفک کی پرواہ کیے بغیر حملہ آوروں کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ اس جانب سے تھا، جدھر حملہ آوروں کا منہ تھا۔ فطری طور پر انہوں نے سامنے ہی کی طرف بھاگنا تھا اگر وہ اپنا موٹر سائیکل موڑتے تو اس میں انہیں وقت لگنا تھا یا پھر نیا فائر کرنے کے لیے اسے گن تو سیدھی کرنا ہی تھی۔ جہاں کو اپنی جانب لپکتا دیکھ کر موٹر سائیکل سوار نے فرار ہونا چاہا۔ اس نے گیسر تو پہلے ہی لگا دیا ہوا تھا۔ جب تک جہاں ان کے قریب پہنچا انہوں نے موٹر سائیکل دوڑانی، تبھی اس کا ہاتھ فائر کرنے والے اس شخص کو لگا جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا ہاتھ کچھ اس طرح بڑا تھا کہ موٹر سائیکل ڈمگ گئی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے۔ پیچھے والا جہاں کے قابو میں آ گیا تھا۔ لیکن موٹر سائیکل چلانے والا توازن نہ ہونے کے باوجود بھی ڈمگاتا ہوا نکل گیا۔ حملہ آور جیسے ہی زمین پر گرا وہ سپرنگ کی مانند اچھلا اس نے گن سنبھالنے اور اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی اور بھاگ نکلا۔ جہاں اس کے پیچھے تھا۔ وہ سڑک پار کر کے گیتا کالونی کی مخالف سمت میں تیر ہو گیا۔ جہاں نے اسے نگاہوں میں رکھا اور اس کے تعاقب میں پوری قوت سے دوڑا۔ ان کے درمیان میں تھوڑا سا ہی فاصلہ تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ پکڑا نہ جاؤں اور یہ پوری قوت صرف کر کے اسے اس لیے پکڑ لینا چاہتا تھا کہ اس حملہ آور کے پیچھے کون ہے وہ اسے بے نقاب کرنا چاہتا تھا وہ سڑک سانپ کی آنت کی مانند پھیلتی جا چلی جا رہی تھی۔ تاہم لمحہ بہ لمحہ ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ گیا جہاں نے پوری قوت صرف کی اور اس پر پھلانگ لگادی۔ یہ داؤ کار گر ثابت ہوا حملہ آور اس کے ٹھکنے میں آ گیا۔ دونوں سڑک پر جا گرے حملہ آور نے جس قدر مزاحمت کی جہاں نے اسی قدر اسے تھپڑوں اور گھونسلوں پر رکھ لیا۔ چند لمحے ہی گزرے ہوں گے حملہ آور ہانپ گیا مگر جہاں نے اسے نہیں چھوڑا اس نے حملہ آور کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ یہاں تک کہ حملہ آور نے مزاحمت ترک کر دی۔ اور بے جان ہو کر سڑک پر پھیل گیا۔

یہ تو وہی نہیں سکتا تھا کہ بھری سڑک پر دو آدمی لڑ رہے ہوں اور ان کے گرد تماشا ہی اکٹھے نہ ہوں جن لوگوں نے سڑک ہلار ہوئے دیکھا تھا ان میں سے کچھ لوگ بھی جہاں کے پیچھے آ گئے تھے۔ جہاں نے شدت جذبات سے اس کی پہلی میں ٹھوک مارتے ہوئے پوچھا۔

”بول کیوں کیا فائر.....؟“

”نہیں بتاؤں گا..... تو چاہے مجھے مار دے.....“ نیچے پڑے ہوئے لڑکے نے بے جان سی آواز میں کہا۔ اور یوں لہو لہو جیسے بے ہوش ہو۔ لاشوری طور پر جہاں کے ذہن میں ہر پریت کا بھی خیال تھا۔ نبھانے وہاں کیا منظر ہوگا۔ اس نے اٹھ اٹھ دیکھا ایک سائیکل رکشہ قریب کھڑا تھا جہاں نے اسے بلایا وہ قریب آیا تو اس نے حملہ آور کو اٹھا کر اس پر تقریباً لٹا دیا پھر خود سوار ہو کر سڑک کی جانب چلنے کا کہا۔ وہ لوگوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر سڑک کی جانب چل دیئے۔

سردھری کیوں ہے؟ سوئی پوری طرح تیار تھی کہ وہ آج اعلان کر دے گی، پھر جو تماشہ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اس وقت میں گھر سے نکل کر دلبر کے گھر کی جانب جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس بار پولیس میں رندھاوا جیسا بندہ نہیں ہے جو میری مدد کرے گا، دو دن پہلے ہی انہیں معطل کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ نئے ڈی ایس پی اور انسپکٹر آئے تھے وہ سرداروں کے اپنے ہاتھ کے بندے تھے۔ اب سرداروں کے ساتھ جو چھڈا بھی لیتا تھا، وہ بہت سوچ سمجھ کر اور بڑے حوصلے سے لینا تھا۔ سرداروں کی اپنی ایک قوت تھی اس کے ساتھ ساتھ پولیس کے لوگ بھی ان کے اپنے ہاتھ کے تھے، وہ کسی طرح کی بھی دھونس جما سکتے تھے۔ میرے ساتھ چند ساتھی تھے، جوڑنے بھڑنے اور اسلحہ چلانے میں ماہر تھے، لیکن سرداروں کے مقابلے میں ہم کچھ بھی نہیں تھے۔ میں ناشتہ کر چکا تھا اور میرے ذہن میں یہی خیالات گردش کر رہے تھے۔ پھر اچانک میں نے سب کچھ اپنے دماغ سے جھٹک دیا، میں نے اپنا رولور اٹھایا، فالٹو میگزین اپنی جیبوں میں بھرے اور باہر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلنے لگا۔ میں اندر والے کمرے سے باہر دالان میں آیا تو سوئی جیسے میرے انتظار میں ہی تھی، میری طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے بولی۔

”جمال! میں نے بھی تیرے ساتھ جانا ہے، کیونکہ اماں کو میں نے پہلے ہی بھیج دیا ہے۔“
”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بات تو کیوں نہیں سمجھتا کہ سردار کبھی بھی مجھے علاقے کے سامنے یہ کہنے نہیں دے گا کہ میں اس کی بیٹی ہوں۔“
”اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ آؤ چلیں۔“ میں نے کہا اور باہر صحن میں کھڑی بائیک کو سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا، سوئی نے گیٹ کھولا تو میں گلی میں آ گیا۔ جب وہ میرے پیچھے آ بیٹھی تو میں نے بائیک بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑنے لگی۔ جس میں بدن سے اٹھنے والی ٹیسس دب کر رہ گئی تھیں۔ میں اپنی گلی پار کر کے چوک میں آ گیا۔ وہاں سناٹا تھا، اچھو کرانے والے کی دکان بھی بند تھی۔ دائیں جانب مڑ کر دوسری گلی میں دلبر کا گھر تھا۔ پہلی گلی پار کی اور پھر دوسری گلی کے سامنے آ کر مڑنے ہی والا تھا کہ سامنے سے ایک جیب نے میرا راستہ روک لیا۔ میں اگر محتاط نہ ہوتا تو بلاشبہ اس کے ساتھ ٹکرا جاتا تھا، میرے پیچھے گلی سنسان تھی۔ سامنے سے جیب نے روکا ہوا تھا، دائیں جانب شامیانے لگے ہوئے تھے۔ جس کے اندر بیٹھے لوگ پڑھ رہے تھے۔ بائیں جانب کی گلی خالی تھی۔ میرے فرار ہونے کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا، تبھی میں نے سرسرا تے ہوئے کہا۔

”سوئی! حوصلہ رکھنا، اگر گڑبڑ ہو جائے تو دلبر کے گھر کی طرف بھاگ جانا، رکنا نہیں۔“

”تم نہیں جانتے جمال! انہوں نے ہمارا راستہ روک کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“ سوئی نے آہستگی سے کہا تو میں چونک گیا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے، میں اس پر زیادہ نہیں سوچ سکا، کیونکہ جیب کے پیچھے جو کار آ کر دو تھی اس میں سے شاہ زیب باہر نکل آیا تھا، کار میں سے چند بندے نکلے تو ان کے پیچھے ٹیک جیب اور موٹر سائیکل پر سوار لوگ آ گئے، وہ تقریباً بیس کے لگ بھگ لوگ رہے ہوں گے۔ شاہ زیب نے اپنی آنکھوں پر سے سیاہ چشمہ اتارا اور کار میں پھینکتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

”جمال! تیرے پیچھے جوڑ کی بیٹھی ہے، اسے چپ چاپ میرے حوالے کر دے۔۔۔۔۔ ورنہ اسے میں نے چھین تو لینا ہے، تو بھی اپنی جان سے جائے گا۔“

”گلتا ہے تو پاگل ہو گیا ہے شاہ زیب!۔۔۔۔۔ اس لیے اول فول بک رہا ہے، تمہارے لیے یہی اچھا ہے کہ میرا راستہ چھوڑ دے۔“ میں نے سرد سے لہجے میں کافی اونچی آواز میں کہا تا کہ میری آواز دور تک پہنچے۔

”تو اگر یہ سمجھتا ہے ناکہ تو ڈیرے سے بچ کر آ گیا ہے، تو یہ تمہاری بہت بڑی بے وفائی ہے، میں نے خود تجھے جانے دیا،

گیتا کا لونی کے سامنے اچھا خاصا رش لگا ہوا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں پولیس بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک پولیس والے کو مخاطب کیا اور حملہ آور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے فائر کرنے والا حملہ آور۔۔۔۔۔ گرفتار کریں اس کو۔“

پھر اس نے کیشو مہرہ اور ہر پریت کو دیکھنے کی کوشش کی، مگر وہ وہاں نہیں تھے۔

”وہ آپ کے ساتھ تھی۔۔۔۔۔“ ایک پولیس والے نے پوچھا، پھر بے ہوش حملہ آور کی طرف دیکھا۔

”ہاں، کدھر ہے اب وہ۔۔۔۔۔؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”انہیں یہاں قریب ہی ایک نجی ہسپتال لے گئے ہیں۔ گولی کدھے میں لگی ہے، ممکن ہے ایک سے زیادہ فائر ہوں۔“

”آپ کس تھانے سے ہیں اور یہ۔۔۔۔۔“ جہاں کے لفظ منہ ہی میں تھے کہ اس کا سیل فون بج اٹھا، اس نے فوراً ریسیو کیا کیونکہ وہ مہرہ کا فون تھا۔

”پولیس، ہر پریت، خیریت سے تو ہے؟“

”گولی لگی ہے آخر۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا تو جہاں نے انتہائی اختصار سے سارا واقعہ سنا دیا۔ تبھی مہرہ بولا۔

”پولیس کو میں نے ہی فون کیا تھا۔ یہاں پر جو انچارج ہے، سیوارام سنگھ، اس سے میری بات کراؤ۔ پھر اپنی گاڑی لے کر آ جاؤ۔ پتہ میں تمہیں بعد میں سمجھاتا ہوں۔“

جہاں نے سیوارام سنگھ کو فون دیا جو اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا، وہ ایک دو منٹ اس کی بات سنتا رہا، پھر فون واپس جہاں کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے کہا۔

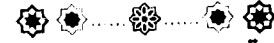
”ہاں بولو مہرہ۔“

”میں نے اس کے ذمے لگا دیا ہے، اب تم فوراً یہاں آ جاؤ، باقی میں سنبھال لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے پتہ سمجھایا اور فون بند کر دیا۔ اس نے ایک نگاہ حملہ آور پر ڈالی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد وہ ہسپتال کی پارکنگ تک جا پہنچا۔ وہ تیزی سے کاؤنٹر تک گیا، جہاں سے اسے ایمر جنسی کے بارے میں بتایا گیا۔ وہ وہاں جا پہنچا، تو کیشو مہرہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”بلڈ کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر اسے آپریشن کے لیے لے جانے والے ہیں۔ تم سنبھالو، میں پتہ کرتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟“

”کون ہے۔۔۔۔۔؟“ جہاں نے سرد سے لہجے میں کہا تو کیشو نے سر ہلاتے ہوئے اس کے کاندھے کو تھپکا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔



صبح کی چمکتی ہوئی دھوپ ہر جانب پھیل چکی تھی۔ دلبر کے گھر کے سامنے شامیانے نصب تھے اور لوگ علاقے بھر سے جمع ہو رہے تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان میں دلبر کے لیے خلوص رکھنے والے کتنے ہیں اور محض دنیا دکھاوے کے لیے

کون کون آئے ہیں۔ اگرچہ یہ ایصالِ ثواب کی محفل تھی لیکن علاقے میں مخصوص حالات کی وجہ سے جو تواتر آ چکا تھا، اس لیے یہ دکھاوا ضروری تھا۔ لوگوں کی یہاں آمد سے پتہ چلتا تھا کہ کون زیادہ دھڑے بندی رکھتا ہے۔ پیر زادوں کے لوگ

بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے، جبکہ سرداروں کے حامی بہت تھوڑے تھے۔ علاقے میں یہی مشہور تھا کہ وہ ذہنی کی واردات میں قتل ہو گیا ہے لیکن سرداروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی وجہ قتل کیا ہے۔ ایصالِ ثواب کی اس محفل میں جو لوگ

وہ تو ہو ہی جاتا تھا مگر۔۔۔۔۔! وہاں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں کسی فی دشمنی کی بنیاد ہی نہ پڑ جائے۔ میں جانتا تھا کہ سرداروں کی

تا کہ اب بھی تم سمجھ جاؤ اور اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ اب یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے چلو شاباش.....“
 ”اور میں بھی تجھے آخری موقع دے رہا ہوں..... پہلے تیرے باپ کا ادھار تھا اب تیرا ادھار بھی لیے پھرتا ہوں یہ نہ ہو کہ ادھار آج ہی چکا دوں۔“ میرے کہنے پر وہ چند لمحے مجھے غصے میں دیکھتا رہا پھر اپنے بندوں کو اشارہ کیا تا کہ وہ سوئی کو بایک پر سے اتار لیں بالکل انہی لمحات میں ان سب کے پیچھے فائرنگ نے فضا کو دھلا کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں جانب سے سنامیانوں میں سے کچھ لوگ نکل آئے اور بائیں جانب والی خالی گلی میں ایک جیب دوڑتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ سوئی بایک سے نیچے اتر گئی اور چلا کر بولی۔

”رشتے میں تم میرے بھائی کہتے ہو..... وہ بھی سوتیلے..... میں نہیں چاہتی کہ تم..... میرے ہاتھوں مر جاؤ۔ اس لیے جیسے آئے ہو ویسے ہی یہاں سے دفعان ہو جاؤ کچھ دیر بعد میں خود جوہلی میں آ رہی ہوں اپنے باپ کو بتا دینا۔“
 ”بے غیرت طوائف..... تیری یہ جرات.....“ شاہ زیب نے غصے میں پاگل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”اوائے..... بے غیرت باپ کے بے غیرت بیٹے..... میں تم سے زیادہ اچھی طرح گالیاں نکال سکتی ہوں۔ اگر تیرے کسی بندے نے کوئی فضول حرکت کی تو اس کا خمیازہ تجھے بھگتنا ہوگا۔ دیکھ رہا ہے تو اب میرے نشانے پر ہے.....“ سوئی نے غراتے ہوئے ارد گرد اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں شامیانوں کی طرف پلچل مچ گئی تھی۔ وہاں سے لوگ باہر نکل کر ہمیں آنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ جمع میں نے کہا۔
 ”اب جاتا ہے کہ ادھار چکاؤں.....“

یہ کہتے ہوئے میں بایک سے نیچے اتر آیا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ میری طرف کھڑا دیکھتا رہا میں اس کے بالکل قریب چلا گیا اور جا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ تب اس نے کہا۔
 ”بہت پیچھے تاؤ گے جمالے.....“

”کہو اپنے لوگوں کو مجھ پر فائر کریں گولی چلا کر مار دیں مجھے کہو.....“ میں نے چیختے ہوئے کہا تو دائیں جانب سے کسی نے زور سے کہا۔
 ”خبردار اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے ورنہ گولی مار دوں گا۔“

فطری طور پر میں نے اس طرف دیکھا تو وہ نیا ڈی ایس پی تھا اور اس کے ساتھ کافی ساری نفری تھی جنہوں نے ہم پر گنیں تانی ہوئی تھیں۔ تبھی سوئی اس طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔
 ”گولی اسے مارو آفیسر جس نے ہمارا راستہ روکا ہے۔“

”تم لوگوں نے جدھر جانا ہے جاؤ۔ شاہ زیب آپ بھی جا سکیں۔“ ڈی ایس پی نے تیزی سے کہا۔
 ”ہم نے تو جوہلی جاتا ہے ڈی ایس پی.....“ میں نے کہا تو شاہ زیب سمیت سبھی چونک گئے۔
 ”نہیں..... بالکل نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ ”اس وقت بالکل نہیں.....“ کہتے ہوئے وہ ہمارے قریب آ گیا۔ پھر شاہ زیب کو کاندھوں سے پکڑ کر کار میں بٹھانے لگا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں بھی وہاں ہی کے لیے مڑا۔ میں بایک پر آن بیٹھا تو اس نے کار واپس موڑ لی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بندوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ سوئی کے ساتھ والے بندے محلی کی کتڑ پر کھڑے رہ گئے اور ہم دہلی کے گھر کی طرف چلے گئے۔ سوئی اندر گھر میں چلی گئی اور میں ہنڈال میں چلا گیا۔

ہنڈال میں علاقے بھر کے چیدہ چیدہ لوگ تھے۔ انہیں خبر ہو گئی تھی کہ شاہ زیب نے میرا راستہ روکا ہے۔ میرا زادہ وقاص بھی ایک طرف اپنے لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے جا کر وہاں بیٹھ گیا۔ اس وقت دعا ہو رہی تھی جب اچانک سردار شاہ دین کی آمد ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ کئی سارے لوگ تھے۔ وہ بھی ایک طرف آ کر

دعائیں شامل ہو گئے۔ دعا ختم ہوئی تھی کہ ڈی ایس پی میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ دھیرے سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
 ”جمال ذرا بات سننا۔“
 میں اٹھ کر اس کے ساتھ ایک طرف ہو گیا اور کہا۔
 ”جی بولیں۔“

”میرے ساتھ ذرا دلبری بیٹھک میں چلو تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

اس نے کہا ہی تھا کہ میں سمجھ گیا۔ وہ رش کے اس وقت میں مجھے اپنے ساتھ رکھ کر سوئی کا اعلان روکنا چاہتا تھا۔ تبھی میں نے پیر زادہ وقاص کو اشارے سے وہیں بیٹھ رہنے کو کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم بیٹھک میں گئے ہی تھے کہ سردار شاہ دین بھی وہیں آ گیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”بیٹھو بیٹا! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بولیں۔“ میں نے کہا اور اس کے سامنے والی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ڈی ایس پی نے بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

”اگر سوئی کو بھی بلا لو.....“ شاہ دین نے کہا۔

”مجھے اس کے بلانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے سردار صاحب لیکن آپ نے موقع کھو دیا..... اس نے اگر یہاں بندے بلوائے ہوئے ہیں تو میڈیا کے لوگ بھی یہاں ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ آپ کی بیٹی ہوئے گا اعلان کر دے گی۔“

”جب ہم بات کر رہے ہیں تو اعلان کی کیا ضرورت ہے؟“ شاہ دین نے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

”اس لیے کہ تمہارے بیٹے نے راستہ روک کر بے وقوفی کی ہے۔ شاید وہ ہمیں اکیلا ہی سمجھ رہا تھا۔“

”میں نے اسے بہت روکا تھا کہ ایسا مت کرو مگر اس نے میری بات نہیں مانی وہی سوتیلہ پن جانیداد کے کھوجانے کا دکھ..... اور غصہ.....“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”تو کیا آپ سوئی کو اپنی بیٹی مان چکے ہیں۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں مانوں گا تو وہ ثابت کر دے گی۔ مجھے یہ پوری طرح احساس ہے۔“ اس نے کسی ہارے ہوئے جواہری کی مانند کہا۔

”ٹھیک ہے پھر اسے کیا اعتراض.....“ میں نے کہا۔

”جمال.....! جب اور جہاں تم چاہو سوئی چاہے وہیں بات کر لو کہ وہ کیا چاہتی ہے لیکن ہمارا ایک سیاسی کیریئر بھی ہے ہم سب کچھ طے کر لیں گے۔ فی الحال یہ بات ہم لوگوں کے درمیان ہی میں رہے۔ باہر نہ نکلے اس میں ہم سب کا فائدہ ہے۔“ سردار نے یوں کہا جیسے یہ سب کچھ اسے بہت مشکل سے کہنا پڑ رہا ہو۔

”ٹھیک ہے سردار صاحب! لیکن بات وہی کیا گارنٹی ہے کہ آپ اپنی بات سے نہیں پھریں گے۔“ میں نے کہا تو شاہ دین کے چہرے پر ایک دم سے جلال آ گیا۔ اس کا چہرہ غصے اور خفت سے سرخ ہو گیا۔ تبھی ڈی ایس پی بولا۔

”میں گارنٹی ہوں..... تم شاید یقین نہ کرو مجھے اوپر سے احکام ملے ہیں سردار صاحب نہ بھی چاہیں تو میں نے یہ معاملہ حل کروانا ہے یہاں تک کہ قانونی معاملات بھی..... یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“

”دیکھ لیں ڈی ایس پی صاحب! انہوں نے اپنی بات سے پھر جانا ہے یہ ہمیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔“ میں نے اسے یاد دہانی کرائی تو وہ غصے سے بولا۔

”نہیں..... اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں مانتا ہوں وہ شاہ زیب کی بے وقوفی تھی بہر حال جو معاملہ مل بیٹھ کر سکون سے طے ہو جائے اس میں لڑنا جھگڑنا عقل مندی نہیں سوئی کا موقف بالکل ٹھیک ہے۔ اسے بلائیں تاکہ اسے بھی معلوم ہو جائے پھر

کل یا پرسوں ہم بیٹھ کر ہر چیز طے کر لیں گے۔“

”اوکے.....! اسے بلانے کی ضرورت نہیں ہوگئی بات.....“ میں نے کہا اور اٹھ گیا وہ بھی اٹھ گئے۔

پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی اپنی سواریوں پر چلے گئے اور میں پنڈال میں آ گیا۔ پیر زادہ وقاص میرے انتظار میں اب بھی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”ہاں بول جمالے..... جاؤں.....“

”ہاں.....! سردار شاہ دین معافی مانگ گیا ہے۔“ میں نے یونہی کہہ دیا۔

”دل نہیں مانتا“ مگر تو کہتا ہے تو مان لیتا ہوں۔ خیر.....! آکھیں ڈیرے پر یا میرے گھر کچھ باتیں کر لیں۔“ اس نے بڑے خجل سے کہا تو میں نے تیزی سے حامی بھری۔

”میرا بھی دل کرتا ہے میں ایک دو دن میں آتا ہوں۔“

”چل ٹھیک ہے“ پھر رب کے حوالے.....“ پیر زادہ نے کہا اور اپنی ہنگی جیب میں بیٹھ گیا۔ وہ چلا گیا تو آہستہ آہستہ لوگ بھی جانے لگے۔ میں نے چھاکے کے ذریعے سوئی کو پیغام بھجوایا تھا کہ سردار سے بات ہوگئی ہے۔

دوپہر کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے۔ سارے بندے اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے اور میڈیا کے لوگ واپس چلے گئے جو کہ مقامی صحافی ہی تھے۔ سوئی اور اماں اندر کمرے میں تھیں اور میں چھاکے کے ساتھ باہر والے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے ساری تفصیل بتا دی تو وہ بولا۔

”جمالے.....! تو مان نہ مان سردار کی اس میں بھی کوئی چال ہے۔ وہ وقت ٹال گیا ہے۔“

”میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ وقت ٹال جائے۔“ میں نے کہا تو پھالے نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا تو بھی وہی سوچ رہا ہے جو میں سوچ رہا ہوں۔“

”کیا بھلا.....؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”اگر بات طے ہوگئی تو معاملہ ہی ختم ہو گیا اور اگر معاملہ ختم ہو گیا تو پھر ہمارا سرداروں سے کیا لینا دینا۔ اس طرح کم از کم دشمنی تو رہے گی۔“

”بالکل! اب سوئی کی بہت زیادہ حفاظت کرنا پڑے گی اس کے ساتھ آئے بندوں کو ہم کب تک یہاں رکھیں گے۔“ میں نے ایک تشویش ظاہر کی۔

”اس کی تم فکر نہ کرو، بلکہ میں تجھے بتانے والا تھا بہت سارے لوگ ہیں جو سرداروں کے خلاف ہیں کسی نہ کسی طرح ان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اب جڑ رہے ہیں ہمارے ساتھ۔ دو چار دن تک میں بتا دوں گا کہ اب ماحول کیا ہے۔ تم پوری توجہ سے یہ سوئی والا معاملہ حل کروادو پھر ذرا سکون سے سوچتے ہیں کہ ان سرداروں کو ناکوں پنے کیسے چبوانے ہیں۔“ اس نے انتہائی غصے میں کہا اور پھر پرسکون سا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ تب میں نے پرسکون سے انداز میں کہا۔

”چھاکے.....! جو کھیل ہم شروع کر چکے ہیں اب چاہیں بھی تو ختم نہیں کر سکتے۔ اب یہ اس وقت ختمے گا جب ہم نہیں ہیں گے یا وہ نہیں رہیں۔“

”یہ تو ہے“ لیکن اس کھیل کے انجام پر کیا ہوگا؟ یہ بھی ہمیں معلوم نہیں، مگر مجھے ایک بات کی سمجھ آ گئی ہے کہ آخر طاقت میں ایسا کیا نشہ ہے۔“ چھاکے نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کھانا کھا کر یہاں سے نکلیں اور کسی ڈیرے پر بیٹھ کر یہ

سوچیں کہ علاقے کے شد زوروں پہلوانوں اور ان لڑکوں کو اپنے ساتھ کیسے ملایا جائے جو کسی نہ کسی حوالے سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ سارے ہی لوگ میرے ساتھ شامل نہیں ہوں گے لیکن جو ہوں گے وہ تو میری طاقت بنیں گے۔ میں ابھی اسی سوچ کا سرا پکڑ کر چل رہا تھا کہ باہر کسی جیب کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کھڑکی میں سے دیکھا باہر ڈی ایس پی کی جیب رکی تھی۔ چھاکے نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا باقی نفری باہر ہی رہی اور ڈی ایس پی اندر آ گیا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ پرسکون انداز میں بیٹھ گیا تو گویا ہوا۔

”آج یہ نورنگر بہت بڑے فساد سے بچ گیا۔ ورنہ کتنی لاشیں گرتیں یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔“

”ڈی ایس پی صاحب! اگر یہ حکمران لوگ انصاف پسندی سے دیانت داری سے اپنے معاملات چلاتے رہیں تو کسی کو بھی ان کی دولت یا جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن یہی لوگ جب انسان پر انسان کی حکمرانی کے نشے میں سب کچھ بھول جاتے ہیں تو پھر رد عمل تو فطری بات ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو جمال.....! مجھے یہاں آئے چند دن ہوئے ہیں۔ علاقے بھر میں میرے بارے میں یہی مشہور کیا گیا ہے کہ میں ان سرداروں کے ایماء پر یہاں آیا ہوں اور انہیں ہی تقویت دوں گا۔ ایسا نہیں ہی یہ ذہن میں رکھنا۔ دوسرا میں نے یہاں آتے ہی یہاں کی امن وامان کی صورتحال کا بہت گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ یقین کر دو اس میں ان حالات کو خراب کرنے میں سردار شاہ دین سے زیادہ شاہ زیب کا ہاتھ ہے میں مانتا ہوں اس بات کو.....“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”یہی تو بات ہے“ لیکن وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”تقریباً ایک سال سے وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف ہی چل رہا ہے خیر..... علاقے کی جو بھی صورت حال ہے میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ وہ کنٹرول میں آجائے لیکن اس وقت میں تم سے جو بات کرنے آیا ہوں سوئی کے بارے میں ہے میرے خیال میں اگر اسے بھی با تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بلاتا ہوں۔“ میں نے کہا تو میرے کہنے سے پہلے ہی چھاکا اندر کی طرف چلا گیا ہمارے درمیان اتنی دیر میں خاموشی ہی رہی کچھ دیر بعد سوئی سر پر آ نچل لیے اندر آ کر بیٹھ گئی۔ تب ڈی ایس پی نے ذرا سا کھنکارتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں میں جو بھی بات کروں گا وہ میں اپنی معلومات کے مطابق کروں گا۔ جہاں آپ کو لگے کہ میری معلومات درست نہیں تو آپ مجھے بتادیں۔ بہر حال آپ کے لیے بہت ساری باتیں نئی بھی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر کہتا چلا گیا۔ ”بلاشبہ یہ معاملہ جو سوئی کے اس دعوے کے بارے میں ہے کہ وہ سردار شاہ دین کی بیٹی ہے اس وقت سامنے آیا جب ملک سجاد کی آمد و رفت سوئی کے گھر شروع ہوئی۔ سوئی کی ماں نے ملک سجاد سے ڈیل کی اور اگر اس وقت ملک سجاد سے بات نہ ہوتی کہ سوئی سرداروں کی بیٹی ہے تو شاید یہ نوبت ہی نہ آتی خیر..... یہ معاملہ چل پڑا ملک سجاد خود لاچکی بندہ ہے اس نے خاموشی اس لیے اختیار کی کہ ایک بار اسی اپنے نکاح میں لے آئے گا تو پھر سرداروں کو بلیک میل کرے گا۔ وہ اپنا پلان سوئی وغیرہ سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا سوئی کو جب معلوم ہوا تو اس کی اپنی سوچ بدل گئی۔ اس نے اپنی شناخت کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ کیا یہاں تک میری بات درست ہے؟“ اس نے سوئی سے پوچھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”جی بالکل درست ہے۔“

”ملک سجاد سے سردار شاہ دین کی نہیں شاہ زیب کی دوستی تھی۔ سوئی کے بارے میں جاننے کے بعد اس نے یہ دوستی

مزید گہری کر لی اسے سبز باغ دکھانے شروع کر دیئے کہ وہ پنجاب سطح کا بہت بڑا لیڈر بن سکتا ہے تاہم انہی دنوں شاہ دین کے معالج نے اسے لاہور بلوا لیا تاکہ اس کا مکمل چیک اپ کیا جائے یہ اس لیے ہوا کہ سوئی نے بھاری رقم دی تھی اس معالج کو؟ یہ کہہ کر اس نے پھر سوئی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”لیکن اس معالج نے جہاں سوئی کو درست بات بتائی کہ وہ اس کی بیٹی ہے ڈی این اے ٹیسٹ رپورٹ کے مطابق وہاں سردار شاہ دین کو بھی ساری کہانی سنائی۔ شاہ دین کو اس وقت سے علم تھا اب وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہ زیب یہاں سے ادھر ادھر ہو تو سوئی اور اس کی ماں سے ڈیل کرنے تاکہ یہ معاملہ چپ چاپ ختم ہو جائے۔ معالج سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ان دونوں کو ملوائے گا وہی ان کی ڈیل کروائے گا۔ ان کے پاس دو آپشن تھے ایک یہ کہ انہیں کسی باہر کے ملک میں بھیج دیا اور ایک معقول رقم انہیں ملتی رہے یا پھر انہیں مناسب جائیداد خرید کر دے دے اور وہ اپنے طور پر ایک پرسکون زندگی گزاریں۔ مگر معاملہ بڑ گیا۔“

”وہ کیسے.....“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ ایسے جمال کہ ملک سجاد کسی طور نہیں چاہتا تھا کہ سردار شاہ دین کی ان سے کوئی ڈیل ہو جائے سوئی اور معالج کے درمیان معاملہ چل رہا تھا۔ انہی کے گھر کے ایک نوکر سے ملک سجاد کو ساری معلومات مل رہی تھیں۔ جب اس نے اپنی گیم کھیلنی شروع کر دی۔ سردار شاہ دین اور شاہ زیب کو بالکل بھی علم نہیں تھا کہ سوئی کون ہے انہیں دیکھا ہی نہیں تھا جب ملک سجاد یہاں آیا اور شدید زخمی حالت میں یہاں سے گھومتا بات چل گئی۔ دونوں باپ بیٹے میں اختلاف بڑھنے لگا باپ کا موقف یہی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اپنانے کا اور انہیں قبول کر لے گا لیکن شاہ زیب انہیں سرے سے قبول ہی نہیں کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ سوئی کے قتل کے ورپے ہو گیا۔“

”مطلب..... اب باپ اور بیٹے کے درمیان یہ کشمکش ہے کہ سوئی کو قبول کر لیں یا نہیں۔ میں نے پوچھا۔

”سردار شاہ دین تو چاہتا ہے۔ شاہ زیب صرف جائیداد کی وجہ سے آڑے آیا ہوا ہے۔ شاید اب تک سوئی کو اپنی بیٹی کے طور پر قبول کر لیتا مگر شاہ زیب نے دھمکی دی ہے کہ پھر وہ کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ جہاں شاہ زیب تمہیں سوئی کے قتل کے لیے تیار کر رہا تھا اور وہ ملک سجاد کو بھی مار دینا چاہتا تھا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے اور تمہیں معلوم بھی نہ ہو کہ کتنا بڑا معاملہ تمہارے ہاتھوں ماضی میں دفن ہو جاتا جس کا تمہیں بھی علم نہ ہوتا۔“

”اب بات کہاں تک پہنچی ہے۔“ میں نے ساری بات سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ دین تو چاہتا ہے کہ سوئی کو اپنی بیٹی کے طور پر قبول کرے مگر شاہ زیب نہیں چاہتا۔ اس میں سوئی کا طوائف ہونا ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ دوسری طرف سوئی اور اس کی والدہ نے آئی جی صاحب سے رابطہ کیا اور مجھے خاص طور پر اس معاملے کو حل کرنے کے لیے یہاں تعینات کیا گیا ہے۔ سوئی کے پاس یہ حق اب بھی ہے کہ وہ جب بھی چاہے عدالت کے ذریعے اس معاملے کو اچھا ل سکتی ہے۔ اس سارے تناظر میں اگر کوئی معقول حل ہو جائے تو بہت اچھی بات ہوگی اس وقت میں آپ دونوں سے یہی مشورہ کرنے آیا ہوں۔“

”ڈی این اے پی صاحب“ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا باپ مجھے بیٹی مان لے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ میری والدین کے خانے میں سردار شاہ دین ہی کا نام درج ہے۔ یہ میری شناخت کا مسئلہ ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے اور یہ تمہارا حق بھی ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں تمہیں شناخت ملے گی اس کے علاوہ کوئی مشورہ؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”شاہ زیب جائیداد چاہتا ہے تاہم وہ ساری جائیداد لے لے..... مجھے بس میری شناخت دے دی جائے۔ بیٹی کے طور پر مجھے قبول کر لیا جائے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ سوئی نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

”پھر ایسا کرتے ہیں میں ان سے بات کرتا ہوں قانونی طور پر سردار شاہ دین تمہیں اپنی بیٹی تسلیم کر لے لیکن ساری جائیداد شاہ زیب کو مل جائے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”بالکل مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اپنے حصے کی جائیداد شاہ زیب کو لکھ کر دے دوں گی۔ یہاں تک کہ اپنے باپ کو بھی سنبھال لوں گی۔“ سوئی نے ایک فخر سے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ کے یہ جذبات میں ان تک پہنچا دیتا ہوں۔ میں خود چاہوں گا کہ شاہ زیب ایک معقول رقم تمہیں دے دے۔ پھر تم ان کی زندگی میں کوئی دخل اندازی نہیں کرو گی۔“

”مجھے شاہ زیب کی زندگی میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے لیکن وہ اگر بہن کا حق جتائے گا تو.....؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”مسئلہ تو یہی ہے ناکہ تم پھر یہ طوائف والی زندگی کو ختم کر کے گمنامی میں زندگی گزارو گی تمہیں بھی معلوم ہے کہ ان کا ایک سیاسی کیریئر ہے۔ وہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو سوئی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے.....! میں ایسی کوئی زندگی نہیں گزاروں گی جس سے انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ میں وعدہ کرتی ہوں میں اپنی ماں کو بھی اس زندگی سے نکال لوں گی بس سردار شاہ دین میرے سر پر بیٹی کہہ کر ہاتھ رکھ دیں۔“ سوئی کا لہجہ حد درجہ جذباتی ہو گیا تھا اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”چلیں یہ طے ہو گیا“ میں آج ہی ان سے بات کرتا ہوں اور اس مسئلے کو ایک دو دن میں نمٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ”ایک بات ہے جمال تب تک کوئی ایسا معاملہ نہ ہو کہ جس سے یہ سارا کچھ کھٹائی میں پڑ جائے ہمیں مسئلے کو سلجھانا ہے۔“

”دیکھیں جی میں پہلے ہی اپنا دفاع کرتا آ رہا ہوں۔ علاقے میں ہونے والے قتل مجھ پر ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے شاہ زیب نے براہ راست مجھے اغواء کر کے قتل کرنے کی کوشش کی اور آج کا واقعہ آپ کے سامنے ہوا۔ مجھ پر اگر وار ہوا تو میں اس کا دفاع تو کروں گا ہاں..... خود سے کچھ نہیں کروں گا اور نہ میں نے پہلے کیا ہے۔“ میں نے بڑے تحمل سے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ تب میں بھی اٹھ گیا۔

”کل دن کے وقت ہم کہیں اکٹھے ہوتے ہیں اور یہ سب طے کر لیں گے..... اب مجھے اجازت۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا سوئی اندر چلی گئی تھی۔ چھانچے اور میری نگاہیں چارہوں میں تو وہ مسکرا دیا میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے اس لیے میں بھی ہنس دیا۔



جب آپریشن کے بعد ہر پریت کو آئی سی یو میں لایا گیا تب تک انوجیت ہسپتال میں آچکا تھا وہ دونوں بے ہوش پڑی ہر پریت کو دیکھ رہے تھے، چھانچے انوجیت نے بڑے تحمل اور آہستگی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”خطرے سے باہر ہے شام تک ہوش آ جائے گا۔ دوبلت اس کے کاندھے میں لگی تھیں اور ایک گردن سے ہلکا سا گرڈ کر گزری ہے۔“ جیسا کہ بتایا۔

”یہ کیسے ہوا؟“ انوجیت نے پوچھا تو وہ تفصیل بتانے کے بعد بولا۔

”حملہ آوروں اور ہر پریت کے درمیان کا رشتہ۔ دراصل نشانہ وہ نہیں تھی میں تھا۔ یہ تو اچانک ڈرائیونگ سیٹ سے نکل کر ہماری طرف آئی تھی۔“ جہاں نے بتایا۔

”سمجھ نہیں آئی اصولاً تو اسے ڈرائیونگ کی طرف کا دروازہ کھول کر اُدھر سے گھوم کر تم لوگوں کی طرف آنا چاہیے تھا؟“ انوجیت نے وضاحت چاہی۔

”اس طرف ٹریفک بھی دروازہ کھولنا خطرے سے خالی نہیں تھا، وہ پنجرہ سیٹ سے نکلی تھی، اگرچہ یہ غلطی ٹریفک سے بچنے کے لیے کی گئی تھی لیکن وہ میرے اور ان حملہ آوروں کی فائرنگ کے درمیان آ گئی۔“ جہاں نے اسے تفصیلی انداز میں ہاتھ کے اشاروں کا بھی استعمال کر کے سمجھایا تو وہ سمجھ گیا۔ تب پوچھا۔

”کون تھے؟“

”میں کچھ نہیں بتا سکتا ابھی حملہ آوروں نے پکڑ لیا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے پوری تفصیل بتائی اور پھر بولا۔ ”اب تم آگے ہو یہاں ہر پریت کے پاس رہو میں دیکھتا ہوں۔“

”تم کہاں جاؤ گے.....؟“ انوجیت نے تیزی سے پوچھا۔

”پولیس اسٹیشن، لیکن پہلے میں کیشیو مہرہ کو فون کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے جہاں نے اپنا سیل فون نکالا اور مہرہ کے نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔ چند باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”تم ابھی ادھر ہسپتال ہی میں رہنا۔ باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرنا۔ دشمن کا کوئی اعتبار نہیں۔“

”میں یہاں پابند ہو کر نہیں بیٹھ سکتا مہرہ۔ مجھے بتاؤ کہ وہ حملہ آور کون تھا اور کس نے بھیجا ہے انہیں؟“ جہاں نے سگھنے لگا۔

”تم ابھی اس سے پوچھنا چھ نہیں کی گئی، میں ابھی پولیس اسٹیشن میں ہی ہوں۔ لگتا ہے یہ کسی گینگ کا معاملہ ہے، درندہ اب تک پولیس والے اسے بے حال کر دیتے۔“

”تم ادھر ہی رہنا، میں آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پولیس اسٹیشن کی لوکیشن پوچھنے لگا۔ پھر فون بند کر کے انوجیت سے کہا۔

”میں جا رہا ہوں۔“

”مگر جہاں تمہیں یہاں کوئی نہیں جانتا، کس سے بات کرو گے؟“ انوجیت بولا۔

”میں دیکھتا ہوں، تم میری فکر مت کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے انوجیت کے کاندھے کو تھپتھپایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو اسے کیشیو مہرہ کی گاڑی باہر ہی دکھائی دی۔ وہ کار ایک طرف پارک کر کے اندر چلا گیا۔ ایک بڑے سے ہال کے کونے میں ایک میز کے گرد مہرہ بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے ایک انسپکٹر جس نے خاکی رنگ کی پگڑی پہنی ہوئی تھی لیکن چہرے پر داڑھی نہیں تھی۔ ایک طرف ایک نوجوان سال کا بیٹھا ہوا تھا۔ مہرہ نے ان سب کا تعارف کرایا۔

”یہ انسپکٹر ہیں یہاں کے، اور یہ گرمیت سگھ چوہان ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ان دونوں سے تعارف کرایا۔

”کیا پراگرس ہے؟“

”انسپکٹر صاحب نے ابھی تک ایف آئی آر درج نہیں کی، درخواست میں نے دے دی ہے، شام چار بجے کے بعد ایف آئی آر کئے گی۔“ مہرہ نے کہا۔

”مجرم پکڑ لیا گیا ہے، موقع واردات دیکھا نہیں گیا، ایف آئی آر کئی نہیں، یہ کیا مذاق ہے۔“ جہاں نے حیرت سے پوچھا تو انسپکٹر نے سرد سے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”وہ لڑکی آپ کی کیا لگتی تھی، جسے گولی لگی ہے۔“

”میری دوست، میری محسن اور میری میزبان.....“ یہ کہہ کر اس نے مہرہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ نے یہ نہیں بتایا کہ فائر دراصل مجھ پر کیا گیا تھا۔“

”میں نے سب تفصیل سے بتا دیا ہے لیکن انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔“ مہرہ نے سکون سے کہا۔

”تم دونوں باؤ لوگ ہو یا، تمہیں کیا پتہ کہ نوکری کس طرح کرتے ہیں۔ آپ حملہ آور کو لے کر بعد میں یہاں آئے ہیں، مگر مجھے فون پہلے آ گیا ہے، آپ لوگوں کے ساتھ کیا کرنا ہے اور اس حملہ آور کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ یہ بھی مجھے بتا دیا گیا ہے۔“ اس نے آنکھیں جھپکائے بغیر اس سرد اور اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو کیشیو مہرہ نے اس سے بھی سرد لہجے میں پوچھا۔

”مطلب، تم ایک کٹھ پتلی ہو۔“

”آپ کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر ذرا سا آگے جھک کر سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”جس بندے نے ہمیں یہاں تعینات کر دیا ہے اس کی تو ممانی ہے نا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بیرسٹر ہیں، یہ فارن سے آئے ہیں لیکن..... جب معاملہ مجھ سے اور ہو جائے تو وہ خود ہی سنبھال لیں گے، ہم نے تو اپنی ڈیوٹی کرنی ہے مہرہ صاحب۔ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کریں، جاب میں اس لڑکی کی دیکھ بھال کریں، مجھے بھی جانا ہے کسی کام سے۔“

”مطلب اتنی دیدہ دلیری سے کہہ رہے ہو کہ تم ہماری کوئی مدد نہیں کرو گے۔“ مہرہ نے پوچھا۔

”آف کورس بیرسٹر صاحب، آپ قانونی جنگ لڑیں، جو آپ کا حق ہے، یہ جان لیں کہ آپ کی جنگ ہمارے لکھے ہوئے پر ہی ہونی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی میز پر سے اٹھائی اور اٹھنے لگا، ”بھی گرمیت سگھنے والے اشارے سے بیٹھنے کو کہا، اور پھر بولا۔

”انسپکٹر..... تم شاید ابھی تک میرا نام سن کر نہیں چونکے ہو یا پھر تم بہت بھولے بن رہے ہو، میں پرتاپ چیمبل سے ہوں..... جو کچھ تم نے کہا ہے، یہ ریکارڈ ہو چکا ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا صحابی صاحب! خبریں تو روزانہ آتی ہیں، چلائیں شوق سے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکلتا چلا گیا۔

مہرہ کے چہرے پر تاریکی چھا گئی، وہ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ تبھی جہاں نے سگھنے سے کہا۔

”میں ابھی اپنی ایمپسی سے بات کرتا ہوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا، یہ کھیل ہی کچھ دوسرا کھیلنا چاہتے ہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہا ہو، پھر اچانک بولا۔

”گرمیت اس حملہ آور کی تصویر لو، اور اسے اپنے چیمبل پر چلاؤ، باقی میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

گرمیت اٹھا اور اس نے سلاخوں کے پیچھے بیٹھے اس حملہ آور کی ویڈیو بنائی اس نے اپنے چہرے کے آگے ہاتھ رکھ لیے وہ واپس آیا تو کیشیو مہرہ کسی کے نمبر ملانے لگا۔ گرمیت تھانے سے نکلتا چلا گیا۔ مہرہ نے اس ساری صورتحال کے بارے میں کسی کو بتایا اور کچھ کرنے کو کہا، جبکہ جہاں حیرت سے یہ دیکھتا رہ گیا کہ قانون کی پاسداری اس طرح بھی ہوتی ہے؟ تبھی مہرہ نے کہا۔

”آؤ چلیں۔“

وہ دونوں تھانے سے نکل کر باہر آئے تو جہاں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ وہ اسے لے کر ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہاں بیٹھنے اور سوڈے کا آرڈر دینے کے بعد کیشیو نے کہا۔

”کچھ سمجھے ہو یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میرا خیال ہے اس پولیس والے کو رشوت چاہیے ہوگی جو آپ نے نہیں دی۔“

جسپال نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”نہیں جسپال! ایسا نہیں ہے، کوئی پولیس انسپکٹر اتنی صاف گوئی، مطلب اتنے دھڑلے سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا، اس نے ہمیں ٹالنا نہیں چلیج دیا ہے“ سواس کے پیچھے صرف اور صرف قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ ہی ہے کیا تم رن ویکو بھول رہے ہو وہ ہم سے کوئی ایسی غلطی چاہتے ہیں جس سے ان کے شک کو یا تو تقویت ملے یا وہ شک دور ہو جائے۔“

”تو آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم مظلوم بن جائیں اور ان سے انصاف کی بھیک مانگتے رہیں۔“ جسپال نے تیزی سے کہا۔

”نہیں“ صرف اتنا کرنا ہے کہ کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھانا، وہ تمہارے بارے میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہارے رابطے کس کس سے ہیں۔ کوئی ایک بھی غلط رابطہ تمہیں شک کے دائرے سے نکال کر یقین کے شنبے میں لے آئے گا۔ گھبراہٹ اور غصے میں ہی غلط قدم اٹھتے ہیں۔ وہ تمہاری یا ہر پریت کے ارد گرد لوگوں کی رسائی دیکھنا چاہتے ہیں کہ مدد کے لیے تم لوگ کن لوگوں کو بلا تے ہو، یہیں سے ان کی تفتیش آگے بڑھے گی۔“ مہرہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، سوائے انتظار کرنے کے.....“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا تو مہرہ نے کہا۔

”نہیں، ہم ابھی یہاں سے اٹھ کر اے سی پی کے آفس میں جائیں گے، جو یہاں سے نزدیک ہی ہے۔“ ”وہاں جا کر ان سے فریاد کریں گے کہ ایک ادنیٰ سا انسپکٹر قانون کی پاسداری نہیں کر رہا ہے۔“ وہ تیزی سے بولا تو مہرہ نے سکون سے کہا۔

”بالکل، فریاد ہی نہیں باقاعدہ لکھ کر دیں گی، ہمیں وہاں پر کچھ وقت گزار کر واپس اس تھانے میں اسی انسپکٹر کے پاس آنا ہے۔“

”کیا آپ بھی کوئی کھیل کھیلنا چاہ رہے ہیں۔“ ”بالکل.....! لیکن اس میں تم بالکل یوں دکھائی دو گے کہ جیسے تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں، تم پریشان ہو رہے ہو کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے اس دفتر میں، ہمیں تقریباً دو گھنٹے ضائع کرنے ہیں۔“ مہرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ سوڈا پیتا رہا اور سوچتا رہا، پھر اٹھ کر اس دکان کے اندر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے ایک فون کال کی، جو تقریباً پانچ منٹ تک چلتی رہی، پھر پیسے ادا کر کے وہ واپس مڑا، جسپال کو ساتھ لیا اور تھانے کی پارکنگ تک چلے گئے۔

وہ اے سی پی آفس میں پہنچے تو وہ اپنے آفس میں نہیں تھا۔ کیشو مہرہ نے وہیں بیٹھ کر درخواست لکھی اور اس کے ماتحت عملہ کو دے کر ڈائری نمبر لے لیا، اس مرحلے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اگلا ایک گھنٹہ انہوں نے وہیں بیٹھ کر اے سی پی کا انتظار کیا۔ بالکل آخری چند منٹ میں وہ اپنے آفس آیا تو وہ دونوں اس کے آفس میں چلے گئے۔ وہ ادھیڑ عمر اور تجربہ کار آدمی تھا۔ کیشو نے جب معاملہ اس کو بتایا تو وہ بولا۔

”اوہ.....! یہ تو وہی معاملہ ہے جس کی خرابی بھی چینل پر چل رہی ہے۔“ ”لیکن آپ کے انسپکٹر نے ہماری کوئی بات نہیں سنی، وہ تو بات ہی کچھ اور طرح سے کر رہا ہے۔“ جسپال نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”آپ نے درخواست دے دی ہے، نا، شام تک اگر وہ اس پر کوئی کارروائی نہیں کرتا تو میں اس معاملے کو خود دیکھوں گا، آپ فکر مند نہ ہوں، میں چھان بین کروں گا کہ ایسا کیوں ہوا۔“ اے سی پی نے تشویش زدہ لہجے میں کہا اور پھر کچھ

تسلی آمیز باتوں کے بعد انہیں بھیج دیا۔ وہ دونوں اس کے آفس سے نکل آئے۔

”اب واپس تھانے جانا ہے، میرے پیچھے آنا لیکن بہت محتاط ہو کر.....“ کیشو نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

وہ جب تھانے پہنچے تو وہاں پر کچھ مزید چینل کے لوگ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر کو گھیرا ہوا تھا اور اس سے سوال کر رہے تھے۔ انسپکٹر بڑے اعتماد سے جواب دے رہا تھا۔ پھر جیسے ہی ان دونوں پر نگاہ پڑی وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”دیکھیں، میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ جس طرح پرتاپ چینل نے رپورٹ دی ہے اور جس طرح خبر کو بگاڑ کر پیش کیا ہے، اصل واقعہ ویسے نہیں ہے، میں نے چھان بین کی ہے۔ فائرنگ کا سرے سے کوئی واقعہ پیش آیا ہی نہیں ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، وہ لڑکی ہسپتال میں ہے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔“ ایک خاتون صحافی نے جذباتی انداز میں پوچھا۔

”آپ میری پوری بات سنیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا نا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔ ”اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ اس موٹر سائیکل سوار کی بائیک غلطی سے ان کی گاڑی کے ساتھ ٹکرائی، انہوں نے اتر کر اسے مارا پٹا، جس کے گواہ موجود ہیں، بھرے بازار میں اسے رگیدا، اسے بری طرح زد و کوب کیا گیا، اور پھر تھانے میں لا کر یہ کہہ دیا کہ اس نے فائرنگ کی ہے۔“

”اس لڑکی کے جو فائر لگے وہ کہاں سے لگ گئے۔ وہ کس کھاتے میں ہیں.....“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔ ”اب صرف یہی مسئلہ حل کرنے والا رہ گیا ہے، میرے خیال میں دو باتیں ہیں، ایک تو کیس مضبوط بنانے کے لیے انہوں نے خود فائر کر لیے ہیں، اور دوسرا خواہ مخواہ کی سنسنی پھیلانے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا گیا ہے۔ بہر حال تفتیش جاری ہے اور میں پوری توجہ سے اس کیس کو دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ معاملہ کب تک صاف ہو جائے گا۔“ ایک دوسرے صحافی نے پوچھا۔ ”دیکھتے ہیں، کب تک ہوتا ہے، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتا ہوا بولا۔ ”اب بس کریں، مجھے اب کچھ مزید کام بھی کرنے ہیں۔“

”انہی لمحات میں جسپال نے ان رپورٹرز کے سامنے اپنی بات کہنا ہی چاہی تھی کہ کیشو نے اسے روک دیا۔ اس نے مضبوطی سے جسپال کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ چلے گئے تو انسپکٹر نے کہا۔

”آپ لوگ پھر آگئے ہو، ممکن ہے میں آپ ہی کو ان سلاخوں کے اندر کر دوں، معاملہ وہی ہے جو میں نے ابھی میڈیا کو بتایا ہے۔“

”انسپکٹر.....! ہم نہیں جانتے کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو، تمہیں ایسا کرنا چاہئے بھی یا نہیں، تمہاری مرضی ہے کہ تم اس واقعے کو کیا رنگ دے رہے ہو لیکن کب تک.....“ کیشو نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تو جائیں نا، جا کر ایسے وسائل تلاش کریں جن سے آپ کی آواز سنی جاسکے۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ ابھی اے سی پی صاحب کے آفس سے آئے ہو، کوئی فائدہ نہیں ہوگا، میری مانو، تو خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکلنا اور جاؤ اپنے اپنے گھر..... سکون کرو..... وہ لڑکی ٹھیک ہو جائے تو اسے گھر میں آرام کرنے دیں..... گڈ لک.....“ انسپکٹر نے کہا اور باہر

نی جانب چل پڑا۔ اسے گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے جسپال نے کیشو سے پوچھا۔

”اب کیا کریں.....؟“

”بس چند منٹ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی اور پرسکون سا ہو کر کرسی پر بیٹھا رہا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ لاک اپ کے اندر سے ایک دم سے اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں، پھر آدھا پانی شروع ہو گئی، تبھی ایک چیخ بلند ہوئی، جس وقت تک دوسرے اہلکار وہاں پہنچتے، اندر سے کسی کی بلبلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ دونوں بھی ہانڈ نکلے اور لاک اپ کی سلاخوں کے سامنے چلے گئے۔ وہ جوجملہ آدھ ہوش بڑا تھا اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے پیچھے چند سپاہیوں نے ایک لمبے ترنگے شخص کو روکا ہوا تھا جو پھرے ہوئے انداز میں اسے مارنے کے درپے تھا۔ وہ اونچی اونچی آواز میں اسے گالیاں نکال رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟“ جہاں کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا۔

”دیکھتے جاؤ، ہوتا کیا ہے، کھیل شروع ہو گیا ہے۔“ کیشو نے سرد مہری سے ہلکی آواز میں کہا۔ اور واپس انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھا، تبھی کسی کا ٹیشیل نے کہا۔

”ارے یہ مر جائے گا..... اس کے خون بہت بہہ رہا ہے۔“

”وہ دوسرے کے بھی تو اتنا بڑا زخم ہے۔“

”ہسپتال تو لے جانا پڑے گا۔ ورنہ یہ تو ہمارے گلے میں انک جائیں گے۔“

”اوئے صاحب کو فون لگاؤ۔“

”وہ باہر ہیں۔“

”تو پھر جلدی بلاؤ بار۔“

وہاں پر اوڈھم مچ گیا، مہرہ اور جہاں تماشا نیوں کی مانند انہیں دیکھتے رہے۔ جہاں کے ذہن میں آ رہا تھا کہ اگر حملہ آور کہیں مر گیا تو سارا ثبوت اور وہ راستہ ختم ہو جائے گا جس سے وہ اپنے اس دشمن تک پہنچتے جس نے حملہ کروایا تھا۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ انسپکٹر بھاگتا ہوا آ گیا۔ حملہ آور فرش پر پڑا تھا۔ وہ ایک ہی نگاہ میں حالات کی نزاکت بھانپ گیا۔ ان دونوں کے خون بہہ رہا تھا۔ انسپکٹر دونوں ہی کو ہسپتال لیجانے پر مجبور تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر تیزی سے بولا۔

”فوراً..... فوراً انہیں ہسپتال لے چلو۔“

”سر..... ایبویٹنس کے لیے فون کر دیں سر.....“ ایک کا ٹیشیل نے تیزی سے کہا۔

”اوئے نہیں، بہت دیر ہو جائے گی، باہر دیکھو، کوئی وین وغیرہ مل جائے، نہیں تو ٹیکسی ہی پکڑ لینا۔“ انسپکٹر نے حکم دیا تو دو چار کا ٹیشیل باہر کی جانب لپکے، بھی مہرہ نے جہاں سے آہنگی کے ساتھ کہا۔

”چلو، نکلتے ہیں۔“

وہ دونوں اٹھے ہی تھے کہ ایک کا ٹیشیل نے مہرہ سے کہا۔

”آپ کی گاڑی بھی تو ہے ناشاب ان کو لے چلیں۔“

تبھی مہرہ نے ایک نگاہ انسپکٹر پر ڈالی اور طنز یہ لہجے میں بولا۔

”سوری..... ان دونوں میں سے کوئی مر گیا تو تیرے انسپکٹر نے سارا مدعا مجھ پر ڈال دینا ہے جاؤ..... جا کر کوئی دوسری گاڑی تلاش کرو۔“

وہ کا ٹیشیل عجیب سی نگاہوں سے گھورتا ہوا ایک طرف ہو گیا جبکہ انسپکٹر نے انہیں غصے میں دیکھا۔ مہرہ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے تھانے سے باہر آ گئے۔ جہاں ایک وین کو ان کا ٹیشیلوں نے گھیرا ہوا تھا۔ انہوں نے ڈرائیور کو نیچے اتارا ہوا تھا، ایک ان سے بات کرنے لگا تو دوسرے تھانے کی طرف لپکے، مہرہ پارکنگ میں

اپنی گاڑی کے پاس رک گیا۔ پھر جہاں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم نے اپنی گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آنا ہے، اگر میں گم بھی ہو جاؤں تو فون پر رابطہ کر لینا۔ کسی بھی غیر یقینی معاملے میں واپس ہسپتال چلے جانا۔“

”کیا ایسی کوئی خطرناک بات ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”میں ایک رسک لینے جا رہا ہوں۔ ہو گیا تو دیکھنا.....“ اس نے یہ کہا ہی تھا کہ ان دونوں حوالا تئوں کو باہر لایا گیا۔ وہ دونوں بے ہوش تھے اور کا ٹیشیلوں نے انہیں ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اٹھایا ہوا تھا۔ انہیں دین میں لایا پھینکا تو وہ چل دی۔ اس وقت مہرہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ریش والے علاقے سے نکلتے ہی وہ ایک بڑی سڑک پر آ گئے، جیسے ہی وہ ایک موٹر سائیکل کے لیے آہستہ ہوئے، سڑک سے آنے والی ایک سفید ویگن نے ان کا راستہ روکنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک سائیڈ دبا کر انہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ تبھی ویگن بھی رک گئی اور اس میں سے پانچ چھ نوجوان گئیں لے کر باہر آ گئے۔ شاید کا ٹیشیلوں کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ممکن ہو جائے گا۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر سائیڈ ڈور کھولا اور انہیں نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک کر کے اترنے لگے، تب تک ایک اور نوجوان ڈرائیور کو نیچے اتار چکا تھا۔ جیسے ہی دونوں حوالا تئوں میں رہ گئے، وہ اس وین میں بیٹھ گئے، دونوں ویگنیں چل پڑیں اور وہ کا ٹیشیل اور ڈرائیور وہیں کھڑے منہ تکتے رہ گئے۔ جہاں یہ سب دیکھ رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ مہرہ نے کیا کھیل کھیلا ہے، اس لیے دھیرے سے مسکرا دیا۔

آگے دو ویگنیں تھیں، اس کے پیچھے مہرہ اور اس کے بعد جہاں، تیزی سے جا رہے تھے۔ اچانک حوالا تئوں والی وین سیدھی نکلتی چلی گئی اور کراس پر سے دوسری وین دائیں جانب مڑ گئی اور مہرہ بائیں جانب چلا گیا، جہاں کو سمجھ نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوا لیکن اس نے مہرہ کا تعاقب جاری رکھا۔ تقریباً دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ ایک ایسی جگہ آ نکلے جہاں بہت کم آبادی تھی۔ زیادہ تر فیکٹریاں تھیں۔ اسے لگا کہ یہ فیکٹری ایریا ہے، مہرہ پختہ تارکول والی سڑک سے اتر کر نیم پختہ راستے پر چل پڑا اور پھر ایک فیکٹری کے آگے جا کر، اگلے ہی لمحے گیٹ کھل گیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ سفید وین وہاں کھڑی تھی، کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ہال نما کمرے میں تھے، جہاں اچھا خاصا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ وہیں زمین پر وہ دونوں حوالا تئوں پڑے ہوئے تھے۔ چند نوجوان ان کے ارد گرد کھڑے تھے۔ مہرہ کو دیکھتے ہی ایک نے کہا۔

”سر.....! جگ دیو کو لے جائیں۔“

”ڈاکٹر نہیں آیا.....؟“ اس نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اس وقت نہیں ہے مگر ڈپنسر ہے وہ آ رہا ہے۔“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک ادھیڑ عمر سا بندہ ہال میں داخل ہوا۔ اس کے پاس میڈیکل بیگ تھا۔ اس نے آتے ہی ان دونوں کو دیکھا جو اس وقت ہوش میں تھے۔

”پہلے جگ دیو کی پٹی وغیرہ کروا سے بعد میں دیکھنا شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔“ مہرہ نے سرد لہجے میں کہا تو حملہ آور نے حسرت بھری نگاہوں سے مہرہ کو دیکھا، ڈپنسر نے جگ دیو کو دیکھنا شروع کیا، تو مہرہ اس حملہ آور کے پاس بیٹھ گیا، پھر سرد سے لہجے میں غراتے ہوئے بولا۔

”دیکھ.....! اب زندگی اور موت دونوں تیرے اپنے اختیار میں ہے جو کچھ میں پوچھنا چاہتا ہوں، وہ اگر سچ دے گا تو تیری مرہم پٹی کر کے تجھے اچھا کھانا دیا جائے گا، اور شہر میں سکون سے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر نہیں بتائے گا تو مار کر ایسی گندی جگہ پھینکوں گا جہاں پر کتے تجھے نوح نوح کر تیری شناخت ہی ختم کر دیں گے..... اب بول کیا کرنا ہے۔“

جا کر ایک چار پائی پر بیٹھ گیا۔ سبھی ایک جوشیلے سے نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔

”جمال.....! یار یہ شاہ زیب تیرے پیچھے ہی کیوں پڑ گیا ہے؟ نہیں اس لڑکی کا چکر تو نہیں ہے؟“

”یہ تمہارا چکر سے مراد کیا ہے؟“ میں نے جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھ لیا۔

”بہی کہ اسے وہ پسند آگئی ہو جبکہ وہ تمہارے پاس ہے۔“ اس نوجوان نے کہا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر بات کیا ہے۔“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”بس دو چار دن ٹھہر جایاں تجھے خود بخود معلوم ہو جائے گا مگر یہ ذہن میں رکھو کہ شاہ زیب اتنا گھٹیا نہیں کہ وہ اس لڑکی کی وجہ سے میرا دشمن بن گیا ہے۔“ میں نے پھر سے انکار کر دیا تو ایک سنجیدہ نوجوان نے کہا۔

”جمال! پورے گاؤں میں یہ تجسس ہے نہ جانے کیسی کیسی افواہیں گھوم رہی ہیں یہ تو سچ ہے ناکہ جب سے اس لڑکی کے نورنگر میں قدم پڑے ہیں قتل و غارت شروع ہو گئی۔“

”میں تیری ساری باتیں مانتا ہوں..... میں تو اس کے چکر والی بات کا جواب دے رہا ہوں۔ لڑکی کے بارے میں شاہ زیب کی سوچ وہ نہیں ہے جو یہ سوچ رہے ہیں۔ معاملات کچھ دوسرے ہیں۔ یہ ساری افواہیں اور تجسس چند دن میں ختم ہو جائے گا۔“ میں نے اشارے میں جواب دیا۔ ظاہر ہے وہ میری بات سے مطمئن تو ہونے والے نہیں تھے۔ اس لیے مجھ سے پوچھا۔

”تمہارے ساتھ دشمنی کا معاملہ کیا ہے؟“

”دیکھو.....! وہ مجھے اپنے باڈی گارڈ بنا کر اپنا غلام بنانا چاہتا ہے سردار شاہ دین نے خود مجھ سے یہ کہا ہے مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں جو دوسروں کو ان کی غلامی سے نکالنا چاہتا ہوں ان کا غلام کیسے بن جاؤں۔ میرا انکار انہیں پسند نہیں آیا۔ اس لیے وہ میرے دشمن ہیں۔“ میں نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کا سہارا لے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”مان لی تمہاری بات، لیکن لڑکی والا قصہ کیا ہے؟“ اسی نوجوان نے بحث کرتے ہوئے کہا۔

”کہنا نادو چار دن میں معلوم ہو جائے گا۔“ میں زنج ہوتے ہوئے کہا تو وہاں پر خاموشی چھا گئی پھر اس بارے میں کسی نے سوال نہیں کیا۔

اگرچہ میں نے انہیں جھوٹ سچ کہہ کر وقتی طور پر ان سے جان چھڑائی تھی، لیکن مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گاؤں نورنگر کے مکینوں کو اس لڑکی کے بارے میں تجسس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس معاملے میں کہیں نہ کہیں سوہنی کا عمل دخل ہے۔ ان کے نزدیک تو وہ ایک طوائف ہی تھی جو ناپنے ہکے لیے میلے میں آئی تھی اور پھر وہ میرے گھر میں ٹھہری۔ میرے ذہن میں جو ایک دم سے سوال ابھرا تھا وہ یہ تھا کہ اگر سوہنی کو سردار شاہ دین قبول کر لیتا ہے تو کیا نورنگر یا پورے علاقے کے لوگ اس انہونی کو قبول کر لیں گے؟ کیا اس قبولیت کے ساتھ سردار شاہ دین کا ماضی سامنے نہیں آئے گا؟ جس میں اس کا کردار کوئی قابل تحسین نہیں تھا۔ اگر سردار شاہ دین اسے بیٹی کے طور پر قبول کر لیتا ہے تو کیا سوہنی پر سے طوائف کا لیبل اتر جائے گا؟ کیا اسے سردار زادی کے طور پر لوگ قبول کر لیں گے؟ کیا سردار شاہ دین کی عزت و احترام کی وہ سطر رہ جائے گی جو انہوں نے اپنے تئیں بلند مقام پر رکھی ہوئی تھی؟ ایک دم سے ہی کئی سارے سوال میرے ذہن میں اترتے چلے گئے۔ میرا وجدان کہہ رہا تھا سردار اپنے رعب و دبدبے کے آگے ہر شے قربان کر دیتے ہیں۔ سردار شاہ دین کبھی بھی اپنی ساکھ عزت و احترام مقام اور مرتبے سے پیچھے نہیں آ سکتا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ اپنے دل سے مجبور ہو کر اولاد کا درد محسوس کرتے ہوئے اور بیٹی کی ہمدردی میں اسے قبول کر لے گا تو وہاں اتنے ہی یہ چانس تھے کہ وہ ضرور کوئی سازش کر کے سوہنی ہی کو ختم

کیشو مہرہ کہتا چلا جا رہا تھا اور اس حملہ آور کی آنکھوں میں وحشت کے ساتھ خوف پھیلتا چلا گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”اسپیکٹرن ویر..... ہم اس کے لیے کام کرتے ہیں۔“ اس نے تھوک نگتے ہوئے کہا۔

”تمہارا تعلق فورسز سے ہے؟“ مہرہ نے پوچھا۔

”نہیں..... وہ وہ قافو قفا ہم سے کام لیتا ہے اور ہماری مدد کرتا رہتا ہے۔“ اس نے کہا تو وہ اٹھ کر بولا۔ ”بھگوان

کے لیے..... میرا اتنا جرم نہیں ہے..... جتنا.....“

”تم نہیں جانتے۔ تم نے کیا کیا ہے؟“ خیر.....! اگر تمہارا کہا جھوٹ ہوا تو.....“ مہرہ نے پوچھا تو ایک دم سے وہ مایوس ہو گیا، پھر کھکھکائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ تصدیق کر لیں۔“

”وہ تو میں کروں گا..... تب تک تم یہاں ہمارے مہمان رہو گے..... سچ ہوا تو چھوڑ دیں گے جھوٹ ہوا تو.....“

جسپال یہ سب دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال تو تھا کہ رن ویر اسے نقصان پہنچانے کے لیے ہی اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے لیکن وہ قانونی تناظر میں سوچ رہا تھا اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ یوں غنڈہ گردی کرے گا اس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ ابھی جائے اور رن ویر سنگھ کو شوٹ کر دے تاہم سوچنے اور اس پر عمل کرنے میں کچھ فرق ضرور ہے اور اس کے لیے وقت چاہیے ہوتا ہے۔

”آؤ چلیں.....“ مہرہ نے اس کا بازو پکڑا اور باہر کی جانب چل دیا۔ باہر برآمدے میں آ کر جسپال نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

”کیشو..... رن ویر پارٹی بن جائے گا یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

”جسپال.....! تمہارے بارے میں میرا اندازہ یہ ہے کہ تم نہ یہاں کی ودتی سمجھ سکتے ہو اور نہ ہی دشمنی۔ یہاں قانون کی پاسداری نہیں ہے سب سے پہلے دھرم پھر مفاد اور اکثر اوقات دھرم کہیں پیچھے رہ جاتا ہے اور مفاد ہی سب سے پہلے ہوتا ہے۔ رن ویر کسی کی لڑائی لڑ رہا ہے نہ زنا کاریوں کے لیے..... اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لیے..... یا قانون کے لیے..... میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا، لیکن جو حقیقت تمہارے سامنے آئی ہے اس پر تم خود فیصلہ کر سکتے ہو۔“

”تو پھر فیصلہ کیشو مہرہ..... مجھے پنڈاؤ کی ہی میں رہ کر سب کچھ کرنا ہے.....“ جسپال نے سرو لہجے میں کہا تو مہرہ چونک گیا چند لمحے سوچتا رہا پھر جوشیلے انداز میں بولا۔

”بالکل درست.....! تم اپنی زمین اور حویلی کے بارے میں فکرت کرنا جائیداد کا مسئلہ مجھ پر رہا جب تک تم بلجیت سنگھ کو اپنے پاؤں کے نیچے نہیں لے لیتے ہو تب تک تم جو بھی کرو گے..... یہ تمہارا اتفاق کریں گے۔“

”ٹھیک ہے.....“ جسپال نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور وہاں سے چل دیے۔ دونوں گاڑی تک آئے اور آگے پیچھے نکلنے چلے گئے۔



سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں دلبر کے گھر سے نکل آیا تھا ڈی ایس پی سے بات کرنے کے بعد میں دلبر کے گھر چلا گیا تھا کہ جو لوگ اب بھی وہاں موجود ہیں انہیں معلوم ہو کہ دلبر کے لواحقین کے سر پر ہم ہیں۔ سہ پہر تک سارے مہمان وغیرہ جا چکے تھے جب سکون ہو گیا تو میں اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ میں پیدل ہی جا رہا تھا۔ چوک میں پہنچا تو حسب معمول برگد کے درخت تلے کافی سارے لوگ جمع تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوانوں ہی کی تعداد تھی۔ میں بھی ان کے پاس

کردے پھر اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا، چہ جائیکہ شاہ زیب اور شاہ دین میں سوئی کے معاملے میں مخالفت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ ممکن ہے شاہ دین اپنی عمر کے تقاضے کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے یہ سمجھوتہ کر لے، مگر شاہ زیب نے تو ابھی حکمرانی کرنا تھی وہ اپنے نام کے ساتھ یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بہن طوائف زادی ہے اس لیے مجھے نہیں لگتا تھا کہ سردار سوئی کے بارے میں کوئی اچھا فیصلہ کرنے والے تھے۔ اس سمجھوتے میں وہ سوئی سے جان چھڑانے والی بات ہی کریں گے۔ کیونکہ سمجھوتے بھی دل سے نہیں کیے جاتے، مجبوری میں کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ میں ان نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کرتا رہا تھا، لیکن یہ سوال جو میرے ذہن میں پیدا ہو رہا ہے تھے، مجھے بے چین کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور دن ڈھل گیا۔ میں وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑا۔

میں جب گھر پہنچا تو بھیدہ دودھ دے کر جا چکا تھا۔ مجھے صحن میں آتا دیکھ کر ماں نے دور بنی سے کہا۔
”منہ ہاتھ دھو کے آ جا پتر..... کھانا کھالے۔“

میں وہیں سے ہاتھ روم کی طرف مڑ گیا۔ پھر جب پارچائی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ باہر کا گیٹ بج اٹھا۔
”یار اس وقت کون آ گیا؟“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے اٹھنا چاہا تو دلان میں کھڑی سوئی نے کہا۔
”تم بیٹھو، میں دیکھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے گیٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ابھی ماں نے تیزی سے پکارا۔
”سوئی.....! ادھر واپس آ جا، میں دیکھتی ہوں، سوچن، سوچن، پتہ نہیں باہر کون ہے؟“
سوئی کے قدم وہیں رک گئے۔ ابا اس کے قریب سے گزر کر باہر گیٹ کے پاس چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد چھوٹا گیٹ کھلا اور ڈی ایس پی اندر آ گیا۔ میں نے اسے دیکھ کر اٹھنا چاہا تو وہ دور سے ہی بولا۔
”بیٹھو، بیٹھو..... مجھے ذرا جلدی تھی اس لیے میں آ گیا۔“

میں اتنی دیر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے مصافحہ کیا، تب تک سوئی اندر سے کرسی لے آئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے سوئی کو بھی بیٹھنے کے لیے کہا، وہ میرے ساتھ چار پانی پر بیٹھ گئی، لیکن ماں کچن کی طرف چلی گئی۔
”سوئی.....! صبح جو ہمارے درمیان بات ہوئی تھی وہ میں نے سردار شاہ دین سے کر دی اور پھر اس پر تفصیلی بات چیت بھی ہوئی، وہ مانتے ہیں کہ تم ان کی بیٹی ہو، لیکن شاہ زیب آڑے آچکا ہے۔“
”وہ تو میں نے کہہ دیا مجھے جائیداد نہیں چاہیے پھر وہ کیوں نہیں مانتا۔“ سوئی نے تیزی سے کہا۔
”وہ صرف اس بات سے خائف ہے کہ تم ایک طوائف ہو۔ وہ اپنے ساتھ تمہارا نام جوڑنا نہیں چاہتا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ تب سوئی مایوسانہ انداز میں بولی۔
”تو پھر کیا کہتے ہیں وہ.....؟“

”شاہ دین نے تو اپنا موقف بتا دیا تھا لیکن اس وقت تو معاملہ شاہ زیب کا ہے۔“ ڈی ایس پی نے کہا تو وہ غصے میں بولی۔

”وہ کیا کہتا ہے، مطلب وہ کیا چاہتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔“

”اس کا کہنا ہے کہ جتنی چاہے تم دولت لے لو..... مگر اس حق سے دستبردار ہو جاؤ کہ تم سردار شاہ دین کی بیٹی ہو۔“

”مطلب وہ میری قانونی حیثیت قبول نہیں کرنا چاہتا۔“ سوئی نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

”بظاہر تو یہی لگتا ہے۔“ وہ بھی تقریباً یابوس ہو گیا۔

”اوکے ڈی ایس پی صاحب، آپ نے تو محنت کی، لیکن سردار ایسا نہیں چاہتے، نہ سہی، میں کل عدالت میں رٹ

دائر کر دیتی ہوں، پھر سارے ملک کو پتہ چل جائے گا، یہ رات درمیان میں ہے۔ رہی زندگی تو کل عدالت میں..... آپ بھی اپنا موقف دے دیں گے نا.....“ سوئی نے اپنی بات کہتے کہتے اس سے پوچھا۔

”میں تو قانون کے مطابق بات کروں گا، میں بہر حال اپنی رپورٹ آج ہی بنا کر بھیج دوں گا۔ اپنے اعلیٰ افسران کو پھر وہ جانے اور آپ یا سردار.....“ وہ آہستگی سے بولا، پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بہر حال.....! آج رات آپ اپنا خیال رکھیں، میں کچھ ففیری یہاں چھوڑے جا رہا ہوں..... وہ آپ کی حفاظت کریں گے۔“
”نہیں ڈی ایس پی صاحب، یہ بچارے سارا دن کے تھکے ہوئے رات کیا ڈیوٹی دیں گے۔ ہم خود اپنی حفاظت کر لیں گے۔“

”بیٹھو پتر کھانا کھا لو..... جو دال ساگ بنا ہے کچھ لو۔“ اماں نجانے کس وقت ٹرے میں کھانا رکھے وہاں آ گئی تھیں۔

”اماں جی.....! اس وقت مجھے قطعاً بھوک نہیں ہے۔ میں سرداروں کے ہاں سے کھانا کھا کر نکلا ہوں۔ لیکن کہتے ہیں کہ کھانا سامنے آ جائے تو انکار نہیں کرنا چاہیے، آپ صرف ایک کپ چائے پلا دیں، کھانا ہو گیا۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں نے اماں کو کھانا واپس لے جانے کا اشارہ کر دیا۔ ابھی سوئی بھی اٹھ گئی۔ میں اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ تبھی وہ بولا۔

”جمال.....! تم کوئی تیسری راہ نکال سکتے ہو؟“

”تیسری راہ تو بھی نکل سکتی ہے نا، جناب کہ اگر دونوں طرف سے مخلص ہوں، اب دیکھیں سوئی صرف اپنی شناخت چاہتی ہے، جائیداد کا حق نہیں۔ دوسری طرف سے نہ شناخت دی جا رہی ہے اور حق..... بلکہ منہ بند کرنے کی قیمت دی جا رہی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”وہی نا.....! یہ تو سامنے ہے تیسرا کوئی حل۔“

”میں وہی کہہ رہا ہوں نا کہ ایک طرف کے لوگ مخلص نہیں ہیں۔“ میں نے پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو اس نے تجسس سے پوچھا۔

”یہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ سوئی کے پاس عدالت جانے کا حق ہے، لیکن یہ حق اس وقت ختم ہو جائے گا جب وہ عدالت پہنچ ہی نہیں پائے گی، ان سرداروں کے دماغ میں کہیں ہے کہ سوئی کی زندگی کا خاتمہ ان کے لیے نجات ہے۔ انہوں نے قانون کی آنکھ میں دھول اس طرح جھونکی ہے کہ دونوں باپ بیٹا ڈرامہ کر رہے ہیں۔ ایک مانتا ہے، ایک نہیں مانتا۔ اور موقع پاتے ہی سوئی نہیں رہے گی۔ حالانکہ سوئی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی شناخت لے کر یہ ملک ہی چھوڑ جائے گی، تو پھر انہیں ڈر کیوں ہے؟“ میں نے تفصیل سے بتایا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”بات تو دل کو لگتی ہے، سوئی کی زندگی کو خطرہ تو ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ تم اس کی حفاظت کر پاؤ گے۔ وہ یہاں سے کہیں محفوظ جگہ پر چلی کیوں نہیں جاتی؟“

”میں تو اپنی پوری کوشش کروں گا کہ اس کی حفاظت کروں، اور جہاں تک چلے جانے کا تعلق ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ لاہور میں بھی محفوظ ہوگی۔ وہاں پر تو وہ زیادہ ان کے نشانے پر ہوگی۔ اب تک انہوں نے یہ ڈرامہ کیوں کیے رکھا، وہ اب اس کی موومنٹ پر نگاہ رکھیں گے۔ آج رات نکلے یا کل صبح، انہوں نے عملہ کرنا ہی کرنا ہے۔“
”تم اتنے پر یقین ہو۔“ اس نے تجسس سے پوچھا تو میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

”جی ڈی ایس پی صاحب.....! میں بچپن سے انہیں سمجھ رہا ہوں جو کچھ یہ سوچ کر بیٹھے ہوئے ہیں میں وہ قطعاً نہیں ہونے دوں گا کہ سوئی میری پناہ میں ہے آپ کیوں نہیں سمجھتے یہ ان کی جائیداد ہی کا نہیں حکمرانی کا بھی مسئلہ ہے ایسی دس بینیاں وہ قربان کر دیں۔“

”سردار شاہ دین تو بہت جذباتی ہے۔“

”لیکن وہ بہت بڑا ایکٹرم بھی ہے۔ بزاز بردست ڈرامہ کرتا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ اس دوران سوئی چائے لے کر آگئی وہ آہستہ آہستہ سب لے کر پینے لگا۔ پھر بولا۔

”اب دیکھو.....! مجھے سو کام ہیں لیکن کل سے انہوں نے مجھے الجھایا ہوا ہے۔ خیر..... تم لوگ اپنی طرف سے درخواست لکھ کر دے دو کہ آپ کو سرداروں سے خطرہ ہے میں اب جاتے ہوئے انہیں پابند کر جاؤں گا۔“

”سوئی چاہے تو دے دے درخواست مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو گیٹ بج اٹھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف گیا وہاں فخر و کھڑا تھا سرداروں کا خاص ملازم۔

”ہاں بولو!“

”ڈی ایس پی صاحب یہیں ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح چائے پیتے ہوئے نفری کے لوگ اور گاڑی دیکھ چکا تھا میں نے پھر بھی ٹھل سے جواب دیا۔

”ہاں..... ہیں۔“

”میں ان سے مل سکتا ہوں۔“

”آ جاؤ.....“ میں نے کہا اور اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ میرے ساتھ ہی چار پائی تک آیا اور پھر بیٹھ گیا۔ ڈی ایس پی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بولو کیا کہنا ہے؟“

”سردار صاحب کہہ رہے ہیں کہ جاتے ہوئے حویلی کی طرف سے ہو کر جائیں۔“

”کیوں.....؟“ اس نے قدرے سختی سے پوچھا۔

”جی یہ تو نہیں معلوم انہوں نے پیغام دیا.....“

”انہیں کہو کہ میں نے سارا دن گزار لیا ان کے کام کے لیے اب مجھے کچھ اور بھی کرنا ہے میں ان کا ذاتی ملازم نہیں ہوں انہیں بتادینا کہ میں کل پورے علاقے کی خود پہچانت بلارہا ہوں اپنے آفس میں انہیں بھی آنا ہوگا کیونکہ مجھے کل تک ہر صورت میں رپورٹ بنا کر بھیجنی ہے۔“ ڈی ایس پی نے نجانے کیوں ایسا کہہ دیا۔

”جی..... وہ شاید آپ سے یہی کہنا چاہ رہے ہیں کہ کل کاغذات کی تکمیل کروالیں سردار صاحب لکھ دیں گے ج چاہیں گے.....“ فخر و نے جھجکتے ہوئے کہا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی بولتا سوئی نے دالان ہی سے کہا۔

”سنو فخر و! جاؤ اور جا کر سردار صاحب سے کہہ دو اس کے پاس صرف دو گھنٹے ہیں میں ڈی ایس پی صاحب کی منصف سماعت کر کے انہیں ہدایت دیتی ہوں۔ اگر وہ یہاں آ کر طے کر لیں تو ٹھیک ورنہ میں ابھی کہ ساتھ واپس جا رہی ہوں پھر عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔ میں تو اپنے باپ کا پاس کر رہی ہوں اگر میرا باپ ہی پاس نہیں رکھنا چاہتا تو پھر میں کیا کروں۔“

”بی بی جی.....! قانونی طور پر معاملہ طے کرنے میں عدالتی کاغذات کی ضرورت ہوتی ہے نا وہ تو اب صبح ہی ملیں گے..... وہ یہی کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کو بھی اور وہ بھی ان صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر کاغذات تیار کروا کر.....“

”کاغذات ہیں میرے پاس۔ وہ آئیں اور ان پر دستخط کر دیں بس..... میں اس صورت میں بھی واپس چلی جاؤں گی یہاں نہیں رہوں گی۔“ سوئی کے لہجے میں غصہ سلگ رہا تھا۔

”ہاں بھی جاؤ“ میں آدھا گھنٹہ یہاں انتظار کر لیتا ہوں تب تک آگئے سردار صاحب تو ٹھیک ورنہ ہر ایک کی اپنی مرضی.....“ ڈی ایس پی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے تھوڑا آرام کرنا ہے۔“

”چلیں۔“ میں نے باہر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ میرے ساتھ بڑھ گیا۔

میں اس وقت کھانا کھا چکا تھا جب چھ کا حواس باختہ سا گھر میں داخل ہوا۔ اسے کسی نے غلط اطلاع دے دی تھی کہ پولیس مجھے پکڑنے کے لیے آئی ہے جب اسے ساری بات کا پتہ چلا تب وہ پرسکون ہو گیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا ڈی ایس پی باہر والے کمرے سے اٹھ کر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ میری توقع کے مطابق سردار شاہ دین وہاں آن پہنچا۔ باہر والے کمرے میں سردار ڈی ایس پی میں اور سوئی کے علاوہ فخر و اور چھ کا بھی تھے۔ سردار چند لمبے خاموش بیٹھا رہا پھر گویا ہوا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ اگر بات عدالت اور عدالت سے میڈیا تک پہنچی تب مجھے سوئی کو اپنی بیٹی قرار دینا ہی پڑے گا لیکن اس کے علاوہ مجھ پر کیا چارج ہوں گے۔ انہیں میں بخوبی جانتا ہوں۔ شاہ زیب کو فقط اپنی جائیداد دکھائی دے رہی ہے جو ساکھ وہ بچانا چاہتا ہے وہ نہیں بچے گی میں پورے دل سے سوئی کو اپنی بیٹی مانتا ہوں کل عدالت میں جا کر جو قانونی کارروائی میری بیٹی چاہے میں اس کے لیے تیار ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ یہی وہ نازک ترین مرحلہ تھا جہاں سوئی جذبات میں آ کر کچھ بھی فیصلہ کر سکتی تھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار کا یہ فیصلہ بہت سوچ بچار کے بعد کیا گیا ہے وہ باپ کے گلے لگ کر رو رہی تھی کچھ وقت ایسے ہی گزر گیا۔ ماحول میں سوگواریت کھل گئی تھی تبھی وہ اس سے الگ ہوئی اور اندر کی جانب چلی گئی۔ میں خاموش تھا۔

”ٹھیک ہے سردار صاحب! کل پھر رپورٹ بنا کر میں مجھوادوں گا کہ فریقین میں سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ آپ کل آ کر دستخط کر دیں۔“

”رپورٹ بنانے میں کونسا وقت لگتا ہے آپ ابھی بنالیں۔ ابھی دستخط کر دیتا ہوں۔“ سردار شاہ دین نے خلوص سے کہا تبھی ڈی ایس پی نے باہر سے ایک انسپکٹر کو بلوایا اور اسے رپورٹ تیار کرنے کو کہا۔ ظاہر ہے کاغذ قلم تو مجھ سے مانگنا تھا میں نے چھاکے کو اشارہ کیا کہ وہ الماری میں سے کاغذ نکال لایا اتنی دیر میں سوئی اندر سے برآمد ہوئی اور کمرے میں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر تھے۔ اس نے آتے ہی وہ اسٹامپ پیپر ڈی ایس پی کو دے دیئے۔ پھر بولی۔

”آپ اسے دیکھیں اور پڑھیں پھر میری نیت کا اندازہ لگائیں۔ یہ میں نے ایک ہفتہ قبل تیار کروائے ہیں۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ بابا کو بتادیں بابا خود پڑھ لیں۔“

ڈی ایس پی نے پہلے وہ دستاویز خود پڑھی پھر سردار کو دے دی۔ جس میں تقریباً بیس منٹ صرف ہو گئے۔ چھاکا کاغذات کا ایک دستہ لے کر آ گیا تھا جو اس نے انسپکٹر کو دے دیا۔

”سردار صاحب! یہ تو بڑا معقول مطالبہ ہے یہ آپ سے شناخت مانگ رہی ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”ہاں.....! مجھے قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں۔ میں ابھی دستخط کر دیتا ہوں۔ بس شاہ زیب سے خوف آتا ہے کہ وہ اسے نقصان نہ پہنچائے۔ یہ چاہے لاہور میں رہے یا پھر کسی غیر ملک میں میں ہر طرح اس کے ساتھ ہوں روپے پیسے کی فکر نہ کرنا.....“ سردار نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ پھر دستاویزات پر دستخط کر دیئے۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر نے رپورٹ

تیار کردی، گواہان میں فخر و اور چھا کا تھے۔ ڈی ایس پی اور میں نے بھی دستخط کیے یوں بڑے اطمینان سے یہ مرحلہ سر ہو گیا۔ ڈی ایس پی خوش تھا کہ اس نے یہ معرکہ مار لیا ہے اور اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب اٹھنے لگے تو سردار نے اپنی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور سوئی کو دیتے ہوئے بولا۔

”یہ رکھ لو..... تمہارے کام آئیں گے۔“

سوئی نے بڑے آرام سے وہ گڈی پکڑی، اس میں سے آدھے نوٹ نکال کر انسپکٹر کی جانب بڑھا دیئے۔ ”یہ باہر بیٹھے ان بے چاروں کے لیے ہیں جو صبح سے.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ڈی ایس پی چند لمحے سوچتا رہا، پھر اس نے نوٹ لے لینے کا اشارہ کر دیا۔ پہلے سردار شاہ دین نکلا، پھر اس کے بعد پولیس والے چلے گئے۔ سوئی بہت پہلے کاغذات لے کر اندر چلی گئی تھی۔ چھا کے نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ میں بھی مسکرا دیا تو وہ سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں، وہ باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ لگایا اور صحن میں نکل آیا، سوئی اماں کے ساتھ لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنسی، مجھے لگا کہ وہ وارنٹی میں میرے گلے آگے گی، اس لیے بجائے ان کے قریب جانے کے چھت کی راہ لی۔

کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے میں خود پر قابو پار ہا تھا۔ یہ بڑی تاریخی رات ثابت ہو رہی تھی۔ سردار شاہ دین کی وہ تمکنت، وہ غرور اور حکمرانی کا خمار ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بت پاش پاش ہو گیا جو خود کو منوانے کے لیے جبر کا ماحول بنائے ہوئے تھا۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس پر حکمرانی کا حق صرف اس کے تخلیق کرنے والے خالق کو حاصل ہے۔ جب خالق نے انسان کو اختیار دے دیا کہ وہ اس دنیا میں اپنی مرضی سے جیسے چاہے زندگی گزارے، تو انسان کو انسان پر حکمرانی اور جبر کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے اور درست ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے جبر کرنا اس لیے غلط ہے کہ اہمیت کردار کو حاصل ہے۔ اعلیٰ کردار اپنی روشنی سے پورے ماحول کو جگمگا دیتا ہے۔ جبر کا راستہ وہی اختیار کرتے ہیں جن کے کردار میں خامیاں ہوں، لالچ اور مفاد پرستی کا بصر ان کے من میں ہو، میں یہی سوچ رہا تھا کہ بیڑھیوں میں آہٹ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا، وہاں چھا کا تھا، اس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا تھا، اس لیے تیزی سے میری طرف بڑھا۔

”ہاں بولو، کیا صورتحال ہے؟“

”جس وقت سردار شاہ دین یہاں آیا ہے اس وقت دونوں باپ بیٹا میں بڑی گرم گرم بحث ہوئی ہے، شاہ زیب ہر حال میں سوئی کو قتل کر دینا چاہتا ہے، اس کا یہ خیال ہے کہ جب وہ ہی نہیں رہے گی تو اس کے ساتھ سارے ثبوت بھی ختم ہو جائیں گے، اگر کوئی انکوائری ہوگی، عدالتی معاملہ چلے گا تو یہ کوئی نئی بات نہیں، جب تک چلے گا بھگت لیں گے۔“

”اور سردار شاہ دین.....؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بڑا زبردستی آدمی ہے، وہ اسے یہ سمجھانا چاہ رہا تھا کہ پھنکارتے ہوئے سانپ اور باؤ لے کتے کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے، وہ کسی لمحے بھی موت کا سبب بن سکتے ہیں۔ انہیں قابو میں کر کے جب چاہے انہیں ختم کر دیا جائے، اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سوئی نے اس کے گرد جو حصار بنا دیا تھا، اسے فی الحال توڑنا بہت مشکل ہے۔ اگر توڑتے ہیں تو خود دنیا کے سامنے ننگے ہو جاتے ہیں۔“

”مطلب اس نے یہ سمجھوتہ بیٹی کی محبت میں نہیں اپنے بچاؤ کے لیے کیا ہے۔“ میں نے پوچھا تو چھا کا بولا۔

”بالکل! ایک طرف پولیس چڑھ دوڑی تھی تو دوسری جانب پورے علاقے میں بات پھیل جانے کا خوف تیسرا سوئی کو ہمارا سہارا مل گیا، معاملہ سانپ کے منہ میں چھوند روالا بن گیا۔ انہیں وہی کرنا پڑا، جو سوئی چاہتی تھی۔“

”ٹھیک ہے، اب شاہ زیب کہاں ہے؟“ میں نے اپنے اندر اٹلتے ہوئے لاوے کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو شام ہی سے ڈیرے پر ہے۔ اس نے بندے جو بلوائے ہوئے ہیں۔ اس کے ارادے خطرناک نہیں لگتے مجھے.....“ چھا کے نے تشویش بھرے۔ لہجہ میں کہا تو میں نے آہستگی سے کہا۔

”چھا کے..... بہت عرصے بعد آج کی رات آئی ہے۔ میں جو کچھ آج کرنے جا رہا ہوں، اس کا میں نے بہت انتظار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو میرے لیے موت کے منہ میں بھی پھلانگ لگا دے گا، اس لیے میں.....“ میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا اول فول بک رہا ہے تو..... جو کرنا ہے بتا۔“

”چل ٹھہر پھر.....“ میں نے اسے کہا اور چھت پر بنے کمرے میں چلا گیا۔ پسٹل تو میرے پاس تھا ہی، میں نے وہاں سے کچھ میگزین لیے، تیز دھار خنجر اٹھایا اور اسے اپنی پنڈلی سے بیٹل کے ساتھ باندھ لیا۔ دو پسٹل مزید اٹھائے جن کی شاندار کارکردگی تھی۔ وہ لے کر میں کمرے سے باہر آیا۔ تالا لگایا اور دونوں پسٹل اور میگزین چھا کے کو تھما دیئے۔ اس نے خاموشی سے وہ پکڑے اور آنکھوں کے اشارے سے پوچھا، تو میں نے جواب دیا۔ ”چل بانیگ لا، پھر نکلیں۔“

ہم دونوں ہی آگے پیچھے چھت پر سے نیچے آ گئے۔ اماں اور سوئی ابھی تک صحن میں تھیں۔ مضطرب سی سوئی نے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن، یہ وقت نہیں تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا چھا کے کے پیچھے باہر گئی میں آ گیا۔ وہ بانیگ اشارت کر چکا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چل پڑا۔ چوک پار کرتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔

”جانا کدھر ہے.....“

”نہر کنارے، حویلی کے پچھواڑے.....“ فصلوں کے درمیان جو راستہ ہے وہاں تک چل.....“ میں نے اسے جگہ بتائی تو اس نے کچھ مزید پوچھے بغیر بانیگ کی رفتار تیز کر دی۔

اندھیری رات میں پہلا پہر ختم ہو چکا تھا، گاؤں میں یہ وقت بڑا پرسکون ہوتا ہے، پکی سڑک پر کوئی ذی روح نہیں تھا۔ البتہ چوک میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھا تھا۔ پکی سڑک پر فرلانگ بھرا آگے جانے کے بعد وہ راستہ نکلتا تھا جو نہر کنارے جاتا تھا۔ چھا کے نے بائیں جانب اس کچے راستے پر بانیگ موڑ لی، تب میں نے چھا کے کو آہستہ رفتار سے چلنے کو کہا۔ حویلی کے پچھواڑے پہنچ کر میں نے اسے رکنے کو کہا تو وہ رک گیا۔ میں بانیگ سے نیچے اتر آیا تو اس نے سوالیہ انداز میں سرگوشی میں پوچھا۔

”یہاں کیوں..... ابھی تو نہر.....“

تب میں نے بڑے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”چھا کے..... میں سردار شاہ دین کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ تم نے میرا یہاں انتظار کرنا ہے، بانیگ کو نہر کنارے لے جا کر چھپا دے، تاکہ بعد میں ہمارا ”کھرا“ انہیں نہ ملے..... واپس اس جگہ آ جانا..... واپس آ کر بانیگ لے لیں گے، اگر میں دو تین گھنٹے میں نہ آیا تو تم واپس پلٹ جانا..... حویلی میں آنے کی حفاظت نہ کرنا، پھر صبح ہی میرا پہرہ کرنا۔“

”یار تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا، کچھ اور بندوبست کرتے..... کہیں دوسری جگہ.....“

”بحث نہیں..... جو کہا ہے وہ کرو۔“ میں نے سختی سے کہا اور فصل کے کنارے کھال کی منڈیر پر چل پڑا۔ مجھے

یقین تھا کہ جب تک میں نگاہوں سے ادھیل نہ ہوا، وہ وہیں کھڑا رہے گا۔ میں اندھیرے میں بڑے محتاط انداز سے چلتا

چلا گیا۔ اس وقت میں پرسکون ہو گیا جب میں نے محسوس کیا کہ چھا کا بانیک لے کر نہر کنارے چلا گیا ہے۔

حویلی کے پھوڑے کی چار دیواری میرے سامنے تھی۔ بچپن سے میں اس حویلی دیکھتا آیا تھا اور ہمیشہ میں نے یہی سوچا تھا کہ جب کبھی مجھے اس حویلی میں داخل ہونا پڑے تو میں خاموشی سے کیسے غل ہو سکتا ہوں۔ میں نے ان گنت مرتبہ اس حویلی کا جائزہ لیا تھا اور محفوظ سے محفوظ راستہ تلاش کر کے نجانے کتنی بار خیالوں ہی خیالوں میں اس حویلی کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ بچپن سے ایک ایک امکان میرے ذہن میں تھا اور اس کے ہزاروں حل بھی میں سوچ چکا تھا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہی یہی تھی کہ محفوظ طریقے سے اس حویلی میں داخل ہو کر باہر نکل آؤں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملازمین کے کوارٹریں اس طرف ہیں اور ایک لوہے کا دروازہ اس چار دیواری میں نصب تھا جو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ ایک گیٹ نما دروازہ آخری سرے پر تھا جو اس وقت کھولا جاتا تھا جب سرداروں نے ڈیرے پر ایمر جنسی میں جانا ہوتا تھا۔ ملک سجاد اسی گیٹ سے نکلتا تھا۔ مجھے دیوار پھانڈنے کی ضرورت نہیں تھی میں لوہے کے اس دروازے سے با آسانی اندر جا سکتا تھا جو ملازمین کی گزرگاہ تھی۔ اس میں سب سے بڑا رسک یہی تھا کہ ملازمین کی نگاہ مجھ پر پڑ سکتی تھی ان کی نظروں سے چٹنا محال تھا۔ کیونکہ وہ حویلی کے اس طرف کھلے میں پھرتے رہتے تھے اور اس میں سو بھی جاتے تھے۔ میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کی طرف اندھیرا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا چند لمحوں اندر کا جائزہ لیا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ وہاں کوارٹروں سے آنے والی جیسی جیسی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہیں دیوار کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ میں چند منٹ دم سادھے وہیں بیٹھا رہا۔ رات کے اس پہر ملازمین کے کوارٹروں میں خاموشی تھی۔ دو چار لوگ باہر چار پائیوں پر لیٹے ہوئے تھے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ مجھے وہیں بیٹھ کر یہی یقین کرنا تھا۔ میں تیرہ یا پندرہ منٹ وہیں اسی مقصد کے لیے بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے خبر سو رہے ہیں تو میں اٹھا اور ان کے قریب سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہاں سے رہائشی عمارت تقریباً دو ایکڑ پر تھی۔ درمیان میں ایک طرف لان اور دوسری طرف سوئمنگ پول تھا۔ جس میں اس وقت پانی نہیں تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا رہائشی عمارت کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں بھی ایک داخلی دروازہ تھا جو میری معلومات کے مطابق اکثر بند رہتا تھا۔ میں وہ دروازہ کھول نہیں سکتا تھا لیکن اس پر بنے ہوئے آرائشی شیڈ میرے کام آ سکتے تھے۔ سردار شاہ دین کی خواب گاہ اوپر والے پورشن میں تھی۔ میں ان شیڈز کے سہارے چڑھ کر اوپر بالکونی میں جا سکتا تھا۔ پھر ایک راہداری کے بعد سردار کی خواب گاہ تھی۔ اصل خطرہ اوپر ہی تھا۔ وہاں سیکورٹی گارڈ موجود رہتے تھے۔ میں نے اپنی ساری ہمت جمع کی اور شیڈ میں انگلیاں جمادیں پھر اپنا وزن اٹھاتے ہوئے میں اوپر چڑھنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد میرے ہاتھ بالکونی تک پہنچ گئے میں نے اپنا سر اٹھایا اور کسی ممکنہ خطرے کو دیکھا سامنے کی راہداری خالی تھی۔ میں چشم زدوں میں بالکونی میں تھا اور اپنے حواس بحال کرنے کے ساتھ ساتھ سانس بھی درست کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد میری سانسیں بحال ہو گئیں۔ میں اٹھا اور دے پاؤں آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا مجھے حیرت ہونے لگی کہ وہاں کوئی سیکورٹی گارڈ کیوں نہیں ہے؟ کیا سردار اس وقت حویلی میں نہیں؟ کیا میری محنت ضائع چلی گئی؟ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

میں نے اگلے چند لمحوں میں خود پر قابو پایا اور مایوسی کو جھٹک دیا۔ راہداری میں اندھیرا تھا لیکن باہر سے چھن کر آئی ہوئی روشنی میں لوہے کی گرل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ سردار شاہ دین کی خواب گاہ کس طرف ہے۔ میں اس راہداری میں آ گیا جہاں ایک طرف کمرے بنے ہوئے تھے اور دوسری طرف لوہے کی گرل سے نیچے صحن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا اور راہداری بھی خالی تھی۔ میں حیران تھا کہ ایسا

سناتا کیوں ہے۔ حویلی کے ملازمین کہاں چلے گئے۔ میں سب سے زیادہ سیکورٹی والوں سے محتاط تھا جو ابھی تک مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے دائیں جانب مڑنا تھا جہاں سردار کی خواب گاہ تھی۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں سامنے دیکھا۔ دیران اور خالی راہداری میں ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی تھی جس سے لوہے کی گرل دکھائی دے رہی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کے تمام سوئچ آف کر دیئے جس سے بلب بجھ گیا تو اندھیرا چھا گیا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر خواب گاہ کا دروازہ تھا میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ دیا وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور دروازے پر دستک دے دی۔ چند لمحوں بعد سردار کے کھنکارنے کی آواز آئی پھر دھیرے سے پوچھا۔

”کون ہے بھی؟“

”جی میں جھینے.....“ میں نے آواز بدل کر ہلکے سے کہا۔ جھینے اس کا باڈی گارڈ تھا اور ہمہ وقت حویلی ہی میں رہتا تھا میں نے بچپن سے ان گنت مرتبہ اس کی آواز سنی تھی۔ مجھے لگا کہ میں نے اس کی آواز کی کاپی ٹھیک کر لی ہے۔ اگلے چند لمحوں میں دروازہ کھل گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑے ہی سردار کی بھونکیں تن گئیں۔ جب تک وہ کچھ سمجھتا یا کچھ کہتا میں نے دروازے میں اپنا پاؤں اڑس دیا پھر پوری قوت سے دروازے کا پٹ اندر کی جانب دھکیل دیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سردار کو دھکا دیا وہ لڑکھڑاتا چلا گیا وہ کھٹکھٹایا ہوئے انداز میں بولا۔

”تم پاگل ہو گئے ہو..... کیا ہوا تمہیں.....“

”آرام سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ جاؤ میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میرے خیال میں تجھے میری بات سمجھ میں آگئی ہوگی.....“ میں نے سردار کے ہاتھ میں کہا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ چند لمحوں میں میری طرف دیکھتا رہا پھر مڑ گیا۔ میں نے دروازے کا لاک لگایا اور اس کے بستر پر چلا گیا۔ جہاں وہ سکون سے لیٹ گیا تھا۔

”بولو..... کیا کہنا ہے تمہیں.....؟“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا تو میں نے بڑے سکون سے کہا۔

”یاد کرو سردار اس وقت کو یاد کرو جب تو نے جوانی کے خمار میں میرے باپ کو قتل کر دیا تھا۔“

”وہ..... وہ ایک حادثہ تھا۔“ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

”نہیں وہ حادثہ نہیں تھا تم نے جان بوجھ کر میرے باپ کو قتل کیا تھا اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں تم سے اتنی لڑت کیوں کرتا ہوں۔“

”جمال..... پتر..... تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے سارا گاؤں جانتا ہے کہ وہ ایک حادثہ تھا اللہ بخشے تیرا باپ بڑا پکا لٹانے باز اور بہترین شکاری تھا۔ میرا تو وہ بڑا اچھا دوست تھا۔ ہم نے جوانی کا بڑا حصہ ساتھ میں شکار کھیلے ہوئے گزارا ہے اور میرے باپ نے تیرے باپ کو یہ زمین دی تھی۔ تمہیں بہکا دیا ہے کسی نے.....“ اس نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

”نہیں سردار نہیں..... تم جھوٹ بولتے ہو..... یہ زمین میرے باپ نے اس وقت بتائی تھی جب یہ کسی کی نہیں تھی خود الاٹ کروائی تھی حکومت سے یہ احسان نہ جتا میں مانتا ہوں کہ میرا باپ بہت اچھا شکاری تھا نشانہ بازی مجھے اڑنے میں ملتی ہے سچ ہے تم دونوں نے بہت شکار کیا لیکن وہ تیرے جیسا بے غیرت نہیں تھا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....“ وہ تیزی سے بولا۔

”بچپن سے..... میں نے اس تحقیق میں وقت گزارا ہے سردار..... جس وقت میری ماں اس گاؤں میں بیاہ کر آئی تو نے اپنی نیت بری کر لی میرے باپ کے ہوتے ہوئے تو کچھ نہیں کر سکتا تھا تو نے میرے باپ کو گولی مار دی بہانہ گردیا کہ گولی بھول سے لگ گئی ساری دنیا جھوٹ بول سکتی ہے لیکن میری ماں جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”تم..... غلط۔“

”خاموش بے غیرت.....“ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”تم نے میری ماں کو مجبور کرنا شروع کر دیا..... تاکہ وہ تیری بات مان لے..... میں اس وقت پیدا ہونے والا تھا، تو نے بڑا انتظار کیا، لیکن میری ماں نے صبر سے کام لیا..... وہ نہ صرف تیرے ظلم سہتی رہی، بلکہ صبر سے آج کے وقت کا انتظار کرتی رہی..... کیا اس کی صرف یہی سزا تھی کہ وہ ایک مجبور بیوہ اور غریب عورت تھی۔“

”میں اب تجھے کیا کہوں.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی، پھر بولا۔

”دیکھ قدرت کے کھیل کتنے نرالے ہیں، تو نے میری ماں کے بارے میں اپنی نیت خراب کی تھی، اس پر ظلم کیے اسے مجبور کرتے رہے..... اب تیری بیٹی، میرے گھر میں ہے میں اس کے ساتھ جو مرضی کروں، تو مجھے نہیں روک سکتا.....“

”دیکھ جمال، وہ میری جوانی کی بھول تھی، میں بہک گیا تھا، تو مجھے معاف کر دے اور سوئی کو یہاں سے جانے دے..... میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں۔“ سردار نے منت بھرے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”یہ تو قدرت کا کھیل تھا، ورنہ میں تجھے ویسے ہی قتل کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا تو اس نے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

”تو مجھے مار دے..... مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا، لیکن وعدہ کر، میری بیٹی کو خراب نہیں کرے گا، اسے یہاں سے دور بھیج دے گا.....“

”میں نے کچھ نہیں کرنا سردار..... اب جو کچھ کرنا ہے، تیرے شاہ زیب ہی نے کرنا ہے، میں بڑے صبر سے اسے برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں، صرف اسی دن کے لیے..... ساری زندگی تیرے بچے، کتوں کی طرح جائیداد پر لڑیں گے، چاہئے تو یہ تھا کہ تو زندہ رہتا اور یہ تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا، لیکن میرا وعدہ ہے کہ تو نے میرے ہاتھوں مرنا ہے۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا تو اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ سر ہانے کی طرف بڑھایا، جسے میں نے محسوس تو کر لیا، مگر کچھ نہ کہا، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے، اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سر ہانے کے تلے سے پھل نکال لیا، میں ہنس دیا، اور پھر ایک جھٹکے سے ہاتھ مارا تو اس کا پھل دور جا گرا۔

”یوں اکیلے کو مارنا.....“

”بکواس بند کر..... تو نے جو ظلم کیے ہیں، انہیں یاد کر اور مرنے کے لیے تیار ہو جا.....“ میں نے کہا ہی تھا کہ اس نے شور مچانے کے لیے منہ کھولا، میں نے پوری قوت سے ایک گھونہ اس کے منہ پر دے مارا، پھر چشم زدن میں پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر نکال لیا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ پھر میں نے اسے مزید وقت نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ خون کی تیز دھار نکلنے لگی، میں بچتا ہوا اٹھ گیا، وہ اپنے بستر پر خراٹے ہوئے تڑپنے لگا۔

میں بڑے سکون کے ساتھ اس کا ترنپاد دیکھتا رہا۔ میری ماں کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں سے جو زخم میرے دل پر لگے ہوئے تھے، ان پر مرہم لگتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ میں اسے مرتا ہوا دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اس نے نیچکی لی، اور ساکت ہو گیا۔ اب میرے لیے وہاں ٹھہرنا فضول تھا، میں نے خنجر کو پنڈلی کی بلٹ میں اڑسا، پھل نکالا اور باہر کی طرف لپکا۔ میں نے پوری احتیاط سے دروازہ کھولا، پھر راہداری میں جھانکا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں جس راستے سے آیا تھا، اسی طرح واپس پلٹنے لگا۔ بالکنی سے اتر کر میں بھاگتے ہوئے ملازمین کے کوارٹرز تک گیا۔ وہ اسی طرح سکون اور مزے سے سو رہے تھے۔ میں نے لوہے والے دروازے کو کھولا اور حویلی سے باہر آ گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نے حویلی میں کتنا وقت گزارا تھا، مجھے یقین تھا کہ چھا کا وہیں

کہیں ہوگا، میں تیزی سے فصلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا کچی سڑک تک گیا، جہاں سامنے ہی چھا کا کھال کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”ہوں.....“ اس نے سرگوشی میں ہنکارا بھرا، اس کا مطلب تھا کہ میں کیا کر کے آ رہا ہوں، تب میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

”مارو یا سردار کو..... اب چل نہر کنارے۔“

اس نے میری بات کا نہ کوئی جواب دیا اور نہ ہی کچھ تبصرہ کیا، وہ فوراً پلٹ گیا۔ ہم آگے پیچھے تیزی سے فصلوں کے درمیان چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ نہر کنارے اس جگہ آ گئے جہاں چھا کے نے بایک چھپائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے بایک نکالی، اشارت کی، تب تک میں پیچھے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بایک بڑھادی۔ ہم نہر کنارے چلتے ہوئے نور نگر کا چکر کاٹ کر دوسری طرف سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں میں سناٹا تھا۔

”میرا خیال ہے، تو گھر میں نہ سو، میری طرف آ جا۔“ چھا کے نے صلاح دی۔

”نہیں، اس طرح شک ہو سکتا ہے، میں گھر ہی رہوں گا۔“ میں نے کہا تو راستے میں چھا کے کا گھر آ جانے پر اسے اتارا، پھر میں اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ اندھیرے گاؤں کی سنان گلیاں پار کرتا ہوا، میں اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچا۔

گیٹ اماں ہی نے کھولا، میں بایک لیتا ہوا صحن میں چلا گیا۔ بایک کھڑی کر کے میں واپس پلٹا تو اماں کے ساتھ سوئی دالان میں تھی۔ وہ دونوں ہی سوالیہ انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرے کپڑوں پر جا بجا خون کے چھینٹے تھے۔ میں نے پنڈلی سے بندھے بلٹ میں سے خنجر نکالا جواب بھی خون آلود تھا، وہ میں نے اپنے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ماں.....! یہ خون اس بے غیرت انسان کا ہے، جس سے بدلہ لینے کا سبق تو نے مجھے بچپن سے دیا تھا۔ مار دیا میں نے سردار شاہ دین کو.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے اماں کے چہرے پر دیکھا، جہاں جیت کی خوشی کا غماز تھا، ماں کے چہرے پر خوشی کا وہ اظہار تھا جس میں کسی مقصد کی تکمیل کا عنصر ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مقصد کی تکمیل اپنی زندگی میں دیکھ پاتے ہیں اور اس خوشی کا سرور وہی جانتے ہیں، ایسا ہی کچھ اس وقت میری ماں کے چہرے پر تھا۔ اس لمحے میں نے سوئی کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ سرخ تھا، گال حد سے زیادہ سرخ تھے، آنکھیں بھیگی ہوئی اور لب بھیجنے ہوئے، سردار شاہ دین کچھ بھی تھا اور کیسا ہی تھا، آخراں کا باپ تھا۔ اس کا دکھ فطری تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ میں اس کے باپ کا قاتل اس کے سامنے قتل کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ یہ بہت جذباتی لمحات تھے، میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکھا، میرے ہاتھ میں خنجر یونہی پکڑا ہوا تھا۔ تبھی میری ماں نے ہولے سے کہا۔

”جا، اسے صاف کر کے اپنا آپ بھی دھو، اس کا غلیظ خون تمہارے بدن پر نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے سنا اور سوئی کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔

میری ماں نے مجھے وہیں کپڑے دے دیے اور پرانے کپڑے لے جا کر انہیں آگ لگا دی۔ یہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب میں ہاتھ روم سے باہر آیا۔ کپڑے جل چکے تھے۔ میں اندر نہیں گیا۔ مجھے سوئی کے دکھ کا احساس تھا مگر میں اسے کوئی دلا سہ نہیں دے سکتا تھا، اس لیے میں اپنی جائے پناہ چھت پر چلا گیا۔ وہی میرے لیے سکون کا گوشہ تھا۔ میں نے سارے ہتھیار اپنی جگہ واپس رکھے، اپنا پسندیدہ پھل لی اور چھت پر پڑی چار پائی پر آ لیٹا۔ اس وقت میں اپنے اندر اتری ہوئی طمانیت کو محسوس کر رہا تھا۔



اس وقت رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ ہسپتال میں خاموشی تھی۔ جہاں کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ایک نلک ہر پریت کے چہرے پر دیکھ رہا تھا جو خواب آور دوائیوں کے زیر اثر محو خواب تھی۔ وہ جس وقت یہاں پہنچا تھا اسے سی سی یو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ انوجیت نے نجی کمرہ میں ہر پریت کو رکھا اور اس کے جاگ جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ جہاں نے اسے جانے کے لیے کہا تھا کہ وہ آرام کر لے وہ اسے آرام کرنے کا مشورہ دیتا رہا۔ بولوں کچھ بحث کے بعد جہاں اسے ریسرورٹ میں بھیجے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گاڑی لے کر نکل گیا۔ تب سے جہاں اسے دیکھتا جا رہا تھا اور اس کی سوچیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ اس وقت تک بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ اگرچہ اسے بھارت آئے بہت تھوڑے دن ہوئے تھے لیکن وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ یہاں محض جنگل کا قانون چل رہا ہے۔ جس کی طاقت ہے وہی اپنی من مانی کرتا ہے پتہ نہیں کب دینکوروں میں ایک بحث کے دوران کسی بندے نے ایک بات کی تھی بھارت کے بارے میں وہ اسے پوری سچائی کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بھارت پر الزام ہے کہ وہ ایک سیکولر ملک ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں ہندو راج کر رہے ہیں۔ چند ہندو خاندانوں نے پورے ملک کے لوگوں کو ریغال بنایا ہوا ہے اور مذہب کو وہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہندو دھرم میں چونکہ طاقت کی پوجا کی جاتی ہے اس لیے وہ طاقت ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اس کو ماننے بھی ہیں۔ اگر سامنے ضرور ہے تو ہندو پوری طاقت استعمال کر کے اسے کچل دینے میں ذرا برابر بھی نہیں ہچکچاتے، لیکن اگر سامنے سے کوئی طاقت ور آجائے تو پھر کتنے کی طرح دم دبا کر کونے میں لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی ان کی حکومت کا فلسفہ ہے اور یہی ان کی خارجی پالیسی کی بنیاد۔ وہ بھارت اور بھارتی معاشرے کو سمجھ گیا تھا۔ یہاں صرف کمزور کو دبا یا جاتا ہے اور طاقت ور کے ساتھ وہ دوستی کا تعلق بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن ہندو اپنی فطری منافقت نہیں چھوڑ سکتے۔ ایسا ہوتا ہے کہ ہر قوم کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ مزاج ماحول سے نہیں بنتا بلکہ ان نظریات کی وجہ سے خود بخود بن جاتا ہے جو وہ قوم رکھتی ہے۔ اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ اس میں موروثی اثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نظریات کو اپنانے پر مجبور کر دیتے ہیں یا نظریات آئندہ آنے والی نسلوں کی وراثتی حیثیت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ہر پریت کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ چونک گیا اور فوراً ہی اس کے قریب چلا گیا۔ ہر پریت ہوش میں آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لمس کا احساس پا کر ہر پریت نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے کی موہوم سی کوشش کی جس پر جہاں کے من میں پیار بھری لہر سرائیت کر گئی اور بے حد جذباتی ہو گیا، تبھی اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیسی ہو؟“

اس پر وہ بولنے کے لیے کوشش پرنا کام ہو گئی اس کے لب ہی لرزے تھے باقی بات آنکھوں سے کہہ دی، وہ تڑپ کر رہ گیا۔

”پریتی..... یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں تم..... موت.....“ اس نے کہنا چاہا تو ہر پریت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیا اور آنکھوں میں یہی تاثر تھا کہ وہ ایسی بات نہ کہے۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری بات اچھی نہیں لگ رہی ہے لیکن یہی حقیقت ہے پریتی..... تم بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ کس نے ہم پر حملہ کروایا ہے اور اس کے پیچھے کون ہے؟ میں انہیں چھوڑ دوں گا نہیں.....“

اس کے یوں کہنے پر ہر پریت کی آنکھوں میں تجسس اتر آیا۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کون ہے جہاں اسے بتاتا رہا کہ وہ کون ہے وہ پوری روداد سنی رہی یوں جہاں ہی باتیں کرتا رہا اور وہ سنی رہی۔ اس دوران نرس آگئی اس نے چارٹ پر لکھی ہوئی ہدایت کے مطابق اسے انجکشن دیا میڈیسن دی اور پلٹ گئی ہر پریت دوبارہ سو گئی، لیکن جہاں کی

آنکھوں میں سے نیند اڑ گئی تھی۔

صبح کی روشنی پھیلنے کے ساتھ ہی ہسپتال میں گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ انوجیت واپس آ گیا تھا۔

”تم ایسا کرو جہاں..... تم ریسرورٹ چلے جاؤ اور جا کر آرام کرو یا پھر واپس اوگی پنڈ چلے جاؤ۔ اور بے بے کو بھیج دو ان کا ہر پریت کے پاس ہونا ضروری ہے۔“

”جیسے تم کہو انوجیت، لیکن میرا یہاں رہنا زیادہ ٹھیک رہے گا۔ اگر بے آجائے تو آسانی رہے گی، اوگی میں تمہارا ہونا زیادہ ضروری ہے۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے میں ابھی نکلتا ہوں۔ دو پہر تک بے کو یہاں لے آؤں گا یا پھر کسی کے ساتھ انہیں بھیج دوں گا۔“ اس نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا اوگی میں ہونا زیادہ ضروری ہے۔ وہ کچھ دیر بعد بیٹھ کر چلا گیا تو جہاں ڈاکٹر کے کمرے میں جا پہنچا۔ کچھ دیر یونہی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب..... اندازاً ہر پریت کو ٹھیک ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟“

”میرے خیال میں تین ہفتے تو لگ جائیں گے زخم بھرنے تک..... وہ نوجوان ہے اور کوئی ایسی بیماری وغیرہ والا مسئلہ بھی نہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”یہاں سے کب ڈسچارج ہو پائے گی۔“ اس نے پوچھا۔

”یہی کوئی آٹھ سے دس دن تک..... کم از کم ایک ہفتہ.....“ اس نے بتایا۔

”اوکے ڈاکٹر..... میں یہی چاہ رہا تھا کہ مجھے پتہ چل جائے آخر ہمیں یہاں کتنے دن رہنا ہے۔“ جہاں نے بے دھیانی میں کہا اور پھر اس سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ یہ ہفتہ اسے جالندھر میں کیسے گزارنا ہے۔ وہ بے تاب تھا کہ وہ جلد از جلد اوگی پنڈ واپس چلا جائے اور رن ویر کو چھیڑے بغیر وہ بلجیت سنگھ کو اپنا نشانہ بنائے۔ کیونکہ رن ویر یہی چاہتا تھا کہ جہاں اس پر کھل جائے اور وہ اپنی تفتیش کے ڈانڈے اس کی ذات کے ساتھ باندھ دے..... وہ اپنے شک کو یقین میں بدلنا چاہتے تھے اور اس راستے سے جہاں کو بچنا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کیٹیو ممبر کو فون کر دیا۔ چند لمحوں بعد اس نے فون ریسو کر لیا تب اس نے ڈاکٹر کی معلومات اسے دے دیں۔

”تم ایسے کرو جہاں میں ہسپتال ہی کے نزدیک گیتا کالونی ہی میں تمہارے رہنے کا بندوبست کر دیتا ہوں ہوٹل وغیرہ میں تم محفوظ نہیں ہو گے۔ تم ریسرورٹ سے اپنا سامان لے کر وہاں آ جانا، میں تمہیں کچھ دیر بعد کال کرتا ہوں۔“

”اوکے.....!“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر ہر پریت کے پاس چلا گیا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر بھونچال اٹھا ہوا تھا۔ دشمنوں نے اسے کم از کم ایک ہفتے تک کے لیے ہسپتال تک محدود کر دیا تھا۔ تبھی اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا۔ اگر ہائی دے ہوٹل اس کے لیے محفوظ نہیں ہے تو کیا یہ ہسپتال اس کے لیے محفوظ ہو سکتا ہے؟ اس خیال نے اسے مزید مضطرب کر دیا، وہ جس قدر اس خیال پر سوچتا چلا جا رہا تھا بہت سارے پہلو اس کے ذہن میں آتے چلے گئے۔ اس نے جلدی سے فون کال انوجیت کو ملائی، وہ ابھی جالندھر شہر سے نکلا ہی تھا۔

”خیریت تو ہے نا جہاں.....“ اس نے پوچھا تو جہاں نے اپنا خیال اسے بتایا۔

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو خیر.....! میں کچھ دیر بعد تمہیں فون کرتا ہوں.....“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

جہاں نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت وہ نجانبے سوچ کی کس راہ پر نکلنے والا تھا اس کے سامنے آنکھیں موند بے ہر پریت پڑی تھی، جس کے لیے اس کے دل میں نجانبے کس قدر پیارا مند رہا تھا۔ اس کے ساتھ بتائے وقت کی بازگشت اسے جذباتی کرتی چلی

جاری تھی۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی پھر اس کے ساتھ ہی انسپکٹر اندر آ گیا؛ جہاں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

”اوئے انسپکٹر.....! یہ تیری پولیس چوکی نہیں ہے جو تو بلا اجازت اندر آ گیا ہے، چل باہر نکل۔“

”میں تم سے بات کرنے آیا ہوں.....“ اس نے کافی حد تک دھیمے لہجے میں کہا تو جہاں نے اٹھ کر سردے لہجے

میں کہا۔

”مجھے کہا ہے نہ نکل جا، تو بس نکل جا.....“

”دیکھ میں تجھ سے بات کرنے آیا ہوں۔“ اس بار اس نے غراتے ہوئے کہا تو جہاں نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ انسپکٹر کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس لیے لڑکھڑاتا ہوا دروازے میں جا لگا۔ جہاں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور دوسرا تھپڑ مار دیا پھر بازو سے پکڑ کر باہر رانداری میں نکال لیا۔ باہر دو پولیس والے کھڑے ہوئے تھے انہوں نے اپنے انسپکٹر کا حشر دیکھا تو چھڑانے کے لیے لپکے۔ تبھی ارد گرد شور مچ گیا کہ پولیس والے ایک بندے کو مار رہے ہیں۔ وہ ایک نئی ہسپتال تھا اور وہاں پریسکورٹی والے بھی تھے۔ وہ بھی تقریباً ایک سے ڈیڑھ دو منٹ تک آپس میں بھڑتے رہے۔ جہاں نے اگر دو ماریں تو انہوں نے چار مار دیں، تب تک سیکورٹی والے آن دھمکے انہوں نے الگ الگ کرتے ہوئے جہاں کو ایک طرف کیا، بھی ان کے بڑے نے پوچھا۔

”یہ ہنگامہ کیوں ہے؟“

”میں اس سے بات کرنے آیا تھا اور یہ میرے گلے پڑ گیا..... اسے نہیں معلوم کہ وردی کیا ہوتی ہے..... میں

اب تجھے بتاتا ہوں.....“ انسپکٹر نے انتہائی غصے میں کہا۔

”اوئے بے غیرت بیچ بتا، تو مجھ سے رشوت مانگے آیا تھا، ورنہ سخت کارروائی سے ڈرا رہا تھا، یہ جھوڑو..... مجھے ہسپتال کے ہیڈ سے ملو، میں پوچھوں، یہ ہمارے کمرے میں اجازت کے بغیر کیسے آیا، چلو اس کے پاس چلو.....“ جہاں نے تیزی سے مگر اونچی آواز میں کہا۔

”انسپکٹر..... کیا آپ نے اجازت لی تھی؟“ سیکورٹی گاڑڈ نے پوچھا۔

”ہمیں کیا اجازت لینے کی ضرورت ہے اوئے.....“ انسپکٹر نے بھنا کر کہا۔

”تو چلو پھر ہیڈ کے پاس..... وہی آپ کا فیصلہ کرتے ہیں۔“ سیکورٹی گاڑڈ نے کہا۔

”تو ہمیں روک کے دکھا.....“ انسپکٹر نے غصے میں کہا تو جہاں نے ایک تھپڑ مزید جڑ دیا اور چیخ کر بولا۔

”میں روکوں گا تمہیں، تو یہاں سے جا کر دکھا۔“

اس چیخ و پکار میں لوگوں کا رش بڑھنے لگا تھا۔ تبھی ہسپتال کا ہیڈ اور مالک بھاگتا ہوا وہاں آ گیا۔ وہ موٹی تو ند والا شخص تھا، جس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”کیا بات ہوگئی.....؟“

سیکورٹی گاڑڈ نے اپنی طرف سے تفصیل بتائی تو جہاں نے کہا۔

”یہ کیسا قانون ہے یہاں پر گولی بھی ہم پر چلی اور یہ دھمکیاں بھی ہمیں لگا رہا ہے۔ اور آپ کیا یہاں سیکورٹی ایسی ہی ہے جو چاہے جس وقت چاہے کسی کا آکر گریبان پکڑ لے کیا یہ آپ کی اجازت سے ہمارے کمرے میں گھسا ہے۔“

”میں اس کے پاس آیا تھا کہ زخمی کا بیان لے لوں۔“ انسپکٹر نے حالات اور ماحول کو سمجھتے ہوئے کافی حد تک تحمل سے کہا تو ہیڈ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”تو آپ کو پہلے ہم سے اجازت لینے چاہیے تھی۔ ہم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ مریض اس حالت میں ہے کہ وہ بیان دے بھی سکتا ہے یا نہیں، یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔“

”میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا.....“ انسپکٹر نے کہا تو جہاں بولا۔

”اسے اپنے کمرے میں بٹھائیں اور میڈیا کو یہاں بلوائیں اس کے سامنے اس کا چہرہ نگا کریں..... کل سے اس کو حملہ آور پکڑ کر دیا ہے اس کا اس نے کچھ نہیں کیا اور بیان لینے یہاں آ پہنچا ہے۔“ یہ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اسے کیشیو مہرہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ بھی تھے۔ اس نے آتے ہی صورت حال کے بارے میں آگاہی لی اور ہیڈ کو اپنا تعارف کرا کر بولا۔

”یہ اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اس انسپکٹر کے خلاف کیس بنوائیں اسے اپنے کمرے تک محدود رکھیں میں ابھی میڈیا والوں کو بلاتا ہوں.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پیش کرنے لگا۔ تبھی ہیڈ کی جان پر بن گئی۔ ظاہر ہے معاملہ میڈیا میں گیا تو اس کے ہسپتال کے بارے میں بھی غلط تاثر جانے والا تھا۔ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

”آپ..... ذرا ٹھہریں..... ہم آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں..... آئیے.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنے آفس کی جانب چل پڑا۔

انسپکٹر حالات کی نزاکت کو بھانپ گیا تھا۔ ممکن ہے آفس میں سکون سے بیٹھنے تک عقل آگئی ہو۔ اس نے سب کے بیٹھتے ہی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”بلاشبہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے، مجھے آپ سے اجازت لے کر ان کے کمرے میں جانا چاہیے تھا۔ میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے تم آئے کس لیے تھے؟“ جہاں نے غصے میں پوچھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنا سارا غصہ اس پر اتار دے۔

”دیکھیں..... آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے آپ میری بات سنیں تو میں آپ کو بتاؤں.....“ اس نے تمیز سے کہا۔

”اچھا چلو بولو،“ کیشیو مہرہ نے تیزی سے کہا۔

”میں انہیں بتانے آیا تھا کہ کل جو حملہ آور انہوں نے ہم تک پہنچایا تھا وہ تھانے سے بھاگ گیا ہے اور اس سے.....“

”انسپکٹر کیوں جھوٹ بولتے ہو تم..... کل تم نے ہمارے سامنے اپنے دو حوالاتیوں کو ہسپتال روانہ کیا تھا، کیا ایسا نہیں ہے؟“ کیشیو نے طنز یہ انداز میں کہا تو وہ دھیرے سے بولا۔

”میں بس اس پر آپ سے بات کرنے آیا تھا، وہ حملہ آور.....“

”کیا ہوا اسے.....؟“ جہاں نے تیزی سے کہا۔

”وہ دونوں حوالاتی اغوا ہو گئے ہیں یا ان کے ساتھی انہیں چھڑا کر لے گئے ہیں۔ میں اپنے کل والے رویے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ آپ سے مل کر اس صورت حال کو سمجھا لوں۔“ انسپکٹر نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہو اس کے ماتھے سے شیشے کا گلاس چھن کر ٹوٹ گیا ہو، کیشیو نے کہا۔

”تم ایسا کرو انسپکٹر.....! اپنے تھانے جاؤ، میں نے عدالت میں آج کیس دائر کر دینا ہے، میں اے سی بی سے اہل ملوں گا، اور تمہاری کارکردگی بتاؤں گا، انسانی حقوق کی تنظیمیں خود تم سے پوچھ لیں گی، مہلا دل (خواتین مجاز) کو بھی متحرک کر دوں گا، اور میڈیا خود بخود ان کی طرف متوجہ ہو جائے گا، تم جاؤ اب ہم خود سنبھال لیں گے۔“

”ٹھیک ہے جی اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو مزید کیا کہہ سکتا ہوں۔“ انسپکٹر کو لگا کہ شاید ان تلوں میں تیل نہیں ہے یا پھر شاید اسے اپنی انسپکٹری کا جوش آگیا ہوگا، یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بجا، لیکن جہاں سمجھ رہا تھا کہ اسے انسپکٹر رن دیر اور اس کے ڈیپارٹمنٹ کی پوری آشر واد حاصل ہے وہ وہاں سے اٹھا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ بھی کیشیو مہرہ نے ہینڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں جناب آپ نے بھی سن لیا ہوگا کہ اصل میں معاملہ کیا ہے۔ آپ فوراً اپنے متعلقہ اداروں کو اطلاع دیں اس واقعہ کی آپ اپنا تحفظ کر لیں ممکن ہے کل کہیں جواب دی ہو جائے۔“

جہاں یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ شخص دھمکی ہے ممکن ہے مستقبل میں ایسا کچھ نہ ہو جس وقت کیشیو مہرہ نہیں آیا تھا اس کے دماغ میں یہ کہیں بھی نہیں تھا کہ وہ اس واقعہ کو کیسے استعمال کر پائے گا۔ لیکن اس کے شاطر دماغ نے کر لیا وہ تو شخص اپنا غصہ انسپکٹر پر اتارنا چاہتا تھا وہ دونوں ہیڈ کے کمرے سے باہر آ گئے تھے اور پھر تیزی سے ہر پریت کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ جہاں نے ایک بار اندر جھانک کر دیکھا ہر پریت بخواب تھی۔

”میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں جالندھر میں ان لوگوں کے ساتھ دکھائی دو جو کسی نہ کسی حوالے سے جرم کی دنیا سے منسلک ہیں۔ میں نے گیتا کا لونی ہی میں تمہارا بندوبست کر دیا تھا، مگر اس واقعے کے بعد مجھے نہیں لگتا کہ تم محفوظ رہو گے اس لیے تمہیں کسی ایسے بندے کے ساتھ رکھنا ہوگا جہاں کم از کم تمہارا تحفظ ہو سکے۔“ کیشیو نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

”لیکن یہاں ہر پریت.....؟“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”یہ انوجیت کی ذمہ داری ہوگی دشمن ہمیں ایک جگہ محدود کر دینا چاہتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

”ہمیں محدود کرنے سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ ہمیں دیوار کے ساتھ لگا کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم مدد کے لیے کس کی طرف دیکھتے ہیں یا کون ہماری مدد کو آتا ہے؟ اس سے سارا معاملہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔ دوسرا ہمارے ایک جگہ محدود ہوجانے سے اگر ان پر کوئی حملہ نہیں ہوتا تو بھی وہ سمجھ جائیں گے..... تم ان کے سامنے بھی رہو لیکن انہیں نقصان پہنچا دو..... میں یہی چاہتا ہوں۔“

”اب کرنا کیا ہے؟“

”فوراً تم اوگی میں چلے جاؤ..... اور تمہارا آنا سامنا بلجیت سے ہو جائے شرط یہ ہے کہ وہ تم پر حملہ آور ہو ملازمین کی صورت میں کچھ بندے تیرے ساتھ بھیج دوں گا۔“

”ٹھیک ہے انوجیت آ جائے تو میں اوگی پنڈ چلا جاؤں گا۔“

”اوکے.....! میں دو پہر دو بجے کے قریب تجھے ریسرورٹ میں ملتا ہوں۔ وہیں تجھے بتاؤں گا کہ میں نے کیا کیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ چند لمحے کمرے کے باہر کھڑا ہوا پھر ہر پریت کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ہنوز بخواب تھی اس جہرے پر پیلا ہٹ واضح تھی وہ اس میں کھویا ہوا تھا کہ انوجیت کا فون آ گیا۔

”جہاں ہسپتال میں کیا ہنگامہ ہو گیا؟“

”ہو کر ختم بھی ہو گیا۔“ یہ کہہ کر اس نے اختصار سے ساری بات کہہ دی۔ تب وہ بولا۔

”میں ایک گھنٹے میں ہسپتال آ جاتا ہوں لیکن میرے آنے سے پہلے ہی کچھ لڑکے وہاں آ جائیں گے۔ اب

ہر پریت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد پھوپھو کلجیت کور کے ساتھ انوجیت آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”جہاں..... اب تو آزاد ہے جو چاہے کر میں ہر پریت کو سنبھال لوں گا۔“

”پتر.....! یہ حالات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس سے آگے بہت سخت حالات آنے والے ہیں۔ دشمن بہت

طاقتور ہے اور یہ جنگ کب تک رہے گی اس کا کوئی پتہ نہیں میری ہر پریت تو ایک دو ہفتے بعد ٹھیک ہو جائے گی لیکن رب تیری خیر کرے۔ دشمن تیری تاک میں ہیں۔“

”رب خیر ہی کرے گا پھوپھو..... تو دل تھوڑا نہ کر مجھے اوگی پنڈ جانے دے پھر میں بلجیت سنگھ کو بھی دیکھ لیتا ہوں اور رن دیکھو کبھی ایک نہ ایک دن تو آئے سنا ہونا ہی ہے۔“ اس کے لہجے میں سے غصہ جھلک رہا تھا۔

”جو کچھ بھی ہے پتر لیکن جنگ میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ تیرے دشمن طاقتور ہی نہیں انتہائی چالاک بھی ہیں۔ کلجیت کور نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کی بات ذہن میں رکھوں گا پھوپھو جی.....“ یہ کہہ کر اس نے انوجیت کی طرف دیکھا پھر ایک نگاہ ہر پریت پر ڈالی اور باہر کی طرف نکلتا چلا گیا۔ اس کا رخ ریسرورٹ کی طرف تھا جہاں کچھ دیر بعد اس سے کیشیو مہرہ نے آن ملنا تھا۔ وہ جالندھر بائی پاس پر موجود ریسرورٹ پہنچا تو اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ اس نے جاتے ہی اپنا سامان سینٹا اور بیگ تیار کر کے باہر کاؤنٹر تک آ گیا۔ اس نے وہاں ادائیگی کی یہاں تک کہ اس میں دو بج گئے اور کیشیو کا فون آ گیا۔ وہ وہیں پر پہنچ رہا تھا۔

وہ دونوں لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیشیو اسے بتا چکا تھا کہ اس نے اے سی پی کو مطلع کر دیا ہے اور دوسری درخواست گزار دی ہے۔ چند چینل کے رپورٹرز کے ساتھ رابطہ کر کے انہیں اس راہ پر لگادیا ہے وہ خود ہی خبر بنا کر چلائیں گے۔ وہ صحافیوں کو چلانے کا ہنر جانتا تھا اس نے کافی حد تک ان کی ضرورت پوری کر دی تھی اور وہ جی جان سے اس کی مدد کرنے کو تیار ہو چکے تھے۔

”اب تم سکون سے اوگی پنڈ جاؤ اور تمہارا پہلا ٹارگٹ یہی ہونا چاہیے کہ بلجیت سنگھ کسی نہ کسی طرح اپنے بل سے نکلے اور پھر جس طرح پہلے دھمکیاں دے گیا تھا اسی طرح پھر دے دوسری طرف تم نے رن دیکو دباؤ میں رکھنا ہے کہ تم پر حملہ آوروں کا کیا بنا چاہے روزانہ تمہیں پولیس چوکی جانا پڑے۔“

”میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو یہاں ہر حال میں ہر پریت کا خیال رکھنا میرا سارا دھیان ادھر رہے گا۔“ جہاں نے آہستگی سے کہا تو کیشیو ہنستے ہوئے بولا۔

”اب اوگی اتنا بھی دور نہیں ہے یا؟ میں منٹ کا راستہ ہے جب دل چاہے آ جانا اور پھر کبھی کبھی تجھے عدالت میں بھی آنا ہوگا شاید میں نے مقدمہ بھی تو دائر کر دیا ہے اگرچہ فیصلہ دو چار برسوں میں تو نہیں ہونے والا۔“

”کیشیو.....! تم میری جائیداد والا معاملہ جلد سے جلد حل کر دو باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔“ جہاں نے یوں کہا جیسے اس کی زنجیریں کھل جائیں گی۔

”صرف ایک یا دو ہفتے تمہارا کیس متعلقہ محکمے کے اہلکاروں نے دیکھ لیا ہے اب بس ان کے ساتھ رشوت طے ہونی ہے۔“

”تو وہ کرونا..... دیکر کس بات کی ہے؟“ جہاں نے تیزی سے کہا۔

”وہ بھی ہو گیا سمجھو میں نے ایک دو دن میں فائل کر لینا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”اندازاً کتنی رقم مانگ سکتے ہیں میں اس کا.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں ضرورت..... جسمیںڈرنے کا ڈنٹ میں خاصی رقم ڈال دی ہے تم اس کی فکر نہ کرو۔“
 ”چل ٹھیک ہے پھر میں نکلتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ہاں وہ میں نے تمہارے لیے دس بندوں کا انتظام کر دیا ہے وہ تیرے ساتھ حویلی میں رہیں گے میں نے انہیں اوگی بھیج دیا ہے۔“ کیشیو نے اس سے اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور دونوں باہر کی جانب چل دیئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اوگی پہنچ گیا۔ وہ سیدھا کونھی گیا۔ وہاں اس نے سامان وغیرہ رکھا پھر جوتی کو بتایا کہ حویلی میں رہنے کے لیے کوئی بند و بست نہیں ہے وہاں چند لوگوں نے رہنا ہے اس لیے کم از کم ان کے سونے کا بند و بست کرنے کے لیے بستر نکال دے اور رات کا کھانا تیار کر دے۔ ایسی ہی باتیں بتا کر وہ حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ رن ویر کا فون تھا۔

”واپس اوگی آنے پر خوش آمدید کہتا ہوں جہاں.....“
 ”اچھا کیا تم نے خود فون کر لیا اور نہ میں تیری طرف خود آنے والا تھا۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔
 ”تو اب آ جاؤ میں چوکی ہی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ کیا تمہارے ساتھ ہر پریت نہیں آئی سنا ہے کسی نے اسے گولی مار دی تھی۔“

”اب تمہیں ساری بات کا پتہ ہے تو کیوں چغل خور عورتوں کی طرح کن سوئیاں لے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
 ”سنا ہے تم نے حویلی میں بدمعاش بھی بلا لیے ہیں۔ دیکھنا یہ جو کچھ بھی کریں گے اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔“

”میں اپنی ذمہ داری جانتا ہوں رن ویر تم نہیں جانتے ہو۔ اب تک کیا تفتیش کی تم نے..... لگتا ہے تمہیں اب اپنا نام بدلنا پڑے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں انہیں جو کسی کا پھینکا ہوا اٹھا کر کھاتے ہیں۔“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ لیکن غصہ اس کے لہجے سے پھلک گیا تھا۔

”جہاں.....! تم مجھے نہیں جانتے..... مگر آہستہ آہستہ جان جاؤ گے..... میں بندے پر فوراً ہاتھ نہیں ڈالتا بلکہ اسے مجبور کر دیتا ہوں کہ وہ خود چل کر میرے پاس آئے تمہیں بھی آنا ہوگا۔ پھر تم جتنے سوال کرنا میں ان کے جواب دوں گا اور اگر سوال نہ کر سکتے تو پھر جواب فوراً دینا۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”اب تو چل پڑے ہیں رن ویر..... دیکھنا کیا ہوتا ہے۔“ جہاں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
 وہ اوگی پنڈ میں پہنچ کر حویلی کے سامنے جاڑ کا تھا۔ حویلی کے باہر دیکیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک ٹرک سائیڈ میں کھڑا تھا جس میں سے مزدور سامان اتار کر اندر لے جا رہے تھے۔ سامنے ہی ایک نوجوان سکھ لڑکا کھڑا تھا جس نے سفید پتلون پہلے اور ہلکے سبز رنگ کی شرٹ اور سفید ہی پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی وہ اس کی گاڑی کی طرف متوجہ تھا۔ جس یال جب کار سے اتر کر دروازہ بند کر چکا تو وہ آگے بڑھا اور زوردار انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔
 ”میں پر یال سنگھ ہوں بائی جی باقی کو میں ہی لیڈ کروں گا۔“

”اوہ پر یال.....! کیسے ہو؟ یہ دیکیں اور یہ سامان.....؟“ اس نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”دیکیں اس لیے چڑھائی ہیں کہ لوگ یہاں سے آ کر کھانا لے جائیں۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ حویلی آباد

ہوگئی ہے اور باقی رہی سامان کی بات تو بائی جی ہم نے یہاں رہنا ہے بستے گھروں میں سامان کے بغیر کیسے رہا جاسکتا ہے۔“
 ”مطلب..... تم لوگ سارا بند و بست کر کے آئے ہو۔“ جہاں نے کہا۔

”جی بائی جی کیشیو صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو فون کال بھی نہ کرنی پڑے رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“
 ”کیشیو صاحب بہت اچھے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ حویلی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔
 ”آئیں میں آپ کو سب سے ملواتا ہوں۔“

”ہاں چلو۔“ جہاں نے کہا اور دونوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔



دن اچھا خاصا نکل آیا تھا جب میری آنکھ کھلی میں چھت پر ہی پڑا تھا۔ مجھے کسی نے جگایا ہی نہیں تھا۔ میں رات سونا نہیں چاہتا تھا لیکن نجانے اتنے زوروں کی نیند کہاں سے آ گئی۔ سورج کی گرمی کا احساس ہی تھا جس نے مجھے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا پھر اٹھ کر بیچے آ گیا۔ میں سیدھا ہاتھ روم میں گیا۔ وہاں خوب نہا کر کسلندی دور کی واپس اندر کی طرف آیا تو کمرے میں ناشتہ لگا ہوا تھا۔ مگر نہ اماں دکھائی دی اور نہ سوئی۔ میں نے ناشتہ کیا ٹھنڈی لسی کے گلاس نے پرسکون کر دیا۔ میں اس وقت گلاس رکھ کر تھوڑا سکون کرنا چاہ رہا تھا کہ سوئی کمرے میں آئی وہ کافی حد تک سوگوار سی تھی۔ میں نے ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کے لب دھیرے دھیرے لرزاں تھے۔ میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی باہر جانے کا سوچا میں نے اپنا جوتا پہنا اور باہر جانے کی نیت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بھانپ لیا کہ میں جانا چاہتا ہوں اس لیے سوئی نے بڑے نرم انداز میں اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا اس نے ایک لمحہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر میرے گلے لگ کر زور و قطار رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ بچکیوں اور سسکیوں میں اس کا بدن لرزنے لگا۔ میں نے اسے سنبھال دیا اور خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کڑوا گھونٹ تو تجھے پینا ہی ہوگا سوئی۔“

”میں..... میں..... تو ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھی۔ مگر اتنی جلدی ایسا ہو جائے گا یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔“ باپ..... ملا بھی..... تو بس چند گھنٹے..... یہ کہتے ہوئے وہ پھر سے رونے لگی۔

”سوئی.....! جتنا رو سکتی ہو اپنے باپ کو رولو پھر اس کے بعد نہیں رونا..... سوچو تم چند گھنٹے کے باپ کو رو رہی ہو جو تمہیں بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا میں بھی تو ہوں..... جسے باپ کے لمس کا احساس تک نہیں مجھ..... میرے باپ کی شفقت چھیننے والا وہی شخص تھا اب رولو جتنا رونا ہے..... میں نے بہت حد تک اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا میں اپنے باپ کی میت پر جانیں سکوں گی۔ میں اس کا چہرہ آخری بار نہیں دیکھ سکوں گی؟“ سوئی نے کہا۔
 ”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا میں ابھی باہر جاؤں گا باہر کی فضا کیا ہے اس بارے میں معلومات لوں گا پھر کچھ کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اگر ممکن ہو سکے تو خدا را.....“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”سوئی..... اتنی نرم دل مت بنو جو لوگ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں انہیں بھولنا پڑتا ہے۔ نہ بھولیں تو روگ بن جاتا ہے۔ جس کی مثال میں ہوں۔ مردہ چہروں کو آنکھوں میں مت رکھو۔ لیکن اگر تم چاہتی ہو تو حویلی چلی جاؤ میں اماں کے ساتھ تمہیں بھیج دیتا ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ.....“ میں نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

”اماں تو صبح کی وہاں چلی گئی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے وہاں دھتکار دیا جائے گا۔“ سوئی نے کسی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا۔

”پھر بھی تم چاہتی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ضروری تو نہیں کہ بندے کی ساری خواہشیں پوری ہو جائیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بھی اس کے پاس وہیں بیٹھ جاؤں میں نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”دیکھ سوئی، تجھے چاہے جائیداد کی بھوک ہے یا نہیں لیکن شاہ زیب کو ہے وہ کسی صورت بھی تجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہے گا۔ اب تجھے اپنے اپنے راستے سے ہٹانے کا وہ کوئی طریقہ بھی آزمائے ممکن ہے وہ تجھے بہن کا مان اور عزت دے کر حویلی بھی لے جائے یا پھر سیدھے سہاؤ قتل کروانے کی کوشش کرے یا ممکن ہے کوئی سازش کر کے قتل کروائے..... اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں جمال.....! مجھے جائیداد کی قطعاً کوئی بھوک نہیں۔ اور نہ ہی میں اس کے لیے کوشش کروں گی، میری ماں کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ میں سکون سے زندگی گزار لوں اور اگر میری ماں بھی مجھے اپنے گلے نہ لگائے تو مجھے اتنا یقین ہے تو مجھے ضرور اپنی جوتیوں میں جگہ دے دے گا۔“ سوئی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیار اور محبت کی لہریں ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی کہیں دور تک پھیل گئیں۔

”یہ یاد رکھو میں اب تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا، لیکن کبھی بھی تم پر نہ اپنا دعویٰ رکھوں گا اور نہ جبر کروں گا، تم اپنی مرضی کی مالک ہو جو چاہو سو فیصلہ کرو۔“ میں نے اپنی سوچ کا اظہار کر دیا۔ تبھی اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”میں تجھے اپنا دل دے چکی ہوں جمال، ایک عام لڑکی جب اپنا دل دے دیتی ہے نا، تو پھر وہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے، وہ چاہے جان لے لے یا زندہ رکھے..... میں تو پھر ایک طوائف ہوں، طوائف کا جس پر دل آ جائے نا وہ.....“ سوئی نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کیا تم ایسا نہیں کر سکتی ہو کہ خود کو طوائف سمجھنا چھوڑ دو، اس زندگی کو بھول جاؤ؟“

”تم چاہو تو.....“ اس نے بڑے گھمبیر لہجے میں جواب دیا۔

”سوئی.....! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میں تم سے محبت محسوس کرتا ہوں اور بلاشبہ تم اتنی پیاری ہو ایسی ہو کہ تم سے محبت کی جائے، لیکن مجھے خود پر اعتماد نہیں ہے، آج میں ہوں، پتہ نہیں اگلے چند لمحوں میں یا محض چند گھنٹوں میں نہ رہوں یہ کتنی سنسناتی ہوئی گولی، میرا جسم ٹھنڈا کر دے..... اور پھر.....“

”ایسا نہ کہو جمال.....!“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”نہیں..... مجھے کہنے دو..... جس طرح کی جنگ میں نے چھیڑ لی ہے اس میں بہت کچھ بھی کچھ نہیں ہے۔ کل اگر شاہ زیب مجھے اپنے ڈیرے پر مار دیتا تو کیا ہوتا، زندگی اور موت بے شک اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن یوں بھی تو ہو سکتا ہے نا میری باقی زندگی کسی جیل خانے میں گزر جائے، یا میں اشتہاری بن جاؤں۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی تم تک رسائی نہ ہو؟“ میں نے اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا جس کے بارے میں وہ بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ چند لمے سوچتی رہی پھر بولی۔

”تم ایسا کیوں نہیں سوچتے ہو کہ تمہارا جو مقصد تھا، وہ پورا ہو چکا۔ ہم یہ جگہ یہ علاقہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اپنی

زندگی کو چھوڑ دیتی ہوں۔ ہم کسی دوسری جگہ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔“

”بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی ایک پرسکون زندگی چاہتا ہوں، ایک پرسکون گھر کا خواب میرے اندر بھی ہے لیکن سوئی، کیا یہ سب ایک دودن میں ہو سکتا ہے، ہمیں یہاں سے سمیٹ کر کسی نئی جگہ پر جا کر نئی زندگی شروع کرنے میں کچھ دن تو لگیں گے۔ میں تیری بات مان لیتا ہوں، پھر بھی اگر میری زندگی میں سکون نہ رہا، وہی سب کچھ ہوا جو میں نے تمہیں پہلے کہا ہے تو پھر.....؟“ میں نے تیزی سے کہتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”وہ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“

”سوئی..... تب مجھے وہ زندگی چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہوگا۔ اتنا دکھ کہ شاید تم اس کا تصور بھی نہ کر سکتی ہو۔ اس وقت میری اکیلی جان ہے، میرے ساتھ کچھ بھی ہو جائے مجھے کچھ فرق نہیں پڑنا۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس وقت تم اکیلی جان ہو، کیا اماں نہیں ہے، کیا میں نہیں ہوں۔“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”سن.....! جب اماں نے مجھے یہ راستہ دکھایا تھا تو ساتھ میں یہ سبق بھی دے دیا تھا کہ پتر خود کو اکیلا بھی سمجھنا میری فکر مت کرنا، میرے بارے میں سوچو گے تو کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے، یہ سبق میں نے یاد رکھا، اس نے مجھے حوصلہ دیا، آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوں لیکن یہ کامیابی ابھی ادھوری ہے، شاہ زیب نے پلٹ کر مجھ پر وار کرنا ہے، اور میں بزدلوں کی طرح یہاں سے بھاگ جانا نہیں چاہتا، یہیں رہنا چاہتا ہوں اور جہاں تک تمہاری بات ہے، تمہارا یہ چند دن کا ساتھ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم صدیوں سے ایک ہوں۔ بلاشبہ تم مجھے اچھی لگتی ہو لیکن تم بتاؤ، کیا میں ان حالات میں ایک گھر بنا سکتا ہوں، تمہارے خوابوں میں رنگ بھر سکتا ہوں۔“ میں بے حد جذباتی ہو گیا تھا، اس لیے کہتا چلا گیا۔

”جمال.....! تم جو سوچو، جو چاہو، میں تمہاری ہوں، زندگی کے آخری لمحے تک میں تیری منتظر رہوں گی، میں اپنا آپ تیرے لیے وقف کر چکی ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور اپنا سر میرے کان دھسے پر رکھ دیا۔ تبھی میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”زندگی میں بھی جینا چاہتا ہوں، لیکن اک ذرا صبر، میں نے خود یہاں نہیں رہنا، یہاں سے دور بہت دور چلے جانا ہے، تم جانتی ہو کہ میں یونہی اچانک اس کھیل سے نہیں نکل سکتا۔ ذرا وقت لگے گا، اور تم میرے ساتھ اس وقت تک کا انتظار کر لو۔“

”میں تمہاری ہوں، تم میری زندگی کے مالک ہو۔ جو چاہو اور جیسا فیصلہ کرو مجھے قبول ہوگا۔“ اس نے حتیٰ انداز میں کہا۔ تبھی میں نے اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”بس یہی یقین رکھنا کہ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ یہ چند دن، چند ہفتے بھی ہو سکتے ہیں، چند مہینے، پھر ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور اگر میں نہ رہا تو.....“

”ایسا مت سوچو.....“ اس نے جلدی سے خود کو الگ کر کے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم یہ باتیں برداشت نہیں کر پا رہی ہو، تمہیں تو میرے ساتھ چلتے ہوئے بہت بہادر ہونا پڑے گا۔ بہت حوصلہ رکھنا پڑے گا۔“ میں نے اس کے ہونٹوں کی زماہٹ کو اپنی انگلی کی پور سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”تم دیکھنا جمال، میں تیرے رنگ میں خود کو کیسے رنگتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ میرے کان دھسے سے لگ گئی۔ میں کچھ دیر اس کی پیٹھ تھپکتا رہا، ایسے میں گیٹ بجنے کی آواز آئی..... وہ مجھ سے الگ ہو گئی، میں اٹھا اور گیٹ تک گیا۔ باہر

چھا کا تھا، وہ خاموشی سے چلتا ہوا میرے ساتھ دالان میں آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔

”اماں نہیں ہے؟“

”وہ تو ہے..... خیر! اب دیکھتے ہیں کہ اپنے منہ سے ہوا کیا نکالتا ہے تو پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے.....“ یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پوچھا۔ ”اماں تو حویلی گئی ہے کیا سوئی بھی گھر پر نہیں ہے۔“ اس نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ بچن میں سے سوئی نے آواز دی۔

”ہاں چھاکے کیا بات ہے میں ادھر چائے بنا رہی ہوں تمہارے لیے۔“

”بس یہی کہنا تھا میں نے..... جلدی سے بنالاء.....“ اس نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی بات کرتے گیٹ پر دستک ہوئی، میں قدرے حیران ہوا کہ اماں کو دستک دینے کی کیا ضرورت دروازہ تو کھلا ہوا ہے ممکن ہے کوئی اور ہو، یہی سوچ کر میں اٹھا اور گیٹ تک گیا۔ میں نے باہر جھانکا تو سامنے ڈی ایس پی کھڑا تھا، اس کے ارد گرد بہت ساری پولیس کی نفری تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں باہر والا کمرہ کھولتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے گیٹ بند کرنا چاہا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا، پھر بڑے سرد سے لہجے میں بولا۔

”میں تمہیں گرفتار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا اور پھر پلٹ کر اندر کی جانب نگاہ دوڑائی، سوئی اور چھاکے دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے ڈی ایس پی میرا بازو پکڑے ہوئے میری گرفتاری کا اعلان کر چکا تھا۔



”میں بھاگوں گا نہیں ڈی ایس پی صاحب! اور نہ میں یہ پوچھوں گا کہ مجھے کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ چلیں، میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ.....“ میں نے چل سے کہا تو وہ غصے اور رعب زدہ لہجے میں بولا۔

”تم بھاگ سکتے بھی نہیں ہو۔ اگر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کر دکھا دو۔“

اس کا انداز مجھے چیلنج کرنے والا تھا۔ مگر میں نے خود کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سوچ چکا تھا کہ میں نے کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کرنی۔

”کہانا..... گرفتار کر لیں مجھے۔“ میں نے کہا تو اسی غصے بھرے لہجے میں بولا۔

”یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں کس جرم میں پکڑ کر لے جا رہا ہوں؟“

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور کوئی چاہے تو بکری چوری کا الزام بھی لگا سکتا ہے۔ آپ گرفتار کرنے آئے ہیں تو کر لیں مگر میں یہ ثابت کر دوں گا کہ میں نے یہ قتل نہیں کیا، محض مجھے پھنسا یا جا رہا ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے دھیرے سے اپنا بازو چھڑوایا اور پولیس دین کی جانب بڑھ گیا جو مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

”ہتھکڑی لگاؤ اسے.....“ اس نے اونچی آواز میں اپنے کسی ماتحت سے کہا۔ اگلے ہی لمحے ایک کانسٹیبل آگے

بڑھا اور اس نے مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ میں اس کے ساتھ پولیس دین میں جا بیٹھا۔ میں نے دیکھا سوئی گیٹ کی درز سے مجھے دیکھ رہی تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اطمینان رکھنے کو کہا، تب تک دین چل دی، اس کے آگے پیچھے گاڑیوں کا قافلہ یوں چل پڑا جیسے کسی اشتہاری مجرم یا پھر کسی دہشت گرد کو پکڑا جاتا ہے۔

جلد یا بدیر ایسا ہونا ہی تھا۔ میں چاہے لاکھ محتاط رہتا، کوئی ثبوت بھی نہ ہوتا لیکن شاہ زیب نے پھر بھی مجھے گرفتار ضرور کروانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ قتل میرے سوا کوئی اور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ وہ مجھ پر یہ جرم ثابت کر سکتا تھا یا نہیں۔ مجھے اس کے سیاسی اثر و رسوخ اور تعلقات کا پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ چاہے جرم ثابت کر سکتا

”وہ حویلی گئی ہے۔ سنا ہے سردار شاہ دین قتل ہو گیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ اس حوالے سے مجھے مزید باتیں بتائے۔

”ہاں..... سنا تو یہی ہے، کوئی کہتا ہے اس نے خودکشی کر لی ہے اور کوئی کہتا ہے قتل ہوا ہے وہ کوئی بہت ہی ظالم قاتل تھا جس نے اس کے زخروں پر خنجر پھیر دیا۔ ویسے اگر وہ خودکشی کر لیتا تو زیادہ اچھا نہیں تھا؟“ چھاکے نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”میرے خیال میں اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی ہوگی۔ خیر..... پتہ چلا کہ شاہ زیب کیا کہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ابھی تک خاموش ہے۔ پولیس آئی تھی صبح صبح..... کیونکہ قتل کا پتہ ہی صبح چلا ہے۔ رات سارے ملازمین اور سیکورٹی گارڈ ڈیرے پر تھے۔ وہاں کیا کچھڑی پکتی رہی ہے یہ تو ابھی معلوم نہیں ہوا۔ مجھے چاچیرا ابھی نہیں ملا، میں ایک چکر اس کے گھر کا لگا آیا ہوں وہ حویلی میں ہے آتا ہے تو معلوم ہو جائے گا۔“

”تو پولیس کے آنے کے بارے میں بتا رہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں پولیس آئی تھی انہوں نے لاش کو قبضے میں لے لیا ہے اور قصبے والے ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ شاہ زیب بھی ساتھ ہے یقیناً اب ایف آئی آر درج ہوگی، سردار تو پورا زور لگا دیں گے قاتل پکڑنے کے لیے۔“

”علاقے کی کیا صورتحال ہے کیا علاقے میں یہ بات گردش نہیں کر رہی ہے کہ شاہ زیب اپنے باپ کا قاتل خود بھی ہو سکتا ہے اس نے کسی کرائے کے قاتل سے قتل کروایا، کیونکہ وہ اپنے باپ سے ناراض تھا، سیکورٹی والوں کے ساتھ ڈیرے پر تھا، شک تو جاتا ہے نا اس کی طرف.....“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... یہ تو ممکن ہے کہ ایسی بازگشت بھی ہو، پھر ناراضگی کی وجہ سے سامنے آئے گی، پولیس والے تو جانتے ہیں نا کہ شاہ زیب ناراض تھا، ایک دوسرے کے ساتھ اچھی خاصی جھڑپ بھی ہو چکی تھی۔“ چھاکے نے بھی سوچتے ہوئے کہا۔

”تو اچھا ہے ناراضگی کی وجہ معلوم ہو جائے علاقے میں پتہ چلے گا تو ساری کہانی لوگوں پر کھل جائے گی، میرا خیال ہے سوئی کو اس علاقے میں عزت و احترام ملنا چاہیے۔ یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ طوائف نہیں ہے۔“ میں نے چھاکے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سب کچھ ممکن ہے، جمالے..... دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ شاہ زیب پر ہی ہے نا کہ وہ شک کی انگلی کس کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہیں سے بات چلے گی۔ میرے خیال میں یہ چند دن تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا۔ ظاہر ہے ان کے تعلق نامورہ وسیع ہے۔ اس کا اپنا ایک سیاسی اثر و رسوخ بھی تھا، یہ سلسلہ چلے گا، پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے راوی ابھی چین ہی چکے ہیں لیکن لکھتا ہے۔

”گاؤں کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ نورنگر میں تو حیرت پھیل گئی ہوگی۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں حیرت تو ہے وہ سوچ رہے ہیں کہ اتنے بڑے بندے پر ہاتھ کس نے ڈال دیا۔ خیر.....! جمالے جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا، تم ذہن میں رکھنا کہ اس قتل کی تفتیش بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوگی اور ہوسنہا۔ اگر شاہ زیب نے چاہا تو..... ورنہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ اتنا کہہ کر اس نے آہستگی سے کہا۔ ”تم بہت محتاط رہنا۔“

”میں محتاط ہی ہوں۔ میں بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ زیب کیسی سوچ رکھتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کرنا، ہاں اگر اس نے کچھ کیا تو اپنا دفاع کرنا تو ہوتا ہے چھاکے.....“

”نہیں، میں بیٹھے کے لیے نہیں آیا، بس جمال کا پتہ کرنے آیا تھا اور یہ تصدیق کرنے آیا تھا کہ اس کی گرفتاری ڈال دی ہے یا نہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا.....“ ڈی ایس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”مطلب یہ کہ گرفتاری ڈالیں گے تو میں ضمانت کراؤں گا، اگر آپ اس کی گرفتاری ہی نہیں ڈالتے اور رات کو..... یا کسی وقت بھی.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اشارے سے ختم کرنے کی بات کی۔

”مطلب آپ کا یہ کہنا ہے کہ ہم اسے ماورائے عدالت قتل کر سکتے ہیں؟“ اس نے غصے میں کہا۔

”ظاہر ہے ایسا ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ زیب نے ہمدردی کی آڑ میں کہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ محض الزام پر آپ نے اسے گرفتار کر لیا، ایسا کیسے ہو گیا؟“ پیرزادہ وقاص نے کافی حد تک غصے میں کہا تو ڈی ایس پی نے نچل سے کہا۔

”اگر آپ یہ ساری باتیں سمجھتے ہیں تو پھر اپنی رسائی بتائیں اور دکھائیں یہ تو اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں کوئی آپ سے ہمدردی کی بھیک نہیں مانگنے آیا، بس یہی بتانے آیا ہوں کہ ضمانت ہو جانے تک آپ اس پر تشدد کریں اور نہ ہی ذہنی اذیت دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور سید حامیرے پاس آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”سن جمال! میں ساری بات سمجھ سکتا ہوں، میں نے اپنی کوشش شروع کر دی ہے، انہوں نے ابھی تک تمہاری گرفتاری نہیں ڈالی اس کا مطلب ہے کہ کہیں نیت میں فتور ہے، شام ہونے تک انہوں نے اگر گرفتاری نہ ڈالی تو پھر جو مجھ سے ہو گا میں کروں گا، تم حوصلہ رکھنا، اور آنکھیں کھلی رکھنا باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے باہر کی طرف چل دیا۔ انسپکٹر نے ڈی ایس پی کی جانب دیکھا اور پھر مجھے لے کر آفس سے نکلتا چلا گیا۔

جس وقت انہوں نے مجھے گرفتار کیا تھا، اس وقت میرے ذہن میں اتنا کچھ نہیں تھا۔ پیرزادہ وقاص کے آنے تک میرے ذہن میں کہیں کہیں کچھ خدشات تھے، مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ آ کر ڈی ایس پی کے سامنے بات کھول گیا تھا اور مجھے ان کی نیت کا اندازہ ہو گیا۔ تب مجھے اپنی فکری نہیں لاحق ہوئی، بلکہ گاؤں میں موجود اماں اور سوئی کے بارے میں بھی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ شاہ زیب جیسا بندہ انتقام میں آ کر کچھ غنڈے میرے گھر پر بھیج دے تو..... اس سے آگے میں نہ سوچ سکا، میرے اندر غصے کی اہر دوڑنے لگی۔ میں اس معاملے کو جس قدر آسان سمجھ رہا تھا، ویسا نہیں تھا، مجھے پولیس کے شکنجے میں کس کردہ کچھ بھی کر سکتا تھا، میں ایک دم سے مضطرب ہو گیا۔



اوگی پنڈ میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ جہاں نے حویلی سے فون کر کے جوتی کو بتا دیا تھا کہ وہ بستر و وغیرہ کا بندوبست نہ کرے، وہ کافی دیر تک پریال سنگھ کے ساتھ حویلی میں رہا پھر واپس کوٹھی آ گیا۔ وہ مسلسل ہر پریت کو سوچے چلا جا رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے بغیر اس گھر میں تھا۔ اب تک اس نے کئی بار انوجیت کو فون کر کے ہر پریت کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ ہر بار اس نے تازہ صورت حال سے آگاہ کیا تھا، جو ہنوز پہلے ہی کی طرح تھی۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ بنتا سنگھ اندر آ گیا۔

”ہاں کیا بات ہے بنتا سنگھ.....؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ جی، باہر پنڈ سے کچھ بندے آپ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کون ہیں؟“

یا نہیں لیکن قانونی شکنجے میں جکڑ کر مجھے انتہائی کمزور کرنے کی بھرپور کوشش ضرور کر سکتا تھا۔ لاشعوری طور پر میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر الزام لگائے اور میں اس میں بری ہو جاؤں، پھر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سردار شاہ دین کو میں نے مارا ہے۔ اب یہ شاہ زیب سے اک نئی طرح سے جنگ تھی۔ اس نے مجھے پھانسی گھاٹ لے جانا تھا اور میں نے اسے بچ کر دکھانا تھا۔ اب یہ کیسے ممکن ہو پاتا، اس بارے میں قطعاً نہیں جانتا تھا، ہاں مگر اس جنگ کی شروعات ہو چکی تھی۔ میں اس سے کسی اور طرح کی جنگ لڑنا چاہتا تھا لیکن اس نے پہل کر دی تھی۔ پولیس گاڑیوں کا قافلہ تیزی سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میں بالکل بھی یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اب آگے کیا ہوگا، لیکن لاشعوری طور پر مجھے پریشانی تو لاحق ہو گئی تھی۔ مقدمہ بازی میں نجانے کتنا وقت لگنے لگی الحال تو ضمانت کروانے پر ہی سارا زور لگ جاتا تھا۔ میں نے تمام تر سوچوں کو جھٹک دیا۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو کر ہی رہنا تھا۔

قصبے کے تھانے میں یہ گاڑیوں کا قافلہ آ کر رک گیا۔ میرے اترنے سے پہلے ہی پولیس نفری نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ تاثر یہی تھا کہ جیسے کسی بہت بڑے مجرم کو گھیرے میں رکھا ہوا ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ مجھ پر نفسیاتی دباؤ ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس میرے بارے میں کس حد تک سنجیدہ ہو چکی ہے۔ اب یہ مجبوری میں تھا یا فرض شناسی کے باعث، میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے اس گھیرے میں ڈی ایس پی کے کمرے میں لے جایا گیا، جو ذرا ہٹ کر تھا۔ وہی ڈی ایس پی جو رات تک ہمارے اور سردار کے درمیان سمجھوتہ کروا رہا تھا اب وہی آفیسر بنا مجھے گھور رہا تھا۔

”دیکھو جمال! کسی بھی قسم کی چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کا مطلب اپنی موت کو آپ دعوت دینا ہوگا۔ تم پر سردار شاہ دین کے قتل کا ہی الزام نہیں بلکہ اس کے ذریعے پر حملہ کرنے، وہاں چھل کرنے کا بھی تم پر الزام ہے، کوشش کریں گے کہ ہم آج ہی تمہیں عدالت میں پیش کریں اور تمہارا ریمانڈ لے لیں۔ مجھے امید ہے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے۔“

”ڈی ایس پی صاحب! آپ مجھ پر جتنے چاہے الزام لگاؤ یہ آپ کا اختیار ہے یا پھر آپ کی مجبوری، کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ مجھ پر الزام لگانے والا کون ہے؟ کس نے کہا ہے کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟“

”سردار شاہ زیب نے تمہارے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔ نامزد پرچہ ہے تمہارے خلاف۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”ٹھیک ہے جناب! اب قتل مجھ پر ڈال دیا گیا ہے، پرچہ بھی ہو گیا ہے تو میں بھگتوں گا۔“ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔

”بس تمہیں یہی بتانا تھا کہ تم پر کیا الزامات ہیں، تعاون کرو گے تو میں تمہارے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکتا ہوں ورنہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس ورنہ کہنے کے بعد بڑے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔ اس کا مقصد میں سمجھ گیا تھا، وہ محض مجھے نفسیاتی دباؤ اور خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے لے جانے کا اشارہ کیا تو انسپکٹر نے میرا بازو پکڑا اور باہر کی جانب لے جانے لگا۔ انہی لمحات میں پیرزادہ وقاص اسی دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی ماحول کا جائزہ لیا، پھر سیدھا ڈی ایس پی کے پاس جا کر ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔

”آپ جمال کو گرفتار کر کے لے تو آئیں ہیں لیکن جب تک میں اس کی ضمانت نہ کروالوں آپ نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا، یہ نہ ہو کہ آپ اس پر تشدد کریں۔“

”آپ بیٹھیں تو سہی۔“ ڈی ایس پی نے انسپکٹر کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے پیرزادہ وقاص سے کہا مگر وہ بیٹھا نہیں کھڑے کھڑے بولا۔

”اوگی پنڈ ہی سے ہیں۔ کوئی دس بارہ بندے ہیں۔“ بننا سنگھ نے دس بارہ پرزور دیتے ہوئے کہا تو جہاں نے اس کی طرف دیکھا پھر سوچتے ہوئے کہا۔

”اچھا چلو! انہیں لان میں بٹھاؤ! میں آتا ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ تبھی اس نے انوجیت کو تازہ ترین صورت حال کے بارے میں بتایا کہ پہلے تو کبھی یوں لوگ ملنے کے لیے نہیں آئے تھے۔

”ان سے ملو دیکھو کون ہیں اور بات کیا کرتے ہیں۔ پھر مجھے تفصیل سے بتانا، تبھی بات سمجھ میں آئے گی، ممکن ہے یہ بھی بلجیت سنگھ کی کوئی چال ہو۔“

”ٹھیک ہے! میں ان کی بات سن کر ہی تم سے بات کرتا ہوں۔“ جہاں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ بننا سنگھ نے پہلے لان میں کرسیاں رکھیں پھر ان لوگوں کو بلا لایا جہاں انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ مختلف عمر کے لوگ تھے۔ جیسے ہی وہ بیٹھے تو اس نے جوتی کو بلا کر کہا۔

”وہ باہر جو بندے آئے ہیں ان کے لیے کوئی مشروب وغیرہ بھیج دو۔“

”میں سوڈا بھجوا دیتی ہوں۔“ جوتی نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی اور وہ باہر ان لوگوں کے پاس چل آ گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سب کو فتح بلائی اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تبھی ان میں سے ایک ادھیڑ عمر بندے نے اپنا تعارف کرایا۔

”جہاں سنگھ جی! میں اوگی پنڈ میں رہتا ہوں! میں نے آپ کے باپ کو بھی دیکھا ہے اور میرا اس سے بہت اچھا تعلق رہا ہے۔ میرا نام رام داس ہے اور میں ہندو ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ساتھ آئے لوگوں کا تعارف کرنا شروع کر دیا۔ ان میں کچھ سکھ تھے کچھ ہندو! ایک ہندو مسلمان تھا اور دو ان میں شورو تھے جو اب عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور انہوں نے باقاعدہ اپنا چرچ وہاں بنایا ہوا تھا۔ سب لوگوں کا تعارف کر دینے کے بعد اس نے کہا۔ ”ہم لوگ آپ سے کیوں ملنے آئے ہیں! یہ سوال آپ کے ذہن میں تو ہوگا؟“

”جی بالکل۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”جب آپ اوگی میں آئے تو میں سمجھ گیا تھا کہ اب کلندر سنگھ کی نسل آگے بڑھے گی! اسے بالکل مار نہیں دیا گیا ہے۔ ہم اگر زبان سے کچھ نہ بھی کہیں، مگر ہم جانتے ہیں کہ آپ کے خاندان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اور اس کا ذمہ دار کون تھا! آج سے نہیں اور نہ سا کا چوراسی کے بعد سے، ہم بہت پہلے ہی سے بلجیت سنگھ اور اس کے خاندان کے مخالف چلے آ رہے ہیں۔ وہ کونسا ظلم ہے جو انہوں نے ہم پر نہیں ڈھایا! ہم غریب پہلے اس کے باپ رویندر سنگھ کے ظلم کا شکار ہوتے رہے اب وہ ہم پر مسلط ہے۔ میں سوچتا رہا کہ آپ سے ملوں آپ کو کچھ اور نہیں تو کم از کم اخلاقی مدد ہی دوں! لیکن ایسا نہ کر سکا۔“

”اب اتنے دنوں بعد آپ آئے!.....؟“ جہاں نے پوچھا۔

”پہلے تو ہم نے یہی سوچا کہ آپ کے پاؤں یہ بلجیت لوگ لگتے نہیں دیں گے، لیکن آج جب کہ حویلی دوبارہ سے آباد ہو گئی ہے تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ ادھر رہیں گے۔ چاہے یہ کچھ مرضی کر لیں۔ اس لیے میں آپ سے ملنے کے لیے آ گیا۔“ رام داس نے کسی حد تک جذباتی انداز میں کہا۔

”آپ کا شکریہ کہ آپ آ گئے! میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“ جہاں نے جوابا کہا۔

”اس پنڈ کی سیاست بھی کچھ عجیب سی ہے۔ جو کچھ تھوڑا بہت دلیر ہے یا اس کے تعلقات ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہے۔ میں نے کئی بار پنچائیت کا انکیشن لڑا مگر ہار گیا۔ غریب کی تو یہاں شنوائی ہی نہیں ہے۔ کوئی پرچہ ہو! کوئی

الزام ہو! ہم غریبوں پر ہی لگتا ہے۔“ وہ کہتا چلا گیا۔

”کیا کرتے ہیں یہ!.....؟“ اس نے پوچھا۔

”اپنی حاکمیت جتانے اور ان پر جبر رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کرتے ہیں۔ کوئی بندہ ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ آپ دیکھیں آپ آئے اور آپ کے آتے ہی انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”یہ تو ہوتا ہے رام داس! اگر ظلم سہنے والے نہ ہوں تو ظالم بھی نہ ہوں اور یہ بھی فطری بات ہے کہ آدمی ہمیشہ طاقت کی طرف اپنا جھکاؤ رکھتا ہے۔ پولیس ان کے ساتھ ہے تو کیا ہوا۔ اگر عوامی طاقت متحد ہو جائے تو کوئی ظالم نہ رہے۔“ جہاں نے کہا تو اسے میں بننا سنگھ اندر سے سوڑے کی بوتلیں ٹرے میں رکھ کر لے آیا۔ پھر اس نے فردا فردا سب کو دیں۔

”بات یہ ہے جہاں جی! لوگ ان کے خلاف متحد ہو جائیں، لیکن ان کی پہنچ دہلی تک ہے پولیس جس کو چاہے اور جب چاہے ذلیل کر دے! اور وہ جو مرضی کر لیں انہیں کھلی چھوٹ ہے! آپ ہی کے ساتھ جو ہوا صاف ظاہر ہے کہ اس رات بلجیت کے غنڈوں نے آپ پر حملہ کیا! وہ اسی گاؤں کے یا ساتھ والے گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے تو پولیس کو کیسے نہیں پتہ! مگر انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔“

”اب نہیں کر پائیں گے رام داس! میں اب یہیں حویلی میں ہوں۔ بلجیت سنگھ یا اس کا کوئی غنڈہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی کرتا ہے تو مجھے بتاؤ! ہم دیکھ لیں گے انہیں۔“ جہاں نے انہیں حوصلہ دیا۔

”بس جی! ہمیں کوئی حوصلہ دینے والا ہو! ہمارے سر پر ہو تو ہم بھی اپنی عزت بچالیں۔“ رام داس نے یوں کہا جیسے وہ جہاں سے یہی بات کہلوانا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں لگا جیسے یہ بھی کوئی بلجیت ہی کی سازش ہوگی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے سوچا چلو سازش ہی سہی کچھ پچھل تو ہے۔ پھر وہاں آئے مختلف لوگ اپنی اپنی کہتے رہے۔ بلجیت سنگھ نے کس طرح وہاں جبر اور خوف کی فضا طاری کی ہوئی ہے۔ اس بارے میں مختلف واقعات سناتے رہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی اس نے انوجیت کو ان بندوں کے بارے میں اور ان کی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔ جس پر اس کا یہی تبصرہ تھا کہ وہ واقعتاً کچھ کہہ رہے ہیں۔ ہندو کیونٹی کی وجہ سے بلجیت سنگھ اس رام داس پر کم ہنی ہاتھ ڈالتا ہے۔ رام داس فطری طور پر وہاں کی چودھراہٹ چاہتا تھا کیونکہ اوگی پنڈ میں سکھ اور ہندو کیونٹی تقریباً برابر ہی تھی۔ بلجیت سنگھ اس لیے ان پر حاکم تھا کہ ایک تو ان کا سیاسی طور پر اکالی دل سے تعلق تھا، دوسرا پنجاب میں وہ ویسے ہی ہندوؤں کو دبا کر رکھتے تھے۔ رام داس کی سیاسی وابستگی گھوم پھر کر بی جے پی سے بنتی تھی۔ اگر کانگریس سے ہوتی تو شاید اس طرح کی صورت حال نہ بنتی۔ انوجیت اور اس کی تنظیم نے کبھی اس لیے انہیں منہ نہیں لگایا تھا کہ وہ ان کی تنظیم کے خلاف تھے۔ اس نے انوجیت سے صورتحال سمجھ لی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

رات کے کھانے پر وہ اکیلا ہی تھا۔ اس نے بھوک مٹانے کے لیے تھوڑا بہت کھایا اور پھر اوپری منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں جاتے ہی اسے ہر پریت یاد آ گئی۔ آج اگر وہ ساتھ ہوتی تو حویلی میں جشن کا سماں ہوتا۔ اس دن حویلی پھر سے آباد ہو گئی تھی۔ ایک بار اس نے مذاق میں کہا تھا کہ جس دن حویلی دوبارہ آباد ہوئی تو ساری رات وہاں دھماکوڑی چمائے گی۔ گاؤں کے لوگوں کو مدعو کرے گی! لڑکیاں ناچے گیں! خوب کھانا پینا چلے گا! اور یہ ایک یادگار جشن ہوگا لیکن ایسا نہیں ہو پایا تھا! یادگار جشن بنانے والی اس وقت اپنے حواسوں ہی میں نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ہنسی مسکراتی جوانی سے بھرپور ہر پریت کا ساتھ لحوں میں چھوٹ گیا تھا۔ اب نجانے وہ کب تک تندرست ہو کر اس کے شانہ بشانہ چل سکے گی۔ اس کے ذہن میں وہ ماضی کے منظر گردش کرنے لگے جب موت کی آنکھوں میں

درمیان میں رہنا ہے رن دیر نگھ اس وقت اس گاؤں میں سے نکلا ہے کہیں بھی اس سے آنا سامنا ہو سکتا ہے۔“
اس نے کہا تو جہاں کے بدن میں سنسنی خیزی پھیل گئی۔ جس کے ساتھ ہی اس کے اندر کی وحشت عود کر آئی۔

”یہ پکا ہے کہ وہ وہاں سے نکل چکا ہے؟“

”جی وہ نکل چکا ہے اس نے پی ہوئی ہی وہ یونیفارم میں نہیں ہے اور اس کے ساتھ صرف ایک آدمی ہے وہ بھی پولیس والا ہی ہے۔ وہاں وہ ایک شادی پر گیا ہوا تھا۔“ سنی نے تفصیل سے بتایا اور پھر اپنا سارا دھیان سڑک پر لگا دیا۔ اکاؤ کا گاڑیاں اس کے قریب سے گزر کر جا رہی تھیں۔ پھر اس نے جانندھر جانے والا روڈ چھوڑ دیا اور ایک موڑ کے قریب جیپ روک لی۔ پھر اس نے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔ کچھ دیر سنتا رہا پھر فوراً ہی گاڑی اشارت کر کے سڑک بلاک کر دی۔ اس کے ساتھ ہی بولتا گیا۔

”سرجی..... اب جو سفید رنگ کی ماروتی آ رہی ہے وہ اسی میں ہے اس کے پیچھے ہمارے بندے ہیں۔“

سنی نے گاڑی کچھ اس طرح روکی تھی جیسے اس میں کچھ خرابی آ گئی ہو اس نے بونٹ اٹھا دیا تھا۔ جہاں نیچے اتر آیا۔ اس کی نگاہیں مادھوپور کی طرف سے آنے والی ماروتی پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ کب دکھائی دیتی ہے۔ اگلے ہی لمحے کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی۔ سنی نے اونچی آواز میں کہا۔

”وہ آگیا سرجی الرٹ.....“

یہ سنتے ہی جہاں سڑک کی دوسری جانب چلا گیا۔ اگلے ہی چند لمحوں میں سفید ماروتی تیزی سے آتی ہوئی ایک دم سے آہستہ ہو گئی اور پھر ایک لمحے میں رک گئی۔ یہ ہونا ہی تھا سنی نے جیپ کھڑی ہی اس انداز سے کی تھی اس اثناء میں پیچھے آنے والی کار بھی وہیں آن رکی۔ اس نے رکتے ہی زور زور سے ہارن دینا شروع کر دیا۔ بلاشبہ یہ رن دیر پر نفسیاتی وار تھا۔ اچانک رن دیر نے پنجرہ سیٹ والا دروازہ کھولا اور بھنا کر کہا۔

”بند کرو ہارن..... دیکھتے نہیں ہو روڈ بلاک ہے۔“

اس پر پیچھے والی کار نے پھر ہارن دے دیا۔ وہ شدید غصے میں سنی کے پاس آیا اور چلا کر بولا۔

”تمہیں گاڑی کھڑی کرنے کی تیز نہیں ہے کیسے روڈ بلاک کیا ہوا ہے۔“

اتنی دیر میں پچھلی گاڑی سے تین لوگ نکلے اور اس کی طرف آگئے، سنی جہاں چلتا ہوا رن دیر کے سامنے آ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔

”جہاں نگھ آپ یہاں.....؟“

”ہاں میں یہاں۔“ جہاں نے سکون سے جواب دیا۔

”کیسے.....؟“ رن دیر نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اس لیے۔“ جہاں نے کہا اور پھل کارن ماروتی میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کی طرف کر کے فارغ کر دیا۔ یکے

بعد دیگرے چار فارغ کرنے کے بعد اس نے رن دیر کے چہرے پر دیکھا جہاں رنگ اڑ گیا تھا۔

”یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو.....“ اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”اور تم نے ہر پریت پر فارغ کر کے اچھا کیا ہے۔“ وہ ایک دم غصے میں بولا۔

”اوہ..... تو آخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔“ یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اپنے ڈیپارٹمنٹ میں معصوم سانپ کے نام سے جانے جاتے ہو۔ اس لیے میں نے چاہا

کہ..... تیرے جیسے گھٹیا سانپ کا شکار کروں..... اور پتہ ہے سانپ کو کیسے مارا جاتا ہے اس پر فارغ نہیں کرتے..... اس کا سر

آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک ہر پریت کو سوچتا رہا۔ تبھی اچانک اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ کیشیو مہرہ کی کال تھی۔ اس نے ریسو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو اس نے تمہید باندھے بغیر کہا۔

”جہاں! تم اپنے گھر کے پچھواڑے سے یوں نکلو کہ کسی کو پتہ نہ چلے کیونکہ سامنے کے گیٹ پر اور پھر آگے راستے پر رن دیر نگھ کے بندے تعینات ہیں۔ ان کی نگاہوں سے بچتے ہوئے تم فصلوں کے درمیان سے سڑک تک پہنچو۔“

”ٹھیک ہے اس کے بعد.....؟“

”وہاں سڑک پر تمہیں فوراً ہیل جیپ ملے گی اس میں صرف ایک ہی بندہ ہوگا تمہارا نمبر اس کے پاس ہے وہ تم سے رابطہ کر لے گا۔ آگے کی ساری تفصیلات وہ تمہیں بتا دے گا فوراً نکلو۔“

”او کے.....“

جہاں نے کہا اور فون بند کرتے ہی اس نے تیاری میں پانچ سے سات منٹ لگائے۔ پھر بڑی احتیاط کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا اس وقت جوتی پہن میں تھی اور دوسرے ملازمین میں سے فقط بننا سنگھ گیٹ پر دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں ٹہلنے والے انداز میں کوشی کی پچھلی جانب گیا، ٹینس کورٹ اور سوئمنگ پول کے درمیان سے نکلتا ہوا وہ باؤنڈری وال تک جا پہنچا۔ وہ اس کے قد سے دو فٹ اونچی تھی اس نے ادھر ادھر دیکھا ڈرا سے فاصلے پر اسے پلاسٹک کا ڈرم دکھائی دیا اس نے وہ اٹھایا دیوار کے ساتھ سیدھا کر کے رکھا پھر اس پر چڑھ کر دیوار کی ساتھ لگ گیا۔ اب دیوار اس کے سینے تک تھی۔ اس نے باہر کا جائزہ لیا تو دوسری طرف خاصی گہرائی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر ایک دم سے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نہ جانے کچھ دیر بعد صورتحال کیا ہو۔ اگر واپسی بھی اسی طرف سے ہوئی تو یہاں سے چڑھنا مشکل ہوگا اور فوری طور پر کوشی کے اندر نہیں آ سکے گا۔ اسے واپسی کا راستہ بنا کر رکھنا چاہیے۔ وہ ڈرم سے نیچے اتر آیا اور پھر اسی تلاش میں اس نے اسٹور کارخ کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں سے سیڑھی مل جائے گی۔ ذرا سی تلاش کے بعد اسے دیوار کے ساتھ رکھی سیڑھی دکھائی دی اس نے فوراً ہی وہ اٹھائی اور دیوار کے ساتھ لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ اسی طرح اس نے دوسری طرف سیڑھی رکھی اور نیچے اتر آیا۔ اس کے آگے فصلیں تھیں۔ اس نے سیڑھی کو دیوار سے ہٹایا اور فصلوں کے درمیان چھپا کر رکھ دیا۔ وہ چند لمحے کھڑے ہو کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتا رہا پھر فصلوں کے درمیان بنے کھال میں سے سیدھا چل پڑا۔ اس کارخ سڑک کی طرف تھا۔ اس نے اپنا سیل فون ہاتھ میں کر لیا تھا تاکہ جو نبی کال آئے تو وہ فون ریسو کر لے۔ سڑک تک پہنچتے ہوئے اسے تقریباً پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہ وہاں پر جا کر رک گیا۔ اسی لمحے جانندھر سے آنے والے راستے کی طرف سے ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں اور تیزی سے قریب آتی چلی گئیں۔ ایک فور و ہیل جیپ زن سے اس کے پاس سے گزر گئی پھر آگے جا کر اینٹوں والے راستے پر رک گئی۔ وہاں سے اس نے ٹرن لیا اور واپسی کے لیے آہستہ آہستہ چل پڑی اگلے ہی لمحے اس کا سیل فون بج اٹھا۔

”ہاں بولو.....!“ جہاں نے محتاط انداز میں کہا۔

”میں سڑک پر ہوں آپ کہاں ہیں سر.....“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”میں تمہیں دیکھ رہا ہوں آ جاؤ میں بھی سڑک پر ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا اور آگے بڑھ کر سڑک کنارے آ گیا۔ تب تک جب بھی اس کے پاس آ گئی تھی۔ رکتے ہی دروازہ کھلا اور وہ اس میں بیٹھ گیا۔ وہ موٹا سانو جوان سکھ تھا جس نے نیلی جینز، ہلکی زرد شرٹ اور سر پر سیاہ رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ جیپ چل پڑی تو اس نے کہا۔

”مجھے آپ سنی کہہ لیں جی، ہم یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے مادھوپور اس کے

کچلتے ہیں۔“ جہاں نے دانت پیستے ہوئی کہا تو وہ طنز یہ انداز میں بولا۔

”جہاں! میں تمہیں صرف ایک موقع دیتا ہوں! آج رات یہاں سے نکل جاؤ! بلکہ کل تک یہ ملک بھی چھوڑ دو! پھر نہیں کہنا کہ میں نے تجھے خبردار نہیں کیا۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ جہاں نے پوری قوت سے پسل کا دستہ اس کے جڑے پردے مارا، ایک لمحے کے لیے رن ویر سنگھ کی آنکھوں میں سے حیرت جھلکی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ رن ویر نے دائیں ہاتھ سے جہاں کا گلا پکڑنا چاہا مگر اس نے کلائی پکڑ لی۔ پھر پسل سنی کی جانب اچھالتے ہوئے وہی ہاتھ رن ویر کی گردن پر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ اسے دھکیلتا ہوا پیچھے کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا، تبھی جہاں نے دونوں ہاتھوں کا مکا بنایا اور پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ رن ویر چکراتے ہوئے کولہوں کے بل زمین پر گر گیا۔ جہاں نے زوردار ٹھوکراں کے منہ پر ماری اس کے بعد جہاں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ رن ویر کا چہرہ لہولہاں ہو گیا تھا۔ وہ گھٹکھیانے لگا مگر جہاں نے اسے نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ اس پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ ہر پریت کا انتقام اُس کے اندر سے وحشت بن کر ابھرا تھا۔ رن ویر سنگھ ساکت ہوا سڑک پر یوں پڑا تھا کہ ٹانگیں کھلی ہوئی اور بازو پھیلے ہوئے تھے۔

”جلدی کریں سرجی، کوئی بھی گاڑی آ سکتی ہے۔“ سنی نے اونچی آواز میں کہا تو جہاں چونک گیا۔ اس نے پسل کے لیے ہاتھ بڑھایا، سنی نے دے دیا۔ جہاں نے رن ویر کے کاندھے پر رکھ کر ایک گولی چلائی، رن ویر ترپ اٹھا۔ اس کے منہ سے بیھانک چیخ نکل گئی۔

”ہر پریت کے یہیں گولیاں لگی ہیں۔ پتہ چلا۔۔۔۔۔ کتنا درد محسوس ہوتا ہے۔“ ”جہاں!۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ چھو۔۔۔۔۔ چھو۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔“ رن ویر نے انتہائی مشکل سے کہا۔

”نہیں رن ویر۔۔۔۔۔ میں اپنے دشمن کو تو معاف کر سکتا ہوں، کسی منافق کو نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پسل کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی پھر اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا ”نہیں میں تجھے گولی نہیں ماروں گا۔“ یہ کہتے وہ تیزی سے اٹھا، اس کے پیروں کی طرف سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا سڑک کے ایک طرف لے گیا پھر اس کو ایک درخت کے پاس لے جا کر اس کا سر جنوبی انداز میں درخت کے تنے سے ٹکرانے لگا۔ خون کے چھینٹے اڑنے لگے اور پھر ترخ کی آواز کے ساتھ اس کا سر پھٹ گیا۔ جہاں نے زوردار ٹھوکراں کی گردن پر ماری تو ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ رن ویر کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ تبھی جہاں واپس پلٹا، سنی جیب واپس موڑ چکا تھا۔ بعد میں آنے والے تماشہ دیکھتے رہے تھے۔ وہ بھی اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ جیسے ہی جہاں جیب میں بیٹھا، سنی نے جیب چلا دی۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے انتہائی رفتار کر دی۔ جہاں خود پر قابو پار ہا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ جیب کس قدر تیزی سے جارہی ہے۔ وہ جالندھر اور گودھڑ روڈ پر چڑھ چکے تھے۔ جس وقت سنی نے فون پر کام ہو جانے کے بارے میں بتایا، تبھی جہاں نے پوچھا۔

”سنی!۔۔۔۔۔ اب تم نے کدھر جانا ہے؟“

”میں واپس جالندھر جاؤں گا۔ میں بھی اسی شادی میں آیا ہوا تھا۔“

”اوکے۔۔۔۔۔!“ اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہی مقام آ گیا، جہاں سے جہاں جیب میں بیٹھا تھا وہ وہاں اتر گیا۔ سنی نے جیب موڑی اور جالندھر کی جانب چل دیا۔ جہاں کو دور کوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فصلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ کوٹھی کی پچھلی دیوار کے ساتھ جا پہنچا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ پھر سیڑھی تلاش کر کے دیوار کی ساتھ لگائی، پھر وہ اسی طرح اندر چلا گیا۔ اس نے سیڑھی اٹھا کر اسٹور میں رکھی، اب گھر کے اندر جانے کا مسئلہ تھا۔ ممکن ہے جوتی نے اندر سے دروازے بند کر لیے

قلمرواات

ہوں وہ گھوم کر صدر دروازے کی طرف گیا۔ وہ کھلتا تھا، وہ اندر داخل ہو گیا۔ کچن میں روشنی تھی، وہ نگاہیں بچا کر اوپری منزل کی جانب بڑھ گیا۔

وہ نہا کر اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آ گیا۔ خون آلود کپڑے اس نے پانی میں بھگو دیئے تھے۔ وہ پرسکون سے انداز میں اپنے بیڈ پر آ کر لیٹا تو اسے لگا جیسے ہر پریت کا اُدھار چکانے کے بعد وہ ایک انجانے بوجھ سے آزاد ہو گیا ہے۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے آن کر دیا۔ جمید رسکھ وقوع کے مطابق آن لائن تھا۔ اس نے خود ہی مبارک باد کا پیغام بھیج دیا۔ دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جو اشاروں کنایوں میں ہی تھیں۔ پھر اس کے بعد وہ آف لائن ہو گیا۔ اس نے بھی لیپ ٹاپ بند کیا، لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔



سہ پہری سے میں حوالات میں بند تھا۔ میرے ساتھ چند دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے وقت کٹ جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اس وقت رات گہری ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی تک انہوں نے کھانا نہیں دیا تھا۔ میں بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا، حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ سوائے پیر زادہ وقاص کے ابھی تک نورنگر سے کوئی بندہ نہیں آیا تھا۔ کسی نے بھی خبر نہیں لی تھی۔ نجائے کیوں میرے داغ میں الجھن بڑھنے لگی تھی۔ کوئی دوسرا میرے پیچھے آیا تانہ آتا، چھانکے نے ضرور آنا تھا۔ اس سے کچھ ہو سکتا یا نہیں مگر اس نے مجھ سے آ کر یہ ضرور پوچھنا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔ مگر وہ بھی نہیں آیا تھا۔

سچا انسان کبھی بھی سامنے سے مار نہیں کھاتا اور نہ ہی اسے سازشی اور منافق شکست دے سکتے ہیں۔ سچا انسان اس وقت شکست سے دوچار ہو کر مار کھاتا ہے جب اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا جائے۔ ظاہر ہے پیٹھ میں خنجر گھونپنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر سچا انسان اعتماد کر چکا ہوتا ہے۔ وہ بڑا زہریلا گھناؤنا اور پرلے درجے کا گھٹیا انسان ہوتا ہے جو یہ ثابت نہ ہونے دے وہ کوئی سازش کر رہا ہے یا اعتماد جیتنے کے لیے منافقت کی انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ اصل میں وہ منافقت ہی کیا جس کے بارے میں پتہ چل جائے۔ بہر حال کچھ بھی ہے منافق۔۔۔۔۔ راندہ درگاہ ہے۔

گہری رات کے سنائے میں پورا تھا نہ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سچی سوری ہیں۔ ہر طرف سناٹا تھا، میرے ساتھ حوالات میں بند لوگ سو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کوئی اپنا سر کھجاتا یا پنڈلی کھالیتا، اس کے بعد خرائٹے تھے جو کم از کم وہاں زندگی کا احساس دے رہے تھے۔ میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں سلاخوں کے ساتھ بیٹھا باہر کا منظر دیکھتے ہوئے اکتا چکا تھا۔ مجھے ایک طرف جہاں یہ الجھن تھی کہ چھانکے کا میرے پیچھے نہیں آیا تھا، دوسری جانب مجھے یہ پریشانی بھی تھی کہ قہانے میں لا کر مجھے اب تک پوچھا ہی نہیں گیا تھا۔ بقول پیر زادہ وقاص انہوں نے میری گرفتاری نہیں ڈالی تھی۔ وہ اپنی طرف سے کوشش کر کے گرفتاری ڈالوا کر ضمانت کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ نجائے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلارہی تھی۔ صورتحال وہ نہیں تھی جو مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس خاموشی کے اندر کوئی طوفان آنے والا ہے۔ قصبے کی مسجد میں لگے گھڑیال سے بارہ بجتے کا احساس ہوا تو میرے اندر بے چینی بڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں وہاں سے اٹھ کر لینے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا کہ مجھے باہر سے سرگوشی سنائی دی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو وہ سادہ کپڑوں میں ایک کانسٹیبل تھا، جو کئی بار مجھے مل چکا تھا۔ میں تیزی سے سلاخوں کے پاس آیا تو کچھ فاصلے پر دکھائی دینے والا سنتری اپنی ڈیوٹی پر نہیں تھا۔

”تم۔۔۔۔۔؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

این اے بھی تھا۔ اس قتل کی تفتیش تو بڑے پیمانے پر ہونا تھی۔

صبح کی روشنی جب پھیلنے لگی تو میں اپنے طور پر رائے قائم کر چکا تھا کہ ان کی قاتل تک رسائی ہو یا نہ ہو قاتل کون ہو سکتا ہے اس بارے میں انہیں یقین ہو یا نہ ہو لیکن وہ یہ طے کر چکے تھے کہ مجھے ہر حال میں ختم کرنا ہے اب اس کا طریقہ واردات کیا ہوگا یہ وہی جانتے تھے۔

تھانے میں تھوڑی بہت ہلچل ہو چکی تھی۔ رات والا سنتری تبدیل ہو چکا تھا۔ میرے ساتھی حوالاتیوں کے کچھ ملنے والے ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے کچھ نہیں کھایا ایک نوجوان حوالاتی نے مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ میں نے اس کے تعلق دار کو چند نوٹ دیئے کہ وہ باہر سے چائے لے آئے۔ وہ چلا گیا مگر ابھی واپس نہیں پلٹا تھا کہ تھانے میں حوالاتیوں کی گاڑی آ گئی۔ تھانے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ سنتری نے حوالات کا دروازہ کھولا اور ہم سب کو باہر نکلنے کے لیے کہا۔ صرف دو لوگوں کو وہیں رہنے دیا باقی سب کو ہانک کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ ہمیں قصبے سے شہر کی عدالت میں لے کر جانا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی چل دی۔ میرے ذہن میں یہ الجھن بڑھنے لگی کہ جب میری گرفتاری نہیں ڈالی گئی تو مجھے جج کے سامنے پیش کیسے کیا جائے گا اگر وہ گرفتاری ڈال چکے ہیں تو پھر رندھاوے کا پیغام کیا تھا؟ یہ سب کیا ہے مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تبھی میں نے ایک دم سے ساری الجھن اپنے ذہن سے جھٹک دی۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو کر ہی رہنا تھا۔

قید یوں کی گاڑی قصبے سے باہر نکل آئی تھی۔ چند حوالاتی تھے جنہیں جج کے سامنے پیش کرنے کے لیے عدالت میں لے جایا جا رہا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ میں اپنے ذہن سے ہر سوچ جھٹک چکا تھا گاڑی ہچکچولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ گاڑی رک گئی پھر تیزی سے پچھلا دروازہ کھولا گیا اور ایک سپاہی اندر آتے ہی میری طرف دیکھ کر بولا۔

”چل باہر آ.....“

”اگر نہ آؤں تو.....“ میں نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا تبھی انسپکٹر کا چہرہ نمودار ہوا وہ میری طرف دیکھ

کر بولا۔

”ہم تجھے نیچے اتار لیں گے..... شرافت اسی میں ہے کہ تم خود اپنے پیروں پر چل کر آ جاؤ۔“

میں نے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر نیچے آ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے مار کر نہیں کہیں پھینک دیں گے۔ تو پھر کیوں نہ لڑ کر ہی مرا جائے۔ تبھی میں نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم لوگ کیا چاہتے ہو صاف بتاؤ۔“

”ادھر دیکھو“ اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر فصلوں کے درمیان کچا راستہ جا رہا تھا وہاں ایک فورڈ جیل جیپ کھڑی تھی جس کے باہر پیرزادہ وقاص دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ تھا۔ ”جاؤ چلے جاؤ وہ جانے اور تم۔“

میرے سامنے ایک مزید سوالیہ نشان آن ٹھہرا تھا۔ کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے مجھ میں.....؟ اس وقت عافیت اسی میں تھی کہ پولیس کے زمرے سے نکل کر پیرزادہ وقاص کے ساتھ چل دوں۔ وہ کیوں دلچسپی رکھتا ہے تھوڑی دیر بعد نکل جانے والا تھا۔ میں اس کی طرف چل پڑا تو پولیس والے قیدیوں کی گاڑی سمیت چل دیئے۔ میں اس کے پاس پہنچا تو لڑس نے بڑی گرجوٹی سے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔

”جمال! ایک نئی زندگی مبارک ہو۔“

”وقت بہت کم ہے..... سنتری واش روم گیا ہے۔ میں اندر سے اپنا کام ختم کر کے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا ہوں میں نے دیر اس لیے کی ہے کہ تمہیں پیغام دے دوں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”پیغام..... کس کا پیغام..... اور کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”رندھاوا صاحب کا پیغام ہے انہوں نے یہ ساری کارروائی دیکھنے کو میری ذمہ داری کیا ڈیوٹی لگائی ہے۔ خیر چھوڑ دو پیرزادہ وقاص تیرے ساتھ منافقت کر رہا ہے۔ وہ ڈی ایس پی صاحب کے سامنے خواہ مخواہ شور مچا کے چلا گیا ہے نرا ڈرامہ کر رہا ہے وہ..... اب تک کاغذات میں نہ تمہاری گرفتاری پڑی ہے اور نہ ہی شاہ دین قتل کیس میں جو ایف آئی آر درج ہوئی ہے اس میں کہیں بھی تمہارا نام نہیں ہے نا معلوم افراد کے بارے میں ہے وہ.....“ اس نے آہستگی سے مجھے معلومات دیں۔

”تو پھر..... کیا کرنا چاہ رہے ہیں یہ.....“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”ایسا اسی وقت ہوتا ہے میری جان جب مادرائے عدالت ہی بندے کو پار کرنا ہو۔ میں نے رندھاوا صاحب کا پیغام تم تک پہنچا دیا اب تم اپنا دھیان کر لو۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

”مطلب پیرزادہ اور شاہ زینب آپس میں مل گئے ہیں۔“ میں نے اپنے طور پر کہا تو کاندھے اچکا کر بولا۔

”مجھے تھانے سے باہر کا علم نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے میں تو شام سے تھانے کے اندر ہوں صرف یہی دیکھنے کے لیے کہ تمہاری گرفتاری ڈالی گئی ہے یا نہیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ یوں بن گیا جیسے میرے لیے اجنبی ہو۔ پھر بڑے ہی طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”تم بھی سو جاؤ اب تمہارے لیے تھانے میں کوئی بستر تو لا کر نہیں دے گا نہیں سوئے گا تو خود بخود دو چار راتوں کے بعد عادت پڑ جائے گی۔“

اس کے عقب میں سنتری آ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے بات کیوں بدل دی ہے۔

”تم لوگ اتنے وحشی ہو کھانے تک کا نہیں پوچھتے پیسے میں دیتا ہوں باہر سے کچھ منگوا دو۔“ میں نے کہا

تو وہ بولا۔

”باہر اس وقت تیرا باپ بیٹھا ہے ہوٹل کھول کے۔ شام کے وقت کہتا کسی کو تو وہ لا دیتا۔ اب صبح ہونے کا انتظار

کر..... سو جاؤ ہاں ایک کونے میں لگ کے۔“

تبھی سنتری نے کہا۔

”اوبابو جی آپ جاؤ آرام کرو جاکر ان حوالاتیوں سے بات کر لو تو پھر ان کی بک بک ہی بند نہیں ہوتی۔“

اس نے مجھے دیکھا اور پھر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ مجھے بھوک کا احساس کچھ زیادہ ہی ستانے لگا تھا۔ لیکن جیسے ہی مجھے پیرزادے کی منافقت کا خیال آیا تو میں سب کچھ بھول کر اس بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے یہ یقین تو تھا کہ جلد یا بدیر ان دونوں کی آپس میں صلح ہو جانے والی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی آپس میں لڑائی ہوئی ہی نہ تھی۔ صرف ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے یہ سارا ڈرامہ کر رہے ہوں۔ بہر حال کچھ بھی تھا یہ معلومات مل جانا کہ میری گرفتاری نہیں ڈالی گئی ہے میرے لیے انتہائی تشویش کی بات تھی۔ وہ مجھے کسی بھی وقت یہاں حوالات سے نکال کر مار سکتے تھے۔ میری وہ رات اس ادھیڑ بن میں گزر گئی۔ وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اگر انہوں نے مجھے قتل ہی کرنا تھا تو یہاں حوالات میں بند کرنے کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ مجھے وہیں راستے میں آسانی کے ساتھ مار سکتے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ یہ تو مجھے اٹھنا ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنے تعلقات استعمال کر کے مجھے یہاں حوالات میں بند کروا دیا تھا۔ بات اب چلی سطح تک محدود نہیں رہی تھی۔ سردار شاہ دین کے جہاں سیاسی تعلقات لا محدود تھے وہاں وہ اہم

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

”نئی زندگی میں سمجھا نہیں۔“

”آؤ میرے ساتھ سکون سے چل کر بیٹھتے ہیں، پھر بات کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں اس کے ساتھ پنجرہ پر آیا تو اس نے جب بڑھادی۔ اس کا رخ قصبے کی طرف تھا۔ پہلی بار میں نے پیرزادہ وقاص کو اکیلے دیکھا تھا، ورنہ ہمیشہ اس کے ساتھ گاڑی ہوتے تھے۔ میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تو آسانی سے بھاگ سکتا تھا، لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ قصبے کی طرف چل پڑا تھا۔ میں خاموش رہا اور اسکے بات کرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی توجہ سڑک پر تھی اور وہ بڑی تیز رفتاری سے جب بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ وہ قصبے سے پہلے ہی دائیں جانب ایک کچی سڑک پر مڑ گیا۔ جبکہ ہمارا گاڑی نورنگر قصبہ پار کر کے تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ نہ تو اپنے گاڑی میران شاہ جانا چاہتا ہے اور نہ ہی نورنگر کوئی تیسری اور نئی جگہ تھی۔ تقریباً تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جنگل شروع ہو گیا۔ میں پہلے وہ علاقہ دیکھ چکا تھا، مگر یہ بات برسوں پہلے کی تھی۔ جب ہم شکار کے شوق میں ادھر آتے تھے۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ جنگل کے پار دریائی علاقہ شروع ہو جاتا ہے، جنگل تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر تھا، مگر جنگل کے سامنے سے آدھا کلومیٹر کچی سڑک جاتی تھی، جہاں گاڑی اور بستیاں آباد تھیں۔ ہم جنگل کے سامنے سے گزر گئے وہ پھر بھی خاموش رہا۔ یہاں تک کہ پھر دائیں جانب ایک تنگ سی کچی سڑک پر آ گیا جو ایک ڈیرے پر جا کر ختم ہوئی۔ وہ حویلی نما ڈیرہ کچی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ وہ گاڑی لیے حویلی نما ڈیرے کے اندر ہی چلا گیا۔ جیپ رکتے ہی کئی سارے لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑے تپاک اور عاجزانہ انداز میں پیرزادہ کو سلام کیا۔ اس طرح وہ مجھ سے ملے کچھ دیر بعد انہوں نے ہمارے لیے ایک کمرہ کھول دیا، جس میں جدید طرز کے بیڈ اور دیگر سامان تھا۔ ہلکی ہلکی گرمی ہو رہی تھی، ایک ملازم نے اے سی چلا دیا، تبھی پیرزادہ جوتے اتارتے ہوئے بولا۔

”جمال! نہالو! اور فریش ہو جاؤ! اتنے میں کھانا آ جاتا ہے، وہ کھا کر باتیں کرتے ہیں۔“ پھر ملازم کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”جمال کے لیے کپڑے لے آؤ۔“

یہ سنتے ہی وہ واپس مڑ گیا۔ پیرزادہ وقاص بیڈ پر لیٹ گیا، میں ہاتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم کھانے سے فراغت کے بعد چائے پی رہے تھے۔ تب اس نے بڑے سکون سے کہا۔

”جمال! تجھے پولیس کے ہاتھوں پر واپس لانے کا پلان شاہ زیب ہی کا ہے۔ اس نے ڈی ایس پی کو مجبور کر دیا کہ وہ تجھے ماورائے عدالت ہی قتل کرے۔ ڈی ایس پی نے اپنے واقعات تمہاری گرفتاری نہیں ڈالی، جس وقت وہ تجھے گرفتار کرنے گیا تھا، اس نے تبھی میرے ساتھ بات کر لی تھی۔ میں جو وہاں پہنچا، چیخا، چلایا، وہ سب ڈرامہ تھا۔ شام تک ڈی ایس پی نے شاہ زیب کو باور کرا دیا کہ وہ مجبور ہو گیا ہے، اب کیا کرے؟“

”کیا کہا پھر شاہ زیب نے.....؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”اس نے تمہیں رات ہی کو مار دینے کے لیے حکم دے دیا تھا۔ اور شاید ڈی ایس پی رات ہی تجھے حوالات سے نکال کر مار دیتا، اگر شاہ زیب ایک دوسری طرح کی خباثت نہ دکھاتا۔“

”وہ کیا.....؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”اس نے پلان یہ دیا کہ جمال کو راستے ہی میں کہیں مار کر واپس گھرایا جائے، یعنی نورنگر اور وہیں پولیس

مقابلے کا ڈرامہ کیا جائے، مطلب پولیس جمال کو گرفتار کرنے آئی مزاحمت میں وہ مارا گیا۔ اور.....“

”اور..... تمہارے گھر کو آگ لگ گئی۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”میرے گھر کو آگ لگ گئی؟“ میں نے تڑپتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں جمال! وہ تیرے گھر کو آگ لگا کر تیری ماں اور سوئی کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا۔ مگر شاید قدرت کو کچھ اور ہی

منظور تھا۔“

”یار وقاص.....! تم صاف لفظوں میں بتاؤ۔“ میں نے اکتائے ہوئے کہا۔

”صاف لفظوں میں بات یہ ہے جمال! اس نے تمہارے قتل کا انتظار ہی نہیں کیا اور رات تمہارے گھر کو آگ

لگوا دی ہے۔“

”کیا.....؟“ میں تڑپ اٹھا۔ میری نگاہوں میں میری ماں گھوم گئی۔

”لیکن..... لیکن..... پوری بات سنو..... مجھے جب ڈی ایس پی نے بتایا کہ شاہ زیب کیا چاہتا ہے تو میں نے

فوراً تمہارے دوست چھاکے کو اطلاع کر دادی۔ جس وقت شاہ زیب کے بندے تمہارا گھر جلانے کے لیے پہنچے اس وقت تک وہ وہاں سے نکل چکے تھے۔ کہاں گئے، اس کا مجھے نہیں علم۔ لیکن میں نے ڈی ایس پی کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ تجھے کچھ نہ کہے..... بلکہ جس طرح تمہیں لے کر آیا ہوں اسی طرح اسے واپس لے کر دیا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تجھے میرے حوالے کر دیا۔“

”اماں! اور سوئی کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟ چھاکا کدھر ہے۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”باوجود کوشش کے میرا ان سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ تمہیں ملنے سے پہلے تک میں نے ان کے بارے میں کسی بھی

اطلاع کا انتظار کیا، ادھر تمہاری طرف بھی آنا تھا۔ اس سے زیادہ میرا شاہ زیب رک سکا ہو سکتا ہے آج کل میں پتہ چل جائے۔“ پیرزادہ وقاص نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تو میں بے چین ہو گیا۔

”وہ سب کیسے ہو گیا..... میرے دوست تھے وہاں..... چھاکا جان دے دیتا، پر..... ہو سکتا ہے وہ

بھی..... پیرزادہ وقاص یار مجھے ایک بار نورنگر لے چل۔ پھر میں دیکھ لیتا ہوں سب کو.....“

”میں تجھے لے جانے کو ابھی لے جاتا ہوں، مگر تو نہیں جانتا، انہوں نے بلوائیوں کی طرح تیرے گھر پر حملہ کیا ہے، اب کچھ نہیں وہاں پر..... اس نے کتوں کی طرح اپنے بندے تیرے پیچھے چھوڑ دیئے ہیں۔ اسے شاید تم نہیں سوئی درکار ہے، جو اس کی جائیداد کی حصہ دار بن گئی ہے۔“

”تو کیا تم جانتے ہو.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ جو ڈی ایس پی ہے، یہ اپنا بندہ ہے، نجانے کس کوشش سے یہاں لگوا یا ہے اسے، اب مجھے بتایا تو مجھے تیری اور شاہ زیب کی دشمنی کے بارے میں اندازہ ہوا۔ خیر..... اگر مجھے سوئی کے بارے میں معلوم ہو جاتا تو میں پوری جان سے اس کا تحفظ کرتا۔“

”میں تلاش کر لوں گا اسے..... میری ماں..... چھاکا.....“ میں رو ہانسا ہو گیا۔

”جہاں تک میرا اندازہ ہے جمال، یہ لوگ کسی محفوظ جگہ ہوں گے، کیونکہ اس حملے سے کچھ دیر پہلے چھاکے تک اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اب اگر قسمت نے ساتھ نہ دیا ہو تو الگ بات ہے۔“ اس نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

”وہی تو میں کہہ رہا ہوں، میں نورنگر جاتا ہوں، وہاں جا کر ساری بات معلوم ہو جائے گی۔ اور پھر شاہ زیب نے اتنا بڑا ادھار میرے سر چڑھا دیا ہے، اسے بھی تو اتارنا ہے۔“

”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا جمال کہ تم نے سردار شاہ دین کو قتل کیا ہے یا نہیں، لیکن اب تیری ان کے ساتھ لڑائی بن چکی ہے، کیا اب تو ان کے خلاف میرا ساتھ نہیں دے گا۔“ پیرزادہ وقاص نے وہ بات کہہ دی، جس کے لیے اس

نے میری مدد کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تک اس نے اپنے مطلب کی بات کیوں نہیں کی ہے، میں نے ایک لمحہ تاخیر کیے بنا کہا۔

”پیرزادہ..... اگر تم یہ کہو کہ میں اب پھنس گیا ہوں اور تم مجھے اس مشکل سے نکال رہے ہو اس کے عوض تمہارا ساتھ دوں تو میرا انکار ہے، لیکن اگر دشمن کا دشمن سمجھ کر میرا ساتھ مانگو تو میں تیار ہوں۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ تم جاگیرداروں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کب ایک دوسرے سے صلح کر کے درمیان کے لوگوں کو مسل دو۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔ پھر بڑے گھمبیر لہجے میں بولا۔

”جمال..... اسیدھی سی بات ہے، اگر اس علاقے پر میری حکمرانی ہو جاتی ہے تو مجھے اور کیا چاہیے، میں سردار شاہ دین کی سوچ اور سیاست کو نہیں پاسکتا تھا۔ مگر شاہ زیب کو تو نیچا دکھا سکتا ہوں، صاف اور سچی بات یہ ہے کہ تم اپنا انتقام لینا، میں پوری مدد میں دوں گا۔ میں اب شاہ زیب کو اپنا ہم پلہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسے ختم کر دینا چاہتا ہوں، میری سیاست کچھ بھی رہے، لیکن تمہارے آڑے کبھی نہیں آؤں گا۔“

”مطلب“ تم میرے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے نہیں ہو گے۔ میرے حلیف کے طور پر سامنے کبھی نہیں آؤ گے۔“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔

”یونہی سمجھ لو اس کی ایک وجہ ہے، جسے تم بخوبی جان سکتے ہو، کچھ جگہیں، کچھ تعلقات کے دائرے اور کچھ مفادات کے مرکز ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ مجبور ہو جاتا ہے وہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ میں جمال کو نہیں روک سکتا کہ میرا اس پر کوئی حق نہیں، تم سمجھ سکتے ہو نا میرے بات.....“

”ٹھیک ہے، میں نے مان لی تیری بات اب پل نورنگر۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہم ابھی چلتے ہیں لیکن یہ ذہن میں رکھنا اس نے اپنے باپ کے قتل میں تیری گرفتاری ضرور ڈالوانی ہے۔ وہ چاہے گا کہ تو پولیس ہی کے ساتھ ٹکرا کر ختم ہو جائے۔“ پیرزادہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ ساری بعد کی باتیں ہیں، تو پہلے مجھے نورنگر پہنچا، پھر سب دیکھ لوں گا۔“ میں نے کہا اور جوتے پہن کر اٹھ گیا۔

ہمارے درمیان جو بے پناہ تھا وہ پا گیا تھا۔ دوپہر سر پر تھی۔ وہ باہر سے کچا ڈیرہ، اندر سے جدید طرز پر سجا ہوا، مجھے اچھا لگا تھا۔ میں اس ٹھکانے میں بہت پہلے پھر تارہا تھا، لیکن یہ حویلی نما ڈیرہ پہلے بھی نہیں دیکھا تھا، صحن میں آکر میں نے پوچھا۔

”یہ ڈیرہ کس کا ہے؟“

”چوہدری شاہ نواز کا۔“ اس نے بتایا تو وہ گرانڈیل قد کا شخص میرے ذہن میں آ گیا۔

”یا، وہ تو قبیلے میں.....“

”یہ اس کا وہ ڈیرہ ہے جہاں خاص لوگ ہی آکر ٹھہرتے ہیں۔ باقی تم سمجھ دار ہو۔“ اس نے گول مول سی بات کی تو میں نے بھی زیادہ تجسس دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ویسے بھی اس وقت میرے دماغ میں صرف اور صرف نوڈگر چھایا ہوا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں جلد جلد وہاں پہنچ جاؤں۔

جس وقت ہم جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے چلے تو میرے اندر بے شمار دوسو۔ ابھرنے لگے۔ میری اماں کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ وہی ایک گھر جس میں میری ماں نے جوانی بیوگی کی حالت میں گزاری تھی۔ جسے کبھی وہاں خطرہ نہیں رہا تھا اور نہ کبھی اس نے مجھ پر خوف مسلط ہونے دیا تھا وہی گھر جلادیا گیا تھا۔ میرے اندر جیسے آگ لگی ہوئی تھی، وہی آگ جس نے میرے گھر کو جلایا تھا، سوئی کا ساتھ اگرچہ چند دنوں کا تھا، لیکن انہی چند دنوں میں اس نے میرے

انتظار کی طوالت کو ختم کر کے میری فتح کو قریب کر دیا تھا۔ میں جو ایک طویل سفر طے کرنے کی سوچ رہا تھا، وہ اس نے مختصر کر دیا، اور چھا کا..... میرے بچپن کا دوست ہی نہیں، میرے بھائیوں جیسا شخص سا تھی، جس کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر بٹتی تو دوسری آ جاتی، جیپ جس طرح تیز رفتاری سے بڑھتی چلی جا رہی تھی، اس سے کئی گنا رفتار سے میرا خون کھول رہا تھا۔ صورتحال کیا تھی، میں اس سے ناواقف تھا، دل نہیں مان رہا تھا کہ انہیں کچھ ہوگا، لیکن ذہن شاہ زیب کی خباثت سے انکار نہیں کر رہا تھا۔ اس نے جوتا بنا بڑا قدم اٹھایا تھا، اب اس کا خمیازہ تو بھگتنا تھا، شاہ زیب نے۔ میں نے خود کو پرسکون کرنے کے لئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔



جہاں کی آنکھ کھلی تو دو پہر ہونے والی تھی۔ کسی نے بھی اسے نہیں جگایا تھا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا، وہ بند تھا، اس نے سیل فون آن کر دیا، اور پھر فریڈش ہو کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ سیل فون اور لیپ ٹاپ بھی اٹھا لیا تھا۔ جوتی اس کے لیے تسی لے آئی جسے پیتے ہی اس نے کہا۔

”جوتی.....! میرے لیے چاہے کھانا لگا دو یا ناشتہ، میں نے جالندھر جانا ہے ہر پریت کا پتہ کرنے۔“

”وہ تو ٹھیک لیکن انوجیت بائی جی نے کہا ہے کہ جب تک وہ نہ آ جائیں، آپ کو کہیں نہ جانے دیا جائے۔ انہوں نے دو تین گھنٹے پہلے فون کیا تھا۔“

”چلو ٹھیک ہے، میں بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور لیپ ٹاپ کھول لیا، تاکہ رن ویر کے بارے میں کوئی خبر دیکھ سکے۔ پنجابی گرو کبھی تو اسے پڑھنی نہیں آتی تھی، اس لیے انگلش اخبار ہی دیکھتا رہا، آخر ایک اخبار میں اسے دو کالمی خبر مل گئی۔ جس کی تفصیلات میں یہی درج تھا کہ دہشت گردوں نے پولیس انسپکٹر رن ویر سنگھ کو قتل کر دیا۔ وہ کئی دنوں سے دھمکیاں دے رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ وہ گول مول سی خبر تھی، جس سے کسی کے بارے میں اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ خبر پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر سوچتا رہا، ممکن ہے اس سے کیشو مرہ نے رابطہ کیا ہو اور اس کا فون بند ملا ہو، وہ خود اس سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ حد درجہ محتاط ہو گیا تھا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ خفیہ والے اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعد میں تھا کہ فون بھی کہیں ٹریس ہو رہا ہو، اگرچہ سیل فون کے معاملے میں ذرا مشکل تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضہ یہی تھا۔ شاید انوجیت اسی مقصد کے لیے جالندھر سے آ رہا ہو، اس نے انوجیت کے نمبر ملا دیئے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے بتایا۔

”یار میں راستے میں ہوں، بیس منٹ تک پہنچ جاؤں گا۔“

”چلو ٹھیک ہے، آ جاؤ تو پھر اکٹھے حویلی چلیں گے۔“ جہاں نے کہا۔

”نہیں، میرے پاس حویلی جانے کے لیے وقت نہیں ہوگا، بس میں آ رہا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ جہاں کے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ سو وہ ناشتہ کر چکا تھا جب گھر کے سامنے گاڑیاں رکنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی بنتا سنگھ نے گیٹ کھول دیا۔ پہلے انوجیت کی گاڑی اندر آئی اور پھر ایسبولینس اس کے پیچھے پیچھے آ گئی۔ جہاں کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ہر پریت.....؟ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا، وہ تیزی سے پورچ میں آ گیا۔ انوجیت تیزی سے اپنی گاڑی میں سے نکلا تب تک ایسبولینس میں سے پھوپھو کجیت گورنگلیں ڈرائیور نے عقبی دروازہ کھولا اور پھر دونوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ بیچر اتارا۔ جہاں کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگی تھیں۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ تبھی انوجیت نے جنہارا دے کر ہر پریت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا تو جہاں کی سانس میں سانس آئی۔ وہ تیزی سے بولا۔

”او یار..... اس کا کتنا وزن ہوگا۔ ہاتھوں پر اٹھا لو۔“

”چل پتر.....! آجا“ اور اٹھا کر لے جا سے اندر۔“ کلجیت کور نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہر پریت نے جہاں کی طرف ایک زخمی مسکراہٹ سے دیکھا جہاں آگے بڑھا اور ہر پریت کو بڑے آرام سے اٹھالیا، پھر اس کے کمرے تک لے جا کر بڑے آرام سے بیڈ پر لٹا دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد انوجیت ایبولینس والے کو بھیج کر آ گیا۔ تبھی جہاں نے پوچھا۔

”یار ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ کم از کم دس دن لگیں گے اور تم اسے.....“

”پہلے تو یہی کہا تھا“ لیکن رات انہوں نے ہر طرح سے مطمئن ہو جانے کے بعد یہی کہا کہ اب زخم بھرتے بھرتے گھر میں زیادہ آسانی سے دیکھ بھال ممکن ہوگی، بس کچھ احتیاطیں کرنے کو اور تین دن بعد چیک اپ کا کہا ہے۔“ اس نے پوری تفصیل بتادی۔

”اب کیسا محسوس کر رہی ہو ہر پریت.....“ اس نے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بہت اچھا“ یہاں گھر میں تو سکون ہے، وہاں ایک طرح سے بے زاری تھی۔“ وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ تب انوجیت نے جہاں کو اشارے سے باہر بلایا، وہ دونوں باہر لان میں چلے آئے تو اس نے پوچھا۔

”رن دیر کو کس نے مارا ہے؟“

”میں نے.....؟“ جہاں نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔

”کیسے.....؟“ اس نے پوچھا تو جہاں نے تفصیل بتادی۔ جسے وہ بڑے دھیان سے سنتا رہا پھر بولا۔ ”میرا خود اسے مارنے کا پلان بن چکا تھا، سب لوگ تیار تھے۔ اس لیے میں ڈاکٹر کے سرچڑھ گیا کہ وہ ہر پریت کو گھر بھیج دے، مجھے تو صبح پتہ چلا، خیر.....! اب تم سنبھالو یہاں، مجھے اپنے کچھ تنظیمی لوگوں سے ملنا ہے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست کرنا ہے جو ہر پریت کے زخم کی روزانہ پٹی کر جایا کرے، شام تک لوٹ آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے.....“ جہاں نے کہا تو وہ انہی قدموں پلٹا اور اپنی گاڑی لے کر کونھ سے نکلتا چلا گیا۔ جہاں وہاں سے سیدھا ہر پریت کے کمرے میں چلا گیا۔ جو بلاشبہ اس کے انتظار میں تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی اور پھر آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”آؤ بیٹھو۔“

”پھوپھو کہاں ہے؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”وہ بہت تھکی ہوئی تھیں، میں نے انہیں آرام کرنے کا کہا ہے، تم سناؤ۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے پاس آنے لگا تھا، تمہاری ضرورت پڑ گئی تھی۔“

”آئے لگا تھا تو آ جاتے؟“ وہ بولی۔

”یہ گرو کی نہیں نہ آتی نا، میں نے ایک خبر دیکھی تھی۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایسی کوئی خاص خبر تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، خاص ہی تھی، پتہ نہیں تھے انوجیت نے بتایا ہے کہ نہیں، میں نے اس بندے کو مار دیا ہے، جس نے تجھ پر فائر کر دیا تھا۔“

”واقعی..... کون تھا وہ؟“ وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

”رن دیر..... رات..... میں نے.....“ اس نے کہا اور باقی بات اشاروں میں سمجھادی۔ پھر ہر پریت کے اصرار پر اس نے تفصیل بتادی کہ کیسے پتہ چلا اور پھر کیسے مارا، وہ باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ سہ پہر ہو گئی۔ اس دوران لیڈی ڈاکٹر آ گئی جو رسول پور کلاں کی رہنے والی تھی۔ اس نے آکر انجکشن دیا اور دوائیں دیں۔ کچھ دیر بعد ہر پریت

سو گئی۔ ڈاکٹر چلی گئی تو جہاں حویلی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ گاڑی لے کر جیسے ہی گیٹ پار کر کے باہر آیا تو اس کے سامنے دو جوان آن کھڑے ہوئے، جہاں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہونم لوگ اور میرا رستہ کیسے روکا ہے؟“

”ہمارا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے اور ہمیں حکم ہے کہ آپ کو گھر تک محدود رکھا جائے۔“ ان میں سے ایک نے تیزی سے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتا، لیکن آپ گھر تک ہی محدود رہیں گے۔“ دوسری بار اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

”جس نے مجھے گھر تک محدود کرنے کا حکم دیا ہے اس سے وجہ بھی پوچھو، ورنہ میرا رستہ مت روکو، جب معلوم ہو جائے تو مجھے بتا دینا، میں پنڈ جا رہا ہوں حویلی.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گاڑی بڑھادی۔ اسے بہر حال یہ معلوم ہو گیا کہ معاملہ خاصا گھمبیر ہو گیا ہے اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے گھیرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کے ارد گرد خطرہ بڑھ گیا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال رینگ گیا۔ اس نے اپنے سیل فون سے رن دیر کے نمبر ملانے شروع کر دیے۔ دوسری طرف تیل جاتی رہی، کافی دیر تیل جانے کے بعد فون کسی نے ریسیو کر لیا، تبھی جہاں نے کہا۔

”آپ کون بات کر رہے ہیں، مجھے رن دیر سنگھ سے بات کرنا ہے۔“

”آپ کون ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا۔

”میں جہاں سنگھ ہوں رن دیر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں فون دیں۔“ اس بار وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔

”رن دیر سنگھ جی، کل رات شہید ہو گئے ہیں، میں ان کا بھائی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ.....“ وہ بولا، پھر لہجہ بھر کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں تمہانے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، وہ گاڑی لیے سیدھا تھاٹھے جا پہنچا، وہ ڈیوٹی پر چند کانسٹیبل تھے اور ایک ایس آئی، تعارف وغیرہ کے بعد ڈیوٹی پر موجود اے ایس آئی سے پوچھا۔

”کیا آپ نے اپنے بندے میرے گھر پر لگائے ہوئے ہیں۔“

”ہم نے نہیں لگائے، یہ آؤ پر سے احکام آئے ہیں اور وہ بندے بھی چند ہی گڑھ سے آئے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیوں.....؟“ اس نے پوچھا۔

”رن دیر سنگھ رات قتل ہو گئے ہیں۔ دوسرے پولیس انسپکٹر ہیں، جن کا تھوڑے ہی دنوں میں قتل ہوا ہے۔ اس کی بڑے پیمانے پر تفتیش کی جا رہی ہے، اور سیدھی بات ہے کہ آپ پر بھی شک ہے۔“

”ٹھیک ہے، اس کا کوئی کاغذی ثبوت ہے تو مجھے دیں، میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں گا۔ لیکن اگر یونہی پولیس کو مجھ پر مسلط کیا گیا تو پھر میں اپنے دکل سے مدد لینے کی ضرورت مجبوراً کروں گا۔ یہ بات اپنے آفیسر تک پہنچا دیں۔“

”آپ ان سے خود بات کیوں نہیں کر لیتے۔“ اس نے کہا۔

”میں نہیں، میرے دکل کریں گے، چند ہی گڑھ کو سنا دور ہے، تین ساڑھے تین گھنٹے کا سفر ہے، اگر یہ اتنا ہی ضروری ہوا تو میں ضرور ایسا کر لوں گا، میں پھر یہاں کے نہیں اعلیٰ حکام سے بات کروں گا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اب دیکھیں جی میں کیا کر سکتا ہوں۔“ ڈیوٹی کانسٹیبل نے بے چارگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، اب میں خود دیکھتا ہوں اس معاملے کو۔ عجیب رویہ ہے۔“ جہاں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

جسپال کو حویلی میں چہل پہل اچھی لگی تھی۔ تقریباً سبھی کمروں میں رہائش ہو گئی تھی۔ وہ دالان میں دھری ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو پریال سنگھ اس کے پاس آ بیٹھا تو اس نے پوچھا۔

”کہو پریال! کیسا لگا ماحول؟“

”ماحول تو بہت اچھا ہے جی، آج صبح سے میں کچھ مشکوک بندے دیکھ رہا ہوں حویلی کے ارد گرد کہیں یہ ہم پرسک نہ کر رہے ہوں کہ یہاں کا تھانیدار ہم نے مارا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

”شک کرنے کو تو مجھ پر بھی کیا جاسکتا ہے مگر تم لوگ پھر بھی محتاط رہنا۔“ جسپال نے عام سے لہجے میں کہا تو پریال نے پوچھا۔

”ویسے بائی جی، وہ گروپ جو ان تھانیداروں کو مار رہا ہے ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی گروپ ہے جو ان تھانیداروں کو مار رہا ہے۔“ جسپال نے چونک کر پوچھا۔

”حویلی کے باہر وہ جو سٹھ (چوپال) ہے نا، میں کافی دیر ادھر بیٹھا رہا ہوں لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اب یہ

لوگوں کا اندازہ ہی ہے نا، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔“ اس نے بتایا۔

”انہوں نے تمہارے بارے میں بھی پوچھا ہو گا کہ تم کون ہو اور حویلی میں کیوں رہتے ہو؟“ جسپال نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”پوچھا تھا اور میں نے بتایا کہ ہم جسپال بائی جی کے ملازم ہیں۔ انہوں نے ہمیں یہاں لا کر رکھا ہے کیونکہ انہیں یہاں پر موجود کچھ لوگوں سے خطرہ ہے، میرا خیال ہے یہ پیغام بلجیت سنگھ تک پہنچ بھی گیا ہو گا۔“ اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

”چلو اچھا ہے۔ لیکن پریال! یہ دھیان رکھنا تمہاری طرف سے پہل نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی جان کو آ جائے تبھی وار کرنا، ورنہ تصادم سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرنا، کیونکہ وہ چاہیں گے کہ تم لڑو اور وہ کسی نہ کسی جاں میں پھنسا لیں۔“ جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی، بائی جی!“ اس نے مودبانہ انداز میں کہا، ”بھی کچن کی طرف سے ایک لڑکی برآمد ہوئی جس نے سیاہ اور سفید دائروں والی قمیض شلوار پہنی ہوئی تھی اور سر پر سفید آئینہ تھا، وہ ہاتھ میں ٹرے لیے نمودار ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر جسپال نے پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

”یہ میری سوئی ہے بائی جی، بہت جلد ہم شادی کرنے والے ہیں۔ باقی یہ وہیں ہوتی ہے جہاں میں ہوتا ہوں۔ میرے بغیر رہ نہیں سکتی نا۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

”ست سری اکال جی۔“ سوئی نے ٹرے رکھا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے فتح بلانی۔

”ست پری اکال..... کیسی ہو؟“ جسپال نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

”جی، بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ چائے پیئیں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ اچھی خاصی نو عمر اور خوبصورت لڑکی تھی۔ دونوں نے اپنا اپنا ٹیگ اٹھالیا۔ چائے کے دھیرے دھیرے سب لینے لگے۔ اس دوران پریال اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ کس طرح وہ سٹوڈنٹس سیاست میں رہا اور اب مد معاشی کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔ کس طرح وہ ایک گروپ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے جس سے اب بہت سارے کام وہ بڑی سہولت سے کر لیتا ہے۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے کہ باہر سے ایک نوجوان نے ان کے پاس آ کر کہا۔

”باہر جی، کچھ لوگ آئے ہیں، جسپال جی، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہیں تو بلا لاؤں انہیں۔“

”نام نہیں پوچھا ان کا۔“ پریال نے کافی حد تک غصے میں کہا۔

”پوچھا تھا، لیکن انہوں نے بتایا کچھ نہیں۔ بس ان کو باہر آنے کا کہا ہے۔“ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا چل، میں آتا ہوں۔“ جسپال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پریال اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ

ادھر ادھر بیٹھے لوگ بھی اٹھ کر باہر کی سمت چل پڑے۔ جسپال نے حویلی کے پھانک پر آ کر دیکھا، باہر کافی سارے لوگ

کھڑے تھے جن کے درمیان ایک کار کھڑی تھی اور اس کے پیچھے پرانے ماڈل کی جیپ تھی۔ ان کافی سارے لوگوں کے

درمیان شلوار قمیض اور بھاری پگڑی کے ساتھ بلجیت سنگھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے ابل رہے تھے اور وہ انتہائی

نفرت و حقارت سے جسپال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جسپال نے اچھٹی ہوئی نگاہ سب پر ڈالی اور گیٹ کے قریب کھڑے

بندے سے پوچھا۔

”ہاں، بھئی، کیا بات ہے؟“

”سردار بلجیت سنگھ جی، آئے ہیں۔ چلو ان کی بات سنو۔“

”اچھا، تو یہ ہے، بلجیت سنگھ۔“ پریال سنگھ نے تیزی سے کہا اور پھر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھ کر

مخصوص اشارہ کیا جسے جسپال نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ بلجیت سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”جس نے ملنا ہے وہ یہاں تک خود آ جائے، جاؤ جا کر کہہ دو۔“ اس نے قد اونچا کیا تھا کہ اس کی آواز دور تک

سنائی دے، جس پر وہ سب چند لمحے کے لیے تو خاموش کھڑے رہے پھر ایک ادھیر عمر کا بندہ آگے بڑھا اور اس کے پاس

آ کر سکون سے بولا۔

”جسپال سنگھ، میں اس گاؤں کا بیچ ہوں، دلیر سنگھ نام ہے میرا اور ہمارا سر بیچ سردار بلجیت سنگھ ہے تمہیں شاید گاؤں

کے ریتی رواج کا نہیں پتہ، اس لیے ہم سب مل کر تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تمہیں سمجھاسیں، ورنہ پنچایت کو یہ قانونی حق

بھی حاصل ہے کہ وہ گاؤں کے کسی بھی شخص کو اپنے پاس حاضر ہونے کا کہہ دے۔“

”جی، بولیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ جسپال نے محل سے پوچھا۔

”کیا ہم یونہی کھڑے کھڑے بات کریں گے، ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟“ دلیر سنگھ بیچ نے پوچھا۔

”کیوں نہیں سردار جی، ہم آپ کو بیٹھنے کے لیے کیوں نہیں کہیں گے؟ آخر کو آپ چل کر میرے گھر آئے ہیں۔“

یہ کہہ کر جسپال نے مڑ کر پریال سے کہا۔ ”ان سب کو بٹھاؤ اور ان کے لیے کچھ کھانے پینے کا بھی بندوبست کرو، جلدی۔“

”جی، بائی جی۔“ پریال نے کہا اور مڑ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اندر سے چار پائیاں نکل کر باہر آئے لگیں۔ وہ ”سٹھ“

میں برگد کے درخت کے نیچے ہی بیٹھتے جا رہے تھے۔ بیچ اور بیچ کے لیے کرسیاں رکھ دی گئیں، انہی کے مقابل جسپال کو

بھی ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ بھی دلیر سنگھ نے بڑے ٹھنڈے اور محل بھرے انداز میں کہا۔

”دیکھ بھی جسپال سنگھ، کسی بھی پنچایت کا کام جہاں مسئلے مسائل کا فیصلہ کرنا ہے وہاں اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ

امن و امان رکھنے میں پوری مدد دے اور ایسا غیر قانونی کام نہ ہونے دے جس سے امن و امان خراب ہو سکتا ہو اس لیے ہم

تمہیں سمجھانے آئے ہیں کہ یہ جو تم نے حویلی آباد کر لی ہے اور اس میں غنڈے لا کر بٹھا دیے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اگر میں آپ کی ان ساری باتوں پر لکیر پھیر دوں تو.....؟“ جسپال نے سکون سے جواب دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ دلیر سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔

”میں نے اچھے لفظ استعمال کیے ہیں بزرگوں ورنہ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میں آپ کی اللہ ساری

باتوں کو جھوٹا ثابت کر دوں۔“ وہ اسی پرسکون لہجے میں بولا۔

”دیکھو تم گھر پر آئی ہوئی پچائیت کی بے عزتی کر رہے ہو۔ تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ اس بار دلیر سنگھ نے کافی حد تک سختی سے کہا۔

”میں نے کوئی غلط تو نہیں کیا۔ بجائے بے عزتی محسوس کرنے کے آپ مجھ سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے کہ میں کیسے غلط ثابت کر سکتا ہوں۔“ وہ قہقہے سے بولا۔

”بولو..... تم بتاؤ.....“ دلیر نے غصے سے پوچھا۔

”میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور آپ پچائیت میرے گھر لے کر آ گئے ہیں۔ میری کوئی غلطی بتاؤ؟ آپ امن وامان کی بات کرتے ہو تو بتاؤ مجھ پر جو قاتلانہ حملہ ہوا ہے اس پر آپ لوگوں نے میرے گھر پر آ کر افسوس تک نہیں کیا، کجا آپ وہ لوگ تلاش کرنے میں میری مدد کرتے۔“

”ہم ماننے ہیں پھر کہ ہم افسوس کرنے تیرے گھر نہیں گئے، پہلی تو بات ہے کہ تمہارا گھر ہے کون سا؟ دوسری بات تم اپنا معاملہ لے کر پچائیت کے پاس نہیں آئے، ہم تجھے کیوں پوچھتے پھرتے، تم تو پولیس کے پاس گئے ہو اب تم جانو اور پولیس.....“ دلیر نے ذیل دیتے ہوئے کہا مگر حیاں کو اس کی بات چھ گئی وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”یہ حویلی وہ کونسی؟ کس کی ہے میری نہیں تو اور کس کی ہے؟“

”نہ یہ حویلی تیری ہے اور نہ وہ کونسی تیری، قانون اس بات کو نہیں مانتا، تم تو ابھی تک یہ ثابت نہیں کر سکے ہو کہ تم واقعی ہی کلونڈر سنگھ کے پتر ہو۔ جس دن تمہیں اپنے بارے میں ثبوت مل جائے، اس دن آ کر بات کرنا۔ اب کوئی اور بات ہے تو کہو۔“ دلیر سنگھ نے ساف لفظوں میں اس سے کہہ دیا کہ وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے۔

”تو پھر تم لوگ کیا کرنے آئے ہو میرے پاس؟“ حیاں غصے میں آ گیا، مگر قہقہے سے بولا۔

”یہی کہ تم نے جو غیر قانونی طور پر اس حویلی پر قبضہ کیا ہے اسے ختم کر دو اور یہ جو منڈھیر (جھٹھ) تم نے یہاں اکٹھی کر رکھی ہے اسے چلتا کرو۔ ہمیں نقص امن کا خطرہ ہے۔“

”کیوں خطرہ کیوں ہے؟ انہوں نے کسی کو کچھ کہا، کسی سے زیادتی کی، کسی کو کافی بُرا بھلا کہا، یا پچائیت کو خوف ہے ان سے؟“ حیاں نے پوچھا۔

”جب تم نے بنیادی طور پر ہی غلط کام کیا ہے تو باقی سارے غیر قانونی کام ہیں۔ پچائیت کو یہ اختیار ہے کہ تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ اس کے لیے ہم پولیس سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔“ دلیر سنگھ نے کہا تو حیاں کو انتہائی غصہ آ گیا۔ وہ کھڑا ہو کر بولا۔

”میں آپ کو بزرگ مانتے ہوئے آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ یہ جو حویلی ہے میرے باپ کی ہے اور اب میں اس کا مالک ہوں۔ یہاں پر موجود سب لوگ یہ بات کان کھول کر سن لیں اور سمجھ بھی لیں کل میرے باپ سمیت میرے خاندان کا خون کیا گیا، آج اگر میرا ہوجائے گا تو کوئی پروا نہیں۔ میں آیا ہی اس خاطر ہوں کہ یہاں مجھے قتل کر دیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میرا خون کون کرتا ہے۔ اب جس میں ہمت ہے وہ حویلی کی جانب بڑھے، وہاں سے سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کا حوصلہ کرنے میں ابھی دیکھ لیتا ہوں اس کو۔“

”دیکھا لڑائی والی بات ہو گئی نا..... تم کر رہے ہو نا لڑنے کی بات۔“ دلیر سنگھ نے کہا

”بس دلیر سنگھ جی بس! مجھے نہ منافقت آتی ہے اور نہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ ایک سچے سکھ کا کرتو یہ ہی سچ ہوتا ہے۔ سچے بادشاہ گردنا تک مہاراج نے سکھی کی بنیاد ہی سچ پر رکھی ہے۔ تم کیسے سکھ ہو جو جھوٹ اور منافقت کی بات کر رہے

ہو۔ شرم کرو لڑنے کی بات میں کر رہا ہوں، یا تم لڑنے کے لیے آئے ہو اتالاؤ لشکر لے کر۔“

”زبان سنجال کر بات کر اؤ، میں ابھی تک خاموش اس لیے رہا ہوں کہ دلیر سنگھ جی بات کر رہے تھے، چل روک تو کیسے روکتا ہے۔“ بلجیت سنگھ نے کھڑے ہو کر کہا تو دلیر سنگھ نے جلدی سے کھڑے ہو کر اسے بٹھادیا۔

”تم بیٹھو بلجیت سنگھ میں بات کر رہا ہوں نا۔“ یہ کہہ کر اس نے حیاں سے کہا۔ ”اوڑ کے! شام سے پہلے تک یہ حویلی خالی کر کے چلے جاؤ، ہاں جب تم اس کے مالک ہونے کا ثبوت لے کر آ جاؤ پچائیت کے پاس توجہ نہ شک یہاں پر رہنا، یہ ہمارا فیصلہ ہے۔“

”اور میں تم لوگوں کا فیصلہ نہیں مانتا۔ اب جو کرنا ہے کر لیں۔“ حیاں نے لا پرواہانہ انداز میں کہا۔

”چلو اؤ، اس کا سامان باہر پھینکو اور نکالو اسے یہاں سے۔“ بلجیت سنگھ نے انتہائی غصے میں کہا تو چند لوگ آگے بڑھے، تبھی حیاں نے اونچی آواز میں کہا۔

”بلجیت، شروعات تم کر چکے ہو۔ یہ تمہاری دوسری باری ہے۔ اب بھاگنا نہیں۔“ حیاں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا، بلجیت کے ارد گرد چند لڑکے ہو گئے۔ پریال سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بھی گنیں سیدھی کر کے بولٹ مار لیے۔

”رُک جاؤ۔“ دلیر نے چیخ کر کہا۔ ”میں کہتا ہوں رُک جاؤ۔“

”دلیر سنگھ آج فیصلہ ہو ہی جائے۔“ حیاں نے کہا تو وہ درمیان میں آتے ہوئے بولا۔

”نہیں، ہم لڑنے نہیں آئے پچائیت کا فیصلہ سنانے آئے ہیں۔ شام تک کا وقت ہے تیرے پاس، پھر نہ کہنا کہ زیادتی ہو گئی۔“ پھر سب لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چلو، واپس“ تبھی حیاں نے اونچی آواز میں کہا۔

”سنو دلیر سنگھ جی، اور وہ بھی جو یہاں موجود ہیں، آج کان کھول کر سن لو، جس میں بھی ہمت ہے جو جب جا رہے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال سکتا ہے، میں بڑھ کر کسی پروا نہیں کروں گا، اور نہ دھوکے سے سازش کر کے گھیرنے کی کوشش کروں گا، ایسا بیچوڑے کرتے ہیں۔ دس بیچوڑے مل کر ایک مرد کو مار سکتے ہیں، لیکن میں مرد اسے سمجھتا ہوں جو سامنے آ کر لٹا کر رو کر رہے۔ تم میں سے اب بھی کوئی چاہتا ہے تو آئے، میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لے۔“

وہاں پورے مجمع میں خاموشی رہی، بلجیت سنگھ کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا، تبھی دلیر سنگھ نے کہنا چاہا۔

”دیکھو حیاں۔“

”نہیں صرف میری سنو اب..... میں جب سے یہاں آیا ہوں، مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ بیچوڑوں کی طرح چھپ کر دار کیا جا رہا ہے۔ مجھے مجبور کیا جا رہا ہے کہ میں بھی مقابلے پر تر آؤں، جہاں تک ہو سکا، میں قانون ہی کی زبان میں بات کروں گا، اور باقی رہی شام کی بات تو شام کس نے دیکھی، جو پچائیت کا فیصلہ ہے وہ کر لے، پھر میرا جو فیصلہ ہوگا، وہ میں سنائوں گا۔“

”ہم نے بھی قانون کے مطابق تم سے بات کہہ دی ہے۔ اب شام تک تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔“ دلیر سنگھ نے کہا اور لوگوں کو گھیر کر واپس لے جانے لگا۔ حیاں نے بلجیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے، پھر بلجیت اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد صرف وہی وہاں پر رہ گئے۔ تبھی پریال نے کہا۔

”بائی جی، میں نے دیکھ لیا ہے، ان میں لڑنے کی ہمت نہیں ہے۔“

.. ”کتا کبھی شیر نہیں ہو سکتا پریال، جس طرح کئی کیمین اپنی عادتوں سے بچنا جاتا ہے، اسی طرح بے غیرت اور گھٹیا انسان بھی اپنی عادتوں ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جو بندہ بھی سازش اور کٹر سے لوگوں کو نقصان پہنچانے کا عادی ہو، کبھی

سامنا نہیں کر سکتا لیکن محتاط رہنا، کتے اور سانپ کا کبھی بھروسہ نہیں کرو۔“ جہاں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ گیا بائی جی۔“ پریال نے کہا تو جہاں نے جیب میں سے اپنی کارکی چابی نکالی اور چل دیا۔

جس وقت وہ کونھی میں داخل ہوا تو ذہنی طور پر کافی دباؤ میں تھا۔ جس طرح وہ سوچ رہا تھا دشمن بھی اسی ٹریک پر سوچ رہے تھے۔ انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ یہاں پر حویلی کو اپنا مرکز بنائے گا اور ان کی طاقت ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی لیے وہ اس مرکز کو بننے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔ یہ بات تو چھپی نہیں رہی ہوگی کہ گاؤں کے لوگ بھی جہاں سے جا کر ملے تھے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی گرفت کمزور ہو۔ انوجیت گھر پر تھا وہ سیدھا ہر پریت کے کمرے میں گیا وہ جاگ رہی تھی اسے دیکھتے ہی مسکرا دی۔ پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولی۔

”جی جی یہ چہرے پر کیا ہوا۔“

”کیا ہوا؟“ اس نے ہاتھوں سے چہرے کو صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اؤ نہیں جی جی تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ کوئی بات ہوئی ہے۔“

”کس کا چہرہ کیا بتا رہا ہے؟“ انوجیت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”میرے چہرے پر۔“ جہاں نے کہا پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر حویلی کے سامنے جو کچھ ہوا اس کی روداد اختصار سے

سنادی۔ وہ دونوں غور سے سنتے رہے بھی انوجیت نے کہا۔

”یاریہ جو پچائیت کو اختیارات دیئے گئے ہیں نا..... یہ ہیں تو اچھے مقاصد کے لیے مگر یہ لوگ اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے پہلے حویلی کے بارے میں کوئی قانونی حوالہ تمہارے پاس ضرور ہونا چاہیے کم از کم ان کی یہ دھمکی تو ختم ہو۔“

”میرا خیال بھی یہی ہے اب کدور میں تمہارے گل صاحب ایڈووکیٹ بھی کچھ نہیں کر پائے اور دوسری طرف کیشیو مہرہ بھی ابھی تک کوئی ایسا سرا تلاش نہیں کر سکا جس سے کم از کم یہ مسئلہ تو حل ہو۔“ جہاں نے کسی حد تک اکتائے ہوئے کہا۔

”یار یہ بھارت کی عدالت کے معاملات ہیں اتنی جلدی حل نہیں ہونے والے یہ تو کسی دفتر سے کوئی گیدڑ پروانہ ہی لینا پڑے گا۔“ انوجیت نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اچھا تم ایسا کرو گل ایڈووکیٹ سے بات کرو میں کیشیو مہرہ سے بات کرتا ہوں ابھی تو دفاتر کا وقت ہوگا دوپہر نہیں ڈھلے۔“ جہاں نے کہا۔

”اوکے.....! میں کرتا ہوں۔“ انوجیت نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ تبھی جہاں نے اپنا فون نکالا اور کیشیو مہرہ کو فون کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ تمہیدی جملوں کے بعد وہ بولا۔

”ابھی چند.....“

”میں نے سب سن لیا ہے پریال نے مجھے بتا دیا ہے۔ میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ تم ایسے کرو ابھی نکلو اور یہاں آ جاؤ اسی ریسروٹ میں آ کر ٹھہرو اور میرا انتظار کرو۔ میں کوئی نہ کوئی حل نکالتا ہوں۔ میں تمہیں اس لیے بلوار ہا ہوں کہ ممکن ہے کسی آفیسر سے ملوانا پڑ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تمہیں جہاں بلواؤں وہاں آنا پڑے گا۔ خیر تم وہاں سے نکلو پھر بات کرتے ہیں۔“ کیشیو مہرہ نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

واپس کمرے میں آ کر انوجیت سے مشورہ کرنے کے بعد جہاں کو وہاں سے نکلنے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اب اسے مزید آدھا گھنٹہ لگنا تھا جالندھر تک پہنچنے کا اس بار جب وہ گیٹ سے نکلا تو کوئی بندہ نہیں تھا۔ وہ جالندھر کی طرف۔

اکیلا ہی چل پڑا۔

وہ بائی پاس روڈ کے اس ریسروٹ میں پہنچ کر بڑے اطمینان سے چائے پی چکا تھا۔ وہ کیشیو مہرہ کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ جالندھر میں داخل ہونے پر اس نے خوش خبری سنائی تھی کہ کام ہو گیا ہے وہ وہاں انتظار کرے۔ تب سے وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً چار بج گئے تھے۔ جب کیشیو مہرہ وہاں آ گیا۔

”سوری یار مجھے دیر ہوگئی۔ دراصل بڑا صاحب گھر چلا گیا تھا اس سے دستخط کروانے کے چکر میں اتنی دیر ہوگئی۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک سفید کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔

”اس کی قانونی حیثیت کیا ہے۔“ جہاں نے پوچھا۔

”ویسے تو قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے لیکن یہ معمولی سا سفید کاغذ بہت بڑا پیریر ہے۔ اس کاغذ کے مطابق تمہارا کیس اس آفیسر کے پاس ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں چونکہ اس حویلی کا کوئی دوسرا عویدار موجود نہیں ہے اس لیے حویلی میں رہنے اور اسے استعمال کی اجازت دی جاتی ہے جب تک..... جب تک..... کیس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔“ کیشیو مہرہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اؤ گڈ.....! مطلب میں ان کی ایک فوٹو کا پی پچائیت والوں کو دے دوں۔ ان کے اطمینان کے لیے یہ کافی ہوگا۔“

”بالکل“ میں نے پریال کو فون کر کے بتا دیا ہے۔ وہ مطمئن ہیں۔ میرے خیال میں اب تم نکلنا شام ہونے سے پہلے تک یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے دو فوٹو کا پی والے کاغذ نکال کر اسے دیتا ہوا بولا۔ ”یہ لو، یہ انہیں دے دینا۔“ کیشیو نے اٹھتے ہوئے کہا تو جہاں بھی کاغذ پکڑتے ہوئے اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے پارکنگ تک آئے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے چل دیئے۔

اس وقت جہاں اوگی پنڈے سے ذرا فاصلے پر تھا جب اس نے اپنے واپس آنے کے بارے میں انوجیت کو بتایا۔ ”ٹھیک ہے تم آ جاؤ پھر شام ہوتے ہی میں تمہارے ساتھ دلیر سنگھ کے پاس جاؤں گا۔ میرا خیال ہے اسے کچھ دوسری باتیں بھی سمجھانا ہوں گی۔“

”نہیں.....؟“ انھی اور اسی وقت انہوں نے شام تک کالٹی میٹم دیا تھا۔ میں کہتا ہوں وہ حجت بھی نہ رہے ابھی وہ معاملہ ختم ہو جائے تو ذہنی دباؤ ختم ہو جائے گا۔“ انوجیت نے کہا۔

”نہیں تم سیدھے دلیر سنگھ کے گھر آؤ میں پنڈے کے باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ جہاں نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ دونوں دلیر سنگھ کے گھر جا پہنچے۔ اس کے گھر کے باہر ایک ہرا بھر اور خست تھا کافی بڑی ڈیوڑھی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ تبھی جہاں نے اس سفید کاغذ کی فوٹو کا پی نکال کر اسے دی۔

”یہ کیس سردار جی میں بڑے صاحب کا حکم نامہ لے آیا ہوں۔ اصل میرے پاس ہے۔ اور یہ نقل آپ کو دے رہا ہوں۔ اس حکم نامے کی تصدیق جب چاہیں کرالیں۔“

سردار دلیر سنگھ نے وہ کاغذ پکڑا پھر پڑھے بغیر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”جہاں پتر! میں جانتا ہوں کہ تو ہی کلو بندر سنگھ کا پتر ہی اور یہ حویلی تیری ہے میں اگر آج نہ ہوتا تو بلجیت کی نیت لڑائی ہی کی تھی۔ یہ کاغذ بنو الیا تو نے اچھا کیا..... اب کم از کم کوئی ثبوت تو ہے نا جس پر میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔ پتر.....! ہماری سوجبوریاں ہیں ان کے ساتھ چلنا پڑتا ہے کبھی خاموش رہنا پڑتا ہے کبھی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے اور

کبھی کوئی اپنی بھی منالیتے ہیں۔ بس تو ان سے بچ کر رہو بڑے ظالم لوگ ہیں.....“ اس نے کافی حد تک دردمند لہجے میں کہا۔

”بس آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ اتنا ہی ظلم کریں جتنا سہہ سکیں یہ نہ ہو کہ اب میں پچھلا حساب بھی ان کے ساتھ برابر کر دوں۔“

”دیکھ پتر.....! ان کا تو کام ہی لڑنا بھڑانا ہے۔ رب کی مار ہے اُن پر اسی لئے تو ان کی دونوں بہنیں کنواری مر گئی تھیں۔ ان کی شادی نہیں ہو سکی معاشرے میں ان کی کیا قدر جو اپنی بہنوں کو برنہ دلا سکیں۔ ہر بندے کے اندر غصہ ہے ہر بندہ لڑ سکتا ہے عزت اور غیرت کا مسئلہ ہوتا ہے ورنہ تو ہر طاقتور آدمی معاشرے کو ختم کر کے رکھ دے۔ نہ پتر، تو ادھر رہ اپنی زمینیں سنبھال، دوسروں کے دکھ سکھ میں کام آ، ان کو نظر انداز کر دے۔“ اس وقت وہ پچائیت والا دبیر سنگھ لگ ہی نہیں رہا تھا۔

”تو پھر رب را کھا دبیر سنگھ جی، پھر ملاقات ہوگی۔“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ایسے نہیں پتر، تو پہلی بار میرے گھر آیا ہے، لسی آرہی ہے، پیڑوں والی تیری چاچی کو کہہ کر آیا ہوں۔ وہ بی لوتم دونوں تو پھر چلے جانا۔“

”ٹھیک ہے سردار جی، جیسے آپ چاہو۔“ جہاں بیٹھ گیا تو اس کے ساتھ انوجیت نے بھی کرسی سنبھال لی۔

”پتر.....! میں نے سنا ہے ادھر کینیڈا میں تمہارا اچھا بھلا کاروبار ہے، تم ادھر رہو گے تو وہاں کون دیکھ بھال کرتا ہوگا۔“ دبیر سنگھ نے پوچھا۔

”وہ جی میری پھوپھو سکھ جیت کور کے پتر، سب سنبھالتے ہیں۔ میں ایک یہ زمین اپنے نام کروالوں تو ادھر ہی کینیڈا بنادینا ہے۔ یہاں فیکٹریاں لگاؤں گا، یہ جو سارا دن منڈھیر و پہلی پھرتی رہتی ہے اسے کام پر لگا دوں گا..... اور یہ جو.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک نوجوان تیزی سے موٹر سائیکل پر آن رکا، وہ حواس باختہ سا بولا۔

”سردار جی..... وہ..... حویلی۔“

”اُوئے کیا ہوا حویلی کو۔“ دبیر سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ انوجیت اور جہاں بھی اٹھ گئے۔ وہ نو وارد دونوں کو دیکھ کر ایک دم سے جھک گیا تھا۔ پھر حوصلہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ جی بلجیت سنگھ نے حویلی کو آگ لگا دی ہے۔“

”آگ لگا دی ہے۔“ جہاں نے پوچھا اس کے لہجے میں انتہا درجے کی حیرت چھلک پڑی تھی۔

”وہاں پر موجود بندے.....“ انوجیت نے پوچھا۔ اس کے حواس قابو میں تھے۔

”انہیں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے، تبھی تو خالی حویلی کو انہوں نے.....“ نو وارد نے کہا تو جہاں تیزی سے اپنی گاڑی کی جانب بھاگا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ اس کے پیچھے کون آ رہا ہے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی گاؤں کی گلیوں میں بھگاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے اپنی حویلی میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ دکھوایا اس میں سے کولٹ پستل نکالا، پھر سیٹھی کیج ہٹا کر اس گلی میں گاڑی موڑ لی، جو سیدھی ستھ میں جا کر کھلتی تھی اور سامنے حویلی تھی۔ اس نے حویلی میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا تو اس کا پناہ داغ دھوئیں سے بھر گیا۔ اس نے دیکھا ستھ میں بلجیت سنگھ کے ساتھ چند لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ایک چھنگاڑ کے ساتھ گاڑی رکی تو وہ متوجہ ہوئے، جہاں نے اندر بیٹھے ہی گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ وہ دیکھوور کے بہترین شوٹنگ کلب کا بہترین ممبر تھا، لیکن یہاں اس نے یہ نہیں دیکھا کہ کس کے کہاں گولی لگ رہی ہے۔ اس نے پورا میگزین خالی کیا تو دوسرا میگزین لمحے میں لگاتے ہوئے

باہر جھانکا۔ وہاں کئی ڈھیر ہو چکے تھے۔ اچانک وارد ہونے اور دوسرا نشے میں ہونے کے باعث وہ اپنے ہتھیار ہی سیدھے نہیں کر پائے تھے۔ یہ جہاں کا جنون تھا، ایک دو نے ہتھیار سیدھے کیے تو جہاں نے ان پر بھی گولیاں برسادیں۔ بلجیت درخت کی دوسری طرف تھا، جس وقت اس نے دیکھا کہ پانسہ ہی پلٹ گیا ہے اس نے بھاگنا چاہا، اس نے غلطی یہ کی کہ اپنی گاڑی کی جانب بھاگا، ممکنہ ہے اس میں اسلحہ پڑا ہوا، یا کچھ اور مقصد تھا، لیکن اس وقت تک جہاں اپنی گاڑی سے باہر آ چکا تھا۔ انہی لمحات میں انوجیت کی گاڑی بھی وہاں آ گئی تھی۔ جہاں نے اونچی اور کھڑکی ہوتی آواز میں کہا۔

”رک جاؤ بلجیت.....! تم بھاگ نہیں پاؤ گے۔ اب تیری ساری سرمنجی ادھر ہی نکالنی ہے..... بھگڑا ہوا جا۔“

اتنا کہتے ہوئے اس نے دو تین فائر اس کے پیروں میں مار دیئے۔ وہ ساکت ہو گیا۔ بلجیت نے دھیرے سے گھوم کر جہاں کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ارد گرد کچھ زخمی زمین پر ادھ مومے پڑے تھے اور کچھ بھاگ گئے تھے اس نے اپنی ضد پوری کر لی تھی، حویلی کو جلا دیا تھا اور یہی وہ جذبات کا انتہائی مقام تھا جہاں جہاں کے لیے تمام حدیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا بلجیت کے پاس جا پہنچا، جو شراب کے نشے میں دھست تھا اور اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔ جہاں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اپنا پستل بیلت میں اڑتے ہوئے دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ بلجیت کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا، پھر جہاں نے اسے گریبان سے پکڑ کر گھونٹہ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس نے ذرا سی مزاحمت کی، لیکن تب تک جہاں نے اس کی دھنکی شروع کر دی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بلجیت کے کہاں کہاں مار رہا ہے، وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا تو جہاں نے پوری طاقت سے ٹھوک اس کے سر پر ماری، اس کی دستار اتر گئی اور کیس کھل گئے۔ تبھی وہ اس کے منہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ جہاں نے ایک پاؤں اس کی بغل میں رکھا اور پوری قوت سے اس کا ہاتھ کھینچ کر بازو نکال دیا۔ بلجیت کی چیخ فضا میں بلند ہو گئی۔ جہاں نے ادھر ادھر دیکھا، اسے برگد کے درخت تلے لائٹیاں اور ڈنڈے پڑے دکھائی دیئے۔ جہاں نے بھاگ کر ان میں سے ایک ڈنڈا اٹھایا جو کافی موٹا اور مضبوط تھا۔ پہلے اس نے بلجیت کی بائیں ٹانگ پر پینڈی کے پاس ضربیں لگانا شروع کر دیں، بلجیت ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح ڈکارنے لگا تھا۔ تین چار ضربوں کے بعد اس کی پینڈی ٹوٹ گئی تو دوسری پر طاقت آزمائی کرنے لگا۔ اسے توڑنے کے بعد اس کا وہ بازو توڑنے لگا جو بھی سلامت تھا۔ پہلا تو جڑ سے نکل کر بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ بلجیت ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکا تھا، اس وقت جہاں مٹی کے تیل کا وہ کین اٹھا چکا تھا، جو ستھ کے قریب پڑا تھا، اور حویلی کے جلانے کے کام نہیں آیا تھا کہ پولیس کی گاڑیاں وہاں آن پہنچی، اس کے ساتھ ہی گاؤں کے لوگوں کا ایک اڑدھام وہاں آ گیا۔ پولیس کے انچارج نے اونچی آواز میں کہا۔

”رک جاؤ جہاں.....! اب کوئی حرکت نہ کرنا۔“

”تم رک جاؤ پولیس والوں! تم کچھ نہیں کر سکتے، میں ان بے غیرتوں کو سبق سکھا رہا ہوں جو دوسروں کا گھر جلاتے ہیں۔ تم بھی انہی کی ساتھ شامل ہو۔“

”بکواس بند کر دو اور اپنا آپ ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔“ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”گولی مجھے بھی چلانا آتی ہے۔ چلاؤ دیکھیں کون مرتا ہے۔“ جہاں نے اپنا پستل نکالتے ہوئے کہا۔

”دیکھو پلیز.....! میں مانتا ہوں کہ بلجیت نے زیادتی کی ہے اور تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اپنے دفاع میں کیا ہی میں تمہیں گرفتار نہیں کرتا، تم چاہو تو جا سکتے ہو اب۔“ بلجیت کو کچھ نہ کہو.....“ وہ لالچت سے بولا تو جہاں نے پوچھا۔

”وہ بندے جو تم یہاں سے لے کر گئے ہو، کیوں.....؟“

”ہمیں حکم ملا تھا کہ انہیں گرفتار کر کے جالندھر لایا جائے، ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں ایسی سازش ہے، پلیز، اسے

چھوڑ دو اور چلے جاؤ۔ میں تمہارے بندے بھی چھوڑ دوں گا۔“

”تم نہ بھی چاہو انہیں چھوڑنا تو وہ تمہیں چھوڑنا پڑیں گے۔ میں جارہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس میں بیٹھ کر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اس کا رخ نجانے کدھر تھا اس کے ساتھ ہی انوجیت بھی نکل گیا۔



میں اپنی گلی میں پہنچا تو مجھے دور ہی سے اپنا گھر جلنے کے آثار دکھائی دے گئے۔ میرے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ کا دھواں میرے دماغ کو بوجھل بنا رہا تھا۔ میرا دوران خون تیز ہونے لگا تھا اور میرا غصہ میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں جوں جوں اپنے قدم گھر کی جانب بڑھا رہا تھا، میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ہیرا زادہ وقاص مجھے گاؤں کے قریب اتار کر چلا گیا تھا۔ جس وقت میں جیپ سے اتر رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک پتل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جمال! اگر تم میرے پاس آنا چاہو تو پھر دیر مت کرنا جو کہو گے وہی کر لیں گے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ گاؤں میں زیادہ دیر نہ رہنا۔“

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور چپ چاپ اپنے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔ میں اپنے گھر کے گیٹ پر رکا، جلے ہوئے گھر کو دیکھ رہا تھا، میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں صحن میں گیا تو ہر کمرہ ہی نہیں دیواریں بھی سیاہ ہو چکی تھیں۔ چھت والا کمرہ ٹوٹ کر گر چکا تھا، ایک ہی نگاہ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہاں کچھ بھی نہیں بچا ہے سب کچھ خاکستر ہو گیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں زیادہ دیر وہاں رہا تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا، جس گھر میں میں نے شعور کی آنکھ کھولی، جو صحن میرے بچپن اور جوانی کا گواہ تھا وہاں اب کچھ نہیں بچا تھا۔ اگرچہ میرا دل رور رہا تھا، لیکن میری آنکھوں میں نمی نہیں اتری تھی۔ شاید میرے اندر آگ ہی اس قدر زیادہ تھی۔ میں پلٹ کر گھر سے باہر آ گیا۔ اب میرے لیے دنیا بھر کے کاموں سے زیادہ یہی اہم ترین کام تھا کہ میری ماں کہاں ہے؟ میری آمد کے بارے میں شاید معلوم ہو گیا تھا اس لیے گلی کے لوگ باہر نکلتا شروع ہو گئے تھے۔ سبھی مجھے یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ انہوں نے آگ لگتے ہوئے دیکھا، بندے شاہ زیب کے پروردہ تھے۔ لیکن کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ میری ماں کدھر ہے؟ میں کچھ دیر ان کے پاس رہا پھر چوک کی طرف چل پڑا۔

شاید میرا آمد کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی اس لیے جیسے ہی میں چوک میں برگد کے درخت تلے پہنچا وہاں کئی نوجوان اور بزرگ جمع ہو گئے تھے۔ بھید مجھے دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

بلاشبہ وہ اکیلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں ان سب لوگوں سے نکل کر بھیدے کے پاس چلا گیا۔

”چلو! گھر چل کر بات کرتے ہیں؟“

”نہیں! گھر نہیں جانا تو صرف یہ بتا کہ اماں کے.....“

”وہی تو کہہ رہا ہوں سکون سے بتاتا ہوں۔ چل آ.....!“ بھیدے نے کہا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن

چند قدم چلنے کے بعد کہا۔

”نہیں بھیدے..... میں نہیں چاہتا کہ تو بھی دشمنوں کے ظلم کا شکار ہو جائے تو نے مجھے جو بتانا ہے یہاں

بتادے یا پھر ڈیرے پر چل میں وہیں آتا ہوں۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”چھا کا مجھے بتا کر گیا ہے۔ وہ اماں کے ساتھ سوئی کو لے کر قصبے میں چلا گیا ہے۔ وہ وہیں ہے، لیکن چھپا ہوا ہے کہہ رہا تھا کہ جب تک ٹوپولیس کے جنگل سے نکل نہیں آتا تب تک وہ وہیں رہے گا قصبے میں وہ کہاں ہیں یہ مجھے نہیں معلوم۔“

”ٹھیک ہے تو جا ڈیرے کا خیال رکھنا۔ میری اگر قسمت میں ہو تو دوبارہ آن ملوں گا۔“ میں نے کہا اور واپس درخت تلے آ بیٹھا۔

میں درخت کے تلے صرف اس لیے جا کر بیٹھا تھا کہ جہاں گاؤں والوں کو معلوم ہو جائے کہ میں واپس آ گیا ہوں وہاں شاہ زیب تک بھی اطلاع پہنچ جائے۔ تیسرا یہ مجھے یہ خود بخود معلوم ہو جانا تھا کہ میرے ٹولے کے لڑکے گاؤں میں ہیں یا کہیں چھپ چھپ چھپ گئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر کوئی گاؤں میں ہوتا تو ضرور سامنے آ جاتا کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا، میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اٹھ گیا۔ میرا رخ اب قصبے کی طرف تھا۔

اس وقت سہ پہر کے بعد سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا۔ میں پیدل چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہاں چند دوکانیں تھیں اور ذرا سا آگے جا کر حویلی کی طرف جانے والا راستہ تھا، میں ایک دکان کی طرف بڑھا جہاں سے چائے وغیرہ کے ساتھ کھانے پینے کو مل جاتا تھا۔ میں جا کر وہاں بیٹھ گیا اور دکان دار کو اچھی سی چائے بنانے کو کہا۔ میرا مقصد وہاں چائے پینا نہیں تھا بلکہ کسی ایسے بندے کی تازہ میں تھا جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح حویلی سے ہو۔ دراصل اس وقت میں سخت الجھن میں تھا۔ ایک طرف دماغ یہ کہہ رہا تھا کہ سب سے پہلے اپنی اماں کو تلاش کروں پھر اطمینان کے بعد شاہ زیب سے دودھ ہاتھ کرنا ہوں گے لیکن دوسری طرف میرے اندر کا جانور مطمئن نہیں ہو رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ شاہ زیب کو اس کا سبق سکھا کر ہی جاؤں میں دراصل وہاں فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میری نگاہوں میں ان تینوں کے چہرے گھوم رہے تھے اور میری تمام توجہ ان کی طرف تھی۔ اماں اور سوئی کا تو معاملہ ایک طرف رہا، میں اپنے جگر کی دوست چھا کے گھر جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ وہاں تھا بھی کون؟ اس کا ایک اکیلا باپ، اگر وہ مجھ سے یہ سوال کر دیتا کہ وہ میری وجہ سے غائب کیوں ہے تو میں اسے کیا جواب دیتا۔ اگر انہی لمحات میں مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ تینوں کہاں ہیں اور خیریت سے ہیں تو میں پوری توجہ سے شاہ زیب کو ختم کرنے کے بارے میں سوچتا۔ مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ میرے سامنے چائے آ گئی۔ میں دھیرے دھیرے سنب لے رہا تھا اور سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بھیدے نے اگرچہ مجھے اشارہ دے دیا تھا لیکن اسے بھی پوری امید نہیں تھی کہ وہ قصبے میں پہنچے ہوں گے بھی یا نہیں۔ مجھے بہر حال انہیں تلاش کرنے جانا تھا۔ اگر میں انہیں تلاش کر بھی لیتا ہوں تو پھر انہیں کہاں رکھوں گا یہاں گاؤں میں جہاں وہ ہر وقت غیر محفوظ ہوں گے؟ یا پھر مجھے سوئی کی بات ماننا پڑے گی اور اس کے پاس اماں کو رکھنا ہوگا؟ کیا وہ ملک سجاد اور شاہ زیب کا مقابلہ کر پائے گی؟ کیا وہ وہاں پر محفوظ ہوگی؟ میں خیالوں کی راہ پر بہت دور تک سوچتا چلا گیا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا اور میری چائے ختم ہو گئی۔ اسی دوران میں نے سڑک پر دیکھا دلبر کا دوست جانی شوکر بانیگ پر بیٹھا آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے تلاش کر رہا تھا کیونکہ اس کی جیسے ہی مجھ پر نگاہ پڑی وہ چونک گیا اور میری طرف بڑھ آیا۔ چند لمحوں بعد میرے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

”بڑا زوردار حملہ تھا ہمارا، شاہ زیب کے بندوں کا، ہمیں تو بعد میں پتہ چلا.....“

”تو پتہ کس کے؟“ اس وقت شاہ زیب کہاں ہے؟“ میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”وہ کل رات سے یہاں پر نہیں ہے۔ سنا ہے شہر گیا ہوا ہے ہو سکتا ہے شام تک واپس آ جائے۔“

”یہ کئی خبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

حیران ہوتا ہوا بولا۔

”وہ ٹھیک تھے۔ چھاکے کو اطلاع ملی تھی کہ شاہ زیب وغیرہ حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں لے کر سیدھا میرے پاس آ گیا۔ آج صبح مجھے اطلاع ملی کہ..... خیر آؤ اندر آ۔“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ میں نے ہائیک اندر کر لی اور صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ بھابی بچن میں تھی اور بچے اندر لی دی دیکھ رہے تھے۔

”اب مجھے بتاؤ وہ کب گئے ہیں؟“

”یہی کوئی دو گھنٹے پہلے ان کا پروگرام یہی ہے کہ چھاکا انہیں چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔ پھر ہم دونوں تیرا کوئی سراغ تلاش کریں گے..... وہ تیرے لیے پریشان تھے.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملائے ہوئے بولا۔ ”لے بات کر لے ان سے“ مجھے اطمینان ہو جائے گا۔“ کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا، فون سوئی ہی نے اٹھایا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چپک اٹھی۔

”تو ٹھیک تو ہے نا جمال.....“

”میں ٹھیک ہوں تو اماں کے بارے میں بتا چھاکا کدھر ہے؟“

”وہ دونوں ٹھیک ہیں اور میرے ساتھ لاہور جا رہے ہیں۔ تو بھی ایسا کر لاہور ہی آ جاؤ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں۔“

”تو میری اماں سے بات کرو.....“ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ چند لمحے بعد اماں کی آواز فون میں گونج اٹھی۔

”میں ٹھیک ہوں پتر! تو اپنی سنا۔“

”بس جب تک تیرا پیہ نہیں مل رہا تھا، میں پریشان تھا اب میں پریشان نہیں ہوں۔“

”تیرے لیے وہاں بہت خطرہ ہوگا جیسا یہ کہتی ہے ویسے مان لے.....“ اماں نے کہا۔

”اماں.....! تو بس دعا کرو..... میں سارے مسئلے حل کر لوں پھر سکون ہوگا۔ چھاکے سے میری بات کروادے۔“

چند لمحے بعد چھاکا لائن پر تھا۔

”تو فکر نہ کر جمال.....! میں انہیں لاہور چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا تو ادھر سہیل کے پاس ہی ٹھہر، میں نے وقت سے پہلے ہی اماں اور سوئی کو وہاں سے نکال لیا تھا۔ دوسرا تیرے چھت والے کمرے کا سارا سامان بھی اٹھکانے لگا دیا تھا۔

تو فکر نہ کر میں آ جاؤں تو دونوں مل کر سب کچھ کریں گے۔ اگر کہتا ہے تو ہم واپس آ جاتے ہیں۔“

”نہیں..... سوئی کے ذہن میں کوئی محفوظ ٹھکانہ ہوگا انہیں وہاں چھوڑ کر تو فوراً واپس آ جا، تیری ضرورت ہے مجھے۔ سوئی سے بات کرو۔“

”ہاں بول جمال کیا کہتا ہے۔“ سوئی کی کھٹکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سوئی.....! تیرے پاس کوئی ایسا ٹھکانہ ہے جہاں تم اور اماں محفوظ رہ سکو، اور ملک سجاد.....؟“

”تو فکر نہ کر..... میرا نمبر ہے نا تیرے پاس..... اس سے رابطہ رہے گا بلکہ نہیں..... میں لاہور جاتے ہی اپنا نمبر

تبدیل کر لوں گی، اور چھاکے کو دے دوں گی، تو مجھ سے رابطہ رکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں چھاکے کا انتظار کروں گا۔ اسے کل تک بھجوادینا واپس۔“ میں نے کہا اور پھر چند باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

”ہاں یہ پکی خبر ہے۔“ اس نے تصدیق کی۔

”چلو پھر تو ایسے کر مجھے اپنا ہائیک دے، میں رات کسی بھی وقت تیرے پاس آؤں گا، تو ادھر میرے ڈیرے پر رہنا، اور یہ خبر ضرور لینا کہ شاہ زیب واپس آ گیا ہے یا نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ہائیک کی چابی مجھے تھماتے ہوئے کہا تو ایک دم سے مجھے خیال آیا۔

”نہیں.....! تو اپنے گھر ہی رہنا، میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ پھر تو شاہ زیب کی پکی خبر رکھنا۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

اس وقت میں ہائیک پر بیٹھا ہی تھا اور چابی انکیشن میں لگائی ہی تھی کہ قصبے کی طرف سے پولیس گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں چونک گیا، نجانے کیوں میری پچھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دے دیا۔ میں اس طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ حویلی کی جانب مزے جائیں تو خطرے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر وہ آگے آتی ہیں تو مجھے اپنا بچاؤ بہر حال کرنا چاہیے تھا۔ میں نے انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ وہاں سے نکل پڑا، میں سڑک کنارے چلتا ہوا گاؤں کی طرف ایک پگڈنڈی پر اتر گیا۔ پولیس گاڑیاں وہیں سڑک پر دکانوں کے پاس رک گئی تھیں۔ کیا میری خبری ہو گئی تھی؟ اگرچہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے بہر حال احساس ضرور ہو گیا تھا۔ میں رکنا نہیں بلکہ گاؤں کے اوپر سے نکلتا ہوا چل پڑا۔ مجھے قصبے تو جانا ہی تھا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر میں نہر کنارے آ گیا۔ میں نے سڑک کا راستہ نہیں لیا، بلکہ نہر کنارے چلتا چلا گیا، اس وقت اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ جب میں قصبے کے قریب پہنچ گیا۔

میرے لیے سب سے اہم سوال یہی تھا کہ چھاکا اماں اور سوئی کو لے کر کہاں جاسکتا ہے؟ میرے ذہن میں تین ہی نام تھے۔ وہ تینوں میرے جگہری دوست تھے اور چھاکے کو ان کے بارے میں پوری طرح علم تھا۔ وہ انہی پر یقین کر سکتا تھا، ان تینوں کے گھر مجھے باری باری جانا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک ترتیب رکھی اور قصبے کی گلیوں میں گھس گیا۔ تقریباً میں منٹ بعد میں اپنے پہلے دوست کے گھر پر تھا۔ اگرچہ اس سے کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا، مگر کہیں بھی اس کی باتوں سے مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ اماں، سوئی اور چھاکا اس کے پاس ہوں گے۔ اس طرح جب میں سہیل کے گھر گیا تو وہ مجھے دیکھتے ہی کھل گیا۔

”اوئے تو صبح کا کدھر غائب ہو گیا تھا، ہم تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گئے کہ تو یا تو پولیس کے ہاتھوں کھپ گیا یا پھر فرار ہو گیا..... چل آ اندر آ.....“

”تو مجھے کہاں تلاش کرتا رہا۔“ میں نے محتاط انداز میں پوچھا تو وہ گیٹ کھولتے کھولتے رک گیا۔

”میں اور چھاکا صبح ہی تھانے گئے تھے، اس وقت تک وہ تجھے لے کر نکل گئے تھے۔ پتہ یہی چلا کہ وہ تجھے شہر کی عدالت میں لے کر جائیں گے، ہم جب وہاں پہنچے ہیں تو پتہ چلا کہ تم آئے ہی نہیں ہو۔“

”پھر.....؟“ میں نے پوچھا۔

”پھر کیا؟ ہم سب ہی پریشان ہو گئے۔ اک کا سہیل سے ذرا سا سراغ ملا تھا کہ تمہیں راستے ہی میں اتار دیا تھا بس پھر ہم نے اپنے طور پر اندازے لگائے تو بتا گیا کدھر تھا؟“ اس نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

”وہ تو میں تجھے بتاتا ہوں لیکن تو یہ بتا کہ اماں اور سوئی کدھر ہیں اب چھاکا کہاں پر ہے؟“

”وہ تو شام کے وقت چلے گئے لاہور، ابھی راستے ہی میں ہوں گے سوئی نے جیب منگوائی تھی۔ اس میں گئے ہیں۔“ سہیل نے مجھے بتایا۔

”اوہ.....!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”ویسے وہ خیریت سے تھے نا.....؟“ میرے انداز پر وہ

مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔

میں نے سہیل کو ساری روداد بتائی تو وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”اب تجھے بہت محتاط رہنا ہوگا جمالے۔ ایک طرف شاہ زیب ہے تو دوسری طرف پولیس اور یہ جو پیر زادہ وقاص ہے نا اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ایسے لوگ دوسروں کو فقط شطرنج کا مہرہ خیال کرتے ہیں۔ جس سے شاہ کو بھی مارا جاسکتا ہے یا پھر اگر پٹ جائیں تو انہیں فرق نہیں پڑتا۔“

”میں سمجھتا ہوں سہیل اب میں چلتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کہاں جائے گا تو..... ادھر سکون سے سو جا، ابھی کھانا کھاتے ہیں۔ پھر گپ شپ کریں گے۔“ سہیل نے بے تکلفی سے کہا تو میں انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”نہیں! مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ تیرا شکر یہ اب بس مجھے اجازت دے۔“

”نا بھائی..... کھانا کھا کر جانا بس پانچ منٹ میں لائی۔“ بھائی نے چکن میں سے کہا تو مجھے وہاں بیٹھنا پڑا۔

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ جب میں سہیل کے گھر سے نکلا۔ میرا رخ گاؤں نورنگر ہی کی طرف تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، بیس پچیس منٹ بعد میں اپنے ڈیرے پر تھا۔ بھیدہ ابھی سویا نہیں تھا۔ اس نے میرے لیے بستر بچھایا تو دل میں اک ہوک اٹھی۔ دو دن پہلے تک میرا اپنا گھر تھا۔ جسے دشمنوں نے جلادیا تھا۔ آج اگر میرے پاس یہ ڈیرہ نہ ہوتا تو میں در بدر تھا۔ میں بستر پر لیٹا نہیں یہی سوچتا رہا، ابھی بھیدہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”تو پریشان نہ ہو جمالے رب سو ہنا کر مریگا۔“

”ہاں اس رب ہی سے تو امیدیں ہیں ساری.....“ میں نے کہا اور پھر لیٹتے ہوئے اس سے کہا۔

”بھیدے..... تو ایسا کریہ بایک لے جا اور جا کر جانی شوکر کو دے دے میرے بارے میں پوچھے تو بتا دینا کہ میں ادھر ڈیرے پر ہوں۔“

”میں آ جاؤں واپس یا.....“ اس نے رکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اگر فوراً تیرے ساتھ چل پڑے تو ساتھ ہی آ جانا ورنہ جیسے تیرا دل چاہے۔“ میں نے کہا اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد بھیدہ چلا گیا اور میری کب آنکھ لگی یہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

اس وقت اندھیرا ہی تھا جب میری آنکھ کھلی میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی تو ستاروں کی چال بتا رہی تھی کہ رات گزر چکی ہے اور کچھ دیر میں صبح صادق ہونے والی ہے۔ ایسے وقت میں ڈنڈو لہا کا اپنا ایک مخصوص شور ہوتا ہے۔ میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ ابھی مجھے بھیدہ دکھائی دیا جو چارے کی ٹوکری اٹھائے ڈنڈوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ چارہ ڈال کر واپس پلٹا تو اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ ابھی وہ سیدھا میرے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”ہاں..... کیا کہا تھا جانی شوکر نے.....؟“

”اس نے کہا تھا تو جا میں آ جاتا ہوں۔ میں تو پھر واپس آ گیا، مگر وہ نہیں آیا ابھی تک۔“

”چل کوئی بات نہیں آ جائے گا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر نہانے کے لیے چل دیا۔

میں نہا کر واپس اپنی چار پائی پر آیا تو جانی شوکر آیا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بر اس نے کہا۔

”اچھا ہوا تم کل فوراً ہی نکل گئے۔ پولیس تیرے لیے ہی کل آئی تھی۔ اسے شاہ زیب نے بھجوایا تھا۔ وہ کل

پورے گاؤں میں تجھے تلاش کرتے رہے ہیں۔ لگتا ہے تیری خبر ہوئی ہے۔“

”وہ تو ہوئی ہی تھی جانی میں کل جان بوجھ کر چوک میں بیٹھا رہا تھا۔ گاؤں میں سارے ہی لوگ میرے جن نہیں

ہیں ان میں بہترے دشمن بھی ہیں۔ تو مجھے صرف اتنا بتا کہ شاہ زیب حویلی میں آیا ہے یا نہیں؟“

”نہیں آیا۔“ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کئی خبر ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”کئی خبر ہے۔“ اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میرا بڑا بھائی حویلی میں ملازم ہے۔ اسے حویلی کے ہر معاملے

کی خبر ہوتی ہے ابھی اس سے تصدیق کر کے تیرے پاس آیا ہوں۔“

”ہے کہاں وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”شہر ہی گیا تھا ابھی تک واپس نہیں پلٹا، ممکن ہے وہیں سے کہیں دوسری طرف نکل گیا ہو۔ ہاں! ان بندوں

کے بارے میں جان گیا ہوں جنہوں نے تیرا گھر جلا دیا تھا۔“

”واہ..... کتنے بندے تھے..... کبھی کے.....“ میں نے تیزی سے پوچھا تو اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”بندے تو بہت تھے لیکن وہ چار پانچ بندے جو سب سے آگے تھے اور ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ وہ اس

وقت ڈیرے پر ہیں۔ شیدا چدھڑ گاؤں میں ہے۔ شاہ زیب نے تیرے گھر کو جلانے کی ذمہ داری اس کو دی تھی۔“

”کیا اس وقت وہ گھر پر ہوگا؟“ میں نے پر جوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں.....! وہ گھر ہی ہے باقی ڈیرے پر ہیں۔“ جانی شوکر نے مجھے بتایا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”چل جانی.....! تو مجھے گاؤں کے باہر چھوڑ دینا، سامنے مت آنا باقی میں سب دیکھ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا

تو وہ بھی اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے سے نکل کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔

جانی شوکر مجھے گاؤں کی کٹڑ پراتار کر چلا گیا۔ صبح صادق کا نور ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور میں تیز تیز قدموں سے

شیدے چدھڑ کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند گلیاں پار کر کے میں اس کے گھر کے سامنے تھا۔ میں یقین کرنا چاہ رہا تھا کہ

وہ گھر پر ہے بھی یا نکل گیا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ اپنی بایک پر باہر نکلا۔ میں نے ایک

لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا ہسل نکالا اور یکے بعد دیگرے دو دفار اس کی ٹانگوں میں دے مارے۔ وہ اس اچانک افتاد پر گھبرا گیا

اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے سر پر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس

کی آنکھوں میں دہشت کے ساتھ حیرت جمی ہوئی تھی۔ وہ چیخا بھول گیا اور کراہنے لگا۔ صبح ہی صبح فائرنگ کی آواز سے نورنگر

گونج اٹھا تھا۔ یہ تو اب ممکن ہی نہیں تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے نہ نکلتے، وہ زمین پر گر چکا تھا اور اسکی بایک اس کے ہاتھ

سے چھوٹ کر ایک طرف گر گئی تھی۔ میں نے اسے جا کر بالوں سے پکڑ لیا اور انتہائی غصے میں کہا۔

”تو نے میرے گھر کو آگ کیوں لگائی؟“

”سردار..... نے کہا..... معاف کر دو..... میں.....“ وہ انتہائی مشکل سے بول رہا تھا۔ اتنے میں اس کے گھر

کے اندر سے اس کی بیوی اور بچے نکل آئے۔ اس نے اپنے شوہر کی حالت دیکھی تو چیخ مار کر بڑھی۔

”خبردار! کوئی آگے بڑھا تو گولی مار دوں گا۔“ میرے یوں کہنے پر وہ وہیں رک گئی۔ گاؤں کے ہر بندے کو خبر

تھی کہ شیدے چدھڑ نے کیا جرم کیا ہے تو اس کی بیوی کو کیوں معلوم نہ ہوتا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اسکے سر پر سوار کیوں ہوں۔

سو وہ منتوں پر اتر آئی۔

”خدا کے لیے اسے معاف کر دو..... اس سے غلطی ہو گئی..... ہم تیرا سارا نقصان پورا کر دیں گے۔“ وہ چیخ رہی

تھی۔ گلی کے لوگ نکل کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا گلی کے درمیان میں لے آیا اور پھر اسے

ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند لمحوں ہی میں وہ دم ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ تب میں نے ہسل سیدھا کیا اور اس کے سر کا نشانہ لے

کرٹرائیگر دبانای چاہتا تھا کہ اس کی جوان بیٹی میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگی۔ اس نے نہایت آزرده لہجے میں روتے ہوئے کہا۔

”میرے باپ کو معاف کر دو.....“

میں نے ایک لمحہ اسے دیکھا، پھر ہل ہلاتے ہوئے کہا۔

”جانبی تیرے صدقے معاف کیا۔“

یہ کہہ کر میں پلٹا، اس کی بایک اٹھائی اور کسی کی طرف دیکھنے بغیر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ میرا رخ دلبر کے ڈیرے کی طرف تھا۔ جہاں مجھے جانی شوکر نے ملنا تھا۔ وہ میرا ناشتہ لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے ناشتہ کیا، شیدے چدھڑ کے بارے میں اسے بتایا تو وہ بولا۔

”تو اکیلا کب تک ان کیساتھ لڑتا رہے گا۔ چند بندے تیرے ساتھ ہونے چاہئیں۔“

”یار بندے اکٹھے کرنے کو تو میں ایک گھنٹے میں کر لوں، پتہ نہیں کون کون علاقے بھر میں میرے انتظار میں بیٹھا ہوگا، مگر میں ان میں سے کسی کا بھی نقصان نہیں چاہتا، اب میری اور شاہ زیب کی جنگ شروع ہو گئی ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے؟“

”نہیں جمالے! تو اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تجھے ساتھیوں کی ضرورت پڑے گی، میں بہت سارے ایسے شہ زوروں کو جانتا ہوں جو شاہ زیب کے مخالف ہیں انہیں ساتھ.....“

”جس طرح سانپ اور شیر کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا کہ وہ جنگل میں کب اور کہاں مل جائیں، اسی طرح میرے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں ہوں، لوگوں کی بھیڑ تو ہر وقت نشاندہی کرتی رہے گی۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جیسے تیری مرضی، پر ایک اکیلا اور دو گیارہ ہی ہوتے ہیں۔“ جانی شوکر نے دوبارہ مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ میں اسے اب کیا بتاتا کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، مجھے خود سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی، اتنے لوگوں کو کہاں رکھتا۔ میں نے یہی بات جب جانی شوکر کو سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

”واہ.....! جمالے! واہ! شاہ زیب نے تیرا ٹھکانہ چھین لیا تو اس کا چھین لے۔ حویلی پر قبضہ نہیں کر سکتا نہ کر کم از کم اس کا ڈیرہ تو تیرے قبضے میں ہو۔ پھر دیکھنا کتنے لوگ تیرے ساتھ آکر شامل ہوتے ہیں۔ ان جاگیرداروں، زمینداروں کے ظلم و ستم کے ستارے نہ جانے کتنے لوگ اپنے دل میں غصہ دبائے بیٹھے ہیں۔ ناراض مت ہونا، میں کوئی تیری محبت میں تیرا ساتھ نہیں دے رہا، بلکہ میرے دل میں ان بے غیرت جاگیرداروں کی نفرت تیری مدد پر مجب کر رہا ہے۔“

”چل پھر اٹھ آریا پارڈیرے پر قبضہ جماتے ہیں یا پھر ہم نہیں..... بول کیا کہتا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔

”چل..... پہلے گاؤں چلتے ہیں وہاں سے کچھ اسلحہ لے لیں، ممکن ہے میرے دو چار بندے بھی ساتھ ہو جائیں۔“ ہم دونوں ڈیرے پر سے اٹھے اور اپنی اپنی بایک پر گاؤں چلے گئے۔ سورج کی روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ میرے گاؤں میں داخل ہوتے ہی لوگ مجھے یوں دیکھنے لگے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ ہلکا ہر ہے انہیں شیدے چدھڑ کے بارے میں پتہ چل گیا ہوگا۔ میں نے کسی کی پروا نہیں کی اور نہ ہی کسی کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کی۔ جانی شوکر اپنے گھر سے دو گئیں اٹھا لیا تھا۔ میں نے ہل کے لیے کچھ فاضل راؤنڈ بھی منگوا لیے تھے۔ ہم صرف دو تھے اور ہمیں

معلوم نہیں تھا کہ ڈیرے پر کتنے لوگ ہوں گے۔ مجھے جانی شوکر کا حوصلہ دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ہی ڈیرے کی جانب چل نکلے۔

گاؤں سے نکل کر ہم پکی سڑک پر آ گئے۔ صبح کے وقت لوگ اپنے اپنے کام کی طرف جارہے تھے۔ ہم ان کی قریب سے تیزی کے ساتھ نکلتے ہوئے اس پکی سڑک پر آ گئے جہاں سے ڈیرے کی طرف جایا جاتا تھا۔ ہم تیزی سے ڈیرے کے قریب ہوتے چلے جارہے تھے، یہاں تک کہ ڈیرے سے دو تین ایکڑ کے فاصلے پر رک گئے۔ یہی میں نے جانی سے کہا۔

”میں ڈیرے کی پچھلی طرف سے اندر جاتا ہوں، پہلے چھت پر جاؤں گا، اور پھر اندر اتروں گا۔ تم تیار رہنا، جیسے ہی اندر سے گولی چلنے کی آواز آئے، تم دروازے کی طرف سے اندر آنا، جو بھی سامنے آئے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بنا گولی مار دینا، ورنہ وہ تجھے گولی مار دے گا۔“

”سمجھ گیا۔“ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے بایک وہیں کھڑی کی اور تیزی سے ڈیرے کے پچھواڑے چلا گیا، جہاں سے میں ایک بار پہلے بھی چھت پر گیا تھا۔ اس وقت تو اندھیرا تھا، اس لیے بہت محتاط تھا۔ لیکن اب دن کے وقت سب کچھ صاف تھا۔ میں تیزی سے چڑھتا چلا گیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے منڈھیر سے نیچے جھانکا، صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر کتنے لوگ ہوں گے۔ میں نے چھت پر سے گھوم کر نیچے اندازہ لگانے کی کوشش کی، برآمدے میں بھی مجھے کوئی بندہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں کوئی ہلچل نہ پا کر مجھے الجھن ہونے لگی۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا، جانی نے مجھے پکی خبر دی تھی کہ اندر پانچ سات بندے تو ہیں۔ جنہوں نے میرے گھر کو آگ لگائی تھی۔ میں کئی منٹ تک تذبذب کا شکار رہا، میں انتظار کروں یا نیچے جاؤں، یہ تو ہونہیں سکتا تھا کہ ڈیرہ خالی ہو۔ میں نے انتظار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تقریباً چندرہ منٹ گزر جانے کے بعد ایک بندہ برآمدے میں سے وارد ہوا اور وہ ٹپٹنے والے انداز میں باہر کی طرف جانے لگا، میں مزید صبر نہ کر سکا اور میں نے اس پر فائر داغ دیا۔ اس کی چیخ فضا میں بلند ہو گئی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس پر فائر کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے شانے کے قریب کا نشانہ لیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ مچھلی کی مانند تڑپتا ہوا زمین پر آ رہا۔ تقریباً دو منٹ کے اندر اندر چھ سات بندے برآمدے کی مختلف اطراف سے برآمد ہوئے، اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھتے میں نے ان پر فائر کھول دیا۔ سچی دروازے کی طرف سے جانی اندر داخل ہوا، اس نے اپنے سامنے ان بندوں کو باکر گن سے فائر کرنا شروع کر دیا۔ کس کے کہاں گولی لگتی ہے یہ قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ وہ تقریباً سارے ہی خون میں لت پت صحن میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی اندر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اب مزید کتنے بندے اندر ہیں۔ میں جانی کو نیچے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا، اس لیے آنا فانا سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے صحن میں آ گیا۔ پہلے وہ میرے فائر کی زد میں تھے اب کوئی بھی گولی کسی بھی کمرے سے میرے بدن کو چاٹ سکتی تھی لیکن یہ رسک لینا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا تو چاچا پیر وچن کے دروازے کے پیچھے چھپا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے جانی کو چھپنے کا اشارہ کر کے سیدھا چاچے پیرو کے پاس چلا گیا۔ صحن میں چیخ و پکار اور کراہیں اٹھ رہی تھیں۔

”ان کے علاوہ کتنے بندے ہیں اور کہاں ہیں؟“

”اس میں ہیں۔“ چاچے پیرو نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دائیں طرف کا ایک لمبا کمرہ تھا۔ میں نے اسے نگاہوں میں رکھتے ہوئے جانی کو اشارہ کیا وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس کے دروازے کے ساتھ جا لگا۔ صحن میں پڑے زخمی بندے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اپنی بقا کے لیے تو بلی بھی گلے پڑ جاتی ہے وہ تو پھر سمجھ بوجھ والے انسان تھے۔ میں

ان کے سر پر جا کھڑا ہوا اور زور سے پکار کر پوچھا۔

”تم میں نے کس کس نے میرے گھر کو آگ لگائی تھی.....؟“

ان میں سے کوئی نہیں بولا بلکہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں دہشت کے ساتھ ساتھ وحشت بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”ہمیں..... معاف..... معاف کر دے۔“ ان میں سے ایک تو منہ بندے نے کہا۔

”اس کی ایک ہی صورت ہے تم میں سے جو بھاگ کے یہاں سے جاسکتا ہے وہ چلا جائے جو نہ جاسکا اس کی قبر یہیں اس ڈیرے میں بنی ہوگی۔ میں دس تک گنوں گا..... ایک.....“

انہوں نے ناقابل یقین انداز سے میری طرف دیکھا پھر ان میں ہلچل آگئی۔ وہ کل سات لوگ تھے۔ ایک بے ہوش پڑا تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔

”دو.....“

ان میں تیزی آگئی۔ اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔ دو لوگوں نے بے ہوش بندے کو ڈنڈا ڈولی کیا اور باہر کی جانب چل پڑے۔

”چار..... پانچ..... چھ.....“

وہ ڈیوڑھی کے پاس پہنچ گئے۔

”آٹھ.....“

وہ دروازہ پار گئے۔ تب میں نے اس کمرے کی طرف توجہ کی، جدھر چاچے بیرون اشارہ دیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر ہی سے جھانک کر دیکھا، اندر کوئی ہلچل نہیں تھی۔ میں نے جانی کو باہر کا دھیان رکھنے کو کہا اور ایک دم سے اندر چلا گیا۔ اندر سے ذرا بھی مزاحمت نہیں ہوئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک کونے میں دو لڑکیاں اور ایک بوڑھا آدمی بندھے ہوئے پڑے تھے ان کی آنکھوں میں خوف تیر ہا تھا اور وہ سبھے ہوئے تھے۔ جلدی سے باہر آ گیا۔ میں نے جانی کو بتایا تو اس نے کہا

”تو ان سے پوچھ کہ یہ کون ہیں۔ میں دروازہ بند کر کے آتا ہوں۔“

”نہیں دروازہ بند نہیں کرنا، بلکہ چھت پر چلا جا، دور دور تک دشمن کے بارے میں پتہ چلے گا۔ اور جو بندے ابھی باہر گئے ہیں انہیں دیکھ کر کوئی گڑبڑ کریں تو گولی مار دینا، ابھی تو وہ صرف زخمی ہیں۔“

میری مزید بات سننے بغیر وہ سیڑھیوں کی جانب بھاگا، میں کمرے میں چلا گیا۔ اس بار میں نے ان ”قیدیوں“ کو دیکھا۔ ایک بوڑھا دیہاتی اور دونوں لڑکیاں بھی دیہاتی ہی تھیں۔ ایک لمبے قد کی، جس پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ گورا رنگ اور جسم کے نشیب و فراز سے کوئی بھی مرد متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسری چھوٹے قد کی اور مونے نقوش والی تھی اس کا جسم قدرے بھاری تھا، میں نے انہیں رسیوں سے آزاد کیا اور بوڑھے سے پوچھا۔

”بابا..... کون ہو تم..... اور یہاں کیسے؟“

”میں بتاتی ہوں۔“ اس لمبی لڑکی نے رندھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”رات ہی یہ لوگ ہمیں چک سندر سے اٹھا کر لائے ہیں۔“

”کیوں.....؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے، یہی بوڑھا باپ ہے، ہماری تھوڑی سی زمین ہے، اور شاہ زیب وہ زمین ہم سے لینا

چاہتا تھا۔ اب ہماری روزی روٹی وہی ہے تو کیا کریں، کب تک زمین کے پیسے کھائیں گے، ہم نے انکار کیا تو.....“ اس نے روتے ہوئے بتایا۔

”کوئی زیادتی تو نہیں کی..... میں نے پوچھا۔“

”ہمیں مارا بہت ہے، باقی دھمکیاں دیتے رہے ہیں کہ عزت لوٹ لیں گے..... مگر ابھی.....“ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”بابا..... تو یہاں بیٹھ اور تم لوگ آؤ میرے ساتھ، ایک ایک کمرے کی تلاشی لینی ہے۔“ میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

”پر پتر..... تو ہے کون.....؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”میں کوئی بھی ہوں، لیکن تیری عزت کا رکھوالا ہوں۔ اب کوئی تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ آج ہی تجھے تیرے گھر پہنچا دیا جائے گا۔“

”اللہ سلامت رکھے مجھے۔“ بوڑھے نے دعا دی تو میں باہر نکل آیا۔ میں نے تقریباً آدھے گھنٹے میں وہاں پر موجود ہر کمرہ دیکھ لیا، کوئی بندہ نہیں تھا، دو کمرے خاص اہمیت کے حامل تھے۔ ایک شاہ زیب کمرہ جس میں فون رکھا ہوا تھا، اور دوسرا اس کے ساتھ والا جہاں سے اسلحہ ملا تھا، پورا اطمینان کرنے کے بعد میں نے جانی کو بلالیا۔ وہ نیچے آیا تو ساری صورت حال اس کو سمجھ آگئی۔ اس نے لڑکی سے کہا۔

”تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر وہاں جاؤ اور کھانا وانا کھاؤ..... اب یہ ڈیرہ ہمارے قبضے میں ہے۔ تم اطمینان رکھو، شام سے پہلے تم چک سندر پہنچ جاؤ گے۔ جاؤ۔“ اس کے یوں کہنے پر وہ لڑکیاں تیزی سے واپس اسی کمرے میں چلی گئیں۔ میں شاہ زیب کے کمرے کی طرف گیا۔ ٹیلی فون چل رہا تھا۔ میں نے پیرزادہ وقاص جکے نمبر ملائے، کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ میں نے اسے ساری صورت حال بتائی، جسے سن کر وہ بولا۔

”واہ.....! اب تو شاہ زیب واپس نہیں آئے گا وہ تو بھاگتا پھر رہا ہے تاکہ پولیس تجھے گرفتار کر لے۔“

”تجھے کیسے پتہ؟“ میں نے پوچھا۔

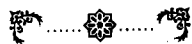
”وہ پوری کوشش کر کے ڈی ایس پی کا تبادلہ کروا رہا ہے۔ وہ اعلیٰ حکام کے سامنے بیٹھا رو رہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اب دیکھیں کیا بنتا ہے۔ خیر! میں بندے بھیجتا ہوں، آدھے پونے گھنٹے تک تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ سمجھو تیرے دوست ہیں، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ گاڑی بھی آ رہی ہے۔ اس پر ان لڑکیوں اور بابے کو بھیج دینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”اور ہاں..... اس ڈیرے میں آج دن تک یارات..... بس اس سے زیادہ نہیں رہنا، خطرناک ہو گا۔“ اس نے مجھے سمجھایا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے اسے باور کرایا۔

”پھر اپنا ٹھکانہ چودہری شاہ نواز کے ڈیرے پر.....“ اس نے مجھے بتا دیا کہ آئندہ کیا کرنا ہے، میں نے الوداعی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا۔ میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا، لیکن جیسے ہی مجھے شاہ زیب کا خیال آتا، میرے اندر نفرت اور غصے کی لہریں سرنگرانے لگتیں۔



جہاں رات کے پہلے پہر ہی جالندھر جا پہنچا تھا۔ اوگی پنڈ سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں انوجیت ہی کا خیال تھا کہ بعد میں پولیس انہیں تنگ کرے گی وہ تو پہلے ہی عتاب کا شکار ہیں۔ دوسرا اس کا دماغ پر ہر پریت کو رچھائی ہوئی تھی۔ وہ زخمی حالت میں گھر پر پڑی تھی۔ ایسے میں اگر پولیس والے انہیں تنگ کرتے تو اس گھرانے کے لیے بہت مشکل پیدا ہو جانے والی تھی۔ یہ سب ظلم اس کی وجہ سے ان پر ہونے والے تھے۔ اس کا دل نہیں کر رہا تھا کہ یوں بھاگ کر وہاں سے نکلے، لیکن کیشو مہرہ کا فون آ گیا تھا اس نے یہی زور دیا تھا کہ جس قدر وہ جلد ہی اوگی سے نکل سکتا ہے نکل آئے بعد میں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ وہ کیشو مہرہ کے اصرار پر اوگی سے نکل تو آیا تھا مگر اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا کہ مشکل وقت میں وہ انوجیت اور ہر پریت کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اوگی پنڈ سے چند کلومیٹر باہر آ جانے تک وہ یہی سوچتا رہا پھر ایک جگہ اس نے بریک لگا کر گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ وہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ جالندھر جائے یا نہیں۔ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ انوجیت کا فون آ گیا۔

”او جہاں!..... جالندھر پہنچے ہو یا نہیں؟“

”نہیں! راستے میں کھڑا ہوں! میرا دل نہیں کر رہا ہے جالندھر جانے کو میں واپس آنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہے پاگل!..... اوئے وہ کیوں؟“

”تو اور ہر پریت اکیلے ہو پھوپھو..... میں اتنے مشکل وقت میں تم لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جاؤں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”اونہیں اوئے جہاں! ایسے مت سوچ! یہ حالات تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم نے اس سے بھی مشکل اور سخت حالات دیکھے ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوتے تو اب تک زندہ ہی نہ ہوتے۔ ان کی جرات نہیں کہ ہماری طرف انگلی بھی اٹھا سکیں۔“ اس نے کافی سخت لہجے میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ ٹوکتے ہوئے بولا۔

”تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے اور یہ صرف چند دن کی بات ہے بات پولیس کی نہیں یہاں کے غنڈوں کی ہے میں نے اپنے لوگ بلوائے ہیں اس کی تم فکر مت کرو میری پوری کوشش ہے کہ معاملہ قانونی بن جائے پولیس والے پر بالکل شک و غیرہ کو چھوڑ رہے ہیں لیکن وہ حوالات سے باہر نہیں آ رہے ہیں کیونکہ انہیں غیر قانونی طور پر پکڑا ہے پولیس والوں کو گمان بھی نہیں تھا کہ تم بلجیت کے ساتھ ایسا کر دو گے۔ کچھ دیر بعد اوگی میں بہت سارے لوگ پہنچ رہے ہیں۔ کیشو مہرہ بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آ رہا ہے تم بس دو چار دن کے لیے اپنے آپ کو محفوظ کر لو۔“ انوجیت نے پوری تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر جیسا تم چاہو۔ میں رابطے میں رہوں گا۔“ انوجیت نے کہا چند منٹ باتوں کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ فون بند ہوا ہی تھا کہ کیشو مہرہ کا فون آ گیا۔

”میں جالندھر کو دروازہ پر ہوں! تم کہاں ہو؟“

”میں بھی اسی روڈ پر جالندھر آ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میری سرخ گاڑی ہے میرے ساتھ دو تین گاڑیاں اور بھی ہیں۔ راستے میں ملتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جہاں نے گاڑی بڑھادی۔ تقریباً دس منٹ سفر کے بعد اسے دور ہی سے سرخ گاڑی دکھائی دی۔ جہاں نے فون پر بتا دیا کہ میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اگلے ایک منٹ میں وہ دونوں سڑک پر رک چکے تھے۔ سرخ گاڑی

سے کیشو مہرہ باہر نکلا تو اس کے ساتھ سارے لوگ باہر آ گئے۔ جہاں بھی باہر آ گیا تو کیشو مہرہ نے کہا۔

”جہاں! تم اپنی چھوڑ کر اس سرخ گاڑی میں آ جاؤ اور اپنی گاڑی ہمیں دے دو یہاں سے دشمنوں کے لیے تمہارا سراغ ختم ہو جانا چاہیے۔ تم دو دن سکون کرو پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے بلجیت کے بارے میں اطلاعیں چند ہی گڑھ سے دہلی تک پہنچ گئی ہیں۔ بہت احتیاط کرنا۔“

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور اپنی گاڑی سے بسٹل کے علاوہ دوسری چیزیں نکال کر سرخ گاڑی کی جانب بڑھا۔ اس نے پنجر سیٹ والا دروازہ کھولا تو اس کی نگاہ ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھی ایک لڑکی پر پڑی وہ جیسے ہی بیٹھا لڑکی نے گاڑی بڑھادی۔ پھر تیزی سے یوٹرن لے کر واپس جالندھر کی جانب چل دی۔ جہاں نے بیک مرر میں دیکھا کیشو مہرہ کی گاڑیاں بھی چل پڑیں تھیں اور لمحہ بہ لمحہ ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا تھا۔ بھی درائیو تک کرتی ہوئی لڑکی نے کہا۔

”ہائے جہاں! نمريتا نام ہے میرا۔ نمريتا کور..... اب چونکہ دو چار دن ہم نے ساتھ ہی رہنا ہے اس لیے تعارف ابھی ہو جائے تو اچھا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ جہاں کی طرف بڑھا دیا۔ گلابی بھرا ہاتھ اس کے سامنے تھا۔ بھی اس نے نمريتا کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے غور سے دیکھا سفید گول چہرہ جس پر مونے نقوش تھے آنکھیں خاصی بڑی اور بال گھٹکھریا لے تھے۔ خاص طور پر اس کے گال بہت سرخ تھے۔ بھرے بھرے نرم بدن پر گلابی ٹی شرٹ اور نیلی جین تھی اس کی رانیں بہت موٹی اور بھاری تھیں۔ پاؤں میں سفید سینڈل جہاں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”کیسی لگی ہوں میں؟“

”کس حوالے سے؟“ جہاں نے شوخ سے انداز میں سوال کر دیا۔

”پہلی نگاہ میں دیکھنے کے حوالے سے باقی خوبیاں تو شاید بعد میں کھلیں گیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ہلکا سا ہنسنے لگا کر ہنس دی۔

”اچھی ہو! امید ہے کہ اچھی دوست بھی ثابت ہوگی۔“ جہاں نے کہا۔

”وہ تو ہوں۔ خیر.....! کیشو جی نے کہا ہے کہ آپ نے کم از کم چار دن تک باہر نہیں نکلنا اور اتنے دن گھر میں رہنے کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔ کیا پسند ہے آپ کو اس کا بندوبست کر دیا جائے گا۔“

”کچھ نہیں! بس تم ڈرائیو تک پر دھیان دو باقی باتیں بعد میں۔“ اس نے کہا اور سڑک پر دیکھنے لگا۔ نمريتا نے کا ندھے یوں اچکائے جیسے اس کی بات کو وہ نظر انداز کر چکی ہو۔ پھر گاڑی کی اسپڈ تیز کر دی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ جالندھر شہر میں داخل ہو گئے لیکن پریم کا لوٹی تک جاتے ہوئے انہیں آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ لگ گیا۔ یہ شہر کا وہ علاقہ تھا جہاں پرانے انداز کی رہائشی عمارتیں تھیں۔ تقسیم کے بعد یہی پوش علاقہ مانا جاتا تھا۔ اب آبادی کے بے تحاشہ بڑھنے کی وجہ سے وہ اندرون شہر میں آ گیا تھا۔ اس لیے اس علاقے میں کافی رش تھا۔ ایک بڑے سارے گھر کے وہ سامنے رکی پھر ہارن کے جواب میں چوکیدار نے گیٹ کھولا تو وہ اندر چلا گیا۔ رات کے سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری منزل پر ایک کشادہ بیڈروم میں اسے بٹھا کر نمريتا غائب ہو گئی تھی۔ کافی دیر بعد وہ آئی تو اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ نازک سی تھیکے نقوش والی اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ نمريتا اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”جو کھانے میں پسند ہے اسے بتا دو..... یہ بنا دے گی۔“

”جو مل جائے۔“ جہاں نے پرسکون لہجے میں کہا تو نمريتا نے اسے کہا۔

”جاؤ.....! جو تمہاری سمجھ میں آتا ہے بناؤ بازار سے منگوالو..... لیکن کھانا بہت اچھا ہونا چاہیے۔“

یہ سنتے ہی وہ لڑکی واپس چلی گئی تو نمريتا اسے یوں بیٹھا دیکھ کر بولی۔ ”جہاں! کیا سو گوار سے بیٹھے ہو۔“

جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھا کر جو چاہے کرنا۔ اوکے۔“

اس پر جہاں نے اسے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اٹھ کر واش روم کی طرف چلا گیا۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ جہاں کو سکون نہیں آ رہا تھا، نمریتا گپ شپ لگا کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ اس کا سارا دھیان اوگی کی طرف تھا۔ جہاں سے ابھی تک اسے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس نے خود اس لیے رابطہ نہیں کیا تھا کہ نجانے وہ کس طرح مصروف ہوں گے اور وہ انہیں ڈسٹرب کرے۔ یہی سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ ہر پریت سے بات کرے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سیل فون اٹھایا، ہریریت کے نمبر ڈائل کر دیے۔ دوسری تیل پر اس نے فون اٹھالیا۔

”کیسے ہو جہاں؟“

”میں ٹھیک ہوں..... تم سناؤ۔“

”میں بہت خوش ہوں۔ تم نے بلجیت کو جس بے رحمی سے مارا، اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی، وہ تھا ہی اس قابل، جالندھر ہی کے کسی ہسپتال میں ہے۔ امید نہیں ہے کہ وہ بچے گا۔“

”چلو اچھا ہے، لیکن میں چاہتا ہوں وہ زندہ رہے۔ مگر اپا بھوجوں والی زندگی گزارے“ سناؤ ابھی تک انوجیت نہیں آیا؟“

”گھر آ کر پھر گیا ہے، کسی جگہ کوئی بہت بڑی پنچائیت ہے، سنا ہے کہ اس میں رویندر سنگھ بھی آئے گا۔ یہ لوگ چاہ رہے ہیں کہ اسے سیاسی ایٹھ بنایا جائے، لیکن انوجیت لوگ چاہ رہے ہیں کہ یہ قانونی مسئلہ بنے۔ حویلی جلانے پر ہی یہ واقعہ پیش آیا، میرے خیال میں یہاں پنچائیت میں اس معاملے کو ٹھپ دیا جائے گا، اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

”معاملہ وقتی طور پر دبے یا نہیں، مجھے تم لوگوں کی فکر ہے۔ وہ کہیں قانونی ٹکجے میں.....“

”نہیں جہاں! تم ہماری فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔“ اس نے اپنے دل کی بات کہی۔

”کاش میں تمہارے پاس ہوتی۔“ اس نے بھی کہہ دیا۔ تو دونوں کافی دیر تک یونہی گپ شپ کرتے رہے، پھر جہاں نے فون بند کیا اور سو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو نمریتا اس کے ساتھ بیڈ پر پڑی سو رہی تھی۔ اس نے مہین سی ناکی پہنی ہوئی تھی، جس میں اس کا سارا بدن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو جہاں چکر گیا کہ یہ اس قدر بولڈ ہو کر میرے ساتھ کیوں پیش آ رہی ہے، کیا ایسا سب کچھ کرنے کے لیے اسے کہا گیا ہے یا یہ خود سے ہی ایسا کر رہی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ہاتھ روم میں گیا۔ اچھی طرح فریش ہونے کے بعد جب وہ واپس آیا تو نمریتا جاگ رہی تھی۔

”صبح بخیر جہاں!..... میرے خیال میں تمہاری رات بہت اچھی گزری ہے۔“

”ہاں!..... لیکن یہ تم کیا دکانداری چکائے ہوئے ہو۔ جاؤ، کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آؤ۔“ اس نے نمریتا کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ!..... یہ کہتے ہوئے وہ خود میں سمٹ گئی۔ حالانکہ ایسے سننے سے کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔“ وہ دراصل میں آئی تھی کہ تم سے اوگی کے بارے میں بات کروں، مگر تم سو رہے تھے۔“

”ہاں بولو..... کیا ہے اوگی کے بارے میں.....“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”رات گئے تک وہاں پنچائیت چلی ہے، جس میں بلجیت سنگھ کا باپ رویندر سنگھ اور پولیس کی اعلیٰ حکام بھی تھے۔“

ظاہر ہے کہ شیو مہرہ کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے، انوجیت کے بھی لوگ تھے۔“

”بنا کیا، وہ بتاؤ۔“ نے تنگ آ کر کہا۔

”کسی فیصلے کے بغیر وہ پنچائیت ختم ہو گئی لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ بلجیت سنگھ کی شرارت کے باعث یہ حادثہ ہوا۔ اس کے بارے میں دلبر سنگھ نے گواہی دی تھی۔ پولیس نے یہ کیس رجسٹرڈ کر لیا ہے۔ چونکہ انچارج معطل ہو گیا ہے۔ اب کیس عدالت میں چلے گا، لیکن تمہاری گرفتاری کے بعد.....“ نمریتا نے کہا تو وہ بولا۔

”اوہ..... خیر کوئی بات نہیں، وہ تو میری ضمانت ہو جائے گی۔“

”ہاں! اس کے لیے آج کوشش کی جائے گی، نکودر میں، لیکن اگر بلجیت نہ رہا تو صورت حال تبدیل ہو جائے گی، اس کے بارے میں اطلاع یہ ہے کہ وہ پتہ دکھائی نہیں دیتا۔“

”چلو جو بھی ہو گا وہ دیکھا جائے گا، تم جاؤ اور ناشتہ بھجواؤ، میں مزید تفصیل معلوم کرتا ہوں۔ نمریتا اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ کچھ دیر اس موجودہ صورتحال کے بارے میں سوچتا رہا کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ۔ جہاں نے اس وقت انوجیت کو فون کیا۔ وہاں سے بھی یہی معلومات ملیں جو نمریتا سے دے چکی تھی۔ وہ کچھ دیر گپ شپ کے بعد رابطہ منقطع کر چکے تو ناشتے کے لیے بلاوا آ گیا۔

اس وقت نمریتا اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ مقامی کالج میں پڑھنے کے بعد اب آزاد ہے، وہ اپنے چاچا کے ساتھ رہتی تھی، ساکورا سی ہی میں اس کے والدین بھی مارے گئے۔ وہ اس لیے بچ گئی کہ وہ ان دنوں گاؤں میں اپنے چاچا کے پاس ہی تھی۔ اس کے دو بھائی بھی اس ظلم کی نذر ہو گئے۔ بچپن ہی سے یہ غصہ اس کے اندر تھا، اس نے باقاعدہ تعلیم کی ساتھ فریڈیم مومنٹ کو جوائن کیا اور اس کے لیے کام کرتی رہی، پھر ایک بار پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ مگر کوئی جرم ثابت نہ ہوا۔ تب سے وہ پوری طرح اپنی تنظیم کے ساتھ چل رہی ہے۔ بظاہر وہ ایک کمپنی میں جاب کر رہی تھی۔ وہ باتوں میں مصروف تھے کہ شیو مہرہ کا فون آ گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”جسمیند رتم سے نیٹ پر رابطہ چاہتا ہے، یہ نمریتا سے کہو، تمہیں لیپ ٹاپ دے۔“

”اوکے!..... میں کہتا ہوں۔“

”پھر جو بھی صورتحال ہو مجھے بتانا، میں جالندھر ہی میں ہوں اور تمہاری ضمانت کی کوشش نکودر میں ہو رہی ہے ورنہ پھر یہاں.....“

”اوکے!.....“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے نمریتا سے لیپ ٹاپ لانے کو کہا تو وہ اٹھ گئی۔ میرے دل میں اچانک تجسس بیدار ہو گیا۔ کیونکہ جسمیند ر نے جو مجھ سے براہ راست بات کرنا چاہی تھی، لازمی طور پر وہ بہت اہم تھی۔ ورنہ جہاں وہ کیشیو کو یہ پیغام دے سکتا تھا وہاں دوسرا کوئی پیغام بھی دے سکتا تھا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی تھی، اور یہ بے چینی اس وقت عروج پر تھی جب وہ لیپ ٹاپ لے کر آئی، اس نے نیٹ ساکٹ میں پلنگ لگا دیا۔

”نمریتا!..... تم ایسا کرو، اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“

میرے یوں کہنے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ وہ سمجھ گئی۔ اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد میں آن لائن تھا اور خوش ہو گیا جب جسمیند ر کو بھی آن لائن دیکھا۔ اس سے باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ رویندر سنگھ کا ایک بیٹا چند گڑھ میں ہے اور بزنس کرتا ہے۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ یہ جواب دیتے ہی میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔

”وہ سیکرٹولہ میں رہتا ہے، لیکن اس کا آفس وہاں سے دور مال روڈ پر ہے۔“

پارہی تھی اچانک ہی میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔

تقریباً چند لمحوں تک نمربتا سے بولا ہی نہیں گیا۔ پھر جب بولی تو آکھڑے ہوئے سانسوں میں آدھے ادھورے لفظوں میں کہا۔

”جس..... پال..... جلدی نکلو..... بھاری تعداد میں پولیس نیچے آ چکی ہے۔“
”ہم نکلیں گے کہاں سے؟“ جہاں سوچتے ہوئے اس سے پوچھا تو نمربتا نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوپر..... اوپر، چھت پر سے..... آؤ۔“

یہ کہہ کر وہ بھاگتے ہوئے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ جہاں اس کے پیچھے بھاگا وہ آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آ گئے۔ وہ ساری چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھیں۔ انہوں نے نیچے جھانکنے کی زحمت نہیں کی بلکہ عقب میں جو چھت تھی اس پر کود گئے۔ ایک کے بعد اگلی اور پھر اس سے اگلی چھت پر کودتے ہوئے وہ اپنی عمارت سے کافی دور نکل آئے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان کے لئے یہ تھا کہ وہ یہاں سے سڑک تک کیسے جائیں۔ تبھی جہاں نے ایک لمحے کو سوچا، پھر ادھر ادھر تاکا۔ وہ جس چھت پر تھے اس کی سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں، تبھی جہاں نے کہا۔
”ہمیں اس طرح چھتیں کودتے ہوئے پولیس دیکھ سکتی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے نیچے اترتی سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، گرو کا نام لیں اور.....“ باقی فقرہ نمربتا نے اشارے سے مکمل کر دیا۔

”نکل“ جہاں نے کہا تو وہ دونوں سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ دوسری منزل پر کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اگلی سیڑھیاں بھی اتر گئے جو صحن میں کھلیں۔ وہاں سامنے ہی تخت پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی اس کے قریب ایک جوان سی عورت کے پاس چھوٹا بچہ کھیل رہا تھا۔ ان دونوں کو اچانک یوں اپنے سامنے دیکھ کر جوان عورت کی چیخ نکل گئی۔ جہاں نے وہاں کھڑے ہو کر بحث کرنا فصول سمجھا۔ انہیں سمجھا نا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا جبکہ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ جہاں نے نمربتا کا بازو پکڑا اور باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔ وہ عورت گھکھکانے والے انداز میں چور چور کا شور مچانے لگی تھی۔ ڈیوڑھی میں جہاں نے نمربتا کو سمجھایا۔

”ہم دونوں یہاں سے نکلتے ہی مخالف سمت میں ہو جائیں گے۔ بالکل نارمل انداز میں۔“

”اوکے.....!“ اس نے کہا پھر چند لمحے بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر دروازہ پار کر گئے۔ ان کے سامنے ایک کھلا بازار تھا، جو کافی بڑا تھا اور اس پر خاصی ٹریفک رواں دواں تھی۔ وہی بازار کا مخصوص شور تھا۔ اس کی قریب سے سائیکل رکشہ اور موٹر رکشہ والے گزر رہے تھے مگر وہ تیزی سے سڑک کر اس کر گیا۔ وہ سکون سے چلتے ہوئے اگلا موڑ مڑ گیا۔ وہاں سے بھی اس نے سڑک پار کی اور ایک جگہ کھڑے رکشوں میں سے ایک رکشہ منتخب کر کے اس کے پاس گیا۔
”ریلوے اسٹیشن چلو گے؟“

”جائیں گا بھائی۔“ اس نے کہا تو جہاں سوار ہوتے ہوئے بولا۔

”چل پھر.....! جانا ذرا جلدی بندہ کہیں گاڑی ہی نہ چڑھ جائے اسے واپس لانا ہے۔“

”تیز چلنے کے ایکسپریس ہوں گے ابھی پہنچا دیتا ہوں۔“

”اب چلو بھی..... جتنی جلدی پہنچاؤ گے اتنا خوش کر دوں گا۔“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ چل پڑا۔ جالندھر کی چند

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“

”میں تمہیں معلومات دے رہا ہوں۔ اسے ذہن نشین کرنے کے بعد صاف کر دینا کمپیوٹر سے تم وہاں جاؤ اور اس کا پتہ صاف کر دو۔“

”واؤ.....!“ میں نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”اس بار تمہیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ جالندھر اور اس کے گرد و نواح میں تمہاری تلاش بہت شدت سے شروع ہو گئی ہے۔ صرف پولیس والے ہی تلاش نہیں کر رہے بلکہ خفیہ والے بھی ہیں۔ یہاں معاملہ کیٹیو مہرہ سے اوپر کا ہو گیا ہے۔ وہ نہیں سنبھال پائے گا۔ میں اس لیے بھی تمہیں جالندھر سے نکال رہا ہوں کہ وہ جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے تم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس لیے بات مکمل ہوتے ہی چند ہی گڑھ کے لیے نکل جاؤ، تم کدھر جا رہے ہو اس بارے میں نمربتا کو بھی معلوم نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“

”میں تمہیں ایک تصویر بھیج رہا ہوں یہ لڑکی تمہارے ساتھ ہوگی۔ یہ لڑکی تمہیں جالندھر اسٹیشن پر ملے گی یا پھر چند ہی گڑھ اسٹیشن پر اس کا نمبر بھی میں بھیج رہا ہوں میں پھر تمہیں کہہ رہا ہوں کہ بہت محتاط رہنا۔ ”معصوم سانپ“ کے ذاتی دوست تمہاری تلاش میں لگ چکے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ وہ ڈیوٹی پر ہیں یا اپنے دوست کا انتقام لینے کے لئے بغیر ڈیوٹی کے ہیں۔ جالندھر سے نکلنا اب تمہاری اپنی صلاحیت پر ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے تم یہاں دھوکا کھا جاؤ میرے بندوں کے چکر میں کہیں تم رویندر سنگھ کے بندوں کے ہاتھ ٹریپ نہ ہو جاؤ کسی پر اعتماد کیے بغیر ابھی نکل جاؤ۔“
تصویر تو بھیجی۔“

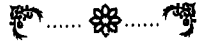
کچھ ہی دیر بعد تصویر آ گئی۔ وہ خوابیدہ آنکھوں والی لڑکی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ابھی سو کر اٹھی ہو۔ سفید گلابی اور پیلے پھولوں والی قمیض پہنے کھلے گیسوؤں کے ساتھ اس کے چہرے کی معصومیت دیدنی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی سنڈ کیٹ، ریکٹ یا خفیہ تنظیم کے ساتھ کام کرتی ہوگی اس کا چہرہ دیکھ کر تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ معصوم سی اسکول ٹیچر ہو جو سوئی چھینے پر بھی واویلا مچا دے۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ جسے ایک بار دیکھا جائے تو وہ تادیر ذہن نشین رہے۔ اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر مجھے تازگی کا احساس ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو میں بھول گیا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں اور کن الجھنوں میں گھرا ہوا ہوں۔

”اوکے گڈ لک جہاں.....! چند ہی گڑھ پہنچو۔ وہاں باتیں ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی نکلتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا تو وہ آف لائن ہو گیا۔ اس نے جو مجھے ضروری معلومات بھیجی تھیں انہیں دیکھتے ہوئے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جسمیہ رنے یہ بڑے اہم وقت پر میری توجہ اس طرف دلائی تھی۔ وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بلجیت سنگھ کا معاملہ حل ہوئے بغیر میں کوئی اور کارروائی کا سوچ سکوں گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پہلی بار جسمیہ رنے مجھے اس قدر محتاط رہنے کا کہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے دی گئی تمام معلومات ختم کر دیں میں نے چند ہی گڑھ نہیں دیکھا تھا، اور نہ ہی اس بارے میں اتنی معلومات تھیں۔ سنا تھا کہ وہ جدید شہر ہے، جسمیہ ر کی دی ہوئی معلومات میرے ذہن نشین ہو گئی تھیں۔ اس سے پہلے مجھے بھارتی ریلوے کا تجربہ نہیں تھا۔ اک نیا جہان میرے سامنے وا ہونے کو تھا۔ اس لیے میں اپنے بدن میں سنسنی محسوس کر رہا تھا، مجھے اب نمربتا کی نگاہیں بچا کر نکلتا تھا۔ فی الحال تو وہ چائے لینے گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے کیسے نکلوں انہی لمحات میں جبکہ میں وہاں سے نکلنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ نمربتا حواس باختہ سی کمرے میں داخل ہوئی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھولے ہوئے سانس کی وجہ سے کہہ نہیں

”کچھ کھاؤ پیو گے جہاں؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو منالی اسی سامان کی طرف اٹھ گئی ٹرین چل پڑی تھی۔



دوپہر ہو چکی تھی۔ پیر زادہ وقاص کی طرف سے کافی سے زیادہ بندے آ گئے تھے۔ ان میں سے چند واپس چلے گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اس بوڑھے اور دونوں لڑکیوں کو بھی لے گئے تھے۔ میں نے وہاں ڈیرے کے فون سے شاہ زیب سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے وہ فون ہی نہیں اٹھایا جو ڈیرے کے نمبروں سے آ رہا تھا۔ اس سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ شاہ زیب کو ڈیرے پر قبضے کے بارے میں علم ہو چکا ہے۔ وہیں ڈیرے پر کافی مال ڈنگر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ سارے کھول دیئے اس کا مطلب تھا کہ وہ جس کے بھی ہاتھ لگتے، چار دن ان کا فائدہ ضرور لیتے، اگر واپس کا مطالبہ نہ کیا گیا تو وہ مویشی انہی کے ہو جانے تھے۔ میں نے چاہے بیرو سے بکرے ذبح کرنے کو کہا تھا، اس لیے دوپہر کے وقت اچھا خاصا کھانا سب لوگوں کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم سبھی نے ایک ہال میں کھانا کھایا، پھر میں جانی شوکر اور طلحہ مانڈی، شاہ زیب والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے، باقی سب اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھ گئے، تبھی جانی شوکر نے کہا۔

”جمالے.....! ایک بات کہوں، لیکن اس کا جواب تم بہت سوچ سمجھ کر دینا۔“

”ہاں بولو۔!“ میں نے اس کے لہجے پر چونکتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں سرداروں کا یہ ڈیرہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے، تمہارا کیا خیال ہے، اس میں شاہ زیب کی بے عزتی نہیں ہے کہ ہم اس کے ڈیرے پر قبضہ کر کے بیٹھے ہیں۔“

”بالکل! بڑی عزتی ہے، علاقے میں تو شور مچ گیا ہوا ہے کہ جمالے نے سرداروں کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ آج اس نے ڈیرے پر قبضہ کر لیا ہے، کل وہ حویلی پر قبضہ کر لے گا۔“ طلحہ مانڈی نے دیدے پھیرتے ہوئے کہا تو میں نے جانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

”شاہ زیب چاہے سامنے نہ آئے، لیکن وہ اپنے بندوں کی مدد سے اور پولیس کی مدد سے ڈیرے پر سے قبضہ ضرور واپس لے گا۔ آج نہیں کل، ہم زیادہ دیر تک اس پر قبضہ نہیں جھاسکتے۔ اور پھر وہ بندے جو یہاں سے بھاگ کر گئے ہیں ان میں پتہ نہیں کون زندہ ہے، کون مر گیا ہے، وہ بھی اپنے ہی گلے پڑیں گے۔ میرے خیال میں ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل سکیں، نکل جائیں، کہیں ہم بھی اس چوہے دان میں نہ پھنس جائیں۔“

”بات تو تیری ٹھیک ہے، ہم نکل جاتے ہیں لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد جائیں گے کہاں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”بہترے ڈیرے ہیں ابھی شام ہونے میں آدھا دن پڑا ہے۔ سرداروں کی گاڑیاں ہیں، ان پر انہی کا اسلحہ لادتے ہیں اور کہیں بھی ٹھکانہ بناتے ہیں۔“

”چل ٹھیک ہے۔ پھر تھوڑی دیر کیوں ابھی نکلتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پیر زادہ وقاص کو فون کر کے موجودہ صورت حال کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

”شام تک اس علاقے میں رہو، میرا مطلب ہے گاؤں اور اس کے ارد گرد شام پڑتے ہی چوہدری شاہنواز کے ڈیرے پر یا سیدھے میرے پاس میرا شاہ آ جانا، میں یہ تھوڑا سا وقت وہاں گزارنے کے لیے کیوں کہہ رہا ہوں؟ اس کی وجہ ہے پورے علاقے میں تیری دھاک بیٹھ گئی ہے، کہ جمال سرداروں کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔ اور سمجھو کہ آج کے دن سے تم دہشت کی علامت بن گئے ہو۔ شاہ زیب کو احساس ہونا چاہیے کہ تم اسی علاقے میں ہو۔ اس پر خوف طاری رہے اور اپنے

سڑکوں کو چھوڑ کر باقی ساری ایسی ہیں جن پر اگر رکشے میں سفر کیا جائے تو سارے جوڑ مل جائیں۔ رکشے والا تیزی سے رکشہ چلائے جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کن راستوں سے کدھر جا رہا ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سوچنا چاہ رہا تھا کہ پولیس اس تک کیسے پہنچی، مگر دماغ اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس نے اس سوچ کو ایک طرف رکھا اور سامنے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب رکشہ رکا تو اسے سامنے جالندھر اسٹیشن کی عمارت دکھائی دینے لگی۔ وہی انگریز دور کی طرز تعمیر تھی جس پر ہندی اور پنجابی کے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے۔ جہاں نے رکشے سے اتر کر بڑا نوٹ جیب سے نکالا اور پھر اسے دیتا ہوا بولا۔

”لو جی، باقی پیسے دے دو۔“

وہ چاہتا تو سارے ہی پیسے اسے دے کر جاسکتا تھا لیکن وہ کسی کو بھی شک نہیں ہونے دے رہا تھا کہ اسے کوئی کسی حوالے سے یاد بھی رکھے۔ باقی پیسے لے کر اس نے بغیر گنے جیب میں ڈال لیے اور پھر عمارت کی جانب چل پڑا۔ عمارت کے اندر جا کر اسے احساس ہوا کہ ٹکٹ لینے والی جگہ تو اسے دکھائی دے گئی ہے لیکن اسے ابھی چند ہی گڑھ کی گاڑی مل بھی جائے گی یا انتظار کرنا پڑے گا؟ یہ معلومات اسے کہاں سے لینا تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تا کہ کسی سے پوچھ سکے، تبھی اسے ایک قلی دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔

”میں منالی ہوں جہاں.....! تمہاری دوست..... رکو میں آ رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جہاں نے فون بند کر کے ادھر ادھر دیکھا، سامنے ہی سفید شلوار قمیص اور بڑے سارے آنچل کے ساتھ کھلے بال اور اس پر مرکوز آنکھوں کی ساتھ وہ خوابیدہ دکھائی دینے والی لڑکی چلتی چلی آ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے سادہ سا لباس پہن رکھا تھا مگر وہ اس میں خوب بچ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی، پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی پھر چند لمحوں بعد اس سے الگ ہو کر بولی۔

”تم پریشان ہوں گے کہ پولیس تم تک کیسے پہنچ گئی۔ اس کی وجہ تمہارا یہ سیل فون ہے۔ وہ اب بھی کچھ دیر بعد تم تک پہنچ سکتی ہے لہذا اسے مجھے دو۔“

جہاں اس کے معصوم چہرے سے نگاہیں ہٹا ہی نہیں پار رہا تھا، اس نے اپنا سیل فون یوں اس کی جانب بڑھا دیا جیسے کوئی معمول اپنے عامل کا حکم مانتا ہے۔ اگلے ہی لمحے ایک نوجوان ان کے قریب آیا تو منالی نے وہ فون اسے دے دیا۔ پھر بڑی ادا سے بولی۔

”اب وہ تمہیں جالندھر ہی میں تلاش کرتے رہیں گے، کیونکہ تمہارا فون ادھر ہی رہے گا۔ رابطہ ختم، چند ہی گڑھ سے نئے رابطے ہوں گے۔“

”ٹرین جائے گی کب.....؟“ جہاں نے رعب حسن سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔

”ابھی کچھ دیر میں..... آؤ.....“ اس نے جہاں کا ہاتھ پکڑا تو اسے لگا جیسے کسی نے ریشم کے گالے نے اُسے چھوا ہے، وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ سامنے پلیٹ فارم پر لوگ گاڑی کی آ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرین پلیٹ فارم پر آن رکی۔ وہ ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ وہ اے سی کمپارٹ تھا۔ اس نے جہاں کو سامنے بیٹھنے کو کہا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد ٹرین نے وسل دی تو جہاں کو احساس ہوا تبھی اس نے پوچھا۔

”کیا ہم دونوں ہی ہیں.....؟“

”کچھ لوگ ہیں ہمارے ساتھ..... فکر نہیں کرو، پرسکون ہو جاؤ۔“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ دونو جوان ان کے پاں آئے، ان کے پاس کچھ سامان تھا۔ وہ انہوں نے رکھا اور واپس پلٹ گئے۔

بچاؤ کے لیے بھاگتا پھرے۔“

”میں ساری بات سمجھتا ہوں پیرزادہ ٹھیک ہے۔ اب اسے صرف میرے اشارے پر ناچنا ہوگا“ میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ نجانے کیوں مجھے اس کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔ ایک احساس ہوا کہ جیسے وہ اب مجھے صرف اور صرف اپنا مہرہ خیال کر رہا ہے اور مجھے اپنے طور پر چلانے کی کوشش کر رہا ہے اتنی بات تو میں سمجھتا تھا کہ پورے علاقے میں یہ خبر تو جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی ہوگی میں یہی سوچنے لگا۔

”کیا سوچنے لگے ہو؟“ جانی شوکر نے پوچھا تو میں اپنے خیالات سے باہر آ گیا۔

”کچھ نہیں، چلو اٹھو نکلو.....“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم سب ڈیرے کے صحن میں آ گئے۔ سارا اسلحہ نکال کر ایک فورڈیل گاڑی میں رکھ دیا۔ سبھی لوگ باہر آ گئے۔ میں نے چند بینڈ گرینڈ اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ چاچا پیرویہ سب دیکھ رہا تھا۔ تبھی میں نے اس سے کہا۔

”چاچا..... باہر آ جا۔“

وہ چپ چاپ باہر آ گیا اور پھر اس کے راستے پر چل دیا جو کچی سڑک پر جاتا تھا۔ جو حلی کے سامنے سے ہو کر قصبے کو جاتی تھی۔ جس کے دوسری طرف ہمارا گاؤں نورنگر تھا۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ مختلف کمروں میں بینڈ گرینڈ پھینکنا شروع کر دیئے۔ اس وقت میں ڈیوڈھی میں تھا جب پہلا گرینڈ پھنسا۔ میں بھاگ کر جیب میں سوار ہوا تھا۔ باقی لوگ دور نکل گئے تھے۔ میرے بیٹھے ہی جیب چل دی۔ تبھی یکے بعد دیگرے وہاں دھماکے ہونے لگے۔ سڑک پر جا کر میں نے ایک نگاہ ڈیرے پر ڈالی تو وہ کھنڈر بن چکا تھا اور کئی کمروں سے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان دھماکوں کی آواز گاؤں میں ضرور سنی گئی ہوگی، ہم سڑک پر رُکے تو میں نے طلحہ مانڈی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

”اب تم جاؤ واپس.....“

”کیا اب ہماری ضرورت نہیں رہی؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میرے خیال میں نہیں..... پیرزادہ کو میرا شکریہ کہنا اور بتانا کہ جلد ہی میں اسے ملنے کے لیے آؤں گا۔ آج رات کے بعد کسی وقت.....“ میں نے اس سے کہا۔

”جیسے تیری مرضی جمالے..... مگر ابھی خطرہ مٹا تو نہیں ہے۔“ طلحہ مانڈی بولا۔

”اب میرے لیے ہر وقت خطرہ ہی خطرہ ہے۔ کب تک سہارے تلاش کروں گا۔“ میں نے کہا تو اس نے چند لمحوں میری طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر اپنے لوگوں کے پاس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سڑک کی مخالف سمت چل دیا۔ جانی شوکر اپنی بانیک پر تھا وہ آگے چل پڑا۔ میں جیب لے کر اس کے پیچھے چلا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سڑک پر چلتے ہوئے وہاں آ گئے جہاں حویلی کو راستہ مڑتا تھا۔ وہاں گیٹ پر خاصی پلچل تھی، گردہ لوگ خاصے درخت تھے۔ ظاہر ہے ان میں شاہ زیب نہیں تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ اب گاؤں کی طرف تھا جانی شوکر پہلے ہی گاؤں میں مڑ چکا تھا۔

میں نے جاتے ہی چھا کے گھر کے آگے گاڑی روکی۔ وہ واپس آ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”یہ جیب تو سرداروں کی ہے۔ یہ دھماکے تو نے ہی کیے ہیں نا۔“ اس نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں.....! ان کا ڈیرہ جلا دیا میں نے۔“

”اب حویلی.....؟“ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

”دیکھتے ہیں، تو مجھے اماں اور سوتلی کے بارے میں بتا۔“

”یہاں سے چل۔ دلبر کے ڈیرے پر۔“

”پیچھے دیکھو۔ اسے بھی سنبھالنا ہے۔“ میں نے اس کی توجہ اسلحہ کی طرف دلائی تو وہ دیکھ کر بولا۔

”اس کو سنبھال لیتے ہیں تو ادھر چل۔“

میں نے جیب ادھر بڑھا دی تب وہ مجھے بتانے لگا۔

”ہم رات کے آخری پہر لاہور پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی اس کونھی میں نہیں گئی جہاں پہلے رہتی تھی بلکہ ماڈل ٹاؤن میں چلی گئی ہے۔ جہاں پہلے ہی کوئی ماضی کی فلمی اداکارہ رہتی ہے۔ اس نے مجھے وہاں کا سارا پتہ ٹھکانہ سمجھایا ہے، اپنا نمبر دیا ہے جس سے اب رابطہ ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں وہ وہاں محفوظ ہے۔“

”تو کہتا ہے تو میں یقین کر لیتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ ہم اس خوشگوار موڈ میں دلبر کے کنویں پر جا پہنچے۔ جہاں معمول کے مطابق کافی سارے لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ نعرے مار کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے تاش ایک طرف پھینک دی تھی۔ وہ خوشی کا اظہار اس لیے کر رہے تھے کہ میں نے شاہ زیب کو دن میں تارے دکھادیئے اور اسے ناچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ میرا گھر تو جلا بیٹھا اب بزدلوں کی طرح اپنا علاقہ اور حویلی چھوڑ کر بھاگا ہوا ہے۔

فتح ہمیشہ وقتی ہوتی ہے، اس کا دورانیہ چاہے جتنا طویل ہو، کیونکہ اس میں ہمیشہ شکست کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ تاہم جدوجہد میں نہ صرف لذت ہے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی مقصد شامل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی جستجو میں انسان کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ یوں فتح اور کامیابی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس وقت وہ لوگ میری فتح اور جرات مندی کی باتیں کر رہے تھے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب فضول ہے۔ میرا مقصد سردار شاہ دین کو ختم کرنا تھا۔ وہ کر دیا لیکن اس کے بعد میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، یہ مجھے کسی اور ہی راستے پر لیے جا رہا تھا۔ کچھ دن بعد تک جب میں پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا تو مجھے اشتہاری قرار دے دیا جائے گا اور پھر اپنی آخری سانس تک میں خود کو بچاتے گزار دوں گا۔ اشتہاری کی موت کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈیرے جاگیر دار اور یہ سردار یہی تو کرتے ہیں جو بندہ بھی علاقے میں سراٹھاتا ہے اسے اپنی چھتر چھاؤں میں لے کر اشتہاری بنا دیتے ہیں۔ یہ کوئی مثبت رویہ نہیں، لیکن اس خفیہ رویے سے ان کی حاکمیت قائم رہتی ہے۔ اب میں بھی اپنی جان بچانے اور شاہ زیب کو مارنے کی فکر میں تھا، پھر اس کے بعد ایک طویل جنگ تھی جو کسی نہ کسی کے ساتھ لڑتے رہنا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ چھا کے نے پوچھا۔

”یہی کہ اب شاہ زیب تک کیسے پہنچا جائے؟“

”اس کا پتہ بھی چل جائے گا۔ فی الحال اپنا کوئی ٹھکانہ تو بنائیں۔“ میں نے کہا۔

”چند دن تو یونہی گزارنا پڑیں گے۔ جتنے دن تک دوبارہ گھر نہیں بن جاتا اتنے دن تو شاہ زیب کو تلاش کرنے میں بھی لگ جائیں گے۔“ چھا کے نے مجھے سمجھایا تو میں نے کہا۔

”اچھا یار! کوئی بندہ بھیدے کے گھر جائے، میں اپنے پرانے کپڑے اسے دیتا رہا ہوں۔ کوئی جائے اور کوئی صاف جوڑا تو لے آئے۔“

میرے کہتے ہی ایک نوجوان سال کا اٹھا اور بانیک پر سوار ہو کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد وہاں خیال آرائی ہونے لگی کہ شاہ زیب کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سب کا یہی خیال تھا کہ جب تک شاہ زیب والا معاملہ حل

نہیں ہو جاتا، کہیں مستقل ٹھکانہ نہ رکھا جائے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے کسی کوٹھکانے کے بارے میں علم ہی نہ ہو اور پھر اتنی بھیڑ بھی اپنے ساتھ نہ رکھے، وہ سب پورے خلوص سے مشورہ دے رہے تھے اور میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں نے یہی سوچا کہ میں رات کے وقت اپنے نورنگر کے علاقے میں رہوں گا اور دن کے وقت کسی جگہ چھپ کے وقت گزاروں گا۔ مجھے صرف شاہ زیب کو ختم کرنا تھا۔ تب تک میرا نورنگر میں کوئی کام نہیں تھا۔ سو میں نہادھو کر قصبے کی طرف نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا تا کہ وہ رات سہیل کے پاس گزاروں۔

میں نے وہیں ڈیرے پر نہا کر کپڑے بدلے اور تروتازہ ہو گیا۔ اس وقت میں وہاں سے اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ دور سے مجھے ایک موٹر سائیکل والا نو جوان آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے ہمارے گاؤں کا ایک بزرگ تھا جنہیں ہم نے پنچائیت کا رکن بنایا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے ہمارے قریب آتے چلے جا رہے تھے۔ میرے سمیت وہاں پر موجود ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ یہ یہاں کیوں آرہے ہیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ڈیرے پر موٹر سائیکل روکی اور وہ بزرگ ہمارے درمیان آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا تو سبھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

”دیکھ پتر جمال! ہم جانتے ہیں کہ شاہ زیب نے خواہ مخواہ تم سے دشمنی بنائی ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں تمہارا نقصان ہوا اور تم دن بدن جرم کی راہ پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے بعد ہوگا، کیا تم اشتہاری بن جاؤ گے اور تم موت کے خوف سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔“

”لیکن اب میں کروں بھی کیا؟ میں اپنے آپ کو کبھی نہ بچاؤں، میری ماں کدھر ہے؟ اس کا جواب ہے آپ اٹھ کے پاس؟ اب میرے یا شاہ زیب کے درمیان دشمنی چل پڑی۔ بھہم میں سے کوئی ایک ختم ہوگا تو اس کا انجام ہوگا ورنہ نہیں۔“

”اس کی درمیانی راہ بھی نکل سکتی ہے۔ یہ دشمنی کسی کے ختم ہوئے بغیر بھی ختم ہو سکتی ہے۔“ بزرگ نے پورے خلوص سے کہا۔

”کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”بیٹا مجھے غلط مت سمجھنا، میں تمہیں ایک مشورہ دینے جا رہا ہوں، اس پر خوب سوچ لینا، پھر بات کرنا، میں نہیں کہتا کہ تم شاہ زیب سے معافی مانگ لو، بلکہ شاہ زیب نے اپنے باپ کے قتل کا الزام اگر تم پر لگایا ہے تو اس کا سامنا کرو، تم نے اگر یہ گناہ نہیں کیا تو پھر نہیں کیا، یہ ثابت کر دو۔“

”بابا!..... آپ پرانی باتیں کر رہے ہیں، میں جس رات حوالات میں تھا، اس رات شاہ زیب کے لوگوں نے میرے گھر کو جلا دیا، میں نے تو اس نیت سے خود کو پولیس کے حوالے کیا تھا، مگر وہاں کیا ہوا؟ میری گرفتاری تک نہیں ڈالی گئی، اور اگلے دن مجھے ماورائے عدالت ہی قتل کرنے کی سازش بنائی گئی تھی۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ مجھے جان سے مارنا ہے تو پھر یونہی سہی۔ جن لوگوں نے میرے گھر کو جلا دیا تھا، ان سے تو میں نے بدلہ لے لیا۔ اب بس شاہ زیب باقی ہے۔“

”ڈیرے پر جو تم نے گولی چلائی ہے نا، اس میں دو بندے مر گئے ہیں، یہ قتل تمہارے سر ہو گئے ہیں۔ سردار شاہ دین کے قتل میں جو ہم سمجھتے ہیں کہ تم پر الزام ہے، اس سے توجہ جاتے لیکن اب ان میں تم پولیس کو مطلوب ہو گئے ہو اور دن بدن تم اس دلدل میں پھنستے چلے جاؤ گے۔“

”اب پھر کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے اس بزرگ کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ جواب۔ اٹھنے نے نہیں بتایا تھا۔

”دیکھو! تم خود کو پولیس کے حوالے کر دو، تم قانونی جنگ لڑو، میں نہیں چاہتا کہ تم پولیس کے ہاتھوں کسی مقابلے میں مارے جاؤ، کیونکہ اس وقت پولیس نے پورے نورنگر کو گھیرا ہوا ہے، پولیس کو اسی وقت اطلاع ہو گئی تھی جب تم نے ڈیرے پر قبضہ کیا تھا۔ انہیں معلوم ہے کہ تم اس علاقے میں ہو، نہ جانے انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ تم اس ڈیرے پر موجود ہو۔ وہ کبھی ا

تک کریں گے، تم نکلنا چاہو گے اور وہ جوشاہ زیب چاہتا ہے، وہ ہو جائے گا۔“

”اور اگر جمالیہاں سے نکل جائے تو.....“ چھا کے نے کافی حد تک غصے میں کہا۔

”نکل گیا تو نکل گیا، کیا پھر خطرہ مل جائے گا۔ رسک ہے نا میرا پتر، جمالے کے ساتھ ان سب میں سے کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔“ بزرگ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بابا!.....! تو ہمیں ڈرانے آیا ہے یا پولیس کو پیغام لے کر، تیرا مقصد کیا ہے؟“ چھا کے نے پوچھا۔

”دو پہر سے پولیس گاؤں میں ہے، ارد گرد کے علاقے کے کچھ معززین بھی وہیں موجود ہیں۔ آج یا کل جو بھی ہو اس کی پورے علاقے کو خبر ہو چکی ہے، پہلے جو کچھ ہوا، وہ کیا تھا اس بارے میں ہم نہیں جانتے، لیکن اس بار اگر تو گرفتاری دے دیتا ہے تو یہ گرفتاری یونہی نہیں ہوگی، بہت کچھ طے کر کے یہ گرفتاری دی جائے گی۔ شاہ زیب کا گند، اب بھی نے سیٹنا ہے۔“

”مطلب، جمال جائے اور پولیس کو گرفتاری دے دے.....“ چھا کے نے چوکتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، ورنہ خواہ مخواہ میں خون خرابہ ہوگا اور اس کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔“ بزرگ نے متانت سے کہا۔

”وہ کیا طے کریں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو بتا دے۔ پھر بیٹھ کر اچھا ہی کریں گے۔ اب اس علاقے میں مزید خون ریزی برداشت نہیں ہو سکتی۔“ بزرگ نے سکون سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں سوچ کر بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ بزرگ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہم سب چوک میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک گھنٹے تک تیرا انتظار کریں گے آ جاؤ تو ٹھیک نہ آئے تو پھر ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔“

”میں مشورہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ چلا گیا کچھ دیر تک ہر بندہ اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ ان سب کا خیال تھا کہ مجھے گرفتاری نہیں دینی چاہیے، اشتہاری ہوتا ہے تو ہو جائے، کیا شاہ زیب پھر اپنی خباثت نہیں دکھائے گا؟

”دکھائے گا، کیوں نہیں دکھائے گا، جمالے کی موت ہی اب اسے اس علاقے میں لے کر آئے گی، اب نجانے کہاں بیٹھ کر وہ پولس کو مہرے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔“ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے تو نکل یہاں سے، پولیس کو ہم الجھا لیتے ہیں۔ پورے علاقے میں ناچتی رہ جائے گی۔“

”لیکن یہ بھی تو سوچو کیا ہم علاقے کی مخالفت لے لیں گے۔ ایک شاہ زیب کی مخالفت ہے، اب دقت ہے کہ اگر علاقے کے معززین کی ہم بات مانتے ہیں تو کم از کم وہ ہماری پشت پر ہوں گے، ہماری محبت میں نہ سہی، شاہ زیب کی مخالفت ہی میں سہی، اگر ہم نے انہیں بھی ناراض کر لیا تو ہمارا اس علاقے میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ میرا خیالی ہے ایک بار علاقے والوں کی ماں کر دیکھ لیں۔“ میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو گرفتاری دے دے گا۔“ ایک نے پوچھا۔

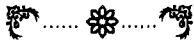
”وہ تو ہے ورنہ پولیس والی ذہنی اذیت تو چلتی ہی رہے گی، وہاں جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اب تو میری مرضی ہے نا کہ وہ میری گرفتاری لیتے ہیں یا نہیں۔ لاشوں کو تو پھٹکڑی پہنانے سے رہے۔“ میں نے دوہرتک سوچتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو جمالے۔“ چھا کے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو چلو پھر چلتے ہیں۔“

باقی میں اور جمال ساری بات خود طے کر لیں گے۔“ ڈی ایس پی نے شاید عوامی طور پر یہ بات کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے“ میں گرفتاری دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پیرزادہ وقاص کی طرف دیکھا، وہ ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر اپنے بازو پھیلا دیئے ایک کانسٹیبل نے میری کلائیوں میں ہتھکڑی ڈال دی، پھر میری تلاشی دی، کوئی قابل اعتراض شے نہ پا کر وہ مطمئن ہو گئے، میں خود چلتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا جب مجھے تھانے میں لا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہاں تین اور لوگ تھے جو میرے لیے اجنبی تھے، اس بار میں باقاعدہ گرفتار ہو کر حوالات میں بند تھا۔ میں اب اس پورے قانونی عمل سے گزرنا چاہتا تھا، اب جو ہونا تھا وہ ہو کر رہتا، اور میں اس کے لیے پورے طور پر تیار تھا۔



شام کے سائے پھیل کر اندھیرا چھا گیا تھا۔ جب چند ہی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ جہاں اور منالی دونوں کے پاس سامان نہیں تھا، وہ ان کے ساتھ والے نوجوان لے گئے تھے۔ اس لیے وہ دونوں ایک ساتھ اٹھ کر بوگی سے باہر آ گئے، اگرچہ جالندھر سے چند ہی گڑھ تک دونوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ خاصا جھوٹ سچ بول کر تکلف کی دیوار گرا دی تھی۔ وہ رعب حسن جو منالی کو دیکھ کر جہاں کو طاری ہو گیا تھا اب وہ کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ وہ اس سے ایک قدم آگے تھی۔ اسٹیشن پر اترنے سے پہلے اس نے اپنا پہناؤ ابھی بدل لیا تھا۔ اس وقت وہ جالندھر والی منالی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ مائینٹنس کے جیسی نیلی چین اور تنگ سی شرٹ، پنسل ہیل، کھلے گیسو میں وہ بھرپور لڑکی دکھائی دے رہی تھی، جس میں بلا کی کشش ہو، جہاں نے فوراً ہی اس سے نگاہیں ہٹا لیں اور چند ہی گڑھ کے جدید اسٹیشن کو دیکھنے لگا، اس کی عمارت کو جدید طرز پر بنایا گیا تھا اور نیلے رنگ کو کافی حد تک بولڈ رکھا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم سے نکلنے ہوئے وہ دونوں شانہ بہ شانہ چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن سے باہر آ گئے، جہاں کافی حد تک محتاط تھا، مگر اسے کہیں بھی کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا جو اس کی طرف متوجہ ہو۔ منالی جیسے ہی ایک جگہ کھڑی ہوئی، اسی لمحے ایک مہنگی کار اس کے پاس آن رکی، جس کا دروازہ منالی نے خود کھولا اور جہاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بیٹھے ہی وہ خود بیٹھی اور کار چل دی۔ کچھ دور جانے کے بعد جہاں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھارت کے دوسرے شہروں سے زیادہ یہ شہر جدید دکھائی دے رہا ہے۔“

”نیا بنانا ہے نا..... بنایا ہی جدید انداز میں ہے اس کا تاثر یہ دیا گیا ہے جیسے کوئی فارن کا شہر ہو، تم دیکھ لو گے اس کا یہ تاثر ہے کہ نہیں۔“ منالی نے عام سے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا، وہ بھی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”ہاں تھوڑا تاثر تو اس کا مختلف ہے۔“

”یہ میرا شہر ہے جہاں میں اس شہر کو خوب سمجھتی ہوں، ابھی کچھ دیر بعد دیکھو گے یہاں بڑے بڑے شاپنگ مالز ہیں۔ یہاں کے امیر ترین علاقوں میں سے ایک علاقہ سیلٹر سترہ ہے، جو یہاں کا مشہور ترین سیکٹر ہے، اس میں وہ شاپنگ مال ہے جو تمہاری منزل ہے، یعنی جسیر سنگھ کا شاپنگ مال۔“ منالی نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”آج تم مجھے ہی جالندھر سے لینے گئی تھی۔“ اس نے ایک دم سے موضوع بدل دیا۔

”نہیں“ جالندھر جا کر معلوم ہوا، مجھے آج صبح وہاں بلایا گیا تھا اور پھر تمہارا ٹاسک میرے ذمے لگا دیا جو کل دوپہر سے پہلے ہو جائے گا۔“

اس کے یوں کہنے پر جہاں سمجھ گیا کہ ڈرائیور اس کے اعتماد کا ہے، سو اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ٹرین

”نہیں“ تم سب لوگ ادھر رہو گے، میں جاتا ہوں اکیلا، اگر میں گرفتار ہو گیا تو تھانے میں ملنے آ جانا، ورنہ شام تک میری قبر کا بندوبست کر لینا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں ان سب کے گلے ملا، ایک کی اور گاؤں کی جانب چل پڑا۔ سچائی اور مردانگی میں حقیقت سے انکار نہیں کیا جاتا، چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔ سازش کرنے والے وقتی کامیابی تو لے سکتے ہیں لیکن ان کے لیے دائمی شرمندگی اور شکست مقدر بن جاتی ہے، مرد وہی ہوتا ہے جو حقیقت کا سامنا کرے، سازشوں سے وقتی کامیابی لینے والے اپنے آپ کو مرد کہلانے کے حق دار نہیں۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں راہ فرار اختیار نہیں کروں گا، بلکہ حقیقت کا سامنا کروں گا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں نے سردار شاہ دین کا قتل کیا۔ اس کے لیے میں نے خود کو پولیس کے حوالے بھی کر دیا تھا۔ میں نے خون کا بدلہ خون لے لیا تھا جو کبھی انہوں نے میرے باپ کو مارا تھا اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر خود کو اس قتل سے برا قرار دلوا لیا۔ آج یہی کچھ میں ان کے ساتھ کر رہا تھا، وہ طاقت کے بل بوتے پر آج بھی مجھے گھیر رہے تھے اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہی کے ہتھیاروں سے انہی کو مات دوں گا۔ میں کب تک بھاگتا؟ گاؤں کے چوراہے میں برگد کے درخت تلے لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ بہت سارے پولیس والے اور گاؤں کے عام لوگوں کے علاوہ چار پائیوں پر علاقے کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک چار پائی پر وہی ڈی ایس پی موجود تھا جو مجھے گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ گاؤں کے بزرگ اور پیرزادہ وقاص بھی وہیں موجود تھا۔ میں نے سب کو سلام کیا اور ایک طرف پڑی خالی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ میری آمد پر جو پچھل مچی تھی، اس پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تبھی پولیس انسپکٹر اٹھا اور اس نے اونچی آواز میں سب گاؤں والوں کو اور پولیس والوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا کہا، جلد ہی چند لوگ وہاں رہ گئے تو ایک بزرگ معزز آدمی نے کہا۔

”ڈی ایس پی صاحب! جمال آ گیا“ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی سچائی کا پہلا ثبوت ہے ورنہ اگر یہ مجرم ہوتا تو اب تک بھاگ گیا ہوتا۔“

”میں مانتا ہوں چوہدری صاحب! اس نے جو کچھ بھی کیا رد عمل کے طور پر کیا۔ شاہ زیب نے اس پر الزام لگایا لیکن ایک بھی ثبوت نہیں دیا۔ میں نے اس لیے اس کی گرفتاری نہیں ڈالی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اسے خواہ مخواہ پھنسیا جا رہا ہے۔ اس نے کسی دوسرے آپشن پر بات ہی نہیں کی تھی۔ اب شاہ زیب لاہور میں ہے اور وہاں سے اعلیٰ حکام کے ساتھ مل کر ہم پر دباؤ ڈالوا رہا ہے کہ ہم اسے گرفتار کریں۔ اب یہ ہماری مجبوری ہے، جمال اگر ہمارے ساتھ چلتا ہے تو ہم اس کے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔“

”یہ نہ ہو کہ اب بھی آپ اس کی گرفتاری نہ ڈالیں اور جس طرح شک تھا کہ.....“ ایک معزز نے کہا تو ڈی ایس پی فوراً بول اٹھا۔

”نہ..... نہ..... اس بار قانون کے مطابق سب کچھ ہوگا۔ اب تک شاہ زیب نے کوئی ثبوت نہیں دیا کہ یہ الزام اس نے کیوں لگایا۔ یہ بالکل اسی طرح ہی ہے جیسے کوئی بندہ اٹھ کر یہ کہہ دے کہ شاہ زیب نے خود اپنے باپ کو قتل کیا، میں کہہ رہا ہوں نا کہ آپ سب اور جمال ہمارے ساتھ تعاون کرے گا تو ہم بھی پوری طرح تعاون کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہم اس کا ریمانڈ نہیں لے پائیں گے، بلکہ اس کی ضمانت ہو جائے گی۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ قانونی طور پر میں جمال کو اپنی صفائی کا پورا پورا موقع فراہم کروں گا۔“

”اب یہی طے ہے نا کہ جمال پر صرف اور صرف سردار شاہ دین کے قتل کا الزام ہے، اور باقی جو کچھ ہوا.....؟“ بزرگ نے پوچھا۔

”ڈیرے پر جو کچھ ہوا، اس کی اطلاع ہے نہیں، لیکن وہاں پر ان اشتہاریوں نے تین لوگوں کو اغواء کر کے رکھا ہوا تھا۔“

مرضی نکل جاؤ۔“

”ہاں.....! یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”سو.....! یہ تین پوائنٹ ہیں، نمبر ایک پارکنگ سے گیٹ تک، نمبر ۲ لابی میں لفٹ سے نکلنے ہی اور تیسرا اس کے آفس میں، ان تینوں میں سے کوئی ایک پوائنٹ دیکھو کیونکہ یہ سب تم نے کرنا ہے، میں پھر اسی مناسبت سے نکلنے کا بندوبست کروں۔“

منالی نے کہا تو اس نے ایک دو لمحے سوچا اور پھر حتمی انداز میں کہا۔

”لابی میں ٹھیک رہے گا۔“

”اس کی وجہ.....؟“ منالی نے پوچھا۔

”نیچے مزاحمت زیادہ ہوگی، وہ چاروں گارڈ ہی نہیں، کھلی جگہ ہونے کے باعث لوگ زیادہ متوجہ ہو جائیں گے، پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا، کیونکہ آف آفیس لابی میں زیادہ چاہئے ہوں گے رش ویسے ہی لگا ہوں میں آجائے گا۔“

”ٹھیک ہے اور لابی کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہاں اتنا زیادہ رسک نہیں ہے۔ دوطرف سے نکلنے کے لیے راستہ ہے، اور وہاں پر زیادہ لوگوں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہوگی، میں اکیلا ہی بہت ہوں۔ میں نے اگر جسیر کو باردیا تو کسی طرف سے بھی نکل جاؤں گا۔ اور اگر میں مارا گیا تو آپ سب لوگ محفوظ رہیں گے۔“

”یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے۔“ منالی نے جہاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”بالکل.....!“

”اوکے.....! اب سکون سے سو جاؤ، اگر تمہیں نیند آگئی تو ٹھیک اور نہ آئے تو مجھے کال کر لینا، میں آج رات تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہتی، لیکن مجھے کام کرنے ہیں کچھ.....“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔

”اوکے گڈ نائٹ۔“ جہاں نے کہا اور بیڈ پر سیدھا ہو گیا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو گئے تھے، جب جہاں کی آنکھ کھلی، وہ عادت کے مطابق کھڑکی میں جا کھڑا ہوا، اور لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ وہ اپنے ذہن میں پوری پلاننگ کر چکا تھا، وہ مطمئن تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں سب کچھ دہرایا اور تیار ہونے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ اس وقت وہ تیار ہو کر ایک صوفے پر بیٹھائی دی دیکھ رہا تھا، جب منالی اندر آئی، اس کے چہرے پر حد درجہ ملاحظہ اور خوشگواریت تھی۔ اس نے ویسی ہی نیلی جین، چیک دار شرٹ اور جاگر پہنے ہوئے تھے، اس نے بالوں کی پونی باندھی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر شاندار مسکراہٹ تھی۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ جہاں نے اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

”اور تم بھی بہت ہینڈم لگ رہے ہو۔ آؤ ناشتہ کریں۔“ اس نے کہا تو جہاں نے فی دی بند کیا، پھر اس کے ساتھ باہر چل دیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے، جہاں میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ ناشتے کی میز پر وہ دونوں ہی تھے۔ پرسکون ماحول میں ہلکی پھلکی گپ شپ میں انہوں نے ناشتہ ختم کیا۔

”دیکھو نو بجے میں تقریباً ایک گھنٹہ پڑا ہے اب ہمیں نکلنا چاہیے۔“

”تو پھر چلو۔“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ جسیر کے شاپنگ مال پہنچ گئے۔ گاڑی پارکنگ میں لگاتے ہی منالی نے کہا۔

”میں نے یہاں فیلڈنگ لگا دی ہے، وہ سامنے دیکھو، سبز اور پیلے رنگ کی ٹوپی پہنے ایک نوجوان لڑکا، وہ اپنا آدی ہے

میں انہوں نے بہت باتیں کر لی تھیں، سوان کے درمیان خاموشی رہی، منالی اپنے طور پر سوچتی رہی اور وہ شہر کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پوش علاقے میں جا پہنچے۔ وہ بڑا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ ایک بنگلہ نما گھر کے سامنے کارر کی ہی تھی کہ گیٹ کھل گیا۔ وہ کارسیت اندر چلے گئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں گیا تو اسے لگا جیسے وہ کسی بور پی ملک کے گھر میں آ گیا ہو۔ منالی اسے سیدھا کمرے میں لگی۔

”یہاں آرام کرو میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ اس وقت وہ فریش ہو چکا تھا جب منالی دوبارہ کمرے میں آئی، وہ پہلے سے زیادہ فریش دکھائی دے رہی تھی۔

”جہاں! آؤ چلیں۔ کھانا بھی باہر سے کھائیں گے اور تمہارے لیے تھوڑی شاپنگ بھی کر لیں۔“

”میرے لیے شاپنگ کرنی ہے تم نے؟“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اپنا لباس دیکھو، میلا ہو رہا ہے اور پھر جسیر کے شاپنگ مالز سے کوئی سوٹ خریدنا تو اور بھی اچھا ہے نا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ منالی کی منانت اس کے حسن میں اضافہ کا باعث بن رہی تھی۔ پورج میں ڈرائیور کار لیے موجود تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تو گاڑی چل پڑی۔

وہ ایک بڑا شاپنگ مال تھا۔ پارکنگ میں کار کھڑی ہوئی تو وہ دونوں پیدل ہی چل پڑے۔ اندر ایک جہاں آباد تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارا چندی گڑھ یہیں شاپنگ کرنے آ گیا ہے۔ وہ سب سے پہلے گارمنٹس کی طرف گئے، جہاں سے جہاں نے اپنے لیے کافی کچھ خریدا، پھر ایک سیل فون شاپ پر جا کر نیا سیل فون لیا، یہی جہاں نے منالی سے پوچھا۔

”اس کا کنکشن.....؟“

”ہے میرے پاس، جو کہیں بھی رجسٹر نہیں ہے۔ ایسے کنکشن رکھنے پڑتے ہیں۔“ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”اوکے.....!“ جہاں نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ دکان سے ہٹ کر بولی۔

”جسیر انداز صبح نو بجے کے بعد یہاں آتا ہے، یہاں اوپر پہلی منزل پر اس کا آفس ہے، ابھی چلتے ہیں اور آفس دیکھ آتے ہیں، تم بھی یہ ساری لوکیشن دیکھو، پھر بیٹھ کر ڈسکس کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“

”اوکے۔“ جہاں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور یوں ہو گیا جیسے وہ وہاں تفریح کی غرض سے آیا ہو۔ وہ دونوں وہاں پر تقریباً دو گھنٹے تک رہے، اس درمیان انہوں نے وہیں سے فاسٹ فوڈ لیا۔ وہیں کھا کر وہ واپس گھر آ گئے۔

وہ دونوں بیڈ پر آئے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ جس پر منالی لکیریں کھینچ کر اسے سمجھا رہی تھی۔

”یہ پارکنگ ہے لیکن جسیر کی گاڑی یہاں سے ہٹ کر کھڑی ہوتی ہے یہاں پر۔“ اس نے کاغذ پر ایک جگہ پنسل رکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر وہ اس گیٹ سے اندر جاتا ہے اس دوران اس کے ساتھ تقریباً چار گاڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو نیچے رہ جاتے ہیں اور دو اس کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو کر اوپر جاتے ہیں۔ یہ لفٹ لابی میں کھلتی ہے، جو تم نے دیکھی، سامنے اس کا آفس ہے، دو گاڑی یہاں رُک جاتے ہیں۔ یہ اس کے ساتھ والا کمرہ ہے، جہاں اس کا ماتحت عملہ ہوتا ہے۔ جسیر دن کے ایک بجے تک یہاں رہتا ہے، اور پھر اس طرح واپس ہو کر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔“

”منالی.....! یہاں شاپنگ مال کی بجائے اس کا گھر.....“ جہاں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”نہیں.....! وہ جس علاقے میں رہتا ہے وہاں سکیورٹی کا بہت زبردست بندوبست ہے۔ ایک تو وہ علاقہ سکیورٹی کے حوالے سے بہت مضبوط ہے، دوسرا اُدھر حکومتی عمارتیں ہیں، سیکریٹ ہے اس تک وہاں پہنچنا اگرچہ ناممکن نہیں ہے لیکن اُدھر پلاننگ بہت لمبی کرنا ہوگی، یہ شاپنگ مال والا آسان ہے یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ نکلنا بہت آسان ہے، جدھر

تھی۔ اس نے ایک دم سے نیچے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سیدھا بڑھا اور باہر والی دیوار میں لگا شیشہ توڑ دیا۔ وہ زمین سے تقریباً بارہ سے چودہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ شیشے کی دیوار میں سے باہر نکلا اور پھر اس دیوار کے ساتھ پلکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ جس وقت اس کے پاؤں زمین پر لگے اوپر سے فائر ہوا، وہ تیز رفتاری سے بھاگا۔ نجانے کہاں سے دو لڑکے نکل کر آئے وہ اوپر کی طرف فائر کرنے لگے۔ ایک دم سے گولیاں برسنے لگی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شاپنگ مال سے سڑک کی طرف بھاگ رہے تھے۔ تقریباً دو منٹ میں وہ درخت کے نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچ گئے۔ گاڑی اشارت تھی ان کے بیٹھے ہی گاڑی چل دی۔ وہ سیکڑسترا سے نکل پڑے تھے۔ تقریباً دس منٹ کے وقفے میں وہ مارکیٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں گاڑی کھڑی کی، وہ فائر کرنے والے لڑکے اتر کر ایک طرف چل دیئے، جہاں اور ڈرائیور ایک دوسری گاڑی میں بیٹھے اور چل پڑے۔ اس بار ڈرائیور کا انداز بہت پرسکون تھا۔

”اب کدھر نکلتا ہے؟“ جہاں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

”نی الحال ہم سپر ہائی وے پر جائیں گے تب تک میڈم کا فون آجائے گا۔“ ڈرائیور نے کہا اور پوری توجہ سڑک پر لگادی۔ تبھی اچانک انہیں سڑک پر پولیس کی گاڑیاں تیزی سے جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ جہاں چونک گیا کہ شہر میں ہلچل مچ گئی ہے۔ اس دوران منالی کا فون آ گیا۔

”جہاں! اگرچہ ہم نے مقصد تو حاصل کر لیا ہے مگر یہ ہماری غلط فہمی تھی کہ وہ لوگ محتاط نہیں ہوں گے۔“

”کیا ہوا؟“ وہ چونکا۔

”میں ابھی تک شاپنگ سینٹر میں پھنسی ہوئی ہوں۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ دیوار توڑ کر نکلے ورنہ دھریا جانا تھا۔ اب پولیس پورے شہر میں ناکہ بندی کر چکی ہوگی۔“

”ہوا کیا؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے وہ لوگ تمہاری یہاں آمد کے بارے میں جانتے تھے۔ جالندھر اسٹیشن پر رابطہ نہیں کتا، ہم نگاہوں میں تھے۔“ منالی نے کہا۔

”پھر تیرے لیے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ میں واپس آ رہا ہوں۔“

”ہرگز نہیں بلکہ فون ڈرائیور کو دو۔“ اس نے تیزی سے کہا، میں نے فون اسے دے دیا۔ وہ چند منٹ سنٹارہا، پھر فون بند کر کے جہاں کو دے دیا۔

”میڈم کہہ رہی ہے کہ جس قدر جلدی اس شہر سے نکل سکتا ہوں، نکل جاؤں، جیسے جیسے وقت گزرے گا یہاں سے نکلتا مشکل بنی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔“

”تو پھر.....؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھتے ہیں کدھر نکلتے ہیں؟“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور پھر ایک ذیلی سڑک پر ڈال لی جہاں سے کچھ آگے جا کر بسوں کا ایک اسٹاپ تھا، ڈرائیور نے گاڑی وہاں آگے روکی اور جہاں کو اشارہ کر کے نیچے اتر آیا۔ دونوں پیدل چلتے ہوئے واپس اسٹاپ پر آ گئے۔

”چندی گڑھ سے اپنی سواری میں نکلتا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ہر جگہ اپنی شناخت دینا پڑے گی۔ یہاں بس میں بیٹھ کر شہر سے نکلتے ہیں۔“

”اوکے!“ جہاں نے سمجھتے ہوئے کہا اور اسٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

جس کے بھی ایسی کیپ ہوگی، وہ ہمارا بندہ ہے، ضروری نہیں کہ باہر نکلتے وقت تم پارکنگ میں آؤ، وہ سامنے سڑک کے پار درخت کے ساتھ گاڑی کھڑی ہے، اس تک جانا وہ تمہیں پہچانتے ہیں بے دھڑک اس گاڑی میں بیٹھ جانا، اب ہم اندر چلتے ہیں اندر جا کر ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے، میں صرف تمہیں کو رو دوں گی۔“

”ساری پلاننگ تم نے کر لی، مگر میرے پاس یا تمہارے پاس اسلحہ نام کی کوئی شے نہیں، فائر کس سے بھاگا؟“ جہاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، تو منالی ہنستے ہوئے بولی۔

”یہ سکیورٹی گیٹ پارکرو بناتی ہوں۔“

وہ دونوں سکیورٹی گیٹ کے قریب پہنچ گئے، ارد گرد بھٹا گاڑ کھڑے تھے، وہ سکون سے گزر گئے۔

”ہاں بولو.....!“ اس نے پوچھا۔

”اگر اسلحہ لے کر آتے تو یہیں پکڑے جاتے، اب وہ دیکھو سامنے اسٹیکس کی دکان ہے، وہاں تک چلو وہاں سب کچھ مل جائے گا۔“ منالی نے کہا اور لچکتی ہوئی اس کے ساتھ یوں چل دی جیسے اسے دنیا کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ وہ دونوں وہیں ایک طرف جا بیٹھے۔ چند لمحے بعد ان کے لیے آرڈر لینے ایک لڑکی آ گئی۔ منالی نے اسے آرڈر دیا، اسی دوران ایک لڑکا تیزی سے چلتا ہوا آیا اور ان کی قریب آ کر پھسل گیا۔ وہ شاپنگ مال کا ملازم تھا، گرتے گرتے وہ جہاں سے نکل گیا تھا۔ بھی جہاں کو محسوس ہوا کہ کوئی بھاری سی چیز اس کی گود میں آن پڑی ہے، لڑکا شرمندہ سا ہو کر اٹھ گیا، اور آگے چلا گیا۔ جہاں نے ٹوٹل کر محسوس کیا، اس میں پھسل تھا۔

”آ گیا.....“ جہاں نے دیکھے بغیر منالی سے کہا۔

”دو پھسل ہوں گے، اب اٹھ اور واش روم کی طرف چلو وہیں جا کر چھپاتے ہیں۔“ منالی نے کہا اور اٹھ گئی۔ وہاں جا کر تنہائی کے لیے انہیں چند منٹ لگے۔ جہاں نے تیزی سے پھسل نکالے، ایک منالی کو دیا دوسرا خود کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ دو فاضل میگزین تھے جو ایک منالی کو دے دیا۔ جب وہ واش روم سے باہر نکلے تو واپس سیدھے اس اسٹیکس کی دکان پر گئے، ان کا آرڈر آچکا تھا۔ انہوں نے وہ کھانا شروع کر دیا۔ نون چکے تھے، منالی نے اپنا فون میز پر رکھ لیا تھا، اچانک اس کا فون بجنا تو منالی تیزی سے بولی۔

”جہاں..... جیسر آ گیا ہے، اسے لابی تک تقریباً پانچ منٹ لگیں گے، تم پہنچو۔“

جہاں کو جیسے کرنٹ لگ گیا، وہ تیزی سے اٹھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں والی لفٹ کی جانب بڑھا، ایک منٹ میں وہ دوسری منزل پر تھا، وہ پرسکون انداز میں لابی کی طرف بڑھنے لگا، راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ جس وقت وہ لابی میں پہنچا، اس نے پھسل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا، عملے والے کمرے میں چند لوگ تھے، مگر وہ سکون سے کام میں مصروف تھے۔ اب کسی بھی لمحے لفٹ کا دروازہ کھلنے والا تھا اور وہ اس کے سامنے ہوتا۔ وہ سائیڈ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا، لفٹ رکی، دروازہ کھلا اور جیسر آگے اور اس کے گارڈ پیچھے پیچھے باہر آگئے، جہاں نے پہلے ایک گارڈ کے سر پر پھر دوسرے گارڈ کا نشانہ لیا۔ دونوں ہی ڈکارتے ہوئے ڈھیر ہو گئے، حواس باختہ آنکھوں میں حیرت لیے پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ جہاں کو دیکھ رہا تھا، اس نے بمشکل کہا۔

”ک..... کک..... کون ہو تم.....؟“

جہاں نے جواب نہیں دیا، بلکہ اس کے ماتھے پر پھسل رکھ کر فائر کر دیا۔ یقیناً جیسر کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ لیکن جاتے جاتے اس نے ایک اور فائر کر دیا۔ جہاں جس راہداری سے آیا تھا، اس کی مخالف سمت راہداری میں بھاگ کھڑا ہوا۔ راہداری سے نکلتے ہی وہ نارمل ہو گیا اور سیڑھیوں کی لفٹ کی جانب بڑھا۔ تب تک سارے شاپنگ مال میں ہل چل مچ چکی

کیا کیا جرم تیرے گلے میں ڈالیں گے اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہو جائے گا جب تم جج کے سامنے پیش ہو گے، بس دو چار گھنٹے ہی ہیں، ابھی سب پتہ چل جائے گا۔“

”مطلب پیرزادہ وقاص کو کوشش کرے گا، لیکن یہ کوشش پوری نہیں ہوگی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا، پھر دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اب کیا کیا جائے، قسمت ہی میں ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی برداشت کریں گے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

”تو فکر نہ کر، میں تم سے پہلے عدالت میں ہوں گا، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ سہیل نے مجھے تسلی دی جو بہر حال دل کو تسلی دینے والی بات تھی۔ اصل معاملہ تو تب کھلنا تھا جب میں جج کے سامنے پیش ہوتا۔ ابھی تک تو قیاس آرائیاں ہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں برتن لے کر واپس چلے گئے میں آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟

تقریباً سات بجے کے قریب قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی تھانے کے اندر آ گئی۔ ہم چاروں ہی تھے۔ ہمارے ساتھ پانچ کانسٹیبل اور انسپکٹر منیر باجوہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا کہ مجھے واپس پلٹ کر اسی حوالات میں آنا ہے، میں قصبے کی حوالات میں تھا اور نزدیک ترین شہر جس میں سیشن جج بیٹھتا تھا وہ تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ جس سڑک پر ہم نے سفر کرنا تھا اس کے دائیں طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے اور بائیں جانب ریلوے ٹریک، جس کے آگے جنوب تک چولستان کا وسیع و عریض علاقہ تھا۔ موسم خاصا گرم ہو چکا تھا۔ قصبے سے نکلتے ہی ایک حوالاتی نے کان پر ہاتھ رکھ کر ماہیا گانا شروع کر دیا۔ جس سے میں ان سوچوں سے باہر نکل آیا کہ مجھ پر کیا کیا الزامات لگائے جائیں گے جس کی وجہ سے میری ضمانت نہیں ہو پائے گی۔ ویسے بھی یہ خام خیالی ہی تھی کہ قتل کے ملزم کو فوراً ضمانت پر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ وہ ماہیا گانا تار با تار دوسرے اس سے محفوظ ہوتے رہے لیکن میں اپنی ہی سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھویا رہا۔ مجھے تھانے اور پکھری کی دشوار گزار اور تھکا دینے والی راہوں سے گزرنا ہوگا۔ میں دراصل ان سے نہیں گھبراتا تھا، میں صرف ان سازشوں سے ڈرتا تھا کہ پتہ نہیں کب اور کس وقت ماورائے عدالت میرے لیے کوئی حکم جاری ہو جائے۔ اصل میں ہمارے ملک کا جو تفتیشی نظام ہے یا پھر جو سزا و جزا کے لیے فیصلے کیے جاتے ہیں ان میں اس قدر لچک ہے کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کیا جاسکتا ہے۔ سفید چمڑی والے جو نظام چھوڑ کر گئے تھے، کالے انگریزوں نے اس کو اب تک مسلط رکھا ہوا ہے، جس میں انسانی تذلیل زیادہ ہے۔ انہی سوچوں میں الجھتے ڈوبتے، ہم ضلعی عدالت میں جا پہنچے۔ ہمیں کو اتوالی میں رکھا گیا۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ ہمیں آواز پڑے اور ہم جج کے سامنے پیش ہوں۔ نیا ڈی ایس پی اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ اور اسے آنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، منیر باجوہ ہی کافی تھا کچھ دیر بعد وہ گھوم کر میرے سر پر آن کھڑا ہوا، کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا، پھر طنز یہ لہجے میں بولا۔

”بہت مان تھانا تجھے خود پردیکھ یہاں عدالت میں تیرے لیے کوئی بھی نہیں آیا، بڑا پیرزادہ پیرزادہ کرتا تھا، وہ اب نہیں آئے گا۔“

”چلو نہیں آتا تو نہ آئے، وہ کون سا میرے مامے کا پتر ہے۔“ میں نے تنک کر کہا۔

”وہ تیرے مامے کا پتر بن بھی نہیں سکتا، کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو اتلی، جاگیرداروں کے یار جاگیردار ہی ہوتے ہیں۔ رات اس نے شاہ زیب سے سودے بازی کر لی ہے، تجھے اس نے ایک مہرے کے طور پر استعمال کر کے پھینک دیا۔“

اس نے طنز یہ انداز میں کہتے ہوئے نفرت سے سر کو جھکا۔

”چل میں تو مہرہ کی طرح استعمال ہو گیا، تو ان کی خدمت داری نوکروں کی طرح کر رہا ہے یا وفا داری.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کو سمجھ کر ٹوکتے ہوئے بولا۔

”بکو اس نہ کر اوائے، میں افضل رندھاوا نہیں، جو تیرے ساتھ یاری نبھاتے ہوئے معطل ہو کر بیٹھا ہے، میں منیر باجوہ

”اپنی دنیا کے لوگوں کا کیا نام ہوگا، آپ جو مرضی پکار لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”پھر بھی یار اب ہمارا ساتھ تو ہے نا.....“

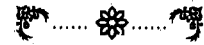
”رانا چرن، نام ہے میرا اب آپ جو چاہو بلاو۔ اس نے کھیا نی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ حالانکہ اس میں شرمندگی والی کوئی بات نہیں تھی۔

انہیں وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک طرف سے چند لوگ آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، تقریباً دس منٹ میں وہاں سات آٹھ سواریاں ہو گئیں۔ کبھی چندی گڑھ کی طرف سے بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ لوکل بس تھی اور جب وہ ان کے قریب آ کر رکی تو رانا چرن نے تیزی سے کہا۔

”یہ بس سیر تک جائے گی، قریب ہی شہر ہے چھوٹا سا۔“

”یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ کدھر جانا ہے۔“ جہاں نے الجھتے ہوئے کہا تو اسی تیزی سے بولا۔

”سیرسرا جھستان میں ہے، وہاں پہنچتے ہی ادھر کی پولیس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ بس وہاں پہنچنے کی دیر ہے۔ جلدی بیٹھیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بالکل آخر میں سوار ہونے والی سواری کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں بس میں سوار ہو گئے، جس میں پہلے ہی سے بہت رش تھا۔ جہاں کو لگا جیسے وہ کہیں بنجرے میں پھنس گیا ہے، لیکن پولیس سے بچنے کے لیے یہ جائے پناہ اچھی تھی۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہیں سیٹ دکھائی نہ دی تو وہ سکون سے کھڑا ہو گیا۔ وہ بیٹھ کر ہی منالی کو پیغام بھیج سکتا تھا۔



حوالات کی سلاخوں کے پیچھے رات جیسے تیسے گزر گئی۔ میرے ساتھ جو تین بندے تھے، وہ ایک دن پہلے تک ایک دوسرے سے اجنبی تھے، شام تک وہ بھی یوں ہو گئے تھے جیسے برسوں سے یارا نہ ہو۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میں ان کے ساتھ کھل مل گیا۔ انہیں تاش کھیلنے کے لیے چوتھے بندے کی ضرورت تھی، وہ میری صورت میں ان کے پاس آ گیا تھا۔ حوالات کے مدقوق پیلے بلب کی روشنی میں رات گئے تک تاش کی بازیاں چلتی رہیں۔ پھر پتہ نہیں کہ سوئے تھے کیونکہ صبح جب آنکھ کھلی تو روشنی ہر جانب پھیل چکی تھی۔ تھانے کا گیٹ کھلا تو بھیدہ میرے لیے ناشتہ لیے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہی سہیل تھا، میرے ساتھی حوالتوں نے جب تک کھانا کھایا، تب تک میں نے بھی ناشتہ کیا پھر بھیدے سمیت سہیل سے بھی باتیں کرتا رہا۔ بھیدہ سہیل کی وجہ سے پہلے جھجکتا رہا تھا، پھر جب وہ پہچان گیا کہ وہ بھی جگری دوست ہے تو اس نے مجھے چھاکے کا پیغام دیا۔

”وہ ناچھا کے نے ایک ایڑی اڑتی خبر سنی ہے، وہ تمہیں بتا سکتی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا ہے خبر؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”ڈی ایس پی سے معاہدہ تو یہی ہوا ہے، ناکہ آج تم عدالت میں پیش ہو گے تو تمہاری ضمانت ہو جائے گی، پیرزادہ

وقاص تمہاری ضمانت دے گا، ریمائنڈ نہیں ہوگا۔“

”ہے تو ایسی ہی.....“ میں نے کہا۔

”لیکن راتوں رات ڈی ایس پی تبدیل ہو گیا ہے۔ نیا جو ہے وہ شاہ زیب کے ہاتھ کا بندہ ہے، اس سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ کیا کرے۔“ بھیدے نے تو مجھے چونکا دیا۔

”اگر ایسا ہو گیا تو معاملہ بہت خراب ہو جائے گا۔ یہ جو نیا ڈی ایس پی آیا ہے، اور شاہ زیب کے ہاتھ کا بندہ ہے۔ اسے ایویس ہی راتوں رات تبدیل نہیں کر دیا گیا۔ اب اتنی کوشش کر کے جو اسے یہاں لگوایا ہے تو۔۔۔“ میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا تو سہیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اب یہ دیکھ لو شاہ زیب نے بڑے وقت پر پتہ کھینچا ہے۔ پہلے وہ ریمائنڈ کے چکر میں تمہیں ادھموا کریں گے، پتہ نہیں

ہوں جانتا ہوں کس بندے کو کس طرح انگلی پر نچایا جاتا ہے۔“

”جب تک تیرا ڈی ایس پی نہیں بدلا تھا اس وقت تک ٹوکس کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا؟“ اس بار میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اوائے بات سن اوئے میں نے تھانیدار ہی رہنا ہے شاہ زیب نے ایم این اے بن جانا ہے اور پیرزادے کا معاہدہ ہوا ہے کہ وہ ایم پی اے بنے گا لیکن تیرے جیسے حوالات میں ریمانڈ پر مار کھاتے ہیں اور پھر جیلوں میں سڑتے ہیں۔ تو ضمانت کے خواب نہ دیکھ، کم از کم چودہ دن کاریمانڈ میں نے لینا ہے اور تیری ساری اکڑ نکالنی ہے۔ یہ خواہش میں بڑے دنوں سے اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔“

”یار! تو نے جو کرنا ہے کر لینا، عورتوں کی طرح دھمکیاں کیوں دے رہا ہے۔ ویسے کتنے قتل ڈالنے کو کہا ہے شاہ زیب نے اور اس کے لیے کتنی رقم دی ہے؟“ میں نے اسے چڑانے کے لیے کہہ دیا۔

”یہ تو تجھے جج صاحب کے سامنے جا کر معلوم ہو گا، کیا ہوتا ہے تیرے ساتھ اور پھر چودہ دن تو میرے ہاتھوں میں ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ نجائے کیوں اس وقت مجھے انسانی نفسیات بڑی عجیب سی لگی، بزدل، گھٹیا اور منافق انسان ہمیشہ اس وقت کھلتا ہے جب سامنے والا انسان اسے بے بس دکھائی دے۔ میں جو خود کو اس قانونی عمل سے گزارنے کے لیے خود کو پیش کر چکا تھا اور میرے ذہن کے کسی کونے میں یہ بھی تھا کہ اگر سردار شاہ دین کا قتل مجھ پر ثابت بھی ہو جاتا ہے تو میں جیل جھگتنے کے لیے تیار تھا۔ میں اتنا تو جانتا تھا کہ پھانسی تک لے جانے والے ثبوت ان کے پاس نہیں ہوں گے، لیکن ابھی کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور منیر باجوه اپنے دل کی ناجائز خواہش مجھے بتا رہا تھا۔ ایک بار تو میرے دل میں ابھی کہ یہاں سے بھاگ جاؤں میں نے اپنے طور پر جائزہ لے لیا تھا کہ چاہے میں جھکڑی میں ہوں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگ سکتا ہوں۔ مگر یہ جلد بازی تھی، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ مجھے کس طرح پھسانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوپہر سے ذرا پہلے ہمیں آواز پڑی تو منیر باجوه مجھے جھکڑی سمیت عدالت میں لے گیا۔ میں حیران تھا اور کسی حد تک مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ پیرزادہ وقاص وعدہ کرنے کے باوجود بھی عدالت نہیں آیا تھا۔ چلو وہ نہ آتا تو کم از کم اس کا کوئی وکیل ہی ہوتا۔ تھوڑی بہت کوشش تو ہوتی، مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں اکیلا تھا، نورنگر کے یا اس علاقے میں سے کوئی بندہ وہاں موجود نہیں تھا جن لوگوں نے معاہدے کے ساتھ میری گرفتاری دلوائی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب میری قسمت مجھے کہاں لیے جا رہی ہے، سو میں نے اپنے آپ کو قسمت اور حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

میں جب عدالت سے باہر آیا تو اس وقت میں انتہائی خطرناک مجرم تھا۔ مجھ پر سردار شاہ دین کے قتل سے لے کر کئی دوسرے قتل بھی کرنے کا الزام تھا۔ شاہ زیب نے بڑی اچھی پلاننگ کی تھی۔ ایسے وقت پر پیرزادہ وقاص سے سمجھوتہ کر لیا تھا جب مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس دوران جو ثبوت پیش کیے گئے وہ سبھی ”ریڈی میڈ“ تھے۔ ضمانت تو اب کیا ہونی تھی اب تو مقدمہ ہی چلنا تھا۔ نجائے کب تک حوالات مقدرمیں تھی اور پھر جیل کی زندگی، پھانسی ہوتی یا عرقید، جو بھی تھا، اس فیصلہ کے انتظار میں کتنا وقت بیت جاتا تھا۔ اس دوران رہائی کی امید تو کی جاسکتی تھی لیکن نصیب میں رہائی کے لیے مجھے جنگ لڑنا تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب یہ پیسے اور تعلقات کا کھیل ہے۔ مہنگا وکیل اور ریڈی میڈ گواہوں کے بل بوتے پر مقدمے کا رخ کہیں سے کہیں کیا جاسکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھ پر باپوسی چھا گئی تھی، لیکن اگلے ہی لمحے نجائے کیوں مجھے اماں کی دعاؤں پر بھروسے کا خیال آ گیا تو میرے اندر ایک دم سے حوصلہ بھر گیا۔ کیا ہوا جو قوتی طور پر منافقین جیت گئے ہیں، مجھے بہر حال ان سے لڑنا ہے اور اس وقت تک لڑنا ہے جب تک میری آخری سانس ہے۔ اس جنگ کی نوعیت کسی قسم کی بھی ہو

اور میدان جنگ کیسا بھی ہو۔ عدالت کی غلام گردشوں سے نکل کر قیدیوں کی گاڑی تک آتے ہوئے باپوسی کا دریا پار کر گیا تھا اور اب میں حوصلے کے میدان میں تھا۔ میرے ساتھ تینوں حوالاتی تھے۔ وہ بھی آگے تو ہمیں گاڑی میں سوار کر لیا گیا۔ انسپکٹر منیر باجوه ہمیں اپنی نگرانی میں سوار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ مجھے بے چین کر رہی تھی۔ جس وقت میں نے گاڑی میں داخل ہونے کے لیے قدم اٹھایا تو اس نے انتہائی حقارت سے کہا۔

”اُدھل جلدی کر بیٹھ، واپس چل کر تیرے اندر سے بد معاشی کو نکالنا ہے، دیکھتے ہیں تو میری خاطر تو وضع کس قدر برداشت کرتا ہے۔“

میں ایک دم سے بھنا گیا۔ مگر اس وقت مجھے خود پر قابو پانا ہی تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ گھٹیا لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو گھیر کر بڑھکیں مارتے ہیں، میں اس وقت اکیلا تھا، میرے ہاتھوں میں جھکڑی تھی اور میں نہتا تھا۔ وہ مجھے غصہ ہی اس لیے دلا رہا تھا کہ میں کچھ ایسا کروں کہ وہ میرے جرائم کی فائل میں ایک نئے ورق کا اضافہ کر دے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ان تینوں حوالاتیوں کے ملنے والے آئے تھے وہ انہیں کافی کچھ کھانے پینے کو دے گئے تھے جبکہ میرے لیے کوئی نہیں آیا تھا انہوں نے مجھے کافی کچھ کھانے پینے کو دیا میں نے سب طرف سے ذہن کو جھٹک کر کھانے پینے کی طرف توجہ کر دی جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہنا ہے، بھوکا تو نہ رہا جائے۔ دوپہر کے بعد ہم وہاں سے چل دیے۔ اچھی خاصی دھوپ تھی اور موسم صاف تھا۔

اس وقت ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ہم شہر اور قصبے کے درمیان میں تھے جب ہماری گاڑی آہستہ ہوئی۔ ٹریفک کے دوران ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تیز اور کبھی آہستہ ڈرائیونگ کی جاتی ہے، میں یہی سمجھا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ بلکہ جان بوجھ کر اس کے آگے ایک ایسی گاڑی لائی گئی تھی کہ گاڑی کو آہستہ ہو جانے پر مجبور کیا جائے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا۔ سبھی اچانک ایک فائر ہوا اور قیدیوں والی گاڑی کا پچھلا نازر برست ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف کا نازر برست ہو گیا۔ گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دم سے شدید فائرنگ ہونے لگی، جو تقریباً آدھے منٹ تک رہی، پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ ان تینوں حوالاتیوں سمیت میں بھی جالی میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ جانی شوکر پر پڑی، اگرچہ اس نے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا لیکن میری نگاہوں سے تو وہ نہیں چھپ سکتا تھا۔ میرے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میں تڑپ کر باہر جانے والے راستے پر آ گیا۔ وہ دس بارہ لوگ تھے اور ان میں سب سے آگے چھا کا کھڑا تھا جو سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔

”ہماری تم لوگوں سے دشمنی نہیں ہے، جو ہتھیار پھینک کر ایک طرف ہو جائے گا اسے کچھ نہیں کہیں گے فوراً ہٹ جاؤ۔“ انہوں نے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ میں باہر نکلا لیکن میرے ساتھ والے حوالاتی باہر نہیں آئے وہ وہیں دبکے بیٹھے رہے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور چھا کے پاس جا پہنچا، اس نے کوئی بات کیے بغیر پائلٹ مجھے دے دیا تو ایک طرح کی قوت میرے اندر بھر گئی۔

”چل نکلتے ہیں۔“ چھا کے نے کہا تو میں نے منیر باجوه کی طرف دیکھتے ہوئے چھا کے سے کہا۔

”ذرا ٹھہرو، تھوڑا ادھار چکا لوں۔“

”تم نکل جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔“ وہ مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

”تو کچھ نہ کہہ لیکن مجھے تو کچھ کہنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے بولٹ مارا اور اس کی ران پر نال رکھ کر فائر کر دیا۔ وہ دھم سے زمین پر گر گیا۔ میں نے دوسرا فائر اس کی دوسری ران میں کیا تو وہ ٹوٹنے کی ساتھ اونچی آواز میں چیخنے لگا۔ تب میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا ”میں تجھے ماروں گا نہیں کیونکہ زندہ رہے گا تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔“

میں چھوٹی بڑی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا، میں وہاں دیک کر بیٹھا رہا اور ان لوگوں کو دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد وہاں دکھائی نہیں دیے لیکن میں نے رسک نہیں لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری طرح بھی کہیں چھپے اس تاک میں تو نہیں کہ اگر میں یہاں ہوں تو باہر نکلوں گا۔ مگر شام تک کچھ ایسا نہیں ہوا۔

سورج مغرب کی آغوش میں ڈوبنے کو بے تاب تھا کہ میں وہاں سے نکلا۔ میں بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کسی بستی کی تلاش تھی۔ وہاں سے میں کوئی نہ کوئی مدد لے سکتا تھا۔ پھر میں یہ سوچنے لگا کہ انہیں کیا جھوٹ بچ کہہ کر مطمئن کروں گا کہ وہ میری مدد کرنے کو تیار ہو جائیں۔ مجھے بہر حال کسی بستی کو تلاش کرنا تھا اس لیے چلتا گیا۔ اس وقت میرے حواس قابو میں آنے لگے، جب میں نے کچھ دور ایک بستی کے آثار دیکھے۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھ گیا۔

اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا، جب میں اس بستی کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا، گاؤں کے ایک طرف لکڑیاں گاڑ کر اور جھاڑیوں کی مدد سے دائرے کی صورت میں پاڑ لگائی ہوئی تھی۔ اس میں گائیں اور کچھ اونٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر بستی تھی۔ ان مویشیوں کے پاس کوئی نہ کوئی بندہ ضرور ہوگا، یہی سوچ کر میں اس جانب بڑھ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک نوجوان سال کا دھوٹی باندھے اوپری جسم سے نگا تیزی سے مویشیوں کے سامنے چارہ رکھ رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک دوسرا شخص گائے کا دودھ دودھ رہا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ تبھی چارہ ڈالنے والے کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر میری جانب دیکھنے لگا، پھر اونچی آواز میں پوچھا۔

”کون جوان ہے تو.....؟“

”میں ایک مسافر ہوں، کچھ دیر آپ لوگوں کے پاس ٹھہرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے آ جاؤ پر دھیان سے تمہارے راستے میں کتا بندھا ہوا ہے۔“ اس نے کہا، تو میں کتے سے بچ کر آگے بڑھا، وہ کتا بھی کوئی بلا چیز تھا، کافی بڑا منہ تھا اس کا اور اچھا خاصہ قائد، لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ایک اجنبی کو قریب پا کر وہ ذرا بھی نہیں بھونکتا تھا۔ یہی سوال جب میں نے اس نوجوان سے کیا تو وہ بولا۔ ”ابھی بندھا ہوا ہے اور ہم ارد گرد پھر رہے ہیں اس لیے یہ خاموش ہے۔ کتے بھی نسلی ہوتے ہیں۔ خیر تو آ بیٹھ.....“ اس نے ایک چار پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اس پر بیٹھ گیا تو چند منٹ بعد پانی لے کر میرے پاس آ گیا۔ دوسرا آدی آرام سے دودھ دھوتا رہا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کھانا کھائے گا؟“

”اگر زحمت نہ ہو تو کھلاؤ، میں بہر حال آپ سے مدد چاہوں گا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے میرے قصبے پہنچا دو۔“

”کون سی جگہ سے ہے تو.....؟“ اس نے سمجھنا چاہا تو میں نے اسے سمجھا دیا۔ تبھی وہ بولا۔ ”وہ تو یہاں سے کافی دور ہے.....“

”چلو آپ مجھے کسی نہ کسی طرح سڑک تک پہنچا دو جس طرف سے میں آیا ہوں۔“ میں نے التجائی انداز میں کہا تو اس وقت وہ بندہ جو دودھ دھو رہا تھا اٹھتے ہوئے بولا۔

”یار ابھی تو آیا ہے ذرا سا سانس لے، کھانا وانا کھا، پھر پہنچا دیتے ہیں۔ اتنی جلدی کیا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے پرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ میں کافی حد تک تھک چکا تھا لیکن ان کا دوستانہ رویہ دیکھ کر میری ساری تھکن جاتی رہی تھی۔ تبھی مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ میرے پاس پستل ہے، کہیں اسی وجہ سے یہ متنفر نہ ہو جائیں۔ تب میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی.....! یہ میرے پاس اکلوتا ہتھیار ہے، چاہو تو آپ اسے اپنے قبضے میں لے سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے پستل نکال کر چار پانی پر رکھ دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے تو کوئی شریف آدمی نہیں ہے خیر.....! تو اب اگر ہمارا مہمان بن ہی گیا ہے تو رکھ اسے اپنے پاس

میں انہیں ویسے ہی چھوڑ کر چھاکے کے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔ انہوں نے دو کاریں اور موٹر سائیکل لے کر یہ کارروائی کی تھی۔ ہم نے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

”مجھے رات ہی معلوم ہو گیا تھا ان کی خباثت کا، اس لیے میں نے سوچا کہ جب وہ پوری طرح اپنی خباثت دکھالیں تو میں ایسا کروں۔“ چھاکے نے مجھے بتایا

”ہم واپسی نورنگر تو نہیں جاسکیں گے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تجھے سوہنی کے پاس بھیج دینا ہے تو چند دن وہاں رہ کر سکون کر، پھر دیکھتے ہیں۔“ چھاکے نے یوں کہا جیسے وہ پہلے ہی سوچ چکا ہو، میں خاموش ہو گیا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ اچانک ہم پر فائر ہونا شروع ہو گئے، اس افتاد پر ہم چونک گئے کہ یہ کون ہے پولیس والے اتنی جلدی ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے تھے، میں نے گھوم کر دیکھا، ہمارے پیچھے فور وہیل جیپیں تھیں۔ ایک فور وہیل کی چھت سے سرنکالے ایک بندہ فائر کر رہا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ چھاکے نے تذبذب میں کہا۔ اب کس کو کیا معلوم کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ جانی شوکرانگی گاڑی میں تھا اور موٹر سائیکل اس سے آگے۔ اچانک ہماری کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا، اور کار ہچکولے کھانے لگی۔ اس کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ ذرا نیور نے بہت مشکل سے اسے قابو میں کیا لیکن پھر بھی وہ ایک ٹیکر کے درخت میں جا لگی۔ اچانک ہی سب کچھ آنا فانا ہو گیا۔ خود کو بحفاظت پا کر میں تیزی سے باہر نکلا، تب تک جانی شوکر اور اس کے ساتھی حملہ آوروں کی فائرنگ کا جواب دینے لگ گئے تھے۔ وہ سڑک میدان جنگ بن گئی تھی۔ میری پشت پر ریلوے لائن تھی۔

فور وہیل گاڑیاں وہ پار نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے چھلانگ ماری اور ریلوے ٹریک کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں جتنی ہوئی زمین پر لیٹ کر میں نے چھت سے سرنکالے حملہ آور پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور وہ لڑھکتا ہوا گاڑی میں غائب ہو گیا۔ ایسا ہی میں نے پچھلی گاڑی والے کے ساتھ کیا۔ وہ بھی لڑھکتا ہوا گاڑی کے اندر غائب ہو گیا۔ میں نے دیکھا، چھاکا اور ذرا نیور بھاگ کر جانی شوکر والی گاڑی میں چلے گئے ہیں۔ وہ ایک سمت سے شدید فائرنگ کرنے لگے تو حملہ آور کی طرف سے بھی اس طرح کی شدت ہونے لگی۔ میرے میگزین میں چند گولیاں تھیں، جنہیں میں حکمت عملی ہی سے استعمال کر سکتا تھا۔ میں شست لیے لیٹا ہوا تھا کہ کوئی میری ریخ میں آئے۔ میں کسی طرح بھی چھاکے وغیرہ کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس فائرنگ میں کمی ہو تو پتہ چلے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ بلاشبہ ان کا تعلق ہمارے انہی دشمنوں سے تھا جو مجھے گھیر کر مارنا چاہتے تھے اور وہ شاہ زیب کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے شست لے کر چار گولیاں اس طرح چلائیں کہ ان کی گاڑیوں کے دو دو ٹائر برسٹ کر دیئے۔ ان کی گاڑیاں ناکارہ ہو گئی تھیں اور وہ وقتی طور پر پرچھپا نہیں کر سکتے تھے۔ اچانک میری نگاہ سڑک پر زور سے آتی ہوئی پولیس گاڑیوں پر پڑی، ممکن ہے۔ وہ انہی کی اطلاع پر آئی ہوں یا منیر باجوہ وغیرہ کے وہ کسی نزدیکی تھانے سے تھیں یا کیا تھا، بہر حال پولیس کی گاڑیاں دندناتی ہوئی آ رہی تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ حملہ آوروں کی سمت کی طرف سے آ رہی تھیں۔ عقل مندی کا تقاضا تو یہی تھا کہ چھاکا لوگ وہاں سے بھاگ جائیں ورنہ جولا شیں گرتی سو گرتیں باقی گرفتار ہو جاتے، اور انہوں نے یہی عقل مندی کی وہ فائرنگ کرنا چھوڑ کر ایک دم سے سرپٹ بھاگ نکلے۔ اب میرا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں جنوب کی طرف نشیب میں اتر اور تقریباً بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا۔ میرے سامنے دور تھا۔ ریتیلی زمین تھی جس میں جا بجا جھاڑیاں تھیں۔ میں اس پر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے جھاڑیوں کا جھنڈا دکھائی دیا۔ میں اس میں سستلنے اور سانس لینے کے لیے چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے جب ذرا سا ہوش آیا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میں تقریباً کلومیٹر سے زیادہ سفر طے کر آیا تھا اور کچھ لوگ ریلوے ٹریک پر پھر رہے تھے۔ دور دور تک وہاں ریتیلی زمین تھی۔

دیا ہے کہ تم آئے تھے لیکن شام ہی کے وقت تم چلے گئے تھے۔ میں جانتا ہوں وہ تصدیق کیے بغیر نہیں ملیں گے۔ اس لیے تم نکل جاؤ یہاں سے۔“

”نکل جاؤں.....؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”مگر وہ ہیں کون؟“

”وہ شاہ زیب ہی کے لوگ ہیں انہوں نے ہی حملہ کیا تھا وہی اپنے ساتھ پولیس لگا کر لائے تھے۔ اس وقت اگر وہ یہاں آئے ہیں تو ہمارے علاقے کے بڑے زمیندار پیر سائیں کے بندوں کو ساتھ لائے ہیں۔ ہم پیر سائیں کو انکار نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں چھپا بھی نہیں سکتے کہ پھر بعد میں شکوہ آئے گا..... تم نکل جاؤ۔“ اس نے یوں کہا جیسے ابھی رو دینے کو ہو۔

”اگر ہم پیر سائیں کے پاس چلے جائیں تو.....“ میں نے یونہی ایک خیال کے تحت کہا۔

”وہ تجھے پکڑ کر شاہ زیب کو دے دے گا“ کیونکہ وہ تم سے پہلے ان کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ تو دیر نہ کر اور نکل جاؤ زندگی رہی تو صبح تک تجھے کوئی نہ کوئی بستی مل جائے گی۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پٹل اٹھا کر اڑسا جوتے پہنے اور اس طرف چل دیا جدھر بڑے بھائی نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں باڑ میں سے ایک چھوٹا سا راستہ تھا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ میں اس طرف ہی سے نکلا تھا کہ کافی سارے لوگ باڑ کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں خاموشی سے دبک کر بیٹھ گیا۔ بلاشبہ انہیں یقین نہ آیا ہوا اور وہ تصدیق کرنے باڑ کی طرف آ گئے تھے۔ اس لمحے بڑا بھائی تیزی سے جھوپڑی میں چھپ گیا۔ اب میرا وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اپنی ہمت مجتمع کی اور جدھر میرا منہ ہوا ادھر چل پڑا۔ میں نے اپنے تئیں سڑک کی طرف جانے والے راستے ہی کو اپنایا تھا میں تیز تیز قدموں سے چلتا چلا گیا۔ راستے میں جھاڑیاں ہیولوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ اگرچہ میں سمجھتا تھا کہ انسانی ذہن جب خوف زدہ ہو تو وہ اپنے ہی بنائے ہوئے ہیولوں سے ڈرتا رہتا ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا حال تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی کسی جھاڑی کی اوٹ سے کوئی بندہ برآمد ہوگا اور مجھ پر جھپٹ پڑے گا اس کے علاوہ مجھے صحرائی جانوروں سے بھی محتاط رہنا تھا میں بڑھتا چلا جا رہا تھا چاندنی رات ہوتی تو شاید میں اتنا نہیں گھبراتا لیکن موت کا خوف اور زندگی بچانے کا حوصلہ مجھے آگے ہی آگے بڑھائے لیے جا رہا تھا۔

نجانے میں نے کتنا سفر کیا تھا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے اور زبان خشک ہو چکی تھی۔ مشرق کی جانب سے صبح کی سرخی نمودار ہو گئی تھی اور میری ٹانگیں تھکن کی وجہ سے جواب دے رہی تھیں۔ اندھیرا ہونے کے باعث مجھے کوئی بتی ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں رکا تو شاید میں گزرتے ہی بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں بے تابی سے سورج کے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی میں کبھی بھی مجھے سورج دیکھنے کی اتنی بے تابی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو رہی ہے۔ دھندلا سا پھیل رہا تھا۔ ارد گرد کا منظر تھوڑا واضح ہونے لگا تو مجھے ایک اونچا ٹیلا دکھائی دیا۔ میں اس پر چڑھنے لگا تاکہ دور دور تک دیکھ سکوں کہ کوئی بستی ہے یا پھر کوئی زندگی کے آثار ہیں تو میں اس طرف جاسکوں۔ میں ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس وقت مجھے سخت مایوسی ہوئی جب دور دور تک لقمہ صحرانہ تھا اور جھاڑیاں تھیں۔ ایک دم سے میرا حوصلہ جواب دے گیا اور پھر مجھ میں اٹھنے کی سکت ہی نہ رہی۔ میں اپنی ماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی یاد کرنے لگا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن زبان کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا مگر رونے سے باز رہا تھا۔ اچانک میری ماں کی اوٹ سے سوئی کی جھلک دکھائی دی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میری

تیرے لیے روٹی لاتے ہیں تو پھر بات کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دونوں وہاں سے نکلے چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ انہوں نے اتنی جلدی مجھ پر اعتماد کر لیا تھا۔ مگر میری یہ خام خیالی تھی اس کا مجھے بہت بعد میں احساس ہوا۔ اس وقت میں اس بات پر حیران تھا اور سیدھا ہو کر چار پائی پر لیٹ گیا مجھے بہت سکون محسوس ہوا۔ اس لیے لیتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں چنگیر اور برتن پکڑے کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پانی تھا اس نے میرا منہ ہاتھ دھلویا اور پھر کھانا میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ اس دوران وہ مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں؟ اور کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے انہیں ساری بات سچ بتادی۔

”دیکھ میرے بھائی.....! جو تو نے کہا ہے اگر یہ سچ ہے تو پھر تو رات یہیں رہ صبح میں خود تجھے سڑک پر چھوڑ آؤں گا“ لیکن اگر تو نے جھوٹ بھی بولا ہے تو ہمیں کوئی نقصان نہیں۔ صبح تجھے سڑک تک پہنچا ہی دیں گے اس لیے کہ تو اب ہمارا مہمان ہے۔“ بڑے بھائی نے کہا جو دودھ دھو رہا تھا۔

”میں نے پہلے سوچا تھا کہ آپ لوگوں سے جھوٹ سچ کہہ دوں گا“ لیکن سچ بولنے کا حرج بھی کوئی نہیں ہے۔ اب جو چاہو آپ لوگ میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہو۔“

”ہم ان دیرانوں میں یونہی نہیں بیٹھے ورنہ ہم روز لٹ جاتے“ تیری طرح کوئی آتا اور پٹل دکھا کر ہمارا مال ہم سے چھین کر لے جائے۔ ہم اپنا بندوبست رکھتے ہیں۔ تم ہماری بستی میں اپنی مرضی سے آگئے ہو لیکن یہاں سے جاؤ گے ہماری مرضی سے۔ خیر.....! اگر تجھے جانے کی اتنی جلدی نہ ہو تو کل دوپہر کے وقت تجھے تیرے قصبے تک پہنچا سکتے ہیں۔“ ان میں سے بڑے نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں گاڑی آتی ہے دودھ لینے کے لیے وہ جب واپس جائے گی تو اس میں تجھے بٹھا دیں گے وہ اس قصبے میں جاتی ہے۔“ بڑے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جیسے آپ لوگوں کی مرضی آپ کا اتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے رات یہاں ٹھہرنے دیا۔ ویسے میں پیدل بھی واپس چلا جاؤں گا۔“ میں مایوسانہ انداز میں بولا۔

”نہیں یار“ تجھے سڑک تک چھوڑ دیں گے۔“ ان میں سے چھوٹے نے ہنسنے ہوئے کہا۔ تبھی ذرا فاصلے پر بنی جھوپڑی کی چھت پر سے ایک بندہ اتر آیا۔ وہ ان کا تیسرا بھائی تھا اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اترتا تو چھوٹا وہی گن لے کر اوپر چلا گیا۔ مجھے ان کی خود اعتمادی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ اس لیے مجھے لیتے ہوئے پھر نیند آ گئی لیکن یہ نیند بڑی کچی تھی کچھ دیر بعد یونہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا جیسے بے چینی اندر بھر گئی ہو۔ ممکن ہے اجنبی جگہ ہونے کے باعث ایسا ہو رہا ہو یا شاید کچھ دیر پہلے جو تھوڑی سی نیند کی تھی اس باعث ہو۔ بہر حال میں کچی کچی نیند میں پڑا رہا۔

رات کا نجانے وہ کون سا پہر تھا جب مجھے لگا کہ ماحول روشناس نہ کیا ہے۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے دن چڑھ آیا ہے مگر جیسے ہی میں اپنے حواسوں میں آیا تو مجھے سمجھ آئی کسی گاڑی کی تیز روشنی باڑے کی طرف پڑ رہی تھی۔ کتابڑے الرٹ انداز میں ان کی طرف دیکھ کر یوں کھڑا تھا جیسے ابھی چھپنے کے لیے چھلانگ لگا دے گا۔ ایسی ہی ایک فور و ہیل دوسری طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ میں ابھی صورتحال سمجھ ہی رہا تھا کہ بڑا بھائی تیزی سے باڑے میں آیا اور مجھ سے بولا۔

”یار! تو نے جو کہا وہ سچ ہے اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ایسے سچے بندے کا ہر طرح سے ساتھ دینا چاہیے لیکن کیا کروں ہماری ہی بستی کے ایک بندے نے اپنے بھولپن کی وجہ سے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور میں نے ان سے جھوٹ بول

کی بناء پر بھی اسے پکڑ لیا تو صورتحال کے مطابق اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔

انسان خود کو جتنا مرضی مظلوم سمجھے بدلے یا انتقام میں جس حد سے بھی گزر جائے، رد عمل میں جتنی مرضی شدت ہو، جرم آخر جرم ہوتا ہے۔ اس کا احساس انسان کے اعصاب پر حاوی ضرور ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص گناہ کی نیت سے جرم نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی توجیہ بہانہ یا وجہ تلاش کر لی جاتی ہے، تبھی پوری شدت سے جرم کر لیا جاتا ہے، لیکن جس طرح اچھے کام کی ایک روحانی خوشی ہوتی ہے اسی طرح جرم کرنے کا بھی احساس منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ ہسپال اس وقت اسی اثر سے گزر رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا وہ منتظر تھا۔ ایک طویل قطار لگی ہوئی سی اور پولیس تلاشی لے رہی تھی۔ اب یہ وقت نہیں تھا کہ وہ منالی سے ہدایات لیتا پھرے۔

”ہم پنجاب اور راجھستان کی سرحد پر ہیں۔ اور یہاں پولیس کی بہت بڑی چوکی ہے۔“ رانا چرن نے بڑبڑاتے ہوئے اسے بتایا، جس پر ہسپال خاموش رہا۔ وہ خود کو آنے والے وقت اور حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ بڑی اور چھوٹی گاڑیوں کی دو قطاریں تھیں، جنہیں بڑی تیزی سے چیک کیا جا رہا تھا۔ تبھی دو پولیس والی اس بس میں بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی سوار یوں پر ایک نگاہ ڈالی، ان کا انداز انتہائی مشکوک نہ تھا، ہسپال نے انہیں اکتاہٹ بھرے انداز میں دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پولیس والے ابھی تک گاڑی ہی میں تھے کہ ایک تیر طراز لڑکا بس میں آیا، اس کے پاس ہینڈی کیمر تھا، اس نے آنا فانا سب کی تصویریں بنائیں اور اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں پولیس والے بھی اتر گئے۔ بس ریٹنگ لگی، کچھ ہی دیر بعد وہ چوکی پار کر گئے تھے۔ تقریباً دو کلومیٹر چلنے کے بعد بس ایک ڈھابے پر رک گئی۔ اگرچہ یہ اتنا لمبا سفر نہیں تھا کہ کچھ کھانے پینے کی ضرورت محسوس ہو۔ مگر یہ ڈرائیور کی مرضی تھی۔ اس نے گاڑی روک دی۔ وہ دونوں اترے اور ایک الگ تھلگ میز کے قریب کرسیوں پر جا بیٹھے۔

”ہم اس وقت راجھستان میں ہیں۔ پنجاب پولیس کا اثر یہاں پر نہیں ہی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم خطرے سے باہر ہیں، ممکن ہے یہاں خفیہ والے پھر رہے ہوں۔“ رانا چرن نے کہا تو ہسپال نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”سیسر یہاں سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جب تک اس بس نے یہاں سے چلنا ہے، میں اس وقت تک آپ کو سیسر پہنچا سکتا ہوں۔“ وہ کافی حد تک شوخ انداز میں بولا۔

”وہ کیسے؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”یہاں بسوں کے علاوہ کاریں بھی کھڑی ہیں۔ لاک کیسا بھی ہو، میں کھول لیتا ہوں۔ آپ بس سڑک تک چلیں، میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔ ہم نکل چلیں گے۔ سیسر میں جا کر چھوڑ دیں گے۔“ رانا چرن نے فخریہ انداز میں کہا اور اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کر دی۔ اس دوران ویٹر چائے کا آرڈر لے گیا۔

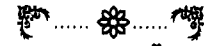
”یار ہمیں رسک لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ منالی ہمیں کچھ بتائے گی۔“ اس کا مطابق ہمیں آگے چلنا ہے۔ تم ذرا صبر کرو میں دیکھ لوں گا تمہاری مہارت.....“ ہسپال نے کہا اور منالی کے نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔ تبھی وہ پریشان لہجے میں بولی۔

”بس میں وہ..... تم سے رابطہ کرنے والی تھی۔ میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی وہ.....“

”منالی..... تم ہوش میں ہو کیا پریشانی ہے؟“

”ابھی تو کوئی پریشانی نہیں، بس میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم سیسر پہنچ جاؤ تو پھر آگے کسی کے سپرد کردوں..... میں اسی رابطے میں لگی ہوئی تھی۔ کب تک پہنچ رہے ہو سیسر؟“ اس نے پوچھا۔

ماں کا خیال رکھنا۔ میں اس سے کہہ نہیں پایا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ کافی دور کھڑا چھا کا میرے پاس آنا چاہتا تھا، پر وہ نہ جانے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑھ نہیں سکتا تھا۔ میں بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ ہلنے کی سکت بھی نہیں بچی تھی۔ میں چیخ کر انہیں اپنے پاس بلانا چاہتا تھا، پر میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں کچھ زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ رنگ برنگے ستاروں کی کھٹکشاں لگ گئی، وہ بلبلوں کی طرح ادھر ادھر پھیل رہے تھے۔ اس دوران اماں، سوئی اور چھا کے معدوم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نیند میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ پھر مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔



ہسپال اور رانا چرن سیٹ مل جانے پر بیٹھ گئے تھے۔ تبھی ہسپال نے منالی کو سیل فون پر پیغام کے ذریعے بتایا کہ وہ کس صورتحال میں ہیں جس پر منالی نے جواباً پیغام بھیج دیا تھا کہ فی الحال وہ ”سیسر“ پہنچیں، وہاں سے پھر آگے جانا ہے یا امرتسر کی طرف جو بھی ہوگا، وہ طے کر کے بتاتے ہیں۔ تاہم پولیس پورے زور و شور سے تلاش کر رہی ہے۔ اس کے لیے وہ جدید ترین آلات کی بھی مدد لے رہے ہیں۔ اس قتل کا شور اس لیے بھی نیوز چینل پر زیادہ ہے کہ یہ رویندر سنگھ ایم ایل اے کے دوسرے بیٹے کا قتل تھا۔ ابھی تک خود رویندر سنگھ کا بیان جاری نہیں ہوا تھا، کیونکہ وہ دہلی سے چند ہی گزے آ رہا تھا۔ حالات بہت کشیدہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پیغام رسانی کر رہے تھے کہ اچانک رانا چرن یوں تڑپا جیسے کسی بچھونے کاٹ لیا ہو۔

”کیا ہوا؟“ ہسپال نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ..... وہ دیکھو سامنے سڑک پر.....“ اس نے سرگوشی میں کہا تو ہسپال نے سڑک پر دیکھا جو کارا انہوں نے کچھ دیر پہلے اسٹاپ پر چھوڑی تھی، وہی کار سڑک پر تھی۔ اس کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں جا رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ بعید نہیں تھا کہ وہ بس روکا کر اس کی تلاشی لینے لگتے۔ پولیس درست سمت میں ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ اگلے اسٹاپ پر یا کہیں بھی تلاشی ممکن تھی۔ یہ انتہائی خطرناک صورتحال تھی۔ پولیس گھیر رہی تھی اور وہ گھیرے میں آ جانے والا تھا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جلتی ہوئی بس سے چھلا نکلتا۔ کیا اسے فوراً بس چھوڑنا ہوگی یا پھر صبر سے کام لیتے ہوئے بے نیاز بنے رہنا چاہیے؟ کیا وہ اسے پہچان لیں گے؟ تبھی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے؟

”سکون سے بیٹھے رہو۔“ ہسپال نے آہستگی سے کہا اور منالی کو پیغام بھیج دیا کہ صورتحال کیا ہے۔ چند لمحوں بعد اس کا فون آ گیا۔

”صورتحال تو خطرناک ہو گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دو۔ مجھے وہاں سے نکلتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی ہے، میں کچھ دیر بعد گھر پہنچ رہی ہوں، میں پھر بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔“

”تک.....“ اس نے مختاط انداز میں کہا جسے منالی سمجھتے ہوئے بولی۔

”کسی طرح سیسر تک پہنچ جاؤ، ویل اینڈ گڈ آگے بہت ہیں سنبھالنے والے، اگر ضرورت محسوس کرو کہ تمہیں بس چھوڑنا ہے تو چھوڑ دینا۔ میں تم سے رابطہ میں ہوں، سیل فون کی حفاظت کرنا، اوکے۔“

”اوکے.....!“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ رانا چرن اس کی طرف تجسس بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ ہسپال نے اس کا ہاتھ تھپکا، جس کا یہی مطلب تھا کہ وہ پرسکون رہے اس نے دھیرے سے سینے کے ساتھ پشت لگالی۔ گویا اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ بس اپنی مخصوص رفتار سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ ہسپال کی پوری توجہ سڑک پر تھی۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے اور وہ پوری طرح تیار تھا کہ اگر پولیس نے کہیں بھی بس روک کر تلاشی شروع کر دی تو وہ پولیس کا سامنا کرنے کے لیے رکے گا، بھاگے گا نہیں۔ اس کی پوری کوشش ہوگی کہ شک نہ ہونے دے۔ لیکن اگر انہوں نے شک

ساتھ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ابھی اس قاتل کی تصویر دکھائی گئی ہے یہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت پورے پلان کے ساتھ مجھے اور میرے خاندان کو مارنے کی کوشش تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک بندے کا کام نہیں ہے اس میں غیر ملکی مداخلت اور شدت پسند تنظیموں کا پورا پورا ہاتھ ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمیں سیاست سے الگ کرنے کی سازش ہے۔ میرے دو بیٹوں کو قتل کیا گیا۔ پولیس آفیسر بھی قربان ہو گئے اور ایک بیٹا ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ میں حکومت سے مانگ کرتا ہوں کہ بڑے پیمانے پر اس گروہ کو تلاش کیا جائے چوبیس گھنٹے کے اندر اس قاتل کو پکڑا جائے ورنہ میں احتجاجی طور پر پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا دوں گا۔ میرے ساتھ میرے سیاسی دوست بھی ہیں۔ میں اس میں حکومت کی نااہلی سمجھوں گا کہ وہ قاتل کو چوبیس گھنٹوں میں گرفتار کر کے قانون کے حوالے نہ کر سکی۔ کیا ہماری سیاسی اور قومی خدمات کا یہ صلہ دیا گیا ہے کہ ایک بوڑھے باپ کو اپنے جوان بیٹوں کی لاشیں اٹھانا پڑیں۔“

”کیا آپ کے بیٹے کی آخری رسومات گاؤں میں ہوں گی یا یہیں چندی گڑھ میں۔“ کسی نے سوال کیا۔
 ”یہیں..... یہیں چندی گڑھ میں۔ کل اسی وقت میں پارلیمنٹ کے سامنے ہوگا اگر قاتل نہ پکڑا گیا تو میرا تب تک احتجاج جاری رہے گا۔“

اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا تو منالی کی آواز ابھری۔

”وہ ایئر پورٹ سے نکل گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں شہر کے قریب پہنچ کر تمہیں بتاتا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو وہ بولی
 ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارا نام نہیں گیا ہے، سی سی کمرے کی تصویر میں تم اتنے واضح نہیں ہو، ٹیک کئیر“

”اوکے“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے اندر ایک سکون اور طمانیت اتر آئی تھی۔ پہلی بار اس نے رویندر سنگھ کی آواز اس انداز میں سنی تھی جب وہ ٹوٹا ہوا تھا پہلی بار اس کی آواز میں طنطنہ تھا اس بار وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند لگ رہا تھا۔ اس کی پھوپھو سکھ جیت نے بھی اپنے پر یوار کے قتل پر ایسا ہی دکھ محسوس کیا ہوگا۔ وہ ایک دم ماضی میں پہنچ گیا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتیں تو اپنے دشمن کو ٹوٹا ہوا دیکھ کر کس قدر پر سکون ہوتیں۔ مگر ابھی انتقام پورا نہیں ہوا تھا وہ رویندر سنگھ کے چہرے پر دہشت اور خوف کی وہ چھائیں دیکھنا چاہتا تھا جس کی اسے خواہش تھی۔ وہی لحاظ اس کی پوری زندگی کا حاصل تھے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ رانا چرن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”سیسر شہر آ گیا ہے منالی کو بتا دے.....“

اس نے فوراً فون ملایا اور صورتحال کے بارے میں بتایا جہاں نے فون لاؤڈ کر دیا تھا۔ رانا بھی سن رہا تھا۔ اس نے شہر کے باہر ہی ایک جگہ کی نشاندہی کی کہ وہاں انہیں فوراً وکیل جیپ میں دو آدمی ملیں گے اس نے جیپ کا نمبر بھی بتا دیا۔ وہ جدھر لے جائیں چپ چاپ ان کے ساتھ چلیں جائیں۔ چند لمحوں بعد اس نے فون نمبر اور جیپ کا نمبر بھی پہنچ دیا۔ جہاں نے فوراً ہی اس نمبر پر رابطہ کیا تو دوسری طرف سے ذرا مختلف لہجے لیکن پنجابی ہی میں جواب ملا ان کا رابطہ ہو گیا تو جہاں کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔

شہر میں داخل ہونے سے ذرا قبل ایک بڑا سارا چوراہا تھا۔ وہ اسی چوراہے پر کھڑے تھے۔ وہ دونوں قد آور نو جوان تھے۔ ایک ذرا صحت مند تھا اور دوسرا پتلا سا دونوں کے نقشو تیکھے تھے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ان کی کار کو دیکھ کر ہاتھ بلایا۔ ان کے عقب میں وہی فور وکیل جیپ کھڑی تھی۔ انہوں نے گاڑی قریب لے جا کر ایک طرف کھڑی کر دی اور ان کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے ہاتھ ملایا پھر صحت مند نو جوان بولا۔

”یار.....! میں تو چاہتا ہوں ابھی اور اسی لمحے پہنچ جاؤں لیکن اب تو یہ بس ڈرائیور پر منحصر ہے کہ وہ ہمیں کب لے کر جاتا ہے۔“

”تم لوگ وہاں سے جلدی نہیں نکل سکتے۔ یہ رانا کو کہو کوئی نگزم لڑائے تم بہت جلدی یہاں سے نکل جاؤ یہی اچھا ہے۔“ وہ تیزی سے اس طرح بولی جیسے وہ بے حد پریشان ہے۔

”تم بتاؤ بات کیا ہے پریشانی.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو اس نے بات کا نئے ہوئے کہا۔

”رانا سے بات کرو میں اسے کہتی ہوں۔“

جہاں نے فون رانا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چند لمحے بات سنتا رہا پھر فون بند کر کے جہاں کو واپس دے دیا۔ اس کے چہرے پر بہت حد تک سنجیدگی آچکی تھی۔ اس نے جہاں کی بات نہیں سنی بلکہ اسے کہا۔

”جہاں! میرے بعد اٹھ کر سڑک کے کنارے پہنچ جانا میں آتا ہوں۔“

”بات کیا ہوئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بعد میں بتاتا ہوں۔“ اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ جہاں تذبذب میں اٹھ کر ٹہلنے والے انداز میں اٹھ گیا اور چلتا ہوا بس کی اوٹ سے سڑک کی جانب بڑھ گیا۔ ڈھابے سے سڑک تک کا فاصلہ کوئی دو سو گز تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا رانا ایک گاڑی کی ڈرائیونگ سائیڈ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ نئے ماڈل کی ہنڈا تھی۔ چند لمحوں بعد وہ اس میں بیٹھ چکا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر تیزی سے گھومتا سڑک کی جانب بڑھتا چلا آیا۔ گاڑی اس کے قریب رکی تو وہ اس میں بیٹھ گیا۔ رانا نے پیر پر ہی رفتار بڑھادی گاڑی نئی تھی اس لیے اس کی پک اپ بھی زیادہ تھی کچھ دیر بعد وہ تیز رفتاری سے کافی دور تک نکل آئے۔

”اب بتاؤ منالی پریشان کیوں تھی؟“

”شاپنگ مال کے سی سی کیمروں میں تمہاری ساری کارروائی ریکارڈ ہو گئی ہے۔ اس میں صرف تمہیں منالی بھی واضح ہے پولیس اسے بھی تلاش کر رہی ہے۔“

”منالی کو اب گھر آ کر پتہ چلا.....؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں.....! دراصل تمہاری تصویر اور نام اس وقت مختلف چینلز پر چل رہے ہیں۔ تمہیں پہچان لیا گیا ہے۔ اس لیے اب چند دن کے لیے تجھے کسی محفوظ ترین ٹھکانے پر رہنا لازمی ہوگا۔“ رانا نے کافی حد تک تشویش زدہ لہجے میں کہا تو اس نے اپنے اندر شدت محسوس کی۔ ایک دم سے جو خوف اس کے اندر موجود تھا وہ نجانے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ بے خوف ہو گیا۔ جب تک وہ چھپا ہوا تھا اس کے ساتھ خوف بھی بندھا ہوا تھا۔ اب اگر چینلز نے اسے دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا تھا تو پھر خوف کس بات کا آئے سامنے کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ منالی کا فون آ گیا۔

”کیا تم پولیس سے محفوظ ہو؟“ جہاں نے اس سے پوچھا۔

”مجھے زیر زمین جاتے اتنا وقت نہیں لگتا میں آگے دس منٹ میں خود کو سنبھال لوں گی۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ جب تک تم سیسر نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک میری ذمہ داری میں ہو۔“

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ میری تصویر اور.....“ اس نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”میں خواہ مخواہ تمہیں ذہنی دباؤ میں نہیں لانا چاہتی تھی اب اس لیے بتایا کہ ممکن ہے وہاں تمہیں کوئی پہچان لے اور مصیبت بن جائے خیر چھوڑو ان باتوں کو وہ رویندر سنگھ ایئر پورٹ پر پہنچ چکا ہے اور رپورٹر اس سے بات کر رہے ہیں سنو“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون ٹی وی کے قریب کر دیا۔ کوئی بھاری آواز میں ٹھیک پنجابی زبان میں اکھڑے ہوئے لہجے کے

”میں راؤ وریام سنگھ اور یہ راؤ ہرنام سنگھ..... اب آپ کا کوئی بال باکانائیں کر سکتا۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھ گیا، دوسرا آگے والی پینچر سیٹ پر براہمان ہو گیا جب جہاں اور رانا پچھلی نشست پر سکون سے بیٹھ گئے، چپ چلی تو ہرنام بولا۔

”جی آگیا جی، آپ کو دیکھ کے..... ٹی وی پر تو آپ کا پھوٹو بڑا مدھم بھر آ رہا تھا۔ جوان ہو تو ایسا جی..... پلس کو ہلا کے رکھ دیا۔ حکومتیں ڈھونڈ رہی ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب ہم نے جانا کہاں ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”دو گھنٹے دے دو ہمیں بس..... صورت گڑھ میں اپنا گھر ہے، باپو آپ کا انتظار کر رہا ہے بڑی شدت سے، آپ کے بغیر روٹی نہیں کھانے والے..... آپ سکون کرو.....“ وریام نے کہا تو وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔ اعصاب کو شل کر دینے والے حالات میں ڈرائسکون ملا تو اس کی آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔ اس نے فون رانا کو تھمایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

جہاں کی جس وقت آنکھ کھلی تو گاڑی کے باہر کا منظر بدل چکا تھا۔ وہ بہترین شاہراہ تھی۔ جس کے دونوں طرف ریت تھی۔ بہت کم آبادی تھی۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے جاگتا دیکھ کر ہرنام نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”جاگ گئے جی، بڑی گہری نیند سوئے جی، لگتا ہے کافی تھکن تھی۔“

”ہاں..... ایسا ہی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے پوچھا۔ ”ہم کہاں تک آ گئے ہیں؟“

”یہی گھر سے پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر، آپ دو گھنٹے سوئے ہیں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھی جہاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اچھا.....! میرے خیال میں جس وقت منالی نے آپ سے رابطہ کیا ہوگا، اس سے لے کر آپ تک بٹنے میں آدھا گھنٹہ لگا ہوگا۔ آپ اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گئے۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کسی منالی کو نہیں جانتے اور نہ ہی ہماری اس سے بات ہوئی ہے۔“ وریام نے کہا تو جہاں کو ایک دم سے جھٹکا لگا۔ جبکہ وہ سامنے منہ کیے روانی سے کہتا چلا جا رہا تھا۔ ”باپو نے فون کر کے آپ لوگوں کے بارے میں بتایا، ہم یہاں ”ادگاڑی“ (بھایا) لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اپنا بزنس پورے راجھستان میں ہے۔ ہم نہ ہوتے تو آپ کو ہمارے ملازمین لے جاتے۔“

”منالی نے اگر بات نہیں کی تو.....“ اس نے پوچھا تو وریام درمیان ہی سے بولا۔

”یہ باپو ہی جانے۔“

اس کے یوں کہنے پر جہاں نے رانا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر بھی کافی حد تک پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اب وہ پتہ نہیں کون تھے، دوست یا دشمن، وہ انجانے میں کس کے تھے چڑھ چکے تھے۔ اگر وہ دشمن ثابت ہوتے تو بچاؤ بہت مشکل تھا۔ انجانی جگہ اور انجانے لوگ، لیکن انجانے کیوں اس کا دل مطمئن تھا، اگر وہ دشمن ہوتے تو اسے یوں سکون سے سونا نصیب نہ ہوتا اور اس کے پاس جو بائسل تھا، وہ اب تک چھین لیا گیا ہوتا۔ وہ گاڑی میں نہیں کہیں بندھا ہوا پڑا ہوتا۔ وہ اس شش و پنج میں تھا کہ صورت گڑھ شہر آ گیا۔ سامنے ہی سائیکس بورڈ پر لکھا ہوا تھا، اس نے انگریزی میں پڑھ لیا تھا۔ وریام نے شہر میں داخل ہونے کی بجائے دائیں جانب والا ایک راستہ اختیار کیا۔ جہاں سکون سے بیٹھا رہا، شہر کے مضافات میں ایک بڑی حویلی کے گیٹ پر جیپ آن رکی، انہیں دیکھتے ہی گیٹ فوراً کھل گیا۔ وہ جیپ پورچ میں لے گئے۔ کافی کھلی حویلی تھی۔ سبزہ زیادہ تھا۔ وہ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اندر سے

حویلی وہی ہندوانہ طور پر گولائی میں تھی۔ گول سیڑھیاں اوپر کو چار ہی تھیں۔ دالان اور برآمدے بنے ہوئے تھے۔ سامنے ہی صوفے پر سفید دھوئی کرتا پہنے، کاندھے پر سنہری چادر ڈالے، بخشی داڑھی اور بڑی مونچھوں والا جس کے سر کے بال بالکل صاف تھے، مولے نقوش اور صحت مند جسم والا راؤ بچن سنگھ بیٹھا ہوا تھا، انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”آؤ..... آؤ جہاں.....! میں کب سے انتظار کر رہا ہوں، بھئی باتیں بعد میں آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں ہاتھ منہ دھو کے آ جاؤ بھئی.....“ بچن سنگھ نے بے تکلف سے انداز میں کہا تو جہاں کو قدرے سکون ملا۔ جو وہ سمجھ رہا تھا، ویسا نہیں تھا۔

اس وقت وہ کھانے کی میز سے اٹھ گئے تھے اور گپ شپ کے لیے سکون سے آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے کہ جب باہر سے ایک ملازم نے ایک چٹ لاکر بچن سنگھ کو دی۔ اس نے چٹ پر نظر ڈالی ہی تھی کہ پریشان ہو گیا مگر یہ تاثر ایک لمحے کے لیے آیا، پھر غائب ہو گیا۔ اس نے ایک نگاہ جہاں پر ڈالی، پھر اپنے بڑے بیٹے وریام کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جہاں! اور رانا کو اندر کمرے میں لے جاؤ، جب تک میں نہ کہوں باہر نہیں آنا، ساری باتاں غور سے سنی ہیں تاکہ تم لوگوں کو پتہ چل جائے.....“ یہ کہہ کر اپنے ملازم سے آنے والے لوگوں کو اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ لوگ فوراً ہی ساتھ والے عقبی کمرے میں چلے گئے، جہاں کی ہول سے وہ باہر کا منظر دکھ سکتے تھے، کچھ دیر بعد تین لوگ اندر آئے، ان میں دو ادھیڑ عمر اور ایک نوجوان تھا۔ تینوں نے گرے رنگ کے سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ تینوں بچن سنگھ کے ساتھ بڑے تپاک سے ملے، انہیں بٹھایا اور بچن سنگھ نے پوچھا۔

”کیا لوگ آپ لوگ ٹھنڈا چائے؟“

”کچھ نہیں راؤ صاحب.....! بس آپ جہاں کو ہمارے حوالے کر دیں، جو ابھی پنجاب سے بھاگ کر آپ کے پاس آیا ہے۔“ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر بندے نے کہا۔

”آپ لوگ سی بی آئی سے ہوئے، لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ کوئی پنجاب سے بھاگ کر میرے پاس آیا ہے، آپ لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ بچن سنگھ نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”دیکھیں راؤ صاحب، وہ ایک جنونی قاتل ہے آج صبح اس نے قتل کیا اور چند گز سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ایک جگہ کار چھوڑی اور دوسری جگہ سے کار چوری کی، اس طرح ان کے راستے کی نشاندہی ہو گئی۔ سیر سے وہ جس گاڑی میں آئے ہیں وہ آپ کے پورچ میں کھڑی ہے، اب اس سے بڑا ثبوت ہم کیا دیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”دیکھ میرے بھائی! یہاں کوئی بھاگ کر نہیں آیا، آپ لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے، اس گاڑی میں تو میرے بچے ادگاڑی کر کے آئے ہیں، سیر ہی سے۔“ اس نے پھر نرم لہجے میں جواب دیا تو نوجوان نے تیزی سے کہا۔

”تو کیا پھر ہم حویلی کی تلاشی لے لیں۔“

”اوئے.....! بات سن.....“ بچن سنگھ ایک دم گرم ہو گیا۔ ”آج تک کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ میری حویلی کی تلاشی لے سکے، تیرے جیسے کسی سی بی آئی والے میری جیب میں ہیں۔ تو حکومت کا ملازم ہے تو ہم حکومت چلانے والے ہیں، کہہ دیا نہیں ہے، تو نہیں ہے۔“

”سوری راؤ صاحب، یہ بچہ ہے، اسے نہیں معلوم، معاف کر دیں اسے، اصل میں آپ کو شاید نہیں معلوم کہ وہ ہمارے تین بندوں کو قتل کر چکا ہے، اس کے علاوہ ایم ایل اے کے بیٹے کو.....“ ادھیڑ عمر نے کہنا چاہا تو بچن سنگھ نے کہا۔

”دیکھ میرے بھائی.....! میں بحث کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے آپ لوگوں سے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ باقی میں چیف منسٹر سے بات کر لیتا ہوں۔“

”آپ بخوشی ان سے بات کر لیں وہ بہت دباؤ میں ہیں۔ سنٹر گورنمنٹ کے وہ مسلسل رابطے میں ہیں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہوگا کہ وہ یہاں سے نکل کر کہیں اور چلا جائے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ آپ تعاون کریں اور اسے ہمارے حوالے کر دیں۔“

”میں سوچوں گا کہ آپ سے کس قدر رعاون کیا جائے۔ ابھی فی الحال آپ جاؤ۔“ بچن سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے راؤ صاحب! ہم ابھی کچھ دیر بعد آپ سے ملتے ہیں۔“ وہ ادھیڑ عمر آدمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو باقی دونوں بھی اٹھ گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد بچن سنگھ اٹھا اور ان کے پاس آ گیا۔

”سن لیا جہاں! وہ اگر یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو مطلب وہ بالکل درست تعاقب کر کے ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھو.....! مجھے وینکوور میں موجود میرے دوست نے کہا تو اس کا حکم سر آ نکھوں پر میں اپنے خون کے آخری قطرے تک تمہاری حفاظت کروں گا، لیکن.....! جس قدر تیزی سے اور جس طرح کا ان کا لہجہ ہے، وہ بتا رہا تھا کہ اسے تم جیسے ہی نکلو گے وہ تمہیں قابو میں کر لیں گے۔ پھر کیا ہوگا میں نہیں جانتا، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ابھی سی ایم کا فون آئے گا اور مجھے اس کے پاس جانا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ میں شام تک اُزار ہوں گا۔“ بچن سنگھ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر میں نکلتا ہوں جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔“ جہاں نے کسی خوف کے بغیر کہا۔

”یہ خود کشی ہوگی میرے بچے! اور جو میرے پاس ہو اور میں اس کی حفاظت نہ کروں یہ تو ممکن نہیں یہ یقین کر لو جہاں! یہاں رہتے ہوئے تم جدھر بھی جاؤ گے یہ لوگ تجھے نکلنے نہیں دیں گے۔ چینل صبح سے تیری تصویر دکھا رہے ہیں۔ یہاں بھارت میں رہنے کی تیرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کو تو سمجھ لے..... ہاں کسی کمرے میں بند رہ کر وقت گزار لے تو الگ بات ہے۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو جہاں نے سکون سے کہا۔

”تو پھر آپ بتائیں نا میں کیا کروں.....؟“

”تم ابھی یہاں سے نکلو گے..... پانچ بج چکے ہیں، لیکن اس سے پہلے ٹو جسمیندر سے بات کر لے۔ اوپر کمرے میں ہر چیز موجود ہے۔ وہ تمہیں بہترین مشورہ دے گا اور اسے صورتحال کی سمجھ بھی آ جائے گی۔“

”اوکے.....!“ جہاں نے کہا تو وہ اسی کمرے سے باہر کی جانب اشارہ کر کے خود ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ دریاہم نے اوپر والے کمرے تک اس کی رہنمائی کی۔ کچھ دیر بعد اس کا رابطہ جسمیندر سے ہو گیا۔ وہ ساری صورت حال بتا چکا تو اس نے کہا۔

”تم پاکستان اور بھارت کی سرحد کے بے حد قریب ہو اگر تھوڑی سی دشواری برداشت کر سکو تو سرحد پار کر جاؤ۔ اس کے لیے حوصلہ بھی چاہیے۔ ادھر ہمارے لوگ موجود ہیں، تجھے سنبھال لیں گے، پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“ جہاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ تم تیار ہو جاؤ، ممکن ہے میں بھی تم تک پہنچ جاؤں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں، بس حوصلہ رکھنا۔“

اس نے کہا۔

”اوکے..... ڈن!“ جہاں نے کہا دیا پھر چند باتیں اور سمجھانے کے بعد ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ تب دریاہم نے اپنی ریست و اچ پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

”آؤ..... چلیں یہاں سے نکلنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔“

وہ دونوں نیچے چلے گئے، بچن سنگھ ان کی انتظار میں تھا۔ جہاں نے اپنا فیصلہ اسے سنا دیا۔ تب اس نے سکون سے کہا۔

”میرا فیصلہ بھی یہی تھا مگر میں نے اس لیے نہیں کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں نے تم پر اپنا فیصلہ مسلط کر دیا۔ دریاہم ہے؟“

سارے معاملے نپٹا دے گا۔ یہ حسرت ہی رہی کہ تم سے لمبی باتاں کرتے، آؤ لے لو۔“ یہ کہہ کر اس نے کھڑے ہو کر دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ وہ اس سے مل چکا تو دریاہم اسے لے کر ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا، ایک الماری سے موٹے کپڑے کی شلو اور قمیص نکالی، پھر ایک بڑی ساری چادر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”تو یہ پہن لو اور اپنے کپڑے مجھے دو۔“

”تم پہنو گے۔“ جہاں نے اس کے صحت مند جسم کی طرف دیکھ کر مزاحاً کہا تو وہ بولا۔

”ارے نہیں! یہ کپڑے ایک تیرے جیسے قد بت کے بندے کو پہنا کر اوپر چھت پر بھیج دوں گا جہاں سے یہ سی بی آئی والے دیکھتے رہیں کہ بندہ موجود ہے، ساتھ میں رانا ہوگا، ہر نام ہوگا، تو یہ کپڑے پہن، پھر میں بتاتا ہوں تیرے ساتھ کیا کرنا ہے۔“

جہاں نے جین شرٹ اتاری وہ کپڑے پہنے، سر سے دستار اتاری اور وہ چادر لپیٹ لی، دریاہم کپڑے لے کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور اسے بھی ساتھ لے کر نیچے آیا، پھر اپنے چند ملازمین کے ساتھ لا کر کھڑا کر دیا۔

”ابھی یہ لوگ برتن اٹھائے باڑے میں جائیں گے، حویلی سے باہر تو بھی ان کے ساتھ ادھر جانا..... میں ادھر ملتا ہوں تم سے.....“

دریاہم نے کہا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ وہ سات آٹھ ملازمین تھے، جن کے ساتھ وہ بھی حویلی کے پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس نے کن اکھیوں سے ارد گرد دیکھا، دور ایک کونے پر سڑک کنارے چند لوگ ایک چھوٹی جیب کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ سب چلتے ہوئے ان کے قریب سے باڑے میں چلے گئے۔ انہیں شک تک نہیں ہوا کہ ان میں جہاں بھی ہو سکتا ہے۔ وہاں سے جہاں نے دیکھا، چھت پر اس کے کپڑے پہنے کوئی تھا، رانا کا ہیولا بھی لگا اور ہر نام بھی اس کے ساتھ تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دریاہم وہاں آ گیا۔ اس نے باڑے کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر دی۔ کیونکہ اس سے کچھ فاصلے پر وہ مشکوک لوگ موجود تھے۔ دریاہم اسے لیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔ جس کے دوسرے دروازے سے نکل کر وہ باہر آ گئے تو سامنے ویسی ہی ایک اور جیب کھڑی تھی۔ وہ دونوں تیزی سے اس میں بیٹھے اور مشرق کی جانب چل پڑے۔ سورج مغرب کی آغوش میں ڈوب رہا تھا۔

وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چلتے چلے گئے۔ راستے میں ایسی گزرگاہیں بھی آئیں، جہاں بہت سست روی سے گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک گاؤں میں آئے، پینچ، جس میں ایک طرف بہت بڑا تالاب تھا۔ اگرچہ ہر گاؤں میں مویشیوں کے لیے ایک تالاب ہوتا ہے لیکن وہ کچھ غیر معمولی تالاب تھا۔

”یہ سرحد کا آخری گاؤں ہے، یہاں سے فقط دو کلومیٹر کے فاصلے پر سرحد ہے۔“ دریاہم نے اسے بتایا۔

”دریاہم میری معلومات کے مطابق تو پاکستان اور بھارت کی سرحد پر باڑ لگی ہوئی ہے، جس سے گزرنے پر بہت مشکل ہوگا، وہ کیسے.....“ جہاں نے پوچھا۔

”اس لیے تو یہاں لایا ہوں، دیکھو.....! سرحد پر متعین فورس میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی، سارے فرشتے نہیں ہیں۔ ان کی اپنی بڑی ضرورتیں ہیں۔ نہ ہوں تو ہم پیدا کر دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے، ہم نے کاروبار کرنا ہوتا ہے۔ یہاں سے کچھ لوگوں کے ساتھ ہماری ذیل ہے۔ تم دیکھتے رہنا کہ ہوتا کیا ہے۔“ دریاہم نے کہا گاؤں کے ایک کچے لیکن بڑے سارے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ اگلے ہی لمحے گھر سے دو لمبے ترنگے مرد نکلے، وہ تپاک سے ملے اور انہیں سر چار پائیوں پر بٹھا دیا۔ شربت وغیرہ پینے کے بعد ان میں سے ایک نے جہاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو یہ ہے وہ جوان.....“

”ہاں یہی ہے دیکھو اسے کوئی تجربہ نہیں ہی اسے تو بس ادھر سے ادھر بھیجنا ہے آگے وہ خود دیکھ لیں گے۔“ وریام نے کہا۔
 ”دیکھیں جی، راؤ صاحب کا حکم آیا ہے تو ہم نے اچانک تیاری کی ہے۔ دو بندے ساتھ ہوں گے وہ ساتھ تو ہوں گے لیکن ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ آگے ہماری بات نہیں ہوئی اس صورتحال کا شکوہ نہیں دینا۔“
 ”نہیں ہوگا اب بتاؤ جانا کب ہے۔“

”ابھی آٹھ بج رہے ہیں۔ دس بجے کے بعد بندہ آکر بتائے گا تب تک ڈیرے پر چلتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں اور.....“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو وریام ہنس دیا۔ پھر وہ پیدل ہی گاؤں سے باہر ڈیرے کی طرف چل دیے۔
 کچے کمروں کے سامنے کھلا سارا صحن تھا جس میں سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی جانکر گدوں پر بیٹھ گئے۔ تبھی کچے کمرے میں سے دونو جوان لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ دونوں ہی گوری چٹی اور روایتی راجھستانی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ گھگھرا اور چوٹی کھلا گریبان کمر برہنہ پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں تبھی دو چار لوگ ایک طرف آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کپڑے تلے پڑا سی ڈی پیئر آن کر دیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی شروع ہو گئی۔
 ایک لڑکی وریام کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی تبھی لمبے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہی تھی اس دن والی..... ابھی دس منٹ پہلے پہنچی ہے یہ۔“

”مارو یا اس ظالم نے تو اس دن..... آج بھی کمال کر دینا ظالم.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اس لڑکی کو ہانپوں میں لے کر جھنجھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر چلتی رہی پھر وریام نے چھوڑا تو اٹھ کر ناچنے لگی۔ گانا شروع ہوتے ہی ان کے سامنے شراب بھرے پیتل کے گلاس لاکر رکھنے لگے وریام نے ایک جام جہاں کے سامنے رکھا تو اس نے دھیرے سے کہا۔
 ”میں شراب نہیں پیتا۔“

”او ظالم! پھر جیتا کیسے ہے؟“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

”بس نہیں پیتا شروع سے عادت ہی نہیں بنی۔“ جہاں نے سکون سے کہا۔

”چل ٹھیک ہے کوئی بات نہیں تو دیکھ..... ان میں شراب سے بھی زیادہ نشہ ہے۔ پاگل کر دیا ہوا ہے اس نے.....“
 وریام شاید اس طوائف پر مرعہ تھا شراب کے جام پر جام چلتے رہے۔ بھنا ہوا گوشت ان کے سامنے آتا رہا۔ پندرہ بیس لوگ تھے۔ وہ سب کھاتے پیتے اور ناچ دیکھتے رہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔
 رات ٹھہر چکی تھی دونوں لڑکیاں خوب ناچ رہی تھیں۔ ایسے میں ایک نوجوان سال لڑکا ڈیرے کے احاطے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وہ لمبا آدمی اٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے وریام کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جہاں کے ساتھ وہ بھی اٹھ گیا۔ وہ تینوں آگے پیچھے باہر نکلتے چلے گئے۔

”لو جی وریام جی، آپ نے موجی مستی کرنی ہے تو ادھر رہو یا جانا ہے تو جاؤ، اب آگے ہمارا کام ہے۔“ اس لمبے آدمی نے ڈیرے سے باہر نکل کر کہا تو وریام نے جہاں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”لے بھی جہاں! رب کے حوالے..... واہر دم پر مہر کرے بس تیری خدمت نہ کر سکا۔“

دونوں ایک دوسرے سے گرجبوشی سے ملے پھر الگ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا لمبے آدمی نے جہاں کا ہاتھ پکڑا اور اندھیرے میں چل دیا۔ وریام واپس چلا گیا تھا اور وہ دونوں پیدل ہی چل پڑے۔ کافی آگے جانے کے بعد انہیں اونٹ بیٹھے ہوئی دکھائی دیے۔

”یہ ہمارے سدھائے ہوئے اونٹ ہیں۔ یہ ہی سرحد پار کرائیں گے۔ یہ سیدھے اپنے ٹھکانے پر جائیں گے۔ انہیں اپنی مرضی سے نہیں ہانکنا۔ یہ جدھر لے جائیں ادھر چلے جانا ہے اور دوسری بات تمہارے ساتھ ایک اور بندہ ہوگا۔ وہ اتنی

”سبھو جھوالا بندہ نہیں ہے۔“ لمبے آدمی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو لمبے آدمی نے قطبی ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

”یہ دیکھو یہ تارا دیکھ رہا ہے یہ تیرے دائیں کاندھے کی طرف رہے بس پھر تو صحیح سمت میں جائے گا اسے مت بھولنا۔“
 ”ابھی کہہ رہے ہو کہ اونٹ.....“ جس پال نے سمجھنا چاہا۔

”اگر تجھے سمت سمجھنے کی ضرورت پڑے تو..... ورنہ یہ تجھے اونٹ ہی اپنے ٹھکانے پر لے جائیں گے واہر دکانا ملے اور بیٹھ اس پر.....“ لمبے آدمی نے ایک اونٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں نے پہلے کبھی بھی اونٹ کی سواری نہیں کی تھی۔ اس لیے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ کوہان کے پیچھے مضبوطی سے بیٹھ گیا تبھی لمبے آدمی نے ایک اونٹ کو اٹھایا تو باقی بھی اٹھنے لگے جہاں ان اونٹوں کی درست تعداد نہ معلوم کر سکا۔ بس اندازہ تھا کہ چھ یا سات ہوں گے۔ اس کا اونٹ تیسرا یا چوتھا تھا۔ لمبے آدمی نے ایک اونٹ کی مہار پکڑی اور سب سے آگے پیدل چلنے لگا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے وہ رک گیا۔ سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس سے دھیمی دھیمی باتیں ہوئیں تو پہلا اونٹ بٹھا دیا گیا۔ وہ بندہ اس پر سوار ہوا تو اونٹ کھڑا ہو گیا۔ اونٹ چل پڑے۔ سامنے لوہے کی اونچی اونچی باڑ دکھائی دیے گئی تھی جو روشن تھی۔ اس پر بڑی بڑی سرج لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ لائٹس بند ہو گئیں تو اونٹ تیزی سے چل پڑے۔ سامنے ایک بڑا سارا سیاہ دروازہ تھا وہ یک لخت کھلا، سبھی اونٹ اس میں سے گزرتے چلے گئے۔ یہ سارا عمل تین یا چار منٹ کا رہا ہوگا۔ جب وہ چند کھیت آگے چلے گئے تو بتیاں پھر سے روشن ہو گئیں۔ اب اونٹ قطار میں نہیں تھے بلکہ پھیل گئے تھے۔ وہ آدمی جہاں کے قریب اپنا اونٹ لے آیا۔
 ”جوان مضبوط بیٹھنا، اونٹ کو ریگستان کا جہاز کہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔

”کیا اب ہم پاکستان میں ہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ابھی نہیں چند کھیت اور پار کر لیں تو پھر..... یہ بازمین سرحد کے اوپر نہیں لگی.....“ اس نے جواب دیا۔

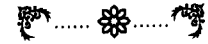
”یہ بتیاں کیوں بند کی گئی تھیں جب ان سے بات.....“ جہاں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”رات کے اس وقت مردوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور وہ بہت پھیل کر بیٹھتے ہیں۔ انہیں بھی چیک کر نیا لے ہوتے ہیں۔ بس رسک نہیں لیا۔ بڑی چوکی پر لائٹ بند کی تھی۔ یہ چلتا ہے۔ تو اب بھارت کو بھول جا۔ یہ آگے جہاں سے کھیت ختم ہو رہے ہیں اس سے آگے ریگستان ہے۔ اس ریگستان سے پاکستان شروع ہو جائے گا۔“
 ”مطلب پھر ہم پرسکون ہو جائیں گے۔“ جہاں نے اطمینان سے کہا۔

”ارے نہیں سکون تو ٹھکانے پر ہی آئے گا۔ آگے پاکستانی چوکیاں بھی تو ہیں۔ ان سے بھی بچنا ہے۔ بس تو سنہیل کے بیٹھ جہاز اڑنے کو ہیں۔“ اس نے پھر سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ جیسے قہقہہ لگانا اس کی عادت ہے۔ جہاں خاموش ہو گیا۔ چند منٹ بعد اونٹ کی رفتار تیز ہونے لگی اور پھر وہ باقاعدہ بھاگنے لگے جب وہ آہستہ چل رہے تھے تو ہچکولے کم تھے لیکن جیسے ہی وہ تیز ہوئے تو جہاں کو لگا کہ جیسے سارا کھایا پیا باہر آجائے گا۔ بہت شدید ہچکولے تھے۔ اس نے ایک بار سامنے کی طرف دیکھا اونٹ پھیل کر یوں بھاگ رہے تھے جیسے ان کی ریس لگی ہوئی ہو۔ اس نے اپنا سر اونٹ کی کوہان کے ساتھ لگا دیا۔ وہ خود پر قابو پار ہاتھا۔

نجانے انہوں نے کتنا سفر کیا تھا۔ ایک دو یا چند کلومیٹر تبھی بائیں جانب سے دو رکھیں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ وہ دو گاڑیاں تھیں۔ اسے لگا کہ جیسے وہ تیزی سے قریب آرہی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہے؟ وہ نوجوان پتہ نہیں کس اونٹ پر تھا۔ اونٹ بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ وہ گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ اس کی ساری توجہ ان ہیڈ لائٹس کو دیکھنے اور سمجھنے کی طرف لگ گئیں۔ وہ کبھی دکھائی دیتیں اور کبھی ایک دم سے غائب

ہو جاتیں۔ یہ آنکھ مجھ کی کافی دیر تک چلتی رہی۔ اچانک وہ گاڑیاں ان کے عقب میں آگئیں، پھر اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا جس نے سنانے کو چیر کر رکھ دیا۔ فائر کی آواز کیا گونجی تھی کہ اونٹ باؤ لے ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے تین فائر مزید ہوئے۔ جہاں کے لیے اونٹ پر بیٹھنا محال ہو گیا ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے بدن کا ہر عضو الگ الگ ہو جائے گا۔ اسے اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے ریڑھ کی ہڈی ابھی چمکتا چور ہو جائے گی۔ وہ سمجھ گیا کہ عقب سے ہونے والے ہوائی فائر ہیں۔ وہ انہیں مارنا نہیں چاہتے بلکہ گھیر کر ان اونٹوں کو اپنے ٹھکانے پر لے جانے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ اونٹ تیزی سے چمکتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ لڑکھڑایا، جہاں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، وہ اونٹ سے یوں گرا جیسے کسی نے اسے دھکا دے دیا ہو، نیچے ریت ہونے کے باعث اسے کوئی چوٹ تو نہیں آئی، لیکن وہ آنا فانا! بھاگتے ہوئے اونٹ کو نہ پکڑ سکا، چند لمحوں تک اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اونٹ کو نہیں پکڑ سکتا تو وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اسے اپنے حواس بحال کرنے میں کتنے ہی منٹ لگ گئے۔ جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو نہ وہاں اونٹ تھے نہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس، صحرا کی گونجی ہوئی مخصوص آواز تھی جو بلاشبہ دہشت پیدا کر رہی تھی۔ جہاں چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اچانک اسے قطبی ستارے کا خیال آیا۔ وہ اس کے باباں کا ندھے پر تھا۔ اس نے اپنی سمت متعین کی اور چل پڑا۔ یہاں بیٹھے رہنے سے زیادہ چلتے رہنا بہتر ہو سکتا تھا۔ یہاں پر بیٹھ کر اونٹ پٹانگ سوچنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ چلتے لگے۔ صحرا میں پیدل چلنا بھی کافی حد تک دشوار ہوتا ہے۔ ناہموار زمین پر وہ محتاط انداز میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے صدیوں سے اسی طرح صحرا میں سفر کر رہا ہے۔ نجانے وہ کتنی دیر تک چلتا رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ پیاس سے زبان سوکھ گئی تھی۔ اسے فقط اتنا یاد تھا کہ عقب میں آسمان پر روشنی کی لکیر دیکھی تھی، پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر ریت پر گر گیا۔



میں یہ محسوس تو کر رہا تھا کہ میں ہوں لیکن احساس یہی تھا کہ میرا وزن نہیں اور میں ہوا میں کسی خشک پتے کی مانند اڑ رہا ہوں۔ شاید بندے کا ناطہ جب زمین سے ختم ہوتا ہے اور وہ عالم برزخ کی جانب سفر کرتا ہے تو یہی کیفیت رہی ہوگی۔ میں خود کو دیکھ رہا تھا لیکن آنکھ جھپکنے کی قوت تک مجھ میں نہیں تھی۔ یہی بے وزنی کثافت سے لطافت تک کے سفر میں اپنا احساس دلاتی ہے۔ میں خود پر غور کر رہا تھا کہ میں کہاں پر ہوں؟ برزخ یہیں کہیں زمین پر ہے یا آسمان کی وسعتوں میں ہے۔ باپھر یہ کسی نئی دنیا کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا جہان ہے جو دنیا سے ہٹ کر ہے۔ میں لمحہ بہ لمحہ اپنے حواسوں میں آ رہا تھا۔ مجھے ارد گرد کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں مگر میں ان کی طرف دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے ہمت کی اور ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ بھی نہ ہوسکا۔ پھر میں نے ساری کوششیں ترک کر دیں۔ کچھ دیر یونہی پڑا رہنے کے بعد مجھے آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے ارد گرد چند لوگ کھڑے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سبھی مقامی تھے۔ ایک بندے نے مجھے اٹھایا تو پتہ چلا کہ میں چار پائی پر لیٹا ہوا ہوں۔ میرے سر کے اوپر درختوں کا سایہ ہے۔ میں حواسوں میں آتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے گھونٹ گھونٹ پانی دیا جا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میرے حواس میرے قابو میں آتے چلے گئے۔ میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ ابھی میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”میں کہاں ہوں؟“

”تم لالہ بھو ہڑ کے ٹو بے پر ہو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ ان میں سے کسی نے کہا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر باریش آدمی تھا۔ میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا اور بتایا۔

”اس وقت میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ یہ لالہ بھو ہڑ کا ٹو بے کہاں ہے؟“ لاشعوری طور پر میرے لبوں سے یہ سوال

نکل گیا۔ اس کے ساتھ دو تین دوسرے آدمی بھی تھے۔ انہی میں سے ایک نے کہا۔

”تم کچھ دیر آرام کرو، کچھ کھاپی کراپے حواس قابو میں کرو، پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”آؤ اٹھو، نہالو، تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ انہی میں سے ایک نے کہا تو میں نے ارد گرد دیکھا، دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ روشنی تیز تھی۔ میں نے ہمت کی اور اٹھ گیا۔ وہ مجھے قریب ہی ایک تالاب پر لے گئے جہاں میں نے کپڑا باندھا اور خوب نہایا۔ انہوں نے مجھے ایک صاف دھوتی اور کرتا دے دیا۔ جسے پہن کر میں پرسکون ہو گیا۔ میں ان کے ساتھ پلٹ کر واپس آیا تو ایک اونٹ کے گرد کافی سارے لوگ اکٹھے تھے اور کسی بندے کو اس پر سے اتار جا رہا تھا۔ جب اسے اونٹ سے اتار کر چار پائی پر ڈالا گیا تو میں نے غور سے دیکھا، اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی لیکن اپنی وضع قطع اور سر کے بالوں سے کچھ معلوم ہو رہا تھا۔ یہی رائے ان سب کی تھی۔ وہی ادھیڑ عمر بندہ اسے ہوش میں لانے لگا۔ جبکہ وہیں موجود دوسرے لوگ میری طرح غور سے دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ تھوڑا تھوڑا پانی پلانے میں اور اس کے حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ وہ ریت میں اپنا پڑا تھا، شکل اور نقوش سے اس کے کپڑے میل نہیں کھا رہے تھے۔ بالکل میری طرح اس نے پہلا سوال ہی یہی کیا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اسے مطمئن کرنے کے بعد اسے پوری طرح حواسوں میں لایا گیا، اور میری طرح ہی اسے نہانے کے لیے تالاب پر لے جایا گیا۔ اگرچہ مجھے بھوک شدت سے ستا رہی تھی لیکن میں بے حال نہیں تھا۔ میں چار پائی پر دوبارہ لیٹا تو مجھے نیند آ گئی۔ پھر میری آنکھ اس وقت کھلی جب کسی نے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر مجھے جگایا۔ کچھ لوگ میرے لیے کھانا لے کھڑے تھے۔ قریب ہی دوسری چار پائی پر اپنے بال کھولے کچھ بھی بیٹھا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے سامنے کھانا رکھ دیا گیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، لیکن ساتھ میں کھانا کھا رہے تھے۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھا چکے تو برتن ایک تیسری چار پائی پر رکھ کر لیٹ گئے۔ مجھے اس کچھ کا نہیں معلوم بہر حال مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں سورج غروب ہو جانے کو تھا۔ تیسری چار پائی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر اس نے کافی حد تک مقامی زبان اور لہجے میں کہا۔

”چلو اٹھو، میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”جہاں میں لے جاؤں۔“ اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح اس نے کچھ کو بھی اشارہ کیا، جس نے اپنے بال باندھ لیے تھے اور اس پر چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لٹھی تھی۔ ہم اس کی پیچھے پیچھے چلتے چلے جا رہے تھے۔ ہم صحرا میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان چلتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر آ گئے جہاں کافی اونچی جگہ پر گویا (مقامی جھونپڑی) بنا ہوا تھا۔ ڈھلوان کے آخر میں ایک کچا ٹھڑا تھا، جس پر خرس کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ کافی سارے بڑے میدان کے ساتھ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے ساتھ ایک کنواں تھا جس کے ارد گرد درختیں جتنے ہوئے پانی نکال رہے تھے۔ وہ پانی کھال کی صورت میں نجانے کس طرف جا رہا تھا۔ ہمیں اس کھلے میدان میں لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ارد گرد کوئی بندہ نہیں تھا۔ بس وہی نوجوان تھا جو ایک طرف ہٹ کر کھڑا تھا اور گوپے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گوپے میں سے ایک ادھیڑ عمر اسماٹ جسم کا درمیانہ قد، چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی، لمبے بال جو شانوں تک پڑے تھے، اس نے باریک کرتا پہن رکھا تھا جو سفید براق تھا۔ اسی طرح گہرے نیلے رنگ کی دھوتی، پاؤں میں کھسے پہنے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نیکھنا ناک پتلے پتلے ہونٹ، جن پر بھاری موچیں

”جو تم میں پہلے شرط پوری کرے گا اسے پہلے.....“

”کیا ہیں وہ شرطیں؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا تو مہر خدا بخش نے میری جانب غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

”میرے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا ہوگی مجھے ہر ادوتو میں تمہاری بات مان لوں گا۔“

”دوسری شرط۔“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ ہے کہ اس لڑکی تانی کے ساتھ جو فائنٹ کر کے اسے زخمی کر دے گا اس کی بات مانی جائے گی۔“ اس نے یوں

لہجہ سے وہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔

”اور یہی شرط؟“ میں نے پوچھا۔ اتنے میں ایک سال بھر کا چھڑا ایک طرف سے بھاگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

مہر خدا بخش کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ بولا۔

”وہ چھڑا دیکھا ہی مجھے بڑا پیارا ہے جو اسے گرا کر اس کی گردن پر چھری پھیر دے گا۔ میں اس کی بات مان لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”لیکن یہ یاد رکھنا ان تینوں میں سے کوئی ایک شرط مان لینے کے بعد اگر ہار گئے تو پھر میری بات ماننا ہوگی۔ میں پھر جب تک چاہوں تم لوگوں کو یہاں رکھوں جانا ہے تو ابھی چلے جاؤ ورنہ میں پھر بھاگنے نہیں دوں گا۔“

نجانے کیوں مجھے مہر خدا بخش کی باتیں اور پری لگ رہی تھیں۔ مگر ان باتوں میں دم تھا ایسا چیلنج جس میں ہمیں اس طرح اندازا لگایا تھا کہ وہ ہمیں بے بس ثابت کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا پھر انتظار کرنے لگا کہ جہاں کیا کہتا ہے۔ جی خاموش تھا۔ جس طرح وہ تانی اب تک خاموش تھی۔ اس نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا تھا، مگر اس کے حسن لموے ماحول کو خوشگوار بنائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جہاں نے آنکھوں ہی

ن میں مجھے جواب دینے کو کہا۔ تب میں نے بہت نرم لہجے میں کہا۔

جہاں تک آپ کی پہلی شرط ہے آپ ہمارے لیے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا بننا ہی نہیں کہ آپ کے

مسائل پر تریں۔ ہمارے بڑوں نے ہمیشہ بزرگوں کو عزت دینے کا ہی سبق دیا ہے۔ لہذا میں ایسا نہیں کر سکتا اور میرا خیال ہے جہاں ہی نہیں۔“ میرے یوں کہنے پر جہاں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”تو پھر.....؟“ مہر خدا بخش نے ہنکارے کے سے انداز میں پوچھا۔

تانی ایک لڑکی ہے ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا بلا ہے یا محض ایک کمزور لڑکی، ہم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے اس لیے تانی

ہم پر رحم کر رہا ہے۔ میں نے صاف لفظوں میں کہا تو مہر خدا بخش نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”پھر پھر.....؟“ کو گرا کر اس کی گردن پر چھری پھیر دو جاؤ میں تم دونوں کو یہ مہلت بھی دے دیتا ہوں کہ جتنے دن چاہے

الو اور جتنی بار مرضی کو شش کرلو جس دن پھر اس کی گردن پر چھری پھیر لو اس دن جہاں کہو گے وہاں پہنچا دوں گا۔ جاؤ

کوشش۔“ اس نے کہا تو تانی نے ایک چھری نکال کر میری جانب بڑھادی۔ اس چھری کا پھل بڑا اور چمکدار تھا۔ ان

دونوں میں اتنا بڑا اعتماد دکھ کر میں واقعتاً حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر تانی کے ہاتھ سے چھری لینا چاہی تو اس

نے میرے پکڑنے سے پہلے ہی چھری چھوڑ دی۔ میں نے لاشعوری طور پر چشم زدن میں چھری کو زمین پر گرنے سے پہلے

ہی قابو کر لیا۔ جیسے وہ ہی چھری میرے ہاتھ میں آئی، اسی لمحے میں سمجھ گیا کہ دراصل وہ ہمارا امتحان لے رہے ہیں۔ میں تانی

کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا تو اس کی بھی آنکھیں مہین سا بن گئیں۔ پھر مجھ سے کافی دور کھڑا تھا، اس کی گردن میں رس نہیں

تھا۔ وہ کھلا ہی چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ خاصا پلا ہوا تھا۔ مجھے نہیں اندازہ تھا کہ میں اسے قابو کر بھی

پاؤں گا یا نہیں لیکن یہ حوصلہ ضرور تھا کہ بچپن سے لے کر اب تک مویشیوں اور ڈھور ڈھگرو کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔

بہت رعب دار لگ رہی تھیں۔ وہ ہماری طرف گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، پھر جیسے اس کھر دے ماحول میں نرم اور

خوشگوار ہوا کا جھونکا در آیا ہو۔ اس کی پشت پر ایک کانسی سی لڑکی دکھائی دی۔ گول چہرہ سیاہ بال جو بوائے کٹ میں تھے۔

پتلی سی جسامت والی درمیانے قد کی اس نے سفید شلوار قمیص جس پر سفید اور نرنگ اور پیلے پھول بنے ہوئے تھے پہنی ہوئی تھی

پاؤں میں سیاہ سینڈل تھے۔ وہ بھی گہری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس ٹیکھے نقوش والی لڑکی کا وہاں ہونا

عجیب سا تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کھر دے اور پھیکے ماحول میں جب عورت آ جاتی ہے

تو ماحول نرم اور رنگین ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں ہماری طرف چند لمحے دیکھتے رہے پھر ہمیں وہیں رککنے کا اشارہ کر کے واپس

پلٹ گئے۔ اگلے ہی لمحے گوپے میں سے دونو جوان نکلے۔ وہ گوپے ہی کے سائے میں چار پائیاں بچھانے لگے اور ہمیں

وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ تبھی ہمارے سامنے جدید مشروبات کے ٹن پیک لائے گئے۔ ہم وہ پی رہے

تھے کہ وہ دونوں وہیں اس چار پائی کی سامنے والی چار پائی پر آن بیٹھے جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

”میرا نام مہر خدا بخش خان ہے عرصہ دراز سے یہاں رہتا ہوں یہ ساری زمینیں اور باڑے میرے ہیں۔ یہ لڑکی یہاں کام

کرتی ہے۔ تانی نام ہے اس کا۔“ وہ تعارف کرا کر خاموش ہو گیا تو پہلے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ میرے بعد وہ سکھ بولا۔

”میرا نام جہاں لکھ ہے میں اصل میں ونیکو درکار بننے والا ہوں۔ پچھلے چند ہفتوں سے بھارت میں تھا۔ رات سرحد

پار کر والی گئی ہے مجھے اب مجھے نہیں پتہ کہ میں کہاں ہوں۔“

”تم جمال مسلمان ہو اور یہ جہاں سکھ ہے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ تم دونوں ایک ہی رات دو مختلف سمتوں سے ملے ہو۔

بے ہوش، ظاہر ہے تم دونوں میں سخت نہیں رہی ہوگی صحرا کا مقابلہ کرنے کی یہاں بڑے بڑے لوگ ہار جاتے ہیں۔ یہ تو

اچھا ہوا کہ تم دونوں چاہے مخالف سمتوں ہی میں سہی لیکن میرے علاقے میں سے پائے گئے ہو۔ یہ تو پکی بات ہے کہ تم

دونوں ہی کو کوئی مجبوری ہی اس دیرانے میں لائی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ تم دونوں کوئی شریف اور معصوم بندے نہیں ہو۔“

”آپ کی ساری باتیں سچ ہیں۔“ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تو وہ جہاں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اور تم جہاں۔“

”ایسا ہی ہے لیکن میں اپنے بارے میں اتنا بتا دوں کہ میں جرائم پیشہ نہیں ہوں۔“

”میں نہیں جانتا کہ تم دونوں جرائم پیشہ ہو یا نہیں لیکن تم دونوں کے پاس سے جدید پستل برآمد ہونا اس بات کی

نشاندہی کر رہا ہے کہ مار دھاڑ قتل وغیرہ تم دونوں کے کریڈٹ پر ضرور ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر

ہماری طرف سے کوئی جواب نہ بغیر بولا۔ ”آرام کر لیا کھانا کھالیا جانا چاہتے ہو تو جاسکتے ہو۔“

”ہمیں تو اندازہ ہی نہیں کہ ہم کہاں پر ہیں پھر کیسے کس طرح.....“ جہاں نے تشویش سے کہا۔

”لڑکے.....! میں اس کا جواب دہ نہیں ہوں اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہوں کہ تم اس وقت کہاں ہو یہ میری مجبوری ہے میں تم

لوگوں کو کہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے سختی اور روکھے پن سے کہا۔

”ہمیں تو سمت کا اندازہ نہیں کہ ہم کس طرف جائیں گے۔ پلیز آپ ہمیں کسی قریب ترین شہر کے پاس پہنچانے

کا بندوبست کر دیں پھر ہم جانیں اور ہماری قسمت۔“ جہاں نے کافی حد تک نرم اور منت بھرے انداز میں کہا۔

”دیکھو جہاں! میں نے تم لوگوں کو پیغام نہیں بھیجا تھا کہ تم یہاں آؤ خود آئے ہو تو خود ہی چلے جاؤ اور پھر میں تمہاری

مدد کیوں کروں.....؟“ اس نے منطقی انداز میں کہا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟ دولت..... وہ میں.....“

”نہیں مجھے دولت نہیں چاہیے۔ میری تین شرطیں ہیں ان میں سے کوئی ایک پوری کر دو تو میں شہر کے قریب پہنچا دوں

طرح طرح کے جانور ہاتھ سے نکلے تھے۔ میں تیز تیز قدموں کے ساتھ اس بچھڑے کے قریب جا پہنچا۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کے لیے آیا ہوں وہ میری طرف دیکھنے لگا، پھر جیسے الرٹ ہو گیا۔ میں اور وہ آمنے سامنے ہو گئے۔ اس کے تھوڑے تھوڑے سینک نکل آئے تھے۔ وہ اگر میرے سینک مار دیتا تو میرے بدن میں دوسرا رخ ہو جاتے۔ میرے ایک ہاتھ میں چھری تھی۔ جو اسے گرانے میں مشکل پیدا کر رہی تھی۔ میں نے چھری کو دانتوں سے پکڑا اور ایک دم سے بچھڑے پر چھلانگ لگا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بچھڑے پر سوار ہو کر اس کی ایک ٹانگ اور پراٹھاؤں گا لیکن میرا خیال محض خیال ہی رہا، اس نے اپنے منہ کے تھپڑے سے مجھے ہوا میں اچھال دیا۔ میں کم از کم دس فٹ تک اچھلا ہوں گا۔ اس دوران چھری میرے دانتوں میں سے نکل گئی اور میں دھپ سے زمین پر آ گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ساری ہڈیاں ٹوٹ گئیں ہوں۔ میرا سر ایک دم سے چکرا گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں ابھی بے ہوش ہو جاؤں گا۔ مجھے اپنی بے عزتی کا اتنا زیادہ دکھ نہیں تھا جتنا ہار جانے کے بعد وہاں سے نکل نہ سکنے کا دکھ تھا۔ میں زمین پر پڑا رہا۔ بھی تانی میرے قریب آئی، اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تو اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھالیا۔ میں چند قدم اس کے سہارے چلا پھر خود ہی قدم بھرتا ہوا چارپائی پر آ گرا۔

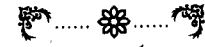
”جاؤ حپال.....!“ مہر خدا بخش نے کہا۔

”میرا ہڈیاں تروانے کا ابھی موڈ نہیں ہے۔“ اس نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

”جمال تو گیا اور.....“ مہر خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں جانوروں کے ساتھ کیوں نکراؤں۔“ حپال نے کاندھے اچکا کر کہا۔

”انسان جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ سانپ کے زہر کا تو پھر بھی علاج ہے، لیکن انسانی زہر سے بچنا بہت مشکل ہے۔ یہ اتنا سریع الاثر ہوتا ہے کہ کئی نسلوں تک زہر کا اثر نہیں جاتا پھر جاؤ، جا کر انہی درختوں کے پاس جا کر آرام کرو، کل بات ہوگی تم لوگوں سے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک دم سے اٹھا اور واپس گولے کی جانب بڑھ گیا۔ میں حسرت سے ان دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔



میری ساری رات اذیت میں گزری تھی۔ بچھڑے کی نکر سے زمین پر گرنے کی وجہ سے دائیں پسلی اور ران تک یوں تکلیف ہو رہی تھی جیسے کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ رات گئے تک حپال میرے ساتھ لفظوں کی حد تک ہمدردی کرتا رہا۔ وہ بے چارہ اور کرم بھی کیا سکتا تھا۔ کوئی دوا نہیں تھی جس سے کسی حد تک سکون مل جاتا۔ میں نے اسے سو جانے کے لیے کہہ دیا اور خود ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تو مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ ہم ساری رات درختوں کے جھنڈ کے پاس میدان میں چارپائیوں پر پڑے رہے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ کوئی ذی روح ہمارے ارد گرد بھی پھنکا ہوگا۔ ہم دونوں ہی تھے اور اگر چاہتے تو وہاں سے کسی سمت بھی نکل سکتے تھے۔ مگر جس اعتماد سے مہر خدا بخش نے کہا تھا کہ اگر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ، میری اجازت کے بغیر نہیں جاسکتے تو اس میں ضرور کوئی راز ہوگا۔ رات بھر میں اس کے سیٹ اپ پر غور کرتا رہا تھا۔ سب کچھ عام سا تھا لیکن تانی کا وجود سارے ماحول کو منفرد بنا رہا تھا۔ اس کا قاتل انداز اور اہمیت سے اس کا وجود واداری سا لگ رہا تھا۔ یا تو وہ اس ماحول میں مس فٹ تھی یا پھر وہ بہت کچھ تھی۔ اس کا حسن، اس پر سادگی، اور پھر اس سے فاسٹ کرنے والی بات، یہ سب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لوگ بھی اتنے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کل ہی چند لوگ دیکھے تھے، پھر وہ بھی دکھائی نہیں دیے۔ یہ کیسی پراسراریت تھی؟ کیا مجھے اسے سمجھنا چاہیے یا پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے؟ اصل میں میری مجبوری یہی تھی کہ نہ تو مجھے یہ معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اور نہ یہ پتہ تھا کہ جانا کس طرف ہے۔ معر

کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کی بجائے، یہیں پڑا رہنا بہتر تھا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح مہر خدا بخش کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ میں نے ان شرائط پر بھی بہت سوچا تھا، اگر وہ ہم پر مہربان ہوتا تو ایسا سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں وہ کسی ٹھکانے پر پہنچا دیتا۔ کیا وہ ہمیں یہاں پر روکنا چاہتا ہے؟ اور اگر روکنا ہی چاہتا ہے تو کیوں؟ ایک تو الجھن اور دوسرا تکلیف کے باعث میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں اپنی غنودگی سے اس وقت نکلا جب ایک نوجوان ہمارے لیے کھانا لے کر آیا۔ حپال نے چارپائی پر ہی میرا منہ ہاتھ دھلوا دیا اور پھر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ وہ نوجوان خامشی سے بیٹھا رہا۔ جب برتن خالی ہو گئے تو وہ انہیں اٹھا کر لے گیا۔

”جمال یا، کہاں آ پھنسے ہیں۔“ حپال نے دوسری چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”یہاں کم از کم یہ ڈر تو نہیں ہے کہ کوئی آ کر ہمیں گرفتار کر لے گا، پڑے ہیں، جب تک مہر خدا بخش چاہتا ہے۔“ میں نے

جواب دیا۔

”کب تک.....“ اس نے اکتائے ہوئے کہا، میں ہنستے ہوئے بولا۔

”اب ملاقات ہوئی تو اس سے پوچھ لینا۔ یا پھر باقی شرائطوں میں سے ایک چن لو۔“

”یہ بندہ عجیب سا لگا ہے مجھے، قوطی سا، پاگل سا۔“ اس نے اپنے طور پر تبصرہ کیا۔

”مگر میرا یہ خیال نہیں ہے۔“ میں نے اپنے طور پر رائے دی۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا تو میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

”بس میرا خیال ہے۔“

لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھا کہ دو تین آدمی ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ تانی بھی تھی۔ اس بار وہ کاسنی رنگ کے شوارٹھیں میں تھی، جس پر سیاہ پھول بنے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو درد نے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ شاید میرے چہرے کے زاویے بگڑے ہوں گے کہ تانی نے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا۔

”مردہ نومرد..... ایک بچھڑے کی نکر سے تم چارپائی پر لگ گئے ہو۔“

”کاش میں لوہے کا بنا ہوا ہوتا۔“ میں نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر مرد نے درد کے بارے میں پوچھ

کر میرے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ درد والی جگہوں پر اچھی طرح ٹٹول لینے کے بعد وہ سیدھا ہو کر بولا۔

”کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی، لیکن پٹھوں کو اچھا خاصا دباؤ ہے ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور اگر میری دلی ہوئی دوا

لوگے تو آج شام تک بھلے جگتے ہو جاؤ گے۔“

”اگر پی لوگے کا کیا مطلب؟“ اسے دیں یہ پیئے.....“ تانی نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔ مگر کچھ بات تھوڑی سخت تھی لیکن

لجہ بڑا نرم تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں تھا۔ وہ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھ

رہی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، اس طبیب نے اپنی پوٹلی میں سے کئی ساری شیشیاں نکالیں، ان میں سے ایک منتخب کی

اور اس میں سے فیو سا سفوف نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کا پیالہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے

بھی پھاٹک کر پانی پی لیا۔

”اب آرام کرو، میں شام کے وقت تمہیں پھر دیکھنے آؤں گا۔“ طبیب نے کہا اور واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ باقی

بندے بھی چلے گئے۔ کچھ دیر تک ہمیں کھڑی گھورتی رہی پھر وہ بھی پلٹ کر چل دی۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا جیسے

کھلے صحرائیں کوئی ہرئی ملائیں بھرتی ہوئی پھر رہی ہے۔

”یار اور کچھ ہونہ ہوئے ہمیں مار دے گی۔“ حپال نے یوں کہا جیسے وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا ہو۔

”اسے چھیڑنا بھی مت مہر خدا بخش کی منہ چڑھی لگتی ہے۔“ میں نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔

”جمال! یہ سب ان کا مجھے ڈراوا لگتا ہے کچھ بھی نہیں ہے، ٹو شام تک اگر ٹھیک ہو جاتا ہے تو پھر نکلے ہیں یہاں سے۔“ جہاں نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

”لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ہم ان کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکل پائیں گے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی اور اسی وقت نکلتا ہوں پتہ چل جائے گا۔“ اس نے بڑے دعوے سے کہا۔

”ٹھیک ہے جاؤ، لیکن پھر بعد میں ان کی کسی ہمدردی کی توقع نہ رکھنا۔ میں جانتا ہوں، ان صحرائی لوگوں کو جی بھر کے مہمان نواز ہوتے ہیں لیکن اگر دشمنی پراتر آئیں پھر.....“ میں نے کہنا چاہا مگر جہاں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم بتاؤ پھر کیا کریں؟“

”ایک دودن آرام کرو مہر خدا بخش کا رویہ دیکھو وہ ہمیں ہماری مرضی کے بغیر تو یہاں نہیں رکھ سکتا۔ میرے خیال میں وہ ہمارے بارے میں تصدیق کرنا چاہ رہا ہوگا کہ ہم کیسے بندے ہیں۔ وہ جو ہسپتال ہم دونوں سے نکلے ہیں اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور میں یہ بھی بتا دوں، معصوم ہم دونوں ہی نہیں ہیں۔“

”ایسا تو ہے یا، مگر یہاں سے نکلتا.....؟“

”نکل جائیں گے یا، مگر صبر کرو۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ دور گوپے کی طرف سے مہر خدا بخش کے ساتھ تانی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے ایک نوجوان بھی تھا جس کے ہاتھوں میں فلاسک ٹائپ چیزیں پکڑی ہوئی تھیں۔ وہ لمحہ بلحہ ہمارے قریب آتے چلے گئے اور پھر ہمارے پاس آگئے۔ میں اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہا تھا کہ اس نے کہا۔

”لیٹے رہو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا لیکن میں پھر بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں درختوں میں سے دونو جوان نکلے انہوں نے ہاتھوں میں سرہانے اور گاؤ تکیے پکڑے ہوئے تھے اس کے علاوہ دیگر کپڑے وہ انہوں نے آنا فانا بچھا دیئے۔ مجھے لگا مہر خدا بخش وہاں پر ڈیرہ ڈالنا چاہ رہا تھا یا کم از کم وہ ہمارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا ایک طرف تانی آن بیٹھی تھی مہر خدا بخش نے کہا۔

”کون لوگ ہو تم..... مگر یاد رکھنا، میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا پھر مہر خدا بخش کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیا آپ میری طویل بات سن لیں گے۔“

”تم جو کہنا چاہتے ہو اور جب تک کہنا چاہتے ہو کہو میں سنوں گا۔“ اس نے کہا تو میں نے اپنی طرف سے اختصار کے ساتھ اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی وہیں کھانا چن دیا گیا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھایا، خوب سیر ہو چکے تو مہر خدا بخش نے کہا۔

”جمال نے تو اپنی کہانی سنا دی جہاں اب تم کہو۔“

جہاں نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ بھارت آنے سے لے کر یہاں صحرا میں پہنچنے تک ساری روداد بیان کر دی۔ یہاں تک کہ سہ پہر ہو گئی۔ ساری بات سن کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ تم دونوں نے سچ بولا مجھے تم دونوں کے بارے میں رات ہی..... ام ہو گیا تھا جمال تیرے بارے میں صرف اتنی جی آفس میں ایک بندے کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ اس نے رات مجھے بتایا کہ تم فیڈیوں والی گاڑی سے فرار ہوئے ہو۔ تمہارا بھری دوست چھا کا بچ گیا ہے وہ زندہ ہے مگر پولیس کی حراست میں ہے۔ جانی شوکر مارا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور بندے..... شاہ زیب کے زیادہ بندے مرے ہیں۔ میں چاہوں تو ابھی اور اسی وقت تمہیں پولیس کے

حوالے کر دوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تم فنکار ہو چاہو تو ایک نئی زندگی کی ابتدا کر سکتے ہو پولیس تمہیں بھول جائے گی۔ اور چھا کا آج شام سے پہلے پولیس حراست سے باہر ہوگا۔“ اس نے بڑی سنجیدگی اور یقین سے کہا تھا میں حیران رہ گیا۔ میں نے اس پر کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے اشارے سے مجھے روک دیا پھر جہاں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”اور تم.....! تمہاری سب سے بڑی خامی وہی ہے جو تم نے مجھے نہیں بتائی۔“

”کون سی؟“ وہ چونکا۔

”جسمیندر سنگھ جس کا سہارا تم نے لیا، ارے ایسے کام کرنے ہوتے ہیں تو صرف اپنے زور بازو پر بھروسہ کیا جاتا ہے شطرنج کے مہرے تو کسی دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔“

”آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“

”میں اسے ہی نہیں جس ریکٹ کے لیے وہ کام کر رہا ہے میں اس کے چلانے والے کو بھی جانتا ہوں، تم نے محض بچوں والا کھیل کھیلا ہے اب سنو.....! بے چارہ انوجیت پولیس حراست میں ہے اور اس پر دباؤ ہے کہ تمہیں پیش کیا جائے، مگر تم تو یہاں ہو۔ بچپن سنگھ نے بہت بڑی غلطی کی کہ تمہیں سرحد پار بھیج دیا۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہوا وہاں تمہاری بنیاد ہی نہیں تھی۔“

”اوہ.....! بے چارہ انوجیت۔“ جہاں نے رو ہنسا ہوتے ہوئے کہا۔

”فکر نہیں کرو وہ بھی آج شام سے پہلے پولیس حراست سے باہر آجائے گا، ایف آئی آر بھی لکھوا دی ہے کہ رویندر سنگھ نے تمہیں اغوا کر لیا ہے اس سے باز یا کر دیا جائے۔ نیوز چینل پر جو کچھ بھی چل رہا ہے وہ سب غلط ہے اور ڈرامہ ہے۔“ مہر نے سکون سے کہا تو جہاں نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ سب کچھ جانتے ہیں.....؟“

”ہاں ایک اور بات، کیشو مہر نے تمہاری طرف سے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ ہی جائیداد والا، اس کی بھی فکر نہ کرو، یہ کہتے ہوئے مہر خدا بخش کے چہرے پر انتہائی درجے کی سنجیدگی تھی۔ اس پر جہاں یوں ہو گیا جیسے وہ ابھی پاگل ہو جائے گا۔

اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا

”آپ کون ہیں؟“ جہاں کے پوچھنے پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اس پر تانی بھی ہنس دی یوں لگا جیسے صحرا میں نفرتی گھنٹیاں بج گئی ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ جو کچھ دکھائی دے رہا تھا وہاں نہیں تھا۔

میں حیرت سے مہر خدا بخش کے چہرے پر دیکھ رہا تھا، جہاں رعب و دبدبہ کے ساتھ سکون پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ہماری روداد بڑے تحمل سے سنی تھی اور پھر چند لفظوں میں اپنی ان رسائیوں کے بارے میں آگاہ کر دیا جس نے مجھے گھما کر رکھا تھا۔ اٹھا، ہٹا، ہارے ضرور دکھائی دینے والا مہر خدا بخش اندر سے کتنا گہرا خطرناک اور طاقتور شخص ہے میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ساحل پہ کھڑے ہو کر سمندر کے بارے میں اتنا علم تو ضرور ہوتا ہے کہ اس میں گہرائی ہے لیکن کتنی گہرائی ہے اس بارے میں فقط اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ سمندر سے اگر دوستی ہو جائے تو وہ بے تحاشا نواز دیتا ہے اپنے سینے پر تیرنے کا ذن دینے پر اپنی ساری وسعت بخش دیتا ہے لیکن اگر دشمنی پراتر آئے تو اپنے اندر اٹھنے والے طوفانوں میں مار کر یوں غم کر دیتا ہے کہ وجود کو زمین ہی نصیب نہیں ہوتی جہاں کے سوال پر اس کی خاموشی سے میرے وجود میں تجسس پھوٹ پڑا تھا۔ ابھی اس نے بڑے جھجھکے سے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں صرف مہر خدا بخش ہوں اور میرے ذمے محض یہاں کی رکھوالی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ مجھی نہیں۔ رہی یہ بات کہ میں یہ سب کچھ کیسے جانتا ہوں تو یہ اس جدید دور میں اتنی حیرت انگیز بات نہیں۔ یہ تو چند جدید آلات کا معمولی سا کھیل ہے۔“

”میں سمجھا نہیں مہر صاحب۔“ میں نے کہا تو مجھے احساس ہوا کہ میرا لہجہ لاشعوری طور پر مودب ہو گیا ہے۔ اس کی شخصیت نے

خبر دینے والا عام ساندہ نہیں ہو سکتا۔ کل میں نے بھی اس کے دعوے کو یونہی خیال کیا تھا، لیکن آج مجھے یقین ہے کہ ہم مہر خدا بخش کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“ میری بات اس نے بڑے غور سے سنی، پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”دیکھ صرف معلومات کا حصول، ایک الگ بات ہے۔ جدید دنیا میں ہستی ہو یا دیرانہ اب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ سیٹلائٹ فون انہی ویرانوں میں کام آتے ہیں۔ اب انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات بہت وسعت رکھتے ہیں۔ صرف معلومات سے مرعوب ہو جانا میرے خیال میں ٹھیک نہیں ہے۔“

”یار! انہیں معلوم ہو گیا نا کہ ہم کون ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو ہے؟“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں، جبکہ ہمیں ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان کی شرطیں پوری نہیں کر پائیں گے کیونکہ ان شرطوں سے ہم خود انکار کر چکے ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”یار! ہم خواہ مخواہ بحث کر رہے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد مہر صاحب کے گپے میں ہم سے کون ملنے آ رہا ہے کوئی تیرے ہیں یا میرے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

”چلو دیکھتے ہیں کون ہیں، پھر اس کے بعد ہی یہاں سے نکلنے کی سوچیں گے۔“ میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ گویا ہماری بات اس موضوع پر ختم ہو گئی۔

سہ پہر ہوتے ہی ہم مہر خدا بخش کے گپے کے سامنے تھے۔ ہماری پہنچتے ہی سرد بار آ یا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم ذرا سی اونچائی چڑھتے ہوئے گپے کے دروازے تک پہنچے اور پھر اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہی مہر خدا بخش کے ساتھ ایک بوڑھے سے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، سر داڑھی، مونچھیں، مھنوں میں بھی سفید ہو چکی تھیں۔ گلابی رنگ اور تیکھے نقوش، بڑی ساری سفید کپڑی میں سے لمبے بال کا ندھوں تک جھول رہے تھے۔ انہوں نے سفید کرتا اور سفید ہی دھوئی پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں مقامی کھسہ پہنا ہوا تھا جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے انہوں نے ہم دونوں کو دیکھا اور پھر ان کی نگاہ مجھ پر تنک گئی۔ مہر خدا بخش نے مجھے ایک طرف پڑی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حسیال کو ایک پیڑھے کی طرف، ہم بیٹھ گئے تو وہ بزرگ بولے۔

”اچھا تو یہ ہیں وہ دونوں.....“ پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”تجھے پتہ ہے کہ تو کون ہے؟ تیری ذات کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ سکول میں استاد نے پوچھا تھا تب میری ماں نے ”گجر“ لکھوایا تھا۔ پھر کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“

”ہاں تجھے واقعی نہیں پتہ؟ تو کون ہے؟ تیری روح کیا کہہ رہی ہے تجھے تیری اپنی ذات کا پتہ ہی نہیں چلا۔“ انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تو میں مودب لہجے میں بولا۔

”تو آپ بتا دیں۔“

”تو..... تو..... قلندر ذات کا ہے..... قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بند زربچہ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ تو جان لے کہ تو وہی ہے..... اور یہ.....“ انہوں نے حسیال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تیرا احسان چکانے تیرے ساتھ آیا ہے۔ تم دونوں نہیں جانتے ہو لیکن میں تمہاری تین نسلیں دیکھ رہا ہوں۔“

”ہماری تین نسلیں باباجی۔“ حسیال نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں پتر..... تین نسلیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب تم دونوں پر اپنا آپ واضح ہو جائے گا۔ کون کیا ہے یہ سب کھل جائے گا۔ تم دونوں پر۔“ انہوں نے جذب سے کہا۔

”مگر میں قلندر..... بند زربچہ اور کتے..... یہ.....“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا تو وہ بولے۔

”یار جدید دور کی ایجاد یہ آلات..... جیسے یہ کمپیوٹر اب اس سے بندہ جو چاہے اور جیسا چاہے فائدہ لے لے..... اب یہ اس آلے کو استعمال کرنے کی سمجھ بوجھ اور نیت پر منحصر ہے کہ وہ اس سے کیا اور کیسا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔“

”تو کیا یہاں انٹرنیٹ بھی ہے؟“ حسیال نے یوں سوال کیا جیسے وہ حیرت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہو۔

”اس سے بھی آگے کی بہت ساری چیزیں۔“ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس کا لہجہ بہت حد تک دوستانہ ہو گیا تھا۔ تبھی حسیال نے پوچھا۔

”مگر لگتا نہیں ہے کہ ہو سکتا ہے؟“ اس کے یوں کہنے پر مہر خدا بخش نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”یہ جو انسان ہے نہ یہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہی بھٹکتا رہ جاتا ہے۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا اسے چھوڑ.....“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر گویا ہوا۔ ”آج شام تم لوگ میرے گپے پر آ کر چائے پیو گے۔“

”لیکن میں چاہوں گا کہ مجھے کسی طرح یہاں سے جانے کی اجازت دی جائے۔“ حسیال نے تیزی سے کہا۔

”کہاں جاؤ گے؟“ مہر خدا بخش نے پوچھا۔

”میں پاکستان میں کہیں کسی نزدیکی شہر میں وہاں سے میں اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر لوں گا اور.....“ یہ کہتے کہتے وہ رک گیا، پھر سانس لے کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”اب شاید میں واپس پنجاب نہ جا سکوں۔“

”ٹھیک ہے، لیکن اس کے لیے وہی شرطیں ہیں، کہ تو دہرا دوں یا تمہیں یاد ہیں۔“ مہر خدا بخش نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ہمارے پاس اس کے لیے کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چند لمحے ہمارے رد عمل کا انتظار کرتا رہا، پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یاد سے آ جانا۔ تم لوگوں سے ملنے کے لیے کوئی آ رہے ہیں۔“

”ہم سے ملنے کے لیے؟ یہاں.....؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ میرے ذہن میں ایک دم ہی سے کئی خیال رینگ گئے۔ مہر خدا بخش نے میری بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ واپس جانے کے لیے چل دیا۔ اس کے دائیں جانب تانی اور بائیں جانب خوبصورت جسم والا لڑکا سرمد تھا۔ وہ چلے گئے تو حسیال نے فکر مند انداز لہجے میں کہا۔

”یار کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم کسی فورسز کے حوالے کر دیے جائیں۔ ہمارا تو سارا کچا چٹھا نہیں معلوم ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ لوگ یہاں رہ بھی اسی لیے رہے ہیں کہ سرحدوں کی حفاظت کریں یا ممکن ہے یہ کوئی جرائم پیشہ لوگ ہوں اور ہمیں.....“

”لیکن مجھے نہیں لگتا حسیال کہ ایسے ہوگا کیونکہ اگر انہوں نے ہمیں حوالے ہی کرنا ہوتا تو رات ہی ہم کسی وقت اٹھا لیے جاتے اتنی مہمان نوازی نہ ہوتی۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”بھال۔“ امیرا خیال تو یہ کہتا ہے اگر یہ لوگ تمہیں ذرا سی بھی آفر کریں تو تم یہیں ننگ جاؤ، کیونکہ یہاں سے نکلنے کے بعد تم سیدھے جیل جاؤ گے۔“ اس نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”تم نے کہا، سا خال۔“ مگر چلے جانا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ اس قدر نازک حالات میں بھی وہ ہنس رہا تھا۔

”یہ تو ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو۔ اکل جو شرطیں مہر خدا بخش نے ہمارے سامنے رکھی تھیں وہ دعویٰ یونہی نہیں تھا، اور تم نے بھی جو، جواب دیا تھا وہ نری مصلحت تھی، دل سے نہیں کہا تھا۔ اپنی شکست کی ذلت سے بچنا چاہ رہے تھے۔ جو بہر حال..... نے اپنی بے وقوفی سے پائی۔ میں ذلیل ہوا، یہ بات تو سچ.....؟“ میں نے اس کی تصدیق چاہی۔

”ہاں یہ تو ہے وقت کی نزاکت تھی۔“ اس نے کسی حد تک سنجیدگی سے کہا۔

”آج اگر اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ تو ہے یوں ویرانے میں بیٹھ کر دنیا کے بارے میں

رہی تھی۔ جب وہ پیالیاں سرو کر چکی تو مہر خدا بخش بولا۔ ”یقیناً تم لوگ ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہو گے؟“

”ہاں..... کیوں..... نہیں؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”میں بھی ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں چند برس قبل انہی ویرانوں میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی اور تب سے میں یہیں پر ہوں۔ جب بھی انہیں مجھے کوئی حکم دینے کی ضرورت ہوتی ہے یہ خود مجھے مل لیتے ہیں میں نہ ان کا نام جانتا ہوں اور نہ ان کا ٹھکانہ..... میں انہیں باباجی ہی کہتا ہوں۔“

”ہمیں یہاں کرنا کیا ہوگا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

”انسان روح اور جسم کا عظیم شاہکار ہے، جسم جس قدر کثیف ہوگا نفس بھی اسی قدر مضبوط ہوگا۔ اور روح جس قدر لطیف ہوگی وہ طاقتور ہوگی مضبوط جسم ہی میں روح طاقتور ہوتی ہے یہاں جسم ہی کی نہیں نفس کی بھی تربیت ہوگی۔“

اس پر میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی حیران ہوا، ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے جب پی چکے تو اس نے ہمیں اٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم اٹھ گئے۔ تب وہ بولا۔

”میں تم لوگوں کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ اگر باباجی کا حکم نہ ہوتا تو آج کل میں تم لوگوں کو یہاں سے روانہ کر چکا ہوگا، لیکن جس رات تم یہاں پر آئے تھے اس شام مجھ تک پیغام پہنچ گیا تھا کہ دو لوگ مختلف سمتوں میں آئیں گے، انہیں سنبھال لوں۔ ابھی تم لوگوں کو یہ ساری باتیں حیرت انگیز لگ رہی ہوں، لیکن کچھ عرصے بعد یہ حیرت نہیں رہے گی اب یہ تم لوگوں پر منحصر ہوگا کہ کتنا سیکھ سکتے ہو اپنے دامن میں کیا کچھ بھر سکتے ہو، کنکر چلتے ہو یا ہیرے۔ آؤ“ یہ کہہ کر وہ گوپے کے باہر جانے کے رستے پر ہولیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ سامنے ہی تین اونٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں ان پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود ایک پر بیٹھ گیا۔ ہم اونٹوں پر سوار ہوئے اور کچھ دیر ایک سمت کو چلتے رہے ایک بڑے سارے گوپے کے قریب ہم جاڑ کے۔ اونٹوں سے اتر کر ہم اس گوپے کے اندر چلے گئے۔ اس گوپے میں ایک دروازہ تھا مہر خدا بخش نے اس پر اپنی ہتھیلی رکھی تو وہ میکا کی انداز میں کھلتا چلا گیا۔ وہ ہمیں ساتھ لیتا ہوا سرھیاں اترتا چلا گیا۔ نیچے ایک ہال نما کمرہ تھا جس میں خوشگوار خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہیں دیوادل کے ساتھ ٹی وی اسکرین، کمپیوٹر اور نجائے کیا کیا آلات لگے ہوئے تھے۔ وہیں کافی سارے لڑکے لڑکیاں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ان میں سرمد بھی تھا جو نجائے کب وہاں سے یہاں پہنچ گیا تھا۔

”یہ ہمارا آپریشن روم ہے یہاں سے صرف باہر کی دنیا سے رابطہ رکھا جاتا ہے، ہمیں سے اپنی حدود کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ آؤ تمہاری بات کروائیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سرمد کا اشارہ کیا۔ اس نے ہمیں دو خالی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اسکرین پر لگا ہیں جما کر کی بورڈ پر انگلیاں مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد سونی کی آواز ابھری وہ ہیلو کر رہی تھی آواز سامنے پڑے اسپیکر سے ابھر رہی تھی۔

”میں جمال بات کر رہا ہوں۔“

”ہائے جمال۔ کیا تم کسی غیر ملک پہنچ گئے ہو اسکرین پر کوئی نمبر ہی نہیں کہاں ہو تم ٹھیک تو ہونا؟“

”ایک دم اتنے سوال کر دیئے تم نے۔ میں جہاں بھی ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں ٹو سنا ٹھیک ہے تو اور اماں کیسی ہے؟“

”ہم ٹھیک ہیں اور پوری طرح محفوظ ہیں۔“ اس نے کہا۔

”مجھے بتا، چھا کا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس نے پکڑ لیا تھا اُسے، لیکن آج صبح ہی وہ نورنگر چلا گیا ہے۔ میرا اس سے رابطہ نہیں ہوا، لیکن وہاں سے مجھے معلوم ہو گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اور شاہ زیب؟“ میں نے پوچھا۔

”پترا تیرے پیدا ہوتے ہی یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ تو کیا ہوگا۔ یہ سفر ہے جو تجھے طے کرنا ہے۔ میری کوئی پیش گوئی تجھے تیرے راستے سے نہیں ہٹا پائے گی۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسی راستے پر چلے گا جو تمہیں ہو چکا ہے۔ اور باقی رہی قلندر کی بات..... قلندر کوئی محض روحانی مقام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرز زندگی کا نام بھی ہے جس میں جو حال بھی ہو، سب شکر گزاری ہے۔ اور جان لو..... حضرت علی کرم اللہ وجہہ قلندر اعظم بھی ہیں۔ ان کا طرز زندگی شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام پر ہے۔ خیر..... میری یہ بات ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی ہماری ایک دفعہ پھر کہیں نہ کہیں ملاقات ہونی ہے تب تمہیں بھی سمجھ آ چکی ہوگی۔ وہ ملاقات بڑی اہم ہوگی۔“

”کیا اب مجھے بندر بچھ اور کتے بچانا ہوں گے۔“ میں نے پوچھا تو وہ دھیرے سے مسکرائے پھر بولے۔

”یہ تو تجھے بچانا ہوں گے ورنہ تو خود ناچار بن جائے گا۔ یہ سارا کچھ کیوں ہے یہ جب ہماری اہم ملاقات ہوگی نا..... تب تم پر کھل جائے گا۔ اس وقت تک تجھے بہت ساری عقل سمجھ بھی آ چکی ہوگی۔“ انہوں نے یہ کہا اور پھر حیران کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”جس طرح کوئی دریا میں غوطے کھاتا ہو کسی انجان کنارے پر جا لگے، تم بھی اسی طرح لڑکھتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے ہو تم دونوں کا ایک ساتھ یہاں تک آنا اتفاق نہیں وقت ہو گیا تھا کہ تم دونوں کو یہاں لایا جائے۔ تم دونوں کچھ وقت یہاں گزارو، یہی وقت کی آواز ہے۔“

”کتنا وقت ہمیں یہاں رہنا ہوگا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”جب تک تم پچھڑے لوگرا کر زنج نہیں کر لیتے اس کی دعوت کھاؤ اور چلے جاؤ۔“ انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو ہمارے درمیان ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

”کیا ہمارا یہاں ٹھہرنا لازمی ہے؟“ حیران نے پوچھا۔

”ہاں۔! نہ ٹھہرنا چاہو تو وہ تم لوگوں کا فیصلہ ہے، بس یہ جان لو جو وقت کی آواز نہیں سنتا، وقت اسے یوں پیچھے دھکیل دیتا ہے کہ وہ ماضی میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فطرت کا سفر جاری ہے اسے چلانے کے لیے قدرت کا انتظام ہماری عقل و سمجھ سے بھی ماورائے فیصلہ تم دونوں کا اپنا ہے، ٹھہر دیا چلے جاؤ۔ یہ تمہارا اپنا اختیار ہے۔“

”باباجی، میں یہ بچوں والا سوال نہیں کروں گا کہ ہمیں یہاں کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے یقیناً کسی مقصد کے لیے ہوگا۔ میں اپنا آپ آپ کے سپرد کرتا ہوں۔“ میں نے پورے خلوص اور جذب سے کہا تو حیران تیزی سے بولا۔

”اور میں بھی یہ دیکھنا چاہوں گا کہ یہ جمال کس طرح پچھڑے کو زنج کرتا ہے۔“

وہ بزرگ چند لمحے ہماری طرف دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔

”آؤ..... تم دونوں میرے قریب آؤ.....“

ہم بھی کھڑے ہو کر ان کی قریب چلے گئے۔ پہلے انہوں نے حیران کو گلے لگایا۔ چند لمحے وہ انہیں اپنے سینے سے لگائے رہے پھر چھوڑ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ وہ چند لمحے جو میں ان کے سینے سے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بے جان ہو گیا ہوں۔ میرا کوئی وزن ہی نہیں رہا۔ یوں جیسے میں خلا میں معلق ہو گیا ہوں۔ پھر مجھے احساس ہو گیا کہ میرا وزن اتنا بڑھ گیا ہے کہ شاید زمین میں دھنس جاؤں گا۔ چند لمحوں میں اپنی تیزی سے بدلتی حالتوں پر میں خود حیران رہ گیا تھا۔ انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور بولے۔

”نو بھئی..... میں چلا.....“ انہوں نے اپنی اٹھائی اور گوپے سے نکلتے چلے گئے۔ مہر خدا بخش ان کے پیچھے لپکا تو ہم بھی آگے بڑھے۔ وہ پیدل چلتے چلے جا رہے تھے۔ اس عمر میں اور اس قدر تیزی کے ساتھ یہ میرے لیے واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ ان کا رخ صحرائی طرف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک نیلے پرچڑے اور پھر دوسری طرف اتر کر لگا ہوں سے اوجھل ہو گئے۔

”آؤ! مہر خدا بخش کی آواز پر میں پلٹا اور واپس گوپے میں آ گیا۔ تب تک چائے آ چکی تھی۔ تانی پیالیوں میں چائے انڈیل

”وہ نورنگر میں ہی ہے بالکل سہا ہوا ہے، کیونکہ ابھی اس نے کچھ نہیں کیا۔ اب چھپا کے سے بات ہوگی تو پتہ چلے گا۔“ اس نے کہا۔
 ”اپنا خیال رکھنا اور گھبراتا نہیں، میں بہت جلد تم لوگوں کے پاس آ جاؤں گا۔“ میں نے اسے دلا سا دیا۔
 ”میں نے چھپا کے سے کہا تھا کہ وہ میرے پاس ہی رہے ادھر لیکن پتہ نہیں کیوں وہ نورنگر ہی میں رہنے پر ضد کر رہا ہے، خیر تم بھی پریشان نہیں ہونا۔ لواں سے بات کرو۔“

”پتر، اپنا بہت سارا خیال رکھنا، میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔“ اماں نے جذب سے کہا۔

”اماں تیری دعاؤں کے سہارے تو جیتا پھر رہا ہوں۔ اک یہی تو طاقت ہے میرے پاس اپنا خیال رکھنا اماں۔“
 ”تو فکر نہ کر پتر، سوئی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ بس تو جلدی سے مجھے ملنے کے لیے آ جا، مگر جب حالات ٹھیک ہو جائیں۔“
 اماں نے اپنے دل کی بات بھی کہہ دی اور مجھے محتاط رہنے کے لیے بھی کہہ دیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میرا گلا گم ہو رہا ہے میں نے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا، ممکن ہے میرے ذرا سی جذباتی پن سے ارد گرد کھڑے لوگ میری کمزوری نہ جان لیں۔ میں نے اماں کو اللہ حافظ کہا۔ ابھی ایک دم سے مجھے احساس ہوا ان کے پاس سوئی کا نمبر کہاں سے آ گیا۔ میں نے تو انہیں نہیں بتایا تھا، کیا یہ لوگ سوئی تک بھی رسائی رکھتے ہیں۔ کیا یہ بات انہوں نے اس لیے کروائی تا کہ مجھے احساس دلایا جاسکے کہ وہ سوئی تک بھی رسائی رکھتے ہیں۔ میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ تب تک انوجیت سے رابطہ ہو گیا تھا۔ حسیال پوچھ رہا تھا۔
 ”کیسے ہوا انوجیت؟ سنا ہے تم پر بہت تشدد ہوا ہے؟“

”ہاں، ہوا تو ہے، خیر اسے چھوڑ دو میں پہلے ہی ان کی نگاہ میں تھا لیکن تم ہو کہاں؟“
 ”جی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم، مجھے ہر پریت کے بارے میں بتاؤ وہ کسی ہے اس کا زخم ٹھیک ہوا؟“
 ”وہ ٹھیک ہے۔ ہم کیشیو مہرہ سے مسلسل رابطے میں ہیں، تمہاری مسلسل تلاش جاری ہے تمہارے سفارتخانے سے بھی رابطہ کیا تھا وینکوور سے تیرے بھائی کے سفارت خانے والوں سے بات کی ہے۔ تو فکر نہ کر لیکن تو ہے کہاں پر؟“
 ”تم گھر پر ہو تو ہر پریت اور پھوپھو سے بات کرادو۔ میری فکر چھوڑ دو میں کہاں پر ہوں۔“
 ”میں کروا تا ہوں وہ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ بہر حال اچھا کیا تم یہاں سے نکل گئے۔ حویلی جلانے کے بعد تو یہ لوگ بہت تشدد ہو گئے ہیں۔“

”تم گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دیکھ لوں گا سب کو۔“ اس نے ایک عزم سے کہا۔ تبھی گلجیت کور کی آواز ابھری۔
 ”کیسے ہو پتر۔“

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہو؟“

”واہ! گرو کی مہر ہے پتر۔ تو اپنا خیال رکھنا۔ لے ہر پریت سے بات کر۔“

”اوئے سانوں! جھڈ کے آپ کدھر چلے گئے ہو؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”بہت جلد تیرے پاس آ جاؤں گا“ تیرا زخم کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے اب۔“

”اچھا سن۔ اگر زیادہ خراب ماحول ہو جائے تو سیدھے وینکوور چلے جانا۔ یہاں جو بھی نقصان ہوتا ہے ہو جانے دینا، میں سنبھال لوں گا آ کر۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بھرپور انداز سے کہا اور پھر چند رسمی فقروں کے بعد فون بند ہو گیا۔ تب مہر خدا بخش نے ہمیں باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی ہم باہر آئے تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

”مہر صاحب! یہ سوئی کا فون نمبر آپ کے پاس کیسے آ گیا؟“

”مجھے یقین تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ سوئی پچھلے چند دنوں سے پولیس کے اعلیٰ حکام سے ملتی رہی ہے، تمہارے لیے اور چھپا کے کے لیے۔ وہاں اس نے اپنا فون نمبر دیا ہوا ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے آپ کی پولیس حکام تک..... میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری کی تھی۔“

”یہاں رہو گے تا تو ساری باتیں سمجھ جاؤ گے۔ آؤ، تمہیں کچھ مزید دکھاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا۔

کچھ فاصلے پر ایسا ہی ایک اور گواپا تھا۔ جو پہلے سے نسبتاً بڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف باڑھ تھی، وہاں بہت ساری گائیں، بکریاں اور اونٹ تھے کچھ ریوڑ کی صورت میں واپس آ رہے تھے وہیں ایک طرف اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ ہم گوپے کے اندر گئے تو ویسے ہی سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں جا پہنچے وہاں جسم بنانے اور بدن کمانے کے لیے آلات سجے ہوئے تھے، ایک طرف بڑا سارا میز پڑا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہاں پر لڑنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس وقت وہاں پر دو بندے ہی موجود تھے جن کے بدن دیکھ کر رشک آ رہا تھا۔ انہیں مہر خدا بخش نے کہا۔

”یہ دونوں اب یہاں آیا کریں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ قدرے ادھیڑ عمر بندے نے ملکا سا جھک کر کہا تو مہر نے ہمیں واپس پلٹنے کا اشارہ کیا۔ پھر اسی طرح اونٹوں پر سوار ہوئے اور ایک مسجد کے قریب جا پہنچے۔ اس سے ملحق ایک بڑا سا گھر تھا۔ ہم اس کے اندر چلے گئے۔ وہیں تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ہم سیڑھیاں اتر گئے۔ ویسا ہی ہال تھا لیکن وہاں انتہائی خاموشی تھی۔ سامنے ذرا سی اونچی مسند پر ایک بوڑھے سفید ریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے ان کے سامنے چند لڑکے اور لڑکیاں سفید لباس میں یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے مراقبے میں ہوں، وہ بزرگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے مہر خدا بخش نے اشارے سے ہمارے بارے میں بتایا انہوں نے آنکھیں بند کر کے ہمیں قبول کرنے کا اشارہ کیا تبھی ہم باہر نکل آئے۔

اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا جب ہم واپس مہر خدا بخش کے گوپے تک آ پہنچے اونٹوں سے اتر کر وہ ہمارے پاس آیا اور بولا۔
 ”پہلی وہ جگہ تھی جہاں تم لوگوں کی ڈینی تربیت ہونا ہے دوسری میں جسمانی اور تیسری پر روحانی تربیت ہوگی، تم لوگ کتنے وقت میں کیا کچھ سیکھ سکتے ہو، یہ تم لوگوں پر منحصر ہے۔“

”ہمیں اگر زندگی نے یہ موقع دے دیا ہے تو ہم اسے ضائع نہیں کریں گے۔“ میں نے پورے خلوص سے کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”اور ہاں، تمہیں ایک چیز یہاں دینی ہوگی اور وہ ہے نشانہ بازی۔ تم فنکار ہو اور اپنا ہنر یہاں دو گے، اگر دینا چاہو.....“

”میں حاضر ہوں۔“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

”کل چند لوگ تمہیں دے دیئے جائیں گے۔ تم ان کی تربیت کرنا اور حسیال! یہ ہمارا معلم سیٹ اپ ہے، تمہیں اپنے مذہب کے بارے میں مکمل آزادی ہے۔ تمہیں جو اچھا لگے قبول کر لو باقی جبر نہیں، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ رواری وہ پھل ہے جس سے کسی درخت کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور ہاں یہاں قریب ہی ایک بستی ہے اب تم دونوں وہاں ایک گھر میں رہو گے درختوں تلے نہیں۔“ اس نے کہا تو ایک مقامی نوجوان ہمیں لے کر اس بستی کی طرف چل دیا۔ اس دن نجانے مجھے کیوں یقین ہو رہا تھا کہ میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

☆☆☆.....

اس دن بارش ٹوٹ کر برسی تھی۔ منہ اندھیرے ہی جو بارش شروع ہوئی تو سارا دن برسی رہی، سہ پہر کے بعد کہیں جا کر بارش تھمی تو ریت کی اپنی ہی جادو بھری مہک نے میرے وجود میں نشہ بھر دیا۔ سرخی بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس نے اگست کے آخر دنوں کے جس کو ختم کر دیا تھا۔ بھوری ریت پانی سے بھیک کر مزید گہرے رنگ کی ہو گئی تھی۔ ایسے موسم

”کیوں نہیں! مگر اس وقت میرے پاس پہل نہیں ہے۔“

”میرے پاس ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص میں ہاتھ ڈالا ریزہ کی ہڈی کے پاس سے پہل نکالا جو سینے میں اڑسا ہوا تھا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے مزید سوال نہیں کیا میں نے پہل پکڑا، میگزین میں گولیاں دیکھیں، مطمئن ہونے کے بعد میں نے تانی کی جانب دیکھا تو اس نے اپنی پشت میرے سینے کے ساتھ لگا دی۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ وہ نشاندہ لگانے والا انداز نہیں تھا۔ میں چونک گیا، لیکن اسے احساس نہیں ہونے دیا۔ میں نے پہل اس کے ہاتھ میں دے کر اس کی بانہوں کے ساتھ بانہیں پھیلائیں وہ میری بانہوں میں یوں ہو گئی جیسے پھل رہی ہو۔ میں سامنے نشانہ دیکھنے لگا، مگر ایسا کوئی بھی نشانہ نہیں تھا۔ میں ہوائی فائر کرنا ہی چاہتا تھا کہ وہ گھوڑی اپنا چہرہ میری جانب کیا اور میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کی ٹھوڑی میرے باباں کا ندھے پر تھی۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حوصلہ دینے کے سے انداز میں کہا۔

”کیا بات ہے تانی، کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”جمال! میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میں..... میں..... تم سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔“ اس نے بے حد جذباتی انداز میں کہا تو میں بھونچا رہ گیا۔ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ دوسروں کی طرح اس کے ساتھ بھی ایک اچھا تعلق تھا۔ میں نے آہستگی سے تانی کو خود سے الگ کیا، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تانی، ہوش میں تو ہونا تم؟“

”ہاں! میں ہوش میں ہوں۔ پھر سن لو، میں تم سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ سے دو آنسو ٹپک کر گالوں پر پھسل گئے۔ مجھے اس وقت یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہوں؟ میں حیران تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ اتنی مضبوط لڑکی یوں ریزہ ریزہ کیوں ہو رہی ہے۔ میں نے اسے دونوں کانڈھوں سے پکڑا اور اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”صاف صاف بتاؤ، تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ یہ مذاق.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کا تھمتے ہوئے بولی۔

”جمال، وہ وقت آ گیا ہے، جس کے لیے میں بہت ڈرتی تھی۔ میں تم سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔“ اس کے لفظ سسکیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے رکی اور پھر کہنے لگی۔ ”یہاں فیصلہ ہو گیا ہے کہ اب تم دونوں کسی بھی دن یہاں سے چلے جاؤ گے، بلکہ تمہیں بھیج دیا جائے گا اور میں چاہتے ہوئے بھی تمہارے ساتھ جانیں پاؤں گی۔“ ”دیکھو! میں نہیں جانتا کہ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو، تمہیں مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟ میں یہ بھی نہیں جانتا، لیکن ایک دن تو ہمیں یہاں سے جانا ہے اور میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ جاؤ گی۔“ میں نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

”ہمارے حالات ایسے ہیں کہ تم مجھ پر چاہو بھی تو یقین نہیں کر پاؤ گے۔ میرے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں کہ جس سے میں ثابت کر سکوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں کون ہوں یہاں کیسے ہوں؟ یہ تم ہی نہیں سوائے مہر صاحب کے دوسرا اور کوئی نہیں جانتا میری مجبوری یہ ہے کہ میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ ورنہ ضرور چلی جاتی۔“ اس نے رو ہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے جواباً کچھ کہنا چاہا تو وہ میرے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ جانی تو یہ ثابت کر دیتی کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تو میں نے کہا۔

”تانی! ہم دونوں میں بہت اچھا تعلق رہا ہے، تم مجھے کس محبت کی بات کر رہی ہو۔“

”میں تم سے اپنی محبت کا جواب نہیں مانگ رہی میں تو محض تمہیں بتا رہی ہوں کہ تم میری پہلی اور شاید آخری محبت ہو۔ پہلے دن جمال پہلے دن، جب میں نے تمہیں دیکھا تھا، میں گھائل ہو گئی، تم پہلی نگاہ ہی میں مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ تم یہیں رہ جاؤ، میں نے خود نہیں سوچا تھا کہ میں تمہارے اتنے نزدیک آ جاؤں گی۔ پہلے دن جب تم نے نشانے کے

میں مجھ سے بیٹھا نہیں گیا۔ میں تنہا ہی کھلے صحرا میں نکل گیا۔ ایک نیلے پرکائی ساری بہیر، بوئیاں دکھائی دیں تو میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے ارد گرد صحرا کو دیکھا۔ بارش نے اس میں زندگی بھری تھی۔ پہلے پہل مجھے وہاں سے وحشت ہونے لگی تھی، پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میں صحرا سے مانوس ہوتا چلا گیا۔

تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ اس وسیع ریگستان میں گزر گیا تھا۔ یہاں سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا تھا، صحیح معنوں میں ہمیں اپنی اوقات کا پتہ چلا تھا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ کنویں کے مینڈک دریا میں آگئے تو پتہ چلا اگر چہ وہ ایک صحرا تھا، بے رونق، لقا و دوق صحرا، ویران مگر بقول خواجہ فرید سائیں کے ”روہی رنگ رنگیلوئی مہمیزی بار ملاوے“ (روہی، بہت رنگین ہے، یہ ہمیں یار سے ملا دیتی ہے) کے مصداق ہمیں اندر تک سے رنگین کر دیا تھا۔ یہاں کی رنگینی اور سنگینی نے ہمیں باہر کی دنیا کو بھلا کر رکھ دیا تھا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارے اندر ایسی صلاحیتیں بھی ہیں، وہ بندہ تھا جسے سیل فون کی سمجھ نہیں تھی اب میں کمپیوٹر کے استعمال کے بارے میں جان گیا تھا۔ ذہنی، جسمانی اور روحانی تربیت کے وہ مدارج طے کیے جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بقول ہمارے ایک استاد کے کہ جب ہم یہاں آئے تھے تو انا کے بہترے بت اپنے اندر نصب کیے ہوئے تھے۔ وہ سب ٹوٹ گئے اور ہماری حالت خواجہ فرید سائیں کے اس شعر جیسی ہو گئی کہ ”دھویں دار فقیر تھیوں سے، فخر و ذایاں سٹیاں“ (ہم تو اب ایسے بے انا بندے بن گئے ہیں جو عشق کی آگ میں جلنے نہیں، محض سلگتے ہیں، کیونکہ ہم نے اپنے سارے فخر اور غرور پھینک دیئے ہیں) وہاں جا کر مجھے صحیح معنوں میں معلوم ہوا کہ میری قدر کیا ہے، وہاں سب نے تسلیم کیا تھا کہ میں نشانے میں فنکارانہ مہارت رکھتا ہوں۔ اس کا میں نے بار بار ثبوت دیا۔ میں نے وہاں یہ مہارت سکھائی، چند لوگ میرے حوالے کر دیئے گئے، جن میں تانی اور سرد بھی تھے۔ اس ایک مہارت دینے کے عوض انہوں نے مجھے کیا کچھ دیا، اور کس کس مہارت سے نوازا، یہ میں ہی جانتا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ جہاں بھی شامل تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کے بڑی تیزی سے نزدیک آتے چلے گئے تھے۔ اس دوران میں اچھی طرح جان گیا تھا کہ مہر خدا بخش کا تانی پر ایوں ہی ناز نہیں تھا، تانی بہت ساری غیر معمولی صلاحیتیں رکھتی تھی۔ جہاں مجھے وہاں سے بہت کچھ ملا، اس میں ایک تانی کی دوستی بھی تھی۔ ان تین مہینوں میں وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی قریب ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ویسے ہی سمجھا تھا جیسے سرد کے ساتھ میری دوستی تھی، لیکن اس کا انداز سب سے منفرد تھا۔

میں بھیکے ہوئے موسم میں خالی الذہن بیٹھا، بہیر، بوئیاں کو دیکھ رہا تھا، اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے ہے، میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو تانی نیلے پر چڑھ رہی تھی۔ سفید مہین لباس میں اس کا گلابی بدن چمک رہا تھا۔ شولڈر کٹ بال بھیکے ہوئے تھے۔ گلے میں سفید موتیوں کا ہار تھا۔ پاؤں میں سفید ہی جاگرتھے۔ وہ میری طرف بڑی گہری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی میری جانب بڑھتی ہوئی آ رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔

”تانی خیر تو ہے، تم یہاں کیسے؟“

”بس یونہی! میرا تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔“

”تو آؤ، کریں باتیں یہاں بیٹھو۔“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے خمار آلود لہجے میں بولی۔

”نہیں، پہلے تم مجھے اسی طرح نشانہ لگواؤ، جیسے پہلے دن مجھے تھام کر نشانہ لگوا لیا تھا۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ زار خمار آلود ہی نہیں تھا بلکہ بھیا ہوا بھی تھا۔ شاید رومانوی تھا یا غمزدہ اس کا انداز نہ کر سکا۔

”خیر تو ہے تانی، تم یہ خواہش کیوں کر رہی ہو؟“ میں نے واقعتاً حیرت سے پوچھا۔

”کیا تم میری یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کرو گے؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔ تب میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

لیے۔ اپنے ساتھ اگایا تھا تو مجھے خود کسی مرد کے لیس کا احساس ہوا تھا۔ میں اس وقت سے منتظر تھی کہ تم میری جانب توجہ کرتے، مگر تم تو پاگلوں کی طرح سب کچھ سیکھ جانے میں مگن تھے۔ کچھ دنوں سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں اپنی محبت کا احساس دلاؤں گی، کم از کم جتنے دن تم یہاں ہواتے دن..... مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں۔ میں اسے کھودوں گی، جسے میں نے چاہا ہے۔ پتہ نہیں، ہم دوبارہ کبھی مل بھی پائیں گے یا نہیں۔ کیسی قسمت ہے میری.....“ اس نے کہا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگی، اس کے گال ناک کی پھٹک اور ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔

”تم یہاں رہ کر بھی میرے ساتھ رابطے میں.....“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”نہیں، جمال نہیں۔ ساتھ، میں ساتھ چاہتی ہوں۔ نجانے کیوں مجھے یقین ہے جمال کہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔“

”ٹھیک ہے تب ہم کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ ایک دم کھل گئی۔

”سچ! یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر اپنی گال میرے سر سے ہولے ہولے رگڑنے لگی۔ پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ”شاید وہی میری نئی زندگی ہو۔“

”شاید!“ میں نے کہا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”آؤ چلتے ہیں۔ حِساں کو میں بتا کر نہیں آیا تھا وہ میری راہ دیکھتا ہوگا۔“

وہ میرے ساتھ یوں چل دی جیسے نرّاس میں ہو، اور میں اس وقت تک نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ میں یہ بات حِساں کو بتاؤں کہ نہیں؟

رات گئے تک میں اسی الجھن میں رہا۔ مجھے تانی سے زیادہ اس بات کی فکر ہو رہی تھی کہ اب ہمیں یہاں سے بھیج دیا جائے گا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت جلدی میں ہمیں یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے اپنے آپ کو دریافت کرنے کا مزہ تو اب آنے لگا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا تھا میں اتنی جلدی یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا یہ تو محض تانی کا خیال تھا، مہر صاحب نے تو مجھے نہیں کہا جب وہ کہیں گے تو دیکھا جائے گا۔ نجانے جذبات کی رو میں وہ کیا کچھ کہتی چلی گئی تھی۔ میں نے سب کچھ ذہن سے نکالا اور پرسکون انداز میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆☆☆

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سارا دن سورج دکھائی نہیں دیا تھا مگر بارش نہیں ہوئی تھی۔ سہ پہر کے بعد ہمیں کچھ دیر کے لیے آرام کرنے کی فراغت ملتی تھی، ہم اس وقت بستی کی طرف جا رہے تھے کہ مہر خدا بخش کے گوپے کے پاس بہت سارے لوگوں کا رش دیکھ کر ہم ٹھنک گئے۔ پھر ہم تیزی سے اس طرف بڑھ گئے۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا، مگر لوگ یوں گوپے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہاں کچھ دیکھنے کے منتظر تھے۔ تقریباً سبھی لوگ وہاں موجود تھے جو بستی میں یا ادھر ادھر رہتے تھے۔ بستی کی طرف سے ابھی کچھ لوگ آ بھی رہے تھے۔ تبھی گوپے کا دروازہ کھلا اور مہر خدا بخش کے ساتھ وہی باباجی بھی نمودار ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے یوں دیکھا جیسے وہ گوپے ہی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مہر خدا بخش نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا، ان کی طرف جاتے ہوئے جب میں میدان کے درمیان میں گیا تو ایک جانب سے اچانک ہچھڑا چھوڑ دیا گیا۔ میں لمحوں میں سمجھ گیا کہ میرے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ جس وقت میں نے ہچھڑے پر نگاہ جمائی ہوئی تھی انہی لمحات میں تانی نے بلم نہا چھری اپنے ہاتھ میں لہرائی اور میری جانب پھینک دی۔ میں اگر چھری پر توجہ دیتا تو ہچھڑا مجھے نکر ماردیتا، مگر یہ میری تو بین تھی کہ چھری زمین پر گر جاتی، میں نے ہوا میں قلابازی لگائی اور چھری کو پکڑ لیا، تب تک ہچھڑا عین میرے نیچے تھا میں نے پوری قوت سے وہ بلم نہا چھری ہچھڑے کے اوپری بدن پر گھونپ دی۔ پھر چھری کے سہارے ہی گھوم کر زمین پر آن کھڑا ہوا۔ ہچھڑا درد کی شدت سے پاگل ہو گیا تھا میں نے ایک جست لی اور اس کے سامنے آ گیا، وہ نکر مارنے کے لیے لپکا تو میں نے اس کے سینک پکڑ لیے۔ اس نے زور زور سے اپنا سر مارنا شروع کر دیا، میں اس کے ساتھ لڑھکتا، کبھی ایک طرف چلا جاتا اور کبھی دوسری طرف، وہ اچھلتا تو میں اس

کے ساتھ اچھل جاتا، تقریباً تین منٹ تک یہی چلتا رہا، تبھی ہچھڑے کا زور ٹوٹ گیا۔ میں نے اپنا دباؤ ایک طرف ڈال دیا۔ دو تین زور کے جھٹکے دیئے تو اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ زمین پر آ گرا۔ میں نے اس کے سینک چھوڑ کر چشم زدن میں چھری اس کے بدن سے نکالی، اس کا خون بہہ نکلا تھا، ہچھڑا تپ کے اٹھنا چاہتا تھا کہ میں نے پاؤں کی ٹھوکرا اس کی تھوٹھنی پر ماری، اس کے حواس مختل ہو گئے، تبھی میں نے ایک لات اس کے سر پر رکھی اور نگہبیر پڑھتے ہوئے اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔ خون کا فوارہ چھوٹ پڑا، ہچھڑا تپ رہا تھا، وہ اٹھنا چاہتا تو میں اس کے ٹھوکرا مارتا، یہ تیز چھری کا کمال تھا، ورنہ شاید مجھے اسے ذبح کرنے میں کچھ مزید دشواری ہوتی، کچھ دیر بعد وہ ساکت ہو گیا، جبکہ میں خون سے لت پت ہو گیا تھا۔ تبھی چند لوگ وہاں آ گئے، انہوں نے میرے ہاتھ سے چھری لیتے ہوئے کہا۔

”جاؤ، نہا کر باباجی کے پاس جاؤ۔“

میں نے سامنے کھڑے باباجی کو دیکھا، انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کیا، جس کا مطلب تھا کہ وہ خوش ہو گئے، میں تیزی سے پلٹا اور بستی کی جانب چل دیا۔

کچھ دیر پہلے جو کچھ میں نے کیا تھا، مجھے خود اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایسا سب کچھ ہو کیسے گیا۔ شاید میرے اندر ہچھڑے کو ذبح کرنے کی خواہش شدت پکڑ گئی تھی لیکن نری خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ ہچھڑے اور میری قوت میں بہت فرق تھا۔ شاید میں نے لاشعوری طور پر اسی تکنیک پر سوچا ہوگا، مگر نہیں، لمحوں میں فیصلے اور ان پر عمل کرنا یونہی نہیں تھا۔ میرے اندر کچھ ایسا بھر گیا تھا جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بلاشبہ میں اسی وجہ سے حیران تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جب میں یہاں آیا تھا تو اندر سے خالی تھا۔

میں والپس گوپے کے پاس پہنچا تو وہاں سامنے میدان میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں گوپے کے اندر چلا گیا۔ حِساں پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ میں نہیں جانتا ان کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔ میرے جاتے ہی ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ باباجی نے میری طرف نگاہوں سے دیکھا، پھر کوئی بات کیے بغیر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اپنے گلے لگایا، مجھے تھکی دی اور کہا۔

”یہ دنیا جنگل تو نہیں ہے پتر، مگر کچھ جانور نما انسانوں نے اسے جنگل بنا دیا ہے۔ ان جانوروں کا کا بھی تو کوئی سدباب کرنا ہے نا۔ کوشش کرو.....“ یہ کہہ کر چند لمحے میری طرف دیکھا اور باہر کی جانب چل پڑے۔ میں ان کی یہ ادائیں سمجھ سکا۔ میں ان کے پیچھے لپکا اور گوپے سے باہر آ گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے میدان میں پہنچ گئے تھے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صحرا میں ادھل ہو گئے۔ میں واپس پیڑھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ نجانے میں کیوں یہ چاہ رہا تھا کہ باباجی میرے پاس کچھ دیر مزید ٹھہرتے اور باتیں کرتے۔

”یہ اچانک آتے ہیں اور اسی طرح چلے جاتے ہیں۔“ مہر خدا بخش نے کہا تو میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اب میری بات ذرا دھیان سے سنو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آج رات تم دونوں یہاں سے جا رہے ہو، یہاں سے جانے کے بعد تم نے بھول جانا ہے کہ کبھی یہاں آئے تھے۔“

”ایسا کیوں مہر صاحب؟“ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”ہم دنیا میں ہر اس جگہ پر ہیں جہاں ہماری ضرورت ہے، میں اس کا ایک حصہ ہوں۔ لیکن تم دونوں کے بارے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ تمہاری آمد سے تقریباً دو ماہ قبل باباجی اچانک یہاں آئے، انہوں نے مجھے بتایا کہ دو مخالف ستوں سے دو لوگ یہاں آئیں گے، انہیں سنبھال لینا، اس سے زیادہ انہوں نے بات نہیں کی تھی۔ پھر تم لوگ آ گئے، یہ بات میں نے تمہیں پہلے ہی بتائی تھی لیکن یہ بات اب تم سمجھ سکتے ہو۔“

”مہر صاحب، ایک منٹ!“ میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ تب میں نے کہا۔ ”آپ لوگ اور باباجی دونوں ایک.....“

”نہیں۔! شاید تم بھول رہے ہو، میں باباجی کا نام تک نہیں جانتا، میں یہاں پر یہ سیٹ اپ بنانے کے لیے آیا تھا، کیونکہ یہ میرا

علاقہ تھا اور میری بود و باش یہیں کی ہے۔ یہ میری ڈیوٹی ہے اور میں یہ ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ جب میں یہاں آیا تو انہی دنوں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے روحانی طور پر میری بہت مدد کی ہے سمجھ لو مجھے اب یہ سمجھ لگ گئی ہے کہ کس ریچھ کو کہاں سے پکڑنا ہے کس کتے کو کیا اشارہ کرنا ہے اور کس بندر کو کیسے نچانا ہے یہ چیزیں مجھے وہ نہیں سکھا سکے جن کے لیے میں نے ساری جوانی تیاگ دی۔“

”وہ لوگ کون؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ راز ہے مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کون کس جگہ پر کیا کر رہا ہے، لیکن سبھی انسانیت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ تمہیں بھی معلوم ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ذہن میں رکھو تم ہمارے نیٹ ورک کا حصہ نہیں ہو، ممکن ہے کبھی ہو جاؤ، میں نے تمہیں یہاں پر فقط باباجی کی وجہ سے رکھا ہے اب تم نے جانا ہے، لیکن اپنے گھر نہیں، ہسپتال کے ساتھ اس کے گاؤں۔“

”میں، اوگی جاؤں گا؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا تو ہسپتال بھی میری طرح چونک گیا۔

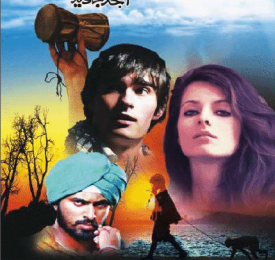
”یہ جمال کا امتحان ہے اور اس کے بعد ہسپتال تمہارا امتحان ہوگا۔ شام ڈھلنے والی ہے، کھانا کھاؤ اور جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم لوگوں نے آج رات ہی سرحد پار کرنی ہے، اب جاؤ تیاری کرو۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو ہم بھی اٹھ گئے۔

ذہن میں ایک دم سے نجانے کتنے سوال گونج اٹھے تھے۔ میں جب وہاں سے نکلا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی دنیا تخیل کرنے وہاں سے نکلا ہوں۔

PART 2

قلندر ذات

امجد جاوید



میرا نوائے شوق

کہانی ختم نہیں ہوتی، کیونکہ جب تک انسان ہے، وہ کہانی بن رہا ہے اور کہانی اُسے بن رہی ہے۔ چاہے کثرت سے وحدت کی طرف دیکھیں یا وحدت سے کثرت کی جانب، یہ سارا پھیلاؤ ایک ہی ہے۔ نکتہ ایک ہی ہے جہاں سے سب پھوٹتا ہے اور جہاں سب سمٹ جاتا ہے۔ یہ سارا پھیلاؤ، یہ پھوٹنا، یہ سمٹنا انسانی صورت ہی کے ساتھ ہے۔ کیونکہ انسانی صورت ہی کردار کا ظہر ہے۔ جیسے کہ سرکار بھٹے شاہؒ نے فرمایا

”گل ایک نکتے وچ مکدی اے“

انسانی حوصلہ اور اس کا ارادہ ایسی قوتیں ہیں، جو کائنات کی تسخیر میں بنیاد قرار دی گئیں ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ زندگی ہے کیا؟ زندگی اور تسخیر میں آخر کیا تعلق ہے، تو اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ زندگی کو تسخیر کرنا ہی زندگی ہے۔ یہ فطری سی بات ہے کہ کسی بھی شے کی تسخیر کے لئے قوت چاہئے ہوتی ہے، اور زندگی کی تسخیر میں صرف ایک ہی قوت کار آمد ہے اور وہ ہے عشق۔ جیسے کہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا،

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم

عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

کہتے ہیں کہ انسانی سوچ کا سراپہ کردار میں نظر آ جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کردار بنتا کیسے ہے؟ انسان وجودی، فکری اور روحانی طور پر کیسے ارتقائی منازل طے کرتا ہے؟ حالات اسے بنا دیتے ہیں یا وہ خود اپنا کردار تخلیق کرتا ہے؟ انسان

اگر اس دنیا میں موجود ہے تو اس کا کردار کیا ہے؟ یہ اور ایسے بہت سارے سوال میرے پیش نظر تھے۔ کیونکہ کردار ہی بتا رہا ہوتا ہے کہ جس صورت سے کردار ظاہر ہو رہا ہے ایسی قوت کا مظہر ہے یا رحمانی قوت کے جلال و جمال کا اظہار ہے۔ دنیا کے تمام فلسفے انسانی صورت ہی سے ظہور پاتے ہیں، دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کہانی کا بہاؤ ایسی سمت میں رواں دواں تھا کہ مجھے ان سوالوں کے جواب بھی درکار تھے۔ الحمد للہ!۔ جہاں تک میری ناقص عقل نے کام کیا، مجھے اس کے جواب ملے اور میں اس داستان کا دوسرا حصہ لکھ پایا۔ اب یہ آپ کی نذر ہیں۔

میں شکر گزار ہوں، جناب حکیم محمد اقبال صاحب، حافظ محمد عباس (لعل بابا) کا جنہوں نے میرے لئے شانِ قلمندرات میں کئی نکتے اور عقدے حل کئے۔ جو آپ سب کی نذر ہیں۔

میں شکر گزار ہوں جناب عمران قریشی صاحب کا جنہوں نے اس داستان کو اپنے ڈائجسٹ نئے افق میں اہتمام سے شائع کیا۔

میں شکر گزار ہوں اس خاک نشین کا جو اپنا آپ ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے۔

میں شکر گزار ہوں اپنے ان تمام قارئین کا جنہوں نے مجھے مسلسل لکھتے رہنے میں ہمیز کا کام کیا۔

دعائیں آپ سب کے لئے، اور آپ سے بھی دعاؤں کا طلب گار ہوں۔

امجد جاوید



رات گہری ہو چلی تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ میں اور جہاں دو اونٹوں پر سوار چلتے چلے جا رہے تھے۔ صحرا میں چلنے اور منزل پر پہنچنے کی تربیت ہمارے کام آ رہی تھی۔ میں ستاروں کی ترتیب سے اپنی راہ پر تھا۔ مجھے چوکیوں کے بارے میں خوب اندازہ تھا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم دونوں باڑ تک آ پہنچے جو ابھی ہم سے کافی دور تھی۔ ہم نے اونٹوں کو واپس ہانک دیا۔ اس وقت میں نے زمین پر لیٹ کر آلہ نکالا تاکہ اپنی سمت درست ہونے کا یقین کر لوں۔ ویسا ہی جہاں لر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہمیں اپنی سمت کے درست ہونے کا یقین ہو گیا۔

ہم کرائنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ ہمیں باڑ کے نیچے بنی سرنگ میں سے گزرنا تھا۔ جو مقامی بھارتی اسمگلروں نے اپنے لیے بنائی تھی اور اس رات انہوں نے اسی سرنگ سے پار آنا تھا۔ ہم بہت قریب جا کر رک گئے۔ ہمارے رالے کے مطابق انہیں اب تک سامنے آ جانا چاہیے تھا۔ ہم زمین سے چپکے ہوئے تھے اور ہماری نگاہیں سامنے لگی ہوئی

تھیں۔ روشنی پھیلنے میں ابھی تین گھنٹے سے زیادہ کا وقت تھا۔ تاہم باڑ پر لگی روشنی سے ارد گرد کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ اسٹاکر وہاں کی سرحدی فورسز کے میل ملاپ ہی سے سرحد پار کرتے تھے۔ ہم زمین سے لگے انتظار کر رہے تھے۔ تھیں سرنگ میں سے ایک بندہ ریٹنگٹا ہوا باہر نکلا اس نے ایک دو لمبے باہر کا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ آیا۔ اس کی کمر پر بڑا سا بیگ تھا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے چھ بندے باہر آئے ان کے پاس ویسے ہی بیگ تھے۔ نجانے اس میں کیا تھا۔ وہ ریٹنگٹے ہوئے ہم سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب بڑھتے چلے گئے۔ ہم مقررہ وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ وقت ہوا سرنگ میں سے تارچ کی روشنی دوبارہ جل کر بجھ گئی۔ ہم تیزی سے ریٹنگٹے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ یہاں تک کہ سرنگ میں سے ہو کر دوسری جانب باہر نکل آئے۔

سامنے کوئی نہیں تھا، ہم ریٹنگٹے ہوئے کافی فاصلہ طے کر گئے یہاں تک کہ ہمیں تارچ کی روشنی سے پھر بتایا گیا کہ ہم نے کدھر جانا ہے کچھ ہی فاصلے پر تین بندے کھڑے تھے۔ ہم نے کھڑے ہو کر ان سے ہاتھ ملایا تو ان میں سے ایک بولا۔ ”چلو بھائی اب گاڑی میں بیٹھو۔“ اس نے تارچ کی روشنی میں ذرا سے فاصلے پر کھڑی فورڈ ہیل جیب کی جانب اشارہ کیا۔ ہم اس میں بیٹھے تو گاڑی چل دی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ سفر طے کرنے کے بعد ایک ڈیرے میں جا پہنچے۔ اس دوران انہوں نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ گاڑی سے اترے تو دیکھا ایک طرف کچھ کمروں کی قطار تھی جس کے باہر مویشی بندھے ہوئے تھے۔ سامنے ذہائی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ ایک طرف کچھ لوگ چار پائیوں پر پڑے سو رہے تھے۔ وہ تینوں ہمیں لیتے ہوئے رہائشی عمارت کی جانب چل پڑے۔ سامنے ہی بڑے سے کمرے میں ایک ادیبز عمر مونا سا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سفید ملبل کا کرتا اور دھوٹی پہنے ہوئے تھا سر پر کچی جھوٹے بال، مونہے چہرے پر موٹی مونچھیں باقی نقوش کے مقابلے میں اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔

”آؤ بھائی آؤ، وقت پر پہنچ گئے۔ آؤ بیٹھو۔“ اس نے اپنے دائیں جانب دھری کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں اندر بٹلے گئے تو وہ بولا۔ ”جسپال کا تو ادھر کوئی مسئلہ نہیں ہے مسئلہ جمال کا ہوگا۔“

”کیسا مسئلہ؟“ میں نے پوچھا۔

”کاغذات تو تیرے بن گئے ہیں۔ تو امرتسر کا رہائشی ہے۔ جس خاندان سے تو تعلق رکھتا ہے اس بارے میں سب کچھ تیرے ہی میل میں ہے دیکھ لینا بس ذرا دھیان سے زبان سے نہ پکڑے جانا۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ تیرا خاندان مسلمان ہی ہے اور تقسیم سے پہلے کا امرتسر میں رہ رہا ہے۔“

”چلو یہ تو میں دیکھ لوں گا، کوئی اور بات؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”اب کہانی سن لو.....“ اس نے چند لمبے جسپال کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تجھے چند غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے چند ہی گڑھ سے۔ انہوں نے ہی تم پر شاپنگ مال میں فائرنگ کی تھی پھر انہوں نے تجھے کہاں رکھا؟ یہ نہیں معلوم۔ بس یہی بات منواتے رہے کہ تو نے رنو پر سنگھ انکپڑ کو قتل کیا ہے۔ ویسے بھی تمہاری حالت پہلے والی نہیں رہی۔ وہاں سے تمہیں نکال کر نجانے کس جگہ لے جا رہے تھے کہ راستے میں جمال کی مدد سے تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اب جالندھر میں ہو یہ تم پر پریس کانفرنس میں کہو گے اور یہ بھی کہ ہر طرح کی عدالت میں ہر طرح کی تفتیش کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو، اور سیدھے سبھاؤ رویندر سنگھ اور رنو پر سنگھ کا نام لے دینا ہے۔“

”کیا جمال کو پریس کے سامنے لایا جائے گا۔ میرا خیال.....“ جسپال نے کہنا چاہا لیکن وہ بات کاٹ کر بولا۔

”تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ یہ کسی جگہ رہے گا بعد میں تمہارے ساتھ آن ملے گا۔ ان چند دنوں میں اسے کچھ سکھایا جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ جسپال مطمئن ہو گیا۔

”اب تم لوگ رہنا چاہو تو رہنا اپنی حالت درست کرو کھانا وغیرہ کھاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ، تم لوگوں نے تقریباً دس بارہ گھنٹے کا سفر کرنا ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ تجھی دونو جوان آئے اور ہماری ایک کمرے تک رہنمائی کی۔ وہاں کچھ دیر رہے اور پھر اگلی سہ پہر تک ہم جالندھر جا پہنچے۔

☆☆☆.....

وہ جالندھر شہر کے باہر کوئی پوش علاقہ تھا۔ جس کے ایک بڑے سارے جنگلے میں مجھے ڈراپ کر کے وہ جسپال کو لے کر چلے گئے۔ میں بہت تھک گیا تھا، مگر سامنے اپنی میزبان کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ وہ لمبے قد کی سڑقدھین تھی، ہانولے رنگ کی جس کے نقوش تھیکے تھے۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے کیسو محض بوائے کٹ تھے، سیلونیس شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے، اس کے دائیں ہاتھ میں لوہے کا کڑا تھا۔ اگرچہ وہ پتلی سی تھی لیکن نسوانی حسن میں خاصی بھاری اور پرکشش تھی۔ اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں دلجیت کور..... آپ کی میزبان، آپ مجھے صرف دل بھی کہہ سکتے ہو۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے ٹیٹ بھجالی میں کہا۔

”لیکن یہ آپ جناب تو نہیں چلے گا اگر میں صرف دل کہوں گا تو؟“

”اؤم جو مرضی کہنا، اندر تو آ جاؤ کہ ساری باتیں ادھر ہی کرنی ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ہم چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر آ بیٹھے۔ تب وہ بولی۔ ”میں تجھے آرام کا اس لیے نہیں کہوں گی کہ ابھی جسپال کی پریس کانفرنس ٹی وی پر آنے والی ہوگی وہ سن لیں تو پھر آرام کر لینا۔ لیکن اتنا وقت ہے کہ تم نہا کر کپڑے بدل لو اگر.....“

”میں فریش ہونا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے لے کر ایک کمرے میں آ گئی۔

میں فریش ہو کر واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ صوفے پر ٹانگیں سیدھے کیے نیم دراز تھی۔ اس کا رخ ٹی وی کی طرف تھا، میز پر چائے دھری ہوئی تھی اور ایک لیپ ٹاپ سامنے والے صوفے پر پڑا تھا۔

”جمال!! اپنی ای میل دیکھ لو پھر باتیں ہوں گی۔“

میں نے لیپ ٹاپ کھولا اور اس میں کھو گیا۔ امرتسر والے جمال کے بارے میں کافی معلومات تھیں، تصویریں اور ویڈیوز تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا کہ دلجیت بولی۔

”ادھر دیکھو جمال! وہ دائیں طرف سنہری عینک والا کیٹھیہ مہرہ ہے۔“

ٹی وی پر جسپال کافی ساری صحافیوں میں گھرا ہوا تھا، وہ بڑے اعتماد سے وہی کہانی دہرا رہا تھا، وہ جب کہہ چکا تو ایک صحافی خاتون نے سوال کیا۔

”وہ شخص جس نے آپ کو فرار ہونے میں مدد دی اب وہ کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا، میں چاہوں گا کہ وہ مجھے ملے، میں اس کا احسان مند ہوں، میں نے اسے اپنے گاؤں کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

”انہوں نے آپ پر تشدد بھی کیا۔“

”پہلے پہل کیا، پھر ذہنی اذیت دیتے رہے، میں اپنے سفارت خانے کے ذریعے ہی قانونی چارہ جوئی کروں گا۔“

اس طرح کی کچھ باتوں کے بعد جسپال کی پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔ میں چائے ختم کر چکا تھا تب دلجیت بولی۔

”اب جاؤ اور آرام کرو۔ رات کھانے پر جگاؤں گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن کیا یہاں تیرے علاوہ کوئی دوسرا نہیں رہتا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ دائیں آنکھ دبا کر بولی۔

”کیوں، نیت خراب ہو رہی ہے مجھ پر۔ ٹو اگر مجھے ہاتھ لگالے تو میں تیری، پھر جو مرضی کر لیتا۔“ اس نے یہ لفظ کہہ تو نبھانے مجھے تانی کیوں یاد آگئی۔ ایسا ہی خمار اس کا تھا۔ مجھے ایک دم سے اس پر غصہ آ گیا۔ تاہم میں نے جھل سے کہا۔

”میری تو نہیں، ممکن ہے تمہاری نیت خراب ہو۔ اس لیے یہاں اکیلی ہو اور باقی رہی ہاتھ لگانے والی بات، تو میں عورتوں سے نہیں لڑتا۔ ورنہ ہاتھ تو کیا تو پوری کی پوری میرے ساتھ آ گئے۔“

”تو نہ سہی میں تو مردوں سے لڑتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چشم زدن میں اٹھی اور تن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کے تیور دیکھے اور لیپ ٹاپ ایک طرف رکھتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا۔ تب وہ بولی۔ ”یہیں لڑو گے یا.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ تبھی وہ ہوا میں اچھلی اور کلک ماری، میں اگر محتاط نہ ہوتا تو وہ میری گردن پر پڑتی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا تھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی عام فائر ہوتا تو خالی جانے والی کلک سے تھوڑا بہت ہی لڑکھڑاتا، مگر وہ اپنے ہی پاؤں پر گھومی اور مجھ پر جست لگادی۔ وہ میرے سر کے برابر تک آ گئی تھی۔ میں ذرا سا جھکا، وہ جیسے ہی میرے سر کے اوپر آئی میں نے دونوں ہاتھوں سے اسے قابو کر لیا۔ وہ کمر کے پاس سے میرے قابو آئی تھی۔ میں نے اپنے جسم کو چلک دی، دونوں ہاتھوں پر اسے گھمایا اور پوری قوت سے صوفے پر دے مارا۔ ایک لمحے تک وہ اٹھ ہی نہ سکی، میں چاہتا تو وہیں پر اسے ڈھیر کر دیتا، مگر میں نے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا۔ تبھی وہ اچھل کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ وہ میرے مد مقابل تھی۔ وہ چند قدم لے کر مکا میرے منہ پر مارنا چاہتی تھی لیکن یہ اس کی چال تھی۔ وہ یکدم جھکی، تھیلی زمین پر لگی اور اپنی ٹانگ میرے پیٹ پر مارنا چاہی یا شاید اس کا نشانہ کچھ اور تھا، میں نے ذرا سا پیچھے ہو کر اس کی ٹانگ پکڑ لی، میں نے اسے دوبارہ زمین پر نہیں ٹکے دیا۔ بلکہ دائرے میں گھمانا چاہا۔ ابھی دائرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس نے جسم کی کمال چلک دکھائی، وہ خود کو لپٹتی ہوئی میری جانب آئی اور میرے کانہوں پر اپنے ہاتھ جمادیے۔ میں نے اس کی ٹانگ چھوڑی تو اس نے اپنا سارا وزن مجھ پر ڈال دیا۔ تبھی میں نے پھر اسے پیٹ ہی سے پکڑا، ایک جھٹکے سے اسے اوپر اٹھایا، اور پھر گھما کر صوفے پر دے مارا، میں جان بوجھ کر اسے فرش پر نہیں مارنا چاہتا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ مجھ پر چھٹی، میں جان بوجھ کر آگے بڑھ گیا اور اسے یوں گلے لگا لیا جیسے معاف کر رہا ہوں۔ وہ میرے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور میں اس کی کمر پر زور ڈال کر اسے دہری کر رہا تھا، میں اس وقت حیران رہ گیا جب وہ دہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا سر اس کی پشت سے لگ گیا۔ وہ اپنے جسم کی چلک کا بہت فائدہ لے رہی تھی۔ میں نے ایک دم سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ مجھے پکڑنا چاہ رہی تھی، لیکن میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی۔ یہ بڑا خطرناک داؤ تھا، اس کی گردن کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ وہ بالکل بے بس ہو گئی، دونوں ٹانگوں کے درمیان سے پکڑی ہوئی گردن وہ دہری تھا اور اس کا پیٹ اوپر تھا۔ وہ اپنی چلک ہی میں مار کھا گئی۔ میں نے چند لمحے اسے یونہی رکھا اور پھر چھوڑ دیا۔ وہ قالین پر گر گئی۔ میں نے اپنا پاؤں اس کے پیٹ پر رکھ دیا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے میری جانب دیکھا، پھر ہنس دی۔ اور اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ میں نے پاؤں ہٹایا تو اٹھتے ہوئے بولی۔

”گڈ۔ اب تم مجھے ہاتھ لگا سکتے ہو۔“

”مگر میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“ میں نے کہا اور لیپ ٹاپ کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے بدن کو بھر پور لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم میں چلک بہت ہے، لیکن اس کا بے جا استعمال تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”میں نے آج محسوس کیا ہے، چلو اب دوستی.....“ اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا، میں نے انتہائی احتیاط سے اس

کا ہاتھ تھام لیا۔ تب وہ بولی۔ ”تمہارے لڑنے کا انداز بھی اچھا ہے، خیر اب جاؤ اور جا کر آرام کر لو، رات کھانے پر ملاقات ہوگی۔“

میں اٹھا اور اپنے لیے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ آتے وقت میں لیپ ٹاپ لانا نہیں بھولا، میں کچھ دیر اس کے ساتھ کھیلتا رہا، پھر اسے بند کر کے ایک طرف رکھا، دلچسپیت کے ساتھ ذرا سی ہاتھ پائی سے میں کچھ گیا تھا کہ میرے یہاں کے میزبان صرف میرے بارے میں جانتا چاہ رہے تھے، ممکن ہے ابھی کچھ مرحلے مزید آئیں۔ میں نے سب کچھ ذہن سے نکالا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆.....

پر تکلف ڈنر کے بعد دلچسپیت کو رنے میری طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”کیا خیال ہے آئس کریم کہیں باہر سے چل کر کھائیں۔“ اس کے ساتھ ہی قریب کھڑے ملازم کو برتن اٹھانے کا اشارہ کر دیا۔

”کیا ایسے ہی چلو گی یا کوئی ڈھنگ کے کپڑے بھی پہنو گی۔“ میں نے کہا تو ہنستے ہوئے بولی۔

”جیسا تم کہو۔“ اس نے آنکھ دبا کر کہا۔ پھر اٹھتے ہوئے بوٹی۔ ”تمہارے لیے کپڑے بیڈ پر پڑے ہیں، وہ پہن کے آؤ“ پھر نکلتے ہیں۔“

میں اٹھ کر کمرے میں گیا تو وہاں پر نیلی جین اور سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پڑی تھی۔ قریب ہی جا کر پڑے تھے۔ میں نے شلوار قمیص کی جگہ وہ پہن لی اور تقریباً دس منٹ بعد جب میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ ہلکے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں تھی۔ اس کی شلوار خاصی گھیر والی اور قمیص سیلیو لیس اور بہت تنگ تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کا اوپری جسم باہر نکلنے کے لیے احتجاج کر رہا ہے اس وقت تک ملازمین نے ڈرائنگ ٹیبل صاف کر دیا تھا۔ وہ کھڑی انگلی میں چابی گھما رہی تھی۔ مجھے اپنا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر وہ بولی۔

”مجھے ہی نہ دیکھتے رہو، چلو باہر کی دنیا دکھاتی ہوں۔“

اس پر میں کچھ نہ بولا، بلکہ باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ پورچ میں سیاہ رنگ کی کروڑا ٹاپ کار کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی میں پنجر سیٹ پر آن بیٹھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور جیسے ہی ہم باہر نکلے تو مین سڑک کی جانب جاتے ہوئے وہ خندیدگی سے بولی۔

”میں جالندھر کی نہیں ہوں، مجھے یہاں آئے ہوئی تین ماہ ہو گئے ہیں، میرے ذمے ایک خاص مشن ہے اس کے لیے کچھ لوگ مجھے دیئے گئے ہیں، جن میں سے ایک تم بھی ہو۔ وہ سارے اسی بنگلے میں نہیں ہیں، اسی شہر کے مختلف علاقوں میں ہیں۔“

”اور تم مجھے ان سے ملوانے لے جا رہی ہو۔“ میں نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”نہیں ابھی تو صرف آئس کریم کھلانے لے جا رہی ہوں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”اور کچھ بتانا چاہو گی۔“ میں نے فطری تجسس کے تحت پوچھا۔

”بہت کچھ۔ ابھی تو میں نے اپنے دل کا حال تم سے کہنا ہے۔“ اس نے فریفتہ ہو جانے والے انداز میں کہا اور اصل بات کو ل کر گئی۔ میں نے بھی دوبارہ نہیں پوچھا تو کچھ دیر بعد بولی۔ ”میں اس خاص مشن کی ساری تفصیلات واپس آ کر ہاری تفصیل سے بتاؤں گی۔ اس دوران ہم تھوڑا بے تکلف تو ہو جائیں۔“ اس نے باباں ہاتھ کی پشت سے میرا گال ہلاتا ہوا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ وہ دکھائی دے رہی ہے وہ وہی نہیں ہے۔ میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کمرشل ایریا میں جا پہنچی۔ جہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ وہ ایک جگہ جا کر کر گئی۔ ہم کار سے اترے اور ایک دوکان

کی جانب چل دیئے۔ اس آئس کریم شاپ کے سامنے دور تک کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ آئس کریم کا آرڈر دے کر اس نے دھیرے سے مگر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
”یہ ارد گرد کی عمارتیں دیکھ رہے ہو جمال؟“

”ہاں دیکھ تو رہا ہوں، کوئی خاص بات؟“ میں نے عام سے انداز میں جواب دیتے ہوئے پوچھا تو اس نے ایک خاص عمارت کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

”وہ عمارت ایک ڈائننگ بار ہے، شہر کے مخصوص لوگ یہاں آتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے ہلا گلا کرنے، جو اکیلے اور عیاشی کرنے۔ اور اس سے کچھ دیر بعد یا کافی دیر بعد ایک بندے نے اپنے گارڈز کے گھیرے میں نکلنا ہے اور ہم نے اسے شوٹ کرنا ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے غیر محسوس انداز میں دوبارہ اس طرف دیکھا اور پھر ارد گرد کا جائزہ لیا۔

”تم نے دیکھا ہوا ہے اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، کئی بار وہ جب بار سے نکلے گا تو میں تمہیں بتا دوں گی، میری آنکھیں اسی عمارت کے اندر موجود ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، لیکن نکلنے کا راستہ تم نے طے کیا ہوا ہے؟“

”ہاں اس کی تم فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس زیادہ سے زیادہ دو منٹ ہوں گے۔ پستل اور گن، جو تم چاہو وہ کار میں پڑا ہوا ہے۔“ اس نے ویٹر کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”یہاں کی آئس کریم بہت اچھی ہے۔“ ویٹر تیزی سے آئس کریم رکھ کر چلا گیا اور میں ذہنی طور پر پلان کرنے لگا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ کچھ دیر بعد جب ہم آئس کریم ختم کر چکے تب میں نے کہا۔
”دلچسپ اٹھو۔“

”لیکن ابھی.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

”میں کہہ رہا ہوں نا کہ اٹھو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گئی۔ ویٹر تیزی سے آیا تو دلچسپیت نے اس کا دل دے دیا۔ ہم ٹپلتے ہوئے کار میں چلے گئے۔ ”اگر یہی پلان تم مجھے پہلے بتا دیتی تو میں تمہیں یہاں نہ بیٹھنے دیتا، ہم یہاں نظروں میں آچکے ہیں۔“

”ممکن ہے تمہاری سوچ ہو، لیکن میں تقریباً روزانہ آتی ہوں اور کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا ہے اور دیکھنا میں کل بھی تمہیں لے کر یہاں آؤں گی۔“

”اچھا چلو کار لگاؤ۔“ میں نے کہا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست کے نیچے گن اور پستل پڑا ہوا تھا۔ دلچسپیت نے کار آہستہ آہستہ نکال لی اس کی نگاہیں سیل فون پر تھیں اور میں اس پورے علاقے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے گن اٹھالی وہ زیادہ ریج کی تھی اس پر سائیکلسنگ لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اپنے پاؤں میں رکھ لی یہ اطمینان کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ”جیسے ہی تمہیں اس کے باہر نکلنے کی اطلاع ملے گا اس عمارت کے سامنے لے آنا مجھے صرف اتنا بتا دینا کہ وہ کون ہے، کار روکنا نہیں، اسپید سے چلتے جانا۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور کار لے کر ایک سڑک پر چل دی۔ وہ بہت آہستہ رفتار سے جاری تھی۔ اچانک اس نے تیزی سے یوٹرن لیا اور بولی۔ ”وہ باہر نکل رہا ہے۔“

اس نے کہا تو میں الارٹ ہو گیا۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑنے لگی۔ بہت عرصے بعد میں نے یوں محسوس کیا تھا۔ تقریباً دو منٹ کے بعد وہ عمارت دکھائی دینے لگی۔ ذرا اور قریب جا کر دلچسپیت بولی۔

”وہ دیکھو وہ چار لوگوں کے درمیان لمبے بالوں والا لڑکا، ریڈ شرٹ، ابھی کار سامنے آئے گی اور وہ اس میں بیٹھ جائے گا۔“

”تیز چلو۔“ میں نے کہا اور گن کی نال ونڈو پر رکھ دی۔ بالکل سامنے جب وہ آیا تو میرے نشانے پر تھا، میں نے فائر کر دیا۔ ذرا سی آواز ابھری تھی، میں نے گھوم کر دیکھا، وہ اپنا سینہ تھامے ٹپ رہا تھا۔ ”دل تیز نکلو۔“

”کیا بتا؟“

”فائر لگ گیا ہے۔“ میں نے کہا تو دلچسپیت نے انتہائی تیز رفتاری سے کار بڑھاتی چلی گئی۔ ایک کر اس پر اس نے رفتار دھیمی کی اور پھر نائل انداز میں چلنے لگی۔ تبھی اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کان سے لگایا، پھر جوش سے بولی۔

”لیس..... جمال..... لیس..... پھاڑ دیا سینہ اس کا..... چل اب گھر جا کے سیلی بریٹ کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ بنگلہ آ گیا۔ چونکدار نے گیٹ کھولا تو وہ کار پورچ میں لے جا کر روک دی۔ میں باہر نکلا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے ہی میرے گلے لگ گئی۔ خوشی میں نجائے کتنی بار میرا منہ چوم لیا۔

”اؤنیر تو ہے، پاگل ہو گئی ہے تو.....“ میں نے اسی پرے دھکیلے ہوئے کہا۔

”اویار اس فٹل کا اثر کیا ہے، تم نہیں جانتے آؤ بتاؤں۔“ یہ کہہ کر اس نے میرا بازو پکڑا اور ہم اندر چلے گئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں رکی، بلکہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ اس نے ٹی وی آن کیا، اور اپنے جوتے اتار کر میرے جوتے اتارنے لگی۔ میں اس کے طرز عمل پر حیران تھا۔ میں جب آلتی پالتی مارکر بیڈ پر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔ ”سن جمال! یہ جس لڑکے کو تم نے قتل کیا ہے، یہ یہاں مے سب سے خطرناک اور بااثر بندے کا اکلوتا بیٹا ہے۔ مدہن لعل نام ہے اس کا۔ بظاہر بڑا سرمایہ دار ہے، صنعت کار ہے، لیکن اس شہر پر راج کرتا ہے اور پچھلے تین برس سے وہ پورے جنوبی ایشیا میں پھیل جانے کے لیے پرتول رہا ہے۔“

”اسنے بڑے آدی کا بیٹا اور یوں کھلے عام، چند گارڈز کے ساتھ؟“ میں نے پوچھا۔

”جنگل میں ایک ہی شیر حکومت کرتا ہے اور مدہن لعل ایسا ہی ہے، کوئی لکس کے خلاف سراٹھانے کی جرات نہیں کر پارہا ہے۔“ اس نے جوش سے کہا۔

”تمہارا اس کے ساتھ کیا لینا دینا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ میرا مشن ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولتی چلی گئی، ”اس شخص مدہن لعل نے یہاں بہت بڑی کیمیکل فیکٹری لگائی ہے جو بظاہر بے ضرر ہے لیکن یہ اس میں ایک ایسا کیمیکل تیار کر رہا ہے جو پانی میں ملا دیا جائے تو وہ تیز شراب بن جاتی ہے جو فوری طور پر تو کوئی بڑے اثرات نہیں دکھاتی، لیکن چند ہی ہفتوں بعد شراب پینے والا کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔“

”اصل بات بتاؤ۔ سیاسی بیان چھو۔“

”تو سنو۔! یہ بندہ سکھ قوم کے انتہائی خلاف ہے جس طرح انتہا پسند ہندو مسلمانوں کو بھارت میں نہیں دیکھنا چاہتے اور انہوں نے پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا، مدہن لعل ان لوگوں میں شامل ہے جو سکھوں کو بھارت میں نہیں دیکھنا چاہتے اور خالصتان تحریک کے اس قدر مخالف ہیں کہ اپنی زندگی اس کی مخالفت میں لگا دی ہے۔ یہ شراب اس کا سب سے بڑا وار ہے۔ اپنے پورے پلان کے ساتھ یہ شراب سکھ نوجوانوں کو مفت دے رہا ہے ابھی یہ اس کے تجرباتی مراحل میں ہے اس کا مان ہے کہ جنوبی ایشیاء میں ایک تنظیم کھڑی کرے اور اس تنظیم کو باقاعدہ اس کام پر لگا دے گا روپاری بنیاد پر، تاکہ لوگ اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں دولت کمانے کے لئے۔ اور میں، اس کا سب کچھ ختم کر دینا چاہتی ہوں۔“ آخری لفظ

دلچسپیت نے انتہائی نفرت سے کہے۔

”کیا یہ اکیلا ہی ایسا کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں یہاں کی خفیہ ایجنسی اس کے ساتھ ہے۔ اب دیکھنا اس قتل پر کتنا شور مچتا ہے۔ یہ سیدھے سیدھے الزام دہشت گردوں پر لگائے گا اور سخت سے سخت قانون بنانے کا مطالبہ کرے گا لیکن اب ہمارے پاس صرف پانچ دن ہیں۔ صرف پانچ دن۔“

”وہ تم جانو کہ تم کیا کرتی ہو مجھے بتاؤ“ میں نے کیا کرنا ہے۔“

”فی الحال یہ دیکھو!“ اس نے ٹی وی اسکرین پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ منو ہر لعل چل بسا تھا۔

”تم دیکھو میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے مجھے اپنی بغل میں لیتے ہوئے کہا۔

”اوتے ٹھہر جا، ابھی تو سیلی بریٹ.....“

میں نے آنکھیں سے اپنا آپ چھڑایا اور باہر کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆

جیسے ہی جہاں نے پریس کانفرنس ختم کی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ بہت سارے صحافی سب کچھ جان لینا چاہتے تھے لیکن کیشو مہر نے جہاں کو ان سب کے درمیان سے نکالنے کے لیے اپنے بندوں کو اشارہ کر دیا۔ انہوں نے جہاں کو گھیرے میں لیا اور باہر کی جانب چل پڑے۔ چند لمحے بعد کیشو مہر بھی اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھے تو کار چل دی۔ تب وہ بولا۔

”جہاں! اب میرا اور تمہارا ساتھ ایک وکیل اور کلائٹ ہی کارہ گیا ہے اب تم جن کے ساتھ ہو وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں مہرہ جی آپ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ جہاں نے پوچھا۔

”تمہارے یہاں آنے سے پہلے تک مجھے خبر نہیں تھی کہ تم کہاں ہو اور اتنا عرصہ کہاں رہے ہو۔ بہر حال مجھے اور جمیندر کو یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب تم ان لوگوں کی ذمہ داری ہو۔ اس معاملے میں انہوں نے اچھی خاصی بریفنگ دی ہے اب میرا معاملہ صرف اتنا ہے کہ چند دن کے اندر اندر تمہاری جائیداد والا معاملہ حل کر دوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اب تک حل بھی ہو گیا ہوگا۔ میری تو صرف فارمیٹیشن ہوگی۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ مرعوب ہو گیا ہو۔ تب جہاں نے پھر پوچھا۔

”کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟ وہ لوگ کون؟ میں سمجھا نہیں۔“

”بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ اب تم سیدھے اوگی جاؤ بے فکر ہو کر۔“ اس نے مبہم سی بات کی اور ایک جگہ ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور رک گیا۔ کیشو مہر اتار تو کار پھر سے چل دی۔

سورج مغربی افق میں ڈوب چکا تھا۔ جب جہاں اوگی میں کوشی کے سامنے پہنچا۔ اس نے دور ہی سے دیکھا، کوشی کے سامنے بہت سارے لوگ جمع تھے۔ یہ ایک طرح سے خطرناک معاملہ تھا۔ اگرچہ ان کا انداز استغفہامیہ ہی لگتا تھا مگر ان میں کوئی دشمن بھی ہو سکتا تھا۔ وہ محتاط ہو گیا۔ جیسے ہی ان کے پاس کار کی وہ اترا آیا۔ لوگوں نے پھولوں کے ہار اس کے گلے میں ڈالے ایک طرف ڈھول بجنے لگا۔ ان میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو ایک بار اسے گمراہ کر لے تھے۔ وہ کچھ دیر ان سے ملتا ملتا رہا پھر اندر کی جانب چل دیا۔ بننا سنگھ نے گیٹ بند کر دیا۔ سامنے کلچیت کور ہر پریت اور انوجیت کھڑے تھے۔ ہر پریت اسے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب سے گلے ملا پھر ڈرائنگ روم میں اس نے وہی کہانی سنائی جو کچھ دیر پہلے پریس کانفرنس میں سنا چکا تھا۔ ابھی انوجیت نے کہا۔

”تم نے دیکھا تمہاری واپسی پر اوگی پنڈ والوں میں اتنا جوش و خروش کیوں ہے؟“

”ہاں یہ میں جانتا جا ہوں گا۔“ جہاں نے تجسس سے پوچھا۔

”تم نے جو بلجیت سنگھ کے ساتھ کیا تھا یہ ان کی اندر کی خواہش تھی وہ دوبارہ لوٹ کر اوگی آ ہی نہیں سکا ہے ابھی تک دہلی میں ہے اپنے باپ کے پاس۔ ان کا تو جیسے یہاں سے صفایا ہی ہو گیا ہے۔“ انوجیت نے بتایا۔

”میں نے سنا تم پر پولیس نے بہت تشدد کیا؟“ جہاں نے آنکھیں سے پوچھا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”یاریہ تو چلتا ہی رہتا ہے تم بے فکر ہو۔“

”چل پتر! اب تو فریش ہو جا“ میں اتنی دیر میں کھانا لگواتی ہوں۔“ کلچیت کور نے کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے ہر پریت کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا اور وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے مبہم سا اشارہ لے کر اٹھ گیا۔

جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ جبکہ اس کی اپنی دنیا بدل چکی تھی۔ ہر شے کی ویسے ہی پڑی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہر پریت اندر داخل ہوئی۔ وہ اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں جوش و خروش ختم ہو کر رہ گیا ہو۔ وہ اس کے پاس گیا اور دونوں ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

”پریتی! کیا ہوا تجھے ایسا کیوں؟“ اس نے پریشانی میں پوچھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اور وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم سے اس کے سینے کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔ ”پریتی! کیا ہوا؟ مجھے بتاؤ تم کیوں رورہی ہو؟“

”پہلی بار! مجھے خوف آیا ہے تیرے جانے کے بعد۔ میں تجھے کھونا نہیں چاہتی جہاں۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“

”اوہ! میں سمجھا نہیں کیا ہو گیا۔“ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اسے الگ کیا تو ہر پریت کا چہرہ ویسا ہی ستا ہوا اور آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے ہیکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں جہاں! بہت کچھ بدل گیا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں بدلا اور اپنا یہ موڈ ٹھیک کر ڈیں تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“ جہاں نے خوشگوار موڈ میں کہا تو وہ دھیرے سے غم زدہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”اب تو تیرے ساتھ باتیں کرنی ہیں یا پھر تیری ہی باتیں کرنی ہیں۔ تیرے بنا اب رہ گیا ہے۔“ اس کے یوں کہنے پر جہاں نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہر پریت! میں تمہیں پہلے جیسا ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ زندگی سے بھرپور۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور آنسو پونچھتی ہوئی ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”تم جاؤ ہاتھ روم میں تمہارے لیے کپڑے نکال دی ہوں۔“

جہاں نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔

لہانے پر دیر تک باتیں چلتی رہیں۔ اس نے اپنے بارے میں کم اور وہاں کی صورت حال کے بارے میں زیادہ بات لی۔ ہلاہراوگی میں اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بلجیت اور اس کا خاندان یہاں سے جا چکا تھا۔ انوجیت کو پھنسیا گیا تھا لیکن دلیر لکھ نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ پولیس کے علاوہ جہاں جہاں بھی ضمانت دینے کی ضرورت پڑی وہاں دلیر لکھ نے ہی ضمانت دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سارے لوگ جو بلجیت سنگھ سے تنگ تھے وہ سبھی انوجیت کے حق میں ہو گئے مجموعی طور پر

اوگی پنڈ کا ماحول بدل چکا تھا۔

”انوجیت جو بھی ہو جائے میں نے رویندر سنگھ کے خاندان کو ختم کرنا ہے بلجیت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اب کہاں ہے؟ دہلی کے کس ہسپتال میں ہے یا.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی تو انوجیت بولا۔

”وہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ میرے خیال میں وہ زیادہ سزا بھگت رہا ہے۔ اپنے باپ کے پاس دہلی ہی میں ہے مجھے تو یہی معلوم ہے آگے رب جانے۔“

”چل ٹھیک ہے میں پتہ کر لوں گا۔“ میں نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو ہر پریت نے جہاں کی طرف بڑے غور سے دیکھا جس کی اسے سمجھ نہیں آ سکی۔

کھانے کے بعد جہاں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے ذہن میں جمال تھا۔ نجائے اب وہ کہاں ہوگا؟ روہی میں جو ایک ساتھ وقت گزرا تھا اس باعث جمال کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ اکیلا پڑا آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا ہوگا۔ بلجیت کی حالت کے بارے میں جان کر نہ تو اسے افسوس ہوا تھا اور نہ خوشی شاید وہ اسے اپنے ہاتھوں سے مارتا چاہتا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ہر پریت ایک چھوٹے سی ٹرے میں چائے کے دھگ رکھے آگئی۔ اس نے خاموشی سے بیڈ پر ٹرے رکھی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”ہر پریت! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہاں گئے تمہارے وہ دعوے ایک گولی کھا کر تم اتنی بدل گئی ہو؟ کیا اب موت سے ڈر لگنے لگا ہے۔“

یہ سن کر وہ چند لمحے جہاں کے چہرے پر دیکھتی رہی پھر بولی تو اس کے لہجے میں افسردگی چھلک رہی تھی۔

”جہاں! میں اب بھی ویسی ہی ہوں لیکن افسوس میں ہوں کہ مجھے یہ گولی اس لیے لگی کہ میں تیرے ساتھ تھی جس مقصد کے لیے میں زندہ ہوں یہ گولی اس کے لیے مجھے نہیں لگی میں اپنے مقصد سے ہٹ گئی تھی شاید رب کو میرا یہ عمل پسند نہیں آیا۔ میں عورت ہوں میرے بھی جذبات ہیں میں چاہے جتنی بھی سخت ہو جاؤں فطری طور پر محبت تو میرے اندر ہے نا۔ تیری جدائی نے مجھ پر یہ راز انکشاف کیا تو مجھے لگا میں نا کام ہو گئی۔“

”پریتی! میں تیری ساری باتیں مانتا ہوں لیکن مجھے بتا اس میں میرا دوش کیا ہے اور جہاں تک تیری ناکامی کی بات ہے تو یہ جان لے میرا مقصد پورا ہو گیا تو میں تیرے مقصد کے لیے لڑوں گا اس کی مجھے آگئی ہو گئی ہے۔“

”سچ جہاں! تو ”سکھی“ کے لیے لڑے گا۔“ اس نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

”ہاں پریتی! مجھے لڑنا ہوگا لیکن اس طرح نہیں جیسے یہاں کے لوگ جرم کے راستے پر چل پڑے ہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں انہیں جرم کے راستے پر ڈال دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی حریت پسند تنظیم جب جرم کے راستے پر ڈال دی جائے تو نہ صرف اپنا مقصد کھو بیٹھتی ہے بلکہ وہ اپنی قوم کا نقصان کرتی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ ہر پریت نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دیکھ! اس وقت ہتھیاروں کی لڑائی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ دشمن نے بڑے گہرے وار کر دیے ہیں سکھ قوم پر۔ شراب کو ان کی رگوں میں ایسے ڈال دیا ہے کہ وہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتے گانوں کے ذریعے فلموں کے ذریعے اور نجائے کس کس طرح ان کے اندر جواں مردی کی علامت شراب پینا بتایا گیا ہے اور سکھ قوم شراب پی رہی ہے۔ تجھے معلوم ہے پورے بھارت میں سب سے زیادہ شراب پنجاب میں پی جاتی ہے۔ کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے سکھ قوم کو، بندوق اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرا نوالہ کا جو پیغام ہے اب سکھ نوجوان اس سے دور بھاگتے ہیں۔ تو خود بتا سا کا چوراسی کے نام سے کس قدر شرمناکی محسوس کرتے ہیں۔ نام نہیں لیتے صرف تیسری نسل کے لوگ ہیں جو

انقام کے چکر میں ہیں۔ پھر اس کے بعد کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے پہلے سکھ قوم کی ذہن سازی کی جائے۔“ ہر پریت نے کہا۔

”تو اور کیا، سکھ قوم کی قوت جن نظریات سے تھی وہ ختم ہو رہی ہے۔ اب دیکھو سا کا چوراسی سکھ قوم کے خلاف ہوا اور

سکھوں کے روحانی مرکز ہر مندر صاحب میں ہوا سکھ قوم کا نقل عام ہوا سکھوں کی عبادت گاہ میں۔ اب سکھ قوم اپنی ہی

عبادت گاہ میں اس سانحہ کی یادگار نصب کرنا چاہتی ہے ہر مندر صاحب میں لیکن نہیں کر پار ہے اپنی ہی عبادت گاہ میں اپنی

یادگار نصب نہیں کر پار ہے پریتی وہ کون سی قوت ہے جو ایسا نہیں کرنے دے رہی۔ وہ دشمن نہیں بلکہ اپنے ہی ہیں ہم میں

اتحاد نہیں اس سے ہی اپنی قوت کا اندازہ لگا لو۔“

”تو بڑی مایوسی والی باتیں کر رہا ہے جہاں۔“ وہ واقعتاً مایوسانہ لہجے میں بولی۔

”جب تک بیماری کا علم نہ ہو علاج کیسے ممکن ہوگا۔ میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ آج بھی ایک سکھ سوالا کہ ہندوؤں

پر بھاری ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے بابا جی مہاراج کے خیالات کو اپنانا ہوگا۔ میں جو سوچ رہا ہوں وہ میں تجھے بتاؤں گا۔

لیکن یہ زمینیں اور جائیداد میرے نام ہو جائیں۔ مانوئل نہیں ہونا۔ ہم فریڈم فائٹر ہیں اور رہیں گے لیکن ہمارا اپنا انداز ہوگا۔

سکھ تنظیمیں جو کرتی ہیں وہ کرتی رہیں وہ ان کا کام ہے ہم اپنا کام کریں گے۔“

”جی جی ایک بات کہوں۔“ وہ بڑے پیار سے بولی۔

”بولو!۔“ اس نے کہا۔

”تیرے لہجے اور بات کرنے میں بڑا اعتماد آ گیا ہے۔ کہاں رہا ہے تو اتنے دن۔“ اس نے پوچھا۔

”میں نے بڑی اذیت میں وقت گزرا ہے۔ کسی بھی لمحے زندگی ختم ہو سکتی تھی۔ یہ واہ گرد کی مہر ہے کہ میں اب تمہارے

سامنے زندہ ہوں۔ موت کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر اعتماد ہی جاتا ہے۔“ جہاں نے کہا اور چائے کا گک اٹھا کر لمبا

سپ لیا۔ ہر پریت نے بھی گک اٹھا کر چائے کی چسکی لی اور چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

”ایک وقت کے لیے تو ایسا لگا تھا کہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پر نہیں واہ گرد ہم سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔“

”وہ سارے کام ہو جائیں گے پر تو وہ پہلے والی ہر پریت بن جا، شوخ و چنچل۔“ جہاں نے کہا تو وہ ایک دم سے ہنس

دی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا پھر بولا۔

”کل صبح تیار رہنا ہم نے جالندھر جانا ہے۔ وہاں کے پولیس چیف سے ملاقات ہے ہو سکتا ہے ہمیں دہلی بھی جانا

پڑے اپنے سفارت خانے۔“

”تو جہاں رہے گا؟ میں تیرے ساتھ رہوں گی جہاں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے بالکل قریب ہو گئی۔ جہاں نے بھی

اسے سہارا دے دیا۔ وہ دونوں بیڈ کے سہارے لگ کر بیٹھ گئے۔ پھر خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ ایک طرف رکھ رکھ کر

بولی۔ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم یوں بچھڑ کر پھر ایک ساتھ یوں بیٹھیں گے حسرت ہی ہو گئی تھی۔“

”اب تو اپنے ذہن سے سب کچھ نکال دے۔ ساری مایوسی ایک طرف رکھ دے اور صرف یہ سوچ کہ آئندہ آنے

والے دنوں میں کیا ہو سکتا ہے اور اس سے ہم نے نبرد آزما کیسے ہونا ہے۔“ یہ کہہ کر جہاں نے اسے مزید قریب کر لیا۔ وہ

اس کی بانہوں میں یوں پھیل گئی جیسے برسوں سے تری ہوئی ہو۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا جبکہ جہاں اس کو صلد دینے کے انداز میں جھکی دینے لگا۔

☆☆☆

صبح میری آنکھ کھلی تو ابھی اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر بیڈ پر کسمسٹا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ میں فریش ہو کر یہ

سوچ ہی رہا تھا کہ کچن تک جاؤں اور چائے بنا کر پیوں۔ اتنے میں دلچیت کورا اندر آئی اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا جبکہ دوسرا وہ خود پی رہی تھی۔ اس نے وہ جوس کا گلاس میری جانب بڑھا دیا تو میں نے پوچھا۔
”تجھے کیسے معلوم کہ اس وقت مجھے کچھ پینے کی طلب ہو رہی تھی۔“ یہ کہہ کر میں نے گلاس تھام لیا۔
”صبح اٹھنے کے بعد ہر بندے کو بھوک لگتی ہے۔ یہ فطری سی بات ہے۔ انار کا جوس ہے پی لو۔“ اس نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت بھی وہ انتہائی مختصر لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
”اور تجھے معلوم ہو گیا کہ میں اٹھ گیا ہوں؟“

”یہ عمارت میرے کنٹرول میں ہے یہاں جو ہوتا ہے مجھے معلوم ہوتا ہے خیر۔! تم یہ جوس انجوائے کر کے ڈرائنگ روم میں آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی میں ہلکے ہلکے سپ لیتا ہوا کھڑکی میں آن کھڑا ہوا باہر صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے سکون سے جوس ختم کر کے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ دلچیت کو رگیروں رنگ کے شلوار قمیص میں کھڑی تھی۔ سر پر دوپٹہ تھا وہ مجھے اشارہ کر کے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا وہ ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی ایک سکھ گیانی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکے ایک طرف جبکہ لڑکیاں دوسری جانب۔ میں بھی لڑکوں والی طرف بیٹھ گیا۔ وہ تقریر کر رہا تھا کہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ میری جانب اس نے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر بولتا چلا گیا۔

”برصغیر کی تاریخ کیا ہے؟ لیکن ذرا غور فرمائیے۔ کیا واقعی ہم اسے تاریخ کہہ سکتے ہیں؟ یا پھر برصغیر کے حکمرانوں سیاست دانوں اور سوراؤں کے منہ پر پوتی ہوئی کالک۔ کسی مذہب یا مت کی اس میں تخصیص نہیں ہر ایک نے دوسرے کی عبادت گاہوں کو گرایا۔ سمار کیا، ملیا میٹ کر کے اپنی فتح کا اعلان کیا، کیا ثابت کرنے کے لیے؟ کیا برصغیر کی مٹی ہی ایسی ہے؟ دوسرے مذہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا موقع نہیں ملا تو اپنے ہی مذہب کے ان لوگوں پر جو کسی نہ کسی حوالے سے ایک دوسرے کے گھریے سے اختلاف رکھتے ہیں محاذ آرائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ گلے کاٹنے، لہو بہا یا اور زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ انسان، جو اس دھرتی پر چلتا ہے اسی دھرتی پر پیدا ہوا۔ کیا اس دھرتی کی مٹی اس قدر ظالم اور لہو کی پیاسی ہے کہ اسکی پیاس بجھتی ہی نہیں۔ مہا بھارت سے لے کر عظیم ہجرت 1947ء تک، پھر سامنے 1984ء تک اور پھر آج تک، اس دھرتی نے کتنا لہو پیا؟ سوال یہ ہے کہ دھرتی پیاسی ہے یا اس دھرتی پر پیدا ہونے والے انسان کی سوچ میں لہو بہانے کی پیاس ہے؟

1947ء میں برصغیر میں لکیر کھینچ دی۔ بے حساب انسانی خون بہا، ان دنوں بارشیں اور سیلاب آنے کی وجہ سمجھ میں آئی؟ بلکہ اب بھی سمجھ میں نہیں آتی وہ دھرتی کے ماتھے پر کالک کو صاف کرنے کے لیے تھا یا لہو بہانے والے ذہنوں پر سے۔ لگتا تھا کہ شاید اب اس دھرتی کے لوگ سنسٹھل جائیں گے۔ اتنا لہو..... لیکن نہیں لہو پھر بھی بہا، لکیر کے اس پار بھی اور لکیر کے اس پار بھی اور اب تک بہہ رہا ہے۔ آسمان حیران ہے دھرتی پریشان ہے یہ سب مذہب کے نام پر ہو رہا ہے؟ وہ سارے مذہب، جو امن آشتی اور بھائی چارے کے علمبردار ہیں۔ کیا مذہبی و چار نہیں سمجھے گئے یا پھر ہم ان اخلاقی ضابطہ حیات کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں؟ بہتا ہوا لہو..... اب بھی یہ سوال کر رہا ہے۔ یہ دھرتی لہو کی پیاسی ہے یا اس دھرتی پر پیدا ہونے والے انسان؟ سوال یہ ہے کہ اس سوال کا جواب ہم کس سے لیں۔ کیونکہ سب ہی اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ کوئی بھی خود کو ناحق نہیں سمجھتا۔ سبھی کے پاس دلائل کے انبار ہیں۔ اور المیہ یہ ہے کہ سبھی اپنے اپنے مذہب سے دلائل لیتے ہیں جو قوم بستی ہے وہی لہو کا خراج دیتی ہے۔ یہ تاریخ ہے۔ کیا ہم سارے مل کر یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ لہو صرف اور صرف منافقت سے بہتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن منافق ہے..... چانکیہ کا پیر و کار کون ہے؟ کون سازش کرنے کی تعلیم دیتا ہے؟

کون سا مذہب یا مت منافقت کی باقاعدہ تربیت دیتا ہے؟ جب یہ پہچان لیا جائے تو لہو بہانے والے کی سوچ بھی واضح ہو جائے گی۔ منافق، اندر سے کچھ اور ہوتا ہے اور باہر سے کچھ اور..... وہ اپنوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور دشمن کو بھی یہی شیطانت ہے..... اور ہمیں اس کے خلاف ہی لڑنا ہے..... یہاں معاملہ مذہب اور مت کا نہیں رہ جاتا..... بلکہ انسانیت کا ہے۔ انسان، جو سچے رب کی سوئی تخلیق ہے۔“

گیانی کہہ چکا تو چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر سکھ مت کے مطابق بات کر کے اٹھ گیا۔ ناشتے کی میز پر بھی تھے۔ بالکل خاموش، ایک دوسرے نے اجنبی، میں نے ایک نظر سب کو دیکھا، وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں تھے جو کچھ دیر پہلے گیانی کی بات سن رہے تھے۔ ناشتہ ختم کرتے ہی دلچیت کو رنے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”آپ سب لوگ صحافیوں کے روپ میں شہر میں پھیل جائیں گے۔ پورا امکان ہے کہ شہر میں جلوس نکلے گا، احتجاج ہوگا، ممکن ہے توڑ پھوڑ بھی ہو، آپ نے کرنا یہ ہے کہ احتجاجی جلوس نکالنے والے جو چند لوگ ہوتے ہیں ان کی تصاویر اور ویڈیو بنانی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو عوام کو حرکت میں لائے ہیں۔“

”ظاہر ہے ان میں پولیس کے علاوہ خفیہ کے لوگ بھی ہوں گے۔ وہ بھی تو رپ کرنے کے چکر میں ہوں گے۔“ ان میں موجود ایک لڑکے نے کہا جو کافی صحت مند تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ خفیہ والے ہی جلوس نکلاؤں۔ یہی تو دیکھنا ہے اور میرے خیال میں ہر صحافی کو چیک نہیں کیا جائے گا کہ وہ آپ لوگوں کو رپ کر لیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کا ابھی تک کوئی ریکارڈ کہیں پر نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سب کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ”کوئی سوال؟“ دل کے پوچھنے پر کسی نے کوئی بات نہیں کی تو اس نے سب کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سب جا چکے تو میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”آؤ، تمہیں جانندہ شہر کی سیر کروا کر لاؤں۔“

”چلو۔“ میں نے کانڈھے اچکاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ ہم پورچ میں آئے تو ایک سفید رنگ کی کار وہاں کھڑی تھی۔ بلاشبہ رات والی کار کہیں ٹھکانے لگا دی گئی ہوگی۔ ہم اس کار میں بیٹھے اور چل دیے۔ ڈرائیونگ دلچیت ہی کر رہی تھی۔ مین سڑک پر آ کر بولی۔

”بھال۔! رات سے فقہ پولیس ہی نہیں خفیہ والے پوری شدت سے قاتل کو تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے کئی جگہوں پر چھاپہ مارا ہے۔ اس سے ایک آئیڈیا ہو گیا ہے کہ ان کے دشمن کون ہو سکتے ہیں۔ رات بھر سے مدن لعل خود سب کی کارروائی دیکھ رہا ہے۔ اس کے اپنے بندے بھی پھیل چکے ہیں۔“

”تو سیکورٹی ہائی الرٹ ہے۔“ میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔
”وہ تو ہے لیکن اس ہائی الرٹ میں ہم نے ایک بندہ پار کرنا ہے جو اس وقت پارک میں جاٹنگ کر رہا ہے۔“
”کون ہے وہ؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”مدن لعل کا سیاسی حریف سردار نہال سنگھ۔ اب یہ مت کہنا کہ وہ بے چارہ کیوں مارا جائے گا۔ وہ بے چارہ نہیں ہے یہ سمجھو کہ وہ ناسور ہے جس نے سکھوں کی جوان نسل کو مروایا۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں نفرت درآئی تھی۔ میں خاموش رہا۔ اس وقت مجھے عجیب سا محسوس ہوا تھا کہ میں ایسے بندے کو کیوں ماروں جس کا مجھ سے براہ راست کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ بولی۔ ”اور پتہ ہے یہ وہ بندہ ہے جو پاکستانی پنجاب میں ”را“ کی دہشت گرد کارروائیوں میں صلاح کار ہے جو لوگ پلاننگ کرتے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے۔“

”پھر تو اسے اغوا کر کے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔
”ایسا بھی ہوگا آگ لگ جائے تو جنگل کے بندر اپنے ٹھکانے چھوڑتے ہیں۔ ان میں طرح طرح کے جانور ہوتے

ہیں۔ میں بتاؤں گی کہ وہ کون ہے۔ جبہ اغوا کر کے تم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو لیکن ابھی وہ چھپا ہوا ہے، میں بعد میں بتاتی ہوں تفصیل سے۔“

”اوکے۔!“ میں نے کہا اور درگردد دیکھنے لگا۔ اس وقت گاڑی شہر کے طویل پل پر سے گزر رہی تھی۔ کافی جدید روپ لے لیا تھا جالندھر شہر نے۔ میں نے اپنا مٹل دیکھا، میگزین نکال کر پھر لگایا اور سامنے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکیوں کے کالج کے سامنے سے گزری اور پھر آگے ایک پارک آ گیا۔

”وہ دیکھو سامنے سفید رنگ کی ماروٹی، وہ چھوٹی گاڑی، جس کے ساتھ سیاہ گاڑی کھڑی ہے۔“

”ہاں۔!“ اس میں ایک گاڑی بھی بیٹھا ہوا ہے۔“ میں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک گاڑی اس کے ساتھ بھی ہے، جیسے ہی پارک کے گیٹ سے باہر نکلنے والا ہوگا، اسے شوٹ کر دینا ہے۔ ہم یہاں باہر ہیں، اس طرح ہمیں یہاں سے نکلنے میں آسانی ہوگی۔“ اس نے پلان بتایا۔ میں گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ دلچسپیت نے اپنی ریٹ وایج دیکھی اور قدرے بے چین ہو گئی پھر اچانک بولی۔ ”وہ دیکھو سبز اور نیلے رنگ کے ٹریک سوٹ میں، جس نے سیاہ پکڑی پہنی ہوئی ہے۔“

وہ تیزی سے آ رہا تھا میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔ وہ وہیں سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تب تک دلچسپیت کا روکیڑ لگا چکی تھی اور پھر انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی کچھ بہ لحد دور ہوتی چلی گئی۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کار ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے روکی اور مجھے اترنے کا کہہ کر ایک دوسری گاڑی کی جانب بڑھی، جس میں پہلے ہی دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں یہ وہی تھیں جنہیں میں نے ناشتے کی میز پر دیکھا تھا۔ واپسی پر بنگلہ دور تھا یا دلچسپیت ہی کسی لمبے راستے سے لے کر آئی تھی واپس آتے ہوئے کافی وقت لگ گیا۔

اس وقت میں اور دلچسپیت ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے۔ اس کے سامنے ایک لیپ ٹاپ تھا۔ دلچسپیت تصویریں نکال کر دیکھتی رہی، پھر ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”پچانو۔!“ ان میں وہ بندہ کون ہے جسے ابھی شوٹ کیا ہے؟“

میں غور سے دیکھتا رہا، پھر ایک بندے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو یہ لگتا ہے۔“

”بالکل۔“ یہی ہے، اور یہ چھ بندے بیٹھے ہوئے ہیں ان میں سے تین ختم ہو گئے ہیں اور چوتھا آج ختم ہو گیا ہے۔ باقی دو رہ گئے ہیں جو یہاں نہیں رہتے، ان میں سے ایک..... یہ والا..... رویندر سنگھ ہے تمہارے دوست جہاں کا دشمن۔ ان دونوں کی تازہ تصویریں بھی دکھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے یکے بعد دیگرے دو تصویریں دکھائیں۔ ان میں وہ بوڑھے تھے۔ ”یہ ہیں وہ دونوں.....“

”ان سب کا آپس میں کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سارے ”را“ کے لیے کام کرتے ہیں اور یہ مغربی پنجاب میں کارروائیاں کروانے میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ اب مدلل گروپ لے رہا تھا۔ اب ان دونوں گروپس کی آپس میں لگ جائے گی اور یہ رویندر سنگھ کے لیے ایک اشارہ ہے کہ جہاں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ جہاں کا کام نہیں انہی کا کام ہے۔“

”تم جہاں کے بارے میں جانتی ہو؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”سب کچھ وہ جب بھارت آیا ہے تب سے اس پر نگاہ ہے اب اس سے بہت سارا کام لیتا ہے۔“

”کیسا کام؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ تو اوپر والے ہی جانیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر قتل سے بولی۔ ”ابھی صرف اس کو بچانا ہے، بعد کی پلاننگ کیا ہے وہ ابھی طے نہیں ہے۔“

اس کا لہجہ عام سا تھا۔ مگر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور جہاں کے بارے میں اتنی گہرائی سے جاننے والی یہ کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ یہ لوگ تو جہاں کو بلیک میل بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کہیں آسمان سے گرا اور کھجور میں اگلنے والی بات تو نہیں ہوگئی؟ تاہم اگلے ہی لمحے میری نگاہوں میں مہر خدا بخش کا چہرہ گھوم گیا، وہ جو دوسرے میرے دماغ میں آیا تھا، ایک دم سے ختم ہو کر رہ گیا۔

”دلچسپیت“ میں نہیں جانتا کہ تم اس گروہ میں کیا اہمیت رکھتی ہو، اور کن لوگوں سے تمہارا تعلق ہے لیکن میں.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

”غلط مت سوچو، میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ ایک معمولی سی کارکن ہوں، مجھے یہ ساری معلومات دی گئی ہیں اور وہ بھی فقط جالندھر کی حد تک۔ یہاں کام مکمل ہوتے ہی ممکن ہیں ہم دوبارہ نمل پائیں۔ اس لیے جو بھی ٹاسک دیا جاتا ہے اسے مکمل کرتا ہے باقی فقط چار دن رہتے ہیں۔“

”ان میں کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ آج شام پتہ چلے گا۔ اس وقت کے لیے تم آرام کر سکتے ہو یا پھر چاہو تو میرے ساتھ وقت گزار سکتے ہو کہ تم مجھے جیت چکے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی اور اس کے پاس سے اٹھنے لگا، وہ بولی۔ ”ابھی کچھ دیر بیٹھو، میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتی ہوں، لیکن چلو پہلے کچھ کھا لیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دیوار کے ساتھ لگا بیٹن دبا یا پھر لیپ ٹاپ پر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا لوگے.....“

”جو بھی۔“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی اور بولی۔

”کاش میں تیرے ساتھ بہت سارا وقت گزار سکتی۔“ اس کے یوں کہنے پر میں مسکرا دیا۔

☆☆☆☆☆

پولیس چیف کے کمرے میں کافی سارے لوگ موجود تھے۔ جہاں سنگھ کا خون اس وقت کھولنے لگا جب اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر رویندر سنگھ کو دیکھا۔ چہرے سے انتہائی متین اور سنجیدہ دکھائی دینے والا اپنے باطن میں کیسی خباثت رکھتا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کیشیو مہرہ، دلبر سنگھ اور ہر پریت تھے، ایک بندہ جو ناشی تھا، وہ سفارت خانے کی طرف سے وہاں موجود تھا، اس کے علاوہ وہاں چند اور لوگ بھی تھے۔ ان کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا، کافی دیر سے بحث و تجویس جاری تھی۔ دونوں طرف کا موقف سن لیا گیا تھا۔ سبھی چند لمحے کی خاموشی کے بعد چیف نے جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں سنگھ جی، آپ نے کہا کہ آپ کو اغواء کر لیا گیا، لیکن اب تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو کہاں سے اغواء کیا گیا، جبکہ آپ کے شواہد چند ہی گڑھ میں پائے گئے ہیں۔ جہاں جمہور سنگھ کے شاپنگ مال کے سی سی کیمرے میں ویڈیو ہے آپ کی کیا اس کی وضاحت کریں گے آپ؟“

”مجھے اوگی اور جالندھر کے درمیان اغواء کیا گیا، یہ اسی دن کا واقعہ ہے جس دن دلچسپیت سنگھ نے حویلی جلائی تھی، اور میرا اس سے آنا سامنا ہو گیا تھا۔ اتنے دن تک میں انہی اغواء کاروں کے قبضے میں رہا۔“ جہاں سنگھ نے انتہائی متانت سے جواب دیا۔

”اور سی سی کیمرے میں آپ کے شواہد؟“ چیف نے پوچھا۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ جہاں نے واضح انداز میں کہا۔

”آپ کو یہ یقین کیوں ہے کہ اغواء کار رویندر سنگھ جی کے لوگ تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ اپنے طور پر نجانے کون کون سی باتیں اگوانا چاہتے تھے جو ساری کی ساری رویندر سنگھ اور نویر سنگھ اسپیکر سے متعلق تھیں۔“ اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

”تو آپ چند ہی گڑھ نہیں گئے۔“ اس نے پھر پوچھا۔

”میں تو نہیں گیا“ اغواء کار مجھے کئی جگہوں پر لیے پھرتے رہے ہیں۔ میں تو بھارت کے بارے میں اتنا نہیں جانتا باقی رب جانے۔“ اس نے کاغذ سے اچکا تے ہوئے کہا تو کیشو مہرہ نے محل سے مطلع کیا۔

”دیکھیں جی“ اس دوپہر جب مجھے معلوم ہوا کہ اوگی میں لڑائی ہوگئی ہے میں جلدھر سے اوگی گیا۔ راستے میں ہمیں جہاں کی گاڑی ملی“ میں نے اسی دن اوگی چوکی تھانے میں رپورٹ کر دی تھی۔ یہ دلیر سنگھ جی اور گاؤں کے چند دوسرے افراد بھی تھے۔ یہ رپورٹ آپ کے سامنے بڑی فائل میں موجود ہے۔“

”ممکن ہے پلان کے مطابق یہ جہاں سنگھ چھپ گیا ہو اور چند ہی گڑھ میں جیسر سنگھ کو قتل کرنے کے بعد اب تک چھپا رہا ہو۔ یہ پلان بھی ہو سکتا ہے؟“ ایک وکیل نے دلیل دیتے ہوئے کہا تو کیشو مہرہ نے دلیل دی۔

”یہ تو پولیس اور خفیہ اداروں کی ناکامی ہوئی تا“ اتنا عرصہ جہاں سنگھ کو تلاش نہیں کر سکے اور پھر اس سے بھی پہلے جب سے اس نے بھارت دھرتی پر قدم رکھا تب سے مسلسل اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی رہیں۔ اس کا پولیس نے کیا کیا؟ ہر پریت پر حملہ ہوا کیا اس کا مجرم پکڑ کر دے دیا گیا؟ اس کا کیا پتا؟ یہ ایک لمبی فہرست ہے اگر آپ ان صاحب کا موقف تسلیم کر لیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جہاں سنگھ کا جرم ثابت کریں۔ چالان بنا کر عدالت میں پیش کریں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہم اپنی صفائی پیش کریں اور جو زیادتیاں اب تک ہوئی ہیں ان کا حساب دیا جائے۔“

”چیف صاحب۔ آپ کی پولیس نے جہاں سنگھ کی کسی درخواست پر کوئی کارروائی نہیں کی؟“ اتاشی نے سوال اٹھایا۔

”تفتیش جاری ہے۔ اور اس کا کوئی نتیجہ سامنے آتا تو کوئی واضح موقف بنتا۔“ چیف نے ڈھیلے سے انداز میں کہا تو اتاشی بولا۔

”آپ نے یا آپ کے ماتحت عملے نے تفتیش ہی نہیں کی، سچ یہی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب عدالت میں دینا ہوگا۔ ہمارے شہری کو یہاں ڈیٹی اڈیت کے ساتھ ہراساں کیا جاتا رہا۔ یہ بھی ہم ثابت کریں گے۔ جہاں سنگھ کے اغواء پر جو رپورٹ کی گئی اس پر آپ نے کوئی کارروائی نہیں کی اور باقی رہ گیا الزام کہ جہاں سنگھ نے جیسر سنگھ کے شاپنگ مال میں جا کر اسے قتل کیا“ سی سی کیمرے کی ویڈیو یہ منظر دکھاتی ہے تو آپ عدالت میں چالان بنا لیں۔ آپ تفتیش کریں کیوں نہیں کی اب تک؟ آپ کو اب تک اشتہاری قرار دے دینا چاہیے تھا جبکہ جیسر سنگھ کے ورثاء کی طرف سے رپورٹ تک درج نہیں کرائی گئی۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ اس کے یوں کہنے پر ایک دم سے خاموشی چھا گئی پھر چیف نے رویندر سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ بولیں آپ کیا کہتے ہیں؟“

”ہونا تو یہی چاہیے کہ تفتیش میں سب کچھ واضح ہو لیکن المیہ یہ ہے کہ کہیں بھی کوئی ثبوت جہاں کے خلاف نہیں“ میں مانتا ہوں کہ بلجیت کے ساتھ اس کی خاصی ٹینشن رہی جس کا نتیجہ بلجیت بھگت رہا ہے میرے دو بیٹے بھی قتل ہو چکے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ ان کے قاتل پکڑے جائیں۔ اب یہ جہاں کے اغواء والی بات ہم نہیں مانتے“ آپ تفتیش کریں اور جو مجرم ہے اسے پکڑیں۔“ رویندر سنگھ نے دھیرے دھیرے اپنا موقف پیش کیا تو اتاشی نے تیزی سے کہا۔

”یہی بات تو ہم کہہ رہے ہیں۔ جہاں کو مجرم ثابت کریں یا اسے کلین چٹ دیں۔ یوں ڈیٹی اڈیت میں نہ رکھیں۔ جہاں سنگھ کی طرف سے جو بھی رپورٹس کی گئیں ہیں اور اس کے ساتھ جو بھی سلوک ہوا ہے رویندر سنگھ خاندان کی طرف سے اس کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ہمارا یہ مطالبہ ہے“ آپ لگائیں اس پر الزامات اور لیں حراست میں۔ اگر نہیں تو..... رویندر سنگھ اس کا جواب دیں۔“

”کیوں رویندر سنگھ جی“ کیا آپ ان سے متفق ہیں؟“ چیف نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی ایک بوڑھے سکھ نے اپنی قیمتی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

”آپ میں سے کچھ لوگ نہیں جانتے کہ میں پنجاب کا حضری ہوں۔ مجھے خصوصی طور پر اس مسئلے کے حل کے لیے حکومت نے یہاں بھیجا ہے“ میں نے دونوں طرف کے موقف سے نہیں جس کے انوسار میں اپنی رپورٹ دے دوں گا۔ میرا دچاریہ ہے کہ رویندر سنگھ جی اگر اپنے بیٹوں کے قتل کی ذمہ داری جہاں سنگھ پر ڈالتے ہیں تو ابھی اپنا موقف لکھیں اور دے دیں۔ جس میں واضح طور پر جہاں کو مورد الزام ٹھہرایا جائے جس پر جہاں کو اپنی صفائی کا بھرپور موقع دیا جائے۔ پولیس اس دوران اپنی کارروائی کرے یہی بات جہاں کے لیے ہے۔ وہ اپنا موقف دے، ثبوت دے، پولیس کارروائی کرے“ رویندر سنگھ جی اپنی صفائی دیں پھر قانون کے مطابق عمل کیا جائے۔“

”میرے خیال میں یہی بہتر رہے گا“ کیا آپ دونوں اس بات پر متفق ہیں؟“ چیف نے دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا پھر چند لمحے رک کر بولا۔ ”آپ چاہے تو مشورہ کر کے پانچ منٹ بعد بتا دیں۔“

”پانچ منٹ کی ضرورت نہیں، ہم متفق ہیں۔“ کیشو مہرہ نے کہا تو جہاں نے تائید کر دی۔

”ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے؟“ منتری نے کہا تو سارے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ”جو ہوا سو ہوا“ رویندر سنگھ جی کے بیٹوں کا قتل بہر حال بہت بڑا نقصان ہے پولیس اپنی کارروائی جاری رکھے۔ اگر جہاں کبھی بھی مجرم ثابت ہو جاتا ہے تو اسے سزا بھگتنا ہوگی“ تب تک کے لیے جہاں کو کلین چٹ ہے اور وہ اپنے تمام معاملات ختم کر دے۔“

”میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔“ رویندر سنگھ نے کہا تو چیف نے جہاں کی طرف دیکھا تب اس نے بھی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے کوئی وقت مقرر ہونا چاہیے۔ یہ تو ساری زندگی مجھ پر تلوار لٹکانے والی بات ہے۔“

”ہلایا یہ آپ کی بات درست ہے۔“ چیف نے کہا۔

”تین ماہ بہت ہیں۔“ منتری نے کہا۔

”اگر میرا ویزہ بڑھ گیا تو، اور میں ادھر رہا، میں وینکوور جا کر بھی اس معاہدے کا پابند رہوں گا“ لیکن اگر یہ ثابت نہ کر سکے تو کیا میں اغواء کا.....“

”وہ سب تم کر سکو گے تمہاری حویلی کا جو نقصان ہوا وہ بھی دیں گے باقی سب کچھ سمجھیں۔ یہ تین ماہ پولیس کو دیئے گئے ہیں آپ کی ضمانت سفارت خانہ دے گا اور رویندر سنگھ کی ضمانت ہم حکومت والے دیں گے۔“ منتری نے کہا۔

”ٹھیک ہے جناب“ تین ماہ تک اگر میں زندہ رہا تو میں یہاں پیش ہوں گا۔ عدالت مجھے جو بھی سزا دے گی میں قبول کروں گا۔“ جہاں نے کہا تو چیف نے اپنے ایک اہلکار کو یہ سب رپورٹ کرنے کے لیے کہا تو ایک دم سے ماحول پرسکون ہو گیا۔ کچھ دیر بعد چائے پر چیف نے کہا۔

”شکر ہے یہ معاملہ طے پا گیا ورنہ آج شہر میں بہت ٹینشن ہے مختلف قسم کی اطلاعات آ رہی ہیں۔ جو بہر حال امن خراب کرنے والی ہیں۔ آج صبح ہی ایک قتل ہو گیا ہے جس کے بارے میں اس میٹنگ سے پہلے معروف رہا ہوں لگتا

ہے یہ کارروائی دہشت گردوں کی ہے۔“ اس نے کہا تو ہر پریت بولی۔

”جب تک سکھ قوم کو اس کی اصل شناخت نہیں دی جائے گی اس وقت تک یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔ ظاہر ہے جتنا دبا نہیں گئے یہ لوگ اتنا ہی سراٹھائیں گے“ آج بھی تو ایک سکھ ہی قتل ہوا ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ سکھ محبت وطن ہو۔ اور.....“ چیف مزید کہنا چاہ رہا تھا کہ اہلکار نے ایک کاغذ لا کر رکھ دیا، چیف نے اسے پڑھا، سب کے سامنے اس کی کاپیاں رکھ دی گئیں۔ سب نے دیکھا اور پھر دستخط ہونے شروع ہو گئے۔ تقریباً دس منٹ میں یہ کارروائی ہو گئی تو سبھی چیف کے دفتر سے باہر نکل آئے۔ سب سے پہلے منتری نکلا، پھر سیکپو رٹی میں رویندر سنگھ اور اس کے حواری۔ جہاں نے اتاشی کو رخصت کیا اور وہ سب کیشو مہرا کے ساتھ چل دیئے۔ کار میں بیٹھے ہی اس نے کہا۔

”لو بھئی جہاں، منتری نے تمہارا کام آسان کر دیا۔ یہ سمجھو تمہارے لیے کیلین چٹ ہے۔“

”تب تک رویندر سنگھ خاندان کلین ہو جائے گا“ کوئی رہے گا ہی نہیں دعوے دار.....“ جہاں نے دانت پیستے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”بہت سنبھل کے..... خفیہ والے اب یہ معاملہ دیکھیں گے۔“ کیشو نے کہا تو جہاں نے اپنا سر ہلا دیا۔

☆☆☆

”حیرت ہے یار، شہر میں جس قدر ہنگامے ہونے چاہیں تھے جتنے ہنگامی جلوس نکلنے چاہیں تھے اتنے نہیں نکلے، ایک جلوس اس کا اور ایک دوسرے کا.....“ دلجیت کور نے کار میں بیٹھے ہوئے کہا۔ ہم ڈنر لے چکے تھے اور وہ آکس کریم والی دکان پر جانے کے لیے تیار تھی۔

”شاید لوگ اب فضولیات میں نہیں پڑتے۔“ میں نے تبصرہ کیا تو اس نے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے، جب تک خفیہ والوں کی آشیر وادہ ہو ایسا نہ ہوتا، خیر۔! یہ بھی اشارہ ٹھیک ہے، ہم نے اسی کے مطابق عمل کرنا ہے۔“

”اب صرف ہم نے آکس کریم ہی کھانی ہے یا کچھ اور بھی کرنا ہے۔“ میں نے یونہی مزاح کے انداز میں پوچھا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”ہمارا ٹارگٹ مدلل ہے اور اس کے ساتھ وہ بندہ جو رویندر سنگھ کے ساتھ تھا۔ ابھی تک کوئی واضح اشارہ نہیں ملا، ورنہ اب تک کارروائی ہو چکی ہوتی۔ میری اطلاع کے مطابق صرف مدلل یہاں ہے۔ خیر تم کیوں دماغ کھاتے ہو میں ہوں نا اس کام کے لیے۔“ اس نے آخری لفظ بڑی ادا سے کہے تو میں خاموش ہو گیا لیکن میرے دماغ میں وہ دوسرا شخص پھنس چکا تھا۔ میں اس کے بارے میں معلومات چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ وہ مختلف سڑکوں پر گاڑی بھگائے چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولی۔ ”خالصتان تحریک کو صرف ہندو نے نہیں کھلا تھا، ان میں جہاں نرنکاری سکھ تھے وہاں بہت سارے خود ساختہ امرت دھاری سکھ بھی شامل تھے جو کانگریس نواز تھے اور خود کو سیکولر کہلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ حکومت نے مقامی سطح پر ان کے گروپ بنا دیے تھے۔ اس پرانے گروپ کے یہ دو افراد باقی بچے ہیں۔ رویندر سنگھ اور جج سنگھ۔ تیسرے کو آج پار کر دیا ہے۔“

”میرے خیال میں ان کو مارنے کا کیا فائدہ وہ بات پرانی ہو گئی اس وقت خالصتان تحریک کس سمت میں کیا کام کر رہی ہے اس کے مخالفین ٹارگٹ ہونا چاہیے، میرے خیال میں تو وقت ضائع.....“ میں نے کہا جاتا تو وہ بولی۔

”نئے لوگ انہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کے لیے جتنی مراعات آ رہی ہیں انہی کی طرف سے سمجھ لو کہ ایک جھکا دیا جا رہا ہے تاکہ وہ نئے لوگ سامنے لائیں جاسکیں۔ جو اندر ہی اندر خالصتان تحریک کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔“

”حکومت کے لیے اب خالصتان تحریک اتنا بڑا ایشیو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہے..... اب بھی ہے بلکہ حکومت زیادہ خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ اصل میں سکھ قوم کا شعور بیدار کرنے کے لیے جو بھی لاش ہوتی ہے یہ انہی لوگوں کو گھما پھرا دیتے ہیں۔ خیر! اس پر تو دوسرے لوگ کام کر رہے ہیں میں اپنی بات کرتی ہوں۔ مجھے مدلل کا ٹامسک دیا گیا ہے، تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس کی جڑیں پاکستان کے پنجاب میں بھی پھیل رہی ہیں۔ خاص طرح کی شراب کا کاروبار تو ہے ہی بلکہ اس کے ذریعے وہ مختلف اداروں تک رسائی بھی کر رہے ہیں۔ رب کرے میں اس اہل درک تک پہنچ جاؤں، پھر تم خود ہی دیکھنا، جمال! یہ لوگ کس طرح پاکستان کے پنجابی لوگوں کو ٹارگٹ کر رہے ہیں۔“

”چلو دیکھتے ہیں۔“ میں نے آکس کریم والی دکان قریب آتے دیکھ کر زیادہ بات نہیں بڑھائی۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ ”دل۔! یہ کار کل والی ہے یا کوئی دوسری؟“

”دوسری ہے۔ کل والی تو نجائے کہاں گئی، میک اور ماڈل وہی ہے۔“ دل نے کار بند کرتے ہوئے کہا۔ اور ہم باہر نکل کر ایک میز کی جانب بڑھے۔ ہمارے بیٹھے ہی ویٹر آ گیا۔ اور آڈر لے کر چلا گیا۔ میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ جس لی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یہ بات مبہم نہیں ہو رہی تھی کہ یہاں خفیہ والوں کی موجودگی نہ ہو۔ اتنا بڑا واقعہ ہو جانے لے بعد ان کا یہاں ہونا لازمی تھا۔ دلجیت میری بے چینی بھانپ گئی تھی اس لیے پوچھا۔

”جمال۔! کوئی پریشانی؟“

اس کے پوچھنے پر میں نے اپنی بے چینی کی وجہ بتادی اور کہا۔

”ہم پر نگاہ ہوگی، تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”اسی لیے تو آئی ہوں کہ معلوم ہو جائے پتہ چل جائے گا کہ ہم پر کوئی نگاہ رکھے ہوئے ہے یا نہیں؟“

”بڑا مان ہے خود پر۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم سے مارا جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں لڑنا نہیں جانتی، وہ تو میں تمہیں جانچ رہی تھی۔ اب کی بار آنا سنا ہوا لہ لہ لینا۔“ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک جوڑا جو بظاہر سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا، عمریں بھی اتنی زیادہ نہیں تھیں، وہ ادھر ادھر دیکھ کر ہمارے قریب آ گئے اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔

”ایا ہم آپ کے پاس بیٹھ سکتے ہیں، مطلب یہاں چیئرز خالی نہیں ہیں۔“ ان میں سے لڑکی نے کہا۔

”ہائے تو بیٹھ جائیں، اس طرح نہ آپ بات کر سکیں گے اور نہ ہم۔“ دلجیت نے مسکراتے ہوئے کہا تو لڑکی نے ایک لی ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مطلب ہم چیئرز لے لیتے ہیں۔“

”آپ کی مرضی، خالی ہیں۔“ دل نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ وہ کرسیاں لے کر ذرا سے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ ان کی باتیں سننے لگیں۔ دل یونہی فرضی جھگڑے کی بات لے کر بیٹھ گئی کہ میں نے اس دن ایک لڑکی کے ساتھ وقت کہاں گزارا تھا۔ میں بھی یونہی بکواس کرتا رہا۔ آکس کریم آئی، ہم نے کھائی اور اٹھ گئے۔ میری نگاہ اس جوڑے پر ہی تھی۔ لڑکی نے فوراً ہی فون اٹھایا اور ایس ایم ایس کر دیا۔ کار اشارت کرتے ہوئے دل بولی۔

”جمال۔! گھر تک پہنچتے ہوئے ہمیں کسی جگہ بھی ٹریپ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”میں بھی سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور ساری توجہ ادھر ادھر لگا دی۔ کار نکال کر آسانی سے نکل تو آئے، لیکن ایک گاڑی

”جمال وہ سفید رنگ کی دین دیکھ رہے ہو۔“

”ہمارا تاقب کر رہی ہے۔“

”انہیں بھی دیکھنے والا کوئی ہے، فکر نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی سے انتہائی اختصار کے ساتھ صورتحال کے بارے میں بتایا اور ساری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ وہ نازل رفتار پر جا رہی تھی۔ جیسے ہی سسٹان علاقہ آیا، سڑک پر ٹریفک نہیں تھی، لیکن ارد گرد خاموش عمارتیں تھیں۔ جیسے فیکٹریاں یا بند گھر ہوتے ہیں اگر ان میں کوئی کمین ہوں بھی تو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسے میں وہ سفید و بگن نے تیزی سے کراس کیا اور ذرا سا آگے جا کر سائیڈ دبانے لگے۔ دل نے رفتار آہستہ کی یہاں تک کہ اسے کاررو کنٹراپڑی۔ دونوں گاڑیاں جیسے ہی رکیں ان میں سے چار پانچ بندے باہر نکل آئے۔ بظاہر ان کے پاس کوئی ہتھیار دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ وہ سبھی کار کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور ڈرائیونگ سائیڈ کی طرف سے دلجیت کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑے سکون سے لنگی تو میں بھی دوسری طرف سے باہر آ گیا۔ ابھی دلجیت نے ان سے پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ اور یوں ہمیں کیوں روکا ہے؟“

”بس ذرا سا پوچھنا ہے تم لوگوں سے، میرے خیال میں یہاں سڑک پر پوچھنا مناسب نہیں ہے تم لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کہاں جانا ہے اور ایسے کیسے لے جاسکتے ہو تم ہمیں جو بات کرنی ہے کرو، ہمیں لوٹنا ہے تو لوٹو اور جاؤ۔“ دلجیت نے کڑھکی سے کہا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

”یہ ایسے نہیں جائیں گے، انہیں لے جانا پڑے گا۔ اٹھاؤ سالی کو اور ڈالو گاڑی میں۔“

”اوئے! گالی مت دے جو بات کرنی ہے کر، بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بھنا کر میری جانب لپکا۔ وہ میرے منہ پر گھونسا مارنا چاہ رہا تھا، میں ایک طرف ہٹ گیا، وہ اپنی چونک میں آگے ہوا تو میں نے کہنی پوری قوت سے اس کی ٹھوڈی پر ماری، وہ چکر اکر گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں دھماچو کڑی مچ گئی۔ تین میری طرف ہو گئے اور تین ہی دلجیت کی طرف، میں فوری طور پر اس کی طرف توجہ نہیں کر سکا، ایک گر گیا تھا، وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دو بھاگتے ہوئے میری طرف آئے، میں نے انہیں بھی تاثر دیا کہ میں نے دونوں کو پکڑنا ہے، جیسے ہی وہ قریب آئے میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے۔ میں اٹھ کر ان کی پشت پر آ گیا۔ وہ جیسے ہی پلٹے میں نے دونوں ہاتھ کے کئے ان کے منہ پر رسید کر دیئے۔ تب تک تیسرا میری پبلی میں ٹھوکر مار چکا تھا۔ اس نے جیسے ہی ٹھوکر مارنا چاہی، میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی، اپنی طرف کھینچ کر جھٹکا دیا، وہ سڑک پر جا پڑا تب تک دونوں میرے گھونٹے مار چکے تھے۔ میں ان سے ذرا ہٹ کر گھوما اور ایک کے لک ماری، اس نے میری ٹانگ پکڑی تو میں اس پر گھوم کر دوسرے پر جا پڑا۔ وہ میرے نیچے تھا، میں نے اس کا سر پکڑا اور زور سے سڑک پر مارا، پھر سیدھا ہو کر اس اکیلے پر پل پڑا۔ اگرچہ اس نے بھی میرے اچھی لگائیں اس دوران اس کی گردن میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اسے دو پوچا اور ٹانگ اس کے گھٹنے پر دے ماری وہ لڑکھڑا گیا۔ میں اسے لیتا ہوا سڑک پر آن گرا۔ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ وہ تینوں ڈھیر ہوئے تو دلجیت کی طرف توجہ کی، وہ تینوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ میں ان کی جانب بڑھا اور ایک کو قابو کر لیا۔ تب تک ہمارے قریب ویسی ہی ایک وین آ کر رکی، اور اس میں سے لڑکے اور لڑکیاں نکلے، پہلی نگاہ میں انہیں پہچان نہیں پایا، پھر جیسے ہی ایک میری پہچان میں آیا کہ وہ وہی تھا، جس نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا تھا، میں کمک آ جانے پر حوصلہ مند ہو گیا۔ وہ ان پر پل پڑے۔ دلجیت ایک طرف ہو کر بولی۔

”انہیں باندھو اور لے چلو۔“

تقریباً دو منٹ کے دورانے میں ان سب کو باندھا، ان کی گاڑی وہیں کھڑی رہنے دی اور اپنی گاڑی میں ڈال کر وہ سب

”کئے، ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ کچھ دیر بعد میں نے مزاح میں کہا۔“

”دلجیت، ویسے تم مارا اچھی کھا سکتی ہو۔“

”ہاں! مار کھانے والا ہی مار سکتا ہے، میں ان بچوں کے انتظار میں تھی۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔

”ویسے اگر تمہارا میک اپ کیا ہوا ہوتا تو سب بگڑ گیا ہوتا اور اب تک تم بھوتی لگ رہی ہوتی۔“ میں نے پھر ہنستے ہوئے کہا تو وہ کھل کر ہنس دی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں ماحول کی ٹینشن دور کرنا چاہ رہا ہوں۔

گھر پہنچنے تک زیادہ وقت نہیں لگا۔ بنگلے میں خاموشی تھی۔ ہم تیزی سے اندر گئے تو ایک لڑکی نے انگلی سے نیچے کی جانب اشارہ کیا تو دلجیت بولی۔

”سب سیمٹو..... اور فرینڈز کا لونٹی..... جلدی۔“

”اوکے!“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی اور دلجیت اندرونی طرف بڑھی۔ میں اس کے ساتھ لپکا، وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی پھر ایک دروازہ کھول کر بیڑھیاں اترتی چلی گئی، میں بھی اس کے پیچھے تھا، نیچے کافی کھلا کمرہ تھا، ان چھ کے ساتھ وہ لڑکی اور لڑکا بھی ایک کونے میں پڑے تھے، جنہوں نے ہم سے چیخڑ مانی تھیں۔ وہ سب ہوش میں تھے۔ دیواروں کے ساتھ سب لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے۔ دلجیت نے اس کو جا پکڑا، جس نے اس سے بات کی تھی۔ اس نے جاتے ہی ایک ٹھوکر اس کے منہ پر ماری اور پوچھا۔

”اب فافٹ بول دے۔ کون لوگ ہو تم؟ ورنہ تم لوگ جانتے ہو، میں مار دوں گی ہر اس بندے کو جس نے زبان نہ کھولی۔“ بول، یہ کہتے ہوئے اس نے زور کی ٹھوکر ماری۔

”ہم دکی سنگھ کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس نے تمہارے بارے میں بتا کر اٹھانے کو کہا تھا۔“

”اور دکی سنگھ کون ہے؟“

”مدن لعل کا خاص آدمی۔“

”ہمیں ہی کیوں اٹھانا تھا؟“

”سارے دن کی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ تو روزانہ ادھر آتی ہے، کل بھی تو قتل سے ذرا پہلے اٹھ گئی تھی اور وہ گاڑی بھی تیری ہی تھی۔“

”قتل۔! کون سا قتل..... اوہ..... وہ جوئی دی ہے..... تم لوگ مجھے اس کا قاتل سمجھ رہے ہو؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”قسم لے لو بھیا، میں نے اسے نہیں مارا لیکن اب تم لوگوں کو ماروں گی۔ اگر دکی سنگھ کے بارے میں نہ بتایا۔“

”شہر میں کون دکی سنگھ کو نہیں جانتا۔“ اس نے کہا تو دلجیت اس سہمی ہوئی لڑکی کی جانب بڑھی، اسے بالوں سے پکڑ لڑاٹھا اور پوچھا۔

”تو کس کے لیے کام کرتی ہے؟“

”اس بندے نے تمہارے بارے میں بتا کر کہا تھا کہ جیسے ہی یہ یہاں سے جائے، ہمیں کال یا ایس ایم ایس کر دے، اس لیے اس نے پانچ سو روپے دیئے تھے، اس سے زیادہ میں کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔“

”اچھا، تو لاؤ اپنا فون دو مجھے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ ”ان سب کی تلاشی لو، اور ان کے فون نکالو۔“ پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”میں تمہیں ایک ہزار روپے دیتی ہوں۔ ان سب کے سامنے لگی ہوگی، کپڑے اتار دے۔“

”نہیں بھگوان کے لیے ایسا مت کرو۔“ وہ ترپ کر بولی۔

”اس کا مطلب ہے تو ہندو ہے۔“ پھر نجانے اس کے دماغ میں کیا آئی اس نے لڑکی کو پکڑ لیا اور اسے لاتوں اور گھونٹوں پر رکھ لیا، کافی دھنائی کرنے کے بعد جب اس کا اپنا سانس اکھڑنے لگا تو وہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ تیرا پار بھی انہیں نہیں جانتا ہوگا۔“

اس پر اس نے نفی میں گردن ہلائی، تب تک ان چھ میں سے چار کے پاس فون نکل آیا۔ اس نے پہلے والے آدمی سے کہا۔

”بتاؤ کی سنگھ کا فون نمبر کیا ہے؟“

وہ تیزی سے بولنے لگا، دلچیت نے وہ نمبر ملائے اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے کوئی تیز آواز میں چیخا۔

”اوئے اب تک کدھر اوہن.....“

”وہ میرے قبضے میں ہیں وہی سنگھ۔“ دلچیت نے کہا۔

”اچھا تو ہے کون، تو..... اور.....“

”میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں فی الحال تو اپنا بچاؤ سوچ، تو جس بل میں بھی ہو گا ناچو ہے میں تجھے وہاں سے نکال لوں گی۔ ابھی میں ذرا ان کی سیوا کر لوں۔“

”تو جہاں کہہ میں وہیں آ جاتا ہوں ابھی اور اسی وقت“ دوسری جانب سے وہی دھاڑا۔

”ابھی بتاتی ہوں تھوڑا صبر کر۔ ان سے تیرا پتہ پوچھ لوں خود آ رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تم میں سے کون کون کی سنگھ سے وفاداری نبھانے والا ہے؟ تاکہ میں اسے ابھی شوٹ کر دوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے قریب کھڑے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا، اس نے فوراً پسٹل نکال کر دلچیت کو دے دی۔ وہ بندھے ہوئے سارے لوگ خاموش تھے۔ تب ایک کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”تم بتاؤ جو کچھ بھی جانتے ہو۔“ اس کے اتنا کہتے ہی وہ فر فر بولنے لگا۔

”وہ جیوتی چوک کے پاس رہتا ہے وہیں قریب ہی ایک بار چلاتا ہے شراب کا بہت بڑا کاروبار ہے اس کا۔ اس پورے علاقے میں اس کا راج ہے اور ہم اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ پورا گینگ ہے اس کا۔“

”مدن لعل کے ساتھ کیا تعلق ہے اس کا؟“

”میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن اتنا پتہ ہے کہ وہ جب جالندھر میں آتا ہے تو وہی سنگھ اسی کے پاس ہوتا ہے۔ مدن لعل کے قریبی سارے لوگ ہی منو ہر لعل کے قاتلوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ ان میں وہی سنگھ بھی ہے جو اس کے زیادہ قریب ہے۔“

”دیکھو ہمیں نہیں معلوم کہ منو ہر کس نے مارا، ہم تو اپنے ہی کسی کام سے جالندھر میں ہیں، تم لوگوں نے چھیڑ کر اچھا نہیں کیا، سردار نہال سنگھ کو مارا، حالانکہ اس کا منو ہر سنگھ کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ خیر۔! بولو مدن لعل کے بارے میں کیا اور کتنا جانتے ہو۔“

”یہی کہہ کر وہ ایک کاروباری آدمی ہے بڑی پہنچ ہے اس کی۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

اس کا مطلب ہے تم لوگ کچھ نہیں بتا رہے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے کونے میں بیٹھی لڑکی سے کہا۔ ”اے تو چل ادھر آ تیری تو میں تنگی فلم بنا کر دیتی ہوں انٹرنیٹ پر تو جو جیتی سوتری بن کر میرے ساتھ جھوٹ بول رہی ہے لے جاؤ اسے اور ان سب کو بھی ڈالو گاڑی میں۔“

اس کے ساتھ دو لڑکے حرکت میں آئے اور اسے اٹھا کر لے گئے۔ اور باقیوں کو ہانک کر اوپر لے جانے لگے۔

ان ساتوں کو گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ فوکس وین میں وہ ٹھس ٹھسا کر آ گئے۔ سب فرش پر لیٹے تھے ان کے اوپر ترپال

ڈال دی گئی۔ وہاں موجود سب لڑکے لڑکیاں ڈرائیونگ روم میں تھے۔ دلچیت نے انہیں دیکھا اور پوچھا۔

”سب کچھ نکال لیا ہے؟“

”جی.....“ ایک لڑکی نے کہا جو آتے ہی ڈرائیونگ روم میں ملی تھی۔

”میں اور جمال انہیں لے کر جا رہے ہیں اور تم“ اس نے مونے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کار لے کر ہمارے ساتھ آؤ باقی سب فرینڈز کا لونی اس لڑکی کا خیال رکھنا اس سے بہت سی کام کی باتیں نکالنی ہیں۔ اسے کچھ پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں پر ہے۔ بہت احتیاط سے جانا۔“ یہ کہہ کر وہ واپس مڑی اور وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تو ہم نکلنے چلے گئے۔

شہر سے باہر ویران کی سڑک پر اس نے وین روک دی۔ پھر اونچی آواز میں کہا۔

”وہی سنگھ کا نمبر ملاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے انہی سے چھیننا ہوا پسٹل فون نکالا اور نمبر پیش کر دیئے۔ لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ تو اس نے اسپیکر آن کر دیا۔ ”اوئے وہی سنگھ تو اپنے بندوں کو بچانا چاہتا ہے تو بچالے میں نے چار گھنٹے کا بم لگا دیا ہے ان کی گاڑی میں اور وہ سارے بندھے ہوئے پڑے ہیں۔“

”اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں.....“

”نکل اپنے بل سے۔ میں تو یہی چاہتی ہوں۔ اگر تو مرد کا بچہ ہے تو نکل۔ آ جا اور بچالے اپنے بندوں کو چار گھنٹے ہیں۔ بڑا وقت دے دیا ہے تجھے۔ اگر کہو تو مزید کم کر دیتی ہوں وقت۔“ دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا تو اس نے سیل فون ترپال کے اوپر پھینک دیا۔ پھر ان کی طرف منہ کر کے بولی۔ ”لو بھئی۔! اب تمہاری قسمت اب دیکھو تم بم سے مرتے ہو یا تمہارا پاس وہی سنگھ تم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔ ہم تو چلے۔“ دلچیت ڈرائیونگ سیٹ سے اتری اور زور سے دروازہ بند کیا، میں بھی اتر گیا اتنے میں موٹا کار ہمارے قریب لے آیا۔ ہمارے پیچھے ہی اس نے یوٹرن لیا اور ہم وہاں سے واپس آ گئے۔

فرینڈز کا لونی کے اس بڑے سے گھر میں پہنچتے ہوئے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ راستے میں کہیں کسی نے نہیں پوچھا اور نہ ہی کہیں ہلچل دکھائی دی۔ دلچیت ان بندوں کو خواہ مخواہ نہیں مارنا چاہتی تھی، بس ایک ڈراوا دے کر چھوڑ دیا تھا، ایک خوف تھا جو ان پر طاری کر دیا تھا، وہ سیدھی اس لڑکی کے پاس گئی جو ایک کمرے میں ننگے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ اسے دیکھتے ہی رونے لگی۔

”دیکھ لڑکی۔! اگر سچ بولے گی تو کچھ نہیں کہوں گی، چھوڑ دوں گی، جھوٹ میں برداشت نہیں کرتی۔ وہ ساتوں کے ساتوں مر چکے ہیں اور باقی بچی ہے تو، اب ساری کہانی سنا دے۔“

”میں وہی سنگھ ہی کے لیے کام کرتی ہوں لیکن مجھے اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا، میں یہاں پڑھتی ہوں، صرف دولت حاصل کرنے کے لیے اس کے چھوٹے مونے کام کر دیتی ہوں۔ تاکہ میرا خرچ چھٹا رہے، کالج میں لڑکوں کو شراب کی سپلائی میں.....“

”بکواس کرتی ہے۔ تو جھوٹ بول رہی ہے۔ ایسے نہیں مانے گی۔ تجھ پر لڑکے چھوڑتی ہوں۔ کل تک تو تجھے سمجھ آ ہی جائے گی کہ سچ بولتی تو ٹھیک تھا۔“ یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گئی تو لڑکی یکدم بولی۔

”ٹھہرو، دل رک گئی۔“ میں مدن لعل کے لیے کام کرتی ہوں، ان سارے لوگوں کو ہینڈل کر رہی تھی۔ پورے شہر میں مختلف جگہوں پر منو ہر کے قاتلوں کی تلاش جاری ہے۔ میں بھی انہی میں سے ایک.....“ یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔

”اب آئی ہو لائن پر۔ منو ہر کا تو ہمیں معلوم نہیں، یہ نہال سنگھ جی کو کیوں قتل کیا؟“

”میں نہیں جانتی؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم ادھر رہو مجھے کچھ کام سے جانا ہے آکر پھر تم سے باتیں کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر دلچیت وہاں سے چل دی۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا ایک بچے سجائے کمرے میں آ گیا۔ اس نے ایک الماری سے اپنے لیے کپڑے نکالے پھر ایک نیلی جین اور سفید شرٹ نکال کر بولی۔ ”یہ تو تیرے کوپورے آجائیں گے، فریش ہو جاؤ۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ مجھے اس کا انداز بہت بڑا لگ رہا تھا۔ مجھے یوں احساس ہو رہا تھا کہ جیسے مجھے یہاں صرف اس کا حکم ماننے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ وہ جو کہے میں کرتا جاؤں، جیسے کوئی کرائے کا غنڈہ کرتا ہے، میرے مقصد کی یہاں اب تک کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔ اب تک اس نے مجھ سے دو قل کر دئیے تھے۔ مجھے اب تک یہ سمجھ نہیں آئی تھی میں یہاں پر کیوں ہوں؟ دلچیت کا تعلق کن لوگوں سے ہے اور یہ سب کچھ کیوں کرتی چلی جا رہی ہے، میں اپنے آپ کو محض باڈی گارڈ محسوس کر رہا تھا جو حکم کا غلام ہوتا ہے۔ میرا دماغ کسی حد تک تپ گیا تھا۔ میں فریش ہو کر نکلا تو وہ اپنے سامنے چائے کے دو کپ رکھے میری منتظر تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی ڈریس پیٹ اور ہلکے پیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ میرے بیٹھے ہی بولی۔ ”جمال! کوئی سوال ہے تمہارے ذہن میں تو بولو۔“

”نہیں۔“ میں نے یکسر کہہ دیا۔

”تو پھر یہ دیکھو۔!“ اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میرے سامنے پھیلا دیا۔ ”یہ مدن لعل کے گھر کا نقشہ ہے یہ جہاں جہاں کراس لگے ہوئے ہیں یہاں اس کے سیکورٹی گارڈ ہوتے ہیں، گھر کے اندر بھی چند لوگ ہوتے ہیں۔“ پھر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ”اور یہ..... یہ کمرہ مدن لعل کا ہے..... اس کا بیڈ روم..... اس کی ایک کمزوری ہے کہ وہ پیتا بہت ہے صبح کے دو تین گھنٹے وہ نمن ہوتا ہے اسے کوئی ہوش نہیں ہوتی۔ ہمارے دو آدمی اس کے گھر میں سیکورٹی گارڈ بن چکے ہیں اور.....“

”تو پھر وہ اسے قتل کیوں نہیں کر دیتے؟“

”اسے مارتا نہیں ہے۔ ابھی صرف اسے اغوا کرنا ہے۔ اب تک جو سارا ماحول بنا ہے وہ خوف کی فضا پیدا کرنے کے لیے تھا اور دوسری بات..... اس مدن لعل کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کب کہاں ہوتا ہے، منور ہو کر مارنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ اسے گھر کر جائیداد میں لایا جائے اور وہ یہاں پر ہے۔ ایک دودن میں اس نے پھر غائب ہو جانا ہے۔“

”ممکن ہے وہ اب کافی دن یہاں رہے۔ اس کا بیٹا“

”وہ برک ہی نہیں سکتا۔ اس کی مجبوری ہے اس کا چاہے سارا خاندان مرجائے۔ ایک بار ہم نے اسے تھائی لینڈ میں پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر نام کام رہے تھے اور جمال، ہم اسے دیے بھی ختم کر دیں لیکن اسے تیرے لیے پکڑا جائے گا۔“

”میرے لیے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کسی حد تک حیرت سے پوچھا۔

”ہاں! جب یہ قابو میں آجائے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ یہ تیرے لیے کسی قدر اہم ہے۔“ اس نے دلچسپی سے کہا تو میں کانٹہ اچکا کر بولا۔

”دیکھ دلچیت، میں تو دیے ہی تیرے لیے کام کر رہا ہوں، کیوں کر رہا ہوں؟ یہ تم بھی جانتی ہو، تم جو کہہ رہی وہ میرے لیے چارہ نہ بناؤ۔ اب بولو کرنا کیا ہے؟“

”تم کہہ سکتے ہو جمال! کیونکہ ابھی تجھے معلوم نہیں، خیر، اسے اغوا کرنا ہے اور پھر باقی سب لوگوں کا کام ختم۔“

”کب کرنا ہے اسے اغواء۔“ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آج رات ہی، بلکہ رات کے بالکل آخری حصے میں۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اگلے ہی لمحے کہا۔

”ٹھیک ہے، پلان کیا ہے؟“

حصہ دوم

میرے پوچھنے پر وہ اس کاغذ کی مدد سے مجھے پلان سمجھانے لگی۔ وہ ان دو سیکورٹی گارڈز پر بہت بھروسہ کر رہی تھی جو میرے خیال میں غلط تھا۔ میں نے اس کا پورا پلان سمجھ لیا۔

☆☆☆

جسپال اور انوجیت اس وقت دلیر سنگھ کے پاس اس کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چیف کے پاس جو رویندر سنگھ کے ساتھ مفاہمت ہوئی تھی وہ اس پر سیر حاصل بحث کر چکے تھے۔ آخر میں دلیر سنگھ نے کہا۔

”بس پتر! اب تو سکون سے اپنی جائیداد کو اپنے نام کر دالے پھر جو تیری مرضی آئے کرنا، یہاں رہنا یا پھر واپس دیکھو چلے جانا۔“

”دیکھو تو مجھے واپس جانا ہی جانا ہے، آج نہ سہی تو کل، لیکن مجھے رویندر سنگھ اور دلچیت سنگھ سے.....“

”اور چھوڑ پتر، ابویں ان سے دشمنی کو بڑھائے گا تو اپنا ہی راستہ کھوٹا کرے گا۔ ان کی اصل طاقت سیاست ہے وہ حکومت میں ہیں اس لیے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکتے ہیں۔ بہت ہتھکنڈے ہیں ان کے پاس۔ یہ تو وہ اپنی مجبوری میں ایسی مفاہمت کر گیا، ورنہ وہ باز نہیں آنے والے تھے۔“ دلیر سنگھ نے تاسف سے کہا تو جسپال تیزی سے بولا۔

”وہ اب بھی باز نہیں آئیں گے باباجی۔ دیکھ لیجیے گا۔“

”ہاں، ہیں تو سانپ..... کتے اور سانپ میں فرق یہ ہے کہ کتے کو اگر روٹی ڈال دو تو وہ وفاداری کرتا ہے لیکن سانپ کو اپنے ہاتھوں سے دو دو دھلاؤ گے تو وہ پھر بھی ڈنگ مارے گا۔ گھٹیا انسان کی فطرت سانپ کی طرح ہوتی ہے، لیکن تو فکر نہ کر، اب ان کا زہر نکل گیا لگتا ہے۔“

”اگر ان کی طاقت سیاست ہے تو ہم سیاست کیوں نہیں کر سکتے۔“ جسپال نے کہا تو دلیر سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

”یہ بڑا گندہ کھیل ہے پتر، یہاں بھارت میں اور تو نہیں سمجھتا پنجاب میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس کھیل میں کتنی منافقت ہے، کتنا لہو بہایا جاتا ہے، تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ تمہارا دیکھو ورنہ نہیں ہے۔“

”بابا! جہاں تک ہوسکا، ہم کریں گے سیاست اور اس کی شروعات یہیں اوگی سے کریں گے۔ آپ کو بتائیں گے یہاں کا سرخ، پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔“ جسپال نے کہا تو انوجیت بولا۔

”اگر اب ہمیں موقع مل ہی گیا ہے تو کیوں ناس کا فائدہ اٹھائیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ دلچیت یہاں دوبارہ قدم رکھے گا اور پھر کیا یہاں کے لوگ ظلم ہی سہتے رہیں گے، کوئی ان کا خیال کرنے والا نہیں ہوگا۔ کیا آپ ان کا بھلا نہیں کر سکتے؟“

”ان کا اثر درسونخ تو ہے نا یہاں۔ وہ کیسے برداشت کریں گے؟“ دلیر سنگھ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”وہ آپ کو سرخ بنائیں گے تو آپ بنیں گے اس کی مہم ہم چلائیں گے، آپ ہاں کریں باقی کام ہمارا ہے، ہم بنائیں گے اثر درسونخ۔“ انوجیت نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے، جب اوگی والے بنادیں گے تو میں بن جاؤں گا۔“

”چلیں یہ تو طے ہو گیا، لیس باباجی، ہم چلتے ہیں، کل جالندھر بھی جانا ہے، میرے خیال میں کل میرے کاغذات مجھے مل جائیں گے۔“ جسپال نے کہا اور اٹھ گیا۔

رات گہری ہو گئی تھی جب وہ واپس اپنی کوشی کی جانب آئے۔ رات کے لیے سیکورٹی گارڈ موجود تھے۔ وہ گھر پہنچے تو کچھ کوران کے انتظار میں تھی۔ اس نے پوچھا۔

”اتنی دیر لگا دی دلیر ویر کے پاس۔“

”بس ایک معاملہ طے کرنا تھا وہ ہو گیا۔“ انوجیت نے کہا۔

”چلو جاؤ! اب سکون کرو بہت دنوں بعد سکون سے سونا نصیب ہو گا۔“ کلجیت کور نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

”دیکھ انوجیت! مجھے اس سیاست سے کچھ نہیں لینا دینا، لیکن اگر تو چاہے تو تیری ساری راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ نہیں تو بتا، کوئی دوسرا بندہ ہے تیری نگاہ میں۔“

”جہاں! اتنے معلوم ہے کہ میں تنظیم سے تعلق رکھتا ہوں۔ اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، میں ان سے تفصیلی بات کر لوں، پھر میں بتاتا ہوں۔“ اس نے واضح کرتے ہوئے کہا تو جہاں بولا۔

”اوکے۔ لیکن یہ یاد رکھنا، جب تک تم تنظیم والے سیاست میں نہیں آ جاتے اور اسمبلیوں میں نہیں پہنچ جاتے، اس طرح لڑتے رہو گے، حکومت خفیہ والوں کے ذریعے تم لوگوں کو دبا کر رکھے گی۔“

”یہ بات ہم بھی جانتے ہیں لیکن یہاں دراشتی سیاست ہے خیر! ہم اپنا زور لگا کر دیکھیں گے آگے جو قسمت۔“ انوجیت نے کہا۔

”اوکے تم کرو آرام کل نکلتے ہیں پھر۔“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر میز پر ہاتھ رکھ کر اپنے کمرے میں جا پہنچا۔

جہاں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ اس نے دیکھا ہر پریت اس کے بیڈ پر پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلا ہوا بیڈ کے پاس جا پہنچا، پہلے اس نے یہی سمجھا کہ اس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کی ہیں اور وہ سوتی ہوئی بن گئی ہے لیکن چند لمحوں بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ واقعتاً سو رہی ہے۔ جہاں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا، وہ فریش ہونے کے لیے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو ہر پریت ایسے ہی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے گیسو تنکے پر پھیلے ہوئے تھے۔ پیازی رنگ کے شلوار سوٹ میں اس کا گلابی رنگ کھراٹھراٹھ رہا تھا۔ اس کا آٹھل کچھ سینے پر تھا اور زیادہ بیڈ پر پھیلا ہوا تھا، وہ چت لیٹی ہوئی تھی اور ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی۔ جہاں اسے کافی دیر تک دیکھتا رہا پھر بیڈ کی دوسری طرف یوں لیٹ گیا کہ

ہر پریت کی نیند میں غفل نہ ہو۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں بہت سارے خیال آتے رہے۔ یہ ہر پریت تو بیاہ اور محبت کو فضول شے سمجھتی تھی، اب اس کی محبت میں گھر گئی تھی، کیا وہ اس کی محبت کا جواب دے پائے گا؟ یہی

ایک سوال اس کے دماغ پر چھا گیا۔ جس کا جواب نہیں میں تھا، اب اس کی زندگی ایک نارمل انسان کی نہیں رہی تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا یہاں آیا تھا۔ جسمینہ کی مدد سے اس نے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لی تھی اور اس کامیابی میں

ہر پریت کا پورا پورا ساتھ تھا لیکن روہی میں جانے کے بعد اس کی سوچ ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اب وہ محض جہاں تک نہیں رہا تھا اس کے اندر کے مقصد نے اسے پوری طرح بدل کر رکھ دیا تھا۔

روہی کے اندر کے مقصد نے اسے پوری طرح بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ کسی اور ہی جہاں کا راہی ہو گیا تھا، جسے راستہ تو معلوم تھا لیکن منزل کی خبر نہیں تھی۔ ایسے میں ہر پریت کا ساتھ وہ کیسے نبھائے گا؟ ہر پریت کے اندر جذبہ انتقام کوئی نئی یا نوکھی بات

نہیں تھی۔ سکھ قوم کے ہر اس گھر میں ایسا ہی جذبہ انتقام پایا جاتا ہے، جن کے آباؤ اجداد کو صرف سکھ سمجھ کر قتل کر دیا گیا تھا، سکھ نسل کشی ہو اور ان میں جذبہ انتقام نہ ہو۔ یہ غیر فطری سی بات تھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ ایک لڑکی تھی، جس کے اپنے خواب ہوتے ہیں۔ وہ بھی محبت میں گرفتار ہو سکتی ہے۔ بدن کی بکاڑ اسے بھی مجبور کر سکتی ہے۔ وہ اس کی طرف

دیکھتا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ ہر پریت نے کروٹ لی، پھر ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔

”آگے جہاں! اس نے خمار آلود لہجے میں پوچھا اور پھر اپنا آنچل سمیٹتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔“ کب آئے؟“

”ابھی، جب تم نے دیکھ لیا، مگر تم یہاں؟“ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ہاں میں۔ وہ دراصل میں نے تمہیں بتانا تھا کہ جسمینہ کی کال آئی تھی۔ میں نے اس سے رابطہ کیا، وہ آن لائن تو نہیں ہوا، بہر حال اس نے کچھ میل بھیجی ہیں۔ وہ تم دکھ لو، یہی بتانے کے لیے میں یہاں لیٹی ہوئی تھی۔“

”اوکے میں دیکھتا ہوں، تم آرام کرو۔“

”نہیں میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی، پھر چپل پہن کر دھیمے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا نیٹ کا پلگ لگا ہوا تھا۔ اسے آن کیا اور اپنی میل دیکھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ میل دیکھتا

جا رہا تھا، اس کی سنجیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جسمینہ نے جمال کی تمام تر مصروفیات کا احوال بھیج دیا تھا۔ وہ یہ تو دیکھ کر خوش ہوا کہ اس نے آتے ہی بہت کچھ کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے بے چینی ہونے لگی کہ جسمینہ اگر جمال کے بارے میں جانتا ہے تو کوئی دوسرا بھی آگاہ ہو سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے بڑی خطرناک بات تھی۔ وہ ایک دم سے پریشان

ہو گیا۔ اس کے پاس جمال کا کوئی رابطہ نہیں تھا کہ وہ فوراً اس بارے میں اسے مطلع کر سکتا، اسے اب روہی میں ہی رابطہ کرنا تھا، تاکہ یہاں وہ جمال سے مل سکتا، وہ رابطے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆.....

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا، دلچسپ کور پوری طرح تیار ہو کر کمرے سے باہر آ چکی تھی۔ اس نے جین ٹی شرٹ اور جا کر پہنے ہوئے تھے۔ میں اس کے انتظار میں تھا۔ جس وقت ہم دونوں کا رتک گئے تو میں نے پوچھا۔

”ہمارے کور کے لیے کوئی ہوگا؟ یا ہم میں صرف ہم دونوں ہی ہوں گے۔“

”بھڑ نہیں چاہیے۔ ایک لڑکے اور لڑکی کو میں نے بھیج دیا ہے، بس وہی ارد گرد ہوں گے۔“ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”اسے رکھنا کہاں ہے؟ یہ تو طے ہو چکا، اگر تم ادھر ادھر ہو گئی تو مجھے راستہ نہیں معلوم۔ اس بارے میں سوچا تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھتے جاؤ ہوتا کیا ہے؟“ اس نے عادت کے مطابق سسپنس رکھا تو میں خاموش ہو گیا۔ میں نے اپنا پائل چیک لیا اور سیٹ کے ساتھ فیک لگا دی۔

وہ نارمل رفتار سے کار لے جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا، جس پر بار بار اس کی نگاہ پڑتی تھی۔ میرے خیال میں وہ مدہن لعل کے گھر سے کسی پیغام کی منتظر تھی۔ مجھے یہ بڑا عجیب سا لگا کہ شہر میں کہیں بھی کوئی چیک پوسٹ نہیں تھی۔ کل سے اتنے ہنگامے ہو گئے تھے لیکن پولیس کار وہ عجیب سا تھا، مجھے اب تک کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی جو گشت پر ہو پڑے نہیں

ان کا کیا بنا ہوگا، جنہیں ہم کی دھمکی دے کر سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔ میں انہی خیالوں میں تھا کہ ایک کار تیزی سے ہمیں کراس لرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ میری نگاہ اسی پر جم گئی۔ اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی، بلکہ لمحوں میں وہ دور ہوتی ہوئی چلی گئی۔

”جمال! اس وقت مدہن لعل سو رہا ہے، سیکورٹی پر ایک درجن بندے ہیں اور ہم اس کے گھر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہیں۔“

”تو کوئی بات نہیں، چلو پہنچو وہاں۔“ میں نے پرسکون انداز میں کہا۔ میری بات سنتے ہی اس نے پوری توجہ سڑک پر اکادی۔ میں نے دیکھا اس کے جڑے بھیج گئے تھے۔ مجھے نہیں لگا کہ وہ ایک لڑکی ہے اس وقت وہ ایسی بھوکی شیرنی لگ رہی تھی جو اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے بے تاب ہو۔

وہ شہر کا پوش علاقہ معلوم ہو رہا تھا کھلی سڑکوں کے ارد گرد بڑے بڑے بنگلے تھے جو درختوں اور پودوں کی بہتات میں گھرے ہوئے تھے۔ الیکٹرک پلڑ پر روشنی کا بہتر بندوبست تھا۔ وہ پورا علاقہ روشن تھا۔ جو کم از کم ہمارے حق میں نہیں تھا۔ اس نے دو تین سڑکیں پار کیں۔ ایک جگہ وہی کار دکھائی دی جو کچھ دیر پہلے ہمارے برابر سے تیزی کے ساتھ گزری تھی۔ تجبی دلچیت کو نے تیزی سے کہا۔

”جمال! وہ سامنے..... سفید گیٹ والا گھر مد لعل کا ہے۔“

میں نے دیکھا دروازے کے باہر سکیورٹی گارڈ الرٹ کھڑے تھے۔

اس قلعہ نما بنگلے کے آہنی گیٹ پر سکیورٹی گارڈ تعینات تھے۔ چار دیواری کافی اونچی تھی۔ جس پر خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ رہائشی عمارت دو منزلہ تھی جہاں نارنجی سی پبلی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چند کھڑکیوں سے روشنی چھن کر باہر آرہی تھی۔ بنگلے کے اندر سکوت تھا اور میرے اندر سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ دلچیت مجھے پلان سمجھا چکی تھی لیکن یہاں آ کر اندازہ ہوا تھا کہ سوچ اور عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہاں کی سکیورٹی کو پار کر کے ہی مد لعل تک پہنچنا تھا جو بظاہر ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ ہم گیٹ کے سامنے سے گزر کر دائیں جانب والی سڑک پر آ گئے۔ ایک چکر لگا کر جب ہم واپس آئے تو کٹڑ والے بُرج میں سے رسہ لٹک رہا تھا۔ وہ سکیورٹی والوں کا بُرج تھا۔ اندھیرے میں وہ رسہ نظر آنا مشکل تھا لیکن بہت غور کرنے پر وہ دکھائی دے رہا تھا۔ دلچیت نے کار روک دی۔ اس نے چھوٹے بیرل کی گن کا ندھ سے لٹکانی اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پاس مزید ہتھیار کیا تھے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں بہر حال پوری طرح لیس تھا۔ ہم دیوار کے قریب چلے گئے۔ میں نے رسے کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور اوپر چڑھنے لگا۔ میں بُرج میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک سکیورٹی گارڈ تو مستعد تھا لیکن دوسرا بے ہوش تھا۔ میں نے صورت حال کا جائزہ لیا تب تک دلچیت بھی وہیں آ گئی۔

”یہ ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔“ اس گارڈ نے دھیمی آواز میں کہا تو دلچیت بولی۔

”اور تم ذرا سا بھی اپنے لیے خطرہ محسوس کرو تو نیچے اتر کر گاڑی لے جانا۔“

اس کے یوں کہنے پر گارڈ نے سر ہلادیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے بُرج سے نیچے اتر آئے۔ چار دیواری سے تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر درختوں اور پودوں کی ایک طویل قطار تھی۔ ہم اس کی آڑ میں چلتے ہوئے اس راستے پر آ گئے جہاں سے رہائشی عمارت کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ ہم ان کی آڑ میں آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ صرف دو یا تین فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ میں نے دیکھا دو گرے ہاونڈ ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ وہ بھونکنا تو چاہتے تھے مگر بھونک نہیں پارہے تھے۔ وہ نشے کی انتہا پر تھے۔ یا پھر زہرا ہنا ہوا تھا اس وقت مجھے کتے کی فطرت کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں بھی مالک سے وفاداری کر رہا تھا۔ اس وقت میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دلچیت نے اپنا سائلنسر لگا پھل نکالا اور ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی۔ ایک کتا لڑھک گیا اسی طرح دوسرے پر فائر کیا۔ دوسرا بھی دہلیز پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ چند منٹ انتظار کے بعد دلچیت آگے بڑھی اس نے دروازے کو دھکیلا جو کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی وردی میں ملبوس ایک سکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھل تھا اور وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ دلچیت ایک لمحہ ٹھٹکی اور آگے بڑھ گئی۔ اس نے آہستہ آواز میں منمناتے ہوئے کہا

”تم لوگوں کے پاس فقط دس منٹ ہیں۔ اندر کے تین سکیورٹی گارڈ اس وقت نشے میں دھت پڑے ہیں میں نے انہیں وہی نشہ دے دیا ہے جو ان کتوں کو دیا تھا۔ ہر پندرہ منٹ بعد اندر سے باہر رابطہ ہوتا ہے اور جس نے رابطہ کرنا ہے وہ بے ہوش ہے ہری اپ.....“ گارڈ کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں نے میز ہیوں کی طرف دیکھا جو چند فٹ کے فاصلے پر

تھیں میں اس جانب بڑھ گیا۔

دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے جیب سے ماسٹر کی نکالی اور مد لعل کے بیڈ روم والے دروازے میں گھسادی۔ اسی وقت دلچیت بھی وہاں پہنچ گئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک شاہانہ بیڈ روم تھا۔ جس کے درمیان میں جہازی سائز بیڈ پر ایک چھوٹے قد کا گہرا سا نولا سر سے گنجا موٹا سا شخص پڑا تھا۔ اس نے سفید کرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ وہ بے سندہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دلچیت سے تصدیق چاہی۔

”یہی ہے.....“ اس نے دھیمی آواز میں کہا اور مد لعل کے سر پر پہنچ گئی۔ اسے گردن سے پکڑا اور زور سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں نشے اور نیند کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ..... اور یہاں تک کیسے پہنچے ہو.....؟“

”وہ بھی بتا دیتے ہیں لیکن ابھی تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔ اٹھو یا پھر ہم اٹھائیں.....“ دلچیت نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ بھنا کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر اپنا ہاتھ سر ہانے کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ وہ بولی۔ ”نہیں مد لعل..... نہیں..... اب کچھ نہیں ہو سکتا..... اٹھو.....“ یہ کہہ کر اس نے خود سر ہانے کے نیچے ہاتھ ڈال دیا۔ وہاں پھل پڑا ہوا تھا۔ تجبی اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”تم لوگ یہاں میرے بیڈ روم تک پہنچے کیسے.....؟“

”سارا کچھ بتائیں گے اور بہت کچھ پوچھیں گے بھی..... چل.....“ دلچیت نے کہا تو وہ بولا۔

”دیکھو..... میں داد دیتا ہوں تمہاری بہادری کی کہ تم.....“ اس نے یہ کہا ہی تھا کہ میں آگے بڑھا اور ایک زوردار گھونسر اس کے منہ پر دے مارا پھر اسے گردن سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے دے مارا۔ اور کہا۔

”سالا کچھ اس کیے جا رہا ہے..... چل.....“

اس کے ساتھ ہی دلچیت نے اُسے تھپڑوں، مکوں اور لاقوں پر رکھ لیا۔ وہ اسے میز ہیوں تک ایسے ہی مارتے ہوئے آئی۔ تب اس نے اسے ٹانگ سے پکڑا۔ میں اس وقت تک میز ہیوں کے آخری زینے تک جا پہنچا۔ دلچیت نے اسے دھکا دے دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے تک آیا۔ میز ہیوں پر قالین کی وجہ سے اسے کم چوٹیں آئی تھیں۔ ایک بار تو مجھے لگا کہ جیسے وہ مر گیا ہے۔ میں نے اٹھایا تو وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس وقت تک وہ سکیورٹی گارڈ بھی آ گیا۔ میں نے دلچیت لے نیچے آتے ہی کہا۔

”سنجھا لو اسے..... میں نکلتا ہوں۔“

میں داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اسے کھولا اور ہلکی سی دھڑ سے باہر جھانکا۔ کافی فاصلے پر آہنی گیٹ کے ساتھ سکیورٹی گارڈ موجود تھے۔ دو باہر تھے اور جو ساتھ سکیورٹی روم میں تھے ان کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تقریباً تین منٹ باقی تھے۔ میں باہر نکلا اور باڑ کی آڑ میں بھاگتا ہوا ان ملبوس رٹی گارڈز سے فاصلے پر جا رکا۔ میں نے ان میں سے ایک کا نشانہ لیا مجھے ٹھک کی آواز سنائی دی لیکن سکیورٹی گارڈ چیخ مار کر گیا۔ دوسرا فوراً گھبراہٹ میں الرٹ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کا بھی نشانہ لیا وہ بھی چکر اتا ہوا گر گیا۔ اس وقت تک بالکل چمک چمکی۔ سکیورٹی روم سے تین گارڈ باہر نکلے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ فائر کس طرف سے ہوا ہے۔ میں نے مزید دیکھا۔ دلچیت پورچ میں آچکی تھی اور گارڈ کے سہارے مد لعل کو وہاں موجود چند گاڑیوں میں سے ایک کار میں بٹھائی تھی۔ میں نے ان تینوں میں سے ایک کا جیسے ہی نشانہ لیا الارم بج گیا۔ اب وہاں پر ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ میں

نے یکے بعد دیگرے ان تینوں کا نشانہ لیا، وہ وہی سڑک پر گرتے چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ ایک آدھ بندہ ابھی روم کے اندر ہوگا، جس نے الارم بجایا تھا۔ مختلف برجون کی طرف سے آلام کی آواز پر فائرنگ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ جیسے ہی دلچیت گیٹ کے قریب آئی، روم میں سے ایک شخص نکلا، اس نے گن سیدی کر کے فائر کرنا چاہا، لیکن میری چلائی ہوئی گولی اسے چاٹ گئی، گیٹ پر اب کوئی نہیں تھا۔ دلچیت کے ساتھ بیٹھا ہوا گارڈ گیٹ کھولنے لگا، اور میں اتنے میں کاری کی پھپھی نشست پر مدد لعل کے ساتھ آ بیٹھا جو ادھ مواسا تھا۔ کارچشم زدوں میں گیٹ سے باہر نکلی، گارڈ ایک جانب بھاگتا چلا گیا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ جبکہ دو سفید کاریں ہمارے آگے پیچھے چل پڑیں۔ جو اس پوش علاقے سے نکلنے ہی مخالف سمت میں مڑ گئیں۔

دلچیت انتہائی تیز رفتاری سے کار بھگائے چلی جا رہی تھی۔ اس کی پوری توجہ سڑک پر تھی۔ میں نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوئی گاڑی ہمارے پیچھے نہیں تھی۔ تاہم میرے اندر ایک بے چینی در آئی تھی۔ جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ فریڈز کالونی کے اس بڑے سے گھر کا گیٹ پار کرتے ہی وہ کار پورچ میں لے جانے کی بجائے سرونٹ کو اس کی جانب لے گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم مدد لعل کو لے کر کوارٹر کے اندر تھے۔ اسے ننگے فرش پر بٹھا دیا تھا اور میں حیران تھا کہ ادھ مواسا ہونے کے باوجود با اعتماد تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ تم لوگوں نے کس طرح مجھ تک رسائی حاصل کی ہے۔۔۔۔۔ بہت بڑی غلطی کر چکے ہو۔۔۔۔۔ تم لوگ۔۔۔۔۔ سب مارے جاؤ گے۔۔۔۔۔ سب۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے زور سے آنکھیں پھینچ لیں۔ تبھی دلچیت نے اس کی پہلی پر لٹ مار تے ہوئے کہا۔

”بے غیرت۔۔۔۔۔ تیری وجہ سے میرا اکلوتا بھائی۔۔۔۔۔ لکھنؤ درنگھ اس دنیا میں نہیں رہا۔۔۔۔۔ یاد آیا کچھ۔۔۔۔۔ تیرے کتوں نے اسے مارا۔۔۔۔۔ تیرے سامنے۔۔۔۔۔ یاد آیا۔۔۔۔۔“

”جو بھی میری راہ میں آیا۔۔۔۔۔ میں نے اسے مار دیا۔۔۔۔۔ تم چاہو تو مجھے مار دو۔۔۔۔۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ لیکن تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔۔۔۔۔ تو بھی نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے کراہتے ہوئے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

”ایک سال سے تیرے ارد گرد ہوں کتے۔ دیکھا تیری سکیورٹی۔۔۔۔۔ تیرے سی سی کیمرے۔۔۔۔۔ تیری قلعہ بندی، سب ختم کر دی میں نے۔۔۔۔۔ اب تیرا سارا نیٹ ورک بھی ختم کروں گی۔“

”آہ۔۔۔۔۔ نیٹ ورک۔۔۔۔۔ نیٹ ورک کو فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔ میں چاہے مر بھی جاؤں۔۔۔۔۔“ اس نے طنز یہ کہا۔

”بکو اس کر رہا ہے تو۔۔۔۔۔ ابھی تیری کیمیکل فیکٹری اڑ جائے گی۔۔۔۔۔ تو پھر دیکھیں گے تیرا نیٹ ورک کیسے چلتا ہے۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ ابول پاکستانی پنجاب میں تیرا نیٹ ورک کون چلا رہا ہے؟ بول؟“

جیسے ہی اس نے یہ سنا، اس نے چونک کر ہم دونوں کو دیکھا، پھر جیسے اسے ساری سمجھ آ گئی۔ تب وہ بڑے اعتماد سے مگر ہنکارتے ہوئے بولا۔

”تو تم لوگ دہشت گرد ہو؟ ورنہ۔۔۔۔۔ یہاں کے کسی بندے کی جرات نہیں تھی مجھ تک پہنچنے کی۔ یہ بھول جاؤ کہ میں تم لوگوں کو کچھ بتاؤں گا۔“

”تیرا ہر ایک عضو بولے گا۔۔۔۔۔“ میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہونہ۔۔۔۔۔! ہر عضو۔۔۔۔۔“ اس نے طنز یہ انداز میں نفرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دلچیت سے کہا۔

”نمک تو منگواؤ۔۔۔۔۔“ میرے سر دلچے سے وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے دہشت زدہ انداز میں میری

جانب دیکھا تو میں نے کہا۔ ”تیرے بیوی بچے اس وقت بنکاک میں ہیں۔۔۔۔۔ منو ہر یہاں تھا مر گیا۔۔۔۔۔ اب ان کی باری ہے۔۔۔۔۔ تم نے سنا ہوگا مدد لعل مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ تیری لاش۔۔۔۔۔ عبرت کا نشان بن جائے گی۔۔۔۔۔ میں بناؤں گا۔۔۔۔۔“

”تو بنا دو۔۔۔۔۔ مجھے کیا سنا رہے ہو۔۔۔۔۔“ اس نے انتہائی نفرت سے کہا۔ اس وقت دلچیت نمک لے آئی۔

”اس کا مطلب ہے تم کچھ نہیں بتاؤ گے۔“ میں نے اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی میں نے پیٹنر ابد لے ہوئے کہا۔ ”ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔۔۔۔۔ یہ تم جانتے ہو نا۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ تم ہی یہاں سے دولت کما سکتے ہو۔۔۔۔۔ تو ہمارے لیے مرا ہوا ہاتھی بنے گا سوا لاکھ کا۔۔۔۔۔ تو مر جائے گا۔۔۔۔۔ تیری جگہ ہم لیں گے۔۔۔۔۔ تیرا سارا کاروبار ہم سنبھالیں گے۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ تیرا نیٹ ورک کہاں کہاں پر ہے۔۔۔۔۔ صرف تم سے تصدیق چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔ ممکن ہے ہمارے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جاتا لیکن۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے خنجر اس کی ران میں پرو دیا۔ وہ مدد لعل کی پھپھی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے خنجر نکالا اور اس میں نمک بھر دیا۔ اس کی چھین بلند ہونے لگیں تو دلچیت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے خنجر اس کی دوسری ران میں پرو دیا تو ساکت سا ہو گیا اور دونوں ہاتھ لہرانے لگا۔ دلچیت نے اس کا منہ چھوڑ دیا۔

”کوئی سمجھوتہ۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ سکتا۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔“ اس نے بمشکل کراہتے ہوئے کہا۔

”لاہور میں کون ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سر دلچے میں پوچھا۔ ”شش۔۔۔۔۔ شیخ ظہیر۔۔۔۔۔ گل۔۔۔۔۔ برگ۔۔۔۔۔ تھ۔۔۔۔۔ ری۔۔۔۔۔“

اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے زخم میں نمک بھر دیا۔

”بکو اس کرتے ہو تم۔۔۔۔۔“ میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

”وکی سنگھ ان کے ساتھ ڈیل کرتا ہے۔۔۔۔۔ اس سے تصدیق ہو جائے گی۔۔۔۔۔ سمجھوتہ بولو۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

”اسے بھی بیہوش لار ہے ہیں۔۔۔۔۔ فکر نہ کرو۔۔۔۔۔“ دلچیت نے کہا۔ ”تم دیکھو گے۔۔۔۔۔ ہم کتنے اچھے مہمان نواز ہیں۔۔۔۔۔ تم سمجھوتہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔۔۔۔۔ ورنہ سچ اگل دیتے۔“

”میں بتا بھی دوں۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ وہ تمہارے کسی۔۔۔۔۔ کام۔۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اسے۔۔۔۔۔ را۔۔۔۔۔ پنڈل کرتی ہے۔۔۔۔۔ مدد لعل بولا۔

”اور رُا کے کتنے لوگ تیرے خلاف ہو چکے ہیں۔ یہ تجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ تو میں نے کہا۔ ”تیرا نالازی ہے۔ بتا جائے گا تو تیرے بچے۔۔۔۔۔ بنکاک میں۔۔۔۔۔“

”بتایا نا۔۔۔۔۔ شیخ ظہیر۔۔۔۔۔“ اس نے پوری قوت لگا کر کہا۔ ”امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے وہ سب۔۔۔۔۔ ڈیل کرتا ہے۔۔۔۔۔“

یہی وہ لمحہ تھا جب دلچیت کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال پک کی۔ چند لمحے فون سننے کے بعد اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش ملی حیرت منکنے لگی۔ اس نے یوں کہا جیسے خود کلائی کر رہی ہو۔

”کہاں غلطی ہو گئی۔۔۔۔۔ پولیس اور خفیہ کے لوگ اس علاقے کو گھیر رہے ہیں۔“

یہ سنتے ہی مدد لعل نے قہقہہ لگایا۔ جو اگرچہ جاندار نہیں مر لیا تھا لیکن اس میں فتح مندی کا احساس چمک رہا تھا۔ اس نے طنز یہ انداز میں میری طرف دیکھا، پھر دلچیت کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم کیا سمجھتے ہو علاقے پر بادشاہت الویں ہی ہو جاتی ہے۔ ابھی چند منٹ میں وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔ چاہے تم لوگ مجھے مار دو۔۔۔۔۔ لیکن تم اور تمہارے سارے ساتھی۔۔۔۔۔ کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ آں۔۔۔۔۔ آپ۔“ وہ کواہ کر رہ گیا۔ پھر انتہائی نفرت سے بولا۔ ”بے غیرت سکھو اور منسلو۔۔۔۔۔ تم لوگوں سے اپنا بھارت شدہ کر کے چھوڑیں گے۔ اس میں چاہے جتنا وقت لگ جائے۔۔۔۔۔ بھگوان کی کرپا سے۔۔۔۔۔ لاہور کا نیٹ ورک چلے گا۔۔۔۔۔ جو پاکستان کی جڑیں ختم کرنے گا۔۔۔۔۔ اب مارو مجھے۔۔۔۔۔ ختم کر دو مجھے۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اضطرابی انداز میں اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دکھایا۔۔۔۔۔ میں نے اسے دیکھا وہ عجیب سی بھاری ڈائل والی تھی۔ میں لمبے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا، وہ مدن لعل کی نشاندہی کرنے والا آلہ بھی تھا۔

”دلجیت۔۔۔۔۔ اس کی بکواس مت سنو۔۔۔۔۔ اور سب کو لے کر فوراً ہٹو یہاں سے، صرف دو منٹ ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور خنجر سے اس کی کلائی کاٹ دی۔ اس کے منہ سے بھیا نک چیخ نکلی۔ دلجیت جا چکی تھی۔ میں نے مدن لعل سے کہا۔

”سنو۔۔۔۔۔! جب تک ہم جیسے سر پھرے لوگ ہیں، تم جتنی بھی کوشش کر لو۔۔۔۔۔ پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔۔۔ میں دیکھوں گا تیرا نیٹ ورک۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے خنجر اس کی گتھی کھوپڑی میں گاڑ دیا۔ اس نے ایک سسکی لی اور مر گیا۔ تقریباً دو تین منٹ کے دوران وہاں پر موجود سب لوگ مختلف سمتوں میں پھیل کر نکل گئے۔ ہم ایک فور وہیل جیب میں سوار وہاں سے نکلے۔۔۔۔۔ ہمارے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی جسے دلجیت اغوا کر کے لائی تھی۔ اس وقت وہ بے ہوش تھی۔ میں نے اس وقت لڑکی پر نہیں سوچا بلکہ میری ساری توجہ اس گھڑی کو ٹھکانے لگانے پر تھی۔ جیسے ہی ہم مین روڈ پر آئے ہمارے قریب سے ایک ٹرک گزرا، میں نے وہ گھڑی اس پر پھینک دی۔ اور پرسکون ہو گیا۔

”یہ گھڑی۔۔۔۔۔“ دلجیت نے پوچھا۔

”مدن لعل کی نشاندہی کرنے والا آلہ۔۔۔۔۔ اب سارے ناکے ٹوٹ جائیں گے۔۔۔۔۔ ہمیں صرف گھنٹہ آدھا گھنٹہ

چاہیے۔۔۔۔۔“ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ کافی دور کاریں کھڑی نظر آئیں انہیں چیک کیا جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ”دلجیت رکو۔۔۔۔۔“

اس نے فوراً گاڑی روک دی۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ وہ ناکہ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”اس لڑکی کا بہانہ کر کے نکل جائیں گے۔۔۔۔۔ بیمار ہے، اسپتال۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔

”نہیں، رسک نہیں لینا۔ نکلو۔۔۔۔۔“ میں نے اترتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً کار چھوڑ دی۔ اور پھر تیزی سے سڑک کنارے سے ہٹ کر اندھیرے میں چلے گئے۔ تبھی دلجیت کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔۔۔۔۔“

”تو نکلو۔۔۔۔۔ میں تو جالندھر کے بارے میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ اس نے چند لمبے سوچا اور ہم بائیں جانب

آبادی کی جانب چل پڑے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم گلیوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے کہیں نکل جائیں گے۔ جہاں سے

کسی محفوظ مقام کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ہم نے گلیاں پار کر لیں تو ہمارے سامنے ریلوے ٹریک تھا۔ میں نے آسمان پر دیکھا اور

سمت کا اندازہ کیا۔ صبح ہونے میں تھوڑا وقت ہی رہ گیا تھا، ہم ریلوے ٹریک پر شمال کی جانب چلتے چلے جا رہے تھے۔ تبھی

دلجیت نے جھنجلاہتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کسے کال کروں۔۔۔۔۔ سڑک پر چلنا خطرناک اور صبح تک۔۔۔۔۔“ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا سیل فون بیچ اٹھا۔ اس نے جلدی سے اسکرین پر نمبرز دیکھے پھر بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”۴۴ جنی نمبر۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون ریسیو کر لیا۔ پھر اگلے ہی لمحے حیرت سے بولی۔ ”بھال تیرا کوئی جاننے والا ہے۔“ میں نے فون کان سے لگایا اور ہلکا ہلکا تو دوسری طرف سے جیپال کی آواز آئی۔

”اوتے کہاں ہے تو۔۔۔۔۔؟“

”لو فرشتہ ہی لگے ہو یار۔۔۔۔۔ تجھے نمبر کیسے۔۔۔۔۔؟“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”بکواس نہیں کر۔۔۔۔۔ جلدی سے بتا تو ہے کہاں، میں جالندھر میں تجھے تلاش کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ دلجیت سے پوچھ لے۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر میں نے فون دلجیت کو دیا تو وہ اسے لوکیشن سمجھانے لگی۔

ہم فرینڈز کا لوٹی سے موتی نگر تک آ گئے تھے۔ ریلوے ٹریک سے ہٹ کر ہم دوبارہ روڈ پر آئے تو ایک مخصوص جگہ پر وہ ہمیں کھڑا ہوا، اس کے ساتھ ایک خوبصورت سی لڑکی تھی۔ ان سے چند فٹ کے فاصلے پر کار کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کار میں جا بیٹھے۔ جیسے ہی ہم اس کار میں بیٹھے وہ چل دیا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سڑک چھوڑ کر ایک گلی میں گھس گیا، جس کی رہنمائی ہر پریت کر رہی تھی۔

موتی نگر میں خالصہ تحریک کے ایک عہدیدار کا وہ گھر، ایک تنگ سی گلی میں واقع تھا جس میں بمشکل کار آتی تھی۔ انہوں نے کار باہر ہی پارک کی اور پیدل اس گھر تک آئے تھے۔ اس وقت وہ چاروں ایک آرام دہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”تو پھر ہر پریت ہی ہمارے کام آئی۔“ دلجیت نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو جیپال بولا۔

”میں پچھلے کئی گھنٹوں سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں، اور دلجیت کا نمبر میں نے وہیں سے لیا، جہاں سے مجھے لینا چاہیے تھا۔“

جیپال نے کہا تو میں سمجھ گیا۔

”مگر تمہیں تلاش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”جسمیندر تیرے بارے میں جانتا ہے، تو دوسرے بھی تیرے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے۔ یہ خطرناک بات تھی اور میں نے۔۔۔۔۔“

”جسمیندر۔۔۔۔۔ وہی نا جواب کینیڈا میں ہے؟“ دلجیت نے پوچھا۔

”تم کیسے جانتی ہو اسے؟“ جیپال نے پوچھا۔

”ہم کچھ عرصہ یہاں اکٹھے کام کرتے رہے ہیں۔ میں بھی وہیں جانے والی تھی، یہ آپریشن پورا کر کے مگر۔۔۔۔۔“ اس نے

آخری لفظ بڑی اداسی میں کہے۔

”مگر۔۔۔۔۔ مطلب۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”آپریشن ادھر رہ گیا۔ میں نے مدن لعل کو چارہ بنانا تھا وہ کی سنگھ کے لیے۔۔۔۔۔ دوسرا آپشن وہ لڑکی تھی۔ اب شاید وہ کی

سنگھ ریز میں چلا جائے۔۔۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ مدن لعل نے لاہور کے بارے میں سچ بولا ہوگا۔“ اس نے تفصیل بتاتے

ہوئے کہا تو ایک لمحہ کے لیے سبھی پر اداسی چھا گئی۔ تب وہ بولی۔ ”ایک سال ہو گیا۔۔۔۔۔ میں مدن لعل پر کام کر رہی تھی، اس

کے دو سیکورٹی کے لوگ بہت مشکل سے خریدے۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔! چھوڑو۔۔۔۔۔! اس نے کہا اور صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

تب ہر پریت بولی۔

”اتنی سی بات پر اداس ہو گئی ہو۔ دیکھ جہاں بھی ہوا نکال لیں گے اسے باہر..... فی الحال کچھ کھانا پینا ہے تو ٹھیک“
ورنہ چلیں اوگی پنڈ۔“

”میرے پاس صرف دو دن ہیں ہر پریت..... پھر میں نے کینیڈا چلے جانا ہے..... جس طرح جہاں یہاں آیا ہے نا..... میں بھی اسی طرح یہاں آئی ہوں..... اس سے پہلے میرا بھائی لکھنؤ میں آ گیا تھا۔ وہ یہاں کی مٹی میں مٹی ہو گیا۔ اس کے قاتلوں کو..... اور اپنے باپ کے قاتلوں کو میں نے مار دیا..... اب واپس نہ گئی تو وہاں کی عدالت میری پراپرٹی میرے نام ختم کر کے چیزٹی کو دے دے گی۔“

”اوہ.....! تم لکھ کر دے آئی ہو، کوئی بات نہیں دو دن بہت ہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”کل مجھے امر تر جانا ہے..... دلجیت کو رنے کہا تو ہر پریت سوچتے ہوئے بولی۔

”تم دو چار گھنٹے سولو..... آرام کرو..... پھر دیکھتے ہیں۔“

اس کے لہجے میں بہت زیادہ اعتماد تھا۔ میں نے ایک نگاہ اس کے حسین چہرے پر ڈالی اس نے مجھے آنکھیں بند کر کے پرسکون ہو جانے کے لیے اشارہ کیا۔ تو میں نے اعلانیہ انداز میں کہا۔

”او کے ہر پریت..... میں تو سو رہا ہوں.....“ یہ کہہ کر میں صوفے پر سیدھا ہو گیا۔ اور پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جس وقت میری آنکھ کھلی تقریباً چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں فریش ہو گیا تھا۔ دلجیت صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے اپنی ٹھوڑی اپنے ہی گھٹنوں پر رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ہولے سے کہا۔

”دلجیت! کیا بات ہے اتنی افسردہ کیوں ہو؟“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر غمزہ مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

”جمال.....! ہم نجانے کس رستے کے راہی ہیں۔ ہماری منزل کیا ہے؟ ہمارا مرکز کہاں ہے؟ کیوں ہے اس دنیا میں اتنی نفرت ہے ایک اچھا بھلا بندہ ہوتا ہے اسے انتقام کی آگ نجانے کیسے کیسے دیں پھر ادیتی ہے۔ درندگی کا شکار ہونے والا بھی درندہ ہی بن جاتا ہے۔ جنگل ہے یہ دنیا..... جس میں لہو سے آبیاری ہوتی ہے ہم کسی کو نہیں ماریں گے تو وہ ہمیں مار دے گا۔“

”لگتا ہے تم پر کچھ زیادہ ہی افسردگی طاری ہو گئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ کھسکتی ہوئی میرے قریب آ کر میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر اپنا سر میرے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

”میں ایک لڑکی ہوں جمال چاہے جتنی خون ریزی کر لوں مار دھاڑ میں جتنی تاک ہو جاؤں لیکن یہاں..... اس سینے میں ایک دل بھی ہے میرے اندر کی عورت کے مطالبات تو وہی عورت والے رہیں گے نا..... کیوں نہیں یہ دنیا پرسکون ہو جاتی..... ہم بھی سکون سے رہیں۔“

”دلجیت کو راجی.....! دنیا اس وقت پرسکون ہوتی ہے جب بندہ اندر سے پرسکون ہو جائے۔ یہیں پر معاف کر دینے کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے خیر.....! تم کینیڈا جا رہی ہو تو سکون سے جاؤ اپنی ایک پرسکون اور نئی دنیا آباد کر دو۔ تو نے اپنے پر یوار کا بدلہ لے لیا یہی بہت ہے۔“ میں نے ٹھل سے کہا۔

”اب میں اس دنیا میں تنہا ہوں جمال کوئی نہیں ہے میرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ میں کسی بندے سے شادی کر لوں گی..... اور بس..... یہی جیون ہے.....“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر میرے چہرے پر انگلی پھیرتے

ہوئے بولی۔ ”میں نے بارہا موت کو اپنے قریب دیکھا ہے اب ڈر نہیں لگتا موت سے زندگی اور موت کے درمیان جو خلا ہے میں اس میں جی رہی ہوں..... نجانے کیا ہوگا؟“

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں اگر دل کرے تو اس پر عمل کر لینا۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا تو وہ میری جانب گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”بولو.....!“

”خدمت خلق کرو..... بہت سکون ملے گا..... اپنی لڑائی کا رخ بدل دو۔ یہی انسانیت ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر ہولے ہولے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں.....! ایسا ہی کروں گی.....“ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”جمال وعدہ کرو تم میرے پاس کینیڈا ضرور آؤ گے۔“

”زندگی رہی اور میں وہاں جاسکا تو ضرور.....“ میں نے وعدہ کر لیا۔ تبھی ہر پریت کمرے میں داخل ہوئی۔

”واہ..... واہ..... بڑا رومانٹک سین چل رہا ہے بھی..... کہیں تم دونوں میں وہ تو نہیں.....؟“ اس نے شوخی سے کہا تو دلجیت گہری سانس لے کر بولی۔

”کاش ایسا ہوتا ہر پریت..... میں نے تو کئی بار اسے آفر کی ہے..... مگر..... یہ تو.....“ یہ کہہ کر وہ دل کھول کر فیس دی تو ہر پریت بھی ہنستے ہوئے بولی۔

”اگر مزید رومانس کا ارادہ نہ ہو تو چلیں۔“

”کہاں؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”یار ذرا مارکیٹ تک چلتے ہیں تھوڑی شاپنگ کریں گے کچھ کھائیں پیئیں گے اور پھر سوچیں گے کیا کرنا ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں پروگرام بتا دیا۔

”چلو.....!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو دلجیت مجھ سے پہلے ہی اٹھ گئی۔

اس گھر سے نکل کر جب ہم تنگ سی گلی میں آئے تو معلوم ہوا کہ بارش ہو رہی ہے۔ اگرچہ اتنی تیز نہیں تھی لیکن کافی جل تھل ہو چکا تھا۔ گلی کی نگر پر چھال کھڑا تھا اس کے ساتھ ایک خوب رو جوان تھا جس نے سرخ رنگ کی پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ ہم ان کے قریب پہنچے تو قریب کھڑی فور و ہیل جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چھال بنے کہا۔

”ادھر بیٹھو۔“

ہم اس میں بیٹھ گئے تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی لڑکی نے جیب بڑھا دی تبھی چھال نے تعارف کرایا۔

”یہ سوئی ہے اور یہ پریال ہے.....“

”وہ حویلی والے.....“ میں نے پوچھا تو چھال نے تیزی سے کہا۔

”بالکل بالکل..... تمہیں تو یاد ہے یارا ابھی ہم ان کے گھر جا رہے ہیں۔ یہیں نزدیک ہی ہے وہ جے کالونی۔“

”او کے.....!“ میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ نہادھو کر فریش ہوئے ہمیں نئے کپڑے دیئے گئے۔ دلجیت نے شلوار قمیص پہنی تھی۔ سبھی ڈرائنگ روم میں کھانے کی میز پر آ گئے۔ تبھی کھانا کھاتے ہوئے پریال سنگھ نے کہا۔

”بائی جی! یہ جس دیکھنے کی آپ بات کر رہے ہیں نا..... دو سال پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ یہی چھوٹی موٹی چوری، غندہ گردی اور منشیات فروخت کرتا تھا اب مجھے سمجھ میں آئی ہے کہ ایک دم سے اتنا مضبوط کیسے ہو گیا۔ خیر! میں نے لڑکوں کو اس

کی تلاش پر لگا دیا ہے۔ وہ بڑی خاموشی سے اسے تلاش کر لیں گے۔“

”اپنے لڑکوں سے یہ کہہ دو کہ اسے تلاش کر کے اس کا ٹھکانہ ضرور معلوم کر لیں۔ اسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔“ جیپال نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں بائی جی ایسا ہی ہوگا۔“ اس نے کہا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

وہ سہ پہر اور شام کے درمیان کا وقت تھا۔ میں جیپال، ہرپریت اور دلجیت ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ من لعل کے بارے میں مقامی ٹی وی تفصیلات بتا چکا تھا اس کی آخری رسومات ادا ہو گئی تھیں۔ اس قتل کے ذمے داروں کے بارے میں یہ اطلاع تھی کہ انہیں چوبیس گھنٹوں میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ میرے خیال میں قاتلوں کو پکڑنے کے لیے ایسی سرگرمی ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اس معاملے میں سیاسی دباؤ لازمی تھا۔ شہر میں ہائی الرٹ تھا لیکن ان سبھی اداہوں کی ایک خالی ایسی ہے جو مجرموں تک پہنچنے میں کامیابی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ انہیں جب تک کہیں سے کوئی نشانہ ہی نہ ملے، وہ مجرم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لیے کیا جاتا ہے تاکہ جو پکڑا جائے وہی مجرم ورنہ باقی سبھی معصوم ہوتے ہیں۔ اکثریت سے زیادہ جرائم انہی سیاسی قذ اور شخصیات کی چھتر چھاؤں کے نیچے ہوتے ہیں۔ پولیس اور خفیہ ادارہ چاہے جتنے آزاد دکھائی دیں، لیکن وہ لوگ بھی انہی کے پاؤں کی زنجیروں میں بندھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر جرائم انہی کے زیر سایہ پھلتے پھوٹتے ہیں اور یہی طاقتور لوگ اس کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات پولیس تو اس حد تک بے بس دکھائی دیتی ہے کہ وہ کسی طاقتور بندے کا آدمی پکڑ بھی لے تو ایف آئی آر درج نہیں کرتے۔ اور کوئی بار پھندا بے گناہوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میں ٹی وی دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ پریال سنگھ آگیا۔ اس کے چہرے کی سرنخی بتا رہی تھی کہ وہ کی سنگھ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔

”اس وقت وہ شیخاں والے بازار میں موجود ہے وہاں ایک دو منزلہ عمارت ہے اس کے ایک کمرے میں اپنے چند لوگوں کے ساتھ موجود ہے۔“

”کتنا وقت لگے گا وہاں تک جانے کے لیے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کوئی آدھا گھنٹہ ممکن ہے کچھ زیادہ لگے کیونکہ وہ اندرون شہر ہے۔“ پریال سنگھ نے جواب دیا۔

”تو پھر نکلو!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر پریال سنگھ سے پوچھا۔ ”انفارمیشن والا بندہ تو قابل اعتماد ہے نا؟“

”سو فیصد وہ وہیں بیٹھا ہے اور ان کی نگرانی کر رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو۔۔۔۔۔!“ میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا تو وہ سب چل دیے۔

شیخاں والا بازار پرانا تھا۔ تنگ سے راستے کے اندر جیپ نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے صورت حال کا اندازہ لگا کر جیپال کو وہیں رہنے کو کہا، سوئی اس کے ساتھ رہنے دی جو ہرپریت کے ساتھ تھی۔ میں پریال اور دلجیت اس بازار میں داخل ہو گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے پریال سے کہا۔

”یار اپنے اس بندے سے پوچھو کہ کی سنگھ کس گاڑی میں یہاں تک آیا ہے اور اس کی گاڑی کس طرف کھڑی ہے۔ ظاہر ہے یہاں اس کی گاڑی تو نہیں آسکتی۔“ میں نے کھلے ہوئے بازار کی صورتحال دیکھ کر کہا۔

میرے کہنے پر اس نے رابطہ کیا اور چند منٹ بعد بتایا۔

”سفید رنگ کی کرولا ہے اس کے پاس اور وہ بازار کے اس سرے پر کھڑی ہے۔“ اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔

”تو پھر جیپال سے کہو ادھر آ جائے۔ کیا اسے راستہ معلوم ہوگا؟“ میں نے کہتے ہوئے پوچھا۔

”بائی جی، سوئی جو ہے۔۔۔۔۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بازار کے درمیان میں دائیں ہاتھ پر دو منزلہ پرانی سی عمارت کے نیچے دکانیں تھیں۔ انہی کے درمیان سے تنگ سی سڑھیاں اوپر چڑھ رہی تھیں۔ میں کن اکھیوں سے جائزہ لے رہا تھا کہ دلجیت نے میرے بازو کو پکڑتے ہوئے ہولے سے کہا۔

”ہم نے اسے مارنا تو ہے نہیں زندہ پکڑنا ہے یہاں مشکل ہو جائے گا کیوں نا ہم باہر اس کا انتظار کریں اور وہیں اسے قابو کر لیں میرے خیال میں وہ زیادہ آسان ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے پریال سنگھ سے پوچھا۔ ”تم نے اسے دیکھا ہوا ہے نا؟“

”جی، لیکن تقریباً دو سال پہلے۔۔۔۔۔ پچھان تو لوں گا۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا تو ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ پریال کا انفارمیشن دینے والا بندہ کہاں تھا۔ بازار کے دوسرے سرے پر جب ہم پہنچے تو میں نے ایک سفید

کرولا کھڑی دیکھی اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ چند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہمیں وہاں کھڑے تقریباً پانچ منٹ ہوئے

تھے کہ جیپال لوگ بھی آ گئے۔ میں نے نئی صورتحال کے بارے میں بتا کر اگلا پلان بتایا۔ ہم وہاں یوں پھر رہے تھے جیسے

تفریح کے موڈ میں آئے ہوئے ہوں۔ سوئی، دلجیت اور ہرپریت ایک کپڑے والی دکان میں کھس گئیں لیکن ان کی تمام تر

توجہ ہماری طرف تھی۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزار چکے تو پریال سنگھ کو کی سنگھ کے نکلنے کی اطلاع ملی تو میرے

اندر سنسنی پھیل گئی۔ چھ منٹ کے بعد میں نے دیکھا۔ ایک نوجوان سنگھ جس نے سفید پتلون اور شرٹ کے ساتھ کالی پگڑی

پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ دو گاڑی تیز قدموں سے چلے ہوئے آ رہے تھے۔ اس وقت تک جیپال، پریال، سوئی اور

ہرپریت جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ میں اور دلجیت آگے بڑھے۔ ایک سنگھ نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس نے سفید کرولا کا

دروازہ کھول دیا۔ وہی سنگھ پچھلی نشست پر بیٹھا بس یہی ایک لمحہ میرے کام کا تھا میں نے کیے بعد ہنگامے دو فائر کیے

سائیلنسر لگے بسٹل سے ٹھک ٹھک ہوئی اور ڈائیونز کے ساتھ ایک گاڑی گر گیا۔ اس وقت تک دلجیت نے بھی فائر کر دیا تھا

دوسرا گاڑی کار میں بیٹھ ہی نہیں سکا۔ وہ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ دلجیت نے بھاگ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اس

وقت تک وہی سنگھ باہر نکلتا چاہ رہا تھا میں نے بسٹل اس کی پسلی سے لگاتے ہوئے کہا۔

”بس وہی۔۔۔۔۔ خاموشی سے بیٹھے رہو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا اور بسٹل کا دستہ اس کی کپٹی پر مارا وہ

ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ میں نے دروازہ لگایا تو دلجیت نے کار بڑھادی۔ جیپ نکل چکی تھی اور ہم اس کے تعاقب میں

تھے۔ تقریباً دو منٹ کے اس ایکشن میں کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ ہوا کیا ہے۔ مگر اب تک شور ہو چکا ہوگا۔ بھرے بازار

میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ ہم انتہائی تیز رفتاری سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ اندر پھیل جانے پر شہر کی روشنیاں جگمگا اٹھی

تھیں۔ مجھے بالکل بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ وہ گلیوں کے درمیان سنسان نی سڑک تھی جہاں جیپ رک

گئی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک پراڈ کھڑی تھی پریال تیزی سے میری طرف آیا اور بولا۔

”یہ گاڑی چھوڑ دیں اور وہ لے لیں۔“

چند منٹ میں وہی سنگھ کو جیپال اور پریال نے اس پراڈ میں ڈالا تب تک میں نے ڈیش بورڈ میں موجود سب چیزیں

نکال لیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھا ایک چھوٹا سا بیگ پڑا تھا میں نے وہ بھی اٹھالیا۔ میں نے پراڈ میں جا کر وہی سنگھ کا سیل فون

نکالا اور اسے بند کر کے پریال کو دے دیا کہ کار میں پھینک دے۔ پریال اور سوئی واپس چلے گئے جبکہ ہم تیزی سے آگے

بڑھ گئے۔ اب یہ جیپال جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

وہ جائیداد اور امرتسر روڈ پر ایک گاؤں تھا۔ جس میں ایک حویلی نما مکان کھیتوں ہی میں بنا ہوا تھا۔ وہاں ہرپریت کا

رابطہ تھا۔ اچھا خاصا اندھیرا تھا جب ہم پہنچے۔ اس بڑے سے گھر کے باہر جس بندے نے ہمارا استقبال کیا وہ لمبے قد کا

توجہ مند آدمی تھا۔ اس نے سفید کرتا پا جامہ پہنا ہوا تھا۔ کاندھے پر نسواری رنگ کی چادر اور اسی رنگ کی پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ خوشی داڑھی والا وہ بندہ پہلی نگاہ میں مجھے اچھا لگا تھا۔ اس نے ہم سب کو دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور فتح بلائی۔

”ست تری اکال سب نوں..... تے جے آئیاں نوں..... آؤ.....“

”وہ بندہ، سردار جی.....“ ہر پریت نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”اؤ تم لوگ آؤ اسے سنبھال لیتے ہیں.....“ اس نے کہا اور اندر کی جانب چل دیا۔ ہم صحن میں جا بیٹھے تو میں نے دیکھا تین چار بندے پراڈو کے پاس آئے اور اسے وہاں سے لے گئے، میں خاموش رہا۔

”پتر..... میں سردار جیوں سنگھ پھورا ہوں۔ جالندھر کالج میں استاد تھا، پڑھاتا تھا وہاں اور یہ ہر پریت میری شاگرد ہے۔ اب ریٹائرڈ ہو گیا ہوں، مجھے خوشی ہوئی کہ ہر پریت نے میری مدد چاہی۔“ اس نے اپنا تعارف کروا کر ہم سب کی طرف دیکھا تو ہر پریت نے ہمارا مختصر تعارف کر دیا۔ ابھی اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے یہاں ہونے کا مطلب ہے کہ تم لوگ کوئی بڑا کام کر رہے ہو ہو گیا یا ابھی باقی ہے؟“

”مدن لعل سر جی.....“ ہر پریت نے گلے پر انگلی پھیر کر کہا تو وہ چونک گیا، پھر خوشی سے اٹھا اور مجھے گلے لگا لیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ ابھی میں نے کہا۔

”یہ دلچسپ..... اس نے..... میں تو اس کے ساتھ شامل تھا۔“

”بڑی بات ہے پتر..... بڑے بڑے سونے نو جوانوں کو انہوں نے روگی کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ مدن لعل سنگھ قوم میں زہریلا خنجر گھونپ رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کا سد باب ہو جائے مگر میرا بس نہ چلا اور میں..... واہ بیٹی واہ..... کمال کر دیا تو نے.....“

اتنے میں ایک ادیب عمر خاتون اور ایک نوجوان لڑکی اندر سے ٹرے اٹھائے آئے۔ وہ جیون سنگھ کی بیوی اور بیٹی تھیں۔ وہ کھانا لگانے کا کہہ کر چلی گئیں اور ہم لسی پینے لگے۔

پر تکلف کھانے سے فراغت کے بعد ہم ڈیرے پر چلے گئے۔ وہ ان کے گھر سے کچھ کھیت چھوڑ کر تھا۔ چار دیواری کے اندر ایک قطار میں پختہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہاں چند لڑکے تھے جن کے ہاتھ میں اسلحہ دکھائی دے رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے کونے والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم پانچوں اس کمرے میں چلے گئے۔ وہی سنگھ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر شدید غم، حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ دلچسپ آگے بڑھی اور اس کی پہلی میں ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔

”آؤ تم ایک چوہے کی مانند میرے قبضے میں گئے ہونا کی سنگھ۔“

اس کی آواز پر وہ چونک گیا۔ وہ دلچسپ کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اسے یقین نہ رہا ہو۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم وہی..... بیٹوں.....“

”ہاں.....! کہا تھا، میں تم تک پہنچوں گی..... مدن لعل تو کیا..... اس کی کیمیکل فیکٹری بھی اڑ گئی۔ اب تو بے روزگار ہو گیا ہے۔ سوچا تجھے کسی کام پر لگا دوں.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے وہی سنگھ کی پگڑی اتاری اور اس کے بال پکڑ لیے۔ ”تو سنگھ قوم کے ماتھے پر کلنگ ہے غے غیرت..... تو وہ نا سور ہے جو کچھ قوم کے بدن میں زہر گھول رہا ہے۔“

”مجھے معاف کر دو..... آئندہ کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”جیل معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن تمہیں سچ بولنا ہوگا..... بولے گا؟“ دلچسپ نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

”پوچھو!“ اس نے ہولے سے کہا تو دلچسپ نے پوچھا۔

”تیرا یہاں کانیٹ ورک توجہ ہو گیا ہے۔ بھارت سے باہر کہاں کہاں ہے۔ بول.....“

”میں صرف پاکستان میں نیٹ ورک کو دیکھتا ہوں۔“

”کیسے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”یہاں سے کافی مال جاتا ہے اور ادھر سے بھی آتا ہے۔ اسی تجارت میں جو مال آتا جاتا ہے اسی میں سب ہو رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کون ہے وہاں پر؟“ دلچسپ نے پوچھا۔

”مقصود راجہ..... میری طرف سے اس سے ڈیل ہے۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ جیون سنگھ نے گرج دواڑ آواز میں کہا۔

”بکواس کرتا ہے غلط بات کر رہا ہے اسے لٹکاؤ الٹا۔ بے غیرت غلط ٹریک پر ڈال رہا ہے۔“

اس پر وہی سنگھ نے چونک کر جیون سنگھ کی طرف دیکھا، پھر جیسے پچھاننے کی کوشش کرنے لگا۔

”دیکھو کوئی تم وعدے کے مطابق غلط بیانی کر چکے ہو، اب تمہارے لیے معافی نہیں ہے۔“ دلچسپ نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”میں نے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو کون سا مجھے چھوڑنے والے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ مجھے مار دو گے۔ پھر کیوں سب کچھ بتاؤں۔ مار دو مجھے۔“ اس نے کہا تو میرا ایک بار دماغ پھر گیا، مگر میں نے خود پر قابو رکھا اور بڑے تحمل سے کہا۔

”آپ سب دوسرے کمرے میں بیٹھیں، میں دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں بکتا اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ تشدد کہتے کسے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔ جیسے ہی وہ آزاد ہوا تو میں نے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہارے دل میں حسرت نہ رہے وہی کہ تمہیں بے بس کر کے مارا گیا۔ اگر تم مجھے بے بس کر دو تو یہ ضمانت ہے کہ تم آزاد کر دیئے جاؤ گے..... ورنہ..... پھر مجھے تشدد کرنے کا پورا حق ہوگا.....“ یہ کہہ کر میں نے بائیں پھیلا دیں اور اسے وار کرنے کی دعوت دی۔ وہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر بولا۔

”نہیں، میں وار نہیں کروں گا، مجھے نہیں لڑنا۔“

”پر میں نے تو لڑنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ میں نے ٹانگ اوپر لے جا کر ایڑی اس کے سینے پر ماری وہ اونچ کی آواز ہکے ساتھ دھرا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور اس کی گردن پر مارے وہ زمین پر چت ہو گیا۔ اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ میں نے ٹھوکر اس کے سر پر ماری تو وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش میں لایا گیا تو وہ میری طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ تب میں بولا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے تجھے ایسے ہی موت مل جائے گی، جب تک تو نہیں بولے گا..... تب تک یوں.....“

”یہ دیکھیں پروفیسر صاحب.....“ باہر سے ایک سنگھ نوجوان اندر آتے ہوئے بولا اس کے ہاتھ میں وہی چھوٹا سا بیگ تھا جو میں نے اس کی کار سے نکالا تھا۔ ”یہ کاغذ کو تجارت سے ہی متعلق ہیں، لیکن اس سے پتہ چل گیا ہے کہ ادھر کس سے لین دین ہے۔“

پروفیسر نے وہ کاغذ پکڑے پھر گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لیا، کچھ دیر بعد وہ بولا۔

”یہ ٹھیک ہیں۔ یہ شیخ انور میں نے پہلے بھی مشکوک بندوں میں سنا ہوا ہے یہ دیکھو یہ ایڈریس ہے ذہن نشین کر لو۔“

میں نے وہ کاغذات پڑھے وہ ایڈریس گلبرگ تھری ہی کا تھا۔ میں نے سب دیکھے اور پھر انہیں واپس کر دیا تو پروفیسر نے کہا۔

”اس بے غیرت نے کانچ میں میرے ساتھ بہت بدتمیزی کی تھی میں نے اسے ایسی غلط حرکتوں سے روکا تھا۔“
 ”پروفسر! اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے کام کا نہیں ماریں اسے، لیکن یہ پہل.....“ میں نے انہیں
 پہل دیتے ہوئے کہا۔

”انہیں پتہ ہے! یہ میرے شیر جوان اسے اور گاڑی دونوں کو جلا دیں گے۔ سب ثبوت ختم، آؤ اب آرام کرو۔“
 ”پروفیسر نے کہا تو وہی سگھ جیج پڑا۔“

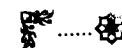
”رب کے حلیے معاف کر دیں، میں کچھ نہیں کروں گا.....“
 ”تو نے کچھ نہیں بولا اب کوئی معافی نہیں۔“ دلچیت نے کہا تو وہ روتے ہوئے بولا۔
 ”میں ہر بات بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے ان شیر جوانوں کو بتا دینا۔“ یہ کہہ کر پروفیسر کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا اور ہم بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔
 اس وقت پوہ پھٹ رہی تھی جب گھر کے سامنے ایک وین آرکی۔ ہم سب صحن ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساری رات
 باتیں چلتی رہی تھیں۔ دلچیت کو امرتسر پہنچنا تھا، گیارہ بجے کے قریب اس کی فلائٹ تھی۔ پروفیسر صاحب نے خود اسے
 ایئر پورٹ پہنچانے کا ذمہ لیا۔ رات کے آخری پہر اس نے سب کو نہانے اور تیار ہو جانے کے لیے کہا۔ وہیں مجھے اور
 جیپال کو سفید کرتا پا جامہ اور بستنی پکڑی دی گئی۔ دلچیت اور ہرپریت کو مونیا رنگ کا شلوار قمیص دیا گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹی
 بھی تیار ہو گئے اور یہ قافلہ امرتسر چل پڑا۔ وہاں سے لے کر امرتسر شہر پہنچ جانے تک پتہ چلا کہ ہائی الرٹ ہے۔ کئی ناکے عبور
 کئے ہر جگہ پروفیسر جیون سگھ شہوار نے ہی بات کی کہ وہ ہر مندر جارہے ہیں اپنی فیملی کے ساتھ اور ہم سیدھے ہر مندر صاحب
 ہی پہنچے۔

میں اس وسیع و عریض عمارت کو دیکھ رہا تھا، نجانے کیوں میرے ذہن میں حضرت میاں میر بالا میر کا نام گھوم گیا۔ جنہوں
 نے ہر مندر صاحب کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ انہوں نے اینٹ کو الٹا کر رکھ دیا۔ مگر وہاں کے ایک سیانے نے اس اینٹ کو اکھاڑ کر
 سیدھی کر دی۔ گرو نے بہت برا مانا یا کہ اگر حضرت میاں میر نے الٹی رکھ دی تھی تو کیا ہوا، اب ہر مندر صاحب میں اکھاڑ پھچاڑ
 ہوتی رہے گی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہوتا آ رہا ہے۔ میں پرکرم پر کھڑا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر میں شہد بیان ہو رہے تھے۔ کیرتن کی
 صدا گونج رہی تھی۔ وہ سب اپنے دھرم کے مطابق رسومات ادا کر رہے تھے جبکہ مجھے مجبوری میں یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔
 اس وقت ہم درشنی ڈیوڑھی سے لنگر خانے کی طرف جارہے تھے جب دلچیت کو رکے پاس ایک نوجوان آیا۔ وہ خوشگوار
 انداز میں اس سے ملاؤہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ باہر چلا گیا۔ دلچیت بڑے آرام سے ہمارے درمیان آ گئی پھر
 اپنا سیل فون مجھے دیتے ہوئے بولی۔

”جمال! یہ لو! میں اس پر تم سے رابطہ کروں گی اگر میں کینیڈا پہنچ گئی تو..... باہر وہ لوگ مجھے لینے کے لیے آ گئے ہیں جن
 کے پاس میرے سارے سفری کاغذات ہیں۔ وہ مجھے ایئر پورٹ پہنچا دیں گے۔ میں چپکے سے جدا ہو رہی ہوں تاکہ شک نہ
 پڑے یہاں بہت سارے خفیہ والے ہوتے ہیں۔ بعد میں سب کو بتا دینا۔“

”اوکے! اوش یو گڈ لک۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا اس کا چہرہ
 ہری نگاہوں میں محفوظ ہو گیا۔ میں آگے بڑھ گیا اور وہ وہیں سے پلٹ گئی۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔ نجانے کیوں میرے دل
 میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ اس کی جدائی کو میں نے محسوس کیا تھا، پھر میں نے سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا کہ سب کو لنگر خانے میں
 بتاؤں گا کہ دلچیت چلی گئی ہے۔



میری آنکھ فون کی تیز آواز سے کھلی۔ ایک لمحہ تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ فون کس کانج رہا ہے، پھر مجھے یاد آیا کہ دلچیت
 نے مجھے فون دیا تھا۔ میں نے فون پک کیا تو دوسری جانب دلچیت تھی۔ اس نے کینیڈا میں پہنچ جانے کا بتایا۔
 ”چلو شکر ہے رب کا تم خیریت سے وہاں پہنچ گئی ہو۔“

”کچ پوچھو نا جمال! جب سے میں بھارت گئی تھی اب جا کر مجھے تمہنی ملی تھی، ورنہ اجنبیوں کے درمیان ہی وقت گزرتا
 گیا تھا۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

”چل کوئی بات نہیں۔ اب تو سکون سے رہ، آرام کر۔“ میں نے کہا۔

”کیا کر رہے ہو تم لوگ.....؟“ اس نے پھر اسی اداس لہجے میں پوچھا۔

”کرتا کیا ہے سور ہے ہیں اور میرے خیال میں صبح ہونے والی ہے۔“ میں نے آسمان پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہاں پر ہو؟ سب نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟“ وہ بچوں کی طرح بولی تب میں نے اس کی دلجوئی کے لیے
 کہا۔

”لنگر خانے میں جا کر میں نے انہیں بتا دیا تھا۔ سبھی ایک دم سے اداس ہو گئے تھے۔ واپس آ کر رات گئے تک تمہیں یاد
 کرتے رہے ہیں، جیپال اور ہرپریت یہاں شہوار صاحب کے مکان کی چھت پر سوئے ہیں۔ سونے تک تیری ہی باتیں
 کرتے رہے۔“

”اوہ.....! وہ جیسے سسک پڑی، پھر چند لمحوں بعد بولی۔“ اور تم جمال.....!“

”اب تم چلی گئی ہو نا تو احساس ہو رہا ہے تمہاری آفرمان لینا تو اچھا تھا۔“ میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر چند
 لمحوں بعد وہ ادائی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں نے فون سرہانے رکھا اور سوچنے لگا۔ اس نے وہی سگھ کے بارے میں نہیں
 پوچھا تھا کہ اس کا کیا بنا۔ مجھے اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان پانچ دنوں میں وہ میرے ذہنی طور پر کتنا قریب آ چکی تھی۔ کچھ
 دیر میں اُسے یاد کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر چھت کی منڈیر پر آ گیا۔ نیلگوں روشنی پھیلنے لگی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے مجھے اپنا
 گاؤں نورنگر یاد آ گیا۔ میں وہاں ہمیشہ جلدی اٹھنے کا عادی تھا۔ ایسی روشنی میں اماں جائے نماز پر بیٹھی ہوتی تھی اور میں
 ابرے کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ پنجاب چاہے مشرقی ہو یا مغربی، یہ تو سیاسی لکیر ہے، لیکن پنجاب کی اپنی ایک مہک ہے
 خاص مٹی کی خاص سوندھی سوندھی مہک، میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، پھر پلٹ کر چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ بھی جیپال بولا۔

”دلچیت اتنی ہی یاد آ رہی ہے جمال؟“

”اوئے نہیں اوئے، نورنگر یاد آ رہا ہے۔“

”سیدھا کیوں نہیں کہتے اماں یاد آ رہی ہے۔“

”ہاں وہ بھی۔“ میں نے ہولے سے کہا تو ہرپریت بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔

”ویسے شہوار صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم چند دن ان کے پاس یہاں رہیں لیکن لگتا ہے ہمیں آج ہی ادگی جانا پڑے گا۔
 جمال اداس جو ہو گیا ہے۔“

”نہیں ہرپریت! میں اداس نہیں ہوا اور پھر ہمیں آج ہی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ جیپال جتنے دن باہر رہے گا، اس پر شک
 نہ ہوگا۔“ میں نے کہا تو جیپال تیزی سے بولا۔

”اویار میری جاسید اوکے کاغذات ایک دو دن میں ملنے والے ہیں اور میرا جالندھر میں رہنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں
 آج ہی نکلنا ہوگا۔“

”اب ہم پراؤ تو استعمال نہیں کر سکتے۔ کل دیکھا تھا اخبار میں عام سواری ہی سے جانا پڑے گا۔“ وہ بولی۔

”تو کوئی بات نہیں یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ کی سنگھ کوٹھکانے نہیں لگا پڑا۔ یہاں سے مدد مل گئی۔“ جہاں نے کہا تو میں نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔

”چلو ٹھیک ہے ناشتے کے بعد ٹھوڑا صاحب سے اجازت لے لیں گے۔“

اس وقت ہم فریش ہو کر نیچے کچن میں آ گئے تھے۔ ٹھوڑا صاحب گھر پر نہیں تھے۔ ہم اس وقت سی پی چکے تھے، جوان کی بیٹی نے ہمیں لا کر دی اور ہمارے ساتھ ہی بیٹھ کر پی تھی۔ تبھی میں نے اس سے پوچھا۔

”یہاں میٹ کی سہولت ہے نا.....“

”بالکل ہے..... چاہیے آپ کو.....“ وہ خوشگوار انداز میں بولی۔

”اگر مل جائے تو.....“ میں نے کہا تو اٹھ کر اندر چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ لیپ ٹاپ اٹھا لائی۔ ہر پریت اور وہ باتیں کرنے لگیں۔ جہاں میرے قریب کھسک آیا۔ میں نے اپنا کاؤنٹ کھولا۔ روی سے ایک سی میل تھی۔ انہیں دلچسپ کے واپس جانے اور اسکا سیل فون میرے پاس ہونے کی اطلاع تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ میں نے وہ تمام تفصیلات پڑھیں۔ بالکل آخر میں مجھے امرتسر جانے کو کہا گیا تھا، جہاں پہنچ کر میں نے ہرمندر صاحب ہی میں رہنا تھا۔ وہاں مجھے کال کی جانی تھی اور اس بندے کے ساتھ میں نے چلے جانا تھا، یہ سب کچھ پڑھ کر جہاں ایک دم سے اداس ہو گیا۔

”تو اس کا مطلب ہے تو میرے ساتھ اوگی پنڈ نہیں جاسکے گا۔“

”اب تیرے سامنے بے دکھو..... خیر تم جالندھر نکلو پھر دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پھر میل کا جواب دے کر لیپ ٹاپ واپس دے دیا۔ میں نے وہی سنگھ سے لی معلومات کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا تھا۔

ٹھوڑا صاحب سے بڑی مشکل سے اجازت لی۔ وہاں سے نکلتے نکلتے ہمیں دوپہر ہو گئی۔ ان کے گاؤں ہی سے ہمیں دو کاریں ڈرائیور سمیت مل گئیں۔ مین سڑک پر جا کر ہم مخالف سمتوں کی طرف چل دیے۔ جہاں کے ساتھ ہر پریت خاصی اداس دکھائی دے رہی تھی۔ جبکہ میں اس حصار میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ بھارت میں آنے کے بعد میں پہلی بار اکیلا نکل رہا تھا۔ میرے پاس اپنی شناخت کی کوئی دستاویز نہیں تھی۔ اگرچہ مجھے بتایا گیا تھا کہ ساری دستاویز تیار ہیں لیکن اس وقت میرے پاس نہیں تھیں۔ میں ڈرائیور کے ساتھ کپ شپ لگا تا رہا۔ پھر جلد ہی میں پچھلی نشست پر میں نے آنکھیں بند کیں اور سوچنے لگا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

میں اس وقت ہرمندر صاحب میں موجود تھا۔ سفید کرتا اور پاجامہ پہنے سر پر بسنتی رنگ کی پگڑی سے میں اس وقت سکھ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ بس میرے ”کیس“ نہیں تھے۔ جبکہ داڑھی خاصی بڑھی ہوئی تھی۔ صرف امرت دھاری سکھ اپنے کیس رکھتے ہیں۔ باقی اپنے بال کنوا لیتے ہیں۔ میں پرشکون سا ”پھر کرما“ کے ساتھ دلان میں بیٹھا ہوا تھا۔ آسان پر ہلکے ہلکے سفید بادل تھے۔ مجھے شدت سے کال کا انتظار تھا۔ اگر کال نہ آئی تو پھر میرے لیے رات گزارنے کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ہوٹل میں کوئی نہ کوئی دستاویز چاہیے تھی، جبکہ امرتسر میں میرا جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا، اک آسرا تھا کہ جہاں اور ہر پریت کے علاوہ ٹھوڑا صاحب کا نمبر میرے پاس فون میں محفوظ تھا۔ ایسی کسی افتاد کے لیے میں ان سے مدد لے سکتا تھا۔ کیونکہ ایسی ہی کسی صورت حال کے لیے جہاں نے کہا تھا کہ میں اسے کال ضرور کروں۔ اس وقت شام کے سائے لہرانے لگے اور ہرمندر صاحب کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں جب سیل فون پر کال آئی۔ وہ شخص ہرمندر صاحب ہی میں موجود تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا اور فون بند کر دیا۔ میں اٹھا اور اس طرف چل دیا جہاں اس نے بتایا تھا۔ وہ ایک موٹا سا سکھ تھا، ادھیڑ عمر، خشکی داڑھی، بڑھا ہوا پیٹ، چیک دار شرٹ اور سیاہ چٹون، گہرے نیلے رنگ کی پگڑی تھی۔ اس نے

یہی نشانی بتائی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر سیل فون نکالا اور اسے کال کر دی۔ اس نے اپنے فون کو دیکھا اور پھر مجھے پھر فوراً ہی آگے بڑھ کر بولا۔

”جی میں ہی ہوں سردار دلچسپ سنگھ.....“ اس نے اپنا نام بلاشبہ غلط بتایا تھا تاہم دلچسپ کا حوالہ ضرور دے دیا تھا۔ میں نے اس کے لئے ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی تو اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی۔ ”ست سری اکال جی آپ کو آؤ چلیں۔“

ہم دونوں ہرمندر صاحب سے نکلتے چلے گئے۔ شمالی سڑک پر آ کر اس نے ایک سائیکل رکشہ والے کو روکا اور ہم اس میں بیٹھ گئے۔ وہ کافی زیادہ بولتا تھا۔ یونہی بازاروں اور وہاں پر موجود دکانوں کے بارے میں مجھے بتانے لگا۔ تقریباً آٹھ دس منٹ رکشہ چلا تھا کہ وہ اسے روک کر نیچے اتر گیا۔ میں بھی اتر آیا وہ قریب کی ایک پارکنگ میں بڑھا اور سیاہ رنگ کی ہنڈائی نکال لایا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تو وہ بڑھتا چلا گیا۔ تبھی وہ پھر شروع ہو گیا۔

”ہم پارکنگ تک پیدل بھی آ سکتے تھے لیکن ہرمندر صاحب میں خفیہ والے بہت ہوتے ہیں۔ آپ وہاں کافی دیر سے تھے میں نے سوچا ممکن ہے آپ کسی کی نگاہوں میں آ گئے ہوں۔ کیونکہ آپ نے کڑا تو پہنا ہوا ہے لیکن کرپان نہیں ہے۔ میں یہ شے دیکھ سکتا ہوں تو خفیہ والے کیوں نہیں، بس اسی لیے احتیاط کی تھی۔“

”اچھا کیا آپ نے احتیاط کی۔“ میں نے کہا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ خاصا رش تھا، اور ایسے رش میں اگر کوئی تعاقب بھی کر رہا ہو تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ سردار دلچسپ سنگھ اب مجھے گھما پھرا کر ہی منزل تک لے جائے گا۔ وہ یونہی امرتسر کی باتیں کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کا موضوع یہی تھا کہ کس جگہ سے کھانے پینے والی کون سی چیز اچھی ملتی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہم یونہی سڑکوں پر پھرتے رہے۔ میں اس دوران دیکھتا رہا کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ جب یہ احساس ہو گیا کہ کوئی نہیں ہے تو وہ ایک پوش علاقے کی طرف لے گیا۔ وہ نیمواڈل ٹاؤن کی آبادی تھی۔ جس کے ایک خوبصورت سے گھر میں وہ مجھے لے گیا۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک لمبا تڑکا بوڑھا سکھ آ گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی چونک گیا۔ یہ وہی گیمانی تھا جس نے ایک دن دلچسپ کور کے گھر میں بھاشن دیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بڑی گرم جوشی سے مجھے ملا اور پھر ”سردار دلچسپ کور“ کی طرف دیکھ کر بولا۔

”آپ اپ جائیں۔“

”جی!“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے مڑا اور چلتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ ”میرا نام کرم جیعت سنگھ ہے۔ تم مجھے صرف گیمانی بھی کہہ سکتے ہو۔ سوری، تمہیں ہرمندر صاحب میں کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر تیرے پیچھے کوئی خفیہ والا لگا ہوتا تو معلوم ہو جاتا۔“

”یہاں آ کر خفیہ والوں کا بہت ذکر سنا ہے اس کی وجہ.....؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”پاکستان کی سرحد ساتھ ہے نا، اور پھر سکھوں کی مرکزی عبادت گاہ بھی یہی ہے اور سکھوں کی مختلف تحریکیں سرگرم ہیں۔ اس لیے یہاں پر کون کس بھی میں ہے، پچھانا جانا بہت مشکل ہوتا ہے جیسے تم ایک مسلمان ہو اور سکھ کے بہروپ میں آدھے سے زیادہ دن وہاں رہے ہو۔ بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے۔“ گیمانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پرسکون انداز میں کہا۔

”ہاں یہ تو ہونا چاہیے۔“ میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے پرسکون رہا، پھر بولا۔

”دلچسپ کور تو گئی، جس کی مدد کے لیے تمہیں بلایا گیا تھا۔ اب یہاں رہ کر تم نے جہاں کی مدد کرنی ہے اس سے پہلے کہ جہاں رویندر سنگھ کو مارے اسے تم نے مارنا ہے۔“

”وہ تو میں کر لوں گا، لیکن جہاں کی حسرت تو.....“

”نہیں، بعض اوقات جذباتی فیصلوں سے بچا جاتا ہے۔“

”اس کا یہاں آنے کا سارا مقصد ختم ہو کر رہ جائے گا اگر اس نے رویندر سنگھ کو اپنے ہاتھوں سے نہ مارا تو.....“ میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو وہ اسی محل سے بولا۔

”دیکھو، خفیہ اور خصوصاً ”را“ کی اس پر گہری نگاہ ہے، انہیں اس کی تین ماہ کی غیر موجودگی ہضم نہیں ہو پارہی ہے۔ وہ رویندر سنگھ سے ہر طرح کی تصدیق کر چکے ہیں کہ جہاں کو اغوا کیا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ جہاں کے اس بیان کو سچ تسلیم کر لیتے لیکن چند گزہ میں جوسی کی کمروں کی فوج ہے اس میں یہ نمایاں ہے، صرف ایک الجھن کی وجہ سے یہ بچ رہا ہے۔ اس ساری ویڈیو میں کہیں بھی اس کا پورا چہرہ نہیں آیا۔ اس لیے شک کی گنجائش رہ گئی ہے۔ ورنہ وہ اب تک گرفتار ہو چکا ہوتا۔“

”پھر اس کے یہاں رہنے کا فائدہ تو کوئی نہیں ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، شاید تم نہیں جانتے، اس کا دیر ختم ہونے والا ہے۔ ایک دو دن میں اسے اپنی جائیداد کی ملکیت والے کاغذات مل جائیں گے۔ اسے واپس کینیڈا جانا پڑے گا۔ پھر وہ دوبارہ آجائے گا تو شہریت کے بارے میں درخواست دے سکے گا۔ یہ کچھ قانونی معاملات ہیں۔ یہاں کے نہیں، کینیڈا کے، خیر! یہاں تک اس کے یہاں رہنے کا فائدہ ہے، میں اسے یہاں سیاست میں لانا چاہتا ہوں۔ ہمیں ایسے بندے چاہیے جو پارلیمنٹ میں آواز اٹھا سکیں، بہر حال یہ ایک لمبا پلان ہے۔“

”گیانی جی، میں آپ سے ابھی کہہ دوں۔ جہاں سیاست نہیں کر سکتا۔“ میں نے حتمی انداز میں کہا۔

”میں تمہارے یقین کو قطعاً نہیں جھٹلاؤں گا لیکن یہ اوگی پنڈے کے علاقے سے ہماری قوت تو بنے گا۔“ اس نے بڑے محل سے کہا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ چاہیں۔ میرے لیے حکم؟“ میں نے بات کو ایک دم سمیٹتے ہوئے کہا۔

”فی الحال تو تم آرام کرو، اور یہ سکھ والا بہروپ ابھی ختم نہ کرو۔ اس حیثیت سے تمہاری ایک شناخت ہے، تمہاری دستاویزات بن جائیں گیں، سکھ ہونے کے ناطے تجھے کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ رویندر سنگھ والا معاملہ کیسے حل کرتا ہے یہ بعد میں سوچ لیں گے۔ کل ہوتی ہے پھر ناشتے کے بعد ملاقات۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔“

”اس گھر میں صرف تین لوگ ہیں، اور وہ ملازم ہیں۔ یہ گھر میری ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ لیکن تم اسے اپنا گھر ہی سمجھنا۔ کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں ایکٹا کالونی میں رہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اٹھ گیا۔ جی جی تینوں ملازم وہاں آگئے، ان میں ایک ادھیڑ عمر سکھ خاتون، ایک نوجوان اور دوسرا بوڑھا سکھ تھا، وہ مجھے ایک ہی خاندان سے لگتے تھے۔ نوجوان نے مجھے بیڈروم تک پہنچایا اور الماری میں پڑے ملبوسات دکھائے۔ میں پرسکون ہو گیا۔ اور بیڈ پر لیٹ گیا۔



رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا، جہاں اور ہر پریت کوٹھی کی چھت پر کافی دیر سے خاموش کھڑے اندھیرے کو گھور رہے تھے۔ کافی دور اوگی پنڈے کی روشنیاں ٹٹھار رہی تھیں۔ وہ کب کی چائے پی چکے تھے اور ان کے ہاتھ میں خالی مگ تھے۔ تبھی ہر پریت نے اس خاموشی کو توڑا۔

”جہاں۔۔۔۔۔ تم اچانک ایک دن چپکے سے چلے جاؤ گے نا؟“

”یاز بندے کو اس دنیا سے جانا تو ہے چاہے چپکے سے چلے جائے یا پھر شور مچا کر.....“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”میں وہ بات نہیں کر رہی جہاں تمہارے کینیڈا جانے کی بات کر رہی ہوں۔ دو بار تم ویزے کی معیاد بڑھا چکے ہو، لیکن ابھی تک تمہیں کاغذات نہیں ملے، یہاں کی ملکیت کے.....“ اس نے بھی ہولے سے کہا۔

”مل جائیں گے یا، لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میرا ذہن جہاں کی طرف لگا ہوا ہے۔ وہ امرتسر جیسے شہر میں ہے اور اکیلا ہے، کوئی ٹھکانہ ملا بھی ہوگا یا نہیں۔“ وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا تھا اونگ دیوار پر رکھ دیا۔

”تو اس سے رابطہ کر لو، پوچھ لو اس سے۔“ ہر پریت نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ حیرت سے بولا۔

”منع کیا گیا ہے، اس کے پاس دلچسپیت کا فون ہے، نجانے کب کیا ہو جائے، اس لیے تو میں پریشان ہوں۔“

”جہاں۔! میں ایک بات کہوں۔“ اس نے اپنا مگ دیوار پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بولو۔!“ اس نے جواب دیا۔

”جمال اپنا خیال رکھ سکتا ہے، میں نے اس جیسے مضبوط اعصاب کے بہت کم لوگ دیکھے ہیں۔ یا پھر وہ بے حس ہے۔ اسے آنے والے خطروں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ تم اس کی فکر نہ کرو، اتنا عرضہ اس کے ساتھ رہنے کے باوجود تم اس کے بارے میں نہیں جان سکتے اور میں نے اسے کچھ دیر میں پرکھ لیا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑے محل سے بولی۔

”وہ مضبوط اعصاب کا ہے یا نہیں مگر دوستوں کے لیے مخلص اور دشمنوں کے لیے غضب ہے۔ میں تو پہچان جانتا ہوں۔“ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو ہر پریت نے واضح طور پر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”ایک بات ٹوٹ کی ہے تم نے۔“

”کون سی.....“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”جب سے رویندر سنگھ بارہوا ہے، کیا کوئی آفیسر نہیں آیا۔ یہیں کا ایک جو نیز بندہ ہی انچارج ہے۔ اور اس نے ایک فون تک نہیں کیا۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”لیکن یہاں خفیہ والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ انہیں ہماری ایک ایک حرکت کے بارے میں معلوم ہے۔ اگر جمال ہمارے ساتھ یہاں آجاتا تو اس کے بارے میں خواہ مخواہ تفتیش شروع ہو جانا تھی۔ اچھا ہوا وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ یہ بات مجھے یہاں آتے ہی انوجیت نے بتائی ہے۔“

”یہ تو رب کی مہر ہے نا، ہم پر..... چلو اچھا ہے۔“ ہر پریت نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”یہی تو مجھے دکھ ہے کہ اب میں رویندر سنگھ کو نہیں مار سکوں گا۔ ایک تو اس کی سیکورٹی بہت سخت کر دی گئی ہے، دوسرا میری ہر حرکت پر نظر ہے اور میرے جانے کے دن بھی بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔“ وہ حسرت سے بولا تو ہر پریت نے اس کے سینے سے لگ کر ذرا سا بھینچ لیا۔ جہاں کی گرم سانس اسے اپنے کانڈھے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنی ناک اس کی ناک کے ساتھ رگڑتے ہوئے افسردہ سے انداز میں کہا۔

”بس یہی بات مجھے دکھ دے جاتی ہے کہ تم جا رہے ہو۔“

”دکھی نہیں ہونا پریتو، میں جانے کے فوراً بعد یہاں آ جاؤں گا اور پھر آتے ہی تیرے ساتھ شادی کرنی ہے۔ میں نے یہاں کی شہریت لینی ہے۔ میری غیر حاضری میں تم نے یہاں بہت سارے کام کرنے ہیں۔ ایک بہترین اسکول بنانا ہے اور ایک جدید ہسپتال، بعد میں فیکٹریز، تمہارا یہ کام مکمل نہیں ہوگا، تب تک میں آ جاؤں گا..... ہمارا رابطہ تو رہے گا نا.....“ جہاں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ان کے درمیان ہو سکتا تھا مزید باتیں چلتیں۔ تبھی جہاں کی کال فون بج اٹھا۔ انوجیت کی کال تھی۔ اس نے کال پک کی۔

”مجھ نہیں آ رہی ہے جہاں کہ میں اس خبر پر خوشی کا اظہار کروں کہ تشویش.....“ انوجیت نے عجیب سے لہجے میں

کہا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا اور ہر بریت کو خود سے آہستگی سے الگ کر دیا۔

”بلجیت سنگھ مر گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے.....“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

”اوہ..... کیسے..... کیا ہوا تھا؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو گیا تھا وہ پہلے ہی۔ بہت زیادہ پینے کی وجہ سے اس کا جگر خون بنانا چھوڑ گیا تھا۔ تین دن پہلے ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا۔ وہ امرتسر والے گھر میں ہی تھا جہاں اس کا بیٹا ہر دھپ سنگھ رہتا تھا۔“

”اوہ! چلو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ یہ جاننا ہوگا کہ بلجیت سنگھ کی آخری رسومات کہاں ادا ہوں گی یہاں ادگی میں یا وہاں امرتسر میں۔“

”اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا رہا۔ بہر حال تم محتاط رہنا یہاں سے اس کے وفادار کوئی غلط سلط حرکت نہ کریں۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں! میں محتاط رہوں گا۔ تم اس وقت ہو کہاں؟“ جہاں نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

”میں ادگی پنڈ میں ہی ہوں۔ میں کچھ دیر میں آ جاؤں گا۔“ اس نے کہا تو جہاں نے فون بند کر دیا۔ پھر ہر بریت کو تفصیل بتا کر بولا۔ ”یہ بڑا شاندار موقع ہے رویندر سنگھ کو ختم کرنے کا۔“

”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے کہہ رہے تھے کہ اس کی سکیورٹی بہت ہے؟“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ایسے وقت میں ہی وہ محتاط نہیں ہوگا۔ اگر ذرا سا پلان کر لیا جائے تو اس کا معاملہ بھی گول کیا جاسکتا ہے۔“ وہ بڑی حسرت سے بولا تو ان میں خاموشی آن ٹھہری۔ تبھی ہر بریت نے اسے دوبارہ اپنے بازوؤں میں لے لیا اور پرسکون لہجے میں بولی۔

”ابھی رسک نہیں لینا بہت مواقع آئیں گے فکر نہ کرو..... اب چلو اور جا کر سو جاؤ صبح جلدھر جاتا ہے۔“

”ہاں ایسے ہی.....“ جہاں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے لے کر بیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ انہیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ چائے کنگ چار دیواری پر پڑے رہ گئے ہیں۔



میری آنکھ صبح تڑکے ہی کھل گئی۔ اب سوائے نہانے دھونے کے میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ میں خوب نہایا اور فریش ہو کر وارڈ روم سے اپنے لیے کپڑوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں مختلف سائز کے کپڑے تھے۔ مجھے ڈریس چٹون اور چیک دار شرٹ مل گئی۔ میں نے وہ پہنی اور نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر خاتون جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ناشتے کے لیے پوچھا میرے اقرار میں سر ہلانے پر وہ اندر کی جانب چلی گئی۔

اس وقت میں ناشتے سے فراغت کے بعد چائے پی رہا تھا جب گیانی کرم جیت سنگھ جی آ گئے۔ وہ بڑے تپاک سے مجھے یوں ملے جیسے پہلی بار مل رہے ہوں پھر وہیں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”وہ بلجیت سنگھ مر گیا ہے جسے جہاں نے توڑا پھوڑا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ اسی حوالے سے تفصیل بتانے لگے۔ پھر بولے۔ ”میرا تو خیال تھا کہ انہی دنوں میں معاملہ صاف ہو جاتا مگر لگتا ہے ابھی اس کی زندگی ہے۔“

”ہاں، آخری رسومات کی ادائیگی میں اس کے ارد گرد بہت بھیڑ ہوگی۔“

”یہ بھی کنفرم نہیں ہے نا کہ وہ آخری رسومات کہاں ادا کرتا ہے ادگی میں یا یہیں امرتسر میں اس لیے کوئی پلان نہیں ابھی۔“

ابھی۔

”تو اس کا مطلب ہے کوئی کام نہیں ہے یہاں پر.....“ میں نے پوچھا۔

”بظاہر تو کوئی کام نہیں ہے۔ بس یہی ہے کہ تم امرتسر کی سیر کر لو یا پھر یہاں آرام کرو۔“ گیانی نے کہا اور میرے چہرے پر دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا اور نگ میں بچی چائے ایک ہی سانس میں ختم کر کنگ سامنے پڑے ہوئے میز پر رکھ دیا۔ تب گیانی جی نے پوچھا۔

”تمہاری جو دستاویزات ہیں، جو بن گئی ہیں، ان دستاویزات کے مطابق تمہارا نام دلجیت سنگھ ہے۔ یہ تم ذہن نشین کر لو؟“

”جی بالکل.....! دلجیت سنگھ ولد بہرام سنگھ، قوم رندھاوا جٹ.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ تبھی وہ خوش ہوتے ہوئے بولا

”اگر آرام کرنا ہے تو گھر میں رہو، باہر سے جانا ہے تو بتا دو، ماحول ٹھیک ہے۔“

اس کے کہنے پر میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”گیانی جی! یہاں امرتسر میں میرے لیے ایک ہی چیز ہے دیکھنے کی، اور وہ ہے جلیانوالہ باغ، اگر کہیں تو وہ میں دیکھ آؤں۔“

”کیسے جاؤ گے بھلا؟“ انہوں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

”یہی ٹیکسی رکشہ پکڑ کر نکل جاتا ہوں ددپہر کے بعد تک لوٹ آؤں گا۔“ میں نے عام سے انداز میں کہا۔

”نہیں! تم کچھ دیر انتظار کرو میں نے اس کا انتظام کیا ہے۔ وہ آ جاتی ہے یہاں پر وہ تجھے دکھالائے گی تب تک تم انٹرنیٹ استعمال کرو میں یہ باتیں تم سے فون پر بھی کر سکتا تھا، لیکن تم سے وعدہ کیا تھا اور میں نے ادھر سے گزر کر جانا بھی تھا، خیر! اب میں چلتا ہوں رب را کھا۔“ یہ کہہ کر گیانی اٹھ گیا۔ میں بھی اٹھا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا باہر پورچ تک آ گیا۔

وہ چلا گیا تو میں نے باہر پھیلی ہوئی چمکیلی دھوپ کو دیکھا، صاف آسمان رنگین گہرا دھیمی دھیمی چلتی ہوئی ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ شاید میں کمروں میں پڑا پڑا تھک گیا تھا اور آزاد فضاؤں میں گھومنا چاہتا تھا۔ میں وہیں کارڈور میں کرسی پر بیٹھ گیا اور گرمیوں کے بعد آنے والے سرد موسم کو محسوس کرنے لگا۔ پارش کے بعد ہوا میں نمی تھی جو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کافی وقت گزر گیا۔ یونہی اوٹ پٹانگ سوچیں سوچتا رہا۔ اسی دوران ایک سفید رنگ کی ماروتی کار گیٹ سے اندر آئی۔ پھر داروں نے اسے آنے دیا تھا تو وہ بلاشبہ گیانی ہی سے متعلق تھی۔ وہ کار دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پورچ میں آن رکی، جو مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھا اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک خاتون نکلی۔ پہلی نگاہ میں وہ ادھیڑ عمر

ہی لگتی تھی، لیکن جیسے ہی وہ میرے قریب آئی تو وہ بھرپور جوان تھی۔ شانوں تک بال جو سادے سے انداز میں باندھے ہوئے تھے آنکھوں پر عینک، ماتھا چوڑا، ٹیکھا ناک، پتلے ہونٹ، لمبی گردن، پتلی سی بھاری سینے والی، لمبے قد کی جوان اور بھرپور

لڑکی، سانولے رنگ کی شفاف چہرے والی نے گہرے نیلے رنگ کی جین اور سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس پر ہلکے سبز رنگ کے پھول تھے۔ گلے میں سکارف نما دوپٹہ پہلی نگاہ میں وہ کسی اخبار کی رپورٹ لگتی تھی یا اس کا تعلق کسی لکھنے لکھانے والے شعبے سے لگتا تھا۔ اس نے آتے ہی بڑے کھنک دار لہجے میں پوچھا۔

”آپ ہی دلجیت سنگھ ہیں نا۔“

”جی! میں ہی ہوں۔ اور آپ.....؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جی! میں ہی ہوں۔ اور آپ.....؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جی! میں ہی ہوں۔ اور آپ.....؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جی! میں ہی ہوں۔ اور آپ.....؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میں نوین کو رہوں۔ گیانی صاحب نے مجھے بھیجا ہے آپ کو امرتسر کی سرکردہ اداوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا، میں نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بالکل ٹھنڈی تھی، یا شاید کار میں اسے سی چلنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

”آئیں چائے یا جوس پی لیں، پھر چلتے ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”مجھے ضرورت نہیں ہے ویسے بھی باہر بہت کچھ کھایا پیایا جاسکتا ہے اگر آپ.....“

”اوکے.....! میں بتا دوں.....“ میں نے کہا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ تب تک ادھیڑ عصر سکھ آ گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا اور ماروتی میں جا بیٹھا۔ جس میں واقعاً اسے سی چل رہا تھا۔

”کہاں چلنا ہے.....“ گیٹ سے باہر آتے ہی اس نے پوچھا۔

”آپ کے رحم و کرم پر ہوں، جدھر لے جاؤ۔“ میں نے کہا تو اس نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ ایسے میں میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب گیانی صاحب تھے۔ انہوں نے نوین کے بارے میں بتا دیا تھا کہ کافی بھروسے مند لڑکی ہے۔ وہ مجھے مختلف راستوں سے لے جانے لگی۔ تقریباً آدھا ٹھنڈا انتہائی خاموشی سے گزر گیا۔ نہ اس نے کوئی بات کی اور نہ میں نے کچھ کہا۔ اس نے کار میں میوزک تک نہیں لگایا تھا۔ آخر تک آ کر میں نے کہا۔

”نوین کو راجی بندہ سیر کرنے کے لیے کیوں نکلتا ہے؟“

”یہی خوشگواریت کے لیے تاکہ موڈ فریش ہو جائے۔ ویسے میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ نے میری خاموشی کو محسوس کیا ہوگا۔“

”ویسے تم ہو تو عقل مند۔“ میں نے واقعاً خوشگواریت سے کہا۔

”دراصل میں آپ کا موڈ دیکھ رہی تھی آپ خاموش تھے تو میں بھی ہو گئی۔“ یہ کہہ کر اس نے پارکنگ میں گاڑی لگانے کے لیے جگہ دیکھنا شروع کر دی۔ ذرا فاصلے پر میں جلیا نوالہ باغ کا بڑا سا بورڈ دیکھ رہا تھا۔ گہرے سبز رنگ والے بورڈ پر پیتل کے حروف سے لکھا ہوا وہ چار زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ بائیں جانب اردو میں تھا، کار پارک کر کے ہم تنگ سی گلی میں آ گئے۔ جس میں بمشکل دو افراد ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔ باغ کے اندر داخل ہوئے تو خاصا کھلا تھا۔

”اصل میں یہ ساری ساڑھے چھ ایکڑ زمین ہے۔ یہ ہمت سنگھ نامی ایک شخص کی تھی جسے راجہ رنجیت سنگھ نے دان کی تھی۔ وہ فتح گڑھ صاحب کے قریب جیلانا نامی جگہ کا تھا۔ کبھی راجہ رنجیت سنگھ بھی وہاں آیا تھا، اس لیے وہ شخص مشہور ہو گیا اور یہ جگہ جلیا نوالہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔“

”تجھی اُس نے یہاں باغ لگایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ اس وقت ہم ایک روش پر آہستہ خرامی سے چلتے چلے جا رہے تھے۔

”نہیں بعد میں یہ ویسے ہی پڑی رہی، اسے شاید جالندھر کے علاقے میں جگہ مل گئی تھی، تب یہ جگہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے کام آتی رہی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”مطلب یہ شروع سے باغ نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔! یہ بعد میں کہیں جا کر بنی تھی۔ اس کا مالک تو 1829ء میں ہی سورگ باش ہو گیا تھا۔ پھر کسی نے پوچھا تک نہیں اس زمین کو، جب 13 اپریل کو..... یہاں سانحہ پیش آیا تھا، تب کبھی کا لگایا ہوا باغ بھی اجڑ چکا تھا، اس وقت یہ ہری بھری زمین نہیں تھی۔“

”یہاں نہتے لوگوں کو مارا گیا۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”ہاں۔! انگریزوں نے تو 378 بتایا تھا لیکن اس وقت کے سول سرجن ڈاکٹر سمجھ نے ایک ہزار پانچ سو چھیسی کی تصدیق کی تھی، لیکن بعد میں ثابت ہوا تھا کہ تقریباً دو ہزار کے لگ بھگ لوگ مارے گئے تھے، متعدد جو شدید زخمی تھے یا کنویں میں پڑے رہے، جو اس طرف ہے۔“ اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کنویں کے ارد گرد اوراد پر چھت بنا دی گئی ہوئی ہے۔ یوں گول دائرے میں برآمدہ بن گیا ہے۔ ہم اس کے قریب چلے گئے۔

”آؤ! میں تجھے وہ ٹکٹا پتھر دکھاؤں، جس کے پاس کھڑے ہو کر جنرل ڈائر نے فائرنگ کا حکم دیا تھا۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا تو ہم وہاں تک چلے گئے۔ ”اور وہ دیکھو۔! وہ یہاں کے شہیدوں کی یادگار سرخ پتھر سے بنائی گئی ہے۔“ وہ باغ کے درمیان میں بنائی گئی تھی۔ جسے میں دیکھ رہا تھا، پھر اس کی طرف بڑھ گیا، جبکہ نوین کو رہتا رہی تھی۔

1920ء کے اگست میں مدن موہن مالویہ نے ساڑھے پانچ لاکھ کی مالیت سے اس باغ کو بہتر بنانے کی کوشش کی تھی لیکن پھر 1961ء میں ”شعلہ کی یادگار“ بنا کر بھارتی صدر نے باقاعدہ اس کو میموریل کے ذریعے اس حالت میں لانے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اب یہاں پرتو بچوں کے لیے کافی دلچسپیاں..... وہ نجانے کیا کہتی چلی جا رہی تھی، جس کی مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ہم اس وقت ان دیواروں کے پاس چلے گئے تھے جہاں گولیوں کے نشان تھے اور کئی جگہوں پر اب بھی خون کے نشان تھے، جو اب سیاہ ہو چکے تھے۔ میرے اندر نجانے کیا ہونے لگا تھا۔ ایک دم سے میرا تصور اس وقت کی طرف چلا گیا۔ جب یہاں نہتے لوگ بیساکھی پر جمع تھے۔ نوین کو رکی آواز آتا بند ہو گئی تھی۔ وہ دوپہر سے پہلے کا وقت تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے غروب آفتاب کا وقت ہو گیا ہو۔ میرے سامنے کی ساری ہریالی ایک دم سے ختم ہو گئی۔ ایک اجاڑ سامیدان میرے سامنے ابھر آیا۔ میں اپنی اس کیفیت پر ششدر تھا کہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ اس اجاڑ میدان میں لوگوں کی آواز آرہی تھی جیسے بہت بڑا ہجوم ہوا اور وہ سب باتیں کر رہے ہوں۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ پھر اچانک ہی فائرنگ کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ لوگوں کی چیخ و پکار اٹھی، یوں لگ رہا تھا جیسے شدید فائرنگ میں لوگ مر رہے ہیں، کراہ رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں 13 اپریل 1919ء کے اس دن میں ہوں، اس ہجوم کا کوئی حصہ ہوں اور میرے اندر میری اپنی حالت خراب ہو رہی ہو۔ ایک خوف تھا جو سر سے پاؤں تک مجھے لرز رہا تھا۔ میں اپنی حالت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر ایک دم سے سب کچھ خاموش ہو گیا۔ وہی سارا منظر دوبارہ ابھر آیا۔ نوین باتیں کرتی چلی جا رہی تھی اور میں اپنی حالت پر شدید پریشان تھا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ کیا میں واقعاً اس ماحول میں چلا گیا تھا؟ کیا میرے ساتھ انہونی ہو گئی ہے؟ یا فقط یہ میرا تصور تھا؟ اگر یہ تصور ہی تھا تو اس قدر مضبوط؟ کیا میں اس دور کی ایک جھلک سن اور دیکھ چکا ہوں؟ یہ سب کیا تھا؟

”بھال..... صاحب..... یہ آپ..... کو کیا ہو رہا ہے..... آپ کا رنگ..... چہرہ..... پسینہ.....“ نوین کو رنے گھبرا کر میری جانب دیکھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر حد درجہ پریشان تھی۔

”نوین۔! جتنی جلدی ہو سکے مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہنا چاہتا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ میں اس وقت خود پر قابو نہیں پا رہا تھا۔

مجھے نہیں یاد کہ ہم وہاں سے کیسے نکلے، کب کا رنگ آئے اور راستے میں کیا کچھ تھا۔ راستے میں نوین کو رنے پوچھا بھی تھا۔

”آپ اگر کہیں تو میں آپ کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟“

”نہیں! بس گھر چلو۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا اور گھر آ گئی۔ وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم تک آئی، پھر پانی منگوا کر پلایا، تب تک میں خود پر قابو پا چکا تھا۔ اس وقت پہلا جو خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ میری اس کیفیت بدلنے کی وجہ کیا تھی؟ کیا یہ حقیقت تھی یا محض میرے تصور کی کارفرمائی؟ اگر حقیقت تھی تو یہ کیونکر

سامنے آئی؟ اور اگر میرے تصور کی کارفرمائی تھی تو کیا کوئی میری ذہنی صلاحیت انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی ہے؟ اور پھر یہ بھی اک سوال تھا کہ کیا یہ میری وجہ ہی سے ہوا؟ میرے اندر سے یا اس کی وجہ کوئی اور ہے؟ یہ خیال آتے ہی میں نے نوین کو رک کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر مصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ انتہائی پریشانی میں میری طرف متوجہ تھی۔ کیا یہ کوئی پراسرار ہستی ہے؟ وہ عینک کے شفاف شیشوں سے میری جانب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور بلاشبہ میرے چہرے پر ہونٹ پٹن ہوگا۔

”مسٹر جمال! آپ ٹھیک ہیں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں اپنے خیالات سے باہر آیا۔

”میں ٹھیک ہوں نوین، بیٹھو۔“ میں نے اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھ گئی پھر بولی۔

”میرے خیال میں اگر آپ ایک بار خود کو ڈاکٹر سے.....“

”نہیں! اگر آپ سارے دن کے لیے آئی ہو تو میں اب باہر جانے سے معذرت چاہوں گا۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ جب تک کہیں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر آپ باہر نہیں جانا چاہتے آرام کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ آپ میرا سیل نمبر لے لیں، جب کال کریں گے میں آ جاؤں گی۔“

’اوکے!‘ میں نے کہا اور سیل فون نمبر لے کر محفوظ کر لیا، پھر صوفے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ باہر کی طرف چلی گئی۔ جب وہ گیٹ کراس کر گئی تو میں اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں بیڈ پر لیٹ کر میں اسی عقدے کو حل کرنے کے لیے سوچنے لگا۔ یہ کوئی خواب ناک کیفیت نہیں تھی۔ میں نے اپنے ہوش و حواس میں یہ سب دیکھا تھا۔ آخر یہ تھا کیا؟ شام ہونے کو آ گئی لیکن مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ تب میں نے اس پر سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ رات میں نے ٹی وی دیکھنے اور سونے میں گزار دی۔

اگلے دن گیانی صاحب ذرا دیر سے آئے۔ اس وقت میں ناشتہ وغیرہ کر کے ایک اردو اخبار دیکھ رہا تھا۔ گیانی صاحب کے ساتھ نوین کو رادرا ایک نوجوان سکھ لڑکا تھا۔ لبا ترنگا، سیاہ پتلون اور ہلکی نیلی شرٹ، سر پر بنستی پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”بکرم جیت سنگھ.....“ گیانی نے صوفے پر بیٹھ کر اس نوجوان کا تعارف کرایا۔ ”بہر حال وہ سے تعلق ہے۔ ابھی چند دن پہلے لدھیانہ سے آیا ہے۔ دونوں گپ شپ لگاؤ گے تو جان پہچان ہو جائے گی۔ نوین کو رے تو تم مل ہی چکے ہو ویسے کل ہوا کیا تھا؟“

”بس اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شاید کچھ کھانے پینے کا اثر تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب نوین نے کہا تھا کسی ڈاکٹر کو دکھانے کو تو دکھا دیتے؟“ گیانی نے صلاح دی۔

”نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں اب بس وہ وقتی تھا۔“ میں نے کہا تو وہ بولے۔

”بلجیت کی آخری رسومات ادھر امرتسر میں ہی ادا کی جائیں گی۔“

”تو کیا یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ میں نے چونکتے ہوئے کہا تو وہ انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

”ہاں! ہے تو اچھی بات، لیکن آج بہت زیادہ رش ہوگا۔ بہر حال اس کا میکیورٹی پلان بکرم کے پاس ہے اور یہ نوین تم لوگوں کے ساتھ ہوگی۔ آپ تینوں کا پلان ہے اور جمال تم ان دونوں کے ہیڈ ہو گے۔ اب جو کرنا ہے سہی لوگوں نے کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہم دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پہلے بکرم کو دیکھا، جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور پھر نوین کو دیکھا تو چونک گیا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا اور وہاں مصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی فلسفے

کی متھی سلجھا رہے ہوں یا کسی پکوان کے اجزائے ترکیبی پر بات کر رہے ہوں۔ وہ مجھے کافی حد تک پراسرار لگی۔ شاید گیانی نے میری نگاہیں پڑھ لی تھیں۔

”جمال! نوین کو روک دیکھ کر باپوس مت ہونا۔ اس کا چہرہ سمندر کا سکوت ہے۔ یہ اپنے حلقے میں ”ریشمی تلواری“ کے نام سے جانی جاتی ہے۔“ گیانی نے کہا تو نوین کے پتلے ہونٹوں پر ذرا سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر غائب ہو گئی۔

”ریشمی تلواری!“ میں نے اس کا نام زیر لب دہرایا تو اچھا لگا۔ تبھی وہ بولی۔

”گیانی جی! جمال میں فقط ایک خرابی ہے یہ یہاں کا پنجابی لہجہ نہیں اپنا سکا، یہ کسی اسے دور کرنی چاہیے۔ اگر اسے یہاں رہنا ہے تو.....“

”تم ٹھیک کہتی ہو نوین خیر! آج سے تم تینوں ادھر ہی یا پھر اکٹھے ہی وقت گزارو گے۔ میری آپ تینوں سے ملاقات اب اس آپریشن کے بعد ہی ہوگی۔ چاہو تو رہنے کا بندوبست کہیں اور کر دوں۔“

”یہاں سے اگر ہم ایک بار نکل گئے تو پھر دوبارہ ہم شاید ہی واپس یہاں آئیں گے۔“ بکرم نے گیانی کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! اگر کوئی بہت پریشانی ہو تو مجھے کال کر سکتے ہو یا پھر نوین کو معلوم ہے کہ رابطہ کس سے کرنا ہے۔ اب مجھے اجازت دو، یہاں سے ہر شے آپ لوگوں کو مل جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر فتح بلاتے ہوئے واہ گردواہ گرد کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ تبھی ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔



حالیہ صوبہ کی فضاؤں میں اچھی خاصی نمی تھی۔ بارش خوب برسی تھی، لیکن صبح بہت روشن تھی۔ نیلے آسمان پر سفید بادل تھے جو کبھی کبھی سورج کے سامنے آ کر دھوپ کو روک لیتے تھے۔ دوپہر ہونے کو تھی جب جہاں سنگھ اور ہر پریت کو رپوینو آفس میں پہنچے۔ وہاں کیشو مہرہ کے ساتھ دو اور لوگ تھے۔ وہ بھی بڑے آفسر کے پاس گئے۔ وہ ان سے بڑے تپاک سے ملا۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد اس نے دروازے سے فائل نکالی اور جہاں سنگھ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ لیں جی! آپ کو اپنی جائیداد مبارک وقت اس لیے لگا کر آپ کی شناخت اور کچھ قانونی معاملات درپیش تھے۔“ ”بہت شکریہ۔“ جہاں سنگھ نے فائل پکڑتے ہوئے کہا اور وہ کیشو مہرہ کی جانب بڑھادی۔ اس نے کچھ دیر ان کاغذات کی جانچ پڑتال کی تب بھی اٹھ گئے۔ دفتر سے باہر آ کر مہرہ نے کہا۔

”نہیں جی جہاں اب آپ قانونی طور پر اپنی جائیداد کے مالک ہیں۔ ہم شام کے بعد آئیں گے اوگی پنڈ اور پھر آپ سے وہیں ٹریٹ لیں گے، کیوں مس ہر پریت۔“

”جی کیوں نہیں، ہم آپ کا انتظار کریں گے۔“ ہر پریت نے خوشدلی سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”لیکن میں آنے سے پہلے فون کروں گا۔ ممکن ہے کوئی کام پڑ جائے۔“ اس نے یہ بات کہہ کر معنی خیز انداز میں ان کی طرف دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے ان سے جدا ہو گیا۔ تبھی وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آفس سے نکلے تو ہر پریت نے کہا۔

”اب سیدھے اوگی چلو راستے میں کہیں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر میں تمہارے لیے کچھ شاپنگ کرنا چاہتا ہوں۔“ جہاں نے تیزی سے کہا۔

”مجھے بھی شاپنگ کرنا ہے، لیکن اس کے لیے کل یا پرسوں آئیں گے اب چلو۔“ ہر پریت نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو

جہاں نے گاڑی کا رخ نکودر روڈ کی جانب کر لیا۔

جس وقت وہ کوٹھی کی طرف مڑنے والی سڑک پر آئے تو جہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے گھر کے سامنے بہت

قلمذرات 60
سارے مشتعل لوگ جمع تھے اور مسلسل ان کے گھر پر پھراؤ کر رہے تھے۔ اندر سے کسی بھی قسم کی مزاحمت نہیں تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ہر پریت کے منہ سے نکلا۔
”اوہ! رپا، یہ کیا؟“
”جلدی سے پولیس کو فون کرو۔“ جہاں نے کافی فاصلے پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ پھر تیزی سے انوجیت کے نمبر ملائے اس نے فوراً ہی فون پک کر لیا۔ ”یہ باہر ہنگامہ، کیسے ہو تم؟ اور کہاں ہو؟“
”لگتا ہے تم آگے ہو۔ میں گھر کے اندر ہی ہوں۔ بٹا سنگھ کافی زخمی ہے اس کی مرہم پٹی کر رہا ہوں۔“
”اوہ! پولیس کو فون کیا؟“

”ہاں! میرے لوگ بھی آنے والے ہوں گے۔۔۔۔۔ تم دور رہنا، پتہ نہیں وہ۔۔۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا تو جہاں نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”میں ان کے سامنے ہوں۔ وہ لوگ ہمارے گھر پر حملہ کر رہے ہیں اور میں تماشائی بن جاؤں، میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ تب تک ہر پریت پولیس کو اطلاع کر چکی تھی۔ اس نے تیزی سے اتر کر کچلی سیٹ کو اٹھایا اور کن اٹھائی ہر پریت نے ڈیش بورڈ میں پڑا پلسل اٹھایا اور دونوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ اس دوران ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے انہیں دیکھ لیا تھا، اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا نہ وہ نعرے لگاتے ہوئے ان کی طرف دوڑے تو جہاں نے ہوائی فائر کر دیئے۔ مجمع ایک دم سے ٹھک کر رک گیا۔ جہاں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان میں متحرک لوگ کون سے ہیں۔ ایسے ہی مشتعل ہجوم میں چند لوگ ہی ہوتے ہیں جو اس پورے ہجوم کا ”موڈ“ بناتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ شور مچاتے ہوئے ہجوم کو کچھ بھی کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ کیونکہ جیسے ہی ہوائی فائرنگ سے ہجوم ٹھک کر رک گیا اس کے ساتھ ہی چند لوگ ”آگے بڑھو مارو۔۔۔۔۔“ کے نعرے لگانے لگے۔

”ہر پریت! تم دیکھ رہی ہو یہ کون لوگ ہیں جو بڑا ہادادے رہے ہیں؟“
”ہاں۔“ اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔
”انہی کو نشانہ بنانا ہے، لیکن سنبل کر۔۔۔۔۔ جب ضرورت ہو۔۔۔۔۔“ جہاں سنگھ نے تیزی سے کہا۔ اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہجوم رک گیا تھا، تبھی ایک شخص نے پلسل نکال لیا اور اس نے بھی ہوائی فائر کر دیا۔ یہ ایک طرح کی دھمکی تھی کہ اگر تم نے ہم پر گولی چلائی تو اسلحہ ہمارے پاس بھی ہے اس کے ساتھ ہی ہجوم میں سے کسی اور نے فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے چیخ کر کہا۔
”آگے بڑھو۔۔۔۔۔ مارو۔۔۔۔۔ بلجیت سنگھ کے قاتل کو مارو۔۔۔۔۔“

ہجوم کو سہارا مل گیا تھا۔ تبھی ان کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ وہ آگے بڑھے تو جہاں نے پھر ہوائی فائر کر دیا۔ اسی دوران کوٹھی کی چھت پر سے انوجیت نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ انہی لمحات میں کچھ گاڑیاں سڑک پر سے نیچے اتر کر ان کے قریب سے ذرا فاصلے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان میں سے کئی سکھ نوجوان نکلے اور باہر نکلتے ہی گتیں سیدھی کیں۔ اس پر جہاں نے اونچی آواز میں کہا۔

”کوئی بندہ نہ مارنا۔۔۔۔۔ ہوائی فائر۔“
ایک ساتھ جب فائرنگ ہوئی تو ہجوم بے قابو ہو کر دوڑنے لگا۔ فصلوں کے درمیان سے اوگی کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ آدھا کلو میٹر تھا، وہ لوگ اس جانب دوڑ پڑے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے بھاگے جہاں ان کے ساتھ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جن لوگوں نے نعرے لگائے ہیں ان میں سے کوئی ایک ہی پکڑا جائے۔ وہ گا بے بگا بے فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے

قلمذرات 61
گئے۔ یہاں تک کہ اوگی تک پہنچتے ہوئے وہ ہجوم غائب ہو گیا۔ اس وقت تک انوجیت بھی ان کے ساتھ آ شامل ہوا۔ اس نے آتے ہی کہا۔
”چلو اب بس کرو۔۔۔۔۔ وہ بھاگ گئے ہیں۔“
”تم پہچانتے ہو ان میں سے کون لوگ تھے؟“ جہاں نے پوچھا۔
”ہاں ان میں سے تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔ اور جو تم پوچھنا چاہ رہے ہو کہ بلجیت کے لوگ کون تھے، انہیں بھی جانتا ہوں۔“

”تو پھر سنو انوجیت! جتنا چاہے وقت گزر جائے، انہیں قابو میں کرنا ہے، چاہے کوئی ایک پکڑا جائے ورنہ ان کی ہمت بڑھ جائے گی، آج اور ابھی۔۔۔۔۔“
”چلو۔! انوجیت نے کچھ سوچے بغیر کہا اور وہ سب لوگ اوگی پنڈ کی جانب بڑھ گئے۔ گاؤں بھر میں ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ لوگ پیدل ہی ہجوم کے پیچھے آئے تھے۔ وہ آتے ہی ”سٹھ“ میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں کافی سارے لوگ تھے۔ اسی دوران کئی سارے لوگوں کو لے کر رام داس بھی آ گیا۔ وہ ایک دن جہاں سے ملنے کوٹھی آیا تھا اور اپنی ہر طرح کی مدد کے بارے میں کہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہر کوئی اس شدید فائرنگ کے بارے میں جانتا چاہ رہا تھا۔ گاؤں میں ہلچل ہو اور دلبر سنگھ کو معلوم نہ ہوا، ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی ایک لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر وہاں آ گیا۔ تب انوجیت نے کوٹھی پر حملے کی بابت ان سب کو بتایا اور نام بتائے کہ ان میں کون کون لوگ شامل تھے۔ اس کے ساتھ ہی جہاں نے اونچی آواز میں کہا۔

”دلبر سنگھ جی، آپ ہمارے بزرگ ہیں اور اس وقت ہم آپ ہی کو سرخ مانتے ہیں۔ آپ کے پاس دو گھنٹے ہیں آپ ان سب کو یہاں لے آئیں اور ان سے پوچھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ورنہ پھر ہم خود ان کو تلاش کر لیں گے۔“
”دیکھو پتر۔! انہوں نے جو کچھ بھی کیا غلط کیا، لیکن میں جتنی کروں گا کہ قتل سے کام لؤ، انہیں بلاتے ہیں اور انہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میرا دوشواں کرو۔“ دلبر سنگھ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔
”آپ ہیں اور اوگی کے لوگ بھی یہاں پر ہیں یہ سب سن لیں کہ آج ہی مجھے میری جائیداد کے کاغذات مل گئے ہیں۔ میں اب آپ سب کی طرح اس گاؤں کا حصہ ہوں۔ کوئی میرے گھر پر حملہ کرنے میں اس کی آنکھیں نکال لوں گا۔ دو گھنٹے بعد میں یہیں آؤں گا۔“ جہاں نے کہا تو دلبر سنگھ نے سکون سے کہا۔

”اگر تم مجھے اپنا بزرگ مانتے ہو تو میرا دوشواں کرو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم ابھی گھر جاؤ، میں جانتا ہوں کہ بٹا سنگھ زخمی ہو گیا ہے، میں نے ڈسپنری کا ڈاکٹر بھجوایا ہے، تم جاؤ۔ میں اس کا کوئی نہ کوئی اُپائے کرتا ہوں۔ میں رام داس جی کو بھی ساتھ لے لیتا ہوں، تم فکر نہ کرو۔“
اس کے تسلی دینے پر جہاں نے انوجیت کی طرف دیکھا، اس نے آنکھوں کے مبہم اشارے سے گھر چلنے کو کہا تو وہ وہاں سے نکل پڑا۔ اس کے ساتھ سارے لوگ تھے جو باہر سے آئے تھے۔

باہر سے آئے نوجوان کھاپی کر چلے گئے۔ انہوں نے شام کو آنے کا کہا تو اس پر جہاں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بٹا سنگھ کی مرہم پٹی کر کے اسے آرام کے لیے لٹا دیا تھا۔ اس کے ساتھی چوکیداروں کو وہاں تعینات کر دیا۔ تب کہیں جا کر وہ ڈرائنگ روم میں گیا تو کلجیت کو اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھی اور اسے گلے لگا کر بولی۔
”جہاں پتر۔! پتہ نہیں میں کب سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی تیری امانت تیرے حوالے ہوئی۔ اب میں سکون سے اپنے رب کے پاس جا سکوں گی۔ چاہے اب مجھے آج ہی بلا لے۔“

”اودھو پھو! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کلجیت کو روک خود سے الگ کیا، پھر صوفے پر بیٹھا کر بولا۔
 ”دیکھو پھو پھو! یہ سب کچھ کل بھی انوجیت کا تھا اور آج بھی اسی کا ہے۔ میں نے تو چند دن کے بعد چلے جانا ہے۔ ابھی رب کے پاس جانے کا پروگرام کنسل کرو۔ ہم نے انوجیت کی شادی کر لی ہے۔ ابھی تو اچھے دن شروع ہوئے ہیں۔“
 ”رب تیری خیر کرے پتر مجھے بہر حال آج سکون آ گیا ہے۔“ کلجیت کو رنے پرسکون لہجے میں کہا۔ پھر جوتی کی طرف دیکھ کر بولی۔
 ”چل جلد جوتی! مٹھائی لا اور سب کو کھلا، یہ کرنا مارے لوگوں نے تو سب بھلا دیا۔“ یہ کہہ کر اس نے انوجیت سے بولی۔
 ”اب تو سن۔ اکل گرد و دارہ صاحب میں ارداس کرانی ہے اس کا بندوبست کرنا ہے۔“
 ”تو جو کہے ماں جی وہی ہو جائے گا۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا تو ہر پریت اس کی فائل لے آئی۔
 ”لو جی! پڑوا اپنی امانت اس کی وجہ سے ہجوم کے پیچھے نہیں جاسکی۔“
 ”چل پھر کبھی سہی۔“ جہاں نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔ اس نے وہ فائل انوجیت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”یہ سب تیرا ہے میرے دیر۔! جب چاہے اپنے نام کروالینا۔ ان چند دنوں میں یا پھر جب میں دوبارہ واپس آیا تو.....“
 ”ہر پریت۔! یہ سنبھال کر رکھ لو اور فی الحال کھانا لگوادو، بھوک لگ رہی ہے۔“ انوجیت نے اس بحث ہی کو سمیٹ دیا۔



”صدیاں غلامی میں گزارنے کے بعد اب جا کر ہندوؤں کو آزادی نصیب ہوئی ہے۔ انہیں حکومت ملی ہے تو یہ ہندو اپنی اوقات سے باہر ہو گئے ہیں۔ یہ اپنی گھٹیا فطرت سے مجبور ہیں یہ نہیں دیکھ سکتے کہ دوسرے مذہب دین یا دھرم کا بندہ ان کے سامنے ہوا اس لیے مذہب اور دھرم کے نام پر ہر طرف انہوں نے جنگ چھیڑی ہوئی ہے دراصل یہ وہ سانپ ہیں جو پٹاری میں بند رہیں تو اچھا تھا۔“ نوین کو رنے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ اس وقت ہم تینوں لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔

”وہ تو جو ہونا ہے سو ہے تم بتاؤ اب کرنا کیا ہے۔ شام تو سر پر آ رہی ہے۔“ بکرم جیت نے تشویش زدہ لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

”کچھ نقشے میں نے تم لوگوں کو سمجھا دیا ہے کہ شمشان گھاٹ کہاں ہے اس کے راستے کہاں ہیں ابھی کچھ دیر میں کلجیت وہاں سے جایا جائے گا۔ ہاں اتنا رشتہ نہیں ہوگا۔ سیکورٹی کی وجہ سے لیکن ارٹھی جلانے کے بعد بہت سارے لوگ واپس آ جاتے ہیں۔ اب رویندر سنگھ کے قریب تو ہم جانیں سکتے ہیں۔ اس لیے اب سارا بھروسہ اس پر ہوگا۔ دور مار گن سے اس کا نشانہ لینا ہے اور وہاں سے نکلتا ہے یہی نکلتا ہی ہماری سب سے اہم کارروائی ہوگی۔“ نوین کو رنے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ نشانہ لگانا کب ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سورج غروب ہونے کے بعد جب انہوں نے پھول چننے ہیں۔ تم پھول چننا سمجھتے ہو کلجیت، مطلب جب وہ ارٹھی کی راکھ اور ناخن اکٹھے کریں گے۔ ایسے وقت میں.....“ نوین کو رنے سکون سے کہا۔

”نکلتے کے لیے تمہارا کیا پلان ہے؟“

”پہلی تو بات یہ ہے کہ ہم الگ الگ نہیں ہوں گے، اکٹھے ہی رہیں گے۔ بکرم جیت دوسری گاڑی میں نہیں کودے گا۔ تم نے چونکہ امرتسر دیکھا نہیں اس لیے تمہیں جتنا بھی سمجھاؤں تم نہیں سمجھ سکتے اس پر اپنا دماغ مت کھپاؤ اس کا رووائی کے بعد محفوظ مقام پر لے کر جانا میرا کام ہے۔“

”اوکے۔! میرا خیال ہے بکرم اب نوین کو تقریر کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ہاں تو ہندوؤں نے کیا کیا۔“ میرے کہنے پر وہ دونوں مسکرا دیئے۔ پھر وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تم لوگ تیار ہو جاؤ، میں کچھ لوگوں سے رابطہ کر لوں۔“ اس نے کہا اور اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ امرتسر پر شام اترنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ نوین اور میں پراڈو میں تھے اور بکرم اپنے چند مقامی ساتھیوں کے ساتھ دو کاروں میں ہمارے کور پر تھا۔ وہ ہمیں اودھم سنگھ کا لوٹی کے پاس ریلوے پھاٹک پر ملاتا تھا۔ ہم بغیر ر کے اس کے پاس سے گزر گئے۔ تاہم ہماری رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ریلوے لائن کے پار گزر سکول کے ساتھ وہ شمشان گھاٹ تھا جہاں کلجیت سنگھ کی ارٹھی کو جلایا گیا تھا۔ وہاں پر موجود بندے نے ہمیں بتایا تھا کہ ارٹھی مکمل طور پر جل چکی ہے اور کچھ دیر میں وہاں سے ”پھول“ اٹھائے جائیں گے۔ یہی وہ وقت تھا جس میں ہم نے اپنا کام کرنا تھا۔ گزرنا سکول کی طرف سے اس شمشان گھاٹ کا عقب تھا۔ شمشان گھاٹ کی چار دیواری چھوٹی تھی جس سے ذرا فاصلے پر اینٹوں سے بنے چار ستونوں پر ٹین کی چھت تھی۔ اس کے نیچے کیا ہو رہا تھا یہ تو میں نہیں دیکھ سکا، لیکن اس سے ذرا فاصلے پر کافی لوگ کھڑے تھے۔ وہ سب وہیں، اسی سمت دیکھ رہے تھے ہم پہلے اس کے قریب سے گزر کر آگے نکل گئے، میں دراصل وہاں کی سیکورٹی کے بارے میں اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ وہاں میرے اندازے کے مطابق سیکورٹی کافی تھی۔ انہوں نے شمشان گھاٹ کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ تقریباً ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر شمشان گھاٹ کے اندر کھڑے کسی شخص کو نشانہ بنایا جاسکتا تھا لیکن وہاں سے نکلتا پھر بہت مشکل تھا۔ یہ بزار سک تھا۔ وہاں میں نے اس آسانی کو قبول نہیں کیا بلکہ نوین سے کہا۔

”تم ایسا کرو کسی طرح گزرنا سکول کے اندر پہنچ جانے کی ترکیب کرو۔“

”لیکن وہاں سے نکلنے میں بہت وقت لگ سکتا ہے میری پلاننگ میں صرف اتنا وقت ہے کہ تم شوٹ کرو اور میں گاڑی وہاں سے بھاگوں بس.....“ نوین نے تشویش سے کہا۔

”چلو پھر واپس اور بتادو کہ ان میں رویندر سنگھ کون ہے۔“ میں نے گن جوڑتے ہوئے کہا۔

”ان میں سفید کرتے پاجامے میں ہے اور اس نے سیاہ رنگ کی پگڑی پہنی ہوئے ہے۔ خاص بات کہ اس کے گلے میں بنستی رنگ کی مالا ہے۔“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”وہ تو سب کا ہے اور اتنی باریکی نہیں۔“

”اوکے۔! وہ جو کمائی دلہنہری عینک لگائے ہوئے ہے، لہسا.....“

”ٹھیک ہے اب تم اپنی ڈرائیونگ پردھیان دینا۔“ میں نے کہا اور گن تیار کر لی۔ سنا پیر اور سالنسر دیکھا اور تیار ہو گیا۔ نوین نے جیسی رفتار رکھی ہوئی تھی۔ میں نے تیزی سے دیکھا۔ نوین کی بتائی ہوئی نشانیوں والا وہ شخص کافی لوگوں کے درمیان میں کھڑا تھا۔ میں نے نوین سے تصدیق کی اور رویندر سنگھ کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ بلکی سی آواز ابھری تھی۔ میں نے رویندر سنگھ کو ساکت ہوتے ہوئے دیکھا تھا تب تک نوین نے گاڑی بھاگی۔

ہم نواں کوٹ کی جانب سیدھے چلے گئے۔ نوین کا بکرم جیت سے پہلے ہی رابطہ تھا۔ میں نے گن پچھلی سیٹ کے نیچے رکھی اور فون لے لیا۔ پھر میں نے بکرم جیت سے رابطہ کیا۔ وہ ہمارے عقب ہی میں تھا اور ہم ریلوے لائن کی ساتھ سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ تھوڑا رشتہ تھا نوین کو وہاں گاڑی کی رفتار دھیمی کرنا پڑی پھر اس کے ساتھ ہی بکرم جیت ہمارے ساتھ آگے۔ پراڈو ہمارے لیے اب خطرے کی علامت تھی۔

”نوین! اب ہمیں پراڈو چھوڑنا ہوگی۔ بکرم ہمارے آگے آ جاؤ۔“ میں نے کہا تو ایک موٹر براس نے گاڑی روک

لی۔ میں نے انتہائی تیزی سے دسی بم کی پن نکالی اور گاڑی میں پھینک دی، پھر آگے کھڑے بکرم جیت کی گاڑی میں بڑھے۔ اس میں بیٹھے ہی اس نے تیزی سے گاڑی بڑھالی۔ چند ہی لمحوں بعد دھماکے کی آواز آئی۔ تب تک ہم ریلوے پھانک کر اس کرچکے تھے۔

وہ امرتسر کا پرانا سا علاقہ تھا۔ بہت گنجان آباد انتہائی تنگ بازار میں سے نوین مجھے اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی۔ ہم نے کچھ دیر پہلے بکرم کی گاڑی چھوڑ دی تھی اور ایک آنر رکشہ کے ذریعے یہاں اس بازار تک آئے تھے۔ تنگ بازار میں میرا سانس گھٹ رہا تھا۔ جبکہ مجھے حیرت یہ تھی کہ وہاں عورتوں اور مردوں کا رش تھا۔ کچھ دیر بعد ہم اس بازار کے دوسرے سرے پر گئے تو آگے رہائشی علاقہ شروع ہو گیا۔ درمیان میں ایک سڑک تھی جسے پار کرنے کے بعد ہم ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ چند گلیاں پار کرنے کے بعد وہ ایک گھر کے دروازے پر آن کر رک گئی اور پھر دھیمے سے لہجے میں بولی۔

”یہ میرا گھر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے تیل دے دی۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھے سکھ نے دروازہ کھولا، اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر پلٹ گیا۔ جیسے کسی اجنبی کا اس گھر میں آنا پہلی بار نہیں تھا، ہم اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی ختم ہوئی تو اس کے ساتھ ہی دائیں جانب سیڑھیاں تھیں۔ نوین نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اوپر چڑھ گئی۔ دوسری منزل کو بھی اس نے پیچھے چھوڑا تیسری منزل پر وہ پرانی طرز کا کمرہ تھا اور اس کی حالت ایسی تھی کہ جس کے بارے میں افراتفری ہی کہا جاسکتا تھا، بہت کچھ تھا، مگر سب بے ترتیب۔ اس نے ٹی وی لگاتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا کمرہ ہے اور آپ نے یہ رات ادھر گزارنی ہے۔ آپ ٹی وی دیکھو، میں کھانے کا بندوبست کر کے آتی ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹنے پیروں واپس پلٹ گئی اور میں مختلف چینل بدلنے لگا کہ اپنے مطلب کی خبریں سکوں۔ ایک مقامی چینل پر رویندر سنگھ کے بارے میں خبر دی جا رہی تھی۔ وہ سورگ باشی ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پراڈوں میں دھماکے کی بھی خبر کو اہمیت دی جا رہی تھی۔ اس واقعہ کا سراوہ دہشت گردی سے جوڑ رہے تھے۔ میں کچھ دیر اس کی تفصیلات سنتا رہا، پھر چینل بدلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک خاتون رپورٹر نے کافی چونکا دینے والی بات کی۔ اس نے رویندر سنگھ قتل اور مدین لعل کے بیٹے منوہر کے قتل کو ایک ہی قاتل کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دونوں قتل کسی ایک ہی بندے نے کیے ہیں، کیونکہ شوٹ کرنے کا انداز ایک سا ہی تھا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ وہ اتنی گہرائی میں سوچ سکتے تھے، لیکن اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تحقیقات کس سطح پر ہو رہی ہیں۔ میں نے اندر سے یہ محسوس کر لیا کہ میرے لیے خطرہ بڑھ گیا ہے، مجھے حد درجہ محتاط ہو جانا چاہئے۔



شام کے سائے پھیلے تو اوگی پنڈ پر بھی خوف چھا گیا۔ ایک طرف دلیر سنگھ ان سبھی نوجوانوں کو سامنے لے آیا تھا، جو اس نجوم میں تھے اور انوجیت کے گھر پر پھراؤ کے ذمہ دار تھے۔ جو بھاگ گئے تھے یا موجود نہیں تھے یا پھر سامنے نہیں آئے تھے۔ ان کے والدین میں سے کسی ایک کو وہاں بلا لیا گیا تھا۔ سٹھ میں اچھا خاصا رش لگا ہوا تھا، کچھ لوگ چار پائوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ اونچی سی جگہ پر اوپر بہت سارے لوگ کھڑے تھے۔ بیچ حضرات کے پاس ہی جہاں سنگھ تھا، اور اس سے کچھ فاصلے پر انوجیت تھا۔ انہوں نے بھی اچھی خاصی تعداد میں لوگ بلائے ہوئے تھے کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ان سے نہٹ لیا جائے۔ پنچائیت کی کارروائی شروع ہوتے ہی خاصی گرما گرمی ہونے لگی تھی۔ حملہ آوروں کا یہ موقف تھا کہ جہاں کی وجہ سے بلجیت سنگھ مرا ہے، اس لیے انہیں غصہ تھا۔ کچھ دیر ان کی باتیں سننے کے بعد دلیر سنگھ نے کہا۔

”تو اہم کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کے گھر پر چڑھ دوڑیں۔ خیر! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھے جنہوں نے عام نوجوانوں کو اسایا اور وہاں پر فائرنگ کی؟“

اس کے ساتھ ہی وہاں پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جھنناٹ میں مختلف نام سامنے آنے لگے۔ یہاں تک کہ چھ سات نوجوان سامنے آ گئے۔ ان میں سے کچھ روپوش تھے اس لیے ان کے ماں باپ وہاں پر سامنے تھے۔

”اس بے چارے بننا سنگھ کا کیا قصور تھا۔ اسے اس قدر زخمی کر دیا، وہ کوٹھی کا ملازم ہی نہیں، گھر کا ایک فرد بھی تھا۔ اگر وہ مر گیا تو اس کا ذمے دار کون ہوگا؟“ جہاں سنگھ نے پنچائیت سے کہا۔

”ظاہر ہے، یہی ذمے دار ہیں۔ اب پنچائیت انہیں کیا سزا دیتی ہے۔“ دلیر سنگھ نے سب بچوں کی طرف دیکھ کر کہا تو جہاں نے سب کی طرف دیکھا اور اجازت لے کر بولا۔

”میں ان سب کو معاف کرتا ہوں، لیکن اگر آئندہ کسی نے ایسی حرکت کی تو میں معاف نہیں کروں گا۔“ اس کے یوں کہنے پر ایک دم سے سب کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی۔ کئی لوگ حیران تھے کہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یہ کتنا دیا لو ہے کہ اس نے سزا انہیں ہونے دی بلکہ معاف کر دیا۔ کئی لوگوں نے جذبات میں آ کر یہ اظہار بھی کر دیا تو اس نے کہا۔ ”دیکھو! آج تک میرے گاؤں والے ظلم و ستم کا شکار رہے ہیں۔ دبے رہے ہیں یہاں زندگی کی سہولتیں نہیں آئیں، آپ سب کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ سب زمین جائیداد میرے نام ہو گئی ہے۔ رویندر سنگھ خاندان نے میری راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں سکول بنیں گے، فیکٹریاں لگیں گی، ہسپتال تعمیر ہوگا، یہ جو پہلے نوجوان“ ہیں، لوگوں کے گھروں کو آگ لگاتے پھر رہے ہیں یہاں کام کریں گے۔ خوشحال ہوں گے۔ اس سے میرے باپ کھوئے سنگھ کی آتما کو سکون ملے گا۔ اس سے آپ لوگوں کو بھی پہچان ہو جائے گی کہ رویندر سنگھ خاندان کیسا تھا؟ کس طرح انہوں نے اپنی سرکشی بچانے کے لیے اسی گاؤں کے نوجوانوں کو اندرا گاندھی حکومت کے گماشتوں کے سامنے ڈال دیا تھا، جنہوں نے ان نوجوانوں کو گولیوں سے بھون ڈالا، جن میں میرا باپ بھی تھا۔ یہ سارے اوگی کے لوگ جانتے ہیں۔“ جہاں سنگھ انتہائی جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا کہ کئی لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہاں سماں ہی کچھ اور بن گیا تھا۔ ایسے میں ایک شخص کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ دوسری طرف سے کچھ سنتا رہا پھر فوراً ہی فون بند کر کے اونچی آواز میں بولا۔

”اوئے سنواو گی والو۔ رویندر سنگھ قتل ہو گیا۔“

وہاں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ رویندر سنگھ کے حمایتی بچوں کے رنگ اڑ گئے۔ پھر سرگوشیاں ایک شور میں بدل گئیں۔ خبر کی تصدیق ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد ماحول ہی کچھ اور ہو گیا۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ جاسکتے ہیں لیکن آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔“ دلیر سنگھ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا تو لوگ فوراً ہی وہاں سے ٹھکنے لگے۔

جہاں اور انوجیت کار میں بیٹھ کر واپس کوٹھی کی طرف جا رہے تھے جہاں کا موڈ انتہائی خراب تھا۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ یہی وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، میں نے اسے مارنا تھا، اسے کوئی دوسرا کیسے مار سکتا ہے؟“

”دھیرج رکھو یا جہاں! یہ لفظ بھی منہ سے مت نکالو۔ اچھا ہوا وہ مر گیا۔ تیرا مشن پورا ہو گیا۔“ انوجیت نے قتل سے کہا۔

”میرے اندر کا غصہ تو ٹھنڈا نہیں ہوگا، میں اپنے ہاتھوں سے مارتا، اس بے غیرت کو.....“ جہاں کا غصہ کسی طور بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر انوجیت نہیں بولا بلکہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ گھر آ گئے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی ہر پریت تک یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ اس کی ایک سہیلی نے بتا دیا تھا۔ اس نے جہاں کا موڈ دیکھا تو خاموش رہی۔ وہ کبھی ڈرائیونگ روم میں تھے اور اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ یہی جہاں نے کہا۔

”اسے کون مار سکتا ہے؟ اور پھر وہ کیسے؟“

”اس کی تفصیلات تو خبریں دیکھ کر ہی ہو سکتی ہے۔“ ہر پریت نے کہا پھر چند لمحے بعد کہا۔ ”تم چلو کمرے میں“ وہیں لیپ ٹاپ ہے کوئی آن لائن ٹی وی دیکھتے ہیں۔“

جہاں اور ہر پریت دونوں ہی بیڈ پر بیٹھے ہوئے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ امرتسر کے ایک مقامی چینل سے وہ تفصیلات بتائیں جا رہی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھتی رہنے کے بعد اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

”یہ جمال کے سوا دوسرا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ ہر پریت نے تیزی سے پوچھا تو وہ لیپ ٹاپ ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

”یہ اس کا اسٹائل ہے، وہ بہت پختہ نشانہ باز ہے، تم دیکھ نہیں رہی ایک رپورٹر یہ بات کہہ رہی ہے کہ منوہرا اور ریندر کا قتل ایک جیسا ہے، میں تو پھر اس کے ساتھ رہا ہوں۔“ اس نے ایک طویل سانس لے کر کہہ دیا تو ہر پریت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”مان لیا، اگر اسی نے یہ قتل کیا ہے تو پھر تم کیا کہتے ہو؟“

”تو پھر کوئی بات نہیں۔ اس نے مار لیا، یا میں نے بات ایک ہی ہے، جمال کو نہیں معلوم کہ یہ ریندر سنگھ کیا ہے، اس سٹی میں یہ پوچھا بڑا قتل ہے، وہ گھبرا جاسکتا ہے، مجھے اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔“ جہاں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

”کیا کرو گے تم؟ اور کیا کر سکتے ہو؟ چار دن بعد تم یہاں سے جانے والے ہو۔ اگر تم اس کا ساتھ دیتے ہوئے گھرے گئے تو؟“

”نہیں، مجھے امرتسر جانا ہوگا، مجھے اسے کسی نہ کسی طرح نکالنا ہوگا یہاں سے، میں نکل جاؤں اور وہ یہاں پھنس جائے۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

”پاگل مت بنو۔“ وہ تیزی سے بولی، پھر اسے اپنی بانہوں میں لے کر دھیرے سے کہا۔ ”دیکھو! تم کینیڈا جا کر ایک طویل عرصے کے لیے دوبارہ یہاں آ سکتے ہو۔ پھر جو چاہے اس کے لیے کر سکتے ہو، ابھی رسک نہیں لیا جاسکتا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ میں ایک دن جاؤں گا اور دوسرے دن واپس آ جاؤں گا۔ اس میں ایک دو ہفتے لگ سکتے ہیں ممکن ہے زیادہ وقت لگ جائے۔ وہ اگر یہاں.....“ اس نے خود کو ہر پریت سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”تم میری بات تو سن لو، ہم امرتسر جاتے ہیں اسے اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں۔ تم پرواز کر جاؤ، ہم اسے اوگی لے آئیں گے، پھر کچھ عرصے بعد وہ جیسے سرحد پار کر سکے گا کروادیں گے، اور اگر ممکن ہو تو تمہارے آنے تک اسے یہاں رکھ لیں گے۔“

”ویسے تم کہہ تو ٹھیک رہی ہو جہاں چار دن بعد جانا ہے وہاں دو دن پہلے ہی سہی۔“ جہاں نے کہا اور جمال کے نمبر ملانے لگا۔ ذرا سی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔

”ہاں بول۔!“ جمال بولا۔

”میں کل امرتسر آ رہا ہوں باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“ جہاں نے کہا۔

”جار ہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں پر اپنا بہت خیال رکھنا، ملے ہیں کل.....“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔“ جمال نے کہا تو فون بند کر دیا پھر سیل فون ایک طرف رکھا اور ہر پریت کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ ”پریتو! تیاری کر لو، صبح صبح نکلیں گے یہاں سے، دوپہر ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔“

”تم جارہے ہو؟“ ہر پریت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، پھر تیزی سے اس کے ساتھ پلٹ گئی۔ پھر کتنی ہی دیر تک وہ اس کے ساتھ لگ کر روتی رہی، جہاں اسے ہولے ہولے اچھکاتا رہا۔

”پریتو! آج اور ابھی جتنا چاہے رولو، پھر بعد میں نہیں۔“

کچھ دیر بعد جب ساری بھڑاس نکل گئی تو وہ اس سے الگ ہو گئی۔ پھر آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

”نہیں روؤں گی۔“

”چل آ، پھوپھو کے پاس چلیں اسے بتائیں۔“ یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اتر گیا۔ ہر پریت بھی اس کے ساتھ چل دی۔



نویں نے سادہ سا کھانا اس کے سامنے رکھا تو وہ کھانے لگا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی شامل ہو گئی۔ جب وہ کھاپی چکے تو کچھ دیر بعد نویں اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ اس دوران وہ جہاں کا فون سن چکا تھا۔ چائے پینے کے دوران اس نے کہا۔

”نویں! میں تمہارے بارے میں یا تمہاری فیملی کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے یہ تجسس نہیں ہے کہ تم اس طرح کیوں زندگی گزار رہی ہو، لیکن ایک بات ضرور پوچھنا چاہوں گا، اور یہ بھی چاہوں گا کہ تم اس کا ٹھیک جواب دو گی۔“

”پوچھو۔!“ اس نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم کوئی پراسرار علم بھی جانتی ہو؟ مطلب اس بارے میں تمہاری کوئی دلچسپی ہے؟“ جمال کے پوچھنے پر وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دی، پھر تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔

”یہ آپ نے سوال کیوں کیا؟“

”سوال کر دیتا، مجھے اس کا جواب چاہیے؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔! میں کوئی پراسرار علم نہیں جانتی اور نہ ہی مجھے کبھی دلچسپی رہی ہے۔“ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولی۔ ”اگر مجھے ایسا کوئی علم آتا ہوتا تو میں اپنے خاندان کی حالت نہ سنوار لیتی، کیوں میں جرم کی اس دنیا میں داخل ہوتی۔ پہلی تو بات ہے یہاں عورت اس قدر ذلیل مخلوق ہے جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہر بندہ عورت کو مفت کا مال سمجھ کر اس سے لطف اٹھانا چاہتا ہے، استعمال کر کے ٹھوپیپر کی طرح کچرے کے ڈبے میں پھینک دینا چاہتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا علم آتا ہوتا تو میں کم از کم اس ذلت سے تو نکل آتی، سکون سے جتنی چاہے دولت کماتی۔“

”تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں لیکن نجانے کیوں تم مجھے پراسرار دکھائی دے رہی ہو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں۔! میں انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ پڑھی لکھی ہوں، جاب نہیں ملی، ایک ویٹا بننے کو میں نے پسند نہیں کیا۔ اپنا غصہ ایسے ہی نکالتی ہوں اس سے مجھے پیسے بھی مل جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے چائے کا طویل سب لیا، پھر گرجاں گئے ہوئے بولی۔ ”یہ پراسرار میں کیسے لگی آپ کو؟“

”میں نہیں جانتا، بس ایسے ہی احساس ہوا تھا۔“ میں نے بھی بات چھپا جانا ہی بہتر سمجھا۔

”وہ کہیں جلیانوالہ باغ میں جو آپ کی طبیعت اچانک خراب ہوئی تھی کہیں آپ اس حوالے سے تو بات نہیں کر رہے ہیں۔“ اس نے اچانک پوچھا۔

”تم یہ کیسے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”دیکھو اگر آپ اس حوالے سے بات کر رہے ہو تو یہاں لوگ یہ بات مانتے ہیں کہ جلیانوالہ باغ میں جو لوگ قتل ہوئے

تھے۔ ان کی روحیں آج بھی وہاں بھٹک رہی ہیں۔ وہ مکتی چاہتی ہیں، لیکن انہیں کوئی مکتی دینے والا نہیں۔ وہ لوگوں کو اس طرح احساس دلاتی ہیں تو لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔“

”کیسے ہوگی ان کی مکتی؟“ میں نے پوچھا۔

”لوگ تو یہی کہتے ہیں اور بچپن سے ہم یہی سنتے آ رہے ہیں کہ جب تک ان پر گولیاں چلانے والے بندوں کا ناش نہیں ہو جاتا، ان کے پر یوار اس دھرتی پر ہیں، انہیں مکتی نہیں ہوگی باقی رب جانے۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ بھی مجھے خیال آیا کہ یہ اگر کوئی پراسرار علم جانتی ہے یا نہیں جانتی، بہر حال اس وقت یہ مجھے یونہی کہانی سنا رہی ہے، اب اس موضوع پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سو میں نے پوچھا۔

”گیانی صاحب سے بات ہوئی؟“

”نہیں وہ خود رابطہ کیا کرتے ہیں، جب فضا صاف ہو جاتی ہے۔“ اس نے لا پر واہانہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے تو اس کا مطلب ہے اب بے فکر ہو کر سو جانا چاہیے، جب تک ان کی کال نہیں آتی۔“ میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر ہاں میں سر ہلا دیا۔ اس کیساتھ ہی اس نے بیڈ کے ساتھ فرش پر سے چیزیں اٹھانا شروع کر دیں پھر ایک گدا اور تکیہ بیڈ کے نیچے سے نکال کر سیدھا کیا تو میں نے پوچھا۔ ”تم بھی اسی کمرے میں سوؤ گی؟“

”اور میں نے کہاں سونا ہے، اپنے کمرے ہی میں سوؤں گی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا اور پھر چادر بچھا کر لیٹ گئی تو میں نے یونہی کہا۔

”نویں! لگتا ہے تم بڑی مشکل زندگی گزار رہی ہو۔“

”مشکل نہیں، مشکل ترین کو، خیر یہ دن بھی کٹ جائیں گے اگر زندگی رہی، ورنہ ایسی بے مقصد زندگی کا فائدہ بھی کوئی نہیں ہے۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا پھر چند لمحے بعد گویا ہوئی۔ ”یار! کوئی نئی بات نہیں ہے، وہی غربت، کسمپرسی کی زندگی، پڑھائی کی تھی، کوئی اچھی جابل جائے گی، نہیں ملی تو اس لائن میں آگئی۔ شادی اس لیے نہیں کی کہ کسی کو پسند نہیں آئی، کوئی مجھے پسند نہیں آیا، یہی مختصری کہانی ہے، اب سو جاؤ۔ مجھے جلدی نیند نہیں آئے گی۔“

”لیکن یہ یاد رکھو کہ ہمیں صبح یہاں سے نکلنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہاں جاؤ گے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ صبح بتاؤں گا، ویسے صبح تک گیانی جی بھی کال کر لیں گے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔“ میں نے کہا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس کے بعد مجھے خبر نہیں رہی کہ میں کہاں ہوں۔

میری جب آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے سورج کی شعاعیں اندر آرہی تھیں۔ فرش پر بستر بھی نہیں تھا۔ میں چند لمحے یونہی بیٹھا رہا، پھر فرسودہ سے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ میں نہا کر باہر آیا تو نویں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور میرے بستر پر امرتسر کا روایتی ناشتہ موجود تھا۔ کچے، مکھن، بھائی، اچار کے ساتھ ملائی والی چائے تھی۔ وہ بازار سے آیا ہوا ناشتہ تھا۔ جس سے فراغت کے بعد اس نے کہا۔

”ابھی تک گیانی جی کی کال نہیں آئی، مگر بکرم جیت واپس لدھیانہ چلا گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کا پیغام آیا ہے۔ اگرچہ شہر میں بظاہر سکون ہے، لیکن بہت سختی ہو رہی ہے۔ اب بولو کیا کرتا ہے؟“

”یہاں سے باہر تو جانا ہے، ہم اگر کوئی غیر قانونی کام کریں گے یا مشکوک حالت میں پھریں گے تو ہی پکڑے جائیں گے، تو پھر چلو ہر مندر صاحب چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”چلو۔“ اس نے کہا تو ہم کمرے سے نکل کر پختی منزل تک آ گئے، پھر گلی میں آ گئے۔ وہاں سے ہم بڑے سکون سے

پیدل چلتے ہوئے سڑک تک آ گئے۔ صبح کی چہل پہل تھی، ہمیں دیکھ کر ایک سائیکل رکھنے والا آگے بڑھا، ہم اس میں بیٹھ گئے۔ نویں کور نے اسے ہر مندر صاحب چلنے کو کہا تو وہ چل دیا۔ کافی دیر بعد اس نے ہمیں ہر مندر صاحب کے شمالی گیٹ کی طرف اتارا۔ ہم اندر چلے گئے۔ بستی رنگ کی پگڑی میرے سر پر تھی۔ نویں نے آنچل لیا ہوا تھا، میں جانتا تھا کہ یہاں پر نہ صرف خفیہ والے ہیں، بلکہ وہاں پر ہر مندر صاحب کے اپنے سیکورٹی کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے پر کر مارا ایک چکر لگایا۔ تب تک گیانی صاحب کا فون آ گیا۔ وہ فون نویں ہی نے سنا، وہ ہمیں اپنے ہاں بلارہے تھے۔ ہم کچھ دیر وہاں رہے اور پھر گیانی صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے۔

ڈرائنگ روم میں جہاں اور ہر پریت بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی باری باری مجھے گلے لگ کر ملے۔ جہاں تو مجھے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے میں صدیوں بعد اسے دکھائی دیا ہوں۔ میں نے اس کا کندھے پر مکا رتے ہوئے کہا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”جو کام میں نے کرنا تھا وہ تم نے کر دیا۔ مجھے اچھا لگا، گیانی صاحب نے مجھے ساری تفصیل بتا دی ہے۔“ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نویں اندر کہیں کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی بیٹھا تو ہر پریت میرے پاس آ کر بیٹھ گئی، بولی۔ ”یہ جا رہا ہے۔“

”اس کی مجبوری ہے، جانا تو پڑے گا، ٹکٹ اوکے ہو گیا ہے کیا؟“

”ہاں، وہ رات ہی کر لیا تھا، ابھی وہ لے کر ہی ادھر آیا ہوں۔ شام کے وقت فلائٹ ہے۔“ اس نے افسردہ سے لہجے میں کہا تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”اوکے، اب پھر مجھے تمہارے ساتھ ہر مندر صاحب جانا پڑے گا، ابھی وہاں سے آیا ہوں۔“

”وہ تو جانا ہی ہوگا، مانتا ٹیکنا تو لازمی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ انوجیت نہیں آیا تمہارے ساتھ، وہ ایئر پورٹ آ جائے گا، اگر اسے آنا ہوا تو، ورنہ تم ہر پریت کو چھوڑنے دو گی جاؤ گے۔“ اس نے کہا تو میں نے سرخ تسلیم کر لیا۔



راجہ ساہنی ایئر پورٹ پر خاصی گہما گہمی تھی۔ امرتسر کا مغربی افق نارنجی ہو گیا تھا۔ جب جہاں کی فلائٹ کا اعلان ہوا۔ ایئر پورٹ پر نویں کور بھی تھی جو ہر پریت کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ جہاں میرے گلے لگ کر دھیرے سے بولا۔

”میں بہت جلد آؤں گا، میرا اب وہاں کینیڈا میں دل نہیں لگے گا۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا اور پھر اس کی پیٹھ تھپک کر خود سے الگ کیا۔ ہر پریت اس کے گلے لگ کر رودی۔ وہ اس سے باتیں کرتا رہا، پھر نویں کور سے ہاتھ ملا کر تیزی سے اندر چلا گیا۔ ہم اس وقت تک وہاں رہے، جب تک فلائٹ اڑ نہیں گئی۔ تقریباً آٹھ بجے ایئر پورٹ سے نویں کور کی ماروٹی ہی میں آئے۔ ہر پریت نے اپنی کار گیانی جی کے گھر ہی چھوڑ دی تھی۔ ایئر پورٹ کی طرف آتے ہوئے راستے میں ایک نالہ دیکھا تھا، جیسے ہی وہ قریب آیا، میں نے دلچسپت کور کا دیا ہوا فون اس میں پھینک دیا۔ گویا ایک باب ختم کر دیا۔

اس وقت ہم امرتسر شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے، میں نے ان دونوں عورتوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور اپنے عقب میں آنے والی سرخ گاڑی پر نگاہ رکھی، جیسے ہی بائی پاس سے ہم نیچے اترے تو وہ گاڑی ہمارے آگے آ کر ہماری سائیڈ دبانے لگی، نویں نے بہت کوشش کی کہ وہ نکل جائے، لیکن اسے وہاں رکنا ہی پڑا۔ ہمارے رکتے ہی چار افراد تیزی سے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں پستل تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہمیں کور کر لیا۔ وہ سارے

نوجوان تھے۔ دو آگے کھڑے تھے اور ایک پیچھے آن کھڑا ہوا۔ چوتھے نے ماروتی کے اندر جھانک کر دیکھا، پھر نوین کو رکھا دروازہ کھول کر بولا۔

”اے مس ڈرائیور! باہر نکلو اور اپنی شناخت کراؤ۔“

نوین نے کاربند کی اور باہر نکل گئی۔ تبھی اس نے ہمیں بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم بھی بڑی تیز سے باہر نکل آئے۔ میں نے خطرہ محسوس ہوتے ہی اپنا پستل ”ڈب“ میں ڈال لیا تھا، میں بھی نکل کر ہر پریت کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”فقیر لوگ ہیں، مانگتا نہیں آتا نہیں، بس چھیننا آتا ہے تم جانتے ہو کہ ہم روڈ پر کھڑے ہیں اس لیے جتنی جلدی ہو سکے جو کچھ ہے نکال دو۔“ پھر ہر پریت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اور یہ اس کے زیور..... فوراً.....“ آخری لفظ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تھا، وہ معمولی اچکے ہمارا راستہ روکے کھڑے تھے۔

”اگر اب تم نے اس کی طرف انگلی بھی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ، اچھی بات ہے۔“

”مال نکالو جلدی، ماں کے.....“ اس نے غراتے ہوئے گالی بک دی تو میں نے چشم زدن میں پستل نکالا اور گولی اس کے ہاتھ پر مار دی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ تب تک نوین اور ہر پریت حرکت میں آ چکی تھیں۔ ہر پریت کار کی اگلی طرف کھڑے لڑکوں پر ٹوٹ پڑی وہ ہاتھوں کے بل آگے بڑھی اور پیر ایک کے اور پھر دوسرے کے منہ پر مارا، کار کی پچھلی طرف ایک چیخ بلند ہوئی۔ شاید کار میں کوئی بیٹھا ہوا تھا، کیونکہ اس نے صورت حال دیکھ کر کار بھگا دی۔ وہ چاروں اب ہماری گرفت میں تھے۔ ابھی ہم ان کی دھنائی میں مصروف تھے کہ ہمارے قریب ایک پولیس موبائل وین آ کر رکی اس میں سے پولیس والے تیزی سے باہر نکلے۔ چند منٹ انہیں سمجھانے میں لگ گئے۔ تبھی انسپکٹر نے کہا۔

”آج پکڑے گئے نا، یہ گروہ کافی دنوں سے ایئر پورٹ سے واپس آنے والوں کے ساتھ واردات کر رہا تھا۔ چلو تھانے۔“

”لے جائیں انہیں جو کچھ کرنا ہے ان کے ساتھ کریں۔“ نوین کو رنے کہا تو انسپکٹر بولا۔

”آپ بھی چلیں، ان کی رپورٹ لکھوائیں۔“

”میرے خیال میں آپ ان کے ساتھ بہتر نپٹ سکتے ہیں۔ ہم نے لدھیانے جانا ہے۔

بڑا طویل سفر ہے۔“ میں نے کہا تو انسپکٹر کی باجھیں کھل گئیں۔ بلاشبہ وہ ان سے لے دے کر چھوڑ دینے میں آزاد تھا۔ اس نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ کچھ آگے نکل آئے پر میں نے نوین کو رے کہا۔ ”یاریہ رشوت اور کرپشن بھی کتنی بری چیز ہے مال آنے کا سوچ کر اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ میرے پستل کا لائسنس ہے بھی یا نہیں؟“

”یہی کمزوریاں اور خامیاں کبھی فائدہ دے جاتی ہیں اور کبھی نقصان.....“ نوین کو ر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور ماروتی کی رفتار بڑھا دی۔

گیانی صاحب ہمارا ڈرائیونگ روم میں انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کافی حد تک سنجیدگی تھی۔ ہمارے بیٹھ جانے تک وہ خاموش رہے پھر بولے۔

”جمال! اب تم باہر نہیں نکلو گے، اس وقت تک جب تک میں نہ کہوں۔“

”خیریت تو ہے گیانی صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے ذرائع نے مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ دلچیت کو ر کے ساتھ جو لوگ تھے ان میں سے کچھ لوگوں کو پکڑ لیا گیا ہے۔

وہ منوہر کے قتل سے مدد لعل کے قتل تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ کیسے پہنچے ہیں یہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو آج کل میں وہ دلچیت تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔“

”گیانی صاحب اس طرح تو آپ بھی.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”ان لوگوں کو یہی معلوم تھا کہ جالندھر سے ایک عام سا گیانی منگوا لیا گیا تھا، جو روزانہ پانچ کرائے کے لیے آتا تھا، دوبارہ دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا۔ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوا بھی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔“

”میں نے تو ہر پریت کو اوگی چھوڑنے جانا ہے۔ کیا میں صبح تک واپس.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”جالندھر تو ہرگز نہیں، دلچیت کا فون فوراً ضائع کر دو، باقی رہی ہر پریت کی بات تو انوجیت آنے والا ہے، یہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔“ گیانی نے کہا تو میں بولا۔

”اوکے۔! جیسا آپ کہیں۔“

”نوین، تم بھی ادھر ہی رہو گی۔ شاید ایک دو دن لگ جائیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اتنے میں انوجیت کے آنے کی اطلاع ملی تو گیانی نے کھانا لگانے کا کہہ دیا۔ اس کے آنے پر اسے بھی موقع کی اور حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔ گیانی نے اوگی کی تفصیل سنی۔ کھانے سے فراغت کے فوری بعد گیانی نے انوجیت سے کہا کہ وہ جالندھر کے لیے نکل جائے۔ اس نے ہر پریت کو لیا اور نکل گیا، میں نے چند دن بعد اوگی آنے کا بھرپور وعدہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد گیانی بھی چلا گیا۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، نجانے کیوں ایک نامعلوم سی بے چینی میرے اندر سرایت کی ہوئی تھی۔ وہاں کے تینوں ملازمین کمروں کے اندر ہی سو چکے تھے۔ میرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ نوین میرے ساتھ والے کمرے میں تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ اب وہ بند تھی۔ میری بے چینی جب بڑھنے لگی تو میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی میں آ گیا۔ باہر ملکی روشنی تھی۔ دور گیت پر سیکورٹی والے موجود تھے۔ پرسکون ماحول تھا۔ میں کچھ دیر یونہی کھڑا رہا، میں لاشعوری طور پر یہ سوچ رہا تھا کہ میری یہ بے چینی کیوں ہے؟ کچھ دیر یونہی سوچتے رہنے کے بعد ایک دم سے مجھے ان آوارہ لڑکوں کا خیال آیا جو ہمیں لوٹنا چاہ رہے تھے۔ آخر ایسی کون سی چیز تھی جس نے انہیں ہماری طرف متوجہ کیا تھا؟ چھوٹی گاڑی ماروتی، جس کے سوار آسان شکار تھے؟ ہر پریت کے معمولی سے زیور جو اس نے کانوں اور گلے میں پہن رکھا تھا۔ وہ ایئر پورٹ ہی سے ہمارے پیچھے لگے تھے؟ یا پھر انہوں نے مجھے سیل فون پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟ یا پھر یہ سب غلط تھا اور فقط میرے ہی دل میں چور ہے؟ میں انہی آوارہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے کمپاؤنڈ میں کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ شاید سیکورٹی گارڈ ادھر ادھر پھر رہا ہوگا، لیکن اس کا انداز ایسا نہیں تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک ہی تھا یا کوئی دوسرے بھی تھے؟ یہ سوچتے ہی میں تیزی سے پلٹا، سائینڈ ٹیبل کی درواز میں دھرا اپنا پستل اٹھایا، اس کے ساتھ ہی راؤنڈ پڑے ہوئے تھے، میں نے اسے بھی اٹھا کر اپنی اندرونی جیب میں ٹھونس لیا۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور نوین کو ر کا دروازہ بجانا چاہا مگر وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بیڈ پر پڑی لیپ ٹاپ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں ہیڈ فون لگے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہیڈ فون، کانوں سے نکال لیے۔ میری نگاہ اسکرین پر پڑی تو میں نے فوراً آنکھیں پھیر لیں۔ وہ اخلاق سوز فلم دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے، لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا۔

”نوین باہر کوئی ہے کون ہے دوست یا دشمن؟ میں نہیں جانتا، اٹھو دیکھو باہر کون ہے؟“

میری بات غور سے سننے کے بعد وہ بولیں بیڈ سے اچھلی جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس نے تیزی سے جوتے پہنے اور میرے ساتھ باہر نکلے کو تیار ہو گئی۔ میں نے اسے کھڑکی سے دیکھنے کی جانب متوجہ کیا، وہ باہر دیکھنے لگی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”ہے کوئی، لیکن وہ اکیلا نہیں ہے وہ دیکھو اس کے پیچھے۔“

وہ دو آدمی تھے بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ان کا مقابلہ کیا جائے یا پھر یہاں سے فرار ہوا جائے۔ میں نے نوین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بولو.....! مقابلہ یا فرار.....؟“

”مقابلہ۔“ اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں اسے لیتا ہوا باہر آ گیا۔

”ایسے کرو یہاں کے ملازمین کو جگاؤ فوراً، میں اوپر جا کر چھت پر سے دیکھتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ دوسری منزل کی چھت پر پہنچ کر میں نے دیکھا باہر گلی میں ایک کار دکھائی دی، جس کے پاس کوئی نہیں تھا، ممکن ہے اس کے اندر کوئی ہو، کمپانڈ میں وہی دو افراد اب نظروں سے اوجھل تھے۔ مجھے سیکورٹی گارڈ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، سوئے ہوئے ہیں یا بے ہوش ہیں؟ کیونکہ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف پھر کر دیکھ لیا۔ اب کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال سوچا اور پھر میں نے اگلے لمحے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کچھلی طرف سے نیچے جھانکا اور چھت پر سے نیچے جانے کا کوئی ”راستہ“ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے ایک پائپ دکھائی دیا۔ میں نے محتاط انداز میں اس پر پاؤں رکھا، اور پھر شید کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اترتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرے پاؤں فرش پر لگے۔ میں فوراً ہی نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے بجائے انہیں تلاش کرنے کے باؤنڈری وال کے اس طرف گیا، جس کے ساتھ کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں قریبی درخت پر چڑھا، پھر باؤنڈری وال پر قدم رکھا اور باہر کی جانب اتر گیا۔ وہ کار کا عقب تھا۔ میں نے محتاط انداز میں کار کے اندر جھانکا۔ ایک شخص سائے کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں گیٹ تھا۔ میں سانس روکے اس کے سر پر جا پہنچا، پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر پینجر سیٹ پر جا بیٹھا اور پستل اس کی گردن پر رکھ دیا۔

”کون ہو تم؟“

وہ حیرت کے مارے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی یوں اسے دبوج لے گا۔ ایک یاد دہانی بعد اس کے اوسان بحال ہو گئے۔ اس نے گردن موڑے بغیر کہا۔

”پستل ہٹاؤ اور بتاؤ تم کون ہو؟“

”یہاں کیا کرنے آئے ہو۔“ میں نے اس سے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ممکن ہے تمہیں یا تیرے جیسے بندے کو تلاش کرنے کے لیے۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”کتنے لوگ ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت سارے تمہارے گمان میں بھی نہیں ہے..... میں نے کہا ہے پستل ہٹاؤ.....“ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ جیسے وہ مجھے کوئی چوٹی تصویر کر رہا ہو۔

”مطلب تم کچھ نہیں بتاؤ گے۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا، اندھیرے میں اس کے چہرے پر پھیلے جذبات میں نہیں دیکھ پایا تھا۔

”تم اپنا آپ کو ہمارے حوالے کر دو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے مجھے دھمکی دی۔ تو میں نے پستل ہٹاتے ہوئے کہا۔

”لو۔! پستل ہٹالیا، اب بتاؤ کیا کرو گے، مجھے گرفتار کرو گے..... کرلو.....“ میں نے کہا تو اس نے ذرا سا کسمسانے کی کوشش کی، میں نے چشم زدن میں پستل کا دستہ اس کی کپٹی پر دے مارا۔ وہ حیرت بھری آنکھوں کے ساتھ بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ میں اتنا تو جانتا تھا کہ کار میں پڑے شخص اور اندر گئے لوگوں کا آپس میں رابطہ تو تھا، ممکن ہے ہماری آوازیں ان کے کسی ہیڈ کوارٹر تک بھی گئیں ہوں۔ میں زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا تھا، میں نے اس شخص کی تلاشی میں دو سے تین منٹ لگائے، گاڑی میں متوقع اسلحہ دیکھا، میں نے اس شخص کا کارڈ، سیل فون اور کاغذات جیب میں ڈالے اور اس شخص سے چابی نکال کر پینک دی۔ میں اس طرح واپس چار دیواری پر چڑھا، بلاشبہ اندر جو لوگ تھے وہ کمانڈو تھے۔ انہیں قابو میں کرنا یا ان سے پوچھنا چھ کرنا اچھا خاصا رسک تھا۔ میں ان سے خوف زدہ نہیں تھا، لیکن میں کوئی رسک لینے کے موڈ میں نہیں تھا، میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ میں انہیں اندر سے کیسے نکالتا۔ میں نے چند لمحے سوچا، پھر باؤنڈری وال سے نیچے اتر آیا۔

میں نے اس بے ہوش شخص کو باہر نکالا، اس کی شرٹ نکالی، پھر سیل فون کی لائٹ میں چابی تلاش کی، وہ جلد ہی مجھے مل گئی۔ میں نے کار کے پیٹرول ٹینک کا ڈھکن کھولا اور اس کی شرٹ کو پیٹرول میں بھگوایا، اب مسئلہ آگ لگانے کا تھا، میرے پاس ماچس یا لائٹر نہیں تھا۔ میں نے پستل سے ایک گولی چلائی، ٹھک کی آواز کے ساتھ گولی نکل اور شرٹ جلنے لگی۔ میں نے انتہائی تیزی سے اپنا آپ بچایا اور چار دیواری پر چڑھ گیا، پھر اگلے ہی لمحے اندر کود گیا۔ میں بھاگتا ہوا ہانسی عمارت کی جانب بڑھا، اس میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگے ہوں گے، اچانک چار دیواری کے باہر زوردار دھماکہ ہوا۔ کار کے شعلے ہوا میں بلند ہو گئے۔

اس وقت میں نے ان دونوں کمانڈوز کو دنیا کا احمق ترین کمانڈو مان لیا جب وہ تیزی سے باہر نکلے انہوں نے پستل تانے ہوئے تھے اور اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو اندر سے نوین یا کسی ملازم کو اپنی ڈھال بنا کر باہر لاتا، ظاہر ہے باہر کسی نے کارروائی کی ہے تو کسی کی موجودگی کے واضح امکانات تھے۔ ممکن ہے وہ ابھی گھر کے اندر افراد تک پہنچے ہی نہ ہوں۔ بہر حال وہ میرے لیے بڑا آسان شکار تھے، میں نے تاک کر نشانہ لیا اور ایک کے سر میں سوراخ کر دیا، وہ ڈکراتا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے دوسرے کو وقت نہیں دیا۔ اس کی رانوں میں گولیاں مار دیں، وہ لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔ میں فوراً ہی اس کے پاس چلا گیا۔ پستل اس کے ہاتھ میں سے نکل چکا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر نال رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کرنے آئے تھے یہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈاکہ.....“ اس نے تیزی سے مگر کراہتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم مرنا چاہتے ہو۔ دیکھو صحیح بات بتاؤ گے تو اس طرح زندہ چھوڑ دوں گا..... ورنہ.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے نال کا دباؤ ڈالا تو وہ بولا۔

”یہاں دہشت گردوں کی اطلاع ملی تھی، ہم صرف دیکھنے آئے تھے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا تو اس نے میں اندر سے نوین باہر آ گئی۔ اس نے صورتحال دیکھی۔

”شک ہوا تھا، ایئر پورٹ سے.....“ یہ کہتے ہوئے وہ درد سے کراہا۔

”ماردو اسے اور نکلو۔“ نوین چیخیں۔

”نہیں نوین۔! میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اسے نہیں ماروں گا۔“ میں نے کہا اور پستل اس کے ماتھے پر سے ہٹالیا۔

اس بندے نے میری طرف ممنونیت سے دیکھا، تبھی نوین نے پوری نفرت سے اس کی طرف دیکھا، پسٹل نکالا اور گولی مار دی۔

”اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے اب وقت نہیں ہے نکلو۔“ پھر پلٹ کر ادھیر عمر سکھ سے بولی۔ ”شام کے وقت مہمان آئے تھے یہاں، رات ہونے سے پہلے ہی چلے گئے۔ ان لوگوں کو سیکورٹی والوں نے مارا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے پورچ میں کھڑی اپنی ماروٹی کی جانب بڑھی میں نے کہا۔

”یہ کار تو نظروں میں آ چکی ہے۔“

”اوئے یہاں سے تو نکلیں۔“ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گیٹ پر پہنچ کر دیکھا، دونوں سیکورٹی والے بے حس پڑے ہوئے تھے۔ بے ہوش تھے یا مر گئے تھے یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے گیٹ کھولا اور ہم وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ گلی میں کئی کھڑکیاں کھل چکی تھیں اور کچھ لوگ باہر بھی نکل آئے تھے۔ نوین کو وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ راستے میں اس نے گیمانی جی سے رابطہ کیا۔

”مجھے پتہ چل گیا ہے فی الحال تم دونوں کہیں چھپ جاؤ۔ وہ ملازمین بھی وہاں سے نکل گئے ہیں۔“ اس نے کہا پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ”وہ سیف ہاؤس تھا ختم ہو گیا۔ نوین تجھے محفوظ مقام تک لے جائے گی اور جب تک میں نے کہوں یہاں سے نہیں جاتا۔“

”اوکے۔!“ میں نے اختصار سے کہا اور نوین کو بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔

”اوئے مت گھبراؤ، ایسے نجائے کتنے سیف ہاؤس ہیں یہاں امرتسر میں۔ تم بہر حال لہو کے مہمان ہو۔ فکر مت کرو۔ واہ گروسب ٹھیک کرے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی نگاہ سامنے سڑک پر لگا دی۔ پھر جلد ہی اس نے مین شاہراہ سے گاڑی چھوٹی سڑکوں پر ڈال دی۔ وہ کچھ دیر گھومتی رہی، پھر ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے بولی۔ ”اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالو کچھ میگزین اور ایک دستی بم ہوگا نکالو۔“

میں نے وہ دونوں چیزیں نکال لیں۔ تب تک وہ باہر نکل آئی تھی۔ اس نے میگزین اپنی جیبوں میں ٹھونے اور دستی بم کی پن نکال کر ایک گلی کی جانب بھاگ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں اپنی پشت پر دھماکا سنائی دیا۔ ہم سکون سے وہ گلی پار کر گئے۔

ہمارے سامنے سڑک کنارے ایک ڈائن کھڑی تھی۔ ہم چہل قدمی کے انداز میں اس کے قریب گئے پھر اس کا دروازہ کھولا اور کار میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سکھ نوجوان اور دوسری پر لڑکی تھی جس نے بڑا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی گاڑی چل پڑی۔ نجائے کن راستوں سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ پھر ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں وہ علاقہ ابھی آباد ہو رہا تھا۔ ایک بڑے سے بنگلے میں ہم جا پہنچے جو ابھی زیر تعمیر تھا، دوسری منزل پر ایک کمرہ اچھا خاصا سجا ہوا تھا۔

”لگتا ہے تم دونوں یہاں تھے۔“ نوین نے لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھ مارتے ہوئے پوچھا تھا۔

”اور کیا، بڑے مزے میں تھے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”تو چلو اب مزے کرو۔ ہمیں کوئی دوسرا کمرہ دکھا دو۔“ نوین نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو ہمیں لے کر ڈرا سا ہاٹ کمرے میں لے گئی جہاں رہائش کے لیے تقریباً ساری ہی سہولیات میسر تھیں۔

”یہاں بیٹھو۔! میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔ فی الحال یہی ملے گا، اور اگر پتہ ہو تو خود جاؤ اور فریج میں سے نکال لاؤ۔“ ”نہیں پتہ نہیں۔“ نوین نے تیزی سے کہا۔

”اوکے۔! میں چائے بناتی ہوں۔“

وہ چلی گئی تو میں نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ خاصی دیر ان جگہ تھی، اندھیرا زیادہ تھا۔ کہیں کہیں کسی پول پر کوئی بلب روشن تھا۔ میں بظاہر دیکھ رہا تھا لیکن میرا دماغ ابھی تک اس واقعے میں الجھا ہوا تھا، نوین واش روم میں چلی گئی تھی۔ میں کافی دیر تک کھڑا رہا۔ تبھی میرے عقب سے نوین کو رکی آواز آئی۔

”اوئے۔! اتنا مت سوچو پتہ چل جائے گا، یہ سب کیسے ہوا؟“

”کب کس سے؟“ میں نے تیزی سے مڑتے ہوئے پوچھا۔

”ایک دودن میں..... پتہ چل جائے گا۔ ہمارے ذرائع ہیں۔ تب تک یہاں سکون سے رہیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ بیڈ پر دراز ہو گئی۔ وہ یوں پھیل کر لیٹی تھی جیسے ستار ہی ہو۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔ ”یہ محفوظ سیف ہاؤس ہے۔ یہ جو ابھی لڑکا تم نے دیکھا ہے اس بنگلے کو بنوا رہا ہے۔ ابھی چند دن یہاں کام رکا ہوا ہے۔ یہ دونوں آپس میں دوست ہیں۔ اکثر یہاں پائے جاتے ہیں۔ دونوں ہی اپنے بندے ہیں۔ ایسے ہی زیر تعمیر بنگلے ہمارے کام آتے رہتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے قریب پڑی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس ویک پوائنٹ کو تلاش کیا جائے جس کی وجہ سے ہم پر شک ہوا۔ مسئلہ معلوم ہوگا تو اس کا حل تلاش کیا جائے گا، اور دوسری بات مجھے تو اب فکر ہونے لگی ہے کہ انوجیت اور ہر پریت اپنے گاؤں اوگی پہنچے ہیں یا کہ نہیں۔“

”ہاں! ان کے بارے میں فکر ہونی چاہیے لیکن جب نوین ہے تو پھر فکر کیسی، میرے پاس ہر پریت کا نمبر ہے، میں کال کرتی ہوں اسے۔“

”نہیں۔! تم اسے کال نہیں کرو گی۔ اگر وہ دشمنوں کے ہاتھ میں ہوئی تو تمہاری یہی کال، انہیں ہم تک پہنچنے میں مدد دے گی۔ پھر یہی امرتسر ہمارے لیے تک ہو جائے گا۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ سوچنے لگی پھر چند لمحے بعد بولی۔

”تو یہ رابطہ کیسے ہو پائے؟“

اس نے کہا یہی تھا کہ وہ لڑکی اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں دھگ اور کچھ دیگر لوازمات ایک ٹرے میں رکھے ہوئے تھے لے آئی۔ اس نے وہ سب میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کس سے رابطہ کرتا ہے؟“

”کچھ لوگوں سے، کیا یہاں کمپیوٹر ہوگا، مطلب نیٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، لیپ ٹاپ ہے۔“

”کچھ دیر کے لیے لا دو پلیز۔“ میں نے کہا تو وہ اسی لمحے پلٹ گئی۔ اور میں اس کے انتظار میں گرم چائے کے سپ لینے لگا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ لیپ ٹاپ لے کر آ گئی۔ میں نے چائے کا گگ ایک طرف رکھا اور اس میں مصروف ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرا رویہ سے رابطہ ہو گیا۔

وہاں سے مجھے سب سے پہلے جو خبر ملی وہ یہی تھی کہ انوجیت کے ساتھ ہر پریت اپنے گاؤں خیریت سے پہنچ گئے ہیں جبکہ جہاں کو ابھی وکٹوریہ پہنچنے میں وقت لگے گا۔ ابھی اس کے بارے میں حتمی نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے جب وہاں یہ سوال کیا کہ خفیہ اداروں کو ہمارے بارے میں شک کیسے ہے تو یہی جواب ملا کہ ابھی اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک ہی ہوا۔ مگر اس بارے میں معلومات اکٹھی کی جا رہی ہیں۔ میرے لیے ہدایت یہی تھی کہ یہیں رہوں اور گیمانی کی اگلی کال کا انتظار کروں۔ میں نے لیپ ٹاپ واپس کر دیا۔ اور واش روم سے ہو کر جب واپس آیا تو نوین مختصر سے لباس میں تھی۔ اور بیڈ

کے ایک کونے میں پڑی تھی۔ گویا وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی کہ مجھے اس کے ساتھ بیڑ پر ہی لیٹنا ہے۔

”یہ کپڑے تو نے کہاں سے لے لیے۔“ میں نے پوچھا۔

”اسی کے ہیں۔ اب تھوڑا سکون محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوکے، تم لیٹ جاؤ، میں ادھر ادھر کہیں میرا مطلب باہر.....“ میں نے کہنا چاہا، لیکن وہ بات کانٹے ہوئے بولی۔

”یہیں لیٹ جاؤ، میں تجھے بالکل نہیں کھاؤں گی۔“ اس کے لہجے میں اکتاہٹ کے ساتھ شکوہ بھرا ہوا تھا، جسے بہر حال

میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میں نے جوتے اتارے اور بیڑ پر لیٹ گیا اور پوچھا۔

”کیا ہم دونوں میں سے کسی ایک کو جاگنا ہوگا؟“

”ضرورت نہیں ہے، وہ دونوں جاگ رہے ہیں، کل چھٹی ہے، اور وہ دونوں پوری رات موج مستی کرنے کے موڈ میں

ہیں۔ تم نے اگر کچھ کھانا پیتا ہے یا جاگنا چاہتے ہو تو میں تمہارے لیے کچھ بنا کر لاسکتی ہوں، تمہارے ساتھ جاگ کر باتیں

کر سکتی ہوں۔“

”نہیں، ہمیں سونا چاہیے، کیونکہ سارا دن وہ سوئیں گے اور ہمیں جاگنا ہوگا۔ کل تمہیں کچن بھی سنبھالنا ہوگا، اس لیے ہمیں

سو جانا چاہیے۔“

”اوکے!“ اس نے کہا اور کروٹ بدل کر سو گئی۔ میں چند لمحے یونہی لیٹا رہا، پھر میں نے لائٹ آف کی اور سونے کے

لیے لیٹ گیا۔

میں کچھ دیر تک آنکھیں بند کر کے یونہی اس سارے معاملے کو لیے سوچتا رہا، کوئی سرا تو ہاتھ نہیں آیا مگر یہ پتہ نہ چلا کہ

میں کب سو گیا۔

میری آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا، نوین بے خبر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ رانوں میں

دیئے ہوئے تھی اور اکٹھی سی ہو کر پڑی تھی۔ میں اٹھا اور دواش روم چلا گیا۔ پھر کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر نیلی روشنی پھیلی

ہوئی تھی، یہی نیلگوں روشنی والا ماحول مجھے سب سے سہانا لگتا تھا۔ کچھ وقت یونہی گزر گیا۔ تبھی نوین کور کا فون بج اٹھا، وہ

کسمپاتی ہوئی اٹھی، اس نے فون سنا، پھر ایک دم سے حواسوں میں آ گئی۔ میں سمجھ گیا کوئی خطرے والی بات ضرور ہوگی، پھر

اس نے میری طرف دیکھ کر فون بند کر دیا۔

”کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا؟“

”ابھی بتاتی ہوں، خیریت ہے کہ نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی، باہر کی جانب چلی گئی۔ میں تذبذب میں ٹھہرنے لگا، کچھ ہی دیر بعد

وہ واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تھا۔ اس نے جلدی سے آن کیا، اور ایک اخبار کا دیب بیچ نکال لیا۔ وہ

انگریزی اخبار تھا۔ پھر اس نے ایک خبر کے ساتھ بنے خاکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھو۔“

میں نے دیکھا، وہ بہت حد تک میرا ہی خاکہ تھا، وہ مجھ سے کافی حد تک ملتا جلتا تھا۔ میں چونک گیا۔ مجھے اپنا خاکہ چھپنے

پر اتنی پریشانی نہیں تھی، جتنی یہ سوچ کر شدید حیرت ہوئی کہ آخر یہ خاکہ چھپ کیسے گیا؟ کس نے مجھے اتنے غور سے دیکھا

تھا؟ کیا میں کسی سازش کا شکار ہو رہا ہوں اور کسی بھی لمحے انڈین خفیہ والوں کے ہتھے چڑھنے والا ہوں۔ میرے اندر بے چینی

اور سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں۔

خاکہ تو خاکہ ہی ہوتا ہے، سو فیصد تصویر تو نہیں ہوتی۔ جس خبر کے ساتھ وہ خاکہ شائع ہوا تھا، اس میں خاصی خرافات بھری

تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ نامعلوم دہشت گردوں کا ٹھکانہ، آتشیں اسلحہ، بارود، نقشے اور دیگر ایسا مواد جس سے یہ ثابت ہوتا تھا

کہ وہ دہشت گرد بھارتی پنجاب میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کا ردوائی میں ڈوکمانڈ مارے گئے، جبکہ

تیسرا راج گیا اور ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا، چند دہشت گرد گرفتار کر لیے گئے اور یہ خاکے والا فرار ہونے

میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری اوٹ پٹانگ باتیں تھیں۔ میں نے اس خبر اور اس کی تفصیلات پر توجہ

نہیں دی۔ بلکہ یہ سوچنے لگا کہ ان تینوں میں سے بچا کون ہوگا، جس کی مدد سے انہوں نے یہ خاکہ بنایا تھا۔ مجھے یہ اچھی

طرح یاد تھا کہ ایک کے سر میں سوراخ میں نے خود کیا تھا، دوسرے کو نوین کور نے مارا تھا، تیسرا جو باہر تھا، جسے میں نے مارا

نہیں تھا، صرف بے ہوش کیا تھا، ظاہر ہے اسے ہوش آ گیا ہوگا اور وہ گاڑی چلنے سے پہلے ہی باہر نکل گیا ہوگا، کیونکہ خبر

میں کسی عورت کا ذکر نہیں تھا۔ یہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ باہر والے کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اندر عورت بھی تھی۔

”یہ بھی ممکن ہے جمال کہ جب ہم باہر نکلے تھے تب ارد گرد کے لوگوں نے ہمیں دیکھ.....“ نوین کور نے کہنا چاہا تو میں

نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔

”نوین، کچھ بھی ہے لیکن یہ خاکہ ہمارے سامنے ایک حقیقت کی طرح ہے۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا، اس پر سوچنے کی

بجائے یہ دھیان کرنا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

”وہ تو ہمیں گیانی صاحب نے بتانا ہے، وہ اگر رابطہ نہیں کرتے تو پھر ہمیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔“ نوین کور نے سکون سے

کہا۔

”چلیں دیکھتے ہیں وہ کب رابطہ کرتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔“ میں نے کانڈھے اچکاتے ہوئے کہا تو مسکراتے ہوئے

بولی۔

”نی الحال تو ناشتہ کریں نا، میں چلی کچن میں، کیونکہ یہ ناشتہ مجھے ہی بنانا ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

انٹرنیٹ آن تھا۔ میں نے اپنا میل باکس کھولا تو روپی سے میل آئی ہوئی تھی۔ میرے لیے یہی ہدایت تھی کہ اگر دوپہر تک

گیانی صاحب رابطہ نہ کریں تو پھر مجھے ایک نمبر پر فون کرنا تھا اور یہ جگہ جہاں میں اس وقت تھا، وہ خطرے سے خالی نہیں

تھی۔ مجھے یہاں سے جلد از جلد نکل جانے کا کہا گیا تھا۔ میں نے وہ نمبر ازبر کیا، پھر سب کچھ صاف کر کے لیپ ٹاپ بند

کر کے ایک طرف رکھا اور بیڑ پر لیٹ گیا۔ نئی اطلاع آ جانے پر جہاں میں پرسکون ہو گیا تھا، وہاں یہ بے چینی بھی درآئی تھی

کہ یہ جگہ خطرناک ہے۔ یہ کیسے خطرناک ہے؟ اس کا مجھے ادراک نہیں تھا۔ لیکن ایک سوال شدت سے میرے ذہن میں

گو بجنے لگا۔ روپی والوں کے ہزار رابطے ہوں گے، نجانے کہاں تک رسائی ہوگی، لیکن انہیں میری موجودہ لوکیشن کے

بارے میں کیسے علم ہے؟ کیا انہوں نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی ہے یا وہ مجھے آزار ہے ہیں؟ کیا یہ سب میرے ساتھ ڈرامہ ہو رہا

ہے؟ کوئی ایسا ذریعہ تو تھا جس سے وہ معلوم کر لیتے تھے کہ میں کہاں ہوں۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے پاس

نہیں تھا۔ لیکن ایک گرہ کی مانند میرے دماغ میں بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے وقت کے ساتھ ہی اس کا جواب ملنا تھا۔

”چلو یار! شہر کی سیر کو نکلیں۔“ ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے نوین کور سے کہا تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھا، پھر

اس حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

”تم ہوش میں تو ہو، لوگوں کو شراب چڑھتی ہے، نشہ دماغ گھما دیتا ہے، لگتا ہے، تجھے ناشتے نے نشہ کر دیا ہے۔“

”نوین یار! میں تجھے بتا نہیں سکتا، میرا دل ڈر رہا ہے، چاہتا ہوں کھلی فضا میں جاؤں۔“ میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے

ئے کہا۔ تب اس نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہاں تم نے کوئی خطرہ محسوس کیا ہے؟“

”نہیں، میں بھی اور ہے بھی، سچ پوچھو تو تذبذب کا شکار ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوکے“ کچھ دیر انتظار کر لیں، گیمانی صاحب کے فون کا پھر نکلے ہیں۔“ اس نے ایک دم سے کہا اور برتن اٹھا کر باہر چلی گئی۔

..... ❁ ❁

دو پہر ہونے والی تھی، مگر گیمانی صاحب کا فون نہیں آیا تھا۔ میں کمرے میں بیٹھا ہوا اکتا گیا تھا۔ میں ٹی وی دیکھنے کی بجائے حالات پر غور کر رہا تھا جبکہ نوین کور لیپ ٹاپ پر گندی فلمیں دیکھ کر اپنا نشہ پورا کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ فلمیں کس حد تک لت کی طرح بندے کو لگ جاتی ہیں۔ اس نے ضد کر کے ایک فلم کا تھوڑا حصہ مجھے دکھایا تھا، وہ ایک ایسی فلم تھی، جس میں تشدد دکھایا جا رہا تھا۔ مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ مجھے صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں کے اس ہتھیار کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا، کس قدر زہر انسانیت کی رگوں میں دوڑا دیا گیا تھا۔ صرف مسلمان ہی اس زہر کے عادی نہیں ہوئے تھے بلکہ پوری انسانیت کو اس میٹھے زہر کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ ان کی اپنی قوم نے اس خنجر سے خود کو زیادہ لہو لہان کر لیا تھا۔ میں نے نوین کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ دو پہر ہو گئی۔ اس کا احساس میں نے اسے دلایا تو وہ ایک دم سے اٹھ کر چلنے کو تیار ہو گئی۔ پھر وہاں سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے ایک سڑک تک آئے وہاں سے رکشہ لیا اور شہر کے پر رونق علاقے میں چلے گئے۔ وہیں میں نے نوین سے ہنستے ہوئے کہا۔

”یار تیرے شہر میں یہ جو پل پرکاریں چل رہی ہیں ان کی سیر کرنا تھی یہ تو کی ہی نہیں۔“

”کی جاسکتی ہے، اگر ہم بس اسٹاپ پر ہوں یا ہر مندر صاحب..... درمیان میں نہیں چلو وہاں چلتے ہیں۔ میں تمہیں سیر کروادوں۔“ نوین کو رننے پل پر چلتی ہوئی کار کو دیکھ کر کہا۔

”نہیں فی الحال کہیں سے اچھا سارا پتی کھانا کھاتے ہیں پھر.....“

”یہیں قریب ہی بھائیوں کا ڈھابہ ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔“ اس نے مجھے بتایا۔

”لیکن پہلے مجھے ایک پبلک بوتھ سے فون کرنا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”اوکے..... وہ دیکھو وہ سامنے..... چلو۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پبلک بوتھ پر پہنچ کر میں نے وہ فون نمبر ملایا تو دوسری طرف سے مردانہ مگر ملائم سی آواز سنائی دی۔

”میں دلچسپ سنگھ شہور بات کر رہا ہوں۔ پر م جیت سنگھ جی سے بات کرنا ہے۔“ میں نے کہا تو دوسری جانب سے بڑی سنجیدگی سے بات ہونے لگی۔ ظاہر ہے وہ کوڈورڈ تھے جس کے بعد میں نے ڈھابے کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے کوڈورڈ میں ایک کار نمبر بتایا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے کھانے کے بعد باہر نکل کر اس کار کے پاس آ جانا تھا اور ڈرائیور کو بلا کر اپنا نام بتانا تھا۔

نوین کو خاموشی سے میرے ساتھ کھانا کھاتی رہی۔ مل چکانے کے بعد جب ہم اٹھنے لگے تو میں نے اس سے کہا

”نوین، اب تیری اور میری راہیں الگ الگ ہیں۔ زندہ رہے تو کبھی ملاقات ہوگی۔ اس لئے تم یہاں سے ذرا بعد نکلتا،

میں پانچ منٹ بعد واپس نہ آیا تو تم چلی جانا۔ اوکے؟“

”اوکے۔ تم مجھے یاد رہو گے۔“ اس نے اپنی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری

تھا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی۔

میں بلا جھجک اس کے پاس گیا تو اس کا ڈرائیور باہر آ گیا۔ میں اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا نام بتایا وہ بغیر کچھ بولے مڑا

اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

ہماری منزل ایک پرانے طرز کی حویلی تھی جو کم از کم ڈیڑھ سو سال پرانی تھی۔ مگر رنگ و روغن اور دیکھ بھال کے علاوہ توجہ

دینے پر وہ بالکل نئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا طرز تعمیر بہترین تھا۔ جس میں انڈین اور انگلش تعمیر کا امتزاج پایا جاتا تھا۔ حویلی کے سامنے لان میں گھاس پودے اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے جس سے میں نے آسودگی جیسی فرحت محسوس کی۔ پورچ میں کارر کی تو باوردی ملازم نے گیٹ کھولا۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں جس قدر بھی ہے، اہمیت ضرور ہے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جو جدید اور قدیم اشیاء سے سجا ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچ کر کسی حد تک مرعوب ہوا تھا۔ شاید اس کی تاریخی حیثیت تھی یا وہاں سے اس حویلی کے کینوں کے بارے میں اظہار ہو رہا تھا۔ میں وہاں رک گیا۔

”آئیے۔!“ باوردی ملازم نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر دائیں ہاتھ میں سیڑھیاں تھیں، وہ ان پر چڑھتا چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوسری منزل پر آ گیا۔

سامنے ہی ایک بڑے سارے چھجے کے نیچے کرسیاں دھری ہوئی تھیں، جن میں سے ایک کرسی پر بھاری بھر کم جتنے والا دیوڑ

عمر سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ جس نے زرد رنگ کی پگڑی، سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ روایتی کرپال کی پٹی کا رنگ نیلا تھا۔ سفید

داڑھی، گہری شریقی آنکھیں لیے وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے

فتح بلائی۔

”ست سری اکال، جی آیاں نوں، جمال آ بیٹھ۔“

اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”بہت شکریہ.....“ یہ کہتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا تو مجھے اپنے ساتھ لانے والا ملازم واپس پلٹ گیا۔

”مجھے رتن دیپ سنگھ کہتے ہیں۔ تم جب سے یہاں آئے ہو مجھے معلوم ہے، مدن لعل اور رویندر سنگھ والا معاملہ

بھی خیر..... تم ہمارے مہمان ہو، یہاں رہو۔“ اس نے بڑے سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں یوں کہا جیسے یہ واقعات اس

کے لیے کچھ بھی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔

”بہت خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر، مہمان بنانے پر دیکھیں مہمان نے ایک دن جانا ہوتا ہے وہ آتا اپنی مرضی سے ہے

جاتا میزبان کی مرضی سے، کب تک میں.....“ میں نے کہا نا چاہا تو وہ قدرے مسکرا کر بولا۔

”اوئے جمال یار تجھے آئے دو منٹ نہیں ہوئے اور جانے کی بات کر رہا ہے۔ باقی تمہاری بات ٹھیک ہے، مہمان نے

جانا تو ہوتا ہے وہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ لیکن فی الحال میری کچھ باتیں سن لو۔“

”جی فرمائیں۔“ میں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”بھارتی خفیہ کو یہ تو معلوم ہے کہ کوئی بندہ ہے جو یہاں امرتسر سے جالندھر تک کارروائیاں کر رہا ہے۔ کون ہے اس

بارے میں نہیں معلوم۔ حیدر علی کے بارے میں خاصی الجھن رہی، اسے پہلے ہی دن ایجنٹ سمجھ لیا گیا اور اس پر کڑی نگاہ رکھی

گئی۔ حیدر علی کا محتاط رویہ اور رویندر سنگھ کی غلط بیانیوں اس نے الجھن ڈال دی، خیر اب وہ بھی نہیں، حیدر علی چلا گیا لیکن

کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ حیدر علی نے دوبارہ آنا ہے لہذا اس کی واپسی کی راہ ہموار کرنی چاہیے۔“

”کیا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں جو گیمانی صاحب سوچ رہے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”بہت حد تک معاملات گیمانی دیکھتا ہے، لیکن اصل فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔ یہ سوچ اس کی اپنی نہیں کسی اور معتبر جگہ کی

ہے۔ خیر، خفیہ کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے ہی رات والا ڈرامہ کیا گیا اور آج جو کچھ اخبارات میں ہے وہ بھارتی خفیہ کو غلط راہ

پر ڈالنے کے لیے ہے۔“

”ایسا کیوں سردارجی؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اس لیے جمال کہ انہیں اپنی اوقات کا پتہ چلتا رہے۔ میں مانتا ہوں ان کے وسائل بہت ہیں، قوت بھی زیادہ ہے، لیکن

لڑتے، جذبے ہیں اور کام ہمیشہ حوصلہ ہی آتا ہے۔ آگ میں چھلانگ لگانے کے لیے جرات چاہیے ہوتی ہے۔“ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ ایسا کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
”تو یہ بات ہے۔“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”مدن محل نے“ را“ کی مدد سے لاہور میں سیٹ اپ بنایا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ کیونکہ ”را“ اور لاہور کے درمیان رابطہ کٹ گیا۔ لاہور والے لوگ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی مضبوط منشیات فروش جو کسی بھی شہر میں ہوتا ہے۔“ اس نے سانس لیا اور میری طرف دیکھا میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ”جمال! میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم سچ کہو گے۔“

”آپ پوچھیں میں سچ ہی کہوں گا۔“ میں نے جواباً کہا۔

”تمہاری یہ ساری بھاگ دوڑ کس لیے ہے؟ کیا مقصد ہے تمہارا؟ کس لیے تم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے؟“ یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ میں خاموش رہا کیونکہ میں خود تذبذب میں پڑ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔
”رتن دیپ سنگھ جی سچ پوچھیں تو میرا کوئی مقصد نہیں ہے شاید میں نے زندگی کی حفاظت کے لیے موت کا سامنا کر لیا ہے۔ حالات ہی ایسے بنتے گئے ہیں اور بس میں چلتا چلا جا رہا ہوں۔“

”سچ کہا تم نے“ کوئی دھرم کے لیے لڑ رہا ہے کوئی زمین اور وطن کے لیے اور کوئی اپنا وجود بچانے کے لیے ہمیں دیکھو سکھ دھرم کو ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے اور ہندو اس میں سب سے آگے ہے۔ ہم اپنا وطن چاہتے ہیں اور ہماری لڑائی اپنا آپ بچانے کے لیے ہے۔ میں اس کے لیے دلائل کے انبار لگا سکتا ہوں لیکن صرف ایک مثال دوں گا۔
سانحہ 1984ء میری ان ساری باتوں کا جواب ہے۔“

”بھی لڑ رہے ہیں لیکن اپنے اپنے انداز میں۔ معاف کیجیے گا جس طرح سکھ پنڈت کی اب حالت ہو گئی ہے اس سے یہ سارے ہدف حاصل کرنا بہت مشکل ہو گئے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”واہمہ دہر کرے گا جمال میں مایوس نہیں ہوں۔ دراصل یہ ہندو پیچھے اپنی اوقات سے باہر ہو گئے ہیں۔ اشوکا کے بعد سے 47 تک یہ غلامی کی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ اب یہ آپ سے باہر ہو گئے ہیں۔ سکھ پر یوار جب چاہے قتل عام شروع کر دیتا ہے تم یقین رکھو وہ دن دور نہیں جب اسی بھارت کے کئی ٹکڑے ہوں گے۔ کیونکہ جس ملک میں دولت عوام نچلے طبقے کے لوگ اپنا ترنگا لہرا نے پر قتل کر دیئے جائیں وہ ایسی جمہوریت کے ماتھے پر کالک سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”یہ بھارتی تو اپنی جڑیں خود کاٹتے جا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ہاں لکل اپنی ساری کرتوتیں مختلف ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں پر ڈال دیتے ہیں۔ جیسے خالصتان تحریک کو پاکستانی آئی ایس آئی نے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں میرے سامنے میرے باپ کو زندہ جلا دیا گیا وہ مجھیں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ میری ماں کو اس حویلی میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ کیا یہ آگ آئی ایس آئی نے لگائی تھی یا ان ہندوؤں نے؟“ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”خیر..... یہ باتیں تو ختم ہی نہیں ہوں گی۔ تم یہاں رہو اور تھوڑے بہت کام ہیں وہ کرو جب ہمارا یہ مہمان جائے گا تو بہت اچھا ہوگا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات سمیٹ دی۔ کیونکہ دو تین ملازم کھانے پینے کا سامان کافی مقدار میں لے آئے تھے۔

”کیا کام ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی کیا جلدی ہے۔ ابھی کھاؤ پیو اور سکون سے سو جاؤ۔ آرام کرو بیٹا دوں گا۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے سیب کو اٹھالیا۔ اس کے ساتھ ہی کھانے پینے اور باتوں کا سلسلہ دراز ہو گیا۔

وہ حویلی کے سرے پر ایک شاندار کمرہ تھا۔ وہی قدیم وجدید انداز میں سجاوا تھا۔ اونچی چھت والا یہ کمرہ خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا۔ کھڑکی کے باہر مہندی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ جن کی مہک محسوس کی جاتی تھی۔ میں نے کمرے کا لاک لگایا، پینٹل نکال کر تنیکے کی نیچے رکھا اور سکون سے بیڈ پر پھیل کے لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے آیا۔

میری نیند ایک دم سے ٹوٹ گئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے دیکھا، دروازے میں ایک سرو قد لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے بلیک نائٹس نما پتلون پہنی ہوئی تھی، گلابی سلیویس شرٹ، لمبی گردن، کھلے ہوئے لانے کیسٹیکھے نقوش اور لمبے ناک والی میری طرف گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا وہ مسکرائی اور بولی۔

”لیٹے رہو دلچیت سنگھ جی میں کوئی غیر نہیں تمہاری میزبان گائیڈ دوست اور جو تم چاہو میں وہی ہوں.....“ یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میرے بیڈ کے قریب آ گئی اور بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اس نے کوئی دل آویز قسم کا پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”بانتیا کو را آپ مجھے ”بنو“ کہہ سکتے ہو میرا ایک نیم.....“

میں نے اس کا ہاتھ تو تھام لیا، مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسا رسپانس دوں۔ اس نے مجھے دلچیت سنگھ کے نام سے ملایا تھا جو میرا یہاں کوڈ نیم تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے مجھے سمجھ آ گئی کہ یہی نام یہاں اسے بتایا ہوگا ورنہ اسے کوئی خواب تھوڑی آ گیا ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر آہستگی سے مسکرا دیا پھر اس کے بدن کو دیکھ کر بولا۔
”دیکھتے ہیں تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو اب معلوم نہیں میزبانی کر بھی پاؤ گی کہ نہیں.....“

”بعض اوقات بندہ بڑے غلط اندازے لگا لیتا ہے کہتے ہیں کہ بندہ اس وقت درست اندازے لگاتا ہے جب وہ بہت تجربے کا رہ گیا ہو۔“ اگرچہ اس نے یہ بات بڑے تحمل سے اور مسکراتے ہوئے کہی تھی لیکن مجھ پر طنز کر گئی تھی۔ جس کا مجھے قطعاً برا نہیں لگا بلکہ ایک طرح سے فرحت محسوس ہوئی میں ہنس دیا۔

”چلیں اپنا اندازہ یقین میں بدل کے دیکھتے ہیں۔“

”ممکن ہے مجھے بھی ایسا ہی کوئی یقین کرنا پڑے۔ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ اس نے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کسی حد تک ہنستے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”دروازہ تم نے کھولا یا پھر یہاں کے لوگوں نے۔“

”یہیں کے لوگوں نے“ مگر یہ حویلی میرے لیے اجنبی نہیں سارے لوگ ہی جانتے ہیں مجھے۔“ اس نے کاندھے اچکا کر کہا تو میں سیدھے مطلب کی بات پر اتر آیا۔

”میری گائیڈ مجھے کیا راہنمائی دے گی؟“

”یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر امرتسر جنکشن ہے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے کیا تم وہ دیکھنا پسند کرو گے۔“

”ابھی چلنا ہے یا کچھ دیر ٹھہر کر۔“ میں نے لیٹے لیٹے ہی کہا۔

”ابھی تو کچھ وقت تمہیں تیار ہونے کو لگے گا پھر میں تجھے آم پاؤں کھلاؤں گی بہت مشہور سوغات ہے یہاں کی پھر اگر دل کیا تو کوئی مووی شووی دیکھ لیں گے یا پھر کسی ڈانس کلب میں چلتے ہیں یا کسی ریسٹوران میں کھانا کھا لیں گے جو دل میں آیا۔“ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”تیاری میں خود کروں گا یا تم کراؤ گی۔“ میں نے پوچھا تو وہ بے تکلفی سے بولی۔

”دونوں مل کر کریں گے میں تمہارے لیے خود کپڑے خرید کر لائی ہوں۔ گاڑی میں پڑے ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے نازک سے بلیک سینڈل اتارے اور بیڈ پر پھیل کر بیٹھ گئی۔ وہ میرے سامنے تھی۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا، مگر اس قدر سانا ہوا بھی نہیں تھا۔ یہی کھلتا ہوا گندمی رنگ، سیلوئس شرٹ کے اوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ میں اس کے بدن میں اُلجھتا جا رہا ہوں۔ اس لیے میں اٹھا اور ہاتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں تیار ہو چکا تھا۔ سیاہ ڈریس چٹون، پر پل شرٹ کے ساتھ سیاہ پکڑی پہن لی تھی، پاؤں میں بلیک شو، داڑھی کو خوب نگلھا کیا، مونچھوں کی نوکیں نکالیں اور تیار ہو گیا۔ اس دوران بائیتا کور بھی تیار ہو گئی۔ اس نے سیاہ عین اور گہرے نیلے رنگ کی بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن لی، پاؤں میں بلیک لیڈر شو، بازوؤں کو کسی حد تک باندھ لیا تھا۔ میں اپنا پسٹل نکال کر جیب میں ڈالنے لگا تو بائیتا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”اسے رہنے دو میرے پاس گاڑی میں پڑا ہے تمہارے لیے خوبصورت تحفہ، فالٹو میگزین بھی ہیں۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے پسٹل واپس رکھ دیا اور پھر اس کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ باہر شام اتر کر رات میں بدل گئی تھی۔ میں نے کھلی فضا میں ایک سانس لیا پھر ہم بلیک ڈائن میں بیٹھ کر حویلی سے نکلے چلے گئے۔ امرتسر شہر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ٹریفک بھی بڑھ گیا تھا۔ میرے ساتھ پہلو میں ڈرائیونگ کرتی بائیتا ابھی تک خاموش تھی۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ میں نے بھی اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ وہ چلتی چلی گئی، یہاں تک کہ ہم ایک شاہراہ پر ملٹی پلیکس سینما کے سامنے آنے لگے۔ اس نے کار پارکنگ میں لگائی اور بولی۔

”اپنے پسٹل اور میگزین لے لو اور باہر کی طرف جا کر کھڑے ہو جاؤ، میں آ رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکلی اور پارک کرنے کے پیسے دے کر اندر کی جانب چلی گئی۔ میں کار سے نکل کر باہر آ گیا۔ شاید شو شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے کافی سارے لوگ تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئی۔ میرے پاس آ کر ایک ٹکٹ میری طرف بڑھا کر بولی۔ ”یہ رکھ، شاید کام آجائے؟“

میں نے ٹکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنی جیب میں رکھ لیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دیر تک ہم پیدل چلتے گئے۔ پھر ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے جو کچھ دیر چلتا رہا پھر ایک جگہ اس نے رکنے کو کہا۔ رکنے کی ادائیگی کر کے وہ اتر گئی۔ میں خاموش رہا۔ ہم شاہراہ پر کھڑے تھے اور روائ ٹریفک کی روشنیاں ہم پر پڑ رہی تھیں۔ بائیتا نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور ایک طرف چل پڑے۔ کچھ ہی فاصلے پر ریلوے ٹریک تھا۔ ہم اس کے درمیان میں چلنے لگے۔ تب وہ بولی تو اس کا لہجہ انتہائی سنجیدہ اور تشویش بھرا تھا۔

”دلچیت! اس ٹریک پر آگے جا کر امرتسر اسٹیشن ہے، لیکن یہ ایک بڑا جنکشن بھی ہے تو فوراً آگے جا کر یہی ایک ٹریک، کئی ٹریک میں بدل جائے گا۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر ریلوے کالونی ہوگی۔ وہاں ایک گودام ہے، جہاں سے اسلحہ بارود اور منشیات پھیلائی جا رہی ہے، اور وہ صرف اور صرف سکھوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ اطلاع ہے کہ ایک بڑی کھیپ یہاں اتری ہے، جو راتوں رات ٹرین اور ٹرکوں کے ذریعے یہاں سے نکلے گی۔ ہمیں اس کھیپ سے غرض نہیں، لیکن اس بندے سے غرض ہے جو یہاں اپنی مگرانی میں یہ سپلائی دے رہا ہے۔ اس سے کافی ساری باتیں کرنی ہیں اس لیے زندہ چاہیے۔“

”بائیتا میں نہیں جانتا کہ تم سکھوں کی کس تنظیم سے تعلق رکھتی ہو، لیکن یہاں آ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ ان تنظیموں میں لڑکیاں بہت زیادہ فعال ہیں۔ وہ زیادہ شدت سے کام کرتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر ایک طویل سانس لے کر سامنے دیکھا، جہاں کئی ٹریک نزدیک آ رہے تھے۔ وہ بولی۔

”تمہارا تجربہ ٹھیک ہے، رہی زندگی تو میں تمہیں یہ تفصیل سے بتاؤں گی۔ یہ چند لفظوں میں سمجھا دینے والی بات نہیں ہے۔“

”اوکے جیسا تم چاہو۔“ میں نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ میری توجہ بھی ادھر، نکلی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں جا پہنچے جہاں سے کچھ فاصلے پر خالی بوگیاں کھڑی تھیں۔ اگرچہ وہاں روشنی تھی لیکن ایک طرف بالکل اندھیرا نہیں مگر ملکی روشنی تھی۔ جو چھن کر آ رہی تھی۔ تبھی بائیتا نے مجھے بازو سے پکڑ کر روکا اور مجھے لے کر اندھیرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔

”وہ دیکھو وہ بوگیاں ہیں اور اس میں سامان رکھا جا رہا ہے، ایک آدمی آ رہا ہے وہ دیکھو، ایسا ہی مال انہوں نے مختلف شہروں کی طرف جانے والی ٹرینوں میں رکھا ہے۔“

”بائیتا! تم نے کہا ہے کہ یہاں کے نگران بندے کو پکڑتا ہے، ہمیں وہاں جانا ہے، یہاں سے ان کا تماشہ کیوں دکھا رہی ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ ہم اس تک یونہی نہیں پہنچ سکتے، وہ اپنے سکیورٹی کے بندوں کے درمیان وہاں موجود ہوگا اور شاید کالونی میں ہم اسے پکڑ نہ سکیں۔ وہاں سے نکلنے کے کئی راستے ہیں۔ اسے یہاں لانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اسے بیل سے باہر لانے کے لیے یہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ کیا جائے۔ وہ یہاں نہ بھی ہوا تو یہاں پہنچ جائے گا۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

”آؤ، اب جیسے میں کہوں ویسا کرنا۔“

میں نے یہ کہہ کر اندھیرے میں بڑھتا چلا گیا۔ میں نے وہاں کا ہر طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ اگرچہ ریلوے سٹیشن میں آنے کے لیے راستے مخصوص ہوتے ہیں مگر لوگ شارٹ کٹ کے لیے راستے بنالیتے ہیں۔ کالونی سے سٹیشن تک آنے میں ایک شارٹ کٹ راستہ بنا ہوا تھا جو درختوں اور پودوں کے درمیان میں سے تھا۔ چھتھی ہوئی روشنی وہاں پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک شخص وہاں سے سر پر پٹی لے کر نکلتا اور تیزی سے بوگی کی طرف بڑھتا، وہ پٹی وہاں بوگی کے دروازے پر رکھتا اور واپس پلٹ جاتا۔ اسی طرح دو تین بندے میرے سامنے سے گزر گئے تھے۔ لازمی طور پر بوگی میں لوگ موجود تھے جو سامان کو ٹھکانے لگا رہے ہوں گے۔ ان بوگیوں میں بہتیرے ایسے چور خانے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا اور بائیتا سے کہا۔

”تم کو پررہنا، اب میں دیکھتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل نکالا، سائیکلنر چیک کیا، پھر سامنے سے جاتے ہوئے بندے پر فائر کر دیا۔ ٹھک کی آواز آئی، جس کے ساتھ اس بندے کی چیخ فضا میں بلند ہوئی، جس نے سنا لے کر چر کر رکھ دیا۔ اس وقت تک ایک بندہ پٹی لے کر ریلوے لائنوں کے درمیان آ چکا تھا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے حلق سے بھی دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ہلچل مچ گئی۔ بوگی میں سے دو بندوں نے سر باہر نکال کر دیکھا، وہ دونوں باہر کی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ مگر میں نے ان کے چہروں کے تاثرات جاننے کی بجائے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے، وہ دونوں ہی کھڑکی میں لٹک گئے۔ اچانک بوگی میں سے ایک بندہ نکل کر تیزی سے بھاگا، وہ چھپتے ہوئے شارٹ کٹ راستے کی طرف جا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ کالونی میں موجود لوگوں کو صورتحال کے بارے میں بتانا چاہتا ہوگا۔ میں نے بائیتا کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا اور سٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں کئی بوگیاں کھڑی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں ان بوگیوں کی طرف بڑھا تھا اور یہ بھی اپنے حواسوں میں دیکھا تھا کہ میں ریلوے ٹریک

کے درمیان بھاگتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک میرے ارد گرد کے سارے منظر ختم ہو گئے اور یوں نیا منظر ابھرا آیا جیسے فلم اسکرین پر ایک منظر کی جگہ دوسرا منظر لے لیتا۔

وہی ہی رات تھی وہاں پر صرف بوگیاں نہیں ایک پوری ٹرین تیار تھی۔ لوگ اس میں بھرے ہوئے تھے۔ بہت سارے چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انجن سے دسل بج رہی تھی کہ اچانک شور مچ گیا۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف سے سکھوں کا ایک جھنڈ نکلا ان کے ہاتھوں میں کرپائیں، بلم لٹھیاں، توڑے دار بندو قیں، آگ لگی ہوئی مشعلیں وہ جنونی انداز میں ریلوے لائنیں پار کرتے ہوئے ٹرین کی جانب بڑھ رہے تھے۔ گالیوں کے شور میں ”جو بولے سو نہال“ سست سری اکال کے نعرے بھی گونج رہے تھے۔ پھر اچانک وحشت ناک چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ کراہیں موت کا پیغام لیتی ہوئی دردناک صدائیں، تین رونے اور کراہنے کا شور، نعرے ایک قیامت کا منظر میرے سامنے تھا۔ وحشی سکھ درندے ان مظلوموں کو بے دردی سے کاٹ رہے تھے۔ اچانک ایک بچے کو بوگی سے باہر پھینکا گیا، جسے ایک سکھ بولائی نے اپنی تلوار سے ہوا ہی میں دوکڑے کر دیا۔ میں نے وحشت، کراہیت اور بے بسی کی انتہا پر زور سے آنکھیں بھیجنے لیں۔ چند لمحوں بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ منظر غائب ہو چکا تھا اب وہی منظر میرے سامنے تھا ”بوگیاں“ سناٹا اور سنائے کو چیرتی ہوئی وحشی جذبات بھرا میرادل، جلیا نوالہ باغ کے بعد یہ دوسرا واقعہ میرے ساتھ ہوا تھا اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ نوین کور کوئی سفلی علم جانتی ہے لیکن اب تو وہ میرے نزدیک نہیں تھی ضرور یہ کچھ اور ہی معاملہ ہے کیا ہے؟ میں اس پر سوچنا چاہتا تھا، لیکن اسی لمحے ہانپتا ہوا بھٹوڑتے ہوئے کہا۔

”دلجیت! کیا ہوا تمہیں؟ تم پسینے سے شرابور کیوں ہو وہ سامنے دیکھو؟“

میں اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ میرادل میری کنپٹیوں میں بج رہا تھا۔ اور سامنے دس بارہ لوگ تیزی سے بوگی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں اسلحہ تھا۔ ”وہ درمیان والا لمبا سا سکھ جس نے سرخ شرٹ پہنی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ وہ چاہیے زندہ۔“

”فکر نہ کرو۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید میرا لہجہ بدل گیا تھا یا وہ مجھے پاگل سمجھ رہی تھی؟ ”تم صرف یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔“

”وہ ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے بوگی سے یکے بعد دیگرے فائر کرنا شروع کر دیا، تبھی انہوں نے بوکھلا کر گرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر اندھا دھند فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ میرا میگزین خالی ہو گیا تو میں نے دوسرا بدل لیا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فائر کدھر سے ہو رہا ہے۔ اس شخص کے ساتھ جتنے آئے ہوئے لوگ تھے وہ سارے ڈھیر ہو گئے تبھی اس بندے کا فون بج اٹھا اور میرے قریب کھڑی ہانپتا ہوا اسے فون ملایا تھا۔

”اگر مرد کے بچے ہو تو یہیں رک جانا، بھاگنا نہیں۔“

”اُوہ۔۔۔۔۔ یہ تم ہو بانیٹا۔“ اس نے بھاری آواز میں یوں کہا جیسے وہ اسے اچھی طرح جانتا ہو۔

”ہاں، میں نے آخر تمہیں بل سے نکال لیا نا چو ہے۔“ اس نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”اور تم کسی خارش زدہ کتیا کی طرح چھپ کر بھونک رہی ہو اپنے پیچھے کتنے کتے لگا کر لائی ہو یا وہ سارے بیچرے ہیں جو چھپے بیٹھے ہیں۔“

”صرف میں ہوں بیچرے تیری چونتوی پر آئی ہوں۔ میں تمہیں چند لمحے دیتی ہوں۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ اور ثابت کر دو گے بیچرے تم ہو، حرامی کی اولاد۔۔۔۔۔ ورنہ میں تیرے سامنے آ رہی ہوں۔“

”او۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ تیرا دیدار ضرور کروں گا“ آ جاؤ۔۔۔۔۔ آج رات تیرے ساتھ ہی آؤں۔“ اس نے گھٹیا انداز میں کہا اور ادھر

ادھر دیکھنے لگا، تبھی ہانپتا ہوا فون بند کیا اور سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

”میں نکلتی ہوں! اگر وہ فائر کرے تو اس کا اسلحہ۔۔۔۔۔ زندہ پڑتا ہے۔“

”او کے۔۔۔۔۔“ میں نے کہا اور اسے نشانے پر رکھ لیا۔

”لو۔۔۔۔۔ جارہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ بوگی سے نیچے اتر گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی، ان کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نوجوان نے اپنا پسٹل اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ تبھی ہانپتا ہوا فون بھی ویسا ہی کیا۔ دونوں آمنے سامنے آچکے تھے۔ تبھی وہ نوجوان بڑھا اور اسے اپنے شکم میں لینے کے لیے لپکا۔ ہانپتا نے زور سے گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کے ساتھ ان میں فائر شروع ہو گئی۔ بلاشبہ وہ نوجوان فائر میں ماہر معلوم ہوتا تھا۔ ہانپتا اگرچہ رہی تھی تو صرف اپنے پھر تیلے بدن کی وجہ سے۔ اس نے زور سے کھڑے ہاتھ ہانپتا کے کانڈھوں پر مارے وہ بیٹھتی چلی گئی۔ تبھی اس نے نوجوان کی ٹانگوں کے درمیان اپنا گھٹنا مارا، وہ دھرا ہو گیا، یہ لمحہ اس نے ضائع نہیں جانے دیا، اور دونوں ہاتھ باندھ کر اس کی گردن پر مارے وہ ڈکراتا ہوا ٹریک کے درمیان گر گیا، تبھی اس نے پسٹل نکال کر اس کے سر پر کھ دیا۔ اب میرا وہاں پر بیٹھنا فضول تھا۔ میں تیزی سے ان کے پاس پہنچا، میرے اندر جوش سرمار رہا تھا۔ چند لمحے پہلے دیکھا ہوا منظر میرا خون کھولا رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور سرد لہجے میں پوچھا۔

”باقی سارا شوق کہیں دوسری جگہ جا کر پورا کریں گے۔“ یہ کہہ کر میں نے پوری قوت سے اپنی کہنی اس کی کنپٹی پر دے ماری۔ وہ اگلے ہی لمحے ساکت ہو گیا۔ میں نے اسے کاندھے پر اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے ہانپتا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک طرف چل پڑی، تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ ریلوے لائن کے ساتھ ایک طرف اتر گئی۔ وہاں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جس سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک فور وہیل جیب کھڑی تھی۔ جس میں دو تین بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس نوجوان کو اس جیب میں پھینکا تو وہ چل پڑی۔ نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ہانپتا کو جیسے ہوش آ گیا، وہ تیزی سے بولی۔

”چل اب نکلیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ریلوے ٹریک کی جانب چل دی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ ہم چند قدم کے فاصلے پر موجود ٹریک کے درمیان آگے ہی چلتے چلے گئے۔ تبھی ہمیں اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، آٹھ دس لوگ بھاگتے ہوئے آ رہے تھے، ان سب کی نگاہیں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ تبھی ہانپتا کی تیز آواز سنائی دی۔

”دلجیت، بھاگو۔۔۔۔۔!“

میں نے اس ایک لمحے میں ماحول کا جائزہ لے کر فیصلہ کر لیا، اور پھر بھاگتے ہوئے ریلوے ٹریک سے باہر نکل گیا۔ ریلوے ٹریک اور سڑک کے درمیان خالی جگہ تھی، ہم دونوں اس طرف بھاگ نکلے۔ ہمارا تعاقب کرنے والے لوگ رکے نہیں، وہ بھی ہمارے پیچھے تھے۔ مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ ان کے پاس اسلحہ نہیں، درنہ اب تک فائر کر چکے ہوتے۔ ڈرانے، دھکانے یا پھر خوف زدہ کرنے کے لیے ہی سہی، میں ایک دم سے رک گیا۔ میں نے اپنی سانسون پر قابو پاتے ہوئے آنے والے لوگوں کو دیکھا۔ ہانپتا آگے نکل گئی تھی۔ تبھی میں نے بے باک انداز میں زور سے کہا۔

”رک جاؤ۔!“ یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل نکال لیا۔ پسٹل پر نگاہ پڑتے ہی وہ سارے کے سارے وہیں رک گئے۔

تبھی میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”پہلی بات تو یہی ہے کہ ہمیں جانے دو اور تم لوگ واپس پلٹ جاؤ۔ دوسری بات، نے زیادہ ہی شوق ہے لڑنے کا تو وہ آگے آ جائے، میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لے اور اگر تم سب نے مجھ سے لڑنا ہے تو ہم ہتھیار پھینک کر اپنا زور آزمایہ لیتے ہیں۔ بولو۔“ تبھی ایک ادھیڑ عمر تو منہ شخص نے اونچی آواز میں کہا۔

”اسلحے کے زور پر تو بیچرا بھی بکواس کر لیتا ہے تم میں دم ہے تو آ میرے ساتھ بیچ لڑا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار ایک دوسرے شخص کی طرف اچھال دی۔ تبھی میں نے بھی پستل بانیٹا کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے کبچ کر لیا۔

ہم دونوں ہی چند قدم آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے سامنے آچکے تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ اچانک اس نے جھکائی دی اور میری پستل میں گھونسا ماردیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جڑے پر ہاتھ پڑا۔ اس نے ایک دم سے گھوم گیا۔ مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں نے دستار باندھی ہوئی ہے میرے سامنے ایک سکھ تھا، اس نے پورے جوش میں پکارا۔ ”جو بولے سونہال“ اس کے ساتھ ہی باقی لوگوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجھ پر پل پڑنے کے لیے بڑھے ایک طرف جہاں میرے ذہن میں آئی کہ بانیٹا بھی سکھ ہے وہ سکھ ہی کی مدد کرے گی، لیکن میری نگاہوں کے سامنے چند لمبے پہلے کا منظر پھر گیا۔ ایک دم سے موت کی طرف لے جاتیں درد بھری کراہیں گونج گئیں۔ نکلے ہوتے بچے کا خیال آیا تو پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا میں نے پوری قوت سے دونوں ہاتھ باندھے اور اس کی ٹھوڑی پر مارے۔

وہ آواز کی آواز کے ساتھ اچھلا اور دور جاگرا۔ تب تک بانیٹا نے فائر کر دیا تھا۔ باقی وہیں رک گئے۔ مجھ پر جنوں سوار ہو گیا۔ اس بے غیرت نے اسے مذہبی لڑائی بنا دینا چاہا تھا۔ میں نے جاتے ہی پاؤں کی ٹھوکرا اس کے منہ پر دے ماری اور اس کا ناک پھل دیا۔ وہ ڈار کا رتا ہوا اسٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا، پھر ایک زوردار ٹھکر اس کے منہ پر ماری وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ میں نے اسے ایک لمبے کا بھی موقع نہیں دیا اور تار بڑ توڑ کے اس کے منہ پر مارے۔ وہ بے ہوش ہونے لگا شاید کسی کی جیج بلند ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن اپنی بغل میں لی اور دونوں ہاتھوں سے مروڑ دی۔ چٹاخ کی آواز آئی اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی میں نے اسے چھوڑا تو وہ یوں گرا جیسے کٹا ہوا درخت گرتا ہے۔ تبھی میں نے باتوں کو دیکھا اور انہیں اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔

اس وقت مجھ پر جنوں سوار تھا۔ مجھے لگا یہ بھی سکھ بلوائی ہیں۔ وہ میرے سامنے کھڑے مجھے تذبذب سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بانیٹا کے پاس اسلحہ ہے ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں انہیں زیادہ وقت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ فائر ہو چکا تھا جس کی آواز سے کوئی بھی ادھر متوجہ ہو سکتا تھا۔ پھر اپنے آپ کو بچانا مشکل تھا۔ اس لیے میں نے ایک جست لگائی اور بانیٹا کے پاس جا پہنچا۔ اس سے اپنا پستل لیا، جس پر سائمنلر لگا ہوا تھا۔ میں نے پستل ان کی طرف سیدھا ہی کیا تھا کہ وہ پلٹے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس شخص کی لاش وہیں پڑی رہ گئی جو گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث کچھ دیر پہلے ہی مر گیا تھا۔ میں یہی دیکھ رہا تھا کہ بانیٹا نے تیز آواز میں کہا۔

”نکلو یہاں سے۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلتا چلا گیا۔ ہم دونوں ایک مصروف سڑک پر آ گئے۔ سامنے ہی آٹور کشہ کھڑا تھا، ہم اس میں بیٹھ گئے۔ بانیٹا ہی نے اسے ملٹی پلکس سینما کے بارے میں بتایا تو وہ چل پڑا۔

تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا، وہ شہلی ہوئی اندر گئی اور پارکنگ سے کار نکال لائی۔ میں سکون سے بیٹھا تو وہ چل دی۔

”آج اگر میرے پاس بغیر سائمنلر کے پستل نہ ہوتا تو معاملہ گڑبڑ ہو جانا تھا، وہ لوگ بھاگنے والے نہیں تھے۔ اس فائر نے انہیں دہشت زدہ کر دیا۔“

”مان لیا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا، مگر یہ بتاؤ کہ اس ہیر کا کیا کرنا ہے جسے زندہ پکڑا ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ پرسکون انداز

میں بولی۔

”ہم ادھر ہی جا رہے ہیں، ممکن ہے رات ادھر ہی گزر جائے۔“

”اوکے اب دھیان سے ڈرائیونگ کرنا۔“ میں نے کہا اور یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے کسی تعاقب کا احساس تو نہیں تھا بس ایوں محتاط تھا۔ وہ عام سی سڑک تھی جس پر فٹ پاتھ نہیں تھا۔ اس سے ہم شاہراہ پر چڑھے ہی تھے کہ ہمارے ساتھ دو کاریں جڑ گئیں۔ چند لمبے تو مجھے احساس نہ ہوا اور جب ان کے تیز دیکھے تو سمجھ گیا۔ ”بانیٹا! ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔“

”مجھے بھی لگا، میں رفتار بڑھا رہی ہوں اور.....“

”رٹش میں نہ جانا۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ ایک کار نے ہمیں سائیڈ ماری، وہ سائیڈ دبا کر ہمیں روکنے کی کوشش کرنا چاہ رہا تھا۔ جبکہ یہ اس نے بہت جلدی کر دیا تھا۔ ان کی ایک کار ہمارے آگے ہوتی تو یہ گمراہ کرنا یا جاسکتا تھا۔ وہ رفتار بڑھانی چلی جا رہی تھی۔ بانیٹا ڈرائیونگ میں کافی ماہر لگ رہی تھی۔ وہ گاڑیوں کے درمیان سے زگ زگ کرتی ہوئے نکل رہی تھی۔ یہ بہت خطرناک انداز تھا، سامنے چوراہا تھا۔ جیسے ہی وہ دائیں طرف مڑی۔ وہاں سے دو مزید گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ گئیں۔ میں نے صورتحال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے بانیٹا سے کہا۔ ”انہیں ڈانچ دے لو گی یا کچھ کریں۔“

”کیا کرو گے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”کچھ بھی، لیکن تماشہ لگ جائے گا۔“ میں نے ان گاڑیوں کو تیزی سے دیکھتے ہوئے کہا، وہ مسلسل ہماری سائیڈ ماری تھیں، ایک گاڑی آگے آنے کی کوشش میں تھی۔

”کچھ بھی کر دو، ہمیں روک رہے ہیں۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے ہڈیانی انداز میں کہا۔

”تم ڈرائیونگ پر دھیان رکھنا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پستل کا بلٹ مارا اور بانیٹا کی طرف والی کھڑکی میں سے اس کار کے ڈرائیور کا نشانہ لے لیا جو سائیڈ دبا رہا تھا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ فائر ہوا تو وہ کار ایک دم سے پیچھے رہ گئی اور پھر کئی گاڑیاں لگنے کی آوازیں آئیں۔ ٹائر جڑ چرائے ہارن بجے اور شور مچ گیا۔ بانیٹا نے سائڈ صاف دیکھ کر گاڑی دائیں طرف کی تو میں نے آگے جانے والی کار کے ٹائر کا نشانہ لیا۔ یہ رسک تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور کار لڑکھڑاتی ہوئی سڑک کنارے ایک درخت سے جا لگی۔ لمحوں میں وہ پیچھے رہ گئی۔

”ہمیں یہ کار چھوڑنا ہوگی۔“ بانیٹا تیزی سے بولی۔

”چھوڑ دو۔“ میں نے کاغذ سے اچکا تے ہوئے کہا۔

”نئی گاڑی آنے تک ہمیں کہیں رکنا ہی نہیں چھپنا بھی ہوگا، یہ انہی کے آدمی ہیں جسے ہم نے اغوا کیا ہے۔“

”اس کا اتنا بڑا گینگ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”بعد میں بتاؤ گی۔“ یہ کہہ کر اس نے کار سڑک کنارے کھڑی کی اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کر کے ڈرائیونگ سیٹ سے باہر آ گئی۔ ہم بھاگتے ہوئے اندھیرے میں چلے گئے جسے بہر حال اندھیرا نہیں کہا جاسکتا تھا، وہاں الیکٹرک پول کی روشنی بہت کم تھی۔ سامنے ہی دو بلڈنگوں کے درمیان ایک چھوٹی سی سڑک تھی، ہم اس میں داخل ہو گئے۔ ہم تیز قدموں سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ کافی آگے جا کر ایک چھوٹا سا چوراہا تھا، وہاں اچھی خاصی ویرانی تھی۔ ہم اس سے بھی آگے نکل گئے۔ وہ سڑک ایک رہائشی علاقے کے بازار میں جا کھلی۔ تنگ سا وہ روایتی بازار تھا۔ کار سے نکل کر یہاں آنے تک بانیٹا اپنے میل فون سے کئی بار بات کر چکی تھی۔ جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم اس بازار میں داخل ہو کر قدرے پرسکون انداز میں چلتے چلے گئے۔ وہ ایک نسبتاً بڑی سڑک پر ختم ہوئی۔ سامنے ہی ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ بانیٹا بھاگتی ہوئی اس میں سوار ہو گئی۔

میں اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک ایسے علاقے میں ہوا جو ابھی زیر تعمیر تھا۔ وہ کسی کھنٹی کی ہاؤسنگ کالونی تھی۔ جس میں چھوٹے چھوٹے دو منزلہ گھر بن رہے تھے۔ وہ کافی وسیع علاقہ تھا۔ جس میں بڑے گھر بھی تھے۔ بلاشبہ وہ مستقبل کے لیے شاہنگ پلازہ بنایا جا رہا تھا۔ اس کی کئی منزلیں تھیں۔ اور ایسے پلازوں میں تہہ خانے ضرور ہوا کرتا ہے۔ ہم اس کار سے اترے اور میری توقع کے بعد ایک تہہ خانے میں آ گئے جہاں کافی روشنی تھی۔ وہ ”ہیر“ بندھا ہوا ایک کونے میں پڑا تھا۔ بائیتا نے جاتے ہی ایک ٹھوکرا اس کی پٹلی میں ماری اور بڑے طنز یہ انداز میں کہا

”بول اوئے تو نے سردار تو تنگھ کے خلاف سوچنے کی جرات بھی کیسے کی؟“

”اور تو اُس کی کتیا“ اب مجھ پر بھونک رہی ہو مجھے کالے گی بھی..... ہاں..... ایسا ہی ہے نا..... آؤ مجھے کالو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے انتہائی بے ہودہ انداز میں اشارہ کیا جس سے وہ پاگل ہو گئی۔ وہ اسے مارنے کو لپکی تو میں نے اسے روک دیا۔

”نہیں بائیتا نہیں! انرجی مت ضائع کرو۔“

میرے یوں کہنے پر وہ رک گئی اور خونخوار نگاہوں سے اسے گھورنے لگی تو وہ طنز یہ انداز میں بولا۔

”کیوں سالی..... یار کے کہنے پر رک گئی آؤ نا۔“

”یہ تیری ماں کا یار ہے اور تو۔“ اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں قہقہے سے بولا۔

”بس! خاموش“ پھر اس ہیر و کے قریب بیٹھ کر بولا۔ ”یہ رشتے نا طے بعد میں جوڑنا“ پہلے تو یہ بتا جو بائیتا پوچھ رہی ہے۔“

”میرے یوں کہنے پر اس نے اپنی آنکھیں میچتے ہوئے میری طرف دیکھا“ پھر بولا۔

”تجھے پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں تو ہماری دنیا کا نہیں لگتا“ کون ہے تو.....؟“

”تیری بہن کا یار ہے.....“ وہ چیختی پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”دلچیت“ یہ ایسے نہیں مانے گا کہتے کی دم ہے یہ.....

مجھے.....“ اس نے بے تابی سے کہا تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا“ پھر ہیر و کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں کوئی بھی ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ بائیتا کے سوال کا جواب تمہیں دینا پڑے گا“ تو چاہے مر بھی جائے نا..... تب بھی تیری لاش بولے گی۔“

”تو مجھے ایک دفعہ کھول دے پھر دیکھتے ہیں لاش کس کی بنتی ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔

”کچھ دیر پہلے میں نے تجھے دیکھ لیا تھا“ ایک لڑکی کے ہاتھوں پٹتے ہوئے۔ میں نے دیکھ لی تھی تیری اوقات اب بس بول دے۔“

”دلچیت! یہ سالانہ نرکاری ہے۔ امرت دھاریوں کے خلاف سب کچھ کرنا“ اس کا دھرم ہے۔ اس لیے یہ رتن سنگھ جی کے خلاف ہے۔“ بائیتا جذباتی انداز میں بولی۔

”تو پھر تمہارا سوال غلط ہے۔ تجھے تو اس سے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ یہ کس کا کتا ہے؟“

”ہاں آج کل یہ کس کا کتا ہے؟“ اس نے سکون سے کہا تو میں نے طویل سانس لی اسے میری بات کی سمجھا آ گئی تھی۔ یہ

کہہ کر وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی“ پھر بولی۔ ”بول تو آج کل کس کا کتا ہے۔“

”تو جانتی ہے کہ مجھے رتن سنگھ کو ختم کرنا ہے اپنے ہاتھوں سے مارنا ہے اسے۔ اب اگر تو نے مجھے نہیں مارا تو میں نے اسے تو مارنا ہے۔“

”زیادہ ہیر و گیری نہ کر میرے سامنے مال کہاں جانا تھا آج؟“

”اب آئی ہے مطلب کی بات پر۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہی بات تجھے پتہ کرنی ہے لیکن کیا تو نہیں جانتی دھندے کا اصول کیا ہے۔ رتن سنگھ کیا اس کا باپ بھی میرے نیٹ ورک کے بارے میں نہیں جان سکتا۔“

”تو غلط سوچ رہا ہے“ صبح تک سب کچھ تیرا سب کچھ برباد ہو جائے گا“ تیرا نیٹ ورک تو کیا تیرے غیر ملکی آقا بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ کاش تو یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہتا۔“ یہ کہتے ہوئے بائیتا نے اپنا پٹل نکال لیا۔ بہت کم لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں جیسے ہی بلٹ لگنے کی آواز آئی اس نے چونک کر دیکھا“ پھر تیزی سے بولا۔

”جب تجھے سب علم ہے تو میرے ساتھ یہ ڈرامہ کیوں مجھے وہیں شیڈ میں کیوں نہ گولی ماری تو نے؟“

”ہاں اب آیا ہے نا تو لائن پر۔“ بائیتا چپکی۔ ”تو بھی یہ بات جانتا ہے کہ امرتسر میں تیرے جتنے ٹھکانے ہیں تیرا سارا نیٹ ورک میں جانتی ہوں۔ اور مرنے سے پہلے تو یہ جان لے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ سب میرے ہوں گے۔ تیرا وہ اسلحہ تیری وہ منشیات ہمارے لوگوں پر استعمال ہونے والی تھی اب وہ تمہارے لوگوں پر ہوگی۔“

”یہ صرف تیری بکواس ہے وہاں لوگ چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہوئے۔“ وہ انتہائی غصے اور بے بسی کے عالم میں یوں بولا جیسے اس بات کا اسے بہت دکھ ہوا ہو۔

”جی..... جی..... ہائے.....! کاش تم یہ دیکھنے کے لیے زندہ ہوتے۔ خیر! اس پورے علاقے میں اگر راج ہوگا تو صرف سردار رتن سنگھ جی کا اور پھر تیرے جیسے نرکاری سانپ تو میں ویسے ہی بڑے شوق سے مارتی ہوں۔ اب سن میں نے جو پوچھنا ہے اگر تو آرام سے بتا دے گا تو پھر تجھے موت بڑے سکون کی ملے گی“ بس ایک فارزاد تو پار نہیں بتائے گا تو تیرا ریشہ ریشہ بولے گا۔ بہت اذیت دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے بائیتا نے اس کے بال پکڑ لیے اور انہیں جھنجھوڑتی ہوئے بولی۔ ”بول“ تیرا وہ غیر ملکی آقا کون ہے تھائی لینڈ کے شہر پتایا میں لوئیسیٹر ہوٹل کے کمرے میں کیا ڈیل ہوئی۔“ یہ سوال کرتے ہوئے غصے کی شدت سے بائیتا کی آواز پھٹ گئی تھی۔ تب وہ حیرت کی انتہا پر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ت..... ت..... تم..... اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”اپنی آزادی کی جنگ گھر بیٹھ کر نہیں لڑی جاتی“ آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔ امرتسر ایک پوتر استھان ہے جہاں تم جیسے بے غیرت آگ اور خون کی ہولی ایک بار پھر سے کھیلنا چاہتے ہو پہلی بار ہر مندر صاحب پر حملہ سکھوں کی بے خبری میں ہو گیا“ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تیرے جیسے نرکاری بے غیرت ہندو بیٹے کے ساتھ اس قدر گھٹیا پس پراثر آئیں گے کہ معصوم لوگوں کا قتل عام کریں گے اب نہیں اب ہم جاگ رہے ہیں..... بولو..... بولو دور نہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے پوری قوت سے گھونسا اس کے سینے پر دے مارا۔ وہ کھانسنے لگا۔ ”نکال اس سینے میں جو کچھ ہے نکال.....“ وہ جنونی انداز میں بولی اور دو چار گھونے پھر مار دیئے“ تجھی وہ کھانستے ہوئے بولا۔

”تو اگر اپنے لیے اتنا جذباتی ہو سکتی ہے تو پھر میں کیوں نہیں..... تو دے اذیت..... میں برداشت کر لوں گا۔“ اس نے انت بھینچتے ہوئے بائیتا کی طرف دیکھ کر کہا“ یہی وہ لمحہ تھا“ جب میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

”بائیتا! تم جاؤ اور جا کر اپنے آپریشن کو دیکھو“ لوگ اس کے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اس پر وقت ضائع نہ کرو یہ تو ماری رات باتیں کرتا رہے گا“ میں دیکھتا ہوں اسے.....“

میرے یوں کہنے پر بائیتا نے کہا۔

”تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں ٹھیک کہتے ہو تم..... اسے زیادہ وقت نہیں دیتا۔“

میں نے پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور اس کے سینے پر ایک لکیر کھینچ دی خون کی دھار سے خنجر کی نوک لتھر گئی وہ دردناک انداز میں چیخا۔

”مجھے مار دو..... مار دو مجھے.....“

”وقت گزر گیا ہے.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر خنجر کی نوک اس کے گال میں چھو دی وہ ترپنے لگا، چند لمحے اسی طرح خنجر رہنے دیا، پھر نکال کر دوسرے گال میں پیوست کر دیا۔

”کھڑے کر دو اس بہن.....“ بانیٹا نے غصے میں غلیظ گالی دی تو وہ جیج اٹھا۔

”وہ بٹاک کا اسلحہ ڈالتا تھا، امریکہ سے آیا ہے، یہ اسلحہ..... اس میں..... را..... ملوث ہے۔“

”اتنی بڑی کھپ کیوں آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”سکھ خفیہوں کے وہ لوگ مارنے ہیں..... جو شدت پسند ہیں۔“ اس نے پوری قوت لگا کر کہا۔

”آزادی کے متوالے کہاوئے بے غیرت۔“ وہ جنونی انداز میں چیخی اور اس کی ٹانگوں پر فائر کر دیا۔

اس کی چیخیں حلق میں انک کر رہ گئیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ تبھی اس نے پٹیل کی نال سیدھی کی اور فائر کر دیا وہ ایک ہنگی لے کر اس جہان سے کوچ کر گیا۔

”ابھی اس سے مزید۔“

”سارا پتہ ہے بس تصدیق چاہیے تھی کہ رطلوٹ ہے کہ نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے وہاں موجود دونوں بندوں سے لاش غائب کر دینے کا اشارہ کیا اور تہہ خانے سے نکلتی چلی گئی۔ اب ہمارا وہاں پر کوئی کام نہیں تھا۔ سامنے گاڑی کھڑی تھی، ہم اس میں بیٹھے اور چل دیے۔ میں سڑک پر آتے ہی بانیٹا بولی۔

”تم یہ جانتا چاہتے تھے نہ کہ سکھ حریت پسند تحریکوں میں لڑکیاں اتنی فعال کیوں ہیں؟ تو سنو سن چوراہی سے چھپا سی تک سکھ قوم پر ہی نہیں، سکھ نوجوانوں پر بہت بھاری تھا، لڑکا، نوجوان اور جوان سب کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ وہ لڑکیاں جو آج اٹھائیس سے تیس سال کے درمیان ہیں، انہوں نے اپنے بھائیوں کو مرتے دیکھا، ان کے لاشے دیکھے، ان پر مین کئے ہیں، اب اگر لڑکا گولی چلا سکتا ہے تو لڑکی کیوں نہیں، میں نے اپنے بھائیوں کے لاشے خود دیکھے ہیں۔ جنہیں انڈیا فورس نے مارا، ان بے غیرت نرکاریوں کی سازش کی وجہ سے۔“

”لیکن نسل آگے بڑھانے کے لیے بچے کون پیدا کرے گا۔“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بہت ہیں اور بہت پیدا ہو رہے ہیں۔ پہلے یہ خیال تھا کہ بیٹے کا بیٹا پیدا ہوتا ہے تو ایک نئی دکان کھل جاتی ہے اور جٹ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو زمین تقسیم ہو جاتی ہے۔ اب ایسی سوچ نہیں ہے، اپنا وطن خالصتان ہوگا تو زمین بھی اپنی ہوگی۔“ اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”تمہیں نہیں لگتا کہ یہ تحریک سازشوں میں گھری ہوئی ہے؟“

”سازشیں کب اور کہاں نہیں ہوئیں دلجیت۔ ہماری صفوں میں بھی کئی ایسے لوگ ہوں گے جو ہماری خرابی کے آقاؤں کو دیتے ہوں گے، جیسے ہمارے لوگ ہمیں ”را“ کی خبر دے دیتے ہیں۔ تم شاید تصور نہیں کر سکتے ہو جس قدر ہماری نسل کشی یہاں کی گئی ہے، خیر..... ہم نے تو لڑنا ہے اپنا وطن حاصل کرنے تک لڑتے رہیں گے۔“ اس نے کہا اور پوری توجہ سڑک پر لگادی۔ حویلی پہنچنے تک ہمیں تقریباً گھنٹہ لگ گیا۔ ایک تو فاصلہ تھا، دوسرا اس وقت ٹریفک اچھی خاصی تھی جو پرانے شہر میں ہی زیادہ تھی۔ پورچ میں گاڑی رکھتے ہی وہ بولی۔

”دلجیت تم چلو اپنے کمرے میں، وہیں آتی ہوں میں، فریش ہو جاؤ اس وقت تک۔“ اس نے کہا اور اپنا سیل فون نکالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اس وقت تک میں فریش ہو کر بیڈ پر پڑائی دی دیکھ رہا تھا، وہاں پر کسی قسم کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب تو یہ ممکن نہیں تھا کہ

پولیس یا دیگر فورسز کو معلوم نہ ہو۔ ریلوے سٹیشن میں اتنا بڑا ہنگامہ چھپ نہیں سکتا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا جبکہ میری نگاہیں ٹی وی اسکرین پر تھیں کہ بانیٹا اندر داخل ہوئی۔ اس نے سیلوپس ٹی شرٹ کے ساتھ شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں بلیک کلر کی ہلکی سی چپل تھی، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ لڑکی بیڈ پر پڑے پڑے تھک گئی ہے اور اکتاہٹ دور کرنے کے لیے اٹھ کر آ گئی ہے۔ وہ بڑے بے تکلفی سے میرے ساتھ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ تو میں نے اپنی سوچ کا اظہار کر دیا۔

”یہ خبر ٹی وی چینل پر کیا، کسی اخبار میں بھی نہیں آئے گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جس کام میں ”را“ ملوث ہو اور وہ خبر نہ دینا چاہیں تو وہ عوام تک نہیں پہنچتی۔ ہم نے جو کیا وہ تو کچھ بھی نہیں اس کے علاوہ بہت کچھ ہو چکا ہے۔“

”کیا ہو چکا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہماری ہی طرح چار گروپ اور تھے جنہوں نے اس نیٹ ورک کے اڈوں کو تباہ کیا ہے، بہت سارا اسلحہ ہاتھ لگا ہے جو اب تک امرتسر سے باہر نکل چکا ہوگا۔ ہمارے چھ بندے کام آگئے ہیں اور لگتا ہے ایک آدھ اور جائے گا، بہت زخمی ہے وہ یہ ہم ہی خوش قسمت ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں ہوا۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ کسی ٹورنامنٹ کے بارے میں بات کر رہی ہو، تبھی میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں جو تمہارے ساتھ تھا، اس لیے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔“

”بے شک..... تو ساتھ تھا، تیرے نشانے بازی بڑی کمال کی ہے دلجیت! رتن بابا یونہی اپنے گرد رتن نہیں رکھتا، اس میں کچھ ہوتا ہے تو ہی قریب آنے دیتا ہے۔ میں نے جان لیا ہے کہ تم میں بہت کچھ ہے۔“ اس نے غماز آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، آخری لفظوں میں اس کے چہرے پر اچھی خاصی سرخی آ گئی تھی۔

”اتنا بڑا ہنگامہ ایک رات ہی میں۔“ میں نے اس کا دھیان کسی دوسری طرف لگاتے ہوئے کہا۔

”ہوں..... ایک ہی رات میں.....“ دراصل ان کی فیلڈنگ تو قریباً تین ماہ سے جاری ہے۔ شری جرنیل سنگھ جھنڈا نوالہ کے مشن کو زندگی دینے کے لیے، بہت کام ہو رہا ہے۔ اسے بہت زیادہ خفیہ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ آخر عوام میں بات لانی تھی۔ اب اس بار ”را“ کو معلوم ہونا ہی تھا۔ انہوں نے بھی اپنی پیش بندی کی ہے اور یہ فقط اسلحہ اکٹھا کرنے کی حد تک نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ کام کر رہا ہے۔ غیر ملکی لوگ اس میں ملوث ہیں۔ انہوں نے تو اپنا اسلحہ فروخت کرنا ہے۔ صرف پیپسی کوکا کولا کی اجازت مانگنے کے لیے بھارت کو انہوں نے بہت کچھ دیا، تو پھر اسلحے کی بڑی مارکیٹ ہے، خیر..... ایسے میں تمہاری آمد کے بارے میں معلوم ہوا تو ایک دم سے پلان آسان ہو گیا۔ ہمیں ماہر نشانہ باز چاہیے تھا، وہ مل گیا، اور وہ مشکل ترین ٹارگٹ آسانی سے مل گیا۔ اور.....“ یہ کہتے کہتے وہ رکی پھر بد لے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور اب تم میرے پاس ہو۔“

”وہ تو ہوں اب تیرے پاس، لیکن یہ پلان کیسے کیا؟“ میں نے یونہی بات بڑھائی۔

”اصل میں ریلوے سٹیشن والا مرکز تھا، وہی سب سے اہم تھا، ہم صرف دونوں وہاں پر نہیں تھے۔ ہمارے ارد گرد لوگ تھے۔ جیسے ہی ہم ”ہیرو“ کو اغوا کر لیتے، انہوں نے اس جگہ پر دھاوا بول دیا۔ ان کے سارے بندے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ تم خود سوچو، اگر وہاں ماہر نشانہ باز نہ ہوتا تو صورت حال کیا ہوتی۔ بہت زیادہ فائرنگ ہونا تھی اور بندے بہت ضائع ہونا تھے اور پھر جب ان کی گاڑیاں ہم پر چڑھ گئی تھیں.....“ اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”اور کس طرح کام ہو رہا ہے؟“

”مثلاً فلموں کے ذریعے پنجابی کلچر بلکہ سکھ ثقافت کو سامنے لایا جا رہا ہے۔ شاید اس طرف دھیان نہ جاتا، لیکن ان نرکاریوں نے اپنی فلموں کے ذریعے سکھ عوام کا ذہن بدلنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اب امرت دھاریوں

سے رتن دیپ سنگھ بھی آ گیا۔ ان کے بیٹھے ہی ایک سفاری سوٹ والے ادھیڑ عمر نے کہا۔

”رتن دیپ سنگھ جی! جب ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ کسی بھی قسم کی کوئی کارروائی سے پہلے ہم دونوں ایک دوسرے کو مطلع کریں گے تو میں اسے کیا سمجھوں۔“

”سمجھنا کیا ہے معاہدے کی خلاف ورزی تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ اسلحے کی اتنی بڑی کھیپ آئے اور ہماری ناک کے نیچے سے نکل بھی جائے، ایسا کیسے ممکن ہے۔“ رتن دیپ سنگھ نے سکون سے کہا۔

”دیکھیں ہم نے کاروبار تو کرتا ہے اس میں آپ کے کسی بندے کو نقصان نہیں پہنچا، آپ کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا، آپ کا روبرو کرتے ہیں، ہم تو کوئی مداخلت نہیں کرتے۔“

”یہ اسلحہ تم نے کن لوگوں کو فروخت کیا ہے؟ اسی سے تمہاری نیت کا اندازہ ہوتا ہے، کن کے خلاف استعمال ہوتا ہے، تم اس سے بھی بخوبی واقف ہو۔“ رتن دیپ سنگھ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ تبھی ایک دوسرے شخص نے کہا۔

”سردار جی! اس کھیپ کی ذیل تو یہ کر رہے تھے، لیکن اس میں ملک کا مفاد ہے۔“

”سیدھا کیوں نہیں کہتے کہ اس میں راہبھی ملوث ہے۔ تو یہ راکس کو مارنا چاہ رہی ہے۔ عوام کے ہاتھ میں اسلحہ دے کر آپ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سیدھے فورسز انہیں کیوں نہیں مار دیتی، جیسے پہلے چوراسی میں مارا تھا۔ اور پھر آپ میرے پاس کیوں آ گئے ہیں۔ یہ سب سننا.....“ اس بار وہ سخت لہجے میں بولا تھا تو ایک تیسرے شخص نے رعب و آواز میں انتہائی بے رخی سے کہا۔

”بانتا! اور اس کے ساتھ ایک نوجوان، وہ ہمیں یہاں لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے قتل کیا، وہ ہمیں حویلی میں ہیں، ہم انہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ ہمارے پاس سرچ وارنٹ ہیں اور.....“

”لگتا ہے تم پولیس میں نئے آئے ہو یا تمہارا تبادلہ حال ہی میں یہاں ہوا ہے۔ اگر بانتا نہ ملی، اور وہ نوجوان جس کا تم ذکر کر رہے ہو یہاں نہ ملے تو پھر؟“ رتن دیپ نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ وہ ایک لمحہ کوتاہی کا شکار ہو گیا۔ تبھی پہلے والا شخص بولا۔

”رتن سنگھ جی! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ شہر میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا ہے، ہمیں اوپر جواب دینا ہے، کیا کہیں گے انہیں؟ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں۔“

”میں یہ کہہ رہا ہوں میرے بھائی کہ میں اس معاملے کو سرے سے نہیں جانتا، کون ہے کس نے کیا ہے یہ سب؟ آپ بانتا کے بارے میں کیوں کہہ رہے ہیں۔ وہ دودن سے یہاں نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو حویلی کی تلاشی لے لیں، پھر اس کے بعد کیا ہوگا، یہ تم لوگ جانتے ہو۔ آپ لوگوں نے اوپر کیا جواب دینا ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اب آپ بتائیں کہ ناشتہ کیا کریں گے۔ انگریزی والا یا.....“ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا تو پولیس آفیسر کے ساتھ بیٹھے ایک شخص نے کہا۔

”دیکھیں سردار جی! ہم رکن اسمبلی ہیں۔ ہم نے سیاست کرنی ہے، اگر ملکی مفاد اس میں شامل نہ ہوتا تو شاید میں ان لوگوں کی بات بھی نہ سنتا، اگر یہ کسی گروپ کی لڑائی ہوتی تو بھی مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ آپ بانتا اور اس نوجوان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ اس نوجوان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے بات اگر بڑھی.....“

”تو بڑھنے دیں بات رام دیال بابو! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میں نے مانا کہ ہم نے سیاست کرنی ہے، لیکن لاشوں پر یا خون کی ہولی کھیل کر نہیں کرنی گندی سیاست۔ بانتا کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے تو نہیں ہے، اور میں کسی نوجوان کے بارے میں نہیں جانتا۔“ رتن دیپ نے کہا تو وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، پھر ان

کو بھی اس کے مقابلے پر آنا پڑا۔ دراصل نرنگاری یہ چاہتے ہیں کہ سکھوں میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جولا نے مرنے کی طاقت ہے جو جذبہ ہے، وہ ختم ہو جائے۔“ وہ کہہ رہی تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ جس طرح مرزائیوں کا طبقہ اسی مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا کہ وہ جذبہ جہاد کو ختم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ انگریزوں کے وفادار مرزائی یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اندر سے جہاد ختم کر دیں۔ اب بھلا یہ ممکن تھا؟ ”اب تم دیکھنا، صرف بھارتی پنجاب میں ہی نہیں، پاکستانی پنجاب کے علاوہ پوری دنیا کی مارکیٹ میں ان فلموں کی نمائش ہوگی، اس طرح لٹریچر پر صحافت میں اور بہت جگہوں پر کام ہو رہا ہے۔“

”اوکے! اب میرا خیال ہے کہ میں بہت تھک گیا ہوں، سونا چاہتا ہوں، تم بھی سو جاؤ۔“

”یار تو واقعی ایسا ہے یا میرے ساتھ کر رہا ہے۔ تجھے عورت سے دلچسپی نہیں، شراب تم نہیں پیتے، تمہارا کھانا پینا بھی اتنا زیادہ نہیں ہے جتنے کیسے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”سمجھ لو کہ ان کے استعمال سے پاکیزگی نہیں رہتی، ان کے قریب نہ جانا ہی دراصل میری قوت ہے، آج میں ان کا استعمال شروع کر دوں، کل ایک چوہے کی طرح، مسل دیا جاؤں گا۔“ میں نے یوں سنجیدگی سے کہا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی، پھر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

”مطلب، کوئی اتنا شہتی کا معاملہ لگتا ہے۔ چل ٹھیک ہے، سو جا، پر مجھے جاگنا ہے۔ جب تک یہ سب معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔“

”اوکے! میری ضرورت ہو تو فوراً جگا لینا۔“ میں نے کہا اور لیٹ گیا۔ وہ اٹھ کر چل دی۔ میں نے بھی لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کمرے کے تلکے اندھیرے میں کوئی مجھ سے ذرا فاصلے پر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں چند لمحے یونہی پڑا رہا، پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑا ایمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ سامنے بانتا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”تم سوئی نہیں ہو؟“

”نیند ہی نہیں آئی، ویسے بھی اب صبح ہونے والی ہے اور.....“ یہ کہہ کر وہ ڈرامائی انداز میں رکی، میں خاموش رہا تھا تو وہ بولی۔ ”کچھ لوگ آ رہے ہیں رتن سنگھ بابا سے ملنے کے لیے۔ ممکن ہے وہ گھر کی تلاشی بھی لیں۔ اس لیے تمہیں تھوڑی دیر کے لیے گارڈ یا کوئی اور..... مثلاً ملازم بننا ہوگا، جس نے خاموش رہنا ہے، ہم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے، کیونکہ وہ رات سے حویلی کی نگرانی چاروں طرف سے کر رہے ہیں۔“

”ارے تمہارے لیے تو میں ملازم کیا، ملنگ بن کر بھی گلیوں میں گھوم سکتا ہوں، مجنوں صحرا کی خاک چھان سکتا ہے، رانجھا جوگی بن سکتا ہے، فرہاد.....“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ ہنسنے ہوئے حیرت سے بولی۔

”اور خیر تو ہے..... تم ٹھیک تو ہوتا، میں نے تو رات ہی سمجھ لیا تھا کہ تم جوگی ہو اب کیا ہو گیا۔“

”میں نے خواب میں دیکھا، تم دریا میں غوطے پر غوط کھا رہی ہو اور ڈوب.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنسنے ہوئے بولی۔

”بس کرو..... اور اب اٹھ جاؤ.....“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکلتی چلی گئی۔

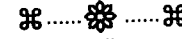
میں پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی اور میں ڈرائنگ روم کے باہر دروازے پر کھڑا تھا۔ پورچ میں یکے بعد دیگرے کئی گاڑیاں رکیں اور ان میں چند لوگ اندر آ گئے۔ دروازے پر کھڑے گارڈ نے انہیں روک لیا، جہاں ان کی تلاشی لی گئی۔ پھر انہیں آگے آنے دیا گیا۔ وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اندر چلے گئے، تبھی دوسری طرف

”وہ نوجوان غیر ملکی ایجنٹ ہے اس کے شواہد مل چکے ہیں وہ یہاں ہی نہیں، مدن لعل کیس میں بھی ملوث ہے آپ بائیتا کو بچانا چاہتے ہیں تو بچالیں مگر وہ نوجوان ہمیں دے دیں، کچھ تو فائلوں کا پیٹ بھرے گا۔“

”میں نے کہا تھا آپ ناشتہ کیا کریں گے۔“ رتن دیپ نے بے رخی سے کہا۔

”ٹھیک ہے سردار جی، پھر ہم سے کوئی گلہ مت کیجیے گا۔ آپ نے بھی تو یہیں کاروبار کرتا ہے۔“ اس پہلے والے شخص نے اٹھتے ہوئے کہا، جس پر سردار رتن دیپ سنگھ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اٹھا بھی نہیں اور نہ ہی انہیں الوداعی کلمات کہے، بس انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا، وہ سارے لوگ میرے قریب سے ہو کر باہر نکلتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد پورج سے گاڑیاں اشارت ہونے کی آواز آئی اور پھر فضا خاموش ہو گئی۔ میری پوری توجہ ان کی طرف تھی۔ اس لیے مجھے احساس ہی نہیں ہوسکا کہ رتن دیپ سنگھ کب میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے میرے کانہ سے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرنا، میں جب تک ہوں کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے کہا تو میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مسکراتا ہوا اندر کی جانب چلا گیا۔



میوزک کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بائیتا کو رات بھر لباس میں آگے آگے جا رہی تھی۔ اپریس شرٹ جو گھٹنوں سے ذرا اوپر تک تھی سیاہ مگر چمکتی ہوئی، برہنہ پنڈلیاں، سیاہ سینڈل پال کھلے اور تیز میک اپ کے ساتھ سیاہ چرمی بیگ، وہ امرتسر کا مہنگا ہاتھ تھا، جہاں امیر ترین گھروں کے لڑکے لڑکیاں تفریح طبع کے لیے آتے تھے۔ اس وقت بھی وہ باروم بھر ہوا تھا۔ نشے میں مدھوش زیادہ تر نوجوان میوزک پر ناچ رہے تھے۔ کچھ لوگ میزوں کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر جام ہی لٹھہارے تھے۔ ہم دونوں ایک خالی میز کے ارد گرد بیٹھے ہی تھے کہ انتہائی مختصر لباس والی ویٹرس آن ٹپکی۔ بائیتا نے آرڈر دے دیا۔ یہاں آنے سے پہلے ہم میں یہ طے ہو گیا تھا کہ میں شراب نہیں پیوں گا اور نہ ہی وہاں پر گوشت سے بنی کوئی شے کھاؤں گا۔ اس کا صلہ مجھے بائیتا نے یہی بتایا کہ وہ جیتی رہے گی تم صرف سوڈا پینا اور نشے کی ادکاری کرنا آگے وہ سنبھال لے گی۔ مختلف رنگوں کی روشنیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ بائیتا محتاط نگاہوں سے ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھی جبکہ میں کسی تھوڑے سا عاشق کی طرح اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ جس وقت ہم کار میں بیٹھ کر حویلی سے نکلے تھے اس وقت میری نگاہیں اس کے بدن میں الجھ گئی تھیں مگر اگلے ہی چند لمحوں میں خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھ لیا کہ ہم کس مقصد سے باہر جا رہے ہیں، جہاں اتنا رسک ہے، ابھی صبح ہی وہ لوگ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔

”یہی تو معلوم کرنا ہے کہ وہ ہم پر ہاتھ ڈالتے ہیں یا آج ہونے والے معاہدے کی پاسداری کرتے ہیں۔“

”معاہدہ.....؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”ہاں، رتن بابا اور یہاں کے کرائم کنگ کے درمیان اس نے راکو ضمانت دی ہے۔ معاہدہ یہ طے پایا ہے کہ وہ عوام میں اسلحہ نہیں پھیلانے کے اور نہ ہی کوئی ایسی اشتعال انگیز مہم چلائیں گے جس سے سنگھ شدت پسند بھڑک اٹھیں۔ جبکہ رتن بابا نے انہیں مکمل چھوٹ دے دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ان شدت پسند کو گرفتار کر لیں لیکن اس ثبوت کے ساتھ کہ وہ بھارت کے خلاف کچھ کر رہے ہیں۔“

”مطلب رتن دیپ سنگھ سیاسی اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اسی لیے تو فوراً اس پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، اب تک یہ ہندو بیٹے رکے رہیں۔“

”بس اس مقصد کے لیے باہر نکلتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! اک پریمی جوڑے کو دیکھنا ہے وہ کیسا ہے، ہوسکا تو کچھ دیر ان کے ساتھ گزار لیں گے۔“ بائیتا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

اس وقت وہ اس پریمی جوڑے کو تلاش کر رہی تھی۔ ویٹرس ہمارے سامنے کافی کچھ رکھ گئی تھی۔ بائیتا نے اپنے لیے جام بنایا اور مجھے صرف سوڈا ڈال کے دے دیا۔ میرے سامنے سلا تھا، میں وہ کھانے لگا۔ اچانک اس کا چہرہ ساکت ہو گیا اور وہ یک ننگ دیکھنے لگی۔ چند لمبے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

”مل گئے وہ جو سرخ اسکرٹ والی لڑکی ہے، جس نے بلیک لائٹ شو ز پہنے ہوئے ہیں، شو لڈر کٹ بال اور اس کے ساتھ والا لڑکا، دونوں ناچ رہے ہیں۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”انہیں اپنا مہمان بنانا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دوسرا پیگ بھی اپنے گلے میں اٹھ لیا۔ وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ وہ یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانے پینے کی طرف بھی متوجہ رہی، اچانک وہ اٹھی، میرا ہاتھ پکڑا اور ان ناچنے والے جوڑے کے درمیان جا پہنچی۔ اس نے مجھے اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب میں نے اس کے بدن پر لگے پرفیوم کی تعریف کی تھی۔ وہ نشے میں تھی اور رومانٹک موڈ کی بھرپور ادکاری کر رہی تھی۔ وہ ناچتے ہوئے بالکل ان کے قریب چلی گئی اور ایک دم ان سے ٹکرائی جس سے وہ دونوں لڑکھڑاکر گئے، سبھی بائیتا نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی بولی۔

”سوری..... سوری..... ویری سوری.....“ یہ کہتے ہوئے وہ انہیں اٹھانے لگی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تب تک میں لڑکے کو اپنا ہاتھ دے چکا تھا، وہ میرا سہارا لے کر اٹھ گیا۔ تو بائیتا بولی۔

”نہیں، غلطی میری تھی۔“

”اوکے، میں نے کہا تھا کوئی بات نہیں۔“ وہ لڑکی کافی حد تک حیرانگی سے بولی تو بائیتا نے اس کی گردن میں اپنی ہاتھیں حائل کرتے ہوئے کہا۔

”تم بہت اچھی ہو، مگر میں اس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گی، جب تک تم میرے ساتھ ایک پیگ نہیں لے لو گی۔ تم اور تمہارا فریڈ، میرے ساتھ ایک ایک پیگ۔“

”اوکے۔“ لڑکی نے کانہ سے اچکاتے ہوئے کہا، وہ سمجھ گئی تھی کہ سامنے والی نشے میں دھت ہے۔ یونہی نہیں جان چھوڑے گی۔ وہ تینوں باریک جانب بڑھ گئے اور میں میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں انہی کی طرف تھیں۔ انہوں نے وہاں سے بوتل لی اور ایک طرف لگے صوفوں پر جا بیٹھے۔ وہ مجھے یوں بھول گئے تھے جیسے میں ان کے ساتھ ہوں ہی نہیں، دفعتاً ایک لڑکی میری جانب بڑھی اور بڑے خمار آلود لہجے میں بولی۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں بیٹھو۔“ میں نے کہا تب تک ویٹرس ہمارے قریب آ گئی۔ اس نے بل رکھا، جسے میں نے ادا کر دیا۔ وہ وہاں سے سب کچھ سمیٹ کر لے گئی۔

”کچھ پینے کی آفر نہیں کرو گے؟“ اس نے کمال ادا سے کہا، جس سے بڑے بڑے لڑھک جائیں۔ وہ آدھے سے زیادہ بدن سے برہنہ تھی۔ میں فوری طور پر نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے، پہلا خیال یہی تھا کہ وہ کوئی کال گرل تھی، جو اپنے گاہکوں کی تلاش میں ادھر آ بھٹکی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جو کچھ بھی لینا چاہو، لے سکتی ہو، بل میں دے دوں گا۔“

میرے یوں کہنے پر وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگی، جیسے میں نے اس کی توقع کے برعکس کچھ کہہ دیا ہو۔ چند لمحے یونہی بیٹھی رہی، پھر بولی۔

”کیا تمہیں مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی؟“

”نہیں کیونکہ جو شے میری نہیں، میں اس پر نگاہ نہیں رکھتا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔
”تم دلچسپ سنگھ ہو یا جو بھی ہو، بھاگنے کی کوشش مت کرنا، تم نے آج ہی حویلی سے نکل کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ بھاگنا چاہو گے بھی تو بھاگ نہیں پاؤ گے۔ بہت سارے لوگ تیرے انتظار میں ارد گرد کھڑے ہیں۔“ اس کے لہجے میں طنزیہ آمیز نفرت تھی۔ تب میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، نہیں بھاگوں گا، لیکن کیا تم مجھے اپنا تعارف کرانا پسند کرو گی؟“

”ہم اندھیروں کے راہی ہیں مسٹر دلچسپ سنگھ، ہمیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارا تعارف کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بالوں کو سینے کے انداز میں اشارہ کیا۔ میں نے بڑے سکون سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”پھر میری بھی ایک شرط ہے، جب تک تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گی، مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا پاؤ گی۔“

”واؤ..... اتنا اعتماد ہے تمہیں خود پر..... اٹھو..... اور چلو میرے ساتھ، ورنہ میرے ایک اشارے پر تیری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”تو لے جاؤ مجھے، اگر تم میں بہت ہے تو تعارف کے بغیر تو میں جانے والا نہیں“ میں نے بھی اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی جو اسے غصہ دلانے کے لیے کافی تھی۔ بلاشبہ اس نے اشارہ کیا تھا، اس لیے دو لمبے ترنگے نوجوان ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھانا چاہا، اس نے میرے بدن کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر زور سے جھٹک دی۔ وہ میز پر گر گیا، میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پر گھونسنے دے مارا۔ تب تک دوسرے نے کھڑی ہتھیلی میرے سر پر ماری جس سے میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ دوسری بار اس نے میرے منہ پر گھونسنے مارنا چاہا تو میں نے بازو سے پکڑ کر اسے بھی میز پر گرادیا۔ سبھی دونوں ہاتھ باندھے اور اس کی گردن پر دے مارے وہ اوخ کی آواز کے ساتھ وہیں لڑھک گیا۔ اچانک سامنے سے تین نوجوان تیزی سے بھاگتے ہوئے آئے اور آتے ہی مجھ پر پل پڑے۔ میں نے کرسی چھوڑ دی تھی۔ پھر کرسی کو گھمایا وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئے تو میں نے ایک کو گردن سے پکڑا، جبڑے پر گھونسنے مارا، تب تک میری پسلیوں پر ٹھوکر پڑ چکی تھی۔ ایک نے مجھے پیچھے سے قابو کیا۔ میں نے اپنا سارا وزن اس پر ڈالا اور اپنی لات گھما کر سامنے والے کو ماری، وہ چھ تھے، چھٹی لڑکی تھی، جو چیخ چیخ کر انہیں ہدایت دے رہی تھی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، ہمارے لڑنے کا شور مچ چکا تھا۔ سیکورٹی گارڈ ہماری طرف بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے یا تو ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دینا تھا یا پھر پولیس کے حوالے کرنا تھا۔ میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ سیکورٹی گارڈ نے ہمیں الگ الگ کیا اور ہانک کر باہر لے جانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا، جیسے ہی ہم باہر آئے، انہوں نے بغیر کچھ کہے ہمیں سڑک پر دھکیل دیا۔ اب وہ میرے سامنے تھے اور میں اکیلا۔ مجھے بائیکا کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب تک کیا کر رہی ہے؟ کیا وہ اب تک نشے میں دھت ہو کر حواس کھو بیٹھی ہے؟ وہ چھ کے چھ میرے سامنے تھے۔ پانچ مرد اور ایک لڑکی، بائیکا اندر ہی کہیں مصروف تھی۔ میری نگاہیں ان حملہ آوروں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے گھیرے میں لینے کے لیے دائرہ بنا رہے تھے۔ میں نے لمحے میں سوچا اور اگلے قدموں چھپے بیٹھے ہوئے دوڑ لگا دی۔ تبھی وہ میرے پیچھے بھاگے۔ میں ایک دم ٹھرنے لے کر سڑک کے درمیان میں چلا گیا۔ ان میں

سے دوسرے برابر چڑھ آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر وار کرتے، میں آگے بڑھا اور پوری قوت سے گھونسنہ ایک کے چہرے پر دے مارا، وہ لڑکھڑایا تب تک دوسرے نے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے، میں نے انہیں پکڑا اور جھٹک دیئے، وہ منہ کے بل سڑک پر گر گیا، میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پر پاؤں مارا، وہ سڑک سے چپک گیا۔ سامنے والا میری طرف لپکا، میں نے اس کی ٹانگوں کے درمیان پیر مارا، وہ دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن اپنی بغل میں لی اور جھٹکا دیا، ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ بے دم ہو گیا۔ میں نے اسے پھینکا ہی تھا کہ وہ چاروں میرے مقابل آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالتور تھا۔ شاید وہ گاڑی میں سے ریوالتور لایا تھا، یا پہلے ہی اس کے پاس تھا۔ اس نے ٹوک کر کہا۔

”رک جاؤ، ذرا سی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔“

میں ایک دم سے ٹھٹک کر رک گیا۔ اب میرے لیے جانے فرار نہیں تھی لیکن سامنے کے ہاتھ میں کھلونا دیکھ کر مجھے ذرا سا اطمینان ہوا تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور اُسی کے لہجے میں بولا۔

”تم کون ہو، اور ایسے کیوں بد معاشی کر رہے ہو؟“

”بہت ہو چکا دلچسپ! تم نے بائیکا کے ساتھ بہت مونی کر لی، اب ذرا ہمارے مہمان بنو۔“ ان میں سے ایک نے کہا تو میں نے پورے اعتماد سے پوچھا۔

”میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟“

”چور کے چور..... اور سپاہی کے سپاہی..... تمہیں کیا چاہیے؟“ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں بتاتی ہوں کہ تم کون ہو؟“ ان کے پیچھے سے بائیکا کی آواز آئی تو انہوں نے چونک کر دیکھا، وہ پٹن لیے کھڑی تھی، یہی ایک لمحہ تھا میں نے چھلانگ لگائی اور ریوالتور والے پر جا پڑا، اس کا ریوالتور چھینا تو ہم دونوں سڑک پر جا گرے۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے وہیں پڑا رہ جاتا، میں نے انہیں کور کر لیا تھا۔ ”دلچسپ! انہیں باندھ دیا پھر گولی مار دو۔“

بائیکا کے اس ”حکم“ میں یہی تھا کہ انہیں محض ڈرانا ہے، باندھنے یا گولی مارنے کی منطق عجیب سی تھی۔ میں نے ریوالتور میں گولیاں چپک کیں، پھر ان کی طرف سیدھا ہی کیا تھا کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”تمہارے آقا ہمیں ہمارے گھر میں آ کر دھمکیاں دیں اور تم لوگ ہمیں بیچ سڑک کے گھیرو..... اور پھر ہم جانے دیں۔ ارے میں رتن بابا کو کیا جواب دوں گی؟ یہ کہتے ہوئے اس نے فائر کرنا شروع کر دیا۔ وہ نچلے دھڑ میں گولیاں مار رہی تھی۔ میں نے بھی سڑک پر پڑے دونوں کی رانوں میں گولیاں اتاریں اور بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلے پر ہماری گاڑی کھڑی تھی، میں نے پچھلا دروازہ کھولنا چاہا تو بائیکا تیزی سے بولی۔ ”آگے..... دلچسپ آگے بیٹھو۔“

میں نے دیکھا، پچھلی سیٹ پر وہ جوڑا بے ہوش پڑا تھا۔ جیسے ہی گاڑی چلی تو میں نے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟ کیسے کیا تم نے؟“

”بس ایک ذرا سی نشیلے پاؤں کی چٹکی اور یہ غنغوں..... یہ سارے اس کے سیکورٹی گارڈ تھے۔ میں تو کب کا انہیں لے کر یہاں گاڑی میں ان کے بے ہوش ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”یہ سب اس وقت ہوا، جب سیکورٹی والوں نے تم لوگوں کو دھکے دے کر بار سے باہر پھینکا۔“

”یہ تم نے بیان کیا تھا؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... میں نے اور اگر میں تجھے بتا دیتی تو پھر نہ تم ایسے لڑتے اور نہ ہی اس میں فطری پن ہوتا، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں ہوگا کہ ان پرندوں کو اغوا کس نے کیا ہے؟“ اس نے تہقیر لگاتے ہوئے کہا تو میں نے

مسکراتے ہوئے داد دینے والے انداز میں کہا۔

”واقعی بانیٹا! تمہاری کھوپڑی میں شیطان کا دماغ ہے۔“

”لیکن تم ہو کہ میری صلاحیتوں کا فائدہ ہی نہیں اٹھا رہے ہو ظالم۔“ اس نے آنکھ مارتے ہوئے غماز آلود لہجے میں کہا تو میں نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے صلاح دی۔

”دھیان سے گاڑی چلاؤ۔“

چونکہ مجھے امرتسر کی سڑکوں کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا اس لیے خاموشی سے دیکھتا رہا کہ وہ کدھر جاتی ہے، کچھ دیر بعد جب وہ اندرون شہر جانے کی بجائے شہر کے باہر والے راستے پر ہوئی تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بانیٹا! کدھر۔۔۔۔۔ کدھر جا رہی ہو کیا ارادے ہیں؟“

”بابا کے ایک دوست ہیں، ہم اُن کے فارم ہاؤس پر جا رہے ہیں اکثر وہیں جاتے ہیں۔ اب پتہ نہیں ان پرندوں کے لیے کتنے دن لگ جائیں۔ سو ہم ادھر رہیں گے۔ انہیں ہم نے اغوا کیا ہے اور اس کے عوض بہت کچھ ان سے لینا ہے۔“

”بہت کچھ۔۔۔۔۔ کتنی رقم۔۔۔۔۔“ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”اونہیں بابا! رقم نہیں لینا، کچھ دوسری ڈیل کرنا ہے۔“ اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔

تقریباً ایک گھنٹہ مسلسل ڈرائیونگ کے بعد ہم امرتسر شہر سے باہر ویرانے میں آ گئے۔ میرے خیال میں وہ ترن تارن کی طرف جانے والا راستہ تھا جس سے اتر کر ہم ذیلی سڑک پر آئے تھے پھر اس کے بعد کافی دیر ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک فارم ہاؤس میں جا پہنچے۔ وہ ہمارے انتظار میں تھے۔ پھانک کھلا تو وہ پورچ میں نہیں رکی بلکہ آگے چلتی چلی گئی۔ کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر چلتے ہوئے اچانک سرکنڈے آ گئے۔ ویران سی جگہ جیسے جنگل ہو اس کے درمیان درخت اور تین جھونپڑیاں تھیں وہاں جا کر یہی لگتا تھا کہ جیسے ہم کسی فارم ہاؤس کے درمیان میں نہیں بلکہ کسی جنگل میں آ گئے ہیں۔ ان تینوں جھونپڑیوں کے پاس اس نے گاڑی جا روکی، پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔

”دلچسپ! ان پرندوں کو اتارنے میں مدد کرو۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا اور پہلے لڑکے کو اٹھایا اور اسے جھونپڑی میں ڈالا، پھر لڑکی کو لانے کے لیے مڑا تو اسے بانیٹا اٹھا کر لے آئی۔ اس نے آتے ہی جھونپڑی میں موجود لائٹن جلائی، پھر تھیلے سے لائٹ نکال کر بولی۔

”اب ان کا ذرا دھیان رکھنا، میں یہاں قریب ہی میں گاڑی کھڑی کر کے آئی۔“ یہ کہہ کر میری سنے بغیر وہ پلٹ گئی۔ گھاس پھوس اور دھان کی ”پرانی“ کا ڈھیر تھا جس پر ان دونوں کو لٹایا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کو کیوں اغوا کیا گیا ہے جو مقصد بھی ہوگا سامنے آ جائے گا، لیکن ان لوگوں کو چھپانے کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ بہت لا جواب تھی۔ بالکل ہی جنگل کا ماحول لگتا تھا۔ میں اس بندے کی سوچ کو داد دے رہا تھا جس کے ذہن میں ایسا خیال آیا تھا۔ انسان کیسا ہے چند فٹ کے فاصلے پر یا پھر اگلے لمحے کے بارے میں نہیں جانتا، ایسی ہی اوٹ پٹانگ سوچیں میرے دماغ میں پھر رہی تھیں کہ بانیٹا واپس آ گئی۔ اس نے لائٹ کا رخ ان دونوں کی طرف کر دیا۔

”ارے! ان دونوں کو ہوش میں نہیں لائے، تھیلے میں پانی تھا یا۔“

میں نے تھیلا کھولا، اس میں سے پانی کی بوتل نکالی اور پھر ان دونوں کے منہ پر چھینے مارے۔ وہ کسماتے ہوئے اٹھ گئے۔ تبھی لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم کہاں ہیں؟“

”ہم جنگل میں ہیں اور تم دونوں کو ہم نے اغوا کر لیا ہے۔ چپخنے، چلانے، شور مچانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا، بھانگنا چاہو گے تو ارد گرد بہت سارے درندے ہیں چیر چھاڑ کر کھا جائیں گے۔ سو تم وہی کرو گے جو ہم کہیں گے۔ لہذا سکون سے سو جاؤ۔“ بانیٹا نے اسے کہا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تبھی لڑکے نے پوچھا۔

”کون لوگ ہو تم، اور کیوں کیا ہے ہمیں اغواء؟“

”بچے، تمہارا سوال فضول نہیں ہے، تمہیں یہ پوچھنے کا پورا پورا حق ہے لیکن تمہارے ان دونوں سوالوں کا جواب تمہارے باپ کو دینا ہے، بلکہ انہیں بتانا ہے کہ ہم کون ہیں اور تم دونوں کو کیوں اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس لیے کوئی سوال مت کرو، سکون سے سو جاؤ، نہیں نیند آتی تو اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ وقت گزارو اور اگر دماغ میں کسی قسم کا کیڑا آیا تو میں وہ ریوالور کی گولی سے نکال دوں گی، سمجھو۔“ بانیٹا نے بظاہر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تھا مگر لہجے میں سفاک پن پوری طرح موجود تھا۔ اس نے تھیلے میں سے ٹن پیک سوڈا نکالا اور اس کی طرف پھینک دیا، پھر لڑکی کی طرف اور ایک مجھے دے کر اپنا ٹن کھول لیا۔ تبھی لڑکے نے ٹن واپس پھینکتے ہوئے کہا۔

”اتنا تو میں جانتا ہوں کہ تم لوگ پاپا کو بلیک میل کرو گے، لیکن یہ نہیں جانتے کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں مر گیا، تب تمہاری کوئی۔۔۔۔۔“ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ بانیٹا نے اپنا ٹن کھینچ کر اس کے منہ پر مارا، جو اس کے ماتھے پر لگا، اس کے ساتھ خون نکل آیا۔

”ارے بھڑوے کی اولاد، تو نے کیا مرنا ہے، میں تجھے خود مار دوں گی، چل اٹھ۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی، ریوالور سیدھا کیا تو لڑکی چیخ پڑی۔

”بھگوان کے لیے ایسا مت کرنا دیدی، میں سمجھا لوں گی اسے۔۔۔۔۔ آپ پلیز۔۔۔۔۔“

”دیکھ تیری گرل فرینڈ تیرے ساتھ کتنی محبت کرتی ہے، چل سو جا، صبح بات کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نیا ٹن نکالا اور پینے لگی۔

ہم دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ ذرا دور راندھیرے میں ایک درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”یہ کیا ڈرامہ ہے بانیٹا! لگتا ہے لمبی پلاننگ کی ہوئی ہے تم نے؟“

”شاید تمہارے ذہن میں ہو جس نے صبح بتایا تھا کہ وہ ”را“ ہے، وہ اس لڑکے کا باپ ہے۔ اس بے غیرت نے کچھ جگہوں پر چھاپے مارے ہیں اور اسلحہ سمیت بندے پکڑ لیے ہیں۔ اس کا رتن بابا سے مطالبہ ہے کہ مجھے اور تجھے اس کے حوالے کر دے۔ اب سمجھو، سیدھا سیدھا ”را“ کے ساتھ معاملہ ہو گیا ہے۔“

”وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی اور اس کے وسائل۔۔۔۔۔ رتن دیپ سنگھ، وہ کیا کر پائے گا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں، اس نے تو کچھ بھی نہیں کرنا، بس اب مختلف تنظیمیں حرکت میں آئیں گی، اگر ”را“ واقعتاً ان کے ساتھ لڑنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے، ہم تو پہلے ہی حالت جنگ میں ہیں اب ”را“ جو مرضی کرے، وہ جو چنگاریاں اب شعلہ بننے جا رہی ہیں انہیں آگ لگانے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ اب ہماری منزل صرف اور صرف خالصتان ہے اور بس۔۔۔۔۔“ بانیٹا نے یوں کہا جیسے وہ اپنا سب کچھ وار چکی ہے۔

”ان کے ساتھ ڈیل کیسے ہوگی فون کے ذریعے وہ ہماری لوکیشن کا اندازہ۔“ میں نے کہا تو وہ تھل سے بولی۔

”ڈیل کہیں اور ہو رہی ہے، ہمیں بس اتنا حکم ملنا ہے مار دو یا چھوڑ دو، بس۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ تنے پر لیٹ گئی۔ اس کا سر میری ران پر تھا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ میرے لیے ایک لڑکی نہیں، حریت پسند تھی، آزادی چاہنے والا کوئی بھی ہو، میں اس کی دل سے قدر کرتا تھا۔

”اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو تم سو جاؤ“ میں جاگ رہا ہوں اور ان کا..... میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”مجھے نیند نہیں آتی دلچیت“ نجانے کتنے سال ہو گئے ہیں نیند کو ترس گئی ہوں۔ تیرے سامنے شراب بھی پی ہے بس خمار سا آتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔“

”کیوں ہے ایسا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جب بھی سوتی ہوں تو میرے خواب میں میرے دیر میری ماں اور میرا پوتا ان سب کی لاشیں صحن میں پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور میں ان کے پاس بین کر رہی ہوتی ہوں.....“ وہ جذباتی لہجے میں بولی پھر ایک دم چوکتے ہوئے بولی۔

”دیکھو وہ (غلیظ گالی دیتے ہوئے) باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے فوراً اس طرف دیکھا تو وہ لڑکا جھوپڑی سے باہر کھڑا تھا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اسے یہ خیال ہی نہیں تھا کہ لائین کی چھتی ہوئی روشنی اس پر پڑ رہی ہے۔ میں بے آواز قدموں سے بڑھا وہ لڑکا تیز قدموں سے چل پڑا تھا۔ میں نے پیچھے سے جا کر پکڑ لیا۔ تبھی اس نے ایک زوردار گھونسا میرے جڑے پر مارا بلاشبہ لڑنے کے فن سے آشنا تھا اور پھر اس وقت وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری پسلی میں گھونسا مار دیا۔ میں ایک قدم لڑکھا گیا۔ وہ پورے جوش سے میری طرف بڑھا۔ اس نے جھکائی دی اور کھڑا ہاتھ میرے کاندھے پر مارا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ میں نے اس کی گردن دبوج لی پھر یونہی اوپر اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارا۔ تین چار ٹھوکروں ہی سے وہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ میں اسے گھینٹتا ہوا جھوپڑی میں لے آیا۔ میں نے تھیلے میں سے سی ٹنگائی اور اسے باندھ دیا۔ لڑکی یہ سب دیکھتے ہوئے تھر تھرا کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے بھی باندھا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تبھی بائیتا نے اندر آ کر کہا۔

”دلچیت تم سو جاؤ“ میں جاگ رہی ہوں۔“

میں وہیں گھاس پھوس پر سیدھا ہوا پھر کچھ دیر بعد پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کہاں ہوں۔



وہ رات اور اگلا دن گزر گیا۔ اس جوڑے کا دم ختم نکل چکا تھا۔ لڑکی تو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ لڑکے نے دوپہر کے بعد بائیتا سے مار کھائی تو تب سے پرسکون تھا۔ تھیلے میں پڑی خشک خوراک اور سکٹ کھاتے ہوئے وہ دن گزرا تھا۔ اس وقت مغرب ہونے کو تھی اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ جب بائیتا کا فون بول اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے پھر اسٹیکر آن کر کے بولی۔

”ہوں بولو کیا بات ہے؟“

”ان دونوں کو چھوڑ کر تم لوگ آ جاؤ“ لیکن حویلی میں نہیں۔“ کسی مرد نے بھاری آواز میں کہا۔

”خیریت تو ہے نا..... ذیل.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ہو گئی ہے سب بندے آ گئے ہیں پراسٹھ نہیں وہ سب رتن بابا کے پاس بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے انہوں نے حویلی کے باہر کیا پورے شہر میں فلیڈنگ کرنی ہے۔ اس لیے تم لوگ نکلؤ ان پرندوں کو دوسرے لوگ ترن تارن میں چھوڑ دیں گے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”اوکے بندے بھیجو۔“ بائیتا نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”لے بھی دلچیت ہمارا یہ آپریشن کامیاب رہا“ لیکن اس سے بڑھ کر ہمارا حویلی جانا کسی مشن سے کم نہیں ہے۔“

”مگر وہ تو کہہ رہا ہے کہ حویلی نہیں.....“ میں نے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”تم دیکھنا ہم حویلی ہی جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کچھ دور پڑے ان دونوں کے پاس چلی گئی۔ کچھ دیر ان سے اتنی کرتی رہی تبھی دو، نو جوان آتے ہوئے دکھائی دیے۔ بائیتا نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہاں سے پیدل چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک شید کے تلے کھڑی گاڑی تک جا پہنچے۔ یہ وہ نہیں تھی جس پر ہم آئے تھے بلکہ دوسری تھی جس پر امرتسر شہر کے مضافات میں پہنچتے ہوئے ہمیں کافی رات ہو گئی۔

ہم بڑے سکون سے باتیں کرتے ہوئے آئے تھے۔ جس میں ایک بات جو میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ جب ”را“ کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ساری کارروائی کے پیچھے رتن بابا ہے تو پھر اب تک وہ اس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈال رہے تھے یہی بات جب میں نے بائیتا سے پوچھی تو وہ بولی۔

”را، کو تو بہت دیر سے معلوم ہے اور میری فائل تیار ہے“ لیکن وہ اس لیے ہاتھ نہیں ڈال رہے کہ رتن بابا کوئی ایک خاص تنظیم سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے پیچھے بہت ساری تنظیمیں ہیں رتن بابا کو وہ چھپڑیں گے انہیں ختم کر دیں گے یا جیل بھیج دیں گے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا رتن بابا آ جائے گا۔ کام تو چلے گا، لیکن اس دوران ان کا کتنا نقصان ہوگا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ ہر بندہ کوئی نہ کوئی ذاتی مفاد رکھتا ہے کون کیا ہے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ہماری منزل ایک دم منزلہ پرانا سا گھر تھا جس کو اچھی طرح سجایا ستورا ہوا تھا۔ بائیتا نے کار باہر ہی کھڑی رہنے دی اور ہم اندر چلے گئے۔ اس گھر میں کافی سارے لوگ تھے۔ پورا خاندان آباد تھا۔ ہم کچھ دیر ان کے پاس رہے پھر ایک کمرے میں چلے گئے جو قدرے ہٹ کر آخری سرے پر تھا۔ وہ کمرہ پرانی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ بائیتا نے کچھ چیزیں ادھر ادھر کیں پھر فرش کو دبا کر ریٹنگ والا ڈھکنا اندر کی طرف کر دیا۔ وہاں ایک خلا بن گیا۔ مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ نیچے اتر گئی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زیر و پاؤر کے بلب روشن تھے۔ ہم سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں چلتے چلے گئے۔ تقریباً فرلانگ بھر چلے ہوں گے کہ ہمیں سیڑھیاں دکھائی دیں اس پر چڑھے اور ایک کمرے میں نکل آئے۔ وہ حویلی ہی کا ایک کمرہ تھا۔

”مطلب..... وہ گھر حویلی کے کچھواڑے تھا؟“ میں نے تصدیق چاہی تو بائیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اپنے کمرے میں گیا فریش ہوا اور لمبی تان کر سو گیا۔

اس صبح میں معمول کے مطابق جلدی اٹھ گیا۔ میں خوب جی بھر کر فریش ہوا سفید کرتا اور پا جامہ پہنا۔ میں صوفے پر بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا کہ حویلی کے ملازمین میں سے ایک نے آ کر مجھے بتایا کہ اوپر چھت پر رتن دیپ سنگھ میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں فوراً ہی اٹھ گیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو رتن دیپ سنگھ کے ساتھ ایک اور بوڑھا سنگھ بیٹھا ہوا تھا جو مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے میز مختلف کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ تب رتن دیپ سنگھ نے بڑشوق نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”دلچیت سنگھ جی یہ ہمارے بہت ہی محترم گلیانی پرونت سنگھ جی ہیں۔ یہاں بڑی مدت بعد تشریف لائے ہیں جب میں نے تمہارے بارے میں بتایا تو بڑے شوق سے ملاقات کرنا چاہی۔“

”آپ کے لیے محترم ہیں تو میرے لئے بھی سر آنکھوں پر میں حاضر ہوں جی۔“ میں نے ادب سے کہا تو اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر مجھے دعائیں دیں پھر بولے۔

”انسان گلیان دھیان بھگوان اور نروان..... یہ سب ایک مالا میں سمجھو موتی جس کے آخری سرے پر پہلا سرا آن ملتا ہے۔ پہلا اور آخری سرا ملتا ہے تو سبھی ایک ہو جاتا ہے۔ بندہ رب رب کرتا ہے جبکہ رب اس کے پاس ہوتا ہے۔ رب کو پانے کے لیے اپنی تلاش کرنا پڑتی ہے واہ گرد کی مہر ہے تم پر تیرے مقدس کا ستارہ بڑے عروج پر ہے۔ تو بھی کسی گلیانی

”باباجی! مجھے تو ان باتوں کی سمجھ ہی نہیں ہے کہیں میں اور کہاں گیان شاید وقت نے مجھے انسان بننے کی بھی مہلت نہیں دی۔ ورنہ یوں درندوں کی طرح دنیا کے اس جنگل میں نہ بھٹکتا۔“ میں نے اپنی طرف سے بڑی عاجزی سے کہا۔

”جو چیز جتنی نایاب ہوتی ہے اتنی ہی مشکل سے ملتی ہے بڑی شے چھوٹے برتن میں تو نہیں سما سکتی نا۔ تم نہ سمجھو لیکن سمجھانے والے تو مجھے سمجھا رہے ہیں۔ تیرا وقت شروع ہو گیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کب تو نچاتے نچاتے خود ناچنے لگتا ہے۔“ گیانی نے یہ لفظ کہے تو مجھے روہی کے بابا یاد آ گئے جنہوں نے مجھے قلمند ہونے کے بارے میں کہا تھا۔ میں چونک گیا، کچھ کہنا چاہا تو گیانی مسکرا کر بولے۔ ”ارے بیٹا! ابھی تجھے نچانا نہیں آیا ابھی تو خود ناچنا سیکھ رہے ہو پھر کہیں جا کر نچاؤ گے اور پھر تیرا قفس شروع ہوگا اور قفس بھی ایسا کہ تیرا اپنا ہو گا اسی دے گا اس زمین پر اپنا نشان ثبت کرے گا۔ کیونکہ شہید کا لہو جب تک زمین پر نہیں گرتا، گواہی مکمل نہیں ہوتی۔“ گیانی نے انتہائی جذب میں کہا تو میں پھر بات نہیں کر سکا۔ وہ شاید مستقبل کی پیشگوئی کر رہا تھا یا پھر کوئی اور ہی اشارے دے رہا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ”چلو، میں تمہیں ایک دوسری بات سمجھاتا ہوں، ہر مندر صاحب، واہ گرو کی مرضی ہے اس کا پوتر استھان ہے لیکن لاہور سے بلایا گیا، حضرت میاں میر بالا پیر کو، انہوں نے سنگ بنیاد رکھا، اینٹ جان بوجھ کر اٹھائی رکھی۔ پتہ ہے تمہیں اس واقعے کا؟“

”جی معلوم ہے۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”ہوا یوں کہ مستری نے جلدی سے وہ اینٹ اکھاڑ کر سیدھی کر دی۔ جس پر گرو ارجن نے بہت افسوس کیا کہ اب یہ ہر مندر بننا ہی رہے گا، اب اس کے جتنے بھی معنی نکلیں میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے اس خطے میں سکھ اور مسلمان ہی وہ قومیں ہیں جو ایک رب کو مانتی ہیں۔ مسلمان کہتا ہے اللہ واحد اس کا کوئی شریک نہیں، سکھ کہتا ہے اک وانکار بس رب ہی ہے۔ گرو کو تب پتہ تھا کہ آنے والے وقت میں سکھوں کو مسلمانوں کی مدد کی ضرورت رہے گی۔ ان کے بغیر نہیں چل سکتے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو انہی سکھوں کی وجہ سے ہوگی۔ اور وقت نے ثابت کیا۔ تقسیم مسلمان نہیں ہم ہوئے ہیں۔ جنم استھان پاکستان میں تو ہر مندر صاحب بھارت میں۔ اس میں سراسر بے وقوفی اس دور کے سکھ لیڈروں کی تھی۔ جب تک سکھ، مسلمان کے ساتھ مخلص نہیں ہوگا تب تک اس پر یونہی عتاب نازل ہوتا رہے گا۔ یہ واہ گرو کی مرضی ہے۔ یہاں بھارت میں سکھوں نے قتل عام کیا، کسی نے پوچھا تک نہیں پاکستان میں کسی سکھ کو کوئی نقصان نہیں ہوا حالانکہ مہاجرین کے ساتھ جو سلوک سکھوں نے کیا اس کی نفرت تیسری نسل تک منتقل ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر رتن دیپ سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”بابا، یہ تیرا مہمان ہے، سیوا کر اس کی۔ اور جو تیرا دل کرتا ہے کر یہاں تیری طرف کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے گا بھی نہیں۔“

”میں نے کیا کرنا ہے جی، گرو جو حکم دیں گے۔“ رتن دیپ نے احترام سے کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”جمال پتر! کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لے مجھ سے۔“ گیانی نے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں ایک لمحے کے لیے چونک گیا۔ کیا رتن دیپ نے اسے میرا نام بتا دیا تھا۔ میں نے رتن دیپ سنگھ کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ ابھی ان لمحات میں مجھے خیال آیا کہ میں ان سے جلیا نوالہ باغ اور اتر مر جگشن پر ہونے والی کیفیت کے بارے میں پوچھ لوں، لیکن نجانے کیوں لفظ منہ پر آتے ہی رک گئے۔ میں باوجود کوشش کے اس سے پوچھ ہی نہیں سکا۔ اتنے میں باغیا آ گئی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، آٹھل گئے میں تھا، اسی رنگ کا جوتا کھلے بال اور حسب معمول میک اپ سے بے نیاز چہرہ۔ اس نے آتے ہی فتح بلائی اور بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تو رتن دیپ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ کھانے کے بعد جب برتن اٹھا دیئے گئے تو پھر سے گپ

شب ہونے لگی۔ رتن دیپ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں بھارت میں پنڈت اور پروہت جو طاقت رکھتے ہیں شاید ہی کوئی ان جیسی طاقت رکھتا ہو۔ بڑے سے بڑا سیاست دان، بزنس مین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کی آشرवाद کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ ان میں سے بہت سارے جرم کی دنیا کے ڈان ہیں۔ جیسے ممبئی میں بال ٹھا کرے ہے اور اس جیسے ہر شہر میں موجود ہیں جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ ہو یا کوئی دوسری خصوصی فورس ہو کسی بھی شعبہ کی خفیہ ہوا ان میں تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو خود جرائم پیشہ ہیں اور انہی ڈان کے آلہ کار ہیں، دوسرے وہ جو صرف پیسہ اور طاقت کی زبان سمجھتے ہیں اور تیسری قسم محبت وطن لوگوں کی ہے جو اپنے پیسے سے مخلص ہیں۔ یہ تیسری قسم بہت کم ہے، ایودھیا کا واقعہ ہو یا گجرات کا۔ یہ پہلی اور دوسری قسم کے لوگوں کی وجہ سے ہوا۔ یہ ساری تمہید میں نے اس لیے باغی ہے کہ تمہیں بتا سکوں کہ یہاں رہتے ہوئے تم نے جو کچھ کیا ان میں محبت وطن کم اور ڈان لوگ زیادہ شامل ہیں۔ جرم کی یہ دنیا فقط اس ملک تک نہیں، پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ خیر، ایسا ہی ایک آشرم اس شہر میں بھی موجود ہے۔ جس کا سربراہ ایک پنڈت ہے، یوگی مشہور ہے اس کا گردہ پنجاب میں پھیلا ہوا ہے، منشیات سے لے کر اسلحہ پھیلانے تک اور لڑکیوں کی سنگٹنگ میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔“

”کیا کرنا ہے اس کے ساتھ۔“ میں نے اتنی طویل تمہید سے اکتاتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے سارے نیٹ ورک کی تفصیل باغیا کے کمپیوٹر پر ہے، وہ وہاں سے سمجھ لیتا۔ اس پنڈت کے خفیہ رازوں تک پہنچ کر اس کا راز فاش کرنا ہے، اور اس کی اصل طاقت دو لوگ ہیں انہیں ختم کرنا ہے، وہ ویسے ہی ختم ہو جائے گا۔“ رتن دیپ سنگھ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”کیا وہ سکھوں کے خلاف ہی کام کر رہے ہیں یا؟“

”ہی، ہمارے لیے یہی اہم نکتہ ہے۔ وہ جرم کی دنیا میں بہت کچھ کرتے چلے جا رہے تھے، لیکن ہم نے انہیں کچھ نہیں کہا لیکن اب پورے پلان کے ساتھ جس میں ”را“ کی پوری آشرवाद شامل ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ مختلف جگہوں پر چھوٹے چھوٹے اڈے بنا کر انہیں جنسی ماحول فراہم کیا جاتا ہے اور وہیں سے سکھ لڑکیوں کو ورغلا یا جاتا ہے۔ ان میں ترکاری سکھ پوری طرح ملوث ہیں۔“ اس نے تفصیل بتادی تو میں نے باغیا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”چلو دکھاؤ تفصیل کیا ہے پھر پلان کرتے ہیں۔“

”پلان تو میں نے کر لیا ہے، مزید تم بتا دینا، آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

میں پہلی بار اس کے کمرے میں گیا تھا۔ کمرے کی ترتیب اور سجاوٹ دیکھ کر میں اس کی نفاست کا قائل ہو گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیڈ پر بیٹھ چکی تھی اور میں اس کے ساتھ بیٹھ کر اسکرین پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ آشرم کی پوری تفصیل بتانے کے بعد اس نے ایک تصویر دکھائی جس میں ایک بوڑھا سفید ریش، مونچھیں اور لمبے بالوں اور سرخ چہرے والا دکھائی دیا۔ اس کے گلے میں مالائیں اور پیلے رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

”یہ پنڈت دیارام ہے اس آشرم کو چلانے والا اور مالک۔“ یہ کہہ کر اس نے دوسری تصویر دکھائی۔ ”یہ پرکاش بادل عرف بجوا ہے۔“ تیسری تصویر دکھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیپ کا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور بولی۔

”یہی نکون ہے جس پر یہ آشرم چل رہا ہے۔ یہ تینوں بہت سفاک ہیں اور.....“

”پلان کیا ہے تمہارا؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”پرکاش اور دیپ کا کوڑا دیا جائے۔ یہ دونوں آشرم سے باہر ہوتے ہیں زیادہ تر اندر کا انتظام دیپ کا کے ذمے ہے اور

باہر کا پرکاش دیکھتا ہے۔“ وہ پوری سنجیدگی سے بولی۔

”اب تک کیوں نہیں اڑا سکے انہیں۔“

”یہ تمہیں ہی نہیں چڑھتے صاف بات یہ ہے تینوں اکٹھے نہیں ہوتے فون پر رابطہ ہے ایک کو ماریں گے تو باقی الٹ ہو جائیں گے۔ پھر ابھی تک براہ راست تو ٹکراؤ نہیں تھا۔ اب پتہ چلا کہ اسلحے کی اس ساری گیم کے پیچھے ان لوگوں کا ہاتھ ہے۔ وہ رتن بابا کو ٹریپ کرنا چاہ رہے تھے۔ اب تو انہیں مارنے کا حق بنتا ہے۔“ اس نے کہا تو میں چند لمحے سوچتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم ایسے کرو جاؤ کچن میں اور چائے بنا کر لاؤ اپنے ہاتھوں سے اُٹھو۔“

”تمہیں چائے چاہیے نا وہ ابھی آ جاتی ہے۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”میں تمہارے ہاتھ کی پینا چاہتا ہوں لیکن خدارا ابھی اس میں زہر مت ملوانا میں ابھی تمہارے بہت کام آنے والا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ زیر لب گالی بکتی ہوئی اُٹھ کر چلی گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور دوبارہ آشرم سے متعلق جو فلمیں تھیں وہ دیکھیں ایک نقشہ تھا اسے سمجھا اور پھر نیٹ کھول کر اپنا ای میل باکس دیکھا۔ روہی کی طرف سے کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے بند کیا تو وہ چائے لے کر آ گئی۔

”یہ لو اس چائے میں خلوص بھی شامل ہے ہمارے روسیے کا۔“

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم سے ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہوگا۔ اب یہ چائے تم پیو۔“ میں نے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

”تیار ہو کر میرے کمرے میں آ جانا دیوارم کے آشرم چلیں۔“

”ابھی۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ابھی۔“ میں نے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

دو پہر ڈھل رہی تھی جب ہم جالندھر روڈ پر موجود آشرم جانے والی سڑک پر مڑے۔ حویلی سے چلتے وقت میں نے بائیں کو پلان بتا دیا اور جو ضروری مدد چاہیے تھی اس کا اظہار بھی کر دیا۔ سو دو گھنٹے کے اندر اندر سارا انتظام ہو گیا تھا۔ کچی سڑک آشرم کے بڑے سارے گیٹ پر ختم ہوئی جہاں سے دائیں اور بائیں سڑکیں نکلی تھیں۔ سفید رنگ کے گیٹ پر کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کے اوپر ہندی میں بڑا سا ”اوم“ لکھا ہوا تھا۔ گیٹ کے باہر پارکنگ تھی جس پر ایک بندہ موجود تھا۔ بائیں نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور پھر اتر کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ خاصی بڑی عمارت تھی جس کے کئی حصے تھے۔ تھوڑا چلنے کے بعد ایک چھوٹا سا فوارا تھا جس کے گرد سڑک گھومتی تھی اور وہیں سے چاروں طرف چھوٹی سڑکیں جاتی تھیں۔ ایک طرف یتیم خانہ تھا ہاسٹل تھا لڑکیوں کا چھوٹا سا ہسپتال تھا رہائشی حصہ اور پھر دیوارم کی اصل عمارت تھی۔

ہال نما کمرے میں کافی سارے لوگ موجود تھے۔ جن میں نو جوان لڑکیاں سیوا کے لیے پھر رہی تھیں۔ دراصل وہ وہاں کی سیکورٹی گارڈ تھیں۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک کاؤنٹر تھا جس پر دیوارم سے ملنے کی وجہ لکھوائی جاتی تھی اور نمبر الاٹ ہوتا تھا۔ طریقہ یہی تھا کہ لوگ یہاں سے آڈیو ریم میں جاتے جہاں دیوارم کا لیکچر ہوتا تھا اس دوران جن لوگوں کو ملنے کی اجازت ہوتی انہیں چٹ دے دی جاتی وہ وہاں رک جاتے اور اپنی باری پر دیوارم سے ملتے۔ آشرم میں صرف ایک جگہ پر سیکورٹی گارڈ چیک کرتے تھے۔ وہ بھی اس ہال کے باہر باقی ہر جگہ سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ آشرم میں ہونے والی ذرا سی ہانچل بھی کہیں نہ کہیں مانیٹر ہو رہی تھی۔ ہم نے سارا جائزہ لے لیا تو بائیں اطمینان سے بولی۔

”کیا خیال ہے آپریشن ہو جائے گا؟“

”کیوں نہیں ہوگا بس تمہارا رابطہ باہر سے ہونا چاہیے نکلنے کا راستہ ہموار ہو۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ میری آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”اس کی فکر نہ کرو وہ ہو جائے گا سب تیار ہے۔“

”تو بس میرے باہر آنے کا انتظار کرنا نہ آسکا تو خاموشی سے واپس چلے جانا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے فکر مند ہو گئی۔ پھر لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو دلچیت تم آؤ گے اور ضرور آؤ گے.....“

”زندگی اور موت کوئی بھی لکھوا کر نہیں لایا میری جان میری موت اگر یہاں لکھی ہے تو کوئی نہیں ٹال سکتا اور اگر نہیں لکھی تو کوئی مار نہیں سکتا۔ میں اگر مر گیا تو خود کو مصیبت میں مت ڈالنا۔“ میں نے آہستگی سے کہا اور ارد گرد لوگوں کو دیکھنے لگا۔

”اگر چٹ تمہارے نام نہ نکلی تو پھر میں یا اگر دونوں کے نام نہ نکلی تو.....“

”تو اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں سنبھال لوں گا بس تم باہر کا خیال رکھنا۔“ لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ آڈیو ریم میں جانے کا اعلان ہونے لگا۔ ملحقہ آڈیو ریم میں سکون سے بیٹھنے کے بعد ماحول کا جائزہ لیا۔ کافی سارے لوگ تھے۔ سامنے اسٹیج پر بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ریکارڈنگ کے لیے جدید آلات کا استعمال تھا کچھ دیر بعد دیوارم چند لڑکیوں اور لڑکوں کے جلو میں اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے سفید رنگ کی دو چادریں اوڑیں ہوئی تھیں ایک دھوتی کی صورت میں اور دوسری کاندھوں پر پھیلائی ہوئی تھی۔ سفید بالوں میں آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا ہوا تھا وہ دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے چند لمحے کھڑا رہا پھر بیٹھ کر بھاشن دینے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ بھاشن ختم ہو گیا۔ دیوارم اٹھ کر اندر چلا گیا۔ ہم دونوں کو ملاقات کی پرچیاں مل گئیں۔ ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ انتظار کرنا پڑا میری باری آئی تو دروازے پر موجود سیکورٹی گارڈ نے مجھے ڈی ڈیکٹر لگا کر چیک کیا اور پھر میں اندر چلا گیا۔ وہ سامنے ایک گدے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس سفید سبز اور نارنجی پھولوں کے گلدستے پڑے ہوئے تھے۔ اندر کا ماحول خشک تھا خوشگوار نہک تھی اور روشنی کافی حد تک دھیمی تھی۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا سمیٹا ہے بالک.....؟“

”دیوارم جی کیا آپ نے راجیو گاندھی کے قتل کے بارے میں سنا ہے وہ کیسے ہوا تھا؟“ میرے یوں کہنے پر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک دم سے اس کی آنکھوں میں قہر اتر آیا لال بھوکا چہرے کے ساتھ اس نے مجھے دیکھا اور پھر غصے میں لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔

”کیا جھاق کرتے ہو.....“

”میں مذاق نہیں کر رہا دیوارم جی شاید آپ کو نہیں معلوم مگر میں بتا دیتا ہوں اسے ہم سے اڑایا گیا تھا۔ وہ ایسا ہم تھا جسے سیکورٹی والے بھی نہیں پکڑ سکے تھے اور نہ اس ہم کو کوئی آلہ پکڑ سکا تھا بالکل ایسے ہم تھے وہ۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیکٹ دونوں ہاتھوں سے کھول دی۔ اس نے اضطرابی حالت میں دیکھا اور پھر خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک دم سے اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ وہ خوف زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی کو مدد کے لیے بلائے۔ ”دیوارم جی اگر آپ نے ذرا سی بھی بے وقوفی کی نا میں نے تو مر ہی جاتا ہے آپ بھی نہیں رہیں گے۔“

”کیا چاہت ہو تم.....؟“ اس نے خوف سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”میں آپ کو ساتھ لے کر جانے کے لیے یہاں آیا ہوں صرف اتنے وقت کے لیے جب تک ہمارے ساتھ کی گئی ہے ایمانی والا معاملہ صاف نہیں ہو جاتا۔“

”بے ایمانی والا معاملہ میں سمجھا نہیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”آپ اُسی وقت سمجھیں گے نا جب ہم سمجھائیں گے“ کیونکہ آپ نے اپنے بندوں کو یہ نہیں سمجھایا کہ ہمارے بے ایمانی والے کام میں ایمان داری پہلی شرط ہوتی ہے۔“ میں نے تیزی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ لیے تو وہ لرز کر رہ گیا پھر دھیمی آواز میں بولا۔

”تم اپنی سمیاسی مجھے بتاؤ میں یہیں آپاے کر دیتا ہوں۔“

”نہیں دیارام جی آپ کو میرے ساتھ تو جانا ہوگا ورنہ بات نہیں بنے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہوگا“ کیونکہ آپ اس میں قصور وار نہیں ہیں۔“

”تو پھر قصور وار کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہمارے پاس وقت کم ہے دیارام جی ان بھول کار میوٹ کنٹرول باہر بھی ہے مجھے زیادہ وقت ہو گیا تو یہ.....“ میں نے اپنی آواز کو سرد بناتے ہوئے کہا تو وہ پھر سے لرز گیا۔ اس دوران میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے سہارا دے کر اٹھالیا وہ ہلے ہوئے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنی گردن پر رکھا اور اپنا ہاتھ اس کی بغل میں دے کر چل پڑا دروازے پر سیکورٹی والے حیران تھے کہ دیارام کو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے آگے بڑھنا چاہا تو اس نے دور ہی سے منع کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتا چلا گیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ خلاف معمول کارروائی سے وہاں پہنچ نہ پئے۔ آشرم میں ایک دم سے تیزی آ گئی۔ باغیتا نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ فون کے علاوہ اشاروں سے اپنے بندوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہم کمرے سے نکل کر ہال میں آئے اور وہاں سے برآمدے میں جب تک ایک فورڈ ہیل جیب ہمارے سامنے آ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا اور میں دیارام کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔ اسٹیرنگ پر بھاری مونچھوں والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی اس نے گاڑی بڑھادی۔ آشرم میں بہت سارے لوگ ہمارے پیچھے بھاگے تھے۔ جب تک ہم فوارے کے راؤنڈ اپاؤٹ تک آئے اس وقت تک کئی گاڑیاں ہمارے تعاقب میں چل پڑی تھیں۔ بلاشبہ ان میں کچھ ہمارے لوگ تھے اور کچھ آشرم والوں کے جیسے ہی ہم گیٹ سے نکل کر مین روڈ پر آئے تو باغیتا نے فون پر کسی کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”اپنے لوگوں سے کہو گاڑیاں پیچھے لے جائیں۔“

اس کے چند منٹوں کے بعد کئی گاڑیاں پیچھے رہ گئیں۔ تین یا چار گاڑیاں تھیں جو ہمارے تعاقب میں بڑھتی ہی چلی آ رہی تھیں۔ باغیتا نے سن روف کھولا اور گن باہر نکال کر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اچانک ہی وہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے سڑک پر الٹ گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے دیارام کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ امرتسر سے باہر ہی سے ہم ترن تارن روڈ پر نکل گئے۔

ہمارے سفر کا اختتام پھر اسی فارم ہاؤس پر ہوا جہاں گزشتہ سے پچھلے رات ہم رہے تھے۔ وہی جنگل کا ماحول جھونپڑیاں ایک چھوٹی سی ندی درخت اور ہوا کا عالم تھا۔ باغیتا اور میں دیارام کو لے کر ایک جھونپڑی میں آ گئے۔ میں نے اپنی جیکٹ جیب ہی میں چھوڑ دی تھی اس لیے جب آنکھوں سے پٹی اتارنے پر اس نے مجھے بغیر جیکٹ دیکھا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

”ادھر بیٹھیں دیارام جی ادھر۔“ میں نے گھاس پھوس پر ایک چادر بچھاتے ہوئے کہا جو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے اس کے حیرت زدہ سوالیہ چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں آپ نے ہماری بات مانی، ہم آپ کو کوئی زحمت نہیں دیں گے۔“

”بات کیا ہے۔“ اس نے کافی حد تک اعتماد سے کہا تو میں بولا۔

”بات یہ ہے دیارام جی آپ کے پرکاش اور دیپکانے ہمارے ساتھ بے ایمانی کی وہ بھی دو کروڑ کی تیسرا کروڑ ابھی ہم نے دینا تھا۔“

”ایسا کیا کیا انہوں نے.....“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے پاس کی ان سے ڈیل ہوئی تھی کہ دس پنجابی لڑکیاں دو ہی پہنچانی ہیں۔ اس نے حامی بھری ایک کروڑ اس نے لے لیا دوسرا اس نے اُس وقت لیا جب لڑکیاں امرتسر میں لے آیا اور ہمارے بندوں کے حوالے کرنے کو کہا۔ طے یہ تھا کہ وہ دو ہی پہنچائے گا۔ تیسرا کروڑ اُسے وہاں ملے گا۔ اس پر نہ صرف وہ لڑکیاں واپس لے گئے بلکہ دو کروڑ بھی ہمیں کر گئے۔“

”کیا وہ یہ کام بھی کرتے ہیں؟“ دیارام جی نے حیرت سے پوچھا تو باغیتا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ایسے نہ کرو سوامی جی سب کچھ آپ کی آشرم واد سے ہوتا ہے ہم نے اگر آپ سے اچھا سلوک کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہمیں بے وقوف بناؤ سیدھے رہو گے تو ہم بھی سیدھے رہیں گے۔“

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور دیارام سہم گیا۔ میں اس کے رویے پر خود حیران تھا وہ اداکاری کر رہا تھا یا واقعتاً خوف زدہ تھا۔ ورنہ اس کے بارے میں یہی معلومات تھیں کہ وہ پٹنا تاز کا ماہر ہے جوگ سنیاں اور یوگا تو وہ جانتا ہی تھا میں نے کئی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں مگر مجھے تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے بھی اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیارام جی آپ تو پٹنا تازم کے ماہر ہیں ٹرانس میں لیں مجھے اور.....“ میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تب وہ چند لمبے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

”اب نہیں ہوتا یا ز شراب اور عورت نے یہ ساری صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ میں نے تو اپنے ارد گرد بڑا احصار بنایا تھا لیکن تم مجھے وہاں سے نکال لائے۔“

”سیدھے لائین پر آؤ دیارام.....“ باغیتا نے تلخی سے کہا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

”کیا چاہت ہو اب تم؟“

”ظاہر ہے دو کروڑ واپس اور جرمانے میں وہی دس لڑکیاں اور بس“ میں نے سکون سے کہا۔

”اسے وقت بھی بتاؤ صرف دو گھنٹے کے اندر اندر.....“ باغیتا تیز لہجے میں بولی پھر اپنا فون نکال کر اس پر نمبر ملائے اور صرف اتنا کہا۔

”پرکاش یا دیپکا سے بات کر آؤ دھیان رکھنا وہ ہمارا فون نہ ٹریس کر لیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اصل میں یہ صرف دیارام کو بتایا گیا تھا ورنہ یہ طے تھا کہ پرکاش کو فون لندن سے آتا تھا جس کے کانفرنس پر باغیتا نے بات کرنا تھی۔ اس طرح پکڑے جانے کا امکان نہیں تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ باغیتا کا فون بج اٹھا۔ اس نے آواز سنی اور فون مجھے دے دیا۔

”پرکاش بات کر رہا ہوں، کون ہو تم.....؟“

”کیا تم دیارام جی سے بات کرنا چاہو گے؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اسپیکر آن کر دیا۔

”اوہ، تو کیا یہ تم ہو۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں“

”کتے کی طرح بھونکنے بند کرو اور صرف میری سنو“ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور فون دیارام کی جانب بڑھا کر اسے اشارہ کیا۔ تبھی وہ بولا۔

”پرکاش! یہ میں کیساں رہا ہوں تم نے باہر ہی باہر سے ان کے دو کروڑ کھالے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے باپو! میری کوئی ڈیل نہیں ہوئی کسی سے یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں؟“

”تمہیں کیسے پتہ کہ یہ کسی ڈیل کے دو کروڑ تھے؟“ دیارام نے اچانک کہا۔

”باپو! آخر کسی ڈیل ہی کے دو کروڑ ملنے تھے کوئی مفت میں تھوڑی دینے لگا ہے بس تم مجھے یہ بتاؤ انہوں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی میں پورے امرتسر میں آگ لگا دوں گا اگر.....“

”میں نے کہا تکتے کی طرح مت بھونک۔“ میں نے سر دلچے میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ دیارام نے کہا۔
”انہوں نے مجھے بڑے احترام سے رکھا ہے۔ اب تم سنو ان کے دو کروڑ روپے اور دس لڑکیاں پنجابی والی وہ ان کے حوالے کر دو صرف دو گھنٹوں میں۔“

”باپو یہ آپ کیا کہہ رہے ہو۔ میں لڑکیاں کہاں سے لاؤں؟“ اس نے کہا تو میں بولا۔

”سن پرکاش! دیارام جی سے اگر تم دوبارہ ملنا چاہتے ہو تو جیسا ہم کہتے ہیں ویسا کرو صرف دو گھنٹے۔“ میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ہنسنے ہوئے بولا۔

”تو پھر تم ماری دواں بڑھے کو اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا کیا کرنی ہے دولت اس نے میرے خیال میں اب تمہیں اسے ماری دینا چاہیے۔ اچھا ہوا تم لوگ اسے لے گئے ہو۔ اب دوبارہ مجھے فون نہیں کرنا کچھ نہیں ملنے والا یہاں سے۔“
”پرکاش! یہ تم کہہ رہے ہو میرے بارے میں۔“ دیارام نے چونکتے ہوئے اس طرح حیرت سے کہا جیسے اسے بہت دکھ ہوا ہو۔

”ہاں ہاں تمہارے بارے میں کہہ رہا ہوں بڑھے میرے خیال میں تو نے بہت عیاشیاں کر لی ہیں۔ اب تمہیں مرجانا چاہیے بھگوان تمہیں سو رگ دے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

”لوجی دیارام جی آپ کا تو اتم سنسکار کر دیا اس نے، اب بولو ہم کیا کریں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ بولا۔

”دھیرج رکھو اور مجھے وچار کرنے دو۔“ دیارام نے کہا تو بانیٹا نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”میں نے وچار کر لیا ہے اب یہ دونوں ڈرامہ کریں گے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ وہ آشرم جوان کی سلطنت بنا ہوا تھا اس میں پولیس اور خفیہ کے لوگ بھی جاسکتے ہیں ہاسٹل میں موجود لڑکیاں جن کی تازہ کھپت ”مالیر کوئلہ“ سے آئی ہے وہ ابھی تک وہیں موجود ہے دو گھنٹوں میں سے پانچ منٹ گزر چکے ہیں مہاراج۔“

”دیکھ کا کوفن ہو سکتا ہے؟“ دیارام نے پوچھا اس بار اس کے لہجے میں گہری بنجیدگی تھی۔

”وہ بھی ڈرامہ کرے گی میں جانتی ہوں۔“

”تم بات تو کراؤ۔“ اس نے بغد ہو کر کہا تو بانیٹا نے نمبر ملائے پھر کچھ دیر بعد کال آ گئی۔

”باپو! تم ٹھیک تو ہونا۔“ دیکھ کا آواز ابھری۔

”یہ پرکاش کیا پاگل پن کر رہا ہے میرے مرنے کے بارے میں۔“

”تو ٹھیک ہی کہا ہے نہ باپو! اب تم نے کتنا جینا ہے۔“ اس نے ہنسنے ہوئے کہا تو بانیٹا نے غصے میں کہا۔

”ارے بندریا! زیادہ ڈرامہ کر ایک گھنٹہ چالیس منٹ ہیں تم لوگوں کے پاس اس کے بعد اسی بڑھے کی ویڈیو چینل کو دے دوں گی جس میں یہ تم دونوں کے بارے میں وہ ساری بکواس کرے گا جو ہم اسے کرنے کے لیے کہیں گے مرکزی خیال یہی ہوگا کہ تم لوگوں کے جرائم سے تنگ آ کر اس نے روپوشی اختیار کی ایک گھنٹہ اڑتیس منٹ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”دلچیت! اب زیادہ وقت نہیں دینا ان لوگوں کو بیان ریکارڈ کرو اس کا اور ہر چینل

کو بھیج دو۔“

اس کے یوں کہنے پر دیارام نے سریوں جھکا لیا جیسے وہ ہار گیا ہو۔ پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

”تم لوگ اسے ڈرامہ مت سمجھو میں اتنی آسانی سے تم لوگوں کے ساتھ آ ہی اس لیے گیا ہوں کہ ان دونوں کو سامنے لاسکوں تم لوگوں نے جو کچھ بھی کرنا ہے جو بھی مجھ سے کہلوانا ہے وہ میں کہنے کو تیار ہوں۔ اب ان لوگوں سے مجھے اپنا آشرم شدہ چاہیے۔“

”وہ تو تم نے کرنا ہی ہے دیارام جی اب آرام کرو تھوڑی دیر بعد تمہیں تکلیف دیتے ہیں۔“ بانیٹا نے کہا اور اپنا سیل فون لے کر باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے وہ مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کر گئی۔ میں نے چند لمحے یونہی انتظار کیا اور اس کے پیچھے جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

”کیا خیال ہے ڈرامہ ہے یا حقیقت۔ کیا وہ لوگ اس دیارام سے جان چھڑانا چاہتے ہیں؟“

”کچھ بھی ہے مقصد تو پرکاش اور دیکھ کا کو ختم کرنا ہے تو وہ ہو جاتے ہیں۔“ میں نے گل سے کہا۔

”وہ کیسے؟“ بانیٹا پریشانی میں بولی۔

”دیکھو اپنے کسی بندے سے کہو کہ وہ پولیس افسران اور مختلف چینل میں دیارام کی روپوشی کی اطلاع دے دیں آشرم میں ہلچل تو پہلے ہی مچی ہوئی ہوگی وہ کسی کو ٹکٹے نہیں دیں گے وہ دونوں باہر ہی ہوں گے ان میں شک کا زہر تو آ گیا۔ دیارام انہیں کیسے واپس آشرم میں آنے دے گا۔ پھر ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

”نہیں وہ تو ہاتھ نہ آئے اپنے انہیں ان کے بلوں سے نکالنا ہے۔“

”پھر اسی باپ سے ان کے ٹھکانے پوچھ نکال لیتے ہیں انہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”چلو ابھی کچھ دیر انتظار کر دو۔“

اس نے کہا اور جیب سے تھپٹا اٹھا کر لائی تھی اس میں سے ٹین پیک سوڈا نکالا ایک مجھے دیا ایک خود لے کر تیسرا نکال کر جھونپڑی میں چل دی۔ دیارام ایک طرف ٹکٹلی لگا رہا تھا ہماری آہٹ پا کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”دیارام..... یار کیا کھویا کیا پایا تم نے یار“ میں نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”سب کھو دیا میں نے سب اس وقت میرے کچھ بھی کام نہیں آ رہا ہے لیکن ایک کوشش اب بھی کی جاسکتی ہے۔“

”وہ کیا؟“ بانیٹا نے پوچھا۔

”اگر ایک بندے کو فون ہو جائے تو وہ ان دونوں کو منتوں میں قابو کر سکتا ہے اسے ان دونوں کے بارے میں سب علم ہے۔“ دیارام نے کافی حد تک اعتماد سے کہا۔

”کون ہے وہ اس کا نمبر بتاؤ۔“ بانیٹا نے تیزی سے پوچھا۔

”ایک نمبر ہی تو میرے پاس نہیں ہے اگر تم کسی طرح آشرم کے مہلا ہاسٹل کا نمبر لے لو تو بات بن سکتی ہے۔“ دیارام نے کہا۔

”وہ ہے نمبر میرے پاس۔“

”تو پھر ملاؤ میں بات کروں گا۔“ اس نے کہا تو بانیٹا نے نمبر ملانے کی بجائے لندن ہی ملایا۔ میرے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے وہ کسی بے شعوری میں غلطی کر جائے ایسا نہیں ہوا کچھ دیر بعد مہلا ہاسٹل میں رابطہ ہو گیا تو ایک عورت نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

”باپو! آپ کہاں ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں، میری بات غور سے سنو کسی بھی مہلا کو ہاسٹل سے باہر نہیں جانے دینا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، اور میری اک مدد کرو مجھے اپارہ سنگھ باجوہ کا نمبر دو فوراً۔“

”ابھی دیتی ہوں پر باپو! آپ کہاں ہیں اور کس کے ساتھ ہیں؟ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ آپ کو اغواء کیا گیا ہے۔“ اس عورت نے اچھے ہوئے کہا۔

”نہیں! میں اغواء نہیں ہوا۔ پرکاش اور دیکھا سے چھپا ہوں وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ تم یہ بات خود بھی اپارہ سنگھ باجوہ کو بتا دو۔“

”لکھو باپو نمبر“ اس عورت نے کہا اور نمبر لکھوا دیا اس کے ساتھ ہی باغیتا نے نمبر بند کر دیا، کچھ دیر بعد اپارہ سنگھ باجوہ کا نمبر مل گیا، کچھ دیر تمہیدی باتوں کے بعد دیارام نے کہا۔

”وہ دونوں مجھے چاہیے، ورنہ میرا قتل ہو جائے گا۔“

”آپ فکر نہ کرو آپ آدھے گھنٹے بعد رابطہ کرنا۔“ اس کے بعد فون خاموش ہو گئے۔

عجب چھڑی سی پک گئی تھی۔ ہم نے سوچا کچھ اور تھا، لیکن اندر سے معاملہ ہی کچھ اور نکلا تھا۔ ہم دونوں کھلی فضا میں آ کر بیٹھ گئے اور اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔ باغیتا نے ساری صورت حال حویلی بتادی۔

ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد ہم جمو پڑی میں گئے۔ دیارام بہت افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ باغیتا نے باجوہ کو فون ملایا۔ جب دوسری طرف سے پر جوش انداز میں کہا گیا۔

”دیارام جی! وہ دونوں میرے پاس ہیں، کیا حکم ہے ان دونوں کے لیے۔“

”مجھے یقین تھا کہ ایک جتنی ہو جو انہیں قابو کر سکتے ہو۔ ورنہ ان حالات میں وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرنے والے۔“ دیارام نے نفرت سے کہا۔

”نہیں! میں ابھی ان کی تلاش کرنے والا تھا، کہ انہوں نے خود رابطہ کر لیا ہے۔ اصل میں آپ کو صورت حال کا نہیں اندازہ، آشرم کو پولیس نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور تلاشی لینے کے لیے بات چیت کر رہے ہیں۔ اسی خوف سے یہ دونوں میرے پاس آ گئے ہیں۔“

”انہیں قابو میں رکھو میں کچھ بندے بھجواتا ہوں، انہیں ان کے حوالے کر دینا۔ اس کے بعد ہی میں آشرم میں آ کر سب سنبھال لیتا ہوں۔“ دیارام نے تیزی سے کہا، پھر کچھ کورڈو ڈٹے ہوئے اور فون بند ہو گیا۔

باغیتا ایک دم ہی سے پر جوش ہو گئی تھی۔ دیارام نے باجوہ کا پورا اتہ پتہ بتایا اس کے بعد باغیتا نے اپنے چند بندوں کو اس کام پر لگا دیا۔ وہ بڑے صبر آزمائے تھے۔ باجوہ کے پیچھے ہوئے بندے غائب ہو جانے تھے یا پھر اتنی محنت کرنے کے بعد کامیابی مل جانے والی تھی۔ میں اس کی اضطراری کیفیت دیکھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس کا فون بج اٹھا۔ اس کے لوگ

تھے اپارہ سنگھ ان سے تصدیق چاہ رہا تھا، فوراً ہی دیارام کی بات کروادی گئی، کچھ ہی دیر بعد پرکاش اور دیکھا کو ان بندوں کے حوالے کر دیا گیا لیکن اپارہ سنگھ باجوہ نے یہ شرط رکھی تھی کہ ان دونوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور دیارام انہیں معاف کر دے گا، باغیتا کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے دیارام کو لیا اور جمو پڑی سے باہر آ گئی۔ ڈرائیور گاڑی لے آیا تھا۔

دیارام کی آنکھوں پر ویسے ہی پٹی باندھ دی گئی اور ہم وہاں سے نکل پڑے۔ ترن تارن سے امرتسر روڈ پر آئے تو ہم نے جب چھوڑ دی۔ ڈرائیور دیارام کو لے کر چلا گیا۔ ایک دوسری کار ہمارے انتظار میں تھی۔ ہم اس پر نکل پڑے۔ ہمارے سفر کا اختتام شہر سے باہر ایک فیکٹری میں ہوا۔ یہ رتن دیپ سنگھ کی فیکٹری تھی اور یہاں کچھ فوڈ پراڈکٹ تیار ہوتے تھے۔ کچھ

ہی دیر بعد ہم فیکٹری کی پچھلی جانب ایک بڑے سارے ستور میں جا کے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔

ستور کے ایک کونے میں بڑی میز کے ارد گرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دو کرسیوں پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ باغیتا اور میں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ تب پرکاش نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال کہ ہمارے درمیان کوئی دشمنی ہے، میں نے کوئی ایسی ذیل نہیں کی جس میں.....“ اس نے کہنا چاہا تو باغیتا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”فضول باتیں مت کرو پرکاش! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سکھ قوم کے خلاف کیا کچھ کرتے رہے ہو اور اب بھی کر رہے ہو۔ میں مانتی ہوں کہ تمہارے پیچھے ہندو تنظیمیں ہیں لیکن تم وہ (نازیبا گالی بکتے ہوئے) ہو جو اپنی ہی ہم وطن بہنوں کو غیروں کے ہاتھ فروخت کر رہے ہو، کیا سکھ عورتیں بھیڑ بکریاں ہیں یا مویشی؟“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

”میں ایسا کچھ سوچ کر نہیں.....“ اس نے پھر کہنا چاہا تو باغیتا نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

”بکواس کرتا ہے سالار۔“ یہ کہہ کر وہ دیکھا کو دیکھ کر بولی۔ ”اور یہ کتنا ابھی تو بھونکے گی۔“ تبھی اس کا فون بجا تو وہ سننے لگی پھر چند لمحوں بعد ہی اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک گاڑی سے کہا۔ ”اے! دی! لا ادھر! جلدی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹی وی لایا گیا، اس کا کنکشن لگایا تو کئی چینل آنے لگے۔ وہ ایک پرک گئی جہاں دیارام

پریس کو اپنا بیان دے رہا تھا۔

”وہ لوگ..... میرے سیوک تھے، پرنتو معاملہ نہیں تھا کہ وہ آشرم میں اندر ہی اندر..... بھیا نک کام میں ملوث تھے۔ مجھے معاملہ ہوا تو میں نے انہیں روکا۔ وہ میری جان کو آگئے، مجھے مارنے کی دھمکیاں دینے لگے، انہوں نے مجھے یہاں یرغمال بنالیا تھا، پھر میں نے کچھ لوگوں سے مدد لی اب وہ فرار ہو چکے ہیں۔ پولیس سے بتی ہے کہ وہ انہیں جلد از جلد گرفتار کر لے

پنجاب کے مختلف علاقوں کی مہلائیں یہاں قید تھیں، وہ ابھی پولیس کی حوالے کی ہیں، ابھی ان کے جرم سامنے آ رہے ہیں۔“

”تم لوگوں کا کام تو کر دیا دیارام جی نے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ دونوں حیرت سے ٹی وی کو دیکھنے لگے جیسے کچھ انہونی ہو گئی ہو پھر دیکھا غراتے ہوئے بولی۔

”یہ دیارام..... اس نے..... یہ خود بڑا مجرم ہے سالار اور..... ہمیں مجرم کہہ رہا ہے۔“

”دیکھو! اگر تم لوگ زندہ رہنا چاہتے ہو، اپنا پورا نیٹ ورک تفصیل سے بتا دو..... کون کون اس کے پیچھے ہے، یہ تم دونوں کو بتانا ہوگا..... آ رام سے بتا دو تو ٹھیک ورنہ.....“ باغیتا نے کہا تو پرکاش نے ایک دم غصے سے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم لوگ ہمیں زندہ چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہی ہمیں پولیس کے حوالے کرو گے تو پھر دوسروں کو بتانے کا فائدہ..... مار دو.....“ اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے اسے کارل سے پکڑ کر اٹھایا اور پوری قوت سے گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرے ساتھ تھم تھم گیا۔ وہ بہترین فائٹر تھا اور میرے ساتھ زور آزمائی پر اترا آیا

تھا۔ اس نے اپنا گھٹنا میرے پیٹ میں مارا، جس سے درد کی شدید لہر میرے اندر اتر گئی۔ اس وقت میں نے اسے ذرا سی ڈھیل دے دی کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے، چند لمحوں ہی میں اس نے وہ میرے پیچھے تھا، اس کا بازو میری گردن میں تھا، دوسرے ہاتھ سے اس نے میری کلائی پکڑی ہوئی تھی، باغیتا حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی، تبھی پرکاش بولا۔

”ہلنا مت..... ورنہ ایک جھٹکے سے تیری گردن ٹوٹ جائے گی۔“

اس لمحے دیکھا کٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے میرے پیٹ میں گھونسا مارتے ہوئے نفرت سے کہا۔

”نیت درک کے بارے میں پوچھتا ہے چل..... ہمیں باہر لے کر چل.....“ پھر گھوم کر سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنی جگہ نہیں چھوڑنی..... ورنہ یہ تو جان سے جائے گا۔“

میں حیران تھا کہ انہوں نے گرگٹ کی طرح کیسے رنگ بدلا ہے۔ میں نے چند لمحے مزید انہیں دیکھا، پھر مڑنے کی اداکاری کرتے ہوئے اچانک اس کا ہاتھ اپنی گردن سے نکالا اور اس کی دونوں کلاںیاں اپنے ہاتھ میں لے کر اس طرح جھٹک دیں کہ اس کے منہ سے اذیت ناک کراہ نکلی، پھر تیز چیخ کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ لٹک گئے۔ میں نے دونوں کھڑے ہاتھ اس کی گردن پر مارے تو وہ چکر اکر زمین پر گر گیا۔ تب میں نے دیپکا کی طرف دیکھا تو وہ ششدر تھی، میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو میں اس کی طرف بڑھا تو بائیتا نے تیزی سے کہا۔

”نہیں دلجیت! اسے میں دیکھتی ہوں تم اسے ہوش میں لا کر مزید دھلائی کرو۔“

میں نے پرکاش کے پہلو میں ٹھوکر ماری۔ وہ ہوش میں آ گیا لیکن اسے سدھ بدھ نہیں تھی۔ میں نے قریب کھڑے سکھ سیکھو رنی گاڑ کی کرپان نکالی اور اس کی ران میں پیوست کر دی، پھر دوسری ران میں ماری وہ ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح بلبلانے لگا، تبھی چٹاخ کی آواز کے ساتھ ماحول گونج اٹھا، بائیتا نے دیپکا کو اپنے آگے رکھ لیا تھا، کچھ ہی دیر بعد وہ چیختے ہوئے کہنے لگی۔

”میں بتاتی..... ہوں..... بتاتی ہوں.....“

میں نے تب تک پرکاش کے دونوں ہاتھ کاٹ کر دیپکا کے سامنے پھینک دیئے وہ خوف اور حیرت سے پکلی پڑ گئی۔ رات گئے تک ساری معلومات لے لینے کے بعد ان دونوں کو ایک شاہراہ پر پھینک دینے کے لیے بائیتا نے انہیں وہیں چھوڑ دیا۔ پرکاش تقریباً مر چکا تھا اور دیپکا کو مار دینے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

وہاں سے نکل کر اس گھر میں گئے اور پھر تہہ خانے کی سرنگ کے ذریعے حویلی میں جا پہنچے۔ رات کے اس پہر رتن دیپ سنگھ ہمارے انتظار میں تھا۔ اس نے ہم دونوں کو اپنے گلے لگایا، دیر تک اپنے سے چمٹائے رکھا، پھر جب اس نے ہمیں الگ کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بہت ساری بیٹیوں کو بچالیا ہے تم نے، کئی گھروں کی عزت، سکسی کی شان تو بیٹیوں سے ہے، میں احسان مند ہوں، تم دونوں کا مانگ جمال کیا مانگتا ہے تو مجھ سے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو خود سے الگ کر دیا، اور میرے چہرے پر دیکھنے لگا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کا پیار۔“

میرے یوں کہنے پر اس نے مجھے دوبارہ اپنے سینے سے لگالیا، پھر روتے ہوئے بولا۔

”تو مجرم نہیں ہے..... نہ ہی ہو سکتا ہے..... تیرا اندر پاک صاف ہے پتر..... میں تیرا احسان نہیں دے سکتا۔ پوری سکھ قوم نہیں دے سکتی۔“

وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ اسی حوالے سے بات کرتا رہا، پھر ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر وہ اندر کی جانب چلا گیا۔

میں فریش ہو کر بیڈ پر پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ پر اچھی خاصی ٹھکن سوار تھی ایسے میں بائیتا شارٹس پہنے اور ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھا اور بولی۔

”دلجیت جی کچھ کھاپی لڑیہ چکن نکلے ہے اور سوڈا..... کھالو اور پھر سوتے ہیں۔“

میں کھانے لگا، اس وقت آدمی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ جب میں لیٹا، مجھے معلوم تھا کہ بائیتا کو نیند نہیں آتی، وہ یونہی

بیٹھی رہے گی اس لیے میں پھیل کر سو گیا۔

صبح کا وقت تھا جب اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے خواب میں اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے اسی پرانے مکان کے صحن میں جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی مکان جسے شاہ زیب کے کارندوں نے جلا دیا تھا لیکن اس وقت خواب میں وہ جلا ہوا نہیں تھا۔ میں حسب معمول کمرے سے باہر آیا تو ماں نے میری طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ نگاہ بھر کے دیکھا کرتی تھیں اور پھر سے اپنے وظیفے میں مشغول ہو جایا کرتی تھیں، لیکن خواب میں انہوں نے بیچ روک دی، پھر میری طرف نگاہ بھر کے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہاں تھا تو۔ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہا تھا تو؟“

”اماں میں یہیں کمرے میں سویا ہوا تھا۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”لیکن میری نگاہوں سے تو او جھل تھا، چل ادھر آ بیٹھ تیرے لیے میں ناشتہ بناتی ہوں۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

”ٹھیک ہے اماں، تو ناشتہ بنا، میں ڈیرے سے ہو کر آیا۔“

”نہیں، تو پھر غائب ہو جائے گا۔ ناشتہ کر لے پھر چلے جانا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف چل دیں اور میں چارپائی کی جانب بڑھا۔ تب میری آنکھ کھل گئی۔ میں ایک دم سے اداس ہو گیا۔ مجھے اماں شدت سے یاد آنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اس صبح رتن دیپ سنگھ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ اتنے دن میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ مجھے رات کا جذباتی پن یاد آنے لگا تھا۔ شاید اس حوالے سے بات کرنے کے لیے اُس نے مجھے بلایا تھا۔ میں ملازمہ کے ساتھ مختلف راہداریاں پار کرتا ہوا اُس کے کمرے میں جا پہنچا تو وہ ایک بڑے سارے کمرے میں قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے سیکے سے فیک لگائی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ دونوں جوان ایک ادھیر عمر خاتون اور بائیتا بیٹھی ہوئی تھیں۔

”آؤ جمال! بیٹھ۔“ رتن دیپ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ میں نے ایک جانب خالی جگہ دیکھی اور بیٹھ گیا۔ تبھی اُس نے کہا۔ ”یہ میرا پر یوار ہے۔ یہ میری جتنی ہے۔“ اُس نے ادھیر عمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو جوان میرا بیٹا گروپال سنگھ اور چھوٹا گرومیت سنگھ، دونوں بزنس کرتے ہیں۔ اور یہ بیٹی بائیتا! سگی بیٹی۔“

”اوہ.....!“ میرے منہ سے نکلا تو دونوں بیٹے ہنس دیئے، پھر گرومیت بولا۔

”اس کے بارے میں ایسے ہی حیرت ہوتی ہے، جو کام لڑکوں کو کرنا چاہیے وہ یہ کرتی ہے باپو کے لیے۔“

”خیر باتیں تو ہوتی رہیں گی ناشتہ لگواؤ۔“

”وہ تو لگ گیا ہے جی آپ چلیں ڈاننگ ٹیبل پر۔“ رتن دیپ کی بیوی نے کہا تو ہم سب اٹھ کر ٹیبل پر آ گئے۔ بائیتا کے بارے میں میری حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔ ناشتے کے دوران رتن دیپ نے کہا۔

”جمال! تم جتنے دن بھی یہاں رہے ہو، میرا دل جیت لیا ہے تم نے، میں چاہوں گا کہ تم دوبارہ بھی یہاں آؤ، مجھے خوشی ہوگی۔“

”مطلب؟ میں کہیں جا رہا ہوں۔“ میں نے چونک کر پوچھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”ہاں، پاکستان۔ تم آج پاکستان جا رہے ہو، تم دلجیت سنگھ کے نام ہی سے پاکستان جاؤ گے۔ سب کاغذ تیار ہیں۔ ٹکٹ بھی ہمارے گیانی کے ساتھ ایک جتھہ جا رہا ہے، بہت سارے پر یوار ہیں ان کے ساتھ، تم بھی ایک پر یوار کا حصہ بن کر جاؤ گے۔ اگرچہ پوری کوشش کی ہے کہ تم بیچانے نہ جاؤ، لیکن تمہاری تلاش ”را“ کر رہی ہے۔ رب سے ہمتی ہے کہ تم

خیریت سے پہنچ جاؤ۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے رتن دیپ کے لہجے میں یاس اتر آئی۔ آواز بھرا گئی۔ ماحول بوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی، جبکہ میرے من میں عجیب سی اٹھل پھٹل ہونے لگی۔

دس بجے کے بعد میں حویلی سے رخصت ہوا۔ سب نے ڈرائنگ روم سے مجھے رخصت کیا، جبکہ بائیتا میرے ساتھ سرنگ میں چلتی چلی گئی۔ جس وقت ہم سرنگ سے نکل کر کمرے میں آئے جو اسٹور ٹائپ تھا، اس نے میرے سینے پر اپنی ہتھیلی رکھی اور زور سے دباتے ہوئے مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”دلچیت! تم نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو، نہ میرے قُرب کے لیے کتنا خون بہا ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ میں قلو پٹھر نہیں لیکن میں نے لوگوں کو اپنے لیے لڑتے دیکھا ہے۔ نجانے کتنے لوگ اب بھی میری چاہت کے طلب گار ہیں۔ میں تمہارے اتنے قریب رہی، مگر تم نے اپنی نیت خراب نہیں کی۔ اسے میں اپنی ہنک خیال کر سکتی ہوں کہ تم نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا، میرے عورت پن کی تذلیل بھی ہو سکتی ہے لیکن جی نہیں چاہتا کہ تمہارے رویے کو فنی خیال کروں، پوچھ سکتی ہوں ایسا کیوں ہے؟“

”میں بتا بھی دوں تو تجھے سمجھ نہیں آئے گی۔“ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا تو وہ میری جانب دیکھتی رہی پھر بولی۔

”لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تو نے میرا دل جیت لیا ہے، تم فاتح کی حیثیت سے اپنے دیس جا رہے ہو۔ یاد رکھنا، میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

”مگر میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور زنی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹانا چاہا۔ وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی اپنا چہرہ میرے قریب لے آئی، اتنا قریب کہ اس کی سانس میں اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔ اس کے قہر قہراتے ہوئے ہونٹ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ شاید وہ ان کی گرمی کا لمس میرے ہونٹوں میں اتار دینا چاہتی تھی۔ میں ساکت رہا، وہ چند لمحے مجھ پر جھکی رہی، پھر اپنے ہونٹوں کی گرامٹ سمیٹ کر تشنہ لبی سے ہی میرے سامنے سے ہٹ گئی۔

”گڈ بائے دلچیت!“ یہ کہتے ہوئے وہ چلتی اور سرنگ میں واپس چلی گئی۔ میں چند لمحے یونہی کھڑا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر اس کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اس گھر میں مجھے کسی نے نہیں روکا جیسے ہی میں مین دروازے سے باہر آیا، ایک نیلی پکڑی والا نوجوان بایک لیے کھڑا تھا۔ میں اسے پہلے بھی حویلی میں دیکھ چکا تھا، اس نے مجھے بیٹھنے کا خفیف سا اشارہ کیا، میں اس کے پیچھے بیٹھا تو وہ چل دیا۔ پورے راستے میں وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا، بلکہ گلیوں اور بازاروں میں سے گھومتا ہوا ایک پوش گھر کے سامنے آن رکا۔ بایک بند کر کے وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں پانچ افراد موجود تھے۔ دو بوڑھے میاں بیوی، دو جوان، جن میں سے ایک شادی شدہ تھا، اُس کی بیوی

”آپ ان سے اچھی طرح تعارف کر لیں۔ آپ ان کے بیٹے ہو چھوٹے“

نیلی پکڑی والے نے کہا تو میں نے رخ بدلائی اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ نوجوان چلا گیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ بابا سنگھ بہت جی دار قسم کا بندہ تھا، جبکہ بی بی اس سے کہیں بہادر۔ ضرورت مجھے ان کی فطرت بھی تھی کہ اگر کوئی مسلک بن جائے اور مجھے اپنا خاندان ظاہر کرنا پڑے تو میں کدوؤں، ورنہ واپسی پر ان سے پوچھتا چھوٹی ہے یا نہیں، میں یہ نہیں جانتا تھا۔

بارہ بجے کے قریب ہم اٹاری اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹرین وہیں سے نکلی تھی اور کاغذات کی جانچ پڑتال وہیں پر ہوتی تھی۔ جتنے داروں کی بس آئی تھی اور ہمیں لے کر اسٹیشن پہنچی تھی۔

اٹاری اسٹیشن پر لوہے کا طویل جنگلا تھا۔ مسافروں کے کاغذات کے لیے کافی کیبن بنے ہوئے تھے۔ جن میں لوگ قطار بنا کر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے پان کھانے والے کو دور ہی سے پٹواڑی کی دکان کے بارے میں معلوم ہو

جاتا ہے، بالکل ایسے ہی سیکورٹی کے لوگوں کے بارے میں مجھے معلوم ہونے لگا۔ بے تحاشا سیکورٹی تھی، نجانے کس کس ادارے کے لوگ وہاں پر ہوں گے۔ ایک کیبن کی لائن میں ہم لگ گئے۔ یہ بہت صبر آزما اور رسک والا مرحلہ تھا۔ اگر میرے کاغذات پر شک بھی ہو جاتا کہ وہ جعلی ہیں تو مجھے وہاں یوں دبوچ لیا جاتا تھا جیسے ملی کسی چوہے کو اپنے پنجے میں لیتی ہے۔ یہ ایسا موقع تھا جب میں اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں رکھ پایا تھا۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میں قطار میں کھڑا رہا اور پھر وقفے وقفے سے آگے سرکنا رہا۔ بابا سنگھ بھائی سنگھ مجھ سے آگے تھے۔ بی بی کور اور بھائی کور ایک دوسرے کیبن کی قطار میں لگی کھڑی تھیں۔ ہمارے ارد گرد صرف پولیس والے وردی میں تھے۔ باقی خفیہ والے سادہ لباس میں پھر رہے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ٹرین کا ڈرافٹ سا حصہ بھی دیکھتے ہیں، ہر ڈبے میں کتوں کو بھراتے ہیں اور بڑی نسل کے بعد کیبن ٹرین کی بوکیوں کی کلیئرنس دیتے ہیں۔ مجھ سے آگے چند لوگ ہی رہ گئے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اُس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے گدھ کسی کے مر جانے کا انتظار کر رہے ہوں۔

نفیہ والے گدھوں کی طرح میرے ارد گرد پھر رہے تھے۔ ہلکا سا ٹھک مجھے جیل کی تاریک کھڑکی میں پھینک سکتا تھا۔ بابا سنگھ کے کاغذات جب کلیئر ہو گئے تو ایک دم میرے اندر سنسنی دوڑ گئی۔ بھائی سنگھ اپنے کاغذات دکھا رہا تھا۔ میرے ساتھ ان کا پورا خاندان بھی ڈوب سکتا تھا۔ یہ سوچ آتے ہی میں نے خود پر قابو پایا اور پھر نارمل ہوتا چلا گیا۔

بھائی سنگھ کے کاغذات اوکے ہو گئے تو میں نے اپنے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ میرٹھے سامنے سکھ نو جوان تھا۔ اس نے کاغذات کو دیکھا، نہیں پڑھا، پھر کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد پہلا سوال یہی کیا کہ مجھ سے پہلے میرا باپ اور بھائی کیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کاغذات اوکے کر دیئے۔ جس کسی نے بھی میرے بارے میں پوچھا تھا، بہت لمب سا چٹا تھا، اس نے انسانی نفسیات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک ہی خاندان کے اگر دو بندوں کے کاغذات مل جاتے ہیں تو تیسرے کے کیوں نہیں۔ میں اپنی دستاویزات سمیٹ کر قطار سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے حلق میں طویل سانس برآمد ہوئی تھی کہ مجھے اپنا سانس سینے ہی میں دہانا پڑا۔ میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے بڑی خاموشی کے ساتھ نختہ گھیرا جانے والا ہو۔ اٹاری اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بہت سارے لوگوں کا ایک جھم جھملا رہا تھا۔ ان میں پولیس والے بھی تھے اور خفیہ والے بھی تیزی سے چلتے چلے آ رہے تھے۔ میری نگاہ ان بندوں پر ٹپکتی گئی جو بالکل ان کے درمیان میں بڑھتے چلے آ رہے تھے یہ وہی تھے جو امرتسر جنکشن سے نکل آنے کے بعد میرے اور بائیتا کے تعاقب میں آئے تھے۔ ان میں سے ایک بندے کو میں نے بغل میں لے کر گردن کی ہڈی توڑ کے مار دیا تھا۔ یہ انہی کے ساتھی تھے۔ میں اگر انہیں اتنی دور سے پہچان سکتا تھا تو کیا وہ مجھے نہیں پہچان سکتے تھے؟ میرے دماغ میں اس وقت یہی تھا کہ میں یہاں سے فرار لے لوں، کیونکہ مجھے یہاں انہی میں سے کسی نے دیکھ لیا ہوگا، اور فورسز کو اطلاع کردی ہوگی؟ وہ تو پہلے ہی کتوں کی طرح میری راہ پر تھے۔ وہ ایسا موقع قطعاً اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتے تھے۔ میں اگر سرحد پار چلا گیا تو یہ ان کی مات تھی۔ وہ تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے تھے اور میں بابا سنگھ کو بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ افاد پڑ گئی ہے۔

بابا سنگھ مجھ سے ذرا فاصلے پر اپنے پر یوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور ایک دم وہاں سے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے فرار کے لیے کسی سمت کا تعین کرنے کے لیے ارد گرد دیکھا لیکن اسی وقت جیسے کسی قوت نے مجھے روک لیا۔ میں اگر بھاگ جاتا ہوں تو ذرا سی تفتیش کے بعد بابا سنگھ پر یوار، وہیں اٹاری اسٹیشن پر پکڑا جاتا۔ بھارتی ناڈا قانون ان پر لگ جاتا اور وہ سارا خاندان جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر جاتے۔ ان کا پرسان حال کوئی نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری سوچ یہ آئی کہ اگر میں پکڑا گیا تو وہ بھی تو کہاں پکڑا جائے گا۔ میرے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اب بھی پاکستان نہیں پہنچ پاؤں گا۔

ان کا مجھ سے فاصلہ محض چند گز رہ گیا ہوگا۔ وہ سارے غضب ناک نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ ہی لمحات کے بعد میں ان کی تحویل میں جانے والا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد دھواں پھیل رہا ہو۔ میں فوری طور پر اسے نہ سمجھ سکا مگر اس کے ساتھ ہی انٹرنیٹ پر موجود آوازیں غائب ہو گئیں۔ ایک دم سے سناٹا چھا گیا تھا، جیسے وہاں پر کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے آپ کو دیکھا، پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، وہاں کوئی بندہ بشر مجھے دکھائی نہیں دیا۔ میں حیران پریشان آنکھیں پھاڑے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ تبھی میری نگاہ اسٹیشن پلیٹ فارم کی مغربی سمت کی جانب رک گئی۔ وہی روہی والے بابا آ رہے تھے، وہی سفید لباس، وہی ہاتھ میں عصا اور وہی چلنے کا تیز تیز انداز۔ انہیں دیکھتے ہی میں ساری صورت حال سمجھ گیا۔ وہ چلتے ہوئے میرے قریب آئے اور آکر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے سرخ و سفید چہرے پر دیکھ رہا تھا جہاں ایک دھیمی سی مسکراہٹ موجزن تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور شکفتہ سے انداز میں گویا ہوئے۔

”کیا تمہیں ہم پر یقین نہیں ہے، جو تم گھبرا رہے ہو۔ اپنی ذات پر یقین رکھو اور اس ذات پر بھروسہ کرو جو زندگی اور موت دینے والا ہے۔ نہ تم اپنی مرضی سے یہاں آئے ہو اور نہ ہی اپنی مرضی سے جا رہے ہو۔ اگر رتبہ تعالیٰ نے تم سے کام لینے ہیں تو وہ ضرور تمہیں سائیں بخشیں گے۔ جاؤ، وہاں کوئی تمہارا منتظر ہے۔ گھبراؤ مت۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجہ کیسے تھے کہ انہوں نے اپنا رخ موڑا اور مشرق کی سمت چل پڑے۔ انہوں نے میری بات ہی نہیں سنی۔ وہ چلتے چلے جا رہے تھے۔ جس وقت وہ پلیٹ فارم کے انتہائی مشرقی کونے تک پہنچ کر بیٹھ اتر گئے، اسی لمحے مجھے ادھر سے ریلوے انجن آتا دکھائی دیا۔ انجن زور زور سے دھل بجا رہا تھا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی تو میں نے غور کیا۔ مجھے لوگوں کا شور بھی سنائی دینے لگا تھا۔ میں ویسے ہی کھڑا تھا، مگر وہ لوگ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سامنے ہی بابا سنگھ پر یوار کھڑا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا چکے تھے۔ میں جلدی سے آگے لپکا اور سامان اٹھا لیا۔ بھائی سنگھ بوگی کے ساتھ ساتھ جا کر وہ بوگی تلاش کر رہے تھے، جہاں ہماری سیٹ تھی۔ میرے ذہن میں خوف نہیں تھا مگر جس اب بھی تھا کہ وہ لوگ گئے کدھر؟

ہم اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سامنے بی بی کور کے ساتھ بھائی سنگھ تھا، میں اور بابا سنگھ ایک طرف بیٹھ گئے۔ تبھی میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، وہ لوگ اسٹیشن پر پاگلوں کی مانند پھر رہے تھے۔ پھر اچانک غائب ہوئے اور کچھ ہی دیر بعد وہ بوگی میں آن گئے۔ میں حوصلے سے بیٹھا رہا۔ وہ قریب سے آگے نکل گئے۔ اور پھر ٹرین چل پڑی۔

پاکستانی سرحد تک ساتھ ساتھ گھڑ سوار بھاگتے رہے۔ جیسے ہی پاکستانی سرحد آئی، میں نے سنگھ کا سانس لیا۔ سہ پہر سے ذرا پہلے ہم واہگہ اسٹیشن پر تھے۔ اگرچہ پاکستانی وہاں سے اپنی کلیرنس دے کر جا سکتے تھے، مگر میں ایک بھارتی تھا اور سنگھ کے روپ میں تھا۔ مجھے بہر حال لاہور اسٹیشن پر جا کر بی بی کور کا ہونا پھر ننگا نہ صاحب جا کر اپنی حاضری بھی دینا تھی۔ لاہور اسٹیشن پر سنگھ یاتریوں کی بڑی تعداد اُتری، میں بھی انہی میں شامل تھا۔ ہم چلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ کچھ یاتری وہیں سے ٹرین کے ذریعے ننگا نہ جا رہے تھے۔ مگر میرا دل نہیں کیا۔ میں نے بابا سنگھ کو یہی مشورہ دیا کہ ہم اپنی سواری سے وہاں جائیں گے۔ بابا سنگھ نے فوراً ہی میری بات مان لی تھی۔ اسٹیشن کی عمارت کے باہر جب ہم آئے تو شام ہو چکی تھی۔

میں کسی ٹیکسی کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ سامنے کھڑی لڑکی پر پڑی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں نے اسے کہیں پہلے دیکھا ہوا ہے۔ وہ بھی پر شوق نگاہوں اور مسکراتے لبوں سمیت کھلتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں ابھی اسے غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ میری جانب بڑھ آئی، چند قدم کے فاصلے پر جب وہ آئی تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا، وہ تانی تھی۔ وہ جس طرح شدت جذبات کے ساتھ میرے سینے سے آگئی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اندر سے میرے لیے کیسا محسوس کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے الگ ہوئی تو میں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

”تانی تم، یہاں کیسے؟“

تب وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”کیوں، میں یہاں نہیں آ سکتی کیا۔“

”لیکن تمہیں پتہ ہے کہ یہاں کتنے خفیہ والے پھر رہے ہوں گے، تیری یہ شدت انہیں متوجہ کر سکتی ہے کہ تازہ تازہ آئے سنگھ کے ساتھ یہ کون جھپیاں ڈال رہی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں ہوتا، تو بھارت سے آیا ہے نا، اس لیے سوچ رہا ہے۔“

اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ ایک پر یوار بھی ہے۔ میں نے تانی کا تعارف کرایا اور ان کے بارے میں بھی بتایا۔

”چلو اب چلیں۔“ تانی نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

”کہاں لے جا رہی ہو؟“

”کہیں تو لے جاؤں گی، چلو نا“ وہ بھند ہو کر بولی تو بابا سنگھ نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”بیٹا! تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ ہم ننگا نہ صاحب چلے جائیں گے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، وہاں میرے بارے میں پوچھ ہو سکتی ہے کہ میں کدھر ہوں۔ میں آپ کو وہاں چھوڑ کے پھر واپس آؤں۔“

”نہیں پتر، اب یہ ضروری نہیں ہے، میں تمہیں یہ بات یہاں آکر بتانا چاہتا تھا“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولا، ”دیکھ پتر ہم نے تمہیں یہاں لا کر کوئی تم پر احسان نہیں کیا، میں خود کتنے برس سے اسی کوشش میں تھا۔ دراصل، میرا اپنا دلچسپ سنگھ کئی برس سے یہاں پھنسا ہوا ہے۔ وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے یہاں آیا ہوا تھا۔ اس کا تعلق بڑا خالصہ سے تھا۔ اب نہیں ہے۔ وہ واپس گھر جانا چاہتا ہے لیکن کسی صورت جائیں پارہا ہے۔ تم آئے تو کچھ اُمید بنی۔ میرا اس سے رابطہ ہوا۔ اس نے سارے کاغذات بنوائے ہیں۔ اب وہ تیری جگہ ہمارے ساتھ ہوگا، وہیں ننگا نہ صاحب میں اپنی انٹری کروائے گا کہ وہ ابھی بھارت سے پاکستان آیا ہے اور ہمارے ساتھ ہی واپس بھارت چلا جائے گا۔“

”یہ بات ہے۔“ میں نے ایک طویل سانس لی۔

”ہاں رتبہ نے تیری صورت میں مجھ پر مہر کی ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ میں اپنے پتر کو یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”لیکن میں آپ کو ننگا نہ ضرور.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا

”نہ پتر اب ایسا نہ کر..... ہمیں جانے دے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ابھی آپ کچھ دیر میرے پاس ٹھہرو، میں آپ کو بھجوا دیتا ہوں۔“ میں نے کہا تو بی بی کور بولی۔

”نہ پتر ہمیں جانے دے۔“

”ٹھیک ہے ماں جی۔“ میں نے کہا اور تانی سے سیل فون کا نمبر لکھ کر دیے کو کہا تو وہ آگے بڑھ کے بی بی کور کو اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

”بی بی! آپ مت گھبرائیں۔ بلکہ ہم پر اعتماد کریں۔ ہم آپ کے بہت کام آئیں گے۔“

بی بی کو نے اس کی طرف دیکھا اور چند لمحے چپے کے بعد بولی۔

”چل دیجیے ایسے تیری مرضی۔“

بی بی کو نے یوں کہنے پر بابا سنگھ کا پر یوار ہمارے ساتھ نکانہ صاحب چلنے کو تیار ہو گئے۔ تانی میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”آؤ چلیں۔“

ہم سب اس کے ساتھ چل پڑے۔ کچھ ہی فاصلے پر سیاہ وین کھڑی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی کلین شیونو جوان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا اور تانی کے پچھلا گیت کھولنے پر باقی سب نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے اگلی سیٹ پر بیٹھا تو وین چل پڑی۔

وین ریلوے اسٹیشن کی حدود سے نکلی اور اس وقت ہم بوہڑ چوک کر اس کر گئے تھے کہ تانی نے پوچھا۔

”اب تم یہ نہیں پوچھو گے، ہم تمہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟“

”تمہارا مجھے یہاں لینے آنے کا مطلب میں سمجھ گیا ہوں کہ اب مجھے تیرے مطابق ہی چلنا ہوگا، تم بتاؤ کہ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ مجھے روہی سے تمہارے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی ہے، لیکن مجھے کوئی حکم نہیں ہے۔ نکانہ صاحب کیوں جارہے ہو، یہ تمہیں وہاں جا کر پتہ چلے گا۔“

”اوکے تو پھر ہم وہیں جاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میرے لہجے میں نہ جانے کتنی یاس بھر گئی تھی۔ مجھے میری ماں یاد آگئی تھی۔ جو اسی لاہور شہر میں تھی۔ وہ میری منتظر تھی اور میں اس کے قریب سے ہو کر جا رہا تھا۔ اس پر تانی نے مجھے غور سے دیکھا اور خاموش رہی، تبھی ڈرائیور نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

”ظاہر ہے اماں اور سوہنی بھی تو ساتھ ہی ہوگی اس شہر میں، کیا ہوتا جو وہ ان سے مل لیتا بے چارہ۔ کچھ دیر ہی کی تو بات تھی۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے غور سے اسے دیکھا، اس کا چہرہ مجھے شناسا لگا۔ تبھی مجھے لگا کہ وہ آواز بنا کر بول رہا ہے۔ میں نے اسے پہچانتے ہوئے تانی سے پوچھا۔

”کون ہے یہ؟“

”پہچان لو تو تمہارا، ورنہ میرا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے خوشگوار حیرت سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی، ڈرائیور بھی ویسے ہی زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اس وقت ہم میکلوڈ روڈ پر آ گئے تھے۔

”نہیں پہچانا، نا، اب بدھو میں جہاں ہوں، جہاں سنگھ فرام کینیڈا.....“

”اوئے تیری خبر ہوئے، یہ سارے کیس صاف کرا دیئے، تم تو واقعی ہی پہچانے نہیں جا رہے ہو۔“ میں نے حیرت سے کہا تو وہ بولا۔

”تم نے جو رکھ لیے ہیں..... ویسے میں بھی تجھے نہ پہچان پاتا اگر تیری تصویر نہ دیکھی ہوتی۔“

تبھی بابا نے حیرت اور دھکی لہجے میں پوچھا

”اوئے پتر یہ سکھ ہے؟“

”ہاں بابا،“ تانی نے تیزی سے کہا، پھر لمحہ بھر رک کر بولی، ”ایک مسلمان اس وقت سکھ کے روپ میں ہے اور سکھ اس

وقت مسلمان بنا ہوا ہے۔ یہ وقت بھی آنا تھا۔“

”واہ گورو..... واہ گورو۔“ بابا سنگھ نے بس یہی تہمرہ کیا اور پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے جہاں سے پوچھا۔

”تو کب آیا ہے؟“

”یار دل ہی نہیں لگا وہاں پر، یہیں روہی میں دل اٹکا ہوا تھا۔ بس سب کچھ سمیٹ کر ادھر آ گیا ہوں۔ پرسوں سے یہیں تیرا انتظار کر رہے ہیں ہم دونوں۔“

اس نے کہا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ ماحول ایک دم سے خوشگوار ہو گیا۔ تبھی اچانک مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا۔

”اسٹیشن سے لے کر اب تک تم نے راستے کے بارے میں نہیں پوچھا، پرسوں تم یہاں آئے ہو اور تمہیں راستوں کا پتہ بھی ہے۔“

”رہے نا پینڈو کے پینڈو اب دیکھ ادھر ڈیش بورڈ پر یہ اسکرین، اس پر سارا راستہ بنا ہوا ہے۔ آج صبح ہی میں نے روٹ بنایا تھا، سوہنی سے پوچھ کر۔“

”تم سوہنی سے ملے ہو؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”پرسوں سے اسی کے ہاتھوں کے پرانے کھار ہا ہیں باؤ جی..... ماں نے بہت پیار دیا ہے یار۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں مجھے پاگل کر دو گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسرت بھرے لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میری ماں محفوظ ہے۔

میں ان جذبات کو اپنے اندر شدت سے محسوس کرنے لگا کہ مجھے اپنی ماں سے ملے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ کار میں خاموشی چھا گئی تھی۔ مجھے اس وقت یہ دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ تانی کو سوہنی کے ان جذبات کے بارے میں معلوم ہو گیا ہوگا جو سوہنی میرے بارے میں رکھتی ہے۔ میں تو بس اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ان لوگوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے، جنہوں نے ہمیں ہمارے گاؤں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری سوچوں کی تان اس وقت ٹوٹی، جب ہم جی ٹی روڈ پر آن چڑھے۔ ہم سب میں خاموشی تھی۔ میں بہت کچھ جہاں سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ لیکن بابا سنگھ پر یوار کی وجہ سے نہیں پوچھ پارہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے سائے پھیل گئے تھے، جب ہم نکانہ صاحب جا پہنچے۔ نہر کی مشرقی جانب جدید کالونی میں ایک کوٹھی نما گھر تھا۔ اس کے پورچ میں وین رکی تو ہم سب اندر چلے گئے۔ سامنے ہی ایک لمبا ترنگا سکھ لوجان کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دوسرے مقامی لوگ بھی تھے۔ بی بی کو نے اسے دیکھتے ہی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ روتے ہوئے اسے گلے لگا کر بولی۔

”اؤ پتر دلجیت! میں نے کیسے کیسے تیری راہ نہیں نکلی۔“

”بے بے، واہ گورو ان کا بھلا کرے، یہ لوگ مجھے ملے تو میری راہ آسان ہوئی ہے۔ انہوں نے میرے کاغذ بنائے ہیں۔“ دلجیت نے جہاں اور تانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ سبھی ایک دم سے منمن ہو گئے۔ وہ ایک جذباتی منظر تھا۔ ہم دیکھتے رہے۔ جب وہ اچھی طرح مل کر بیٹھ گئے تو کھانا لگ جانے کا اعلان ہوا۔ کھانا کھا کر ہم چائے پی رہے تھے کہ دلجیت سنگھ میرے پاس آ کر بولا۔

”بھاء جی! میں ان سب کو گردوارہ لے کر جا رہا ہوں، وہاں ان کی رہائش کا بہترین انتظام ہے۔ ابھی میں آپ سے کچھ

بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”بولو“ میں نے کہا۔

”بھاء جی! میں بھر خالصہ کے ساتھ تھا اور میرے بارے پتہ چل گیا تو میں بھارت سے نکل آیا۔ یہاں میری مدد سردار امر سنگھ نے کی۔ وہ پاکستانی ہے، مگر ہمارے جیسے لوگوں کی مدد کرتے ہوئے انہیں سنبھال لیتا ہے۔ میں کئی برس سے یہاں ہوں اور ان کی خدمت کر رہا ہوں۔“

”کیسی خدمت کر رہے ہو تم؟“

”اس کا بہت پھیلاؤ ہے، اسی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم، اس بار یہاں کی حکومت نے بڑے پیمانے پر سکھوں کو آنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ سیکورٹی کا مسئلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ کئی طرف سے دھمکیاں مل رہی ہیں اور سیکورٹی میں بہت مشکل پیش آرہی ہے۔“ اگرچہ وہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا لیکن وہ باتوں ہی باتوں میں مجھے اپنی بات سمجھا گیا۔

”ہم سے کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا

”یہ تو امر سنگھ ہی بتائے گا، انہی سے بات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میرے سر ہلانے پر وہ کچھ دیر بعد سب کو لے کر چلا گیا اور ہم اپنی باتیں کرنے لگے۔ میں نے انہیں بھارتی پنجاب کی اپنی روداد سنار ہا تھا۔ رات گئے، دلچسپ سنگھ پھر آگیا۔ اس کے ساتھ امر سنگھ تھا۔ وہ اڈیز عمر خور و شخص تھا۔ سکون سے بیٹھ جانے کے بعد اس نے بتایا۔

”معذرت خواہ ہوں کہ اس وقت آیا، یہ آپ کے آرام کا وقت ہے، لیکن ذمے داری ایسی ہے کہ ان دنوں میں بھی نہیں سو رہا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں، میں سمجھتا ہوں۔ آپ کہیں۔“ میں نے کہا تو بولا۔

”مجھے رتن دیپ سنگھ نے آپ کے بارے میں بتایا ہے، آپ انہی کے مہمان تھے۔ وہاں مسئلہ تھا، اسی لیے انہوں نے آپ کو جلد بھجوا دیا۔“

”ہاں بہت اچھے انسان ہیں وہ۔“ میں نے اعتراف کیا تو وہ بولا۔

”بس، یہاں پر کچھ ایجنٹ ہیں سکھ بہروپ میں، مجھے نہیں علم کہ وہ یہاں کیا کرنا چاہتے ہیں، لیکن سیکورٹی ہماری ذمے داری ہے۔ میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ اگر آپ ہاں کریں تو.....؟“

اس نے کہا تو میں نے تانی کی طرف دیکھا تو تیزی سے بولی۔

”امر سنگھ جی، ہم حاضر ہیں۔ حیاں ادھر ہی رہے گا، میں اور جمال گردودارے میں رہیں گے۔“

”تو چلیں میرے ساتھ، میں آپ کے وہاں رہنے کے بارے میں بتاؤں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں پہلے تو حیران ہوا کہ تانی نے یہ بغیر سوچے سمجھے ایک دم سے کیسے کہہ دیا۔ پھر سوچا، اس میں کوئی نا کوئی بات ہوگی، جو اس نے امر سنگھ کو ہاں کہہ دی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں اس کے ساتھ چل دیے۔ حیاں خود وہاں رہ گیا تو میرا خیال مزید پختہ ہو گیا کہ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ طے ہے۔

گردوارہ جنم استھان کی زرد اور سفید عمارت میرے سامنے تھی۔ اس پر خوب لائینگ ہو رہی تھی۔ فوارے کے دائیں جانب ایک آفس میں ہم بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ وہاں کیسی صورت حال ہو سکتی تھی۔ میں تانی کے ساتھ ڈیوڈھی کے اندر گیا، کنویں کے پاس سے ہوتا ہوا بڑے صحن میں آگیا، اور پھر وہاں اس چھوٹے

سے کمرے میں چلا گیا جہاں گرنٹھ صاحب پڑی تھی۔ آدمی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ وہاں اتنے لوگ نہیں تھے، ہاں مگر چہل پہل کافی تھی۔ میں اندر گرنٹھ صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا، سچی میری نگاہ وہیں ایک کونے میں بیٹھے ایک بوڑھے سکھ پر پڑی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ سچی وہ ایک دم سے اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

”اک اونکار..... سچے بادشاہ..... اک اونکار۔“ پھر آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا اور کتنے ہی لمحے میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس کے یوں دیکھنے پر میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے باباجی؟“

”وہی سچ ہے، سچ بھی وہی ہے، وہی سچ رہے گا۔ سب اس میں ہیں، اور وہ سب کا ہے اور اسی سے سب ہیں۔“ وہ واضح لفظوں میں بولا۔

”کیا یہ بات آپ مجھے کہہ رہے ہیں؟“

”سب کے لیے ہے پتر، اک اونکار۔ دو جانہیں ہے کوئی، وہی سب کا ہے۔“

”بے شک باباجی،“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ سچی اچانک مجھے احساس ہوا کہ بابا کا لہجہ سرائیکی ہے۔ یہ میرے لیے بہر حال نئی بات تھی۔ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”باباجی آپ کس علاقے کے ہیں، مطلب یہاں آپ.....“

”یہاں کا کوئی نہیں ہے پتر، مٹی نے مٹی مل جانا ہے، جانا وہیں ہے جہاں سے ہم سب آئے ہیں۔ تو یہاں آیا ہے ہمارا نہیں ہے، پر مہمان تو ہے اور مہمانوں کو خالی ہاتھ نہیں بھیجتے، جاتے ہوئے مجھے مل کر جانا، یہاں نہیں ملا تو فکر نہ کرنا۔ اب جاؤ۔“ اس نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ روہی والے بابا سے ملنے کے بعد مجھے اب ایسے معاملات میں حیرت نہیں رہی تھی۔ میں اٹھا اور اس چھوٹے کمرے سے باہر آگیا۔

ہمیں شمالی طرف میں ایک ہوٹل نما عمارت میں کمرہ مل گیا۔ میں جاتے ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ میرا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ جو کچھ امر سنگھ نے بتایا ہے اگر وہ ہو گیا تو بہت ساری انسانی جانوں کے علاوہ پاکستانی اداروں کی شکست تھی، اور میں یہ کبھی نہیں چاہتا تھا۔ تانی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”وہی جو امر سنگھ نے بتایا، اسی پر سوچ رہا ہوں کہ اتنی خلقت ہے، یا تریوں نے کل رسوم ادا کرنی ہیں، اتنے لوگوں میں سے ان چند افراد کو کیسے تلاش کر پاؤں گا۔“

اس پر تانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مصرف تم ہی تو نہیں ہو اور بہت سارے لوگ ہوں گے انہیں تلاش کرنے کے لئے۔ تم کیا سمجھتے ہو، وہ تنہی کوئل جائیں گے۔ دوسرے لوگ بھی تو انہیں تلاش کر سکتے ہیں۔“

”کر لیں، ہمیں کون سا کریڈٹ لینا ہے۔ بس اتنا معلوم ہو جائے کہ خطرہ نہیں ہے۔“

”اتنی بے نیازی؟“ اس نے چونکتے ہوئے کہا

”میں نہیں جانتا یہ کیا ہے، لیکن انسان اور انسانیت کو بچانا ہی ہمارا فرض ہے، تم یہ سوال کر سکتی ہو کہ یہ غیر مذہب کے لوگ ہیں، تو ہمیں کیا؟ ایسی بات نہیں، یہ میرے دین کی ذمہ داری ہے۔ اسلام، سلامتی سے ہے، امن دینے والا، اس کے دائرے میں آنے والا، ہر ذی روح اپنے آپ کو محفوظ سمجھے۔ یہی میرا دین ہے، امن اور سلامتی والا۔“

”سب لوگ مذہب کے نام پر لڑ.....“

”تانی! یہ میرا موضوع نہیں ہے اور نہ میں اس پر بحث چاہتا ہوں، میں تو انسان کی بات کرتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو وہ بولی۔

”تو پھر سوچو کہ تم انہیں تلاش کیسے کرو گے، وہ کون لوگ ہیں، یہ میں تمہیں بتاتی ہوں۔“

”کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا تو اس نے اپنا سیل فون نکالا اور اس میں سے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے ان لوگوں کا لیڈر، جو اس آپریشن کا ہیڈ ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ دو بندے ہیں۔“

میں نے ان تصویروں کو دیکھا، وہ تینوں سکھ تھے۔ وہ کسی ایئر پورٹ پر سے لی گئی تصویریں تھیں۔ میں نے اس کے پس منظر میں دیکھ کر اس ایئر پورٹ کا اندازہ لگانا چاہا، مگر کچھ نہیں آ سکا تو میں نے تانی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا اور پوچھا۔

”یہ کون ہیں اور.....؟“

”یہ تینوں ‘را’ کے ایجنٹ ہیں، یہ کینیڈا سے یہاں آئے ہیں۔ یہ تصویر ٹورنٹو ایئر پورٹ کی ہے۔“

”یہ بات تم نے وہاں امر سنگھ کے پاس کیوں نہیں بتائی، یاد وہ لوگ اس بارے جانتے ہیں؟“

”کوئی بھی نہیں جانتا یہاں۔ اب تم جان گئے ہو۔ شاید تمہیں کریڈٹ کی ضرورت نہ ہو لیکن کہیں نہ کہیں کسی کو اس کیڈٹ کی ضرورت ہے۔ اب یہ بچوں والا سوال مت کرنا کہ یہ تصویریں مجھ تک کیسے پہنچی ہیں۔ اب ہمیں اس وقت صرف یہ سوچنا ہے کہ ان لوگوں کو اتنے جھوم میں سے پکڑنا کیسے ہے۔“

”ہاں۔ یہی ٹھیک رہے گا، تم کچھ کہو، تمہارے ذہن میں کچھ ہے؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو تانی نے پوچھا۔

”بہت کچھ ہے۔ ان کا پلان صرف یہی ہے کہ وہ یہاں دھماکے کریں گے اور فکل جائیں گے۔ دہشت پھیلانا مقصد ہے ان کا اور یہ ان لوگوں کو پیغام دینا چاہتے ہیں کہ جو مشرقی پنجاب میں کارروائیاں کرنے والوں کے ہمدرد ہیں۔“

”دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ وہ کبھی خیر نہیں چاہتا، میں صرف انہیں پکڑنے کا طریقہ پوچھنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے تانی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہوتا تو اب تک جا کر پکڑ چکی ہوتی انہیں۔ تم یہ سوچو کہ اگر تم نے یہاں دھماکے کرنے ہوتے تو کیسے کرتے۔“

اگر تم مجھے بیڈ پر اپنے ساتھ لیٹنے کی اجازت دو تو میں تمہیں لیپ ٹاپ پر نقشہ دکھاتی ہوں۔“

”آ جاؤ۔“ میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے سامان سے لیپ ٹاپ اٹھا لائی اور میرے پہلو میں لیٹ گئی، کچھ دیر بعد اس نے میرے سامنے جنم استھان کا نقشہ کر دیا۔ ہم بہت دیر تک اسی پہلو سے بات کرتے رہے۔ ہمارے درمیان کل ہونے والی رسوں کا بھی ذکر آیا کہ وہ کیسے ہوں گی۔ میری نیند اڑ چکی تھی۔

تانی نے بھی آنکھ نہیں جھپکی تھی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ لوگوں کا رش بڑھنے لگا تھا۔ کیرتن کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں فریش ہو کر باہر نکلا تو میرے ساتھ تانی بھی تھی۔ میں سیدھا اس جگہ گیا، جو کنٹرول روم تھا۔ وہاں سی سی کیمرے میں وہ تمام مکینہ جگہیں دیکھیں، جہاں وہ ممکنہ کارروائی کر سکتے تھے۔ میرا نہیں خیال تھا وہاں ایسی کوئی کارروائی کرتے۔ اس کے بعد میں کمپیوٹر سیکشن میں گیا اور وہ تصویریں ایک کمپیوٹر میں ڈال کر ان کا ڈیٹا لیا۔ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا، وہ لوگ کسی ڈیٹا میں نہیں تھے اور نہ ان لوگوں میں تھے، جو سکھ یا تریوں کے بارے میں معلومات کے طور پر کمپیوٹر میں محفوظ کیے ہوئے تھے۔ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا، میرا کون سا ڈیٹا یہاں ہوگا، میرے نام پر تو دلچسپ سنگھ ہوگا۔ میں نے فوراً اپنی تصویر کی مدد سے اپنا ڈیٹا لیا۔ توقع کے مطابق وہاں بابا سنگھ کا بیٹا دلچسپ سنگھ ہی تھا۔

”تانی، وہ ابھی یہاں نہیں ہیں اور اگر وہ یہاں پر ہوئے بھی تو وہ ان تصویروں کی طرح نہیں ہوں گے اور نہ ہی وہ لوگ

ابھی یہاں آئیں گے۔“ میں نے کمپیوٹر سیکشن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”تو پھر وہ کہاں ہو سکتے ہیں؟“ وہ ایک دم سے پریشان ہو گئی۔

”دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور اندر کی طرف چل دیا۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ ہم خاموش تھے۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا، گردوارہ کے صحن میں آ گیا۔ ہر طرف لوگ بھرے ہوئے تھے۔ میں اس درخت کے پاس چلا گیا، جو ایک یادگار کے طور پر تھا۔ وہاں کسی سکھ کو اس درخت کے ساتھ الٹا لٹکا کر جلا دیا گیا تھا۔ میں وہاں کھڑا ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ کافی رش تھا۔ میں پاکی کے پاس بیٹھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

مجھے لگا جیسے وہاں پر کوئی بھی نہیں ہے۔ ایک دم سے دیرانی ہو گئی ہو۔ اچانک باہر سے چیخنے پکارنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ میں بھاگتا ہوا باہر کی جانب گیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا، دیرانی تھی، لیکن سڑکوں پر خون کھرا پڑا تھا۔ میرے سامنے چند لوگ بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کے قدموں کے نشان خون کے دھبوں کی مانند تھے۔ جو باہر ہی سے آئے اور فوارے کے گرد سے ہو کر وہاں باہر ہی کی جانب چلے گئے تھے۔ میں ان کے پیچھے بھاگا تو ایک دم سے شور اُٹھ آیا۔ میں وہیں درخت کے پاس کھڑا تھا۔ تانی میرے ساتھ کھڑی لوگوں کو دیکھ رہی تھی، تبھی میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں جو کچھ بھی ہوگا، وہ باہر ہی ہوگا، جہاں سے جی ہوئی بس آئے گی، اس کے آگے پیچھے ہی کچھ ہوگا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ تانی نے تشویش سے پوچھا تو میں نے کہا۔

”میں نہیں جانتا، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ رسوں کے وقت جھوم بہت زیادہ ہوگا۔ وہ ایک دم سے ظاہر ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے وہ خود سامنے نہ آئیں۔“

”لیکن، کیسے، تم یہ کیسے کہہ رہے ہو؟“

”میں نے کہا نا کہ میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم امر سنگھ کا نمبر ملاؤ۔“ میں نے اسے کہا تو اس نے اپنے سیل سے نمبر ملائے اور رابطہ ہو جانے پر سیل مجھے دے دیا۔

”جی، دلچسپ، کیا بات ہے۔“ وہ بولا۔

”کہاں ہو مجھے ابھی مل سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا

”میں گردوارہ کے آفس میں ہوں۔“ اس نے بتایا تو میں نے وہیں آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

وہ آفس میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے سیل کی تصویریں اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بندے مل سکتے ہیں؟“

”ابھی کمپیوٹر.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہاں ان کا ریکارڈ نہیں ہے۔“

”تو پھر کیسے.....“ وہ ایک دم چوکتے ہوئے بولا

”میں بتاتا ہوں، یہ تصویریں، اپنے ان لوگوں تک پہنچا دو، جن پر تمہیں پورا اعتماد ہے۔ گردوارہ کے اندر کم اور ان جگہوں پر زیادہ تلاش کریں، جہاں بس تیار ہو رہی ہے، یا یہاں پر آنے والی کوئی سنگت، جو کسی بھی صورت میں موثر والی ہو۔“

”یہ کیوں، تم کیا سمجھتے ہو، یہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ایک دم سے یوں اٹھ گیا، جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ تانی نے وہ تصویریں اس کے سیل میں ڈال دی تھیں۔ وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے حپال کو اطلاع

دوپہر کے بعد امر سنگھ نے بتایا۔ ایک جگہ سے اطلاع ملی ہے کہ تصویر والے دو مشکوک لوگ ایک گردوارہ میں موجود ہیں۔ ان کی تمام تردیجی ایک دین تیار کرنے میں ہے۔ جو وہ جنم استھان لے کر آنے والے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ریکس شروع ہونے والی تھیں۔ میں نے انہیں وہیں رکنے کو کہا اور امر سنگھ کے ساتھ اس گردوارے کی جانب چل پڑا۔

دو تانی میرے ساتھ تھی، اور گیٹ پر حمال ہمارے انتظار میں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم وزیر کی حیثیت سے اس گردوارے میں پہنچ گئے۔ ایک طرف کچھ لوگ ایک گاڑی کو تیار کر رہے، انہیں میں وہ دو مشکوک بندے بھی تھے۔ جیسے ہی ہم ان کے قریب گئے، ہمارے ارد گرد محافظوں کا دائرہ بن گیا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی؟“ امر سنگھ نے پوچھا۔

”بس سنگت کی تیاری ہو رہی ہے۔“ وہیں پر ایک سکھ نوجوان نے کہا تو امر سنگھ نے ایک مشکوک بندے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ نوجوان کہاں سے آیا ہے بھئی؟“

”یہ۔ اُدھر والے پنجاب سے آیا ہے۔ بڑی سیوا کی ہے جی اس نے،“ اس نوجوان نے کہا تو امر سنگھ نے خوش ہوئے کہا

”اُدوجوان، ذرا ادھر آ، کچھ ہمیں بھی بتا، اُدھر کے کیا حالات ہیں۔“

”سردار جی آپ دیکھ رہے ہو، ابھی تو وقت ہی نہیں ہے، ابھی کچھ دیر بعد تو گردوارے جانا ہے، باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔“ اس نے کہا تو امر سنگھ نے کہا۔

”اودھر تو آ، ہم بھی تو تیرے ساتھ ہی جائیں گے نا گردوارے۔“ امر سنگھ نے کہا تو اس نوجوان نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر لمحے بعد وہ نوجوان کام چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرا مشکوک نوجوان اس کے گھیسوں سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے تو یقین ہو گیا مگر امر سنگھ ٹھیک کر رہا تھا۔ اسے وہاں سے حکمت کے ساتھ ہی نکالنا تھا۔ امر سنگھ اس نوجوان کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ اسی لمحے اس نے اشارہ کر دیا۔ محافظ دوسرے نوجوان پر بل پڑے۔ اگلے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ حمال کی کار میں تھے۔ تبھی امر سنگھ نے وہاں موجود لوگوں سے کہا۔

”تم سب حراست میں ہو۔ اس وقت تک، جب تک ان کے دو اور ساتھی نہیں مل جاتے، میں ادھر ہی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم وہاں سے نکل پڑے۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑیاں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ امر سنگھ اس وقت تک وہاں رہے گا، جب تک ان کے بارے میں وہاں سے پوری معلومات نہیں لے لیتا۔ انتہائی تیزی سے ہم اسی گھر میں آ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ان نوجوانوں کو ایک کمرے میں لے کر فرش پر پھینک دیا گیا۔

”بولو۔ کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟“ میں نے ان سے پوچھا تو دونوں نے انتہائی خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

”جی امر سر سے جی، ہمارے کاغذات.....“

”بکواس نہیں، حقیقت، یہ تصویر کس کی ہے، بچانو۔“ میں نے سیل سے تصویر نکال کر اس کے سامنے کی تو چند لمحے دیکھتا رہا، پھر سر پھیرتے ہوئے بولا

”مجھے نہیں معلوم جی کون ہے یہ۔“

میں نے دوسرے کو دوسری تصویر دکھائی تو اس نے بھی انکار کر دیا۔

”جہاں یہ لوگ ایسے نہیں مانیں گے۔ اسے مناد، یہاں پاکستان میں نمک بہت سستا ہے۔“ میرے یوں کہنے پر اس

نے دونوں کو فرش پر التالیٹ جانے کو کہا۔ وہ لیٹ گئے تو میں نے کمر سے بندھی ہوئی کرپان نکالی اور دونوں کے اٹنے ہاتھ اوپر نیچے زمین پر رکھ کر اس پر کرپان ماردی۔ ان دونوں کی ایک ساتھ چیخ بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی امر سنگھ کی کال آ گئی۔ وہ پر جوش انداز میں بول رہا تھا

”اوائے دلچیت، ایک طاقتور ہم اس گاڑی کے نیچے سے مل گیا ہے۔ ان بہن..... سے باقی کا پوچھ، میں نے ادھر سب کو لگا دیا، اوپر اطلاع دے دی ہے۔ تیسرا پکڑنا ہے۔ جلدی کر۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیل فون بند کر دیا پھر ان کے سامنے بیٹھ کر بولا۔

”ہم پکڑا گیا ہے، اگر تم تعاون کرو گے تو میں بھی تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔ بتا تیسرا کہاں ہے۔ ورنہ تجھے موت بھی نہیں ملے گی۔“

وہ دونوں گوٹکی کی حالت میں رہے۔ اتنے میں تانی آگے بڑھی اور ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”دیکھو۔ ہم نے تم لوگوں کو صرف یہاں سے ہی رکنے ہاتھوں نہیں پکڑا ہے۔ بلکہ ٹورنٹو سے تم لوگ ہماری نگاہ میں ہو۔ تم دونوں نے شاید غور نہیں کیا کہ تمہاری یہ تصویریں ٹورنٹو انٹرنیٹ کی ہیں اور تم جس کے لیے کام کر رہے ہو۔ ہمیں اس کا بھی پتہ ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو اس سے بات کرادو تمہاری؟“ تانی نے کچھ اس اعتماد سے کہا کہ وہ ایک دم چونک گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تانی نے ان کے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ انہی کے سیل فون اپنے سامنے رکھ لئے، جو تلاش میں ہاتھ آئے تھے۔ تانی نے اپنے سیل سے نمبر دیکھے اور پھر رابطہ کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”ہیلو شیام عرف بابو شرما۔“ تانی نے کہا۔

”کون ہو تم؟“

”وہی جس نے تمہارے جنم استھان پر بھیجے ہوئے بندے قابو کر لیے ہیں۔ بات کرو گے ان سے؟“ تانی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ دوسری طرف سے چیخ کر کہا گیا تو تانی نے ایک کو بولنے کا اشارہ کیا۔

”میں..... میں بات کر رہا ہوں جی۔“

”میں کسی کو نہیں جانتا۔“

”تم نہ جانو لیکن ہم تمہیں جانتے ہیں۔ تم نے پہل کر لی، اب ہماری باری ہے۔ اب تڑپنا نہیں۔“ تانی نے نفرت سے کہا تو دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ اسی لمحے امر سنگھ آ گیا۔

”کچھ بتایا ان ماں..... نے“

”ابھی تک نہیں۔“ حمال نے کہا۔

”تو پھر انہیں کرو فورسز کے حوالے، وہ خود پوچھ لیں گے ان سے۔“ امر سنگھ نے کہا تو میں نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اب بھی اپنے بارے میں سچ بتاؤ، تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ تم سے اچھا سلوک کروں گا اور یہاں سے جانے بھی دوں گا۔ ورنہ تمہیں پتہ ہے کہ وہ لوگ تو سب کچھ.....“

”اگر آپ وعدہ کریں کہ مجھے سرحد پار کروادیں گے تو میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔“ ایک نے کہا۔

”بولو۔“ میں نے کہا تو وہ کہتا چلا گیا۔

ان کا تیسرا ساقی حسن ابدال میں مصروف تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ جیسے ہی انہوں نے جنم استھان میں دھماکا کرنا تھا، اس دھماکے کی اطلاع اسے مل جاتی تھی۔ اسی وقت وہاں بھی دھماکا کرنا تھا۔ اگرچہ وہاں بندے کم تھے۔ لوگ کم مرتے یا نہ مرتے، مگر پاکستان میں موجود ہر گردوارے پر خوف چھا جاتا۔

”تو وہ تیسرا حسن ابدال میں ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے اس کی ساری تفصیل بتادی۔ تب میں نے امر سنگھ سے کہا، ”دیکھ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے کچھ نہ کہنا، میں جب تک حسن ابدال سے واپس نہ آ جاؤں، انہیں کچھ نہیں کہنا، ان کا خیال رکھنا ہے، انہیں سرحد تک بھی لے جانا ہے۔“

”چل وعدہ۔“ امر سنگھ نے کہا تو میں اور تانی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جہاں نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ وہیں سے ایک شخص بھی ہمارے ساتھ ہو لیا۔ سہ پہر کا وقت تھا اور حسن ابدال کا راستہ تقریباً چھ گھنٹے کا تھا۔ راستے میں ہم اپنے لوگوں سے رابطے میں تھے۔

رات کے سائے پھیل چکے تھے۔ جب ہم حسن ابدال کے قریب پہنچے۔ دائیں ہاتھ سے شہر کی جانب مڑے، پھر اونچی نیچی، ٹیڑھی میڑھی سڑک سے ایک تنگ سی گلی میں آ گئے۔ کاروہیں روکی تو گردوارہ پیچہ صاحب کے دروازے پر کافی لوگ موجود تھے۔ انہیں میں سے ایک بندہ آگے بڑھا اور اس نے پچھانے ہوئے ساتھ لیا اور اندر کی جانب چلا گیا۔ دائیں جانب پر بندھک کمیٹی کا آفس تھا۔ ہم وہاں چلے گئے، جہاں ایک گیانی ہمارے انتظار میں تھا۔ وہ ہمیں لے کر اوپر کی منزل میں چلا گیا، جہاں رہائشی کمرے تھے۔ انہی میں سے ایک کمرے کے آگے وہ رک گیا۔ دروازہ بجانے کے بعد چند لمحوں انتظار کرنا پڑا۔ بھی کچھ لوگوں کے ساتھ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا، تو اسے باہر نکال لیا گیا۔ میں اس کی تصویر سیل فون میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ اسے خاموشی کے ساتھ نیچے چلنے کو کہا۔ وہ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ بات کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ نہ تو جنم استھان پر دھماکا ہوا اور نہ ہی پیچہ صاحب کی انتظامیہ نے اسے باہر نکلنے دیا تھا۔ چند لوگ اسے گھیر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم اسے اپنی گاڑی تک لے آئے اور اسی وقت واپسی کے لیے نکل پڑے۔ حسن ابدال سے نکلنے ہی ہم نے اسے فورسز کے حوالے کر دیا۔ ننگا نہ صاحب میں رسومات بڑے امن اور سکون سے ہو گئی تھیں۔ میں نے بھی سکون کا ایک طویل سانس لیا۔

اس وقت صبح کے آثار پھیل رہے تھے، جب ہم موٹر روے سے لاہور پہنچ گئے۔ تانی میرے کاندھے کے ساتھ سر لگائے سو رہی تھی۔ میں نے اسے سونے دیا۔ یہاں تک کہ ایک بڑے سارے بنگلے کے گیٹ پر رُک کر چہال نے ہارن بجایا۔ گیٹ کھل گیا اور اس کے درمیان میں سے دور پورچ میں میری ماں کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سوئی تھی، جس کے چہرے پر بے حد سنجیدگی تھی۔ کاررکتے ہی میں نکلا اور ماں کے سینے سے جا لگا۔ وہ بہت دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگائے رہیں۔ پھر مجھے خود سے الگ کر کے میرا سر اور ماتھا چوما۔ سوئی اشتیاق بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے زور سے بچھ لیا۔ وہ جلدی سے الگ ہو گئی۔ ہم اندر چلے آئے۔ میری ماں کو شاید میرا سکھ کاروپ اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی روپ کو ختم کرنے کا سوچا اور سیدھا ہاتھ روم میں جا گھسا۔

☆.....☆.....☆

سارا دن آرام کرنے کے بعد باقی وقت میں اماں کے پاس ہی رہا تھا۔ وہ جب سونے لگیں تو میں، جہاں اور تانی اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں آ بیٹھے۔ رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا اور ہم باتیں کرتے چلے گئے۔ اوگی پنڈ میں اب مکمل خاموشی تھی۔ یہ جہاں کو بھی معلوم تھا۔ انہی باتوں کے دوران سوئی وہاں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ اس

نے آتے ہی معذرت خواہانہ انداز میں کہا

”سوری مجھے دیر ہو گئی۔ اماں کو سونے میں کچھ دیر لگ گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ ادھر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ چھاکے کا کیا حال ہے۔ گاؤں کیسا ہے، اس بارے مجھے بتایا ہی نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”وقت ہی کہاں ملا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس دوران تانی نے چائے لگ سب کے سامنے رکھ دیئے۔ تبھی وہ بولی، ”گاؤں میں سب ٹھیک ہے، شاہ زیب دوبارہ گاؤں میں واپس نہیں گیا، سنا ہے کہ وہ تب سے ادھر لاہور ہی میں ہے اور آج کل اس کا یارا نہ ملک سجاد سے بہت زیادہ ہو گیا ہے اور چھاکا بھی ٹھیک ہے۔“

”چھاکے کو پتہ ہے کہ میں آ گیا ہوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”چھاکے سے رابطہ ہو گیا تھا۔ وہ تجھ سے ملنے کے لیے فوراً آنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے وہیں رہنے کو کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ ہم خود وہاں جائیں۔ اب دیکھیں کیا حالات بنتے ہیں۔“ سوئی نے کہا تو، جن حالات میں وہاں سے نکلا تھا، انہیں یاد کرتے ہوئے میرے اندر غصہ بھر گیا تھا۔

”ہم جائیں گے اور اس طرح جائیں گے کہ اب کسی شاہ زیب کی اور نہ کسی پیر زادے کی، کسی کی بھی کوئی جرات نہ ہو۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ملک سجاد اور شاہ زیب کے بارے میں تجھے کیسے پتہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں کوئی نہیں ہے، جو بھی معلومات ملتی ہیں، وہ گاؤں ہی سے ملی ہے، زیادہ تر چھاکا ہی بتاتا ہے۔“ سوئی نے وضاحت کی تو میں خاموش ہو گیا۔ کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا گاؤں جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میں چند لمحوں سوچتا رہا، پھر جہاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیوں جہاں چلیں، صبح ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔“

”چلو۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ جانے کے لیے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔

”لیکن تم ایسے کیسے جا سکتے ہو، کیوں جانا ہے اب وہاں، اتنی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں ہم، ہمیں اور کیا چاہئے۔“

سوئی نے ایک دم سے کہا تو میں دھیرے سے ہنس دیا اور بولا۔

”اب شاید سکون میری زندگی میں نہیں ہے۔ اب تم اس کی فکر نہ کرو۔“ میں نے کہا تو اس نے یوں میری جانب دیکھا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن باری ہو۔ اس صورت حال کو تانی اور جہاں فوراً سمجھ گئے۔ اسی لیے تانی اٹھتے ہوئے بولی۔

”جمال، اگر جانا ہے تو بتا دینا، اس وقت تک میں میں تیار ہو جاؤں۔“

تانی لنگی تو جہاں بھی باہر چلا گیا۔ تنہائی پاتے ہی وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”جمال لگتا ہے اب تم بہت دور نکل گئے ہو؟“

”تم ٹھیک سمجھی ہو سوئی۔ اب میری زندگی میری نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو ان راہوں سے پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا۔ میں گاؤں اس لیے جانا چاہتا ہوں کہ میرے کچھ وعدے ادھورے ہیں، ابھی وہاں میرے خواب میرے انتظار میں ہیں۔ کچھ یادوں کے کانٹے اب بھی مجھے چھو رہے ہیں۔“

”مجھے اب کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے ماں مل گئی، اتنی دولت ہے میرے پاس کہ میں باقی زندگی سکون سے گزار سکوں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”سوئی! اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا یہی زندگی ہے۔ جہاں تک ہماری دسترس ہے، کیا ہم اللہ کی اس مخلوق کو ان

ظالموں سے نہیں بچا سکتے، جنہوں نے انہیں بے دام غلام بنا رکھا ہے اور وہ بے چارے لوگ، اس شکنجے کو اللہ کی رضا سمجھنے پر مجبور ہیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہم کہاں تک اور کیا کر سکتے ہیں۔ کتنے لوگوں سے لڑ پائیں گے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہاں تو پورا معاشرہ ان ظالم لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”نہیں سوئی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ سارے لوگ ظالم نہیں ہیں۔ اصل میں ہمارے اس معاشرے کا روگ وہ منافق لوگ ہیں، جو اپنی خباثت کو دوسرے کی طاقت سے لوگوں پر مسلط کرتے ہیں۔ ظالم اور منافق دونوں بزدل ہوتے ہیں، اور وہ دونوں اپنے اندر کے خوف سے معاشرے میں مجبور لوگوں پر ظلم روا رکھتے ہیں۔ انہیں بس کوئی روکنے والا ہو، یہ کتے کی مانند دم بٹا کر بھاگتے ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے میرے لہجے میں ٹپکی آگئی۔

”اس کا مطلب ہے تم ان سب سے مقابلے کی ٹھان چکے ہو؟“ سوئی نے حتیٰ لہجے میں پوچھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اور کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟“

”کیوں نہیں، میں تو کب کی آس لگا کر بیٹھی ہوں کہ کب تم مجھے کوئی حکم دو اور میں.....“

”نہیں، میرے لیے نہیں، اُس اللہ کے لیے اور اس کی اُس مخلوق کے لئے، جس نے گورے اور کالے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ مجھے بتاؤ کیا تصور ہے اُن لوگوں کا، جو زمین کے ان خداؤں کے سامنے بے بس ہیں۔ انہیں بے بس کر دیا گیا ہے اس زمینی نظام میں جکڑ کر۔ جہاں تک ہمارا بس چلتا ہے، ہمیں منافقوں اور ظالموں کے خلاف لڑنا ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں، صبح ہم یہاں سے اکٹھے ہی چلیں گے۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو میں نے آنکھوں سے اس کی بات مان لینے کا عندیہ دے دیا۔

سوئی رات گئے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ میرے جانے سے لیکر اب تک کی تمام روداد مجھے سناتی رہی، میں بھی اسے بتاتا رہا کہ میرے ساتھ کیا گزری۔ وہ اٹھ کر گئی تو میں لمبی تان کر سو گیا۔

صبح ناشتے کے بعد ہم گاؤں جانے کے لیے تیار تھے کہ اچانک میرا وہ سیل فون بجنے لگا، جو مجھے تانی نے دیا تھا۔ میں کال ریسیو کی تو دوسری طرف مہر خدا بخش تھا۔ کچھ دیر حال اور احوال پوچھنے کے بعد اس نے کہا۔

”جمال! ابھی تم لاہور ائر پورٹ تجاؤ۔ وہاں ایک آدمی شاہد معین کراچی سے آرہا ہے، اسے اپنے ساتھ لاؤ۔ اس کی پوری بات سنو، پھر میں تم سے بات کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی جاتا ہوں۔“ میں نے فوراً کہا تو اس نے بتایا۔

”اس کی تصویر، تمہارے سیل فون پر ابھی آ جاتی ہے، اسے بھی میں نے تمہاری تصویر بھیج دی ہے۔“

”جی، میں ٹھٹکا ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے کال ختم کر دی۔ میں نے سب کو صورت حالی بتائی اور ائر پورٹ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں تانی اور چہال لاہور ائر پورٹ چانچے۔ میں نے وہ ائر پورٹ پہلی بار دیکھا تھا۔ ہمیں اندر جا کر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاہد معین ہمیں مل گیا۔ وہ کلین شیو، خوبصورت نقوش والا، وجہ اور لمبا ترنگا، صحت مند نوجوان تھا۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں بہت گہری تھیں۔ سادی ہی شلوار قمیض اور ویسٹ کوٹ پہنے وہ ہمارے سامنے تھا۔ وہ ہمیں بڑے تپاک سے ملا۔ ہم اسے لے کر واپس آ گئے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا

”میں کراچی کا رہنے والا ایک جیولر ہوں۔ یہ کاروبار میرے باپ دادا سے چلتا چلا آرہا۔ انہوں نے ایں بزنس میں

بہت ترقی کی۔ ہمارا شمار کراچی کے ان بڑے جیولرز میں ہوتا ہے، جن کا بزنس دوہی اور ٹڈل ایسٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ اب بات یہ ہے کہ میں آپ سے ملنے یہاں تک کیوں آ گیا۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

”ظاہر ہے، ہم مطلب کی بات کریں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے کہ مجھے اپنی بات بتانے اور سمجھانے کے لیے آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سنانا پڑے گی۔ اس سے آپ معاملہ کے ہر پہلو کو اچھی طرح جان جائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا، جیسے عندیہ چاہ رہا ہو۔

”بے شک آپ اپنی بات کہیں۔ جتنا وقت لیں، ہم سننے کو تیار ہیں۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ میری طرف متشکرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”جمال بھائی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں۔ اس لیے میں نے بڑی بے فکری کی زندگی گزاری۔ چھوٹی سی عمر میں ہی میں دنیا گھوما پھرا ہوں۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ ہم کرکٹ میچ دیکھنے دہلی یوں چلے جایا کرتے تھے، جیسے کسی مقامی اسٹیڈیم میں جاتے تھے اور میرے باپ نے مجھے کبھی نہیں روکا۔“

”ٹھیک ہے، ہم نے مان لیا کہ آپ بہت امیر باپ کے بیٹے ہیں، آگے بولیں۔“ تانی نے کہا تو وہ ذرا سا مسکرا دیا۔

”معاف کیجئے گا، میں آپ کو اپنی دولت سے مرعوب نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں لاڈ پیار میں پلا، لاابالی اور بے پروا سلاڑی کا تھا۔ جسے نہ بزنس کی سمجھ تھی اور نہ ذمے داری کا احساس۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحے چپ رہنے کے بعد وہ گویا ہوا، ”ایک دن میرے ابا نے مجھے احساس دلایا کہ میں نے بزنس سنبھالنا ہے، اب مجھے اس میں دلچسپی لینا چاہئے اور کام سیکھنا چاہئے۔ میں تیار ہو گیا اور ایک دن اپنے شوروم پر جا بیٹھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آخر ایک دن مجھے یہی کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر شاہد معین جیسے خیالوں میں کھو گیا۔

☆.....☆.....☆

شاہد پہلے دن اپنے شوروم میں اپنے باپ کے ساتھ آ بیٹھا۔ اس دن اس کا باپ بہت خوش تھا۔ شوروم میں کام کرنے والے بہت لوگ تھے۔ دوپہر سے ذرا پہلے ان کے شوروم میں چند گاہک آئے۔ ان میں دو مرد حضرات اور تین خواتین تھیں۔ ان خواتین میں ایک لڑکی تھی۔ اس نے جیسے ہی اپنے چہرے پر سے پلو ہٹایا، شاہد پہلی ہی نگاہ میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سارے جہان کا حسن اسی ایک لڑکی پر آن کر ختم ہو گیا ہو۔ نازک اور کامنی سی وہ لڑکی یوں لگ رہی تھی، جیسے وہ کوئی کالج کی گڑیا ہو۔ اس لڑکی کا چہرہ اس قدر پرکشش تھا کہ شاہد اسی میں کھو کر رہ گیا۔ بات یہ نہیں کہ اس نے حسین لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں، بلکہ ایسا حسن جو سیدہ حادل میں آ کر جائے ایسا نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی، سیدھے اس کے دل میں اتر گئی۔ پہلی بار اس نے کسی کو پالینے کی خواہش کو اپنے اندر اس طرح موجزن پایا تھا، جیسے سمندر میں جوار بھانا اٹھ گیا ہو، سمندر بھی تو اسی وقت پاگل ہوتا ہے جب چاند اپنے پورے جوبن پر ہو۔ چاند میں تو بھر بھی داغ ہوتا ہے، وہ تو اتنا پیارا، معصوم اور پرکشش چہرہ رکھتی تھی کہ اس کے اندر کی دنیا اٹھل پھٹل ہو گئی تھی۔ اسے اپنا آپ پرایا لگنے لگا تھا۔

وہ لوگ کافی دیر تک جیولری دیکھتے رہے اور شاہد کی نگاہیں اسی کا طواف کرتی رہیں۔ انہوں نے کافی ساری خریداری کی۔ انہوں نے جتنے بھی زیورات خریدے، اسے لڑکی کے ساتھ لگا لگا کر دیکھتے رہے۔ شاہد کو تب یوں لگ رہا تھا کہ شوکیس میں پڑے زیورات اتنے خوبصورت نہیں لگ رہے ہیں، جتنے اس کے بدن کے ساتھ لگ کر اچھے لگ رہے تھے۔ وہ اسی میں کھویا رہا۔ کافی دیر بعد ان کی خریداری ختم ہوئی۔ اتنی دیر میں اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کراچی سے تعلق بہر حال نہیں رکھتے ہیں۔ وہ زیادہ تر سندھی زبان ہی بول رہے تھے۔ خریداری کے بعد انہوں نے رقم کی ادائیگی کر دی تو انہوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ پھر مرد حضرات نے اس لڑکی سمیت دونوں خواتین کو وہاں سے زیورات کے ساتھ چھوڑا اور باہر چلے گئے۔ وہ

لڑکی بالکل اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید کابس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے بات کرے۔ شاید قسمت یاوری کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ دونوں خواتین انھیں اور شوروم سے مزید زیور دیکھنے لگیں۔ وہ لڑکی اس کے پاس بیٹھی رہی۔ تبھی اچانک شاہد کے دل میں نجانے کیا ہوک اٹھی، وہ اٹھا اور ایک نازک سی ہیرے کی انگوٹھی لے آیا اور پھر جھنجھکے ہوئے اس نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سینے۔“

”جی،“ اس نے اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر ہولے سے کہا۔ تو شاہد نے وہ انگوٹھی اس کے سامنے کرتے ہوئے ہاتھ بڑھانے کا اشارہ کیا۔ اس لڑکی نے چند لمحے سوچا اور پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ شاہد نے اپنی سانس روکی اور اس کا سر میں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک انگلی منتخب کی اور اس میں وہ ہیرے کی انگوٹھی پہنادی۔ پھر دھیرے سے کہا۔

”بہت شکریہ۔“

وہ لڑکی چند لمحے اس انگوٹھی کو دیکھتی رہی پھر اس نے شاہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے مجھے یہ انگوٹھی کیوں پہنائی؟..... اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح انگوٹھی پہنانے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“

”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ بہت سمجھدار ہیں۔ آپ نے جو سمجھا ہے وہی ٹھیک ہے۔ مجھے آپ بہت پسند آئی ہو۔“

”مگر یہ اب ممکن نہیں ہے۔“ اس نے انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا۔

”نہ نہ اسے پہنے رکھیں۔ ممکن ہے یا نہیں، مجھے اس سے مطلب نہیں۔“ شاہد نے تیزی سے کہا تو اس کے یوں کہنے پر وہ لڑکی رک گئی۔ پھر انگوٹھی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

”یہ اس لیے ممکن نہیں کہ یہ جو زیورات خریدے جا رہے ہیں، یہ سب میری شادی کے لیے ہیں، پرسوں میری بارات آنے والی ہے۔“

شاہد کو یوں لگا جیسے وہ مذاق کر رہی ہے۔ اس لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

”وہ آپ کو مبارک ہو، لیکن آپ مجھے پسند آئی ہیں، میرا دل کہتا ہے کہ آپ میرے لیے بنی ہیں اور میرا دل جھوٹ نہیں بولتا، اگر آپ میرے لیے بنی ہیں تو آپ مجھے چھل جائیں گی، ورنہ، یہ انگوٹھی میرے جھوٹے دل کی یاد تو دلاتی رہے گی۔“

”نہیں، یہ پھر بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ ہو نہیں سکے گا۔ آپ اپنے دل کو سمجھالیں۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا تو وہ بولی۔

”میرا تعلق ایک ہندو فیملی سے ہے۔ میرا نام شیویتا دیوی ہے۔ میرا تعلق سکھر کے کاروباری اور زمیندار گھرانے سے ہے۔ ہم صرف شادی کی خریداری کے لیے یہاں آج ہوائی جہاز کے ذریعے آئے ہیں اور ابھی کچھ دیر بعد واپس لوٹ جائیں گے۔ میرا خیال ہے آپ یہ انگوٹھی.....“

”پلیز شیویتا۔ آپ اسے پہنے رہیں۔ چلو یہی قبول کرلو۔“ شاہد نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا تو شیویتا نے چند لمحے انگوٹھی کو اپنی گلابی انگلی میں گھمایا اور پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“

”آپ کچھ بڑھی لکھی بھی ہیں۔“ شاہد نے یونہی بات بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے انگلش میں ماسٹر کیا ہے۔“

”بہت اچھا، کہاں سے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہیں سکھر سے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا تو اس نے پوچھا۔

”اور کتنے لوگ ہیں آپ؟“

”میں، میری ماما اور پتا، بس،“ شیویتا نے جواب دیا۔ شاید وہ مزید باتیں کرتے۔ وہ دونوں خواتین آہستہ آہستہ واپس آ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں تو ان کے درمیان باتیں چلنے لگیں۔ شاہد اس گلابی رنگت والی حسینہ کو دیکھتا رہا۔ شیویتا کو اس کی محویت کا پوری طرح احساس تھا۔ کچھ دیر بعد ان کے ساتھ آئے مرد بھی آ گئے۔ وہ سب اٹھے اور شوروم سے باہر چل دیئے۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ شوروم کا داخلی گیٹ پار کرتے ہوئے، شیویتا نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ پھر ایک دم سے اسے یوں لگا جیسے چند لمحوں ہی میں بہار سے خزاں کا موسم ہر طرف پھیل گیا ہو۔

شاہد شمعین کے دن رات کا چین لٹ گیا تھا۔ ہر وقت اُس کی نگاہوں کے سامنے شیویتا ہی رہنے لگی تھی۔ اُس نے خود کو بہت سمجھایا۔ وہ اپنے آپ پر ہنس بھی لیکن قرار تھا کہ ابھی نہیں رہا تھا۔ اس نے سوچا، شاید چند دن ایسے ہی گزریں گے۔ پھر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا اور شاید ایسا ہو جاتا لیکن تیسرے دن کی صبح شوروم جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آیا، جہاں اخبار بھی پڑا ہوا تھا۔ اخبار دیکھتے ہوئے اچانک اس کی نگاہ ایک خبر پر پڑی۔ وہ خبر سکھر سے تھی۔ جس کے مطابق، شادی والے گھر میں ڈکیتی کی واردات میں ڈاکو سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ مزاحمت پر دلہن کے ماں باپ سمیت ان کا ایک رشتے دار ہلاک ہو گیا تھا اور دلہن شدید زخمی تھی۔ تین افراد کے قتل کی خبر سے علاقے میں دہشت پھیل گئی۔ ان سیٹ میں دلہن کی تصویر تھی۔ جو شدید زخمی تھی اور اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ وہ بلاشبہ شیویتا تھی۔ وہ اس کی تصویر سے دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔

وہ جس قدر ناشتہ کر سکا تھا، وہیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے اس کی ماں تھی۔ اس نے حیرت سے شاہد کو دیکھا اور بولی۔

”یہ اچانک تم نے ناشتہ کیوں چھوڑ دیا؟“

”بس ماما، میں نے کر لیا، اور ہاں بابا کو بتا دیجئے گا، میں آج شوروم نہیں جاؤں گا، بلکہ مجھے کہیں کام جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

دوپہر سے پہلے وہ ہوائی جہاز کے ذریعے سکھر پہنچ گیا۔ وہ سیدھا اسپتال گیا۔ جہاں شیویتا کے بارے میں معلومات اسے آسانی سے مل گئیں۔ وہ صبح تک انتہائی نگہداشت وارڈ میں پولیس کے تحفظ میں تھی لیکن کچھ دیر پہلے اسے کراچی لے گئے تھے، اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہیں سے اسے معلوم ہو گیا کہ اسے کس اسپتال میں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ واپس اتر پورٹ پہنچا اور شام ہونے سے پہلے کراچی کے اس اسپتال میں پہنچ گیا۔ جہاں شیویتا زندگی کی جنگ لڑ رہی تھی۔

سکھر میں اجنبیت کے باعث شاید وہ اتنا کچھ نہ کر پاتا، جتنا وہ کراچی میں کر سکتا تھا۔ اس کے دوست اور پھر اس کا تعلق بہت کام آیا۔ رات گئے تک وہ شیویتا کے پاس تھا۔ شاہد نے دیکھا، وہی انگوٹھی شیویتا کے ہاتھ میں تھی۔ جس پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ شیویتا کے ساتھ اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں بلکہ ان کے گاہکوں کے دو لوگ تھے جو انہی کے ملازم بھی تھے۔ یا پھر وہ چند پولیس والے تھے جو اسے لے کر وہاں پہنچے تھے۔ انہی کی زبانی اسے سارے واقعے کے بارے میں پتہ چلا۔

شیویتا کا ایک چاچا تھا، جس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ وہ سکھر کے نواح سلطان پور میں رہتے تھے۔ جہاں ان کی آبائی زمین تھی۔ جس کی دیکھ بھال اس کا چاچا ہی کرتا تھا اور شیویتا کے باپ کو باقاعدہ حصہ دیتا تھا۔ وہ بہت عرصے سے اپنے بھائی سے شیویتا کے رشتے کی بات کر رہا تھا لیکن ایک تو شیویتا نہیں مان رہی تھی کہ اس کے چچا زاد کم بڑھے لکھے اور دیہاتی ہیں۔ دوسرا وہ انہیں پسند نہیں تھے۔ رشتہ مانگنے کے باوجود انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی کہیں دوسری جگہ ہوئی تو وہ یہ شادی ہونے نہیں دیں گے۔ شیویتا کی شادی کراچی کے ایک ہندو انجینئر

لڑکے سے ملے پانگی۔ اگلی صبح بارات آتا تھی کہ یہ ہنگامہ ہو گیا۔ ساری وجہ صرف زمین تھی۔ شیوینا کے ساتھ اس کی زمین اور تمام شہری جائیداد کے ساتھ چلتا ہوا کاروبار ان کا ہو جانے والا تھا۔ اب شیوینا یہاں زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑی تھی۔ رات گئے شیوینا کو ہوش آ گیا تو شاید نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اپنے سامنے شاہد کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سرسراتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”آپ.....؟“

”ہاں میں.....“ اس نے دھیرے سے کہا تو اس نے پوچھا
”آپ کیسے؟“

”ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ اب تم پوری طرح محفوظ ہو۔ تم کراچی میں ہو، یہاں تمہارا علاج ہو رہا ہے۔“ شاہد نے اسے بتایا تو وہ بولی

”میرے ماما پتا؟“

”وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔“ اس نے صاف بتا دیا۔ وہ ایک دم سے شاک میں آ گئی اور پھر بے ہوش ہوتی چلی گئی۔ دوسرے دن کی شام اسے ہوش آیا اور پھر وہ ساری رات خاموشی ہی کی نذر ہو گئی۔ اگلی صبح شیوینا اسے کتنی ہی دیر تک دیکھتی رہی اور پھر پوچھا۔

”لگتا ہے آپ ادھر ہی ہیں، اپنے گھر نہیں گئے؟“

”تمہیں اس حال میں چھوڑ کر کہاں جاتا۔“ اس نے پیار سے کہا۔

”کیا میرے ماما پتا کی رشتی.....“

”تمہارے ملازمین بتا رہے تھے کہ ان کا کریا کرم کر دیا گیا ہے۔“ شاہد نے بتایا

”وہ لوگ کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا

”باہر ہیں، بلاؤں؟“ شاہد نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ نجانے ان سے کیا باتیں کرتی رہی کیونکہ شاہد باہر نکل گیا تھا۔ اسی رات شیوینا نے اس سے کہا۔

”شاہد۔ میری زندگی کو خطرہ ہے، وہ ڈاکو نہیں تھے، میرے چاچا کے بیٹے یا پھر انہی کے بھیجے ہوئے لوگ تھے، جو مجھے کسی بھی وقت مار سکتے ہیں۔ یہی وہ چاہتے ہیں۔ کیا آپ مجھے چند دنوں کے لیے چھپا سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔ میں تو تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھ سکتا ہوں، تم حکم کرو، کیا چاہتی ہو۔“

”میں بس ان کی نگاہوں سے چھپ جانا چاہتی ہوں۔ میں اس طرح مجبوری کی حالت میں مرنا نہیں چاہتی، مجھے ان سے انتقام لینا ہے۔“ شیوینا نے کہا

”ٹھیک ہے جیسا تم چاہو، کیا تم مجھ پر اعتماد کرو گی؟“ شاہد بولا۔

”اس کے بچا کوئی چارہ نہیں ہے۔“ اس نے شاہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو بس ٹھیک ہے، جیسا میں کہوں، ویسے ہی کرنی جانا۔“

اس کے یوں کہنے پر شیوینا نے آنکھیں بند کر کے اس کی بات مان لینے کا عندیہ دے دیا۔

شاہد نے پہلے دن ہی سے سوچ رکھا تھا کہ اب آنے والے دنوں میں کیا ہو سکتا ہے۔ وہ لڑنے بھڑنے والا بندہ نہیں تھا۔ اگرچہ شیوینا نے انتقام کی بات کی تھی۔ وہ اسے فنی جوش سمجھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بعد میں اسے سمجھا لے گا کہ اس راہ پر نہ ہی چلا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پھر ایک رات وہ چپکے سے اسپتال سے نکلے۔ شاہد پہلے ہی گاڑی کا ریڈور کے پاس لے

آیا تھا۔ وہ اس میں بیٹھی اور پولیس کی نگاہوں میں آئے بغیر وہاں سے نکل گئے۔ اس نے اپنے ملازمین کو سر شام ہی سلطان پور واپس بھیج دیا تھا۔ انہیں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے علاج کے لیے غیر ملک جا رہی ہے۔

شاہد نے اپنے ایک دوست کی مدد سے فلیٹ لیا ہوا تھا۔ جہاں اس نے ایک نرس اور ایک خدمت گار خاتون کا انتظام کر دیا تھا۔ اس رات وہ اپنے گھر چلا گیا۔ جہاں اس کے والدین اس کے بارے میں پریشان تھے۔ حالانکہ وہ فون سے رابطے میں تھا۔

☆.....☆.....☆

تقریباً تین ہفتوں کے بعد وہ ٹھیک ہو گئی۔ انہوں نے نرس کو فارغ کر دیا لیکن اس خاتون کو اپنے ہاں ہی ملازم رکھا۔ شیوینا اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ شاہد کے ساتھ کسی پارک، ریسٹوران یا شاپنگ کے لیے چلی جائے۔ شاہد کے گھر والوں کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ اس نے کسی ہندو لڑکی کو کسی دوسری جگہ فلیٹ میں پناہ کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ شاید وہ خود پر یقین کے انتظار میں تھی کہ وہ کب اپنے ماں باپ کا بدلہ لینے کے قابل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایک دن جب وہ دونوں فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شیوینا نے کہا۔

”شاہد! آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ آپ نے مجھے اس وقت پناہ دی جب میں اس قابل نہیں تھی کہ کچھ بھی کر سکوں، لیکن اب میں واپس سکھر جانا چاہتی ہوں اور وہیں رہ کر اپنے ماما پتا کا بدلہ لینا ہوگا مجھے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں انتہا کی نفرت تھی۔ اس پر شاہد نے اس کے چہرے پر دیکھا جہاں نفرت ہی نفرت تھی۔ اس نے محتاط انداز میں شیوینا سے کہا۔

”شیوینا! میں یہ نہیں کہتا کہ تم ان سے بدلہ نہ لو، تمہارا انتقام بنتا ہے، لیکن سوچو، تم ایک اکیلی عورت کیا کر سکتی ہو۔ ظاہر ہے، تمہیں ان سے لڑنے کے لیے کسی مرد کا سہارا لینا ہوگا۔“

”وہاں لوگ میرے ساتھ ہوں گے، میں اپنی برادری میں یہ بات رکھوں گی.....“ وہ تیزی سے بولی تو شاہد نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں، تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں جو تمہیں کہنے جا رہا ہوں اسے غور سے سنو،“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہتا ہی چلا گیا، ”میں یہاں غافل نہیں بیٹھا ہوں میری جان، میں تمہارے اس کیس کے بارے میں پوری طرح آگاہ ہوں۔ انہوں نے یہ سب کچھ پہلے ہی سوچا ہوا تھا۔ پولیس کے ساتھ مل کر انہوں نے اس سارے واقعے کو ڈکیتی بنا دیا ہے کہ کچھ ڈاکو آئے، انہوں نے لوٹ مار کی اور مزاحمت پر اتنے بندے مار دیئے، بات ختم۔ قتل کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہے کہ وہ تیرے چاچا نے کیا ہے یا اس کے بیٹے ملوث ہیں۔ اب تم جتنا بھی چیخو چلاؤ گی، کچھ بھی نہیں ہوگا، کیونکہ اب تک کسی ڈاکو کو نہیں پکڑا گیا، کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ اب تھوڑا عرصہ گزرے گا، کوئی ڈاکو مارا جائے گا اور یہ ڈکیتی اسی پر ڈال کر معاملے کو سرے سے ہی ختم کر دیں گے۔“

”ایسا ہوا ہے۔“ وہ حیرت سے چیختے ہوئے بولی۔ اس پر شاہد نے قہقہے سے کہا۔

”میں نے بتایا تھا کہ میں اس بارے میں پوری طرح اپ ڈیٹ ہوں۔ تم جاؤ اور جا کر معلوم کرو، میں درست کہہ رہا ہوں یا غلط، یہ سب ہو گیا ہے۔“ شاہد نے کہا تو اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے شیوینا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ”ممکن ہے تم یہ سوچ رہی ہو کہ میں تجھے اس لیے روک رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ مجھے اپنے دل پر تب بھی اعتماد تھا، جب کچھ بھی میری دسترس میں نہیں تھا، میں نے کہہ دیا تھا کہ تم میری بیوی ہو۔“ وہی ہی ہو گی، تم جہاں بھی چلی جاؤ۔“ شاہد نے اعتماد سے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ پھر کتنی دیر تک اس نے کوئی بات

نہیں کی۔ شاید اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ تبھی وہ بولی
 ”شاید ایک بار میں جاؤں گی اور انصاف حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔“
 ”ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ میں نے وہاں بہت سارے تعلق تلاش کر لیے ہیں۔ وہ تمہاری مدد کریں گے۔“ شاید نے پورے خلوص سے اسے یقین دلایا۔

اور پھر ایک دن وہ سکھر چلی گئی۔ شاید یہ بات جانتا تھا کہ شیو تانے سکھر میں اپنا رابطہ بنایا ہوا ہے۔ شیو تانے اپنا چانک سکھر نہیں پہنچی تھی۔ بلکہ وہاں موجود تعلق رکھنے والے لوگوں کو بتا کر اپنے گھر آئی تھی۔ اس کے ملازمین نے گھر سنبھال رکھا تھا۔ لیکن اس کی باقی ساری جائیداد اور کاروبار اس کے چاچا کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر جاتے ہی اپنی برادری والوں سے رابطہ کیا اور ایک چٹائی رکھ لی۔ اگلے دن انہی کے ایک بڑے بزرگ کے گھر میں چٹائی رکھ لی گئی۔ جہاں اس نے اپنی بات برادری والوں کے سامنے رکھنا تھی۔ شیو تانے کو اگلے دن ہی پتہ چل گیا کہ برادری کے بہت سارے لوگوں نے اس بات کو مانا ہی نہیں کہ یہ سب اس کے چاچا کی طرف سے ہوا ہے۔ بلکہ انہوں نے بھی یہ کہا کہ اب وہ اپنے بزرگ چاچا کی بات مان کر اس کی بہو بن جائے اور سکون سے زندگی گزارے۔ اسے شاید نے جو بتایا تھا، وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا تھا۔ برادری والوں نے اس کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ وہ اپنے باپ کا کاروبار اور جائیداد بھی واپس نہیں لے پائی تھی۔

اگلے چند دنوں میں شیو تانے کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ اگر وہاں رہے گی تو سوائے قتل ہو جانے کے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ اس نے شہر کا بہترین وکیل کیا اور اس واقعے کی از سر نو تفتیش کروانے کے احکامات جاری کروا دیئے۔ اس دوران شاید اس کے پاس سکھر جاتا رہا اور اس کی ہر طرح سے مدد کرتا رہا۔ اس کا چاچا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ تو خاموش رہا پھر اس نے بھی اپنا وار کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلی بات جو اس نے اپنی برادری میں پھیلائی وہ یہ تھی کہ وہ ایک مسلمان لڑکے کے عشق میں پاگل ہو گئی ہے۔ نجمانے اس کے کب سے تعلقات ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی اپنی برادری کے لوگوں کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں۔ کبھی کوئی براہ راست دھمکی دے جاتا اور کوئی فون کال پر اسے دھمکی دیتا۔ اس دوران دوبارہ اسے ڈرایا گیا یوں جیسے موت اس کے قریب سے ہو کر گذر گئی ہو۔

چھ ماہ اسی طرح گذر گئے۔ وہ اپنے طور پر کچھ بھی نہیں کر پائی۔ یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے چاچا اور اس کے بیٹوں سے نہ تو اپنی زمین حاصل کر پائے گی اور نہ ہی اپنا کاروبار۔ وہ جائیداد بھی حاصل نہیں کر سکے گی جو شہر میں تھی۔ یہ تو کوئی وقت ہی ہوگا جو وہ اٹھس لوٹا سکتا ہے ورنہ اب وہ اس قدر طاقت ور ہو گئے تھے کہ ان سے جان ہی بچا لیتی تو یہی غیبت تھا۔ آخر ایک دن اس نے اعتراف کرتے ہوئے شاید سے کہا۔

”میں جان گئی ہوں کہ ابھی میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مجھے ان سے چھپ کر ہی رہنا ہوگا۔“
 ”تو پھر چلو میرے ساتھ کراچی۔ بھول جاؤ کہ یہاں تمہاری کوئی جائیداد تھی۔ ہم زندگی کے نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔“ شاید نے کہا تو وہ بولی۔

”کیا آپ میرے ساتھ شادی کر لو گے؟ کیا آپ کے گھر والے ہندو لڑکی کو قبول کر لیں گے؟“

”تم ہاں کرو، میں نہ صرف تجھے اپنا لوں گا بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی منالوں گا۔“ شاید نے پورے دل سے کہا۔

”ٹھیک ہے شاید، میں آپ کے ساتھ شادی پر تیار ہوں لیکن اگر آپ کے گھر والے نہ مانیں تو پلیز انہیں مجبور مت کرنا۔ میں کسی دوسرے ملک چلی جاؤں گی اور وہاں محنت مزدوری کر لوں گی۔“ شیو تانے اپنا فیصلہ سنایا۔

”دیکھو۔ اس وقت اگر میں تجھ سے کوئی بھی شرط منوانا چاہوں تو یہ تمہاری مجبوری کی حالت ہے۔ تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔ میری محبت اپنی جگہ، لیکن میں تجھے مجبور نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے اب بھی پیار نہیں ہے تو تم جو چاہو سو کر سکتی ہو۔“

”اور اگر میں یہ کہوں کہ میرے دل میں آپ کے لیے اسی دن سے پیار جاگ گیا تھا جس دن آپ نے مجھے یہ انگوٹھی پہنائی تھی تو.....؟“

”میں یہ اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”تو آپ یہ بھی جان لیں کہ میں نے آپ کے ساتھ اتنا وقت گزارا ہے، مجھے آپ سے محبت نہ بھی ہوتی پھر بھی آپ کے کردار نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں مجبوری سے نہیں دل سے مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ اگر میں آپ کی زندگی میں آؤں تو کم از کم مسلمان تو ہوں۔ یہ میرا آپ پر اعتماد ہے۔“

”شیو تانے۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ تم میری وجہ سے یا میرے کردار کی وجہ سے مسلمان ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم اسلام قبول کرو تو اللہ کے لیے کرو۔ اپنی عاقبت کے لیے کرو، میں تو تمہارے ہندو ہونے پر بھی تمہیں قبول کرنے کو تیار ہوں۔“ شاید نے کہا۔

”نہیں، میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”تو پھر ٹھیک ہے، تم یہاں رہتے ہوئے اسلام قبول کرو اور کراچی آ جاؤ۔ میں تجھے کھلے دل سے قبول کروں گا اور اپنے والدین کو بھی منالوں گا۔“

شاید اس طرح کہنے پر وہ مان گئی۔

اگلے چند دنوں میں شاید نے اپنے والدین کو بٹھا کر پوری روداد سنا دی اور پھر انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ شیو تانے سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے والدین کو علم تھا کہ اگر وہ نہ کریں گے، تو کیا ہوگا۔ وہ پہلے ہی اسے ایک فلیٹ میں رکھے ہوئے تھا پھر بعد میں سکھر تک اس کے تعلقات بن گئے تھے۔ اب تک تو یہ معاملہ چھپا ہوا تھا۔ اگر بات ضدا بنا پر آگئی تو محض بدنامی کے سوا اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آنے والا۔ ممکن ہے شاید اسی لڑکی کے چکر میں ان ہندوؤں کی بھیٹ چڑھ جائے، سو شاید ہی کی مان لی جائے۔

”دیکھو بیٹا۔ میں اپنا کاروبار اور تمام تر ذمے داری تمہیں سونپ دی ہے۔ اب تم جو چاہو سو کرو۔ ہاں اگر وہ لڑکی مسلمان ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ ہم لوگوں کو یہ نہیں بتائیں گے کہ اس کا ماضی کیا ہے۔“ اس کے باپ نے اپنی رائے دے دی۔ شاید کو اپنے والدین کا عندیہ مل گیا۔ سو اس نے شیو تانے کو بتا دیا کہ اس کے والد بھی کیا چاہتے ہیں۔

اگلے چند دن بعد ہی شیو تانے سکھر کے ایک عالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام سارہ سعید رکھا گیا۔ وہ اپنا گھر اپنے ملازمین کو دے کر کراچی چلی گئی۔ اسی دن دونوں کی شادی ہو گئی اور انہوں سب کچھ بھول کر پرسکون زندگی گزارنے کی ابتدا کر دی۔

☆.....☆.....☆

ان کی شادی کو دو سال ہونے کو آ گئے تھے۔ اس دوران ان کا ایک بیٹا مراد پیدا ہوا تو ان کی زندگی میں بہار آ گئی۔ وہ بہت اچھے دن گزار رہے تھے۔ شاید نے آہستہ آہستہ سارہ کے ذہن سے سکھر میں موجود جائیداد کو نکال دیا تھا۔ ان کا اپنا بزنس اتنا بڑا تھا کہ اسے کوئی فکر محسوس نہ ہوئی۔ ہاں کبھی کبھی اس کے دل میں انتقام لینے کا خیال ضرور اٹھتا تھا۔ جو وقتی اہمال کی مانند بیٹھ جاتا تھا۔ اس دوران اس کی والدہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا کہ ایک دن اسے خون موصول

”میں شیوینا کا چاچا بات کر رہا ہوں۔ وہی شیوینا جسے تم نے زبردستی مسلمان کر کے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔“
”تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوئی ہے۔ اس پر کوئی جبر نہیں کیا گیا۔ ہاں البتہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”بکواس کرتے ہو تم۔ بہتری اسی میں ہے کہ تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ تم نہیں جانتے کہ تیرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ چاچا نے دھمکی دیتے ہوئے اپنا دم اکھڑا دیا۔

”دیکھو مجھے دھمکی مت دو۔ وہ میری بیوی ہے اور مسلمان ہے۔ اب اگر اس کے بعد تم نے کوئی ایسی بات کی تو مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھ تم“ شاید نے غصے میں کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

”تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔ میں اپنی سبھی تم سے چھین کر لے جاؤں گا۔“ چاچا نے بھی غصے میں کہا تو وہ بولا۔

”تم جو کرنا چاہتے ہو کر لو، اب تک میں نے اسے سمجھایا ہے کہ جو لوگ اپنے سنگے رشتوں کو زمین جائیداد کے لیے قتل کر دیں، ان سے بڑا بے غیرت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے ساری جائیداد پر تھوک دیا ہے۔ تم سنبھا لو سب، اب اگر دوبارہ فون کر کے یہ بات بھی کہی تو پھر میری بیوی کا تم لوگوں سے اپنا انتقام لینا بنتا ہے۔ پھر وہ نہیں، میں تم لوگوں کے لیے قہر ثابت ہوں گا۔“

”تم یہیں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہو، لیکن ہم اس تک پہنچ بھی گئے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ.....“

”بکواس بند کرو۔ تم سے جو ہو سکتا ہے کرو اور جو میں نے پھر کرنا ہے اس کا انتظار کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور سارہ کو کال کی۔ ذرا سی دیر میں اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ شاید نے اسے فون کال کے بارے میں بتایا تو وہ بولی

”وہ پہلے مجھے فون کر چکے ہیں اور ایسی ہی باتیں مجھ سے بھی کی ہیں۔“

”اب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ دیکھتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں۔“ شاید نے اسے تسلی دے دی، مگر خود پریشان ہو گیا۔ اس کے سامنے یہی سوال تھے کہ وہ اب تک سارہ کو کیوں نہیں بھولے؟ وہ تو یہاں آگئی تھی سب کچھ انہیں دے کر تو کیا وہ اس کی جاسوسی کرتے رہے ہیں، انہوں نے اب تک کیا کیا اور کس حد تک ان کے بارے میں معلومات لی ہیں؟ کیا وہ اس حد تک جاسوسی کر رہے ہیں کہ وہ سارہ کو جان سے مار دیں۔ اس کا جواب ایک ہی تھا کہ سارہ کے قتل کے بعد ساری جائیداد ان کے ہاتھ آ جانے والی تھی۔ ان کے لیے سارہ کا قتل ضروری تھا۔ جس کے بعد ان کے لیے ہر طرح کا خطرہ ٹل جاتا۔ وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دو دن بعد ان پر افتاد پڑ گئی۔

وہ صبح ناشتے کے بعد شوروم جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ باہر بہت سارے لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ باہر گیا تو ایک وکیل کے ساتھ پولیس والے تھے۔ سارہ کا چاچا، کورٹ کی طرف سے بیلف لے آیا تھا، بلکہ یہ ایک طرح سے چھاپا تھا۔ کچھ میڈیا کے لوگ ان کے ساتھ تھے۔

”جی بولیں کیا بات ہے؟“ اس نے تھل سے پوچھا تو وکیل نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔

”آپ نے شیوینا نامی ایک ہندو لڑکی کو زبردستی اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے، ہم اسے بازیاب کرانے آئے ہیں۔“

”یہاں شیوینا نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی اور نہ ہی میں نے کسی کو زبردستی رکھا ہوا ہے۔ میرے گھر میں میری بیوی ہے اور اس کا نام سارہ ہے۔“

”دیکھا جھوٹ بول دیا نا،“ اس کے چاچا نے کہا تو وکیل بولا

”دیکھیں ہمارے پاس کورٹ کا حکم ہے۔ ہم آپ کے گھر کی تلاشی لیں گے۔“

”ابھی کسی کو اتنی جرات نہیں ہوئی کہ میرے گھر کی تلاشی اس طرح جھوٹ بول کر لے سکے۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔“
”تو آپ کورٹ کا حکم نہیں مان رہے ہیں۔“ وکیل نے کہا۔

”جب مجھے عدالت بلائے گی تو میں چلا جاؤں گا۔“ شاید نے کہا تو وہ لوگ ایک نوٹس اس کے گھر کے باہر لگا کر چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کافی سارے اسلحہ بردار لوگ اس کے گھر کے سامنے آ کر فائرنگ کرنے لگے۔ اس کے گارڈز نے مزاحمت کی لیکن وہ اس کے گارڈز کا حصار توڑ کر اندر آ گئے۔ انہیں سارہ کی تلاش تھی۔ شاید نے مزاحمت کی لیکن اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ انہوں نے شاید کے سر پر ڈاڑھا مارا جس سے وہ بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ اس کا بیٹا مراد وہیں بلکتا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو سارہ نہیں تھی۔

شاید نے قانون کا سہارا تو کیا لینا تھا۔ میڈیا میں یہ بات زور و شور سے کہی جانے لگی کہ ہندو لڑکیوں کو اغوا کر کے انہیں زبردستی مسلمان کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں ہندوؤں پر عرصہ دراز تک ہو گیا ہے۔ یہاں ان پر ظلم ہو رہا ہے۔ چند دنوں ہی میں عالمی میڈیا بھی زور زور سے چلانے لگا۔ اس کا جواب دینے کے لیے سارہ کہیں نہیں تھی اور شاید کو بھی اپنا آپ چھپانا پڑا۔ چند دن ہو گئے وہ یونہی پھر رہا تھا کہ کچھ لوگوں کی وساطت سے وہ ہمارے پاس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

”پھر سارہ سے تمہارا رابطہ نہیں ہوا؟“ میں نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ بلکہ مجھے اس کے ساتھ یہ فکر بھی کھائے جا رہی ہے کہ اسے قتل نہ کر دیا گیا ہو اور دوسری طرف میرے والد صاحب، میرے بیٹے کو لے کر اپنی ہی میں اپنے کسی عزیز یا جاننے والے کے ہاں روپوش ہیں۔ پتہ نہیں ان کا کیا بنا ہوگا۔“

”ہوں۔“ اس کی طویل بات سن کر میں نے ہنکارا بھرا بولا، ”اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

”ظاہری بات ہے، مجھے سارہ کی تلاش ہے۔ وہ مل جائے تو میڈیا کو جواب دیا جاسکے، عدالت میں ثابت کیا جاسکے، میرا بوڑھا باپ اور معصوم بیٹا اپنے گھر میں سکون سے رہیں۔ میرا کاروبار تباہ ہو رہا ہے اور پھر سب سے بڑی بات کہ مجھ پر الزام بہت زہر پھیل گیا ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کہا اور پھر جہاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”جاؤ اس کے ساتھ، مگر زیادہ دن مت لگانا۔ میں ذرا یہاں دیکھ لوں۔ تانی کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ تمہاری مدد کرے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم ابھی نکلتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو میں نے تانی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کوئی خوشگواریت نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جانا نہ چاہ رہی ہو۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

جس وقت وہ نکلے، سہ پہر ہو چلی تھی۔ میں خود انہیں انر پورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔ انہیں یہاں سے سیدھا کھرجانا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر واپس آیا تو سوئی تیار بیٹھی تھی۔ میں، وہ اور اماں اسی وقت گاؤں کے لیے چل دیے۔

رات گئے ہم گاؤں پہنچے۔ میں نے وہاں پہنچنے سے ذرا پہلے چھپا کے کوفون کیا۔ وہ ہمارے اچانک آنے پر حیران ہو گیا۔ وہ گاؤں سے باہر آ کر ہماری راہ میں کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیسا رنپانس کرے۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملا۔

میں نے اسے اپنے ساتھ پتھر سیٹ پر بٹھالیا اور چل دیا۔ اماں اس سے حال احوال پوچھتی رہی۔ جیسے ہی میں اس راستے پر مزاج اس کے گھر کی طرف جاتا تھا تو اس نے حیرت سے کہا۔

”جمال کدھر جا رہے ہو؟“

”ہم تیرے پاس آئے ہیں اور تیرے گھر ہی کی طرف جائیں گے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ سب کو اپنے سامنے دیکھ کر، آپ سب میرے پاس آئے، یہ اس سے بھی بڑی بات

ساتھ بہت کچھ کھانے پینے کو لائے تھے۔ وہ کھاپی کرہم بیٹھے تو چھا کا اور میں باہر والے کمرے میں چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

جسپال، شاہد اور تانی دوپہر کے بعد سکھر پہنچ گئے تھے۔ سکھر ہی سے شاہد کا ایک دوست ابراہیم انیس لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس کا گھر دریا کنارے شہر کے اس علاقے میں تھا جو کبھی پوش علاقہ شمار ہوا کرتا تھا۔ بڑا سارا بنگلہ تھا اور اس میں وہ اپنے چند لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا خاندان کسی گوشہ میں تھا۔

”شاہد۔ میں ساری تفصیل سن چکا ہوں۔ اب تم یہاں رہو، ہم دیکھتے ہیں ہمیں کیا کرنا ہے۔“ جسپال نے کہا تو وہ حیرت سے بولا

”آپ لوگ پہلی بار یہاں آئے ہیں، آپ کو علاقے کے بارے میں کیا پتہ؟ میں آپ کے ساتھ.....“

”نہیں، ہم سلطان پور تلاش کر لیں گے، تم صرف ادھر رہو، باقی ہمارا کام ہے۔ یہ جو پورچ میں فورڈ ٹیل جیپ ہے، اس کی چابی کہاں ہے؟“ جسپال نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی تانی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ شاہد کو کیا پتہ کہ وہ ساری معلومات حاصل کر چکا ہے اور اب تک ان کے لوگ سلطان پور پہنچ کر بہت ساری معلومات لے چکے تھے۔

”یہ لو۔“ ابراہیم نے چابی اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا، ”راتے میں ایک چیک پوسٹ آتی ہے، دھیان سے جانا۔“

اس کے یوں کہنے پر جسپال نے کوئی جواب نہیں دیا اور چابی لے کر باہر نکلتا چلا گیا۔

ریلوے پھاٹک سے پہلے ہی ایک آدمی ان کے انتظار میں تھا۔ جسپال نے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ دی۔ وہ سیدھا اسٹیرنگ پر آن بیٹھا اور کچھ کہے بغیر جیپ بڑھا دی۔ ریلوے پھاٹک کراس کرتے ہی چیک پوسٹ آگئی۔ جیپ پر اسٹیکر تھا۔ اس لیے کسی نے بھی اسے نہیں روکا۔ وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ وہاں سے سلطان پور کا سفر اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی اور وہ وہاں پہنچ گئے۔

وہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جس کی ساری آبادی ہندو تھی۔ جب وہ اس گاؤں میں پڑ سارا م کے بڑے سے گھر کے سامنے جا رُکے۔ گھر کے باہر چار پائیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سندھ کے زمیندار گھرانوں کے لیے ایسے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ان کے گاڑیاں پھر غریب غریب ہوتے ہیں۔ جسپال اور تانی جیپ سے اتر آئے۔ وہاں پر ہر بندہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ڈرائیور جیپ ہی میں رہا۔

”کس سے ملنا ہے جی آپ کو؟“ ایک بندے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑے نرم سے لہجے میں سندھی زبان میں پوچھا جسے جسپال نہیں سمجھ سکا مگر تانی اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس نے ترجمہ کیا تو جسپال نے کہا۔

”مجھے پر سارا م سے ملنا ہے۔“

”آپ کا نام کیا ہے، تاکہ اندر اطلاع دی جائے۔“

”مجھے صرف یہ بتاؤ، وہ یہاں ہے یا نہیں۔“ جسپال نے یہ ویسے ہی پوچھا تھا، جبکہ اسے اطلاع تھی کہ پڑ سارا م گھر پر ہی ہے۔ تانی ان میں ترجمانی کرتی رہی اور ساتھ میں ہنسنے لگی۔

”نام تو بتانا ہو گا بابو۔ ویسے ہم کیسے اطلاع کریں گے۔“ اس بندے نے کہا تو جسپال بولا۔

”اندر جا کے بتاؤ کہ تمہاری موت تم سے ملنے کے لیے آئی ہے، جس سے بھاگنا بھی چاہو تو تم بھاگ نہیں سکو گے۔“

اس کے تیور دیکھ کر اگرچہ وہاں پر موجود سارے لوگ ہی الرٹ ہو گئے لیکن ان کے چہروں پر حیرت بھی تھی۔ ایک بندہ دھیرے سے کھسک کر اندر چلا گیا، جسے جاتا ہوا اس نے دیکھ لیا تھا۔

ہے۔ لیکن.....“

”اوائے چھا کے تو پاگل ہو گیا ہے، جو اس طرح کی باتیں کر رہا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”یار میرے گھر میں کوئی عورت نہیں، گھر کا برا حال ہو رہا ہے، وہ گھر آپ کے شایان شان بھی نہیں، بستر بھی نہیں کہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ میں نے ایک دم سے پوچھا تو وہ بولا

”یار جب تم لوگوں کا اپنا گھر ہے تو آپ ادھر رہیں جا کر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مطلب۔“ میں نے غصے میں پوچھا تو اماں نے خوشی سے کہا۔

”سمجھ گئی، اس نے ہمارا گھر دوبارہ بنوا دیا ہو گا۔“

”دیکھا اماں سمجھ گئی۔“ چھا کے نے بھی خوشی سے کہا تو مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ میں نے اپنے گھر کی جانب رخ موڑ لیا۔

میں گھر کے سامنے رکا۔ ویسا ہی گھر تھا جیسے جلتے سے پہلے تھا۔ چھا کے نے گیٹ کھولا تو میں کار اندر لے جاتا چلا گیا۔

”سب کچھ ویسا ہی بنا دیا ہے میرے اشفاق پتر نے، سارا سامان ہے، یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی چھوڑ کر گئے ہوں۔ بہت پیر لگا ہو گا نا؟“ اماں نے کہا تو وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

”اماں، بیٹا بھی کبھی ہوا اور پیسے کی بات بھی کرتی ہو۔ میرا کوئی حق نہیں ہے تم پر۔ اماں تمہیں نہیں پتہ جمال یہاں سے جاتے ہوئے مجھے بہت کچھ دے گیا تھا اور اس کا ابھی بہت کچھ ہے میرے پاس۔“

”اچھا چل باتیں نہ بنا، سامان رکھ اندر۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ حالانکہ سوئی پہلے ہی سامان اندر رکھنے لگی تھی۔ تب چھا کے نے کہا۔

”تیرا اوپر والا کمرہ بھی ویسا ہی بنوایا ہے اور اس میں وہ سب کچھ پڑا ہے جو اس میں ہوتا تھا۔“

”چل دیکھتے ہیں۔“ میں نے اسے ساتھ لیا اور اوپر چلا گیا۔ بہت دن بعد میں ان فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ جبکہ وہ مجھے بتا رہا تھا

”دوبندے ہر وقت یہاں ہوتے ہیں۔ میرے پاس اب اچھے خاصے لوگ ہیں۔“

”تو یہ سب چھوڑ، مجھے شاہ زیب کا بتا، کہاں ہے وہ؟ اور اس کے خواری یہاں کون کون ہیں؟“ میں نے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

”جمال لگتا ہے تو اپنے گھر میں واپس نہیں آیا، بلکہ شاہ زیب کی تلاش میں آیا ہے۔“

”ہاں۔“ تھوڑا سا وقت تھا میرے پاس، سوچا اپنا پرانا حساب برابر کر لوں۔ کہاں ہے وہ؟“

”جب سے وہ یہاں سے گیا ہے، واپس پلٹ کر نہیں آیا۔ اس کی خویلی میں وہی لوکر چاکر ہیں۔“ چھا کے نے بتایا تو میں نے پوچھا

”اس کا کوئی رابطہ نمبر ہے تمہارے پاس؟“

”ہاں ہے، کیوں تو نے بات کرنی ہے۔“ اس نے پوچھا تو میں نے کہا

”وقت آنے پر اس سے بات تو کرنا ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، صبح کر لیں گے بات، آؤ نیچے چلیں۔“ اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ نیچے کمرے میں آ گیا۔ ہم اپنے

”اگر ہم جہیں اندر ہی نہ جانے دیں تو.....“ ان میں سے ایک بھاری مونچھوں والے نے کہا اور ساتھ ہی اپنی واسکٹ کے اندر سے ریوا اور نکال لیا۔ ابھی وہ ریوا اور سیدھا بھی نہیں کر پایا تھا کہ تانی یوں اچھلی جیسے ہوا میں لہ بھر کے لیے اڑی ہو، اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے ریوا اور چھین لیا گیا تھا۔ وہ سب حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ جہاں نے انہیں حیرت ہی میں رکھا اور اپنا سطل نکال لیا۔

”جس کی موت آئی ہے، وہیں رہے، باقی چلو میرے ساتھ اندر۔“ اس نے سطل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ربوٹ کی مانند اس کے آگے لگ کر اندر کی جانب چل پڑے۔

اندر سے وہ گھر کافی بڑا تھا۔ بڑے سے صحن کے تین اطراف میں دو منزلہ کمرے تھے۔ جہاں جیسے ہی صحن میں آیا تو ایک ادیبز عمر شخص اور ایک نوجوان لڑکا تیزی سے باہر آئے۔ وہ برآمدے میں سے اتنے سارے لوگوں کے درمیان ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھنک گئے، تبھی پرسارام نے کڑک کر کہا۔ جس پر جہاں نے یوں اشارہ کیا جیسے سمجھانہ ہو، پھر بولا۔

”تانی اسے بتاؤ، مجھے ہندی آتی ہے، وہ بولو۔“

تانی نے بتایا تو وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔

”کون ہو تم؟ اور اس طرح کیسے اندر آ گئے ہو؟“

”دیکھو، پرسارام، ہم پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر تم بنے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو، پھر مجھے ہی کیا، کسی کو دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔“ جہاں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ پرسارام نے رعب دار آواز میں کہا تو وہ بولا۔

”میں کون ہوں، اس کا تو مجھے بھی نہیں پتہ، ہاں چاہتا کیا ہوں، اس پر بات ہو سکتی ہے۔“ اس نے پرسارام کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو پہلی بار اس کے لڑکے نے کہا

”اوپر زیادہ ہیر و گھیر کی مت دکھا، جو بھونکنا ہے جلدی بھونک، ورنہ تیری.....“

”اؤکتے کی اولاد، سن، تیرا باپ دلال ہے کیا، جوا پتی بہو بیٹیوں کا کاروبار کرتا ہے؟ بول؟“

اس نے یہ کہا ہی تھا کہ اس لڑکے نے تیزی سے ہاتھ میں دبایا ہوا سطل سیدھا کیا اور فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر ہو گیا۔ تانی نے اس لڑکے کے ہاتھ کا نشانہ لیا تھا، اس کا سطل نہ جانے کہاں چلا گیا، جبکہ لڑکے کے فائر سے ایک بندہ صحن میں گر کر ترے لگا تھا۔ تانی بنا کچھ بولے اس لڑکے کے پاس پہنچ گئی اور اگلے ہی لمحے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن اس کے سامنے تانی تھی، ایک چھلاوہ، اس نے لڑکے کی ناک پر گھونسا مارا اور پھر آنکھوں میں انگلیاں ماریں۔ وہ ایک طرح سے اندھا ہو گیا۔ تانی نے ایک کھڑی پھیلی اس کے سر پر ماری اور گردن پر ہاتھ مار کر فرش پر گرا دیا۔ چشم زدن میں اس نے لڑکے کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ تانی نے اپنے پاؤں کی ٹھوکرا اس کے منہ پر ماری تو لڑکے کے منہ سے کراہیں نکل گئیں۔

”بند کرو یہ تماشا.....“ کچھ سارام چیخا، پھر جہاں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”سارہ کہاں ہے، اسے میرے حوالے کر دو۔ میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔ ورنہ میں یہاں پر ہوں۔ اس کے بغیر تو میں جانے والا نہیں۔“

جہاں نے کہا تو پرسارام کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”وہی جو تم سننا نہیں چاہتے ہو۔“ جہاں نے برجستہ کہا۔

”یہاں کوئی سارہ نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”سچ کہہ رہے ہونا، پھر تم ہی نے کہنا ہے کہ وہ تمہارے پاس ہے اور میں نے نہیں ماننا۔“

”عجب آدمی ہو تم، ابھی ٹھہرو، میں کرتا ہوں تیرا بندوبست، میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر مجھے ہی دھمکیاں دے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ واپس پلٹنے لگا تو تانی نے ایک فائر اس کے قدموں میں کر دیا۔ وہ ڈر کر رک گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ تبھی اچانک ایک نوجوان لڑکی پاگلوں کی طرح اندر سے نکلی اور باپ کو ہتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ اس کے پیچھے ہی اس کی بیوی روتی ہوئی آگئی۔ بلاشبہ وہ چھپ کر یہ سب دیکھ رہی تھیں اور انہیں لگا ہوگا کہ تانی نے اس کے باپ کو گولی مار دی ہے۔ اسی لمحے جہاں نے تانی کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ بلا جھجک آگے بڑھی اور اس نے لڑکی کی کلائی پر اپنا ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا۔ وہ سیدھی فرش پر گری۔ اس دوران اس کے ایک ملازم کی غیرت جاگی اس نے جہاں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے قابو کرنا چاہا لیکن اگلے ہی لمحے جہاں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اپنے سامنے کر لیا۔ سطل والا ہاتھ اس کی پسلیوں میں مارا اور دوسرا ہاتھ اسکی بغل میں دے کے پیچھے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ یہ سب ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں ہوا۔ جہاں نے اس ملازم کی پنڈلیوں میں فائر جھونک دیا تو باقی سب سہم گئے۔ اس نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کس کا خون کھول رہا ہے یہ سب دیکھ کر؟“ اس پر کوئی نہیں بولا تو وہ پرسارام کی طرف دیکھ کر بولا، ”تیری بیٹی لے کر جا رہا ہوں۔ سارہ واپس کر دو گے تو مل جائے گی یہ بھی، وعدہ رہا۔“ اس نے کہا تب تک تانی اس لڑکی کو اٹھا کر اپنے آگے لگا چکی تھی۔ وہ اسے لے کر جیسے ہی باہر نکلی۔ پرسارام کی بیوی چلا اٹھی۔

”بھگوان کے لیے میری بچی کو مت لے کر جاؤ۔ اس بے چاری کا کیا قصور.....“

”سارہ کا کیا قصور، اس کے ماں باپ کو مارا اور اب اسے اغوا کر کے رکھا ہوا ہے۔“

”میں بتاتی ہوں۔ وہ ڈیرے پر قید ہے۔“

”ہوگی، مجھے اب اسے لے کر نہیں جانا۔ تم لوگ خود اسے کراچی میں اس کے گھر چھوڑ کے آؤ گے۔“ یہ کہہ کر اس نے زمین پر پڑے لڑکے کو ٹھوک ماری اور اسے اٹھایا، ”چل تو بھی چل اور دیکھ تیری بہن کے ساتھ کیا ہوتا ہے، چل“ جہاں نے اسے کالر سے پکڑا اور اپنے ساتھ لے جانے لگا تو اس کی ماں دھائی دینے لگی۔ جہاں نے ایک فائر اس کے پاس بھی جھونک دیا اور کہا، ”جس کی موت آئی ہے یا جو ان بہن بھائی کی موت چاہتا ہے وہ ہمارا پیچھا کرے، سارہ کو چھوڑ آؤ۔ یہ مل جائیں گے۔“

تانی اور جہاں ان دونوں کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لائے اور جپ میں لا پھینکا۔ اگلے چند منٹ میں وہ وہاں سے نکل چکے تھے۔

”دیکھو، چاہے جتنا لمبا سفر پڑ جائے۔ چیک پوسٹ کی طرف سے نہیں جانا، اب تک وہاں فون ہو گیا ہوگا۔“

”نہیں سر۔ یہ لوگ اب فون نہیں کریں گے۔ اور اب ہم نے اس طرف سے جانا بھی نہیں ہے، ہم کہیں اور جا رہے ہیں۔“ اس ڈرائیور نے کہا تو جہاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بھی ڈرائیور جپ کی رفتار بڑھا چلا گیا۔

جپ میں خاموشی طاری تھی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ سفر طے کر لینے بعد جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، ایسے میں تانی نے پوچھا۔

”مزید کتنا سفر باقی ہے؟“

”بس جی، ہم اس گونڈ کے بالکل قریب ہیں، جہاں ہم نے جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا اور ایک طویل سانس لی۔

ہر طرف اندھیرا اچھا خاصا پھیل گیا تھا، جب وہ ایک گوشہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ آبادی میں نہیں گئے بلکہ مصنوعی جنگل کے درمیان بنے راستے پر مڑ گئے۔ تقریباً دس منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک ڈیرہ نما حویلی میں جا کر کے۔ وہ دونوں بہن بھائی جیب سے نکال ایک کمرے میں ڈال دیئے گئے، جہاں سامان کے نام پر کوئی شے نہیں تھی۔ تبھی ڈائریور نے پوچھا۔
 ”ان کا بھی کیا کرتا ہے، اگر آپ کہیں تو.....؟“

”انہیں ابھی کچھ نہ کہو، رات بھر پڑے رہیں گے تو صبح ان کی آواز میں بڑا درد بولے گا۔“ تانی نے تیزی سے کہا تو جہاں بولا۔

”یہ روی نہیں ہے تانی، یہاں لمحہ قیمتی ہے۔“

”تو پھر کرو جو کرتا ہے۔“

”رات ذرا مزید ڈھل جانے دو، بلکہ تم ایسا کرو، شاید سے رابطہ کرو، ادھر کے حالات کیا ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ تانی نے کہا اور فون کرنے لگی۔ جہاں ایک سبے ہوئے اور آرام دہ کمرے میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد تانی نے آکر بتایا۔

”وہاں ایک دم خاموشی ہے۔ کسی نے ان سے بات نہیں کی، لیکن وہ اس بات پر اُلٹ ہو گئے ہیں کہ پرسارام کے دونوں بچے ہماری پاس ہیں۔“

”مطلب انہیں معلوم ہے کہ دونوں بہن بھائی ہمارے پاس ہیں۔“

”یس۔ وہ امن، سکون اور شانتی سے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ جہاں کے پاس آ بیٹھی۔ کچھ دیر بعد ان کے سامنے کھانا جن دیا گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ اس کمرے میں چلے گئے جہاں وہ دونوں بہن بھائی تھے۔ لڑکی کافی حد تک سہی ہوئی تھی، جبکہ لڑکے میں خاصا غصہ تھا۔ تانی نے جاتے ہی اس کی پیلیوں میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں اب بول، سارہ کہاں ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم، ایسے معاملات بڑا بھائی دیکھتا ہے۔“ اس نے کافی حد تک غصے میں کہا تو تانی نے ایک زوردار چھڑا اس کے منہ پر مارا اور اسے بالوں سے پکڑ کر آگے کی طرف جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرا تانی نے اپنا بیڑ زور سے اس کی گردن پر مارا تو وہ تڑپ اٹھا۔ اسی لمحے اس کی بہن بول پڑی۔

”اسے ہالے ڈیرے پر رکھا ہوا ہے۔“

”یہ سمجھنا دلوی ہے۔“ جہاں نے کہا اور پھر اس سے پوچھا، ”وہ ڈیرہ کہاں ہے؟“

”ہمارے گھر سے کافی دور کھیتوں میں۔“

”وہ ابھی زندہ ہے نا؟“ جہاں نے پوچھا۔

”جب تک تو زندہ ہی تھی۔“ لڑکی نے سہے ہوئے انداز میں کہا۔

”دیکھو۔ اگر تمہارا یہ کہنا غلط ثابت ہونا تو پھر دیکھنا، تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔“ تانی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”نہیں، میں نے ٹھیک بتایا۔“ وہ حتیٰ لچے میں بولی تو جہاں باہر نکل گیا۔ اس نے فون پر وہاں سلطان پور کے نزدیک آدمیوں سے کہا کہ وہ معلوم کریں، کیا سارہ ڈیرے پر قید ہے۔ فون بند کر کے وہ کمرے میں چلا گیا۔ اس نے تانی کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور آکر کمرے میں بیٹھ گئے۔ انہیں سلطان پور سے اطلاع کا انتظار کرنا تھا۔

ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ شاہد کافون آگیا۔ اس کے لچے میں گہری تشویش تھی۔ جہاں کی آواز سنتے ہی بولا۔
 ”ابھی پرسارام کافون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اس کے دونوں بچے واپس کر دیں، ورنہ بات بہت دور تک جائے گی۔“

”کہاں تک چلے جائے گی، بکو اس کرتا ہے وہ، سارہ اس کے پاس ڈیرے میں قید ہے اور.....“

”یہی بات تو کہہ رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ سارہ اس کے پاس ہے۔ اس نے اپنی ہندو برادری کو اکٹھا کر کے کہا ہے کہ مسلمان حملہ آور سارہ کے عوض اس کے بچے لے گئے ہیں، اب کیا کرنا چاہئے۔ وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ بات وزیر اعلیٰ تک فوراً پہنچائی جائے، اس کے ساتھ ساتھ میڈیا کو بھی بتایا جائے اور جو عالمی تنظیمیں ہیں انہیں بھی آگاہ کیا جائے۔ وہ بہت زیادہ واویلا کریں گے۔“

”تم کیوں گھبرارہ ہو شاید، وہ تجھے کیوں بتا رہا ہے، جائے جا کر ان سب کو بتائے، اس نے جو سارہ کے ماں باپ قتل کیے ہیں ان سے بچنا چاہتا ہے، بہر حال میں سارہ کو ضرور واپس لے آؤں گا۔“

”بات اگر ہندو مسلم تنازعہ میں چلی گئی تو.....“

”اوئے تو کیا بھارت میں رہ رہا ہے، تھوڑی ہمت کر۔“ جہاں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ سارہ کو نقصان پہنچا دیں۔ ممکن ہے کہ وہ اسے ختم کر کے الزام تم پر لگا دیں۔ پرسارام کا کیا پتہ؟“ شاہد نے کہا تو جہاں بولا۔

”تو ایسا کر تھوڑا سکون کر، میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ تبھی جہاں نے ایک دم سے فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد جہاں اور تانی اپنے ڈائریور کے ساتھ پھر سلطان پور کی جانب چل دیئے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سارہ ڈیرے پر ہے۔

سورج مشرق کی اوٹ سے نہیں نکلا تھا، جب وہ دونوں سلطان پور پہنچ گئے۔ شاید جہاں یوں سیدھے وہاں نہ جاتا اگر وہاں اس کے لوگ نہ ہوتے، انہوں نے یہ کھوج لگایا تھا کہ سارہ ابھی تک ڈیرے پر ہے اور اس وقت اس کی سیکورٹی بڑھا دی گئی ہے۔ دوسرا ابھی جو نیلگوں نور چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، وہ اس ملگجی روشنی کا فائدہ لینا چاہتا تھا۔ جہاں کو سلطان پور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ راستے ہی میں ان کا ایک آدمی مل گیا۔ اس نے ساری تفصیل بتا دی تھی۔ اس نے گاڑی کچھ دور ہی چھوڑ دی اور فہلوں کے درمیان سے ہوتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وہ آدمی اس سے آگے تھا اور اس سے ذرا پیچھے تانی کو ردیتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ڈیرے کی چھت پر کوئی بندہ نہ ہو۔ اس لیے بہت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ وہ ڈیرے کی دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ لکڑی کا چھانک کھلا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی اندر گئے، سامنے دالان میں چار پائی پر دو بندے بیٹھے ہوئے تھے، انہیں دیکھ کر ایک دم سے بولے۔

”کون ہو تم؟“

بولنے والوں کے لفظ منہ ہی میں رہ گئے تھے، جہاں نے ان پر یکے بعد دیگرے فار کھول دیا۔ ایک دم سے پرسکون فضا میں خوف پھیل گیا۔ وہ وہاں نہ رہ کر بھاگ کر دالان میں چلے گئے۔ تبھی سامنے والے کمرے سے دو بندے نکلے، تانی نے ان پر فار جھونک دیئے۔ ابھی اندر سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ تانی فوراً اندر گئی۔ ایک عورت فرش پر بندھی ہوئی پڑی تھی۔ جہاں اور آدمی باہر کھڑے رہے۔ تانی نے اسے کھولا اور ساتھ میں اسے سمجھائی رہی

”گھبراؤ مت، ہمیں شاید نے بھیجا ہے۔ بس اب نکلنے کی کرو۔“

”میں کیسے یقین کر لوں کہ.....“

”یہاں سے نکلو، تیری بات کرواتے ہیں۔“ تانی نے تیزی سے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر دالان میں آگئی۔ ایسے میں اوپر چھت پر سے فائرنگ ہونا شروع ہوگئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ایک ہی شخص تھا، ایک تو وہ انہیں روکنا چاہتا تھا، دوسرا اس قدر فائرنگ سے وہ لوگوں کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ سارہ انہیں مل گئی تھی۔ لیکن اب نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی جہال نے اس آدی سے کہا۔

”میں نکلتا ہوں، تم کو ردینا اور تانی تم گیٹ سے نہیں، اس چھوٹی دیوار سے.....“

تانی سمجھ گئی کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ چھلانگ مار کر دیوار پر چڑھ گئی۔ وہاں سے اس کا سر منڈیر تک جا پہنچا تھا۔ جیسے ہی جہال صحن میں گیا، ایک دم سے وہ فائر ہوئے ایک اوپر سے اور ایک تانی کی طرف سے۔ وہ اوپر چھت والا بندہ دھپ سے گرا۔ جہال گیٹ پار کر گیا۔ تانی نے سارہ کا ہاتھ پکڑا اور دیوار پر کھینچ لیا۔ تب تک جہال دیوار کے دوسری جانب آگیا۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آیا اور اس نے سارہ کو پکڑا کر زمین پر اتار لیا۔ اس کے پیچھے ہی تانی نے چھلانگ ماری۔ وہ تینوں اس جانب بھاگے، جدھر ان کی جیب کھڑی تھی۔

روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ انہوں نے دیکھا، سلطان پور گاؤں کی طرف سے کافی سارے بندے بھاگتے ہوئے چلے آ رہے تھے، بلاشبہ ان کے پاس اسلحہ بھی ہو سکتا تھا۔ جہال اب کسی طرح بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ جیب کے قریب آئے تھے کہ جہول کی طرف سے فائر ہو گیا۔ وہ تیزی سے جیب میں بیٹھے تو ڈرائیور نے جیب بھاگادی اور پھر وہ ہر آنے والے لمحے کے ساتھ جہول سے دور ہوتے چلے گئے۔

راستے میں جہال نے شاہد کا فون ملایا۔ جلد ہی ان کا رابطہ ہو گیا۔ جب اس نے یہ سنا کہ وہ سارہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور وہ اللہ کے ساتھ ہے تو وہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے سارہ سے بات کر کے اسے حوصلہ دیا اور فوراً اس کے پاس پہنچ جانے کے لیے کہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ اسی ٹھکانے پر پہنچ گئے، جہاں سے نکلے تھے۔

☆.....☆.....☆

صبح کانٹیکو نور چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ سورج ابھی مشرق کی اوٹ میں تھا۔ میں ساری رات نہیں سو پایا تھا۔ رات گئے تک چھا کا گاؤں کی روداد سنا تا رہا، کچھ میں اپنے بارے کہتا رہا۔ پھر وہ سو گیا تو میں صحن میں آگیا۔ میں تازہ ہوا میں سانس لیتا رہا اور پھر چھت پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسلحہ اور دوسری ساری چیزیں ویسی ہی تھیں جیسے آگ لگنے سے پہلے تھیں۔ میں کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تبھی میری نگاہ ذرا فاصلے پر منڈیر کے ساتھ کھڑی سوئی پر پڑی۔ وہ اندھیرے میں انجان نقطے پر نظریں جمائے نجانے کیا سوچے چلے جا رہی تھی۔ میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے گھوم کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

”کیا بات ہے، کیا سوچ رہی ہو؟“

”ہاں، میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم گاؤں میں تو آگئے ہیں، لیکن یہاں آکر ہم کریں گے کیا؟“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”دیکھو جہال۔ یہاں پر اب تمہارے لیے کچھ نہیں ہے سوائے تلخ یادوں اور پرانی دشمنی کے۔ تم اک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ اور.....“

”نہیں سوئی نہیں، تم غلط سوچ رہی ہو، میں اپنی خاطر یہاں نہیں آیا، بلکہ ان لوگوں کے لیے یہاں آیا ہوں جو نسل در نسل غلامی میں جی رہے ہیں۔ میں انہیں غلامی سے نکالنا چاہتا ہوں۔ مہری دشمنی شاہ دین تک تھی، وہ ختم ہوگئی۔“

”کیا کر سکتے ہو تم؟ اتنے لوگوں کو غلامی سے کیسے نکال سکتے ہو، اب وہ تمہی پٹی بات مت کرنا کہ میں انہیں شعور دوں گا، شعور والے بھی یہاں کچھ نہیں کر پارہے ہیں۔“ سوئی کے لہجے میں انتہائی درجے کی سنجیدگی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، آج کا دانش ور بھی لگاؤ مال ہو گیا ہے، اس کی عقل پیسے والا خرید رہا ہے۔ لیکن جو زندہ ہوتا ہے نا وہ نہیں بکتا۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”زندہ تو ہم سب ہیں، لیکن مردوں سے بدتر۔“

”نہیں، ہم زندہ ہی نہیں ہیں۔ ہماری وہ سوچ نہیں ہے، جو زندگی کا احساس دے۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں ہے، اس سوچ پر عمل کرنے کا نام ہے جو ہمارے رب نے اپنے محبوب کے ذریعے ہمیں دی ہے۔ جس نے اس زندہ سوچ کو اپنا لیا اور اس پر عمل کرنے لگا، وہ دنیا سے نہیں دنیا بنانے والے کا ہو جاتا ہے۔ مرنے کے لیے زندہ ہوا جاتا ہے، وہ کیا مرے گا، جو پہلے ہی مردہ ہو۔“

”میں تمہاری یہ بات نہیں سمجھ پائی؟“ سوئی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، کبھی مردے کی بھی قربانی ہوئی ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں تو۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”قربان وہی ہوتا ہے، جو زندہ ہوتا ہے، جو دیکھ رہا ہوتا ہے، یہی فلسفہ شہادت ہے، لیکن یہ میں تمہیں پھر کسی وقت سمجھاؤں گا، فی الحال، میں تجھے یہ بتا دوں کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔“

”وہی تو پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیسے تم انہیں غلامی سے نجات دے سکتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”تعلیم اور وہ بھی زندوں والی تعلیم، غلامی سے نجات کا باعث بنتی ہے، یہ جاگیردار، وڈیرے، یہ وسائل پر قابض لوگ، صرف اسی وجہ سے ہیں کہ وہ لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صرف اس علاقے کے لوگوں کی مجبوری ختم کرنا ہوگی، بس۔“ میں کافی حد تک جذباتی ہو گیا تھا۔

”مگر کیسے، تم اتنے وسائل کہاں سے لاؤ گے؟“

”وہی دے گا، جس نے مجھے یہ سوچ دی ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا تو اس نے چونکتے ہوئے میری طرف دیکھا پھر بولی۔

”اگر میں کروں تو؟“

”کوئی کرے، لیکن کرے، جو ہو سکتا ہے اور جس حد تک بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جوش سے بولی۔

”یہاں آنے سے پہلے میرے ذہن میں کوئی سوچ نہیں تھی لیکن اب ہے، میں جو کچھ بھی کروں، تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

”میں پہلے تم سے کیا دور ہوں؟“ میں نے پیار سے کہا تو وہ اسی لہجے میں بولی۔

”میں ابھی کچھ دیر بعد اپنے باپ کے گھر جاؤں گی، تم تیار رہنا۔ جنھوں نے لوگوں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، وہی اب.....“

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہی ہے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ وہ چھت سے نیچے چلی گئی اور میں اس کے پیچھے، چھانے کو اٹھانے چلا گیا۔

ناشتہ کر چکے تو سوئی نے شاہ زیب کا فون نمبر مانگا، اس نے بتایا تو سوئی نے نمبر ملا کر اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف کافی

دیر تک بیل جاتی رہی۔ دوسری کوشش پر فون رسیو کر لیا گیا۔

”ہیلو، کون ہے؟“ شاہ زیب کی آواز گونجی

”میں سوئی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”بولو، کیا بات ہے۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”میں نے تمہیں صرف اتنا بتانا ہے کہ میں آج حویلی جا رہی ہوں، اور اب میں وہیں رہوں گی۔ تم اگر چاہو تو مجھے روک سکتے ہو۔“

”دیکھو، جو ہو گیا، سو ہو گیا، اب تم چاہو تو اپنے حصے کی جائیداد کے برابر دولت لے کر الگ ہو سکتی ہو لیکن یہ حویلی پر قبضہ میں.....“

”میں قبضہ نہیں کر رہی، اپنا حق لے رہی ہوں۔ ابھی کچھ دیر بعد میں جاری ہوں وہاں، روک سکتے ہو تو روک لو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر اسی وقت مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ جب سوئی اور میں حویلی کے سیاہ گیٹ کے سامنے جا کر کے حویلی کے باہر دو سیکورٹی والے کھڑے تھے۔ اس کے پاس ہی فخر و نبل رہا تھا۔ سوئی نے اپنی کار روکی اور باہر نکل آئی۔ پھر چند قدم چلنے کے بعد جیسے ہی گیٹ کے پاس پہنچی، فخر و تیزی سے باہر آیا اور بولا۔

”سوئی بی بی۔ میں خون خرابہ نہیں چاہتا۔ شاہ زیب سب کچھ میرے حوالے کر کے گئے ہیں۔ وہ آجائیں تو.....“

”تم خود خون خرابے والی بات کر رہے ہو فخر و۔ گیٹ کھولو۔“ سوئی نے غصے میں کہا تو وہ چند لمحے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”بی بی، شاہ زیب نے رات ہی بندے یہاں بھجوا دیئے ہیں، وہ سب اندر ہیں، وہ فائر کھول سکتے ہیں۔ خدا کے لیے بی بی جی آپ.....“

”مجھے معلوم تھا کہ شاہ زیب یہ بے غیرتی کرے گا، میں بھی پورے انتظام سے آئی ہوں۔ بلاؤ ان کو اور انہیں کچھ مجھ پر فائر کریں۔“ سوئی نے انتہائی غصے میں کہا تو فخر و بے تاب سے بولا۔

”میری جرات کہاں کہ میں بات کروں۔ گیٹ پار کر کے ہی وہ فائرنگ شروع کر دیں گے۔“

تبھی میں نے کہا۔

”سنو فخر و، تم پرے ہٹ جاؤ، اگر زندگی چاہتے ہو، میں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا بیل نکال لیا۔ اسی دوران سیکورٹی والوں نے اپنی گتیں سیدھی کر لیں۔ میں سارا پلان کر کے آیا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے گتیں سیدھی کیں، اسی لمحے اندر سے پودوں کے پاس سے آواز آئی۔

”او سیکورٹی والو، اپنی گتیں زمین پر رکھ دو، ورنہ پہلے تم مرو گے۔“ وہاں چھکا کا پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے پچھلا راستہ اختیار کر کے بندے اندر داخل کر لیے تھے، تبھی ہم یہاں آئے تھے۔ شاہ زیب کے بلائے ہوئے بندے شاید حویلی کے اندر تھے۔ فخر و گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے پلٹ کر سیکورٹی والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ سوئی اندر نہیں گئی، بلکہ وہیں کھڑے شاہ زیب کو فون کیا۔ رابطہ ہو جانے پر بولی۔

”میرے ہی باپ کے گھر جانے سے مجھے تمہارے روکا، اب تم نے خود دشمنی کی ابتدا کر دی ہے۔ میں حویلی کو جلا رہی ہوں، آگ لگا دوں گی۔ جو بندے تم نے یہاں چھپا کر رکھے ہیں، دیکھتی ہوں وہ اندر ہی کراتے ہیں یا ہماری لاشیں کرتی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تبھی سوئی نے حویلی کے اندر قدم رکھا تو سامنے سے فائر ہو گیا۔ ظاہر ہے فائر کرنے والے نے سامنے ہو کر فائر کرنا تھا، جس وقت اس نے فائر کیا، میں نے بھی گولی چلا دی۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے آگرا۔ میں نے

بیل فخر و کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

”کتنے لوگ ہیں؟“

”چھ تھے جی، اب پانچ.....“

میرے پیچھے کھڑے ایک لڑکے نے سیکورٹی والوں سے گتیں لیں اور انہیں سڑک کی طرف بھاگ دیا۔ فخر و گیٹ پر ہی کھڑا رہا، اندر موجود بندوں نے فائر کھول دیا۔ ایک طرف سے چھکا سیر می لگا کر اوپر چڑھ گیا۔ اب میرے لیے رکنا بہت مشکل ہو رہا تھا اور میں سوئی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے سوئی کو کور دیا۔ وہ پیدل ہی چلتی ہوئی پورچ تک پہنچ گئی۔

سامنے سے ایک نے سوئی پر فائر کرنا چاہا لیکن میرے فائر کرنے پر نہ کر سکا۔ تبھی چھکا کا اندر سے برآمد ہوا، اس نے اندر صاف ہو جانے کا بتایا اور غائب ہو گیا۔ اس دوران افسردہ سا فخر و قریب آ کھڑا ہوا۔ جب سوئی نے فخر و سے کہا۔

”یہاں پر جتنے ملازم ہیں، انہیں یہاں بلاؤ، میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

یہ سنتے ہی فخر و وہاں سے چلا گیا۔ وہ پورچ کے سامنے ہی کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد وہاں سارے ملازم آ گئے۔ تو فخر و نے ادب سے کہا

”جی بی بی جی، سب آ گئے ہیں، ان کے علاوہ جو کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔“

اس پر سوئی نے ملازمین کو دیکھا اور بولی

”تم سب آج سے فارغ ہو۔“

”مگر ہم جائیں گے کہاں؟“ ایک شخص گھبراتے ہوئے بولا۔

”اپنے مالک کے پاس۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے بڑے نوٹوں کی گڈی نکال کے فخر و کو دی اور کہا، ”یہ لو اسے سب میں بانٹ دو۔ آدھے گھنٹے کے اندر حویلی خالی چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ وہ چلتے ہوئے اس جگہ جا پہنچی جہاں سے ان ملازمین کو دیکھا جاسکتا تھا۔ آدھے گھنٹے تک وہ وہاں کھڑی رہی، وہ سب چلے گئے اور فخر و اس کے پاس آ گیا۔ اس نے چابیاں تھمائیں اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”بی بی جی، میرا مرنا جینا یہیں اس حویلی میں ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے.....“

”نہیں فخر و، تم جاؤ، مجھے تیری ضرورت نہیں ہے۔“ سوئی نے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا

”بی بی جی، میرا کیا قصور، شاہ زیب جی نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو اندر.....“

”میں نے کہا چلے جاؤ۔“ سوئی نے اس بار سختی سے کہا تو وہ چند لمحے دیکھتا رہا، پھر پلٹ کر چلا گیا۔ اسی دوران میں نے چھاکے کو فون کر دیا۔

شاید اس وقت ہم دونوں ہی حویلی میں تھے۔ پتہ نہیں سوئی اس وقت اتنی جذباتی کیوں ہو گئی۔ وہ ایک دم سے میرے گلے لگ گئی۔ وہ رونے لگی تھی اور میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ وہ اس وقت تک میرے ساتھ لگی روتی رہی جب تک چھکا کا نہیں آ گیا۔ وہ مجھ سے الگ ہو کر بولی۔

”جمال۔ اب اس حویلی سے ظلم نہیں ہوگا، بلکہ یہ تعلیم کا مرکز ہوگی۔ میں نے شروعات کر دی ہے۔“

”اور میں اس کی حفاظت کروں گا۔“ میں نے اسے شانے سے پکڑا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس وقت مجھے سوئی پر بہت پیار آ رہا تھا۔

جسپال، تانی، شاہد اور ابراہیم ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بھی بحث چل رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ شاہد کا موقف تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر صرف سارہ کو لے جایا جائے جبکہ ابراہیم کہہ رہا تھا کہ یوں آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔ ہمیں پورا پورا معاملہ صاف کرنا چاہئے۔

”دیکھو۔ مجھے اس کی جائیداد وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بس سارہ مل گئی اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔“ شاہد نے کہا تو ابراہیم بولا۔

”اب یہ صرف جائیداد کا معاملہ نہیں رہا، انہوں نے اسے مذہبی ایٹھ بنا لیا ہے۔ بات عالمی تنظیموں تک پہنچ گئی ہے۔ کیا تم میڈیا پر دیکھ نہیں رہے ہو؟“

”تو اس پر اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ شاہد نے کہا۔

”سارہ، باقاعدہ عدالت کے سامنے جائے گی، جہاں انہوں نے داویلا کیا ہے۔ میڈیا پر سارہ ہی اپنے بارے میں بتائے گی۔“ ابراہیم نے اسے راستہ بتاتے ہوئے کہا تو جسپال بولا۔

”میرے خیال میں ابراہیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر سارا ام کی اب وہ جرات نہیں ہوگی، اس کے بچے ہمارے پاس ہیں۔ ایک دودن لگیں گے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اور کیا، اسے تو اب اپنے باپ کا بھی بدلہ لینا چاہئے۔“ اس نے جوش سے کہا تب یہ طے پا گیا کہ کیا کرنا ہے۔ دوپہر ہونے تک ایک پولیس آفیسر کے ساتھ وہ قحطانے جا پہنچے۔ وہاں میڈیا کو بھی بلایا گیا تھا۔ اس پولیس آفیسر نے سارا کریڈٹ خود لے کر ایک کامیاب چھاپے کی فرضی داستان سنائی۔ میڈیا کو سارہ نے بتایا کہ اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔ پر سارا ام صرف اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اس پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اسے شک ہے کہ اس کے والدین کے قتل میں پر سارا ام کا ہاتھ ہے۔

ابھی میڈیا والے وہیں تھے کہ ایک مہنگی فورڈ جیل جپ وہاں آڑکی۔ اس میں سے قریبی گوٹھ کا سردار مہرل شاہ بڑے کر وفر سے باہر آیا۔ وہ اس علاقے سے صوبے کی اسمبلی کا رکن تھا۔ سب اسی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سارہ کو دیکھتا ہوا ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

”کیسے آتا ہوا شاہ جی۔“ پولیس آفیسر نے متانت سے پوچھا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”شاہد میں جلدی آگیا۔ یہ رش کم ہو جائے تو میں نے سارہ بی بی سے بات کرنی ہے۔“

تبھی سارہ نے شاہد کی طرف دیکھ کر کہا

”اسے بتاؤ کہ وہ آپ سے بات کریں۔“

”ہاں، ہم شاہد میاں سے بات کر لیں گے۔“ اس نے کافی حد تک قحط سے کہا۔

بات ختم ہو چکی تھی۔ جلد ہی میڈیا والے وہاں سے چلے گئے۔ تو پولیس آفیسر انہیں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ تبھی شاہد نے کہا۔

”بولیں، آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”بات اتنی سی ہے، اس بے چارے پر سارا ام کے بچوں کو ان کے حوالے کر دو۔ رہی جائیداد کی بات تو آپ اس کی قیمت بتاؤ، میں ادا کرتا ہوں، قصہ ختم، وہ کبھی آپ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھیں گے۔“

”اور اگر ایسا نہ کریں تو.....؟“ جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں ہوگا، یہ لوگ اس بے چاری سارہ کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ چین سے نہیں رہنے دیں گے اسے۔ آپ یہ

سوال کر سکتے ہیں کہ میں یہ بات کیوں کر رہا ہوں، میں وزیر اعلیٰ کی طرف سے آیا ہوں۔ بہت ساری عالمی تنظیمیں اصل قصہ جانتا چاہ رہی ہیں۔“

”کیا قصہ ہے یہ، آپ کیا سمجھتے ہیں، بتائیں گے؟“

”پر سارا ام کا لالچ ہے، میں جانتا ہوں۔ میری اس سے بات ہوئی ہے۔ وہ خود بیان دے گا۔“ مہرل شاہ نے کہا۔

”اوکے۔“ شاہد نے ایک دم سے کہا تو وہ بولا۔

”بتائیں قیمت،“ مہرل شاہ نے کہا۔

”سب کچھ کون خریدے گا؟“ شاہد نے پوچھا۔

”سب کچھ پر سارا ام خریدے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو شاہد بولا۔

”ٹھیک ہے، ڈن۔“ شاہد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

”آپ آرام سے کراچی جائیں، میں وہیں آپ سے ملوں گا۔ آپ اس کے بچے.....“ مہرل شاہ ادھوری بات کہہ کر شاہد کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہمارے کراچی جاتے ہی اس کے بچے اسے مل جائیں گے۔“ شاہد نے کہا تو وہ بولا۔

”اب یہ مذہب بدلنے والا ایٹھ بھی نہیں ہوگا، یہ میرا وعدہ ہے۔“ مہرل شاہ نے کہا اور اٹھ گیا، پھر بولا، ”اب اجازت۔“ یہ کہہ کر اس نے شاہد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ہاتھ ملایا تو وہ باہر کی طرف چلا گیا۔ تبھی جسپال نے ان سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ قحطانے کے محن میں آکر ابراہیم نے کہا

”اب آپ جائیں کراچی، سکون سے، میں کل انہیں آزاد کر دوں گا۔“

”یار میں تمہارا احسان زندگی بھر.....“ شاہد نے کہنا چاہا تو اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا

”ایسا نہیں کہتے، دوست بھی کہتے ہو اور ایسی بات بھی کرتے ہو۔“ اس نے شاہد کو اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا اور پھر

اسے گلے لگاتے ہوئے بولا، ”آؤ میں تجھے ایئر پورٹ چھوڑ دوں۔“

وہ کبھی وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ میں اس وقت سوئی کے ساتھ اپنے ڈیرے پر تھا۔ مجید بہت خوش تھا۔ چھاپے کے نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ ڈیرے پر بھی ڈھور ڈنگروں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ ہم اس کے پاس بے نکل کر کار کی طرف آرہے تھے،

”بہت عرصے بعد سکون کے چند دن دیکھنے کو ملے ہیں، کیوں نا چھاپے کی شادی کر دیں، چند دن ہلاکٹا رہے گا۔“ سوئی نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اشارت کر دی پھر گیتز میں ڈالتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر کہا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے، تیرے ساتھ وہ حویلی میں رہے گی مہارانیوں کی طرح۔“

تبھی وہ ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”جمال میں نے حویلی میں نہیں، اماں کے پاس رہنا ہے اور وہب تک رہوں گی، جب تک تم یہاں ہو۔ ورنہ میں اماں کو لے کر یہاں سے واپس چلی جاؤں گی۔“ سوئی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یار تم نے تو میری ماں پر قبضہ جما لیا ہے۔“

”یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے، میں کیا کروں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے کہا۔

”بس، اتنا ہی تھا تمہارا جذبہ بڑے دعوے کر رہی تھی کہ یہاں علم کی روشنی پھیلاؤں گی، اس کا کیا ہوگا، خدا نخواستہ میں نہ رہوں تو یہ لوگ پاچکے علم کی روشنی اور وہ بھی تیری دی ہوئی۔“

”وہ تو میں نے ایک پورا پورا جیکٹ بنایا ہوا ہے۔ میں کوئی ماہر تعلیم نہیں، میں نے ایک این جی او سے بات کی ہے۔ وہ چلائے گی سب، میں تو پیرہ دوں گی۔ میں نے ان کو بلوایا ہے، تجھے پتہ ہے کہ ان کے کچھ لوگ آگئے ہیں اور انہوں نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ تیری طرح نہیں، میں اس کی حفاظت کروں گا۔“ اس نے میری نقل اتارتے ہوئے کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا پھر میں نے پوچھا۔

”اور وہ جھاکے کی شادی والی بات.....؟“

”پہلے جھاکے سے پوچھتے ہیں، وہ کیا کہتا ہے، کوئی پسند تو ہوگی نا اس کی؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے،“ میں نے کہا تو انہی لمحات میں جھاکے کا فون آگیا، میں نے پوچھا۔ ”ہاں بول کیا بات ہے؟ ابھی تیرا نام لیا تھا کہ.....“

”شیطان ٹپک پڑا۔ خیر۔ بڑے دنوں بعد پیر زادہ وقاص کا فون آیا ہے، وہ تم سے بات کرنے کے لیے مجھ سے نمبر مانگ رہا ہے، کیا خیال ہے دے دوں؟“

”تم نے پوچھا نہیں وہ کیا چاہتا ہے؟“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”کہہ رہا ہے وہ اور اس کے ساتھ علاقے کے چند معززین تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”یار تم خود ہی اس سے وقت ملے کر لو اور پھر مجھے بتا دینا۔ مل لینے میں کیا حرج ہے، نمبر مانگے تو دے دینا۔“ میں نے کہا تو بولا۔

”میں شام کا کھد دیتا ہوں۔“

”کہہ دینا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ابھی سہ پہر ہی کا وقت تھا کہ پیر زادہ وقاص، چوہدری شاہنواز اور علاقے کے کچھ زمیندار میرے گھر کے سامنے آئے۔ چھانکا انہیں بیٹھک میں بیٹھا چکا تھا، جب میں ان کے پاس گیا۔ کافی عرصے بعد میں نے پیر زادہ وقاص کو دیکھا تھا۔ خوشگوار ماحول میں بات شروع ہوئی لیکن اس وقت یہ بات الجھ گئی جب چوہدری شاہنواز نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”بھئی جمال، تم نے جس طرح شاہ دین کی پوری جائیداد حاصل کر کے اپنا بدلہ لے لیا، اسے ہم مانتے ہیں۔ تمہارا اشار اب علاقے کے زمینداروں میں ہوگا۔ ہم تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور خیر سگالی کے طور پر تمہارے پاس آئے ہیں۔“

”آپ سب کی مہربانی کہ مجھے بان دیا لیکن میرا بدلہ ان کی ذات کی حد تک تھا، جائیداد کی صورت میں نہیں تھا۔ مجھے جائیداد کا نہ پہلے لالچ تھا اور نہ مجھے اب ہے۔ وہ سب کچھ شاہ دین کی بیٹی اور شاہ زیب کی بہن، سوئی کا ہے۔“ میں نے ان کے سامنے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں جمال۔ صرف ہم ہی نہیں سبھی یہ بات جانتے ہیں کہ وہ لڑکی تیری مرضی کے خلاف ایک قدم نہیں اٹھاتی اور نہ ہی اس میں اتنی جرات ہے۔ یہاں جو بھی ہو رہا ہے تیری مرضی کے بغیر نہیں ہو رہا ہے۔“ پیر زادہ وقاص نے کہا تو میں بولا۔

”وقاص۔ یہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ مجھے اس جائیداد سے کوئی سروکار نہیں۔ اب مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ لوگ کسی بات سے خوش نہیں ہیں۔ کھل کر بات کریں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”تو پھر سنو، زمینداری کرو، الیکشن لڑو، جو مرضی کرو، لیکن یہ پڑھنا پڑھانا، یہ حوبلی کو کسی سکول میں بدلنا، یہ ٹھیک نہیں ہے، کیوں غریبوں کے بچوں کی محنت مزدوری چھین رہے ہو، سوئی کو اگر ایسا شوق ہے تو وہ ادھر شہر میں پورا کر لے۔“ چوہدری شاہنواز نے پرجوش انداز میں کہا تو میں سمجھ گیا وہ کس نیت سے آئے ہیں۔ تب میں نے صاف لفظوں میں کہا۔

”یہ سوئی کا ہی نہیں میرا بھی خواب ہے کہ یہاں کے بچوں کی قسمت میں بھی تعلیم ہو۔ وہ خواب ہم پورا کریں گے۔ آپ غریبوں کے بچوں سے اتنی ہمدردی نہ کریں کہ انہیں صرف محنت مزدوری تک محدود کر لیں۔ آپ بھی ان پر مہربانی کریں۔ انہیں محض غلام نہ بنا کر رکھیں۔ انہیں بھی اپنی قسمت بنانے کا موقع دیں۔“

”تم لوگ بہت پچھتاؤ گے۔ یہ غریب ایسا جن ہے اگر اسے قابو میں رکھیں گے تو ہی خود محفوظ رہیں گے۔ تم نئے نئے امیر ہوئے ہو، تمہیں بہت بعد میں سمجھ آئے گی، انہیں اگر دبا کر نہیں رکھو گے تو یہ تمہیں کھا جائیں گے۔ بہر حال ہمیں یہ کام پسند نہیں ہے۔ ظاہر ہے ہم اس کی مخالفت کریں گے۔“ چوہدری شاہنواز نے کہا تو میں عمل سے بولا۔

”چلیں۔ آپ کریں مخالفت، ہم اپنا کام کرتے ہیں، آپ اپنا کام کریں۔“

”مطلب تم ہمارے سمجھانے سے نہیں سمجھو گے۔ اتنے لوگ آئے ہیں تمہارے پاس، تم نے ان کی قدر نہیں کی جمال۔“ اس نے غصے میں کہا

”میں ہر اس بندے کی قدر کرتا ہوں، جو مجھ سے اپنی قدر کروانا چاہے گا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو چوہدری شاہنواز ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے آئے تھے، ویسے چلے گئے۔ میں اور جھاکا بہت دیر تک ان کی باتوں پر تبصرہ کرتے رہے۔ پھر میں اسے باہر والے کمرے میں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ میں نے سوئی کو لوگوں کے آنے کے بارے میں بتایا تو کافی حد تک رنجیدہ ہو گئی۔ اس کا یہی خیال تھا کہ یہ شاہ زیب ہی کی مخالفت ہے۔ جس پر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سوئی مجھے اپنے ساتھ لے کر حوبلی چلی گئی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ ان لوگوں کو بھی علاقے کے ماحول کے بارے میں بتا دے۔ وہاں تھوڑی دیر ان سے گپ شپ کے بعد ہم یونہی باتیں کر رہے تھے کہ جھاکے کا فون آگیا۔

”اویار تجھے یاد ہے، وہ ایک انسپکٹر افضل رندھاوا تھا، جس نے حیری بہت مدد کی تھی۔“

”ہاں، یاد ہے مجھے، کیا ہوا ہے اسے؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”وہ آیا بیٹھا ہے، تجھے ملنا چاہتا ہے، کہہ رہا ہے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”میں آ رہا ہوں،“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مگر میرے اندر نجانے کیوں ایک طرح سے بے چینی ہونے لگی۔

میں گھر پہنچا اور سیدھا افضل رندھاوا کے پاس گیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اگرچہ وہ مسکراتے ہوئے ملا، مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اطمینان سے بیٹھ گئے تو وہ بولا۔

”پتہ نہیں جمال، میں تم سے یہ بات کیوں کر رہا ہوں، میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا، لیکن تم تجھے نہیں اب پتہ چلا کہ تم ادھر ہو تو میں نے تم سے یہ شیئر کرنے کا سوچ ہی لیا۔“ وہ بات کرتے ہوئے الجھ رہا تھا۔

”رندھاوا صاحب آپ کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس طرح تو مجھے سمجھ نہیں آئے گی کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے سکون سے کہا تو وہ کتنی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”تمہیں پتہ ہے نا کہ میں معطل ہو گیا تھا اور وہ مجھے شاہ زیب اور وقاص پیر زادہ نے کروایا تھا؟“

”تو کیا آپ اب تک بحال نہیں ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہو گیا ہوں، لیکن ابھی تک زیرِ عتاب ہوں۔ ان کی رسائی اور پر تک ہے، میں ڈی ایس پی ہو سکتا ہوں اگر کوئی کام دکھا دوں تو؟“ وہ اصل بات پر آ گیا۔

”مثلاً کیسا کام؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھو، تم میری مدد کر پاؤ گے یا نہیں لیکن یہ بات تیرے پاس امانت ہوگی۔“ اس نے اپنے طور پر تسلی چاہی تو میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”آپ کہو، بلا جھجک کہو۔“

”میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کوڑ کا پھر کہتا چلا گیا۔ ”یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ان جاگیرداروں اور وڈیروں کے ڈیروں پر بد معاش، ڈاکو اور اشتہاری عام طور پر رہتے ہیں۔ ہم چاہیں بھی اور ہمیں معلوم بھی ہو تو ہم انہیں نہیں پکڑ سکتے۔ میں معطل تھا۔ انہی دنوں، کچھ خفیہ والے ادھر آئے انہوں نے یہاں سے کچھ ایسے سنگل پکڑے ہیں، جن کی انہیں سمجھ ہی آئی ہے کہ یہاں، اس علاقے میں ملک دشمن لوگ کام کر رہے ہیں۔ ہم یہاں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔ وہ واپس چلے گئے۔ ممکن ہے وہ تفتیش جاری رکھیں، مگر میں نے بھی اپنا کام جاری رکھا۔ مہینہ بھر پہلے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں، چوہدری شاہنواز کے ڈیرے پر کچھ ایسے لوگ ہیں جو ملک دشمن ہیں۔“

”آپ کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اسی سکون سے پوچھا تو صاف گوئی سے بولا۔

”جہاں، میں معطل ہوا، مجھے میں بڑی سبکی ہوئی ہے۔ بحال بھی ہو گیا، کوئی گناہ ثابت بھی نہیں ہوا، نوکری ٹھیک ہے، مگر میں اپنا تاثر ٹھیک کرنا چاہتا ہوں، میں بالکل یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں یہ وطن کی محبت میں کرنا چاہتا ہوں۔ سال بھر بعد میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ بس.....“ یہ کہہ کر وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”مجھے ایک بار وقاص پیرزادہ لے کر گیا تھا وہاں، یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاہ زیب نے میرا گھر جلایا تھا، یاد ہے نا وہ دن؟“

”یاد ہے، تم نے دیکھا ہوا ہے وہ ڈیرہ؟“ اس نے تیزی سے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں نے دیکھا ہے، لیکن کیا آپ کو یقین ہے، اگر یقین ہے تو پھر پلان کیا ہے؟“

”دو باتیں ہیں کھل کر ایک دم سے چھاپے مارا جائے یا پھر خفیہ طور پر وہاں جایا جائے۔ میں ان دونوں صورتوں میں ساری گیم اپنی طرف لے آؤں گا۔ اس کی تم فکر نہیں کرو۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بندوں کے بارے میں پتہ ہے یا وہ بھی معلوم کرنے پڑیں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ کفرم ہیں۔ میرے پاس ان کی تصویریں ہیں۔ یہ سیل فون میں ہیں۔“ اس نے اپنی جیب سے فون نکالتے ہوئے کہا۔

”مگڈ۔ لیکن ایک بات ہے رندھاوا، یہ بات ابھی تک ہضم نہیں ہو رہی کہ تم مجھے ہی کیوں بتا رہے ہو اور میری مدد کیوں چاہتے ہو، تم یہ سب کچھ پہلے بھی کر سکتے تھے؟“ میں نے اسے شک کی نگاہ سے دیکھا۔

”تمہارا یہ سوال بنتا ہے جہاں، کیا آج ہی وہ تمہارے پاس نہیں آئے؟ اور پھر تم خود بتاؤ، اس علاقے میں کوئی دوسرا ہے بتا دو، جو یہ کام کر سکے؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

”بات یہ نہیں ہے، مجھ سے بھی بڑے جگرے والے یہاں پر ہیں، مگر انہیں کوئی چوٹ نہیں لگی، چڑیا کو بھی جگ کر دے نا تو سانپ کو مارنے پر ٹٹل جاتی ہے۔ خیر۔ جب کچھ کرنا ہو تو مجھے بتا دیتا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات مان جاؤ گے۔ میری طرف سے تو چاہئے آج رات ہی کو.....“ اس نے اپنی بات

ادھوری چھوڑ کر میری طرف دیکھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ ساتھ ہو گے یا یہ کام مجھے ہی کرنا ہوگا۔“

”میں ساتھ ہوں گا، پوری نفی ہوگی۔“ اس نے جوش سے کہا۔

”مجھے پلان بتاؤ، سب کر لیں گے۔“ میں نے کہا تو ایک دم سے اٹھ گیا۔ پھر چپکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”میں صرف دو گھنٹے بعد تمہیں کال کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ میری سنی ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا اور میں اپنے بلدیہ میں وہ سنسنی محسوس کرنے لگا، جو لوگوں کو نچانے کے وقت میرے اندر پھیلتی تھی۔

☆.....☆.....☆

کراچی کے پوش علاقے میں موجود شاہد معین کے جنگلے میں پہنچے تو اس کا بیٹا وہیں اس کا منظر تھا۔ دادا اپنے پوتے کو لے کر آ گیا تھا۔ جس وقت سارہ اپنے بیٹے کو انتہائی جذباتی انداز میں مل رہی تھی۔ اس وقت جہاں کو اپنی ماں یاد آ گئی۔ جب وہ اس دنیا سے گئی تھی تو بلاشبہ اسے بھی اپنا ہی بیٹا یاد آیا ہوگا۔ وہ اس منظر میں دردنگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ آنسوؤں میں لپٹی ہوئی خوشی کا منظر ہی عجیب ہوتا ہے۔

خوشگوار ماحول میں ڈنر کے بعد جہاں اور تانی باہر لان میں آ گئے۔ بڑے لان کے ساتھ پام اور پیسٹے کے درخت تھے۔ لان کے چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ کراچی کی فضا میں بھی عجیب خمار آلود تھیں۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے تانی بولی

”جہاں، کتنا اچھا موسم ہے۔“

”ہاں۔ ہے تو ایسا ہی، تم نے صحرا میں زیادہ وقت گزارا ہے نا، اس لیے تجھے بھلا محسوس ہو رہا ہے۔ خیر، اب بتاؤ کیا پر وگرام ہے۔ چلیں واپس۔“

”اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر موسم کا مزہ لیتے ہیں۔“ تانی نے خمار آلود لہجے میں کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”اوئے میں اندر جانے کی بات نہیں کر رہا، واپس نورنگر جانے کی بات کر رہا ہوں، جہاں کے پاس۔“

”ابھی روہی سے کوئی اطلاع نہیں ہے، جیسے ہی وہ کہیں گے، ہم وہاں چلے جائیں گے، تب تک تو ہمیں یہیں رہنا ہو گا۔“

”ویسے تمہارا کیا خیال ہے، یہ جو مہرل شاہ درمیان میں پڑا ہے، کیا اسے وزیر اعلیٰ نے ہی بھیجا ہو گا یا یہ خود ہی.....“ جہاں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مجھے صمد کا فون آیا تھا۔ یہ معاملہ عالمی تنظیموں کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ خاص طور پر بھارتی میڈیا اسے بہت اٹھارہا ہے۔ اس کے پیچھے ظاہر ہے نا کا ہاتھ ہے۔ ایسا کوئی موقعہ وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جس سے پاکستان کو بدنام کیا جا سکے۔ اب سارے یہی چیخ رہے ہیں کہ پاکستان میں اقلیتیں محفوظ نہیں۔“

”یہ تو ہے، وہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے۔“ جہاں نے کہا۔

”یہ تو ہے نا۔ اب دیکھنا، یہ پر سارام، جب اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا تو دادا پلا کرے گا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ بھارت جانے گا، وہاں اس بات کو لے کر خوب پروپیگنڈا کیا جائے گا۔ کسی نے سارہ کی بات پر توجہ نہیں دینی کہ وہ سلمان کیوں ہوئی، سبھی اس بات پر زور دے گے کہ اقلیتوں کو تحفظ نہیں ہے۔“ تانی نے جوش میں کہا۔

”ادھر پاکستانی میڈیا کو چاہیے نا کہ وہ اصل بات بتائے۔“ جہاں نے کہا۔

”یہ تو دکھ کی بات ہے، یہاں کا میڈیا ابھی پھوڑ نہیں ہوا۔ یہ سب وقت کے ساتھ ٹھیک ہوگا۔“ تانی نے ایک طویل سانس لے کر کہا تو حچال بولا۔

”تمہارے خیال میں اب ہمارا یہاں کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ظاہر ہے جب ان کے درمیان جانیداد کی ذیل ہو جائے گی تو ہم جا سکیں گے۔“ تانی نے اپنا خیال ظاہر کیا تو حچال سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے خیال میں بھی یہی تھا کہ ابھی خطرہ ملا نہیں ہے۔ سارا مسئلہ تو جانیداد کی وجہ سے تھا۔

وہ چھل قدمی کرتے ہوئے لان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے تھے۔ دونوں میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک حچال نے کہا۔

”تانی اس طرح تو سارہ اب بھی خطرے میں ہے۔ جب تک یہ.....“

”یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ وہ لوگ اسے اب بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اس کے مرنے سے پر سارا م کو بہت فائدہ ہوگا۔ جانیداد تو اس کے ہاتھ میں ہے ہی، وہ اپنی ہندو برادری میں بھی سرخرو ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اسے کچھ نایدہ تو توں کی حمایت بھی تو مل گئی ہے۔“ تانی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے چوک ہو گیا۔

”تانی، اس کا مطلب ہے وہ یہاں پر، یا کہیں بھی سارہ پر حملہ ضرور کریں گے۔“ حچال نے کہا تو تانی گہری سنجیدگی سے بولی۔

”اس سے پہلے ہم پر ہوگا۔“

”تو پھر ہمیں اپنا بندوبست کر لینا چاہئے۔“ حچال نے کہا تو تانی نے آنکھوں سے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اسی وقت وہ دونوں چلتے ہوئے گیٹ تک گئے اور وہاں کی سیکورٹی کو اپنے حساب سے جانچنے لگے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ تانی اور حچال بنگلے کی چھت پر تھے۔ چاند مغرب میں ڈوب چکا تھا، لیکن آبادی میں موجود لائٹنگ کے باعث دھیمی دھیمی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں چوکے تھے۔

☆.....☆.....☆

ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں اور افضل رندھاوا دونوں ایک جیب میں وہاں پہنچے تھے، جہاں سے چوہدری شاہنواز کا ڈیرہ کچھ دور تھا۔ لیکن وہاں پر روشن بجلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چاند مغرب میں ڈوب چکا تھا۔ میں اگرچہ ایک بار وہاں سے ہو کر آیا تھا لیکن مجھے پوری طرح اس ڈیرے کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ اندر سے کیسا ہے۔ میں نے چھانکے کو نورنگری میں رہنے دیا تھا کہ کسی بھی ہنگامی صورت میں وہ سوئی اور اماں کا خیال رکھے۔ افضل رندھاوا کے لوگ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔

ہم دونوں جیب روک کر اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ چند لمحوں بعد ایک لمبے قد والا نوجوان ہمارے قریب آیا اور آتے ہی بولا۔

”سردہ دونوں موجود ہیں، یہ کنفرم ہے، لیکن کہاں ہیں، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔“

”وہ ہیں تو ہیں ڈیرے پر نا؟“ میں نے پوچھا تو دھیمے لہجے میں بولا۔

”یہ کنفرم ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے لوگوں کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کہاں پر ہیں اور کس طرح ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں پورا پلان ترتیب دے لیا گیا۔ ہم نے جیب وہیں چھوڑی اور پیدل ہی ڈیرے کی جانب چل پڑے۔ وہ ڈیرے کی بائیں طرف والی مٹی سے بنی ہوئی دیوار تھی۔ اس کی اونچائی تقریباً بارہ فٹ تو رہی ہوگی۔ میں نے اپنے

ہتھیار سنبھالے اور دیواروں میں کیل ٹھونک کر چڑھنے لگا۔ رندھاوا ابھی میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ چند منٹ بعد ہم دیوار پر چڑھ چکے تھے۔ اندر مچن میں ٹیوب لائٹ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے گیٹ کے پاس مجھے کوئی بندہ دکھائی نہیں دیا۔ ممکن ہے گیٹ کے پاس جو کمرہ بنا ہوا تھا، اس میں کچھ لوگ موجود ہوں۔ رندھاوا کو اشارہ کر کے میں اندر کی طرف اتر گیا۔ وہ میرے کور پر تھا۔ کسی بھی حملے سے پہلے مجھے فرار کا راستہ بنانا تھا۔

میں تیزی سے گیٹ کے پاس کمرے کے باہر پہنچ گیا۔ اندر روشنی تھی۔ میں نے پورے دھیان سے اندر سے کسی کی موجودگی کا احساس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی ہے۔ میں نے گیٹ پر دیکھا، وہاں ایک بڑا تالا لگا ہوا تھا۔ میں اچانک ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک بندہ چار پائی پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ایک دم سے اٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی گن اٹھاتا، میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن اس کے سر پر ماری تھی، جس کے باعث وہ اٹھ ہی نہیں سکا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں اسے وہیں پڑا رہنے دیا اور تیزی سے چابیاں اٹھائیں، جو اس کے سر ہانے پڑی ہوئی تھیں۔ میں محتاط انداز میں باہر نکلا، ارد گرد کسی کو بھی نہ پا کر میں نے گیٹ پر لگے تالے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی تالا کھل گیا۔ اب یہ رندھاوا کا کام تھا کہ وہ اپنی فورس لے کر کیسے اندر داخل ہوتا ہے۔

میں واپس کمرے میں آیا اور اسی چوکیدار کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ذرا سی کوشش پر وہ ہوش میں آ گیا۔ وہ میری طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“

”میں جو کوئی بھی ہوں اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہے، تم صرف اتنا بتاؤ، وہ دو غیر ملکی کہاں ہیں اور کس کمرے میں ہیں۔“ میں نے آہستگی پوچھا تو اس کی آنکھوں میں خوف مزید گہرا ہو گیا۔

”یہاں کوئی غیر ملکی نہیں ہیں۔“ اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا تو میں نے اسے فوراً ہی گردن سے پکڑ کر کہا۔ ”ہم ایسے ہی انہیں یہاں لینے نہیں آگئے ہیں، ہمیں پتہ ہے وہ یہیں ہیں۔ تم نہیں بتاؤ گے تو ہمیں ذرا دیر لگ جائے گی انہیں تلاش کرنے میں، مگر تم جان سے جا سکتے ہو۔ بولو۔“ میں نے سرد سے لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ ایسے میں دونوں جوان اس کمرے میں آگئے تو وہ انہیں دیکھ کر بالکل ہی سہم گیا۔ سچی وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اندر والا گیٹ پارکر کے دائیں ہاتھ والے دوسرے کمرے میں ہیں وہ۔ اگر آپ زیادہ شور نہیں کریں گے تو انہیں لے جا سکتے ہیں۔ وہ اس وقت نشے میں دھت ہیں۔“ وہ فر فر بولنے لگا تھا۔

”دیکھو اگر تمہاری یہ معلومات درست ہوئیں تو تجھے کچھ نہیں ہوگا، اگر غلط ہوئیں تو.....“ میں نے کہنا چاہا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

”سو فیصد درست ہیں جی۔“

”اسے لے جاؤ اور اپنی حفاظت میں رکھو۔“ میں نے کہا اور باہر آ گیا۔ چند لمحوں پر نوجوان پوزیشن لے چکے تھے۔ بلاشبہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ میرے پیچھے دوڑ کے تھے۔ میں بلا جھجک اندر والے گیٹ پر پہنچ گیا۔ فضا میں سکوت طاری تھا۔

خاموشی گہری تھی۔ جیسے گردوں اور زور کہیں مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے محتاط انداز میں چند میز حیاں چڑھیں اور انہیں پارکر کے کچھ قدم چلتا ہوا اندرونی عمارت کے گیٹ پر جا پہنچا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اندر کی گن مکن لینے کی کوشش کی۔ سوائے سنائے کے مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ میں نے گیٹ کو ذرا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

اگرچہ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ ڈیرہ تھا، کوئی بھی کسی وقت بھی اندر باہر آ جا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت

گیٹ کھلے ہونے پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو راہداری میں چھوٹے بلب کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کمرے تھے۔ جہاں میں ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ مجھے باہر سے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ دو نوں غیر ملکی اندر والا گیٹ پارکر کے دائیں طرف والے دوسرے کمرے میں ہیں۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ دونوں لڑکے میرے کور پر گیٹ کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں بتائے گئے کمرے کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا، دروازہ لاک تھا۔

اس وقت میں نے اپنا ہسٹل دائیں سے بائیں ہاتھ میں کیا اور دائیں ہاتھ سے جب میں پڑی ماسٹر چابی نکال رہا تھا کہ دروازہ اچانک کھل گیا اور اگلے ہی لمحے میرے ماتھے پر ہسٹل کی سردنال آن لگی۔ بلاشبہ اسے میری آمد کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ میری تمام تر احتیاط اور پلاننگ ضائع ہو گئی تھی۔ انہیں کیسے پتہ چلا؟ اس سوال پر سوچنے کی بجائے میں اپنے سامنے کھڑے اس ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھ رہا تھا جو انتہائی طنزیہ انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ میری تمام تر توجہ اس کی طرف تھی۔ میں اس کے پیچھے نہیں دیکھ سکا کہ اندر کون کون ہیں۔ اس نے انتہائی حقارت سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”ابھی تم کچے دکھاری ہو، اتنے پختہ نہیں ہوئے کہ شیر کی کچھار میں داخل ہو کر اس کا شکار کرو۔ اپنا ہسٹل مجھے دو۔“ آخری لفظ اس نے بڑے تحکمانہ انداز میں کہے تو میں جواب دینے کی بجائے اچانک جھکا، اسی دوران میں نے اپنے گھٹنا اٹھا کر اس کی ٹانگوں کے درمیان پوری قوت سے مارا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کے ہسٹل سے فائر ہو گیا۔ وہ دہرا ہو چکا تھا۔ میں نے لمحے کے لمحے جیسے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے گردن پر زور سے ہاتھ مارا۔ وہ دروازے کے درمیان فرش پر گر پڑا۔ میں نے پوری قوت سے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تو اس کے منہ سے عجیب قسم کی آواز نکلی۔ تبھی میں نے سامنے دیکھا۔ بیڈ پر بیٹھی ہوئی ایک حسینہ میری جانب ہسٹل تانے ہوئے تھی۔ اور اس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان بے بسی سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ افسوس کر رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار کیوں نہیں ہے۔ وہ حسینہ کوئی فائر اس لئے نہیں کر پارہی تھی کہ میری پشت پر سے وہی دولٹ کے بھی اپنی گنوں کے ساتھ اس پر نشانہ لئے کھڑے تھے۔ میں اس ادھیڑ عمر کے شخص پر پاؤں رکھ کر کمرے میں لا گیا۔ وہ دونوں حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں اس حسینہ کے پاس گیا اور اس کے ہسٹل پر ہاتھ ڈال دیا، جو اس نے آرام سے چھوڑ دیا۔ ہسٹل ہاتھ سے بیڈ پر گرنے کے دوران اس کے چشم زدن میں قلابازی کھائی اور اس طرح میرے گلے آگئی کی پلٹ کر فرش پر جا پڑا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے تارے نظر آ گئے۔ میری گڈی پر چوٹ لگی تھی۔ میں سنبھل ہی رہا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہسٹل پر ڈال دیا۔ میں اس کی ہمت کی داد دینے بنا نہ رہ سکا۔ وہ مجھ سے ہسٹل چھین چکی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے وہ ہسٹل تان کر بولی۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ آجائیں گے۔ بولو کون ہو تم؟“ اس لڑکی کے لہجے میں حکم کے ساتھ حقارت بھی تھی۔ تبھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا

”تم میرے ہاتھ ہی نہیں آئی ہو بلکہ میرے سینے سے بھی لگی بیٹھی ہو۔ اور کتنا قریب آؤں میں تمہارے۔“

”بکواس بند کرو اور بتاؤ، ورنہ گولی مار دوں گی۔“ وہ چیختے ہوئے بولی

”تمہارا چاہنے والا ڈارلنگ۔“ میں پھر سے طنزیہ لہجے میں کہا تو بھنا گئی اس نے میری گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا

”تم ایسے نہیں مانو گے، اپنے لوگوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔“

”وہ تو ہتھیار نہیں پھینکیں گے، تم چاہو تو کوشش کر لو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے میری بات سن کر یوں

میری طرف دیکھا جیسے وہ کوئی اور ہی فیصلہ کر چکی ہو۔ تبھی اس نے مڑ کر اس نوجوان سے انتہائی غصے میں کہا

”او بے غیرت، آگے بڑھ اور اسے باندھ، میں دیکھتی ہوں کہ یہ کیسے فائر کرتے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ نوجوان آگے بڑھتا، وہ ادھیڑ عمر شخص اچانک اٹھا اور دائیں جانب کھڑے لڑکے سے گن چھین لینے کی کوشش کی۔ ممکن ہے اس کی یہ کوشش کامیاب ہو جاتی اگر بائیں جانب والا لڑکا الارٹ نہ ہوتا۔ اس نے گن اس کے سر پر ماری تو وہ پھر سے فرش پر جا پڑا۔ اس دوران لڑکی کی توجہ اس طرف ہوئی، جس کا میں نے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے زور سے اوپر اچھالا اور پوری قوت سے کہنی اس کے سینے پر ماری۔ وہ دہری ہوئی چلی گئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اس نوجوان نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لئے، جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر چکا ہے۔ دونوں لڑکوں نے انہیں باندھنے کی بجائے باہر کی جانب مخصوص آواز دی۔ اگلے چند لمحوں میں باہر سے کئی سارے لوگ آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ان سب کو باندھ لیا۔

لڑکی کی آنکھوں میں انتہائی نفرت تھی۔ وہ بندھی ہوئی عجیب سی لگ رہی تھی۔ پہلی بار میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ تھیکہ نقوش والی، چھریے بدن والی تھی۔ اس کے گیسو کافی لمبے اور گھنے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں بہت گہری تھیں۔

”چلو اب نکلو۔“ رندھاوا بولا، جونہی انے کب وہاں آ گیا تھا۔ تبھی میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ انہیں ہماری آمد سے پہلے خبر کیسے ہو گئی؟“

”انہیں پہلے پتہ تھا؟“ وہ حیرت سے یوں بولا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے اس کی

طرف دیکھا اور کہا

”ہاں، مجھے یقین ہے کہ یہاں کیمرے لگے ہیں اور وہ بھی بہت جدید۔“

”تم سوچ بھی نہیں سکتے، یہاں پر کیا کچھ ہے۔ پھر بھی میں تمہاری ہمت کی داد دیتی ہوں کہ تم نے ہمیں باندھ لیا۔ خیر، کب تک..... بس تم یہ جان لو کہ یہ تمہاری حرکت تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔“ اس لڑکی نے حقارت سے کہا تو مجھے اس کا لہجہ انتہائی برا لگا، اس سے پہلے کہ میں اس کا منہ توڑ دیتا، رندھاوا نے جوش سے کہا

”اوتے، اگر کیمروں والی بات ہے تو بس پھر جلدی نکل، انہیں لے جا، باقی میں دیکھتا ہوں، اب یہ ڈیرہ ہمارے قبضے میں ہے۔ تم نکلو، اس کی باتوں میں نہ آؤ۔“

رندھاوا نے بہت معقول بات کی تھی، اس لئے میں نے وہاں کی تلاشی لینے کی بجائے، انہیں اٹھانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

باہر وہ دھیمی روشنی تھی۔ ان تینوں کو اندرونی کمروں سے باہر تک لانے میں چند منٹ لگے۔ چونکہ ایک دوسری گاڑی میں پڑا تھا۔ اسی وقت ہماری گاڑی آگئی تھی۔ انہیں اس میں پھینکا اور ہم ڈیرے سے نکلتے چلے گئے۔ باقی سب نجانے کس طرف نکل گئے تھے۔ تقریباً گھنٹے بھر بعد میں انہیں لے کر اپنے ڈیرے پر تھا۔ چھاکا وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔

وہ تینوں فرش پر بندھے ہوئے پڑے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ تینوں ہوش میں تھے۔ میں نے

اُس ادھیڑ عمر شخص کو بالوں سے پکڑا اور سرد سے لہجے میں پوچھا

”بتاؤ، کیا نام ہے تمہارا اور کہاں سے آئے ہو؟“

”میں نام اجمل ہے اور میں لاہور کے قریب رہتا ہوں۔ وہاں سے آیا ہوں۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا تو

میں نے اسے جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا

”اصل نام اور جگہ بتاؤ، یہ جان لو کہ اگر تم نہیں بتاؤ گے تو تمہارا ہر ریشہ بتائے گا۔“

قلمذرات
”تو ہریشے سے پوچھ لیتا۔“ اس نے لا پرواہانہ انداز میں کہا تو مجھے چپ چڑھ گئی، میں نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا
”چلو، پھر ایسے ہی سہی۔“ یہ کہہ کر میں اٹھ گیا۔ اور قریب کھڑے لڑکے سے کہا، ”اس کے کپڑے اتارو، اور دیکھو یہ مسلمان ہے یا نہیں؟“
”تمہیں کوئی شدید غلط فہمی ہوگئی ہے مسٹر، ہم یہاں اپنے سرکاری کام سے موجود ہیں۔ چاہے تو چوہدری شاہنواز کو بلا کر پوچھ لو۔ بعد میں بت چھٹاتا، میں تم سے.....“
اس کے لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ وہ لڑکا اس کے کپڑے اتارنے لگا تھا۔ وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے باہر سے دو مزید لڑکے آ گئے۔ چند منٹ بعد اس کے کپڑے اتار دیئے گئے۔ وہ مسلمان نہیں تھا۔
”دیکھو، میں تم پر تشدد نہیں کرنا چاہتا، اپنے بارے میں اصل بات بتا دو گے تو ممکن ہے تمہارے بارے میں اچھا سوچ لوں۔“

”تم لوگ کون ہو؟“ اس نے ڈھیلے سے لہجے میں پوچھا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا
”ہمیں برنس میں کہہ لو، ہر طرح کا کاروبار کرتے ہیں، جیسے جنگل سے کوئی جانور پکڑ لیا، اور اسے ایسے شخص کو بیچ دیا جو اس جانور کو پسند کرتا ہو، جیسے تم لوگ۔ ہم انہیں دے دیں گے، جنہیں تمہاری ضرورت ہے۔ وہ تم لوگوں کو بیچیں، یا رکھ لیں یا مار دیں، یا پھر انہیں ہی واپس کر دیں جس نے تم لوگوں کو پالا ہے۔ ہمیں تو نوٹوں سے غرض ہے پیارے، مطلب تم سمجھ ہی گئے ہو گے، اغوا برائے تادان۔“

”میں تمہیں نوٹ دیتا ہوں، تم ہمیں چھوڑ دو۔“ اس نے تیزی سے کہا
”کیسے دو گے، تم تو ہمارے پاس ہو اور تمہارے تن پر کوئی کپڑا نہیں ہے، جس میں کوئی پیسا پڑا ہو۔“ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا

”دیکھو! چوہدری شاہنواز کو پیغام دے دو، تمہیں تمہاری مطلوبہ رقم مل جائے گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا
”میں اپنی مطلوبہ رقم کا اندازہ کیسے لگاؤں گا۔ یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ جو تعارف تم نے کرایا ہے وہ غلط ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو، اپنا آپ چھپا رہے ہو۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم کون ہو، کیا کرتے ہو، خیر نہ بتاؤ، میں اس لڑکی پر لڑائی کر کے دیکھ لیتا ہوں۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ لڑکی نے پوچھا
”میں تو نوٹ چاہتا ہوں، نوٹ.....“ میں نے کسی لالچی بندے کی طرح کہا تو وہ بولا
”کہا تو ہے کہ چوہدری شاہنواز سے رابطہ.....“

”نہیں ہمارا طریقہ کار کچھ الگ سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم تینوں میں سے ایک بندے کو چھوڑ دیا جائے گا۔ وہی ہمارا پیغام دے گا اور تم پہنچائے گا، جہاں ہم کہیں گے۔ ہم فون وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتے کہ وہ ٹریس ہو جاتا ہے۔ خیر، تم لوگوں کی قیمت کا اندازہ لگانا ہے، اپنے بارے بتاتے ہو یا کروں اس حسینہ سے بات۔“
یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چپکے گالوں پر کسی شہدے کی مانند ہاتھ پھیرا تو اس نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”میں نے کہا تھا کہ چوہدری.....“ اس نے کہا تو میں نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا اور سخت لہجے میں کہا

قلمذرات
”لگتا ہے تم ایسے نہیں مانو گے۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کے سینے پر کراس کا نشان بنادیا۔ نوک اتنی گہری نہیں رکھی تھی۔ لیکن پھر بھی خون تیزی سے نکلنے لگا تھا۔ وہ ایک دم سے بلبلاتے ہوئے چیخ اٹھا۔ کمرہ اس کی دھاڑوں سے گونج گیا۔ میں نے قریب رکھا ہوا نمک اٹھایا اور اس کے زخموں میں بھرتے ہوئے کہا، ”سنا ہے یہ تمہارے ملک میں بہت مہنگا ہے اور ہم اسے کھانے کی بجائے یوں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اب بھی یولو گے یا.....“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی ران کی طرف اشارہ کیا۔

”میں اجمل ہوں۔ اجمل مسیح، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں کسی دوسرے ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔“ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی ران پر زخم بنادیا اور کہا
”تم سوچو، میں اس حسینہ سے پوچھتا ہوں۔“ میں یہ کہہ کر اس کی طرف لپکا تو وہ تیزی سے بولی
”اتنے مرد ہو تو مجھے کھول کر.....“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے اور میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔
”میں نہیں چاہتا کہ میرے نوٹ کم ہو جائیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ تجھے ذمہ رکھوں۔“
یہ کہتے ہوئے میں نے لڑکوں کی جانب دیکھا اور اس نوجوان کے بھی کپڑے اتارنے کا اشارہ کیا۔ جمی وہ لڑکا تیزی سے بولا

”میں مسلمان ہوں اور یہ دونوں، انڈین ہندو ہیں۔ میں..... فرحان ہوں، میں تمہیں ساری بات بتا دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، تم بتاؤ، اگر تمہاری بات کی تصدیق ہوگئی تو.....“ میں نے جان بوجھ کر فخر و ادھور اچھوڑ دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور کہنے لگا۔

”میں لاہور میں رہتا ہوں، علامہ اقبال ٹاؤن میں۔ یہ مجھے وہیں ملی۔ پہلی بار میں نے اسے مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ پھر ہم میں بس تعلق ہو گیا۔ پھر یہ اچانک غائب ہوگئی۔ تقریباً ایک سال بعد مجھے ملی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ مجھ سے کیا کام لیتی رہی ہے۔ اب جبکہ میں پولیس کی نظروں میں مشکوک ہو گیا تو اس نے مجھے یہاں بلا لیا۔ یہاں آ کر مجھے پتہ چلا کہ یہ مشکوک لوگ ہیں اور ان کا تعلق بھارت سے ہے۔“

”اگر تمہارے بارے میں لاہور سے پتہ کیا جائے تو.....“ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ چھاکے نے رندھاوا کے آجانے کی خبر دی۔ میں دیر اس لئے کر رہا تھا کہ رندھاوا انہیں آکر لے جائے۔ یہ اس کا سر درد تھا کہ وہ کون ہیں۔ یہ اس نے ثابت کرنا تھا۔ میں نے تو محض اس کی مدد کی تھی۔ لیکن میں کسی نہ کسی طرح شاہنواز کو اپنے سامنے کھولنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج نہیں تو کل، ان کے بارے میں اسے پتہ چل جاتا ہے کہ میں نے اغوا کیا ہے۔ میری دشمنی تو بن جانی تھی۔ لیکن کم از کم اسے یہ تو معلوم ہونا کہ وہ بھی غیر ملکی ایجنٹ ہے۔ اس لئے میں باہر چلا گیا۔ رندھاوا باہر لڑکوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”چوہدری شاہنواز پاگل ہو رہا ہے۔ اس کے بندے تمہارے بیٹھے ہیں تاکہ یہ آئیں اور انہیں لے جائیں۔ مگر میں انہیں اب ان کے ہاتھ میں نہیں دینے والا۔“ وہ تیزی سے بولا

”تو انہیں لے جا رندھاوا، مگر شاہنواز کو کب پکڑتا ہے، وہ میرے لئے درد سبن جائے گا۔“ میں نے کہا تو بولا
”اس پر میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ خفیہ والے ہی ڈالیں گے ہاتھ اس پر۔“
”لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ ابھی تمہے چڑھ جائے، اور وہ تیرے خفیہ والے اسے ابھی لے جائیں۔“ میں نے

”بات کراؤ“ اس نے کہا تو میں نے فون اس لڑکی کو دے دیا۔ اس نے فون کان سے لگاتے ہی کہا۔ ”شاہنواز جی، انہیں ان کی مطلوبہ رقم دے دیں۔ وہ آپ کو مل جائے گی۔“ پھر دوسری طرف سے نجانے کیا سنتی رہی، لیکن میں بات مکمل نہیں ہونے دی اور فون لے کر کہا

”اب کیا خیال ہے؟“

”جتنی چاہو اور جہاں چاہو، میں رقم تجھے ابھی دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن میرے بندوں کو کوئی نقصان نہیں ہونا چاہئے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا

”نہیں ہوگا اگر تم نے وعدہ خلافی نہ کی تو۔“ میں نے کہا

”نہیں وعدہ خلافی نہیں ہوگی۔ رقم ہوا۔“ اس نے کہا تو میں بولا

”تین کروڑ۔“ میں نے اس سے رقم مانگ لی تو اس نے لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور بولا

”ڈن ہو گیا۔“

اس نے رقم دینے کا وعدہ کر لیا۔ میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ رقم کیسے لینی ہے، اور بندے کیسے دینے ہیں۔ وہ مان گیا۔ میں اور رندھاوا ہا ہر آ گئے۔

”چوہا، مل سے باہر آ رہا ہے، میں ساری صورت حال بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر رندھاوا تے فون پر بات کی۔ ہم وہیں کھڑے تھے۔ شاید وہ لوگ قریب ہی تھے۔ کچھ ہی دیر بعد چند فوجی جو اس وقت عام شلواری قمیض میں تھے، تیزی سے اندر آئے اور کمرے کی جانب بڑھے۔ انہوں نے زیادہ وقت نہیں لیا، ان تینوں کو اٹھا کر لے گئے۔ ایک میجر ریک گے آفسر کے سامنے یہ کاروائی ہوتی رہی۔ ٹرک ان تینوں کو لے کر چلا گیا تو وہ آفسر میرے پاس آیا اور ہاتھ ملا کر بولا

”مسٹر جمال۔ آپ نے بہر حال ایک اچھا کام کیا ہے۔ اور یہ بھی کہ شاہنواز اب سامنے آئے گا۔“

”اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اس شاہنواز کو پکڑتا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ مضبوط لہجے میں

تیزی سے بولا

”نہیں، اب ہم اسے پکڑ لیں گے۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کانڈھے اچکا کر کہا تو اسی انداز میں بولا

”میں مانتا ہوں کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں نے انہیں ٹریس تو کر لیا تھا لیکن تلاش نہیں کر پائے۔ یہ ایک امر تھ تھا اور وہ لڑکی، مالٹی دیوی تھی۔ یہ دونوں تقریباً چھ سال سے اسی علاقے میں کام کر رہے تھے۔ وہ لڑکا فرحان اس لڑکی کے جال میں پھنس گیا تھا۔ یہ اس لڑکے سے مختلف کام لیتی تھی۔ اسے اپنی محبت وغیرہ کا چکر دیا ہوا تھا۔ جوان کا طریقہ ہوتا ہے، آپ کو معلوم ہی ہوگا۔“

”چلیں اب تو میدان صاف ہو گیا، لیکن مجھے نہیں لگتا، ان کے اثرات تو یہاں ہوں گے؟“ میں نے کہا تو وہ بولا

”ظاہر ہے ان کے اثرات ابھی یہاں ہوں گے۔ اور ممکن ہیں ہوں بھی۔ شاہنواز کے پاس یہ چھپے ہوئے تھے

، اسے ابھی پکڑنا ہے، آپ محتاط رہنا، وہ ہاتھ آ گیا تو پھر میدان صاف ہوگا۔ میں آج کل میں آپ کے ساتھ دوبارہ ملتا ہوں۔ آپ نے پلان کر لیا، شکریہ۔“

”اگر وہ ابھی ہاتھ نہ آیا تو؟“ میں نے پوچھا

”ہمارے پاس دوسرے راستے بھی ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”یہ تو پھر بات کرنا پڑے گی۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں نے اسے انفرادی بات بتا کر کہا

”ایک کوشش کر لیتے ہیں تو ان لوگوں سے بات کرو، ممکن ہے ابھی وہ نہیں تو اس کا کچھ نہ کچھ ثبوت ملے یار۔“

”چل، جیسے تو چاہے۔ کوشش کر لے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا اور میرے ساتھ اندر چل دیا۔

وہ تینوں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رندھاوا اندر جا کر انہیں دیکھتے ہوئے بولا

”اب ان کا کیا کرنا ہے؟ بات کر لی ان کی؟“

”نوٹوں کا معاملہ ملے ہو گیا ہے نا، اس کے بعد جو ہو، ہمیں کیا۔“ میں نے کہا تو وہ سمجھ گیا اس لئے جوش سے خوش ہوتے ہوئے بولا

”اصل میں ان کی رقم بڑی بگڑی مل رہی ہے۔ یہ بڑے اہم لوگ ہیں۔ بھارت کی تنظیم را کے ایجنٹ ہیں۔ یہ فرحان تو پاکستانی ہے، اور اس لڑکی کے ہاتھوں استعمال ہوا ہے۔ اس کا باپ اتنی زیادہ رقم نہیں دے رہا ہے۔ اسے شاید چھوڑنا پڑے۔“

”اور ان لوگوں کے بارے تو ہم ان کی حکومت سے بات نہیں کر سکتے، انہیں تو مارتا ہی پڑے گا۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ جلدی سے بولا

”ارے نہیں، میں نے ان کے پکڑنے سے پہلے ہی سارے آپشن دیکھے تھے، ان کی حکومت سے نہ سکی، ان کے مخالفین تو ہیں۔“

”چلو پھر ڈن کرو اور انہیں یہاں سے غائب کرو۔“ میں نے اطمینان سے کہا

”دیکھو اگر تم لوگوں کو دولت ہی چاہئے تو میں دے سکتا ہوں۔“ اس نے کہا جس نے اپنا نام اجمل مسیح بتایا تھا۔

”کیسے..... کیسے دے پاؤ گے تم؟“ رندھاوا نے پوچھا

”صرف ایک بار چوہدری شاہنواز سے بات کر لیں، میں گارنٹی دیتا ہوں کہ وہ منہ مانگی رقم دے دے گا۔ آپ لوگ بات تو کرو۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا تو میں بولا

”تم نے اپنے بارے میں درست نہیں بتایا تو میں یہ بات کیسے مان لوں۔ تمہارا یا شاہنواز کا کیا اعتبار۔“

”اب جاننے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ ان کے نوٹ مل رہے ہیں۔ میں ابھی انہیں لے جاتا ہوں۔“ رندھاوا نے کہا

”دیکھو، ایک بار میری بات کراؤ۔“ لڑکی نے کہا تو میں نے ایک دم سے کہا

”چلو، تیری بات مانتے ہیں۔ کرتے ہیں فون۔“ میرے یوں کہنے پر ان کے چہروں پر ایک دم سے رونق آ گئی۔ مجھے ایسی بات کرنے کا تجربہ تھا۔ میں نے اس کا نمبر پوچھا اور باہر آ کر روپی میں فون ملا کر انہیں نمبر دے دیا۔ چند منٹوں کے بعد رابطہ ہو گیا۔ میں نے اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا

”تیرے ذمے سے جو لوگ اغوا ہوئے ہیں وہ میرے پاس ہیں۔“

”تو جو کوئی بھی ہے۔ وہ لوگ زندہ رہیں یا مر جائیں۔ لیکن تو زندہ نہیں رہے گا، میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا، تجھے پتہ نہیں تو.....“

”بکواس کرتا رہے گا یا اپنے ان رشتے داروں سے بات بھی کرے گا، جو تیرے ساتھ بات کرنے کو بے تاب ہیں۔“

”میجر، جیسے یہ آپ کا وطن ہے، ویسا ہی میرا بھی ہے۔ مجھے اپنے وطن کے لئے کام کر کے خوشی ہوگی۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔

”اویار جمال تیری مہربانی، لیکن بہت خیال رکھنا، شاہنواز کی کہانی ختم سمجھو۔“ رندھاوا نے کہا، ہاتھ ملایا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اس وقت دن نکلنے کو تھا، جب ہر طرف ایسی خاموشی چھا گئی، جو طوفان آنے سے پہلے کی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

جسپال چھت پر ٹپکتے ہوئے تھک گیا۔ ان دونوں نے ساری رات مختلف پہلوؤں سے پلان کیا تھا۔ اگر دشمن یوں آیا تو ہم ایسے کریں گے۔ وہ باتیں کر کے تھک گئے تو خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور تانی کے پاس بڑی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ تبھی تانی نے ریٹ واچ دیکھتے ہوئے نیند سے بوجھل بھاری آواز میں کہا

”لگتا ہے یہ رات سکون سے گزر جائے گی۔“

”اچھا ہے سکون سے گزر جائے۔ سارے چارے چاری نجانے کب سے سکون کی نیند نہیں سوئی، آج وہ بھی سکون ہی سے سو رہی ہے۔“ جسپال نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو تانی ہنستے ہوئے بولی

”اس نے تمہیں نیند میں جا کر بتایا کہ اب میں سکون سے سو رہی ہوں۔“

”نہیں، ابھی کچھ دیر پہلے میری شاہد سے بات ہوئی ہے، وہ جاگ رہا ہے۔ انہوں کو بچانے اور ان کی حفاظت کا خوف انسان کو بے چین رکھتا ہے۔ نکتے دنوں بعد اسے اپنا بیٹا دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ باپ ملا ہے۔ کبھی کبھی آسودگی بھی انسان کو بے چین کر دیتی ہے۔“ جسپال نے حسرت آمیز لہجے میں کہا تو تانی اٹھتے ہوئے بولی

”جسپال تم یہ موٹی موٹی باتیں کب سے کرنے لگے ہو۔ رو ہی میں تم ایسے نہیں تھے، بڑے لالباہلی اور غیر سنجیدہ قسم کے بندے تھے نا۔“

”وقت وقت کی بات ہے پیاری۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بھی مسکرا کر اٹھ گیا۔ دونوں پھر سے ٹپکتے لگے۔ اچانک تانی کی نگاہ اندھیرے میں ان کاروں پر جم گئی، جو ان کے بنگلے سے ذرا فاصلے پر ایک دم سے رک گئیں تھیں۔ ان میں سے کافی سارے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ اس نے جسپال کی جانب دیکھا وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

” فوراً شاہد کو فون کر کے بتادو، میں سیکورٹی والوں کو الارٹ کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا فون نکالا اور نمبر پش کر دیئے۔ شاہد سمجھتا تھا کہ ایسے وقت میں اسے کیا کرنا ہے۔

وہ چار کاریں تھیں، جن میں سے لگ بھگ چدرہ سولہ آدمی نکل آئے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ بنگلے کو گھیرنا شروع کر دیا۔ جسپال ان کے طریقے کو سمجھ گیا تھا۔ تانی نے شاہد کو بتا دیا تھا سیکورٹی والے الارٹ ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ بنگلے کے پیچھے آ گئے تھے۔ لگ رہا تھا کہ ایک دم سے چاروں طرف سے حملہ کریں گے۔ یہ بہت خطرناک صورت حال تھی۔ وہ دوطرف سے تو مقابلہ کر سکتے تھے، چاروں طرف سے نہیں۔ ان میں سے اگر چند بندے بھی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تو شاہد ان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا اور سکون سے سوئی ہوئی سارہ کے ساتھ نجانے کیا ہو؟ یہی سوچتے ہوئے جسپال ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ اس کے بدن میں سنسنی پھیل گئی تھی۔

باہر سے آئے ہوئے حملہ آور انہیں ہار پہنانے نہیں آئے تھے، جو بھی ان کے راستے میں آتا اسے جان سے مار دینا ہی ان کا مقصد تھا۔ تانی بھاگ کر بنگلے کے چھوڑے دیکھ رہی تھی۔ وہ لوگ تیزی سے پھیل کر باہر کھڑے تھے۔ تانی بے آواز قدموں سے بھاگتی ہوئی واپس آئی اور صورت حال بتا کر بولی

”سیکورٹی والے محض چار لوگ ہیں یا پانچ اور وہ بھی گیٹ پر..... اب کیا کیا جائے۔“

”ان کی جان لے لیں گے یا اپنی جان دے دیں گے، بس اتنا ہی ہوگا۔ تم گولیاں ضائع مت کرنا سمجھ لینا جمال تمہارا امتحان لے رہا ہے، جو اس نے سکھایا ہے اسے ضائع مت کر دینا تانی۔“ جسپال کے لہجے میں درندگی عود آئی تھی۔ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ دائیں جانب والی دیوار سے ایک شخص کود کر اندر آ گیا۔ جسپال نے اپنی گن سیدھی کی اور فائر داغ دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور باہر پھیل چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تیز فائرنگ سے ماحول گونج اٹھا۔

ہر طرف سے گولیاں برسنا شروع ہو گئیں تھیں۔ جسپال اور تانی چھوٹی دیوار کی آڑ میں نشانہ لگاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ کچھ ہی منٹوں میں کافی سارے لوگ گر چکے تھے۔ ماحول پر ایک دم سے سکوت طاری ہو گیا۔ اسی دوران جسپال کا فون بج اٹھا۔ وہ کوئی اجنبی کال تھی۔ جسپال نے فون رسیو کر لیا تو دوسری طرف سے تیزی میں کہا گیا۔

”جسپال گھبرا نا نہیں، ہم تمہاری مدد کو پہنچ رہے ہیں۔ ہم سے پہلے کچھ لوگ آئیں گے، وہ باہر موجود لوگوں کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔ بس چند منٹ انہیں روک رکھو۔“

”تم کون ہو؟“ اس نے پوچھا

”یہ تعارف کا وقت نہیں۔ ہم انہیں سنہال لیں گے، بس چند منٹ.....“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جسپال نے فون سیٹ کو گھورا اور تانی کے پاس جا کر کال کے بارے میں بتایا۔ وہ فقط سر ہلا کر رہ گئی۔ ایسے ہی وقت میں دو کیمین گاڑیاں وہاں آئیں۔ ان میں سے تیزی کے ساتھ چند لوگ نکلے اور ایک دم سے چاروں جانب بھاگ اٹھے۔ جسپال نے ایک کونشانہ بنالیا، وہ سڑک پر گرا۔ تبھی دائیں جانب کپاؤنڈ میں ایک دقتی بم آ کر گرا، جس کے دھماکے سے کھڑکیاں تک لرز اٹھیں۔ اس کے ساتھ ہی چند لوگ دیوار پار کر کے اندر آ گئے۔ تانی نے جیسے ہی ایک کونشانہ بنایا، گولیوں کی بو چھاڑ آئی۔ اگر تانی لمحے کے بھی آدھے وقت میں نیچے نہ جھکتی تو اس کا بدن چھلنی ہو جانا تھا۔ اسی وقت بائیں جانب ایک دقتی بم اور ان گرا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ بندے اندر آ گئے۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ جو بھی فائرنگ ہو رہی ہے اوپر چھت پر سے ہی ہو رہی ہے۔ وہ انہیں اٹھنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ مسلسل چھت پر فائرنگ کر رہے تھے۔ صورت حال سنگین ہو گئی تھی۔ ایسے میں جسپال کا فون بج اٹھا۔ اس نے کال سنی تو دوسری طرف وہی بولا

”حوصلہ رکھنا، میں پہنچ گیا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ اس وقت تانی جسپال کے قریب آگئی اور اونچی آواز میں بولی

”سارہ اور شاہد کا کچھ پتہ ہے، وہاں کیا صورت حال ہے؟“

اس کے یوں کہنے پر جسپال نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا

”تم فوراً نیچے چلی جاؤ۔ وہ گھبرا کر کچھ الٹا سیدھا نہ کر لیں، جلدی جاؤ۔“

یہ سنتے ہی تانی نیچے کی طرف بھاگی۔ جسپال نے نیچے دیکھا، بنگلے کے ارد گرد کافی سارے لوگ تھے اور کچھ کپاؤنڈ میں آچکے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ بلاشبہ ان کا مقصد سارہ اور شاہد کو زندہ پکڑنا تھا، ورنہ اب تک وہ انہیں ختم کرنے کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ جیسے ہی جسپال نے یہ سوچا، اس نے تاک تاک کر کپاؤنڈ میں موجود حملہ آوروں کا نشانہ لینے لگا۔ کسی کی چیخ بلند ہوتی تو اس کے ساتھ ہی برسٹ اوپر کی جانب ماریا جاتا۔ اسی نشانہ بازی میں تھوڑا وقت گزرا تھا کہ باہر ایک دم سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ جسپال نے باہر کی طرف دیکھا، کچھ مختلف گاڑیاں سڑک پر رک رہی تھیں۔ ان میں سے کافی سارے لوگ باہر آ کر ان حملہ آوروں پر بے دریغ فائرنگ کر رہے تھے۔

اچانک ہی ماحول بدل گیا۔ ان کے پیچھے ہی پولیس کی گاڑیاں آ گئیں۔ حملہ آور بھاگنے لگے۔ جو بچے تھے، ان

کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ جہاں تیزی سے نیچے آیا۔ زخمیوں کے لئے ایسولینس آچکی تھی۔ سارہ، شاید، اس کا بیٹا مراد اور باپ ایک کمرے میں تھے اور ان کے پاس تانی موجود تھی۔ جہاں باہر کپاؤ غڑ میں آگیا تو ایک لمبا توںکا نو جوان، جس کے بال کافی لمبے اور سیاہ تھے، گھنی داڑھی، بھاری مونچھیں اور کسرتی بدن کا مالک وہ نو جوان اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے پتلے پتلے گلابی لبوں پر مسکراہٹ لا کر کہا

”تم جہاں ہوتا؟“

”ہاں اور تم؟“ اس نے پوچھا

”ابھی میں نے ہی فون کیا تھا تمہیں، بدر نام ہے میرا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو جہاں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کون ہو تم اور یہ جملہ آدروں.....“ جہاں نے پوچھنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا

”سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے، آؤ،“ یہ کہہ کر وہ جنگل کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں تین بندے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس چند لوگ گنیں لئے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر بدر نے جہاں سے کہا: ”باقی سب کو پولیس لے گئی ہے، زخمی ہسپتال میں ہوں گے اور باقی حالات میں، یہ بچے ہیں ان سے ساری بات پوچھتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اُن کے قریب چلے گئے۔ گنوں والے دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بدر نے جاتے ہی ایک بندے کی پسیلوں میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا، ”اب شروع ہو جاؤ میرے لالی، کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟“

زمنیں پڑا ہوا وہ شخص کراہ کر رہ گیا مگر زبان سے کچھ نہیں بولا، چند لمحے انتظار کے بعد جب وہ نہیں بولا تو مگن لئے ہوئے شخص نے کہا

”میں جانتا ہوں جی، یہ کون ہیں، اور کس کے بندے ہیں۔“

”کیا یہ نہیں بتاے گا؟“ بدر نے پوچھا

”اسے کچھ دیر لگے گی۔“ مگن والی شخص نے ہنستے ہوئے کہا تو بدر نے کہا

”کون ہیں یہ لوگ؟“

”یہ اصغر ذکیت کے لوگ ہیں اور مہرل شاہ کے لئے کام کرتے ہیں۔“

یہ سن کر بدر نے زمین پر پڑے ایک بندے کو اٹھا کر پوچھا،

”کیوں بھی، یہ درست کہہ رہا ہے یا غلط اطلاع دے رہا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی خاموش رہا۔

بدر چند لمحے اسے دیکھتا پھر ایک دم سے اس نے بندے کو اٹھایا، اسے فضا میں اچھالا، وہ اوپر سے جیسے ہی نیچے آیا بدر نے اپنا گھٹنا آگے کر دیا، اس کے کمر گھٹنے پر آکر لگی، کڑک کی آواز آئی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کی کرب ناک کراہ بلند ہوئی، اس کے ساتھ ہی وہ بے دم ہو کے گھوما اور زمین پر جا پڑا۔ فوری طور یہ اندازہ نہیں ہوا یا کیا وہ مر گیا یا فقط بے ہوش ہوا تھا۔ بدر نے اس کی طرف سے نگاہیں گھما کر تیسرے کی جانب دیکھا تو وہ تیزی سے بولا

”ہاں، ہم اصغر ذکیت کے لئے کام کرتے ہیں، اور اس کا سر پرست مہرل شاہ ہے۔ اب چاہو تو مجھے گولی مار دو۔“

”مجھے جانتے ہو؟“ بدر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ کر پوچھا

”نہیں، مگر ایک ہی بندہ اصغر ذکیت کا سامنا کر سکتا ہے اور وہ بدر چاٹو یو ہے۔ کیا تم وہ ہی ہو؟“ اس نے غور سے بدر کی جانب دیکھ کر پوچھا

”ہاں، جاؤ، اب بھاگ جاؤ، اصغر سے کہنا کہ اگر وہ مرد ہے تو میرا سامنا کرے، اور مہرل شاہ سے کہہ دے کہ اب اس کے دن گئے جا چکے ہیں۔ ان دونوں کی لاشیں بھی میرے پیغام کے ساتھ لے جا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پسٹل نکالا، دو فائر زمین پر پڑے بندے کو مار دیئے۔ پھر جہاں کی جانب دیکھ کر بولا، ”آؤ رانا اندر کا حال معلوم کریں۔“ وہ دونوں تیزی سے اندر گئے تو سبھی ڈرائینگ روم میں جمع ہو چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر شاہد سرسراتے ہوئے انداز میں بولا

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے ایسا بھیانک منظر دیکھنے کو ملے گا۔ اگر آپ سب ہماری مدد نہ کرتے تو اب تک ہماری لاشیں.....“ یہ کہہ کر وہ جھر جھری لے کر خاموش ہو گیا۔ اس پر بدر نے اسے غور سے دیکھا اور گویا ہوا

”یہ تو اب ہونا ہے شاہد جی، یہ اس وقت تک چلے گا، جب تک ہم نہ مر جائیں یا پھر وہ مہرل شاہ اور پر سارا م کو نہ مار دیں۔“

”یہ بہت مشکل نہیں ہو جائے گا۔“ اس نے خوف زدہ ہوتے ہوئے پوچھا

”ہے تو سہی، لیکن ناممکن نہیں ہے ان لوگوں کو مارنا۔ تھوڑی سی محنت کرنا ہوگی۔“ بدر نے کہا تو تانی بولی

”کیسے ہو گا یہ سب؟“

”دیکھو، ہم اس وقت ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔“ یہ کہہ کر بدر نے مراد اور اس کی طرف دیکھ کر کہا، ”بزرگوں، آپ اسے ساتھ لے جا کر سو جائیں، سکون سے، ہم ادھر ہیں۔“

وہ سمجھ گیا اور مراد کو لے کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ تو جہاں بولا

”اصل میں اب دو ہی راستے ہیں، اور ان میں سے ایک کو چھنا ہوگا، ایک یہ کہ ہم اپنے آپ کو دشمنوں سے بچاتے رہیں اور دوسرا دشمنوں ہی کو مار کر سکون سے زندگی گذاریں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو جہاں، لیکن سب سے بڑا ایک مسئلہ ہے، ہماری توجہ دو طرف ہوگی۔ ایک طرف ہم انہیں بچائیں گے اور دوسری طرف دشمنوں پر وار کریں گے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے، پہلے انہیں کوئی محفوظ ٹھکانہ دیا جائے، پھر.....“ جہاں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو تانی نے کہا

”بالکل۔ بدر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سوچنے والی بات یہ کہ وہ محفوظ ٹھکانہ کون سا ہو سکتا ہے؟“

”وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن پہلے شاہد سے تو پوچھ لیں۔“ بدر نے کہا

وہ تیزی سے بولا ”جو آپ مناسب سمجھیں۔“

”تو ٹھیک ہے، سوچتے ہیں کہ تم لوگوں کے لئے کیا کیا جائے۔“ جہاں نے کہا اور تانی کی طرف دیکھا، وہ سمجھ گئی کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆.....

صبح کا اُجالا پھیل گیا تھا جب میں چھا کے کے ساتھ گھر آ گیا۔ اُس نے مجھے گھر کے دروازے پر اتارا اور خود اپنے گھر کی جانب چلا گیا۔ جب تک میں فریش ہو کر اپنے کمرے میں آیا سوئی ناشتہ لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”پتہ ہے اماں کیا کہہ رہی تھی، ابھی مجھ سے۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے پوچھا تو وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی

”وہ کہہ رہی تھیں کہ اب جمال کو سکون سے رہنا چاہئے۔ ادھر ادھر کی فضول حرکتوں سے باز آ جائے اور کوئی

ڈھنگ کا کام کرے۔“

”ویسے اماں ہیں کہاں؟“ میں نے جان بوجھ کر پوچھا تو بولی

”خالہ صغراں کے گھر گئی ہیں، میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“

”اچھا یہ سب ہو جائے تو کیا ہوگا؟“ میں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی

”اپنا گھر ساؤ، اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہو، جیسا سب کرتے ہیں۔ یہ اماں کی خواہش ہے۔“

”ٹھیک ہے، سوچوں گا۔“ میں نے ہولے سے کہا تو تیز لہجے میں بولی

”ابھی سوچو گے، مطلب ابھی تک تم نے اس بارے سوچا ہی نہیں، تمہیں کچھ احساس ہے کہ نہیں؟“

”تم چائے تو بنا کر لائی نہیں ہو۔ اس کا احساس ہے تمہیں، جاؤ لے کر آؤ، پھر میں بتاتا ہوں۔“ میں نے اس کی

بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہ غصے میں اٹھ کر باہر چلی گئی۔

جب تک میں نے سکون سے ناشتہ نہیں کر لیا، جب تک وہ واپس نہیں آئی۔ پھر جب آئی تو چائے تپائی پر رکھ کر

پلٹنے لگی تو میں نے اسے کلائی سے پکڑ لیا۔ وہ رک گئی تو میں ایک ہلکا سا جھٹکا دیا، وہ کئی ہوئی شاخ کی مانند بیڑ پر آگری۔ میں

نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا

”سوئی۔! میں جانتا ہوں کہ تو کیا سوچ رہی ہے۔ اور تمہیں بھی پتہ ہے کہ ہم اس وقت کتنی بڑی دشمنی میں

گھرے ہوئے ہیں۔ ایسے وقت میں گھر سنا، اور اپنی بیوی اور گھر کی دیکھ بھال کرنا کتنا مشکل ہے۔ یہ گھر، بیوی اور بچے،

یہ کمزوری بن جاتے ہیں۔“

”میں اور کچھ نہیں چاہتی، بس تمہارا نام چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی خواہش بالکل نہیں ہے۔“ وہ ہیکے ہوئے لہجے

میں بولی تو میں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا

”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہماری دشمنی ختم ہوگئی ہے؟“

”نہیں، لیکن کب تک، یہ کب تک چلے گی۔ میں اکتا گئی ہوں۔ میں کہتی ہوں یہ سب زمین جائیداد ان کے منہ

پر مارو اور یہاں سے کسی گناہ جگہ پر جا کر رہتے ہیں۔“ وہ مجھ سے الگ ہو کر تھمتاتے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی تو میں

نے سمجھاتے ہوئے کہا

”تم کیا سمجھتی ہو، وہاں ظالم لوگ نہیں ہوں گے، یہ معاشرہ، اپنا دشمن آپ ہی بنا ہوا ہے، میں نے تم سے کہا نہیں

ہے کہ یہ دنیا ایک جنگل ہے اور اس میں فقط طاقت کی حکومت ہے۔“

”میں نہیں جانتی کسی فلسفے کو اور دنیا کو، میں بس تجھے چاہتی ہوں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی

”تو بس پھر چاہتی چلی جاؤ۔ سمجھو یہی تیرا نصیب ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ غصے میں اٹھ کر باہر چلی

گئی۔

میں ناشتہ کر چکا تو وہ باہر نیم کے درخت کے نیچے اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر اسی کے ساتھ

چارپائی پر بیٹھ گیا تو وہ سمٹ گئی۔ پھر لمحہ بھر بعد بولی

”جمال یہ جرائم کی دنیا دلدل ہے۔ تم اس میں دھنستے چلے جاؤ گے، واپسی کا کوئی راستہ نہیں ملے گا تمہیں۔ پھر

.....“

”مجھے افسوس ہوا ہے سوئی۔ تم مجھے مجرم سمجھتی ہو؟ میں تو اس راہ پر چل نکلا ہوں، جس پر میرے دشمنوں نے مجھے

ڈال ڈیا، اب تو صرف زندگی اور موت کی جنگ ہے، اور تم چاہتی ہوں کہ میں یہ جنگ ہار جاؤں۔ چلو۔! میں نہیں اٹھاتا

ہتھیار۔ پھر اگر کسی نے مجھے مار دیا یا پانچ کر دیا تو اس کی ذمہ دار تم ہوگی۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا تو تیزی سے بولی

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ یہ خود پر مسلط کی ہوئی جنگ کو تم خود ہی ختم کرو گے۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں

کہا تو میں کوئی بات کہنے بنا اٹھ گیا۔ وہ جس زندگی کی بات کر رہی تھی۔ وہ شاید اب میرے مقدر میں نہیں تھی۔

میں الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ صحن سے نکل کر باہر والے کمرے میں آؤ گیا لیکن ایک ٹیکھی سوچ میرے دماغ

میں ڈرائی تھی۔ یہ سوئی ایک دم سے اتنی خوف زدہ کیوں ہوگئی ہے؟ وہ جو میرے ساتھ زندگی اور موت کے سفر پر چل نکلی

تھی، اس نے اس قدر خوف زدہ ہو کر بات کیوں کی تھی؟ کیا واقعی ہی اماں نے اسے ایسا کہنے کو کہا تھا؟ بہت ساری سوچیں

میرے دماغ میں الجھتی چلی جا رہی تھیں۔ میں نے ان سب کو جھٹکا اور اپنا ذہن چھانکے کی طرف لگا دیا، جو ابھی تک واپس

نہیں پلٹا تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا، اس کا فون بند تھا۔ مجھے ایک دم سے تشویش ہونے لگی۔ میں نے فوری طور پر ادھر ادھر

نمبر ملانے، اس کے ان ساتھیوں سے پوچھا، جو اس کے ساتھ ہمہ وقت رہتے تھے۔ لیکن کسی کو بھی اس کے بارے میں نہیں

پتہ تھا۔ ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے کل رات کے بعد اسے نہیں دیکھا۔ میں نے ہر ایک سے یہی کہا کہ اس کا فون اپنے

کمرے میں کہ وہ کدھر چلا گیا ہے۔ مجھے ایک دم سے اس کے بارے میں تشویش ہونے لگی تھی۔ کیونکہ میں چاہ رہا تھا کہ اس کے

ساتھ باہر نکلوں اور معلوم کروں کہ رات کی کاروائی کے بارے میں کسی کو پتہ بھی ہے یا نہیں؟ لیکن چھانکے کا کہیں دور دور

تک پتہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ شاہناز کا کیا بنا؟ کچھ دیر بعد مجھے یاد آیا تو میں نے رندھاوا کو فون کیا۔

اس نے میری کال کاٹ دی۔ میں نے پھر کوشش کی تو اس کا فون مصروف جا رہا تھا۔ میرا دماغ ایک دم سے گھوم گیا۔ اب

سوائے انتظار کے میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھ سے کمرے میں نہیں بیٹھا گیا، میں اٹھا اور صحن میں سے ہو کر گلی میں

آ گیا۔ میں آہستہ قدموں سے چوک کی طرف جانے لگا تو پیر زادہ و قاص کا فون آ گیا۔

”جی پیر زادہ صاحب، کیسے یاد کر لیا؟“ میں نے اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا تو اس نے ٹھہرے

ہوئے لہجے میں کہا

”تمہارا یار چھانکے کا کدھر ہے، پتہ ہے اس کے بارے میں؟“

”نہیں، کیوں کیا ہوا اسے، وہ اپنے گھر میں ہوگا۔“ میں نے الجھتے ہوئے کہا تو وہ بولا

”اس کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ زخمی حالت میں ہسپتال پڑا ہے۔ بتانے والے نے شبہ بتایا ہے، ممکن ہے وہ

ناہو، ہسپتال میں پتہ کر لو۔“ اس نے بتایا تو میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ میں نے چوک میں پہنچنے تک اس کے ساتھیوں

کو فون کر دیا۔ کچھ دیر بعد اکبر نامی ایک نوجوان بائیک لے کر آ گیا تاکہ ہسپتال جا کر چھانکے کا پتہ کیا جائے۔ میں اس کے

ساتھ بیٹھا اور ہم قصبے کے ہسپتال کی طرف چل دیے، جو وہاں سے چند ہی کلومیٹر پر تھا۔

ہم فوراً گھر سے نکل کر ہسپتال کے آدھے راستے میں تھے۔ اکبر تیزی رفتار سے بائیک بھگائے لے جا رہا

تھا اچانک ہمارے دائیں جانب سے ایک کار تیز رفتاری سے نکلی۔ اس نے کپے میں کار اتاری تو دھول کا ایک غبار اٹھا جس

سے سامنے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ جیسے ہی دھول صاف ہوئی تو سامنے سرخ رنگ کی کار بالکل سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔

اس کے پیچھے دو سیاہ رنگ کی کبین گاڑیاں تھیں، جنہوں نے پورا راستہ روکا ہوا تھا۔ میں چونک گیا اور پوری طرح الرٹ

ہو گیا۔ اکبر کو بائیک روکنا ہی تھی۔ جیسے ہی اس نے بائیک روکی۔ اچانک ہی سامنے سے کئی سارے لوگ نکل آئے۔ ان

میں ایک لمبا تڑنگا نوجوان تھا۔ جس کے ہاتھ میں بسل تھا۔ باقی کئی لوگ گئیں تھامے ہوئے تھے۔ نوجوان نے اپنا چشمہ

اتارا، میرے قریب آ کر سردے لہجے میں بولا

”نیچے اترو۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا، اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ گھمایا اور اس کا پستل سمیت ہاتھ میری گردن پر پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں سمجھتا، اس نے دوسرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں بائیک سے نیچے گرا ہی تھا کہ اس کے ساتھ آئے کئی سارے لوگ میری جانب بڑھے۔ میں نے ایک جست لگاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا ”اکبر نکل جاؤ۔“

انہوں نے اکبر کی طرف دیکھا تک نہیں، بلکہ میری طرف بڑھ آئے۔ کیونکہ میں سڑک کی بائیں جانب کھیتوں کی طرف بھاگا تھا۔ اسی وقت میرے ارد گرد فائر ہونے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے اکبر کو نکلنے ہوئے دیکھ لیا تھا، اس لئے بے پرواہ ہو کے فصلوں کی جانب بڑھا تھا۔ مگر وہ مجھ سے بھی تیز نکلے تھے، انہوں نے فائر بند کیا اور میرے پیچھے لپکے۔ میں زیادہ دور تک نہیں جا سکا تھا کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ کئی سارے تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑتے ہی بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ میں نے جہاں تک ہو سکا مزاحمت کی۔ ایک بار میں ان کے چنگل سے نکل بھاگا تھا۔ مگر وہ سارے ہی فائر تھے۔ تقریباً دس بارہ منٹ کے بعد میں اس وقت بے بس ہو گیا، جب کسی نے میرے سر پر پستل کا دستہ مارا۔ اس وقت میں ہوش و حواس کھو بیٹھا اور مجھے پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں، اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

ایئر پورٹ روڈ پر وہ گلستان جو ہر کا علاقہ تھا۔ جس میں ایک کافی کشادہ اور نئی تعمیر شدہ کوٹھی تھی، جس میں وہ سب پہنچ گئے۔ جہاں اور تانی نے علاقہ پہلی بار دیکھا تھا، جبکہ بدر اسی علاقے میں رہتا تھا۔ ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد مراد اور اس کے دادا کو ایک کمرے میں سلا دیا گیا اور وہ پانچوں ڈرائیونگ روم میں آ بیٹھے۔ جی جہاں نے بدر سے پوچھا ”اب تو اپنا تعارف کرادو۔“

اس پر وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر بولا

”کہاں سے سنو گے؟ بچپن سے یا.....“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہنا چاہا تو تانی نے تیزی سے کہا

”نہیں، نہیں..... وہاں سے بتاؤ، جہاں سے تمہیں ہمارے بارے میں پتہ چلا تھا، تمہاری کہانی پھر سن لیں گے۔“

اس کے یوں کہنے سے ماحول کافی حد تک خوشگوار ہو گیا۔ بدر لیوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا

”میں تم لوگوں کے لئے غیر نہیں ہوں۔ میرا تعلق بھی روہی سے ہے۔ میں نے بھی وہاں کچھ عرصہ گزارا ہے۔

ابھی تم وہاں بات کر کے تصدیق کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا، ”میں کل دینی میں تھا، جب مجھے فوراً یہاں کبھی جانے کو کہا گیا۔ یہ علاقہ میرا ہے، ویسے تو مجھ سے بھی کئی بڑے مگر مجھ یہاں ہیں، لیکن میں اپنے طریقے سے رہتا ہوں۔ اس لئے زیادہ گڑبڑ نہیں ہوتی، خیر، یہاں آ کر تم لوگوں کے بارے میں پتہ چلا۔ شام تک مجھے یہ اطلاع مل گئی کہ اصغر ذکیت کے لوگ تم لوگوں کو پکڑنے والے ہیں۔“

”کہاں سے پتہ چلا؟“ تانی نے پوچھا

”یہاں کے میرے اپنے ذرائع نے بتایا، مہرل شاہ کے بارے مجھے معلوم ہو چکا تھا، میں یہ معلوم کر رہا تھا کہ وہ

اصل میں چاہتے کیا ہیں، وہ سب پتہ کر کے میں تم لوگوں تک آنا چاہتا تھا۔“

”تو کیا اس بارے پتہ چلا؟“ جہاں نے پوچھا

”ہاں، پتہ چلا، وہ صرف سارہ ہی کو مارنا نہیں چاہ رہے ہیں بلکہ وہ شاہد سمیت اس کے گھر والوں کو بھی ختم کرنا

چاہتے ہیں۔ یہ ذمہ داری مہرل شاہ نے اس لیے لی ہے کہ پر سارام نے ساری جائیداد میں سے آدمی جائیداد کی قیمت مہرل شاہ کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔“ بدر نے کہا تو جہاں بولا

”اگر یہ بات ہے تو ہم اس پر سارام کے بچے.....“

”بھول جاؤ انہیں، وہ اپنے بچے لے جا چکے ہیں۔ ابراہیم کو مار کر.....“ بدر نے افسردہ لہجے کہا تو انہیں ایک دم

سے شاک لگا

”یہ کیسے ہوا؟“ تانی نے تیزی سے پوچھا

”اصل میں بات یہاں تک محدود نہیں رہی تھی۔ اسے سیاسی ایٹھو بتایا جا رہا تھا، اور پر سارام نے اسے پوری

طرح سیاسی ایٹھو بتالیا تھا۔ بس پھر بہت سارے سیاسی لوگ اس دباؤ میں آ گئے۔“

”بدر، تم صاف بات کیوں نہیں بتا رہے ہو، کیسا سیاسی ایٹھو؟“ سارہ نے ایک دم سے کہا تو بدر نے اس کی طرف

دیکھا اور بولا

”تم بھی جانتی ہو کہ پر سارام یہاں کے ہندوؤں میں اپنا اثر رسوخ رکھتا ہے۔ اس نے اپنے بڑوں سے بات کی

، انہیں موقع مل گیا، وہ لوگ جو بھارت یا ترائے کے لئے جاتے ہیں، انہیں میڈیا پر اس طرح پیش کیا جانے لگا کہ جیسے یہ

پاکستان سے تنگ آ کر یہاں سے ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بھارتی میڈیا نے اس ایٹھو کو بہت اٹھایا۔ دیا پر یہ ثابت کیا

جانے لگا کہ پاکستان میں ہندو کمیونٹی پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ بات حکومتی ایوانوں تک جا پہنچی۔ سیاسی لوگوں نے مہرل شاہ کو

ٹاسک دے دیا کہ اس ہنگامے کو یہیں ختم کرو۔ اس نے پر سارام سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اس میں سب سے زیادہ پر سارام

فائدے میں رہا۔“

”کیسے؟“ جہاں نے جذباتی لہجے میں پوچھا

”پاکستانی حکومت سے مدد لے کر، اپنے بچے واپس لئے، علاقے میں مہرل شاہ جیسے بندے سے گٹھ جوڑ کیا،

اپنی کمیونٹی میں با اثر ہوا، بھارت نواز لوگوں کی نظروں میں آ گیا۔ اب وہ اس سے ہر طرح کا کام لیں گے اور اسے پوری مدد

دیں گے۔ اب وہ علاقے میں مضبوط زمیندار کے طور پر ابھرے گا۔“ بدر نے تفصیل بتائی تو شاہد رو ہانسا ہو کر بولا

”سارا کھیل لالچ کا ہے اور اس میں بے چارہ ابراہیم کام آ گیا۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“ جہاں نے پوچھا تو بدر نے جواب دیا

”دیکھو، سارہ اور شاہد کب تک یہاں چھپے رہیں گے۔ ہمیں انہی کا خیال رہے گا۔ اصغر ذکیت یا مہرل شاہ کے

بندوں کو میں سنبھال لوں گا مگر جو ”را“ کے لوگ ان کے پیچھے لگ چکے ہیں، ان کے لئے بہت محتاط ہونا پڑے گا۔“

”تمہیں کیسے یقین ہے کہ را کے لوگ.....“ جہاں نے پوچھا تو بدر بولا

”مہرل شاہ، کون ہے، یہاں پر ہر مضبوط آدمی کے پیچھے کوئی نہ کوئی قوت ہے۔ میں بھی کچھ نہیں ہوں، اگر مجھ

پر.....“ وہ کہتے ہوئے رک گیا

”تو پھر کیا کریں؟“ تانی نے پوچھا

”یہ لوگ ابھی ادھر ہی رہیں گے۔ یہ شہر انہیں چند دن تو چھپا لے گا۔ ہم تینوں آج ہی سکھر جائیں گے۔ یہ چاروں

میرے لوگوں کے حوالے ہیں اور ہم تینوں اپنا کام مکمل کریں گے۔ مزید اگر کوئی بات پوچھنا چاہتی ہو تو روہی فون کرلو۔ مجھے

ابھی بہت سے کام ہیں۔“ بدر نے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔ جہاں بہت کچھ تیزی سے سوچتا چلا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

مجھے جب ہوش آیا تو میں ایک نیم تاریک کمرے کے رخ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کتنی دیر تک بے ہوش رہا ہوں۔ سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی سوال آیا کہ یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے مجھے اغوا کیا ہے؟ لاشعوری طور پر میرا دھیان چوہدری شاہنواز کی طرف جاتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ اسے پکڑا بھی تھا یا یونہی چھوڑ دیا گیا، یا پھر وہ ہتھے ہی نہیں چڑھا؟ میرا دماغ گھوم رہا تھا اور میرے بدن سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے سر میں خون کی چیچھا ہٹ محسوس ہوئی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ دروازے کی چرچر اہٹ کے ساتھ ہی روشنی بھی اُمنڈ آئی۔ اس کے بعد چند لوگ اندر آ گئے، ان میں وہ نوجوان بھی تھا، جس نے پہلی بار مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا

”تجھے ہوش آگیا؟“ یہ کہہ کر وہ میرے پاس فرش پر بیٹھا اور میرے بال زور سے پکڑ کر بولا

”تیرے بارے سنا تو بہت تھا، مگر تو ایک حقیر چوہے کی طرح میرے قابو میں آگیا، میں چاہتا تو وہیں ایک گولی تیرے پار کر دیتا۔ لیکن میں ابھی تیرے اندر سے بہت کچھ نکالنا چاہتا ہوں۔ اگر تجھے بھونکنے پر مجبور نہ کیا تو میرے یہاں آنے کا مقصد ہی ختم ہو جاتا۔“

”کون ہو تم اور چاہتے کیا ہو؟“ میں نے پوچھا تو ایک دم سے قہقہہ لگا کر بولا

”گڈ، بولتا بھی ہے، چل بول، یہ اعتراف کر کہ رات تو نے ہی ہمارے بندے پکڑوائے ہیں؟“

”جب تک تو اپنے بارے میں نہیں بتائے گا، مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکے گا۔“ میں نے یہ کہا ہی تھا کہ اس نے میرا ماتھا زور سے فرش پر مارا تو میری آنکھوں کے آگے ستارے ناز گئے۔ میں نے خود پر قابو پایا تب تک وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا

”ایک حقیر چوہا مجھ سے سوال کر رہا ہے کہ میں کون ہوں۔ ابھی بتاؤں گا، جب تم اپنی آخری سانسوں پر ہو گے۔ تمہیں خود پر افسوس ہو گا کہ تم بھارت میں دلجیت سنگھ بن کر کس طرح گئے تھے۔“

”مطلب تم بھارتی ہو۔“ میں نے انتہائی نفرت سے کہا تو وہ حقارت سے بولا

”ہاں میں بھارتی ہوں، اور صرف تیرے لئے یہاں آیا ہوں۔ میں تجھے خود اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔ بول۔ شاہنواز اور میرے ساتھی کہاں ہیں؟“ اس نے شاہنواز کے بارے میں پوچھا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی خفیہ والوں کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ مجھے ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔ تبھی میں نے اسے جان بوجھ کر غصہ دلاتے ہوئے کہا

”ہمت ہے تو پوچھ لے؟“

”تو بولے گا، اور بتائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے پھر سے میری پسلیوں میں ٹھوکر ماری تو مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور اُس کی طرف دیکھتے ہوا بولا

”دیکھ تو جو کوئی بھی ہے، اس طرح بندھے ہوئے کو کوئی بھی مار سکتا ہے، تیرے جیسے چار بھجورے بھی ایسا ہی کریں گے۔ تیری مردانگی تو میں تب دیکھوں، جب تو میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ پتہ تو تب چلے گا، گھیر کر مارنا تو بھجوروں کا کام ہے۔“

”اس کی باتوں میں مت آنا باس، یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“ اس کے پیچھے کھڑے ایک گن بردار نے کہا تو وہ دانت پیستے ہوئے بولا

”بول، ہمارے آدمی کہاں ہیں؟“

”ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے پوچھ بھجورے۔“ میں نے کہا تو وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے میرے سر کے بال پکڑے اور

میرا سر فرش پر مارنا چاہا۔ اسی لمحے میں نے اپنے آپ کو جھٹکا دیا تو میرا سر زمین پر نہ مار سکا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ غصے میں پاگل تو پہلے ہی تھا، اس کی عقل ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ میرے ہاتھ کھولنے لگا۔ میرے ہاتھ کھلے تو مجھے اٹھا کر بولا

”آدکھا اپنی مردانگی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک مٹکا میرے منہ پر مار دیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے جب میں نے اس کے ماتھے کے درمیان بیخ مارا تو چکرا گیا۔ میں نے اسی لمحے دونوں ہاتھوں کی کھڑی ہتھیلیاں اس کی کنپٹیوں پر ماریں تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ فانیٹر تھا، بجھ گیا اس لئے فوراً پیچھے ہٹا اور خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے غیر محسوس انداز میں چاروں طرف دیکھ لیا تھا کہ وہاں پر کتنے بندے ہیں۔ تین آدمی تھے، اور اُن تینوں کے پاس گنیں تھیں۔ وہ میرے سامنے آ کر مجھ پر چھپٹا اور اس کے ساتھ ہی کوئی تیز دار آلہ میری ران میں چھبوا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں انگارے بھر دیئے گئے ہوں، میں ٹپ اٹھا۔ میں اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ میں نے دیکھا وہ پتلے پھل والا خنجر تھا۔ اُبلتا ہوا خون میری ران سے نکل کر ٹانگ کو بھگور رہا تھا۔ ٹیس کا احساس میرے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ اسی لمحے وہ مجھ پر دوبارہ چھپٹا تو میں نے اسے اپنی لپٹ میں لے لیا۔ اس کا سر میری بغل میں آیا تو میں نے اس کی گردن کو بھج لیا۔ اب میں اسے نکلنے نہیں دیتا چاہتا تھا۔ وہ اپنا پورا زور لگا رہا تھا۔ وہ جس قدر زور لگاتا، اسی طرح اپنے آپ کو میرے شکم میں جکڑا ہوا پاتا۔ اس نے ٹانگوں سے مجھے گرانے کی بہت کوشش کی لیکن اس وقت میری ہتھ اسی میں تھی کہ وہ میرے قابو میں رہے۔ میں اسے لیتا ہوا غیر محسوس انداز میں ایک بندے کی جانب بڑھنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اس فانیٹر کو بچانے کے لئے مجھ پر فائیر کرے یا مجھے گن مارے یا مجھ پر چھپے۔ ایسا ہی ہوا، جیسے میں اس کے قریب ہوا، اس نے گن ہوا میں لہرائی اور اس کا دستہ مجھے مارنا چاہتا تھا، اسی دوران میں نے بغل میں دی ہوئی گردن کو جھٹکا دیا، کڑک کی آواز آئی اور وہ ڈھیلا ہو گیا، اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مر گیا ہے یا ابھی زندہ ہے، کیونکہ میں نے اسے چھوڑ دیا تھا، جب تک اس کی گن نیچے آئی اس وقت تک میں گن پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ گن میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ میں نے اگلے ہی لمحے اپنی جگہ چھوڑ دی، اسی لمحے

وہیں فائر ہوا۔ میں نے فرش پر جست لگائی اور اس کا نشانہ لیا، جس نے فائر کیا تھا۔ وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ میں نے تیسرے کا نشانہ لیا۔ وہ بھی خون میں لت پت ہو گیا۔ اب انہیں دیکھنے کا اتنا وقت نہیں تھا۔ میں نے انہیں وہیں چھوڑا اور اس کمرے سے باہر نکلا۔

میں نے اگلے ہی لمحے اپنی جگہ چھوڑ دی، اسی لمحے وہیں فائر ہوا۔ میں نے فرش پر جست لگائی اور اس کا نشانہ لیا، جس نے فائر کیا تھا۔ وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ میں نے تیسرے کا نشانہ لیا۔ وہ بھی خون میں لت پت ہو گیا۔ اب انہیں دیکھنے کا اتنا وقت نہیں تھا۔ میں نے انہیں وہیں چھوڑا اور اس کمرے سے باہر نکلا۔

شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا پھیل رہا تھا۔ باہر لمبا کاریڈور تھا۔ وہ کوئی پرانا ڈاک بنگلہ تھا یا کوئی ایسی ہی دوسری عمارت تھی۔ مجھے یہ بھی دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں ابھی فرار کا راستہ دیکھ ہی رہا تھا کہ باہر کی طرف سے کئی لوگ بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ کرتا، میں تیزی سے بھاگا اور دائیں جانب کی دیوار کو دو گیا۔ میں جہاں پر گرا۔ اس کے ارد گرد کئی فائر ہوئے، میری قسمت ساتھ دے رہی تھی اس لئے میں بچ گیا۔ میں تیزی سے بھاگا تو وہ لوگ بھی میری پیچھے لگ گئے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ایک لمحے کے لئے رکتا اور ان کا نشانہ لے کر فائر کرتا۔ میں اگر برست بھی مارتا تو اس وقت تک وہ مجھے نشانہ بنا چکے ہوتے۔ میری سامنے چیلن زمین تھی، جس پر جا بجا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے ایک ٹیکری دکھائی۔ میں اس کی آڑ میں بے دم ہو کر گر گیا۔ میں بہت حد تک چکرا گیا تھا۔ ایک

تو اندھیرا ہو رہا تھا، دوسرا مجھے اتنا زیادہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور تیسرا میری ران میں اٹھتیں ہوئیں ٹیسیں بے حال کر رہی تھیں۔

میں چند لمحے یونہی پڑا رہ کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میری ران میں ٹیس بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے آنے والے لوگوں کو دیکھا۔ وہاں مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ سامنے میدان خالی تھا۔ اگر کوئی سامنے ہوتا تو اس کا ہولناکی دکھائی دیتا۔ بلاشبہ وہ جھاڑیوں کی آڑ میں ہوں گے۔ وہ پیچھے بھی ہٹتے تو اتنی دیر میں وہ مجھے دکھائی دے گئے ہوتے۔ اچانک میں نے موہوم سی آہٹ پر اپنے پیچھے دیکھا، دو الیٹین نسل کے کتے بھاگتے ہوئے میری طرف آرہے تھے۔ میں ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ میں نے اگر ان پر فائر کیا تو مجھے پر گولیوں کا مینہ برس جائے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ انہیں ویسے ہی ماروں گا۔ ایک کو فائر مار کر جب تک دوسرا فائر کرتا، میں یہاں سے اٹھ بھی نہ پاؤں گا۔ وہ کتے وحشت ناک انداز میں میری جانب بڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنی نگاہیں ان پر گاڑ دیں۔ جیسے ہی وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ گئے، انہوں نے وہیں سے مجھ پر چھلانگ لگانے کے لئے اپنے بدن کو تولا ہی تھا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا

”ہش۔“

نجانے اس آواز میں کیا جادو تھا۔ وہ کتے ایک دم سے ٹھٹھک کے یوں رک گئے، جیسے وہ مجھ سے خوف زدہ ہو گئے ہوں۔ میں ایک دم سے حیران رہ گیا کہ ان کتوں کو کیا ہوا؟ میری نگاہیں انہی پر جمیں ہوئیں تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے، پھر انہوں نے اپنی ٹانگیں آگے کی طرف پھیلا دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں پرسکون انداز میں بیٹھ گئے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہوا؟ وہ چیر پھاڑ دینے کے انداز میں میری طرف آنے والے یوں کیوں بیٹھ گئے، جیسے وہ کوئی میرے پالتو ہوں۔ اس عجیب صورت حال نے مجھے حیران کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس صورت حال کی وجہ معلوم کرتا۔ مجھے کچھ فاصلے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ جھاڑیوں کے درمیان سے دو بندے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ جو باتیں کر رہے تھے، ان کی مجھے تو سمجھ نہیں آئی۔ لیکن ان کے ساتھ ہی دو بندے مزید ان کے پاس آ گئے۔ وہ چار ہی تھے۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ میں سمجھ گیا۔ انہوں نے کتے اسی لئے بھیجے تھے کہ یا تو وہ مجھے چیر پھاڑ دیں گے، یا اگر میں ان پر فائر کرتا تو میری لوکیشن معلوم کر لیتے۔ میں اگر فائر کر کے کسی کتے کو مار بھی دیتا تو ان کا نقصان نہیں ہوتا تھا۔

وہ اکٹھے نہیں ہوئے بلکہ پھیل کر آگے بڑھنے لگے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک ہی برسٹ میں ان کا کام تمام کروں گا۔ وہ آہستہ آہستہ میری ریخ میں آتے چلے گئے۔ جیسے ہی وہ میرے نشانے پر آئے۔ میں نے فائر کھول دیا۔ میں نے ان میں سے تین کو تو گرتے دیکھا، جب تک ایک گولی میری کہنی کے اوپر سے میرا بازو ادھرتی ہوئی نکل گئی۔ میرا بازو سُن ہو کر رہ گیا۔ میں اگر اس کے فائر نہ مارتا، اس نے مجھے مار دیتا تھا۔ انہیں میری لوکیشن کا پتہ چل گیا تھا۔ میں نے اگلے ہی لمحے وہ جگہ چھوڑ دی اور پوری قوت سے بھاگا۔ میں جس قدر تیزی سے بھاگا تھا، ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ مگر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ اسی لمحے میرے پیچھے ایک دو فائر ہوئے، شاید میں ان کی ریخ سے نکل گیا تھا یا پھر ان میں فائر کرنے کی ہمت نہیں رہی ہوگی۔ پھر کچھ نہیں ہوا۔ میں اپنی بقاء کے لئے بھاگتا چلا گیا، حالانکہ میری ران کا زخم مجھے بھاگنے نہیں دے رہا تھا، مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے زخم چرتا چلا جا رہا ہے۔ میں آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ میری سانس پھول گئی تھی۔ میں اپنا سانس بحال کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب میں اپنے آپ میں آیا تو اندھیرے میں چپکتے ہوئے جگنو دکھائی دیئے۔ ایک لمحے کو میں نہ سمجھ سکا، پھر جیسے ہی غور کیا۔ یہ وہی الیٹین نسل کے کتے تھے، بلاشبہ وہ میرے پیچھے یہاں تک آ گئے تھے۔ نجانے مجھے یہ کیوں احساس ہونے لگا کہ یہ محض کتے نہیں ہیں، کچھ بھی

دوسری کوئی مادیاتی مخلوق ہو سکتی ہے۔ میں نے اس وقت ان پر زیادہ دھیان نہیں دیا بلکہ سانس بحال ہوتے ہی تیز تیز قدموں سے آگے چل پڑا۔ میرے ساتھ وہ کتے بھی چل پڑے۔

میں کسی ہستی کی تلاش میں تھا۔ اس سے نہ صرف مجھے یہ اندازہ ہو جاتا کہ میں کہاں پر ہوں، بلکہ مجھے وہاں سے کوئی مدد بھی مل سکتی تھی۔ چٹیل میدان ختم ہو گیا تھا تو ریتی اور دلدلی جگہ محسوس ہونے لگی۔ اچانک میرے سامنے دیا آ گیا۔ میں نے مغرب کی جانب دیکھا۔ چاند کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں بینک بیٹھ کر ساری رات انتظار کرتا یا پھر دریا میں کود کر پار اترنے کی کوشش کرتا۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ دوسرا کنارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نجانے اس کا پاب کتنا تھا، میں اگر تیرتے ہوئے راستے ہی میں بے دم ہو گیا تو کیا کروں گا۔ سوائے ڈوبنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں بیٹھ رہنے سے میرے زخم میں زہر پھرنے کا اندیشہ تھا۔ ممکن ہے مجھے ہوش ہی نہ رہتا، صبح تک نجانے کون کون سے جانور مجھے ہڑپ کر جاتے۔ میں ابھی ایسی الجھن میں تھا کہ اچانک مجھے متحرک روشنی دکھائی دی۔ میں نے غور کیا وہ تین گاڑیاں تھیں۔ بلاشبہ وہ میری تلاش میں تھے، ورنہ اس وقت ان گاڑیوں کا یہاں کیا کام تھا۔ اس وقت میں نہبتا اور زخمی تھا۔ میں چاہتا بھی تو کب تک ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں کوئی آڑ تلاش کرنے لگا۔ کبھی میرے دل میں آئی کہ ان سے بچتے رہنے کی بجائے دریا پار کرنے کی کوشش کر، اگر زندگی ہوئی تو پار کر جائے گا، اگر موت ہے تو وہ لوگ مجھے مارنے یا پھر مجھے زندہ پکڑنے کے لئے سر پر پہنچ جانے والے ہیں۔ پھر میں نے مزید نہیں سوچا اور دریا میں چھلانگ ماری۔

سر درپانی نے مجھے سر سے پاؤں تک سُن کر دیا۔ میں کچھ دیر بعد پانی کی سطح پر آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ دونوں کتے میرے دائیں بائیں تیرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک دم سے میرا حوصلہ بلند ہو گیا۔ میں نے دونوں کو اپنے ساتھ لگایا اور اپنا سارا بوجھ ان پر ڈال کر خود کو پانی کے حوالے کر دیا۔ میں ان کتوں کے ساتھ پانی کے بہاؤ کی جانب بہتا چلا گیا۔ نجانے کتنی دیر تک میں بہتا رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ نہیں دیکھا تھا۔ میں دوسرے کنارے لگا تو میرے حواس پوری طرح بحال تھے۔ میں پانی سے باہر آیا تو میرے سامنے ایک ہیولا سالہ لہرایا۔ میں نے غور سے دیکھا، دھیمی دھیمی روشنی تیز ہونے لگی۔ میں ادھر دیکھتا رہا، جیسے ہی وہ ہیولا میرے قریب ہوا تو میں انہیں پہچان گیا۔ میرے سامنے وہی وہی والے بابا کھڑے تھے۔ ان کے آس پاس ایک روشنی کا ہالا تھا۔ جس میں صاف طوط پر دکھائی دے رہے تھے۔ میں ایک دم سے چکر ا گیا۔ وہ میری جانب غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا عصا بلند کیا اور اونچی آواز میں کہا

”آج تو دریا پار زندہ کرتا تو اپنی منزل کھوئی کر لیتا۔ گھبرا مت، ابھی تجھے کندن بننا ہے، کندن۔“

”میں حاضر باباجی۔“ میں نے پورے خلوص سے کہا تو وہ اسی رعب سے بولے

”اس دنیا میں ایک مخلوق منافقوں کی ہے، جو ان کتوں سے بھی بدتر ہے، کتے کو معلوم ہے کہ اس کا مالک کون ہے، لیکن ان منافقوں کو نہیں معلوم۔ اور تو..... اپنے بارے میں جان لے کہ ابھی تو صرف ایسا قلندر ہی ہے جو کتے اور بندر نچا سکتا ہے، نچا، ابھی یہ کتے بندر نچا، ابھی تیری منزل بڑی دور ہے، جا، اب جا۔“ انہوں نے تیز تیز کہا اور مڑ کر چل دیئے۔ روشنی معدوم ہوتی چلی گئی اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں حیرت میں ڈوبا ان کے لفظوں پر غور کرتا رہا۔ یہ کیا منظر تھا، مجھے اس کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سکھر پہنچتے ہوئے انہیں شام ہو گئی تھی۔ ابراہیم بے چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا، ورنہ وہ سیدھے وہیں جاتے۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی ایک فور وریل جیپ ان کی منتظر تھی۔ بدرؤ رانیور کے ساتھ بیٹھ گیا، جہاں اور تانی پھیلی

”پرسارام اپنے خاندان سمیت گاؤں میں نہیں ہے؟“

”گاؤں میں نہیں ہے، کدھر گیا ہے وہ؟“ جیپال نے تیزی سے پوچھا تو اس نے بتایا

”یہی تو ابھی معلوم نہیں ہوا۔ پچل کو جیسے ہی پتہ چلا وہ ہمیں بتا دے گا۔“

”اوہ! میں تو چاہتا تھا کہ آج رات ہی.....“ جیپال نے کہا تو بدر بولا

”یہ ممکن نہیں ہے۔ پچل کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

سرشام ہی انہوں نے رات کا کھانا کھالیا۔ وہاں کے لوگوں نے بہت تکلف سے کام لیا تھا۔ انہوں نے چائے

پی اور کمرے سے باہر آگئے۔ اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ایک کمرے میں پڑے رہے۔ آدھی رات کے قریب پچل کے

واپس آجانے کی اطلاع ملی تو سب وہیں اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پچل نے وہاں کی پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا

”وہ اپنے خاندان کے ساتھ سادھو بیلا گیا ہوا ہے۔ مجھے جب پتہ چلا تو میں نے اس کی پوری تحقیق کر کے ہی

واپس آیا ہوں۔ اب یا تو اسے وہیں دیکھ لیا جائے یا پھر کل رات کا انتظار کیا جائے۔“

”یہ سادھو بیلا کیا ہے؟“ تانی کے پوچھنے پر پچل نے اسے بتایا

”یہ ایک پرانا مندر ہے، یہیں سکھر میں۔ دریائے سندھ کے درمیان وہ سفید مندر کافی پرانا ہے۔ وہاں تک

کشتیوں ہی کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے۔“

”تمہیں یقین ہے وہ اس وقت وہاں پر ہوگا؟“ جیپال نے پوچھا

”پورا یقین ہے تو ہی واپس لوٹا ہوں۔ باقی میرے بہت سارے لوگ ادھر ہیں۔ جیسے ہی وہ واپس آیا۔ مجھے پتہ

چل جائے گا۔“

”اب کیا کریں؟“ تانی نے کہا

”چلتے ہیں ادھر سادھو بیلا، اگر آپ لوگوں نے ابھی جانا ہے تو۔“ پچل نے کہا تو بدر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے

کہا

”نہیں، وہ عبادت گاہ ہے۔ کسی کی بھی ہے، میں وہاں خون خرابہ نہیں چاہتا۔ ہم انہیں گاؤں واپس آجانے پر ہی

دیکھیں گے۔“

”تو اب؟“ تانی نے پوچھا

”اب میڈم ایسا کرو، ادھر آرام کرو۔ کل دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ اب تو مجبوری ہے۔“ پچل نے کہا تو انہوں

نے سکون سے سو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پچل کے لوگ سیکورٹی پر تھے لیکن انہوں نے اپنے طور پر ایک دوسرے کی حفاظت بھی

طے کر لی۔

صبح ہوتے ہی انہوں نے پرسارام کے بارے میں پوچھا۔ وہ ابھی تک گاؤں واپس نہیں لوٹا تھا۔ انہوں نے

ناشتہ بھی کیا اور پچل کو ساتھ لے کر بارگ کی طرف چلے گئے۔ وہیں ڈیرے پر سارا دن یونہی کھاتے پیتے، پلان بناتے اور

پرسارام کا انتظار کرتے گذر گیا۔

سہ پہر کے وقت انہیں اطلاع ملی کہ وہ واپس لوٹ آیا ہے اور اب اپنے گھر میں ہے۔ یہ سنتے ہی پچل سلطان

پور کل گیا۔ انہوں نے بھی اطلاع ملتے ہی وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ شام ہو رہی تھی جب وہ وہاں سے نکل پڑے۔ جیپ

لے پاس وہی کل والا ڈرائیور کھڑا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سلطان پور کے

مضافات میں تھے۔

سیٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ ڈرائیور چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بائی پاس پر چڑھا تو بدر نے اس سے پوچھا۔

”پچل کدھر ہے؟ ادھر شہر ہی میں ہے یا.....“ اس نے فحشہ ادھورا چھوڑ دیا، جس پر ڈرائیور نے کہا

”ادھر نہیں ہے، لیکن وہ آج ہی تم سے رابطہ کرے گا۔ وہ کام ہی سے گیا ہے۔“

”کب گیا تھا؟“ بدر نے پوچھا

”تمہارا فون آنے کے بعد نکل گیا تھا۔“ ڈرائیور نے جواب دیا تو جیپ میں خاموشی چھا گئی۔

ان کے سفر کا اختتام ایک ایسے ڈیرے پر ہوا جہاں تین طرف باغ تھا اور ایک طرف کچا راستہ تھا جو کھیتوں کی

طرف جاتا تھا۔ اونچی چار دیواری کے اندر کافی سارے کمرے بنے ہوئے تھے، جن کی حالت بہت اچھی تھی۔ وہ ایک

کمرے میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے لئے تازہ اورنج کا جوس آگیا۔ وہ جوس پی رہے تھے کہ بدر کو پچل کا فون آگیا۔ وہ

اس سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے فون بند کر کے جیب میں رکھا اور ان دونوں کی طرف دیکھ کر بولا

”میں جس پچل کی بات کر رہا ہوں، یہ ڈیرہ اسی کا ہے۔ وہ اس علاقے کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا

ہے اور اس وقت دوپہر سارا م کے علاقے میں موجود ہے۔“

”یہاں سے کتنی دور ہے؟“ تانی نے پوچھا

”پندرہ منٹ کے فاصلے پر.....“ بدر نے سکون سے کہا تو تیزی سے بولی

”مطلب ہم بہت قریب ہیں۔“

”قریب تو ہیں تانی لیکن وہاں پر بہت سخت سیکورٹی ہے۔ پرسارام نے اپنے ارد گرد ایسا ماحول بنایا ہوا کہ کوئی

بھی اس تک رسائی نہیں لے سکتا۔“ بدر نے کافی حد تک تشویش سے کہا تو جیپال بولا

”وہ تو وہاں جا کر دیکھ لیں گے، مزید کیا بتاتا ہے وہ پچل؟“

”مطلب اس نے اپنے بندے پھیلا دیئے ہیں پورے گاؤں میں، جو اسے وہاں کی رپورٹ دے رہے ہیں۔

میرا خیال ہے جب تک وہ گرین سیکٹر نہیں دے دیتا، ہمیں یہاں انتظار کرنا چاہیے۔“ بدر نے محتاط لہجے میں کہا تو جیپال بولا

”چاہے اس میں جتنا وقت لگ جائے؟“

”ظاہر ہے ہم یہاں خود کوشی تو نہیں کرنے آئے، نا، منظر صاف ہوگا تو ہی کچھ کریں گے۔“ بدر نے مسکراتے

ہوئے کہا تو جیپال بولا

”یہ انسانی فطرت ہے بدر کہ حد سے زیادہ سیکورٹی سے بندہ لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ جو اپنی جتنی

سیکورٹی رکھتا ہے، وہ اتنا ہی بزدل ہوتا ہے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم اس پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ میرے خیال

میں یہ رات سب سے اہم ہے اگر اس رات ہم نے کچھ کر لیا تو ٹھیک ورنہ پھر شاید ہی ہم کچھ کر پائیں گے۔“

”میں نہیں جانتا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے، لیکن اگر تم آج رات ہی چاہتے ہو تو میں تیار ہوں۔ چلتے ہیں۔“

بدر ایک دم سے مان گیا۔ ان میں لمحہ بھر کی خاموشی چھا گئی۔

”اچھا بدر تم ایسا کرو، پچل سے پوچھو صورت حال کیا ہے، اگر ہم آج ہی آنا چاہیں تو.....“ تانی نے سوچتے

ہوئے لہجے میں کہا

”اوکے، میں پتہ کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور باہر کی جانب چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس آگیا۔ اس کے

چہرے پر مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ تانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ڈھیلے سے انداز میں بولا

سفر کے دوران ان کا پگل سے مسلسل رابطہ رہا تھا۔ اُس نے علاقے کے اُن ڈاکوؤں کو ساتھ میں ملا لیا ہوا تھا، جنہوں نے علاقے پر خوف طاری کیا ہوا تھا۔ وہ ان سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ اس لئے وہ سلطان پور کے مضافات میں ہی انہیں مل گیا۔ وہ انہیں کھیتوں میں موجود ایک چھوٹے سے ڈیرے میں لے گیا جو کچا تھا اور کافی حد تک اُجاڑ ہو چکا تھا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد حپال نے اپنے ذہن میں پلاننگ کر لی تھی۔ تبھی اُس نے کہا

”دیکھو بدر، اس مشن میں تم لیڈر ہو، ہم نے وہی کرنا ہے جو تم کہو گے، لیکن میں تمہیں اپنا پلان بتاتا ہوں اگر تمہیں پسند آئے تو بتانا۔“

”بولو۔“ اس نے حپال کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بتانے لگا۔

”میں نے پرسارام کا نہ صرف گھر دیکھا ہوا ہے، بلکہ اس کے اندر محن تک جا چکا ہوں۔ اس سے آگے کیا ہے وہ میں نہیں جانتا۔ میں اور تانی، خاموشی سے اس کے گھر کے اندر اتریں گے۔ اندر جو سیکورٹی ہوگی، میں اسے سنبھال لوں گا، لیکن باہر جو بھی سیکورٹی ہے، انہیں تم لوگ سنبھالو گے۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ تم لوگوں کے ذمے ہوگا۔“

”ڈن ہے حپال، کب چلیں؟“ بدر نے کہا تو حپال بولا

”ابھی اور اسی وقت، اس وقت سیکورٹی الٹ نہیں ہوگی۔“ حپال نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا

”چلو نکلو۔“

وہ تینوں جیب میں جا بیٹھے اور پگل دیوار کی جانب بڑھا جہاں ایک پرانا سا موٹر سائیکل کھڑا تھا۔ وہ فون کرنے لگا تھا۔

وہ گاؤں میں پہنچ گئے۔ انہوں نے جیب گاؤں کے باہر ہی روک دی اور تیزی سے ان گلیوں میں گھس گئے، جو میڑی میڑی ہو کر پرسارام کے گھر کی جانب جاتی تھیں۔ اس کے گھر کے سامنے کھلی جگہ تھی، جہاں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں سے بدر الگ ہو گیا۔ تانی اور حپال ساتھ ہی مڑتی ہوئی گلی میں گھس گئے۔ انہیں کسی ایسے راستے کی تلاش تھی، جہاں سے وہ اندر داخل ہو سکتے تھے۔ ایک جگہ سے انہیں دیوار نیچی دکھائی دی، جس پر چڑھ جاسکتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، اگلے ہی لمحے تانی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پیٹ کے پاس دونوں ہاتھ پیالے کی صورت میں باندھے، حپال نے اس پر پاؤں رکھا اور ایک ہی بلے میں دیوار کے سر پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اس نے اپنے آپ کو اٹھایا اور دیوار پر جا چڑھا۔ دوسری جانب دھبی روشنی تھی اور رہائشی پورشن کافی آگے تھا۔ حپال دیوار پر لیٹ گیا اور ہاتھ بڑھا کے تانی کو اوپر کھینچ لیا۔ حپال نے پہلے تانی کو نیچے اتارا، پھر خود نیچے آ گیا۔ وہ دیوار کی جڑ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے کوئی بات کہنے بغیر جدید آٹومیٹک پستل نکالے، جن پر سائیکلنگ لگا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتے گئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ انہیں پوری طرح احساس تھا کہ کوئی چھت پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن ابھی تک وہاں سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ وہ سامنے دلاں میں چلے گئے۔ وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں اندر کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ پورا خاندان کھانا کھا رہا تھا۔ وہ سبھی فرش پر ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پرسارام، اس کی بیوی، بیٹیاں اور بیٹے۔ حپال نے نگاہوں ہی نگاہوں میں تانی کو وہیں رکے اور کوردینے کا اشارہ کیا اور خود جست لگا کر اندر جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھتے۔ حپال نے پستل پرسارام کے ماتھے پر رکھ دیا۔ وہ سارے سہم کر رہ گئے۔ اس نے واضح طور پر ان کی آنکھوں میں خوف دیکھا، پرسارام لرز کر رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے لولا چھوٹ گیا تھا۔ حپال اس کی طرف دیکھ کر نفرت سے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا، اور تم ہمیں مار دو گے؟“

”مم..... مم..... میں نے..... کچھ نہیں..... کیا۔“ وہ نکلتے ہوئے بولا تو اس نے کہا

”ابراہیم کو مارا اور سارہ پر قاتلانہ حملہ، اس بے چاری نے تیرا کیا لگاڑا ہے۔ پر اب تو کچھ نہیں کر سکے گا۔ میں آج تجھے زندہ ہی نہیں چھوڑوں گا۔“

”اب، نہیں.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ وہ ایک دم سے ہٹ گیا۔ اگرچہ حپال اس سے بات کر رہا تھا، لیکن وہ چونکا تھا۔ پرسارام کے بڑے بیٹے نے پھرتی دکھاتے ہوئے اٹھ کر اسے پرچھلانگ لگانا چاہی۔ تب تک باہر سے خاموش فائر ہوا اور وہ چیخ مار کر کمرے کے فرش پر پڑ پڑنے لگا۔ اس کی ماں ہڈیاں انداز میں چینی تو حپال نے زور سے کہا

”خاموش! تم سب لوگ گھیرے جا چکے ہو۔ جس نے بھی حرکت کرنے کو شش کی، وہ مار دیا جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا اور پھر لمحہ بھر بعد بولا، ”مجھے صرف پرسارام چاہیے، جو مجھی ہمارے راستے میں آیا ختم ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے پرسارام کو گریبان سے پکڑا اور اٹھا لیا۔ وہ ایک دم سے ڈھیلا سا ہو گیا جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ انہی لمحات میں گاؤں کے ایک طرف شور مچ گیا۔ پگل نے اپنا کام کر دیا تھا۔

اس نے گاؤں کے باہر کھیتوں میں پڑی سوکھی لکڑیوں کو آگ لگا دی تھی۔ اس کا مقصد صرف لوگوں کی توجہ ہٹانا تھا۔ بلاشبہ لوگوں نے الاؤ دیکھا تو اس جانب بھاگنے لگے ہوں گے۔ یہ ان کے لئے بھی الارم تھا۔ اب انہیں ہر صورت میں وہاں سے نکلنا تھا۔ حپال نے پرسارام کو گھسیٹا اور باہر کی جانب چل پڑا، ایسے میں اندر سے کسی نے فائر کیا، زوردار دھماکا ہوا اور کسی کے فائر تو لگا لیکن کوئی چلانے والا اندر کے دروازے میں آن کر۔ وہ گھر کا کوئی ملازم تھا۔ تانی نے اسے نشانے پر لے لیا تھا۔ انہی لمحات میں باہر بھی فائرنگ ہونے لگی۔ بلاشبہ باہر بدر کی ان سیکورٹی والوں سے مدد بھیڑ ہو گئی تھی۔ صورت حال نازک ہو گئی تھی۔ باہر شدید فائرنگ ہونے لگی تھی۔ تبھی پرسارام بولا

”میں سب کچھ بھلا دوں گا۔ بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔“

”تم نے خود موقعہ گنوا دیا ہے پر۔“ حپال نے کہا اور اسے باہر کی جانب لے جانے لگا۔ تبھی باہر سے بدر بھاگتا ہوا اندر آیا اور اونچی آواز میں حپال کو پکارا تو تانی نے باہر ہی جواب دیتے ہوئے کہا

”بول، بدر.....“

”میں کچھ بندے اندر بھیج رہا ہوں۔ ان سب کو باندھ لو، باقی باہر میدان صاف ہے۔“ اس نے کہا اور فوراً ہی پلٹ گیا۔ وہ سبھی ایک دم سے سہم گئے۔ پرسارام کی بیوی تو غش کھا کر گر پڑی۔ چند لمحے بعد کئی سارے لوگ وہاں آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی سب کو باندھ دیا۔ پرسارام سب دیکھ رہا تھا، اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے حپال سے کہا

”میرا سب کچھ لے لو، مجھے کچھ نہ کہو۔“

”کیا دو گے؟“ اس نے ایک دم سے پوچھا

”سب دھن دولت، کہنے سب“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا تو وہ بولا

”لاؤ، کتنا دو گے؟“

”چلو آؤ، جو تجوری میں ہے، سب لے لو۔“ اس نے جیب سے چابیاں نکالتے ہوئے کہا، حپال نے وہ چابیاں ان لوگوں کی جانب اچھالتے ہوئے کہا۔

”جو بھی ملے، لے کر آنا، اور آتے ہی اس گھر کو آگ لگا دینا، میں لے جا رہا ہوں اسے۔“ یہ کہہ کر اس نے پرسارام کو اٹھایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔ حپال نے گھما کر اسے محن کے فرش پر مارا۔ وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ تانی آگے بڑھی، اس نے پستل اس کے ماتھے پر رکھا اور ٹرانگنیر با دیا۔ ہلکی سی ٹھک ہوئی اور پرسارام

کی کہانی ختم ہوگئی۔

”تم بھی نہ حیا، خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہو۔ چلو نکلو اب۔“ تانی نے بسمل کی نال سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بدر باہر گیت پر تھا۔ تانی نے اسے بتایا، تو اس نے وہاں موجود مقامی ساتھیوں کو، جو بلاشبہ اس علاقے کے ڈاکو تھے، صورت حال بتا کر نکلنے کے لئے کہا۔ وہ سبھی اندر چلے گئے۔ بدر نے ڈرائیور کو فون کیا کہ وہ گاڑی کی طرف آرہے ہیں۔ ڈرائیور نے اس سمت کو محفوظ بنایا۔ وہ بھاگتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ پہلے ہی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ مسلسل مقامی ڈاکوؤں کے رابطے میں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ اس کے بعد تک انہوں نے وہاں پر لوٹ مار کی۔ شدید فائرنگ کے ساتھ جیسے ہی انہوں نے پرسارام کے گھر کو آگ لگائی، تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے سب نے شعلے بلند ہوتے ہوئے دیکھے، وہ گاڑی لے کر نکل گئے۔

وہ انتہائی تیز رفتاری سے واپس ڈیرے پر پہنچے تھے۔ وہاں آتے ہی سب سے پہلے انہوں نے سارہ کو ساری کاروائی کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت حد تک پرسکون ہو گئی تھی۔ رات گئے ان کی ٹمکٹ کنفرم تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں رہ کر الگ الگ ایئر پورٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے سیل فون ضائع کر دیئے تھے۔

☆.....☆.....☆

میرا اندازہ یہی تھا کہ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔ میں اکیلا اور میرے ساتھ دونوں کتے تھے۔ ہم ایک سیدھے راستے پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ میں ایک کچی سڑک پر بابا جی کی باتیں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن مجھے کسی بات کی بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں نے دریا پار کرنے سے پہلے ان کتوں کو دشمنوں ہی کی طرف سے سمجھا ہوا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچنے لگا کہ ممکن ہے یہ تائید غیبی ہو۔ مگر اس بات کو دل قطعاً نہیں مان رہا تھا۔ وہ کتے دشمنوں ہی کی طرف سے تھے۔ ایک ہی رات میں بہت کچھ انہوٹا ہو گیا تھا۔ شاید مجھے سمجھ اس لئے بھی نہیں آرہی تھی کہ میرے بدن پر لگے زخموں سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ بدن کی خراشوں میں سے جلن تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ران کا زخم سوچ گیا تھا۔ بھیکے ہوئے بدن پر کپڑے چپکے ہوئے تھے اور ہوا سے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جو دریا میں نے ابھی عبور کیا ہے وہ دریائے ستلج ہے۔ لیکن کہاں سے پار کیا، اس کا مجھے بالکل بھی پتہ نہیں تھا۔ میں جہاں پر تھا، وہاں سے میرا گاؤں نورنگر کس جانب ہے اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ میں چلتا چلا گیا۔

شاید اس وقت پوہ پھٹ رہی تھی۔ جب میں نے اپنی دائیں جانب کچھ گھٹیوں کی آواز سنی جو لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی چلی جا رہی تھی۔ میں ٹھک کر رک گیا۔ وہ کوئی ریزہ والا گولا تھا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گیا۔ گوالے نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر مقامی زبان میں پوچھا

”کون ہو تم اور کدھر جانا ہے؟“

”مسافر ہوں بابا، جدھر چاہو لے جاؤ، یا کسی اڈے پر اتار دینا۔“

”آ جاؤ“ اس نے کہا تو میں آگے بڑھ کر ریزے پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ وہ کتے بھی آگئے تو اس نے ریزہ

آگے بڑھا دیا۔ ظاہر ہے مجھے جس تھا اس لئے پوچھا

”یہ کون سی جگہ ہے، اور تم کدھر جا رہے ہو؟“

میرے پوچھنے پر جب اس نے بتایا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نورنگر سے کوئی سو کلومیٹر سے بھی دور تھا۔ میں معلومات لیتا ہوا باتیں کرتا رہا۔ ایک گاؤں کے چھوٹے سے بس اسٹینڈ پر جب اس نے مجھے اتارا تو دن نکل آیا تھا۔ کتے

بھی میرے ساتھ ہی اتر آئے۔ میرے ذہن میں سوئی کا فون نمبر تھا۔ میں نے ایک پی سی او پر جا کر کال ملائی تو اس نے فوراً فون رسیو کر لیا۔ میں نے اپنی جگہ بتائی ہی تھی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روتے ہوئے بولی

”میں تجھے لینے کے لئے آرہی ہوں۔“

”تم مت آنا، پہلے مجھے چھاکے کے بارے میں بتاؤ۔“ میں نے تیزی سے پوچھا

”وہ تو ٹھیک ہے، اور تجھے تلاش کر رہا ہے۔ تجھے پیرزادہ وقاص نے غلط اطلاع دی تھی۔ وہ دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے کہا

”اچھا، تم ایسے کرو۔ مجھے اس کا نمبر دو۔ میں بات کرتا ہوں۔“

اس نے مجھے نمبر دیا۔ میں نے چھاکے کو کال ملائی تو اس نے بھی وہی پیرزادے والی بات بتا کر کہا

”میں آتا ہوں تجھے لینے کے لئے، لیکن تم اپنا خیال رکھنا۔ ہو سکتا ہے دشمن آگے پیچھے ہوں۔ میں کرتا ہوں

کچھ۔“ یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں اسی پی سی او کے ساتھ بنے بیٹھ گیا۔ مجھے چکر آرہے تھے اور میری حالت گبڑنے لگی تھی۔ شاید پی سی والے کو میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔ اس نے اپنے لئے چائے منگوائی تو ساتھ میرے لئے بھی منگوائی۔ میں چائے پی چکا تو میرا دل خراب ہونے لگا۔ چکر تیز ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ میں اپنے آپ پر قابو پانے میں ناکام ہو گیا۔ ایک دم سے مجھے قے آگئی۔ میں یہ مشکل اس پی سی او سے باہر نکلا تھا۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ کتے میرے ارد گرد منڈلانے لگے تھے۔ قے کرنے کے ساتھ ہی میں زمین پر گر پڑا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ میرے آنکھوں کے سامنے پہلے دھند چھائی، پھر سب کچھ عائب ہو گیا۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو کچھ دیر تک مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میرے بدن میں اگرچہ درد کم تھا لیکن تیز بخار سے نڈھال ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ میں کسی ہسپتال میں ہوں جو اتنا اچھا نہیں تھا۔ وہ دیہاتی علاقے کا چھوٹا سا ہسپتال تھا۔ وہاں چند بیڈ پڑے ہوئے تھے، جو سب بیڈ خالی تھے۔ میرے پاس سادہ سے لباس والا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے مہرے سے اس کی شخصیت بہت جاذب نظر تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، پتلے لب، بھاری چہرہ، جس میں آنکھیں بہت شفاف اور جاندار تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں پوری زندگی بس رہی ہے۔ وہ اپنی چمک دار اور پرکشش آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے ہوش میں آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ فطری طور پر نکلا۔

”میں کہاں ہوں؟“

”جہاں تمہیں ہونا چاہیے۔ مطلب ہسپتال میں ہو تم۔“ اس نے بھاری اور شفیق لہجے میں کہا

”آپ لائے ہیں مجھے یہاں؟“ میں نے پوچھا

”ہاں، میں اڈے سے گزر رہا تھا۔ میں تمہیں دیکھا، تمہاری حالت بہت خراب تھی، میں تجھے یہاں لے آیا۔ وہ پی سی او والے کو میں نے تمہارے ذمے جو پیسے تھے، وہ اسے دے دیئے ہیں۔ تمہارے کتے باہر بیٹھے ہیں۔ انہیں میں نے لمانے کے لئے روٹیاں ڈال دی ہیں۔ اور تم اب ٹھیک ہو۔“ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا تو میں خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد مجھے خیال آیا تو میں نے کہا

”آپ کا بہت شکریہ کہ.....“

”نہ نہ، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر، تمہارے کچھ ٹیسٹ میں نے شہر بھجوائے ہیں، آجائیں گے تو تمہاری

دوائیاں بھی آجائیں گی۔ یہاں ہسپتال میں کوئی سہولت نہیں ہے۔ چاہو تو یہاں رہو، یا پھر میرے ساتھ میرے گھر آ جاؤ، یا پھر جیسے تم کہو۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ پھر اگلے ہی لمحے اس پر اعتماد کر لیا۔ اگر وہ میرا دشمن ہوتا تو اب تک میرے ساتھ جو چاہتا کرتا۔

”جیسا آپ چاہیں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو آپ ہی کے حوالے کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ بولا

”تو پھر اٹھو، اگر چل سکو تو آؤ، گھر ہی چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ بیچ پر سے اٹھ گیا اور مجھے سہارا دیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرے بدن سے بدبو کے بجائے اُٹھ رہے ہیں۔ وہ ساری توجہ پر ہی ہوئی تھی۔ میں اس بو سے خود پریشان ہو گیا۔ میں نے اس شخص کے چہرے پر اس بو کا رد عمل دیکھنا چاہا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا، جیسے اسے یہ بو آئی ہی نہ ہو۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ وہ مجھے سہارا دے کر باہر لایا۔ اس دیہاتی ہسپتال کا ڈاکٹر اور کپاؤنڈر باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ انہی کے پاس کتے بیٹھے ہوئے تھے، جو میری طرف آ کر ذرافاصلے پر رک گئے۔ ان سے ذرافاصلے پر ایک کبوتر فوراً ہیل کھڑی تھی۔ تبھی ڈاکٹر نے پوچھا

”جار ہے ہیں آپ؟“

”ہاں ڈاکٹر، ٹیسٹ آجائیں گے تو میں آپ کو زحمت دوں گا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا

”نہیں نہیں سر، آپ بس مجھے ذرافاسفون کر دیں، میں فوراً پیچ جاؤں گا۔ ویسے تو میڈیسن بھی آئی جائیں گی۔“

ڈاکٹر نے تیزی سے کہا تو وہ بولا

”ہاں وہ تو ہے۔ خیر آپ ذرا میری مدد کریں گے، اسے گاڑی تک.....“

”کیوں نہیں،“ یہ کہتے ہوئے وہ دونوں میری جانب بڑھے۔ وہ میرے قریب آئے تو میں نے واضح طور پر انہیں بو سے پریشان ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ انہوں نے مجھے جلدی سے گاڑی میں ڈالا۔ مگر آفرین ہے اس شخص پر، اس کے ماتھے پر ذرا شکن نہیں آئی۔ کتے گاڑی میں بیٹھ گئے تو وہ چل دیا۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک فارم ہاؤس پر ہوا۔ پہلی نگاہ میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ جنگل میں منگول ہے۔ دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ وسیع چار دیواری میں اندر ایک رہائشی عمارت تھی، جس کے پورچ میں اس نے گاڑی روکی اور مجھے سہارا دے کر اندر لے جانے لگا تو چند لوگ آگے بڑھے۔ اس نے انہیں دور رہنے کا اشارہ کیا تو وہ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھے ایک شاندار کمرے میں لے گیا۔ جہاں جہازی ساز کا ایک بیڈ تھا۔ وہاں مجھے لٹا کر بولا

”یہاں آرام کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا اور میں اپنے آپ پر قابو پانے لگا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد تک میں صاف ستھرے لباس میں پڑا ہوا تھا۔ میرے سائیڈ ٹیبل پر میڈیسن تھیں۔ میرا پیٹ بھر چکا تھا اور بخار کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اور وہ میرے پاس کئی چکر لگا چکا تھا۔ میں اب تک اس کے بارے میں یہی اندازہ لگا پایا تھا کہ وہ اس فارم ہاؤس کا مالک ہے۔ بہت ہی اچھا انسان ہے۔ اس نے شہر میں ٹیسٹ کے بعد وہیں کے اچھے ڈاکٹروں سے رابطے کے بعد دوائیاں منگوا کر مجھے دیں۔ میرے کپڑے خود تبدیل کئے۔ کھانا کھلایا اور میڈیسن دے کر چلا گیا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جان سکا تھا۔ نہ میں نے پوچھا اور نہ اس نے مجھے بتایا۔ شاید دوائیوں کا اثر تھا، میں غنودگی میں تھا اور پھر نجانے کب سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو ہر جانب اندھیرا تھا۔ میں ویسے ہی پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد روشنی ہوئی تو وہ میرے سامنے تھا۔

اس کے ہاتھ میں کھانا تھا۔ اس نے میرے سامنے رکھا اور پوچھا

”کیسا محسوس کر رہے ہو جوان؟“

”بہت بہتر۔“ میں نے کہا تو اس نے کھانے کی طرف اشارہ کر کے بولا

”کھاؤ۔ پھر دوا بھی لینی ہے۔“

”آپ اپنے بارے میں مجھے نہیں بتائیں گے۔“ میرا تجسس لیوں پر آ گیا تو وہ ذرا سا مسکرایا اور بولا

”تم کھانا کھاؤ، میں تمہیں بتاتا ہوں۔“

”بہتر۔“ میں نے کہا اور ٹرے اپنے سامنے رکھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا

”میں آرمی سے ریٹائر کر لیا ہوں۔ میرا نام سرفراز حسین ہے۔ میری بیوی بچے، پوتے پوتیاں ہیں۔ وہ سب شہر

میں رہتے ہیں۔ یہ فارم ہاؤس میں نے بنایا ہے۔ میں یہاں بھی رہتا ہوں اور شہر میں بھی۔ شاید تمہارے بارے میں مجھے اس لئے بتایا گیا کہ میں ہی تمہارے نزدیک تھا۔“

”میرے بارے میں بتایا گیا تھا کپ کو؟“ میں نے پوچھا تو اس نے کہا

”ہاں، اسی میجر نے، جو تم سے بھارتی لے گیا تھا۔ میں تم تک پہنچا اور تجھے یہاں لے آیا۔ تمہارے جسم میں

زہراثر کرنے کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ کچھ زخم تھے، بہر حال تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”مجھے یہاں رہنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا

”جانا چاہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ لیکن مشورہ دوں گا کہ کچھ دن یہاں رہو، آرام کرو، گپ شپ کرو میرے

ساتھ، پھر چلے جانا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا، پھر یوں بولا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو، ”اور ہاں، تم گھروالوں کی فکر مت کرنا۔

انہیں بتا دیا گیا ہے۔ وہ مطمئن ہیں۔ کل میں تجھے فون دوں گا۔ باتیں کر لینا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں پرسکون

ہو گیا۔ میں نے کھانا کھایا تو وہ خود برتن لے گیا۔ میں نے وہ دوائیاں کھائیں جو اس نے میرے سر ہانے رکھ دیں تھیں۔

میں لیٹا اور ان حالات پر غور کرنے لگا کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں روہی

والے بابا جی ڈرا آئے تو میں ان کی باتوں پر سوچتے ہوئے نجانے کب سو گیا۔

☆.....☆.....☆

جسپال اور تانی آتے ہی سو گئے تھے۔ دوپہر کے بعد جا کر ان کی آنکھ کھلی تو وہ نہادھو کر فریش ہو گئے۔ سارا دن

کے لئے کھانا بنا چکی تھی۔ کھانے کی میز پر بدر نہیں تھا۔ ان دونوں کے ساتھ وہ چاروں تھے۔ سارا، شاہد معین، اس کا باپ

اور بیٹا مراد۔ وہ کھانے کے ساتھ باتیں بھی کرنے لگے۔ اسی دوران جسپال نے پوچھا

”بدر کہاں گیا؟“

”تم لوگوں کو چھوڑ کر گیا ہے، ابھی تک واپس نہیں آیا اور نہ ہی کوئی اطلاع ہے۔“ سارا دھیرے سے بولی تو اس

نے پوچھا

”کچھ بتا کر گیا ہے؟“

”نہیں، کہہ رہا تھا کہ شام تک لوٹ آئے گا۔“

”اوکے۔“ جسپال نے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دو کھانی کھکے تو وہ دونوں واپس کمرے میں آ گئے۔

تانی بیڈ پر پھیلتے ہوئے بولی

”یہ مہرل شاہ والا کا نشانہ ہوتا تو اب تک ہم واپس جمال کے پاس جا چکے ہوتے۔“

”یہ تو ہے، ویسے ہم نے فون کر کے بھی معلوم نہیں کیا کہ ان کا حال کیا ہے۔“ جسپال نے پوچھا

”تو انہوں نے ہمارا کون سا حال پوچھ لیا ہے۔“ تانی نے جملے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ تہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر

”تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے ہم نے لوٹ کر ان کے پاس جانا ہی نہیں ہے۔“
 ”جانا تو ہے، اگر زندگی نے ساتھ دیا تو۔“ وہ افسردگی سے بولی تو اس نے کہا
 ”تم ایسے کرو، کچھ دیر مزید آرام کر لو۔ لگتا ہے ابھی تم فریش نہیں ہوئی۔“
 ”میں فریش ہی ہوں لیکن اگر تم میرے ساتھ باتیں کرنا چاہتے تو الگ بات ہے۔“ تانی نے کاندھے

اچکاتے ہوئے کہا تو حسیال نے محض اسے ہنسانے کی خاطر رومانوی لہجے میں کہا
 ”کاش تانی تم میری محبوبہ ہوتی تو میں اب تک تیری یہ افسردگی دیکھ کر تجھے باہر گھمانے پھرانے لے جاتا، تجھے
 شاپنگ کراتا، کھانا کھاتا، سیر کراتا۔“

”جسپال، تم ایسا کرو پلیز، چند گھنٹوں کے لئے مجھے مجبورہ بنانی لو۔ کم از کم یہ حسرت تو نہ رہے گی۔“ اس نے غصے
 میں کہا تو جسپال پھر سے ہنس دیا پھر ایک دم سے افسردہ ہوتا ہوا بولا

”پتہ نہیں ہر پریت کس حال میں ہوگی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے پاس لوٹ کر ضرور جاؤں
 گا۔ پر رت جانے، یہ ہوگا بھی یا نہیں۔ پتہ نہیں وہ میرا انتظار ہی کرتی رہے گی۔“

”اوائے ہمیں ہو کیا گیا ہے۔“ تانی نے ایک دم سے خود پر قابو پا کر کہا، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف
 دیکھا اور ہنس دیئے۔ تبھی جسپال نے کہا

”چل آ چلتے ہیں باہر، دیکھا جائے گا، جو ہوگا۔“

اس پر تانی نے ذرا سوچا اور ایک دم سے تیار ہو گئی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر باہر ڈرائیونگ روم میں آئے تو
 سامنے صوفے پر بدر کے ساتھ شاید اور بچل بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سامنے دو سیاہ بیک پڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بدر
 نے کہا

”اچھا ہوا تم دونوں بھی آگئے یار۔“

”خیر ہے؟“ جسپال پوچھتے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھا تو تانی بھی ساتھ میں بیٹھ گئی۔
 ”یہ ہمارا حصہ لے کر آیا ہے۔“ بدر نے سنجیدگی سے کہا تو جسپال نے حیرت سے کہا
 ”حصہ؟“

”ہاں وہی جو پر سارا رام کے گھر سے لوٹا گیا تھا۔“

”وہ سب انہیں دے دو، جنہوں نے ہماری مدد کی تھی۔ وہ وہیں کے مقامی لوگ تھے نا۔“ جسپال نے کہا
 ”اویار پوری بات سن لو، پر سارا رام کے گھر سے کروڑوں روپے نکلے ہیں، سمجھو بوری بھری تھی انہوں نے، وہ اُن
 کے لئے بہت بڑی رقم ہے۔ یہ دونوں بیک سونے سے بھرے ہوئے ہیں۔ نجانے کس کس کا خون چوستا رہا ہے ساری عمر۔
 ایک پوری پوٹلی ہیروں کی ہے۔“ بدر نے تفصیل بتائی

”واؤ۔! مطلب کافی خزانہ ملا ہے۔ خیر، یہ بھی رکھ لیتے۔“ اس نے کہا

”ارے نہیں یار، ان کے لئے وہی بہت بڑی دولت تھی۔ یہ زیور اور ہیرے انہیں کہیں بھی چھنسا سکتے ہیں۔ ظاہر
 ہے انہوں نے اسے کہیں تو بیچنا تھا نا، یہ ان لوگوں نے لئے مصیبت بن سکتا ہے، سوانہوں نے ہماری طرف بھیج دیا ہے۔“
 ”بچل، یہ تم رکھ لو۔“ جسپال نے کہا

”ناسائیں، یہ شے ہمارے لئے خطرناک ہے، ہمیں وہاں سے جو نوٹ مل گئے ہیں نا وہی کافی ہیں۔ یہ آپ

جانو اور آپ کا کام، اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے واقف بھی نہیں ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ پھر اٹھ کر سب سے
 ہاتھ ملایا، کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

”تم لوگ اسے ٹھکانے لگا لو گے؟“ تانی نے پوچھا تو شاہد بولا

”یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ڈھل جائیں گے تو ان کی پہچان ہی نہیں رہے گی۔ ہیرے بہر حال کچھ
“ وہ کہتے کہتے رک گیا تو بدر نے کہا

”شاہد بھائی، تم اس کا جو مرضی کرو، لیکن یہ یاد رکھو کہ ہمیں ابھی کچھ دیر بعد یہاں سے نکل کر کلفٹن کے علاقے
 میں شفٹ ہونا ہے۔ اگرچہ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا ہوں۔“

”اوکے، میں تیار ہوں۔“ شاہد نے اُٹھتے ہوئے کہا تو بدر نے دونوں بیک اسے تھما دیئے تو جسپال نے افسردگی
 سے کہا

”یار ہم تو باہر جانا چاہتے تھے اور تم پھر خانہ بدوش ہو رہے ہو۔“

”باہر کہاں جانا ہے؟“ بدر نے پوچھا

”یار، کوئی کپڑے خریدیں گے، کچھ کھائیں بیٹیں گے، تھوڑی بہت سیر کریں گے۔“ اس نے کہا تو بدر نے
 مسکراتے ہوئے کہا

”یار، کچھ دیر ٹھہر جاؤ، میں کسی کو بلاتا ہوں، اس کے ساتھ بھیج دوں گا۔ اس دوران ہم شفٹ کر لیں۔ آپ لوگ
 ادھر ہی آ جانا۔“

”اوکے۔“ تانی نے ایک دم سے کہا اور ڈرائیونگ روم میں بیٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔

سہ پہر کے بعد شام ہونے کو آگئی تھی، جب ایک نئی سرخ کار انہیں لے کر شہر کی جانب نکلے۔ گہرے سانولے
 رنگ کا بلوچی ان کا ڈرائیور تھا۔ کچھ دیر سڑک پر چلتے رہنے کے بعد اس نے بہترین انگریزی میں پوچھا

”سر، کدھر جانا ہے آپ کو؟“

”کچھ کپڑے خریدیں گے، کھائیں بیٹیں گے اور سنا ہے کراچی ساحل سمندر پر ہے، ساحل دکھلاؤ۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ اس نے کہا اور پھر سامنے دیکھ کر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک بڑے شاپنگ
 پلازہ کے سامنے کار روک دی۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھا پھر ان سے بولا، ”آپ ادھر شاپنگ کرو، میں ادھر کار میں انتظار کرتا
 ہوں۔“

جسپال اور تانی شاپنگ پلازہ میں گھومتے ہوئے اپنی پسند کے کپڑے خریدتے رہے۔ کچھ دیر وہاں گزار کر وہ
 باہر نکل آئے۔ شہر میں پھرتے رہنے کے بعد وہ کلفٹن روڈ پر تین تلواری کی طرف سے ساحل سمندر جاؤ گے۔ جیسے ہی بلوچی
 نے کار روکی، جسپال نے پوچھا
 ”یہ کیوں سی جگہ ہے؟“

”یہ بن قاسم پارک ہے، یہ گنبد اور وہ سامنے چوترا، یہ جہانگیر کوٹھاری کے نام سے مشہور ہے، کافی پرانا ہے
 ۔“ تانی نے کہا

”یہ پارک لگتا ہے، نیا بنا ہے۔“ جسپال نے کہا

”جی، یہ سیدھے جائیں گے تو بن قاسم روڈ ہے۔ اس سے آگے بھی پارک ہے۔ ساحل سمندر وہ سامنے ہے۔
 آپ کہیں تو میں آپ کو ادھر.....“ بلوچی نے جواب دیا تو جسپال بولا

”ٹھیک ہے، اچھا ہے، پیدل وہاں تک جائیں گے، چہل قدمی ہی ہوگی۔ چلیں۔“

”آپ اُدھر جا کر سکون نہ بیٹھیں، گپ شپ کریں، وہاں ساحل تک جائیں، میں آپ کے لئے کھانے کا آرڈر دے دوں، ویسے کیا کھانا پسند کریں گے آپ؟“ بلوچی نے مودب لہجے میں پوچھا

”یہاں کے راویتی کھانے۔“ ثانی نے فوراً جواب دیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا

”میں آپ کو ادھر ہی ملوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

وہ دونوں آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ایک جگہ ثانی نے رک کر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ جہاں اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ پتلی سی، نازک اور سمارٹ سی دکھائی دینے والی ثانی کتنی خوبصورت ہے۔ اس کا سراپا کسی کو بھی پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ کمر گویا ہے ہی نہیں، بھاری سینہ، لمبی گردن، ٹیکھاناک اور شولڈر کٹ گیسو، جو ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اچانک وہ مڑی اور جہاں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا

”اچھا تم کیا بات کر رہے تھے ہر پریت کے بارے میں صبح؟“

اس کے یوں پوچھنے پر جہاں کی آنکھوں کے سامنے ہر پریت کا سراپا لہرا گیا۔ اسے ہر پریت شدت سے یاد آگئی۔ وہ ایک دم سے جذباتی ہو گیا۔ وہ چند لمحے اسے سوچتا رہا پھر پیار بھرے لہجے میں بولا

”کیا یاد کرنا ہے اسے، بس وہ انتظار کر رہی ہوگی، کتنا عرصہ ہو گیا ہے، اسے فون بھی نہیں کیا۔ وہ تو پریشان ہوگئی ہوگی نا۔“

”جہاں، یہ زندگی بھی کیا شے ہے، بندے کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ اگلے پل کیا ہونے والا ہے اور پھر بھی کتنوں کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ کتنے وعدے، کتنا پیار، چیزوں کے ساتھ، انسانوں کے ساتھ، پر ہوتا کیا ہے، کچھ بھی نہیں ایک دم سب کچھ ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔“ ثانی دور آسمان پر پھیلے ہوئے بادلوں کو دیکھتے ہوئے بولی تو جہاں چونک گیا۔ اس نے پیار سے ثانی کا ہاتھ پکڑا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں پلے کر کہا

”ثانی، اتنی مایوسی کیوں؟“

اس پر وہ ہلکے سے مسکرا دی، پھر اپنا سر جھٹکتے ہوئے اس کی جانب دیکھ کر بولی

”نہیں میں مایوس نہیں ہوں، بلکہ یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم جسے چاہتے ہیں اس سے اتنا دور کیوں ہو جاتے ہیں؟ دیکھو، تم اور ہر پریت ایک دوسرے سے کتنا دور ہو، میں اور جمال کہاں کہاں بھٹک رہے ہیں۔ تمہارے اور ہر پریت کے درمیان کوئی نہیں ہے، لیکن مجھے تو یہ بھی پتہ کہ جمال میرا ہے بھی یا کہ نہیں، میں اس کے لئے اپنا آپ دائرہ چکی ہوں، اسے شاید اس کا احساس بھی نہیں ہوگا۔“

”ہاں۔! یہ بندے کی سوچ ہی تو ہے۔ جو اسے دور کرتی ہے یا پھر نزدیک، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم خود ہی یہ سارا جھنجٹ پال لیتے ہیں؟“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”ہاں، شاید تم سچ کہتے ہو۔ جب تک میں نے جمال کو دیکھا نہیں تھا۔ اس کی صورت میرے سامنے نہیں آئی تھی، تب بلاشبہ وہ ایک آئینہ دل کی صورت میں میرے لاشعور میں پڑا تھا۔ وہ سامنے آیا تو ایک دم سے مجھے خود اپنے اندر پڑی محبت کا احساس ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے میں ایسی کہاں تھی۔ اپنے آپ سے لا پرواہ، وہیں روی کے صحرا میں پڑی تھی۔ اس کی محبت نے مجھے یہاں لا کر پھینک دیا ہے اور اب بھی اسکے پاس نہیں ہوں۔ یہ سب میرے اپنے اندر ہی تو چل رہا ہے، میں اپنی سوچوں ہی کے تابع سب کرنی چلی جا رہی ہوں، اس میں جمال کا تو کوئی بھی قصور نہیں ہے۔“

”بالکل ایسے ہی ہے۔ ہر پریت کو میں نے پہلے کون سا دیکھا ہوا تھا۔ اس کی صورت سامنے آئی تو ہی میں اس پر نہال ہو گیا ہوں۔“ جہاں نے کہا

”میں اکثر سوچتی ہوں، یہ ہماری اپنی ہی محبت ہے، جو اپنا آپ ظاہر کرتی ہے، اپنے ہونے کا احساس دیتی ہے۔ ہمارے اندر، جیسی محبت ہوگی، ویسا ہی اظہار کرے گی نا۔“ ثانی نے دھیمے لہجے میں کہا

”مثلاً کیسے؟“ جہاں نے پوچھا

”دیکھو، جو مغربی قوم ہے، محبت اس میں بھی ہے، لیکن وہ جسم کی ضرورت کو محبت کا نام دیتے ہیں، ان کے ہاں پیار اور محبت کا مطلب فقط جنس ہے۔ بہت کم وہ محبت ہے جو جسم کی ضرورت سے ماورا ہیں، جبکہ ہمارے ادھر مشرق میں، ایسی محبت کو محبت کا قتل تصور کیا جاتا ہے، جسم سے ماورا ہو کر محبت کی جاتی ہے۔ میں اس سے بحث نہیں کرتی کہ ان دونوں میں کیا خوبی ہے اور کیا خرابی ہے، میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ یہ ہمارے اندر کا تصور ہے جسے عملی صورت میں ہم ظاہر کرتے ہیں۔“ ثانی نے دھیرے سے کہا اور ایک بچ پرا کر بیٹھ گئی، جبکہ جہاں کھڑا رہا

”تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ ہماری اپنی سوچ ہی کسی کے ساتھ محبت یا نفرت کا باعث بنتی ہے۔“ اس نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی

”بالکل، اگر ہمارے اندر محبت نہیں ہوگی تو وہ کیسے ظاہر ہوگی، خالی برتن میں سے کیا نکلے گا؟“

”ہاں، یہ بات تو ہے، ویسے ہم کچھ زیادہ ہی سنجیدہ باتیں نہیں کرنے لگے؟“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا

”نہیں، یہ سنجیدہ باتیں نہیں ہیں، یہ تو عام سی بات ہے، اصل میں ہم اپنے اندر جھانکتے ہی نہیں۔ کتنی عجیب بات ہے تاکہ ہم اپنے لئے وقت ہی نہیں نکالتے، ہم جو ہیں، اپنے بارے میں جانتے ہی نہیں؟“ ثانی پھر سے سنجیدہ ہونے لگی تو جہاں بولا

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو، انسان نے اپنے بارے میں تحقیق اتنی کر لی ہے، جس کا کوئی انت نہیں۔“ جہاں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

”کتنی کر لی ہے، کچھ بھی نہیں۔ اگر انسان نے اپنے بارے میں تحقیق کی ہوتی، اپنے اندر جھانک کر دیکھا ہوتا تو ہم اس جگہ یوں نہ کھڑے ہوتے، یہ گولی ایجاد بھی نہ ہوتی اور ہر طرف جنت کا نظارہ ہوتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو جہاں نے کہا

”یہ تم نے اتنی موٹی موٹی باتیں کہاں سے سیکھیں ہیں، ویسے تمہارے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم، کبھی اس طرح کی بات ہی نہیں ہوئی۔“

”دیکھو، اب میرے بارے میں جاننے کا تجسس کہاں ہے، تمہارے اندر تھا نا، باہر آ گیا۔“ وہ تیزی سے بولی تو جہاں نے کہا

”تم میرا سوال گول کر گئی ہو۔“

”نہیں، ابھی وقت نہیں ہے اس جواب کا، پھر کسی وقت جواب دوں گی۔“ اس نے کہا اور مغرب کی جانب دیکھا۔ جہاں سورج نے افق کو سرخ کر دیا ہوا تھا، جس کی گواہی بادل بھی دے رہے تھے۔ تیز ہوا سے ان کا لباس جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔

”واپس چلیں۔“ جہاں نے پوچھا

”دل تو یہی چاہتا ہے کہ یہاں سکون سے بیٹھی رہوں۔ لیکن کب تک بیٹھوں گی یہاں، آخر جانا تو ہے۔“ یہ کہہ کر

وہ اٹھ گئی۔ دونوں چلتے ہوئے پارک سے باہر جانے والے راستے پر ہو گئے۔

وہ دھیمی چال چلتے موسم کا لطف لیتے ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں سامنے کھڑا ہوا بلوچی دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ان کی وہی سرخ کار کھڑی تھی۔ ملجگا اندر اچھا گیا تھا۔ شہر کی بتیاں روشن تھیں۔ چند قدم کے بعد وہ کار میں جا کر بیٹھنے والے تھے کہ اچانک سامنے سڑک پر ایک کار تیزی سے آن رکی۔ اسی کے پیچھے ایک ڈبل کیبن فور و جیل رک گئی۔ ان گاڑیوں کے رکنے کے انداز ہی سے دونوں چونکا ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور اس میں سے گن کی بال برآمد ہوئی۔ اس سے پہلے کہ فائر ہوتا، وہ زمین پر لیٹ گئے۔ یہ فطری بات تھی کہ وہ سریالوں کا نشانہ لیتے۔ وہ فوری طور پر ان کے حملے سے بچ گئے۔ ایک دم ہی سے کئی فائر ہوئے تھے۔ پارک کا گیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ دونوں ہی لڑھکتے ہوئے اس کی آڑ میں چلے گئے تھے۔ اچانک دوسرا برسٹ ہوا۔ تب تک جیپال نے اپنا ہاسٹل نکال لیا تھا۔ اسی لمحے تانی کے ہاتھ میں بھی ہاسٹل دکھائی دیا۔ انہوں نے سامنے دیکھ کر جوابی فائر کرنا چاہا، لیکن سامنے دونوں گاڑیاں پر کئی فائر لگے ہوئے تھے۔ جیپال نے ادھر ادھر دیکھا، ذرا سے فاصلے پر بلوچی اپنا ہاسٹل لئے پوزیشن میں تھا۔ اور اس سے پیچھے کافی سارے لوگ گتیں لئے ان گاڑیوں پر فائر کر رہے تھے۔ تب جیپال کو احساس ہوا کہ گھر سے بھیجنے میں بدر کو اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔ ایک پورا گروپ اس کے ساتھ نگرانی کو بھیجا ہوا تھا۔ سامنے سے کوئی فائر نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کم از کم گاڑیوں کے ٹائر ہی پتھر کر دے جائیں، ان کی پشت سے کئی فائر ہوئے۔ جن میں سے کچھ باڈی پر لگے اور دونوں کے ٹائر یکے بعد دیگرے زوردار آواز سے پھٹ گئے۔ اس کے ساتھ اس میں سے کچھ بندے نکلے اور انہوں نے بھاگنے کے لئے سڑک پار کرنا چاہی۔ اسی لمحے سامنے سے دو افراد نے ان کو نشانہ پر لے لیا۔ ان میں سے کسی نے جوابی فائر کیا، کوئی سڑک پر گر گیا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ سب گرائے گئے۔ وہ سب تیزی سے آگے بڑھے۔ اتنے میں ان کے قریب ایک ہائی ایس وین آ کر رک گئی۔ ساتھ میں کیری ڈیو تھا، انہوں نے ان سب کو اٹھا کر ان گاڑیوں میں پھینکا اور چل دیئے۔ ایک دم سے ماحول پرسکون ہو گیا۔ وہاں پر موجود لوگ جو سہمے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ باہر آنے لگے تھے۔

”سرا! آجائیں، اب کوئی نہیں ہے ادھر، کھانا کھاتے ہیں۔“

”نہیں، اب بھی کوئی ہو سکتا ہے، محتاط رہو، جو ہمارے بارے میں یہ جان سکتا ہے کہ ہم کدھر ہیں، وہ درست پلاننگ بھی کر سکتا ہے۔“ جیپال نے اسے سمجھایا تو وہ بولا

”سر، یہ اصغر ذکیت کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ ان کا طریقہ واردات ہم جانتے ہیں۔“

”بحث نہیں، اب نکلو،“ تانی نے کہا تو بلوچی کا منہ اچکا کر رہ گیا۔ وہ کار میں بیٹھ گئے تھے، اسی وقت بدر کا

فون آ گیا

”سنا ہے کوئی راہ میں مل گیا تھا؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے بھرپور تہمت لگا دیا

”ہاں، باقی سب بھی سن لیا ہوگا۔“ جیپال نے جواب دیا تو اس نے کہا

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”واپس آ رہا ہوں گھر۔“ جیپال نے جواب دیا

”نہیں، وہ کیوں کھانا تو کھاؤ یا، وہ تیار ہے اور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ بدر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو

جیپال بولا

”اب مزہ نہیں آئے گا یا، ممکن ہے ادھر.....“

”تم کھاؤ کھانا، رزق کو یوں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ رب ناراض ہوتا ہے۔“ اس نے کہا تو وہ بولا

”اوکے، میں کھانا کھا کر ہی آتا ہوں۔“

یہ سن کر اس نے فون بند کر دیا اور بلوچی سے ریسٹوران کی طرف جانے کو کہا۔

وہ ایک بانسوں سے بنا ہوا جدید طرز کا ریسٹوران تھا۔ جو ساحل کے اوپر تھا اور نیچے پانی کی لہریں تھیں۔ سامنے ہی بدر بیٹھا ہوا تھا، جو اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جیپال اور تانی اس کے سامنے بیٹھتے گئے تو وہ بولا

”تمہیں یہاں تنہا چھوڑ دوں یا پھر کوئی تم دونوں کو خراش بھی لگا جائے تو میرا ہونا تو پھر نہ ہونا باؤ جی۔“ اس نے پنجابی میں کہا تو جیپال ہنس دیا، اس پر تانی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تنبیہ کی سے کہا

”زیادہ مت ہنس، کوئی اب بھی یہاں ہوگا۔“

”کوئی نہیں ہے میڈم، اس وقت یہاں جتنے بندے ہیں، یہ سب ہمارے ہیں۔ باہر بھی، سب کھانی رہے

ہیں۔ پلیز آپ بھی ذرا ان خوبصورت لیوں پر مسکرا ہٹ لے آئیں۔“ بدر ایک دم سے شوخ ہو گیا تھا۔ فطری طور پر تانی مسکرا دی تو جیپال نے پوچھا

”اصغر ذکیت ہی کے بندے تھے؟“

”ہوں، وہی تھے، مہرل شاہ نے انہیں بھجوا دیا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔“

”تم مجھے بتا دیجئے، میں.....“ جیپال نے کہا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا

”ناجانی ایسا مت کہہ۔ تو نے یہاں آ کر ایک یہی تو خواہش کی تھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو جیپال نے پوچھا

”انہیں ہمارے بارے میں کیسے پتہ چل گیا کہ ہم کہاں پر ہیں؟“

”دیکھ جانی، یہ علاقہ میرا ہے۔ یہاں میرے بارے جاننے کو بہت سارے لوگ ہیں۔ انہیں اس وقت بھی

معلوم ہوگا کہ میں کہاں پر ہوں۔“ بدر نے کہا

”تو یہ خطرناک بات ہے۔“ تانی نے تیزی سے کہا تو وہ اطمینان سے بولا

”نہیں، میں خود آیا ہوں ان کے سامنے، اگر نہ آتا تو اس وقت ان کے بندے کیسے ہاتھ چڑھتے اور پھر وہ

لوگ اس وقت کچھ ایجنٹوں کے ہاتھ میں ہیں۔ مہرل شاہ کوئی معمولی شے نہیں۔ نہ ہی وہ پر سارا رام ہے کہ جسے ہم یونہی مار

دیں گے۔ اس کے لئے بہت سوچنا ہوگا اور پلان بنانا ہوگا۔“

اسی دوران کھانا ان کے سامنے لگایا جانے لگا تو جیپال نے کہا

”اوکے، فی الحال رزق سامنے آ گیا ہے، اب اس پر توجہ دو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس کھانے کے بعد ہم چار بندے یہاں سے نکل رہے ہیں، مہرل شاہ کی طرف، دیکھا

جائے گا۔“ بدر نے کہا تو جیپال نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وقت کیا ہو گیا ہوگا۔ میں بیڈ پر پڑا اپنے حالات

کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان میں جہاں میں کرل سرفراز کے بارے میں سوچتا، اسی کے ساتھ روہی والے بابا جی بھی میری

نگاہوں کے سامنے آ جاتے۔ میرا موت کے منہ سے نکل آنا، دریا پار کرنے میں ان کتوں کی مدد کرنا، جو مجھے ہی چیرنے

پھاڑنے کے لئے آئے تھے اور لب دریا روہی والے بابا جی کا ملنا، ان کی باتیں اور پھر کرل سرفراز کا ملنا، مجھے سب ایک

ہی سلسلے کی کڑی لگ رہے تھے۔ ایک بات میرے ذہن میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بابا جی نے روہی میں جب ملاقات کی

تھی۔ اس وقت یہ کہا تھا کہ ہم فقط دو بار ہی ملیں گے، لیکن وہ اب تک مجھے کئی بار مل چکے تھے۔ کیا ان کا کہنا غلط تھا؟ اگر کہنا

درست تھا تو مجھے کیوں اور کیسے مل رہے تھے؟ کیا یہ بھی کوئی راز ہے۔ میں نے طے کر لیا کہ اس دفعہ اگر ان سے ملاقات ہوئی تو یہ بات ان سے ضرور پوچھوں گا۔ کرل سرفراز کی شخصیت بھی مجھے بڑی ماورائی سی لگ رہی تھی۔ بظاہر اتنا سادہ بندہ، اتنا مشفق، میرے بے کی بدبو جسے محسوس بھی نہیں ہوئی، اتنا بڑا محل نما گھر اور وہ خود میری خدمت کر رہا ہے۔ حالانکہ اس نے نوکر بھی مجھے دکھائی دیئے تھے۔ میں سوچتا رہا۔ جب اکتا گیا تو بیڈ سے اٹھا اور کمرے میں روشنی کرنے کے لئے اٹھا۔ انہی لمحات میں کمرہ روشن ہو گیا۔ کرل سرفراز میرے سامنے کھڑا تھا، اس کے لبوں پر دھیمی سی پروقار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور بیڈ پر میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا

”کیسی طبعیت ہے اب؟“

”بہت اچھی، بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“

”گڈ۔ اس کا مطلب بھوک بھی لگی ہوگی۔“ اس نے کہا تو میری بھوک ایک دم سے جاگ گئی۔ میں نے ہلکے

سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا

”جی، بھوک تو لگ رہی ہے۔“

”آؤ پھر ڈرائیونگ روم میں چلتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائیونگ روم میں آ گیا۔ کھانے کی میز بھری پڑی تھی۔ ہم وہاں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ اس دوران کرل سرفراز نے میری طرف دیکھ کر پوچھا

”چوہدری شاہنواز کے بارے میں جانتے ہو کہ اسکے ساتھ کیا ہوا؟“

”نہیں، میں معلوم کر ہی نہیں پایا اس کا مجھے موقع ہی نہیں ملا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے

”وہ اس وقت خفیہ والوں کے پاس ہے۔ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا، اس کے ثبوت مل گئے ہیں۔“

کرل سرفراز نے بتایا

”کیا کر رہا تھا وہ؟“ میں نے پوچھا

”اس نے تمہارے علاقے میں بھارتی خفیہ کاسٹرنر بنایا ہوا تھا۔ باہر سے لوگ یہاں آتے تھے اور وہ یہاں سے انہیں آگے بھیج دیتا تھا۔ مطلب انہیں ہر طرح کا تحفظ دیتا تھا۔ دوسرا وہ سیاست میں سرگرم ہی اسی لئے تھا کہ علاقے میں جرائم پیشہ لوگوں کو تحفظ دے اور ان کے ذریعے لوگوں کو خوف زدہ رکھے۔ ان میں قتل، اغوا، ڈکیتی کی واردتیں شامل ہیں۔“

کرل سرفراز نے تفصیل سے بتایا

”مطلب، سب کچھ جو ہمارے ملک میں جاگیر دار کر رہے ہیں، اسی کی آڑ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ویسے کتنا بڑا المیہ ہے کہ یہ لوگ ملک اور عوام کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہی جاگیر دار، وڈیرے اس ملک کے سیاست دان بنے ہوئے ہیں۔ عوام بے چاری.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا

”عوام بے چاری نہیں ہے۔ یہ رب تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو قوم اپنی حالت نہیں بدلنا چاہتی، وہ اس قوم کو اسی حال میں رکھتا ہے، جس میں وہ پڑی ہوئی ہے۔ یہ قصور اس قوم ہی کا ہے کہ وہ خود پر ظلم کروا رہی ہے۔“ اس نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا

”بات تو ساری شعور کی ہے ناجی۔ اس قوم کو شعور ہی نہیں ہے کہ وہ خود میں کیا ہیں۔“ میں نے کہا تو کرل سرفراز ایک دم سے مسکرا دیا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا

”جمال، تم ایک قوم کی بات کر رہے ہو۔ میں کہتا ہوں، خود انسان اپنے آپ کے سامنے رکاوٹ ہے، اور اسے احساس ہی نہیں ہے۔“

”رکاوٹ، کیسی رکاوٹ، ہر انسان ترقی چاہتا ہے، اگر مجموعی طور پر دیکھیں تو انسان نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ اس نے اس دنیا کو کیا کچھ نہیں دے دیا۔“ میں نے تیزی سے کہا

”کس چیز کی ترقی، کس میں ترقی؟ انسان کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا اس میں انسان نے ترقی کر لی ہے یا، اس کا پہلے سے بھی زیادہ ماحال ہو گیا ہے؟“

”ہاں، یہ تو ہے کہ اگر انسان نے کسی شے میں ترقی کی ہے، تو اسی قدر اپنی جاہی کے لئے بھی سامان کر لئے ہیں۔“ میں نے اسکی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا

”کیا انسان کا دنیا میں آنے کا یہی مقصد ہے؟“

”تو پھر اور کیا ہے۔ یہی کہ انسان اپنے رب کی عبادت کرے۔ اس کے مطابق چلے۔“

”یہ سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی انسان اپنی ہی جاہی کے دہرے کیوں ہو گیا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ خون کے رشتے بھی، ایک دوسرے کا خون بہا دیتے ہیں۔ یہ جو اتنی خون ریزی ہو رہی ہے، اور غور کرو تو ہر مذہب کا بندہ ایک دوسرے سے لڑ رہا ہے۔ ہم ہندوؤں کے خلاف لڑ رہے ہیں، ہندو ہمیں ختم کرنے کے دہرے ہیں، سکھ اور ہندو لڑ رہے ہیں۔ عیسائی دنیا اسلام کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ یہودی پوری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی تک دود میں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک نئی قوت پیدا ہو گئی، جو مذہبی لوگوں کے خلاف ہے اور انہیں ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ہر مذہب کے لوگوں میں فرقے ہیں، وہ ایک دوسرے کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا ہے یہ سب کچھ۔ یہ ہم دھماکے، یہ دہشت گردی یہ کیا ہے؟“

”میرے خیال میں جو رب تعالیٰ سے ڈرنے والے لوگ ہیں وہ ایسا نہیں کرتے۔“ میں نے دلیل دیتے ہوئے

کہا تو وہ بولا

”میں مان لیتا ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے کہ جو ساری دنیا کے مذہبی رہنما ہیں، انہی کے ہاتھوں زیادہ خون ریزی ہو رہی ہے۔ کیا تم اخبار نہیں پڑھتے، خبروں کو نہیں جانتے۔ قرآن کو جلا نے کا واقعہ کئی عام آدمی نے تو نہیں کیا اور اگر ان کی فہرست بتائی جائے تو بہت طویل ہے، لیکن میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں مذہبی لوگوں کو تشدد پسند ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو مجموعی انسانیت کی بات کرتا ہوں کہ بحیثیت انسان، ہم کیا کر رہے ہیں۔“ کرل سرفراز نے سنبھالتے ہوئے کہا تو میں نے

کہا

”ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی لوگوں کے لبادے میں آ کر انسانیت دشمن اپنا دار کر رہے ہیں؟“

”تم اسے اس نکتہ نگاہ سے دیکھ لو۔ جیسے بھی دیکھو، نتیجہ یہی ہے کہ انسان مر رہا ہے، اس کی صورت کوئی بھی ہو۔“

اس نے میری طرف دیکھ کے کہا

”یہ المیہ تو ہے، آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے، اس کی وجہ ہے آپ کے ذہن میں؟“ میں نے پوچھا تو وہ اپنا

سر ہلاتے ہوئے بولا

”یہی سوال ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ہمیں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

”تو پھر سمجھائیں نا آپ؟“ میں نے جس سے کہا تو وہ بولا

”ضرور، کیوں نہیں، تم یہ بات سمجھ جاؤ، شاید اسی لئے تم یہاں ہو۔ میں تمہیں دلیل اور ثبوت کے ساتھ یہ بات سمجھاؤں گا، لیکن ابھی نہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ اور میری بات سمجھنے کے قابل ہو جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا

”ابھی تم یہاں سے جا کر اپنی میڈیسن لینا اور کچھ بھی سوچے بغیر سکون سے سو جانا۔“ یہ کہہ وہ کھانے کی طرف

☆.....☆.....☆

وہ کراچی کا جدید ترین پوش علاقہ تھا۔ دورویہ سڑک کے درمیان نصب پول سے پہلی روشنی اندھیرے کو دور کر رہی تھی۔ ایسے میں سرخ کار دھیمی رفتار سے چلتی جا رہی تھی۔ بلوچی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ بدراگلی سیٹ پر تھا۔ چپال اور تانی پچھلی نشست پر تھے۔ ریستوران سے لے کر یہاں تک ان کے درمیان خاموشی تھی۔ تبھی بدر نے کہا ”ہم جس طرف جا رہے ہیں، وہ مہرل شاہ کا گھر نہیں ہے۔ وہ جہاں رہتا ہے، وہاں کی سیکورٹی اتنی ہے کہ کاروائی ہو بھی جائے تو بندہ نہیں نکل سکتا۔“

”تو پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ چپال نے پوچھا
”خبر یہ ہے کہ مہرل شاہ یہاں کے ایک بنگلے میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ بھی سیکورٹی بہت ہے۔ لیکن ہم نے اسے جانے تو نہیں دینا۔“ بدر نے یوں کہا جیسے خود کلائی کر رہا ہو
”تو پلان کیا ہے؟“ چپال ہی نے پوچھا تو وہ بولا
”اگر سڑک پر بھی حملہ کیا تو یہاں سے نہیں نکل پائیں گے۔ ہم اس بنگلے میں جائیں گے۔“ بدر نے کہا تو تانی قہقہہ لگا کر بولی

”اور کیا وہاں سے نکلنا آسان ہوگا؟ جو پہلے ہی اتنے لاؤ لٹکر کے ساتھ وہاں جا رہا ہے، وہاں اس بنگلے میں کوئی اہتمام نہیں ہوگا بدر ڈیر۔“

”میں مانتا ہوں کہ وہ قلعہ نما بنگلہ ہے، لیکن وہاں پر کچھ ایسا ہے، سب کچھ میں کروں گا، تم دونوں نے مجھے کو رہنا ہے۔ بلوچی کی صرف یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال لے جائے۔“ بدر نے پلان بتاتے ہوئے کہا تو چپال نے کہا

”اگر ہم کار تک پہنچ گئے تو.....“

”ظاہر ہے، ہم کار میں بیٹھیں گے تو وہ جائے گا یہاں سے۔“ بدر نے پھر کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو چپال نے اس کی بات مانتے ہوئے سر ہلا کر کہا ”اوکے۔“

بلوچی اسی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر یونہی چلتے رہے کہ بدر کا فون بج اٹھا۔ وہ صرف مس کال تھی۔ اس کے نیچے ہی جیسے بدر میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔

”چلو، وہ نکلنے والا ہے۔“ اس کے یوں کہتے ہی بلوچی نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ بنگلے تیزی سے پیچھے جانے لگے۔ ایک جگہ جا کر اس نے بریک لگا دیئے۔ بدر نے ادھر ادھر دیکھا، اور کار سے اتر کر انہیں بھی اتر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر آ کر آگے بڑھے تو وہ بولا، ”اچھی طرح یہ علاقہ دیکھ لو، ہم کار کے علاوہ بھی نکل سکیں۔“

”اوکے۔“ چپال نے کہا تو اس نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا
”وہ دیکھو، سامنے، سفید اور نیلے رنگ کا بنگلہ ہے نا۔ ہم نے وہاں تک جانا ہے۔ صرف جانا ہی نہیں اس کے اندر بھی اترتا ہے۔“

”وہ مہرل شاہ کہاں ملے گا؟“ تانی نے پوچھا

”وہ اس بنگلے میں ہے اور ابھی وہاں سے نکلنا چاہتا ہے۔“ بدر نے کہا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ اس کے ساتھ

تیزی سے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ باؤنڈری وال تک جا پہنچے۔ وہاں کافی روشنی تھی۔ وہ جلدی سے ایک درخت کے ساتھ لگ گئے۔ وہ کچھ دیر کسی رد عمل کا انتظار کرتے رہے، جب کچھ نہ ہوا تو وہ وہاں سے نکلے۔ ان کے لئے باؤنڈری وال پار کرنا مشکل نہیں تھا۔ چند لمحوں میں ہی چپال دیوار پر تھا۔ اس نے پہلے بدر کو اوپر کھینچا، بدر اوپر پہنچ کر دوسری جانب اتر گیا۔ پھر تانی نیچے آئی اس کے بعد چپال آ گیا۔ وہ زمین سے لگے پودوں میں دبک کر سامنے دیکھ رہے تھے۔ کافی فاصلے پر بڑے سے لان میں صوفے دائرے میں لگے ہوئے تھے۔ ان پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں سرخ قالین تھا، جس پر دو طوائفیں ناچ رہی تھیں۔ صوفوں کے آگے میز تھے۔ جب پر مختلف مشروب تھے۔ ان میں شراب کی بوتلیں بھی تھیں۔ بلاشبہ وہ مخصوص لوگوں کی عیاشی تھی۔ وہ طوائفیں بھی کوئی تعلقیت قسم کی نہیں تھیں بلکہ آدھے سے زیادہ برہنہ تھیں۔ صوفوں پر بیٹھے ہوئے بدست لوگ ان پر نوٹ نچاؤ کر رہے تھے۔ سبھی نے مہرل شاہ کو دیکھا کہ وہ کہاں پر ہے۔ انہیں وہ دکھائی نہیں دیا، ایک لمحے کے لئے ان پر مایوسی چھا گئی کہ کہیں وہ چلا نہ گیا ہو۔

”دکھائی نہیں دے رہا ہے؟“ بدر نے سرگوشی میں کہا تو چپال بولا

”چل تھوڑا آگے نکل، شاید دکھائی دے جائے۔“

”تم لوگ سیکورٹی والوں کو نظر انداز کر رہے ہو۔ پہلے انہیں تو دیکھ لو۔“ تانی نے سرگوشی میں تیزی سے کہا تو

چپال بولا

”وہ دیکھو، ان سے کچھ فاصلے پر گارڈز ہیں، بے وقوف ایک ہی سمت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”ممکن ہے، دوسری طرف بھی ہوں۔“ تانی نے کہا تو چپال آگے بڑھتے ہوئے بولا

”جب آہی گئے ہیں تو اپنا کام کریں یہ کن چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ پھر اکڑوں ہو کر لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا گیا۔ اسی کے پیچھے بدر اور تانی بھی بڑھتے چلے گئے۔ کافی آگے تک جا کر انہیں وہ سارا منظر صاف نظر آنے لگا۔

وہ سب نشے میں دھت تھے۔ شراب و شباب کا نشہ سرچڑھ کر بول رہا تھا، گارڈز ایک طرف کھڑے اسی تماشے میں محو تھے۔ محفل پر رنگ آیا ہوا تھا۔ مہرل شاہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ طوائفیں ناچ رہی تھیں، کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ اس دوران چپال نے سارے منظر کو سمجھ لیا تھا۔ اس کے مطابق بدر جو کرنے جا رہا تھا، وہ غلط تھا اور خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ جو سوچ رہا تھا، وہ اگرچہ خطرناک تو تھا، لیکن اس میں کامیابی کے امکانات زیادہ تھے۔ اس نے اپنی سوچ بارے بدر کو نہیں بتایا، بلکہ خاموش رہا۔ اچانک مہرل شاہ اٹھا تو ایک لمحے کے لئے محفل ڈسٹرب ہوگئی۔ اچھی خاصی ہانپل تھی۔ لوگ اٹھ اٹھ کر اس سے سلام کر رہے تھے۔ اس دوران اس کی سیکورٹی پر مامور لوگ آگے بڑھ آئے تھے، تاکہ اسے اپنی حفاظت میں لے لیں۔ اسی وقت پتہ چل گیا کہ اس کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔

مہرل شاہ نے لوگوں سے مل کر جیسے ہی محفل سے باہر نکلنے کے لئے قدم بڑھائے، بدر تیزی سے آگے بڑھا۔ تانی اس کے پیچھے کسی لمبی کی مانند بڑھی، جبکہ چپال ذرا ہٹ کر اس فوارے کی جانب بڑھا، جو ان کے راستے میں آتا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتے جا رہے تھے۔ مہرل شاہ ان کے نشانے پر تھا۔ اچانک بدر اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے مہرل شاہ کو اپنے نشانے پر لے لیا تھا۔

”کون ہو تم؟“ مہرل شاہ نے ایک دم سے رکتے ہوئے کہا تو بدر بولا

”تمہاری موت؟“

اس کے یوں کہنے پر مہرل شاہ ایک دم سے فہم دیا۔ لیکن اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔ اگرچہ چپال اس سے پہلے نہ ملا

ہوتا تو شاید وہ بھی اس سے دھوکا کھا جاتا۔ اس نے یہی تاثر دیا تھا کہ وہ ڈرا نہیں ہے۔

”میں جب چاہوں گا نا بچے، موت تب آئے گی۔ تم پاگل ہو جو میرے راستے میں آگئے ہو۔“ مہرل شاہ نے کہا۔ جہاں سمجھ رہا تھا کہ وہ محض وقت لے رہا ہے، بدر خواہ خواہ ڈائیلاگ بازی میں پڑ گیا ہے۔ اسے اب تک ختم کر دینا چاہیے تھا۔

”میں تو آ گیا ہوں، تمہارے راستے میں۔ اب روک لو مجھے۔“ بدر نے سرد لہجے میں کہا، اسی لمحے چشم زدن میں مہرل شاہ نیچے بیٹھ گیا۔ بدر نے گولی چلا دی، جو سامنے والے گارڈ کے گلی۔ صرف لمحے کا ذرا سا حصہ تھا، گولیاں اس کے بدن کے آر پار ہو سکتی تھیں۔ سامنے والے گارڈ نے گنیں سیدھی کر لیں تھیں۔ جہاں اور مہرل شاہ کے درمیان ایک جست کا فاصلہ تھا، جہاں نے وہ وقت ضائع نہیں کیا اور ایک ہی جست میں مہرل شاہ پر جا گرا۔ اور اسے لے کر لڑھک گیا۔ وہ اس نئی افتاد سے ایک دم چونک گئے۔ اسی لمحے تانی نے پسل لہراتے ہوئے اٹھی اور آگے بڑھ کر اونچی آواز میں کہا ”خبردار۔! اگر کوئی ہلا تو جان سے مار دوں گی۔“

وہ سب ایک دم ساکت ہو گئے۔ اتنے میں جہاں نے مہرل شاہ کی گردن پکڑ لی تھی اور پسل کی نال اس کے منہ میں دیتے ہوئے بولا

”ہٹو، ورنہ مار دوں گا۔“

گارڈز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ وہیں ساکت تھے۔ تبھی جہاں نے مہرل شاہ کے منہ پر چھڑ مارتے ہوئے کہا

”صرف ڈیل کا حساب کرنا ہے، کرو تو زندگی، ورنہ یہیں مار دوں گا، کہا تھا نہ کہ دھوکا دو گے تو مار دوں گا۔“ مہرل شاہ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا تو جہاں بولا، ”ابھی چلو ساتھ، بتاتا ہوں، زندگی یا موت اب تیرے اپنے ہاتھ میں ہے نا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسے بھی اٹھایا، تب تک بدر اور تانی نے گارڈز کو روک کر لیا۔

مہرل شاہ کا فانی بھاری تھا اس نے مزاحمت کی لیکن جہاں نے پھر بھی اسے اٹھالیا۔ وہ تیزی سے لے کر اُسے بھاگا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ بدر اور تانی اُلٹے قدموں آئے، انہوں نے ڈرائیور کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ نکل گیا۔ جہاں نے اسے گاڑی میں پھینکا، بدر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ساتھ تانی بیٹھی اور نکل پڑے۔ سامنے اٹنی گیٹ تھا۔ گارڈز سامنے گنیں تانے کھڑے تھے۔ مہرل شاہ خود کو بچانے کی فکر میں تھا۔ جہاں نے توجہ نہیں دی بلکہ اس نے اپنی جیب سے دستی بم نکال کر گاڑی کی جانب پھینک دیا۔ اس دوران جیسے ہی جہاں کی گرفت ڈھیلی ہوئی، مہرل شاہ نے گرفت سے نکلنا چاہا۔ تانی دیکھ رہی تھی۔ اس نے پسل کا دستہ اس کے سر پر مارا، اسی کے ساتھ ہی دھماکا ہوا تو ساتھ ہی فائرنگ ہونے لگی۔ جب تک وہ گیٹ تک پہنچے، باہر سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ یکے بعد دیگرے تین چار دھماکے ہوئے۔ گیٹ کے پرچے اڑ گئے۔ وہ گاڑی لیے باہر نکل گئے۔ سامنے ہی سرخ کار لیے بلوچ ان کے انتظار میں تھا اور اس کے ساتھ ان کے کافی سارے ساتھی کئی ساری گاڑیوں میں تھے۔ وہ گاڑی اس کے قریب لے گئے۔ بنگلے سے فائرنگ ہونے لگی تھی۔ انہوں نے مہرل شاہ کو سرخ کار میں ڈالا اور چل پڑے۔ باقی سب بھی ان کا راستہ صاف کرتے ہوئے چل پڑے تھے۔ بے ہوش مہرل شاہ ان کے ساتھ پھیلی سیٹ پر تھا۔ اچانک بلوچ بولا

”سائیں، یہ اچھا کیا، یہاں تو یہ مثال بن گئی، کہ زندہ مہرل شاہ لاکھ لاکھ اور بے ہوش مہرل شاہ کروڑ کا۔“

”اوئے نہیں اوئے کئی کروڑ کا۔“ بدر نے کہا اور ایک دم سے ہنس دیا۔ ماحول ایک دم سے بدل گیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس کے پیسے کھرے کرنا چاہتے ہو، لیکن اس کی رسائی حکومت تک ہے، پوری حکومتی

مشینری اسے تلاش کرنے نکل پڑے گی۔“ جہاں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا ”بلکہ تلاش کرنے کے لئے نکل پڑی ہوگی۔ میں جانتا ہوں۔ مگر تم ابھی زیادہ نہیں جانتے ہو یہاں کے بارے

میں، ابھی کئی چوہے بلوں سے نکالے ہیں۔ اسے ابھی کچھ دیر کے لئے مہمان رکھنا ہوگا۔“ بدر نے سنجیدگی سے کہا ”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ جو چوہے ہیں، بلکہ جو اصلی والے چوہے ہیں، وہ گہری بلوں میں چلے جائیں گے۔ ہا

ں چاہو تو رسک لے کر نوٹ کھرے کر سکتے ہو۔“ تانی نے کہا تو جہاں بولا

”چل کوئی بات نہیں خرچہ پانی بھی تو چلانا ہے۔“ جہاں کے یوں کہنے پر وہ سبھی ہنس دیے۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، جب وہ سپر ہائی وے سے نیچے اتر آئے۔ اس سے آگے، وہ چھوٹی سڑک پر مڑے اور چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ انہیں روشنیاں دکھائی دیں، جو دھیرے دھیرے ایک بڑے سے فارم ہاؤس کی صورت اختیار کر گیا۔ انہوں نے کار پورچ میں روکی۔ اسی لمحے کئی سارے بندے باہر آ کر ان کی کار کے گرد کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں باہر نکل کر اندر کی طرف چل دیے۔ وہ لوگ مہرل شاہ کو کار میں سے نکال کر اندر لے جانے لگے۔

”یہ کون سی جگہ ہے، اور کس کی ہے؟“ تانی نے عالی شان ڈرائیونگ روم کے گداڑ صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ مہر سکندر یار کا ڈیرہ ہے، مہرل شاہ کا سب سے بڑا دشمن، اور ہمارا بھی یار..... نہیں بلکہ مہر سکندر کسی کا بھی یار

نہیں ہے۔“ بدر نے نچی سے مسکراتے ہوئے کہا تو جہاں ہنس دیا پھر بولا

”یار، یہ سب جو کوئی بھی ہے، تو کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروا، بھوک لگ رہی ہے۔“

”او کے باس، جیسا حکم۔“ بدر نے کہا تو تانی نے ہنستے ہوئے کہا

”ویسے اب تم جہاں کو باس کہو گے، احسان مانو اس کا، نئی زندگی دی ہے اس نے تمہیں۔“

”ہاں، اگر یہ بروقت فیصلہ نہ کرتا تو.....“ بدر یہ کہتے ہوئے رکا اور پھر اچانک بولا، ”ویسے تم بھی کمال کی چیز ہو،

اصل کریڈٹ تو تم ہو اس مشن کا۔“

”اوئے تعریفیں بند کر اور جا۔ ابھی اس سالے مہرل شاہ کو بھی بھگتنا ہے۔ چل جا۔“ جہاں نے کہا تو بدر اندر کی

جانب چلا گیا۔

اس وقت سورج نکلنے کے آثار واضح ہو گئے تھے، جب مہر سکندر یار ڈیرے پر آ گیا۔ وہ ایک بڑی سی گاڑی میں

آیا تھا۔ اس نے آتے ہی بدر سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا

”ویسے وہ ہے ابھی زندہ نا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ ان کے پاس بیٹھ گیا

”ابھی تک تو زندہ ہے، تمہارے آدمیوں کے پاس ہے۔ میں نے تو اسے مار دینا تھا۔ بس تمہارے لئے لایا

ہوں۔ جو کرنا ہے کرو۔“

”سودا کرنا ہے اس کے ساتھ۔ یہ ایک دن میں تو نہیں ہوگا نہ یہ سب۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تانی کی طرف

دیکھ کر کہا تو بدر ہنستے ہوئے بولا

”دیکھ لو ہمیں یہاں رکھ بھی پاؤ گے؟“

”کیوں، میں کیوں نہیں رکھ سکتا، میں چاہوں نا تو تم میری مرضی سے جا بھی نہیں سکتے یہاں سے۔“ اس نے

غیب سے لہجے میں کہا تو جہاں نے بدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

”بدر۔! یہ کیا بات ہونے لگی ہے، اسے کہو، ہمیں روک کر دکھائے، لے میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا ہی تھا

کہ مہر سکندر یار نے ہنستے ہوئے کہا

”تیرا ساقی بہت گرم دماغ کا ہے، اسے میرے بارے میں بتایا نہیں تھا۔“
”نہ بھی بتاؤ تو یہ خود سمجھ دار ہے، تم اپنی بات کرو مہر؟“ بدر کا لہجہ ایک دم سے تلخ ہو گیا تھا۔ تو وہ ٹھنڈے انداز میں بولا

”ٹھیک ہے، اب کرو بات، مہرل شاہ کو مارنا ہے تو اسے لے جاؤ، اور جہاں چاہو مارو، اگر میرے حوالے کرتے ہو تو مانگو کیا مانگتے ہو۔“

”تم نے جو سودا کرنا ہے کرو، باقی مجھ پر چھوڑ دو۔“ بدر نے کہا تو حسیال نے پوچھا
”کیسا سودا کر رہے ہو بدر؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ مہر سکندر یار نے کہا، پھر لمحہ بھر کر بولا، ”یہ مہرل شاہ، حکومت میں بہت رسائی رکھتا ہے، ہر بار میری وزارت مار جاتا ہے۔ اب اس سے وزارت تو لینی ہے نا، اس لئے بدر کو تکلیف دی تھی۔ اب وزارت کی بات کرنے میں دن تو لگیں گے نا، اس لئے روک رہا تھا، تم کچھ اور سمجھو۔“

”دیکھو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، تمہیں وزارت ملتی بھی ہے یا نہیں۔ اسے سنبھال بھی پاؤ گے یا نہیں، ہم نے اسے مارنا ہے اور بس۔“ حسیال نے کہا تو وہ بولا
”اسے مارنا ہے تو پھر اسے بھی لے جاؤ، میں نے تو اس وقت تک اسے رکھنا ہے جب تک مجھے وزارت نہیں مل جاتی۔“

”ٹھیک ہے، اسے ہمارے حوالے کرو۔“ حسیال نے سر دلچے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا
”بدر یہ تمہارا سودا خراب کرے گا۔ مجھے وزارت ملنے کا مطلب جانتے ہونا تو اسے سمجھاؤ، سنو! مجھے وزارت ملنے کا مطلب ہے، یہ پورے سندھ میں جو مرضی کرتا پھرے، کوئی نہیں پوچھے گا اسے۔“
”بات اتنی کرتے ہیں، جتنی بندہ کر سکے، یہاں سندھ میں ایسے ایسے لوگ پڑے ہیں، جو تمہیں کھا جائیں، یہ مہرل شاہ تم سے سنبھالا نہیں گیا۔ اسے ہم چوہے کی طرح لے کر آئے ہیں۔ پورا سندھ۔“ حسیال نے طنز یہ لہجے میں کہا تو اچانک تانی نے کہا

”بدر، جو کرنا ہے ڈن کرو، چلتے ہیں۔“

”ہاں لڑکی سیانی لگتی ہے۔ ادھر ہو میرے پاس، بہت اچھا وقت گزرے گا۔“

”اچھا، تو بہت اچھا وقت گزرے گا۔ کیسے یہ بتاؤ گے مہر صاحب۔“ تانی نے لچکتے ہوئے کہا تو حسیال نے بہ مشکل اپنا قہقہہ روکا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مہر کیا سوچ رہا ہے اور تانی کا اس پر کیا رد عمل ہوگا۔

”ادھر ہمارے پاس رہو گے تو ہی پتہ چلے گا نا۔“ اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا تو تانی شرما گئی۔
حسیال کا مزید برا حال ہو گیا، وہ قہقہہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ انہیں لجات میں ایک بندہ تیزی سے اندر آیا اور اسی تیزی سے بولا
”سائیں! پولیس۔۔۔۔۔۔“

ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ اتنی جلدی یہاں پولیس آ جانے کی صرف دو دو جہات ہو سکتی تھیں، یا تو پولیس ان کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی یا پھر مہر سکندر اور پولیس کے درمیان پہلے ہی رابطہ تھا۔ حسیال نے مہر سکندر کے چہرے پر دیکھا، جہاں خباثت بڑھ گئی تھی۔ اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا اور پر جوش سہجے میں بولا
”بدر! تو پھر کیا کہتے ہو؟“

”میں تو کہتا ہوں، ہمیں جانے دو۔“ بدر نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس پر مہر سکندر بولا

”پولیس آ گئی ہے، اس کے ساتھ جانا چاہو تو ابھی چلے جاؤ، اگر پولیس کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو پھر رکنا پڑے گا، پولیس کے ساتھ نہیں جانا تو پھر میں تجھے تحفظ دوں گا اور یہ تحفظ میری شرائط پر ہوگا، بولو کیا کہتے ہو، جانا ہے یا رکنا ہے؟“

ایک دم سے خاموشی چھا گئی، جسے لمحہ بھر بعد تانی نے اپنی ٹھکتی ہوئی آواز میں توڑا

”یہ پاگل ہیں، انہیں کیا سمجھ مہر جی، آپ میرے ساتھ بات کریں۔“

مہر سکندر نے تانی کی طرف خوشگوار حیرت سے دیکھا، پھر ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

”کہنا یہ لڑکی زیادہ سمجھ دار ہے۔ چل لڑکی تیرے صدقے انہیں معاف کرتا ہوں، انہیں لے جا اندر، اور سمجھا، میں پولیس والوں کو واپس بھیجتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے مہر صاحب۔۔۔۔۔۔“ تانی نے کہا اور حسیال کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب چل دی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بدر کو پکڑا اور چلتی چلی گئی۔ تبھی انہیں مہر سکندر کی آواز آئی، وہ اپنے اس ملازم کو کہہ رہا تھا

”انہیں کہو، واپس جائیں، جب میں انہیں بلاؤں، تبھی آئیں۔“

”جی سائیں۔“

وہ تینوں ڈیرے کی پچھلی طرف بنے لان میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ان سے کافی دور سیکورٹی گارڈز کھڑے تھے۔ بظاہر وہاں سے فرار کو کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن حسیال اور تانی یہاں سے نکل جانے کا راستہ سوچ چکے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں گے۔ بدر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”تانی! کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں۔“

”میں دشمن کو معاف کر دیتی ہوں، مگر منافق اور دھوکے باز کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اس مہر سکندر نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔“ اس نے غصے میں کہا تو حسیال بولا

”ہمارے ساتھ نہیں، بدر کے ساتھ۔“

”لیکن اب تو ہمارے ساتھ ہو گیا نا۔“ تانی نے دبے دبے جوش سے کہا تو بدر سر دلچے میں بولا

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔“

”تو یہاں پر آیا ہی کیوں تھا، کوئی دوسری جگہ نہیں تھی کیا؟“ حسیال نے پوچھا

”میں نے کہنا نا کچھ چوہے ہیں، جنہیں بلوں سے باہر لانا ہے۔ یہ مہرل شاہ کے لئے ہی مجھ سے رابطے میں تھا۔ بڑی آفری تھی اس نے، لیکن اب اس نے گیم بدل دی ہے، اس کا مطلب ہے میرا شک درست تھا۔“ بدر نے انجھٹے ہوئے کہا

”ٹھک مطلب، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ حسیال نے تیزی سے پوچھا

”اب مجھے سمجھ آرہی ہے۔ وہ اب مہرل شاہ کے سامنے اچھا بن جائے گا کہ اس نے مہرل شاہ کی جان بچائی۔ اس احسان کے عوض وہ بہت ساری مراعات لے گا۔ لیکن مجھے یہ نہیں لگتا۔۔۔۔۔۔ ابھی اسے مزید سمجھنا ہوگا۔“ بدر غصے میں بولا

”تم جتنا مرضی سمجھ لو، وہ مہرل شاہ کے ساتھ جو بھی کرے۔۔۔۔۔۔“ تانی نے کہنا چاہا تو بدر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا

”ہاں وہ مہرل شاہ کے ساتھ جو کچھ بھی کرے، اسے مار دے یا اس پر احسان کر دے، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کے دماغ میں کیا ہے، میں یہ بھی نہیں جانتا، مگر اتنا معلوم ہے کہ ہمارے بارے میں وہ اچھا

قطعاً نہیں سوچ رہا ہے۔“ جہاں نے کہا

”وہ جو جوتا ہے، اسے سوچنے دو، ہم نے جو کرتا ہے، وہ ہم کریں گے، یہ اب مجھ پر چھوڑ دو۔“ تانی نے کہا تو جہاں مسکراتے بولا

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن بدر، تم اسے پہچان ہی نہ سکتے کہ یہ کیسا بندہ ہے؟“

”یہ اب تک میرے ساتھ ٹھیک چل رہا تھا اور پھر یار وہ منافقت ہی کیا جس کا پتہ چل جائے۔ خیر دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا

”وہ بلوچ، وہ کدھر ہے، اس کا کچھ پتہ ہے کہ نہیں؟“ جہاں نے کہا

”اگر ابھی تک ہم ہیں تو وہ بھی ہوگا۔“ بدر نے غصے بھری بے بسی سے کہا تو چند لمحوں کے لئے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ اندر سے ایک ملازم آیا اور انہیں لے کر پھر سے اندر چلا گیا۔ مہر سکندر صوفی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ان تینوں کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا بلکہ انہیں چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر بولا

”میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو یہاں پابند نہیں کیا جاسکتا۔ تم یا تو مر جاؤ گے، یا پھر میرے بندوں کا خون خرابہ کر کے نکلنے کی کوشش کرو گے۔ مگر میں کہتا ہوں تم معزز مہمانوں کی طرح یہاں رہو، مجھے وزارت ملنے تک انتظار کرو، مہرل شاہ کو مارنے کی ضد نہ کرو۔ یا پھر اسے چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

”جیسے آپ کہیں گے، دیا ہی ہوگا۔“ تانی نے کہا اور گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا

”ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے ملازم کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں کی جانب بڑھتے ہوئے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ بدر اور جہاں دونوں اس کے ساتھ چل دیئے۔ جبکہ تانی خود جا کر اس کے ساتھ صوفی پر بیٹھ گئی۔ مہر سکندر ایک دم سے خوش ہو گیا۔ اس نے بڑے پیار سے تانی کے دائیں گال پر ہاتھ پھیرا اور پھر پیار بھرے لہجے میں بولا

”تم بہت سمجھ دار ہو، جب تک ادھر رہو، ہمارے ساتھ عیش کرو اور جب جانا چاہو تو.....“

اس پر تانی نے تڑپ کر کہا

”نہیں، میں کہیں نہیں جانا چاہتی۔ میں آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں، اور اگر آپ نہ بھی رکھیں تو کم از کم ان دونوں سے میری جان چھڑوا دیں، میں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں ان سے بہت دور چلے جانا چاہتی ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“ مہر سکندر نے چونکتے ہوئے پوچھا تو وہ رُودینے والے انداز میں بولی

”میں ان سے بہت دور چلے جانا چاہتی ہوں، ایسی جگہ جہاں ان کا سایہ بھی نہ پڑے۔ بس آپ میری اتنی مدد کر دیں، میری ان سے جان چھڑوا دیں، تاکہ میں ان سے آزاد ہو جاؤں۔“

”جیسا تم چاہو، ویسا تو میں کروں گا ہی، لیکن ایسا کیوں، کیسے تم ان کے ہتھے چڑھ گئی؟“ مہر سکندر نے تیزی سے پوچھا تو وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی

”یہ ایک لمبی کہانی ہے، میں آپ کو پھر بعد میں بتاؤں گی۔“ تانی نے رو ہانسنے ہوتے ہوئے کہا تو وہ پیار سے بولا

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ہم بعد میں بات کریں گے، ابھی تم فریش ہو جاؤ۔ آرام کرو میرے بیڈروم میں، پھر بات کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک دم سے تیار ہو گئی۔ تبھی اس نے دور کھڑے اپنے ایک ملازم کو اشارے سے بلایا اور تانی

کو اپنے بیڈروم میں لے جانے کو کہا۔ تانی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔ مہر سکندر اس کی طرف لپٹائی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ مہر سکندر کے ڈیرے پر سکوت طاری تھا۔ جہاں اور بدر نجانے کہاں تھے۔ بلوچی کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ سیکورٹی گارڈز کے سوا کوئی دوسرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مہرل شاہ کا بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ابھی تک ڈیرے پر ہی ہے یا اسے وہاں سے کہیں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہاں پر ایسا سکوت طاری تھا، جیسے یہاں بھی کوئی ہنگامہ ہوا نہیں تھا۔ ایسے وقت میں تانی، مہر سکندر کے بیڈروم میں تھی۔ وہ خوب سوئی تھی۔ اسے کچھ دیر پہلے جگا کر بتا دیا گیا تھا کہ مہر صاحب آنے والے ہیں۔ وہ تیار ہو جائے۔ یہ پیغام دینے والا اس کے لئے کپڑے اور کافی کاسٹیکلس بھی رکھ گیا تھا۔ تانی انہیں چند لمحے دیکھتی رہی اور نیند کا خمار اتارتی رہی، پھر کپڑے اٹھا کر ماحقہ باتھ روم میں چلی گئی۔

کافی وقت گزار کر جب وہ بیڈروم میں آئی تو وہی سناٹا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر خود کو سنوارتی رہی۔ جب تیار ہو چکی تو اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ انہی لمحات میں دروازے پر دستک ہوئی اور وہی ملازم اندر آ گیا

”مہر سائیں آپ کو باہر یاد کر رہے ہیں۔“

”اچھا میں آتی ہوں۔“

”آپ کو کیا پتہ کہ کدھر جانا ہے، میں لے چلتا ہوں نا آپ کو۔“ اس نے مودب سے لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ وہ اسے باہر لان میں لے گیا، جہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مہر سکندر بید کی کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد بھی ایسی ہی کرسیاں پڑی تھیں۔

”آؤ، آؤ سوہنا، آؤ، بیٹھو۔“ اس نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کے ساتھ ہو کے بیٹھ گئی اور بڑی ادا سے بولی

”میں نے سوچا تھا کہ آپ ادھر بیڈروم میں ہی آؤ گے۔“

”جلدی کا ہے کی ہے، ابھی بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، کوئی تعارف کرتے ہیں، اب دیکھو نا سوہنا، مجھے تمہارے نام ہی کا پتہ نہیں ہے۔“ اس نے سو فیصد انداز میں کہا۔ تانی نے ایک ادا سے اس کی طرف دیکھا اور بولی

”تانی نام ہے میرا اور میں بھارت کے شہر ممبئی سے تعلق رکھتی ہوں۔“

اس کے یوں کہنے پر مہر سکندر ایک دم سے چونک گیا اور سیدھے ہوتے ہوئے بولا

”تم انڈیا کی ہو، ممبئی سے، میرا مطلب ہے، وہاں سے کہاں؟“

”ہم وہاں جو ہو کے علاقے میں رہتے تھے۔ میری قسمت خراب کہ میں کمانے کی غرض سے دہلی چلی گئی۔ میں بہت اچھی کمپیوٹر گرافکس ہوں۔ بس وہیں ان کے ہتھے چڑھ گئی، یہ مجھے یہاں لے آئے۔“ تانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا

”غیر قانونی طور پر لائے ہوئے نا۔“ اس نے تصدیق چاہی

”بالکل، یہ جہاں ہے نا اس سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ ہم کافی ملتے تھے کبھی کسی پارک میں، کبھی کسی ہوٹل میں خوب موند کرتے تھے، ایک رات اس نے مجھے ایک فیوری میں لے جانے کی آفر کی کہ وہاں ہلا گا کریں گے، کھائیں پیئیں گے، موند کریں گے۔ میں اس کے ساتھ فیوری میں چلی گئی۔ وہ رات تو موند میں گزری، لیکن صبح ہوتے ہی ماحول بدل گیا تھا۔ میں کراچی میں تھی اور تب سے ان کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ آپ مجھے ان سے کسی طرح.....“ اس نے کہنا چاہا تو مہر سکندر اس کی بات کاٹ کر بولا

”اب تم میری پناہ میں آگئی ہو، اب یہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ، تمہارے کاغذات، مطلب پاسپورٹ وغیرہ کدھر ہیں؟“

”دہیں دہی میں ہیں۔“ تانی نے تیزی سے کہا

”مطلب اب اگر تم دہی جانا بھی چاہو تو غیر قانونی طور پر جانا ہوگا۔“ مہر سکندر نے خود کلامی کے سے انداز

میں کہا

”ظاہر ہے، مجھے وہیں جانا ہے۔ لیکن میں بہت جلد وہاں سے بھارت چلی جاؤں گی۔“ تانی نے تیزی سے کہا

تو وہ بولا

”یہ تم تو بڑے کام کی چیز ہو۔ اگر ہم تمہیں بھارت ہی پہنچادیں تو.....؟“

”اس کا کیا فائدہ ہوگا، میرے سارے کاغذات تو.....؟“

”اوئے چھوڑو ان کو، یہ سب بن جاتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ تانی نے پوچھا

”ابھی ممکن کر دیتے ہیں،“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور چہرے پر شیطانی مسکراہٹ لا

کر پوچھا ”دہی کا کوئی فون ہے تو بتاؤ، وہاں سے سارے کاغذات منگوا لیتے ہیں۔ کوئی دوست، سہیلی، کوئی کہنی کا دوست.....؟“

بلاشبہ وہ اس کے بیان کی تصدیق چاہ رہا تھا۔ تانی نے ایک لمحہ کو اپنے ماتھے پر انگلیاں پھیریں اور یاد کرتے ہوئے ایک نمبر بتایا۔ مہر سکندر نے وہ نمبر ڈائل کیا اور پیش کر دیا۔ دوسری طرف کال جانے لگی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے اسپیکر آن کیا اور فون اسے تھما دیا۔ دوسری طرف سے کوئی مرد ہیلو ہیلو کہہ رہا تھا۔

”میں تانی بات کر رہی ہوں، تم احسان الحق بات کر رہے ہوتا۔“

”ہاں ہاں، میں احسان الحق ہی بات کر رہا ہوں۔ مگر تم بتاؤ تم کہاں ہو، کدھر غائب ہو، یہ نمبر تو پاکستان کا ہے۔“

کیا تم بھارت چلی گئی تھی، یہ کیا چکر ہے؟“

”میں بہت بری طرح پھنس چکی ہوں۔ وہ جہاں بھی نا، میں کیا بتاؤں، قید میں ہوں۔ ایک دردمند بندے سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ اسی کے فون سے بات کر رہی ہوں۔ تم ایک کام کر دو پلیز۔“ تانی نے گلوگیر لہجے میں کہا تو اس نے پوچھا

”بولو، بتاؤ۔“

”کسی طرح میرے فلیٹ چلے جاؤ اور مالٹی سے میرے کاغذات لے کر مجھے پوسٹ کر دو۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ میں پھنسی ہوئی ہوں۔“ تانی نے بتایا تو دوسری طرف سے پوچھا گیا

”اچھا، میں کوشش کرتا ہوں۔ اپنا ایڈریس بتاؤ۔“ دوسری طرف سے پوچھا گیا تو تانی نے مہر سکندر کو اشارے سے پوچھا کہ کیا بتاؤں۔ اس نے بات کو گول کر جانے کا اشارہ کیا تو وہ بولی

”میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتی، جب تم کاغذات لے لو تو اسی نمبر پر رابطہ کرنا۔“ تانی نے کیا

”اوکے۔ میں آج تو نہیں کل جا سکوں گا۔“ اس نے کہا تو تانی بولی

”جیسے بھی ہو پلیز میرا یہ کام کر دینا۔“ یہ کہہ کر اس نے الوداعی کلمات کہے اور فون بند ہو گیا۔

مہر سکندر کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ تانی نے جو بھی کہا ہے وہ سچ کہا ہے۔ اس

لے وہ بڑے اطمینان سے بولا

”خیر تم ادھر رہو میرے پاس، کر لیں گے سب کچھ، ابھی ان سب سے جان چھڑاتے ہیں تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مہر سکندر نے برا سامنے بتا کر کہا

”کن سے جان چھڑانی ہے مہر صاحب؟“ تانی نے پوچھا

”او یہی جہاں اور بدر، میرا پلان یہ ہے کہ انہیں ختم کریں تو ان کی سرورڈی ختم، وہ ڈرائیور بے چارہ بھی ان کے ساتھ مارا جائے گا۔ رہا مہرل شاہ، تو دیکھتے ہیں اس کے ساتھ کیا سودے بازی ہوتی ہے یا اسے بھی مارنا ہوگا۔“

”انہیں مار کر مہرل شاہ کو کیوں مارتے ہیں۔ پہلے مہرل شاہ سے سودے بازی.....“

”نہیں، اس سے سودے بازی میں وقت لگے گا، انہیں پہلے ہی ختم کرنا ہوگا۔“ اس نے حقارت سے کہا تو تانی

پر جوش لہجے میں بولی

”بس پھر تو میں آزاد ہوں گی۔ سکون سے ادھر رہوں گی۔ ویسے اب تک آپ نے ان کو ختم کیوں نہیں کیا؟“

تانی نے پوچھا

”اس لئے کہ میں دیکھوں، ان کا پیچھا کرنے والا کوئی ہے کہ نہیں؟“ مہر سکندر نے سکون سے کہا

”تو کوئی.....؟“ تانی نے تشویش سے پوچھا

”نہیں، کہیں بھی ہینچل نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کا ساتھی تھا بھی تو وہ زیر زمین چلا گیا ہے۔ مہرل شاہ کی تلاش بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے، وہ لوگ اور پولیس والے ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں انہیں۔ ان میں سے کوئی چوہا بھی باہر نہیں نکلے گا۔ اور آج رات.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے ان کے ختم ہو جانے کا اشارہ کیا۔ تانی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”وہ اور مہرل شاہ ایک ہی جگہ قید ہیں؟ میرا مطلب ہے۔ اگر مہرل شاہ نے ان سے سودے بازی کر لی

تو.....؟“ تانی نے کہا تو وہ طنزیہ انداز میں بولا

”مہرل شاہ میرا مہمان ہے، وہ اوپر والے کمرے میں سکون سے سو رہا ہے۔ اسے یہی معلوم ہے کہ میں نے

اسے جہاں اور بدر سے پھینکا ہے اور اب تک یہاں چھپا کر رکھا ہے۔ اور وہ نیچے تہ خانے میں پڑے ہیں۔ خیر یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں، دیکھو، سورج ڈھل رہا ہے، تم آؤ، آج کی شام رنگین کریں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو تانی نے ایک ادا سے کہا

”مہر صاحب، میری شام تو اس وقت رنگین ہوگی جب میں جہاں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں گی۔ بڑی

رات پڑی ہے، آپ مجھے خوش کریں، میں آپ کو نہال کر دوں گی۔“ تانی نے یہ لفظ اس طرح تمنا بھرے انداز کہے کہ مہر سکندر بن پیپے ہی نشے میں آ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو تانی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ دونوں چلے تو مہر سکندر نے تانی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

وہ دونوں ہی ڈاریننگ روم میں آ گئے۔ وہاں ایک ہی صوفے پر بچو کے بیٹھ گئے تو مہر سکندر نے اپنے ملازم سے

کہا

”جاؤ، ان دونوں کو لے آؤ، ان کا کام ختم کریں لیکن لانا ذرا دھیان سے۔“

”جی۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ تانی نے غماز آلود آواز میں کہا

”آئیں بیڈ روم میں چلیں۔“

”ابھی چلتے ہیں، وہاں کچھ پینے کا تو بندوبست کر لیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک دوسرے ملازم کو سمجھاتے ہوئے

کہا، ”ہمارا پیسے کا شربت ادھر بیڈروم میں رکھو، کچھ کھانے کا سامان بھی ادھر لاؤ۔“ وہ یہ کہہ کر باہر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جبکہ تانی کے اندر سستی پھیلنے لگی تھی۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ذرا سا وقت گزرا ہو گا کہ اندر ہی کے راستے سے جہاں اور بدر کو لایا گیا۔ ان کے ساتھ چند لوگ اس طرح تھے جیسے وہ کوئی بہت خطرناک لوگ ہوں۔ ذرا سی کوتاہی سے وہ انہیں ختم کر سکتے ہیں۔ تانی یوں مہر سکندر کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی، جیسے وہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ جہاں اور بدر اسے یوں گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ بہت زیادہ غضب ناک ہوں۔

”تم لوگوں نے جانا ہے یا یہاں سے، تو جاؤ،“ مہر سکندر نے ہنگ آمیز انداز میں کہا تو جہاں بولا

”ٹھیک ہے، آؤ تانی چلیں۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں جانے والی، یہ تمہاری فیری نہیں کہ تم مجھے اغوا کر کے کہیں بھی لے جاؤ، اب تو میں مہر سکندر کے ساتھ رہوں گی۔ یہ مجھے بھارت بھجوا دیں گے۔“ تانی نے مہر سکندر کے ساتھ لگ کر کہا تو بدر نے غضب ناک ہوتے ہوئے کہا

”چلتی ہے یا۔۔۔۔۔“

”نہیں نہیں بدر، لڑکیوں کے ساتھ ایسے بات نہیں کرتے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پٹل نکلا اور اسے تھمتاے ہوئے بولا، ”تانی، تم جس طرح چاہو، انہیں ختم کر سکتی ہو۔ انہیں ختم کرو اور چلیں بیڈروم میں۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ اس کے حلق ہی میں رہ گیا، تانی نے پٹل بائیں ہاتھ سے پکڑا اور دائیں ہاتھ سے مہر سکندر کی گردن کے قریب رگ پکڑ کر مسل دی۔ وہ وہیں سن ہو کر بیٹھ گیا۔ تانی نے وہاں لوگوں کی طرف دیکھ کر پٹل مہر سکندر کی کینٹی پر رکھ کر غراتے ہوئے کہا

”کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا، ہلا تو میں اسے مار دوں گی۔ فوراً مہرل شاہ کو ادھر لاؤ بدر، وہ اوپر ہے۔“

یہ سنتے ہی بدر نے ایک بندے کی گن پر ہاتھ ڈال دیا اور اس سے چھین لی۔ ان سب کو باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔ بدر تیزی سے اوپر کی طرف چلا گیا۔ تانی نے پٹل جہاں کی جانب اچھال دیا۔ اس نے وہاں موجود چار بندوں کو گتیں رکھ دینے کا اشارہ کیا۔ سامنے والے بندوں نے گتیں رکھ دیں اور سب پیچھے ہٹ گئے۔ جہاں نے مہر سکندر کو سنبھالا تو تانی بھی بدر کے پیچھے لپکی۔

وہ دونوں تیزی سے بیڑھیاں چڑھتے ہوئے جا رہے تھے، بدر جیسے ہی بیڑھیاں چڑھ کر گیلری میں گیا، اچانک سامنے ہی سے دو آدمی گتیں سنبھالتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بدر کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ شاید انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ بدر کے پیچھے تانی ہوگی۔ تانی نے یکے بعد دیگرے فائر کر دیئے۔ بدر جھک گیا، سامنے سے گولیاں اوپر سے نکل گئیں۔ وہ دونوں رُک گئے۔ کوئی بھی ان کے سامنے نہیں آیا تو وہ اکڑوں حالت میں آگے بڑھے۔ سامنے دو ہی کمرے تھے۔ کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے مہرل شاہ کو انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھے ادھر گئے۔ دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔ لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ اسے باہر آنے کو کہا جائے۔ انہوں نے دروازے کو چھید کر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے مہرل شاہ ان کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔ بدر نے اسے اشارے سے نیچے چلنے کو کہا۔ وہ سر جھکائے ان کے آگے لگ گیا۔ وہ اسے لے کر نیچے آئے تو مہر سکندر ویسے ہی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ وہ ان سب کو لے کر باہر آگئے۔ پوریج سے بھی آگے نکل کر جہاں نے سیکورٹی والوں سے کہا

”ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے، تم لوگوں نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں اچھا کیا، اب بلوچی کو لاؤ، ورنہ اس کو مار دیں گے۔“ بدر نے مہر سکندر کو ٹھڈا مارتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں لپکتی گئیں۔

مہرل شاہ خاموشی سے زمین پر پڑا تھا۔ کچھ دیر ہی میں انہیں بلوچی دکھائی دیا۔ وہ ان کے قریب آیا تو جہاں نے اسے سامنے کھڑی فور و ہیل لانے کو کہا جو مہر سکندر کی تھی۔ بلوچی نے اس کی جیب سے چابی نکالی اور ذرا سی دیر میں فور و ہیل گاڑی ان کے پاس لے آیا، انہوں نے مہر سکندر اور مہرل شاہ کو جیسے ہی گاڑی میں ڈالا، وہاں موجود سیکورٹی والوں میں ہلچل مچ گئی۔ نزدیک والے تو کچھ نہیں کر سکتے تھے، ان کے پاس ہتھیار ہی نہیں تھے، مگر دور والوں نے ایک دم سے فائرنگ شروع کر دی۔ بلوچی پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ تانی بیٹھ گئی۔ جہاں اور بدر نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ چند لمحوں کے لئے سامنے سے مزاحمت کم ہوئی تو وہ دونوں گاڑی میں آ بیٹھے، گاڑی چل دی۔ مہر سکندر اور مہرل شاہ ان کے پاؤں میں تھے اور وہ کھڑکیوں سے گتیں نکالیں فائرنگ کرتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گیٹ پر تھے۔ وہ تیز رفتاری سے سڑک پر چڑھے تو ان کے پیچھے گاڑیاں چڑھ دوڑیں۔

سپر ہائی وے تک وہ بیس منٹ کے قریب پہنچ گئے۔ جہاں ان کے انتظار میں ایک فور و ہیل جیب کھڑی تھی۔ ان چاروں نے وہ گاڑی چھوڑی اور نیچے اتر آئے۔ انہوں نے مہرل شاہ کو باہر نکالا اور سڑک پر پھینک دیا۔ بدر نے گن سیدی کی اور اس پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ وہ زیادہ وقت نہیں تڑپا، جلد ہی ساکت ہو گیا۔ مہر سکندر یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن کوئی بھی رد عمل ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔ تانی نے اُسے پیچ کر پیچھے کا مہو اس پر فائرنگ کرنے لگی۔ ان دونوں کے مرتے ہی وہ چاروں فور و ہیل میں بیٹھنے لگے۔ وہ وہاں سے چل دیئے۔ آدھی رات سے قبل ہی وہ اس ٹھکانے پر پہنچ گئے، جہاں شاہد، سارہ اور معین الدین اور بیٹے مراد کو چھپایا ہوا تھا۔ وہ پہنچے ہی تھے کہ سارہ ان کے پاس آ گئی۔

”میرا تو دل دہل گیا تھا۔ ایک دم ہی غائب ہو گئے، کہاں تھے آپ لوگ؟“ سارہ نے پوچھا

”اس وقت مجھے بہت کام ہیں، میں نے جانا ہے۔ ساری تفصیلات ان سے پوچھ لیں۔“ بدر نے اٹھتے ہوئے کہا تو جہاں بولا

”کہاں جا رہے ہو، میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تم اکیلے نہیں جا سکتے ہو۔“

”نہیں جہاں، یہ کام میرا ہے، مجھے ہی کرنا ہوگا۔“ اس نے سکون سے کہا

”ادھر بیٹھو، اور بتاؤ کیا کرنا ہے؟“ تانی نے پوچھا

”مہرل شاہ مر گیا ہے، یہی وقت ہے اس کے یہاں تسلط کو ختم کرنے کا ہے اور پھر میں نے سوچ لیا ہے، جس جگہ بھی ان کا تسلط ہے وہ اب میرا ہوگا۔“

”تم کر لو گے؟“ جہاں نے کہا

”ہاں اب کر لوں گا۔ مہر سکندر کو میں نے سامنے لانا تھا، اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ سامنے آجائے، وہ اور

مہرل شاہ دونوں مل کر اپنا نیٹ ورک چلا رہے تھے۔ وہ وزارت وغیرہ تو ساری کہانی تھی، جھوٹ تھا سب۔ میں جانتا ہوں کہ مہر سکندر نے خود مہر شاہ کو وزارت دلوائی۔ وہ اگر کوئی اور بات کرتا تو شاید میں اس کے جھانے میں آ جاتا۔“

”کیا وہ اتنا ہی بے وقوف تھا؟“ سارہ نے پوچھا

”نہیں وہ بے وقوف نہیں تھا، بس تانی کے حسن کے سامنے ہار گیا، عورت کا رسیا، عورت ہی کے ہاتھوں مرتا ہے۔“ بدر نے کہا

”کیا وہ۔۔۔۔۔؟“ سارہ نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔ اس پر تانی ہنستے ہوئے بولی

”سارہ تم جانتی ہو کہ خدا نے عورت کو ایسی صلاحیت سے نوازا ہوا ہے کہ وہ مرد کی آنکھ میں اس کی نیت پڑھ لیتی

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ میں نے اس بے غیرت کی آنکھ میں جیسے ہی یہ پڑھا تو وہ مجھے بہت آسان شکار لگا۔ میں نے اسے مارنے کا اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے اس فیصلے کو حیا لکھ گیا تھا۔

”کیا کیا تو نے؟“ سارہ نے پوچھا

”اسے بے وقوف بنایا، اسے یقین دلایا کہ میں ان دونوں کے چنگل میں پھنس گئی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ساری تفصیل بتا دی۔

”دہی میں فون، یہ سمجھ میں نہیں آیا؟“ سارہ نے الجھتے ہوئے پوچھا

”یار، پوری دنیا میں نیٹ ورک ہے روہی کا۔ بدر جانتا ہے۔ یہ کوڈ ہیں ہمارے۔ جیسے ہی میں نے احسان الحق کو کہا تو سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ جو سپر ہائی وے پر فور وینیل ملی، یہ ہمارے نیٹ ورک ہی کا کمال ہے نا۔“ ثانی نے مسکراتے ہوئے کہا

”اُسے کیسے معلوم کہ تم لوگ کہاں ہو، ہم تو کل سے تلاش کر رہے ہیں۔ ہمیں تو.....“ سارہ نے کہنا چاہا مگر ثانی نے بات کاٹتے ہوئے کہا

”یہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ہمیں کیسے تلاش کر لیتے ہیں۔ لیکن روہی والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ یہی تو ہمیں اعتماد ہے۔“

”عجیب بات ہے؟“ وہ پھر الجھتے ہوئے بولی تو بدر نے اٹھ کر تیزی سے کہا

”سارہ، تم تیار رہنا، اور شاید کو بتا دینا کہ وہ بھی تیار رہے ممکن ہے تم لوگوں کو یہاں سے فوراً نکلتا پڑے۔ شاید وقت نہ ہو۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ سارہ نے پوچھا

”سارہ میرے پاس تفصیلات کا وقت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ حیا لکھ نے ایک طویل سانس لی اور کرسی پر پھیل گیا۔ ثانی اٹھی اور ساٹھ کوٹے کر اندر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

میری آنکھ کھلی تو صبح کی نیلگوں روشنی کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ مجھ سے بستر پر نہیں رہا گیا۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میں کاریڈور سے نکل کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ میرے باہر آتے ہی وہ دونوں کتے بھاگتے ہوئے آئے اور میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ میں نے انہیں کچھ دور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے۔ میں بھی وہیں بنی چند سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گاؤں سے لے کر یہاں تک کا سارا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ کرل سرفراز کی شخصیت اور اس کی باتیں میرے ذہن میں گونجنے لگیں۔ ان کی یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ انسان اپنی راہ میں خود ہی رکاوٹ ہے۔ یہ کیسے ہے؟ اسی سوال کا جواب میں چاہتا تھا۔ اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے اس سوال کا جواب دے گا۔ میں اپنے طور پر بہت سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں تو یہی آیا تھا کہ انسان اپنی راہ میں کیسے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ تو وہی گڑبڑ ہے جو وہ اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ترقی کرے، وہ تو اپنی راہ کی رکاوٹیں دور کرتا ہے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ کرل سرفراز کے ساتھ اس کا ملازم تھا۔ ملازم نے دوڑے اٹھائے ہوئے تھے۔ کرل میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا تو اس کے ملازم نے ایک ٹرے ہمارے درمیان رکھی۔ ٹرے میں دو گلاس فریش جوس تھے۔ دوسری ٹرے میں کتوں کے لئے روٹیاں اور گوشت کے پارچے تھے۔ اس نے ٹرے میں گوشت اور روٹیاں کتوں کے آگے پھینکیں اور واپس پلٹ گیا۔ تبھی چند لمحے خاموشی کے بعد وہ بولا

”جمال۔ اتم نے کبھی زندگی کے بارے میں سوچا ہے، یہ کیسے ہمیں مل گئی، اور یہ سب کیا اور کیسے ہوا، کیا ہے یہ سب کھیل تماشا؟“

اس کے یوں کہنے پر میں چند لمحے سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ اس لئے میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا

”سچ پوچھیں نا مجھے ایسی باتیں کرنے والا کوئی ملا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی میں نے سوچا ہے۔ مجھے تو بس زندگی مل گئی، ہوش آیا تو یہی پتہ چلا کہ میرے سر پہ ذمے داریوں کا بوجھ ہے اور انتقام ورثے میں مل گیا۔ پھر کیا تھا، یہی جو آپ کے سامنے ہوں۔ مجھے کیا پتہ زندگی کہاں سے آئی، اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ یہ زندگی کیا ہے، کیا کھیل تماشا ہے؟“

”دیکھو۔ ایہ جو سب کچھ دکھائی دے رہا ہے، یہ ایک تمہارے ہونے سے ہے۔ مطلب انسان کے ہونے سے ہے، اگر اس کائنات میں انسان نہیں ہے تو یہ کائنات بھی نہیں ہے۔ اسے کون دیکھ رہا ہے، اس کے نام کون رکھ رہا ہے، اسے تغیر کون کر رہا ہے؟“ انہوں نے جذب سے کہا

”ظاہر ہے یہ انسان ہی ہے۔“ میں نے اُس کی بات سمجھتے ہوئے کہا

”انسان کو اللہ پاک نے جوڑے سے بنایا۔ انسان کی ابتدا کیا ہے۔ ایک قطرہ جو باپ کی پشت سے اچھلتا ہوا نکلتا ہے۔ دراصل اس قطرے میں ایک پوری صورت پڑی ہوئی تھی، جس نے وجود میں آنا ہوتا ہے۔ ماں کے وجود میں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ایک صورت میں آتا ہے، تب اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ ایک وقت تک وہ بے روح رہتا ہے۔ صورت پاتے ہی اس میں روح آتی ہے۔ اس میں بھی پوری حکمت ہے۔ خیر۔ ایک پورے عمل کے بعد جب وہ ماں سے الگ ہوتا ہے تو اس دنیا میں آ جاتا ہے۔ وہ اپنا ایک پورا وجود، پوری ایک صورت رکھتا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ، جیسے ہی وہ صورت دنیا میں آئی تو اس کے ساتھ کیا تبدیلی ہوئی۔؟“ کرل نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”آپ بہتر سمجھتے ہیں، آپ ہی مجھے بتائیں۔“ میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا

”جب وہ صورت اس دنیا میں آئی تو سب سے پہلے اس نے اپنی والدہ کو مقام ماں پر فائز کر دیا۔ باپ کو باپ ہونے کا مقام مل گیا۔ کسی کا بھتیجا، بھانجا، بھائی، بیٹا، اس کے آنے کے ساتھ ہی رشتے ظاہر ہو گئے۔ اگر وہ نہیں تھا تو یہ سارے رشتے کہاں تھے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

”نہیں تھے۔ کوئی رشتہ نہیں تھا۔“ میں نے کہا

”ہاں دنیا میں انسان کے پہلے سانس کے ساتھ ہی ظہور ہونا شروع ہو گیا۔ اس نے ذرا ہوش سنبھالا، اس نے آسمان کو دیکھا، آسمان ظاہر ہو گیا، چاند کو دیکھا، چاند ظاہر ہو گیا، سورج، مٹی درخت سب، جسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ آشکارا ہوتے جاتے ہیں۔ کائنات کھلتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے اندر تبدیلیاں ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اب اس کے دیکھنے کے دو راستے ہیں، ایک باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ ایک کائنات اس کے اندر ہے اور دوسری کائنات باہر موجود ہے۔“

”اور میرا خیال ہے اسی کائنات سے وہ دنیا کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔“ میں نے پوچھا

”بالکل، دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اس کی اندر جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اسی سے اس کے خیال بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے بتایا

”کیا اسے خبر نہیں ہوتی؟“ میں نے پوچھا

”دیکھو۔ ایک قطرے سے وجود بن جانا، اور پھر اس دنیا میں آکر اس کا وجود پروان چڑھنا۔ یہ فطری عمل

ہیں۔ ایک خاص وقت پر آکر اس میں تبدیلیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ وجود چاہے مرد کا ہے یا عورت کا۔ اس سے پہلے وہ معصوم ہوتا ہے۔ کوئی شریعت اس پر لاگو نہیں ہوتی۔ آخر یہ کیسی تبدیلی ہے جو اس پر شریعت کے احکامات لگ جاتے ہیں؟ مطلب وہ کوئی ایسی قوت ہے جس کی حفاظت کے لئے یہ سارا انتظام ہے۔ یہ تبدیلی بڑی اہم ہے اور.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا

”ہاں، یہی تو سمجھنا چاہوں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا تو وہ بولے

”وہ ہے اس کے اندر کی تخلیقی قوت۔ انسان زندگی پاتا ہے ایک قطرے سے۔ اور پھر ویسا ہی قطرہ جب اس کے اپنے اندر پیدا ہوتا ہے تو ایک نئی زندگی دینے پر قادر ہو جاتا ہے۔ ایک بیج بار آور ہو کر کتنے ہی نئے اشجار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ کوئی معمولی صلاحیت ہے۔ یہ بہت بڑی صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت کی حفاظت کے لئے، اس کے صلاحیت کے پیدا ہوتے ہی۔ اسی کے ساتھ ہی شریعت لاگو ہو جاتی ہے۔ نگاہ سے لیکر شرماہ کی حفاظت تک کے احکامات آ جاتے ہیں۔ یہ زندگی ہے۔ جو رب تعالیٰ نے دی۔ اس کی پوری پوری حفاظت کے لئے۔“

”مطلب، جس وقت صورت سامنے آگئی تو اس کے ساتھ ہی سارا عمل شروع ہو گیا۔“ میں نے کہا

”بالکل، جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ صورت کے وجود میں آتے ہی تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ اصل میں صورت کا ظہور ہی مقصد تھا، جس میں سے ہر چیز دیکھی جانی ہے۔ پیدا ہوتے ہی رشتے ظاہر ہوئے۔ اسی سے حضرت آدمؑ کے بارے میں معلوم ہوا۔ یعنی ہم اس صورت سے آدمؑ کو دیکھ سکتے ہیں۔ آدمؑ سے لیکر یہ صورت اور اس صورت سے آدمؑ تک۔ پورا سلسلہ جڑ گیا۔“

”صورت کے ظہور کا اصل مقصد.....؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولے

”وہ صورت آئینہ ہے، سبھی اسی میں اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ باپ اس میں اپنا باپ ہونا دیکھ رہا ہے۔ ماں اس میں اپنا مقام دیکھ رہی ہے۔ سارے تعلق اسی میں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ اب وہ صرف اپنا وجود اور صورت ہی نہیں لے کر آیا۔ بلکہ خیال بھی لے کر آیا۔ وہ وجود ایک خیال تھا، ایک خیال میں پڑا ہوا تھا۔ صورت میں ظہور ہوا۔ تب اس میں انفس و آفاق پیدا ہو گئے۔ اس میں فکر سوچ پیدا ہو گئی۔ ارد گرد کی پہچان آگئی۔ اب اس کی پرورش دو طرح سے ہونا شروع ہو گئی۔ بدنی اور فکری۔ یہ سب زندگی سے ہے۔“

”مطلب یہ سارا کچھ زندگی سے ہے؟“ میں نے پوچھا

”ہاں۔! اور اب ایک بہت اہم بات بتانے جا رہا ہوں، ممکن ہے تمہاری سمجھ میں نہ آئے، لیکن غور کرو گے تو سمجھ میں آجائے گی۔ جس طرح میں نے بتایا کہ جس نے انسان کو ایک قطرے سے پیدا کیا اور وہ اس قطرے کو واپس لوٹا لینے پر قادر ہے۔ یہ سارا عمل جس میں دیکھا گیا وہ انسان ہے۔ ابھی وہ عالم امکان میں ظاہر نہیں ہوا۔ ابھی وہ زوجیت کے معاملے میں نہیں آیا، اس کے بیوی، بچے نہیں، اکیلا ہے۔ اس کے اندر کیا تھا، کیا ہے اور کیا ہوگا۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا

”زندگی سدا سے تھی اور سدا رہے گی۔ لیکن تمہیں اس کا احساس اس لئے نہیں ہے کہ یہ حقیقت تم سے اوچھل ہے۔ تم خود اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے اس بارے کبھی سوچا ہی نہیں۔“

”بالکل، مجھے بتایا ہی نہیں کسی نے۔“ میں نے اعتراف کر لیا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولے

”اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ تو باتیں دو ہی ہو گئیں۔ ایک بات تو یہ ہوگی کہ تم میری بات مان جاؤ گے اور دوسری یہ کہ نہیں مانو گے۔ ماننے اور نہ ماننے کی آخر کوئی نہ کوئی توجہ ہوگی نا۔“ اس نے میری طرف

دیکھ کر اپنی بات کی تائید چاہی۔

”جی بالکل، ایسا ہی ہے، ویسے یہ وجہ ہے کیا؟“ میں نے گہری سانس لے کر کہا تو وہ بولے

”کسی بات کو ماننے اور نہ ماننے کا معیار انسان کے اندر لاشعوری طور بنتا چلا جاتا ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر معیار بنتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے اس کی توجہ باہر کی دنیا میں ہے۔ وہ باہر دیکھ رہا ہے۔ باہر ہی کے حالات اس کا معیار بناتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے اندر کیا کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اندر جھانکتا ہی نہیں کہ وہ معیار، جس پر اس نے فیصلے کرنے ہیں، وہ درست بھی ہیں یا نہیں؟“

”مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میرے اندر جو معیار ہیں وہ درست ہیں یا غلط؟“ میں نے پوچھا

”ہاں۔! یہی تو بات ہے کہ ہم سوچیں، اپنے اندر جھانک کر دیکھیں کہ جو کچھ میرے اندر ہے، وہ کیا ہے۔ میں اپنے اندر کیا کچھ لئے پھرتا ہوں؟“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کے لئے خاموش ہوئے، پھر کہتے چلے گئے۔ ”جمال، یہ ساری باتیں تو بعد کی ہیں، پہلے کی بات تو یہ ہے کہ زندگی کہاں سے آئی؟ زندگی کو دیکھتا کون ہے؟ کیسے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟“

”ظاہر ہے، زندگی کو زندہ لوگ ہی دیکھتے ہیں۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیئے اور بولے

”بالکل۔ زندگی کو زندہ لوگ ہی دیکھیں گے اور وہ سمجھیں گے کہ اصل میں زندگی ہے کیا۔ اسی طرح زندہ ہی یہ دیکھ پاتے ہیں کہ مردہ کون ہے؟ مثال کے طور پر سامنے اگر ایک لاش پڑی ہے۔ اس میں سب علاماتیں وہی ہیں، جو زندہ کی ہوتی ہیں، ایک روح ہی نہیں ہوتی، جو بذات خود دکھائی نہیں دیتی۔ کیا کوئی مردہ آکر گواہی دے گا کہ یہ مراد ہوا یا زندہ بتائے گا کہ یہ اب محض جسد خاکی ہے، یہ زندہ نہیں۔“

”ہاں یہ بات تو سمجھ میں آگئی، اصل میں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا

”میں کہنا یہ چاہتا ہوں، جب باہر کی دنیا بارے ہم کوئی بھی فیصلہ اپنے اندر پڑے معیار سے کرتے ہیں، تو کیا ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ہم اس معیار کو پرکھ لیں کہ وہ کیا ہے؟ درست بھی ہے یا غلط؟“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں بولا

”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کیسے، کیسے پرکھیں؟“ میں نے پوچھا تو گویا ہوا

”ظاہر ہے اس کے لئے بھی ہمیں کوئی نہ کوئی معیار، کوئی کسوٹی تو لینا ہوگی۔ جس سے ہم اپنے اندر کو پرکھ سکیں۔ کسی بھی چیز بارے ہم فیصلہ کر سکیں کہ وہ ہمارے لئے درست ہے یا غلط۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کور کے، پھر بولے، ”یہ بات اپنی جگہ، لیکن اس سے پہلے ہم یہ غور نہ کر لیں کہ انسان کے اندر وہ کون سی چیز ہے، جس کی وجہ سے یہ ساری نگہ کش ہے؟“

”میرے خیال میں تو وہ روح ہے، جو انسان میں موجود ہے تو وہ زندہ ہے، اس میں نگہ کش ہے، یہ ہنگامے ہیں، وہ دیکھ اور بول سکتا ہے۔“ میں نے جوش سے کہا

”روح.....! چلو ایک لمحے کو مان لیتے ہیں کہ اس میں روح ہے، لیکن اس میں کوئی نگہ کش نہیں ہے، وہ دیکھ اور بول بھی نہیں سکتا۔ اور پھر ہم روح کی بات کریں جسے ہم نے دیکھا نہیں۔ جس پر ہم بات نہیں کر سکتے، وہ کیسی ہے۔ ہم تو اس پر بات کرتے ہیں، جو دکھائی دیتی ہے۔“ وہ بولے تو میں نے کہا

”روح کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ روح جب نہیں ہوتی تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ روح کے بغیر بھی انسان زندہ رہتا ہے تو کیا تم مان لو گے۔ وہ بھی جسمانی لحاظ سے، میں کوئی روحانی بات نہیں کر رہا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا

”دیکھو، ہمیں وہاں سے غور کرنا ہوگا، جب انسان محض ایک ایسے قطرے کی صورت میں ہوتا ہے جو باپ کی پشت سے نکلتا ہے اور وہ ماں کے رحم میں جاتا ہے تو نمونپا تا ہے۔ اس کی افزائش شروع ہو جاتی ہے، اس کا وجود ظاہر ہوتا ہے پھر ایک وقت کے بعد اس میں روح آتی ہے۔ پہلے دن سے لے کر روح آنے تک وہ کون سی شے ہے، جس سے ایک قطرہ پورا وجود، پوری صورت بن جاتا ہے، روح تو بعد میں آتی ہے۔“

”وہ کیا چیز ہے؟“ میں نے پوچھا

”تم اسے جان سمجھ لو۔ یعنی یہ گوشت پوست، بنا روح کے بھی پروان چڑھتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا، پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا، ”روح ہوتے ہوئے بھی، انسان، انسان نہیں رہتا، حیوان بن جاتا ہے، اس پر کبھی غور کیا تم نے؟“

”ہاں اس کی تو مجھے کافی سمجھ ہے۔ انسان کس قدر درندگی پہ اتر آتا ہے، حیوانیت ہی کا روپ ہے نایہ۔“ میں نے کہا تو میری آنکھوں کے سامنے کئی سارے منظر گھوم گئے۔

”میرا سوال ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، جبکہ رب تعالیٰ نے تو اسے احسن تقویم پر پیدا کیا۔ اسے بہت اچھا بنایا۔ اس خالق کا شاہکار ہے یہ انسان۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”آپ بتائیں، یہ کیا تبدیلی ہے؟“ میں نے دھیمے سے لہجے میں بولا

”انسان میں تخلیق کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک بیج لگایا تو اس سے درخت بن گیا۔ جس سے ہزار ہائے بیج بن جاتے ہیں۔ اس تخلیقی صلاحیت کے ساتھ رب تعالیٰ نے اس کے وجود میں بہت کچھ رکھ دیا، جس کا خود انسان کو اندراک نہیں، آہستہ آہستہ وہ اپنے بارے جانتا چلا جا رہا ہے۔ یہ اسی وقت جانتا ہے جب وہ اپنے بارے میں جانے لگا کہ اس کے اندر کیا پڑا ہے۔“

”اسے کیسے پتہ چلے گا کہ اس کے اندر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا

”تمہیں کس نے بتایا کہ ماں کا دودھ کیسے پیتے ہیں؟ پرندے کو کس نے اڑنا سکھایا؟ یا مچھلی کو کس نے تیرنا بتایا۔ یہ جہلت ہے انسان کی۔ جب اس پر کوئی موقعہ آتا ہے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے تو اس معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو میں الجھتے ہوئے بولا

”بات آپ نے اندر کے معیار سے شروع کی اور کہاں تک لے آئے۔ کہیں ہم الجھ تو نہیں گئے؟“

”نہیں الجھتے نہیں، بلکہ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ آدمی، انسان سے حیوان کیسے بن جاتا ہے۔“ انہوں نے سکون سے کہا

”وہ تو آپ نے بتا دیا کہ اس کے اندر کے معیار سے۔“ میں نے انہیں یاد دلایا تو وہ ذرا سا مسکرا دیے اور بولے

”ہاں، اس کے اندر کے معیار ہی سے، لیکن یہ نہیں سمجھو گے کہ یہ اندر کا معیار بننا کیسے ہے؟“

”جی یہ تو سمجھنا چاہوں گا۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے

”چلو، یہ بات آج رات ہی کو کسی سکون سے سمجھاؤں گا۔ فی الحال، تم اندر جا کر دو اٹھا لو اور آرام کرو۔ باتیں تو ہوئی رہیں گی اور تمہیں یہ بھی بتانا ہے کہ انسان اپنی راہ میں رکاوٹ کیسے ہے۔“

یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا کاندھا پایا اور ہاتھ پکڑ کر اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھ گیا تو وہ مجھے اندر کی جانب لے کر بڑھ گیا۔

صبح کی نیلگوں روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی بدر واپس پہنچا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی سب کو اکٹھا کر لیا۔ حیاں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا

”کدھر تھے تم؟“

”یہ جو کراچی شہر ہے نا، اس میں جو بھی مہرل شاہ کا حصہ تھا، وہ سب چھین لیا ہے میں نے۔ یہ سب دو نمبر دھندے ہیں۔“ اس نے کہا تو حیاں نے پوچھا

”لیکن کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا تھا؟“

”نہیں، یہ میرا اور میرے لوگوں کا مسئلہ تھا، وہ ہو گیا۔ خیر۔! تم لوگ سنو.....“ اس نے کہا پھر شاہد کی طرف دیکھ کر بولا، ”شاہد! تمہارے لئے اب یہاں پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ سکون سے زندگی گزارو۔ اپنا بزنس سنبھالو، اپنے باپ کی خدمت کرو۔ حیاں اور تانی جس مقصد کے لئے آئے تھے وہ پورا ہوا۔“

”اور اب.....؟“ حیاں نے پوچھا

”اب تم لوگ آرام کرو۔ جب جانا چاہو، چلے جانا،“ اس نے اطمینان سے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو سارہ نے کہا

”شاہد، چلیں پھر اپنے گھر؟“

”ظاہر ہے اب تو جانا ہی ہوگا۔“ اس نے کاندھے اچکا کر کہا

”ٹھیک ہے تو نکلو پھر، ناشتہ وہیں چل کر کریں گے۔“ تانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے بنگلے کے لئے نکل چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

ڈنر کیے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں بیڈ پر آ کر لیٹ تو گیا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں یونہی کرل سرفراز کی باتوں پر سوچتا چلا جا رہا تھا۔ پہلی بار مجھے ایسی سوچوں سے واسطہ پڑا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتانا چاہ رہا ہے۔ آخر وہ مجھے سے چاہتا کیا؟ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے کرل تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ وہ سامنے دھری میز پر رکھ کر بولا۔

”ساری بتیاں بجھا دو اور میرے سامنے آ کر بیٹھو۔“

میں نے ویسا ہی کیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اس نے ماچس کی تیلی جلائی تو کمرے میں روشنی ہو گئی۔ جلتی ہوئی تیلی سے اس نے سامنے رکھی موم بتی روشن کر دی۔ پتہ نہیں وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ موم بتی جلا کر اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا

”بھال۔! یہ شمع کیسی ہے۔ اس کا شعلہ کدھر ہے؟“

یہ عجیب سا سوال تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی طرف دیکھ کر کہا

”یہ شمع آپ نے میز پر لگائی ہے اور اس کا شعلہ اوپر کی طرف جا رہا ہے۔“

”بھال۔! یہ ایک چھوٹا سا تجربہ ہے۔ بہت چھوٹی کلاسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ میں اس سے تمہیں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں، میں جو بات بھی پوچھوں، تم اس کا جواب دیتے جانا، میں پھر تمہارے سارے سوالوں کے جواب تفصیل سے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے بیک میں سے ایک عدسہ نکالا اور اسے شمع کے سامنے کیا۔ ایک مناسب فاصلہ دے کر اس نے میری توجہ دیوار کی طرف کی اور پوچھا ”وہاں پر شمع کیسے دکھائی دے رہی ہے۔“

”وہاں پر الٹی شبیہ ہے، الٹ نظر آرہی ہے۔“ میں نے جواب دیا تو اس نے ایک اور عدسہ نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ دیوار پر عکس سیدھا دکھائی دینے لگا۔ تو اس نے پوچھا ”اب شبیہ کیسی ہے؟“

”اب شمع سیدھی دکھائی دے رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا تو اس نے وہ دونوں عدسے میز پر رکھ دیئے۔ پھر وہ اٹھا اور لائٹ جلا کر کمرہ روشن کر دیا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر آ بیٹھا اور بولا

”تمہیں ایمان مفصل آتا ہے؟“

”جی، گاؤں کے مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا تھا اور یاد بھی کر دیا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے ایمان مفصل اسے سنا دیا۔ وہ بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ میں سناچکا تو وہ بولا

”اس کا ترجمہ بھی آتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے، پوری طرح یاد نہ ہو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”کاش، مولوی صاحب، یہ سمجھا بھی دیتے کہ وہ کیا رٹا رہے ہیں۔ خیر! میں تمہیں اس کا ترجمہ سناتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کوڑکا اور پھر بولا ”اس کا ترجمہ ہے، میں ایمان لایا اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر۔“

”جی، ایسے ہی ہے۔“ میں نے کہا تو بولا

”اب ذرا غور کرو، اس میں خیر اور شر، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کے معنی اور مطالب جو بھی لئے جائیں۔ بات دو متضاد چیزوں کی ہے۔ خیر! انسانیت کے لئے خیر تو رب تعالیٰ چاہتا ہے، یہ پھر شر کیوں؟ خیر اور شر کا انسان کے اندر ہونا کیوں؟“

”یہ بات تو آپ ہی بتائیں نا۔“ میں نے کہا

”دیکھو۔! فرشتوں کو کھانے پینے کی حاجت نہیں، انہیں رزق کے ذائقوں کے بارے میں کیا معلوم؟ بالکل اسی طرح، اگر ایک ہی شے بارے میں معلوم ہو، اور دوسری کا پتہ ہی نہ ہو تو اس کا احساس کیا؟“ انہوں نے کہا

”ہمیں اس شے ہی کا ادراک ہوگا تو ہم اس کے بارے میں جان پائیں گے۔“ میں نے بتایا

”جی بالکل۔ اگر ایک چیز کا الٹ ہوگا تو ہی ہمیں درست کا احساس ہوگا۔ برائی کا احساس نہ ہو تو نیکی کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ خیر کا وجود اسی وقت ممکن ہے جب اس کے مقابلے میں شر ہوگا۔ چونکہ انسان احسن تقویم پر پیدا ہوا ہے تو اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس رب نے تو اس میں سب کچھ دے دیا۔ کیا اب انسان کا حق نہیں کہ وہ رب تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو دیکھے، اور ان کے بارے میں پتہ کرے؟“

”ہاں جی یہ تو بنتا ہے کہ وہ اپنے اندر کے بارے میں جانے کہ جو کچھ رب تعالیٰ نے اسے دیا ہے، جن نعمتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے، اس کے بارے میں جانے۔“ میں نے کہا

”تو پھر میرے بھائی، جو کچھ انسان کے اندر ہے اسے پہچاننے کا کوئی تو معیار ہوگا، کوئی کسوٹی، کوئی پیمانہ تو ہونا

”جی اسی کی وجہ سے تو خیر اور شر میں تمیز ہو سکے گی۔“ میں نے کہا

”اب بات یہ ہے کہ ہم اگر مذہب کا پیمانہ یا معیار لے لیں تو ممکن ہے اس پر اختلاف ہو، لیکن اگر ہم انسان ہی کو سامنے رکھ لیں تو بات کچھ سمجھ میں آجائے گی کہ وہ باتیں جو انسان کی فلاح کے لئے ہیں وہ خیر اور جو فلاح کے لئے نہیں ہیں وہ شر۔“ انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا، جب انہوں نے اپنی بات جاری رکھی، ایلھوا کر ہم اس جلتی ہوئی شمع کو حقیقت مان لیں تو یہ دعوہ سے انسان میں شر اور خیر کی علامت ہیں۔“

”او۔۔۔۔۔! تو آپ یہ سمجھانا چاہ رہے تھے۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ بولے

”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔“

”جی کہیں، میں سن رہا ہوں۔“ میں نے دھیمے انداز میں کہا تو وہ بولے

”دیکھو! اصل میں یہ دو سوچیں ہیں۔ ایک منفی سوچ اور ایک مثبت سوچ۔ اگر انسان کسی شے کو ایک ہی نگاہ سے دیکھے۔ ایک ہی سوچ کے ساتھ سوچے تو درست نہیں ہوئی۔ انہوں نے دلیل دی تو میں نے پوچھا

”اگر مثبت سے بھی دیکھے تو بھی۔۔۔۔۔“

”کسی کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ مثبت ہے، جب تک منفی نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک منفی نہیں ہوگا تو مثبت کا پتہ نہیں ملے گا۔“ انہوں نے پھر یاد دلایا

”دونوں کے ہونے سے ہی صورت حال کا واضح پتہ ملے گا۔“ میں نے مانتے ہوئے کہا

”یہ رب تعالیٰ کے بندے میں بہت بڑی نعمت ہے کہ اس میں ایسے دونوں چیزیں رکھ دی گئیں ہیں۔ اور اختیار انسان کو دے دیا کہ جو چاہو چن لو۔“ انہوں نے کہا تو میں نے بات سمجھنے کی خاطر کہا

”خیر اس کے اپنے لیے بہترین ہے اور شر انسانیت کے لئے قاتل ہے۔ اگر انسان شر کی نگاہ ہی سے اس کائنات کو دیکھتا ہے تو وہ انسانیت کا قاتل ہے اور اگر وہ فقط خیر ہی کو سامنے رکھے ہوئے ہے تو اسے کیا معلوم وہ کیا کر رہا ہے؟“

”میرے بھائی، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شر کی قوت جانے بغیر وہ خیر کو کیسے پہچانے گا؟ میں یہ نہیں کہتا وہ شر پیدا کرے پھر خیر کی طرف آئے، یہ تو پکا نہ بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کوڑکے پھر بولے ”اصل میں انسان نے سب کچھ الٹ لیا ہوا ہے۔ اس نے مادیت ہی کو سب سمجھ لیا ہوا ہے۔ حالانکہ مادیت کچھ بھی نہیں۔ یہ جو سامنے ہے یہ سب میرے ہونے سے ہے، میں انہیں دیکھ رہا ہوں تو یہ ہیں، میں نہیں ہوں تو یہ کہاں ہیں۔ یہ مکان کیا ایسے ہی بن گیا۔ یہ پہلے کسی کی سوچ میں تھا۔ یہ سوچ منتقل ہوئی ہے۔ اصل میں بنیادی چیز ہی خیال ہے۔“

”یہ تو میں مانتا ہوں۔“ میں نے بتایا

”تو اس پر سوچو، جو سوال ہو مجھ سے کرو۔ پھر میں بتاؤ گا کہ انسان اپنی راہ میں خود ہی رکاوٹ کیوں ہے اور کیسے ہے؟“ انہوں نے سکون سے کہا تو میں نے سر جھکا لیا۔ میں اس پر سوچنا چاہتا تھا۔ بہت ساری سوچیں میرے اندر سر اٹھا رہی تھیں۔ میں خود یہ سب سمجھنا چاہتا تھا۔ شاید زندگی مجھے نئے پہلو دکھانا چاہ رہی ہو یا ایک نئی زندگی میرے سامنے واضح ہو رہی تھی۔

ہے۔ اس کا باپ معین الدین گھر پر ہی تھا۔ ایک دم سے سکون چھا گیا تھا، جس کی وجہ سے جہاں کو بے چینی ہو رہی تھی۔ سب کچھ اچانک کیسے ٹھیک ہو گیا۔ کیا پر سارام اور مہرل شاہ کا خاتمہ اتنا آسان تھا، وہ جس قدر طاقتور بندے تھے، مہر سکندر اپنا کھیل کھیل رہا تھا، وہ محض جنگی میں ختم ہو گئے۔ کہیں نہ کہیں کچھ ایسا تھا، جہاں الجھن تھی۔ کیا شاید اب محفوظ ہے، سارہ کے لئے کوئی خطرہ نہیں؟ کیا مہرل شاہ، مہر سکندر اور پر سارام کے لوگ ان کا پیچھا نہیں کریں گے؟ ان کے پیچھے تو حکومت کے لوگ تھے؟ کیا انہوں نے ذرا سا بھی ان لوگوں کو تلاش نہیں کیا؟ وہ کافی دیر سے اسی وجہ کو تلاش کر رہا تھا۔ ایسی کیا وجہ ہے کہ بالکل نہیں ہوئی اور بدر نے بڑی آسانی کے ساتھ معاملہ حل ہو جانے کی نوید سنائی۔ یہ آسانی اور سکون جہاں کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”کہاں کھوئے ہوئے ہو جہاں؟“ تانی اس کے پاس آ کر بولی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا گلاس تھا، جسے اس نے جہاں کو تھمایا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب اس نے چائے کا سپ لے کر سوچتے ہوئے لہجے میں اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں اسے آگاہ کیا۔

”ممکن ہے جو تم سوچ رہے ہو، وہ جس قدر درست ہو سکتا ہے، اسی قدر غلط بھی ہو سکتا ہے۔ دراصل تم مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتے ہو، وزنہ تمہیں احساس ہوتا کہ شہر اور علاقوں پر تسلط کے لئے یہ کیسے لڑتے ہیں۔“

”کیا بدر روہی سے تعلق رکھنے والا نہیں ہے؟ کیا وہ مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے؟ اور وہ یہ جو کچھ کر رہا ہے سب ٹھیک ہے۔“ جہاں نے تیزی سے پوچھا

”بدر کا تعلق روہی سے ہے۔ وہ مجرم بھی نہیں ہے، لیکن اس شہر کا مزاج ایسا ہے کہ اس کے ساتھ ایسے چلنا پڑتا ہے۔“ تانی نے سکون سے کہا

”میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟“ اس نے کہا

”سنو۔! جس طرح ہر شہر کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ ماحول ہوتا ہے، اسی طرح وہاں کی زیر زمین دنیا کا بھی اپنا ماحول اور مزاج ہوتا ہے۔ جیسے ممبئی میں بھائی گیری چلتی ہے، وہ ماحول تم امرتسر میں نہیں پاؤ گے، لاہور اور کراچی کے انداز میں فرق ہے۔ ہاں بہت حد تک ممبئی اور کراچی کے مجرمانہ ماحول میں یکسانیت ہے۔ ایسا کیوں ہے، میں نہیں جانتی۔“ تانی کہتے کہتے آخر میں اپنی بات گول کر گئی۔

”میں نے شہروں کے مجرمانہ ماحول پر کوئی تحقیق نہیں کرنی، تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو۔“ جہاں نے اکتا کر اس سے پوچھا

”اس لئے کہ جو ہو رہا ہے اسے سکون سے دیکھو، جتنا کام ڈے لگا ہے اس پر غور کرو اور.....“ تانی نے کہنا چاہا تو جہاں نے غصے میں کہا

”بکواس کر رہی ہو تم، جس کام کے لئے ہم آئے تھے، وہ تو ہو چکا، اب یہاں کیوں پڑے ہیں۔ ایوں کہانیاں سنائے چلی جا رہی ہے مجھے۔“

”اوہ، تم تو ناراض ہو گئے یار۔ خیر، تم آرام کرو۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔“ تانی نے اٹھتے ہوئے کہا تو ٹھیک اسی وقت جہاں کا فون بج اٹھا۔ اس نے سنا تو دوسری طرف شاہد تھا۔

”جہاں، میں یہاں شوروم پر آ تو گیا ہوں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“ شاہد نے تشویش سے بتایا

”کیوں کیا محسوس ہو رہا ہے۔“ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا

”صبح سے کئی مشکوک لوگ شاہد کا چکر لگا چکے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک عورت نے تو مجھ سے یہ بھی پوچھ لیا ہے کہ پر سارام کے گھر سے جو زیور نکلا ہے وہ دکھاؤ، وہ خریدار ہے۔“ شاہد نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا تو جہاں نے پوچھا

”بدر کو بتایا؟“

”ہاں، مگر وہ الجھا ہوا ہے، ابھی تک پلٹ کر جواب نہیں دیا۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں، تم گھبراؤ مت۔“ جہاں نے ایک دم سے کہا اور اٹھ گیا۔

تانی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر جہاں نے بتایا تو وہ بولی

”کچھ دیر ٹھہر جاؤ، میں ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندر کی جانب چلی گئی۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا اور تیزی سے اس موجودہ صورت حال کے بارے سوچنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد تانی واپس آئی تو اس کے لمبوں مسکراہٹ تھی۔

”لو بھی، تم جو سمجھ رہے تھے، بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ چلو راستے میں بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پورچ کی جانب چل پڑی۔ بلوچی ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ شاہد کے شوروم کی طرف جا رہے تھے۔

”اب بتاؤ، کیا بات ہے؟“

”یہاں پر جو روہی کا نیٹ ورک ہے اس کے مطابق، بدر بری طرح پھنس چکا ہے۔ اس نے جلد بازی کی اور مہرل شاہ کے سارے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انڈر ورلڈ کے لوگ اتنی جلدی مہرل شاہ کو نہیں بھولے۔ اور نہ ہی اس کے لواحقین، وہ بدلہ لینے کو میدان میں اتر رہے ہیں۔ وہ لوگ.....“

”یار تو کہانیاں مت سنا، اصل بات بتا۔“ جہاں نے چڑتے ہوئے کہا

”جس عورت کے بارے میں شاہد نے بتایا ہے کہ وہ اس کے پاس پر سارام کے زیور اور جواہرات کا پوچھنے آئی تھی، وہ صرف ایک پیغام تھا، ایک تیسرا گروہ یا پھر وہی لوگ پوری طرح میدان میں آ گئے ہیں، وہ کون ہیں، کیا چاہتے ہیں، یہ پتہ کرنا ہے۔“

”کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ وہ بھی مرا ہوا۔“ جہاں نے حماقت سے کہا تو تانی نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا

”جہاں، تم کچھ چڑے نہیں ہو گئے ہو؟“

”ہاں، مجھے غصہ آ رہا ہے، پتہ نہیں کیوں یہاں ہمارے ساتھ چوہے ملی کا کھیل، کھیل جا رہا۔ شاید بلا مقصد۔ شاہد کے معاملات میں الجھا یا جا رہا ہے۔“

”مجھے نہیں لگتا۔“ تانی نے اعتماد سے کہا

”کیوں؟“ اس نے پوچھا تو بلوچی ایک دم سے بولا

”اگر آپ برانڈ منائیں تو میں کہوں؟“

”بولو۔“ جہاں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”مجھے یہاں کے انڈر ورلڈ میں کتنے برس ہو گئے ہیں، مجھے خود بھی نہیں معلوم، شاید بچپن سے ہی ہوں۔ میری عقل سمجھ کے مطابق، نہ مہرل شاہ کچھ تھا، اور نہ مہر سکندر، کوئی تیسرا کھیل کھیل رہا ہے، اور اس کا سرابدر بھائی سے ملے گا۔ وہ شاید دل میں کچھ لئے بیٹھا ہے۔“

”یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟“ تانی نے پوچھا

”اس لئے کہ جتنے بڑے یہ لوگ تھے، جتنے مضبوط، اس قدر خاموشی کا چھا جانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی تیسرا گروہ جوان سے بھی مضبوط ہے۔ وہ میدان میں آگیا ہے۔“ بلوچی نے کہا

”وہ کون ہو سکتا ہے؟“ ثانی نے پوچھا

”شوروم پر پہنچ کر میں کچھ بتا سکوں گا۔ بس کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے۔“ اس نے کہا اور اپنی توجہ سڑک پر لگا دی۔

شاید کافی حد تک پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی بدر بھی تھا۔ وہ دونوں پہنچے تو جہاں نے جاتے ہی پوچھا

”وہ عورت کون تھی؟“

”پتہ نہیں کون تھی، وہ صرف رابطہ نمبر دے گئی ہے۔ یاد دوسرے لفظوں میں دھمکی.....“ بدر نے جواب دیا

”تم نے تو مہرل شاہ کا سارا کچھ سنبھال لیا ہے، پھر یہ کون ہے، جانتے ہو؟“ ثانی نے پوچھا

”ہاں، جانتا ہوں۔ سالار صدیقی ہے۔ جس کی پشت پر نجانے کتنے سیاست دان ہیں۔ یہاں کے اندر ورلڈ میں گولڈ کنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد، صرف اور صرف پرسارام کا سونا اور جواہرات وغیرہ حاصل کرنا ہے۔“

”اور اس کے علاوہ، مہرل شاہ کا بدلہ بھی۔“ جہاں نے تیزی سے کہا

”ہاں۔ وہ انہی کا آدمی تھا۔ اگر اب اس شہر میں رہنا ہے تو یا تو ان کی بات ماننا ہوگی یا پھر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔“

بدر نے کہا

”لاؤ، کہاں ہے اس کا رابطہ نمبر۔ میں بات کرتا ہوں۔“ جہاں نے کہا

”ابھی ٹھہرو، میں نے اس سے بات کی ہے۔“ بدر نے کہا تو جہاں نے پوچھا

”کیا بات کی ہے؟“

”یہی کہ میں اسے کچھ بھی نہیں دینے والا، ہمت ہے تو چھین لے مجھ سے۔“ بدر نے کہا تو جہاں ایک دم سے خوشگوار انداز میں بولا

”میں نے بھی یہی کہنا تھا۔ اور اب ایک کام کرو، پتہ کرو وہ کہاں ہے۔ اسے ہم خود ہی مل لیتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو شاہد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ دھیرے سے بولا

”میں نہیں سمجھتا کہ ہم بات کو اتنا طول دیں گے۔ کیوں نہ خون خرابے کے بغیر ہم یہاں سے ویسے ہی چلے جائیں۔ وہ سارا سونا میں نے ڈھلوا کر محفوظ کر لیا ہے۔ کروڑوں کا سونا ہے اور جوہرات کی مالیت کا اندازہ نہیں، وہ بھی اتنے ہی کے ہوں گے۔ میرا خیال ہے، تم دینی نکلتے ہیں اور.....“

”کیا اس کی رسائی وہاں تک، نہیں ہوگی؟“ بدر نے کہا اور پھر جہاں کی طرف دیکھ کر بولا، ”ایسا کرتے ہیں، شاہد کو دینی بھیج دیتے ہیں، اس سارے سونے کے ساتھ۔ اور ہم.....“

”آج ہی، بلکہ ابھی۔“ جہاں نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا

”تم سب اپنا اپنا پلان دے چکے؟“ اچانک ثانی نے کہا تو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سب خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جب چند لمحوں تک کوئی نہیں بولا تو اس نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا، ”یہاں آنے سے پہلے میں اپنا پلان کر چکی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سارے معاملے کو اب میں دیکھوں گی۔ میں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔“ ثانی نے کہا تو سب نے یوں تائید میں سر ہلا دیا جیسے وہ اس کی بات مان گئے ہوں۔ ان سب کو احساس ہو گیا تھا کہ



وہ بہت گلابی شام تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں اور کرنل سرفراز دونوں لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ جو کچھ کرنل نے مجھے بتایا تھا، اس پر بات ہو چکی تھی۔ سچی چائے کاسپ لے کر انہوں نے کہا

”دیکھو! صورت کے ظہور کے ساتھ ہی اس میں دو طرح کی ڈوپلینٹ ہوتی ہے۔ اس کی بدنی اور فکری ڈوپلینٹ۔ جیسے کہ میں نے تمہیں سمجھا دیا کہ قطرے سے قطرے تک کا سفر ہو گیا۔ وہ لامکاں سے مکاں میں آگیا۔ اب فکری ڈوپلینٹ میں اس کے سامنے استاد آئے گا۔ وہ اس کی فکری پرورش کرے گا۔ یہ فکری پرورش ہے کیا؟ اصل میں ہوتا کیا ہے جسے ہم فکری ڈوپلینٹ کا نام دیں گے؟“

”میرے خیال میں وہ خیر اور شر کی تمیز ہی ہے۔“ میں نے بتایا

”بے شک تم بہت قریب پہنچ گئے ہو۔ ہے ایسا ہی۔ دراصل فکری ڈوپلینٹ کا مطلب انسان میں ”نگاہ“ کا پیدا ہونا ہے۔“ انہوں نے کہا

اور نگاہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا

”وہ قوت اور صلاحیت جس سے اپنے ہونے کا مقصد معلوم ہو جائے، میں کیوں، میں کیوں، یہ جو صورت مجھے ملی ہے، اس میں کیا ہے۔ کیونکہ صورت ہی سے یہ کائنات ہے اور ساری کائنات اسی صورت میں پڑی ہے۔ یہ سب کچھ خیال میں تھا اور خیال ہی میں سب کچھ پڑا ہے۔ جیسے صورت سے آدم کا پتہ ملتا ہے اور آدم کا اس صورت سے۔ دنیا اور کائنات کے سارے فلسفے اسی ایک صورت میں سے ظاہر ہوتے ہیں۔“

”اور سب کچھ زندگی سے ہے۔“ میں نے سمجھتے ہوئے کہا

”اب یہ بھی سمجھ لو کہ زندگی کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئے پھر بولے، ”وہ کائنات جو چاہئے اندر کی ہے یا باہر کی اسے تسخیر کرنے کا نام زندگی ہے۔ باہر کی کائنات اس وقت تسخیر ہوتی ہے جب اندر کی کائنات تسخیر ہو جائے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے پوچھا

”تم یہی سمجھ لو کہ اندر کی تسخیر کا نام ہی زندگی ہے۔ کیونکہ خیال ہی سے سب کچھ ہے۔ پہلے خیال ہے۔ خیال آئے گا تو ہی حقیقت بنے گی۔ اس کی اصل ارادہ ہے۔ انسان کے ارادے میں سب کچھ پڑا ہے، جو اس کائنات کو تسخیر کرنے کی اصل کنجی ہے۔“

”سو یہ ثابت ہوا کہ انسان کی وجہ سے ہی کائنات ہے۔ اسی کے ہونے سے سب ہے۔“ میں نے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہے پھر باقی ماندہ چائے پی کر خالی پیالی ایک طرف رکھی اور بولے

”انسان تین طرح سے ڈیولپ ہوتا ہے۔ بدنی، روحانی اور فکری طور پر۔ بدن اس کا مٹی ہے مٹی سے پیدا ہونے والی چیزیں ہی اس کی بڑھوتری میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اب یہاں دو چیزیں ہیں۔ مٹی کی کچھ چیزیں اس کے لئے درست ہیں اور کچھ غلط۔ یہاں حلال اور حرام کا تصور ہے۔ اسی طرح روحانی طور اس کی عبادت اور نیکی اس کی روح کی پرورش کرتی ہے اور گناہ اس کی روح کو بیمار کر دیتی ہے۔ یہ پورا ایک عمل ہے۔ جو بہر حال پھر کسی وقت صحیح، اور علم و حکمت اس کی فکری ڈوپلینٹ کرتا ہے۔ یہ سارا کچھ ملتا ہے تو اس میں نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ تب جا کر اسے پہچان ملتی ہے۔ یہی وہ

”آپ کی یہ باتیں سن کر تو مجھے یوں احساس ہو رہا ہے جیسے میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک حیوانی زندگی گزار رہا تھا۔ پیدا ہوا۔ کھایا پیا اور مر گیا۔“ میں نے اعتراف کیا

”یہ بھی تمہاری اپنی سوچ ہے۔ تم میں مجھ میں ہر انسان میں وہ سب کچھ ہے جو اس کائنات کو تخیل کرنے کے کام آسکتا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اپنے آپ سے کتنا کام لے سکتے ہیں، خود کو کتنا تخیل کرتے ہیں۔“ انہوں نے سکون سے کہا

”یہ کیسے ممکن ہے، کیسے تلاش کریں۔“ میں نے پوچھا تو وہ بولے

”اپنی بدنی، روحانی اور فکری ڈوپلنٹ کو درست سمت دے کر۔ اور پھر میں نے کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں کی۔ اسے تو آج کی سائنس بھی ثابت کر رہی ہے۔ جیسے ڈی این اے۔ کیا آدم سے لیکر آج تک کہ انسان کا ڈیٹا اس میں نہیں ہے۔ میں اس پر بھی یقین نہیں کرتا۔ مجھے اگر یقین ہے تو اس بات پر کہ رب تعالیٰ نے جو علم الاسماء دیا ہے۔ وہی دراصل تمام تر قوتوں کا منبع ہے۔ انسان اسی علم کو حاصل کرنے کی راہ میں خود ہی رکاوٹ ہے۔“

”کرئل صاحب، میرے جیسا انسان۔ جسے پتہ ہی نہیں ہے، اس کے اندر یہ سب کیسے پیدا ہو۔ وہ کیا قوت ہے جو اس کے لیے یہ صلاحیت پیدا کرے۔“ میں نے سوال کیا تو وہ بولے

”شاید تم نے میری باتیں غور سے نہیں سنیں۔ نگاہ کیا ہے، یہی تو وہ چیز ہے جو اسے ایسے اور برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ نگاہ ہی اسے محبت کے بارے میں بتائے گی۔ ساری کائنات کا سلسلہ محبت کے دم سے ہے۔ محبت ادب سکھاتی ہے، ایک بات غور سے سن لو۔ انسان کی سب سے بڑی کرامت، اس میں محبت کا پیدا ہو جانا ہے۔“

”اور محبت کیا ہے؟“

”یہ مجھے بتانے کا حکم نہیں۔ جتنا بتانے کا حکم ہوا تھا بتا دیا۔ اب غور کرنا اور اپنے فکر سوچ کے مطابق عمل کرنا تمہارا کام ہے۔ جس نے تجھے اس راہ پر لگایا ہے، وہی تجھے سب بتانے کا بندوبست کرے گا۔ فی الحال تو اپنے بارے میں سوچ، تو کہاں کھڑا ہے۔ جو باتیں ہم نے کیں ہیں۔ وہ تیرے اندر ہیں؟“

”یہ کیا کرئل صاحب۔ پیاس دے کر چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے تو ابھی.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے

”ساتھ میں سب ہوگا۔ تو فکر کیوں کرتا ہے۔ ابھی تجھے بہت سفر کرنا ہے۔ اس سفر کو سر پر سوار مت کرو، بلکہ اس کا مزہ لو۔ لوگ زندگی کو سمجھنے میں ہلکان ہوئے پھرتے ہیں، جبکہ زندگی اپنا آپ سمجھانے کے لئے تیرے پاس چل کر آچکی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اندر کی طرف چلے گئے۔ میں وہیں اپنی سوچوں میں کھو گیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

سورج مغرب کی اوٹ میں چھپ چکا تھا۔ کراچی پر شام اتر آئی تھی۔ وہ سب شاید کے شوروم میں بیٹھے ہوئے تانی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دوپہر سے نگلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بلوچی تھا۔ شاید، جہاں اور بدر شوروم میں بیٹھے بیٹھے اکتا چکے تھے۔ انہیں قطعاً معلوم نہیں تھا کہ تانی کہاں مصروف تھی اور کیا کر رہی تھی۔ اندھیرا جب پھیلنے لگا تو شاید نے جہاں کی طرف دیکھ کر پوچھا

”یار اب تو اس سے رابطہ کرو، وہ کہاں ہے اور کرنا کیا چاہ رہی ہے؟“

”تمہارے پاس فون ہے، تم پوچھ لو۔ مجھے اس سے رابطے کا کوئی شوق نہیں، وہ خود ہی فون کر لے گی۔“ جہاں

نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا

”دیکھو، خدا نخواستہ اس کے ساتھ کچھ حادثہ بھی ہو سکتا ہے، وہ.....“ شاید نے کہا تو جہاں نے مسکراتے ہوئے

کہا

”میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔“ لفظ جہاں کے منہ ہی میں تھے کہ اس کا فون بج اٹھا۔ جیسے ہی اس نے اسکرین پر نگاہ ڈالی وہ چونک گیا اور بولا، ”لو آگیا اس کا فون،“ یہ کہہ کر اس نے کال ریسیور کے پوچھا ”کدھر ہو تم اور کیا کر رہی ہو؟“

”صرف دو گھنٹے مجھے مزید چاہیے، اس کے بعد سب بتا دوں گی۔“ اس نے جواب دیا

”تمہیں یہاں سے گئے ہوئے اب تک آٹھ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ یا رات ہی دیر تک تو ہم کبھی نہیں بیٹھے۔ آخر تم کر کیا رہی ہو؟“

”سب کچھ میں بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال تم لوگ یہاں سے نکلو اور بیٹنگ پر آ جاؤ۔ دھیان رہے کہ تم لوگوں کی نگرانی ہوگی۔ میری بھی نگرانی ہوئی تھی۔ وہ لوگ ہمیں نگاہوں میں رکھے ہوئے ہیں۔“

”تم اس وقت بیٹنگ پر ہو؟“ اس نے پوچھا

”ہاں۔ اب آ جاؤ تم لوگ۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

بیٹنگ تک پہنچتے ہوئے انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اگر انہیں پہلے سے نگرانی کے بارے میں معلوم نہ ہوتا تو انہیں نگرانی کا پتہ ہی نہ چلتا۔ دو گزیاں مسلسل ان کا پیچھا کرتی ہوئیں بیٹنگ تک آئیں تھیں۔ جہاں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ تانی کرنا کیا چاہتی ہے۔ وہ تینوں خاموشی سے آ کر ڈرائیونگ روم میں بیٹھ گئے۔ تھی تانی اندر سے آئی اور ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”یہ سارہ کدھر ہے۔ باہر نہیں آئی ابھی تک؟“

”سارہ، مراد اور تمہارے ابو یہاں نہیں ہیں۔ وہ یہاں سے بہت دور نگر پہنچنے والے ہیں، وہ اس وقت بہاول پور سے نکل چکے ہیں اور نورنگر تک پہنچنے میں انہیں مزید ایک گھنٹہ لگے گا۔“ اس نے سکون سے کہا تو شاید ایک دم سے چونک کر یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے تانی پاگلوں والی بات کر رہی ہو۔

”تم..... تم نے انہیں کیوں بھیجا؟ وہ..... کن کے ساتھ گئے ہیں، راستے میں اگر.....“ غصے اور حیرت کے باعث شاید سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

”وہ تینوں اور تمہارا سونا اور جواہرات سب وہاں پر محفوظ ہیں۔ وہ سب ہمارے لوگوں کی حفاظت میں وہاں تک بائی روڈ گئے ہیں۔ سارہ نے میری بات مان لی اچھا کیا۔“ تانی نے کہا

”وہ اب کہاں ہیں؟“ شاید نے پوچھا

”بتایا نا، وہ بہاول پور کر اس کر چکے ہیں۔ نورنگر میں ان کے پہنچنے کی اطلاع ہو چکی ہے، وہ ان کا انتظار کر رہے

ہیں۔“ تانی نے بتایا تو بدر نے پوچھا

”ایسا تم نے کیوں کیا؟“

”ہاں یہ سوال تم نے ٹھیک کیا۔ اس کا سیدھا جواب تو یہی ہے کہ سونا اور جواہرات کے ساتھ سارہ لوگوں کو محفوظ رکھانے پر پہنچا دیا ہے۔ اور دوسرا جواب بھی سن لو، تم لاشعوری طور پر وہ کام کرتے چلتے جا رہے ہو، جو وہی والوں کو پسند نہیں ہیں۔“

”مطلب، روہی والوں کو پسند نہیں، میں نے کیا کیا ہے۔“ بدر نے حیرت سے پوچھا
 ”تم عام جرائم پیشہ لوگوں کی مانند علاقے فتح کر رہے ہو، تاکہ جتنا زیادہ علاقہ تیرے پاس ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ تسلط رکھنا چاہتے ہو۔ دولت اور طاقت کے لئے تم وہ سب کرتے چلے جا رہے ہو، جو روہی والوں کا وطیرہ نہیں ہے۔“
 ”دولت اور طاقت کے بغیر کیا ہو سکتا ہے۔ یہاں رہ کر ان جرائم پیشہ لوگوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ان پر دبدبہ چاہئے۔“ بدر نے تیزی سے کہا
 ”لیکن منشیات کا کاروبار، ناجائز سگنگ، اور قتل، یہ ہمارا کام نہیں ہے۔“ ثانی نے اس کے چہرے پر دیکھ کر کہا
 ”یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا
 ”مگر ہم نہیں کرتے، ہم صرف ان کا خاتمہ کرتے ہیں جو انسانیت کے دشمن ہیں۔ کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”میں کیا کروں، طاقت کے بغیر.....“ بدر نے کہنا چاہا تو ثانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا
 ”ہم یہاں کیوں ہیں، صرف تمہیں یہ بتانا ہے کہ تمہارے بغیر بھی روہی والوں کے کام ہو سکتے ہیں۔ تم دولت اور طاقت کی ہوس میں وہ سارے اصول بھول رہے ہو، جو تمہیں بتائے گئے تھے۔ اسی لئے تمہیں دعویٰ سے یہاں بلوایا گیا تھا۔“ ثانی نے کہا
 ”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔“ بدر نے غصے میں کہا تو ثانی سکون سے بولی
 ”دیکھو بدر، میں اس کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتی، یہ تیسری پارٹی کوئی اور نہیں۔ تمہاری ذاتی دشمن ہے۔ تم نے سونے اور جواہرات کی ڈیل اس سالار صدیقی سے خود کی؟“

”ہاں کی، میں سونے اور جواہرات سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔“ اس نے تیزی سے کہا
 ”کس نے کہا تھا؟“ ثانی نے پوچھا
 ”وہ سونا اور جواہرات میرے تھے، وہ لوگ مجھے دے گئے تھے۔ میں جو چاہوں اس کا کروں۔“ بدر نے جواب دیا

”اگر ہم میں سے کسی نے اس سے حصہ نہیں لیا تو مجھے اس کے حقدار نہیں ہو۔ اگر ہو تو بتاؤ؟“ ثانی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔
 ”اب کیا کرنا ہے؟“ بچال نے خاموشی توڑی تو ثانی نے کہا
 ”اب جو کچھ کرنا ہے بدر ہی نے کرنا ہے، اگر وہ سالار سے جان چھڑا سکتا ہے تو ٹھیک، ورنہ ہم اس کا معاملہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے ہیں۔“

”اب ڈیل تو اس سے ہو نہیں سکے گی، اس لئے دشمنی تو ہو گئی اس سے۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے ڈیل کر لوں، مگر اب میرے پاس تو کچھ نہیں۔“ بدر نے سکون سے کہا
 ”تو بس اس سے یہی کہو کہ اس نے اس ڈیل کے بارے میں شاید سے کیوں بات کی۔ مان جاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ آج رات اس کا کام کر دیتے ہیں۔“ ثانی نے کچھ اس طرح کہا کمرے میں موت کا سناٹا پھیل گیا۔ بدر نے چند لمحے سوچ کر فون نکالا اور سالار صدیقی کے نمبر ڈائل کر دیئے۔ ذرا دیر بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے سالار ہی تھا۔ بدر نے غصے میں پوچھا

”تم میری نگرانی کیوں کروا رہے ہو؟“

”تم جانتے ہو، گولڈ میرے لئے نشہ ہے، جہاں یہ ہوگا، میں وہیں ہوں گا۔ تم میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ جب تک وہ گولڈ مجھے دے نہیں دیتے ہو۔ مجھے سکون کیسے ملے گا۔ آج رات تم نے مجھے وہ گولڈ دیئے کا وعدہ کیا ہے، تو نگاہوں سے دور کیسے کر دوں۔“
 ”لیکن تم بلاوجہ میری نگرانی کر کے خود کو مشکوک کر رہے ہو۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم مجھ سے ڈیل نہیں، گولڈ مجھے سے چھین لینا چاہتے ہو؟“
 ”گولڈ لینا ہے میں نے تم سے۔ نگاہوں سے اوجھل کیسے کر دوں تمہیں۔ اور میں نے ہر صورت میں گولڈ لینا ہے تم سے، چاہے جس طرح دو۔“
 ”اگر ایسی بات ہے تو پھر میں تم سے ڈیل نہیں کر رہا۔ میں وہ کسی.....“ بدر نے کہنا چاہا تو اس نے بات کاٹتے ہوئے دھاڑ کر کہا

”اس کا انجام جانتے ہو نا تم؟“
 ”تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی خناس ہے تمہارے دماغ میں تو میں اسے نکال دوں گا۔“ بدر نے کہا تو دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ تبھی ثانی نے کہا
 ”بس ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں۔ اب نکلو یہاں سے۔“

”کہاں جانا ہے؟“ بدر نے پوچھا
 ”گڈانی۔ اس کا معاملہ وہیں دیکھیں گے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دو فوروییل جیپوں میں وہاں سے نکلے۔ شاید کو انہوں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی جب وہ گڈانی کے علاقے میں جا پہنچے۔ یہاں کلشن یاد دوسرے ساحلی علاقوں کی مانند رونق نہیں تھی، کافی دیران علاقہ تھا۔ ساحل سے کچھ دور ہی انہوں نے گاڑیاں روک دیں۔ اندھیرا کافی تھا۔ ثانی، بدر اور بچال کے ساتھ چند آدمی تھے، جن کے ہاتھوں میں نارنج تھی۔ وہ بھی ساحل کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ثانی اور بدر کے کاندھوں پر بڑے بڑے بیک تھے۔ جنہیں وہ بہت حفاظت سے لے جا رہے تھے۔ ساحل کے ساتھ ہی ایک موٹر بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ جس میں وہ بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھے ہی موٹر بوٹ چل دی۔ کچھ دیر بعد ساحل سے کافی دور ایک چھوٹے اسٹیمر کی بتیاں دکھائی دینے لگیں، جو لمحہ قریب آتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ اسٹیمر کے پاس پہنچ گئے تو نارنج ہی کی مدد سے ان کو پہچان ہوئی۔ موٹر بوٹ سے اسٹیمر کی طرف جانے والے چھ لوگ تھے۔ وہ بھی اوپر چڑھ گئے۔ وہاں اسٹیمر میں صرف تین لوگ تھے۔ اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد انہوں نے ان تینوں کو ایک طرف لے جا کر باندھ دیا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ تبھی ان میں سے ایک بندے نے ہمت کر کے پوچھا

”یہ کیا کر رہے تم لوگ، ہمیں باندھنے کا مطلب جانتے ہو کیا ہے؟“
 ”جانتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اسٹیمر سالار صدیقی کا ہے، جسے ہم نے بڑے طریقے سے کرائے پر حاصل کیا ہے۔ اب ہم اسی اسٹیمر پر دعویٰ جائیں گے، تمہیں کوئی اعتراض؟“ ثانی نے حقارت سے کہا تو اس بندے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”یہ..... یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔“ اس نے کہا
 ”اور تم لوگ ٹھیک کر رہے تھے۔ ابھی تم نے سالار کو اطلاع نہیں دی کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ تاکہ وہ ہمیں قتل کر سکے۔“ ثانی نے اس کی پسلیوں میں زور سے لات مارتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

تانی نے انہیں زیادہ وقت نہیں دیا، ان کے سروں پر بسل کے دستے مار کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ اس دوران بدر اور جہاں نے بیک کھولے۔ اس بیک میں چھوٹے چھوٹے کئی بم تھے۔ جنہیں وہ تیزی سے لگانے لگے۔ دس منٹ میں انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ میزمری کے ذریعے سمندر میں اتر گئے۔ ان سے کافی دور موٹر بوٹ تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اس بوٹ پر پہنچ گئے۔ وہ تھک کر پڑ رہے تھے۔ وہ بوٹ میں لیٹ گئے۔ موٹر بوٹ چلانے والا، آہستہ آہستہ انہیں ساحل کی جانب لے جانے لگا۔

اس دوران ساحل کی طرف سے دو موٹر بوٹس تیزی سے اسٹیمر کی جانب بڑھنے لگیں تو تانی سمیت سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بدر نے اپنی جیکٹ کے اندر سے فون لیا جو پلاسٹک کے چھوٹے بیک میں بند تھا۔ وہ بیک ہٹا کر فون نکالا۔ فون بھینکنے سے محفوظ تھا۔ اس نے فون سے ساحل پر چھپے ہوئے لوگوں سے رابطہ کر کے پوچھا ”تم لوگوں نے سالار کو جاتے ہوئے دیکھا، وہ تھا ان میں؟“

”جی تھا ان میں، ابھی یہاں سے گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم لوگ تیار ہو، ہم ابھی آتے ہیں، لیکن یہ دیکھ لینا، ان کا کوئی آدمی یہاں پر نہ ہو۔“ بدر نے کہا تو دوسری طرف سے بتایا گیا

”جی ان کے دو آدمی ہیں یہاں پر، ان کے پاس گاڑیاں بھی ہیں۔ شاید وہ ان کے لوٹنے کا انتظار کریں گے۔“

”انہیں ابھی کچھ نہیں کہنا۔ صرف ان پر نظر رکھو۔ آنکھوں سے ادھمل نہ ہوں۔ میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ ساحل کی جانب بڑھ رہے تھے۔

تانی آنکھوں کے ساتھ ٹائٹ ٹیلی اسکوپ لگائے اسٹیمر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا دوران خون تیز ہو چکا تھا۔ وہ دونوں موٹر بوٹس تیزی سے اسٹیمر کے قریب پہنچ چکیں تھیں۔ اب ان کی کامیابی کا امکان صرف یہی تھا کہ وہ لوگ اسٹیمر پر چڑھ جائیں۔ جبکہ وہ ایسا نہیں کر رہے تھے۔ نیچے سے تار کے ذریعے اشارہ دیا جا رہا تھا، مگر اوپر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہی اس پلان کا سب سے کمزور لمحہ تھا۔ تانی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بم پھٹنے میں چند منٹ رہ گئے۔ اوپر سے کوئی ہلچل نہ ہوئی تو وہ سب تیزی سے اسٹیمر پر چڑھنے لگے۔ اب بم پھٹنے کا وقت منٹوں سے سیکنڈوں پر آ گیا تھا۔ اچانک اسٹیمر پر زوردار دھماکے ہونے لگے۔ چند دھماکوں کے بعد اسٹیمر میں آگ لگ گئی تو تانی نے ساحل کی طرف جانے کو کہا۔ یہ سب تیزی سے ساحل کی طرف گامزن ہو گئے۔ بدر نے فون نکالا اور ساحل پر اپنے لوگوں سے رابطہ کیا

”تم لوگوں نے دھماکے سنے ہیں؟“

”سنے تو ہیں، یہ کیا ہوا ہے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا

”میں آکر بتاتا ہوں۔ وہ ساحل پر جو لوگ تھے، ان کی کیا پوزیشن ہے؟“ بدر نے پوچھا تو دوسری طرف سے

بتایا گیا

”وہ ابھی تک وہیں ہیں۔“

”اگر ان پر قابو پا سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ ختم کر دو انہیں۔“ بدر نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی تانی نے اونچی آواز میں

کہا

”شاید سالار بچ گیا، ایک بوٹ تیزی سے واپس آ رہی ہے۔“

”یقیناً وہ اسٹیمر پر نہیں گیا تھا۔ چلو جلدی سے ساحل پر پہنچو۔“ بدر نے کہا تو جہاں بھی اٹھ بیٹھا۔ وہ اب تک

صرف تماشا دیکھ رہا تھا۔ بدر نے ساحل سے رابطہ کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سالار کے آدمیوں سے کافی دور ساحل پر آ گئے۔

موٹر بوٹ سے اترتے ہی وہ انتہائی تیزی سے اس طرف آ گئے جہاں سالار کے لوگ تھے۔ وہ سب گھات لگائے سالار کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی بوٹ ساحل پر آ گئی۔ ایک پنسل نارچ کی محدود روشنی میں وہ اپنی گاڑیوں کی طرف آ رہے تھے۔ وہ فون پر اونچی آواز میں کسی کو انتہائی غصے میں ہدایت دے رہا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں یہی سمجھ آ رہی تھی کہ وہ بندوں کی تلاش کرنے اور انہیں قابو میں کرنے کا کہہ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی گاڑی کے قریب آیا۔ ہر طرف سے کئی نارچیں روشن ہو گئیں۔ وہ روشنی میں نہایا درمیان میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے اور اس کی گاڑیوں کے نائز برسٹ ہو گئے۔

”سر پر ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھ جاؤ سالار، ورنہ ایسا ہی تمہارے ساتھ کریں گے، جیسا تیری گاڑیوں کے ساتھ ہوا۔“ تانی نے کہا تو سالار نے آواز کی سمت دیکھا اور سر پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ اگلے ہی لمحے تانی اور جہاں آ گئے بڑھے اور ان کی تلاشی لی۔ سالار کی جیکٹ سے دو بسل نکلے۔ اس کے ساتھیوں کے پاس سے جو اسلحہ ملا۔ وہ اکھٹا کر کے ایک گاڑی میں رکھ دیا۔ تبھی بدر آ گئے بڑھا اور سالار کے سامنے جا کر بولا

”اب بتاؤ سالار، مرنے سے پہلے کا نشانہ کیا ہوتا ہے؟“

”تم نے مجھے دھوکے سے پکڑا اور.....“ اس نے کہنا چاہا تو بدر نے کہا

”تمہارے منہ سے یہ بات نہیں بگتی سالار۔ تم نے ہمارے لئے جو جال بچھایا تھا، اسی میں پھنس گئے تو یہ دھوکا

ہو گیا؟ یہ اسٹیمر کس کا ہے؟ ہم نے خود ساری معلومات تم تک پہنچائی اور تم ہمیں جال میں پھانسنے کے لئے، ہمارے ہی جال

میں آتے چلے گئے، اور اب کسی چوہے کی مانند یہاں پڑے ہو۔“ تانی نے تحارت آمیز لہجے میں کہا

”میں نے تو بدر سے ڈیل کی تھی، اپنا پیسہ لو اور گولڈ مجھے دو، بس۔“ سالار نے کہا تو بدر بولا

”اور اس کے بعد.....“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا، جب سالار نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولا،

اس کے بعد تم مجھے مار دیتے، اور گولڈ تمہارا ہو جاتا۔ یہ اچھا ہوا کہ تم پھنس گئے۔ ورنہ مجھے زیادہ محنت کرنا پڑتی۔ مجھے میرے

ساتھیوں کے سامنے مشکوک ہونا پڑا۔ بولو، کس سے ڈیل ہوئی ہے تمہاری؟“ یہ کہہ کر اس نے زوردار گھونسا اس کے منہ پر

دے مارا۔

”اگر مجھے یہاں سے جانے دو تو میں ساری بات بتا دیتا ہوں۔“ سالار نے کہا

”بولو۔“ بدر نے تیزی سے کہا

”تو سنو! مہرل شاہ اور مہر سکندر کے قتل کا بدلہ تم سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ کچھ بیرونی طاقتوں نے انہیں روک

دیا۔ کچھ سیاست دان ہیں جو ان کے لئے کام کر رہے ہیں۔ گولڈ کا تو بہانہ تھا۔ اصل میں وہ تم اور تمہارے ساتھیوں تک پہنچنا

چاہ رہے ہیں۔ ان کا کوئی کام یہاں نہیں ہو پارہا ہے اور اب وہ تم لوگوں تک پہنچ چکے ہیں۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ بدر نے پوچھا

”بھارت سے تعلق رکھتے ہیں اور دعویٰ میں ان کا نیٹ ورک ہے۔ وہ زیادہ تر سیاست دانوں میں کام کر رہے

ہیں۔“ سالار نے کہا تو اچانک جہاں نے اونچی آواز میں بولا

”بدر، زیادہ باتیں نہیں کرو۔ نکلو یہاں سے، ہم اب بھی محفوظ نہیں۔ وہ لوگ ہمیں گھیر سکتے ہیں۔“

”تمہارا یہ بندہ بہت سمجھدار ہے۔ لیکن ایسی سمجھداری کی کیا اوقات، جو بعد میں آئے۔ تم لوگ اب تک گھیرے

جا چکے ہو۔ میں نے پہلے ہی ہر طرح سے تم لوگوں کا بندوبست کر دیا تھا۔“ یہ کہہ کر سالار نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے تانی

نے اپنا بسل سیدھا کیا اور سالار کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اسی کے ساتھ ہر طرف سے فائرنگ ہوئی اور درمیان میں

لے پیالی ویسے ہی رہنے دی۔ وہ چائے پی کر تھوڑا تازہ دم ہوئے تو تانی نے سیدھا لپٹے ہوئے پوچھا

”بدر! تمہارا فون کام کر رہا ہے یہاں؟“

”ہاں کر رہا ہے۔ کیوں؟“

”میرا خیال ہے کہ یہ جو ہمارے ارد گرد ماحول بنا ہوا ہے اسے ختم نہ کر دیں؟“ تانی نے عجیب سے لہجے میں کہا تو

انہوں نے پوچھا

”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

”یہی کہ جو لوگ ہمیں پکڑنا چاہتے ہیں، انہی پر وار کر دیں۔“ اس نے سکون سے کہا تو جہاں تیزی سے بولا

”نہیں، میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتا، ہمیں بہر حال یہاں سے نکلنا ہے۔ اب یہاں کے معاملات بدر

نہ جانے۔ ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔“

”مجھے اب نئے سرے سے سارا سیٹ اپ کرنا پڑے گا۔ میں مانتا ہوں کہ میں روپی والوں کی نگاہوں سے

اوجھل نہیں ہو سکتا۔“

”بس ٹھیک ہے۔ تو پھر فون کرو، ہمارے سنے پہلی فلائٹ سے نکلیں بگ کروالو۔ ہمیں بھی اب نور عمری جانا

ہے۔“

”تو نکلیں پھر؟“ بدر نے ایک دم سے کہا تو وہ دونوں اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹی کار سے کراچی شہر

کی طرف گامزن تھے۔ صبح کا نور چاروں جانب پھیل گیا تھا، جب وہ واپس بیٹنگے میں پہنچ گئے۔

☆.....☆.....☆

اندھیرا کافی گہرا تھا۔ ہر طرف سکون تھا۔ شام ہوتے ہی کرنل سرفراز کہیں چلے گئے تھے۔ میں کافی دیر تک

کارڈور میں بیٹھا ان کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ان کی یہ بات کہ انسان کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ

اس میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بہت ہی پرکشش تھا اور اسی کی وجہ سے مجھے سوچنے کے لئے کافی راستے مل گئے

تھے۔ ڈنر پر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اکیلا ہی تھا۔ ڈنر کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور کرنل کی باتوں پر

سوچتا رہا۔ مجھے ان باتوں کے سوچنے پر مزہ آ رہا تھا۔ یہ ذہنی مشقت مجھے خود اچھی لگ رہی تھی۔ میں بیٹے پر بڑا سوچتا رہا اور

پھر نہ جانے میری کب آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں اٹھ کر کھڑکی میں چلا گیا۔ باہر گہرا اندھیرا اور سناٹا تھا۔ مجھے یوں لگا

جیسے کافی دور کہیں کوئی گاڑی رکھی ہے۔ میں نے پہلے تو اسے اپنا وہم خیال کیا، پھر یہ سوچا کہ شاید کرنل واپس آیا ہو۔

چند لمحوں میں خاموشی کی نذر ہو گئے۔ اچانک اس گہرے سنائے کوکتوں کی آواز نے چہرہ کر رکھ دیا۔ وہ بری

طرح بھونکنے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فائر ہوا جس نے فضا میں سنسنی بھری۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ میرے اندر

اچانک ہی جوانی بھر گئی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، جسے ہاتھ میں لے کر باہر نکلتا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میں وہاں

بیٹھا رہتا۔ میں کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک ملازم تیزی سے اندر آیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولا

”کچھ لوگوں نے فارم ہاؤس پر چڑھائی کر دی ہے۔ وہ کون ہیں اس بارے میں نہیں معلوم، مگر باہر کچھ مشکوک

لوگ ہیں۔“

”کتے لوگ ہیں وہ؟“ میں نے پوچھا

”یہ ابھی مجھے نہیں پتہ، مگر وہ دو گاڑیوں پر ہیں اور اندر آنے کی کوشش میں ہیں۔ ان کے بارے میں پتہ چل جاتا

ہے ابھی۔“ اس نے تیزی ہی میں بتایا تو مجھے ایک دم سے خیال آیا۔ تب میں نے پوچھا

کھڑا سالار کا ہر بندہ گرنا چلا گیا۔

جہاں کا خشک درست تھا۔ وہ لوگ جو انہیں گھیرنے والے تھے، ان سے کچھ فاصلے پر ہی تھے۔ اسٹیئر کے تباہ

ہوتے ہی وہ لوگ حرکت میں آچکے تھے۔ گڈانی کا علاقہ ان کے لئے جال ثابت ہو سکتا تھا۔ اب یہاں سے نکلنا ہی ان کے

لئے سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اسی علاقے میں تانی کے ساتھ منسلک کچھ لوگ تھے، جو یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے

تھے۔ انہوں نے اطلاع تانی کو دے دی تھی۔ یہ اطلاع پاتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”بولو! کیا کرنا ہے اب، نکل چلیں یا ان کا مقابلہ کرنا ہے۔“ تانی نے پوچھا

”یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔“ جہاں نے کہا تو اس نے اگلے ہی لمحے کہا

”چلو! نکلے ہیں۔ خواہ مخواہ الجھنے کی ضرورت نہیں۔ بعد میں دیکھتے ہیں۔“

انہوں نے پلان طے کیا اور واپس سمندر کی جانب چل پڑے۔ وہ زمینی راستے کی بجائے سمندری ساحل کے

ساتھ کراچی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ وہ تینوں موٹر بوٹ میں بیٹھے تو ان کے ساتھی گاڑیاں وہاں چھوڑ کر اندھیرے میں

نکل گئے۔

گہرا اندھیرا، نم دار تیز ہوا اور ساحل کے ساتھ سفر کرتے کرتے وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ ان کے درمیان

خاموشی تھی۔ ان کی ساری توجہ وہاں سے نکل جانے میں تھی۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہونے کو تھا جب وہ ایک ویران علاقے

میں آکر رکے اور ساحل کے ساتھ بوٹ روک دی گئی۔ وہ بوٹ سے اتر کر خشک جگہ آگئے۔ سامنے مٹی اور سرکنڈوں سے جی

جھونپڑیاں تھیں۔ وہ اس جانب بڑھ گئے۔ وہاں ہر جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتے جا

رہے تھے۔ اچانک ان کے سامنے دوڑ کے آکر رک گئے۔ وہ بدر کے آدی ہی تھے۔ انہیں پہچان کر بدر بولا

”ہاں کہو، کسی صورت حال ہے یہاں؟“

”ٹھیک ہے بھائی، اگر ابھی نکلنا ہے تو ایک چھوٹی گاڑی حاضر ہے، صبح تک تو بہت کچھ بندوبست ہو سکتا ہے۔“

ایک لڑکے نے آہستہ آواز میں کہا تو بدر نے پوچھا

”دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے، تم بتاؤ، یہاں ارد گرد کوئی ایسے لوگ جو اجنبی ہوں، یا ایسا ماحول جس میں کوئی مشکوک

.....“

”تھے ایسے لوگ، اور وہ اب بھی ہیں۔ کافی ہلچل ہے ماحول میں بھائی۔“

”کتے لوگ ہوں گے وہ سب؟“ بدر نے پوچھا

”آپ ابھی ان کے بارے میں مت سوچیں۔ ماحول کافی سخت ہے، پولیس بھی ہے ان کے ساتھ۔ اب پتہ

نہیں وہ جعلی پولیس ہے یا.....“ اسی لڑکے نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”یہاں کوئی جگہ ہے کچھ دیر تک رہنے کے لئے؟“ بدر نے پوچھا

”بہت، آپ آئیں تو سہی۔“ اسی لڑکے نے کہا تو وہ ان کے ساتھ چل دیے۔ وہ لڑکے انہیں ایک جھونپڑی

میں لے گئے، جہاں زمین پر درمیانی پٹی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گئے تو وہ لڑکا بھی ہوئی پھلی کے ساتھ تھوڑی روٹیاں

لے آیا۔ وہ برتن ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا

”ہیں تو یہ ٹھنڈی۔ اگر کہیں تو گرم کر لانا ہوں۔ ویسے کچھ دیر بعد گرما گرم چائے ضرور مل جائے گی۔“

”چل لایا، یہ پیٹ کا دوزخ تو بھریں۔“ جہاں نے کہا اور روٹیاں اپنے آگے رکھ لیں۔ جب تک انہوں نے

”یہ سب تمہیں کیسے پتہ اور ان کے بارے کیسے معلوم ہو جائے گا؟“

”آئیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ دو تین راہداریاں مڑنے کے بعد وہ ایک کمرے میں لے گیا۔ وہ فارم ہاؤس کا کنٹرول روم تھا۔ اس میں چھ اسکرین لگے ہوئے تھے، جن میں مختلف مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں دو اسکرین ایسے تھے، جن میں فارم ہاؤس کے باہر کے مناظر تھے۔ وہاں اچھی خاصی پچھل تھی۔ فور ویل جیپوں کے آگے چند لوگ متحرک تھے۔ وہ اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے۔ شاید وہ کتوں کی وجہ سے ابھی تک اندر داخل نہیں ہو پائے تھے۔ میں نے سارا ماحول سمجھا اور پھر اسی ملازم سے پوچھا

”یہاں پر اپنے بندے کتنے ہیں اور ہتھیار کہاں ہیں۔“

”ہم یہاں پر صرف چار بندے ہیں۔ تین ہم اور ایک بندہ باہر گیٹ والے کمرے میں ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”تم فکر نہ کرو۔ مجھے ہتھیار لا کر دو، باقی میں دیکھتا ہوں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ مڑا اور اس نے دیوار میں لگی ایک الماری کے لوہے کے پٹ کھولے۔ اندر پڑا جدید اسلحہ دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ میں نے اپنی پسند کا پسٹل لیا۔ فالٹور اوپن اٹھائے اور باہر کی جانب جانے لگا تو ملازم نے کہا ”سر! آپ کو اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے آپ باہر جائیں کوئی بات نہیں لیکن انہیں فارم ہاؤس کے اندر ضرور آنے دیں۔ پھر آپ دیکھیں ان کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔“

”کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔“

”سر! یہ جو کنٹرول روم میں بندہ بیٹھا ہے، یہ سب دیکھ لے گا۔“ اس نے کہا تو مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی، میں اس کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

باہر دھبی روشنی تھی، جس میں صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے ان کی لوکیشن کے بارے میں اندازہ تھا اور دوسرا کتے ان کی سمت بارے نشاندہی کر رہے تھے۔ میں کاریڈور کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کتے بڑی زور سے بھونکنے لگے تھے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر کتوں کو خاموش کرایا تو باہر آنے والے لوگ الرٹ ہو جائیں گے۔ اور ایسا نہ کیا تو وہ باہر والے لوگوں کی گولی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ سو میں دم سادھے دیکھتا رہا۔ مجھ سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر ایک آدمی دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ وہ چند لمحوں کے بعد دوبارہ اٹھا۔ اس نے باہر کچھ پھینکا، جس کے چند لمحوں کے بعد وہ آدمی اندر آگئے۔ اس کے ساتھ ہی تین آدمی آگئے۔ وہ چھ تھے۔ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ کافی حد تک پھیلے ہوئے تھے۔ گتے وہاں سے بھاگ کے دوسری جانب چلے گئے تھے اور وہ وہیں کھڑے ان پر بھونک رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک آدمی زکا اور دوسروں کو زک جانے کا اشارہ کیا۔ وہ شاید اندر کی سُن گن لینا چاہتا تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد چھوٹے ہی وہ اندر کی جانب آگے بڑھا اور میں نے فائر کرنے کے لئے پسٹل صید حائی کیا تھا اچانک سرخ رنگ کی شعاعیں ان کی جانب بڑھیں۔ انہیں جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔ انہیں اپنا ہوش ہی نہیں رہا اور پہلے ہی بے ملے تین میں گر گئے۔ دوسرے ابھی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ میں یکے بعد دیگرے ان پر فائر کرتا رہا۔ لیکن شعاعیں پہلے ہی اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ ملازم کیا کہہ رہا تھا۔ ان میں سے ایک واپس مڑا اور دیوار کو دربارہ جانا چاہتا تھا کہ میرے نشانے کا شکار ہو گیا۔

ایک دم سے سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کوئی کراہ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ تبدیل کر لی تھی اور کاریڈور کے دوسرے سرے پر چلا گیا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے سو فیصد یقین تھا۔ اچانک دو آدمی اٹھے اور فائر کرتے ہوئے کاریڈور کی

جانب بھاگے۔ وہ سامنے سے فائر نہیں ہونے دینے چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کاریڈور کی سیڑھیوں تک آگئے۔ شعاعیں پھر نکلیں۔ مگر وہ اس کے اثر میں نہیں آئے تھے۔ میں نے ان کے نچلے دھڑکا نشانہ لیا اور فائر کرنا شروع کر دیا۔ وہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے۔ اچانک میرے سر کے اوپر سے ایک راکٹ فائر ہوا۔ وہ کسی نے چھت پر سے چلایا تھا۔ اگلے ہی لمحے باہر کھڑی گاڑی دھماکے سے پھٹ گئی۔ میں نے لمحہ بھر کی حیرت و روشنی میں ان بندوں کے بارے میں اندازہ کر لیا کہ کون کدھر ہے۔ دھماکے کے فوراً بعد ایک اور راکٹ چلایا گیا اور دوسری گاڑی بھی دھماکے سے تباہ ہو گئی۔ تبھی اندر سے ایک ملازم باہر آیا، اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس نے باہر آتے ہی کاریڈور میں سوچ آن کر دیا۔ باہر لان میں دور تک روشنی ہو گئی۔ وہ چھ کے چھ وہیں پڑے دکھائی دیے۔

”وہ جو باہر ملازم تھا، اس کا کیا ہوا، اسے دیکھو۔“

”وہ محفوظ ہے اور راجلے میں ہے۔ وہ باہر والے اس کمرے میں ہے۔“ اس نے گیٹ کے ساتھ بنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس پر میں سر ہلا کر رہ گیا۔ تب اس نے کہا، ”انہیں اٹھائیں، یا یہیں پڑا رہنے دیں؟“

”دیکھیں تو سہی یہ کون ہیں؟“ میں نے صلاح دی تو وہ محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ میں اس کے کور پر تھا۔ اتنے میں باہر والے کمرے سے بھی ملازم آ گیا۔ ان میں سے دو لوگ مر چکے تھے۔ جیسے ہی میری نگاہ کاریڈور کے ساتھ پڑے تین بندوں میں سے ایک پر پڑی تو میں چونک گیا۔ یہ وہی تھا، جس نے مجھے چند دن پہلے اغوا کیا تھا اور جس کی وجہ سے میں یہاں پر تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میری تلاش میں ادھر آیا تھا۔ اس نے مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے ملازم سے اسے اٹھانے کو کہا۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کا خون کافی حد تک بہہ گیا تھا۔ ایک ملازم نے اسے کاریڈور کے فرش پر لٹا دیا تھا۔ دو ملازموں نے مرے ہوؤں کو الگ کیا اور باقی تین کو باہر والے کمرے میں لے گئے۔ وہ میرے سامنے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں نے پانی اس کے منہ پر مارا تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اسے ہوش دلانے کے لئے اس کا منہ پکڑا، تب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میری جانب خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر اٹکتے ہوئے بولا

”میں..... میں..... نے مان..... لیا..... تم خط..... طرناک..... ہو..... بہت..... تلاش..... کیا میں نے..... تمہیں اور..... اب.....“ تکلیف کے باعث اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

”یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم بھارتی ہو اور تمہیں میرے قتل کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں تک؟“

”میں..... بھیجا..... نہیں گیا..... مجھے بلوایا..... گیا ہے..... شاہنواز..... کا پورا ایک گروہ ہے..... جو ہمارے ساتھ کام کرتا ہے..... تیرے علاقے میں ہمارا..... پورا امیٹ ورک..... چل رہا ہے..... اس کی حفاظت..... تو ہم نے کرنی ہے..... نا..... یہ لفظ اس نے بہت مشکل سے کہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہچکیاں لینے لگا۔ میں نے پانی اس کے حلق میں اغڑایا ہی تھا کہ باہر کافی ساری گاڑیاں آن رکیں۔ ملازم حیرت سے باہر کی جانب لپکا۔ اگلے چند لمحوں میں کرنل سرفراز کے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی آگئے۔ وہ لوگ آتے ہی ان لوگوں کو اٹھانے لگے۔ میرے سامنے پڑا جوان میری جانب سر ت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا

”تم مجھے..... اپنے ہاتھوں سے..... مار دو..... میں قید..... ہونا نہیں چاہتا۔“

”نہیں، تجھے کوئی بھی نہیں مارے گا۔ تم اگر علاج سے زندہ بچ گئے تو میں تم سے ملوں گا۔ جاؤ اب۔“ میں نے کہا اور وہاں سے پلٹ کر اندر کی جانب چلا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ کرنل مجھ سے کوئی بات کریں، مگر وہ جلالت میں تھے۔ فوراً ہی واپس چلے گئے۔ میں آدمی رات گزر جانے کے بعد بھی یونہی جاگتا رہا۔ میرے حواس ہی نہیں، میرا اندر بھی جاگ گیا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یونہی ساری رات بیٹھا سوچتا رہا۔

اس وقت صبح کی نینکوں روشنی ہر جانب پھیل گئی تھی، جب کرنل واپس آیا۔ جیسے ہی وہ میرے پاس آکر بیٹھا۔ اس کے پیچھے ہی ملازم دو کپ چائے لے کے آگیا۔ اس نے ہمارے درمیان کپ رکھے اور واپس مڑ گیا۔ تبھی وہ بولا ”وہ نوجوان جس کے حلق میں تم نے پانی ڈالا تھا، وہ رستے ہی میں مر گیا۔ اس کی لاش فی الحال میں نے سرد خانے میں رکھوا دی ہے، پھر بعد میں دیکھیں گے۔ ویسے میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی کہیں۔“ میں نے تیزی سے کہا

”میں مانتا ہوں چاہے جتنا جدید حفاظتی نظام ہو، جب تک بندے میں دل اور جگر نہیں ہوتا۔ وہ جدید نظام بھی بے کار ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے سب سنبھال لیا۔ لیکن جب میں آیا تو تم دشمن سے اتنا پیار کیوں جتا رہے تھے؟“

”میں نے اس سے پیار نہیں کیا، بلکہ اس وقت وہ بے بس تھا۔ وہ چاہیے دشمن تھا، لیکن بے بس انسان کے ساتھ اور میں کیا کرتا۔“ میں اپنی طرف سے بہت مناسب جواب دیا تھا

”تم پہلے بھی ایسے ہی تھے یا یہاں پر کسی بات کا اثر لیا ہے۔“

”شاید پہلے ہی سے تھا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا

”خوب! کسی کے اندر کچھ ہو تو ہی باہر آتا ہے۔ انسان خود اپنے اعمال سے بتا دیتا ہے کہ اسے مٹی کیسی لگی ہے۔ مٹی بھی حلال اور حرام ہوتی ہے اور حرام مٹی فقط منافق کو لگتی ہے۔ اس کے ساتھ پیار جتنا خود اپنے آپ کے ساتھ دھوکا ہے۔“

”یہ منافق کا پتہ کیسے چلتا ہے۔“ میں نے پوچھا

”منافق ہوتا ہی وہی ہے جس کے بارے میں تب پتہ چلے، جب وہ منافقت کر جاتا ہے۔ میں نے تین برس تک ایک ایسے بندے کو پالا جو خود کو انسان ثابت کرتا رہا۔ لیکن بعد میں جب وہ منافقت کر گیا تو پتہ چلا کہ اسے مٹی ہی حرام لگی ہوئی تھی۔ بابا جی بلے شاہ سرکار نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا ہے ناکتے تیغوں اُٹے۔“

”دوست اور دشمن کا پتہ اسی وقت چلتا ہے۔ جب مشکل آن پڑے۔ ان کے بارے میں بندہ کلیم ہو جاتا ہے کہ وہ کیسے ہیں۔ لیکن منافق کی منافقت کے بعد بھی بندہ نہ سنبھلے تو وہ خطا کھاتا ہے۔ وہ پھر نہیں سنبھل سکتا۔“

”میں آپ کی بات یاد رکھوں گا۔“ میں نے دل سے کہا تو وہ بولے

”آج تم نورنگر واپس جاؤ گے۔ پتہ نہیں آگے حالات کیا بننے ہیں لیکن مجھے نجانے کیوں یہ احساس ہو رہا کہ تم لوٹ کر یہاں ضرور آؤ گے۔“ انہوں نے کچھ ایسے عجیب لہجے میں کہا کہ میں اندر سے ہلک کر رہ گیا۔ اس لئے جلدی سے بولا

”یقیناً جانیں اگر نورنگر میں معاملات پھیلے نہ ہوتے تو میں یہیں رہ جاتا۔ بہت سکون ہے یہاں پر، میں یہیں رہنا پسند کرتا۔“

”لیکن تمہارے مقدر میں سکون نہیں ہے اور نہ ہی اس کی خواہش کرتا۔ خیر! اب اٹھو، اور تیار ہو جاؤ۔ ڈرائیور تمہیں نورنگر چھوڑ آئے گا۔“

اس کے کہنے پر میں اٹھا تو وہ بھی اٹھ گیا۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے لگایا تو ایک لمحے کے لئے مجھے وہ وقت یاد آ

گیا، جب میں گوپے میں بابا جی سے ملا تھا۔ ویسی ہی ٹھنڈک میرے اندر اتر گئی تھی۔ میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے مجھے کائنات میں پھینک دیا گیا ہو اور میں بے وزن ہو گیا ہوں۔ چند لمحے یہی کیفیت رہی۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے الگ کیا میں خود میں بہت بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے اس تبدیلی کا پورا پورا احساس تھا۔ یہ کیا معرکہ تھا، اس کی مجھے اس وقت سمجھ نہیں آئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب میں وہاں سے نکلا تو بہت زیادہ پر جوش تھا۔ وہ دونوں کتے میرے ساتھ گاڑی میں میرے ساتھ نورنگر جا رہے تھے۔ جنہیں میں کتے کہہ رہا تھا۔ وہ منافقوں سے زیادہ اچھے تھے، انہیں میں کیسے بھول جاتا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر کا سورج اپنی دھوپ سمیت بادلوں کے ساتھ آنکھ پھولی کھیل رہا تھا، جب تانی اور جہاں، نورنگر کے قریب پہنچ گئے۔ دو پہر سے پہلے وہ بہاول پور ایئر پورٹ پر اترے تھے، جو انہیں ویران سا لگا تھا۔ شاید اس لئے بھی ویران لگا کہ وہ چھوٹا تھا اور بہت کم سواریاں اتریں تھیں۔ وہ ایئر پورٹ سے باہر آئے تو سامنے سرمد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے سیاہ رنگ کی فورڈ ہیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ بہت تپاک سے ملا، وہ دونوں سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ایک بندے کے ساتھ انہیں روانہ کر دیا۔ وہ جیسے ہی نورنگر کے قریب پہنچے تو ڈرائیور نے پوچھا

”اگر آپ کہیں تو نورنگر فون کر دیا جائے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔“

”تمہارے پاس نمبر ہے، اور کسے کرو گے فون؟“ جہاں نے مسکرا کر پوچھا تو ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا

”سرورہی کا مسلسل رابطہ ہے وہاں۔ اشفاق نامی ایک نوجوان ہے وہ۔ جمال کے بہت قریب ہے۔“

”تم گھر جانتے ہو؟“ تانی نے پوچھا

”میں پہلے کبھی نہیں گیا۔ لیکن پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے جواب دیا۔ تانی محسوس کر رہی تھی کہ یہ کوئی ایسے سوال

نہیں تھے جو پوچھیں جائیں، بس یونہی وہ خاموش رہ رہ کے اکتا چکی تھی، دوسرا شاید اس کے اندر خوشی تھی کہ وہ جمال کے پاس جا رہی ہے۔ جمال کے تصور کے ساتھ ہی اسے سوئی کا خیال بھی آیا۔ ایک وہی تھی جو جمال کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ پتہ نہیں مستقبل میں اس کے ساتھ کیسا رویہ اپنانا پڑے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ سوئی بھی اس وقت نورنگر میں ہے۔ تانی نے سوچ لیا تھا کہ وہ ہر ممکن حد تک سوئی کے ساتھ اپنا رویہ اچھا ہی رکھے گی۔ دونوں کے تعلق میں سوئی کا رویہ ہی بنیاد ثابت ہوگا۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ وہ نورنگر گاؤں کے داخلی راستے پر آگئے۔ جہاں اشفاق عرف چھا کا اپنی ساتھ چند لوگوں کو لیے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا تو ڈرائیور نے جپ روک دی۔ چھا کا آگے بڑھا اس نے ان تینوں پر نگاہ ڈالی، پھر مسکراتے ہوئے بولا

”تانی اور جہاں! میرے گاؤں نورنگر میں خوش آمدید۔ جی آیاں نوں۔“

”ہمیں پہچان لیا تم نے؟“ جہاں نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا

”دوستو کی خوشبو، دور ہی سے آ جاتی ہے۔ اور تم دونوں تو پھر اپنے ہو۔ آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنی بایک پر جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے جپ اس کے پیچھے لگا دی۔ ان کے سفر کا اختتام جمال کے گھر کے سامنے ہوا۔ وہ جپ سمیت اندر چلے گئے۔

جمال اور اس کی ماں سامنے ہی صحن میں نیم کے درخت تلے چار پائی پر بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھا۔ پہلے اس نے جہاں کو سینے سے لگایا اور پھر تانی سے گلے ملا۔ جہاں نے آگے بڑھ کے اماں کے قدموں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ماں نے اسے کانڈھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور سر پر پیار دیتے ہوئے دعائیں دینے لگیں۔ تانی ماں سے گلے ملی اور پوچھا

”اماں جی، یہ سوئی کدھر ہے؟“

”وہ ابھی کچھ دیر پہلے حویلی گئی ہے، ادھر کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنا ضروری تھا۔ تم لوگ بیٹھو، میں تمہارے لئے کھانا لاتا ہوں۔“

”ہاں اماں یہ کام تو کرو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ جہال نے کہا اور چارپائی پر پھیل گیا۔

”یہ سارہ بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔“ ثانی نے پوچھا

”وہ حویلی ہی میں رہتی ہے۔“ جمال نے کہا۔ پھر جو ان میں باتیں شروع ہوئیں تو ختم ہونے کو نہیں آرہی تھیں۔ جمال نے کرنل سے ہونے والی باتوں کو گول کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ یہ باتیں ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتا تھا۔ اس نے جہال کی روداد سنی۔ اس دوران کھانا بھی کھا لیا گیا۔ مغرب کے بعد تک سوئی واپس نہیں چلی تو وہ سب حویلی کی طرف چل دیئے۔ اماں گھر پر رہی۔ کچھ دیر بعد وہ سارے حویلی کے ڈرائینگ روم میں جمع تھے۔ ایک طرف جمال، جہال اور چھا کا بیٹھا ہوا تھا تو دوسری جانب سارہ، ثانی اور سوئی تھیں۔ ان کے درمیان کھانے پینے کی بہت ساری نعمتیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ باتوں میں مگن تھے۔ جی جہال نے ایک نئی بات چھیڑی

”یار جمال! ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم کبھی ملیں گے اور اس طرح ایک چھت تلے اکٹھے ہوں گے۔ یہ رتب کی کیا مرضی ہے یار؟“

”وہ تم نے سنا نہیں ہے کہ بندہ ہی بندے کی دوا ہوتا ہے۔ میں اکیلا تھا۔ جنہیں اپنا دوست خیال کرتا تھا، وہ سب منافق نکلے۔ پر رتب کی اپنی مرضی ہے۔ میرے ساتھ ہر خیال کا بندہ آتا چلا گیا۔ میں جو خود کو بڑا کمزور سمجھتا تھا، آج بہت حوصلہ مند ہوں۔ میں نے یہ جان لیا ہے کہ وقتی شکست، ایک بہت بڑی فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اگر نیت درست ہو۔“ جمال نے جواب دیا

”ہاں۔۔۔۔۔! یہ تو ہے۔ میرے خیال میں اب سکون چھا گیا ہے۔ دور دور تک تیرے دشمن نہیں ہیں۔ میں اب واپس کینیڈا چلا جاؤں۔ کیونکہ پھر وہیں سے اٹھنا جاسکوں گا۔“

”کیوں، ہر پریت کی بہت یاد آرہی ہے نا۔“ ثانی نے کچھ ایسے کہا کہ سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ریگ مچی۔ تبھی جمال بولا

”جہال، اگر تم جانا چاہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ تم جاؤ، تمہارے بھی اپنے تیری راہ تک رہے ہیں۔ جہاں تک دشمنی ختم ہو جانے کی بات ہے، ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ پتہ ہی اب چلا ہے کہ دشمن اور دشمنی ہوتی کیا ہے۔ مجھے اپنی ذات کے لئے نہ پہلے کچھ چاہی تھا اور اب چاہتا ہوں۔ جو انتقام میں نے لینا تھا وہ لے لیا۔“ وہ کہہ چکا تو اس پر اچانک سوئی نے کہا

”مایوس ہو گئے ہو جمال؟“

لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ اس نے چونک کر سوئی کی جانب دیکھا۔ کچھ دن پہلے وہ اس راہ سے دستبردار ہو جانے کا کہہ رہی تھی اور اب اس نے جس طرح یہ سوال کیا تھا اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ نہیں چاہتی۔ یہ تضاد، کیوں؟ یہی سوال اس کے ذہن میں پھیل گیا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو سوئی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ بڑے سکون سے بولی

”ضروری نہیں ہے کہ ہم بڑھ کر لوگوں کو اپنا دشمن بنائیں، ہمیں اپنا کام کرنا ہے، بہت کام کرنا ہے۔ ہم ساری دنیا کو ٹھیک نہیں کر سکتے تو نہ سہی لیکن اپنے آپ کو تو ٹھیک کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔“ جمال نے پوچھا تو وہ اسی سکون سے بولی

”ہمارے اپنے مقاصد ہیں۔ ان کی راہ میں کوئی بھی آیا تو وہ ہمارا دشمن ہوگا۔ ابھی ہم نے کیا کچھ نہیں کرنا، کیا تمہیں یاد نہیں تم نے میرے ساتھ کیا کیا وعدے کئے ہوئے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اس ملک میں انسانیت کے سب سے بڑے قاتل یہاں کے جاگیردار اور وڈیرے ہیں۔ اور اب ان کے ساتھ وہ نودو تپتے بھی شامل ہو گئے ہیں، جو انہی غریب عوام کا لہو چوس کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں؟ سارے کے سارے سیاست دانوں کا روپ دھار کر ایوانوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے اس عوام کے ساتھ؟ کبھی سوچا؟ سارا ملک شاید ہم ٹھیک نہ کر سکیں، مگر جہاں تک ہماری دسترس ہے، ہم ان کے لئے کچھ کریں گے، چاہئے اس کا طریقہ کوئی بھی ہو۔ یہ جو ہمارے ارد گرد لوگ ہیں، جو ہمارے اپنے ہیں، کیا ان کا ہم پر کوئی حق نہیں ہے۔ شاید یہاں پر شاہ اتنا ظالم نہ ہو مگر شاہ کے مصاحب زیادہ ظالم ہیں۔“

سوئی جس طرح جذباتی انداز میں یہ سب کہتی چلی جا رہی تھی، جمال کے ہونٹوں پر اسی طرح مسکراہٹ پھیلی چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ چکی تو اس نے کہا

”جیسے تم کہو، میں تو پہلے ہی تم سے یہی کہتا تھا۔“

”تو پھر سنو! ہمارے سب سے بڑے دشمن وہ بے غیرت سیاست دان ہیں جو عوام کو بے شعور رکھے ہوئے ہیں۔ عوام کو الف بے پڑھنے کی تو اجازت ہے لیکن شعور سے بے بہرہ کئے دے رہے ہیں۔ چند لوگوں کو خوش کرنے اور انہیں نوازنے والا کوئی بھی دستور ہو، ہم اسے نہیں مانتے۔ یہیں اس علاقے کے سیاست دانوں سے آغاز کرنا ہوگا۔“

”ہو گیا۔“ جمال نے ایک دم سے کہا تو ماحول میں ایک دم سے ساٹا چھا گیا۔ یہ خاموشی کچھ طویل ہوئی تو سوئی نے اس کی طرف دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولی

”اب آپ چاہیں تو آرام کریں۔“

اس کے یوں کہنے سے سبھی اٹھ گئے۔ جب سارے کمروں میں جا کر لیٹ گئے تو سوئی نے جمال کو لیا اور گاؤں والے گھر میں آگئی۔

☆.....☆.....☆

میں اور سوئی چھت پر کھڑے دور اندھیزے میں گھور رہے تھے۔ میں اس سے پہلے آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی، شاید میرے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے چہرے ہی پر دیکھ رہی تھی۔

”اتنی بڑی تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں سوئی؟“

”میں نے بہت سوچا ہے جمال، تم ٹھیک ہو اور میں غلط تھی۔ زندگی کا تو کوئی مجرورہ نہیں ہے، ابھی ہے، ابھی نہیں ہوگی۔ کون اس بارے حتمی بات کر سکتا ہے۔ جس دن میں تمہیں ان راستوں سے لوٹ آنے کا کہہ رہی تھی، ضد کر رہی تھی تم سے، اس وقت مجھے ادراک نہیں تھا کہ سانپ تو سانپ ہی ہوتا ہے، اس کا بچہ بھی سانپ ہی ہوتا ہے۔“

”کہیں تم شاہ زیب کی بات تو نہیں کر رہی ہو؟“ میں نے تیزی سے پوچھا

”میں وقاص پیرزادہ کی بات کر رہی ہوں۔ وہ محض دشمنوں ہی سے نہیں ملا، بلکہ اپنی قوت بڑھانے کے لئے اس نے نجانے کن کن لوگوں سے ساز باز کر لی ہے۔ اس کا پہلا ٹارگٹ میں ہوں۔ اب یہ مت سمجھنا کہ جب مجھ پر پڑی ہے تو میں تمہیں اس کے خلاف اکسار ہی ہوں۔ بلکہ.....“

”اصل بات بتاؤ، کہانیاں چھوڑو۔“ میں نے اکتا کر اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا تو وہ بولی
”یہ بھڑا وہ وقاص اور چوہدری شاہنواز بہت عرصے سے گھ جوڑ کئے ہوئے ہیں۔ اس کا تمہیں علم ہی ہوگا۔
شاہنواز جب سے خفیہ والوں کے ہتھے چڑھا ہے، وقاص نے اپنا راستہ بدل لیا۔ وہ ایک طرف خود بھارتی لوگوں کی مدد کر رہا
ہے تو دوسری جانب یہاں پر بھارتی لوگوں کا نیٹ ورک اس کے ساتھ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب اور ملک
سجاد نے بھی اس کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔“

”یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے سونی، ایسا انہوں نے کرنا ہی تھا، لیکن تم ان کا ٹارگٹ کیسے ہو؟ یہ بتاؤ۔“ میں
نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی

”میں نے تعلیم کے ذریعے لوگوں میں شعور پھیلانے کی مہم کا جیسے ہی آغاز کیا تو یہاں پر میری زبردست مخالفت
ہوئی ہے۔ پہلے تو میں سمجھ ہی نہیں سکی۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پورے علاقے کے وہ شہ زور جو یہاں میلے میں میدان
جیتے رہے ہیں۔ وہ اب بھڑا وہ وقاص کے ذاتی ملازم ہیں اور اسی کی ایماء پر یہاں کے بہت سارے لوگ بھی ایسی تعلیم کی
مخالفت کر رہے ہیں، جو یہاں کے سرکردہ ہیں۔ وہ اس تعلیم کو مذہب کے خلاف کہہ رہے ہیں۔“

”تمہارے نصاب میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس سے وہ.....“ میں نے پوچھا
”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بلکہ میں نے تو صرف ایک بات کو، بلکہ ایک آیت کریمہ کو سامنے رکھا ہے اور وہ ہے
تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو بھٹلاؤ گے۔ میرا سا نصاب اسی بات پر ہے۔“

”تو پھر میں دیکھ لوں گا سب کو۔ ایک صرف ہمارا دین ہے جس میں عورت اور مرد دونوں پر تعلیم فرض قرار دی گئی
ہے۔ جتنا حق کسی مرد کا ہے اتنا ہی کسی عورت کا حق بھی ہے۔ تم گھبراؤ مت، تیرا اور میرا دشمن ایک ہی ہے۔“ میں نے اسے
حوصلہ دیا

”علاقے میں منفی پروپیگنڈا پھیل رہا ہے۔“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے بتایا

”یہ منافق لوگوں کا ہتھیار ہے، انہیں سے بچنا ہے، لیکن جب سامنے حق آ جاتا ہے تو یہ لوگ کسی خارش زدہ
چوہے کی مانند چھپ جاتے ہیں۔ حوصلہ اور اپنی نیت درست رکھو۔ رب تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔“

”اب مجھے حوصلہ آ گیا ہے جمال اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ رب میرے ساتھ ہے۔“ اس نے جذب سے کہا
تو میں اس کے چہرے پر دیکھتا رہ گیا، بھی اس نے یوں کہا جیسے اسے یاد آ گیا ہو، ”سارہ، اس کا بیٹا مرد اور سر یہاں پر
ہیں۔ میں نے انہیں حویلی میں رکھا۔ ان کے بارے میں کیا ارادہ ہے۔“

”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ میں نے واقعتاً کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا

”وہ بہت بڑی دولت اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔ دو دن ہوئے وہ یہاں کے بارے باتیں پوچھتی رہی تھی۔
یہاں کا سارا سیٹ اپ اس نے دیکھا تو اس نے اپنی ساری دولت اس سیٹ اپ میں لگانے کے لئے میرے سامنے ڈھیر
کردی۔ اور اس نے یہیں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔“

”نہیں! وہ دولت ہماری نہیں ہے۔ اور میرے خیال میں وہ یہاں رہ بھی نہیں سکے گی۔ خواہش اور فیصلے میں
بڑا فرق ہوتا ہے۔ بس اس کی دل آزاری نہیں ہونی چاہئے۔ اسے بہت عزت اور احترام دیتا۔“ میں نے اسے سمجھایا تو بولی
”جیسے تم کہو۔“

اس نے کہا تو ہم میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے ایسے ہی تنہائی کے لمحوں میں وہ میرے ساتھ
لگ کر سکون محسوس کیا کرتی تھی۔ آج اس نے میرے وجود کے لمس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ مجھ سے فاصلے پر ہی

کھڑی رہی۔ کچھ لمحے یونہی گزر گئے تو میں نے کہا
آؤ چلیں، مجھے چھپا کے سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے آگئی۔ ہم
دونوں چھت پر سے نیچے آ گئے۔

چھپا کا باہر والے کمرے میں، میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر میری جانب کروٹ لے
لی، میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا

”چھپا کے، اپنے علاقے کی صورت حال کیا ہے؟ کچھ پتہ بھی ہے یا.....“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا
چھوڑ دیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا

”پتہ ہے، سب پتہ ہے، اگر شاہنواز پکڑا گیا ہے تو اس کے حواری کیا چپ بیٹھے ہوں گے۔ وہ پہلے سے زیادہ
کام کر رہے ہیں۔ تمہارے خلاف اس قدر زور اگلا جا رہا ہے کہ لوگ تم پر اعتماد ہی نہ کریں۔ اور اس وقت اس کا سب سے
زیادہ فائدہ بھڑا وہ وقاص لے رہا ہے۔“

”کیا کر رہا ہے وہ؟“ میں نے پوچھا

”چوہدری شاہ دین اور چوہدری شاہنواز کو وہ اس علاقے کا نجات دہندہ بنا کر پیش کر رہا ہے اور تجھے ڈاکو، جو
عزت دار لوگوں سے ان کی حیثیت چھین رہا ہے۔ قاتل، چور اور ڈاکو، جو اس علاقے پر غنڈہ گردی سے حکومت کرنا چاہتا
ہے۔ اور بس۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا عجیب ہو رہا تھا، جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت دکھ ہو رہا ہو۔

”یہ تو ہوتا ہی ہے، مخالف پھول برسانے سے تو رہے، وہ تو آگ ہی آگلیں گے۔ خیر تم اس کو اپنے ذہن پر مت
سوار کرنا۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو وہ بولا

”ایک اور بڑا کھیل دکھا رہا ہے وہ۔ ایک پیر صاحب نجائے کہاں سے لایا ہے، وہ لوگوں میں عجیب باتیں کر رہا
ہے۔ انہیں خوف زدہ کر کے نجائے کس دین کی تبلیغ کر رہا ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولا تو میں ہنس دیا۔

”ایسا ہوتا ہے، ہمارے ہاں ابھی بہت سارے لوگ ضیف العقاد ہیں۔ ایسے لوگوں کی باتوں میں زیادہ آ
جاتے ہیں۔ کہنا تم فکر نہ کرو۔ رب تعالیٰ بہتر کرے گا۔“

”تم آگئے ہونا۔ یہ بات انہیں معلوم ہوگئی ہوگی، اور تم بچ جانا، وہ سیدھے سبھاؤ تم سے مقابلہ نہیں کریں گے
بلکہ کوئی سازش بنائیں گے، دھیان رکھنا۔“ اس نے تیزی سے یوں کہا جیسے یہ بات اسے ابھی یاد آئی ہو۔ میں چند لمحے
سوچتا رہا پھر اسے سو جانے کا کہہ کر باہر والے کمرے سے اندر آ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

اگلی صبح میں، جہاں اور تانی ڈیرے پر چلے گئے۔ مجھے نے پہلے سے کہیں زیادہ موٹی پال لیتھے۔ چھپا کا اس
کے ساتھ کاروبار کرنے لگا تھا۔ ہم وہاں دھری ہوئی چار پائیوں پر جا کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں مجھے سے وہاں کا
حال احوال لے رہا تھا کہ باہر گیٹ پر ایک کار آ کر رکی۔ چند لمحوں بعد علاقے کے وہ معززین اندر آ گئے جو ہر سال میلہ منعقد
کرواتے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ میرے پاس یوں آئے تھے۔ میں نے انہیں احترام سے بٹھایا اور تپاک سے ملا۔ وہ
سات لوگ تھے۔ مجھے کو مزید چار پائیاں نکال کر لانا پڑیں۔ وہ سب بیٹھ گئے، حال احوال بھی ہو گیا تو ان میں سے ایک
بزرگ نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”بیٹا! ہم سب علاقے کے بزرگ تیرے پاس خود چل کر آئے ہیں۔ تم سے ایک درخواست کرنا تھی، اگر تم
قبول کر لو تو۔“

”آپ کسی بات کر رہے ہیں، آپ اپنے آپ کو میرا بزرگ بھی کہہ رہے ہیں اور ایسی بات بھی، میں سمجھا نہیں

یہ کیا ہے؟“ میں نے الجھتے ہوئے کہا

”دیکھو! انجانے کب سے ہر سال مسافر شاہ کے میدان میں میلہ لگتا آرہا ہے۔ لیکن پچھلے سال نہیں لگا۔ اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو۔ اسی وجہ سے درخواست کرنا پڑ رہی ہے۔“ اس بزرگ نے اپنا لہجہ حد درجہ مودبانہ بناتے ہوئے کہا تو مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایک طرح سے میں بات تو سمجھ گیا تھا لیکن ان سے پوری بات کہلواتے کے لئے میں نے کہا

”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں اور میں بھی نہیں جانتا کہ پچھلے برس میلہ کیوں نہیں لگا تھا۔“

”تم ہی تھے بیٹے، جس کی فائرنگ نے میلہ اجاڑ دیا تھا۔ پتہ ہے چار بندے مرے تھے پیر زادہ وقاص کے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تو اب یاد بھی نہیں ہے۔ سارے تم سے ڈرتے ہیں، اور پھر اس میں ناچنے والی وہ لڑکی تیرے گھر آگئی، جس کی وجہ سے چوہدری شاہ دین کے ساتھ تمہاری مخالفت چلی، ایسے میں میلہ بھلا کیا لگتا۔ چوہدری شاہ دین بھی گیا، اور اس کا بیٹا بھی، جسے تم نے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یہی لوگ تو ہوتے تھے میلہ لگوانے والے۔ اب وہ نہیں تھے، ایک تمہارا ڈرتھا، میلہ کیسے لگتا؟“

”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میلہ میرے ڈر کی وجہ سے نہیں لگتا۔ اور اب چوہدری نہیں ہیں تو میلہ نہیں لگتا۔ یہی بات ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی تو اس بزرگ نے سر ہلا کر کہا

”ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔“

”کیا میں نے کسی کو روکا میلہ لگانے سے؟ اس معاملے میں کسی سے بات ہوئی؟“ میں نے پوچھا

”نہیں، چاہے نہ ہوئی ہو، لوگ تو تمہارے نام سے کانپتے ہیں۔ ایسے میں میلہ کہاں لگے گا اور پھر بیٹا چوہدری کی حویلی پر اب وہ سوئی مائی کا قبضہ ہے، اس لئے.....“ بزرگ نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوکتے ہوئے کہا

”بزرگو! اس نے قبضہ نہیں کیا، اپنا حق لے بیٹھی ہے وہ۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ سوئی مائی، اسی شاہ دین کی بیٹی ہے۔ اس کا اپنے باپ شاہ دین کے ساتھ جھگڑا تھا، میرا نہیں تھا۔ شاہ زیب اپنے کرتوتوں کی وجہ سے در بدر ہے، کسی کے خوف سے نہیں۔“ میں نے کہا تو ایک دوسرے بزرگ نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا

”چلیں ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ اور مانے بغیر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور پھر ہم یہاں بحث تو کرنے آئے نہیں، سیدھے سیدھے تم سے بات کرنے آئے ہیں کہ ہم میلہ لگوالیں؟“

”میں کون ہوتا ہوں اجازت دینے والا، کیا پہلے میری اجازت سے میلہ لگتا تھا؟“ میں نے بات کو کسی حد تک سمجھتے ہوئے کہا۔ بڑا اوجھاوار کیا تھا مجھ پر۔ بلاشبہ بہت سوچ سمجھ کر آئے تھے۔

”دیکھو، بات پھر وہیں آجائے گی کہ پچھلے میلے میں تمہاری وجہ سے.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں بات کاٹتے ہوئے کہا

”کیا میں نے ہنگامہ کیا تھا؟ میں پیر زادہ وقاص سے کہا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو ہتھیار دے کر وہاں لائے اور ہنگامہ کرے۔“

”تم بھی تو ہتھیار لے کر آئے تھے بیٹا۔“ تیسرے نے کہا

”تو آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہم کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس بار میلہ لگے اور تمہاری نگرانی میں لگے۔“ ایک بزرگ نے کہا تو دوسرا فوراً بولا

”نگرانی میں نہیں بلکہ تم خود میلہ لگواؤ، انتظام ہم کر دیں گے۔ علاقے کے شد زوروں میں بہت مایوسی پھیل رہی

ہے۔ وہ سب ہمارا سال تیار کیا کرتے ہیں۔“

”آپ سب میرے بزرگ ہیں، یہ میں نے پہلے ہی اقرار کر لیا ہے، آپ اس طرح نہ کریں، میں بہت چھوٹا سا بندہ ہوں، میری کیا جرات کہ میں علاقے کے خلاف ہو سکوں۔ آپ جو چاہیں سو کریں، آپکو پورے علاقے نے اختیار دیا ہوا ہے۔ مجھ سے جو خدمت چاہیں وہ میں حاضر ہوں۔“ میں نے انتہائی انکساری سے کہا۔

”دیکھو! سیدھی سی بات ہے، علاقے کے لوگوں کو تمہاری طرف سے ہی خوف ہے۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری مرضی ہوئی تو میلہ لگ جائے گا ورنہ.....“ اُن میں سے ایک بزرگ نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ورنہ کیا؟“ میں نے پوچھا

”ورنہ میلے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم میلے کی حفاظت کا ذمہ لو تو ہم میلے کا انتظام کرتے ہیں۔“ ایک نے کہا تو میں چونک گیا۔ لیکن بڑے تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا

”یہ آپ سیدھے سیدھے مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں کہ میں ہی میلے کو اجاڑنے کا سبب ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ مجھے آپ انجمن میں نہ ڈالیں، میں اگر ذمہ داری لے لوں تو وہاں کوئی بھی اپنا کام کر جائے۔ بات تو مجھ پر آئے گی۔ اور اگر میں ذمہ داری نہیں لیتا تو کوئی اپنا کام کر گیا تو پھر بھی مجھی پر بات۔ آپ لوگ میرے خیر خواہ ہیں یا دشمن بن کر آئے ہیں۔ کس نے بھیجا ہے آپ کو؟“ میں نے ایک دم سے کہا تو ان میں ایک دو مسکرا دیے۔ میں نے ان کی توقع کے مطابق بات کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ تبھی کچھ دیر خاموشی کے بعد ایک بولا

”دیکھو۔ ابھی کچھ وقت ہے تم کل تک سوچ لو ٹھنڈے دل سے۔ ہم پھر آجائیں گے۔ اب میلہ ہونا یا نہ ہونا تمہاری مرضی پر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

اب ہم چلتے ہیں۔“ ایک نے کہا تو سبھی اٹھ گئے، انہوں نے میری ہاں یا نہ، نہیں سنی اور خاموشی سے ہاتھ ملا کر باہر چلے گئے۔ وہ جب چلے گئے تو حسیال نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

”لگتا ہے تیرے خلاف کافی نفرت پھیلی ہوئی ہے یہاں پر۔ اور یہ کھچرے بابے تجھے پھنسانے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔“

”اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ کس کے کہنے پر کر رہے ہیں۔ بڑی زبردست پلاننگ کی ہوئی ہے انہوں نے۔ علاقے کے لوگوں میں جان بوجھ کر نفرت پھیلانی جا رہی ہے۔“ میں نے کافی حد تک دکھ سے کہا تو تانی تڑپ کر بولی

”تو پھر کیا ہوا جمال، نفرت ہی ہے نا۔ ہم اسے محبت میں بدل دیں گے۔ یہی بابے تمہارے گن گائیں گے۔ میں کہتی ہوں لگائیں میلہ، اور پھر دیکھتے ہیں کون سے دشمن ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

”دشمن بھی سامنے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خیر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ بولی

”اب وہ آئیں نا تو کہہ دینا، ہم میلہ کروائیں گے۔“

”اوتانی ٹو یہ سب جذباتی انداز میں کہہ رہی ہے۔ دیکھ رہی تھی کہ وہ سب سوچ کر آئے ہیں۔ یہاں مقامی ہی نہیں، باہر کے لوگ بھی اپنا کام دکھائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ساری کا لک میں اپنے منہ پر تھوپ لوں۔ مجھے انہی لوگوں میں رہنا ہے، انہیں میں کام کرنا ہے۔ میں یہاں نفرت نہیں محبت چاہتا ہوں۔ میں آج جا کر پیر زادہ وقاص کو گولی مار دوں۔ کیا سمجھتی ہو، میرے بارے انواہیں یقین میں نہیں بدل جائیں گئیں؟“

”تو پھر کیا کریں؟“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا تو میں سکون سے جواب دیا
”بتانے والے خود ہی بتادیں۔ گے دیکھتے ہیں، وہ کب اور کیسے بتاتے ہیں۔“
”چلو جی قصہ ہی ختم، ویسے یار یہ تیرا میلہ ہوتا کب ہے۔“ جہاں نے پوچھا
”کیوں، تو کیوں پوچھ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا

”اگر جلدی ہو جائے تو میں ادھر رہوں، اور اگر دیر ہو تو چلا جاؤں۔ یا پھر جو بھی فیصلہ کرنا ہو جلدی کر لینا، مجھے
کچھ جلدی ہے۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تو میں ایک دم سے ہنس دیا۔ اس نے بڑی گہری چوٹ کی تھی۔
”جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو سکون کے یہ دن گذارو۔“ میں نے کہا تو وہ بولا
”تم اسے سکون کہتے ہو، ادھر ہر پریت میری راہ تک رہی ہوگی۔“ جہاں نے حسرت سے کہا
”یار تمہیں واقعی اس سے محبت ہو گئی ہے۔“ میں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا

”ہاں۔ دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس رہوں یا وہ میرے پاس رہے۔ شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔“ وہ
دھیمے سے لہجے میں بولا۔ سچی تانی نے گہری سنجیدگی سے کہا

”محبت قربت کی محتاج تو نہیں ہے۔ ہزاروں میل کی دوریاں بھی ہوں نا تو محبت کم نہیں ہو جاتی۔ یہ دوریاں، یہ
ہجر تو محبت بڑھاتی ہیں۔ دوسرے کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ وہ زیادہ یاد آتا ہے۔“
”کیا تم قربت کی لذت سے انکار کرو گے؟“ جہاں نے کہا تو وہ بولی
”محبت ہونا تو پھر ہجر کیا اور وصال کیا، دونوں ہی لذت دیتی ہیں۔“

”اچھا یہ محبت کے فلسفے کو کچھ دیر ایک طرف رکھو۔ ابھی چلیں، اماں انتظار کر رہی ہوگی۔ چل کے ناشتہ تو کر
لیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہم گھر پہنچ گئے تو سوئی نے ناشتہ لگا دیا۔ وہ ہمارے انتظار ہی
میں تھی۔

دوپہر سے ذرا پہلے میں اور چھا کا باہر والے کمرے میں تھے۔ باقی سب حویلی میں تھے۔ وہ اماں کو بھی وہیں
لے گئے تھے۔ میں نے ڈیرے پر ہونی والی باتوں کے بارے میں اسے بتایا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا اور پھر بولا
”بہر زادہ وقاص نے اپنی طرف سے یہ سازش کی ہے۔ وہ ہمیں پورے علاقے میں گندہ کرنا چاہتا ہے۔“
”پھر کیا کہتے ہو تم؟“ میں نے اس سے پوچھا

”میرے خیال میں تو سیدھے بہر زادہ وقاص ہی کو پکڑ لیتے ہیں۔ اس پر کوئی اور مدعا ڈال کے، اسی کو دبا دیتے
ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”لیکن وہ جو کثیرالگوگوں کے دماغ میں ڈال چکا ہے، اس کا کیا کیا جائے۔ اسے گولی مار دینا بہت آسان
ہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے ہم اس پر چڑھ دوڑیں اور وہ مظلوم بن جائے۔ منافق کا یہی تو کام ہوتا ہے کہ وہ مظلوم بن کر
ہمدردیاں حاصل کرتا ہے۔ ایسا نہیں چھا کے۔ سازش کا مقابلہ ایسے کیا جائے کہ اس کی سازش اسی پر الٹ دی جائے۔ یا کم
از کم وہ ننگے ہو جائیں۔ ان کا گندہ باہر آجائے“ میں نے اسے سمجھا یا تو وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا
”تو پھر ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا، جب تک وقت ہمیں ایسا کوئی موقع نہ دے دے۔“

”ہاں۔ ایہ موقع ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔ پورے علاقے میں پھیل جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ میرے رب نے ہماری
مدد کا ضرور بندوبست کیا ہوگا۔“ میں نے یقین سے کہا تو چھا کا سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ سارا دن یونہی سوچتے ہوئے گذر گیا۔ میں گولی چلا سکتا تھا۔ سامنے آئے دشمن سے بھڑک سکتا تھا۔ لیکن اس

سازش کا مقابلہ کیسے کیا جائے، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ جہاں واپس کینیڈا جانے کی تیاریوں میں تھا۔ اس کی سفری
امتیازات لاہور میں سوئی کے گھر پر محفوظ تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ لاہور جاؤں اور اسے وہاں سے
الوداع کہوں۔ یہ طے کرتے، کھاتے پیتے، باتیں کرتے دن گذر گیا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اماں اور سوئی گاؤں والے گھر میں چلی گئی تھیں۔ میں اور جہاں باہر والے کمرے
میں سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے تیزی سے اپنے
اوردرد دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن میں اپنی کلائی پر گرفت کو محسوس کر رہا تھا۔ کوئی مجھے کھینچ رہا تھا۔ میری طرح جہاں
بھی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بھی میرے جیسی کیفیت میں تھا۔ کوئی نادیدہ قوت چاہتی تھی کہ ہم اس کے
ساتھ چلیں۔ میں نے مزاحمت چھوڑ دی اور اٹھ گیا۔

باہر والا دروازہ خود بخود کھل گیا ہوا تھا۔ میں اندھیری گلی دیکھ رہا تھا۔ میں نے جہاں کی طرف دیکھا۔ وہ میری
طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کر لیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم دونوں ہی اٹھ گئے۔ وہ گرفت
امیٹ نہیں ہوئی۔ ہم گلی میں آگئے تو وہ گرفت بھی ختم ہو گئی۔ اچانک ہمارے سامنے زمین پر ایک دودھیا لکیر پھیل گئی۔ جو
ہمارے قدموں سے شروع ہوئی اور سامنے بڑھتی ہی چلی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہمیں راستہ سمجھا رہی ہے۔ وہ لکیر گلی پار
کر گئی تھی۔ ہم دونوں جیسے ہی اس لکیر پر چلنے لگے۔ ہمارے قدم اٹھ گئے۔ جیسے ہوا میں معلق ہو گئے ہوں۔ ہم اس لکیر پر
آگے ہی آگے بڑھنے لگے۔ کوئی نادیدہ قوت ہمیں اڑا کر لے جانا چاہتی ہوں۔ ہم نے مزاحمت تو پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ ہم
بے وزن ہو گئے اور اس لکیر پر اڑتے ہوئے گاؤں سے باہر چلے گئے۔ وہاں سے بھی آگے نہر بھی پار کر گئے۔ یہاں تک کہ
ہم اسی میلے والے میدان میں مسافر شاہ کے کھڑے کے پاس آن کرے، جہاں پردہ لکیر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

اسی لمحے میرے اندر اطمینان پھیل گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سب مجھے کوئی نہ کوئی بات سمجھانے کے لئے ہو رہا
ہے۔ دشمن اگر سازش کر رہے تھے تو ہماری مدد کے لئے بھی کوئی موجود تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ مسافر شاہ کے کھڑے پر
دودھیا روشنی پھیل گئی۔ اس میں روی والے بابا جی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

”وقت آ گیا ہے کہ اب تمہیں تیرے بارے میں بتا دیا جائے۔“

”میں کون ہوں، کیا یہ آپ جانتے ہیں؟“ میں نے مودب لہجے میں پوچھا

”میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں تمہاری تین نسلوں سے تجھے جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ جانتا
مگر مجھے حکم ہی تین نسلوں تک کا ہوا ہے۔“ انہوں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا
”لیکن بابا جی آپ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ آپ مجھے صرف دو بار ملیں گے۔ مگر آپ تو مجھے اب تک کئی بار مل چکے
ہیں۔ اسے میں کیا سمجھوں۔“ میں نے اپنے دماغ کی الجھن ان کے سامنے رکھ دی۔

”تمہاری یہ سوچ ہونی چاہیے، کیونکہ ابھی تک تمہیں اس راز کی سمجھ نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ تم اسے سمجھ جاؤ
گے۔ اور یہ یقین رکھو کہ میں تمہیں اب تک صرف ایک بار ہی ملا ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا

”یہ تو مزید الجھن والی بات ہو گئی بابا جی۔“ میں نے کسی ضدی بچے کی مانند کہا تو وہ بولے

”کہا نہ ابھی تمہیں سمجھ نہیں۔ ابھی تم صرف دیکھو، اسے سمجھنے کی کوشش کرو گے تو پاگل ہو جاؤ گے۔ اپنے اندر
صرف جذب کی قوت پیدا کرو۔ اب دیکھو۔! میں تمہیں تمہارے بارے میں بتانا چاہتا ہوں اور تم دوسری باتوں میں الجھ
رہے ہو۔“

”نہیں بابا جی، جیسا آپ چاہیں۔“ میں نے تیزی سے کہا تو چند لمحے خاموش رہ کر بولے

”تیری کہانی اسی میدان سے شروع ہوئی تھی۔ یہ میرے ہیروں تلے جو جگہ ہے یہ اسی وقت مخصوص کر لی گئی تھی۔ یہ کیوں مخصوص ہوئی۔ یہ تجھے بتائے گا، لیکن تمہاری کہانی یہیں سے شروع ہوئی تھی، یہ ایک حقیقت ہے۔“

”کیسے باباجی، میری کیا کہانی ہے۔ کیسے شروع ہوئی تھی یہ۔ اس جگہ کا اس سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا تو پہلی بار باباجی جہاں سے مخاطب ہوئے۔

”جہاں! تم جانے ہو کہ تم بھی اس جہاں سے کچھ تعلق رکھتے ہو؟“

”تم دونوں ایک دوسرے سے بہت ساری باتیں کر چکے ہو۔ لیکن کبھی یہ احساس نہیں کیا کہ جب جہاں حرکت میں آیا تو تم بھی اس وقت بھارت میں آ کر اس چکر دیو میں پڑ گئے تھے۔ تم دونوں کی کہانی ساتھ ساتھ کیوں ہے۔ اکٹھے روی کیوں پہنچے؟ یہ تم نے ابھی نہیں سوچا۔ مگر آج سے نہ صرف تم سوچو گے بلکہ سمجھ بھی جاؤ گے۔ جہاں کیا ہے، یہ بھی سمجھ جائے گا۔“

”آپ بتائیں گے ناباباجی؟“ میں نے کہا تو وہ اپنی بھاری آواز میں بولے

”میں نہیں، وقت تمہیں بتائے گا۔ اپنا زرخ میدان کی جانب کرلو۔ اور ادھر غور سے دیکھو۔ وقت پلٹ کر اپنا آپ تمہیں دکھانے آ رہا ہے۔ اس میں کیا ہوا، وہ سوچنا اور اس سے اخذ کرنا یہ تم دونوں پر منحصر ہے۔ پلٹ جاؤ اور بدلتے منظر کو دیکھتے رہو، سوال مت کرنا۔“ انہوں نے گھمبیر آواز میں کہا تو ہم پلٹ گئے۔

ہماری سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا میدان تھا۔ بس کہیں کہیں خاردار جھاڑیوں کا پتہ چل رہا تھا۔ اس سے آگے ہم دیکھنے سے بے بس تھے۔ اچانک ہمارے سامنے کا منظر بدل گیا۔ رات کا اندھیرا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دن کا اجالا آ گیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا صحرا تھا۔ جس کے درمیان میں ایک چمیل میدان تھا اور اس پر لوگ ہی لوگ تھے۔ ہمارے سامنے میلہ جاگ اٹھا تھا۔

میلے کے آخری دن کا میدان جگ چکا تھا۔ دوپہر ڈھلنے کے ساتھ ہی علاقے بھر سے آئے ہوئے لوگ ایک بڑے دائرے میں کھڑے تھے۔ اسی دائرے میں جاگیرداروں، زمینداروں اور میلے کے منتظمین کے الگ الگ جگہوں پر شامیانے لگے ہوئے تھے۔ وہ سبھی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ کرسیوں پر براجمان تھے۔ انہی کے درمیان ان کے شہرہ زور بھی تھے، جو مقابلے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے ہر علاقے کا بااثر آدمی میدان سے باہر مقابلے کے لئے موجود ہے۔ اس وقت لوگوں میں عام تاثر یہی تھا کہ مقابلہ تو رام گڑھ والوں نے جیت ہی لیتا ہے۔ مگر تجسس یہ تھا کہ ان کے مقابلے میں آنے والا وہ کون سا شہرہ زور ہے، جس نے اتنا حوصلہ کر لیا۔ کس نے یہ ہمت کی ہے کہ ان کے سامنے مقابلے لئے اترے۔

تماشاخیوں کی بڑی تعداد نعرے بازی کر رہی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ شور رام گڑھ والوں ہی کا تھا۔ ان سب کے درمیان ٹھاکر رام دیال رائے تھی ہوئی مونچھوں اور چڑھی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے میدان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ خمار یونہی نہیں تھا۔ وہ کئی برسوں سے یہ مقابلہ جیتنا آ رہا تھا۔ جس کے لئے ہر طرح کی تیاری بڑے اہتمام سے ہو کر تھی۔ جس کی وہ خود نگرانی کیا کرتا تھا۔

میلے کے لئے رام گڑھ سے نکلنے والی سچ دیج ہی نرالی ہو کر تھی۔ ٹھاکر رام دیال رائے بڑے شوق اور اہتمام سے میلے میں شریک ہونے کے لئے آتا تھا۔ چاندی کی زین والے گھوڑے پر سوار وہ سب سے آگے ہوتا، اس کے پیچھے رام گڑھ والوں کا قافلہ ہوتا تھا۔ باجے گا جے کے ساتھ وہ یوں نکلے جیسے کسی جنگ کے لئے جا رہے ہوں۔

صحرا کے درمیان موجود اس چمیل میدان میں تین دن تک خوب رونق رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہاں پر کوئی بستی اُگ آئی ہو۔

ٹیلے آباد ہو جاتے۔ وہاں خیمے لگ جاتے۔ خرید و فروخت کے لئے میدان کے ایک جانب دوکانیں سج جاتیں۔ جاہ جاتے والوں کی منڈلیاں لگ جاتیں۔ جادوگری اور شعبد بازی کے کمالات دکھانے والے، عورتوں کے سنگھار اور بچوں کے کھلونے بیچنے والے، مختلف بھگوانوں کی مورتیاں اور تصویریں فروخت کرنے والے، طوائفیں، حکیم، سنیاہی، پتھر کٹینے بیچنے اور ٹونگی والے بھی آ جاتے۔ چھوٹے موٹے نو سر باز، چور اور ٹنگی لگانے والی بھی موجود ہوتے۔ اس میلے میں تفریح کے ساتھ موسیقی کی نمائش بھی ہوتی۔ تین دن میں جہاں دور دراز کے لوگوں کو آپس میں ملنے کا موقع ملتا، وہاں ہر طرح کے مقابلے ہوتے۔ وہاں اسی میلے میں پتہ چلتا کہ کس علاقے میں کون، کتنا شہرہ زور ہے۔ ان شہرہ زوروں کے مقابلے ہی میں ان شہرہ زوروں کی طاقت کا اندازہ ہوتا، وہاں ان شوقین جاگیرداروں اور زمینداروں کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ کیونکہ ان میں بعض ایسے مقابلے تھے، جن کی سرپرستی زر کثیر خرچ کرنے ہی سے ہو سکتی تھی۔ شہرہ زوروں کے ان مقابلوں سے نہ صرف اُن کے شوق کا پتہ چلتا تھا بلکہ علاقے پر اپنی دھاک بٹھانا بھی مقصد ہوتا تھا۔ طاقت کے اس اظہار کی خواہش کی وجہ سے ان مقابلوں کی تیاری کے لئے محنت، زور اور وقت خرچ کیا جاتا تھا۔ عوام کی بھی سب سے زیادہ دلچسپی اسی میدان میں دیکھنے کو ملتی، جہاں شہرہ زور اپنی طاقت اور مہارت دکھاتے تھے۔ تین دن تک میدان میں مختلف مقابلوں میں ہار جیت چلتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن کی دوپہر کے بعد آخری مقابلہ شمشیر زنی کا ہوا کرتا تھا۔ جو اس میدان کا سب سے بڑا، سب سے سنسنی خیز اور دل ہلا دینے والا مقابلہ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے شہرہ زور یہاں سے ساری زندگی کے لئے اپنا جھنڈا ہار کر لے جاتے تھے۔ کئی شہرہ زوروں کی تو یہیں موت ہو گئی تھی۔

ٹھاکر رام دیال رائے، کی اسی شمشیر زنی کے مقابلے میں سب سے زیادہ دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ یہ دلچسپی اسے اپنے سوگد ہاشی جی سے وراثت میں ملی تھی۔ اسی میدان میں اس نے بھی اپنی طاقت اور مہارت کا کئی بار مظاہرہ کیا تھا۔ پھر بعد میں اس نے خود شمشیر زنی نو جوان تیار کئے۔ وہ سارا سال ان پر بے تحاشا دولت لٹاتا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ رام گڑھ والے کبھی شکست نہیں کھاتے تھے۔ ہر برس علاقے میں سے کوئی نہ کوئی شہرہ زور مقابلے پر آتا، شکست کے ساتھ ساری زندگی کے لئے اپنا جھنڈا ہار جاتا۔ حریفوں نے بڑی محنت کی ہوتی تھی مگر جیت ان کا مقدر نہ بن سکتی تھی۔ یوں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ شمشیر زنی کے مقابلے میں رام گڑھ والوں سے کوئی بھی مقابلہ نہیں جیتا جاسکتا۔ ٹھاکر رام دیال رائے اس پر نہ صرف فخر کرتا بلکہ اسے یہ زعم بھی تھا کہ وہ ناقابل شکست ہے۔

اس بار اس نے بہت سوچ رکھا تھا۔ وہ اپنے اس ناقابل شکست ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ جیت جانے کا خمار بہت سارے لوگ کو پاگل کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ شکست کے اندر جیت اور جیت کے اندر ہار پڑتی ہوتی ہے۔ بس اسے دیکھنے کے لئے نگاہ چاہئے۔

اس وقت میدان میں موجود ہر ذی روح کا دوران خون تیز ہو گیا، جب مصنفین میدان میں آ گئے۔ یہ مقابلہ شروع ہونے جانے کا علامت تھا۔ تماشاخیوں کا شور بلند ہوا اور پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھانے لگی۔ یہاں تک کہ جیسے آواز سلب ہو گئی ہو۔ پھر اہواجم سماعت بن گیا۔ منصف میدان کے درمیان میں آ گئے تھے۔ انہوں نے شہرہ زوروں کو میدان میں آ کر مقابلہ کرنے کی دعوت دے دی۔ تبھی پورے جھوم کی ٹنگا ہیں رام گڑھ والوں کی جانب اٹھ گئیں۔ یہی وہ خمار آلود لمحہ تھا، جس کا نشہ سارا سال رہتا تھا، اسی خمار میں ٹھاکر رام دیال رائے نے پورے کورفر کے ساتھ پورے پنڈال پر نگاہ دوڑائی۔ کوئی باہر نہ نکلا تو اس نے اپنے اس شہرہ زور کو میدان میں جانے کا اشارہ کیا، جو اس کے اشارے کا منظر تھا۔

شہرہ زور تیزی سے میدان کی جانب لپکا۔ ایک ہاتھ میں ڈھال اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لہواتا ہوا، بجرنگ لمبی کی جے کے نعرے لگاتا ہوا، وہ اس مقام تک چلا گیا، جو میدان کے وسط میں تھا۔ وہیں منصف بھی کھڑے تھے۔ وہ شہرہ زور اپنی

چمکتی ہوئی تلوار اور نقش و نگار والی ڈھال کے ساتھ بزرگ بلی کے نعرے لگاتا پورے پنڈال کو لٹکا رہا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں نکل رہا تھا۔ کسی طرف سے بھی کوئی شمشیر زن تلوار سونت کر مقابلے کے لئے میدان میں نہیں نکلا تھا۔ شہہ زور کی ہر لٹکاؤں کو رام دیال رائے کو ایسا نشہ دے رہے تھے۔ جو پرانی سے پرانی شراب بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا نشہ وہی محسوس کر سکتا ہے، جس نے ایسا احساس پایا ہو۔ اس نے بڑے غرور کے ساتھ اپنی دائیں مونچھ کو انگلیوں کی پور سے مسلا۔ فتح مندی کا نشہ سب نشوں پر بھاری ہوتا ہے۔ اور یہی لحاظ اس کے دماغ کو خمار آلود کر رہے تھے۔

پنڈال میں سے کوئی بھی باہر نہیں آیا تھا۔ جبکہ اس مقابلے کے لئے اعلان پر اعلان کیا جا رہا تھا۔ ٹھا کر رام دیال رائے کی مسکراہٹ مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ اس کے دماغ پر فتح مندی کا نشہ چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسی خمار میں جھوم گیا۔ ایک طرح سے وہ پورا علاقہ اپنے نگینے کر چکا تھا۔ پورے علاقے نے یہ مان لیا تھا کہ رام گڑھ والوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میدان میں لٹکانے والے شہہ زور کے ہر نعرے کے ساتھ ٹھا کر رام دیال رائے کا یہ احساس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پنڈال میں بھی یہ سرگوشیاں ہونے لگیں تھیں کہ اب ان کے مقابلے میں کوئی نہیں اترے گا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ ٹھا کر رام دیال رائے کی گردن مزید تن گئی تھی کہ کوئی بھی ان کے مقابلے میں نہیں اترے گا۔ اب فقط مصنفین کی طرف سے فتح مندی کے رسمی اعلان ہونا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی ان کے مقابلے میں نہیں آیا تھا۔ انہی فتح مندی اور سنسنی خیز لمحات میں ٹھا کر رام دیال رائے نے دماغ میں موجود خیال کے اظہار کا فیصلہ کر لیا۔

پورے علاقے میں دھاک بٹھانے کا یہ سب سے بہترین موقع تھا۔ اس طرح ہمیشہ کے لئے یہ مقابلہ وہ اپنے نام کر لے گا۔ یوں پورے علاقے میں اس کے نام کا ڈکناؤں جانے کا بلکہ پھر جس سے جو چاہئے گا اپنی بات منوالے گا۔ اس کے اندر کارا جیوت پوری طرح سے جاگ گیا تھا۔ تبھی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مصنفوں نے بھی اس کی جانب دیکھا تو ٹھا کر رام دیال رائے نے کہنا شروع کیا۔ وہ جو کہہ رہا تھا، اس کی آواز کو اعلان کرنے والے پورے پنڈال تک پہنچا رہے تھے۔

”ٹھا کر رام دیال رائے کو اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ پورے علاقے کی جنتا میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو رام گڑھ کے شہہ زوروں سے مقابلہ کر سکے۔ ٹھا کر جی اعلان کرتے ہیں کہ چاہے کوئی ہار بھی جائے لیکن اس شہہ زور کا مقابلہ کرے تو اسے ڈوگنا انعام دے دیا جائے گا۔“

اس اعلان کے ساتھ ہی پورے پنڈال میں بھینٹنا ہٹ شروع ہو گئی۔ مگر کافی دیر تک کوئی بھی مقابلے کے لئے نہیں نکلا۔ تب ٹھا کر رام دیال رائے کی طرف سے اگلا اعلان کیا گیا۔

”اگر کوئی شہہ زور اس زعم میں نہیں نکلتا کہ اس کے ہاتھوں رام گڑھ کا شہہ زور نہ مارا جائے تو یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ نہ ڈرے، اسے خون معاف ہوگا بلکہ فتح مندی کی صورت میں سوگنا انعام دیا جائے گا۔“

یہ اعلان پورے پنڈال میں گونج گیا۔ مگر حیرت یہ تھی کہ کوئی بھی میدان میں نہیں نکلا۔ ٹھا کر رام دیال رائے میدان مار لینے کے خمار میں جھومنے لگا۔ تبھی اس نے وہ اعلان کر دیا جس کے بارے میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

”اگر کوئی شہہ زور مقابلہ کرنے کے ہمت نہیں رکھتا تو پورا علاقہ یہ مان لے کہ ٹھا کر رام دیال رائے کی برابری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ انہی کی شان ہے کہ وہ مقابلہ جیت کر جا رہے ہیں۔ اب یہاں کبھی شمشیر زنی کا مقابلہ نہیں ہوگا۔ یہ جگہ جہاں یہ میلہ لگا ہوا ہے، اب ٹھا کر رام دیال رائے کی ملکیت ہے۔ تاکہ یاد رہے کہ یہ میدان ٹھا کر رام دیال رائے جیت چکے ہیں۔ اس اعلان کے بعد بھی اگر کسی میں ہمت اور جرات ہے، کسی کے خون میں جوش آیا ہے تو وہ سامنے آ سکتا ہے۔“

یہ اعلان کیا ہونا تھا کہ پورے پنڈال میں سراپیسنگی پھیل گئی۔ جہاں عوام حیرت زدہ رہ گئے تھے وہاں جاگیردار، بڑے

زمیندار اور بااثر لوگوں کو ٹھا کر رام دیال رائے سے اس قدر رعوت کی امید نہیں تھی۔ اس نے کھیل کو جنگ میں بدل دیا تھا۔ نفرت، حسد، ناامیدی اور بے بسی جیسے جذبات سے فضا بوجھل ہو گئی تھی۔ ٹھا کر رام دیال رائے ان جذبات اور بوجھل فضا سے بے نیاز فاتحانہ نگاہوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کبھی اسی کی رعیت ہوں۔ طاقت کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کرسی پر بیٹھ جاتا اور منصف اس کی فتح مندی کا اعلان کر دیتے، پنڈال میں سے ایک شخص باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی تلوار تھی جسے وہ لہراتے ہوئے دھیرے دھیرے قدموں سے آگے ہی آگے اسی طرف بڑھتا چلا گیا، جہاں منصف کھڑے تھے۔ انہی کے پاس رام گڑھ کا شہہ زور کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے سارے پنڈال کو سانپ سوگھ گیا۔ حیرت بھری نگاہیں اس پر جم گئیں۔

اس شخص کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ جسے وہ لہرانیں رہا تھا بلکہ تلوار اس نے یوں پکڑی ہوئی تھی جیسے اسے ہتھیار سے زیادہ خود پر اعتماد ہو۔ وہ لمبا تر نکلتا تھا، اس نے لمبا کرتا پہنا ہوا تھا اور دھوئی باندھی ہوئی تھی۔ چہرہ سیاہ داڑھی سے مزین تھا۔ سر کے سیاہ دراز گیسو اس کے کاندھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہلی نگاہ میں یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے، اور کس علاقے کا ہے۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ جس طرح قدم بڑھاتا جا رہا تھا۔ ٹھا کر رام دیال رائے کو اس کے بڑھتے ہوئے قدم کا میاں کی کے زینے سے نیچے دھکیل رہے تھے۔ اترتا ہوا نشہ بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ وہ ایسی ہی اذیت سے دوچار ہو گیا۔ وہ اپنے دشمن کی طرف پوری طرف متوجہ تھا، وہ یہ دیکھ ہی نہیں پایا کہ پنڈال کا ماحول بدل گیا ہے۔

تماشاخیوں میں سے کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ مقابلہ ہوگا۔ سارے لوگ اس پر حیران تھے کہ جس کا نہ تو خلیہ شہہ زوروں جیسا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں ڈھال تھی۔ پھر بھی وہ اس خطرناک مقابلے کے لئے میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ اپنا دفاع کیسے کرے گا؟ وہ کہیں سے بھی ماہر شمشیر زن نہیں لگتا تھا۔ مگر۔۔۔۔۔! یہ حقیقت تھی کہ وہ مقابلے پر اتر آیا تھا اور اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں اس کے سامنے اس کا حریف کھڑا اسے نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔ منصف بھی اسے دیکھ کر حیران تھے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اپنی موت کو دعوت دینے کے لئے میدان میں اتر آئے گا۔ بظاہر ان دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں لگتا تھا مگر نووارد شمشیر زن ان کے درمیان اعتماد سے کھڑا تھا۔ ہر جانب پھر سے سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تبھی ایک بزرگ منصف نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جوان۔۔۔۔۔! تم بناؤ ڈھال کے مقابلے کے لئے آگئے ہو، تمہیں احساس نہیں کہ تلوار زخم بھی لگاتی ہے؟“

”بے شک تلوار زخم ہی لگاتی ہے، لیکن سارے زخم دکھائی نہیں دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ آپ مقابلہ شروع کروائیں۔“ اس نے انتہائی اعتماد سے کہا تو بوڑھے منصف نے کہا

”پھر بھی ہم تمہیں ڈھال مہیا کر سکتے ہیں تاکہ مقابلہ برابری میں ہو۔“

”میں سہاروں کا قائل نہیں ہوں۔ آپ مقابلہ شروع کروائیں۔“ نووارد نے اعتماد سے کہا تو کسی کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ بوڑھا منصف چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مقابلہ شروع کرنے کا اشارہ کر دیا۔

دونوں حریف آمنے سامنے تھے۔ اشارہ پاتے ہی ان کے جسموں میں بجلی کو دگئی۔ رام گڑھ کے شہہ زور نے بزرگ بلی کا نعرہ لگایا اور تلوار بازی کے جوہر دکھاتا ہوا آگے بڑھا۔ نووارد کی نگاہ تلوار پر نہیں حریف پر تھی۔ پورا ہجوم یوں خاموش تھا جیسے ان کی سانسیں رُک گئیں اور ہوا کی سننا ہٹ تیز ہو گئی ہو۔ رام گڑھ کے شہہ زور نے پوری قوت اور جولانی سے حملہ کیا، جسے نووارد نے انتہائی مہارت سے روک لیا۔ پھر وار پوار روکتے ہوئے وہ حریف سے پسپا ہوتا رہا۔ جیسے حریف کی طاقت کا اندازہ کر رہا ہو۔ وہ کچھ دیر دفاعی حالت میں رہا اور رام گڑھ کے شہہ زور کو اپنی مرضی سے میدان میں گھماتا رہا۔ ٹھا کر رام دیال رائے سمجھ رہا تھا کہ نووارد جو چاہ رہا ہے، وہی ہو رہا ہے۔ لیکن عام عوام کو لگ رہا تھا کہ وہ ابھی زخم کھا کر گرے گا تو اٹھ

نہیں پائے گا۔ حیرت انگیز طور پر دونوں میں سے کسی کو زخم نہیں آیا تھا۔

ٹھا کر رام دیال رائے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقل یہ تسلیم کر چکی تھی کہ نووارد ماہر تلوار باز ہے۔ جو چہیترے اس نے دکھائے تھے، وہ اسے بھی نہیں آتے تھے۔ لیکن وہ تو اس احساس کے ساتھ تملار ہاتھ کو نووارد نے آکر نہ صرف اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا تھا بلکہ جن عزائم کا وہ اعلان کر چکا تھا، اُن پر بے دردی سے لکیر پھر گئی تھی۔ انتہائی عداوت کے احساس اور بڑھتے ہوئے غصے کے ساتھ اس کے اعصاب تن گئے۔ ادھیڑ عمری میں شکست کا یہ تھیمڑا وہ سہہ نہیں پارہا تھا۔ جوش مارتے ہوئے خون میں شرمندگی کی ٹھنڈک نے اس کے جسم کو ترخا کر رکھ دیا تھا۔ اس نووارد نے میدان میں قدم رکھتے ہی راجپوتی فخر اور انا پر جو کاری ضرب لگائی تھی اس کے زخم نے ٹھا کر رام دیال رائے کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے حال ہو رہا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نووارد کو دیکھ رہا تھا جو اس کے شہہ زور کو پسپا ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ تلوار بازی کے جوہر اس سے پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملے تھے کہ بنا ظاہری زخم لگائے وہ حریف کو تاپنے پر مجبور کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میدان کا رنگ بدل رہا تھا۔ ان جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف سے نووارد کے حق میں نعرہ بازی شروع ہو گئی تھی جو کبھی رام گڑھ والوں سے شکست کھا چکے تھے۔ کسی نے پہلی بار رام گڑھ والوں کو شکست سے دوچار کرنا تھا۔ عوام اس بدلتی ہوئی صورت حال میں پر جوش ہو گئے تھے۔ اسی سنسنی نے پورے ماحول میں جادو بھر دیا تھا۔ واضح شکست کے آثار نے ٹھا کر رام دیال رائے کو پاگل کر دیا۔ اب سے ذرا دیر قبل جو لوگ اس کے سامنے گردنیں جھکا چکے تھے، وہی اب اس نووارد کی وجہ سے اس کی طاقت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ اپنی عقل کو بیٹھا، تہی دانت پیٹتے ہوئے انتہائی غصے میں اس کے منہ سے اضرائی انداز میں نکل گیا۔

”اسے اب مرجانا چاہیے۔“

آواز اتنی بلند نہیں تھی لیکن اتنی دھیمی بھی نہیں تھی کہ قریب کھڑا بھاتو نہ سن سکے۔ بھاتو اس کا وہ خاص ملازم تھا، جو پشتوں سے ان کی خدمت کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان ملازمین میں سے تھا جو اپنے مالکوں پر جاں نثار کر دیتے ہیں اور مالک کے اشاروں کو کھوں میں سمجھ بھی لیتے ہیں۔

ٹھا کر رام دیال رائے کی نگاہیں برسر پیکار شمشیر زنوں پر لگی ہوئیں تھیں۔ نووارد بلا کا پھر تیل ثابت ہوا تھا۔ اس نے کئی ایسے وار بھی بچائے تھے کہ اگر ڈھال بھی ہوتی تو فوج نہ پاتا۔ بعض اوقات تو صاف لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے حریف کو تھکا رہا ہے۔ ورنہ ایسے مرحلے بھی آئے تھے کہ جب وہ فیصلہ کن وار کر سکتا تھا۔ پھر چانک نووارد نے اپنی تلوار بلند کی اور اگلے ہی لمحے رام گڑھ کے شہہ زور کی ڈھال دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک ٹکڑا شہہ زور کے ہاتھ میں رہ گیا اور دوسرا دور جا کر گرتا۔ تلوار زنی کے مقابلے میں ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ شہہ زور نے حیرت کی انتہاؤں پر جا کر اس گرے ہوئے بکترے کو دیکھا، یہی لمحہ اس پر بھاری تھا، نووارد نے اپنی تلوار کی نوک اس کی شہہ رگ پر رک دی۔

پورے چندال میں شور مچ گیا۔ اس شور میں رام گڑھ والوں کی انتہائی ہزیمت کی خوشی زیادہ تھی۔ بظاہر مقابلے کا فیصلہ ہو چکا تھا جو بلاشبہ نووارد کے حق ہی میں ہونا تھا۔ انہی لمحات میں عوام نے دیکھا ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور اس نووارد کے دائیں کاٹھ سے بیست ہو گیا۔ اس ہاتھ میں نووارد نے تلوار پکڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کسی سمجھ میں بھی وہ بات آئی، ہر طرف سے ہجوم میدان میں ٹوٹ پڑا۔ ہر بندہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اپنی شکست سے بچنے کے لئے رام گڑھ والوں نے ایسا کیا ہے۔ ورنہ مقابلہ تو نووارد جیت ہی چکا تھا۔

پہلے تو ٹھا کر رام دیال رائے کو خود سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا، مگر جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ یہ تیر بھاتو نے چلایا ہے تو اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب وہ اس مقابلے کو ادھورا ثابت کر سکتا تھا۔ کیونکہ ہارنے سے بہتر ہے مقابلہ ادھورا رہ جائے۔

یہاں ہجوم کے میدان میں آجانے سے وہ گھبرا گیا تھا وہاں وہ بھی سوچ رہا تھا کہ انہیں واضح شکست نہیں ہوئی۔ یہ فقط اس کی خود کو ڈھارس تھی۔ ورنہ وہ بھی جانتا تھا کہ اسے شکست ہو چکی ہے۔ اس کی عقل کہہ رہی تھی کہ اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ورنہ پھرا ہوا ہجوم کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسے اچھی طرح یہ معلوم تھا کہ اس کے مخالفین حاسدین کے کارندے بھی ہوں گے جو انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مگر اس کی راجپوتی اُنا اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے مرد میدان رہا تھا۔ یوں پیٹھ دکھا کر بھاگنا نہیں چاہتا تھا، ورنہ ساری عمر کے لئے اس پر دھبہ لگ جاتا۔ اس کے ملازمین نے اسے گھیرے میں لے کر تلواریں سونت لیں تھیں۔ دو بندے توڑے دار بندو قیل لے کر اس کے ارد گرد کھڑے ہو گئے تھے۔ فائر کے لئے وہ توڑے ڈال چکے تھے۔ کچھ دیر تک ہجوم میدان میں رہا، پھر آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ ہر بندہ حیران اور پریشان تھا کہ تیر کھایا ہوا تلوار باز کدھر گیا؟ وہ انہیں دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ وہ اسی ہجوم میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ اسے زمین لگ گئی یا آسمان؟ وہ کہاں گیا؟ ٹھا کر رام دیال رائے سمیت ہر بندے کے ذہن میں یہی سوال تھا۔

حیران و پریشان ہجوم کسی فیصلہ کن اعلان کا منتظر تھا۔ مصنفین بھی ورطہ حیرت میں تھے کہ کیا کریں۔ شکست خوردہ شہہ زور کو اس لئے انعام دیں کہ وہ ابھی تک میدان میں تھا یا گھائل ہوئے نووارد کو تلاش کر کے اسے انعام دیں کیونکہ وہ جیت چکا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھے۔ یہ فیصلہ ہونا باقی تھا۔ وہ ابھی اس پر مشورہ کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ٹھا کر رام دیال رائے اپنے چاندی کی زین والے گھوڑے پر سوار مصاحبوں، ملازمین اور جانثاروں کے ساتھ ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ گھوڑے سے نہیں اترا بلکہ وہیں کھڑے کھڑے اپنی پچکی ہوئی اتار کے باعث اندر ہی اندر بیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس نے مصنفین کے قریب گھوڑا لے جا کر روک دیا، پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا

”فیصلہ تو ہو چکا۔ آپ میرے شہہ زور کو انعام دیں یا نہ دیں..... مگر میری طرف سے مقابلے کی ہمت کرنے والے جوان کو پہلے دو گنا انعام دینا تھا لیکن اب سو گنا انعام دینے کا اعلان کرتا ہوں، وہ آئے اور اپنا انعام لے جائے۔“

یہ کہہ کر اس نے گردن اونچی کر کے دو دروڑ تک کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ پھر اپنے گھوڑے کی لگا میں تمام کر چاروں طرف گھوما۔ لیکن وہ نووارد کہیں نظر نہیں آیا۔ ٹھا کر رام دیال رائے جانتا تھا کہ وہ سامنے آ بھی گیا تو اسے سو گنا انعام دینا اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا کر کے ایک تو وہ اپنی اتار کو تسکین پہنچاتے ہوئے لا شعوری طور پر اپنی طاقت کا رعب بجا رہا تھا۔ اور دوسرا وہ سننے والوں کو یہ پیغام دے رہا تھا کہ یہ مقابلہ اس کی حیثیت کو کم کر دینے والا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس نووارد کو ملنا چاہتا تھا، جس نے تلوار بازی کے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ جس سے وہ خود بھی ناواقف تھا۔ کیونکہ علم اور فن کی کوئی حد ہے اور نہ کنارا۔ وہ اتنا بڑا انعام دے کر اسے اپنا گرویدہ کر لینا چاہتا تھا۔ ٹھا کر رام دیال رائے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر بولا،

”میں جا رہا ہوں۔ اگر وہ بعد میں بھی آ کر اپنے انعام کا مطالبہ کرے تو اسے بتا دیں کہ ٹھا کر رام دیال رائے کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں۔ وہ جب چاہے آ سکتا ہے۔ وہ ہمارا مہمان ہوگا۔ میں اس کی جان کی حفاظت کا امدہ لیتا ہوں۔“

اس نے یہ لفظ بڑے رعب و دبدبہ سے کہے تھے۔ اور پھر ان معززین کا رد عمل دیکھے بغیر گھوڑا موڑ لیا۔ وہ میدان سے نکلا تو اس کا رخ رام گڑھ جانے والے راستے کی طرف تھا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ رام گڑھ کی جانب پلٹتے ہوئے اسے جیت کے نشے کا خمار نہیں تھا۔ اس کا من ہار تسلیم کر چکا تھا مگر دماغ میں ابھی تک جیت جانے ہی کی سوچیں کلہاڑ ہیں تھیں۔ دماغ طرح طرح کی تاویلیں اور دلیلیں دے رہا تھا کہ وہ فتح مند ہے، لیکن دل کی ایک نفی ان ساری تاویلوں پر لکیر پھیر رہی تھی۔ وہ قافلے کے ساتھ میدان سے نکل کر صحرا کے درمیان

میں بنے ہوئے راستے پر ہولیا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے ان سب سے آگے تھا۔ پہلے واپسی پر وہ نعروں کی گونج میں شادیا نے بجاتے ہوئے آتے تھے۔ مگر اس بار ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی کی بھی ہمت نہیں پڑی تھی کہ جیت یا ہار جانے کے بارے میں لب کشائی کرے۔ وہ بیس یا پچیس لوگ تھے اور وہ سب تیزی سے چلتے تھے۔ باقی لوگ ابھی پیچھے تھے۔ وہ اونٹوں، گدھوں اور بتیل گاڑیوں میں آ رہے تھے۔

اچانک انہیں سامنے موڑ پر بول کے درختوں کے پاس آگئی ہوئی کریری کی جھاڑی کے ساتھ ایک شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے کالی چادر اوڑھی ہوئی تھی اور اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا۔ شام کے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں بھی وہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سراب کی مانند دھوکہ نہیں دے رہا تھا کہ کسی کو اس کا یقین نہ آتا۔ انہوں نے دور ہی سے اس شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے بھی ان کی آمد پر سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے کو یہ منظر خلاف معمول لگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ شخص زندہ بھی ہو اور ان کی آمد کا احساس بھی نہ کرے۔ تو پھر یہ ان کی راہ میں اس طرح کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ اگر یہ اس طرح بیٹھا رہا تو ہمارے گھوڑوں کی سٹوں تلے آکھلا جائے گا۔ یہ سوچتے ہی اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور اس شخص سے تھوڑے فاصلے پر رُک گیا۔ پھر اس نے بھانود کو دیکھ کر کہا

”کیا میں وہی دیکھ رہا ہوں جو تو دیکھ رہا ہے؟“

”جی مالک! میں پتہ کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور لمحوں میں اس شخص کے پاس پہنچ گیا۔ پھر زور سے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا

”کون ہو تم، اپنا چہرہ اوپر کرو۔“

بھانود کے اس مخاطب پر اس شخص نے اپنا سر اٹھایا، بھانود کی طرف دیکھا اور پھر اسے کوئی اہمیت دیئے بغیر اسی طرح سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا جیسے وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ بھانود نے جب اس کا چہرہ دیکھا تو وہ چونک گیا۔ اس نے اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے کئی بار پکارا مگر اس شخص میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ جیسے اس کی آواز دینا نہ دینا ایک برابر ہو۔ وہ کچھ دیر کوشش کے بعد لوٹ آیا اور ٹھاکر رام دیال رائے کی طرف دیکھ کر گھرے لہجے میں بولا

”مالک! کوئی سادھو، سنت معلوم پڑتا ہے۔؟“

ٹھاکر رام دیال رائے نے اپنے بڑوں سے کئی بار سنا تھا کہ ناگ ہو یا سادھو، سنت، ان کا راستہ نہیں کاٹنا چاہئے۔ مگر یہاں صورت حال مختلف تھی۔ سادھو، سنت اس کی راہ میں تھا، وہ بھی آدھے ادھورے راستے پر، وہ چاہتا تو اس کے پاس سے ہو کر گزر بھی سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی بہت سارے خیال آتے چلے گئے۔ جس میں یہ بات بھی تھی کہ اگر یہ سادھو سنت ہے تو پھر اس کا یہاں بیٹھنا بے معنی نہیں ہو سکتا، ضرور اس میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ کچھ دیر پہلے بھی تو میدان میں انہی بیٹھے تھے۔ اگر اب یہ سادھو یہاں بیٹھا ہوا ہے تو ضرور کوئی بات ہے۔ یہ یقین کرتے ہی اس نے کہا

”تم سب ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔“

”مالک اگر؟“ بھانود نے کہنا چاہا تو ٹھاکر رام دیال رائے نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔ تب وہ خاموش ہو کر وہیں کھڑا رہا۔ ٹھاکر رام دیال رائے گھوڑے پر سے اتر ا اور ان سب کو وہیں چھوڑ کر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس شخص کے پاس جا کر رکھا اور سخت لہجے میں بولا

”کون ہو تم؟ سادھو یا.....“ وہ پانکھڑی کہنا چاہتا تھا کہ اس شخص نے اپنا سر اٹھا دیا۔ تبھی ٹھاکر رام دیال رائے پوری جان سے لرز گیا۔ یہ تو وہی نووارد تھا جس نے ابھی کچھ دیر پہلے میدان میں تلوار بازی کے جوہر دکھائے تھے۔ بھانود کی پہچان میں اگر وہ نہیں آیا تھا تو میدان میں اس کے گیسو سیاہ تھے، لیکن اس وقت اس شخص کے ساری زلفیں دودھ کی مانند سفید

تھیں۔ وہی نیلکا الف ناک، بڑی بڑی خمار آلود پر جلال آنکھیں، جن میں ایسا رعب موجود تھا جس کے سامنے ٹھاکر کو اپنی حیثیت ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کشادہ پیشانی، دبدبہ ظاہر کرتا ہوا چہرہ، وہ چند لمحوں میں ٹھاکر رام دیال رائے کی طرف دیکھتا رہا، پھر کڑکتی ہوئی آواز میں بولا

”پہچانا مجھے ٹھاکر؟ میں کون ہوں؟“

پہچان تو میں کیا ہوں..... لیکن..... جانتا نہیں کہ..... آپ..... ہیں کون؟“

اگرچہ اس نے بڑے حوصلے سے کہا تھا لیکن اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے ایسے صورت حال سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔

”چہرہ ہی پہچان گئے ہو تو اچھی بات ہے۔ ورنہ میری بات سمجھنے میں نجانے تجھے کتنا وقت لگتا۔ اور اس دوران تم نجانے کتنا نقصان اٹھا لیتے۔“ اس بار اس کا لہجہ تینبی تھا۔

”لیکن آپ ہیں کون؟“ ٹھاکر کا لہجہ مزید دھیمہ ہو گیا تھا۔

”یہ تم اگرچہ ہو بھی تو نہیں جان سکتے ہو۔ اور اگر کوشش بھی کرو گے تو الجھ جاؤ گے۔ شاید میں تیرے سامنے کبھی نہ آتا، اگر تیرے غرور اور تکبر نے تمہیں، تیری اوقات سے باہر نہ کر دیا ہوتا۔“ اس شخص کے لہجے سے اب غصہ چھلکنے لگا تھا۔

”یہ تو ہم راجپوتوں.....“

”بس آگے کچھ مت کہنا۔ کیا تم اس دھرتی کا سینہ چھاڑ سکتے ہو، یا آسمان کو چھو لیا ہے تم نے..... تم تو اتنے بے بس ہو کہ اپنی سانس کو اپنے تالچ نہیں کر سکتے ہو، اور دراصل کاوارٹ پیدا نہیں کر سکتے ہو۔“ اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

”یہ تو بھگوان کی دیتا ہوتی ہے..... منٹ اس میں کیا کر سکتا ہے۔“ ٹھاکر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا

”پھر بھی..... پھر بھی تمہیں اتنا غرور ہے؟ کیا ایک عظیم طاقت کا احساس رکھنے والا، اپنے بارے میں نہیں سوچتا ہے کہ وہ خود کیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ مٹی پتھر کی بنی ہوئی بے جان مورتیاں کسی کو اولاد دینے کی سکت رکھتی ہیں۔ بے جان تو سراپا موت ہے، اس میں زندگی کہاں، اور تم اس میں زندگی تلاش کر رہے ہو؟“ اس شخص کے لہجے میں موجود دبدبے سے زیادہ اس کی بات نے دہلا کر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں آندھی کی طرح یہ خیال اٹھا کہ وہ تو اس کے دھرم کا ایمان کر رہا ہے۔ وہ جوش سے بولا

”آپ میرے دھرم کا ایمان نہیں کر سکتے۔“ گویا بات سخت کہی لیکن لہجہ نرم تھا۔

”جی بات سے وہی گھبراتا ہے جس کے من میں چور ہو۔ میں نے اگر جی بات کہہ دی ہے تو اس پر یقین کرنے کی بجائے اس پر بحث کر رہے ہو؟ اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ میری بات کو سمجھو اور اس پر غور کرو۔ ایک ذرا سی بات تم نہیں سمجھ سکے اور تجھے خود پر غور ہے کہ جیسے کوئی بھی اس دھرتی پر تم جیسا نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس شخص نے ٹھاکر کی طرف غور سے دیکھا۔ تو ٹھاکر نے بڑے مان سے کہا

”یہ دھرم باتیں ہیں، ان پر بحث، سوچنا اور سمجھنا کیسا؟ پرکھوں کی کہی ہوئی باتیں کیا غلط ہو سکتی ہیں؟“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب بھی آڑے ہوئے ہو۔“ یہ کہہ کر اس شخص نے ٹھاکر کی طرف گہری نگاہ سے دیکھتے ہوئے ”تمی لہجے میں کہا، ”جاؤ، تمہیں عقل سمجھ دینے والا اور یہی باتیں سمجھانے والا، تیری نسل سے پیدا ہوگا۔ پھر میں تم سے آکر ہاتھوں گا کہ بول، پرکھوں کی باتیں کیا ہوتی ہیں، تیرا خون تجھے بتائے گا کہ بے جان مورتی میں موت اور انسانی صورت میں زندگی پڑی ہے، جا“ ہر ادا ہوتے ہوئے لفظ کے ساتھ اس شخص کا غصہ بڑھتا گیا تھا۔ مگر ٹھاکر کو اس کا غصہ یا وہی نہیں رہا۔ وہ تو ان لفظوں پر چونک کر رہ گیا تھا، جو اس نے ادا کر دیئے تھے۔ وہ انتہائی حیرت سے بڑبڑایا، جیسے تصدیق کر رہا ہو۔

”میری نسل سے؟“

”ہاں، تیری نسل سے..... لیکن یہ یاد رکھ، تیرے غرور کا یہ حال رہا تو بہت بچھتاؤ گے۔“ اس نے سختی سے پھر تہمت کی۔ لیکن ٹھا کر جیسے کسی سحر میں جکڑا گیا تھا۔ وہ وہیں آڑا ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں خوشگواریت اتر آئی تھی۔ وہ پھر سے سرسراتے ہوئے انداز میں بولا

”میری نسل سے؟“

”ہاں..... ہاں، تیری نسل سے، تجھ سے ایک صورت نے سامنے آنا ہے۔ یہ طے ہے اور لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں سے بہت کچھ ظاہر ہونے والا ہے۔ لیکن سن۔۔۔! موت کا خیال، زندگی نہیں دے سکتا، جبکہ زندگی کو فقط زندگی ہی سمجھ سکتی ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو ہی ٹوٹے بچے گا، ورنہ نشان بھی مٹ جائے گا۔“ اس شخص نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو ٹھا کر نے کچھ کہنے کے لئے اپنے لب کھولے، مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹھا کر کو روک دیا۔ اس شخص نے اپنے گرد سے لپٹی ہوئی سیاہ چادر ہٹائی تو اس کے دائیں کاندھے میں تیرا اسی طرح پوست تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے وہ تیر کھینچ کر نکال لیا۔ ٹھا کر اپنی جگہ ٹھٹھک گیا تھا۔ وہ شخص چند لمبے ٹھا کر کی جانب دیکھتا رہا پھر تیر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس شخص کے کاندھے سے خون اگلنے لگا تھا۔ تیر خون آلود تھا۔ ٹھا کر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ تیر پکڑ لیا تو وہ شخص اٹھ کر چل دیا۔ ٹھا کر اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ مگر گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے دل میں یہ شدت سے خواہش تھی کہ وہ شخص کو روک لے، اس سے باتیں کرے، اس سے معذرت کر لے۔ اس نے اپنی نسل کے وارث بارے باتیں پوچھے، لیکن وہ آواز دے ہی نہیں سکا۔ جبکہ وہ شخص چلتا ہوا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یوں ہوا کہ جیسے زمین اسے نگل گئی یا آسمان اسے کھا گیا۔ ٹھا کر کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بت بنا کتنی ہی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی جس میں نہ صرف اس کے لیے خوشخبری تھی بلکہ ایک طرح سے تنبیہ بھی تھی۔

”جاؤ، تمہیں عقل سمجھ دینے والا اور یہی باتیں سمجھانے والا، تیری نسل سے پیدا ہوگا۔ پھر میں تم سے آکر پوچھوں گا کہ بول، پرکھوں کی باتیں کیا ہوتی ہیں، تیرا خون تجھے بتائے گا کہ بے جان مورتی میں موت اور انسانی صورت میں زندگی پڑی ہے، جا۔“

ٹھا کر دیال رائے کو یہ یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اسی پر بیت رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا کہ وہ پینا دیکھ رہا ہے۔ کیا یہ خوشخبری اس کے عوض میں ملتی تھی کہ وہ اپنا غرور توڑ دے۔ یا اس کے بھاگیہ میں کچھ اور ہی تھا، یا اس کا بھگوان اس سے کچھ دوسرا چاہتا تھا۔ پہلی بار بھگوان کے نام پر اس کا دل نہیں جھٹکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خون آلود تیر، اسے اس کی حقیقت سے آگاہی دے رہا تھا۔ یہ پینا نہیں ہو سکتا تھا۔ دن کے ایک ہی پہر میں اتنا کچھ ہو جانا، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

”چلیں مالک۔!“

بھانود کی آواز پر وہ بری طرح چونک گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ چند قدم کے فاصلے پر رام گڑھ کے لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ یہ سازا واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہوگا۔ وہ بھی اس کے گواہ ٹھہر گئے تھے۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا تیر ساری کہانی بیان کر رہا تھا۔ وہ بھی اس تیر کو دیکھتا اور کبھی لوگوں کو۔ تبھی بھانود نے آگے بڑھ کر وہ تیر اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے گھوڑے تک آیا اور اس پر سوار ہو کر چل دیا۔ تبھی قافلہ بھی اس کے ساتھ بڑھا۔ ٹھا کر دیال رائے کو محسوس ہونے لگا کہ اس کے غرور پر یونہی ضرب نہیں پڑی۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

☆.....☆.....☆

جمال اور جہاں دونوں یوں کھڑے تھے، جیسے بُت بن گئے ہوں۔ ایک کے بعد ایک ٹھنڈا ہوا تھا۔ اس وقت

ان کے سامنے رام گڑھ کی وہ حویلی تھی، جس میں ٹھا کر دیال رائے رہتا تھا۔ وہ اس منظر میں کھو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ حویلی میں موجود اپنی خواب گاہ میں بڑے کر دفر سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے اس شخص کا چہرہ ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم اور غیر معمولی واقعہ تھا۔ جس سے اس کا غرور و تکبر خاک میں مل گئے تھے، جو اس کی موت کے مترادف تھا۔ راجپوتوں میں یہ روایت رہی تھی کہ اگر وہ میدان میں ہار جاتے تو پیٹھ دکھانے کی بجائے مر جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس شخص نے تو اُسے ایسی موت دے دی تھی، جو لمحہ بہ لمحہ اسے مر جانے کا احساس دے رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی پکار پکار کر کوئی کہہ رہا تھا کہ ناجائز طریقے سے وہی جیتا کرتا ہے، جن کے بدن پر لگی مٹی ناجائز ہوا کرتی ہے۔ جیت ہار تو کھیل کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے ذاتی اتکا کا مسئلہ بنالیا جائے۔ یا پھر ناجائز مٹی سے بنے جسموں کی فطرت ہی یہی ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنی قوت کے اظہار کا یہی طریقہ اپناتے ہیں۔ اس وقت جبکہ وہ میدان میں تھا اور اس نے بڑے ظالمانہ انداز میں نووارد کے بارے میں موت کی خواہش کی تھی۔ وہی لمحہ اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ جس کی اذیت وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک خطرناک سانپ کی مانند ہو رہا تھا، جس کا زہر نکال دیا جائے۔ مجروح اتکا اور احساسِ شرمندگی کے ساتھ اس کا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ انسان تھا، شاید اس لئے ایسا سوچ رہا تھا، ورنہ ناجائز مٹی سے بنے ایسے جذبات کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس شخص نے ٹھا کر دیال رائے کو ایک ایسی اُمید دی تھی، جس سے وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اس کی یہ بات تو اس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہی تھی کہ ”جاؤ، تمہیں عقل سمجھ دینے والا اور یہی باتیں سمجھانے والا، تیری نسل سے پیدا ہوگا۔ پھر میں تم سے آکر پوچھوں گا کہ بول، پرکھوں کی باتیں کیا ہوتی ہیں، تیرا خون تجھے بتائے گا کہ بے جان مورتی میں موت اور انسانی صورت میں زندگی پڑی ہے، جا۔“ وہ جس قدر اس بات پر سوچتا ہی قدر اسے اس کی دوسری باتوں پر یقین آتا جا رہا تھا۔ اگر چہ اسے اپنے دھرم کے انوسار کچھ کے ہی دے رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی مزید سوال بھی اٹھ رہے تھے۔ اس شخص کی یہ بات کہ ”پھر بھی..... پھر بھی تمہیں اتنا غرور ہے.....؟ کیا ایک عظیم طاقت کا احساس رکھنے والا، اپنے بارے میں نہیں سوچتا ہے کہ وہ خود کیا ہے؟ کیا تم نہیں چانتے ہو کہ مٹی پتھر کی بنی ہوئی بے جان مورتیاں کسی کو اولاد دینے کی سکت رکھتی ہیں۔ بے جان تو سراپا موت ہے، اس میں زندگی کہاں، اور تم اس میں زندگی تلاش کر رہے ہو؟“ اسے تکلیف تو دے رہیں تھیں، لیکن وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ دوسرا کون ہے جو اولاد دیتا ہے؟ میں اگر اپنے دھرم کے انوسار انہی دیوی دیوتاؤں کو اولاد دینے والا سمجھتا ہوں تو پھر میں بے اولاد کیوں ہوں؟ جن سے میں نے اولاد مانگی، کیا وہ اس قدر بے بس ہیں کہ میری نسل کا وارث مجھے نہیں دے سکتے ہیں؟ میری یہی خوجہ کا کی گود نہیں بھر سکتے ہیں؟ جبکہ وہ دیوانوں کی مانند پراگھٹا کرتی ہے۔ ہم نے ہر طرح کی بھیٹ دی ہے، کیا کسی دیوی دیوتا نے کچھ بھی سویکار نہیں کیا؟ آخر کیوں؟ کیا کی کوتاہی ہے؟ کیا میرے بھاگیہ میں ایسا لکھ دیا گیا ہے، اگر ایسا لکھ دیا گیا ہے تو کس دیوی یا دیوتا نے لکھا ہے، کیا میں اس لئے بے اولاد ہوں کہ جس نے لکھا اسے میں نہیں جانتا ہوں؟ سوالوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

یہ سوچ بیہوش رک جاتی تو ایک نیا سلسلہ دراز ہو جاتا کہ وہ شخص کیسی شستی رکھتا تھا؟ تبھی وہ سارے منظر اس کی نگاہ میں گھوم جاتے۔ اس کی تلوار بازی کے جوہر، ایک ہی وار میں ڈھال کو دو ٹکڑے کر دینا، اس کے چہرے کا جلال، میدان میں جوان رعنا، اور راستے میں بوڑھا، مگر چہرہ اتنا ہی پرکشش، دمکتا ہوا جیسے ماہتاب، اور اس وقت تو وہ کانپ کر رہ گیا تھا جب اس نے تیر نکال کر اسے تھاما دیا تھا، اس کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ اسے روک سکے۔ انہی جھلتیوں کا رعب تھا کہ وہ اس شخص کی بات پر ذہن اور دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ کبھی بھی زیرک اور عقل مند شخص کے کسی بھی قسم کی بے بسی باعث سکون

نہیں ہوتی۔ اس کے دماغ پر وہی شخص حاوی تھا اور بے چینی تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی جتنی جیوتیکا اس کے پاس آگئی۔ اور بڑی محبت سے اس کے پاس بیٹھ کر بولی

”ایک بات پوچھوں نا تھ؟“

”ہاں۔! پوچھو۔“ اس نے ہکا را بھرنے والے انداز میں کہا۔ ٹھا کر دیال رائے کی سنجیدگی کم ہی نہیں ہو پائی تھی۔

”میلہ ختم ہونے کئی دن ہو گئے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب سے آپ واپس آئے ہیں، آپ کو چپ لگ گئی ہے۔ نہ ہنستے ہیں اور نہ ہی بات کرتے ہیں۔ بس ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے نا تھ؟“ جیوتیکا نے بہت مان اور محبت سے پوچھا تو ٹھا کر دیال رائے نے ایک طویل سانس لی اور بولا

”ہاں جیوتیکا، ایک ایسا انہونا واقعہ ہوا ہے کہ جسے میں چاہتے ہوئے بھی اپنے دماغ سے نہیں نکال پار ہا ہوں۔“

”ایسا کیا ہو گیا ہے نا تھ؟“ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی تو ٹھا کر دیال رائے نے اس کی طرف دیکھا، پھر چند لمحوں تک یونہی دیکھتا رہا۔ جیسے وہ اس کی بات کا جواب دینا چاہ رہا ہو لیکن اسے لفظ نہیں مل رہے ہوں۔ جب جیوتیکا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے اپنی بات دہرائی تو جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ ساری بات سنا دی۔ پھر اپنی خواب گاہ کی دیوار پر سجائے اس تیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”یہ وہی تیر ہے جیوتیکا۔! وہ شخص میرے دماغ سے نہیں نکل رہا ہے۔ ایک طرف اس نے مجھے موت دے دی۔ میرا غرور، میرا تکبر، میری تمکنت اور میری شان اس نے اپنے پاؤں تلے مسل دی۔ اور یہی ایک راجپوت کی موت ہوتی ہے۔ مجھے وہیں خودکشی کر لینی چاہیے تھی۔ لیکن۔۔۔۔! اسی زبان سے اس نے مجھے جیون بھی دان کر دیا ہے۔ اس پر مجھے غصہ بھی بہت آ رہا ہے اور اس کی بات پر یقین کر لینے کو دل بھی چاہتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔“

”لیکن کیا نا تھ؟“ جیوتیکا تیزی سے بولی

”میں ڈرتا ہوں۔“ وہ شرمندہ لہجے میں پوچھا

”آپ نا تھ۔۔۔۔۔ آپ ڈرتے ہیں۔ مگر کس سے؟“ اس نے حیران کن لہجے میں پوچھا

”اپنے آپ سے۔۔۔۔۔ اپنے بھاگیہ سے اور۔۔۔۔۔ وہ یوں بولا جیسے اپنے آپ سے لرز گیا ہو۔ تو وہ بھی ڈولتے ہوئے لہجے میں بولی

”میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے نا تھ، بھگوان کی سونگند، میں مر جاؤں گی اگر آپ نے اپنی بات مجھ سے نہ کہی۔ کیوں ڈرتے ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو بھگوان سے بھی لڑنے کی جرات رکھتے ہیں۔ تو پھر بھی؟“

”تم غلط نہیں ہو جیوتیکا۔! لیکن یہ سوچو، میرے غرور کو مٹی میں ملا دینے والا، مجھے میری نسل کے وارث کا اعلان بھی کر رہا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ سب ہوا کیوں؟“ اس کا لہجہ دل دہلا دینے والا تھا جیسے کوئی مرتے ہوئے زندگی کی بھیک چاہ رہا ہو۔

”آپ۔۔۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا مگر ٹھا کر دیال رائے نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا

”اسی برس گرمیوں میں مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔ رام گڑھ میں ایک ہی گھر مسلمانوں کا تھا۔ اور اس کے پر یوار میں صرف تین لوگ تھے۔“

”ہاں میں جانتی ہوں۔ وہ کسان ہے، اور ان گرمیوں میں ان کی فصل کو آگ۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے جیوتیکا بری طرح چونک گئی۔ اور پھر حیران کن نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ یاس بھرے لہجے میں بولا

”وہ آگ میں نے لگوائی تھی۔“

”کیوں نا تھ، کیوں؟“ وہ حیرت سے بولی

”تا کہ وہ ایک ایک دانے کو محتاج ہو جائے۔ وہ میرے پاس آ کر گر گڑائے، مجھ سے بھیک مانگے یا پھر یہاں سے چلا جائے۔“ وہ حسرت سے بولا

”آپ نے ایسا کیوں کیا نا تھ؟“ اس نے پوچھا

”وہ رام گڑھ میں ایک ہی پر یوار تھا۔ میں چاہتا تو ان تینوں کورات کے اندھیرے میں قتل کر دیتا، یا پھر انہیں یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیتا۔ مگر اس طرح بات پورے علاقے میں پھیل جاتی۔ میں جانتا ہوں کہ علاقے میں اتنے سے مسلمان ہیں جو سب مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ میں نے ایسا کرنے کے لئے قتل کا استعمال کیا۔ میں نے اس کے کھیتوں کو آگ اس لئے لگوائی تھی کہ وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر میرے پاس آئے اور میں اس کی زمین منہ مانگے دام دے کر خرید لوں اور اسے یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دوں۔“

”لیکن ایسا ہونا نہیں نا تھ۔ وہ پر یوار تو اب بھی رام گڑھ میں موجود ہے۔ وہ آپ سے مدد مانگنے بھی نہیں آیا۔“ جیوتیکا نے تیزی سے کہا

”ہاں ایسے ہی ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ اپنا جیون کیسے بتا رہے ہیں۔ وہ میرے پاس ہی نہیں کسی کے پاس بھی مدد مانگنے نہیں گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں میلے سے آنے کے بعد اس کو خود بلاؤں گا اور اسے یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دوں گا۔“ ٹھا کرنے حسرت سے کہا

”آخر کیا بگاڑا تھا انہوں نے، جو آپ نے انہیں یہاں نہیں رہنے دینا چاہ رہے ہیں۔ وہ تو کسی سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے، یہ تو دو برس پہلے یہاں آئے ہیں، ان کا اتنا اثر بھی نہیں ہے؟“ جیوتیکا نے پوچھا

”یہ معاملہ دھرم کا بھی ہے جیوتیکا۔! پنڈت چرن جی لعل نے مجھ سے کہا کہ یہ مسلمان ملچھ ہوتے ہیں۔ شوروروں کی مانند، انہی کا منہ ساریہ اس علاقے پر ہے کہ انہی دو برسوں میں نہ بارشیں ہونیں ہیں اور نہ فصلیں اچھی ہوئیں ہیں اور یہ علاقے میں انہی مسلمانوں کی نحوست ہے کہ میرے ہاں وارث پیدا نہیں ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوا اور پھر کہتا چلا گیا، ”کیا کروں جیوتیکا، جب میں تیری طرف دیکھتا ہوں، اتنے سال کی رفاقت۔۔۔۔۔ اپنی دراشت اور ایک بیٹے کی خواہش، مجھے پاگل کر دیتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کس مندر میں نہیں گئے، کہاں کہاں ماٹھا نہیں ٹیکا، یہاں تک کہ کبھ کے میلے میں بھی گئے، کتنے سادھو، سنتوں سے پرارتھنا کروا کے دیکھ لی، کتنے پیڑوں پر تم نے سوت نہیں ہاندھا، گاؤں ماتا کی پرارتھنا تم اب بھی کرتی ہو، یہاں مندر بنوایا، کیا ہم نہیں جانتے کہ ہم میں ایک بیٹے کی خواہش کتنی شدید ہے۔ کیا ہم نہیں چاہتے کہ بھگوان ہم پر دیا کرے۔“ ٹھا کر کے لہجے میں مایوسی کھلی ہوئی تھی۔

”چاہتے ہیں، کیوں نہیں چاہتے۔ اگر پنڈت جی نے کہا ہوگا تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ انہیں یہاں سے نکال دیں، ان کا جو نقصان ہوا، اس سے زیادہ انہیں دے دیں۔ آپ زراش نہ ہوں۔ شاید بھگوان ہماری کھنائی اس طرح دور کر دے۔“ وہ بھی اس کی ہنوا بن گئی۔ ٹھا کر خاموش رہا تھا تو وہ بولی، ”آپ میری بات مان لیں نا تھ۔“

”نہیں شاید میں مسئلے پر یوار کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کر پاؤں گا۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا

”کیوں؟“ وہ حیرت سے بولی

”مجھے لگتا ہے جیوتیکا، جیسے اس مسئلے پر یوار کو ستانا ہی میرا دوش ہے۔ پنڈت نے جو کہا اس کا الٹ ہو رہا ہے۔ اس منہ کی شکتی میں اپنے آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ کوئی سپنا نہیں، حقیقت تھی، اگر اب بھی میں نے آنکھیں بند رکھیں تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔“

”کیا ایسا کر کے دھرم بھر شٹ نہیں ہوگا؟“ جیوتیکا نے حیرت سے لرزتے ہوئے کہا

”کیا دھرم اور کیا ادھرم، یہ تو کچھ اور ہے، کھائی دیتا ہے۔ ہمارے بھاگیہ میں کیا ہے، اوش ہم کیا جانیں۔“ ٹھا کرنے کھوئے ہوئے لچے میں سامنے ٹنگے ہوئے تیر کی طرف دیکھ کر کہا تو جیوتیکا نے اپنا سر بھکا لیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولی

”تو کیا کریں گے آپ؟“

”ہمیں اس مسئلے پر یوار سے ہٹنا مانگی ہوگی۔“ ٹھا کرنے کہا تو جیوتیکا کو یوں لگا جیسے ساری راجپوتی اقامتی کا ڈھیر ہو گئی ہے۔ اس کے من میں بھی ایک طوفان اٹھا اور پھر لمحوں میں وہاں شانہ آگئی۔ اس نے یوں کہا جیسے اپنی موت مرتے ہوئے زندگی چاہ رہی ہو۔

”اگر یہ رازی رہے تو.....؟“ اس نے کہا تو ٹھا کرنے آ، سگی۔ دیا۔ جیوتیکا نے محسوس کیا کہ ٹھا کرنے یہ فیصلہ کر لیا ہے تو اس کے چہرے پر امید کے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔

☆.....☆.....☆

وہ سہانی شام بڑی دلکش تھی۔ مغربی آفت پر جھلکتا ہوا سورج اپنی طلائی کرنیں زمین پر نچھاور کر رہا تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے سفید بادل بستی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ذرا دیر پہلے ساکت ہو جانے والی ہوا، یوں چل رہی تھی جیسے وہ خمار آلود ہو۔ موسم بہار کے شروع میں جو بارشیں ہوئیں تھیں، انہوں نے رام گڑھ کے اس صحرائی علاقے کی فضا کو شفاف بنا دیا ہوا تھا۔ یوں پورے ماحول میں مست کر دینے والی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ لہلہاتی فصلوں سے لیکر درختوں تک کے رنگ نکھرے ہوئے تھے۔ ایسی خوشگوار شام میں ٹھا کر دیال رائے اپنی شاہانہ ہمیشی میں سوار اپنی حویلی واپس آ رہا تھا۔ وہ میلے کی تیاریاں دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ وہ اس سہانی شام سے ضرور لطف اندوز ہوتا مگر اس کا دھیان اسے غافل کئے ہوئے تھا۔

میلے پر جانے کے لئے رام گڑھ کے لوگوں میں وہی جوش اور جذبہ تھا، جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ اگلی صبح سورج نکلنے ہی انہیں میلے میں جانے کے لئے رام گڑھ سے نکلنا تھا۔ اسی میدان کی جانب کوچ کرنا تھا، جس میں اس کی راجپوتی اقا کو چل دیا گیا تھا۔ میلے کی ہمیشہ کی طرح بھرپور تیاری بھی اس کے من میں تازگی نہیں بھر سکی تھی۔ سارے جذبے ماند تھے۔ سفید گھوڑوں کی ہلکی اپنے راستوں پر چلی جا رہی تھی۔ بھانود بھی چلا رہا تھا۔ وہ بھی اپنے مالک کی کیفیت سے آشنا تھا، سودہ خاموش تھا۔ صرف پرندوں کے اپنے گھونسلوں میں جانے کا شور تھا یا کبھی کا، یہاں تک کہ وہ حویلی جا پہنچے۔

ٹھا کر دیال رائے ڈانوں ڈول کیفیت میں کبھی سے اترا اور حویلی کے اندر چلا گیا۔ اسے احساس ہوا کہ حویلی میں سناٹا ہے۔ ہر طرف اور ہر وقت رہنے والی چہل پہل محسوس نہ ہوئی تو وہ چونک گیا۔ کیونکہ اسے پوری طرح احساس تھا کہ آج ضرور کچھ ہوگا۔ اسی لئے اسے سب سے پہلے اپنی جیوتیکا کا خیال آیا۔ وہ امید سے تھی اور یہی وہ دن تھے جب اس کی نسل کا وارث اس دنیا میں آنے والا تھا۔ وہ کون سا دن ہو سکتا تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ بس ٹھا کر دیال رائے کو قومی امید تھی کہ یہ چٹکارا ہی دن ہوگا جب اسے میدان میں جانا ہوگا، ورنہ یہ سب کچھ غلط ہو جاتا۔ وہ ایک دم سے مضطرب ہو گیا۔ اس کے قدم تیزی سے زنان خانے کی جانب اٹھ گئے۔

جہازی پٹنگ، سفید ریشمی بستر پر دراز جیوتیکا کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چہرے پر کرب پھیلا ہوا تھا۔ وہ درد کی اس کیفیت سے گزر رہی تھی، جس کے نتیجے میں کسی بھی عورت کو ماں جیسا اعلیٰ مقام مل جاتا ہے۔ جیوتیکا کراہ رہی تھی۔ پاس کھڑی دانی جنداں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے اسے مسلسل حوصلہ دے رہی تھی۔ ٹھا کر پر نگاہ پڑے ہی اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جس پر جیوتیکا نے گہرا کراہٹیں کھول دیں۔ اس کی خاص ملازمتیں بھی رکنی اور کاٹنا

بھی دانی جنداں کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ سترہ برس کی ناامیدی والی زندگی کے بعد جو چٹکارا اس نے دیکھا تھا اور جس کی بہ سے یہ دن اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس کی اہمیت کو وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ میلے پر جانے کے دن ہی اس کی جتنی ایسی کیفیت میں آگئی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکا تھا۔ بظاہر وہ آزاد تھا، جا بھی سکتا تھا، اسے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان دیکھی زنجیریں اسے باندھ چکی ہیں۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا۔ مرضی اسی شخص ہی کی چلتی ہے، جس نے اسے اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔ اس نے جیوتیکا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سکتے ہوئے بولی

”ہاتھ.....“

اس ایک لفظ میں نجانے کتنی امیدیں، خواہشیں، خوف، آرزوئیں، اور فکری کھلی ہوئی تھی۔ ٹھا کر اس لچے کا احساس کر کے پورے شریہ سے کانپ گیا۔ تبھی اس نے کہا

”دھیر راجکھو جیوتیکا، بھگوان تم پر بڑی دینا کرنے والا ہے۔“

”پرنتو، مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ میرا جیون ہی میرا ساتھ چھوڑ رہا ہے، ہاتھ۔“ اس نے سکتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ

کرب کی انتہاؤں کو چھو رہی ہو۔

”نہیں، ایسا نہیں ہوگا، وشواس رکھو۔“ اس نے حوصلہ دیا تو وہ بولی

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بھگوان مجھ پر اتنی دینا کرے گا۔ آپ کو تو پتہ ہے ناکہ ہم نے ان سترہ برسوں میں کتنا

اذیت ناک وقت گزاریا ہے۔ اور.....“ شاید وہ مزید کہتی لیکن درد کی لہر نے اسے مزید نہیں بولنے دیا۔ دانی جنداں فوراً ہی

وہاں آگئی۔ اس کے پیچھے ہی رکنی اور کاٹنا تھی۔ ٹھا کرنے ان کی طرف دیکھ کر کہا

”یہ کتنا نازک وقت ہے، تم اچھی طرح جانتی ہو۔ جس شے کی بھی ضرورت ہو حاضر کی جائے، کسی نے بھی غفلت کی تو اس

کا انجام بہت برا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے کاٹنا سے پوچھا

”یہ حویلی میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟“

”مالکن نے حکم دیا ہے کہ اس گھڑی کسی کا سایہ نہ پر جائے، شبھ سے.....“

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی خواب کی طرف چل دیا۔

اس کا اضطرب بڑھ رہا تھا۔ اس کی سوچوں نے اسے خود سے بے گانہ کر دیا تھا۔ جس طرح خود ٹھا کرنے اس شخص کو

دیکھا تھا، اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا تھا۔ ٹھا کر ہی نے اس شخص سے بات کی

تھی۔ اور وہ تیر کی صورت میں ایک حقیقت اس کے ہاتھ میں تھا کہ چلا گیا تھا۔ اس شخص کے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا تیر جواب

اس کی خواب میں سج چکا تھا۔ اس نے اپنی فتح اور شکست کی بات نہیں کی تھی۔ ٹھا کر کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا

ہے۔ آج یقین ہو گیا۔ تذبذب بھرے لوگوں نے جو دیکھا، وہ چھپا نہیں رہ سکا، حقیقت عیاں تھی۔ دھیرے دھیرے یہ

بات پھیلنے لگی کہ وہ شخص کوئی اوتار تھا، بھگوان کا کوئی روپ تھا۔ انوہوں نے اسے نجانے کیا سے کیا بنا دیا۔ جس معنی میں بھی

اگر کیا گیا، اسے ماورائے مخلوق ہی گردانا گیا۔ ٹھا کرنے ایک دن پنڈت چرن جی محل سے پوچھا تھا

”پنڈت جی یہ بتاؤ، کیا ایسی کوئی مخلوق ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں ٹھا کر جی، آتما کے کئی روپ ہوتے ہیں، اوش جو چاہے سو کر سکتی ہے، میرے انوسار وہ کوئی بھٹی ہوئی آتما

تھی جو آپ کے ارادے نوٹ کرنے آتی تھی۔ اس کا اپنا بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ ٹھا کرنے پوچھا تو پنڈت آتما، بھینٹ، پوجا اور بھگوان سے باہر نہیں آسکا۔ وہ تو بس یہ جان گیا تھا کہ جل

دن اس نے اس مسلمان خاندان سے معافی مانگی تھی، اس سے اگلے ہی دن اس کے حویلی میں سبزہ آ گیا تھا۔ جیوتیکا کی گود

ہری ہو گئی تھی۔ تبھی اس کے ذہن میں تھا کہ میرا غرور کدھر گیا؟ جس دن اس نے خود کو بے بس مخلوق مانا، اس پر سبزہ آگیا۔ اب اسے یقین آ گیا تھا۔ اس کی اپنی موت ہی اسے زندگی بخش رہی ہے۔ لاشعوری طور پر اس کی نگاہ دیوار پر لٹکے تیرپے پڑی۔ اس کی سوچ کا دھارا یہی بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ اس شخص پر یقین کر چکا تھا۔ موت میں نہیں زندگی میں زندگی پڑی ہوئی ہے۔ یہ زندگی کیا ہے؟ وہی سمجھتا ہے جو زندہ ہے۔

ٹھا کر انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کا دروازہ یوں بجایسے کوئی دیوانہ دستک دے رہا ہو۔ وہ باہر گیا تو رکنی اپنی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی

”بدھائی ہو مالک، بھگوان نے آپ کو پتر دیا ہے۔“

”بھگوان نے نہیں.....“ بے ساختہ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور جب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی سونے کے سکے اس کے ہاتھ میں آئے اسے دے دیئے اور جیوتیکا کی خواب گاہ کی جانب چل دیا۔

جیوتیکا کے چہرے پر خوشیوں کے گلاب کھلے ہوئے تھے۔ مانتا کا روپ ہی تقدس بھرا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیر پہلے موت و حیات والی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اب سکون سے آنکھیں موندے پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں نوزیدیا بچہ پڑا تھا۔ دائی جنڈاں نے اسے اٹھایا اور ٹھا کر کی گود میں دے دیا۔ اس کا لپٹا پاتے ہی ٹھا کر جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ نجانے کہاں سے فخر اس میں آ گیا تھا، ایک باپ بن جانے کا فخر جو غرور سے کہیں لذت آمیز تھا، اسے بھی احساس ہوا کہ وہ بھی اپنی نسل دے پایا ہے۔ ایک زندگی سے نئی زندگی۔ اس کا اپنا کوئی گمشدہ حصہ، گلابی رنگت، کھڑے نین نقش، گول منول سا ایک عام سا بچہ، اس نے انہیں مقام دے دیا تھا۔ وہ یقین اس کے ہاتھوں میں تھا، جو اس شخص نے اسے دیا تھا۔

سورج نکلنے سے پہلے تک رام گڑھ کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹھا کر دیال رائے کا وارث پیدا ہو چکا ہے۔ رام گڑھ پر ابھی اندھیرا اچھایا ہوا تھا، مگر حویلی پوری طرح روشن تھی۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ جس میں مندر کی بجنے والی گھنٹیاں زوردار آواز میں گھل گئی تھیں۔ بلاشبہ پنڈت چرن جی لعل کو معلوم ہو گیا تھا کہ حویلی کا وارث آ گیا ہے۔ جس طرح یہ اطلاع رام گڑھ میں پھیلی ہر بندہ اپنی وفاداری جتانے حویلی کی جانب لپکا۔ ہر چہرے پر خوشی تھی۔ ٹھا کر کے مردان خانے میں بدھائی دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ حلوائیوں نے بھی وہیں آ کر ڈیرہ جمالیا۔ اندھرا چھٹنے لگا اور سورج طلوع ہونے کی بستی روشنی مشرقی افق پر پھیل گئی۔

”ٹھا کر جی۔! میلے پر جانے کا فیصلہ کیا ہے؟“ رام گڑھ کے باسی نے ٹھا کر سے سوال کیا تو وہاں موجود ہر بندے کی نگاہ ٹھا کر پر جم کر رہ گئی۔ تب اس نے بڑے تحمل سے جواب کہا

”ایسے موقع پر جبکہ میری نسل کا وارث اس دنیا میں آیا ہے۔ کیا مجھے اپنی خوشیاں چھوڑ کر میلے پر چلے جانا چاہیے؟“

”نہیں ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔“ کئی لوگوں نے ہم نوا ہو کر کہا تو وہ بولا

”تو پھر سنو۔! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے، مجھے پر یہ دینا ایسے وقت میں ہوئی جب میں میلے سے آ رہا تھا، اور ابھی میلے ہی کا سہ ہے۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لئے اب میں بھی میلے پر نہیں جاؤں گا۔ اور نہ کسی مقابلے میں حصہ لوں گا۔ رام گڑھ کی پڑ جائے طور پر جانا چاہئے، مقابلوں میں حصہ لینا چاہئے تو میں نہیں روکوں گا۔ یہ ان کا حق ہے۔“

”ٹھا کر جی یہ کیسا فیصلہ ہے۔ یہ مقابلے ہمارے لئے کسی دیدہ سے کم نہیں ہیں۔ اس طرح تو رام گڑھ والوں کی ناک کٹ کر رہ جائے گی۔“ ایک جذباتی نوجوان نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو اس نے تحمل سے جواب دیا۔

”جیسے یہ احساس ہے وہ چلا جائے۔ رہا ناک کٹنے کا مسئلہ، تو ایسی کوئی بات نہیں ہے، بہت ہو چکا۔ اب دوسروں کو موقع ملنا چاہئے۔“ ٹھا کر کو یہ لفظ کہتے ہوئے خود ان کے کھوکھلے پن کا احساس ہو گیا تھا۔

”پھر بھی ٹھا کر جی، آپ رام گڑھ کے لوگوں سے خود کو جدا نہیں رکھ سکتے ہیں۔“ ایک بزرگ بندے نے کہا تو وہ بولا

”میں کب ان سے الگ ہوں۔ میں نے خود کبھی نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے، پڑ جا کو تو نہیں روکا۔ میں شہر زوروں کی سرپرستی اسی طرح کرتا رہوں گا۔ میں آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں۔ اب بھی تم لوگ جو فیصلہ کرو میں اس کے مطابق ہی کروں گا۔“ اس نے تیزی سے کہا تو ایک بزرگ نے کہا

”نہیں، یہ ایسا وقت نہیں ہے۔ آپ نہ جاؤ، لیکن وہاں پر مقابلے کے لئے لوگ ضرور بھیجیں، آپ آخری دن آ جانا۔ یہ ہماری انا کا مسئلہ ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، جیسا آپ لوگ چاہوں۔“ ٹھا کر نے کہا اور پھر اس موضوع سے توجہ ہٹاتے ہوئے بولا، ”رام گڑھ اور ارد گرد کی بستیوں میں یہ اعلان کروادو کہ ہر کوئی تینوں وقت کا تین دن تک بھوجن حویلی میں کرے۔ ہر خاص و عام، ہر مذہب اور ہر ذات کا فرد اس دعوت میں آ سکتا ہے۔“

یوں سورج نکلنے کے ساتھ ہی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ میلے پر نہ جانے اور حویلی میں ہونے والی دعوت کے بارے میں اطلاع ہر جانب پھیل گئی۔

دو پہر ہونے والی تھی۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ اتنی بڑی دعوت کے لئے بہت سارے لوگ موجود تھے۔ دالان سے لیکر باہر باغیچوں تک قالین بچھا دیئے گئے تھے۔ لوگ آ کر ان پہ بیٹھتے جا رہے تھے۔ مگر! سب ایک جگہ نہیں بیٹھ رہے تھے۔ ہندو اپنی ذات پات کے انوسار مختلف ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ اور بانی مذاہب کے لوگ اپنے اپنے لوگوں میں۔ ایک ہی نگاہ میں دیکھا جاسکتا تھا کہ لوگ مذاہب کی بنیاد پر تقسیم ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

حویلی کے بڑے دالان میں علاقے بھر سے آئے ہوئے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی دو دو جہات تھیں۔ ایک تو وہ سب ٹھا کر رام دیال رائے کو بدھائی یا مبارک باد دے آئے تھے۔ دوسرا وہاں پر اس علاقے کا مہاپنڈت بھگوان داس آیا ہوا تھا۔ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ان سب کے دماغ میں یہی تھا کہ یہ کام پنپا کر ہی میلے میں جایا جائے۔ اسی لئے وہاں پر سب موجود تھے۔ مہاپنڈت بھگوان داس پوری محویت سے پوجا میں مصروف تھا۔ بھگوان داس کے ساتھ کئی چیلے تھے۔ پنڈت چرن جی لعل بھی اس کا چیلہ تھا۔ وہ سب اس کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی نے پیلے رنگ کی دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ اوپری ننگے بدن پر جینو اور پیلے چادر اوڑھی ہوئی تھی، جس پر سنسکرت میں لفظ کڑھے ہوئے تھے۔ بھگوان داس کی طرح سب کا سر منڈھا ہوا تھا اور چہرے پر کوئی بال نہیں تھا۔ بھگوان داس ادھیر عمر ہونے کے باوجود مضبوط جسم کا مالک تھا۔

اس کے سامنے آگ روشن تھی۔ جس کے آس پاس پھل، میوے اور دوسری کھانے پینے کی اشیاء دھری ہوئیں تھیں۔ وہ زور زور سے اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے آگ میں کچی ڈالتا جا رہا تھا۔ وہ نومولود کے لئے پوجا کر رہے تھے۔ معززین کی نگاہیں ان پنڈتوں پر تھی جو پراتھنا کا سانداز اپنائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پوجا ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ جس کے ساتھ ہی دعوت عام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابھی پوجا کا ایک حصہ رہتا تھا۔ جس کے مطابق مہاپنڈت نے نومولود کی جنم کنڈلی بنانے اور اس کے مطابق اس کا شہ نام بھی رکھنا تھا۔

ہندو معاشرہ کوئی باقاعدہ مذہب یا مربوط نظام نہیں ہے، جس میں انسانیت کی فلاح ہی مقدم ہو۔ بلکہ اس کی ایک تاریخ ہے کہ آریاں نے مقامی مفتوح لوگوں اور اپنی قوم کو جکڑ کر رکھنے کے لئے رسومات کا سہارا لے کر ایک ایسا معاشرہ تخلیق کیا جس میں انسان کی انسان پر حکومت سے جبر کا نظام وجود میں آ گیا۔ جس کے تلے آج تک انسانیت سک رہی ہے۔ آج کا ہندو معاشرہ اس کی گواہی خود پیش کرتا ہے، جو انسانی جبر کے بدترین دور سے گذر رہا ہے۔

ایسا اس لئے ہے کہ یہ کوئی الہامی مذہب نہیں بلکہ رسومات، توہمات اور چند ایسے نظریات کی بنیاد رکھتا ہے، جو دیدہ بتاتے

ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ وید الہامی ہیں یا نہیں، یہ طے ہے کہ ان ویدوں کا ظہور اُن آریا لوگوں نے کیا جو یہاں کے مقامی باشندے نہیں تھے اور انہوں نے مقامی باشندوں کو غلام بن کر جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل کیا تھا، رسومات، توہمات اور چند نظریات کی بنیاد میں حالات و واقعات اور ماحول پر دسترس کی شدید ضرورت کے تحت، ہندو معاشرہ میں ان گنت افکار نے جنم لینا شروع کر دیا۔ جن میں ”شکتی کی پوجا اور خوف کا نفوذ“ شامل تھا۔ اس نظام نے انسان کو یوں جکڑ لیا جیسے آکٹوپس، جس نے وقت کے دریا میں زندگی کو جکڑ لیا۔ رسومات کی کوئی انتہا نہ رہی اور بڑھتے ہوئے توہمات نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ نظریات نے مختلف افکار کا چوغہ پہن کر مذہبی رنگ اپنایا تو یہ سلسلہ دراز ہونے لگا۔ ہندو معاشرہ، خصوصاً برہمن نے، یا دوسرے لفظوں میں ہندو مذہبی اجارہ داروں نے دھرم کے نام پر مختلف طبقوں کو، مختلف طریقوں سے اپنا غلام بنالیا۔ ذات پات کی حد بندی نے اسی حیثیت کو مقام بنایا کہ زندگی اسی کے تابع ہو گئی۔ منو شاستر نے جو قوانین بنائے اسے مذہبی حیثیت مل گئی۔ انسان کی انسان پر حکومت کو مذہبی درجہ مل گیا۔

انسان کا اس دنیا میں آنے اور اس دنیا سے چلے جانے تک میں اگرچہ ہر مذہب اور ہر نظام فکر میں انسانی بہبود کے لئے طریقہ کار موجود ہیں۔ ان طریقہ ہائے کار میں تبدیلی، رسومات کا مختلف انداز اور فکر کی بنیاد جہاں ایک معاشرے کو دوسرے سے الگ کرتا ہے، وہاں ان رسومات، فکر اور طریقہ کار کی اہمیت اپنے اپنے معاشرے میں اہمیت بھی رکھتی ہے۔ ہندو معاشرہ ہے ہی رسومات کا مجموعہ۔ اسی معاشرے میں پیدائش سے لیکر راکھ ہو جانے تک کی اتنی رسمیں ہیں، جن کا انت نہیں۔ مختلف علاقوں میں نہ صرف ان کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ ان کی اہمیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس دھرم کی بنیاد خوف پر رکھی گئی ہے، اس لئے یہ اپنے مستقبل کے بارے میں بہت فکر مند ہوتے ہیں۔ یہی فکر مندی نے چند ایسی رسومات یا فنون میں ترقی کی، جو انہیں کسی نہ کسی طرح اس خوف سے نجات دے۔ ان میں ایک فن مستقبل میں جھانکنے کا بھی ہے، جسے وہ جوش کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بچے کی پیدائش پر، جوش کے ذریعے اس کے مستقبل میں جھانکا جاتا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ اس بچے کے بھائیہ یا قسمت میں کیا ہے۔ وہ درست ہے یا غلط، یہ ایک الگ بحث ہے، تاہم، یہ رسم ہے کہ اس کی جنم کنڈلی بنائی جاتی ہے اور جو پنڈت نے کہہ دیا اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

جنم کنڈلی میں جوش یا علم نجوم سے سہارا لیا جاتا ہے۔ علم نجوم اور فلکیات دو الگ الگ دائروں میں ہونے کے باوجود ستاروں کے بارے ہی میں جانے کو کہا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں جوش کے علم کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے، جو آج کے جدید دور میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کی آمد سے ہزاروں سال پہلے بابل کی تہذیب میں بھی یہ علم اپنی اہمیت رکھتا تھا۔ ہندوستان میں یہ علم وہاں کی تہذیب کے تسلسل میں آیا پھر اس علم کی پیدائش یہاں ہندوستان میں ہوئی۔ اس بحث سے بھی صرف نظر کرتے ہوئے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ علم ان مذہبی لوگوں کے ساتھ منسلک رہا جو عبادت گاہوں میں تھے اور اس کا انتظام کرتے تھے۔ مطلب پر دہت یا پنڈت، وہی اس علم کے وارث قرار پائے انہوں نے اس علم سے بے شمار آمدنی حاصل کی، اور یہی لوگ دوسروں کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ یوں یہ لوگ معتبر ٹھہرے۔ ان کا مقام و مرتبہ بلند ہوا۔

اب مانتھا لو جی چاہے یونانی ہو یا ہندوستانی، ان مذہبی لوگوں نے ان کی قسمت ان ستاروں کے ساتھ جوڑ دی، جو اس منزل، منطق البروج یا Zodiac belt کہلاتے ہیں۔ اور انسان ان مذہبی لوگوں کے ہاتھوں پر غلام بن کر اپنی قسمت کا حال چاہتا رہا۔ حالانکہ یہ بے بس ستارے اس سورج کے گرد گردش کرتے ہیں جو خود کشش کا محتاج ہے، خود کسی کشش میں تیر رہا ہے اور یہاں تک کہ اپنا نام رکھنے پر بھی قادر نہیں۔ سورج کو سورج کا نام کس نے دیا، انسان نے، جب تک وہ اپنی اس صلاحیت پر غور نہیں کرے گا کہ رب تعالیٰ نے یہ صلاحیت انسان کو دی ہے کہ وہ ان کے نام رکھنے سے لیکر اس کی

چالوں تک کو جان لے، وہ انسان پر انسان کی حکومت کے لئے ان مذہبی لوگوں کا محتاج رہے گا۔ بھوجن کے بعد پنڈت بھگوان داس نو مولود کی جنم کنڈلی بنانے میں پوری طرح مچو تھا۔ پیدائش کی ایک ایک ساعت اس کے سامنے تھی۔ ٹھا کر دیال رائے بھی موجود تھا۔ سبھی چیلے اور وہ معززین جو ابھی گئے نہیں تھے، وہ سب وہیں موجود تھے۔ ایک دم سے پنڈت بھگوان داس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں قہر اور چہرے پر خوف طاری تھا۔ سبھی چونک گئے۔ ہر کسی کا یہی احساس تھا کہ کوئی انہونی ضرور ہے۔ کچھ دیر بعد مہا پنڈت نے اپنا سر اٹھایا اور بولا

”اس بالک پر سایہ ہے، گھمبیر سایہ۔ جس نے اس کا بھائیہ چھپا لیا ہے، سایہ..... جس سے یہ کبھی نہیں نکل پائے گا۔“

”مہاراج۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ ٹھا کر نے پوچھا

”ترنت ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو یہ لگتا ہے یہ تیرا سب کچھ چھین لے گا۔ ایسا بھائیہ میں نے آج تک نہیں دیکھا، نوٹ کر دے گا یہ سب کچھ..... اتم آتما۔“ یہ کہتے ہوئے مہا پنڈت کی آنکھیں پھیل گئیں، جیسے وہ کوئی خوف ناک منظر دیکھ رہا ہو۔ مہا پنڈت کے یوں کہنے پر وہاں سراپسی کی پھیل گئی۔ ٹھا کر دیال رائے بھی چونک گیا۔ اس نے پوچھا

”میں سمجھا نہیں مہاراج، یہ.....“

مہا پنڈت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”نہ..... نہ بالک، ایسا بالک.....“ مہا پنڈت نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چیلے بھی اٹھ گئے۔ تو پنڈت چرن جی لعل نے تیزی سے کہا

”مہاراج، جنم کنڈلی تو بنائیے، بالک کا شہ نام بھی تو رکھیے؟“

”ہم دوبارہ آئیں گے، تجھی سب ہو گا۔ اس وقت نہیں۔“ مہا پنڈت نے تیزی سے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ اس کے چیلے بھی ساتھ میں چل پڑے۔ علاقے کے وہ معززین خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی چپ چاپ وہاں سے جانے لگے۔ ٹھا کر دیال رائے گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رام گڑھ میں دودن دعوت چلی، ہر کسی نے وہیں سے کھایا۔ ایک طرح سے جشن کا سماں رہا۔ دور و نزدیک سے مانگنے والے بھکاریوں نے بھی خوب پیٹ بھرا۔ راہ چلتے مسافروں کو بھی دعوت دی گئی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن کی سہ پہر دسترخوان لپیٹ دیا گیا۔ حویلی میں سکون سا در آیا۔ ٹھا کر دیال رائے جیویر کا کے پاس سے ہو کر اپنی خواب گاہ میں تھا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے بیٹے کے ساتھ رہا تھا۔ جس نے حویلی ہی کو خوشیاں نہیں دیں، اسے بھی فخر سے نوازا دیا تھا۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر ٹنگے ہوئے تیر پتھی۔ اس کے ذہن میں مہا پنڈت کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس شخص کی کبھی ہوئی بات بھی یاد آرہی تھیں جو اس نے تیر دینے سے پہلے کہیں تھیں۔ دونوں کی باتیں باہم متھم گھتا ہو رہی تھیں۔ وہ بہت الجھا ہوا تھا ہی، لیکن ایک نکتے پر وہ کامل یقین رکھتا تھا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی حالات میں پیدا ہوا ہے۔ جبکہ وہ ناامید ہو چکا تھا۔ اس نے سارا غرور اور تکبر مٹی کر دیا تھا۔ آئندہ بھی انہونی ہو سکتی تھی۔ ٹھا کر نے ہمیشہ اپنی پیٹھ خالی محسوس کی تھی۔ نوکروں، چاکروں، محافظوں اور شہہ زوروں کی فوج ہونے کے باوجود اسے اپنی تنہائی کا احساس ستا تا رہتا تھا۔ اب محض تین دن کا بیٹا ہونے کے باعث اسے لگا جیسے اس کی پشت پر کوئی ہے۔ حالات کے پانی میں نمک کی مانند گھلتا ہوا حوصلہ اب ایسی چٹان بن گیا تھا جو طوفانوں میں بھی ایسا نہ رہنے کی سکت رکھتا ہو۔ زندگی کے پھیکے رنگ، الجھی ہوئی بے لگام سوچیں اور بے مقصد شب و روز بالکل ہی بدل گئے تھے۔ اب اسے زندگی بامقصد دکھائی دینے لگی تھی۔ اب اس کے سامنے اپنے پتر کی زندگی تھی۔ جسے اس نے خود بنانا تھا۔ ایسی اعلیٰ تعلیم و تربیت کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب

انسان کی زندگی سوچ کے ساتھ ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی تو سوچ ہی بدل گئی تھی۔ ابھی کل ہی کی بات تھی۔ وہ صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ رام گڑھ میں زندگی دھیرے دھیرے جاگ رہی تھی۔ مشرقی افق نیلگوں ہو رہا تھا، جس میں صبح کا ستارہ اپنا آپ منوانے کی کوشش میں ٹٹم رہا تھا۔ مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کا ارتعاش پھیل رہا تھا۔ لوگ اپنے ڈھور ڈنگر باندھ رہے تھے۔ گلیوں میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ حویلی کا ہر کیکس جاگ کر اپنے کام دھندوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایسے میں ٹھا کر اپنی خواب گاہ کی کھڑکی میں آکھڑا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ اس کا دروازہ کا معمول تھا لیکن یہ سب اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ صبح کے نظارے میں زندگی کا احساس بہت خوشگوار تھا۔ اسے یہ صبح نئی لگی تھی۔ اس کی سوچ پھیلی گئی۔

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے، وہ بھی انسانوں جیسا گوشت پوست کا ہوتا ہے۔ اس کے لہو کا رنگ بھی ایک جیسا ہوتا ہے اور سارے اعضاء بھی۔ یہاں تک کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ہر انسان ایک جیسا ذہن لے کر آتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد ہی وہ سماجی مراتب، انداز فکر، مذہب، قوم، رنگ اور نسل میں تقسیم ہوتا ہے۔ فطرت اسے ایک جیسا بناتی ہے۔ اور یہ انسان کی اپنی تقسیم ہے کہ وہ خود ہی دائرے بناتا کر دائرہ در دائرہ تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ مان لیا جائے کہ دنیا کی یہ رنگینی مختلف افکار کی مرہون منت ہے۔ تو افکار کی اہمیت سے پہلے انسان کو الوہیت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے ہونے ہی سے یہ سارے رنگ ہیں۔ یہ سارے افکار انسان ہی دے رہا ہے، ہاں یہ بحث الگ ہے کہ یہ افکار کہاں سے آتے ہیں اور کس لئے آتے ہیں؟

بیٹے کے پیدا ہونے سے پہلے اس نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ جس سے اس کی اپنی ذات اور اس کے ارد گرد پھیلی کائنات کا حوالہ ہو۔ اس سے پہلے اس کی زندگی چند معمولات کے گرد گھومتی تھی۔ جائیداد، طاقت کا اظہار، اور خواہشوں کی تکمیل، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ سورج کو سور یا دیوتا مان کر روزانہ اس کی پوجا کرتا تھا۔ لیکن کبھی اس کی مانیت، حیثیت اور افادیت پر نہیں سوچا تھا۔ وہ بزرگ ملی کو مانتا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ شکتی کا دیوتا کیوں اور کیسے ہے؟ اس کا دھرم یہی تھا کہ جو پنڈت نے بتا دیا، کبھی اس پر سوچتا بھی تو الجھ کر رہ جاتا۔

وہ انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ بھانودتیزی سے اندر آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

”بھانود، خیریت تو ہے، کیا ہوا ہے تمہیں؟“ ٹھا کر دیال رائے نے حیرت سے پوچھا

”غضب ہو گیا مالک! آپ چلیں میرے ساتھ باہر اور پنڈت چرن جی لعل کی بات سنیں۔“

”ایسی کیا بات بھانود؟“

”مالک وقت نہیں ہے۔ چلیں۔“ بھانود نے ٹھا کر دیال رائے کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی تو وہ اس کے ساتھ باہر کی جانب چل دیا۔ دلاں کے پاس پنڈت چرن جی لعل خوف زدہ انداز میں ہاتھ باندھ کھڑا تھا۔ ٹھا کر دیال رائے نے اس کی طرف دیکھا تو وہ چلاتے ہوئے بولا

”ٹھا کر جی۔! ابھی کچھ سے بعد سینا آپ پر چڑھائی کرنے کو ہے، آپ کوئی بھی اُپائے کر لو۔“

”پنڈت جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں، مجھے صاف بات بتائیں کیا ہوا۔“ ٹھا کر دیال رائے نے سکون سے کہا تو وہ تیزی سے بولا

”مجھے مہا پنڈت نے آج میلے میں بلایا تھا۔ وہیں سارے علاقے کے وہی چند معزز تھے جو آپ کے خلاف ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میلہ ختم ہونے کو فوراً بعد رام گڑھ پر چڑھائی کر دی جائے۔“

”مگر کیوں پنڈت جی؟“ ٹھا کر دیال رائے نے پوچھا تو وہ بولا

”اس کی وجہ مہا پنڈت بھگوان داس جی مہاراج ہیں۔ ان کا کہنا کہ آپ کے گھر میں جو پتر پیدا ہوا ہے، وہ دیوی دیوتاؤں کی اچھیا نہیں ہے، بلکہ وہ ایسا پورش ہے جو ان دیوی دیوتاؤں کا ایمان کرے گا۔ وہ ایک مہا آتما کے جیسا ہے جو ہندو دھرم کے خلاف ہوگا، اسے یہیں ختم کرنا ہوگا۔“

”مطلب انہیں مجھ سے نہیں میرے بیٹے سے خوف ہے؟“ ٹھا کر دیال رائے نے پوچھا

”یہی بات ہے ٹھا کر جی، اسی لئے انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ کے بیٹے کی بھینٹ مانگ رہے ہیں یا پھر وہ خود اسے مار دیں گے۔ میلے کے بعد وہ ایک سینا لے کر آ رہے ہیں۔“ پنڈت نے کہا تو ٹھا کر نے سوچتے ہوئے کہا

”بھانود، کوئی اور ہوتا تو میں اس کی بات کو اہمیت نہ دیتا۔ مگر یہ پیغام پنڈت جی لے کر آئے ہیں۔ سب کو بلاؤ، ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔“

”جیسے حکم مالک۔“ بھانود نے کہا اور فوراً ہی پلٹ گیا۔ جس انہونی کا ٹھا کر دیال رائے لاشعوری طور پر انتظار کر رہا تھا اس کا سہ آگیا، لیکن یہ سہ، اتنی جلدی آگیا؟ یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

حویلی کے مردان خانے میں رام گڑھ کے کبھی بڑے جمع تھے۔ ان کے سامنے ساری صورت حال رکھ دی گئی تھی۔ وہ لوگ لڑنے مرنے کو تیار تھے۔

”ٹھا کر جی، یہ سب لوگ بہانہ بنا رہے ہیں، انہیں آپ کی شان و شوکت نہیں بھائی، وہ کب سے رام گڑھ کو ختم کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔“ یہی ان کی رائے تھی جس کی ترجمانی ایک بوڑھے نے کی تھی۔ اس پر ٹھا کر دیال رائے نے ان سب کی طرف دیکھ کر کہا

”میرے ایک بیٹے کے لئے نجانے کتنے مارے جائیں گے۔ کیوں نام میں ایسا کروں، یہ سب چھوڑ کر یہاں سے چلا جاؤں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ٹھا کر جی، کیا آپ کی رگوں میں راجپوتی خون پانی بن گیا ہے۔ وہ آپ کو لٹکا رہے ہیں اور آپ خوف زدہ ہیں؟“ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا تو ٹھا کر دیال رائے کے خون نے جوش مارا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ فیصلہ ہو گیا کہ ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔ شہہ زوروں اور محافظوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا تھا۔ رام گڑھ کے لوگ تیار تھے۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ ٹھا کر اپنی بیوی جیوتیکا کے پاس تھا، جو خوف زدہ ہونے کے ساتھ بے حال ہو رہی تھی کہ اس کے بیٹے کے دشمن حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہ روتے ہوئے بولی

”نا تھ۔! ایک طرف آپ کا بیٹا ہے اور دوسری طرف آپ کی راجپوتی انا، اگر وہ کامیاب ہو گئے تو دونوں نہیں بچ پائیں گے، لیکن اگر ہم اپنے بیٹے کو بچالیں تو انا کا کیا ہے۔“

”تو کیا کروں میں؟“ ٹھا کر دیال رائے نے پوچھا تو تیزی سے بولی

”ہم کسی کو بتائے بنا یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ خون بھی نہیں بہے گا۔ ہم یہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔“

”میں اپنے لوگوں کو کیا جواب دوں گا؟“ ٹھا کر دیال رائے بولا، وہ میرے خون پر شک کریں گے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا کہ ٹھا کر دیال رائے کے خاندان پر کوئی دھبہ لگے۔ ہم راجپوت اپنی انا کے لئے اپنے بیٹے قربان کر دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور جیوتیکا کی خواب گاہ سے نکل گیا۔

ٹھا کر دیال رائے اپنے شہہ زوروں اور محافظوں کے ساتھ اس انتظار میں تھا کہ کب حملہ آور آتے ہیں۔ انہیں اطلاع

مل رہی تھیں کہ میلے کے بعد وہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ مہا پنڈت موجود ہے جو اس لڑائی کو دھرم پودھ کا نام دے رہا ہے۔ جس سے لوگ مرنے مارنے پر تل گئے ہوئے ہیں۔ اسی دوران بھانوو وہیں آیا اور اس نے آہستہ سے ٹھا کر دیال رائے کو بتایا

”مالک۔ احویلی سے مالکن چلی گئی ہیں، وہ چھوٹے مالک کو بھی ساتھ لے گئیں ہیں۔“

”کس طرف گئی ہے؟“ ٹھا کر دیال رائے نے انتہائی پریشانی میں پوچھا تو بھانوو نے بتایا

”حویلی سے ہی پتہ چلا ہے کہ وہ جنگل کی طرف نکلی ہیں۔“

”چلو۔! انہیں واپس لائیں۔“ ٹھا کر دیال رائے نے لمحوں میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے نکلا، اس کا رخ جنگل کی طرف تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔

ایسے ہی ہوا، ٹھا کر دیال رائے کو زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ جیوہیکا اسے جلد ہی مل گئی۔ کبھی کھڑی تھی۔ لیکن وہ اس سے کچھ فاصلے پر اپنے بیٹے کے ساتھ اکیلی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے چند ایسے لوگ کھڑے تھے، جن کے حلیے ہندو پنڈتوں کی مانند تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چستی ہوئی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جیوہیکا کو گھیرا ہوا تھا۔ وہ خونخوار انداز میں اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ٹھا کر اور بھانوو اُن کے قریب پہنچے، وہ راہزن ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس نے جاتے ہی انہیں لکارتے ہوئے کہا

”کون ہو تم لوگ اور ٹھا کرانی کا راستہ کیوں روک کر کھڑے ہو۔“

تبھی ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا

”ہم نے ٹھا کرانی کا نہیں، اس بچے کو روکا ہے، ہم نے اس کو ٹھٹھ کرنا ہے، روک سکتے ہو تو روک لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بچہ چھین لینے کے لئے آگے بڑھا، ٹھا کر بجلی کی سی تیزی سے ان کے درمیان آگیا۔ وہ اور بھانوو ان کا مقابلہ کرنے لگے۔ چند لمحوں ہی میں ٹھا کر کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ زیادہ دیر ان کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ سامنے والے تلوار باز تو یوں تھے جیسے نہ انہیں زخم لگتا ہے اور نہ ہی وہ ٹھکتے ہیں۔ اس وقت تو ٹھا کر کو یقین ہو گیا، جب اس نے واضح طور پر ایک کی گردن پر وار کیا۔ یہ ایسا وار تھا جس سے گردن اُڑ کر زمین پر جا گرتی ہے، لیکن ٹھا کر نے محسوس کیا کہ اس کی تلوار کسی چٹان سے ٹکرائی ہے۔ ٹھا کر کو یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے کوئی ماورائی مخلوق ہے۔ ایسی لمحے ہی میں اسے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ ایک دم سے اس نے اپنے بھگوان سے مدد چاہی، اس کے لبوں سے بجز رنگ بلی نکلا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے خود اپنا نعرہ کھوکھلا لگا۔ ذہن کے کسی خانے میں یہ بے بسی موجود تھی کہ اس کا بھگوان کچھ نہیں کر پائے گا۔ وہ مٹی کی مورت اسے زندگی نہیں دے پائے گی۔ ایک دم سے اسے وہ شخص یاد آگیا، جس نے ایسی ہی کچھ لفظ کہے تھے۔ اس کی پوری توجہ ان کے ساتھ مقابلیے پر لگی ہوئی تھی۔ انہی لمحات میں اس نے پوری شدت سے اس شخص کو یاد کیا۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کی تلوار بازی کے جوہر اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئے۔ اس وقت وہ حیران رہ گیا جب انہی حملہ آوروں کی پشت پر وہ شخص نمودار ہوا۔ وہی سفید برف کے جیسے گیسو، توخمند بدن، باریش اور چمکتے ہوئے چہرے والا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار تھی۔ اس نے وہیں سے لکڑا۔ حملہ آوروں نے پلٹ کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ان کے درمیان مقابلہ شروع ہو گیا۔ ٹھا کر، بھانوو اور ٹھا کرانی انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس نواورد کی تلوار جسے لگتی وہ گرنا اور گرے ہی اسے آگ لگ جاتی۔ خون نکلنے کی بجائے دھواں اٹھتا۔ اور لمحوں میں وہ راکھ بن جاتا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سبھی راکھ بن چکے تھے۔

”یہ..... یہ کیا تھا مہاراج؟“ ٹھا کر نے اس نواورد سے پوچھا تو بولا

”یہ، بہر حال انسان نہیں تھے۔ تیرے پنڈت بھگوان داس کے جادو کا کرشمہ تھا۔“

”بھگوان داس؟ وہ میرے بچے کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟“ ٹھا کرانی نے بیٹے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے پوچھا تو شخص بولا

”جس طرح اس بچے نے اس دنیا میں آتے ہی تمہیں ماں کے اور ٹھا کر کو باپ کے مقام پر فائز کر دیا، اسی طرح شیطانی قوتوں نے بھی آنکھ کھول لی ہے۔ وہ اس بچے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ بچہ پروان چڑھے۔“

”کیوں مہاراج کیوں؟“ ٹھا کر نے چلاتے ہوئے پوچھا تو وہ محل سے بولا

”اس لئے کہ یہ کٹکٹش اس دنیا میں پوری طرح موجود ہے۔ یہ بچہ ایسی صلاحیتیں رکھتا ہے کہ شیطانی قوتیں اس کے مقابلے میں ہمیشہ ڈرتی رہیں گئیں اور یہ بچہ ان کا مقابلہ کرتا رہے گا۔“

”ایسا کیوں ہے؟“ ٹھا کر نے ضدی لہجے میں پوچھا تو وہ بولا

”تیرا تکبر، کسی انسان کو شوبھا نہیں دیتا کہ وہ تکبر کرے۔ یہ اسی کا حق ہے جس نے سب کو پیدا کیا۔ انسان کی صفات عاجزی ہے، اسکی بندگی بھی ہے، جب تک وہ عاجز ہے۔ بندگی عاجزی ہی سے ہوتی ہے۔ گوشت کے ایک ٹکڑے کے لئے کیوں اتنا تڑپ رہے ہو، کیوں خود پر قابو نہیں رکھ سکتے ہو؟ کہاں گیا تیرا تکبر؟“

”ہمارا امتحان مت لو مہاراج۔“ اس نے بے بسی سے کہا تو وہ بولا

”میں نہیں، کوئی اور یہ چاہتا ہے۔ کہا تھا نہ کہ یہ تیرا دھرم، بے جان مورتیوں کو پوجنے والا، یہ زندگی نہیں دے سکتا، اس میں تو موت پڑی ہے۔ میں نے تو تمہیں زندگی کی نوید دی تھی۔ موت کون دے رہا ہے؟ اب بولو، موت کے اندھیروں میں گم ہو جانا چاہتے ہو یا زندگی؟“

”میں اپنے مالک کی زندگی چاہتا ہوں۔“ ٹھا کر نے یوں کہا جیسے وہ اپنا سب کچھ بھول چکا ہو کہ اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔

”یہ تو طے ہے ٹھا کر، جب تک یہ بچہ تیرے پاس رہے گا، تب تک تیرے دھرم کی شیطانی قوتیں اسے ختم کرنے کے درپے رہیں گیں۔ ابھی دیکھ لو،“ اس شخص نے کہا

”میں کیا کروں مہاراج، مجھے بتاؤ؟“ ٹھا کر نے عاجزی سے کہا تو اس شخص نے تیزی سے پوچھا

”تم چاہتے کیا ہو؟ اپنا بچہ یا اپنی اتا؟“

”دونوں،“ ٹھا کر نے کہا

”مل نہیں سکتے۔ ایک کا فیصلہ کرنا ہوگا۔“

”اپنا بچہ۔“ ٹھا کر نے ایک دم سے کہہ دیا تو اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا

”ٹھا کر اپنی آنکھیں بند کرو اور ایک منظر دیکھو،“

ٹھا کر نے آنکھیں بند کر لیں، پھر چونک کر اس شخص کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا، تب اسی شخص نے کہا

”اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے، یہ منظر اس دنیا میں ہوگا تو پھر اس بچے کو ہمیں چھوڑ دو اور پلٹ جاؤ۔ اب یہ تم پر ہے کہ موت

کے بعد زندگی پاتے ہو یا زندگی میں موت کا انتخاب کرتے ہو۔“

”میں آپ پر یقین کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا، ”جیوہیکا! اپنے بچے کو ہمیں چھوڑ دو۔ اگر

اس کی زندگی چاہتی ہو تو۔“

جیوہیکا نے ایک نگاہ اپنے بیٹے کے چہرے پر ڈالی، تین دن کا بچہ اور ماں کی مامتا میں کٹکٹش عروج پر تھی۔ آنسو گالوں سے لڑھک کر بہہ رہے تھے۔ وہ بھی سمجھ چکی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے اپنا آنچل سیدھا کیا، اور زمین پر بچھا دیا۔ پھر اس

پرتین دن کا بیٹا رکھ دیا۔

”سنو! یہ بدن کی مٹی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بدن حلال کا ہو تو اس میں خیال بھی حلال ہی آتے ہیں اور حلال بدن جب مٹی ہوتا ہے تو یہ مٹی ایسے بیج اگاتی ہے، جس میں سے امن اور آشتی اگتی ہے۔ اور اس کی خوشبودر دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ حرام مٹی سے بنابدن کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا، اس کی مٹی ہمیشہ فساد کے کانٹے اگائے گی، اب تم سوچ لو،“

”میں پلٹ رہا ہوں مہاراج، یہ بچہ آپ نے دیا اور اسے آپ ہی کو سونپا۔“ یہ کہہ کر ٹھا کر دیال رائے نے اپنے گھوڑے کی لگا میں موڑیں تو سامنے کھڑے شخص نے کہا۔

”دیال رائے! تو ہندو ہے اور یہ بچہ ابھی کسی مذہب پر نہیں۔ میرے آقا ﷺ کے مطابق ابھی یہ فطرت سلیمہ پر ہے۔ ہم اسے جو چاہیں بنادیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

”تم گواہ رہنا، میں اپنے دھرم پر نہیں رہا۔ میرے دھرم کے لوگ اسی بچے کی وجہ سے یدھ پر قتل گئے ہیں۔ میں آپ پر چھوڑتا ہوں، آپ اسے جو چاہئے بنا دیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا دھرم کیا ہے، جو آپ کا دھرم ہے وہی بنادیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر جیسے چوکتے ہوئے بولا، ”بلکہ اپنے جیسا بنادیں۔“

”جاؤ، پھر تم سرخرو ہوئے۔“ اس شخص نے کہا تو جیو تیکا اپنے بچے کو دیکھتے ہوئے بکسی میں جا بیٹھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ رام گڑھ کی طرف چل دیئے۔ ٹھا کر کے چہرے پر ذرا سا بھی ملال نہیں تھا۔ جبکہ جیو تیکا خون کے آنسو رو رہی تھی۔ رام گڑھ پہنچتے ہی ٹھا کرنے دیکھا، ایک لشکر رام گڑھ کے سامنے تھا۔ اس کے اپنے لوگ بھی لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ اسے دیکھتے ہی سب میں جان پڑ گئی۔ حملہ آوروں کے نعروں میں پاگل پن گونج رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے ان پر حملہ کر سکتے تھے۔ سارے کا سارا رام گڑھ لڑنے کے لئے تیار تھا۔ اور پھر یہ پاگل پن بودھ کی صورت اختیار کر گیا۔ پنڈت بھگوان داس کے ساتھ علاقے کے وہ لوگ بھی تھے، جو ہمیشہ ہی ٹھا کر کے دشمن رہے تھے۔ ابھی تین دن پہلے ہی اس کی حویلی سے کھاپی کر گئے تھے۔ ایسے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو کسی کے در سے کھاتے بھی رہتے ہیں اور انہی کے دشمن بھی بن جاتے ہیں، یہی لوگ منافق ہوتے ہیں۔ دونوں طرف سے لوگ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ منافقت اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ شیطانیٹ ہنس رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

تین دن کا نومولود بچہ اس شخص کے ہاتھوں پر تھا۔ اس کے سامنے جھکیاں تھیں۔ کسی میں روشنی تھی اور کوئی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کسی میں سے ڈھولک بجنے کی آواز آرہی تھی کوئی گارہا تھا۔ دوسری جھکیوں کی طرح ایک جھکی کے باہر رچھ بندھا ہوا تھا۔ جس کے پاس ایک بندر یا اور بندر بھی تھے اور ان سے ذرا پرے ایک سفید کتا لیٹا ہوا تھا۔ جھکی کے اندر ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایسی ہی عمر کی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں صاف دیکھا جاسکتا تھا کہ ان کے چہروں پر زندگی کی تھکن موجود تھی۔ وہ جھکیاں ان لوگوں کی تھیں جو ذات کے قلندر تھے۔ ان کا پیشہ بھی تھا کہ گلیوں، بستیوں اور شہروں میں رچھ، بندر اور کتوں کو نچا کر ان کا تماشا دکھا کر روزی روٹی کماتے ہوئے بستی بستی، شہر شہر گھومتے رہتے۔ یہی ان کی زندگی تھی۔ وہ مرد اور خاتون بھی قلندر ذات تھے۔ ان کی اولاد نہیں تھی، جس کی وجہ سے وہ زندگی کو بھیل رہے تھے۔ وہ شخص اس بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے جھکی میں داخل ہوا تو ان دونوں نے اسے چونک کر دیکھا اور ان کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی۔ وہ بچے کو دیکھ رہے تھے۔ تبھی اس شخص نے کہا

”یہ لے، لالو، میں نے تجھے تیرا بیٹا لایا ہے۔“

”کس کا بچہ اٹھا لایا ہے تو۔“ اس نے غور سے بچہ دیکھتے ہوئے کہا

”تجھے اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔ پارسہ کیا لو اس بچے کو قبول کرتی ہے۔؟“

”ہاں، اب تو میں اس قابل نہیں رہی، یہی سبھی، میرا بیٹا تو ہوگا۔“ پارسہ بولی

”چل دے دے اسے، میں اس کی خوشی میں خوش ہوں۔“ لالو یوں بولا جیسے وہ بھی اندر سے خوش ہو۔ تبھی پارسہ نے جذباتی لہجے میں کہا

”جھوٹ کہہ رہا ہے تو، میں سمجھتی ہوں۔ لا دے میرا بچہ۔“

اس شخص نے وہ بچہ پارسہ کی گود میں دے دیا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگایا ہی تھا کہ ماما کے سوتے پھوٹ پڑے۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس نے لالو کی طرف دیکھا اور لرزتے ہوئے بولی

”لالو، یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ چاہے اس نے کسی دوسری عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ لالو نے حیرت سے کہا تو وہ شخص تیزی سے بولا

”یہ بعد میں بتاتی رہنا۔ پہلے اس کا نام سن لو، یہ خوشی محمد ہے۔ اس کے غٹنے ہو چکے ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جانا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ شخص جھکی سے نکلتا چلا گیا۔ لالو نے جب بچے کو دیکھا جو پارسہ کے سینے سے زندگی پارہا تھا تو ساری بات سمجھ گیا۔ وہ ساری رات ان کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ انہیں خوشی اور حیرت ہی اس قدر تھی۔ قبیلے کے سردار نے رات ہی کہہ دیا تھا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ اور پھر سورج نکلنے سے پہلے ہی قلندروں کی وہ ساری جھکیاں اکھڑنے لگیں۔ لالو بھی ان میں شامل تھا۔ گدھے، گھوڑے اور خچروں پر سامان لا کر وہ چل پڑے۔

جس وقت سورج کی روشنی پھیل رہی تھی، وہ رام گڑھ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہ اب زندگی نہیں رہی تھی۔ موت نے سب کچھ تباہ کر دیا تھا۔ انسانی خون کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جلی ہوئی لاشوں کے ساتھ ہر گھر جل چکا تھا۔ وہ حویلی جہاں انہوں نے تین دن تک کھانا کھایا تھا، وہ آج کھنڈر بن چکی تھی۔ نجانے کیوں پارسہ نے اس بچے کے چہرے پر دیکھ کر رام گڑھ کو دیکھا۔ موت بھی زندگی ہی سے دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ رام گڑھ سے آگے نکل گئے۔ ان کے پاس چمکتی ہوئی زندگی تھی۔

☆.....☆.....☆

منظر اچانک ہی بدل گیا۔ جمال اور جہاں ساکت تھے اور یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بھی اسی منظر کے کردار ہوں۔ وقت تیزی سے لوہرس آگے گزر گیا تھا۔ وہ منظر ایک گاؤں کا تھا۔ وہ پوری توجہ سے اس نئے منظر کو دیکھنے لگے۔

☆.....☆.....☆

وہ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ گرمی اور جس نے ہر ذی روح کو سایے تلے پہنچا دیا تھا۔ ایسے وقت میں لالو قلندر جھکے ہوئے ٹالوں اور بوجھل قدموں سے کھیتوں میں بنے راستے پر چنا جا رہا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئیں تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بوڑھے قلندر کا بہت برا حال تھا۔ اس کے بوسیدہ کپڑے پٹے ہوئے تھے۔ سر کے لمبے بال بکھرے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ ہونٹوں پر چڑی جی ہوئی تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ بہت لاغر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ بندر اور کتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا لڑکا بھی چلتا چلا آ رہا تھا۔ جو چہرے سے بہت بھولا اور معصوم دکھائی دے رہا تھا لیکن بھوک اور غربت کی اپنی ایک چھاپ ہوئی ہے جو اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اوپر نہیں دیکھا جو جا بجا پھٹی ہوئی تھی۔ نیچے اس نے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔

پیروں سے بھی ننگا تھا۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ لالو قلندر نے دور ہی سے کنواں دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر روٹی نہ بھی ملی تو کم از کم یہ چھلسا دینے والی دوپہر تو وہیں گزر جائے گی۔ پینے کو پانی مل جائے گا۔

وہ کنواں سردار ہیرا سنگھ ڈھلوں کا تھا۔ جس کا شمار گاؤں کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں فقط اپنی محنت مزدوری سے غرض ہوا کرتی تھی۔ ضلع جالندھر کی تحصیل کدور کے قریب گاؤں اڈوگی بھی ان گاؤں میں شمار ہوتا تھا، جہاں فصلیں شاداب اور کسان خوشحال تھا۔ دودر یاؤں کے پاٹ میں آباد یہ علاقہ ویسے بھی زرخیز تھا۔ سردار ہیرا سنگھ ڈھلوں نے یہاں اس گاؤں میں آکر جو تھوڑی سی زمین بنائی تھی، وہ اسی میں ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اپنی محنت کرتا اور خوشحال تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا کلندر سنگھ تھا۔ جس کی ابھی میس نہیں بھگی تھیں۔

سردار ہیرا سنگھ اپنے کنویں کے پاس درختوں تلے چار پانی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے بیلوں کی جوڑی کو باندھا تھا۔ اور اب خود آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ اسے دور کھیتوں کے پاس سے ایک قلندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ قلندر وہیں آ گیا۔ اور اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ بچہ بھی اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا تو جانور بھی بہتے ہوئے پانی میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے گدڑی زمین پر رکھ دی تھی۔ اسے سانس چڑھا ہوا تھا جو بحال ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے سانس بحال کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس کی کمزور حالت دیکھ کر سردار ہیرا سنگھ ڈھلوں کو بہت ترس آیا۔ اس نے نرم سے لہجے میں پوچھا

”اوبا، خیر تو ہے، ٹھیک تو ہے نا تو؟“

”نہیں سردار، میں ٹھیک نہیں ہوں۔ بس کسی وقت یہ سانس ختم ہو جاسکتی ہیں۔ بہت مشکل میں ہوں۔“ قلندر نے اکھڑی ہوئی سانسوں میں بتایا

”کیا مشکل ہے تجھے؟“ ہیرا سنگھ نے پوچھا

”مشکل ہی مشکل ہے، میرا بدن میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے، نجانے کب کہاں میری زندگی ختم ہو جائے، بس یہ میرا بچہ ہے، سوچتا ہوں اس کا کیا بنے گا۔“ قلندر نے تیز سانسوں میں کہا

”کیا تیرا کوئی نہیں ہے؟ تیرا قبیلہ، کوئی رشتے دار، کوئی بھی نہیں ہے؟“ ہیرا سنگھ نے حیرت سے پوچھا

”قبیلہ بھی تھا، ایک بیوی بھی تھی، جواب اس دنیا میں نہیں رہی۔ قبیلہ بھی بچھڑ گیا۔ بس اکیلا ہوں۔“ قلندر نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ وہ اب سردار کو کیا بتاتا کہ اس کے اپنے قبیلے والوں نے اسے الگ کر دیا تھا۔ انہوں نے اس بچے کو قبول ہی نہیں کیا تھا۔ بچہ ہی ایسی صلاحیتوں والا تھا کہ بجائے اسے کچھ کھانے کے، رچھ، بندر اور کتے اس کے اشاروں پر کام نہیں سکھایا۔ بچہ ہی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ خود ڈر گیا تھا۔ بچے کی فطرت میں ایسا تھا۔ اوپر سے اس کے قبیلے والوں نے نہ ناچتے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ خود ڈر گیا تھا۔ بچے کی فطرت میں ایسا تھا۔ اوپر سے اس کے قبیلے والوں نے نہ صرف اس بچے کو قبول نہیں کیا بلکہ خواہ مخواہ اس کی ذمہ داری بھی نہیں لی۔ جیسے ہی اس کی بیوی پارہاگلے جہاں سدھاری، قبیلے والے بھی اس سے نظر انداز کرنے لگے۔ قلندر در بدر پھرتا، ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک جاتا ہوا، یہاں آ گیا تھا۔

”روٹی کھائے گا؟“ ہیرا سنگھ نے پوچھا

”بھوک تو لگی ہے، پر جاتا ہوں گاؤں میں، کہیں نہ کہیں سے روٹی مل جائے گی، بس یہ ذرا دھوپ ڈھلے اور تھوڑی دیر سانس لے لوں۔“ قلندر نے کہا

”یار بات سن، بھوکا تو میں بھی ہوں۔ میری روٹی نہیں آئی ابھی تک، بندہ روٹی لینے گیا ہوا ہے، ابھی آ جاتا ہے تو کھاتے ہیں۔“ ہیرا سنگھ نے کہا تو قلندر نے سر ہلا دیا۔ بچہ شاید بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لئے سایہ ملتے ہی زمین پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد سو گیا۔ سردار ہیرا سنگھ اور لالو قلندر یونہی وقت گزاری کے لئے باتیں کرنے لگے۔

”کدھر کا ہے تو؟“ ہیرا سنگھ نے اس سے پوچھا

”مجھے نہیں پتہ، جب سے ہوش سنبھالا ہے، سفر ہی میں ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کہاں کہاں تک گئے ہیں۔“ لالو قلندر نے کھر کھراتی ہوئی آواز میں کہا

”کیسی زندگی ہے یار یہ بھی، ہمیشہ سفر میں رہنا۔ آج یہاں تو کل وہاں، اور ہم بیلوں کی جوڑی کی طرح یہیں گھوم رہے ہیں۔“ ہیرا سنگھ نے کہا

”جیسے رت رکھے، ویسے رہنا پڑتا ہے۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں قلندر بنوں۔ بس بن گیا۔ میں اگر کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہوا جاتا تو شہزادہ ہوتا۔“ لالو نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا تو ہیرا سنگھ کو دور سے اپنا ملازم آتا ہوا نظر آیا۔

”لے بھئی، مجھے لگتا ہے، روٹی آگئی۔ تو منہ ہاتھ دھو لے اور اس بچے کو بھی اٹھا۔“ ہیرا سنگھ نے کہا اور تل کے پاس جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ ملازم کھانا لے کر پہنچ گیا تو ہیرا سنگھ نے اس سے پوچھا، ”کیوں دیر ہو گئی تھی تمہیں؟“

”سردار جی، اب آپ کچھ دن دیر سو رہی سے روٹی کھائیں گے، آپ کے گھر میں بنی ہوئی ہے۔“ ملازم نے کہا تو ہیرا سنگھ بولا

”اوشاباش اے بھئی، سنکھ نال دھی آئی ہے، تین بھائیوں کی اکیلی بہن، چل اس کا نام ہی سنکھجیت کو رکھ دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے روٹی اپنے سامنے رکھی، آدھی روٹیاں اور سائل لالو قلندر اور بچے کو دے دیا اور انہیں دوسری چار پانی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ سب کھانا کھانے لگے۔ ملازم نے ان کے پاس پانی رکھ دیا۔ کھانا کھا کر وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

ملازم اپنا کام کرنے لگا اور وہ سو گئے۔

سہ پہر سے ذرا پہلے سردار ہیرا سنگھ اٹھ کر کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ ملازم بھی کہیں کام کر رہا تھا۔ بچہ بھی اٹھ کر بندر اور کتے کے ساتھ کھیل رہا تھا، جبکہ لالو قلندر جس کروٹ لیٹا تھا، اسی کروٹ پڑا رہا۔ کافی دیر بعد جب سردار ہیرا سنگھ واپس آیا تو اس نے لالو قلندر کو غور سے دیکھا اور پھر اسے اٹھایا لیکن وہ بے جان تھا۔ اس کی روح پرواز کر گئی تھی۔ ہیرا سنگھ نے ایک طویل سانس لی اور کھیتے ہوئے اس بچے کو دیکھا، جسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ ہیرا سنگھ کو اس بچے پر بہت ترس آیا۔

ہیرا سنگھ نے اسی وقت اپنی ملازم کو بلایا اور لالو قلندر کی نعش کو تیل گاڑی پر رکھ کر گاؤں کی جانب چل دیا۔ وہ بچہ پھٹی پھٹی لگا ہوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ اچھی طرح شعور تھا کہ آج کے بعد وہ اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ کیونکہ ایسا ہی اس کی ماں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ پھر کبھی واپس نہیں آئی تھی اور نہ کبھی اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ باپ کے بچھڑ جانے کا اسے شدید دکھ تھا، لیکن اس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔

لالو قلندر کی نعش گاؤں میں ہیرا سنگھ کے گھر کے سامنے رکھ دی گئی۔ وہاں چوراہا تھا جس کے درمیان میں بڑا درخت تھا اور اس کے نیچے لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ اسے نکیہ کہتے تھے۔ وہاں ہر مذہب کا بندہ آتا تھا۔ ہیرا سنگھ کے گھر کے سامنے احمد بخش کا گھر تھا۔ وہاں نکیہ پر اس وقت یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ کیا لالو قلندر کی نعش کو جلا یا جائے یا پھر دفن کیا جائے؟ وہ سکھ تھا، ہندو تھا یا مسلمان؟ کون تھا وہ؟ اگرچہ یہ مسئلہ اسے نہلاتے وقت حل ہو سکتا تھا لیکن اسے نہلاتے کون؟ کبھی گاؤں کے ایک مسلمان بزرگ احمد بخش نے اس بچے کو اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھا

”بتایا نہیں! تیرا باپ بھگوان کو مانتا تھا، واہگر کو مانتا تھا یا پھر اللہ کو؟“

”پتہ نہیں جی، وہ جس کے گھر سے مانگتا تھا، اسی کو دعائیں دیتا تھا، ہندو کے گھر سے مانگتا تھا تو کہتا تھا بھگوان تجھ پہ کرپا کرے، سکھ اسے کچھ دیتا تھا تو کہتا تھا رت تیرا بھلا کرے مسلمان دیتا تو کہتا اللہ تجھ پہ کرم کرے۔“ بچے نے معصومیت سے کہا تو احمد بخش شیخ نے اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”دیکھو بھائیو، یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ یا تو اس قلندر کی نفس کو دیکھ لو، یا پھر جو بندہ بھی اس کی ذمہ داری لیتا ہے، وہ اپنے مذہب کے مطابق اس کی آخری رسومات پوری کر دے۔“

”بھی ایک شخص نے اس بچے کی پھٹی ہوئی قمیص کا آگے والا پٹو اٹھاتے ہوئے کہا ”پر یہ بچہ تو مسلمان ہے۔“

اس کے تصدیق کرنے پر احمد بخش شیخ نے خود ذمہ داری لے لی۔ اس نے گاؤں کے ان مسلمانوں سے کہا، جو وہیں کھڑے تھے کہ اس نفس کو پورے احترام سے دفن دیا جائے۔ سو فوری طور پر اسے غسل دیا گیا۔ کفن کا انتظام بھی اسی نے کیا اور مغرب کی نماز کے بعد گاؤں کی مسجد میں اس کی نماز جنازی پڑھی گئی۔ پھر اسے گاؤں سے باہر قبرستان میں دفن دیا گیا۔ لالو قلندر اس دنیا سے چلا گیا۔

اس بچے کی رات ہیرا سنگھ کے مہمان خانے میں گزری۔ لیکن اس سے پہلے اسے نہلایا گیا۔ کلندر سنگھ کے کپڑے اسے پہنائے گئے۔ جب وہ دفن کرا گئے تو اسے خوب کھانا کھلایا گیا۔ پھر جو وہ سویا تو صبح جاگا۔ نجانے اتنی میٹھی نیند اسے کیسے آگئی تھی۔ اگلی صبح جب وہ ناشتہ کر چکا تو کلندر سنگھ اپنے باپو ہیرا سنگھ کے پاس آیا اور بولا

”باپو، میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا ہی نہیں، کہتا ہے بس مجھے کا کا کہہ کر پکارتے ہیں، اس کا کوئی نام تو ہونا چاہیے نا؟“

”ہاں پتر، اس کا کوئی نام تو ہونا چاہیے، پر یہ مسلمان ہے، اب ہم کیا نام رکھیں یا ر؟“

”کوئی سا بھی رکھ لیں۔“ کلندر سنگھ نے کہا۔ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اسے اپنے گھر کے دروازے پر احمد بخش شیخ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو ہیرا سنگھ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا

”آئیں بھاء جی بیٹھیں۔“

”میں کھیتوں کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ وہ کل لالو قلندر کے ساتھ جو بچہ تھا، کیا کرتا ہے اس کا؟“ احمد بخش شیخ نے پوچھا

”کرنا کیا ہے، ادھر رہے گا ہمارے پاس یا جیسا آپ مناسب خیال کریں۔“ ہیرا سنگھ نے کہا تو اتنے میں ہیرا سنگھ کی بیوی لسی کا گلاس لے کر آگئی۔ اس نے احمد بخش شیخ کو گلاس چھتھاتے ہوئے کہا

”بھاء جی، بچہ بہت معصوم اور بھولا سا ہے، وہ تو لگتا ہی نہیں کہ لالو قلندر کا ہوگا۔“

”پر کیا کریں، وہ ہے ہی اس کا۔ قلندر کا پتر قلندر۔“ ہیرا سنگھ نے کہا

”برامت ماننا ہیرا سنگھ، تم اسے رکھو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، پر وہ مسلمان بچہ ہے، میں کہتا ہوں جہاں چار دوسرے ہیں وہاں پانچواں یہ بھی سہی۔“ احمد بخش شیخ نے بہت عقل مندی سے اپنی بات کہہ دی تھی، ایک تو اسے یہ سمجھا دیا تھا کہ مسلمانوں کے بچے کو مسلمانوں ہی کے گھر میں رہنا چاہئے اور دوسرا وہ اس بچے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھے گا، کوئی نوکر چاکر نہیں۔ ہیرا سنگھ اس کی بات سمجھ گیا۔ اس نے فوراً ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا

”جیسے آپ کی مرضی بھاء جی، میرے گھر میں رہے یا آپ کے گھر میں، ایک ہی بات ہے۔ آٹنے سامنے گھر ہے۔ ہم سب اس کی ذمہ دہال بھال کریں گے۔“ اس نے بھی احمد بخش شیخ کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ وہ بھی اس بچے کی نگہبانی کرتے رہیں گے۔

”بلاؤ اس کو کہاں ہے وہ؟“ احمد بخش شیخ نے کہا تو کلندر بھاگ کر گیا اور اسے لے آیا۔ واپس آتے ہی اس نے احمد بخش شیخ سے دینی سوال کیا جو وہ اپنے باپو سے کر چکا تھا۔ تب احمد بخش شیخ نے کہا

”ہاں۔! سوچتے ہیں اس کا نام۔“ پھر اس بچے کو اپنے پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے پوچھا، ”چل اب ہم اپنے گھر چلیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسے ساتھ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

اصل میں احمد بخش شیخ کی بیوی بھاگاں مائی نے جب اس بچے کو دیکھا تھا تو اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ وہ اس کا پتر بن جائے۔ ساری رات وہ اسی کے بارے سوچتی رہی۔ صبح نور کے تڑکے وہ بیٹھی رو رہی تھی کہ احمد بخش شیخ نے حیران ہو کر اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو بھاگاں مائی نے اپنے دل کا حال کہہ دیا۔ جہاں وہ اپنے اندر کی مانتا سے مجبور ہو گئی تھی، وہاں اسے وہ اس فرمان کی بھی پیروی کر رہی تھی کہ تقیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والا بخش دیا جائے گا۔ پھر اسے بچے پر ترس ہی بہت آیا تھا۔ احمد بخش شیخ نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس بچے کو لے آنے کی پوری کوشش کرے گا۔

اس نے بچے کو جیسے ہی بھاگاں مائی کے سامنے کیا، اس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ تبھی بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا، ”میرا خوشی محمد۔“

”چل یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اس کا ابھی تک کوئی نام نہیں تھا، تو نے اسے نام دے دیا۔“ یہ کہہ کر اس نے ہیرا سنگھ کے گھر ہونے والی بات بتادی

”ہاں بس اس کا نام خوشی محمد ہی ہے۔ میرا پانچواں پتر۔“ بھاگاں مائی نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ خوشی محمد بھی اس کے ساتھ یوں لگ گیا، جیسے اسے اپنی ماں مل گئی ہو۔

☆.....☆.....☆

یہ برصغیر کا وہ دور تھا، جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئے لگ بھگ ایک برس گزر گیا تھا۔ تحریک آزادی اپنے زوروں پر تھی۔ احمد بخش شیخ بہت سمجھدار آدمی تھا۔ اس کے تین بھائی مزید تھے، فتح محمد عرف قزو، غلام محمد عرف غلاما اور محمد بخش عرف مندو۔ یہ تینوں بھائی ایک جٹ تھے۔ خوشحال زمیندار ہونے اور شیخ ہونے کی وجہ سے وہ وہاں، اوگی پنڈ میں ”لمتیاں دی پتی“ والے مشہور تھے۔ اوگی پنڈ میں جوتین تھی، وہ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ زمین تقسیم در تقسیم ہوتی ہوئی لوگوں کے پاس تھوڑی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ احمد بخش شیخ نے سوچا تھا کہ اس کے اپنے چار بیٹے ہیں اور اب پانچواں خوشی محمد بھی آ گیا۔ اسی طرح بھائیوں کے بھی بیٹے ہیں۔ زمین جب تقسیم ہوئی تو کچھ بھی نہیں رہے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ اس کی اولاد، اس تقسیم کے بعد کہاں سے کھائے کمائے گی؟

احمد بخش شیخ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ نواب آف بہاول پور نے انیس سو ستائیس سے آبادکاری نظام بنایا ہے۔ جس نے تحت جو قرضی چاہے الاٹمنٹ کروا لیتا، زمین آباد کرتا تو اسے وہ زمین مل جاتی۔ اس کے اپنے گاؤں اوگی سے اور آس پاس لے گاؤں سے کافی لوگ وہاں چلے گئے تھے۔ انہیں زمین مل گئی تھی۔ وہاں سب سے بڑا مسئلہ زمین کی آبادکاری تھا۔ اب وہاں زمین کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کرنا جو شیر لانے کے مترادف تھا۔ احمد بخش شیخ نے ایک دن اپنے بھائیوں کا اکٹھا کیا اور ان کے سامنے یہ بات رکھی۔ کافی دیر بحث و تحیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ احمد بخش شیخ خود اور فتح محمد دونوں

وہاں چلے جائیں اور دو بھائی ادھر ہی رہیں۔ جب وہاں زمین کی الاٹمنٹ ہو جائے تو یہ بھی ادھر ہی آجائیں گے۔ خوشی محمد کے تقریباً دو سال اس گاؤں میں گذرے۔ اپنے بھائیوں سے زیادہ اس کی کلوندر سنگھ کے ساتھ بنتی تھی۔ دونوں سارا دن کھیلتے، کبھی ہیرا سنگھ کے کنویں پر اور کبھی لمبیاں دی جتنی میں وقت گذرتا۔ دونوں ہی اپنے پاس غلیل رکھتے تھے۔ سارا دن پرندوں کا شکار کرتے رہتے۔ کھانا پینا اچھا ملا تو خوشی محمد نے خوب رنگ ڈھنگ نکالا۔ جب ایک دم اسے وہاں سے بھی جانا پڑا۔ اسے کلوندر سنگھ کا ساتھ چھوٹ جانے کا بہت دکھ تھا۔ پہلے احمد بخش شیخ اور فتح محمد ریاست بہاول پور آئے، وہاں بات چیت کی۔ لوگوں سے ملے۔ ایک دن پلٹے تو دونوں اپنی بیویوں اور بیٹوں سمیت بہاول پور روانہ ہو گئے۔

وہاں انہوں نے دن رات ایک کر دیا۔ صحرائی زمین کو آباد کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے لی ہوئی زمین آباد کر لی اور قیام پاکستان ہو گیا۔ لوگ آگ اور خون کا دریا پار کر کے آنے لگے۔ ان میں احمد بخش شیخ کے دونوں بھائی بھی لائے۔ ان کے پاس آگئے۔ احمد بخش شیخ نے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور زندگی نئے سرے سے شروع کر دی۔ اوگی پنڈوالی زمین کا کلیم داخل کر دیا گیا۔ یوں کسی کو کہیں زمین ملی اور کسی کو کہیں۔ وہ سب بھائی پاکستان کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

اس وقت خوشی محمد تیس برس سے اوپر کا ہو گیا تھا، جب اس کی شادی کی باری آئی۔ چاروں بھائیوں میں سے کسی کی بیٹی ایسی نہیں رہی کہ جس سے خوشی محمد کی شادی ہو سکتی۔ سب بیای جاکچکی تھیں۔ احمد بخش اب بوڑھا ہو چکا تھا اور بھاگاں مائی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ ایک فتح محمد ہی اس کے پاس تھا۔ اس کی اولاد بھی بیای جاکچکی تھی۔ احمد بخش نے ساتھ والے گاؤں میں خوشی محمد کی شادی کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی عقل مندی کی، اسے زمین دینے کا فیصلہ کر لیا۔ نورنگر میں کلیم کی زمین بڑی ہوئی تھی۔ احمد بخش نے وہ زمین خوشی محمد کو دے دی۔ وہ دونوں میاں بیوی وہاں جا کر بس گئے۔

نورنگر کی بستی بنانے کب کی آباد تھی۔ وہاں کے آثار بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بستی پہلے بھی آباد تھی۔ وہاں کے لوگ بتاتے تھے کہ یہ پہلے ہندوؤں کی آبادی تھی۔ جو کسی وجہ سے ختم ہو گئی تھی۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ یہیں پر شیطانیٹ اپنا بھیا تک روپ دکھا چکی ہے۔ نورنگر کبھی رام گڑھ تھا جو بالکل بدل کر اب مسلمانوں کی بستی بن چکا تھا۔ نورنگر سے فقط دو میل کے فاصلے پر وہ میدان تھا، جہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ اب میلے میں کھیلوں کی نوعیت بدل گئی تھی اور مسافر شاہ کے تھڑے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

تقریباً سات برس بیت گئے۔ خوشی محمد نے وہاں جا کر خوب محنت کی۔ اس علاقے میں پانی اچھا تھا۔ فصلیں شاداب ہونے لگیں۔ بچپن میں غلیل سے پرندوں کا نشانہ لینے والا شوق اب گن کے ساتھ شکار میں بدل گیا تھا۔ اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ اور اسی خوبی کے باعث اس علاقے کے بڑے زمیندار کا بیٹا چوہدری شاہ دین اس کا بہرہ گہرا دوست بن گیا تھا۔ وہ اکثر شکار پر نکل جاتے۔ خوشی محمد کو سب کچھ مل گیا تھا، بس کی تھی تو اولاد کی نعمت تھی جو ابھی انہیں ملی تھی۔ وہ رب کے ہاں سے ناامید نہیں تھے۔

خوشی محمد کی بیوی صابراں اپنے نام کی طرح صابر و شاکر عورت تھی۔ قدرت نے اسے رنگ روپ بھی خوب دیا تھا۔ وہ سادہ سی مگر بیو عورت اپنے رب کی رضا میں راضی تھی۔ اگرچہ اسے اولاد ہونے کا دکھ تو تھا لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے صرف شاہ دین کا خوف تھا، جس کی بری نظر سے بچ جانا چاہتی تھی۔ وہ بہت کم باہر جاتی۔ خوشی محمد نے دونوں کو رکھ چھوڑے تھے، وہی کام کرتے تھے۔ صابراں نے اشارے کنائے میں خوشی محمد کو شاہ دین کے بارے میں بتایا بھی، جسے وہ نہ سمجھ سکا۔ صابراں نے اپنی لڑائی اپنے رب سے لگالی۔ وقت گذرتا گیا، یہاں تک کہ قدرت ان پر مہربان ہو گئی۔ وہ امید سے

ہو گئی۔

ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام جمال رکھا گیا۔ وہی جمال جو اپنے سامنے سارے منظر دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دنیا میں آیا تو اس کا باپ قتل ہو چکا تھا۔ جس کا بدلہ لینے کے لئے وہ اس مقام پر آکھڑا تھا۔ سارے منظر ایک دم سے ختم ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

ہمارے سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا میدان تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی ڈالے باباجی وہیں ہمارے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہمیں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مسکراتے ہوئے بولے

”جمال، کیا اب تمہیں سمجھ آگئی ہے کہ تم کس حد تک قلندر ہو؟“

”لاو قلندر کی وجہ سے وہ قلندر تھا، اسی ناطے میں بھی ہوں۔ میں جان گیا، مجھے اب کیا کرنا ہے۔“

”یہ اچھا ہوا کہ تم سمجھ گئے ہو۔ لیکن ابھی منزل بہت دور ہے، تجھے ابھی بہت سفر کرنا ہے۔“ باباجی نے کہا تو میں نے جیسے سے پوچھا

”یہ آپ نے مجھے میری تین نسلوں کے بارے میں بتایا، آپ انہیں کیسے جانتے ہیں، انسان کی عمر تو ایک.....“

”بادشاہ کسی شخص کا نام نہیں ہوتا، ایک مقام کا نام ہے، جو جس وقت بادشاہ ہوتا ہے اسے وہ مقام ملنے کے ساتھ سارے اختیارات بھی مل جاتے ہیں۔ اسے ماضی تو معلوم ہوتا ہے اور مستقبل کی سوچ بھی دی جاتی ہے۔“

”مقام! آپ کا.....“ میں نے پوچھنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے

”تیری اور شیطان کی کشمکش جاری رہے گی۔ جتنا خود کو مضبوط رکھے گا، تیرے اندر جتنی پاکیزگی آئے گی، تو اتنا ہی مضبوط ہوگا۔ اپنی اور اپنے اندر پڑے قطرے کی حفاظت کرنا، تیری حفاظت خود بخود ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے جہاں کی طرف دیکھا اور کہا

”تیرے پر یوار کے۔ اتھ بہت ظلم ہوا، تیرے دشمن تجھ سے بہت بھاری ہیں۔ پر ہیرا سنگھ کی مدد کا اُسے حق تو ملتا ہے نا۔ جاؤ، میرا رب تم دونوں کے ساتھ ہے۔“ انہوں نے کہا اور مسافر شاہ کے تھڑے سے اتر گئے۔ وہ کچھ دور تک تو دکھائی دیئے پھر معدوم ہو گئے۔ ان کے پاؤں تلے روشنی جاگ اٹھی۔ وہ اس لکیر پر چل پڑے۔ پھر لحوں میں وہ نورنگر میں تھے۔

☆.....☆.....☆

اس رات کا باقی حصہ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں ہی میں کاٹا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ جیسے میری طرح جہاں کو بھی نیند نہیں آئی، ویسے ہی سوال اس کے ذہن میں بھی ہوں گے۔ مگر ہم میں خاموشی ہی رہے، ایک لفظ تک کا تبادلہ نہیں ہوا۔ ہم کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تو میرے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ گیا۔ میں جو ایک ذرا سی اجنبیت اس سے محسوس کرتا تھا، وہ اب نہیں رہی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے من سے بھی اجنبیت نکل گئی ہوگی۔ ابھی سورج نکلنے کے آثار ہو رہے انہیں ہوئے تھے، میں نے بایک نکالا اور ہم ڈیرے پر چلے گئے۔ اس صبح میں نے پہلی بار نورنگر کو نئے انداز سے دیکھا۔ یہی جگہ کبھی رام گڑھ ہوا کرتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ زمین چالیس برس بعد اپنا مالک بدل لیتی ہے۔ یہاں تو بستی ہی کا رنگ ڈھنگ بدل گیا تھا۔ کھنڈر کس نے آباد کئے کوئی پتہ نہیں، ممکن ہے قیام پاکستان کے بعد یہاں کے لوگ چلے گئے ہوں۔

چھکا کا ابھی سویا ہوا تھا۔ میں نے اسے جا کر جگایا تو وہ حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر تشویش زدہ لہجے میں پوچھا

”اد جہاں تجھے خیر تو ہے؟، ابھی تو صبح نہیں ہوئی اور تو ڈیرے پر آ گیا ہے؟“

”اد خیر ہی ہے۔ چل تو اٹھ اور منہ ہاتھ دھو، تجھے کہیں کام بھیجنا ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس کے

چہرے پر حیرت ابھی تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی اس نے کہا

”میں پوچھتا ہوں خیر ہی ہے یا نا؟“

”تو ایسے کر، منہ ہاتھ دھو کے ہر اس بندے کے گھر جا، جو کل یہاں میلے کروانے کے سلسلے میں آئے تھے، انہیں جا کر کہو کہ ہم میلے میں کسی بھی طرح کی گڑبڑ نہ ہونے کی ضمانت دیتے ہیں، وہ میلہ کروانے کی تیاریاں کریں۔“ میں نے کہا تو وہ حیرت سے بولا

”تو پاگل ہو گیا ہے جو ان کی باتوں میں آ کر یونہی میں بڑا رہا ہے، تجھے پتہ بھی ہے کہ وہ ہمارے خلاف سازش کر رہے ہیں اور تو پھر بھی پاگل پن کر رہا ہے۔“

”جب میں نے کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا ہے، تو یہ پیغام جا کر ان سب کو دے دے۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ ہسپتال کی طرف دیکھ کر بولا

”یار تو ہی سمجھا اسے، پورا علاقہ ہمارے سامنے ہے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ میلہ خراب کرنے کی وہ پوری تیاری کئے بیٹھے ہیں۔ وہ ہمیں پھنسانے کی پوری.....“ اس نے کہنا چاہا تو ہسپتال نے کہا

”جب تجھے جمال کہہ رہا ہے، تو پھر تو ویسا ہی کر، جیسا یہ کہہ رہا ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر اس نے دیوانوں کی طرح ہم دونوں کی جانب دیکھا اور پھر پوچھا

”یہ تم دونوں کی صلاح ہے، لیکن مجھے سمجھاؤ کہ یہ کیسے ہوگا؟“ چھا کا اڑ گیا۔

”یار شیخ پوچھو نہ تو ہمیں بھی پتہ نہیں کہ یہ کیسے ہوگا، لیکن دشمنوں کی سازش نہ صرف ناکام ہوگی بلکہ یہ انہی پر الٹ جائے گی، یہ میرا گمان کہتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو ایک دم سے خاموش ہو گیا، اس کے چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ تبھی اس نے دھیمے سے لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ بھیدہ اپنے کام کاج میں مصروف تھا۔ ہم بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

سورج نکلنے پر ہم واپس گھر کی جانب لوٹ آئے۔ اماں اور سوئی ناشتہ تیار کئے بیٹھی تھیں۔ میں نے اور ہسپتال نے نہادھو کراچھے کپڑے پہنے اور ڈٹ کر ناشتہ کر کے باہر نکلنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارا گیٹ بجا، میں اٹھ کر باہر گیا تو سامنے ایک نو جوان سی دیہاتی لڑکی اور ایک تنومند دیہاتی جوان کھڑا تھا۔ لڑکی نے ہمارے ہی علاقے کی عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا، سر پر بڑا سا سرخ آٹھن تھا۔ جوان نے بوکی کی قمیض پہنی اور لٹھے کی چادر باندھی ہوئی تھی۔ ان سے ذرا فاصلے پر بائیک شینڈ پر لگی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے پوچھتا، وہ لڑکی بولی

”جمال بھائی ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔ اندر آنے کے لئے نہیں کہو گے؟“

”مگر میں تم لوگوں کو جانتا نہیں، پیچھا نہ نہیں، تم لوگ ہو کون؟“ میں نے دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جوان بولا

”جمال بھائی کہیں بیٹھ کر بات کریں؟“

”آؤ.....“ میں ان دونوں کو غور سے دیکھتا ہوا اندر لے گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یوں کسی اجنبی کو اپنے گھر میں لا رہا ہوں، ممکن ہے اس کے پاس اسلحہ ہو، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر۔۔۔ انجانے کیوں میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ ان پر اعتماد کر لیا جائے۔ وہ دونوں ایک چار پائی پر بیٹھ گئے۔ ہسپتال انہیں دور کھڑا غور سے دیکھ رہا تھا۔

”باتیں بعد میں کرتے ہیں، پہلے سناؤ کیا کھاؤ پیو گے۔“ میں نے پوچھا

”سب کچھ کھائیں پئیں گے جمال بھائی، لیکن پہلے یہ تو جان لو کہ ہم ہیں کون؟“

”تو بتا دو، یہ تو تم دونوں ہی نے بتانا ہے نا؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا

”میں پروین ہوں اور یہ میرا منگیترو ذوالفقار عرف زلفی۔ اسے تو تم پہلی بار دیکھ رہے ہو گے، لیکن مجھے آپ نے ایک بار دیکھا ہوا ہے، میرے ذہن میں تھا کہ میرا چہرہ تمہیں یاد ہوگا۔“ پروین نے مسکراتے ہوئے بتایا

”کہاں دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا

”شاہ زیب کے ڈیرے پر، یاد ہے تمہیں وہاں ایک کمرے میں ایک بوڑھا آدمی اور دو لڑکیاں بندھی ہوئیں ملی تھیں۔ جنہیں تم نے بڑی عزت کے ساتھ واپس بھیجا تھا۔“ پروین کے یاد دلانے پر میرے ذہن میں فوراً آ گیا۔

”ہاں مجھے یاد آ گیا، کیا وہ تم تھی؟“ میں نے پوچھا

”ہاں ان میں ایک لڑکی میں تھی اور دوسری اس زلفی کی بہن اور اس کا باپ تھا۔“ پروین نے بتایا تو زلفی بولا

”جمال بھائی! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تم نے میری بہن اور باپ کے ساتھ میری منگیترو کی بھی مدد کی اور انہیں حفاظت سے گھر بھیجا۔“ زلفی نے ممنونیت سے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے پوچھا

”یار اتنے عرصے بعد؟“

”میں یہاں نہیں تھا۔ اگر یہاں ہوتا تو ان بے غیرتوں کی جرات نہ ہوتی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف تین دن ہوئے ہیں۔ اور اب بھی دیکھنا، میں کیا کرتا ہوں۔“ وہ یوں بولا جیسے اپنے آپ پر قابو پار ہا ہو۔ تب میں نے پوچھا

”اتنا عرصہ رہے کہاں ہو؟“

”جیل میں، سزا کاٹ رہا تھا۔ تین دن پہلے رہائی ہوئی ہے۔“ اس نے بتایا

”کیا، کیا تھا؟“ میں نے پوچھا

”قتل کئے تھے۔ خیر، وہ کیس تو نہیں پڑا مجھ پر، بچ گیا ہوں، ڈکیتی پڑ گئی تھی۔ اسی کی سزا کاٹی ہے۔ پر دشمنوں نے میرے باپ سمیت میری بہن اور میری منگیترو پر بڑا ظلم کیا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر یوں ہو گیا جیسے خود پر قابو پار ہا ہو۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ میں نے پوچھا

”نہیں۔! جمال بھائی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چار پائی سے نیچے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا

”زلفی نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں جوڑے، پر میں ہاتھ باندھ کر تم سے منت کر رہا ہوں کہ مجھے کوئی کام بتا، کسی دشمن کا پتہ دے۔ میں تیرا احسان مند ہوں۔ جو تو نے مجھ پر احسان کیا ہے، میں اس کا بدلہ تو نہیں دے سکتا، پر جان تو دے سکتا ہوں۔ میری بہن اور منگیترو کی عزت کی تم نے، بتا جمال بھائی بتا، تیرے کسی بھی کام آ سکتا ہوں۔ سمجھ لو کہ میں تیرا زرخید ہوں۔“

”پہلے تم چار پائی پر تو بیٹھو۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا، پھر بولا

”مجھے جیل ہی میں ساری بات معلوم ہو گئی تھی۔ تب سے میں نے تمہیں کر لیا تھا کہ پہلے تیرے کام آؤں گا، پھر اس بے غیرت وقاص کی.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے دانت پیس کر گالی دے ڈالی تو میں نے پوچھا

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وقاص پیرزادہ نے ہی اپنے بندے بھیجے تھے اور انہی کے ہاتھ انہیں واپس اپنے گھر.....“

”نہیں، اصل میں وہی بندہ تھا۔ یہ شاہ زیب تھا یا پیرزادہ وقاص، چوہدری شاہنواز تھا یا سردار کھل یہ سب ایک ہی ہیں، ان سب نے علاقے کو اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ میں نے بندے سردار کھل کے مارے تھے۔ اس نے پیرزادہ

وقاص سے کہہ کر انہیں گھر سے اٹھوایا، شاہ زیب کے ڈیرے پر رکھا تا کہ اگر میں واپس آ بھی جاؤں تو ان سب کا مقابلہ نہ کر سکوں۔ میرے دشمن یہ سب ہیں۔“ زلفی نے کہا تو میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے؟ میں اس

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا

”جمال بھائی، تم جانتے ہو، ذخیرے میں پیر زادے نے اپنا ایک نیا ٹھکانہ بنالیا ہے؟“ اس نے بتاتے ہوئے پوچھا تو اس نے تفصیل بتا دی

”میں اس کے بارے میں جہاں تک ہو سکتا تھا، جیل میں خبر رکھتا تھا۔ کئی سگی ساتھی اس کے بارے میں بتا دیتے تھے۔ مجھے کوئی تین مہینے پہلے ایک خبر ملی تھی کہ اس نے ذخیرے میں بندے رکھے ہیں۔ وہ سارے ہی اشتہاری ہیں۔ ان سے وہی ڈکیتی، قتل اور ایسی ہی واداتیں کروا رہا ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ ایک دم وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔“

”وہ جدی پشتی زمیندار ہے۔ اور.....“ چھاکے نے کہنا چاہا تو وہ بولا

”وہی تو، پہلے بھی وہ ایسا ہی تھا۔ لیکن اب یا تو اس پر کسی کا ہاتھ ہے، یا پھر کوئی وقت اس کے ساتھ آئی ہے۔ پہلے اتنا حوصلہ نہیں تھا اس میں، پہلے بھی تو یہ ذخیرہ اسی کی ملکیت تھا۔“ زلفی نے اپنے طور پر تجزیہ کیا۔

میں اس ذخیرے کے بارے میں جانتا تھا۔ ایک دو بار میں شکار کرنے اس طرف گیا تھا۔ وہ درختوں سے بھر ایک جنگل تھا۔ پہلے وہ قدرتی تھا بعد میں دریا کی زمین پر ناجائز قبضہ کر کے اسے پھیلا کر مصنوعی جنگل بنایا گیا۔ جس سے لکڑیاں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس کے ایک طرف سڑک تھی۔ خاصا جنگل پار کرنے کے بعد دوسری جانب دریاے ستلج تھا۔ اگر ایک طرف سے خطرہ ہوتا تو وہ لوگ دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ پہلی تو بات یہ ہے کہ اس طرف کوئی جاتا ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے اب پیر زادہ وقاص نے اپنے مقصد کے لئے بندے وہاں رکھ چھوڑے ہوں۔ ان کے ڈیرے پر بھی تو ایسے کئی بندے پڑے ہی رہتے تھے۔

”ایسے میں جبکہ وہ اتنا طاقتور ہو گیا ہے، تو کیا کلاے گا۔“ میں نے پوچھا

”یہی تو میں نے تصدیق کرنی ہے، اگر اس نے میرے ساتھ منافقت کی ہے تو میں کیوں نہ کروں۔ اور میں نے تو وقاص کو مارنا ہی مارنا ہے، جب بھی موقع ملے، چاہے آج ہی۔“ زلفی تیزی سے بولا

”چلو دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے تو؟“ میں نے کہا تو اس نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا

”جمال بھائی۔! تو میرا محسن ہے۔ میری جان بھلے چلی جائے، پر بس چلے نا تو تجھ پر آج نہیں آنے دوں گا۔ چھا کا جانا ہے میرے بارے میں۔“

”فون ہے تیرے پاس؟“ میں نے پوچھا

”ہاں ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے کہا

”رابطہ رکھنا۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور بات ختم کر دی۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ وہ پروین کے آنے تک انتظار کرتا رہا، وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا آئینہ تھا۔ پروین وہ زلفی کو دکھاتے ہوئے بولی

”اماں نے دیا ہے، کہہ رہی تھی کہ تم پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو۔“

زلفی نے میری طرف دیکھا اور شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہمارے علاقے میں رواج تھا کہ جب بھی کسی کو اگر سر پر ڈالنے والا آئینہ دے دیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے بیٹی یا بہن کے طور پر عزت دی گئی ہے۔ میں نے پروین کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا تو زلفی میرے گلے ملا۔ پھر اس کے بعد وہ چلے گئے۔ نجانے کیوں مجھے زلفی پر اعتماد ہو رہا تھا۔

ہم تینوں ذرا اطمینان سے بیٹھے تو میں نے چھا کے سے کہا

”اس علاقے میں جب شاہ زیب نہیں رہا، چوہدری شاہنواز بھی پکڑا گیا ہے۔ یہی پیر زادہ وقاص چاہتا تھا۔ میں یہ اس

معا ملے میں خاموش رہا اور بولا

”زلفی، رتب نے مجھے اتنا حوصلہ دیا ہے کہ میں اپنی حفاظت کر سکوں۔ مجھے تم سے کوئی کام نہیں لینا اور نہ ہی میرا کوئی ذاتی دشمن ہے۔ تو جو چاہئے سو کرو۔“

”لیکن ایک شرط پر؟“ یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر دیکھا

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا

”جب بھی میری ضرورت پڑے۔ مجھے آواز ضرور دے لینا۔ رتب کی قسم تجھ سے پہلے جان دوں گا، یہ زلفی کا وعدہ ہے۔“

”دیکھ جمال بھائی، اس کے جیل سے آنے پر ہم نے شادی کرنا تھی، لیکن اب یہ آیا ہے تو ہم دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اپنے دشمن ختم نہ کر لیں، ہم شادی نہیں کریں گے۔“

”یار، دعا کر کہ ایسا ہو ہی نہ، خیر تو بیٹھ میں تیرے لئے کچھ لاتا ہوں۔“ میں یہ کہہ کر اٹھنے لگا تو چپال ٹرے پکڑے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ اس نے کھانا ان کے سامنے رکھ دیا اور میرے ساتھ چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پروین سے بولا

”ٹو انڈر جالماں کے پاس، وہیں ادھر بیٹھ کر کھالے، اماں نے کہا ہے۔“

زلفی، کھاتے ہوئے اپنی جیل کی رو داد سنانے لگا۔ وہ وجہ بتانے لگا جس باعث اسے قتل کرنا پڑے۔ وہ کھاپی چکا تو کچھ دیر بعد پروین بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ایسے میں چھا کا آ گیا۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے اندر آیا اور اس کی نگاہ زلفی پر پڑی تو وہ بری طرح چونک گیا۔ میں نے اس کے چہرے کا بدلنا ہوا رنگ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس نے بایک کھڑی کی اور سیدھا اس کی طرف آیا۔ تب تک زلفی بھی اٹھ گیا۔ وہ دونوں یوں گلے ملے جیسے صدیوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ میں نے چھا کے سے پوچھا

”تو جانتا ہے اسے؟“

”ارے یار یہی تو ہے زلفی ڈکیت۔“ چھا کے نے بتایا تو ایک دم سے میرے ذہن میں یہ نام گونج گیا۔ اس کے بارے میں سنا ہی کرتا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی اس علاقے میں کبھی بڑی دہشت ہوا کرتی تھی۔ وہ ان نوجوانوں کے لئے بڑا ہیرو تھا جو کسی نہ کسی طرح جرائم کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں تعلیم نہ ہو وہاں جرائم پیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں پیدا کرنے والے یہی جاگیردار، وڈیرے اور زمیندار ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد چھا کے کو معلوم ہو گیا کہ وہ کس وجہ سے میرے پاس آیا ہے۔

”یہ کب سے تیرا جاننے والا ہے، تو نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“

”کافی عرصے سے، ہم نے ایک دوسرے سے کام لئے ہیں۔ پر اتنا واسطہ نہیں تھا۔ میں اس تعلق کو چھپا کر ہی رکھتا رہا ہوں، اس جیسے اور یہ نہیں کتنے تعلق ہیں، اب کس کس کا ذکر کروں۔“ چھا کے نے بتایا تو میں نے پوچھا

”ہاں، تو بتا، کیا کر آیا ہے؟“

”ان سب لوگوں کو پیغام دے آیا ہوں۔ آگے سے کوئی حیران ہوا اور کوئی مسکرا دیا۔ اب پتہ نہیں ان لوگوں کے دل میں کیا ہے۔“ چھا کے نے کہا تو زلفی نے تجسس سے پوچھا

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟“

اس پر چھا کے نے مختصر انداز میں اس سے کہہ دیا تو وہ سوچتے ہوئے بولا

”میں سمجھ گیا ہوں کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ بس ذرا سی تصدیق کرنا ہوگی۔“

لئے کہہ رہا ہوں کہ شاہ زیب کے بارے میں سازش کا گواہ تو میں خود ہوں۔“

”اسے گمان بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح واپس آؤ گے اور حویلی کے ساتھ ساری جائیداد بھی تیرے اشارے پر ہوگی۔ اب وہ تمہیں اپنے راستے کا کاٹنا سمجھ رہا ہے۔ اور سازش ہی کے ذریعے ہی ختم کرنا چاہتا ہے۔“ چھاکے نے جواب دیا تو جہاں بولا

”یار تم لوگ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ ابھی جاتے ہیں اور اس کا کام ہی ختم کر دیتے ہیں۔ نہ وہ رہے گا اور نہ کوئی سازش۔“

”یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے بعد ہم بھی انہی میں سے ہی ہو جائیں گے۔ ضرورت ہوئی تو یہ کام بھی ہو جائے گا۔ ہم نے یہاں رہنا ہے جہاں، اور علاقے میں اپنی ساکھ بنانی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ دشمن سانپ کی مانند ڈنگ مارے گا۔ فی الحال سانپ کا زہر نکالنا ہے، اس کا سر نہیں چکنا۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ الجھتے ہوئے بولا

”مجھے تمہاری منطق کی سمجھ نہیں آتی، میں تو کہتا ہوں کہ عوام کو پتہ چلنا چاہئے کہ ہم ان سانپوں کا نہ صرف زہر نکال سکتے ہیں بلکہ ان کا سر بھی پکل سکتے ہیں۔“

”نہیں! ہم نے خوف کی فضا طاری نہیں کرنی۔ ایسا ظالم لوگ کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو لوگوں کو شعور دینا ہے، انہیں بتانا ہے کہ ان کا حق کیا ہے۔ فطرت نے انہیں جو آزادی دی ہے، وہ اس کے مطابق جییں۔ ہمیں لوگوں کی محبت چاہئے۔“ میں نے کہا تو جہاں کا دم اچکا کر رہ گیا۔

”تو محبت صاحب، پھر کرنا کیا ہے؟“ چھاکے نے پوچھا

”ابھی تم نے صرف یہ کرنا ہے کہ علاقے میں اپنے لوگوں کو پھیلا دو، پتہ کرو کہ آخر وہ کیا رہا ہے؟“

”سمجھو، ہو گیا۔“ چھاکے نے کہا

”تم یہ کرو۔ میں اور جہاں افضل رند ہاوا سے مل کر آتے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے غور سے مجھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔ میں نے سیل فون نکال کر رند ہاوا کا نمبر پیش کیا۔ اس کا فون بند تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد فون کرنے کا سوچ کر سیل جیب میں رکھ لیا۔ پھر جہاں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا

”چل، حویلی کی خبر لیں، ادھر جا کر نیٹ پر بھی کچھ دیکھتے ہیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ اٹھا اور گاڑی نکالنے چل دیا۔ میں نے اندر جا کر سوئی سے پوچھا کہ وہ جانا چاہے گی؟ وہ بھی تیار ہو گئی۔ ہم نے اماں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی چلے گئے۔

بظاہر سکون تھا۔ کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ صرف میلے والی بات سامنے تھی۔ میں حویلی کے لان میں اسی چھتری تلے بیٹھا ہوا تھا، جس کے نیچے کبھی شاہ دین بیٹھا کرتا تھا، میرے پاس جہاں اور تانی بیٹھے ہوئے تھے، ہمارے درمیان یونہی کپ شپ چل رہی تھی۔ ابھی مجھے خیال آیا کہ مجھے افضل رند ہاوا کو فون کرنا ہے۔ میں نے سیل نکالا اور رابطہ کیا۔ لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔

”بڑی عمر ہے جمال تمہاری۔ میں ابھی تمہیں فون کرنے والا تھا۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا

”خیر تو ہے نا؟“

”ہے بھی اور نہیں بھی، یہ تو وقت بتائے گا، ویسے خبر سن لو، چوہدری شاہنواز کی ضمانت ہو گئی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے۔ شاہ زیب اور ملک سجاد اسے لینے عدالت میں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ تینوں اب اکٹھے جائیں گے۔“ اس نے بتایا

”تیرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چوہدری شاہنواز، ملک سجاد اور شاہ زیب ایک ہو گئے ہیں۔“ میں نے پوچھا

”جی، اور دوسری اطلاع یہ ہے کہ شاہ زیب اب اپنی زمین واپس لے گا اور پوری طرح سوئی بی بی کا مقابلہ کرنے آ رہا ہے۔“ اس نے مزید کہا تو میں نے پوری توجہ سے پوچھا

”یہ اطلاع دی کس نے؟“

”یار میرے بندے ہیں نا ان کے ارد گرد، خیر تم گھبرانا نہیں، میری بات ہو گئی ہے، کچھ دیر بعد کوئی نہ کوئی بندہ تمہارے پاس ضرور پہنچے گا۔“

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جہاں اور تانی میرا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ بات کس نوعیت کی ہوگی۔ میں نے کال کی تفصیل بتائی تو جہاں نے کہا

”میرے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا کہ دشمن خود ہی چل کر ہمارے پاس آ رہا ہے۔“

”لیکن اس کے لئے پوری پلاننگ کی ضرورت ہوگی۔ خیال رہے کہ تینوں نے اپنے طور پر انتقام لینا ہے، اور وہ کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”چل، دیکھ کون تجھ سے آ کر بات کرتا ہے۔ پھر اپنی پلاننگ کر لیں گے۔“ تانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ پھر بولا

”یہ سارا کچھ جو ہو رہا ہے، یہ سارے حالات جو بن رہے ہیں، کیا ہم نے بنائے ہیں؟“

”نہیں تو؟“ تانی نے کہا

”تو پھر سوچنا سمجھنا کیسا؟ حالات جیسے بھی ہوں، ہم نے اپنا دفاع کرنا ہے۔ ہمارا مقصد صرف فتنے کو ختم کرنا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ ماحول جو ایک دم سے کھردرا ہو گیا تھا، وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم باتیں کرتے، باہر سے ملازم نے آ کر بتایا کہ کوئی صاحب ہیں جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک خاتون بھی ہے۔

”کون ہیں، یہ پوچھا؟“

”شکل سے وہ غیر ملکی لگتے ہیں، یہاں کے نہیں ہیں۔“ ملازم نے کہا۔ تعجبی تانی نے تیزی سے کہا

”اسے اچھی طرح چیک کر کے گاڑی وہیں کھڑی کر لینا اور انہیں ادھر بھیج دو۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ ملازم نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ ٹھیک انہی لمحات میں جہاں کا فون بج اٹھا۔ اس نے اپنا سیل دیکھا اور ماتھے پر تیوریاں ڈالتے ہوئے کہا

”نمبر کوئی نہیں ہے، شاید روپی سے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اسپیکر آن کر کے فون کال ریسیو کر لی

”ہیلو جہاں، جسمیند ربات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی تو جہاں نے پوچھا

”او جسمیند ر، کیا حال ہے تیرا، کدھر ہو؟ اور اتنے عرصے بعد کال کی؟“

”میں، ادھر کینیڈا میں ہی ہوں۔ کال اس لئے کی کہ ابھی تمہارے گیٹ پر، بلکہ، جمال کے گیٹ پر، نہیں میرا مطلب ہے سوئی بی بی کی حویلی کے گیٹ پر دو مہمان آ کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ہی بندے ہیں۔“ جسمیند ر نے ایک ہی سانس میں اپنی معلومات بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے بارے میں سب جانتا ہے۔

”کون ہیں وہ، کس لئے آئیں ہیں وہ؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا

”اپنے ہی لوگ ہیں، دوست ہیں میرے۔ اور وہ جو بات کریں گے، وہ خود ہی کریں گے۔ حالات جو بھی ہوں، مجھے

یقین ہیں کہ تم سب ان کے ساتھ سلوک اچھا کرو گے، وہ مہمان ہیں تمہارے۔“ جمسید نے دوسرے لفظوں میں ہمیں احساس دیا کہ اگر بات سمجھ میں آتی ہے یا نہیں آتی، ان کے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کیا جائے۔

”ٹھیک ہے، میرے خیال میں وہ آگے ہیں۔“ جہال نے دور سے ایک نوجوان جوڑے کو آدیکہ کرکھا تو جمسید ر بولا

”بعد میں کال کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

میرے سامنے لان کے درمیان پختہ راہداری پر نوجوان جوڑا چلتا چلا آ رہا تھا۔ لڑکے نے رائل بلیوسوٹ کے ساتھ ہلکی نیلی شرٹ اور سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ لمبے قد کا کسرتی بدن والا، اس کے ساتھ سفید کڑتا، کالی جینز والی لڑکی تھی جس کے بال بوائے کٹ تھے۔ اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا بیگ کاندھے پر تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر سیدھے ہی ہماری طرف آ گئے۔

”تانی، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔“ جہال نے کہا تو تانی اٹھ کر دوڑ چلی گئی۔ وہ وہاں سے ہٹتی نہیں بلکہ فون پر ہی سب کہہ دیا۔ وہ ان کی طرف سے الٹ تھی، تانی کی یہ ادائیگہ بہت اچھے لگی تھی۔ نوجوان نے آتے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور انگریزی میں بولا

”ہیلو، میں جان ہوں، برطانیہ سے۔ تم جہال ہونا اور یہ جہال۔“

”میں جہال ہی ہوں۔“ اس نے ہاتھ ملایا تو جان نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھادیا

”میں کرسینا، فرانس سے“

وہ دونوں ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے تو نوجوان نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا

”میں آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا، مگر آپ کے بارے میں مجھے بتایا ضرور گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جمسید نے ہمارے بارے میں آپ کو فون کر دیا ہوگا۔“ اس نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا

”ہاں بتا دیا ہے۔ لیکن اس نے تم دونوں کی آمد کا مقصد نہیں بتایا۔“ جہال نے کہا

”اگر آپ کو جلدی ہے تو میں چند منٹ میں اپنی بات ختم کر دیتا ہوں لیکن اگر مجھے اپنی بات سمجھانے کا موقعہ دیں گے تو میں پوری تفصیل سے بات کہوں گا بھی اور اگر آپ چاہیں گے تو میں سمجھانے کی کوشش بھی کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، تم اطمینان سے اپنی بات کہو۔“ جہال نے کہا تو اس دوران میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چھانکے کی کال تھی۔

میں نے فون رسیو کیا تو چھانکے نے تیزی سے کہا

”اوئے زلفی نے کاروائی ڈال دی، اس نے وقاص کو گولیاں مار دیں ہیں۔“

یہ خبر بلا دینے والی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں اس اطلاع پر کیسے رد عمل کا اظہار کروں۔

میں ان کے سامنے یہ فون نہیں سن سکتا تھا، اس لئے اٹھ کر ڈرافٹ صلی پر چلا گیا اور دھیسے لہجے میں پوچھا

”یہ کیسے ہوا؟ کچھ پتہ چلا؟“

”ہونا کیا تھا۔ زلفی یہاں سے گھر گیا، پروین کو چھوڑا اور سیدھا وقاص کے ڈیرے پر چلا گیا۔ وہ کہیں جانے کے لئے اپنی لینڈ کروزر پر سوار ہو رہا تھا۔ زلفی نے جاتے ہی فائر کھول دیا۔ پورا برسٹ اس کے بدن میں اتار دیا، ساتھ میں دو گارڈز بھی پھڑک گئے ہیں۔“ اس نے بتایا تو میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا

”پھر! وقاص بچا تو نہیں ہوگا۔“

”وہ نہیں رہا اس دنیا میں۔“ چھانکے نے مزید بتایا تو میں نے پوچھا

”اور زلفی کہاں ہے؟“

”اس بارے کوئی پتہ نہیں، وہ ڈیرے پر گیا، اس نے فائرنگ کی، جب تک کسی کی سمجھ میں آیا، وہ وہاں سے بھاگ گیا، پورے علاقے کے لوگ ہائی الرٹ ہیں مگر پھر بھی زلفی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔“

”خیر اس کی خبر رکھنا، اگر رابطہ کرے تو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بتانا، میں ابھی مصروف ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں۔“ میں نے اسے سمجھایا اور فون بند کر دیا۔

جان اور کرسینا بظاہر جہال کی بات سن رہے تھے، لیکن ان کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ میں جیسے ہی ان کی سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھا تو جان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

”ہم دراصل ایک عالمی انسانی حقوق کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگ امن، تعلیم اور انسانی وسائل کے لئے کام کرتے ہیں۔ ہمارا مرکزی دفتر برطانیہ میں ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ہماری شاخیں ہیں۔ یہاں پاکستان میں بھی شاخ ہے۔ ہم اسی سلسلے میں آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں، تاکہ آپ کو ہم اپنے بارے میں بتا سکیں۔“

”بہت سارے اداروں کو آپ نے دعوت دی ہے، ان میں ایک ادارہ ہمارا بھی ہے۔ آپ تعلیمی میدان میں یہاں کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہماری خدمات حاضر ہیں۔“ کرسینا نے بتایا تو میں نے کہا

”آپ کو میں نے دعوت نہیں دی۔“ میں نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا

”سوئی بی بی کی طرف سے خط تھا۔ ہم اس کی تفصیلات کے لئے آئے ہیں۔“ کرسینا نے کہا تو ایک لمحے کے لئے میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چند لمحے بعد میں نے ان سے کہا، ”آپ پلیز، ہمیں کچھ وقت دیں، تانی بی بی ہی آپ سے بات کریں گی۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھا تو جہال بھی میرے ساتھ اٹھ آیا۔ میں حویلی کے اندر گیا اور جہال سے پوچھا

”یہ کیا ڈرامہ ہے؟ جمسید رکا تعارف اور یہ لوگ دوسری بات کر رہے ہیں۔“

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ اس نے سیل سے جمسید کو کال ملائی، لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ جہال نے ان دونوں کے بارے میں بتایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا

”بظاہر ان کا یہی کام ہے۔ لیکن اصل میں ان کے جو کام ہیں، ان کی تفصیلات میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا، یہ یاد رکھو کہ میں نے انہیں تمہارے پاس بھیجا ہے، میں نے ہی انہیں معلومات دی ہیں۔ لیکن وہ لوگ مجھ سے براہ راست واقف نہیں ہیں، میں ان کے بارے میں سب جانتا ہوں۔“

”کچھ تو بتاؤ، ان کے بارے میں، ایسے ان سے کوئی کیا بات کرے۔“

”انہوں نے وہی کچھ بتانا ہے جو وہ بظاہر کرتے ہیں۔ اس نے پس منظر میں تفصیل یہ ہے کہ بلاشبہ ان کا تعلق عالمی انسانی حقوق کی تنظیم سے ہے لیکن ان کا ٹارگٹ وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے اپنے علاقے میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ جو بالآخر سیاست کی دنیا میں داخل ہو کر اسمبلی تک پہنچ سکتے ہیں۔ اٹھارہ کروڑ عوام کے ذہن بدلنے کی بجائے وہ چند ایسے لوگوں پر بے ہوا نوازشات کرتے ہیں۔ اور پھر ان سے اپنے مقاصد حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی سیاسی پارٹی کوئی بھی ہو، وہ ہر طرف سے اپنا فائدہ لینے میں کامیاب ہیں۔“

”ان کا اصل مقصد کیا ہے؟“ جہال نے پوچھا تو اس نے کہا

”اب تم بچوں والی بات کر رہے ہو، یا عالمی طاقتوں کی ایجنڈا کیا ہے؟ وہ مختلف روپ میں اپنے خونی منہ بٹھاتے ہیں، یہ بھی سمجھو ان کا ایک منہ ہے۔“

”اب بتاؤ، ان کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟“ جہال نے پوچھا

”ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرو اور انہیں پھر آنے کا کہہ دو۔ اس دوران تمہیں روپی سے بھی معلومات مل جائیں

گی۔ اگر تم لوگ ان سے مدد لیتا چاہو تو یہ بہت زیادہ مدد دے سکتے ہیں۔“ ہجیمینڈ نے مشورہ دیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے، یہ ابھی صرف تعارف چاہتا ہے۔ میں نے جہاں کے ذمے لگایا کہ وہ ان کے ساتھ بات چیت کرے۔ جہاں چلا گیا تو میں نے رندھاوا کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی تو میں نے پوچھا ”تمہارے کسی بندے نے آنا تھا، آیا کیوں نہیں، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”آنا تو تھا، لیکن وہ غیر زادہ وقاص قتل ہو گیا ہے نا، اس لئے تھوڑی سی پچھل ہے۔ میں خود آتا ہوں اسے اپنے ساتھ لے کر۔“

”اور وہ دوپٹھی جوادھر آنا چاہ رہے تھے؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا

”وہ آئیں گے، یہ ان میں طے ہے۔ شاہنواز انہیں لے کر آئے گا۔ میں اسی کے لئے تو سارا بندوبست کرنا چاہ رہا تھا، خیر ملتے ہیں یا بعد میں اور تفصیل طے کرتے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور حویلی کے اندر چلا گیا۔

میں نے نیٹ آن کیا اور روہی کی طرف سے کسی متوقع ہدایات کے لئے میل دیکھی۔ وہاں میرے لئے بہت کچھ تھا۔ جان اور کرشنا کے بارے میں تفصیل درج تھی۔ وہاں ان لوگوں کے بارے میں بھی فہرست تھی جو اس تنظیم کے پروردہ تھے اور اس وقت سیاست میں طاقتور تھے۔ انہیں بہت اچھا ریپانس دینے کو کہا گیا تھا۔ تفصیلات پڑھنے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ لیکن بنیادی معلومات مل گئیں۔ میں نے نیٹ بند کیا اور واپس لان میں آ گیا جہاں میز پر ڈھیر سارے لوازمات سجے ہوئے تھے۔ سوئی، سارہ اور جہاں سے وہ باتیں کر رہے تھے۔ سوئی ان سے کہہ رہی تھی۔

”آپ کی خدمات بہت اچھی ہیں۔ اور لوگ بھی ہمارے رابطے میں ہیں۔ بہت جلد ہم آپ سے رابطہ کرتے ہیں۔“

”ہم انتظار کریں گے، اور آپ ہماری بہترین خدمات سے استفادہ کریں گے، اس کی ہم پوری توقع رکھیں گے۔“

جان نے مسکراتے ہوئے کہا تبھی کرشنا اٹھتے ہوئے بولی

”تو پھر ہمیں اجازت دیں۔“

”نہیں آپ ہمارے ساتھ لچ کریں گے، اس وقت تک آپ آرام کر سکتے ہیں، چاہیں تو گپ شپ کریں۔“ جہاں نے کہا تو جان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اپنے گھر میں نیم کے درخت تلے پڑا، رندھاوا کا انتظار کر رہا تھا کہ ایسے میں تانی آگئی۔ وہ میری سامنے والی چار پائی پر آ بیٹھی پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولی

”یہ وقاص کا قتل ہمارے لئے کوئی مشکل پیدا کر سکتا ہے؟“

”میرے خیال میں تو آسانی ہی ہوئی ہے، تم نے ایسے کیوں سوچا؟“ میں نے اس سے پوچھا

”ظاہر ہے اس کی آخری رسومات پر شاہنواز کے ساتھ، ملک سجاد اور شاہ زیب بھی آئیں گے، انہیں یہاں آنے کا جواز مل گیا ہے۔“

”میں انہیں ویسے بھی یہاں آنے سے نہیں روک سکتا۔ ہاں اگر یہاں آکر وہ کوئی ایسی ویسی بات کرتے ہیں تو پھر میرا خیال ہے انہیں معاف نہ کیا جائے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولی

”تمہارے خیال میں کیا اب وہ میلہ لگانے کی ضد کریں گے، ظاہر ہے انہوں نے ہمیں گھیرنے کے لئے یہ سارا اہتمام کر رہے تھے۔“

”وہ نہیں، اب ہم چاہیں گے کہ میلہ لگے، وہ بھی ہماری مرضی کے مطابق، باقی جو حالات ہوں گے، اس کے مطابق

دیکھ لیں گے۔“ میں کہہ چکا تو ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا، میں نے تانی کے چہرے پر دیکھا اور پیار بھرے لہجے میں پوچھا، ”تانی، تم کہیں بور تو نہیں ہو گئی ہو، یہاں کی زندگی سے اکتا گئی ہو؟“

”میں اکتائی نہیں، بلکہ اتنے سارے لوگوں کے درمیان رہنے کا مجھے مزہ آرہا ہے، بس ایک شکایت ہے مجھے۔“ اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا

”وہ کیا شکایت ہے؟“ میں نے پوچھا

”تم مجھے وقت نہیں دیتے۔ میں جانتی ہوں کہ اب تمہارا اپنا کوئی وقت نہیں ہے لیکن پھر بھی، میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، ہر دم ہر پل۔“

”اوکے، میں کوشش کروں گا کہ تم میرے ساتھ رہا کرو، اب خوش؟“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ پھر کراچی میں گزرنے والے وقت کی بابت بتاتی رہی۔ اسی دوران رندھاوا کی کال آگئی کہ وہ آگیا ہے۔ میں نے اسے اندر آ جانے کو کہا تو وہ اندر صحن ہی میں آگیا۔

رندھاوا اب ڈی ایس پی بن چکا تھا۔ ایک بہت بڑا محرکہ اس نے سر کیا تھا۔ راکے ایجنٹ پکڑنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن شاہنواز کا قح جاننا، گویا سانپ کو زخمی کر دینے کے مترادف تھا۔ اس وقت وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبا ترنگا، خوربو نو جوان تھا۔ انہیں دیکھتے ہی تانی اٹھ گئی۔ علیک سلیک کے بعد رندھاوا نے اس نو جوان کا تعارف کرایا

”یہ شعیب ہے، اور صاف بات بتا دوں کہ یہ اپنے ملک کی خفیہ ایجنسی کا آفیسر ہے۔ اس کی ڈیوٹی تمہارے ساتھ لگائی جا رہی ہے، تمہارے ساتھ مطلب اس علاقے میں، ظاہر ہے اسے یہاں رہنے کا کوئی جواز چاہئے ہوگا۔“ رندھاوا کہہ چکا تو میں نے براہ راست شعیب کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے، کہاں دیکھا ہے، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ لہجہ بھر سوچتے رہنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا

”کیسا جواز چاہئے تمہیں؟“

”حوالی میں کوئی ایسی جاب، جس سے میں آزاد ذرا دھرا دھرا آ جا سکوں۔“

”ہو گیا، تم ابھی سے وہاں جاب پر ہو۔ اور میرا نہیں خیال کہ تمہیں مزید کوئی بات سمجھانا ہوگی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا

”میں سمجھتا ہوں، آپ بے فکر رہیں۔“

”وقاص کی نماز جنازہ مغرب کے بعد ہے۔ آؤ گے؟“ رندھاوا نے پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”کیوں نہیں، ضرور آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا تو تانی نے چکن کے دروازے پر ہی سے کہا

”چائے بن گئی ہے، پی کے جائیں۔“

اس پر رندھاوا ایک دم سے چونکا اور بولا

”مجھے تو خیال ہی نہیں تھا۔ یہ بھی یہاں پر ہیں۔“

”تعارف ہے اس سے؟“

”ہاں، ان کے بارے میں سنا ہے۔“ اس نے کہا اور چار پائی پر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ شعیب کی ڈیوٹی کیوں لگائی گئی ہے ادھر؟“

”یہ بی بتا دیتا ہے۔“ اس نے شعیب کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ دھیسے سے لہجے میں بولا

”شاہ دین یہاں کا ایم این اے تھا، اور شاہنواز ایم بی اے۔ یہ دونوں بیرونی قوتوں کیلئے کام کرتے تھے، خاص طور پر ’را‘ کے لئے۔ ان کے بڑے بڑے پراجیکٹ تھے، جنہیں آپ کی مدد سے ختم کیا گیا۔ میں یہاں پر اس لئے ہوں کہ یہ دوبارہ کم از کم اپنے علاقے میں کوئی ایسا کام نہ کریں اور انہیں کبھی بھی اسلحہ کارکن منتخب نہ ہونے دیا جائے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ان کے پراجیکٹ کیا تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ایسے میں تانی چائے کے کپ ایک ٹرے میں رکھے آگئی۔ سب نے کپ لئے تو وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔

”میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ میں نے اسے خصوصی طور پر اسٹڈی کیا ہے، فی الحال اتنا جان لیں کہ یہ اعلیٰ سطح کی معلومات دیتے تھے، اپنے دشمنوں کو ختم کرتے تھے، ٹارگٹ لوگوں کا قتل، خوف و ہراس، خاص طور پر تعلیم دشمنی۔“ اس نے اختصار سے بتایا تو میں نے پوچھا

”وقاص کی یاری شاہنواز سے تھی لیکن وہ شاہ دین کے خلاف تھا، اب شاہ زیب.....“

”میں بتاتا ہوں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا، پھر لمحہ بھر سانس لے کر بولا

”وقاص خدایہ پاپا اے بننا چاہتا تھا، اس لئے ایک لمبی سازش کر رہا تھا۔ اب شاہ دین نہیں رہا تو شاہنواز ایم این اے اور وقاص ایم بی اے بننا چاہتا تھا۔ اب وقاص کی جگہ شاہ زیب لے گا۔ وہ اب سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسمبلی تک رسائی لیں۔ اور ایسا ہم نے ہونے نہیں دینا۔“

”مستقبل کی بات تو ایسے ہی سمجھ میں آتی ہے۔ یورپی یونین کے لوگ بھی اس علاقے میں دلچسپی رکھتے ہیں، کیا وہ بھی ایسے ہی ہیں؟“ میں نے پوچھا

”طریقہ واردات مختلف ہے اور ظاہر ہے، جو آدمی کروڑوں اربوں روپے لگا کر رکن بنتا ہے، اس کی اپنی دلچسپی تو ہے تا کہ اس سے دو گنا مال کمائے۔ وہ کئی گنا مال لگاتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ جمال صاحب! تاریخ شاہد ہے کہ جب تک کوئی قوم مضبوط ہے، اسے کوئی شکست نہیں دے سکا، کھوکھلی قوم کو اپنی انگلیوں پر نچایا جاسکتا ہے۔ اور یہ لوگ قوم کو کھوکھلا کرنے کا جرم کر رہے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی تو شاید اچھی بن جائے لیکن آئندہ آنے والی نسلیں کو تاریکی میں دھکیل رہے ہیں۔“

”فکر نہیں کرو شعیب، کم از کم یہ لوگ اب ہماری انگلیوں پر تاجیں گے۔“ میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا تو وہ لمبی سانس لے کر رہ گیا۔

”ٹھیک ہے، میں اب چلتا ہوں، وقاص کے ہاں ہی ملاقات ہوگی۔“ رندھاوا نے اٹھتے ہوئے کہا تو شعیب بھی اٹھ گیا۔

”میں آتا ہوں حویلی۔“

وہ دونوں چلے گئے۔ تانی نے میری طرف دیکھ کے کہا

”لگتا ہے، بہت ساری قوتیں یہاں جمع ہو رہی ہیں، تم نے محسوس کیا؟“

”ہاں! ایسا ہوتا ہی ہے تانی، جب بھی کہیں اچھائی ہونے لگتی ہے، تبھی وہیں شیطانی قوتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وقاص کی نماز جنازہ پر لگتا تھا پورا علاقہ ہی اُمنڈ آیا ہے۔ ایک بڑے میدان میں اس کا اہتمام تھا۔ میں چھاکے کے ساتھ جان بوجھ کر دیر سے پہنچا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسے موقع پر میرا دشمنوں سے آنا سامنا ہو۔ ہم نے کار ایسی جگہ لگائی،

جہاں سے آسانی کے ساتھ نکلا جاسکے۔ میں پچھلی صفوں میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم خاموشی سے نکلے اور نورنگری طرف چل پڑے۔

خلاف توقع چھاکا بہت خاموش تھا۔ جیسے ہی ہم گاؤں کے قریب آئے تو اس نے کہا

”ڈیرے پر پہلو، بھیدے کے پاس۔“

”خیر ہے؟“ میں نے پوچھا اور کار کا رخ اس جانب موڑ دیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے پر جا پہنچے۔ میں کار سے نکل کر محن میں پڑی چارپائی پر بیٹھنے لگا تھا کہ چھاکے نے کہا

”اندر چلو۔“

میں اندر کی جانب بڑھ گیا۔ میں کمرے میں گیا تو سامنے زلفی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ مجھ ہی سے رابطہ کرے گا۔ میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا کہ پیچھے کھڑے چھاکے نے کہا

”یہ صبح کا یہیں ہے۔ اب اس کا کیا کرنا ہے، یہ تم بتا دو۔“

”کرنا کیا ہے، ادھر رہے گا تو کسی نہ کسی کی نظر چڑھ جائے گا۔ ظاہر ہے ہمارے پاس ہونے کی وجہ سے وقاص کا قتل ہمارے کھاتے پڑ جائے گا۔“ میں نے کہا تو چھاکا بولا

”تو پھر کہاں رکھیں، اب پولیس کے حوالے تو کریں گے نہیں۔“

”ایسا کرو، صبح سویرے تک ٹھہرو، میں یہاں سے اسے نکال لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“ میں نے زلفی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا

”مجھے دور کہیں مت بھیجنا، میں یہیں کہیں رہنا چاہتا ہوں۔ میں اب پروین سے بھی زیادہ دور نہیں رہ سکتا۔“

”وہ بھی تیرے پاس ہی رہے گی۔ بہت جلد وہ تجھ سے آن لے گی۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا اور واپسی کے لئے نکل آیا۔ محن میں آکر میں نے کہا

”چھاکے! اب یہ کام تمہارا ہے، اسے گاڑی میں ڈالو اور کرٹل سرفراز کے فارم ہاؤس چھوڑ آؤ، کسی کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ زلفی ہے کہاں، کسی اپنے کو بھی نہیں۔ آج ہی یا جب بھی وقت ملے پروین کو بھی اس کے پاس چھوڑ دینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا تو میں نے فون پر کرٹل سرفراز کے نمبر پیش کئے۔ رابطہ ہو جانے پر میں نے اشارے کئے میں بات بتائی۔ انہوں نے زلفی کو بھیج دینے کے لئے کہا تو میں نے اسی وقت چھاکے کو روانہ کر دیا، خود بانیک لے کے اپنے گھر آ گیا۔

رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ میں اور سوہنی چھت پر تھے۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر کھڑی مجھے دیکھے چلے جا رہی تھی۔ اس نے جان، کرشینا اور شعیب کے بارے تفصیلی بات کر کے سمجھ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب سوہنی مجھ سے ذرا فاصلے پر رہتی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس میں شدت نہیں رہی یا اس نے خود پر قابو پا لیا ہے، یا یہ اس کی ناراضگی کا اظہار ہے۔

مجھے اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے یہی باتیں پوچھیں تو وہ بولی

”جمال! میں نے تمہیں اس دنیا میں جانے سے روکا تھا، لیکن میں غلط تھی۔ شاید کسی مقصد کو حاصل کر لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا، جتنا اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”یہ احساس کیسے ہوا؟“ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا

”بہت کچھ سوچا میں نے، اپنا حق نہیں حاصل کر سکتی تھی، اب کر تو لیا، لیکن اگر طاقت نہیں ہوگی تو میں اسے کیسے سنبھال

سکتی ہوں۔ اور اس وقت جو قوتیں ہماری دشمن ہیں ان کا بس چلے تو یہ سب اگلے ہی لمحے ہمیں ختم کر دیں۔ یہ جو گلشن ہم نے بنالیا ہے اور جس کی ابھی تعمیر نو بھی نہیں ہو سکی، اس کی حفاظت کیسے ہوگی، بلاشبہ ہمیں طاقت چاہیے ہوگی۔“ اس نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے جذب سے کہا تو مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ میں ان چند لمحوں میں ہر شے بھول جانا چاہتا تھا۔ سوئی کا قرب پا کر اب مجھے بھی سرشاری محسوس ہوتی تھی۔

”چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یہ بتاؤ، پہلے تم میرے قریب رہنے کی کوشش کرتی تھی، اب تم مجھ سے دور رہتی ہو، اس کی وجہ کیا ہے؟“ میرے یوں پوچھنے پر وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی

”جمال۔! جب ذمے داری کا احساس نہیں ہوتا تو سوچیں کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ ہمارے مقصد بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن اب ذمے داری زیادہ ہے تو سوچیں بھی مختلف ہو گئی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی، اب تو سمجھو مجھے تم سے محبت ہی نہیں عشق ہو گیا ہے۔ تم جہاں بھی رہو، مجھے یقین ہے کہ تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“

”میں اس یقین کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں۔“ میں اس کی باتوں سے سرشار ہوتا ہوا بولا تو وہ غماز آلود لہجے میں بولی

”یہ تو میں بھی نہیں جانتی، بس اماں نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ جس سے محبت کی جاتی ہے، اس پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اعتماد کے بغیر محبت کا بے۔ محبت تو میرے اندر ہے نا اور اس کی آبیاری میں نے ہی کرنی ہے۔ جتنے یقین کے ساتھ کروں گی، اسی قدر پرسکون ہو جاؤں گی۔“

”جانتی ہو یہ محبت اور عشق ہوتے کیا ہیں؟“ میں نے پوچھا تو وہ لذت آگہیں لہجے میں بولی

”محبت صرف خوبیوں سے کی جاتی ہے، اور عشق خوبیوں، خامیوں سے ماورا ہوتا ہے، اس میں صرف ذات سامنے ہوتی ہے۔ اور تم میرے سامنے ہو، ہر وقت، ہر لمحے۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں۔“

”تمہیں ایسی باتیں سکھاتا کون ہے؟“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی اچانک میرا سیل فون بج اٹھا۔ سارا سکون ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے فون نکالا تو وہ اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال رسیو کی۔

”جمال۔! تمہیں برا تو لگے گا لیکن میں بتا دوں کہ میں چوہدری شاہنواز بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے نفرت میں بھگی ہوئی آواز میں کہا گیا تو میں سکون سے بولا

”اچھا کیا بتا دیا کہ تم شاہنواز بات کر رہے ہو۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”صرف تمہاری موت چاہتا ہوں۔ خواہش ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں۔“ اس نے اسی نفرت سے کہا

”میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا اور پھر خواہشوں کا کیا ہے، وہ تو بے چاری ایک پدی بھی کرتی ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ تڑپ کر بولا

”میں چاہتا تو ابھی تم بات بھی نہ کر رہے ہوتے، جب تم وقاص کے ہاں سے واپس جا رہے تھے تو میرے آدمیوں کی نگاہ میں تھے۔ ایک گولی، تیری بولتی بند کر سکتی تھی۔ لیکن نہیں میں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔“

”کہاں آؤں، تیرے ڈیرے پر یا تیرے گھر پر، پھر دیکھتے ہیں کون مرتا ہے اور کون جیتا ہے، زندگی موت تو میرے رب کے ہاتھ میں ہے، جس نے، جب اور جیسے جانا ہے وہ مقرر ہے۔ بولو؟“ میں نے غصے میں کہا

”کہانا ایک گولی تجھے اگلے جہاں پہنچا سکتی ہے لیکن ایسے تھوڑی ماروں گا، سارا علاقہ تجھ سے عبرت پکڑے گا، اور ہاں، طوائف کی بیٹی سوئی سے کہہ دینا، میلے پر اسی نے ناچنا ہے۔ تیرے سامنے نچاؤں گا اُسے۔“ اس نے انتہائی نفرت سے اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، سوئی نے فون مجھ سے لے لیا۔ فون سے چھن کر آنے والی آواز اس نے سن لی تھی۔

”سن اُوئے بھجورے۔! اتنا بڑا بول مت بول، میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں تیری بیٹی نچا دوں گی۔ پر نہیں، میں عورت کی عزت کرتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ تجھے نچا دوں۔ اب میلہ بھی کتنی دور ہے۔ فقط چند دن، ہمت ہے تو مقابلے پر آ جانا۔ تیرے پیروں میں گھنگروں میں خود باندھوں گی۔“ اس نے کہا اور فون مجھے دے دیا۔ میں نے فون کان سے لگایا تو وہ

”گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔“

ہم دونوں میں چند لمحے خاموشی رہی، میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں مایوسی اور حسرت پھیل چکی تھی۔ شاید طوائف کی بیٹی ہونا اس کے لئے بہت بڑا طعنہ بن چکا تھا۔ تبھی میں نے اسے اپنی گلے لگایا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے اسے رونے دیا، کافی دیر بعد اس کا جی ہلکا ہوا تو آنسو پوچھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور نیچے کی طرف چل دی۔

میں سونا نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے جھاکے کی فکر تھی۔ وہ زلفی کو لے کر کرل سرفراز کے پاس گیا تھا۔ وہ جب تک وہاں بحفاظت پہنچ نہ جاتا، میں سو ہی نہیں سکتا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی، لیکن اس کا فون نہیں آیا تھا اور نہ ہی میری کال جا رہی تھی۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ مجھ سے لینا نہیں گیا۔ میں باہر والے کمرے سے نکل کر چھت پر جانے کے لئے صحن میں آ گیا۔ پچھلی رات کا چاند ابھر آیا تھا۔ تبھی میری نگاہ اماں والے کمرے پر پڑی، جس میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ کیا اماں جاگ رہی ہے؟ یہ سوچ کر میں اس کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے ہی سے میری نگاہ اندر پڑی، اماں کو نے والی چار پائی پر سو رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جائے نماز بچھائے سوئی بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ میں صرف اس کے بڑبڑانے کی آواز ہی سن سکا جو آنسوؤں میں بھگی ہوئی تھی۔ وہ روتے ہوئے انتہائی جذب سے دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا، دبے قدموں واپس صحن میں آ گیا۔ میرے لئے خوشگوار حیرت کی بات یہی تھی کہ وہ ہی سوئی ہے جو میلے دے دن مجھے ملتی تھی۔ اس گھر میں آئی تو نیم برہنہ تھی، اور آج..... اس میں کوئی شک نہیں کہ رب تعالیٰ، جسے چاہے اور جب چاہے ہدایت سے نواز دے۔ مجھے سمجھ آگئی تھی کہ وہ پرسکون انداز میں، اتنے یقین کے ساتھ باتیں کیسے کر سکتی ہے۔ میرے اندر خوشگوار ٹھنڈک کے ساتھ ایک نیا عزم بھی اتر گیا۔ مجھے اس وقت سوئی پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔ میں اسی کے بارے سوچتا ہوا صحن میں پڑی چار پائی پر لیٹ گیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے پہلا خیال چھاکے کا آیا۔ میں نے جلدی سے فون لیا اور اسے کال ملا دی۔ اگلے چند لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔

”میں واپس گاؤں آ رہا ہوں۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ سب کچھ حفاظت سے ہو گیا ہے۔“

”اچھا چل سیدھا ادھر ہی آنا، ناشتہ اکٹھے ہی کریں گے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر کے فریش ہونے چل دیا۔

☆.....☆.....☆

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ میں باہر والے کمرے میں بیٹھا ہوا میلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات جو شاہنواز نے دھمکی دی تھی، میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے جو علاقے میں خوف و ہراس پھیلا کر اپنے طاقت ور ہونے کا جو تاثر پھیلا یا ہوا تھا۔ اسے وہ ہر حال میں دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ ہمارا وجود ختم کر دیتے۔ میلے میں انہوں نے شر پھیلا نا ہی تھا۔ پہلے صرف اپنا تاثر بحال کرنا مقصد ہو سکتا تھا لیکن اب وہ وقاص کا انتقام بھی ہمیں سے لینا چاہتے تھے۔ ملک سجاد یونہی ان کا ساتھ دینے یہاں نہیں آ گیا تھا۔ وہ بھی زخمی سانپ تھا۔ شاہ زیب کی تو ایک طرح سے سلطنت چھن گئی تھی۔ اس کا بس چلنا تو اب تک ہمیں ختم کر چکا ہوتا۔ ایک طرف دشمنوں کا یہ اتحاد تھا، لازمی بات تھی کہ انہوں نے بلا سوچے سمجھے یہ چڑھائی نہیں کی تھی۔ وہ طاقتیں ان کے ساتھ تھیں جن کا نیٹ ورک ہم نے ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف جان اور کرسمینا کا یہاں آ جانا اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ یہاں ایسا کچھ ہے، جس سے انہیں فائدہ

مل سکتا ہے۔ انہیں وہ مہرے دکھائی دے رہے تھے، جو ان کے کسی کھیل میں کام آسکتے تھے۔ چاہے کسی رنگ ہی میں سہی، ان کا مقصد خیر خواہی نہیں تھا۔ تیسری طرف شعیب کی آمد ہمارے لئے جیسی بھی ہوتی، لیکن اس کی پہلی ترجیح اس کی اپنی الجھنی تھی۔ اسے اپنے مقاصد عزیز تھے۔ ہم اگر ان کے مطابق چلیں گے تو وہ ہمارے دوست ہیں، اگر ان کے مطابق نہیں ہیں تو انہیں دشمن بننے ذرا بگ وقت نہیں لگنا تھا۔ مختلف تو تھے ہمارے گرد گھیرا ڈال رہی تھیں۔ میں اسی بارے سوچ میں تھا کہ رندھاوا کا فون آگیا۔

”ایک خبر ہے جمال، اسے ذرا غور سے سننا۔“ اس نے متانت بھری آواز میں کہا

”بولو، کسی خبر ہے؟“ میں نے سکون سے کہا

”اب مجھے نہیں پتہ کہ یہ خبر تمہارے لئے کیسی ہے۔ خیر، تمہارے دوست جہاں بارے جہان بین کی اطلاع ہے کہ وہ جرائم میں ملوث ہے۔ اسی بارے جہان بین.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس بات کا نٹے ہوئے پوچھا

”جرائم والی بات درست نہیں۔ کہیں نہ کہیں سے غلط فیض ہوا ہے، کیا اس کا پتہ کر سکتے ہو؟“

”وہ تو معلوم ہو جائے گا، لیکن پھر بھی اسے یا تو واپس جانا ہوگا، یا پھر ویزہ بڑھائے گا۔ اطلاع کے مطابق اس کا ویزہ ختم ہونے والا ہے، پہلی صورت میں ممکن ہے کوئی بات نہ ہو لیکن دوسری صورت میں کوئی نہ کوئی الجھنی تمہیں تنگ کرے گی۔ تم اپنے دشمنوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو ایک دم۔۔۔ مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھا

”یاد رہے کہ یہ کہیں شعیب تو اس مقصد کے لئے یہاں نہیں آیا، مجھے ابھی بتا دے اگر بعد میں پتہ چلا تو.....“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے میری بات قطع کرتے ہوئے بولا

”جمال! اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے، ذرا سا بھی اعتماد ہے تو اسے دشمن مت سمجھنا۔ وہ سمجھو میں ہی ہوں۔ میں اس کا ضامن ہوں۔ میں اسے خود تم تک لایا ہوں۔ کیوں لایا ہوں، یہ میں تمہیں بعد میں تسلی اور تفصیل سے بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے میں کرتا ہوں جہاں سے بات۔ پھر بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے ایک دم سے پریشانی ہونے لگی تھی۔ میں جہاں کے ہونے سے بڑا حوصلہ محسوس کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اگر وہ جائے گا نہیں تو اسے چھپ کر رہنا ہوگا اور وہ غیر قانونی ہو جائے گا، پریشانی بڑھتی چلی جائے گی۔ ویزہ ختم ہو جانے والی بات تو ہو سکتی تھی لیکن جرائم والی بات کہاں سے آئی، اس بارے معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔

جہاں حویلی میں تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا لیپ ٹاپ میں مگن تھا۔ میرے بیٹھے ہی اس نے لیپ ٹاپ پرے کھسکا دیا اور میرے چہرے پر دیکھ کر بولا

”خیر ہے، بڑے سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو، کہیں تانی نے شادی کی فرمائش تو نہیں کر دی؟“

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے رندھاوا کی اطلاع کے بارے بتا دیا تو وہ بھی ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ پھر دھیرے سے بولا

”میری آج ہی جسمیندہ سے بات ہوئی ہے۔ اس نے بھی مجھے بتایا ہے۔ دراصل ’را‘ والوں نے میری اس وقت سے نگرانی شروع کر دی تھی، جب میں بھارت میں تھا۔ میں کینیڈا گیا اور وہاں سے فوراً ہی یہاں آ گیا۔ میں اس دوران ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہوں۔ ایک تو کس ختم کر دینے سے میں فوراً ہی ان کی نظروں میں نہیں آیا تھا، دوسرا میں یہاں رہا ہی نہیں تھا لاہور ہی سے سندھ چلا گیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تو ان کی نگاہوں میں آ گیا کہ وہی جہاں ہوں۔“ اس نے تفصیل بتائی تو میں نے پوچھا

”کیا اس نے یہ بات بتائی ہے کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟“

”صرف شک ہے، اور وہ بھی ’را‘ نے پیدا کیا، یہاں شہناز جیسے ان کے کارندے تو ہیں ہی۔“

”تو پھر کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا

”جیسے تم کہو، ویسے میں آج ہی اسلام آباد نکلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ویزہ بڑھ جائے گا۔ یہ میلہ تو بھگتا لیں۔ پھر دیکھا جائے گا، ویسے بھی ویزہ ختم ہونے میں چار دن باقی ہیں ابھی۔“

”یہ جسمیندہ کیا چیز ہے، اس کی اتنی رسائی ہے کہ ہر معاملے کی خبر دے دیتا ہے، ایسا کیسے؟“ میں نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا

”یار لوگ روہی جیسے دیرانے میں بیٹھ کر نیٹ ورک چلا رہے ہیں، وہ تو پھر کینیڈا میں ہے۔ دولت اور طاقت کے ساتھ اگر عقل بھی استعمال کر لی جائے تو ممکن ہے۔ وہ میدان کا آدمی نہیں ہے لیکن پس پردہ وہ اپنا کھیل اس طرح کھیل رہا ہے کہ ہر جگہ اس نے اپنے مہرے جمادیئے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ خود کسی کے کھیل کا مہرہ ہے۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا

”دیکھو جہاں! اگر آرام سے ویزہ بڑھ جائے تو ٹھیک ورنہ غیر قانونی کام مت کرنا۔ اب تم نظروں میں ہو۔ ممکن ہے تم پر ’را‘ کا ٹیپہ لگا دیں۔ بہت احتیاط کرنا، ورنہ یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو اس نے سر ہلادیا۔ تبھی میں نے کہا، ”ویسے میرا تو خیال ہے تم چپ چاپ نکل جاؤ کینیڈا، میں دیکھ لوں گا سب۔ کیونکہ تمہیں بھارت بھی جانا ہے تمہیں وہاں مشکل نہ ہو جائے۔“

”کیا میں روہی سے رابطہ کر کے پوچھ لوں؟“ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا تو میں نے کہا

”نہیں، تم نکل جاؤ۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو اس نے کانڈھے ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ وہ کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا

”ٹھیک ہے۔ میرے کاغذات لاہور میں ہیں، میں آج ہی نکل جاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میرے گلے لگ گیا۔

☆.....☆.....☆

شام ہو رہی تھی۔ جہاں چلا گیا تھا۔ چھا کا اس کے ساتھ گیا تھا۔ انہیں گاؤں سے نکلے کافی وقت ہو گیا تھا۔ میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ رات جس میں ہم نے اپنا ماضی دیکھا تھا، اس نے جہاں میں ایک الوہی پیدا کر دیا تھا۔ وہ میدان جس نے سوئی کو ملایا اور پھر جہاں کو۔ میں چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا اور پھر بانیک لے کر نکل گیا۔ میں اس میدان میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ شاید تنہائی میں جہاں کی یاد کروں تو مجھے سکون مل جائے۔

میں مسافر شاہ کے کھڑے تک جا پہنچا۔ جب میں نے بانیک کھڑی کی، اس وقت مجھے درخت تلے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے لمبے سفید بال تھے، اسی طرح سفید ریش، چمکتا ہوا چہرہ۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ لیکن کہاں مجھے یہ سمجھ نہیں آئی۔ وہ کوئی مسافر ہو سکتا تھا جو ستانے کے لئے یہاں بیٹھا ہو، مگر یہ وقت نہیں تھا ستانے کا۔ اس وقت تو مسافر اپنی منزل کی طرف رواں ہوتے ہیں کہ کسی ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ یہ دیرانہ تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پر مجھے کیا، مجھے تو کہیں تنہائی میں بیٹھنا تھا، شاید یہ بھی ایسے ہی سکون اور تنہائی کے لئے یہاں بیٹھا ہو۔ یہی سوچ کر میں نے بزرگ خیال کرتے ہوئے اسے دور ہی سے سلام کیا۔ تو وہ مسکراتے ہوئے اونچی آواز میں بولا

”آ جاؤ، آ جاؤ، میں تیرے ہی انتظار میں ہوں۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دھیمی

ہے، شیطان تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، کیونکہ وہیں پر شیطان نے قابو میں آ جانا ہے، یہ شیطان کو بھی معلوم ہے۔“

”اپنے آپ پر نگاہ کیسے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے

”عجب بات ہے، نو جوان! تم اپنے گھر کی حفاظت نہیں کرتے، اس پر نگاہ نہیں رکھتے ہو، تمہارا وجود جس میں سب کچھ ہے، جو تمہاری اصل ہے، جو احسن تقویم پر ہے، اتنی گراں مایہ ہستی کو نہیں دیکھو گے؟“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رکے اور پھر بولے، ”یہ نگاہ ہی تعین کرتی ہے کہ یہ نیکی ہے یا برائی۔ دیکھو، دنیا میں عورت کا وجود ہے، جب ہم عورت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہماری نگاہ ہی اس کے رشتے اور مقام کا تعین کرتی ہے، جیسے نگاہ اٹھتی ہے تو سامنے والی عورت کے ہاں ہونے کا تعین کون کرتا ہے، ماں کے لئے ہمارے جذبات اور احساسات کیا ہوں گے؟ پھر نگاہ اٹھتی ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، ہماری نگاہ سارے رشتوں اور ان کے مقامات کا تعین کرتی ہے۔ ہمارے اندر کی نگاہ کو کئی تو معیار ہوگا؟ اسی طرح یہ تعین کرنا کہ کیا نیکی ہے اور کیا برائی، جب انسان سے ظہور ہوتی ہے تو انسان ہی اس کا تعین کرتا ہے، اسی معیار سے جو اسے رب تعالیٰ نے دے دیا ہے۔“

”تو پھر انسان کیوں شیطانیات سے مات کھا رہا ہے، جب شیطان کے پاس طاقت ہی نہیں ہے، انسان تو برائی کی طرف زیادہ مائل ہوتا؟“ میں نے اچھٹے ہوئے پوچھا

”جب انسان کی نگاہ اپنی اچھائی والی قوت پر ہوگی، اسے ادراک ہوگا کہ نیکی کی طاقت کتنی عظیم ہے تو شر اس کی نگاہ سے اوجھل ہوگا۔ اس کا تو وجود ہی نہ رہا۔ لیکن جب وہ شر کو نگاہ میں رکھے گا تو گویا وہ شیطانیات کو اپنے وجود میں راہ دے رہا ہے۔ شیطان بھی تو اپنا آپ انسان کے وجود سے ظاہر کرتا ہے۔ تو انسان حق کو اپنے وجود سے ظاہر کیوں نہیں کر سکتا، حق کا تعین اس کی نگاہ ہی کرے گی۔“ انہوں نے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا

”بزرگو! یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیسے؟“ میں نے پھر وہی سوال کر دیا

”میں پوچھتا ہوں کہ شیطان کی فتوحات کیا ہیں؟ یہی کہ وہ انسان سے برائی کروا دیتا ہے؟ اگر انسان ہی اسے مہلت نہ دے؟ اس کے تدموں کی پیروی نہ کرے۔ انسان اپنی قوت ہی شیطان کو استعمال نہ کرنے دے، وہ برائی پر غلبہ پالے گا، گویا شیطان پر غلبہ پالیا۔ اچھائی کا نہ ہونا ہی برائی ہے۔ حق نہ ہونا ہی باطل ہے، خیر کا نہ ہونا ہی شر ہے۔ اور یہ حقیقت ازل سے ہے کہ جب حق آ جاتا ہے تو باطل وہاں نہیں رہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان اچھائی کی لذت کو محسوس نہیں کرتا۔ خیر کی لذت سے نا آشنا ہی اسے غافل رکھتی ہے۔ جو شے انسان اپنے اندر محسوس کرے گا۔ جس پر اس کی نگاہ ہوگی اسی کی لذت پائے گا۔ جس کے اندر جو شے بڑی ہے، وہ اسی کی لذت محسوس کرے گا۔ انسان جب شیطان کو راستہ دیتا ہے، بے غیرتی اور شریک پیدا کر سکتا ہے تو وہ اچھائی، کیوں نہیں کر سکتا جبکہ یہ قوت تو اسے رب تعالیٰ نے دے دی ہوئی ہے کہ وہ اچھائی کرے۔“

”ہم اپنے وجود کے اندر ہی سے شیطان اور شیطانیات پر غلبہ پاسکتے ہیں، یہ انسان کی اپنی دسترس میں ہے۔ انسانی وجود کا عمل اور کردار ہی یہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے انسانیت یا شیطانیات۔“ میں نے سمجھتے ہوئے کہا

”شر پیدا کرنے میں وہ لذت نہیں ہے جو برائی کو روکنے میں ہے۔ یہ زیادہ سرور آگئیں ہے۔ آدم کے ساتھ کوئی شیطان کو سرنگوں کروا دیا، یہ کس نے برقرار رکھا ہے؟ وہی، جو انسان ہوگا۔ مقام شہیری کی ابتدا تو یہی ہے کہ شیطانیات کو اپنے سامنے سرنگوں کر لیا جائے اور یہی مقصد انسانیت ہے۔ صرف نیکی کی طاقت کو اپنے اندر بڑھالیا جائے جو رب تعالیٰ کا عطیہ ہے۔“ انہوں نے کہا تو میں نے کچھ پوچھنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے بولے، ”جاؤ۔! اپنے اندر پریشانی اور خوف کو مت جگہ دو، یہی شیطانی جھکنڈے ہیں، وہ خوف کی فضا پیدا کرتا ہے

سی مسکراہٹ تھی۔ میرے لئے اب یہ انہوں نے واقعات نہیں رہے تھے۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیوں پریشان ہو تم، ہر کوئی سدا ساتھ تو نہیں رہتا، اور پھر جو ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔“ اس درویش نے دھیمے مگر پرسکون لہجے میں کہا

”پریشانی تو ہوتی ہے، جب دشمن تو تمیں چڑھ آئیں۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر کہا

”خوف اور پریشانی دو مختلف چیزیں ہیں نو جوان، اور پھر تم کیا سمجھتے ہو، جہاں جہاں بھی حق اپنا ظہور کرتا ہے، وہیں پر باطل آمو جو ہوتا ہے۔ حق اور باطل کی یہ کشمکش تو ظہور آدم سے ہو گئی تھی، یہ کوئی نئی اور انوکھی بات تو نہیں ہے، کیا تم نہیں جانتے ابلیس کب بنا؟“

”میرے خیال میں تو وہ آدم سے پہلے کا تھا۔“ میں نے اپنے علم کے مطابق بتایا تو وہ بولے

”بیشک اس کا وجود پہلے ہی سے ہوگا، لیکن اس وقت وہ عزرا زیل تھا، بحث اس سے نہیں کہ وہ کیا کرتا تھا اور کتنا مقرب تھا، جیسے ہی ظہور آدم ہوا اور اس نے رب تعالیٰ کی نافرمانی کی تو ابلیس بن گیا۔ یعنی ابلیس اور ابلیسیت کا ظہور اس وقت ہوا جب آدم کا وجود اس کائنات میں سامنے آیا۔“

”جی، تب سے شیطان پوری قوت سے انسان کو بھٹکا رہا ہے اور.....“ میں نے کہنا چاہا تو میری بات کاٹ کر بولا

”تجھے کس نے کہا کہ شیطان کوئی قوت رکھتا ہے، شیطان کی اپنی کوئی قوت نہیں ہے نو جوان۔ یہ سمجھ لو۔“

”تو پھر وہ کیسے بھٹکا رہا ہے؟“ میں نے پوچھا

”تم مجھے ایک بات بتا، یہ نیکی اور برائی، خیر اور شر، انسانیت اور شیطانیات، ان سب کا ظہور کہاں سے ہو رہا ہے، وہ کون سی جگہ ہے جہاں سے ان کا ظہور ہوتا ہے اور ہم سمجھ سکتے ہیں یہ خیر ہے یا شر، انسانیت ہے یا شیطانیات؟“ اس نے میری چہرے پر دیکھ کر پوچھا تو ایک دم سے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، میں سرسراتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکا۔

”میرے خیال میں یہ انسان کا وجود ہی ہے، جس سے یہ سب ظاہر ہو رہا ہے۔“

”مطلب انسان کا وجود انسانیت کو ظاہر کر رہا ہے، اور وہیں سے شیطانیات بھی سامنے آ رہی ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟ شیطان کا کوئی ہر کارہ یا خود شیطان کبھی سامنے آیا ہو؟ تو پھر شیطانیات انسان کے وجود سے ظہور کیوں ہوتی ہے؟“

”یہ آپ ہی بتائیں؟“ میں نے سمجھنا چاہا تو وہ بولے

”رب تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کر دیا۔ اب اسفل السافلین کیسے ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود انسان ہی شیطان کو طاقت دے رہا ہے۔ شیطان کی اپنی کوئی طاقت نہیں ہے۔ انسان اسے اپنے وجود میں راہ دیتا ہے تو ہی شیطان کو اپنے ظہور کا موقع ملتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابلیس کو رب تعالیٰ نے مہلت دی ہے تو انسان کو کتنی بڑی قوت سے نوازا ہے کہ وہ اس پر قابو پاسکتا ہے۔ انسان کے پاس تو طاقت ہے، انسان اسی وقت شیطان سے ڈرتا ہے، جب اسے اپنی طاقت کا ادراک نہیں ہوتا۔“

”انسان کو اپنی طاقت کا ادراک کیسے ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے

”جب تم اپنے آپ سے غافل ہو جاؤ گے تبھی شیطانیات کے آلہ کار بنو گے، تبھی وہ تمہارے وجود سے راہ پائے گا۔ تم شیطان کو اپنے وجود سے نکال باہر پھٹکنے اور اسے روک دینے کی طاقت رکھتے ہو، قوت ہے نا تو ہی ایسا کر سکتے ہو۔ ہمارے اندر جو رب تعالیٰ نے انسان اور انسانیت رکھ دی ہے اسے کوئی نہیں جھین سکتا اور نہ کوئی نکال سکتا ہے۔ اصل میں یہ ہماری غفلت ہے جس نے ہمیں ہی اپنے آپ سے اوجھل کر رکھا ہے۔ جس کی نگاہ اپنے آپ پر ہوتی ہے، جو اپنے آپ کو سمجھتا

اور انسان کو اپنے آپ سے غافل کر دیتا ہے۔ تو شیطان اور شیطانت کے مقابلے میں نکل۔ صرف اپنے اندر کی اچھائی پر ننگا رہ رکھ اور انہیں اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے۔ جیسے یہ میلہ، اس میں شرکی قوت کو نہتا کر دے، اس کی قوت ہی نہیں رہے گی تو امن رہے گا۔ نیکی والی قوت رکھ، وہ شر کو تمہارے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے گی۔ پھر آنا، باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ جاؤ اب۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کو کہا تو میں اسی لمحے اٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ بایک اٹھائی اور وہاں سے نکل آیا۔ واپسی پر میں خود میں ایک نئی طاقت محسوس کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لیکن ہمارے گھر میں اُجالا تھا۔ اماں نے گھر میں رات کے کمانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ سارہ، اس کا بیٹا مراد، تانی اور سوئی کے ساتھ چھا کا بھی موجود تھا۔ اماں نے مکن میں ہی دسترخوان لگا دیا۔ ہم بڑے سکون سے کھانا کھا رہے تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے فون سننے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو سوئی نے روکتے ہوئے کہا

”بھال کھانا تو کھالو، پھر دیکھ لینا۔“
میں نے ہاتھ روک لیا۔ مگر فون مسلسل بجنے لگا تو اماں نے کہا

”بھال دیکھ لو نا۔“

میں نے فون اٹھا کر اسکرین دیکھی تو وہ حویلی سے تھا۔ میں کال رسیو کی تو دوسری طرف سے سیکورٹی گارڈز کا انچارج تھا۔ میری آواز سننے ہی بولا

”سر آپ فائرنگ کی آواز سن رہے ہوں گے، حویلی پر حملہ ہوا ہے، پتہ نہیں کون لوگ ہیں۔“

”انہیں کچھ دیر روک کر رکھو، میں ابھی آیا۔“ میں نے کہا اور انتہائی تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا، ”حویلی پر حملہ ہو گیا ہے، جلدی نکلو۔“

جب تک میں ہتھیار اٹھا کر نکلا، چھا کے کے ساتھ تانی جا کر کار میں بیٹھ چکی تھی۔ اس نے سوئی اور سارہ کو سختی سے منع کر دیا کہ کچھ بھی ہو باہر نہیں نکلتا۔ چھا کسی کوفون کر رہا تھا۔ اسی دوران اس نے تیزی سے کہا،

”تم نکلو، میں آ رہا ہوں۔“

میں کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار بھگادی۔ گاؤں سے نکل کر جیسے ہی میں سڑک پر آیا تو تانی نے کہا

”بھال، بہت دھیان سے، ہو سکتا ہے دشمن ہمارے لئے گھات لگائے بیٹھا ہو۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا اور کار ایک دم سے اس کے راستے پر ڈال دی جو حویلی کے پچھلی طرف سے نہر پر جا نکلتی تھی۔ بچپن سے حویلی کا ایک ایک راستہ میں نے سوچا ہوا تھا۔ اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ میں نے کار کچھ فاصلے پر روکی اور نکل کر تقریباً بھاگتے ہوئے آگے بڑھا۔ تانی میرے ساتھ تھی۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر تھی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہم حویلی کی چار دیواری تک جا پہنچے۔ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کافی دور سے فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ اتنا بھرپور نہیں تھا یا پھر دشمن کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ میں حویلی کے بلندی دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے چار پانچ گن بردار ملازمین کو پرغمال بنائے کھڑے تھے۔

وہ حویلی میں جس حد تک آ چکے تھے، وہ تو ایک حقیقت تھی۔ لیکن میں فائر کرنے سے پہلے پوری طرح جانچ لینا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک رسائی کر چکے ہیں۔ اچانک مجھے شیعہ کا خیال آیا۔ میں نے اسے کال ملائی تو اس نے فوراً کال وصول کر لی

”کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا

”میں اس وقت حویلی کی دوسری منزل پر ہوں۔“ اس نے تیزی سے بتایا

”صورت حال کیا ہے؟“ میں نے پوچھا

”نچلی منزل تک وہ آگئے ہیں، دوسری کی طرف وہ بڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کی طرف سے خاموشی چھا گئی ہے، کوئی فائرنگ نہیں ہو رہی ہے۔ نیچے کیا صورت حال ہے، میں نہیں جانتا۔“

”میں نیچے ہوں، انہیں اوپر نہیں آنے دینا، کوشش کرنا کہ ان میں سے لوگ زندہ پکڑے جائیں۔ فکر نہیں کرنا۔“ یہ کہہ کر میں فون بند کر دیا۔ میں نے ملکی روشنی میں تانی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر غصہ تھا، اس نے سب سن لیا تھا۔ ہم نگاہوں ہی نگاہوں میں پلان ترتیب دے کر خاموشی سے مخالف سمتوں کی جانب بڑھ گئے۔

وہ پانچوں میرے سامنے تھے۔ تین ایک طرف تھے اور دو ایک جانب، انہوں نے ملازمین پر گتیں تانیں ہوئیں تھیں۔ اچانک ایک طرف سے فائر ہوا، اسکے ساتھ ہی ایک زمین پر گر کر تڑپنے لگا، اس سے پہلے کہ وہ سمجھتے میں نے تین والی قطار میں سے ایک کو نشانہ بنایا اور فائر کر دیا۔ جب تک وہ فائر کی سمت کا اندازہ کرتے یا بھاگ کر جاتے، دو مزید فائر ہوئے، وہ بھی زمین پر تھے۔ ایک آخری بچا تھا وہ باہر کی جانب بھاگا، اس کے دونوں طرف سے فائر آ گئے۔ ان کے گرتے ہی ملازمین اٹھ گئے۔ میں نے دور ہی سے پوچھا۔

”اندر کتنے لوگ ہیں؟“

”کوئی بھی نہیں ہے،“ ایک ملازم بولا تو میں نے سامنے آ کر کہا

”سب لوگ ایک کمرے میں چلے جاؤ۔ ایک اوپر جا کر شعیب سے کہے کہ نیچے آ جائے اور انہیں دیکھے، جو زندہ ہے اسے سنبھالے۔“ میں نے تیزی سے کہا، کہنے کے دوران تانی میرے پاس آ گئی۔ اب ہمیں باہر کی جانب دیکھنا تھا۔ میں اور تانی باہر کی جانب نکلے ہی تھے کہ باہر سے زوردار فائرنگ ہونا شروع ہو گئی۔ ایک دو منٹ یہ بھرپور فائرنگ رہی پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ تبھی چھا کے کافون آ گیا

”کدھر ہو، میدان صاف ہے۔“

”میں گیٹ پر آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر سوئی کا نمبر ملا کر اسے محتاط ہو جانے کا کہا، وہ مجھ سے تفصیل پوچھنا چاہتی تھی لیکن وقت نہیں تھا۔ میں گیٹ کے پاس پہنچا تو وہاں چھا کا کئی سارے لوگوں کے ساتھ تھا، اس نے کچھ لوگوں کو زمین پر لٹایا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا

”چھا کے ان سب کو سنبھالو، میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سامنے کھڑی بایک پر بیٹھا تو تانی میرے پیچھے آ بیٹھی۔ نجائے کیوں مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ اس حملے کا مقصد مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ جو میں سمجھ رہا تھا وہ بہت بڑا تھا۔ میں ہوا کی رفتار سے اپنے گاؤں کی طرف جا نکلا۔

میں گلی میں پہنچا تو دھک سے رہ گیا۔ وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ گلی میں تین گاڑیاں اور دو موٹر سائیکل کھڑے تھے۔ دو آدمی گیٹ میں گولیاں مار رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سے پورا ماحول خوف سے بھرا ہوا تھا۔

”تانی! تم یہیں ٹھہرو، میں اوپر کی گلی سے جاتا ہوں، جیسے ہی موٹر سائیکل کی روشنی نظر آئے تم.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے دتی ہم دے دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بایک سے نیچے اتر گئی۔ میں اسی وقت واپس مڑا اور برق رفتاری سے بڑھا۔ بلاشبہ وہ سوئی کو اغواء کرنے کے چکر میں تھے۔ انہوں نے بہت سوچ کر پلان کیا تھا۔ یہ پلان ہمارے درمیان کسی بندے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ میں گلی کی کھڑ پر پہنچا اور بریک لگا کر جیسے ہی دتی ہم کی پن نکالی، گلی میں ایک زبردست دھماکا ہوا، اسی لمحے روشنی ہوئی، میں نے بھی ہم پھینک دیا۔ اچانک ہی کئی چٹخیں بلند ہوئیں۔ ان میں سے کئی میری طرف

بھاگے۔ میرے ہاتھ میں آٹوینک پسل تھا۔ میں نے تاک کر ان کا نشانہ لینا شروع کر دیا۔ گلی کی دوسری کٹڑ پر بھی ایسی ہی فائرنگ تھی۔ اس وقت میں حیران رہ گیا جب میرے گھر کی چھت پر سے فائرنگ ہونے لگی۔ اچانک ہی ایک زور دار دھماکا ہوا، یہ چھت پر سے دتی بم تھا۔ چھت پر بنا کر ہاسلے سے بھرا ہوا تھا۔ گلی میں چیخیں، کراہیں اور آواز زاری تھی۔ میں چند منٹ وہیں کھڑا رہا، پھر اسی طرح اوپر سے گھوم کر وہاں چلا گیا جہاں تانی تھی۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا وہ دیوار کی جڑ کے ساتھ بے حس و حرکت لٹی ہوئی تھی۔ میں چونک گیا۔ تانی کا اس طرح پڑے ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے بھاگ کر اسے اٹھایا تو وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس کا پورا بازو خون سے لت پت تھا، اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، جہاں سے خون ابل رہا تھا۔ میرا دماغ اچانک پھر گیا۔ میں نے اس کا پسل اٹھایا اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک دم سے خیال آیا۔ یہ میری بے وقوفی تھی۔ مجھے تانی کو پہچانا چاہئے تھا۔ میں نے لمحے میں خود پر قابو پایا اور فون نکال کر چھاکے کا نمبر پیش کیا۔

”میں گاؤں آ رہا ہوں۔“

”جلدی پہنچ، تانی کو فائر لگا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے فون جب میں ڈالا اور پسل تان لی۔ سامنے سے فائرنگ ختم ہو چکی تھی۔ شاید وہ لوگ دبک گئے تھے یا پھر بھاگ گئے تھے، اس بارے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اچانک چھت پر سے پھر فائرنگ ہوئی مگر نیچے سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ میں سوئی کو فون کر کے پوچھوں۔ میں نے جلدی سے کال ملائی تو لمحوں میں رابطہ ہو گیا

”میں چھت پر ہوں، میرے ساتھ سارہ ہے، اماں اور مراد نیچے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں گلی ہی میں ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے جان بوجھ کر تانی کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔ چھاکے پہنچ گیا تو اس کی کار کی ہیڈ لائٹس کی وجہ سے گلی میں روشنی ہو گئی۔ اس کے ساتھ کافی لوگ تھے جو یکے بعد دیگرے اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں پہنچ گئے۔ گلی روشن ہو گئی تھی۔ مجھے کوئی بندہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ اگر کوئی تھا تو وہ چھپا ہوا ہو سکتا تھا۔ چھاکے نے تانی کو کار میں ڈالا اور مجھے وہیں رکنے کا کہہ کر نکل گیا۔ کچھ اس کے ساتھ چلے گئے اور باقی وہیں ٹھہر گئے۔

”جو کوئی بھی ہے اسلحہ پھینک کر باہر آ جائے، ورنہ دیکھتے ہی گولی مار دوں گا۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا تو چند لمحے تک کوئی حرکت نہ ہوئی، پھر ایک کار کی سائیڈ سے آدمی نکلا۔ اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ زخمی تھا۔ وہ قریب آیا تو اسے لوگوں نے سنبھال لیا۔ اگلی چند منٹ تک کوئی دکھائی نہ دیا تو میں آگے بڑھا۔ میرے ساتھ دونو جوان تھے۔ اچانک ایک کار کے پیچھے سے ایک بندے نے فائر کرنا چاہا، وہ فائر تو نہ کر سکا، اس سے پہلے ہی تین فائر اسے لگ گئے۔ وہ ڈکارتا ہوا زمین پر تر پڑ گیا۔ میرے سامنے کئی بے حس و حرکت لوگ پڑے ہوئے تھے، جن کا مجھے افسوس تھا۔ وہ ان لوگوں کی حفاظت کر رہے تھے، جو انسان کہلانے کے حق دار ہی نہیں تھے۔ پوری گلی میں پھر لیا۔ کوئی خطرہ نہ رہا تو میں نے سوئی کو فون کر کے باہر آ جانے کو کہا۔ اگلے چند منٹ میں وہ چاروں باہر آئے، باہر کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ وہ فوراً ہی حویلی کے لیے نکل گئے۔ میں اس زخمی کے پاس گیا اور اس سے پوچھا

”کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟“

”شاہ زیب نے، ہم اس کے ساتھ ہی آئے ہیں۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا

”اس کا فون نمبر بول، میں اس سے پوچھ لوں کہ وہ تیرا علاج کرا دے گا یا میں کروں۔“

”میں مر جاؤں گا، مجھے بچاؤ، جو کہو گے کروں گا۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو میں نے اپنا سوال دہرایا تو

اس نے نمبر بتا دیا۔ میں نے شاہ زیب کا نمبر ملایا۔ چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے پہلو کہا تو میں نے آواز پہچانتے ہوئے کہا

”تجھے پتہ تو چل ہی گیا ہوگا کہ تیرے سارے بندے مارے گئے ہیں، یا میرے قبضے میں ہیں۔ اب یہ مت کہنا کہ تم نے تو بندے بھیجے ہی نہیں تھے۔“

”یہ تو شروعات ہیں پیارے، میلے تک دیکھ تیرے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ تو اس قابل ہی نہیں رہے گا کہ میلے میں جاسکے، ورنہ وہیں تجھے ختم کر دوں گا، میں جانتا تھا کہ تو ایسے ہی کسی حملے کی تیاری میں ہوگا، مگر کب تک؟ کب تک ایسے حملوں سے بچتا رہے گا۔“ اس نے نفرت سے کہا

”جب تک میرے رب سائیں نے چاہا، مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ باقی رہی بات حملوں کی تو یہ مجھے بھی کرنے آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ میں خود آتا ہوں، اور تو چوہے کی طرح چھپ جاتا ہے۔ اب تم نے پہل کر لی ہے، انتظار کر میں تم تک کب پہنچتا ہوں۔“ میں نے اس کی دھمکی کا جواب دیتے ہوئے کہا تو وہ غصے میں بولا

”اگر مرد ہے تو ابھی آ جا۔“

”کسی میدان میں آؤں؟ یا اس بل میں جہاں تم چھپے بیٹھے ہو۔ ابھی تم اپنے بندے سمیٹ کر لے جاؤ، یقین کرو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ میں نے انتہائی طنز سے کہا تو ایک دم سے فون بند ہو گیا۔ میں نے زخمی بندے کی جانب دیکھا، اسے ہسپتال پہنچانے کا کہہ کر حویلی کی جانب چل دیا۔

میں نے راستے میں چھاکے سے پوچھا، وہ ہسپتال پہنچ چکا تھا۔ تانی کے کاندھے، ران اور پنڈلی میں گولیاں لگی تھیں۔ اس وقت وہ بے ہوش تھی۔ ابتدائی طبی امداد دے دی گئی تھی اور وہ اسے ضلعی ہسپتال لے کر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ حویلی میں رندھاوا پہنچ چکا تھا۔ اس نے لاشیں قبضے میں لے لیں اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچا دیا۔ اس وقت میں جہاں کی کئی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا سورج طلوع ہوا تو پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ اب نجانے کیا ہوگا؟ دوسری طرف افواہوں نے سر اٹھالیا تھا۔ ہر کوئی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ ظلم اور احسان، جب بھی اور جہاں بھی کیا گیا تھا، اس کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ میں حویلی میں تھا، جبکہ اماں اور سارہ ضلعی ہسپتال چلے گئے تھے۔ تانی ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی، ڈاکٹرز نے یہی کہا تھا کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ حتمی بتا سکتے ہیں۔ اس کے لئے میں اپنے دل میں بہت درد محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر اُس کے پاس جا پہنچوں۔ فطری نسی بات ہے کہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا تو مطمئن ہو جاتا۔ لیکن اس وقت میرا یہاں رہنا بہت ضروری تھا۔ چھاکا اس وقت تانی کے پاس تھا اور جہاں چلا گیا تھا۔ رات گئے اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا، جب وہ فلائٹ کے لئے ڈیپارچر لاؤنچ میں تھا۔ میں نے اسے یہاں کے بارے میں بالکل نہیں بتایا تھا۔ اس کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ نورنگر اور علاقے بھر سے بہت سارے لوگ ہماری حفاظت کے لئے آ گئے تھے۔ جو حویلی کے ارد گرد اور گاؤں میں موجود تھے۔ میں نے شعیب کے ذمے لگا دیا کہ انہیں سنبھالے، خواہ بخواہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کر دیں۔ ان میں کوئی سازش بھی ہو سکتے ہیں۔ رندھاوا سے میری بات ہو چکی تھی۔ ان کے آٹھ آدمی مارے گئے تھے۔ دوشید زخمی تھے جن کی حالت نازک تھی اور ایک خطرے سے باہر تھا۔ صرف ایک آدمی صبح سلامت تھا۔ یہ وہی تھا جس نے اپنا آپ میرے حوالے کیا تھا۔ وہ بیان دے چکا تھا کہ وہ شاہ زیب کے لئے کام کرتا ہے اسی نے یہ جملہ کر دیا ہے۔ جبکہ شاہ زیب اس واقعہ کا سرے سے انکار کر دیا تھا اور الزام لگایا کہ یہ مجھے پھنسانے

کے لئے کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے میلے کے سارے منتظمین کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

دو پہر سے تھوڑی دیر پہلے وہ میرے پاس آ گئے۔ میں نے ایک کمرے میں انہیں احترام سے بٹھایا۔ چائے آ جانے تک ان کے ساتھ رات والے واقعے پر بات کرتا رہا۔ تبھی ان میں سے ایک نے کہا

”جی بیٹا، ہمیں کیوں بلایا، کوئی خاص بات؟“

”خاص ہی نہیں، بہت اہم بھی ہے۔ کیا آپ سب نہیں سمجھتے کہ اس موقع پر مجھے آپ سے بات کر لینا چاہیے۔“ میں نے صاف لفظوں میں کہا، کیونکہ اب میں ان سے محل کر بات کر لینا چاہتا تھا۔

”کیسی بات بیٹا؟“ اسی نے پوچھا تو میں نے کہا

”آپ سب میرے لئے بہت محترم ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کسی دوسرے کی باتوں میں آکر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کریں۔“ میں نے کہا تو دوسرے نے پوچھا

”تم محل کر بات کیوں نہیں کرتے ہو۔“

”تو پھر مجھے آپ سب جواب دیں کہ میلے کے بارے میں مجھ سے گارنٹی لینے کا مطلب کیا تھا، کس کے کہنے آپ نے مجھے کہا؟ یہ سازش بے نقاب ہو چکی ہے کہ میلے میں کس نے شر ڈالنا ہے۔ میں جانتا ہوں، آپ سے صرف تصدیق چاہتا ہوں۔“ میں نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا تو ان میں سے چند ایک کے چہرے یک دم بدل گئے۔

”یہ تم الزام لگا رہے ہو ہم پر۔“

”میں الزام نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں، آپ میری بات سے انکار کریں، میں ثبوت دے دوں گا۔“ میں نے پورے اعتماد سے کہا تو ان میں سے ایک بولا

”کہاں ہے ثبوت؟“

”یہ ایسے تھوڑی دے دوں گا، میں پورے علاقے کے معززین کو جمع کر کے دوں گا تا کہ وہ آپ سب لوگوں کے بارے میں جان سکیں کہ آپ کس کے آلہ کار ہیں، ذرا سا ثبوت تو اس وقت بھی دے سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سیل فون نکالا اور رات شاہ زیب سے ہوئی بات کی ریکارڈ کال چلا دی۔

”یہ تیری اور اس کی دشمنی ہے، اس کا میلے سے کیا تعلق؟“ ایک نے تیزی سے کہا تو دوسرے نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

”یہ سچ ہے جمال، ہم وقاص کی باتوں میں آ گئے تھے۔ اس نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ میلہ کروائیں اور اس میں وہ تمہیں اپنا ٹارگٹ بنائے۔ اب اگر ہم ہٹ دھرمی کریں گے تو مزید ذلیل ہوں گے۔ میں تو یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ تم لوگوں کی لڑائی میں کتنے بے گناہ مارے جاسکتے ہیں۔ نہیں میں باز آیا۔“ اس کے یوں کہنے پر باقی خاموش ہو گئے۔ میں چند لمحوں کی طرف سے کسی بات کا انتظار کرتا رہا، پھر بولا

”اب یہ فیصلہ آپ لوگوں نے کرنا ہے۔ بلاشبہ اس میلے میں لڑائی ہوگی اور لازمی بات ہے کہ بے گناہ بھی مارے جاسکتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔ اور اب آپ نے میلہ کروانا ہے۔ جائیں جا کر انہیں بتا دیں، دیکھتے ہیں کہ میلے میں پہنچنا کون ہے۔“ میں نے حتمی اور سخت لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اسی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

شام تک تانی کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر نے مثبت رد عمل کا اظہار کیا تو مجھے کافی سکون ملا۔ چھانکے نے مجھے پوری تفصیل بتا

دی تو اطمینان ہوا۔ اماں اور سوختی کی وجہ سے وہ بہت مطمئن تھی۔ رات گئے جہاں کا کینیڈا سے فون آ گیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ اسے بھیجے کی سازش ہی اسی لئے کی گئی تھی کہ وہ حملہ کریں۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے مطمئن کیا۔ اس کی فون کال سن کر میں خود سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے خود بڑھ کر ان پر حملہ کر دینا چاہئے یا صرف اپنا دفاع ہی کروں؟ اس وقت میری طاقت بکھر گئی تھی۔ اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس بارے میں میرے دشمنوں کو ضرور خبر ہوگی۔ ایک سوال میں اب تک نظر انداز کرتا چلا جا رہا تھا کہ وہ کون تھا جسے یہ معلوم تھا کہ کل رات ہم سب حویلی میں نہیں تھے؟ میں اگر پوچھ گچھ کرتا تو یہ بات ان سب کو الٹ کر سکتی تھی، جو بہر حال میرے لئے نقصان دہ تھی۔ نجانے کیوں میرا شک شعیب کی طرف جاتا تھا۔ لیکن دل نہیں مان رہا تھا۔ دوسری جانب ان کے ہاں میرا ایسا کوئی بندہ نہیں تھا جو ان کے بارے میں مجھے کوئی معلومات دے سکے۔ میں ایک طرح سے حصار میں آ گیا تھا، جیسے کوئی کسی کو باندھ کے رکھ دے۔ یہی کیفیت مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ سازشی ایسا ہی کرتے ہیں، دشمن کو زیر کرنے سے پہلے اس کی طاقت کو توڑتے ہیں۔

میں حویلی کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا مسلسل یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ دروازے میں شعیب نمودار ہوا۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے اندر آنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔

”آؤ شعیب! اتنی رات ہو گئی ہے، تم ابھی تک سوئے نہیں۔“ میں نے پوچھا تو وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا

”سر! کیا یہ ایسے حالات ہیں کہ مجھے سو جانا چاہیے؟“

”حالات تو ایسے نہیں ہیں لیکن.....“ میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی، اب میں اسے کیا کہتا۔ میرے خاموش ہو جانے پر اس نے کہا

”سر اگر آپ اجازت دیں تو میں شاہنواز کے ڈیرے پر کوئی تھوڑی بہت ہانچل مچا دوں؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا

”مطلب، انہیں بتا دیا جائے کہ ہم کمزور نہیں ہیں۔“ اس نے بے خوفی سے کہا تو میں نے محتاط لہجے میں پوچھا

”شعیب جو تم کہہ رہے ہو، وہ کبھی سچ رہے ہو، اور کیا یہ تمہاری آفیشل ڈیوٹی ہوگی یا تم یہاں کہ حالات دیکھ کر تم ایسا چاہ رہے ہو؟“ میرے پوچھنے پر اس نے چند لمحوں سوچا اور بولا

”سر! ہمیں موقع ہی نہیں ملا کہ میں آپ کو تفصیل سے اپنی یہاں موجودگی بارے بتا سکوں۔ پہلے میں آپ کو وہ بتاتا ہوں، پھر میرا خیال ہے میں آپ کو اپنی بات سمجھا سکوں گا۔“

”بولو!“ میں نے دلچسپی سے کہا

”سر! یہ جو شاہنواز ہے نا، میرے باپ کا قاتل ہے۔“ یہ اس نے بہت مشکل سے کہا تھا، پھر چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد بولا، ”میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ یہاں حالات بہت مشکل ہو گئے تھے تو میری ماں واپس اپنے میکے چکوال چلی گئی۔ میں وہیں پلا بڑھا۔ میرے اندر اسی طرح آج بھی انتقام بھرا ہوا ہے، اسی کی وجہ سے میں بھرتی ہوا۔ میں یہاں کے حالات بارے میں جانتا تھا۔ شاید آپ نے مجھے نہیں دیکھا، جس وقت شاہنواز کے ڈیرے پر ایکشن ہوا، میں آپ کے ساتھ تھا، میں آپ کے کور پر تھا۔“

”اوہ! تو وہ تم تھے؟“ میں نے بے ساختہ کہا اور اس کے چہرے پر دیکھا تو مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہوا ہے۔ تبھی وہ بولا

”جی میں ہی تھا۔ وہاں پہلا فائر میں نے کیا تھا۔ مجھے یہ امید تھی کہ میں شاہنواز کو وہیں ختم کر لوں گا، مگر ایسا نہ ہو سکا، وہ

پکڑا گیا، کوئی ثبوت اس لئے نہیں ملا کہ وہ سیاسی بیک گراؤ نظر رکھتا ہے۔ یہاں سے اطلاعات آتی رہیں کہ وہ علاقے پر وہی دبدبہ چاہتا ہے، خفیہ طاقتیں اس کی مدد کو آن پہنچیں ہیں۔ اسی لئے ہمارا نیٹ ورک حرکت میں آ گیا۔ میں نے اپنے آفیسر کے ساتھ مل کر ایک پورا پلان ترتیب دیا ہے۔ اس میں میرا اپنا ذاتی انتقام بھی شامل ہے، جو مجھے یہاں لے کر آیا ہے۔ میرا کسی پر احسان نہیں ہے، بلکہ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ کے سہارے میں کامیابی حاصل کر پاؤں گا۔ اس لئے یہاں آپ کے علم میں لائے بغیر میں کچھ نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہاں سے کس نے ادھر اطلاع دی ہوگی کہ ہم سب.....“

میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا

”وہ میں نے پکڑ لیا ہے اور اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ ایک معمولی سیکورٹی گارڈ تھا یہاں، میں اسی پر ہی کھیل کھیلے جا رہا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو؟“

”بہت بڑا کام کیا ہے تو نے؟“ میں ایک دم سے خوش ہو گیا تو وہ تیزی سے بولا

”یہ حملہ بغیر کسی پلان کے غفلت میں تھا۔ انہیں شام کے وقت خبر ملی اور انہوں نے چڑھائی کر دی۔ اگر حملہ کسی پلان کے تحت ہوتا تو اب تک وہ حویلی پر قبضہ کر چکے ہوتے یا سوئی بی بی اغواء ہو چکی ہوتی۔“

”تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ سب تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ میں نے پوچھا

”اگر ان کے دو آدمی یہاں ہیں تو ہمارے تین بندے وہاں پر ہیں۔ اور وہ آفیشل ڈیوٹی پر ہیں۔ میں نے بہر حال سیکورٹی کا ایک نیا پلان بنالیا ہے، وہ میں آکر بتاتا ہوں پہلے میں.....“

”خیر اب تم کیا کھیل کھیلے جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا

”اس وقت شاہنواز اپنے گھر ہے، شاہ زیب اور ملک سجاد اس کے ڈیرے پر ہیں۔ میں اسی خبر کے ذریعے انہیں پیغام دوں کہ آپ یہاں سے نکل کر جا رہے ہیں، تانی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ حویلی خالی ہے، ملازمین ڈر کی وجہ سے بھاگ گئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ جو رد عمل کریں گے، میں اسی کے مطابق اپنا کام کروں گا۔“

”مجھے صرف یہ کرنا ہے کہ غفلت میں گاڑی لے کر نکل جاؤں؟“ میں نے محتاط انداز میں پوچھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا

”جی سر۔! تاکہ جو باہر خبر بیٹھا ہے وہ بھی انہیں اس اطلاع کی تصدیق کر دے۔“

”او۔ کے میں نکلتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اسی وقت اٹھ گیا۔ میں یہ رسک لینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ شاہنواز کے ڈیرے پر ایکشن کے وقت وہ میرے ساتھ تھا۔ باقی جو اس نے کہانی سنائی تھی، مجھے اس پر سو فیصدی یقین نہیں تھا، وہ ایجنٹ ہی کیا جو سیدھی بات کرے۔ میں اس پر پوری طرح اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے فون کر کے چھاکے کو اس ساری بات سے آگاہ کیا تو وہ بولا

”جمال، یہ کر گزرو، اس سے رندھاوا کی پوزیشن کا بھی پتہ چل جائے گا کہ کہیں وہ ہمیں ڈبل کر اس تو نہیں کر رہا؟ اور اس نے شعیب کو ہمارے سر پر لا بٹھایا ہے، ہمارے بارے میں جاننے کے لئے، اب یہ ضروری ہے۔“

”تو پھر میں نکل رہا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ بولا

”میں تمہیں دوبارہ کال کر کے بتاتا ہوں، تب نکلتا، میں یہاں بھی یہ ڈرامہ کرتا ہوں کہ تانی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ممکن ہے ان کا یہاں بھی کوئی خبر ہو؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا

رات کے آخری پہر حویلی کے پورچ میں اچھا خاصا ہنگامہ کیا گیا، صرف یہ جتانے کے لئے کہ میں وہاں سے جا رہا ہوں۔ میں اکیلا ہی وہاں سے نکلا تھا۔ گیٹ پر رک کر میں نے سیکورٹی ہیڈ کو ہدایت دی کہ وہ الٹ رہے اور نکلتا چلا گیا۔ شہر جانے والی سڑک سے ذرا پہلے چھاکے کی طرف سے بھیجے ہوئے چند بندے کھڑے تھے۔ میں بھی انہیں پہچانتا تھا۔ وہ سب میرے ساتھ آ بیٹھے۔ میں نے گاڑی شہر کی طرف بھگا دی۔ کافی آگے جا کر میں نے گاڑی کچے راستے میں اتاری، وہاں بھیدہ میرے لئے بایک لے کر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر گاڑی کھڑی کر دی۔

”لو بھئی دوستو۔! تم میں سے صرف ایک میرے ساتھ آ جائے، باقی بھیدے کے ساتھ ڈیرے پر چلے جائیں۔ یا شہر کا ایک چکر لگا آؤ۔ میں آتا ہوں۔“

”نہیں جی، ہم جانتے ہیں کہ آپ کسی مہم پر ہو، ہم آپ کے ساتھ ہی جائیں گے۔“

”نہیں یار، جہاں میں جا رہا ہوں وہاں خاموشی چاہیے، صرف ایک بندہ جو بایک اچھی طرح چلا لے، بس۔“ میرے یوں کہنے پر ایک لڑکا نیچے آ گیا۔ اس نے بایک سنبھالا، میں نے پستل نیفے میں اڑسا، گن کے ساتھ فاضل میگزین نکالے

اور ہم وہاں سے چل دیئے۔ ہمارا رخ شاہنواز کے ڈیرے کی طرف تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے اس ڈیرے کا فاصلہ کم از کم بیس منٹ کا تھا۔ ہمارا یہ سفر کھیتوں کے درمیان کچی سڑکوں سے ہوتا تھا۔ ہم تقریباً پچیس منٹ میں ڈیرے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت آخر شب کے چاند نے اپنا سر نکالا تھا۔

”تم یہیں ٹھہرو، بایک کے پاس اور ہر طرف سے محتاط رہنا۔“ میں نے کہا اور گن اسے تھا کر قریبی درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ میں نے ڈیرے کی طرف دیکھا۔ وہاں اچھی خاصی ہلچل تھی۔ پھر ایک دم سے گیٹ کھلا اور تین گاڑیاں تیزی سے نکل کر چلتی چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد ہی سکون چھا گیا۔ ان میں کون کدھر گیا تھا، میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے چھاکے کو

فون کر کے بتایا

”میری گاڑی ان کے پاس.....“

”تم کہاں ہو، وہ بتا رہے ہیں کہ تم اکیلے کہیں نکل گئے ہو۔“

”میں شاہنواز کے ڈیرے کے باہر ہوں۔“ میں نے بتایا تو اس نے دھاڑتے ہوئے کہا

”تم وہاں؟“

”ہاں، میں وہاں ہوں، لیکن میری بات سنو، اپنے ان دوستوں سے کہو کہ وہ کہیں بھی چھپ کر سکون سے بیٹھ جائیں، سڑک پر نہ رہیں۔ ممکن ہے میرے چکر میں.....“

”میں سمجھ گیا، لیکن تم وہاں سے نکلو، ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔“ اس نے غصے کو دباتے مہمے کہا تو میں نے فون بند کر کے ”خاموشی“ پر لگا دیا۔

میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ ان گاڑیوں میں کون گیا ہے۔ اگر ان میں شاہ زیب یا ملک سجاد ہیں تو میں ان کے پیچھے جاؤں، وہ اگر نہیں ہیں تو ڈیرے میں ہی کوشش کروں۔ میں بے چین تھا کہ مجھے ان کے بارے میں پتہ چلے۔ میں درخت سے نیچے آ کر آیا اور ٹھہرنے لگا۔ اچانک مجھے شعیب کا فون آ گیا تو میں نے فون رسیو کیا تو وہ بولا

”کہاں ہو آپ؟“

”میں سڑک پر ایک جگہ کھڑا ہوں، کیوں؟ اور مجھے کب تک باہر رہنا ہوگا؟“

”آپ کہیں ادھر ادھر ہو جائیں۔ ڈیرے سے پتہ چلا ہے کہ شاہ زیب کافی سارے لوگوں کو لے کر نکلا ہے آپ کے لئے۔ خبر نے میرے مطابق ہی اطلاع دی ہے۔“

”تم کہاں ہو؟“

”میں شاہنواز گھر کے باہر ہوں۔ ڈیرے پر جانے کے لئے وہ کسی وقت بھی نکل سکتا ہے۔ شاہ زیب نے اسے صورت حال بتا کر وہیں بلوایا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے ڈیرے پر ملک سجاد ہی ہے؟“

”ممکن ہے ہو یا وہ شاہ زیب کے ساتھ نکل گیا ہو، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”ڈیرے کے اندر کی صورت حال کا پتہ کرو، اگر ملک سجاد وہاں نہیں ہے تو شاہنواز نے وہاں کیا کرنے جانا ہے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ وہ تیزی سے بولا

”وہ نکل آیا ہے، بعد میں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جھنجھلا کر رہ گیا۔

میرا ڈیرے پر آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ میں اکیلے اندھا دھند ڈیرے میں گھس بھی جاتا اور وہاں کوئی نہیں ہوتا تو پھر بھی مایوسی ہوتا مگر۔ اور پھر یہ ایک بہت بڑا رسک تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا، اگر وہ یہاں نہیں ہیں تو ان تین گاڑیوں میں سے کسی ایک میں تو ہوں گے، وہ میرے شکار پر نکلے ہیں تو کیوں نا میں ان کا شکار کروں؟ یہ سوچتے ہی میں بائیک کی طرف بڑھا۔ لڑکا میرے انتظار میں تھا۔ میں نے اس سے گن پکڑی تو وہ بائیک پر جا بیٹھا۔ میرے بیٹھنے تک اس نے بائیک اشارت کی۔ میں نے اسے راستہ بتایا، اگلے چند لمحوں میں ہم وہاں سے نکل پڑے۔

واپس پکی سڑک پر آتے ہمیں اتنا ہی وقت لگا۔ میں راستے میں اسے سمجھاتا ہوا آیا کہ کس صورت حال میں کیا کیا جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اس لڑکے نے کہا

”بھائی جی۔ میں رابطہ کروں گا ڈی والوں سے؟“

”ہاں، انہیں بتاؤ کہ ہم کہاں پر ہیں۔“

وہ لڑکا ان سے رابطہ کرنے لگا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک ڈیرے پہ ہمارے انتظار میں تھے۔ اس نے اپنی پوزیشن بتا کر فوراً آ جانے کو کہا۔

ہم وہیں کھڑے انتظار کرتے ہوئے اس سمت دیکھ رہے تھے، جدھر سے ہماری گاڑی نے آنا تھا۔ انہی لمحات میں جب ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ مخالف سمت سے تین گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میرا دوران خون ایک دم ہی سے تیز ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ تینوں گاڑیاں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ میں نے لڑکے کو بائیک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور اس نے بائیک اشارت کر لیا۔ میں نے گن سیدھی کر لی۔ وہ تینوں گاڑیاں سڑک کے درمیان یوں رک گئیں کہ جیسے انہوں نے راستہ روک لیا ہو۔ ہماری گاڑی ان سے کچھ فاصلے پر رکی ہی تھی کہ کئی سارے لوگوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ تیز روشنی میں ان سب کی نقل و حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ درمیان والی گاڑی میں سے پہل لے لئے شاہ زیب نکلا۔ میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی، اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اسی لمحے لڑکے نے جگہ بدل لی۔ میں نے دیکھا شاہ زیب لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر گر گیا تھا۔ وہاں موجود سبھی لوگ اچانک افتاد پر چونک گئے۔ وہ دو سامنے کی گاڑی کو نشانہ بنانے والے تھے، لیکن ایک سائیڈ سے حملہ ہو جائے گا۔ یہ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے فائرنگ نہیں روکی۔ ہماری گاڑی کی طرف سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ پتہ نہیں وہ لوگ کتنے تھے۔ لیکن جو میری ریخ میں آ جاتا وہ پچتا نہیں تھا۔ لمحوں میں سڑک پر لاشیں بکھر گئیں۔ اچانک آگے والی گاڑی دھماکے سے پھٹ گئی۔ شاید ٹنکی میں کوئی بلبٹ جا گئی تھی۔ اسی وقت پچھلی گاڑی مڑی اور پھر وہ بھاگتی چلی گئی۔ کچھ دیر ہی میں سکون ہو گیا۔ میں اپنی گاڑی تک گیا، وہاں سے ٹارچ لی اور دور ہی سے دیکھنے لگا کہ شاہ زیب ہے بھی یا اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ ایک طرف پڑا تھا۔ میں نے دو لڑکوں کو اپنے کور پر لیا اور اس کی

جانب بڑھا۔ باقی لوگوں کو پھیلادیا تھا کہ اگر کوئی دیکھا پڑا ہے تو اسے پکڑ لیا جائے۔

میں شاہ زیب کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو اس نے آنکھیں کھولیں، میری طرف دیکھ کر اس کے چہرے پر نفرت پھیل گئی۔

”اب بھی اگر تم کہو کہ دوبارہ اس علاقے میں نہیں آؤ گے تو میں تمہیں بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے مجھ پر تھوک دینا چاہا تو میں نے اپنے پہل کی نال اس کے منہ میں رکھتے ہوئے کہا، ”ممکن ہے کل صبح تمہیں کوئی پہچان بھی نہ پائے کہ تم شاہ زیب ہو۔ گھٹیا باپ کی گھٹیا اولاد، کوئی گھٹیا حرکت مت کرنا۔“

میری بات سن کر اس کے وجود میں ایک بارگی جنبش ہوئی اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں ملک سجاد بھی تھا یا نہیں، میں نے ایک نگاہ سڑک پر پڑے لوگوں پر ڈالی اور فوراً ہی وہاں سے نکل جانے کے لئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔

اس وقت میں پکی سڑک سے اتر کر حویلی جانے والی سڑک پر تھا، اس وقت میں ان سب لوگوں کو اتار چکا تھا، جب چھاکے کی کال آئی۔ اس نے انتہائی پر جوش لہجے میں کہا

”تم نے شاہ زیب کو پار کر دیا۔“

”تم تو مجھے روک رہے تھے۔ وہ میرا شکار کرنے نکلا تھا۔ خیر، آکر تفصیل پوچھ لینا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ حویلی پہنچا تو وہ پھٹ چکی تھی۔ میں نہانے کے لئے ہاتھ روم میں گھس گیا۔

میں فریش ہو کر بیٹھا چائے پی رہا تھا، جب شعیب آیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سرمستی بھری مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا۔ میرے قریب آتے ہی بولا

”میں نے اپنا انتقام لے لیا۔ کر دیا شاہنواز کا کام۔ وہ نہیں رہا اس دنیا میں۔“

میں نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا

”مبارک ہو۔“ پھر اسے الگ کرتے ہوئے کہا، ”میں سمجھتا ہوں کہ معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے، لیکن ان حیوانوں، سانپوں اور موزی جانوروں کو مار دینے کا حکم ہے جو انسانوں کے لئے ضرر رساں ہو جائیں، خیر کیسے ہوا سب؟“

میں بیٹھ گیا تو وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا

”میں اس کے گھر کے سامنے اس کی تاک میں تھا۔ میرے ساتھ دو مزید لوگ تھے۔ گیٹ کھلا اور اس کی گاڑی باہر نکلی تو اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا، ہم تین طرف کھڑے تھے اس پر برسٹ مارے، اس کے گاڑی کو موقع ہی نہیں ملا کہ ہم پر فائر ہی کر سکیں۔“

”تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ ختم ہو گیا، کوئی خبر۔ کوئی اطلاع؟“ میں نے پوچھا

”سارے علاقے میں یہ اطلاع پھیل چکی ہے، بلکہ شاہ زیب کے مرنے کی بھی، ملک سجاد تو یہ سنتے ہی واپس بھاگ گیا ہے۔ ڈیرہ سنسان پڑا ہوا ہے، کوئی اشتہاری وہاں نہیں ہے۔ اس کا بیٹا ہی ہے، جو لندن سے آ رہا ہے، وہ دیکھیں کیا کرتا ہے۔ شاہ زیب والی تو نسل ہی ختم ہو گئی۔“ اس نے دبے دبے جوش سے بتایا

”لیکن شاہ دین کی تو ہے، اس کی بیٹی سوئی بی بی۔“ میں نے اسے یاد دلایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ تبھی میں نے کہا، ”خیر تم اب الٹ رہنا اور پورے علاقے کی خبر رکھنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”جی بہتر۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ کم از کم اب یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ صرف قانونی کاروائیاں تھیں۔

سورج کافی اونچا چڑھ آیا تھا، میں جب کار میں سوار مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ درویش مجھے وہاں ضرور ملے گا، جس نے میرے اندر ایک نیا حوصلہ بھردیا تھا۔ ایک ذرا سی بات سے میرے اندر ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ میلہ جو میرے لئے چیلنج بن رہا تھا اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں پہنچا تو اسی درویش کو وہیں برگد کے درخت تلے پایا۔ اس دن وہ دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ میں جب کار سے اتر رہا تھا، اس نے نگاہ بھر کر میری طرف دیکھا۔ پھر جب تک میں اس کے قریب جا کر بیٹھ نہیں گیا، وہ مٹی کے پیالوں میں چائے ”پھیشتا“ رہا۔ میں سکون سے بیٹھ گیا تو اس نے ایک پیالہ میری طرف بڑھاتے کہا

”لے پی لے، آج ہماری چائے پی کر بھی دیکھ۔“ درویش نے کہا تو میں نے وہ پیالہ لیا اور چائے کاسپ لیا۔ گڑ والی چائے مزید اتر گئی۔ وہ اس وقت تک خاموش رہا، جب تک میرا اور اس کا پیالہ خالی نہیں ہو گیا۔ اس نے اپنے لب صاف کیے اور بولا

”مٹی کے اس پیالے میں چائے ہم نے خود ڈالی اور خود ہی مزے سے پی لی، سو ادو تو چائے کا ہی تھا نا کہ ہم نے اس میں ڈالی ہی چائے تھی۔ اب اگر ہم اس میں دودھ ڈال لیتے، تو مزہ دودھ ہی کا آتا تھا، پانی ڈال لیتے تو پانی کا، یا پھر بھنگ ڈال لیتے تو بھنگ نے اپنا رنگ دکھانا تھا۔“

”جی، ظاہر جو چیز بھی اس میں ڈالی جائے گی، مزہ تو اسی کا آتا ہے نا۔“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو مسکراتے ہوئے بولا

”تیرا اور میرا وجود مٹی کا ہے، اس میں جو ڈالنا ہے وہ ہم نے ہی ڈالنا ہے۔ اس وجود میں نیکی ہوگی تو نیکی کی لذت سے آشنا ہوگا، اگر برائی ہے تو اس کا سوا دی پائے گا۔ جو بھی کچھ، جس میں ہوگی، وہی اسے محسوس کر پائے گا۔ اب وہ اپنے اندر جھانکنے کا تو ہی اسے پتہ چلے گا نا۔“ انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا

”جی بالکل، یہ ایک فطری سی بات ہے؟“ میں نے کہا

”اور ہاں۔! یہ فطرت ہے کیا؟ کبھی سوچا ہے اس کے بارے میں؟“ انہوں نے پوچھا تو میں نے عاجزی سے کہہ دیا

”جی نہیں، میں نے بھی نہیں سوچا۔“

”تو پھر غور کر، یہ سارا نظام جو تیری نگاہ میں ہے۔ یہ اگر کشش کے تحت ایک دوسرے سے بندھا ہوا ہے نا تو یہ تجس بھی ابھارتا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تجس آخر کہاں ابھرتا ہے، کسی درخت میں تو نہیں ابھرتا، تجس کا ظہور وہیں ہوگا نا جہاں یہ پڑا ہوگا۔ یہ کسی قوت ہی کے تحت ابھرتا ہے، اور جس میں سے ابھرتا ہے، وہاں تجس کے ابھرنے کا مقصد تو ہوگا۔ یہ باہر کی کائنات اپنی طرف متوجہ کر کے انسان کے اندر تجس پیدا کر دیتی ہے تو کیوں؟ اس کا بڑا سیدھا اور سادہ سا جواب ہے کہ انسان اس فطرت کو سمجھے، وہ اسے تب سمجھ سکے گا جب وہ اپنے آپ کو سمجھے گا۔ اب دیکھو، چھوٹی سے بات ہے، کیا تم سرخ رنگ کی وضاحت کر سکتے ہو؟ کیا آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہی درست ہے، دن کے وقت جو چیز جس طرح دکھائی دیتی ہے اور وہ رات کو کسی اور طرح دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب اسی وقت پتہ چلے گا جب وہ اس جہان رنگ و بو میں اترے گا، اور انسان کے سوا کوئی دوسرا نہیں اترتا۔“

”کیونکہ بابا جی اسے یہ صلاحیتیں عطا کر دی گئیں ہیں نا، اور وہ اسی بل بوتے پر وہ سمجھ سکتا ہے۔“ میں نے کہا

”اے صلاحیتیں کیوں دی گئیں؟“ یہ کہہ کر انہوں نے لمحہ بھر کر کہا، ”رب تعالیٰ کی عنایت سے، اس مادی دنیا میں، اسی خاک سے انسان خود کو بناتا بھی ہے، اور خود کو توڑ بھی لیتا ہے، وہ اپنے بارے میں اور اس کائنات کو بھی جاننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے منصب پر فائز ہے کہ رب تعالیٰ نے اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس ارض کا خلیفہ بنا دیا، کیونکہ

یہی وہ ہستی ہے جو خود اپنی معرفت اپنے آپ سے خود حاصل کرتی ہے، اس کا ادراک اس عزائیل کو تھا، اس نے انکار تو آدم کی ہستی کا کیا اور نافرمانی رب تعالیٰ کی ہوئی۔“

”میں یہ بات تو سمجھ گیا ہوں بابا جی کہ انسان کے وجود ہی سے سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے، یہاں تک کہ شیطانی بھی۔“ میں نے کہا تو وہ بولے

”بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، خاک پڑی ہوئی تھی لیکن اس میں زندگی نہیں تھی، رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا اور اس خاک میں زندگی پیدا ہو گئی۔ گن میں ہر شے رکھ دی گئی جس کا ظہور ہو رہا ہے، یہ انسان ہی ہے جو اس گن کا ظہور اس زمین پر کرتا چلا جا رہا ہے، یہ رب تعالیٰ کی دی ہوئی خلافت کے باعث ہی تو ہے۔ سورج کا چمکنا کون دیکھ رہا ہے، اور چاندنی کو چاندنی کا نام کون دے رہا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت کر پاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شیطانی ہی ہے کہ وہ فقط اسی کائنات میں غرق ہو جائے اور اسے اس معیار پر نہ دیکھے جو عین انسانیت ہے۔ عین انسانیت کا معیار اسے اس وقت ملے گا جب وہ خود کو بہ حیثیت انسان دیکھے گا اور اسی نگاہ سے اس کائنات کو پرکھے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ نیکی عین فطرت ہے اور برائی شیطانی کیوں ہے کہ وہ اسے نیکی سے غافل کر دیتی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولے

”خود اپنے آپ پر نگاہ رکھنا ہی نیکی ہے اور یہی عین فطرت ہے۔ فطرت کا سیدھا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔“

”تو یہ ساری کشش کیوں؟ رب تعالیٰ چاہتے تو سیدھے طرح انسان کو اسی کام پر لگا دیتے۔“ میں نے محض ان سے سیکھنے کی غرض سے ایک نئی بات کہہ دی تو وہ ذرا سا مسکرائے اور بولے

”تمہیں پھر ایک چھوٹی سے کہانی سنی پڑے گی، اور وہ کہانی تھے پھر کسی وقت سنائیں گے۔ اس وقت تو صرف ایک بات سمجھ لے کہ نیکی عین فطرت ہے، اور انسان کی یہ کشش برائی پر غالب آتا ہے، یہاں تک کہ شیطانی طمع کو لینا ہی اس کا مقصد ہے۔ اچھائی کو سرفرازی اور برائی کو سرنگوں کرنا ہی انسانیت ہے۔ یہی کشش انسان کا کردار بناتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وجود میں کیا ہے۔ نیکی کی خوشبو، منافقت کی سڑاند یا برائی کا اندھیرا۔“

”تو اس کا مطلب جو.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹنے ہوئے بولے

”مطلب جو بھی ہے، اس مٹی کے پیالے میں جو کچھ ڈالنا ہے تو نے ڈالنا ہے، اور اس میں سے باہر وہی کچھ آتا ہے جو تو نے ڈالا ہے، ذائقہ بھی تو نے چکھنا ہے، تیری ہی صوابدید ہے کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اب تو جا اور سیلے کی تیاری کر اور اپنے ساتھی کو گھر لے آ، وہ بے چاری بھی تو میلہ دیکھے نا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے پاس پڑی ہوئی لکڑیاں اٹھائیں، انہیں سلکتی ہوئی لکڑیوں پر رکھ دیا اور اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ میں سمجھ گیا اب مزید باتیں نہیں ہوں گئیں۔ میں نے اٹھ کر اس کھلے میدان کو دیکھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ میں کار میں بیٹھا اور واپس اپنے گھر آ گیا۔ مجھے گھر آئے کچھ وقت گزرا تھا کہ چھاکے کا فون آ گیا۔

”یارتا نی ضد کر رہی ہے کہ وہ ہسپتال میں نہیں رہنا چاہتی، واپس آنا چاہتی ہے۔ کیا کروں؟“

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا

”میں نے بات کی ہے، ان کا تو یہی کہنا ہے کہ اب بس پٹی بدلنا ہے، اس کی دیکھ بھال ہو جائے تو آپ لوگ جاسکتے ہو۔“ وہ اطمینان سے بولا

”اسے لے آؤ۔ یہاں وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسی وقت میں نے میلے کے منتظم کو فون کیا اور پوچھا

”کب دے رہے ہیں میلے کی تاریخ؟“

”وہی، جس تاریخ پر ہر سال میلہ ہوتا ہے۔“ اس نے نرمی سے کہا

”ٹھیک ہے، پھر تو چند دن رہ گئے ہیں۔ علاقے میں کروا اعلان، اس بار جتنے بھی انعام ہوں گے میری طرف سے ہوں گے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

جسپال کی فلائٹ چند ہی گڑھ کے بین الاقوامی ایر پورٹ پر اترتی تو اس کے حواس پوری طرح جاگ گئے۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ اسے احساس تھا کہ ایر پورٹ سے نکلنے ہوئے اسے گیارہ بج جائیں گے۔ اس وقت اگرچہ اس کے ”گیس“ نہیں تھے لیکن پٹری باندھی ہوئی تھی اور سکموں کی نئی نسل کی طرح اس نے بس نشانی ہی کے طور پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئیں تھیں، یوں جیسے چند دن کا شیوہ بڑھا ہوا ہو۔ سامان کے نام پر اس کے پاس ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ امیگریشن سے فراغت کے بعد وہ باہر آیا تو ایک نوجوان سکھ اس کی جانب بڑھا۔

”جسپال سکھ ڈھلوں جی، آپ کے سواگت کے لئے جی، میں گرمیت سنگھ،۔ ست سری اکال۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر اسے خوش آمدید کہا۔ جسپال نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اسی طرح ہاتھ جوڑ کر جواب دیتے ہوئے کہا

”ست سری اکال جی۔“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا تو گرمیت نے جلدی سے ایک فون سیٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا

”لو جی کرلیں بات۔“

جسپال نے فون پکڑا اور جمیندر کے نمبر پر اس نے فون رسو کر لیا۔

”ٹھیک ہے جسپال، اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ اپنا ہی لڑکا ہے۔“

تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے اپنا سامان اس کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد ایک فور ہیل جیب میں وہ ایر پورٹ سے نکل رہے تھے۔

جسپال نے بہ مشکل ایک ہفتہ کینیڈا میں گزارا تھا۔ جاتے ہی اس کی ملاقات جمیندر سے ہوئی۔ وہ دونوں اس کے ساتھ رہا تھا۔ ان میں بہت ساری باتیں ہوئیں۔ بہت سارے منصوبے ان دونوں کے درمیان زیر بحث آئے۔ وہ اوگی پنڈ ہی جانا چاہتا تھا کہ وہ دونوں پہلے اچانک جمیندر اس سے ملا

”جسپال اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اوگی پنڈ جانے سے پہلے تم چند ہی گڑھ جاؤ، تو کیا تم چلے جاؤ گے؟“

”معاملہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا

”یہ تمہیں وہاں جا کر تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ یہ مہم اگر کامیاب ہوگی تو سمجھو تم نے خالصتان تحریک کی بہت بڑی خدمت کر دی۔ اور میرے ساتھ تمہیں اس کا کتنا فائدہ ہوگا، یہ وقت بتائے گا۔“

”کل کس نے دیکھا ہے میری جان، تم آج کی بات کرو، آج ہی سب کچھ ہے۔ فائدہ تیرا ہو یا میرا، ایک ہی بات ہے، ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔“ جسپال ایک دم سے مان گیا۔ اسی وقت ان میں سب طے ہو گیا۔ ہفتے کے اختتام پر وہ بھارت آ گیا۔

ان کے سفر کا اختتام سیکر آٹھ کے علاقے میں گولف روڈ کی طرف سے اندر کی جانب ایک دو منزلہ سفید بنگلے کے سامنے ہوا۔ یہ چند ہی گڑھ کا وہ علاقہ تھا، جس کے مغرب کی جانب سکھنا کھیل تھی۔ فضا میں آبی علاقے کا مخصوص احساس پوری

طرح موجود تھا۔ یہاں زیادہ تر نئے لمرز کے گھر اور عمارتیں تھیں۔ دیکھ بھال کی وجہ سے وہ علاقہ صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بلڈنگ کے ارد گرد اچھا خاصہ سبزہ تھا۔ بڑا سا گیٹ پار کرنے کے بعد وہ پورچ میں پہنچے۔ سامنے بڑا سا راولی دروازہ تھا۔

دروازہ گرمیت نے چابی سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ تبھی اس کی نگاہ ڈرائینگ روم میں موجود ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ صوفے پر بیٹھ رہی تھی۔ انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ انتہائی مختصر سا شارٹس، ایک جھنجھکی نما ٹی شرٹ سے آدھا اور بدن ڈھکا ہوا تھا، الجھے ہوئے لمبے بال، اجڑا ہوا میک اپ سے بے نیاز چہرہ، جیسے کئی دنوں سے دھویا ہی نہ گیا ہو، اگرچہ گورے بدن میں گلابی پن تھا، لیکن اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کی بڑی بڑی مخمور نگاہیں جسپال پر ٹکی ہوئیں تھیں۔ پہلی نگاہ میں جسپال کو اس کا چہرہ اجنبی نہیں لگا، بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کو پہلے اُس نے کہیں دیکھا ہوا ہو۔ جسپال کی نگاہ اس لڑکی سے ہٹ کر میز پر پڑی تو اس لڑکی کے مدہوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ مہنگے برائڈ کی شراب کی آدھی سے زیادہ خالی بوتل کے ساتھ گلاس رکھا ہوا تھا۔ جسپال کی طرف دیکھ کر وہ لڑکی ذرا سا مسکرائی، پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی

”میرے اس اجڑے ہوئے گھر میں خوش آمدید۔ مجھے پتہ ہے تمہیں شاید یہ سب اچھا نہ لگا ہو، لیکن مجبوری ہے، میں ایسی ہی ہوں، میں نیہا ہوں، نیہا گردال، اپنے گھر میں تجھے دیکھ کر ہنسی ہوں، بیٹھو۔“

جسپال نے اس کا ہاتھ تھام لیا، پھر اگلے لمحے اس کا ٹھنڈا ہاتھ چھوڑ کر ساتھ بیٹھنے پر مجبور ہوا۔ اس دوران گرمیت اس کا سامان رکھ کر واپس آ گیا۔

”بائی جی، کیا پیٹا پسند کریں گے، ٹھنڈا، چائے کافی، کچھ بھی جو بولیں تو.....“ اس نے آتے پوچھا اور بوتل کی جانب بھی اشارہ کر دیا۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا

”چائے پلا دو۔“

”جی ٹھیک ہے بائی جی،“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے پلٹ گیا۔ جسپال یہ سوچے چلا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کا چہرہ اور نام اسے جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ نیہا بولی

”تم اسی طرح شرمیلے ہو یا اداکاری کر رہے ہو؟“

”مجھے کیسا ہونا پڑا ہے تھا؟“ جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر بولی

”تجھے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ جیسے تم میری مدد نہیں کر پاؤ گے، لیکن دل نے کہا کہ نہیں تم ضرور میری مدد کرو گے۔“

”میں نہیں جانتا کہ تم کیا چاہتی ہو، اپنا مسئلہ بتاؤ، شاید تمہاری مدد کر سکوں، کیونکہ میں یہاں آیا ہی اسی لئے ہوں۔“ اس نے صاف انداز میں کہا

”اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی آئے ہو، کھانا کھاؤ، آرام کرو، پھر.....“ اس نے خمار بھرے لہجے میں کہنا چاہا تو جسپال نے کہا

”اب ہم کون سا کہیں مصروف ہیں، تم بتاؤ، میں سن رہا ہوں۔“

”نہیں، میری بات چند لفظوں میں تجھے سمجھ نہیں آئے گی، ایک کہانی ہے، جو تمہیں سننا ہوگی، ممکن ہے وہ تجھے انتہائی بور لگے، اس میں تمہارے لئے کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن۔۔۔۔۔۔ وہ کہانی سن کر ہی تم میری بات کو سمجھ پاؤ گے۔ تم بھی یہیں ہو اور میں بھی یہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کوری، پھر چونک کر بولی، ”اگر تمہیں برائہ لگے تو؟“

”نہیں مجھے برائہ نہیں لگے گا۔“ جسپال نے سکون سے کہا تو وہ مسکرا دی۔ پھر ایک بیڈ روم کی طرف اشارہ کر کے بولی

”جاؤ، جا کر ایزی ہو جاؤ، پھر خوب آرام کرو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“ اس نے کہا اور بوتل کھول کر ایک چھوٹا پیگ بنایا اور گلاس تمام کر بیٹھ گئی۔ جہاں اٹھا اور بیڈروم میں چلا گیا۔

جہاں کی آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ وہ بے خبر سویا تھا۔ وہ اچھی طرح فریش ہوا، اس نے جین کے ساتھ سفید شرٹ پہنی اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتری ہوئی رات کے اندھیرے کو شہر کی روشنیاں دور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فضا میں نمی پھیلی ہوئی تھی، جس کا احساس اسے گہری سانس لینے سے ہوا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا، پھر اپنے پیچھے آہٹ پا کر مڑا تو سامنے نیہا کھڑی تھی۔ وہ کافی حد تک فریش لگ رہی تھی، اس کے سلبجے ہوئے گیسو، تروتازہ چہرہ اور ڈھنگ کی شرٹ کے ساتھ ڈریس پتلون بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت ہوش میں ہے۔

”تمہیں تو یہاں سے کوئی منظر دکھانی نہیں دے رہا ہو گا نا؟“ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا

”بالکل، یہاں اس کھڑکی سے پہلی دفعہ باہر جھانک کر دیکھا ہے، لیکن سوائے اندھیرے کے باہر کچھ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا

”کیسا لگتا ہے جب کئی سارے منظر آنکھوں میں ظہر جاتے ہیں، یوں جیسے پلکوں کے ساتھ چپک کر رہ گئے ہوں، ان سے جان بھی چھڑانا چاہو تو نہیں چھڑائی جاسکتی۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی اور پلٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ اس نے نیہا کی بات کا جواب نہ دیا تو وہ بولی، ”کھانا کھاؤ گے یا کہیں باہر چلنا پسند کرو گے؟“

”ابھی تو کھانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا ہے، جب بھوک لگی تو بتا دوں گا، ویسے اگر تم پسند کرو تو ہم باتیں نہ کر لیں۔“ جہاں نے کہا تو وہ مسکرا دی، پھر اپنے بیڈروم کی طرف اشارہ کر کے اس طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھ گئے۔ نیہا اگر وال جیسے کہیں کھو گئی۔ پھر کبھی چلی گئی۔

”یہ تین برس پہلے کی بات ہے۔ جہاں، جب میں ایک نجی ہسپتال میں نرس کے طور پر کام کرتی تھی۔ میری فیملی میں میرا باپ، میری ماں اور ایک بہن تھی۔ ہمارے ہاں انتہائی غربت تھی۔ ہمارے گھر کا ہر فرد کام کرتا تھا، پھر کہیں جا کر روٹی پوری ہوتی تھی۔ باپ ایک کپڑے والی دوکان پر کام کرتا تھا، بہن ایک سکول میں پڑھاتی تھی، ماں سارا دن گھر میں لکڑی کے کھلونوں پر رنگ کرتی رہتی تھی۔ اس وقت ہم جگتا پورہ کی بستی میں رہتے تھے، آج وہاں کچھ ڈیولپمنٹ ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی، ”میری یہ کہانی اس رات شروع ہوئی جب میں چار سے بارہ بجے کی ڈیوٹی ختم کر کے ہسپتال سے واپس گھر کی طرف آرہی تھی۔“

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک طویل لیکن سرد سانس لی۔

☆.....☆.....☆

اس رات ان پورٹ کی طرف جانے والے راستے پر چھ مہنگی کاروں کا قافلہ بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ ایک سب سے آگے، دو اس کے پیچھے، پھر ایک کار جس میں سندپ اگر وال بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو کاریں تھیں۔ سندپ سنگھ اگر وال، جسے چند ہی گڑھ کے انڈر ورلڈ والے سندو کے نام سے جانتے تھے، اپنی کار میں پچھلی نشست پر بڑے کردار سے بیٹھا ہوا تھا۔ باقی کاروں میں اس کے باڈی گارڈ تھے۔ اس وقت وہ تھائی لینڈ جانے کے لئے ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔

فلایٹ میں تھوڑا سا ہی وقت رہتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے بغیر جہاز پرواز نہیں کر سکتا۔ وہ لمبے قد کا جوان تھا، رنگ صاف، کلین شیو، موٹے نین نقش اور کسرت کے باعث کافی مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ کچھ وقت میں وہ ان پورٹ پہنچ جانے والے تھے کہ اچانک اگلی دو کاریں دھماکے سے اڑ گئیں۔ تیسری کار تیز

رفتاری کے باعث سنبھل نہ سکی اور ان میں جا لگی۔ وہ چوتھی کار میں تھا۔ اس کی کار میں بھی پچھلی کاریں آگئیں۔ شدید جھٹکے میں وہ اپنا بسٹل نکالنا نہیں بھولا۔ حملہ آوروں کو پوری طرح معلوم تھا کہ وہ کس کار میں ہے اس لئے ایک برسٹ اس کی کار کو لگا۔ اس کی کار بلیٹ پروف تھی۔ اسے گولی تو نہ لگی لیکن وہ اگلے ہی لمحے دوسری طرف سے نکل گیا۔ دو یا تین لمحوں کے اس وقفے میں وہ فٹ پاتھ پر تھا مگر اس کی کار میں ایک راکٹ لاٹچر آگیا۔ ایک دھماکا ہوا اور وہ سڑک کے کنارے جا پڑا۔ ایک شعلہ بلند ہوا جو اونچے الاؤ میں بدل گیا۔ اس کے ہاتھ سے بسٹل نکل کر بجانے کدھر گم ہو گیا تھا۔ اچانک شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ کسی کو کچھ احساس نہیں تھا کہ کون کسے نشانہ بنا رہا ہے۔ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ اسے قطعاً پتہ نہیں تھا کہ اس کا جسم کہاں کہاں سے پھٹا ہے۔ سندو کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا بدن خون میں بھیگ رہا ہے اور جلن سارے بدن میں ہو رہی ہے۔

وہ فٹ پاتھ سے بھی آگے سڑک کنارے پڑا تھا، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکتا۔ وہ سر نہ ہموڑے پڑا تھا کہ ایک گولی بجانے کدھر سے آئی اور اس کی ران میں گھس گئی۔ اسے لگا جیسے کسی نے آگ اس کے بدن میں پیوست کر دی ہو۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب اسے احساس ہوا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے، وہ اگر یہاں سے ادھر ادھر نہ ہوا تو یہ لوگ اسے مار دیں گے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر بڑا حملہ ہوگا۔ سڑک پر آگ اور خون کا ہنگامہ برپا تھا۔ موت ناچ رہی تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت صرف کی اور ریگتے ہوئے سڑک سے نشیب کی جانب بڑھ گیا۔ اور پھر لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا گیا۔ اس کے پورے بدن میں جلن ہو رہی تھی۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس سنسان علاقے میں آگئی گھاس پھوس کی جھاڑیوں میں جا چھا۔

وہ کچھ دیر وہیں پڑا رہا۔ فائرنگ کی آواز ختم ہو گئی تھی۔ لوگوں کا شور بھی ختم ہو گیا تھا، لیکن اس کا بدن کمزور پڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ایسے ہی پڑا رہا تو کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہو جائے گا اور پھر موت اسے ابدی نیند سلا دے گی۔ وہ گھسٹتا ہوا، اس سنسان علاقے میں ایک پگڈنڈی نما راستے پر آ گیا۔ جس سے کچھ فاصلے پر وہ ایک بستی نما کالونی کی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اس بستی تک پہنچ جائے تو زندگی اس کا ساتھ دے سکتی ہے، ورنہ وہ اسی راستے پر پڑا رہا تو زندگی اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ زندگی میں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے نا کہ شدید خواہش ہونے کے باوجود بندے کی دسترس میں کچھ نہیں رہتا۔

نیہا اس وقت سیکرٹریز میں کے بس سٹاپ سے اتری۔ بس سٹاپ سے کچھ فاصلے پر لگتا تھا جیسے بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے اور ٹوٹی پھوٹی کاریں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ انہیں دیکھا اور اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ وہ روزانہ ہی ادھر سے گزرتی تھی۔ اگرچہ جگتا پورہ کو جانے والا راستہ ذرا آگے تھا، لیکن جس راستے پر یہ جاری تھی، یہ راستہ کسی حد تک سنسان ہونے کے ساتھ شارٹ کٹ تھا، دوسرا اس کا دیکھا بھالا تھا اور بس سٹاپ کے سامنے تھا۔ وہ بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو اندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں ذرا بھی حرکت نہیں تھی۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ اس کے من میں خوف اتر آیا۔ وہ اس سے پہلو بچا کر نکل جانا چاہتی تھی کہ اس شخص نے حرکت کی اور پکارا

”پلیز! مجھے بچالو.....“

اس کے بڑھتے ہوئے قدم جم کر رہ گئے۔ جیسی سی روشنی میں اس نے دیکھا، وہ شخص خون میں لت پت پڑا تھا۔ تکلیف کی شدت کے باعث اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ ایک ٹکڑے ہونے کے ناتے وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ شدید زخمی ہے اور اسے ٹریینٹ کی ضرورت ہے۔ وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔ اسے لگا یہ کوئی زخمی ہے اور اسی حادثے سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ

بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گئی اور دھیرے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا
”میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”کچھ بھی..... جو تمہاری..... سمجھ میں آئے..... مجھے بچا لو پلیز۔“

”میں تمہیں کسی ہسپتال لے جاؤں؟“ نیہانے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا

”نہیں، میرے دشمن..... مجھے تلاش..... کر رہے ہوں گے۔ کسی ایسی جگہ..... جہاں میں..... کم از کم یہ رات..... گزار لوں اور..... مجھے کوئی..... لگی ہے وہ..... نکل جائے۔“

اس شخص کے یوں کہنے پر نیہا کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ کچھ دیر پہلے سڑک پر ہونے والا حادثہ بہر حال ویسا نہیں تھا۔ جو اس نے سوچا تھا۔ گولی لگنا کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔ نیہا کا گھر کچھ ہی فاصلے پر تھا، ایک دم سے اسے خیال آیا تو اس نے پوچھا
”دیکھو، میں تمہاری کیسے مدد کر سکتی ہو، پولیس اگر مجھ تک..... نیہانے کہنا چاہا

”صرف ایک رات..... مجھے کچھ وقت کے لئے..... چھپا لو۔“ وہ کراہتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا
”دیکھو، میرا گھر یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ وہاں تک جا سکو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ اس نے پراعتماد لہجے میں کہا

”مجھے سہارا دو۔“ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو نیہانے اسے سہارا دے کراٹھا۔ خون سے اس کے کپڑے لت پت ہو چکے تھے۔ سندو سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ران میں لگی ہوئی گولی نے اس کے پورے بدن میں ٹیسیں بھر دی تھیں۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد کراہتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑا۔

”اگر تم میرے گھر تک پہنچ گئے تو میں تمہاری گولی بھی نکال دوں گی۔ میں زس ہوں۔“ اس نے بتایا تو سندو کو لگا جیسے اس کی زندگی بچ جائے گی۔ وہ پوری قوت سے اٹھا اور اس کے سہارے چلنے لگا۔

اس بستی نما کالونی میں چھوٹے بڑے کئی گھر تھے، لیکن ساری ہی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ رات کے تقریباً دو بجنے والے تھے۔ ٹیڑھی میڑھی گلیاں اور راستے سنسان ہو گئے ہوئے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہیں راستے میں کوئی نہیں ملا۔ وہ اسے لے اپنے گھر میں آ گئی۔

”اے یہ کون ہے، کہاں سے اٹھالائی ہے تو اسے؟“ اماں نے دروازہ کھول کر خون سے لت پت ایک اجنبی کے ساتھ اسے دیکھ کر نیند میں بھری آواز سے پوچھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، سندو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی بڑے نوٹ اس کے ہاتھ میں آئے اس کی ماں کی طرف بڑھا دیئے۔ ماں نے حیران نظروں سے وہ نوٹ پکڑے اور خاموش ہو گئی۔ اس کا باپ تھراپی کر مد ہوش پڑا تھا۔

”اماں جلدی سے پانی گرم کر دے۔“ نیہانے کہا اور اسے اندر والے کمرے میں لے جا کر زمین پر لٹا دیا۔ اس نے امیر جنسی کے لئے اپنے گھر میں کچھ میڈیسن رکھی ہوئیں تھیں۔ وہ سب اٹھالائی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ سندو کے سارے کپڑے اتار دیئے۔ صرف ایک جالیکہ اس کے بدن پر رہ گیا۔ نیہا جب اس کے کپڑے اتار رہی تھی تو سندو کے گلے میں بھاری سونے کی چین تھی، وہ اتاری، بریسلٹ الگ کیا، سونے کی چین والی گھڑی، انگوٹھیاں الگ کیں۔ اس نے اتنا سونا کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے وہ سنبالا اور اپنی ماں کو خبر نہ ہونے دی۔

وہ ماہر سرجن تو نہیں تھی لیکن سندو کی ران سُن کی اور پھر چیر کر اس نے گولی نکال لی۔ خون بہنے لگا تھا۔ جسے اس نے مشکل سے روک لیا۔ اس کے بدن پر کافی سارے چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ صرف ایک بڑا زخم تھا۔ اس نے سب پر مہم بٹی کر دی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس وقت سندو کو میڈیسن کی ضرورت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گولی والی جگہ پر سوجن ہو سکتی ہے اور ممکن

ہے زہر کا اثر ہو جائے۔ لیکن اتنی رات گئے وہ کہاں سے میڈیسن لاتی۔ سندو انجکشن کے زیر اثر پڑا تھا، جس کا اثر کچھ دیر بعد ختم ہو جاتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور کمرے سے باہر صحن میں آ گئی، جہاں اس کی ماں پڑی ہوئی تھی۔

”ماں اسے یہیں پڑے رہنے دینا، میں اس کے لئے میڈیسن لے کر آتی ہوں۔“ نیہانے کہا تو اس کی ماں نے پوچھا
”ارے اتنی رات گئے کہاں جاؤ گی، پہلے ہی میرا دل ڈر رہا ہے۔ صبح دیکھ لینا۔“

”نہیں اماں اسے ضرورت ہے، میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے وہی نوٹ اپنی ماں سے لیے اور گھر سے باہر نکل گئی۔ کافی آگے ایک چوراہے پر اسے ایک رکشہ دکھائی دیا۔ رکشے والا، رکشے ہی میں پڑا ادھڑا ہوا تھا۔ وہ اس میں جا بیٹھی۔ قریبی ہسپتال کے باہر دوکانوں سے اس نے دوائیاں لیں اور اسی رکشے پر واپس آ گئی۔ تب تک صبح کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

اس کا باپ صبح ہی اٹھ کر اپنے کام پر نکل گیا۔ ماں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ بہن بھی کام پر نکل گئی۔ ماں باہر ہی بیٹھی رہی تاکہ کوئی آنے والا اندر نہ آ سکے۔ دوپہر سے پہلے اسے ہوش آیا تو نیہانے پوچھا
”اب کیسی طبیعت ہے؟“

”میرے مسیحا کو معلوم ہوگا۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی
”دیکھو! تمہیں بہت اچھے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے، میں نے کوئی علاج نہیں کر دیا، زہر پھیل سکتا ہے، اور اتنے جھوٹے گھر میں تمہاری موجودگی بارے معلوم ہو سکتا ہے۔“

”مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے، تم یہی کہنا چاہتی ہوتی۔“ اس نے پوچھا
”ہاں، میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔ تمہیں علاج کی زیادہ ضرورت ہے۔“ اس نے سندو کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا
”ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں، لیکن تجھے تھوڑی ارز رحمت دوں گا۔ مجھے کپڑے اور، ایک ٹیکسی لا دو۔“
”باپو کے دھلے کپڑے چلیں گے، دھونی کرتا؟“

”چلیں گے۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا
”کپڑے پہن لو، تو ٹیکسی بھی آ جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے باپ کے کپڑے لا دیئے اور انہیں پہنانے میں اس کی مدد کی۔ وہ پہن چکا تو بولا

”نیہا، تم نے میری بہت مدد کی، میری زندگی بچائی۔ میں.....“
”پلیز ان باتوں کو چھوڑو۔ اماں گئی ہے رکشہ لینے، آگے جا کر ٹیکسی خود لے لینا۔“ اس نے تیزی سے کہا
سندو نے یہ سنا تو خاموش رہا، پھر عجیب سے لہجے میں پوچھا

”نیہا! تجھے ڈر نہیں لگا؟“
”ڈر کیسا؟“

”یہی اتنے سنسان راستے سے تم آتی ہو، میں خون میں لت پت کوئی چور، غنڈہ.....“ اس نے پوچھا تو نیہا انتہائی تلخی سے بولی

”کاہے کا ڈر، پیسہ ہمارے پاس نہیں، جو کوئی چھین لے گا، عزت ہے نہیں، جولوٹ لے گا۔ اور میرا یہ ماحول ایسا ہی ہے، جس میں زندگی سسکتی ہے، ہم ساری عمر زندگی سے لڑتے ہیں۔“ نیہانے کہا اور چونکتے ہوئے بولی، ”ہاں یہ لو، تیرا زیور، اور تیرے پیسے، اس کپڑے میں ہیں۔“

”یہ نوٹ مجھے دے دو، باقی تم رکھ لو، شکریہ سمجھ کر۔“ سندو نے کہا، تو تیزی سے بولی

گئیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ بدن پر تولیہ لپیٹے وارڈ روم کے سامنے آئی تو ایک مشاطہ نے کہا ”یہ سارے ڈریس آپ کے لئے ہیں، جو بھی پسند کریں، ہم وہی نکال دیتی ہیں۔“

نیہانے ہلکے کاسنی رنگ کا ایک ڈریس پسند کیا۔ کچھ دیر بعد وہ جب آئینے کے سامنے آئی تو خود کو بھی نہ پہچان پائی۔ ہلکے سے میک اپ کے ساتھ اس کا حسن اپنا آپ منوار ہاتھا۔

ملنگی روشنی میں ہنگے کے عقبی لان میں سندو کے سامنے والی کرسی پر نیہا بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک میز تھی جس پر شراب کی بوتل کے ساتھ لوازمات دھرے ہوئے تھے۔ سندو نے دو چھوٹے پیگ بنائے اور ایک اس کی طرف بڑھا کر بولا ”نیہا، تمہارے نام، جس نے مجھے ایک نئی زندگی دی۔“

نیہانے وہ جام پکڑا اور اپنے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا،

”انتاعرصہ کہاں رہے؟“

”تمہیں شاید یہ بہت عرصہ لگا ہو، لیکن میرے لئے بہت مشکل وقت تھا۔ ایک ماہ تک تو میں چھپ کر اپنا علاج کرواتا رہا۔ دراصل میں جنہیں اپنا دوست سمجھتا تھا، وہی میرے دشمن نکلے۔“ سندو نے گہرے دکھ سے کہا اور اٹھ گیا۔ نیہا بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی۔ وہ دونوں چلتے لان کے سرے پر چلے گئے، جہاں کافی حد تک اندھیرا تھا

”کیوں وہ کیوں دشمن ہو گئے؟“ اس نے پوچھا

”تم شاید یہ بات نہ سمجھ سکو، یہ ایک لمبی کہانی ہے“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”انسان ایک دوسرے کا دوست یا دشمن سوچ ہی کی وجہ سے بنتا ہے۔ کچھ نظریات ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یا تو محبت ملتی ہے یا پھر منافقت۔ جس نظریے کی بنیاد، جیسے رویے پر رکھی جائے گی، فطری طور پر انسانی سوچ میں وہی رویہ ان نظریات کے ساتھ پروان چڑھے گا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوا چند لمحے بعد اس نے خوشگوار لہجے میں کہا، ”خیر تم ان باتوں کو چھوڑو، میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں، تم یہ پیگ ختم کرو۔“ سندو نے کہا اور ہونٹوں سے لگا کر گلاس خالی کر دیا۔ ایسا ہی نیہانے کیا۔

”تم اپنے بارے میں یہی بتاؤں گے نا کہ تم ایک مجرم ہو۔“ نیہانے کہا

”میں مجرم ہوں یا نہیں ہوں، بحث اس سے نہیں، لیکن تم ایک غریب نرس چاہے ہو، لیکن میری سیما ہو۔ میرا کوئی پتہ نہیں، میں کب اور کس وقت مارا جاؤں، لیکن میری محسن، میں تمہیں تو غربت سے نکال جاؤں۔“ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور میز کے پاس جا کر بوتل سے دو پیگ بنادے۔ پھر دونوں پیگ لے کر واپس نیہا کے پاس آ گیا

”کیا کرو گے میرے لئے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا

”دور استے ہیں، ان میں سے ایک تم نے چننا ہے، جو تم چاہو، یا پھر تم بتا دینا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”کیا، کون سے راستے؟“ نیہانے پوچھا

”جتنی دولت چاہو، مجھ سے لے لو، اور اپنی دنیا جس طرح چاہو بنا لو۔ اور دوسرا یہ کہ میرے ساتھ رہو،“ اس نے کہا اور

نیہا کی آنکھوں میں دیکھا

”تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا

”تم چاہتی تو اس رات مجھے مار سکتی تھی۔ اس رات اگر میرے بہت سارے دشمن بن گئے تھے تو ایک اچھا انسان بھی مل گیا، تمہاری صورت میں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر کہوں گا کہ عقیدت ہے تم سے۔ میری صرف ایک خواہش ہے کہ تم ایک پرسکون اور خوشیوں بھری زندگی گزارو، تمہارے یہ لفظ مجھے نہیں بھول رہے کہ، کاہے کا ڈر، پیسہ ہمارے پاس نہیں، جو کوئی چھین لے گا، عزت ہے نہیں، جو لوٹ لے گا۔ اور میرا یہ ماحول ایسا ہی ہے

”نہیں، ہم بچیں گے تو خواہ مخواہ پکڑے جائیں گے۔ چوری کا سمجھ کر۔ سب لے جاؤ۔“ اس نے پوٹلی تھماتے ہوئے کہا۔ اسنے میں باہر کشتے کی آواز آئی۔ نیہانے اسے سہارا دیا اور کشتے میں ٹھادیا۔ کچھ دیر بعد کشتہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلی شام جب وہ ہسپتال گئی تو اسے اخباروں سے زیادہ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ رات والا شخص کون تھا۔ ایسا ہوتا ہے، جرائم کی دنیا میں کسی مجرم کے خوف کا تاثر زیادہ ہوتا ہے اور بذات خود وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حقیقت میں کوئی بات بہت کم ہوتی ہے لیکن جب لوگوں کی زبان پر چڑھتی ہے تو کہانیاں اور افسانے بن کر پھیل جاتے ہیں، جب کہ وہ ایسی افواہوں کا روپ دھارتے ہیں، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ گزرے، دو ماہ سے زیادہ کا وقت ہو گیا۔ اس کی ماں کو جب بھی وہ ”زیور“ یاد آتا تو نیہا کو کونسنے دینے لگ جاتی۔ اس کے خیال میں ان کی زندگی بدل جاتی، اور شاید یہاں سے بھی نکل جاتے۔ نیہا کی وہی زندگی تھی۔ روزانہ جب وہ ان راہوں سے چلتی تو اسے وہ انجمنی یاد آ جاتا۔ اُسے کئی طرح کے خیال آتے، لیکن وہ انہیں جھٹک دیتی۔ غربت اور قسمت کا ساتھ شاید نہیں بنتا۔

ایسے ہی ایک رات جب وہ ہسپتال سے نکل کر بس سٹاپ کی جانب بڑھی تو ایک سیاہ بھنگی کا راس کے پاس آرکی۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست کا دروازہ کھلا اور سندپ اگر وال نے اسے آہستگی سے پکارا

”نیہا، آؤ، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔“

وہ ایک ہی نگاہ میں اسے پہچان گئی تھی۔ وہ ایک لفظ کہے بنا اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ وہ حیران ضرور تھی کہ سندو نے اسے یاد رکھا۔ پہلی بار وہ کسی قیمتی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

”تم نے تو یہ سوچا ہوگا کہ شاید میں تجھے بھول گیا ہوں، اب واپس پلٹ کر نہیں آؤں گا۔“ سندو نے کہا

”شاید ایسا ہی تھا، یا شاید یقین تھا کہ تم ایک دن پلٹ کر آؤ گے، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ نیہانے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ اس پر سندو کافی دیر تک خاموش رہا، پھر پوچھا

”نیہا، کیا تم اپنے گھر والوں کو بتا سکتی ہو کہ آج تم گھر نہیں آ رہی ہو، میں تجھے آج اپنا مہمان بنانا چاہتا ہوں۔“

”میں اگر تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟“ اس نے لرزتے ہوئے کہا، اس کے ذہن میں سندو کے بارے سنی ہوئی باتیں پھیل گئیں تھیں۔

”میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا، میں صرف درخواست کر سکتا ہوں تم سے، اسی لئے میں خود آیا ہوں، تمہیں لینے کے لئے۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ چاہتا تو اسے اپنے بندے بھیج کر اٹھوا بھی سکتا تھا۔ نیہا کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر ایک طویل سانس لے بولی

”ٹھیک ہے میں کہہ دیتی ہوں۔“

اس نے اپنی بہن کو فون کر کے بتا دیا کہ اسے دوپہری ڈیوٹی کرنا ہوگی، اس لئے وہ کل دوپہر ہی کو آ سکے گی۔ سندو اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

وہ ایک عالی شان گھر تھا۔ پورے میں کافی ساری گاڑیاں کھڑی ہوئیں تھیں۔ وہ اس کے ساتھ سہمی ہوئی اندر ڈارنگ روم میں چلی گئی۔ وہاں وہ عورتیں کھڑی تھیں۔ سندو نے نیہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”اسے لے جاؤ اور فریش کر کے لاؤ۔“

وہ عورتیں ایسی تھیں، جیسے پرانے وقتوں میں بادشاہوں کی مشاطہ ہوا کرتی تھیں۔ وہ اسے ایک بڑے ہاتھ روم میں لے

جس میں زندگی سکتی ہے، ہم ساری عمر زندگی سے لڑتے ہیں۔“

”سندو، جیسے تم کہو۔“ یہاں نے اچانک کہا اور اس کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔ وہ اسے تھپکتا رہا۔ کافی دیر بعد اس نے نیہا کو الگ کیا اور بولا

”اب نہیں رونا۔ واگھر سب ٹھیک کر دے گا۔ آؤ کھانا کھاتے ہیں، پھر ساری رات پڑی ہے باتوں کے لئے۔“

اگلے دن نیہا کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خواب کی سی کیفیت میں ہے۔ اگلے چند دنوں میں اس کی زندگی ہی بدل گئی۔ اس نے ایک بڑی رقم دے کر اپنے والدین کو سمجھا دیا کہ وہ اب جو وہ نوکری کر رہی ہے، اس میں وقت کا کوئی تعین نہیں۔ والدین بھی سمجھ گئے کہ پڑیا اب گھونسلے سے اڑ گئی ہے۔

نیہا کو سندو کے ساتھ رہتے ہوئے ایک سال سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اس دوران نجانے وہ کن ملکوں میں گئی اور کیا کچھ دیکھتی رہی۔ سندو بنیادی طور پر بہت اچھا انسان تھا۔ حالات اور خاص طور پر بھارت میں سکھوں کے ساتھ جو ہور ہا ہے اس کے رد عمل میں سندو جیسے کئی لوگ پیدا ہو چکے ہیں۔ بظاہر اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا، لیکن اصل میں وہ جرائم کی دنیا میں بہت آگے تک نکل چکا تھا۔ اس کی اصل طاقت بہر حال نہ یا سکھ لیبریشن فرنٹ جیسی ایک سکھ تنظیم تھی، جو سامنے نہیں تھی، لیکن سکھوں کے اتحاد کے لئے پوری طرح کام کر رہی تھی۔ وہ ایک کاروباری نیٹ ورک تھا، جس کے سائے میں وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے چلے جا رہے تھے۔ مختلف ملکوں اور حکومتی ایوانوں میں رسائی کے باعث وہ بہت مضبوط اور طاقت ور تھے۔

نیہا کے ذہن میں بھی کبھی نہیں تھا کہ وہ فلمی ہیروئن بنے گی۔ ایک دن ایسے ہی مذاق میں بات چلی۔ ان کے ایک مشترکہ فلم پروڈیوسر دوست نے کہا کہ نیہا تو فلمی ہیروئن لگتی ہے، کیوں نا اسے لے کر فلم بنائی جائے۔ اسی دن طے ہو گیا کہ وہ بھارت کی پنجابی فلم میں ہیروئن ہوگی۔ اس دن سے پہلے اس کا نام کچھ اور تھا، نیہا اگر وال اسی دن رکھا گیا تھا۔

نیہا کی پہلی فلم ہی ہٹ ہو گئی۔ اگلے دو برس میں وہ بھارتی پنجابی فلموں کی مقبول اور معروف ہیروئن بن گئی۔ اس دوران سندو سے اس کا ساتھ ویسے ہی رہا۔ اور سندو نے اپنی تنظیم کے لئے اس سے بہت سارا کام لیا۔ ایک عام لڑکی شاید وہ کچھ نہ کر سکتی، جو نیہا نے کیا۔ سندو اور نیہا نے شادی تو نہیں کی لیکن ایک ایمانا ٹوٹ رشتہ ان میں موجود تھا۔ سندو کا جو بھی مقصد تھا، وہی اب نیہا کا تھا۔ ان کے لئے دولت کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ یوں زندگی کے سفر پر اپنا مقصد لئے چلتے چلے جا رہے تھے۔ مختلف سکھ تنظیموں کے پانچ لڑکے سندو کی سرپرستی میں پنجاب کے ایک گرو دوارے میں مذہبی تعلیم کے ساتھ تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کا تعلق بیرون ملک سے تھا۔ ایک سکھ گیانی ان کی تمام تر دیکھ بھال کر رہا تھا۔ سکھ پنٹھ میں پانچ بیاروں کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی نسبت سے ان پانچ لڑکوں کو ایک بڑے مقصد کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ یہاں سے بنیادی مذہبی تعلیم لینے کے بعد انہیں کینیڈا لے جایا جانا تھا۔ وہاں انہیں جدید علوم کی تربیت دی جانی تھی۔ وہ پانچوں لڑکے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی جان واردینے کا حلف دے چکے تھے۔ چند دن بعد انہوں نے کینیڈا چلے جانا تھا۔ سندو ان کی روانگی کے انتظامات میں لگا ہوا تھا کہ اچانک سندو سمیت وہ پانچوں لڑکے غائب ہو گئے۔ نیہا اور سندو کے ساتھیوں نے جب ان کی تلاش شروع کی تو انہیں بھی قتل کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ چند ہی دنوں میں اس کے بہت سارے ساتھی مارے گئے، خطرہ کچھ زیادہ ہی بڑھا تو نیہا سمیت اس کی گینگ کے سارے لوگ زیر زمین چلے گئے۔

”وہ کون لوگ تھے، جنہوں نے سندو کا سب کچھ تباہ کیا، کچھ پتہ چلا۔“ جیسا کہ نے پوچھا تو نیہا بیڈ پر پھیلتے ہوئے بولی ”پہلے پہل تو بالکل ہی پتہ نہ چلا کہ وہ کون لوگ تھے، لیکن پھر آہستہ آہستہ معلوم ہو گیا کہ بھارتی خفیہ ایجنسی ’را‘ کے لوگ تھے۔ ان کی مدد سکھ پر یوار کے مقامی لوگوں نے کی۔“

”ان لڑکوں کی ایسی کیا تربیت ہو رہی تھی کہ ’را‘ والوں کو تابزا آپریشن کرنا پڑا۔“ جیسا کہ نے اچھے ہوئے پوچھا ”ان پانچ لڑکوں کو اس لئے تیار کیا جا رہا تھا کہ بھارت میں ان سیاست دانوں کو ختم کرنا ہے، جو کسی نہ کسی صورت میں سکھ نسل کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے علاوہ آئندہ آنے والے الیکشن میں سکھوں کی تمام حریت پسند تنظیمیں اپنا امیدوار کھڑا کرنے والی تھیں۔ یہ طے ہو گیا تھا۔ چونکہ پنجاب میں مسلمان بھی ہیں، ان سے سیاسی سطح پر بات ہو رہی تھی۔ اور یہ سب سندو کی سرپرستی میں ہو رہا تھا۔“ نیہا نے ایک طویل سانس لے کر کہا ”وہ حملہ، جس میں تم اس سے ملی تھی، وہ کس نے کیا تھا، اس بارے کبھی تمہیں پتہ چلا؟“ جیسا کہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”بنیادی طور پر وہ بھی ’را‘ ہی کا تھا، لیکن سندو کے بندے تو ڈکر، وہ اس سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔“ ”اب تم کیا چاہتی ہو؟“ جیسا کہ نے پوچھا ”سندو اور ان پانچ لڑکوں کی واپسی۔“ اس نے سکون سے کہا ”دیکھو، زندگی اور موت تو رتب کے ہاتھ میں ہیں، کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اچھی تک زندہ ہیں، اور پتہ ہے وہ کہاں ہیں؟“

”مجھے ان کے زندہ ہونے کا پورا یقین ہے، کیونکہ وہ ’را‘ والوں کی کسی فائل میں نہیں۔“ ”را‘ والوں نے انہیں پکڑا ضرور ہے لیکن اب وہ کہاں ہیں اس بارے کسی کو معلوم نہیں۔“ ”را‘ کے کرتا دھرتا کو بھی نہیں۔“ اس نے پورے یقین سے کہا تو جیسا کہ خاموش ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

”نیہا! اب میں سمجھا ہوں کہ تمہارا چہرہ جانا پہچانا کیوں لگا۔ تمہیں فلموں میں دیکھا ہوگا۔ اب فلمی مصروفیت.....“ جیسا کہ نے پوچھا تو وہ بات قطع کرتے ہوئے بولی ”بالکل بھی نہیں، میں ان کے لئے گم ہو چکی ہوں۔ ابھی کچھ فلمیں ادھوری ہیں، لیکن کوئی بات نہیں، وہ ہو جائیں گی اگر سندو مل گیا تو۔“ وہ رو ہانسا ہوتے ہوئے بولی

”ریٹکس نیہا۔! رتب بھلا کرے گا، آؤ اب کھانا کھاتے ہیں۔ پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“ جیسا کہ نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔



میلے والا میدان جگ گیا تھا۔ پچھلے برس میلہ نہیں ہوا تھا، سو اس بار پورے علاقے کے لوگوں میں جوش و خروش عروج پر تھا۔ سب کچھ ویسے ہی ہو رہا تھا، جیسے ہر برس ہوتا تھا۔ چھا کا اور اس کے ساتھی پوری طرح اس میلے کی نگرانی کر رہے تھے۔ علاقے سے بہت سارے شہر زوروں نے اپنے طور پر بھی ذمہ داری لے لی تھی کہ وہ میلے میں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہونے دیں گے۔ پہلے دن کی شام جب میں وہاں گیا تو میلہ بھر پور تھا۔ میں نے ایک چکر لگایا اور واپس برگد کے درخت کے پاس آ گیا جہاں پر وہ درویش ملے تھے۔ اس وقت وہ درخت کے پاس نہیں تھے، بلکہ آگ اسی طرح جل رہی تھی اور پرانی سی کیتلی میں چائے اُبل رہی تھی۔ اُن کی گدڑی اور دوسری چیزیں ویسے ہی پڑی ہوئیں تھیں۔ میں ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یوں لگا جیسے وہ اچانک درخت کے پیچھے ہی سے نمودار ہوئے ہوں۔ وہ آ کر اپنی گدڑی پر بیٹھتے ہوئے بولے

”ہاں بھی تو جوان، تیرا میلہ تو بہت زوروں کا لگا ہے۔ بڑے لوگ آئے ہیں یہاں پر۔“

”میرا میلہ کیا ہے باباجی، آپ خود ہی رونق لگا کر بیٹھے ہیں۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔“ میں نے عاجزی سے کہا

”عاجزی اچھی شے ہے نو جوان، پر بندے کی اپنی لٹا بھی تو ہونی چاہئے۔ جس طرح بندگی میں خلوص اور ریا کاری ہوتی ہے۔ اس میں ذرا سا ادھر ادھر ہو جانے سے بندگی میں عروج آ جاتا ہے یا پھر بندگی ہی سے خارج ہو جاتا ہے، اسی طرح بندگی میں عاجزی بڑی ضروری ہے کیونکہ یہ بندے کی شان ہے اور تکبر رتِ تعالیٰ کی شان۔ ہم اگر اتنا ہی کہہ دیتے ہیں کہ تو خدا ہے، تو میں اس میں کہاں ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو تو خارج کر دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ تو میرا خدا ہے تو اس میں میرا ہونا ہوا۔ اور عاجزی یہ ہے کہ کہا جائے میں تیرا بندہ ہوں۔ اس میں، میں، کا وجود ہوا۔ رتِ تعالیٰ پر یقین کے ساتھ اس پر کئی بھروسہ ہی عاجزی ہے۔ یہ بندہ ہی کرتا ہے۔“

”یہ زندگی، اور اس میں بندگی ایک وجود کے ساتھ ہی ہے نا، یہ تو میں نے بات سمجھ لی ہے۔“ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا

”اور اس وجود میں ”میں“ کیا کچھ ہے؟ یہ فطری سی بات ہے کہ ہم اسے عقل کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ عقل بھی تو اسی وجود میں پڑی ہے۔ عقل سے سوچنا بھی تو فطری ہے، یہی وہ شے جو اس راستے پر ڈالتی ہے جہاں ہم اشیاء کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ یہ فطرت ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے تو تجسس بڑھتا ہے، تجسس ایک راستے پر ڈالتا ہے اور عقل اس کی راہنمائی کرتی ہے، یہاں تک کہ عقل ایک منزل پر آ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ کیونکہ عقل سے جہاں حیرتیں ابھرتی ہیں، وہاں عقل ایک تماشا بھی کرتی ہے۔“

”وہ تماشا کیا ہے باباجی؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ ہلکا سا مسکرائے اور بولے

”عقل ہر وقت ایک نیابت گھڑنے میں مصروف رہتی ہے۔ یہ ہمارے ارد گرد جنت نئے بُت وجود میں آتے ہیں یہ عقل ہی تو گھڑ رہی ہے، اب کسی بُت کا ظاہری وجود ہے اور کسی کا ظاہری وجود نہیں۔ عقل بُت خانہ سجائے بیٹھی ہے، یہاں تک کہ کوئی ابراہیم آ جاتے ہیں اور وہ بُت خانہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اب دیکھو عقل کی منزل کہاں پر ظاہر ہوتی ہے؟ اور عقل اپنی تمام تر جولائیاں کہاں دکھاتا ہے؟ یہاں تک کہ اس حلقہ آفاق میں جو گرما گرمی ہے، یہ کس کے دم سے ہے، اسی انسانی وجود سے۔“

”باباجی جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں کہ انسان اپنے ہی خیالات سے بُت گری کرتا ہے اور اسی میں ہی بُت خانہ ختم ہو جاتا ہے۔“ میں نے نجات سمجھتے ہوئے اسے دھرایا۔

”یہ نہیں سمجھو گے کہ عقل کے بُت کون سے ہیں، عورت کی خواہش، لالچ، تکبر، حکومت، حسد، یہ سب عقل میں جوں کی طرح نصب ہے۔ جائیں تو وجود بُت خانہ بن جاتا ہے، اور بُت خانوں میں کیا ہوتا ہے، کیا تم نہیں جانتے ہو؟“ انہوں نے دھیمے انداز میں کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا اور پھر جواب دیتے ہوئے کہا

”وہاں تو پھر بُت پرستی ہوگی،“

”ایک دوسری طرح کے بُت بھی ہوتے ہیں، وہ نظریات ہیں۔ اپنے طور پر نظریہ گھڑ لیا اور پھر اس پر ڈٹ گئے، اب اس سے کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا، یہ ایک الگ سی بحث ہوگی، مگر یہ دیکھو تمام فلسفے اور نظریات بھی تو اسی صورت میں سے ہوتے ہیں، جو انسانی وجود میں ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا

”ابھی تم نے پوچھا کہ زندگی کے یہ تماشا؟“ یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے، ”زندگی کیا ہے؟ پہلے تو یہ سمجھنا ہوگا، زندگی کو تسخیر کرنے کے عمل کو ہی زندگی کہتے ہیں۔“

”زندگی کو تسخیر کیسے کیا جاتا ہے باباجی؟“ میں نے پوچھا تو بولے سے ہنس دیے، پھر میری طرف پر شوق نگاہوں سے

دیکھ کر بولے

”اپنے آپ کو تسخیر لو۔ زندگی خود بخود تسخیر ہو جائے گی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو کہ تم خود زندگی کے مظہر ہو، خود زندگی ہو، جو رتِ تعالیٰ نے تمہیں تقویٰ کر دی ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کتنی دیر تک وہ اسی کیفیت میں رہے۔ اس دوران میں نے میدان کی جانب دیکھا۔ میلہ اپنے بھرپور انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہ میدان جہاں سارا سال اندھیرا چھایا رہتا تھا، اس رات برقی قلموں سے یوں روشن تھا، جیسے دن چڑھا ہو۔ وہ درویش آنکھیں بند کئے پڑے رہے، کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے توجہ نہ کی تو میں اٹھا اور واپسی کے لئے چل دیا۔

میں گھر آیا تو اماں کے پاس سوئی موجود تھی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لئے بیٹھا تو اماں نے کہا

”حویلی میں جا کر کھاؤ، تانی کئی بار تمہارا پوچھ چکی ہے۔ آج نجانے کیوں وہ بہت اداس لگ رہی ہے۔ اس کی دل جوئی کرو جا کر۔“

میں چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر سوئی کی طرف دیکھا، جس کا آدھے سے زیادہ چہرہ آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی، اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ میں اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔

تانی اب کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی۔ وہ اب اپنے سہارے اٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ جب سے تانی واپس نورنگر آئی تھی، میں نے اس کی بھرپور نگہداشت کی تھی۔ تانی اسی میں خوش تھی کہ میں اس کے پاس ہوں اور میلے کے انتظامات کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

تانی ایک کمرے میں دھیمی روشنی کئے پڑی تھی۔ میں نے جا کر کمرہ روشن کر دیا تو میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ تانی نے تیزی سے یوں اپنے آنسو پونچھے، جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے ایک سیاہ ٹراؤزر پر سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ رہی بیٹھ گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک ٹھیک ہے۔ وہ سکون سے بیٹھ گئی تو میں نے دھیمے سے پوچھا

”تانی کیا بات ہے، کیوں زور رہی ہو۔“

میرے یوں پوچھنے پر اس نے میری طرف جبرائلی سے دیکھا اور بولی

”تمہیں کس نے کہا کہ میں زور رہی ہوں، یہ تو ایسے ہی آنکھوں میں جھین ہو رہی ہے۔“

”اچھا تم ایسا کرو، اٹھو، میں تمہیں ایک اچھا سا سوٹ دیتا ہوں، وہ پہنو، ہم میلے پر گھوم کر آئیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا

”سوٹ میں نکال کر پہن لیتی ہوں، لیکن میلے پر نہیں جا پاؤں گی، یہ جو فائر لگا ہے اس کا زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوا۔ بے احتیاطی کی تو.....“ اس نے کہا تو میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا

”چلو، اٹھو سو سو، ایک لڑکی دکھائی دو، پھر کھانا کھاتے ہیں اور گیس لگاتے ہیں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ سارا اپنے بیٹے مراد کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے وہاں موجود ملازم سے کہا کہ وہ ہمارا کھانا چھت پر لگا دے۔

میں ڈرائیگ روم میں ہی تھا کہ تانی آف وائٹ کمر کے سوٹ پہنے وہاں آ گئی۔

”آؤ اوپر چلتے ہیں چھت پر۔ وہیں کھانا کھائیں گے۔“

”مجھے سے شاید بیڑھیاں.....“ اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے

کے قریب تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ہونٹوں پر ایک دم سے مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنے بازو میری گردن کے گرد حائل کر دیئے۔ میں اسے بازوؤں میں بھر کر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ملازم نے چارپائی نکال کر بستر لگا دیا تھا۔ چھت پر لا کر میں نے اسے بستر پر بٹھادیا اور خود سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر میلے کی روداد سامنے لگا۔ وہ سنتی رہی۔ کھانا بھی کھالیا۔ اس دوران اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا۔ چائے کگ دے کر جب ملازم چلا گیا تو میں نے تانی سے پوچھا

”سچ بتانا تانی، کیوں افسردہ تھی تم۔ کسی نے کچھ کہا یا کسی کی کوئی بات بری لگی یا.....“

”نہیں، نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، ایسا سوچنا بھی مت، مجھے یہاں سے پیار ہی اتنا ملا ہے کہ میں ساری زندگی کا پیار جمع کر لوں تو بھی اس کے برابر نہیں ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے جمال۔“

”تو پھر تم اداس کیوں ہو؟“ میں نے پوچھا تو ایک دم سے مضطرب ہو گئی، اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، پھر بالوں میں انگلیاں پھیر کر زور سے آنکھیں بند کیں اور ایک طویل سانس لے کر بولی

”جمال! مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم لوگ مجھ سے نفرت نہ کرو، مجھے خود سے الگ نہ سمجھو۔ پلیز“

”یار ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔“ میں نے اس کا جذباتی پن دیکھ کر پوچھا، پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا سر سہلایا

”جمال! میں مسلمان نہیں بلکہ مسیحی ہوں۔“

اس نے ڈرتے ہوئے کہا تو اس انکشاف پر میں ایک دم چونکا تو ضرور لیکن خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا

”تو پھر، اس میں اداسی کی وجہ؟“

”جمال، میری ساری زندگی نفرتوں میں گزری ہے، کچھ اپنوں سے، کچھ بیگانوں سے۔ روہی میں مجھے عزت ملی، احترام ملا، مجھے اعتماد ملا۔ اپنے ہونے کا احساس ہوا، لیکن محبت نہیں ملی۔ میں جب سے نور مگر آئی ہوں، میں نے اتنا پیار پایا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ خاص طور پر اماں سے۔ میں سمجھتی ہوں اماں ہی ایک ایسی ذات ہے جس نے سب کو پرو کر رکھ دیا ہے۔ آج ہم یہاں ہیں تو یقیناً جانو اماں کی وجہ سے۔“ اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا

”یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا

”میں جانتی ہوں کہ سوئی تم سے بے حد محبت کرتی ہے، اتنی محبت کہ تم بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے ہو۔ اس کی محبت کے سامنے تو مجھے اپنی محبت بہت کم لگتی ہے۔ باپ سے نفرت اپنی جگہ، لیکن پھر بھی وہ تم سے محبت کرتی چلی جا رہی ہے۔ عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے، لیکن محبت میں شراکت برداشت نہیں کرتی۔ سوئی یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں، اور اسی وجہ سے یہاں ہوں، اس نے نہ صرف برداشت کیا، بلکہ تم سے محبت ہونے کے ناطے مجھے پیار اور احترام دیا۔ ایسا کیوں ہوا، صرف اماں کی وجہ سے۔“

”اماں کی وجہ سے، میں سمجھا نہیں؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولی

”سوئی طوائف کی بیٹی تھی، اس نے اس ماحول میں آنکھ کھولی، بچپن سے جوانی تک تربیت حاصل کی۔ مگر کہاں گئی وہ تربیت، وہ ماحول، اماں کے پاس آئی، اس کے پاس رہی اور آج وہ کیا ہے، شاید تم اور میں نہیں سوچ سکتے۔ مجھے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں مسیحی ہوں، لیکن اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ پرستش کے لئے کوئی اور طاقت ہے۔“

”مطلب کیسے۔ تم کھل کر بتاؤ۔“ مجھے خود تجسس ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے ایک نئی سوئی سے متعارف کروا رہی تھی۔

”اماں تو عبادت کرتی ہے، لیکن سوئی دوہری عبادت کر رہی ہے۔“ اس نے کہا

”دوہری عبادت۔ کیا مطلب؟“

”مثلاً، اماں نماز پڑھتی ہے، سوئی بھی پڑھتی ہے۔ جتنا اماں جاگتی ہے، اتنا وہ بھی جاگتی ہے، لیکن سوئی اماں کی خدمت کرتی ہے۔ وضو سے لے کر جائے نماز بچھا دینے تک کے چھوٹے چھوٹے کام۔ سوئی کے اندر کی طوائف نجانے کب کی سر چکی ہے۔ وہاں تو ایک عبادت گزار بندہ موجود ہے۔“ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں بتایا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر تانی کی طرف دیکھ کر کہا

”تانی، میری اماں ہے ہی ایسی۔ سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم کہ میری اماں کیا ہے، بس مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ میری ماں ہے اور میری ساری طاقت اس کی دعا ہے۔ خیر، تمہارے بارے میں کبھی تجسس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ کیا تم اپنے بارے میں مجھے بتاؤ گی۔“

”کیوں نہیں، میں تو بتانا چاہتی تھی، لیکن نفرت.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تو وہ کہتی چلی گئی

”میرا باپ اندریاس گوجرانولا کا رہنے والا تھا۔ اس نے پادری بننے کی تعلیم حاصل کی اور پھر ایک برطانیہ کی شہریت رکھنے والی پاکستانی نژاد عورت سے شادی کر لی جو میری ماں تھی۔ میں برطانیہ میں پیدا ہوئی تھی، اور میری شہریت وہیں کی ہے۔ میرا ایک بھائی ہے جو کبھی پاکستان میں ہوتا ہے اور کبھی برطانیہ، وہ پرنس کرتا ہے، اور یہاں کی مسیحی برادری میں اس کا بہت اثر سوخ ہے۔ میں زیادہ عرصہ برطانیہ میں رہی ہوں۔ میرے نہ چاہنے کے باوجود بھی مجھے ”نن“ بننے کی تعلیم دی جانے لگی تھی۔ مجھے تو پہلے ہی سب پسند نہیں تھا اور پر سے ایک نوجوان پادری میرے جسم کے حصول میں لگ گیا۔ دراصل مجھے ”نن“ نہیں بنایا جا رہا تھا، بلکہ ایک ایجنٹ بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اسی دوران میرے باپ نے میری ماں کو قتل کر دیا۔ وہ پکڑا نہیں گیا، بلکہ وہاں سے فرار ہو گیا اور پھر اس کے بعد ہم نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا

”پھر کیا ہونا تھا، ہماری بلکہ میری بد قسمتی کا آغاز ہو گیا۔ مجھے لوٹ کا مال تصور کر لیا گیا۔ سب سے پہلے اس نوجوان پادری نے مجھے اپنی رکھیل بنائے رکھا۔ جب وہ مجھ سے اکٹا گیا تو بڑے کردار کے الزام کے ساتھ مجھے ”نن“ تو نہ بننا پڑا، بلکہ مجھے ایجنٹ بننے کی تربیت دی جانے لگی۔ میری شکل صورت دیکھ کر لوگوں کو ورغلانے کی تربیت دی جانے لگی۔ دوسرے لفظوں میں مجھے تربیت یافتہ طوائف بنا دیا گیا۔“ اس نے انتہائی دکھ سے بتایا

”روہی کیسے پہنچی؟“

”مجھے پاکستان میں چھوڑا گیا اور یہاں کے کئی سیاست دانوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کا ٹارگٹ دیا گیا۔ اور میں کرنی رہی۔ میں چند سیاست دانوں کے بارے میں تو پوری تفصیل سے بتا سکتی ہو۔ کون، کیا ہے؟ اسی دوران مجھے ایک ابھرتے ہوئے سیاست دان کا ٹاسک دیا گیا۔ ظفر سیال تھا نام اس کا، میں اس کے قریب ہوئی لیکن وہ میرے ہتھے نہ چڑھ سکا۔ اس کا کردار بہت مضبوط تھا۔ مجھے اس کو قتل کر دینے کا کہا گیا۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ اسے ساری صورت حال بتادی۔ وہ روہی کا پروردہ تھا۔ اس نے مجھے وہاں بھیج دیا۔ مہر خدا بخش نے مجھے بہت عزت دی۔ میں نے جو سیکھا تھا، سب وہاں سکھا دیا، جیسے تم نے نشانہ بازی کا تھک وہاں دیا۔“

”دیکھو! یہ راز تمہارے اور میرے درمیان ہی رہے گا۔ تم کیا تھی اور کیا ہو، یہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں یہاں عزت ہی ملے گی۔“ میں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے الگ کر کے اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دلایا۔ وہ ایک دم سے رُو پڑی، پھر بولی

”جمال! اس قدر ذلیل ہوتا ہے یہ عورت جب اسے لوٹ کا مال سمجھ لیا جائے۔“
 ”لیکن اب نہیں ہو۔ یہاں رہو، ہمارے ساتھ فیملی ممبر بن کر، باقی سب بھول جاؤ۔“ میں نے کہا تو اس نے آنسو پونچھ لیے۔ پھر اس کے بعد ہم دیر تک بیٹھے رو ہی کو یاد کرتے رہے۔

☆.....☆.....☆

صبح کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ جہاں بیدار ہوا اور کتنی ہی دیر تک پڑا سوچتا رہا کہ سندھ پ اگر وال عرف سندھ کو کہاں تلاش کرے۔ اسے غائب کرنے والی بھارت کی ریاستی خفیہ تنظیم ’را‘ تھی۔ اسے یہ تو اعتماد تھا کہ یہاں کام کے لئے وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ اسے لوگ مل جائیں گے۔ مگر وہ کس سے کیا کام لے؟ اگر یہ معلوم ہوتا کہ سندھ کہاں ہے، جب کوئی پلاننگ کی جا سکتی تھی، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ بھارت میں بھی ہے یا نہیں، یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا اسے مار کر اس کا وجود ہی ختم کر دیا گیا ہو۔ وہ پھر چاہیے ساری عمر ٹانگ ٹوٹا رہا۔ سندھ، اسے کہاں ملتا۔ یہ سوچتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا یہ سب کہیں اس کے لیے دھوکا تو نہیں؟ اسے خواہ مخواہ ایک ایسا ٹانگ دے دیا گیا ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو گیا اگر جسمیندر نے ایسا کیا تو یہ بہت غلط کیا تھا۔ کیا اب وہ اس کا دوست نہیں رہا اور اسے بڑے آرام سے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے؟ جہاں کو بہت سے ایسے خیال آتے چلے گئے۔ ایک دم سے اسے لگا جیسے وہ اگر یہاں کچھ دیر اور پڑا رہا تو قوطی ہو جائے گا۔ لہذا اسے یہاں سے اٹھ جانا چاہئے۔ وہ اٹھا اور کچن کی طرف چل دیا۔ ابھی اس نے چائے کا پانی دھرا ہی تھا کہ گریت کسی جن کی طرح آگیا۔

”اوبائی جی مجھے بتاؤ، میں آپ کو چائے دے کے آتا ہوں۔“

”میں نے کہا تمہیں کیا تکلیف دینی ہے یار۔“ جہاں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا

”اوبائی جی، آپ بیٹھ جا کر، میں لاتا ہوں چائے، میڈم تو ابھی دیر سے اٹھے گی، آپ ناشتہ کھو تو وہ بھی بنا دیتا ہوں۔“

”ابھی چائے لے آ۔“ یہ کہہ کر جہاں اپنے کمرے کی بالونی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ گریت چائے لے کر آگیا۔ جہاں نے سب لے کر کہا

”یار چائے تو تم نے اچھی بنائی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں خاموش رہا پھر پوچھا۔ ”یار گریت تو نے کبھی سندھ صاحب کو دیکھا ہے؟“

”کیوں نہیں جی، چھوٹا سا تھا جب میں ان کے پاس آیا تھا، پھر یہیں پلا بڑھا ہوں۔“ اس نے تیزی سے بتایا تو وہ ایک دم سے چوکتے ہوئے بولا

”دیکھ، تجھے معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، تیری میڈم کو تو صرف اتنا معلوم ہے کہ سندھ کا کچھ پتہ نہیں، اب ہمیں تلاش کرنا ہے، تو مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ تجھے کس پر شک ہے۔“ جہاں نے پوچھا

”اگر مجھے معلوم ہوتا تو سندھ صاحب کو اپنی جان دے کر بھی لے آتا۔“ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا

”چل تو مجھے یہ بتا کہ سندھ کو سب سے زیادہ کس پر اعتماد تھا۔ وہ اپنے اہم مشورے کس سے کرتا تھا۔“ جہاں نے پوچھا

”ہاں! یہ میں بتا سکتا ہوں، یہیں چند گزھ کا ہی ایک نوجوان ہے، سندھ صاحب جتنی عمر تھی اس کی۔ نام اس کا ہے

مردار کلیان سنگھ لیکن سب اسے کوئی کہتے تھے۔“

”تھے کا کیا مطلب؟“ جہاں نے چونک کر پوچھا

”بزنس تو وہ پہلے ہی کرتا تھا، اب اس کا بزنس بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے، اب سارے اسے کلیان سنگھ ہی کہتے ہیں۔“ گریت نے بتایا

”یہیں چند گزھ میں ہوتا ہے یا.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا

”یہاں ہوتا ہے جی، یہاں کی سیاست میں اس کا بڑا نام ہے، سندھ صاحب سے جب دوستی تھی، تب بھی سیاست میں اس کا نام بولتا تھا۔“ اس نے تیزی سے بتایا

”اچھا تم کیا سمجھتے ہو کہ سندھ کا سب سے بڑا دشمن کون تھا؟“ اس نے پوچھا

”کئی سارے تھے، کوئی ایک تھا۔ حکومت کے لوگ اس کے پیچھے تھے، انڈر ورلڈ کے لوگ الگ، کاروباری دشمن الگ، کوئی ایک نام تو نہیں ہے۔“ گریت نے بتایا

”اچھا تو ایسا کر، بہترین ناشتہ بنا میں اتنے میں تیار ہوتا ہوں۔ اس دوران تو نے یہ سوچنا ہے کہ سندھ کا سب سے بڑا دشمن کون تھا اور وہ کہاں پایا جاسکتا ہے، بس اتنا یاد کر کے بتا۔“ جہاں نے اسے خالی گد دیتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا۔ جہاں نے ایک سراپکڑ لیا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ اس کے آخر میں کچھ ملتا بھی ہے یا نہیں۔

اسے تو کوشش کرنا تھی۔ اسے نجانے کب یہ سنا تھا کہ چوری تلاش کرنی ہو تو پہلے اسی جگہ سے کرو، جہاں چوری ہوئی ہو۔ بلاشبہ وہاں سے کوئی نہ کوئی ایسی راہ مل جائے گی۔ اور اگر چوری غائب کرنی ہو تو اس جگہ وہیں سے بھٹکایا جاسکتا ہے۔

وہ تیار ہو کر ناشتہ کر چکا تو اسی دوران جسمیندر کا فون آگیا

”لگتا ہے اچھا خاصا آرام کر لیا ہے تو نے۔“

”تجھے خواب آگیا، یا ویسے ہی کہہ رہے ہو؟“ جہاں نے خوشگوار موڈ میں کہا

”یار ہم جس دنیا میں ہیں نا، وہاں لہجے سے نیت پچھاننے کی کوشش کرتے ہیں، تم نے فون نہیں کیا، میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ تم آرام کر رہے ہو۔“

”میں نے آرام بھی کر لیا اور خود کو تیار بھی، اب تم بولو۔“ جہاں نے کہا

”پہلی بات تو یہ ہے کہ نہیہا کے اس ٹھکانے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے، اس کے پاس فی الحال کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ تم جس قدر جلدی ہو سکتے یہاں سے شفٹ کر جانا، دوسری بات یہ ہے کہ ابھی یہاں سے نکلو تو سکھنا جمیل کے جنوب مغرب میں گروساگر صاحب کا گردودادہ ہے۔ وہاں ماتھا ٹھکنے پہنچو، وہیں کچھ لوگ تمہیں مل جائیں گے۔ اگر چاہو تو اسی گردودارے میں رہ سکتے ہو۔“

”مجھے ٹھکانے کی پرواہ نہیں، بس بندے کام کے دے دینا، باقی رتب جانے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ نہیہا ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور باہر نکلتا چلا گیا۔

سرور روڈ سے آگے جا کر اسے کچھ رکشے کھڑے دکھائی دیے۔ اس نے ایک رکشہ لیا اور گردودارے چل پڑا۔ اس نے گولف کلب کی طرف سے راستہ لیا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ گردودارے کے سامنے تھا۔ ماتھا ٹھکنے کے بعد وہ پلٹ کر مین میں آیا تو ایک نوجوان لڑکے نے اس کے سامنے آکر کہا

”ست سری اکال جہاں بائی جی۔“

”ست سری اکال، کیا نام ہے تمہارا۔“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولا

”نام تو سچے کرو مہاراج کا ہے جی۔ ہم تو سیوک ہے ہیں جی۔ آپ سیوک سنگھ ہی کہہ لو جی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طرف اشارہ کیا، جہاں ایک لڑکی کھڑی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”آئیں جی، میں آپ کو اپنی دوست سے ملواؤں۔“ یہ

کہہ کر وہ اس طرف بڑھ گیا۔ جہاں اس کے پیچھے چلا گیا۔ ان کے پاس پہنچے تو تاریکی رنگ کے شلوار قمیض میں غریبہ مائل لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولا

”یہ رویت کور ہے، سمجھ لیں میری باس ہے، یہیں چند گڑھ سے پڑھی ہے۔ باقی آپ اس سے خود پوچھ لیجئے گا۔“
”ست سری اکال جی۔“ اس لڑکی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، جہاں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھیں زیادہ روشن اور باتیں کرنے والی تھیں۔ اس نے بھی فتح بلائی تو دوسری کی طرف اشارہ کر کے کہا
”اگر یہیں بیٹھ کے بات کرنی ہے تو وہاں دلاں میں بیٹھتے ہیں، ورنہ کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”میرے خیال میں یہیں باہر بیٹھ جاتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو سیوک سنگھ باہر کی طرف چل پڑا، وہ تینوں بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ گردودارے کا کافی کھلا لانا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اجنبیت دور کرنے میں لگ گئی۔ تبھی جہاں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ میری کیسے مدد کریں گے، لیکن ہمیں ایک آدمی تلاش کرنا ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا پورا ہو گیا ہے۔“

”آپ کے ذہن میں کوئی بات ہے؟“ رویت کور نے پوچھا
”ہاں ہے۔ مجھے ایک ایسے بندے سے اس کی تلاش شروع کرنا ہوگی جس پر مجھے محض شک ہے۔“ جہاں نے گہری سنجیدگی سے کہا

”کون ہے وہ؟“ سیوک سنگھ نے پوچھا
”وہ اس شہر کا مشہور بزنس مین کلیان سنگھ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے۔“ جہاں نے کہا تو رویت کور اور سیوک سنگھ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر رویت کور بولی
”جو بھی معلومات ہوں گی، مل جائیں گی۔“

”تو پھر آج ہی سے کام شروع کر دیں۔“ جہاں نے کہا تو سیوک بولا
”اگر آپ گردودارے میں رہنا چاہتے ہیں تو بات کر لیتا ہوں۔ مسئلہ کوئی نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ کہیں دوسری جگہ رہنا ہے تو آپ ہمارے ساتھ چلیں، یہ رویت کور آپ کی میزبان ہوگی۔“
”چلو۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔

☆.....☆.....☆

وہ میلے کے آخری دن کی دوپہر تھی۔ میں اپنے گھر ہی میں تھا۔ اس تیسرے دن کی شام میرا ارادہ تھا کہ میں میلے میں جاؤں۔ دو دن تک کسی کی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لوگ امن اور سکون کے ساتھ میلے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اگرچہ عوام کو یہی احساس تھا کہ میلے کی آخری رات وہی رقص و سرود کی محفل جھمکے گی، لیکن کوئی بھی طوائف وہاں کسی کے ہاں نہیں پہنچی تھی۔ اب اس علاقے میں کوئی ایسا بندہ نہیں رہا تھا کہ ان کی میزبانی کر سکے۔ ممکن تھا کہ اپنے طور پر وہاں کوئی آجائے، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

شام کا سورج مغرب میں غروب ہونے جا رہا تھا۔ افق پر تاریکی رنگ پھیل گیا تھا۔ میں گھر سے نکلا اور میلے والے میدان کی جانب نکل گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں کچھ دیر درویش کے پاس بیٹھوں گا اور میلے کو دیکھ کر آ جاؤں گا۔ جب تک میں میلے کے میدان میں پہنچا، سورج غروب ہو گیا تھا۔

میں نے کار برگد کے درخت کے پاس روکی۔ وہاں نور ویش تھا اور نہ ہی اس کی گدڑی۔ درخت کی جڑ میں چندا بیٹھیں

اور راکھ پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے عشق کے بارے میں کسی کی تعریف یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ، بس ٹوٹی ہوئی رسیاں اور تھوڑی سی راکھ، یہی عشق ہے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ یہاں سے کہیں دوسری جگہ کوچ کر گیا ہے۔ میں کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ جیسے اس کے ہونے کا احساس کر رہا ہوں۔ پھر چھانکے کو فون کیا
”کدھر ہو تم سب لوگ؟“

”اچھا ہوا تمہارا فون آگیا یا، میں ابھی تمہیں فون کرنے لگا تھا۔“ اس نے تیزی سے کہا

”خیریت تو ہے نا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا

”فی الحال تو خیریت ہے۔“ اس نے جواب دیا

”تو پھر بات کیا ہے؟“ میں نے پوچھا

”بات ہی ہے کہ ہمیں تو یہ یقین تھا کہ کوئی طوائف وغیرہ نہیں آئے گی، آئے گی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ لیکن یہاں

تو کافی ساری لڑکیاں پوری تیاری سے آگئیں ہیں، سینکڑوں لوگوں کا مجمع ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا

”تو پھر کیا ہوا، ناچنے دیں انہیں۔ آخر کسی کے پاس تو آئے ہوں گے نا؟“ میں نے سکون سے کہا

”یہی تو پتہ نہیں چل رہا، میں نے معلوم کیا ان تنظیمیں سے لیکن کسی کو نہیں معلوم، باقی مجھے ان کے ناچنے سے نہیں کوئی

تکلیف، میرے خیال میں کوئی شریدا نہ ہو جائے۔“ اس کے لہجے میں بھی تشویش تھی۔ میں نے چند لمحے سوچ کر کہا

”اچھا، تم بتاؤ کہاں ہو، میں آتا ہوں۔“

وہ مجھے بتانے لگا۔ میں نے لوکیشن سمجھی اور فون بند کر کے جب میں ڈال لیا۔ اس وقت میں کار کی جانب بڑھا ہی تھا کہ

اچانک میری گردن پر پسل کی نال آگئی۔ میں ایک دم سے ٹھٹھک گیا۔

”مرکز مت دیکھنا، چلو کار میں بیٹھو۔“

خطرے کا الارم بج گیا تھا۔ دشمن نے اچانک وار کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تو مجھے اسی وقت گولی مار دیتے۔ لیکن ایسا انہوں

نے نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ مجھے ایسے ہی موقع کی تربیت تھی۔ میلے سے چھن کر آنے والی ملکی

روشنی سے مکمل اندر نہیں تھا۔ میں نے ایک دم سے جھکاؤ دی اور پلٹ گیا۔ میرے سامنے ایک اجنبی تھا۔ اس نے فائر

کر دیا۔ گولی نہانے کدھر گئی لیکن تب نہ۔ ایک اور شخص اس کی مدد کو آگیا۔ لیکن اس لمحے میں حیران رہ گیا، جب اس نے اس

اجنبی کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ اسی وقت نہانے کس طرف سے ایک راکٹ لانچر آیا اور میری کار کے پرچے اڑ گئے۔ دھماکا

بہت زوردار تھا۔ میں نے اس لمحے کو غنیمت جانا اور ایک طرف بھاگ نکلا۔ میں نے محسوس کیا میرے پیچھے کئی سارے

لوگ ہیں۔ دھماکے سے وہاں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اچانک میرے ارد گرد فائرنگ ہونے لگی۔ میں ایک دم سے رک گیا۔

میں نے دیکھا میرے ارد گرد سات آٹھ لوگ تھے۔ میں کب تک بھاگتا، مجھے ان کا مقابلہ کرنا ہی تھا۔ میں ان کی طرف

دیکھنے لگا تو وہ ایک دم سے آہستہ ہو کر میری جانب بڑھنے لگے۔ میرے ارد گرد گھیرا جگمگا ہوا تو ایک دم وہ رک گئے۔ انہوں

نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، پھر ایک موٹے سے شخص نے انگریزی میں دھاڑتے ہوئے کہا

”یہ ہمارا شکار ہے، اگر تم لوگ اب ذرا بھی آگے بڑھے تو میں.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ ایک فائر ہوا تو وہ

ڈکارتا ہوا گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ ایک دوسرے پر فائرنگ کرنے لگے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے اور سبھی

مجھے پکڑنا چاہتے تھے؟ وہ کون تھے جو مجھے انوار کرنا چاہتے ہیں؟ اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ فضا میں ہیلی کا پٹر موجود ہے

۔ وہ یہاں کیوں؟ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، میں ایک دم سے بھاگ نکلا تھا، میری کوشش تھی میں چھانکے وغیرہ کی طرف چلا

جاؤں، مگر مجھے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اچانک ہیلی کا پٹر کی آواز تیز ہونا شروع ہو گئی۔ میں نے روشنی کی جانب دیکھا پھر روشنی

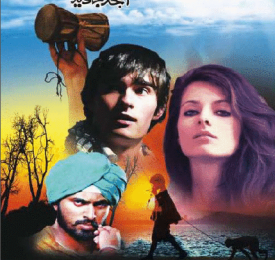
سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے ساتھ ہی تیز روشنی کا ہالہ میرے ارد گرد ہو گیا۔ میں جدھر بھی جاتا، وہ ہالہ مجھے گھیرے ہوئے تھا جیسے وہ روشنی مجھ پر فوکس ہوگی ہو۔ اچانک میرے سامنے ایک بڑا سا جال آ گیا۔ میں اس سے بچنا چاہتا تھا، مگر نہیں بچ سکا۔ میں اس جال میں پھنس گیا۔ اگلے ہی لمحے میں فضا میں اٹھتا چلا گیا۔ میلہ اور میلے کی روشنیاں کہیں بہت پیچھے رہ گئیں تھیں۔ تیز ہوا سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ میں جال میں پھنسا جھول رہا تھا۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں، اور مجھے اغوا کرنے والے کون ہیں؟

(بقیہ واقعات تیسرے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔)

PART 3

قلندر ذات

امجد جاوید



آزراہِ محبت۔!

قلندر ذات کا تیسرا حصہ حاضر خدمت ہے۔

کہانی اس وقت کہی جاتی ہے، جب کہانی کا سامع موجود ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے..... جب تک انسان تخلیق نہیں ہوا تھا، تب تک یہ کائنات ویران تھی۔ اس میں کن فیکون کی صدا نہیں گونجی تھی۔ جیسے ہی رُب تعالیٰ نے کن فیکون فرمایا، اس کائنات میں رونقیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ صرف انسان کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ ”الست ہر بکم“ کس سے فرمایا گیا؟ اور ”قالو ہلی“ کی وجہ آفریں صدا کس نے بلند کی؟

”ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم..... سورج بھی تماشائی، ستارے بھی تماشائی۔“

انسان دنیا میں آگیا۔ اس سے یہاں زندگی کا ظہور ہوا۔ اسی ہنگامہ فردا میں اس کا عمل، تخلیق سے لیکر تحمیل کی طرف ایک سفر شروع ہوا۔ اس میں انسان نے اپنے وہ رنگ و روپ دکھائے جو اگرچہ اسی میں ہی پڑے ہوئے تھے لیکن اسے گماں نہیں، یقین نہیں تھا۔ اس بے گمانی اور بے یقینی میں جس انسان نے یقین کو حاصل کیا، اس نے انسان کے حقیقی چہرے کو پہچان لیا۔ اور جس نے بے گمانی اور بے یقینی ہی کو اپنی منزل قرار دیا، وہ شیطانت کے ظہور کا باعث بنا۔ جیسے کہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا اور شیطان کا چہرہ خدا کے طور پر زمانے کے سامنے لے کر آیا۔ جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے رُب تعالیٰ کی تسلیم و رضا پر یقین رکھا اور اسی فرعون کا سر زمین بوس کر دیا۔ یہی کشمکش آج بھی جاری و ساری ہے۔ آج بھی اولادِ نمرود، شداد اور فرعون شیطان کا چہرہ دکھا رہے ہیں اور ان کے لئے حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی اولاد پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

”آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے..... کیا کسی کو، پھر کسی کا امتحان مقصود ہے۔“

جس طرح ابلیسیّت، آج بھی انسان کو بے یقینی و بے گمانی میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ اسی طرح حق کے نمائندے اس ابلیسیّت کی سرکوبی پر مامور ہیں۔

انسانیت کی تکمیل کا ظہور مولائے گل، وجہ تخلیق کائنات، سرور عالم، سالار بدر و حنین، شافع محشر، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پاک سے ہوا۔ ان کے جلال و جمال سے دنیا آشنا ہوئی، انہوں نے انسانیت کو زندگی بخشی۔ جہاں انسانیت سک رہی تھی، بے نام نمود ہو کر تڑپ رہی تھی، انسانی تذلیل کا نظام پورے عروج پر تھا، انسان کے اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے بتوں کی پوجا تھی، بیٹیوں کو ذلت کی علامت سمجھا جاتا تھا، ایسے میں نبی رحمت ﷺ نے وہ سوچ اور فکر دی، جس سے ایک حقیقی انسان کو ظہور بخشا، جسے ”مومن“ کا نام دیا گیا۔ اسی انسان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہیں جمال سے جلال کو آشکار کیا، کہیں جلال کو جمال سے آشکار کیا۔ اور یوں حقیقت انسانی کا چہرہ واضح ہو گیا۔ تب امر با معروف و نہی عن المنکر سے صراط مستقیم کا نصاب عیاں ہو کر انسانیت کا نصب العین بن گیا۔ وہ بندہ مومن جب کربلا میں پہنچتا ہے تو انہوں نے اس نصب العین کو اپنے خون سے تفسیر دے کر دنیا پر واضح کر دیا کہ یہی انسانیت ہے اور اسی میں انسانیت کی بقا ہے۔

”بڑی سادہ وہ رنگین ہے داستانِ حرم..... نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسمعیل۔“

مطلب، انسانیت کا نصب العین، حسینیت۔

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسینؑ

دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ

سرداد نہ داد در دست یزید

حق کہ بنا لا الہ است حسینؑ

حسینیت سے شیطانیت کا قلع قمع ہوا۔ ورنہ انسانیت کمزور پڑ جاتی۔ انسانیت کی طاقت حسینیت ہے۔ جو شیطانیت کے اوڑھے ہوئے ہر نقاب کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ انسانیت کی بقا حسینیت ہے۔

قلندر لاہوریؒ نے جس طرح اس نصب العین کو دکھایا اور خودی سے تعبیر کیا۔ خودی دراصل وہی نصب العین تھا، جسے مسلمان بھلا چکے تھے۔ وہ اپنے اسلاف کے اسرار و رموز کو فراموش کر چکے تھے۔ اس انداز میں قلندر لاہوریؒ نے فلسفہ حسینیت کو سمجھانے کے لئے خودی کے اسرار کو واضح کیا۔ اور عالم اسلام میں از سر نو ایک نئی روح پھونک دی۔ جب بھی جو خودی کو اپنائے گا، زندہ ہو جائے گا۔ جس کی مثال ملک پاکستان ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے نمود، شداد، فرعون اور قارون کے سامنے کلمہ حق بلند کیا۔ مشرق میں سے وہ خورشید طلوع کیا، جس شیطانی قوت کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، ان کے سورج کو غروب کر دیا۔ رب تعالیٰ نے ایسے محبوب ﷺ کے غلاموں کو یہ شان بخشی ہے۔

”توڑا نہیں جادو، میری جگہیر نے تیرے سحر کا..... ہے تجھ میں سحر جانے کی جرات تو کر جا“

”اس مرد خود آگاہ و، خدا مست کی صحبت..... دیتی ہے گداؤں کو کھوکھو جم و پردیز“

بلاشبہ قلندر لاہوریؒ کی یہ کرامت ہے کہ اس دنیا میں عالم جاوید (پاکستان) کا ظہور کر دیا۔ اور قائد اعظم جیسا مجاہد اسلام بھی دنیا کو دکھا دیا۔ جس کے بارے میں انہوں نے کہا،

”خود آگاہی نے سکھا دی ہے جسے تن فراموشی..... حرام آتی ہے اس مرد مجاہد پر زہ پوشی۔“

جس کی خودی فولاد سے بھی مضبوط تھی۔ جہاں ہندی اور فرنگی سوچ و فکر گھٹنے ٹیک گئی۔ دنیا نے دیکھا، جس نے نہ زہ پہنی اور نہ ہی تلوار کو ہاتھ لگایا تھا۔ اس کی نگاہ ہی نے یہ کام کر گئی تھی۔

”کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا..... نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔“

اس عالم جاوید کی حفاظت اُس زندہ فوج پر فرض ہے، جو لشکر اسلام ہے، جو جذبہ شہادت سے پوری طرح معمور ہے۔ کبھی ان میں سے شہادت کا مقام ظاہر ہوتا ہے اور کبھی ضرب حیدری کا ظہور ہوتا ہے۔ سلامتی ہو ان نگہبانوں پر۔

الحمد للہ! میں آخر میں ان کا شکریہ ضرور کہنا چاہوں گا، جنہوں نے میری نہ صرف معاونت فرمائی بلکہ میری مدد کرتے رہے۔ میری کہاں اوقات تھی کہ میں اتنا بار اٹھا سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں اپنے محترم گل فراز صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد محترم عمران قریشی صاحب (نئے افق کراچی) کا۔ جناب ضیاء الرحمن ضیاء صاحب، جناب حکیم محمد اقبال صاحب۔ جناب حافظ محمد عباس (لعل بابا)۔ حافظ محمد اصغر اور وہ خاک نشین جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، اپنی شریک حیات کا، اپنے بچوں سمن فاطمہ، احمد بلال، احمد جمال، عائزہ فاطمہ کا جن کا وقت میں نے لیا۔

امجد جاوید

چلی جا رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے منہ اور تیز دانتوں سے مجھے ایک دم ہی سے نفرت ہونے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے ظلم سے ان چھوٹی مچھلیوں کو بچاؤں، یہ سوچ ابھی میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ایک دیوبیکل دریائی گھوڑا نمودار ہوا، شارک اسے دیکھ کر بھاگنے لگی، مگر اس نے اپنا بڑا سامنہ کھولا اور سانس کے ذریعے اسے کھینچا، وہ شارک اس کے منہ میں آدھی ہی گئی تھی کہ دریائی گھوڑے نے اس کاٹ لیا۔ شارک کے جسم کا آدھا حصہ پانی میں تیرنے لگا۔ خون کے پھیلنے کی وجہ سے پانی سرخ ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب پانی صاف ہوا تو شارک کے جسم کا آدھا حصہ کچھوے جیسی عجیب و غریب قسم کی آبی مخلوق کی زد میں تھا۔ وہ اسے لے کر نکل جانا چاہتے تھے، جبکہ دیوبیکل دریائی گھوڑا پانی ہی میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی رہا اور پھر پرسکون ہو کر ایک جانب بڑھ گیا۔ میں بھی اس دریائی گھوڑے کے ساتھ چل دیا۔ وہ میرے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ پتہ نہیں ہم نے کتنا سفر طے کیا تھا۔ مجھے دکھائی دیا کہ سامنے لکیروں کی صورت میں کافی سارا پانی مختلف رنگوں کا تھا، جو گدلہ ہو رہا تھا۔ دریائی گھوڑا اپنی مستی میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اسے پتہ ہی نہ تھا کہ سانپ کے جیسے ایک بازو نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دریائی گھوڑا ٹرپا، ایک ہی جھٹکے میں اس نے وہ بازو خود سے الگ کیا تب تک دو بازو اسے گھیر چکے تھے، وہ ان سے بندر آزما تھا کہ ایک اور بازو نے اسے جکڑ لیا۔ وہ آکٹوپس تھا۔ دریائی گھوڑے نے بہت مزاحمت کی مگر وہ خود کو ان بازوؤں سے الگ نہ کر سکا۔ شارک کو نکل جانے والی دریائی گھوڑا، آکٹوپس کے سامنے بے بس تھا۔ یہاں تک کہ اس کی مزاحمت جاتی رہی۔ وہ بے بس وہ کر سکتا ہو گیا۔ آکٹوپس کے سبھی بازو اس سے چٹ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بازو الگ ہوئے تو دریائی گھوڑا جیسے تھا ہی نہیں۔ وہ اس کے بازوؤں ہی میں تحلیل ہو گیا تھا۔ پانی ایک بار پھر سے گدلہ اور سرخ ہو چکا تھا۔ جب ماحول صاف ہوا تو آکٹوپس بڑی مستی میں ایک جانب بڑھ گیا۔ مجھے جس ہوا کہ اس آبی دنیا میں اس پر بھی کوئی بھاری ہے؟ میں اس کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔

بہت دور آگے گہرا اندھیرا بڑھنے لگا۔ لیکن اس گہرے اندھیرے میں رنگ برنگی روشنیاں غمنا رہی تھیں۔ جیسے چھوٹے چھوٹے بلب جلتے بجتے ہوئے دور تک جاتے دکھائی دیں۔ کئی لہریں دور تک جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ آکٹوپس مستی میں آگے جا رہا تھا۔ وہ روشنیاں گہرے اندھیرے میں تھیں جو بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ میرا دھیان اس کی خوبصورتی میں گم ہو گیا۔ اچانک آکٹوپس کا بازو لرزنے لگے جیسے بے جان ہو گئے ہوں۔ چند لمحوں بعد بنا تڑپے وہ بے جان ہو گیا اور وہ کسی انجانے منہ میں غائب ہونے لگا۔ لحوں میں اس آکٹوپس کو نکل لیا گیا تو گہرا اندھیرا چھٹنے لگا۔ روشنیاں بھی مدہم پڑنے لگیں۔ نیلگوں روشنی میں مطلع صاف ہوا تو دیکھا وہ ایک بہت بڑی جیلی فش تھی۔ اس نے اپنے کو چھپانے کے لئے آگے پیچھے ایسا گدلہ پن چھوڑ دیا تھا کہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے مگر اس نے اپنی طرف کشش کے لئے روشنیاں دکھائی تھیں۔ میں آبی دنیا کے مشاہدے میں تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سے بھی بڑی اور عالم مخلوق کون سی ہے۔

☆.....☆.....☆

دوپہر ہو چکی تھی، جب روایت کور کے ساتھ جہاں سنگھ چھ منزلہ عمارت کے سامنے رکشے میں آن رکھا۔ چند ہی گز کے وی آئی پی روڈ جس پر ایسی کئی عمارتیں ہیں۔ انہی میں سے ایک عمارت کی تیسری منزل پر روایت کور کا فلیٹ تھا۔ لفٹ کے ذریعے وہ دونوں فلیٹ تک جا پہنچے۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ اندر گئے تو جہاں نے پہلے سادہ سی روایت کور کو دیکھا، پھر ایک نگاہ فلیٹ کے اندر ڈالی۔ پھر اس نے ایک مہنگے صوفے پر بیٹھتے ہوئے خوشگوار لہجے پوچھا "روایت۔! یہ فلیٹ تمہارا ہی ہے نا، ہم کسی دوسرے کے فلیٹ میں تو نہیں کھس آئے؟"

میرے چاروں طرف اندھیرا تھا اور میں فضا میں جھولتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ روشنی بھی غائب ہو چکی تھی جو مجھ پر فوس تھی۔ وہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں، اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ پہلی بار مجھے یوں لگا جیسے میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔ اتنی بلندی سے اگر میں گر بھی گیا تو میرا کچھ نہیں بچتا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے یہ صدا آئی کہ تیرا گرنا ہی تیرا اٹھنا ہے، ہر زوالے راکھالے، ایک دم سے اندھیرا چھٹ گیا۔

مجھے کسی طرف بھی سورج دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی اس کی سمت کا اندازہ ہوا۔ لیکن نیلا آسمان میرے سامنے واضح تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا، نزدیک ہی بادلوں کے کٹڑے تھے۔ مجھے لگا کہ میں انہیں چھو سکتا ہوں۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک دم سے ساکت رہ گیا۔ نیچے تاحدنگہ نیلا سمندر تھا۔ میری نگاہ پڑتے ہی سمندر کی پرسکون سطح پر ہلچل ہونے لگی۔ نیلی سطح پر سفید رنگ کی ایک لکیر ابھری، جو دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہلکی سی لکیر دائرے میں گھومنے لگی۔ سمندر کا جھاگ اٹھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دائرہ ایک سفید بھنور میں بدل چکا تھا۔ جس میں وسعت آتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بھنور اتنا پھیلا کہ میرے سامنے سمندر کی نیلی سطح ایک سفید بھنور کی صورت اختیار کر گیا، جسے میں غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے چال کی رسیاں ایک ایک کر کے ٹوٹی چلی جا رہی ہیں۔

یہ ایک دوسری قسم کی مصیبت تھی۔ یہی وہ ایک لمحہ تھا جس نے مجھے حوصلہ دے دیا۔ اسی ایک لمحے میں یہ خیال آیا تھا کہ یہ اچانک روشنی، سمندر اور بھنور، یہ کچھ اور ہی ہیں۔ میں ایک مشاہدہ، مسافر شاہ کے تھڑے پر کر چکا تھا۔ اس وقت میری پشت پر بابا جی روہی والے کھڑے تھے۔ لیکن اس وقت تو میں فضا میں معلق تھا اور کسی لمحے جال ٹوٹنے کے باعث میں اس سمندر میں گر سکتا تھا۔ اور پھر وہی ہوا، جال ٹوٹ گیا اور میں سیدھا اس بھنور کی طرف بڑھنے لگا، یہاں تک کہ سمندر کی نمی نے میرے ہاتھوں کو چھو لیا۔ میں سمندر میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

میرے سامنے وہ نیلگوں ماحول تھا جو فجر کے بعد سے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت کا ہوتا ہے۔ میں سمندر میں گرنا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سمندر کی تہ میں موجود گارے تک جا پہنچا۔ ہر جانب نیلگوں روشنی تھی۔ دور دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتاً میری نگاہ اپنے وجود پر پڑی، جو بالکل ٹرانسپیرنٹ تھا۔ سفید دھویں کی مانند یا پانی کے بلبلے کی طرح۔ سانس لینے میں مشکل یا دباؤ جیسی کوئی کیفیت میں نے محسوس نہیں کی۔ میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ سامنے سے سیاہ دھبے واضح ہو کر رنگین مچھلیوں کے جھنڈ میں بدل گئے۔ سرخ پیلے اور نارنجی رنگ کے ساتھ سیاہ دھاریاں آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ وہ سب میرے قریب سے گزر گئیں اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میری راہ میں کچھ دیر تک ایسی ہی بے شمار رنگ برنگی مچھلیاں دکھائی دیتی رہیں، میں جن کے رنگوں میں کھو کر رہ گیا۔ ایسے ایسے آبی پودے دکھائی دینے لگے جو پہلے کبھی نظر میں سے نہیں گزرے تھے۔

اچانک میری دائیں جانب سے شارک نمودار ہوئی، اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ان معصوم اور خوبصورت مچھلیوں کو لٹکتی

”ہوں.....“ رونیت کور نے ہنکارا بھرا اور پھر کھڑے کھڑے بولی، ”یہاں آنے والے ہر بندے کو ایسا محسوس نہیں ہوتا، تم بیٹھو، میں آکر بتاتی ہوں، کچھ بیٹا چاہو تو فریق میں سے لے لو۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلی گئی۔ جہاں نے فریق میں سے ٹھنڈا مشروب نکالا اور دوبارہ پھر سے صوفے میں آگھسا۔ کچھ دیر بعد رونیت کور واپس آئی تو اس نے شارٹس کے ساتھ سیلولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کا گورا بدن ہی نہیں جھلک رہا تھا، بلکہ فربہ ناک بدن کی چمکاہٹ تک کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے گیسو پونی میں باندھے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں اس کے پاس آکر صوفے کی دوسری طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

”تمہارا کون سا روپ اصلی ہے؟“ جہاں نے کہا ایک اور لمبا گھونٹ لیا۔

”دونوں ہی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر ایک لمحہ خاموشی کے بعد خوشگوار انداز میں بولی، ”جہاں جی، گردودارے تو اس طرح نہیں جایا جاسکتا، اور یہاں گھر میں، ایسے ہی رہتی ہوں میں، یہ لکڑی فلیٹ میں نے خود خریدا ہے۔ اور یہاں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے یہی میرا لائف سٹائل ہے۔ تم مجھے مذہب کے معاملے میں بہت کٹو اور باقی زندگی میں الٹا ماڈرن کہہ سکتے ہو۔“

”میرے کیا کام آسکتی ہو؟“ جہاں نے دو ٹوک انداز میں پوچھا

”جیسا کام تم چاہو۔“ اس نے جہاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”تم نے مجھے اتنی جلدی اتنی ساری معلومات دے دیں ہیں کلیان سنگھ کے بارے میں، اس سے لگتا ہے کہ تمہارا نیٹ ورک کافی مضبوط.....“ اس نے کہنا چاہا تو رونیت کور بولی

”نہیں جس طرح تم سوچ رہے ہو، ویسا میرا کوئی نیٹ ورک نہیں ہے، ہاں کالج کا ایک گروپ ہے جو کافی مذہبی ہے، اس کے لئے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں، کمپیوٹر سافٹ ویئر انجینئر ہوں۔ ہمارے پروفیسر صاحب ہیں، وہ بھی بہت مذہبی ہیں۔ سمجھو، وہی ہمیں لیڈ کرتے ہیں، وہی ہمارے ذمے کام لگاتے ہیں اور ہم نے کبھی اس کام کے بارے میں نہیں پوچھا۔“

میں بھی زیادہ تفصیلات میں نہیں جاتا، میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ سندو کی تلاش ہم کیسے کر پائیں گے۔ اس کے بارے میں جو معلومات مجھے ملی ہیں، وہ میں نے تمہیں اور سیوک سنگھ کو بتا دی ہیں۔“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ رونیت کور بھی سوچنے والے انداز میں اس کے چہرے پر دیکھتی رہی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر سرسراہٹ والے انداز میں بولی

”دیکھو، میں ایک سافٹ ویئر انجینئر ہوں۔ میرے پاس جو مہارت ہے اس کی آخری حدوں تک میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ میری یہ مہارت تمہارے کس قدر کام آسکتی ہے۔“

”یہ میرے کیا کام آسکتی ہے؟“ جہاں نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”میں نے کہا نا کہ مجھے نہیں پتہ، ہاں لیکن تم جو سوچو، اس کے لئے میں کچھ نہ کچھ کر سکتی ہوں۔ اس کے لئے میں تمہیں ایک چھوٹا سا تماشہ دکھا سکتی ہوں۔“ رونیت کور نے مسکراتے ہوئے کہا

”کیسا تماشہ؟“ وہ تیزی سے بولا

”ابھی دکھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنے بیڈ روم میں چلی گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مہنگا لپ ٹاپ تھا۔ پھر چلتی ہوئی اس جگہ چلی گئی، جہاں شیشے کی مضبوط دیوار تھی۔ وہاں صوفے دھرے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہی الٹی پی روڈ کا چوراہا صاف دکھائی دے رہا۔ اس نے جہاں کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہ آکر بیٹھ گیا تو رونیت کور بولی، ”جہاں،

یہ سامنے چوراہا دیکھ رہے ہو، کس قدر ٹریفک رواں دواں ہے۔ ٹریفک میں کوئی خلل نہیں ہے، سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا۔“

”بالکل ایسے ہی ہے۔“ اس نے کہا

”چندی گڑھ کے آدمے سے زیادہ صے کوڈ پھیل کر دیا گیا ہے، جس میں سیکورٹی سے لیکر ٹریفک کے اشارے تک کنٹرول کئے جاتے ہیں۔ میں جب چاہے اس کا سارا نظام درہم برہم کر دوں، جس کی بھی سیکورٹی ہو، جب چاہے قسم کر دوں۔ یہی چوراہا ہے، اسے صرف دو منٹ اپنی مرضی سے روکوں گی۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا

”اس سے گاڑیوں کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“ جہاں نے نے تیزی سے کہا

”تو ہو جائے۔“ اس نے لپ ٹاپ کی اسکرین پر دیکھتے ہوئے اس قدر روکھے انداز میں کہا کہ جہاں کو اس کے اندر کی درندگی کا احساس ہونے لگا۔

”لو دیکھو۔“ رونیت نے کہا تو جہاں نے فوراً چوراہے کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی ”ابھی چاروں طرف کی ٹریفک ایک دم سے رُکے گی۔“ اس نے دیکھا ٹریفک رکنے لگی۔ ”اب چاروں طرف سے چلے گی۔“ چند لمحے گزرے، چاروں جانب کی ٹریفک چل پڑی۔ ”دیکھنا کتنی گاڑیاں لگتی ہیں۔“ گاڑیاں ایک دم سے چلیں، کوئی سیٹھ میں بڑھی کوئی آہستگی سے، اگلے ہی لمحے کئی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ جہاں نے رونیت کی طرف دیکھا، وہ اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر چوراہے پر دیکھا، وہاں ٹریفک بلاک ہو گئی تھی۔ رونیت نے لپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور اس کے ساتھ آکر کھڑی ہو گئی۔ چوراہے پر گھمسان پڑا ہوا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔

”یہ تم نے کیسے کیا؟“ جہاں نے پوچھا

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، شہر کا نظام میری ان اگلیوں میں ہے۔ آؤ، ادھر بیٹھتے ہیں، یہ کہہ کر وہ اسی صوفے پر جا بیٹھی جہاں وہ پہلے جہاں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گیا تو رونیت نے بتایا، ”کلیان سنگھ کے بارے میں جو کچھ میں نے بتایا، یہ وہ معلومات ہیں، جو ہر بندے کو پتہ ہے، یہ معلومات وہ خود لوگوں کو بتانا چاہتا ہے۔ میں بتانا یہ چاہتی ہوں کہ یہ میرے کسی نیٹ ورک کا کمال نہیں ہے۔“

”تو کیا تم کلیان سنگھ کے کمپیوٹر سے وہ ساری معلومات.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ بات اچکتے ہوئے اک ادا سے بولی

”یہ ہوئی نا بات، ایک لائن مل گئی نا، میں شام تک تمہیں وہ ساری معلومات دے دوں گی جو بھی مجھے اس کے پاس سے ملیں، اس میں سے آگے تم جو چاہو۔“

”اپنے پروفیسر سے کب ملواری ہو مجھے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”چاہے ابھی مل لو، ویسے تم نے ملنا تو ہے ہی ان سے، آخر لیڈ تو انہوں نے ہی کرنا ہے۔“ رونیت نے کانڈھے اٹھاتے ہوئے کہا

”تو چلو، ابھی ملتے ہیں۔“ جہاں نے کہا

”آؤ۔“ وہ اٹھی اور باہر کی طرف چلی۔

”اس صلیے میں؟“ اس نے تیزی سے پوچھا

”ارے کیا فرق پڑتا ہے، آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ جہاں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ بالکل سامنے والا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلی گئی۔

بہت سہا ہوا ڈرائنگ روم تھا، جس میں بستی رنگ زیادہ تھا۔ ایک سیاہ صوفے پر موٹا سا ادھیر عمر سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ جس

کی داڑھی سفید تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ سفید شلوار قمیض پر گہرے نیلے رنگ کا ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور اسی رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

”آئیے آئیے، جہاں سنگھ جی آئیے۔ ست سری اکال جی۔“ اس نے کھڑے ہو کر فتح بلائی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پروفیسر دیویدر سنگھ کہتے ہیں، تم مجھے صرف پروفیسر کہہ سکتے ہو۔“ جہاں نے بھی فتح بلائی اور وہ دووں بیٹھ گئے۔ رویت کو اندر کی طرف چلی گئی۔

”سندھپ اگر وال عرف سندھ..... کہاں تلاش کریں اسے، اور کیسے؟“ جہاں نے کسی تمہید کے بنا مطلب کی بات کی تو پروفیسر سنگھ سر ہلاتے ہوئے بولا

”مل جائے گا، اگر وہ اس دھرتی پر ہوا، میں جانتا ہوں اسے، کالج دور میں وہ بہت غرقم کالڑکا تھا۔ بہت اٹھان تھی اس کی۔ اس نے دھرم کے لئے کام بھی بہت کیا، اسی لئے میں نے حامی بھری اسے تلاش کرنے کی۔“

”مطلب آپ کا رابطہ.....“ جہاں نے کہنا چاہا

”یہ دنیا ہے، ہمیں ایک دوسرے سے رابطہ کرنا ہی پڑتا ہے۔“ پروفیسر سنگھ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے تیزی سے کہا پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا، ”تم نے بہت اچھا سوچا ہے کہ اس کے ارد گرد ہی سے سراغ لیا جائے۔ صرف کلیان جی ہی کو نہیں دیکھنا، اس کے اور بہت سارے دوست بھی ہو سکتے ہیں، جیسے اس کی دوست نیہا اگر وال بھی تو ہے۔ بہت کچھ انجانے میں بھی ہو سکتا ہے۔ خیر! رویت آج شام تک، یا صبح تک کوئی نہ کوئی راستہ دکھا دے گی۔“

پروفیسر نے قحط سے کہا

”جب تک.....؟“ جہاں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بہت کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن جب تک ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہوگا تب تک ہم کیا کریں گے۔“ پروفیسر نے سکون سے کہا

”کون کر رہا ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔ جس پر پروفیسر اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، چند لمحوں بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا

”بیٹا! میں نے اپنی زندگی دھرم کے لئے دے دی ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم سن سینتالیس میں آزاد ہوئے تھے، کیونکہ سن چوراسی میں ہمیں یہ یقین دلا دیا گیا کہ ہمارا کوئی وطن نہیں ہے، ہم بے وطن ہیں۔ اس وقت میں نیا نیا پڑھانے لگا تھا۔ بس پھر میں نے اپنا مشن بنا لیا۔ اور تب سے میں دھرم کے لئے کام کر رہا ہوں۔“

”اب ریٹائر ہو گئے ہیں آپ؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولا

”ہاں! اور میری ساری زندگی کی جمع پونجی یہ چند بچے ہیں، جنہیں میں نے تیار کیا ہے۔ یہ سارے بچے کسی نہ کسی حوالے سے سن چوراسی کے زخم خوردہ ہیں۔ اور کالج ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے کیریئر کی سمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ میں نے اس دور سے بڑا تجربہ لیا ہے۔ خیر۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اکیلا بوڑھا یہاں بیٹھا باتیں کر رہا ہوں، ایسا نہیں ہے وقت آنے پر سب کچھ سامنے آ جائے گا۔“

”یہ تو ج ہے پروفیسر صاحب ہم سکھوں کا کوئی وطن نہیں۔ لیکن اس میں غلطیاں تو ہمارے بڑوں کی بھی ہیں۔ اتھاس (تاریخ) کو بدلا نہیں جاسکتا۔“ جہاں نے دہمی ہوئے کہا۔

”جہاں! شاید ابھی تم نے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“ پروفیسر نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا، پھر خود پر قابو پا کر بولا، ”شطنخ کی بساط بچائی جاتی ہے تو مہروں کے ذریعے کھیل کھیلا جاتا ہے۔ مہرے بے جان ہوتے ہیں اور

ان مہروں کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان کے ذریعے کون شاطر کھیل رہا ہے۔ بے چارے مہرے ان مہروں کی نہ مات ہوتی ہے اور نہ جیت۔ اسی طرح کٹ پتلی کو بھی پتہ ہوتا کہ کون مداری اسے اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ مداری یا تماشا باز پس پردہ ہوتا ہے۔ کٹ پتلی کی جیت ہوتی ہے نہ ہار۔ اس کا کام صرف انگلیوں پر تانچنا ہے۔ فائدہ تماشا دکھانے والا مداری لے جاتا ہے۔ یہی حال اس دنیا کا ہے، تم کیا بننا پسند کرو گے، مہرہ، شاطر، کٹ پتلی، مداری، تماشا باز؟“ وہ اس سے بھی زیادہ دکھ سے بولا

”ایک تیسری قسم قلندر کی ہوتی ہے، جو زندہ خونخوار جانوروں کو اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ یہاں آدمی نما جانور بہت ہیں، اور انسان بہت کم ہیں اس دنیا میں، اور سمجھو کہ یہ دنیا انہی انسانوں کی وجہ سے چل رہی ہے۔“ جہاں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو جہاں سنگھ، لیکن کیا تم جانتے ہو یہ سارے کھیل تماشے کیوں ہوتے ہیں؟“ پروفیسر سنگھ نے پوچھا

”آپ بتائیں، آپ بہر حال مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولا

”ہر زمانے اور ہر دور میں انسان پر انسان نے حکومت کی ہے، یہ کوشش بھی ایک کھیل کی مانند ہوتی ہے۔ کھیلنے والے پس پردہ ہوتے ہیں، کسی مہرے کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس گیم کا حصہ بن گیا ہے۔ آج بھی ”گریٹ گیم“ جاری ہے۔ جس میں سرحدیں کوئی معنی نہیں رکھتیں ہیں۔ وقت کے ساتھ ہتھیار بھی بدل گئے ہیں۔ پرانے ہتھیاروں پر یقین رکھنے والی قوتیں، نئے ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں کر پار ہی ہیں، ہمارے سامنے کے حالات ہمیں یہی سبق دے رہے ہیں۔ جیسے میڈیا، کبھی ایک آلہ تھا، اب ایک ہتھیار بن چکا ہے۔“ ”گریٹ گیم“ کھیلنے والے اس ہتھیار کو جس طرح استعمال کر رہے ہیں، تم اس سے بخوبی واقف ہو۔ شطنخ پر تو مخصوص مہرے ہوتے ہیں، لیکن گریٹ گیم کی بساط پر ہانے کتنے مہرے ہوتے ہیں، کیونکہ گریٹ گیم کا پھیلاؤ بہت بڑا ہے سمجھ لو ان دیکھی بساط، جس کا کوئی سرا کنارا نہیں ہے۔ اور ممکن ہے تم اور میں کسی گریٹ گیم کا حصہ ہوں۔“ پروفیسر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”میں تو ایک بات جانتا ہوں، دنیا کی کوئی بھی گریٹ گیم ہو، وہی قوتیں مہرہ بنتی ہیں، جنہیں اپنے آپ کا شعور نہیں اور جنہیں اپنے آپ کا شعور ہوتا ہے وہ ایسی کئی گریٹ گیم اپنی جنگی میں پکڑ کر ایک طرف پھینک دیتی ہیں۔ یہ دنیا تو کوئی شے ہی نہیں، انسان کا پختہ ارادہ ہی سب کچھ ہے۔ آپ گم نہ کریں، واہگرو نے جو آپ کے ذمے کام اگلا ہے نا وہ کریں۔“ جہاں نے کہا

”وہی تو کر رہا ہوں پتر! اگر وہاں نے ہمیں پانچ کلکے کیوں دیئے؟ شیطانی ارادے، طاقت کی جانب اور منفی طاقت فطری طور پر حکومت کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔ جس مقصد کی بنیاد میں منفی رویے ہوں، ایسی حکومت ظلم کی حکومت ہوتی ہے۔ گروؤں نے پانچ کلکے اسی لئے دیئے ہیں۔ نککھا اس لئے کہ اپنے دماغ کو سنوار کر رکھو تکبر نہ ا لے دو، کچھ اس لئے کہ اپنی شہوت پر قابو رکھو، کیس، فطرت کے ساتھ رہو، جو حسد سے دور رکھتی ہے، کڑا، کسی بھی اہل کی جانب ہاتھ بڑھاؤ تو تجھے احساس ہو جائے کہ یہ انسان کے لئے غلط ہے۔ کرپان، اپنی خواہشوں کو کاٹ کر رکھو۔“ پروفیسر نے سکون سے کہا تو جہاں بولا

”یہ تو ہم سوچتے ہیں نا، عالمی سطح پر.....“

”قلندر اعظم سے لیکر اشوکا تک، بلین سے لیکر رنجیت سنگھ تک اور مغلوں سے لیکر اندرا گاندھی تک..... سب کو

لہو۔ کس نے کیا کیا، یہی سب اتھاس ہے۔“ وہ تیزی سے کہتا چلا گیا

”پروفیسر صاحب! باقی رتب جانتا ہے، جو کام رتب کے کرنے والے ہیں وہ رتب کرے، جو ہمارے کرنے

والے ہیں، وہ ہمیں کرنے چاہئیں۔“ جہاں نے بے حد جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر پروفیسر نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ اندر سے ایک ادیب عمر خاتون باہر آئی اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی

”آؤ جی، پرشادے شہک لو۔“

”یہ میری سردارنی ہے جہاں، آؤ، کھانا کھاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے پروفیسر اٹھ گیا۔

وہ کھانا کھا کر وہیں ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے چائے پی رہے تھے کہ رونیت کو وہیں آگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور ایک طرف آکر ٹیٹھی اور پر جوش لہجے میں بولی

”کلیان سنگھ عرف کلی کا میں نے سب کچھ دیکھ لیا، اس نے بہت بلیک منی بنائی ہے، جس کا کچھ حصہ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ کہیں پر بھی سندو جی کے بارے میں پتہ نہیں چلا، مگر! ایک اشارہ ملا ہے۔“

”وہ کیا؟“ پروفیسر نے پوچھا

”ہمارے اس چندی گڑھ کے ایم ایل اے، ہرنیک سنگھ چاؤلہ کے ساتھ کلیان سنگھ کا اس وقت سے کاروباری تعلق ہے جب سے سندو غائب ہوا ہے۔ شراکت داری میں ایک بڑی رقم لگائی گئی ہے۔ اس کی ایف آئی آر بھی ان دونوں نے جا کر لکھوائی تھی۔ سندو کا پتہ ان دونوں میں سے باہر آئے گا۔ یہ مجھے یقین ہو گیا۔ اصل حقیقت کیا ہے یہ.....“

رونیت کو نے کہنا چاہا

”پتہ کر لیتے ہیں۔“ جہاں نے اس کی بات اُچک لی۔ پھر اس کے چہرے پر دیکھا

”ٹھیک ہے، میں ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ جہاں نے گہرا سانس لیا اور کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

نیلگوں روشنی چھٹ چکی تھی اور آہستہ آہستہ تاریخی روشنی زرد رنگ میں بدلتی جا رہی تھی۔ ایک زوردار لہر آئی اور اس نے مجھے ساحل سمندر پر یوں پھینک دیا، جیسے اس سمندر نے مجھے اُگل دیا ہو۔ میرا وہ جسم، جو تہہ آب ٹرانسپیرٹ ہو گیا تھا، اب مجھے یوں دکھائی دینے لگا تھا جیسے مادی وجود تو ہو لیکن نہ اس کا وزن ہو اور نہ ہی احساس۔ میں نے اپنے اطراف میں دیکھا تو میں ایک خاردار جھاڑی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ جھاڑی کی ایک شاخ کے سرے پہ موجود ایک خار کو دیکھا۔ ایسے ہی اس پر نگاہ پڑی تھی۔ نوک خار پر پانی کا ایک قطرہ محو رقص تھا۔ وہ ایک عام سا قطرہ تھا۔ نہ آجینے کی مانند اس میں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ نہ ایسا تھا کہ کوئی ہیرا سورج کی روشنی میں دمک رہا ہو۔ بس وہ ایک شفاف قطرہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا میں خار جیسے جموم رہا تھا۔ ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ سورج کی روشنی میں اس کے رنگ بدلنے، کبھی دھنک رنگ اور کبھی طلسماتی رنگ پھوٹتے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اس کی بے رنگی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دم سے اس قطرے میں سے آہ و بکا کی آوازیں پھوٹنے لگیں۔ میں حیران ہو گیا کہ قطرے کی چمک دمک تو ہوتی ہے، لیکن یہ رونے، آہ و بکا کی آوازیں کیسی ہیں؟ میں جب پوری طرح اس میں کھو گیا تو ایک صدا ابھری۔

”میری آہ و بکا میں نہ کھو کر رہ جا، میرے اندر کی صاف صدا سن۔“

میں اس قطرے کی جانب دیکھنے لگا۔ بلاشبہ یہ اسی قطرے کی آواز تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس کی آہ و بکا عروج پر تھیں۔

”میں سن رہا ہوں، تو بتاتا تو ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ایک قطرہ ہوں۔ سمندر سے الگ ہوا قطرہ، آنکھ سے ٹپکا ہوا، بارش کا قطرہ یا وہ قطرہ، جس میں تخلیق کا جوہر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور یہ جان لو، قطرہ اسی وقت بنتا ہے جب وہ الگ ہو جائے۔“

”یہ تمہاری آہ و بکا، یہ کیا ہے؟“ میں نے اس کے رنگوں اور اس کی تڑپ کو دیکھتے ہوئے پوچھا

”تو میری آہ و بکا تو سن رہا ہے لیکن میں نے تم سے کہا ہے کہ میرے اندر کی صدا سن۔“

”کیا ہے تمہارے اندر کی صدا؟“

لوک خار پر میرا رقص، میری تڑپ دیکھ۔ میں اپنے سمندر سے الگ ہوں اور سمندر کے کنارے پڑا ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ سارا سمندر میرے اندر پڑا ہے۔ میری صدا میری جدائی ہے، کیا تو میری جدائی میں میرا وصال نہیں دیکھ رہا۔ کیا تو مجھ میں ایک سمندر کی پیاس نہیں دیکھ رہا۔ میرے اندر ایک مکٹی ہوئی کائنات موجود ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ میری تڑپ اور سمندر کی تڑپ ایک جیسی ہے۔ میں سمندر سے الگ ہو گیا ہوں تو مجھے پتہ چلا ہے کہ پیاس کیا ہوتی ہے؟ مجھے جدائی اور وصال کی لذت سے آشنائی ہوئی ہے۔ میں سارے سمندر کی قوت ہوں۔ میری اسی حرکت میں تو سمندر کی حرکت پوشیدہ ہے۔ میں تڑپتا ہوں تو سمندر بھی تڑپتا ہے۔“

”یہ تو تم اپنی تعریف میں کہہ رہے ہو۔ ایسا ہے بھی؟“

”میں سمندر کی پیاس ہوں اور سمندر میری پیاس ہے۔ اس سے بڑا ثبوت میں تمہیں اور کیا دوں۔ تم نہیں مانتے تو اس میں قصور تمہارا نہیں، تم خود سے غافل ہو۔ خود پر غور کرو۔ کیا تم کبھی ایک قطرہ نہیں تھے۔ کیا آج تم میں کائنات تغیر کرنے کی خواہش نہیں ہے؟ یہ تڑپ انہی میں نہیں ہوتی جو خود سے غافل ہیں اور خود سے غفلت سب سے بڑی غلطی ہے۔“

”غلطی، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”جدا ہونے کے بعد بھی، جدائی کو محسوس نہ کرتا ہی سب سے بڑی غلطی ہے۔ اور دیکھو، غلطی کا احساس ہی اس کے سدھارنے کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ غلطی بذات خود کہہ رہی کہ یہ تمہاری کوتاہی ہے اس کی تکمیل کرو اور مکمل ہونے کی کوشش کرو۔“

”چند قدم پر تو یہ سمندر پڑا ہے، جاؤ اس میں جا کر مل جاؤ، اتنی آہ و بکا کیوں؟“

”میں آہ و بکا نہیں کر رہا بلکہ یہ اعلان کر رہا ہوں کہ مجھے وہ مائل گیا۔ اب مجھے دیکھو! میں سمندر سے الگ ہوا تو مجھ میں جدائی پیدا ہو گئی۔ اب تو بھی جدائی دیکھ اور جدائی میں پڑا ہوا وصال دیکھ۔ ہجر میں وصال ہے اور وصال میں ہجر۔“

”یہ راز چاہے ہو نہ ہو، لیکن.....“

”نگاہ پیدا کر، جو تجھے میری آہ و بکا لگتی ہے اس میں میری ہمت دیکھ، میرا دل ولولہ دیکھ کہ میں جدائی ہونے کے باوجود اصل کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ اب میرا سمندر سے ملنا یونہی نہیں ہوگا۔ مجھ میں جدائی نے یہ ہمت پیدا کر دی ہے کہ اب بارش کی صورت میں سمندر سے جا ملوں گا۔“

”تو پھر یہ، آہ و بکا، اور شور غل کیوں؟“

”مجھے یہ سمجھ آگئی ہے کہ جب میں بارش کے قطرے کی صورت میں سمندر سے ملوں گا تو سمندر سے نہیں ملنا، بلکہ پانی میں جا کر ایک اصول موتی بننا ہے۔“

”یہ راز تجھے کس نے بتایا؟“

”میرے ہونے نے، میں جدائی میں جلا ہوں اسی لئے مجھ میں سوز پیدا ہو گیا ہے اور وہ ظرف پیدا ہو گیا ہے۔“

تو بھی خود میں ظفر پیدا کر کہ ہر بندہ اپنے ظرف کے مطابق مانگتا ہے۔
”یہ کیا ظرف ہے کہ جس نے تم سے تیری رنگینی ہی چھین لی، قطرہ تو چمکتا ہے، اس میں رنگینی ہوتی ہے، لیکن تو اتنا سادہ کیوں ہے؟“

”دلکش تو ہوں نا، صرف ان کی نگاہ میں جو قطرے کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اسی بجز نے میری رنگینی کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ دیکھنا جب یہ سادہ سا قطرہ موتی بنا تو انمول ہو جائے گا، دیکھنا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے وہ قطرہ مزید تر پنے لگا۔ وہ دھند جیسے رقص میں آگیا اور پھر سورج کی تیز دھوپ میں اس کا وجود آسمانوں کی جانب اٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یوں لگا جیسے وہ قطرہ تحلیل ہو گیا۔ مگر ایسا نہیں تھا، ایک دم سے بادل آسمان پر چھا گئے۔ سورج ان کی اوٹ میں چھپ گیا۔ ہزار ہا قطرے بادلوں سے گرنے لگے۔ ان میں سے وہ قطرہ نچانے کیسے کیسے رنگ لئے سمندر سے جا ملا، ایک دم سے اس کی روز نشیناں تیز ہو گئیں۔ ایک سیٹی اس کے لئے محو انتظار تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔

مجھے اگلی منزل کے لئے اٹھنا تھا۔ میں راز جان گیا تھا کہ قطرے کو گہر بننے کے لئے جدائی ضروری ہے، وصل کی تڑپ ہی اس کے گہر بن جانے کا راز ہے۔ ایک قطرہ، قطرہ ہی نہیں، قلم بے ساحل بھی بن سکتا ہے۔ میں ساحل سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

جہاں اور رونیت کور فورڈ ہیل جیپ کی پچھلی نشست پر تھے۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ سیوک سنگھ تھا۔ ان کی پچھلی سیٹ پر دو لڑکیاں بیٹھی ہوئیں تھیں، جن کا تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔ سہ پہر ہونے والی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سڑکوں پر ٹریفک بہت بڑھ جاتا ہے۔ ان سب نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کلیان سنگھ کو اٹھایا جائے۔ کیونکہ ہر نیک سنگھ سے اس کی دوستی اور کاروباری تعلق سب کچھ سمجھا گیا تھا۔ ہر نیک سنگھ کے بارے میں انہیں شک تھا کہ وہ کوئی ایجنٹ ہے، یا کسی کے لئے وہ کام ضرور کرتا ہے۔ اب معلومات لیں تو کڑیاں اس شک کو مزید پختہ کرنے لگیں۔ کلیان سنگھ کے بارے میں یہ فیصلہ اس شک کے بارے میں یقین کرنا تھا۔

وہ انہی اونچی اونچی عمارتوں میں سے ایک تھی جو سکھنا جھیل کے جنوب میں واقع تھیں۔ یہ ایک بڑا کاروباری مرکز مانا جاتا تھا۔ اس سفید عمارت میں بہت سارے دفاتر تھے۔ جہاں اور رونیت کور عمارت کے سامنے اتر گئے جبکہ باقی جیپ سمیت پیمینٹ پارکنگ میں چلے گئے۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے کلیان سنگھ کے آفس کے سامنے پہنچ گئے۔

بدلی سوت پہنے دلی لڑکی نے صاف انگریزی میں ان سے پوچھا

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

”کلیان سنگھ سے ملنا ہے، بہت ضروری۔“ رونیت نے کہا

”جی بالکل، آپ دیکھیں، ہم وقت پر پہنچے ہیں۔“ رونیت نے پورے اعتماد سے کہا تو وہ دلی لڑکی بولی

”آپ کا نام پلیز؟“

”مسز اینڈ مسٹر اروڑہ فرام لدھیانہ چیمبر آف کامرس“

”اوکے“ دلی لڑکی نے کہا اور کمپیوٹر میں دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں۔“

وہ دونوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔ رونیت کور نے جب ان کا کمپیوٹر ہیک کیا تھا، اسی وقت اس نے ایک نام پڑھ لیا

تھا اور وہ اسی وقت کے حساب سے وہاں پہنچ گئے تھے۔ اب جو وہ کرنے جا رہے تھے، اس دوران مسز اینڈ مسٹر اروڑہ فرام لدھیانہ چیمبر آف کامرس کو نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ کلیان سنگھ کے آفس میں داخل ہو گئے۔

وہ سامنے ایک بڑی ساری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں نے نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے غصے میں کہا
”کون ہو تم لوگ، اروڑہ صاحب تو.....“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ جہاں اپنا پستل نکالتے ہوئے بولا

”ہمارے بارے سنو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔ لہذا آرام سے بیٹھ جاؤ، ہمارے.....“

میں پوچھتا ہوں، کون ہو تم؟“ اس نے بنا کسی خوف کے کہا تو جہاں بنا کچھ کہے آگے بڑھا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ جس پر کلیان سنگھ نے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑنا چاہی

”جلدی کرو، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ رونیت کور نے دبے ہوئے لہجے میں تیزی سے کہا تو جہاں نے پستل کلیان سنگھ کے ماتھے پر مارا، وہ ایک دم سے چمکراتے ہوئے کرسی پر ڈھ گیا۔ جہاں نے اس کی گردن نہیں چھوڑی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

”کک..... کک کون ہو تم؟“ کلیان کے منہ سے غصے اور نفرت سے نکلا، جس میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

”ہمیں صرف ایک سوال کا جواب چاہئے، یہیں جواب دو گے یا ہمارے ساتھ جانا ہے، یا پھر.....“ جہاں نے

غراتے ہوئے کہا

”کیسا سوال؟“ اس نے آنکھیں سیڑھتے ہوئے پوچھا

”سندھپ اگر وال عرف سندو۔ تمہارا دوست، کہاں ہے؟ صرف اسی کا جواب چاہئے، اب یہ مت کہنا کہ مجھے پتہ

نہیں؟“ جہاں نے کہا تو وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر ایک دم سے خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے بولا

”مجھے نہیں پتہ تم کون ہو، لیکن میں بھی اسے تلاش کر رہا ہوں۔ اس کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ مجھے کچھ بھی ہو

جائے لیکن اس کا پتہ چل جائے، میں حاضر ہوں۔“

”تو چلو پھر ہمارے ساتھ، مل کر تلاش کریں۔“ جہاں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے اٹھ گیا۔ اس

کے ماتھے پر خون تھا۔ جسے اس نے ٹشو پیپر سے صاف کیا۔ اس نے میز کی دراز کھولی، اس میں سے سیل فون نکالا، پھر

چایاں نکالیں، اس کے ساتھ ہی اس نے پستل نکال کر ان پر تانتے ہوئے نفرت سے بولا، ”مجھے اس کی تلاش تو ہے،

لیکن تم جیسے غنڈوں کے ساتھ یوں آسانی سے چلا جاؤں۔ پستل پھینکو۔“

”کلی، یہ تم نے بہت اچھا کیا، ابھی سامنے آگئے، اب تجھے معافی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہی جہاں نے اسے جھکائی

دی، کلیان نے فائر کر دیا۔ جس کی آواز پورے اپارٹمنٹ میں پھیل گئی۔ جہاں اس پر جا بڑا تھا۔ وہ دونوں فرش پر تھے،

رونیت نے کلیان کی کلائی پر زور سے ایڑی ماری، اس کا پستل چھوٹ گیا، جسے رونیت کور نے تیزی سے اٹھایا۔ جہاں

اسے لگاتار مار رہا تھا۔ پھر اسے اٹھایا اور پوری قوت سے دروازے میں دے مارا۔ باہر سیکورٹی والے آگئے تھے اور

انہوں نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ مگر ان سے بھی پیچھے دو لڑکیاں گئیں لئے کھڑی تھیں۔ انہوں نے سیکورٹی والوں کو کور

کیا ہوا تھا۔ رونیت نے یہ منظر دیکھا تو وہاں موجود سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کسی نے بھی حرکت کی تو سمجھو وہ اوپر.....“

جہاں نے کلیان کو اٹھایا اور میز ہیوں کی جانب بڑھا۔ ان کے درمیان طے تھا کہ لفٹ ان کے لئے بچھرہ ثابت

ہو سکتی ہے۔ گھومتی ہوئی سیڑھیوں کے نیچے تک وہ تیزی سے آرہے تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ عمارت کی سیکورٹی کو پتہ نہ چلے، اور انہوں نے پولیس کو اطلاع نہ دی ہو۔ سیڑھیوں کے نیچے سات اٹھ نو جوان کھڑے تھے۔ جہاں ٹھٹھکا تو رونیت کور نے کہا۔

”جلدی نکلو۔ یہ اپنے ہی ہیں۔“

انہوں نے نیچے سب کو کور کیا ہوا تھا۔ وہ کلیان کو لے کر جیسے ہی سیڑھیاں اترے، وہاں موجود لڑکوں نے کلیان سنگھ کو قابو میں کر لیا۔ وہ اسے باہر گاڑی تک لا رہے تھے کہ ایک سیکورٹی والے نے فائر کر دیا جو ایک لڑکے کو لگا۔ تبھی انہوں نے ایک دم سے زوردار فائرنگ شروع کر دی، جس سے وہ عمارت ہی نہیں پورا علاقہ کو گونگ اٹھا۔ تبھی ایک لڑکے نے زخمی لڑکے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا

”اب نکلیں آپ، میں سب سنبھال لیتا ہوں۔“

ڈرائیور ان کی گاڑی لے آیا تھا۔ انہوں نے کلیان سنگھ کو اس میں پھینکا اور سبھی بیٹھ کر چل دیئے۔

ڈرائیور بہت ماہر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے نکلتا چلا گیا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا بہاؤ تھا۔ کلیان سنگھ کو جہاں نے دیا ہوا تھا۔ رونیت اپنے لپ ٹاپ میں مصروف تھی۔ وہ شہر کی ان سڑکوں کا بلاک کر رہی تھی، جو ان کی راہ میں تھیں۔ تقریباً چندرہ منٹ کے بعد وہ سنسان علاقے کی جانب بڑھتے ہوئے ایک تعمیر بلڈنگ میں گاڑی سمیت آگئے۔ جہاں پہلے ہی سے کچھ لوگ تھے۔ وہ اسے تیسری منزل کے اس کمرے میں لے گئے جہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ جہاں نے اسے زور سے دھکا دیا تو کلیان فرش پر جا گرا۔ اس کے چہرے پر چوٹ آئی تھی۔

”چل شروع ہو جا، نہیں بتائے گا تو اس قدر تشدد ہوگا کہ تو موت چاہئے گا، مگر نہیں ملے۔“ جہاں نے کہا۔

”میں سچ کہتا ہوں، مجھے سندو کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔“ کلیان نے بے خوفی سے جواب دیا۔

”رونیت، تم باہر جاؤ اور لڑکوں کو اندر بھیجو، وہ اس کے کپڑے اتاریں، پھر اس کی.....“ جہاں نے کہنا چاہا مگر

کلیان تیزی سے بولا۔

”مجھے اس کے بارے میں پتہ نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری مدد نہیں کروں گا۔ مجھے خود سندو کی تلاش ہے۔“

”کیوں نہیں ہوگی، وہ تمہارا بہترین دوست تھا اور تمہیں اس کے بارے میں سب پتہ تھا، اب تم یہ بھی کہو گے کہ تمہیں اس کے گم ہوجانے کا بھی پتہ نہیں؟“ رونیت نے کہا

”لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، میں خود آج تک حیران ہوں۔“ وہ یوں بولا جسے احتجاج کر رہا ہو۔

”تو پھر کیا ہر نیک سنگھ کو پتہ ہے۔ جواب تمہارا بہت اچھا دوست ہے، جس کے تمہارے ساتھ بہت اچھے کاروباری

مراسم ہیں، یہ انہی دنوں تمہارا دوست بنا تھا تا جن دنوں سندو گم ہو گیا تھا۔“ جہاں نے کہا تو وہ دھیرے سے بولا

”بھئی کبھی مجھے بھی شک ہوتا ہے کہ شاید ہر نیک ہی نے ایسا کیا ہو مگر مجھے ایسا نہیں لگا۔ اسے سندو سے.....“

کلیان نے کہا تو رونیت نے طنز آمیز انداز میں کہا

”ہمیں یہ پتہ ہے کہ ہر نیک کیا ہے اور تم ساتھ رہتے ہو، تمہیں نہیں پتہ۔ جہاں، یہ ایسے نہیں مانے گا۔ میں بھیجتی ہوں لڑکے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

”اب بھی وقت ہے۔“ جہاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”مجھے جہاں کے غائب ہونے کا پتہ ایک ہفتے بعد لگا تھا۔ وہ اکثر ایسے غائب ہو جاتا تھا۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہر نیک سنگھ ایک عیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے دو نمبر دھندے بھی ہیں۔ مجھے ان دونوں میں کوئی ایسی وجہ نہیں ملتی جس سے شک ہی ہو سکے کہ.....“ کلیان نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا، تب تک لڑکے اندر آگئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اس کی پگڑی کو بڑی احتیاط سے اتارا اور ایک طرف رکھ دی۔ پھر ایک نے اس کی شرٹ اتاری، دوسرے نے پیٹنٹ اتاری تو فقط کچھارہ گیا۔ لڑکوں نے ڈنڈے اٹھائے اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر کراہتے ہوئے بولا

”رب کے لئے میری بات سنو،“

جہاں کے اشارے پر لڑکے رکے تو اس نے پوچھا۔

”بولو، کیا کہتے ہو؟“

”مجھے ہر نیک پر کئی شک ہیں، ممکن ہے اسی نے سندو کو غائب کیا ہو۔ لیکن مجھے کیا پتہ کہ تم ہر نیک سنگھ کے بندے ہی ہو؟“

اس کے یوں کہنے پر جہاں ایک دم سے تھک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے پتہ ہے لیکن وہ اعتماد نہیں کر رہا تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ معاملہ اس کے اور ہر نیک کے درمیان تھا۔ اور انہیں سے پتہ چل سکتا ہے۔

”چلو، اتنا بتا دو کہ سندو زندہ ہے؟“ جہاں نے پوچھا

”اسے زندہ ہونا چاہئے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا

”ٹھیک ہے، تم ہمارے مہمان رہو۔ اس وقت تک، جب تک ہر نیک ہمارے ہاتھ نہیں آ جاتا۔“ جہاں نے کہا تو وہ بولا

”بہت مشکل ہے، تب تک وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔“

”دیکھتے ہیں۔“ جہاں نے کہا اور لڑکوں کو اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔

سورج مغرب کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ چندی گڑھ کی روشنیاں جگمگا اٹھیں تھیں۔ جہاں اور رونیت موہالی کی طرف جانے والی سڑک پر موجود ایک بڑے بنگلے میں تھے۔ بظاہر وہ ایک فیکٹری سے ملحقہ دفتر تھا۔ جس میں کام کرنے والے لوگ جا چکے تھے اور تھوڑے سے لوگ وہاں تھے۔ وہ دونوں ایک کمرے میں تھے۔ ان کے پاس اجمیت سنگھ اور سانولے چہرے والی پتلی سی گرلین کور تھی۔ وہ چاروں کمپیوٹر کے پاس تھے۔ تبھی رونیت کور نے جہاں سے کہا

”لو ہم یہاں آگئے ہیں، اب بتاؤ، میرے سامنے سمجھو پورا چندی گڑھ ہے۔ جہاں کی نشان دہی کرو گے وہیں

میں اسے تلاش کر لوں گی۔“

”یہاں کوئی سیکٹر سولہ ہے؟“

”بالکل ہے۔“ یہ کہتے ہوئے رونیت کور نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا، ”یہ سامنے سیکٹر سولہ ہے۔“

تب جہاں نے اسے اسے ہندسوں میں لوکیشن بتائی، رونیت اسی مطابق کمپیوٹر میں فیڈ کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد

رونیت کور سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی

”یہ سرخ دھبہ ہر نیک کی نشان دہی کر رہا ہے۔ اور نقشے کے مطابق وہ اس وقت سیکٹر سولہ میں ہے۔ مطلب بقول

تمہارے اس کے سیل فون کی لوکیشن ہے۔“

”مزید دیکھو، وہ جگہ کون سی ہے، لڑکے پہنچ جائیں گے وہاں۔“ ابھیت نے تیزی سے کہا

”وہ لڑکوں کے بس کی بات نہیں ہوگا۔“ گرلین کور نے اس سے بھی تیز لہجے میں کہا

”مگر یہ تو یقین ہو جائے گا کہ وہ وہیں ہے۔“ ابھیت نے کہا

”یہ ٹھیک ہے، مگر کوئی ایکشن نہیں۔“ یہ کہہ کر روئیت کور نے جہاں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”جہاں یہ پکا ہے نا؟“

”ایک دم پکا۔“ اس نے کہا۔

تبھی ابھیت نے فون نکالا اور کسی کو ہدایات دینے لگا۔ جہاں پر سرخ دھبہ تھا۔ وہ لوکیشن بتائی۔ وہ فون کرچکا تو روئیت نے گرلین سے کہا

”تم رہو ادھر اور ہمیں اپ ڈیٹ کرتے رہنا، ہم نکلتے ہیں، ادھر ادھر کا بھی خیال رکھنا۔“

”میں جانتی ہوں، مجھے کیا کرنا ہے۔“ اس نے اعتماد سے کہا

وہ چاروں ایک سیاہ فورڈ ٹیل گاڑی میں سوار تیزی سے میکسرسولہ کی طرف جا رہے تھے۔ ڈرائیور وہی تھا لیکن گاڑی انہوں نے بدل لی تھی۔ جہاں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ جو منظر اس کے سامنے آیا تھا، اس نے بے چین کر دیا تھا۔

اگرچہ شہر جدید طرز پر آباد تھا، لیکن میکسرسولہ کی آبادی قدرے گنجان لگتی تھی۔ وہاں زیادہ رش تھا۔ ایک ہال میں تقریب جاری تھی۔ لڑکوں نے یہی بتایا تھا کہ ہرنیک سنگھ اندر موجود ہے، وہ اس تقریب کا مہمان خصوصی ہے اور سٹیج پر بیٹھا ہوا ہے۔

”کافی ہنگامہ ہو سکتا ہے۔“ جہاں نے دھیمے سے کہا

”اس کے ساتھ سیکورٹی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، ایسے میں ہمارا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“ روئیت کور نے ہولے سے اپنی رائے کا اظہار کیا

”مجھے بس چند منٹ دیں گے؟“ ابھیت نے اجازت طلب انداز میں پوچھا

”کیا کرو گے تم؟“ جہاں نے پوچھا

”صرف اتنا کہ یہاں ہنگامہ کر دوں، افراتفری پھیلادوں، اس دوران.....“

”وہ پہلے ہی کلیان سنگھ کی وجہ سے چوکنے ہوں گے، اس طرح وہ زیادہ چوکنے ہو جائیں گے۔“ روئیت کور نے بد مزہ ہوتے ہوئے کہا

”لیکن اس طرح تو وہ تقریب کے بعد سیکورٹی کے گھیرے میں یہاں سے نکل جائے گا۔ اسے پچھلے دروازے سے نکالیں گے۔“ ابھیت نے کہا

”ڈن! کرو۔“ جہاں نے ایک دم سے کہا

”آپ پیچھے چلو۔“ ابھیت نے کہا اور کار سے اتر کر لڑکوں سے رابطہ کرنے لگا۔

جہاں اور روئیت اپنے ڈرائیور کے ساتھ اس عمارت کی پچھلی طرف چلے گئے، جہاں سنسان سی تنگ گلی تھی۔ جس میں بہ مشکل ایک چھوٹی گاڑی جا سکتی تھی۔ ڈرائیور گاڑی ہی میں رہا اور وہ اس متوقع جگہ جا پہنچے جہاں سے ان کا خیال تھا کہ ہرنیک نکلے گا۔ اس طرف ہال کی اندر کی بہت دھیمی آواز آرہی تھی۔ کوئی بڑے زوروں سے تقریر کر رہا تھا۔ اچانک ہال میں دھماکہ ہوا۔ جس سے اندر افراتفری پھیل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گلی کی طرف سے ایک دروازہ کھلا۔ کرتا پاجامہ اور ویسٹ کوٹ پہنے ہوئے بھاری جینے والے سردار کو کافی سارے لوگ گھیرے میں لے کر نکلے۔

”یہی ہے ہرنیک سنگھ.....“ روئیت کور نے تیزی سے کہا۔ جس پر جہاں نے ہٹل نکلا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ لوگوں کے اس گھیرے میں گھس گیا جو ہرنیک کے ارد گرد تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں کو یہی باور کرانے لگا، جیسے وہ اسی کا باڈی گارڈ یا سیکورٹی والا ہے۔ جہاں نے اسے پکڑا اور گلی میں سے باہر نکلے گئے۔ اگلے ہی لمحے کسی نے ہرنیک کا ہاتھ چمڑا لیا۔ ہرنیک ان کے ہاتھوں سے نکل گیا، سامنے گلی میں سے چند لڑکے تیزی سے اندر آگئے اور سیکورٹی والوں اور ان کے درمیان میں دیوار بن گئی۔ شاید وہ لوگ سمجھ گئے تھے، اسی لئے ایک دم سے انہوں نے لڑکوں پر حملہ کر دیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے دست وکریاں تھے۔ گلی میں گھمسان پڑ گیا۔ دو سیکورٹی والوں نے جہاں کو دونوں ہانڈوں سے پکڑ لیا تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب گلی کے باہر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ دھماکے کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فطری طور پر وہ سب چونکے لیکن جہاں نے اسی لمحے سے فائدہ لے لیا۔ ان کی توجہ بٹ چکی تھی۔ اس نے اپنے دونوں طرف کھڑے لوگوں کے پیٹ میں پوری قوت سے کھدیاں ماریں، یہ دیکھے بغیر کہ وہ ڈہرے ہو گئے ہیں، اس نے وہیں اپنے پیروں پر سے چھلانگ لگائی اور ہرنیک سنگھ کے منہ پر گھونسا مارا اور پھر اس پر جا پڑا۔ وہ دونوں ہی فرش پر تھے۔ جب تک اس نے ہرنیک کی گردن اپنے قابو میں کر لی تھی اسی وقت روئیت کور اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں سے بھڑ چکی تھی۔ وہ چار تھے اور روئیت اکیلی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ صرف اپنا دفاع کر رہی تھی اور جو بھی جہاں کی طرف بڑھتا، اسے روک لیتی۔ اس لئے لہو لہواں ہو رہی تھی۔ گلی کے باہر فائرنگ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چاروں طرف یوں دتی بم کے دھماکے ہو رہے تھے کہ جیسے کسی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔ جہاں پوری توجہ سے ہرنیک سنگھ کو قابو میں کرنے کے لئے اس پر ٹوٹا پڑا تھا۔ اس نے ماتھے اور ناک کے درمیان ایسا زوردار پیچ مارا کہ اگلے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گیا۔ روئیت بے حال ہو چکی تھی۔ جہاں اسے بچانے کے لئے بڑھا تو ایک گاڑی نے ہٹل تان لیا۔ جہاں نے ایک دم سے اسے جھٹکی دی، فائر تو ہوا، لیکن ہٹل اس کے ہاتھ سے جہاں کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا۔ باقی تینوں نے روئیت کو چھوڑ دیا اور اپنے ہٹل نکال کر جہاں پر تان لئے تھے۔ انہیں دیر ہو گئی تھی۔ جہاں فوراً ہی زمین پر لیٹا اور گھومتے ہوئے ہٹلر کسی تردد اور وقت ضائع کئے ان پر فائر کر دیئے۔ روئیت کور کا برا حال تھا۔ جہاں نے اسے سہارا دیا تو وہ کراہتے ہوئے بولی

”بلاشبہ گلی کے باہر ہمارے ہی لوگ ہوں گے۔ مجھے چھوڑو، باہر دیکھو، کیسا ماحول ہے۔“

جہاں کسی بحث کے بغیر اسے یونہی گلی میں چھوڑ کے باہر کی جانب بڑھا۔ باہر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ تین لڑکے اندر آنے کی کوشش میں تھے مگر سامنے کی فائرنگ سے رکے ہوئے تھے۔ جہاں نے تاک کر انہیں نشانہ بنایا تو راستہ صاف ہو گیا۔ وہ فوراً اندر آگئے۔

”میں ہرنیک کو لیکر آتا ہوں۔ مجھے گاڑی تک کور دینا۔“ جہاں نے تیزی سے کہا اور ہرنیک کو اٹھا لیا۔ وہ بہت بھاری تھا لیکن پھر بھی جیسے تیسے وہ اسے گاڑی تک لے گیا۔ تبھی اسے آواز سنائی دی۔ جہاں نے دیکھا ان کا ڈرائیور گاڑی لئے کھڑا تھا، اس نے ہرنیک سنگھ کو گاڑی میں پھینکا۔ روئیت کور اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ لڑکوں نے انہیں کور دیا۔

وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ جیسے ہی وہ روڈ پر آئے روئیت کور نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

”میرا سیل فون اور لیپ ٹاپ کدھر ہیں۔ میں راستہ صاف کرتی ہوں۔ تم بہت احتیاط سے نکل چلو اور رابطہ کر کے گرلین کو اپنی پوزیشن بتا دو۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور تیز رفتاری سے چل دیا۔ وہ اسی عمارت میں آن پہنچے، جہاں انہوں نے کلیان سنگھ کو رکھا

”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ تو کلیان سنگھ کا دوست تھا اور.....“
 ”اسی کلیان نے تمہارا پتہ بتایا ہے۔ جھوٹ بولتے ہو؟“ یہ کہہ کر اس نے پٹل اس کے ماتھے پر رکھ دیا تو چند لمے تذبذب میں رہا، پھر مردہ سی آواز میں بولا
 ”میں نے اس کے اغوا کی ڈیل کی تھی۔ اسی لئے کلیان کے قریب ہوا۔ میں نے اسے اغوا کر بھی لینا تھا، مگر مجھ سے پہلے ہی کسی نے اسے اٹھا لیا۔ میرا خیال ہے وہ ”را“ والوں نے.....“
 ”اب تمہیں کوئی پتہ نہیں؟“ ابھیت نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ وہ اعتماد سے بولا۔

”ہمارے بارے میں تجھے پہلے سے کس نے بتا دیا کہ تجھے اغوا کرنے آئیں گے۔“ ابھیت نے پوچھا
 ”وہ تو کل کا بتایا جا رہا تھا کہ کوئی مجھے اغوا کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو کوئی اور ڈیل تھی۔ سندو دالا معاملہ ہی نہیں تھا۔“
 ”سندو کے معاملے میں تمہاری ڈیل کس سے ہوئی تھی؟“ جہاں نے پوچھا۔
 ”گر باج سنگھ نام کا آدمی تھا۔ اس نے بہت بڑی رقم دی تھی۔ سندو کے کم ہوجانے کے بعد سے اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی اس نے مجھ سے رقم واپسی کا مطالبہ کیا ہے۔“ ہرنیک نے کہا۔
 ”تم چند ہی گڑھ کے سیاست دان ہو، کیا سمجھتے ہو، ہمیں بے وقوف بنا لو گے۔ سندو کا پتہ بتاؤ یا گر باج سنگھ کا، دس تک گنوں گا۔“ ابھیت نے سرد لہجے میں کہا تو جہاں نے ہر پال سنگھ کی طرف دیکھ کر گر باج کے بارے میں پوچھا
 ”اس نام کا شخص، ادھر کہیں رہا ہے؟“
 ”ممکن ہے اس نے نام بدل کر یا کسی دوسری طرح ان کے قریب ہوا ہو۔ لیکن جو بھی کرنا ہے، پانچ دس منٹ میں کر کے نکل جاؤ، پولیس اور خفیہ پورے شہر میں پھیل چکی ہے، وقت بہت کم ہے۔“
 ”اوکے، ابھیت مار دو گولی اسے۔ کلیان کو بھی ختم کرو اور چلو۔“
 ”نہیں، رب کے لئے نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔ وہ پانچ لڑکے میرے پاس ہیں وہ دے دیتا ہوں۔“ وہ چیختے ہوئے بولا۔

”کہاں ہیں وہ لڑکے؟“ جہاں نے چوتھے ہوئے کہا تو وہ بولا
 ”وہ میرے فام ہاؤس پر ہیں۔ آرام سے ہیں۔“ جیسے ہی ہرنیک نے کہا تو جہاں کو غصہ آ گیا۔ اس نے ابھیت کا پٹل ہٹایا اور پوری قوت سے گھونٹہ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا
 ”بے غیرت، تو نے اب تک مذاق بنایا ہوا ہے، قسطوں میں معلومات دے کر کیا کرنا چاہتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہرنیک کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کی اچھی ٹھکانی کرنے کے بعد جہاں نے اپنی پنڈلی سے لگا فخر نکالا اور اس کی ایک ران میں دبایا، پھر چیرتے ہوئے باہر نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہرنیک تڑپنے لگا۔ کچھ دیر بعد تڑپتے ہوئے گھٹی ہو آواز میں بولا۔

”رب کے لئے..... بخش دو..... میں..... سب بتا..... دیتا ہوں۔“
 ”ایک منٹ میں بتا دو یہ تمہیں آخری موقعہ ہے، اب گولی تیرے دماغ کے پار ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے ابھیت نے اس کی کنپٹی پر پٹل کی نال رکھ دی۔

”گر باج کا..... فون نمبر..... بتا دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے..... دو چار بار بی ملا ہے..... ہمارا رابطہ فون پر ہی تھا..... مجھے کلیان کے ذریعے..... سندو کی حرکات و سکنات بارے پتہ چل جاتا تھا..... جو میں گر باج کو بتاتا تھا..... کلیان کو

ہوا تھا۔ وہ ہرنیک کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ سبھی ایک لڑکے نے جہاں کو پیغام دیا
 ”سرکہہ رہے ہیں کہ زیادہ وقت نہیں، ہائی الرٹ ہو گیا ہے۔ چند ہی گڑھ ہمارے لئے چوہے دان ثابت ہو سکتا ہے، اگر احتیاط نہ کی گئی تو۔“

”ٹھیک ہے، یہاں دلوڑکوں کے علاوہ سب چلے جائیں۔ گاڑی چھپا دو۔ روشنی وہی جو معمول کے مطابق ہو۔ درنیت کو لے جاؤ، وہ بہت زخمی ہے۔“ جہاں نے کہا۔
 ”اوکے۔“ لڑکے نے کہا اور باہر کی طرف چلا گیا۔
 ایک نیم تاریک کمرے میں جہاں سنگھ کے سامنے گر لین کور، ابھیت سنگھ اور ایک نیا لڑکا ہر پال سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس تینوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہمارا پہلا برا مشن ہے۔ پہلے ہم نے اتنے بڑے پیمانے پر کچھ نہیں کیا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ ہرنیک کو پکڑنے کے بارے میں کوئی جانتا ہے اور اس نے ہرنیک کو بتا دیا۔ اسی لئے سارا پلان پہلے ہی سے تیار تھا۔ کیا خیال ہے؟“

”معاف کرنا ابھیت، یہ سب اشارہ تمہاری طرف جاتا ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ معاف کیا جاسکتا ہے لیکن غداری نہیں، کیا تم اس کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہو؟“ ہر پال سنگھ نے سرد سے لہجے میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں مانتا ہوں کہ حالات سب میرے بارے شک پیدا کر رہے ہیں، لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، میں مروتا سکتا ہوں لیکن غداری کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم لوگ مجھے جو بھی سزا دو مجھے قبول ہوگی۔ مگر مجھے ایک موقعہ ضرور دیا جائے کہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ میں غدار نہیں ہوں۔“ ابھیت نے پورے اعتماد سے کہا۔

”ٹھیک ہے، وقت نہیں، اس لئے ہرنیک اور کلیان کے بارے جو فیصلہ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے، صرف بیس منٹ ہیں تمہارے پاس، کلیان کو لاؤ۔“ ہر پال نے کہا
 ”اوکے۔“ ابھیت نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ اٹھ گئے۔

ملجے اندھیرے میں ہرنیک سنگھ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ چاروں اس کے پاس چلے گئے۔ آہٹ پا کر وہ سیدھا ہوا تو جہاں نے انتہائی طنز یہ لہجے میں کہا۔

”نیٹاجی، سکون سے میرے سوالوں کا جواب دو گے یا مار کھا کے بکواس کرو گے؟“
 ”تم نہیں جانتے کہ تم نے موت کو آواز دے لی ہے۔ سارا چند ہی گڑھ مجھے تلاش.....“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، کہ ابھیت، کلیان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے لفظ سن لئے تھے اس لئے اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا پھر سخت لہجے میں بولا۔

”سن ہرنیک! ہمیں تم سے کوئی لینا دینا نہیں، صرف ایک سوال ہے، اس کا جواب چاہئے، جھوٹ بولو گے تو موت، سچ بولو گے تو جانے دیں گے، تم بھی جانتے ہو کہ وقت بہت کم ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پٹل نکالا، بیٹنی کیچ ہٹایا تو اس کی آواز ہی سے ہرنیک سہم گیا۔

”بولو، کیا پوچھنا ہے؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”سندھپ اگر وال، عرف سندو کہاں ہے؟“ ابھیت نے پوچھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر کلیان کی طرف دیکھ کر بولا۔

نہیں معلوم..... کیا ہوا سندو کے ساتھ..... اس لئے تعلق رکھا ہوا تھا..... کہ اگر سندو کے بارے میں..... یا ان پانچ لڑکوں کے بارے میں..... کوئی پوچھے..... تو مجھے فوراً پتہ چل جائے۔“

”نمبر بولو۔“ جہاں نے کہا تو اس نے نمبر بول دیا۔ جہاں نے کال ملائی تو دوسری جانب اس کی توقع کے مطابق فون بند تھا۔ ہرنیک کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”گلتا ہے تو اپنا اتم سنکار بھی نہیں کروانا چاہتا۔ میں نے تجھے شوک دیا تو لاش اوپر پھینک دینی ہے جہاں چیل کوئے تجھے کھائیں گے۔“

”اب میں کیا کروں، مجھے فون دو، میں ابھی لڑکے جہاں کہو پہنچا دیتا ہوں۔“ اس نے اذیت بھرے لہجے میں تیزی سے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

”میں تیری بات کروا دیتا ہوں، نمبر بولو۔“ جہاں نے کہا تو نے نمبر بتایا۔ جہاں نے اپنے فون سے اس مخصوص جگہ فون کیا۔ نمبر بتایا۔ کچھ دیر بعد کال آگئی تو اس نے اسٹیکر آن کر کے فون ہرنیک کو دے دیا۔

”ہیلو، کون بول رہا ہے۔“

”سردار جی آپ، کہاں ہیں، ٹھیک تو ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک نہیں ہوں، اگر تم لوگ میری زندگی چاہتے ہو تو فارم ہاؤس سے وہ پانچ لڑکے واپس اسی گردوارہ صاحب پہنچا دیں۔“

”جی، لیکن یہ نمبر تو.....“ دوسری طرف سے کسی نے کہا تو جہاں نے اس کی بات کاٹ کر سرد ملجے میں کہا ”اوائے تم جو بھی ہو، اگر سمارٹ بننے کی کوشش کی تو یہ تیرا سراوریتا نہیں رہے گا۔ صرف دس منٹ ہیں تیرے پاس، اگر لڑکے نہ پہنچائے تو.....“

”تم کوئی آسمان پر نہیں ہو، اگر سردار جی کو کچھ ہو گیا تو ہم تیرے.....“ دوسری طرف سے کہا گیا تو ہرنیک بولا ”جیسا کہہ رہے ہیں ویسا کرو، جلدی۔“ ہرنیک نے کہا تو جہاں نے کہا

”سالے، نمبر سے ہمیں فریس کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرنے کی بجائے کام پر لگ جاؤ، تیرے سردار کی ایک ٹانگ ہم نے چیر دی ہے، خون بہہ رہا ہے دھڑا دھڑ، دیر کو گے تو سمجھ لو کیا ہوگا۔“

”کیا یہ سچ ہے سردار جی؟“ تشویش زدہ لہجے میں پوچھا گیا۔

”ہاں، سچ ہے۔“ ہرنیک نے کہا۔

”نہیں، ابھی کرتا ہوں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا تو جہاں نے فون بند کر دیا

”کیڑا ہے نادماغ میں۔ اب تم کیا کہتے ہو کلیان جی۔“ جہاں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا تو کلیان سگھ بولا۔

”میرا قصور تمہارے سامنے ہے۔“

”تم گرباج کو جانتے ہو؟“ ابھیت نے پوچھا۔

”ہاں، میں اس کے ساتھ کئی بار اس سے ملا ہوں، لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیوں ہرنیک سے ملتا ہے، یہ آج پتہ چلا۔ مجھے آپ جو کہو، میں کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے کہا تو جہاں بولا۔

”کلیان سگھ جی، گرباج چاہئے، یا سندو کا پتہ۔“

”میری فون پر بات کر آؤ یا مجھے جانے دو۔ کل شام تک میں اس کا کھوج نکال لوں گا، اگر اعتماد کرتے ہو تو۔“ کلیان نے اعتماد سے کہا تو جہاں نے ہر پال سگھ کی طرف دیکھا تو ابھیت بولا۔

”یہ میری ذمہ داری ہے، میں اس سے رابطے میں رہوں گا۔“

”کلیان سگھ کو چھوڑ دیں اور جیسے ہی لڑکے واپس ملتے ہیں، اس ہرنیک کو گولی مار دیں، ہم جارہے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر جانے لگے تو ہرنیک چیختے لگا۔

”نہیں..... ایسے نہیں مارو۔“

جہاں رک گیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”مجھے گرباج چاہئے، دے سکتے ہو؟“

”ہاں، مگر.....“ وہ بے چارگی سے بولا تو ابھیت نے پستل سیدھا کیا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولا

”بھرتی بے غیرتی کرو گے۔“

”وہ بہت خطرناک لوگ ہیں، میں نے ان کے بارے بتایا تو مجھے ہی نہیں میرے سارے پرپوار کو مار دیں گے یہاں تو میں اکیلا ہی مردوں گا۔“

”یہ میرا وعدہ رہا، تجھے کچھ نہیں کہوں گا، اگر گرباج کا پتہ دے دو تو؟“

”میں ابھی بات کرتا ہوں، ایک دوسرے نمبر پر بات کرو۔“ ہرنیک نے کراہتے ہوئے کہا

اسی طرح دوبارہ کال ملائی گئی۔ رابطہ ہوا تو ہرنیک نے کہا۔

”گرباج کہاں ہو تم، مجھے بچاؤ۔“

”سوری۔! اب وہ تم تک پہنچ گئے ہیں، اب تجھے مرنا ہی ہوگا۔“ دوسری طرف سے بھاری آواز میں کہا گیا

”تم تو میرے دوست ہو، میں مشکل میں.....“ ہرنیک نے کہا۔

”تم نے بھاری معاوضہ لیا ہے اس کام کا، اب بھکتو، اور ہاں دوبارہ فون مت کرتا، تیرے مرنے کی اطلاع مجھے ہو جائے گی۔“ اسی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہرنیک یوں ہو گیا جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔

”ہر پال، لڑکے مل جائیں تو انہیں کہیں چھوڑ کے نکل جاؤ۔ یہ جگہ اب صاف کر دو۔ گرلین آؤ میرے ساتھ۔“

”اس ہرنیک کو چھوڑ دیا تو.....“ ابھیت نے کہنا چاہا۔

”یہ اب کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اب کوئی جتنا بھی چھپنا چاہئے، مجھ سے نہیں بچ پائے گا۔ آؤ۔“ جہاں نے کہا اور وہاں سے گرلین کو کور کے ساتھ نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

میرے سامنے ایک عظیم صحرا تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ بھوری، سنہری ریت تاحہ نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک پر ہول

سانا تھا، جس میں فقط ہوا کی دہشت ناک سنناٹ تھی۔ میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف

اور کیوں چلتا جا رہا ہوں۔ اچانک صحرا میں تاریکی چھانے لگی۔ جس کے ساتھ ہی ماحول میں وحشت بڑھنے لگی۔ سورج

سہا دھویں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھا تو سامنے کا منظر حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔

ایک دائرے میں بے شمار عجیب و غریب قسم کے جانور بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ جانور پہچانے جا

رہے تھے اور کچھ عجیب و غریب مخلقت تھے۔ ان میں سب سے آگے ایک آٹو، چگاڈو، اور کرگس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان

کے بالکل سامنے کی طرف ریچھ، لنگور اور بندر تھے۔ انہی کی دائیں جانب رال ٹکاتے ہوئے کتے بیٹھے ہوئے

تھے اور ہائیں جانب لومڑی اور سانپ تھے۔ ان کے علاوہ کافی سارے ایسے جانور بھی تھے جنہیں میں نہیں

جانتا تھا اور نہ ہی انہیں کبھی دیکھا تھا۔

”کوئی اور بات کرنا چاہتے ہو؟“

”جناب میں نت نئے فلسفے گڑھ کر فکر و فلسفہ میں انتشار بڑھا رہا ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں عورتوں سے امامت تک کروادی گئی۔ مرد اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ یورپ کی عورتیں بچے پیدا نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے عورت سے اس کا عورت پن چھین لیا۔ آزادی نسوان کے نام پر۔ یہی حال اب برصغیر کی عورتوں کا ہے، وہ اندھی ہو چکی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یورپ کی عورتوں کا کیا حشر ہو چکا ہے، پھر بھی آزادی نسوان کی تحریکیں چلا رہی ہیں۔ آقا! میری کیا کیا خدمات نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر ابلیس نے چگاڑ کی طرف دیکھا اور کہا، ”اے گیانی! تمہارا آسمان اُلٹا ہے، ہاں اب تم بولو۔“

”آقا! میں زیادہ باتیں کر کے دماغ خراب نہیں کرتا۔ میں جو کیا ہے اس کی تصویریں جھلک دیکھاؤں گا تاکہ ہر شے واضح ہو جائے۔“ چگاڑ نے دست بدستہ ہو کر کہا۔

”تو پھر کھولو اپنی کھلی اور دکھاؤ، کیا دکھاتے ہو۔“ شیطان نے اپنے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

چگاڑ نے اپنی کھلی کھولی، اس میں سے سیل فون نکالا، اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر سیل فون اس پر رکھا تو وہ آئی پڈ بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اسکرین بڑی ہوئی لیپ ٹاپ جیسی ہو گئی، پھر وہ ٹی وی جیسا بن گیا۔ جس کی جماعت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سینما اسکرپ ساز کی اسکرین بن گئی۔ سبھی اس طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسکرین پر سب سے پہلے ایک نائٹ کلب کا منظر ابھرا۔ نوجوان جوڑے مستی میں ایک دوسرے سے جڑے ناچ رہے تھے۔ ہر جوڑا اپنے آپ میں مست تھا۔ کسی کسی کی خبر نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی چگاڑ کی آواز ابھری۔

”میں نے ہر جگہ یہ کلچر متعارف کرا دیا ہے۔ یہ صرف انہی ملکوں میں نہیں ہے، جہاں اجازت ہے، بلکہ میرا کام تو وہاں آسان ہوتا ہے جہاں ان نائٹ کلب پر پابندی ہوتی ہے، وہاں یہ نوجوان چمپ کر موج مستی کرتے ہیں، یہ دیکھوان کے گھروں کا منظر، میں نے ان کے گھروں کا نائٹ کلبوں میں بدل دیا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی منظر بدل گیا۔ گھروں میں نوجوان جوڑے ناچ رہے تھے۔ شراب عام بہہ رہی تھی۔ اس میں کلی منظر بدلے۔ نائٹ کلب، ہوٹل، رقص گاہیں، گھروں میں مخلوط پارٹیاں، جہاں رشتے ناٹوں کی کوئی پروا نہیں تھی، نہ کسی رشتے کے تقدس کا احساس اور نہ احترام۔ اس کے ساتھ ہی منظر بدلا، سمندر کنارے برہنہ عورتیں نمودار ہوئیں، اس کے ساتھ بڑے بڑے سوئمنگ پول میں نہاتے جوڑے، اٹھکلیاں، قہقہے، شور شراب، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ ان سارے مناظر میں یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہ سارے جسم اور بدن کے بچاری ہوں۔ اور بدن کی ہوس نے سب کو حیوانی سطح پر لا کھڑا کیا ہو۔ انہیں دوسرا ہوش ہی نہ ہو۔

”شہا ہاش! ان ترقی پذیروں کو جلد از جلد ترقی یافتہ بنا دو۔“ شیطان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”مہرا گیانی اگر دیکھنا ہے تو میرے سامنے بیٹھے رہچھ، بندر اور لنگور کو دیکھو، یہ وہ آئینہ ہیں جس میں انسان کو یہ ہار کر لیا کہ ان کے آباء و اجداد یہ جانور ہیں۔ ڈارون کی تھیوری کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے، کتنا احمق ہے یہ انسان۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ سائنسی اصول ہر زمانے میں، ہر جگہ ایک ہی نتیجہ دیتا، مگر انسان کی عقل پر قربان جاؤں، من و من یہ تسلیم کر لیا کہ جس حقیقت کا وجود ہی نہیں، اسی کو تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ ان عقل کے اندھوں سے پوچھا جائے کیا اب لنگور اور بندر سے انسان بنتے ہیں؟ جو انسان کی اولاد دکھوانا سمجھتے ہیں اور جانوروں میں اپنے آباء و اجداد کو تلاش کرتے ہیں۔ آخر کار صدیوں سے انسان کی عقل فکر میں نہ آنے والے ان رازوں نے اپنی منزل کو پالیا۔ ان کی باسوں

یہ عجیب میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ سارے ہی بار بار آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ کتنا ہی وقت یونہی گزر گیا۔ اچانک آسمان کی طرف سے ایک چمکتا ہوا اٹھ ریت پر آن گرا۔ جو کچھ لمحے تو پڑا رہا، پھر ہلنے لگا۔ اسی طرح ہلتے ہوئے وہ ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹوٹنے ہی ہر جانب سڑاند پھیل گئی۔ سارے جانور سجدے میں گر کر شور مچانے لگے، کسی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس ٹوٹنے ہوئے اٹھنے میں سے ایک گرگٹ نے سر اٹھایا۔ چند لمحوں میں اس نے نہ صرف اپنے رنگ بدلے بلکہ اس کا چہرہ بھی تبدیل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بھیانک چہرہ واضح ہو گیا۔ اسی لمحے وہ سارے جانور سجدے میں سے اٹھ گئے۔

”میرے چیلوں، تمہیں انسان کی بربادی مبارک ہو۔ تمہاری درخواست پر میں نے اجلاس بلا لیا ہے، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے اپنی بھدی اور خرفرائی ہوئی آواز میں کہا تو میں سمجھ گیا۔ وہ شیطان تھا۔ اور اس کے ارد گرد سارے اس کے چیلے تھے۔ سبھی ایک عجیب الخلقت جانور نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”بے شک انسان کی بربادی آپ ہی کی وجہ سے ہے گرد جی، ہم کیا چیز ہیں۔ آج کے اس اجلاس کی درخواست آپ سے اس لئے کی گئی ہے کہ آپ کا ہر چیلہ بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ اب یہ فیصلہ چاہتے ہیں کہ ان میں بڑا کون ہے؟“

اس پر ابلیس چند لمحے خاموشی سے سب کو دیکھتا رہا پھر اپنی بھدی اور خرفرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم وہ ہو جو انسان کو اپنے جیسا بنا لیتے ہو۔ انسان کتنا پاگل ہے، اپنی انسانیت چھوڑ کر جانور بن جاتا ہے۔ تم وہ صفت اور صلاحیت ہو، جو کسی انسان میں داخل ہو جاؤ تو وہ اپنی انسانیت کو بھول جاتا ہے۔ مجھے تم سب پر فخر ہے۔ خیر! اجلاس کی ابتدا کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا پھر آٹو پر نگاہ ٹکا کر بولا، ”اے آٹو، میرے دانشور، تجھے تو نروان حاصل ہے میرے اس دانشور کی شان یہ ہے کہ جب انسان کے لئے سورج غروب ہوتا ہے تو اس کے لئے طلوع ہوتا ہے، یعنی کالی رات میں اس کا دن طلوع ہوتا ہے، بتا اے دانشور آٹو، تو کس حد تک کامیاب ہے۔“

اس پر آٹو آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

”جناب! یہ آپ ہی کی مہربانی ہے کہ مجھے نروان دیا۔ میرا یہ نروان ایسا ہی ہے کہ میں انسانوں کے ذہن میں شک پیدا کرتا ہوں۔ جس سے ان کی فکری پختگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ان میں خوف پیدا کر دیتا ہوں، ہر طرح کا خوف، موت کا خوف، بھوک کا خوف، ان کے اپنے وجود کا خوف۔“

”تم اس کی کوئی مثال دے سکتے ہو؟“ شیطان نے چلبلا تے ہوئے پوچھا۔

”بے شمار ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ میں نے انسان میں خوف پیدا کر دیا ہے کہ اس زمین سے پانی ختم ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا؟ اس خوف کا پیدا ہونا ہی تھا کہ آپ نے دیکھا، انسان اسی لئے بڑے بڑے اجلاس بلا رہا ہے، حالانکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ جس نے انسان کو پیدا کیا، وہ پانی ختم نہیں ہونے دے گا۔ اس نے کہہ دیا ہوا ہے کہ جتنا پانی میں نے دے دیا، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ کیونکہ خالق نے ہر شے کو پانی سے زندگی بخشی ہے۔ زندگی اور پانی لازم و ملزوم ہیں۔ میں نے ایسا ابہام پیدا کیا، کوئی سمجھ ہی نہیں رہا۔“

”اور بڑی مثال؟“

”انسان کی جس میں حقیقی آزادی ہے، میں نے اسے غلامی بنا کر فلسفہ پیدا کر دیا۔ اور جو غلامی ہے، اسے آزادی بنا دیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میں نے ہر جگہ آگ لگائی ہوئی ہے، کسی کو سمجھ ہی نہیں آنے دے رہا ہوں کہ حقیقی آزادی ہے کیا؟“

”یہ ڈر خوف نہیں ہے، بلکہ یہ ڈر وہ ہے جس سے حضرت انسان آگہی پا سکتا ہے، پھر ہماری طاقت وہاں پر سلب ہو جاتی ہے۔ یہ اجلاس چاہے جس مقصد کے لئے تھا، لیکن تمام بلیات کو یہاں بلانے کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ کیا میں وہ بتاؤں؟“ شیطان نے درمندی سے کہا تو تمام بلیات اور جانور اچھل اچھل کر شیطان کی تائید کرنے لگے۔

”آقا، جیسا آپ چاہیں۔“ سبھی طرف سے یہی آواز بلند ہوئی تھی۔

”سنو! میں کیا چاہتا ہوں یہ میں بعد میں بتاتا ہوں، پہلے یہ جان لو کہ ہم اس وقت برصغیر کی اس دھرتی پر کھڑے ہیں، جسے چاہئے تقسیم کر دیا ہے، مگر میں اس کی تقسیم کو نہیں مانتا۔ مجھے سرحدوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہاں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے صحتک نیکوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کے انسان ہمارے ایجنڈے، ہڈ پگنڈے اور جھکنڈے کو ختم کر سکتے ہیں۔ یہ بات تم لوگوں کو ایسے سمجھ نہیں آئے گی، اس کے لئے تمہیں ماضی میں لے جانا پڑے گا۔“ شیطان بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

”کہو آقا کہو۔“ ایک شور اٹھا۔

”جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میری دشمنی انسان سے ہے، اور ان میں سے سب سے بڑا دشمن مسلمان ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا پھر کہتا چلا گیا، ”یہ انتہائی نازک لمحات ہوتے ہیں جو صدیوں کے بعد قوموں پر آتے ہیں، وہ لمحات ہوتے ہیں آزادی کے۔ میری بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ میں ان لمحات کو ٹال دوں۔ حقائق عالم سے ان کی آنکھیں بند کر دوں۔ تاکہ وقت گزر جائے۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو پھر کچھ نہیں بچتا۔ کیونکہ آزادی کے لمحات صدیوں بعد ہی قوموں پر آتے ہیں۔ حقائق عالم کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے میں مذہبی، عوامی، سیاسی اور معاشرتی گردہوں میں گھس جاتا ہوں۔ ہر طرح سے انہیں گمراہ کرتا ہوں۔ ان کے اندر نفرت، حسد اور کینہ بھردیتا ہوں۔ یہ بہت آسان ہے۔ صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک دوسرے سے بڑا کر کے دکھا دو۔ انہیں یہ باور کرا دو کہ تم سب سے بڑے ہو۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں نے ہر ایک کو یہ باور کرایا کہ تم سب سے بڑے حریت پسند ہو۔ ماری حریت تمہارے پاس ہے۔ میں نے سب کے ہاتھوں میں حریت تمہادی اور ان کا شیرازہ بکھریا۔ اس کے بعد میں نے بڑا دار یہ کیا کہ انہیں بتایا تم ہی سب سے اعلیٰ اور برتر قوم ہو۔ اپنی قوم کے لئے سب سے بہتر فکر کرنے والا دوسرا کون ہے۔ انہیں لڑنے مرنے کے لئے تیار کر لیا۔ انہیں کہا کہ اپنے ماننے والوں کو الگ کر لو۔ اور جسے تم اچھا سمجھتے ہو اس کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرو۔ سبھی آزادی کے متوالے حریت پسند بن گئے۔ میں نے اپنی ہنرمندی سے اس وقت کو ان کی آنکھوں سے اڑا دیا۔ ان قیمتی لمحات کو اپنے دام فریب سے الجھا دیا۔ میں کامیاب تھا کہ انسان، انسان کی غلامی کا تسلسل قائم رہتا۔ اپنی ہی غلامی میں نسل در نسل انسان خود پر ظلم کی انتہا کرتا رہتا۔ میں کامیاب تھا، اس وقت دو چار لوگ جو مذہب، سیاست اور آزادی سے واقف تھے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انفرادی طور پر ان کے دماغ میں بھی ڈال دیا تم ہی حریت پسند ہو اور بڑے گردہ والے ہو۔ یوں وہ اپنے ماننے والوں کو لے کر الگ ہو گئے۔ میں نے اصل میں انہیں گمراہ کر کے انہیں اپنی ہی قوم کا دشمن بنا دیا۔ یہ ثابت کر دیا کہ وہ جاہل اور ظالم ہیں میں کامیاب تھا مگر.....“

”مگر کیا ہوا آقا؟“ ایک شور اٹھا۔

”اس وقت میرے ارادوں کو ایک مرد حریت کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرے ہتھکنڈوں کو بھانپ لیا۔ اس نے بروقت دو قوی نظریہ پیش کر کے نہ صرف میرے مکر و فریب کے جال کو ان کی نگاہوں پر ظاہر کیا اور ان کے مقصد کو واضح کیا۔ جسے میں اپنے جال کے نیچے چھپائے ہوئے تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پوری مسلمان قوم کو غلامی میں رکھوں۔

سے اپنے آباد اجداد کی بوا کا اور اک پایا۔“

”واہ! تم نے خوب کام کیا۔“ شیطان نے تعریف کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

”اور تو اور میرے گیان کو مغربی مفکرین جس طرح پیش کر رہے ہیں، وہ میری طاقت کا مظہر ہیں۔ میں وہ گیان عام ہونے نہیں دیتا، جس میں انسان کو عقل آجائے، جیسے آئن سٹائن کی تھیوری کو قانون بننے میں کتنا وقت لگا۔ اب بھی اس میں شک ڈال دیا ہے میں نے، اس کی طرف کسی کو آنے ہی نہیں دیتا کہ کسی انسان کو اس کی سمجھ آ جائے مگر یہ وہ راز ہے جسے اگر انسان سمجھ لے تو اپنے وجود ہی کے بہت سارے انکشافات اس کے منتظر ہیں، جس سے وہ حقیقت کو سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، انسان کو اندھیرے میں رکھو۔ اندھیرا ہی ظلمت ہے جو کفر کی طرف لے جاتا ہے، ان کو انہی کے جسم میں الجھا دو، اسی لذت میں گم کر دو۔ ان بیدوں کی طرف نہ جانے دو جس سے انسان شعور پا جائے۔“ شیطان نے چیخ کر کہا، پھر کمرس کی طرف دیکھ کر کہا، ”بولو تیرا دھیان کیا کہتا ہے؟“

کمرس آگے بڑھا اور اپنی بھدی آواز میں بولا۔

”میرے آقا! کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ کس قدر موت بانٹنی شروع کر دی ہے۔ نروان والا آؤ تو اس طرف لاتا ہے، گیان والی تو مست کرتی ہے اور انہیں الجھا دیتی ہے، لیکن اصل کام تو میں کرتا ہوں۔ میں موت بانٹتا ہوں۔ دیکھ نہیں رہے انسان کس قدر ذلیل و خوار ہو کر مر رہا ہے۔ روئے زمین پر اس وقت سب سے ارزاں خون مسلمان کا ہے، مجھے ان پر محنت نہیں کرنا پڑتی، یہ تو میلیکین کی طرح ہیں جو اپنا ابو خود ہی پی رہے ہیں۔ اتنی قتل غارت کبھی پہلے دیکھی تھی آقا؟“

”شاباش، تمہارا کام بہت اچھا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کتے اور سانپ کی طرف دیکھا۔ کتا آگے بڑھا تو شیطان نے کہا، ”تم تو پیچھے ہٹ جاؤ، تم میں جو انسان سے وفاداری کی فطرت ہے وہ مجھے کھٹکتی ہے، تم سے تو اچھا یہ سانپ ہے۔ تم آگے آؤ اور بتاؤ۔“

سانپ تیزی سے آگے بڑھا اور پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نیلی آنکھیں تیزی سے گھمائیں۔ پھر اپنے روپ بدلے اور بولا۔

”یہ نروان، دھیان اور گیان والے ایک طرف، موت بانٹنے والی بھی ایک طرف، یہ سب اس وقت تک ناکارہ ہیں، جب تک میں سازش نہ کروں۔ یہ میری سازش کا کمال ہے کہ انسان آپس میں لڑتے ہیں۔ اگرچہ انسان مجھے کتے سے بھی بدتر سمجھتے ہیں، لیکن میں ان میں ایسے چہرے کے ساتھ جاتا ہوں کہ وہ مجھے گلے لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میرا احترام کرتے ہیں۔ میں انہی کے اندر کے تکبر، لالچ اور بھوک کو استعمال کرتا ہوں۔ میرا سب سے بڑا ہتھیار وہ سکارل ہیں جو کتابوں کو ہاتھ میں رکھ کر ان سے علم حاصل کرنے کی بجائے، دوسروں پر تنقید کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ میری سازش ہی سے وہ ہمارے جال میں آتے ہیں۔ اس سے آگے ہی یہ نروان، گیان اور دھیان والے کام کر سکتے ہیں۔“

سانپ کے کہنے پر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ شیطان خاموش تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے، پھر وہ بولا

”میں خوش ہوا کہ میرے پیچھے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں ان میں کوئی فرق نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا ایجنڈا، پروپیگنڈا، اور جھکنڈا مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ تم سب بڑے ہو، بس تم میں سے وہ بڑا ہے جو زیادہ انسانوں کو بہکا دے۔ تم سب نے بڑے بڑے کام کر لئے مگر ایک خطرہ اب بھی ہے، میں اسی سے ڈرتا ہوں۔“

”آپ بھی ڈرتے ہیں آقا؟“ ایک مزاح مارے ہوئے جانور نے حیرت سے پوچھا۔

اس مرد حریت نے کہا غیر کی طرف مت دیکھو، اپنی طرف آؤ، اپنوں سے مل کر آزادی حاصل کرو، غیر کے ساتھ ملنے سے رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ خود آزادی حاصل کرو اور غیر کو اپنے ارادے سے نکال دو۔ یہی حریت ہے۔ خود اپنی قوت سے آزادی حاصل کرو۔ یہی میرے لئے موت تھی۔“

”پھر آپ نے کیا کیا آقا؟“

”کیا تم نے نہیں دیکھا۔ اس غلامی کی اندھیری رات میں اس ملک کے دل میں اس نے ان کے محبوب رہنما قائد اعظم کا دیدار کر لیا۔ اور صورت کو ان کے دلوں میں اتارا۔ میرے پھیلائے ہوئے جال کو پھاڑ دیا اور اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔ ایک صورت سامنے کر دی، جس پر یقین کو قوت بنا دیا۔ لیکن میں بھی اپنا کام کر چکا تھا۔ میں نے اس خطے میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس قلمند لاہوری کی آواز جس کے کانوں میں بھی پڑی اس پر آزادی کا جنون طاری ہو گیا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا اس قلمند کی نواؤں کی بجلیاں جہاں گرتی تھیں، وہاں سے آزادی کی تلواریں پھوٹی تھیں اور میں بے بس ہو گیا۔“

”خاموش کیوں ہو گئے آقا؟“

”چیلے چیخ اٹھے تو وہ چند لمحے چپ رہنے کے، بعد رقت آمیز لہجے میں بولا

”وہ وقت قابل دید ہوتا ہے جب آزادی کے متوالوں کے جذبے آسمان سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے حوصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر قربانی سے گزر جاتے ہیں۔ وہ میرا جال کاٹ کر نکل گئے۔ وہ ”لا الہ الا اللہ“ پر گئے۔ انہوں نے ایک نیا جہان بنا لیا۔ کائنات میں اپنا آپ ظاہر کر کے ”اللہ“ کی قوت کا مظہر بن گئے۔ یہ لوگ موت سے بے تپ و سناں گزر گئے۔ انہیں موت بھی نہ روک سکی۔ وہ قلمند کی دی ہوئی صورت میدان میں ڈٹی رہی۔ اس کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ وہ میرے اندر کے فتنے کو دیکھ رہا تھا۔ میں تنگ ہو کر ناچا۔ وہ قلمند تھا اور اس نے مجھے نچا کر رکھ دیا۔ وہ صاحب بصیرت میری چالوں کو سمجھتا تھا۔ ورنہ میں کسی کی سمجھ میں آنے والا نہیں ہوں۔ اس نے لا الہ الا اللہ سے سفر کیا اور ایک نیا جہان بنا کر محمد رسول اللہ کی طرف بڑھنے کو تیار تھے۔ جو درس حریت انہیں ان کا دین دیتا ہے وہ سینے سے لگا کر موت سے بھی گزر گئے۔ اس وقت میرا جال ٹوٹ گیا تھا، وہ دوبارہ نہیں بن سکا۔ وہ وقت میرے لئے بڑا دردناک تھا۔ اس وقت جو اپنی قوت بازو سے نکل گئے، سو نکل گئے۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”اس مرد قلمند نے میرے سارے منصوبے ختم کر دیئے۔ لیکن میں بھی اس سے بڑا انتقام لیا۔ سکھوں کے ہاتھوں قتل و غارتگری کا بازو گرم کر دیا۔ میں نے اس جاہل قوم کی سوچ ہی سلب کر لی۔ یہ کیسے بے ہوش لوگ ہیں، جنہیں آزادی کا احساس تک نہیں ہوا۔ اس وقت یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے آزادی حاصل کر لی، کیا تم نے نہیں دیکھا سن چوراسی میں، ان کے ساتھ میں نے کیا کیا۔ میری اہلیست تنگ ہو کر ناچی۔ آزادی کا خمار ان کے ذہنوں میں نکل گیا۔ ہر اس قوم کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے جو غیر کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرتے ہیں۔ آزادی صرف اپنی قوت بازو سے نصیب ہوتی ہے۔ انہوں اب پھر حریت کا نعرہ لگا دیا ہے۔ ان کی عقل میں مزید جو کیں ڈال دو۔ تاکہ انہیں ہوش تک نہ آئے۔ اگر کہیں انہیں آزادی کا پتہ چل بھی جائے اور یہ آزادی ان کے سینے میں ابھرے تو بارود سے ان کے سینے ٹھنڈے کر دو۔ یہی اس قوم کی سزا ہے۔“

”ہمارے سب سے بڑے دشمن مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟“ ایک چیلدا دست بدست بولا۔

”اسی دن سے میرا اگلا مقصد شروع ہو گیا۔ تاکہ یہ جو سلاستی کے نام پر جہان بنایا گیا ہے، یہی سلامت نہ رہے۔ اس پر کبھی شباب نہ آئے۔ یہ خزاں رسیدہ ہی رہے۔ یہاں پھول کی بجائے خون بہے۔ پہلے میں ان کی شہرہ رگ پر

مہری رکھ دی۔ سو کچھ ہی سال بعد میں نے سن بیٹھ میں اس پر حملہ کر دیا۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ یہ ابھی کمزور ہے، یہاں کے لوگ بھوکے ہیں۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ شہادت ان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ میں نے ان کے دل پر شب خون مارا۔ اس کے شہیدوں نے میرے مذموم منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ انہوں نے شہادت کی روایت کو برقرار رکھا۔ میں کہاں سکون سے بیٹھنے والا تھا۔ چند سال بعد ہی میں نے اس کا ایک بازو کاٹ کر رکھ دیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پنڈال کی طرف فخر سے دیکھا تو سانپ نے اٹھ کر کہا۔

”لیکن کیا آپ نے نہیں دیکھا آقا، انہوں نے ظاہری شباب حاصل کر لیا، اس نے ایٹم بم کی صورت میں اپنا ایک ٹوٹا بازو پیدا کر لیا ہے؟“

اس کے یوں کہنے پر شیطان نے غضب ناک اعزاز میں اسے دیکھا اور خرخراتی ہوئی آواز میں انتہائی غصے میں کہا

”اتحق! تم نے میرے زخم جگر پر ناخن مار دیا۔ اس بے غیرت کو یہاں سے اٹھا کر کچھل نشتوں پر دھکیل دو، مجھے برداشت نہیں ہو رہا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا لباس تار تار کر دیا۔ اس کے سیاہ بدن پر نشان واضح تھے۔ ”یہ دیکھو! میرے جسم پر، میرے ظاہر اور باطن پر یہ جو فحشت کے داغ ہیں، یہ اس مرد قلمند کے پے در پے وار کرنے کے نشان ہیں۔ اس نے وہ تلوار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی ہے جو مسلسل چلتی چلی جا رہی ہے۔ اس لئے اب میری ترجیح بدل گئی ہے۔“

”کون سی ترجیح آقا؟“

”چیلے بولے۔“

”یہ جو لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر ملک بنا، اسے چلانا تو انسانوں ہی نے ہے نا۔ میں نے اس ملک کے باسیوں کو اس تلوار سے غافل کر دیا ہے جس کی طرف مرد قلمند نے توجہ دلائی تھی۔ جو ان میں بجلی کی سی صلاحیت بھر دینے کے لئے کافی ہے۔ میری نگاہیں ادھر ہی گڑھی ہوئیں ہیں۔ میں کوئی لمحہ خالی نہیں جانے دیتا۔ افسوس اس نے ظاہری شباب حاصل کر لیا۔ چافنی کے پہاڑوں نے اس کا جلال دیکھا، جس سے میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ سو تب سے میرا مقصد صرف یہی ہے کہ میں اسے روحانی طور پر اس قدر کمزور کر دوں کہ یہ تھوڑی سی ہٹا سکیں۔ میں اسے باطنی دھاب حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑنا۔ کیا تو نہیں دیکھا، جن اسلامی سماج کے دماغوں میں طاقت کا جنون پیدا ہوا میں نے ان کے ساتھ کیا کیا۔“

”وہ اپنی موت آپ مرنے جا رہے ہیں۔“ چیلوں نے خوشی سے بھٹکیں بجاتے ہوئے کہا

”نہیں، وہ مرنے نہیں ہیں، یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ وہ پھر سے زندہ ہو جانے کی قوت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے لئے کچھ اور ہی سوچ لیا ہے۔“

”کیا سوچا ہے آقا۔“ چیلوں نے پوچھا۔

”اس ملک نے ظاہری عالم میں تو شباب حاصل کر لیا ہے، میں انہیں روحانی شباب پر ہی نہیں آنے دوں گا۔“

شیطان نے زور سے کہا تو ایک چیلدا اٹھ کر بولا

”آقا یہ روحانی شباب کیا ہے؟“

”اس قوم کی اکملیت عشق رسول (ﷺ) میں ہے، وہی پیدا نہ ہونے دو۔ یہی ان کا روحانی شباب ہوگا۔“

”میں نے انہیں باطنی طور پر کمزور کرنے کے لئے ساری قوت لگا دی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ انکو، چمکاؤ، ساپ کیا کیا کر رہے ہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ، ہر شعبہ زندگی میں، چاہے وہ سیاسی ہے، مذہبی یا معاشرتی علمبردار ہیں۔ مہلایا ہے، بیوروکریسی ہے، زندگی کے ہر شعبے میں میرے ساتھ لگ جاؤ۔ تم نے دیکھا نہیں اس وقت سب سے

زیادہ مذہبی منافرت نہیں ہے۔ جو ملک مذہب کے نام پر بنا۔ یہاں کے لوگ مذہب کے لئے نہیں، مسلک کے لئے لڑتے ہیں۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہوگی۔ اب میں کامیاب ہوں، بڑی دیر ہوگئی میرے مقابل کوئی نہیں آ رہا۔ میں نے ہر جانب فحاشی پھیلا دی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب کوئی میرے مقابل آ کر مجھے شکست دے۔ ایسا ہمیشہ چلتا رہے گا اگر.....“ شیطان یہ کہہ کر خوف زدہ انداز میں خاموش ہو گیا۔

”مگر کیا آقا؟“ چیلے تشویش زدہ لہجے میں بولے۔

”یہ ملک ایک وجود کی مانند ہے اور اس کا ایک دل ہے، جسے عالم جاوید کہتے ہیں۔ اسی عالم سے، اسی دل سے ہم وقت صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ میں نے پوری کوشش کر کے انہیں ان صداؤں سے دور رکھا ہوا ہے۔ طوفان بدتمیزی اس قدر برپا ہے کہ انہیں آواز سنائی نہیں دیتے۔ میں نے پورا زور لگایا ہوا ہے کہ ان کے کانوں میں عالم جاوید کی آواز نہ پڑے۔ میں نے ان کے کان بند کر دیئے ہوئے ہیں۔“

”ایسا کیا ہے اس آواز میں آقا؟“ ایک چیلے نے پوچھا تو شیطان کو جھرجھری آگئی اس نے کہا۔

”تم نے نہیں دیکھا، انہی صداؤں نے پہلے کیا کیا ہے۔ اس عالم میں ایک جہان پیدا کر دیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پھر سے اس جہان میں اس کی روح نہ پیدا ہو جائے۔ وہ قوانین جو ان کی آنکھوں پر کھل نہیں رہے جو چودہ صدیاں پہلے تجربات سے گذر چکے ہیں۔ آج بھی وہ اسی طرح کامیاب ہیں، جیسے پہلے تھے اور ابد تک رہیں گے۔ ان قوانین کو ان کی آنکھوں سے دور رکھا، کہیں پھر سے وہ انقلاب پیدا نہ ہو جائے، جس میں تین سو تیرہ عالم کفر پر ہماری تھے۔ فرشتے ان کی نصرت میں آج بھی اتر سکتے ہیں۔“

”کیا ایسا ہو جائے گا؟“ چیلہ ڈرتے ہوئے بولا تو شیطان نے ایک زوردار تھقہ لگایا اور سخت سے بولا۔

”جو اپنے آپ کو بھول گئے، انہیں کیا یاد آئے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سنجیدگی سے سب کی طرف دیکھا اور بولا، ”سنو! نو جوانوں کو تعلیم سے عاری کر دو، نصاب سے اسلاف کے کارنامے اڑا دو، میں نے بھی ایٹم بم بنالیا ہے۔ بے غیرتی، عیاشی، فحاشی پھیلا دو۔ ہر شعبہ فکر میں پھیلا دو۔ دوسری بات سنو! یہ مذہب جو عورتوں کو عزت اور احترام دیتا ہے۔ عورت ہی کو اس کے مقام سے گرا دو۔ عورتوں کی لہر کو تیز کر دو، انہیں غلامی کا احساس دلاؤ۔ انہیں مذہبی اور دنیاوی تعلیم سے بے گانہ کر دو۔ عورتوں کی بلا وجہ بازاروں میں گردش بڑھا دو۔ لچے، لفنگے، لالٹے تلکے میرے ماننے والوں کو چوراہوں میں تعینات کر دو۔ عورتوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم روک دو۔ تاکہ بیماری کی صورت میں مرد معالج ہی انہیں دیکھیں۔ مرد خود مجبور ہو جائیں اپنی عورتوں کو غیر مردوں کے آگے ڈالنے کے لئے۔ یہ جو نئے نئے دو تھنے میں نے بتائے ہیں یہ رنگ برنگے نشے ہیں۔ قوموں کا سرمایہ نو جوان ہوتے ہیں۔ نیا شباب پکڑتے جاؤ اور انہیں ان نشوں پر لگا دو۔ انہیں اخلاقی، فکری، شعوری طور پر تباہ و برباد کر دو۔ حکمہ یہ اپنے حوصلے کھو بیٹھیں۔ جب یہ خود سے بے گانہ ہو جائیں گے تو یہ خود ہی میں نہیں رہیں گے۔ تو پھر دین اور مذہب کہاں رہیں گے۔ کہیں پیر تعویذ پیچیں گے اور کہیں مولوی فتویٰ فردی کر دیں گے۔ خدا اور دین کہاں رہے گا؟ انہی کے ہاتھوں انہیں ختم کر دوں گا۔ میں ساری ذمہ داری پوری کرنے کے بعد خود بری الذمہ ہو جاتا ہوں اور سارا الزام حالات پر ڈال دیتا ہوں کہ وقت کا یہی تقاضا تھا، تم بھی ایسے ہی کرو، بلکہ یہ انسان پر ہی ڈال دو۔“

”یہ تو ہم کر کے ہی رہیں گے۔ کوئی نئی بات بھی ہے آقا۔“ چیلہ آگے بڑھ کر بولا۔

”میں اس ملک کی نسلوں کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور میرے جال سنہری ہیں۔ رنگ برنگے خوبصورت ہتھیار جو بغیر دھماکے کے اندر تک فنا کر دیتے ہیں۔ سن لو! میرا ایجنڈا، میرا پروپیگنڈا اور ہتھکنڈہ مضبوط ہاتھوں میں

ہے۔ میرا منشور واضح اور صاف ہے۔ بے غیرتی، فحاشی اور عریانی کو عام کر دو۔ عام لوگ میری بات کو نہیں سمجھتے۔ اس کامل میں نے یہ نکالا، میں نے اپنا منشور دس دس روپے کی سی ڈیز میں ریڑھیوں پر رکھ دیا ہے تاکہ یہ اپنی آنکھوں سے اس کے معانی اور مقصد کا مشاہدہ کر لیں۔ کہواتنا سستا ہتھیار کس کے پاس ہے؟“

”آقا، آپ ہی کے پاس ہے۔“ چیلوں نے شور مچا دیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ شیطان نے انہیں خاموش ہونے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ چپ ہو گئے تو وہ بولا۔

”میرے جال نعرے نہیں، میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔ یہ سب انسان ہی کرتے ہیں جو میرے چیلے ہیں۔ کیا یہ اب بھی نہیں سمجھتے کہ میں ان کی آزادی کا کتنا خواہاں ہوں۔ تم اس وقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتے کہ میرا کیا حال ہوتا ہوگا، جب میں ان دانشوروں کی عقل کی صراحیوں میں ان حسین افکار کی نئے اُتارتا ہوں۔“

’ہمارے لئے کیا حکم ہے آقا؟‘ ایک بڑے چیلے نے پوچھا جواب تک خاموش تھا۔

”ہم نے اس ملک کے دل کو قابو کرنا ہے۔ یہی ہماری منزل ہے۔ ذرا جلدی قدم بڑھاؤ، ہمارا سفر اس ملک خدا داد کے دل کی طرف ہے۔“

”اس سے کیا ہوگا آقا؟“ چیلے نے پوچھا۔

”پھر سن لو! یہ موت سے گذر کر لا الہ الا اللہ تک تو آن پہنچے ہیں۔ میری پوری کوشش ہے کہ یہ محمد رسول اللہ تک نہ پہنچیں۔ کیونکہ ان انسانوں میں کلے کی حقیقی روح سامنے نہ آجائے جو پہلے ہی ان میں بسی ہوئی ہے۔ محمد رسول اللہ ہی ان کی روحانی تکمیل ہے۔ اسی سے یہ پوری دنیا پر چھا جائیں گے۔ پھر یہاں میری کسی سازش کا اثر نہیں ہوگا۔ میں بے بس ہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ تھک سا گیا اور اس نے اپنے گردن جھکا لی۔

اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔ شیطان کا ہر چیلہ تیار تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیطان گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ سڑاند چاروں جانب پھیلنے لگی۔ مجھ سے وہاں کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ تبھی وہ انڈا پھر سے بند ہونے لگا۔ اس میں سے مختلف رنگ نکلنے لگے اور وہ واپس آسمان کی جانب اٹھ گیا۔ سارے چیلے شور مچاتے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سورج کی روشنی تیز ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ صحرا ان شیطانی چیلوں سے خالی ہونے لگا، اسی طرح ریت بھی سرکنے لگی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے انہی کی منوہیت کی وجہ سے دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صحرا میدان بنتا چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے خود کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پایا۔

☆.....☆.....☆

رونیت کو بستر پر میرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پٹیاں کی ہوئی تھیں۔ اسے کافی زخم آئے تھے۔ ان پانچ لالوں کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی کہ وہ ایک گردوارہ میں پکچ کر محفوظ ہو گئے تھے۔

”اب یہ گرجا کہاں سے ملے گا۔“ رونیت نے پوچھا تو جہاں مسکرا دیا۔ پھر بولا۔

”تم اگر فکار ہو تو کیا ہم نہیں ہو سکتے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، دن چڑھنے سے پہلے میں تیری اس سے ملاقات کروں گا۔“

”یہ کیسے ہوگا؟“ رونیت کو رنے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا تو جہاں نے اسے کانٹوں سے پکڑ کر لٹاتے ہوئے کہا۔

”جس فون نمبر سے اس نے بات کی ہے، وہ ایک ایسی جگہ محفوظ ہو گیا ہے، جہاں سے اس کی ساری حرکت کا پتہ چل جائے گا۔ اب تک اس کی لوکیشن کا پتہ چل گیا ہوگا۔ صرف تعدیق کی جارہی ہوگی اور جیسے ہی اس کے بارے میں.....“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے وہ اسی کال کا منتظر تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے سنتا رہا۔ چند منٹ بعد کال ختم ہو گئی۔ اس نے جلدی سے فون کانوں سے ہٹایا اور ان بکس میں جا کر ایس ایم ایس دیکھا۔ پھر فون روئیت کور کی جانب بڑھا کر بولا،

”یہ دیکھو! اس سالے گرباج کی لوکیشن اور مجھے بتاؤ کہ میں نے یہاں کیسے پہنچنا ہے۔“

روئیت کور نے ایس ایم ایس پڑھا اور سائبر نیٹیل پر پڑا ہٹا لپ ٹاپ اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔

”یہ ایئر پورٹ جانے والے راستے میں پڑتا ہے۔ سیکٹر انٹیس میں یہ گھر موجود ہے۔ اس کی مزید تفصیلات.....“

”مجھے بعد میں بتانا، پہلے کال کرو لوگوں کو، ابھی اور اسی وقت اسے پکڑنا ہوگا۔ پلان بنانا ہے۔“

”اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا فون اٹھایا اور کال کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا: ”وہ تمہیں سیکٹر انٹیس کے میڈیکل چوک پر ملیں گے۔ انہیں اہمیت سنگھ اور ہرپال سنگھ ہی لیڈ کریں گے۔ وہاں تک تمہیں میں لے جاتی ہوں۔“

”تم کہاں جاؤ گی، کچھ اور سوچو۔“ جہاں نے فوراً کہا تو ایک لمحہ سوچ کر اس نے کہا۔

”میں ابھی گرلین کور کو بلا لیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کال ملا دی۔

کچھ دیر بعد وہ گرلین کور کے ساتھ سڑک پر جیپ بھگائے جا رہا تھا۔ راستے میں روئیت کور انہیں دستیاب معلومات دے رہی تھی۔ ان سب کے درمیان رابطہ تھا۔

سیکٹر انٹیس کے چوراہے پر اہمیت اور ہرپال ایک گاڑی میں کھڑے تھے۔ ان کے آتے ہی وہ نزدیکی کیونٹی پارک کی پارکنگ میں گاڑیاں لگائیں اور اندر چلے گئے۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ان کے درمیان ایک ہی سوال تھا کہ گرباج سنگھ تک کیسے پہنچا جائے، اور اس کا پلان کیا ہو؟

میرے خیال میں ایک پکڑاس کے گھر کا لگایا جائے، وہاں صورت حال دیکھیں کیا ہے۔ پھر اسی مناسبت ہی سے دیکھیں گے کہ کتنے لوگ چائیں ہو گے۔“ اہمیت نے کہا، اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے جہاں کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چند لمحے فون سنتا رہا۔ فون بند کر کے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”دیکھو! جب قسمت اچھی ہو، لیکن اگر ہم اپنی قسمت کو خراب نہ کر لیں۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“ گرلین کور نے آنکھیں سیٹھرتے ہوئے تیزی سے پوچھا

”گرباج کے جس سیل فون کی نشاندہی پر ہم یہاں پہنچے ہیں، وہ اس وقت ہمارے انتہائی قریب ہے بلکہ میں کہوں اسی پارک میں، مجھے کہا گیا ہے کہ وہ سیل فون اس وقت میرے سیل فون کے بالکل قریب ہے۔“

”مطلب گرباج یہیں اس پارک میں ہے؟“ ہرپال نے ہولے سے پوچھا۔

”میں نے گرباج کے فون کی بات کی ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی نوکر ہو۔“ جہاں نے فوراً محتاط لہجے میں کہا

”اب پتہ نہیں وہ دیکھنے میں کیسا ہوگا؟“ گرلین کور نے کہا تو ہرپال نے شوخی سے کہا۔

”تو نے اس سے شادی کرنی ہے۔“

”پھر اس کی طرف سے پہلی گولی میں تجھے ماروں گی۔“ گرلین نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”کلیان سے پوچھ لیں کہ گرباج دکھنے کیسا ہے؟“ اہمیت نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، کسی کو معلوم نہ ہو کہ ہم کہاں ہیں۔ میں سوچتا ہوں۔“ جہاں نے کہا اور پارک میں دیکھا۔ وہاں کافی لوگ تھے۔ عورتیں، مرد اور بچے تھے۔ کئی لوگ خوش گپیوں میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی کھانے پینے میں مصروف اور چند لوگ جامنگ ٹریک پر تھے۔

”یار، تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے کتنے فاصلے پر ہے؟“ ہرپال نے پوچھا۔

”میں پتہ کرتا ہوں۔“ جہاں نے کہا اور فون نکال لیا۔ چند منٹ بعد اسے پتہ چلا کہ وہ فون مسلسل ایک دائرے میں گھوم رہا ہے، کبھی دور ہو جاتا ہے کبھی نزدیک۔ وہ سمجھ گیا کہ گرباج اس وقت جامنگ کر رہا ہے۔ یہی معلومات اس نے سب سے شیر کی تو وہ سب ہی تیار ہو گئے۔ انہوں نے جامنگ کرتے چند لوگوں کو دیکھا۔ انہیں ایک آدمی پر شک ہو گیا۔ وہ کچھ شیم تھا، خاصا بھاری، لمبے قد کا۔ وہ کلین شو تھا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور نیلا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ شک کی وجہ یہ تھی کہ اس سے دو قدم پیچھے دو لوجوان بھی بھاگ رہے تھے۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر تھے۔ اور انہی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر میں ان کے قریب گزر جاتے۔

”یہ بالکل اس کے ہاڈی گاڑ ہیں۔ میں اسے کال کرتا ہوں۔ فون ان سے نہ نکلا تو ارد گرد کے لوگوں پر نظر رکھو۔“

”سمجھ گئے۔ کال کرو۔“ اہمیت نے کہا تو جہاں نے نمبر ملا یا۔ ایک لوجوان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون اٹھا۔ ان کے قدم ذرا سے ڈھیلے ہوئے۔ جہاں نے فون بند کر دیا۔ وہ آپس میں بات کرنے لگے۔ جہاں نے پھر کال ملا دی۔ وہ ان کے بالکل قریب تھے۔ بھاری بدن والا تشویش سے کہہ رہا تھا۔

”اس فون پر اب کس نے کال کر دی۔“

تب تک اس کے پیچھے والے لوجوان نے فون اسے تھما دیا۔ اس نے کان سے لگا کر کہا۔

”ہیلو، کون؟“

”میں جہاں ہوں۔ مجھے ہر نیک سنگھ جی نے بھیجا ہے۔ آپ کہاں ہو۔ مجھے آپ سے فوری ملنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب سے گزر گیا۔

”تم کون ہو، میں کسی ہر نیک سنگھ کو نہیں جانتا۔“

”وہ بہت زنجی ہیں۔ ہسپتال میں ہیں، مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے آپ کو خطرہ ہے۔“

”میں اپنے آپ کو خود سنبھال لوں گا۔ اور پھر جب میں کسی ہر نیک کو نہیں جانتا تو میں کیوں اس کا پتہ کرتا پھروں۔“

”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ گرباج سنگھ وہی ہے۔ اب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ہرپال بولا۔

”اسے پارکنگ میں گھیرتے ہیں۔ وہاں تک لے جانا مشکل ہو جائے گا، لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔“

”خواخواہ پولیس پیچھے لگے گی وہیں پارکنگ میں، خاموشی سے۔“ اہمیت نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اگلے منٹ میں انہوں نے پلان ترتیب دے لیا۔

گرباج سنگھ نے اسی وقت اپنی جامنگ ختم کی اور باہر کی جانب چل پڑا۔ اس نے پارک کا گیٹ پارک کیا اور پارکنگ کی جانب بڑھا۔ وہ اپنی کار کے پاس پہنچا۔ اس کے گاڑ اس کے پیچھے تھے۔ گرباج نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ساتھ کی گاڑی کی اوٹ سے جہاں سنگھ نکلا اور اس کی کینٹی پر پسل رکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی حرکت مت کرنا، ورنہ گولی مار دوں گا۔“

گرباج ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے گاڑ اپنی گتیں سیدھی کرتے اہمیت اور ہرپال ان پر اپنے پسل تان چکے تھے۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ گرباج نے خود پر قابو رکھتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

”ہر نیک سنگھ جی نے بھیجا ہے۔ تمہیں ساتھ لے کر جانا ہے، انہیں تم سے کام ہے۔“ جہاں نے کہا۔
”گنیں پھینک دو۔“ ہرپال نے سر دلچھے میں کہا۔

انہوں نے گنیں پھینکنے کی جھکائی دے کر سیدی کرنا چاہیں تو ابھیت نے فائر کر دیا۔ جو ایک گارڈ کے لگا اس کے ساتھ ہی ہرپال اور ابھیت نے زوردار انداز میں پائل گارڈز کے سر پر مارے۔ وہ زمین بوس ہو گئے۔ گرلین کور آگے بڑھی اس نے گنیں اٹھالیں۔

”چلو!“ جہاں نے اسے کالر سے پکڑ کر اپنی کار کی جانب دھکا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔
گرلین کور نے ساری صورت حال روایت کور کو بتا دی تھی۔ آگے اسی نے بندوبست کرنا تھا۔

اس وقت رات کا پہلا پہر ختم ہونے کا تھا۔ جب وہ ایک بنگلہ نما گھر میں جا پہنچے۔ پورج ہی میں ایک بندے نے انہیں اندر کا راستہ دکھایا۔ وہ گرباج سنگھ کو لے کر ایک کمرے میں آگئے، جس میں سامان نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ راہنمائی کرنے والے لڑکے نے کہا۔

”یہ لیس جی، کمرہ بند کر لیں، یہ ساؤنڈ پروف ہے، یہاں کوئی جتنا بھی شور کرے، اس کی آواز نہیں آتی۔ جو کرنا ہے کھل کر کریں۔ کوئی شے منگوائی ہو تو یہ بٹن دبا دیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کے ساتھ لگے سرخ بٹن کی طرف اشارہ کیا اور باہر کی طرف چلا گیا۔

وہ گرباج کو فرش پر بٹھا چکے تھے۔ جہاں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سیدھے سبھاؤ میرے سوالوں کا جواب دو گے یا تشدد کے بعد منہ کھولو گے۔“

”بولو!“ اس نے اختصار سے کہا۔

”سندو کہاں ہے؟“ جہاں نے دھیمے سے لہجے میں انتہائی سنجیدگی سے کہا تو گرباج سنگھ نے اسے یوں دیکھا جیسے بم پھٹ گیا ہو یا پھر وہ کسی دوسری ہی دنیا کا بندہ دکھائی دے رہا ہو۔ اس کی آنکھیں وا ہو گئیں تھیں۔
”ک..... کون..... ہوتم؟“

جس قدر اسے حیرت ہوئی تھی، جہاں اس کی حیرانگی پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس قدر شدید رد عمل کی اس سے توقع نہیں تھی۔
”تمہیں ہر نیک سنگھ نے بھیجا؟“ گرباج نے پوچھا تو جہاں بولا۔

”نہیں، مجھے اس نے نہیں بھیجا۔“

”پھر تم کون ہو؟“ اس نے صحتوں میں سیڑھیں کھینچتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک حیرت جی ہوئی تھی۔

میں جو کوئی بھی ہوں، تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔“ جہاں نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا
”تمہیں کس نے بتا دیا کہ میں کسی سندو کو جانتا ہوں، اگر ہر نیک نے تجھے میرے پیچھے لگایا ہے تو پھر تم بہت بڑا
دھوکہ کھا چکے ہو۔“

”کیسا دھوکہ گرباج سنگھ؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم، مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ میری ہر نیک کے ساتھ دشمنی چل رہی ہے۔ ممکن ہے تو کسی گرباج سنگھ کو تلاش کر رہے ہو، اس نے تجھے میری راہ پر لگا دیا۔ میں اس کے ساتھ دشمنی کی تصدیق کر سکتا ہوں۔“

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور ابھیت کی طرف دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”اس بھڑوے نے کہہ دیا اور ہم نے مان لیا۔ یار ہمارے ماتھے پر بے وقوف لکھا ہوا ہے یا ہم کسی کامیڈین فلم میں
کام کرتے ہیں۔“

”دیکھیں میں ایک شریف آدمی ہوں، اس وقت میں بے بس ہوں۔ یہاں تو میں ایسا کوئی ثبوت نہیں دے سکتا
کہ جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ میں آپ لوگوں کا مطلوبہ بندہ نہیں ہوں۔“ اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تو
اچانک جہاں کے ذہن میں ایک خیال آیا، وہ گرلین کور کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

”ایک طرح سے تصدیق ہو سکتی کہ وہ وہی گرباج سنگھ ہے جسے ہم تلاش کر رہے ہیں یا ہر نیک سنگھ نے ہمیں غلط
ریک پر ڈال دیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ وہ الجھتے ہوئے بولی۔

”ابھی دیکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا فون نکالا اور کلیان سنگھ کو فون ملا دیا۔ لہجوں میں رابطہ ہو گیا تو دوسری طرف سے
وہ تیزی سے بولا

”شکر ہے اورتب تیرا فون آ گیا۔ میرے پاس تو تمہارا نمبر ہی نہیں تھا۔“

”کیا بات ہے کلیان سنگھ، بڑا.....“ جہاں نے کہنا چاہا اس نے بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

”میں نے آتے ہی بندے اس کی تلاش میں لگا دیئے تھے۔ گرباج آج دو پہر ہی سے غائب ہے، جس گھر میں
وہ رہتا تھا، وہ خالی ہے، کوئی اس کا بندہ نہیں، مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ سندو کو غائب کرنے والا وہی ہے۔ اُسے پتہ
چل گیا ہے کہ.....“

”اچھا مجھے یہ بتا، وہ دیکھنے میں کیسا ہے، اس کا کوئی حلیہ، کوئی تصویر اس کی ہے تمہارے پاس۔“ اس نے پوچھا تو
کلیان نے کہا۔

”تصویر تو نہیں، آفس کے کیمرے کی ریکارڈنگ میں وہ ہو سکتا ہے، وہاں سے اس کی تصویر مل سکتی ہے۔“ کلیان
نے کہا تو جہاں کو یہ سمجھ بھی آگئی کہ ان کی بھی ریکارڈنگ وہاں ہوگی۔ وہ کہہ رہا تھا، ”نین نقش تو اُس کے عام سے
ہیں، قد بھی کوئی ساڑھے پانچ فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ پکارنگ ہے اس کا، پکڑی باندھتا ہے، ناک تکوار ہے اس کی،
درمیانہ سا بدن، نہ موٹا اور نہ پتلا، کیس نہیں رکھے ہوئے اس نے۔“ جیسے جیسے کلیان بتاتا جا رہا تھا، ویسے ہی کمرے
کے اندر والے گرباج کے بارے میں اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ وہ اس کا مطلوبہ بندہ نہیں ہے۔ یہی جب اس نے
گرلین کو بتایا تو وہ بھی تشویش سے اسے دیکھتے ہوئی بولی۔

”رونیت کور سے کریں بات؟“

”میں ان دونوں کو باہر بھیجتا ہوں، انہیں ساری بات بتاؤ، پھر جو فیصلہ ہو۔“ یہ کہہ کر جہاں اندر گیا۔ وہ مکش میں
تھا۔ ہر نیک سنگھ نے اسے ایسا چل دیا تھا کہ وہ خود کو بے وقوف سمجھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو تینوں نے اس کی طرف
دیکھا۔ اس نے دونوں کو باہر بھیج دیا۔

”کیا تم کوئی تصدیق کر رہے ہو؟“ گرباج نے پوچھا۔

”اگر ہوگئی تو، ورنہ تمہارے ساتھ ہی کام چلانا پڑے گا۔“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

”دیکھو، تم جو چاہو تصدیق کرو۔ جب تم لوگوں کو اطمینان ہو جائے، تب پھر مجھے جانے دینا۔“

اس پر جہاں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ کمرے میں ٹپٹلے لگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف
سے فافل ہے۔ کچھ ہی منٹ بعد وہ تینوں اندر آ گئے، ان کا چہرہ بھی بجھا ہوا تھا۔

انہی لمحات میں سل فون بج اٹھا۔ وہ گرباج کا فون تھا، جسے گرلین کور نے پکڑ لیا تھا۔ اس نے جتنا ہوا فون جہاں
کو ہوا دیا۔ اسکرین پر ایک تصویر چمک رہی تھی۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا، ”مائی ٹو۔“ جہاں کی نگاہیں اس تصویر پر ٹپک

کر رہ گئیں۔ فون خاموش ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے فون دوبارہ بجنا تو جہاں نے وہ تصویر گرباج کو دیکھتے ہوئے پوچھا ”یہ کس کی تصویر ہے، بہت خوبصورت ہے۔“

”یہ میری بیوی کی تصویر ہے، اسی کا فون آ رہا ہے۔ وہ پریشان ہوگی۔“

”اوکے، اسے ایس ایم ایس کر دیتے ہیں کہ تم معروف ہو، بعد میں دیکھتے ہیں۔“ جہاں نے صلاح دی اور ایس ایم ایس کر دیا۔ پھر سر اٹھا کر اپنے تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر دروازے کے ساتھ لگا سرخ بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں ہی میں ایک لڑکا اندر آ کر بولا۔

”جی ہائی جی۔“

”یہاں جولا کے ہیں ان میں سے دو چار کو بلا لاؤ۔“

”ابھی آتے ہیں ہائی جی۔“ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

”دیکھو گرباج، میں تمہیں صبح تک کا وقت دیتا ہوں۔ تم مان گئے اور میرے سوال کا جواب دے دیا تو ٹھیک، ورنہ تجھے میں گولی مار دوں گا۔ صبح تک یہ لڑکے تمہاری اچھی طرح سیوا کرتے رہیں گے۔“ جہاں کے یوں کہنے پر تینوں نے اسے چونک کر دیکھا۔ گرباج کے چہرے کا بھی رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے تیزی سے کہا۔

”تم ابھی تصدیق.....“

”بکواس بند کرو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہے، تمہاری عقل اب ٹھکانے لگے گی۔“ لڑکے اندر آ گئے تھے۔ تبھی پہلا گھونسا جہاں نے اس کے منہ پر مارا۔ تبھی وہ چار لڑکے اس پر پل پڑے، تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ اس کی دھناتی کرتے رہے۔ وہ سر سے پاؤں تک لہو لہان ہو گیا۔ وہ بے بس ہو گیا تھا۔ تبھی اس نے کہا۔

”میں بے قصور ہو، مجھے چھوڑ دیں۔“

”اوکے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ میں ناشتہ تبھی کروں گا، اگر تم مجھے میرے سوال کا جواب دے دو گے یا میں تجھے گولی نہ مار دوں۔“ یہ کہہ کر اس نے لڑکوں کی طرف دیکھا اور کہا، ”ہر آدھے گھنٹے کا آرام دے کر اس کی سیوا کرتے رہو، مرتا ہے تو مر جائے، مجھے میرے سوال کا جواب دینے والا مل گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں، آؤ ابھی۔“

جیسے ہی یہ لفظ اس نے کہے گرباج سنگھ بری طرح چونک گیا۔ پھر تیزی سے بولا۔

”ٹھہرو! تم انجانے ہی میں سہی، مجھ تک پہنچ گئے ہو اور سندھو کے بارے میں سوال کرتا ہی بڑی بات ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے ہو لیکن، میں تمہارے سوالوں کا جواب دے بھی دوں، پھر بھی تم سندھو تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔“ اس بار اس نے سکون سے کہا جیسے وہ خود پر قابو پا کر کوئی فیصلہ کر چکا ہو۔

وہ تینوں اس کی بات سن کر چونک گئے۔ لیکن جہاں نے بڑے تحمل سے کہا۔

”گرباج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم کوئی معمولی چیز نہیں ہو، تم دھوکے میں یا پھر اپنے زعم میں مار کھا گئے ہو۔ تمہارا کوئی گروہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مت کہنا کہ میں نے تمہیں نکلنے کا راستہ نہیں دیا۔ ہمت ہے تو جاسکتے ہو۔ تمہیں شاید یہ خیال بھی نہیں ہوگا کہ تم یوں میرے ہاتھوں چوہے کی مانند پھنس جاؤ گے۔“

”بات تمہاری ٹھیک ہے جہاں، نہ میں دھوکے میں مارا گیا ہوں نہ زعم میں، یہ تقدیر کی طرف سے ہے۔“

”چلو صبح تک آرام کرو۔“ یہ کہہ کر جہاں آگے بڑھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا پھل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ

پکراتے ہوئے فرش پر جا پڑا۔

”یہ مر گیا؟“ گرلین نے پوچھا۔

”نہیں، بے ہوش ہے، اسے انکشن دے دو، صبح تک اسے ہوش نہ آئے۔ ابھی تھوڑا اور کام کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا، وہ تینوں بھی اس کے ساتھ باہر آ گئے۔

”یہ کیا تم نے اسے.....؟“ ہرپال نے پوچھا۔

”یہ ابھی آدمی کہانی ہے، یہ صبح تک پوری ہوگی۔ تم میرے ساتھ چلو، یہ ابھی اور گرلین اس کا خیال رکھے گے، مادر ہے اور اس سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہونا، یہ گینکسٹر ہے، اس کے فائینٹر ہونے میں کوئی شک نہیں، غفلت نہیں کرنی، چاہو تو یہاں کچھ سیکورٹی بڑھا لو۔“

”اوکے سمجھ گئے۔“ ابھیٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو جہاں تیزی سے چل دیا۔ ہرپال اس کے ساتھ تھا۔

رات کا تیسرا پہر شروع ہونے کو تھا۔ جہاں سنگھ کار سے اتر کر اسی بنگلے کے سامنے جا رکا، جہاں سے وہ صبح چلا تھا۔ گیٹ پر ایک چوکیدار تھا۔ جہاں کو پورا یقین تھا کہ وہ اسے پہچان نہیں پائے گا۔ اس لئے وہ جا کر بولا۔

”یار جاؤ، اور گرمیت کو بلا کر لاؤ۔“

”دیکھیں جی ہماری ڈیوٹی ادھر ہے، آپ کون ہیں میں نہیں جانتا، ایسا ہی ہے تو آپ انہیں فون کر لیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا فون کرنے کے لئے وہاں سے ٹھہلا ہوا گیٹ سے ہٹ گیا۔ اس نے فون نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد چوکیدار کے پاس جا کر بولا، ”دیکھو، وہ فون نہیں اٹھا رہا، میں واپس چلا جاتا ہوں، صبح بتا دینا کہ امر لکھ آیا تھا دہائی سے، اب کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔“

”ٹھیک ہے صاحب بتا دوں گا۔“ چوکیدار نے کہا اور لوہے کے گیٹ کے اندر چلا گیا۔ یہ سارا ڈرامہ اس نے یہ دیکھنے کے لئے کیا تھا کہ اندر کیا صورت حال ہے۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا گاڑی تک گیا، اور پھر ابھیٹ کو ایک طرف لے جانے کا کہا۔ بنگلے کے دائیں جانب اس نے کار رکوائی اور اس کی چار دیواری کے پاس جا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہ دیوار پر تھا۔ اس نے ابھیٹ کو جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے درمیان طے تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ رات گئے وہاں گاڑی کھڑی دیکھ کر کوئی بھی آ سکتا تھا۔

جہاں دوسری جانب اتر گیا۔ چند منٹوں میں وہ بنگلے کے کچن والے دروازے تک پہنچا۔ وہ بند تھا۔ اس نے تار نکالی اور چند منٹ میں تالہ کھول لیا۔ وہ احتیاط کے ساتھ اندر اندر ہیرے کھس گیا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم لی بیڑھیوں تک آیا، پھر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر کے ڈرائنگ روم میں ٹی وی چل رہا تھا اور نیہا اگر دال شارٹس اور دگھی نمائی فرٹ پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں ٹی وی پر جمی ہوئیں تھیں۔ ہاتھ میں گلاس تھا۔ سامنے شراب کی بوتل تھی۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گرمیت کہاں ہو سکتا ہے، کہ وہ ایک دم سے نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں پلٹ تھی جس میں کچھ کھانے کو تھا۔ جہاں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیڑھیوں کے پاس دو گیلے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گملہ لڑھکا دیا۔ اندر دالوں ہی نے چونک کر دیکھا۔ پھر گرمیت باہر دیکھنے کو آیا۔ جہاں ایک دم سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ گرمیت جیسے ہی باہر آیا، جہاں نے ایک زوردار مکہ اس کی گردن پر مارا۔ وہ پکڑا گیا۔ دوسرا مکہ اس کے ماتھے پر مارا تو وہ زمین بوس ہو گیا۔ ایک لمحے میں اس نے گرمیت کی تلاشی لے ڈالی، اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ تبھی اندر سے آواز آئی۔

”کیا ہوا گرمیت؟“

جہاں نے گرمیت کو اس کے کالر سے پکڑا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ نیہا اگر دال اسے دیکھ کر ایک دم سے چونک

اٹھی۔ چند لمحے اس کے منہ سے کچھ بھی نہ نکلا۔ بس ہکا کر رہ گئی۔

”جسپال تم اور ایسے؟“

”تم مجھے یہ بتاؤ، یہ تمہارا لہو کب ہے یا شوہر؟“ جسپال نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ نیہا نے حیرت سے پوچھا۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکالا، اس سے ڈرائنگ روم کے پردوں کی رسیاں کاٹیں اور اس سے گرمیت کو باندھ دیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو جسپال؟“ وہ روہاٹا ہوتا ہوا بولی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے نیہا کے بیڈ روم میں لے گھسیٹ کر لے گیا۔ نیہا اس کے پیچھے ہی آگئی۔ ”کچھ بولو گے بھی، یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ہاں، ادھر آؤ، میں بتاتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔“ جسپال نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بیڈ پر بیٹھا لیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”مجھے ایک ہی سانس میں بتا دو کہ سندھپ اگر وال عرف سندھ کہاں ہے؟“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ انتہائی حیرت سے بولی تو جسپال نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تو وہ الٹ کر بیڈ پر جا پڑی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔

”مجھے اداکاری نہیں چاہئے۔“ وہ سر دلچے میں بولا۔

”تجھے ہو کیا گیا ہے، ایسا کیوں کر رہے ہو؟“ اس نے روتے ہوئے کہا

”میں یہ مانتا ہوں کہ تم بہت بڑی اداکار ہو۔ لیکن اب تمہاری اداکاری نہیں چلنے والی۔“ یہ کہہ کر اس نے نیہا کا سیل فون اٹھایا جو اس کی شارٹس میں سے نکل کر بیڈ پر پڑا تھا۔ پھر گرباج کا سیل فون نکال کر نمبر ملائے اور تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ نیہا نے اٹھایا اور حیرت سے جسپال کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سیل..... تم نے کال ملائی۔ گرباج کہاں ہے؟“

”اب سمجھ گئی ہو، میں کیا کہنا چاہتا ہوں، اس وقت یہ میرے قبضے میں ہے۔“

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“ نیہا نے کہا اور یوں سر پکڑ لیا جیسے اس کا سر چمکا رہا ہو۔ اس پر جسپال نے ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

”میں تجھے اس پچھلے سے لٹکا دوں گا یا پھر.....“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑا اور خنجر نکال کر اس کی گال پر رکھ کر ٹوک چھوڑی۔ اس پر نیہا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”میں سب بتا دیتی ہوں۔“

”لیکن یہ یاد رکھنا، اگر جھوٹ ہوا تو ایک دم نہیں ماروں گا۔ سبھی؟“ اس نے دھمکی دی۔ وہ چند لمحے خود پر قابو پاتی رہی، پھر بولی۔

”میں ایک پیگ؟“

”ٹھہرو، میں دیتا ہوں۔“ جسپال نے اٹھتے ہوئے ابھیت کو کال ملا دی۔ بوتل اٹھاتے ہوئے اس نے کہا، ”اوپر والی منزل پہ، سب خالی، چونکدار کی طرف سے آ جاؤ۔“

یہ کہہ کر جسپال نے بوتل اٹھائی اور نیہا کے پاس بیڈ پر جا بیٹھا۔ اس نے بوتل پکڑ کر منہ کو گالی، چند گھونٹ لینے کے بعد بولی۔

”گرباج سے میری ملاقات ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ ان دنوں ایک فلم کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ ڈائریکٹر کو ملنے آیا تھا۔ وہ سارا دن ہمارے ساتھ رہا۔ بہت گپ شپ ہوئی۔ وہ کوئی فلم بنانا چاہتا تھا۔ یوں اس سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ یہ ملاقاتیں بڑھیں اور دوستی سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم شادی کر لیں گے۔“

”سندھ کو اس کا پتہ نہیں تھا؟“ جسپال نے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں، میں نے اسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا۔ میں نے دراصل یہ سوچا تھا کہ سندھ نے مجھے اپنی رکھیل ہی لکھا ہے۔ جب یہ جوانی میرا ساتھ چھوڑ جائے گی، پھر کون پوچھنے والا ہوگا۔ سندھ کے دھندے ہی ایسے تھے، وہ نجانے لب اور کس وقت یہ دنیا ہی چھوڑ جائے۔ گرباج سنگھ کی کینیڈین شہریت ہے۔ شادی کے بعد ہم نے وہیں بس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چھ ماہ پہلے ہم نے کینیڈا میں شادی کر لی تھی۔ وہاں ہم ایک ماہ رہے تھے ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے۔ اس دوران اس نے میری پسند کا ایک گھر خرید کر دیا، جہاں ہم نے رہنا ہے۔ میں سندھ سے علیحدگی کی بات کرنا تو چاہ رہی تھی کہ وہ غائب ہو گیا۔“

”تو پھر اب سندھ کو تلاش کیوں کر رہی ہو۔ تمہیں کیا وہ مرے یا جیئے؟“ جسپال نے کہا۔

”اس کے بعد کچھ اچھا نہیں ہوا۔ سندھ کے ساتھی مارے جانے لگے۔ خود مجھے چھپنا پڑا۔ گرباج بھی مجھے بہت محتاط رہنا تھا۔ میں بس یقین کر لیتا چاہتی تھی کہ سندھ اب بھی زندہ ہے یا.....“

”تم اب بھی جھوٹ بول رہی ہو۔ تم نے اور گرباج دونوں نے سندھ کو غائب کیا ہے۔ یا پھر تم استعمال ہو گئی ہو، اصل کہانی کیا ہے وہ مجھے بتا دو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی جسپال، لیکن اب لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔“ اس نے کہا اور بوتل منہ سے لگا کر چند گھونٹ لے لئے۔ پھر بولی، ”اگر ایسا ہے تو بہت بڑا دھوکہ ہوگا، اس نے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ یہ دیکھو، میری شادی کی تصویریں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون لیا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر جسپال کے آگے کر دی۔ ”یہ میں اور گرباج، کینیڈین عدالت میں۔“

جسپال نے وہ تصویر دیکھی تو بری طرح چونک گیا۔ یہ تو وہی تھا جس کا حلیہ کلیان سنگھ نے بتایا تھا۔ تو پھر ان کے پاس گرباج ہے وہ کون ہے؟ وہ چمکا کر رہ گیا۔

وہ خاموش بیٹھا بھی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ ابھیت سنگھ اندر آ گیا۔ نیہا اُسے دیکھ کر چونکی پھر یوں ہو گئی جیسے اسے کوئی سرکار ہو۔ وہ سمجھ گئی تھی اس نے ابھیت کو ایک طرف لے جا کر ساری بات بتائی تو وہ پہلے حیران ہوا، پھر ایک دم ہلکا کر بولا۔

”انہی میں سے بات نکلے گی، دیکھنا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور جاتے ہی نیہا کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ چیخنے لگی تو اس نے نیہا کے منہ پر ہاتھ رکھا اور میڑھوں کے پاس لے آیا۔ ”اگر صاف بک دو گی تو ٹھیک، ورنہ یہاں سے نیچے پھینک دوں گا۔“ بیچ گئی تو ساری زندگی کے لئے اناج ہو جاؤ گی۔“

”نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے، چھوڑو اسے؟“ گرمیت نے کہا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ان پر مسلط لے کھڑا تھا۔ اس کے لیوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ جسپال اور ابھیت نے ایک دوسری کی جانب دیکھا تو ہال لے ایک خفیف سا اشارہ ابھیت کو کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”بھسمند رنے کیا بے خوف بندہ ہمارے متھے لگا دیا۔ جس نے ہماری ہی تقشیر شروع کر دی۔ تمہیں سندھ کو تلاش کرنے کا کہا تھا، اور تم نے ہمیں ہی نشانہ بنالیا۔“

”سندو کی تلاش ہی میں تم تک پہنچے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو نیہا اگر وال ہلکی ہلکی تالیاں بجاتی ہوئی بولی۔
 ”یہ تو ماننا پڑے گا گر میت کہ بندہ بے خوف نہیں سمجھدار ہے۔ اتنی جلدی کوئی عام آدمی ہم تک نہیں پہنچ پایا۔ گر میت
 پھسل مجھے دو، اور انہیں باندھ کر پولیس کو فون کر دو۔ کہو ڈاکو ہیں، لیکن پہلے کچھ لوگوں کو بلا لو، جو انہیں ختم کر دیں۔“
 جس وقت نیہا نے گر میت سے پھسل پکڑا، جہاں کو اتنا ہی وقت کافی تھا، مگر اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ گر میت
 نے رسیاں لے کر انہیں باندھ دیا۔ تبھی نیہا نے آگے بڑھ کر جہاں نے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے نفرت سے کہا
 ”سندو کی تلاش چاہئے تھی بس۔ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے، یہی تعقدیق چاہئے تھی، مگر تم تو پانچ پیاروں کو آزاد کروا
 کر دھرم کا پالن کرنے لگے۔“

”تو پھر تم جو چاہتی، مجھے وہی بتانا تھا نا؟“ جہاں نے یوں کہا جیسے اس سے شکوہ کر رہا ہو۔

”مجھے صرف یہ چاہئے تھا کہ گرباج کو لوگوں کے سامنے لا کر سندو کا معاملہ یہیں گول کر دوں۔ مگر تم کچھ اور ہی
 کرنے لگے، خیر، مجھے افسوس ہے کہ تمہیں معاوضے کی بجائے موت مل رہی ہے۔“

”تم اگر مجھے مار دو گی تو گرباج، جو تمہارا شوہر ہے، وہ تو ہمارے قبضے میں ہے، کیا تم اسے نہیں بچانا چاہتی۔“

”اسے ویسے بھی مارنا تھا۔ وہ نہیں رہے گا تو لوگ تلاش کرتے رہیں گے، جبکہ ہمیں یہاں رہنا ہی نہیں ہے۔“

”وہ تمہارا شوہر ہے جس کی تصویر تمہارے اس سیل فون میں ہے، جس کے ساتھ تمہاری شادی.....“

”جس کی تم نے تصویر دیکھی ہے اور جسے تم نے پکڑا ہوا ہے، وہ مچھلی پکڑنے کو ایک چارہ تھا، بے چارہ، وہ کراپے

پر لپا ہوا تھا۔ مارنا چاہو تو مار دو، آزاد کرنا چاہو تو کر دو، بعد میں بھی تو اس نے جیل ہی بھگتی ہے۔“

”میں نے بندے بلوائے ہیں، وہ ابھی پانچ منٹ میں آتے ہیں۔“ گر میت نے کہا۔

”تم ان کا انتظار مت کرو، بیک اٹھاؤ ہم یہاں سے نکلیں۔“ نیہا تیزی سے بولی۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ گر میت نے کہا تو جہاں نے پوچھا۔

”یار گر میت، تم اتنے شارب نہیں لگتے، جتنا تم نے کام دکھایا، تم آزاد کیسے ہو گئے۔“

”جس وقت تم بول اٹھانے گئے تھے، نیہا نے تمہارا خنجر میری طرف کھسکا دیا، تمہارے ہی خنجر سے آزاد ہوا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ہلکا سا تھک لگایا تو جہاں نے کہا۔

”میں خنجر کے بغیر بھی آزاد ہو جاتا ہوں، یہ دیکھو۔“

وہ اگلے ہی لمحے آزاد ہوا۔ تبھی نیہا نے فائر کر دیا۔ جہاں وہاں نہیں تھا، وہ اچھل کر نیہا پر جا پڑا۔ وہ اگلا فائر ہی نہ کر

سکی۔ اس نے پھسل والے ہاتھ کو قابو کرنا چاہا۔ نیہا نے پھسل پھینک دیا۔ جہاں نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ فرش

پر جا پڑی۔ گر میت اس پر پل پڑا۔ وہ ایک اچھا فائر ثابت ہوا، اس نے اپنی کہنی جہاں کی گردن پر ماری، اور گھٹنا اس

کے پیٹ میں مارا۔ جہاں لڑکھڑکیا۔ اس نے گھونٹہ منہ پر مارا۔ تب تک نیہا بھی اٹھ کر اس کے مقابل آگئی۔ ماحول

بہت سخت ہو گیا تو جہاں نے یہ کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ممکن ہے گر میت نے بندے بلوائے ہی ہوں اور وہ آ

جائیں۔ جہاں اٹھا اور اس نے گر میت کو پکڑا، اس نے جہاں کی گردن قابو کرنا چاہی مگر اسے دیر ہو گئی۔ جہاں نے

اسے اٹھایا اور سر کے اوپر لے جا کر زور سے فرش پر مارا۔ وہ اٹھ ہی نہ سکا۔ پھر اس نے نیہا کو پکڑا اور زور سے اس کے

سر پر مکا مارا۔ وہ چکرا کر گر گئی۔ جہاں نے ابھیت کو کھولا۔ پھر دونوں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے نیچے لے گئے۔

انہوں نے بڑی احتیاط سے ڈرائنگ روم پار کیا اور پورچ میں کھڑی گاڑی تک آگئے۔

اس جنگلے میں سکون تھا، جہاں انہوں نے گرباج کو رکھا ہوا تھا۔ وہاں تک جاتے ہوئے راستے میں نیہا کو ہوش آ

گما تھا۔ ہر پال سنگھ کو اس کے آنے کی خبر تھی اس لئے پورچ میں کھڑا تھا۔ جہاں نے نیہا کو اتارا اور دھکا دے کر
 اگے لگا لیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کمرے تک جا پہنچے۔ جیسے ہی نیہا کی نگاہ گرباج پر پڑی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ
 مدد حیرت سے بولی۔

”تم گرباج یہاں، ان کے پاس.....“ پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ وہ یوں ہو گئی تھی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی
 ہو۔ تبھی جہاں نے کہا۔

”تم نے کیا سمجھا، میں نے اُسے یہاں رکھا ہوا ہے جس کی فوٹو تم نے مجھے دکھائی، تم اس گرباج کو محفوظ سمجھ کر

لکھ دھوکہ دے رہی تھی؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پھسل نکالا اور غصے میں کہا، ”جو جگہ ہے، وہ بک دو، ورنہ میں کیا کروں

گام نہیں سمجھ سکتی، بہت پیار ہو گیا تم لوگوں سے؟“

”نیہا، میرے خیال میں قسمت نے ہمیں ہر ادیا یہ بات مان لینی چاہئے۔ باوجود ایک بڑا کھیل کھیلنے کے، آخر یہ ہم

ہم پہنچ گئے۔“ گرباج نے فکست رخ لہجے میں کہا۔

”کیا کہ ہے؟“ جہاں نے پاؤں کی ٹھوکر گرباج کے منہ پر ماری۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی دھار بہہ نکلی، جسے

وہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”یہ سچ ہے کہ سندو کو میں نے غائب کیا ہے۔ اور وہ زندہ ہے۔ نہ وہ خود یہاں آ سکتا ہے اور نہ ہی تم اس تک پہنچ

سکتے ہو۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اسے غائب کرنے کے لئے بہت بڑی گیم کی۔“

”کلیان اور ہرنیک وغیرہ کو.....“

”وہ میں نے اپنا ایک ڈی بنایا تھا۔ پکڑا جاتا وہ، اب وہ غائب ہو گیا ہے تو اسی کی تلاش ہوتی۔ میں نے دو دن بعد

یہاں سے چلے جانا تھا۔“

”سندو کو غائب ہوئے تین ہفتے ہو گئے، تم اب تک یہاں کیوں ہو اگر اسے ہی غائب کرنا تھا؟“ ابھیت نے

پوچھا تو وہ بولا۔

”سندو کے غائب کرنے کے بعد میرے پاس تین ٹاسک تھے، ایک سندو کی ساری دولت اکٹھی کر کے کینیڈا ٹرانسفر

رنا، دولت میں نے اکٹھی کر لی ہے لیکن اب صرف ٹرانسفر رہتا تھا جو میں نے صبح کرنا تھی۔ دوسرا اس دوران میں نے

لندہ لینک ختم کرنا تھی۔ وہ بہت حد تک میں نے ختم کر دیا۔ ان دو کاموں کے لئے نیہا نے میری بہت مدد کی۔“

”اور تیسرا ٹاسک؟“ ابھیت نے پوچھا۔

”ان پانچ پیاروں کو ختم کرنا، لیکن جہاں ضرورت سے زیادہ تیز نکلا، میرے خیال میں یہ ایک ہفتہ تک یہیں بھل

لہوں میں بھٹکتا رہتا۔ اور مجھے دو دن چاہئے تھے۔ سارا کام اس وجہ سے ڈسٹرب ہو گیا کہ اس نے آج ہی سب

مالہ کر کے پانچ پیارے بھی چھڑوا لئے۔ اس پر لازمی وہ نقلی گرباج پکڑا جاتا۔ میرے لئے مشکل ہو جاتی اور میں نے

اسے دوپہر کے وقت ہی اٹھالیا۔“ یہ کہہ کر اس نے سانس لیا پھر بولا، ”مجھے ایک بات بتاؤ گے جہاں؟“

”بولو۔“ جہاں نے کہا۔

”آخر تم مجھ تک اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے، میں حیران ہوں، ایسا ممکن نہیں ہو سکتا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا

”سچ بہت کڑوا ہے گرباج، میں بتا دیتا ہوں، لیکن ایک بات اگر تم بتاؤ تو؟“

”پوچھو۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کام پر کیوں لگایا گیا؟“

”کہانا بھل بھلیوں کے لئے۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم پولیس اور خفیہ کی نگاہوں میں نہ آتے، میں نے انہیں اس ٹریک پر ڈال دیا تھا۔ یہاں تک کہ ہر نیک کو بتا دیا تھا کہ وہ اغوا ہونے والا ہے، پھر بھی وہ بے وقوفی کر گیا۔ جیسے ہی وہ اغوا ہو ا، میں نے اپنا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکا، تم نے پارک میں مجھے گردن سے جا پکڑا، یہ کیسے؟“

اس پر جہاں ہنس دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بلاشبہ قسمت نے ہی ساتھ دیا ہے، ورنہ ایک سیل فون کال کی وجہ سے وہ پکڑا نہ جاتا۔ اسے یہ بات سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔ اس لئے وہ ان سے کھیلنے لگا۔

”دیکھو، لالچ بہت بری بلا ہے، یہ ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں، پھر بھی سبق نہیں لیتے۔ تم نے یہاں اگر وال کو استعمال کر کے اور ساری دولت لے کر غائب ہونے والے تھے۔ یہ تمہارا شروع ہی سے پلان تھا، ورنہ تم کبھی نقلی گرباج کھڑا نہ کرتے، کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

”بالکل، ایسا ہی ہے“ اس نے جواب دیا تو جہاں نے اگروال کے پاس گیا، اس کی گالوں پر پسلی کی نال پھیرتے ہوئے بولا۔

”ایسا ہی تیری اس نقلی محبوبہ نے کیا، وہ تجھے پھنسا کر ساری دولت.....“

”بکواس کر رہا ہے تو، میں ایسا.....“ یہاں نے جج کر اس کی بات کاٹی۔

”اس کا حق یہ ہے ایسا کرتی، میں جو کر رہا تھا اس کے ساتھ، خیر جو ہوا، وہ ہو گیا، حقیقت یہ ہے کہ ہم تیرے قبضے میں ہیں، اب بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے سندو سے کوئی سروکار نہیں، اس جیسے پتہ نہیں کتنے لوگ ایسے بے نام موت مر جاتے ہیں، دھرم کی خدمت میں نے کردی، ان پانچ پیاروں کو بچا کے۔ اب صرف دولت ہی بچتی ہے، وہ دے دے، تم آزاد ہو۔“

”جتنی چاہو، دولت ملے گی، لیکن دھوکہ نہیں کرنا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا

”دولت ملنے کے بعد جہاں چاہو گے ہم اپنی حفاظت میں تمہیں وہاں چھوڑیں گے۔“ جہاں نے کہا اور اجمیت سے بولا ”جیسے چاہو ڈن کرلو، یہ اب تم لوگوں کی ذمہ داری ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گرلین کو اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ پورج میں اس نے جا کر گرلین سے کہا، ”رونیت کور کے پاس چلو۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔

جہاں بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا اور رونیت کور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ جہاں نے اسے ساری روداد سنا دی تھی۔

”جہاں! ایک طرح سے دیکھا جائے تو جو کام تیرے ذمے تھا، وہ ہو گیا ہے۔ ہمیں جسمیدہ کو بتا دینا چاہئے۔ اور وہ بھی جو موجودہ صورت حال ہے۔“ رونیت کور نے اسی سنجیدگی سے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے سمجھنا یہ ہے کہ گرباج کا یہ کھیل کیسا تھا، کیوں کھیل اس نے اتنا بڑا کھیل، کیا تم یہ سمجھ نہیں رہی ہو کہ جس قدر یہ بڑا کھیل تھا، اسی قدر اس کے پیچھے کوئی بڑا مفاد ہو سکتا ہے۔“

”گریٹ گیم کا یہ حصہ ہے جہاں، کوئی شاطر کہیں بیٹھا یہ کھیل، کھیل رہا ہوگا۔ اس نے مہرے ادھر ادھر کئے، اور یہ حقیقت ہے کہ ہم بھی اس کھیل میں مہروں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے جسمیدہ بھی اس کھیل میں مہرہ بن کر استعمال ہو گیا ہے، ہمارے ہاتھ کیا آیا فقط سندو کی وہ دولت جو گرباج لے کر جا رہا تھا، وہ بھی ہمیں ملی نہیں۔“ رونیت کور بڑے دد سے بولی

”دیکھو، دولت ایک بڑی حقیقت ہے۔ کسی بھی تحریک کے لئے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وسائل دولت

حاصل ہوتے ہیں۔ دوسری بات تم بھول رہی ہو، ہم نے ان پانچ پیاروں کو بھی تو بچا لیا ہے۔ واہگرو نے ہم سے لے لی۔ یہ تھوڑی بات ہے۔“ جہاں نے کہا

”میں تمہاری بات سے انکار نہیں کرتی۔ دولت بھی حقیقت ہے، اب دیکھو اگر ہمارے پاس وسائل نہ ہوں تو ہم کبھی نہیں کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ ان پانچ پیاروں کی بازیابی اور کینیڈا پہنچا دینے تک کی حفاظت، وہ اب ہماری ذمہ داری بن چکے ہیں۔“ رونیت کور نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”لیکن رونیت، کیا تمہارا نہیں خیال کہ ہمیں اس کھیل کو ذرا مزید دیکھیں۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے، دیکھنا چاہئے، لیکن پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ اپنی حد میں رہ کر کام کرتا ہے۔ جس ان ام اپنی حد سے نکلے، وہ ہمارے لئے ٹھیک نہیں ہوگا۔“ رونیت کور نے گول مول جواب دیا

”ام اپنی حد خود بڑھاتے ہیں، جب ہم نے کام ہی اپنے دھرم کے لئے کرتا ہے تو.....“ اس نے کہا تو رونیت کور لے چار سے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اور ہنسیکے ہوئے لہجے میں بولی

”تم بہت تھک چکے ہو۔ تم ابھی سکون کرو، فریش ہو جاؤ گے تو باتیں کریں گے۔ اس پر بھی سوچ لیں گے۔ آؤ ایک چاؤ۔“ رونیت کور نے کہا اور جہاز سیئرز کے بیڈ کی ایک طرف ہو گئی۔ جہاں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک گما۔ اسے نیند آتے ہوئے زیادہ وقت نہیں لگا۔

☆.....☆.....☆

میں نے جیسے ہی درختوں کا جھنڈ پار کیا، میرے سامنے ایک بہت بڑے پاٹ والا دریا تھا۔ اس دریا کے اوپر سے ایک پل تھا جو دیکھنے میں بڑا نازک لگ رہا تھا۔ میں جیسے ہی اس پل پر آیا تو دریا کی سطح دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ پل لے ایک طرف بڑا صاف اور شفاف پانی آرہا تھا۔ لیکن جیسے ہی پل کے نیچے سے دوسری طرف نگاہ پڑتی، وہاں کا منظر بالکل دوسرا تھا۔ دریا کا پانی دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دائیں جانب صاف ستھرا اور نیلگوں پانی تھا۔ اس میں پھول تھے اور ٹھہرا ہوا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ ادھر کنارے پر رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔

”مفت تھے، پرندے تھے اور ہریالی تھی، جو نگاہوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی گدلہ، سیاہی مائل اور سڑا ہوا تھن زدہ پانی بہہ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں پتلی پتلی اور سرخ رنگ کا خون بہہ رہا ہو۔ اس کے کنارے سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے، آدھے ادھورے کھائے ہوئے انسانی بدن، ڈھانچے اور ہڈیاں پڑی ہوئیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی گدلہ بیٹھے انہیں بھجھوڑ رہے تھے۔ ایسا دریا میں لے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دونوں پانی باہم بہہ رہے تھے۔ ایک دوسرے میں مل نہیں رہے تھے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم سے آواز آئی

”کیوں حیرت زدہ ہو؟“

”اس دریا کو دیکھ کر۔“ میں نے تیزی سے کہا

”غور سے دیکھو، یہ دریا بے شہوت ہے۔ جو پیچھے کا پانی ہے، وہ سمجھو انسان کی وہ عمر ہوتی ہے جب وہ معصوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ بالغ ہونے کے پل سے گزر جاتا ہے تو شہوت کے دوی راستے ہیں۔ جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔ ایک وہ جو فطری راستہ ہے۔ اس میں سکون اور اطمینان ہے۔ غور سے دیکھو، اگلی نسل کو فطرت بھی خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ وہاں زندگی ہے۔ جبکہ دوسری طرف موت کا پرہول سناٹا ہے۔ یہ شہوت کا غیر فطری بہاؤ ہے۔ جس کا اہم نام کسادوں پر دیکھ سکتے ہو، جہاں صرف موت ہے۔“

”یہ فطری اور غیر فطری شہوت کے بہاؤ؟“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا

”یہ شہوت اس قدر قوت ہے کہ اسی کو نہ صرف قابو کرنے کی بڑی ضرورت ہے بلکہ پاکیزہ رکھنا اس سے بڑی ضرورت۔ یہ تخلیق کا منبج ہے۔ سنو! اگر آج عورت یا مرد میں سے کسی ایک کی تخلیقی قوت سلب ہو جائے تو اس زمین پر زندگی کب تک رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو سال، یا اس سے ذرا زیادہ۔ غیر فطری بہاؤ، تخلیقی قوت کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسانی نسل کو ختم کر دینے اور اس پر موت طاری کر دینے کی وجہ ہے۔ شہوت کا غیر فطری ذریعہ انسانی زندگی ہی کے لئے نہیں انسانی بقا کے لئے بھی خطرناک ہے۔“

میں اس دریا کو دیکھتا رہا اور اس آواز کا مختصر رہا لیکن کافی دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے ہل پار کرنے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ تو وہ ہل میرے قدموں کے نیچے سے سرکنے لگا۔ میں لحوں میں دریا پار کر گیا تو میرے سامنے ایک پہاڑ تھا۔ میں پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میں اس کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ دوسری جانب میرے لئے ایک اور حیرت تھی۔

تا حد نگاہ لوگ ہی لوگ تھے۔ سبھی شور کر رہے تھے۔ کوئی ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے کان پڑی آواز انہیں سنائی ہی نہ دے رہی ہو۔ ان کی نگاہ زمین پر تھی۔ اس سے بھی آگے کھانے پینے کی چیزوں کا ذخیرہ تھا۔ وہ لوگوں سے بہت بلند تھا۔ کوئی بھی اور نہیں دیکھ رہا تھا، یا تو لوگ اس ذخیرے میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکال نکال کر کھا رہے تھے یا ایک دوسرے سے چھین کر کھا رہے تھے۔ کوئی مانگ رہا تھا کسی کی زبان اتنی لمبی تھی کہ اس نے کھانے اس رکھے ہوئے تھے، وہ ہڑپ کر جاتا تو پھر سے ان پر کھانے رکھنے شروع کر دیتا۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

”یہ وادی جوف ہے۔ جسے تم پیٹ کی وادی بھی کہہ سکتے ہو۔“

”یہ کیسی وادی ہے، یہاں لوگ ہلکان کیوں ہو رہے ہیں۔“ میں نے حیرت سے پوچھا

”اصل میں یہ کم ظرف لوگ ہیں۔ وہ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں کہ رزق کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے اس کی طرف تو دیکھیں۔ وہ تو اپنے نفس طرف دیکھ رہے ہیں۔ رزق کی کمی نہیں، ان کی نیت میں کمی ہے۔ اسی لئے ایک دوسرے سے چھین رہے ہیں۔ اور وہ دیکھو ایسے بھی ہیں اپنے حصے سے وافر اور اپنا بھی دوسروں کو دے رہے ہیں، وہ لوگ دیکھو، کتنے مطمئن ہیں۔“

”ہاں میں دیکھ رہا ہوں، جو جتنا زیادہ ذخیرہ کر رہے ہیں، ان کے پاس سے اتنا زیادہ نقص اٹھ رہا ہے۔“

”وادی جوف کے لوگ صرف پیٹ سے سوچتے ہیں، جو جتنا پیٹ سے سوچتا ہے اتنا ہی زیادہ نقص پھیلاتا ہے۔ اور وہ نقص اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس سے دوسرے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔“

”کیا اب مجھے بھی اس وادی کو پار کرنا ہوگا۔“

”نہیں تجھے پیٹ تک کا مشاہدہ کروا دیا گیا ہے۔ آگے تو سوچ تجھے کیا کرنا ہے۔ تو جس منزل کا راہی ہے، وہ منزل ابھی دور ہے۔ تجھے ابھی سفر میں رہنا ہے، یہاں تک کہ تیری منزل آجائے۔“

میں ان لفظوں پر غور کر رہی رہا تھا کہ ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے لگا جیسے میں نیند سے جاگا ہوں یا پھر بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آیا ہوں۔ میں ویسے ہی جال میں پھنسا ہوا تھا۔ تیز ہوا پھڑپھڑا رہی تھی اور میں نجانے کس منزل کی جانب جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا میں نیچے کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی پہلی کا پٹر کی سرچ لائیٹ روشن ہو گئی۔ میں نے نیچے دیکھا، وہاں درخت ہی درخت تھے۔ اور میں جال سمیت تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

دوپہر کے بعد جہاں کی آنکھ کھلی تو رونیت کور نے اس سے کہا

”تیار ہو جا، پروفیسر صاحب کے پاس جانا ہے۔ وہاں پریزنٹر سامتی آرہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پروفیسر کے گھر تھے، جہاں تین سکھ جوان اور ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان گہری سنجیدگی تھی۔ وہ بھی جا کر بیٹھ گئے۔ تو پروفیسر نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ میں کسی بھی اہم مسئلے پر مشورہ لیتا ہوں۔“ پھر ان کی طرف دیکھ کر بولا، ”یہ ہے وہ نوجوان جس نے گرہاں جیسے بندے کو ایک ہی رات میں پکڑ لیا۔“

”واہ! واہ! میرے خیال میں جس طرح اس نے اپنا سیٹ اپ بنایا تھا، اسے پکڑنا بہت مشکل تھا۔ اس نے کل جانا تھا۔“ ایک نے کہا تو پروفیسر صاحب بولا:

”وہ تو جو ہوتا ہے وہ ہو گیا۔ ہر حال، اجمیت اور گرلین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اب انہیں سنبھال لیں گے۔ ایک دو دن میں اس کا سب ہو جائے گا۔ اصل معاملہ یہ ہی کہ اب کیا کرنا ہے؟“

”کس معاملے میں؟“ ایک نے پوچھا

”یہی سندھ کے معاملے، دیکھو، سندھ کی دولت ہمارے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کے بعد ہمیں اس سے کوئی سرو کار نہیں ہوگا۔ مگر سندھ دل جاتا ہے تو اس کا وہ ہر فائدہ ہے، وہ ہماری طاقت بن سکتا ہے۔ دولت تو ہاتھ آئی جائے گی۔ تیسری بات یہ جو پانچ بیاروں کی واپسی ہے، اس سے خالصتان تحریک اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے جو لوگ بھی ہیں، ان میں ہماری ساکھ بن چکی ہے۔ ہم کوئی جرائم پیشہ لوگ نہیں، ہم بھی تو اپنے اعزاز میں دھرم ہی کا کام کر رہے ہیں۔“ پروفیسر نے تفصیل سے بتایا تو دوسرے نے کہا

”تو آپ کا مطلب ہے کہ سندھ کا تلاش کیا جائے؟“

”یہی تو میں نے آپ سب سے مشورہ کرنا ہے۔“ پروفیسر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”میرے خیال میں تو اس تلاش کرنا چاہئے، اگر مل جائے تو اچھا ہی ہے۔“ ایک عورت نے صلاح دی

”کیوں آپ سب کیا کہتے ہیں“ اس نے پوچھا تو کچھ دیر بعد وہ سب اسی بات پر راضی ہو گئے کہ سندھ کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہ کیسے ممکن تھا، یہ بعد کی بات تھی۔

کھانے کے بعد وہ سب لوگ چلے گئے۔ یہ ذمہ داری جہاں ہی پڑا دی گئی کہ وہ سندھ کو تلاش کرے۔ جہاں جیسے ہی واپس رونیت کے گھر آکر صوفے پر بیٹھا تو صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھتے ہوئے رونیت کور نے پوچھا

”کہو، کرو گے نا تلاش اسے ہمارے ساتھ مل کر؟“

”تم اگر میرے ساتھ رہو، تو میں کوشش کر لوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی

”میں اسے مذاق سمجھ کر فٹ لوں یا تم کوئی شرط لگا رہے ہو؟“ رونیت کور نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”جو تم سمجھ لو۔“ اس نے بھی گول مول جواب دیا تو ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ تبھی جہاں کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہ روی سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر باتیں سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جمال کو میلے والے میدان سے اٹھایا گیا ہے۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے رونیت کی طرف دیکھا اور بولا

”ہو سکتا ہے میں اب تم لوگوں کی مدد نہ کر سکوں۔ مجھے ایک اہم ذمہ داری نبھانے کے لئے جانا ہوگا۔ بہت معذرت کے ساتھ، پروفیسر صاحب کو بتا دیتا۔“

”یہ کیا کہہ رہے تم، ایسی کون سی افتاد پڑ گئی ہے؟“ وہ حیرت زدہ ہوتے ہوئے بولی

”یہ میرے لئے سب سے بڑی اور سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سوری۔“ اس نے کہا تو رونیت کو اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

”لیکن کیا تم اکیلے یہ سب کر لو گے جو تم کرنے جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا

”یہاں بھی تو میں اکیلے ہی آیا تھا۔“ وہ بولا

”مگر تمہیں ہماری مدد لینا پڑی تھی۔“ اس نے جواب دیا تو حصال نے ایک لمحہ کو سوچا۔ تبھی رونیت نے کہا

”تم میرے ساتھ چلو پروفیسر کے پاس، ہم کوئی راستہ نکالتے ہیں، ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔“

”اوکے۔“ اس نے ایک دم سے کہا اور اٹھ گیا

☆.....☆.....☆

یہ کوئی مشاہدہ نہیں تھا بلکہ میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ وہ گھٹا جنگل دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کتنا بڑا ہے۔ میں صرف اتنا ہی دیکھ سکتا تھا، جہاں سرخ لائٹ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس سے آگے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک بڑا سارا میدان تھا۔ میں دھیرے دھیرے نیچے آ رہا تھا۔ اس میدان میں کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہاں تک کہ میرے قدم زمین سے جا لگے۔ اس کے ساتھ ہی لی کا پٹر سے جال الگ ہو گیا۔ ذرا سی کوشش کے بعد میں جال سے باہر آ گیا۔

ہیلی کا پٹر جا چکا تھا۔ میرے سامنے بہت ساری مختلف ماڈل اور میک کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہر طرف ملجوا اندھیرا تھا۔ کافی فاصلے پر کوئی عمارت کا شائبہ تھا، جو بہت زیادہ روشن تھی۔ میں کہاں تھا؟ اس بارے مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ تبھی عمارت کی طرف سے تیز روشنی ہوئی۔ وہ گاڑیوں کا ایک قافلہ تھا، جو لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر مجھے سے ذرا سے فاصلے پر رک گیا۔ ہیڈ لائٹس مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ ان گاڑیوں میں سے کئی لوگ باہر نکلے۔ وہ کافی سارے تھے۔ ان میں ایک لمبا سا آدمی آگے بڑھتے ہوئے میری طرف آ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

”اس جزیرے پر خوش آمدید، میں مانتا ہوں کہ تمہیں یہاں لانے کا طریقہ کچھ ٹھیک نہیں تھا، مگر اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔“

”یہ کون سا جزیرہ ہے اور تم کون ہو۔“ میں نے اس سے پوچھا

”دیکھو جمال۔! ہم تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کے پابند نہیں ہیں۔ لیکن ہم تمہارے ساتھ بہت ساری باتیں کرنے والے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم یہاں دوست بن کر رہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ خون خرابہ ہو، لڑائی بھڑائی میں کوئی مارا جائے۔“ اس نے حصل سے کہا

”ایسا کیوں چاہتے ہو تم؟“ میں نے پوچھا

”ہم تمہیں اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، جب تک تم کسی کو کچھ نہیں کہو گے۔ تم اس جزیرے پر آزاد ہو۔ فرار ہونے کی کوشش بھی کرو گے تو نہیں روکیں گے۔ کیونکہ تم فرار ہو نہیں پاؤ گے۔“ اس نے اسی حصل سے کہا

”مجھے یہاں لانے کا مقصد؟“ میں پھر پوچھا

”یہی تو، یہی تو بتانا ہے بلکہ سمجھانا ہے، اور وہ ہمارا پاس تمہیں بتائے گا۔ اگر تم میری بات سمجھ گئے ہو تو آؤ، چلیں۔“ اس نے ساتھ میں ہاتھ کا اشارہ کیا تو میں آگے بڑھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے ہاتھ ہی کے اشارے سے ایک گاڑی کی طرف راہنمائی کی۔ میں اس میں جا کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد یہ قافلہ واپس جا رہا تھا۔

وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ اس جنگل میں ایک محل کا ہونا حیران کن ہی تھا۔ اس کی چار دیواری کی اونچائی بہت زیادہ تھی۔ میں پورچ میں اتر کر یہی دیکھ رہا تھا کہ میرا میزبان بولا

”یہ چار دیواری اس لئے اونچی بنا گئی ہے اور اس پر لوہے کا جھنگھ اس لئے لگایا گیا ہے کہ اس جزیرے کے خوفناک درندے اور وحشی لوگ ادھر نہ آجائیں۔“

وہ میری نگاہیں بھانپ کر مجھے ایک دوسرا ہی پیغام دے کر سمجھا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سامنے ہی ایک وجیہ مرد اور حسین عورت کھڑے تھے۔ اس نوجوان نے مجھے ان کے حوالے کیا۔ وہ مجھے لیتے ہوئے ایک شاندار کمرے میں لے گیا۔ جو کسی فائو سٹار ہوٹل کے سوئٹ جیسا تھا۔

”تمہیں یہاں رہنا ہے۔ تم فریش ہو جاؤ، تو پھر تمہارے لئے یہیں کھانا لاتے ہیں۔ کیونکہ باقی سب کھا چکے ہیں۔“ اس مرد نے کہا اور باہر چلا گیا

”اس جانب ہاتھ دہم ہے۔ جاؤ، میں تمہارے لئے کپڑے نکالتی ہوں۔“ اس عورت نے چل کر کہا اور ایک جانب چلی گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں یہاں قیدی ہوں یا مہمان؟ رات گئے میرے سو جانے تک انہوں نے میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک ہی رکھا۔

میں سو جانے کے لئے بیڈ پر دراز ہوا تو میلے والے میدان سے لیکر یہاں آ جانے تک جو مشاہدہ کروا گیا تھا۔ میں اس پر غور کرنے لگا۔ یہ مشاہدہ بے مقصد نہیں تھا۔ لازمی چور پر میری آنے والی زندگی میں اس کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک ایک واقعہ یاد آ رہا تھا۔ اس مشاہدے میں مجھے کیا کیا بات سمجھائی گئی تھی، اس کا نظہور ہونا باقی تھا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میں صبح جب بیدار ہوا تو ہر جانب اُجالا پھیللا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں گیا تاکہ باہر کا نظارہ کر سکوں۔ میرے سامنے ایک گہرا سبز لان تھا اور اس سے آگے گہرے سبز اور شاداب درخت تھے۔ میں نے کھڑکی کھولی تو خوشگوار ہوا سے ایک دم میرے اندر خوشگواریت اتر گئی۔ میں کافی دیر وہیں کھڑا رہا۔ تبھی مجھے پشت پر سے نسوانی آواز سنائی دی۔

”آپ تیار ہو جائیں، کچھ دیر بعد میٹنگ ہے۔“

میں نے گھوم کر دیکھا جین اور ٹی شرٹ پہنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور چہرے پر سکوت طاری تھا۔ اس کی آواز اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”اوکے۔ تم جاؤ۔“ میں نے کہا

”نہیں، میں آپ کو تیار کروں گی۔“ اس نے کہا تو میں نے کانڈھے اُچکا دیئے۔

وہ ایک بڑا ہال تھا۔ جس کی چھت خاصی اونچی تھی۔ وہ خالی تھا۔ وہاں کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ ہر ایک کے سامنے میز تھا۔ میں نے بزنس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کہ میں کوئی بزنس میٹنگ لینے جا رہا ہوں۔ درمیان میں ایک میز خالی پڑی ہوئی تھی جس کے دونوں جانب کرسیاں پڑیں ہوئیں تھیں۔ وہی لڑکی مجھے ایک خالی کرسی پر بٹھا گئی۔

میرے پیٹھتے ہی ہال کی دائیں جانب سے ایک دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ وہ آتے ہی بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر شفاف انگریزی میں بولا

”جمال! تمہیں یہاں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہر والدین کی طرح بچپن میں، میرے والدین نے بھی میرا ایک نام رکھا تھا، جس سے میں جان چھڑا چکا ہوں۔ وہ نام ایک خاص مذہب اور قوم کی نمائندگی کرتا تھا۔ جب مجھے شعور آیا تو میں نے اس سے جان چھڑوالی۔ میں آزاد ہو گیا۔ اگر تم مجھے پکارنا چاہو تو اپنی زبان میں ”آزاد“ کہہ سکتے ہو۔“ یہ کہہ

کردہ ایک لمحے کے لئے رکا پھر کہتا چلا گیا، ”میرا تمہیں یہاں لانے کا طریقہ بہت غلط تھا۔ یوں جیسے کسی کو اغوا کر کے لایا جاتا ہے، لیکن میری مجبوری تھی۔ یہاں تمہاری طرح کئی لوگ ہیں۔ سبھی کو ایسے ہی لایا ہوں۔، سب سے الگ الگ بات کرنے میں وقت لگ جاتا، یہاں سب سے فوراً بات ہو سکتی ہے۔ اب دیکھو لوگوں کو یہاں اکٹھا کرنے میں تین ہفتے لگ گئے۔ الگ الگ بات کرنے اور سمجھانے میں کتنا وقت لگتا۔“

”تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو۔“ میں نے قتل کے ساتھ اس سے پوچھا

”طاقت، اور بہت زیادہ طاقت۔ اس خطے پر حکومت چاہتا ہوں، جس کے میں اور تم باسی ہو۔ سرحدوں کی کوئی اہمیت نہیں، مذہب، زبان، رنگ نسل کسی کی کوئی اہمیت نہیں، ان سب سے ماورا ہو کر اس خطے پر حکومت کرنی ہے، جس پر صدیوں سے دوسرے لوگ ہمیں محکوم بنائے رہے۔ وہ گئے تو دور دراز کے لوگ ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ کیوں؟“

”شاید اس لئے کہ ہم محکوم رہنا پسند کرتے ہیں“ میں نے تنگی سے کہا

”تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس خطے پر آریان نے قبضہ کیا۔ انہوں نے انسانیت پر ظلم یہ کیا کہ مذہب کو استعمال کیا، انسان پر انسان کی حکومت کے لئے۔ شور بھی تو انسان تھے انہیں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ یہ ان کا مذہب نہیں بلکہ ان کا خوف تھا کہ ہم سے اپنا وطن واپس نہ چھین لیں۔ یہ حربہ کامیاب رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے بھی یہی حربہ مسلمانوں کے لئے استعمال کیا۔ خیر، آج بھی ایسے ہی ظلم جاری ہیں۔ سرحدوں نے ملک بنا دیئے، لیکن ہر ملک میں انسان کا استحصال جاری ہے۔ غربت، بھوک، بیماری، ذلالت، انسان کا مقدر ہی کیوں؟ دس سے پندرہ فیصد لوگ اتنی دولت رکھتے ہیں کہ ان کا شمار نہیں۔“

”تو کیا ہم ان کی دولت چھین کر ان غریبوں میں بانٹ دیں؟“ میں نے سکون سے کہا

”ضروری نہیں کہ چھین لیں، طاقت کے آگے ہر شے بے بس ہو جاتی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا، میں تو اس سے بھی آگے کا سوچ رہا ہوں۔ اگر تم لوگ میرا ساتھ دو تو ہم اس خطے میں اپنی مرضی کی حکومت بنائیں، جب چاہیں اور جو چاہیں کریں، لیکن باہر کی طاقتوں کو یہاں گھسنے نہیں دیں۔“

”مطلب تم، کسی کی گریٹ گیم کے مہرے ہو، اور آگے ہمیں مہرے بنانا چاہتے ہو۔“ میں نے کہا

”تم اسے اس طرح سوچ سکتے ہو، لیکن میں کسی کا مہرہ نہیں، میں تو اس گریٹ گیم سے نکلنے کا کہہ رہا ہوں۔ چھپے ہوئے ہاتھ جب چاہیں اور جس کا چاہیں خون بہا دیں، کیا تم نے کبھی کسی معصوم بچے کی خون میں نہائی ہوئی یاد دہ جلی لاش دیکھی ہے؟ اگر دیکھی ہے تو کیا جذبات تھے تمہارے؟“

”مجھے جذباتی کرنے کی کوشش مت کرو۔ سیدھی بات کرو، مجھے ہی کیوں چنا، اور تم نے کیسے مان لیا کہ میں تمہاری بات مان جاؤں گا؟“

”نہ مانو، جبکہ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سے انکار نہیں کر پاؤ گے۔ میں پچھلے ایک سال سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم میں ہمت ہے، حوصلہ ہے، کچھ کرنے کی قوت بھی ہے، لیکن تمہارے پاس کوئی مقصد نہیں۔ حالات نے تجھے جس راہ پر ڈال دیا، تم بگڑتے جا رہے ہو۔ تم میں صرف ایک خوبی ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں یہاں لانے کا اتنا تردد کیا، تم بجرمانہ ذہن نہیں رکھتے ہو۔ ورنہ دولت، طاقت اور حکومت کسے نہیں چاہیے۔ جراثیم پیشہ لوگوں کی یہاں میں لائنیں لگا دیتا، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لئے رکا پھر بولا، ”تم میرے مہمان ہو، یہاں سکون سے رہو۔ سوچو اور پھر فیصلہ دینا۔ ایک دن تم واپس بھی چلے جاؤ گے۔ جائے بنا چارہ بھی

میں۔ حتیٰ فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہوگا۔“

”تم ہو کون؟ اور اصل مقصد.....“

”یہ قبل از وقت سوال ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی بتاؤں گا۔ میرا مقصد کیا ہے یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اکتا دوں۔ میں بے جا خون بہانے کے خلاف ہوں، مجھے نفرت ہے جو سازشیں کرتے ہیں، مذہب کی آڑ لے کر اپنے غلط مقاصد پورے کرتے ہیں۔ انسانیت کا نام لے کر کردہ منصوبے گھڑتے ہیں۔ تم صرف ایک ہفتہ رہو۔ سب بچے جاؤ گے۔“

”اور اگر میں ایک ہفتے سے پہلے ہی یہاں سے چلا گیا تو.....“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”یہ تمہاری شدید غلط فہمی ہوگی۔ میری مرضی کے بغیر تم یہاں سے جا بھی نہیں سکتے ہو۔ ابھی تم نے یہ جگہ نہیں چھوئی، خیر، اگر تم پھر بھی یہاں سے چلے جاؤ تو تم جو کہو گے میں وہ کرنے کو تیار ہوں گا۔“

”یہ لفظ یاد رکھنا مسٹر آزاد، کیونکہ مجھے تمہاری باتوں سے بدبو آ رہی ہے۔ تم بھی انہی بے غیرت لوگوں میں سے ہو، جو انسانیت اور غریب لوگوں کا نام لے کر درندگی پر اتر آتے ہیں۔ خود کو سیکولر کہلوا کر مذہبی خو غواری کرتے ہو۔ میں تمہارا نقاب اتار دوں گا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا۔ پھر بولا

”چلو، ایسے ہی سہی، میں چاہتا تھا کہ ہم سکون اور پیار بات کو سمجھتے لیکن تم کچھ اور ہی چاہ رہے ہو۔ آج کی میٹنگ بالکل ختم کرتے ہیں۔ باقی باتیں کل سہی۔“ اس نے یہ کہا اور میری طرف دیکھتا ہوا اٹھ گیا۔

میں اس ہال سے باہر نکلا تو میں بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چیز تھا۔ اس کے عزائم کیا ہو سکتے تھے۔ مجھے اسکی باتوں نے ذرا سا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ میری ساری توجہ وہاں سے فرار ہونے کی جانب ہو گئی۔

میں محل کی راہداریوں سے ہوتا ہوا باہر جانے لگا۔ میں باہر آ گیا۔ میرے سامنے ایک لمبا راستہ تھا، جس کے دونوں طرف سبز لان تھے۔ بیرونی گیٹ پر کوئی چوکیدار یا سیکورٹی والا نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت تو ہوئی کہ سیکورٹی گارڈ کے نام پر کوئی بندہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اس نے کوئی جدید قسم کا سیکورٹی سسٹم بنایا ہوگا۔ جسے بہر حال سمجھنا ضروری تھا۔ میں سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ میں نے جیسے ہی گیٹ کی طرف جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھائے ایک دم سے زور دار قہقہوں کی آواز سنائی دیئے۔ میں نے اس جانب دیکھا تو چند مرد اور تین عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک مرد نے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں ایک لمحہ سوچے بغیر ان کی طرف بڑھ گیا۔ میں ان کے پاس گیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی وہی مرد بولا

”یہ تو ہمیں معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم یہاں پر سنے ہو۔ تمہارے اعزاز سے لگتا ہے کہ تم مسٹر آزاد سے میٹنگ بھی کرائے ہو۔ اور اب تم یہاں سے بھاگ جانے کی سوچ بھی رہے ہو گے؟“

”تمہاری ساری باتیں درست ہیں۔“ میں نے اعتراف کر لیا تو سارے ہنس دیئے

”یہ تو ٹھیک ہے فوراً مان گیا؟“ ایک عورت نے کہا

”کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ تم کون ہو اور کہاں سے اٹھا کر لائے گئے ہو؟“ مرد نے پوچھا تو میں نے اپنے بارے میں بتا دیا

اس کا مطلب ہے تم پنجابی سمجھ سکتے ہو؟“ ایک نوجوان نے کہا

”ہاں، کیا تم بھی پنجابی ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”ہاں، میں بھی ہوں۔“ اس نے دھیمے سے بتایا

”اور تم لوگ؟“ میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا تو پہلے والی عورت بولی
”ہماری تفصیل ذرا لمبی ہے، بتا دیں گے، لیکن اتنا بتا دیں کہ ہم بھی تمہاری طرح یہاں مہمان ہیں۔“ یہ کہہ کر اس
نے زوردار قہقہہ لگا دیا

”تم باہر کی طرف اس لئے جا رہے تھے کہ یہاں سے فرار ہو سکو؟“ پہلے والے مرد نے پوچھا پھر فوراً ہی بولا ”اور یہ
بات یقینی ہے کہ تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہوگا؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں صاف کہہ دیا
”تو پھر سنو، تم یہاں سے باہر نہیں جا سکتے، میرا خیال ہے تجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ تم اس وقت ہو کہاں پر؟“

”میں جہاں بھی ہوں، ہوں تو اسی زمین پر نا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا
”زمین پر؟“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا، پھر یوں بولا جیسے وہ مجھے اس دنیا کا احمق ترین آدمی سمجھ رہا ہو، ”اگر یہاں
سے نکلنا اتنا آسان ہوتا تو ہم سب یہاں سے کب کے جا چکے ہوتے۔ کوئی یہاں چار ہفتوں سے پھنسا ہوا ہے، کوئی
دو اور کوئی تین۔ اور تم آج رات ہی آئے ہو، یہاں کے بارے پتہ کچھ نہیں اور.....“

”تم کیوں نہیں نکل سکے یہاں سے؟“ میں نے نخل سے پوچھا
”جس جگہ ہم ہیں، یہ ایک جزیرہ ہے۔ اس کے چاروں طرف سمندر ہے۔ یہاں آنے اور یہاں سے جانے کا
راستہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جس طرح ہمیں یہاں لایا گیا ہے۔ اس جزیرے پر گھنا جنگل ہے۔ جس میں ہر
طرح کا خون خوار جانور موجود ہے۔ یہاں سے نیکر ساحل تک اگر ان جانوروں سے کوئی بچ بھی جائے تو ان وحشیوں
سے کوئی نہیں بچ سکتا جو یہاں رہتے ہیں۔ انہی وحشیوں کے ہاتھوں تمہاری طرح کا ایک سر بھرا ہلاک ہو چکا ہے۔ وہ
اسے کھا گئے ہیں۔ اگر تم بھی ان کا ٹولہ بننا چاہتے ہو تو جاؤ۔“

”اور اگر بچ گئے تو آکر ہم سے ہمارے بارے پوچھ لیتا، ہم تمہیں اپنا تعارف کروا دیں گے۔“ اسی عورت نے قہقہہ
لگاتے ہوئے کہا۔ میں نے ان سب کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں پاگل ہوں یا
دنیا کا احمق ترین انسان ہوں۔

”ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ وہی پنجابی نوجوان اٹھ گیا
”واہ، اچھا لگا مجھے، کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا
”مجھے سندھپ اگر وال کہتے ہیں، تم مجھے سندھپ بھی کہہ سکتے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری جانب قدم
بڑھا دیئے۔ ہم نے سب پر نگاہ ڈالی اور باہر کی جانب چل دیئے۔

میں اور سندھو، باہر جانے والے مرکزی گیٹ کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہم گیٹ سے باہر آ گئے
۔ وہاں آکر میں نے طویل سانس لی اور چاروں طرف دیکھا۔ محل نما اس عمارت کے آگے کافی دور تک میدان
تھا۔ جس کے سرے سے کافی فاصلے پر گھنا جنگل دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف سے اس محل نما
عمارت کو جنگل نے گھیرا ہوا ہے۔ میں جائزہ لے رہا تھا کہ سندھو نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
”تمہیں یقین ہے کہ تم اس گھنے جنگل سے گزر کر ساحل تک پہنچ جاؤ گے؟“

”تم میرے ساتھ کیوں آئے ہو؟“ میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔
”میرا دل کہتا ہے کہ میں تم پر بھروسہ کر لوں۔ حالانکہ میں تمہارا نام تک نہیں جانتا۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں
کہا تو میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے یہیں سے سنا ہے کہ ہر طرف سے چھ کلومیٹر ہے۔ مطلب بارہ کلومیٹر محیط کا یہ جزیرہ ہے۔“
”اور کیا سنا ہے اس کے بارے میں؟“ میں نے مزید معلومات کے لیے پوچھا۔
”وہی جوان لوگوں نے بتایا۔ خونخوار جانور، وحشی جنگلی اور یہ بھی ایک جنگل۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا
”اگر راستے میں کوئی نہیں آیا تو ہم دوپہر سے پہلے ساحل تک پہنچ جائیں گے۔“ میں نے کہا اور ایک زوردار

”تو پھر تم اپنا بھروسہ قائم رکھو۔ ہم نہ صرف ساحل تک جائیں گے بلکہ ساحل سے بھی آگے جائیں گے۔ باقی
رہی نام کی بات تو مجھے جمال کہتے ہیں۔“

”مطلب مسلمان ہواور پاکستانی۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ بہت کچھ سمجھ گیا ہو۔
”چلیں پھر؟“ میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قدم بڑھا دیئے۔

اسے میں سمجھتا بھی تو میری بات اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے اپنا مقصد دیکھ کر سمجھا
تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے مقصد کا تعین ہو گیا تھا۔ اب میری زندگی میری نہیں رہی
تھی۔ میں مشاہدہ کر چکا تھا۔

وہ لوگ جو موت سے بھاگتے ہیں، موت ان کے تعاقب میں رہتی ہے اور جو لوگ موت کا تعاقب کرنے
لگے، زندگی خود اس کی حفاظت کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ایسا انہی لوگوں کا مقدر ہوتا ہے جو اعلیٰ مقصد لے کر
چلتے ہیں۔ پھر کائنات کے تمام ذرائع اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں، تاریخ کے
اوراق ایسی بے شمار مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ زندگی وجود کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق اعمال کے
ساتھ ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ جس طرح
صرا کی اپنی مخصوص آواز ہوتی ہے، اسی طرح جنگل کی بھی اپنی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ
ہے کہ جنگل میں پرندے بولتے ہیں اور ہوا کی سرسراہٹ سے آواز بدل جاتی ہے۔ مختلف پرندوں کی مختلف
بولیاں سماں باندھ دیتی ہیں۔ اگر خوف کو خود پر مسلط کر لیا جائے تو یہی آوازیں قدم قدم پر ڈرا دینے کا باعث بن
ہاں ہیں۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ کوئی بھی مقصد لے کر چلو، وہ مقصد کتنا ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ
ہو، ابتدائے سفر ہی سے مختلف بولیاں سنائی دینے لگ جائیں گی۔ غشی، مثبت بولیاں، جن میں اگر بندہ الجھ گیا تو
مقصد کی راہ کھوٹی ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو اپنے مقصد پر نگاہ رکھتے ہوئے بولیاں تو سنتے ہیں لیکن ان پر توجہ نہیں
دیتے، وہی اکثر کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

خوف انسانی صلاحیتوں کو نگل لیتا ہے۔ دشمن اسی ہتھیار سے ختم کرنے کی ابتدا کرتا ہے۔ لیکن اگر بندے کے
پاس اعلیٰ مقصد ہو تو دشمن کا پیدا کیا ہوا یہی خوف ایک ہتھیار بن جاتا ہے۔ دشمن سمجھتا ہے کہ ڈر گیا، اس وقت وہ
ہماری طرح اپنی خباثت ظاہر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ منافقین بھی پوری طرح نکلے ہو جاتے ہیں۔ یہاں مقصد کی
مدد صرف جیت ہوتی ہے بلکہ اسے زندگی مل جاتی ہے اور دشمن کا پھیلایا ہوا خوف دشمن ہی کی موت بن جاتا
ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی اوقات کیا ہے۔

ہم جنگل میں داخل ہو کر اس کے ٹیزے میڑھے راستوں پر چلتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا
کہ عمارت سے ساحل تک کا کتنا سفر ہے۔ اس لیے معلومات لینے کی خاطر اور وقت گزاری کے لیے میں نے
سندھو سے پوچھا کہ شاید اسے معلوم ہو تو اس نے کہا۔

”میں نے یہیں سے سنا ہے کہ ہر طرف سے چھ کلومیٹر ہے۔ مطلب بارہ کلومیٹر محیط کا یہ جزیرہ ہے۔“
”اور کیا سنا ہے اس کے بارے میں؟“ میں نے مزید معلومات کے لیے پوچھا۔

”وہی جوان لوگوں نے بتایا۔ خونخوار جانور، وحشی جنگلی اور یہ بھی ایک جنگل۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا
”اگر راستے میں کوئی نہیں آیا تو ہم دوپہر سے پہلے ساحل تک پہنچ جائیں گے۔“ میں نے کہا اور ایک زوردار

قہقہہ لگا دیا۔ یہ میرا پائل پن نہیں تھا بلکہ میں سندھ کو حوصلہ دے رہا تھا اور شاید وہ بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہم کتنا سفر طے کر آئے ہیں۔ ایک جگہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس میں شفاف پانی تھا۔ پانی کو دیکھتے ہی پیاس ابھر آئی۔ میں ایک تنے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سندھ نے تالاب کے پانی کو چکھا اور بھر سیر ہو کر پی لیا۔ میں اس وقت پانی پینے کے لیے اٹھ گیا تھا، جب ایک تیر میرے سر کے اوپر سے درخت میں لگا۔ ایک دم سے میری ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ سندھ بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ بھی چونکا ہو گیا۔ مجھے یہی اندازہ کرنا تھا کہ یہ تیر آیا کس طرف سے تھا۔ میں محتاط لگا ہوں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک سات اٹھ جنگلی ہمارے سامنے نمودار ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے، بھالے اور تلوار نما ہتھیار تھے۔ مختلف عمروں کے کالے سیاہ ننگ دھڑنگ جنگلی جنہوں نے اپنے ارد گرد چین یا مختلف کپڑوں کے شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ اس پر انہوں نے بچے اور پند باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ میں اور سندھ نے ایک دوسرے کے ساتھ کمریں جوڑ لی تھیں۔ ہم سبھی ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔ میں ان کے پیٹیرے بھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ محتاط انداز میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم پر اکٹھے ہو کر حملہ کرتے میں نے سامنے والے جنگلی پر حملہ کی جھکانی دے کر بالکل دائیں جانب والے جنگلی پر جا پڑا۔ وہ بلاشبہ اس پیٹیرے میں تھا کہ میں سامنے والے پر حملہ کر دوں گا تو مجھ پر ٹوٹ پڑے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کی لہجہ بھر کی غفلت کا میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے لیتا ہوا زمین پر جا پڑا۔ میں وہیں لگا نہیں رہا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ میں نے وہ چھینا اور وہاں سے چٹم زدن میں ہٹ گیا۔ اسی لمحے وہاں تلوار اور بھالے کے وار ہوئے۔ میں نے دیکھا ان کا دائرہ ٹوٹ چکا تھا۔ تین جنگلی نہتے سندھ کو گھیرے ہوئے تھے۔ اسی لمحے میں نے ایک چیخ ماری اور نیزہ سیدھا کر کے ان کی جانب بھاگا۔ چیخ سے وہ میری جانب متوجہ ہو گئے۔ سندھ نے اس کا فائدہ لیا اور ان کے گھیرے سے باہر آ کر ایک جانب بھاگ گیا۔ میں نے نیزہ اس کی جانب پھینک دیا، جیسے اس نے پکڑ لیا۔ وہ جنگلی کچھ قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ پہلا بھرپور ہلہ ان پر نفسیاتی دباؤ ڈال گیا تھا۔

ہم آٹنے سامنے تھے۔ وہ سب ایک طرف اور ہم دونوں ایک جانب تھے۔ وہ سبھی ایک جان ہو کر ہم پر حملہ آور ہوئے۔ میں ذرا سا ترچھا ہوا اور ایک جانب بھاگ نکلا۔ وہ آدھے بٹ کر میری جانب آگئے۔ میں وہیں گھومتے ہوئے انہیں اپنے پیچھے لگا کر بھاگتا رہا، پھر اس وقت جب کے میں نے انہیں خود کو پکڑنے کا موقعہ دے دیا، اور وہ میرے قریب آگئے تو میں ایک دم رک گیا۔ وہ مجھ سے آگے۔ میرے ذہن میں تھا کہ کس کے پاس تلوار ہے اور کس کے پاس بھالا۔ وہ میرے اوپر سے آگے جا کرے۔ اسی وقت میں نے ایک سے تلوار چھینی اور لیٹے ہوئے ایک جنگلی کی گردن پر رکھ دی۔

”اپنے ساتھیوں سے کہو وہ ہتھیار پھینک کر دور ہٹ جائیں۔“ میرے یوں کہنے پر اس وہ آنکھیں پٹپٹا کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے میری بات کی سمجھ نہ آئی ہو۔ تاہم باقی ٹھنک گئے تھے۔ میں چند لمحے انتظار کیا، پھر بولا، ”میں جانتا ہوں کہ تم لوگ انگریزی سمجھتے ہو۔ میں تین تک گنوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے تلوار کی نوک اس کی گردن میں چھبھو دی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے تیزی سے انگریزی میں اپنے ساتھیوں سے وہی کہا جو میں اسے کہہ چکا تھا۔ انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔

سندھ نے جلدی سے وہ سب ہتھیار اکٹھے کر لئے۔ تب میں نے سب کو زمین پر لیٹ جانے کا کہا تو وہ لیٹ گئے۔ تبھی سندھ نے زور سے پنجابی میں پوچھا۔

”تمہیں کیسے انداز ہوا کہ یہ انگریزی جانتے ہیں۔“

تب میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

”یہ جنگلی نہیں ہیں، بلکہ اس جزیرے کے وہ مقامی لوگ ہیں، جنہیں انہوں نے اپنی سیکورٹی اور لوگوں کو ارانے کے لیے رکھا ہوا ہے۔“

”تمہیں پتہ کیسے چلا؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا

”ان کے شارٹس، اور پھر ان کے پیٹیرے دیکھ کر، ممکن ہیں ان کے آباء اجداد جنگلی ہوں، مگر یہ نہیں ہیں۔“

میں نے کہا اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر بولا، ”بتاؤ، میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

جس پر اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہاں کا اشارہ کر دیا۔ پھر ذرا مشکل انگریزی میں بولا

”تم ہم سے توقع جاؤ گے لیکن، آگے کیا کرو گے۔ جنگل کے درندے ہیں اور گن بردار سیکورٹی گارڈ۔“

”وہ ہماری قسمت ہے، ہم تمہیں بھی کچھ نہیں کہنا چاہتے، نہ مارنا چاہتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمارے راستے سے ہٹ کر چلے جاؤ۔“ میں نے لہجہ میں ہمدردی بھرتے ہوئے کہا۔

”ہم چلے جاتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے فوراً تلوار اس کی گردن سے ہٹا لی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ باقی بھی اٹھ گئے۔ وہ ایک ساتھ ہو کر کھڑے ہوئے اور ہمارے آگے جھکے، اس لمحے انہوں نے ہم پر چھلانگیں لگا دیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں غیر محتاط تھا، سندھ کچھ زیادہ

تھا۔ وہ ہم پر ٹوٹ پڑے۔ چار میری طرف اور تین سندھ کی جانب۔ انہوں نے ہمیں ٹکوں اور ٹکوں پر رکھ لیا۔

تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں مار کھاتے ہوئے یہی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مجھے موقع مل جائے

ایک کے کئے سے میرے گال کی جلد پھٹ گئی تھی، جس سے لہو بہنے لگا تھا۔ ان کی رفتار ذرا سی ڈھیلی ہوئی تو

میں نے ایک کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہلکی سی آواز آئی وہ تڑپنے لگا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ زمین پر گر کر

تڑپنے لگا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ باقی تو مجھے ماری رہے تھے، میں نے دوسرے کی گردن کو قابو کیا

، اور اس کی گردن کی ہڈی توڑ کر اسے پھینک دیا۔ باقی دو مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ یہی لہجہ مجھے چاہئے تھا۔

میں نے اپنا گھٹنا ایک کی ٹانگوں کے درمیان مارا وہ دہرا ہوا تو اس کی گردن میرے ہاتھ میں تھی۔ اگلے چند لمحوں

میں وہ بھی زمین پر تھا۔ یہ دیکھ کر چوتھا بھاگ اٹھا۔ باقی تینوں سندھ کو بے دردی سے مار رہے تھے۔ وہ لہو لہان ہو

رہا تھا۔ میں نے تلوار اٹھائی اور ان کی طرف بھاگا۔ میں نے جاتے ہی ایک کی کمر میں تلوار گھسا دی۔ اس کی لرزا

خیز چیخ فضا میں پھیل گئی۔ باقی دونوں رک گئے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں موقعہ نہیں

دیا۔ ایک کے چرکا لگا تو وہ بلبل اٹھا۔ تب تک سندھ بھی سیدھا ہو گیا تھا۔ اس نے تلوار مجھ سے پکڑی تو ایک

بھاگ نکلا، مگر سندھ نے اسے جانے نہیں دیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے اس جنگلی کو پکڑا اور تلوار اس کے پیٹ

میں گھسا دی۔

”سندھ، یہاں سے فوراً نکلو، ان کی چیخیں بہت دور تک گئی ہوں گی۔ ممکن ہے ان کے مزید لوگ آجائیں۔“

میں نے کہا تو اس نے ایک بھالا اٹھایا، باقی ہتھیار تالاب میں پھینکے اور میرے ساتھ چل دیا۔ اس دوران ہم

نے دو چار چلو پانی پی لیا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہاں سے نکل گئے تھے۔

کافی دور جانے کے بعد ہم ایک ایسے گھنے درخت کے نیچے رک گئے، جس کی شاخیں زمین سے لگ

رہیں تھیں۔ مجھے میرا زخم تکلیف دے رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ مجھے ان جڑی بوٹیوں کے

بارے میں بھی معلوم ہونا چاہئے، جو زخموں کو فوراً آرام دے دیتی ہیں۔ میں نے اس حوالے سے سندو سے کہا تو وہ کراچے ہوئے میرے جانب دیکھ کر بولا۔

”بھائی جی میں کئی بار ایسے مرطوں سے گذر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے وہ بوٹی دکھائی نہیں دی۔“

”چلو پھر چلتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں سستانے کا کہتے ہوئے بولا۔

”بہت مارا ہے خالوں نے۔“

”مجھے تو اب یہی معلوم ہے کہ ہر لمحہ دشمن سے خبردار رہو، اب بھی وہ ہر آنے والی رکاوٹ جو ہمارا راستہ روکے گی وہی ہماری دشمن ہے، حالات اور نوعیت کے ساتھ دشمن بھی بدل جاتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔ جیسے وہ میری بات سے اتفاق کر رہا ہو۔ ہم وہاں کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ متوقع دشمن سے کیسے بچنا ہے، یہ ہم نے طے کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جسپال سنگھ اور رونیت کور کے سامنے گرباج سنگھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان خاموشی تھی۔ گرباج سنگھ پر تشدد کے واضح نشان موجود تھے۔ جسپال نے اس کی حالت دیکھی اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”گرباج! اگر تم چاہو تو ہم تمہارے ساتھ ایک ڈیل کر سکتے ہیں۔“

”حقیقت یہ ہے کہ میں تم لوگوں کا قیدی ہوں، میری پوزیشن ہی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں سے ڈیل کر سکوں۔ ویسے اگر تم کوئی بات منوانا چاہتے ہو تو بولو۔“ اس نے دھمے سے لہجے میں بے بسی سے کہا۔

”دیکھو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا، ہمیں صرف سندو سے مطلب ہے، وہ مل جائے تو اس کے عوض تم نے جو سندو کی دولت اکٹھی کی ہے، ہم وہ تمہیں دے دیں گے اور اپنی حفاظت میں تجھے کینیڈا روانہ کر دیں گے۔“ جسپال نے قہقہے سے کہا۔

”میں پھر وہی کہوں گا کہ وہ یہاں نہیں ہے، وہ ایک ایسی جگہ پر ہے۔ جہاں وہ کسی کی قید میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے، میں نہیں جانتا، میں اسے اپنی مرضی سے یہاں نہیں لاسکتا۔“ گرباج نے احتجاجاً کہا۔

”تو پھر تم ہمیں اس کا پتہ بتا دو، ہم اسے خود لے آئیں گے۔ تجھے تب تک ہمارے پاس رہنا ہوگا۔“ رونیت نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ اس وقت بھارت میں نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پر ہے جہاں جانے کے فقط دو راستے ہیں۔ ایک فضائی اور دوسرا سمندر میں سے ہے۔“ اس نے کہا تو جسپال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”فضائی مطلب؟ اور سمندر.....؟“

”فضائی مطلب وہاں پر کوئی اتر پورٹ نہیں ہے۔ وہ ایک جزیرہ ہے۔ ہیلی کاپٹر سے جایا جاسکتا ہے یا پھر سمندر سے اس کے ساحل تک۔ آگے بہت دشوار گزار راستہ ہے اور.....“ گرباج نے کہنا چاہا۔

”مطلب سندو کو ہیلی کاپٹر کے ساتھ اٹھایا اور جزیرے پر لے گئے۔ کیا تم اس کی لوکیشن بتا سکتے ہو؟“ جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

”اگر تم کہتے ہو تو بتا دیتا ہوں۔ تب تک مجھے یہاں رہنا ہوگا، کیوں نامیں ان لوگوں سے بات کر لوں، اگر کوئی صورت نکل آئے؟“ گرباج نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیک ہے، کرو رابطہ۔“ جسپال نے کہا اور اس کا فون میز پر رکھ دیا، جسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ہلکے آگئی۔ اس نے تیزی سے نمبر تلاش کیے اور پھر پیش کر کے رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ جسپال نے فون پکڑ کر اس کا اسکرین آن کر دیا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ جس سے آواز ابھری

”ہاں گرباج، تم کینیڈا کے لیے نکلے نہیں ہو؟“

”ٹھیک اب میں نہ جاسکوں، میں پکڑا گیا ہوں۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”وہاں نان سٹس، یہ کیسے ممکن ہے، اتنا فول پروف پلان اور تم پکڑے گئے۔ وہ کوئی آسانی مخلوق ہیں؟“ دوسری طرف سے کہا گیا

”گلتا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے وہ آسانی مخلوق ہیں۔ مجھے انہوں نے پکڑ لیا۔“ گرباج نے کہا۔

”کیا کہتے ہیں وہ؟“ دوسری طرف سے قہقہے سے پوچھا گیا

”یہی کہ سندو کو چھوڑ دیا جائے۔ اس کے عوض وہ مجھے.....“ گرباج نے کہنا چاہا مگر اس کی بات پوری نہ ہوئی قہقہے سے آواز ابھری

”یہ تم ڈرامہ کر کے ہمارے ساتھ کوئی ٹیم تو نہیں کر رہے ہو؟“

”بہت افسوس ہے ہاس، مجھ پر تمہیں اعتماد ہی نہیں۔“ گرباج نے دے دے غصے میں کہا۔

”ہات اعتماد کی نہیں، حقائق کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندو اس وقت جزیرے سے باہر نکلنے کی کوشش میں ہے۔ وہ ایک سر پھرے پاکستانی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ ہم اس کا کچھ نہیں کر سکتے، اب چاہے وہ جزیرے سے نکل بھی گیا تو ہم اسے مار دیں گے۔“ فون سے کہا گیا

”اور یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“ وہ بولا۔

”مر جاؤ اور انہیں اگر ہمارا راستہ دکھایا تو ہم ان کے ساتھ تجھے بھی مار دیں گے۔“ دوسری طرف سے سفاکانہ لہجے میں کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جسپال نے وہ فون اٹھایا اور کوئی بات کیے بنا وہاں سے اٹھ گیا۔

اس نے باہر نکلتے ہی کسی نامعلوم جزیرے پر موجود کسی ہاس کا نمبر روپی والوں کو دے دیا تاکہ اس کی لوکیشن کے بارے میں معلوم ہو سکے۔

”اب کیا خیال ہے جسپال؟“ رونیت نے پوچھا۔

”خیال کیا، ہم اس کی لوکیشن دیکھ کر اس جزیرے پر جا رہے ہیں۔“ جسپال نے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”لوکیشن کا تو گرباج کو بھی نہیں معلوم؟“ وہ بولی۔

”پتہ کرتے ہیں نا۔“ جسپال نے کہا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے اسی ہاس کی طرہ آواز ابھری

”میری کھوج سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں اگر جزیرے میں بیٹھا ہوں تو اسے اپنا مضبوط قلعہ بنا کر، میں سمجھ گیا ہوں کہ گرباج کو تم لوگوں نے کیسے ٹریس کیا ہوگا۔ عقل مندی اسی میں ہے کہ خاموشی سے سندو کو بھول

ہاؤ۔“

”کیوں چھوڑ دیں سندو کا خیال اور کیوں بھول جائیں اسے ہم۔“ جسپال نے کہا۔

”پہلے اس کے بچ جانے کی امید تھی میں اسے بہت بڑی آزادی دینے والا تھا لیکن وہ احمق نکلا، اس نے اپنی موت خود چن لی ہے۔ وہ اب مر جائے گا۔“ دوسری جانب سے اسی سفاکانہ انداز میں کہا گیا۔

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے؟“ جہاں نے غصے میں کہا

”آؤ، سو دفعہ آؤ، مجھ تک پہنچو اگر ہمت ہے تو لیکن میری کھوج تم لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔ میں صرف ایک دفعہ سمجھاتا ہوں، دوسری بار صرف موت ملتی ہے۔“ پاس نانی شخص کے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جہاں اور رونیت ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔



میں اور سندو ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ سندو کچھ جنگلی بیر لے آیا تھا۔ ہم وہ کھا رہے تھے۔ دراصل وہ بوٹی تلاش کرنے گیا تھا جس سے زخموں کو آرام ملتا تھا، اس کے ساتھ وہ بیر بھی لے آیا۔ اس بوٹی سے ہمیں کافی افادہ ہوا تھا اور ہم اچھا محسوس کر رہے تھے۔

”بائی جی دیکھا، شام تک اس بوٹی کا کمال، زخم یوں سل جائے گا جیسے تھابی نہیں۔“ اس نے کہا

”ہاں یار میں نے درد اور جلن میں کافی آرام محسوس کیا ہے۔“ میں نے اسے بتایا

”کہا نا شام تک درد کیا زخم بھی ختم۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا کہ اس نے یہ کیسے سیکھا تھا۔

وہ کہہ چکا تو پوچھا ”یار! یہ چھ کلومیٹر کہیں بہت زیادہ نہیں ہو گئے؟“

”پتہ نہیں ہم نے ساحل کی طرف کتنا سفر کیا ہے، اس طرف بڑھے بھی ہیں یا یہیں کہیں گھوم رہے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں ہمیں رات ہونے سے پہلے ساحل تک پہنچ جانا چاہئے۔“ اس نے اپنی رائے دی

”اور میرا خیال ہے کہ ہم سفر ہی رات کو کر سکیں گے۔“ میں نے کہا

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”اس جنگل میں ہمیں تلاش کیا جائے گا بلکہ کیا جا رہا ہوگا۔ جو اس جنگل سے واقف ہوگا، وہ رات کو نہیں نکلے گا۔ مطلب وہ جنگلی، وہی نکلیں گے، جو پوری تیاری سے ہمیں مارنے کے لیے ہمیں تلاش کریں گے۔“ میں اپنے طور پر اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”اور وہ جدید اسلحے سے لیس ہو سکتے ہیں۔“ سندو نے یوں کہا جیسے مجھے یاد دلا رہا ہو۔

”اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے یار، رات کے وقت انہیں چکمہ دینا آسان ہوگا۔“ میں نے اس سمجھایا تو اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ ناچار مجھے بھی اس کے ساتھ چلنا پڑا۔

ہم پھر سے ایک خاص سمت کا تعین کر کے چلنے لگے۔ کیونکہ اس جنگل میں کوئی واضح راستہ تو تھا نہیں۔

جنگلیوں سے چھینا ہوا بھالا اور تلوار ہمارے پاس تھی۔ گھنے درختوں میں سے سورج کا اندازہ کیا تو لگا کہ دوپہر ڈھل رہی ہے۔ ہم دونوں جنگل میں سے آئی آوازوں پر کان دھرے محتاط ہو کر آگے پیچھے چلتے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ہمیں ایسی سرسراہٹ محسوس ہوئی جس میں غراہٹ ملی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دم سے رک گئے اگر ہم محتاط نہ ہوتے تو ہم اس شیر کی جھلک نہ دیکھ سکتے جو ہم سے ذرا فاصلے پر شست باندھے ہوئے تھا۔ میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”سندو! ڈرنا نہیں، شیر طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ احمق بھی ہوتا ہے۔ اسے اپنی طاقت کا غرور ہوتا ہے۔ اسے طریقے سے قابو کرنا ہے۔“

”کیسے۔“ اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

”الگ الگ ہو کر، توجہ بانٹ دو اس کی۔“ میں نے تیزی سے کہا اور دائیں جانب سرکنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور دوسری طرف بڑھا، اس دوران شیر پوری طرح ہمارے سامنے آ گیا۔

میرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ شیر ہمیں یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی اجنبی مخلوق اسے دکھائی دے گئی ہو۔ وہ ہمیں دیکھ کر غصے میں غرانے لگا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اچانک وہ چاروں پنجے مارتے ہوئے ایک دم سے اٹھا اور اس نے مجھ پر چھلانگ ماری۔ میں پوری طرح محتاط تھا، اس لیے ایک طرف ہو گیا۔ وہ سامنے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، میں نے پوری قوت سے تلوار اس کی گردن پر مارنا چاہی لیکن وارڈرا سا اوچھا پڑا اور اس کے سر پر لگی۔ وہ دھاڑا اور تڑپ کر پلٹا۔ اس کے زخم آ گیا تھا۔ جیسے ہی شیر کی توجہ میری جانب ہوئی، سندو نے بھالا اس کی کمر میں اُتار دیا۔ وہ اس کی جانب پلٹا تو میں نے تلوار کا وار کر دیا۔ یہاں اس کی توجہ بٹ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس پر وار کرے۔ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔ شاید اسے ہماری پلاننگ سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے اپنا رخ میری جانب کر لیا۔ وہ پوری قوت سے اٹھا اور مجھ پر چھلانگ لگائی۔ لاشعوری طور پر میں نے اپنے بچاؤ کے لیے تلوار آگے کر دی، جو اس کے سینے میں پوری اتر گئی۔ میں تلوار واپس نہ کھینچ سکا۔ وہ ایک طرف زمین پر جا گرا اور میں دوسری جانب۔ اس دوران سندو غافل نہیں تھا۔ اس نے بھالا اس کی آنکھ میں اتار دیا۔ وہ دھاڑنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ وہ شاید مر گیا تھا یا بے ہوش تھا، ہم اسے ویسے ہی چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ ایک تلوار ہی تو میرے پاس ہتھیار ہے۔ میں نے اسے نکالنا چاہا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ تلوار میں نے نکال لی۔ ہم آگے بڑھ گئے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم نے شیر کو مار لیا۔ میں اکیلا ہوتا تو اس کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا۔“ سندو نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی اور درندہ بھی ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”مثلاً کوئی دوسرا درندہ؟“ اس نے سنجیدگی سے کہا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس پر بات کرنے لگا کہ دشمن کی توجہ بٹ جائے تو کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہم یہی باتیں کرتے ہوئے چلتے چلتے گئے۔

اس وقت شام ہو رہی تھی، جب ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم ساحل کے قریب ہیں۔ لہروں کا مخصوص شور ہمیں سنائی دے رہا تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک دم سے ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر تین سیاہ پوش یوں اتر آئے جیسے کسی درخت سے گرے ہوں۔ انہوں نے گھنٹیں تھامی ہوئی تھیں اور ہمیں نشانے پر لیا ہوا تھا۔

”ہتھیار پھینک کر یہیں زمین پر لیٹ جاؤ۔“ صاف انگریزی میں حکم دیا گیا۔

”بھاگو۔“ میں نے سندو سے کہا اور ایک دم سے قریبی درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ ایک دم سے فائرنگ ہوئی، جس سے جنگل جھنجھٹا اٹھا۔ سندو نے عقل مندی یہ کی تھی کہ وہ میری مخالف سمت میں بھاگا تھا۔ ان کی گھنٹیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دور پھینک دیا۔ آواز کے ساتھ ہی ادھر فائرنگ ہونے لگی۔ سندو میری طرف دیکھ رہا تھا اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہی ہوا، اس طرف بھی فائرنگ ہونے لگی۔ میری کوشش

تھی کہ ان تینوں کو الگ الگ کر لیا جائے تو پھر مقابلہ ہو سکتا تھا، ورنہ ایک ساتھ وہ تینوں ہم پر حاوی تھے۔ جنگل کے خاص شور میں ان گن برداروں کی طرف سے خاموشی تھی۔ میں نے اوٹ میں سے سر نکال کر دیکھا، وہ تینوں سامنے تھے، اس کے ساتھ ہی فائر ہوا اور جو درخت میں لگا۔ مجھے اب ہر حال میں وہاں سے ہٹنا تھا۔ میں نے پھر ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا اور پوری قوت سے ان کی طرف پھینکا۔ میں اسی لمحے اس درخت سے اگلے درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ سندو مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ ایک گن والا وہیں کھڑا رہا، باقی دو ہماری سمتوں کا تعین کر کے محتاط انداز میں آگے بڑھے۔

میں بھی چاہتا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ آگے آرہے تھے۔ تیسرا ان کے کور پر تھا۔ میں ایک بڑا رسک لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری طرف جو آ رہا تھا، میں نے اس کی آہٹ کا انداز لگایا۔ وہ اسی درخت کی جانب جا رہا تھا، جہاں میں پہلے تھا۔ وہ جیسے ہی مجھ سے سات آٹھ قدم کے فاصلے پر رہ گیا، میں ایک دم سے نکلا اور پوری قوت سے تلوار اس کی جانب پھینک دی، وہ گھومتی ہوئی گئی اور اس کے سینے پر جا کر لگی۔ وہ ایک لمحے کو ہل گیا، اس کا ہاتھ ٹرانسیر پر تھا، فائر نہ جانے کس سمت ہوئے، لیکن میں اس کی بوکھلاہٹ کا فائدہ لینا چاہتا تھا، میں نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھ کر قلابازی کھائی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا اور میرا دونوں کا فاصلہ تھا، وہ میری طرف گن سیدھی نہ کر سکا اور میں نے اس کی گن ایک جھٹکے سے چھین لی۔ وہ اپنے زور میں آگے کی طرف دہرا ہوا تو میں نے اس کے منہ پر گھٹنا مارا۔ اس کے منہ سے چیخ ابھری۔ میں نے گھا کر گن اس کے سر پر ماری۔ چٹاخ کی آواز آئی وہ زمین بوس ہو گیا۔ اس کے ساتھ میں زمین پر جا پڑا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ میرے اوپر سے گزر گئی۔ اب وہ دونوں میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے تاک کر کور دینے والے کے ماتھے کا نشانہ لیا، اگلے ہی لمحے وہاں سوراخ ہوا اور وہ کئے ہوئے فہمیر کی مانند زمین بوس ہو گیا۔ تیسرا جو سندو کو تلاش کر رہا تھا، وہ چھپ گیا تھا۔ میں نے اونچی آواز میں سندو کو پکارا۔ اس نے جواباً میرا نام لیا۔

”تیسرا اکدھر ہے، دو ختم ہیں۔“

”وہ ہمیں چھپ گیا ہے، میں نکالتا ہوں اسے۔“ میں جانتا تھا کہ یہ اس کا دھوکا تھا۔ اس لمحے فائر ہوا۔ وہ اس نے سندو کی آواز پر کیا تھا، میں اس کی لوکیشن سمجھ گیا۔ میں نے برست مارا۔ اگلی ہی لمحے ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں فوراً ہی اس کی طرف نہیں بڑھا۔ بلکہ رکا رہا۔ سندو نے مجھے دیکھ کر سر نکالا تبھی اس گن بردار نے بھی سر اٹھایا۔ اس نے گن سیدھی کی، لیکن میں نشانہ لگا کر فائر کر چکا تھا، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

ہم نے تینوں کی گنیں اٹھائیں۔ ان کی تلاشی لینے پر فاضل راؤ بھی ملے۔ ایک کے پاس پستل بھی تھا۔ وہ ہاتھ آتے ہی مجھے ایک گونہ تسکین مل گئی۔ اس کے علاوہ ان کی جیبوں سے کچھ کام کی چیزیں بھی ملیں، جیسے چاقو، مٹی ٹارچ وغیرہ۔ ایک کی جیب سے فون ملا۔ میں نے پہلے تو اسے وہیں چھوڑ دینا چاہا، پھر ایک خیال کے تحت اسے بھی لے لیا۔

ہم آگے بڑھ گئے تھے۔ ہاتھ میں اسلحہ آ جانے سے کافی اعتماد آ گیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اب جنگل سے کیسے نکلا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اب نکلنا مشکل تھا۔ سندو تیز چل رہا تھا کہ میں نے اس سے کہا۔

”آہستہ چلو، اور بہت دھیان سے۔“

”یار ساحل پر پہنچ جائیں، پھر.....“ اس نے تیزی سے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

”وہاں تمہاری پھوپھی بیٹھی ہوئی ہے روٹیاں پکا کے، اوئے، یہ درختوں سے اتر سکتے ہیں تو ہمارے استقبال

کے لیے وہاں بھی لوگ ہو سکتے ہیں، اس سے پہلے راستے میں بھی کوئی مل سکتا ہے۔“ میں نے سختی سے کہا تو ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا اور بولا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے، ساحل پر تو ہم سامنے ہوں گے، جنگل سے فائر کرنا آسان ہو سکتا ہے، اور پھر کون سا وہاں کوئی کشتی ہمارے انتظار میں ہوگی۔“

”کشتی بھی مل جائے گی، لیکن آہستہ چلو۔“ میں نے کہا اور قدم بڑھاتا چلا گیا۔ سندو بھی پرسکون انداز میں چلتا چلا گیا۔

اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا، جب ہم جنگل کے سرے پر پہنچ گئے۔ وہاں سے آگے بھوری مائل سفید ریت تھی۔ کافی آگے جا کر نیلگوں سمندر تھا۔ تاحد نگاہ پانی، جس پر ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں اداس کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

انسان بھی بڑا عجیب ہے، سمجھتا ہے منظر اس کے اندر کو بدل دیتے ہیں، حالانکہ وہ خود اپنے اندر کی اداسی کو خود محسوس کر کے اسے خود پر طاری کر لیتا ہے۔ چاہے تو اگلے ہی لمحے اپنے اندر پڑے کسی انہونے جذبے کو طاری کرے اداسی کو ختم کر سکتا ہے۔

”کتنا حسین منظر ہے یار۔ ایسی کئی جگہوں پر عیاشی کے نہانے کتنے منظر میری یادوں میں محفوظ ہیں۔“ سندو نے کہا تو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اپنے اندر کو بدل لیا۔ میں ایک دم سے خوشگوار ہو گیا۔ میں نے سندو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیکھو۔ رات گزارنے کے لیے، ہمیں اس جاتی ہوئی روشنی کا فائدہ لے کر کوئی چٹان بنا لینی چاہئے۔“

میرے یوں کہنے پر مجھے لگا کہ میں نے اسے یادوں سے نکال دیا ہے۔ وہ سر جھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں، ہمیں ایسا ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میری پھوپھی تو آنے والی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ہتھ لگا دیا۔ پھر چند لمحوں بعد بولا۔ ”یار۔ ارونی کیا یاد آئی، بھوک محسوس ہونے لگی ہے۔“

”اپنے آپ کو تیار کر لے، ممکن ہے ہمیں ایک دو دن بھوکا رہنا پڑے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں کل صبح تک، دن کے وقت میں جنگلی پھل تلاش کر لوں گا اور اگر کوئی شہد کا چھتا.....“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف دیکھتے ہوئے رُک گیا۔ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

وہاں تھوڑے فاصلے پر ایک تالاب تھا۔ جہاں کچھ ہرن پانی پی رہے تھے۔

”روٹی نہ سہی لیکن پیٹ بھرے کا سامان تو ہو سکتا ہے۔ یہ ہرن.....“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”تم کھا لو گے؟“

”بھوک کے لیے کیا نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں آگے بڑھ گئے۔ سندو ایک طرف چلا گیا۔ اس نے وہاں جا کر فائر کر دیا۔ وہ ہرن انتہائی تیزی سے میری جانب بڑھے۔

میں چمبا ہوا تھا۔ ایک ہرن میرے قابو آ گیا۔ باقی نکل گئے۔ سندو ہنستا ہوا میرے پاس آ گیا۔ تب میں نے کہا ”دیکھو، اسے بتاؤں گا میں۔ تم لکڑیاں اکٹھی کرو اور آگ جلاؤ، میں اتنے میں.....“ لفظ میرے منہ ہی میں رہ گئے۔ سندو نے ایک طرف اشارہ کیا، تو میں نے اس جانب دیکھا۔

ساحل کی طرف کافی فاصلے پر ایک جیب آ کر رکی ہوئی تھی۔ وہ بند جیب تھی، جسے سفاری یا جنگل کے لیے لایا گیا ہو۔ وہ رُک رہنے کے بعد ایک دم سے یوں مڑی کہ اس کا رخ سیدھا ہماری جانب تھا۔ اگلے ہی لمحے

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ فون ہماری نشاندہی کر رہا تھا۔ جو میں نے اس سیکورٹی والے کی جیب سے لیا تھا۔ میں نے تو یہ سوچ کر فون لیا تھا کہ اس سے باس کے ساتھ بات کروں گا، جب بھی اس نے رابطہ کیا لیکن وہی فون اب ہمارے لیے پھندا بن جانے والا تھا۔ میں نے جیب سے فون نکالا اور سندو سے کہا۔

”سندو جلدی سے کوئی کپڑا دو یا۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی قمیص پھاڑ دی۔ کپڑے کی ایک جچی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے تیزی سے مضبوطی کے ساتھ وہ فون اس میں باندھا اور پکڑے ہوئے ہرن کے گلے میں باندھ دیا۔ میں نے اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد کہ وہ کہیں گرنے جائے اس ہرن کو چھوڑ دیا۔ وہ ہرن قلا نہیں بھرتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔

”آؤ درخت پر۔“ میں نے کہا اور قریب کھڑے ایک بڑے درخت پر چڑھنے لگا۔ سندو نے بھی ایسا ہی کیا۔ میرے پاس دو گئیں تھیں۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک ٹہنی پر اپنے آپ کو جما کر اس جیب کو دیکھنے لگا۔ وہ جیب جنگل کے اندر آئی اور پھر ہمارے نیچے سے گذرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔

”نہ بچان ہی بنی اور نہ ہی کھانے کا بندوبست ہوا۔ لگتا ہے یہ رات یونہی گزرنی پڑے گی۔“ سندو نے کہا تو میرا قبضہ نکل گیا۔ ”اچھا ہوا وہ ہرن ہمارے کام آ گیا، ورنہ وہ جان سے جاتا اور ہمارے پاس آگ جلانے کو ماحس نہیں تھی اور نہ ہی چمقنا۔“ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو چند لمحوں بعد بولا۔ ”ایسے ہی موقع کے لیے کہتے ہیں تھہ نہ پچھتو کوڑی یا وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔“ سندو نے جل کر کہا پھر وہ خود ہی ہنسے لگا۔

”اب تو ساری رات اس درخت پر گزارنا پڑے گی۔“ میں نے کہا تو ہماری باتیں شروع ہو گئیں۔

وہ پوری رات ہم سو نہیں سکے۔ شاید ہماری آنکھ لگ جاتی لیکن ایک تو یہ ڈر تھا کہ نیند میں ہم درخت سے نیچے گر سکتے ہیں اور دوسرا رات بھر کئی جھپٹیں وہیں ساحل پر گھومتی رہیں۔ ممکن ہے وہ ایک یا دو ہی ہوں اور بار بار چکر لگا رہی ہوں۔ وہ رات جس طرح درخت پر کٹی، اس کی اذیت میں ہی جانتا ہوں۔

اس وقت دن کی نیلگوں روشنی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، جب ساحل سے کچھ فاصلے پر ایک اسٹیر آن رکا۔ کچھ دیر تک مجھے یہی لگا کہ یہ میرے لاشعور کا کرشمہ ہے جو مجھے دھوکا دے رہا۔ جس طرح صحرا میں سراب دکھائی دیتا ہے اس طرح شاید جنگل کی اس صورت حال میں بھی کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہو، مگر جب سندو نے بھی تصدیق کی تو مجھے یقین ہو گیا۔ مگر یہ اسٹیر کس کا ہو؟ کیا انہوں نے ہمیں پکڑنے یا مارنے کے لیے کوئی نفری منکوا لی ہے؟ یا پھر یہ کوئی دوسرے لوگ ہیں؟ اس سے پہلے کہ ہم اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرتے، میری نگاہ ان چار جھپٹوں پر پڑی جو کچھ فاصلے پر دائیں جانب ساحل پر کھڑی تھیں۔ ان میں سے کئی سارے لوگ نکلے اور کچھ ہی دیر میں انہوں نے پوزیشنیں لے لیں۔ جیسے آنے والے ان کے دشمن ہوں۔

صورت حال کافی دلچسپ ہو گئی تھی۔ آنے والے نبھانے کون تھے اور ان کا سامنا کرنے والے یقیناً باس کے لوگ تھے۔ جو کل سے اس ساحل پر گھوم رہے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ دشمن ہیں یا دوست؟ ہمیں اس صورت حال میں کیا کرنا ہوگا؟ اس کے لیے ہمیں ابھی زکنا تھا۔ میں نے سندو کو ساتھ لیا اور درخت سے نیچے اتر آیا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر آن چھپے، جہاں سے سامنے کا منظر بالکل واضح تھا۔

کافی وقت گذر گیا۔ سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ تبھی اسٹیر سے انگریزی میں اعلان کیا گیا۔

”ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا راستہ روکنے کے لیے تم لوگ آگے ہو، ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے، ہم جنگل میں بالکل داخل نہیں ہوں گے اگر تم لوگ ہمارے دو آدمی سندو اور جمال واپس کر دو۔ ہم واپس چلے

ہائیں گے۔ ہمیں اس کے علاوہ کوئی غرض نہیں۔“

ہم دونوں ہی اپنا نام سن کر اچھل پڑے تھے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اعلان جہال کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ ہم تک اپنی آواز پہنچانا چاہ رہا ہو اور جان بوجھ کر ہمارا نام لے رہا ہو کہ ہم ان کی آمد بارے جان جائیں۔

”لے بھی سندو، اپنے دوست پہنچ گئے۔“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ جو اسٹیر پر آئے ہیں، تمہیں کیسے پتہ وہ ہمارے دوست ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا، پھر خود ہی بولا۔ ”کوئی بھی ہوں یا ہمارا نام لے رہے ہیں، یہاں سے تو نکلیں گے۔“

”سمجھو، اب نکل گئے۔“ میں اعتماد سے کہا۔

اس نے دوبارہ پھر اعلان کیا۔ اس کا اعلان ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ساحل کی طرف سے فائر ہونے لگے، کئی گئیں سیدی ہو چکی تھیں۔ یہ اسٹیر والوں کو پیغام تھا کہ موت ان کے استقبال کے لیے موجود ہے۔

”جمال! یہاں پیچھے سے ہم نہ فائر کر دیں، سینڈوچ بنا دیں سالوں کو؟“ وہ نفرت سے بولا۔ مجھے لگا اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا

”ممبر کرو، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور غور سے اس سارے ماحول کو دیکھنے لگا۔ ساحل کی طرف سے فائرنگ ہونے لگی تھی۔ لیکن اسٹیر کی طرف سے خاموشی تھی اور وہ ابھی تک ساحل کے قریب نہیں آیا تھا۔

انہوں کی آڑ میں کچھ لوگ کھڑے تھے اور ان کا رخ سمندر کی جانب تھا، ان لوگوں کی پشت ہماری طرف تھی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گذر گیا۔ اکا دکا فائرنگ ہوتی رہی۔ اس دوران میں نے تینوں گنوں کو لوڈ کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں نشانہ لوں اور ایک ہی گولی میں ایک بندہ نہ پھڑکے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے پاس بلٹ زیادہ تھیں اور وہ بندے بہت کم۔

وہ لوگ شاید اُکتا گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسٹیر کی طرف مسلسل فائرنگ شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا تھا وہ ان کی فائرنگ کی ریج میں نہیں تھا، ورنہ وہ اب تک اسٹیر کو نقصان پہنچا چکے ہوتے، اسٹیر والوں نے عقل مند کی تھی کہ اب تک فائر نہیں کیا تھا، وہ اپنا اسلحہ ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب جو کچھ کرنا تھا ہمیں ہی کرنا تھا۔ میں نے ایک گن سندو کو دے کر کہا۔

”دیکھ! تو نے ہر فائر ایک نئی جگہ سے کرنا ہے، یہ اتنی تیزی سے ہو کہ وہ بھی سمجھیں کہ ہم دونوں فائرنگ کر رہے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا، لیکن تم؟“ اس نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

”تم صرف یہ دیکھنا کہ وہ گرتے کیسے ہیں۔“

سندو گن لے کر مجھے سے کافی فاصلے پر چلا گیا۔ تیز روشنی میں ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اٹمانہ لیا اور ایک بندہ گر گیا۔ پھر میں رکا نہیں، مسلسل فائر کرتا رہا۔ میرے سامنے ہلچل مچ گئی۔ اس اچانک افتاد ہ وہ بولکھا گئے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ ہم یہاں بھی ہو سکتے ہیں اور ان پر فائر بھی کر سکتے ہیں۔ وہ انہوں کے اندر چھپ گئے۔ اندر سے جوابی فائر ہونے لگا۔ جو بلاشبہ اندھا دھند فائرنگ تھی۔ سندو اپنا کام کر رہا تھا۔ جس سے انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فائر ہو کہاں سے رہے ہیں۔ میں نے جھپٹوں کے ٹائروں کا نشانہ لیا۔

”یہ ہی ٹائر پھٹے، انہوں نے جھپٹیں بڑھا دیں۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں جا سکے، کوئی کچھ فاصلے پر اور کوئی زیادہ فاصلے پر ریت میں دھنس گئیں۔ ساحل پر لاشیں بکھری پڑی تھیں۔“

مجھے پورا یقین تھا کہ اسٹیئر سے یہ سارا منظر دیکھا جا رہا ہوگا۔ کیونکہ جس لمحے وہاں سے گاڑیوں نے حرکت کی وہاں سے راکٹ فائر ہوا، جو سیدھا ایک جیب میں لگا تو اس کے پرچے اڑ گئے۔ ایسی صورت حال میں جو بھی دوسری جیبوں کے اندر تھے، وہ نکل کر بھاگے۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا راکٹ فائر ہو گیا۔ دوسری جیب کے ساتھ ہی تیسری کو بھی آگ لگ گئی۔ ساحل پر بھاگنے والے چار لوگ تھے۔ میں نے تین کو ہی گرایا تھا کہ ایک کو سندو نے مار گرایا تھا۔ ماحول بدل چکا تھا۔

اب ہمارے پاس چھپے رہنے کا وقت نہیں تھا۔ میں محتاط انداز میں نکلا تو سندو بھی میرے پیچھے لپکا۔ ہم تیزی سے سمندر کی جانب بھاگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسٹیئر سے ایک کشتی ساحل کی جانب آنے لگی تھی۔ تقریباً دس منٹ میں ہم سمندر کی لہروں میں تھے، کشتی ہمارے قریب آگئی اور میری توقع کے مطابق اس میں جہال تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

”تو ٹھیک تو ہے نا؟“

”میں ٹھیک ہوں، تو دیر مت کر جہال، ہم اب مزید خطرے میں ہوں گے، جلدی کر“ میں نے جواب دیا تو اس نے فوراً ہی بوٹ کا رخ پھیرا اور واپس اسٹیئر کی جانب تیزی سے چل دیا۔ میں اسٹیئر کے عرشے پر کھڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ بوٹ اٹھائی گئی تھی اور اسٹیئر واپسی کے لیے مڑ چکا تھا۔ ایسے میں ایک فربہ مائل، خوبصورت سی لڑکی میرے پاس آ کر بولی۔

”مجھے روینیت کور کہتے ہیں، آپ ڈفی ہیں، نمی سے ذم خراب ہو سکتے ہیں، آئیں، میں آپ کی ڈریننگ کردوں۔“

”وہ سندو، مجھے سے زیادہ ڈفی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے اس کی ڈریننگ کر دی ہے۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا تو میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اسٹیئر پر کافی لوگ تھے۔ عملے کے چند لوگوں کے علاوہ جہال کے ساتھ آئے کچھ لوگ تھے۔ ڈریننگ کے فوراً بعد ہمیں کھانے کو کافی کچھ مل گیا۔ کھانے کے دوران جہال اور روینیت کور کے ساتھ سندو بھی تھا۔

”تم کس خطرے کی بات کر رہے تھے؟“ جہال نے پوچھا تو میں نے کہا۔

”ان کے پاس ہیلی کاپٹر ہیں۔ ممکن ہیں دو سے زیادہ ہوں، میرا اندازہ ہے کہ وہ کھلے سمندر میں.....“ لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ ایک بندہ بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا اور تیزی سے بولا۔

”ہماری ریخ میں ہیلی کاپٹر آ رہا ہے۔ دو چار منٹ میں واضح ہو جائے گا۔“

”اسے اس وقت تک کچھ نہیں کہنا، جب تک اس کی طرف سے فائر نہ ہو، اگر ایک بھی فائر ہوتا ہے تو اسے تباہ کر دو۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ یہ سن کر وہ واپس چلا گیا۔ ہم نے کھانا وہیں چھوڑا اور کسی مکث سے جلے کی جوابی کارروائی کے لیے تیار ہو گئے۔

ہمیں فضا میں ہیلی کاپٹر دکھائی دینے لگا تھا۔ عملے کا ایک بندہ راکٹ لانچر لیے تیار تھا۔ ویسے بھی اسٹیئر کا اپنا ایک حفاظتی نظام تھا۔ ہم پوری طرح تیار تھے۔ ہیلی کاپٹر ایک دائرہ میں گھوما اور دور چلا گیا۔ پھر جیسے ہی واپس ہوا تو اس میں سے ایک راکٹ فائر ہوا۔ جو سیدھا اسٹیئر کے اوپری اگلے حصے کو توڑتا ہوا سمندر میں جا گرا، تب تک نیچے سے تین راکٹ فائر ہوئے۔ دو عملے کے لوگوں نے فائر کیے تھے اور ایک اسٹیئر سے ہوا۔ دو فائر خالی گئے تھے لیکن تیسرا ہیلی کاپٹر کے درمیان میں لگا تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور ہیلی کاپٹر گھومتا ہوا سمندر میں جا گرا۔

عملے کے لوگ جلدی سے فائر زدہ حصے کی جانب بڑھے۔ ایسا نقصان نہیں تھا کہ ہم سفر نہ کر سکتے۔

”ہم نے کتنی دیر کا مزید سفر کرنا ہے۔“ میں نے عملے کے بڑے سے پوچھا۔

”ایک گھنٹہ مزید لگ سکتا ہے۔“

”ایسا ہی حملہ مزید ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس.....“ میں نے کہنا چاہا لیکن وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”اب نہیں ہوگا، میں نے اپنی کہنی کو بتا دیا ہے، وہ اور سمندری نگرانی کرنے والے ہماری حفاظت کے لیے آ رہے ہیں، اب فضا کی نگرانی ہوگی، آپ اطمینان رکھیں۔“ اس نے تسلی دی تو میں عرشے پر بڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے احساس ہوا کہ کم از کم میں یہاں غیر قانونی ہوں۔ مجھ سے تو بہت پوچھ گچھ ہوئی۔ یہی بات جب میں نے جہال سے کہی تو روینیت کور تیزی سے بولی۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں، یہ بات پہلے ہی اس بندے سے ہو چکی ہے، جو اس اسٹیئر کا مالک ہے اور وہ کہنی چلاتا ہے۔ عملے کے ساتھ آپ کو نکال لیا جائے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”تم یہاں تک پہنچے کیسے؟“ میں نے جہال سے پوچھا تو اس نے سندو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اس کی وجہ سے۔“ یہ کہہ کر اس نے ساری بات اختصار سے بتا دی۔ تبھی سندو کے چہرے پر زندگی دوڑ گئی۔ وہ خوش ہوتا ہوا بولا۔

”یہ داہگرہ کی مہر ہے کہ وہ پانچ پیارے بچ گئے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے زندگی مل گئی۔“ یہ کہہ کر وہ چوکتے ہوئے بولا، ”اس جزیرے کی لوکیشن کا پتہ کیسے لگا۔“ سندو نے پوچھا تو جہال نے کہا۔

”میں خود حیران ہوں۔ یہ کسی نمبر پر ٹریس نہیں ہوا، پھر بس ٹیپی مدد ملی اور ہم یہاں پہنچ گئے۔“ اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ اس کی ٹیپی مدد کون سی ہو سکتی تھی۔ اسے روہی سے بتایا گیا ہوگا۔ انہوں نے کیسے پتہ کیا، یہ بہر حال وہی جانتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا، ”کل بارہ بجے کے قریب ہمیں پتہ چلا تھا۔ اور پتہ ہے یہ جزیرہ کہاں ہے، ممبئی کے قریب، ہم چند ہی گڑھ سے ممبئی رات پہنچے اور رات ہی کے آخری پہر بندرگاہ سے نکلے تھے۔“

”چندی گڑھ سے ممبئی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں وہیں تھا، میں، روینیت اور ابھیت تینوں، اڑھائی گھنٹے کا فضا کی سفر تھا، اس دوران ساری بات بہت ہو گئی۔ ہم تم لوگوں تک پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے۔“ جہال نے بتایا تو سندو نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جہال ایک بات پوچھوں؟“

”جتنی مرضی پوچھو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم نے اچانک اس جزیرے سے نکلنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔ تم نے تو صرف اس باس سے ایک ملاقات ہی کی تھی اور میرے خیال میں تم یہاں کے بارے میں جانتے تک نہیں تھے، تمہیں تو اتنا بتایا گیا کہ یہ جزیرہ کس قدر اہمناک ہے اور ہم نے دیکھا بھی کہ خطرناک ہے، یہ سب کیسے سوچا جتھے کہ تم یہاں سے نکل سکتے ہو؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے میرے ساتھ آنے فیصلہ کیوں کیا؟“ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”میں یہاں سے تنگ آ چکا تھا، وہ آئے دن نئی کہانی سناتا تھا۔ مجھے اس کے کسی مقصد کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا، تم نے ہمت کی، تو میں نے بھی یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ بس ایک گمان تھا کہ تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تو تم میں کچھ ہے؟“ اس نے پھر سے الجھتے ہوئے اسی لہجے میں کہا، جیسے اسے سمجھ نہ آرہی ہو کہ

وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور پوچھنا کیا چاہتا ہے۔

”دیکھ سندو! تمہیں تو صرف گمان تھا، لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ میں اس جزیرے سے نکل جاؤں گا۔“ میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا، پھر تیزی سے پوچھا۔

”یہ یقین کیوں تھا؟“

”اس کا مجھے بھی نہیں پتہ۔“ میں نے اس سے چھپاتے ہوئے کہا۔

”آپ اس بندے سے پہلی بار ملے، پہلی ملاقات کے بعد ہی اس سے بغاوت کر دی، ایسا کیوں ہوا؟ آخر کیا دیکھا تھا کہ.....“ رونیت نے پوچھا۔

”وہ انسانیت کا دشمن ہے رونیت، یہ بات مجھے پہلی ملاقات ہی میں معلوم ہو گئی تھی اور بس۔“ میں نے کہا تو وہ بھی سر ہلا کر رہ گئی۔

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن مجھے اطمینان تھا۔ جس وقت مجھ سے اس بندے نے، جو خود کو آزاد کہتا تھا، بات کی تو مجھے اس کے مشاہدہ کی ساری حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ جال میں پھنسے ہوئے جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہ سب آشکارا ہو گیا۔ وہ شیطان کا چیلہ تھا۔ مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ جس وقت میں نے اس کی بات سن کر پورے اعتماد کے ساتھ اس جزیرے سے نکل جانے کا کہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ ابھی مجھ سے مزید کام لیے جانے ہیں۔ اب میں جو بھی ارادہ کروں گا، وہ ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اب میرا ذاتی کوئی مقصد نہیں رہا تھا، میں نے اپنا آپ انسانیت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

میں سندو اور رونیت کو سمجھانا بھی چاہتا تو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ جب تک انسان اپنے بارے میں آگہی نہیں حاصل کر لیتا، اُس وقت تک اسے بہت سی سامنے کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ باتیں کرتے ہوئے، ہم ممبئی بندرگاہ تک آن پہنچے۔ وہاں ایک مرحلہ تھا جو طے ہوا۔ دوپہر کے بعد ہم وہاں سے نکل گئے۔



جو ہو کے علاقے میں موجود اشوک منگر کالونی میں ایک پرانے جنگلے میں ہم سب آن ٹھہرے تھے۔ وہاں میں، جہاں، سندو، رونیت کو اور ہر پال سگھ تھے۔ ہم سب وہاں سے نکل سکتے تھے لیکن ایک تو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ میں کیسے جاسکتا ہوں۔ دوسرا ابھی آزاد اور جزیرے والا معاملہ ختم ہوا نہیں لگتا تھا۔ سب سے پہلے سندو نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر سبھی نے چند دن وہیں ٹک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں ایک کمرے میں تھا۔ خوب آرام کر لینے کے بعد شام کے وقت جاگا تو جنگلے کے لان میں چند لوگ بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ میرے سامنے صوفے پر جین اور ٹی شرٹ پڑی ہوئی تھی۔ میرے ساز کے جوتے نیچے دھرے ہوئے تھے۔ میں نہا کر فریش ہوا اور کپڑے پہن کر نیچے ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ جہاں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور سندو ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ ان کی باتوں سے یہی انداز ہوا کہ وہ اسی کے لوگ تھے، جو گینگ ختم ہونے کے بعد ڈر کر ممبئی بھاگ آئے تھے۔ یہ سب کچھ اس کے مقامی دوست نے کیا تھا۔ وہ کون تھا ہمیں اس سے غرض نہیں تھی۔ سندو نے ہنگی شراب کی بوتل آدمی سے زیادہ چڑھائی ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح مخمور تھا۔ تبھی وہاں کے ملازم نے کھانا لگا دینے کا کہا۔ رونیت اور ہر پال پہلے ہی وہیں موجود تھے۔ کھانے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران سندو پوری طرح سے خمار آلود تھا۔ سبھی میں نے پوچھا۔

”سندو، کیا تو نے یہ پتہ کیا ہے کہ یہ جزیرہ اب تک لوگوں کی، یا حکومت کی نظر میں کیوں نہیں آیا تھا، کیا کسی

کو بھی نہیں پتہ تھا اس کا؟“

”یار ہم نے وہی دیکھا، جو اس نے ہمیں دکھایا، ایسے کئی جزیرے ہیں، جو کچھ لوگوں کی اپنی ذاتی ملکیت میں بھی ہیں۔ ہمیں یہی یاد کر لیا گیا کہ ہم دنیا کے پتہ نہیں کون سے خطے میں ہیں، تاکہ ہماری ہمت ہی نہ پڑ سکے وہاں سے بھاگ جانے کی۔“ اس نے بڑی پختہ کی بات کی تھی

”اور وہاں پڑے لوگ شاید اب بھی یہی سمجھ رہے ہوں گے۔“ رونیت کو نے سمجھتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے، انہیں جانے دیا گیا ہو یا پھر وہ مار دیئے گئے ہوں، اب اس کی کوئی کھوج کرے گا تو پتہ چلے گا۔“ اس نے چڑھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”یاد رہے اتنا طاقت ور آدمی ہے کہ مجھے پاکستان سے اٹھا کر اس جزیرے تک پہنچایا اور کسی سرحد یا حکومت کا کوئی رد عمل نہیں ہوا۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کے طاقت ور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، لیکن وہ جو بھی تھا یا ہے، بڑے جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک تھا۔ یہ لوگ بہت بڑے پیمانے پر اسفلنگ کرتے ہیں۔ یہ اس کی قسمت خراب تھی یا ہماری خوش قسمتی کہ ہم اس کے چنگل سے نکل آئے۔ ورنہ وہاں سے نکلنے کا کوئی چانس لگتا نہیں تھا۔“ سندو نے یوں کہا جیسے اسے جیتے ہوئے دن یاد آگئے ہوں۔

”کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟“ میں نے بالآخر وہ سوال کیا جس کے لیے میں نے اتنی تہمید باندھی تھی۔

”مجھے تو ہوا بہت شک تو ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے، وہاں پر دوسرے لوگوں کے اندازے تھے، اب ایک دو دن میں کنفرم ہو جائے گا، میں یہاں رکا بھی اسی لیے ہوں، میں اسے چھوڑوں گا نہیں، جس نے میرا سارا سیٹ اپ تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ سالہا گرباج، اسے بھی یہاں لایا جا رہا ہے، بائی روڈ، پتہ چل جائے گا۔ بس ایک دو دن میں، میرا مال ہڑپ کر جانے والا تھا، میں سکھاتا ہوں سارے کو سبق۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

مجھے لگا اسے کافی چڑھ گئی تھی۔ میں اسے ٹوکنا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ نشے میں باتیں کرتا رہا۔ میں اور جہاں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ رونیت کو پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ جبکہ ہر پال اس کے ساتھ ہاتوں میں مشغول ہو گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔ ہم دوسری منزل کے ایک ایسے کمرے میں آگئے جہاں جنگلے کا لان دکھائی دے رہا تھا۔

”یار جہاں ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی، یہ رونیت کافی ماہر ہے، اس نے بہت کچھ ہیک کیا، لیکن جزیرے کے نمبر سے کچھ معلوم نہ کر سکی، اس نے بتایا تھا کہ جزیرے پر کوئی خاص لہروں کی سیکورٹی ہے، لیکن روی والوں سے کچھ نہ چھپ سکا، یہ کیسے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا

”یہ بات مذاق میں مت لو، ایسا کچھ ہے کہ ہم روی والوں سے چھپ نہیں سکتے؟“ اس نے کہا۔

”کیا تم ان سے چھپنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اوائے نہیں اوئے، میں یہ پتہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایسا ہے تو ہمیں اس کا پتہ ہونا چاہئے۔ تاکہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

”تم اپنا سمرت کھپاؤ، سمجھ لو کہ ایسا ہے، کیسے ہے، اسے چھوڑو، اگر ایسا ہے تو بہت اچھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک دوسری بات، اب جزیرہ تو گولائی میں تھا، ہمیں تو نہیں پتہ تھا کہ تم کہاں ہو۔ ہم نے ایک چکر لگایا،

دوسرے چکر پر روی کی طرف سے تمہاری لوکیشن بتا دی گئی کہ تم کہاں پر ہو، اسی وجہ سے ہم ایک خاص جگہ پر رک گئے، اور وہیں پر تم تھے، یہ کیسے؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

”دیکھو، مجھے اس کا جواب معلوم نہیں ہے، یا تو روی فون کر کے پوچھ لویا پھر جب ہم وہاں گئے تو پتہ کر لیں گے۔ اب بتاؤ پروگرام کیا ہے؟“ میں نے پرسکون ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”یار، بڑا دل کرتا ہے ہر پریت کو دیکھنے کے لیے، میں نے تو سوچا تھا کہ چند گز سے سیدھا اوگی پنڈ جاؤں گا، مگر یہاں تو ایک نیا ہی پھنسا ہو گیا ہے، پتہ نہیں کب مل سکوں گا ہر پریت کو سے۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا تو میں ہنس دیا

”کل شام تک کی بات ہے، اگر اس آزاد کے بارے میں کچھ پتہ چلتا ہے تو ٹھیک، ورنہ ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ اس بار تو میں بھی اوگی پنڈ جاؤں گا۔ جہاں کچھ عرصہ میرا باپ رہا تھا۔“ میں نے بھی کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو کچھ دیر تک ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں میلے والے میدان سے لیکر یہاں ممبئی آجانے تک الجھا ہوا تھا۔ اس میں بہت ساری باتیں ایسی تھیں جو مجھے سوچنے پر مجبور کر رہیں تھیں۔ میں جب جال میں پھنسا ہوا تھا، اس دوران جو مشاہدہ مجھے ہوا، وہ کسی مقصد سے خالی نہیں تھا، اس کا یقین مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب آزاد نے اپنی بات کی تھی۔ مجھے ایسی حربے سمجھنے میں ایک لمحہ بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے باقی مشاہدے کی بھی سمجھ آرہی تھی۔ جزیروں سے نکلنے کا میرا اپنا فیصلہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ارادہ کر لیا تو یہاں سے نکل بھی جاؤں گا، چاہے راستے میں جو بھی رکاوٹ آئی۔ میرا یقین ہی میرے کام آیا۔ میں عام حالات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایسا کر گذروں گا، جو میں نے کر دیا۔ اس وقت میرے سامنے ایک ہی سوال تھا، کیا میرا یہاں آنا کسی مقصد کے لیے ہے؟ کیا مجھے اس پر سوچنا چاہئے یا پھر خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہئے؟ میں بے چین ہو گیا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا اور پھر چلتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا۔ نم دار ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تو ذرا سکون محسوس ہوا۔ مجھے لگا جیسے میری بے چینی مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی ہے اور کوئی ہے جو میرے اندر سے مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بڑی ساری چھت پر میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد مجھے لگا جیسے میں مراقبے میں ہوں۔ میرے اندر سے اٹھنے والی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ پھر کوئی کہنے لگا

انسان کے لیے علم سب سے اہم شے ہے۔ اسی باعث اسے اشرف المخلوق کا درجہ نصیب ہوا۔ کیونکہ یہ علم ہی شعور پیدا کرتا ہے۔ شعور کے ساتھ ہی انسان میں جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس کا ارادہ بنتا ہے۔ یہی ارادہ جب پختہ ہو کر یقین میں بدلتا ہے تو پھر وہ عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس سے انسان کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ کیا ہے؟ علم سے عمل تک کا سفر، سوچ کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ وہ کون سی شے ہے جو علم سے عمل تک کا سفر طے کروانی ہے؟ خوف، لگن، شوق، محبت، عشق، جنون ان میں سے جو بھی ہو، ویسا ہی عمل ہوگا۔ کوئی بھی سوچ انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان ہی کی عظمت ہے کہ اس میں سوچ اٹھتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس میں سوچ پہلے کہیں پڑی ہوئی ہے جو اپنا اظہار کرتی ہے۔

انسانی سوچ کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ وہ سامنے جو کچھ دیکھتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ کیسے بنا؟ اس کے بنانے والا کون ہے؟ دوسری سوچ کا پہلو یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں ہے؟ گویا وہ

حال میں رہ کر ماضی اور مستقبل دونوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ دراصل یہی انسان کی عظمت ہے کہ وہ سوچتا ہے۔ یہی سوچ اسے اپنے رب سے ملاتی ہے اور کائنات کی گتھیاں کھول کر اسے تسخیر کرتا چلا جا رہا ہے۔ انسانی سوچ جو اس کے اندر سے ابھرتی ہے دراصل اس کے خالق کا عطیہ ہے۔ جس سے انسان اپنی عظمتوں کو بھی چھوسکتا ہے اور پستیوں میں بھی گر سکتا ہے۔

خود انسان کو اس کا اپنا احساس دلانے والی قوت اس کے اندر ہی پڑی ہے۔ یعنی یہی سوچ، یہ سوچ صرف انسان ہی میں آسکتی ہے۔ سوچ، شعور اور شخصیت بھی ایک سفر ہے۔ جو انسان کے اپنے ہی اندر پڑا ہوا ہے۔ یہی عطیہ خداوندی ہے اور یہی یہی کن فیکون کا راز بھی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ خالق اور مخلوق کا تعلق کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ یہی سوچ ہے جو انسان کو اس کے اپنے مقامات، اس کی اپنی ہی صورت میں دکھائے جاتے ہیں۔ کیونکہ خود انسان میں نئے نئے مقامات پڑے ہیں۔ اسی صورت سے ان مقامات کا ظہور ہے۔ ظاہری مراجب کی حفاظت کے ساتھ مقام بھی اسی میں عیاں ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنے مقام کا تعین خود کرتا ہے اور جب تک وہ ماضی اور مستقبل میں برابر دیکھتا ہے، وہ مقام انسانیت پر فائز رہتا ہے، صرف ایک طرف دیکھنا، انسانیت کے زمرے میں گناہ ہے۔

یہی وزہ خاک، جب سوچتا ہے تو آسمانوں سے بھی مادرا ہو جاتا ہے، آسمانوں کا راز داں بن جاتا ہے، یہی وہ سوچ ہے جو کائنات کی تسخیر کے لیے روبہ عمل ہے۔ جب وہ اپنے مستقبل کو اپنے ماضی سے جوڑتا ہے بھی وہ راز داں بنتا ہے۔ اس سارے معاملے کی وضاحت صرف ڈی این اے جیسے ڈزے سے ہو سکتی ہے، پورا ماضی اس کے اندر پڑا ہوا ہے، اور مستقبل بھی کن فیکون کا راز داں ہونے اور اپنے اصل مقصد کو پہچاننے کے لیے ماضی اور مستقبل میں برابر جھانکنا ہوگا۔ کیونکہ یہی رب تعالیٰ کی منشاء ہے۔ کیونکہ کن فیکون ہو رہی ہے، یہ لاحدود ہے، اور لاحدود تو میں ہی انسان کو نوازی گئی ہیں۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خالق کے بارے میں سوچتا ہے اور یہ بھی فطرت ہے کہ اگلی کئی صدیوں کے منصوبے بنا کر روبہ عمل ہے۔ جو اس کو برابر رکھتا، وہ اپنے مقام کا تعین کر سکتا ہے اور کائنات اس کی ہر طرح سے مددگار ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے اندر پڑی صلاحیتیں یوں دیکھ سکتا ہے جیسے ہر طرح کے سامان سے بھرے ہوئے تاریک کمرے کو روشن کر دیا جائے۔ پھر جس وقت جس شے کی ضرورت ہو وہاں سے لے سکتا ہے۔ یہ کوئی نئی یا نوکھی بات نہیں۔

میرے اندر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں کافی دیر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر نیچے آ کر جہاں کے ساتھ بیڈ پر سو گیا۔ اگلے دن دوپہر تک سوتے رہنے کے بعد ہم نے لُنج اکیلے ہی کیا۔ سندھ صبح سے غائب تھا۔ اس کے ساتھ رویت اور ہر پال بھی تھے۔ سہ پہر کے بعد وہ آیا۔ اس وقت چائے پیتے ہوئے اس نے بتایا کہ چند گز سے وہاں جو کچھ اس کے پاس تھا، وہ سب بھی جو گر باج اور نیہا اگر وال کے ہتھے نہیں چڑھا تھا، سب کچھ اس نے پروفیسر کو دے دیا تھا۔ وہ لوگ سکھ دھرم کے لیے کام کر رہے تھے۔ سکھ دھرم کے نام پر اس نے اپنا سب کچھ دان کر دیا تھا۔ وہ ایک قریبی گردوارے کا تھا لیکن گئے تھے۔ پھر کچھ لوگوں سے ملنے اور شاپنگ کرنے کے بعد آئے تھے۔ وہ میرے اور جہاں کے لیے بھی سامان لائے تھے۔ وہ ساری رواد سناچکا تو میں نے پوچھا۔

”آزاد کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”اس کے بارے میں ابھی کچھ پتہ نہیں چلا ہے۔ لیکن کچھ کڑیاں مل گئی ہیں۔ اس کا پتہ چل جائے گا۔“ سندھ

نے گہری سنجیدگی سے کہا، پھر ایک دم سے بولا۔ ”وہ ابھیت سنگھ آگیا ہے چند ہی گزہ سے ممبئی بائی روڈ تقریباً پچیس گھنٹے کا سفر ہے جو اس نے کیا، گرجا کو لے کر پہنچ گیا ہے۔ اسے بے ہوشی کا انجکشن دے کر ایک لاش کے طور پر ایمبولینس میں رکھ کر لایا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ابھیت تو سو رہا ہے۔ نیچے، تہ خانہ ہے ادھر، وہیں رکھا ہے گرجا کو۔“ سندو نے کہا۔

سندو پتہ نہیں کیسے اس آزاد کے بارے میں پتہ کر رہا تھا، ایک دم سے میرے ذہن میں آیا کہ جسمیند کو بہت زیادہ معلومات ہوتی ہیں، اس سے پتہ کیا جائے۔ چائے پی کر ہم اپنے کمرے میں گئے تو میں نے جہاں سے کہا۔ اس نے جا کر سندو کا فون لیا اور جسمیند کو کال کی۔ اس نے ایسے کسی گینگ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ سو شام ہونے تک کسی بھی قسم کی کوئی معلومات ہمیں نہ مل سکی۔ اب میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ روہی کا تھا۔ اس وقت اس بنگلے میں نہ تو نیٹ کی سہولت تھی اور نہ ہی کوئی کمپیوٹر تھا۔ میں اور جہاں باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے میں نے سندو کا ہتا دیا تھا۔

ایک ہوٹل کے نیٹ کیسے میں سہولت دستیاب ہوگئی۔ میری میل میں بہت ساری معلومات پڑی ہوئیں تھیں۔ فون نمبروں کی ایک فہرست کے ساتھ جو معلومات وہاں درج تھیں، اس کے مطابق وہ بظاہر ایک بین الاقوامی اسمگلرز کا گینگ تھا۔ خفیہ طور ان کا کیا کام تھا ابھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بظاہر یہ ایک امپورٹ ایکسپورٹ کی بڑی فرم تھی جزیروں پر جو بندہ ہمارے سامنے آیا، وہ محض ایک مہرہ تھا۔ اس گروہ کے اصل لوگ کہاں پر ہیں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ جن لوگوں کے یہ نمبرز تھے، وہ اگرچہ سامنے کے لوگ تھے لیکن اپنے اپنے علاقے کے طاقتور لوگوں میں شمار ہوتے تھے، جو ان کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ ممبئی میں دو ہی لوگ تھے، اور باقی مختلف شہروں کے۔ انہی میں ایک نمبر ایسا تھا، جس کے ساتھ یہ سب رابطہ کرتے تھے۔ وہ نمبر ممبئی شہر کے علاقے دادر کا تھا۔ ان کے بارے میں مزید معلومات لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہدایات دی گئی تھیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ممبئی ہی میں ایک بندے کا فون نمبر دیا گیا تھا اور اس سے رابطہ کرنے کی بات کہا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کوڈ تھے، جس سے میری اور جہاں کی شناخت ہوتی۔ میں نے وہ سارے نمبر نوٹ کر لئے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے اندر ایک نئی قوت بھر گئی ہے۔ میں جہاں کے ساتھ ہوٹل سے نکلا تو بہت پر اعتماد تھا۔

ایک پی سی او سے میں نے اسی نمبر پر فون کیا۔ کچھ دیر باتوں میں کوڈ کے تبادلے کے بعد وہ مجھے پہچان گیا۔ ”جانتی گھبرانے کا نہیں بڑو، اپن ہے ادھر۔ جراسا ٹائم دو، اپن خد تیرے پاس ہوئے گا۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”میں گھبرا نہیں رہا، بس جلد از جلد اس تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو چل پھرا سن کر، اپنی لوکسین بتا، پھر دس منٹ بعد مجھے پھون لگا۔ چل۔“ اس نے کہا تو میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اسے بتا دیا۔

”کتنے لوگن ہیں تیرے ساتھ؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اور میرا دوست۔“ میں نے کہا۔

”چل دس منٹ بعد۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ دس منٹ بعد میں نے فون کیا تو اس نے مجھے ایک

فون کا نمبر اور ساتھ ہی اسے کہنے کے لیے کوڈ بھی بتایا۔ میں نے فون رکھ کر اطراف میں دیکھا۔ اسی نمبر کی ایک فون کھڑی تھی۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔

وہ ہمیں مختلف سڑکوں، بازاروں کے بعد ایک پرانے سے علاقے میں لے آیا۔ تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہاں سے ہم پیدل چلے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے ہوتے ایک پرانی طرز پر بنے مکان کے سامنے لے آیا۔ دیکھ بھال اس مکان کی اچھی تھی۔ ککڑی کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد ایک لمبی ایوڑمی تھی۔ اس کے آگے بڑا سارا صحن تھا، ایک طرف سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ وہ ہمیں لیتا ہوا چوٹی منزل کی چھت پر چلا گیا۔ چھت کے درمیان میں چار پرانی کرسیاں، ککڑی کے بیج اور چار پائیاں پڑی تھیں۔ چند لوگ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے، کچھ منڈیروں کے ساتھ کھڑے گیس لگا رہے تھے۔ ایک چار پائی پر ایک پتلا سا، لمبے قد کا اڈھیر غرض شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ گیا۔ اس نے کرتا شلوار پہنا ہوا تھا۔

”ارے جانی بھائی کے گھر میں دیکھ، آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ ہم دونوں سے گلے ملا۔ اس کے سامنے دھری چار پائیاں میں سے ایک پر ہم بیٹھ گئے۔ تو اس نے پوچھا۔

”جمال بھائی، بولو، رم، واسکی یا.....“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں، بس ہم باتیں کرتے ہیں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”چل جائے تو چلے گی یار۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا اور پھر متوجہ ہو کر بولا، ”اپن کو بتایا، ادھر کوئی بڑا اسمگلر ہے اور میرے منج میں یہ بات نہیں گھس رہی، اکھا ممبئی میں کون اسمگلر ہے جیسے جانی بھائی نہیں جانتا، پر پھر بھی، جو کوئی بھی ہوئیں گا، ٹریس کرے گا اور تم جو ڈیمانڈ کرے گا، دے گا، اپن کے پاس لڑکا لوگ بہت ہے، خلاص کرنا ہے، وہ بولو۔“

”پہلے تو مجھے ایک فون دو، کچھ کرنسی، اور ادھر سے باہر جانے کے لیے کوئی بھی شناخت تاکہ اگر ضرورت پڑے تو فوراً نکل سکوں۔“

”یہ تو ہو گیا، اور بولو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب ظاہر ہے جانی بھائی کوئی پلان کروں گا نا، تو بتاؤں گا، مجھے یہ گینگ کوئی چھوٹا موٹا نہیں لگتا، بہت پھیلا ہوا ہے، مجھے لگتا ہے یہ بھارت اور پاکستان میں دور تک پھیلا ہوا ہے۔“ میں نے اپنی رائے دی۔

”ارے یار، یہ جو ہم دونوں کا کنٹری ہے نا، یہ سالامیدان بنا ہوا ہے، وہ بول رہا تھا نا ادھر حکومت کرنے کا، وہ ٹھیک بولا، ورلڈ میں چند لوگن ہیں جو یہ سب سین پارٹ کر رہا ہے اور یہ سب ادھر لڑ رہا ہے۔“ جانی بھائی نے انفس زوہ لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھا نہیں جانی بھائی۔“ میں نے اس کی بات کو سمجھنا چاہا۔ اسی دوران چائے آگئی، جیسے پہلے ہی بنی ہوئی ہو۔ وہ ہم پینے لگے تو وہ بولا۔

”دیکھ۔ یہ سالادورلڈ ہے نا چار حصوں میں ہے، ایک یورپی پونین ہے، دوسرا امریکہ اور اس کے ساتھ کے لوگن، تیسرا چین اور اس کے ساتھ والے، اور چوتھا ہمارا کنٹری، یہ سمجھو سب کا نئی نیٹ، پہلے تینوں، ادھر فائیت کر رہا ہے، سب پیسے کے لیے، اُن کے لوگن اتنا نہیں خلاص ہوتے جتنا ہمارا لوگن گاجر مولی بنے ہیں، یہ ہمارے کنٹری کے لوگ سمجھ نہیں ہیں، یہ اگر سمجھ گئے، خود کو پادفل بنا لیا تو یہ بھی ان کے جیسا ہو جائے گا۔ اس میں یہ جو جیوش ہیں نا، یہ سب سے ڈرتی ہیں، سارے ورلڈ میں ان کا گند ہے۔“ جانی بھائی خاصا جذباتی ہو گیا

تھا۔ میں اس پر کچھ نہیں بولا، یہ بہر حال اس کی رائے تھی۔

”خیر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر حتمی انداز میں کہا۔

”تم ایسا کرو، اپن کے ہوٹل میں ٹھہرو، ادھر بہت کام کا لوگن ہے، جو ڈیمانڈ کرے گا، وہ ہی ہوگی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے ہی انداز میں سیاست اور سیاسی منظر نامے پر بھرپور گفتگو کرنے لگا، جس کی مجھے ذرہ برابر بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس دوران ہم نے چائے ختم کی تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا جانی بھائی، چلتا ہوں، رابطہ رہے گا۔“

”ارے کہیں نہیں جا رہا، اپن کے پاس ہی ٹو، ڈونٹ وری۔“ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔ میں پلٹ گیا۔ گلی میں آئے تو وہی ٹیکسی والا ہمیں واپس لے کر چل دیا۔ مجھے ذرا بھی پتہ نہیں چلا کہ ہم کن ہوٹل بھلیوں میں گئے تھے اور وہاں سے کیسے بڑی سڑک پر نکل آئے۔ وہ ہمیں لیتا ہوا ایک فائینوٹار ہوٹل میں آگیا۔ میں اس بھل بھلیوں والے مکان اور اس ہوٹل کو دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس کے مزید کتنے کاروبار ہوں گے۔ وہاں اس مکان میں وہ پتہ نہیں کس حیثیت سے رہ رہا ہوگا۔ میں نے اس بارے میں سارے خیال جھٹکے اور اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ لابی سے ہوتا ہوا کاؤنٹر پر چلا گیا۔ اس نے بس ایک دو جملے کہے۔ پھر مجھے سلام کیا اور باہر کی جانب چل دیا۔ اگلے چند منٹ میں ہمارا وہاں اس طرح استقبال ہوا جیسے ہم دی دی آئی پی مہمان ہوں۔

تیسری منزل کے ایک سوئٹ میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ میں نے حسب عادت کھڑکی کھول کر دیکھا، سامنے سمندر تھا۔ اگرچہ وہاں خاصی روشنی تھی لیکن رات کے اندھیرے میں دور تک نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ اس سارے دورانے میں جہاں بالکل خاموش رہا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے دیکھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا اپنی سوچوں میں گم تھا۔

”کیا بات ہے جہاں، تم اتنے خاموش کیوں ہو؟“

”یار، ہم کیا کر رہے ہیں، یہ جو ٹو نے جانی بھائی سے مدد لی ہے، اس کا کیا فائدہ، ٹو کرنا کیا چاہتا ہے۔“ وہ ایک دم سے جوش میں بولا، جیسے ناراض ہو۔

”میں اس آزاد کو ڈھونڈھ نکالنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”وہ ایک مہرہ تھا، وہ کہاں ملنے والا ہے۔ ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اتنی جلدی میں ہم مار کھا سکتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر پلان کے ساتھ.....“

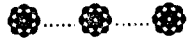
”یہی کریں گے میری جان۔ ابھی ہم بیٹھیں گے تو سب سمجھا دوں گا۔“ میں نے کہا تو ایک طویل سانس لے کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ بجا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ویٹر ٹرائل کھینچی ہوئی اندر آ گئی۔ اس نے لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

”گڈ ایوننگ سر! یہ کھانا آپ کے لیے اور یہ فون۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب میں سے ایک مہنگا سیل فون نکال کر جہاں کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے پکڑا اور مجھے دے دیا۔ تبھی وہ بولی۔ ”سر، میں آپ کی یہاں ہوسٹ ہوں۔ جو چیز بھی چاہئے مجھے بتا دیں۔“

”فی الحال تو کچھ نہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”تو پھر آپ ایسا کریں کہ کھانے کے بعد تیار ہو جائیں۔ میں ابھی آپ کے لیے ڈریس لاتی ہوں۔ آپ کی

تصویریں بنانے کے لیے ایک فوٹو گرافر آئے گا تو.....“ اس نے بڑی ادا سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی ”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا تو وہ واپس مڑ گئی۔ اگلے دو گھنٹوں میں یہ سب ہو گیا۔ بلاشبہ میرے نقلی کاغذات تیار ہوتا تھے۔ جہاں نے مجھ سے بات نہیں کی، وہ سکون سے سو گیا تھا۔ جبکہ میں جاگتا رہا۔



وہ ایک روشن صبح تھی۔ ہم خوب سونے کے بعد بہت فریش اٹھے تھے۔ ناشتہ کر لینے کے بعد ہم وہاں سے ہانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر وہ ویٹرس آئی، اس نے میرے کاغذات مجھے تھمائے، اس کے ساتھ مہولے بڑے پرانے نوٹوں کی چند گڈیاں مجھے دیں۔

”ہم ابھی یہاں سے نکل رہے ہیں۔“ میں نے اسے بتایا تو اس نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے، میں اس کے لیے بندوبست کر دوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے جہاں کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ تبھی میں نے فیصلہ کر لیا۔ اس لڑکی کو اپنے کاغذات دیتے ہوئے کہا۔

”دو ٹکٹ، امرتسر کے لئے۔“

میرے یوں کہنے پر جہاں نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر ایک دم سے ہنس دیا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ اس لڑکی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے سند کو بتا دیا کہ میں جا رہا ہوں۔ بعد میں رابطہ کروں گا۔



شام کے سائے پھیل رہے تھے، جب ہم اوگی پنڈ کے نزدیک پہنچے تھے۔ امرتسر پہنچتے ہی میرا جی چاہا کہ میں رتن دیپ سنگھ سے ملوں، اُن کے پاس کچھ دیر ٹھہروں، لیکن میں نے پھر کسی وقت ان سے ملنے کا سوچ کر لکھی لی اور ترن تارن تک آئے۔ یوں تین جگہ سے ٹیکسیاں بدلنے کے بعد اوگی پنڈ آن پہنچے۔ سامان کے نام ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لیے سڑک ہی سے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور پھر اوگی سے باہر کھیتوں میں لکھی سرخ رنگ والی کٹھی کے باہر پیدل چلتے ہوئے آن رکے۔ باہر بنتا سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جہاں کو دیکھ کر یوں ہلکا جیسے کوئی جن دیکھ لیا ہو۔

”اُدھائی جی آپ، ایک دم سے، نہ کوئی پیغام نہ..... اور یہ آپ کے کیس.....؟“

”جل یار بننے آگیا ہوں نا، ٹو سنا ٹھیک ہے نا، باقی باتیں پھر کریں گے۔“ جہاں نے کیس والی بات گول راتے ہوئے کہا تو اس نے گیٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے، واہ گرو کی مہر ہے، پر یہ کیس.....“

جہاں نے اس کی نہیں سنی۔ ہم اندر چلے گئے۔ ڈرائیونگ روم میں ایک اویز عمر خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نگاہ ہم دونوں پر ڈالی، وہ یوں ہمیں دیکھنے لگی جیسے بے ہوش ہو جانے والی ہو۔

”اودھ پھو، رب کا نام ہے، چیخ نہ مار دینا، یہ میں ہی ہوں جہاں۔“

”یہ سنتے ہی وہ اٹھی اور بڑے ہی جذباتی انداز میں اسے گلے لگا لیا، وہ کافی دیر تک اُسے سینے سے لگائے، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ ہونہ ہو جمال پتر ہے؟“

”جی پھو پھو، میں جمال ہی ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے مجھے بھی گلے سے لگا لیا

”پر پتر اچانک، فون تو کیا ہوتا۔ انوجیت تجھے لینے.....“ کلجیت کور نے کہنا چاہا تو جہاں جلدی سے بولا۔
”وہ ہے کدھر؟“

”وہ تو باہر ہی گیا ہے، ہر پریت.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ہر پریت کور کسی طوفان کی طرح آئی ا پھر ایک دم سے رک کر جہاں کو دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو
”یہ میں ہی ہوں پریتو۔“ جہاں نے شوفی سے کہا۔

”پر تو وہ جہاں نہیں جو یہاں سے گیا تھا۔“ اس نے جس انداز سے کہا، اس سے وہ مجھے کڑنڈھی لگی۔
”میں وہی ہوں، پتہ نہیں کس طرح اپنا آپ بچا کر لایا ہوں، چل، مجھے نہ مل، جمال سے تول لے۔“
جہاں نے جیسے ہی میرا تعارف کر لیا وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو
”جمال دیرے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے گلے لگ گئی۔ پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بہت یاد کرتے تھے ہم تمہیں۔ پر یہ اچانک.....“

”ساری باتیں ابھی پوچھ لو گی یا بیٹھنے بھی دو گی۔“ جہاں نے مصنوعی غصے میں کہا۔
”تمہیں تو بے بے جی ہی بیٹھنے کو کہے گی، میں نہیں، جمال دیرے ٹو بیٹھ، میں لسی لے کے آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جس طرح طوفانی انداز میں آئی تھی، اسی طرح آندھی کی مانند واپس پلٹ گئی۔ اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ جہاں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
”بہت غصے میں لگتی ہے یار۔“

”چل منانے میں کون سا وقت لگے گا۔“ میں نے کہا تو کلجیت کور بیٹھتے ہوئے بولی۔
”رب کی بڑی مہر ہے پتر کہ تو آگیا، روز پتہ نہیں کیسے کیسے خیال آتے تھے، بڑا سرکھاتی رہی ہے ہر پریت میرا، کبھی ادھر کی بات تو کبھی اُدھر کی بات۔“

”لگتا ہے پھوپھو، اب تو بیروں میں جیسے سفر بندھ گیا ہے، ایک دن بھی سکون سے نہیں گذرا۔ خیر آپ سناؤ، اُدگی میں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔“ جہاں نے ایک لمبی سانس لے کر کہا
”سب ٹھیک ہے،“ یہ کہہ کر وہ اٹھتے ہوئے بولیں، ”تم بیٹھو، میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“
انہیں گئے ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ ہر پریت کور آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں کافی کچھ تھا۔ وہ ہمارے سامنے رکھ کر بولی۔

”جمال دیرے، یہ اچانک آنا، کوئی سامان نہیں جس سے باقاعدہ سفر کی پلاننگ کا احساس ہو، لگتا ہے کوئی معاملہ ٹھیک نہیں؟“

”یہ تو جاسوس کب سے ہو گئی؟ اب آگئے ہیں تو سب کچھ بتا دوں گا، کیوں پریشان ہوتی ہے۔“ جہاں نے شرارت بھرے غصے میں کہا۔

”میں تم سے بات نہیں کر رہی پھر تو جواب کیوں دے رہا ہے۔“ وہ منہ پھلا کے بولی۔
”اچھا چل، ختم کر دے غصہ، اور میرا ایک کام کر دے۔“ میں نے ہر پریت کی طرف دیکھ کر کہا۔
”بول دیرے کیا کام ہے؟“ اس نے جلدی سے پوچھا تو میں نے کہا۔

”ایک الگ تھلک کمرہ، میں نے اس جہاں کے ساتھ نہیں رہنا، یہ بہت بور کرتا ہے۔“ میں نے کہا تو جہاں ایک دم سے ہنس دیا اور ہر پریت میری بات سمجھتے ہوئے ایک دم سے شرمدادی، پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”آپ لسی بیٹیں، میں کمرہ ٹھیک کر دیتی ہوں۔“

وہ چلی گئی تو میں لسی پیتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ اگلے چند گھنٹے بہت اہم تھے۔

دوسری منزل پر کمرے کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔ میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے لیپ ٹاپ رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرا رویہ سے رابطہ ہو گیا۔ رویہ کے آپریشن روم میں سرمد کے علاوہ دو تین مزید لوگ بھی تھے۔ کچھ دیر اس معاملے پر بات ہوتی رہی۔ پھر میں نے اپنا خیال بتایا۔ وہ انہوں نے مان لیا۔ میں پوری طرح تیار ہو گیا۔
میرے سامنے پاکستان اور بھارت کے مختلف شہروں کے ان لوگوں کے نمبر تھے، جو وہ نام نہاد اچورٹ اٹکھورٹ کمپنی چلانے والوں کے بڑے تھے۔ بلاشبہ وہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ میں نے ان میں سے آٹھ فہروں کے لوگوں کے نام پڑے۔ میں نے سب سے پہلے جانی بھائی سے رابطہ کیا۔ میں نے جب اس سے مدد چاہی تو وہ ایک دم سے پر جوش ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ رابطے میں رہا۔ ممبئی کے دو لوگوں کے بارے جانی بھائی کو لہہ دیا، اس نے ایک گینگ بنا کر مجھے اس کا نمبر دے دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اسی مناسبت سے مجھے رویہ سے ان لوگوں کے نمبر ملنے لگے جو مقامی طور پر ان کا وہاں مقابلہ کر سکتے تھے۔ جیسے جیسے مجھے ان لوگوں کے نمبر ملتے گئے، میں ان سے رابطہ کرتا گیا۔

پوری رات یہی سلسلہ چلتا رہا۔ جہاں کو پتہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، اس لیے اس نے ہر پریت اور انوجیت کو اپنے ساتھ مصروف رکھا اور پھر اسے ہر پریت کو بھی منانا تھا۔ اس لیے مجھے کسی نے بھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ رات کے آخری پہر جب میں نے اپنے طور پر سارے انتظام کر لیے اور ان لوگوں کے ذمے کام لگا دیے تو مطمئن ہو گیا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے اب بھی کوسوں دور تھی۔ میں رات بھر ان کے ساتھ رابطے میں رہا۔
اگلی صبح، ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ میں نے اُدگی کی روشن صبح کا مزہ لیا۔ سب کے ساتھ ناشتہ کیا اور پھر سے لڑے میں آگیا۔ میں نے ایک بار پھر سے رابطہ کرنا شروع کر دیا۔ سب نے ان آنکھوں کے بارے میں بتا دیا کہ وہ کون ہیں اور ان کے معمولات کیا ہیں، وہ کس وقت اپنے آفس جاتے ہیں۔ میں نے ان سب کو شوٹ کر اپنے کا کہا تھا اور انہوں نے اسی مناسبت سے اپنا اپنا خیال دیا۔ دن کے ساڑھے دس اور گیارہ کے درمیان یہ کام ہوتا تھا۔ سبھی نے گھر، آفس کے پاس یا راستے ہی کا پلان کیا تھا اور میں اس پر مطمئن تھا۔

دس بجے کے بعد مجھے سب سے پہلے چند گڑھ ہی سے پروفیسر کے لوگوں نے بتایا کہ یہاں وہ بندہ پار کر اگیا ہے، جس کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر آکھوں جگہوں سے یہ خبر مل گئی۔ سب نے کامیابی سے وہ مشن پورا کر دیا تھا۔ تبھی میں نے رویہ کی مدد سے ممبئی شہر کے علاقے دادر میں موجود اس گڑھ کا نمبر ملایا جن سے ان سب کے رابطے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا۔
”ہیلو، پریم ناتھ! کیسے ہو؟“

”کون ہو تم، اپنا تعارف کراؤ، اور کہاں سے بات کر رہے ہو۔“ اس کا لہجہ حقارت بھرا تھا
”اس خطے پر حکومت کرنے کا خواب تم لوگ دیکھ رہے ہو اور پوچھ مجھ سے رہے ہو کہ میں کہاں سے بات کر رہا ہوں، میں نے تم جیسے احمق لوگ نہیں دیکھے؟“ میں نے انتہائی طنز سے کہا۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ اس بار اس کے لہجے میں کافی حد تک تجسس تھا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو صرف آٹھ لوگ کام آئے ہیں، یہ تو شروعات ہے۔“ میں نے طنز یہ کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ وہ وحشت سے بولا۔

”صرف میری سنو پیادے، چاہتا میں یہ ہوں کہ اپنے بڑوں سے میری بات کراؤ، یا اپنے جیسے اس پیادے کو میرے حوالے کرو، جو اپنا تعارف آزاد نام سے کرواتا ہے۔“ میں نے نفرت سے کہا۔

”اوہ! تم وہی تو نہیں ہو، جو اس کے جزیرے سے بھاگ گئے تھے۔ ہم خود تیری تلاش میں ہیں۔“ وہ تیزی سے یوں بولا، جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

”تو پھر آؤ، ملیں، کہاں ملنا ہے؟“ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی جان پیاری نہیں؟“ اس نے غصے میں کہا

”بالکل بھی نہیں پیاری، میں نے اپنا تعارف آٹھ لوگوں سے کروا دیا ہے، امید ہے کہ ان کے بارے میں اطلاعات مل سکیں ہوں گئی، اپنے بڑوں سے بات کر کے مجھے بتاؤ، کہاں ملنا ہے یا اپنا سیٹ اپ ختم کر کے، برصغیر پر حکومت کرنے کا خواب پھر خواب ہی رہنے دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

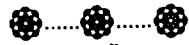
”دیکھو، ہم تمہیں اپنا حصہ بنانا چاہ رہے ہیں اور تم دشمنی کر رہے ہو، تم شاید جانتے نہیں، ہم شام سے پہلے تمہارا اور تمہارے ساتھ جڑے لوگوں کا اس دنیا سے خاتمہ کر دیں گے۔“ اس نے پھر سے کہا۔

”چلو پھر میں شام کے بعد تمہارے ساتھ رابطہ کرتا ہوں، اپنے باقی لوگوں کو الٹ کر دو۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

فی الحال مجھے بس اتنا ہی کرنا تھا۔ ان کے سارے سیٹ اپ کی چولیں مل گئی تھیں۔ انتقاماً وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میں نے سرمد کو نورنگر کے بارے میں کہا تو اس نے وہاں کی سیکورٹی کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتا دیا۔ وہاں ہر طرح سے خیریت تھی۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال کے لیے نپٹنے کا پورا انتظام تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ جانی بھائی کی بات کافی حد درست تھی اور وہ لوگ جو برصغیر پر حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے، انہوں نے یہ خواب ایسے ہی نہیں دیکھ لیا تھا۔ اس سارے خطے پر جو لوگ حکومت کر رہے ہیں یا طاقت جن کے ہاتھوں میں ہے، وہ زیادہ تر موروثی ہیں۔ جتنی بھی سیاسی پارٹیاں ہیں، ان کے جو بڑے لیڈر ہیں، ان میں زیادہ تر موروثی خاندان ہیں یا پھر ان کے پروردہ لوگ۔ یہ سب نفرت کی سیاست کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو کچلنے اور نیست و نابود کر دینے کے سوا انہیں بات ہی کوئی نہیں آتی۔ لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے انہیں کچھ ہوا ہو، ہاں مگر ان میں چند ایسی مثالیں ہیں، جنہیں بیرونی طاقتوں نے مقامی لوگوں کے تعاون سے ختم کیا۔ اس بات کو سمجھنے کی واضح دلیل یہ ہے کہ اس موروثی سیاست کو مضبوط سے مضبوط تر کیوں کیا جا رہا ہے؟ کوئی طاقت ایسی ہے، جو انہیں سہارا دیئے ہوئے ہے تاکہ ان کے ایجنڈے پر کام ہوتا رہے۔ دوسری طرف سارے خطے میں عوام کے وہی مسائل ہیں، غربت، بیماری، بے روزگاری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، کرپشن ایسے ناسور اب تک قوموں کے بدن پر سے بہہ رہے ہیں۔ حکمرانوں اور عوام کے درمیان جو طبقہ ہے، وہ زیادہ ظالم ہے۔ وہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان اپنا مفاد رکھ کر دونوں کو اندھا کیے ہوئے ہے۔ ذات پات، قوم پرستی، فرقہ واریت، مذہبی جنونیت، عصیت، ان سب کو پروان کون چڑھا رہا ہے؟

ایسے میں بیرونی طاقتیں، اپنا اثر رسوخ انہی لوگوں پر استعمال کرتی ہیں جو طاقت ور ہوتے ہیں۔ انہی کے ساتھ مل کر اپنے منصوبے پورے کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعے بات سمجھی جاسکتی ہے کہ سن چوتھر میں اسلامی سربراہی کا فرس لاہور میں اسلامی دنیا کے لیے جو پلان ترتیب دیا گیا تھا۔ بینکنگ سے لے کر نیوز ایجنسی تک، کاروباری معاملات سے لے کر کرنسی تک کو طے کر لیا گیا تھا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہو پایا، سب کچھ

کاغذوں میں رُل گیا اور حالات ہی بدل گئے۔ وہ پلان آج یورپی یونین کی صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔ یہ سب کیسے ہوا؟ اس سوال کو لے کر چلیں تو بہت سارے معاملات سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ خطہ میدان کارزار بنا ہوا ہے، یہاں کی تسلیں اپنوں ہی کے تسلط میں ہیں، نفرت کی سیاست نے دماغوں کو ماؤف کر کے رکھا ہوا ہے اور سب سے زیادہ خون یہیں بہہ رہا ہے؟ یہیں سب سے زیادہ آلہ کار بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ جو اپنی طاقت کے لیے انسانیت کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ میر جعفر اور میر صادق تو آج کے منافقین کے سامنے لے لکتے ہیں۔



جہاں کے کمرے میں ہر پریت بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے جو بھی اور جیسی بھی تھی، اپنی روداد سنا دی تو ہر پریت نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو اس لیے تو نے کیس کٹا دیئے؟“

”لیکن میرے اندر جو سکھ ہے، وہ تو ویسا ہی ہے نا؟“ جہاں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تو اب بھی یہاں نہیں رہے گا، چلا جائے گا، میرا انتظار تو جیسے ۱۰ ویسا ہی رہے گا۔“ ہر پریت نے اپنی سوچ کے مطابق نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔

”یہ تیرے سامنے ہے، میں اب اس مشن سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔“ جہاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

”تو پھر میں بھی سکھنی ہوں، میرا فیصلہ بھی سن لے، میں تیرا انتظار کروں گی، اور تیرے انتظار میں چاہے مجھے ۱۰ سال آجائے۔“ اس نے بھی حتمی انداز میں کہہ دیا

”تو پھر، غصہ کس بات کا، آؤ، جو ذرا سا وقت ہمیں ملا ہے، اسے خوشی خوشی گزار دیں۔ پھر پتہ نہیں یہ لمحات ۱۰ بارہ ملیں گے بھی یا نہیں۔“ جہاں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے رکی رہی پھر اس لے پہننے سے جا لگی۔ نجانے کب کے رُکے آنسو تھے جو بہہ نکلے یا پھر آنے والے وقت کے احساس سے وہ رُو ا لی تھی۔ جو بھی تھا، وہ جی بھر کے روئی تھی۔ جب جی ہلکا ہو گیا تو اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک کہتا ہے جہاں، محبت قربانی مانگتی ہے اور میں قربانی دینے کو تیار ہوں۔“

”ہل اب یہ جذباتی باتیں ختم کر اور تیار ہو جا، جالندھر چلتے ہیں، کچھ شاپنگ کریں گے، کچھ کھائیں بیٹیں گے پھر واپس آ جاتے ہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”مجھے کوئی شاپنگ نہیں کرنی، کھانے پینے کو یہاں بہت کچھ ہے۔ ہمیں پہلے بلیمبر سنگھ سے ملنا ہے، پھر اس لے اہد ایلو دیٹ گل سے۔ یہاں کی تمہاری جائیداد کے بارے میں ابھی کچھ مسئلے ہیں، وہ حل ہونے والے ہیں۔“ ہر پریت نے اسے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا

”تیرے ساتھ جانا ہے تو جدھر لے جا۔“ جہاں نے شوخی سے کہا۔

”وہ جمال کو ساتھ.....“ ہر پریت نے کہنا چاہا تو جہاں نے اس کی بات کا نٹے ہوئے کہا

”اُھ ہموڑ اُسے، اُسے سونے کی پیاری ہے، اسے سونے دے، ہم تب تک آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک دم سے مان گئی اور کو در جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ انہوں نے جاتے ہوئے بلیمبر سنگھ ملتے ہوئے جانا تھا۔



سورج ڈوب چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے انوجیت میرے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ میں کمرے میں پڑا تھا، پھر ہوا خوری کے لیے اوپر چھت پر چلا گیا۔ مغرب کی جانب اوگی پنڈ پھیلا ہوا تھا، جو قہصے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں چہل قدمی کرتا رہا پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر روئی کی مدد سے پریم ناتھ سے رابطہ کرنے کو کہا لیکن اس سے پہلے میں نے نورنگر کے بارے میں تسلی کر لی۔ وہاں بالکل سکون تھا۔ پریم ناتھ جیسے میرے ہی انتظار میں تھا۔

”جو ہونا تھا سو ہو گیا، ہم تم سے اب بھی دوستی چاہتے ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”کیا تمہارے بڑوں کا یہی فیصلہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے، یہ فیصلہ ہوا تو میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔“ اس نے مفاہمانہ لہجے میں جواب دیا

”اب اپنے بڑے کے بارے میں تم مجھے بتاؤ گے یا میں اسے خود تلاش کر لوں۔“ میں نے پوچھا۔

”اسے تو ہم نے بھی نہیں دیکھا، اگر تم تلاش کر سکو تو شوق سے؟“ اس نے جواب دیا

”یہ بات تم خود کہہ رہے ہو یا پھر اپنے بڑوں کی مرضی سے۔“ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگا دیا۔

”تم انہیں تلاش نہیں کر سکتے، اس لیے بات مذاق میں ٹال رہے ہو۔“ اس نے طنز کیا

”تمہارا وہ مہرہ آزاد، اس نے بھی مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا، کہاں ہے وہ، تاکہ وہ میرے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو نبھائے۔“ میں نے پوچھا۔

”افسوس، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا، خیر تم اگر ہمارے ساتھ دوستی کرتے ہو تو بات آگے بڑھائیں؟“

اس نے پوچھا۔

”تم لوگوں کی وجہ سے میرا اب تک دس ملین ڈالر سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے، پہلے وہ دو، پھر بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اگلے ہی لمحے بولا۔

”بولو، کہاں دیئے ہیں۔“

”کہاں دے سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”پاکستان اور بھارت میں کہیں بھی۔“ اس نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے، ممبئی کے جوہو میں اشوک گمر کی اسٹریٹ تھری پر جو بینک ہے، اس میں رقم ڈال دو، کل دس بجے تک۔ اکاؤنٹ نمبر تم تک پہنچ جائے گا، باقی باتیں پھر کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ روئی والے بھی ہمارے درمیان ہونے والی باتیں سن چکے تھے۔

جس وقت میں بات کر رہا تھا، اس دوران جہاں کو رویت کور کا فون آیا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس وقت کدور میں ایڈووکیٹ گل کے پاس تھا۔ اس کے بتانے پر میں نے رویت کور کو فون کیا۔

”تم نے جس کہنی کے بارے میں کہا تھا، میں نے اسے ہینک کر کے اس کے بارے میں ساری معلومات لے لیں ہیں۔ اس کے بارے میں ساری تفصیلات میں نے میل کر دی ہیں۔“ اس نے تیزی سے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”رویت، تم نے کبھی گاؤں کی زندگی دیکھی ہے، مطلب کبھی وقت گزارا ہے گاؤں میں؟“

”مجھے نہیں یاد کہ میں نے گاؤں میں کہیں ایک آدھ دن سے زیادہ وقت گزارا ہو۔“ اس نے حیرت بھرے

انداز میں بتایا

”ٹھیک ہے، میں تفصیلات دیکھ کر بتاتا ہوں کہ تمہیں یہاں گاؤں میں آنا ہوگا یا پھر میں ممبئی آ جاؤں، کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم ہی یہاں آ جاؤ، یہاں موسم زیادہ اچھا ہے، انجوائے کرنے کا موقع زیادہ ملے گا۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا وہ کیا چاہتی ہے۔ کچھ دیر اس کے ساتھ مزید بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اگلے دن کے بعد کیا کرنا ہوگا۔ نبھانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھے اب اپنے لیے اندگی نہیں گزارنی۔

میں چھت سے نیچے آیا تو بھوتی دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو بولی۔

”بڑی بی بی، آپ کو کھانے کی میز پر بلا رہی ہیں۔“

”باقی لوگ؟“ میں نے پوچھا۔

”ان میں کوئی بھی نہیں ہیں، وہ اکیلی بیٹھی ہیں۔“ اس نے بتایا تو میں بجائے کمرے میں جانے کے اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ انوجیت رات دیر سے آئے گا اور وہ دونوں ابھی کدور سے ہی لوٹ لکے۔ انہیں بھی دیر ہو جائے گی۔ میں جب کھانے کی میز پر پہنچا تو کلجیت کور اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔

”آ جا پتر، کھانا کھا لیں۔ ان میں تو آج کوئی بھی نہیں۔“ انہوں نے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہر سٹک اپنے آپ کو سوا لاکھ کہتا ہے۔ آپ مجھے دو لاکھ سمجھ لو، آپ دو لاکھ کے ساتھ پرشادے کھکھ رہے ہو۔“ مہرے یوں کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ کھانا مزے کا تھا۔ اس دوران کلجیت کور سے باتیں بھی چلتی رہیں۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والی قمل مزاج خاتون تھیں۔

کھانے کے بعد میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ اس وقت میں نے رویت کور کی تفصیلات دیکھ لی تھیں، جب وہ لی میری سائیڈ ٹیبل پر چائے رکھ گئی۔ ان تفصیلات میں کچھ نہیں تھا، سوائے ایک ایسی کہنی کہ جو عام کاروباری ہوتی ہے۔ میں چائے پیتے ہوئے سوچتا رہا، میں ان لوگوں کی تلاش میں وقت ضائع کر رہا ہوں یا اس میں سے ہلکا لٹکا گا۔ بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے سب سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور نے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلی صبح میں جلدی بیدار ہو گیا۔ میں فریش ہو کر چھت پر گیا تو جہاں پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔

”ہم رات دیر سے آئے تھے، تم اس وقت سو گئے تھے۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کر رہا، ورنہ کیا کچھ ہو گیا ہے اس کا تمہیں پتہ ہی نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے اسے لہا تو اس نے پوچھا۔

”کیا ہو گیا، ذرا میں بھی تو سنوں۔“ تب میں نے اس اختصار سے سارے واقعات بتا دیئے۔ وہ سنجیدگی سے سنتا رہا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا، ”تمہارے خیال میں اب یہاں ڈیڈ لاک ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”دیکھو۔ باقی ملکوں کا تو مجھے پتہ نہیں۔ لیکن ان ممالک میں سیاست دان وہ لوگ ہیں، پانی جن کے پلوں لے لچھے سے ہو کر گزرتا ہے۔ مطلب، ان کے سہارے کے بغیر یا ان کی معلومات میں ہوتا ہے کہ ان کے طاقے میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی ایسے گینگ پرورش پاتے ہیں۔ وہ ان سے پورا پورا مفاد لیتے ہیں۔“ اس نے مجھے

سمجھاتے ہوئے کہا

”مگر ہم تو کسی سیاست دان کا سہارا نہیں لے رہے؟“ میں نے جوابا کہا۔

”ہم کون سا ٹینگ بنا کر باقاعدہ کوئی کام کر رہے ہیں اور پھر تم میری بات نہیں سمجھتے، بڑے سیاست دان اپنا گروہ رکھتے ہیں اور کئی گروہ اتنے طاقت ور ہیں کہ وہ خود اپنے سیاست دان تخلیق کرتے ہیں تاکہ ان کی طاقت کا سکہ جمار ہے اور وہ جو چاہیں سو کریں۔“ اس نے پر زور انداز میں کہا

”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو یہ جو آٹھ بندے ضائع ہوئے ہیں، یہ کوئی عام کیڑے مکوڑے تو تھے نہیں، اگر کل تم نے نوز سنی ہوتیں تو تمہیں کسی حد تک پتہ چل گیا ہوتا کہ کون لوگ رد عمل دکھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے انہیں کوئی تکلیف ہوئی ہوگی تو وہ رد عمل دکھا رہے ہوں گے، وہیں سے آگے راستہ نکلتا ہے۔“ جہاں نے بڑے پختے کی بات کہی تھی۔

”ان کے ساتھ تنظیمیں بھی احتجاج کر رہی ہوں گی، مطلب نوز پیپر دیکھے جائیں، ان میں ان لوگوں کی تصویریں بھی ہوں گی۔“ میں نے کہا۔

”جمال۔! میں نے اب تک یہی سمجھا ہے، کوئی بھی طاقت، چاہے وہ چھوٹی ہے یا بڑی، اس کی کہیں نہ کہیں دلچسپی ضرور ہوتی ہے، یہ سناخن کی بات ہے۔ وہ اس دلچسپی کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ جتنی بڑی طاقت ہوگی وہ اتنی بڑی دلچسپی رکھے گی۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

”تم اس کی کوئی مثال دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں، مثال کے طور پر ایک اسلحہ ڈیلر، یہ چاہے گا کہ اس کا اسلحہ بکے، ظاہر ہے جہاں لڑائی ہوگی وہیں بکے گا، منشیات فروش ان جگہوں پر قبضہ کرے گا جہاں منشیات بنتی ہے یا بکتی ہے۔ کوئی تیل کی دولت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، اس کے لیے چاہئے جتنے لوگ مر جائیں۔ ایک سیاست دان کو عہدہ چاہئے، وہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس طرح ایک طویل فہرست ہے۔ کہیں پر مفاد ایک ہو جاتا ہے اور کہیں پر یہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ یہی جنگ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔“ اس نے انتہائی دکھ سے کہا۔

”تمہارے خیال میں انسانی فلاح کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسا ہے، تبھی یہ دنیا بچی ہوئی ہے، رتب کا اپنا ایک نظام ہے، وہ تو چلتا ہے، انسان چاہے جو مرضی کرنا رہے۔ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وسائل پر قبضے کی اس جنگ میں رتب کا نام لے کر بھی انسانیت کو گمراہ کیا جاتا ہے۔“ اس نے درد مندی سے کہا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ شیطانی قوتیں ہیں نا،“ میں نے کہا تو وہ سوچتا ہوا بولا۔

”اب دیکھو، پاک بھارت تو رہے ایک طرف، تھائی لینڈ کا ایک شہر ہے پتایا، جس کا نام تم نے سنا ہوگا، اس ملک میں بڑا امن تھا، جس طرح بھی انہوں نے ترقی کی، یہ الگ بحث ہے لیکن، جیسے ہی وہاں پر جی ایٹ کا اجلاس ہونے کی تیاریاں ہوئیں، معاملات ہی کچھ دوسرے ہو گئے، جی ایٹ کا اجلاس نہیں ہوا، لیکن تب سے ملک کے حالات خراب ہونے لگے۔ مجھے ان کے حالات میں دلچسپی نہیں، فقط یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ ایسی کون سی قوت ہے جو وہاں امن نہیں چاہتی؟ اور وہ دلچسپی کیا ہے جس کے لیے امن تباہ کر کے رکھ دیا گیا ہے؟“

”ہاں، یہی خفیہ طاقتیں اپنا ایجنڈا اس دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہیں، اور اس کے رد عمل میں بھی لوگ اپنا کام کر رہے ہیں۔ خیر، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ

دی۔ کیونکہ ایسے میں ہر پریت ایک ٹرے میں چائے کگ رکھے وہیں آگئی۔

”یہ صبح صبح یہاں کیا میٹنگ چل رہی ہے؟“ اس نے گنگ ہمیں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”میں جہاں سے پوچھ رہا تھا کہ تم ہر پریت سے شادی کب کر رہے ہو؟“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

اس پر ہر پریت نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ چائے پینے کے دوران یونہی وہ نکودر جانے اور وہاں کے احوال کے بارے میں بتاتے رہے۔ پھر ہر پریت گنگ لے کر نیچے چلی گئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جہاں اُس کے بارے میں بات کرے لیکن اس نے نیچے جا کر اخبار دیکھنے کو کہا تو میں اس کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

وہ لیپ ٹاپ کھول کر مختلف اخبار پڑھتے ہوئے رد عمل نوٹ کرتا رہا۔ اس دوران میں نہا کر فریش ہو گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر جانے سے پہلے اس نے بھارت اور پاکستان میں سے ایک ایک سیاست دان کا نام میرے سامنے رکھ دیا۔

”یہ ہیں وہ لوگ جنہیں سب سے زیادہ تکلیف ہوئی ہے۔ میرا یقین کرو، ان میں سے بہت کچھ نکلے گا۔“

اس نے پورے یقین سے کہا۔

بھارت میں اس نے جس سیاست دان کا نام لیا تھا، وہ ممبئی ہی کا رہنے والا تھا۔ رامیش پاٹل اس کا نام تھا اور رکن پارلیمنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت میں بھی تھا۔ پاکستان میں ملک فرحان سیال تھا، جو ان دنوں اپوزیشن میں تھا اور بہت خاموش تھا۔ وہ بیان نہیں دیتا تھا اور نہ ہی وہ میڈیا کے سامنے آتا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ لوگ صاف ہوئے اس نے بھرپور قسم کی احتجاجی بیان بازی کی تھی۔ بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں ان دونوں کے بارے سوچتا ہوا ناشتے کی میز تک جا پہنچا۔ اس دن انوجیت کے ساتھ خوب باتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر مقامی سیاست کے بارے میں ہی بات کرتا رہا۔ اصل میں وہ جس سکھ تنظیم کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اس کا اپنا طریقہ کار تھا۔ بہر حال خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم کیا گیا۔

میں، جہاں، ہر پریت اور انوجیت وہیں ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر باتوں کے بعد یہ طے ہوا کہ مجھے اوگی پنڈ دکھایا جائے۔ ہم چاروں ہی نکل پڑے تھے۔ وہ پرانا کنواں دیکھا، جہاں بہرا سنگھ کی لالو قلندر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہاں بس برگلڈ کا درخت تھا۔ کنواں ختم ہو چکا تھا۔ وہاں کافی وقت گزارنے کے بعد ہم گاؤں کی جانب چلے گئے۔ ”لٹیاں دی پتی“ میں پرانے گھر دیکھے۔ چوپال اور وہ جگہ جہاں کبھی مسجد ہوا کرتی تھی۔ وہاں اب مسجد نہیں تھی۔ دل کافی دکھا۔ میں اسی کیفیت میں تھا کہ روہی سے فون آگیا۔

مجھے یاد تھا کہ اس وقت ممبئی میں پریم ناتھ میرے فون کے انتظار میں ہوگا۔ مجھے صورت حال بتا دی گئی۔ وہ ہاری فیلڈنگ کے ساتھ تھا۔ فون اس سے ملایا جا چکا تھا۔

”اکاؤنٹ نمبر دیں۔“ بلا کسی تہدید کے کہا گیا۔

”اب مجھے تمہاری رقم نہیں چاہئے۔ کیونکہ تمہاری نیت کچھ اور ہے۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دیا

”لگتا ہے کچا کھلاڑی ہے تو، ہمت ہے تو جھین لے مجھ سے رقم، میں تمہیں اب بل سے نکال کر رہی ہوں گا۔“ اس نے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا

”میں تیرے باپ کو بل سے نکالنے کے چکر میں ہوں، دیکھتے ہیں کب تک چھپتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہت بھولے ہو تم، بلکہ بے وقوف، پہلے مجھ سے تو نہٹ لو، پھر خواب دیکھنا۔ تم تو مجھ سے لے نہیں سکے۔“

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”میں صرف یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تم دوستی کرنا چاہتے ہو یا دشمنی، اتنا لاؤ فکر لا کر تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم لوگ دوستی نہیں کرنا چاہتے، صرف مجھے سامنے لانا چاہتے ہو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر آ جاؤ نا سامنے، کس نے روکا ہے۔“ وہ پھر طنزیہ انداز میں بولا

”ٹھیک ہے، انتظار کرو۔“ میں نے کہا، تب فون بند ہو گیا، روی کا فون چل رہا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں کی صورت حال بتادی۔ میں نے اسی لمحے ممی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم مزید کچھ دیر آؤگی پتہ کھوتے رہے۔ پھر واپس گھر آ گئے۔ وہیں آ کر میں نے جہاں کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر بعد آؤگی سے نکل رہا ہوں۔

”یہ اچانک فیصلہ؟“ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتا دیا

”مجھے بہر حال جانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میرا نہیں خیال کہ تمہارا یہ فیصلہ درست ہے، ہم اس میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ ہم نے جو راستہ طے کیا ہے، ہمیں اسی پر چلنا ہوگا۔“ اس نے سوچ بھرے لہجے میں کہا

”تو پھر یہ ممی،.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”اگر سانپ کی گردن پکڑ لی جائے تو پھر وہ سارے کا سارا ہاتھ میں آ جاتا ہے، جب اُس کا زہر نکالنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ہمیں صرف وہاں تک پہنچنا ہے، جو یہ سارا نظام چلا رہا ہے اور یہ ہمیں رامیش پاٹے ہی بتائے گا۔“

”تب پھر مجھے ممی جانا ہوگا۔ میں نکلتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”صرف تم نہیں، میں بھی۔ آج ہی دونوں نکلیں گے۔ میری ہر پریت سے بات ہو چکی ہے، ڈونٹ وری۔“

”تو چلو، پھر نکلیں۔“ میں نے کہا تو اس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔



کوئی سکھ امرتسر پہنچے اور وہ ماتھا ٹیکنے دربار صاحب نہ جائے، یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی جب ہم امرتسر پہنچے۔ سندو ابھی تک ممی میں تھا اور ٹاک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ میری اس سے بات ہوئی تو میں نے اسے واپس ممی آنے کا کہہ دیا۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں رتن دیپ سنگھ سے ملوں، اس سے بھی زیادہ میں بائیتا کور دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا امرتسر میں اس کے ساتھ گزارا ہوا وقت بڑا یادگار تھا۔ کئی یادگار لمحے ابھی تک نقشہ اپنی اپنی جگہ پر میرے اور بائیتا کور کے انتظار میں تھے۔ مجھے ان کا فون نمبر یاد نہیں تھا کہ انہیں کال کر لیتا۔ ہاں علاقہ ضرور یاد تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے راستے میں جب جہاں سے ذکر کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”یار میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں، جیسا تم نے اس کے بارے میں بتایا ہے نا، وہ دیکھنے کی چیز ہوگی۔“

سورستے ہی میں ہمارا پروگرام بن گیا کہ رتن دیپ سنگھ سے ضرور ملا جائے۔ لیکن پہلے وہ ہر مندر صاحب جانا چاہتا تھا۔ وہیں سے ہم نے ٹیکسی والے کو چھوڑ دیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ہر مندر صاحب سے نکلے اور ایک ٹیکسی میں اس علاقے میں جا نکلے۔ ہم نے اس ٹیکسی والے کو بھی فارغ کیا اور پیدل ہی چل پڑے۔ شام ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی جب ہم رتن دیپ سنگھ کی حویلی جا پہنچے۔

رتن دیپ سنگھ کو میں بہت اچھی طرح یاد تھا۔ میں جب وہاں پر تھا تو اس وقت میرے ”کیس“ تھے اور میں

دلکھ سنگھ تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگوں نے مجھے نہیں پہچانا، لیکن جیسے ہی رتن دیپ سنگھ کو میرے بارے میں پتہ چلا تو وہ مجھے لینے پورچ تک خود آیا۔ وہ مجھے یوں ملا جیسے مجھے دوبارہ اُسے ملنے کی امید نہ ہو۔

”اؤ یار بڑی خوشی ہوئی ہے تم سے دوبارہ مل کے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ اس کا ملنا مجھے بتا رہا تھا کہ وہ کتنے خلوص سے مل رہا ہے۔ مجھ سے الگ ہوا تو میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ جہاں سنگھ ہے، میرا دوست۔“

”اؤ تمہارا دوست ہے تو ہمارا بھی ہے نا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جہاں کو بھی گلے لگا لیا۔

کچھ دیر بعد ہم ڈرائیونگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کی بیوی ہمیں آ کر مل گئی تھی۔ اس کے دونوں بچے گھر پر نہیں تھے۔ مجھے بائیتا کور سے ملنے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ ایسے میں ایک ملازمہ نے بتایا کہ ہمارے لیے کھانا لگا دیا گیا ہے۔

”لو بھئی، تم لوگ کھاؤ کھانا، پھر کرو آرام، صبح باتیں ہوں گی۔“ رتن دیپ سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ہم صبح تک نہیں رہیں گے، ہمیں آج ہی ممی کے لیے نکلتا ہے، یہ تو بس امرتسر آیا تو آپ سے ملے گا جانے کو دل نہیں کیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بتایا تو وہ کھڑے کھڑے بولا۔

”یار جب تمہارا دل نہیں کیا جانے کو تو ہم تمہیں یوں تھوڑی جانے دیں گے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا، کوئی دکھ سکھ کی باتیں کرتے ہیں۔ اگر ابھی جانا بہت ضروری ہے تو میں تمہیں روک نہیں سکتا، لیکن اگر کل تک رک سکتے ہو تو رک جاؤ۔ کچھ دیر ہی سہی“ یہ کہہ کر وہ میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے ہم کل دوپہر سے پہلے نکل جائیں گے، ویسے بھی ابھی ٹکٹ لینے تھے۔“ میں نے کہا تو وہ خوش ہو گیا۔ پھر چلتے ہوئے بولا۔

”کھانا کھا کر اوپر، آ جانا میرے پاس۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائیونگ روم سے نکل گیا اور ہم کھانے کی میز کی جانب بڑھے۔ کافی پر تکلف کھانا تھا، سیر ہو کر کھایا۔ ہم اس وقت اوپر جانے کے لیے کھڑے ہی ہوئے تھے، کہ ایک دم سے بائیتا کور میرے سامنے آئی اور آتے ہی میرے گلے لگ گئی۔ اس کا چہرہ مجھ سے دو تین انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خوشی بھرے لہجے میں کہا

”اب بتاؤ، وہ کس جوا بھی تک ہم دونوں کے درمیان لٹک رہی ہے، اسے اُتار لوں۔“

”تیری مرضی ہے بھئی، میں تو اُس وقت بھی تیری دسترس میں تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی گرفت ایک دم سے ڈھیلی ہو گئی، پھر وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”مطلب، تیری مرضی نہیں ہے، چل میں اس وقت ہی تجھے تم سے چھینوں گی، جب تمہاری مرضی ہوئی۔“ یہ کہہ کر اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا، ”یہ تو اچانک ٹپک کہاں سے پڑا ہے؟“

”چل اوپر بابا کے پاس وہیں بتاتا ہوں، اور ہاں یہ میرا دوست جہاں سنگھ۔“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے غصہ ہوتے ہوئے بولی۔

”وہی جہاں؟“ یہ کہہ کر اس نے جہاں سے زوردار انداز میں ہاتھ ملایا، پھر ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کی طرف چل دی۔

رتن دیپ سنگھ اکیلا ہی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں اختصار سے بتایا کہ کس طرح مجھے اغوا کر لیا گیا تھا، اور اب میں اسے تلاش کرنے کے چکر میں ہوں۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔

”اپنے فون میں ایک نمبر محفوظ کر لے، زوردار سنگھ نام ہے اُس کا، اس کے بڑھاپے پر مت جانا، جگری یا ہے میرا، ممبئی کے انڈر ورلڈ کی پوری جانکاری ہے اس کے پاس۔ خود متحرک نہیں ہے، لیکن یہ سب کچھ کیونٹی یا سکھ دھرم کے لیے کرتا ہے۔ صرف اپنے لوگوں کو تحفظ دینے کے لئے۔ ورنہ اس کا انڈر ورلڈ سے کوئی لینا دینا نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے نمبر بتایا، جسے میں نے محفوظ کر لیا، تبھی اس نے زوردار سنگھ کو کال ملا کر میرے بارے میں بتا دیا کہ میں کسی بھی وقت دو چار دن میں اس سے ملوں گا۔ اس کے بعد ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ میرے جانے کے بعد ہونے والی باتیں کرتا رہا۔ اصل دلچسپ سنگھ واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کے والدین بہت یاد کرتے تھے مجھے۔ لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا کہ ان سے مل سکتا۔ دلچسپ سنگھ اب رتن سنگھ ہی کیلئے کام کرتا تھا۔ وہ جہاں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ جالندھر میں بہت کام ہو سکتا ہے، اگر جہاں ادھر رہے تو۔

”لیکن بابا، مجھے نہیں لگتا کہ یہ پیچھی پنجرے میں رہ کر کام کرنے والے ہیں۔“ پہلی بار بانیٹا کو اس گفتگو میں بولی تھی، جواب تک بالکل خاموش تھی۔

”ہاں، لگتا تو ایسے ہی ہے۔“ رتن سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر ہماری طرف دیکھا ”بابا! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں جمال کے ساتھ ممبئی چلی جاؤں، تھوڑی دیر ہو بدل جائے گی۔“ اس نے یوں کہا جیسے ہم کسی تفریحی ٹور پر جا رہے ہوں۔ اس پر جہاں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ”دیکھ پتر۔! تو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ یہ وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔ آگے تیری مرضی۔“ رتن دیپ سنگھ نے عام سے انداز میں کہا۔

”یہاں بھی تو وہی کچھ ہے بابا، یہ سب میرے لیے کون سا نئی چیزیں ہیں۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا ”بہت فرق ہے، یہاں اور وہاں میں، سارے بھارت اور بھارت سے باہر جتنا کراؤم ہے، سمجھو وہیں سے پھونتا ہے۔ دہلی میں اتنا کچھ نہیں ہوتا، جتنا ممبئی سے بنایا ہوا کھیل پورے بھارت میں کھیلا جاتا ہے۔ وہاں بھائی گیری ایک دھندہ ہی نہیں، روایت ہے۔ وہاں ایک الگ سی زندگی ہے، یہاں سے بالکل مختلف ماحول ہے۔“ رتن سنگھ نے کہا۔

”تو آپ مجھے ڈرا رہے ہیں؟“ وہ بولی۔

”نہیں، تمہاری بات کا جواب دے رہا ہوں۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا ”پھر تو میں جاؤں گی، وہاں سے کچھ سیکھ کر ہی آؤں گی، باقی واہ گرو کی مرضی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

”میں جانتا ہوں کہ تو بہادر ہے، وہاں سب.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”تم اگر ساتھ نہ لے جانا چاہو تو الگ بات ہے۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں تجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس کے چہرے پر غصہ پھیل گیا۔ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر یوں بولی جیسے خود پر قابو پارہی ہو ”اوکے بابا، اب ہم چلتے ہیں۔ ابھی ان کی کتلیں بھی لانی ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم ذرا دیر وہاں رہے اور رتن دیپ سنگھ کی اجازت سے نیچے ڈرائنگ روم میں آگئے۔

وہ پوچھ میں گاڑی لیے کھڑی تھی۔ میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جہاں پیچھے۔ وہ ہمیں لیتے ہوئی گل ملی۔ سارے راستے وہ خاموش رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے، سو میں بھی خاموش ہی رہا۔ دربار صاحب کے پاس ہی ایک ٹریول ایجنٹ سے دو ٹکٹ لے کر ہم واپس آگئے۔ صبح دس بجے کے قریب فلائٹ تھی۔ ہم کار میں آکر بیٹھ گئے۔

”ناراض ہو۔“ میں نے اسٹیرنگ پکڑے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے مختصر انداز میں جواب دیا۔

”چل میں تجھے آکس کریم کھلاتا ہوں۔“ میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

”میں بچی نہیں ہوں۔“ اس نے روکے لہجے میں جواب دیتے ہوئے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ حویلی آگئے۔ اس نے ڈرائیونگ روم ہی سے ہمیں الوداع کہا اور اندر کی جانب چلی گئی۔ ملازمین نے ہمیں کمرہ دکھایا۔

صبح ناشتے کی میز پر رتن دیپ سنگھ، اس کی بیوی اور بیٹے موجود تھے۔ خوشگوار ماحول میں ناشتہ کر کے ہم کافی اہم باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم اجازت لے کر چل دیے۔ ان کا ایک ملازم ہمیں اتر پورٹ چھوڑنے چل دیا۔ اٹھنا کور کے روٹھ جانے کا بہت افسوس تھا لیکن اس کی ضد بھی تو ٹھیک نہیں تھی۔ جس وقت جہاز اڑا، اس وقت میں نے اُسے بھی ذہن سے نکال دیا۔

دوپہر کے وقت ممبئی اتر پورٹ پر ہم اترے۔ ہمیں وہاں کسی نے لینے تو آنا نہیں تھا۔ ہم اتر پورٹ سے باہر اٹھے اور جوہر جانے کے لیے ٹیکسی لی اور چل پڑے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم بنگلے سے ذرا دور اتر گئے۔ جہاں لے لہسی والے کو فارغ کیا۔ ہمیں بنگلے کا پوری طرح آئیڈیا تھا، بس یونہی احتیاطاً پیدل چل نکلے۔

سندو، اہمیت، ہر پال اور رویت کو ڈرائیونگ روم میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں وہاں بیٹھے کوئی ملے یا چارمنٹ ہوئے ہوں گے کہ باہر سے پوچھا گیا

”جمال صاحب سے ملنے کے لئے بانیٹا کور گیٹ پر آئی ہیں۔“

”اوہ۔!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا

”مار، لگتا ہے تیرے پیار میں تڑپ رہی تھی، جو تیرے پیچھے پیچھے آگئی۔“ جہاں زور سے ہنستے ہوئے بولا۔ سبھی میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اسے اندر آ جانے کے لیے کہا اور اس کے آنے تک مختصر تعارف کروا دیا۔ سبھی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ نیلی جینز پر گلابی شرٹ، کھلے ہال، ہونٹوں پر میرون لپ اسٹک، سیاہ گاگلز اور کانڈے پر چھوٹا سا بیگ۔

”تمہارا پیچھے پیچھے آنا بہت اچھا لگا۔“ جہاں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میں آگے آگے آئی ہوں، دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تم دونوں کا، آخر اتر پورٹ سے یہاں بھی تو آنا تھا۔“ یہ لہجے ہوئے وہ سب سے ہاتھ ملانے لگی۔ جہاں نے اس کا بیگ پکڑ لیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھے اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔ مگر وہ مجھ سے روشنی روشنی لگ رہی تھی۔



دوپہر کے کھانے کے بعد سبھی اوپر والے کمرے میں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے ہم وہاں تفریح کرنے نہیں آئے تھے۔ میں نے اپنی ساری کارروائی انہیں بتا دی، لیکن ذرا سی تہدیلی کے ساتھ۔ میں روہی اور

اس کی مدد کو گول کر گیا تھا۔ وہ سبھی خوش تھے۔ انہیں گرباج سے کوئی مدد نہیں ملی تھی۔ گرباج کو یہ معلوم تھا کہ وہ ابھی تک چندی گڑھ ہی میں ہے، اسے یہی بتایا گیا تھا۔ جس فون سے اس کا رابطہ تھا، وہ بند تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لیے انہوں نے میرے ہی پلان پر عمل کرنے کو کہا۔

”پلان یہ ہے میری جان کہ ہم رامیش پاٹے ہی کو پکڑیں گے اور اسی سے آگے ہمیں معلومات ملیں گی۔ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔“ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ اس سے آگے کے سارے لوگ الرٹ ہو جائیں گے اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔“ سندو نے اپنی رائے دی۔ بات اس کی معقول تھی۔

”کیوں نہ اسے پکڑا جائے، جس سے رقم کی بات ہوئی تھی۔“ رونیت کور نے کہا۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ ابھیت نے پوچھا۔

”وہ گینگ سامنے آئے گا، تو ہم بھی اُن کے سامنے آجائیں گے۔ ان کے تحفظ کے لیے کون کون سامنے آتا ہے، اس سے.....“ رونیت نے کہنا چاہا مگر سندو بات کا نٹے ہوئے بولا۔

”یہ بہت لمبی لڑائی ہے، وہ ہمیں الجھا کر رکھ دیں گے۔ یہاں کے انڈر ورلڈ میں کون کب کس کا دشمن بن جائے، کچھ بھی پتہ نہیں چلتا، اور نہ ہی ہمیں یہاں کے بارے میں پوری طرح علم ہے، کس جگہ سانپ ہے اور کس جگہ شیر۔“

”تو کیا تم لوگ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے، کہیں سے تو شروعات کرنی ہے نا۔“ رونیت نے کہا۔

”لیکن ہمارا مقصد تو اس بندے تک پہنچنا ہے جو یہ سارا کھیل کھیل رہا ہے۔“ سندو نے جوابا کہا۔

”انہیں اپنے پیچھے لگانا ہوگا۔“ ایک دم سے بائیتا کور نے گہری سنجیدگی سے کہا، سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے تو وہ اسی لہجے میں بولی۔

”ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک رامیش پاٹے، اسے جھپٹا تو حکومتی ایجنسیاں ہمارے پیچھے لگ جائیں گئی۔ اس لیے معاملہ ذرا مشکل ہو جائے گا۔ اس پریم ہاتھ کو پکڑیں اور اپنے ہونے کا ثبوت دیں۔ ایک ہلچل تو مچے گی، وہ ہمیں پکڑنے کے لیے متحرک ہوں گے تو ہی ملی تھیلے سے باہر آئے گی۔ آگے جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔“

”ڈن ہو گیا۔“ سندو نے ایک دم سے کہا، پھر رونیت کور کی طرف دیکھ کر بولا ”تم ادھر رہو گی، اور ہمیں گائیڈ کرو گی۔ تم نے سارا کچھ کر لیا ہوگا۔“

”ہو گیا، شام تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اپنے انداز میں کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔

بائیتا کور نے شلوار قمیص پہنی اور پوری طرح تیار ہو کر میرے ساتھ کار میں آ بیٹھی۔ اگرچہ میں جانی بھائی کے ساتھ رابطے میں تھا۔ اسے پریم ہاتھ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لیکن میں پہلے زوردار سنگھ سے ملنا چاہتا تھا۔ فون پر بائیتا کور ہی نے اس سے بات کی تھی۔ وہ دادر کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی بتائی ہوئی ایک خاص جگہ پر جا کر ہم نے رابطہ کیا۔ پھر وہ ہمیں فون پر گائیڈ کرنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اس تک پہنچ گئے۔

وہ اپنے بڑے سارے گھر کے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا بھی نہیں تھا، جیسا میں نے تصور کر لیا تھا۔ وہ ہمیں اٹھ کر ملا۔ اسے بائیتا کور کے مل جانے پر بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ بولا۔

”رتن نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم بھی ممبئی آ گئی ہو۔ سچ پوچھو تا تم اُس کا بیٹا ہو۔ باقی تو سب پیسے کے پیچھے بیٹھے

ہو گئے ہیں۔“ اس نے کافی حد تک دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اتنے میں اندر سے ملا زمین کھانے پینے کو بہت کچھ لے آئے، جو بہر حال پنجابیوں کی روایت تھی۔ تبھی اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں پتر، تو بتا، کون بندہ چاہئے تمہیں؟“

”پریم ہاتھ ہے کوئی۔“ یہ کہہ کر میں اس کی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی کا نام بتا دیا۔ اسے سنتے ہی وہ بولا۔

”ارے ہاں، یاد آیا، آج سے چند برس پہلے وہ ایک چھوٹا موٹا گینگ چلاتا تھا۔ پچھلے دو برس سے اس کی اذان بہت اونچی ہو گئی ہے۔ منشیات بیچتے بیچتے وہ اب اسلحے کا کاروبار کر رہا ہے۔ اب مضبوط گینگ ہے اس کا۔“

”وہ ملے گا کہاں؟ اسے پکڑنا ہے۔“ بائیتا کور نے کہا۔

”اس کے آفس میں تو ذرا مشکل ہوگا، مگر سے لے کر اس کے آفس کے درمیان اسے اٹھایا جاسکتا ہے۔ ہاں یہ معلومات مل سکتی ہیں کہ کب اس پر ہاتھ ڈالا جائے۔“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”لیکن اگر اس کے گھر پر.....“ میں نے پوچھا۔

”ممکن ہے، تم ذرا سکون سے بیٹھو، ذکر کرتے ہیں، تب تک پتہ چل جائے گا سب۔“ یہ کہہ کر اس نے فون نکالا اور کال ملا کر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے فون واپس جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد رتن دھپ سنگھ کی باتیں ہی ہونے لگیں۔ اس دوران رامیش پاٹے کا بھی ذکر میں نے کر دیا۔ تب اس نے کہا۔

”اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس لیے سو بار سوچنا ہوگا کہ بھارت کی ساری ایجنسیاں تم لوگوں کے پیچھے لگ جائیں گی۔ اس سے کام ذرا مشکل ہو جاتا ہے، بہر حال دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔“ اس نے عام سے لہجے میں یوں کہا جیسے یہ کام مشکل تو ہے ناممکن نہیں۔ مجھے اس کا انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سامنے بیٹھے بندے کو ذرا نہیں رہا تھا، اس کی باتوں سے مزید حوصلہ ملتا تھا۔

دس بجے کے قریب جب ہم زوردار سنگھ کے پاس سے اٹھے تو پورا پلان لے کر ہی اٹھے۔ ایک خاص جگہ پر جانی بھائی کے لوگ اسلحہ سمیت پہنچ گئے تھے۔ ہمیں راستوں کا بالکل پتہ نہیں تھا۔ اس لیے زوردار سنگھ نے ایک باہر ڈرائیور ہمارے ساتھ کر دیا۔

دادر کا وہ علاقہ کافی گنجان آباد تھا۔ پریم ہاتھ کا گھر ایسی جگہ تھا، جہاں ابھی تک پرانے طرز کی عمارتیں موجود تھیں۔ کسی زمانے میں وہ کھلا علاقہ ہوگا۔ لیکن ان دنوں ایسے ہی دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ پرانا علاقہ ہو۔ جانی بھائی کے لوگ چار گاڑیوں پر تھے۔ انہیں لیڈ کرنے والا نوجوان میں نے اس دن چھت پر دیکھا تھا، جب میں جانی بھائی سے ملنے گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا۔ ہم ایک طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔

”یہ جانی بھائی کا علاقہ تو نہیں ہے لیکن اپنا لوگ کام کر لے گا۔ آپ لوگ ادھر اتجار کرو، ہم.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اونہیں، میں تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گا۔ خیر! یہ تو پکا ہے نا کہ اس کا سیکورٹی ہوگا۔ تمہارا کام صرف سیکورٹی کو سنبھالنا ہے، باقی میں دیکھ لوں گا۔“ یہ سب ملے کر کے ہم اپنی اپنی گاڑیوں کی جانب چل دیے۔

وہ پرانی طرز کا ایک بنگلہ تھا۔ شاید وہ پرانے زمانے کے کسی امیر آدمی نے بنوایا ہوگا۔ اب اس کے پاس تھا۔ اس کی دیواریں اونچی نہیں تھیں۔ لیکن گیٹ پر کچھ سیکورٹی والے تھے۔ وہ نوجوان گیٹ پر گیا اور اس نے وہاں کوئی بات کی۔ اس وقت تک چار دیواری پر لگی تاروں کو چیک کر لیا گیا تھا۔ سیکورٹی والے نے فون پر اندر بات کی، پھر اجازت ملنے پر انہوں نے ہم تینوں کو چیک کیا اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔ بائیتا کور ڈرائیور

کے ساتھ گاڑی ہی میں باہر گیٹ پر تھی۔

ہم پورچ کے قریب پہنچے تو سامنے سے چند لوگ باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ انہی کے درمیان ایک سوٹ پہنے ہوئے ادھیڑ عمر آدمی نے آکر ہتک آمیز لہجے میں پوچھا۔

”کیوں ملتا ہے پریم ناتھ جی سے، اپنا منٹ لی ہے یا ایسے ہی منہ اٹھا کر چلے آئے ہو؟“

”انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میں جب چاہے ان سے مل لوں، ہم نے ان سے نوکری.....“ ”نو جوان نے الجالت سے کہا۔

”اچھا یہیں رُک، میں پوچھتا ہوں۔“ اس نے اسی طرح ہتک آمیز لہجے میں کہا اور واپس مڑ گیا۔

نو جوان نے بہت پتے کی بات کی تھی۔ ایسے کرائم گینگ والوں کو ہر دم نئے لڑکوں کی ضرورت رہتی ہے۔ لڑکے بھی مختلف انداز میں ان گینگ میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا انڈر ورلڈ میں نام بول رہا ہوتا ہے۔ یہی نئی بھرتی ان کی طاقت ہوتی ہے۔ گینگ والے جیسا چاہیں انہیں استعمال کرتے ہیں۔ توقع کے مطابق ذرا سی دیر میں وہ ادھیڑ عمر باہر آ گیا۔ اس نے آتے ہی اسی ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

”ادھر کھڑے ہو جاؤ، ابھی صاحب نے کہیں جانا ہے، تمہاری بات ہو جائے گی۔“

ہم اس وقت پورچ کے پاس تھے۔ سامنے دروازہ تھا، جس سے پریم ناتھ نے آنا تھا۔ چار قدم اور تین سیزھیماں ہماری راہ میں تھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس نو جوان کی طرف دیکھا اور اس طرح ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے کہ وہ دروازہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ اس وقت تک میں بھانپ چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا ہے اور وہ اس نو جوان کے ساتھ کیا کریں گے۔ گیٹ کے پاس بائیتا کور انتظار میں تھی۔ وہ چند منٹ بہت جان لیوا تھے۔ اتنے میں ایک سیاہ چھپاتی ہوئی کار پورچ کی طرف آئی، اسی لمحے اندر کا دروازہ کھلا اور ایک کالے رنگ کا پتلا سا شخص باہر آنے کے لیے دروازے ہی میں تھا۔ اس کا سر گنجا تھا، سفید کوٹ پینٹ اور سنہری کمائی دار عینک لگائے ہوئے تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اسے دیکھتے ہی گن مین الرٹ ہو گئے۔ میں نے اپنے ہی خیروں پر چھلانگ لگائی، ایک گن والا میری نگاہ میں تھا، اس کی گن چھینتا ہوا پریم ناتھ پر جا پڑا۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا بڑا حوصلہ کرے گا۔ میں نے بائیں بازو سے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے دھکیل کر پیچھے کرے میں لے گیا۔ سیکورٹی والوں کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ اسی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نو جوان ایک دم سے پیچھے ہٹا۔ اس نے ایک گن مین کی گن چھین کر ان پر تان لی۔

”خبردار، کوئی ہلا تو۔“ میں نے شخصے میں سے باہر دیکھتے ہوئے زوردار آواز میں کہا۔

نو جوان نے اس وقت فائر کر دیا۔ یہ باہر والوں کے لیے الرٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں طرف سے ایک دم فائرنگ ہونے لگی۔ سیکورٹی والے اس طرف دیکھنے لگے تبھی اس نو جوان کے پیچھے کھڑے لڑکے نے ایک گن پر ہاتھ مارا اور گن قابو میں کرتے ہی ان پر تان لی۔

”پیچھے ہٹ جاؤ۔“ اس نو جوان نے کہا۔

اسی لمحے گیٹ پر زوردار فائرنگ ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ بائیتا کور پیچھے نہیں رہنے والی۔ وہ کار میں پورچ تک آن پہنچی۔ تبھی پریم ناتھ نے مگلیائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”میری بات مانو گے تو ماروں گا نہیں۔ تعاون کرو گے تو کام آؤں گا، چلو۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے آگے

بلا ہایا تو سیکورٹی والوں نے گتیں تان لیں۔ تبھی بائیتا کور یو لور تان کر کھڑی ہو گئی۔

”پیچھے ہٹ کر گتیں پھینک دو، اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو، پورا لشکر ہے، کوئی زندہ نہیں بچے گا۔“ اس نے لڑت اور غصے میں کچھ یوں کہا کہ پریم ناتھ تیزی سے بولا۔

”کوئی فائر نہیں کرے گا۔“

میں اسے دھکیلے ہوئے اندر کی جانب لے گیا۔

”تیرے پاس صرف تین منٹ ہیں، میرے دس ملین ڈالر دے دو، ایک بھی بلٹ نہیں چلاؤں گا اور چلا جاؤں گا، دوسری صورت میں.....“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”تم؟“ اس نے شدت حیرت سے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ تب میں نے سر لہجے میں کہا۔

”وقت شروع ہو گیا ہے۔“

اسی لمحے اندر سے ایک بندہ نمودار ہوا، اس نے فائر کرنا چاہا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

”مجھے اوپر کرے تک جانا ہوگا۔“

”آدھا منٹ گزر چکا ہے۔“ میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہی ادھیڑ عمر شخص جلدی سے اندر کی طرف گیا، ایک منٹ سے بھی کم وقت میں بریف کیس لے آیا، اس نے جلدی سے کھول کر دکھایا، اس میں نوٹ تھے۔

”کم ہوئے تو میں دوبارہ وصول لوں گا۔ اب چلو، باہر تک ہمیں چھوڑ کے آؤ۔“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے ہٹ گیا۔ اس ہتکچا ہٹ میں خوف تھا۔

”تمہیں رقم مل گئی، تم جاؤ۔“ اس نے کہا۔

”مگر مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں اور تجھے اپنی سیکورٹی کے لیے کچھ ٹیس بھی دینا چاہتا ہوں، اگر تم زندہ رہے، میرے ساتھ تعاون کرو گے تو.....“ میں نے کہا۔

”چلو۔“ وہ ڈرے ہوئے انداز میں بولا

میں اس کے ساتھ باہر کی جانب آیا تو باہر بہت سارے لوگوں نے ایک دوسرے پر گتیں تانی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی ٹھنک گیا۔

”کتنا خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ دیکھ رہے ہو؟“

میرے یوں کہنے پر اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو اس کے باڈی گارڈوں نے گتیں جھکا دیں۔ ہم آگے بڑھے۔ میں نے اُسے بائیتا والی کار میں بٹھایا اور کار چل پڑی۔ ہم جیسے ہی گیٹ کے باہر گئے۔ کاروں کا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بندے ہمارا پیچھا کریں گے۔ اس لیے میں نے کہا۔

”میرا وعدہ ہے کہ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنے بندوں کو ہٹ جانے کا کہو، ورنہ.....“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے فون نکالا اور انہیں رک جانے کا کہہ دیا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”تم کس کے ماتحت کام کرتے ہو، نام بتاؤ اور جاؤ، تیرا کام ختم، یہ بات ہمارے درمیان رہے گی۔“

”رامیش پاڑے۔“ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد سکون سے کہا۔

”گاڑی روکو۔“ میں نے ڈرائیور سے کہا تو گاڑی رک گئی۔ میں اسے ٹول چکا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار

نہیں تھا۔ ”صرف ایک بات دھیان میں رکھو، موت کے منہ میں چھلانگ لگانا کوئی معمولی بات نہیں، لیکن اسی میں ہی سب سے کم خطرہ ہے، صرف حوصلہ چاہئے۔ ورنہ ہزار پلان دھرے رہ جاتے ہیں۔ جاؤ۔“

میں نے اسے جانے دیا۔ ڈرائیور سمجھتا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ نکل گیا۔ ایک کراس پر ہم نے گاڑی چھوڑ دی۔ میں اور باغیتا جانی بھائی والے لڑکوں کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں اب ان کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ مجھے کہاں لے جاتے۔ وہ ہمیں جو ہوا لے بیٹھنے کے آگے چھوڑ کر نکل گئے۔ اس سارے معاملے میں چار گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ میں نے بریف کیس جانی بھائی کے لڑکوں کو دے دیا تھا۔ ہم اندر گئے تو سبھی ڈرائیونگ روم میں تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کی سانس میں سانس آئی۔

”یہ دیکھ، قتل اور ڈھپکتی کی واردت، یہی ہے نا وہ بندہ؟“ ہماری بات سن کر سندو نے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوش میں کہا۔

”ہاں یہی ہے۔“ باغیتا نے کہا

”مان گئے استاد، یار تو اتنا حوصلہ کیسے کر لیتا ہے؟“ سندو نے جوش بھرے لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

”دیکھ، موت کا ایک وقت مقرر ہے، اسے جب، جہاں اور جس وقت آنی ہے سو آتی ہے اور پھر جو انسانیت کا دشمن ہے، وہ قابلِ رحم نہیں۔ اس نے میرے ساتھ تعاون کیا، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں اسے مار بھی سکتا تھا۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ رویت کو رہائے گی۔“ میں رویت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مطلب، رامیش پاٹھ، اسے ٹریس کرو، پھر پلان کرتے ہیں۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ جانی بھائی کا فون آگیا

”بڑو تم تو استادوں کا استاد نکلا رہے، لڑکا لوگ تم سے امپریس ہو گیا یار۔“ اس نے چپکتے ہوئے کہا۔

”بس جانی بھائی، کام تو پھر کام ہی ہوتا ہے نا۔“ میں نے بھی خوشگوار موڈ میں کہا

”ارے تیرا شکل ان لڑکا لوگن نے ایسا بتایا، دل خس ہو گیا رہے۔ پن یہ تو نے ڈال کیوں بھیجا؟“

”یہ دیکھنے کو کہ اصلی ہے یا نقلی، اور پھر لڑکوں نے بھی محنت کی ہے نا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہے تو اصلی، پن ابھی مارکیٹ میں لے جانے کا نہیں، میری بات سزتا ہے نا، لڑکا لوگ کو میں نے خس کر دیا، ڈونٹ وری۔“ اس نے چپکتے ہوئے کہا۔

”اچھا کیا، یہ تیرا کام ہے جو مرضی کر۔“

”یار ایسن کر ادھر میرے پاس آ جا، بڑو اکھا ممبئی پر راج کریں گے۔ چل فنی فنی پر بات کر۔“ جانی بھائی نے بڑے موڈ میں کہا۔

”نہیں جانی بھائی، میں کسی اور منزل کا راہی ہوں۔ تو بول، تیرا کوئی کام ہے تو.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ارے نا، کوئی پلان ہو تو بتانا بڑو، چل رکھتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے بھی فون بند کر دیا۔

ہم ساری رات نہیں سوئے تھے۔ رات کے دو بجے کے قریب جب رویت نے بتایا

”اس وقت رامیش پاٹھ گوا میں ہے اور وہاں پر اپنی فیملی کے ساتھ ہے۔ سرکاری معلومات کے مطابق

وہاں پر وہ چھٹی گزارنے گیا ہے۔ تین دن کا ٹور ہے، ایک دن ہو گیا ہے، ابھی دو دن باقی ہیں۔“

”تو پھر نکلتے ہیں۔“ سندو نے فیصلہ سنا دیا

”پہلے پوری معلومات لو، پھر نکلتا، وہ سڑک چھاپ یا گینگ چلانے والا غنڈہ نہیں ہے، سرکاری پروٹوکول کے ساتھ ہوگا۔“ ہر پال ہنستے ہوئے بولا۔

”پروہ ہے تو انسان ہی نا، یہاں ممبئی میں وہ زیادہ طاقتور ہوگا۔“ سندو نے اپنی رائے دی تو رویت بولی۔

”بات یہ نہیں کہ وہ کتنا طاقت ور ہے یا کمزور، بات صرف معلومات کی ہے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ جس کے پاس زیادہ معلومات ہوگی وہ اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے۔ وہ یہاں ہے یا وہاں، ہمیں رستہ کہاں سے ملتا ہے؟“

”تو ٹھیک ہے نا، آج اور ابھی نکلتے ہیں گوا، اپنی گاڑیوں میں نکلیں گے تو دس گھنٹے کا راستہ ہے، جہاز سے جاؤ گے تو ایک گھنٹے کا، وہاں جا کر لوکیشن دیکھتے ہیں، دو دن میں کچھ نہ کچھ تو معلومات ملیں گی۔ میرا ایک دوست

ہے وہاں۔“ سندو نے تیزی سے کہا

”ٹھیک ہے، تو پھر نکلتے ہیں۔“ میں بولا۔

”ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو؟“ سندو نے میری طرف دیکھ کر کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا

”بولو۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”یار یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو، تم ادھر ممبئی میں رہو۔ ہم دیکھتے ہیں اُسے۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ کچھ کرنا چاہتا ہو۔ ممکن ہے یہاں پر وہ اپنے آپ کو ایک فالتو شے تصور کر رہا ہو۔ وہ یہاں رہ کر سوائے خالی دعوؤں کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے اندر کا مردیہ برداشت نہ کر رہا ہو وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ خود کو ثابت

کرنا چاہتا ہو کہ اب بھی وہ سندو ہی ہے۔ میں نے چند لمحے سوچا اور مسکراتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے اپنی ٹیم بنا لو اور نکل جاؤ۔“

وہ ایک دم جوش سے بھر گیا۔

”تم اور باغیتا ادھر رہو، باقی ہم سب جاتے ہیں۔“ اس نے کہا تو مجھے یاد آیا، جی میں نے پوچھا۔

”وہ گرباج نے کچھ بتایا یا ابھی تک بے ہوش ہی پڑا ہے؟“

”نہیں وہ ہے تو ہوش میں، لیکن کچھ بتا نہیں پا رہا مجھے لگتا ہے، اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔“ ابھیت نے بتاتے ہوئے اپنی رائے دی۔

”چل اسے تو دیکھتے ہیں، اگر ناکارہ ہے تو پھینک دیتے ہیں اسے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے سندو کی طرف

دیکھا اور بولا۔ ”تب تک سندو تم اپنے دوست کو تلاش کر لو جو مدد کر سکتا ہے یا پھر کوئی دوسرا تلاش کرنا ہوگا؟“

”اوکے۔“ سندو نے کہا تو میں، ابھیت اور جہاں کے ساتھ نیچے خانے کی طرف چل دیئے۔

گرباج فرش پر دہرا ہوا پڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ اس کے اٹھنے کی کیفیت کو دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اس پر بہت تشدد ہو چکا ہے۔ میں اس کے پاس جا کر فرش پر بیٹھا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چند منٹ میری طرف دیکھتا رہا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم لوگ مجھے مار کیوں نہیں دیتے ہو؟“

”اس لیے کہ تمہیں مار کر ہمیں کچھ حاصل ہونے والا نہیں، بلکہ جو تمہیں معلوم ہے وہ بتا دو۔“ میں نے اس کے چہرے پر لگے زخم پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو، جو مجھے پتہ تھا وہ میں نے سب بتا دیا۔“ اس نے زو دینے والے انداز میں کہا

”لیکن ہمارے مطلب کی تم نے ایک بھی بات نہیں بتائی۔“ میں نے قہقہے سے کہا۔

”میں کیسے اور کیا بتاؤں کہ تمہیں میری بات پر یقین آجائے، میں شروع سے بتا سکتا ہوں کہ میں کیسے اس گیم میں آیا، اس میں سے تم جو چاہو پوچھ لو۔“ وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ پھر ایک نئی کہانی سنائے گا۔“ جیپال نے کہا۔

”نہیں میں پوری بات بتاؤں گا، جو بالکل سچ ہوگی۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”چل ٹھیک ہے سن۔“ میں نے کہا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا

”میں کینیڈا میں رینل اسٹیٹ کا چھوٹا موٹا کام کرتا تھا، لیکن میری ہر دم یہی کوشش ہوتی تھی کہ راتوں رات امیر بن جاؤں۔ اس لیے میں ہر طرح کا دھندہ بھی کر لیتا تھا۔ ایسے ہی ایک دن میرے دوست نے مجھے ایک ادھیڑ عمر شخص سے ملوایا کہ اسے بھارت میں کسی کام کے لیے کچھ بندے چاہئیں۔ میں اسے ٹورنٹو ہی میں ملا تھا۔“

”کام کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی بتا رہا ہوں نا،“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کا پھر کہتا چلا گیا، ”اس نے سندھپ اگر وال یعنی سندھو کو اغوا کرانے میں مدد دینے اور اس کی گرل فرینڈ نیہا اگر وال کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کا کام دیا۔ دونوں کام زبردست تھے۔ یہ کام مجھے میری شکل صورت دیکھ کر نہیں بلکہ انڈین اور پنجابی ہونے کی وجہ سے ملا۔ اس میں ڈالروں کی بہتات کے علاوہ ایک فلم ایکٹرس کے ساتھ وقت گزارنے کا چانس بھی تھا۔ میں نے فوراً ہاں کر دی۔ ہمارے ساتھ سات آٹھ مزید لوگ تھے۔ انہیں ایسے ہی مختلف لوگوں کے اغوا میں مدد دینا تھی۔ اغوا کرنے والے کون لوگ تھے، یہ ہمیں نہیں بتایا گیا۔ میں چند دن کے بعد ہی بھارت آ گیا۔“

”یہاں آ کر تو نے جو کچھ کیا، سندھو کو اغوا کر دیا۔“ جیپال نے تیزی سے کہا۔

”میں نے پوری محنت کی تھی اور ان کا جو کام تھا وہ پورا کر دیا۔ میں نے بڑا محتاط پلان بنایا تھا۔ صرف میں نے لالچ یہ کیا کہ سندھو کی دولت سمیٹنا چاہی۔ وہ بھی میں نے سمیٹ لی تھی۔ اب صرف نیہا کو قتل کر دینا تھا کہ ساری کہانی وہیں دب جائے اور جیپال نے مجھے پکڑ لیا۔“

”تم نے آواز سے بات کی تھی، کیا یہ وہی شخص تھا، جس نے تم سے کینیڈا میں ڈیل کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، وہ کوئی دوسرا شخص تھا۔ لیکن بھارت میں آ کر اسی سے رابطے میں تھے۔ اس دوران ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب لوگوں کو ایک جڑ پرے پراکٹھا کر رہا ہے۔ اب اس کا نمبر بند ہے۔“ اس نے روہانسا ہو کر کہا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے، اب اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو پھر تم کیا کرو گے؟ ظاہر ہے ہمارے کام تو نہیں آؤ گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

”میں ہمیشہ کے لیے اس زندگی سے توبہ کر لوں گا اور واپس کینیڈا چلا جاؤں گا۔ میں نے بہت سزا پالی۔“ اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”اوکے، دیکھتے ہیں، تمہارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اوپر ڈرائیونگ روم میں آ کر میں نے جیپال سے پوچھا۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب بھی سچ بات کر رہا ہے۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا

”اور اہمیت تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے پوچھا

”نہیں، جو اس نے کہنا تھا کہہ دیا، پتہ نہیں کتنی بار پوچھا، وہ یہی جواب دے رہا ہے۔ اس پر مزید محنت فضول ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے اب اسے میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا تو سندھو نے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں کوئی معاملہ ہے۔“

”پتہ نہیں، ویسے تو یہ بیکار ہی ہے، ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”ٹھیک ہے دیکھ اسے، ہم تیار ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں نے صوفے پر بیٹھی بانٹیا کور کی طرف دیکھا۔ وہ یوں بیٹھی تھی جیسے نیند میں ہو۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

”کمرے میں جا کر سو جاؤ، یہاں کیوں بیٹھی ہو۔“

”تیرے انتظار میں، تُو مجھے یہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے جاؤ اور مجھے سلا دو۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا۔

”چل۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے ایک دم سے کہا اور اسے اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ میرے یوں کرنے پر کبھی نے اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کرنے لگے۔ میں اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اسے بیڈ پر لٹایا اور اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ مجھے اس کا وہ انداز یاد آ رہا تھا جب وہ مسلح لوگوں کے درمیان پہل تان کر کھڑی تھی۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔

”بھو!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”ہوں۔“ اس نے نیند بھرے لہجے میں ہنکارا بھرا

”تم اتنی دلیری سے پہل تان کر کھڑی ہو گئی، تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگا کہ سامنے اتنے لوگ اسلحہ تانے کھڑے ہیں۔“ میں نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

”نہیں لگا۔“ وہ آنکھیں بند کیے بولی۔

”کیوں؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ تم اندر خطرے میں تھے، اور اب باتیں بند کرو اور خاموشی سے میرے ساتھ لیٹے رہو، مزے کی نیند آ رہی ہے۔“ اس نے خمار بھرے لہجے میں کہا میں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ کچھ اور میرے نزدیک ہو گئی پھر جلد ہی سو گئی لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک موجودہ حالات پر سوچتا رہا۔ ایک خیال آتے ہی میں نے جانی بھائی کا نمبر ملا دیا۔

”بول بڑو۔“ اس نے چپکتے ہوئے کہا۔

”جانی بھائی کبھی تم نے جیل کو دیکھا ہے، جسے ہم گدھ کہتے ہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں دیکھا ہے، بڑا صبر ہوتا ہے اس میں، جب تک اس کا شکار مر نہیں جاتا، وہ اس پر نظر رکھتا ہے، چاہے، جتنے دن گزر جائیں۔“ اس نے بھی میری بات کو سنجیدگی سے لیا تو میں نے کہا۔

”مجھے دو تین لڑکے ایسے ہی چائیں، بہت صبر والے مگر نفل ڈرامہ باز۔“

”ہے نا، کب چائیں۔“ اس نے پوچھا۔

”ابھی بھیج سکتے ہو تو ابھی، ورنہ کل رات کو۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

سندو نے اپنی گاڑیوں پر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت رات کا اندھیرا تھا جب وہ لوگ گوا نکلنے کے لیے تیار تھے۔ وہ نکل گئے تو جانی بھائی کی طرف سے دولڑکے آگئے۔ انہوں نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ چونکہ ہریال نے وہیں اس جنگل میں رہنا تھا، اس لیے میں نے اسے ساتھ لیا اور ایک کمرے میں چلا گیا۔ ان تینوں کو گرہاج کے بارے اچھی طرح بریف کرنے کے بعد، انہیں ایک پلان دیا کہ انہوں نے کرنا کیا ہے۔ وہ سمجھ گئے تو میں وہاں سے نکلا۔ سب تیار تھے۔ اس لیے انہوں نے اسی وقت اپنا کام شروع کر دیا۔

ان تینوں نے گرہاج کو بے ہوش کیا۔ اسے تہہ خانے سے لاکر کار میں ڈالا اور نکل گئے۔ چرچ روڈ کے پاس ایٹور لعل پارک اس وقت سنسان تھا۔ انہوں نے پوری احتیاط سے ادھر ادھر کا جائزہ لے کر تسلی کر کے پارک میں ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ پھر اسے نکال کر ایک بیچ پر ڈال دیا۔ ہر پال انہیں وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ دونوں اس کے قریب بیچ کے پاس یوں لیٹ گئے جیسے رات سے یہیں پڑے ہوئے ہوں۔ شراب کی ایک خالی بوتل قریب ہی رکھ لی۔ بظاہر وہ سوئے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حالت سے لگ رہا تھا کہ انہوں بڑی پی ہوئی ہے۔ اب تک شراب کے غمار میں ہیں۔ ممبئی کے پارکوں، فٹ پاتھوں، اور ایسی جگہوں پر جہاں رات گزاری جاسکے، کئی موالی، بے روزگار، غریب غریبا، رات گزارنے کو پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی کرنا تھا۔

کوئی آدمی کھٹے کھٹے بعد گرہاج کو ہوش آگیا، وہ اٹھنے کی کوشش میں تھا لیکن نہیں اٹھ سکا۔ اس کے منہ سے زور دار کراہ نکلی۔ یہی وہ موقع تھا جب وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا ڈرامہ شروع ہو گیا۔

”اے چھوٹے، کیا ہے رے، ایسا آواز کیوں نکالتا ہے، کچھ دکھتا ہے؟“ اس کی آواز میں یوں خمار تھا جیسے نشے میں ہو، تبھی دوسرے نے بھی اسی نشی آواز میں جواب دیا

”ارے نہیں بڑے، میں کب بولا؟“

”تو پھر کون بولا؟“ وہ لیٹے لیٹے حیرت سے بولا۔

اس پر گرہاج نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کراہ کر کہا۔

”یار میں ہوں۔“

”ہائیں تو کون؟“ بڑے نے کہا اور اٹھ بیٹھا، چھوٹا بھی اٹھ گیا اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا

”یار یہ کیا مصیبت ہے، سونے بھی نہیں دیتے یہ لوگ، یہ کدھر سے نکارے۔“

بڑے نے آنکھیں ملٹے ہوئے گرہاج کو دیکھا، پھر الجھتے ہوئے نشی آواز میں اس سے پوچھا۔

”یار جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو ادھر نہیں تھا، ہم نے ادھر بیٹھ کر بوتل خالی کیا۔ کیا تو اس وقت تھا ادھر؟“

”نہیں، تم میری مدد کرو، مجھے اٹھا دو۔“ گرہاج نے منت بھرے لہجے میں کہا تو چھوٹا بولا۔

”ابے پڑا رہ، اٹھ کے کیا کرے گا، سو جا۔“

”نہیں، میں مصیبت میں ہوں، میری مدد کرو یار۔“ اس نے پھر اسی لہجے میں کہا۔

”پر نہیں کیا فائدہ، اپنا نقشہ ہرن کر دیا نا۔“ چھوٹے نے اکتاہٹ سے کہا تو وہ انہیں لالچ دیتے ہوئے بولا۔

”دیکھو۔ میری مدد کرو گے تا تو مالا مال کر دوں گا۔“

”دیکھ بڑے کیا ہے اس کے پاس، وہ تو لے۔“ چھوٹے نے یوں کہا جیسے وہ لونے کے چکر میں ہو۔

”دیکھ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، مجھے اغوا کیا گیا تھا، مجھے کسی ٹھکانے لگا دو تو میں تم دونوں کو بہت دوں گا۔“ اس نے کہا۔

”کیا لٹوا ہے تیرے ساتھ؟“ بڑے نے پوچھا۔

”یار میں سب بتا دوں گا۔ مجھے کسی محفوظ جگہ لے چلو، میرا یقین کرو، ایک فون کال کروں گا، تو جتنے چاہے گا

اٹنے پیسے دوں گا۔“ گرہاج نے پھر منت کی تو بڑے نے چند لمحے سوچنے کی ایکٹنگ کی پھر اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔

اس نے تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا ”فون ہے تیرے پاس؟“

”نہیں تو، اپن کہاں رکھتا ہے۔“

”کوئی محفوظ جگہ ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ایک کھولی ہے۔“ بڑے نے کہا تو گرہاج چونک گیا، تبھی اس نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ کنسی جگہ ہے؟ میں کہاں ہوں؟“

”تو ممبئی میں جوہو کے ایٹور لعل پارک میں ہے، کسی بات کرتا رہے ٹو۔“ جیسے ہی بڑے نے کہا تو وہ چونک

گیا، اس میں جیسے جان آگئی۔

”سچ کہتے ہو میں ممبئی میں ہوں۔“ اس نے تصدیق کی تو بڑے نے دوبارہ دہرا دیا۔

”ٹو مجھے اس کھولی ہی میں لے چل۔ دوپہر سے پہلے چلا جاؤں گا، مالا مال کر دوں گا۔ ٹو چل لے چل مجھے،

نکلی دور ہے؟“ اس نے یوں تیزی سے پوچھا جیسے بے صبر ہو رہا ہو۔

”تھوڑا دور ہے۔ ٹیکسی رکشہ تو لینا پڑے گا۔“ بڑے نے کہا تو گرہاج نے اپنی جینسیں ٹٹولیں۔ اسے جب

سے چند ٹوٹ مل گئے۔ اس نے وہ بڑے کو دے دیئے۔ دونوں نے مل کر گرہاج کو اٹھایا اور اسے لے کر پارک

کے باہر چل دیئے۔ اس میں جوش بھر گیا تھا۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی، جب وہ اسے گھوکھلے روڈ پر واقع ایک چال میں لے آئے جو سریش کالونی کی

ہلک سائیڈ پر ایک بڑی عمارت تھی۔ کم آمدنی والوں کے لیے ممبئی میں ایسی کئی عمارتیں ہیں، جن کے کمرے ڈربہ

لما اور ان میں انسان پرندوں کی مانند رہتے ہیں۔ دوسری منزل پر ایک کمرہ نما کھولی تھی۔ اس میں انہوں نے

گرہاج کو لا ڈالا۔ چھوٹا اس کے پاس لیٹ گیا اور بڑا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں

ایک فون تھا۔

”دیکھ میں فون ادھر بھائی سے مانگ کر لایا ہوں، تو کال کر لے، چائے لائے گا تاڑکا تو فون واپس کرنے کا

ہے، اسے پیسہ بھی دینا ہے کال کا۔“ بڑے نے اسے فون تھماتے ہوئے کہا۔

گرہاج نے فون پکڑ کر تیزی سے نمبر ڈائل کئے۔ تھوڑی دیر تک بات کرتا رہا تو اس کا چہرہ تھمتانے لگا۔ فون

واپس لوٹانے سے پہلے، اس نے ڈائل کیا ہوا نمبر صاف کر کے فون بڑے کو دے دیا۔

”یہ فون واپس کر دے اور چائے لے آ، پھر نکلتے ہیں۔“ اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جسے چھوٹے اور بڑے

لے بہت محسوس کیا۔ بڑے نے فون واپس لیا تو چھوٹے نے پوچھا۔

”ابے کہاں نکلتا ہے، تیرے کو لینے کوئی نہیں آئے گا کیا، تو بھی اپنے جیسا پٹر ہے کیا؟“

”اؤ نہیں یار، تم تو شک ہی کرتے چلے جا رہے ہو، ہم یہاں سے ایک جگہ جائیں گے، وہاں میں تم کو پیسہ

نرس بیک سے دوایاں نکال کر رکھ چکی تو ڈاکٹر واپس جانے کے لیے پلٹا تو نرس بھی چلی گئی۔ اس سے انہیں لگا کہ جیسے گرباج کی آمد کے ساتھ ہی ڈاکٹر کو بلا لیا گیا تھا۔ وہ جا چکے تو اس شخص نے چند بڑے نوٹ نکال کر انہیں دے دیئے۔ تبھی اس شخص نے کہا۔

”دیکھو، تمہیں ایک دو دن لگ جائیں گے یہاں۔ ابھی تم شاید ہی کینیڈا کا سفر کر سکو۔ میری تو مصروفیت رہتی ہے، اگر تمہارے یہ دوست تمہاری دیکھ بھال کر سکیں تو اس کے الگ پیسے دے دیں گے۔“

”نہیں، ہم نے جانا ہے، ادھر رہنے کا نہیں، ہم تمہارے لغوے میں نہیں آتے۔“ چھوٹے نے تیزی سے کہا اور اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ بڑا بھی اٹھ گیا۔

”ابھی میں مزید پیسے دیتا ہوں، تم جا کر نئے کپڑے خریدو، یا میرے یہاں سے لے لو، شام تک تو رہو، کھانا دانا کھاؤ، پھر چلے جانا۔“

”نہیں تم کوئی لیے لغوے والا لگتا ہے، ہم تیرے لغوے میں نہیں آتے، اپن کو جانے کا ہے۔“ بڑے نے ہلکا سا انداز سے کہا جیسے وہ بہت ڈر گیا ہو۔ وہ دونوں وہاں رہنے کو نہیں مانے۔ گرباج اور اس شخص کو جب یہ یقین ہو گیا کہ یہ عام سے ٹوری قسم کے شرابی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

وہ دونوں واپس کھولی میں چلے گئے اور یہ ساری روداد انہوں نے مجھے دوپہر کے بعد فون پر دی۔ میں نے انہیں کھولی ہی میں رکنے کا کہہ دیا۔



جہاں کے ساتھ، سارے لوگ سہ پہر کے قریب گوا بچھ گئے۔ سندو نے وہاں اپنی طرز کے بندے تلاش کر لیے ہوئے تھے۔ اس نے روڈ کے ذریعے جانے کو اسی لیے ترجیح دی تھی کہ اس دوران وہ گوا میں مدد کے لیے لوگ تلاش کر سکے۔ فریڈنس ایک چھوٹا گینگ چلاتا تھا۔ اس کا زیادہ کام غشیات کی فروخت تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر ملکی لوگوں کو لوٹ بھی لیا کرتا تھا۔ سمندر کے ذریعے اسلحہ لانے اور لے جانے کا ماہر تھا۔ سندو کو کام کا آدمی مل گیا تھا۔ جس وقت وہ گوا پہنچے انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ رامیش پاڈے کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ عالمی امن والا وہ ایک فائینو اشار ہوٹل تھا۔ انہوں نے وہیں کمرے لیے اور رامیش پاڈے کے بارے اپنے کام کی ابتدا کر دی۔ رات گئے تک وہ پوری طرح تیار ہو کر پلان بنا چکے تھے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے اور رامیش پاڈے سے نپٹنے کے بعد وہاں سے نکلنا کیسے ہے۔ کیونکہ واردات سے پہلے نکلنے کا راستہ سوچا جاتا ہے۔

سورج نکل آیا تھا۔ مشرق سے ابھرے ہوئے سورج کی روشنی سے سمندر کا پانی یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا ہلکورے لے رہا ہو۔ ہوٹل کی کھڑکی سے ساحل سمندر کا منظر بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سارے لوگ اس وقت ساحل پر تھے۔ جہاں نے رامیش پاڈے کو پہلی بار اسی صبح ساحل سمندر پر دیکھا۔ وہ ادیب عمر، فریبہ مائل اور نانائے قد کا تھا۔ اگرچہ اس نے اسے تصویروں میں دیکھ لیا تھا لیکن اس وقت ذرا مختلف لگا۔ اس کے ساتھ اس کی موٹی اور گورے رنگ کی بیوی، دو لڑکین عمر کی بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ ان سے ذرا واسطے پر چند سیکورٹی گارڈ ٹہل رہے تھے۔ ان کا انداز داک کرنے والا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ سیکورٹی کا کوئی اور ارزہ بھی موجود ہو، لیکن فی الحال سامنے پانچ چھ بندے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

اس وقت جہاں ہوٹل کے ایک ایسے کمرے میں تھا جہاں سے ساحل سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کسی

دوں اور بات ختم۔“ گرباج نے کہا۔

”وہاں جا کر ٹیکسی کا کرایہ بھی ہم کو دینا پڑے، ادھر جا کر بولے گا کہ ہم بھاگ جائیں، کوئی پیسہ نہیں۔“ چھوٹے نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”نہیں یار ایسا نہیں ہوگا، میرا یقین کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے بڑے سے کہا، ”جایا اگر چائے ملتی ہے تو ٹھیک، ورنہ وہیں چل کر پیتے ہیں۔“

”چائے تو آئے گی، ادھر چل کے دوبارہ پی لیں گے۔“ بڑے نے کہا اور باہر نکل گیا۔ بڑے کے واپس آنے سے پہلے ہی لڑکا چائے دے گیا۔ انہوں نے چائے پی اور وہ دونوں اسے پکڑ کر کھولی سے باہر بیڑھیوں تک لائے اور اسے نیچے لے آئے۔ اسی طرح وہ سڑک تک آئے، وہیں سے انہیں ٹیکسی ملی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے ڈرائیور سے کہا۔

”آزاد مگر چلو۔“

”آزاد مگر کہاں پر؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”دیر آؤ بیسیاں روڈ کے ساتھ ہی اندر بلڈنگ میں جانا ہے۔“ گرباج نے کہا تو ٹیکسی چل دی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ آزاد مگر پہنچ گئے۔ ان دونوں نے اندازہ لگا لیا کہ گرباج نے وہ جگہ نہیں دیکھی ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک بلڈنگ سامنے آ کرے۔ باہر ہی ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ صورت حال بھانپ کر آگے بڑھا۔ اس نے گرباج کو غور سے دیکھا اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”گرباج سنگھ؟“

اس پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اس شخص نے اپنا والٹ نکال کر ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔ اس دوران وہ دونوں گرباج کو سہارا دیئے کھڑے رہے۔ وہ پلٹا تو انہیں آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھا۔ چاروں لفٹ سے چوتھی منزل تک گئے۔ پھر ایک اپارٹمنٹ میں انہیں لے جایا گیا۔ وہ کافی سجا ہوا تھا۔ ایک لڑکی ان کی منتظر تھی۔ گرباج کو صوفے پر لٹا دیا کر دونوں نے کھڑے کھڑے ہی اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لے بڑو، ہم نے تجھے ٹھکانے پر چھوڑ دیا، اب ہم جاتے ہیں۔“ چھوٹے نے کہا تو وہ اجنبی شخص بولا۔

”یار تم اتنے اچھے ہو، ہمارے دوست کو ہم تک پہنچا دیا، ابھی بیٹھو، چائے داتے بیٹو، پھر چلے جانا۔“ یہ کہتے ہوئے اس اجنبی شخص نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر سامنے دھرے صوفے پر بیٹھا دیا۔

”میں نے ان دونوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ انہیں ڈھیر سارے پیسے دوں گا۔“ گرباج نے کہنا چاہا تو وہ شخص بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”یار یہ ہمارے محسن ہیں، ابھی چلے جائیں گے، خوش کر دیں گے انہیں، تم بتاؤ، یہاں کیسے؟“

”مجھے نہیں معلوم، میں تو چند ہی گڑھ میں تھا، وہ لوگ کب مجھے یہاں ممبئی میں لے آئے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ تو ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ میں ممبئی میں ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے پارک سے اب تک کی روداد سنا دی۔ وہ شخص غور سے سنتا رہا۔ اس دوران چائے آ گئی۔ ایسے میں ایک ڈاکٹر اور نرس بھی وہیں آ گئے۔ انہوں نے کافی دیر تک پوری تسلی کرنے کے بعد کہا۔

”کافی تشدد ہوا ہے۔ یہ غیبت ہے کہ کوئی بڑی فریکچر نہیں ہے۔ میں انہیں فوری طور پر ستر کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ بہت ضروری ہے تو ایک دو دن بعد تک، اتنے میں یہ کافی سنبھل جائیں گے۔“

اور جوڑے کا کمرہ تھا جو اس وقت بے ہوشی کی حالت میں بیڈ کے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کمرے کی کھڑکی میں کھڑا دور بین سے رامیش پاڈے اور اس کی فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ رویت کو اس کے پاس کھڑی تھی۔ سندو، اجمیت اور فریڈنس کے لوگ ساحل سمندر پر اسی کے قریب ہی تھے۔ تبھی جہال نے رامیش پاڈے کو روہی کی مدد سے فون کال ملائی۔ جس کا ریکارڈ کہیں نہیں ہوتا تھا۔ رامیش نے حیرت سے بچتے ہوئے فون کی اسکرین کو دیکھا، پھر کان سے لگا کر پہلو کیا۔ اسٹیکر آن تھا۔ جہال نے فون رویت کو رکھتے ہوئے کہا۔

”رامیش پاڈے، میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو اور میں تجھے مارنا بھی نہیں چاہتا، صرف چند سوال کا جواب نہیں چاہئے، بلکہ ان کی تصدیق چاہتا ہوں۔“

رامیش سمجھ دار بندہ تھا۔ اس نے فوری ری ایکٹ نہیں کیا، بلکہ بڑے تحمل سے بولا۔

”تم کون ہو، کیا یہ نہیں جانتے کہ مجھے دھمکی دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“

اس پر جہال نے اُسے جواب نہیں دیا بلکہ سائیکسٹر لگی گن کو سیدھا کیا، ٹیلی اسکوپ سے اس کے بیٹے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے سے رفلکس بال کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ کمرے میں ہلکی سی آواز گونجی لیکن وہاں ساحل پر ایک دم سے اُن کے درمیان خوف پھیل گیا۔ اس کے گاڑا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک دم سے الرٹ ہو گئے۔ تب جہال نے سرد لہجے میں کہا۔

”میری بات کا جواب نہ دینے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سب کو یہیں مار سکتا ہوں۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آیا تو بتاؤ، کس کا نشانہ لوں؟“

”اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تو جواب لینے کے بعد ہمیں کچھ کہے گا نہیں؟“ اس نے بڑے تحمل سے کہا۔

”تم گاڑی مانگنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تماشا بننا چاہتے ہو تو بولو، تیرے گاڑی بھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔ میرے پاس تم لوگوں سے زیادہ گولیاں ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟“ جہال نے بے پردہ لہجے میں کہا۔

”پوچھو۔ کیا پوچھتے ہو؟“ اس نے سیکورٹی والوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکنے ہوئے کہا۔

”پریم نا تھ تمہارا گینگ چلا رہا ہے یا کسی دوسرے کا؟“ جہال نے پوچھا۔

”اوہ تو یہ تم ہو۔“ اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر بولا، ”وہ کسی دوسرے کا گینگ چلا رہا ہے۔“

”تمہارا اس میں کیا کردار ہے؟“ جہال نے پوچھا۔

”اپنا مفاد لے کر انہیں کھینچنے کا موقع دے رہا ہوں۔ وہ جو کھیل کھیل رہے ہیں، اسے دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے سکون سے گول مول جواب دیا

”اس دوسرے بندے کے بارے میں بتاؤ، کون ہے وہ؟“ جہال نے پوچھا۔

”میری اس سے صرف دو بار ملاقات ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون ہے، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ کسی عالمی گینگ کا ایک حصہ ہے۔“ رامیش بولا۔ اس دوران ایک سیکورٹی والا وہاں سے ہٹنے کی کوشش میں پیچھے ہٹا

اور ان سے الگ ہو کر جیب سے فون نکالا ہی تھا کہ جہال نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ گھوم کر ساحل پر جا پڑا۔

”یہ باقی لوگوں کے لیے کافی ہے نا۔“ جہال نے کہا۔ اس وقت رامیش پاڈے کے چہرے پر تشویش لہرائی

۔ اس نے اپنے لوگوں کو مارواڑی زبان میں کچھ کہا تو جہال بولا، ”وقت کم ہے رامیش، اس کا رابطہ نمبر دو۔“

”ابھی دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون سے نمبر دیکھا، اور پھر بتا دیا۔ جہال کو معلوم تھا کہ یہ نمبر نوٹ ہو گیا ہوگا۔ تبھی اس نے کہا۔

”ایک منٹ یہیں رکو، میں نمبر کی تصدیق کر لوں، اگر غلط ہوا تو.....“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ جہال نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ اسی لمحے روہی سے تصدیق ہو گئی کہ نمبر چل رہا ہے اور وہ میٹھی کا ہے۔ جہال نے گن وہیں رکھی۔ فون سے رامیش کا نمبر ڈیلیٹ کیا۔ دونوں سکون سے باہر نکل گئے۔ جس وقت وہ اپنے کمرے میں پہنچے۔ اس وقت تک ہوٹل میں بھگدڑ نہیں مچی تھی۔ کسی نے ان پر شک نہیں کیا۔ ان کے پاس کمرے میں رکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان کا سامان دو گھنٹے پہلے جا چکا تھا۔ کمرے سے انہوں نے وہ سامان لیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ ساحل پر سن باتھ لینے جا رہے ہیں۔ ان کی گاڑیاں فریڈنس کے ایک گیراج میں تھیں۔ جو شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔ جہال اور رویت ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوں لابی میں آئے جیسے وہ ایک دوسرے میں گم ہوں اور ابھی ساحل پر جا کر ایک دوسرے میں مزید گم ہو جائیں گے۔ یہ توقع تھا کہ وہ ہوٹل سے گم ہونے کے لیے ہی وہاں سے نکلے تھے۔ وہ ساحل کے ایک خاص مقام پر آ گئے۔ تبھی انہیں اطلاع ملی کہ رامیش، اس کی فیملی اپنے گاڑی زسیت ابھی تک ویسے ہی کھڑے ہیں لیکن تب تک اطمینان حیرت میں آ گئی تھیں۔

ابھی چند منٹ ان کے لیے بہت اہم تھے۔ اگر وہ نمبر غلط ہوتا تو وہیں رامیش کو گولی مار دی جاتی۔ اس کے لیے سندو تیار بیٹھا تھا۔ پھر انہوں نے فرار ہو کر اکیلے اکیلے مختلف جگہوں پر پہنچنا تھا لیکن اسی وقت روہی سے کال آ گئی۔ وہ نمبر درست تھا اور اس شخص کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ وہ لوگ فوراً واپس مہینے پہنچ جائیں گے۔ گوا سے نکلنے کے لیے ان کے پاس وقت انتہائی کم تھا۔ اگر وہ زیادہ دیر کرتے تو وہ یہاں پھنس بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ناکہ بندی کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ انہیں لگا جیسے انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ اال دیا ہو۔



اس وقت سورج نہیں نکلا تھا جب میں اور بائیتا کورنا شتے سے فارغ ہو گئے تھے۔ میں رات بھر نہیں سویا تھا۔ بڑے اور چھوٹے نے جس وقت مجھے وہاں کی روداد سنائی تو میرا شک پختہ ہو گیا۔ گرباج نے جس بندے کا نمبر ملا تھا، اگرچہ اس نے ہوشیاری سے ڈیلیٹ کر دیا تھا لیکن وہ کسی جگہ جال میں انک گیا۔ پھر اسی نمبر کی مدد سے ہند نمبر سامنے آئے جو بہت تیزی سے ایک دوسرے کو ملائے گئے۔ میرا شک یقین میں بدلنے لگا کہ جہاں پر گرباج ہے، وہیں سے ضرور کچھ نہ کچھ سامنے آئے گا۔

شام ہوتے ہی میں نے جانی بھائی سے ملنے کو کہا۔ اس نے ہوٹل آ جانے کو کہا۔ میں بائیتا کور کے ساتھ اس کے ہوٹل پہنچ گیا۔ جہاں میں اور جہال ایک رات ٹھہرے تھے۔ ہوٹل کی چھت پر میری اور اس کی ملاقات ہوئی۔ اسے ساری بات کی خبر تھی۔ چونکہ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ نمبر کہیں ٹریس ہو گئے ہوئے تھے، اس لیے اس نے پوچھا۔

”بڑو، تجھے کیسین مالوم کہ اس بلڈنگ میں وہ سالہ آزاد ہوئے گا؟“

”پتہ نہیں کیوں جانی بھائی، میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ وہاں کچھ نہ کچھ ہے، گرباج نے بہت تشدد بھلا، پر بات پھر بھی ٹھیک نہیں کی۔“ میں نے اسے بتایا

”تو پھر سے اس سالے گرباج کو وہاں سے اٹھا لیتے ہیں۔ کیا بولے ٹو۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”دیکھ جانی بھائی، ہم دونوں کے علاوہ باقی لوگ رامیش پر ہاتھ ڈالنے گئے ہیں، یا تو وہ مرے گا، یا بچ بولے

گا۔ اگر اس نے بھی اس بلڈنگ میں رہنے والے کسی بندے کی تصدیق کر دی تو میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس پر وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر اٹھ کر ٹیلے لگا، کچھ دیر بعد بولا۔

”ٹو اتنا بڑا رسک لے گا، میرے دماغ میں نہیں تھا۔ چل ٹو کہتا ہے، ویسا ہی کرنے کا، کتنا لڑکا لوگ چاہیے تھے؟“

”زیادہ رش نہیں چاہئے، چار پانچ، جو فائیر اور شوٹر بھی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مل جائے گا۔“ اس نے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا پھر پر کلف ڈز کے بعد وہیں ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہر گئے۔ کمرے میں آتے ہی میں نے باغیا کور سے کہا۔

”تم نے کوئی بات نہیں کی، خاموش رہی؟“

”میرے مطلب کی کوئی بات نہیں تھی اور مجھے لگتا ہے کہ ٹو جتنی محنت کر رہا ہے وہ فضول جائے گی۔“ اس نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے کہا۔

”کیوں ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یار، وہ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو تیرے انتظار میں وہاں بیٹھا ہوگا کہ ٹو جائے اور اسے پکڑ لے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں کیا کہنا چاہتی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”مان لیا کہ وہ لوگ اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں، جنہیں تم نے پکڑنا ہے، تم جزیرے سے بھاگے، گرباج پکڑا گیا، پریم ناتھ سے دودو ہاتھ کر کے رامیش کا پتہ پوچھا، کیا یہ باتیں ان لوگوں کے لیے الارم نہیں ہیں کہ تم کسی بھی وقت ان تک پہنچ سکتے ہو۔“ وہ بولی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو، رامیش ہی تصدیق کرے گا نا کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ اصل الارم تب ہوگا، جب رامیش کو کچھ ہوگا۔ جس کے سر پر یہ ساری گیم کی جارہی ہے۔ پریم ناتھ جیسے دوسرے مہرے بھی ہو سکتے ہیں۔“

”پھر بھی رسک ہے، تم چاہو تو ہم اس بلڈنگ میں جا سکتے ہیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اہم آدمی وہاں سے ملے۔“ اس نے ہلکی سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا تو میں نے نگاہیں پھیر لیں۔ میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور باغیا کی باتوں پر سوچنے لگا۔ باغیا سوگنی اور میں نے روہی سے مسلسل رابطہ رکھا تھا۔ میری ساری توجہ ایک نمبر پر مرکوز ہوگئی۔ وہ ایک نمبر تھا جس پر بہت زیادہ کالیں آرہی تھیں اور وہاں سے کی بھی جارہی تھیں۔ یہ وہی نمبر تھا جس پر گرباج نے کال کی تھی۔ اور اس پر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جانی بھائی کے بیچے ہوئے لڑکے سورج نکلنے سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ ہم ناشتہ کر کے تیار ہوئے اور اس وقت لاہی میں آگئے جب سورج نے اپنی روشنی پھیلانے کے لیے سر اٹھایا۔ وہ ہمیں وہیں لاہی میں ملے۔ وہ چھ لوگ تھے اور دو فور وینیل جیپوں میں آئے تھے۔ ہم چار چار بیٹھ گئے اور آزادانہ طور پر طرف چل پڑے۔

اس وقت ہم ویرا ڈیپائی روڈ کی اس بلڈنگ کے قریب تھے جس وقت جہاں نے رامیش پاٹلے کو گمن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا، رامیش پاٹلے نے جیسے ہی وہ نمبر جہاں کو بتایا۔ اسی وقت روہی سے اس نمبر کی مزید تصدیق ہوگئی۔ یہ وہی جگہ تھی، جس جگہ گرباج جا پہنچا تھا، کچھ دیر بعد مین روڈ سے ویرا ڈیپائی لنک روڈ سے ہوتے ہوئے ایک فٹول اسٹیشن کے پاس آن رکے۔ اس دوران میں تمام راستے میں انہیں سمجھاتا آیا تھا کہ یہ آپریشن انتہائی کم لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہ کیسے کرنا ہوگا۔ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔ خاص آلات کے ساتھ ہم

سب میں رابطہ تھا۔ ایک جگہ ہونے والی آواز دوسرے کو سنائی دی جا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے روڈ پر ہم اس بلڈنگ کے پاس پہنچ گئے۔

اتنی صبح روڈ پر اکا دکا لوگ ہی تھے۔ بلڈنگ کا چوکیدار میز پر سر رکھے پڑا تھا۔ ایک لڑکے نے اسے اٹھایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، لڑکے نے زوردار گھونسنہ اس کے سر پر مارا۔ وہ اسی لمحے لڑھک گیا۔ ہم چار پہلے لفٹ میں داخل ہوئے، باقی سیڑھیوں سے اوپر چل پڑے۔ جیسے ہی چوتھی منزل تک پہنچ کر لفٹ کا دروازہ کھلا، سامنے پانچ لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ایک گرباج تھا۔ باقی چاروں نے ہم پر گتیں تان لیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں سے اس ساری گینگ کے سوتے پھوٹتے تھے۔ میں نے اب تک گرباج کو ایسے چہرے کے ساتھ ہی دیکھا تھا جس پر مظلومیت ہوتی تھی، لیکن اس وقت اس کے چہرے پر خباثت بھری طنز یہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی نفرت تھی۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یوں میرے سامنے آ جاؤ گے۔ میں چاہوں تو یہ چاروں ابھی تیرے بدن میں اتنے سوراخ کر دیں کہ کوئی گمن بھی نہ سکے۔ مگر میں تمہیں ایسے نہیں ماروں گا، لے چلو انہیں۔“ آخری لفظ اس نے ایسے تحمانہ انداز میں کہے تھے جن میں ہلا کی نفرت تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ان چاروں نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔ انہوں نے ہمیں پکڑنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا، بلکہ گن سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم جیسے ہی باہر آئے، کارڈور میں سے دو بندے بھاگتے ہوئے آگئے۔ چند لمحے وہ صورت حال کا جائزہ لیتے رہے، پھر لمحہ بھر میں سب کچھ سمجھ کر ہماری تلاشی لینے کے لیے آگے بڑھے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ ہمیں نہتا کر چکے تھے۔

گرباج کی پوری توجہ میری طرف تھی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں ہی میں نہیں بلکہ اس کے چہرے سے نیچتی نفرت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اور میرے ساتھی نہتا ہو چکے تھے۔

”چند منٹ، اگر تم لیٹ ہو جاتے تو شاید ہم کبھی نہ ملتے۔ خیر، یہ اچھا ہوا برا، تم لوگوں نے میری مہمان نوازی کی اب ہم تمہاری مہمان نوازی کریں گے چلو۔“ اس نے کارڈور میں اس طرف چلنے کا اشارہ کیا، جدھر سے دو بندے تیزی سے آئے تھے۔ میں ایک لفظ بولے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔

مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ جب انہوں نے ہماری تلاشی لی تھی، اس وقت ان کی توجہ اس آلے کی طرف نہیں گئی، جس سے ہم سبھی ایک دوسرے کی بات سن سکتے تھے۔ وہ گردن کے پیچھے تھا اور اس کا ہمیں سامنا ایک ہمارے کانوں میں لگا ہوا تھا۔ یہی احساس مجھے اطمینان دے رہا تھا کہ یہاں ہونے والی باتیں باغیا کور کے ساتھ ان ساتھیوں نے بھی سن لی ہوں گی، جو سیڑھیوں کے ذریعے اوپر آ رہے تھے۔ باغیا کور ان کے ساتھ تھی۔ اس سمیت سبھی محتاط ہو گئے ہوں گے یا نہیں، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ ہمیں لیتے ہوئے بالکل سامنے والے دروازے پر آن رکے۔ انہوں نے دروازے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک لمبے قد والی لڑکی کھڑی تھی، جس نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سفید شرٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی تھی اور اس کے بال بندھے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں وہ بزنس ویمن دکھائی دے رہی تھی، لیکن اس کی نیلی آنکھوں میں سے سفاکیت جھلک رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے میرے

ساتھیوں کو وہیں رکھنے اور مجھے اندر لے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ پشت پر دروازہ بند ہو گیا اور اس لڑکی نے پسل نکل کر مجھ پر تان لیا۔

”چلو، آگے بڑھو۔“ اس نے انگریزی میں تھکمانہ انداز میں حقارت سے کہا۔

وہ ڈرائنگ روم تھا، جس کے آگے ایک اسٹڈی روم تھا۔ وہ مجھے وہاں لے گئی، سامنے ایک ادیز عرصہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ جھریوں بھرے چہرے پر کسی جذبے کا کوئی احساس تک نہیں تھا۔ اس نے لمبا سیاہ کوٹ، سفید شرٹ اور سر پر مخصوص ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے جوباس پہنا ہوا تھا، اس سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ یہودی ہے۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر سامنے بڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”بہادر ہو لیکن اپنی مسلمان قوم کی طرح بے وقوف بھی ہو۔ اتنی بڑی آخر تم ٹھکرا چکے ہو۔ ہم چاہتے ہیں.....“

”تم یہودی ہو، تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے، اس لیے تمہیں گالی دینے کی ضرورت نہیں۔ تم ابلیس کے بچے ہیں۔“ اس نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جو میری بات سن کر بھی ساٹ رہا۔ چند لمحوں بعد بولا۔

”تم لوگ وہی کرتے ہو جو ہم چاہتے ہیں۔ اسی برصغیر پر کتنے انگریز تھے؟ تمہارے ہی بھائی بند ایک دوسرے کو مارتے رہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ بولو کامیاب کون ہے، ہم یا تمہاری حق قوم، گھٹیا ہم ہوئے یا تم لوگ؟“

”یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے تاکہ کون کس چیز کو کامیابی سمجھتا ہے۔ تم ابلیس کو پھیلانا چاہتے ہو اور ہم انسانیت کو اس کا اعلیٰ مقام دینا چاہتے ہیں۔ تم مجھ سے اپنی بات منوانا سکتے؟ نہیں نا، یہی میری کامیابی ہے۔“ میں نے انتہائی طعنے سے کہا۔ اس پر وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ پھر حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

”تم..... اور تمہاری کامیابی..... ہماری گریٹ گیم میں تیرے جیسے تنکے ذرا سی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہماری بچائی ہوئی بساط پر تیرے جیسے مہرے نہیں ہوتے، ہاں مگر! مہروں کو بساط تک لانے میں ایندھن کی طرح کام آتے ہیں۔ تیری کامیابی اس لڑکی کے پسل کی چند روپے والی گولی میں تحلیل ہو جائے گی، وہ بھی چند لمحوں میں۔“

”تو دیر کس بات کی ہے۔“ میں نے کہا تو اسی لمحے پسل کی نال میرے سر پر رکھ دی گئی۔

”بس دو لمحے..... لیکن ہم یہ بلٹ بھی ضائع نہیں کریں گے۔ ابھی فورسز کے لوگ یہاں آجائیں گے اور وہی سب کچھ تم لوگوں کے ساتھ کریں گے۔ یہ ہے کامیابی۔ تم بھی اپنے وطن سے دور ہو اور میں بھی۔ تم ایک دہشت گرد بن کر یہاں کی جیلوں میں اذیت ناک زندگی گزارو گے اور میں، میرے ایک اشارے پر بمبئی کرائم برانچ، خفیہ ایجنسیاں، آئی بی، را ان سب کے لوگ دوڑے چلے آئیں گے۔ بھارتی قانون ”ٹاؤ“ تو کیا، تم مہاراشٹر کا قانون ”کوکا“ ہی برداشت نہیں کر پاؤ گے۔“ اس نے طعنے لہجے میں کہا۔

”دیر مت کرو، میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”میرے ساتھ کیا ہوگا، میں یہ بھی جانتا ہوں۔ بھارتی حکومت پر میرا احسان ہوگا۔ ایک پاکستانی دہشت گرد اور اس کا نمیت ورک ان کے حوالے کر رہا ہوں۔ رامیش پاٹل میرا احسان مند ہوگا۔ دنیا کو یہ خبر ہی نہیں ہوگی کہ تم میرے ہی لائے ہوئے کاٹھ کے وہ آٹو ہو، جو ہمارے اس زمین ہاؤس سے نہیں بلکہ کسی سڑک سے پکڑے

گئے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن کچھ لوگوں کی آنکھیں بند نہیں ہیں۔ میری کوئی حیثیت نہیں، لیکن میری جگہ کوئی دوسرا آجائے گا اور.....“ میں نے کہا چاہا تو وہ بولا۔

”کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ دیکھو! حق۔ یہاں بھارت میں اپنا اثر سوخ بنانے کے لیے ہم نے کتنی محنت کی۔ سوڈے کی بوتلوں سے کام شروع کر کے آج انہیں اسلحہ فروخت کر رہے ہیں، جو آخر کار تیرے ملک پر چلایا جاتا ہے۔ اتنا سب کچھ چند لوگوں کے ذریعے نہیں ہوتا، اوپر سے لے کر نیچے تک گرفت کرنا پڑتی ہے اور وہ ہم نے کر لی۔ بھارت اپنے یوم آزادی پر ہمارے اسلحے کی نمائش کر رہا ہے۔ تمہیں تمہارے ملک سے اٹھایا اور جبراً لے کر گئے، کیا خیال ہے، وہ راڈار میں نہیں آیا ہوگا؟ یہ سمجھ لو، ہماری طرف سے آنکھیں بند ہیں اور اس وقت تک بند رہیں گی، جب تک ہم چاہتے ہیں۔“

”تم باتیں ہی کرو گے یا مجھے گولی بھی مارو گے۔ اتنی تفصیل بتا کر مجھے مرعوب کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔“ میں نے حقارت سے کہا۔

”نہیں، تمہیں اب بھی ایک چانس دے رہا ہوں۔ سنو۔ یہیں برصغیر میں راجے مہاراجے، نواب، جاگیردار اور وڈیرے ہیں نا، ان میں سے ایک تمہیں بھی بنا دوں گا، یہ میرا یعنی ڈیوڈ رینز کا وعدہ ہے۔ ہمارے لیے کام کرو۔ قوت ہم دیں گے، عیش تم کرنا۔“ اس نے چمکتی آنکھوں سے کہا۔

”تم تو بہت بڑے احمق ہو، مجھے زندہ.....“ میں نے کہا چاہا تو وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

”اپنے سوا، اپنے ہر ساسی کو خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کرنا ہوگا، وہ بھی جنہوں نے رامیش پاٹل سے پر حملہ کیا ہے۔ صرف تم رہو گے، یہی ایک راستہ ہوگا تم پر اعتماد کرنے کا، بولو۔“ اس نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔ تو میں ایک لمحے کے لیے سوچنے لگا۔ اس دوران میں نے جائزہ لے لیا کہ اس لڑکی کے سوا کوئی اور اس کمرے میں تو نہیں تھا لیکن اس اپارٹمنٹ اور اس بلڈنگ میں تو ہو سکتے تھے۔ پسل میرے سر پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”پہلے یہ پسل ہٹاؤ۔“ میرے کہنے پر اس نے اشارہ کیا اور لڑکی نے پسل ہٹا لیا۔ تب میں نے کہا۔

”دیکھو، یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے۔ اپنی مخوس شکل ہٹا کر اس حسین لڑکی کو میرے سامنے بٹھاؤ تاکہ میں کچھ اچھا سوچ سکوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس لڑکی کے گالوں کو چھوا، جس پر اس لڑکی نے برا مناتے ہوئے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

”تم کتنا وقت لوگے سوچنے کے لیے؟“ ڈیوڈ رینز نے پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس اس حینہ کے انتظار میں ہوں۔“

میرے اتنا کہتے ہی باہر سے میرے کالوں میں منمنہاٹ ہوئی کہ جانی بھائی اپنے لوگوں کے ساتھ پہنچ چکا ہے اور باغیہ کور تیار ہے۔ سیرجیوں والے لوگ محفوظ ہیں۔ کہو تو دھاوا بولیں۔

”ایسی بکواس مت کرو۔ تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”کوئی بھی ہو۔ میرے لیے تو ایک خوبصورت حینہ ہے۔ بس ذرا سا وقت دو، اس اسٹڈی روم سے بیڈ روم تک کا سفر طے کرنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اشارہ دے دیا، اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر پھر سے اس کے گال چھوئے تو اس نے پھر میرا ہاتھ جھٹکا لیکن اس بار میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بجائے اسے میز پر

پھینکنے کے، اس کا سہارا لے کر میں اٹھا ایک ٹانگ سے کرسی کو دھکا دیا اور دوسری ٹانگ کا پیر سیدھا ڈیوڑ رہینز کے منہ پر مارا۔ ایک دم سے ہلچل مچ گئی۔ میری ساری توجہ پستل پر تھی۔ تب تک وہ لڑکی میری بغل میں گھونہ مار چکی تھی۔ میں نے پستل پر ہاتھ مارا تو وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ تبھی میں نے اس کی ناک پر بیچ مارا، وہ لڑکھڑائی۔ میں نے اس کے پیٹ میں گھسنا مارا۔ ڈیوڑ رہینز پستل کی جانب بڑھا۔ میں اس سے پہلے ہی اس پر جا پڑا۔ تبھی اس لڑکی نے میری پسلیوں میں زور دار ٹھوکر ماری۔ ایک لمحے کے لیے میرا بدن سُن ہو گیا۔ میں پلٹا تو ایک اور ٹھوکر میرے سینے پر پڑی۔ میرے ایک ہاتھ میں پستل تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، فطری طور پر اس نے اپنی ٹانگ کھینچی، تب میں نے زور سے دھکا دیا تو وہ کولہوں کے بل جا گری۔ میں نے تیزی سے اٹھنا چاہا تو ڈیوڑ رہینز نے مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ تب تک وہ لڑکی کسی اسپرنگ کی مانند اٹھ کھڑی ہوئی اور کسی ماہر ریسلر کی طرح اپنی کہنی میری سینے پر مارنے کے لیے مجھ پر حملہ آور ہوئی،۔ میں ہٹ گیا تو اس کی کہنی فرش پر لگی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ وہیں ساکت ہو گئی۔ مجھے بس اتنا ہی سادقت چاہئے تھا۔ میں نے پستل کی نال اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھی اور ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور اس کے سر سے گولی نکل گئی۔ اسی لمحے ڈیوڑ رہینز کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور اسی کرسی لے جا کر بیٹھا دیا جہاں بیٹھا وہ حقارت بھرے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

اس میں ڈیڑھ منٹ سے بھی کم وقت لگا تھا کہ تبھی دروازہ کھلا اور دو کمانڈو ٹائپ نوجوان تیزی سے اندر آ گئے۔ میں نے پستل ڈیوڑ رہینز کے سر پر رکھ دیا تو وہ جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ انہوں نے لمحوں میں صورت حال کا جائزہ لے لیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کمرے میں کیرے لگے ہوئے ہیں اور ہمیں کسی جگہ پر دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے باہر لوگوں کو سنانے کے لیے کہا۔

”یہ دونوں نوجوان جو یہاں تھے بچانے آ گئے ہیں، نہیں بچا پائیں گے۔ اس کمرے میں لگے کیرے بھی نہیں بچا پائیں گے۔ مجھے پتہ ہے کہ یہیں کسی کمرے میں مجھے دیکھا جا رہا ہوگا لیکن اب تجھے مرنا ہے۔“

”تم مجھے مار بھی دو گے تو زندہ بچ کر نہیں جاسکتے ہو۔“ ڈیوڑ رہینز نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے یہاں سے زندہ جانا ہی نہیں ہے۔ تم نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر اپنی موت کو دعوت دے دی ہے۔ اب میرے ساتھ باہر چلو گے یا یہیں مرنا پسند کرو گے؟“ میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

”دیکھو۔ اب بھی سوچ لو، دولت کا ایک ڈیر تمہارا منتظر ہے۔ طاقت ایسی کہ تم.....“ وہ بولا تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”تم اہلیست کے لیے یہاں ہو اور میں انسانیت کے لیے تمہاری بد قسمتی ہے کہ تم نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں غلط اندازہ لگا لیا ہے۔ اب ریمیش پاٹرے سمیت ہر اس بندے کو پیغام مل جائے گا۔ چلو۔“

”میں مرجاؤں گا، تو کیا ہوا، ہماری جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی ہیں کہ تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے جونیٹ ورک یہاں بنایا ہے، تمہیں اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”اور میں نے فیصلہ کر لیا، تجھے اور تیرے نیٹ ورک کو میں نے ہی جاہ کرنا ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”ہونہہ.....“ اس نے حقارت سے ہنکارا، پھر نفرت سے بولا۔ ”تم ایک گھٹیا چیونٹی سے بھی زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، یہ خواب تو ہو سکتا ہے لیکن تیرے جیسے کمزور لوگ یہ خواب دیکھنے کی اوقات بھی نہیں رکھتے۔ میں چاہے مرجاؤں، لیکن شام ہونے سے پہلے تیرا خون کسی سڑک پر بہہ جائے گا۔ کیا تجھے یاد نہیں تمہیں تنکے کی طرح

اٹھالیا گیا تھا۔ ایک تنکا طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب چاہے مجھے مار دو۔“

”نیچے جا کر سڑک پر مارو گا، اٹھو۔“ میں نے اس کا کار پکڑ کر اٹھانا چاہا تو وہ کمانڈو نوجوان حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے مجھے کور کیا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ ڈیوڑ رہینز کے دائیں کاندھے کے اوپر گردن کے پاس تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے تھے۔ ان باتوں کے دوران میں پستل کو اس پوزیشن میں لے آیا تھا کہ ایک نوجوان کے چہرے کا نشانہ لے سکوں۔ جیسے ہی انہوں نے حرکت کی میں نے فائیر کر دیا۔ گولی اس کی ناک اور آنکھوں کے درمیان لگی تھی اس کی تیز چیخ کمرے میں گونج گئی۔ میں نیچے بیٹھ گیا۔ دوسرے نوجوان نے اسے تذبذب میں گولی نہ چلائی کہ کہیں ڈیوڑ رہینز کو نہ لگ جائے۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں نے اس پر بھی فائر جوونک دیا۔ وہ تڑپ کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اسی لمحے دروازے کے باہر کار پکڑ میں تیز فائرنگ ہونے لگی۔ ڈیوڑ رہینز کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ ہڈیاں ان انداز میں بکواس کرنے لگا۔

”تم..... تم ایسا نہیں کر سکتے..... میں تمہاری قوم سے بدلہ لوں گا۔ ایک کے بدلے سو مریں گے۔“

میں نے اسے گردن سے پکڑ کر دروازے میں دے مارا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا، مگر وہ کسی مکینزم سے بند تھا۔ میں اس دروازے پر فائرنگ کر کے گولیاں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ڈیوڑ کو کار سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اگر تم مجھے نہ مارو تو میں تمہیں جانے کا محفوظ راستہ دے سکتا ہوں۔“

”بولو.....“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ جیب سے کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔

”اسے دروازے پر لگاؤ۔“

میں نے کارڈ پکڑا اور دروازے پر لگایا۔ دروازہ تو کھل گیا، لیکن سامنے کا منظر کسی میدان کارزار سے کم نہیں تھا۔ تین لاشیں کاریڈور میں تھیں۔ اسی لمحے باغیتا کو ایک کمرے سے نکل کر باہر آئی اور مجھے دیکھ کر میڑی سے بولی۔

”لکھو، پولیس آ رہی ہے۔“ میں نے ایک نگاہ ڈیوڑ کو دیکھا اور آگے کی جانب بڑھا۔ میں جیسے ہی باغیتا کو کے پاس پہنچا، اس نے پستل سیدھا کیا اور ڈیوڑ پر فائر کر دیا۔ میں نے دیکھا فائر اس کے چہرے پر لگا تھا۔

”باقی لوگ.....؟“ میں نے آگے کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا تو میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگتے ہوئے بولی۔

”وہ نکل چکے ہیں۔ ان بے غیرتوں نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ یہاں پورا ایک کنٹرول روم تھا۔ نکل، میں نے ہم رکھا ہے وہاں۔“

ہم سڑکیوں ہی میں تھے کہ اوپر ایک دھماکا ہوا۔ ہم انتہائی تیزی سے نیچے پہنچے ہی تھے کہ سامنے کھڑے ایک نوجوان نے ہلڈنگ کی پچھلی طرف سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہاں سے نکلے تو سامنے ایک چھوٹی سی دیوار تھی۔ ہم نے وہ پارکی تو دوسری جانب ایک معروف سڑک تھی۔ ہم نے اپنے ہتھیار چھپا لیے لیکن اس طرح رکھے کہ جیسے ہی ضرورت پڑے انہیں استعمال کر لیا جائے۔ وہاں ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ ہم تینوں نے بالکل نارمل حالت میں وہاں سے چلتے ہوئے سڑک پار کی۔

وہ ڈیپائی روڈ کا آف لنک روڈ تھا۔ اس کے سامنے ایک گلی تھی۔ جانی بھائی سے ہمارا مسلسل رابطہ تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے چار لڑکے بری طرح زخمی ہیں، جنہیں ٹریینٹ کے لیے اسپتال کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ یہ اس نے اچھا کیا تھا کہ لڑکوں کی صورت میں اپنی شناخت نہیں چھوڑی، ورنہ اس کے لیے بہت مشکل ہو

جاتی۔ ہم نے محتاط انداز میں کچھ ہی فاصلہ پیدل طے کیا اور جیسے ہی اس گلی کی طرف بڑھے بائیں جانب سے ایک سیاہ فورڈ جیل کچھ فاصلے پر تیزی سے آرکی۔ اس کے رکتے ہی فطری طور پر ہم تینوں کی ادھر نگاہ گئی۔ اس میں سے ایک دم دو لوگ نکلے اور گتیں سیدھی کر لیں۔ ان کی گتوں کا رخ اپنی طرف دیکھ کر بلاشبہ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ہمارا شکار کرنے آنے پہنچے تھے۔ لاشعوری طور پر ہم نے بھی ہتھیار نکال لیے۔

گلی کے پاس پرسکون ماحول میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہاں اگر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو بہت سارے بے گناہ لوگ مارے جاسکتے تھے۔ میں نے ہانپتا کور کی جانب دیکھا۔ ہمارے پاس فیصلے کے لیے لمحے سے بھی کم وقت تھا۔ اس نے وہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔ ہم پوری قوت سے بھاگ کر گلی میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ سے فضا ترتر اٹھی۔

ہم اس گلی سے نکل جانا چاہتے تھے۔ گلی بند بھی ہو سکتی تھی یا دوسری طرف سے دشمن کے لوگوں سے آنا سامنا ہو سکتا تھا۔ ہمارے پیچھے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے جانی بھائی کے لڑکے سے کہا کہ وہ گلی سے نکلے ہی مخالف سمت میں نکل جائے۔ وہ سمجھ گیا۔ ہم جیسے ہی گلی سے نکلے، وہ ایک جانب مڑا اور لوگوں میں غائب ہو گیا۔ ہم نے ٹریفک کے بھاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے روڈ پار کرنے کی کوشش کی۔

فائرنگ رکی ہوئی تھی۔ ہم نے روڈ پار کیا اور دوسری طرف جا کر دیکھا، چند لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ میں جلد از جلد اس چوہے بلی کے کھیل کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے چند منٹ چاہئے تھے غائب ہونے کے لیے، وہ ہمیں لگا ہوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہاں ٹھہرنے کے باعث مزید فورسز آ کر ہمیں دیوبچ سکتی تھیں۔ میں سڑک کنارے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میرے سامنے چار لوگ تھے جو تیزی سے روڈ پار کرنے کی کوشش میں تھے۔ مجھے فقط چار فائر کرنے کا وقت لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

”نکلو بائیتا!“ میں نے بے ساختہ کہا اور روڈ کی دوسری جانب ایک گلی میں کھس گیا۔ گلی کی دوسری جانب ریلوے ٹریک تھا۔ جس کے پار جمو پٹریوں کی ایک پوری بستی آباد تھی۔

”کہاں ہو، یہ فائر.....“ جانی بھائی نے پوچھا تو میں نے لوکیشن بتا دی۔

”دیکھو، ایک ریلوے برج ہے یہاں، وہ تمہارے کس طرف ہے؟“ اس نے پوچھا تو میں نے برج دیکھ کر اسے بتایا تو اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”چل بڑو ٹریک پار کر کے بھاگ، برج کے نیچے پہنچ۔“

ہم دونوں نے ٹریک پار کیا اور برج کی طرف بھاگنے لگے، جو تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس طرف برج کے نیچے چند لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، جو ایک دم سے کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو ایک نے کہا۔

”ہم جانی بھائی کا دوست ہے، چل ہمارے ساتھ۔“

وہ ہمیں لیتا ہوا اس جمو پٹری کی جانب چل دیا۔ اس کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی تھے۔ وہ ہمیں ٹین اور لکڑی سے بنے ایک چھوٹے سے گھر میں لے گیا۔ جہاں ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جانب گتیش دیوتا کی مورتی کے سامنے دیا جل رہا تھا۔ جب تک ہماری سانس بحال ہوئیں وہ پانی کی بوتلیں لے آیا۔

”ادھر کا پانی آپ لوگ جم تائیں کر سکتے ہیں، یہ پیور واٹر پڑ۔“

”کب نکلیں گے یہاں سے؟“ بائیتا نے پوچھا تو جانی بھائی کی آواز آئی

”ابھی آپ آرام کرو، اکٹھا مہینے میں تم لوگن کی تلاش کے لیے فورسز لگ گیا ہے۔“

”وہ ہمیں اسی علاقے میں ڈھونڈیں گے جانی بھائی؟“ میں نے کہا۔

”لیکن اس طرح لکھنا بھی خطرناک ہے، ذرا ویٹ۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا

”آج جس شے نے ہمیں بچایا ہے نا، وہ ہمارے درمیان رابطہ تھا، ورنہ ہم کب کے دھر لیے گئے ہوتے۔“

بائیتا کور نے سکون سے تہرہ کیا

”وہ سلا گر باج بچ گیا۔“ میں نے ڈکھ سے کہا۔

”نہیں بڑو، وہ سب سے پہلے مرا ہے، وہ کاریڈور میں تھا، جب ہم نے حملہ کیا۔“ جانی بھائی نے کہا، پھر لمحہ بعد بائیتا کہنے لگی

”اس بلڈنگ میں آٹھ اپارٹمنٹ تھے، یہ سارے انہی لوگوں کے پاس تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان پر اس طرح حملہ ہو سکتا ہے، پورا کنٹرول روم تھا، تیری باتوں سے پتہ چلا.....“

”اب لکھنا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”کہا نا تھوڑا ویٹ۔“ جانی بھائی نے کہا اور اُس طرف سے خاموشی ہو گئی۔ چند لمحے انتظار کے بعد بائیتا کور مجھے تفصیلات بتانے لگی جبکہ میں ڈیوڈ ریہنز سے ہونے والی باتیں یاد کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی باتیں مجھے کھائے جا رہی تھیں۔

ساری رات جاگتے رہنے کے باوجود اس وقت بھی نیند میری آنکھوں میں نہیں تھی۔ میں یہ ابھی طرح جانتا تھا کہ ہم جتنا وقت یہاں رہے، اتنا ہی خطرہ بڑھتا چلا جائے گا۔ ہم فورسز کی لگا ہوں سے اوجھل ہوتے تو شاید انہیں ہمارا سراپہ نہ ملتا، لیکن ہم ان کی ناک کے نیچے سے ہی نکلے تھے اور اس علاقے میں موجود تھے۔ گزرتے لمحات کے ساتھ اسی علاقے پر ان کا فوکس ہو جانا تھا اور ہمارے لیے لکھنا بہت مشکل ہو جانا تھا۔ اس وقت میرے اندر بے چینی پورے عروج پر تھی۔



گوا میں سب سے پہلے جہاں اور رویت کور ہی ساحل کی طرف سے اس گیراج کی جانب نکلے تھے، جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ پیدل ہی وہاں سے نکلے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر وہ گیراج تک پہنچیں گے لیکن ایک دم ہی سے ناکہ بندی ہونا شروع ہو گئی تو فریڈنس نے سب کو الگ الگ نکل جانے کا حکم دیا۔ اسی لئے سبھی الگ الگ ہو گئے تھے۔

جہاں اور رویت اس وقت ساحل سے شہر کی طرف جانے والی مصروف سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ مقامی اور غیر ملکی لوگوں کی وہاں پر گہما گہمی تھی۔ سڑک کنارے کافی اشال لگے ہوئے تھے، جہاں مختلف چیزیں مل رہی تھیں۔ رویت وہاں چیزیں دیکھنے لگی۔ تبھی انہیں سندو کا فون ملا۔

”جہاں! ایک بری خبر ہے۔“

”کیا؟“ اس نے مرتعش لہجے میں پوچھا۔

”چندی گڑھ میں کچھ لوگ پروفیسر کو اٹھانے آئے تھے۔ مقابلے میں تین لڑکوں کے ساتھ پروفیسر بھی مارا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان کے نیٹ ورک کی نشاندہی گر باج نے کی ہوگی۔“ اس نے رنجیدہ لہجے میں بتایا تو جہاں سرمراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔ اس کا مطلب ہے اب چند گڑھ محفوظ نہیں۔“

یہاں اور وہاں چند گڑھ میں بھی پولیس ہی نہیں اور بہت سارے لوگ بھی پوری طرح الرٹ ہو چکے ہیں۔ تم لوگ جس قدر جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جاؤ۔ ہم بعد میں آتے رہیں گے۔ تم جہاں بھی جاؤ، رابطہ ضرور کرنا، مجھے جمال کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔“

”تم لوگ ہو کہاں پر؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ہم یہاں ساحل پر ہی ہیں۔ یہاں کے سارے راستے بند ہیں۔ سخت چھان بین ہو رہی ہے۔ ہمیں نکلنے ہوئے وقت لگ سکتا ہے، اتنی دیر میں تم لوگ.....“ اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی

”اوکے، تم لوگ اپنا خیال رکھنا۔“ جہاں نے کہا تو رابطہ کٹ گیا۔

جہاں نے رونیت کی طرف دیکھا، وہ چیزیں خریدنے میں محو تھی۔ جہاں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبا یا تو وہ فوراً ہی پلٹ کر جہاں کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جو ساٹ تھا۔ اس نے رونیت کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چل دیا۔ جہاں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پروفیسر کے بارے میں اسے کیسے بتائے۔ کافی دور تک چلتے رہنے کے بعد رونیت نے تجسس سے پوچھا۔

”کوئی بات ہے جہاں؟“

”ہاں۔ لیکن تمہیں یہ بہت حوصلے سے برداشت بھی کرنا ہوگا۔“ وہ باوجود کوشش کے اپنے مرتضیٰ لہجے پر قابو نہ رکھ سکا تو وہ بولی۔

”کہہ دو۔“ اس پر اس نے وہ ساری بات بتا دی۔ ایک لمحے کے لیے رونیت کو حواس باختہ ہوئی۔ پھر ایک دم سے جہاں کے گلے لگ کر رونے لگی، یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس نے رونیت کو رکوڑنے دیا۔ کچھ دیر وہ اس سے الگ ہوئی یوں ہو رہی تھی جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ پھر سسکتے ہوئے بولی۔

”وہ میرا پاپ تھا اور وہی میری ماں، ہمیں فوراً چند گڑھ نکلنا ہوگا۔“

”یہ دیکھ لو کہ وہاں رسک ہے۔“ جہاں نے کہا تو وہ ضد کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں، جو کچھ بھی ہو، میں اٹم سنسکار میں ضرور شامل ہوں گی۔“

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور انٹرپورٹ کے لیے ٹیکسی دیکھنے لگا۔



سہ پہر ہو گئی تھی اور ہم اسی جھونپڑی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس دوران جانی بھائی نے ہم سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہمارے کانوں کے ساتھ لگے آلات خاموش ہو چکے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ وہی لڑکا فون لے کر آ گیا۔ دوسری طرف جانی بھائی تھا۔ وہ سکون سے بولا۔

”بڑو۔ ادھر اپنا حلیہ بدل اور ساتھ والی چھمیا (حسین لڑکی) کو بھی کہہ۔ تم دونوں اپن کے پاس آ جاؤ، ادھر مگر میں۔ اب ہوٹل پر کڑی نگر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ تبھی میری نگاہ ایک پیکٹ پر پڑی جو وہ لڑکا لے کے آیا تھا۔ ہم نے کپڑے بدلے اور کچھ دیر بعد میزبان لڑکے سمیت ہم اس جھونپڑی سے پیدل نکل پڑے۔

تقریباً دو گلو میٹر آگے ایک ٹیکسی ہمارے انتظار میں تھی۔ لڑکا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم پیچھے، ٹیکسی چل دی۔ کافی دیر تک سفر کرتے رہنے کے بعد ہم ممبئی کے تجارتی اور پرانے علاقے کولابہ میں موجود ایک پرانی

ملاک کے پورچ میں آ کرے۔ پھر ہم چھٹی منزل کے ایک اپارٹمنٹ تک جا پہنچے۔ اندر ڈرائنگ روم میں جانی بھائی بیٹھا ہوا تھا۔

کچھ دیر باتوں کے بعد میں اور بائیا فریش ہوئے، پھر کھانے کے بعد جانی بھائی نے پوچھا۔

”جمال، اب تیرا پروگرام کیا ہے؟“

”میں ممبئی میں رہ کر اس ڈیوڈ کا سارا نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔ بس یہی میری.....“

”شاید ابھی تم ایسا نہ کر سکو۔ ابھی کھانا کھا، سکون کر، ادھر لڑکا لوگ ہے، سیفٹی ہے۔ چاہے تو گھوم پھر لے۔

”بات ہوگی۔ لبا لبا ہے۔ کچھ دن انڈر گراؤڈ رہنا ہوگا۔“ جان بھائی نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”دیکھ جانی بھائی، تو میرا محسن ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تجھے کوئی خطرہ ہو، وہ بھی میری وجہ سے۔ میں کوئی اور حکم نہ کر لوں گا تم.....“

”ارے کیسے بات کرتا ہے بڑو، یہ دھول مٹی جو اٹھی ہے نا، دو چار دن میں بیٹھ جائے گا۔ پھر تم جو کرنا۔ ابھی آرام کر، پھر ملتے ہیں۔“ یہ کہہ وہ اٹھا اور اپنا سیل فون مجھے دے کر اپنے لوگوں کے ساتھ چلا گیا۔ ایک دم سے مالا چھا گیا۔ دو تین لڑکے تھے، جو باہر تھے۔ میں اور بائیا کور بیڈ روم میں آ گئے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، یہ علاقہ تھا جہاں انڈیا گیٹ، تاج محل ہوٹل اور دیگر مشہور عمارتیں تھیں۔ میرے دائیں جانب انڈیا گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ میں واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ تو بائیا کور نے لیٹتے ہوئے کہا۔

”جانی بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا، بس سکون کرو۔ پھر میں بتاؤں گی کہ کیا کرنا ہے۔“

”کیا ہے تیرے ذہن میں؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”دور دار سنگھ کے پاس کوئی نہ کوئی.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

”مجل ابھی سکون کرتے ہیں، پھر دیکھا جائے گا۔“ میں نے بائیا کے پہلو میں لیٹتے ہوئے کہا۔ وہ ذرا سا مسائی اور پھر پرسکون ہو گئی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ڈیوڈ رہنمائی کی باتیں میرا دماغ خراب کر رہی تھیں۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ بائیا سو چکی تھی۔ میں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میں نے ایک لڑکے سے رابطہ کے بارے پوچھا۔ اس نے ایک کمرے میں پڑے کمپیوٹر کے بارے میں بتایا۔ میں اسے کھول کر بیٹھ گیا۔

وہاں سے کافی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ انہوں نے ڈیوڈ کے بارے میں کچھ بھی نہ کرنے اور ایک نمبر پر بات کرنے کی بابت ہدایت دی ہوئی تھی کہ جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی جہاں کا نمبر تھا۔ مجھے

مالی حوصلہ مل گیا کہ اب جس نئی راہ کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ ضرور اس کے ڈاٹے ڈیوڈ تک جاتے ہوں گے۔ میں نے پہلے جہاں سے رابطہ کیا۔ وہ چند گڑھ پہنچ چکا تھا اور رونیت کے ساتھ پروفیسر کے اٹم سنسکار

میں معروف تھا۔ میں نے دوسرا نمبر لڑائی کیا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف ایک بھاری آواز سننے کو ملی۔

”اوہ! را کے جاوے کے بعد میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے کہا۔“

”مجھے پتہ ہے، تم اس وقت انڈیا گیٹ کے پاس ہو۔ سورج ڈھلنے کے بعد، مجھے وہیں ملو۔“

”کہہ کر اس نے اپنی شناخت بتائی۔ میں نے جواباً ڈان کرتے ہوئے کہا۔“

”لہجہ ہے، میں پہچانتا ہوں وہاں۔“

”اور ہاں، تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے، اسے مت لانا، اسے کہو وہ واپس اپنے شہر چلی جائے۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ اب واپس اس اپارٹمنٹ میں نہیں جانا۔“

اس کے ساتھ ہی اس کا فون بند ہو گیا۔ میں کمپیوٹر کے پاس سے اٹھا اور بائیکاٹ کور کے پاس گیا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ میں سوچ چکا تھا کہ اس سے کیا کہنا ہے۔

”بائیکاٹ! ہمیں یہاں سے ابھی نکلنا ہے، فوراً۔“

”کیا ہوا؟“ اس نے تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم یہاں سے سیدھی زور آور سنگھ کے پاس چلی جاؤ یا پھر امرتسر، ہمیں اب غائب ہونا ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔

”پر ہوا کیا ہے؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمارے لیے فورسز اس علاقے میں پہنچ چکی ہیں۔ وہ لڑکا جو ہمیں یہاں چھوڑ گیا تھا، وہ پکڑا گیا ہے۔“ میں نے کہا تو بائیکاٹ کے چہرے پر تشویش لہرا گئی۔ زور دار سنگھ کا نمبر اسے یاد تھا۔ اس نے رابطہ کیا۔ اگلے چند منٹوں میں ہم وہاں سے نکل پڑے۔ بائیکاٹ کور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل گئی اور میں پیدل ہی انڈیا گیٹ کی جانب چل پڑا۔ سورج مغرب کی اوٹ میں جانے کو تیار تھا۔

میرے پیچھے سمندر کی ٹھانٹیں مارتی لہریں تھیں۔ انڈیا گیٹ سے مشرق کی جانب کافی فاصلے پر میں ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں لوگوں کا کافی رش تھا۔ ہر طرف لوگ سیر پائے اور موج مستی کے لیے پھر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد جوڑوں کی تھی۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک موٹا سا شخص گٹار پر اپنی بھدی آواز میں نجانے کس زبان میں کوئی گیت گارہا تھا۔ میں اندر سے بے چین اور بظاہر پرسکون تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک کھٹنے سے زیادہ وقت ہو گیا کہ میرا سیل فون بجا۔ وہی نمبر تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، وہیں موجود تھا۔ چند منٹوں میں وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ چہرے پر بدن کا ادھیر عمر شخص تھا۔ موٹے نقوش، سیاہ رنگ اور سرخ آنکھیں۔ غیر معمولی طور پر اس کی آواز بھاری تھی۔

”تم مجھے شیوا کے نام سے پکار سکتے ہو اور تمہیں آج رات یہاں سے نکلنا ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر یہاں تو ڈیوڈ.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”اس کے لیے ابھی وقت چاہئے۔ وہ صرف ایک چھوٹا سا گروہ یا کسی مافیا کا نیٹ ورک نہیں ہے۔ اس میں حکومت شامل ہیں۔ حکومت کا مطلب، تمام فورسز اور اس کے پیچھے ان کی پوری قوت۔“

”تم مجھے ڈرا رہے ہو یا ان سے مرعوب کر رہے ہو؟“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے، یہ نیٹ ورک توڑنا ہے، مگر اس کے لیے تھوڑا صبر، گہری پلاننگ اور طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ انکھی کرلو، میں تمہیں یہیں ملوں گا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تو میں ایک دم سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میرے پاس اگر ارادہ اور حوصلہ ہے تو قوت بھی ہونی چاہئے۔ ابھی تو مجھے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ڈیوڈ رینز سے بات کہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔ زمینی سطح سے لیکر حکومتی ایوانوں تک کتنی مضبوط چین ہے۔ جب تک مجھے ان کے بارے پتہ نہیں ہوگا، تب تک ہوا میں تیر مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”کیا کہتے ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو میں کہہ چکا۔ تجھے آج رات یہاں سے نکلنا ہے۔ اٹھو اور چلو میرے ساتھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پھر سے میری آنکھوں میں دیکھا۔ میں اٹھ گیا۔

ہم وہاں سے پیدل ہی نکلے تھے۔ مختلف سڑکیں پار کرتے، گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک گھر میں چلے گئے۔ وہاں مجھے مقامی مائی گیلوں کے جیسے کپڑے دیئے گئے۔ وہاں کچھ لوگ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب وہاں سے نکلے اور ممبئی ڈیک پر آ گئے۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں سے چھوٹے بڑے جہاز، اسٹیر، مائی گیلوں کی کشتیاں سمندر میں جاتی تھیں۔ سامنے لوہے کا چھانک تھا، جس پر دو سنتری کھڑے تھے۔ وہ ان مائی گیلوں کا اجازت نامہ دیکھ رہے تھے۔ شیوا ان سب سے آگے تھا۔ اسے دیکھتے ہی دونوں سنتری خوش ہو گئے۔ اس نے جاتے ہی ایک سنتری کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھے، جو اس نے فوراً چھپا لیے۔ اجازت نامہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور ہم بڑے آرام سے آگے بڑھے۔ ڈیک پر مختلف اقسام کی کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں نسبتاً ایک بڑی کشتی جسے وہ چھوٹا جہاز کہہ رہے تھے، اس میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر بعد انجن اشارت ہوا اور ہم ممبئی سے بحیرہ عرب کے گہرے پانیوں کی طرف چل پڑے۔ شیوا میرے پاس نہیں آیا۔ وہ اپنے ساتھی مائی گیلوں کے ساتھ مصروف رہا۔ میں انجن والے کیمین میں بیٹھا اور اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے بھارت سے نکل جانے کا اندازہ ہو گیا تھا۔

تقریباً رات کے دو بجے کا وقت ہو گا جب گہرے پانیوں میں ایک دوسری کشتی کے قریب جا پہنچے۔ دھیرے دھیرے وہ ساتھ لگی تو شیوا نے مجھے کیمین سے باہر آنے کو کہا۔ سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے ساتھ لگی کشتی میں جانے کو کہا، جس میں چند لوگ کھڑے منتظر تھے۔ میں اس میں کود گیا۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور پھر لیمن میں چلا گیا۔ میرے والی کشتی چل پڑی۔ نئی کشتی والے لوگ مجھے کیمین میں لے گئے جہاں تیز روشنی تھی۔ میں ایک دم سے ٹھنک گیا۔ میرے سامنے کرل سرفراز بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ گئے۔

”کرل آپ؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا

”ہاں میں، آؤ بیٹھو۔“

انہوں نے مجھے گلے لگایا اور پھر ایک بیڈ نما جگہ پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔ باقی لوگ باہر نکل گئے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ یہاں پر ہو گئے۔“ میرے کہنے پر وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے بولے۔

”یہ دنیا ہے، اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن تم اس وقت سے میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو، جب سے تم میرے پاس تھے۔ تم میری ذمہ داری میں ہو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر بولے۔

”تمہیں میلے سے اٹھایا گیا، یہ بے پروائی نہیں تھی۔ بس تجھے خبر نہیں کی گئی تھی۔ تجھے جال میں سے اٹھانے کی تیری حفاظت پر مامور لوگ آگئے تھے، مگر ان کا پلان بہت مضبوط تھا۔ اب تمہارا گھر محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ اب میری ذمہ داری میں ہے۔“

”یہ ذمہ داری کس نے دی کرل؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھا

”میں نے خود لی ہے یہ ذمہ داری، جس طرح نیکی اور بدی کے درمیان ایک واضح لکیر ہے اسی طرح امانیت اور شیطانت کے درمیان بھی لکیر ہے۔ کون کس طرف ہے، یہ اب تم اچھی طرح جانتے ہو، اسی باعث امانت داری لی ہے میں نے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے

”میری بس اب یہی آرزو ہے کہ میں ڈیوڈ رینز کا نیٹ ورک تباہ کر دوں۔ اس نے بہت غلط.....“ میں نے لہنا چاہا تو وہ میری بات کا نئے ہوئے انتہائی جذباتی لہجے میں بولے۔

”اس جیسے نجانے کتنے ہیں اس وقت بھارت میں، تم کس کس سے لڑو گے۔ اسے بھول جاؤ اور اب ہمیں

پوری جائفشانی سے اسے، اس کے مقام انسانی تک پہنچتا ہے۔ اسی میں انسان کی عظمت ہے کہ وہ انسان ہے۔ وہ انسان جو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اب انسان خود دیکھ لے کہ اس کی آرزو کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔“

”یہ آپ ہی بتائیں۔“ میں کہا

”انسان کا مقام بندگی کیا ہے؟ یہ خود کو سمجھنا ہے۔ جو بندہ خدائی، فرعونی دعویٰ کرتا ہے، وہ اپنے مقام بندگی سے گر جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی معرفت سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے دل کی آنکھ اندھی ہوتی ہے۔ وہ منکر خود ہوتا ہے، خدا کا منکر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ خود کو پہچان لیتا تو خدا کا منکر نہ ہوتا اور مقام انسان پر لازم ہوتا اور حقیقی مقصد کو پالیتا۔“

”مقام انسان کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے لیے تمہیں پھر سے اکائی کو سمجھنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے، پھر کہتے چلے گئے، ”اکائی کی ضد کثرت نہیں بلکہ تفرقہ ہے۔ یہ تفرقہ کیا ہے؟ صورت میں موجود ہر طرح کی سوچ پڑی ہے۔ اس میں حسد، منافقت، دوئی، غیر، ہوس، بے غیرتی، فساد، ظلم، تکبر، غرور، جیسی انسانی تذلیل والی سوچوں کو نکال کے باہر پھینک دیا جائے اور اس کی جگہ اکائی سے یکتائی حاصل کی جائے، انسان وحدت میں آئے۔ وحدت پیدا کرنے والی قوت عشق ہے۔ جس میں غیر نہیں ہوتا، عاشق کی نگاہ اپنے محبوب پر رہتی ہے، وہی اس کا مرکز و محور ہوتا ہے۔ سارے مجاہدے، کوششیں اور جہاد انسانی صورت کی وحدت میں عین ہونے کے لیے ہیں۔ یہی مقام انسانیت ہے۔“ انہوں نے پورے جذب سے کہا۔

”اسے میں یوں سمجھا ہوں کہ آرزو ہی مقصد بناتی ہے، جسے لذتِ رُوبہ عمل کرتی ہے۔ تبھی اس کے کردار کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس مقام پر ہے۔“ میں نے کہا۔

”آرزو سے مقام تک کے سفر میں ریاضت سب سے ضروری ہے۔ مثلاً کمپیوٹر بنی کو لے لو، ایک آرزو پیدا ہوئی، اسے حقیقت تک لانے میں نجانے کتنے مرحلے درپیش ہوئے، کتنا وقت لگا اور کتنی کوششیں ہوئیں، اس کے بعد کیا ہوا، اب پوری دنیا انسان کی انگلی پر ہے۔ اب اس میں کتنی برائیاں ہیں اور کتنی اچھائیاں، وہی اس کے مقام کا تعین کرتا ہے لیکن انسان پھر بھی اس سے ماورا ہے۔ کیونکہ یہ سب انسان کر رہا ہے۔ یہ انسان کی آرزو کی تخلیق ہے۔ یہ انسانی آرزو کی گنتی میں آئے گا۔“ انہوں نے کہا، پھر لمحہ بھر کے لیے رُکے اور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولے، ”یہ بہت بڑی بات ہے کہ تمہارے اندر آرزو پیدا ہو گئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے ہی تھے کہ اندر سے ایک لڑکے نے فون آنے کی بابت بتایا۔ وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اندھیرے میں سمندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کبین سے چھن کر آتی ہوئی روشنی میں پانی نظر آ رہا تھا۔ میں اب تک کرل سرفراز کے یہاں ہونے پر حیران تھا۔

کشتی کی رفتار کیا تھی اور ہم کس طرف جا رہے تھے، میں نے یہ کرل سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک کبین میں مصروف رہے تھے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا دوکھتا رہا۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہونے لگے تھے، جب کرل میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے دوگ تھے۔ انہوں نے ایک مجھے دیا اور مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

سورج طلوع ہونے کو بے تاب تھا۔ مشرق کے ماتھے پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرمئی بادل افق پر پھیلے

کچھ ایسا کرتا ہے، جس سے ان سب کی ہمت جواب دے جائے، ان پر ہمارا خوف مسلط ہو جائے۔ یہودیوں نے تو یہاں جگہ بنائی ہے، اصل قصور وار تو وہ ہیں جنہوں نے انہیں یہاں جگہ دی۔ اگر جگہ دے بھی دی ہے تو یہ ان کا ملک ہے، جو چاہیں کریں، لیکن وہاں بیٹھ کر اگر میرے وطن کے بارے میں بری سوچ رکھیں گے تو وہ دماغ ہی ختم کر دینا ہمارا فرض بنتا ہے۔ ہم یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔“

میں نے پہلی بار انہیں یوں جذباتی دیکھا تھا۔ اس لیے بڑی احتیاط سے پوچھا۔

”تو پھر مجھے یوں واپس کیوں؟“

دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رُکے اور پھر کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں کھانے لگا۔ اس دوران وہ مجھ سے مختلف سوال کر کے بھارت میں ہونے والے واقعات پوچھتے رہے۔ باتوں کے دوران ذرا الجھن ہوئی۔ کیونکہ کبین میں انجن کا شور تھا۔ ہم باہر کھلی فضا میں پڑی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ کافی دیر باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

”کرل، آپ یہاں کیسے؟“

”میرا ایک مقصد ہے اور میں اسی کی حفاظت میں ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مقصد اور حفاظت؟“ میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

”دیکھو۔! مقصد کی حفاظت اصل حقیقت ہے، اس کے لیے جان دینی پڑے یا لپٹی پڑے، ایک ہی بات ہے۔ اب یہ مقصد ہمارے اندر کس قدر راسخ ہے، یہ ہمارے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ عمل بتا دیتا ہے کہ ہم لکیر کے کس طرف کھڑے ہیں۔ انسان میں اچھائی اور برائی کی تمیز رکھی ہوئی ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے۔ یہ ہمارے کردار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری آرزو کیا ہے۔ اس کا اظہار ہماری ذات نے کرنا ہے کیونکہ یہ ہمارے اندر ہی پڑا ہوا ہے۔ مقصد اسی وقت راسخ ہوتا ہے جب آرزو پیدا ہوتی ہے۔“

”یہ کس طرح ہو جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہر اکائی اپنے اندر کائنات چھپائے ہوئے ہے۔ جیسے ایک بیج سے پورا درخت وجود میں آتا ہے۔ اکائی ہے تو اس کا ظہور ہے۔ اکائی وہ قوت ہے جس میں ہر قوت جذب، پنہاں اور سموئی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بات میں تمہیں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ دیکھو۔ پوری انسانی صورت ایک قطرے میں پڑی ہوئی ہے۔ ایک قطرے سے صورت اور صورت میں پھر سے قطرے کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں تخلیق کی آرزو ہوتی ہے۔ یہ سارا پر اس یا عمل، لذت کے باعث اپنی تکمیل کرتا ہے۔ سمجھو، تخلیق کی آرزو کی لذت قطرہ بن جاتی ہے۔ یہی جسم و جان کا ملاپ ہے۔ اس سارے پراس یا عمل میں لذت ہی اہم ہے۔ یہ لذت وہ ہے جس میں تمام سراپا لذتیں پڑی ہوئی ہیں۔ جیسے کھانا پینا، سونا، دیکھنا۔ جب یہ لذت ظہور میں آتی ہے تو سراپا لذت ظہور میں آ جاتا ہے۔ کیا ہم اپنے حواس کی لذتیں نہیں جانتے۔“

”مطلب، آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی پراس یا عمل اس وقت آگے بڑھتا ہے جب اس میں لذت ہوتی ہے۔“ میں نے ان کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”اب دیکھو، دل، عقل اور جسم رُوبہ عمل ہیں۔ عقل کے پاس تصور ہے، جسم کے ساتھ کردار ہے اور دل کے پاس عشق ہے۔ جب ان تینوں کا میل ہو جاتا ہے تو عمل وجود میں آتا ہے۔ تصور، کردار اور عشق کی لذتیں آرزو سے پیدا ہوتی ہیں۔ آرزو ہی مقصد کو وجود میں لاتی ہے۔ یہی مقصد انسان کو عمل کے ذریعے تمام جدوجہد اور

ہوئے تھے۔ تبھی کرٹل نے چائے کاسپ لیتے ہوئے گھرے لہجے میں کہا۔
 ”انقلاب کا سورج طلوع ہونے سے پہلے، سرفخی پھیل جاتی ہے۔ آزادی کی سحر یونہی نہیں مل جاتی۔ پتہ نہیں
 کتنے سیکڑوں ہزاروں ستاروں کا خون ہوتا ہے تو سحر نصیب ہوتی ہے۔“
 ”بے شک آزادی یونہی نصیب نہیں ہوتی، یہ قربانی مانگتی ہے۔“ میں نے ان کی بات پر تبصرہ کرتے
 ہوئے کہا۔

”اور اگر، اس آزادی کو ضائع کر دیا جائے، یا اس کا غلط استعمال کیا جائے، یا آزادی کے اصل ثمرات سلب
 کر لیے جائیں، تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“ انہوں نے اسی کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا
 ”آزادی کی حفاظت زندہ قومیں کرتی ہیں۔“ میں نے جوش سے کہا۔

”قوم، افراد سے بنتی ہے اور ہر فرد اپنی اکائی میں ایک پوری قوم ہے۔ کیا ہمارے اندر یہ آرزو ہے کہ ہم اپنی
 آزادی کی حفاظت کریں، کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں؟ اپنی ہی قوم کا ہر فرد،
 اپنے اندر جھانک کر دیکھے کہ وہ اس آزادی کی، کس قدر حفاظت کر رہا ہے، یا آزادی کی حفاظت کرنے کی آرزو
 اس میں ہے؟ پتہ چل جائے گا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔“ انہوں نے بھیکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے تو اب تک جو دیکھا ہے، ایسا بہت کم ہے۔“ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”یہی تو المیہ ہے، وہ سوچ جو اس قوم میں ہونی چاہئے تھی، وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ جو ایک وطن کا مقصد تھا،
 یہ اپنے مقصد سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دور آسمان پر نگاہیں لگا دیں، پھر چائے کا ایک طویل
 سپ لے کر بولے، ”زندگی کی بقا، واضح مقصد میں اور مقصد آرزو میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ آرزو میں جس قدر ترتیب
 ہوتی ہے، انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں اتنی ہی بیدار ہوتی ہیں۔ ترقی کی نئی راہیں، کامیابی کی نئی تدبیریں اور عقل
 کی رسائیاں آرزو ہی کے وطن سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی سے انسان کے اندر وحدت افکار پیدا ہوتی ہے جو بالآخر
 وحدت کردار میں ظاہر ہوتی ہے۔“

”زندگی، مقاصد کی تخلیق کرتی ہے اور کسی بھی مقصد میں کامیابی آرزو کی شدت میں ہے“ میں نے اپنا سبق
 دہرا دیا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

”آرزو ترتیب ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ لذت بھی رکھتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس کے اندر آرزو کی ترتیب
 ہے، وہی اس کی لذت سے واقف ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور لمحہ بھر دیکھتے رہنے کے
 بعد بولے۔

”تم اکائی سے سفر کر کے یکتائی کی طرف جا رہے ہو، یہ میں جانتا ہوں، اس لیے تم پر بھاری ذمہ داری
 عائد ہو گئی ہے۔ تم نے سوال کیا تھا تاکہ میں یہاں پر کیوں ہوں، تو اسی مقصد کے لیے۔ یہ جو ممبئی سے کراچی
 تک کا سفر ہے، میں اس میں تم پر واضح کر دوں۔ چاہو تو اپنے گاؤں جا کر پرسکون زندگی گزارو، یا پھر اپنی آرزو
 کے اپنے مقصد کا تعین کر لو۔“

”میرے مقصد کا تعین تو ہو چکا کرٹل۔“ میں نے کہا تو وہ بولے

”کیا ہے؟ میں سننا چاہتا ہوں۔“

”ہم نے عظیم قربانیاں دیں، یہ افق پر سرفخی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، آزادی کا سورج طلوع ہو گیا۔ اس لیے
 کہ پاکستان کا مطلب ہے لا الہ الا اللہ۔ اور اب پاکستان کا مقصد ہے محمد رسول اللہ۔ یہی میری آرزو ہے، یہی

میرا مقصد۔“ میں نے پورے دل سے کہا۔ تب انہوں نے طویل سانس لی اور گہری سنجیدگی سے بولے
 ”کراچی پہنچ جائیں، باقی باتیں وہیں چل کر ہوں گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا اور
 کہیں کی جانب چل پڑے۔ میں اپنے سامنے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

دوپہر ہونے کو تھی جب کشتی کراچی کے مضافات میں سمندر کنارے لگی۔ وہاں پہلے سے کئی لوگ موجود تھے۔
 وہ چھوٹی کشتیاں لے کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ کرٹل سرفراز اور میں ایک کشتی میں بیٹھ کر خشکی پر آ گئے۔

سامنے ہی ایک فورڈ ہیل جیب کھڑی تھی، ہم اس میں بیٹھے تو جیب چل دی۔ تقریباً پندرہ منٹ چلنے کے بعد ہم
 ایک فارم ہاؤس کی طرز پر بنے گھر میں آ گئے۔ وہاں موجود ملازمین نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کچھ دیر
 فریش ہونے میں لگی تھی کہ مجھے کھانے پر بلا لیا گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر چھ لوگ موجود تھے، جن میں مختلف عمروں
 کے جوان مرد و خواتین تھیں۔ ساتواں میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کرٹل سرفراز وہیں آ گئے۔ نہایت
 خاموشی میں کھانا کھایا گیا۔ فقط برتنوں کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ کھانا ختم ہوتے ہی تیزی سے برتن اٹھا لیے گئے
 اور چائے سرو کر دی گئی۔ تبھی کرٹل سرفراز بولے۔

”الحمد للہ۔ ہم سب خیریت سے یہاں پہنچ گئے۔ سب سے پہلے اپنا تعارف کرائیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“
 یہ کہہ کر کرٹل نے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ تھکے نقوش والا، جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں اور
 داڑھی جیسے ابھی اُگی نہیں تھی، مگر بال سیاہ اور گھنے تھے۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے سب کی طرف
 دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں جنید ہوں، تعلق پاکستان کے شہر پشاور کے نزدیک گاؤں سے ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا طالب علم ہوں،
 اتنی ڈگریاں تو میرے پاس نہیں ہیں لیکن اس زمانے کے جو مسائل ہیں انہیں حل کرنے کی صلاحیت مجھ میں ہے
 ۔ امریکہ میں تھا، صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ذلیل کیا گیا۔ بہت سارے لوگ ابھی وہاں بھگت رہے ہیں
 لیکن میں اپنے آپ سے سمجھوتہ نہیں کر پایا ہوں۔“

اس سے آگے سانولے رنگ کا لمبا ترنگا، متناسب جسم اور موٹی گردن والا نوجوان تھا، اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور
 سنجیدگی سے بولا۔

”میں اکبر علی ہوں، لوگ مجھے اٹلی جنٹ کہتے ہیں۔ فارن انجینئر اور سماجی بہبود میرا شعبہ ہے۔ معذرت خواہ ہوں
 کہ میں کوئی مذہبی آدمی نہیں لیکن وطن پرست ہوں۔ آئر لینڈ سے تعلیم لی، دنیا کے بیشتر ممالک میں رہا ہوں۔
 ہمیشہ اپنے ملک میں انسانی تذبذبل کے نظام پر کڑھتا رہا ہوں۔ میرا تعلق سندھ کے علاقے جا مشورو سے ہے۔“
 سخت چہرے اور سانولے رنگ کے اس نوجوان نے اپنا تعارف کرایا جس کے نقوش کافی حد تک موٹے تھے اور
 اچھا خاصا صحت مند تھا۔

”میں فہیم الحق ہوں لاہور کے نزدیک ایک گاؤں سے ہوں۔ آئی ٹی انجینئر ہوں۔ میں نے تعلیم تو امریکہ میں
 حاصل کی ہے لیکن کام اپنے وطن میں کرنا چاہتا ہوں۔ مختلف سوفٹ ویئر بنانے اور بیک کرنا مجھے آتا ہے۔ یہاں
 نہ آتا تو چین چلا گیا ہوتا۔“

اس کے دائیں گال پر تل تھا اور شاید مسکراتے رہتا اس کی عادت تھی۔ کافی حد تک فربہ مائل، موٹے موٹے
 گالوں، غلائی آنکھوں، موٹے اور ریلے لیوں والی اس لڑکی نے لب واکے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں مہوش ہوں۔ ابھی حال ہی میں ملائیشیا سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ مائیکرو اکنامکس میں بہت آگے تک جانا

چاہتی ہوں۔ پنجاب کے شہر ساہیوال سے میرا تعلق ہے۔“

اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت زیادہ سفید اور سرخ رنگ کی۔ انتہائی سرخ گال، پتلے پتلے ہونٹ اور گہری سیاہ آنکھیں جبکہ اس کے بال بھورے مائل تھے۔ اس نے سب کی طرف دیکھا اور کافی حد تک دھیمی آواز میں کہا۔

”زویا میرا نام ہے۔ اسلام آباد سے تعلق رکھتی ہوں۔ تحقیق و ترقی اور انسانی وسائل میرا شعبہ ہے لیکن کمپیوٹر میرا شوق ہے۔ برطانیہ سے تعلیم لی ہے۔ اب یہیں رہنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔“

خوبصورت اور اسٹائلش، اس کے لباس میں رنگوں کا احتجاج آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ چہرے پر سرخی، سفید رنگت۔ وہ بولی تو اس کی آنکھیں زیادہ باتیں کر رہی تھیں۔

”میں گیت ہوں۔ فیشن ڈیزائنر، مگر میڈیا میرا کام ہے۔ میں اتنی مذہبی نہیں ہوں سمجھ لیں کہ سیکولر ہوں۔ کراچی سے ہی تعلق ہے۔“

”میں جمال ہوں، پاکستان کے شہر بہاول پور سے تعلق، مسلمان ہوں لیکن آپ سب جیسا پڑھا لکھا نہیں ہوں۔“ میں نے اپنا تعارف کرایا تو کرٹل سرفراز نے سب کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ جتنے بھی شے ہیں، ان کے علاوہ یہ سب تربیت یافتہ ہیں۔ پچھلے ایک برس سے یہ سب مختلف جگہوں پر وہی تربیت حاصل کر رہے ہیں، جو تم نے روہی میں حاصل کی ہے۔ ابھی ایک ماہ سے یہ روہی میں تھے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ جان لیا ہے۔ یہ پچھلے ایک ماہ سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ وہ جو تم کرتے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئے، ایسے میں ایک نوجوان اندر آ گیا۔ مجھے وہ جانا پہچانا لگا۔ اس پر کرٹل نے کہا۔

”یہ ایک مانی گیر کے روپ میں ہمارے ساتھ فیری میں آیا ہے۔ سلمان صغیر نام ہے اس کا۔ ہر طرح کے اسلحے اور بلیک مارکیٹ کی پوری معلومات اس کے پاس ہوتی ہیں، یہ مستونگ بلوچستان سے ہے۔“

سلمان نے سب کی طرف دیکھا اور خوشدلی سے سب کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہم سب کے درمیان اگر کوئی مشترک چیز ہے تو وہ ہے پاکستان، جو ہمارا وطن ہے۔ پاکستان وجود میں آیا، یہ خوش قسمتی ہے، لیکن اس کے ساتھ بد قسمتی یہ ہوئی کہ یہ ان ہاتھوں میں آ گیا جو اس نظریاتی مملکت کے خلاف رہے اور فقط اپنی مرضی کا نظام مسلط کرنے پر پوری طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ اسے ایک فلاحی اسلامی ریاست بننا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ یہاں پر کسی نہ کسی صورت میں آمریت مسلط رہی۔ وہ نظام جس کے لیے یہ پاکستان تخلیق ہوا تھا، اب تک خواب ہے۔ یہ سب اسی جاگیرداری نظام کی وجہ سے ہے، جو سفید انگریزوں کے بعد کالے انگریزوں کو منتقل ہوا۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس ملک کے سارے ثمرات چند خاندان سمیٹ کر لے جائیں اور انسانی تذلیل کا نظام اس کے عوام پر مسلط کر دیا جائے۔ سینا لیس سے لیکر اب تک حکمرانی کرنے والے جو ادارے ہیں، اسمبلیاں ہیں، ان میں کتنے انجمن خاندانوں سے ہیں اور کتنے عوام میں سے۔ اس ملک کی نام نہاد اشرافیہ ہی اس ملک کو کتوں کی مانند بھنبھوڑ رہی ہے۔ انہی کتوں کے باعث کئی گدھے اس ملک کو نوچنے کے لیے رال پٹکا رہے ہیں، اس کے ساتھ مل کر کئی چوہے اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ دیمک زدہ سوچ والے بے غیرت سیاست دان مفاد پرستی کی انتہا کئے ہوئے ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ وہی انگریز والا اصول کہ تقسیم کرو اور حکمرانی کرو، اپنایا ہوا ہے۔ انہوں نے پاکستانی قوم کو لسانیت، مذہبی تفرقہ بازی، صوبائی عصبیت اور اس طرح

کے کئی خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہ دراصل ان کے پیر تیر ہیں، تاکہ عوام انہی میں الجھی رہے اور وہ مزے سے حکمرانی کریں۔ ان سے نکلیں گے تو سوچیں گے لیکن ہم نے پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ کیسے ہوگا، یہ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے تم لوگوں کو لیکچر دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”کرٹل! امریکیوں نے ووٹ کے ذریعے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کس ملٹی نیشنل کمپنی کو خود پر حکومت کرنے کی اجازت دے۔ سو اس وقت جمہوریت کا تماشا یہ ہے کہ اپنے اوپر سرمایہ داروں یا پھر جاگیرداروں کو مسلط کر لیں۔ یہ جمہوریت اور اس کا تماشا ہم سمجھتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں، ہمارے کام کرنے کی سمت کیا ہوگی؟“ سب سے پہلے جنید نے پوچھا۔

”اس وقت بیرونی طاقتیں پوری طرح پاکستان کو کمزور نہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ہندو کی سازش سے ہمارا ایک بازو کٹ گیا لیکن ایسی طاقت سے زور حیدری ہمیں عطا ہو گیا۔ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جس نے یہ قوت حاصل کی۔ جس دن اس طاقت کا اعلان کیا تھا، اسی دن سے امریکن اس کی مخالفت میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ قوت ان سے چھین لی جائے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ہم سے یہ طاقت چھین نہیں لی جاتی۔ شاید دنیا کو ابھی معلوم نہیں کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ اگر بے غیرت اور نام نہاد اشرافیہ اس ملک کو کمزور کرنے کے درپے ہیں، بیرونی ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، اپنے مفادات کے لیے ملک سے کھیل رہے ہیں تو یہاں غیور اور غیرت مند لوگ بھی ہیں جو اپنے ملک کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ ہم نے ہر اس قوت سے لڑنا ہے، اسے ختم کرنا ہے جو ہمارے ملک کو نقصان پہنچا رہی ہے اور اس ملک کے لیے وہ کچھ کرنا جو یہاں وہی نظام لے آئے جس مقصد کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ تاکہ یہ وہی اسلامی فلاحی ریاست بن سکے، جس کا مومنہ حضرت عمرؓ نے ہمیں دیا ہوا ہے۔ ہمارا نعرہ ہوگا۔ پاکستان کا مقصد کیا، محمد رسول اللہ ﷺ۔“

”کرٹل! میں سمجھ گیا کہ آپ مجھے ممبئی سے یہاں کیوں لائے ہیں۔ ہمیں حکم دیں تاکہ ہم ابھی سے اس پر عمل کریں۔“ میں نے پورے جذب سے کہا۔

”نہیں۔ مجھے حکم نہیں دینا، یہ سب تم لوگ خود طے کرو گے۔ آج اور ابھی سے یہ سب تمہارے ساتھی ہیں اور تم انہیں لیڈ کرو گے۔ تم لوگوں کا رابطہ روہی سے رہے گا۔ میں تم سب کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔“ کرٹل سرفراز نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا، جب میں اس بھاری ذمہ داری کے لیے پوری جان سے لرز گیا۔ یہ لرزہ کسی خوف سے نہیں تھا، بلکہ وہ سرخوشی تھی کہ میں بھی کسی مقصد کے لیے جن لیا گیا ہوں۔ میں نے سب کی طرف دیکھا، تو مسکرا دیا۔ انہوں ایک جاندار اور با اعتماد مسکراہٹ مجھے دی تو میں سرشار ہو گیا۔ مقصد واضح تھا۔



جہاں اور رونیت نے جیتل کا وہ گڑوا میز پر رکھ دیا، جس کا منہ سرخ کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔ اس میں پروفیسر کی راکھ اور ان جملے ناخن تھے، جسے وہ ”پھول یا استھیاں“ کہتے ہیں۔ میز کی دوسری طرف پروفیسر کی ہڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل ساٹ تھا۔ اگرچہ ایک عورت ہونے کے ناتے رونیت کو اس کا ڈکھ سمجھ سکتی تھی لیکن اسے یہ حیرت ضرور تھی اس کی آنکھ سے ایک قطرہ بھی آنسو کا نہیں بہا تھا۔ وہ چند لمحے ”استھیاں“ والے گڑوے کو دیکھتی رہی، پھر ہولے سے بولی۔

”رونیت پتر! اسے اسٹڈی روم میں رکھ آؤ۔ پھر آ کر میری بات سنو۔“

”جی بہتر۔“ رونیت کور نے فرمانبرداری سے کہا اور برتن اٹھا کر اسٹڈی روم کی جانب چلی گئی۔ پروفیسر کی بیوی اٹھی اور وہ بھی اندر کی جانب چلی گئی۔ جہاں وہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ خود پروفیسر کی بیوی کے رویے پر حیران تھا۔ اس وقت اس کی حیرت مزید بڑھ گئی جب اس نے ناشتے کی ٹرے لاکر میز پر رکھ دی۔ اتنے میں رونیت کور بھی واپس آگئی تھی۔ اس نے بھی حیرت سے دیکھا۔ پروفیسر کی بیوی نے ناشتہ رکھا، فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر رکھی، پھر بیٹھے ہوئے بولی۔

”آؤ، پترو، پرشادے شکھ لو، تم لوگوں نے رات کا کچھ نہیں کھایا۔“

”ابھی دل نہیں کر رہا، میں بعد.....“ رونیت نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”کب تک پترو، کب تک کچھ نہیں کھاؤ گی۔ آؤ، ناشتہ کرو، پھر کچھ دوسرے کام بھی کرنے ہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ تینوں ناشتہ کرنے لگے۔ اس وقت وہ ناشتہ کر کے چائے پی رہے تھے کہ ابھیت سنگھ، گرلین کور، اور دوسرے جو سات تھے، وہیں آ گئے۔ ان سے چند لمحے بعد سندو بھی آ گیا۔ سب خاموش تھے لیکن ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان میں سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ تبھی پروفیسر کی بیوی استھیں والا برتن لے کر آئی، اس نے وہ درمیان میں پڑی ہوئی میز پر رکھا اور پھر ایک طرف صوفے پر بیٹھ کر سب کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں اٹک بار تھیں، سوائے جہاں کے۔ وہ ان سب کو دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ ان کی پروفیسر کے ساتھ جذباتی وابستگی کس حد تک ہے۔ چند لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے، تبھی پروفیسر کی بیوی نے اپنے پٹو سے بندھا ہوا ایک کاغذ نکالا اور رونیت کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”یہ پڑھ کر سب کو سنا دے پترو۔ یہ خط مجھے انہوں نے دو دن پہلے دیا تھا اور ساری بات سمجھا دی تھی۔“

رونیت کور نے وہ خط پکڑ کر کھولا اور پڑھنے لگی۔ وہ سب یوں متوجہ ہو گئے جیسے گرتھ صاحب کی کوئی ”بانی“ پڑھی جانے والی ہو۔

”میرے بیٹوں اور بیٹیوں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ مجھے اگر کسی نے گولی نہ ماری تو میں ان دھمکیوں کے دباؤ میں مر جاؤں گا جو مجھے دی جا رہی ہیں۔ میرا یہ خط تم لوگوں کو اس وقت ملے گا جب میں نہیں ہوں گا۔ مجھے یہ یقین ہے کہ میرے اتم سنسکار کے بعد تم لوگوں کو جس پر ذرا سا بھی شک ہو، تم اسے مار دو گے یا خود مر جاؤ گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ تم لوگوں کے پاس دو راستے ہیں۔ نمبر ایک۔ خاموشی سے چپ چاپ اپنی دنیا میں کھو جاؤ۔ یہ بھول جانا کہ کسی پروفیسر نے تم لوگوں کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔ اپنی زندگی جیو۔ نمبر دو۔ انتقام لو، لیکن وہ ذاتی نہ ہو، ہم نے دھرم کے نام پر اپنی زندگی وقف کی ہے اور دھرم ہی کے لیے کام کرنا ہے۔ تم لوگ جتنا بنا کر دھرم کے لیے ایک جُٹ کام کرو گے، تو سمجھو میری آتما شانت رہے گی۔ میں سمجھوں گا میرا مشن آگے بڑھا ہے۔ اپنا ایک لیڈر جن کر اس کی تابعداری کسی گرو کی مانند کرنا۔ اسی میں تم لوگوں کی فتح ہے۔ ان دو راستوں کے علاوہ اگر کوئی اور بات کسی کے ذہن میں ہے تو وہ میری استھیں کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ آگے جو کچھ کرنا ہے وہ تمہارا لیڈر یا گرو تمہیں بتا دے گا۔ واہگرو جی کا خالصہ، واہگرو جی کی فتح۔“ ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی۔ کتنی دیر تک کوئی نہیں بولا۔ آخر رونیت کور ہی نے کہا۔

”بولو، کیا کہتے ہو، میں نے تو دوسرا راستہ چن لیا ہے۔ جسے پہلا راستہ پسند ہے، وہ ابھی جاسکتا ہے، اس پر کوئی گلہ نہیں ہوگا۔“

”دھرم کو کون چھوڑ سکتا ہے رونیت۔ ہمارا جینا مرنا اسی کے لیے ہے۔“ ابھیت نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا

اور اپنا ہاتھ استھیں والے گڑوے پر رکھ دیا۔ اگلے چند لمحوں میں سبھی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ایک طرح سے حلف دے دیا۔ ”قسم ہے مجھے اپنے گرو کی جو بھی اب ہمارا گرو ہوگا، اس کا حکم ہم پر فرض ہے۔“ سبھی نے اس کے ساتھ اونچی آواز میں دہرا دیا۔ وہ قسم دے کر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے تو چند لمحے بعد پروفیسر کی بیوی نے کہا۔

”پترو! یہ استھیاں اب تم لوگوں کے حوالے جب وقت ملے تو اسے فتح گڑھ صاحب لے جا کر جل پروا کر دینا۔“

”نہیں آپ ہمارے ساتھ جائیں گی۔“ رونیت نے تیزی سے کہا۔

”وہ تم جب جاؤ اور ہو سکے تو مجھے بھی لے جانا۔“ یہ کہہ کر وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”دیکھو۔ اب ہم نے اپنا لیڈر چننا ہے، یہ کیسے ہوگا، اگر گرو جی کوئی اشارہ دے جاتے تو.....“ ابھیت نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تبھی اب تک خاموش بیٹھا ہوا ہرپال بولا۔

”ایک حل تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر بندہ اس شوٹر کو تلاش کرے جس نے پروفیسر پر گولی چلائی، جو پہلے تلاش کر لے گا، وہی لیڈر۔“

”یہ ٹھیک نہیں، اس کا مطلب ہے ہر بندہ لیڈر بننے کی خواہش لے کر نکلے گا۔ ایسا نہیں۔ میرے خیال میں ہر بندہ ایک کاغذ لے اور اس پر اپنے سوا اس کا نام لکھے، جسے وہ لیڈر مان سکتا ہے۔ جسے زیادہ مانیں گے، وہی لیڈر ہوگا۔“ ابھیت سنگھ نے گہری سنجیدگی سے کہا تو سبھی مان گئے۔ رونیت کاغذ لے آئی۔ کچھ دیر بعد جب چھ لوگوں کی طرف سے جہاں کا نام آیا تو وہ چونک گیا۔

”ہم تمہیں اپنا لیڈر مانتے ہیں۔“ ہرپال نے کہا۔

”وجہ۔ میں تو تم لوگوں کے درمیان.....“ اس نے کہنا چاہا تو ابھیت بولا۔

”کم از کم میں اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ میں نے تم میں وہ دیکھا ہے، جو کم از کم ہم میں نہیں۔“

”تمہیں ماننا ہوگا۔“ رونیت نے کہا۔

”یہ بحث نہیں ہے، میں ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ لیڈر تو وہ ہو جو ایک جگہ ٹھہر کر تم لوگوں کی لیڈر کر سکے۔ اگر میں کہوں کہ سندپ کو لیڈر بنا لو تو یہ بہتر رہے گا۔“ جہاں نے کہا تو سندو بولا۔

”میں کیسے، میں تو.....“

”فی الحال تو یہ ذمہ داری لو، پھر بعد میں دیکھیں گے۔“ جہاں نے کہا تو ابھیت سنگھ نے اسی وقت استھیں والے گڑوے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارا وفادار رہوں گا اور سکھ دھرم کے لیے جان بھی دینی پڑی تو دوں گا۔“

اس کے بعد سبھی نے یہی عمل دہرایا تو سندو کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بڑے ہی گمبیر لہجے میں بولا۔

”تو پھر سنو۔ ہم آج ہی چند ہی گڑھ چھوڑ دیں گے، مگر ہمارے کان اور آنکھیں ادھر ہی رہیں گے۔ کرتار پور صاحب میں استھیاں جل پروا (راکھ پانی کی نذر) کرنے کے بعد ہمارا ٹھکانہ کون سا ہوگا، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ فوراً نکلنے کی تیاری کی جائے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سب باہر جانے لگے۔

جہاں رونیت کور کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ رونیت کور تیزی سے سامان کے نام پر اپنے کپڑے اور

لیپ ٹاپ کے ساتھ کچھ دیگر الیکٹرونکس کی چیزیں اٹھا رہی تھی۔ وہ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ تیار ہو چکی تو جہاں نے پوچھا۔
”چلیں۔“

”اوکے۔“ رونیت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے ایک دوسرے کے آنے سامنے کھڑے رہے، تبھی رونیت ایک دم سے پلٹ گئی۔ اس نے بیک اٹھایا، اور جہاں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ پروفیسر کی بیوی اس کے انتظار میں تھی۔

کرتار پور تک کوئی ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا جس سے انہیں شک ہو کہ دشمن ان کے پیچھے ہے۔ وہ چار گاڑیوں میں کرتار پور صاحب کے گروہ دارے جا پہنچے۔ انہوں نے پہلے جا کر ماتھانیکا اور پھر پروفیسر کی استھیاں قریب بہتے ہوئے دریائے ستلج میں بہادیں۔ جل پروا، رسم کے بعد سندھ پ عرف سندو نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اب ہم واپس چندی گڑھ نہیں جائیں گے۔ ہمارا ٹھکانہ اب جالندھر ہوگا۔ یہاں سے ہر بندہ اکیلا اکیلا نکلے گا اور مختلف وقت میں جالندھر پہنچے گا۔ اگر اس وقت دشمن ہماری تاک میں ہے تو اسے لگے کہ ہم جالندھر میں گم ہو گئے ہیں، یا یہیں سے کہیں دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ سمجھو جالندھر ہی میں دشمن کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ کہاں ملتا ہے، یہ میں تمہیں ایس ایس ایم ایس کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔
رونیت کار چلا رہی تھی۔ جہاں چھٹی نشست پر اور پروفیسر کی بیوی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اس کی سندو سے بات ہو چکی تھی اور جالندھر بالکل نزدیک آ گیا۔ تبھی اس نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

”رونیت، میں جس مقصد کے لیے چندی گڑھ گیا تھا، وہ تو ہو چکا۔ وقت آ گیا ہے کہ مجھے اب جانا ہوگا۔“

اس پر رونیت کور نے شدت حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”تم اکیلے کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے؟ ہم تمہیں اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ اپنا لیڈر مان رہے ہیں اب جبکہ وقت آ گیا ہے تو ہمیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟ تم نہیں جا سکتے۔“

”میں تم لوگوں سے الگ نہیں ہو رہا ہوں، بلکہ جہاں کہیں بھی ہوں گا تم لوگوں سے جڑا رہوں گا، ایسی ہی توقع میں تم لوگوں سے بھی رکھوں گا۔ اب مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں روک نہیں سکتی لیکن اگر تم ہمارے ساتھ رہو تو یہ زیادہ اچھا ہوگا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”تم مجھے اپنے قریب ہی پاؤ گی۔“ جہاں نے کہا تو وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”تمہیں یہ بات اب سندو کو بتانا چاہئے۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور سندو کو فون ملا دیا۔



کراچی شہر پر شام ڈھل کر رات اتر آئی تھی۔ ہم سبھی کلفٹن کے اس بنگلے میں تھے جو گیت کا تھا۔ ہم سب ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ملجوا اندھیرا تھا۔ سامنے سفید اسکرین تھی، جس کے پاس گیت کسی لیکچرار کی طرح کھڑی لیپ ٹاپ پر کچھ دکھانے کو تیار تھی۔ اس نے بٹن پریس کیا اور اسکرین کی جانب دیکھنے لگی۔ اسکرین پر ایک مچی بستی کے مناظر نمودار ہوئے۔ ایک مکان کی چھت پر لوگ

لوہیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں تاش کے پتے تھے۔ پاس ہی نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ وہ سب ”تین پتے“ پر جوا کھیل رہے تھے۔ منظر بدلتا تو ایک کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا، اس میں ”چھکا“ پر جوا کھیلا جا رہا تھا۔ تبھی وہ فلم روک بولی۔

”یہ صرف ایک علاقے کا منظر نہیں ہے، یہ جوا کراچی کے غریب علاقوں میں کینسر کی طرح پھیل رہا ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں روپے روزانہ ادھر سے ادھر ہوتے ہیں۔ اب دوسرا منظر دیکھیں۔“ اس منظر میں لوگ پر مہیاں لے رہے تھے۔ شہر کے مختلف علاقوں کی یکے بعد دیگرے کئی تصویریں سامنے لائی گئیں۔ تبھی اس نے کہا۔
”یہ سٹہ کھیلا جا رہا ہے۔ پرائز بانڈ کے نام پر چیاں دی جاتی ہیں اور کروڑوں روپے لگائے جاتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی منظر بدلتا اور ایک شخص کو دکھایا گیا جو فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ ساتھ میں تیزی سے لکھ بھی رہا تھا۔ اس کے پاس کمپیوٹر آپریٹر تھے، جو اس میں فیڈ کرتے چلے جا رہے تھے۔ ”یہ کرکٹ پر جوا کھیلا جا رہا ہے۔ یہ کام اب زیادہ بڑھ کر دیگر کھیلوں پر بھی ہونے لگا ہے۔ اس میں بات کروڑوں سے بھی اوپر تک چلی گئی ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر بولی۔

”آپ یہ سوال ضرور کریں گے، یہ میری نظر میں آسکتا ہے اور عوامی سطح پر چل رہا ہے اور عوام دیکھ رہے ہیں یا تو پولیس سوئی پڑی ہے جو اس جرم کو نہیں دیکھ رہی؟ تو میرا جواب یہ ہوگا کہ نہیں پولیس سوئی ہوئی نہیں ہے، وہ جاگ رہی ہے اور پوری طرح اس دھندے میں ملوث ہے۔ یہ دیکھیں یہ پولیس کا ادنیٰ سا ملازم ہے، ساجد نام ہے اس کا۔“ اسکرین پر ایک بھاری بھر کم شخص کا چہرہ ابھرا، جس پر خاصی کڑنگی تھی۔ ”یہ ادنیٰ سا ملازم اس جوئے کی دیکھ بھال پر مامور ہے خود اپنی نگرانی میں کر داتا ہے لیکن یہ اس قدر طاقت ور آدمی سمجھا جاتا ہے کہ جس علاقے سے چاہے اپنی مرضی کے پولیس افسران کو تبدیل کروا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے یہ طاقت کس نے دی؟“

”ظاہر ہے یہ مافیا ہوگا اور یہ ادنیٰ ملازم ایک مہرہ جو عوام کے سامنے ہے۔“ اکبر علی نے کہا۔

”بالکل ٹھیک کہا، اس کی سرپرستی یہ ایم این اے کر رہا ہے۔ جس کا تمام تر خرچ یہ ساجد نامی آدمی اٹھا رہا ہے۔ یہ معاملہ یہیں تک نہیں رکتا، یہ چند سیاسی لوگوں کو ایک کمپنی اپنی مرضی سے چلا رہی ہے۔ جو بظاہر کرنسی کا کام کرتی ہے۔ یعنی سطح سے اٹھایا جانے والا سارا سرمایہ یہاں تک آ کر پہنچتا ہے اور پھر یہی لوگ ہنڈی کے ذریعے سرمایہ باہر منتقل کر رہے ہیں۔ اور اس کے عوض باہر سے اسلحہ اور فضیات یہاں پہنچ رہی ہے۔ اس مافیا کو چلانے والے کچھ لوگ دوہنی میں ہیں اور کچھ دوسرے ممالک میں۔ انہی کے ہاتھ میں یہاں کی ڈوریں ہیں۔ وہ جب چاہیں یہاں کے حالات خراب کر دیں اور جب چاہیں امن اور سکون رہے۔“ گیت یہ کہہ کر خاموش ہو گئی تو اکبر علی نے پوچھا۔

”ان کے تو دوسرے ذرائع بھی ہوں گے؟“

”بالکل ہیں، لیکن ابھی میں انہیں چھیڑنا نہیں چاہتی، میں یہاں آپ کو پلان یہ دے رہی ہوں کہ یہی منی ایکس چینج والی کمپنی درمیانی پل کا کام دے رہی ہے۔ یہیں سے اگر ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں تو چھپے ہوئے لوگ سامنے آتے چلے جائیں گے جو اس سارے دھندے میں ملوث ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو پیغام دینا ہے۔“ گیت نے جذباتی انداز میں اپنی بات کہی

”گیت! یہ وقتی طور پر ہوگا۔ یہ پھر شروع ہو جائے گا۔ جب تک عوام خود جوا کھیلنا نہیں چھوڑیں گے۔“ جنید نے اپنی رائے دی۔

”زمینی سطح پر اگر جوا کھیلنے کے مواقع نہیں رہیں گے تو یہ کم ضرور ہو جائے گا، لیکن اس سے ہمیں طاقت مل جائے گی۔“ سلمان نے کہا۔

”پے شک ایسا ہی ہے، لیکن آپ ایک خوف مسلط کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی کوشش سے غرض ہے۔ نتیجہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔ ہدایت تو اس کے ہاتھ میں ہے نا۔“ فہیم نے تائید کی۔

”پلان کیا ہے؟“ میں نے پوچھا تو گیت نے اسکرین کی مدد سے پورا پلان اور اس کی تمام تر جزئیات بتا دیں۔ کچھ سوال جواب ہوئے۔ سب متفق ہونے کے ساتھ اپنی اپنی ذمہ داری لے لی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ تبھی جنید نے ایک بیگ سے کافی سارے سیل فون نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ عام سے دکھائی دینے والے سیل فون نہیں بلکہ خاص ہیں۔ میں نے اس سیل فون میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ کسی جگہ بھی ٹریس نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک بٹن دبانے سے یہ عام سیل فون بن جائے گا۔“

”واؤ! امیزنگ، بلیک مارکیٹ میں ابھی اس کی بازگشت تو ہے لیکن آیا نہیں۔“ سلمان نے حیرت سے کہا۔

”میری بٹاری میں اور بہت کچھ ہے۔ جو تمہیں بلیک مارکیٹ میں بھی نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں بہت کچھ ہے۔ اب فہیم اور زویا سے مل کر کوشش کروں گا۔ فی الحال یہ تو کریں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو سب تیار ہو گئے۔ میں ان کے ساتھ جانے لگا تو سلمان نے تیزی سے کہا۔

”نہیں آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ کام ہمارے لیے کس قدر معمولی سا ہے۔ یہاں رہ کر آپ ہمیں پل پل محسوس کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”بس دیکھتے جائیں۔“ زویا نے کہا تو میں وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ زویا کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جنید، اکبر علی اور مہوش ایک گاڑی میں وہاں سے نکل چکے تھے۔ زویا اسی اسکرین پر لیپ ٹاپ کی شہمہ دکھانے لگی جہاں گیت نے مناظر دکھائے تھے۔ ان کی تصویر تو میں نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر ان کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی حرکات و سکنات چھوٹے چھوٹے رنگین دائروں کی صورت میں سامنے اسکرین پر واضح تھیں۔

جنید، اکبر علی اور مہوش، اس کئی منزلہ عمارت کے سامنے جاڑے۔ جہاں اس منی ایکس چینج کا مرکزی آفس تھا۔ وہ تینوں لفٹ کے ذریعے اس فلور پر چلے گئے۔ لفٹ سے نکلے ہی ان کی تلاشی لی گئی۔ ان کے پاس سے کوئی ہتھیار نہیں نکلا سامنے ہی ڈیسک تھا۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی ان کی طرف متوجہ تھی۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

”ہمیں یہاں کے ذمے دار بندے سے ملو، ہمیں معلوم ہے کہ مالک یہاں نہیں ہوتا۔“ جنید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس پر لڑکی نے حیرت اور پریشانی میں ان تینوں کو دیکھا، پھر فون پر کسی سے وہی بات دہرا دی، جو انہوں نے کہی تھی۔

”آپ ذرا انتظار کریں۔ رضوی صاحب بڑی ہیں۔ وہ ابھی آپ سے ملنے ہیں۔“

”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ یہیں فون پر بات کروادو۔“ جنید نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو اس نے فون ملا کر پھر بات کی اور ریسیور اس کی جانب بڑھا دیا

”ہیلو۔ کون بات کرنا چاہتا ہے؟“ رضوی نے پوچھا۔

”میں جنید ہوں۔ تمہیں نام سے نہیں کام سے غرض ہونی چاہئے۔ ایک دس کروڑ کی ڈیل ہے، کرنا چاہتے ہو تو ابھی مل لو، ورنہ ہم کسی دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“

”کیسی ڈیل؟“ رضوی نے پوچھا۔

”کیا فون پر ہی بات کرو گے یا سامنے بھی آؤ گے۔ اگر تمہارا رویہ ایسا ہی ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔“ جنید نے غصے بھرے لہجے میں کہا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

”نہیں نہیں، آپ آؤ۔ میں انہیں کہتا ہوں وہ لے کے آتے ہیں۔“

ایک بار پھر ان کی تلاشی لی گئی اور انہیں رضوی کے آفس میں پہنچا دیا۔ وہ آدھے سے زیادہ گنجے سروالا تھا، موٹے نقش اور فربہ مائل ڈھیلی چٹون اس نے گیلکس سے باندھی ہوئی تھی۔ اس نے کاروباری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا ہے دس کروڑ کی ڈیل؟“

مہوش نے اپنا لیپ ٹاپ اس کے لیپ ٹاپ کے پاس رکھ دیا۔ تب تک جنید نے کہا۔

”بلیک منی، دس کروڑ ہے، برطانیہ یا فرانس میں دینی ہے، کیا لو گے؟ اور ہاں رقم کہیں سے لینی ہوگی۔“

”ایک کروڑ، سیدھا حساب ہے۔“ رضوی نے سنجیدگی سے کہا۔

”ڈن، کرنسی کیسے لو گے، اپنے بندے بھیجو گے یا ہم ادھر ٹھہریں۔ دوسری طرف رقم کب پہنچے گی؟“ جنید نے عجزی سے کہا۔

”رقم کہاں سے لینی ہے؟“

”ہوٹل فائن سے۔ وہاں ہمارا ایک بندہ موجود ہے، یہاں سے نزدیک ہی ہے۔“

”اوکے آپ ان کے ساتھ چلے جائیں اور رقم دے دیں۔ رقم ملتے ہی دس منٹ بعد دوسری طرف پہنچ جائے گی۔ ادھر کا پتہ کیا ہے۔“

”میں بتاتی ہوں۔“ مہوش نے کہا اور تیزی سے لیپ ٹاپ ٹاپ کھول لیا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے پوچھا، آپ کا ای میل پلایز تاکہ میں ساری معلومات آپ کو دے دوں؟“ رضوی نے ای میل بتا دیا۔ مہوش نے تیزی سے لیپ

ٹاپ پر کام کرتی رہی۔ پھر دو منٹ بعد بولی۔

”آپ دیکھ لیں معلومات آپ کو مل گئیں؟“

رضوی نے اپنے لیپ ٹاپ پر نگاہ دوڑائی۔ میل دیکھی اور کنفرم کر دی۔ وہ تینوں اٹھ گئے۔

”میں ایک گھنٹے تک ہوٹل فائن میں انتظار کروں گا۔“ جنید نے کہا اور چل دیا باقی دونوں بھی اس کے پیچھے چل دیئے۔ مہوش نے وہاں کی ساری معلومات اپنے پاس ٹرانسفر کر لی تھیں۔

دوسری کار میں سلمان، فہیم اور گیت تھے۔ ان کا رخ چیمبر روڈ کی طرف تھا جہاں وہ منی ایکس چینج کا مرکزی دفتر تھا۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ جہاں سارا کالا دھن لیا اور دیا جاتا تھا۔ وہ عمارت پوری طرح روشن تھی۔ اگر گیت نے اس عمارت کی جزئیات نہ بتائی ہوتیں تو پہلی نگاہ میں یہی لگتا تھا کہ اجازت کے بغیر اس عمارت میں گھسنا، ناممکن تھا۔ فہیم گاڑی میں بیٹھا رہا۔

سلمان بڑے اعتماد سے نیچے اترا اور اس نے وہ فرضی نام بتایا جو وہ کمپیوٹر سے دیکھ چکے تھے۔ ضروری کارروائی اور تلاشی کے بعد انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان کی کار وہیں روک لی گئی تھی اس لیے وہ

تینوں پیدل چلتے ہوئے اس دفتر تک جا پہنچے۔ انہیں معلوم تھا کہ اعجاز صدیقی اپنے دفتر میں ہے، جو ساری رقم کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ فہیم اس کا سب کچھ ہیک کر چکا تھا۔ غلطی کے باقی لوگ اس کے دفتر سے ملحقہ ایک ہال میں تھے۔ اس وقت وہاں صرف چار لوگ موجود تھے۔

”جی، بولیں، آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟“ صدیقی نے تیزی سے اکتائے ہوئے لہجے میں یوں کہا جیسے اس کے پاس وقت نہ ہو

”ہم یہاں سے رقم لوٹنے آئے ہیں۔ روک سکتے ہوں روک لو۔“ گیت نے دھیمے مگر سرد لہجے میں کہا تو صدیقی ان کی طرف یوں دیکھنے لگا کہ جیسے وہ دونوں کسی دوسرے جہان کی مخلوق ہوں۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”پاکل ہو یا کسی دوسرے جہان کی مخلوق۔ ایک منٹ سے پہلے تم پکڑے جاؤ گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پاؤں کے نیچے لگا الارم کا بٹن دبا دیا۔ کہیں بھی کچھ نہیں ہوا تو وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

”تمہارا یہاں کا سارا نظام ہم جام کر چکے ہیں۔ تم کچھ بھی کرلو، کچھ نہیں ہوگا۔ سامنے دیکھو، باہر لگے کسرے اور تمہاری یہ اسکرین تاریک ہے، کسی کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، باہر والوں کے لیے اندر سب سکون ہے۔ یہ کہتے ہوئے سلمان نے اس کی دراز میں پڑا پسل نکالا، اس کا میگزین دیکھا، پھر صدیقی پر فائر کرنے کے لیے سیدھا کھینچا۔

”تمہارا پسل اور اب تم، کہو کیا کہتے ہو؟“

”مجھے مت مارو، تم جو چاہے یہاں سے لے جا سکتے ہو، میں کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔“ صدیقی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

”اس دیوار گیر الماری کا نمبر بھی نہیں دو گے، جس میں کرنی موجود ہے؟“ سلمان نے کہا۔

”یہ..... یہ..... لو۔“ اس نے سامنے رکھے کاغذ پر نمبر لکھ دیا۔ تب سلمان نے اسے گولی مارنے کی بجائے پسل کا دستہ زور سے اس کے سر پر مار دیا۔ وہ پہلے ہی دہشت زدہ تھا اگلے ہی لمحے وہ ڈھیر ہو گیا۔

گیت اور سلمان دونوں محتاط انداز میں باہر کی جانب لپکے۔ سامنے دو گاڑیوں کا پہرہ دے رہے تھے۔ دونوں کو گیت نے نشانے پر لیا تو سلمان نے پلٹ گیا۔ اس نے دیوار گیر الماری کو کھولا تو اندر سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ اس نے پہلے میز سے اٹھائیں ہوئی کچھ چیزیں اندر پھینکیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لیزر شعاعیں ختم ہو گئی ہیں یا نہیں۔ لیزر شعاعیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ تیزی سے نیچے پہنچا۔ ہر طرف کرنی نوٹ کی گڈیاں اوپر سے نیچے تک لگی ہوئی تھیں۔ سلمان تیزی سے کرنی نوٹوں کو بیگوں میں بھر لے گا۔

اس دوران جنید، اکبر اور مہوش وہاں پہنچ چکے تھے۔ جیسے ہی اندر سے انہیں کہا گیا کہ رقم کے تحیلے تیار ہیں۔ اسی وقت انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور گیت پر جا پہنچے۔ انہیں دیکھتے ہی سیکورٹی گارڈ الارٹ ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں جا کر بات کرتے، انہوں نے سائمنلٹر لگے پسل سے فائر کر دیئے۔ ٹھک ٹھک کی آواز آئی اور وہاں موجود بندے زمین پر آ رہے۔ وہ تیزی سے اندر چلے گئے۔ ان کی راہ میں جو بھی آیا، وہ انہیں ڈھیر کرتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ صدیقی کے کمرے تک جا پہنچے۔ ہال میں موجود لوگ باہر کی صورت حال سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ جیسے ہی ہال میں گئے تب انہیں پتہ چلا کہ باہر تو صورت حال ہی بدل چکی ہے۔ ایک بوڑھے آدمی نے فوراً اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے، باقیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ مہوش نے انہیں ایک جگہ اکٹھے

ہو جانے کو کہا۔ وہ کونے میں لگ گئے۔ اس دوران وہ اپنے بیگ سے اسپرے کی بوتل نکال چکی تھی۔ وہ اس نے وقفے وقفے سے دو تین بار ان پر چھڑکا تو وہ بے ہوش ہوتے چلتے گئے۔ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ صدیقی کے کمرے میں آئے۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ مہوش نے اس کے منہ پر چھڑکاؤ کر دیا۔ جنید اکبر نیچے جا چکے تھے، جبکہ گیت اور مہوش باہر نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ جیسے ہی نکلنے کا راستہ صاف ہو چکا، فہیم اپنی فور و ہیل اندر لے گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ سولہ تحیلے انہوں نے فور و ہیل میں رکھے اور باہر آ گئے۔ جنید اور مہوش دوسری کار میں بیٹھے اور وہ سب وہاں سے نکل پڑے۔

پھر روڈ سے کلکشن تک کا راستہ زیادہ سے زیادہ آدھے یا پون گھنٹے کا تھا۔ اگر اس میں ٹریفک نہ ہو تو وہ با آسانی اتنے وقت میں پہنچ سکتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں سے نکلے اور چل پڑے تھے۔ دونوں گاڑیاں دو لفظوں کی صورت میں حرکت کر رہی تھیں۔ میرے بدن میں سنسنی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ یہی راستہ ان کے لیے خطرناک تھا۔ جبکہ وہ آگے پیچھے گاڑیاں دوڑاتے ہوئے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ٹریفک اشارے پر رک ہی جاتے تھے۔ زویا نے شاید میری توجہ بنانے کے لیے بتایا

”ان دونوں عمارتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سیکورٹی کے لحاظ سے۔ اگر ایک میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو دوسری میں فوراً پتہ چل جاتا ہے۔ اسی لیے انہیں دونوں طرف جانا پڑا۔ اس وقت وہ دونوں عمارتیں فہیم کی مرضی کا ہیں۔ وہ جیسے ہی ادھر یہاں پہنچیں گے۔ تب انہیں آزاد کر دیا جائے گا، مطلب ان کا سارا نظام معمول کے مطابق کام کرے گا، تب انہیں پتہ چلے گا کہ کیا ہو گیا ہے۔“

اس کے بتانے پر میں نے ایک طویل سانس لی۔ سامنے اسکرین سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اب تیزی سے قریب پہنچ رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ سب اسی کمرے میں تھے اور ساری بات بتا چکے تھے۔

”تو یہ مشن چند گھنٹوں میں ختم ہو گیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اکبر نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، یہ مشن اب شروع ہوا ہے۔ ایک گھنٹے بعد جب اس سے جڑے سارے لوگوں کو پتہ چلے گا، ایک ایک کر کے وہ سب ہمارے جال میں آتے چلے جائیں گے۔ پھر یہاں بیٹھ کر ہم ان سے کھیلیں گے۔“

”میں رقم تمہارے خانے میں پھینک آؤں، آؤ سب میری ہیلپ کرو۔“ سلمان نے کہا تو وہ سب باہر چلے گئے۔ میں زربل مسکرا دیا۔ ان کی سوچ وہی تھی، جو میری تھی۔ روپی نے انہیں ہیرا بنا دیا تھا۔



جہاں سنگھ، جالندر کے بائی پاس پر موجود، اسی موٹیل کے سامنے کھڑا تھا، جہاں وہ اور ہر پریت ایک رات گزار چکے۔ اس نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور اس موٹیل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ڈانگ ہال میں داخل ہوا تو سامنے ہر پریت کور بیٹھی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہلکے سبز رنگ کا کڑھائی والا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کس کر باندھی ہوئی چوٹی، ہلکا ہلکا میک اپ، پیروں میں اسی رنگ کا کھتہ پہنے وہ چٹا بن اس کی راہ تک آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہر پریت کے چہرے پر خوشی کے دینے روشن ہو گئے۔ وہ وہاں پر کسی کی بھی پروا نہ کرتے ہوئی ابھی اور والہانہ انداز میں اس کے گلے لگ گئی۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ جہاں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

”پوچھو کیسی ہے، النوجیت کیسا ہے؟“

”دونوں ہی ٹھیک ہیں اور تجھے بڑا یاد کرتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی تو وہ بھی اس کے سامنے والی میز

پر بیٹھ گیا۔ تبھی وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تیری سب سے بری عادت یہ ہے کہ تم اپنے بارے میں نہیں بتاتے ہو کہ تم کہاں ہو، کیسے ہو، کوئی رابطہ نہیں ہوتا، کوئی پتہ نہیں ہوتا تمہارا۔“ اس پر جہاں بالکل خاموش رہا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ہر پریت چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر غصے میں بولی۔

”میری بات کا جواب دو، میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے، کیا میں بک بک کر رہی ہوں، ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟“

”میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم ابھی سے بیوی بن گئی ہو۔ یار..... جب تک لاواں (شادی) نہیں لگتیں، کم از کم دوست بن کر تو رہو۔“

”بہت دوست ہیں تیری، میں جانتی ہوں، ابھی جو تجھے چھوڑ کر گئی ہے، کون تھی وہ؟“ اس نے غصے بھرے لہجے میں تیزی سے پوچھا۔

”تم دیکھ رہی تھیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تو دو دھنسنے سے اس سڑک پر نظریں جمائے ہوئے ہوں۔“ ہر پریت نے تیزی سے کہا تو جہاں کو اس پر بڑا پیار آیا۔

”رونیت کو رتھی وہ، جنہیں بھی اس سے دوستی کرنا ہوگی، تجھے اس سے ملاؤں گا۔ بڑے کام کی چیز ہے، ہیرا ہے وہ ہیرا۔“ جہاں نے کہا تو ہر پریت منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”وہ واقعی ہی ایسی چیز ہے یا مجھے چڑا رہے ہو۔“

”وہ ایسی ہے، جب تم ملوگی تو مان جاؤ گی۔“

”یہ جو یہاں جالندھر میں تین چار جگہوں کا انتظام کیا ہے میں نے“ کیا یہ انہی لوگوں کے لیے تھا؟ کیا یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے وہاں.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی

”بالکل، انہی لوگوں نے ٹھہرنا ہے وہاں۔ اپنے لوگ ہیں۔ خیر کچھ کھلاؤ پلاؤ گی یا بھوکے ہی رکھو گی۔“

جہاں نے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کر دیا۔ وہ کھانے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کے بعد وہاں سے اٹھے اور اوگی پنڈ کی طرف چل پڑے۔ ہر پریت کا ڈرائیو کر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ بائی پاس سے اوگی پنڈ کی جانب بڑھے، جہاں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہر پریت! کیا اب بھی تمہارا خالہ جتھے کے ساتھ رابطہ ہے؟“

”ہاں ہے، ان سے رابطہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ کسی ایسے بندے سے جو ذمے دار ہو اور کسی بھی قسم کا فیصلہ کر سکتا ہو۔“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”جہاں بچ پوچھو نا، وہ تم سے خود ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں صاف بتا دیا ہوا ہے۔ وہ سب کچھ جو میں جانتی ہوں۔ مجھے نہیں پتہ تم ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو، مگر میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے ملنے سے ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔“ ہر پریت کے لہجے میں کافی حد تک جوش تھا۔

”ہر پریت! میں اب ایک طویل عرصے تک ادھر رہنا چاہتا ہوں۔ صرف دھرم کی سیوا کے لیے۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کب پورا (مرنا) ہو جانا ہے۔ ایک سنگھ کی شان یہی ہے کہ وہ دھرم کی خاطر لڑتا رہے۔“

مہال نے دور کہیں خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

”اور میرے ساتھ شادی؟“ ہر پریت نے کہا۔

”تم جانتی ہو کہ شادی ایک کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے، شادی کر لوں یا سیوا کر لوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہر پریت اس کی بات سمجھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس دی۔

اوگی پنڈ پہنچتے ہوئے انہیں سہ پہر ہو گئی۔ کلجیت کو ران کی راہ تک رہی تھی۔ انوجیت بھی گھر پر تھا۔ بننا سنگھ اور لہتی بھی تھی۔ شام تک وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا انہی سے گپ شپ کرتا رہا۔ شام ڈھل چکی تو کلجیت کو ران نے جوتی کو ڈانٹنے ہوئے کہا۔

”اے جوتی! کچھ عقل کر، یہاں بیٹھی ہے، کچھ کھانے کو بنا۔“

”بے بے، جوتی کو میں نے روکا ہے۔ ہم کھانا باہر کھائیں گے، ہمارے ساتھ انوجیت ویر بھی جائے گا۔“ ہر پریت نے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ اس نے رابطہ کر کے طے کر لیا تھا۔

”چل، پھر ٹھیک ہے، کرٹو اپنے جہاں ویر سے باتیں۔ میں تو چلی۔“ کلجیت کو رانٹھ کر اندر چلی گئی۔ تب مہال نے جیب سے کافی سارے نوٹ نکال کر آدھے آدھے کئے۔ ایک ہاتھ سے بننا سنگھ کو اور دوسرے ہاتھ سے جوتی کو دیتے ہوئے بولا۔

”میں تم دونوں کے لیے کوئی شے نہیں لاسکا۔ تم اپنی پسند سے لے آنا۔“

”جہاں ویر مجھے تو کچھ نہیں چاہئے، میری ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔“ جوتی نے جلدی سے کہا۔

”او، رکھ لو، پکڑو۔“ اس نے زبردستی اسے تھماتے ہوئے کہا۔ دونوں نے وہ نوٹ لے لیے اور خوشی خوشی

وہاں سے چلے گئے۔ جہاں کافی دیر تک مسرور وہیں بیٹھا رہا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بندے کو کتنا سرور دیتی ہیں۔

رات کا پہلا پھر شروع ہو چکا تھا۔ جہاں فریش ہو کر کار میں آ بیٹھا۔ اس کے ساتھ پہلو میں ہر پریت تھی۔

انوجیت پہلے ہی نکل چکا تھا۔ ان کا رخ رسول پور کلاں کی جانب تھا۔ تمام راستے ہر پریت کو خاموش رہی۔

جیسے ہی وہ رسول پور کلاں کے قریب پہنچے، تب اس کے لب وا ہوئے۔

”وہاں سردار ویر سنگھ ہے۔ اس وقت خالہ جتھے اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وہ بندہ ہے جو بہت عرصے سے

تمہارے ساتھ ملنا چاہتا ہے۔ بہت ٹھنڈا اور تنظیمی بندہ ہے۔ بہت سیوا کی ہے اس نے دھرم کی۔“

”چل دیکھتے ہیں۔“ جہاں نے دھیرے سے کہا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔

گاؤں میں وہ سب سے بڑی پیلے رنگ کی حویلی تھی۔ حویلی کے سامنے کافی ساری زمین خالی تھی۔ وہاں ایک

طرف کافی سارے لوگ چار پائیاں ڈال کر بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ عام آدمی کے لیے وہ گپ شپ

تھی لیکن جہاں سمجھ گیا تھا کہ وہ سب سیکورٹی کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے دیکھنے کا انداز ہی ایسا تھا۔ انہوں

کا رویہ میں لے جا کر روکی تو سردار ویر سنگھ بڑے دروازے سے باہر آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر لمبے قد اور بھاری جینے

والا گراٹیل شخص تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیص اور زعفرانی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ اسے اطلاع

مل چکی تھی کہ مہمان آ گئے ہیں۔

”ست سری اکال سردار جہاں سنگھ جی، جی آ یاں نوں۔“ اس نے دونوں بازو پھیلا کر اس کا استقبال کیا اور

اُسے گلے لگا لیا۔

”ست سری اکال سردار ویر سنگھ جی۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہا۔

”آؤ تشریف لے آؤ۔“ دیرنگھ نے کہا اور پھر ہر پریت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دعائیں دینے لگا۔ وہ تینوں آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔ وہاں دونو جوان مزید بیٹھے ہوئے تھے۔ دیرنگھ نے بیٹھتے ہی ان کا تعارف کرایا۔

”یہ دونوں، میرے سکے بیٹے تو نہیں، لیکن انہوں بیٹوں سے بڑھ کر سیوا کی ہے۔ سردار جوگندر سنگھ اور سردار سریندر سنگھ۔ یہ دونوں خالصہ جتھہ کے سرخیل ہیں۔“ اس نے کہا تو دونوں نے ہاتھ جوڑ کر اسے فتح بلائی۔ تب وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”سردار جی! ہر پریت نے مجھے پہلے بھی کہا تھا کہ میں آپ سے مل لوں لیکن میں ایسے ہی نہیں ملنا چاہتا تھا۔ اور سچ پوچھیں تو میرا یہاں رہنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ میں نے جن سے انتقام لینا تھا، وہ لے لیا، اپنی زمین جائیداد واپس لے لی۔ جس کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ میرے پاس کینیڈا میں ہے۔ مطلب مجھے کوئی معاشی پرالیم نہیں ہے۔ لیکن اب میں یہاں رہنا چاہتا ہوں، اپنے دھرم کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ جیسی بھی ہو سکے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”پتر! جو تیرے ساتھ بیٹی ہے نا، یہاں کے ہر گھر کے ساتھ وہی بیٹی ہے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، بھائی، بہن، زعمہ جلائے گئے ہیں۔ اتنی بڑی قربانی دینے کے بعد بھی یہ ملک اب ہمارے لیے اجنبی ہے۔ اب ہر سکھ یہ سوچ رہا ہے کہ ہم ستالیس میں آزاد ہو گئے تھے لیکن ایسا نہیں چوراسی میں ہمیں یہ پوری طرح جتا دیا کہ ہم اس ملک میں غلام ہیں۔ پہلے انگریزوں کے اب ہندوؤں کے۔ اب یہ نئی بات نہیں ہے۔ یہ رونا تو اب تک چلتا آیا ہے لیکن خوف ناک بات سکھ پنٹھ کے لیے یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو کیا دے کر جا رہے ہیں؟ غلامی کا خوف ناک احساس؟ شرمناک احساس؟“ سردار دیرنگھ نے رو ہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ کہانیاں میں نے بہت سن لیں، اب آگے کی دیکھیں، کیا کرنا ہے ہمیں؟ کیا کرنا ہوگا ہمیں؟“ جہاں نے متانت سے پوچھا۔

”خالصتان، یہی ہماری منزل ہے، اپنی زندگی میں حاصل نہیں کر پائے تو کم از کم اپنی نسلوں کو یہ جدوجہد تو دے کر جاسکتے ہیں۔ کسی کامیابی کی کوئی بنیاد تو ہو جس پر ہماری نسلیں فخر کر سکیں۔“ سردار دیرنگھ نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو جوگندر سنگھ بولا۔

”ہمارے بندے ٹاڈا کے تحت اندر ہیں، کوئی کہیں پر قتل ہو جاتا ہے، سب سے پہلے ہمارے بندوں سے تعیش شروع ہوتی ہے۔ کوئی واردات بھی ہو۔“

”دنیا بہت آگے نکل گئی ہے سردار جی، اب جنگ صرف گولی چلانے سے نہیں جیتی جاسکتی۔ لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بڑے میدان ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ طاقت کے بنا کچھ نہیں ہو سکتا، مگر جتنے بھی محاذ ہیں ان پر ہمیں لڑنا ہوگا۔ وہ میدان چاہے میڈیا کا ہے، تعلیم کا، لوگوں کو شعور دینے کا ہے۔ انہیں یہ بتانا ہوگا کہ آزادی ان کا حق ہے۔“ جہاں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو سردار دیرنگھ بولا۔

”میری تو عمر گزرنی پتر، اب جو کہتا ہے تمہی لوگوں نے کرنا ہے۔ جو تم لوگوں کی عقل سمجھ میں آئے۔“

”تو پھر آپ مجھ پر یقین رکھیں، باقی واہگرو جانے کیا ہوتا ہے۔“ جہاں نے جتنی لہجے میں کہا۔

”میں چاہتا ہوں، جتنے کو نیا خون ملے، ڈر اور خوف سے نکل کر اپنی بات منوانے کی جرات پیدا ہو۔“ دیرنگھ

نے کہا تو جہاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اس وقت جتنے کے معاملات کون دیکھ رہا ہے؟“

”یہ جوگندر سنگھ۔“ دیرنگھ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے یہ سرداری رہے اسی کے پاس، لیکن اس کا کام کئے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کرنا ہے۔ یہ فیصلہ کون کرے گا، آپ بہتر سمجھتے ہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”میں تیری بات سمجھ گیا ہوں۔ ایسے ہی ہوگا۔“ دیرنگھ نے جوش سے کہا۔

”بس تو پھر آپ کل ہی سے دھرم سیوا کے لیے اٹھیں۔ اپنے علاقے میں جتنے بھی گرو دوارے آتے ہیں، ان کا ہاتھ ٹھیکیں، ان کے مسائل معلوم کریں۔ باقی کام ہمارا ہے۔ کیوں جوگندر سنگھ۔“ جہاں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”جیسے کہو بائی جی، میں حاضر ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آؤ، پرشادے ٹھکسیں۔“ دیرنگھ نے کہا اور اٹھ گیا۔ جہاں نے اپنی سوچ کے مطابق عمل شروع کر دیا تھا۔

رات گئے جب وہ ایک ساتھ واپس آئے تو ڈرائنگ روم میں انوجیت کا پہلا سوال ہی یہی تھا

”اب کیا کرنا ہوگا؟“

”مجھے جتنے کے ساتھ منسلک دو چار نو جوان ملا دو، سمجھ دار ہوں، دلیر ہوں اور کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“ جہاں نے جواب دیا تو انوجیت نے کہا۔

”میں کل ہی ایسے نو جوان تلاش کر لوں گا۔ میں اب چلتا ہوں۔ صبح مجھے جالندھر جانا ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

جہاں اپنے کمرے میں جا کر ایزی ہوا اور ابھی اس نے بیڈ پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ کھولا ہی تھا کہ ہر پریت گھوٹی سے ٹرے میں چائے کے دمک رکھے آگئی۔ اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی! آخر تم ان نو جوانوں کا کرنا کیا چاہتے ہو؟“

اس پر جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا، وہ سیدھی اس کے اوپر آگری۔ اس نے اپنی ٹاک ہر پریت کی ناک سے رگڑتے ہوئے کہا۔

”ہر وقت ایسی باتیں ٹھیک نہیں ہوتی ہیں پرتو۔ اب ہم ہیں اور اب ہماری ہی باتیں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور اس کے سامنے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں چائے پینے لگے۔ وہ اسے سمجھانے لگا کہ کل اس نے کیا کرنا ہے۔

اگلے دن کا سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جہاں نے گاڑی نکالی تو ہر پریت بھی اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ وہ ہالدر کی جانب چل دیے۔ جہاں کا سندو سے رابطہ تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی مختلف جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ سندو پوری طرح تیار بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

”یار! میں تیرے کہنے پر یہاں آ گیا ہوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں رہنے سے میں بہت جلد حالات پر قابو پا لوں گا۔ لیکن یہاں فوری طور پر پیسہ.....“ سندو نے کہا تو جہاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”پیسہ بہت ہے، آج ہی تمہیں بہت زیادہ رقم مل جائے گی، اس کی فکر چھوڑ، یہ بتا پروفیسر کے قاتلوں کا

مکھ چلا؟“

”میں نے چند گزھ میں موجود اپنے سارے ذرائع اس کام پر لگا دیئے ہیں۔ جیسے ہی پتہ چلے گا، اس کے مطابق پلان کر لیں گے۔“ سندو نے کافی حد تک بے بسی سے کہا تو جہاں سوچ میں پڑ گیا۔

”سندو، کہیں تو حوصلہ تو نہیں چھوڑ گیا۔ وہ جس طرح کہتے ہیں کہ ہاتھی اپنے استھان پر ہی بھلا لگتا ہے؟ چند گزھ چھوڑ کے تم خود کو کمزور تو نہیں سمجھ رہے ہو؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”ایسا نہیں ہے یار، ادھر کالے سفید سارے دھندے تھے، مال بھی تھا اور طاقت بھی۔ یہاں تو ماحول سمجھوں گا تو معاملہ چلے گا نا، تھوڑا وقت لگے گا۔“

”چل اٹھ، تجھے ماحول سمجھاؤں۔“ جہاں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”وہ رونیت کو تو بتا دو۔“

رونیت کور اور پروفسر کی بیوی اوپری منزل پر تھیں۔ جہاں نے ہر پریت کی طرف دیکھا اور ان کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اوپر چلی گئی تو یہ باہر نکل آئے۔ وہ ابھی کار میں بیٹھے نہیں تھے کہ رونیت کور کی کال آگئی۔

”یہ رونیت کی کال.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔ ادھر سے چند لفظوں ہی میں بات ہوئی تھی کہ سندو کا چہرہ متمنا اٹھا۔ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

”جہاں، پروفسر کے قاتلوں کا پتہ چل گیا ہے، چل جلدی رونیت کے پاس۔“

وہ دونوں تیزی سے اندر جا کر اوپری منزل پر گئے۔ رونیت کور اپنے لیپ ٹاپ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے پاس بی گرلین کور اور ہر پریت کور تھیں۔ ان کے آتے ہی رونیت نے بتایا

”انہیں کسی انڈر ورلڈ کے بندے یا کرائم پیشہ نے قتل نہیں کیا بلکہ قتل ”را“ کے اُن ایجنٹوں نے کیا ہے، جو باقاعدہ ملازم نہیں ہیں، مگر ان کے لیے کام کرتے ہیں۔“

”کون ہیں اور وہ کہاں رہتے ہیں؟“ سندو نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ دیکھو، یہ میری ایک صحافی دوست کی ای میل ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ کل سے میرے رابطے میں ہے۔ رات اس نے ڈانس کلب میں کچھ لوگوں کو دیکھا جو بہت زیادہ شراب پی رہے تھے اور بہت زیادہ مستی کر رہے تھے۔ ان کا جھگڑا وہاں کی سیکورٹی سے ہو گیا۔ سیکورٹی والے انہیں باہر نکالنا چاہتے تھے اور یہ نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ اس پر سیکورٹی والوں نے انہیں خوب مارا پیٹا۔ کلب والوں نے پولیس کو بلوایا تا کہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی سادہ لباس میں دو لوگ آئے انہوں نے ان شرابیوں کو لے جانا چاہا۔ انتظامیہ نہیں مانی۔ وہ انہیں پولیس ہی کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ پولیس آئی تو انتظامیہ نے وہ دونوں شرابی ان کے حوالے کر دیئے۔“ اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کوڑکی تو سندو نے بے مبری سے پوچھا۔

”لیکن اس سے پروفسر کے قاتلوں.....“

”بتا رہی ہوں نا۔“ رونیت نے کہا۔

”اوکے اوکے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اس سارے ہنگامے کے دوران میری صحافی دوست کو یہ معمول سے ہٹ کر لگا۔ اس نے تصویریں لے لیں اور اپنے دوست صحافی کو بتا دیا کہ کلب میں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ انہوں نے پولیس آفیسر سے بات کی۔ پولیس

آفیسر صاف کر گیا کہ گرفتاری کا ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ کلب میں دو شرابی اودھم مچا رہے تھے انہیں وہیں ڈانٹ لپٹ کر ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ ابھی وہیں تھا نے میں تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ وہ دونوں شرابی پارہو چکے ہیں۔ ان کی لاشیں سڑک پر پڑی ہیں۔ اس وقت پولیس آفیسر دیکھنے لائق تھا۔ اس نے فوری رد عمل میں فون کیا اور نجانے کسے کہا کہ پہلے ایک بڑھے کا قتل رفع دفع کیا۔ اب انہیں کس کھاتے میں ڈالوں۔

میرے پاس پریس بیٹھا ہوا ہے انہیں کیا جواب دوں؟ یہ دو تین فقرے ہی سارا پول کھول رہے تھے۔ صحافی ان کے سر ہونٹ کی کہ اگر وہ دونوں شرابی اپنے گھر چلے گئے تھے تو کیا انہیں کس نے قتل کر دیا؟ رات سے یہ معاملہ چل رہا ہے۔ لاشیں پوسٹ مارٹم کے بعد سرد خانے میں ہیں۔ ابھی صبح میری سیکٹی کو اس کے دوست نے بتایا تو اس نے مجھے یہ تفصیل ای میل کر دی ہے اور اُن دو سادہ لباس فوجیوں کی تصویریں بھی ہیں، یہ دیکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ان دونوں فوجیوں کی تصویریں دکھائیں جو سادہ لباس میں تھے۔

”ان فوجیوں کا سراغ لگانا ہوگا۔“ سندو نے زیر لب کہا تو رونیت بولی۔

”ابھی کچھ دیر میں پتہ چل جائے گا۔“

”وہ کیسے؟“ سندو نے پوچھا۔

”اسی پولیس سے پتہ چلے گا اور میرے دوسرے ذرائع بھی تو ہیں۔ آؤ اتنی دیر میں ناشتہ کرتے ہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔“ ہر پریت کور نے ستائش بھری نگاہوں سے رونیت کو دیکھتے ہوئے کہا تو جہاں اس دیا پھر بولا۔

”ابھی تو مزید کھلے گی۔“

”یہ کیا جہاں، تعارف تو کراؤ۔“ وہ قدرے حیرت سے بولی۔

”یہی ہے وہ میرا حوصلہ، میری محبت اور میرا جنون۔“ جہاں نے ہر پریت کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو ہر پریت سرشار ہو گئی۔

”واؤ! بھائی.....“ گرلین کور نے کہا اور ہر پریت کے گلے لگ گئی۔ رونیت کور بھی اس کے گلے لگی۔

”یہ جذباتی سین پھر دکھانا، آؤ ناشتہ کرلو۔“ سندو نے کہا تو سب باہر والے کمرے میں چلے گئے۔

سندو ناشتہ نہیں کر سکا۔ وہ چھت پر چلا گیا۔ اس نے چند گزھ میں اپنوں سے رابطہ کرنا شروع کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ سب ایک کمرے میں جمع تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ فوجی کون ہیں؟ وہ کہاں رہتے ہیں اور ان کا تعلق کس ادارے سے ہے؟ یہ تصدیق ہو جانے کے بعد سندو نے پوچھا۔

”بول جہاں اب کیا کرنا ہے؟“

”مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ یہ کام ”را“ کا ہے۔ اصل میں انہوں نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ وہ جب چاہیں ہمیں مسل کر رکھ دیں۔ میں نے آتے ہوئے پروفسر کو کہا بھی تھا کہ وہ محتاط رہے۔ پروفسر کا قتل ہر نیک لکھ کے رد عمل میں تھا۔ اور سندو یہ جان لو کہ ممبئی میں تمہیں دیکھا گیا ہوگا۔ کیونکہ گرباج نے سب کچھ بتایا ہے تو ان کی توجہ اس طرف ہوئی۔“

”مجھے لگتا ہے، جہاں کا یہاں آنے کا فیصلہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ اگر ہم بھی وہیں رہتے تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچتا۔“ رونیت کور نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ اس نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

”وہی کچھ جو انہوں نے کیا، انہیں واپس لوٹا دیں گے۔ کتنے لوگ لگائے ہیں اور اب تک کی اپ ڈیٹ کیا ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”دو لوگ پوری طرح ان کے پیچھے ہیں۔ باقی چار لوگ بھی ان کے آس پاس ہیں۔“ سندو نے کہا۔

”انہیں فوراً ہٹا لو، وہ گھیرے میں آ جائیں گے۔ وہ بندے بھی گنوا لو گے، میں بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔“ جہاں نے تشویش سے کہا پھر رویت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ان کا آفسر کون ہے؟ مطلب اس کا رابطہ نمبر کچھ معلوم ہوا؟“

”یہ دونوں ایک ہی بندے کو کال کرتے ہیں اور لگتا ہے کہ وہ اس وقت اپنے گھر میں۔ کافی دیر سے اس کا فون ایک ہی جگہ پر پڑا ہے، حرکت نہیں کر رہا ہے۔“

”میں سمجھ گیا کہ کیا کرنا ہے۔“ سندو نے کہا اور اپنے بندوں کے ساتھ رابطہ کرنے لگا۔ ایک دم سے ماحول سخت ہو گیا تھا۔ بھی جہاں کو خیال آیا، وہ فوراً سندو کے پاس چلا گیا۔

”اپنے لوگوں کو ہٹانے کے بعد انہیں کہو فون ضائع کر دیں۔ کسی صورت میں بھی فون نہ رکھے جائیں، ورنہ ہم یہاں پکڑے جائیں گے۔ بلکہ اس کے بعد وہ شہر ہی چھوڑ دیں۔“

بات سندو کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سب کو ہدایات دیں اور پھر بتایا۔

”اس آفسر پر دو بندے لگا دیئے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں خبر آ جائے گی کہ کیا ہوتا ہے۔“

انہوں نے وہ آدھا گھنٹہ بہت مشکل سے گزارا۔ ان دو فوجیوں پر جو بندے تھے وہ ہٹ گئے تھے، ٹیلی فون بوتھ سے انہوں نے اشارے میں بات کی تھی اور وہ شہر سے نکل گئے تھے۔ ان کے پکڑے جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

اسی دوران ٹی وی پر خبر نشر ہونے لگی کہ محکمہ داخلہ کے ایک اہم آفسر کو اس کے چار بندوں کے ساتھ اڑا دیا گیا۔ حملہ آوروں نے اس وقت راکٹ لانچر سے فائر کر دیا تھا جب وہ اپنی سرکاری جیب میں گھر سے نکلا تھا۔ اس دہشت گردی کے حملہ میں دہشت گرد پکڑے نہیں گئے۔ تاہم فورسز پوری کوشش میں مصروف ہیں کہ وہ پکڑے جائیں۔ شہر بھر میں ناکہ بندی کر دی ہے۔

”لو جی اپنے پروفیسر صاحب کا بدلہ لے لیا ہے۔“ سندو نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو اس کی بیوی بولی۔

”انہوں نے دھرم کی سیوا کا کہا تھا، یوں دہشت گردی کرنے کو نہیں کہا تھا۔“

”ماں جی، دھرم کی سیوا آزادی سے ہوتی ہے۔ ہم میں سے جو بھی چندی گڑھ جائے گا، یا انہیں یہاں کی بھنگ مل گئی تو انہوں نے ہمیں مارنے کو کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا۔“ سندو نے کہا۔

”بیٹا! وہ ”را“ ہے۔ اس کے پیچھے حکومت اور فوج ہے۔ کب تک؟“ اس نے کہا۔

”جب تک واہ گرد چاہے گا۔“ سندو نے بڑے حوصلے سے کہا۔ بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر سرفی آئی تھی۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ تبھی جہاں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا وہ اسے لمبی رقم دینا چاہتا تھا۔

سندو اور ابھیت ایک گاڑی میں، جبکہ ہر پریت کور اور رویت کور جہاں دوسری گاڑی میں آ بیٹھے۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے جانندھر شہر کے اس مصروف بازار میں آ گئے جہاں کی جلیبیاں پورے علاقے میں مشہور تھیں۔ وہ سبھی اکٹھے ہو کر دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”یار یہ تو سنا تھا کہ پنجاب کے میبلے ٹیلوں میں جٹ جلیبیاں کھایا کرتے تھے، یوں اس طرح تازہ جلیبیاں کھائیں گے تو کیسا لگے گا۔“ سندو نے کہا تو اس پر باتیں کرنے لگے جبکہ جہاں کی پوری توجہ بازار کے دونوں اطراف میں تھی۔ اچانک اسے دائیں طرف سے دو سکوتر سوار دکھائی دیئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے کے پاس ایک بڑا سارا گتے کا کارٹن تھا۔ وہ دونوں کار کے پاس آ کر یوں رکے جیسے لڑکھڑا گئے ہوں۔ جب وہ سیدھے ہو کر چلے تو وہ کارٹن وہیں دو گاڑیوں کے درمیان چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ جہاں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ابھیت! جاؤ کارٹن سنبھالو۔“

یہ سنتے ہی وہ سکون سے آگے بڑھا، کار کی ڈگی کھولی اور کارٹن اس میں رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ پھر ابھیت کے ساتھ سندو جا بیٹھا۔

”رویت آتے اپنا گاؤں دکھاؤں، کل چھوڑ دوں گی یہاں۔“ ہر پریت نے کہا تو وہ فوراً مان گئی۔ سندو اور ابھیت چلے گئے تو یہ تینوں بھی بازار سے نکلے۔ ہر پریت کی خواہش تھی کہ وہ تھوڑی شاپنگ کر لے، اسی لیے گاڑی کا رخ مین مارکیٹ کی طرف کر دیا۔

وہ کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے۔ وہ سنور سے باہر نکلے تو ان کی گاڑی کے پاس کچھ لوگ کھڑے دیکھ کر ہر پریت نے جہاں سے کہا۔

”جہاں! وہ دیکھو، لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔“

”اب یہاں تو کھڑے نہیں رہ سکتے، چل دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ جہاں انہیں نظر انداز کرتا ہوا اپنی کار کے پاس گیا اور چابی سے دروازہ کھولنے لگا۔ تبھی مختلف عمر کے آٹھ دس لڑکے اس کی طرف بڑھے۔ وہ سارے اس کے ارد گرد کھڑے ہو گئے تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”جہاں سنگھ تیرا نام ہے اور تو اوگی میں رہتا ہے جو کینیڈا سے آیا ہے۔“

”میں جہاں سنگھ بھی ہوں اور اوگی میں بھی رہتا ہوں۔ میں یں کینیڈا سے آیا، مگر لگتا ہے تم لوگوں کو کسی نے تمیز نہیں سکھائی بات کرنے کی۔“ اس نے دبے دبے غصے میں کہا تو وہی طنزیہ انداز میں بولا۔

”وہی تمیز ہی تو سکھانے آئے ہیں تمہیں۔“

”اوئے سیدھی بات کر اس سے، اگر مانتا ہے تو ٹھیک ورنہ اسے یہیں.....“ ایک دوسرے لڑکے نے کہا۔

”چل تو ہی کہہ دے۔“ پہلے والے نے جہاں کو گھورتے ہوئے کہا۔

”سن او جہاں! تو نے یہاں رہتا ہے تو سکون سے رہ، سیاست میں منہ مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا ابھی ہم لوگوں سے پالا نہیں پڑا، بڑی کہانیاں سن لی ہیں تیری دلیری کی۔ اب اگر اوگی میں زندہ رہتا ہے تو اپنی اس معشوق سے شادی کر اور سکون سے رہ۔“ دوسرے نے حقارت بھرے لہجے میں اسے انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔

”اور اگر میں تیری بات نہ مانوں تو؟“ جہاں نے غراتے ہوئے کہا تو رویت کور نے شاپنگ بیگ کار میں پھینکے اس لڑکے کا بازو پکڑ لیا جس نے انگلی اٹھائی تھی۔

”اوئے، اگر تو نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو پہلے میرے اس تھپڑ کا جواب دے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے

دنانے کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ ہر پریت بھی ماحول کو سمجھ چکی تھی۔ اس نے بھی بیگ پھینک دیئے۔ اس نے پہلے کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ سبھی ایک دم سے حیران ہوئے اور ان تینوں پر ہل پڑے۔

انہیں یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کن لوگوں سے بھڑ بیٹھے ہیں۔ جو بھی ان کے نزدیک جاتا اس کی چیخ بلند ہو

تی۔ جہاں کو اپنا پہل نکالنے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ مارکیٹ میں ایک دم سے شور ہو گیا۔ ہر پریت اور رویت کے لڑنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ وہ تینوں ایک جٹ ہو کر لڑ رہے تھے، تین یا چار منٹ میں کئی سارے زمین بوس ہو چکے تھے۔ ان لڑکوں کو جب سب کچھ الٹا پڑتا دکھائی دیا تو وہ ایک دم سے بھاگ نکلے۔ جہاں نے ان کے پیچھے بھاگ کر ان دو کو پکڑ لیا، جنہوں نے اس سے انتہائی بدتمیزی سے بات کی تھی۔ اس نے دونوں کو کالر سے پکڑا اور اپنی کار کے پاس لاکر سڑک پر دے مارا۔ پھر اپنا پہل نکال کے بولا۔

”بولو۔ کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟“

”سردار مان سنگھ باجوہ نے۔“ ایک نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا

”وہ کون ہے؟“ جہاں نے پوچھا تو ہر پریت نے تیزی سے کہا۔

”ہمارے دشمنوں کے خاندان ہی کا ہے، اس انکیشن میں ایم ایل اے کا امیدوار ہے۔“

”اوہ!“ جہاں فوراً سمجھ گیا۔ یہ رات سردار ویر سنگھ سے ملاقات کا نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ اس نے سڑک پر پڑے دونوں لڑکوں کے ایک ایک بازو پر اپنے پاؤں مارے تو ان کے بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ان کی تیز چیخ فضا میں بلند ہوئی تو جہاں نے اس لڑکے کی وہی انگلی پکڑ لی جو اس نے دکھاتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

”بتا دینا اپنے لڑے باجوہ کو، میں تو کب سے کوئی نیا دشمن تلاش کر رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے انگلی مروڑ کر توڑ دی۔ لڑکے چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ تب اس نے لڑکے کا ہاتھ چھوڑا اور کار میں جا بیٹھا۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ آ بیٹھیں تو اس نے کار بڑھا دی۔



میری توقع کے مطابق مختلف ٹی وی چینلوں پر جو خبر چلی تھی، اس میں ذمکتی کی واردات میں نامعلوم افراد ہی بتائے گئے تھے۔ پہلی عمارت میں گئے لوگوں کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کے نظام کو جام کرنے کی کوئی بات کی گئی تھی۔ انہوں نے سارا زور اسی پر دیا تھا کہ دو سیکورٹی والے مارے گئے ہیں اور جو زخمی تھے ان کی تعداد بڑھ کے بتائی جا رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر جنید نے بتایا کہ اس کمپنی کے مالک سیٹھ نیلا کے فون پر بہت زیادہ فون آئے تھے۔ ان میں ملکی بھی ہیں اور غیر ملکی بھی۔ کچھ دیر تک ان کی چھان بین ہو جائے گی۔

”تم لوگ کرنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ محض ایک واردات نہیں ہے، اور ہم کوئی ایک مقصد حاصل نہیں کرنا چاہتے ہیں، ابھی ہم چار ستوں میں بڑھیں گے۔“ اکبر نے پوری سنجیدگی سے بتایا

”وہ کون کون سی ہیں؟“

”نمبر ایک، پولیس کا وہ طاقتور بندہ جو کھلے عام جوا کروا رہا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح قانون کے شکنجے میں لانا ہے، تاکہ پولیس میں موجود وہ چہرے بے نقاب ہوں جو اس قسم کے دھندوں میں براہ راست ملوث ہیں اور انہیں بھی احساس ہو جائے کہ انہیں کسی کا خوف لاحق ہو سکتا ہے۔“ اکبر نے وضاحت کی

”یہ کیسے ہوگا؟“ میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔

”ان کی مخالف قوت میں بھینا لوگ موجود ہوں گے، وہ کہتے ہیں تا جب نظام ٹوٹتا ہے تو طاقت سر اٹھاتی ہے۔ ان کے مخالفین بھی تو کچھ نہ کچھ طاقت رکھتے ہوں گے۔ وہ لازماً حرکت میں آئیں گے۔“

”دوسرا یہ ہے کہ سیٹھ نیلا کو یہ باور کرایا جائے کہ یہ سب کچھ ان کے مخالفین نے کرایا ہے۔ ظاہر ہے اس سے

ان کے درمیان ایک نئی قسم کی محاصرت شروع ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس سے وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی طاقت بھی استعمال کریں۔ اس سے حالات میں کشیدگی تو آئے گی لیکن اس سے ان کی طاقت کے علاقے اور طریقہ کار سمجھ میں آ جائے گا۔“ جنید نے بتایا

”یہ جو دھندہ کر رہے ہیں، یہ پاکستان کے خلاف جاتا ہے، ہنڈی کے ذریعے رقم باہر جاتی ہے۔ جس سے ملک کو نقصان تو ہو ہی رہا ہے، اس سے چند لوگ اپنی بلیک منی محفوظ کر رہے ہیں۔ یہ بلیک منی پاکستانی عوام کا اتصال ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ کیسے دھندہ کرتے ہیں، ان کا سارا ثبوت میرے پاس ہے، یہ سارے ثبوت چند ڈی وی ڈیز مختلف اداروں کو بھیج دی جائیں گی اور انہیں مجبور کیا جائے گا کہ ان کو پکڑا جائے۔“ زویا نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ جو کوئی ہوئی دولت ہے یہ ہمارے نئے سیٹ اپ کے لیے کام آئے گی۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“ سلمان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ وہ سب ایک دم سے ہلچل مچا دینا چاہتے تھے۔ وہ مجھے ہی نہیں روٹی کو بھی یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں۔

”ٹھیک ہے، یہ یاد رکھیں کہ ہم نے اپنا مستقل ٹھکانہ یہاں نہیں بنانا۔ میں آج یہاں سے نکل رہا ہوں۔ دو چار دن میں یہ سب ختم کر کے تم لوگ وہیں آ جانا جہاں میں تم لوگوں کو بلاؤں۔“ میں نے حتی انداز میں کہا وہ سب کافی حد تک میرے اس فیصلے کو قبول نہیں کر پائے۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے ان سے پوچھ لیا، ”کیا مہری تجویز پسند نہیں آتی؟“

”بات پسند اور نا پسند کی نہیں، اب تو ہمارا اور تمہارا ساتھ ایک ہے، یہ ہم الگ الگ کیسے؟“ گیت نے پوچھا۔

”ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ دولت لوٹتے رہیں اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے رہیں۔ ہمیں اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کے لیے ہم کہیں بھی ایک جگہ مستقل نہیں رہ سکتے ہیں۔“ میں نے انہیں کہا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے مگر ہر جگہ ہماری رسائی نہیں ہو سکتی، ہمیں اپنے نیٹ ورک کے لیے، زمینی حقائق جاننے کے لیے لوگ چاہئے ہوتے ہیں۔“ مہوش بولی تو ایک دم سے سلمان بول اٹھا۔

”اد کے۔ تم جہاں بھی رہو، ہمارے رابطے ہی میں رہو گے۔ کہاں جانا ہے، میں بندوبست کر دوں۔“

”میں چلا جاؤں گا، تم لوگ اپنے اپنے کام پر لگ جاؤ، میری فکر مت کرو۔“ میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ کراچی کی ایک خوشگوار شام تھی جب میں کلفٹن کے اس گھر سے نکلا جو بن قاسم باغ کے پاس تھا۔ دن ختم ہونے کو تھا جب میں ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ میرا وہاں سے نکلنا کرل سرفراز کے ساتھ طے تھا۔ میرے فون کے جواب میں ایک شخص نمودار ہوا اور سید حامیرے پاس آ گیا۔ وہ مجھے کٹ دے کر پلٹ گیا۔ میں نے بورڈنگ کارڈ لیا اور لاؤنج میں آ بیٹھا۔

مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ بالکل میرے سامنے والی نشست پر ایک لڑکی آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سیاہ جینز کے ساتھ گرے ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں لہبا سیاہ رنگ کا سکارف تھا۔ بوائے کٹ

بالوں کے ساتھ اس کی غلافی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے کہیں پہلے دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ وہ مسلسل میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کے چہرے پر موجود دشمنائی مجھے بے چین کر رہی تھی۔ ایک دم سے میرے اندر سسنی پھیل گئی۔

وہ مسلسل میری طرف دیکھے چلے جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جو دھیمی سی مسکان کھیل رہی تھی، میں اسے کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ وہ ایک دم سے مجھے جتنی پراسرار لگی تھی، اس کی آنکھوں میں اس قدر اپنائیت بھی چھلک رہی تھی۔ جبکہ میرے اندر بے چینی اٹھنا فطری عمل تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں انھوں اور اس کے پاس جا کر پوچھ لوں کہ وہ کون ہے؟ شاید میں ایسا کر بھی لیتا مگر اس وقت باہر جانے کے لیے اعلان ہونے لگا۔ میں لاؤنج سے نکل گیا۔ لاؤنج سے جہاز تک وہ میری نگاہوں سے اوجھل رہی لیکن وہ میرے دماغ سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آن بیٹھا اور اسی کے متعلق سوچنے لگا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ میں چونک گیا۔ وہ میرے ساتھ آکر اطمینان سے بیٹھ گئی تھی۔ میرے اندر ایک دم سے الارم بج اٹھا۔ میں پوری طرح محتاط ہو گیا۔ تبھی اس نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔

”لوگ اتنی جلدی بھول جاتے ہیں، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

اس کی آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ میں نے تب اسے غور سے دیکھا تو ایک دم سے میرے ذہن میں آگئی۔ لیکن شک اب بھی تھا۔

”سوری کیا آپ نے مجھے کچھ کہا؟“ میں نے انتہائی مہذب انداز سے پوچھا۔

”جی میں نے آپ ہی سے کہا ہے؟“ اس نے پھر دھیمی آواز میں ہی کہا۔

”لیکن میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“ میں نے یہی چاہا کہ وہ خود بتائے، کہیں میرا شک غلط نہ ہو جائے اور میں کوئی غلط نام لے بیٹھوں۔ میں پر اعتماد اس لیے بھی ہو گیا تھا کہ کٹرل مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے لیے اس سفر میں ایک سرپرائز بھی ہوگا۔ میں سمجھ گیا تھا یہ سرپرائز کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا یہاں ہونا اور میرے ساتھ سفر کرنا کسی بڑے معاملے کا اشارہ تھا۔

”ذرا تصور کرو، میری آنکھوں پر موٹی سی عینک لگی ہو۔ میں اپنی عمر سے ذرا بڑی دکھائی دے رہی ہوں۔ پھر تم میرے ساتھ کسی باغ میں بھی گھومے ہو۔“ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے ہوئے بولی۔

”میں پہچان تو گیا ہوں۔ لیکن ذرا سا شک اب بھی ہے۔ اگر چاہو تو خود بتا دو۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ ذرا سامنے بسورتے ہوئے بولی۔

”میں فوتن کور ہوں، اب پہچانا؟“

”ہاں اب پہچان گیا، لیکن تم یہاں کیسے؟ اور یہ تم بہت حد تک بدل گئی ہو، جوان، خوبصورت اور پرکشش۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک نئی لڑکی میرے سامنے آگئی ہو۔ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”لاہور پہنچ جائیں، پھر سکون سے باتیں کریں گے۔“ اس نے ایک ادا سے کہا تو مجھے ایک بار شک ہوا جیسے یہ فوتن کور نہیں کوئی دوسری لڑکی میرے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ میں نے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا دی۔

لاہور انر پورٹ سے ہم یوں باہر آئے جیسے ہم دونوں میں کوئی اجنبیت نہیں ہے بلکہ ہم سفر ہیں۔ باہر ٹیکسی موجود تھی، جس کا نمبر مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے تو ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ ڈیش بورڈ پر پڑا سیل فون بج اٹھا۔ نو جوان ڈرائیور نے ڈیش بورڈ پر پڑا سیل فون اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کی کال ہے۔“

میں نے فون پکڑا تو دوسری طرف کٹرل سرفراز تھے۔ میرے سلام کرنے پر انہوں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، کیسا رہا سرپرائز؟“

”پہلے سے کافی خوبصورت ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی ہے، جس نے مجھے باغ کی سیر کرائی تھی۔“ میں نے ہنسنے ہوئے کہا تو وہ بولے

”یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ خیر! کہنا تمہیں یہ تھا کہ یہ مہمان ہے۔ جیسے کہے دیے کرتے جانا۔ اس کے ساتھ ملے ہے۔ اور ہاں یہ فون اپنے پاس ہی رکھنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو انہوں نے فون بند کر دیا۔ جو تھوڑا بہت شک تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

ٹیکسی نے ہمیں مال روڈ پر موجود فائیو اسٹار ہوٹل میں چھوڑ دیا۔ استقبالیہ پر بھارتی نژاد برطانوی خاتون کے نام پر سوئٹ بک تھا۔ ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد جب میں فریش ہو کر آیا تو اس نے شارٹس پہن رکھے تھے۔ سامنے مہنگی شراب کی بوتل کے ساتھ لوازمات تھے۔ ایک گلاس میں وہ شراب ڈالے ہلکے ہلکے چسکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا

”بہت بدل گئی ہو فوتن۔“

”ہاں میں نے فیصلہ کر کے باقاعدہ پلاننگ کر کے خود کو بدلا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے لمبا سا سپ لیا اور یوں گویا ہوئی جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔ ”جمال، جب تم چلے گئے تو میں نے بہت سوچا، ہم اتنے دن ساتھ رہے، لیکن تم نے مجھے عورت ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ میری بہت ساری خامیوں کو بھی نظر انداز کیا۔ ورنہ میں نے جس کے ساتھ بھی کام کیا، تنہائی میں اس کی پہلی ترجیح میرا جسم ہوا کرتی تھی۔ جرم کی اس دنیا میں ایک عورت ہونے کی وجہ سے طوائف بن جانے پر مجبور تھی۔ اس کی صرف اور صرف ایک وجہ تھی کہ میں طاقتور نہیں تھی، کسی کے سہارے چل رہی تھی۔ رقم تھوڑی ہوتی یا زیادہ، اس کے عوض زندگی کو گھینٹنے پر مجبور تھی۔ تم سے میں بہت کچھ سیکھا۔ مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے یہ کام ہی چھوڑ دیا۔ کوئی تین ماہ بعد بائیکاٹ کور میرے پاس آئی، میری اس سے کسی بات ہوئی۔ تب اس نے مجھے امرتسر چھوڑ دینے کو کہہ دیا اور میں نے چھوڑ دیا۔“ یہ کہہ کر وہ نیا گلاس بنانے لگی۔

”امرتسر چھوڑ کر کہاں گئی؟“

”ممبئی۔“ یہ کہہ کر اس نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

”تب سے میں وہاں ہوں۔ میں نے خود کو پوری طرح بدل لیا۔ اس دن سے میں نے رقم کا نہیں طاقت کا حصول ہی اپنا مقصد بنا لیا۔ اب طاقت بھی ہے اور دولت بھی۔ اب اگر میں چاہوں تو اپنے لیے، وقت گزاری کے لیے کسی لڑکے کو بلا لیتی ہوں۔ کوئی میری طرف دیکھنے کی جرات نہیں کرتا۔ اس کے لیے میں نے کئی لڑکے ہالے ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ سپ لینے کیے رکی تو میرے ذہن میں کئی سوال آئے مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس معاملے میں یہ وہیں کی وہیں ہے۔ مجھے اس پر کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے، یہ اس کی ذاتی زندگی ہے۔ وہ سب لے کر بولی۔

”جب پچھلے دنوں تم وہاں تھے تو میرا بہت دل کیا تھا تمہیں ملنے کو، مگر اس وقت میں یونا میں پھنسی ہوئی تھی

اور تم زوردار سنگھ کے پاس ٹھہرے بھی تو زوردار دیر ہی کے لیے تھے۔ جب تک میں ممبئی آئی، تم وہیں کہیں غائب ہو چکے تھے۔ مجھے ولی ڈکھ ہوا تھا لیکن واگوروی مہر سے مجھے تمہارے پاس یہاں بھیج دیا گیا۔“

”کس نے اور کیوں؟“ میں پوچھا۔

”ظاہر ہے زوردار سنگھ نے مجھے بھیجا۔ مگر ہمارا ایک بڑا نیٹ ورک ہے۔ وہ سکھ دھرم ہی کے لیے کام کر رہا ہے لیکن اس کے بہت سارے دوسرے کام بھی ہیں۔ صرف مشن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اب بات یہ ہے کہ مجھے تمہارے پاس کیوں بھیجا گیا۔“

”وہی تو پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو یہ تمہیں بتانا ہوگا کہ تم ممبئی میں کیا چاہتے ہو اور میں یا میرا نیٹ ورک تمہارے لیے کیا کر سکتا ہے، اس حوالے سے میں تمہیں بتاؤں گی کہ ہم کہاں تک کیا کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں دولت کے علاوہ دوسرے مفادات بھی ہوں گے۔“ اس نے واضح طور پر کہا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

”بہت خوب“ تم تو بڑے کام کی چیز بن گئی ہو۔“

”مجھے ذاتی طور پر تمہارے کام آکر بہت خوشی ہوگی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

”ابھی کھانا کھاتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر باہر ٹیرس کی جانب بڑھ گیا۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں اپنے مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اپناتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پیچھے کوئی ایسی سوچ ہوتی ہے اور آخر کار بات وہیں اس لکیر پر آ کر رہتی ہے کہ کون انسانیت کے ساتھ ہے اور کون اہلیست کا پیروکار۔ اس کے لیے جرائم کی دنیا کو بھر پور استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے انڈر ورلڈ میں بھی چھوٹی بڑی کمپنیاں بن چکی ہیں اور وہ ساری دنیا میں پھیل چکی ہیں۔ بے شک اس میں بھی بڑی اور چھوٹی مچھلیاں ضرور ہوں گی۔ جو اپنے مفاد کے لیے کام کرتی ہیں اور اسے بزنس کا نام دے دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں جتنا بڑا شہر ہوتا ہے اتنی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ وہاں کی تہذیب اور ماحول میں بھی انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ ممبئی بھی ایک ایسا ہی شہر ہے، جس کی بنیاد میں جرم ہے۔

سات جزیروں پر مشتمل شہر ممبئی، جب کوئی نام نہیں ہوا کرتا تھا، اور وہ محض سات مختلف جزیرے تھے، کولابہ، مزائیون، بوڑھی عورت کا جزیرہ، ودالہ، ماہم، پارسی اور ماروٹوٹا۔ امن پسندانہ جزیروں پر ”اشوکا“ کی نگاہ پڑی اور اس نے یہاں پر انہیں اپنے قبضے میں لیکر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ جس طرح اصل بھارتیوں پر آریان نے آکر حکومت کی اور انہیں شور بنادیا۔ اسی طرح یہاں کے اصل باشندوں کو اس نے انتہائی ذلیل کیا تاکہ وہ سرنہ اٹھا سکیں۔ اشوکا کی موت سے لیکر 1343ء تک یہ جزیرے مختلف ہندو حکمرانوں کے ہاتھوں منتقل ہوتے رہے۔ اس کے بعد گجرات کے مسلمانوں نے اس پر قریباً دو سو سال تک حکومت کی۔ ماہم کا علاقہ ان کا مرکز تھا جہاں آج بھی اسی دور کی ایک مسجد موجود ہے۔ 1534ء کے لگ بھگ پرتگیزیوں نے یہاں قدم جمائے شروع کر دیئے۔ انہوں نے سازش اور طاقت کے ذریعے مسلمانوں سے بہت سارے علاقے چھین لیے۔ خاص طور پر مغربی ساحلی علاقے جو تجارت کے لیے بہت اہم تھے۔ وہ وہاں آباد ہوئے، رومن کیتھولک چرچ بنائے۔ باعمرہ میں آج بھی سینٹ اینڈریو چرچ موجود ہے۔ انہوں نے انہی علاقوں میں قلعہ نما عمارتیں بنائیں اور آ

ہستہ آہستہ کبھی جزیروں پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے ساتوں جزیروں کے مقبوضہ علاقے کا نام رکھا ”بوم بیا“ (Bom Baia)، جس کا پرتگیزی زبان میں مطلب ہے ”بہت اچھا ساحل“۔ تقریباً بیس برس بعد انگریز بادشاہ چارلس نے پرتگیزی شہزادی کیسٹرین آف برگنزا سے شادی کی تو یہ بوم بیا ان کی عملداری میں آ گیا۔ یہ شہر انہیں تحفے میں دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کی قیمت یہ پائی کہ ان جزیروں کو دس سوئے کے پونڈ کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔ اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کا مرکزی دفتر گجرات کے شہر ”سورت“ میں تھا، 1687ء میں انہوں نے اپنا مرکزی دفتر یہاں تبدیل کر لیا، یہی جگہ تجارتی مرکز قرار پائی اور انہوں نے اس کا نام بوم بیا سے بدل کر ”ممبئی“ رکھ دیا۔ لیکن ساحلی قلیوں نے اس نام کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے اسے ”ممبا“ پکارا۔ یہ نام ان کی مبادیوی کی نسبت سے تھا۔ جس کا مندر آج بھی بابونا تھ کے علاقے میں ہے۔ یہ علاقہ چوڑی پٹی ساحل پر ہے۔ یہ غریب طبقہ کی پہلی بغاوت تھی، جو بادی گئی۔ پہلی بار یہ شہر ایک یونٹ میں آ گیا۔ یعنی جزیرے ایک شہر بننے کی ابتدائی سطح پر آ گیا تھا۔

تقریباً پچاس برس کے بعد لگ بھگ 1835ء کے قریب ایک نئی قوت داخل ہوئی۔ رستم جی دوراب بھائی پائیل نے اپنا آبائی وطن ایران چھوڑا اور ہندوستان کے اسی ساحلی شہر میں آن آباد ہوا۔ اس کے ساتھ کافی سارے لوگ تھے۔ دراصل یہ زرتشت تھے اور اسلام کے اثرات سے اپنے مذہب کو بچا کر ہندوستان میں محفوظ ہونا چاہتے تھے۔ وہ پارسی جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے، انہیں دوراب بھائی نے آ کر اکٹھا کیا اور انہوں نے بھی سازش اور طاقت کے ذریعے برطانوی اور ساحلی قلیوں کی مدد سے ان جزیروں پر قبضہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پارسیوں نے کم تعداد میں ہونے کے باوجود ایسا کر دکھایا۔ یہ سب انہوں نے اپنی طاقت سے نہیں کیا بلکہ یہ طاقت انہوں نے غریب اور پے ہوئے طبقے کو استعمال کر کے کی۔ یہیں سے ”بھائی گیری“ کا آغاز ہوا۔

پارسی ہی اس ”بھائی گیری“ مافیا کے بانی ہیں۔ رستم جی دوراب بھائی پائیل نے ایک نئی طرز کی مزاحمت سے اپنی طاقت کا احساس دلایا تھا۔ وہ غریب اور مزدور طبقے سے جنگ پر آمادہ، اور باغی قسم کے نوجوانوں کو جن کر انہیں زبردست طریقے سے استعمال کرتا۔ جو سب سے بڑا غنڈہ ہوتا وہ ”بھائی“ کہلاتا۔ یوں اب تک یہی اصطلاح ان غنڈوں کے لیے مخصوص ہے، جو باقاعدہ ایک مثال ہی نہیں روایت بن گئی ہے۔

ممبئی میں جرم کی طاقت سے حکومت کا آغاز ہو چکا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک گروپ سے نئے گروپ بنتے چلے گئے۔ ان میں علاقے تقسیم ہونے لگے۔ ہر علاقے کا نیا ”بھائی“ وجود میں آنے لگا۔ ممبئی کے دولت مندوں نے اپنے مفاد کی خاطر نہ صرف اس طاقت کو استعمال کیا بلکہ اسے پروان چڑھایا۔ رقم اور تحفظ فراہم کر کے تجارتی حلقوں میں اپنا اثر رسوخ اور رعب داب بڑھانے میں کامیاب ہوتے گئے۔ اسی دھارے میں سیاست دان بھی آتے گئے۔ ان سے بھی کام لیا جانے لگا۔ یوں ”بھائی گیری“ نے اتنی وسعت اور گہرائی اختیار کر لی کہ یہ مافیا کی صورت اختیار کر گیا۔

”بھائی گیری“ کا خام مال تب بھی اور اب بھی غریب، لاوارث، یتیم اور بگڑے آوارہ بچے ہیں جو اپنے اہن میں انتقام لے کر پرورش پاتے ہیں۔ یہی انڈر ورلڈ مافیا ہے۔ عورتوں سے لیکر منشیات کے کاروبار تک، انسانی قتل سے لے کر ڈیکیتیوں تک، چوری سے اسپیلنگ تک، ایک چھاپڑی والے لیکر فلمی پنڈتوں تک سے ہمت وصولی، تمام تر جرائم اب اسی انڈر ورلڈ مافیا ذمے دار ہے۔ یہ مافیا اس حد تک مضبوط ہو گیا ہے کہ اب ہر شعبے میں بادشاہ گر یہی لوگ ہیں۔ مطلب معمولی جیب کترے سے لیکر حکومتی ایوانوں تک، ان کی گرفت پوری طرح

موجود ہے۔ ان سب کا صرف ایک مقصد ہے، ”فائدہ“

بھارت کے وجود میں آنے کے بعد 1960ء میں مختلف علاقوں کو ملا کر اسے مہاراشٹر کا نام دے دیا گیا۔ پارسی سیاست سے آؤٹ ہو گئے، ہندو چھا گئے۔ پارسیوں نے ملٹی نیشنل کمپنیاں بنا کر تجارتی حلقوں میں اپنی حکومت بنائی۔ لیکن انڈور ولڈ مافیا بھی جڑیں اس حد تک مضبوط کر چکا ہے کہ ان کے بغیر ممبئی چل ہی نہیں سکتی۔

انہوں نے اپنے خام مال کی پیداوار کا بہت خیال رکھا ہوا ہے۔ ممبئی، جہاں فلک بوس عمارتوں کا تسلسل ہے، وہاں دنیا کی سب سے بڑی جموینٹری بھی موجود ہے۔ سود کی غمخت سے غریب، غریب تر اور دولت مند امیر ترین ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ساحلی شہر کے اس تناظر میں دیکھا جائے تو کراچی بھی اس ”بھائی گیری“ سے محفوظ نہیں۔ ممبئی اور کراچی میں بہت سی مماثلت ہے۔ دونوں ساحلوں پر مافیا کا قبضہ پوری طرح موجود ہے۔ اسی کے ساتھ ہی تیسرا ساحل دوسری بھی ہے۔ ممبئی سے دوسری تک جرائم کی دنیا پھیلی ہوئی ہے اور اس پر اب کون حکومت کر رہا ہے؟ یہی سمجھنے کی چیز ہے۔

”یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟“ نوین نے کہا تو اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی گردن پر گرم ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے پلٹتے ہوئے نوین کو ر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چھوڑ دیئے۔ تبھی اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھ پر اعتماد نہیں کر پارہے ہو یا تمہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم دراصل چاہتے کیا ہو۔“

”نوین، یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر کیا بات ہے؟“ اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ جو میں چاہتا ہوں، وہ تم کو بھی پاؤ گی یا نہیں، لیکن ایک طرح سے تم پر اعتماد کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ تمہیں کرل صاحب نے بھیجا ہے۔“ میں نے اس کے بال بگاڑتے ہوئے کہا۔

”بھیجا نہیں بلوایا ہے مجھے، یہ ذہن میں رکھو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہنس دیا

”چل کھانا کھاتے ہیں، پھر باغ ہی میں جا کر باتیں کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے میز تک لے آیا۔

سہ پہر ہو رہی تھی، جب ہم دونوں باغ جناح میں داخل ہوئے۔ نوین کو ر باوجود شراب پینے کے اس قدر نشے میں نہیں تھی، بلکہ سرور والی کیفیت میں تھی۔ ہم ہوٹل سے پیدل ہی باغ تک آئے تھے۔ مجھے کھلی فضا میں سانس لینا اچھا لگ رہا تھا۔ ایک لان میں نگلی بیچ پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ تمہارے نیٹ ورک کی رسائی کہاں تک ہے، صرف ممبئی کا ایک علاقہ، پورا ممبئی یا پھر دہلی تک بھی رسائی ہے۔ کیونکہ میرا ڈسٹن وہ ہے، جس نے اپنے خونیں پنجے بھارت میں گاڑ لیے ہیں اور اس کی نظر پاکستان پر ہے۔“

”تم ڈیوڈ ریمنز کی بات کر رہے ہو، وہی جو ویرا ڈیسیائی روڈ کے ساتھ بلڈنگ میں.....“ اس نے کہا اور جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”بالکل وہی، وہ تو نہیں رہا، مگر اس کا نیٹ ورک اب بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو، میں تمہیں ایک بات سمجھاتی ہوں۔ جس طرح کچھ لوگ یہودیوں کو بھارت لانے میں خوش ہیں، اسی طرح کچھ لوگ مخالف بھی ہیں۔ وہ اسے وہاں نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ یہ زہریلا ناگ ہے، وہ پلانے والے کو بھی کاٹ لیتا ہے۔ میں مانتی ہوں، انہوں نے بھارت میں بہت گہرائی تک رسائی لے لی ہے، مگر یہ ناممکن نہیں ہے۔ اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”یہ بات نشے میں تو نہیں کہہ رہی ہو، یا فقط مجھے حوصلہ دے رہی ہو یا پھر تمہیں اس کی سنگینی کا احساس نہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کا مقصد صرف اسلحہ فروخت کرنا ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”نہیں، صرف اسلحہ فروخت کرنا نہیں ہے اور بہت کچھ ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔

”یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ رات تک میں تمہیں اس بارے میں بتا دوں گی، فی الحال اپنی بات کرو۔ تھوڑی پیار بھری باتیں، ایسا سکون، جسے میں یاد رکھوں۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

”ایسا کیا ہو سکتا ہے، تم میرے بارے میں جانتی تو ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ اس دوران اس نے اپنا سیل فون نکال کر پیغام بھی ٹائپ کرتی رہی۔ مجھے لگا کہ وہ ڈیوڈ ریمنز کے بارے میں لکھ رہی ہے۔ یہ پیغام تو منٹوں میں پکڑا جاسکتا تھا اور ایسی صورت حال میں جبکہ اس کے قاتلوں کو بڑے پیمانے پر تلاش کیا جا رہا ہو۔ کچھ دیر بعد وہ پیغام لکھ چکی تو میں نے اپنی تشویش کے بارے میں کہا تب وہ ہنس دی۔ پھر اپنا سیل فون مجھے دیتے ہوئے بولی۔

”پڑھ لو۔“

میں نے سیل فون پکڑا اور پڑھا، مگر پڑھ نہ سکا، وہ اوٹ پٹانگ زبان تھی۔ اس نے کوڈ ورڈز میں لکھا تھا۔ میں نے اسے سیل فون واپس کر دیا۔ اس نے وہ پیغام بھیج دیا۔ ہم وہاں کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے بہت ساری معلومات دیں۔ سورج ڈھل گیا تو ہم اسی طرح پیدل واپس آ گئے۔

ڈنر کے بعد نوٹن کو ر نے ایزی لباس پہنا اور میرے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور میں سنتا رہا۔ میں اس کی باتیں اس لیے سنتا رہا کہ اس کی رسائی کے بارے میں معلوم ہو سکے۔ وہ ممبئی میں ہونے والی اپنی وارداتوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بارہ سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہوا تھا کہ اس کے سیل فون پر پیغام آ گیا۔ اس نے دیکھا اور پھر اپنے فون پر ای میل بکس کھول لیا۔ وہ چند لمحے پڑھتی رہی، پھر بولی۔

”یہ ڈیوڈ ریمنز والا نیٹ ورک بظاہر حکومتی سامنے میں ہے، مطلب بھارتی ایجنسیاں انہیں تحفظ دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کے لوگ یہاں ہیں جو بہت کم تعداد میں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فعال ہیں۔ وہ کئی ”سرے امور کے لیے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ گنتی کے یہ لوگ، بھارتی ایجنسیوں کی پشت پر ہیں۔“

”اگر انہیں ختم کرنا ہوگا تو بھارتی ایجنسیوں ہی سے لڑنا ہوگا۔ وہی ان کا سامنا کریں گی۔“ میں نے کہا۔

”ایسا تو ہے، اب بولو کیا کرنا ہوگا۔“ اس نے پوچھا تو میں نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

”میں بتا دوں گا۔“

”اوکے“ اور یہ نام لکھ لو، جو یہاں اسی شہر اور کراچی میں موجود ہیں، جو ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور نام

ایک لکھ لو جو یہودیوں کی بھارت آمد کے مخالف ہیں۔“

”یہاں کسی پنڈ پر لکھ دو اور سو جاؤ۔“ صبح تمہیں جانا بھی ہے۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔
میں اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گیا تھا۔ میری سوچیں بہت پھیل گئی تھیں۔ لیکن سونے سے پہلے میں سوئی سے رابطہ کرنا نہیں بھولا۔ اسے میں نے بتا دیا کہ میں لاہور میں ہوں۔

☆.....☆.....☆

مارکیٹ میں ہونے والے ناخوشگوار واقعے کی اطلاع ہم سے پہلے ہی اوگی پنڈ پہنچ چکی تھی۔ سردار ویر سنگھ کے ساتھ بلیر سنگھ بیچ گئے تھے۔

”دکھ یہ نہیں کہ اس نے کمینہ پن دکھایا، دکھ یہ ہے کہ ہماری ملاقات کی تفصیل کس نے اس تک پہنچائی۔“ ویر سنگھ نے بوجھل لہجے میں کہا۔

”سردار جی، یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے کسی منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اندر ہی کہیں کالی بھیریں ہیں۔ ان کا پتہ کریں۔“ بلیر سنگھ نے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ سب سامنے آجائے گا۔ آپ بس کل سے گرد و دارہ سیوا شروع کریں۔ پہلے شاید کہیں کسی دوسرے پنڈ سے ہوتی۔ اب اسی باجوے کے پنڈ سے شروع کریں گے۔ کیا یاد کرے گا وہ۔“ جہاں نے کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا۔ بلیر سنگھ نے بات سمجھ لی تھی، اس لیے ایک دم سے ہنس دیا۔ کچھ دیر غور کرنے پر ویر سنگھ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ اصل میں یہ پورے علاقے میں اپنی طاقت کا اظہار تھا۔

”پھر تو پتہ نہیں لگتا چاہئے، دن کتنا رہ گیا ہے، کل کی تیاری میں کچھ وقت تو چاہئے نا۔“ ویر سنگھ بے چین ہوتے ہوئے بولا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ بلیر سنگھ بیچ بھی اٹھ گیا۔ ان کے جانے کے بعد کجیت کور نے رونیت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”معاف کرنا پڑے، تو پہلی بار ہمارے گھر آئی اور پہلی بار تمہیں اس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔“

”اوہ بے بے جی، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دھیمے سے بولی۔ ”روز کا یہی کام ہے۔“ اس پر سبھی ہنس دیے۔

”چل رونیت، تمہیں ڈریس دوں اور تو فریش ہو کر کہن لے۔“ ہر پریت اُسے اپنے کمرے کی جانب لے جاتے ہوئے بولی تو جہاں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ کافی حد تک خوشگوار تھا۔

جہاں، ہر پریت، انوجیت اور رونیت، چاروں شام ہونے تک چھت پر کھلی فضا میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کسی بات کا سرا شروع ہوتا تو وہ پھیلتا جاتا۔ ہوتی ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لائی رہی۔ اس وقت سورج ڈوبنے کو تھا، جب جہاں کے سیل فون پر کال آگئی۔

”کون ہے جہاں؟“ ہر پریت نے پوچھا۔

”تم شاید اسے نہیں جانتی، یہ باغیا کور ہے۔ اس سے پوچھ لو۔“ اس نے رونیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کال پک کر لی۔

”اوہ شکر ہے تم نے کال پک کر لی۔“ باغیا کور نے تیزی سے کہا۔ اس کا لہجہ نارمل نہیں تھا

”خیر تو ہے باغیا؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”اوئے خیر تو نہیں ہے۔ کہاں ہے ٹو؟“ اس نے اسی لہجے میں پوچھا۔

”میں اوگی میں ہوں۔ اپنے گھر۔“ اس نے جوابا کہا۔

”دیکھ، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تو اپنے گاؤں سے دور ہو جا، اس طرح وہاں سے جانا ہے کہ گھر والوں کو کوئی پوچھنا تاجھ میں تنگ نہ کرے۔ سکون سے سنا، تمہارے بارے میں ”را“ والوں نے فائل کھول لی ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے۔ وہ چاہے حقیقت ہے یا فرضی۔ تمہیں پھنسانے کے لیے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تمہارے گھر پر چھاپہ مارنے والے ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھے ہی بتانے میں دیر ہوگئی ہو۔“ اس نے تیزی سے تفصیل بتائی۔

”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

”میں تمہیں سب سمجھا دوں گی، تمہیں نکلنے میں بھی وقت لگ سکتا ہے، وہ تیرے گھر کی دہلیز تک پہنچ گئے ہوں گے یا پہنچنے والے ہوں گے۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیسے پتہ؟ اور میرے بارے میں.....“ جہاں نے پوچھنا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”بکواس بند کرو اور نکلو۔ میں جالندھر آ رہی ہوں۔ سب کچھ سمجھا دوں گی۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا

”کیا کہہ رہی تھی۔“ رونیت نے پوچھا تو اس نے میزبھیوں کی جانب بڑھتے ہوئے ایک منٹ میں ساری بات کہہ دی۔

”یہ کیا ہوا؟“ ہر پریت نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھا تو رونیت بھی ان کے پیچھے جاتے ہوئے بے چین ہو کر بولی۔

”ہم نکلے ہیں جہاں۔“

”اوکے، نکلو۔“ جہاں نے کہا اور پھرتی سے میزبھیاں اترتا چلا گیا۔ وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ جہاں باہر کی جانب بڑھنے لگا۔ بھی ہر پریت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سب اچانک، ایسا کیا ہو گیا؟“

”میں تمہیں سب تفصیل سے فون پر بتاؤں گا۔ باغیا کور غلط نہیں کہہ سکتی، ضرور کچھ ہوگا۔“ اس نے ہر پریت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”یہاں کا کون خیال کرے گا،؟ بولو، بتاؤ مجھے۔“ یہ کہہ کر اس نے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سنو چاہے کچھ بھی ہو جائے، سردار ویر سنگھ کے ساتھ گرد و دارہ سیوا کی ریلی میں ضرور شامل ہوتا ہے۔ وہ بہت ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ہر پریت ایک دم سے مانتے ہوئے بولی اور پھر ایک طرف ہٹ گئی۔ جہاں نے اسے یوں ایلھا جیسے ہر پریت کو اپنے دل میں اتار رہا ہو۔ چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد وہ پلٹ کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے انوجیت بڑھا اور پھر پورچ میں رک کر فون کرنے لگا۔ جہاں اور رونیت پورچ میں کھڑی کار میں بیٹھے اور اگلے چند لمحوں میں وہ کوشی سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ابھی وہ اوگی پنڈ اور جالندھر شہر کے درمیان تھے، اسی وقت جہاں کا فون بج اٹھا۔ انوجیت کی کال تھی۔

”باغیا کور کی بات ٹھیک ثابت ہوئی ہے، تمہارے جانے کے یہی کوئی چار پانچ منٹ بعد دو لوگ آئے تھے۔

”اوہ دوسری بی آئی کے بتا رہے تھے۔ انہوں نے تمہارا ہی پوچھا تھا۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”بھی کہ اس سے طوائفیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے جالندھر چلا گیا ہے۔ اس نے فون نمبر مانگا ہے تو میں نے دے دیا۔ کیا اس نے بات کی؟“

”ابھی تک تو نہیں کی، لگتا ہے،“ وہ جالندھر میں داخل ہوتے وقت ہی مجھ سے ملنا چاہتے ہوں گے۔ خیر کوئی اور بات؟“ جہاں نے پوچھا۔

”اور بات تو کوئی نہیں ہے، تمہارے بارے میں اوٹ پٹانگ سوال کرتے رہے۔ میں نے بلیئر سنگھ بچ کو کال کر دی تھی، وہ آگئے۔ پھر انہوں نے اتنی بات نہیں کی اور چلے گئے۔“

”ٹھیک ہے اپنا اور سب کا خیال رکھنا، سردار ویر سنگھ سے رابطہ ضرور رہے تمہارا، بلکہ اسے بتا دو۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جہاں نے فون بند کر دیا اور ساری بات رونیت کو بتا دی۔ وہ تشریف سے بولی۔

”یار معاملہ کیا ہو گیا ہے؟ اس کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ میں سندو سے رابطہ کرتی ہوں۔ اسے بتا دوں۔“

جس وقت وہ جالندھر کے قریب پہنچے، اس وقت تک نہ صرف سندو سے رابطہ ہو چکا تھا، بلکہ وہ باغیتا کور کے ساتھ رابطے میں بھی تھے۔ اسے بھی اولیٰ میں سی بی آئی کے بندوں کے آنے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔

باغیتا کور نے اسے شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس کا پتہ بتایا اور اسے وہیں پہنچنے کو کہہ دیا۔

وہ فارم ہاؤس جالندھر شہر سے مشرق کی جانب جی ٹی روڈ پر ذرا ہٹ کر کوٹ کلاں میں تھا۔ جس وقت تک وہ پہنچے، سندو وہاں آچکا تھا۔ فارم ہاؤس کا منیجر ایک لمبا چوڑا بھاری جسم کا سکھ نوجوان تھا۔ وہی سب دیکھ رہا تھا۔

سندو ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا، جب جہاں اور رونیت وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی سندو نے پوچھا۔

”یار جہاں، یہ سب اچانک کیا ہو گیا ہے؟“

”مجھے خود نہیں معلوم، باغیتا نے یہ سب بھگدڑ مچا دی ہے، وہ آئے گی تو پتہ چلے گا۔“ یہ کہتے ہوئے جہاں صوفے پر بیٹھ گیا اور اسے بھی سی بی آئی کے بندوں کے بارے میں بتا دیا۔

”باقی سب ٹھیک ہے نا۔“ رونیت نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں، سب ٹھیک ہے، وہ پروفیسر کی بیوی کو اس کے آبائی گاؤں بھیج دیا ہے، وہاں اس کا کوئی بھتیجا اب بھی ہے، ہر پال گیا ہے اسے چھوڑنے۔“ سندو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیوں، ہم اسے سنبھال سکتے تھے۔“ رونیت بولی۔

”اچھا کیا، ورنہ اس کی بھی زندگی کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ خیر جب تک باغیتا آتی ہے، کوئی چائے وائے ہی پی لی جائے۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت ہم چائے پی چکے تھے، جب باغیتا کور آمدی اور طوفان کی طرح وہاں آگئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”جہاں، سندو، اس وقت ہم بہت زیادہ خطرے میں ہیں۔ جس کا تم لوگوں کو اندازہ نہیں۔“

”کچھ بتاؤ گی بھی یا.....“ سندو نے چڑتے ہوئے کہا تو باغیتا نے اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ، میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“

ہم تینوں ایک بیڈ روم میں چلے گئے۔ اس نے ایک یو ایس بی نکالی اور سامنے پڑے ہوئے ڈی وی ڈی میں لگا دی۔ ٹی وی اسکرین روشن ہوگئی۔

وہ کسی کانفرنس ہال میں ہونے والی بات چیت کی ویڈیو تھی۔ وہاں چند آدمی ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے

سامنے ایک اسکرین تھی۔ جس پر باغیتا کور کی تصویر تھی۔ کوئی اس کے بارے میں بریف کر رہا تھا

”سرا یہ ہے باغیتا کور، جس کا تعلق تو امرتسر سے ہے، لیکن یہ یہاں ممبئی میں پائی جا رہی ہے۔ یہ حیرت کی بات نہیں کہ یہ ممبئی میں کیوں ہے۔ اس کا ماضی ایسا ہی ہے کہ یہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پکڑی نہیں گئی۔ حیرت یہ ہے کہ زمین ہاؤس میں اس کا ہونا اور اس پاکستانی کے ساتھ۔ یہ

دیکھیں۔“ یہ کہہ کر اس کی مختلف تصویریں دکھائی جانے لگیں۔ یہ سب زمین ہاؤس میں لگے خفیہ کیمروں سے لی گئی تھیں۔ لفٹ میں، ڈیوڈ ریسنز کے کمرے کے باہر، ان کے کنٹرول روم میں۔ کوئی کہہ رہا تھا

”یہ سوال اپنی جگہ، یہ تو اسے پکڑ کر ہی پوچھا جاسکتا ہے تاکہ وہاں پر کیا کر رہی تھی۔ کیونکہ اسی پاکستانی کے ساتھ یہ مختلف جگہوں پر دیکھی گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے، اسے پکڑو۔ مزید کیا ہے؟“ کسی نے رعب دار آواز میں حکم دیتے ہوئے پوچھا۔

”مزید یہ ہے سر کہ جس وقت زمین ہاؤس پر حملہ ہوا، اس سے کچھ ہی دیر پہلے رامیش پانڈے پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔ اس کا ایک گارڈ مارا جاتا ہے۔ رامیش پانڈے سے کچھ سوال پوچھے جاتے ہیں۔ ان

میں ایک فون نمبر بھی پوچھا جاتا ہے جو کہ زمین ہاؤس ہی کا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی وہاں حملہ ہو جاتا ہے۔ مطلب رامیش پانڈے پر قاتلانہ حملہ اور زمین ہاؤس پر حملہ ایک ہی سلسلے کی کڑی ہے۔ کیونکہ وہاں سے ہمیں کچھ مزید شواہد ملے ہیں۔“

”وہ کیا ہیں؟“ اس رعب دار آواز والے نے پوچھا۔

”سر یہ دیکھیں، یہ تصویر، اس میں ایک لڑکا ہے اور یہ ایک لڑکی، یہ گوا کے ہوٹل سے لی گئی تصویر ہے۔ جہاں میں سے یہ پتہ چلا ہے کہ فائرنگ ان دونوں نے کی ہے۔ جس کمرے سے کی گئی، وہاں موجود جوڑے نے ان کی تصدیق کی ہے، انہوں نے اس جوڑے کو باندھا اور بے ہوش کر کے بیڈ کے نیچے ڈالا۔“

”ان کے بارے میں پتہ چلا۔“ رعب دار آواز میں پوچھا گیا تو بریف کرنے والے نے کہا۔

”یہ لڑکی تو چند ہی گڑھ کی ہے۔ اس کے بارے میں شک ہے کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کے ساتھ اس کا تعلق تھا، چند دن پہلے وہ پروفیسر قتل ہو گیا ہے۔ ریکارڈ برکسی کا کوئی جرم نہیں اور یہ لڑکا، اس کا نام

مہال سنگھ ہے۔ اگرچہ یہ کینیڈا سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہاں اوگی پنڈت تحصیل کدور ضلع جالندھر میں رہتا ہے۔ پولیس اور سی بی آئی کے مطابق جب سے یہاں آیا ہے اس کی سرگرمیاں مشکوک ہیں، ایک معاہدہ بھی آن ریکارڈ ہے۔ جن کے ساتھ معاہدہ ہوا، وہ لوگ قتل ہو گئے۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ ہوا، یہ سب فائل میں ہے، جو

آپ کے سامنے پڑی ہے۔“

”سرا ایک دوسری بری خبر یہ ہے کہ جس آفیسر کو اس پروفیسر کو راستے سے ہٹانے کا ٹاسک دیا گیا تھا، وہ ابھی لکھ دیر پہلے گھر سے نکلنے ہوئے دہشت گردوں کے ہاتھوں اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس کی پوری تفصیل آگئی ہے ہمارے پاس۔“

”اوہ!“ یہ کہہ کر چند لمحوں کی خاموشی رہی پھر اس رعب دار آواز والے نے کہا۔

”اسے بھی پکڑو اور پوری طرح دیکھو، یہ سب مختلف جگہوں کے لوگ ایک جگہ کیسے؟ اور ان کا ہدف زمین ہاؤس ہی کیوں؟ پاکستان سے ان کا تعلق کیا ہے۔ یہ سب مجھے آج رات سے پہلے چاہئے۔ ہری اپ۔“ اس کے ساتھ ہی وہ فلم ختم ہوگئی۔

”اچھا چور وہ ہوتا ہے جو نکلنے کا راستہ پہلے بنا کر رکھے۔ اگر ہم اپنے چور راستے ان فورسز میں بنا کر نہ رکھیں تو کب کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے گل سڑ گئے ہوتے۔ یہ ہائی پروفائل میٹنگ تھی دہلی میں۔ جواب سے پانچ گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔ اطلاع مجھے پہلے ملی اور یہ فلم بعد میں۔ اب بتاؤ، میں، رونیٹ اور تم کیا کریں؟“

”کچھ بھی نہیں، بس چند دن زیر زمین رہو، دھول بیٹھ جائے تو باہر نکل آئیں۔“ سندو نے سکون سے کہا۔

”کوئی دوسرا ہوتو مجھے تمہاری اس احمقانہ بات پر اتنا افسوس نہ ہوتا، بے وقوف بھارت سرکار اس بے غیرت یہودی کے بارے میں کس قدر پریشان ہے تم نے اس کا اندازہ نہیں کیا۔ کس طرح انہوں نے چھان بین کی ہے اور وہ جان گئے ہیں کہ یہ سب کن لوگوں نے کیا ہے؟“

”اس وقت میں تمہاری ذہنی حالت کے بارے میں جانتا ہوں بانیتا، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ سندو نے کافی حد تک خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس اس کا ایک حل ہے۔“ جہاں نے سکون سے کہا۔

”وہ کیا؟“ بانیتا کو رنے تیزی سے پوچھا۔

”وہ یہ کہ میں خود کو پولیس یا جو فورس بھی مجھے پکڑنا چاہے، اس کے حوالے کر دوں، تشدد ہوگا جو بھی ہو، میں یہ ثابت کر دوں گا کہ میں وہاں گوا میں نہیں تھا۔“ جہاں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم کسی یورپ کی فلم والی فورسز کے پاس نہیں جا رہے ہو، جو تمہیں مہمان بنا کر رکھے گی۔ تیرا ریشہ ریشہ الگ کر کے تجھے مار دیں گے اور تمہاری لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔“ رونیٹ نے غصے میں کہا۔

”تو پھر کیا کریں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہی جو میں نے کہا ہے۔ آج رات یہاں سکون سے رہو، کھاتے پیتے ہیں، انجوائے کرتے ہیں۔ اس دوران سوچ لیں گے۔“ سندو نے کہا تو بانیتا کو ایک دم سے مسکرا دی۔ پھر بولی۔

”ہاں یار ٹینشن سے مسئلہ حل تو نہیں ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے مینیجر کو بلایا اسے کافی کچھ ہدایات دے دیں۔ وہ سب اٹھے اور مختلف کمروں میں جا کر سو گئے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا، جب انہیں جگایا گیا۔

ڈنر بہت خوشگوار ماحول میں لیا گیا۔ اس کے بعد بانیتا کو رنے تینوں کو بتایا۔

”دہلی کی آپ ڈیٹ یہ ہے کہ انہیں نہ تو بانیتا کو رٹی ہے امرتسر میں، وہ ممبئی ہی سے واپس نہیں آئی۔ نہ ہی رونیٹ چند ہی گڑھ میں ملی، آخری بار اسے پروفیسر کے اتم سنسکار پر دیکھا گیا تھا۔ اب ان کا کوئی بندہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جہاں آخری مرتبہ اوگی اور جالندھر کے درمیان دیکھا گیا ہے کسی لڑکی کے ساتھ۔ وہ چشم دید اوگی گاؤں ہی کا آدمی ہے۔ لہذا اب سارا زور جالندھر میں جہاں کو تلاش کرنے میں لگایا جائے گا اور وہ سب اس مقصد کے لیے نکل پڑے ہیں۔“

”ایک منٹ ایک منٹ.....“ رونیٹ نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یار جہاں، تیرا سیل فون نمبر انہوں نے لیا، اب تک اس کی مدد سے وہ یہاں تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے تمہیں کال کی ہے۔ یہ کیا بات ہے؟“

”انوجیت نے جو سیل نمبر دیا ہے، وہ نمبر کے ایک ڈیرے پر پڑا ہے۔ اسے کوئی نہیں سنتا۔ یہ اگر وہاں پہنچے تو سوائے سیل فون کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ انوجیت پاگل نہیں ہے۔“

”یہی کہ آج رات اس بندے کو ختم کرنا ہے، جس نے میری دہلی ہوئی نیم مردہ فائل میں دوبارہ جان ڈالی ہے اور وہ ہے مان سنگھ۔ ابھی کچھ دیر پہلے انوجیت نے مجھے بتایا کہ میری خبر دینے والا وہی ہے۔“

”چل یار کئی دن ہو گئے، کچھ کیا نہیں۔“ سندو نے انگڑائی لے کر کہا تو بانیتا کو رنس دی۔

”مزہ آگیا یار، مجھے ایسے ہی حوصلے والے بندے چاہئے تھے۔ چل یہ جہاں کا اک چھوٹا سا کام کریں، پھر تم لوگوں کو ایک بڑے کام پر لگاتی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ رونیٹ نے پوچھا۔

”وہ آکر بتاتی ہوں، پہلے یہ بیگار بھگت لیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ زوردار انداز میں ہنس دی۔

تقریباً رات کے دس بجے کا وقت ہوگا، جب وہ فارم ہاؤس سے نکلے۔ جہاں نے انوجیت سے کہہ کر بندے لگا دیئے تھے۔ بہت محتاط ہو کر وہ وہاں پہنچے تو ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ مان سنگھ نے اپنی حویلی اوگی پنڈ کے باہر اپنی زمینوں میں بنائی ہوئی تھی۔ حویلی سے کافی دور انہوں نے اپنی فورسز جیل جیب روک دی۔ وہ چاروں ہی تھے۔

جہاں کا رابطہ وہاں کے ایک لڑکے سے تھا، جو ساری خبر دے رہا تھا۔ اس وقت وہاں پر صبح ہونے والی گرو دوارہ سیواریلی روکنے کی بات ہو رہی تھی۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے روکا جائے۔ سیکورٹی والے تھوڑے

بندے تھے جن کی پوزیشن کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے اچھی طرح پوچھا تھا کہ چھت پر سیکورٹی گاڑا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب اسے یہی ملا تھا کہ ہوتے ہیں مگر اس وقت نہیں ہیں، وہ رات دیر سے چھت پر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ پکا معلوم ہو گیا تھا کہ وہاں چوکی کا تھانیدار، وہی سی بی آئی کے

دو بندے اور اوگی کے وہ لوگ تھے، جو اب بھی رویندر سنگھ کے وفادار تھے اور اب مان سنگھ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رتب نے اسے بہت بڑا موقعہ دے دیا ہے۔

وہ چاروں جیسے ہی حویلی کے گیٹ پر گئے، وہاں سیکورٹی پر لگے ہوئے دو بندوں نے انہیں آگے جانے سے روکا۔ سندو نے بنا کوئی لفظ کہے فائر کر دیا۔ پستل پر سائیلنسر لگا ہوا تھا، ٹھک کی آواز آئی اور سیکورٹی گارڈ گرنا

چلا گیا، سندو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کہ اس کی چیخ نہ نکلے۔ اس سے پہلے کہ دوسرے کو سمجھ آتی، جہاں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے سینے میں بھی فائر دے ہارا، اس کے گلے سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ ان دونوں کو ایک

طرف لگا کر وہ آگے بڑھے، تب تک رونیٹ اور بانیتا آگے جا چکی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مان سنگھ بہت

سارے لوگوں کے درمیان سائیڈ والے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں آگے بڑھیں اور ذرا فاصلے سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو تاکنے لگیں۔ انہیں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے مان سنگھ کون ہے، لیکن انہیں یہ

اندازہ ہو گیا تھا کہ سی بی آئی والے کون ہو سکتے ہیں یا ان میں پولیس والا کون ہے۔ اس لان میں سی بی آئی

والے دور ہی سے پہچانے جا رہے تھے۔ ان تینوں نے سفید سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ رونیٹ نے اپنی

طرف سے پولیس والے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اسی لمحے جہاں وہیں آ پہنچا، اب اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

اس نے مان سنگھ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دو چار لمحوں کی دیری سے ان دونوں کی چیخ بلند ہوئی۔ تبھی ان چاروں

نے پھیل کر فائرنگ شروع کر دی۔ سامنے بھگدڑ چچ پھیلتی تھی لیکن جو بھی ان کی ریش میں آتا، گولی اس کے لگ

جاتی۔ دو منٹ کے دوران اسے سامنے لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ دور کہیں سیکورٹی والے بے آواز فائرنگ سے

نہیں بلکہ چیخ و پکار پر متوجہ ہوئے تھے۔ تبھی بانیتا کو رنے کہا۔

”نکلو“ یہ کہہ کر وہ پیچھے پلٹنے لگی۔ رویت اس کے کور پر تھی۔ اسی لمحے جہاں لان کی جانب بڑھ گیا۔ وہ تیزی سے ان سفاری سوٹ والوں کے پاس گیا، ان کی جیبیں ٹٹولیں، ان میں سیل فون ملے، وہ لے کر فوراً ہی پلٹ پڑا۔ سندو اس کے کور پر تھا۔ اسی طرح سندو اور جہاں پیچھے ہٹے۔ ان کی راہ میں کوئی نہیں آیا۔ شاید اتنی لاشیں دیکھ کر ان کا حوصلہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پوری قوت سے بھاگتے ہوئے وہاں تک آئے جہاں ان کی فور وہیل کھڑی تھی۔ جہاں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگلے چند منٹوں میں وہ جاندھر جانے والی سڑک پر تھے۔ وہ شہر کے قریب پہنچنے والے تھے۔ یہی سی بی آئی والوں کا ایک سیل بج اٹھا۔ سندو نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے کسی نے انگریزی میں تیزی سے پوچھا۔

”ہیلو، نریش، کیسے ہو تم اور یہ خبر کیا ہے کہ.....“

”کون بات کر رہا ہے۔“ سندو نے کسی فلم کے ولن کے انداز میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”تیرا باپ بات کرت ہوں، بھڑوی کے۔ جسے تو نے پھون لگایا ہے، اس کا بڑے افسر سے بات کرا۔“

”کیا مطلب۔!“ دوسری طرف سے حیرانگی میں پوچھا گیا

”ابے بھڑوی کے، تجھے سمجھ نا ہی آوت ہے، بولا کسی افسر سے بات کرا۔“ اس نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی

”میں ہی اس کا آفسر بات کر رہا ہوں۔“

”تو پھر سن تیرا وہ ملاجم ترنت دنیا چھوڑ گیا ہے، میں نے اس کے سینے ماگولی اتاری۔ کدھر بھلا بولو۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو، کون ہو تم؟“

”اماں بتایا تو ہے تیرا باپ۔ بولو کہاں گولی لگی؟“

”تو نے اسے مار دیا ہے لیکن اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا تو فون جہاں نے لیتے ہوئے کہا۔

”دیکھ، تو کوئی بھی ہے، تجھے ہماری لوکیشن کا پتہ تو چل ہی جائے گا۔ لیکن جس کے لیے یہ لوگ اس گاؤں میں آئے تھے، اسے پکڑنے کے لیے پرائم منسٹر یا کم از کم چیف منسٹر سے پوچھا ہوتا۔ وہ تو اب پتہ نہیں کہاں ہے، لیکن اس کا پیغام اپنے سارے لوگوں کو دے دو۔ جس نے بھی اس بندے کو یا اس سے متعلق کسی بندے کو بھی پکڑنے یا ہاتھ بھی لگانے بلکہ برا سوچنے کی بھی کوشش کی، وہ سمجھو اپنی موت پر مہر لگا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر دوسری طرف سے کچھ بھی سننے بغیر اس نے فون بند کیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

”پیغام تو دے دیا، اب یہ دوسرا بھی پھینک دوں۔“ سندو نے پوچھا۔

”نہیں اس پر ابھی بھی کال آئے گی۔ یہی کہنا، بلکہ رویت تم کہنا۔“ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس فون پر بھی کال آگئی۔ رویت نے ایسا ہی پیغام دیا اور فون باہر پھینک دیا۔ انہوں نے طویل سانس لی اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔

واپس فارم ہاؤس تک آتے ہوئے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ فور وہیل گیراج میں لکوانے کے بعد ہی بائیا کور سکون سے اندر چلی گئی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان سب کے سامنے یہی سوال ہوگا کہ اب کیا کرنا ہے؟

وہ ایک روشن صبح تھی۔ لاہور پر سورج چمک رہا تھا جب میں اور نوتن کور ہوٹل کے باہر پورچ میں کھڑی کار تک آگئے۔ وہیں سے واپس کے لیے نکلتا تھا۔ کار میں بیٹھنے ہی نوتن نے کہا۔

”جس طرح کوئی سکھ امرتسر آئے اور وہ دربار صاحب نہ ہو کر جائے، اسی طرح جو لاہور آئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مڑھی نہ جائے تو عجیب سا لگتا ہے۔“

”تم وہاں جانا چاہتی ہو، تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ پھر پتہ نہیں لاہور دوبارہ آج بھی سکون یا نہیں۔“ اس نے کہا تو ڈرائیور نے کار دائیں طرف کی بجائے بائیں جانب موڑ لی۔ وہ صبح کا وقت تھا، جب ہم مال روڈ سے جا رہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم مینار پاکستان کے سامنے جاؤ۔ میں بھی پہلی بار وہاں گیا تھا۔ ہم روڈ پر ہی تھے۔ رنجیت سنگھ کی مڑھی کی جانب مڑتے ہی آگے کوئی رکاوٹ تھی۔ ڈرائیور کو کار روکنا پڑی۔ میں وہیں اتر گیا تو نوتن کور نے کار میں سے باہر جھانک کر حیرت سے پوچھا۔

”کیا ہوا، یوں کار کیوں.....“

میں نے پوری شان سے کھڑے مینار پاکستان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم چلو، میں آتا ہوں۔“

وہ آگے بڑھ گئے اور میں مینار پاکستان کو دیکھنے لگا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ اس وقت میرے دل میں کیسے جذبات تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پاکستان کا نام لیے بغیر اس کی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ میں نے چشم تصور سے اس مجمع کا ادراک کرنا چاہا تو ایک دم سے سارے منظر ہٹ گئے۔ حال میرے سامنے نہیں رہا، بلکہ وہ پارک لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہی ۱۹۴۰ء کا منظر میرے سامنے تھا۔ ملی جذبے سے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ دور اسٹیج پر قائد اعظم محمد علی جناح تقریر کر رہے تھے۔ ان کی آواز پنڈال میں گونج رہی تھی۔ ایک روشنی اور نور کا ہالہ ان کے ارد گرد تھا۔ میرے دل میں آیا کہ یقیناً افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے، یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے۔ وہ روشنی کا ہالہ پورے مجمعے کے لوگوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس روشنی کے منبع کو دیکھنا چاہا تو وہ میری پشت پر سے آ رہا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ روشنی کا ہالہ بادشاہی مسجد کے سامنے ایک مزار میں نہیں گم ہو رہا تھا۔ درمیان کی ساری رکاوٹیں ختم تھیں۔ وہ روشنی اسی مزار سے پھوٹ رہی تھی۔ قائد اعظم کی تقریر جاری تھی کہ ماضی کا وہ منظر تحلیل ہو گیا اور حال کے سارے منظر جاگ اٹھے۔ میرا تجسس بیدار ہو گیا۔ میں پلٹا اور بادشاہی مسجد کی جانب چل پڑا۔ وہاں سڑک پر سے وہ منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راجستے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مڑھی کے سامنے نوتن کور اور ڈرائیور میرے انتظار میں تھے۔

”تم لوگ اندر جاؤ، میں تمہیں یہیں ملوں گا۔“

پتہ نہیں میرے لیے میں کچھ تھا یا کیا تھا کہ نوتن اور نوجوان ڈرائیور نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں ان کی کوئی بات سننے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مجھے وہ مزار دکھائی دینے لگا۔ میں اس جانب بڑھتا چلا گیا۔ وہ مزار شاعر مشرق حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا تھا۔ جنہیں میں قلندر لاہوری کہتا ہوں۔ میں اس مزار کے اندر چلا گیا۔ میں نے پیروں کی جانب کھڑے ہو کر پورے جذب سے فاتحہ پڑھی اور واپسی کے لیے دروازے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک آواز گونجی

میرے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، میرے سامنے حضرت اقبالؒ خود کھڑے میری طرف بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ایک لمحہ کے لیے میرے بدن میں سنسنی پھیلی تاہم مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ میں ایسے منظر دیکھ چکا تھا۔ میں بادل کھڑا ہو گیا۔ بھی ان کی آواز گونجی

”تم آئے نہیں لائے گئے ہو۔ تاکہ تمہیں تمہاری امانت سونپ دی جائے۔“

”حضرت کیسی امانت؟“ میں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو بھی بادل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے اندر کارازی تمہاری امانت ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ میں تمہیں تم پر ہی آشکار کر رہا ہوں۔ تمہارا ہونا ہی سب سے بڑا راز ہے۔ تم اپنا راز خود آپ ہی ہو۔“

”میرا ہونا، میں خود راز ہوں، میں سمجھا نہیں؟“ میں نے ادب سے کہا تو وہ بولے۔

”دیکھو یہ جو تم میرے سامنے ہو، یہ تم ہی ہو یا کوئی دوسرا کھڑا ہوا ہے؟ تم ہو یا تم نہیں ہو؟ دیکھ کون رہا ہے؟“

”جی میں ہی ہوں۔ میں ہی کھڑا ہوں۔ آپ کی بات سن رہا ہوں، آپ کو دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تیرا خود میرے سامنے ہونا، ایک دوسری زندگی کی دلالت کرتا ہے۔ لیکن اس زمین پر انسان کا ہونا خود اس کی دلیل ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ میں بے چارگی سے کہا۔

”کوئی بھی فیصلہ کہاں ہوتا ہے؟ آرزو کہاں پیدا ہوتی ہے، انسان ہی کے اندر نا۔ اس کے خود کے اندر۔ تو سب سے پہلے ”خود“ ہے۔ اپنے خود کے ہونے کا ادراک ہی تو میں چاہتا ہوں۔ سنو، منکر خدا نزد مٹا

کافر است..... منکر خود نزد من کافر تر است۔ اپنے خود ہونے کا احساس ہی انسان کو خودی کی طرف لے کر جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی تکمیل کو دیکھ پاتا ہے۔“ انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری

سنجیدگی سے کہا۔

”خودی، یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے خود کا اقرار کر، اپنے آپ کو دیکھ، خود سے خودی تک کا سفر دراصل حقیقت کی طرف بڑھنے کا عمل ہے۔“

”خود“ ہوگا تو خودی آئے گی۔ خودی کو سمجھنے کے لیے پہلے خود کو سمجھنا ہوگا۔ تیرا اپنا ہونا، تجھے خدا نے اپنا ہونا دیا ہے، تو اپنے ہونے کا اعتراف کر، اس شہکار کا منکر نہ بن۔ اپنے آپ سے دھوکا نہ کر، اپنے آپ پر ظلم نہ کر،

اپنے آپ کا دشمن نہ بن، خود سے خودی کے درمیان جو بڑے بڑے بُت پڑے ہوئے ہیں جو تم نے خود ہی گھڑے ہوئے ہیں۔ انسان کا اصل مقصد ہے کہ وہ خود کو پہچانے۔ اپنے خود کی پہچان ہی دراصل باطل قوتوں کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ باطل ہی ہے جس نے انسان کے گرد ایسے حجاب پیدا کر دیئے ہوئے

ہیں کہ انسان اندھا ہو چکا ہے اور جو ان پردوں کو اٹھا دیتا ہے، حقیقت اس پر کھل جاتی ہے۔ آج دنیا کا ہر انسان نظریاتی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔“ انہوں نے انتہائی جذب سے کہا۔

”یہ سفر کیسے طے ہو سکتا ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو وہ بولے

”خود، اسے خود کھڑا ہونا ہوگا۔ پھر کہیں جا کر اسے خودی کی ثمرات مل سکتے ہیں۔ خود سے خودی تک کے

درمیان راستہ، منازل، اسرار و رموز طے کرانے والی ایک ہی قوت ہے اور وہ ہے عشق۔ کیونکہ جو ہر زندگی ہے

عشق..... جو ہر عشق ہے خودی۔“

”میں کیسے خودی تک پہنچ سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم پر راز آشکار ہو جائیں گے۔ خودی رانگ در آغوش کردن، فنا را با بقا ہم دوش کردن۔ تمہارا جو مسئلہ بھی ہوگا سوچتے جانا، حل تجھے ملے چلے جائیں گے۔ خودی کہیں اور سے نہیں تمہارے اندر ہی پڑی ہے۔ یہ امانت میں نے تم تک پہنچانی ہی تھی کہ عطا ہوا ہے خس و خاشاک ایشیاء مجھ کو..... کہ میرے ہلے میں ہے سرکشی و بے باکی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ میں آگے بڑھا اور ان کی ہاتھوں میں سا گیا۔ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی، جو وہی والے بابا جی سے ملنے سے ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد انہوں نے مجھے خود سے جدا کر دیا۔ پھر وہ میرے سامنے نہیں تھے، مگر میں اپنے وجود میں بہت زیادہ لطافت محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں بہت ہلکا ہو گیا ہوں۔ میں حزار سے باہر نکل آیا۔ روشن دن میں میرے اندر کیا کیا تبدیلی آگئی تھی، یہ میں ہی جانتا تھا۔

میں پیدل ہی تیز قدموں سے شاہی قلعے کی جانب چل پڑا۔ وہ دونوں باہر سڑک پر کھڑے پریشانی میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی انہیں سکون ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم کار میں

بٹلے تو کار چل دی۔ اس کا رخ واپس کی طرف تھا۔

کافی دیر خاموش رہنے کے بعد نون کور نے مجھے بتایا کہ وہ امرتسر اس لیے جاری تھی کہ باغیہ کور ادھر ہے لیکن

اب وہاں کے حالات بدل گئے ہیں۔ وہ اب وہاں پر نہیں ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے یہی بتایا کہ ”را“ اس کے پیچھے لگ گئی ہے اور وہ کل سے غائب ہے۔ اب جا کر پتہ کرتی ہوں کہ تفصیل کیا ہے۔

ہم واپس پہنچ گئے۔ پاکستانی پرچم کے ساتھ ترنگا بھی لہرا رہا تھا۔ یہ محض دو پرچم نہیں دو نظریات لہرا رہے

تھے۔ یہ انسانی سوچ ہی ہے جس نے درمیان میں گیٹ، تاریں اور راہداریاں بنائیں ہوئی تھیں۔ انسانی سوچ کا، عمل میں اظہار ہی حقیقت ہے۔ وہ اس طرف کے تمام مراحل سے گزر کر گیٹ تک آن پہنچی۔ اس نے اپنے

گلاسز اتارے۔ مجھے دیکھا اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ واپس آ گیا۔ میں نے ڈرائیور

سے کہا کہ وہ مجھے سوئی کے گھر چھوڑ دے۔ وہاں موجود ملازمین میں نے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سردار احمد

عرف دارا میرا بابت دستاویزی تھا، جو بچپن ہی سے میرا وفا دار تھا۔ قسمت نے اسے لڑکپن ہی میں نورنگر سے نکلنے پر

مہمور کر دیا تھا۔ وہ لاہور کے مختلف ہوٹلوں میں ویٹر رہا، پھر کئی کام کرتے کرتے وہ اب ہیرابن گیا تھا۔ میں نے

وہ گھر اس کے سپرد کر دیا تھا۔ لاہور میں میرے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔

☆.....☆.....☆

سندو، باغیہا، جہاں اور رویت چاروں آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ موجودہ حالات کے بارے میں ایک

ایک بات کر چکے تھے۔ سبھی سندو نے پوچھا۔

”یہ تو طے ہے کہ اب سبھی ہماری جان کے درپے ہیں، اب یہ ہم پر ہے کہ سسک سسک کر مریں یا ایک دم

مر جائیں۔“

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے سندو، ایک دم سے حوصلہ چھوڑ گئے ہو۔ یارا اگر ہم مریں گے بھی تو کم از کم بہت سوں

کو لے کر مریں گے۔“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”سنو میری بات سنو۔“ باغیہا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں متوجہ کرتے ہوئے کہا، پھر لمحہ بھر تک کر بولی۔

”مجھے یہ پوری طرح احساس ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ رات ہی سے میرے دماغ میں یہی

سوال تھا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ جان لو کہ ہم نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں ڈالا بلکہ ہم سانپوں کی بستی

میں ہیں۔ کوئی بھی اور کہیں سے بھی سانپ ڈنگ مار سکتا ہے۔ کون کتنا زہر رکھتا ہے، ہمیں نہیں معلوم کیونکہ.....“

”شاعری مت کر۔ سیدھی لائین پر آ۔“ رونیت نے چڑتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔ تو سنو، یہ پنجاب ہے، یہاں خالصہ کا جتنا زور ہے، وہاں اتنی ہی منافقت ہے۔ ابھی ہمیں طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک مرکز پر اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ بہت سارے لوگ ہیں۔ ہمیں طاقت حاصل کرنا ہے اس وقت ہمیں وہ جگہ چاہئے کہاں ہمیں کچھ وقت کے لیے سکون اور طاقت مل سکے۔ میرے خیال میں وہ جگہ ممبئی سے بہتر کوئی نہیں ہے۔“ باغیتا کو رنے تمنا تے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

”یار وہ جگہ تو.....“ رونیت نے کہنا چاہا تو حسیال بولا۔

”باغیتا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بندہ بھیڑی میں گم ہوتا ہے۔“

”ممبئی ہی کیوں؟“ رونیت کو راہی جگہ انگ گئی۔

”وہ اس لیے کہ سندو ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ یہ جزیرے سے جمال کے ساتھ بھاگا، اس کے ساتھ گم ہوا، تو تب سے گم ہے۔ ان کے خیال میں یہ انہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ممبئی پہنچنے کے بعد یہ ان سے ٹھکڑ گیا تھا۔ یہ اپنا بزنس وہاں سیٹ کرے۔ جیسا کہ چند گڑھ میں کرتا تھا۔ اور جو، اب یہ چند گڑھ میں نہیں کر سکتا۔ یہ تم لوگ جانتے ہو۔ وہ لوگ جو سامنے نہیں ہیں، سندو کے ساتھ وہاں جڑ جائیں گے۔ یہ دنوں اور ہفتوں میں اپنے آپ کو مضبوط کرے گا۔ ہم باقی تین بچتے ہیں، ہم چھپ سکتے ہیں اور آزاد حالت میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

”ڈن ہو گیا۔“ رونیت کو رنے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اب سب سے بڑا مسئلہ یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اپنے سارے لوگوں سے کہو وہ ایک ایک کر کے یہاں سے نکل پڑیں اور ممبئی پہنچیں۔ سندو تم نکلو اور ان سے پہلے ممبئی پہنچو۔ تمہیں وہاں ایک ڈاکٹر سے ملنا ہے۔ تم وہاں اس وقت سے ایڈمٹ ہو، جب تم جزیرے سے ممبئی آئے۔ تمہیں وہاں ایک ہمدرد انسان چھوڑ گیا تھا تم ایک سڑک پر زندگی اور موت کی کشمکش میں اسے ملے تھے اور وہی تمہارا علاج کروا رہا ہے۔ وہاں ساری کاغذی کارروائی ہو چکی ہے۔ وہاں تمہیں اسپتال ہی میں رہنا ہے۔ وہ ہمدرد انسان تمہیں بزنس کروائے گا۔“

”باغیتا تمہارے ہاتھ دکھانا۔“ حسیال نے شوخی سے کہا تو اس نے حیرت سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کیوں؟“

”دیکھو تو سہی تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔“

اس پر سبھی زیر لب مسکرا دیئے۔ ماحول میں جوتاؤ تھا وہ ایک دم سے ختم ہو گیا۔ باغیتا کو ر کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہوا، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پھر سر جھٹک کر بولی۔

”سندو، تم نکلو، ہماری ملاقات اب ممبئی ہی میں ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر اور اس کے اسپتال کا نام بتایا۔

سندو اٹھا اور اندر کی طرف چل دیا تو وہ بولی۔

”رونیت! اب ہمیں بھی نکلنا ہے۔“

کچھ دیر بعد وہ تینوں ایک سیاہ کار میں سب فارم ہاؤس سے نکلنے چلے گئے۔ ان کے حلیے کافی حد تک بدلے ہوئے تھے۔ تینوں نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ میں انہیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔

انہوں نے جالندھر سے لدھیانہ تک کا سفر بہت احتیاط سے کیا۔ بڑی شاہراہ سے ہٹ کر چھوٹی سڑکوں سے

کل کر ہی لدھیانہ اسٹیشن پہنچے تھے۔ ایک طویل سفر ان کے سامنے تھا، انہوں نے اپنی کار وہیں چھوڑی اور ممبئی جانے کے لیے اسٹیشن پر آ گئے۔ وہیں سے انہوں نے ٹرین پکڑی، حسیال کے سامنے وہ دونوں بیٹھیں ہوئی تھیں۔ وہ تینوں ہی ادھڑ رہے تھے۔ وہ بڑی حد تک خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

ڈرائیور نے مجھے سوئی کے گھر کے سامنے اتارا تو مجھے اتار کر اس نے ڈگی کھولی۔ اس میں سے ایک چھوٹا سوٹ کیس نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔

”یہ آپ کے لیے ہے، اس میں کچھ سامان ہے۔“

میں نے وہ سوٹ کیس لیا اور اسے جانے کے لیے کہہ دیا۔

وہ چلا گیا تو میں نے تیل دی۔ گیٹ کے ساتھ والا چھوٹا دروازہ کھلا تو میرے سامنے چھکا تھا۔ وہ چند لمبے مجھے دیکھتا رہا اور پھر ایک دم سے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ زور رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے الگ کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”چھاکے خیر تو ہے نا؟“

”خیر ہی یار، بس تیرے آنے کی خوشی میں یہ آنسو ہیں۔ تو ملتا ہے تب آنسو، مچھرتا ہے تب بھی آنسو، یار وہ ہمارے خوشی بھرے عام سے دن لوٹ کر واپس کیوں نہیں آ جاتے۔“ اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے سکون کا ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔

”جن لوگوں کے لیے کوئی اعلیٰ مقصد جن لیا جاتا ہے نا، سکون ان کے لیے موت بن جاتی ہے۔“

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو نہیں سمجھے گا، چل اندر چلیں، اماں آئی ہیں؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، انہیں میں ہی لے کر آیا ہوں لیکن سوئی نہیں آئی۔ اس نے کہا تھا کہ میں خود بات کر لوں گی۔“

چھاکے نے کہا اور میرے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

ڈرائنگ روم میں اماں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے سفید براق لباس پہنا ہوا تھا اور ہاتھ میں سیاہ تسبیح تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انھیں اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ نجانے کتنی دیر تک میں مامتا کو محسوس کرتا رہا۔ اماں نے مجھے خود سے الگ کیا اور میرا ہاتھ چومنے کے بعد بولیں۔

”میرے رب کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تیری صورت دکھائی۔ آہیٹھ میرے پاس۔“ وہ صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔ چھاکا اندر کی طرف چلا گیا اور میں نے پناہ سرا اماں کی گود میں رکھتے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

”کیسا ہے تو؟“

”اماں! وہ بچے کیسے ہوتے ہیں جو اپنی ماں سے ٹھکڑ جاتے ہیں۔ ماں سے ٹھکڑنا فطرت کی منشاء تو ہے لیکن ٹھکڑنے کے بعد وہ کہاں جاتا ہے؟ مجھے لگتا ہے میں ٹھیک مقام تک جا پہنچا ہوں۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے چند دن پہلے میں نے ایک خواب دیکھا تھا میرے بچے۔ میں نے دیکھا تو ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے، تیرے ارد گرد سبزہ ہی سبزہ ہے۔ لیکن تیرے سامنے جوادی ہے، اس پر چیلیں، کونے اور لہانے کون کون سی فضائی مخلوق موجود ہے، اور زمینی جانور کتے، بھیڑیے، چیتے، شیر نجانے کون کون سے

درندے اس وادی پر حملہ آور ہیں۔ سب کی رائیں ٹپک رہی ہیں اور تجھے حکم ملتا ہے کہ تو ان سب کو بھگائے۔ تو کبھی آگے دیکھتا ہے اور کبھی پیچھے اور ابھی تذبذب میں کھڑا ہے۔ پھر مجھے ملتا ہے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں، پھر بولیں۔

”میں جب سے دعا مانگ رہی تھی کہ تو میرے پاس آجائے اور تو آگیا۔“

”اماں تیرا خواب سچا ہے۔“ میں نے اماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”سن، میری طرف سے تمہیں ہر طرح کی اجازت ہے۔ اب میری گود سے نکل اور اپنے سچے مقصد کی جانب بڑھ۔ اپنے وطن کی سرحدوں پر ڈٹ جانے والے بھی تو ماؤں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ مائیں اپنے بیٹے وطن پر قربان نہ کریں تو یہ وطن بھی نہ رہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اللہ پاک ان ماؤں کو چھتا ہے جن کے بیٹے اس عظیم مقصد کے لیے چنے جاتے ہیں۔ وہ تو وردی میں ہوتے ہیں اور بغیر وردی میں خاموشی سے شادت پا کر امر ہو جا۔ رب کی مرضی کیا ہے اسے ہی قبول کر۔“ اماں نے انتہائی خوشگوار لہجے میں کہا تو میں نے اماں کے چہرے پر دیکھا، وہاں سکون تھا۔ اماں نے میرا سراپتی گود سے اٹھایا اور بولیں۔

”چل اب کچھ کھا پی لے۔“

”اماں! سوتی کیوں نہیں آئی؟“ میں نے دھیمے سے پوچھا تو وہ بولیں۔

”میں تو تھی ان پڑھ، جیسے سمجھ میں آیا زندگی گذارتی رہی، انتقام کی آگ میں سلکتی رہی، وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ سمجھو، وہ اگر چراغ کی طرح خود جل رہی ہے تا تو اس نے کئی دوسرے چراغ بھی روشن کر دیئے ہیں۔“ اماں نے کہا تو میں سمجھ گیا۔ وجود اور روح کے درمیان جان موجود ہوتی ہے، بھی زندگی چلتی ہے۔ اب روح کون ہے یا وجود کون، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اٹھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

سہ پہر تک باتیں چلتی رہیں۔ نورنگر کے بارے میں ہر ایک کے بارے میں تانی، سارا اور اس کے بیٹے کے بارے میں۔ وہاں کی سیکورٹی کے بارے میں چھاکے نے بتایا تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا۔ سہ پہر کے بعد اماں نورنگر جانے کو تیار ہو گئیں تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اماں اتنی جلدی کیوں؟“

”بیٹا، وہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔ میری مامتا سے زیادہ، تجھے پیغام دینا ضروری تھا۔ میں نے تجھے رب کے حوالے کیا ہے، اب وہی تیرا رکھوالا ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میرا ہاتھ چوما اور جانے کے لیے بڑھ گئیں۔ میں پوریج تک ان کے ساتھ گیا۔ وہ کار میں بیٹھیں اور چل دیں۔ ایک بار تو میرا دل عجیب سا ہوا، پھر مجھے اطمینان سا آتا چلا گیا۔

میں واپس آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہی تھا کہ گیت کی کال آگئی۔

”تم کدھر ہو؟“

”میں لاہور میں ہوں۔“ میں نے جواب دیا

”یہاں بات بہت آگے تک بڑھ گئی ہے۔ سیٹھ نیلا اور اس کے پس پردہ باس ایک طرف ہیں اور اس کے مخالفین ایک طرف کھل کر سامنے آگئے ہیں۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”مطلب وہی کچھ جو تم لوگ چاہ رہے تھے؟“ میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اس سے بھی آگے، تمام تر ڈیٹا حکومتی اداروں اور سیٹھ نیلا کے مخالفین کو دے دیا ہے۔ اب بس چھاپے ہی

پڑنے ہیں لیکن اس سے ایک بہت ہی اہم بات سامنے آئی ہے۔“ اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے بتایا

”وہ کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”سیٹھ نیلا کا جو پس پردہ باس ہے، وہ اس وقت دوئی میں ہے۔ اس کا صرف یہی بزنس نہیں ہے۔ وہ اسلحہ اور مشینات کے دھندے میں بھی ملوث ہے۔ کراچی کے کچھ علاقے اس نے اپنی سلطنت بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن جو بات ہمیں معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ چند غیر ملکی ایجنسیوں کے لوگ موجود ہیں، جنہیں یہ یہاں کے مقامی لوگوں کے ذریعے تحفظ دے رہا ہے۔“ اس نے بتایا

”ظاہر ہے وہ لوگ جرائم پیشہ لوگ ہوں گے۔ خیر، یہ بتاؤ یہ بات کہاں سے اور کیسے معلوم ہوئی؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

”فہیم کے جدید آلات بہت کارآمد ہیں۔ وہ اس باس کی اور مخالفین کی باتیں مسلسل سن رہا ہے۔ مخالفین نے ہمدستی دی ہے کہ اگر وہ باس کوئی نقصان کرے گا تو پھر اس کے لوگ بھی غیر ملکی ایجنٹوں کو اٹھالیں گے۔“

”یہ معلوم ہوا کہ وہ ایجنٹ کون ہیں اور وہ کیا کارروائی کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی یہ پتہ نہیں چلا۔“ گیت نے بتایا

”تو پھر تم لوگوں نے کسی ایجنٹ کو اٹھایا ہے ابھی تک؟“ میں تیزی سے پوچھا۔

”تمہیں ہی بتانا تھا، ہمارا تو ارادہ ہے۔“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”ہاں دیکھو تو سہی وہ کون لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ابھی فہیم اور مہوش لاہور پہنچ رہے ہیں۔ باقی باتیں وہ بتائیں گے۔“ اس نے کہا پھر الوداعی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ پہنچ گئے۔ انہیں وہی ڈرائیور چھوڑ کے گیا تھا جو مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ آتے ہی ایک کمرے میں کھس گئے۔ بظاہر وہ ایک ایسے لڑکے کا کمرہ تھا جسے کمپیوٹر کا جنون ہوتا ہے۔ اس دوران فہیم نے مجھے ہمدان دیا کہ کراچی میں ہونے والی کارروائی میں ہم یہاں بیٹھ کر بھی آڈیو اور ویڈیو آلات کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں۔ جب تک دارا چائے بنا کر لایا۔ انہوں نے اس کمرے کو کنٹرول روم کی صورت دے دی۔ ہم وہیں چائے پیتے ہوئے باقی لوگوں کے رابطے میں آگئے۔ سامنے اسکرین پر زویا، گیت، سلمان، جنید اور اکبر علی دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی اکبر نے کہا۔

”صورت حال بڑی خطرناک ہو گئی ہے۔ سیٹھ نیلا کو اپنا کام ختم ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی اپنے مخالفین کو دھمکیاں بڑھ گئی ہیں۔“

”یہ دھمکیاں ہی دیں گے یا کچھ کریں گے بھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اصل میں ایک تیسری قوت بھی ان میں آگئی ہے۔ جو دونوں کے معاملات حل کروانے کی کوشش میں ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ خود ہی ان میں جنگ کروادیں اور وہ تیسری قوت ہم خود ہی ہیں۔“ اکبر علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر دیر کس بات کی ہے؟“

”بس یہی کہ پہلا وار کس طرف کیا جائے۔ ایک طرف ایک ایجنٹ ہماری نگاہ میں آگیا ہے تو دوسری طرف واہ لعل کالونی میں ایک اڈا، جہاں سے اسلحہ کی ڈیلیوری ہو رہی ہے۔“

”ایجنٹ اٹھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھتا ہوا بولا۔

”ڈن ہو گیا۔“

زویا، سلمان، جنید بھی اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ گیت وہیں رہ گئی۔ زویا اور سلمان ایک کار میں ہو گئے اور اکبر کے ساتھ جنید بیٹھ گیا۔ وہ کاروں میں نکل پڑے۔ اسکرین پر چار منظر دکھائی دینے لگے۔ ان تینوں کے ساتھ ہم بھی وہیں تھے۔

سورج مغرب میں چھپ چکا تھا۔ شہر کی روشنیاں جل اٹھیں تھیں۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے گزری روڈ پر آ گئے۔ ان کا رخ ڈی ایچ سیون کی طرف تھا۔ کچھ دیر ہی میں وہاں پہنچ گئے۔ ایک کار اس کے گھر کے دائیں جانب، دوسری بائیں جانب کھڑی ہو گئی۔ تب گیت تیزی سے کمپیوٹر کے ساتھ منسلک سیل فون پر اسی ایجنٹ کے نمبر پر رابطہ کرنے لگی تھی، جسے اغوا کرنے کے لیے وہ جا رہے تھے۔ اس کمپیوٹر میں ایسا سوفٹ ویئر تھا، جس سے کال کرنے والا اپنا نمبر دینے کی بجائے کوئی بھی نمبر دے سکتا تھا۔ کال سننے والے کو اپنے سیل فون اسکرین پر وہی نمبر دکھائی دے گا، جو کال کرنے والا دینا چاہتا تھا۔ اس لیے یہی سمجھا جاتا تھا کہ کال اسی سیل فون سے آئی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس پر اعتماد کر سکتا تھا۔

”میں دوستی میں موجود پاس والا نمبر دے کر کال کر رہی ہوں۔ غور سے سننا سب، بات کیا ہوتی ہے۔“ سب خاموش ہو گئے۔ بتل جانے لگی۔ چند لمحے بعد دوسری طرف سے پہلو کہا گیا۔ گیت نے کسی تمہید کے بغیر انتہائی سنسنی خیز انداز سے انگریزی میں کہا۔

”سنو تمہاری جان کا خطرہ ہے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً نکلو۔“

”مگر کہاں، مجھے کون مارنا چاہتا ہے اور تم کون ہو؟“ دوسری طرف سے جواب آیا

”وقت ضائع کرنا ہے تو ٹھیک، مری بات سننی ہے تو سن لو۔“ گیت کا لہجہ تھکسا نہ تھا

”اوکے۔“

”باہر نکلو، میں نے تمہاری سیکورٹی کے لیے کچھ بندے بھیجے ہیں۔ یہاں سے ایسے نکلتا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ پتہ چلا ہے کہ تمہاری سیکورٹی سے کچھ بندے دشمن کے ساتھ ہیں۔ صرف ان تک پہنچ جاؤ، باقی وہ سنبھال لیں گے۔“ گیت نے سمجھاتے ہوئے کہا لیکن اس کا لہجہ وہ حکم دینے والا ہی تھا۔

”کیا تم میری پاس سے بات کروا سکتی ہو۔“ اس نے بے اعتماد ہوتے ہوئے کہا۔

”وہ بڑی ہیں، انتظار کرو۔ اتنی دیر میں اگر تم مر گئے تو تمہارے اوپر والوں کو جواب دے دیا جائے گا۔“ گیت نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے پوری اُمید تھی کہ وہ کال بیک کرے گا۔ فہیم نے اس کا نمبر بیک کر لیا تھا۔ اس نے جیسے ہی کال ملائی، وہ سیدھے گیت کے سیل فون پر گئی۔

”بولو۔ اب کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آئی میری کوئی بات؟“ وہ یوں ترش لہجے میں بولی جیسے ابھی کھا جائے گی۔

”نہیں نہیں، میرا مطلب تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ مجھے کن کے ساتھ جانا ہوگا۔“

”نہیں تمہیں اعتماد نہیں اس لیے تم اپنی مرضی کرو۔ یہاں تک کہ دشمن تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دیں کیونکہ وہ اس وقت تمہارے ارد گرد ہیں۔ صرف حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم کیسے ایجنٹ ہو، شہر میں ہونے والی اتنی بڑی واردات کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔ ان کا اگلا قدم ہمارے دوست مارنا ہے۔ اس وقت امیر جنسی ہے اور تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔ گٹ لاسٹ اور یہیں بیٹھ کر مرو۔“

”نہیں نہیں بتاؤ مجھے کیا کرتا ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”اوکے۔ کال سننے ہوئے اسی طرح باہر نکلو۔ تم واک کے لیے نکلے ہو، یہی تاثر دینا۔ وہی دو گارڈ اپنے ساتھ لو جو روزانہ جاتے ہیں۔ کسی کو شک مت ہونے دینا۔ اپنا پسل لے کر نکلو، میں گائیڈ کرتی ہوں۔“

”اوکے میں نکل رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سیکورٹی والوں کو آواز دی۔ انہیں ساتھ لیا اور باہر کی جانب چل دیئے۔ ”میں گیت سے باہر آ گیا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اسکرین پر جنید اور سلمان نے اشارے سے سمجھا دیا کہ وہ باہر نکل آیا ہے۔ وہ زویا اور سلمان کی جانب چل پڑا تھا۔ جو دائیں جانب کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”اوکے، سو قدم پر جا کر ان سے پیچھے ہو جاؤ، جیسے ہی یہ دونوں گارڈ ختم ہوں، تم سامنے کھڑی کار میں جا کر بیٹھ جاؤ، ہری اپ۔“

سو قدم ہوتے ہی ایک بارگی دو فائر نکلے، اس کے ساتھ ہی دو چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ ایجنٹ سیدھا زویا اور سلمان والی کار میں پھنسی نشست پر جا بیٹھا۔ وہ اسکرین پر دکھائی دینے لگا تھا۔ مجھے وہ شکل ہی سے بھارتی لگا تھا۔ اس کا فون چل رہا تھا جو اس نے کان سے لگایا ہوا تھا۔

”ہری اپ جنٹل مین۔“ زویا بولی اور اس کے ساتھ ہی کار چل دی۔ ذرا دور جانے کے بعد گیت نے کہا۔

”دیکھو کہیں تعاقب تو نہیں ہو رہا؟“

”ایک سیاہ کار ڈکار آ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”دونٹ وری، یہ ہمارے لوگ ہیں۔ یہ لوگ مجھے بتا دیں گے۔ وٹ پو گڈ لک۔“ جیسے ہی اس نے کہا فون بند ہو گیا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر سلمان اور زویا کو دیکھا۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر گھوم کر سیدھے واپس گھر آ گئے۔ انہوں نے پورچ میں کاریں کھڑی کیں اسے یوں لیا جیسے اس کی پوری حفاظت کر رہے ہوں۔ وہ ایک کمرے کی جانب بڑھ گئے اور اسے صوفے پر بٹھادیا۔ اس دوران اکبر نے اس کا پسل نکال لیا تھا۔ سلمان اس کے پاس گیا اور اس نے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”کچھ چاہئے؟“

”پلیز تھوڑی سی، اسکی۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”اوکے۔“ سلمان نے کہا اور باہر چلا گیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس نے جلدی سے کال ملائی تو گیت کی آواز ابھری

”یہ بھارت کے نمبر ملا رہا ہے، بات کروادوں یا ڈراپ کر دوں؟“

”بات کروادو، تاکہ اسے پتہ چلے کہ یہ ٹریپ ہو چکا ہے پھر اس نمبر کی ہر کال سننا۔“ اکبر نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، مجھے ذرا سا وقت دیں۔ نمبر تو آ ہی گیا ہے، پہلے میں.....“ سلمان نے تیزی سے کہا شاید وہ اپنے

الفاظ سے اس ایجنٹ کو قابو کرنا چاہ رہا تھا۔

”اسے بات کرنے دو، دیکھو تو سہی وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ پھر اسے دیکھ لینا۔“ میں نے کہا تو بات ان

لی مجھ میں آ گئی۔ چند لمحے بعد اس کی کال مل گئی۔ اس نے تیزی سے کہا۔

”سرا یہ کیا چویشن ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”کیسی پتویشن، بات کیا ہے؟“ دوسری طرف سے سوال کیا گیا۔ تب اس نے انتہائی اختصار سے روداد سنا دی تو دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ایسی کوئی صورت حال نہیں ہے، تم ٹریپ ہو چکے ہو۔ فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔“

”اوہ!“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ فون بند ہو گیا۔

سلمان نے وہ سب سنا اور اٹھ گیا۔ اس نے ایک الماری سے بوتل نکالی، گلاس لیا اور زویا کو برف لانے کا کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔ اس نے بوتل میز پر رکھی اور گلاس اسے تھما دیا۔ ایجنٹ نے جلدی سے گلاس لیا اور بوتل کھول کر اس میں سے شراب اٹھ لی۔ اتنے میں زویا برف لے کر پہنچ گئی۔ اس نے انتظار بھی نہ کیا اور شراب حلق میں اٹھ لی۔ زویا ساتھ میں بیٹھ گئی۔

”تم نے جس نمبر پر فون کیا ہے اب وہاں فون مت کرو۔ اب اس نمبر سے تمہاری کال کوئی نہیں سنے گا۔“ سلمان نے اس کا میل فون پکڑتے ہوئے سکون سے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں درست بتایا گیا ہے کہ تم ٹریپ ہو چکے ہو۔ دراصل ہم خون خرابہ پسند نہیں کرتے اور نہ ہی تشدد کے قائل ہیں۔ ہم چاہیں گے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔“ سلمان اسے یوں کہہ رہا تھا جیسے وہ اس کا بہت اچھا دوست ہو۔

”کون لوگ ہو تم؟“ اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

”فضول بکواس نہ کرو۔ ہم نے کوئی تمہارا نام پوچھا۔ ہے، جو تم ہمارے بارے میں پوچھ رہے ہو۔“ سلمان نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“ اس نے پر اعتماد انداز میں کہا تو سلمان نے خوش ہو کر کہا۔

”ہاں یہ ہوئی نا بات۔“ اس دوران اس نے گلاس میں شراب ڈالی اور گلاس اس کے آگے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو ہم سے تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہیں گے، بلکہ مہمان نوازی کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم کیا کر سکتے ہیں، تم وہ سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔“

”دھمکیاں مت دو، کام کی بات کرو۔“ اس نے شراب کا گلاس اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”کیا ناسک دیا گیا ہے تمہیں یہاں؟“ سلمان نے کہا تو سامنے بیٹھے ایجنٹ نے اچانک گلاس سلمان کے منہ پر دے مارا۔ وہ پوری طرح تیار بیٹھا ہوا تھا، ہلکی سی جھکائی دے گیا۔ گلاس فرش سے ٹکرا کر چھٹا کے سے ٹوٹ گیا۔ تب تک ایجنٹ نے سلمان پر چھلانگ لگا دی تھی۔ جب تک ایجنٹ زمین پر گرنا، تب تک زویا بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے فرش پر گرنے سے پہلے ایجنٹ کے منہ پر زور دار ٹھوکر ماری۔ وہ ذرا سا اچھلا اور فرش پر آ رہا۔ زویا نے اس کی گردن پر اپنی جیل ماری تو وہ وہیں سن ہو کر لیٹ گیا۔ سلمان نے آگے بڑھ کر اسے کالر سے پکڑا اور اسے اٹھایا۔ اس کا چہرہ لہو لہان ہو رہا تھا۔

”اے لڑکی تو نے بہت زور سے مارا، بھلا کوئی ایسے مارتا ہے، دیکھو، اس طرح مارتے ہیں۔“ اس نے کار والا ہاتھ اوپر کیا اور پھر چٹلون کو پکڑا اور زور سے دیوار میں دے مارا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی پھر بے جان سا ہو کر فرش پر گر گیا۔ سلمان نے بڑھ کر میز سے شراب کی بوتل اٹھائی، اور اس کے دونوں پیروں پر اٹھ لی۔ پھر

ماچس کی تیلی جلانے کے لیے رگڑی ہی تھی کہ وہ خوف سے چیخنے لگا۔

”نہیں، مجھے مت مارو۔“

”نہیں صرف پیر جلائیں گے۔ شراب کا یہ مزہ بھی تو چکھو، دیکھو کیسے جلاتی ہے۔“ سلمان نے سرد لہجے میں یوں کہا جیسے بہت غصے میں ہو۔

”میں نے غلطی کی۔ میں مانتا ہوں۔“ وہ رو دینے والے لہجے میں بولا تو سلمان نے کہا۔

”ہم نے تو کہا تھا کہ تعاون کرو۔“

”بولو کیا پوچھنا ہے؟“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”کیا ناسک ہے تمہارا؟“ سلمان نے دہرایا

”ادھر اسلحہ آتا ہے، کہاں سے آتا ہے مجھے نہیں معلوم، میرا کام صرف یہ ہے کہ اسے بلوچستان اور سندھ کے علاقے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ بہت سارے مقامی لوگ میرے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔“ اس کا لہجہ تنک درد بھرا تھا۔ سلمان چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر دھیمے سے پوچھا۔

”یہ کیسے ہوتا ہے؟“

”نوٹ، سب کچھ نوٹ کرتا ہے، یہاں ہر بندہ بکاؤ ہے، بس ریٹ اس کے مطابق لگانا پڑتا ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے جوش میں یوں بولا جیسے وہ گالی دے رہا ہو۔ تبھی میں نے کہا۔

”سلمان! فی الحال اسے باندھو اور یہیں پڑا رہنے دو۔ بعد میں دیکھتے ہیں۔“

اس نے ویسے ہی کیا اور دو چار منٹ میں اسے باندھ کر وہیں ایک کونے میں ڈال دیا۔ وہ ہولے ہولے کانپتے ہوئے کراہ رہا تھا، وہ دونوں اُسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گئے۔ واپس کنٹرول روم میں آ کر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ابھی اس سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا۔“

”جلدی کس بات کی ہے۔ رات بھر ہے نا تمہارے پاس، سیٹھ نیلا اور اس کے مخالف، دونوں طرف کی بات سنو، وہ کیا کہتے ہیں، اسی کے مطابق اس سے پوچھنا، اور پھر صبح ہونے سے پہلے.....“ میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”لیکن اس سے یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلحہ کیسے آتا جاتا ہے، کون لوگ ہیں اس میں؟“ زویا نے تیزی سے کہا تو میں سکون سے بولا۔

”اسے اس وقت نہیں روکا جاسکتا، جب تک بھیجنے والے خریدنے والے موجود ہیں۔ رسد بھی آتی ہے جب طلب موجود ہو۔ ہمیں طلب ختم کرنی ہے۔“

”اوکے۔“ اس نے یوں کہا جیسے میری بات سمجھ گئی ہو۔ اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ انہیں ابھی بہت کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے۔

”تم لوگ کھانا دانا کھاؤ۔ پھر صبح تک کوئی آؤٹ پٹ لکھنا چاہئے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس ائے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر باہر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ جہاں دزے نے کھانا لگا دیا تھا۔

ہم کھانا کھا چکے تو مہوش اور فہیم اسی کمرے میں چلے گئے اور میں ہوا خوری کے لیے چھت پر آ گیا۔ مجھے سوئی بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اس گھر میں اس کا ہونا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی کسی

کونے سے نکلے گی اور میرے سامنے آکھڑی ہوگی۔ یہ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرے گی۔ میں اس کی یادوں میں کھویا ہوا، چھت پر ٹہل رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا، یہ وہ فون تھا جو مجھے فہیم نے دیا تھا اور اس میں نمبر ٹریس نہ ہونے والی تکنیک تھی۔ مجھے نمبر بھی دکھائی نہیں دیا تھا تب میں فوراً سمجھ گیا کہ دوسری طرف بلا شبہ فون کور ہوگی۔ میں نے کال پک کر لی

”امرتسر پہنچ چکی ہوں اور اس وقت رتن دیپ سنگھ جی کے پاس ہوں۔“

”اتنی دیر بعد فون کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں آتے ہی افتاد پڑ گئی۔ بائیس بس ”را“ والوں کے ہتھے چڑھنے ہی والی تھی۔ یہ تو اسے رتب ہی بچا گیا۔ یہاں امرتسر میں تو کیا پورے پنجاب میں اسے تلاش کیا جا رہا ہے اسے، بہت بڑا کام ڈال دیا ہے اس نے۔“

”کسی چھوٹے کام کی اس سے امید بھی نہیں ہے۔ لیکن اب وہ ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی پتہ نہیں کہاں ہے۔ آخری بار جالندھر میں تھی۔ اب دیکھیں کہاں ہو سکتی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم ممبئی کب جا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بس ابھی یہاں سے نکل کر اپنے گھر جاؤں گی، صبح سویرے میری فلائیٹ ہے یہاں سے۔ وہاں جا کر بات کروں گی، یہ رتن دیپ سنگھ جی سے بات کرو۔“ اس نے کہا اور فون اُسے دے دیا۔ وہ کچھ دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا، پھر فون بند کر دیا۔

رات کے گھرے سنائے میں سوئی کی یاد اس قدر تھی کہ کچھ دیر پہلے کی ہنگامہ آرائی بھی اس کی یاد کو بخونہ کر سکی۔ ایک کے بعد ایک خیال آتا چلا جا رہا تھا۔ میں سوئی کے خیالوں میں تھا کہ فون میں تھر تھراہٹ ہوئی۔ وہ فہیم کی کال تھی۔

”ہاں بولو۔“ میں نے کہا۔

”ابھی کال ٹریس ہوئی ہے کہ گھاس منڈی میں جہاں اس جو امانیا کے لوگوں کا گڑھ ہے۔ وہاں سے کچھ لوگ ہنگامہ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ ان کا ٹارگٹ شاہ فیصل کالونی میں موجود ایک مارکیٹ ہے۔ جو شاید ان کے مخالفین کی ہے۔“ فہیم نے تیزی سے بتایا

”مخالفین کی طرف سے کوئی پیش رفت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کی طرف سے ابھی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔“ اس نے بتایا

”یہ خبر ان تک پہنچا دو۔“ میں نے کہا تو گیت بولی۔

”میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اگر کچھ دوسرے لوگوں کے ذریعے گھاس منڈی کے اڈے پر ہی حملہ کر دیا جائے۔“

”تمہارے پاس ایسے لوگ ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل ہیں۔ جس وقت یہ ہنگامہ ہو رہا ہو، اس وقت ادھر بھی.....“ اس نے بات جان بوجھ کر ادھوری

چھوڑ دی

”اوکے“ تو پھر رات بھر میں دونوں طرف کو ہلا کر رکھ دو۔ کوشش یہ کی جائے کہ گھاس منڈی میں جو اڈے کا سرغنہ ساجد پولیس کے علاوہ دوسری فورسز پکڑ لیں۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ گیت نے کہا اور پھر فون آف ہو گیا۔ میرے اندر سنسنی پھیلنے لگی۔ میں کچھ دیر چھت پر رہا لیکن بے چینی ہو گیا۔ یہاں سوئی کی یادیں تھیں جو میری بے چینی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ میں نیچے چلا گیا۔ میری توقع کے مطابق مہوش اور فہیم کنٹرول روم میں تھے۔ سامنے اسکرین روشن تھی۔ وہ دونوں جب سے آئے تھے، اسی طرح مصروف تھے۔ میں نے مہوش کی طرف دیکھا اس کا چہرہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

”مہوش! تم آرام کر لو، میں اور.....“

”میں بالکل ایزی ہوں، فکر نہ کریں۔“ اس نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جاؤ، تھوڑا سکون کر لو۔ میں ہوں یہاں پر۔“ میں نے اس سے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ دارے نے اس کے لیے کمرہ سیٹ کر دیا ہوا تھا۔

سب سے پہلے شاہ فیصل کالونی کی مارکیٹ میں کچھ نامعلوم لوگ چند کاروں پر آئے اور آتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ مارکیٹ میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سیدھے اس مارکیٹ کی انتظامیہ والے دفتر کی جانب بڑھے۔ لیکن جیسے ہی ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ لوگ دفتر چھوڑ کر چھپ گئے کیونکہ وہ لوگ ان کے منتظر تھے۔ انہوں نے ہنگامہ کرنے والے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔

اس دوران گھاس منڈی میں جوئے کے اڈے پر دھاوا بول دیا گیا۔ وہاں پر جو عام لوگ موجود تھے۔ انہیں ڈرا دھمکا کر بھاگ دیا گیا۔ وہاں پر ساجد نامی وہ سرغنہ بھی موجود تھا۔ جوئے کے اڈے والوں نے فائرنگ کر کے مزاحمت کر دی تو معاملہ بڑھ گیا۔

ان دونوں ہنگاموں کی اطلاع پولیس کو معمول کے مطابق ہی ہوئی لیکن خفیہ فورسز کی مطلع کر دیا گیا تھا۔ جب یہ ایک ہی وقت میں دونوں ہنگامے شروع ہوئے وہ وہاں تک پہنچ چکے تھے۔ دونوں طرف سے ہی بندے مرے اور زخمی بھی ہوئے۔ لیکن کامیابی یہ ہوئی کہ ساجد نام کا وہ سرغنہ پکڑا گیا۔ ٹی وی اسکرین پر یہ خبریں چل رہی تھیں۔ فورسز نے ساجد کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ایک طرف یہ ہنگامے چل رہے تھے تو دوسری طرف فون پر اطلاع دعویٰ تک پہنچ گئی۔

مخالفین کا سارا زور اپنے ان لوگوں پر تھا جو حکومت میں تھے۔ وہ سیٹھ نیلا کا سارا ریکارڈ لے کر وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ رات گئے یہ فیصلہ ہوا کہ چھاپہ مارا جائے۔

صبح ہونے تک تین کام ہوئے۔ سیٹھ نیلا سمیت اس کے کارندوں کو پکڑ لیا گیا۔ سی ڈیز، کمپیوٹر اور وہ ریکارڈ جو ہنڈی کے ذریعے سرمایہ باہر منتقل کیا جا رہا تھا، وہ سب قبضے میں لے لیا۔ دوسرا ساجد نامی سرغنہ پولیس کی حراست سے نکل کے دعویٰ فرار ہو گیا۔ پولیس صاف کر گئی کہ ایسا بندہ انہوں نے پکڑا ہی نہیں تھا۔ تیسرا کام یہ ہوا کہ رات جوائینٹ پکڑا تھا، اسے زندگی سے آزاد کر کے زخمی پارک کے قریب پھینک دیا گیا۔ اس کے تمام نمبر حاصل کر لیے گئے تھے۔ دن نکلنے ہی اس کی لاش مل گئی۔ اس سے کراچی انٹرورلڈ میں ہچکل مچ گئی۔ جس کا احساس ٹیلی فون کالز سے ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

ابھی صبح کی روشنی پھیلی نہیں تھی جب ٹرین بور پولی اسٹیشن کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں پر ان کے چند خاص لوگ موجود تھے، جنہیں زوردار سنگھ نے بھیجا ہوا تھا۔ انہوں نے ہر طرح کا جائزہ لے لیا ہوا تھا۔ وہ جگہ ان کے لیے محفوظ تھی۔ ٹرین رُکی تو انہوں نے کھڑکی سے دیکھا۔ ان کی پہچان کے مطابق کافی لوگ تھے۔ وہ بڑے سکون

سے اترے اور باہر کی جانب چل دیئے۔ ان تینوں کے لیے ٹیکسی موجود تھی، وہ اس میں بیٹھے اور چل دیئے۔ وہ ہری اوم مگر کا علاقہ تھا جہاں کارٹر روڈ پر کویتا اپارٹمنٹ کے سامنے ٹیکسی جا رہی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تیسری منزل پر گئے تو ایک اپارٹمنٹ ان کا منتظر تھا۔ جس کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رونیت کے سارے دوست موجود تھے۔ تقریباً تیس گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد وہ کافی حد تک تھک چکے تھے۔ وہاں ان کے لیے ملازمین کے نام پر کچھ سیکورٹی گارڈ تھے۔ انہوں نے ایزی ہو کر کھانا کھایا۔ پھر چائے پیتے ہوئے سب اکٹھے تھے۔ تبھی بائیتا کور نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”یہاں ہم نے زیادہ دیر کے لیے نہیں رہنا لیکن جتنا بھی رہنا ہے، بالکل ایک عام سے شریف شہری کی طرح زندگی بسر کرنی ہے۔ اس شہر کو خواہوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ خواب پورے کرو، انجوائے کرو لیکن اپنے کان اور آنکھیں کھول کر رکھو۔ زندگی بہت قیمتی ہے مگر ہمارا مقصد زیادہ قیمتی ہے، جس نے آئندہ آنے والی نسلوں کو زندگی دینی ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں، ہم اپنی زندگی تک دینے کو تیار ہیں۔ لیکن یہاں کون ڈیل کرے گا، سندو تو ابھی اسپتال ہی میں ہوگا۔“

”جب تک سندو منظر عام پر نہیں آتا، تب تک رونیت کو سب کو ڈیل کرے گی۔ تم لوگ کل ہی سے مختلف کمپنیوں کو جوائن کرو گے اور ممبئی میں پھیل کر رہو گے۔ میں اور جیپال سنگھ تم سب کے ساتھ بچ رہیں گے کیونکہ ہم ایک جگہ تک کر نہیں رہ سکتے یہ ہماری مجبوری ہے۔“ اس نے سنجیدگی ہی سے کہا اور اٹھ گئی تو سب بھی چلے گئے۔

وہ تینوں ایک کمرے میں آگئے تو بائیتا کور بولی۔

”نوتن کور یہاں پہنچ چکی ہے اور اس نے ہمارے لیے سارا سیٹ اپ بنا لیا ہوا ہے۔ مجھے اور جیپال کو ابھی یہاں سے لٹکنا ہے اور رونیت، جب تک یہ سب اپنے ٹھکانے تک نہیں پہنچ جاتے تبھی یہاں رہنا ہوگا۔“

”اوکے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں کویتا اپارٹمنٹ سے جانے کے لیے نکل پڑے، ان کی منزل کیا تھی، یہ انہیں نوتن نے بتانا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر ہونے کو تھی۔ مقامی میڈیا چیف رہا تھا۔ مگر ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پولیس فورس کے بارے میں مختلف باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔ کراچی جو کبھی امن کا گہوارہ تھا ان دنوں مافیا اسٹائل کے قتل اور اغوا برائے تاوان سے لے کر عسکریت پسندی تک، بم دھماکے اور فرقہ وارانہ قتل، پوری بند لاشیں اور نوگو ایریا ز اب شہر کی پہچان بن گئی تھی۔ بارود کے ڈھیر پر پڑے اس شہر میں جرائم کی سطح آخر کیوں بڑھ رہی ہے؟ یہی وہ بنیادی سوال ہے، جس کا جواب ہر شہری کو سوچنا ہوگا۔ کراچی اور ممبئی میں جہاں کئی معاملات میں تضاد ہے وہاں مماثلت بھی ہے۔ کہیں جرائم کے معاملے میں ان شہروں کی مماثلت تو نہیں؟ کئی سارے سوال تھے جو میرے ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے، مگر سب کا جواب ایک ہی تھا۔ کسی بھی بیماری کی علامت کو ختم کرنے کے لیے اس کی بنیادی وجہ کو علاج کر کے ہی اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ بیماری کیا ہے؟ صرف علاج سے گھبرا ہے۔ جرائم کو ختم کرنے کے لیے جرائم کی دنیا میں اترنا بہت ضروری تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ چانک ایک خیال میرے ذہن میں سرایت کر گیا۔ میں کچھ دیر اس پر سوچتا رہا، پھر میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر

لما کہ چونکہ یہ ایک تجربہ ہوگا، اس کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے، جب نتائج سامنے آئیں گے تو ہی اسے سب پر ظاہر کیا جائے۔ میں اسی وقت اٹھ گیا۔

کنٹرول روم میں مہوش اکیلی بیٹھی گیت اور زویا سے کپ شپ کر رہی تھی۔ ان کے درمیان کوئی نیا سوفٹ ویئر زیر بحث تھا۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”سوری، میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا، کہتے ہیں کہ جس مرد کی شامت آئی ہو وہ خواتین میں جا بیٹھتا ہے۔“

”اگر شوق ہے شامت کا تو وہ پورا کر دیتے ہیں۔“ گیت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں مجھے کوئی شوق نہیں۔“ میں نے کہا لیکن ساتھ ہی سنجیدگی سے پوچھا۔

”زویا، یہ جو ہم نے کراچی میں سارا منظر بنا دیا ہے، کیا اس کا کوئی فائدہ ہے؟“

”سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ دعویٰ یا کسی دوسرے ملک میں بیٹھے ہوئے مداریوں کو اپنے ہونے کا احساس دلایا جائے۔“ گیت نے جواب دیا

”اور ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہونے والا، سوائے چند دن کام رُک جانے کے۔ وہ اپنے نئے گھوڑے بنا لیں گے۔“

”کیا وہ مداری قسم کے لوگ تم لوگوں نے ٹریس کر لیے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نمبروں کی حد تک اور لوکیشن کے بارے میں ہمیں سو فیصد معلومات ہیں اور دعویٰ میں موجود اس بندے کرامت جو نیو کے بارے میں پوری معلومات ہیں، جو یہاں جوامافیا، اور اسلحہ اور دوسرے کئی جرائم میں ملوث ہے۔“ زویا نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”اس کے کام کا طریقہ کار بھی؟“

”کافی حد تک کی یہ ضروری ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اگر یہ ہو جائے تو کچھ نیا کیا جائے؟“ میں نے کہا تو وہ سب آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ اس دوران جنید اور فہیم آگئے۔ تھوڑی دیر بات سمجھتے رہنے کے بعد فہیم بولا۔

”ہم کوشش کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں ایسا ممکن ہے، ہو جائے گا۔“

”تو کرو، یہ مسلمان اور اکبر کدھر ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کچھ کارگو کروانے گئے ہیں لاہور کے لیے۔ آتے ہی ہوں گے۔“ جنید نے بتایا

”میں رابطہ کر لیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اپنے سیل فون پر ان سے رابطہ کرنے لگا۔ وہ ٹرکوں والے اڈے پر موجود تھے۔ میں نے ان کے واپس آ جانے تک انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ تین گھنٹوں کے بعد وہ اسکرین پر میرے سامنے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سولہ کروڑ میں سے چودہ کروڑ لاہور کارگو کروا دیئے ہیں۔ وہ پہنچا دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ بات کیا ہے؟

”کیا تم آج ہی دعویٰ جاسکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں، بس نکت خریدنا ہوگا۔ میں ایسا بندوبست رکھتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا

”تو پھر آج ہی دعویٰ کے لیے نکلو، تمہارے ساتھ کوئی بھی جاسکتا ہے تو اسے لے جاؤ۔“

”کرنا کیا ہے؟“ زویا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کرامت جو نیو کا قتل اور اسے یوں ٹھکانے بھی لگانا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔“

”میں جاتی ہوں اس کے ساتھ، ہو جائے گا۔“ زویا نے کہا تو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ دونوں دوہنی جانے کی تیاری میں لگ گئے اور ان سب نے پوری توجہ اس پر لگا دی کہ کرامت جو نیچو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات مل جائیں۔ دو گھنٹوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کرامت جو نیچو دوہنی کے جنوب میں واقع ایک صحرائی علاقے الفتح میں جا رہا ہے۔ جہاں کوئی فنکشن تھا۔

”میں فنکشن کے بارے میں جانتی ہوں۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ ہمیں وہاں مل جائے گا۔ میرے خیال میں اس سے اچھا وقت کبھی نہیں مل پائے گا۔“ زویا نے انتہائی پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔

شام ہونے تک سلمان اور زویا دوہنی پہنچ گئے۔ اس دوران۔ وہ دونوں ہمارے رابطے میں تھے۔ ان کی آواز ہی نہیں تصویر بھی ہمیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت ان دونوں کے ساتھ بڑا جذباتی تعلق محسوس ہو رہا تھا۔ سلمان کے دوہنی میں کچھ غیر پاکستانی دوست تھے۔ ان میں دو لڑکیاں اور دو ہی لڑکے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ ریسٹوران میں کھانا کھا چکے تھے، جب کرامت جو نیچو دوہنی سے نکل کر اس صحرائی علاقے کی جانب چل پڑا۔ اس کے ساتھ کتنا لاؤ لنگر تھا یا نہیں تھا اس بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی۔ وہ بھی اسی وقت اس علاقے کی جانب چل نکلے۔ انہوں نے پتہ کر لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ یہ وہاں کی ثقافتی روایت ہے کہ بچہ صحرا میں رات کے وقت رقص اور رے کشی سے لطف اندوز ہوا جائے۔ وقت اور حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ لوگ بدلے تو انداز بھی بدل گئے۔

وہ گاؤں بچہ صحرا میں تھا، جس سے دو کلومیٹر آگے وہ میلہ نما تقریب تھی۔ دور قاتیں لگی ہوئی تھیں، جس کے درمیان میں روشنی اتنی تھی کہ آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہیں پر سیکورٹی کا پہلا حصار تھا۔ ان کی اچھی طرح سے جامہ تلاشی لی گئی اور آگے جانے دیا گیا۔ قاتوں سے کوئی سو قدم پہلے پھر اسکیٹنگ کی گئی تو وہ اندر داخل ہو سکے۔ غیر ملکی اور لڑکیوں کا ساتھ ہونے کے باعث ان سے کوئی پوچھ بچھ نہیں ہوئی تھی۔

اندر کا سماں ہی کچھ عجیب تھا۔ عربی موسیقی کی دھن گونج رہی تھی۔ عین درمیان میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے، جن پر ایک نیم برہنہ رقاصہ ٹھہر کر رہی تھی۔ اس کا نیلے رنگ کا لباس چمک رہا تھا۔ ایک طرف بے شمار براڈ کی شراب کی بوتلیں بھی ہوئی تھیں، جہاں سے لوگ پی رہے تھے۔ ایک طرف مختلف انواع و اقسام میں بنے گوشت کے کھانے تھے، لوگ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے، کچھ پہلو میں لڑکیوں کو بٹھائے اپنی مستی میں گم تھے۔ وہاں پر ہر طرح کی مستی کا پورا سامان میسر تھا۔ سلمان اور زویا کو وہاں کرامت جو نیچو کی تلاش تھی۔ وہ بھی ایک قالین پر جا بیٹھیں۔

”ایک کمی ہے یہاں۔ مطلب ان کی مستیاں ایک خاص حد تک ہی جاسکتی ہیں، اس سے آگے تو بس تشنہ کامی ہے۔“ سلمان کے ایک دوست نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا تو دوسرا دوست ہنستے ہوئے بولا۔

”جس تشنہ کامی کی تم بات کر رہے ہو، اس کا راستہ یہیں کہیں سے نکلتا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر خیمے لگائے گئے ہوں گے، کیونکہ یہ اس فنکشن کا حصہ ہے۔ جو جسے میسر ہوگا، وہی اپنے لیے مخصوص خیمے میں جا کر اپنی موج مستی کرے گا۔“

”یعنی پورا اہتمام ہے۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”مگر ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، ہمیں کسی وقت بھی چیک کیا جاسکتا ہے۔“ ایک دوست نے کہا۔

”لیکن یہ اس وقت ہوگا جب میزبان یہاں آئے گا اور وہ سب سے ملے گا۔“ دوسرے نے بتایا۔

”معصیت یہ ہے کہ وہ بندہ بھی تو تلاش کرتا ہے۔“ سلمان نے کہا تو گیت کی آواز گونجی

”سلمان۔ حلیہ ذہن نشین کرو، گول بھاری چہرہ، سندھی انداز کی خوشی داڑھی کے ساتھ بھاری مونچھیں، کنبی آنکھیں، ناک چٹلا اور ذرا سا خیدہ، موٹی گردن اور دائیں گال پر زخم کا ہلکا سا نشان۔ یہ تصویر اس کی بزنس کمپنی کی سائیٹ پر لگی ہوئی ہے۔“

”وہ رہا۔“ ایک دم سے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے زویا نے پر جوش لہجے میں کہا تو سلمان بولا۔

”اب اسے میں.....“

”نہیں تم ٹھہرو، میں دیکھتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے زویا اٹھ گئی۔ تبھی سلمان اور اس کے ساتھی الرٹ ہو گئے۔ زویا دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ وہ اس وقت جام ہاتھ میں لیے پوری توجہ سے رقاصہ کے رقص میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھی اور حتی الامکان اپنے لہجے کو خواب ناک بناتے ہوئے بولی۔

”ہیلو، سر کرامت! کیسے ہیں آپ؟“

اس نے زویا کو عجیب سی اجنبیت کے ساتھ دیکھا اور پھر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ آپ مجھے پہچانیں، ماضی کو یاد رکھنا بھی نہیں چاہئے۔ میں تو ایک نئی ذیل کے ساتھ یہاں آپ کے پاس آئی ہوں۔“ زویا نے لہجے کو بارعب بناتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھا نہیں، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”جب بات ہوگی تو ہی سمجھ میں آئے گی۔ یہاں اس ماحول میں ہونہیں سکتی۔ میں کراچی کی تازہ صورت حال کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔“ اس نے کہا تو کرامت نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”وہی جو میں اپنے پاس کی طرف سے آپ کے لیے پیغام لے کر آئی ہوں۔ سیٹھ نیلا سمیت ساری ذیل ہو جائے گی۔ باقی آپ کی مرضی۔“ زویا نے کہا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ تو وہ اٹھ گئی۔ تبھی وہ جام رکھ کر اضرائی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم کون ہو؟ اور یہ باتیں.....“

”آپ تو بچوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں کرامت جو نیچو سے بات کر رہی ہوں۔“ زویا کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

”چل بات کرتے ہیں۔“ اس نے ایک طرف آنے کا اشارہ کیا تو زویا جان بوجھ کر باہر کی جانب جانے لگی۔ وہ دونوں خاموشی میں آگے بڑھتے گئے۔ قاتوں سے باہر آ جانے پر اس نے پوچھا

”اب بتا، کیا کہتی ہو؟“

”آپ کے مخالفین یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کراچی پر قابو پالیں۔ گھاس منڈی سے لے کر جہاں تک آپ کا سکہ چلتا ہے۔ یہ ان کی ابتدا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ذیل کرو تو انہیں سمندر میں پھینک دیں گے۔“ زویا نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

”ذیل کون کرے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا پاس، اگر آپ ابتدائی باتیں ڈن کر لیں تو۔“ زویا نے اسی با اعتماد لہجے میں کہا۔

”کہاں بات کرنی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جہاں آپ چاہیں۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا تو وہ اسے ان خیموں کی جانب لے کر چل دیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا وہ پلٹا اور اس طرف چل پڑا، جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ جیسے ہی ایک جدید فورڈ ہیل کے پاس آیا، اس کے دو گارڈ فوراً سامنے آ گئے۔ کرامت نے اشارہ کیا تو انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر جا بیٹھے۔ اس سے پہلے وہ کوئی بات شروع کرتے مسلمان کے ساتھ ایک دوست وہاں وہیں پہنچ گئے۔ گارڈ اگرچہ الرٹ تھے مگر انہیں صرف یہی احساس تھا کہ اندر ان کا پاس ایک لڑکی کے ساتھ ہے۔ ان کی پوری توجہ اندر کی طرف ہی تھی۔ جیسے ہی مسلمان ان کے سر پر پہنچا، وہ مڑے تب تک دونوں ان پر آن پڑے۔ مسلمان نے پوری طرح انہیں ہلٹے نہیں دیا ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ریت پر پڑے تڑپ رہے تھے۔

”بولو، کیا ذیل کرنی ہے؟“ کرامت جو نیچے جیسے ہی کہا زویا اس پر ٹوٹ پڑی۔ وہ خاصا سخت جان تھا اور پہلے ہی سے محتاط تھا۔ اس کے وار سے بچ گیا۔ اس نے زویا کی گردن قابو میں کر لی اور اسے سیٹ پر لٹا دیا، ایسے میں دروازہ کھلا اور مسلمان اندر آ گیا۔ اس نے کرامت کی گردن پکڑی اور ایک زوردار جھٹکا دیا۔ وہ پورے بدن سے لرزا اور تڑپنے لگا۔ زویا نے اپنی گردن چھڑائی اور تیزی سے پیچھے ہٹی۔ اس کے دوست نے دروازے کھولے اور دونوں گارڈ زکو گاڑی میں پھینک دیا۔ پھر دروازے بند کر کے واپس چل پڑا۔ مسلمان نے چابی ٹٹولی تو کرامت کے پاس سے نکل آئی۔ اس نے فورڈ ہیل موڑی اور چل دیا۔

وہ بستی میں جانے کی بجائے اس کے قریب سے آگے بڑھ گئے۔ اس کے دوست پیچھے پیچھے آتے ہوئے بستی سے سیدھے دوہنی کی جانب نکل پڑے۔ کرامت کی جیب جاندار تھی۔ وہ صحرا کی جانب چل پڑے۔ کافی دور جا کر زویا نے اس کا سیل فون قابو میں کیا تو مسلمان نے ان تینوں کو صحرا میں پھینکا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ زویا نے سیل فون سے سم کارڈ نکالا اور سیل فون باہر پھینک دیا۔

”ویل ڈن۔ اب یہ سم کارڈ اپنے سیل میں ڈال لو اور کسی محفوظ مقام پر چلے جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”اوکے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

میرے سامنے میز پر کراچی میں موجود ان دو لوگوں کے نمبر تھے، جن سے کرامت جو نیچو کا رابطہ تھا۔ یہی اس کے تمام تر پھیلاؤ کے ذمے دار تھے۔ میں نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”سب سنو کیا میں کرامت جو نیچو کی آواز میں بات کر سکتا ہوں۔“

”سو فیصد تو نہیں لیکن چلے گا، ایک سو فٹ دیر ہے جس سے آواز کو اس کے مطابق بتایا جاسکتا ہے۔“ گیت نے کہا تو مبہوش نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”یہاں تو بے سُرے ترین لوگ گھوکا رہے ہوئے ہیں، یہ تو بس آواز کو ذرا بھاری کرتا ہے، تو نے کون سا گانے گنوائے ہیں؟“

اس سمیت سبھی سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ان دونوں سے وہ کیسے کام لیتا ہے اور اس وقت ان کے درمیان کیسی بات چل رہی تھی۔ کرامت کے بات کرنے کا انداز میں سمجھ ہی گیا تھا۔ ایک کھٹے بعد زویا اور مسلمان بار دوہنی میں اپنے دوستوں کے پاس جا پہنچے۔ اس کا صرف فون آن

رکھنا ضروری تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے کراچی میں موجود اس کے ایک کارندے فصیح صدیقی کو فون کر دیا۔

”کیا صورت حال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کیا خاک ہوگی۔ پیسہ پکڑا گیا، مخالفین نے سیٹھ نیلا کو پکڑ لیا اور ابھی تک آپ نے کچھ کیا نہیں۔“

”دیکھو میں بہت کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن ساری کوشش کس لیے غلط ہو رہی ہے معلوم ہے تجھے؟“

”نہیں تو، کیا مطلب؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ لطیف شاہ یہ سارا کام اسی کا کیا دھرا ہے، وہ غدار ہو گیا ہے، گھاس منڈی پر حکومت کرنے کے لیے؟“ میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

”ایسا کیا واقعی.....؟“ اس نے انتہائی حیرت سے کہا۔

”یہ ساجد آیا ہے نا یہاں پر، اس نے ساری بات تفصیل سے بتائی، میں نے اس کی تصدیق کی ہے تو کنفرم ہو گیا۔“ میں نے غصے کو کم نہیں ہونے دیا

”یہ تو ہمیں بھی لے ڈوبے گا۔“ وہ تشویش سے بولا۔

”لے ڈوبے گا کیا، اس نے سارے نام دے دیئے ہیں، تھانے سے پتہ تو کرو، اوپر سے آرڈر آنے والے ہیں۔ تم خود سوچو اتنی بڑی ذہنیت، اندر کے بندے کے علاوہ کوئی دوسرا کر سکتا ہے۔ سیٹھ نیلا کیسے پکڑا گیا، اس کے سارے راز کس نے دیئے؟“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر، اب کیا کرنا ہے؟“

”لطیف شاہ کا جو بھی ٹھکانہ ہے، اسے آزادو۔ اسے بھی ختم کر دو۔ کوئی ثبوت نہ رہے۔ اب اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یہ کام آج رات ہو جانا چاہئے، سورج نکلنے سے پہلے اس کا کام تمام کر کے میرے پاس یہاں دوہنی آ جاؤ۔“ میں نے تحسنانہ لہجے میں کہا۔

”ہو گیا سمجھو۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ چند لمحے بعد میں نے لطیف شاہ کا نمبر ملا لیا، یہی باتیں اس سے کر کے کہا کہ تجھے ختم کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں ختم کرے، تم اسے نیست و نابود کر کے دوہنی آ جاؤ۔ وہ تیار ہو گیا۔

کوئی دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ گھاس منڈی اور اس کے گرد و نواح میں شدید فائرنگ کی اطلاعات ملنے لگیں۔ ٹی وی اسکرین پر خبریں دکھائی دینے لگیں تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ اس میں شدت آنے لگی۔ ہنگامے بڑھتے گئے۔

☆.....☆.....☆

جسپال سنگھ اور باغیا کور دونوں دیرولی کے پوش علاقے میں تو تعمیر بن گئے میں تھے۔ ممبئی میں ان کا پہلا ٹھکانہ وہی تھا۔ وہ کچھ دیر نیند کے بعد ڈنر لے چکے تھے اور باہر جانے کے لیے تیار تھے۔ انہیں گوپال نند سے ملنا تھا۔ اگرچہ وہ ہندو تھا، لیکن وہ شوشلسٹ ہونے پر زیادہ فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ایک تھا، جنہوں نے ”را“ کی ٹاپ میٹنگ کی ویڈیو باغیا کور تک پہنچا دی تھی۔ اگرچہ وہ را سے تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی رسائی بہت دور تک تھی۔ باغیا کور خود اس سے ملنا چاہتی تھی اور گوپال نند سے بھی کہا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے مل لے۔ اس کے پاس کوئی کام تھا، جسے وہ کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں ایک بار کا وقت دیا تھا۔ وہ ایک ایسا بار تھا جو ممبئی میں جگہ جگہ کھل گئے تھے اور وہاں ناچ گانے اور شراب پینے کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر ”بھائی لوگوں“ ہی کی گمرانی میں چل رہے تھے۔ اس لیے ہر غیر قانونی کام وہاں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کوئی گاڑی لینے

کی بجائے پیدل ہی نکلنا پسند کیا، وہ اس جنگل سے نکلے اور پیدل ہی آگے بڑھتے گئے۔ کافی آگے جا کر انہیں ٹیکسی ملی تو وہ اس میں بیٹھ گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اس بار کے سامنے تھے۔ وہ میں سڑک سے ہٹ کر ایک گلی میں تھا۔ وہاں لوگوں کی رہائش کم اور اس طرح کے کلب اور بار کے علاوہ مختلف سٹور اور کھانے پینے کی دوکانیں تھیں۔ ایک طرح سے وہ جگہ ٹائیٹ فوڈ اسٹریٹ کے جیسی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں کچھ دیر پھرتے رہے پھر گوپال نند سے رابطہ کیا۔ وہ اسی بار کے اندر بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اندر گئے تو خاصا شور تھا۔ وہاں کافی سارے جوڑے تھے۔ اس کے علاوہ بھی خاصی خواتین دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے محتاط انداز میں اسے تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا، جلد ہی ان کے فون پر کال آگئی۔ وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔

میز پر آئے سامنے بیٹھے ہی اس نے کھانے پینے کا پوچھا اور پھر کولڈ ڈرنک منگوا لیے۔ جب تک کولڈ ڈرنک آئے انہوں نے اپنے درمیان اجنبیت کو ختم کر لیا تھا

”بات یہ ہے کہ یہاں کے اور امرتسر کے ماحول میں بڑا فرق ہے میں بھی یہ مانتا ہوں ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے لیکن ماحول کوئی بھی ہو، اصل چیز حوصلہ ہے، جو کر جائے۔ معاف کرنا میں صرف دھرم کے لیے کام نہیں کرتا، بلکہ اپنے نظریے کے لیے کام کرتا ہوں اور ہر کام کے لیے سرمایہ بھی تو چاہئے نا۔“

”ہمیں اس سے غرض نہیں کہ تم کیا کرتے ہو اور کیسے کرتے ہو۔ تمہارے پاس ہمارے لیے کیا آفر ہے؟“

بائیتا کور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ سی ان سی کرتے ہوئے بولا۔

”روکڑے کی آپ فکر نہیں کریں۔ وہ اتنا طے گا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے اور کام بہت سے ہیں، جیسا کام ہوگا ویسا روکڑا ہوگا۔“

”مثلاً؟“ بائیتا کور نے پوچھا۔

”مطلب، ان میں ایک کام یہ بھی ہے کہ ایک کمشنریل کے پولیس والے کو اڑاتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے استہزایہ انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تو جہاں سنگھ نے ایک دم سے کہا۔

”ڈن ہو گیا۔ جو اور جیسے تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اگلی بات کرو۔“

اس کے یوں کہنے پر گوپال نند نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہ کام ایسا نہیں ہے کہ تم بازار جاؤ اور کوئی برگر بیڑا لے کر آ جاؤ۔ پولیس کمشنر ہے وہ۔“

”وہ لوہے کا بنا ہوا ہے یا اس کے لیے کوئی مخصوص گولی بنی ہے؟“ جہاں نے سر دلچے میں پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے یہ بندہ ہمیں کام دے گا۔“ اس نے بائیتا کور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا پھر جہاں کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمہیں کام سے غرض ہے نا، بولو، باقی میں دیکھ لوں گی۔“ بائیتا کور نے بھی کہا تو ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ ایسا کام ہے لیکن تم لوگوں کو شاید پتہ نہیں ہے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ میرے پاس دوسرے کئی کام ہیں، مثلاً اغوا، کسی بزنس مین کا قتل، منشیات یا اسلحہ کی ڈیوری۔ سوچ لو، ان میں جو تم لوگ کرنا چاہتے ہو تو کل شام میں تمہیں بتا دوں گا۔“

”ڈن ہو گیا۔“ جہاں نے کہا وہ غور سے اسے دیکھنے لگا پھر اس نے جہاں سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

”مزید کچھ لیں گے؟“

گویا اس نے بات ختم ہو جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔ وہ دونوں کوئی مزید بات کیے بنا وہاں سے اٹھ گئے۔ اس وقت وہ داخلی دروازے کی جانب جا رہے تھے۔ اچانک داخلی دروازہ دھڑ سے کھلا اور کئی سفید لباس والے اندر داخل ہوتے چلے گئے۔ وہ سبھی کالی چٹلون، اور سفید ہاف سیلو سٹروں میں تھے۔ ان میں تین لوگ آگے بڑھ گئے، دو ایک طرف چلے اور دوسری جانب، دو بندے دروازے میں کھڑے رہے۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ پورا پلان کر کے آئے ہیں۔

”یہ چھاپہ ہے جہاں۔“ بائیتا کور نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو اس نے بھی ہولے سے کہا۔

”جو بھی ہواب ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔“

”دروازے میں.....“ بائیتا کور نے کہا چاہا کہ اندر سے چند لڑکیاں چیختی ہوئی باہر آئیں۔ وہ انہیں یوں دھکے دے رہے تھے جیسے وہ کوئی جانور ہوں۔ وہ بے تحاشا گالیاں بک رہے تھے۔ وہ وہاں پر موجود لوگوں کے ساتھ یوں سلوک کر رہے تھے جیسے یہ بہت بڑے مجرم ہوں۔ میوزک بند ہو گیا تھا۔ ناچتے، تھرکتے ہوئے جوڑے ایک دم سے رُک گئے تھے۔ سفید لباس والوں نے انہیں بھی آگے لگا لیا۔ وہ انہیں ریوڑ کی مانند ہانکتے ہوئے باہر کی جانب لانے لگے تو ایک سفید لباس والے نے بائیتا کور کے کاندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور بازو سے پکڑ کر آگے کی جانب دھکیلا۔ دوسرے نے جہاں کی گردن پر مارا اور آگے دھکیلا۔ وہ دونوں بھی اس چھاپے کی زد میں آ گئے تھے۔ وہ ان سب کو ہانک کر سڑک پر لے آئے۔ ان میں گوپال نند بھی تھا، جو مسکراتے ہوئے اُن کی جانب دیکھ رہا تھا۔ باہر پولیس کی جیب کے ساتھ قیدیوں والی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ ایک سفید لباس والے نے زور سے کہا۔

”چلو، سب بیٹھو گاڑی میں۔“

اس آواز کی بازگشت میں ایک موٹا سا بندہ بار کے دروازے میں سے باہر آیا اور اونچی آواز میں بولا۔

”میں اس بار کا منبر ہوں۔ تم ایسے نہیں کر سکتے، یہ بھائی کا علاقہ ہے، پہلے اس سے بات کرو۔“

اس کے یوں کہنے پر جیب میں سے کسی ولن کی طرح ایک پولیس آفیسر نکلا، اس نے بھی ویسا لباس پہنا ہوا تھا، وہ قد میں ان سے لمبا، سر سے کافی حد تک منجھا، بھاری چھٹی ٹائپ مونچھیں، فریبہ مائل تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس منبر کے پاس جا کر ایک زوردار تھپڑ مارا پھر کہا۔

”بولو کیا کہہ رہے تھے تم؟“

”دیکھو اے سی پی، تم مجھے چاہے مار دو، لیکن میں اپنے کسٹمر ایسے نہیں لے جانے دوں گا۔ بھائی.....“ اس نے کہا چاہا تو اے سی پی نے اسے گریبان سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ سڑک پر جا رہا۔ اے سی پی نے اپنا سر دس ریوالتور نکالتے ہوئے اونچی آواز میں حکم دیا

”سب کو بھاؤ گاڑی میں، دیکھتا ہوں اس کے بھائی کو،“ یہ کہہ کر اس نے منبر کو لات مارتے ہوئے کہا۔

”چل نکلا اپنے بھائی کو، کتنی دیر میں آئے گا وہ سالاجوہا، میں کھڑا ہوں ادھر۔“

”بھائی تیرا بھگڑا بھائی سے ہے، کسٹمر کو جانے دے، ادھر ہی بات کرتے ہیں۔“ مینیجر نے آڑتے ہوئے کہا۔

”اوئے تیری تو ماں کا.....“ اس نے زوردار گالی کے ساتھ اسے گریبان سے پکڑ کر پھر زمین پر دے مارا۔

ارد گرد کھڑے لڑکے تو پریشان تھے لیکن لڑکیاں زور دیتی تھیں۔ تبھی ان میں سے ایک لڑکی نے آگے بڑھتے ہوئے اے سی پی سے کہا۔

”میں جرمنی سے آئی ہوں، ہم چھ لوگ ادھر وزٹ کے لیے آئے ہیں، آپ ہمیں ایسے نہیں پکڑ سکتے۔“
 ”اوئے اسے پہلے ڈال اندر، اس کی جرمنی تو ادھر پولیس اسٹیشن میں جا کر نکالتے ہیں۔ سالی جرمنی کی۔“
 اے سی پی نے انتہائی غصے میں کہا۔

اس دوران جہال نے بائیکاٹ کور کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کر لیا۔ منجر سیل فون پر وہاں کے حالات بتانے لگا تھا۔ سفید لباس والے لڑکے لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر گاڑی میں پھینک رہے تھے۔ جیسے ہی ایک سفید لباس والے نے بائیکاٹ کور کو پکڑا۔ اس نے پوری قوت سے اس کی ناک پر پھینچ مارا۔ تب تک جہال نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور سیدھا اے سی پی جا پڑا۔ اس کا پہلا ٹارگٹ ریوالور کا قبو میں کرنا تھا۔ اے سی پی کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس پر یوں حملہ کر سکتا ہے۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جہال اسے لیتا ہوا سڑک پر آ رہا۔ اے سی پی کسی اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ تب تک جہال نے اس کی کپٹی پر کھڑی پھیلی کاوار کیا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں وہ مدہوش سا ہو گیا۔ اس دوران جہال نے اپنا پٹل نکال کر اے سی پی کی کپٹی پر رکھ دیا۔ سبھی سفید لباس والے ایک دم سے وہیں رُک گئے۔

”اوئے منجر، جلدی کر، سب کو نکال لو گاڑی میں سے اور بھگا دو، میں دیکھتا ہوں اسے، لگتا ہے اسے زندگی نہیں پیاری۔“ جہال نے اونچی آواز میں کہا۔

منجریوں کا کیا پلٹنے پر ابھی تک حیران کھڑا تھا۔ جب تک وہ آگے بڑھا جو چند لوگ تھے، وہ گاڑی سے نکل آئے۔ وہاں موجود لڑکے لڑکیاں تیزی سے بھاگتے چلے گئے۔ ان بھاگنے والوں میں گوپال مند بھی تھا۔ وہاں میدان میں اے سی پی، سفید لباس والے، وہ دونوں اور منجر دنگ رہ گئے۔ بائیکاٹ کور کو وہ بندہ یاد تھا جس نے اسے دھکا مارا تھا، وہ اس کے پاس گئی اور بالوں سے پکڑ کر الگ کر لیا۔ پھر اپنا پٹل نکال کر اس کے ماتھے پر نال رکھتے ہوئے بولی۔

”جیسے زندگی پیاری ہے وہ اپنے ہتھیار پھینک دے۔“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک نے فائر کر دیا۔ وہ بہت محتاط تھی سفید لباس والے کو لیتے ہوئے سڑک پر لیٹ گئی۔ پھر وہیں پڑے پڑے اس پر فائر کر دیا۔ ان میں سے ایک چیخ مارتے ہوئے گر گیا۔ میدان صاف ہوا تھا یا انہیں باہر آنے میں دیر ہو گئی تھی، یا انہیں گمان نہیں تھا، کچھ بھی تھا، ایسے میں اس بار میں موجود غنڈے اسلحہ سے لیس باہر آ گئے۔ انہوں نے سب کو کور کر لیا۔ جہال دوسری طرف مصروف تھا، اس نے ٹٹول کر اے سی پی کا دوسرا ریوالور نکال لیا تھا۔ نیچے پڑے سفید لباس والے نے بائیکاٹ کور کو قابو کرنا چاہا تو بائیکاٹ کور نے اس پر بھی فائر کر دیا۔ جہال نے اے سی پی کی ٹانگ پر نال رکھی اور ٹرائیکلر دبا دیا۔ جیسے ہی دونوں نے فائر کیا، اسی لمحے انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، اور پھر ایک دم سے ان سب کو چھوڑ کر وہ ایک طرف بھاگ نکلے۔ وہ بھاگتے چلے جا رہے تھے کہ ان کے ساتھ ایک ٹیکسی بھی دوڑنے لگی۔ گوپال نند اس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

”آؤ بیٹھو۔“

اس کے ساتھ ہی ٹیکسی آہستہ ہو گئی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھے تو ٹیکسی ہوا سے ہاتیں کرنے لگی۔
 ”یار اتنی خطرناک جگہ پر بلایا تھا تو نے۔“ جہال نے گوپال نند کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں تو روز ادھر ہی آتا ہوں۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ بھائی کی اس اے سی پی کے ساتھ لگ گئی ہے۔ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا، ضرور اونچے لیول کی گیم ہوگی۔“ وہ بولا۔

”لیکن ہم تو مارے جاتے نا، اب بھی پتہ نہیں کسی چوک پر دھر لیے جائیں۔“ بائیکاٹ کور نے کہا۔
 ”دھیرج رکھو اب کوئی ماں کالا لال، اس علاقے میں سے ہمیں نہیں پکڑ سکتا۔“ وہ چپکتے ہوئے بولا۔
 ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ بائیکاٹ کور نے پوچھا۔

”کامل مل گیا ہے، میں جس بندے سے ملوانے جا رہا ہوں، اس سے اتنی جلدی ملاقات ہو نہیں پاتی۔“ وہ اس لہجے میں بولا تو وہ کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

وہ ایک وسیع وعریض پرانے طرز کی حویلی تھی۔ وہ گیٹ پر ہی رک گئے تو ٹیکسی آگے نکل گئی۔ گوپال نند نے اگر اسے کرایہ نہیں دیا تھا تو یہی گمان کیا جاسکتا تھا کہ وہ انہی لوگوں کا آدمی ہوگا۔ گیٹ پر ہی ان کی تلاشی لے کر اسلحہ رکھ لیا گیا۔ ان میں وہ سروس ریوالور بھی تھا جو اس نے اے سی پی سے چھینا تھا۔ وہ نہتے ہو گئے تھے۔ وہ دونوں گوپال نند کے پیچھے چلتے چلے گئے۔ وہ حویلی کے اندر نہیں گیا، بلکہ اوپر سے گھوم کر حویلی کی کچھلی جانب پائیں باغ کے لان تک چلا گیا۔ جہاں کافی ساری کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ آس پاس چند سیکورٹی والے گھوم رہے تھے۔ وہ ان پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی دو ملازم مشروبات کے ساتھ کافی کچھ کھانے کو بھی رکھ گئے۔ گوپال انہیں سرو کر کے بولا۔

”یہ رام تھواری لعل جی کی آبائی حویلی ہے۔ اس وقت حکومت میں ہیں اور تین منسٹریز ان کے پاس ہیں۔“
 ”تو پھر تم نے ہمیں یہاں لا کر بہت بڑا رسک لیا ہے۔“ جہال نے کہا۔

”ایسا شاید وہی میں ہو سکتا تھا، یہاں تو یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ لو آپ آگئے۔“ گوپال نند نے کہتے ہوئے سامنے دیکھا اور تومند سا چھوٹے قد کا سر سے گنجا شخص آتا ہوا دکھائی دیا جس نے کرتا پاجامہ اور واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں میں لیدر کے ہلکے سلپر تھے۔ اس نے دور ہی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
 ”دیکم ویکم جی، بھئی ابھی تم لوگوں کی میں نے تعریف سنی، بہت دنوں سے میں ایسے ہی کسی بندے کی تلاش میں تھا۔“

”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جی جو آپ کو فون پر بتایا۔“ گوپال نے خوشگوار لہجے میں کہا تو رام تھواری نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس نے بتایا تو ہوگا آپ کو لیکن ابھی تفصیلات نہیں بتا پاؤں گا۔ رابطے میں رہو۔ ہم کام بتا دیں گے۔“
 ”کام جو بھی ہو، وہ آپ کی مرضی کا، لیکن کرنا کیسے ہوگا، یہ ہم جانیں اور ہمارا کام۔“ جہال نے کہا۔
 ”بس، ہماری طرف کوئی انگلی بھی نہ ہو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ایسا ہی ہوگا۔“ جہال نے کہا تو وہ اٹھ گیا پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”ہم آپ جیسے لوگوں کی قدر کرتے ہیں، اس لیے ادھر ملنے کو آگئے، ورنہ اندر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، خیر ملتے رہیں گے باتیں ہوتی رہیں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اُسی تیزی سے اندر چلا گیا۔

”چل، اب تم لوگوں کو چھوڑ دوں۔“ گوپال نے کہا تو وہ اس کے ساتھ باہر کی جانب چل پڑے۔ وہ گیٹ پر آئے تو سوٹ میں لمبوں ایک بندہ وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا پیکٹ انہیں دیتے ہوئے کہا۔
 ”یہ صاحب کی طرف سے آپ کو منہ دکھائی ہے۔“

اس پر جہاں نے گوپال کی جانب دیکھا اس نے لے لینے کا اشارہ کیا تو اس نے وہ پیکٹ لے لیا تو وہ شخص واپس حویلی کی طرف پلٹ گیا۔ وہاں گیٹ سے انہوں نے اپنے پستل لیے، سروس ریوالور وہیں چھوڑ دیا اور باہر آ گئے۔ چند لمحوں بعد وہی ٹیکسی آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔ گوپال نندان کے ساتھ ہی ٹیکسی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔ ذرا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد گوپال نند نے جہاں سے کہا۔

”اتنی جلدی، اتنے بڑے بندے کے ساتھ ملاقات ہو جانا، کچھ عجیب سا نہیں لگا تمہیں؟“

”لگا تو ہے، میں تم سے یہ پوچھنے والا تھا، خیر، تم بتاؤ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ جہاں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”میں تمہیں صاف بتا دوں، یہ سب اتفاق نہیں تھا، بلکہ میں نے اس کی پوری پلاننگ کی تھی، بولو تو ایک تیر سے تین ہزار کیے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ذرا سا خاموش ہوا، جس پر انہوں نے کوئی بات نہ کی تب وہ کہتا چلا گیا۔

”بانتا کور کے بارے میں بہت سنا تھا، اس کے بہت دور تک تعلقات ہیں یہ بھی میں جانتا ہوں، لیکن خود کیا ہے، یہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ سوچا تھا کہ اس سے وہ کام لیا جائے جو ان دنوں ہمارے لیے وبال بنا ہوا ہے لیکن ساتھ میں یہ سوال بھی تھا کہ یہ کر لے گی؟“

”تو پھر؟“ بانتا کور نے جیسے ہوئے کہا۔

”میں نے پلان کیا، تمہیں جان بوجھ کر اس بار میں بلایا۔ ادھر پولیس کو انفارم کیا کہ اس بار میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ بار کے مالک اور اے سی پی کی آپس میں لگی ہوئی تھی۔ اسے موقعہ دیا گیا، کیونکہ بار کا مالک خود کو بھائی سمجھنے لگا تھا اور پچھلے کئی ماہ سے تیواری صاحب کو ہفتہ نہیں بھیج رہا تھا۔ تم لوگوں کا حوصلہ بھی دیکھ لیا، بار کے مالک کو سبق سکھا دیا اور اے سی پی کو اس کی اوقات یاد دلادی، ہمارے کئی کام اڑا کر بیٹھا ہوا تھا۔“

”مطلب تم ہم پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تم بہت خطرناک بندے ہو؟ ایسے ہی نا؟“ بانتا کور نے انتہائی طعنے لہجے میں کہا۔

”تم اسے جو مرضی سمجھ لو، اس نے ڈھٹائی سے کہا۔“

”چل روک ٹیکسی۔“ بانتا کور نے ایک دم سے کہا تو ٹیکسی روک دی گئی۔ وہ دونوں اترے اور جہاں نے وہ پیکٹ واپس اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

”میں ایسا کوئی تمہہ نہیں لیتا، میرے ساتھ کام ڈن کرو تو اپنی مرضی سے لوں گا۔ واپس کر دینا تیواری کو۔“

وہ ایک مارکیٹ میں اتر گئے۔

کیا خیال ہے تمہارا، یہ گوپال نند.....“ بانتا کور نے مارکیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے کہنا چاہا تو جہاں نے اس کی بات کا نٹے ہوئے تمبرہ کیا

”اعتماد والا بندہ نہیں ہے۔“

”لیکن تم جانتے نہیں، یہ مدام تیواری شکل سے جتنا احمق لگتا ہے، یہ اتنا ہی خطرناک ہے اور خفیہ والوں کے اندر تک رسائی رکھتا ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ بانتا کور نے عام سے لہجے میں کہا۔

”چلو، دیکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے موضوع ہی ختم کر دیا اور دوسری باتیں کرنے لگے۔ ایسے میں نوتن کور کا فون آ گیا کہ وہ ان کے ہاں پہنچ چکی ہے۔ کچھ دیر وہاں وقت گزارنے کے بعد وہ بنگلے کی جانب چل پڑے۔

نوتن کور ان کے انتظار میں بیٹھی سیل فون پر گیم کھیل رہی تھی۔ جہاں نے محسوس کیا کہ نوتن کا رویہ بانتا

کور کے ساتھ مودبانہ تھا۔ اس نے پاکستان میں ہونے والی تمام باتیں بتادیں۔ پھر دو سیل فون نکال کر انہیں دیئے۔

”یہ وہاں سے تم لوگوں کے لیے تحفہ آیا ہے۔“

”ان میں کیا خصوصیت ہے۔“ بانتا کور نے پوچھا۔

”یہ جدید ترین ٹیکنالوجی ہے، ابھی بلیک مارکیٹ میں ہے۔ ان سے تمہاری کال کہیں بھی ٹریس نہیں ہوگی۔ بے دھڑک جمال سے بات کر سکتی ہو۔“ نوتن کور نے کہا تو بانتا کور کے چہرے پر انہونی خوشی پھیل گئی۔ چند لمحوں بعد حسرت سے بولی۔

”میں اس سے تب ہی بات کروں گی جب میں اسے کوئی تحفہ دینے کے لائق ہوئی۔“

وہ رات گئے تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہو رہے تھے جب جہاں نے جمال کو کال کر دی۔

☆.....☆.....☆

اس وقت میں سونے کے لیے بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے پر جوش لہجے میں جہاں سگھ بولا۔

”کیسے ہو؟“

”اوئے جہاں لے تو؟ مطلب میرا تحفہ پہنچ گیا۔ اوئے کیا ہے تو؟“

”بہت ٹھیک ہوں۔ واہ گرد کی مہر ہے۔ ممبئی میں ہوں“ اس نے چپکتے ہوئے کہا۔

”اُو خوش کیا۔ تو ایسے کر ساری صورت حال لکھ دے، پھر میں تجھے بتاتا ہوں کہا کرنا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

”ٹھیک ہے، مجھے یہاں سیٹ اپ بنانے میں وقت لگ سکتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، اتنے دن موج کر، بانتا کور بڑے دل والی ہے، وہ بڑی اچھی دوست بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن تیرے لیے بڑا جذباتی ہو جاتی ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے بتایا

”یہ اس لیے کہ وہ خود بہت اچھی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے الوداعی باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔ میرے اندر گھب سا خوشگوار تاثر پھیل گیا تھا۔

میں سوکر اٹھا تو کراچی کے ماحول میں تیزی تھی۔ عام آدمی کے لیے وہی سیاست دانوں کی بیان بازی تھی اور آفیسروں کی طفل تسلیمیاں جاری تھیں۔ ان میں ایک اعلیٰ پولیس آفیسر ثناء اللہ عباسی کا بھی بیان تھا۔ وہ بہت حقیقت کے قریب تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آفیسر اس معاملے کو گہرائی کے ساتھ جانتا ہے۔ میں نے وہ نام ان میں رکھ لیا۔

”پھر کے بعد میں نے فریش ہو کر لیپ ٹاپ کھولا۔ مجھے یقین تھا کہ جہاں کی ای میل آئی ہوئی ہوگی۔ اس نے ممبئی کی ساری روداد لکھ دی، حتیٰ کہ رات اے سی پی اور رام تیواری کی بات بھی لکھ دی تھی۔ تمام حالات ہٹنے کے بعد میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ میرے خیال میں اب ممبئی میں کام کا آغاز ہو جانا چاہئے۔ میں نے اسے ٹیل کا جواب دیا اور نوتن کور کا کچھ ہدایات دیں۔ مطمئن ہو کر نیچے آ گیا تو ڈرائنگ روم میں مہوش بیٹھی ہوئی

تھی۔ اس کے پاس دارا بیٹھا ہوا نگین لگا رہا تھا۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر دارا لہجہ لگانے چلا گیا۔ مہوش نے بتایا کہ زویا اور سلمان واپس کراچی آ گئے ہیں۔ فہیم چونکہ لاہور ہی کا ہے، اس لیے اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ واپسی پر اسے کراچی سے آیا ہوا کارگو لانا ہے۔ میں اور مہوش حالات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ گیت کا فون آ گیا۔

”ایک بری خبر ہے۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”وہ کیا؟“ میں نے غل سے پوچھا۔

”کرامت جو نیچو گروپ کورٹ دھچکا ملا سولہ، لیکن مخالف گروپ کا بھی علاقہ چھین لینے کی کوشش کی ہے۔“ یہ بری خبر تو نہیں، اب یہ جرائم پیشہ کچھ دن آپس میں لڑتے رہیں گے، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا چاہئے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اصل خبر تو اس کے پس منظر میں ہے، یہاں جس بندے کو مار رہے ہیں، وہ بہت بڑا ڈرگ کا سپلائر ہے اور منشیات کی سپلائی کے لیے بچوں تک کو استعمال کرتا ہے۔“ اس نے تیزی سے بتایا

”یہ بھی ان لوگوں کا عام کام ہے۔ ہمارے لیے بری خبر.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”یہ ہے کہ انہوں نے بمتہ خوری آج ہی سے شروع کر دی ہے اور بوری بند لاشوں کی دھمکیاں عام بزنس میں کو بھی دینے لگے ہیں۔ کہیں ہم نے کم برے لوگوں کو ختم کر کے زیادہ برے لوگوں کو آگے تو نہیں کر دیا۔ وہ اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کریں گے۔“

”ان کے بڑوں کا پتہ ہے کچھ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو پتہ ہے ایک اہم سیاست دان ہے رضا ہمدانی، بظاہر بڑا تاجر ہے لیکن جرائم پیشہ ہے۔ وہی سب یہاں دیکھ رہا ہے۔ لیکن انہیں ختم کیسے کریں گے؟“ گیت نے میری بات سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

”تم اس کے بارے میں مجھے معلومات دو، کچھ کرتے ہیں۔“ میں نے اسے کہا۔ تو وہ تیزی سے بتانے لگی۔

میں نے اسی لمحے روی میں سرمد سے رابطہ کیا۔ وہ آن لائن تھا۔ میں نے اسے اپنی ضرورت کے بارے میں بتایا۔ اس نے کچھ دیر بعد بتانے کو کہا۔ میں مطمئن ہو گیا اور گیت سے کہا ابھی کچھ مزید تلاش کرے۔ میں اور مہوش اٹھ گئے۔ لہجہ لینے کے بعد ہم دوبارہ کمرے میں آئے تو گیت کے پاس کچھ مزید معلومات تھیں۔ اس وقت تک سرمد کا فون آ گیا تھا۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد آپ کو علی نواز کا فون آئے گا۔ میں کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ وہ سندھی تھا لیکن بلا کا حوصلے مند اور جرات والا تھا۔ میں نے اپنا فون کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کر دیا کہ سب لوگ بات سن لیں۔

”بہت کچھ سیکھا اور پھر بہت سنا ہے، جی آپ کے بارے میں، بہت خوشی ہوئی کہ میں آپ کے کسی کام آ رہا ہوں۔“ اس نے سندھی لہجہ میں کہا۔

”مجھ سے سیکھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو شاید یاد نہیں، میں نے آپ سے نشانہ بازی سیکھی تھی روی میں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی تھا۔“ اس نے خوشی بھرے انداز میں بات کی۔

”علی نواز اتم میرے لیے نہیں انسانیت کے لیے کام کر رہے ہو۔ فرض کرو تمہارا بیٹا ہے اور کوئی اسے نشے کی لت میں اس حد تک لگا دے کہ وہ نہ مرا ہوا ہو اور نہ زندہ ہو تو تمہاری حالت کیا ہوگی۔“ میں ڈھکی دل سے کہا۔

”میں آپ کے جذبات سمجھ گیا ہوں۔ آپ حکم کریں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”رضا ہمدانی کا نام سنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل سنا ہے؟“ اس نے کہا۔

”ابھی، اس وقت وہ اپنے گٹھری آفس میں ہے، میرا ایک دوست اور تمہارے جیسا بھائی تم سے بات کرے گا اور تم اس سے ڈن کر لو۔ آج شام سے پہلے پہلے اس کا وجود مٹ جائے۔“ میں جذباتی ہو گیا تھا۔

”ہو جائے گا۔ بھائی سمجھو، میں انتظار میں ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر کے جنید اور اکبر سے کہا کہ وہ فوراً اس سے ملنے کے لیے چلے جائیں۔ اسکرین پر رضا ہمدانی کی تصویر آ گئی تھی۔ یہ ان کی کسی سائیٹ سے اٹھائی ہوئی تصویر تھی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ عام لوگوں کی زندگی بچانے کے لیے اگر چند لوگ مار دیئے جائیں تو یہ گھانٹے کا سودا نہیں ہے۔ میں نے گیت سے کہہ دیا کہ ایسے چند بندوں کے نام بتا دے۔ وہ اس کام میں لگ گئی۔

میں ان کے لیے سوچ رہا تھا کہ نون کا فون آ گیا۔

”میں انہی کے پاس ہوں، جس طرح کے بندے تم نے بتائے تھے، ان میں سے صرف ایک آدمی ملا ہے۔

نوجوان ہے، بنگلور کی سیلکون سٹی کا تربیت یافتہ ہے۔ اردن سنگھ نام ہے اس کا۔“

”اسے فوراً اُن کے پاس پہنچا دو۔ رونیت کور کو بھی ادھر ہی بلا لو۔“ میں نے کہا۔

”وہ رات کسی وقت تک آ جائے گا۔ اس وقت وہ تھائی لینڈ میں ہے اور بنگاک انر پورٹ پر ہوگا۔ وہ جب اہلی ممبئی پہنچا، اس کے لیے قریب ہی ایک ہوٹل میں بکنگ ہے، وہ ادھر آ کر آرام کرے گا۔ پھر ہم اسے لے لیں گے۔“ نون کور نے تفصیل سے بتایا

”وہ جیسے ہی ادھر آئے تو مجھے بتانا، میں اس سے بات کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

کوئی دو گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران فہیم واپس آ گیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے چار کارڈن لا کر رکھ دیئے۔ میں نے اسے تازہ صورت حال کے بارے میں بتایا تو وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ جیسے ہی علی نواز کے پاس جنید اور اکبر پہنچ گئے اور انہوں نے ساری بات اسے سمجھا دی تھی تو جنید نے مجھے فون کر کے سب کچھ بتا دیا۔ سامنے اسکرین پر وہ مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ علی نواز ایک وجیہ نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی داڑھی، مونچھیں اور سرخ و سپید چہرہ۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ جی فہیم نے کہا۔

”شام کے چار بج رہے ہیں۔ رضا ہمدانی اس وقت تک اپنے آفس ہی میں ہے۔ جیسے ہی تم لوگ وہاں پہنچو گے، میں سارے آفس کے نظام کو اپنے کنٹرول میں لے لوں گا۔ شرط یہ ہے کہ آفس میں داخلے سے پہلے اسی کہنی کا کوئی ایک کارڈ حاصل کر لو پھر وہ آفس میرے قابو میں آئے گا۔“

”ہو جائے گا۔“ جنید نے کہا۔

”تو پھر سمجھو اس کا آفس کیسا ہے۔“ فہیم بولا پھر اس نے اسکرین پر اس کے آفس کا نقشہ ظاہر کر کے انہیں گاہک پر کرنے لگا۔

”اس کا آفس پورے کا پورا اس کے اپنے کنٹرول میں ہے۔ روڈ سے لیکر اس کے اپنے بیٹھنے والی جگہ تک کوئی بھی اس کی مرضی کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ وہاں پر محتاط نہیں ہوگا۔ جب وہ نہیں ہوتا تو اس کی صورت حال کیا ہوتی ہوگی، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کارڈ میں نے اس لیے کہا ہے کہ سارے دروازے

قربانیوں کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ جو ہر طرح کی قربانی دے چکے ہیں اور دیتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اب بھی سب کچھ کرنے کو تیار ہے کہ یہاں وہ نظام آئے، جس کے لیے پاکستان بنا۔ وہ کون لوگ ہیں جو دین اسلام کے نام پر آج بھی اس عوام کو سنہرے خواب دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ عوام تو آج بھی دین اور ملت کے لیے اپنا آپ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ وہ لوگ جو محبت ملت و وطن ہیں، دین و ملت کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں، انہیں کس نے روکا ہوا ہے؟ پارلیمنٹ ہی کو لے لیں، ایک عام آدمی کو اس تک پہنچنے کے لیے کتنے بیرئیر پار کرنا ہوں گے، دولت، قومیت، برادری ازم، صوبائی عصبیت، فرقہ بازی، یہ بیرئیر کس نے بنائے، یہ نظام بنانے والا کون ہے؟ جس نے قوم کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا، ان میں اس حد تک تفریق پیدا کر دی کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ یہاں قانون ایک نہیں، امیر کے لیے قانون دوسرا ہے اور غریب کی مثال اُدھوردی جاتی ہے۔ نظام تعلیم ایک نہیں، تعلیم کا معیار دولت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ علاج کی سہولت غریب کے لیے نہیں، لیکن غریب کے سرمائے سے نام نہاد اشرافیہ بیرون ملک سے اپنا علاج کرواتے ہیں۔ کس نے اس قوم کی سوچ فکر کو پیٹ میں بند کر دیا کہ ان کا شعور ہی کام نہ کر سکے۔ یہ ڈیرہ شاہی، جاگیر داری، سرمایہ داری ہے جس نے اس ملک کا نظام بنایا ہوا ہے۔ یہ خون آشام اشرافیہ عوام کا لہو چاٹ کر بھی آزاد ہے اور عوام پس رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ اس نام نہاد بے غیرت اشرافیہ کو وہ پاکستان نہیں چاہئے، جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا۔ یہاں محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام چلنا ہے۔ جو انسانی بقا اور حیات جاودانی کا باعث ہے۔ اس نام نہاد اشرافیہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام نہ لا کر دین سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، یہ سراسر نافرمانی ہے۔ اسلام کے حقیقی ثمرات سے دور رکھنے والے یہی بے غیرت اشرافیہ ہے، جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام نہ لا کر ان ثمرات سے محروم کر دیا اور یہ قربانیاں دینے والی قوم کے اُن جذبات سے کھیل رہے ہیں، جو وہ آج بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام لانے کو بے تاب ہیں۔

یہ موجودہ نظام ایسا نہیں ہے جس میں قوم کی صلاحیتوں کو ملکی تعمیر و ترقی کے لیے پوری طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہاں تو قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں کہ کہیں یہ لوگ باصلاحیت یا ہنرمند نہ بن جائیں، بے روزگاری کا عفریت آج بھی نوجوان کو نگل رہا ہے۔ کیوں؟ کیا یہ نام نہاد اشرافیہ خود کو آسمانی مخلوق سمجھتی ہے؟ فلاحی مملکت میں ٹیکس کے عوض سہولیات دی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں ایک بھکاری بھی ماچس کی ڈیپا لیتا ہے تو وہ بھی اس پر ٹیکس دیتا ہے۔ عوام کو سرتاپا ٹیکس دینے والی مشین بنانے کے باوجود انہیں کوئی فائدہ نہیں۔ ٹیکس کے نام پر یہ وہ جتہ ہے، جو روزانہ عوام دے رہے ہیں اور ہر ماہ بعد گیس پانی اور بجلی کا ایک ”ترقی پذیر بل“ تھما دیا جاتا ہے۔ جس کی پوری طرح رسائی ہی نہیں ہے۔

پاکستان میں نہ تو دریاؤں کے پلوں کی توسیع ہو سکی اور نہ ہی نئے ڈیم بنانے کی روایات موجود ہے۔ اسمبلیوں میں بیچ کر ڈیم بنانے کے عمل کو روکنے والے ملک دشمن کون لوگ ہیں، عوام یا اشرافیہ تاکہ ملکی، زرعی اور توانائی کی ضرورت پوری نہ ہو سکیں۔ ہر سال عوام کو غرق اور تباہ و برباد کرنے والے یہ کون لوگ ہیں؟ جن کا کوئی بھائی، بہن یا بیٹا کبھی نہیں ڈوبا، ان کے محلات قائم ہیں۔ کبھی سیلاب میں کسی کا محل ڈوبتا ہے؟ صرف قوم غوطے کھا رہی ہے۔ پھر عوام کی مدد کا ڈرامہ کرنے والے، ہر برس کرپشن کرپشن کا راگ الاپنے والے ہی درحقیقت اُمت کے دشمن ہیں اور قانون الٰہی، نظام مصطفیٰ کی مخالفت کا طوق گلے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ جعلی ہمدرد ہیں۔ جو ایک جال کی مانند ہیں تاکہ قوم اس سے نکل ہی نہ سکے اور پانی میں ڈوب کر مرنے رہے۔ عوام ڈوب رہے اور سر اٹھانے کی

جرات نہ کرے۔ خدارا، شعور کی آنکھیں کھولو اور ان کے اصل چہرے دیکھو۔ ان کے پاؤں کے نیچے سے نکلوا اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ۔ ڈیم بنانے میں رکاوٹ کون ہیں؟ یہ سیلاب میں ڈوبتی عوام یا بیرونی امداد کھانے والے بے غیرت اشرافیہ؟

اس نام نہاد اشرافیہ کو یہ معلوم ہے کہ جس دن قلمند لاہوری کا پیغام اس قوم نے پڑھا اور سمجھ لیا تو ہر انسان ایک تلوار ہوگا اور اگر ان میں کروڑوں تلواروں میں سے ایک کروڑ تلواریں بھی نکل آئیں تو کون کیا کرے گا؟ نام نہاد اشرافیہ کیا کرے گی، یہ لوگ تو پہلے ہی موت سے گزر گئے ہیں۔ بغیر تیغ و سناں، موت سے گزر کر یہ ملک حاصل کیا۔ اس قوم کے سامنے لا الہ الا اللہ ہی تھا۔ تو اب یہ محمد رسول اللہ کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ نام نہاد اشرافیہ اور وہ لوگ جو اس ملک و قوم کے دشمن ہیں، یہ جان لیں جب پاکستان بنا تھا تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا، آج ان کے پاس ضرب حیدری ہے، وقت لگ سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا نظام یہاں کوئی نہیں روک سکتا کہ یہ ملک بنا ہی اسی لیے ہے۔ اس ملک کی قیادت اور عزت و غیرت فقط یہی نظام ہے کیونکہ خودی کا سر کہاں لا الہ الا اللہ..... خودی کا سر عیساں محمد رسول اللہ۔ یہی میرا پیغام ہے اور یہی میرا مقصد۔

میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس لیے کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے ہی کہا۔

”تم لوگ اگر سوچنا چاہتے ہو تو سوچ لو۔ جو رہنا چاہتا ہے رہے جو جانا چاہتا ہے چلا جائے۔“

میں نے کہا اور اٹھ کر اوپر چلا گیا۔ میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں نے انہیں صاف بتا دیا تھا، میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

مغرب ہو جانے کے بعد جب میں نیچے آیا تو سبھی کو اپنی اپنی جگہ دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔

”مزید کوئی بات نہیں ہوگی، سب تمہارے ساتھ متفق ہیں اور شاید ہم بھی یہی چاہتے ہیں کیونکہ ہماری اس دنیا

میں رہنے کی وجہ بھی انتقام ہی ہے، جو اس معاشرے کی ناانصافی کے باعث پیدا ہوا۔ اب بتاؤ کرنا کیا ہے؟“

”وہ بھی بتا دوں گا، ابھی معاشرے کے ان ناسوروں کو ختم کرنا ہے، میرے خیال میں گیت تم نے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”تمیں بندے چتے ہیں ہیں میں نے۔“

”وہ علی نواز کو بتا دو۔ ادھر کراچی میں گیت، زویا اور سلمان رہیں گے، اکبر اور جنید ادھر آجائیں۔ ہمیں اب

ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کرنا ہے۔“

”اوکے ہو گیا۔“ سلمان نے کہا۔

”اب یہ کام جلد از جلد ہو جائے تو بہتر ہے۔“ میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر لان کی جانب چل دیا۔

☆.....☆.....☆

جہاں اور باغیا کور کا حلیہ کافی حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہ دونوں یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے کسی دفتر میں کام کرنے والا کوئی جوڑا ہو اور ابھی ابھی کسی دفتر سے اٹھ کر آئے ہوں۔ ان کے پاس پرانے ماڈل کی کار تھی جسے جہاں ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جا رہے تھے۔ ان کا رخ اتر پورٹ کی طرف تھا، جس کے قریب ہی اہیں ہوٹل میں اردو سنگھ آکر ٹھہرا تھا۔ جس طرح کی معلومات اس کے بارے میں تھیں، وہ لوگ اسے بہت مہمیا کر رکھنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ ان کے درمیان اردو کے بارے میں بہت دیر تک بات ہو چکی تھی۔

اس وقت وہ مہاتما گاندھی روڈ پر اگر وال مارکیٹ کے پاس تھے۔ وہاں سے کچھ آگے انہوں نے ٹرن لے کر نہرو روڈ پر جانا تھا کہ بائیکاٹ کور کا سیل بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا اور اضطرابی انداز میں بولی۔
”رَب خیر کرے، اگل زوردار سنگھ جی کا فون ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کال رسیو کر لی اور ساتھ ہی اسپیکر آن کر دیا کہ جہاں بھی سن لے۔

”اوچر کہاں ہو تم؟“ زوردار سنگھ نے پوچھا۔

”جی، ادھر ہی ہوں، ایئر پورٹ کی طرف جارہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا

”وہ بات یہ ہے پتر کہ وہ سندھپ سنگھ نہیں ہے جو ڈاکٹر کے پاس ایڈمٹ تھا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”جی، جی ہاں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ڈاکٹر کا فون آیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ لوگ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں۔“ بوڑھا زوردار سنگھ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

”وہ کون تھے۔“ بائیکاٹ کور ایک دم سے پریشان ہو گئی

”یہ اسے نہیں معلوم ہوا، وہ اُسے گمن پوائنٹ پر لے گئے ہیں۔“ اس نے بتایا

”اب کیا ہوگا؟“ وہ تشویش سے بولی۔

”تلاش کرتے ہیں، کہتا ہوں کسی کو کیونکہ میں تو سامنے نہیں آ سکتا۔“ اس نے کہا۔

”اوکے، پھر ہم ہی اُسے دیکھتے ہیں۔ کہاں ہے اس کا اسپتال؟“ بائیکاٹ کور نے کہا تو زوردار سنگھ نے وہ پوری لوکیشن میپ کر دینے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ جہاں نے گاڑی روک دی۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بہت بڑا لارم ہے بائیکاٹ؟“

”میں سمجھتی ہوں، ایسا ہی ہے۔ مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم سے غلطی کہاں پر ہوئی؟“ بائیکاٹ کور نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ جہاں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”بظاہر سندھو کا کسی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے پاس وہ پرسوں رات پہنچا، مطلب کوئی اس کی تاک میں تھا؟ اگر کوئی اس کی تاک میں تھا تو کیا چاہتا ہے؟“

”بائیکاٹ! دو طرح کے لوگ ہی ہیں جو اسے پکڑنا چاہتے ہوں گے۔ ایک وہ جنہوں نے اسے جزیروں کے لیے اغوا کیا تھا۔ دوسرا وہ جنہیں ہم نے مل کر مارا ہے۔ میرے خیال میں تیسری پارٹی ابھی کوئی ہے نہیں۔“ جہاں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اگر یہ بھی نہ ہوئے تو؟“ بائیکاٹ کور نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر سوچنا ہوگا۔ پھر معاملہ لمبا ہو سکتا ہے۔“ وہ بولا۔

”دوسری بات یہ ہے کہ سندھو بھی زوردار سنگھ جی کا نام جانتا ہے اور ڈاکٹر بھی۔ اگر تشدد کے ذریعے انہوں نے نام اگل دیا تو میں بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔“ اس نے غصہ میں بھرے ہوئے لہجے میں کہا تبھی زوردار سنگھ کی طرف سے پیغام مل گیا۔ اس نے پڑھا اور زیر لب دھیمے سے بولی۔

”یہ تو کلابہ کا علاقہ ہے۔ یہاں سے کافی دور۔ اب ہمیں وہاں نکلنا ہوگا۔“

”دیکھو، جو ہونا تھا وہ ہوا، جنہیں مارنا ہوتا ہے وہ مار ہی دیتے ہیں اور اغوا کرنے والے ہمیشہ رابطہ کرتے ہیں۔ انتظار کرنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی رابطہ تو ہوگا۔“ جہاں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم جو کہہ رہے ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ نام اگلوانے کے لیے.....“ بائیکاٹ کور نے کہا۔

”اس اردو سنگھ جی کا کیا کرنا ہے۔ اب فیصلہ تمہارا ہے، اسے پہلے ٹھکانے تک پہنچائیں یا چلیں کولابہ میں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”میرے خیال میں فون کور کے ذمے لگاتے ہیں کہ وہ اسے ڈیل کر لے، ہم چلتے ہیں کولابہ۔ کیا کہتے ہو؟“ اس نے جہاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اوکے۔“ جہاں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا اور گاڑی بڑھا دی۔

راستے میں اس نے فون کور سے رابطہ کیا اور اسے صورت حال بتائی۔ پھر ان کے درمیان یہ رابطہ مسلسل رہا۔ یہاں تک کہ وہ کولابہ پہنچ گئے۔ ان کا ٹریک بتا رہا تھا کہ جانا کہاں ہے۔

وہ اسپتال کے سامنے تھے۔ نیلے رنگ کا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ انہوں نے کار پارک کی اور سیدھے ڈاکٹر جگدیش سنگھ کے کمرے میں جا پہنچے۔ وہ ادھیڑ عمر، پتلا سا، لمبے قد کا تھا۔ اس نے عینک لگائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اپنا تعارف کرایا۔ تب اس نے کہا۔

”ہاں ابھی بھائی زوردار کا فون آیا تھا۔ میں تو بہت پریشان ہوں۔ وہ بندہ آیا بھی پرسوں رات تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے کل ہی فارغ کر دوں لیکن.....“

”وہ کون لوگ تھے، کوئی پتہ چلا؟“ جہاں نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں اس وقت یہاں نہیں تھا، محلے کے لوگ ہی تھے۔ میں نے اس کے اغوا کے بارے میں ابھی پولیس کو بھی نہیں بتایا۔“

”آپ نے اس کی فائل تو نہیں بنوائی اور یہاں لوگوں کو.....“ بائیکاٹ کور نے پوچھا۔ تو اس نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، ابھی کچھ نہیں تھا۔“

”آپ پولیس کو اطلاع دے دیں۔ انہیں یہی بتائیں کہ اسے کچھ لوگ بے ہوشی کی حالت میں لائے تھے۔ ایک فائل تیار کر لیں اور اس میں کوئی بھی جعلی ایڈریس اور نام لکھ لیں کہ وہ یہی لکھوا گئے ہیں۔ آج انہی لوگوں نے آکر اسپتال کے چار جز دیئے اور اسے لے گئے ہیں۔ جبکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔“

”اور یہ کہ آپ کو پہلے ہی سے شک تھا کہ کوئی بڑا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایک دو دن دیکھنے کے بعد وہ مریض بالکل ٹھیک تھا۔“ بائیکاٹ کور نے کہا۔

”اوکے میں کہہ دوں گا، بلکہ ابھی پولیس بلوا لیتا ہوں۔ اب میں اس معاملے کو اپنے انداز میں دیکھوں گا۔ اب مجھے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے۔ آپ لوگ جانیں اور وہ مریض جانے، میں مزید کچھ نہیں کر پاؤں گا۔“ اس نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔ اس کا یہ کورا پن دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ وہ فورسز کو سب کچھ بتا سکتا ہے۔ انہیں ڈاکٹر جگدیش سنگھ کے کمرے سے نکلتے ہوئے کافی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اس لیے گئے تھے کہ اغوا کرنے والوں کا کوئی سراغ ملے۔ مگر انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

”اب بولو کیا کرنا ہے؟“ بائیکاٹ کور نے راہداری میں چلتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے تو یہ ڈاکٹر ہی غلط لگتا ہے۔“ جہاں نے کہا تو بائیکاٹ کور نے ایک دم سے چونک کر کہا۔

”ممکن ہے یہ زوردار سنگھ کو دھوکا دے رہا ہو؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

”پھر مجھی یہ سوال رہے گا کہ کیوں اور کون لوگ؟“ اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔
”یہ ایک لمبی بحث ہو سکتی ہے۔ بہت سارے سوال پیدا ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ہمیں زوردار سنگھ سے بات کر لینی چاہئے، ان کے پاس کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔ کوئی راستہ نکلے گا، پھر کرنا تو ہی نے ہے۔ یہاں سے نکلو، پھر دیکھتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو وہ ایک دم سے مانتے ہوئے بولی۔
”اوکے ڈن۔ چلو۔“

دو دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے راہداری پار کر کے استقبالیہ ہال میں آ گئے۔ وہ وہاں رکے نہیں، آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

وہ اسپتال سے باہر آ گئے۔ اس دوران باغیچہ کور نے فون کر کے پوری صورت حال زوردار سنگھ کو بتادی۔ اس نے بھی آ جانے کو کہا۔ اس وقت وہ پارکنگ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک دم سے چار لوگ کاروں کی اوٹ سے نکلے اور ان پر پل پڑے۔ ایک زوردار سنگھ جہاں کی گردن پر پڑا تھا۔ اگرچہ وہ سہار گیا لیکن اس کے ساتھ دوسرے نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ یہی کچھ باغیچہ کور کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اچانک افتاد پر وہ گھبرے تو گئے لیکن انہوں نے جیسے ہی مزاحمت کی ایک پانچواں بندہ ریوالور تانے سامنے آ گیا۔
”رک جاؤ۔“ اس نے بڑے کھردرے لہجے میں حکم دیتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں انہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے اور فوراً ہی انہوں نے بھی اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔
”کون ہو تم لوگ؟“ جہاں نے پوچھا۔

”سوال کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔ صرف ہم نے پوچھنا ہے اور تم لوگوں نے جواب دینا ہے۔“ سامنے والے نے اسی کھردرے انداز میں کہا تو پارکنگ میں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔
جہاں اور باغیچہ حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پیچھے دو، دائیں بائیں دو اور ایک سامنے پھسل تانے کھڑا تھا۔ وہ بھاگنا تو کیا لڑنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔
”کون ہو تم اور اس طرح ہمیں کیوں.....“ جہاں نے پوچھا تو سامنے والے نے کھردری آواز میں تلخی سے جواب دیا۔

”بھونکتا کیوں ہے، بتایا نہیں سوال صرف ہم نے کرنا ہے، تم نے صرف جواب دینا ہے؟“

”پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟“ جہاں نے یوں کہا جیسے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔

”وہ جمال کدھر ہے، جسے تو نے جزیرے سے اٹھایا تھا۔ اب یہ مت کہنا کہ تجھے پتہ نہیں۔“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”میں ہی جمال ہوں۔ بولو کیا کہنا ہے؟“ جہاں نے اعتماد سے کہا۔

”جب تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ ہوگا تو تیرے بدن کی بوٹی بوٹی بولے گی کہ جمال کدھر ہے۔“ وہ انتہائی نفرت سے بولا۔

”سندھ کدھر ہے؟“ جہاں نے جواب دینے کی بجائے پوچھا تو اس نے غصے میں کہا۔

”میرے پاس ہے، وہ بھی سب کہے گا۔ جس طرح تم بکو گے۔“ یہ کہہ کر اس نے پھسل تانتے ہوئے جہاں

پر لٹا ہیں جمائے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”چلو، انہیں لے چلو۔“ ایسے میں ان چاروں نے انہیں آ کر پکڑ لیا اور پاس کھڑی ایک ہائی ایس کی جانب بڑھے۔ ابھی وہ دو قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک دو لوگوں کی چٹخیں بلند ہوئیں اور انہوں نے بے ساختگی میں باغیچہ اور جہاں کو چھوڑ دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جس کا فائدہ انہوں نے اٹھایا۔ گولی کسی نے بھی چلائی ہو، فی الوقت گرفت تو انہی کی کمزور ہوئی تھی۔ انہوں نے پہلے پھسل والے ہاتھ کو قابو کیا، دوسرا زوردار سنگھ ان کے پھرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑا گئے۔ دونوں نے بیک وقت اپنے اپنے گھٹنے کا استعمال کیا، وہ ایک دم سے چپچے اور ان کی گرفت مزید ڈھیلی پڑ گئی۔ دونوں نے حملہ آوروں کے پھسل چٹخیں لیے۔ جب تک ایک اور فائر ہوا، وہ پانچواں جس نے پھسل تان کر باتیں کی تھیں، وہ کراہتا ہوا ز میں بوس ہو گیا۔ باغیچہ اور جہاں دونوں ہائی ایس میں گھس گئے۔ تبھی جہاں نے باہر کا منظر دیکھا۔ پارکنگ میں چند لوگ موجود تھے۔ جو تلخی روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔

”جہاں گھبراتا مت، ہم پہنچ چکے ہیں۔“ فون کی سانس سے آواز آئی تو وہ باہر نکل آئے۔ ان پانچوں کو لائٹنگ چمکا تھا۔ لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ کون زندہ ہے اور کون زندہ نہیں رہا۔ جہاں اسی پانچویں بندے کے پاس گیا اور ٹھوک مارتے ہوئے پوچھا۔

”اب جواب دو گے یا مرنا پسند کرو گے؟“

”میں مر رہا ہوں، مجھے بچاؤ۔“ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”ایک شرط پر، ابھی اسپتال لے جاؤں گا، بولو تم لوگ کون ہو اور سندھ کہاں ہے؟“

”ہمیں آفیشل آرڈر ملے ہیں کہ یہاں سے سندھ نامی بندے کو اٹھانا ہے اور جو بھی اس کی معلومات کے لیے آئے، اسے بھی پکڑنا ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”کس نے دیئے یہ آرڈر، آرمی، را، پولیس؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا۔

”پولیس کا.....“ اس نے مشکل سے بتایا

”سندھ کہاں ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ہمارے ہی ایک سیف ہاؤس میں ہے۔“ اس نے اکتاتے ہوئے بتایا

”رابطہ کرو اور بتاؤ کہ تم کس حالت میں ہو۔ اسے واپس لایا جائے، ورنہ تم پانچوں تو گئے۔“ جہاں نے کہا۔

”وہ ابھی تک میری ہی کھڑی میں ہے۔ میں مر گیا تو وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ مجھے اسپتال لے چلو۔“ اس کے کہنے پر جہاں نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر ایک دم سے پھسل نکال کر اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔

”ہمیں اس کی اتنی ضرورت نہیں، بھلے مار دو اسے۔ لیکن اب ممبئی پولیس کے ساتھ ہماری جنگ شروع ہے۔

لو، مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے فائر کر دیا۔ اس نے دوسرا سانس بھی نہیں لیا اور اس کا سر اٹھک گیا۔ پھر اس نے باقی چاروں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ان چاروں کو دیکھو۔ جو زندہ ہو اس سے پوچھو، سندھ کہاں ہے؟ جو جواب نہ دے اسے گولی مار دو۔ اور ان کے تل فون نکال لو۔“ جہاں نے تیزی سے کہا۔

”ایک کو گولی نہیں لگی۔ باقی تینوں مر چکے ہیں۔“ باغیچہ کی آواز گونجی تو قریب پڑا شخص نے جو زندہ بچا تھا تیزی

سے بولا۔

”وہ اسی علاقے کے سیف ہاؤس میں ہے۔“

”کہاں ہے وہ سیف ہاؤس؟“ بائیتا نے پوچھا تو اس نے پتہ بتا دیا۔ وہ قریب ہی دیو کی مگر میں تھا۔
”تم لوگ اسے لے کر نکلو، ہم دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اس نے غلط بیانی کی ہو تو اسے راستے میں مار کر پھینک دینا۔ جلدی، وقت کم ہے، فائرنگ کی آواز بہت دور تک گئی ہوگی۔“ نوتن کور نے کہا تو جہاں نے قریب پڑے بندے کو اٹھایا اور ہائی ایس میں پھینک دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ باقی مرے ہوئے لوگ لہو لہان ہو رہے تھے۔ چند لمحوں ہی میں وہ وہاں سے چل دیئے۔ نوتن کور کے ساتھ آئے لوگ ان کی دین کے آگے پیچھے تھے۔ اگرچہ فائرنگ سے کافی سارے لوگ متوجہ ہو گئے تھے لیکن کوئی قریب نہیں آیا تھا۔ وہ کسی مزاحمت کے بغیر وہاں سے نکل گئے تھے۔ سڑک پر آتے ہی ان کے راستے جدا ہو گئے۔ ذرا سا فاصلہ طے پایا تھا کہ اس زندہ بندے کا سیل فون بول پڑا۔ وہ مضطرب ہو گیا تو بائیتا نے اسے کہا۔
”کرو بات۔“

”میرے آفیسر کا فون ہے۔“ اس نے اسکرین پر دیکھ کر کہا تو اس نے فون پکڑ کر اسپیکر آن کر دیا۔
”جی سر!“

”کہاں ہو تم لوگ، ادھر فائرنگ کی آواز.....“

”سرباقی سب مر گئے ہیں۔ میں ہی بچا ہوں اور ان کی گریٹ میں ہوں۔“ اس نے صورت حال بتا دی

”وہاں، یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ دوسری طرف سے انتہائی حیرت میں کہا گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر۔ اگر اس بندے کو آزاد نہ کیا گیا تو میں بھی مر جاؤں گا سر۔“ اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ سب کیسے ہو گیا۔“ آفیسر نے پوچھا تو بائیتا نے اس سے فون پکڑ کر کہا۔

”اُوئے اُوئے کے پٹھے، تجھے لوگوں کو جان سے مارنے کا حق ہے، تو کیا دوسروں کو جان بچانے کا بھی حق نہیں۔ سنو، اگر اگلے پانچ منٹ میں سندو آزاد نہیں ہوا تو ہم اس بندے کو تو ماری دیں گے اور پھر اگلا ٹارگٹ تم اور تیرے اگلے پیچھے ہوں گے۔“

”دیکھو، تم لوگ مجرم ہو، اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو، میں.....“ اس نے کہنا چاہا تو بائیتا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”گلتا ہے تم فلمیں زیادہ دیکھتے ہو، فضول باتیں مت کرو، پانچ منٹ شروع ہوئے پانچ سیکنڈ ہو گئے ہیں۔“
”اوکے“ میں اسے واپس کر دیتا ہوں۔ لیکن اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرے جوان کو نہیں مارو گے۔“ آفیسر کی آواز آئی۔

”وقت کم ہے، ڈیل کرو، ورنہ ہمارا آدمی تو سمجھو مر ہی گیا ہے، لیکن پھر کیا ہوگا، یہ تم جانتے ہو۔“ بائیتا نے غصے میں کہا۔

”یہ جو تمہارے پاس بندہ ہے، اسے معلوم ہے۔ یہ تم لوگوں کو لے آئے گا۔“ آفیسر نے پھر کٹ جتنی کی تو بائیتا نے فون بند کر دیا۔ پھر وہ فون اپنے ہاتھ ہی میں رکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھ جوان، سوچ کر جواب دینا، جو پہلے پتہ بتایا تھا، وہی درست ہے یا.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تو وہ سوچتے ہوئے ہی بولا۔

”سو فیصدی درست ہے، اب اگر وہ لوگ بندے کو آگے پیچھے کر دیں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور روایت کو آفیسر کا نمبر دے کر کہا کہ اس کی لوکیشن دیکھ کر بتاتی رہو۔ اگر یہ کہیں ادھر ادھر حرکت کرے تو فوراً بتانا۔

ان کی دین تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ جہاں کا دماغ اس سے بھی تیز بھاگ رہا تھا۔ اسے کہیں نہ کہیں گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دم سے ان کے گرد گھبراہٹ ہو جانا بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس کا پہلا خیال گوپال مندی کی طرف گیا، کہیں اس نے تو بے غیرتی نہیں کی۔ مگر وہ تو بات رات تک ختم ہو گئی تھی۔ اگر اس کی طرف سے ایسا کچھ ہوتا تو وہ رات ہی دھر لیے گئے ہوتے۔ جس طرح آفیسر نے اُسے وہاں بلایا تھا، وہ اکیلا تو نہیں ہوگا۔ وہ تو ان کے لیے پوری فیلڈنگ لگائیں گے۔ تو کیا سندو کو ان کی گرفت میں مر جانے دیں؟ یہ سوال ابھرا تو اسے ایک دم سے تکلیف ہوئی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، چاہے چند دن کا ساتھ تھا، وہ اسے چھڑانے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہ سوچتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا۔ جو بھی ہوگا اب دیکھا جائے گا۔ اس کے خیالات کی تار جب ٹوٹی جب، بائیتا کا فون بج اٹھا۔ وہ چند لمحوں بات کرتی رہی، پھر فون بند کرتے ہوئے بولی۔

”یہ جوان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہی لوکیشن ہے۔“

”چلو، پھر نوتن کو بتاؤ، ادھر ہی نکلیں۔“ جہاں نے کہا۔ ہی تھا کہ زوردار سنگھ کا فون آ گیا۔

”جی اٹکل۔“ بائیتا نے فون رسیو کرتے ہی کہا۔

”کہاں پر ہو؟“ اس نے پوچھا تو اس نے اپنی صورت حال بتا دی۔

”اس بندے کو قابو میں رکھو اور فوراً کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچو۔ ادھر محل مہر روڈ والے ٹھکانے پر مت جانا۔ وہاں اگر کوئی ساتھی ہے بھی تو اسے وہاں سے نکل جانے کا کہو۔ میں بعد میں فون کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

بائیتا نے جہاں کو بتائے بغیر پہلے روایت کو فون کیا کہ وہ وہاں سے پوری احتیاط کے ساتھ فوراً نکل جائے اور وہیں پہنچے جہاں سے آئی تھی۔ وہ اس سے بعد میں رابطہ کرے گی۔ بعد میں اس نے جہاں کے کان میں بتایا۔ اس نے وین کی اسپینڈ بڑھا دی۔ یہ اس کی اضطرابی کیفیت کا لاشعوری اظہار تھا۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ بائیتا نے نئی صورت حال کے بارے میں نوتن کو روک بھی آگاہ کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ کچھ دیر بعد جہاں نے ایک مارکیٹ کی پارکنگ میں وین روک دی۔ اس وقت تک انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کس علاقے میں ہیں۔ بائیتا نے اس بندے کو زخمی جوان پر ترپال ڈال دی۔ اس کا سیل فون اٹھا کر دین سے نیچے اتر آئی۔ جہاں پہلے ہی نیچے اتر آیا تھا۔ نوتن کو اپنے ساتھیوں سمیت ان سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ نوتن اور بائیتا کے درمیان مسلسل رابطہ تھا۔ وہ دونوں ٹھپکتے ہوئے ایک اسٹور میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے انہوں نے جوس لیے اور بڑے آرام سے پیتے ہوئے باہر آ گئے۔ اس دورانیے میں انہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ گیا۔ انہیں زوردار سنگھ کے فون کا شدت سے انتظار تھا۔ تبھی ان کا فون آ گیا۔

”اس وقت تم لوگ کہاں ہو؟“

”ہمیں زیادہ تو نہیں معلوم، پراسٹور کا نام بتا دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے بتا دیا

”اوہ تم تو اس وقت ہمیں مگر کے سولہ نمبر روڈ پر ہو۔ یہ مارکیٹ اسی روڈ پر ہے۔ یہ چار کوپ گاؤں کے آس

پاس ہے۔ خیر، میں ایک نمبر دے رہا ہوں، اس کے ساتھ رابطے میں ہو جاؤ۔ ابھی کچھ دیر بعد تم لوگوں سے کچھ بندے ملیں گے۔ ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنا، یقین نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔ بہت ساری باتیں تمہاری منتظر ہیں۔ میں بعد میں رابطہ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر زوردار سنگھ نے پھر فون بند کر دیا۔ جیسے ہی اس نے جہاں کو بتایا تو اس نے تہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تیرا انکل زوردار سنگھ جی، کہیں زیادہ اسرار تو نہیں ہو گیا۔ اتنا سسپنس پھیلا یا ہوا ہے۔“ اس نے آخری سب لیا اور خالی ڈبا ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اس سے پہلے بائیتا اس کی بات کا جواب دیتی اس کا فون بج اٹھا۔

اس کی بیلو کے جواب میں کسی نے کہا۔

”ہم لوگ دس منٹ تک پہنچ پائیں گے، اپنا خیال رکھنا۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

انہیں دس منٹ گزارنے بہت بھاری ہو رہے تھے۔ اس دوران بائیتا فون ہی کرتی رہی کبھی فون کور اور کبھی زوردار سنگھ کو۔ تبھی ایک شاعر فور وہیل مارکیٹ کی اسی پارکنگ میں آرکی۔ وہ دونوں ایک طرف کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا، کچھ گاڑیاں آگے پیچھے سڑک پر ہی رُک گئی تھیں۔ ایسے میں بائیتا کا فون بجا۔ اس نے کال ریسیو کی تو کسی نے بھاری آواز میں کہا۔

”ہم اسٹور کی پارکنگ میں ہیں، تم لوگ کہاں ہو۔“

”تم فور وہیل میں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اوہ تو یہ تم دونوں ہو۔ آ جاؤ۔“ فور وہیل کا سیاہ شیشہ نیچے ہوا تو ایک بھاری بدن والے بندے کا کلین شیو چہرہ دکھائی دیا جو ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ کبھی دروازہ کھلا تو وہ حیران رہ گئے۔ سامنے آنکھیں بند کیے سندو پڑا تھا۔

”کیا یہ.....؟“ بائیتا سے کہا نہیں گیا۔

”نہیں، صرف بے ہوش ہے۔ تم لوگ بیٹھو، چلیں۔“ اس بھاری بدن والے نے کہا تو وہ فور وہیل میں بیٹھے ہی تھے کہ وہ چل پڑے۔ جہاں نے دین میں پڑے بندے کا سیل فون نکال کر پھینکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سب کیسے؟“

”کہیں سکون ملتا ہے تو پوری تفصیل سے بتاؤں گا۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ممبئی میں ہی ہیں، جہاں ہم جا رہے ہیں، وہ کافی محفوظ جگہ ہے۔“ اس نے کہا۔

”میری ایک دوست میرا انتظار کر.....“

”فون کورنا، اسے بھی بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں وہ لڑکا، جو تمہاری لینڈ سے آیا ہے، کیا نام ہے ہاں اردو سنگھ، وہ بھی پہنچ جائے گا۔ اب تم محفوظ ہو۔“ اس نے کہاں تو جہاں نے بائیتا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ سڑک سے اتر کر آئند پارک کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ پھر دریائے دھانی سر کے کنارے بنے ایک خوب صورت دو منزلہ فارم ہاؤس میں جا پہنچے۔ اگرچہ رات کے وقت اتنا دکھائی تو نہیں دے رہا تھا، لیکن پھر بھی یہ احساس تھا کہ سرسبز پہاڑیوں کے درمیان، پودوں اور بیلوں سے لدا ہوا وہ فارم

ہاؤس کافی بڑا تھا۔ ممکن ہے وہ بہت حسین دکھائی دینے والا ہو، مگر رات کے اندھیرے اور گاڑیوں کی روشنی میں لفظ اعجاز ہی کیا جاسکتا تھا۔ پورچ میں فور وہیل رکی تو سبھی نیچے اتر آئے۔ اندر سے چند ملازمین باہر آئے، انہوں نے بے ہوش سندو کو اٹھایا اور اندر لے گئے۔

”ابھی ڈاکٹر آ جاتا ہے، یہ ہوش میں آ جائے گا۔ تم سب لوگ فریش ہو جاؤ۔ ابھی ڈنر پر ملتے ہیں۔“ بھاری بدن والے نے کہا اور اندر کی جانب چلا گیا۔ جہاں کو اگرچہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ملازم کے کہنے پر اس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے، جدھر وہ لے جانا چاہتا تھا۔

ڈنر پر ان دونوں کے علاوہ وہی بھاری بدن والا موجود تھا۔ اس نے میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر ٹیپکین درست کرتے ہوئے کہا۔

”سندو کو ہوش آ گیا ہے۔ ڈنر کے بعد ہم اسے دیکھ پائیں گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، وہ ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا، پھر جیسے اسے یاد آ گیا، ”اور ہاں نام تو میرا تھیا سنگھ ہے، لیکن لوگ مجھے لی ایس کے نام سے جانتے ہیں۔ تم لوگ بھی کہہ سکتے ہو، لو شروع کرو۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ بائیتا کی طرف دیکھ کر پھر بولنے لگا۔

”بائیتا! دراصل یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی، جب وہ فلم تمہارے کسی ہمدرد نے لا کر تمہیں دی۔ دراصل وہ تمہارا ہمدرد نہیں، سب سے بڑا دشمن تھا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”آگے سنو گی تو تمہیں اعجاز ہو جائے گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، اور تم لوگوں کو کتنے بڑے طوفان سے بچا لایا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں کی جانب دیکھا

”کیسا طوفان؟“ بائیتا نے پوچھا۔

”اصل میں انہیں وہ شخص چاہئے، جو سندو کے ساتھ جزیرے سے فرار ہوا تھا، اس نے ڈیوڈ ریمز کو مارا، اور ان کے زمین ہاؤس کو تباہ کر کے غائب ہو گیا۔ یہ ایک طرح سے ممبئی فور سسر اور را کے لیے تو چیخ بن گیا تھا، موساد کے لیے بھی ایسا ہی ہے۔ زمین ہاؤس سے تمہاری تصویر ملنے کے بعد انہوں نے اس کلیو کو ضائع نہیں ہونے دیا اور اسی کو استعمال کرنے کا سوچا، جیسے کے جہاں کے بارے میں بھی پتہ چلا۔ یہ کارڈ انہوں نے اس لیے کھینچا کہ گمراہی میں یا ایک دوسرے کو بچانے کے لیے تم لوگ نکلے گے۔ وہی ہوا۔ تم لوگ نکلے اور بڑا کام یہ ہوا کہ تم لوگوں نے اوکی میں سی بی آئی والوں سمیت بندے مارے اور وہاں سے نکلے۔ ان لوگوں کو تمہارے جاندھر میں ہونے کے بارے میں یقین ہو گیا۔ وہ لوگ ادھر جاندھر میں ہی تم لوگوں کو گھیرنا چاہتے تھے کہ تم سب ایک بار پھر گم ہو گئے۔ یہ چوہے ملی کا کھیل وہ خود کھیلنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اس کھیل کے سرے تک پہنچ سکیں۔“

”وہ سی بی آئی والے اسی مقصد کے لیے وہاں گئے تھے؟ مطلب مجھے پکڑنے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”جی، اسی مقصد کے لیے، مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے پکڑا کیوں نہیں؟ یہی کہنا چاہتے ہو تا تم؟“ ٹی ایس لے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، جہاں نے کہا۔“

”تم لوگ تو سامنے تھے ہی، اصل میں وہ جمال کو تلاش کر رہے تھے جو پاکستانی تھا اور یہیں کہیں غائب ہو گیا

تھا۔ وہ اس تک پہنچنا چاہتے تھے۔“ ٹی ایس نے بتایا

”تو پھر یہ سندو.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”بتا رہا ہوں نا، جالندھر میں تم لوگ غائب ہوئے تو یہ سندو انہیں امرتسر اتر پورٹ پر دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی ممبئی اس کے ساتھ آ گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جمال یہیں ممبئی میں ہے۔ دو دن کسی نے رابطہ نہ کیا تو انہوں نے خود ایکشن کیا اور سندو کو پکڑ لیا۔ تاکہ کوئی تو باہر آئے گا۔ وہی ہوا، تم لوگ باہر آ گئے۔“

”اب میرا سوال یہ ہے کہ تم کون ہو اور یہ سب کچھ تمہیں کیسے پتہ ہے؟“ جہاں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جس دن نرمین ہاؤس میں بتایا جی ہم اسی دن سے اس جمال کو تلاش کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کا اور ہمارا مقصد ایک ہی ہے۔ یہ کیوں اور کیسے ہے، یہ بعد میں بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر کہنے لگا۔

”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم پوری قوت لگا کر یہ معاملہ دیکھ رہے تھے کہ زوردار سنگھ جی نے ہمیں بتایا کہ سندو کو نکالنا ہے۔ وہ ہم نکال لائے ہیں۔ زوردار جی کی شرط یہ تھی کہ ہم نے تم لوگوں کو بھرپور مدد دی ہے اور زوردار سنگھ جی کا نام تک نہیں لینا، وہ اس سارے معاملے سے الگ ہیں۔ اب یہ دھیان میں رہے کہ ہم نے زوردار سنگھ جی کو درمیان میں نہیں لانا، انہیں بھول جانا ہے۔ سمجھیں وہ اس معاملے میں ہیں ہی نہیں۔ وہ ہمارے محسن ہیں اور ایک جھٹکے میں ہمارا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے سوال کا ابھی تم نے جواب نہیں دیا۔“ جہاں نے اسے یاد دلایا

”وئی میں بہت ادھر کی سطح پر تم لوگوں کا ذکر چل رہا ہے۔ جہاں فورسز سب تم لوگوں کو پکڑنا چاہ رہی ہیں، وہاں سیاست دان بھی دو طرف ہیں۔ ایک جو یہودیوں کو بھارت میں داخلے کی اجازت دے رہے ہیں، اور دوسرا وہ جو شدید مخالف ہیں۔ بھارت سرکار یہودیوں کے حق میں ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے سرمایہ ہی اتالا پھینکا ہے کہ یہ انکار کر ہی نہیں سکتے۔“ ٹی ایس نے تیزی سے کہا۔

”تم کہاں ہو؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے یہودیوں کے مخالف ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر یوں چونکا جیسے اسے یاد آ گیا ہو، ”اور ہاں، رام تیواری بھی اسی لائن میں تھا، جنہوں نے تم لوگوں کے ذریعے جمال کو پکڑنا تھا۔ لیکن مجھے یہ شک ہے کہ وہ تم لوگوں کو بھی ڈیل کر اس کریں گے، کیونکہ وہ سیاست دانوں کے اسی گروپ سے ہے جو یہودیوں کے مخالف ہیں۔“

”یہ شک تمہیں کیسے ہوا؟“ باغیتا نے تیزی سے پوچھا۔

”کیا انہوں نے کسی پولیس آفیسر کو مارنے کی بات کی تھی، اس بارے کوئی بات ہوئی اس کے کسی کارندے سے؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا

”یہ تو ہوا۔“ یہ کہہ کر جہاں نے اس رات والی ساری روداد سنا دی تو اس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے جوش سے کہا۔

”تو بس، بات صاف ہو گئی۔ وہ پہلے ہی دو پولیس آفیسر اسی طرح پار کر دیا تھا۔ ہر وہ آفیسر، جو اس کی فائل لیتا ہے۔ اس کے دن گئے جاتے ہیں۔ اس بار اس کی کرپشن کی فائل سمجھتے بھر بھرے کے پاس ہے۔“

”وہ کیسا آفیسر ہے؟“ باغیتا نے پوچھا۔

”وہ دیانت دار، بہادر اور وطن پرست ہے۔ کرپٹ نہیں ہے۔ اسی لیے فائل اسے دی گئی ہے۔“ ٹی ایس نے

”چتے ہوئے کہا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہم بہت بڑی سازش سے بچ گئے۔“ باغیتا نے زیر لب کہا۔

”وہ تم سب کو اکٹھے پکڑنا چاہتے تھے اور یہودی نواز لابی پوری طرح سرگرم ہے۔ انہیں خاص طور پر جمال مطلوب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ انہیں پھر نقصان پہنچا سکتا ہے۔“ ٹی ایس نے وضاحت کی۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ جہاں نے پوچھا۔

”صاف بات ہے، یہودی لابی کی تباہی اور اپنا مفاد۔ خیر ابھی یہاں رہو۔ حالات کو دیکھتے ہیں پھر کوئی پلان کرتے ہیں، یہ پھیلاؤ صرف بھارت ہی میں نہیں پاکستان تک پھیلا ہوا ہے۔“ ٹی ایس نے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کھانے کے بعد وہ سندو کے پاس چلے گئے۔ اس پر کافی تشدد ہو چکا تھا۔ اس نے یہی بتایا کہ اس نے تشدد دیکھا تھا مگر بات کوئی نہیں بتائی۔ انہوں نے اسے آرام کرنے دیا اور دونوں اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ انہیں لوتن اور اردو سنگھ کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ یہاں آئند پارک کے علاقے میں آنے کے لیے چل پڑے تھے۔



میں لاہور میں گھر کی چھت پر کھڑا مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ افقی لکیر پر ابھی اندھیرا تھا۔ افق پر پھیلی ہوئی سرفی اندھیرے پر چھائی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے گھر سے دور افق تک گھر ہی گھر پھیلے ہوئے ہیں۔ ساری رات گزر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے گیت نے بتایا تھا کہ علی نواز، سلمان اور زویا نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ ہند اور اکبر لاہور کے لیے پرواز کر چکے تھے۔ میں پرسکون ہو کر چھت پر آ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوئی ہوا میں ٹھنڈی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری سوچوں میں اضطراب تھا۔ مجھے لگا کوئی مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے غور کیا تو کوئی کہہ رہا تھا

”خود سے مقام خودی تک رسائی دینے والی قوت صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے عشق۔ جب حضرت عشق طلوع ہوتا ہے تو وہ انسان کے سر سے ہر تک اپنی سلطانی قائم کر لیتا ہے۔ عشق میں بے ساختگی ہے۔ عشق کی کوئی وجہ نہیں ہوتی اور نہ اسے بتایا جاسکتا ہے۔ یہ خود قدم اٹھاتا ہے۔ اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا کہ حالات کیا ہیں۔ کوئی اس کے ساتھ چلتا ہے یا نہیں۔ عاشق کا کام تو اپنی ذات کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ ایک سطر پر جانا ہے۔ کتنے ابوجہل ہیں یا کتنے ابولہب، راستے کی دشواریاں کیا ہیں اور مصیبتیں کس حد ہیں۔ یہ اس کی لاہ میں نہیں ہوتیں اور نہ ہی اس کے عشق کے والہانہ پن میں کی کا باعث بن سکتی ہیں۔ حالات عشق پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ عشق کی تکمیل کسی وجہ کی محتاج نہیں ہے۔“

”مجھے اپنی ذات میں عشق کی تکمیل کیسے کرنا ہوگی؟“

”عشق کی تکمیل نہیں ہوتی، یہ تو نہ اپنی حد رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی کنارہ ہے، بلکہ ذات کو اپنی طرح لا محدود ہونے کے ظہور کی وجہ بنتا ہے۔ اصل میں عشق کرتا کیا ہے؟ زندگی کو بنانے کے لیے عدم کو جلاتا ہے، زندگی کو مٹانے سے وجود کو بناتا ہے اور اس سے ایک نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے جو عشق کے اپنے مطابق ہوتی ہے، بلکہ میں عشق ہوتی ہے۔ کیونکہ عشق اپنی نئی تخلیق کرتا ہے جو کہ سر بکف، جانناز اور مجاہد بناتا ہے۔

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریب تمام

ہے اسی میں مشکلات زندگانی کی کشود

”میں تو سفر شروع کر چکا ہوں۔“

”تو پھر اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کی حسرت نہ کرو بلکہ اپنے خواب کی تعبیر میں لگ جاؤ۔“

”خواب کی تعبیر.....؟“

”خواب دیکھنا ہی خواب کی تعبیر کی طرف بڑھنا ہے، تعبیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے خوابوں سے پیار کرو، انہیں محبت دو، انہیں اہمیت دو۔“

شاید میرے اندر مزید باتیں چلتیں، تاہم میری توجہ اس بجتے ہوئے فون کی طرف ہو گئی، جس کا کہیں بھی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ بھارت سے کال تھی۔ میں نے وہ رسیو کی تو دوسری طرف جہاں تھا۔ اس نے رات ہونے والے واقعات کے بارے میں بتایا تو میں نے کہا۔

”زب کا شکر کرو کہ تم لوگ ایک بہت بڑی سازش سے بچ گئے، لیکن اب بھی بہت احتیاط سے، کب، کون اور کہاں بدل جائے، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ لیکن مجھے بائیکا کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا چاہتی ہے؟“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔
”دیکھو، اس کے لیے اب سب سے بڑا مسئلہ اپنی بقا ہے۔ ایک طرح سے تم لوگ سامنے آ چکے ہو اور پھر خاص طور پر جب معاملہ یہودیوں کا ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ بھارت کا وہ طبقہ جو سارے وسائل پر قابض ہے وہ اس گدھے کو بھی باپ مانتے ہیں جس کے پاس سرمایہ ہو اور یہ بے دریغ سرمایہ بھارت میں پھینک رہے ہیں۔“
”ارے ہاں، ٹی اےس نے مجھے یہ بتایا کہ پاکستان میں براہ راست تو نہیں مگر چند سیاست دانوں کے ذریعے یہودیوں کے ایجنڈے کے لیے راہ ہموار کی جا رہی ہے اور اس پر باقاعدہ کام ہو رہا ہے۔“

”کون ہیں وہ؟“ میں نے چوکتے ہوئے کہا کیونکہ اسی لمحے میرے بدن میں سسٹنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔
”بظاہر تو کوئی بندہ بھی سامنے نہیں ہوگا، لیکن اس نے صرف اتنا اشارہ دیا ہے کہ این جی اوز ہیں، جو کام کر

رہی ہیں۔ یہ اس وقت پاکستان میں اپنی جگہ بنا پائی ہیں، جب زلزلہ آیا تھا۔“ اس نے بتایا
”اس سے کہو کہ وہ مزید بتائے، اندر تک سراغ لگائے۔“ میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔
”میری پوری کوشش ہوگی کہ میں ان کا سراغ لگا لوں۔ لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ سکون سے بیٹھ جائیں یا کچھ.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”سکون سے کیوں بیٹھو۔ انہیں اس حد تک مجبور کر دو کہ وہ صرف تمہاری بات مانیں۔ مجھے فقط وقت دو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ تم میری اس نوجوان اردو سنگھ سے بات کروانا، پھر کوئی کام کی بات سوچتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی کچھ دیر میں کراتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہو سکے تو آن لائن ہی بات ہو، تاکہ باقی بھی سن لیں گے اور ان سے بھی تعارف ہو جائے۔“ میں نے کہا اور پھر ہمارے درمیان رابطہ منقطع ہو گیا۔

سورج روشن ہو چکا تھا۔ میں چھت سے نیچے آیا تو جنید اور اکبر کنٹرول روم میں مہوش اور فہیم کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ملے ملانے کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ دوسری طرف سلمان، زویا اور گیت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب باتیں سن رہے تھے۔ تب میں نے جہاں سے ہونے والی باتیں بتا کر اسی تاثر میں کہا۔
”ہماری پہلی ترجیح ایسے لوگوں کو تلاش کرنا ہے۔“

عشق کا مظہر خود انسان ہے، اس میں سے عشق کا ظہور ہوتا ہے انسان میں سے ہی عشق کو دیکھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عشق میں بے ساختگی کی پہلی ساخت کو تو ذکر اپنی ساخت پر لے آتا ہے۔ یہی خودی کی طرف پہلا قدم ہے۔ کیونکہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے مرد و مومن عیاں ہوتا ہے۔
”اس کا ظہور کیسے ہے؟“

”انسانی ذات ہی میں تو ہوتا ہے۔ یہ عشق اس کے اندر ہی تو پڑا ہوا ہے۔ یہ انسان کا ارادہ ہی تو ہے کہ وہ مسلک عشق اختیار کرے، گویا کہا جاسکتا ہے کہ انسان ہی عشق کو اٹھاتا ہے۔ جب ذات کا ظہور، باطل کے مقابلے میں حق کو نمایاں کرنے سے ہوتا ہے۔ یہ ظہور ظاہری اور باطنی ہے۔ باطل جس، غرور و تکبر اور قوت سے سامنے آتا ہے، حق بھی اسی سرکشی و بے باکی، تندی و شوخی اور قوت کے ساتھ آئے گا۔ حق کے ہاتھ میں آجانے والے وسائل اور قوت نعمت بن جاتے ہیں، جبکہ باطل نری موت ہے۔“
”باطل کیا ہے؟“

”ہر وہ شے جو انسان کو اس کی انسانیت سے غافل کر دے، وہ باطل ہے۔ شیطان کا پہلا کام ہی یہی ہے کہ وہ انسان کو غافل بناتا ہے، اور انسان کا اصلی چہرہ اس کے سامنے واضح نہیں ہونے دیتا۔ انسان تو اللہ کا غلیف ہے۔ اور انسان جب اپنے آپ کو پہچانتا ہے تو اسے اپنی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو اسے مقام خودی تک پہنچاتا ہے، جہاں خودی ہر شے کو مغلوب کر دیتی ہے۔ انسان اپنے وجود میں پڑے ہوئے عدم کو نکال باہر پھینکتا ہے۔ انسان کا سیدھا ہونا ہی حق ہے۔ حق کا بڑھنا یا باطل کا مٹنا، ایک ہی بات ہے۔ انسان اپنے آپ کو پہچانے۔ باطل نے سارے مسائل پیدا ہی اسی لیے کیے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو پہچان نہ پائے۔ باطل ہے ہی اس لیے کہ تم اس پر غلبہ پاؤ۔ خوف باطل کیا ہے کہ غارت گر باطل بھی ٹو۔“
”اسے قوت کہاں سے ملتی ہے؟“

”اس کے اپنے اندر سے اور عشق اسے ہر طرح کی قوت دیتا ہے۔ جہاں پر انسانیت کی نفی کرنے والی، پہچان مٹانے والی، تخریبی قوتوں کی نفی کرے گا، وہاں انسانی اثبات کرے گا۔ ہر وہ شے جو جہنمی غلامی پیدا کر کے حوصلہ پست کرے، وہی اصل میں باطل اور شیطانت کا معیار ہے۔ شیطان نظریاتی کمزوری کی تاک میں ہوتا ہے۔ اور یہیں سے انسان کے اندر بُت بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایمان کی کمزوری، تفرقہ بازی، تعصب، منافقت، عیش کوٹی جاگیر داری اور سرمایہ داری کی تمام تر خباثتیں یہیں سے پیدا ہوتی ہیں۔ درویش میں ہو تو وہ عیار ہے اور بادشاہ میں ہو تو وہ بھی عیار ہوتا ہے۔ یہی وہ پہچان ہے جہاں بندہ مومن حق و باطل کی لکیر کھینچ کر عشق کی طاقت کے ساتھ آواز حق بلند کرتا ہے۔“

”میں خود سے خودی تک کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میرے اندر عشق کی گہرائی کیا ہے میں کیا ہوں، میری قوت کیا ہے۔“

”عشق اپنے راستے اور وسائل خود بناتا ہے۔ اصل میں جب تک دل زندہ نہیں ہوتا، اس وقت تک خود زندہ نہیں ہوتا، سفر پر جانا چاہتے ہو تو یہ تمہارے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ یہی بقا کا راستہ ہے۔ فنا خود اختراکی ہے، نابصیری ہے اور خود پیدا کردہ ہے۔ تخریب کو ختم کرنا ہی دراصل تعمیر ہے۔ شیطان کو کچڑ، اس پر غلبہ لے، انسان کا چہرہ خود بخود نکھر جائے گا۔ شیطان کے قبضے میں گئے وسائل کو چین کر انسانیت کو لوٹانا ہے۔ اصل پیغام بنی نوع انسان کے لیے ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو، دنیا کا ہر انسان اپنے مثبت پہلو کی طرف دیکھے۔ یہی تیرا سفر ہے۔“

”ہم ابھی سے کام شروع کر دیتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ دنیا بھر میں سے جو زیادہ انسانی حقوق کی پامالی کر رہے ہیں، انہوں نے ہی انسانی حقوق کی تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں۔ اسی کی آڑ میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔“ گیت نے اپنی رائے دی تو فہیم تیزی سے بولا۔

”بالکل، میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ جس طرح کسی بھی ملک کی خبر رساں ایجنسی کہنے کو تو غیر جانبدار ہوتی ہے لیکن اس میں اپنے ملک و قوم کی جانبداری پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ مثلاً بی بی سی، کیا ان کے ملک میں کوئی جرم نہیں ہوتا، کوئی کرپشن نہیں، کوئی قتل نہیں لیکن دنیا بھر سے وہ اپنی پالیسی جو کہ مسلمان مخالف پالیسی ہے، اس پر عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی انتہائی جانبدار ہیں۔ انہیں وہی کچھ دکھائی دیتا ہے، جنہیں وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ امریکہ کا نائن الیون ہوا، تو دنیا بھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ لیکن مسلمانوں پر ہونے والا ظلم کہیں دکھائی نہیں دیتا۔“

”تو بس پہلے انہیں دیکھو اور میرے خیال میں آج شام تک اس کا نتیجہ سامنے آ جانا چاہئے۔“ میں نے کہا تو سبھی اس پر مختلف باتیں کر کے اپنی اپنی رائے دینے لگے۔ اسی دوران جہاں آن لائن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ارد گرد سگھ تھا۔ وہ پتلا سا نوجوان تھا، بہت گہری آنکھیں، گلابی ہونٹ، چوڑی پیشانی سفید رنگ اور سیاہ پگڑی باندھے، ہونٹوں پر مسکان سجائے صاف انگریزی میں بولا۔

”سب کو میری طرف سے ست سری اکال، آداب اور میری طرف سے سلامتی کی بہت زیادہ دعائیں۔“

”ارد گرد سگھ، تمہیں دیکھ کر اچھا لگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ان دوستوں سے بات کرو۔ ہمارے درمیان جو رابطہ ہے، وہ زیادہ سے زیادہ بہتر ہو۔“ میں نے کہا۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے یہاں آتے ہی رونیت کور کی صورت میں ایک بہترین کام کرنے والی ساتھی مل گئی ہے۔ یہ اس کی قابلیت ہے کہ اس نے جو بھی سیکھا، اپنی مدد آپ کے تحت۔ ہم دونوں مل کر آپ دوستوں سے رابطے کی پوری کوشش کریں گے۔“ اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا اور سب میں باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ ساری ٹیبل کل باتیں تھیں۔ اس کے نتیجے میں دونوں میں بہت ساری معلومات کا اضافہ ہو گیا۔ اس نے سلمان کو مزید معلومات دیں۔ کچھ چیزیں لینے اور کچھ دینے کو کہا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں اب ممبئی میں بہت حد تک رسائی کر جاؤں گا۔ چاہے بھارت کمپیوٹر میں جتنا آگے ہے، بلیک مارکیٹ اس سے بھی تیز ہے۔ یہ تو کسی شے کو استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کتنا بڑا فنکار ہے۔ ایک چھوٹے سے چاقو سے پھل کاٹا جاتا ہے اور کسی کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔



آئندہ پارک کے علاقے میں دریائے دھانی سر کے کنارے بنے ہوئے فارم ہاؤس کے عقبی گیٹ سے نکل کر جہاں اور بائیا پیدل چلتے ہوئے دریا کنارے تک چلے گئے تھے۔ وہ وہیں کنارے پر آگے بڑے پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان کافی بحث ہو چکی تھی اور اس وقت ان میں خاموشی تھی۔ شاید وہ اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ تبھی بائیا نے دریا کی لہروں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”کیا کہتے ہو؟“

”وہی جو تم نے سوچا۔“ جہاں نے دھیمے سے جواب دیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا انکر دریا میں پھینک دیا۔

”تو پھر اٹھو، اس سالے کو پال نند تک پہنچنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔“ بائیا کور نے ایک دم جوش سے اٹھتے

ہوئے کہا تو جہاں سگھ نے جیب سے فون نکالا، اس پر نمبر پیش کیے اور اٹھ کر چل دیا۔ وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ جہاں کا ملایا ہوا نمبر مل گیا تو اس نے کہا۔

”یہ تمہارا فیصلہ ہے۔“ ٹی ایس ہمیں جانا ہے گوپال نند سے ملنے کے لیے۔“

”آج نہیں تو کل ان سے سامنا تو ہوتا ہی ہے۔ کیوں نہ آج ہی سہی۔“ جہاں نے کہا۔

”اوکے ہو گیا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ سامنے ہی فارم ہاؤس کا عقبی گیٹ تھا۔ وہ اس تک پہنچے ہی نہیں تھے کہ گیٹ کھلا اور ایک سیاہ فور ڈریل باہر آگئی۔ اس میں ٹی ایس بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اور نوجوان تھا۔ وہ گیٹ کھول کر بیٹھے اور چل دیئے۔ ان کا رخ براہیلی کے علاقے کی طرف تھا۔ راستے میں مختلف جگہوں سے کئی لوگ ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں تھے۔ جہاں اور بائیا کو بھی ایک کار مل گئی۔ وہ اسی کارواں کے ساتھ رہے لیکن ان سے الگ آگے بڑھتے گئے۔

وہ ایک معروف بازار تھا، جس کے ایک ریسٹوران میں وہ دونوں جا بیٹھے تھے۔ ٹی ایس اور اس کے ساتھی ارد گرد پھیل گئے تھے۔ وہ انہیں دکھائی تک نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے گوپال نند کو وہیں بلایا تھا۔ اس نے وہیں آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں تھے۔ تبھی داخلی دروازے سے گوپال نند آتا ہوا دکھائی دیا تو جہاں نے مخصوص اشارہ دے دیا۔ وہ آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور اپنی مخصوص دھیمی مسکراہٹ سے بولا۔

”اتنی امیر جیسی کیا آن پڑی کہ یوں بلوالیا۔“

”دیکھو گوپال! ہمارے پاس وقت نہیں ہے، فضول قسم کی بھاگ دوڑ کے لیے۔ جتنا ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بولو اس پولیس آفیسر کا کام تمام کرنا ہے یا نہیں، جس کا ایڈوائس تم لوگ ہمیں دے چکے ہو؟“ جہاں نے پوچھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ارے کام تو کرنا ہے، تبھی ایڈوائس دیا لیکن تم اتنی جلدی کا ہے کہ کر رہے ہو؟ ارے وہ پولیس آفیسر ہے۔ کوئی ٹھوری نہیں جو تم یوں بات کر رہے ہو۔“ گوپال نے کافی حد تک الجھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری کل والی فضول سی گیم نے ہمارا بہت سادقت ضائع کر دیا۔ اگر کام ہے تو ٹھیک، ورنہ ہمیں آج ہی ملائیشیا کے لیے نکلتا ہے، اپنا ایڈوائس واپس لو۔“ بائیا کور نے کہا تو اس پر گوپال نند نے اسے غور سے دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ تم لوگ بھارت سے کہیں بھی نہیں جاسکتے۔ کسی بھی ائر پورٹ پر تم لوگ دھر لیے جاؤ گے۔ میرا تو خیال ہے ممبئی سے بھی“ اس نے کہنا چاہا مگر جہاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”یہ ہمارا مسئلہ ہے، تم اپنی کہو، کام ہے یا نہیں؟“

”ہے۔“ اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

”تو پھر ڈن تم نے کرنا ہے یا تیواری نے؟“ بائیا نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

”میں ان سے بات کر لوں۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”اس کا مطلب، تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اٹھو اور بھاگ جاؤ۔ دوبارہ ہم سے رابطہ نہیں کرنا اور اگر ہماری ضرورت محسوس ہو تو تیواری سے کہنا کہ رابطہ کرے، چلو بھاگو۔“ بائیا کور نے اس قدر درشتی سے کہا کہ گوپال نند کا

منہ چند لمحے کھلا رہ گیا، پھر اسے ہوش آیا تو اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ بائیتا بولی۔
 ”ایک لفظ بھی کہا تو یہیں تیرا حلیہ بگاڑ دوں گی سائل، چل بھاگ۔“

اس نے دونوں کی طرف دیکھا، دھیرے سے اٹھا اور تیزی سے باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ بھی ہل دے کر باہر کی جانب نکل پڑے۔ وہ باہر کھڑی کار کے پاس آئے۔ انہیں کچھ فاصلے پر ٹی ایس دکھائی دیا۔ وہ کار میں بیٹھ گئے تو ٹی ایس کا فون آگیا۔

”سالا پوری فوج کے ساتھ آیا تھا، کم از کم بارہ لوگ تھے اس کے ساتھ۔“ اس نے بتایا
 ”ان میں سے اب بھی کوئی ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”تیرے بائیں طرف سیاہ ہنڈا کارڈ میں چار لوگ اب بھی موجود ہیں، لگتا ہے تعاقب کریں گے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”چل پھر ان کا تو کام کریں۔“ جہاں نے کہا اور کار بڑھا دی۔ وہ ہنڈا بھی حرکت میں آگئی اور ان کے پیچھے چلنے لگی۔ جہاں کے آگے ٹی ایس کی فور وہیل تھی۔ وہ مہا دیو بھائی ڈیسائی روڈ کی طرف بڑھے اور پھر مین روڈ پر آگئے۔ کافی آگے جا کر کلو پادی روڈ سے بھی آگے نکل کر نیشنل پارک کے پاس دائیں جانب کھلے میدان میں اتر گئے۔ وہ کار مسلسل ان کے پیچھے تھی۔ جیسے ہی جہاں نے میدان میں کار روکی تو وہ ہنڈا بھی رُک گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری کاروں نے بھی انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں وہ کار صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں نے اپنا پمپل نکالا اور کار سے باہر نکل کر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے والے دونوں ٹائر برسٹ کر دیئے۔ اسی کے چند لمحے بعد کسی نے دوسری طرف سے فائر کیے تو کار کے پچھلے ٹائر بھی پھٹ گئے۔ جہاں نے اندر بیٹھے لوگوں کا چند لمحے انتظار کیا۔ ان میں سے کوئی باہر نہیں نکلا تو وہ سامنے آگیا۔ اس نے اشارے سے انہیں باہر نکلنے کو کہا۔ وہ نہیں نکلے تو جہاں نے جیب میں سے دستی بم نکالا۔ اسی لمحے باقی کاریں پیچھے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس نے بم کی پن نکال کر اس کار کی طرف پھینک دیا۔ اسی لمحے کار کے چاروں دروازے کھلے اور وہ تیزی سے باہر نکل کر پوری قوت سے بھاگے۔ مگر جب تک جہاں اپنی کار میں بیٹھ چکا تھا۔ بائیتا نے کار کو گیزر لگا لیا تھا۔ انہیں عقب میں دھماکا سنائی دیا۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ سب اسی طرح واپس مین روڈ کی طرف چل پڑے۔ تبھی جہاں کے سیل پر گوپال کا فون آگیا
 ”تیری تیواری کے ساتھ ملاقات فکس کر دی ہے۔ آج رات ہی کو.....“

”بہت دیر کردی بھڑوے تم نے۔ ہم پر نگاہ رکھنے والے تیرے بھیجے ہوئے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے تو کسی کو نہیں بھیجا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”پھر وہ کسی دوسرے کے لوگ ہوں گے۔ چل کس وقت کرا رہا ہے تیواری سے ملاقات۔“ اس نے پوچھا۔

”بس دو چار گھنٹوں میں، تو فوراً آجا۔“ اس کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو پارہی تھی۔

”گوپال، اب جگہ میری ہوگی، آنا ہے تو ٹھیک ورنہ تو اپنا آپ سنبھال، میں دیکھتا ہوں تیرے تیواری کو۔“ یہ کہہ اس نے فون بند کر دیا۔

دس منٹ نہیں گزرے ہوں گے، اس کا سیل بج اٹھا۔ جہاں نے فون رسیو کیا تو دوسری طرف کسی نے بڑی ملائمت سے کہا۔

”ارے جہاں۔ ہم ہیں رام تیواری لعل، بھئی کدھر ہو تم، آؤ، بیٹھ کے کام کی بات کرتے ہیں۔“

”بات تو ہو گئی ہے، ہاں اگر مزید بات ہی کرنی ہے تو جہاں ہم چاہیں گے وہاں آنا ہوگا۔“ جہاں نے کہا۔

”دیکھو ہم چاہیں تو ابھی تمہیں کان سے پکڑ کر اپنے سامنے لے آئیں۔ مگر ہم ایسا کریں گے کیوں۔ تم خود آؤ گے یا ہم لائیں تمہیں۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تو پھر اسی بات پر لگ گئی تیواری، اگر آج رات یا اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم مجھے اپنے سامنے لے آؤ تو جو تم کہو گے میں کروں گا۔ اگر نہ لائے تو جہاں میں کہوں وہیں آ جانا۔“ جہاں نے اس سے بھی زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا۔

”دیکھو۔ ہمیں مجبور مت کرو کہ تمہارے بارے میں کچھ غلط سوچیں۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”سوچ کے دیکھ لو۔“ اب کہ جہاں کا انداز چڑانے والا تھا۔ اس نے مزید بات نہیں کی اور فون بند کر دیا۔ اس پر جہاں مسکرا دیا۔

بائیتا کو، جہاں اور ٹی ایس تینوں فور وہیل میں تھے۔ باقی سب ان کے تعاقب میں بڑھے چلے آ رہے تھے۔ نوجوان جیب تیزی سے بھاگے چلا جا رہا تھا۔ ٹی ایس نے ساری بات سن کر کسی کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ آ رہے ہیں۔ ایک خاص مقام پر آ کر وہ سب رُک گئے۔ صرف فور وہیل آگے بڑھتی گئی۔

وہ پرسکون، سرسبز و شاداب اور صاف ستھری سرکاری کالونی تھی۔ الیکٹرک پول کی روشنی سے ماحول خاصا خوب ناک سا ہو رہا تھا۔ وہاں اتنے بڑے گھر نہیں تھے لیکن سبھی روشن تھے۔ فور وہیل دھیمی رفتار سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ ایک پارک کی باؤنڈری کے پاس آگئے تو ٹی ایس نے رُکنے کو کہا۔ نوجوان نے فور وہیل روک دی۔

”ٹی ایس، تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا؟“ بائیتا کو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بائیتا! مجھ پر یقین رکھو۔“ اس نے بائیتا کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا اور گیٹ کھول کر نیچے اتر گیا۔ فرنٹ سے وہ بھی باہر نکل گئی تو جہاں بھی جیب چھوڑ کر نیچے آگیا۔ وہ ذرا سا ہی پیدل چلے تھے کہ ایک سادہ لباس میں پولیس مین تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ بات کرتا، ٹی ایس بولا۔
 ”صاحب کو بتاؤ، ٹی ایس آیا ہے۔“

”صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور چل دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے پارک میں جا پہنچے۔ ایک مخصوص جگہ پر وہ کھڑے ہو گئے۔ جہاں مل جلکا سا اندھیرا تھا۔ تبھی ایک طرف سے دراز قد جوان آگیا۔ اس نے ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کا ایک ہاتھ جیب میں تھا۔ بال سنورے ہوئے، کلین شیو اور گورے رنگ کا تھا۔

”دیکھ۔“ اس نے بھاری آواز میں کہتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

”یہ جہاں اور بائیتا ہیں۔“ ٹی ایس نے تعارف کرایا تو اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تصور میں دیکھا ہے انہیں۔ مجھے نو دہائی کہتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ان تینوں سے ہاتھ ملایا۔

”ابھی ہم نے تیواری.....“ ٹی ایس نے کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ سے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے وہ ہڈیانی انداز میں یہ حکم دے چکا ہے کہ میں ہر حال میں ان دونوں کو تلاش کروں۔ اس نے

مجھے صرف بارہ گھنٹے کا وقت دیا ہے۔ ابھی آٹھ بجے ہیں، صبح آٹھ بجے تک۔“ یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”مطلب، تم نے اس کی دم میں آگ لگا دی ہے۔“

”یہ حکم اس نے ذاتی طور پر دیا ہوگا؟“ ٹی ایس نے پوچھا تو نوذورانے تلخی سے کہا۔

”ہاں، سالا سمجھتا ہے کہ ہم اس کے ذاتی ملازم ہیں۔“

”کیا وہ سمجھتا نہیں ہے کہ ہم اس سے کھیل رہے ہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”ہمیشہ تیرا کہ ہی ڈوبتا ہے اور طاقت کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے، جس میں اکثر اوقات ساری حسیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے ایک نہیں اب تک تین پولیس آفیسروں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اب وہ اُس کے گرد جال بن رہا ہے جس کے پاس اس کی فائل آگئی ہے۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر آپ اسے کیوں نہیں پکڑتے؟“ بائیتا نے پوچھا تو وہ یوں بولا جیسے وہ بہت تکلیف محسوس کر رہا ہو۔

”ثبوت نہیں ہیں اور قانون ثبوت مانگتا ہے۔ یہ سیاست دانوں کے اس کلب سے تعلق رکھتا ہے جو سبھی کریمینل ہیں۔ خیر میری ٹی ایس سے تفصیلی بات ہوگئی ہے۔ اور شاید یہ میرے بارے میں نہیں جانتا کہ میں روایتی انداز میں مجرم کو نہیں پکڑتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم لوگ میرے سامنے بیٹھے ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ جہاں نے کہا۔

”انتا سمجھ لو کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ میں نے جب ٹی ایس سے بات کی تھی، تب میں نے تم لوگوں کے بارے میں بہت اسٹڈی کیا۔ جتنا کچھ بھی مجھے مل سکا، اس کے مطابق میں آپ لوگوں سے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول سے ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ بھول جانا کہ ہم ایک دوسرے سے ملے تھے۔“ اس نے جہاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسی ڈیل؟“ اس نے پوچھا۔

”اس مہم میں تم لوگ میری مدد کرو، تیاری کو مارتا بڑا کام نہیں، میں یہ کام بہت اچھے طریقے سے کر سکتا ہوں، مجھے وہ پورے ثبوت کے ساتھ چاہئے، اور..... اس کے عوض میں یہ ثابت کروں گا کہ تم دونوں محبت وطن ہو اور وہ فلم ایک سازش کے تحت تیاری کی گئی تھی جو ”را“ کے پاس ہے۔“ اے سی پی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ڈن۔“ جہاں نے ایک دم سے کہہ دیا، پھر لہجہ بھر بعد بولا۔

”مجھے کسی گارنٹی کی ضرورت نہیں۔ میں یہ کام کروں گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ مجھے استعمال کرنے کا سوچا بھی نہ جائے۔“

”دیکھو میں ہندو گھرانے میں پیدا ہوا، میرا نام ہندوؤں والا ہے۔ لیکن میں انسان اور انسانیت کا قائل ہوں۔ اگر کسی کے ساتھ ظلم ہوتا ہے تو اسے انصاف ملنا چاہئے۔ کیونکہ بے انصافی ہی بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ ایسا ہندو، مسلمان، سکھ یا کسی کے ساتھ بھی ہو۔ خیر آپ لوگ کیا پتا پسند کریں گے۔“ یہ پوچھتے ہوئے اس نے گویا بات ختم کر دی تھی۔

”کچھ نہیں۔ اب ہم چلیں گے۔“ ٹی ایس نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑنے تو نوذورانے کہا۔

”یہ یاد رہے کہ ہم چاروں اور صاحب کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں کہ ہم رابطے میں ہیں۔“ اس نے یاد دلا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ وہ پھر وہاں نہیں رکے۔

وہ سبھی اس وقت آشاگر کے علاقے میں تھے، جہاں سے وہ ہائی وے پر آکر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کا رخ سدھارتھ نگر کی جانب تھا، جو ہائی وے کی بائیں جانب تھا۔ وہ وہیں ایک گھر میں کچھ دیر رکتا چاہتے

تھے کہ روایت کور کا فون آگیا۔ اسے گوپال نند کا فون نمبر دے کر کہا گیا تھا کہ اسے تلاش کرے۔

”وہ گوپال نند مسلسل حرکت میں ہے۔ اس وقت وہ بور پولی ہی کے علاقے میں ہے۔ میرے سامنے جو نقشہ ہے، اس کے مطابق وہ گل مہر روڈ سے آگے پنجابی گلی کے پاس رُکا ہوا ہے۔ اب پتہ نہیں وہ وہاں رکتا ہے یا نہیں۔“ روایت کور نے تیزی سے بتایا۔

”یہ آشاگر ہی کا علاقہ ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”ہاں ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔“ ٹی ایس نے کہا اور ڈیوٹر کو بتانے لگا کہ کدھر جانا ہے۔ اگلے پورن سے اس نے فور ویمیل موڑ لی۔

آشاگر کے اس علاقے میں بڑی بڑی بلڈنگیں تھیں۔ جس کے ایک بڑے سے کراس پر موجود مارکیٹ کے پاس وہ آرکے۔ روایت کور مسلسل بتا رہی تھی کہ گوپال نند اب گل مہر روڈ پر نہیں ہے۔ وہ انہیں یہ تو بتا سکتی تھی کہ اس کی لوکیشن کیا ہے، مگر حتمی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کہاں اور کس جگہ پر ہے۔

”میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس جگہ کا مجھے پتہ مل جائے۔ مجھے امید ہے مل جائے گا۔ آپ اس علاقے کا ایک چکر لگاؤ۔“ روایت نے کہا تو وہ پھر سے چل دیئے۔ یہ آنکھ مچولی آدھا گھنٹہ چلتی رہی۔ تبھی روایت کور نے ایک بلڈنگ کے بارے میں بتایا۔ اس کے خیال میں وہ وہیں ہو سکتا ہے۔ وہ اس بلڈنگ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ وہیں ٹھہرے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اسے باہر کیسے نکالا جائے کہ ایک دم سے بائیتا کی نگاہ دوسری طرف ہوئی تو وہ پر جوش انداز میں بولی۔

”وہ دیکھو، جہاں، ادھر وہ سامنے گوپال نند۔“

جہاں نے فوراً ادھر دیکھا، وہ بلڈنگ سے نکل کر ایک سرخ کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو سیکورٹی گارڈ تھے۔ سرخ کار میں ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹی ایس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”اسے گھیرو۔“

اس وقت تک گوپال نند کار میں بیٹھا تو کار چل پڑی تھی۔ تبھی نوجوان نے فوراً ہی فور ویمیل تیزی سے ادھر موڑی اور سیدھا اس کار کے سامنے جا رُکا۔ کار والے کو بہت زور سے بریک لگانا پڑے تھے۔ بریکوں کی چرچاہٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جہاں اور بائیتا نے پھل نکال کر فائر کر دیئے، جس سے سرخ کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا بھی پھٹ گیا۔ سرخ کار والے تیزی سے باہر نکلے تو جہاں بھی انتہائی ریسک لے کر باہر آگیا۔ اس نے انہیں پھل سے کور کرتے ہوئے زور سے کہا۔

”رک جاؤ گوپال، ورنہ گولی مار دوں گا۔“

جیسے ہی اُس نے جہاں کی آواز سنی اس نے انتہائی حیرت سے پلٹ کر دیکھا اور پھر اپنا پھل نکالتے ہوئے پوری قوت سے چپا۔

”یہی ہے جہاں۔ جسے ہم تلاش کر رہے تھے۔“

اس کا جوش رانگاں گیا۔ سیکورٹی گارڈز نے اپنی گنیں سیدھی کی ہوئی تھیں کہ ایک ہی وقت میں دو فائر ہوئے اور وہ لڑکتے ہوئے سڑک پر گر گئے۔ اس وقت تک باقی کاریں بھی ان کے ارد گرد آن رکیں اور اس میں سے کئی نوجوان باہر آ گئے۔ گوپال نند نے فائر کرنا چاہا مگر اسے دیر ہوگئی تھی۔

”نہیں، فائر کیا تو جان سے مار دوں گا، پھینک دو پھل، جلدی۔“ جہاں نے کہا تو اس نے ارد گرد دیکھا اور

کی دھنکی کرنے کے بعد وہ اس سے بولی۔

”چل لگا فون اپنے اس بے غیرت تیواری کو اور اسے بول کہ تو ہمارے پاس ہے۔ اسے کہہ اپنی فوج بھیجے۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔“ یہ کہہ کر وہ گالیاں دینے لگی۔ جب اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو اس نے فون نکالا ہلرک کر بولا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں، اس پر ذرا سوچ لیں۔“ وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

”تجھ پر کم از کم مجھے اعتماد نہیں، کتے پر تھوڑا اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ اسے روٹی ڈالو تو وہ نہیں کاٹتا، مگر تیرے جیسے منافق، کب دھوکہ دیں جائیں، اس بارے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ تجھ سے پولیس والے ہی پوچھیں گے۔“ جہاں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے باہر چل دیئے۔

جہاں کو یوں لگا تھا کہ ابھی سویا تھا اور ابھی جاگ گیا۔ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر کسی نے بھی اسے نہیں جگایا تھا۔ گوپال نند کو رات ہی دودرانا خود لے گیا تھا، اس کے ساتھ اس نے کیا کیا، انہیں بالکل خبر نہیں تھی۔ وہ فریش ہو کر ڈرائینگ روم میں آیا تو ٹی ایس اور بائیتا بھی فریش بیٹھے ہوئے تھے۔

”کچھ کھانی لوتو چلیں۔“ بائیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تیواری کی کوئی خبر؟“ اس نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”کوئی براہ راست خبر نہیں ہے لیکن رانا نے یہی بتایا کہ اس کے لوگ شہر بھر میں اور خاص طور پر بوروہلی میں پھیلے ہوئے ہیں۔“ ٹی ایس نے بتایا

”کیا خیال ہے، ابھی خاموش.....“ اس نے کہنا چاہا تو ٹی ایس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ہم نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ چوبیس گھنٹے گزر جائیں۔ پھر اس کے ساتھ کھیلتے ہیں۔“

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ آند پارک کی طرف جانے کے لیے نکل پڑے۔

دوپہر ہو چکی تھی، جب وہ سبھی آند پارک والے فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں نوتن کور، رونیت کور، گرلین کور، سندپ سنگھ، جہاں سنگھ، ٹی ایس اور بائیتا کو جمع تھے۔ ان کے سامنے اروند سنگھ کھڑا تھا۔ سلمان نے انہیں وہ ساری چیزیں مہیا کر دی تھیں، جو وہ چاہتا تھا۔ وہ انہیں کہہ رہا تھا

”ہے تو رسک، لیکن اس کا ایک چھوٹا سا تجربہ ہم اسی تیواری پر کریں گے۔ اس کا سارا کال ڈیٹا میرے پاس آگیا ہے۔ شہر کے ہر کونے سے اسے کال جائے گی۔“

”اروند ہم نے اسے پکڑنا ہے۔“ بائیتا نے کہا۔

”لیکن اگر اس کے ساتھ کھیل لیا جائے تو کیسا ہے؟ اسے بھی اندازہ ہو کہ اس نے کن لوگوں چھیڑ دیا ہے۔“ اس نے دلچسپی سے کہا۔

”اروند تم، کسی دوسرے ٹریک پر سوچ رہے ہو، یہ چوہے بلی کا کھیل ہم انورڈ نہیں کر سکتے، تمہارا اصل فوکس ہونا چاہئے کہ یہاں جو یہودی لابی کام کر رہی ہے اس بارے زیادہ سے زیادہ معلومات لو اور دوسرا ہمیں اپنے دھرم کے لیے کام کرنا ہے۔ یہی ہمارے دو مقصد ہیں۔“ بائیتا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اوکے، میں ایسا ہی کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا، پھر رونیت کی طرف دیکھ کر بولا۔

مابوسانہ انداز میں پھل نیچے پھینک دیا۔ تبھی چند نوجوان اس کی طرف محتاط انداز میں بڑھے اور اسے قابو میں کر لیا۔ ڈرائیور یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس کے قریب گیا اور اس کے ماتھے پر پھل کی نال رکھ دی۔

”مم..... مم..... میرا تو کوئی..... قص..... قصور نہیں۔ میں تو.....“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا تو جہاں نے کہا۔

”میں نے تجھے مارنا بھی نہیں ہے۔ یہاں سے سیدھے جاؤ اور تیواری سے کہنا اگر وہ اپنے باپ کا ہے تو مجھے پکڑ لے، جاؤ۔“

اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا تو ڈرائیور تیزی سے نکلا اور ایک جانب کو بھاگ اٹھا۔ گوپال کو وہ قابو کر کے ایک کار میں ڈال چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ٹی ایس نے کال ملائی اور کسی سے کہنے لگا کہ تیواری کا خاص کارندہ پکڑ لیا ہے۔ اس سے پوچھنا خود کر لیں۔ فون کر کے اس نے گوپال کا فون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سو جہاں کے بیٹھے ہی وہ اسے لے کر چل دیئے۔

وہ آشاگر کے علاقے سے نکل کر ساٹا نگر میں پہنچ گئے۔ وہاں بنگلہ نما ایک بڑا سارا گھر تھا۔ نوجوان گوپال کو لا کر ایک کمرے میں پھینک چکے تھے۔ جہاں، بائیتا اور ٹی ایس اس کمرے میں جا پہنچے۔ گوپال فرش پر پڑا تھا۔ وہ سہما ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف چمک رہا تھا۔ جہاں اس کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”دیکھ اگر تجھے یہ امید ہے ناکہ تیواری تجھے بچالے گا، تو یہ امید اب ختم کر دے۔ تو جانتا ہے ناکہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟“

”میں کیا جانوں۔“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابے کتے کے بیچ، تو ایک تیرے کئی نشانے لگانے کا دعویٰ کرتے ہو اور یہ تجھے پتہ نہیں، کمال ہے بھی۔“ جہاں نے بڑے قہقہے سے کہا اور ایک مکا اس کی آنکھوں کے درمیان دے مارا وہ تڑپ اٹھا، ایک لمحے کے لیے اس کا سانس ہی گم ہو گیا پھر جب اس کا سانس بحال ہوا تو وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”اس نے تجھے پکڑنے کے لیے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے۔“

تبھی بائیتا کور غصے میں آگے بڑھی اور اس کی پہلی میں ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔

”ہاں، لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کی زندگی کا اب یہی وقت ہے، اور تمہاری زندگی کا بھی۔“

”مجھے معاف کر دو، میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ تیواری کو بھی سمجھا دوں گا۔“ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا تو ٹی ایس ہنستے ہوئے بولا۔

”اس بے غیرت کا ڈرامہ دیکھ۔ اوئے بھڑدی کے، تجھے کسی تھیٹر میں کام کرنا چاہیے تھا۔ وہاں زیادہ کامیاب رہتا۔“ یہ کہہ کر اس نے جہاں کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اسے ہم نے نہیں مارا، اسے وہی مارے گا، جس پولیس آفیسر کو یہ مارنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ہڈیوں سے اور بہت کچھ نکلوا لے گا، اس پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ آؤ، تیواری والا کام کریں، اسے بولو مرنے چکا ہے۔“

”چلو۔“ جہاں نے فوراً کہا اور اٹھ گیا۔ وہ تینوں چند قدم دروازے کی جانب بڑھے ہی تھے کہ گوپال بولا۔

”تم لوگ جو چاہتے ہو، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں، پلیز مجھے.....“ اس نے مزید کہنا چاہا تھا کہ بائیتا کور آگے بڑھی اور زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ وہ اس پر ہل پڑی۔ وہ چیختے لگا۔ اس

تم بتاؤ کہ اب تک ہم نے اس بارے کیا کچھ معلوم کیا ہے۔
 ”ہماری اب تک کی یہی کامیابی ہے کہ ہم نے تیواری اور اس سے متعلق چند لوگوں کے سیل فون تک رسائی لے لی ہے۔ جس فون کے بارے میں ہم چاہیں گے۔ جیسے ہی وہ کہیں کال کرے گا، ہمیں یہاں معلوم ہو جائے گا۔“ ردنیت کور نے سکون سے کہا۔

”گڈ، یہ تو بہت اچھی بات ہے، کیا تیواری کا فون سن سکتے ہو تم؟“ جہاں ایک دم سے خوش ہو گیا۔
 ”جی، وہ بہت شارپ بندہ ہے، فون پر بہت کم بات کرتا ہے، اس کے چند آدمی ہیں جو سارا کچھ دیکھتے ہیں۔ میں انہیں بھی دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا

”تو کیا ہے ان کے بارے...“ اس نے تجسس سے پوچھا تو سبھی اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے۔
 ”وہ گوپال نند کی کم شدگی کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں۔“ اس نے بتایا
 ”سمجھو، وہ اب ماضی ہے۔ میں بتاتا ہوں اب کرنا کیا ہے۔“ یہ کہہ کر ٹی ایس نے سب کی طرف دیکھا پھر بولا۔
 ”میں چند نام اور فون نمبر دیتا ہوں۔ انہیں دیکھو، ان میں سے کوئی نہ کوئی بندہ سامنے آ جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہودی لابی کے حق میں ہیں۔“

”تمہاری رانا سے بات ہوئی؟“ تون نے ٹی ایس سے پوچھا۔
 ”ہاں، وہ کافی پر امید ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب میں تیواری کو دیکھتا ہوں۔ میں اور بائیا ابھی کچھ دیر کے لیے نکلتے ہیں۔“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں باہر آ گئے۔ ان کا رخ دریا کنارے کی طرف تھا۔ فارم ہاؤس سے نکلتے ہی بائیا نے کہا۔
 ”یہ ٹی ایس ہمیں اپنے انداز میں تو نہیں چلا رہا؟“

”بالکل، ایسا ہی ہے۔ وہ جو ہمارا سیٹ اپ جالندھر میں بننا تھا، یہاں بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی دوسری طرف دیکھنا چاہنا تھا اور ہم اس میں پھنس کے رہ گئے ہیں۔“ وہ سوچتے لہجے میں بولی۔
 ”پھر کیا کہتی ہو؟“ جہاں نے پوچھا۔

”دیکھو، ہم جانتے ہیں کہ ہم اپنے دھرم کے لیے کتنا کام کر رہے ہیں۔ ہم گیمانی نہیں بن سکتے لیکن مجرم ضرور بن گئے ہیں۔“ وہ حسرت سے بولی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ جہاں نے حیرت سے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”کسی کی گیم سے نکل کر صرف اپنی گیم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ممبئی فتح نہیں کرنی، لیکن امرتسر پر حکومت ضرور کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے جہاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ابھی کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ان دونوں میں تیواری کا فیصلہ کرو، اور یہودی لابی میں دہشت پھیلا دو۔ دونوں طرف کے اہم بندے مارو، ممبئی میں اپنی جتنی قوت بھی ہے، جمع کر لو، پھر جو بالکل ہوگی، دیکھا جائے گا کہ ہم اسے اپنے مقصد کے لیے کیسے استعمال کرتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے بائیا کور کی آنکھوں میں غصہ اتر آیا تھا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا تو وہ اس کی تفصیلات طے کرنے لگے۔



لاہور پر رات کے سائے پھیل چکے تھے۔ میں دوسری منزل پر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے سبھی نے ڈنڈیا تو وہیں انسانی حقوق کی تنظیموں کے بارے جو معلومات مل چکی تھیں، اس بابت کافی گفتگو ہوئی تھی۔ میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ٹی ایس کی انفارمیشن کا بھی انتظار تھا۔ میں یونہی محض شک میں کسی پر دھاوا بولنے والا نہیں تھا۔ میں کسی سرے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ سب اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ ایسے میں میرے سیل فون پر چھاکے کی کال آ گئی۔ میں نے فون رسپونڈ کیا تو وہ بڑے ضبط کے ساتھ حال احوال پوچھنے لگا۔
 ”تجھے ہوا کیا ہے چھاکے؟“ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تو وہ لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولا۔
 ”کچھ نہیں بس کل سے سویا نہیں ہوں، اس لیے آواز بھاری ہو رہی ہے۔“

”مجھے سچ بتاؤ، تجھے ہوا کیا ہے؟“ میرا تجسس بیدار ہو گیا تو اسی نرم لہجے میں بولا۔
 ”یار یہ تو پوچھ لے، میں نے فون کیوں کیا ہے؟“

”چل، بول کیا بات ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”اصل میں کل سے اماں کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔ وہ کبھی تو نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ وہ تجھے یاد کرتی ہیں۔“ اس نے بتایا

”چھاکے مجھے سیدھی بات بتا۔“ مجھے کچھ اور ہی شک ہونے لگا تھا۔ اس لیے تیزی سے پوچھا۔
 ”ٹو تو ایویس ہی گھبرا گیا ہے۔ یہی موسیٰ بخار ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم مصروف نہیں ہو تو ایک چکر نور مگر کا لگا لو، اماں کا دھیان بھی ذرا بٹ جائے گا اور ہم بھی تم سے مل لیں گے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول کہا جیسے وہ مجھ سے شکوہ کر رہا ہو۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا۔

”ٹھیک ہے، میں ابھی نکلتا ہوں۔“

”میں انتظار کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جب مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں گیا۔ میں نیچے آیا، دھند اس وقت باہر جانے کے لیے کنٹرول روم سے نکلا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔
 ”کدھر جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میںیں مارکیٹ تک، مجھے کچھ.....“ اس نے جواب دیا تو میں کہا۔
 ”تم تیار ہو جاؤ، ہم ابھی کہیں جا رہے ہیں۔“

”اوکے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور واپس اپنے کمرے کی جانب مڑ گیا۔ میں کنٹرول روم میں جا کر ابھل جانے کا کہہ آیا۔

لاہور سے نکلے تو رات کا دوسرا پہر تھا۔ سیاہ ہنڈائی میرے پیروں کے نیچے تھی اور میں اسے اڑائے لیے چلا جا رہا تھا۔ اس وقت پودہ پھٹ رہی تھی، جب میں نورنگر میں حویلی کو جانے والے راستے پر مڑ رہا تھا۔ میں آہنی گیٹ تک پہنچا تو سامنے چھاکے کا کھڑا تھا۔ گیٹ کھل گیا تو میں نے جیند کو گاڑی پارک کرنے کا کہہ کر خود اتر آیا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ میں آگے بڑھا اور چھاکے کے گلے لگ گیا، وہ بڑی گرم جوشی سے مجھے ملا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”چھاکے، سچ بتانا، خیریت ہی ہے نا؟“

”جی بات تو یہ جمال، اماں بہت بیمار ہے، تجھے بلانے کے لیے ہم سب نے کہا مگر وہ ماننی ہی نہیں ہیں۔ اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔“ وہ روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

”کافی عرصہ ہو گیا۔“ چھاکے نے جواب دیا
 ”سارا اور اس کے بیٹے کا کیا حال ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔
 ”وہ دونوں خوش ہیں، شعیب کئی بار یہاں انہیں آکر مل چکا ہے۔ وہ دعویٰ میں ہوتا ہے، اس نے سارا کو لے
 جانا چاہا مگر وہ نہیں گئی۔“

او کے آؤ، چلیں۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔
 میں تازہ دم ہو کر اوپر ہی ڈرائیوگ روم میں آیا تو سبھی وہیں تھے۔ چھاکا، سارا، تانی سوہنی اور اماں۔ ناشتہ تیار
 تھا۔ میں جا کر سب سے ملا۔ تانی نے شلوار نمیش پہنی ہوئی تھی، کچھ دیر پہلے والی تانی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ اس
 وقت میں چھاکے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے چٹون اور شرٹ پہنی ہوئی تھی اور ٹانگی بھی لگائی ہوئی تھی۔
 ”اوئے چھاکے یہ کیا؟“ میں نے خوشگوار حیرت سے کہا تو اماں نے ایک دم سے کہا۔
 ”جمال! آج کے بعد تم نے اسے چھاکا نہیں کہنا، اشفاق کہنا ہے، چوہدری اشفاق۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے اماں، پر اسے یہ سکھایا کس نے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ میری بیٹی سارا نے سکھایا ہے۔ دیکھنا یہ میرا پترا بہت بڑا آدمی بنے گا۔“ اماں نے رساں سے کہا تو
 میں نے اسے چوہدری اشفاق کہنے کا پورا ارادہ کر لیا۔ ناشتہ ختم ہونے تک باتیں چلتی رہیں۔ تبھی سارا اٹھ گئی
 ”مجھے اجازت، میں دوپہر کے بعد آپ سے باتیں کروں گی مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔“
 ”اس وقت کہہ لو ضروری باتیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، مجھے اسکول جانا ہے۔ میں پہلے ہی لیٹ ہو چکی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اماں بولیں۔
 ”یہ یہاں کا سارا اسکول سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ رہتی ہی وہیں اسکول میں ہے۔ یہ تو چٹیاں گزارنے یہاں
 آتی ہے حویلی میں۔“

”اماں آپ بھی تو وہیں ہوتی ہیں۔“ سارا نے کہا اور چل دی۔ میں نے سوہنی کی طرف دیکھا اس کے چہرے
 پر ایک میٹھی مسکان تھی۔ اس نے اب تک ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پیاس کے ساتھ ایسی ناپیدہ
 لہریں پھوٹ رہی تھیں جنہیں میں کوئی نام تو نہیں دے پایا مگر وہ مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔
 ”اماں، اس چھاکے نے فون کر کے اس طرح کہا کہ میں ڈر رہی گیا۔ اس نے تو.....“ میں نے کہنا چاہا تو
 سوہنی ایک دم سے بولی۔

”ٹھیک کہا اس نے، اماں ٹھیک نہیں ہیں۔ یہاں کے ڈاکٹرز نے جو کہا وہ اگر سن لیں تو تم بھی پریشان ہو
 جاؤ۔ اماں ہماری نہیں سنتیں۔ میں نے چھاکے سے کہا کہ وہ تمہیں بلائے۔“

”کیوں، کیا ہوا؟“ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا
 ”اب میں تفصیل بتاتی.....“ اس نے کہنا چاہا تو اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”او پترا مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ایویں پریشان ہیں سب۔ اب عمر کا بھی تقاضا ہے، کمزوری تو آئے گی۔“
 اماں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو میں خاموش رہا، پھر تانی کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اماں اٹھ کر اندر چلی تو
 سوہنی انہیں چھوڑنے ساتھ چلی گئیں۔

”بات کیا ہے؟“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

”تو نے اچھا کیا مجھے بلا لیا، چل آماں سے ملتے ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور حویلی کی جانب چل پڑا
 تو اس نے بھی میرے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

دوسری منزل کے بڑے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہولے سے بجایا تو اندر سے اماں
 نے کہا۔
 ”آ جاؤ۔“

میں نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اماں بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے قرآن مجید کھلا ہوا تھا۔ ان
 کے بیڈ سے ذرا فاصلے پر بڑی سی چادر سے اپنا آپ ڈھانپنے سوہنی نماز پڑھنے میں مگن تھی۔ دوپٹے کے ہالے میں
 اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ایک نور تھا جو اس سے پھوٹ کر متاثر کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں چند لمحے اس کے چہرے کی
 تاب نہ لا سکا۔ میں نے اماں کی طرف دیکھا وہ مجھے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے کلام پاک بند کر دیا تھا۔ میں
 آہستہ آہستہ ان کے قریب گیا اور ان کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے میرا سر اٹھایا، اسے
 چوما اور مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”خیر سے آئے ہو نا پترا۔“

”جی اماں، بس دل کیا اور آ گیا۔“ میں نے سکون سے کہا تو میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔
 ”چل تو منہ ہاتھ دھو کے تازہ دم ہو جا۔ میں یہ منزل ختم کر لوں تو پھر تیرے ساتھ باتیں کرتی ہوں۔“
 ”ٹھیک ہے اماں۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے نکلنے ہوئے میں نے ایک نگاہ سوہنی پر ڈالی۔ وہ
 قعدہ میں تھی۔ میں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا اور باہر آ گیا۔
 ”یار اماں تو ٹھیک ہے، میں تو ایویں ڈر گیا تھا۔“ باہر کھڑے چھاکے کو دیکھ کر میں نے کہا تو وہ خاموش رہا۔
 میں آگے بڑھا تو اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”ادھر ہے تمہارا کمرہ۔ سوہنی نے رات ہی بتا دیا تھا۔“

ہم اس طرف چل پڑے۔ میں اس کے ساتھ کارڈور سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا۔ حویلی کی دائیں
 جانب باہر کی طرف ایک میدان تھا۔ جہاں کبھی فصلیں اگا کرتی تھیں۔ وہاں کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ورزش
 کر رہے تھے۔ وہ سبھی ٹریک سوٹ میں تھے۔ ان لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ایک لمبی دیوار تھی۔ دونوں طرف
 سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”آؤ، پہلے یہی دیکھ لو۔“ اس نے کہا اور کارڈور میں آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ سرے تک گیا تو سارا
 منظر واضح ہو گیا۔ وہ سب ایک منظم انداز میں ورزش کر رہے تھے۔ لڑکوں کی طرف تانی کھڑی تھی اور انہی کے
 ساتھ پوری طرح مصروف تھی۔ میں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بدن گرم ہو جانے تک یہی چلتا رہا، پھر وہ
 زور زور سے انہیں حکم دینے لگی۔ ایک دم سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگے۔ بالکل روہی کی تربیت والا
 انداز تھا۔ دوسری جانب لڑکیاں بھی وہی کر رہی تھیں۔ تانی پورے جوش کے ساتھ۔ کبھی کسی کے ساتھ فائینٹ
 کرنے لگتی اور کبھی کسی کے ساتھ۔ کافی دیر تک یہی چلتا رہا۔ جہاں کوئی غلطی کرتا اسے سمجھاتی۔ یہ مرحلہ ختم ہوا تو
 اس نے ہدایات دینی شروع کر دیں۔

”کب سے یہ چل رہا ہے؟“ میں نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

لے غور کیا، وہ خانہ بدوش نہیں تھیں۔ خانہ بدوش جو ہر طرح کا جانور، کتے، بے، خنزیر تک کھا جاتے ہیں، مقامی لہان میں انہیں ”بورے“ کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک طرح کی نفاست تھی، یہی شے مجھے ان میں دلچسپی پیدا کر رہی تھی۔ جب وہ پانی بھر چکیں تو میں نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک بڑی لڑکی سے کہا۔

”وہ سامنے جمونپڑیاں تم لوگوں کی ہیں۔“

”ہاں ہماری ہیں۔“ اس نے تصدیق کی۔ اس کا لہجہ اندرون روہی اور سندھی کا ملا جلا تاثر دے رہا تھا۔

”تم میں جو بڑا بزرگ ہے نا، اسے یہاں بھیجو، میں اس سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا تو انہوں نے کوئی جواب دیے بغیر گھڑے سر پر اٹھائے اور تیز قدموں سے چل دیں۔

میں مسافر شاہ کے تھڑے پر بیٹھ گیا تھا۔ اشفاق بھی ذرا فاصلے پر میرے پاس براجمان ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جمونپڑیوں سے ایک لمبے قد کا، پتلا سا آدمی نکلا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل پڑا۔ اس نے گہرے رنگ کا کرتا اور سفید دھوٹی باندھی ہوئی تھی۔ سر پر سفید بھاری پکڑی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ اس کے کپڑے صاف اور دھلے ہوئے تھے۔ خانہ بدوشوں کی طرح میلے کپڑے نہیں تھے۔ اس کے پیچھے تین مختلف عمر کے نوجوان بھی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کی بڑی بڑی سفید مونچھیں اور بے تحاشا داڑھی اس کے پتلے ہارے پر عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ تینوں نوجوان اس کے پاس گھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں کو جڑ کر پر نام کیا۔ وہ ہندو تھے۔ بوڑھے کا نام رام لعل تھا۔ وہ جوگی تھا۔ وہ لوگ دو ہفتوں سے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک بات میں نے محسوس کی۔ جب تک وہ اپنا تعارف کراتا رہا، اس دوران وہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اتنی گہری نگاہ کہ مجھے احساس ہو گیا کہ اس کے انداز میں ایک طرح کا غرور ہے۔ چند لمحے بعد وہ روہی اور سندھی ملے لہجے میں بولا۔

”جی حضور، فرمائیں، کس لیے بلایا؟“

”تم لوگ یہاں کیسے؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اگر آپ کو ہمارے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو ہم آج ہی چلے جاتے ہیں۔“ اس نے لہجہ مودب رکھا لیکن اس میں ایک خاص اکھڑ پن تھا۔

”مجھے یہاں تمہارے ڈیرہ لگانے پر اعتراض نہیں ہے، میں نے یہاں میلے کے علاوہ کبھی کسی خانہ بدوش کا اہم نہیں دیکھا۔ اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم یہاں کیسے؟ کوئی خاص مقصد ہے اس علاقے میں آنے کا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا جو کسی سانپ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہا پھر اسی لہجے میں بولا۔

”میں ایک جوگی ہوں۔ میں خاص سانپوں کو پکڑنے کے لیے مختلف علاقوں کا سفر کرتا رہتا ہوں یہاں میں ایک خاص قسم کے سانپ کی تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ یہاں پایا جاتا ہے۔“ اس نے مودب لہجے میں کہا۔

”کیا وہ سانپ یہاں ملا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی موجودگی کے آثار تو ہیں لیکن دو ہفتے ہو گئے، وہ ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ پوری کوشش کے بعد بھی اسے تلاش نہیں کر پائے ہیں۔“ اس بار وہ ذرا عجیب سے لہجے میں بولا جیسے بے بس ہو گیا ہو۔

”کیا وہ اتنا ہی نایاب سانپ ہے، جس کی تلاش تمہیں یہاں تک لے آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سوئی ہی بتا دے گی آپ کو۔“ اس نے کہا ہی کچھ اس طرح تھا کہ میں نے اس موضوع کو ایک طرف رکھ دیا اور میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یہ تم نے بہت خوب کیا کہ یہاں کے نوجوانوں کو تربیت دے رہی ہو۔ یہ خیال کیسے آیا؟“

”میری مجبوری تھی۔ مجھے اپنی فتنس رکھنا تھی۔ دوسرے یہاں رہتے ہوئے میں فضول نہیں بیٹھ سکتی، سو میں نے اماں سے اجازت لی اور یہ سب شروع کر دیا۔ شروع میں تھوڑا مخالفت ہوئی، پھر سب ٹھیک ہو گیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا

”تم یہاں خوش تو ہونا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک دم خوش۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر سورنگ بکھر گئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے یہاں کی سیکورٹی کا پورا احساس تھا۔ میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ سوئی آگئی۔ وہ آتے ہی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

”اماں بہت سیریس ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ایک وقت ہی میں انہیں دو طرح کے مرض لاحق ہو گئے ہیں۔ ایک دل اور دوسرا انہیں ہائی بلڈ پریشر ہے۔“

”مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ میں نے چونکتے ہوئے کہا تو تیزی سے بولی۔

”اماں نے منع کیا تھا۔ وہ تو اب بھی نہیں چاہتی تھیں کہ تمہیں بتایا جائے، بس دوا کھالی تو ٹھیک۔“

”تو پھر تیاری کرو، اماں کو کسی بھی باہر کے ملک لے چلتے ہیں، اس پر تو کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی نا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

”میں پتہ نہیں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ وہ نہیں مانتیں۔ تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔ تم کہو تو شاید مان جائیں۔“

”ٹھیک ہے میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو اٹھ کر اندر جانے لگا۔ تب سوئی نے مجھے روک دیا

”اس وقت وہ دوا کے اثر میں سونے لگی ہیں۔ جگایا تو ان کی طبیعت.....“

”ٹھیک ہے میں شام کو بات کروں گا۔“ میں نے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔ میرے پیچھے ہی تانی بھی اٹھ آئی۔ چوہدری اشفاق میرے انتظار میں تھا۔ ہم نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ کچھ دیر بیٹھے اور وہاں کے بارے معلومات لینے کے بعد میں اور اشفاق، سارا کا اسکول دیکھنے چل پڑے۔ وہاں ہی پر ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ میں نے مسافر شاہ کے تھڑے پر مسافروں کے لیے کچھ سہولیات مہیا کرنے کا کہا تھا۔ اشفاق نے وہاں کافی کام کروا دیا تھا۔ میں نے اس کام کے بارے میں پوچھا تو اس نے کار کار رخ ادھر موڑتے ہوئے کہا۔

”چل ادھر کا بھی ایک چکر لگالیں۔ تو خود ہی دیکھ لے کیا کچھ کیا ہے، جو رہ گیا ہو وہ بتا دینا۔“

اس نے وہاں کافی کام کروا دیا ہوا تھا۔ ایک طرف کمروں کی نظارہ گئی اور اس کے ساتھ برآمدے تھے، جہاں مسافر کچھ دیر بیٹھ کر سکون لے سکتے تھے۔ پانی کا بہترین انتظام کر دیا گیا تھا۔

”بس اب یہاں بجلی پہنچ جائے تو مزید بہتر ہو جائے گا، میرے خیال میں وہ جلد لگ جائے گی۔“ اشفاق نے بتایا۔ پھر ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

”وہ دیکھو، کافی قطعات پر گھاس لگوا دی ہوئی ہے لیکن یہ سبز بھی ہوں گے جب یہاں ٹوب ویل لگ جائے گا۔“ وہ بتا رہا تھا لیکن میں وہاں کھڑا دیکھ رہا تھا، کنویں پر چند لڑکیاں پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا مسافر شاہ کے میدان کے ایک سرے پر بڑی رنگین جمونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ وہیں سے آئی تھیں۔ میں

”ہاں وہ اتنا ہی نایاب ہے۔ لیکن لگتا ہے وہ اب یہاں نہیں ہے۔ میرے آتے ہی شاید یہ بخود چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“ اس نے قدرے فخریہ لہجے میں بتایا۔

”مطلب وہ سانپ تم سے ڈر گیا اور یہاں سے بھاگ گیا۔ یہی کہنا چاہ رہے ہو نا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”لگتا تو یہی ہے؟“ اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایسی کیا بات ہے تم میں؟“ میں نے اس میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”اس روئے زمین پر کوئی ایسا سانپ نہیں ہے جو اپنے زہر سے مجھے نقصان پہنچا سکے۔ سنا ہے اس سانپ کا زہر بہت تیز ہے اتنا تیز کہ جیسے ہی وہ کسی بندے کو ڈستا ہے اس کا جسم پھٹنے لگتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کا زہر مجھ پر اثر کرتا ہے کہ نہیں۔“ جوگی نے یہ کہتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔

”اس سانپ کی تلاش تمہیں اس لیے ہے کہ تم اس کے زہر پر تجربہ کر سکو؟“ میں نے پوچھا تو چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”ہاں، ایک تو تجربہ کرنا تھا، دوسرا.....“ یہ کہتے ہوئے وہ یک دم سے رک گیا، لمحہ بھر بعد بولا۔

”جب وہ سانپ ہی نہیں ہے تو اس کا کیا ذکر، ویسے بھی ہم آج کل میں جانے والے ہیں۔“

”تمہیں تو وہ سانپ نہیں ملا لیکن اگر میں وہ سانپ یہاں بلا لوں تو کیا پھر خود کو ڈسواؤ گے۔“ میں نے کہا تو اس نے شدید حیرت سے میری طرف دیکھا، چند لمحے اسی کیفیت میں رہا تو میں بولا۔

”میں دیکھنا چاہوں گا کہ اس سانپ کے کاٹنے سے بدن کیسے پھٹتا ہے۔“

”حضور یہ آپ بہت بڑی بات کر رہے ہیں؟“ اس نے یوں کہا جیسے میں پاگل ہوں اور یونہی بڑ میں کہہ رہا ہوں۔ اس کے لہجے میں تیز طعنت تھی۔

”اگر میں بلا لوں تو؟“ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”ہاں، بلا لیں۔“

میں نے ایک نگاہ پورے میدان پر ڈالی۔ ایک طرف چٹیل میدان، ایک طرف ٹیلے اور دو طرف جھاڑیاں اور درخت اُگے ہوئے تھے۔ میں چند لمحے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا کہ میرے اندر سے کوئی قوت اس سارے میدان میں پھیل رہی ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، کہ ایک سانپ تیزی سے رینگتا ہوا تھڑے کی جانب آ رہا تھا۔ میں نے خود پہلی بار ایسا سانپ دیکھا تھا۔ اس کا رنگ ہلکا نیلا، جس میں کہیں کہیں سیاہ دھبے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین فٹ کا رہا ہوگا۔ پتلا سا، چمکتا ہوا سانپ جس پر نگاہ نہیں ٹک رہی تھی۔ وہ تھڑے سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا۔ میں نے واضح طور پر اس جوگی کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلتی ہوئی محسوس کی۔ تبھی میرے قریب اشفاق نے ہولے سے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“

میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ جوگی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہی ہے وہ سانپ، اسی کی تلاش تھی تمہیں؟“

”یہی ہے سانپ، میں اسی کی تلاش میں یہاں تک آیا ہوں۔“ اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا تو میں بولا۔

”چلو، اب اسے خود کو ڈسواؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ تمہارا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔“

میرے یوں کہتے ہی وہ ساتھ کھڑے تینوں نوجوان ایک دم سے بول پڑے۔ یہ ان کی اضرائی کیفیت تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تبھی ایک نوجوان نے کہا۔

”نہیں گھوجی، یہ بڑا زہریلا سانپ ہے، اس کا ڈسا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے ہم، بس پکڑ لیں ان کو۔“

”ایسے نہیں پکڑ سکتے تم اسے، اپنے آپ کو ڈسواؤ تو پکڑو۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو جوگی نے میری طرف دیکھا پھر اپنے نوجوانوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”نہیں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

جوگی سانپ پکڑنے کو آگے بڑھا تو سانپ غضب ناک ہو گیا۔ اس کی پھنکار میں شدت تھی۔ وہ سبھی چوکنا تھے۔ لیکن کسی کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ آگے بڑھ کر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تبھی جوگی نے حوصلہ پکڑا اور سانپ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ سانپ اس کے ہاتھ سے لپٹ گیا۔ واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ سانپ نے اسے اس لیا تھا۔ کیونکہ اس کے ماتھے پر ایک دم سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ جھومنے لگا جیسے اسے سانپ کے ڈسنے سے سرور آ رہا ہو۔ وہ اپنے پاؤں سے مل گیا۔ اس کے چیلے بالکے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے کوئی شے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہو۔ چند منٹ تک وہ اسی کیفیت میں رہا۔ پھر اسے ہوش آنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ نارمل حالت میں میرے سامنے کھڑا تھا مسکرا رہا تھا۔

”بہت زہریلا ہے یہ سانپ، جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔“ وہ جوگی خوش ہوتے ہوئے بڑبڑایا۔

”یہ تجربہ تم نے کر لیا کہ اس میں کتنا زہر ہے۔ اب چھوڑ دو اسے۔“

”نہیں یہ نایاب سانپ مجھے چاہئے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

”کیا کرنا ہے تم نے سانپ کا کیوں چاہئے تمہیں؟“ میں نے پوچھا تو وہ خاموش رہا، جیسے وہ مجھے بتانا نہ چاہتا ہو کچھ دیر بعد میں نے پھر پوچھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں یہ سانپ کیوں چاہئے۔“ میں نے پوچھا۔

”حضور آپ کیا کریں گے پوچھ کر، مجھے سانپ مل گیا۔“ اس نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

”ہو سکتا ہے اب یہ تمہارے کام کا نہ رہا ہو اس نے تمہیں ایک بار ڈس لیا ہے.....“ میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بڑے غرور سے بولا۔

”نہیں، یہ ایک ہی وقت میں کئی بار ڈس سکتا ہے، ہر بار اس کا اثر اتنا ہی رہتا ہے۔ میں نے جو اس سے کام لیا ہے وہ لے لوں گا۔“

”لیکن تمہیں بتانا ہوگا کہ یہ کس مقصد کے لیے لے کر جاؤ گے، کیا کام لو گے اس سے؟“ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو اس نے سرور میں آتے ہوئے بڑے غرور سے کہا۔

”میں مانتا ہوں کہ تم نے سانپ کو یہاں بلا لیا، کچھ تو ہو، لیکن اگر اسے ڈسواؤ تو میں بتا دوں گا۔“

”ایسا ہے، تو لاؤ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اپنا وہ ہاتھ آگے کیا جس میں اس نے سانپ پکڑا

تھا۔ میں نے اسے پکڑا اور اپنے ہاتھ پر رکھ لیا۔ سانپ کی فطرت ہے ڈسنا، اس نے مجھے ڈس لیا لیکن اگلے

ہی لمحے وہ خود بل کھانے لگا۔ میں نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ وہ جوگی حیرت اور غم میں زور زور سے چیخنے لگا۔
 ”یہ کیا ہو گیا۔ یہ مر گیا..... یہ مر گیا۔“ وہ زمین پر پڑے ہوئے سانپ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
 ”تمہیں کیسے پتہ یہ مر گیا ہے۔“ میں نے سکون سے کہا تو اسی طرح دکھ بھرے لہجے میں بولا۔
 ”جب سانپ الٹ جائے تو وہ مر جاتا ہے۔“

”نہیں، یہ ابھی مرا نہیں، جس طرح سانپ کے زہر نے تمہیں ہلا کر رکھ دیا تھا، اسی طرح جب سانپ نے مجھے ڈسا تو وہ خود بے خود ہو گیا ہے۔ انتظار کرو، ابھی ہوش میں آجائے گا۔“

”ایسا ہے، کیا میں اسے اپنے ساتھ لے جا پاؤں گا؟“ وہ ایک دم خوشی سے بولا۔

”ہاں ایسا ہی ہے، لیکن اسی وقت لے جا سکو گے جب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ اس کا کرنا کیا ہے۔“

میری بات سن کر وہ چند لمحے خاموشی سے کھڑا سوچتا رہا۔ اس کے بالکے بھی ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے سانپ پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کا زہر چاہئے۔ اس کے زہر میں خاص نایاب قسم کے جز ہیں۔ میرا ایک بیٹا بہت بڑا کیمسٹ ہے۔ مجھے نایاب سانپ ڈھونڈنے کا شوق ہے تو اسے زہر کی خاصیتوں پر تجربات کرنے کا جنون ہے۔ اس نے بہت ساری اختراعات کر لی ہیں۔ یہ سانپ اسے چاہئے۔“

”اور وہ یہ سارا کام دولت بنانے کے لیے کر رہا ہوگا۔ اسے یہ کوئی غرض نہیں ہوگی کہ انسانیت کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔“ میرے یوں کہنے پر وہ خاموش رہا۔ میں نے سانپ کی طرف دیکھا، وہ سیدھا ہو کر معمولی سی حرکت میں تھا۔ میں نے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کراہت سے کہا
 ”اٹھاؤ اس سانپ کو اور لے جاؤ۔“ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ دم سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑ گڑاتا ہوا بولا۔

”مجھے خود پر بہت زعم تھا، بڑا ناز تھا، مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہئے تھا جب آپ نے سانپ کو بلایا۔ میں سمجھ گیا ہوں، آپ بہت بڑے گیانی ہو۔ مجھے بس اپنے چرنوں میں جگہ دے دو، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”کیوں رہنا چاہتے ہو تم یہاں۔ تمہیں سانپ چاہئے لے جاؤ، اور چاہئے تو مزید لے جاؤ۔“ میں نے یوں کہا جیسے یہ اب کچھ بھی اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ وہ مزید گڑ گڑانے لگا۔ میں اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر کہا۔

”تم ٹھیک سمجھ ہو، آج کے بعد تیرے بیٹے کے ہاتھ میں وہ اثر نہیں رہے گا اور نہ تم میں یہ صلاحیت، ایک چھوٹے سے سانپ کا زہر تمہیں مار سکتا ہے۔“

”رحم حضور رحم.....“ وہ گڑ گڑانے لگا۔

”یہاں رہو، اپنے بیٹے کو بلاؤ، وہ مجھے مطمئن کرے گا تو ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔ جاؤ، اپنے سب لوگوں کو ان کدوں میں لے آؤ۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

”جیسے آپ کا حکم سرکار۔“ اس نے کہا اور سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے چیلے بالوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ فوری ہی پلٹ گئے۔

بظاہر وہ معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن ایک بے چینی میرے اندر اب بھی تھی۔ مجھے سکون نہیں آ رہا تھا۔ تبھی میں نے اس جوگی سے پوچھا۔

”یہاں اس میدان میں یا اس کے ارد گرد تم لوگ ہی ہو یا کوئی دوسرا بھی ہے؟“

”یہاں تو ہم لوگ ہی ہیں، ہم سب آپس میں رشتے دار ہیں۔ ہمارے گھر شہر میں ہیں۔ لیکن اس طرح رہنا ہماری مجبوری ہے کہ ہم سانپ.....“ اس نے مزید کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، تم لوگوں کے علاوہ کوئی اور ہے اس علاقے میں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے چونکا۔ میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔

”ایک ملنگ ہے، اس طرف بڑے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے کا وہاں پر بیٹھا ہوا

ہے۔ وہیں رہتا ہے، ہم نے کبھی اسے ادھر یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا، اس کے معمولات کیا ہیں یہ بھی نہیں پتہ۔“

”کیا اب وہ وہاں پر ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ اس نے جواب دیا تو میں اس جانب دیکھنے لگا۔ مجھے کافی کچھ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے

زمین پر پڑے ہوئے سانپ کو دیکھا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جانے دواسے، پھر جب چاہے بلا لیں گے اسے، تمہیں تو صرف اس کا زہر ہی چاہئے نا۔ وہ مل جائے

گا۔“ میں نے کہا اور اس سمت چل پڑا، جس طرف اس ملنگ کے ہونے کا جوگی نے بتایا تھا۔

اس پورے میدان میں برگد کا درخت صرف مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس ہی تھا، یا پھر وہ برگد کا درخت تھا، جس کے نیچے وہ ملنگ گدڑی بچھائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی کچھ برتن پڑے تھے۔ دو ایک پونلیاں تھیں۔ قریب ہی ایک بکری بندھی ہوئی تھی، جس کے آگے کافی سارا چارہ پڑا ہوا۔ اس کے سامنے مٹی کا ایک بڑا سا کوٹڑا دھرا ہوا تھا، جس میں وہ پورے جذب سے اس بھنگ کی طرف متوجہ تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”بابا! مجھے پیاس لگی ہے، پانی تو پلاؤ۔“

ملنگ نے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”جو پانی تھا وہ میں نے اسے ٹڑے میں ڈال لیا، اب میرے پاس تو یہی ہے، اگر تم چاہو تو یہ پی لو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں بھنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جیسے مجھے وہ پینے کے لیے اکسا رہا ہو، اسی لیے میں نے پوچھا۔

”کیا یہ کوئی خاص شے ہے جو میں پی نہیں سکتا؟“

”یہ بھنگ ہے جو میں گھوٹ چکا ہوں۔ شاید یہ تیرے جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”کیا ہوتا ہے اس سے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے، نشہ کر دیتی ہے یہ بھنگ، یہ میری طرح کے رند ہی پی سکتے ہیں۔“ اس ملنگ نے یوں کہا جیسے میری اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہو۔

”مجھے تمہاری بھنگ سے کوئی غرض نہیں ہے، اور نہ اس کے نشے سے کوئی مطلب ہے، میں تو اسے پانی سمجھ کر پی لوں گا، دیتے ہو کیا مجھے؟“

”ہاں ہاں آؤ بیٹھو، یہاں میرے سامنے۔“ اس ملنگ نے پھر اسی استہزائیہ لہجے میں کہا تو میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان کوٹڑا دھرا ہوا تھا، جس میں لبالب بھنگ پڑی ہوئی تھی۔ اس

نے بڑی نفاست سے مٹی کا پیالہ اٹھایا، اسے لبالب بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ دوسرا بھرا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ لو جام فلک سیر..... لیکن فلک سے گرنہ جانا یہ رندی کی توہین ہے۔“ اس نے مجھے یوں متنبہ کیا جیسے وہ مجھے گرانے پر تیار ہوا ہو۔ میں نے وہ مٹی کا پیالہ پکڑا اور اس میں پڑی ”فلک سیر“ کو پی گیا۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے پیالہ بھرا اور پی گیا۔ اس طرح ہم نے چار چار پیالے ایک گھنٹے میں لیے ختم کر لیے۔ ملنگ کی آنکھیں سرخ ہوئی کی مانند ہو چکی تھیں۔ وہ جھومنے لگا تھا تو مجھے احساس ہو گیا کہ اب یہ پورے نشے میں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھابنگ سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کے جھومنے پر مسکرا دیا اور پوچھا۔

”باباجی کہاں پر ہو، کون سا آسمان ہے؟“

ملنگ نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور نشے میں لتھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں ایک نیا آسمان بنا رہا ہوں.....“ وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ جب میں نے کہا۔

”باباجی! آپ اکیلے اکیلے ہی نیا آسمان بنا رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ میں شامل کر لو۔“

ملنگ میری بات سن کر چونک گیا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہاری سیر ابھی شروع نہیں ہوئی؟“

”نہیں باباجی میری تو ابھی تک پیاس بھی نہیں بجھی، میں نے سیر کیا خاک کرنی ہے۔ اگر اجازت دیں تو یہ باقی پڑی فلک سیر پی لوں یا ابھی آپ پیئیں گے؟“

اس نے لاچاری والے انداز میں ہاتھ ہلا کر اجازت دیتے ہوئے کہا۔

”اب اس سے زیادہ پینے کی میری گنجائش نہیں ہے، تم اگر پی سکتے ہو تو پی لو۔“

میں نے ایک بار پھر اس گرتے ہوئے ملنگ کو دیکھا، پھر پیالے اور کوٹھے کو، میں نے کوٹھہ اٹھایا اور منہ کو لگا کر پینے لگا۔ کوٹھہ خالی کر کے جب میں نے رکھا تو وہ ملنگ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ میرے پینے سے نشہ اسے ہی ہو گیا ہو۔ وہ حیرت کی انتہا پر تھا، مگر کوئی بات نہیں کر پا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کا جھومنا بند ہو گیا اور وہ بائیں کروٹ زین بوس ہو گیا۔

میں نے ارد گرد دیکھا، مجھے ایک گھڑا دکھائی دیا۔ میں اس گھڑے کی طرف بڑھا تا کہ پانی لے سکوں، مگر وہ خالی تھا۔ میں نے پانی کے لیے ادھر ادھر دیکھا لیکن مجھے پانی نہیں ملا۔ میری نگاہ قریب بندھی ملنگ کی بکری پر پڑی۔ میں نے پیالہ اٹھایا اور بکری کا دودھ دھوئے لگا۔ آدھے سے زیادہ پیالہ بھر گیا۔ میں واپس اس ملنگ کے پاس آیا اور دودھ کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر کچھ کہہ بنا دودھ پینے لگا۔ پیالہ خالی ہوا تو میں نے الگ رکھ دیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کب ہوش میں آتا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے ہوش آ گیا لیکن اس کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کبھی خالی کوٹھے کی طرف اور کبھی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ وہ کچھ کہے۔ تبھی اس نے پوچھا۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوا؟“

”نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا

”یہ کمال تو بلا نوش رند کا ہے۔ تم نے اسے کیسے حاصل کیا؟“ اس ملنگ نے عاجزی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تم پوچھنا کیا چاہتے ہو اور یہ رند کیا ہوتا ہے؟“ میں نے جان بوجھ کر اس سے سوال کیا

”رند، مطلب وہ جو بلا نوش ہو، جو نشے پر قابو پالے۔“ ملنگ نے کہا۔

”نہیں، میرے نزدیک رند وہ ہوتا ہے جو نشے میں سے ہوش حاصل کر لیتا ہے۔ میرے لیے یہ رندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔“ میں نے اسے بتایا تو حیرت سے بولا۔

”لیکن، تمہیں نشہ کیوں نہیں ہوا، جبکہ میں تو چار پیالوں ہی میں اپنا نشہ پورا کر لیا کرتا ہوں۔ اتنی زیادہ تو کوئی برداشت نہیں کر سکتا جتنی تم پی گئے ہو۔“

”تم کیا چاہتے تھے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں..... میں تمہیں گرانا چاہتا تھا۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم ایک دو پیالوں میں گر جاؤ گے۔“

اس کے اعتراف پر میں نے اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پردے ہی میں کہا۔

”مجھے نشہ اس لیے نہیں ہوتا کہ میں نے شراب عشق پی ہوئی ہے۔ جو شراب طہورہ کے نام سے مشہور ہے۔“

”یہ کون سی شراب ہوتی ہے، میں نے تو سنی نہیں۔ میں یہ پینا چاہتا ہوں تاکہ میں بھی تمہارے جیسا کمال حاصل کر سکوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ اس کے یوں کہنے پر میں مسکرا دیا اور بولا۔

”یہ ایسے نہیں مل جاتی، اس کے لیے تھوڑا وقت لگانا پڑتا ہے، کیا تم میرے کہنے پر صبر کر سکو گے؟“

”جیسے آپ کہو۔“ اس نے عاجزی سے جواب دیا تو میں نے اسے سختی سے کہا۔

”وہ سامنے بابا مسافر شاہ کا تھڑا دیکھ رہے ہو؟“

اس نے نگاہ اٹھا کر تھڑے کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جی جی دیکھ رہا ہوں“

”تو چلو وہاں جاؤ اور روزانہ صبح سے شام تک وہاں جھاڑو لگایا کرو، تیرے نشے کا بندوبست کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔“ اس نے کافی حد تک بے پروائی میں کہا۔

”نہیں اب تم نہیں بھی جانا چاہو گے تو میں وہاں پر رکھوں گا۔ اٹھو، ورنہ لے جانے والے تجھے یہاں سے لے جائیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

”جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ وہ اپنی چیزیں اٹھانے لگا پھر اس نے اپنی بکری کھولی اور سارا سازو سامان اکٹھا کر کے کاندھے پر رکھا اور تھڑے کی جانب چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔

ہم واپس مسافر شاہ کے تھڑے پر آ گئے۔ جوگی اور اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی وہیں آ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کمروں کے نزدیک اپنی جھونپڑیاں لگانا شروع کر دی تھیں۔ میں نے جوگی کو اپنے پاس بلایا اور اس ملنگ کے بارے میں ہدایات دیں۔ اس نے وہ سب غور سے سنا اور عمل کرنے کی یقین دہانی کروادی۔ جب میں اشفاق کو لے کر وہاں سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔



مبئی پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج مغرب کی اوٹ چھپنے کو بے تاب تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایسے میں بائیکا کور فارم ہاؤس کے ایک لان میں اکیلی ٹہل رہی تھی۔ اس کے ٹہلنے میں اضطراب واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی فیصلے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ جہاں تک ایک کمرے میں کھڑا اسے

غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود بھی ایسی حالت میں تھا۔ وہ فیصلہ تو کر چکا تھا کہ اب جو بھی گیم کرنی ہے، وہ خود ہی کرنی ہے۔ تیواری کا نیٹ ورک پورے ممبئی میں تو نہیں پھیلا ہوا تھا، لیکن بورا ویلی میں اسے پوری دسترس حاصل تھی۔ جس طرح اس نے ونود رانا جیسے پولیس آفیسر کے بارے میں سنا تھا اور ملاقات میں اس نے محسوس بھی کر لیا تھا، وہ بندہ یوں تیواری جیسے مجرموں کی لعنت ملامت سنے، ایسا ہو نہیں سکتا تھا، مگر وہ مجبور تھا، سامنے اسے قطعاً جواب نہیں دے پارہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ اس کے خلاف سرگرم تھا۔ اصل بات جو سوچنے والی تھی، وہ یہی تھی کہ ونود رانا یہ ثابت کر پائے گا کہ جو کچھ بھی ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کیے گئے ہیں وہ جعلی ہیں اور جھوٹے ہیں؟ فوری طور پر دماغ اس بات کو ماننے سے انکاری تھا۔ کیا وہ فقط جھانسا دے کر ہمیں استعمال کر رہا ہے یا وہ ایسا کر پائے گا؟ لازمی بات ہے کہ بائیکاٹ کور کے ذہن میں بھی یہی سوال ہوگا، تبھی اس نے اپنے استعمال ہو جانے کی بابت کہا۔ اب انہیں کرنا کیا ہوگا؟ کیا وہ تیواری والے معاملے کو چھوڑ دیں؟ یہودی لابی والے معاملے کو بھول جائیں؟ چونکہ ”را“ ان کے پیچھے ہے، وہ یہاں سے نکل جائیں؟ کیونکہ یہاں پر تیواری جیسے بندے سے بچنے کے لیے ان کے پاس وہ قوت نہیں تھی کہ اکیلے گیم کر سکیں۔ دوسری صورت میں وہ دوسرے کے ہاتھوں میں استعمال ہونے پر مجبور تھے۔

ایسے میں اس کے پیچھے نوتن کور آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے باہر بائیکاٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کیا بات ہے؟ تم دونوں اتنا پریشان کیوں ہو؟“

اس پر جہاں سنگھ نے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں سکون پھیلا ہوا تھا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا
”میرے دماغ میں تیواری ہے اس وقت، اس کا دیا ہوا وقت ختم ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ ہی رہتا ہے۔“
”تم خوف زدہ ہو اس سے؟“ نوتن کور نے کسی تردد کے بغیر کہا تو جہاں سنگھ نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ بولی۔
”مجھے بتاؤ، کیا کرنا ہے تمہیں؟“

اس پر جہاں سنگھ نے طویل سانس لی اور بولا۔

”اس کے نیٹ ورک کی مجھے تھوڑی بہت شدید آگئی ہے۔ مجھے وہ توڑنا ہے لیکن.....“

”وہ اتنی جلدی ٹوٹ نہیں سکتا، تم اکیلے ہر جگہ تو نہیں پہنچ سکتے، ظاہر ہے جب تک پوری معلومات نہ ہو، ان پر ایکٹ بے وقوفی ہے، وغیرہ وغیرہ۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ جہاں سنگھ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تیرے اور میرے درمیان بائیکاٹ نہیں جمال ہے اور میں نے جمال کے لیے ہی کام کرنا ہے، جو تم سوچ رہے ہو، وہ میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں پیپر پر سمجھاؤں کہ تمہیں کرنا کیا ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے نوتن نے بڑے نرم انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔

چند کارڈز پار کرنے کے بعد وہ اسے لیے اپنے کمرے میں آن پہنچی۔ اس نے جہاں کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود الماری کی جانب بڑھی۔ اس میں سے کچھ کاغذ اور قلم لے کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ کاغذ پر کچھ نشان تھے۔ وہ اسے سمجھانے لگی کہاں پر کیا کرنا ہے اور یہ سب کیسے ہوگا، وہ بھی اسے بتا دیا۔

”ڈن ہو گیا، آؤ بائیکاٹ سے.....“ جہاں سنگھ نے جوش بھرے لہجے میں کہا اور اٹھ گیا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”یہ کبھی بائیکاٹ کور پر ظاہر نہیں ہونے دینا کہ میں نے تمہیں یہ سب بتایا ہے، میں چاہے کام اسی کے لیے کر رہی ہوں، لیکن یہ سب جمال کے لیے ہے اور میں اسی کے لیے یہ سب کرتی رہوں گی۔ یہ میرا نیٹ ورک

ہے۔ جو تمہارے لیے کام کرے گا۔ اُس پر بھی ظاہر ہونا چاہئے کہ یہ سب تم نے کیا ہے، یہ سب تمہاری طاقت ہے۔ تم چاہو تو جانی بھائی کو بھی اپنے ساتھ شامل کر سکتے ہو۔ وہ جو ہو کے علاقے کا سب سے بڑا بھائی ہے۔ بائیکاٹ کے پاس صرف زور دار سنگھ کا نیٹ ورک ہے اور اب ٹی ایل، یہ بھی بڑا گروہ ہے، لیکن اس کے اپنے مفاد ہیں۔“

”اوکے۔ میں اپنے مطابق چلوں گا۔“ جہاں سنگھ نے کہا اور باہر نکل پڑا۔ اس کے انداز میں تیزی اور جلدی تھی۔ اس وقت وہ بائیکاٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ جانی بھائی کا فون آ گیا۔ اس نے تمہیدی باتوں کے بعد کہا۔

”ارے اودھ جہاں سنگھ، کدھر ہو، ممبئی میں ہوتے ہوئے تمہائی محسوس کرو، اپنا تو پھر ادھر نہ ہونے کا ہونا۔“

”میں بھائی فون کرنے ہی والا تھا۔“ جہاں سنگھ نے کہا۔

”تو بس بول، کرنا کیا ہے، باقی میں دیکھ لوں گا۔“ جانی بھائی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”ہم نے مل کر ہی کرنا ہے۔ میں پلان.....“

”تم نے جو کرنا ہے کرو، میں ایک لڑکے کا نمبر دے رہا ہوں، اس سے بات کرو اور جو کہنا ہے وہ کہہ دو۔“ یہ کہہ کر اس نے الوداعی بات کی اور فون بند کر دیا۔

”کیا کرنے جا رہے ہو؟“ بائیکاٹ کا فون حد تک سمجھ گئی تھی۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”تم آؤ میرے ساتھ اردوہ کے پاس۔“ یہ کہہ کر اس نے کوئی بات کہے بنا فون جیب میں ڈالا اور مڑ گیا۔

وہیں اس نے اپنی معلومات کی بنیاد پر پلان ترتیب دینا تھا۔ وہ ایک دم سے جوش میں بھر گیا تھا۔

اس وقت ممبئی پر رات اترا آئی تھی۔ جہاں سنگھ اور بائیکاٹ فارم ہاؤس سے نکل کر آشاگر کی طرف جانے کے لیے فورڈ ٹیل جیب دوڑائے چلے جا رہے تھے۔ بائیکاٹ ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ جہاں سنگھ ہاتھ میں لیے مسلسل سوچ رہا تھا۔ تیواری کا وہ حویلی نما گھر جو اہر نگر کے علاقے میں تلسی جمیل کے کنارے تھا، جس سے کچھ ہی فاصلے پر فلم سٹی کپلیکس تھا۔ لیکن تیواری کے پیچھے جو دماغ تھے، وہ تین لوگ تھے۔ جو بورا ویلی ہی کے مختلف علاقوں میں رہ رہے تھے۔ جہاں سنگھ نے جو پلان ترتیب دیا تھا وہ یہی تھا کہ ایک ہی وقت میں ان تینوں کو اغوا جائے۔ ایک طرف نوتن نیٹ ورک کے لوگ تھے، دوسری جانب جانی بھائی کے اور تیسری طرف ٹی ایل کے لوگ۔ اس نے ونود رانا کو بتا دیا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ پوری طرح اپنے لوگوں کے ساتھ الٹ تھا۔

وہ پونا جانے والے روڈ پر تھا۔ ڈائمنڈ انڈسٹریل اسٹیٹ کے اسٹاپ پر پہنچ کر سڑک کے دائیں جانب ایک گھرنا سا پختہ راستہ دھر کھاری گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ جہاں کے اشارے پر بائیکاٹ نے جیب ادھر موڑ لی۔ کافی آگے جا کر جنگل شروع ہو گیا، جہاں سے دھر کھاری گاؤں جدا ہو گیا تھا۔ وہ جنگل میں سفر کرنے لگے۔ دو کلومیٹر سے زیادہ سفر کرنے کے بعد جنگل کے درمیان کافی سارا کھلا میدان تھا۔ اس میدان کی شمال کی جانب ایک بڑا مارا گھر بنا ہوا تھا، جس میں لکڑی کا زیادہ کام تھا۔ اس کی دوسری منزل پر روشنی ہو رہی تھی۔ بائیکاٹ نے اس گھر کے سامنے جیب روک دی۔ وہ دونوں اترے اور بڑے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ملچو کا ساندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ راہداری پار کرتے ہی وہ ایک کھلے ڈرائیونگ روم میں آ گئے۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ وہ دونوں اس پر چڑھتے چلے گئے۔ وہ سیڑھیاں ایک بڑے سے ہال میں ختم ہوئیں۔ سامنے کمرے تھے۔ جس کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ سامنے اردوہ سنگھ، رونیت کور اور نوتن کور کھڑے تھے۔ تبھی نوتن کور بولی۔

”ممبئی میں یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔ یہ میں نے کچھ عرصہ قبل خریدی ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پرسکون وقت

”ٹی ایس کے لوگ بڑی خطرناک جگہ جا پہنچے ہیں۔“ جہاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا
 ”وہ تو ہے، لیکن ابھی دیکھنا۔“ نوتن نے کہا تو وہ سب اسکرین کی طرف دیکھنے لگے۔ ہمل راج کو کسی نے
 مخاطب کیا تو اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ پھر لمحہ بھر بات سننے کے بعد اس کے چہرے پر غصے کے آثار
 واضح ہو گئے۔ وہ ایک دم سے اٹھ گیا اور تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ وہ چلتا چلا جا رہا تھا۔ یوں دکھائی دے
 رہا تھا کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ وہ بار کے کاریڈور میں تھا، ابھی کسی نے اس کے سر پر ریوالتور کا دستہ مارا، اس میں
 قوت برداشت تھی کہ وہ ضرب کھا کر گر نہیں بلکہ ایک دم سے پلٹا۔ تب تک اُسے دوسری ضرب پڑ چکی تھی۔ وہ
 لڑکھڑا گیا۔ کسی نے اسے سہارا دے دیا۔ اچانک وہاں پر فائرنگ ہونے لگی۔ شور اور چیخوں کی آواز بڑھ گئی۔
 کچھ دیر ہی میں منظر بدل گیا۔ وہ باہر سڑک پر تھے اور کار بھاگنے لگی تھی۔ اورند سنگھ نے وہ منظر بھی اسکرین کے
 اوپر چھوٹا کر دیا۔ پہلے والے منظر پر بھی بھاگتی ہوئی سڑک نظر آرہی تھی۔

تیسرا منظر واضح ہو گیا تھا۔ وہ کرشنا کالونی کا علاقہ تھا۔ وہاں ایک گلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بورا ویلی کا پرانا
 علاقہ تھا۔ گلی کی کٹڑ پر کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہ جوان سا بندہ تھا جس سے جا کر نوتن کور کے لوگ باتیں
 کرنے لگے۔ وہ کافی حد تک سکون سے باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اٹھ گیا۔

”یہ ہر دیک پوڑ وال ہے، تیواری کے سیاسی معاملات اور میڈیا کے مسئلے بھی حل کرتا ہے۔ یہ خود ایک اچھا
 صحافی ہے، تیواری نے اسے غربت کے باعث خریدا ہوا ہے۔“

”اب دیکھیں اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟“ باغیا بڑبڑائی۔ تب تک کچھ لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہو چکے
 تھے۔ اچانک ہر دیک پوڑ وال کو کسی نے دھکا دیا۔ وہ منظر سے ہٹ گیا۔ سامنے کھڑے لوگ ہکا بکا تھے۔ کیمرو
 تیزی سے حرکت میں آیا، وہ بھی دین میں داخل ہو گیا۔ دین میں ہر دیک پوڑ وال نیچے پڑا ہوا تھا۔ اور وہ بھاگے
 جا رہے تھے۔

”چل باغیا نکل۔“ جہاں نے تیزی سے کہا اور کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ وہ بھاگتے ہوئے نیچے آئے اور
 باہر نکل کر فورڈ ہیل میں جا بیٹھے۔ جہاں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہی اسے شارٹ کیا اور یوٹرن میں واپسی کی
 طرف پلٹا اور رفتار بڑھا دی۔

وہ پوتا سے ممبئی کی جانب چل نکلا تھا۔ ایک اسٹاپ سے ذرا آگے نکل کر وہ سڑک سے اتر گیا اور کچے راستے پر
 گاڑی بھاگتا ہوا چلتا چلا گیا۔ وہاں بھی ایسا ہی ایک گھر تھا لیکن وہ چھوٹا تھا اور سارا لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کے
 پاس ہی ایک ندی بہہ رہی تھی، جس کا پانی ایک آبشار سے گرتا تھا۔ اس نے جا کر وہاں جیپ رُوک کر ہیڈ
 لائٹس بند کر دیں۔ ایک دم سنائے نے انہیں گھیر لیا۔ وہ دونوں نیچے اترے اور اس گھر کی جانب بڑھے۔ جیسے
 ہی انہوں نے دروازہ کھولا، اندر روشنی ہو گئی۔ دو نو جوان ہاتھوں میں گیس پکڑے الٹ تھے۔ یہ سارا بندوبست
 نوتن کور کا تھا۔ یہ سارے لوگ اسی کے نیٹ ورک سے متعلق تھے۔ جہاں نے وہاں کی صورت حال کے بارے
 میں پوچھا تو ایک نو جوان نے بتایا کہ ارد گرد پوری سیکورٹی موجود ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی پرندہ بھی پر
 نہیں مار سکے گا۔ وہ کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ وہ ایک بات اوپر گیا، نیچے ٹھہرتا رہا یہاں تک کہ اس کے سیل فون
 پر ان تینوں کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔ یہ اطلاع وہاں کے سیکورٹی چیف کو بھی مل گئی تھی۔ وہ
 الٹ ہو گئے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک ہائی ایس وین وہاں آگئی۔ وہ اس طرح آ کر کھڑی ہوئی کہ وین
 اور گھر کا دروازہ آمنے سامنے تھا۔ وین میں فقط چار آدمی تھے۔ وہ تینوں، جنہیں اغوا کیا گیا تھا اور ایک جوان

گزارنے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن اب یہی جگہ ہمارے لیے محفوظ پناہ گاہ ہوگی۔ یہیں بیٹھ
 کر ہم نے سب کچھ کرنا ہے۔“

”رات ہونے کی وجہ سے میں دیکھ تو نہیں پائی، مگر میں اسے گرین ہاؤس کہوں گی۔“
 ”تم جو مرضی کہو ڈرائنگ۔“ نوتن کور نے کہا۔

”بہت خوب نوتن، مجھے تمہاری ذہانت پر ناز ہے۔“ باغیا اسے سراہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

مزید دو گھنٹوں میں اپنا سیٹ اپ بنایا۔ یہاں تک کہ انکا رابطہ لاہور سے بھی ہو گیا۔ اردند اور جہاں اسکرین
 کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اردند اسے بتا رہا تھا۔ ”یہ گہرے سبز رنگ کے گول دائرے والے جانی بھائی کے
 لوگ ہیں اور یہ اپنے ٹارگٹ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ جو ہمیں یہاں ہلکے سبز رنگ کے دائرے میں دکھائی دے
 رہا ہے۔ میں ابھی ان کا ویڈیو لنک لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کی بورڈ کے ساتھ الجھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اسکرین پر
 منظر ظاہر ہو گیا۔

وہ نگینش گھر کے علاقے میں ایک کشادہ روڈ پر کھڑے تھے۔ روڈ لائٹس سے وہاں کافی اجالا تھا۔ جس بندے
 کے پاس سگنل دینے والی ڈیوائس تھی، وہ باہر نکلا تو اردگرد کا منظر سمجھ میں آ گیا۔ وہ تین کاروں میں تھے۔ وہ آگے
 بڑھا اور میں گیٹ کے پاس چلا گیا۔ اس نے نیل دی اور انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں ہی میں ایک سیکورٹی گارڈ
 نے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہ کچھ بھی پوچھ نہیں سکا تھا۔ کسی نے اسے گردن سے پکڑ کر وہیں دبا لیا۔ وہ اندر داخل
 ہو گئے۔ پورچ کے پاس دو سیکورٹی گارڈ بھاگ کر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ قریب نہ آ سکے، اس سے پہلے
 ہی ان کے فائرنگ کیا اور وہ سر می سڑک پر جا گرے۔ گیٹ کھل گیا تھا۔ انہوں نے کاروں کی ترتیب جو بھی رکی
 لیکن وہ اندر ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ وہیں ایک بوڑھا سا شخص بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ ابھی نوتن بولی۔

”نہی ہے، پارل اوت جو اس کی ساری فنانس دیکھتا ہے۔ اس کے گھر میں بہو ہے اور اس کی بیوی باقی
 سب فارن میں ہوتے ہیں۔“

وہ حیرت سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ پارل اوت
 مزاحمت کرنے لگا۔ ابھی لڑکے نے اس کے سر پر زور سے پھل مارا۔ وہ ڈھلکتا ہوا بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ لڑکے
 نے اسے اپنے بازوؤں پر سہارا دیا اور باہر کی طرف نکلا۔ وہ بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پارل
 اوت کو لے جا کر کار میں ڈال دیا۔ باقی شاید کسی مزاحمت میں مصروف ہوں گے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک روڈ پر چل
 دوڑے۔ اسی دوران دوسری طرف سے بھی انڈیکیشن ہونے لگی۔ وہ ٹی ایس کے لوگ تھے۔ پہلے والا منظر چھوٹا
 ہو کر اسکرین کی اوپر کی طرف چلا گیا نیا منظر سامنے آ گیا۔

وہ پیٹروادی کے علاقے کے ایک بار میں تھے۔ رنگ برنگی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مختلف لوگ ناچ رہے
 تھے۔ کچھ صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں ایک جوان العمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس
 دائیں بائیں دو نیم برہنہ لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں کھویا ہوا تھا۔

”یہ ہمل راج ہے، جو اس کی ساری غنڈہ گردی کو دیکھتا ہے۔ یہی بندہ اس کی طاقت ہے۔“ نوتن نے بتایا
 ”حیرت یہ ہے کہ یہ یہاں بیٹھا ہے، اسے تو.....“ باغیا نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”اسے ابھی تک روکا گیا ہے پولیس اگر آج رات تک گوپال نند کو تلاش نہ کر سکی تو یہ کرے گا۔ لیکن اس کے
 لوگ شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ ہارن کا سب سے بڑا ٹھکانہ ہے۔“

گورال، پانچواں ڈرائیور تھا۔ وہ تینوں بے ہوش تھے۔ جنہیں جلد ہی گھر کے اندر پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس شخص پر بہت خوش تھا، جس نے ان تینوں کے اغوا کو منظم کیا تھا۔ اتنے لوگوں کا رش اس نے نہیں راستے ہی میں ختم کر دیا تھا۔ وہ اسی سے رابطے میں تھا،

ان تینوں کو اس گھر میں موجود بڑے سارے تہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ ساتھ آیا نوجوان گورال انہیں ہوش میں لا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش میں آ گئے۔ جس نے بھی آنکھ کھولی اس نے اپنے سامنے کھڑے، بائیتا اور گورال کو پایا۔ سب سے پہلے ہمل راج نے اکڑ لہجے میں سوال کیا۔
”کون ہو تم لوگ اور ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟“

بائیتا آگے بڑھی اور پوری قوت سے جوتے کی نوک اس کے منہ پر دے ماری۔ وہ ہلبلا اٹھا۔ دوسرے سہم گئے۔ تبھی وہ گورال آگے بڑھا اس نے بھی ایک ٹھوک اس کی پسلیوں پر ماری۔ وہ چند لمحے اکٹھا ہو گیا۔ شاید اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی بائیتا آگے بڑھی اور اس نے تینوں کی طرف دیکھ کر سرد سے لہجے میں کہا۔

”تیواری، صرف تیواری کے بارے میں بات ہوگی۔ اس کے علاوہ صرف موت مل سکتی ہے۔ سمجھ یا نہیں؟“
”کیا چاہتی ہو تم؟“ بوڑھے پاریل اوت نے پوچھا۔

”تیواری کے وہ سارے کالے کارنامے، جو اس نے تم لوگوں کے ذریعے کیے ہیں۔ تم نہیں بتاؤ گے تو کوئی اور بتا دے گا لیکن تم لوگوں کا فقط اتنا نقصان ہوگا کہ تم لوگوں کے گھر کا ہر ہر فرد ایک ایک کر کے مار دیا جائے گا اور آخر میں تم لوگ مار دیئے جاؤ گے۔ تمہاری بڑیاں اسی تہ خانے کے کچے فرش میں دبا دی جائیں گی۔ اب فیصلہ تم لوگوں نے کرنا ہے کہ کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“ بائیتا نے کسی دوسرے درجے کی فلم کے ولن کی مانند کہا۔
”تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی ہو.....“ بوڑھے پاریل اوت نے کہا۔

”تمہارے لیے نہ سہی، لیکن اتنا تو پتہ چلا کہ اتنی گہری وفاداری ہے کہ اپنے بچے بھی اس پر.....“
”نہیں، تم غلط سمجھی ہو، ہم بتا بھی دیں تو اس نے کوئی جرم کیا ہی نہیں، جب اس نے جرم کیا ہی نہیں تو ثابت کیا ہوگا۔ ہم نے کیا ہے سب، سارے سیاست دانوں کے فرنٹ میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ کوئی عدالت اسے سزا نہیں دے سکتی۔“ اس بار اس کا لہجہ مایوسی بھرا تھا۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت گھاگ قسم کا بندہ ہے

”غلط کہتے ہو تم۔“ میز جیوں سے اترتے ہوئے جہاں نے کہا تو سبھی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سبھی اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ ان کے قریب آ کر بولا۔

”دراصل تم سب مجھڑے ہو۔ دلال، دھرتی کو ماما مانتے ہو اور اپنی ماں ہی کا سودا کرنے والے دلال، مان بیچنے والے۔“ یہ بات سن کر ہمل راج غصے میں پاگل ہو گیا۔ اس نے انتہائی نفرت اور حقارت سے کہا۔
”تمہیں یہ بہت مہنگا پڑے گا۔“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ بائیتا نے پہلے کی طرح ایک زوردار جوتے کی نوک اس کے منہ پر ماری۔
”کوئی بھی کسی کو باندھ کر مار سکتا ہے، میرے ہاتھ میرے کھول تو میں تمہیں بتاؤں۔“ وہ زور سے چیخنے ہوئے بولا۔

”شرط یہ ہے کہ جو ہار مان جائے، دوسرا اسے قتل کر دے گا۔“ بائیتا نے کچھ اس طرح کہا کہ سبھی نے ایک

دلہا اسے دیکھا تب تک اس نے گورال کو اسے کھولنے کا اشارہ کر دیا۔ ہمل راج کے ہاتھ جیسے ہی کھلے، وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بائیتا نے اسے پوری طرح اٹھنے ہی نہیں دیا اور لات گھما کر اس کی کمر پر دے ماری۔ وہ لا کھڑا ہوا دیوار تک گیا۔ بائیتا اسے مارنے کو لپکی، لیکن وہ بجلی کی سی سرعت سے پلٹا اور اس نے ایک کھڑی پھیل بائیتا کی گردن پر ماری۔ وہ ہل گئی۔ اس نے وہ لمحہ ضائع نہیں کیا، اس نے بیچ ماتھے کے درمیان میں مارا۔ وہ محوم کر زمین پر گری، تبھی وہ اسے پکڑنے کے لیے لپکا، یہی اس کی غلطی تھی۔ بائیتا ایک طرف ہٹ گئی وہ زمین پر آن رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھے اور اس کی گردن کی پچھلی طرف پوری قوت سے مارے۔ وہ بالکل ہی دم میں یوں ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک ٹھوک اس کی پسلی میں ماری۔ وہ تڑپ کر اٹھنے لگا مگر وہ بائیتا ہی کیا جواب اسے اٹھنے دیتی۔ وہ وحشیوں کی مانند اس پر ہل پڑی۔ ہمل بے ہوش ہو گیا۔ اس نے کالر سے پکڑ کر اٹھایا لیکن وہ نہیں اٹھ سکا۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے الگ ہو گئی۔ جوان آگے بڑھا اور وہ اسے ہوش میں لانے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا تو وہ نہایت غصے میں بولی۔

”کوئی بھی حلال زادہ غنڈہ گردی نہیں کرتا، امیروں کا کتابن کر غریبوں پر نہیں بھونکتا۔ اس کے خون میں شک ہوتا ہے جو کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اٹھ، اب بتا، کس طرح مرنا چاہے گا بول۔“

وہ اسے مارے جارہی تھی اور انتہائی وحشت سے کہتی جارہی تھی۔ تبھی جہاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
”نہیں، اسے مارنا مشکل نہیں ہے، اسے چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر اس نے ہمل راج کو اس سے چھڑا لیا۔ وہ بے دم سا زمین پڑا تھا۔ چند لمحے یونہی خاموشی میں گذر گئے تو وہ بولا۔

”پاریل جی، تم جانتے ہو کہ تیواری نے دو پولیس آفیسر مارے ہیں اور اب تیسرے کی باری ہے۔ اس کے جرائم کی لسٹ بہت بڑی ہے۔ اور.....“
”مگر تم کچھ بھی ثابت نہیں کر پاؤ گے۔“ بوڑھے پاریل نے کہا۔

”تو جس نے کیا، اسے تو سزا ملنی چاہئے نا، مثلاً تمہیں اور تیرے ان سب کو جنہوں نے اس کے ساتھ وفا داری کرتے ہوئے بے گناہ لوگوں پر ظلم کیا۔“ جہاں نے کہا تو اس پر پاریل خاموش رہا۔ کوئی کچھ نہیں بولا تو اس نے کہا، ”تیواری اور تم جیسے سب لوگ اب میری ہٹ لسٹ پر ہیں۔ مجھے اب ثبوت بھی نہیں چاہیے، میں صفائی چاہتا ہوں۔ تم لوگ اگر قانون سے کھیل سکتے ہو تو تمہارے باپ بھی ادھر ہی رہتے ہیں۔ تم لوگوں نے دولت کمانے کے لیے ہر چھوٹا بڑا جرم کیا، جس نسل کے لیے تم نے دولت لوٹی ہے، وہ دولت استعمال کرنے والی نسل ہی نہیں رہے گی۔ اس دولت کا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ ایک ایک فرد مارو دوں، تم جیسے بے غیرتوں کی نسل ختم کرنا ہوگی، سانپ ہو یا سنپولیا۔ ایک ہی چیز ہیں۔“

وہ بہت زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس نے بوڑھے پاریل کی کے بڑھاپے کی پروا کیے بغیر اسے اٹھایا اور پوری قوت سے دیوار میں دے مارا۔ وہ دیوار کی جڑ میں بے دم سا ڈھیر ہو گیا۔ تبھی وہ ہر دیک پوڑ وال کی طرف بڑھا۔ وہ پرسکون تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے جہاں کو روکتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس تیواری کے وہ ثبوت ہیں، جن کے بارے میں تم لوگوں کو ہوا بھی نہیں لگ سکی، میں وہ ثبوت دے دیتا ہوں، لیکن کیا گارنٹی ہے کہ تیواری سزا پالے گا، مجھ پر یا میرے خاندان پر کوئی عتاب نہیں آئے گا، لہٹ پولیس والے مجھے جگہ جگہ تک نہیں کریں گے، حتیٰ کہ میں کسی کتے کی طرح کسی سڑک پر مر جاؤں گا اور میری لاش بھی کوئی نہیں پہچان پائے گا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو ہر دیک، ہوتا یہی ہے، سیاست میں گند اتنا پھیل چکا ہے کہ اس کی سڑاند سے ہر آدمی کا دماغ جل رہا ہے۔ کہیں سے تو یہ گند صاف کرنا ہے، مجھے ثبوت دو اور جو تم چاہتے ہو، میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔“ جہاں نے حتیٰ انداز میں کہا۔

”صرف یہ پتہ نہ چلے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”ڈن ہو گیا۔“ اس نے حتیٰ انداز میں کہا۔

”وہ میرے پاس یہاں تو نہیں ہے۔ کچھ ویڈیوز ہیں، دستاویزی ثبوت ہیں اور وہ کچھ جو ابھی سمجھ میں آ رہا لیکن ہو رہا ہے، اس پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔“ ہر دیک نے کہا تو جہاں نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

”تمہیں اپنے کسی پر اعتماد ہے؟“

”ہاں، میرا ایک دوست یہ سب کچھ لاسکتا ہے۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا تو جہاں نے اپنا سیل فون نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”لے یہ بات کر۔“

ہر دیک نے فون پکڑ لیا۔ اس نے نمبر ملائے اور اپنے کسی دوست سے بات کرنے لگا۔ اسپیکر آن تھا، ان کے درمیان ہونے والی گفتگو وہ سن رہے تھے۔ اس کا دوست پریشان تھا کہ وہ کدھر ہے؟

”یہ پریشانی چھوڑو کہ میں کہاں، کیونکہ مجھے خود نہیں معلوم یہ جگہ کون سی ہے اور وہ لوگ کون ہیں؟“

”کوئی اتنا ہتا، کوئی اندازہ ہے پولیس کو.....“

”نہیں، پولیس کو قطعاً نہیں بتانا اگر تم میری زندگی چاہتے ہو تو۔ پولیس کو ہرگز اطلاع نہ دی جائے۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

”تو پھر میں کروں، مجھے بتاؤ۔“ اس کے دوست نے بے چارگی سے کہا۔

”دیکھو، تم میرے گھر جاؤ، میرے کمرے میں جو میری الماری ہے اس میں ایک سیاہ رنگ کی فائل پڑی ہوگی، کافی موٹی ہے۔ وہ اٹھاؤ اور باہر نکلو۔“ یہ کہہ کر اس نے جہاں کی طرف دیکھا تا کہ معلوم کر سکے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ جہاں نے اسے اشارہ کیا کہ بس۔ تب اس نے اپنے دوست سے کہا۔

”پھر اسی نمبر سے جیسے کہا جائے ویسا ہی کرنا۔“

”میں کرتا ہوں لیکن وہ لوگ.....“ اس کے دوست نے کہا تو ہر دیک تیزی سے بولا۔

”اگر تم میری زندگی چاہتے ہو تو یہ فوراً کرو۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا تو فون بند کر دیا گیا۔ وہ بات کر چکا تو اس نے ہانپتا سے کہا۔

”اب تیری زندگی کا انحصار اس فائل پر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جہاں کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھایا اور واپس اوپر جانے کے لیے پلٹ گیا۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں جہاں کے سیل فون پر ہر دیک کے دوست کی کال آ گئی۔ اس سے پہلے جہاں نے دودرانا سے رابطہ کر لیا تھا۔ دودرانا کے چند اہم بندے اس جگہ پہنچ گئے، جہاں سے ہر دیک کو اٹھایا گیا تھا۔ وہ بغیر وردی میں تھے۔ اس کے قریب ہی ایک سنسان جگہ پر انہیں ملنا تھا۔ اگلے چندرہ بیس منٹ میں وہ مرحلہ بھی طے ہو گیا اور کچھ دیر بعد وہ فائل دودرانا کے پاس پہنچ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جہاں کو دودرانا کی کال ملی۔ وہ بہت پر جوش تھا۔

”بہت خوب جہاں، اگرچہ اس کے جرائم سے کہیں کم یہ ثبوت ہیں لیکن اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ تم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اب تمہیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گا۔ لیکن میری ایک خواہش ہے۔“ جہاں نے کہا۔

”بولو۔“ اس نے ممنونیت سے پوچھا۔

”جب بھی اسے گرفتار کرنے کے لیے جایا جائے، مجھے ضرور ساتھ لے جائیں۔“ اس نے کہا تو دودرانا چند لمحے خاموش رہا پھر ایک دم سے بولا۔

”ٹھیک ہے، لیکن میں تمہیں اس کے گھر نہیں لے کر جاؤں گا، تھانے لے جانے سے پہلے کچھ دیر ملاقات کروادوں گا۔“

”یہ زیادہ بہتر رہے گا۔“ جہاں نے کہا۔

”میری کال کا انتظار کرنا۔“ دودرانا نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جہاں نے فون جیب میں رکھا اور مسکرا دیا۔

رات کا پچھلا پہر چل رہا تھا۔ جہاں اور ہانپتا ابھی تک وہیں تھے جہاں ان تینوں کو رکھا ہوا تھا۔ جہاں شدت سے دودرانا کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ہر دیک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دل میں تیواری کے لیے شدید نفرت تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا تھا کہ غربت میں اس کے پاس سوائے جرائم کی زندگی اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر اس کا ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا تھا۔ دو برس پہلے اس کے غنڈوں نے اس کے ایک دوست کو صرف اس لیے مار ڈالا کہ انکیشن میں اس نے بھرپور مخالفت کیوں کی تھی۔ تب سے اس نے سوچ لیا کہ وہ صحافی تو بن ہی چکا ہے، کیوں نا تیواری سے انتقام لیا جائے۔ وہ رسک لے چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچ چکا تھا کہ اگر اس میں اسے ناکامی ہوئی تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ تھائی لینڈ کی طرف نکل جائے گا۔ وہ اسی پر بات کر رہے تھے کہ دودرانا کا فون آ گیا۔ جہاں نے رسیو کیا تو وہ بولا۔

”کتنی دیر میں آسکتے ہو؟“

”کہاں آنا ہوگا۔“

”وہیں جہاں ہم ملے تھے۔ اس کے قریب ہی۔“

”ایک گھنٹہ تو لگ سکتا ہے۔“

”کہیں تم وہیں تو نہیں ہو، جہاں وہ ابھی تک ہیں۔“

”وہیں ہوں۔“ میں نے بتایا تو اس نے کہا۔

”تمہیں شاید زیادہ وقت لگ جائے۔ تم سیدھے بوراویلی پولیس اسٹیشن کے پاس آ کر مجھے کال کرو۔“

”میں آ رہا ہوں۔“ جہاں نے کہا اور ہانپتا کو فون کیا۔ وہ ان تینوں کو وہاں موجود گورال کے سپرد کر کے فوراً ہی آ گئی۔ ہانپتا نے ارور کو فون کیا تا کہ وہ ہمیں گائیڈ کر سکے اور وہاں سے نکل پڑے۔ وہ چالیس منٹ سے بھی کم وقت میں بوراویلی پولیس اسٹیشن کے پاس ایک چوک میں آ کر رک گئے۔ وہاں سے اس نے کال کر کے دودرانا کو بتایا وہ اسے کافی حیرت ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کیسے پہنچ گیا۔

”اچھا کیا تم جلدی پہنچ گئے ہو، یہیں اسی چوک سے ٹرن لو ہائیں جانب، آگے دو گلیاں چھوڑ کر تیسری میں ہائیں جانب ہی گلی میں آ جاؤ۔ میں باہر ہی ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ وہاں پہنچے تو دودرانا کی کھڑ پر ہی تھا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ اس نے کار وہیں کھڑی کرنے کو کہا اور اپنے

”یہ..... یہ کیا کیا تو نے.....؟“ وہ حیرت کی انتہاؤں پر تھا اس لیے لکنت زدہ آواز میں بولا۔
 ”تم نے بہت بے غیرتی کر لی، تیرے سارے ثبوت میرے پاس آچکے ہیں۔ وہ تینوں میرے مہمان ہیں اور انہوں نے ہی وہ ثبوت دیئے ہیں۔ میں نے تو تیرے ساتھ کھیل کھیلنا ہے، تو اب میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا، اگر تجھے چھائی نہ بھی ہوئی تو جیل میں تجھے مروادوں گا۔ پولیس والوں کے قتل ایسے ہضم نہیں ہوتے۔“
 ”کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ظاہر ہے، تمہاری گرفتاری پر میڈیا میں واویلا اٹھے گا، تمہاری پارٹی اور بے غیرت سیاست دانوں کا وہ کلب جس کے تم ممبر ہو وہ طوفان بدتمیزی اٹھائے گا۔ پورا بھارت ہی نہیں بلکہ دنیا بھی یہ جان لے کہ تم پکڑے گئے ہو۔ سنو، یہ سب تمہارے ہی خلاف استعمال کرنے والا ہوں۔ جگجگ بھر بھرے میرے محسن ہیں، ان کے خلاف سوچنے والے کو بھی میں موت کی نیند سلا دیتا ہوں۔“

”تم جو چاہو سو کرو، مگر مجھ سے جلدی بات کرو۔“ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ دودو اسے مارنے والا نہیں اس لیے جہاں آگے بڑھا اور اس نے اسے گریبان سے پکڑ کے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”تمہیں اگر کوئی غلط فہمی ہے تو دور کر لو، میں تمہارے حلق میں اب بھی گولی مار سکتا ہوں۔ باہر سے کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ وہاں سب اپنے ہی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، جو پہلے ہی تیرے ساتھ آئے قافلے کو کہیں دوسری جگہ لے جا چکے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور فرش پر گر گیا۔
 ”سنو، میں کیا چاہتا ہوں۔ تمہارے لوگ اس گرفتاری کو محض سیاسی رنگ دیں گے۔ یہ سیاسی رنگ رہ سکتا ہے اگر تم اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ فلم غلط ثابت کرو، جو اپنے ہی لوگوں کے ذریعے تم نے بائیتا تک پہنچائی تھی۔“
 دودو نے کہا۔

”اُدہ یہ ہو جائے گا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔
 ”تب تک تم میرے مہمان رہو گے۔ میں تمہاری گرفتاری نہیں ڈالوں گا، بس تم بھی اغوا ہو گئے ہو۔ دوسروں کی طرح۔“ دودو نے کہا۔
 ”دودو تم اسے ایک دن رات رکھنا چاہتے ہو؟“ بائیتا نے پوچھا۔
 ”ہاں، مگر تم کیوں.....“

”کل رات اسے مجھ سے لے لیتا۔ یہ مجھے دے دو، مجھے اس سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“
 ”دیکھ لو، یہ رابطہ کیسے کرے گا اپنے لوگوں سے؟“ دودو نے لمحہ بھر سوچ کر کہا۔
 ”یہ میرا دوسر ہے۔“ وہ اعتماد سے بولی۔
 ”لے جاؤ۔“ دودو نے کہا تو بائیتا کسی چیل کی طرح اس پر جھٹی۔ اسے دو چار ایسی لگائیں کہ وہ بے ہوش ہوتا ہلا گیا۔ تب تک دودو اپنے لوگوں سے رابطہ کر چکا تھا۔ وہ پولیس کی حفاظت میں تیواری کو وہیں چھوڑ گئے، جہاں وہ پہلے تینوں تھے۔



مغرب سے ذرا دیر بعد میں اماں کے پاس جا پہنچا۔ وہ کمرے میں اکیلی ہی تھیں۔ میں ان کے پاس بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

ساتھ پولیس وین میں بٹھا لیا۔ ایک بار بائیتا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تھا کہ کہیں یہ پولیس والے ہمیں دھوکے سے بڑے آرام کے ساتھ لے کر تو نہیں چلے۔ ہم تیواری کا شکار کر رہے تھے اور تیواری ہمارا شکار کر لے؟ میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ مختلف سرکوں اور گلیوں میں سے بھاگتا ہوا ایک پرانی بلڈنگ میں لے گیا۔ جس کے سامنے کافی گند تھا اور نشی قسم کے لوگ سوئے پڑے ہوئے تھے۔ ہم تینوں اندر چلے گئے۔ دوسری منزل پر ایک کمرے میں خاصا کاٹھ کہاڑ پڑا تھا۔ دھول بھی خاصی تھی اور ایک خاص طرح کی چراغ پھیلی ہوئی تھی۔ وہیں چند لوگ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی پاڈی کام سے تھکے ہارے ہوں۔ اس کے اندر سے ایک مزید کرہ کھلتا تھا۔ وہ انہیں وہاں لے گیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، سامنے ایک کرسی پر تیواری بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ غضب ناک تھا۔ اس کے ساتھ دو گراؤیل گارڈ کھڑے تھے۔ دودو نے جاتے ہی بڑے ادب سے کہا۔

”جناب کیا کہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے تھے کہ تیواری انتہائی غصے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”انہیں تم ایسے ہی لے آئے ہو، ان کی ٹانگیں اور بازو کیوں نہیں توڑے تم لوگوں نے، کیا وہ تینوں آگئے ہیں، جنہیں یہ اغوا کر کے لے گئے تھے۔“

اس کے یوں کہنے پر بائیتا اور جہاں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بائیتا کی آنکھوں میں بھی تھا کہ کیا میں نے تمہیں پہلے نہیں اشارہ دیا تھا کہ دودو ہمارے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے۔ اس نے بھی ڈبل گیم کھیلی تھی۔ ایک طرف تیواری کے خلاف ثبوت لے لیے اور دوسری طرف انہیں لے جا کر تیواری کو خوش کر دیا۔ جہاں کے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ ایسے تو ان کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ وہ ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ بائیتا اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کر لیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی طے شدہ حکمت عملی پر عمل کرتے دودو بولا۔

”سرا وہ تینوں بھی برآمد ہو گئے ہیں۔ وہ انتہائی زخمی حالت میں ہیں۔ انہیں میں نے اسپتال بھجوا دیا ہے، وہاں ان کی ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے۔ جیسا آپ نے کہا میں ان سے وہی سلوک کرتا مگر مجھے انہیں آپ کے سامنے بھی تولانا تھا اور دوسرا میں نے ان کا ڈنگ نکال دیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اب آپ جو کہیں میں وہی سلوک ان کے ساتھ.....“

”تم بولتے بہت زیادہ ہو۔ خیر انہیں ہمارے حوالے کرو، ہم دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے انتہائی نخوت سے کہا تو جہاں بولا۔

”دیکھو تیواری، اگر تم مرد ہو تو اپنی زبان پر قائم رہو، تم نے چوبیس گھنٹوں میں مجھے پکڑنا تھا، وہ تم نہیں پکڑ سکے۔ ہم نے تیرے.....“

”ابے چپ سلامرد ہونے کی بات کرتا ہے، ہم یہاں حلف دے کر اس کا پاس نہیں کرتے، وعدوں کی پاس داری کرتے رہے تو کر لی سیاست؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے گارڈز کی طرف دیکھا اور بولا۔

”لے چلو انہیں۔“ جیسے ہی وہ آگے بڑھے، دودو نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستل سیدھا کیا اور یکے بعد دونوں کے چہروں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ گھوم کر فرش پر جا پڑے۔ دودو نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورا میگزین ان پر خالی کر دیا۔ تیواری ایک دم حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس کی آنکھیں باہر آ گئیں۔

”اماں! تو نے مجھے بتایا نہیں۔ اتنی بیمار ہو گئی ہو اور.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات پر ٹوکتے ہوئے بولیں۔

”پتر، میں بیمار نہیں ہوں۔“

”اماں یہ ڈاکٹر، سوئی، تانی یہ سب کیا جھوٹ بول رہے ہیں۔“ میں نے نرم سے لہجے میں کہا تو وہ بولیں۔
”تن کا زخم سب کو دکھائی دے جاتا ہے پتر لیکن جو من میں ہوا سے صرف وہی محسوس کر سکتا ہے، جس کے من میں ہو۔“

”میں سمجھا نہیں اماں؟“ میں نے جان بوجھ کر پوری بات سمجھنے کے لیے پوچھا تو بڑے نرم لہجے میں بولیں۔

”وہ سب سچے ہیں کہ انہیں یہی دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن اصل سچائی کیا ہے، یہ تو میں ہی جانتی ہوں نا۔“

”اماں! اپنے پتر کو بھی نہیں بتائے گی؟“ میں نے شکوہ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تجھے ہی تو بتانا ہے پتر۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے یوں خاموش ہو گئیں جیسے کچھ سوچ رہی ہوں۔ پھر جیسے ان کے خیالات مجتمع ہو گئے تو وہ بولیں۔

”اس کائنات میں ہر جاندار شے اپنے ماحول میں خوش رہتی ہے، بعض اوقات تو ماحول پر ہی اس کی زندگی کا دارم دار ہوتا ہے۔ جیسے مچھلی، پانی کے بنا مر جاتی ہے، میری حالت بھی ایسے ہی ہے پتر۔“

”کیا آپ کو یہ ماحول پسند نہیں ہے؟“ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، بلکہ میں یہاں لمحہ لمحہ مرتی ہوں۔ میرا دم گھٹتا ہے یہاں۔ یہ جو بلی چاہے اب سوئی کے پاس ہے، وہی اس کی مالک ہے لیکن یہاں وہ مختص رہا ہے، جس نے تیرے باپ کو قتل کیا۔ چاہے تم نے اس سے انتقام لے لیا ہے۔ لیکن مجھے تو ہر دم احساس رہتا ہے۔ مجھے ہر دم یہی یاد رہتا ہے۔ میں بھلانا بھی چاہوں تو نہیں بھلا پاتی۔ میں اگر اس ماحول سے الگ ہو جاؤں تو میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔“

”تو پھر الگ کیوں نہیں ہوئیں۔ اتنی اذیت کیوں برداشت کر رہی ہیں، کیا مجبوری ہے آپ کو۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”سوئی ہی کی مجبوری ہے مجھے۔ وہ صرف خدمت گزار ہی نہیں میرے لیے اور بہت زیادہ اہم ہے۔ وہ کیا تھی جب میرے پاس آئی تھی، اور اب کیا ہے، یا تم نے اس میں فرق ہی محسوس نہیں کیا؟“

”اماں! وہ تو ساری کی ساری بدل گئی ہے۔“ میں نے اعتراف کیا

”بس یہی، میں اسے یہ دُکھ کہہ نہیں سکتی اور اس کا بھی تواب کوئی نہیں ہے۔ میں اب اُسے چھوڑ بھی نہیں سکتی۔“ اماں نے بے چارگی سے کہا۔

”درمیان میں فقط ماحول ہی ہے نا، میں ایسا کرتا ہوں، آپ دونوں کو لندن بھجوا دیتا ہوں۔ وہاں آپ کا علاج بھی ہوگا اور آپ کا ماحول بھی بدل جائے گا، پھر اس کے بعد سوچ لیں گے۔“ میں نے اس کا حل دیا تو وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”نہیں پتر، وہاں جا کر تو شاید میں زندہ ہی نہ رہ سکوں، کیا تم سارا کو بھول گئے ہو، جس نے یہاں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ تانی کا کون ہے؟ اشفاق کا کون ہے؟ عبیدہ بے چارہ کہاں جائے گا۔ وہ میرے آسرے جی رہا ہے۔ میں ان سب کی ماں بھی ہوں اور باپ بھی۔ پھر وہ سب جن کی اب میں آس ہوں۔“

”تو اماں بتاؤ، میں کیا کروں کہ تو خوش رہے؟“ میں بے چارگی سے پوچھا تو ایسے میں سوئی اندر آ گئی اور

بڑے سکون سے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر بولی۔

”میں بتاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یوں باتیں سننا انتہائی غلط بات ہے۔ لیکن ماں بیٹے کی باتیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جمال کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ سو میں اماں کے ساتھ اسی گھر میں رہوں گی۔ میں خود یہاں گھٹن محسوس کرتی ہوں۔ یہ گھر میں سارا کو دے دوں گی۔ وہ اسے جیسے چاہے استعمال کرے اور اماں اب میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔“ اس نے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”جیسے تیری مرضی پتر، میں تو زندہ ہی اب تم لوگوں کے لیے ہوں۔“ اماں نے کہا۔

”چلیں آئیں، میں نے کھانا لگوادیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ میں نے اماں کو اٹھایا اور باہر چل دیا۔

کھانے کی میز پر سبھی تھے۔ تبھی اشفاق نے میری اور جوگی والی جو ملاقات ہوئی اور جو سانپ والا واقعہ ہوا، وہ سب بتا دیا۔ اس نے ملنگ والی بات شاید اس لیے نہیں بتائی کہ وہاں جو ہوا اس کا گواہ میں اور ملنگ ہی تھا۔ ملنگ اور اماں نے اس واقعہ پر اتنا تبصرہ نہیں کیا لیکن سارا اور تانی چونک اٹھی تھیں۔ انہوں نے بہت سارے سوال کر دیئے۔ میں چپ چاپ سنتا رہا، کھانے کے بعد میں یہی کہہ کر اٹھ آیا کہ میں بتاؤں گا بھی تو تم لوگوں کی کچھ میں نہیں آئے گا۔

مجھے احساس تھا کہ تانی مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے اور میں بھی اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کھانے کے بعد میں اسے ساتھ لیے حویلی کی چھت پر چلا گیا۔ ملنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کرسیاں اور چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم ان پر نہیں بیٹھے، بلکہ ٹھنڈی اور خمار آلود ہوا کا لطف لیتے ہوئے ٹپٹتے رہے۔ وہ مجھے وہاں کے بارے میں بتاتی رہی۔ کافی دیر بعد ہم چار پائیوں پر آکر بیٹھ گئے تو تانی نے بڑے مان سے کہا۔

”جمال ایک بات پوچھوں؟“

”میں تمہیں یہاں لایا ہی اس لیے ہوں کہ تم جتنی چاہے مجھ سے باتیں کر سکو۔ تمہیں کبھی بھی مجھ سے اہالت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔ پھر یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”میری اس بات کو کسی منفی سوچ میں نہ لینا، میں صرف سمجھنا چاہتی ہوں کہ ایک ہی شے دو جگہ مختلف رنگ پسے مالتی ہے؟“

”تم کل کر کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، سوئی بھی تم سے محبت کرتی ہے اور میں بھی، دونوں کی محبت میں کوئی غرض نہیں ہے، انتہائی خلوص ہے اس میں اور میں اپنے بارے میں جانتی ہوں۔ لیکن وہ انتہائی مطمئن ہے، اس کی ذات میں سکون ہے اور میں بے حد بے چین، افسردہ اور تنہائی محسوس کرتی ہوں، یوں سمجھ لو کہ میرا دل ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ میں خوش نہیں رہتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟“ اس نے بہ مشکل اپنی بات کہی۔ جبکہ میں اس کی بات کو سمجھ چکا تھا۔

”تانی! یہ لوگ جب صبح اٹھتے ہیں تو وہ اپنا منہ کیوں دھوتے ہیں۔ حالانکہ اس پر کچھ بھی نہیں لگا ہوتا۔ آفس کے لیے یا کہیں بھی جاتے وقت۔ ہم بہت تیار ہوتے ہیں، اپنی پسند کی خوشبو لگاتے ہیں، یہ خوشبو لگانا، اپنے آپ کو سنوارنا یہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے خیال میں ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اس میں سکون ملتا ہے، ہمیں ایسا کر کے خوشی ملتی ہے۔“

اس نے جوابا کہا۔

”اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مست المست رہتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو سنوارنے یا خوشبو لگانے جیسا کام نہیں کرتے، وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے خیال میں وہ بھی اسی حالت میں خوش رہنا پسند کرتے ہوں گے۔“

”زندگی کا اصل حاصل اس کی مسرت ہے۔ مسرت کے حصول ہی میں حسن ہے۔ جو بندہ خوش و خرم ہوگا، اس کا چہرہ اس کے اندر کی خوشی کا اظہار کر دیتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے پوچھا۔
”وہی تو، ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے۔“

”اس کا سارا تعلق دل سے ہے۔ مردہ دل ارب پتی ہونے کے باوجود چہرے پر رونق نہیں رکھتا۔ اس میں منفی جذباتوں کا فروغ ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ زندگی محض ایک حادثہ ہے۔ وہ معاملے کو عقل کے تقاضوں پر لے جاتا ہے۔ اس میں منفی سوچ کا فروغ پانا عین فطری ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس میں زندگی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں جو صاحب دل ہوتا ہے اس کے پاس مادی سہولیات بھلے نہ ہو، روپیہ پیسہ بھی کم ہو پھر بھی وہ خوش رہتا ہے اور پورے زمانے کا مقابلہ کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت دنیا نہیں ہوتی اصل میں ضروریات سے لگلا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی سرشار ہوتی ہے کیونکہ خوشی وجود میں انرجی پیدا کرتی ہے۔ یہ فطری ہے۔“

”مگر یہ سب ہوتا کیسے ہے؟“ تانی نے پوچھا۔

”زندہ دلی محبت کے ساتھ آتی ہے۔“ میں نے کہا وہ چند لمحے خاموش رہی پھر الجھتے ہوئے بولی۔

”کیا میری محبت میں اب بھی تمہیں شک ہے؟ کیا میرے اندر محبت نہیں ہے؟“

”مجھے تمہاری محبت پر کوئی شک نہیں اور نہ ہی انکار ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”تو پھر.....؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”دیکھو محبت پانی کی مانند ہے۔ بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ۔ یہ جس پیمانے میں جائے گی ویسی ہ جائے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے وہ پیمانہ کیسا ہے؟“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔
”میں سمجھی نہیں؟“

”دیکھو تمہاری محبت صرف میرے ظاہری وجود کے ساتھ ہے اور اسے میری نسبت سے محبت ہے۔ جو کہ حقیقی وجود ہے۔ جو اصل حقیقت کو پالیتا ہے وہ زندہ دل ہے اور جو حقیقت کا انکار کر دیتا ہے وہ مردہ دل ہوتا ہے۔ محبت ہی عشق کا روپ دھارتی ہے اور زندگی نسبت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔“
”یہ کیسے ہوتا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”مسک عشق اختیار کرنا پڑتا ہے۔ عشق رب تعالیٰ کی انسان کو ودیعت ہے۔ کیا جب تک میں ہوں تبھی تک تیرا عشق ہے، محبت ہے، کیا میرے وجود کے ساتھ تیری محبت، تیرا عشق ختم ہو جائے گا؟ نہیں یہ عشق نہیں، عشق تو ناتمام ہوتا ہے۔“ میں نے سمجھایا

”یہ عشق اختیار کیے ہوگا؟“

”ظاہری عشق تو ظاہری وجود سے ہوتا ہے اس سے انکار نہیں، لیکن انسان کیوں نہ لامحدود عشق اختیار کرے جو باطن کو خود انسان پر عیاں کر دیتا ہے۔ یہ مقصد کے ساتھ ہوتا ہے۔ مقصد جس قدر بلند ہوگا۔ خود انسان بھی

اسی قدر بلند ہوتا جاتا ہے۔ آسمانوں سے بلند تر، وہ عشق حقیقی، جو رب تعالیٰ تک براہ راست رسائی دے دے۔“
”بہی تو میں چاہتی ہوں۔ یہ کیسے ہوگا پلیز مجھے بتاؤ۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔

”سنو۔ جتنا بلند مقصد ہوگا، اس میں جتنا بڑا زخم لگتا ہے، اتنی ہی بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ نئی طاقت، نئے زخم اور نئی رسائی کے لیے وجود بھی نیا ہی چاہئے ہوتا ہے اور یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ جب چاہے نیا وجود حاصل کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ سرشاری سے بولی۔
”مجھے کچھ اور بتاؤ یہ کیا ہے۔“

”قلمندرا لاہوری“ کا ایک مصرعہ ہے نا، یہ دل مردہ نہیں ہے اسے زندہ کر دو بارہ..... دل تو پہلے بھی زندہ ہی ہوتا ہے۔ یہ مقام جان تک ہے۔ محض جان والا دل مردہ ہے۔ یہ محض حیوانیت ہے۔ اس میں حقیقی زندگی نہیں۔ جب اس میں روحانی زندگی آگے کی تو دراصل اس کا دل زندہ ہو جائے گا۔ جان کا نکھار اس کی روح ہے اس میں جب عشق آئے گا تو روشنی آجائے گی۔ پھر نور علی اور ہے۔ زندہ جسم کا روحانی وجود دل کی طرف راغب ہوتا ہے ہمیں سے حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔“ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی یہ خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔
یہاں تک کہ کچھ دیر بعد وہ بولی۔

”چلو۔ اب چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ ہم دونوں نیچے کی طرف چل پڑے۔

میں ساری رات نہیں سو پایا تھا۔ میں نے نورنگر کے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ سب کام ٹھیک چل رہا تھا۔ افضل رندھاوا کا پیغام مجھے ملا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے وہ ملاقات کل پر تالی اور اپنے آپ کو ایک کمرے میں مقید کر لیا۔

لاہور سے مختلف اطلاعات آ رہی تھیں۔ انہوں نے چند لوگوں کو نہ صرف تلاش کر لیا تھا۔ بلکہ ان کے بارے میں اہم ثبوت بھی لے لیے تھے۔ یہ ایسے ثبوت تھے کہ اگر انہیں کسی عدالت میں پیش کیا جائے تو تسلیم ہی نہ کیے جائیں۔ لیکن انہی ثبوتوں اور اشاروں کے سہارے پوری جرم کی جڑ تک جایا جاسکتا تھا۔ ہم صبح ہو جانے تک ہاتھ کرتے رہے۔ نورنگر، کراچی اور لاہور کے درمیان کانفرنس کال چلتی رہی۔ آ کر یہی فیصلہ ہوا کہ میں آتا ہوں تو یہ آپریشن شروع کرتے ہیں۔

میں اپنی عادت کے مطابق صبح صبح اٹھا اور باہر نکل گیا۔ نورنگر جاگ اٹھا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی تو تاحد نگاہ ہریالی ہی ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ باہر ایک نوجوان جوگی آیا ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میرے ذہن میں اسی وقت آ گیا کہ وہ کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر آیا ہوگا۔ میں نے اسے بٹھانے کو کہا اور پورے طرح فریش ہو کر باہر نکلا۔ وہ نوجوان جوگی باہر فرش پر ہی بیٹھا ہوا تھا حالانکہ اس کے پاس خالی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ کل والے ان نوجوانوں میں سے ایک تھا۔

”تم کرسی پر کیوں نہیں بیٹھے ہو۔“

”بس میں کبھی بیٹھا ہی نہیں۔“ اس نے مودب لہجے میں کہا۔

”کیسے آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے سائیکس جی نے بھیجا ہے کہ آپ کو بلا لاؤں۔“ اس نے کہا۔

”خیر تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے تجھے کچھ نہیں کہا، تم خود اپنے وجود کے غلام بن گئے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ نشے پر تم نے قابو پالیا ہے، مگر یہ کیا کر رہے ہو؟“

”یہ مجبور کر دینے والی بات ہے؟“ اس نے اسی لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

”یہ کیفیت عارضی ہے، کیا تم جانتے اور سمجھتے ہو؟“

”ہاں میں مانتا ہوں۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”میں تمہارا، روزانہ کا کوٹہ مقرر کر رہا ہوں، اتنی ہی پیٹا، زیادہ نہیں۔ ہاں اگر بن پئے بے خود ہونے کو من چاہ تو مجھے آواز دے لینا، میں تجھے ہمیشہ کی بے خودی دے دوں گا۔“ یہ کہہ میں اٹھا اور جوگی کو اشارہ کیا کہ جو مانتا ہے اسے دے دو۔ وہ ساتھ آیا تو جوان اس کا بندوبست کرنے لگا اور میں نے جوگی کو سمجھا دیا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھنا ہے۔ کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد میں وہاں سے نور مگر کی جانب چل دیا۔

حویلی کی طرف آتے ہوئے وہی میدان راستے میں پڑتا تھا، جہاں تانی روزانہ لڑکے اور لڑکیوں کو ٹریننگ دیتی تھی۔ وہاں کل کی طرح کئی لڑکے اور لڑکیاں موجود تھیں۔ ان میں تبدیلی صرف یہی تھی کہ تانی تو ان میں موجود تھی لیکن اس کا لباس بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس کے بدن کا کوئی اعضاء دکھائی نہیں دے رہا تھا، سر پر بڑا سا قلاب تھا، صرف اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے ایک دم سے شاک لگا۔ میں نے اسے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے تبدیلی اپنائی ہو۔

میں اسے پر شوق نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ حویلی کے گیٹ پر سے ہی میں نے دیکھا، اماں ٹیرس میں کھڑی اسی میدان کی طرف دیکھ رہی تھی، جہاں تانی موجود تھی۔ کچھ دیر بعد میں اماں کے پاس جا پہنچا۔

”اماں کیا دیکھ رہی ہو؟“ میں نے بڑے شوق سے پوچھا تو انہوں نے میرا ہاتھ چوما اور بولی۔

”ایک نئی تانی کو دیکھ رہی ہوں۔“

’نئی تانی۔ مطلب؟‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تانی آج صبح فجر کے وقت مسلمان ہو گئی ہے۔“ اماں نے فخر سے کہا تو میرے اندر سکون کا دریا بہنے لگا۔

مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا لیکن اماں کہہ رہی تھی۔

”آج میں نے اسی خوشی میں پورے نور مگر کی دعوت کی ہے۔ اگر تمہیں جانا بھی ہو تو اس محفل کے بعد جانا۔“

”جی اماں۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ مجھے گامیرے اندر نور ہی نور پھیل گیا ہے۔



رات کے پچھلے پہر ہی سے میڈیا چیخنے لگا تھا۔ وہ ہانگوں کی طرح وہی کہے جا رہے تھے، جو کوئی انہیں کہہ دیتا۔ کسی ایک جھیل نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔ بلکہ تیواری کے حامی چینل یہی کہہ رہے تھے کہ وہ الما ہو گئے ہیں اور مخالفین یہ واویلا کر رہے تھے کہ وہ خود کہیں چھپ گئے ہیں۔ کہیں پر بھی کوئی حتمی بات نہیں کی جا رہی تھی اور نہ سچ بتایا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دونوں رانا کی پلاننگ بالکل ٹھیک سمت جا رہی تھی۔ پولیس پر یہ ہاؤ تو آ رہا تھا کہ انہیں فوری تلاش کیا جائے لیکن یہ نہیں کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ونو دوہرا فائدہ لینا چاہ رہا تھا۔ ایک طرف وہ وقتی طور پر یہ گرفتاری چھپا کر حکومت کے دباؤ سے بچنا چاہ رہا تھا تو دوسری طرف دیئے گئے قوت کی تصدیق کر رہا تھا۔ اس دوران بہت ساری گرفتاریاں بھی وہ آسانی سے کرتا چلا جا رہا تھا۔

وہ رات ہی گرین ہاؤس واپس آ گئے تھے۔ تیواری کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا، بس اتنا بتا

”وہ جو کل آپ وہاں ہمارے پاس ملنگ چھوڑ آئے ہیں نا، اس کے بارے میں بات کرنی تھی سائیں جی نے۔“ اس نے اپنا لہجہ مودب ہی رکھا

”کیا بات کرنی تھی۔“ میں نے پھر پوچھا تو وہ بولا۔

”یہ تو وہی جانتے ہیں۔ اگر آپ وہیں چلے آئیں تو، یہی انہوں نے کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے ابھی چلتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پورچ میں کھڑی کار کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد میں اس نوجوان جوگی کو لیے مسافر شاہ کے ٹھڑے کی طرف چل دیا۔

سورج ابھر رہا تھا جب میں ٹھڑے کے پاس جا پہنچا۔ رام لعل جوگی میرا منتظر تھا۔ میں کار سے اترا تو وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔

”حضور۔ آپ کو اس طرح بلانے پر بڑی معافی چاہتا ہوں، میں آپ کو کبھی نہ بلاتا اگر یہ ضروری نہ ہوتا۔“ وہ عادت کے مطابق ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”رام لعل کام کی بات کرو نا۔“ میں نے کہا۔

”وہ جو بندہ آپ نے ہمارے ذمے لگایا تھا، میں اس سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔“ وہ ندامت سے بولا۔

”تنگ آ گئے، مطلب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اگر بات صرف بوٹی کے نشے تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ وہ چرس کا بھی عادی ہے۔ میں نے کل سے اسے کچھ نہیں دیا اور نہ ہی اسے کوئی شے استعمال کرنے دی۔“ اس نے بتایا

”اچھا کیا، میں نے تمہیں یہی تو سمجھایا تھا۔“ میں اس کی ساری بات سمجھ گیا کہ وہ اب آگے کیا کہے گا۔

”رات ہوتے ہی اس نے مجھے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ اسے بوٹی پینے دی جائے یا پھر چرس ہی دے دوں۔ میں نے کچھ نہیں دیا تو آدمی رات کے وقت اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ یا تو مجھے نشہ دو یا پھر میں اسے اپنا کوئی سانپ ڈسوادوں۔“ اس نے بتایا

”پھر کیا کیا تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”کرنا کیا تھا، میں نے اسے باندھ کر کمرے میں پھنکوا دیا ہے، بات یہیں تک رہتی تو بھی ٹھیک تھا لیکن.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا

”لیکن کیا؟“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”وہ فقط ایک ملنگ ہی نہیں، اور کچھ بھی ہے، وہ آپ کا یہاں کے لوگوں کا دوست نہیں ہو سکتا۔“ اس نے انکشاف کیا تو میں مطمئن ہو گیا۔ اسے دیکھ کر جو بے چینی ہوئی تھی، اسے سکون مل گیا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا اندازہ ہے، باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔“ رام لعل نے کہا میں خاموش ہو گیا، پھر اس کے ساتھ اس کمرے میں گیا، جہاں وہ پڑا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ میں نے اس کے بدن پر ہاتھ رکھا تو مجھے برف کی طرح لگا۔ میرا لمس محسوس کر کے اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا اور نہایت درد

مندی سے شکوہ بھرے لہجے میں بولا۔

”تم نے بہت ظلم کیا ہے مجھ پر۔“

کر چلے آئے کہ جو نور دانا نے کہا ہے وہ پورا کر دو تو تمہاری بچت ہو سکتی ہے۔ ورنہ وہ جو کرے گا، وہی جائے۔ گرین ہاؤس کی کچھلی طرف چھوٹا سا باغ تھا، جو دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اجڑا ہوا تھا۔ جہاں وہیں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ تبھی ارد گرد بھی وہیں اپنا گناہ تھا دے دیں آگیا۔

”کافی اچھی خبریں ملی ہیں۔ یہاں پر یہودیوں نے جو جگہ بنانی شروع کی ہے، اس وقت ان کے کرتا دھرتا چند لوگ ہیں۔ ان میں سے مقامی یہودی اور دوسرے لوگوں پر جی کھول کر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ ان میں دو نام ایسے ہیں۔ جن کے بارے میں خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ سارے فیصلے کرتے ہیں۔“ ارد گرد نگہ نے بتایا تو جہاں نے کہا۔

”یہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ کرتے رہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ سکھ دھرم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سکھوں کا تعلق پاکستان سے ہے، دوسرا ہندوؤں کو خوش کرنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔“

”ہاں میں وہ آپ کو بتانا بھول گیا کہ ہندو قوم پرست شیو سینا ان کے ساتھ پوری طرح ہے۔ کم از کم ممبئی میں وہ ان کی پوری سپورٹ کر رہے ہیں۔ ان کے دو لوگ ہیں۔ ان چاروں کی آپس میں ایک تنظیم بنی ہوئی ہے۔“

”ان چاروں کو ختم کرنا لازمی ہے جہاں؟“ ایک دم سے بانیتا کو رنے نمودار ہوتے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہ یہ کہ ابھی وٹوڈ کا فون آیا ہے۔ اس نے ایک بڑی اہم بات بتائی ہے۔ وہ فلم جسے ہم اپنے گلے کا پھندا سمجھ رہے ہیں وہ آفیشلی نہیں ہے۔ صرف انجی لوگوں کی بنائی ہوئی ہے۔“ بانیتا نے جوش سے کہا۔

”مگر یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ حقیقت ہے۔“ جہاں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

”میں مانتی ہوں اور یہ سوال میں نے بھی کیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ سی بی آئی دالے لوگ جعلی تھے۔ وہ لوگ اسی تیواری کے تھے۔ یہ ایک پورا گروہ ہے جن کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اس طرح نہ جانے کتنے لوگوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔“ بانیتا نے اسی جوش سے بتایا تو ارد گرد نے پوچھا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ فورسز کی معلومات کو اصل جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنی دسترس میں کر لیتے ہیں۔ پھر خود ہی مختلف فورسز کا حوالہ دے کر انہیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ ثبوت آفیشلی رہ ہی نہیں جاتے؟“

”بالکل، وٹوڈ نے اسی اعتماد پر ہم سے کام لیا ہے۔ وہ پہلے ہی جانتا تھا، اس کی تصدیق ہر دیک کے ثبوت سے ہو گئی ہے۔ وہ اسی ثبوت کی بنا پر آج دہلی گیا ہے۔ یہاں پر تجلیت بھر بھرے پوری طرح الٹ ہے۔“ بانیتا نے بتایا تو جہاں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر پوچھا۔

”ہم اگر چاہیں تو امرتسریا جاندھر جاسکتے ہیں؟“

”صرف آج کا دن نہیں، جیسے ہی وٹوڈ واپس آتا ہے، وہ ہمیں گرین سگنل دے دے گا، ویسے میں اپنے طور پر بھی تصدیق کر رہی ہوں۔“ بانیتا نے پورے اعتماد سے کہا۔

”اوکے۔ ایک دن اور سہی۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا تو بانیتا نے ارد گرد کی طرف دیکھا اور بولی۔

”ابھی جو تم نے مجھے نام بتائے ہیں، ان کے بارے میں معلومات بعد میں لیتا۔ پہلے ان کی باری ہے جنہوں

نے ہمارے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی۔ ان کی ضلیں یاد رکھیں گی کہ کسی سکھنی سے پالا پڑا تھا۔ میں سب لوگوں سے کہتی ہوں کہ تیار ہو جائیں، آج کی رات ممبئی پر بہت بھاری ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”کیا کرنا چاہتی ہو تم؟“ جہاں نے دھمے مگر سرد لہجے میں پوچھا

”انہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ انہوں نے ہم سے کھیلنے کی جرات کیسے کی؟“ وہ غصے کی انتہا پر تھی۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں معاف کر دو، مگر یہ فیصلہ ایسے وقت میں کرو، جب تم غصے میں نہ ہو، کیا وہ اس انتظار میں نہیں ہوں گے کہ ہم کب ان پر نوٹ پڑتے ہیں اور وہ.....“ جہاں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہنا چاہا لیکن وہ اس کی بات کا منہ ہوئے بولی

”جہاں! ابھی وقت ہے۔ آج نہیں تو پھر کبھی نہیں۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو جہاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔“

”میرے خیال میں جہاں ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ارد گرد نگہ نے سوچنے والے انداز میں کہا

”کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ بانیتا نے کہا

”دیکھو! یہ تیواری والا معاملہ ختم ہی سمجھو۔ اب یہاں سے کچھ بھی نہیں سامنے آنے والا۔ وٹوڈ رانا نے جو کچھ کرنا تھا، وہ کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ تم لوگوں کو کلین چٹ دے دے گا۔ تم لوگ کم از کم حکومت نگاہ میں بے گناہ ہو جاؤ گے اور آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی تم لوگ آزادی سے گھوم پھر سکو گے؟“ ارد گرد نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

”نہیں ارد گرد، ہمارے ارد گرد بہت سارے دشمن ہیں۔“ بانیتا نے کافی حد تک سکون سے جواب دیا

”ہمارا دشمن بہت چالاک ہے، منافق اور خفیہ کاروائیاں کرنے والا ہے۔“ جہاں نے کہا

”تو پھر اسی کی چال اُس پر الٹ دو۔“ یہ کہہ کر اس نے بانیتا کے چہرے پر دیکھا، چند لمحوں یونہی رہنے کے بعد وہ بولا، ”ہم یہاں پوری طاقت میں نہیں ہیں۔ یہاں ہمارا کوئی نیٹ ورک نہیں، ہم دوسروں پر انحصار کرتے ہیں، دوسروں کا اپنا فائدہ ہے۔ اگر ہم یونہی دوسروں پر انحصار کرتے رہے تو ہم بھی استعمال ہوتے ہوئے خرچ ہو جائیں گے۔ یہ جگہ ہمارے لئے محفوظ نہیں۔ وہ جو آج ہمارے دوست ہیں، کسی وقت بھی ہمارے دشمن بن سکتے ہیں، خاص طور پر ٹی ایس کے لوگ۔ وہ کسی مقصد کے لئے نہیں صرف ”فائدہ“ کے لئے لڑ رہے ہیں۔ انہیں ہماری اس جگہ کے بارے پوری معلومات ہے۔ اس لئے.....“ ارد گرد نے کہنا چاہا تو بانیتا اکتاتے ہوئے بولی

”تم کہنا کیا چاہتے ہو ارد گرد۔“

”ہمیں وقت چاہئے، ذرا سا وقت۔ میں کہیں بھی بیٹھ جاؤں، مجھے اپنا کام کرنا ہے، لیکن میں جتنا محفوظ ہوں گا، تم لوگوں کے اتنے ہی کام آسکوں گا۔“ اس نے بتایا تو جہاں نے کہا

”ارد گرد ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”وہ بات جو میں کہنا نہیں چاہ رہا تھا کہہ دیتا ہوں کہ ہم یہاں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر پائے ہیں، ہم ان یہودیوں کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں ہیں، جن کے کی پشت پر حکومت کی طاقت ہے۔“ ارد گرد نے دھمے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا

”کیا چاہتے ہو؟“ بائیتا نے پوچھا

”اگر دشمن کو اسی کے ہتھیار سے مارنا ہے تو پہلے ہمیں محفوظ ہونا ہوگا۔ ہمیں ان سے کھیلنا ہے۔“ اردوند نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا

”تم جو چاہو، ہم وہی کرنے کو تیار ہیں۔ یہ جگہ بدلنا چاہتے ہو تو وہ بھی کر لیتے ہیں۔“ بائیتا نے کہا تو وہ پورے جوش سے بولا

”تو پھر میں دشمن کو اپنے پسندیدہ میدان میں لے آؤں گا۔ پھر جو چاہو سو کرنا۔“

اس کے یوں کہنے پر بائیتا اور جہاں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر بائیتا نے پوچھا

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”اس وقت حکومت میں موجود یہودی لابی، شیو سینا اور یہودیوں کے درمیان یہی بات زیر بحث ہے کہ ممبئی میں یہ جو ان کے مخالف لوگ پیدا ہو گئے ہیں یہ کون ہیں، ان کا سد باب کیسے کیا جائے اور اصل میں یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ اسی کا جواب انہیں کوئی راستہ متعین کرنے میں مدد دے گا۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ ان کے پھیلائے ہوئے جال میں ہم جا پھنسیں۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ پوری پلاننگ کرنا ہوگی۔ اور وہ پلاننگ میرے ذہن میں آچکی ہے۔“ اردوند نگہ نے کہا

”وہ کیا ہے؟“ جہاں نے پوچھا

”انہیں اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ ان کے بڑے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ وہیں ان پر ایک کاری ضرب لگائی جائے۔ تاکہ یہ برس برس اٹھ ہی نہ سکیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”یہ کیسے ممکن ہوگا؟“ بائیتا نے کہا

”اب تم لوگوں کو میدان میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ کبھی ہوئی بساط پر مہرے اپنی ماضی سے چلو۔ کسی کی بساط پر خود مہرے نہ بنو۔“ اردوند نے اعتماد سے کہا

”بساط اور مہرے؟ میں کچھ سمجھا نہیں اردوند سنگھ جی؟“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”اس دنیا میں بہت سا مفاد، بہت سارے لوگوں سے جڑا ہوا ہے، اگر کوئی کسی کو ٹریپ کرنے کے لئے اپنا جال بچھاتا ہے تو کیوں نہ اسی جال میں کسی دوسرے کو ٹریپ کر لیا جائے۔ جال بھی کسی دوسرے کا اور ٹریپ ہمارا دشمن ہو جائے۔“ اس نے جواب دیا

”تمہارا جواب مجھے پسند آیا اردوند سنگھ۔ لیکن یہ خوش گمانی ہے۔ ایک عقلی یا غیر عملی شے۔ اور پھر کیا اس کے لئے ہمارا ممبئی میں رہنا ضروری ہے یا نہیں؟“ بائیتا نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا

”یہی لگتا ہے، ابھی یہی لگتا ہے۔ بعض اوقات تو کوئی واقعہ ہمارے سامنے ہو بھی جائے تو ہم اس پر یقین نہیں کر رہے ہوتے۔ میں یہی بات میں سمجھا رہا ہوں۔ دور کہیں سکون سے بیٹھ کر پورا کھیل کھیلیں گے۔“ اس نے سکون سے کہا

”کیسا کھیل؟“ جہاں نے پوچھا

”میں پوچھتا ہوں، اس وقت اگر وہ چاروں مرجائیں گے تو کیا بھارت میں یہودی لابی اپنا کام بند کر دے گی، ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ میں امریکہ میں رہا ہوں اور یہودی ذہنیت سے اگر پوری طرح نہیں تو کم از کم بہت حد تک تو ضرور واقف ہوں۔ سو میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اب کیا کر سکتے ہیں۔ اس کا تھوڑا بہت خاکہ بنا ہے،

جس وقت ذرا سی بھی تصویر واضح ہو گئی، میں تفصیل سے تم دونوں کو بتا دوں گا۔ اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہو تو۔“ اردوند نے پورے اعتماد سے کہا تو بائیتا نے حتیٰ لچھے میں کہا

”ہو گیا۔ تم آج ہی بلکہ ابھی، رویت اور گرلین کو لے کر امرتسر نکل جاؤ۔ شام تک تم لوگ جالندھر پہنچ جاؤ گے میرے فارم ہاؤس پر۔ جب تک تم وہاں پہنچو گے، تمہارے مطلب کی ہر شے وہاں پہنچ جائے گی۔ میں تمہارا رابطہ دے دوں گی۔“

”اوکے۔“ اردوند نے کہا ادنگ میں پڑی کافی اپنے حلق میں انڈیل کر اٹھ گیا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ انہیں شام تک انتظار کرنا تھا، یا پھر اگلے دن تک، جب تک ونود رانا دہلی سے واپس نہیں آ جاتا، یا پھر فون پر کوئی اطلاع نہیں دے دیتا۔

☆.....☆.....☆

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرا نور مگر آنا کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ کچھ ایسے کام تھے، جن کی وجہ سے میں یہاں کھنچا ہلا آیا تھا۔ ثانی اندر سے کب کی بدل چکی تھی۔ اصل شے کردار ہوا کرتا ہے۔ برے سے برے ماحول میں اگر ایک بھی اچھے کردار کا مالک ہو تو اس کی شخصیت میں مقناطیسیت آ ہی جاتی ہے۔ لوگ اس کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔ اچھی سوچ ہی کردار بناتی ہے۔ جو جس طرح کی سوچ رکھتا ہے اس طرح کے کردار کا اظہار ہوتا لٹری بات ہے۔ غلط سوچ والا بندہ چاہے جتنا مرضی تقویٰ اور پرہیز گاری والا بادہ اپنا لے، اس کے کردار سے ہٹا آ ہی جاتی ہے۔ ثانی اندر سے ایک صاف سلیٹ کی مانند تھی، اس نے باطل کو قبول نہیں کیا اور جیسے ہی حق اس کے سامنے آیا وہ اس کے اندر اتر گیا۔

دن کا پہلا پھر گزر گیا تھا اور میں ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا کچھ اور ہی سوچے چلا جا رہا تھا۔ جنید میرے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میں نے بیدے کے ساتھ اسے پورا علاقہ دیکھنے اور ایک خاص قسم کا سروے کرنے کے لئے امداداری دی تھی۔ وہ اسی کام میں مصروف تھا۔ وہ میرے رابطے میں رہتا تھا۔ اس وقت میرے اندر ایک خواہش سر اٹھارہ رہی تھی اور میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ ثانی آگئی۔ اس نے سفید شلوار قمیص کے ساتھ سیاہ جاب پہنا ہوا تھا۔ اور سیاہ رنگ کا ہی عایا پہنا ہوا تھا۔ چہرہ کسی بھی طرح کے میک اپ سے بے نیاز تھا، اگرچہ وہ پہلے اگلی بہت کم میک اپ کیا کرتی تھی، لیکن آج اس کا چہرہ بہت زیادہ ہی کلفت لگ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پورے دل سے کہا

”ثانی زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔“

”تمہیں بھی مبارک، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔“ یہ کہہ کر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا تو میں نے کہا

”ثانی انسان ایک آئینہ ہے، وہ اس میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ جیسے ہی آئینے پر پڑی دھول صاف ہوتی ہے وہ اپنا آپ صاف دیکھنے لگتا ہے۔ تم نے اپنے آپ کو دیکھا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی کریڈٹ نہیں ہے۔“

”ہاں، یہ فیصلہ میرا اپنا ہے۔“ اس نے پورے اعتماد سے کہا

”ایک اکیلی اینٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، جو کوئی چاہے جیسے اس کے ساتھ سلوک کرے، اسے جہاں کھنچا جائے رکھ دے۔ لیکن وہی اینٹ جب دیوار میں لگتی ہے تو اسے ہلایا نہیں جاسکتا۔ وہ اینٹ پہلے اکائی تھی، دیوار میں لگنے کے بعد وہ یکائی میں آگئی۔ وہ وحدت میں ضم ہو گئی۔“ میں نے کہا

”مطلب، میں سمجھی نہیں۔“ اس نے سمجھنے والے انداز میں میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا
 ”ایٹن کی اپنی حیثیت محدود تھی۔ جیسے ہی وہ دیوار میں لگی تو وہ وحدت کے دائرے میں آگئی۔ محدود جو تھی وہ
 لامحدود میں جا کے وحدت حاصل کر چکی۔ اسے نگاہ تو دیکھ رہی ہے لیکن عقل تسلیم نہیں کر رہی۔ یہ فقط ایک مثال
 ہے، میں اصل میں تجھے بتانا یہ چاہ رہا ہوں کہ انسان بھی انتشار سے وحدت میں جا سکتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ
 ہر آدمی دیکھتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں، کیونکہ اس کا دل زندہ نہیں۔ جس کا دل زندہ ہے اسے یہ معلوم ہے کہ
 کائنات محدود نہیں۔ کیونکہ وہ ”نظر“ سے دیکھ رہا ہے۔“

”میں یہ سمجھنا چاہتی ہو کہ دل زندہ کیسے ہوتا ہے؟“ اس نے پوری توجہ سے پوچھا

”میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ دل مردہ نہیں ہوتا، دل زندہ ہی ہوتا ہے۔ جسے ”مردہ دل“ کہا گیا ہے،
 اصل میں اسے انہی چیزوں نے فانی بنایا ہوا ہے جو اس کے اندر پڑی ہوئی ہیں۔ یہ وہ حجابات ہیں جو اسے اپنی
 طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے، اس کی نگاہ کے آگے اندر میرا پیدا کر دیتے ہیں۔ عشق کی آگ جب آتی ہے تو ان
 سارے مادی حجابات کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے خاشاک غیر اللہ اُڑ جاتے ہیں تو عشق حقیقی کا ظہور ہوتا ہے۔
 حجابات اُڑ جاتے ہیں۔ ہر شے واضح ہو جاتی ہے اور بندہ عین حقیقت ہو جاتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہ اللہ
 کی وحدانیت کو پوری طرح پالیتا ہے۔ یہی محدودیت سے وحدت تک کا سفر ہے۔“ میں نے پورے جذب سے
 کہا

”اور ہمیشہ کی زندگی؟“ اس نے تیزی سے پوچھا

”جب دل میں عشق اترتا ہے تو ساری آلائشیں اُڑ جاتی ہیں۔ تو دل آئینہ بن جاتا ہے اسے پھر صاف
 دکھائی دینے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اس ذات سے جڑ جاتا ہے، جس کے قبضے میں ہر شے ہے۔ جو ہر عشق ہی وحدت
 ہے۔ جو آقا ﷺ کا دیا ہوا راستہ ہے۔ زندہ دل سے وابستہ ہونے ہی سے زندہ دلی کا ظہور ہوتا ہے، یہ جو دل
 ہے تا یہ زندہ کو دے، تو ہمیشہ کی زندگی پالیتا ہے۔ یہ آقا ﷺ کی سنت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں کہ آقا
 ﷺ کا طرز زندگی ہی اصل حیات ہے۔ یہی اصل زندگی ہے۔“ میں نے کہا تو اس یہ سن کر آنکھیں بند کر لیں۔
 ہم میں ایک خاموشی آن ٹھہری۔ تب میں نے کہا، ”میری ایک خواہش ہے۔“

”وہ کیا؟“ اس نے آنکھیں سکوڑتے ہوئے پوچھا

”یہی کہ تم انتشار سے وحدت میں چلی جاؤ۔“ میں نے کہا

”کیسے؟“ اس نے پوچھا

”میں پورے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں بھی تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔“
 میں نے کہا تو بولی

”مجھے تم سے عشق ہے۔“

”میں نے مان لیا۔ عشق انسان کو رب تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہے۔ لیکن اسے اختیار کرنے کا اور اسے
 چھوڑنے کا اختیار بھی رب تعالیٰ نے انسان ہی کو دیا ہے۔ مہر اتم سے ایک سوال ہے؟“ میں نے اس کے
 چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا

”وہ کیا؟“ اس نے کہا

”کیا تمہارا عشق میرے ہونے تک ہے، اگر میں کل نہ رہوں تو تمہارا عشق ختم ہو جائے گا؟“ میں نے سوال

کیا تو وہ ایک دم سے چوٹ گئی، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی
 ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میرے لئے تمہارا عشق فقط ظاہر تک ہے کیونکہ تم عشق کا بے پایاں وصف حاصل کرتی ہو۔“ میں نے
 کہا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے چمک اٹھیں پھر سکون سے بولی
 ”کیسے؟“

”درحقیقت خدا کے سوا کسی کا وجود نہیں ہے، ظاہری عشق اور محبت اپنے دل سے نکال دو اور اللہ کے عشق
 کو اپنے اندر جگہ دو۔ مسلک عشق اختیار کرو۔ تمہارے مقصد بھی آسمانوں کی طرح بلند ہو جائیں گے۔ نفسی
 خاشاک کو جلاتا ہوگا۔ اپنی تعمیر کرنا ہی تخریب ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مسکراہٹ سے بولی
 ”یہی کرنا کیا ہوگا۔“

”محدود تو محدود ہی ہوتا ہے۔ لیکن لامحدود بھی ایک حد ہے، وہ ذات جس کا عشق اختیار کرنا چاہو گی، وہ ان
 سے بھی ماوراء ہے۔“ میں نے کہا تو وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اس کے اندر سکون اتر گیا ہو۔ شاید ہماری
 مزید بات چلتی لیکن انہی لمحات میں اشفاق اندر آیا تو میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔ میں
 نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”بولو، کیا خبر ہے؟“

”وہ جوگی بھی وہیں ہے اور ملک بھی۔“ اس نے دھیسے سے لہجے میں کہا

”آؤ چلیں۔“ میں نے تانی کو بھی چلنے کا اشارہ کیا اور اٹھ گیا۔

ہم تینوں نے پورچ سے کارلی اور مسافر شاہ کے ٹھڑے پر جا بیٹھے۔ ملک سکون میں نہیں تھا۔ وہ بے سکون اور
 بے چین جوگی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بونگ کا کوڑا تھا لیکن پی نہیں رہا تھا۔ تانی اور اشفاق اس
 چار پائی پر بیٹھ گئے، جو وہاں ان لوگوں نے رکھ دی تھی۔ میں ان دونوں کے پاس زمین پر جا بیٹھا۔ انہوں نے
 میری طرف دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔

”پی کیوں نہیں رہے ہو؟“ میں نے پوچھا تو ملک نے سر اٹھائے بغیر ہولے سے کہا

”میں اپنے آپ پر حیرت زدہ ہوں، مجھے خود پر بہت مان تھا۔ لیکن میں تو مٹی کا ڈھیر ثابت ہوا۔ شاید یہ اس
 لئے ہوا ہے کہ کوئی میرے مقابلے پر نہیں آیا تھا یا.....“ یہ کہتے کہتے وہ رک گیا اور بے بسی سے میری طرف
 دیکھنے لگا۔ میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ پھر اس بوڑھے جوگی کی طرف دیکھ کر پوچھا

”اور تم؟ تمہیں کوئی حیرت ہے؟“

”ہاں میں بھی حیرت زدہ ہوں لیکن میری حیرت کی نوعیت کچھ دوسری ہے۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے
 کہا۔ میں ہنس دیا۔

”کیا ہے وہ حیرت؟“ میں نے پوچھا

”یہی کہ میں نے جھوٹ بولا اور یونہی بات گھڑی، لیکن آپ نے اسے سچ کر دکھایا۔“ اس نے لہجے میں
 حیرت فک رہی تھی۔

”کیا اور کیسا جھوٹ، میں سننا چاہوں گا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”میں جوگی ضرور ہوں اور میرا تعلق بھارت کے علاقے صورت گڑھ کے پاس مناسکر گاؤں سے ہے۔
 میں وہیں ایک پرانے گاؤں کا باسی ہوں، یہ بھی سچ ہے کہ مجھ پر زہرا اثر نہیں کرتا اور میرا یہ پیشہ ہمارے آباء و

اجداد سے ہے۔ میری اسی صلاحیت کو استعمال کیا گیا۔ مجھے بھارت کی خفیہ تنظیم رانے تربیت دی ہے کہ دشمن کے علاقے سے اطلاعات کیسے اکٹھی کی جاتی ہیں۔ میں پچھلے تیرہ برس سے یہی کام کرتا آ رہا ہوں۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ ایسے ہی پھر رہا ہوں۔ یہاں بھی مجھے ایک خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور وہ یہی مقصد تھا کہ جب بھی جمال یہاں آئے، فوراً اطلاع کر کے اگلی ہدایات کا انتظار کیا جائے۔ میرا کام صرف اتنا ہی ہوتا ہے۔“

”مجھ سے کیا جھوٹ بولا۔“ میں نے پوچھا

”یہی کہ یہاں پر ایک خاص قسم کا سانپ ہے، حالانکہ یہ سانپ اس علاقے کا ہے ہی نہیں، یہ افریقی علاقوں میں پایا جاتا ہے اور میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ آپ کا چسکار ہے یہ، وہ سانپ جو یہاں ہے ہی نہیں، اس یہاں نہ صرف حاضر کر لیا بلکہ دکھا دیا کہ وہ آپ کا مطیع بھی ہے۔ میں نے پوری زندگی ایسا چسکار نہیں دیکھا۔“ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا

”یہ ملنگ بھی تو اسی مقصد کے لئے یہاں بیٹھا ہے۔ یہ بھی تو بھارتی خفیہ کا بندہ ہے۔ اس کی صلاحیت.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ ملنگ بولا

”مجھے نشے پر پوری دسترس تھی۔ لوگ مجھے نشے میں دھت سمجھ کر اپنے سارے راز اگل دیتے ہیں۔ اب مجھے پتہ چلا جسے میں اپنی طاقت سمجھتا تھا، وہ تو میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔“ اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

”تو اب کیا کرنا چاہتے ہو؟ اپنا فرض نبھایا؟ دے دی اطلاع؟“ میں نے پوچھا

”نہیں، اور نہ ہی دے سکتے ہیں۔“ جوگی نے ہاتھ باندھ کر کہا

”کیوں؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھ کر پوچھا

”میں سمجھتا ہوں کہ اب میری نسل سے یہ صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ سرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہے اور نہ ہی انسانیت۔ ہم بھی سانپ صفت ہو گئے ہیں۔ ہمیں انسان بننا ہے، شیطان نہیں۔ نیلی آنکھوں والا سانپ شیطان ہی تو ہے۔“ جوگی نے دست بدست ہو کر کہا

”یہ ملنگ.....؟“ میں نے پوچھا

”میں بھی اپنے ہوش میں آنا چاہتا ہوں۔“ اس نے صاف لفظوں میں کہا

”یہاں رہو اور اپنی حالت کا مشاہدہ کرو۔ اپنے آپ کو تسخیر کرو۔ تم پر تمہارا باطن کھل جائے گا۔“ میں نے کہا

”کیسے؟“ جوگی نے اسی طرح ہاتھ باندھے پوچھا

”انسان چاہے جس مذہب، نظریے یا عقیدہ کا ہو، وہ انسان ہے اور رب تعالیٰ نے انسان کو بے تحاشا صلاحیتوں سے نوازا ہے، اسے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے۔ یہ خود ہے جو اسفل سافلین میں جا گرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے اپنی ان ذاتی صلاحیتوں سے جو اسے رب تعالیٰ نے دیں ہیں۔ ان سے دنیا کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا، بظاہر انہو نیاں ہوئی ہیں۔ لیکن جب بھی انسان اپنے باطن سے جڑا، جب اس نے انسانیت کے لئے بہت کچھ کیا۔ اگر انسان اپنا آپ شیطانیت کو دے سکتا ہے تو اس سے چھٹکارا بھی خود اسی نے پانا ہے۔ خود ہی کرنا ہے اس نے۔ اپنے باطن تک اس نے خود ہی رسائی لینی ہے۔ اپنا آپ تسخیر کرو، یہی تمہاری تعمیر ہے۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ دونوں میری طرف دیکھتے رہے۔ میں کار میں آ بیٹھا۔ تانی میرے ساتھ اگلی نشست بیٹھ گئی۔ تبھی اشفاق نے پوچھا

”ان کا کرنا کیا ہے؟ جانے دیں انہیں۔ خواہ خواہ توجہ ان کی طرف رہے گی۔“

”دیکھو، انہیں دیکھو، یہ کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ خود کو بدل لیں تو دشمن کا یہی تیر، دشمن ہی کے سینے میں جا لگے گا۔ یہ جان لو کہ یہ تیر زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ احتیاط کرنا۔“ میں نے کہا

”انہیں میں دیکھ لوں گی۔“ تانی نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا سیاہ حجاب میں اس کا گلابی چہرہ متمل رہا تھا۔ تبھی میں نے اشفاق سے کہا

”اور ہاں! آج سے یہ سارا نور مگر تم دونوں کے حوالے، اس کی سیکورٹی سے لے کر، یہاں کے سب انتظامات تک تمہاری ذمہ داری ہے۔“

میرے کہنے پر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ واپس حویلی آنے تک پھر ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

☆.....☆.....☆

اس نیم تاریک کمرے میں جگجگت بھر بھرے اور دائیں جانب دونوں دانا بیٹھے ہوئے تھے ان سے ذرا فاصلے پر دیوار کے ساتھ تین کائشیل کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو جہاں کے ساتھ بائیں کور اندر آ گئے۔ وہ دونوں آ کر ان کے سامنے دھری کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے جگجگت بھر بھرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس سارے معاملے میں پس پشت رہا تھا۔ وہ اچھی شخصیت کا مالک تھا اور اس کے چہرے پر عام پولیس والوں کی طرح سختی نہیں تھی۔ وہ اگر سول کپڑوں میں ہوتا تو پرو فیسر ہی لگتا۔ اُن دونوں کے بیٹھتے ہی وہ مسکرایا اور پھر نرم اور پرسکون لہجے بولا

”میں تم دونوں کا بہت مشکور ہوں۔ آپ نے ہماری بہت مدد کی۔ ہم اس کا کوئی عوض تو نہیں دے سکتے، ہاں مگر ایک چھوٹا سا تحفہ ضرور دیں گے۔ اور وہ ہے تم دونوں کی بے گناہی، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم جرائم پیشہ نہیں ہو بلکہ محبت وطن اور حریت پسند ہو۔“

”ٹھیک یو آفیسر۔“ بائیں نے کسی جذبے کے بغیر کہا

”اگر میں آپ دونوں کو پولیس جوائن کرنے کا مشورہ دوں تو کیا آپ.....“ اس نے مسکراتے ہوئے، دھیمے

لہجے میں پوچھا تو وہ تیزی سے بولی

”ہم ہرگز جوائن نہیں کریں گے۔“

”پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“ جگجگت بھر بھرے نے پوچھا

”مجھے میں رہ کر سو پابندیاں ہیں، جیسے کہ آپ ہماری مدد لینے پر مجبور تھے۔ ہمارا مقصد انسانیت ہے، اس کے لئے ہم کام کرتے رہیں گے۔“ بائیں نے جواب دیا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا

”یہی تم بھی ایک گورکھ دھندہ ہے۔ دہلی کی ساری سیاست اب یہاں کٹتی ہوئی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یہ یہودی ایک وائرس کی طرح ہیں، جہاں جائیں گے اس قوم کو کھوکھلا کر دیں گے۔ اور ہمارے سیاست دان ان کے ہاتھوں بک چکے ہیں۔ صرف ہمارے ہی نہیں پڑوسی ملک کے سیاست دان بھی۔ ان میں کچھ سرمایہ دار ہیں، کوئی اپنی صنعت کا تحفظ چاہتا ہے اور کوئی اپنی بین الاقوامی ساکھ بچانا چاہتا ہے۔ اس سے ہو گا کیا؟ یہاں کے اور سرحد پار کے عوام کا لہو نہ بے گا۔ کتنے بچے مارے جائیں گے، کتنی عورتیں کتنے جوان، تباہی کے سوا کچھ نہیں، اور ان کی تجوریاں بھریں گی اسلحہ بیچ کر۔“

”تو پھر انہیں یہاں سے بھاگ کیوں نہیں دیتے؟“ جہاں نے کہا

سمیت گیارہ بندے میں نے پکڑ لئے ہیں اور یہ سارے اہمیتو بھارت، جن جاگرتی سمیتی اور دیگر ہندو سخت گیر تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہندو راشٹریہ یعنی ہندوانہ حکومت چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں سیکولر بھارت کا کوئی تصور نہیں۔ میں نے پہلی بار تجربہ کیا کہ فورسز سے ہٹ کر کام کروں تو میں نے کامیابی پالی۔ ورنہ میں ابھی کوئی پلان کرتا ہوں، وہ اُن تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کی جڑیں اس قدر مضبوط اور گہری ہیں، اسی سے سمجھ لو۔“

”یہ تو بہت خطرناک بات ہے؟“ بانیتا نے یوں کہا جیسے کسی کھائی سے بات کر رہی ہو۔
 ”بابری مسجد گرانے اور گجرات فسادات کے بعد برہمنی ذہنیت والوں کا مقصد حل نہیں ہو سکا۔ یہ تنظیمیں سنگھ پرچار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ جو ملک، حکومت، عوام اور عالمی سطح پر مسلمانوں اور سکھوں کے بارے گمراہ کرتا ہے۔ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیں، کہیں بھی کوئی ایسی واردات ہوتی ہے، فوراً مسلمانوں کے خلاف سکھوں یا کسی دوسرے کے خلاف رٹا رٹایا بیان میڈیا پر آ جاتا ہے۔ تقیث میں وہ سب الٹ ہوتا ہے۔ اصل میں اٹلی جلس بیورو، پولیس میں مداخلت کرتی ہے۔ ٹرین بم دھماکوں میں جب مجرم گرفتار کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا تو ہمارے ایک پولیس انسپکٹر نوڈ بھٹ نے خودکشی کر لی۔“ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو جہاں نے پوچھا ”تو کیا ہم ابھی نہ جائیں، یہیں ممبئی میں رہیں۔“

”تمہارا یوں کہنا اچھا لگا، اگر تم دونوں چاہو تو رابطے میں رہنا، مجھے آپ لوگوں کی مدد چاہئے ہوگی۔ ابھی آپ چاہیں تو آج ہی اپنے گھروں کو چلے جائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ماتحت کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے لوگوں کی چند گڈیاں اس کی طرف بٹھا دیں۔ اس نے وہ پکڑ کر میز پر رکھتے ہوئے کہا، ”یہ ذرا سی بھینٹ ہے، یہ آپ قبول کر لیں۔“

”نہیں آفیسر! یہ آپ اپنے بچوں کی مٹھائی کے لئے لے جائیں۔ اب ہمیں اجازت۔“ جہاں نے کہا تو وہ چند لمبے سوچتا رہا پھر بولا

”ٹھیک ہے، میں براہ راست اب تم دونوں سے رابطے میں رہوں گا۔ اگر یہاں رہو تو میرا جتنا علاقہ ہے وہ تم دونوں کا، جو چاہو سو کرو۔“ جگجیت بھر بھرے نے کہا تو بانیتا ہنستے ہوئے بولی

”نہیں، ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھی تو جہاں بھی اٹھ گیا۔ جگجیت بھر بھرے نے اٹھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

”اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“ دودرانا نے پوچھا

”مطلب؟“ جہاں نے چوتھے ہوئے پوچھا

”مطلب یہ ہے کہ اگر تم ابھی امرتسر جانا چاہتے ہو، تو میں تمہیں ایئر پورٹ تک چھوڑ دیتا ہوں۔ ٹکٹ کی بھی کوئی اتنی دیری نہیں ہوگی۔“ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا تو بانیتا نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے ہم ابھی نکلتے ہیں۔“

”میں یہاں سے امرتسر تک آپ سے رابطے میں رہوں گا۔“ دودرانا نے کہا تو ایک بار پھر وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے باہر نکل آئے۔

اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا جب وہ دونوں امرتسر ایئر پورٹ سے باہر آئے تو ان کے انتظار میں سیاہ فریری کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھے تو فریری چل دی۔ دودرانا نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ کسی نے

”میں انہیں ایک منٹ برداشت نہیں کرتا۔ لیکن میرے اکیلے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے ان کی، فقط یہود نواز سیاست دانوں کی فائل کھولی تھی، اور اتنا ہنگامہ ہو گیا۔“ جگجیت بھر بھرے نے دہی لہجے میں کہا

”تو بس، آپ نے جنگ ہار دی۔“ جہاں نے پوچھا

”نہیں، جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔ اس تیواری سے بہت کچھ ملا ہے، میری اور اس کی ڈیل ہو گئی ہے۔ اس نے خود کو بچانے کے عوض ایک ہفتے کے اندر ان دوسروں کے بارے میں بتانے کا کہا ہے، وہ سب کچھ جو اس کے پاس پڑا ہے، ہر دیک کو میں تمہاری لینڈ بھجوا رہا ہوں۔ وہاں اس کے لئے کام کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہی رامیش پاٹلے ایک بہت بڑی ٹیم کھینے جا رہا ہے۔“ جگجیت بھر بھرے نے جوش سے کہا

”کیسی ٹیم؟“ جہاں چوتھے ہوئے بولا

”ابھی مجھے اس کے پورے خدوخال کا نہیں پتہ۔ لیکن میں اپنے ماضی کے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا

”ماضی میں کیا ہوا تھا؟“ بانیتا نے سوال کیا تو وہ ذرا دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا

”سن دو ہزار سے تم لوگوں نے ناندیڑ بم دھماکا، ٹرین بم دھماکا، اجیر شریف بم دھماکا، مالیکاؤں بم دھماکا، احمد آباد بم دھماکا، یہ سب سنا ہوگا؟“ اس نے پوچھا

”کچھ کچھ کا یاد ہے مجھے۔“ بانیتا سوچتے ہوئے بولی

”بابری مسجد کو گرایا گیا، کیوں؟ گجرات کے فسادات ہوئے، کیوں؟ سمجھو تو ایکسپریس میں بم دھماکا کیا گیا کیوں؟ یہ جواب طلب سوال ہیں نا؟“ یہ کہہ کر وہ چند لمبے بانیتا کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ اور ہی سوچ رہا ہو، پھر بولا، ”یہ سب برہمنی ذہنیت کا شاخسانہ ہے، جن کی وجہ سے اب بھارت کو خطرہ ہے، ان کی جڑیں خفیہ اداروں، خاص طور پر آئی بی میں بہت گہری ہو چکی ہیں۔ مطلب اندر تک، اتنی اندر تک کہ جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ادارے اب کس کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں؟ اسی برہمنی ذہنیت نے میڈیا اور خاص طور پر علاقائی میڈیا پر پوری طرح کنٹرول کر لیا ہوا ہے۔ یہ انسانیت سوز واقعات خود کرتے ہیں، اور پھر الزام مسلمانوں پر لگا دیتے ہیں تاکہ انہیں دہشت گرد قرار دیا جاسکے۔ آئی بی ان کی پوری معاون ہے۔“

”کون لوگ ہیں یہ؟“ بانیتا نے پوچھا

”یہ تو میں بھی نہیں جانتا، ہو سکتا ہے تم ہو، میں ہوں یا یہ دودرانا، کوئی بھی، کہاں تک کون بندہ ہے، یہ کوئی نہیں جانتا، لیکن.....“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کو سانس لے کر اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا، ”ایک سوال میں کروں؟“

”جی کیوں پوچھیں؟“ جہاں نے کہا

”تم لوگوں کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ اتنی پولیس فورس ہونے کے باوجود میں نے تم لوگوں سے یہ اتنا سا کام کرنے کو کیوں کہا؟“ اس نے پوچھا

”یہ سوال تو ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا

”میں جانتا ہوں کہ میں اس وقت ہٹ لسٹ پر ہوں اور کسی وقت بھی کوئی گولی مجھے چاٹ جائے گی، کیونکہ میں ان کے اندر تک اتر گیا ہوں۔ میں نے مالیکاؤں بم دھماکے کے مجرم پکڑ لئے ہیں، سادھوی پرگیہ سنگھ ٹھاکر، حاضر سردس کرل پر دہشت، جو سمجھو تو ایکسپریس دھماکہ کیس کا سرغنہ ہے، رامیش ایادھیما، سوامی دیا نند پاٹلے،

میں ان کے اندر تک اتر گیا ہوں۔ میں نے مالیکاؤں بم دھماکے کے مجرم پکڑ لئے ہیں، سادھوی پرگیہ سنگھ ٹھاکر، حاضر سردس کرل پر دہشت، جو سمجھو تو ایکسپریس دھماکہ کیس کا سرغنہ ہے، رامیش ایادھیما، سوامی دیا نند پاٹلے،

انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بائیتا نے ٹی ایس، نوتن کور، اور زوردار سنگھ کو بتا دیا کہ انہوں ہنگامی طور پر یہاں سے نکلنا پڑ رہا ہے۔ وہ بعد میں رابطہ کریں گے۔ جہاز میں سوار ہونے تک انہوں نے امرتسر میں بھی بتا دیا۔ وہ حویلی پہنچے تو جہال نے کارڈ کئے ہی کہا

”دیکھو بائیتا، تم اپنے گھر والوں سے ملو جلو، لیکن مجھے فی الحال اوگی جانے دو۔ اب ہماری جالندھر ہی میں ملاقات ہوگی۔“

”اندر تو آؤ، کچھ کھا پی لو، تھوڑا آرام کر لو؟“ بائیتا نے حیرت سے کہا تو وہ بولا

”نہیں مجھے جانے دو۔“

”اوکے، تم جاؤ۔“ اس نے کہا پھر اپنے ڈرائیور سے اسے لے جانے کو کہا اور خود اتر گئی۔ ڈرائیور نیچے بھی نہ اتر اور وہیں سے اوگی پنڈ کے لئے روانہ ہو گیا۔

سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ جب وہ جالندھر کی فضاؤں میں جا پہنچا۔ وہ اس بار ہر پریت کو سر پرائیز دینا چاہتا تھا۔ کوئی سات آٹھ کے درمیان کا وقت ہوگا، جب وہ سرخ چھت والی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے جا پہنچا۔ بننا سنگھ نے اسے دیکھا تو فوراً ہی گیٹ کھول دیا اور ڈرائیور اسے پورچ میں لے گیا۔

وہ کار سے اتر کر اندر ڈرائیونگ روم میں گیا تو ہر پریت صوفے پر آلتی پالتی مارے گروکھی میں شائع ہونے والا پنجابی اخبار پھیلائے بیٹھی تھی۔ سفید قمیص، نیلی شلوار اور دوپٹہ، جو ڈھلک کر اس کی گود میں پڑا ہوا تھا۔ بالوں کی لٹ اس کے جھکے چہرے پر جمبول رہی تھی۔ جہال اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ آہٹ پا کر ہر پریت نے سر اٹھایا تو سامنے جہال کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لئے ساکت ہی رہ گئی، جہال نے اپنی بائیں پھیلا دیں۔ وہ تیر کی مانند اس کے سینے سے آگئی۔ اسے لگا زندگی جیسے رک گئی ہو، روح تک میں سیرابی اترتی چلی جا رہی ہے۔ وہ الگ ہوئے تو جہال نے پوچھا

”پھوپھو اور انوجیت کدھر ہیں؟“

”وہ گھر پر نہیں ہیں، گردو دارے گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔ تم بیٹھو۔“ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ ہر پریت اندر چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی لوٹ آئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

”سنا، یہاں سب خیر سکھ ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہے۔ تو کچھ کھا پی لے، آرام کر لے، پھر باتیں ہی تو کرنی ہیں۔“ ہر پریت نے کہا

”نہیں ہر پریت، مجھے آج شام سے پہلے جالندھر جانا ہے، لیکن فکر نہ کر، اس وقت تک میں تم سے بہت ساری باتیں کر لوں گا۔“ اس نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

شام کا سورج ڈھل گیا تھا، جب میں اور جنید واپس لاہور پہنچ گئے۔ تمام راستے ہم اس کے کئے گئے سروے پر بات کرتے رہے۔ سڑکوں پر رش کی وجہ سے کافی دیر بعد ہم گھر پہنچے، جہاں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ہم اندر گئے، ڈرائیونگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ کنٹرول روم میں فقط مہوش بیٹھی ہوئی زویا سے کراچی میں ہونے والے تازہ حالات کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ہمارے آنے پر خوش دلی کا اظہار تو کیا لیکن اس میں گرم جوش نہیں تھی۔ کچھ تمہیدی اور روایتی باتوں کے بعد میں نے پوچھا

”سب کہاں ہیں؟“

”فہیم ابھی یہاں تھا، ہو سکتا ہے اپنے کمرے میں ہو۔ باقی سب بھی اپنے اپنے کمرے میں ہوں گے۔“ اس کا منہ اچکاتے ہوئے کہا

”سب لوگوں نے کھانا کھا لیا؟“ میں نے پوچھا

”ابھی کہاں، ابھی تو دارا ہی واپس نہیں لوٹا، وہ مارکیٹ گیا تھا۔“ اس نے بتایا

”اوکے، سب کو یہاں بلاؤ، میں اوپر کمرے سے ہو کر آیا۔ ذرا جلدی۔“ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایسے مایوس کیوں ہیں؟ میں نے زیادہ وقت نہیں لیا اور واپس کنٹرول روم میں آ گیا۔ وہاں جنید، اکبر اٹلی جٹ، مہوش اور فہیم، بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد میں نے ان کے مایوسانہ رویے کے بارے میں پوچھا تو اکبر نے بولا

”دراصل وہاں ممبئی میں جہال کا آپریشن کامیاب نہیں رہا، وہ واپس آؤگی پنڈ چلا گیا ہے۔ اس کے ساتھ بائیتا بھی واپس لوٹ گئی ہے۔ یہ ساری بات نوتن کور نے بتائی ہیں۔ وہ کافی حد تک مایوس تھی، اس ناکامی کے بعد ظاہر ہے اس کا اثر لیا سب نے۔“

”اوہ، یہ تو اچھا نہیں ہوا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا

”اچھا تو واقعی نہیں ہوا۔“ جنید نے رائے دی

”کوئی وجہ بتائی نوتن کور نے۔“ میں نے پوچھا

”نہیں، کہہ رہی تھی کہ انہیں اچانک وہاں سے نکلنا پڑا ہے، ظاہر ہے وہ چند لوگ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان یہودیوں کے پیچھے پوری حکومت کی سپورٹ ہے، فورسز ان کی حفاظت پر لگی ہوئیں ہیں۔“ مہوش بولی

”ویسے اگر ہم وہاں پر ہوتے تو کچھ نہ کچھ کر آتے۔“ اکبر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا جسے میں نے نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا

”ان کی طرف سے مطلب جہال یا بائیتا کی طرف سے کوئی فون یا کوئی اطلاع؟“

”ابھی تک تو نہیں، ان دونوں میں سے کسی نے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی ہم نے۔“ مہوش نے صورت حال بتائی

”اوکے میں دیکھتا ہوں، پھر ڈنر کے بعد بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ وہ سب اٹھنے لگے تو اسی دوران مہوش کا فون بج اٹھا۔

”ٹھہریں، بھارت سے فون ہے۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا تو سبھی رک گئے۔ مہوش نے کال رسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف اردو سنگھ تھا۔

”ہائے مہوش۔! گڈ ایوننگ۔“ اس نے کہا تو مہوش نے جواب دیتے ہوئے پوچھا

”کیا صورت حال ہے ادھر، سنا ہے۔۔۔۔۔“

”تمہی اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا

”سنی سنائی کو چھوڑو، پہلے مجھے یہ بتاؤ، جمال واپس آ گیا تو رنکر سے؟“

”ہاں میں آ گیا ہوں اور تمہاری بات سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ پرجوش لہجے میں اس نے وہ بات بتائی کہ جہال اور بائیتا واپس جالندھر کیوں آ گئے۔ مختصر انداز میں بتا کر وہ بولا

”ممبئی میں ایک بہت بڑا کام ہونے جا رہا ہے۔ مجھے اس گینگ کا پتہ مل گیا ہے جو وہ یہ سب کرنے جا

رہے ہیں۔ ہم اس سے کیا فائدہ لے سکتے ہیں، یہ آپ لوگوں کے سوچنے کا کام ہے۔“
 ”تفصیل کیا ہے؟“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو اس نے وہ تفصیل بتا دی جو اسے معلوم تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر بعد فون کرنے کا کہا اور فون بند کر دیا۔

اروند بہت بڑی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ سبھی نے سن لیا تو میں نے سبھی کے چہروں کو پر جوش دیکھا۔
 ”سب نے سن لیا۔“ میں ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا

”مزید کہنے کی ضرورت نہیں، ہم ابھی لگ جاتے ہیں کام پر۔“ فہیم کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا
 ”اوکے۔ ڈنر پر ملتے ہیں اور پھر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر اوپر چلا گیا۔

اروند سنگھ کا ایک دوست جو خود بھی کمپیوٹر سے متعلق تھا اور وہ میکنگ میں کافی آگے جا چکا تھا، اس نے اروند کو نئی تکنیک سے متعارف کروایا کہ انتہائی راز دارانہ پیغامات کس طرح کوڈ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور پھر انہیں ڈی کوڈ کرنے کی تکنیک کیا ہے۔ اس کے دوست کو ایک خاص قسم کا سوفٹ ویئر چاہئے تھا، جو اروند بنا سکتا تھا۔ دونوں نے اس پر مل کر کام کیا۔ کچھ ہی دنوں میں انہوں نے وہ چند کمپیوٹر کھنگال لئے جہاں جہاں یہ تکنیک استعمال ہو رہی تھی۔ اروند کا دوست چونکہ چین میں بیٹھا تھا اسے بھارتی معاملات میں کافی دلچسپی تھی۔ اس لئے اس کی خفیہ تنظیموں کی سرگرمی پر نگاہ تھی۔ اسی دوران ان دونوں کی توجہ ایک ایسی تنظیم کی طرف گئی جو یہودیوں کے بھارت میں دلچسپی کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے کوڈنگ پیغامات میں یہودیوں کے خلاف کوئی بڑا آپریشن کرنے تیاریوں کے بارے میں بات چل رہی تھی۔ وہ لوگ پوری طرح تیار تھے۔ وہ سب بھارتی تھے اور ان کا سربراہ حکومتی پارٹی کا وزیر رانیش پانڈے تھا۔ بظاہر وہ یہودیوں کے قریب اور ان کا دوست تصور کیا جا رہا تھا۔ ان کی پلاننگ میں احتیاط اس قدر تھی کہ ابھی تک ان کے پیغامات میں یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ وہ کریں گے کیا؟ وہ یہ سب کیوں کرنے جا رہے تھے، اس کا بھی علم نہیں ہو سکا۔

میں نے اوپر جا کر جہپال سے بات کی۔ جہپال اس وقت جائیداد شہر کے فارم ہاؤس میں آچکا تھا، جو بائیکا کا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اروند، اور رونیت کے ساتھ گرلین پوری طرح کمپیوٹر کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ میں نے ساری صورت حال بتا کر اسے کہا

”جہپال! یہ ناکامی نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں اسے، تم صرف اتنا کرو کہ جتنے لوگ بھی تمہارے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، انہیں ایک مرکز پر لاؤ، کسی بھی کچھ کرنے کے لئے تیار کرو۔ دولت کی فکر مت کرو، صبح ہونے سے پہلے میں نوٹن کور کو بھجوا دیتا ہوں۔“

”بائیکا آجاتی ہے تو میں پھر تم سے رابطہ کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر گیا۔ کراچی، لاہور اور جالندھر کے ساتھ ممبئی میں لوگ سب رابطے میں تھے۔ وہ کامیابی جو ہاتھ سے نکل کر ناکامی کا احساس ہاتھوں میں دے گئی تھی، اس کی صورت بدلنے لگی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ سلمان، اروند، فہیم اور رونیت، سبھی مل کر اس معاملے کو دیکھ رہے تھے۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے کہ ایک دم سے فہیم پر جوش انداز میں بے ساختہ بولا
 ”پکڑ لیا۔“

”کیا پکڑ لیا؟“ اروند نے پوچھا

”یہ دیکھ۔“ اس نے ایک لنک اسے بھیجا اور میری طرف دیکھ کر بولا

”یہ واقعہ ممبئی میں ہوگا۔ اس کی یہ تفصیلات ہیں۔“ یہ کہ اس اس نے اسکرین پر دکھایا تو میرے اندر جوش بھرتا گیا۔ پورا پلان اس پر درج تھا۔ انہوں نے اسے ڈی کوڈ کر لیا تھا۔ جب وہ پلان سبھی کی نگاہ سے گذر گیا تو میں نے سبھی کا مخاطب ہو کر کہا

”ممکن ہے یہ سب اُلٹ ہو، یہ بھی کوڈ در کوڈ بات ہو، ابھی خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی سے یہ دیکھیں کہ یہ ماحول، یہاں دے رہے ہیں۔ وہی ہے؟ کل شام تک کا وقت ہے ہمارے پاس۔ تب فیصلہ کریں گے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔“

”بالکل، ٹھیک۔“ اروند نے کہا تو سبھی متفق ہو گئے۔ میں اوپر چلا گیا۔

وہ ڈی کوڈ پلان یہ تھا کہ ممبئی کے تاج محل ہوٹل میں یہودیوں کے کچھ بڑے اور ان سے متعلق دنیا بھر سے بزنس کیونٹی کے لوگ وہاں آ رہے تھے۔ وہ لوگ یہ حتمی فیصلہ کرنے جا رہے تھے کہ بھارت میں وہ کیا اور کس حد تک اپنا بزنس دیں گے اور وہاں سے کیا مقاصد حاصل کریں گے۔ یہ اجلاس انتہائی خفیہ تھا۔ اسے ٹاپ سیکرٹ رکھا گیا تھا۔ وہ لوگ جو یہاں آ رہے تھے۔ انہیں بھی انتہائی خفیہ رکھا جا رہا تھا۔ ان لوگوں کا پلان یہی تھا کہ پہلے وہ خود ملے کریں گے، پھر اس کے بعد وہ اپنا ایک نمائندہ جنہیں گے جو بھارتی حکام سے بات چیت کرے گا۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ مراعات لے پائیں گے۔

اس وقت دنیا میں عالمی سطح جو بھی مذاکرات، معاملات، سمجھوتے یا پلان ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ ان میں لفظ ایک رخ ہی کو مد نظر نہیں رکھا جاتا بلکہ ملٹی پر پز ہوتا ہے، اس ایک ہی پلان سے ممکن حد تک کئی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگرچہ ہر ملک کی اپنی حیثیت ہے، لیکن دنیا میں لابی سسٹم ہے۔ وہ کسی نظریہ سے بھی متعلق ہو سکتی ہے۔ بظاہر ہمیں چند کیونٹیز ہی دکھائی پڑتی ہیں، جیسے یورپی یونین، امریکن بزنس لابی، مسلم ممالک، چین روس لابی، لیکن اس سے بھی ماورا، خفیہ تنظیمیں ہیں، جو اپنے مفاد کی خاطر کسی ملک کو جنگ میں جھونک دیں تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، انہیں اگر اپنا مفاد دکھائی دیتا ہے تو وہ اسے جنگ میں جھونک دیں گے۔ جیل پر قبضہ کرنا ہے اور اس کے لئے کس کس کو لڑانا ہے۔ کتنے انسانوں کا خون بہانا ہے، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہاں دولت پھینکنی ہے اور وہاں سے کیا اٹھانا ہے، وہ ملے کرتے ہیں، کس جگہ پر کون سی ضرورت پیدا کرنی ہے، یہی لوگ کراتے ہیں۔ صرف ’فائدہ‘ ان کی نگاہ میں ہوتا ہے، انسان یا انسانی اخلاقیات ان کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ بھی ایسے ہی لوگ تھے۔ وہ بھارت کو فائدہ دینے کے ساتھ ساتھ وہاں سے کیا مقاصد چاہتے تھے اور پاکستان کو کس حد تک نقصان پہنچا سکتے ہیں یہ انکا ایجنڈا تھا۔

دراصل عالمی سطح پر دہشت گردی کی مبہم اصطلاح کے پردے میں جبر و استبداد کو قانونی جواز دینا شروع کر دیا گیا ہے۔ جعلی اور مصنوعی دہشت گردی کے واقعات کو بنیاد بنا کر دنیا بھر کے عوام کو خوف کی کیفیات کا شکار کر دیا جائے اور حکمرانوں سے کسی قسم کا کوئی سوال نہ کیا جائے۔ بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار بد سے بدتر کرنے کا جواز یہی ہے۔ موساد کو ایسا موقع ملنا چاہئے۔ بھارت میں ان جیسی رجعت، فاشٹ فرقہ پرست نظریات رکھنے والی قوتوں سے ناطہ جوڑنا ان کا فطری عمل تھا۔ اسی لئے وہ فطری طور پر بھارت میں اپنی جگہ بنا کر خود کو مضبوط کر رہا تھا۔

اس کے برعکس وہ لوگ بھی اسی دنیا میں موجود ہیں، جو کرتے تو اپنے فائدے ہی کے لئے ہیں، ان کا مفاد ان سے گہرا رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے رب تعالیٰ نے ہر ظالم کے لئے کوئی سبق دینے

والا پیدا کرنا ہوتا، تبھی توازن قائم رہتا ہے۔ یہ انسان کا فیصلہ ہے کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو زندہ آئین و قوانین کے ساتھ جوڑ لیا وہ فلاح پا گیا، جو دنیا کی خواہش رکھتا ہے، وہ مردہ قرار پایا۔ فلاح وہی قوم پاتی ہے جو اپنے تن مردہ میں نئی جان پیدا کرتی ہے۔ ورنہ ”ہے جرمِ معنی کی سزا مرگ و مفاعلت“۔ کولابہ کے علاقے میں موجود تاج محل ہوٹل میں اس تنظیم کے چند لوگ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ وہ باقاعدہ کمرے لے کر عیش کر رہے تھے۔ یہ ہوٹل انڈیا گیٹ کے ساتھ اور ساحل سمندر پر واقع ہے۔ کولابہ ہی میں ایک کاروباری عمارت میں ان کا مرکز بن چکا تھا۔ صرف دو دن بعد وہ اس وقت حرکت میں آنے والے تھے، جب یہودی لابی کے لوگ وہاں پہنچ جاتے۔

میں بہت پر جوش ہو گیا تھا۔ اور پوری توجہ اسی طرف لگا دی تھی۔ میں نے اروند اور فہیم کو آن لائن بٹھا کر سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ دوپہر کے وقت ہی میں نے نوتن کور سے پوچھا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن جو پلان ڈی کوڈ ہوا تھا، اگر شروعات اس کے مطابق ہوئیں تو آگے کا سارا معاملہ ویسے ہی ہوتا تھا۔

☆.....☆.....☆

جائیداد پر سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ جہاں اروند کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ گرلین کور اور رونیت کور کھڑی ہوئی بیٹھی تھیں۔ ان سب کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے درم آلود ہوں۔ وہ کل شام سے مسلسل کمپیوٹر کے آگے بیٹھے ہوئے تھے اور پورا پلان سمجھنے کی کوشش میں تھی۔ اسی کمپیوٹر اسکرین پر سبھی اکٹھا تھے۔ بائیا ابھی تک فارم ہاؤس نہیں پہنچی تھی۔

”کچھ سمجھ میں آیا اروند؟“ رونیت نے پوچھا

”کئی آپشن ہیں، سمجھ میں آ رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی یہ واردات ہوئی تبھی اس کی صورت واضح ہوگی۔ کیونکہ اس واردات کے لئے اندر کے لوگوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔“ اس نے اسکرین پر نگاہیں جمائے کہا تو جہاں کے ذہن میں تجلیت بھر بھرے کی ساری بات ایک دم سے ابھری تو تیزی سے بولا

”تو پھر انتظار کرو، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی طرف نکل گیا۔ وہ کچھ دیر ٹھہرا ہوا سوچتا رہا، پھر اس نے فون نکالا اور جہاں کے نمبر ملانے لگا۔ ذرا سی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔

”جہاں، یہ جو بھی واردات ہے، اس کا تعلق ہم دھماکوں کے اس سلسلے کے ساتھ ضرور جڑا ہوا ہے اور اس کا مرکز اگر ممبئی ہے تو تجلیت بھر بھرے بھی ان کی ہٹ لسٹ پر ہوگا، وہ اسے مار دیں گے۔“

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ ہم نے چاہا ہے کہ یہ یہودی اور ان کے حواری سبق سیکھیں تو انہیں سبق ضرور ملے گا۔ اس میں کس کا کتنا نقصان ہوتا ہے، یہ تو بعد کی بات ہے۔“ جہاں نے پرسکون لہجے میں کہا

”لیکن اس میں ہمارا فائدہ کہاں ہے؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولا

”فی الوقت ہمیں صرف تماشائی بننا ہے، پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں تم اتنے پرسکون کیوں ہو؟“ جہاں نے پوچھا

”دیکھو، یہ تسلسل ہے انہی ہم دھماکوں کا تو انہوں نے ہٹ کرنا ہی ہے اسے، اب یہ بچ سکتا ہے تو بچ جائے،

یہ کیا ہونے جا رہا ہے، ہو گیا تو اس کی سمت دیکھ کر اس کے نتائج دیکھ کر اندازہ لگایا جائے گا کہ یہ کون ہیں، ہم اس میں نہیں کود سکتے۔ ہمارا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اروند وغیرہ سے کہو، سکون کر لیں۔“

”اوکے، میں کہتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کرتے ہوئے اندر کی طرف چل پڑا۔

وہ سب لوگ آرام کرنے چلے گئے لیکن جہاں کو سکون نہیں آ رہا تھا۔ یہ آگہی بھی بڑی اذیت دیتی ہے۔ ہم دھماکوں میں کتنے لوگ اپنوں سے بچھڑ جائیں گے، اور ان کا کوئی گناہ بھی نہیں، کسی کو یہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ وہ کیوں مارا جا رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں پڑا یہی سوچ رہا تھا کہ بائیا کور آگئی۔

”اوئے جہاں تو ادھر پڑا ہے، بڑی خاموشی ہے، کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کچھ نہیں یار، یہ لوگ ساری رات بیٹھے رہے ہیں کمپیوٹر پر، میں نے کہا سو جاؤ تو وہ آرام کر رہے ہیں۔“ جہاں نے عام سے انداز میں کہا

”کچھ ملا بھی یا یہ اروند یونہی دعوے کر.....“ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تو جہاں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ سختی رہی اور اس کی آنکھیں پھلتی رہیں۔ ساری بات سن کر وہ بے چین ہو گئی، اور تیزی سے پوچھا، ”یہ بات بھر بھرے کو بتائی؟“

”نہیں، ابھی نہیں۔“ اس نے سکون سے کہا

”ہمیں بتا دینی چاہئے۔“ یہ کہہ کر اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا، ”دیکھو، میرا خیال ہے کہ اگر یہ بات اٹھلی ٹھس کو معلوم بھی ہوئی تو وہ اس تک یہ بات نہیں پہنچائیں گے۔ ہم اسے خبردار کر دیتے ہیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ جہاں نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بائیا کور نے فون سے نمبر ملائے تو کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے بھرے بھرے کو ساری بات بتا دی تو اس نے کہا

”بائیا یہ کوئی نئی بات نہیں روز کام معمول ہے۔ کسی نہ کسی طرف سے دھمکی آ جاتی ہے۔ اگر کچھ ہونے جا رہا ہے تو میں دیکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ بائیا نے مایوس ہوتے ہوئے کہا تو جہاں بولا

”میں بھی کہہ دیتا تو اس کو جواب یہی ہوتا تھا۔ اب صرف دیکھو۔ کیا ہوتا ہے۔“

اس پر بائیا کو خالی الذہن کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم سے بیڈ پر لیٹ کر گہرا سانس لیا اور مرہ لگائی ہوئی بولی، ”جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔“ یہ کہہ کر وہ ایک دم سے ہنس دی۔

”بس اسی طرح رہو۔“ جہاں نے کہا

”چل یار میں بھی سولوں۔“ یہ کہہ کر وہ جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گئی۔ جہاں دوسرے کنارے لیٹ گیا۔

وہ فرلش ہو کر فارم ہاؤس کے ایک سبز لان میں شام کی چائے پی رہے تھے۔ ان کے درمیان یہی موضوع چل رہا تھا کہ ممبئی میں کیا ہو سکتا ہے۔ پھر باتیں مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئیں نجائے کدھر نکل گئیں۔ سورج غروب ہوا تو وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ بھی کمپیوٹر اسکرین پر نگاہیں جما کر بیٹھ گئے۔ ان کا ربط ممبئی میں پوری طرح ہو چکا تھا۔ ٹی ایس، نوتن کور اور زوردار سنگھ کے لوگ اپنے پورے لوازمات کے ساتھ ان مختلف جگہوں پر چلے گئے جہاں انہیں کہا گیا تھا۔ ان سب کو بائیا کور دیکھ رہی تھی اور ہم فقہ تماشائی تھے۔

ممبئی پر شام اتر آئی تھی۔ ٹی ایس کے لوگ کولابہ جیٹی کے آس پاس پھیل چکے تھے۔ ان میں سے کچھ لڑکے

سمندر میں بھی چلے گئے تھے۔ دھند کا بڑھتے ہی ٹی ایس نے اطلاع دی کہ تقریباً چار تا پچیس کل میل (سات کلو میٹر) کے فاصلے سے تین مختلف بوٹس پر تقریباً دس آدمی بڑی تیزی کے ساتھ ساحل جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس سامان کے بھرے ہوئے تھیلے ہیں۔ وہ ساحل کے پاس پہنچ گئے، انہیں کسی نہیں پوچھا، کوئی کسی فورس کا بندہ وہاں نہیں تھا۔ وہ اسی طرح ساحل پر اترے جیسے وہ کوئی مقامی ہوں۔ پہلی کشتی پر سے چار آدمی اپنی بھاری بیگز کے ساتھ مجھی مارگر ساحل پر اترے، باقی چھ دوسری کشتیوں میں ساحل کے ساتھ پھرتے ہوئے مہینے کیے پریڈ کے علاقے تک جا پہنچے۔ وہ سارے کے سارے جوان اور نوجوان تھے۔ انہوں نے پتلونیں اور ٹی شرٹس پہنی ہوئیں تھیں۔ وہ وہاں بیس منٹ تک پھرتے رہے لیکن سوائے مقامی چھبھروں کے کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں تو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ طالب علم ہیں اور دوسرے شہر سے آئے ہیں۔

”اب یہ یہاں سے نکلیں گے۔“ اروند نے کہا

”پہلی نشانی پوری ہو چکی۔“ فہیم بڑبڑایا

”ٹی ایس سے کہو کہ یہ بندے نگاہوں سے اجھل نہ ہوں۔“ باغیتا نے کہا تو ٹی ایس کا جواب آیا ”بالکل۔ ایسا ہی ہوگا، ہم پوری طرح تیار ہیں۔“

بھدوار پارک، ممبئی کی پریڈ کے قریب ساحل پر کچھ دیر رکنے کے بعد وہ چھ لڑکے وہاں سے نکل پڑے۔ انہوں نے اپنی کشتیاں وہیں چھوڑ دیں اور مین روڈ تک پیدل آ گئے۔ وہاں پر آ کر وہ دو ٹولٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک ٹولی میں دو اور دوسری میں چار لڑکے تھے۔

”وہ سبھی ٹیکسیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔“ ٹی ایس نے اطلاع دی

”کوئی اندازہ ہے کہ اب یہ کیا کریں گے؟“ باغیتا نے پوچھا تو اروند بولا

”ان کے انداز سے یہی لگتا ہے کہ یہ چار مختلف جگہوں پر واردات کریں گے۔ ان میں سب سے بھاری واردات وہ لوگ کرنے والے ہیں، جو چار ہیں۔“ رونیت نے اپنے طور پر تبصرہ کیا۔

”اوکے اب دیکھو یہ کرتے کیا ہیں۔“ جہاں نے ٹی وہ نگاہیں جمائے کہا

اس وقت ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ جب فوٹن نے اطلاع دی کہ وہ مجھی مارگر سے ٹیکسی میں سوار ہو کر ناتھ لعل روڈ پر چڑھے، پھر چوک سے واپس ہو کر ٹیکسی سے اترے ہیں اور سیدھے کیفے لیو پولڈ میں داخل ہو گئے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد اندر سے فائرنگ کی شدید آوازیں آنے لگیں۔ چیخ پکار کے ساتھ ہی ہر طرف بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ یہ معلوم کر سکے کہ اندر ہو کیا گیا ہے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ہی ٹی دی پر چیخ و پکار مچنے لگی۔ وہ لوگ ایک ایک لمحے کی خبر دینے لگے۔ وہاں سے لاشیں ہٹائے جانے اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے کا سلسلہ چل رہا تھا کہ ایک ٹیکسی میں بم پھٹنے کی اطلاع ملی۔ اسی دوران ٹی دی رپورٹ کرنے لگا کہ شیواجی ریلوے اسٹیشن پر دو لوگوں نے فائرنگ شروع کر دی ہے اور اسی طرح اوبرائے ہوٹل میں دو لوگ گھس گئے ہیں اور انہوں نے فائرنگ کرنا شروع کر دی ہے۔ اسی لمحے یہ خبر بھی دی جانے لگی کہ یہودیوں کے سنٹر نرمیان ہاؤس میں شدید فائرنگ ہوئی ہے اور وہاں پر دو لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے لوگوں کو برغمال بنا لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاج محل ہوٹل کے اندر فائرنگ ہونے کی آوازیں آنے لگیں ہیں۔ ٹی دی اسکرین پر یہ ساری رپورٹس چل رہی تھیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے، اب ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟“ باغیتا کورنے پر جوش انداز میں اروند سے پوچھا۔

”یہ دیکھو، یہ سارا ڈرامہ یہاں لکھا ہوا ہے۔ ان میں سے وہ لوگ جو اب منظر سے ہٹ گئے ہیں، وہی اب جگجگت بھر بھرے کو ماریں گے۔“

”وہ، کون ہیں اس وقت؟“ باغیتا نے پوچھا

”وہ تو شیواجی ٹرمینل پر فائرنگ کرنے والے منظر سے ہٹ گئے ہیں، پولیس ان کی تلاش میں ہے۔“ رونیت کورنے تیزی سے کہا

”وہ جال میں لا رہے ہیں جگجگت بھر بھرے کو۔“ اروند نے کہا تو باغیتا نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے لگی، مگر فون مصروف جا رہا تھا۔ اس نے دود کا نمبر ملایا وہ بھی دیسا ہی ملا تب اس نے ٹی ایس کو مخاطب کیا اور پوچھ اکر دہا کہاں ہے؟

”میں شیواجی ٹرمینل کے پاس ہی ہوں۔ یہاں سے وہ دہشت گرد نکل چکے ہیں اور ہر طرف پولیس ہے۔“ ”دیکھو ٹی دی پر دکھایا جا رہا ہے کہ جگجگت بھر بھرے نے بلٹ پروف جیکٹ پہن لی ہے اور وہ پوری طرح مقابلے پر تیار ہو گیا ہے۔ اس تک یہ اطلاع پہنچ جانی چاہئے کہ جال میں پھنس رہا ہے۔“ باغیتا نے تیزی سے کہا تو وہ بولا

”مگر میں اسے تلاش کہاں کروں گا اور مجھے اس تک پہنچنے کون دے گا۔“

”دیکھو، یہ ٹی دی والے جو لمحہ لمحہ کی رپورٹ دے رہی ہیں نا، وہ حملہ آوروں کی کتنی بڑی مدد کر رہے ہیں۔ اس سارے کھیل کو جو کھیل رہی ہیں، وہ سامنے دیکھ رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا تم اندازہ نہیں کر سکتے ہو؟“ اس نے پوچھا تو ٹی ایس بولا

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اس تک پہنچوں گا کیسے؟“

”میں کرتی ہوں کچھ“ یہ کہہ کر اس نے دودرانا کے نمبر ملائے تو چند لمحے بعد اس نے فون رسبو کر لیا، ”جگجگت بھر بھرے کو بچا سکتے ہو تو بچا لو۔“ ”مطلب ایسا کیا؟“

”تم لوگوں کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو رہا ہے۔ جگجگت بھر بھرے کو غلط اطلاع دی جائے گی اور وہ جال میں جا پھنسے گا۔“ اس نے چیخ کر بتایا

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

”تمہیں ابھی سمجھنے کی ضرورت نہیں، میری بات سمجھو، کہاں ہو؟“

”میں ان سے تھوڑا فاصلے پر ہوں۔“

”ٹی ایس ابھی آپ کو ملتا ہے۔ وہ ساری بات سمجھا دے گا۔“ وہ بولی

”اوکے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا

ٹی ایس کو ٹی وقت ضائع کئے بغیر دودرانا کی طرف بھاگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس سے جا ملا۔ اسی دوران یہ اطلاع آ رہی تھی کہ دو حملہ آور، شیواجی ٹرمینل کے کچھیل طرف موجود کا ماہسپتال میں موجود ہیں، وہاں انہوں نے فائرنگ کی ہے اور لوگوں کو برغمال بنایا ہوا ہے۔

کا ماہسپتال کے نزدیک ہی آزادگر پولیس اسٹیشن تھا۔ دودر اور ٹی ایس جیسے ہی وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ جگجگت بھر بھرے اپنے دو سیکورٹی گارڈز کو ہدایت دے کر اپنے ساتھ لے جا چکا ہے۔ وہیں پر اسپیکر راتے اور سالکر بھی

آگئے۔ وہ شیواجی ٹریٹل ہی سے آئے تھے انہیں بھی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ کاما ہسپتال میں کیا ہو رہا ہے۔ وہیں انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کاما ہسپتال کی مین انٹرنس سے تنگ جائیں اور وہاں سے اپنے آپریشن کا آغاز کریں۔ کاما ہسپتال کی مین انٹرنس کے سامنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ راستے نے یہ تجویز دی کہ سامنے سے ایک کیا جائے۔ وہ وہاں سے گمنوں کی فائرنگ کی آوازیں رہے تھے۔ وہ درختوں کی اوٹ میں میں سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہیں سے انہوں نے فائرنگ کی ابتدا کی تو ہسپتال کی طرف سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ذرا سی دیر کے بعد ہسپتال سے ایک دقتی بم آگرا۔ وہ بم ان سے ذرا فاصلے پر گرا اور پھٹ گیا۔ ایک چندھیا دینے والی روشنی میں زبردست دھماکا ہوا۔ وہ سبھی فوراً وہاں سے ہٹ گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بلٹ بروف گاڑی میں سامنے کی طرف جایا جائے۔ وہ تینوں اور ان کے کاشیبل جن مین اورون جادھو بھی تھا، گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور ان کا رخ کاما ہسپتال کی طرف ہو گیا۔ اسی لمحے انہیں وائرلیس پر پیغام موصول ہوا کہ قریب ہی کی ایک عمارت راج بھون کے پاس سرخ رنگ کی گاڑی کے پاس چھپے ہوئے ہیں۔ وہیں انہیں دیکھا جائے۔ یہ ان کے لئے حیرت انگیز بات تھی۔ ان کی ساری توجہ ادھر ہو گئی۔ اسی پوائنٹ پر سالسکر نے ڈرائیور کو ہٹا کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس وائرلیس کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ دونوں حملہ آور کاما ہسپتال کی اوٹ سے سو فٹ کے فاصلے پر ایک دم نکلے، جیسے انہیں پوری طرح پتہ ہو کہ اس گاڑی میں کون ہے، وہ انہی کی طرف آ رہی ہے۔ انہوں نے بے تحاشا پورے اعتماد کے ساتھ فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ راستے کے پاس اے کے فارٹی سیون بھی جبکہ سالسکر کے پاس نو ایم ایم کا پستول تھا۔ ایک بار تو یوں لگا جیسے ایک حملہ آور زخمی ہو کر گر گیا ہے، لیکن اگلے ہی لمحے وہ اٹھ گیا اور اس کا نشانہ وہ تینوں تھے۔ جگجیت بھر بھرے فائرنگ کی زد میں آ گیا اور اس نے موقع پر دم توڑ دیا۔ وہ دونوں آگے بڑھے، انہوں نے دیکھا، سبھی مر چکے ہیں۔ حالانکہ ارون جادھو ابھی زندہ تھا۔ وہ یوں بن گیا جیسے مر گیا ہو۔ ان میں سے ایک حملہ آور نے پوچھا

”ان میں جگجیت بھر بھرے کون ہے؟“

دوسرے نے گن کی نال سے جگجیت بھر بھرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”یہ ہے۔“

”اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہنی ہوئی ہے، ہو سکتا ہے ابھی یہ زندہ ہو۔“ اس نے یہ کہا ہی تھا کہ دوسرے نے نفرت سے اس پر پھر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

”ہم اپنا کام کر چکے، یہ اتنی آسانی سے مارا جائے گا۔ باسٹرڈ۔“ دوسرے نے نفرت سے کہا اور تیزی سے مرے ہوؤں کو نکال کر گاڑی میں بیٹھے اور نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد یہ خبری دی پڑی کہ جگجیت بھر بھرے مر گیا ہے۔

”اُوہ، بہت برا ہوا۔“ بائیتا کور نے صدے سے کہا

”اسے چال میں لایا گیا، وہ چلا گیا اور پھنس گیا۔ انسداد دہشت گردی اسکواڈ کا سربراہ یوں آسانی سے مر جائے گا، کیا یہ انہونی نہیں ہے۔“ اردوند نے کرسی موڑ کر جیزی سے کہا

”بات انہونی یا ہونی کی نہیں ہے اردوند، کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ اس دنیا.....“ بائیتا نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا

”دنیا میں جو مرضی ہوتا رہے، میں اپنی بات کر رہا ہوں، یہ جو اسکرین پر چل رہا ہے یہ سب ڈرامہ ہے،

انہوں اور صدے یہ ہے، اس میں انسان مر رہے ہیں، ابھی نجانے کتنے لوگ مریں گے۔ یہ جو فورسز یہاں لگائی جا رہی ہیں، کیا یہ انسان نہیں؟ کتنے لوگ خون کی اس ہولی میں جموٹے جا رہے ہیں، کس لئے؟“

”یہ تو دی لوگ بتا سکتے ہیں جو یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔“ بائیتا نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا جیسے وہ اب صدے سے باہر نکل آئی ہو۔

”یہی کھیل میں ان پر اٹھنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی بتا دوں کہ سب نیپال کی سرحد کے پاس طے ہوا ہے۔ اور یہ لوگ وہیں کے ہیں۔ یہ سامنے اسکرین پر ان کے بارے میں سب موجود ہے۔ اب انہوں نے الزام کس پر لگاتا ہے یہ بھی طے ہے، گرلین، دیکھو ڈرن تیار ہے یا نہیں۔“ اردوند نے کہا اور اپنی سیٹ سے اٹھ گیا

”یہ تمہارا کیا طریقہ اردوند، ادھر لوگ..... اور..... تم ڈرن کی بات۔“ رونیت نے حیرت سے کہا

”یہ درندگی سے بھر ڈرامہ ابھی ختم ہونے والا نہیں۔ پوری ممبئی ہل چکی ہے۔ ممبئی میں موجود فورسز، ممبئی کے دادا پڑدادا سب ڈیر ہیں، کسی میں جرات نہیں کہ اس کو سمجھ سکیں۔ اور تم لوگ کب تک کھانا نہیں کھاؤ گے؟“ اس نے جوش بھرے انداز میں یوں کہا جیسے وہ صدے میں جانے کے بعد حواس باختہ ہو گیا ہو۔

”اردوند ٹھیک کہہ رہا ہے، آؤ ڈرن کرتے ہیں۔“ جیپال نے کہا اور اٹھ گیا۔

”دیکھو، نرمیان ہاؤس میں کیا ہو رہا ہے۔“ رونیت نے اس کی توجہ ٹی وی کی طرف دلائی۔ وہ وی فائرنگ اور پولیس کے گھیرنے کی اطلاعات تھیں۔ اسی طرح تاج محل ہوٹل، اور برائے ہوٹل، ان سب سب جو آپریشن ہو رہے تھے، ان سب کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ نشر ہو رہی تھی۔ تبھی جیپال نے تبصرہ کر ہوئے کہا

”یار یہ میڈیا کی خبروں، اپ ڈیٹس اور رپورٹ سے تو یوں لگتا ہے جیسے ان حملہ آور دہشت گردوں کو بتایا جا رہا ہے پولیس اور دوسری فورسز ان کے خلاف کیا کر رہی ہیں، یا پھر ان لوگوں کو جنہوں نے یہ حملہ کروایا ہے۔“

”مجھے بھرے بھرے۔ کی بات اب تک یاد ہے کہ کن لوگوں نے مقامی میڈیا پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اب دیکھنا، یہ سب ہو رہا ہے نا، کوا اس بارے معلوم نہیں کہ یہ کون کر رہا ہے۔ لیکن! یہ فوری طور پر الزام مسلمانوں پر لگائیں گے، ہو سکتا ہے یہ سکھوں کے سر بھی تھوپ دیا جائے۔“ بائیتا کور نے دھمے سے لہجے میں کہا

”آؤ، دوسرے کمرے میں چلیں۔“ جیپال نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اڑسٹھ گھنٹے گزر گئے تھے۔ برصغیر میں موجود لوگوں کی طرح ہم بھی اس واقعے کے ساتھ مسلسل جڑے رہے تھے۔ پوری توجہ اسی دہشت گردی کی واردات پر تھی۔ اس سارے واقعے میں ایک سو چھاسٹھ سے زائد بے گناہ لوگ مارے گئے، جبکہ ساڑھے تین سو کے قریب لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ ان میں ہائیکس غیر ملکی مارے گئے۔ وہ ہائیکس غیر ملکی کون تھے؟ جگجیت بھر بھرے کی بلٹ پروف جیکٹ کہاں گئی؟ اسے کس نے اس طرف دھکیلا؟ کیا بھارتی اٹلی جنس اور نیوی کی خفیہ اس قدر تالائق ثابت ہوئی کہ انہیں ان حملوں کا احساس تک نہیں ہوا۔ دس ہندے ان کے ملک میں آسانی سے داخل ہو گئے، کسی نے ان سے نہیں پوچھا؟ وہ اپنی نااہلی کے باعث لاعلم تھے یا ان کی ملی جلتی تھی؟ ابھی حملہ ہوا ہی تھا، تاج محل میں لوگ محصور تھے، ہر طرف افراتفری تھی، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن بھارتی میڈیا یہ بکتے لگا تھا کہ پاکستان کے کن کن شہروں پر حملہ کر دینا چاہئے۔ اس دوران مجاہدین نامی نامعلوم تنظیم نے حملوں کی ذمہ داری بھی لے لی اور ای میل کے ذریعے یہ ذمہ داری قبول کی؟ یہ ای میل کسے بھیجی گئی؟ وہی بندہ کیوں پکڑا گیا جس نے جگجیت بھر بھرے کو قتل کیا؟ وہ

وہاں سے نکل کر کدھر جا رہے تھے؟ وہ زندہ گرفتار ہونے والا دہشت گرد تین برس پہلے نیپال میں گرفتار کیا گیا تھا۔ وہی زندہ کیوں بچا جس نے بھر بھرے کو مارا؟ تاج محل کے باہر پولیس اور ”کچھ لوگ“ اس طرح لوگوں کی ”مدد“ کر رہے تھے جیسے وہ ہلاکتیں بڑھانا چاہتے ہیں اور سب سے اہم سوال کہ تجلیت بھر بھرے کو کا ما ہسپتال کی طرف کس نے دھکیلا اور وائریس پر ایسا پیغام کیوں دیا گیا تھا۔ ایک ہی جگہ تین آفیسر کس طرح جمع ہو گئے تھے۔ کس نے انہیں وہاں جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ اور ایسے سوالوں کا تسلسل تھا جس کی سمجھ اسے آ سکتی جسے ہندو تو انکی عقلیوں کے بارے میں ذرا سا بھی پتہ ہو۔ یہ بھارت کا گھٹیا اور غلاب ڈرامہ تھا۔ اگر پاکستانی حکومت اسی وقت ہوش سے کام لیتی تو حملے کی پہلی رات ہی بھارت کے کپڑے اُتار کر اس کے میڈیا کے منہ پر دے مارتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

ان اسٹوٹ گھنٹوں کی کارروائی نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر نئی سوچ کے ساتھ ایک ایسا سوال پیدا ہوتا کہ میں اپنے اندر سے مل جاتا۔ جدید ٹیکنالوجی جہاں ہر راز کھول رہی ہے، وہاں درندگی کس تک بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ سب کیوں؟ ایک سوچ ہی ہے نا، جسے نظریہ بنالیا جاتا ہے اور پھر اس کی آپٹاری انسانی خون کے ساتھ کی جاتی ہے۔ کیا یہ انسانیت ہے یا شیطانی؟ ہندو انہما پسند جو مسلمانوں کو زندہ جلانے سے دریغ نہیں کرتے، ان کے لئے انہوں کو مار دینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان شدت پسند ہندوؤں کی حالت تو یہ تھی کہ ان کے اخبار ”سامنا“ کے ادارے میں یہ لکھا گیا کہ ہم نے بھر بھرے کے منہ پر تھوک دیا۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں تھی، لیکن ان کا پاکستان کو میلی نگاہ سے دیکھنا ہرگز قبول نہیں تھا۔ ان میں کچھ انہما پسند ہندو ایسے بھی تھے جس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھارتی فوج آج ہی پاکستان پر چڑھائی کر دے۔ سیاسی بیانات کی مچھلی منڈی میں صرف پاکستان ہی کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا تھا۔ مجھے یہ ہرگز قبول نہیں تھا۔

میں اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہا۔ پھر اس شام میں نے دو اہم فیصلے کر لئے۔ ایک یہ کہ پاکستانی سیاست میں ان لوگوں کا قلع قمع کرنا جو کسی بھی لحاظ سے پاکستان کے وجود کو برداشت نہیں کرتے اور دوسرا زخم زخم پاکستان کی سیاسی نظام کو عوامی بنانا۔

ڈنر کے بعد کراچی اور لاہور کے لوگ آن لائن ہو گئے۔ جس طرح پچھلے دو دنوں سے رات کے وقت بیٹھ کر ان حالیہ واقعات پر تبصرہ آراکی ہوتی تھی۔ میں نے ان سب کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”بھال تمہارے یہ فیصلے سر آنکھوں پر، یہ ہونے چاہئیں لیکن یہ ابھی فوری نوعیت کے نہیں ہیں۔ ہمیں ابھی اس طرف توجہ دینا ہوگی کہ اس وقت پاکستان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کا سد باب کیسے کیا جائے۔“

اکبر علی اٹلی جنٹ نے اپنی رائے دی

”اگر ہم اس میں پڑ گئے تو جو اک نیا جہان بھال بنانا چاہتا ہے، وہ نہیں بنا پائیں گے۔“ زویا ایک دم سے بولی

”مطلب دونوں کام ایک ساتھ کرنے ہوں گے۔“ جنید نے دھیمے لہجے میں کہا

”ظاہر ہے ابھی ایسے ہی ہوگی، یہ سیاست دانوں کی اتنی غلاقت ہے کہ اسے سمیٹتے سمیٹتے عمر گزر جائے گی۔“

علی نواز نے اپنی بھڑاس نکالی

”تو ڈن ہو گیا۔“ اکبر علی نے ہاتھ اٹھائے ہوئے کہا

”کیا؟“ میں نے پوچھا

وہ لوگ جو ہمارے نئے جہان میں رکاوٹ ہوں گے، انہیں دور کریں گے اور بس۔“ اس نے وضاحت کی

”اس کے لئے طاقت چاہئے، دولت کی ہمارے پاس کی نہیں، افرادی قوت اکٹھا کر رہے ہیں۔ اسلحہ جتنا چاہیں مل سکتا ہے۔“ اکبر نے جذباتی لہجے میں کہا

”چلو بیہیں سے شروعات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی۔ ہم نے طے کر لیا کہ کس نے کیا کرنا ہے۔ کل کی شام سے ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔ کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔

☆.....☆.....☆

”ہمارا مسئلہ وہی ہے جو غلام کا ہوتا ہے۔ ہم آزاد ملک میں آزاد شہری ہوتے ہوئے بھی غلام ہیں۔ ایک سکھ اس ملک میں دہشت گرد اور ملک دشمن ہی سمجھا جاتا ہے، کیوں، ایسا کیوں ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف اور صرف وہ ہندو ذہنیت ہے جو اپنے سوا کسی کو برداشت ہی نہیں کر پارہی ہے۔ اور ہمارے گرد مہاراج، سچ بادشاہ نے جو ہمیں سبق دیا ہے وہ یہی ہے کہ سچا سکھ مروتو سکتا ہے لیکن غلام نہیں ہو سکتا۔ ہانڈوں میں یہی لکھا ہے، ہم جد جہد کریں گے۔“ جہاں نے پورے جوش سے کہتے ہوئے سب کی طرف دیکھا۔

اس کے سامنے رونیت، باغیتا، گرلین اور ارونڈ بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہم نے اپنی زندگی اپنے دھرم کے نام لگا دی ہے جہاں، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ رونیت نے گرلین کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا

”اروند! اگر تم یہاں رہو یا کینیڈا، تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ اگر میں تم تینوں کو وہاں بھیج دوں تو کیا تم محفوظ نہیں ہو جاؤ گے اور ہماری مدد.....“

”میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ ہم وہاں زیادہ محفوظ ہوں گے اور زیادہ کام آسکیں گے۔“ اس نے تجزی سے کہا

”تو پھر تیاری کرو۔ یہ باغیتا کی ذمہ داری ہے کہ تمہارے جانے کا بندوبست کر دے۔ وہاں تم میرے پاس ہی ہو گے۔ باغیتا اور میں یہاں اپنی طاقت بنائیں گے، جو جیسی بھی بنی۔“ جہاں نے کہا

”ہو گیا سمجھو، ابھی امرتسر کے لئے نکلو۔“ باغیتا نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا اور اٹھ گئی۔

آدھی رات سے کچھ زیادہ ہی وقت ہو گیا تھا جب جہاں انہیں امرتسر کی جانب روانہ کر کے خود آؤگی کی طرف چل پڑا۔ اس نے ہر پریت کو فون کر دیا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے پورچ میں گاڑی کھڑی کی، ہر پریت نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو گویوں دیکھتے رہے جیسے صدیوں بعد ایک دوسرے کو دیکھا ہو۔

”ایسے ہی کھڑی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا

”جودل میں بیٹے ہوں انہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، میں تو جی بھر کے تمہیں دیکھ رہی ہوں، ہو نکتا ہے تم یہ کہہ دو کہ میں نے ابھی واپس لوٹ جانا ہے اور میں تمہیں روک بھی نہیں سکتی۔“ ہر پریت نے یوں کھوئے کھوئے انداز میں کہا کہ جہاں کے وہ اندر نکلتی اتر گئی۔ وہ مسکرا دیا اور پھر بولا

”آؤ، اوپر کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔“

”تم چلو، میں آتی ہوں۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو اس نے قدم بڑھا دیے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ جہاں ایری ہو کر بیڈ پر آن لیٹا تھا کہ ہر پریت اس کے لئے چائے کے ساتھ

لوازمات لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھا اور اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔
 ”سوری ہر پریت۔! میں جالندھر میں ہوتے ہوئے بھی تم سے رابطہ نہیں کر سکا۔“ یہ کہہ کر اس نے چائے کا
 گنگ اٹھایا تو وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی

”جی، کیا تمہیں یہ احساس ہے کہ ایک عرصہ ہو گیا تم نے مجھے پرچونہ نہیں کہا؟“

اس پر جہاں نے اُسے چونک کر دیکھا، پھر چند لمحے سوچتے ہوئے کے بعد بولا

”کاش ہم اپنی محبتوں میں وہ مناس رکھ پاتے، لیکن کیا کریں ہر پریت، اس دنیا میں جینے کا حق صرف
 طاقت و دلوں کو ہے، یا تو وہ اپنا غلام بنا لیتے ہیں یا پھر مار دیتے ہیں، تیسری کوئی راہ نہیں ہے جینے کی۔ کاش ہم
 بھی آزادی سے اپنے رشتوں کو نبھاسکیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے افسردہ ہو گیا۔

”میرا مقصد تمہیں افسردہ کرنا نہیں جی، میں تو یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ میرے لئے تمہارے پاس جتنا بھی
 وقت ہو، وہ پوری طرح میرا ہو اور بس۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرا دی، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زبردستی کی مسکراہٹ
 تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ جہاں نے بھی افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا اور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ ان دونوں میں
 خاموشی اتر آئی تھی، جیسے ساری بات سمجھتے بھی ہیں اور سمجھنا بھی نہیں چاہتے۔ کچھ دیر بعد اس نے خوشگواریت سے
 پوچھا، ”اچھا چھوڑ، بتا یہاں کیسا چل رہا ہے سب؟“

”جیسا تم نے کہا تھا، ویسا ہی چل رہا ہے۔ پورے علاقے میں جتنے بھی محلوں و دارے ہیں، میں نے سردار
 ویر سنگھ نے سیوا یا تراکمل کر لی ہے۔ بہت ساری جگہوں پر مسائل ہیں۔ لیکن وہ مسئلے ایسے ہیں جن میں لوگوں کی
 ذاتی انا شامل ہے، باقی کچھ نہیں۔“ ہر پریت نے بتایا

”اصل چیز لوگوں کی ہمدردی ہے، کیا ویر سنگھ وہ ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے یا نا کام؟“
 جہاں نے پوچھا

”بہت حد تک، وہ جو آئی بی والے مارے ہیں نا، ان کا بڑا اثر ہے۔“ ہر پریت نے سوچتے ہوئے کہا
 ”مطلب یہ بھی طاقت ہی کو مانتے ہیں، انسانیت یا دھرم کو نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا، پھر چند لمحے سوچ
 کر بولا ”ہمیں صبح ویر سنگھ جی کے پاس جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ہر پریت نے تابعداری سے کہا تو جہاں ہنس دیا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے
 اپنے قریب کر لیا۔ وہیں بیٹھے، باتیں کرتے انہیں پوری رات گزر گئی۔ اس کا احساس انہیں اس وقت ہوا جب
 گرد و دارے سے گیلیاں پورے گاؤں کو اٹھانے کے لئے حکم جاری کرنے لگا۔

انہیں ناشتے پر کافی دیر ہو گئی۔ چھو پھو کلجیت کور اور انوجیت سے باتیں کرتے وقت گزرنے کا احساس ہی
 نہیں ہوا۔ وہاں انہوں نے گھریا کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کی۔ کلجیت کور جب اٹھ گئی تو اس نے انوجیت
 سے کہا کہ وہ آج بلیمہ سنگھ کیج کو یہاں گھر میں بلائے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا جب ہر پریت اور جہاں دونوں
 کار میں بیٹھ کر ویر سنگھ کی حویلی چل دیئے۔ ویر سنگھ انہی کے انتظار میں تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ان
 کے ملازم آؤ بھگت میں لگ گئے۔ کافی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جہاں نے پوچھا

”سردار جی اب کیا سوچا ہے آپ نے انکیشن کے بارے میں۔ یہاں سے کس کو اپنا نمائندہ بنانا ہے۔“

”سیدی اور جی بات تو یہ ہے کہ میں اب اس قابل نہیں رہا۔ گرد و دارہ سیوا میں کچھ اتنا سکون ملا ہے کہ کچھ

دوسرا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرے منہ بولے بیٹے جو گندرسنگھ اور سریندر سنگھ تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ فیصلہ
 تم پر چھوڑتا ہوں تو جسے چاہے اس کام کے لئے جن لے۔“ اس نے واضح لفظوں میں اپنی رائے دے دی
 ”میں اکیلا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا سردار جی۔ جتنے داروں اور گلیانیوں کے بغیر یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں چاہتا
 کہ طاقت کے زور پر اسے منوایا جائے۔ ہم نے دھر سیوا کرنی ہے اور اس حکومت سے اپنا حق مانگنا نہیں چھیننا
 ہے۔ جس میں یہ جرات ہے وہ آگے آئے۔“ جہاں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا

”ہونا بھی یہی چاہئے۔ اب تک جو ہمارے نمائندے تھے، وہ ہمیں ہی بیچتے رہے۔ حکومت کے خبر بن کر
 اپنی قوم کے لوگوں کو مرداوتے رہے، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔“ ویر سنگھ نے دھکی لہجے میں جواب دیا
 ”تو سردار جی، آج شام کو علاقے کے کسی بھی گرو داروے میں سارے گلیانیوں کو بلائے ہیں اور ان سے
 بات کرتے ہیں۔“ جہاں نے کہا

”اوہ بھائی! میں نے بات کر لی ہے، اور انہوں نے مجھے یہ حق دے دیا ہوا ہے کہ اگر میں چاہوں تو ٹھیک
 ورنہ جسے میں چاہوں۔ اور میں نے سوچ لیا ہوا ہے۔“ اس نے سکون کہا

”کیا سوچا؟“ اس نے بھی اسی سکون سے پوچھا
 ”میں تجھے اس مقصد کے لئے چھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ویر سنگھ نے اس کے چہرے پر دیکھا۔ جہاں مسکرا دیا اور
 کسی جذبے کے بغیر بولا

”نہیں ویر سنگھ جی، میں نہیں۔ علاقے کا کوئی بھی جوان.....“
 ”یہ چٹاؤ میں نے تم پر چھوڑا۔“ ویر سنگھ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہہ دی تو جہاں نے کہا
 ”تو ٹھیک ہے، میں انوجیت سنگھ کا نام دیتا ہوں۔“

”مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ تم ایسے ہی کرو گے۔ میں اس نام پر پہلے ہی لوگوں کا اتفاق لے چکا ہوں
 ۔ انکیشن سے پہلے ہی ہم اسے یہ ذمہ داری دے دیں گے۔“ ویر سنگھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر اسی حوالے
 سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ دوپہر کے بعد وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ وہ گھر نہیں گئے بلکہ اوگی میں پہلے بلیمہ
 سنگھ کیج کے گھر گئے، پھر اسے ساتھ لے کر گاؤں کے لوگوں سے ملے اور ایک حسرت زدہ نگاہ اپنی برباد حویلی پر
 ڈال کر وہ شام تک واپس گھر آ گئے۔

گہری شام اتر آئی تھی۔ جہاں کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑے اور فضاؤں میں پھیل جائے۔ وہ اپنی اس
 کیفیت کو نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح اپنے احساس میں کھویا رہا جتنی اس کا من چاہا کہ وہ جمال کو
 فون کرے۔ اس نے فون نکال کر نمبر ملائے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد
 جمال نے کہا

”اروند نے مجھے کچھ نام دیئے ہیں۔ یہ وہ شدت پسند ہیں، جو ہندوؤں کے علاوہ بھارت میں کسی کو دیکھنا
 بھی پسند نہیں کرتے ہیں اور ملک میں ہندو حکومت چاہتے ہیں، یہی وہ لوگ جو ان کی طاقت ہیں، ختم کرنا ہے
 انہیں۔“

”ابھی جاتا ہے؟“ اس نے پوچھا
 ”نہیں ابھی کچھ دیر بعد تجھے اروند سنگھ پوری تفصیل بتائے گا۔ پھر شاید تجھے کسی بھی طرف لکھنا پڑے۔“
 جمال نے کہا

”ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا گیا۔ اس وقت ڈنر لے کر چائے پی رہے تھے، جب اردو سنگھ کا فون آ گیا۔ جہاں نے اس کی کال سنی تو وہ اسے تفصیل بتانے لگا۔ اردو نے اسے میل بھی کر دی تھی۔ جہاں کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔

☆.....☆.....☆

رات کا گہرا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اکبر، جنید اور میں لاہور سے شمال کی جانب نکل رہے تھے۔ ہمارے پاس فورڈ جیل جیپ تھی جس میں ہر طرح کا اسلحہ رکھا ہوا تھا میں نے نکلنے سے پہلے سارے بندوبست کر لئے تھے۔ ہمارا رخ کوٹ بہادر پور کی طرف تھا۔ راوی ہل تک ٹریفک کے رش کی وجہ سے جیپ آہستہ رکھنا پڑی، پھر رفتار تیز کر دی۔

ہمیں چوہدری الطاف گجر کے ڈیرے تک جانا تھا۔ وہ سابق رکن اسمبلی تھا، اور نئے الیکشن میں رکن اسمبلی بن جانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لئے جو بھی ذریعہ ملا اسے استعمال کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ جاگیر دار ہونے کے ساتھ ساتھ فیکٹری آؤٹ بھی تھا۔ اس کا بھائی اس کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جن دنوں وہ رکن اسمبلی تھا، ان دنوں دولت کمانے اسے بہت ساری آفرز ہوئیں تھیں۔ جن میں ایک آفر اسے بھارت سے بھی تھی۔ یہ آفر لاہور ہی کی ایک فوجی خانہ چلانے والی عورت میڈیم زرینہ کے توسط سے ہوئی تھی اور بعد میں الطاف گجر کو اس نے ان لوگوں سے ملوایا تھا۔ وہ چند لوگ ایک مافیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے جہاں اور دوسرے مقصد تھے، وہاں حکومتی رسائی رکھنے والے لوگوں کا اپنی ساتھ ملائے تھے۔ کاروباری وسعت میں مدد اور غیر ملکوں تک رسائی دیتے تھے اور ان سے اپنا مقصد نکالتے تھے۔ بظاہر وہ بھی کاروباری لوگ تھے لیکن دراصل وہ ”را“ کے وہ ایجنٹ تھے، جو انتہائی خطرناک تھے اور ہر طرح کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے زمین تیار کرتے تھے۔ جیسے ہی الطاف گجر ان سے جڑا، اس کا کاروبار وسعت اختیار کر گیا۔ دولت اس پر برسنے لگی اور غیر ملکی دورے بڑھ گئے۔ اگلے الیکشن میں وہ ہار گیا۔ اب آنے والے الیکشن میں وہی لوگ اس کی بھرپور حمایت کر رہے تھے۔ دولت پانی کی طرح بھائی جا رہی تھی۔ اس بار وہ ایسا گھوڑا تیار کر رہے تھے، جس پر وہ پوری طرح سواری کر کے اپنی منزل حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس چمن میں شامل ہو گیا تھا، جس کے آخر میں یہودی تھے۔

وہ ایک انتہائی خطرناک پلان تیار کر چکے تھے۔ انہوں نے رکن اسمبلی بنوانے کے عوض اسے منسٹر بنواتا تھا، اسی وعدے پر وہ اپنے کافی سارے بندے پاکستان میں پھیلا رہے تھے۔ وہ لوگ بھارت سے آتے، کچھ عرصہ یہاں اس کے پاس رکھتے، دستاویزات بنواتے اور لاہور اور اس کے گرد و نواح میں پھیل جاتے۔ وہ جو بھی کرنا چاہتے تھے وہ میرے وطن کے لئے کسی طور بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ الطاف گجر دولت کمانے کے ساتھ طاقت حاصل کر رہا تھا۔ میرے وطن کے لئے زہر رکھنے والا سانپ کسی بھی وقت عفریت بن سکتا تھا۔ میں نے یہی سوچا، وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سیدھے اسے اٹھاتے ہیں، بعد میں دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ میں سوچا، فیصلہ کیا اور چل پڑے۔ راوی ہل سے ہمارا رخ شیخوپورہ کی طرف ہو گیا۔ میرے فون پر راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔

میں نے شام سے پہلے ہی ایک بندہ اس گاؤں میں بھیج دیا تھا۔ ہمارا اور اس کا وہاں پہنچنے کا دورانیہ تین گھنٹے کا تھا۔ وہ بھکاری کے روپ میں کوٹ بہادر کے اس گاؤں میں پھر چکا تھا، جہاں الطاف گجر کی آبائی حویلی اور گاؤں سے ذرا فاصلے پر اس کا ڈیرہ تھا۔ اس نے فون پر مجھے پوری تفصیل بتا دی تھی کہ وہ علاقہ کیسا ہے اور وہاں

کی زمینی صورت حال کیا ہے۔ میرا ہمیشہ سے ہی یہ طریقہ رہا تھا کہ میں پہلے نکلنے کا راستہ تلاش کرتا ہوں۔ وہ میں نے اس سب کو چھ لیا تھا۔ وہ کوئی ترنوالا نہیں تھا کہ جاتے ہی اسے ختم کیا جاسکتا تھا۔ وہاں موجود بندے نے یہ اطلاع دی تھی کہ اس کے ڈیرے پر کئی طرح کے لوگ ہیں، جو شکل ہی سے بد معاش لگتے ہیں۔

میں کوٹ بہادر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اس بندے سے رابطہ کیا اور صورت حال کے بارے میں پوچھا

”ابھی تک میں نے الطاف گجر کو نہیں دیکھا اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ یہاں ہے کہ نہیں۔ میں نے اب تک ڈیرے پر دو پکڑ لگا چکا ہوں۔“ اس نے بتایا تو میں نے اردو کو فون کیا۔

”اس کے فون کی لوکیشن تو یہی بتا رہی ہے کہ وہ اپنے گاؤں ہی میں ہے۔ وہ وہیں ہوگا۔“ اس نے پورے یقین سے کہا

جیپ اکبر ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اسے گاؤں کا ایک پکڑ لگانے کا کہا۔ ہم مین روڈ سے اتر کر کوٹ بہادر کی طرف چل پڑے۔ اس گاؤں کی لوکیشن اس طرح تھی کہ اس کے دو طرف راستہ جاتا تھا، ایک وہ جس پر ہم تھے، دوسرا گاؤں سے باہر سیدھا نکل جاتا تھا اور تیسرا گاؤں کے درمیان سے ہو کر بائیں جانب نکل جاتا تھا، جو دو سرے گاؤں سے ہو کر پھر مین روڈ پر جا چڑھتا تھا۔ ہم گاؤں میں چلے گئے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں نے کیسے بات کرنے ہے۔ میں نے اکبر سے کہا کہ وہ سیدھا ڈیرے کی بجائے اس کی حویلی چلے۔

گاؤں میں بجلی کی روشنی تھی۔ لیکن بہت کم جیگا ہٹ کی وجہ سے ملجکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گاؤں کے درمیان چوک میں ایک بڑا سارا مکان تھا۔ جس کے درمیان ایک دو منزلہ مکان تھا۔ اس کے اطراف میں کافی جگہ ہونے کے باعث ایک طرف ٹریکٹر، گاڑیاں اور زرعی مشینیں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف ایک بڑا سارا ڈیرہ تھا لیکن اب وہ کھلا نہیں ہوا تھا۔ بلاشبہ پرانے وقتوں میں یہی ڈیرہ استعمال ہوتا تھا۔

گاؤں میں اجنبی گاڑی دیکھ کر بہت سارے لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔ جیسے ہی اس کی حویلی کے سامنے جیپ رکی، میں نے الطاف گجر کو فون کیا۔

”ہیلو، کون بات کر رہا ہے۔“ اس نے کہا

”میں فرحان علی باجوہ بات کر رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کافی حد تک رعب سے کہا

”کون فرحان علی، اپنا تعارف کرائیں۔“ اس نے کہا

”میں آپ کی حویلی کے باہر کھڑا ہوں، آپ سے ملنا چاہتا ہوں، مل کر پورا تعارف کرا دیتا ہوں۔“ میں نے اسی لہجے میں کہا

”باہر کھڑے ہیں، مجھ سے پوچھے بغیر کہ میں گاؤں میں ہوں بھی یا نہیں۔“ اس نے محتاط ہوتے ہوئے کہا

”مجھے معلوم ہے کہ آپ کہاں ہے، اسی لئے سیدھا ادھر آ گیا، ڈیرے پر نہیں گیا۔“ میں نے کہا

”تو آپ چلو ڈیرے پر، میں وہیں آتا ہوں۔“ اس نے کہا میں نے قدرے غصے میں کہا

”لیکن میں آپ سے یہیں بات کرنا چاہتا ہوں، بات کرنی ہے یا میں جاؤں۔“ میں نے رعب سے کہا

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اگلے چند منٹ میں ایک لمبا ٹرک فحش اندر سے برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ دو تین اور آدمی تھے۔ تب تک میں جیپ سے باہر آ چکا تھا۔ اس نے میری طرف

دیکھا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اسی دوران ایک بندہ واپس چلا گیا۔ وہ لمبا شخص مجھے لیتا ہوا اندر کی جانب چل پڑا۔

اس گھر والے ڈیرے کا راستہ اندر سے تھا۔ وہاں محن میں کافی ساری کرسیاں پڑی ہوئیں تھیں۔ جن پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ ایک طرف بڑی ساری چار پائی تھی۔

”آئیں بیٹھیں، چوہدری صاحب ابھی آتے ہیں۔“ اسی لمبے فحش نے کہا۔ میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ یوں ہو گیا جیسے کافی مضطرب ہوں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا، ایک لمبے اقد اور فربہ جسم کا ادھیر عمر فحش اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ اس نے سفید شلوار قمیض پر نیوی بلیو ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ بڑی آہستہ سے چلتا ہوا آیا۔ اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسا میں کوئی حقیر کیزا کوٹھا ہوں اور پھر آدھا سا ہاتھ ملائے ہوئے طنزیہ سے بولا

”ہاں جی فرحان علی جی، کون ہیں آپ، کراہیں تعارف۔“

”میرا تعارف یہ ہے کہ مجھے اشوک کانت نامی ایک بندے نے آپ کے بارے میں بتایا ہے جو تقریباً چھ ماہ یہاں اس گاؤں میں رہا، پھر لاہور میں آپ کی فیکٹری میں کام کرتا رہا اور پھر ہمیں مل گیا۔“ میں نے اس سے بھی زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم سے مسکراتے ہوئے اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا

”ارے، ہمارے اس گاؤں میں کوئی ہندو بھی رہتا رہا ہے، مجھے پتہ نہیں۔ خیر تم نے مجھے یہی بتانا تھا؟“ اس نے آخری لفظ بڑی تفحیک سے کہے

”کیا اتنا کافی نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا

”ہاں تمہاری موت کے لئے اتنا بھی کافی ہو سکتا ہے۔ اب تم بتاؤ کون ہو؟“ اس نے غصے میں کہا۔ اسی لمحے اس کے دونوں گارڈ الارٹ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گنیں سیدھی کر لیں۔ وہ لمبا فحش اپنا پسٹل نکال چکا تھا۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ باہر سب کچھ دیکھا جا رہا ہے۔ میں نے گھوم کر پورا ماحول انہیں دکھا دیا۔ ان کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

”مطلب آپ میرے ساتھ تعاون کرنے کی بجائے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا

”جس طرح کا مذاق تم نے کیا ہے، تمہارے جوتے مارے جانے چاہیں۔“ اس نے غصے میں کہا ہی تھا کہ ٹھک ٹھک کی ہلکی سی آوازیں ابھریں اور اس کے ارد گرد کھڑے تینوں گارڈ ز کی چیخیں بلند کرتے ہوئے ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ ان کی پوری توجہ میری طرف تھی۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی باہر کی دیو یار پر چڑھ کر اتنی تیزی سے اس کے بندے پھڑکا دے گا۔ الطاف گجر نے چھ فٹ سے زیادہ دیوار پر کھڑے جنید کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں سائیکلسر والا آٹو ٹیک پسٹل تھا جو مسلسل اس کے بندوں کے بدن میں سیسہ اتار رہا تھا۔ اس نے ایک دم اندر جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے گردن سے پکڑ لیا۔ پھر پوری قوت سے اس کی آنکھوں کے درمیان بیچ مارا۔ وہ چند لمحوں کے لئے اندھا ہو گیا۔ میں نے اسے گھسیٹا اور باہر کی جانب لے کر بڑھا۔ میں گلی میں آیا تو دو بندے حویلی میں سے نکلے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فائر کرتے، جنید نے ان پر فائر کر دیا۔ اکبر جیپ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں نے اسے اندر دھکیلا اور خود بیٹھ گیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر زور سے ہاتھ مارا وہ بدحواس ہو گیا۔ تب تک جنید آگیا۔ اس نے آتے ہی پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اکبر نے تب تک جیپ بڑھا دی تھی۔ وہ بندہ گاؤں سے نکل کر

باہر والے راستے پر تھا۔ وہ مسلسل رابطے میں تھا۔ وہاں ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ اکبر نے جیپ ادھر بڑھا دی۔ راستے میں اسے اٹھایا اور ہم تیزی سے مین روڈ جانب بڑھ گئے۔

”اصل خطرہ اب ہو گا سر جی۔“ اس بندے نے بتایا

”کیسا خطرہ؟“ جنید نے پوچھا

”یہ سارا علاقہ اس کے بندوں سے بھرا پڑا ہے۔ سیل فون سے چند منٹوں میں یہ خبر پورے علاقے میں پھیل جائے گی۔ ہمارا ٹکٹا“ وہ کہہ رہا تھا کہ سامنے دائیں طرف سے دو کاریں بھاگتی ہوئیں مین روڈ کی طرف آ رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر مزید گاڑیاں بھی تھیں۔ ہمارے روڈ تک پہنچنے سے پہلے وہ روڈ تک پہنچ جاتی تو وہ ہمارا راستہ روک سکتی تھیں۔

”جنید، گجر کو سنجالو، میں کار والوں کو دیکھتا ہوں، اکبر جیپ نہیں روکنی، ان میں مار دو بے شک۔“ میں نے کہا اور کھلے ہوئے سن روف میں لائچر لے کر اٹھ گیا۔ میں یو پی ان پر فائر نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی ہمارا راستہ روکنے کے لئے آئے ہیں یا اس معاملے سے متعلق ہیں ہی نہیں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا۔ وہ کاریں کچھ فاصلے برسرک کے بالکل درمیان میں رک گئیں۔ انہوں نے راستہ روک لیا تھا۔ اگر ہم سائیڈ سے بھی ہٹ کر جاتے تو رفتار بہر حال کم کرنا پڑتی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمارا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ میں نے نشانہ لیا اور لائچر داغ دیا۔ اگلی ہی لمبے ایک دھماکا ہوا اور وہ کاریں کئی فٹ اچھلیں۔ اس کے فوراً بعد دو دھماکے ہوئے۔ اور وہ کاریں پھٹ گئیں۔ اس وقت تک ہم ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اکبر کو رفتار بالکل آہستہ کرنا پڑی۔ اس نے سائیڈ سے جیپ نکالی اور پھر اسی طرح آگے تیز رفتاری سے بڑھنے لگا۔

اس وقت ہم مین روڈ پر چڑھ آئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مین روڈ پر ہمارے لئے تاک کے لگ جائیں گے۔ اسی لئے میں الطاف گجر کا بندو بست وہیں کیا ہوا تھا۔ شیخ پورہ سے پہلے ہی دائیں جانب سڑک کنارے ایک کارخانہ تھا۔ اس کا مالک اگر چہ لاہور میں رہتا تھا، لیکن ہمارے لئے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی رہائش کے لئے وہیں ایک شاعر سیٹ اپ بنایا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ ان لوگوں کی عیاشیوں اور خفیہ معاملات کے لئے ہوتے ہیں۔ وہاں ملازمین بھی ان کے اعتماد کے لوگ رکھے ہوئے تھے۔ میرا فون پر رابطہ ہو چکا تھا۔ وہ میرے انتظار میں تھا۔ ہم اس طرف جا پہنچے جہاں اس نے الگ کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ وہاں ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ہم نے الطاف گجر کو نکالا اور اندر لے گئے۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ تہہ خانے میں آئے سانسے چار کمرے تھے۔ ان کے درمیان ایک راہداری تھی۔ اندر کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں کے ساتھ گاؤں کی لکڑی لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اسے لے جا پھینکا۔ اکبر اور جنید وہیں ٹھہر گئے۔ میں وہاں سے باہر جاتے ہوئے کہا

”جیسے ہی اسے ہوش آجائے مجھے بتانا۔“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اوپر آگیا۔ جیپ پورچ سے ہٹا دی گئی تھی۔

میں ڈرائنگ روم میں آن بیٹھا اور نہیم سے رابطہ کیا۔

”وہاں چھ بندے سڑک پر مارے گئے ہیں اور تین گاؤں میں، پولیس کو مصیبت پڑ گئی ہے۔“ نہیم نے پوری تفصیل بتانے کے بعد کہا

”ہات آئی جی تک پہنچی ہے کہ نہیں؟“ میں نے پوچھا

”پانچ گنی ہے؟“

”اوکے، میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میرا میزبان میرے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ مجھے سمجھ آ رہی تھی۔ وہ میرا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ مجھے کچھ دوسرے لوگوں سے بھی رابطہ کرنا تھا، میں نے ان سے بات کی۔ میں ابھی اسی میں مصروف تھا کہ اکبر نے مجھے کال کی کہ اسے ہر ش آگیا ہے۔ میں وہاں سے اٹھا اور تہ خانے میں چلا گیا۔

الطاف گجر آکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے گاؤں تھکے کے سہارے بیٹھا اس کی جانب مسلسل دیکھ رہا تھا۔ تبھی وہ سہی ہوئی آواز میں بولا

”کون ہو تم؟“

”اپنے گھر میں تو کتنا بھی شیر ہوتا ہے، تم تو کتے سی بھی کم نکلے ہو، یہاں تمہاری ہوا ہی نکل گئی ہے۔“ میں سرد سے لہجے میں کہا

”میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔“ اس نے اسی طرح ڈرے ہوئے انداز میں کہا

”یہی بات تم اپنے گھر میں بھی کر سکتے تھے، تین بندے گھر میں مروا کر، بار بندے سڑک پر مارے گئے، کیا فائدہ ہوا، تم اب ہماری قید میں ہو۔“

”چہرہ بندے مارے گئے؟“ وہ یوں بولا جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔

”سڑک پر تو وہی مرے ہوں گے، نا، جو تیرے ڈیرے کتوں کی طرح پڑے رہتے ہیں اور تیرے گندے عزائم میں تیری مدد کرتے تھے، مالک کی وفاداری میں آئے اور مارے گئے۔“

”یہاں کے مقامی۔“ میں نے پوچھا تو وہ میری جانب یوں دیکھنے لگا جیسے اس میں خون ہی نہ رہا ہو۔

”کک..... کون ہو تم؟“

”وقت ضائع نہ کرو، اگر زندگی چاہتے ہو تو، جو میں پوچھو بتاتے جانا، ورنہ، تم موت مانگو گے وہ نہیں ملے گی۔“

”تم خفیہ والے ہو یا.....“ اس نے کہنا چاہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا

”میں چاہے تمہارے باپ ہوں۔ میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“

”ہاں، ان میں چند لوگ ہیں جو بھارتی ہیں۔“

”کتنے لوگ پاکستان میں پھیلا چکے ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ سوچتے ہوئے بولا

”یہی کوئی، تیس چالیس تو ہوں گے اب تک۔“

”تجھ جیسے بے غیرت کو یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ یہ اپنی ہی قوم کے خلاف کتنا بڑا جرم ہے۔ وہ یہاں ہمارے اچھے کے لئے تو نہیں آئے۔ خیر! پوری تفصیل چاہئے مجھے ان بندوں کی، کون کون اس میں ملوث ہے۔ تعاون کرو گے تو تیری بیوی بچے بچے جائیں گے، میں تجھے بھی کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اگر ذرا سی بھی بے غیرتی کی تو اس زمیں سے تیری نسل ختم ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جنید اور اکبر سمجھ چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ میں اوپر آیا تو میرا میزبان مضطرب سا ڈرائیونگ روم میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔

”یہ اس وقت تک یہاں رہے گا، جب تک اس سے پوری معلومات نہیں مل جاتیں۔ زیادہ سے زیادہ آج

رات پاگل کا دن۔ آؤ مجھے چھوڑ دو۔“ میں نے کہا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولا

”اگر آپ کہیں تو میں ادھر ہی رہتا ہوں۔ کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں یا آپ خود میری کار لے جائیں۔“

”چابی کہاں ہے؟“ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے فوراً جیب سے چابی نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں چابی لے کر باہر آ گیا۔ پورچ میں اس کی سیوک کھڑی تھی۔ میں اس میں بیٹھا اور لاہور کی طرف نکل گیا۔ رات کافی ہو گئی تھی۔ میں الطاف گجر کو چھوڑ کر واپس آ رہا تھا، اس وقت میں راوی پل سے کافی پیچھے تھا کہ کڑل سرفراز کا فون آ گیا۔ حال احوال کے بعد انہوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ میں ایک بڑی کامیابی کی طرف بڑھ گیا ہوں۔ کافی عرصے سے گینگ مل نہیں رہا تھا۔

”پتہ نہیں کتنے بندے اس نے ملک میں پھیلا دیئے ہیں۔“ میں نے کہا

”وقت گلے گا لیکن وہ مل جائیں گے، خیر تم راوی پل پر پہنچو گے تو اس سے پہلے ہی ایک سرخ ہنڈا ملے گی۔ اس میں ایک لڑکا ہے طارق نذیر، وہ تجھے ملے، باقی ساری بات وہ بتا دے گا۔ غیر معمولی اعتماد کا لڑکا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا

”میں تم سے بعد میں بات کروں گا، ممکن ہوا تو تجھے ملے آؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ ان کا فون بند ہوتے ہی فون پر کال آ گئی۔

”میں طارق نذیر بات کر رہا ہوں اور آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ میں کہا اور فون بند کر دیا۔

راوی پل سے پہلے ہی سڑک کنارے سرخ ہنڈا کھڑی تھی۔ ایک لڑکا اس کا ٹائر بدل رہا تھا، جبکہ سوٹ میں لمبوس ایک وجہ اور لمبے قد کا لڑکا پاس کھڑا تھا۔ عام لوگوں میں دیکھ سکتے تھے کہ کار کا ٹائر بدلا جا رہا ہے۔ وہ نظر انداز کر کے آگے گزر رہے تھے۔ میں اس کے پاس جا کر رک گیا۔ لمبے قد والے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بنا کچھ کہے میرے ساتھ پنجر سیٹ پر آن بیٹھا۔ وہ طارق نذیر تھا۔ پل پار کرنے تک وہ اپنے بارے میں بتا چکا تھا۔

”یہ کافی بڑا اور مضبوط گینگ ہے سر جی، میں پچھلے ماہ سے اس پر کام کر رہا تھا۔ لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس کے بل بوتے پر میں کوئی کارروائی کر سکتا یا آگے بڑھ سکتا۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا

”ان کی طرف توجہ کیسے گئی؟“ میں نے پوچھا

”یہ اطلاع تو تھی کہ سرحد پار سے لوگ آئے ہیں، ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، لیکن وہ کہاں کھپ جاتے ہیں، اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے سیکریٹری سطح کے بندے نے ایک نجی محفل میں الطاف گجر سے کافی بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ اس معاملے کو لے کر ان میں کچھ تو کھار بھی ہو گئی۔ محفل میں تو بات آئی گئی ہو گئی لیکن اگلی صبح وہ سیکریٹری اپنے ہی گھر میں مردہ پایا گیا۔ اس قتل کی تفتیش میں نہ صرف ناکامی ہوئی بلکہ الطاف گجر کے بارے میں کوئی بارے میں کوئی ثبوت ہاتھ نہیں آیا۔ سیکریٹری کے ایک دوست نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ رقم کا مطالبہ کسی لمبے ہی دو نمبر دھندے کی وجہ سے تھا۔ جب سے میں کوشش کر رہا تھا، مگر ہاتھ نہ ڈال سکا۔“

”یہ پتہ چلا تھا کہ بھارت سے آنے والے بندے آگے بھیج رہا تھا؟“ میں نے پوچھا

”یہی تو ان دنوں میں مجھے پتہ چلا تھا۔ قتل والا معاملہ تو پیچھے رہ گیا، میں اس کی چھان بین میں لگ گیا۔“

”اب سب کچھ پتہ چل جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں اس سمجھانے لگا کہ اب کرنا کیا ہے۔ وہ سنتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم ایک اوپن ایئر ریسٹوران کے پاس پہنچ گئے۔ کھانا کھانے تک میں نے اسے سمجھا دیا۔ پارکنگ میں اس کی کار آچکی تھی۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ہماری درمیان اب فون پر ہی رابطہ ہوتا تھا۔ کھیل اب شروع ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

جہاں کے ساتھ پانچ لوگ تھے۔ وہ فور وہیل میں تقریباً چار گھنٹے کا سفر کر کے جالندھر سے کھیل شہر کے قریب پہنچے تھے۔ اس وقت صبح کے پانچ سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا، جب وہ شہر سے باہر ہی ایک ڈھابے پر رُکے۔ وہاں پہلے ہی ان کے لئے دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام راستے وہ ان سے رابطے میں رہے تھے۔ گاڑی رکتے ہی وہ انہیں پہچان گئے۔ وہ لوگ کھیل شہر ہی کے تھے اور ایک نیٹ ورک کے ساتھ جڑے ہوئے تھے جو انہیں ہر طرح سے نواز رہا تھا۔ ان کا تعلق کہیں جا کر کینیڈا میں تھا۔ ایک طرح سے وہ بھی سکھ دھرم ہی کے لئے اپنی جان دارے بیٹھے تھے۔ وہ سبھی منہ ہاتھ دھونے لگے۔ ایک ان میں سے مہمانوں کی خدمت میں لگ گیا، دوسرا جہاں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا تو جہاں نے پوچھا

”سنا مال تیار ہے یا ابھی کچھ وقت لگے گا؟“

”وہ تو تیار ہے، لیکن آپ نے ڈیوری کہاں لینی ہے؟“ اس نے اسی انداز میں جواب دیا

”کیا مطلب، وہ تم لوگ جیسا چاہو۔“ جہاں نے خوشگوار لہجے میں کہا

”نہیں، جہاں آپ ڈیوری لیں گے، اسی مطابق پھر سارا مال تیار ہوگا۔ ظاہر ہے گودام بھی تو چاہئے ہوگا مال رکھنے کے لئے۔“ سامنے بیٹھا شخص کافی سمجھ دار تھا

”ڈیوری کہاں لی جاسکتی ہے؟“ جہاں نے اس کی بات پر سوچتے ہوئے پوچھا

”ایک تو بالکل وہیں، جہاں مال پڑا ہے، دوسرا جہاں شوروم ہے۔ یہ فیصلہ کرنا ہوگا، ابھی ہمارے پاس کم از کم تین گھنٹے ہیں۔ یہی وقت ہے جب مال کارخانے سے شوروم جاتا ہے۔“ اس بندے نے جواب دیا

”کیا خیال ہے، شوروم پر تو کافی رش ہوگا، چاہت صبح کا وقت، کارخانہ ٹھیک رہے گا۔“ جہاں نے صلاح دی

”چلیں، یہ آپ کی مرضی، مال چونکہ خراب ہونے کا ڈر ہے اس لئے جلد از جلد اسے گودام تک لے جانا ہوگا۔ وہ بھی شہر کے باہر۔“ اس بندے نے کہا

”چلو ٹھیک ہے۔“ جہاں نے ڈن کرتے ہوئے کہا اور اس بندے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

جلد ہی وہ سارے آکر بیٹھ گئے۔ ان کے لئے گرم گرم پراٹھے اترنے لگے تھے۔ کھانے کے لئے میز بھر گیا تھا۔ وہ کھانے لگے۔

ارجن کھتری، کھیل شہر کا مشہور کاروباری اور سیاست دان تھا۔ وہ سیاست کے میدان میں کبھی سامنے نہیں آیا تھا، لیکن اسی میدان کا سب سے گھاگ کھلاڑی وہی تھا۔ پورے علاقے کی خبر اس کے پاس ہوتی تھی۔ دیکھنے اور سمجھنے والی یہی سمجھتے تھے کہ اس کی سیاست بس شہر تک محدود ہے۔ وہ وہی کام کرتا ہے جس سے اس کے کاروبار کو کسی نہ کسی حوالے سے فائدہ ہوتا ہو۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے کا کھلاڑی تھا۔ وہ فقط

شہر ہی کی سیاست پر نہیں خالص ہندو حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کرنے والوں میں چند لوگوں میں سے ایک تھا۔ سمجھوتہ ایکسپریس میں جو بم دھماکا ہوا تھا، اس میں وہ اس نے پوری طرح معاونت کی تھی، یہی اس کی آنکھیں اور کان تھا۔

ممبئی حملوں کے بعد پاکستان کے لئے جو الزام تراشی کرنی تھی اس میں اس کا ایک اہم کردار یہ بھی تھا۔ دولت کے انبار اس کے پاس جمع تھے اور اسی طرح وہ آگے خرچ بھی کر رہا تھا۔ جو صرف اور صرف ”ہندو راشٹریہ“ کے لئے مخصوص تھا۔ یہودیوں نے نہ صرف ان کے مقصد میں انہیں کامیابی کے لئے مدد دینے کا بھر پور وعدہ کیا تھا بلکہ ان کی تجارت کو بھی عالمی سطح پر لے جانے کی بھی معاونت کی تھی۔ اس نے حکومت میں موجود ایم ایل ایز پر سرمایہ کاری کر رہا تھا کہ وہ انہی کی بات کریں۔ بھارت میں یہودیوں کے پیر جمانے میں اس کی سب سے زیادہ مدد شامل تھی۔ جہاں اس کی سرکوبی کے لئے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اردن سکھ نے اسے ساری معلومات دے دیں تھیں۔

سورج اُگنے کی منجلی روشنی پھیل چکی تھی۔ سردی کا احساس کافی حد تک زیادہ ہو گیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے بہت کم لوگ سڑکوں پر تھے۔ ہلکی ہلکی دھند تھی۔ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو اپنے کام کاج کے لئے آ جا رہے تھے۔ وہ کم رفتار سے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے، وہ انہیں فالو کر رہے تھے، جو ڈھابے سے ان کی راہ نمائی کر تے ہوئے موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ ارجن کھتری کی قتل انبالہ روڈ پر موجود سیکٹر ۲۰ کے ایک گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ جسے انہوں نے وہ جگہ بتائی تھی جہاں مال پڑا تھا، جبکہ اس کا کاروبار پرانے شہر میں تھا جسے وہ شوروم کہہ رہے تھے۔ وہ کی قتل انبالہ روڈ پر آگئے۔ جہاں سے دائیں طرف سیکٹر ۲۰ کوراستہ جاتا تھا، وہ پہلی ہی سڑک پر مڑ گئے۔ پھر مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے وہ دو منزلہ کوشی کے سامنے جا رکے۔ موٹر سائیکل والے آگے نکل گئے۔ گھر کے سامنے دو سیکورٹی والے کھڑے تھے۔ جیپ رکتے ہی وہ الٹ ہو گئے۔ ان کے ساتھ جیپ میں سے ایک بندہ نکلا اور اس نے سیکورٹی والوں سے کہا

”ہمیں فوری طور پر ارجن کھتری جی سے ملنا ہے، ہم فون کر رہے ہیں وہ فون رسیو نہیں کر رہے ہیں۔“

”وہ اس وقت سو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ جائیں گے تب اگر ان کی اجازت ہوگی تو مل لینا۔“ سیکورٹی والوں نے خشک سے لہجے میں جواب دیا

”ہمیں بھی پتہ ہے کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہوں گے لیکن ان سے ملنا بہت ضروری ہے، اسی وقت، انہیں صرف اتنا بتا دو کہ ریش پانڈے جی کا پیغام ہے۔ ہم سے نہ ملیں، صرف فون پر بات سن لیں۔“ اس نے کچھ ایسے کہا کہ سیکورٹی والا ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اس بندے کو وہیں رُک جانے کا اشارہ کیا اور اندر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ کر بولا

”وہ اٹھ گئے ہیں اور اشران کر رہے ہیں، ہاتھ کرنے کے بعد ہی وہ آپ لوگوں سے مل پائیں گے۔ اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا۔“ سیکورٹی والے کے لفظ منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ اس نے پستل نکالا اور اسے اندر کی جانب دھکیلتا چلا گیا۔ دوسرے نے گن سیدھی کی توجیپ میں سے فائر ہوا اور اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر گیا۔ وہ لڑکتا ہوا گیٹ میں جا لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سارے جیپ سے اتر آئے۔ صرف ڈرائیور کی سیٹ پر ایک مندہ بیٹھا رہا۔ وہ چند لمحوں میں گیٹ کے اندر تھے۔ گیٹ پر تالا نہیں تھا۔ انہوں نے گیٹ کھولا اور جیپ اندر لے آنا کا اشارہ کر کے اندر گھس گئے۔

ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں ایک نجی سنوری عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پوجا کی تھالی پکڑی ہوئی تھی اور وہ اندر کی جانب بڑھ رہی تھی، جیسے ہی اس کی نگاہ جہال پر پڑی کہ کوئی اجنبی گھر میں کھس کر اس کے سر پر پہنچ گیا ہے تو اس نے لاشعوری طور پر خوف زدہ ہو کے چیخ مارنا چاہی تھی لیکن آواز اس کے حلق میں دب کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ جہال اس کے قریب گیا اور دیکھنے مگر کراخت لہجے میں پوچھا

”کہاں ہے ارجن کھتری؟“

”میں یہاں ہوں۔“ کمرے کے اندر سے آواز آئی تو اس نے گھوم کر دیکھا، سامنے ایک بھاری جتنے والا گنجا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستل تھا۔ اس وقت وہ سفید دھوٹی اور کرتے میں تھا۔ کاندھوں پر پیلے رنگ کا کپڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں لکشمی دیوی کی مورتی دھری ہوئی تھی، جس پر تازہ پھولوں کے ہار چڑھائے ہوئے تھے اور سامنے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ جہال اسے دیکھنے لگا۔ موٹے نین نقش پر انتہائی نفرت پھیلی ہوئی تھی۔

”تم ہوا رجن کھتری؟“

جہال نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس کے چہرے پر نفرت بڑھنے سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔

”کون ہو تم اور اس طرح میرے گھر میں کیسے داخل ہوئے ہو؟“ اس نے لفظ چباتے ہوئے پوچھا

”میں تجھے رامیش پانڈے کے پاس لے جانے کے لئے آیا ہوں، چلو گے میرے ساتھ؟“ جہال نے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گیا، پھر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا

”کیا کہا تم نے، کون ہے یہ رامیش پانڈے؟“

”سارا بھارت جانتا ہے اسے، روز اخبار میں پڑھتے ہو، اس سے باتیں کرتے ہو، اتنا جھوٹ تو نہ بولو سوای ارجن کھتری جی۔“ جہال نے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ جہال نے چھلانگ لگائی اور اس پر جا رہا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستل سے فائر ہو گیا۔ ایک دھماکا ہوا جو کمرے میں گونج کر رہ گیا۔ پستل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، جو اندر آنے والے ایک بندے نے اٹھا لیا۔ وہ دونوں قالین پر گرے ہوئے تھے اور جہال اس کی پوری طرح سے دھنائی کر رہا تھا۔ دو منٹ میں ارجن کھتری کے منہ سے خون بہنے لگا اور وہ بے حواس ہو گیا۔ جہال نے اسے گردن سے پکڑا اور باہر لے جاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا

”گھر کا ہر فرد باندھ دو، اور جو ذرا بھی گڑ بڑ کرے اسے گولی مار دو۔ یہ سنتے ہی وہ عورت تھر تھر کاٹنے لگی۔ جہال نے ارجن کھتری کو دھکیلا اور باہر کی طرف لے گیا۔ جیب پوریج کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ جہال نے اسے جیب میں دھکا دے دیا۔ وہ اندر جا کر ا۔ جہال نے اس کے سر پر پستل کا دستہ مارا تو یوں بے ہوش ہوتا چلا گیا جیسے مر گیا ہو۔ باقی لوگوں کو چند منٹ لگے تھے۔ وہ بھی آگے تو وہ وہاں سے نکلنے چلے گئے۔

کیقتل انبالہ روڈ پر انبالہ کی طرف جاتے ہوئے سڑک کے بائیں ہاتھ پر ایک کالج آتا ہے، اس سے ذرا آگے دائیں جانب ہی ایک چھوٹی سڑک نکلتی تھی۔ ان کی راہنمائی کرنے والے موٹر سائیکل والے اسی جانب مڑ گئے۔ انہوں نے جیب بھی ان کی ساتھ موڑ لی۔ تقریباً دو فرلانگ کے بعد وہ ایک کچے راتختے پر مڑے اور سیدھے ایک ڈیرے میں جا گئے۔ وہ بھی انہی کے پیچھے چلے گئے۔ وہ ویران ڈیرہ تھا، کوئی ذی روح وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ارجن کھتری کو جیب سے اتارا اور اسے اندر لے کر ایک کمرے میں فرش

پر لٹا دیا۔ ایک بندہ پانی لے آیا۔ وہ اس کے منہ پر چھیننے مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد ارجن کھتری کو ہوش آ گیا۔ وہ ان کی طرف ہونٹوں کی طرح دیکھنے لگا۔ جلد ہی اسے سمجھ آ گئی کہ وہ اغوا ہو چکا ہے۔ تبھی جہال اس کے قریب فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا

”اب تم یہ پوچھو گے کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں رامیش پانڈے کا نام سن کر سمجھ جانا چاہئے تھا۔ تمہارا یہ قصور کیا کم ہے کہ تم نے سمجھوتہ ایکسپریس میں بے گناہ لوگوں کی جان لینے کا جرم کیا۔“

یہ سن کر وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر سوچتے ہوئے بولا

”کیا چاہتے ہو؟“

”صرف یہ کہ تمہارے بڑے اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔ سکھوں کے بارے جو تم لوگ چاہ رہے، اس خواہش کو اپنے اندر دفن کرلو۔“ جہال نے سرد لہجے میں کہا

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا

”یہ جو تم لوگوں نے ممبئی میں ڈرامہ کیا ہے نا، اب اس کے ڈانڈے تم لوگ سکھوں اور مسلمانوں سے ملا رہے ہو، جس فون پر باتیں ہوئیں، وہ امریکہ میں کسی کھڑک سنگھ کے ذمے ڈال کر اپنا جرم چھپانا چاہتے ہو۔ اس سے پہلے کہ تم لوگوں کا ڈرامہ کوئی نیا رخ اختیار کرے، بندے بن جاؤ۔“ جہال نے کہا تو اس کی طرف دیکھنے لگا

”میں اب بھی پوچھتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے بے چارگی سے پوچھا

”مجھے معلوم ہے کہ پولیس کتوں کی طرح ہمیں تلاش کرنے پر لگ گئی ہوگی۔ اس لئے وقت کم ہے اور ہمیں لکھنا ہے۔ اپنے آقا سے بات کرو اور اسے بتاؤ جو میں نے کہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اس کا فون آگے کر دیا۔ ارجن کھتری نے لرزتے ہاتھوں سے فون پکڑا اور اس کے نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کا رابطہ ہو گیا۔ اس نے ساری بات دہرا دی۔ پھر فون جہال کی طرف بڑھا دیا

”ہاں! بولو۔“ اس نے کہا

”اسے چھوڑ دو، تمہارا مطالبہ جو بھی ہے ہم اسے مان رہے ہیں۔“

”تم رامیش پانڈے ہو؟“ اس نے پوچھا

”ہاں۔“ دوسری طرف سے جواب آیا

”تو سن لو، جب تک جھجیت بھر بھرے کے قاتل سامنے نہیں آئیں گے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ یہ ہماری شروعات ہیں۔ سنو، یہ میں اس کے سر میں سوراخ کرنے لگا ہوں جہاں بے گناہ انسانوں کے بارے نفرت پکتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ارجن کھتری کے سر میں گولی مار دی۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ جہال نے سیل فون وہیں پھینکا اور باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ سب بھی وہاں سے نکلنے چلے گئے۔ وہ ارجن کھتری کو تڑپتے ہوئے وہیں چھوڑ گئے۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

☆.....☆.....☆

میں ساری رات فہیم کے ساتھ کنٹرول روم میں رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کے فون ٹریس کرتا چلا جا رہا تھا جو کسی طرح بھی الطاف گجر سے متعلق تھے۔ پولیس اور خفیہ اداروں پر حکومتی دباؤ بڑھ گیا تھا۔ دوسری طرف زویا اور رونیت مصروف رہی تھیں۔ وہ رامیش پانڈے کو مرکز بنا کر ان کے ارد گرد لوگوں کو تلاش کرتے چلے جا رہے تھے۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو میرے پاس کافی حد تک معلومات آچکی تھیں اور مجھے یہ پتہ چل چکا تھا کہ لاہور میں فیضان بٹ ان سارے گینگ کو چلا رہا تھا۔ اس کے بندے یہ معلوم نہیں کر پائے تھے کہ آخر وہ لوگ ہیں کون جنہوں نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا تھا؟

طارق نذیر پولیس ہیڈ سے اس کے گھر پر مل چکا تھا۔ اس نے ہمارے متعلق کوئی بات کہنے بغیر پولیس ہیڈ کو بتا دیا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اسے کس حد تک لے کر جانا ہے۔ پولیس اتنا ہی کام کرے، جتنا اس سے کہا جائے۔ ابھی وہ پولیس ہیڈ کے گھر ہی تھا کہ فیضان بٹ کا فون آگیا۔ وہ پولیس ہیڈ سے ایک وفد کے ساتھ ملنا چاہتا تھا، اس نے آفس میں آ جانے کا وقت دے دیا۔

جس وقت فیضان بٹ اپنے ساتھ چھ لوگوں کا وفد لے کر پولیس ہیڈ کے آفس میں پہنچا، اس وقت طارق نذیر وہیں موجود تھا۔ فیضان بٹ صرف حکومتی دہاؤ کا پٹا کھیلے ہوئے الطاف گجر کو اپنی تاجر برادی کا فرد ظاہر کر کے ہمدردی جتا رہا تھا۔ طارق نذیر مجھے ان کی ساری گفتگو فون پر سن رہا تھا۔ پولیس ہیڈ نے فوری کارروائی کرنے اور الطاف گجر کو بازیاب کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ایسے ہی وقت میں نے فیضان بٹ کو فون کر دیا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے دوسری بار ملایا تو اس نے فون رسیو کر لیا۔

”ہیلو۔ کون؟“

”میں ہوں جس نے الطاف گجر کو اغوا کیا ہے۔“ میں دھیمے لہجے میں کہا

”تم؟“ اس کی حیرت اس کی آواز سے مجھ تک پہنچی، وہ مزید لفظ نہیں کہہ پایا

”میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم کن لوگوں کے ساتھ، کس کے پاس بیٹھے ہو۔ میں تمہیں اتنا بتا دوں تم نے یا کسی نے الطاف کو بازیاب کیا کرتا ہے، میں تجھے اوپر پہنچانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ میں نے غصے میں کہا

”تجھے معلوم نہیں کہ تم کس سے بات کر رہے ہو، میں تمہیں.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس بات کا نکتہ ہونے کاٹ دیا

”وہ بے بس کیا کر سکتا ہے جو پولیس کی مدد لینے، پولیس کے در پر کسی کتے کی طرح دُم ہلا رہا ہے۔ اگر تم میں اتنی جرات ہوتی کہ تم کچھ کر سکتے ہو تو پولیس کی مدد لینے یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔“ میں نے انتہائی طنز سے کہا

تاکہ اس کے اندر غصہ بھڑک اٹھے

”میرے سامنے آؤ تو میں تجھے بتاؤں۔“ اس نے انتہائی غصے میں کہا

”میں تمہارے سامنے آتا ہوں یا تجھے اپنے سامنے لے کر آتا ہوں، شام تک فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی صرف اپنی کار کے بارے میں پتہ کر، اُس کا کیا بتا۔ میں بعد میں فون کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد طارق نذیر نے مجھے کال ملی۔ اس نے بتایا کہ فون کال کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی اور اپنے لوگوں کے ساتھ حمزہ سے باہر نکل گیا۔

”مجھے بتاؤ، تمہارا کوئی سیف ہاؤس ہے، جہاں تم آسانی سے الطاف گجر سے تقیش کر سکو؟“

”بالکل ہے۔ میں آپ سے یہی کہنے والا تھا۔“ اس نے کہا

”ٹھیک ہے، میں بعد میں بتاتا ہوں کہ وہ تجھے کہاں ملے گا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا

فیضان بٹ کی کار پولیس ہیڈ کے آفس سے کافی دور ویرانے میں پہنچ چکی تھی۔ اس کا ڈرائیور اسی میں پڑا تھا۔

لوگوں نے اسے کھول دیا، کار میں بم لگایا اور وہاں سے دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ چند قدم چلے اور ریمورٹ

سے کار اڑادی۔ کار پھٹنے کا چشم دید اس کا ڈرائیور تھا۔

جس وقت یہ کاروائی ہو رہی تھی، جنید اور اکبر کافی حد تک الطاف گجر سے معلومات لے چکے تھے۔ اس سے مزید وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے انہیں الطاف گجر کو طارق نذیر کے سپرد کرنے کا کہا۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ اس فیکٹری سے الطاف گجر کو نکال کر، خود سامنے آئے بغیر طارق نذیر کے سپرد کر دیا۔ وہ اسے لے کر سیف ہاؤس چلا گیا اور وہ دونوں گھر کی طرف لوٹ آئے۔ تب میں نے فیضان بٹ کو فون کیا

”کچھ پتہ چلا کار کا؟“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے کافی حد تک دھیمی آواز میں پوچھا

”تمہاری طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا

”بہت پچھتاؤ گے۔“ اس نے کڑھکی سے کہا

”شام تک اپنی طاقت دکھا دو تو ٹھیک، ورنہ میں تیرا زہر نکالنا خوب جانتا ہوں۔“ میں اسے غصہ دلایا

”سامنے آ کر بات کرو تو میں تجھے دیکھوں۔“ اس نے بھنا کر کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا

”بس یہیں گھٹنے ٹیک دیئے۔ کہو کہ مجھے تلاش نہیں کر سکتے ہو، پھر میں تم تک پہنچوں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ اسی وقت مجھے طارق نذیر نے بتایا کہ وہ سیف ہاؤس پہنچ چکا ہے اور فیضان بٹ کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لئے پولیس سیکورٹی کے نام پر تین بندے بھیج دیئے ہیں۔ یہ اس نے میرے ہی کہنے پر کیا تھا، تاکہ اس کی نقل و حرکت کے بارے میں پوری طرح آگاہی رہے۔ وہ اس واقعہ کی وجہ کافی پریشان ہو چکا تھا اور اپنی طاقت کو اکٹھا کر رہا تھا۔ میں شام تک اسے اُس کی حالت پر چھوڑ دیا۔

الطاف گجر نے کافی حد تک مار کھانے کے بعد تعاون کیا تھا۔ اس نے وہی چند بندے بتائے جو اسے یاد تھے۔ اس میں فیضان بٹ کس حد تک ملوث تھا، وہ بھی اس نے بتا دیا۔ طارق نذیر نے اسے اپنے ادارے کے کھاتے میں ڈال کر ایک بڑے آپریشن کی منظوری لے لی۔ وہ اب مزید گرفتاریوں کے لئے پلان کر رہا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ فیضان بٹ کا اضطراب کافی حد تک بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے گلبرگ مارکیٹ والے آفس میں تھا اور اس کے گرد سیکورٹی کا ایک حلقہ بن چکا تھا۔ اس نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کو بھی بتا دیا تھا کہ معاملہ کیا بن گیا ہے۔ انہیں یہ خبر نہیں مل رہی تھی کہ یہ سب ہو کیسے گیا؟

الطاف گجر کے گاؤں سے چند بھارتی پکڑے جا چکے تھے۔ انہوں نے وہاں چھاپہ مار کر کچھ دستاویزات بھی حاصل کر لیں تھی۔ فیضان بٹ آفس سے نکل کر کہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے وہیں ان چند لوگوں کو بلایا تھا، جو اس کے خاص لوگ تھے اور لاہور میں اس گینگ کو چلانے کے پورے ذمہ دار تھے۔ اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جاتا کدھر ہے؟

جیسے ہی شام آتری وہ اپنی پوری سیکورٹی کے ساتھ مارکیٹ سے نکلا۔ طارق نذیر اور میری گینگ کے لوگ اسی مارکیٹ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی وقت میں بھی باہر نکل آیا۔ میرے ساتھ میرے شیر اکبر اور جنید تھے۔ میں حمزہ سے مارکیٹ کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ گھر سے نکلنے اور مارکیٹ کے قریب پہنچ جانے تک میں نے سب کو رابلے میں لے چکا تھا۔ فیضان بٹ کی کار کے آگے پیچھے کافی کاریں چل پڑیں تھیں۔ ان کا تعاقب شروع ہو چکا تھا۔ کافی دیر جب وہ نہر کنارے چڑھے تو پتہ چلا کہ ان کا رخ کس طرف ہو سکتا ہے۔ جنید آندھی اور طوفان کی طرح کار بھگائے لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان کا قافلہ جلو پارک سے تھوڑا پہلے

دائیں جانب ہل پار کر کے چل پڑے۔ آگے بہت کھلے کھلے گھرتے۔ وہ قافلہ ایک گھر میں چلا گیا، جس کی بناوٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا ڈیزائن کہیں دوسرے ملک سے لایا گیا ہے۔ وہ گھر جگمگا رہا تھا۔ کچھ کاریں وہیں گیٹ کے پاس ہی رک گئیں اور فیضان بٹ والی کار کے ساتھ پولیس کی گاڑی بھی پورچ میں جاری۔ پولیس والے باہر ہی رک گئے اور وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ میں انہیں دیکھ نہیں رہا تھا، لیکن میری آنکھیں وہاں پہنچ چکی تھیں۔

”پتہ کرو کہ اس گھر میں کس طرف سے داخل ہوا جاسکتا ہے۔“ میں اپنے لوگوں کو ہدایت دی اور ہل پار کر گیا۔ وہ تو تعیر علاقہ تھا اور ابھی بہت ساری جگہوں پر تعمیر جاری تھی۔ جس وقت میں اس گھر کے پاس پہنچا، مجھے اطلاع مل گئی کہ میں نے کہاں سے جانا ہے۔

ہم جیسے ہی گیٹ پر پہنچے، گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہیں قریب ہی ایک پولیس والا گمن لئے کھڑا تھا، بلاشبہ اسی نے سیکورٹی والوں کو کہا تھا کہ نئے آنے والے مہمانوں کو اندر آنے دیا جائے۔ ہم بڑے آرام سے پورچ میں جاڑے۔ میں نے وہیں کھڑے ہو کر باہر کا جائزہ لیا۔ پولیس والوں کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں بات ہو گئی تھی۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ نفری پہنچ رہی ہے۔ میں نے انہیں یہی ہدایت دی تھی کہ اگر بات ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ وہاں تک آئیں، ورنہ ہمارے نکل جانے کے بعد ہی وہاں پہنچیں۔ لان میں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، ان میں کچھ لوگ اسلحہ بردار بھی تھے۔ سیکورٹی والوں کو شک ہوا تھا یا نہیں میں اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا، لیکن ہم زیادہ دیر تک پورچ میں رہے، چند لمحوں میں جائزہ لیا اور اندر داخل ہو گئے۔ داخلی دروازے کے سامنے ہی ایک کھلا سا ڈرائیونگ روم تھا۔ اس میں پانچ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، چھٹان کے درمیان صوفے پر جو بیٹھا تھا، وہ شکل ہی سے غیر ملکی لگ رہا تھا، اس کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال تھے، نین نقش چٹکے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود بہت چست دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پہلو میں فیضان بٹ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہلی نگاہ میں پہچان لیا تھا، ایک تو اس کی تصویر میری نگاہوں سے گزر چکی تھی، دوسرا اب تک جو اس کے بارے میں سنا تھا، وہ پہچان کے لئے کافی تھا۔ ہمارے اچانک اندر داخل ہونے پر انہوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ ہم تین ہی تھے۔ میں سیدھا ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اکبر اور جنید دونوں دائیں بائیں ہو گئے۔

”کون ہو تم اندر کیسے آ گئے ہو؟“ فیضان بٹ نے ایک دم سے اچھلتے ہوئے پوچھا

”میں کون ہوں، یہ تو بعد میں پتہ چلے گا، لیکن تم لوگوں کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے کہ تم کون لوگ ہو؟“ میں نے کہا تو ان سب کے چہروں پر سوالیہ نشان مچ گیا۔ میں نے انہیں زیادہ حیران نہیں رہنے دیا اس لئے آگے بڑھ کر فیضان بٹ کے پاس چلا گیا۔ اسے کارل سے پکڑا ہی تھا کہ اس نے زور سے اپنا کارل چھڑا چاہا، میں نے دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار گھونٹہ اس کے منہ پر دے مارا، وہ صوفے سے الٹ کر گرا۔

”کون ہو تم؟“ اس بار غیر ملکی نے اٹھتے ہوئے غصے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، وہ ہوا میں اچھلا اور میرے اوپر آ رہا، میں نے مانا تھا کہ وہ بہت اچھا فائٹر ہو سکتا تھا، لیکن اس وقت میرے پاس یہ کھیل تماشے دکھانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ میرے اوپر تو آ رہا، لیکن مجھ سے الگ نہیں ہو سکا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کو سینے کے قریب سے گھیر لیا۔ پھر اوپر اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ قالین ہونے کی وجہ سے اسے چوٹ نہیں آئی۔ لیکن اس وقت تک جنید کے خاموش پھل نے ٹھک کی آواز نکالی تو اس کی چیخ بلند ہو گئی۔

”خبردار۔ کوئی ہلنا بھی مت، ورنہ وہ اپنی موت کا ذمہ دار خود ہوگا۔“ اکبر نے اونچی آواز میں کہا تو سب نے حیرت سے ہمیں یوں دیکھا جیسے ہم کوئی انہونی مخلوق ہیں جو ان کے سر پہ مسلط ہو گئے ہیں، ورنہ شاید ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں کسی کی جرات ہو سکتی ہے کہ ان کی جانب کوئی انگلی بھی اٹھائے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا

”تم لوگ شاید یہی سمجھ رہے ہو کہ تم سب کسی آسانی مخلوق سے تعلق رکھتے ہو، اس وطن میں جو کئے جاؤ، تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہم آگئے ہیں پوچھنے کے لئے۔ میں تم لوگوں کو صرف چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں، اب تک جتنے بھی بھارتی یہاں داخل ہو چکے ہیں، انہیں واپس لے آؤ، ورنہ تم لوگوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے یہ تمہاری سوچ میں بھی نہیں ہوگا“ یہ کہتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھوں میں پھل نکال لئے اور پھر سب کی ٹانگوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ وہ چیخنے لگے۔ میں نے فیضان بٹ کو اٹھایا اور اسے اکبر کی طرف دھکیلا پھر اس غیر ملکی کو اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے ٹھوڑی کے نیچے گھونٹہ مارا۔ اس بار اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ تب میں پھل اس کے ماتھے پر رکھا اور گولی چلا دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ فیضان بٹ کو اپنے آگے لگائے اکبر باہر کی طرف چل دیا، میں ایک نگاہ تڑپتے ہوئے ان سب کو دیکھا اور تیزی سے باہر کی جانب نکلا۔

دروازے کے ساتھ ہی پولیس والا کھڑا تھا۔ وہ اندر کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ باہر لوگ پریشان ہو گئے ہوئے تھے۔ اچانک جنید میرے پیچھے سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں جیسے ہی پورچ میں نکلا، اس وقت تک جنید لان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب دقتی بم اچھال چکا تھا۔ تین دقتی بم مختلف جگہوں پر جا کرے۔ ایک زوردار دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی دوسرا مزید ہوئے۔ دھواں اور مٹی کا غبار اٹھا۔ اس وقت تک اکبر نے فیضان بٹ کو گاڑی میں دھکا دے دیا تھا۔ جنید تیر کی طرح وہاں سے نکلا۔ جب تک لوگوں کو ہوش آتا، ہم گیٹ سے باہر جا چکے تھے۔ جنید انتہائی رفتار سے نکلا تھا۔ ہل تک جاتے میں طارق نذیر سے کہہ دیا کہ وہ بندہ سنبھال لے۔ ہم ہل سے نکلے تو پولیس ہمارے قریب سے گذر گئی۔ کچھ فاصلے پر وہ ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم نے گاڑی اس کے حوالے کی اور اس کی کار میں بیٹھ کر نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ جہاں سنگھ جاندھر کے ایک گھر میں موجود تھا۔ یہ اس نے اپنے لوگوں کا مکان بنا کر دیا تھا۔ اصل میں جن اس نے اروند کو کینیڈا بھیجا تھا، اس کے فوری بعد روہی کی طرف سے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جانے لگا تھا۔ ایک مرکز جاندھر میں بن گیا تو دوسرا لاہور میں۔ وہ ایک لمبی خوشگوار نیند کے بعد فریش ہو کر کمپیوٹر کے سامنے آن بیٹھا تھا۔ اروند آن لائن تھا۔ دوسری طرف جمال موجود تھا۔ اروند انہیں بتانے لگا تھا۔

”دونوں طرف کے سیاسی حلقوں میں جو کھلبلی مچی سو مچی، خفیہ ایجنسیوں پر بھی سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ سیاسی حلقے انہیں ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔“

”وہ جو بھی کہتے رہیں، سب سمجھتے ہیں کہ یہ روئل تو ہونا ہی ہے، تم ذرا کال ملاؤ، میں رائیش پاٹل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ جہاں نے کہا

”ٹھہرو! پہلے یہ بتاؤ، کیا بات کرو گے؟“ جمال نے تیزی سے پوچھا

”یہی کہ..... وہ..... اب ہوشیار ہو جائیں۔“ اس نے کہا تو جمال کے ساتھ اروند بھی ہنس دیا۔ جہاں کو

سمجھ آگئی کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔

”یار جہاں کیا تمہارا کچھ کہنا بنتا ہے۔“ جمال نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے ایک دم سے اعتراف کر لیا لیکن پھر تیزی سے بولا، ”یار انہیں پتہ تو چلنا چاہئے کہ وہ ہر وقت ہماری ہٹ لسٹ پر ہیں۔“

”میں کرتا ہوں بات، تم سنو۔“ جمال نے کہا تو ارونڈ سکھ کال ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی کال مل گئی۔ فون اس کے کسی بندے نے اٹھایا۔ کچھ دیر بحث کے بعد اس نے فون۔ امیش پاٹل سے کوڈے دیا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے بڑے سکون سے پوچھا

”وہی، جس نے ارجن کھتری کو قتل کیا۔ جس کی لاش ابھی تک تم لوگوں کو نہیں ملی۔“ جمال نے بھی اسی سکون سے کہا تو تیزی سے بولا

”کہاں ہے اس کی لاش؟“

”بتاتا ہوں، لیکن اس سے پہلے تجھے بتانا بہت ضروری ہے۔“ جمال نے اپنا سکون نہیں ٹوٹنے دیا

”کیا کہنا ہے مجھ سے؟“ وہ بولا

”یہی کہ اگر تم لوگ ہندو راشٹریہ چاہتے ہو تو ہم بھی ایک سیکولر بھارت چاہتے ہیں۔ ممبئی حملوں میں تم لوگ بہت بڑی غلطیاں کر گئے ہو، مگر ہم نہیں کریں گے۔ میں چاہوں تو تیرے وہ سارے شدت پسند ہندو جیلوں ہی میں مار دوں، کرتے ہو سودا؟“ جمال نے اس بار انتہائی غصے میں کہا

”تمہیں غلط انفارمیشن ملی ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہم تو حکومت کی.....“ اس نے کہنا چاہا تو جمال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”جھوٹ مت بولو پاٹل، میں اس وقت سے تمہاری بے غیرتیاں دیکھ رہا ہوں، جب تم نے مختلف جگہوں سے بندے اٹھا کر ایک جزیرے پر اکٹھے کئے۔ وہ تمہارا پلان یہی تھا کہ ممبئی بم دھماکوں کے بعد انہی لوگوں کو پکڑا دو اور بات ختم۔ اس کے ساتھ تم نے دیکھا کہ نیوی کو تم کس حد تک دھوکا دے سکتے ہو، تم نے اپنی وزارت کا بھرپور فائدہ اٹھایا پاٹل۔ لیکن اب نہیں۔“ جمال نے طنزیہ لہجے میں جگ آمیز انداز میں کہا

”کیا چاہتے ہو اب؟“ اس کے لہجے میں غصہ چمک بڑا تھا

”یہی کہ اپنی ساری دوکانداری سمیٹ لو۔ وہ بندہ جو تم نے پکڑ لیا ہے، بلکہ پکڑا دیا ہے، اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرو، لیکن کھیل یہیں بند ہونا چاہئے۔“ جمال نے تھکمانہ انداز میں کہا

”دیکھو، تم اپنا کام کرو، میں اپنا کام کرتا ہوں۔ ایک ارجن کھتری کو مار لینے سے یہ مت سمجھو کہ ہماری اتنی بڑی تحریک ختم ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔“

”اور اب تم کچھ کر بھی نہیں سکو گے۔ میں چاہوں تو تمہیں آسانی سے ختم کر سکتا ہوں لیکن میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ دشمن کو زندہ رکھنا ہی نہ صرف مردانگی ہے بلکہ میں نے ابھی تم سے ادھار بھی چکانا ہے۔“

”کیسا ادھار، کیسی مردانگی۔“

”ادھار یہ ہے کہ ججیت بھر بھرے کے قاتل مجھے دے دو، تو زیادہ بندے نہیں پھڑکاؤں گا۔ میں اب تمہیں فون نہیں کروں گا۔ میں اس وقت سمجھ جاؤں گا کہ تم میری بات ماننا چاہتے ہو۔ جب تم چوبیس گھنٹوں میں اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دو گے، نہ دیا تو میں تمہیں مار دوں گا، یہ چنوتی (چیلنج) ہے تمہیں۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ اس نے کہا

”چلو پھر پہلی لاش کا تحفہ لے، وہ کھیل انبالہ روڈ پر کالج سے آگے پڑی ہے۔ اگر اٹھانا چاہو تو اٹھا لو جا کر۔ صبح ہونے تک مزید لاشیں مل جائیں گی۔“ جمال نے تو دوسری طرف سے چند لمحوں تک کوئی بات نہیں ہوئی، پھر وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا

”میں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ان کے درمیان چند لمحے خاموشی رہی تھی جہاں بولا

”نہیں کرنی تھی بات، اب اپنا قول نبھانا پڑے گا۔“

”یہ نبھانا ہی تھا میری جان، تم نے شاید اسے اتنا سنجیدہ نہیں لیا، مگر اس کی کھوج میں رہا کہ آخر اس جزیرے میں کیوں لے جایا گیا اور وہ کون تھا۔ میں نے اس سے بدلہ لینا ہے وہ میں لے لوں گا۔ اسے بچنے کا ایک راستہ دیا ہے لیکن وہ نہیں مانا، اب بھی اگر وہ سوچ لے۔ خیر۔! تم سب سے پہلا یہ کام کرو، واپس آؤ گی جاؤ۔ اور انو جیت کو سیاست میں داخل کرنے کی بھرپور محنت کرو۔ چند دن ہر پریت کے ساتھ گزارو۔ میں دیکھ لیتا ہوں سب۔“ جمال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”یہ تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟“ جہاں نے خشکی سے کہا

”نہیں تمہیں بے عزت کر رہا ہوں۔“ جمال نے ہنستے ہوئے کہا تو ارونڈ کے ساتھ کئی لوگوں کا قہقہہ لگ گیا جو سب سن رہے تھے۔

”اب تو ہو گیا۔ کیا فائدہ ملا تجھے۔“ جہاں نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا

”یار سر نہ کھاؤ۔“ جمال زچ ہوتا ہوا بولا

”اوکے، جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہوگا، ویسے آئینہ دیکھتے ہو آج کل، تمہارا چہرہ کسی غریب قسم کی کپہنی کی ادھو مر رہی پشنت کی طرح لگ رہا ہے تم بھی جاؤ نورنگر اور سوچی کے ساتھ چند گزارو، فریش ہو جاؤ گے۔“ جہاں نے بھی مذاق کیا۔ لیکن اس پر جمال نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا

”اور ہاں، نورنگر سے یاد آیا، تم فوری طور پر مناسکر جاؤ، یا بندہ بھیجو، وہاں معلوم کرو کہ رام نام کا کوئی ہوگی ہے؟“

”کیا ہوا؟“ جہاں نے پوچھا تو جمال نے اسے اختصار سے بتا دیا

”ارے اس سانپ کو وہاں کیوں چھوڑ آئے۔ وہ تو.....“ اس نے کہنا چاہا تو جمال بولا

”اس کا زہر میں نے نکال دیا ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ویسے میں اس کا پوچھتا ہوں۔ جو تمہیں کہا ہے وہ کرو۔“ جمال نے کہا۔ ان کے درمیان مزید بات چلتی کہ ارونڈ نے کہا

”ابھی رامیش پاٹل نے پرائم منسٹر سیکریٹریٹ فون کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے ممبئی میں کال ملائی ہے۔ اس کے بارے کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔“

”وہ جو مرضی کرے، ہم اپنا کام کریں گے۔“ جمال نے کہا اور پھر یونہی ان کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ یہاں تک کہ انہیں باتیں کرتے ہوئے سورج نکل آیا۔

”جمال، یہاں تو نکل آیا ہے سورج، تمہاری طرف چند منٹ بعد نکلے گا۔“ جہاں نے کہا

”لیکن تو نے اگلے چوبیس گھنٹوں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں میں رہنا ہے۔ یہ کنفرم ہو جائے کہ تم اوگی پنڈ

ہی میں ہو۔ کل سارا دن لوگوں میں گزارنا، ہو سکے تو لوگوں کو اکٹھا کر کے کھیل تماشا کر لینا۔“ جمال نے اسے سمجھایا تو حیران ہو کر آگئی تھی کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ کچھ دیر بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔ دو گھنٹے بعد وہ نکلا اور اوگی کی طرف چل پڑا۔ جہاں ہر پریت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اوگی پہنچا تو ناشتہ میز پر لگا ہوا تھا۔ پھوپھو کلجیت، انوجیت اور ہر پریت اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم ہوا۔ کلجیت کور اوگی میں کسی کے ہاں چلی گئیں اور وہ تینوں ماسی موضوع پر بات کرنے لگے کہ آئندہ الیکشن کیسے لڑنا ہے۔ اسی دوران اس نے جوگی رام کے بارے میں معلومات کے لئے ایک بندے کو ماسکر بھجوا دیا۔

☆.....☆.....☆

رامیش پاٹل سے بات کر کے میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا، میں نے دعویٰ کر لیا تھا، مجھے یقین تھا کہ جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہو جانا ہے، لیکن ممکن ہے وقت آگے پیچھے ہو جائے۔ میں کچھ دیر اس بارے سوچتا رہا، پھر اچانک میرے ذہن میں سارا پلان آتا چلا گیا۔ بس مجھے چند چیزیں کنفرم کرنا تھیں۔ وہ میں نے فییم اور اروند کو بتا دیں۔ انہوں نے مجھے دوپہر تک اس بارے کنفرم کر دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں ناشتہ کر کے چھت پر چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا تناؤ کھلی فضا میں دور ہوتا ہے۔ میرے لاشعور میں کہیں تھا کہ میں نے کسی کو چیلنج دیا ہے، اسے پورا کرنا ہے۔ میں نے ایک دم سے رامیش پاٹل کو ذہن سے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ انوجیت سنگھ کے بارے میں سوچنے لگا جو سیاست کے میدان میں کودنے والا تھا۔ اچانک میرے من میں آیا کہ سیاسی نظام کو چلانے والے آخر لوگ ہی تو ہوتے ہیں۔ جب تک ٹھیک اور درست بندے نہ آئے، اس وقت تک نظام درست چل ہی نہیں سکتا۔ میرا دھیان اپنے ہی سیاسی نظام کی طرف چلا گیا جہاں سوائے کرپشن، جھوٹ اور استحصال کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا دل کیا کہ اس سیاسی نظام میں اچھے لوگوں کو آنا چاہئے، مگر کیسے؟ یہ ایک الجھا ہوا سوال تھا جس کا جواب بہر حال موجود تھا، فوری طور پر میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اشفاق کو اپنے علاقے سے ایم این اے الیکشن لڑا دیا جائے۔ اس بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ جب تک عام عوام یہ سمجھتی رہے گی کہ یہ کام چند مخصوص خاندانوں کا ہے، یہ عوام اسی طرح پستی رہے گی۔ چونکہ اس نظام کو لوگوں ہی نے بدلنا ہے، اس لئے لوگ بھی اچھے ہی لائیں جائیں۔ میری سوچ اس طرف چل پڑی۔ ایسے میں کرل سرفراز کا فون آ گیا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”ایویں ہی کچھ سوچیں سوچتا جا رہا تھا یہاں کی سیاست کے بارے میں۔“ میں نے کہا

”مثلاً کیا۔“ انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتا دیا، تب انہوں نے کہا، ”میں نے اس پر بہت سوچا ہے اور میرے پاس ایک پلان بھی ہے۔ اس بارے میں تم سے بات کرتا۔ لیکن ابھی تم نے جو رامیش پاٹل کو چیلنج دیا ہے، اسے پورا کرنا اور پوری بنجیدگی سے کرنا ہے۔“

”ہو گیا، اس بارے آپ کے جو ذہن میں ہے، میں وہ ضرور سننا چاہوں گا۔“ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا

”میں نے کچھ معلومات تجھے میل کر دی ہیں۔ اسے دیکھو، یہ نوٹن کور گروپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ تم دودو رانا سے رابطہ کرو، میں بھی کچھ کرتا ہوں۔“ انہوں نے راستہ دکھاتے ہوئے کہا

”اوکے۔“ میں نے کہا اتنا انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں چھت سے اتر کر نیچے اس کمرے میں آ گیا جہاں

فییم بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے لیپ ٹاپ لیا اور میل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور چند لمحے سوچنے کے بعد بائیتا کور سے رابطہ کیا۔

”ہائے ظالم۔! یہ میری قسمت ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھ سے بات کرو، یقین جانو بڑا مس کرتی ہوں تمہیں، بولو کیا حکم ہے میرے لئے۔ اب یہ مت کہنا کہ کوئی حکم دینے کے لئے نہیں صرف تم سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔“ اس نے ایک دم سے شوخی بھرے لہجے میں کہا تو میں نے ابھی اسی انداز میں کہا

”یار تم تو گمیا نی ہو گئی ہو۔ اب تو کہنے سے پہلے ہی من کی بات جان جاتی ہو۔“

”بولو، بات کیا ہے۔“ اس نے کافی حد تک سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا تو میں نے اسے رامیش پاٹل سے ہونے والی ساری بات بتا دی

”کرنا کیا ہے؟“ اس نے پوچھا

”تم دودو رانا سے بات کرو، کہو میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پھر جو بھی بات ہوگی تمہارے سامنے ہو جائے گی۔“ میں نے اس سے کہا

”میں اس سے رابطہ کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں انتظار کرنے لگا، تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے کال کر کے بتایا کہ وہ خود بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کانفرنس کال میں دونوں کو لے لیا۔ کچھ دیر تمہیدی باتوں میں کے بعد میں نے پوچھا

”کیا تم کلجیت بھر بھرے کا انتقام لینا چاہتے ہو؟ اس سیٹ اپ کو ختم کرنا چاہتے ہو جو رامیش پاٹل نے بنا دیا ہے؟ یا خاموشی سے اپنی نوکری کرنا چاہتے ہو؟“

”مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں دلبرداشتہ ہو چکا ہوں۔“ وہ مایوسی سے بولا

”میرے کہنے پر ایک بار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ، حوصلہ پکڑو، ایک بار پھر سے فتح یاب ہو جاؤ۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

”کیسے کوئی راستہ ہی نہیں ہے؟“ اس نے پھر اسی مایوسی میں کہا

”دیکھو دودو، میں نے اسے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے، جس میں سے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے اس دوران اس نے پرائم فٹنر سیکرٹریٹ سے بھی رابطہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے بندوبست میں لگ گیا ہے۔ اسے یہ انداز ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں تو اس پر خوف طاری ہے۔ میں مانتا ہوں کہ خوف زدہ انسان بہت خطرناک ہوتا ہے، اسے اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے، لیکن ظالم اندر سے انتہائی بزدل ہوتا ہے۔ اس کے بندوبست ہی اسے لے ڈوبتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو۔“

”میں سمجھ گیا، مجھے کیا کرنا ہے، بولو تم کیا چاہتے ہو۔“

اس نے ایک دم سے چونکتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں جوش بھرا ہوا تھا۔

”بس اسے ٹھیک کر رکھو، اوپر سے جو بھی سیکورٹی کے لئے ہوگا، اس میں اپنے بندے داخل کر دو۔ باقی کام بائیتا کر لے گی، یہ ابھی ممبئی آ رہی ہے۔“ میں نے کہا تو بائیتا کور نے شوخی میں کہا

”ارے تم تو مجھے نارتھ پول جانے کا بھی کہو تو میں جانے کو تیار ہوں، یہ تو اپنی ممبئی ہے یار۔“ یہ کہہ کر وہ کلکلا کر ہنس دی۔ تب میں نے کہا

”بس تم وہاں پہنچو، یہ ذہن میں رکھنا کہ یہ صرف تمہارا آپریشن ہوگا۔ اس میں حیران کہیں نہیں ہے۔“

”وہ کیا ہر پریت کے پاس ہے؟“ اس نے پوچھا

”ہاں وہ ادھر ہی ہے، میں نے خود اسے وہیں رکھنے کو کہا ہے۔“ میں نے جواب دیا
”کاش تو بھی میرے پاس ہوتا۔“ اس نے حسرت سے کہا تو میں ایک دم سے بولا
”یہ کل تک ختم کرو، پرسوں میرے پاس ہوگی تم۔“

”مجھے معلوم ہے یہ تم اپنی بات سچ کر دکھاؤ گے۔ کیا یہ آج رات نہیں ہو سکتا مینی والا کام۔“ یہ کہہ کر وہ پھر
ہنس دی۔ تو میں نے کہا

”میں نے اسے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے، تم نکلنے کی تیاری کرو۔ دود میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ تم سن
رہے ہو۔“ میں نے پوچھا

”میں سن رہا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کوئی ڈیویلیپمنٹ دیکھنے کو ملی میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“ اس نے جوش
سے کہا

”نہیں، تمہیں، میرا نمبر نہیں ملے گا، میں خود کروں گا، یہ کہیں بھی ٹریس نہیں ہوگا۔ اب تم اپنی آنکھیں کھول لو
اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنا شروع کر دو۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا تو میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں نے سب کو بتا دیا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ سب لوگوں کی توجہ اس کام پر لگ گئی تھی۔

کچھ وقت گزرا تھا کہ کرنل سرفراز کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے ایک فون نمبر دیتے ہوئے کہا

”یہ وہ جوان ہے، جسے میں نے اس کام کے لئے چنا ہے جو تم چاہ رہے ہو۔ میں چاہتا تھا کہ اسے کندن
بناؤں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابھی کندن نہیں بنا، ابھی اسے بھی میں ڈالنا ہے، ڈال سکتے ہو تو یہ کام اپنے
ذمے لے لو، اس کی تمام تر ذمہ داری تمہیں خود پر لینا ہوگی۔ اگر یہ تمہیں اپنے مطلب کا بندہ نہ لگے تو.....“

”وہ اگر آپ نے چنا ہے تو وہ اس قابل ہوگا۔ میں تیار ہوں اسی کی ذمہ داری لینے کے لیے۔“ میں نے کہا
”میں نے اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات ای میل کر دی ہیں۔ جب چاہے اسے بلا لیتا۔“ انہوں
نے کہا اور فون بند کر دیا

ولید احمد کا تعلق پنجاب کے شہر جہلم سے تھا۔ اس کا باپ ایک چھوٹا زمیندار تھا، جس کی چند ایکڑ زمین تھی۔ جو
قیام پاکستان سے پہلے ہی کی آبائی زمین تھی۔ ولید باپ کا اکلوتا بیٹا ہی تھا۔ دو بہنیں تھیں جو اس سے بڑی تھیں
اور اپنوں گھروں میں آباد تھیں۔ اس کا بچپن بہت غربت میں گذرا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی ابتدا مائٹ سکولوں
سے کی تھی۔ وہ بہت ذہین تھا۔ ہر امتحان میں امتیازی نمبر لیتا ہوا بورڈ میں پہلی پوزیشن لی۔ آگے پڑھنے کے لیے
اس کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔ باپ نے حوصلہ دیا اور زمین کا ایک ٹکڑا گروڈی رکھ کر اسے کالج میں داخلہ دلوا لیا۔
اس نے سائنس مضامین کا انتخاب کیا۔ جب تک اس نے کالج کی تعلیم ختم کی، اور انجینئرنگ میں جانے کا وقت
آیا اس وقت تک وہ غربت کی انتہاؤں پر پہنچ چکا تھا۔ باپ نے زمین بیچ دینے کا ارادہ کر لیا۔ جس جاگیر دار نے
وہ زمین گروڈی رکھی ہوئی تھی، اس نے اپنی رقم کے عوض زمین پر قبضہ کر لیا۔ نہ زمین بچی اور گروڈی زمین چھڑا
سکے۔ وہ انجینئرنگ میں نہ جاسکا۔ باپ نے اسے حوصلہ نہ ہارنے کا کہا اور آگے پڑھائی جاری رکھنے پر زور دیا۔
مجبوراً اسے یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا۔ یونیورسٹی میں ولید کے اندر جو لیڈرانہ صلاحیتیں تھیں، ان کا اظہار ہونے لگا
تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک اس کے اندر کا غصہ دوسرا، استحصالی نظام سے نفرت۔ ان دونوں طلبہ تنظیموں پر

پابندی تھی۔ طلبہ نے اپنے اظہار کے کئی دوسرے راستے نکال لئے تھے۔ مقامی جاگیردار نے پہل تو اسے اپنے
انداز میں استعمال کرنے کو شش کی، پھر باقاعدہ اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ جس کا خمیازہ ولید کو زمین چھن
جانے کی صورت میں ملا۔ یہاں تک کہ جب اس نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی تب تک وہ پورے علاقے کے
سیاسی لوگوں میں اپنی پہچان بنا چکا تھا۔ وہ ایک شعلہ جوالا تھا، جو کسی بھی وقت کہیں بھی آگ لگا سکتا تھا۔ انہی
دلوں وہ کرنل سرفراز کی نگاہ میں آ گیا۔ اس نے ولید کو حوصلہ دیا اور پڑھنے کے لئے بریڈ فورڈ یونیورسٹی بھجوا دیا۔
وہاں اس نے اپنی پڑھائی کے ساتھ کام بھی کیا۔ اس نے سیاست اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ
ساتھ پیسے بنائے اور اپنے والدین کی کفالت کرتا رہا۔ چھ سال تک وہ وہیں رہا۔ پڑھائی ختم کرنے کے فوراً بعد
اس نے وہاں رہنے کی بجائے پاکستان آنے کر ترجیح دی۔ کرنل سرفراز کی مدد اس کے ساتھ شامل تھی۔ اس نے
یہاں آتے ہی اپنا بزنس شروع کیا اور سیاست کے لئے بالکل نئی پارٹی کا انتخاب کر لیا۔ اس نے مقامی زمیندار کو
بالکل نہیں چھڑا، بلکہ اسے نظر انداز کر کے اپنی ساکھ بنانی شروع کر دی تھی۔ اسے پاکستان آئے دو برس ہو چکے
تھے۔ میں نے اسے فون کیا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔

”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا

”میں لاہور سے ابھی تھوڑی دور ہوں۔ گوجرانولہ کر اس کر آیا ہوں۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے، راوی پل پر آ کر مجھ سے رابطہ کرنا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب میں نے جنید اور اکبر کو ساتھ لیا اور نکل پڑا۔ میں ابھی راستے ہی میں تھا جب ولید کا
فون آ گیا۔ میں نے اقبال پارک میں مینار پاکستان کے پاس پہنچ جانے کو کہا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ مینار
پاکستان کے سائے میں کھڑا تھا۔ ہم اس کے قریب چلے گئے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی تصویر دیکھ چکے
تھے۔ وہ لمبے قد کا ایک متوازن اور بارع شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص کے ساتھ گہرے نیلے
رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا، جس کے اندر ہلکے نیلے کا سکارف تھا۔ علیک سلیک کے بعد ہم کچھ دیر باتیں کرتے
رہے۔ اکبر اور جنید دونوں خاموش پاس کھڑے رہے۔ میں نے اسے کہا

”ولید! مسلمانوں نے الگ وطن کا جدوجہد نہ جانے کب سے کی تھی۔ اس کے لئے بڑی قربانیاں بھی دیں۔

لیکن الگ وطن کا مطالبہ ۱۹۴۰ء میں یہاں کیا۔ مقصد کا تعین کیا اور چند برس میں الگ وطن حاصل کر لیا۔“

”جی، میں اس وقت کو بہت اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا

”تم شاید میری بات نہ سمجھ سکو۔ لیکن میں نے وہ منظر دیکھا ہے، اس وقت کے مسلمان اور آج کے مسلمان
میں فرق کیا، مجھے یہ بھی نہیں کہنا، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اسی قوم میں ایک نئی روح پھونکنی ہے۔ یہ جو
مردہ قوم ہے، اسی میں ایک نئی زندگی بیدار کرنی ہے۔“ میں نے خیالوں میں کھوئی ہوئے انداز میں کہا

”آپ کے خیال میں یہ کیسے ہوگا؟“ اس نے پوچھا

”سنو! اپنی قوم کو یہ پیغام دینا ہے کہ اس زندہ آئین کی طرف آ، جس میں زندگی ہے، زندگی کی حفاظت
ہے، زندگی کی بقا ہے۔ جو تیری عزت، فخر اور غیرت ہے۔ مردہ آئین و قوانین کو جلا دے اور زندہ آئین و قوانین
لو لے آ۔ جس آئین کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ اس اندھیرے کو جس نے تیری آنکھوں اور فکر کو اندھا کیا ہوا ہے
اس زندہ آئین و قوانین سے جلا ڈال۔ یہی مقصد اس ملک کے وجود میں آنے کا ہے۔“

”زندہ آئین و قوانین کا مطلب آپ قرآن و سنت ہی کو لے رہے ہیں نا۔“ اس نے پوچھا

”ہاں، زندہ آئین و قوانین کے علاوہ کسی دوسرے آئین و قوانین کو نہ مان۔ جس میں حکمرانوں کو استغنی حاصل ہوں اور قوم کو کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ اگر تمہیں طمانچہ لگانا ہے تو عدالت میں طمانچے کا جواب طمانچہ ہے۔ لیکن یہ ان حکمرانوں کو گوارا نہیں۔ اسی لئے کہ زندہ آئین و قوانین، زندہ کے لئے ہیں۔ مردہ سوچ کچھ قوت نہیں رکھتی۔ ٹو انیس کروڑ اور وہ چند لوگ مردہ خور۔ حکمرانوں پر کوئی آئین لاگو نہیں۔ یوں لگتا ہے عدلیہ اور انتظامیہ کو حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے والے عوامی دماغوں کا ”علاج“ کرنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔

اے نوجوان اسلام اٹھ کھڑا ہو۔ اسی اعلیٰ مقصد کے لئے۔ یہ جو وطن عزیز کی بنیادوں میں خون ہے، یہ تیرا ہی خون ہے، اور تو اُن کا خون ہے، تو جہاں بھی ہے، تعلیم میں، صحافت میں، سائنس میں، میڈیا میں، سیاست میں، ٹیکنالوجی میں، فوج میں، تو جس شعبہ زندگی میں بھی ہے۔ جہد عمل میں آجا کیونکہ عمل ہی سے ہر شے ظہور میں آتی ہے۔ تو بہت بڑی قوت ہے، یقین نہیں آتا تو تاریخ پر نظر ڈال۔ ان سلاطین کی طرف نہ دیکھ، ملا کی طرف نہ دیکھ، بیروں کی طرف نہ دیکھ، صرف اپنی طرف دیکھ، اپنے دل کی طرف دیکھ اور حق سے قوت پالے۔

”باقی نہ رہی تھ میں وہ آئین ضمیری..... اے کشتہ سلطانی، ملائی و پیری“

”جی بالکل۔“ اس نے بہت توجہ سے سنتے ہوئے کہا تو میں نے اپنی بات جاری رکھی

”کیا جہ ہے کہ ایک عام آدمی محبت دین و ملت و وطن، جو بے لوث خدمت کا عزم رکھتا ہے ہو وہ ایوان اقتدار میں کیوں نہیں پہنچ سکتا۔ انہوں نے رکاوٹیں ہی اتنی کھڑی کی ہوئی ہوئیں ہیں کہ ان کے علاوہ کوئی ان ایوانوں کے متعلق سوچ بھی نہ سکے۔ کیا ان کے علاوہ کوئی اعلیٰ دماغ نہیں جو عتبات حکومت سنبھال سکے۔ اس شیطانی کے جال کو پھاڑ ڈالو، جس طرح یہ وطن حاصل کیا تھا۔ تجھے تو اعلیٰ پیدا کیا گیا تھا اور شیطان مردود تجھے نچا دکھانے کے درپے ہے۔ تجھے محکوم و محتاجی اور غلامی میں ڈالا ہے۔

یہ جمہوریت کا راگ اپنے والے بے غیرتوں سے کوئی یہ پوچھے کہ کیا یہ دن رات سڑکوں پر بادشاہت کا تماشا نہیں ہے کہ شاہی سواریاں گزرتی ہیں تو سیکورٹی الرٹ کے نام پر سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں۔ بوڑھے، بیمار بچے، امیر غنی والے ذلیل و خوار ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، ہسپتال کی بجائے رکشوں میں بچے جتنے پر مجبور ہیں۔ کیا بات ہے ان عوامی نمائندوں کی جنہیں عوام کا احساس ہی نہیں۔ یہ عوامی جمہوریت کا تماشا ہے یا بادشاہت کا بے غیرت مظاہرہ۔ ان کا حکومت میں آنے کا مقصد سرمایہ داری، جاگیر داری، وڈیہ شاہی، غرور، تکبر، ہوسا کی کی حفاظت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تاکہ ملکی سرمایہ کو، زمین کو اور وسائل پر زیادہ سے زیادہ فتوحات کر سکیں۔ تاکہ اس پورے ملک کو اپنی جاگیر بنا لیں ان کی حسین صبحوں کو دیکھو اور ان کی رنگین شاموں کو دیکھو اور عوامی امنگوں کا قتل عام دیکھو۔“ میں نے یہ کہہ کر ایک لمحہ سانس لیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اے عشق جلوہ گر ہو، خود نمائی اور خود افزائی و خود آرائی فرما، اپنے لشکر سے سامنے آ، عقل نے حرم پاک میں بغاوت کر ڈالی ہے تو اپنے نشتر سے ان کی کھوپڑیوں سے خون فاسد نکال دے۔ عقل کو بچہ شیطانی سے آزاد کر، اسے اپنے قبضہ میں لے لے، اس کی گردنوں سے لیٹرنر نکال دے تاکہ یہ انسان بنیں اور انہیں انسان نظر آئیں۔“

وہ خاموش کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ اور میں کہتا چلا گیا۔

”قوم کو بیدار کرنے کے لئے کہو۔! یہ جو ان لوگوں نے تم پر جیتے جی موت وارد کی ہوئی ہے۔ تیری ذہنی خوبیوں کو جو جنتی تخلیق و ایجادات کی حامل ہیں اگر تو اپنی ضروریات خود پوری کرے گا تو تجھے دوسروں سے مانگنے

کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہی تیری خود داری ہے۔ لیکن یہ لوگ نہیں چاہتے کہ تو خود دار ہو جائے۔ حکومتیں اعلیٰ ذہنوں کو وسائل مہیا کرتی ہیں۔ جبکہ انہوں نے تیری ذہنی خوبیوں کے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں۔ ان کا مقصد برآمدات و درآمدات سے ٹیکس بنانا ہے۔ تو جانتا ہے کہ حرکت میں زندگی ہے اور موت سکون ہے کیونکہ یہ عمل و کردار کو روکنے والی ہے۔ زندہ بنو اور ان زنجیروں کو توڑ دو۔ زندہ بنو، حرکت میں آ جاؤ۔ اسی زندہ انقلاب کی طرف آؤ، اپنی طرف آؤ۔ دل کی طرف آؤ۔ خوداری کی طرف آؤ، پاش پاش کر دو ان رکاوٹوں کو۔

یہ جو عمری، عبدودی اور مرجی نعرہ زن ہیں، اس کے مقابل نعرہ حیدری لگا۔ جنہوں نے اس ملک کی دولت، زمین اور وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے اور زیادہ سے زیادہ پر قبضہ کے خواہاں ہیں۔ ان کے بچے ہوس سے یہ تھیاریا چھین لو۔ دین پاک کی طرف آ جاؤ، پلیدیہ کو جلا دو، مردہ تمنا کو جلا دو۔ عوام سے نفرت کرنے والے، انہی لوگوں کو ان کے خداوند افرنگ نے حریت پسندوں کے خون کے عوض یہ جاگیریں دی ہیں۔ ان حریت پسندوں کا خون ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اور آج یہ تیری امنگوں کا خون بہا رہے ہیں۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے تجھے غلام بنائے رکھیں۔ اب یہ اس ملک کے خدا بنے بیٹھے ہیں۔

جس نے تیرے ارادے پر قبضہ کیا ہوا ہے، جس نے تجھے غلامی، محکوم و محتاجی میں ڈالا ہوا ہے، وہ جانتے ہو کیا ہیں؟ سرمایہ داری، جاگیر داری، وڈیہ شاہی، ان کی غلامی سے نکل اور حق کی پناہ میں آ جا۔ یہ تجھے آزاد کرتی ہے، شیطانیہ سے، مادیت سے، ہوسا کی سے۔

دھوکا باز شیطان کے چیلوں، ہوس پرستوں نے تیری فکر اور وطن پر شب خون مارا ہوا ہے۔ اپنے اندر زندگی کی قوت کو پہچان و عقل کے ڈر اور خوف سے نکل کر عزم اور یقین لے۔ دل کی طرف آ جا۔ جہد مسلسل اور عمل پیہم کی طرف آ۔ اپنے دل سے قوت حاصل کر، عقل کو شیطان کے بچے خوئیں، شک اور ڈر سے پاک کر اور اپنے سامنے سے اس منظر کو ہٹا دے، اپنے ارادہ کو آزاد کر لے۔ تم کتنے کروڑ ہو اور یہ چند لوگ، جنہوں نے تیری فکر اور وطن پر قبضہ کر رکھا ہے۔“

میں نے اسے پیغام دے دیا۔ میں کہہ چکا تو وہ بولا

”میں نے سن لیا اور سمجھ لیا۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں یہی سبق جب چاہیں سن لیں۔“

”اور پھر چلیں۔“ میں نے کہا اور چل دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں ایک نئے دور میں داخل ہونے جا رہا ہوں۔

ولید نے علامہ اقبال ٹاؤن میں ایک گھر بنایا ہوا تھا۔ ہم وہاں چلے گئے۔ رات تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران مجھے کوئی فون نہیں ملا۔ رات پڑتے ہی ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ میں نے ولید سے اگلے دن ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

میں واپس گھر پہنچا تو فہیم نے مجھے بتایا کہ بائیا ممبئی پہنچ چکی ہے اور وہ ایئر پورٹ سے نوین کور کے ساتھ اس کے گھر کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے وود رانا کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ رامیش پاٹلے کی سیکورٹی بڑھادی گئی ہے۔ انسداد دہشت گردی کے خصوصی اسکواڈ کو الرٹ کر دیا گیا تھا اور ممبئی میں کسی بھی قسم کی دہشت گردی کو روکنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے تھے۔ پولیس کا ایک دستہ اس کے گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔

میں نے جو چیلنج رامیش پاٹلے کو دیا تھا، اس میں ابھی آٹھ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت پڑا تھا۔ لیکن اس دوران مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے ایک میل آنا تھی، اسے پڑھنے کے بعد ہی میں اگلا قدم اٹھا سکتا

رامیش پاٹلے کے راجھستان میں آبائی گاؤں جگر واس میں ہی اس کی اصل طاقت تھی۔ یہی اس کا حلقہ تھا اور یہیں ان شدت پسندوں کا گڑھ تھا۔ بذات خود وہ ان سے دور رہتا تھا کہ عام عوام کو یہ تاثر دے سکے کہ وہ ان کے خلاف ہے اور سیکور ہے، لیکن سب سے زیادہ تحفظ انہیں یہی فراہم کرتا تھا۔ وہیں ایک مندر تھا۔ جس کے ساتھ ایک بڑا سارا دھرم شالہ بنا ہوا تھا۔ اسی میں ان کی ساری پلاننگ ہوتی تھی۔ اس وقت اس دھرم شالے میں چند لوگوں کی میٹنگ جاری تھی۔ ان پر میری دھمکی کا اثر ہو گیا ہوا تھا۔ وہ بے بس تھے کیونکہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ دھمکی آئی کس طرف سے ہے۔ وہ رامیش پاٹلے کو گاؤں آنے کا کہہ چکے تھے مگر وہ خود کو ممبئی میں زیادہ محفوظ تصور کر رہا تھا۔ انہوں نے گاؤں سے بندے بھی بھجوا دیئے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ رامیش پاٹلے انہیں مدد کو کہے تو وہ اس کی مدد کر سکیں۔ لیکن خاموشی کے باعث وہ لوگوں کی کیفیت میں تھے۔

یہ سب کچھ وہاں پر موجود میری آنکھیں اور کان دیکھ اور سن رہے تھے۔ یہ سیٹ اپ بنانے میں مجھے بڑی محنت اور صبر کرنا پڑا تھا اور میں نے اپنے طور پر یہ کام کر لیا تھا۔ وہ میرے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ میں کب انہیں کہوں اور وہ اپنا کام شروع کر دیں۔ میں اس پر کاری ضرب لگانے کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔

جگر واس میں میرے بھیجے ہوئے لوگ پہنچ چکے تھے اور ان کا میرے ساتھ مکمل رابطہ تھا۔ وہ سارے کے سارے پولیس یونٹ فارم میں تھے۔ وہاں کی مقامی پولیس کو جو احکامات ملے تھے، ان کے بارے میں راجھستان کی پولیس کو علم ہی نہیں تھا۔ وہ سب غیر پولیس والوں کی طرف سے اصل نمبروں سے احکامات جاری کئے گئے تھے۔ انہوں نے یہ تصدیق کر لی ہوئی تھی کہ جگر واس چھکی اور اس کے قریبی شہر اندور کی پولیس رامیش پاٹلے کے لوگوں کی بے دام غلام تھی۔

میرے لوگ سیدھے اس دھرم شالہ کے مہا پجاری کے پاس پہنچے۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر یہی بتایا کہ وہ لوگ رامیش پاٹلے کی حفاظت کے لئے بھجوائے گئے ہیں۔ اس پر دھرم شالہ کے مہا پجاری نے یہ سوال کیا ”رامیش پاٹلے کی حفاظت کے لئے یہاں کیوں آپہنچے ہو؟ وہ تو ممبئی میں بھائی اس وقت؟“

جس پر میرے لوگوں نے انہیں جواب دیا ”رامیش پاٹلے کسی بھی وقت یہاں آ سکتے ہیں۔ ابھی ان کی طرف سے اطلاع آ جائے گی۔ ان کی آمد یہاں خفیہ رکھی جا رہی ہے۔ چاہیں تو تصدیق کر لیں۔“

”آپ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ مہا پجاری نے پوچھا ”اس لئے کہ ایک آپ ہی ہیں جو ہماری یہاں مدد کر سکتے ہیں۔ تاکہ ہم یہاں بہترین حفاظتی انتظامات کر سکیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

انہوں نے اتنا بڑا رسک یونٹی نہیں لیا تھا۔ مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ رامیش پاٹلے ممبئی چھوڑ کر جگر واس کے لئے نکلنے والا ہے۔ حکومت اور سیکورٹی اداروں نے تو اس وہیں رہنے کا کہا تھا، اور اسے پورا تحفظ دینے کے لئے سیکورٹی بھی لگا دی تھی۔ مگر اس کے اپنے لوگوں، خاص طور پر ہندو راشٹریہ والوں نے اسے ایک دو دن چھپ جانے کو کہا تھا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ اگر اسے استعفیٰ بھی دینا پڑا تو وہ ممبئی میں اس حیثیت سے نہیں رہ پائے گا۔ حکومت اسے اتنا تحفظ نہیں دے سکے گی۔ پھر بھی تو اسے جگر واس آنا ہی ہے۔ عام عوام سے یہی کہا جاتا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور وہ ڈاکٹروں کے مشورے پر آرام کر رہا ہے، لیکن وہ گھر میں ہو گا ہی

نہیں۔ رات کے آخری پہرہ فیصلہ ہوا۔ تبھی رامیش پاٹلے نے جگر واس جانے کا عندیہ دے دیا۔

مہا پجاری نے اس بات کی تصدیق اپنے لوگوں سے کر لی کہ رامیش پاٹلے وہیں آ رہا ہے تو اس نے ان لوگوں کو وہاں حفاظتی اقدامات کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ تیزی سے اپنا کام کرنے لگے۔

اردو سنگھ نے اس کے خفیہ فون تک رسائی حاصل کر لی ہوئی تھی۔ جس میں یہ سارا پلان کیا گیا تھا۔ مجھے لگا کہ جہاں وہ خود کو زیادہ محفوظ تصور کر رہا ہے، وہاں ہی اسے شکار کیا جائے۔ اس وقت سورج نکل رہا تھا، جس وقت میں جہاں سے بات کر رہا تھا، ایسے ہی وقت وہ اپنی بلٹ پروف کار میں گھر سے نکل رہا تھا۔ میں نے یہ خبر دودو رانا کو اس حد تک دے دی کہ وہ نکل رہا ہے اور اس نے ممبئی شہر کی سہانی بلڈنگ سے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر اڑنا ہے اور اپنے شہر اندور میں اترتا ہے۔ وہاں سے خفیہ طور پر اس نے جگر واس پہنچ جانا ہے۔ میں نے اس کے گھر سے لیکر جگر واس تک، سبھی جگہوں پر لوگ بٹھا دیئے، جہاں بھی وہ قابو آیا، وہیں اس کو پکڑ لیں گے۔ دودو رانا اور بائیا کور کا آپس میں رابطہ ہو گیا تھا۔ دودو رانا نے جو پلان بنایا تھا، وہ بائیا کور سمجھ چکی تھی اور اس کے لئے پوری طرح تیار تھی۔

وہ میرے لئے بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ میرے ساتھ بہت سارے لوگ جڑ گئے ہوئے تھے۔ ہم سبھی رابطے میں تھے۔ ایک جگہ ہونے والی بات دوسری جگہ پر سنی جا سکتی تھی۔ دن کی روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔ بائیا کور اور دودو رانا کے ساتھ دو بہترین لوگ تھے جو فائیر اور شوٹر بھی تھے، ان میں ایک پائلٹ بھی تھا۔ وہ چاروں اسی بلڈنگ کی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ رامیش پاٹلے نے چونکہ وہاں سے فرار انتہائی حد تک خفیہ رکھا ہوا تھا، یہاں تک کہ ہائی آفیشل میں چند لوگ ہی جانتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں کا چھت تک پہنچ جانا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ جیسے ہی وہ چھت پر پہنچے، وہاں ہیلی کاپٹر تیار تھا۔ ان کے چھت پر آتے ہی وہاں کے چیف سیکورٹی گارڈ نے انہیں روکتے ہوئے انتہائی غصے میں پوچھا

”کون ہو تم لوگ، اور یہاں کس لئے آئے ہو؟“

”جس شخصیت نے یہاں سے اڑنا بھرنی ہے، میں اس کو بحفاظت یہاں سے بھیجنے کے لئے آ ہا ہوں، میں چاہوں تو تمہیں بھی یہاں سے بھگا سکتا ہوں۔“ دودو رانا نے اپنا اصلی کارڈ اسے دکھاتے اور جعلی نام بتاتے ہوئے سکون سے کہا۔ اتنی دور سے وہ گارڈ اس کا نام کیا پڑھ سکتا تھا، صرف تصویر تھی جو اس نے ایک نگاہ دیکھی۔

”مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے؟“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو دودو رانا بولا

”رامیش پاٹلے سے میری بات کراؤ، میں تمہیں وہ نام بتانے کا پابند نہیں ہوں، جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ رامیش پاٹلے نیچے آ چکے ہیں۔ باقی تمہاری خود ذمہ داری ہوگی۔“

”اوکے میں بات کرنا ہوں۔“ چیف سیکورٹی گارڈ نے کہا اور نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کے گارڈ سے بات ہو گئی۔ اسپیکر آن تھا۔ چند لمحوں بعد رامیش پاٹلے لائین پر تھا۔ دودو نے اس سے فون لیا اور ذرا دور جا کر اس ہائی آفیشل کا نام لے لیا کہ یہاں سے بحفاظت بھیجنے کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ وہ مان گیا۔ دودو رانا نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

رامیش پاٹلے چھت کی طرف آ رہا تھا۔ اس دوران بائیا کور ہر طرف کا جائزہ لے چکی تھی۔ ہیلی کاپٹر میں پائلٹ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف چار سیاہ پوش سیکورٹی گارڈ گنیں لئے الٹ کھڑے تھے۔ ان سے دور

چیف سیکورٹی گارڈ تھا۔ رامیش پاٹے کے ساتھ کتنے لوگ آنے والے تھے، یہ انہیں نہیں معلوم تھا۔ تبھی چھت پر آنے والے دروازے میں رامیش پاٹے نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دو گارڈ تھے، جو اس کے ذاتی تھے، ان کے پیچھے دو فضائی کہنی کے گارڈ تھے۔ نوڈرانا تیزی سے آگے بڑھا۔ ممبئی میں رہتے ہوئے رامیش اور نوڈو کی بہت ساری ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ رامیش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تب تک نوڈرانا نے اسے سیلوٹ مار دیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا

”سر! مجھے آپ کو یہاں سے بحفاظت بھیجنے کا حکم ہوا ہے اور میں پوری تیاری سے آیا ہوں۔“

”اوہ! آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ یہاں سے اڑان بھرنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد میں جگر واس ہوں گا۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا

”وہ تو سر ٹھیک ہے، لیکن آپ کے ساتھ کمال کے لوگ ہوں گے۔ وہ آپ کو.....“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو نوڈو ایک دم سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بائیکاٹ کو اشارہ کیا، وہ دونوں پستل لئے ایک ساتھ ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھے۔ اس کے دو سیکورٹی گارڈ آگے بڑھ کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے تو رامیش پاٹے ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نوڈرانا نے اسے سیلوٹ کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ہیلی کاپٹر اڑنے کو تیار ہو گیا۔ اگلے چند منٹ بعد وہ فضا میں تھا۔

ہیلی کاپٹر کا رخ ممبئی سے اندور کی طرف تھا۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر اڑا رہا تھا۔ اس کا رابطہ اپنے کنٹرول ٹاور سے تھا۔ رامیش پاٹے اس کے پیچھے کی نشست پر بیٹھا تھا اور اس کے ذاتی گارڈ اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی پیچھے درمیان میں بائیکاٹ کور اور دائیں بائیں وہ دونوں لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر شہر سے باہر ہوا، بائیکاٹ کور کے اشارے پر پیچھے بیٹھے دونوں لڑکوں نے آگے بیٹھے گارڈوں کے سر پر پستل کی نال رکھی اور ٹرائیگر دبا دیا۔ پتہ ہی اس وقت لگا، جب وہ دونوں ہی لڑھک گئے۔ رامیش پاٹے کے منہ سے ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس نے پائلٹ کے سر پر گن رکھتے ہوئے کنٹرول ٹاور سے رابطہ منقطع کر دیا۔ تاکہ یہاں کی کوئی آواز باہر نہ جاسکے۔ تبھی بائیکاٹ کور نے کہا

”پائلٹ، تم اسی طرح اڑتے رہو، جیسا میں کہوں۔ ورنہ تم بھی ان کی طرح مر سکتے ہو اور جان لو کہ ہمارے ساتھ یہ پائلٹ ہے۔“

”لیس، جیسا آپ کہو۔“ پائلٹ نے جواب دیا

”تو پہلے ایک چکر لگاؤ اور سمندر پر لے چلو۔“ بائیکاٹ کور نے حکم دیا۔ تب رامیش پاٹے نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

”ابھی بتاتے ہیں، اتنی جلدی کا ہے کی ہے بابو۔“ بائیکاٹ کور نے انتہائی طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

کچھ ہی منٹ بعد وہ ممبئی کے جنوبی ساحل تک جا پہنچے۔ ہیلی کاپٹر نیلے سمندر پر اڑتا رہا۔ اسی دوران ایک لڑکا آگے جا بیٹھا اور دوسرا رامیش پاٹے کو باندھنے لگا۔ تب تک بائیکاٹ کور نے پائلٹ کو واپس پلٹنے کا کہا۔ تبھی رامیش پاٹے نے پھر پوچھا

”کون ہو تم لوگ؟“

”ارے بوا، بتاتے ہیں، کاہے کو شور مچاوت ہو۔“ وہ پھر اسی لہجے میں بولی۔

سمندر کا گہرا پانی آچکا تھا۔ دور دور تک کوئی جہاز یا ایسا کچھ نہیں تھا، سوائے ایک اسٹیمر کے۔ پائلٹ کو ہدایت دی جانے لگی کہ اس اسٹیمر تک لے جایا جائے۔ وہ عین اس کے اوپر لے گیا اور وہیں روک دیا۔ تبھی ایک نے پائلٹ کو نیچے اترنے کو کہا۔ سیزھی لگ چکی تھی۔ وہ آرام سے نیچے اتر گیا۔ پھر رامیش پاٹے کو اتار جانے لگا۔ پھر دوسرے کے ساتھ بائیکاٹ کور بھی اتر آئی۔ تو ہیلی کاپٹر آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے پہلے والا لڑکا ہیلی کاپٹر سے سمندر میں کود گیا۔ اسٹیمر پر چند لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اسے بچانے کے لئے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ تبھی کچھ فاصلے پر جا کر ہیلی کاپٹر ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ اس کے پرزے پرزے ہو کر سمندر میں گر گئے۔ جس وقت ہیلی کاپٹر کا نام و نشان تک نہ رہا تب بائیکاٹ کور نے اونچی آواز میں کہا

”اے پائلٹ! تجھے ہم نے اس لئے بچایا ہے کہ تم نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور ہماری بات مانی۔ اسی طرح ماننے رہو گے تو یہ وعدہ ہے، تمہیں واپس مجھوا دیں گے، ورنہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے سمندر کی جانب اشارہ کیا۔ پائلٹ نے کانڈھے اچکاتے ہوئے کہا

”مجھے آپ پر یقین ہے۔“

”تو جاؤ پھر آرام کرو۔“ اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گیا تو اس نے رامیش پاٹے کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”تم بھی چلو، تم سے تو بڑی باتیں کرنی ہیں۔“

بائیکاٹ کور اسے لے کر اندر چلی گئی۔ اسی وقت وہ پہلا کودنے والا لڑکا، اسٹیمر سے چھلانگ لگانے والوں کے ساتھ اسٹیمر پر آ گیا۔

جس وقت رامیش پاٹے فضا میں تھا، اسی وقت میں نے جگر واس میں موجود لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں۔ انہیں وہاں سے نکلنے میں دس سے پندرہ منٹ درکار تھے۔ لیکن رامیش پاٹے کی وہاں پہنچنے کی اطلاع پر دھرم شالے میں وہ سارے لوگ وہاں آنے لگے تھے جو اس کے قریبی تھے۔ جنہوں نے یہ سارا پلان کیا تھا۔ ان میں وہی لوگ تھے، جو ہندو راشٹریہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کا یہاں اکٹھے ہونے کا مقصد ہی یہی تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے؟ ان لوگوں کو تلاش کیا جائے کہ یہ کون ہیں؟ نیا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ جس وقت ہیلی کاپٹر فضا میں پھٹا، اس وقت وہ کافی تعداد میں وہاں پہنچ چکے تھے۔ میرے لوگوں نے بہانہ بنایا کہ وہ رامیش پاٹے کو گاؤں سے باہر پوری سیکورٹی کے ساتھ یہاں تک لائیں گے۔ اس لئے وہ وہاں سے نکل گئے۔ دھرم شالہ والوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اسٹیمر کے اندر بے کمرے میں رامیش پاٹے بندھا ہوا پڑا تھا۔ بائیکاٹ کور کے پیچھے دوسرا لڑکا کھڑا تھا اسٹیمر کا عملہ باہر تھا۔ بائیکاٹ کور میرے ساتھ رابطے میں تھی۔ اس نے فون رامیش پاٹے کے سامنے رکھ کر اسٹیکر آن کر دیا۔

”بولور رامیش پاٹے۔! چوبیس گھنٹے پورے ہونے میں ابھی کتنا وقت ہے؟“

”اوہ، تو یہ تم ہو؟“ اس نے چونکتے ہوئے کہا

”ہاں، میں، جس طرح تم نے مجھے میرے گاؤں سے اٹھایا تھا اور ایک جزیرے پر لا پھینکا تھا، وہ ایک انتہائی اعفانہ پلان لگتا تھا، لیکن میں مانتا ہوں تم نے بڑی ذہانت دکھائی تھی۔ ان سب لوگوں کو ممبئی حملے کا مجرم ظاہر کر کے اپنے لوگوں کو صاف بچا جاتے، تمہاری طرف کسی کا دھیان ہی نہ جاتا۔“ میں نے انتہائی سکون سے کہا

”اب کیا چاہتے ہو؟“ اس نے ایک بارے ہوئے جواہری کی طرح پوچھا
”جنگیت بھر بھرے کا قاتل، تو اس وقت جیل میں ہے۔ وہ لوگ اسے بھی ظاہر نہیں کریں گے۔ وہ اسے مار
دیں گے۔ اس کی صورت کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ میں تمہیں کب کا مار سکتا تھا، لیکن! میں تمہاری اصل طاقت کو ختم
کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا

”میں ہندو ہوں، کیا مجھے حق حاصل نہیں کہ میں ہندو راشٹریہ بنا لوں، جس طرح تم لوگوں نے اپنا الگ وطن
بنا لیا ہے۔“ اس نے سوال کیا

”بناؤ، مگر دلیل سے، غنڈہ گردی اور دہشت گردی سے نہیں۔ سکھوں کو بھی حق دو کہ وہ اپنا خالصتان بنالیں۔
بے گناہ لوگوں کے خون پر حکومت کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا ہے؟“ میں نے کہا

”ہمارے اپنے فلسفے ہیں۔“ اس نے کہا

”تو پھر اپنے ہی فلسفے کے انوسار، مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں اگر مر بھی جاؤں تو کوئی بات نہیں۔ اور بہت سارے لوگ ہیں۔ کس کس کو روکو گے؟“

”جہاں تک ممکن ہوا، میں روکوں گا اور تیرے ساتھ والوں کا حال کیا ہوگا، وہ بھی دیکھ لینا۔ باغیا ابھی فون بند
کر دو۔“ میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ باغیا کور نے فون اٹھا کر اسٹیکر بند کیا اور مجھ سے پوچھا
”اب بولو۔“

”پہلے وہ کام کرو جو تم سے کہا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ اس نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے بیک
میں سے ایک بم نکالا اور رامیش پاٹل کے جسم سے باندھ دیا۔ جب وہ یہ کام مکمل کر چکا تو باغیا کور نے مجھے
بتایا، تو میں نے کہا، ”اور اب اپنے لوگوں کو لے کر باہر آؤ۔ ایک چھوٹا جہاز تمہیں لینے کے لئے آرہا ہے۔“ وہ
باہر نکل گئی۔

”لیکن ان لوگوں کو ایسی ہی چھوڑ دینا ہے؟“ اس نے پوچھا

”بالکل نہیں، بس تم دیکھتی جاؤ۔ اس جہاز میں بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اسے کہا تو تیزی سے بولی

”ہاں مجھے جہاز نظر آرہا ہے۔“

”اب اس میں جاؤ۔“ میں نے کہا

”وہ جب تک آتا ہے، تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ درانا کا کیا بنا، وہ تو پکڑا جائے گا۔ اس سارے کھیل میں اس کی
قربانی کیوں دی گئی؟“ باغیا کور نے افسوس بھرے لہجے میں کہا

”اسے کچھ نہیں ہوگا، وہ بالکل محفوظ ہے۔“ میں نے اسے بتایا تو باغیا کور کے منہ سے بے ساختہ نکلا
”گڈ۔ مگر وہ کیسے.....؟“

”جی میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”جہاز کتنی دور ہے؟“

”بس قریب ہے۔ ہم نے لائف جیکٹ پہن لی ہے، اور کشتی سے اس طرف جانے والے ہیں۔“ اس نے
میری بات سمجھتے ہوئے اصرار نہ کرتے ہوئے بتایا تو میں نے کہا

”اپنا یہ فون اسٹیکر کے کپتان کو دے دو اور بس جلدی پہنچو، مجھے دوسرے کام بھی کرنے ہیں۔ فوراً۔“

باغیا کور اور وہ دونوں لڑکے، کشتی میں بیٹھے اور جہاز کی جانب چل دیے۔ جب تک وہ جہاز میں نہیں پہنچ گئے،

میں ان کے ساتھ رہا۔ میرے ساتھ جڑے ہوئے لوگ سب سن رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ وہ کام کر رہے
تھے۔ جس وقت جہاز کئی ٹائیکل میل دور چلا گیا تو میں نے کپتان سے کہا۔

”دیکھو! میں نہیں چاہتا کہ تم اور تمہارے آدمی ماریں جائیں۔ تمہیں بھی پتا ہے، اور اس پائلٹ کو بھی پتا
ہے۔“

”جی میں سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا

”اگر تم نے ایک ذرا سی بھی غلطی کی تو نہ تم بچ سکو گے اور نہ تمہارے لوگ۔ اس لئے جیسا کہا گیا ہے ویسا
ہی کرنا ہے۔ ساری اطلاع دینے کے بعد یہ اسٹیکر چھوڑ دینا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ میں نے کہا

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ اس نے کہا

”اب میں تمہیں کال نہیں کروں گا۔ یہ فون بے کار ہے اسے سمندر میں پھینک دو۔“ میں نے کہا

”اوکے۔“ اس نے کہا، پھر سائیکس سائیکس کی آواز آئی اور فون ڈیڈ ہو گیا۔

”بندہ سمجھدار لگتا ہے ورنہ یہ فون بہت بڑا رسک تھا، اس سے وہ بہت کچھ سمجھ سکتے تھے اور ہمیں سارا سیٹ
اپ بدلنا پڑتا۔“ اروند اچانک بولا

”نہ سمجھتا تو دوسرا آپشن ہے۔ اس میں فون ضائع ہو جاتا اور اسے بھی سزا مل جاتی۔ خیر کون ہے لائین پر؟“
میں نے اروند سے پوچھا

”وہی ہائی آفیشل، جس نے رامیش پاٹل کو جگر واس جانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ انہی میں سے ایک ہے
۔“ اس نے فوراً جواب دیا

”بات کراؤ۔“ میں نے کہا تو چند سیکنڈ کے بعد دوسری طرف وہ ہائی آفیشل تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا

”کون بات کرنا چاہتا ہے اور تم کون ہو۔“

”میں بتاتا ہوں، سن لو گے تو تمہاری ہوا خارج ہو جائے گی۔ ممکن ہے تمہاری پینٹ بھی گیلی ہو جائے۔“

”کون ہو تم اور کیا بات ہے؟“ اس نے کافی حد تک سنجیدہ لہجے میں یوں پوچھا جیسے اسے حیرت ہو۔

”تم نے تو رامیش پاٹل کو جگر واس بھیجا تھا، لیکن پتہ ہے، وہ کہاں ہے؟“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے
گھبراتے ہوئے بولا

”کک..... کک..... کیا مطلب؟“

”پتہ کرو اس کا، نہ پتہ چلے تو مجھ سے پوچھ لینا۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ اس نے حیرت سے کہا

”احقانہ سوال مت کرو اور پتہ کرو۔ میں لائین پر ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے فون رکھ کر دوسرے فون
سے کسی کو کال کر کے پوچھا۔ تین چار منٹ بعد اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا

”کہاں ہے وہ؟“

”وہ اس وقت میرے قبضے میں ہے اور اس کے مرنے میں ابھی ایک گھنٹہ پڑا ہے۔ تلاش کر سکتے ہو تو کرلو۔
ایک گھنٹہ۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

سب کے ساتھ ہونے کے باوجود میری توجہ تین طرف تھی۔ باغیا کور کو بحفاظت کسی محفوظ مقام تک لے جانا
تھا۔ اس کی ذمہ داری کراچی میں بیٹھے سلمان نے لے لی۔ وہ اس کی گمرانی کرنے لگا۔ دوسری طرف جگر واس

سے سارے لوگ نکل کر اپنی اپنی محفوظ پناہ گاہوں کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری پولیس کی وردیاں اتار کر ایک جگہ رکھ کر آگ لگا دی تھی۔ لیکن دھرم شالے میں موجود لوگوں کو وہیں تک محدود کرنا تھا کہ وہ اگلے بیس منٹ تک وہیں بیٹھے رہیں۔ یہ فیہیم نے اپنے ذمے لے لیا۔ وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ میں ارونڈ سنگھ کے ساتھ لگ گیا۔

اسٹیر کے کپتان سے ساری بات ہو چکی تھی۔ اگرچہ اسے بھاری رقم دے کر اس کام کے لئے آمادہ کیا گیا تھا۔ لیکن اسے اپنا آپ بھی بچانا تھا۔ اس لئے اسے ایک کہانی دے دی گئی ہوئی تھی۔ وہ کہانی یہ تھی کہ چند لوگوں نے اس کے پرپوار کو اغوا کر لیا ہوا تھا اور گن پوائنٹ پر گہرے پانی کی طرف لے آئے تھے۔ پھر سب کچھ وہی تھا جو اس کے سامنے ہوا تھا۔ وہ لوگ کدھر گئے؟ یہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ اب جبکہ وہ چلے گئے ہیں تو وہ اطلاع دے رہا ہے۔

اس کپتان نے اپنے لوگوں کو اطلاع دی، جو چند منٹوں میں ہائی آفیشل تک پہنچ گئی۔ جس وقت وہ اطلاع پا چکا تو میں نے ارونڈ کے ذریعے اسے کال کر دی۔

”مل گیا وہ تمہارا رامیش پاٹل؟“ اور میں جانتا ہوں کہ اب تم لوگوں کی ہمت نہیں پڑ رہی ہوگی کہ اسے جا کر بچا سکو۔“ میں نے انتہائی طنز سے کہا

”تم ہمیں مس گا بیڑ کر رہے ہو۔“ اس نے کہا تو میں طنزیہ لہجے میں بولا

”تم لوگوں میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے، اسے بچا پاؤ۔ میں تمہیں آدھا گھنٹہ دے رہا ہوں نا، اب آدھے گھنٹے بعد ہی فون کروں گا، لیکن اس وقت تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔“ میں گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، صرف دو منٹ رہتے تھے۔ مجھے اس سے مزید ایک دو باتیں کرنا تھیں۔ اس لئے بولا

”دیکھ، میں تمہارے جس فون پر بات کر رہا ہوں، مجھے پتہ ہے یہ بہت ساری جگہوں پر سنا جا رہا ہے۔ تم کچھ نہ بھی کہنا چاہو، تو بھی میرا پیغام پہنچ گیا ہوگا۔ تمہاری ساری مشینری حرکت میں آگئی ہوگی۔ میرا فون تلاش کیا جا رہا ہوگا اور رامیش پاٹل کے کو تلاش کرنے کی تک دو شروع ہو گئی ہوگی۔ صرف ایک منٹ بچا ہے تمہیں تحفہ دینے کو۔ اس کے بعد تم لوگوں کو میری بات کا یقین آئے گا۔ اور افسوس کرو گے کہ پہلے ہی میری بات کیوں نہیں مان لی گئی۔“

”کیا ہے ایک منٹ کے بعد؟“

”رامیش پاٹل کے گاؤں بارے پتہ کرو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سامنے اسکرین پر جگر واس گاؤں کے اس دھرم شالہ کا منظر تھا۔ وہاں جانے والے لوگوں نے ایک کیمرو وہاں لگایا تھا جہاں سے اس دھرم شالہ کی پوری عمارت دکھائی دیتی تھی، جس میں بیٹھ کر یہ منصوبہ سازی ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو کتنا اور کس حد نقصان پہنچانا ہے؟ مایگاؤں بم دھماکہ، سمجھوتہ ایکسپریس جیسے بم دھماکے یہیں بیٹھ کر طے ہوئے تھے۔ یہ اطلاع تھی کہ وہ لوگ، جو رامیش پاٹل کے منتظر تھے ابھی اندر ہی ہیں۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ وہ اغوا ہو گیا ہے اور اس کا کہیں پتہ نہیں چل رہا۔ وہاں کھلبلی مچ گئی۔ وہ مختلف جگہوں پر فون کرنے لگے۔ وہ سب مہا بھاری سمیت وہیں تھے۔ اسی لمحے ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس عمارت سے دھواں اور شعلے بلند ہوئے۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد چند مختلف جگہوں پر دھماکے ہوئے۔ میں وہاں کی آواز نہیں سن پایا تھا۔ لیکن پورا منظر میرے سامنے تھا۔

”بند کر دو اور بھول جاؤ کہ یہاں کبھی کچھ ہوا تھا۔“ میں نے کہا تو نہ جانے فیہیم نے یا کسی نے بھی وہ منظر اسکرین سے ختم کر دیا۔ اس کی جگہ ارونڈ، فیہیم اور زویا سامنے آ گئے۔

”کیا رامیش پاٹل زندہ رہے گا؟“ مہوش نے پوچھا تو ارونڈ بولا

”نہیں، انہیں اُس اسٹیر کا پتہ چل گیا ہے وہ لوگ پوری قوت کے ساتھ اس جانب بڑھ رہے ہیں۔“

”تو پھر؟“ اس نے پوچھا

”اس اسٹیر کا بھی یہی حال ہوگا۔“ ارونڈ نے کہا

”دس منٹ رہ گئے ہیں۔“ مہوش بولی

”ہائی آفیشل سے ہاٹ لائن پر جو بات ہو رہی ہے، میں وہ سن رہا ہوں۔“ ارونڈ نے کہا اور فون کال سنانے لگا۔ اس میں یہی بتایا جا رہا تھا کہ اسٹیر کے کپتان سے بات کر کے انہوں نے صورت حال معلوم کی تھی۔ رامیش پاٹل وہیں ہی تھا۔ پہلی کا پڑ اس اسٹیر تک پہنچ رہے تھے۔ جبکہ کپتان چیخ رہا تھا کہ رامیش پاٹل کے ساتھ جو بم باندھا گیا ہے، اس کے پھٹنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ انہوں نے کپتان کو اسے کھولنے اور واپس مڑنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ لیکن کپتان نے کہا کہ وہ یہ رسک نہیں لے سکتا۔ اس لئے وہ سب لوگوں کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس نے باقی لائف بوٹ لیں، ان میں پائلٹ سمیت اپنے بندے بٹھائے اور سمندر میں اتر گیا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بالکل آخری منٹ پر وہ سب اسٹیر سے کافی فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ انہیں پوری امید تھی کہ وہ بچ کر واپس چلے جائیں گے۔ دو پہلی کا پڑ اسٹیر کے اوپر آ چکے تھے۔ ان سے سیڑھیاں نیچے اتر آئیں تھیں۔ ایسے میں ایک زبردست بم دھماکہ ہوا۔ جس کا ارتعاش لائف بوٹ تک بھی پہنچا۔ جو لوگ عرشے پر اتر چکے تھے۔ ان کا پتہ نہیں چلا۔ اسٹیر کو آگ لگ گئی۔ رامیش پاٹل کے اکہیں پتہ نہ چلا۔ ہاٹ لائن پر یہ سب بتایا جا رہا تھا۔ اور ہم سب سن رہے تھے۔

”اروند کال ملاؤ۔“ میں نے کہا تو چند لمحوں میں کال ملا دی گئی۔ اسی ہائی آفیشل نے کال رسیو کی۔ ”بس اتنا ہی کہنا ہے، اب اگر کوئی منصوبہ بناؤ تو یہ سوچ لینا اس کی کتنی قیمت چکانا ہوگی۔ میں پھر بات کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ ہم سب میں خاموشی پھیل چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس وقت دن کے دس بج چکے تھے۔ موسم کافی خشک تھا۔ سورج اور بادلوں کی آنکھ چھوٹی چل رہی تھی۔ ہوا اتنی تیز نہیں تھی۔ ایسے میں ہر پریت کور جب تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی تو سیدھی جہاں سنگھ کے دل میں اتر گئی۔ ہر پریت نے نیوی بلیوسوٹ پہنا ہوا تھا، جس پر سفید دھماکے کی کڑھائی تھی۔ بڑا سارا آئینہ گلے میں تھا۔ ہال سنوار کر چوٹی باندھی ہوئی تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ اسے جاذب نظر بنا رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟“ ہر پریت نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ کوئی عورت اپنے سامنے کھڑے ہوئے مرد کی نگاہوں میں موجود پیغام کو نہ پڑھ لے۔

”میں سوچ رہا ہوں۔ آج کے دن کم از کم ہمیں بالکل اکیلے، کہیں دور تنہا ہونا چاہئے۔“ جہاں نے کہا

”مثلاً، کہاں؟“ وہ شوشی سے بولی

”کسی بیچ پر سمندر کنارے، کسی ویران جنگل میں یا پھر کسی پہاڑی مقام پر، جہاں صرف ہم دونوں ہوں۔“

اس نے بھی شوشی سے کہا تو وہ تصور میں کھو جانے والے لہجے میں دھم سے بولی

”اب یہ مت کہنا کہ کہوں گی کہ کاش ہم وہاں ہوں، اصل میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے، ہمیں گردوارے جانا ہے، جہاں سب لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔“

اس پر جہال نے اسے چونک کر دیکھا اور پھر غمت زدہ لہجے میں بولا
”یار کیسی محبوبہ ہو تم، خواب میں بھی حقیقت کی تلخی ملا دیتی ہو۔“ پھر ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولا،
”چلو، مہارانی جی چلیں۔“

”اُداس نہ ہو یار، یہ خواب ہم فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تا تو دیکھ لیں گے۔“ ہر پریت نے کہا تو جہال نے قہقہہ لگا دیا۔ دونوں خوشگوار موڑ میں پوریج میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

جیسے ہی جہال کی طرف سے اسے اوگی میں رہنے کو کہا گیا تھا، اسی وقت اس نے پتہ کیا کہ اگر اوگی پنڈ میں کسی کا بھی کوئی نقص ہو، کسی کا ارداس ہو، اگر وہ ہے، تو ٹھیک، ورنہ وہ خود ارداس رکھ لیتے ہیں۔ فوراً ارداس رکھنے کے بارے میں اگر کوئی پوچھ بھی لے تو کہہ سکتا ہے کہ رات مجھے بڑا بمیاں خواب آیا تھا، اس لئے رکھ لیا ارداس، کوئی منع نہیں کر سکتا تھا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہو گیا کہ اوگی پنڈ کے ہی خاندان نے گردوارے میں ارداس رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہیں جانے کا پروگرام بنالیا۔ پھر دو پہر تک پنڈ میں رہنے کا سوچا اور نکل آئے تھے۔ گردوارے میں بہت سارے سکھ جمع تھے، کئی لوگ آ بھی رہے تھے۔ گرنہ صاحب کا پاٹھ کیا جا رہا تھا۔ وہ

دونوں بھی جا کر بیٹھ گئے۔ ہر پریت عورتوں کی طرف اور جہال مرد حضرات کی جانب۔ تقریباً دس بجے کے قریب وہ ارداس ختم ہوا تو ننگر شروع ہو گیا۔ گیارہ بجے تک وہ گردوارے سے نکل آئے تھے۔ ان کا رخ سردار ہلیر سنگھ پنچ کے گھر کی طرف تھا۔ وہاں کچھ دیر وقت گزارنے کے بعد وہ پنڈ کی مختلف جگہوں کو دیکھنے کے لئے نکل پڑے، تاکہ جو مسئلہ مسائل ہو اس کے بارے میں جانکاری مل جائے۔ اصل مقصد یہی تھا کہ لوگوں کے درمیان رہا جائے۔ دو پہر دو بجے تک وہ اسی میں مصروف رہے، پھر وہ واپس گھر لوٹ آئے۔

جس وقت جہال اپنے کمرے میں جا کر فریش ہوا تو ہر پریت چائے لیکر اس کے پاس جا پہنچی۔ اس نے چائے کا ٹرے بیڈ پر رکھا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ جہال اس کے سامنے آ بیٹھا تو ہر پریت نے پوچھا
”یہ سارا ڈرامہ کس لئے تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم، یہ جہال نے کہا تھا۔“ اس نے جواب دیا

”پھر پوچھو، اس سے کیا بات تھی۔“ ہر پریت نے چائے کی چسکی لے کر کہا

”میں تو نہیں پوچھتا۔ بات ہوئی تو کوئی نہ کوئی کام نکل آئے گا، اور مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔ آئیل مجھے مار، نہیں، مجھے تمہارے ساتھ کافی وقت گزارنا ہے۔ جب اسے ضرورت ہوگی تو وہ خود کال کر لے گا۔“

”چلو یہ تو اچھا ہوا۔“ ہر پریت نے شوخ ہوتے ہوئے کہا اور پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولی، ”چل، اب خواب دیکھ، میں بھی دیکھتی ہوں۔“

”دن کے وقت خواب نہیں دیکھے جاتے۔ رات کو سہی۔“ اس نے بھی ویسے ہی جواب دیا تو ہر پریت قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر بولی

”آج اوگی میں شادی بھی ہے۔ ”جاگو“ ہوگی، چلیں گے، بڑا مزہ رہے گا۔ لوگوں میں بھی رہیں گے۔“

”چل ٹھیک ہے ڈن۔“ جہال نے کہا تو وہ نہال ہو گئی۔ یہ دن اس کے لئے انتہائی خوشی کے دن تھے۔ اس وقت بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ وہ بندہ آ گیا جسے اس نے مناسکریجھا تھا تاکہ جوگی کے بارے میں پتہ کر سکے

۔ وہ نیچے لان میں بیٹھا تھا۔ وہ چائے ختم کر کے اس کے پاس جا پہنچے۔

”ہاں، سنا کیا خبر لایا ہے؟“ جہال نے پوچھا

”یہ ٹھیک ہے کہ وہ مناسکریجھا کا رہنے والا ہے۔ پچھلے چند برس سے وہ وہاں نہیں ہے۔ اس کے خاندان کے لوگ اور چند چیلے بھی اس کے ساتھ ہی نجانے کہاں چلے گئے ہیں۔ اس کے خاندان کے دوسرے لوگ وہیں موجود ہیں۔ اس جوگی کے پاس کافی چسکار ہیں۔ اسے سانپ نہیں ڈستا، اور کوئی سانپ ڈس بھی لے تو اسے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا ایک بیٹا ہے، ممبئی میں رہتا تھا۔ وہ زہر کا بڑا ماہر تھا۔ کچھ برس سے اس کا بھی کچھ اتہ پتہ نہیں۔ یہ اس کی تصویر لایا ہوں۔“ اس نے سیل فون سے بیٹائی ہوئی تصویر دکھانے کے لئے اپنا سیل فون اس کے آگے کر دیا۔

”یہ تم مجھے میرے نمبر پر سنز کر دو۔ میں دیکھ لوں گا۔ بہت شکر یہ تمہارا۔“ جہال نے کہا تو اس نے تصویر بھیج دی۔ پھر اٹھا اور چلا گیا۔ تبھی جہال تصویر دیکھتے ہوئے مصنوعی اکتاہٹ سے بولا
”اب تو اسے کال کرنا ہی پڑے گی۔“

اس پر ہر پریت نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا دیا۔

☆.....☆.....☆

لاہور پر شام اُتر آنے کو تھی۔ میں نے ولید سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ اس سے ملوں گا۔ میرا اس سے ملنا ضروری بھی تھا۔ لیکن مجھے طارق نذیر سے بھی لازماً ملنا تھا۔ فیضان بٹ اور الطاف گجر سے اب تک وہ کیا نکال پایا تھا۔ اس بارے پتہ چلنا چاہئے تھا۔ انہی دونوں بندوں سے پتہ چلنا تھا کہ وہ بھارتی کدھر ہیں، جو پاکستان میں پھیل چکے ہیں۔ جیسے ہی میں نے طارق نذیر سے رابطہ کیا تو وہ پر شوق انداز میں بولا

”سرجی، بہت بڑی کامیابی ملی ہے۔ چند بندے پکڑے گئے ہیں اور ہاتھوں کے بارے میں پتہ چل رہا ہے۔ ایک دو دن میں جب سارا فائل ہو گیا تو پوری رپورٹ کے ساتھ آپ سے ملتا ہوں۔“

”اوکے۔ میں انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا۔ جب میں نے ولید کے نمبر ملائے۔ وہ جیسے میرے انتظار میں تھا۔

”میں آپ کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔“

”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا

”ادھر لاہور ہی میں ہوں۔ مجھے امید تھی کہ آپ ضرور کال کریں گے۔ آپ آئیں کوئی یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ اس نے پر جوش لہجے میں کہا

”میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف جانے کے لئے اٹھ گیا۔

میں ڈرائنگ روم میں آیا تو کنٹرول روم میں فہیم اور مہوش کے ساتھ جنید بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ اکبر کدھر ہے؟“ میں نے پوچھا

”اپنے کمرے میں ہے۔ کہہ رہا تھا کہ سر میں درد ہے، سونا چاہتا ہے۔“ جنید نے کہا

”چلو اسے سونے دو، تم آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے کہا تو مہوش بولی

”احتجاج، احتجاج۔“

”کیا ہوا جنہیں؟“ میں خوشگوار حیرت سے پوچھا

”یہ لوگ بہت سوراہا ہیں، جنہیں آپ ساتھ لے جاتے ہیں۔ اور دوسری بات کہ ہم دارے کے ہاتھ کے بنے کھانے کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں، ہمیں ہولنگ کرنی ہے بس۔“ وہ کھڑے ہو کر بولی

”پہلی بات تو یہ ہے تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔ دوسری یہ کہ جب تمہارا دل چاہے تم باہر جاؤ، جو تمہارا دل چاہے کرو، پابندی تھوڑا ہے۔ اسی دارے سے جو چاہے منگوا لیا کرو۔“ میں نے کہا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ میں، جنید اور مہوش تینوں فور و ہیل میں نکلے، جسے جنید ڈرائیو کر رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم علامہ اقبال ٹاؤن پہنچ گئے۔ وہ ہمارے ساتھ رابطے میں تھا۔ ہم نے درجیل پورج میں روکی۔ ولید پورج ہی میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہم تینوں ڈرائنگ روم میں چلے گئے تو سامنے کرل سرفراز بیٹھے ہوئے ہمیں خوشگوار انداز میں دیکھ رہے تھے۔ ملنے کے بعد جب ہم بیٹھے تو موجود آپریشن نے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ یہ سب باتیں کر چکے تو وہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بولے

”جمال! اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں بہت کچھ تبدیل کرنا ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے پوچھا

”دیکھو! جو انسان کا دل ہوتا ہے نا، وہی زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ انسان میں پہلے دل بنتا ہے تو باقی عمل بعد میں پورا ہوتا ہے۔ جسم کا کوئی حصہ کٹ جائے تو جان برقرار رہتی ہے، لیکن جیسے ہی دل کو کچھ ہو جائے تو زندگی نہیں بچتی۔“ انہوں نے لفظوں کو بہت احتیاط سے چنتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”میں سمجھا نہیں؟ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، کھل کر کہیں۔“

”میں جانتا ہوں کہ تمہاری والدہ تمہارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور جس قدر اہمیت رکھتی ہیں، اسے بھی جانتا ہوں۔ اس تناظر میں تم میری بات کو سمجھ رہے ہو؟“ انہوں نے کہا تو مجھے ایک دم سے ان کی بات بڑی اہم لگی۔ تب میں نے کہا

”آپ کہیں، جو کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”نورنگر، اب اتنا محفوظ نہیں جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ دوسرے معاملات ہیں۔ جوگی اور ملنگ کا وہاں ہونا اور تمہارا وہاں سے ہی انخوا بہت کچھ سمجھا رہا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا ہے کہ سب کو محفوظ کر لیا جائے۔ پھر بعد میں دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔“ انہوں نے کہا تو میں نے پوچھا

”آپ کے ذہن میں کیا ہے؟“

”سارا اور اس کے بیٹے مراد کو اس کے باپ کے پاس بھیج دیا جائے۔ دوہنی میں وہ سیٹ ہو گئے ہیں، حالانکہ کراچی میں بھی ان کا بزنس ویسا ہی ٹھیک ہو گیا ہے، جیسا پہلے تھا۔ یہاں ان کے والد صاحب ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائر کے، پھر بولے، ”تانی، کو ابھی تھوڑی تربیت کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ ابھی نو مسلم ہے۔ میں چاہوں گا کہ تم اسے برطانیہ جانے کی اجازت دو۔“

”وہاں اس کا کون ہے؟“ میں نے پوچھا

”کوئی خونی رشتہ تو نہیں ہے، لیکن اور بہت ہیں، جو اس کی بہترین ذہنی تربیت کر سکیں گے۔“ انہوں نے کہا

”ٹھیک ہے۔ وہ جائے بہ خوشی۔“ میں نے جواب دیا

”اور اماں اور سوٹی کو کہاں رکھنا ہے، یہ میری ذمہ داری ہے، میں اسے پورا کروں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض؟“

”نہیں، کوئی اعتراض نہیں۔“ میں جواب دیا

”تو بس، باقی جو تم چاہو، وہی ہوتا رہے گا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہم میں چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔ تبھی ولید احمد نے کہا

”سر میں اب کچھ کہوں۔“

”بولو، تمہاری سننے ہی تو آئیں ہیں۔“ کرل سرفراز نے کہا تو اس نے اجازت پا کر کہا

”سر! جیسے کہ آپ نے مجھے سمجھایا ہے کہ میں اپنی سیاست کی بنیاد خدمت خلق پر رکھوں تو میرے پاس ایک پلان ہے۔ میں کوئی نئی سیاسی جماعت نہیں چاہتا بلکہ اسی نظام میں ہی رہ کر یہاں سے وہی سوچ دینی ہے جو پاکستان کی آواز ہے۔ میرا مقصد حکومت حاصل کرنا نہیں ہوگا، بلکہ اس نظام کو وفاقی بنانا ہے عوام کے لئے، اور میرا رول ماڈل ہوگا حضرت عمر فاروقؓ کا نظام حکومت۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں دوسرے اصحاب کو فالو نہیں کروں گا، وہ بھی میرے پیش نظر ہیں۔“

”پلان کیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا

”یہ کہ جب تک اچھے لوگ نہیں ہوں گے، نظام اچھا کیسے ہوگا؟ پہلے اچھے لوگوں کی ضرورت ہے۔ مجھے تین سو تیرہ انسان تیار کرنے ہیں، مجھے پتہ ہے کہ اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ لیکن میں یہ کروں گا۔“ اس نے پر جوش لہجے میں کہا

”ہم سے کیا چاہو گے؟“ کرل نے پوچھا

”دیکھیں! ہم ایک چھوٹی سی جاب کے لئے پانچ دس سال کا تجربہ مانگتے ہیں، اور جن لوگوں نے ملک اور عوام کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہے، وہی ان پڑھ اور قانون سے بالاتر ہوں تو پھر سوائے جاہی کے اور کیا ہوگا؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا پھر لہجہ بھر رک کر بولا، ”پورے پاکستان سے تین سو تیرہ لوگوں کو تربیت دینا ہوگی کہ سیاست کیسے کرتے ہیں۔ جنہوں نے اسمبلی میں جا کے قانون سازی کرنی ہے، انہیں قانون اور آئین پڑھانا ہے۔ انہیں بتانا ہے کہ انسانیت کیا ہوتی ہے۔ انہیں نظریہ پاکستان پوری طرح راسخ کروانا ہے۔ اور اس میں میری سرپرستی جمال صاحب کریں۔“

”تمہارا خیال تو اچھا ہے۔“ کرل نے تعریف کی

”یہ سب آن لائن ہوگا۔ پاکستان کے ہر کونے سے یہ لوگ تربیت پائیں گے اور اس دوران وہ خدمت خلق سے سرشار ہو کر اپنی ساکھ بھی عوام میں بنائیں گے۔ اگر ان میں سے چند لوگ بھی اسمبلی میں آ گئے تو ہماری کوشش رنگ لے آئے گی۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے، تم اپنی کوشش کرو، ہم پوری طرح تمہارے ساتھ ہیں۔ دنیا بھر سے، جہاں سے کوئی اچھی شے ملتی ہے، اسے لاؤ، اور یہ کام شروع کرو، پھر جو ہوگا اسی کے مطابق فیصلہ ہوتا رہے گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا تو کرل سرفراز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے بعد کافی دیر تک ہم اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کافی وقت ہو گیا۔

”ہم گھر سے کھانا کھانے کے لئے نکلے تھے۔“ خاموش بیٹھی مہوش نے ایک دم سے یاد دلایا تو ولید نے ہلک کر کہا

”بات یہ نہیں کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا، میں نے آرڈر کیا ہوا تھا لیکن کرل صاحب نے منع کر دیا، ویسے ابھی کہوں گا تو آجائے گا۔“ اس نے بتایا تو کرل مسکراتے ہوئے بولے

”اگر زیادہ بھوک ہے تو ابھی کچھ کر لیتے ہیں، ورنہ کم از کم ایک گھنٹہ آپ لوگوں کو مزید بھگتنا پڑے گا۔“
”وہ کیوں؟“ مہوش نے پوچھا

”یہ جمال کا ایک بہت ہی اہم مہمان آنے والا ہے، اسے ایئر پورٹ سے لینا ہے۔“ انہوں نے کہا تو میں چونک گیا۔ میں نے کرل کی طرف دیکھ کر پوچھا
”بانتیا کور؟“

”جی، وہ کراچی سے اڑ چکی ہے اور کچھ ہی دیر میں ایئر پورٹ پر ہوگی۔ تم لوگ اسے لے کر آؤ، میں تم لوگوں کے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا تو میرے اندر ایک دم سے سنسنی پھیل گئی۔ میں سوچنے لگا، کرل کو میرے ہر اقدام کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔

ہم سبھی وہاں سے نکلے اور ایئر پورٹ کی جانب چل پڑے۔ ہمارے ساتھ ولید بھی تھا مگر وہ اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ ابھی فلائیٹ آئی نہیں تھی۔ ہم وہیں ایئر پورٹ کی عمارت میں کھڑے باتیں کرنے لگے۔
جہاز آنے کے کچھ دیر بعد بانتیا کور پتلون کوٹ میں ملبوس، کسی بزنس ویمین کی طرح ہمارے سامنے تھے۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، وہ کسی کی بھی پردا کئے بغیر سیدھی میری طرف آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ میرے کان میں شرارت سے بولی

”یہ مان لیا کہ تو نے وعدہ پورا کیا، اب باقی باتیں بھی مان جاؤ۔“

”ابھی تو چل، باقی دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ دوسروں سے ملنے کے بعد ہم ایئر پورٹ سے نکلے تو رستے ہی میں کرل صاحب کا فون مل گیا۔ انہوں نے ہمیں مال روڈ پر موجود فورسٹار ہوٹل میں بلا لیا۔ وہاں بہت اچھا انتظام کیا ہوا تھا۔ میں، بانتیا اور کرل ایک جانب کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ بانتیا بولی
”سر، میں نے آپ کا نام بہت سنا ہے، لیکن آپ سے کبھی ملی نہیں۔ آج میں نے آپ کو دیکھ بھی لیا اور مل بھی لیا۔“ اس کے لہجے میں بہت اشتیاق تھا۔

”چلیں، یہ قسمت میں تھا کہ تمہیں اس طرح آنا پڑا، اسی بہانے مل بھی لیا۔ ویسے میں تمہاری بہادری کی داد دیتا ہوں، تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو۔“ کرل صاحب نے اس کی تعریف کی تو وہ ایک دم سے آرزو ہوئے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی

”مجھے ونودرانا کا بہت دکھ ہے، وہ بے چارہ خواہ خواہ مارا جائے گا۔ اس کا گوشت تو وہ کتوں کی طرح نوح لیں گے۔ بہت برا ہوگا۔“

”اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا

”تم نے اس بات کا جواب مجھے تب بھی نہیں دیا تھا“ وہ کافی حد تک غصے اور شکوہ بھرے لہجے میں بولی
”دیکھو، جب وہ رامیش پانڈے کے لئے نکلا تھا تو دراصل وہ انتہائی قابل اور قابل اعتماد ساتھیوں نے ایک جگہ چھاپا مارنے کے لئے نکلا تھا۔ اس کے ارد گرد اور کاغذوں میں یہی درج ہے۔ لیکن وہ راستے میں ڈراپ ہو کر سہانی بلڈنگ کی طرف آ گیا۔ اپنا کام کر کے جیسے ہی وہ اس بلڈنگ سے نکلا، وہ چیف سیکورٹی گارڈ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گیا۔ تاکہ کوئی بندہ بھی گواہی دینے والا نہ رہے۔ ونودرانا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ کامیاب چھاپے کے بعد واپس اپنے آفس گیا اور اس وقت وہ اپنے گھر میں موجود ہے، کسی کو شک تک نہیں ہوا۔“ میں نے تفصیل بتائی تو اس کا چہرہ ایک دم سے کھل گیا۔

”یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔“ وہ پر جوش لہجے میں بولی
”کہو تو بات کرادوں۔“ میں نے شوشی سے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی
”ویسے اتنا تو یقین ہے مجھے تم پر۔“

”آؤ کھانا کھاتے ہیں۔“ کرل نے کہا اور اس گوشے کی جانب بڑھ گیا جہاں باقی لوگ موجود تھے۔

کھانے کے بعد جیسے ہی ہوٹل سے نکلے، کرل نے مجھے کہا
”ان سب کو بھیج دو، میں اور تم ابھی کہیں جانے کے لئے نکلیں گے۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا اور جنیڈ کو بلا کر بانتیا کور کے ساتھ واپس چلے جانے کو کہا۔ ولید سمیت سب چلے گئے تو ہم ایک فور ورجیل میں کسی نامعلوم مقام کی جانب چل پڑے۔

☆.....☆.....☆

پنجاب میں اور خاص طور پر سکھوں میں شادی بیاہ پر ایک خاص رسم ہوتی ہے، جسے ”جاگو“ کہا جاتا ہے۔ اس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں ساری رات جاگتے ہیں۔ دلہن کی ممانی اپنے سر پر گارگر، منکا یا اس سے ملتا جلتا برتن سجا کر رکھتی ہے۔ باقی رشتے دار عورتیں اور لڑکیاں اس کے ساتھ لگ جاتی ہیں۔ پھر لڑکوں کے ساتھ پورے گاؤں میں پھرتے ہیں۔ جگہ جگہ ٹھہر کر گیت، مانیے اور پتے گاتی ہیں۔ رات بھر جاری رہنے والے اس شغل میلے میں رشتے ناطوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ دراصل یہ رسم نضیال کی آمد بارے ہوتی۔ جس کی صورت مختلف انداز میں بدلتی رہی ہے۔ مختلف مقامات پر تھوڑی تبدیلی کی ساتھ بہر حال موجود ہے۔

اس رات اوٹی پنڈ میں ایسی ہی ایک ”جاگو“ تھی۔ جہاں سنگھ، ہر پریت کور اور انوجیت سنگھ تینوں پنڈ میں موجود تھے۔ ان کے ہونے سے لڑکے لڑکیوں میں بڑا جوش بھر گیا تھا۔ ہندو کیونٹی کے بہت سارے لڑکے لڑکیاں بھی اس میں شامل ہو گئی تھیں۔ شادی والا گھرا تنے امیر نہیں تھے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے امیر لوگ ان کے بیاہ میں آئیں گے اور ہر پریت چپکے سے ان کی ساری مدد کر دے گی۔ وہ بہت ممنون تھے۔ اس لئے انہیں بڑی اہمیت دے تھے۔ ”جاگو“ نکل کر دو تین گلیاں پار کر آئی تھی۔

وہ اوگی پنڈ کا ایک چوک تھا۔ ارد گرد کے گھروں کی چھتوں پر لوگ چڑھے اس جاگو کو دیکھ رہے تھے۔ بہت سارے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر انہیں دیکھنے کے لئے وہیں موجود تھے۔ گیتوں کے ساتھ باتوں کا شور تھا۔ اپنے میں ایک گلی کی طرف سے ہوڑ بجنے کی آواز آنے لگی اور اگلے چند منٹوں میں ایک کھلی جیب میں چند پولیس اہلے وہاں آ کر رک گئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور گاڑیاں بھی تھیں۔ کھلی جیب میں سے ایک سنگھ انسپکٹر باہر آ گیا۔

اسے دیکھ کر سارے لوگ خاموش ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ اونچی آواز میں بولا

”جہاں سنگھ ڈھلوں، آگے آؤ۔“

اس پر جہاں نے ہر پریت اور انوجیت کو سکون سے رہنے کا کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے انسپکٹر.....“ یہ کہہ کر اس کے سینے پر لگے بیج کو دیکھنے لگا جہاں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔

”تمہیں ہمارے ساتھ تھانے جانا ہوگا۔“ اس نے بڑے بارعب لہجے میں کہا

”کیوں؟“

”یہ تو تمہیں وہیں جا کر بتائیں گے، چلو۔“ اس نے آگے بڑھ کر اس کلائی پکڑے کی کوشش کی تو جہاں

اس طرح دیتے ہوئے بولا

”تم مجھے ایسے نہیں لے جاسکتے ہو۔ تم جاؤ، میں خود آ جاؤں گا، وہ بھی صبح، اب نہیں۔“

”یہ تم غلط کر رہے ہو، ہم تمہیں لینے آئیں ہیں۔“ انسپکٹر نے رعب سے کہا

”میں بحث نہیں چاہتا انسپکٹر، جاؤ، صبح آؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دیکھا، پولیس کے لوگ آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ اسے لے جانے کے لئے ہی آئے ہیں۔

”تمہیں پروڈکول کے ساتھ لے جانا ہے، چپ چاپ لے جانا ہوتا تو گھر سے اٹھا لیتا، میری بات سمجھ رہے ہوتا؟“ اس بار انسپکٹر نے ڈھکے چھپے انداز میں یہ بات کہہ دی کہ وہ اسے ذیل کر کے لے جانا چاہتا ہے۔

”میں تمہاری بات نہ صرف سمجھ گیا ہوں بلکہ اس کا جواب بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تم جو چاہو سو کرو، میں تو صبح ہی آؤں گا۔ اب لے جانا ہے تو تمہاری مرضی۔“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”پکڑ لو اسے۔“ جیسے ہی انسپکٹر نے حکم دیا، پولیس کے لوگ آگے بڑھے، اسی لمحے جاگو میں موجود سارے لوگ آگے بڑھ آئے۔ ہر پریت ان سب سے آگے تھی۔

”تم اسے ہماری مرضی کے بغیر نہیں لے جاسکتے ہو۔ گولی چلائی ہے تو چلاؤ، اگر اسے لے گئے تو ہم بھی اس کے ساتھ ہی تھانے جائیں گے۔“ ہر پریت نے زوردار انداز میں کہا۔ انسپکٹر گھبرا گیا۔ وہ سب کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دم سے بولا

”کوئی گاؤں کا بڑا اس کی ضمانت دے گا کہ یہ صبح آجائے گا تھانے؟“

”میں کسی کی ضمانت نہیں دوں گا۔ اب تم جاؤ اور جا کر آرام کرو۔“ جہاں نے کہا

”تم اپنے لئے بہت ساری مشکلات بڑھا رہے ہو جہاں؟“ انسپکٹر نے غصے میں کہا

”میں پیدا ہی مشکلات میں ہوا ہوں۔ میرے جتنی مشکلات تھے آجائیں تو تم ویسے ہی مر جاؤ، اب جاؤ۔“ اس بار جہاں نے بھی غصے میں کہا تو وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور تیزی سے پلٹ کر واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی نفری بھی واپس چلی گئی۔ ایک دم سے خاموشی ٹوٹ گئی۔ لوگ باتیں کرنے لگے، جن کی کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سمجھ تو جہاں کو بھی نہیں آ رہی تھی کہ یہ آخر ہوا کیا ہے؟

”بھول جاؤ کہ کوئی یہاں آیا تھا۔ تم لوگ انجوائے کرو۔“ انوجیت سنگھ نے سب کو کہا تو پھر سے وہ سب گیت گانے لگے مگر وہ پہلے والا جوش ختم ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں ان لوگوں سے الگ ہو کر گلی کی کھڑ پر آگئے تو ہر پریت نے تشویش سے پوچھا

”یہ کیا تھا جہاں؟“

”اس وقت تو مجھے نہیں پتہ، لیکن پتہ چل جائے گا۔“ وہ دھیرے سے بولا پھر ہر پریت کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا، ”تم انجوائے کرو، ہم یہیں ہیں، کہیں نہیں جا رہے۔ ڈونٹ وری۔“

”میں اب کیا انجوائے کروں گی، تم چلو گھر، وہیں جا کر کسی سے بات کرتے ہیں۔“ وہ بھرائے ہوئے سے لہجے میں بولی

”کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ابھی آدھے گھنٹے میں معاملہ صاف ہو جائے گا۔ تم جاؤ سب میں، پریشان نہ ہو میں دیکھ لیتا ہوں سب۔“ جہاں نے اسے کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔ پھر انوجیت کی طرف دیکھ کر بولا، ”یار، تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے؟“

”ہاں، میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ بس کفرم کرنے کی دیر ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا

”بات کیا ہے؟“ جہاں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا

”بظاہر تو بات کوئی بھی نہیں ہے، اس وقت بھی میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی، لیکن اب سوچ رہا ہوں،

وہ بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔“ اسی نے پھر اسی لہجے ہی میں کہا تو جہاں نے کہا

”چلو وہی بات بتا دو، کچھ تو آئیڈیا ہو۔“

”چند دن پہلے میرے ہی ایک سنگھی دوست نے مجھے کہا تھا کہ یہ جو سردار ویر سنگھ کے دونوں منہ بولے بیٹے ہیں نا جو گندر سنگھ اور سریندر سنگھ، یہ ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ اپنے باپ سے باہر باہر ہی کوئی کچھڑی پکار رہے ہیں۔ اب میں نہیں جانتا کہ وہ کیسی کچھڑی ہے، اور کس کے خلاف ہے۔ چونکہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لئے میں نے تفصیلات نہیں پوچھیں۔“ انوجیت نے بتایا

”کیا تم اپنے اس دوست کو بلا سکتے ہو، یا میری اس سے فون پر بات کر سکتے؟“ جہاں نے پوچھا

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر اسے کال کر دی۔ ساتھ ہی انسپکٹر آن کر دیا۔

”ہاں انوجیت، کیا ہو گیا، اتنی رات کو۔“ اس نے کال رسپو کرتے کہا

”کیا تم اوگی پنڈ آ سکتے ہو اس وقت؟“ انوجیت نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا

”لگتا ہے، خیر نہیں ہے جو تم مجھے اس وقت بلا رہے ہو۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا

”بات تو کچھ ایسی ہی ہے دیرے، اگر نہیں آ سکتے تو فون پر ہی بات کر لو۔“ انوجیت نے کہا

”نہیں، دس منٹ کا رستہ ہے، میں ابھی آ جاتا ہوں۔“ اس نے کہا تو انوجیت نے اسے اپنی لوکیشن بتادی اس نے پہنچ جانے کو کہا۔

وہ وہیں کھڑے تھے۔ ”جاگو“ والے اگلی گلی میں جا چکے تھے۔ اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اتنے میں وہ دوست اپنی

ہائیک پر وہاں ان کے پاس آ گیا۔ حال احوال اور پوری بات سننے کے بعد اس نے پورے یقین سے کہا

”میں تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ پولیس والے اس نے تم لوگوں پر چڑھائے ہیں، لیکن اب یہ پوری طرح واضح ہو گیا ہے کہ یہ کام ان دونوں بھائیوں کے سوا کسی کا نہیں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ پورے اعتماد سے کہتا چلا گیا۔

”دیکھو جی، ہماری ان کے ساتھ کافی پرانی دشمنی چلتی آ رہی ہے۔ پہلے زمین کی لڑائی تھی، پھر سیاسی لڑائی

ارمیاں میں آ گئی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کی سُن گن ضرور رکھتے ہیں۔ میرا بھائی جہنام سنگھ اس وقت چندی

گڑھ میں پڑھ رہا ہے۔ اپنے کالج میں سیاسی لیڈر ہے۔ اچھا گروپ ہے اس کا۔ اسمبلی ممبر اور وزیر امور نوجوان

ہر تاب سنگھ پچھلیا میرے بھائی لوگوں کی زبردست سپورٹ کرتا ہے، وہ ہماری حامی سیاسی پارٹی کا ہے اور وہ پارٹی

ہر سنگھ کی سیاسی پارٹی کی زبردست مخالف ہے۔ اب قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں بھائی، پچھلے مہینے سے، اس کے

ساتھ کافی ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ اب وہ ان کے ساتھ بیو پارٹنر ہو کر رہیں گے۔ اس لیڈر نے میرے بھائی کو بتایا

کہ یہ چونکہ تمہارے علاقے کے ہیں، اس لئے پتہ کرو کہ کہیں دھوکا دینے والی کوشش تو نہیں کر رہے۔ وہ اپنی

پارٹی میں آنا چاہتے ہیں اور سیاسی مدد مانگ رہے ہیں۔“

”تو یہ ہے اس کا پس منظر؟“ جہاں نے پوچھا

”ظاہر ہے، ہم تو اپنے دھرم کی بات کریں گے۔ میرا بھائی میری نہیں مانتا۔ وہ جدید دور اور سیکولر پارٹی کی

امت کرتا ہے۔ اب آپ دیکھ لیں، اگر تو آپ ان کی سیاسی راہ میں آتے ہیں، آپ کی وجہ سے انہیں نقصان ہوتا

ہے تو ممکن ہے یہ کاروائی انہی کی طرف سے ہو۔ ممکن ہے نا بھی ہو۔ کوئی دوسرا وار کر رہا ہو۔“ اس نے اپنا خیال ظاہر کیا

”ٹھیک یو، میں دیکھتا ہوں۔“ جہاں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا پھر چند قدم دور جا کر اس نے سردار رتن دیپ سنگھ کو امرتسر میں فون کر دیا۔ اس پارٹی کے سارے سوتے وہیں سے پھوٹتے تھے۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی جہاں کا نام سنا تو بہت خوش ہو کر بولا

”اوئے تو کہاں ٹھیک پڑا اس وقت، خبر تو ہے نا۔ پر خیر کہاں ہوگی، جب تیرا فون آ گیا اس وقت۔“ تبھی اس نے انتہائی اختصار سے ساری بات بتا کر کہا۔ ”سردار جی۔! میں اس وقت کم از کم اپنے پنڈاؤگی میں نہ تو لڑائی چاہتا ہوں اور نہ کوئی شور شرابا، میں نے یہاں سے ایم ایل اے کی سیٹ لیتی ہے۔ مجھے صرف یہ پتہ کرنا ہے کہ یہ کام پر تاب سنگھ ٹھیک لیا کا ہی ہے؟“

”پھر ظاہر ہے.....“ اس نے کہا چاہا تو رتن دیپ سنگھ اس کی بات کا نٹے ہوئے بولا

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب پولیس بھی کچھ نہیں کہتی اور پر تاب سنگھ ٹھیک لیا تجھے ابھی فون کرتا ہے اور تجھے پوری بات بتا دے گا۔ وہ سچ ہوگی۔ باقی پھر دیکھ لینا، جو ہوگا مجھے بتانا اگر تم نے نہیں لڑنا، اگر لڑنا ہے تو مجھے کال مت کرنا، سمجھ گئے ہوتا۔“

”ٹھیک ہے سردار جی، جیسے آپ کہیں، یہ میں آپ کو بعد میں بتاتا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو انہوں نے فون بند کر دیا۔ پھر انوجیت کے پاس آکھڑا ہوا، جواب بھی اپنے دوست کے ساتھ گپ لگا رہا تھا۔ جہاں کو دیکھتے ہی بولا

”بائی جی، اگر آپ کہیں تو ہم کوئی کوشش کریں، میں ملتا ہوں، انسپکٹر سے اور بات کرتے ہیں۔“

”تمہارا بہت شکریہ، باقی رہی انسپکٹر سے بات تو وہ کریں گے، اور پوری سلی سے کریں گے۔“ اس نے جواب دیا تو وہ اجازت لے کر وہاں سے چل دیا۔

تقریباً بیس منٹ گزرے ہوں گے۔ جہاں کا سیل فون بج اٹھا۔ ان نے کال رسپونڈ کی تو دوسری طرف سے بھاری آواز میں کہا گیا

”میں پر تاب سنگھ ٹھیک لیا، آپ جہاں سنگھ جی ہی ہونا اوگی پنڈ سے؟“

”ہاں جی سردار جی میں ہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا تو وہ ہنستے ہوئے بولا

”چلو، جیسے ہوئی، آپ سے آدمی ملاقات تو ہو ہی گئی۔ مجھے بتایا ہے ابھی سردار رتن سنگھ جی نے، آپ تو اپنے ہیں۔ بس مس انڈر سٹینڈنگ ہو گئی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا، لیکن یہ ہنسی کہیں سے بھی شرمندگی والی نہیں تھی، بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس پر طنز کر رہا ہو۔

”یہ مس انڈر سٹینڈنگ ہوئی کیوں سردار جی؟“

”اب یہ باتیں فون پر تھوڑا کی جاتی ہیں۔ آپ خود سمجھ دار ہو۔ آؤ نا آپ چند ہی گڑھ میرے مہمان بنو، پھر باتیں ہوں گئیں۔“ اس نے اسی لہجے میں کہا

”بھنام سنگھ نے آپ سے کیا کہا؟“ اس نے پوچھا

”آں ہاں،“ اس نے اتنا کہا لمحہ بھر کوڑکا اور پھر بولا ”وہی جو آپ کے پورے علاقے کے لوگ کہتے ہیں۔“

خیر اب چھوڑیں یہ سب۔ آپ ایک دو دن فرصت نکال کر آئیں۔ بات کرتے ہیں۔“ اس نے اپنی بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ اس سے جہاں سنگھ کو ذرا بھی تجسس نہیں ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ پورے علاقے میں اس کے بارے میں کیسی کیسی افواہیں سرگرم ہیں۔

”ٹھیک ہے سردار جی، میں ایک دو دن میں ملتا ہوں آپ سے، ہوتی ہے ملاقات۔“ اس نے کہا تو الوداعی ہاتھوں کے بعد فون بند کر دیا۔

اسے معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹکا اور جاگو کی طرف بڑھ گیا جواب اگلی گلی میں مڑ رہے تھے۔ راستے میں جاتے ہوئے اس نے انوجیت کو ساری بات بتا دی۔ وہ اس پر ہنس دیا۔ ہر پریت اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ تبھی اس نے جہاں کا قریب سے چہرہ دیکھا تو ہر پریت کے چہرے پر جوتاؤ تھا وہ ایک دم سے ختم ہو گیا اور وہ پر جوش انداز میں گیت گانے والوں کا ساتھ دینے لگی۔ جہاں کو خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔ کیا ہر پریت اسے اس قدر سمجھنے لگ گئی ہے۔ اس کے چہرے ہی سے اندازہ لگاتی ہے کہ اس کے من میں کیا ہے؟

☆.....☆.....☆

رات کا آخری پہر ختم ہو چکا تھا اور صبح کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ ہم لاہور کی مضافاتی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک بڑا فارم ہاؤس تھا، جس میں ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ جیسے ہی ہم ہوٹل سے چلے تھے، تب میں نے اشفاق چوہدری کو اس فون پر صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا جو کہیں بھی ٹریس نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ انتہائی خاموشی سے اماں، تانی، سوہنی، سارا اور مراد کو لے کر نورنگر سے چل پڑا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کو خبر نہیں تھی، وہ سب وہاں سے نکل گئے ہیں۔ اشفاق چوہدری نے فارم ہاؤس کے قریب آکر اطلاع دی تو اسے وہاں سے لے آئے۔ جب سبھی ڈرائیونگ روم میں بیٹھ گئے اور انہیں چائے سرو کر دی گئی تو اماں نے پوچھا

”پتر۔! یہ اچانک تو نے ہمیں یہاں کیوں بلا لیا؟“

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، کرنل سرفراز بولے

”اماں جی، مجھے جمال سے زیادہ آپ کی حفاظت کا خیال ہے۔ بے شک رب تعالیٰ ہی انسانوں کی حفاظت کرنے والا ہے، وہی زندگی اور موت دینے والا ہے۔ لیکن ہمیں بھی تو اپنے تحفظ کی ہدایت کی گئی ہے۔“

”لیکن بیٹا، نورنگر میں بھی تو ٹھیک تھا، وہاں اتنی سیکورٹی.....“ اماں نے کہنا چاہا تو وہ بولے

”جتنی مرضی سیکورٹی ہو، اس میں سے دشمن راہ بنا لیتا ہے۔ جیسے کہ نورنگر ہی کے اطراف میں دشمن پہنچ چکا ہے۔ پہلے جمال کا اغوا ہوا، پھر انہوں نے اپنے دو بندے یہاں تک بھیج دیئے۔ اب بھی وہاں پر بھینا کچھ ہوگا۔ وہ بعد کی بات ہے۔ اگر وہاں غفلت ہو جاتی تو؟“

”ٹھیک ہے بیٹا۔! جیسے تم لوگ بہتر سمجھو۔“ اماں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے

”کیا آپ کو بتا دیا گیا ہے کہ تانی اور سارا اپنے بیٹے کے ساتھ اب جا رہی ہیں؟“

”ہاں، مجھے بتایا ہے اشفاق نے۔ ٹھیک ہے انہیں جانا چاہئے۔ بہر حال میری خواہش تھی کہ تانی کی شادی میں اپنے ہاتھوں سے کرنی۔“ وہ تانی کی طرف دیکھ کر بولی

”اگر اللہ نے چاہا تو یہ بھی ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے تانی اور سارا کی طرف دیکھ کر کہا، ”آپ تیار ہو جاؤ، ابھی کچھ دیر بعد تم دونوں کی فلائیٹ ہے۔ تانی دوپہر میں ایک دن رک کر لندن جائے گی۔“

دن کے دس بج چکے تھے۔ جہاں سنگھ، الوجیت اور بلیمہ سنگھ پہنچ گئے تھے ہی اوگی پنڈ کی پولیس چوکی جا پہنچے۔ تھانے میں انسپکٹر موجود تھا۔ ان کی آمد کے بارے میں جیسے ہی اسے پتہ چلا، وہ اپنے آفس سے باہر نکل آیا۔ انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنے آفس میں بٹھایا۔

”دیکھیں جی، ہم تو حکم کے پابند ہیں۔ اوپر سے حکم ہوا کہ آپ کو گرفتار کر لیں، ہم گرفتار کرنے چل پڑے، اب حکم یہ ہے کہ آپ کی بات مانی جائے۔ سو آپ حکم کریں، ہم تو ملازم ہیں۔“ اس نے یوں ملائمت سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

”اصل دکھ تو یہی ہے نا کہ جو کام جس کا ہے وہ نہیں کر رہا، بلکہ عوامی اداروں کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لئے دن بدن بگاڑ پیدا کیا جا رہا ہے۔ اب دیکھو، ہمارے علاقے میں کتنا غیر قانونی نشہ فروخت ہو رہا ہے۔ کئی ایسے دھندے ہیں۔ جن سے آپ کی بھی جگاڑ لگتی ہے اور وہ بھی کھلم کھلا سب کر رہے ہیں۔ رہ گئی بے چاری عوام، جس کے لئے یہ ادارے بنے ہیں، وہ تو گئی نابھاڑ میں۔“ جہاں نے بڑے دکھی لہجے میں کہا

”اور سر جی، یہ قصور بھی تو عوام ہی کا ہے نا، کیوں ایسے لوگوں کو چھتے ہیں جب عوام کے ہاتھ میں طاقت ہے تو وہ کیوں نہیں استعمال کرتے۔“ انسپکٹر نے کہا

”اس میں بھی بڑی خرابیاں ہیں۔ بات جہاں سے بھی چلے گی۔ قانون کی حاکمیت پر آ کر کر کے گی۔ خیر! بتا سکتے ہو کہ یہاں سے میرے خلاف کون بندہ ہے؟“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”جی مجھ سے نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ وہ بھی زور آور ہیں اور آپ بھی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ مجھے اوپر سے حکم ملا اور انہوں نے اس افواہوں کی بنیاد پر یہ معاملہ اٹھایا ہے کہ جو آپ کے بارے میں پورے علاقے میں مشہور ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”کیسی افواہیں؟“ جہاں نے پوچھا

”یہی کہ آپ دہشت گرد ہو۔ جو بھی آپ سے دشمنی لیتا ہے، وہ پھر زندہ نہیں رہتا۔ غیر ملکی ایجنٹ اور نجانے کیا کیا پھیلا ہوا ہے آپ کے بارے میں؟“ اس نے بے خوف انداز میں کہا تو بلیمہ سنگھ پہنچ بولا

”ارے انسپکٹر صاحب! جو بے چارہ اپنی حویلی دوبہ ٹھیک نہیں کروا سکا۔ جو اپنے گاؤں میں ہی سکون سے نہیں رہ پارہا، وہ کیا ہوگا۔ خیر! آئندہ کوئی ایسا معاملہ ہو تو پہلے مجھے بتاؤ۔ میں اس گاؤں کا پہنچ ہوں، سمجھے۔ اب ہم چلتے ہیں۔“

”اوسرکار، چائے تو پی کر جائیں، بندہ گیا ہے لینے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”پھر کسی وقت سہی۔ بلکہ ہم آپ کو چائے پر بلائیں گے۔“ جہاں نے کہا اور باہر نکل گئے۔

جس وقت واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک بار سردار دیر سنگھ جی سے ضرور بات کریں گے۔ کیونکہ اس سے بات کرنا ضروری تھا۔ وہ تینوں وہیں سے سیدھے اسی پاس چلے گئے۔ اس وقت وہ اپنی حویلی پر نہیں ڈیرے پر تھا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”سردار جی! آپ بیٹھیں، آپ ہمارے لئے بڑے محترم ہیں، کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔“ جہاں نے آگے بڑھ کر انہیں کانٹھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا

”نہیں پتر، مجھے تو تیرے سامنے زمین پر بیٹھنا چاہئے، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔“ سردار دیر سنگھ نے ان سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا

”اوکے، میں تیار ہوں اور میرا خیال ہے کہ سارا نے بھی کوئی تیاری نہیں کرنی، ہمارے پاس کون سا سامان ہے۔ ہم ابھی نکلنے کے لئے تیار ہیں۔“ ثانی نے کہا

وہ سب باتیں کر رہے تھے اور میں درزیدہ نگاہوں سے سوئی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل میری جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ مجھ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہے۔ مگر یہ وقت نہیں تھا۔ اس لئے نگاہیں نہیں ملا رہا تھا۔ مجھے اپنا پتہ تھا، سوئی کی نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ وہ مجھے پتھر کا بنا سکتی تھی۔ میں اشفاق کے ساتھ اٹھ گیا، جو اسی وقت واپس جانے کو تیار تھا۔

سورج نے اپنی روشنی سے لاہور کو جگمگا دیا تھا۔ ہم ایئر پورٹ پر تھے۔ ان کے سفری کاغذات لئے ایک بندہ وہاں موجود تھا۔ اس نے ساری کلیرنس کروا کر دی۔ پھر جیسے ہی جہاز اڑا، ہم پلٹ آئے۔ کرل سرفراز راستے ہی میں مجھ سے جدا ہو گئے اور میں سیدھا گھر جا پہنچا، جہاں بائیکاٹ اور میری منتظر تھی۔

وہ اوپر والی منزل پر میرے بیڈ روم میں تھی۔ اس نے شارٹس کے ساتھ سیلو لیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ عورت پن سے بھر پور بائیکاٹ کور کی جوانی اپنا پورا اظہار کر رہی تھی۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا، اس نے بیڈ پر لیٹے لیٹے ہی بانٹیں پھیلا دیں۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا تو اس نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

”کتنی آرزو تھی کہ تجھے یوں اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر زور سے بھینچ لوں۔“ وہ خمار آلود لہجے میں بولی

”اپنی آرزو پوری کرو اور بڑے شوق سے کرو۔ میں نے کب روکا ہے۔“ میں نے کہا تو کچھ دیر تک میرے ساتھ جڑی رہی پھر خود ہی الگ ہو کر بولی

”مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں تمہارے پاس ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ کپڑے تو نے کہاں سے لے لئے؟“ میں نے اس کا ذہن بدلنے کے لئے پوچھا

”رات ہم کسی مارکیٹ میں گئے تھے۔ مہوش نے بھی شاپنگ کی۔ وہ بے چاری تم مردوں میں اکیلی پھنسی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی کی سوسرورت ہوتی ہے۔ اب وہ کیا کیا تم لوگوں کو بتائے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے کہا

”اوہ! ویسے میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا

”خیر، ایسا بھی نہیں، اس کی بہت ساری ضروریات زودیا پوری کر دیتی ہے۔ وہ اسے بہت کچھ کراچی سے بھجوا دیتی ہے۔“ اس نے یونہی کہا تو میں نے پوچھا

”بائیکاٹ! اب تم آئی ہو، کیا پروگرام ہے تمہارا؟“

”سارا وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا

”گرو استھانوں پر نہیں جاؤ گی؟“ میں نے پوچھا

”ہاں ویسے جانا تو چاہئے۔“ اس نے یوں کہا جیسے پہلے اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، میں کراچی سے زودیا اور گیت کو بلاتا ہوں۔ مہوش کو ساتھ لینا اور گھوم پھر آنا۔ مجھے یہاں بہت ضروری کام ہیں، وہ ایک دو دن میں نمٹا لوں۔ پھر ہم اکٹھے ہی وقت گزاریں گے، جہاں تک ہو سکا۔“ میں نے کہا تو چند لمحے سوچتی رہی، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ بائیکاٹ کور نے جین شرٹ پہنی اور میرے ساتھ نیچے چلی گئی۔

”اس نے جو باتیں کی ہیں، ان پر غور کریں۔ وہ اپنے دکھ نہیں سنا رہا تھا، ان دونوں کی صفائی دے رہا تھا۔ اس نے بالکل ویسا ہی کیا ہے جو میں نے راتِ شام سنگھ سے باتیں کر کے سوچا تھا۔“ اس نے جواب دیا

”تم شام سنگھ سے ملے تھے؟“ انوجیت نے پوچھا

”ہاں! میں اور ہر پریت، وہیں سے، شادی والے گھر ہی سے شام سنگھ کے گھر چلے گئے تھے۔ میں نے بڑی تفصیل سے بات کی ہے اس کے ساتھ۔ یہ دیر سنگھ دوہری چال چل رہا ہے۔“ جہاں نے کہا

”بہت دکھ ہوا یہ سن کر۔“ بلہر سنگھ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا

”دکھ تو اس بات کا بیچ صاحب کہ یہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ نہیں دے رہے ہیں، بلکہ یہ دھرم کے ساتھ بھی کھلاؤ کر رہے ہیں۔ نام دھرم کا لیتے ہیں لیکن قوت اپنے لئے حاصل کرتے ہیں۔ میں نے پورے علاقے میں اس کا زیادہ دھرم کو ماننے والا چنا تھا، مگر وہ کچھ اور ہی نکلا۔ خیر، اب دیکھتا ہوں یہ کرتے کیا ہیں۔“ جہاں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ان کے درمیان شاید مزید بات چلتی، تاہم اسی لمحے ہر پریت کی کال آ گئی۔ ان کے گھر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان میں خاموش پھیل گئی تھی۔ یہ خاموشی اوگی پنڈت تک ایسے ہی رہی۔ وہ بلہر سنگھ کو اس کے گھر اتار کر واپس چل پڑے۔ جہاں سنگھ خود پر بہت حد تک قابو پا چکا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب ان سے کھیلے گا۔

وہ گھر پہنچے تو ان کے لان میں شام سنگھ کے ساتھ تین افراد مزید بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گاڑی پورچ میں روکنے کے بعد انہی کی جانب بڑھ گئے۔ اس کی آمد پر وہ چاروں ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

”ست سری اکال جی۔“ اس نے فتح بلائی تو سب نے بھی ایسے ہی فتح نکلا دی تو اس نے کہا، ”جی بیٹھیں، تشریف رکھیں۔“

وہ سب بیٹھ گئے تو شام سنگھ نے مسکراتے ہوئے ان کا تعاف کرایا۔ ان میں سے ایک جالندھر کا وکیل تھا، اور دو کدور سے کاروباری تھے۔ ان تینوں کا تعلق اسی پارٹی سے تھا جس کا شام سنگھ ممبر تھا اور پرتاب سنگھ مجھیلا اس پارٹی کا وزیر تھا۔ وہ خیر سگالی کے طور پر اس کے پاس آئے تھے۔ جہاں کو معلوم تھا کہ وہ کس کے کہنے پر آئے ہیں۔ پھر بھی ان کی خاصی آؤ بھگت کی گئی۔ وہ دیر تک ان کے ساتھ بیٹھا گپ شپ لگاتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنی تمام تر نیک تمناؤں کا اظہار کر کے چلے گئے۔ انہوں نے اس پر خاصا زور دیا تھا کہ وہ ایک بار چندی گڑھ ضرور جائے۔ اس نے شام سنگھ سے ملے کر لیا کہ آج کل میں ضرور جاتے ہیں۔

جہاں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ فریش ہوا اور ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ ان تازہ حالات پر سوچنے لگا تھا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسے میں ہر پریت کمرے میں آ گئی، اس نے غور سے جہاں کو دیکھا اور مصنوعی حیرت سے بولی

”یہ کیا، ابھی تو اچھے بھلے تھے تم؟“

اس پر جہاں نے اسے دیکھا اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا

”تمہیں سوچ رہا تھا، اور ظاہر ہے تم ایسی شے ہو، جو بندے کو پاگل کر دے۔ رات کی تم تو میرے حواسوں ہر چھا گئی ہو۔“

”اچھا، رات سے حواسوں پر چھائی ہوئی ہوں، پہلے کہاں پر چھائی ہوئی تھی؟“ اس نے شونی سے پوچھتے ہوئے دوسری کرسی قریب کی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”ایسا بھی کیا سردار دیر سنگھ، تو کیوں شرمندہ ہے۔“ بلہر سنگھ بیچ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”دیکھ، اس لڑکے نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ میرے ساتھ چلا، مجھے خود کہا کہ اگر سیاست میں مجھے حق دیتا ہے، لیکن جو کدور اور سریندر نے اچھا نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں، انہوں نے کیا کیا ہے۔ میں نے بہت روکا انہیں۔“ اس نے ہیکے ہوئے لہجے میں کہا

”سردار وہ تیری مرضی کے خلاف کیسے چلے گئے۔“ بلہر سنگھ بیچ نے اس سے پوچھا

”وہ میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں مری جاؤں اور وہ میری جائیداد کو آپس میں بانٹ لیں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے بہت دکھ سے کہا

”سردار دیر سنگھ اتنا دکی نہ ہو، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ ہوا کیا ہے؟“ بلہر سنگھ بیچ نے پوچھا۔ وہ سب بیٹھ گئے تو سردار دیر سنگھ نے کہا

”وہ جوان ہو گئے ہیں۔ میرے منہ بولے بیٹے ہیں، میں نے کافی سے زیادہ جائیداد ان کے نام لگوا دی ہے۔ باقی بھی انہی کا تھا۔ وہ اس علاقے کی سیاست پر بھی قابض ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ جہاں سنگھ یوں آجائے گا اور ان کے خوابوں پر پانی پھر جائے گا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ انوجیت سنگھ کی وہ بات نہیں بن سکے گی، جو وہ بنانا چاہ رہے ہیں، جو بھی ہے، میرا ان سے اختلاف ہوا ہے اس بات پر۔ مگر وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اس علاقے میں زیادہ بیچ ہے، وہ زیادہ رسائی رکھتے ہیں، ان کا ووٹ بنک زیادہ ہے۔ سو ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور وہ اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ میرا ان پر کوئی بس نہیں ہے۔“ وہ بھاری لہجے میں بولا اس پر جہاں سنگھ چند لمحے خاموش رہا پھر کہا

”آپ نے بات صاف کہی، آپ سے ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ لیکن کیا آپ انہیں پیغام دے سکتے ہیں میرا؟“

”بولو بیٹا!“ اس نے کہا

”مہی کہ وہ آج شام سے پہلے پہلے آکر معافی مانگ لیں اور کل صبح علاقے بھر کے بڑوں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے، تو بات ختم ہو سکتی ہے، میں اسے بھول جاؤں گا۔ ورنہ نہیں۔ کیونکہ جب دو بھگتے ہیں تو ان کے لئے میدان ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“ جہاں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اٹھ گیا۔

”بیٹا بیٹھو تو سہی، ہم بات کرتے ہیں۔ میں انہیں سمجھاتا ہوں۔ کوئی صلح کی راہ نکالتے ہیں۔“ سردار دیر سنگھ نے کہا تو جہاں بولا

”آپ سے تو اب تعلق رہے گا، یہ ہم چاہیں گے، وہ دونوں ہم سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں تو جو میں نے کہا ہے، وہی کریں، باقی میں خود دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ کوئی بات سننے بنا باہر کی طرف چل پڑا۔ بلہر سنگھ بیچ اور انوجیت بھی اس کے ساتھ چلتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔ ان کے ڈیرے سے نکل کر جب وہ اوگی پنڈت کی طرف جانے کے لئے سڑک پر چڑھے تو ساتھ بیٹھے ہوئے بلہر سنگھ نے پوچھا

”جہاں، تو نے بہت سخت بات کر دی۔ وہ دونوں یہ کبھی نہیں چاہیں گے۔ وہ تو بڑا دکی تھا۔“

”نہیں بیچ صاحب ایسا نہیں ہے، وہ دیر سنگھ بھی ڈرامہ کر رہا ہے۔ اس کا یہ لہجہ اور انداز اب صرف ان دونوں کو بچانے کے لئے ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ دونوں اس دیر سنگھ کی مخالفت میں ایک قدم بھی اٹھا سکیں۔ ان سب کی ملی بھگت ہے۔“ جہاں نے ڈیریونگ کرتے ہوئے سڑک پر دیکھتے ہوئے کہا

”تمہیں یہ کیسے احساس ہوا؟“ بلہر سنگھ نے پوچھا

”پہلے صرف دماغ پر۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا

”مطلب میں تمہارے دل میں نہیں ہوں۔“ وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی تو فضا ایک دم سے سوگوار سی ہو گئی۔ چند لمحے وہ خاموش رہی اور پھر تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔ جہاں اسے حیرت سے دیکھنے لگا کہ یہ تو اچھی بھلی تھی اسے کیا ہوا؟ پھر یہی سوچ کر بیٹھا رہا کہ یہ بھی اس کی کوئی ادا ہی ہوگی۔ خود ہی مان جائے گی۔

☆.....☆.....☆

اس شام گھر میں میلہ لگا ہوا تھا۔ کراچی سے سبھی آگئے ہوئے تھے۔ باغیتا کو ان کے درمیان بیٹھی باتیں ہی کرتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی ٹی وی ڈرامہ کی کسی ایکٹریس سے بات کر رہے تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے اسے اسکرین ہی پر دیکھا تھا، وہ بھی مدہم مدہم۔ آج وہ ان کے درمیان تھی۔ میں نے یہی بات کہی تو سلمان نے ہنستے ہوئے کہا

”یہ تم نے ٹھیک کہا، باغیتا کو اگر چہرے سے دیکھو تو یہ انڈین اداکارہ تو لگتی ہے، اس کے بعد گردن سے نیچے آؤ تو بے وایج والی.....“ اس نے کہا چاہا تو باغیتا کو نے خوشگوار انداز میں چیختے ہوئے کہا

”خبردار! آگے کچھ بولے تو۔“

اس پر سبھی ہنس دیئے تھے۔

”کاش ہمارے ساتھ آج اروند سنگھ، رونیت کور اور گرلین کور ہوتیں، مزہ آ جاتا۔“ فہیم نے کہا

”وہ کینیڈا میں ہیں، آنے میں وقت لگے گا۔ اب انہی سے گذارا کرو۔“ گیت نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسی دوران ولید کی کال آنے لگی۔ میں نے اسے کال کر سب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا

”ہمارا ایک نیا دوست ہے، ولید احمد۔ اس نے آپ سب کے لئے ڈنر کا اہتمام کیا ہے، اپنے گھر میں۔ کیا سب لوگ چلنے کے لئے تیار ہو؟“

”جمال بھائی، وہ تو اس کا چھوٹا سا گھر ہے، وہاں کوئی ایسا ہے نہیں کہ اتنے لوگوں کا بندوبست کرے گا۔ کھانا باہر ہی سے آئے گا تو کیوں تاکسی ہوٹل ہی میں.....“ مہوش نے شرارت سے کہتے ہوئے باقی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”نہیں، ہم ماڈل ٹاؤن کے ایک گھر میں جا رہے ہیں۔“ میں نے بتایا

”یہ مہوش اسی لئے موٹی ہے کہ اسے کھانے کا بڑا چمکا ہے، بہت کھاتی ہے۔“ زویا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”لیکن تم سے زیادہ فٹ ہوں چھپکلی، کبھی دوڑ لگانا میرے ساتھ۔“

”یہ بندوبست بھی میں نے کر دیا ہے۔ چلو، وہاں تم لوگوں کے لئے سر پرائیز ہے۔“ میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں نے ولید کے نمبر ملائے اور اسے کال کر دی۔ وہ آنے ہی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ چار کنال کا ایک بڑا سا بنگلہ تھا۔ پورچ کے پاس میں دروازے پر ولید کے ساتھ کرنل صاحب کھڑے تھے۔ ان سے مل کر ہم ڈرائیونگ روم میں آگئے۔

”یہاں کیا سر پرائیز ہے؟“ مہوش نے پوچھا

”بیٹا! یہ ہے گیت کا پروڈکشن ہاؤس۔ نیچے فیسٹ میں آپ بیٹھیں گے اور اپنا کام کریں گے۔ یہاں آپ کا آفس ہوگا۔ گیت اپنے سٹاف کے ساتھ لوگوں سے ملاقات کرے گی۔ اور اوپر سب کی رہائش ہوگی۔ اور یہ

سیکورٹی کے حساب سے بھی محفوظ بنایا گیا ہے۔“

”اور باہر لان، جہاں میں نے زویا کے ساتھ دوڑ لگایا کرتی ہے۔“ مہوش نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

”یہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن آج باغیتا کو ہمارے ساتھ ہے، تو اس کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی پارٹی میری طرف سے، آؤ۔“ کرنل نے کہا اور چل پڑا۔ تبھی باغیتا کو نے مجھے کاندھے سے پکڑا اور پھر گلوگیر سی آواز میں متاثر کن لہجے میں بولی

”یار، تم سب کیسے ہو، ایک پر یوار کی طرح۔ کتنا پیار ہے اور کتنی محبت، دل کرتا ہے یہیں رہ جاؤں۔“

”تو رہ جاؤ، روکا کس نے ہے؟“ میں نے کہا تو ایک دم سے وہ اپنی آئی پر آگئی۔ اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا

”تم وعدہ کرو، تو یہیں رک جاتی ہوں۔“

”باہر ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا اور قدم بڑھا دیئے تو وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی

”ڈرپوک۔“

بڑے سارے لان میں یوں اہتمام تھا جیسے کسی کی تقریب ہو۔ کینڈل لائیٹ ڈنر جیسا ماحول بنایا ہوا تھا۔ ہنسی مذاق میں ڈنر کیا۔ پھر واپس ڈرائیونگ روم میں آکر بہت ساری باتیں طے ہونے لگیں۔ وہیں سے صبح انہوں نے باغیتا کو سیر کر دانے لکھنا تھا۔ سو میں ان کے پاس سے نکلا اور فارم ہاؤس کی طرف چل دیا۔

رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کا تھا، جب میں وہاں پہنچا۔ وہاں کی خادمہ نے مجھے میرے لئے مخصوص کمرے میں پہنچا دیا۔

”کچھ لیں گے آپ؟“ اس نے پوچھا

”نہیں، لیکن اماں؟“ میں نے کہا

”وہ تو اب سو گئیں ہوں گی اور سوئی بی بی بھی انہی کے ساتھ ہیں۔“ خادمہ نے ہولے سے کہا

”نہیں، میں ابھی نہیں سوئی۔ تم جاؤ۔“ دروازے میں سوئی کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے بزرنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور سیاہ حجاب میں اس کا چہرہ دک رہا تھا۔ خادمہ خاموشی سے چلی گئی۔ میں یوں کھڑا ہو گیا، جیسے اس کے ٹرانس میں آگیا ہوں۔

”آؤ۔“ میں نے ہولے سے کہا

”اماں تمہارے انتظار میں جاگ رہی ہیں۔ ان کے پاس چلو، میں آتی ہوں۔“ سوئی نے کہا تو میں باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ مجھے کمرے کے سامنے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں اندر داخل ہوا تو اماں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ میں نے جاتے ہی ان کے پاؤں چومے اور پھر ان کے ساتھ یوں لپٹ گیا جیسے کوئی سہا ہوا بچہ اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ وہ مجھے ہولے ہولے تھپتھپاتے لگیں۔

”اماں، تم جاگ رہی تھی۔“ میں یونہی پوچھا

”مجھے پتہ تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“ انہوں نے انتہائی شفقت سے کہا

”میں تو کل بھی نہیں جانا.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولیں

”بیٹا! اتم جس راہ پر ہو، اور جس مقام پر ہو، تمہارا کبھی کبھی مل لینا ہی بہت ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں بات بدلتے ہوئے کہا، ”ابھی تانی کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ پہنچ چکے ہیں، آرام کر کے ماریٹ سے اپنے لئے

شاہنگ بھی کرائے ہیں۔ سارا بہت خوش تھی اور شعیب بھی اور مراد تو بہت زیادہ ہی خوش ہے اسے ماں اور باپ مل گئے ہیں۔“

اتنے میں سوئی چائے لے کر آگئی۔ اس نے ٹرے بیڈ پر ہی رکھا اور بیڈ پر ہی آلتی پالتی مارتے ہوئے بولی ”لیکن، ایک بات ہے۔ تانی یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا

”اسے یہاں گھر اور ایک خاندان مل گیا تھا۔ وہاں جا کر وہ پھر سے اکیلی ہو جائے گی۔ میں جانتی ہوں کہ سیکورٹی کے علاوہ تم لوگوں نے اس سے بڑے کام لینے ہیں۔ اس لئے وہ بھی نہیں بول سکی۔“ سوئی نے کہا

”یہ تو ہے، خیر اسے چھوڑو، اپنی باتیں کرو۔“ میں نے کہا، کیونکہ اس کی باتوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ہم چائے پیتے رہے اور یونہی نورنگر کی باتیں کرتے رہے۔ میں انہیں یقین دلاتا رہا کہ بہت جلد وہ واپس نورنگر چلے جائیں گے۔

چائے پی لینے کے بعد سوئی نے کہا

”اب اماں کو سونے دو۔“ دوسرے لفظوں میں اس نے یہی کہا کہ آؤ میں نے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ میں اٹھ کر اپنی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اس رات سوئی سے بہت باتیں ہوئیں۔ مجھے لگا وہ اپنی ذات کے حصار سے نکل آئی تھی۔ اس نے پوری تفصیل سے سارے حالات کے بارے میں باتیں کیں۔ نورنگر میں اس نے لوگوں کے لئے کیا کچھ کیا۔ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے خواب کیا ہیں، یہ سب اس نے مجھے بتایا۔ میں سنتا رہا اور وہ کہتی رہی۔ وہ جو بات مجھے پوچھتی وہ میں اسے بتا دیتا۔ یہاں تک کہ رات کا تیسرا پہر شروع ہوا تو اٹھ گئی۔

میں مزید دو دن تک فارم ہاؤس پر رہا۔ اس دوران باہر رابطہ رہا۔ وہ سبھی باغیتا کور کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے نکل گئے ہوئے تھے۔ وہ خوش تھے۔ ولید اپنے آبائی شہر چلا گیا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جو اس کے ذہن میں ہے، وہ سب کاغذ پر اتارے گا۔ تبھی سارے اس پر بات سکیں گے۔ تیسرے دن کی شام میں سوئی کے گھر چلا گیا۔ اس شام میں اس گھر میں تہہ تھا۔

بہت عرصے بعد مجھے تنہائی ملی تھی اور اس تنہائی میں مجھے لگا کہ یہ تنہائی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اپنے آپ سے ملنے اور اپنے بارے میں سوچنے سے کیا کچھ سامنے آتا ہے۔ عقل اور دل کے درمیان بیٹھ کر ان کی بحث میں کیا کچھ ہاتھ آتا ہے۔ یہ ایک الگ دنیا ہے۔

☆.....☆.....☆

جہاں اور ہر پریت، چند گڑھ ایئر پورٹ سے نکل کر باہر آ چکے تھے۔ وہ کل سے صبح تک امرتسر میں رتن دیپ سنگھ کے پاس تھے۔ اس نے انہیں بڑا مان دیا تھا۔ خاص طور پر ہر پریت کو اس نے بہت عزت دی۔ گذشتہ رات وہ پارٹی کے چند عہدیداروں سے بھی ملے۔ انہوں نے اپنے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ پرتاب سنگھ جیٹھیا ان کا منتظر تھا۔ اس نے گاڑی بھیج دی تھی جو انہیں لے کر اس کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔

وہ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے تپاک سے ملا۔ پھر صوفوں آسنے سامنے بیٹھے ہوئے پرتاب سنگھ جیٹھیا نے کہا

”آپ کے بارے میں سن سن کر بڑا ہی اشتیاق ہو گیا تھا کہ آپ سے ملا جائے۔ آج آپ سے مل لیا تو

بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

”جی، اگر وہ دونوں ہمیں دھوکا نہ دیتے تو شاید ہم اب تک آپ سے مل ہی نہ پاتے۔“ جہاں بولا

”یہ سیاست میں چلتا ہے۔ سیاست میں آنے کا مطلب ہے اپنے دشمنوں میں اضافہ کرنا۔ جن کے بارے میں لگمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ دشمن ہو سکتے ہیں، یا وہ ہمارے دوست ہیں، وہی سازش کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کرسی، یہ عہدہ بڑی ظالم چیز ہے جہاں سنگھ جی۔“

”لیکن اگر اسی عہدے اور کرسی کا درست استعمال کیا جائے تو کیا دوستوں میں اضافہ ممکن نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا

”اصل میں سارا نظام کرپٹ ہو چکا ہے۔ ہر بندہ صرف اپنے فائدے کے لئے سوچتا ہے۔ اسے دوسرے سے غرض نہیں ہے۔ آپ نے دھرم کے لئے سب کچھ تہ تیغ دیا ہے، میں جانتا ہوں، لیکن اپنوں ہی نے اپنی سکھ قوم نے اپنے ہی دھرم کے ساتھ کیا کھلواڑ کیا ہے، آپ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ اگر ایک سکھ کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے نا کہ وہ خوددار ہے سچا ہے۔ تو میں ایسے سکھوں کو بھی جانتا ہوں جو دھرم کے نام پر اپنا آپ کیا، اپنے دھرم کو بھی بیچ رہے ہیں۔“ اس نے دکھے ہوئے لہجے میں کہا

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ نشے کی لہر سے جو سکھ قوم ختم ہو رہی ہے۔ ان کے ہاتھ سے ہتھیار پھینک دیا گیا ہے تو یہ صرف غیروں کی سازش نہیں، اس میں اپنے بھی پوری طرح ملوث ہیں۔ بکاؤ مال ہر قوم میں ہوتے ہیں۔“ جہاں بھی کافی حد تک دھمکی ہو گیا

”اب وقت آ گیا ہے کہ انہی میں سے ایسے لوگ پیدا کئے جائیں جو نظام کو ٹھیک کریں، اب وقت جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ دھرم کے نام پر سیاست کرنے والے منافقوں کو نکال باہر کرنا ہے۔ اس لئے آپ کی سیاست میں آمد ایک اچھا شگون ہے۔“ پرتاب سنگھ جیٹھیا نے کہا

”مجھے امید ہے کہ میرا بھائی انوجیت سنگھ سیاست میں ایک اچھا اضافہ ہوگا۔“ جہاں نے اسے یقین دہانی کرائی۔ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد انہیں اس گیسٹ ہاؤس میں بھیج دیا جہاں اس کے وی وی آئی پی مہمان ٹھہرتے تھے۔

گیسٹ ہاؤس ہی میں پرکلف ڈنر پر پارٹی کے دو عہدیدار بھی تھے۔ کھانے کے دوران بہت ساری باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ان کے علاقے کے بارے میں زیادہ جانتے تھے۔ علاقے میں کون لوگ زیادہ اہم ہیں۔ ان کے بارے میں اسے اچھی طرح بریف کیا گیا۔ رات گئے تک انہوں نے ایک بھر پور میٹنگ کے بعد انہیں یہ اطمینان دلایا کہ انکیشن میں ٹکٹ انہیں ہی ملے گا، اگر وہ علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو۔ جہاں سمجھ گیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے اسی رات واپس آنا تھا۔ پرتاب سنگھ جیٹھیا نے انہیں چند دن رکنے کا کہا لیکن جہاں ہی نے یہ عندیہ دیا کہ وہ اب دوبارہ آئے گا تو پورے پروٹوکول کے ساتھ ہی چند گڑھ میں داخل ہوگا۔ اسی رات کے آخری پہر وہ واپس امرتسر کے لئے روانہ ہو گئے۔

دو پہر ڈھل چکی تھی، جس وقت جہاں اور ہر پریت واپس اوگی پنڈ پینچے۔ انوجیت کو ان کی چند گڑھ یا تارا ہارے ساتھ ساتھ معلوم ہوتا چلا گیا تھا۔ اس وقت وہ نکودر میں تھا۔ وہ جیسے ہی آئے اس کا فون آگیا کہ میں آ رہا ہوں، اس دوران اگر کوئی بات کرنے کے لئے آ جائے تو اسے ٹال دیا جائے۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں کلچیت کور کے ساتھ بیٹھے تھے اور بھوتی ان کے سامنے چائے رکھ گئی تھی۔ ہر پریت نے صوفے پر آلتی پالتی ماری

اور چائے کا گھٹا ہاتھ میں لے کر پوچھا

”یہ بات اس نے کیوں کہی؟“

”یہ تو وہ آکر ہی بتا سکتا ہے۔“ جہاں نے کہا

”نہیں، وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، تم دونوں بتا کر تو نہیں گئے تھے، لیکن یہاں لوگوں کو تمہارے چند ہی گڑھ جانے کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔“ کلجیت کو نے کہا

”تو پھر.....!“ ہر پریت نے سمجھنے والے انداز میں اپنی ماں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا

”مطلب، جن لوگوں کو دلچسپی تھی، انہوں نے پوری خبر رکھی کہ وہاں چند ہی گڑھ میں کیا ہوا؟“ کلجیت کو نے کہا تو جہاں سمجھ گیا۔ اس لئے دیر سے بولا

”آپ کے من میں کوئی بات ہے تو بتائیں؟“

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر ہولے سے بولی

”آج صبح سردار ویر سنگھ جی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا شام کو آ جاؤ۔

کہنے لگا کہ میں فون کر کے آؤں گا۔“ کلجیت کو نے کہا

”اور اب تک اس کا فون نہیں آیا ہوگا۔“ جہاں نے پوچھا تو کلجیت کو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لگتا ہے کدور میں کوئی ایسی ہی بات ہوگی۔“ ہر پریت نے کہا تو جہاں بولا

”وہ آ جائے گا تو بتا دے گا، پہلے سرکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک بات ہے، جاؤ پٹر، جا کر آرام کرو، اتنا سفر کر کے آیا ہے۔“ کلجیت کو نے کہا تو جہاں اٹھ کر چل دیا۔ اس وقت وہ خود تھوڑا سکون چاہتا تھا۔

ڈنر کے لئے جب وہ سارے اکٹھے ہوئے تو انوجیت نے بتایا۔

”ویر سنگھ آج کدور میں تھا۔ وہیں اس نے اپنی پارٹی کے لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ مجھے شاید اس کے بارے میں پتہ نہ چلتا، اگر میری اس کے ساتھ ملاقات نہ کروادی گئی ہوتی۔“

”ملاقات کروائی گئی، مطلب؟“ جہاں نے پوچھا

”مجھے آج پارٹی کے لوگوں نے بلایا تھا۔ وہ یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ کیا میں نے ودھان سبھا کا الیکشن لڑنا چاہتا ہوں اور اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔“ اس نے کہا تو جہاں نے سکون سے پوچھا

”تو پھر تم نے کیا کہا؟“

”وہی جو ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے الیکشن لڑنا ہے۔ اور یہ میرا فیصلہ کیوں ہے، یہ بھی بتا دیا کہ سردار ویر سنگھ نے یہ فیصلہ دیا تھا۔ پھر پارٹی کے لوگوں کے ساتھ ہم بیٹھے اور سردار نے یہ بات مانی، اور جو بقول ان کے غلط فہمی ہوئی، وہ بھی مان لی۔“ اس نے تفصیل سے کہا تو جہاں بولا

”مطلب تم بات ختم کر آئے ہو نا؟“

”ظاہر، پھر بات ختم ہی کرنا تھی۔“ انوجیت نے کہا

”کیا تمہارا دل مانتا ہے کہ وہ اب وہ خاموش رہیں گے۔ ہماری حمایت یا مخالفت کچھ بھی نہیں کریں گے۔“

اس نے سوال کیا

”لگتا نہیں ہے، اس وقت تو وہ وقت کو سنبھال گئے ہیں۔ انہیں شاید یہ امید نہیں تھی کہ تمہاری اس قدر پارٹی

میں بات ہوگی، اور.....“ انوجیت نے کہنا چاہا، لیکن جہاں اس کی بات کاٹنے ہوئے بولا

”آئندہ بھی ان پر بھروسہ مت کرنا۔ دوست اور دشمن کی پہچان کرنا سیکھ لو۔ ورنہ اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ تمہارے پاس صرف ایک پیمانہ ہونا چاہئے یہ دیکھنے کے لئے کہ منافق کون ہے؟ جس وقت تم منافق کو سمجھ جاؤ گے، دوست دشمن کی پہچان بھی آ جائے گی۔ اب اس موضوع پر چاہئے بات نہ ہو، مگر اس سے بہت زیادہ محتاط رہنا۔ اب جبکہ تم سیاست کے میدان میں قدم رکھنے جا رہے ہو۔ قدم قدم پر امتحان ہوگا۔ منافق کو پہچان رکھنے والا ان امتحانوں سے آسانی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں یہ یاد رکھوں گا۔“ انوجیت نے گہری سنجیدگی سے کہا تو جہاں اسے سمجھانے لگا کہ اب آگے کیسے چلنا ہے۔ ڈنر کے بعد انوجیت باہر نکل گیا۔ جہاں اپنے کمرے میں آ گیا تو پیچھے ہی ہر پریت آ گئی۔ پھر وہ تھے اور ان کی باتیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

برف میں جے ہوئے سانپ میں اگر حرکت نہیں ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں زہر ختم ہو گیا ہے۔ یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے، لیکن یہ کہانی آج بھی اسی طرح تازہ ہے، جس طرح یہ تب تھی، جب یہ کہیں کسی نے سنائی تھی۔ دشمن وقتی طور پر اگر جے ہوئے سانپ کی طرح ہو جائے تو اس میں سے زہر نکل نہیں جاتا۔ زہر دیا ہی رہتا ہے۔

نورنگر میں جوگی رام لعل اور ملک کی موجودگی یہ ظاہر کر چکی تھی کہ ”را“ کی رسائی نجانے کب سے وہاں تک قہمی۔ بہت پہلے بھی میں نے اسی علاقے سے بندے پکڑے تھے۔ اور اب اگر کرنل سرفراز نے وہاں سے اماں اور دوسرے لوگوں کا نکالا تھا تو اس کی ضرورت کوئی وجہ رہی ہوگی۔ جبکہ مجھے اطمینان اس بات کا تھا کہ اشفاق چوہدری نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ نورنگر سے سب اچھا ہی کی رپورٹ تھی۔

اس وقت میں صبح کی ملجھکی روشنی میں میز پر کھڑا چائے پی رہا تھا، سوئی کا گھر کچھ اس طرح تھا کہ سامنے سے آنے والی سڑک اس کے گیٹ تک آتی تھی۔ پھر دائیں اور بائیں مڑ جاتی تھیں۔ بالکل انگریزی کے حرف ”لی“ کی طرح۔ یہاں میز سے سامنے میں روڈ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ ایک لکڑی دین گیٹ پر آ کر رکی اور اس میں سے سب اترنے لگے۔ وہ سارے آگئے۔ بائیتا کو نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر اندر آ گئی۔ میں نے سوچا چائے ختم کر کے ہی نیچے جاتا ہوں میں وہاں کھڑا رہا۔ میں وہاں سے پلٹ کر جانے ہی والا تھا کہ دو موٹر سائیکل سوار سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ معمول تھا۔ سو میں اپنے کمرے میں آیا تو بائیتا کو کمرے میں آ چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی

”سب آگئے اور اپنے کمروں میں بھی چلے گئے ہیں، وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ آؤ سو جاؤ۔“

”نہیں تم آرام کرو، مجھے اب نیند نہیں آئے گی۔ میں واپس چھت پر جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ بائیتا کو میرے بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

میں دوبارہ چھت پر آ گیا۔ میں جیسے ہی چھت پر آیا، میرے سامنے کی روڈ پر کھڑے دونوں موٹر سائیکل سوار مجھے دیکھ کر ایک دم سے ہراساں ہو گئے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگے تھے، پھر زیادہ وہاں کھڑے نہیں رہ سکے، اور فوراً ہی نکل گئے۔ میں بھی چونک گیا کہ وہ وہاں کیوں کھڑے تھے اور اب بھاگ بھی گئے ہیں۔ میں نے یہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں موٹر سائیکلوں کی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ مشکوک تھے۔ اس وقت میں نے

دارے کو فون کیا۔ وہ ابھی جاگ رہا تھا، سویا نہیں تھا۔

”ہاں! کیا بات ہے، چائے لاؤں؟“ دارے نے پوچھا تو میں نے کہا
”سب کو جگا دو، اور انہیں کہہ دو کہ محتاط ہو جائیں، میں ابھی آتا ہوں۔“

شاید میرے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس نے تیزی سے کچھ پوچھا تھا، جسے میں نے نہیں سنا۔ گیٹ پر سیکورٹی گارڈ کے نام پر ایک آدمی ہی تھا۔ میں نے اس فون کر کے اندر کی جانب ہو جانے کو کہا اور پھر نیچے آ گیا۔ جب تک میں نیچے آیا سبھی ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے، سوائے بائیتا کور کے۔ میں نے انہیں اپنے شک کے بارے میں بتایا تو سب سے پہلے سلمان ہی نے کہا
”ہاں، جب میں دین والے کو واپس بھجوا رہا تھا، اس وقت ہی وہاں دو بندے ایک موٹر سائیکل پر آئے تھے۔“

”اگر یہ صورت حال ہے تو ہمیں ایک چکر اس علاقے کا لگ لینا چاہئے۔ اگر کوئی ہماری تاک میں ہوا تو سامنے آ جائے گا۔“ جنید نے اپنے دونوں ہاتھل شرت میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، انتظار کرنے سے زیادہ علاقہ دیکھ لینا چاہئے۔ احتیاط زیادہ بہتر ہے۔“ زویا نے کہا
”چلیں ایسا کرتے ہیں آج باہری سے ناشہ کرتے ہیں۔“ مہوش نے زویا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ہی تھا کہ باہر سے سیکورٹی گارڈ نے اونچی آواز میں بلایا۔ سب تیزی سے باہر جانے لگے تو میں نے انہیں روک دیا۔
”میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ اس نے گیٹ کی جبری میں سے باہر کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے باہر دیکھا تو سامنے سڑک پر ایک سیاہ رنگ کی فور وہیل کھڑی تھی۔ اگرچہ وہ گیٹ سے کافی دور تھی لیکن اس کے کھڑے ہونے کے انداز ہی سے شک ذہن میں لہرا گیا۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ ایسے میں ایک اور فور وہیل اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ میرے دماغ میں خطرے کا الارم بج گیا۔

میں پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ اسی لمحے ایک فور وہیل گیٹ کے پاس آن رکی۔ اس میں سے دو آدمی نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ وہ جس وقت تک گنیں سیدھی کر کے گیٹ کی جانب مڑے، اس وقت تک میں اپنا ہاتھ نکال لیا تھا۔ جیسے انہوں نے گیٹ کو ہاتھ لگایا، اسی وقت، وہ یوں پیچھے پلٹ کر گرے، جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی فور وہیل کی چھت پر گولیاں برسنے لگیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، چھت پر بائیتا کور کھڑی تھی، اس کے دونوں ہاتھوں میں ہاتھ تھے۔ میں اوٹ میں ہو گیا اور جبری میں سے باہر دیکھا۔ سامنے والی فور وہیل تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ میں نے اس کے ٹائیروں کا نشانہ لیا تو اس کے ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گئے۔

اچانک ہی اس فور وہیل کی چھت کھلی اور اس میں سے ایک بندہ باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں راکٹ لا چڑھا۔ وہ بہت خطرناک تھا۔ اس سے نکلا ہوا فائر بم کی طرح تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سیدھا ہو کر فائر کرتا، میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا۔ میں فائر نہیں کر سکا تھا لیکن اس سے پہلے ہی وہ لڑھک گیا۔ میں نے دیکھا۔ جنید اور اکبر نجانے کب چھتوں کو پھلانگتے ہوئے ان کے سر پر جا پہنچے تھے۔ یہ انہوں نے ہی فائر کئے تھے کہ وہ چھت میں سے گن سیدھی ہی نہیں کر سکا تھا۔ میں نے گارڈ کو اچانک گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ زویا اور سلمان اندر والے کمرے میں کھڑے تھے۔ گیٹ کھلتے ہی گیٹ کے ساتھ کھڑی فور وہیل سامنے آ جاتی۔ لیکن جیسے ہی گیٹ کھلا،

اس وقت تک وہ بیک کیمیر میں واپس مڑ چکی تھی۔ میں نے رسک لیا اور اس کا نشانہ لے فائر کر دیے۔ سامنے کے دونوں ٹائر دھماکے سے پھٹ گئے۔ مگر وہ رکنے نہیں پونہی مڑتے گئے۔ اس وقت سامنے ایک ہی فور وہیل کھڑی تھی جو اس کے پیچھے آئی تھی وہ نجانے کب واپس پلٹ گئی تھی۔

فائرنگ سے پورا علاقہ کوخ اٹھا تھا۔ سامنے کھڑی فور وہیل پر جنید اور اکبر نے اتنی گولیاں چلائیں تھیں کہ اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ جیسے ہی آگ کا شعلہ بلند ہوا وہ فور وہیل ایک دھماکے سے پھٹ گئی۔ اس وقت یہ پتہ نہیں تھا کہ کتنے آدمی اس میں تھے، زندہ بھی تھے کہ وہ لوگ اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

کون ہو سکتے تھے؟ یہ پہلا سوال تھا جو میرے ذہن میں آیا۔ مگر اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ سبھی کے ہونٹوں پر یہی سوال تھا۔ مگر یہ وقت اس سوال کے جواب کا نہیں تھا۔

”اس سے پہلے کہ پولیس یہاں پر آئے، فہیم تم ایسا کرو، فوراً بائیتا اور گیت کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“ سلمان تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔“

”جانا کہاں ہوگا؟“ سلمان نے پوچھا
”وہیں ماڈل ٹاؤن، فوراً۔“

میرے کہنے پر وہ پورچ میں کھڑی گاڑی کی جانب بڑھے اور اگلے چند منٹ میں وہ وہاں سے چلے گئے۔ جنید اور اکبر ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ وہ سامنے کی چھت پر دکھائی دے رہے تھے۔ میرے پیچھے مہوش، زویا، علی نواز کھڑے تھے۔

”ابھی پولیس آتی ہوگی، اس کے بہت سارے سوال ہوں گے۔ لہذا، جو بھی کہنا ہے، میں نے ہی کہنا ہے، تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، سلمان سے رابطہ رکھنا۔“ میں نے کہا اور دوسری گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں بھی وہاں نکل گئے۔ تب میں طارق نذیر کو فون کیا۔

”سر، مجھے اطلاع مل گئی ہے اور میں اپنے آفس سے نکل پڑا ہوں۔ میرا متعلقہ تھانے سے رابطہ ہو گیا ہے۔“ وہ تیزی سے بولا

”پولیس والے بہت سوال کریں گے اور.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا

”وہ کوئی سوال نہیں کریں گے۔ میں سب دیکھ لوں گا، بس میرے آنے تک وہاں رہیں۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں واپس پلٹ کر اندر آ گیا۔ مجھے اب طارق نذیر کا انتظار تھا۔

باہر پولیس کی بہت ساری نفری آ چکی تھی۔ ڈی ایس پی ریک کے آفیسر نے گیٹ پر کھڑے سیکورٹی گارڈ سے سوال جواب شروع کئے ہی تھے کہ طارق نذیر پہنچ گیا۔ اس نے پولیس آفیسر سے بات کی اور اس کے ساتھ ہی اندر آ گیا۔ جس طرح طارق نذیر میرے ساتھ تپاک سے ملا، پولیس آفیسر بھی ویسے ہی ملتے ہوئے بولا

”ہم نے پورے علاقے کو گھیر لیا ہے۔“

”لیکن، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، وہ لوگ تو اپنا کام کر کے جا چکے۔ اگر ان کا کوئی بندہ ہوا بھی تو انہی تمام شایوں میں ہوگا، جسے ہم پکڑ نہیں سکتے۔“ میں نے کہا

”آپ کو کسی پر شک ہے یا کوئی پہلے سے دھمکی؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا

”بظاہر کوئی دھمکی نہیں تھی اور شک۔ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے جواب دیا

ایک طویل سانس لی اور کہا

”بہت اچھا کیا۔ باقی کہاں ہیں؟ تیرے پاس ہی ہیں نا؟“

”بالکل، میرے پاس ہیں۔ اور ڈٹ کر کھارہے ہیں۔ کیا آپ نے بھی وہی سوچا، جو ہم سب کا خیال تھا کہ ابھی فوراً ماڈل ٹاؤن نہیں جانا چاہئے؟“

”بالکل، تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں آ رہا ہوں، پھر کسی طرف نکلتے ہیں۔ لیکن باہر نظر ضرور رکھنا۔“ میں نے اسے سمجھایا تو وہ بولا

”اسکی فکر نہ کریں۔ مجھے پورا خیال ہے۔“

اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد میں نے فون بند کیا تھا کہ جنید نے پوچھا

”کون سی جگہ ہے آپ کی نظر میں؟“

”ہے، لیکن اس وقت نہیں اور باغیتا کور کے سوا باقی سب وہیں چلیں جائیں گے۔“

”کیا ہم بھی؟“ جنید نے پوچھا

”ہاں، تم دونوں بھی۔ یہاں سارا سیٹ اپ، ڈسٹرب ہو گیا ہے۔ اسے دوبارہ بناتے تھوڑا وقت لگے گا۔

پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

اس وقت ہم نہر کنارے جا رہے تھے۔ جبکہ وہ سارے گلبرگ میں کہیں تھے۔ میں نے جنید کو مسلم ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پر چھوڑ دینے کو کہا۔ انہوں نے مجھے اتار دیا۔ میں نے وہاں سے رکشہ لیا اور شاہ جمال کے شاپ پر رکشہ چھوڑ کر پیدل ہی چل پڑا۔

شاہ جمال کے علاقے میں بہت پہلے میں نے اپنے لئے سیف ہاؤس بنایا تھا۔ وہاں کافی دیر سے ایک فیملی رہ رہی تھی، جسے میں ہی انور ڈکرتا تھا۔ ایسے ہی کسی وقت کے لئے میں نے وہ جگہ بنا کر رکھی ہوئی تھی۔ میرا وہ دوست ایک سرکاری محکمے میں سیکشن آفیسر کی سطح کا ملازم تھا۔ میں اکثر وہاں چلا جاتا اور رات رہ کر، یا کبھی دن گزار کر چلا آتا تھا۔ وہاں میں یہی مشہور تھا کہ میں ان کا ایک رشتہ دار ہوں جو دوسرے شہر میں رہتا ہے اور وہیں کاروبار کرتا ہے۔ یہاں مال خریدنے آتا ہے۔ ایک دو دن رہ کر واپس چلا جاتا ہے۔ میں نے اسے فون کیا۔ اس وقت وہ گھر سے دفتر کے لئے جانے کو تیار تھا۔ وہ میرے آنے تک رک گیا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا تو وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر چلا گیا۔ اوپری منزل پر میرے لئے مخصوص کمرہ تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ ان کی ملازمہ میرے لئے چائے رکھ گئی۔

وہ سبھی گلبرگ کے ریسٹوران میں بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ میں نے ان کے لئے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ کہاں رہیں گے۔ ایسا ہی ایک بزرگ جوڑا ایک معروف ٹاؤن میں رہتا تھا۔ ان کے ساتھ نورنگر سے آیا ہوا ایک جوڑا رہتا تھا، جو ان کی خدمت پر مامور تھا۔ یہ وہاں جاتے تو ان کے پوتے پوتیاں ہی ظاہر ہوتے۔ میں نے انہیں ساری بات سمجھا دی اور وہاں جانے کے بارے میں کہہ دیا۔

دوپہر کے بعد میرا اردن سنگھ سے رابطہ ہوا۔ اس نے دسترس میں موجود تمام کمپیوٹر کھنگال مارے، اپنی طرف سے بہت سرکھپایا لیکن اسے کوئی ایسا بھی اشارہ نہیں ملا، جس سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کس کا کام ہے؟ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اس دوران میں نے ہر طرف رابطہ کیا۔ کرل سرفراز کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب ہوا کیسے؟ باقی ہر طرف سے سب اچھا کی خبر آئی تھی۔ نورنگر میں بھی سکون تھا۔ اشفاق چوہدری کو ہم پر ہونے

”سر، آپ ابھی یہاں سب دیکھیں، پھر میں آپ سے تفصیل کے ساتھ بات کروں گا۔“ طارق نذیر نے پولیس آفیسر سے کہا

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میڈیا کو کیا کہا جائے۔ وہ تو اپنی تصویر بنا کر اس کے شواہد بھی جاری کر چکا ہوگا۔“ پولیس آفیسر بالکل درست کہہ رہا تھا۔ اسے بھی تو کوئی ایسی بات چاہئے تھی، جو وہ میڈیا سے کہہ سکتا۔ ”آپ اسے ڈکیتی بتا دیں، میرا بھی یہی بیان ہے کہ کچھ نامعلوم افراد ڈکیتی کے لئے آئے تھے، میرے سیکورٹی گارڈز نے انہیں مار بھگایا۔“

”اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔“ پولیس آفیسر نے طارق نذیر سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں ہی سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

پولیس آفیسر کے جانے کے بعد طارق نذیر نے بتایا

”سر جی، فیضان بٹ سے بہت ساری باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس کا پورا ایک گروہ یہاں کام کر رہا ہے۔ ان کی طرف سے کافی دھمکیاں بھی آرہی ہیں۔ اس گھر کے بارے میں کب، کسے اور کیا معلوم تھا، میں کچھ نہیں کہہ سکتا ابھی، لیکن بہت جلد یہ پتہ چل جائے گا۔“

”اوکے، اب سنبھالو یہاں سب کچھ، ظاہر ہے میڈیا یہاں کے رہائشی کے بارے میں بھی کوئی بات کرے گا، اس لئے میں نکل رہا ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے تیزی سے کہا

”سر یہی بات میں آپ سے کہنے والا تھا، میں سب دیکھ لیتا ہوں۔ آپ کے لئے سیف ہاؤس.....“

”وہ ہے میرے پاس۔“ میں نے کہا اور جنید کو اشارہ کیا۔ وہ اکبر کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھا اور ہم وہاں سے نکل کر ماڈل ٹاؤن کی جانب چل پڑے۔

میں روڈ پر آتے ہی اکبر نے پوچھا

”سر یہ کس کا کام ہے، کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں ابھی نہیں، لیکن بہت جلد پتہ چل جائے گا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی یہی سوچ رہے تھے۔ وہ بھی میری طرح جلد از جلد ان تک پہنچ جانا چاہتے ہوں گے۔ جہاں تک میرا خیال تھا، یہ فیضان بٹ کے لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں پر میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے کرل صاحب نے اپنے لوگوں کی حفاظت کے لئے جو پلان کیا ہے، مجھے اسے بدلنا پڑے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ محض فیضان بٹ کے لوگ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پیچھے لازماً کوئی دوسری قوت ہے۔ وہ کوئی بھی ہوں، آخر انہوں نے یہاں کی رہائی کی ہوگی۔ انہوں نے ہمارے آنے جانے کا پورا شیڈول دیکھا ہوگا۔ اور پھر اسی وقت حملہ کیا، جب یہ سارے لوگ یہاں آ چکے تھے۔ اگر وہ لوگ یہاں پورے پلان کے ساتھ حملہ کر سکتے ہیں تو ماڈل ٹاؤن والا گھر بھی ان کی نگاہ میں لازماً ہوگا۔ وہ قطعاً محفوظ نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ یہ سب کس نے کیا، ابھی تو اپنے لوگوں کی حفاظت کیسے کروں، مجھے یہ سوچنا تھا۔ انہیں ابھی ماڈل ٹاؤن نہیں جانا چاہئے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فوراً سلمان کو فون کیا۔

”کہاں ہو تم لوگ؟“

”ہمیں بھوک لگی تھی، میں تو نہیں ایک ریسٹوران میں لے آیا ہوں۔ کچھ کھا پی لیں تو پھر چلے جاتے ہیں۔“ اس نے خوشگوار انداز میں جواب دیا تو میرے حواسوں پر جو انجانا بوجھ تھا، ایک دم سے ختم ہو کر رہ گیا۔ میں نے

روشنی نے ہر شے کو محیط کیا ہوا ہے۔ اسی تناظر میں دیکھو پاکستان کو، یہ قلعہ اسلام، دل، ایک حرم ہے۔“

”ذکر اور فکر کیا؟“ میں نے گرہ کھولنے کے لئے کہا

”ذکر کا تعلق دل سے ہے اور فکر کا عقل سے۔ شعلہ عشق کا تعلق دل سے ہوتا ہے کہ دل لا محدود ہے۔“

انہوں کی فرمایا

”جی، میں سمجھ گیا۔ آپ پاکستان کو دل کہہ رہے ہیں اور اس کی حیثیت ایک حرم کی سی ہے۔“ میں نے واضح کر کے سمجھنے کی کوشش کی۔

”میں اس پر بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئے پھر کہتے چلے گئے۔ ”ملک چھوڑا، گھر بار چھوڑا، مال و دولت، زمین و جانیداد چھوڑی، ہماری عزتیں، مائیں بہنیں، بیٹیاں، جن کی کوکھ میں ابھی نئی آنے والی زندگی ہمک رہی تھی، انہیں دنیا میں آنے سے پہلے قصید کر دیا گیا۔ بچوں کو کرپانوں پر لہرا دیا گیا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بھیگ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر ہلکے ہوئے لہجے میں بولے، ”جب یہ اتنا کچھ ہو جائے تو پھر باقی بربریت بارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ بچے قتل کرنا، شیطانیت کی آخری حد ہے۔ ہمارے تمام ظاہری رشتے، بہن بھائی بچے، بیٹے، بیٹیاں اور تمام جسمانی قربانی، ساری جانی قربانی سے ہم گزر گئے۔ ہم نے ہر شے مطلب و مقصد حقیقی پر لگا دی۔ یہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جب قوم میں عشق آ جاتا ہے تو اس میں عزم و یقین آ جاتا ہے۔ عشق ہی لذت حیات اور لذت موت سے آشنا کر دیتا ہے، بلکہ محرم راز بنا دیتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ رکے پھر بولے، ”دیکھو! قلندر لاہوریؒ نے کہا نہیں ہے کہ خودی ہے زندہ تو موت ہے اک مقام حیات..... کہ عشق موت سے کرتا ہے، امتحان ثبات۔“ موت کے آئینے میں تجھے دکھا کے رخ دوست..... زندگی اور تیرے لئے دشوار کرے..... کشادہ دل سمجھتے ہیں اس کو..... ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں۔“

یہ موت حیات کا بھی بڑا عجیب فلسفہ ہے؟“ میں نے کہا تو وہ بولے

”یہ محض فلسفہ نہیں، حقیقت ہے۔ دیکھو! کافر یہ سمجھتا ہے کہ موت آئی تو ہر شے ختم ہوگئی۔ لیکن دین ہمارا یہ بتاتا ہے کہ آج کا دن کل کی خبر دیتا ہے۔ یہ جہان جو دکھائی دیتا ہے، یہ جو ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ اگلے جہان کی خبر دیتا ہے۔ اسی روز و شب میں الجھ کے نہ رہ جا..... کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں، زندگی اس عالم میں آئی تو یہ عالم ظاہر ہو گیا۔ اسی عالم ظاہر کا ایک باطن ہے، جو انسان کے اندر ہے اور وہ دل ہے۔ مگر اسی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہوا ہے۔ اور ظالم کو سمجھ نہیں آ رہی کہ یہی باطن اس کا دل ہے۔ اسی طرح موت اگلے جہان کا دروازہ کھولتی ہے۔ موت ایک مقام زندگی ہے جہاں سے ہم اگلے جہاں میں جا کر ظاہر ہوتے ہیں۔ موت ہر شے کے ختم ہونے کا نام نہیں ہے۔“

”جی بالکل، کیا آپ اس پس منظر میں پاکستان کی بات کر رہے تھے، جو دل ہے؟“ میں نے پوچھا تو جذب سے بولے

”عاشقی! تقلید محبوب ﷺ سے محکم ہوتی ہے..... یہ قافلہ عشق، مرد قلندر کے مومن حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی سالاری میں روانہ ہوا۔ ”مرد میدان، ٹو میر لشکر..... نوری حضوری تیرے سپاہی۔“ جب قافلے نے وہاں سے ہجرت کی تو موت و حیات کی لذت سے گذر کر وطن پاکستان میں آ گیا۔ یہ وطن پاکستان، دل کا حرم ہے۔ جنہوں نے موت کو اپنے آپ پر وارد کر کے رسم شبیری ادا کرتے ہوئے، دل کا حرم کا دروازہ کھول دیا۔

والے حملے کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ وہاں متحرک ہو گیا تھا کہ کہیں یہاں سے تو کچھ نہیں ہوا؟ سورج ڈھل گیا لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ راز اچانک ہی کھلنے والا ہے۔ میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹکا اور نیچے آ گیا۔ میں تھوڑی دیر اپنے دوست کے پاس بیٹھا اور وہاں سے نکل پڑا۔ شاہ جمال کا علاقہ، وہاں ایک بزرگ کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہیں ایک اونچی سی جگہ پر ان کا مزار ہے۔ اس کے ساتھ ایک بڑی ساری مسجد تھی۔ میں خود کو پرسکون کرنے کے لئے اس طرف بڑھ گیا۔ فاتحہ خوانی کے بعد جب میں واپسی کے لئے پلٹ رہا تھا کہ میری نگاہ ایک سفید پوش پر پڑی۔ سر پر سفید عمامہ، سفید لباس، ریش مبارک سفید، یہاں تک کہ ان کی ہمنویں بھی سفید ہو چکی تھیں۔ ہماری بھرم وجود اور سرخ و سفید چہرہ۔ وہ میری جانب بڑی پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا دل کیا کہ ان کے پاس جا کر بیٹھوں۔ میں نے جونہی ان کی جانب قدم بڑھائے، ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ زیادہ ہوگئی۔ وہ سفید کپڑا بچھائے، مسجد سے ہٹ کر قبروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے سلام کیا تو سلام کا جواب دے کر بڑے پیار سے لیکن دھیمے لہجے میں بولے۔

”بیٹھو! چلو آج تم سے بھی ملاقات ہوگئی۔“

ان کا اتنا ہی کہنا تھا کہ میں سمجھ گیا۔ ان سے ملاقات کوئی اتفاق نہیں ہے، منظر کچھ اور ہے اور پس منظر کوئی اور بنا رہا ہے۔ تب میں نے بڑی عاجزی سے کہا

”جی، یہ میری بھی خوش نصیبی ہوگی کہ میں نے آپ کا دیدار کر لیا۔“

”یہ تو بندے کی خوش نصیبی اسی وقت ہو جاتی ہے جب وہ رب تعالیٰ کے حضور آ جاتا ہے۔ باقی ساری رکاوٹیں تو عارضی ہیں، اس عارضی دنیا کی طرح۔ کیونکہ یہ دنیا ہے نا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا

”جی آپ نے بالکل درست فرمایا۔ میں چاہوں گا کہ آپ مجھے کوئی نصیحت کریں۔“ میں نے کہا تو وہ بولے

”ارے بھائی، میں جانتا ہوں کہ تم کیا ہو اور تو کس منزل کا راہی ہے۔ تجھے کہاں سے کیا ل گیا۔ ہم تو بس پیام دینے والے ہیں۔ اگر چاہو تو لے لو۔“

”جی میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ میں نے انتہائی دلچسپی سے کہا تو وہ دائیں جانب قبر پر جلتے ہوئے دیپے کی طرف اشارہ کر کے بولے

”یہ چراغ دیکھا ہے جو روشن ہے، کیا تم اس کی ماہیت کو سمجھتے ہو؟“

”حضور آپ ہی فرمائیں، میری توجہ آپ کی طرف ہے۔“ میرے کہنے پر وہ بولے

”یہ دیکھو، یہ چراغ ہے، یہ پہلے مٹی تھا، اس کو گوندھا گیا، آگ میں پکا گیا۔ اس میں تیل ڈالا گیا، مٹی رکھی گئی۔ مٹی سے چراغ بن گیا اور اس نے مٹی کو اپنے اندر لے لیا۔ تیل اور مٹی اس کے اندر آ گئی۔ اب اس میں روشنی نہیں ہے، روشنی کیسے ہوتی ہے، اسے کوئی جلاتا ہے۔ کوئی عمل ہوتا ہے جلانے کے لئے۔ جب کوئی اسے جلاتا ہے تو روشنی ہوتی ہے۔ روشن کرنے والا ظاہر ہو جاتا ہے۔ اندر اور باہر نظر آنے لگتا ہے۔“

”جی، یہ سمجھ گیا، لیکن.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے

”یہ سلسلہ یوں ہوا کہ پہلے تصور پیدا ہوا، اس میں جہد عمل اور شہیدوں کا خون ڈالا گیا اور اس کے دل کی قندیل کو جلا یا گیا تو روشنی پیدا ہوئی۔ اب سمجھو، جسم اور جان کے درمیان سانس پڑی ہے جو خون کو ذکر سے گردش میں رکھے ہوئے ہے۔ جس سے فکر پیدا ہو رہا ہے۔ روشنی میں ہر شے پڑی ہے اور ہر شے میں روشنی ہے۔ اور

زبردست جہاد کرتا ہے اور ان کے دلوں میں عشق کی آگ لگا دیتا ہے۔ جس سے عزم و یقین کی روشنی ہر شے واضح کر دیتی ہے۔ ان کے دلوں میں کھوئے ہوئے شخص کی آرزو پیدا کر دیتا ہے، اس طرح مردہ دلوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ ہدف جوان کے سینوں سے نکل کر انہیں بے ہدف کر گیا تھا، اور جن کی وجہ سے وہ بے ہدف ہو گئے تھے، اس وجہ کو ختم کر کے ان میں ہدف رکھ دیتا ہے۔ انہی میں دوبارہ جلوہ گری پیدا کر دیتا ہے اور وہ بے نشانوں میں نشان کو ظاہر کر دیتا ہے۔ افراد قوم نہ صرف اپنے ہدف کو پہچان لیتے ہیں۔ بلکہ اس پر پورا یقین کرتے ہوئے انہیں پانے کے ایک جہد پیہم، شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں بے عملی، عمل کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ وہ مرد قلندر، مرد حق، ترجمان حقیقت، حکیم الامت، مفکر اسلام، شاعر مشرق، رنر خودی جو مصور پاکستان ہے، اس نے کیا کیا، اس نے اندھیری رات میں قوم کو روشنی، راہنما دکھایا، بے ہدف سینوں میں ہدف دکھا دیا۔ اس نے غلامی میں سے آزادی دکھائی۔ موت میں سے حیات دکھا دی، بے یقینی میں سے یقین پیدا کر دیا، جو سینے عشق سے خالی تھے ان میں عشق پیدا کر دیا۔ بت خانہ ہندوستان میں، حرم پاکستان بنا دیا۔ ضمیر کن فلک تیرے علاوہ کوئی نہیں۔ بے نشان کا نشان تیرے علاوہ کوئی نہیں۔ بے تصور کو تصور دیا۔ جس سے فکر تخلیق ہوئی، نشان ملا، عمل پیدا ہوا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ..... ٹوٹا ہے ایشاء سے سحر فرنگیانہ۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئے پھر جذب سے بولے، ”خودی قلندر، مطلب قلندر اور مقصد قلندر۔ ذات قلندر لا الہ الا اللہ، ظہور قلندر، محمد رسول اللہ ﷺ۔ قلندر بجز دو حرف لا الہ کچھ نہیں رکھتا، فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا۔“

”اصل میں یہی کام ہے کہ کسی کو ان کی منزل کا نشان مل جائے۔“ میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچ کر بولے ”جب ہندوستان میں اسلام نہیں پہنچا تھا۔ یہاں بزرگان دین اسلام کا آفاقی و حقیقی انسانیت کا پیغام لے کر آئے۔ حضرت علی ہجویری و داتا گنج بخش، حضرت معین الدین چشتی، اجیری، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر۔ حضرت سخی سلطان باہو، حضرت بابا جی محمود شاہ صاحب مبارک اور دوسرے بزرگان نے جو عشق کی شمع دلوں میں روشن کی تھی، وہ مکملہ جوانہوں نے ان کے دلوں میں ڈالا تھا، اسے پاکستان کی صورت میں سامنے لے آئے، اس کی زمین بے حدود اس کا آفتق بے ثغور..... اس کے سمندر کی موج دجلہ، دنیوب و نیل۔“

”بلاشبہ یہ عطیہ خداوندی ہے۔“ میں نے تبرہ کیا

”اور سنو۔! اب یہ پاکستان لا الہ الا اللہ ہو گیا ہے۔ اب اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کا، خدائی اور مصطفائی ﷺ کا نظام ظاہر ہوتا ہے۔ جب یہ نظام آگیا تو پھر اس کی نہ کوئی باطنی عروج کی انتہا ہوگی اور نہ ظاہری ترقی کی انتہا ہوگی۔ یہ نظام اسی دل سے ظاہر ہوگا۔ خودی کا نقصن تیرے دل میں ہے..... فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے۔ حریم ذات ہے اس کا نشین ابدی..... نہ خاک تیرہ لمحہ ہے نہ جلوہ گاہ صفات۔“

”سرکار یہ نظام کب اس دل سے ظاہر ہوگا؟“ میں نے سوال کیا تو وہ بولے

”زندہ آئین، قرآنی، نورانی جاودانی، جس کو حکمتہ بالغہ فرمایا ہے۔ جو مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جو زندگی کو سرتاپا اس کے حقوق عطا کرتا ہے۔ اس کی طرف آنا ہوگا، جو پرانی رسوم و قیود کو توڑ کر مال و دولت، رنگ و نسل کے امتیازات کو ختم کر دے۔ فرعونیت و رعیت کی تمیز ختم کر دے۔ انسانیت کو مساوات کے حقیقی فطری اصولوں سے روشناس کر دے۔ جو بتاتا ہے کہ اسلام میں کسی قسم کے جمود فکری کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ زندگی کے نت نئے تقاضوں سے، نئے چیلنجز سے برسر پیکار ہو کر، اس پر پوری طرح غالب ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔“

یعنی دل کے حسین چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ اس قافلہ عشق نے لا الہ کی تلوار سے غلامی، محکومی اور محتاجی، احساس کمتری، مایوسی، ناامیدی، مجبوری کی رگوں سے خون بہا دیا اور اپنے خون سے لا الہ اس کائنات پر لکھ دیا۔ آزادی بھی، خود مختاری بھی، حکومت بھی حاصل ہوگئی۔ ”خودی شیر مولا جہاں اس کا صید،..... زمیں اس کی صید آسمان اس کا صید۔ اپنے خون دل سے دل کی تعمیر کی۔ تیری تبدیل ہے تیرا دل..... ٹوٹا آپ ہے اپنی روشنائی۔ ہر شے ہے جو خود نمائی..... ذرہ ذرہ صہید کبریائی۔ جہاں آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر..... نبوت ساتھ جس کو لے گئی تھی وہ ارمغان تو ہے.....“ میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے..... میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے۔ تو کیا ہوا؟ اس چمن کی مٹی نے دل کا راز ظاہر کر دیا۔ اے ارض پاک تیری حرمت پہ کٹ مریں ہم..... ہے خوں تیری رگوں میں اب تک رواں ہمارا۔“

”جی، یہ تو ہے۔“ میں نے کہا

”ایک وقت ایسا آیا کہ ان سے ہر ایک شے چھین لی گئی۔ روٹی، ہتھیار، تحفظ کا ہر سامان پہلے ہی لے لیا گیا، پھر وہ کیا تھا کہ یہ بے تیق و تفنگ لڑے اور اس مقام سے بھی کامیاب گذر گئے۔ کافر ہے تو کرتا ہے شمشیر پہ بھروسہ..... موسن ہے تو بے تیق بھی لڑتا ہے سپاہی۔“ یہ کیا تھا؟ یہ تھا اس مرد قلندر کی دی ہوئی عشق کی آگ، جس نے حیات و موت سے بھی گذار دیا۔ فقر جگہ میں بے ساز و بیراق آتا ہے..... ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم۔“

”یہ عشق کی آگ، یہ حیات اور ممات، یہ کیسی قوت ہیں سرکار، کیسے کیسے پہاڑوں کو رائی بنا دیتے ہیں۔“ میں نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے کہا

”بود و بود صفات ہیں، یہ ذات کی جلوہ گریاں ہیں۔ جس کو تو حیات سمجھتا ہے، جس کو ممات سمجھتا ہے ان کو ثبات نہیں ہے۔ ثبات کسے ہے، یہ عشق جاودانی، دل کی حیات ہے۔ یہ دونوں پردے اس نے اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے اوڑھے ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ بولے، ”محکومی پتہ ہے کیا ہوتی ہے؟“

”سرکار آپ فرمائیں؟“ میں نے کہا

”محکومی یہ ہوتی ہے۔ جب دل، فکر، جسم، تقدیر محکوم ہو جاتی ہے، یعنی دوسروں کے تابع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ زندگی اور موت بھی غیروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ وہ لذت حیات و موت سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ان کا جینا مرنا بھی اپنا نہیں رہتا۔ حیات جاودانی کی تڑپ ان میں ختم ہو جاتی ہے۔ عشق ان کے دلوں سے ہجرت کر جاتا ہے۔ وہ تقدیر جو خدا نے مسلمانوں کے دل میں رکھی تھی اس سے ان کی نظریں اٹھ گئیں۔ جو دل ہی سے ظاہر ہونا تھی، وہ جمود کا شکار ہو گئی، بے عملی، جہد اور عمل پیہم ان سے تحلیل ہو گئے۔ کسے خبر کہ سفینے ڈبو چلی کتنے..... فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی۔“

”اور جن کے اندر یہ آگ پوری طرح موجود ہو؟“ میں نے دھیمے سے لہجہ کہا

”باطل کا ارادہ، جس طرح باطل، اپنی باطل فکر کو تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح مرد حق، قوم کی تقدیر کو تخلیق کرتا ہے۔ قوم جب غلامی، محکومی، مجبوری اور محتاجی کو اپنی تقدیر سمجھ لیتی ہے، وہیں آ کر ایک مرد قلندر، مرد حق اس تقدیر کو توڑ دیتا ہے۔ تقدیر ممکن قوت باقی ہے ابھی اس میں..... نادان جسے سمجھے تقدیر کا زندانی۔ مرد حق، حق اندیش و حق بین ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارادے سے قوم کی تقدیر تخلیق کرتا ہے۔ مہر و ماہ و انجم کا محاسب ہے قلندر..... ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر۔ میدان کار گہ میں، میدان جنگ میں، اس کا تیر، حق کا تیر ہوتا ہے۔ مرد حق

اس طرح یہ دھارا اپنی لا متناہی منزل کبریائی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ 'خودی کی ہے یہ منزل اولیں..... مسافر یہ تیرا ٹھکانہ نہیں۔'

”اب کرنا کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولے

”جب یہ پاکستان بن گیا تو کیا ہوگا؟ اصل میں یہ مرد قلندر نے اپنی قیغ خودی کی دھار کی ایک جھلک قوم میں سے دیکھی ہے۔ اب، جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بنی..... جگر خون ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا، جو پاکستان بننے کے دشمن تھے اب بھی وہی دشمن ہیں۔ بلاشبہ اس کا دشمن شیطان ہی تو ہے۔ اس کے علاوہ جو شیطان نظام ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ اے مسلمان! حضرت سلمان کا معجزہ بھر سے سیکھ لے۔ کہ کوئی شیطان نہیں جو تیری آنکھوں کی تاک میں نہ ہو۔ اس دل کی وہ خفیہ نظر بیدار، ہوشیار اور برق رو سے تیز تر برق افشانی کر، جو اس حرم کے اندر دوسو سے، خناس، شیطان فکری، فتنوں، غدار، منافق، باغی، اور باہر کائنات میں ان بھیس بدلے والے، عیار، مکار اور دغا باز دشمن کی گہری چالوں پر نگاہ رکھنے والی نظر، نگہبان حرم ہوشیار۔ نگہبان حرم تجھے سلام۔ نگہبان حرم تیرا اللہ نگہبان نظر دل کی حیات جاودانی“

”اب میرے لئے کیا حکم ہے۔“ میں نے پوچھا

”جسم و جان سے گذر کر، موت و حیات سے گذر کر مکان و زماں سے گذر کر، اس دل کو پالیا۔ دل کو ایسے ہی پایا جاتا ہے۔ دل میں ڈوب کر، حق کے ساتھ محکم ہو کر، دل سے، درود سے محمد رسول اللہ ﷺ سے ظاہر ہو۔ اب اسی دل سے ظاہر ہو، زماں پر بھی قبضہ کر اور مکاں کو بھی قبضے میں لے لے۔ یہی خودی ہے۔ جاؤ، تجھے پیام عشق دے دیا۔ تخلیق کا بھید کن فکان تیرے علاوہ کوئی نہیں، بے نشان کا نشان تیرے علاوہ کوئی نہیں۔ زندگی کے راستے میں اور بھی بے خوف قدم رکھ، کیونکہ کائنات میں تیرے سوا کوئی نہیں ہے تہہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر..... قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نرم انداز میں آنکھیں بند کی اور خاموش ہو گئے۔ کتنے ہی لمحے وہاں گذر گئے۔ میں ان کے سامنے بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ وہ انہوں نے آنکھیں کھولیں، میری طرف اجنبیوں کی طرح دیکھا اور وہ بچھا ہوا سفید کپڑا اٹھا کر ایک طرف چل دیئے۔ میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں چونکا اس وقت جب میرا فون بج اٹھا۔ وہ جنید کی کال تھی۔ وہ قریب ترین سڑک پر آچکا تھا۔ پھر میں بھی اٹھا اور چل دیا۔

☆.....☆.....☆

انوجیت سنگھ مصروف ہو گیا تھا۔ اسے اوگی پنڈی نہیں، ارد گرد سے بہت سارے ایسے نوجوان مل گئے تھے، جو صرف دھرم کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے۔ اس کی جدوجہد کالج دور سے تھی، جو اس وقت پورے جوبن پر دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ بھی کام کر رہا تھا۔ اس لئے ایک ہی دن میں اس نے اپنے گرد لوگوں کو جمع کر لیا۔ کدور میں ایک مرکز بنا لیا۔ شہر کے بہت سارے نوجوان اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ جہاں نے اسے یہی کہا تھا کہ وہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ سرگرمیاں شروع کرے۔ اگر درمیان میں کہیں کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو بتانا۔ سو انوجیت پوری جان سے اس مقصد کے لئے لگ گیا تھا۔

جہاں سارا دن بیٹ پر پڑا رہا۔ کبھی سو جاتا اور اٹھ کر یونہی ٹھٹھٹھ لگتا۔ اسے کئی بار خیال آیا تھا کہ کسی سے رابطہ کرے، کوئی بات پوچھے، کوئی خبر لے، مگر یہی سوچ کر فون کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا کہ جب کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی کو کال کروں۔ اس دن ہر پریت بھی انوجیت کے ساتھ نکل ہوئی تھی۔

وہ اپنی اُن سہیلیوں سے ملنے نکل پڑی تھی جو کبھی اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھیں۔ اب جتنے لوگوں سے بھی رابطہ ہو جاتا اتنا ہی کم تھا۔

اس وقت سورج ڈھل چکا تھا، جب ہر پریت واپس لوٹ کے آئی۔ انوجیت کہیں دوستوں میں تھا۔ اس نے لیٹ ہی گھر آنا تھا۔ جہاں اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آکر اس کی روداد سن رہا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ امرتسر سے سردار تن دیپ سنگھ کی تھی۔ حال و احوال کے بعد اس نے کہا

”یار اگر تم صبح تک یہاں تک آسکو تو؟“

”جی میں حاضر ہو جاتا ہوں، چاہئے آپ ابھی کہو، میں نکل پڑتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا

”نہیں، اتنی جلدی بھی نہیں، صبح میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ دس بجے تک پہنچ جانا۔ باقی جب چاہو آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”ٹھیک ہے جی۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

”کیا بات ہو سکتی ہے؟“ ہر پریت نے سن کر پوچھا

”اب تو کل ہی پتہ چلے گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، یہی ایکشن کی بات ہوگی۔ اب جو تُوڑ تو پورے عروج پر ہیں نا، پارٹی ٹکٹ کے بھی سبھی سے وعدے ہو رہے ہیں۔ آخر وقت تک پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوتا ہے۔“ جہاں نے عام سے لہجے میں کہا

”میں چلوں تمہارے ساتھ؟“ اس نے پوچھا

”جیسے تمہارا دل کرے، لیکن اس وقت تمہاری یہاں زیادہ ضرورت ہے۔ میں صبح جاؤں اور شام تک لوٹ آؤں گا۔ دو سواد گھنٹے کا تو راستہ ہے، تو سنا پھر باقی دن کہاں گذارا۔“ جہاں نے کہا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ وہ اپنی روداد سنا کر اٹھ گئی۔ کلجیت کور ڈنر کے لئے بلانے لگی، اسی دوران فون کور کا فون آ گیا۔ وہ ایسے فون سے بات کر رہی تھی، جو کہیں ٹریس نہیں ہو سکتا تھا۔

”خیر تو ہے نا تو تن؟ اور تم جالندھر کب آئی ہو؟“ جہاں نے خوشگوار لہجے میں کہا

”بالکل خیر ہے، اور میں آج ہی آئی ہوں، کہاں ہو تم اور جالندھر کتنی دیر میں آسکتے ہو؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

”میں بھر پور چھ رہا ہوں خیر تو ہے نا؟“ اس بار اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”میں پھر کہہ رہی ہوں، خیریت ہے۔ میں یہاں ہوں جالندھر، سوچا تم سے گپ شپ کر لوں، اب یہ مت کہنا کہ میں اوگی پنڈ آ جاؤں۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہی ہوں۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا

”یار بڑا سسپنس ہے، خیر، میں ڈنر لے کر نکلتا ہوں، آنا کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا

”وہی باغیچہ کور کے فارم ہاؤس پر، وہیں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر الوادگی باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ڈنر کرنے کے بعد جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے فور وٹیل نکالی، اسلحہ اس میں رکھا اور اکیلے ہی نکل پڑا۔ ہر پریت نے اسے پورچ سے الوداع کیا۔ کدور جالندھر روڈ پر آتے ہی اس نے جیب کی رفتار تیز کر دی۔ اس کے دماغ میں کہیں کھد بد ہونے لگی تھی کہ ایک دم سے یوں فون نہیں آسکتے ہیں۔

اس وقت رات کے سو اگیارہ بجے کا وقت تھا جب وہ فارم ہاؤس پہنچ گیا۔ فون کور اس کا پورچ ہی میں انتظار کر رہی تھی۔ وہ کافی حد تک سویر اور ماڈ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پتلون پر شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کے

ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ان کے بیٹھے ہی چائے آگئی۔
 ”تمہیں کل رتن دیپ سنگھ نے امرتسر میں بلایا ہے نا۔“ نوتن نے نگ اسے تھماتے ہوئے کہا
 ”ہاں، تم سے کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے فون کیا تھا۔“ جہاں نے بتایا
 ”تو بات یہ ہے جہاں، انہوں نے پورے پنجاب سے کچھ لوگ جنیں ہیں۔ وہ انہیں کوئی ٹاسک دینا چاہتے
 ہیں۔ وہ سارے لوگ کسی نہ کسی طرح سردار جی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہاں کل یہی بات ہوگی۔“ اس نے بتایا
 تو جہاں نے پوچھا

”کیا تمہارے ساتھ ان کی بات ہو چکی ہے؟“

”ہو چکی ہے۔ ان سے بھی کسی نہ کسی حوالے سے بات ہو چکی ہے۔ صرف تم سے نہیں ہوئی ہے۔ کل سب
 لوگوں کو ایک کرنا ہے تاکہ وہ اپنے طور پر کام کرنا شروع کر دیں۔“ اس نے کہا
 ”میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ لوگ با اعتماد نہیں ہوں گے۔ لیکن کیا وہ سارے ایک ساتھ چل سکیں گے؟“ جہاں
 نے پوچھا

”یہ تو کل بات ہوگی نا، تم چاہو تو انکار بھی کر سکتے ہو، اگر بہتر سمجھو تو ان کے ساتھ شامل ہو جانا۔“ وہ بولی
 ”اوکے، یہ تو پھر کل ہی معلوم ہوگا۔“ اس نے کہا

”نہیں، میں اس بارے کچھ تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ وہ میں تجھے بتا دوں گی، اس لئے تمہیں یہاں بلایا ہے۔
 اور ہاں بائیتا کور کے بارے میں سنا ہے، وہ جہاں کے پاس ہے؟“ نوتن نے مسکراتے ہوئے کہا
 ”وہ چھلاوا ہے، کہیں بھی جاسکتی ہے۔“ جہاں نے تیسرا کیا۔

”کیا یہ بھی معلوم ہے کہ ان پر حملہ ہوا ہے، اور وہ سارے اس وقت زیر زمین ہیں؟“ نوتن نے بتایا
 ”اوہ۔! میں کرتا ہوں رابطہ۔“ جہاں نے کہا اور اپنا فون نکالا تو نوتن بولی

”کل پتہ کریں گے، اس وقت سب خیریت ہے۔“ اس نے کہا اور پھر اپنی باتوں میں کھو گئے۔

اس وقت سورج نہیں نکلا تھا، جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہاں پرے رہنے سے کیا ہے، امرتسر کے لئے
 نکلتے ہیں۔ اس وقت ٹریفک بھی کم ہوگا۔ وہ ویسے ہی اٹھے اور امرتسر نکل پڑے۔ ڈھائی گھنٹے بعد وہ امرتسر
 میں تھے۔ دن کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی جب وہ حویلی پہنچے۔ انہیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا۔ وہیں
 ناشتہ کر کے تیار ہوئے اور اس خاص کمرے کی جانب چل پڑے جہاں انہوں نے بلوایا تھا۔

سردار رتن دیپ سنگھ سامنے ہی ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے صوفوں پر تین سنگھ اور دو
 لڑکیاں بیٹھی ہوئیں تھیں۔ ان سب کا انداز یوں بے تکلف تھا جیسے ایک ہی خاندان سے ہوں۔ رتن دیپ بیٹھا
 رہا۔ لیکن باقی سارے اٹھ گئے۔ وہ رتن دیپ سے ملا، باقی سب سے ہاتھ ملایا تو نوتن کور کے ساتھ صوفے پر
 بیٹھ گیا۔ تو رتن دیپ نے سن کی طرف دیکھ کر کہا

”میں تم سب کو جی آیاں نوں کہتا ہوں۔“ پھر جہاں سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا، ”خاص طور پر جہاں سنگھ
 تمہارا۔ خیر، پہلے میں سب کا تعارف کرادوں تم سے یہ تو آپس میں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ اس نے ان
 تین جوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”یہ جو پہلا ہے اس کا نام ہے وکرم سنگھ، بلا کا فائبر ہے اور ماہر نشانہ باز، اسلحہ اس کا کھلوتا ہے۔ اس کا تعلق
 بنالہ سے ہے۔ اور یہ دوسرا سر جیت سنگھ، تھوڑا پاگل، لیکن انتہائی وفادار، غرور بہادر، یہ ہوشیار پور سے ہے۔ اور

تیسرا جلد پوسنگھ، دلیر، فائبر اور ماہر پلانر، فتح گڑھ صاحب سے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش ہوا، پھر لڑکیوں کی
 جانب دیکھ کر کہا، ”یہ بچن کور ہے، یہ کیا کچھ کر سکتی، مجھے بھی یقین نہیں آتا دوسوہ سے اور اس کے ساتھ کرن کور
 ہریانہ سے، اس کے بارے میں بھی نہ سمجھ آنے والی باتیں ہی سنی ہیں۔“

”اور میرے بارے تم جانتے ہی ہو۔“ نوتن کور نے کہا تو ایک ہلکا سا تھقہ لگایا۔ جس سے ماحول کافی حد تک
 بے تکلفانہ ہو گیا۔

”اب تمہارے ذہن میں جو سوال ہے کہ انہیں کیوں ملوا رہا ہوں تو یہ ان سب کے ذہنوں میں بھی ہے۔
 میں نے ابھی کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی کہ تم سب لوگوں کو یہاں اکٹھا کرنے کا مقصد کیا ہے۔“

”ظاہر ہے کوئی بھاری سمیا (مشکل) ہوئے گی۔“ سر جیت سنگھ نے کہا
 ”کوئی سمیا نہیں ہے۔ لیکن اس معاملے میں سب سے بات ہوتی رہی ہے سوائے جہاں کے۔ ابھی ایک

اور نے تم لوگوں میں شامل ہونا ہے اور وہ ہے بائیتا کور، میری بیٹی۔ وہ ابھی یہاں نہیں ہے۔ بہت جلد آ جائے۔
 گرو مہاراج اس کی حفاظت کرے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، پھر چند لمحے بعد بولا، ”پورا ایک سال ہو گیا،
 میں نے پورے پنجاب سے یہ ہیرے پتے ہیں۔ دراصل تم لوگوں کو میرا اکٹھا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس
 وقت دھرم کی جو جنگ جاری ہے، اس میں ہندو حکومت طاقت سے نہیں، سازش سے سب کو مار رہی ہے۔ میں
 ساری زندگی یہ جنگ لڑتا رہا ہوں۔ اس عمر میں آ کر میں تھک نہیں گیا، بلکہ میں یہ سمجھ گیا ہوں کہ انہیں مارنا کیسے
 ہے۔ سکھ قوم ہندو کے ہاتھوں بہت استعمال ہو چکی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ طاقت سے لڑنے والے بہت
 ہیں۔ اور گرو مہاراج کی کرپا سے وہ لڑ رہے ہیں۔ لیکن۔! بہت سارے محاذ ایسے ہیں جہاں ہمیں لڑنا ہے۔
 تم لوگوں کو ایک ہی مقصد دینا چاہتا ہوں، اور وہ ہے۔ ہندو سازش کا مقابلہ، وہ ہمارے خلاف ہو یا ہمارے
 دوستوں کے خلاف۔“ وہ انتہائی جذباتی لہجے میں کہہ کر خاموش ہو گیا تو جلد پوسنگھ بولا

”یہ تو بہت بڑا میدان ہے، ہندو دن بدن عالمی سطح پر اپنے دوست بڑھا رہا ہے۔ اور اس دوستی میں وہ اپنی
 طاقت تو بڑھا ہی رہا ہے لیکن اس دوستی میں دوسروں کو کچلنا بھی شامل ہے۔“

”تم لوگوں کا فوکس صرف پنجاب ہوگا۔“ رتن سنگھ نے ان کو ٹارگٹ دے دیا۔

”میں تیار ہوں۔“ بچن کور نے حتمی انداز میں کہا تو یہی بات کرن کور نے بھی کہہ دی۔

”ہم بھی منہ نہیں موڑ رہے، بلکہ ہم تو کچھ کرنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔“ سر جیت نے کہا

”میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ شاید یہ دکھ لے کر مرنا ہوگا کہ میں گرو کا خالصہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ پایا۔ لیکن
 اتنا تو اطمینان ہوگا کہ میں اپنے جیسے کئی لوگ چھوڑ کر جا چکا ہوں۔ اب کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، یہ تم لوگ جانو
 اور تم لوگوں کا کام۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا

”یہ ہم لوگوں کا خواب تھا سردار رتن سنگھ جی، آپ نے ہمیں موقعہ دے دیا۔ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں
 گے۔“ وکرم سنگھ نے یقین دلایا تو رتن سنگھ بولا

”دیکھو۔! میں جانتا ہوں کہ تم سب اپنی اپنی جگہ ایک قوت ہو۔ تم لوگوں کے پیچھے بڑی قوتیں ہیں۔ اب ایک
 جٹ ہو کر اپنی طاقت کو استعمال کرو گے تو دھرم کو کتنی سہا جیتا ملے گی، اس کا تصور کرو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تم
 لوگوں کی اپنی قوتی طاقت ہوگی، یہ بھی سوچو۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوتے ہوئے ایک دم سے بولا۔ ”اور ہاں ابھی یہ
 فیصلہ مت کرنا کہ تم ساتھ ہو یا نہیں۔ دن بھر سوچو اور فیصلہ کرو۔ جو بھی فیصلہ ہوگا، مجھے پورے دل سے مانوں گا۔“

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے، میں تیار ہوں۔“ بلند یوسنگھ نے کہا تو رتن دیپ نے جہاں کئی طرف دیکھ کر پوچھا

”تم کیا کہتے ہو؟“

”یہ خیال اور آپ کی محنت بہت اچھی ہے۔ اور ہم سب ایک جٹ ہو کر چلے تو بڑی کامیابیاں ہمارے قدم چومیں گیں، لیکن ایک بات بارے آپ نے شاید سوچا ہو۔ وہ یہ ہے کہ مرکز کے بغیر کچھ بھی نہیں چلتا اور عہدے کی طاقت، اپنے بات منوانے کی ضد ایسا سب کچھ ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ دھرم کی بنیاد پر جھوٹ نہیں چلتا۔ پورے خلوص سے چلنا ہوتا ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ دھرم کی جنگ لڑنے والے چور ڈاکو، اور قاتل بن گئے ہیں ایسا کیوں ہوا؟ ذاتی فائدہ، لوبھ اور لالچ۔“

”اور سب سے بڑی ایک دوسرے پر اعتماد کی کمی۔“ وکرم سنگھ نے کہا تو سربیت سنگھ بولا

”جان دارنے اور جان لینے میں بڑا فرق ہے بابو، آج گرد مہاراج نے ہمیں موقعہ دے دیا ہے تو ہم چل پڑیں، وقت خود فیصلہ کر دے گا کہ کون اس قابل تھا اور کون نہیں؟“

”تو ٹھیک ہے چل پڑیں۔“ جہاں نے ایک دم سے کہا تو رتن دیپ سنگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا

”تو پھر آج، ہر مندر صاحب جا کر سچے گرد بادشاہ کے حضور حاضری دیں گے، ارداس کریں گے اور وہیں گرد مہاراج ہماری مدد کر دے گا کہ تم لوگوں کے جتنے کا بڑا کون ہوگا۔ وہ چاہے کوئی بھی ہو، گرد مہاراج نے قبول کر لیا تو ہم اسی کے آگے سیس نوا (گردن جھکا) دیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور ہلکے ہلکے کہا،

”واہ گرد کا خالصہ، واہ گرد جی کی فتح۔“

وہاں بیٹھے سارے لوگ یہی دہرانے لگے۔ تبھی جہاں سنگھ نے پورے اعتماد اور سنجیدگی سے کہا

”رتن سنگھ جی، اگر ہم یہی فیصلہ نہیں کر پائے تو پھر آگے کیا فیصلہ کریں گے۔ یہیں پتہ چلے گا کہ ہمارا جٹ کس حد تک مضبوط رہ سکتا ہے اور ہم ایک دوسرے کو کتنا مانتے ہیں۔ سب سے پہلے میں کہتا ہوں کہ جو بھی اس جتنے کا سردار ہوگا، میں اس کی تابع داری کروں گا۔“

”سردار جی، آپ بڑے ہیں، ان میں کون لیڈ کرے گا، آپ کے ذہن میں ہوگا؟“ بچن کور نے پوچھا

”میں تو بلند یوسنگھ کا نام دیتا ہوں۔“ رتن سنگھ نے کہا تو جہاں اٹھا اور بلند یوسنگھ کو ہاتھ پکڑ کر بولا

”سب سے پہلے، میں ان تابع داری قبول کرتا ہوں اور ہر مندر صاحب جا کر بھی اس کی شہیت لوں گا۔“

”ہوگئی بائی جی۔“ بلند یوسنگھ نے اس کے گھٹنے کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو باری باری سب نے ویسا ہی کیا جیسا جہاں نے کیا تھا۔

”چلو۔! اب ہر مندر صاحب چلتے ہیں۔“ رتن دیپ سنگھ نے کہا تو سبھی اٹھ گئے۔ ان کے چہروں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چغاب کا اک نیا اتحاس لکھیں گے۔

☆.....☆.....☆

دن کا پہلا پھر گزر چکا تھا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ میں پوری کوشش کر چکا تھا کہ کسی طرح مجھے معلوم ہو جائے، لیکن وہ ایک اشارہ بھی نہیں ملا تھا۔ میرے اندر بے چینی انتہا پر تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ یوں مجھ پر حملہ ہو جائے اور مجھے پتہ نہ چلے۔ یہاں پر آلات بھی بے بس ہو گئے ہوئے تھے۔ میں اس وقت صحت پر

بیٹھا تھا۔ اس ناؤں میں میرا پہلا دن تھا۔ اگرچہ یہاں بہت سناٹا تھا۔ کوئی شور شرابا نہیں تھا۔ یہ جگہ جتنی محفوظ ہو سکتی تھی، اتنی ہی خطرناک بھی تھی۔ وہ سبھی نیچے تھے اور اپنے طور پر نجانے کیا کچھ کر رہے تھے۔ رات بائیکا کور بھی میرے پاس نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں رہی اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں اب تک سوچوں ہی میں گم ہوں۔ مجھے اپنے دل سے پوچھنا چاہئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنے دماغ میں آئی ہوئی ساری سوچوں کو باہر نکال دیا۔ میں اپنے آپ میں کھو چکا تھا۔

سب سے پہلے مجھے پانی کی لکیر دکھائی دی۔ جو دھیرے دھیرے بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک دریا میرے سامنے تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا، جو ٹھیلے رنگ کا تھا۔ میں اس کے اوپر سے گزر گیا۔ یہاں تک کہ ایک راستہ دکھائی دیا جو دریا کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ وہیں ایک طرف بہت کھلا میدان آ گیا۔ اس کے درمیان میں ایک شخص زنجیروں سے بندھا ہوا تھا۔ اور وہ زنجیریں زمین کے ساتھ گاڑی ہوئی لکڑی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ اس کا خون ٹپک رہا تھا اور وہ فریاد کنتاں تھا۔ مجھے اس کا چہرہ یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ کہاں دیکھا ہے، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تب اچانک وہ مجھ پر واضح ہو گیا۔ میں نے سراٹھا دیا۔ تبھی مجھے میز جیوں پر آہٹ سنا دی۔ میں نے دیکھا بائیکا کور ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے پکڑے ہوئے تھی اور اس میں چائے کنگ تھے۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”آؤ بائیکا! آ جاؤ۔“ میں نے اسے دیکھ کر کہا تو آگے بڑھ آئی۔ پھر ٹرے میرے قریب رکھتے ہوئے بولی

”یہ تم کہاں گم تھے؟“

”کہیں نہیں، بس یونہی اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”جہاں، میں نے جتنا وقت تمہارے ساتھ گزارا ہے، اس دوران میں نے کبھی تمہیں اتنا مایوس نہیں دیکھا۔ کل سے تم ایسے کیوں ہو گئے ہو؟“ اس نے کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

”ہر کام میں رتِ تعالیٰ کا کوئی راز ہوتا ہے، ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کچھ دیر ٹھہر جاؤ، ابھی وہ راز بھی کھل جائے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور قریب پڑا ہوا فون اٹھا لیا۔ بائیکا کور نے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے طارق نذیر کے نمبر پر کال کی۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔

”کچھ پتہ چلا؟“ میں نے پوچھا

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی، پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔“ اس نے انتہائی مایوسی میں کہا

”فورا پتہ کرو، تمہارے دائرہ کار میں جتنے لوگ آتے ہیں، ان سب کو اس کام پر لگاؤ۔ جیسے ہی پتہ چلے، مجھے بتانا، بہت وقت گزر چکا، اگر تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے تو بتاؤ، پھر میں کچھ کروں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

”یہ کیا ہے جہاں؟“ بائیکا کور نے پوچھا

”ابھی بتاتا ہوں نا۔“ میں نے کہا اور فہیم کو کال ملائی۔ وہ نیچے کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فورا کال پک کی

”جی بولیں۔“ اس نے کہا تو میں نے بتایا

”میری بات غور سے سنو، تم کمپیوٹر پر دیکھو، دریائے راوی کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب کہیں بھی کوئی ایسی جگہ ہے، جہاں کھلا میدان ہو یا اس طرح کی مشابہہ کوئی جگہ ہے تو تلاش کرو۔“

”میں ابھی دیکھتا ہوں، بلکہ تم آبی جاؤ، ہم مل کر دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں اور بائیکا کور نے سکون سے چائے پی اور پھر نیچے چلے گئے۔ وہ ٹرے اپنے ساتھ اٹھا لائی۔ ہم فہیم کے

کمرے میں گئے تو وہیں مہوش بھی تھی۔ وہ دونوں جیسے ہماری راہ تک رہے تھے۔

”کچھ ملا؟“ میں نے پوچھا

”یہ دیکھیں، جیسے تم نے کہا اس کے مطابق ہو۔“ اس نے کمپیوٹر اسکرین پر ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ جگہ ایسی تو نہیں تھی، جیسے مجھے نظر آئی تھی۔ بلکہ وہاں درخت اور گھر تھے۔ مگر وہاں جگہ کی مناسبت سے سب کچھ ویسا ہی تھا، جو مجھے دکھائی دیا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور پھر پوچھا

”اس جگہ کا نام کیا ہے؟“

”کوٹ دلاور۔ یہ لکھا ہوا ہے۔“ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا اور پھر فون نکال کر اپنے اپنے متعلق ان لوگوں کو فون کیا جو میرے لئے کام کرتے تھے۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے اس سے پوچھا

”کیا نام تھا اس کا جہاں ہم نے کچھ دیر کے لئے ایک بندہ رکھا تھا۔ وہیں شیخو پورہ روڈ پر۔“

”سر، اس کا نام چوہدری زوہیب ہے، میں اسی کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن آپ تو.....“

”اس کے بارے میں کیا بات تھی؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا

”سراسر غائب ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔“ اس نے کہا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ریگ گئی۔

”اچھا، تم صرف اتنا پتہ کرو کہ اس کے کارخانے میں سے دو دن سے بندہ کون غائب ہے؟ اور وہ رہتا کہاں ہے؟ اور تیسری معلومات یہ لینی ہے کہ اس کے کارخانے میں کام کرنے والے کسی بندے کا بھی تعلق کوٹ دلاور یا اس کے آس پاس کہیں سے ہے؟“

”میں ایک گھنٹے بعد آپ کو بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے انتظار کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

اس نے ایک گھنٹے سے پہلے ہی مجھے فون کر دیا۔ اس نے پر جوش لہجے میں کہا

”جی ایک بندہ غائب ہے اور اس کا تعلق بھی کوٹ دلاور سے ہے۔ اس کا نام اشرف پاڈا ہے۔ اس کے فون پر بہت ٹرائی کیا گیا، مگر دو دن سے اس نے فون اٹھایا ہی نہیں۔“

”اس کا نمبر بتاؤ۔“ میں نے پوچھا تو اس نے نمبر بتا دیا۔ میں نے اسے مزید نگاہ رکھنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ نمبر فہم ہی نے لکھا تھا اور وہی اس پر کوشش کرنے لگا کہ یہ فون اس وقت کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ عام فون ہی ثابت ہوا۔ اور میری توقع کے مطابق اس وقت وہ کوٹ دلاور کے پاس ہی تھا۔ میں نے سب کو اکٹھا کیا اور چلنے کے لئے کہا۔ جنید، اکبر، علی نواز اور سلمان میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ باغیچہ کو بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے اسے خود روک دیا۔ وہ اصرار کرنے لگی۔ تب زویا بھی ساتھ چلنے کا کہنے لگی۔ ہم دونوں میں بٹ گئے۔ میں، باغیچہ کو، زویا اور سلمان اور دوسری میں وہ تینوں تھے۔ دوپہر ہونے میں وقت تھا۔ جب ہم وہاں سے کوٹ دلاور کے لئے نکل پڑے۔

سلمان نے اس راستے کو ٹریس کر لیا تھا، وہی جنید کے ساتھ رابطے میں تھا۔ ہم دو فور و ہیل میں تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم کوٹ دلاور پہنچ گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کوٹ دلاور بستی نما تھا اور ایک طرف سرے پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سارا میدان شروع ہوتا تھا، جو کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں جھاڑیاں درخت اور نجانے کیا کیا اُگا ہوا تھا۔ اس میدان میں گڈنڈی نما راستے جاتے تھے۔ ایک طرف کچا راستہ تھا جہاں پر ٹائروں

کے نشان تھے۔ ہم وہاں جا کر رک گئے۔

جنید نے اشرف پاڈے کے بارے میں معلومات لینے کے اپنا رخ بستی کی طرف موڑ لیا۔ وہ اس کے بارے میں پتہ کرنے لگے تھے۔ وہ اس کے گھر تک جا پہنچے تھے۔ مگر وہ گھر نہیں تھا۔ وہیں ایک مقامی نے بتایا کہ وہ ذرا دور ایک چائے خانے پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ فوراً وہاں پہنچے۔ وہ شخص چند لوگوں کے درمیان بیٹھا کہیں ہانک رہا تھا۔ جنید کا فون آن تھا اور ہم سب سن رہے تھے۔

”اشرف پاڈا تمہارا نام ہی ہے؟“ جنید نے اس کے ساتھ ہاتھ ملا کر پوچھا

”جی ہاں، پر تم کون ہو؟“ اس نے قدرے رعب سے پوچھا

”تم کارخانے سے غائب ہو، وہاں کچھ بتا کر نہیں آئے، نہ تم فون کال سن رہے ہو۔ کیا بات ہے۔“ جنید نے پوچھا

”میں نے وہاں کام چھوڑ دیا ہے، میں نے بتا دیا تھا مینیجر کو۔ بلکہ اس کے ساتھ حساب بھی کر آیا تھا۔“ اس نے بتایا تو جنید نے پوچھا

”مطلب، مینیجر کو تمہارے بارے میں پتہ ہے کہ تم کام چھوڑ گئے ہو؟“

”جی ہاں، پر تم کون لوگ ہو اپنا تعارف تو کراؤ۔“ اس نے پھر اسی رعب دار لہجے میں پوچھا

”دیکھو، ہم لوگ پولیس سے ہیں۔ وہاں ڈکیتی ہو گئی ہے اور مینیجر نے تم پر شک کا اظہار کیا ہے۔ اسی نے ہی تمہارا پتہ بتایا ہے۔“ جنید نے پورے اعتماد سے کہا تو وہ تیزی سے بولا

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو، وہ تو.....“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک دم سے خاموش ہو گیا، جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ جنید نے اس کی بات نظر انداز کر دی تو اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

”مجھے کچھ پتہ نہیں اور میں پابند نہیں ہوں تم لوگوں کا، میں نے جب ایسا کیا ہی نہیں تو خواہ مخواہ.....“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ جنید نے پستل نکال لیا اور اکبر نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ پھر ایک جھٹکے ہی میں اسے فور و ہیل میں لا پھینکا۔ چند لمحے بعد جب وہ وہاں سے نکلے تو اس وقت تک علی نواز نے اس نے منہ میں پستل کی نال ڈالتے ہوئے پوچھا

”بول اوئے، تیرا مالک کدھر ہے؟ کہاں رکھا ہوا ہے اسے؟“ یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”دیکھ۔! اب یہ بے غیرت کیسے دیکھ رہا ہے۔“ اکبر نے اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا

”میں کچھ نہیں جانتا ہوں سوائے اس کے کہ وہ اس طرف کہیں چھپایا ہوا ہے۔“ وہ پوری طرح صاف نہ

بولا تو علی نواز نے اسے گھورتے ہوئے کہا

”دیکھ، اگر کچھ نہیں بتائے گا تو تجھے مرنا ہوگا، تعاون کرو گے تو شاید ہم تجھے چھوڑ دیں۔“

”میں سچ کہتا ہوں، وہ ادھر ہے اور وہاں جو جاتا ہے پھر وہ واپس نہیں آتا۔“ اس نے آڑے انداز میں بتایا۔

”وہاں کیا آدم خور ہیں؟“ اکبر نے کہا

”اس سے بھی بڑی بلائیں ہیں۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا تو اکبر اس کی پٹائی کرنے لگا۔ وہ اس کی اس

وقت پٹائی کرتے چلے آئے، جب تک وہ ہم تک نہیں پہنچ گئے۔ وہاں لا کر اس نے اس کھینچ کر فور و ہیل سے نکالا

اور گھسیٹا ہوا فور و ہیل کے آگے لے آیا۔ اشرف پاڈے نے کف زدہ انداز میں ہماری جانب دیکھا۔ تبھی اکبر نے

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے جنید سے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”گزار دے اس کے اوپر سے۔ اس کے تین ٹکڑے ہونے چاہئیں کم از کم۔“

”خدا کے لئے مجھے مت مارو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں نہ کرتا تو وہ میرے بچے مار دیتے۔“ وہ واویلا کرتے ہوئے بولا

”تو پھر کچ کیا ہے فوراً اگل دے۔“ اکبر نے اس کے ٹھوکرا مارتے ہوئے کہا

”اس رات میں گھر آنے کے لئے کارخانے سے نکلا تھا کہ ہمارے ہی کوٹ کے کچھ لوگ کار میں جا رہے تھے۔ یونہی باتوں ہی باتوں میں انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ بندوں کی تلاش میں پھر پھر کراپاگل ہو گئے ہیں، لیکن وہ انہیں نہیں ملے۔ انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرح کے بندے تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے تھوڑا شک تھا کہ ہمارے کارخانے کا مالک رات ادھر ہے۔ وہ اسی وقت ادھر ہوتا تھا جب کوئی خفیہ کارروائی ہی کرتا ہوتی تھی۔ میں نے اپنے شک کا اظہار کر دیا۔ اور گھر چلا گیا۔ اگلے دن انہوں نے مجھے گھر سے ہی لے لیا اور پوری طرح پتہ کرنے کو کہا۔ میں لالچ میں آ گیا۔ میں نے وہاں جا کر جب چھان بین کی تو پتہ چلا رات یہاں پر ایک بندہ لایا گیا تھا اور اسے تہہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ اس کا تھوڑا بہت حلیہ بھی پتہ چل گیا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو اکبر یک لخت اس کی پھر دھنائی کرنے لگا۔

”بول بے غیرت بول۔“

”بتا رہا ہوں نا،“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوا پھر کہتا چلا گیا، ”جب تک یہ وہاں پہنچے، اسے لے جایا جا چکا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ انہوں نے مینیجر کو قابو کیا اور مالک کو بلوایا۔ اور پھر وہ مالک کو لے گئے۔ کئی دن سے وہ ان کے پاس ہے۔ ممکن ہے انہوں نے اسے مار دیا ہو۔“ اشرف پاڈے نے خوف زدہ لہجے میں بولا

”تجھے یقین ہے کہ تو نے سچ کہہ دیا ہے؟“ اکبر نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر بولا

”ہاں، ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا

”چل پھر۔“ یہ کہہ کر اس نے اشرف کو اٹھایا اور فوروجیل کے آگے باندھ دیا۔ علی نواز نے اس کی مدد کی

۔ اس دوران مہوش کا فون آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ جو پاڈے کا نمبر دیا تھا، اس سے جو نمبر ملے ہیں، ان میں زیادہ تر اسی علاقے میں موجود ہیں اور چل رہے ہیں۔

اس وقت ہم سبھی آگے بڑھنے کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دینے والے تھے کہ ایک گولی آئی اور سامنے وینڈ اسکرین میں جا لگی۔ چمنائے کے ساتھ شیشہ ٹوٹ گیا۔ ہمیں ایک دم چھپنا پڑا۔ ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ گولی کس طرف سے آئی ہے۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد جیسے ہی میں نے سر اٹھایا، سامنے موجود جھاڑیوں میں سے ایک بندے نے سر اٹھایا اور ہاسٹل سے فائر کر دیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ فائر کرنے کے بعد سر نیچے کر لیتا۔ سر اس نے خود نیچے نہیں کیا، بلکہ فائر لگنے کے بعد ہی وہ نیچے گرا۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ جوش میں اٹھے اور ان سے فائرنگ کا تبادلہ ہونا شروع ہو گیا۔

”جمال، جیپ میں بیٹھو، آگے بڑھتے ہیں۔“ باغیتا نے کہا۔ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں سمجھ گیا وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ ہم فوراً ہی جیپ میں آ بیٹھے۔ ایک جیپ جنید اور دوسری سلمان چلانے لگا تھا۔ باغیتا کور نے سن روف کھولا اور اس میں گن رکھ لی، اس نے اپنا پہلو میرے ساتھ لگا لیا۔ اسی طرح اکبر اور علی نواز نے کیا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے ہم کسی سفاری ٹور پر ہیں اور جانور مارنے کے

لئے نکلے ہیں۔ وہ ہی ایک گروپ سامنے آیا تھا، پھر اس کے بعد کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمیں گھیرے میں لینے کے لئے پرتول رہے ہوں گے۔ ہم خود ان کے جال میں جا رہے تھے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ راستے میں جنید کو میں نے بتا دیا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں جھونپڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ سورج چمک رہا تھا اور اس میں ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے قریب قریب درخت نہیں تھے۔ ہم کچھ فاصلے پر جا کر رک گئے۔ جیپ رکتے ہی سبھی انتہائی سرعت کے ساتھ جھاڑیوں میں پھیل گئے۔ ہر ایک کے پاس بساط بھر اسلحہ تھا۔ میں اور باغیتا کور ایک طرف ہو گئے۔ ہم اس وقت پھیل رہے تھے کہ ایک لالچر آیا اور اس نے پہلے کھڑی جیپ کو اڑا دیا۔ دوسری اس سے کچھ فاصلے پر تھی۔ آگ اس تک نہیں پہنچی تھی۔ وہ اشرف پاڈا اسی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگا تھا۔ ہم انتہائی سرعت کے ساتھ وہاں سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میری نگاہ جلتی ہوئی جیپ پر پڑی تو اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایک دم سے میرے دماغ میں خیال آیا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے دو ہینڈ گرنیڈ نکالے، ایک باغیتا کور کو دیا اور دوسرے کی پن کھینچ کر ان جھونپڑیوں کی طرف پھینک دیے۔ ان کے گرتے ہی دو دھماکے ہوئے اور ان جھونپڑیوں کو آگ لگ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ باہر نکلے، وہ ہمارے نشانے پر تھے۔ سامنے سے زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ دشمن سامنے ہوا اور وہ میرے نشانے پر ہو، اور اسے نشانہ نہ لگے۔ میں نے ہاسٹل کو دونوں ہاتھوں میں لیا اور ممکن حد تک انہیں نشانہ بناتا چلا گیا۔ ایک جھونپڑی سے آگ دوسری میں لگ گئی تھی۔ میں کچھ دیر کے لئے فائرنگ روک دی۔ لوگ وہاں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ میری کوشش تھی کہ ان میں وہ لوگ مریں نہیں بلکہ زخمی ہو جائیں۔

سہ پہر ڈھل کر شام میں بدل رہی تھی۔ ہم سب نے ان جھونپڑیوں کو گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک دم سے فائرنگ کرتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ سامنے سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ لیکن ان کی آنکھیں دھوئیں سے بند ہو رہی تھیں۔ ان کے پاس سوائے بھاگنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ جلتی ہوئی جھونپڑیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اچانک ایک جھونپڑی میں سے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارے سامنے کئی بندے گرے ہوئے تھے۔ میں نے اور باغیتا کور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ملے کر ایک دم اسی جھونپڑی کی جانب بھاگے۔ اس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ سامنے ہی وہ کارخانے کا مالک زوہیب بندھا ہوا بیٹھ رہا تھا۔ ہماری پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے کھولیں۔ میں نے ہاسٹل سیدھا کیا اور زنجیر پر فائر کر دیا، وہ یکلخت ٹوٹ گئی۔ وہ دیوانہ وار ہماری جانب بھاگا۔ میں اسے لے کر باہر آ گیا۔ بھاگتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا

”اندرو کوئی اور ہے تمہارا ساتھی؟“

”نہیں کوئی نہیں ہے۔ میں ہی تھا؟“ اس نے چیخنے ہوئے حواس باختہ انداز میں کہا تو میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا، ”کوئی نہ چھوڑو۔“

میرے کہنے کی دیر تھی کہ وہاں پر قیامت برپا ہو گئی۔ سامنے جو بھی سر اٹھاتا، وہ مار دیا جاتا۔

ہماری پشت پر دریا تھا۔ وہ لوگ سامنے سے بھاگنے لگے۔ دھوئیں اور آگ میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کتنے تھے۔ ہم کچھ آگے گئے تو سامنے کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ دیر تک ہم وہاں کسی زندہ بندے کی تلاش کرتے رہے مگر ہمیں کوئی نہیں ملا۔ میرے ارد گرد چند لاشیں اور کافی سارے زخمی پڑے تھے۔ ان میں کچھ

میں ہے، وہ ایک صحافی اٹھاتا ہے۔ اس کے اخبار دیکھو، اس میں کتنا زہر بھرا ہوتا ہے، ان نگہوں کے بارے میں جو دھرم کے لئے اپنا سب کچھ قربان کئے بیٹھے ہیں۔ وہ اخبار انہیں دہشت گرد دکھاتا ہے، ایسا میں پہلی بار نہیں کر رہا ہوں بلکہ سنت جرنل سنگھ جھنڈر نے بھی ایک کو مارا تھا، وہ نگہوں کے خلاف حکومت کو بھڑکانے سے باز ہی نہیں آتا تھا۔ آگ لگائی ہوئی تھی اس نے۔“ بلدیو سنگھ نے کہا

”کرنا کیا ہے؟“ وکرم سنگھ نے پوچھا

”وہ اخبار تو ساری زندگی، نگہوں کے خلاف نہیں لکھے گا، لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو بھی عقل آ جائے کہ ایسا کام نہیں کرنا۔ اور اب تو نیوز چینل کا زمانہ ہے، انہیں بھی قابو کرنا ہے۔ یہیں سے انہیں میسج دینا ہے۔“ بلدیو سنگھ نے کہا

”پلان کیا ہے؟“ سرجیت سنگھ نے پوچھا

”وہ ابھی طے کرتے ہیں، لیکن ایک بات یاد رہے، ہمیشہ کے لئے، رازداری سب سے پہلے ہے، ہماری طرف کوئی شک کی نگاہ سے بھی نہ دیکھے۔ اس لئے کوئی بھی پلان بنانے سے پہلے یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے۔“ بلدیو نے کہا

”رابطہ ہی ہوگا، جس کے دوران ہی کوئی دوسرا ہم میں دخل اندازی کر کے ہمارے بارے معلوم کر سکتا ہے۔ سو اسے مضبوط بنالیں۔“ جہاں نے کہا

”وہ میری ذمہ داری ہے۔“ نون کور بولی

”تو ٹھیک ہے، وہ اخبار ہمیں کا ہے، اس کا مالک بھی یہیں رہتا ہے اسی شہر میں۔ اب میں بتاتا ہوں کہ کرنا کیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے ایک پیپر رکھا اور انہیں تفصیل بتانے لگا۔

اخبار کا مالک ارجن کمار ایک مشہور آدمی تھا۔ اس نے اخبار کمپنی بنا کر ہندی اور انگریزی اخبار نکال رہا تھا۔ اور ان دنوں وہ نیوز چینل بنانے کی پوری تگ و دو میں تھا۔ وہ صرف ایک صحافی نہیں تھا، بلکہ اس کی تمام تر توانائی، پنجاب میں ہندو کی مضبوط کرنے اور سکھوں کی ہر طرح سے مزاحمت کرنے میں لگائی ہوئی تھی۔ اس کا براہ راست حکومتی اداروں سے تعلق تھا۔ خفیہ والوں کے لئے وہ بہت بڑا سہارا اور اس کا ذریعہ تھا۔ جس سے وہ اس پورے علاقے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

۱۹۸۳ء میں وہ ایک معمولی سا صحافی تھا، جسے کوئی اخبار نوکری نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ چند گزہ میں وقت گزارنے کے بعد واپس جالندھر آ گیا اور یہاں ایک نامہ نگار کی حیثیت سے اس نے اپنا کام شروع کیا۔ ۱۹۸۴ء کے سانحہ کے بعد اس نے سکھوں کے خلاف بہت زیادہ رپورٹنگ کی۔ اس وقت خفیہ والوں کو ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔ وہ ان کی ضرورت بنتا چلا گیا۔ جس کے ساتھ ہی اس پر نوازشات کی بارش ہونے لگی اور وہ اخبارات کا مالک بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تعلقات کے دائرے میں وسعت آنا شروع ہو گئی اور اس نے دوسرے کئی کاروبار شروع کر لئے۔

ارجن کمار جالندھر کے ایک پوش علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے گھر سے اس کے آفس کی بلڈنگ کا فاصلہ ڈیڑھ کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔ اس کے گھر پر کافی سیکورٹی تھی۔ وہ اپنی شاعرانہ بی ایم ڈبلیو کار میں نکلتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ گھر سے نکلتا اور اپنے آفس تک جاتا، وہ وہاں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے گزارتا اور پھر کسی نہ کسی پارٹی میں چلا جاتا، یا کوئی ملاقات ہوئی وہاں چلا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر ہی رہتا۔ اس نے اپنے گھر میں

بے ہوش ہو چکے تھے۔ ان میں زندہ لوگوں کو باندھ لیا گیا تھا۔ جس وقت سورج ڈھل رہا تھا، اس وقت میں نے طارق نذیر کو فون کیا۔

”کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں سرجی، لیکن میں نے اپنی تفتیش کا دائرہ بڑھا دیا ہے، امید ہے کہ صبح تک مجھے کچھ نہ کچھ.....“

”تم سر کراتے رہنا اور میں نے ان بندوں کو پکڑ لیا ہے۔ اگر کریڈٹ لینا ہے تو آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جاؤ۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا تو ایک دم ہی چیخ اٹھا

”کہاں سر!“

میں نے اسے راستہ سمجھایا تو اس نے وہاں پہنچنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ تبھی میں نے سامنے کھڑے جنید سے کہا

”ان سے پتہ کرو، ان کا بڑا کون ہے؟“

”میں نے پتہ کیا ہے، وہ بھاگ گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا

”چلو ان سب کو گاڑیوں میں ڈالو اور لے چلو۔ اب وہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکیں گے۔“ میں نے کہا اور ساتھ ہی ان گاڑیوں کی جانب اشارہ کر دیا۔ مجھے پوری طرح پتہ تھا کہ یہ گاڑیاں چوری کی ہوں گیں۔ وہ ان بندوں کو لادنے لگے اور میں مالک کے زخم دیکھنے لگا۔ اسے حوصلہ دینے لگا۔ وہ بہت ڈرا اور سہا ہوا تھا۔ زویا اور بانیتا کو راز گرد پر نگاہ رکھے پشت سے پشت جوڑے کھڑی تھیں۔

وہ جو ایک فورجیل بچ گئی تھی اور اس کے آگے اشرف پاڈا کو باندھا ہوا تھا، اسے کھول کر باندھا اور زخمیوں کے ساتھ پھینک دیا۔ بانیتا، زویا، سلمان اور علی نواز اس میں بیٹھ کر نکل پڑے۔ اکبر نے زخمیوں والی گاڑی نکالی، جو سامنے ہی بندھے ہوئے تھے۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جبکہ جنید نے ایک دوسری گاڑی اٹھائی اور اس میں زویا کو ڈالا۔ ہم وہاں سے نکل پڑے تھے، اس وقت سورج کی لوبھی ختم ہو چکی تھی جب ہم کوٹ دلاور سے نکل کر دریا کنارے چلتے چلے گئے۔ جیسے ہی ہم سڑک کنارے آئے، سامنے سے پولیس فورس کا قافلہ ہمیں آتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ وہ جیسے ہی قریب آیا، میں رک گیا۔ طارق نذیر دیوانہ وار میری جانب بڑھا۔

”یہ سارے زخمی ہیں۔ انہیں بچاؤ، ان سے بہت کچھ معلوم ہوگا۔ باقی وہاں اب سوائے لاشوں کے اور کچھ نہیں ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بہت کچھ ملے گا۔ میں اسے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ میں نے زویا کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے، میں ملتا ہوں۔“ اس نے کہا اور قافلے کی طرف چل پڑا، جو اس سے کافی آگے نکل گیا تھا۔ میں نے جنید کو دیکھا، اس نے گاڑی بھگالی۔ ہم وہاں سے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

ہر مندر صاحب سے پلٹ کر وہ رتن دیپ سنگھ کی حویلی واپس نہیں گئے بلکہ انہوں نے وہیں سے جالندھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ انہوں نے پرکراما کے پاس بیٹھ کر کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک لائین آف ایکشن ترتیب دے لیں۔ وہ مختلف گاڑیوں میں بانیتا کور کے فارم ہاؤس میں آن ٹھہرے جہاں ان کے لئے دو پہر کا کھانا تیار تھا۔ راستے میں آتے ہوئے ان کے درمیان بہت ساری باتیں ہوتی رہیں تھیں۔ وہاں پہنچ کر کھانے کے بعد وہ بیٹھ گئے۔

”ساتھیو! یوں تو میرے ذہن میں بہت سارے پلان ہیں، لیکن سب سے پہلا کام جو میرے ذہن

کھل جائے گا۔ ہر کسی کو اپنی گاڑی سنبھالنے کی فکر ہو جائے گی اور ایسے میں وہ ارجن کمار کی گاڑی میں کچھلی طرف اور اگلی طرف نیچے جم لگا دیں گے۔ یہ سارا ایکشن ایک منٹ سے بھی کم وقت کا تھا۔ اچانک اشارہ بند ہو گیا۔ گاڑیاں رکنے لگیں تو جہاں نے اپنی کار گاڑز اور ارجن کمار والی کار کے درمیان لگائی تو کار ٹیڑھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں سگھ غصے میں نکلا۔ اس نے اپنی کار دیکھی۔ لیکن اس دوران نجانے کب بچن کور نے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی اپنے پاؤں باہر نکالے، اس نے ہم اپنے پاؤں پر رکھا۔ اس کے اوپر طاقتور مقناطیس لگا ہوا تھا۔ ذرا سے پاؤں اوپر اٹھائے تو وہ ہم گاڑی کی کچھلی طرف لگ گیا۔ اس سارے عمل میں پندرہ سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا۔ ٹریفک کے شور کان پھاڑ رہا تھا۔ جہاں نے اپنی کار دیکھی، اتنا زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ وہ واپس اپنی کار میں آ بیٹھا، تبھی اشارہ کھل گیا۔ لوگ اپنی اپنی گاڑیوں کے ساتھ چل پڑے۔ جہاں سگھ بھی چل پڑا۔ اس نے اسی معروف شاہراہ پر ایک مارکیٹ کے سامنے اپنی کار پارک کی۔ بچن کور کو ساتھ لیا اور کچھ فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چل دیے۔ اس کا بلد یو سگھ کے ساتھ مکمل رابطہ تھا۔ وکرم سگھ کے ساتھ کرن کور ہم لگانے میں ناکام رہے تھے۔ یہی ان کا پلان تھا کہ دونوں لگ جائیں تو بہت اچھا، لیکن اگر ان میں سے ایک بھی لگ جائے تو ان کا کام ہو جاتا تھا۔

اب انہیں صرف فارم ہاؤس نہیں جانا تھا۔ بلکہ ان کاروں سے جان چھڑا کر ڈھلہ روڈ پر موجود ایک ریسٹوران میں اکٹھے ہوتا تھا۔ بلد یو سگھ سب سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد جہاں اور بچن کور اور وکرم سگھ کے ساتھ کرن کور آ گئی۔ ان کے گٹ اپ ختم ہو چکے تھے۔ وہ ایک ٹیبل پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اور سامنے ٹی وی اسکرین پر ہم بلاسٹ کی روداد دکھانے کے ساتھ ساتھ تفصیل بتائی جا رہی تھی۔ وہ ہم اس کے دفتر کے بالکل قریب پھٹا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی سیکریٹری اور ڈرائیور بھی ختم ہو گئے تھے۔ پچھلے گاڑز کی گاڑی کو بھی نقصان ہوا۔ اس کے گاڑز زخمی ہو گئے تھے۔ ٹی وی اسکرین پر یہ سوال کیا جا رہا تھا کہ یہ قتل کس نے کیا؟ مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی تھی کہ اسکرین پر بریکنگ نیوز آ گئی۔ کسی ہندو دہشت گرد تنظیم نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

”یہ ای میل انہیں دہلی سے ملی ہے۔ اب تلاش کرتے رہیں کہ یہ کون تھا، کیوں تھا اور کیسے تھا؟“ بلد یو سگھ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا

”اور سناؤ کاروبار کیسا جا رہا ہے آج کل؟“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا

”چلیں پھر فارم ہاؤس؟“ وکرم سگھ نے پوچھا

”تم لوگ جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔“ جہاں نے کہا اور کافی کاگ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ہم بھی نکلتے ہیں۔“ بچن کور نے کہا

وہ سب اٹھ گئے۔ بلد یو نے کاؤنٹر پر جا کر ٹبل دیا اور سبھی باہر آ گئے۔ جہاں نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا

”ٹھیک ہے، ملتے ہیں پھر۔“

انہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور اپنی اپنی راہ ہو گئے۔

جہاں نے نوٹن کور سے کہا کہ وہ اس کی گاڑی لے کر اوگی پنڈ آ جائے۔ اس نے اگلی صبح آنے کا کہا تو جہاں نے ٹیکسی لی اور اوگی کی جانب چل پڑا۔

ہی ایک آفس بنایا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنے اخبارات پر نگاہ رکھتا تھا۔ صحافتی حلقوں میں وہ ایک کامیاب شخص مانا جاتا تھا۔

بلد یو سگھ نے اسی راستے میں اسے پکڑنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس نے ارجن کمار کے بارے میں پورا ہوم ورک کیا ہوا تھا۔ وہ جب گھر سے نکلتا، تو اس کے ساتھ دو کاریں گاڑز کی ہوتی تھیں۔ جو اس کی کار کے آگے اور پیچھے رہتی تھیں۔ اور اس کی کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک پرسنل سیکریٹری ہوتی۔

بلد یو سگھ نے سب کچھ بتانے کے بعد اس نے پیپر پر دو جگہوں پر نشان لگا دیے۔ پھر بولا

”یہ وہ دو جگہیں ہیں، جہاں اسے روکا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں ہمیں اپنی قسمت پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہاں پر دو اشارے ہیں۔ اگر یہ بند ہوئے تو ہم اپنا کام کر سکتے ہیں، ورنہ ہمیں اس وقت تک.....“

”مجھے پانچ منٹ دو، میں بتاتا ہوں۔“ جہاں نے کہا اور اس نے رویت کو روک فون ملا دیا۔ چند لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ ایک منٹ تو ان کے حال احوال میں گزر گیا، پھر جہاں نے پوچھا، ”کیا جاندر میں اشاروں کا سسٹم کمپیوٹرائزڈ ہے۔“

”ہاں، میرے پاس پورے پنجاب کا ڈیٹا ہے۔“ وہ بولی تو جہاں نے پوچھا

”اگر ایک خاص وقت پر کسی اشارے کو بند کرنا ہو تو کر سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں، بس یہ بتا دو کہ کس وقت اور کون سا کرنا ہے، تم جتنا وقت کہو گے میں روک دوں گی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا تو جہاں نے اسے وہی دو مخصوص اشارے بتا کر کہا

”میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں، تم الٹ رہنا۔ میں وقت تمہیں بتا دوں گا۔ اس وقت تک تم ایک بار چیک کر لو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں سب دیکھ کر تمہیں بتاتی ہوں۔“ رویت نے کہا تو ان کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا

”لو جی، ان اشاروں کی فکر نہ کریں، جب چاہیں اور جتنی دیر چاہیں، بند ہو سکتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو بلد یو سگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی خوشی چمکنے لگی۔

”تو ٹھیک ہے، باقی تم سمجھ چکے ہو، اگلا کام سر جیت سگھ کرے گا۔“ اس نے کہا اور پیپر کو آگ دکھادی۔ سہ پہر ہو چکی تھی جب وہ سب فارم ہاؤس سے اپنی اپنی گاڑیاں وہاں چھوڑ کر، وہاں موجود دو چوری کی کاروں میں نکلے۔ بلد یو سگھ کے پاس اس کی اپنی ہی گاڑی تھی۔ صرف نوٹن کور وہیں رہ گئی۔

جس وقت بلد یو سگھ نے انہیں یہ اطلاع دی کہ وہ گھر سے نکل چکا ہے تو سبھی الٹ ہو گئے۔ وہ اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ تاکہ اگر کہیں بھی وہ ادھر ادھر ہو تو دوسروں کو پتہ چل جائے۔ وہ اپنی گاڑی میں اکیلا تھا اور انہیں ہر لمحہ بتا رہا تھا کہ ارجن کمار اور اس کے گاڑز کی گاڑیاں کہاں کہاں سے گزر رہی ہیں۔ ایک کار میں جہاں سگھ اور بچن کور تھے، دوسری میں وکرم سگھ کے ساتھ کرن کور تھی۔ اس وقت جہاں سگھ نے پکڑی اور نفلی داڑھی مونچھیں لگائیں ہوئی تھیں۔ اس نے سب کے سامنے آنا تھا۔ اگر سنٹیل پر کوئی سی سی کیمرہ بھی ہوتا تو بعد میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

جیسے ہی اطلاع ملی کہ وہ اشارے کے قریب ہے، جہاں نے رویت کو الٹ کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ رابطے میں تھی۔ جہاں نے ان تینوں کاروں کو دیکھا اور اس نے ان کے ساتھ اپنی کار لگا دی۔ پلان یہ تھا کہ وہ ارجن کمار اور گاڑز کے درمیان اپنی کار لانے کی کوشش کرے گا۔ وکرم سگھ اگلے گاڑز اور ارجن کمار کے درمیان آئیں گے۔ جان بوجھ کر دونوں گاڑیاں ارجن کمار کی کار سے ٹکرائیں گیں۔ جیسے ہی کاریں ٹکرائیں گیں، اشارہ

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ قتل اگرچہ بلند پوئیکھ کی منصوبہ بندی میں تھا۔ لیکن پوئیکھ کر یہ سب کر دینا کہیں فضول تو نہیں تھا یا پھر کسی نئے ہنگاموں کی شروعات تھیں؟ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کارخانے کے مالک کو ہسپتال میں داخل کروا کے اس کی ٹریٹمنٹ شروع کر دی گئی۔ اس پر تشدد کیا گیا ہوا تھا۔ سبھی میرے ساتھ تھے۔ لیکن ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر الٹ تھا۔ بائیا کو میرے ساتھ تھی اسی کمرے میں جہاں اسے رکھا گیا ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب دواؤں کے اثر سے اسے کچھ جسمانی راحت ملی تو میں نے اس نے پوچھا

”کیا ہوا تھا؟“

”مجھے مینجر کا فون آیا کہ کچھ لوگ آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایسا معمول کے مطابق ہوتا رہتا تھا۔ کاروباری معاملات میں ایسا چلتا ہی رہتا تھا۔ میں کارخانے گیا۔ وہاں چند لوگ تھے۔ میں نے پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کاروباری نہیں ہو سکتے ہیں۔ خیر! انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ جو بندہ یہاں لایا گیا ہے وہ کہاں ہے؟ میں یہ مانا ہی نہیں کہ کوئی بندہ یہاں لایا گیا، اسے یہاں رکھا گیا۔ وہ یوں بات کر رہے تھے جیسے انہیں پورا یقین ہو۔ پھر انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔“

”وہاں جا کر بھی یہی پوچھتے رہے؟“ میں نے کرپدا

”ہاں، انہوں نے مجھ پر تشدد کی انتہا کر دی۔ اس کے ساتھ میرے بیوی بچوں کو مارنے کی دھمکی دی۔ جب میں یہ مان گیا کہ ایک بندے کو یہاں لایا گیا تھا، اور اگلے دن یہاں سے وہ لے گئے تھے۔ وہ کون تھے، یہ مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے کراہتے ہوئے بتایا

”انہوں نے یہ پوچھا کہ تم کس کے لئے کام کرتے ہو، جس بندے نے مجھے تمہارے ساتھ متعارف کرایا تھا، اس کے بارے میں بتایا۔“ میں نے پوچھا

”نہیں، میں نے براہ راست تمہارے ساتھ ہی اپنا تعلق بتایا، کہ بس وہ میرا دوست ہے۔ مگر انہوں نے یقین نہیں کیا۔ وہ ان دو بندوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔“ اس نے بتایا۔ لیکن میرے سوال کا جواب اب بھی نہیں ملا تھا کہ آخر وہ میرے گھر تک کیسے پہنچ گئے تھے؟ اس کی باتوں سے مجھے ابھی تک ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ تبھی بائیا کو نے پوچھا

”وہاں کیسے لوگ تھے، وہ آپس میں کیسی باتیں کر رہے تھے، ان سے کوئی سمجھ میں آیا؟“

”وہ اکثر ایسے لوگوں کی باتیں کرتے تھے جو مختلف مقامات پر تھے۔ ان سے فون پر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہیں یہی کہا جاتا تھا کہ چند دن کے لئے ادھر ادھر ہو جائیں۔ یا جب کسی کا دل کرتا تھا، مجھے مارنا شروع کر دیتے تھے۔“

”ٹھیک ہے، اب میں تمہیں جیسے بتاؤں، ویسے ہی پولیس کو بیان دیتا اور ہاں میں نے تمہارے گھر والوں کو اطلاع دے دی ہے۔ وہ ابھی تمہارے پاس آ جاتے ہیں۔ میں تمہیں بعد میں بلتا ہوں۔ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں تم محفوظ ہاتھوں میں ہو۔“ میں نے اسے تسلی اور حوصلہ دیا پھر بائیا کو کے ساتھ باہر آ گیا۔ میں بائیا کو کے ساتھ کار خود ڈرائیو کرتا ہوا ناؤں کی طرف جا رہا تھا۔ میں خاموش تھا، جس پر وہ اکتائے

ہوئے انداز میں بولی

”جمال! کیا بات ہے، اتنے خاموش کیوں ہو؟ میں نے تم سے پہلے بھی پوچھا ہے۔ بات کرو گے تو پتہ چلے گا۔“

”یار، مجھے ساری سمجھ آ گئی ہے کہ کون لوگ ہیں، ابھی طارق نذیر مجھے کنفرم بھی کر دے گا، یہ الطاف گجر ہی کے لوگ ہیں اور ان کا ساتھ فیضان بٹ کے لوگوں نے دیا۔ لیکن ایک کڑی نہیں مل رہی ہے۔“ میں نے اسے کہا

”کیا، کون سی کڑی؟“ اس نے پوچھا

”میں نے گھربارے میں اس قدر احتیاط رکھی تھی کہ یہاں کسی کو بھی نہیں لے کر آیا، طارق نذیر کو بھی نہیں چونکہ بہر حال ایک معتبر ذرائع سے مجھے ملا تھا۔ وہ لوگ میرے گھر تک کیسے پہنچ گئے؟ یہ ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔“

”ہاں، یہی بات اہم ہے، انہوں نے یہاں تک رسائی کیسے لی، یہاں تک کیسے پہنچے؟ یہی نکتہ ہے، جس نے تم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔“ وہ جیسے لہجے میں بات کو سمجھتے ہوئے بولی

”وہ اس تاک میں تھے کہ باقی سب لوگ کب واپس آتے ہیں۔ انہوں نے اسی دن، بلکہ اسی وقت حملہ کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے کافی دنوں سے اس گھر پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اگر اس دن قسمت ساتھ نہیں دیتی، میں چھت پر نہ ہوتا، تو بہت سارا نقصان ممکن تھا۔ وہ جس تیاری سے آئے تھے، وہی بتا رہی ہے کہ وہ ہمیں کس حد تک ختم کرنا چاہتے تھے۔“ میں نے متوقع تباہی کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا

”جمال! میرے خیال میں یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ تم تھوڑا دیر جرح رکھو اور اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ دو۔“ بائیا کو نے خوشگوار لہجے میں کہا تو میں مسکرا دیا۔

اس وقت ہم گلبرگ سے ڈیفنس کی جانب جا رہے تھے۔ رستے ہی میں ایک غیر ملکی ریسٹوران دیکھ کر بائیا بولی

”وہاں گھر میں تو، ایسا ہی کھانا ملے گا، کیوں نا اس ریسٹوران میں کچھ ٹیسٹ کر لیا جائے۔“ وہ بولی

”چلو، یہ بھی سہی۔“ میں نے کہا اور کار اس جانب موڑ لی۔ پارکنگ میں کار لگا کر ہم اس وقت اندر جا بیٹھے۔ وہاں کافی رش تھا۔ عورتیں، بچے اور ان کی ساتھ مرد حضرات تھے۔ کچھ ہماری طرح جوڑے بھی تھے۔ ہم ایک پرسکون اور تنہائی میں کوئی جگہ دیکھ رہے تھے۔ جو بہر حال وہاں ناپید تھی۔

”کیا خیال ہے، یہیں ٹرائی کریں یا پھر کوئی دوسرا جگہ چلیں؟“ میں نے بائیا کو سے پوچھا

”دیکھ لو، یہاں رش زیادہ ہے، جبکہ ہمیں اس وقت کوئی پرسکون گوشہ مل جائے تو تھوڑا دماغ کو آرام آ جائے۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

ہم باتیں ہی کر رہے کہ ریسٹوران ہی کا ایک آدمی ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے ہم سے پوچھا تو ہم نے اپنا مسئلہ بتا دیا۔

”نو پراہم، آپ آئیں۔“ اس نے کاروباری مسکراہٹ سے کہا اور ایک جانب اشارہ کیا۔ سامنے میز حیاں تھیں۔ ہم اس کے ساتھ اوپر چلے گئے۔ دو کرسیوں کے درمیان ٹیبل لگا ہوا تھا۔ سامنے شیشے میں سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ہم وہاں بیٹھ گئے تو میں نے بائیا کو کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا

”جب سے تم آئی ہو پہلی بار چند لمحے سکون سے بیٹھنے کو ملیں ہیں۔“

”سکون ہمارے نصیب میں کہاں۔“ اس نے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر باہر اشارہ کیا۔ دو گاڑیاں ہوٹل کے کپاؤٹ میں آ کر رکی ہوئیں تھیں۔ ان میں سے چھ لوگ باہر نکل آئے تھے۔ سبھی نے پتلون اور شرٹوں کے ساتھ جیکٹ پہنی ہوئی تھی جو کسی کی کھلی ہوئی اور کسی کی بند تھی۔ ان کا انداز محکوک ہی نہیں تھا، بلکہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔

”کیا خیال ہے؟ یہ ہمارے مہمان ہیں یا کسی دوسرے کے ہو سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا ہی تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔

میں نے بجتے ہوئے سیل فون کو جیب سے نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر اجنبی نمبر جگمگا رہے تھے۔ پھر باہر کی جانب نظر دوڑائی۔ وہ لوگ اندر آ رہے تھے۔ میں نے بائیتا کور کی طرف دیکھ کر فون رسیو کر لیا۔ میرے پہلو کے جواب میں کسی اجنبی نے کہا

”سارٹ مین، میرے بندے تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ امید ہے تم زیادہ سارٹ بننے کی کوشش نہیں کرو گے اور چپ چاپ ان کے ساتھ آ جاؤ گے۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا

”یہ تفصیل میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا، جب تم میرے سامنے اپنی موت کے لئے بھیک مانگ رہے ہو گے۔ میں.....“ وہ کہہ رہا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، کیا چاہ رہا ہے۔ میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور تیزی سے اٹھا۔ بائیتا کور مجھے دیکھ رہی تھی، اس لئے مجھ سے پہلے ہی وہ اٹھ گئی۔

”یہ لوگ ہمارے لئے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سامنے کے واش روم میں گھس گئی۔ یہ چند قدم چلتے رہنے کے دوران اس نے اپنا پسل نکال لیا تھا۔ میں دوسری طرف بنے ہوئے ستون کے ساتھ لگ گیا۔ وہاں سے سیڑھیوں کا سرا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں پوری طرح الٹ ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نہیں آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سبھی تربیت یافتہ ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا، بائیتا کور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بتا دیا کہ وہ آ رہے ہیں۔ اس نے دروازے کی آڑ لے لی۔ اس نے پسل کا سیٹھی کچ بٹایا اور وہ فائرنگ کے لئے پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔

ایک دو منٹ کے اندر ہی وہ اوپر آ گئے۔ وہ چار تھے۔ ایک نے آتے ہی کسی نے کہا

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ نہ جمال اور.....“

”یہیں ہوں گے، دیکھو۔“ دوسرے نے تھکمانہ انداز میں کہا۔ اسی لمحے وہ آگے آ کر پھیلنے لگے۔ اس طرح

وہ مجھے دیکھ لیتے، میں جب تک ایک دو کو فائر کرتا، جب تک وہ مجھے نشانہ بنا لیتے۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے بائیتا کور نے فائر کر دیا۔ اس لمحے انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ فائر کس طرف سے ہوا ہے۔ میں نے اسی لمحے کا فائدہ اٹھایا اور تیزی میں نے ایک کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ پسل سمیت اس کا ہاتھ اڑ گیا تو اس کے منہ سے بھیا نک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد موقعہ نہیں تھا۔ ان کی طرف سے گولی چلی اور بائیتا کور بھی اگلا فائر چکی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے فائر کر دیا۔ وہ واپس مڑنا چاہتے تھے یا نہیں، البتہ میں سامنے نکل کر ان پر فائر کرتا چلا گیا۔ وہ چاروں فرش پر پڑے چیخ رہے تھے۔ بلاشبہ نیچے والوں نے اوپر آنا تھا یا پھر بھاگ جانا تھا۔ میں انہیں بھاگنے کا موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے پسل کا میگزین بدلا اور سیڑھیوں کے سرے پر دیکھنے لگا۔ وہاں

کوئی نہیں تھا۔ میں نے بائیتا کور کو دیکھا۔ وہ پاؤں کی ٹھوکر سے ان کا اسلحہ ان سے الگ کر رہی تھی۔ وہ ایسا کر چکی تو میں نے اسے سیڑھیوں کے سرے پر نظر رکھنے کو کہا۔ وہ میری جگہ آ گئی تو میں تیزی سے ششے کی بڑھا۔ ایک الماری کی کنڈی نہیں تھی۔ میں نے اسے کھولا اور نیچے قدم رکھا اور ایک ہاتھ سے جھول گیا۔ اسی لمحے مجھے اندر کا منظر دکھائی دیا۔ وہ منظر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے ایک دم سے شاک لگا۔ ان دونوں حملہ آوروں نے دو عورتوں اور چند بچوں کو يرغمال بنایا ہوا تھا۔ بچوں کی ہچکیاں بندھی ہوئیں تھیں۔ اگر ایک ہوتا تو میں چشم زدن میں اس کا صفایا کر چکا ہوتا۔ وہ دو تھے۔ اگر ایک مرنے کو تو دوسرا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میں نیچے بڑی آسانی کے ساتھ جاسکتا تھا، لیکن اوپر جانا بہت مشکل تھا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ بائیتا کور دوسری طرف نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ میں وہیں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بہت مشکل سے کھڑا ہونا چاہا لیکن میری حرکت سے آواز پیدا ہوئی۔ میں کوئی ایسی آواز بھی نہیں نکالنا چاہتا تھا، جس سے نیچے کھڑے حملہ آور متوجہ ہو جاتے۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بائیتا کور کو فون کر دیا۔ اس نے بجائے فون سننے کے چند ثانیے کے بعد کھڑکی میں آ کر دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا، تو میں نے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوبارہ کال کر کے نیچے کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔ پھر اسے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے۔ اس وقت دو عورتوں اور بچوں کی زندگی کا سوال تھا۔ بائیتا کور پیچھے ہٹ گئی تو میں نے بڑی احتیاط سے خود کو اس طرح ٹیبرس پر لٹا لیا کہ آواز تک پیدا نہیں ہونے دی۔ اس بار جب میں نے ان حملہ آوروں کے چہروں پر کافی حد تک تھوٹ لیش دیکھی تھی۔

میں نے بائیتا کور کو یہ سمجھایا تھا کہ وہ ایک دم سے سیڑھیوں پر سے لڑھکتے ہوئے ایسے نیچے گرتی چلی جائے جسے کہ وہ بے ہوش ہے یا مر چکی ہے۔ ایک آدھ ٹانے کو ان حملہ آوروں کی توجہ ہٹانی تھی۔ لیکن اس سے پہلے میں اسے کہا تھا کہ وہ اپنا پسل میری طرف پھینک دے۔ وہ وہاں پر ان چاروں میں سے کسی کا بھی اسلحہ استعمال کر سکتی تھی۔ چند لمحوں ہی میں اس نے پردے کے ایک کپڑے میں پسل باندھ کر بالکل میرے اوپر تک پہنچا دیا۔ میں لینے لینے وہ کھولا، اس کا میگزین دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے ایکشن کے لئے کہہ دیا۔

میں غور سے شست ہاندھے امی پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ تبھی اُن کی توجہ ہٹی، انہوں نے گھوم کر دیکھا، تبھی میں نے دونوں ہاتھوں سے پوری توجہ کے ساتھ دو فائر کئے۔ ان کے ہاتھوں سے پسل نجانے کدھر گئے، اس کے ساتھ ہی ان کے حلق سے چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے اگلا لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ جس وقت تک ان کی چیخیں کم ہوتیں، میں ٹیبرس سے کود گیا تھا۔ بلاشبہ بائیتا کور بھی اٹھ گئی ہوگی۔ میرے قدم جنوبی زمین پر لگے۔ وہ دونوں باہر کی جانب بھاگ کر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

میں اسپرنگ کی مانند اچھلا اور ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ میں ان پر وار کروں گا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں ایک دم سے جھک گیا وہ میرے اوپر سے الٹ کر باہر فرش پر جا گرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتے میں ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک بائیتا کور بھی آ گئی۔ اس نے آتے ہی ایک بندے کے منہ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ اس کے دیکھا دیکھی میں نے بھی اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ آؤخ کی کر یہہ آواز نکال کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

خطرہ ٹل جانے کا احساس کر کے لوگوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ یہ ایسی صورت حال تھی، جس میں ہمارے لئے خطرہ بڑھ جاتا۔ پولیس کو جواب دینا، وقت ضائع ہونا اور خواہ مخواہ تفتیش سے گزرتا، کئی ایسے مرحلے تھے۔

اس سے بہتر یہی تھا کہ ان دونوں کے لئے کمریہاں سے نکل جائیں۔ میں نے فوری طور پر ان کی تلاشی لیتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو کہا کہ فوراً رسی لائیں۔ جب تک ہم نے ان دونوں نے تلاشی لی تب تک ہمیں رسی دستیاب ہوگئی۔ میں نے دونوں کو باندھتے ہوئے بائیکاٹ کو کوسجھا دیا کہ اب کیا کرتا ہے۔ وہ تیار ہوگئی۔ جیسے ہی میں نے دوسرے کو باندھا، وہ کار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے کار قریب لائی۔ اس کا دروازہ کھولا۔ چھٹی ایک آدمی تیزی سے بولا

”ارے کیا کر رہے ہو بھائی، پولیس آتی ہی ہوگی۔“

ہم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ان دونوں کو اٹھا کر، کار کی پچھلی سیٹ کے درمیان رکھا۔ بائیکاٹ کو رے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم وہاں سے چل دیئے۔

”کدھر جانا ہے؟“ اس نے پوچھا

”فی الحال چلتے چلو۔ بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیل فون نکال لیا۔ میں نے طارق نذیر کے نمبر پر کال کی۔ میرے خیال میں اس نے بیل بھی نہیں بنجئے دی تھی کہ فون پک کر لیا۔

”جبر میں آپ ہی کو فون کر رہا تھا۔“ اس نے تیزی سے پر جوش لہجے میں کہا

”کیوں؟“ میں نے پوچھا

”اس بندے کا پتہ چل گیا ہے، جس کی وجہ سے آپ کے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ وہی منجر تھا، وہ ہمارے پاس ہے اسی نے بتایا۔“ وہ بولا

”اچھا میں یہ تفصیل تمہارے پاس آ کر سن رہا ہوں۔ مجھے کوئی سیف ہاؤس بتاؤ، یا پھر ایسی جگہ جہاں دو غلط قسم کے بندوں کے ساتھ ہم بھی کچھ وقت گزار سکیں۔“ میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولا

”اوہ! ایسا کیا ہو گیا سر؟“

”یار، آکر بتاتا ہوں نا، جلدی بولو۔“ میں نے کافی حد تک تلخی سے کہا تو وہ میری لوکیشن پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا تو وہ بولا

”آپ سیدھے اسی روڈ پر آتے چلیں جائیں۔ پھر دائیں جانب آئیں گے تو نہر آجائے گی۔ تب تک میں پہنچ جاتا ہوں، میں کار میں سوار ہو گیا ہوں، میں قریب ہی ہوں۔“ اس نے روانی میں کہا۔ میں اگلے چوک کو دیکھنے لگا جہاں سے مڑنا تھا۔ ہم نہر پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے طارق کھڑا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہم کون سی کار میں ہیں۔ میں نے کال کر کے اسے بتایا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک جگہ نما گھر میں آ گئے۔

”وہ منیجر بھی ادھر ہی ہے۔ آپ خود اس سے پوچھ لیں۔“ طارق نے بتایا

”ان دونوں کو اتارو، یہ ذرا خاص مہمان ہیں، ان کی خاطر داری کرو، ان کے ہاتھوں پر زخم ہیں، انہیں فست ایڈو پھر ان سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

نئے فرش فرش پر ایک ادھیڑ عمر فرد بہ ناکل شخص اُدھ موا ہوا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

”یہی ہے وہ منیجر۔“ طارق نے بتایا تو میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ آواز سن کر اس نے بہ مشکل پوٹے کھولے، میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ میری جانب خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے

لگا۔ پھر یوں سرگرا دیا جیسے وہ مایوس ہو کر ہر طرح کی صورت حال کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ میں نے اس کے بال پکڑے اور اس کا سر اٹھا کر پوچھا

”کیسے ہوا سب؟“

”جس وقت فیضان بٹ کی گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے پھنسی تھی، اس وقت تمہارے دو بندے فیکٹری میں موجود تھے اور الطاف گجر بھی وہیں تھا۔ یاد ہے آپ کو؟“ اس نے یوں کہہ کر یاد دلانے کی کوشش کی جیسے یہ بہت پرانی بات ہو۔ میں سمجھ گیا تھا۔

”آگے کہو۔“ میں بولا

”اس وقت مجھے فون کال ملی کہ میرے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے، انہوں نے میرے بیٹے کی آواز تک مجھے سنائی۔ میری بات کروائی اس سے۔“

”تمہارے بیٹے کا اغوا؟“ میں نے یوں پوچھا جیسے مجھے بہت حیرت ہوئی ہو۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک نئی کہانی گھڑے گا۔

”جی، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے تاوان مانگے گا، جیسے آج کل اغوا برائے تاوان کی دبا پھیلی ہوئی ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا

”تو پھر.....؟“ میں نے پوچھا

”انہوں نے مجھ سے کوئی رقم نہیں مانگی، بلکہ انہوں نے مجھ سے کام لینے کے بارے میں کہا۔ اور جب انہوں نے مجھے کام بتایا تو میں نے سوچ لیا کہ اب نوکری تو چھوڑنا پڑے گی۔ اپنے بیٹے کی خاطر میں نوکری چھوڑنے کا سوچ لیا تھا۔ دوسرا انہوں نے میرے بیٹے کو نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہاں رات سے کس طرح کے بندے کو رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے تصدیق کی تو میں نے بتا دیا کہ بندہ ابھی تک ادھر ہی ہے۔ انہوں نے مجھے ان سب پر نگاہ رکھنے کو کہا۔ یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے ادھمل نہ ہونے پائیں۔ جب تک وہ آئے آپ لوگوں کے بندے الطاف گجر کو نکال کر لے جا چکے تھے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ میں اپنے مالک کو یہاں بلواؤ، میں نے اسے بلالیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں پتہ۔ میرا بیٹا ابھی تک ان کے پاس ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے ابھی مر جائے گا۔

”انہوں نے تم سے کام کیا لیا؟“ میں نے قہقہے سے پوچھا تو وہ بولا

”جب تک وہ پہنچے آپ کے بندے تو جا چکے تھے۔ انہوں نے یہی کہا کہ میں وہ بندے پہچان کر اسے دوں کہ وہ کون ہیں۔ میں نے اپنے ایک بندے کو ان کے پیچھے لگا دیا تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر میں وہ بندے نہ پکڑوائے تو میرا بیٹا بازیاں نہیں ہوگا۔ میرا آدمی ان دو بندوں کا گھر دیکھ آیا۔ بعد میں انہیں گھر کا بھی پتہ چل گیا۔“

”کیا ملا تھے، نہ بیٹا اور نہ نوکری، اب کہو گے کہ ان کے ہمارے میں بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں، کہاں کے ہیں، تم انہیں نہیں جانتے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا

”جی ہاں، میں نہیں جانتا۔ مگر میرے بیٹے کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میری اس سے بات ہوتی ہے، اب شاید وہ اپنی ماں سے بات کرتا ہوگا۔“

”مطلب، تم نے اپنے بندوں کے ذریعے ہمارے گھر کی نشاندہی کروائی۔ اور انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ

کردیا۔ اگر ہماری قسمت اچھی نہ ہوتی تو اب تک ہم منوں مٹی کے چپے پڑے ہوتے۔ خیر! اب تم ہمارے مہمان ہو۔ دیکھتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں، جو ہم تک پہنچے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب کیا کرنا ہے اس کا؟“ طارق نے پوچھا

”یہ مہمان ہے۔ اس کو کھانا دو، اب کچھ نہیں کہنا اسے۔ میں بعد میں بات کروں گا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور چل دیا۔ جیسے ہی کمرے میں آئے تب میں نے طارق سے کہا، ”اس کا بیٹا اگر واقعی ہی اغوا ہوا ہے تو، الگ بات ہے اور اگر نہیں، تب پھر معاملہ دوسرا ہوگا۔ اب پتہ یہی کرنا ہے کہ اس کا بیٹا اغوا ہوا تھا؟ اس کے بیٹے کا پتہ کرو۔ اس کے گھر کی اور گھر والوں کی خفیہ نگرانی ہو۔“

”جی ہو جائے گا۔“ طارق نے کہا تو بائیا کور نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

”اوئے! بھوکا ہی مار دینا ہے تو نے کوئی روٹی کا بھی بندوبست ہے یا زری تفتیش ہی چلنی ہے۔“

”ہاں۔! یہ تو ہے۔“ میں نے یوں کہا جیسے اس کی بات سمجھ میں آئی مگر یہ تو اس نے بیڈ کے سرے پر رکھا نکیہ اٹھایا اور میرے دے مارا۔

”بس دس منٹ دے دیں مجھے،“ طارق نے کہا اور جلدی سے مڑ گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کے لئے نہایت پر تکلف کھانا چن دیا گیا۔ بائیا کور نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر چائے کا مک لے کر بیڈ پر جا بیٹھی۔

”اب تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ سکون سے سو جانے کو من کر رہا ہے۔ آؤ، کچھ دیر سکون سے سو جائیں۔“ اس نے خمار آلود آواز میں کہا تو میں ہنس دیا

”وہ جو ساتھ لائیں ہیں ان.....“

”انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ صبح تک وہ باتیں کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

”اگر سونا ہی ہے تو ناؤں چلتے ہیں۔“ میں رائے دی

”اب تو ہلنے کو بھی جی نہیں کر رہا اور تم ظالم ہو پھر سفر کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔“ وہ فحشی آواز میں بولی تو میں ہنس دیا

”ویسے نہیں ادا کار ہونا چاہئے تھا۔ اسکرین پر دھمال ڈال دو، بچی۔“

”میرا تو ابھی دھمال ڈالنے کو بڑا دل کر رہا ہے، آؤ نا۔“ اس نے باقاعدہ بانہیں پھیلا کر کہا تو میں اپنا قہقہہ نہ روک سکا تو وہ بھی کھل کر ہنس دی۔

ہم چائے پی چکے تو میں اٹھا اور نیچے والے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑے تھے۔ اور ان کی آنکھوں میں نفرت اُبل رہی تھی۔ مجرم چاہئے کتنا بڑا ہو، اس کی آنکھ میں خوف ڈر آتا ہے۔ لیکن وہ جو کسی مقصد کے لئے نکلے ہو، ان کی آنکھ کچھ اور ہی بول رہی ہوتی ہے۔ یہ آنکھیں ویسی ہی تھیں جو کسی مقصد کے لئے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مقصد انسانیت کے لئے قابل قبول بھی ہے یا وہ حیوانیت اور شیطانت کے زرخے میں پھنس کو اسی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں جھانک کر کافی دیر دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھوں ہر سفید پٹی باندھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں دوا وغیرہ بھی دے دی گئی ہوگی۔ میں ان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نرمی سے پوچھا

”کون ہو تم لوگ؟“

”ہم کوئی بھی ہیں، تم اپنا کام کرو، ہمیں مار دو، ہماری بوٹی بوٹی کرو، دکھاؤ اپنی درندگی۔ مادر.....“ اس نے انتہائی نفرت سے مجھے گالی دی۔ ایک دم سے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اندر سے ایک لہرائی لیکن جس طرح یہ لہرائی تھی۔ اسی طرح میں نے اس پر خود قابو پالیا۔

”میں یہ جانتا ہوں کہ تم دونوں مجرم نہیں ہو۔ اور نہ وہ تھے، جو تم لوگوں کے ساتھی تھے۔ تھے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ چونکہ اب وہ مر چکے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں ان کی آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ادا کر دی جائیں۔ باقی تم لوگوں سے باتیں تو میں بعد میں بھی کر لوں گا۔“ میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو میرے یوں کہنے پر ایک نے سراٹھا کر اسی نفرت آمیز لہجے میں کہا

”وہ نہیں رہا تو کوئی بات نہیں، اب اس کا جسم ہے، چاہے جلا دو یا دفن دو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”یہ تو بچی بات ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ وہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں، میں.....“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسرا اُکتائے ہوئے انداز میں بولا

”جو مرضی کرو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔“

”لیکن ہمیں تو ہے۔“ میری پشت سے بائیا کور کی آواز آئی۔ انہوں نے سامنے کھڑی بائیا کور کو دیکھا پھر استہزیائے انداز میں مسکرا دیئے۔ میرے لئے یہ کافی حیرت والی بات تھی کہ یہ لوگ اتنے بڈر ہیں۔ لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ بڈر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی غیرت مند آدمی بچوں اور عورتوں کو یرغمال نہیں بناتا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑی تھی، جیسے ابھی ان پر برس پڑے گی۔

”تو کرتے رہو، ہم سے کیا پوچھ رہے ہو۔“ پہلے نے بھی اسی طرح اُکتائے ہوئے انداز میں کہا جیسے ہم ان کے آرام میں غل ڈال رہے ہوں۔

”تم لوگوں سے تو بہت کچھ پوچھنا ہے، دیکھو، ہم کتنے اچھے ہیں کہ تم دونوں سے یہ پوچھ رہے کہ کیسے بتاؤ گے، آرام سے یا ذلیل ہو کر۔“ بائیا کور نے دانت پیستے ہوئے کہا تو دونوں نے سراٹھا کر دیکھا

”بندھے ہوئے.....“ دوسرے نے کہا چاہا تو وہ آگے بڑھی اور اس نے قریب کھڑے ایک بندے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا

”اسے کھول دو۔“

وہ بندہ آگے بڑھا اور اس نے دوسرے کو کھول دیا۔ وہ آزاد ہوتے ہی کھڑا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بائیا کور سے زیادہ بھاری ہے۔ مگر میں بھی اس کا اعتماد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سامنے کھڑے اس بندے کو وار کرنے کی دعوت دی۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا۔ اور اس نے جھکائی دے کر پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر مارا مگر اس کی کوشش رائیگاں گئی۔ بائیا کور نے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا اور وہ وہ بے ساختہ آگے جھک گیا، بائیا نے اس کی گردن پر زور دار کلائی رسید کی، جس سے وہ اپنی ہی جوکھ میں لڑکھڑاتا ہوا آگے دیوار کی جڑ میں جا گرا۔ بائیا کور نے اسے اٹھنے نہیں دیا، پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوک اس کے سر پر دے ماری اس کا سر دیوار سے لگا۔ وہ چکرا گیا۔ وہ ٹکی نہیں، اس نے اس کا سر پکڑا اور دوبارہ اسے دیوار پر دے مارا۔ خون کا فوارا اس کے سر سے نکل پڑا۔ بائیا کور نے اسے کار سے پکڑا اور گھسیٹ کر کمرے کے درمیان میں لے آئی۔ پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند ثانیے میں وہ ادھ موا ہو گیا تو وہ ایک طرف ہو کر بولی۔

”اب اسے کھول دو، اور اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔“

”ظہر۔“ میں نے کہا اور پھر بندھے ہوئے کی طرف دیکھ کر پوچھا، ”کیا خیال ہے؟“
وہ چند ثانیے سوچتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔
”پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔“

بائیتا کو ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
”کون لوگ ہو تم؟“

میرے یوں پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا
”ہم بھارتی ہیں اور اپنے مشن پر ہیں۔“

”ہمارے پیچھے کیوں تھے؟“

”تم دونوں کو اغوا کر کے لے جانا تھا؟“ وہ بولا۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا

”وہیں، جہاں ہمارا پاس کہتا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔“ وہ بولا

”کب سے یہاں ہو؟“ میں نے پوچھا

”دو سال ہو گئے ہیں۔“ اس نے کہا

”میرے پیچھے ہی کیوں؟“

”کہنا تا پاس نہ حکم دیا ہے کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ تم ہی الطاف گجر کو پکڑ کر لائے ہو۔ تم ہمارا نیٹ ورک
تباہ کر دینا چاہتے ہو۔“ وہ نفرت سے بولا تو میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا
”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یقین جانو، تمہیں جانے دوں گا۔ کیونکہ تم ایک مقصد
کے لئے لڑ رہے ہو۔ تم کوئی مجرم نہیں ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے پہلی بار نرم انداز میں میری طرف دیکھا، پھر
مایوسی سے بولا

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتہ نہیں، میرا پاس کہاں ہے، مجھے بس میرے ساتھی سے حکم ملا اور میں اس
کے ساتھ چل دیا۔“

”ٹھیک ہے پڑے رہو، جب تجھے اپنے پاس سے رابطہ کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے بتا دینا۔“ میں نے کہا
اور باہر چل دیا۔ دوسرا بے ہوش ہو چکا تھا۔ قریب کھڑے بندے نے اسے دوبارہ باندھ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا پہلا پہرا بھی ختم نہیں ہوا تھا جب جہاں اوگی پنڈ پھنچ گیا۔ پھوپھو کلجیت کو رکھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی
تھی۔ اس نے ڈرائیونگ روم داخل ہوتے ہی فتح بلائی تو پھوپھو نے جواب دے کہا
”تو ہڑ جلدی سے کھانے پر آ جا، میں حیرا انتظار کر رہی ہوں اور باقی سب کو بھی بلاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ آواز دینے لگی۔ جہاں وہیں بیٹھ گیا۔ چند منٹوں میں سارے وہاں آ گئے۔ خوشگوار ماحول بن گیا۔
وہ وہاں بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ جہاں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ رتن دیپ سنگھ نے انکیشن ہی کے
لئے بلایا تھا۔ پارٹی میں ہر پل اور پرنچے تو ہو رہی ہے۔ ایسی ہی کچھ باتیں کر کے اس نے سب کو مطمئن کر دیا کہ
وہ بہت اہم کام سے گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھا اور ایسا ہونا ناممکن تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہو اور ہر پریت اس کے آس پاس نہ ہو

وہ ایزی ہو کر بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ ہر پریت آ گئی۔ وہ حسب معمول اس کے پاس بیڈ پر نہیں بیٹھی، بلکہ قریب
پڑی ایزی چیئر پر سٹ کر بیٹھ گئی۔ جہاں بنے پہلے تو محسوس نہ کیا، پھر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے
حیرت سے پوچھا

”خیر تو ہے پرتو، یوں اجنبی ہو رہی ہو؟“

”کہاں تھے تم، اتنی رات کو اچانک نکلے؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”بتایا تا کہ میں رتن دیپ سنگھ کے پاس گیا تھا۔ کیوں تم شک کیوں کر رہی ہو؟“ اس نے ہر پریت کی آ
کھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”مجھے شک نہیں یقین ہے۔“ اس نے اعتماد سے کہا

”مطلب میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ اس نے ناراضگی سے کہا

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی

”کوئی وجہ تو ہو، میرے جھوٹ بولنے، نہ بولنے کی، کیا بچوں کی طرح کر رہی ہو۔“ وہ اکتاتے ہوئے بولا
”میں نے کہا تا کہ تمہاری باتوں پر میرا دل نہیں مان رہا ہے۔ اور اب اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں
ہے۔“ اس نے شک کر کہا

”اچھا، میرا مغز نہ کھاؤ، صبح وہ نون کو ر آ جائے گی ادھر، اس سے پوچھ لینا تفصیل کہ میں کہاں تھا۔ اب چاہو تو
اب بھی پوچھ لو کہ میں کہاں تھا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اچھا، غصے کیوں ہوتے ہو، بس تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا

”تو پھر، یوں اجنبی کیوں لگ رہی ہو؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی

”میں تمہارے لئے چائے لانا بھول گئی، وہ لے آؤں۔ یا پھر جوتی کو بھیج دوں؟“

”ہر پریت! ادھر بیٹھو، میرے پاس اور بتاؤ بات کیا ہے؟“ جہاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر
کہا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا، ”بولو کیا بات ہے؟“

”میں بہت ڈسٹرب ہوں جیسی، میری سوچیں مجھے پاگل کر رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔“ اس
نے بے چینی کے سے انداز میں کہا

”کیسی سوچیں ہیں؟“ اس نے نرمی سے پوچھا

”ایسی کہ یہ جو ہم انکیشن لڑنے جا رہے ہیں، کیا ہوگا اس سے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم اسمبلی کی سیٹ
جیت جائیں گے۔ اور مجھے سو فیصد امید ہے کہ ہم جیت بھی جائیں گے۔ لیکن، اس کے بعد ہوگا کیا؟ پورے
ملاقاتے میں جہاں صرف چند لوگ ہمارے دوست ہوں گے، وہاں اس سے کہیں زیادہ دشمن پیدا ہو جائیں
گے۔ ایک خوشامدی ٹولہ بن جائے گا جو ہمیں گھیرے میں لے لے گا۔ اگر ان کے کام ہوتے رہے تو وہ
دوست دکھائی دیں گے اور اگر کام نہ ہوئے تو یہی لوگ سازش کریں گے۔ منافقت کریں گے اور دشمنوں کا ساتھ
دیں گے، ان پر اعتماد کیا ہی نہیں جاسکتا، ہم ہر طرح کے لوگوں کی نگاہوں میں آ جائیں گے۔ وہ سکون وہ اطمینان
، جو توڑا بہت ہمیں میسر ہے، وہ بھی نہیں رہے گا۔“ وہ یوں کہتی چلی گئی، جیسے وہ پھٹ پڑی ہو۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ جہاں نے نرمی سے پوچھا

”یہ سب چھوڑو، میں انوجیت کو تو یہ نہیں کہہ سکتی، تمہیں تو کہہ سکتی ہوں۔“ وہ پھر یوں بولی جیسے اسے سمجھ نہ

آری ہو کہ وہ آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ جہاں نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑا اور پھر اسے قریب کر لیا۔ وہ ساری کی ساری اس کی طرف ہو گئی۔ جہاں نے اس کا سراپے زانو پر رکھ لیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا

”پریتو! سچ بتانا، بات کیا ہے؟“

وہ اس کے چہرے پر دیکھتی رہی، جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو پھر کچھ لحوں بعد بولی

”جہاں! ہم کب تک بھاگتے دوڑتے رہیں گے، کالج لائف میں اک جوش تھا، عقل نہیں تھی، بہت کچھ کیا کیونکہ ہمیں لگتا تھا کہ اب کچھ دن ہی ہیں، جب ہم اپنی قوم کو آزاد کرائیں گے، لیکن اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ اب ناممکن ہے، آزادی ہم سے بہت دور ہو گئی ہے، ہم لڑتے ہوئے مرجائیں گے اور شاید اگلی نسل ایسا کچھ کر پائے۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تیر رہی تھی۔

”پھر کیا کرنا چاہئے ہمیں؟“ اس نے پوچھا

”یہی کہ زندگی کو زندگی سمجھ لیں اور جو ہو رہا ہے اسے قبول کر لیں۔ خود سے ایسا کچھ نہ کریں جو زندگی کو ختم کرنے والا ہو، سکون بھی تو چاہئے نازندگی میں۔“ اس نے اپنی آنکھوں میں اُمید کے نجانے کتنے دپتے جلائے کہا تو جہاں آہستہ سے بولا

”پریتو! جیسا تو چاہئے گئی نا، ویسا ہی ہوگا۔ ہم ابھی اور اسی وقت الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کر سکتے ہیں لیکن اس سے ہوگا کیا؟ ہم پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، بہت ساری جگہوں پر یہ طے کر لیا گیا ہے، اب واپسی ناممکن ہے۔“ جہاں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”لیکن ابھی تو اتنی مشکل نہیں ہے، بعد میں تو.....“ اس نے کہنا چاہا تو جہاں اس کے ہاتھ کو دبا کر بولا

”زندگی یہ نہیں ہے جو تم چاہ رہی ہو۔ زندگی کا مقصد کچھ دوسرا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتانے والا نہیں بلکہ تمہیں دکھاؤں گا زندگی ہوتی کیا ہے۔ اور آزادی ایک دن میں نہیں مل جاتی۔ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ ہم نے آزادی کی اس وقت قدر نہیں کی جب وہ ہمارے سامنے دھری ہوئی تھی۔ اگر ایک بار آزادی چھین جائے تو پھر بہت دیر بعد ملتی ہے۔ اب یہ آزادی بہت وقت بعد ملے گی اور بڑا خون بہانا پڑے گا۔ ہم جس سے آزادی مانگ رہے ہیں وہ کمینڈ دشمن ہے۔ اور آخری بات، تم اتنی مایوس کیوں ہو گئی ہو، کب سے تم نے عقل کی باتیں سوچنا شروع کر دی ہیں؟“ اس نے بڑے پیار سے کہا

”مجھے ڈر لگتا ہے جہاں، ہماری قربانی ہمارا لہو کہیں رائیگاں نہ چلا جائے۔“ وہ دکھ سے بولی

”ہمیشہ وہ لہو رائیگاں جاتا ہے، جس میں انسانیت سے محبت نہ ہو۔ ہم کسی کو نچا دکھانے یا اپنی انا کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں، ہمیں طاقت سے بھی غرض نہیں لیکن۔! اگر کوئی ہماری حرمت کو نقصان پہنچائے گا تو اس کے لئے معافی نہیں ہے۔ بتاؤ کیا ہونی چاہئے معافی؟“ اس بار جہاں بات کرتے ہوئے کافی حد تک جذباتی ہو گیا۔ اس پر وہ سوچتے ہوئے بولی

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”پریتو، میں سمجھتا ہوں کہ تم اکیلی ہوتی ہو اور اوٹ پٹانگ سوچتی رہتی ہو۔ خیر، اب تم مجھے ایک اچھی سی چائے پلاؤ، پھر میں تمہیں ایک مزیدار بات بتاتا ہوں۔“ جہاں نے یونہی کہہ دیا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ٹرے لئے واپس آ گئی۔

”وہ بھوتی لے کر آ رہی تھی۔ اب سناؤ مزیدار بات۔“ اس نے ٹرے اپنے سامنے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا

”مزیدار بات یہ ہے کہ باغیہا کو اس وقت جمال کے پاس لاہور میں ہے۔“ اس نے ایک دم سے کہا

”ارے واہ، وہ کیسے؟“ وہ کافی حد تک حیرت طے جوش سے بولی

”بس چلی گئی اس کے پاس۔“ جہاں نے کہا

”کاش ہم بھی وہاں جاتے۔“ ہر پریت نے آہ بھرتے ہوئے کہا تو جہاں بولا

”بس یہ الیکشن سے فارغ ہو جائیں، پھر شرعی ننگانہ صاحب چلیں گے درشن کے لئے۔“ اس نے کہا اور چائے پینا ہر پریت کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ تبھی اس نے موضوع بدل دیا۔ وہ الیکشن بارے بتانے لگی۔ یونہی ارد گرد کے گاؤں جانے کی باتیں۔

رات گئے وہ دونوں باتوں میں الجھے رہے۔ یہاں تک کہ انوجیت بھی ان کے پاس آ گیا۔ وہ الیکشن ہی کی باتیں کرنے لگا۔ رات کے دوسرے پہر تک باتیں کر رہے کے بعد وہ سونے کے لئے چلے گئے۔

صبح کی روشنی بہت حد تک پھیل گئی تھی جب جہاں کی آنکھ کھلی۔ اس کے پاس سوائے نوتن کوڑ کا انتظار کرنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے تیار ہوا۔ اور پھر ڈرائیونگ روم میں آ گیا۔ کلجیت کو روپیں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہیں اسے پتہ چلا کہ رات پنڈ کے ایک گھر سے لڑکی اغوا ہو گئی ہے۔ بھائی کی آنکھ کھلی تو اس نے مزاحمت کی، جس پر انہوں نے بھائی کو فائر مار دیا۔ وہ بے چارہ وہیں مر گیا۔ اب نہ لڑکی کا پتہ ہے اور نہ لڑکی لے جانے والوں کا۔ انوجیت انہی کے گھر گیا ہوا تھا۔

”پھوپھو، یہ تو بہت برا ہوا، میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے اپنا سیل فون نکال کر کہا اور انوجیت کے نمبر ملانے لگا۔ جلد ہی اس نے فون رسیو کر لیا۔

”کچھ پتہ چلا؟“ اس نے پوچھا

”نہیں، کوئی سراغ نہیں ملا، پولیس آئی تھی اور قانونی کارروائی کر کے چلی گئی ہے۔ لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئے ہیں۔ اب دیکھیں۔“ وہ جواب میں بولا

”اچھا، میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ اٹھنے لگا تو کلجیت کو روپولی

”ناشتہ کر کے جانا، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ جائے۔“

”جی پھوپھو، جیسا آپ کہیں“ اس نے کہا تو کلجیت کو رائٹ کر کچن کی طرف چل دی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ بلیئر سنگھ پنچ کے پاس جا پہنچا۔ وہ اپنے گھر ہی تھا اور چنچاٹ گھر جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ جہاں کے جاتے ہی وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھا اور ادھر چل دیا۔

”پنچ جی، آپ کو کوئی اندازہ ہے یہ جو اغوا ہوئی ہے لڑکی، یہ کون کر سکتا ہے؟“ جہاں نے اپنا کام شروع کر دیا

”ابھی دیکھتے ہیں، کیا نکلتا ہے۔ اصل میں یہ جو لڑکیوں کے اغوا والے معاملات ہیں نا، ان میں آدمے سے زیادہ وہ ہوتے ہیں، جن میں لڑکیاں خود شامل ہوتی ہیں۔ بس لوگوں میں یہ بات مشہور نہ ہو کہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی آپس کی دشمنی کی سمجھٹ چڑھ جاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جرم ہو، مجھے نہیں لگتا کہ کسی کی اتنی جرات ہو گئی ہے کہ وہ ایسا جرم کرے، وہ اب پہلے والا ماحول نہیں رہا۔“ بلیئر سنگھ نے سمجھاتے ہوئے کہا

”آپ کیسے یہ معلوم کر پائیں گے؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولا

”دیکھو بیٹا! سیانوں کی ایک کہادت ہے کہ جہاں جرم ہوتا ہے، سراغ بھی وہیں سے ملتا ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے دشمن کو شک کی زد میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے یہاں۔ سبھی ایسا کرتے ہیں۔ وہ اپنی صفائی دیتے ہیں یا پھر ایسا کوئی سراغ یا سمت دے دیتے ہیں، جس سے بات آگے چلائی جاتی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی صفائی دے دی، تو بہت حد تک یہ معاملہ صاف ہو گیا۔ اگر لڑکی کہیں دوسرے لڑکے کے ساتھ بھاگی ہے تو بھی وہیں بات کھل جاتی ہے۔ کیونکہ خود کو الزام سے بری کرنا ہوتا ہے ناظرینوں نے۔“

پتھ نے تفصیل بتائی

”اور اگر جرم ہو تو.....“ جہاں سے پوچھا

”تو پھر لوگ پولیس کی مدد لیتے ہیں، اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو انصاف ملتا ہے۔ ایسا جرم کرنے والا اکثر ہمیشہ طاقتور بندہ ہی نکلتا ہے اور طاقت ور ہاتھ نہیں آتا۔“ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اسی خاموشی میں وہ پنچاٹ گھر جا پہنچے۔ وہاں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر صرف کوئی قتل ہو گیا ہوتا تو شاید ایسے وقت میں یہ پنچاٹ نہ ہوتی بلکہ آخری رسومات کے بعد یہ سب ہوتا، لیکن چونکہ ایک لڑکی کا اغوا ہوا تھا، اس لئے پنچاٹ بلا نا لازمی تھا۔ وہاں کیا فیصلہ ہوتا، یہی سننے کے لئے جہاں بھی بیٹھ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ باتیں سنتے رہنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کسی باہر ہی کے بندے کا کام ہے۔ گاؤں میں ان کے رشتے داروں ہی سے ان کی چپقلش تھی۔ انہوں نے نہ صرف صفائی دے دی تھی، بلکہ آئندہ بھی اگر ان کا کوئی جرم ثابت ہو جائے تو وہ ہر طرح کی سزا کے لئے تیار تھے۔ سبھی لوگوں کا اس پر اتفاق تھا کہ لڑکی بہت اچھی تھی، کسی نے اس میں ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی شک بھی کیا جاسکے۔ طے یہی پایا کہ پولیس سے مدد لی جائے اور خود بھی کوشش کی جائے۔

جہاں وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے بلیر سنگھ پتھ سے بڑے مایوسانہ لہجے میں کہا

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا پتھ جی، جب تک پولیس اس لڑکی تک پہنچے گی، اس کا پتہ نہیں کیا حشر ہو جائے گا۔ وہاں ان کی دسترس ہی میں نہ رہے۔“

”اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ کوئی سراغ تو ملے جہاں کوشش کی جائے، اب جیسے ہی ملے گا، کچھ کرتے ہیں۔“

وہ دونوں اس گھر میں گئے جہاں کی لڑکی اغوا ہوئی تھی۔ ادھیڑ عمر ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بہن اغوا ہو گئی اور بھائی بہن کو بچاتا ہوا مارا گیا تھا۔ ان پر تو قیامت گذر گئی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا کہ لڑکی کی ایک جگہ بات چل رہی تھی لیکن ابھی کچھ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ساتھ والے گاؤں تلونڈی بھارد میں رہتے تھے اور لڑکا اپنے کام کی غرض سے کدور شہر میں رہتا تھا۔ اور وہیں کسی کے پاس ملازم تھا۔ ابھی تک ان دو خاندانوں میں بات اس لئے طے نہیں ہو پائی تھی کہ لڑکے والے جہیز کا کوئی زیادہ ہی مطالبہ کر رہے تھے۔ جبکہ لڑکی اس لئے نہیں مان رہی تھی کہ اسنے لاچکی لوگوں کے ہاں وہ شادی نہیں کرے گی۔ والدین کا خیال تھا کہ وہ لوگ اگر کچھ کم جہیز پر راضی ہوئے تو یہیں ہاں کر دیں گے۔ وہ کچھ دیر ان کے گھر رہے اور پھر وہاں سے واپس آ گئے۔

جہاں نے بلیر سنگھ پتھ کو اس کے گھر چھوڑا ہی تھا کہ ایسے میں فوتن کور کی کال آ گئی کہ وہ گھر پہنچ چکی تھی۔ جہاں کا من بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اسی دھبی من کے ساتھ گھر آ گیا۔

فوتن کور ڈرائنگ روم میں ہی تھی اس کے پاس ہر پریت بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ان کے سامنے کھانے پینے کو

کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔ جہاں ان کے پاس جا بیٹھا۔ تو فوتن کور نے ہی غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

”خیر تو ہے نا جہاں، ایسے منہ کیوں بنا رکھا ہے؟“

”یار، بات ہی ایسی ہے، بہت دکھ ہو رہا ہے۔“ وہ آرزو لہجے میں بولا

”ایسی کیا بات ہو گئی، وہی تو پوچھ رہی ہوں؟“ اس نے اچھے ہوئے پوچھا تو جہاں نے سارا احوال کہہ دیا۔ تو وہ بھی افسردہ ہوتے ہوئے بولی، ”بہت برا ہوا۔“

”وہ غریب لوگ ہیں، اگر قاتل مل بھی گئے نا، تو وہ ان کا کچھ نہیں کر پائیں گے۔“ ہر پریت نے کہا تو جہاں نے اس کی طرف دیکھ کر تلخ لہجے میں پوچھا

”ہر پریت۔! ان قاتلوں کا پتہ تو چلے، تم تو ایسے کہہ رہی ہو، جیسے تمہیں پتہ ہے کہ اس کے قاتل کون ہیں، اور کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا۔“

”میں مانتی ہوں کہ مجھے نہیں پتہ لیکن تم جاننے ہو کہ ایسے جرم کون لوگ کرتے ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر پولیس کی بجائے ہم ان قاتلوں کی تلاش کریں تو جلدی ان تک پہنچ جائیں گے۔“ وہ مایوسانہ لہجے میں بولی

”ہر پریت یہی ہے وہ ضرورت، جس کی وجہ سے ہمیں طاقت اپنے ہاتھ میں لینی ہے۔ بے شک دشمن پیدا ہوتے ہیں، لیکن طاقت کے آگے، بہت کم لوگ سمراتے ہیں، سودفعہ سوچتے ہیں۔ یوں بے بس نہیں ہونا پڑتا۔ بتاؤ، یہی معاملہ اگر ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم کیا کرتے۔ یہ جنگل ہے ہر پریت، اس میں کیسے رہنا ہے یہ اب ہمیں جاننا پڑا ہے، یہ سیکھنا ہو گا۔ انسان اب مہذب نہیں رہا۔ درندہ بھی بھوک لگنے پر شکار کو لکھتا ہے، جبکہ انسانوں کی ان بستیوں میں ہر وقت صیاد گھات لگائے بیٹھا ہے، شاید ان کی بھوک فنی ہی نہیں۔“ جہاں جیسے ایک دم ہی سے پھٹ پڑا تھا۔

”جہاں! تم پر سکون رہو، رب مہراں کرے گا، تم پریشانی مت لو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر اس سے پوچھا، ”کیا پولیس سے تم ذاتی طور پر ملے ہو؟“

”نہیں، ابھی تو نہیں ملا۔“ اس نے جواب دیا۔

”دیکھتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں۔“ فوتن نے کچھ ایسے کہا کہ جہاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ ایک دم سے پر سکون ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میں نے بانیتا کور کے ساتھ بڑے سکون سے ناشتہ کر کے فہیم کو فون کیا۔ میں نے یہاں آتے ہی اس اجنبی ”باس“ کا نمبر اسے دے دیا تھا کہ جس نے مجھے دھمکی لگائی تھی۔ یہ سب اسی کے لوگ تھے۔ وہ چاروں تو مر گئے۔ پولیس انہیں اٹھا کر لے گئی تھی۔ باقی دو ادھر پڑے ہوئے تھے۔ میڈیا پر بہت کچھ ہوتا رہا تھا۔ جسے میں نے تھوڑا بہت سنا، پھر دھیان ہی نہیں دیا۔ فہیم سے کہا تھا کہ وہ پتہ کرے یہ کس کا نمبر ہے؟ لیکن باوجود رات گذر جانے کے وہ ابھی تک بتا نہیں پایا تھا۔ دوسری نیتل پر اس نے کال رسیو کرتے ہوئے اس نے مایوسی سے کہا

”ابھی تک اس کے بارے میں پتہ نہیں چلا، میں نے اردن اور رویت سے بھی مدد لی، مگر پتہ نہیں چلا۔“

”کہیں ان کے پاس تو وہی کچھ نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے؟“ میں نے پوچھا

”دنیا بہت آگے چلی گئی ہوئی ہے۔ اگر یہ ٹیکنالوجی ہمارے پاس ہے تو کسی دوسرے کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ہے اس کا توڑ بھی مل سکتا ہے میں نے سلمان سے بات کی ہے، وہ بھی معروف ہے، اس نے رابطہ نہیں کیا۔ اردو بھی اسی تلاش میں ہے۔“ اس نے مجھے پوری تفصیل بتا دی۔

”اب اسے تلاش تو کرنا ہے، کیسے ہوگا، یہ تو ہی جانتے ہیں نا جو اس کے ماہر ہیں۔“ میں نے کہا

”مجھے امید ہے، ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“ وہ اعتماد سے بولا تو میں نے اس سے کہا

”اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور اٹھ گیا۔ پھر مختصر انداز میں بائیکاٹ کو کو بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس کمرے کی طرف چل پڑے جہاں ان دونوں کا رکھا ہوا تھا۔ اس وقت مینجر سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اسے بعد میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ان دو بندوں سے دلچسپی تھی۔

وہ دونوں فرش پر بندھے ہوئے چت پڑے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ویسی ہی نفرت تھی جو میں نے رات کے وقت دیکھی تھی۔ جس نے بائیکاٹ کو سے مار کھائی تھی، وہ ذرا بھی نادم نہیں تھا۔ جبکہ دوسرا میری جانب یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے میں اسی سے بات کروں گا۔ میں نے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا

”دیکھو بھئی، تمہارے پاس نے مجھ سے تو رابطہ نہیں کیا اب تک، اگر تم لوگوں کو کوئی طریقہ آتا ہو تو بتاؤ؟“ میرے اس سوال پر ان میں سے کوئی بھی نہیں بولا تو میں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”اوتے بولو۔“ بائیکاٹ کو نے ان کے پاس آ کر پوچھا

”چلو یہ بتا دو، کہ وہ کون ہے کہاں ہے، میں خود مل لیتا ہوں جا کر؟“ میں نے پوچھا

”ہمیں اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ یہاں اس ملک میں ہے یا کہیں دوسرے ملک میں موجود ہے۔ ہمیں تو حکم ملتا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔“ دوسرے نے دھیمے لہجے میں جواب دیا

”کیسے ملتا ہے حکم؟“ میں نے پوچھا

”فون پر، وہ بھی ہمارے لیڈر کو ملتا تھا، وہ ہمیں ساری تفصیل بتاتا تھا۔“ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا

”کون تھا لیڈر؟“ میں نے سوال کیا

”وہ شاید مر گیا ہے۔ وہ ان چاروں میں سے ایک تھا جو اوپر تم دونوں کے پاس گئے تھے۔“ دوسرے نے کہا

”یہ تھا اور میں مزید کہنے لگا تھا کہ میرا سیل فون بج گیا۔ میں اسکرین پر دیکھا تو ایک دم سے مسکرا دیا، پھر کال رسیو کرتے ہوئے اسٹیکر آن کر دیا، اس کی ہیلو کمرے میں گونج گئی تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

”بھئی واہ، ابھی تمہارے بندوں کے ساتھ، تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہاں گیا وہ چوہا، کس بل میں ہے، دھمکی دے کر غائب ہو گیا ہے۔“

میرے کہنے پر وہ مجھ سے بھی اونچا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

”میں کہیں بھی نہیں ہوں اور تمہارے بالکل قریب ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی تمہیں ابھی کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ بہت لمبا کھیل کھیلتا چاہتا ہوں جمال، تو ابھی سے مجھے تلاش کرنے لگ گئے ہو۔ ابھی تو میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم، اگر تم اتنے ہی طاقتور ہو تو میرے سامنے آؤ، پھر چاہئے جتنی مرضی لمبی انگڑ پلے، میں

کھیلوں گا۔ ورنہ میں نے تمہیں تلاش کر لیا تو تمہارا کھیل ختم کر دوں گا۔“ میں نے بڑے تحمل سے کہا

”نہیں ایسے نہیں جمال..... جب میں کھیلنے کا کہہ رہا ہوں تو آؤ..... کھیلو۔ جیت ہار کے بغیر کھیل کیسے ختم ہو سکتا ہے، اور ہاں..... اگر میں ہار گیا تو خود اپنا آپ تیرے حوالے کر دوں گا، اور..... اگر جیت گیا تو تجھے مرنا ہوگا۔“ اس نے طنز یہ انداز میں کہا

”تم کھیلتا چاہتے ہو تو کھیلو، میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا، پھر فیصلہ میں کروں گا۔ اور ہاں دھوکے سے اور چھپ کر وارمر نہیں کرتا۔“ میں نے اس سے تشکیک آمیز لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

”یہ فلسفے چھوڑو اور آج کی حقیقت والی بات کرو۔“

”اب ملے ہیں تو باتیں ہوتی رہیں گیں۔ خیر ہمت ہے تو اپنے دو بندے لے جاؤ، میرے پاس بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ بے چاروں نے بہت مار کھائی ہے۔ وہی بندے جنہیں تو نے میرے لئے بھیجا تھا۔ تاکہ وہ مجھے پکڑ کر تیرے پاس لے آئیں، بے چارے۔“ میں نے افسوس ناک انداز میں کہا

”او چھوڑو جمال، ایسے کیڑے کوڑے پتہ نہیں کتنے روزانہ کا کروچ کی طرح مرتے ہیں، دو بلٹ ان کے دماغ میں اُتارو، وہ بھی میری طرف سے، کیونکہ ایسے لوگوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، وعدہ رہا کہ ان کے مرنے کے عوض میں تمہارے چار بندوں کی جان بخش دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔

”چلو انتظار کرو میرا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون واپس جیب میں رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ فطری طور پر ان کے چہرے مایوسانہ حد تک مسخ ہو گئے تھے۔

”تمہارا پاس بہت چالاک ہے، کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں کو مار دوں۔ اس کی بات مانوں گا تو بھی اسی کا فائدہ اور زندہ چھوڑوں گا تو بھی وہی فائدہ میں رہے گا، کیا؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا

”جو تمہارا دل چاہئے۔“ دوسرا مردہ لہجے میں بولا اور اس نے اپنا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ میں اٹھا اور بائیکاٹ کو باہر جانے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ سامنے ہی طارق نذیر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ چھپاتے اور تھوڑا ایتنا تے ہوئے کہا

”میرا خیال ہے انہیں کسی جیل میں رکھوا دیا جائے۔ بعد میں دیکھیں گے۔“

”اور وہ منیجر، اس کا کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا

”وہ اگر آج کوئی بات بتاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ اسے بھی ان کی طرح جیل میں رکھوا دو۔ اور یہ پتہ کرو کہ اس کا بیٹا واقعی ہی اغوا ہوا تھا یا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا

”میں نے پتہ کیا تھا۔ وہ اغوا تو ہوا تھا، اور اب بھی.....“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رکا، پھر بولا، ”نہیں، میں پھر سے دیکھتا ہوں۔“

”گڈ بوائے، اچھی طرح دیکھنا، مجھے کچھ اور ہی دکھائی دے رہا ہے فی الحال۔“ میں نے کہا اور بائیکاٹ کو کے ساتھ باہر کی جانب چل پڑا۔

میں ٹاؤن والے نئے گھر میں جب پہنچا تو وہاں سکوت تھا۔ وہ باس میرے ذہن پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ مجھے جانتا بھی تھا، میرے قریب بھی تھا، میری انتہائی احتیاط کے باوجود مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ جس ہی بہت زیادہ تھا کہ وہ کون تھا؟ اس پر وہ میرے اتنے قریب تھا کہ میرے بارے میں جان لیتا تھا۔ یہ کیسے؟

اس وقت بائیکاٹ کو نے فہم اور مہوش کے پاس چلی گئی تھی۔ باقی سب بھی ہیں موجود تھے۔ میں کمرے میں تھا

تھا۔ میں اس باس کے بارے جتنا بھی سوچتا، میرا ذہن اسی قدر بکھر جاتا۔ میں اس بارے میں سب سے بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس وقت وہ سارے ہی باس کا نمبر اور اس کی لوکیشن تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جس طرح مجھے کارخانے کے مالک زوہیب کے بارے میں پتہ چلا تھا، ویسی ہی توجہ لگا کر دیکھوں۔

میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بیڈ سے نیچے قالین پر آ بیٹھا۔ میں نے پوری توجہ یہ سوچنے پر لگا دی کہ وہ کون ہے اور میرے بارے میں کیسے جان لیتا ہے۔ چند لمحوں ہی میں میرے دماغ سے ساری سوچیں ہٹ گئیں۔ میں نے خود کو خلا میں محسوس کیا۔ میری بند آنکھوں کے سامنے بننے والے دائرے ختم ہو گئی اور وہاں پر اس طرح رنگ پھیلنے لگے، جیسے کئی لوگ ان رنگوں کو اڑا رہے ہوں۔ وہ لوگ تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن مختلف رنگ اڑتے اور فضا میں جا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے۔ وہ رنگ مختلف بادلوں کی صورت اختیار کر جاتے۔ جب کبھی وہ بادل بٹتے تو ان میں سے مجھے ایک شہر کا منظر نظر آتا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں فضا میں ہوں یا ہوائی جہاز میں بیٹھا نیچے کسی شہر کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں فضا میں فلا بازیاں کھاتا ہوا نیچے آنے لگا۔ یہاں تک کہ میں ایک سڑک پر جا کر۔ میرے ارد گرد بہت سارے لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر بندے کا اپنا رنگ تھا۔ میں نے اپنے رنگ پر غور کیا تو میرا رنگ بھی مختلف تھا۔ مجھے وہ نیلا اور ارغوانی کا ملا جلا لگا۔ وہ مجھے دھواں کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ جو اوپر کی جانب اٹھ جاتا تھا۔ میں جس بندے کو بھی دیکھتا، وہ بھی دھواں کی مانند تھا۔ وہ دھواں بھی اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا۔ اچانک وہ منظر ہٹ گیا۔ ایک معمول کی زندگی میرے سامنے تھی۔ اور پھر وہ منظر بھی ہٹ گیا۔ میں اپنے آپ میں آ گیا۔ دروازے میں گیت کھڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ بولی

”یہ کیا ہو رہا ہے، تم ایسے قالین پر کیا کر رہے ہو؟“

”میں بہت تھک گیا تھا، یہ جسم کو سکون دینے کی ایک مشق ہے، وہ کر رہا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سکون سے کہا تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر آ گئی۔ میں اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے ان سب کی کوششوں کے بارے میں بتاتی رہی اور میرا ذہن ان مناظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، جو میں کچھ لمحے پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہ سب کیا تھا، مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ان مناظر کو سمجھنا کچھ دیر کے لئے موقوف کیا اور گیت کی بات سمجھنے لگا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ اب اس جگہ پر پروڈکشن ہاؤس چلا پاؤں گی۔ وہ جگہ اب غیر محفوظ ہو گئی ہے۔“ اس نے کہا ”تو کیا خیال ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا

”میں واپس کراچی چلی جاتی ہوں۔ وہیں پر کام کرتی ہوں۔“ اس نے اپنا خیال بتایا

”تو اس کا مطلب ہے، باقی کچھ لوگ بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔“ میں نے پوچھا

”ظاہر ہے، مجھے ان کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔ ان کے بغیر تو کام نہیں چلے گا، لیکن سارے تو نہیں جائیں گے۔ ہاں جنید اور علی نواز کو تم اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے مشورہ دیا

”نہیں، تم انہیں بھی لے جاؤ۔ اپنا سیٹ اپ بنا لو۔ پھر اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، اس وقت پتہ نہیں کیا صورت حال ہوگی۔“ میں نے کہا

”میں نے اپنا سیٹ اپ دوئی میں بنانا ہے۔ یہ سب تو نہیں جاسکیں گے نا وہاں پر۔“ وہ تیزی سے بولی ”لیکن تم دوئی میں تو نہیں رہو گی نا، کراچی تو آنا ہوگا، ان لوگوں کی تمہیں وہاں ضرورت ہوگی۔ اور پھر تم

سب سے میرا رابطہ رہے گا۔ جب بھی اور جس کی مجھے ضرورت ہوگی، میں بلا لوں گا۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں، یہاں پر آپ کا کام چل جائے گا؟“ اس نے پوچھا تو مسکراتے ہوئے بولا

”کیوں نہیں، بلکہ میں اب کہوں گا کہ تم سب لوگ جاؤ، ممکن ہے میں بھی وہیں کراچی آ جاؤں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیرے پیچھے پیچھے دوئی چلا آؤں۔“

میری اس بات وہ مسکرا دی۔ پھر خوشگوار لہجے میں بولی

”چلیں، یہ تو اچھا ہوگا کہ تم وہاں آ جاؤ، کچھ دن سکون سے کٹ جائیں گے۔ پھر پوری پوری پلاننگ کے ساتھ نیا کام شروع کریں گے۔“

”اوکے، جیسا تم چاہو۔“ میں نے اطمینان سے کہہ دیا۔ میں اس سے مزید بحث نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد وہ جانے کو تیار ہو گئی۔

دو پہر تک وہ لوگ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہیں ایک نجی کمپنی کی فلائٹ سے سیٹیں مل گئیں۔ وہ سبھی تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ دارے نے ان سب کے لئے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ وہ سب نے مل کر کھایا اور پھر وہ سب نکل گئے۔

اس وقت دو پہر ڈھل چکی تھی۔ میں اور بائیکا کورلان میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان سب کے جانے پر ہلکا سا جدائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں انہی کی باتیں یاد کرتے ہوئے اس بتا رہا تھا کہ کتنا اچھا وقت ان سب کے ساتھ گزرا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اداس ہو رہے ہو۔“ بائیکا کور نے پر شوق نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ”ساتھ چاہے چند دن کا ہو، احساس تو ہوتا ہے نا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”ہجی، بتانا، مجھے اسی طرح یاد کیا تھا۔ جب تم پہلی بار امرتسر سے آئے تھے؟“ اس نے اسی طرح پر شوق لگا ہوں سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا

”ہاں۔! ایمانداری سے بتاؤں گا۔ تم مجھے بہت عرصہ تک یاد آتی رہی ہو۔ تب تک ہم دوبارہ نہیں مل گئے۔“ میں نے پوری سچائی سے بتایا تو اس کی آنکھیں تک مسکرا دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ میرے میل

فون پر چوہدری اشفاق کے نمبر جگمگانے لگے۔ میں نے کال رسیو کی تو وہ سکون سے بولا

”یار۔! کوئی نورنگر آنے کا ارادہ ہے؟“

”کیا ہوا، کوئی خاص کام؟“ میں نے پوچھا

”خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ جو ملنگ اور جوگی رام لعل تم یہاں چھوڑ گئے تھے، وہ اب بھی یہیں ہیں۔ میں نے ان میں تو کوئی خاص بات نہیں دیکھی، لیکن چند دنوں سے ان کے پاس کچھ لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ وہ بندے مجھے مٹھوک کہتے ہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور دوسری ہچل تو نہیں ہے علاقے میں؟“ میں نے پوچھا

”نہیں، ابھی تک تو نہیں ہے۔ لیکن میرا دماغ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں میں کوئی گڑبڑ ہے۔“ اس نے الجھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک دم سے فیصلہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے، میں چکر لگاتا ہوں۔ تم ان لوگوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے رکھو۔ دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اسے

وقت کتنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ بڑی ادا سے بولی

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا تو ہم ایسے ہی باتیں کرتے ہوئے مارکیٹ جا پہنچے۔

تقریباً دو گھنٹے تک یونہی جو سمجھ میں آیا اس کے لئے خریدتے رہے۔ ہمیں شاپنگ کرتے ہوئے کوئی دیکھتا تو بلاشبہ ہمیں اناڑی کہتا۔ اسی دوران گیت کا فون آ گیا کہ وہ لوگ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ ابھی ایئر پورٹ سے نکل رہے ہیں۔ ہم شاپنگ بیگز سے لدے واپس گاڑی تک آئے۔ میں نے اپنا سامان بائیتا کور کے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سامان کے اوپر رکھ دیا اور چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بائیتا کور نے وہ سارا سامان جلدی سے کچھلی سیٹ پر رکھا، جو رکھتے ہی بکھر گیا۔ سب سے اوپر کچھ پر فوم کی بوتلیں تھیں۔ وہ جو گری تو ان میں سے دو ٹوٹ گئیں۔ کار میں تیز مہک پھیل گئی۔

”اوہ! یہ کیا ہوا یار۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی

”کچھ نہیں ہوا، پر فوم ضائع ہو گیا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ پلٹتے ہوئے بولی

”میں نے لیکر آئی ہوں، بس ایک منٹ ٹھہرو۔“

”چلو آ جاؤ، کچھ اور بھی ہیں۔“ میں نے کہا تو میری بات سنی ان سنی کرتی ہوئی دوکان میں کھس گئی۔ میں نے وہ دونوں بوتلیں اٹھائیں تاکہ انہیں باہر پھینک دوں اور ان کی تیز مہک سے نجات ملے۔ میں نے جیسے ہی وہ ٹوٹی ہوئی بوتلیں اٹھائیں، ان میں پڑا ہوا پر فوم میری کپڑوں پر گر گیا۔ میں نے وہ بوتلیں باہر پھینک دیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔ میں نے دروازے کھول دیئے تاکہ وہ مہک ختم ہو جائے۔ پانچ منٹ کے دوران بائیتا کور پلٹ آئی۔ اس نے دو کی بجائے چار بوتلیں خرید لی تھیں، وہ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھ دیں اور ہم چل پڑے۔

”ہم جدھر سے گزرتے گئے، ادھر سے خوشبو بکھرتی چلی جائے گی۔“ بائیتا کور نے کہا اور بچوں کی طرح ہنس دی۔ جبکہ مجھے وہ مہک اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اس وقت ہم شہر ہی میں تھے۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ سبھی مجھے خیال آیا تو میں نے کہا

”یار کھانا نہ کھالیں۔ یہاں سے نورنگر کا فاصلہ چار اور پانچ کھنوں کا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوتا، رستے میں کچھ دیکھ لیں گے یا وہیں چل کر کھائیں گے۔“

اس نے کہا تو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد میں پیٹرول لینے کے لئے ایک فلنگ اسٹیشن پر رکا۔ وہیں ایک ہوٹل بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی بائیتا کور نے کہا

”ارے یہاں تو ڈھابہ بھی ہے، یہیں سے نہ کچھ کھانی لیں؟“

”یہاں سے کھا لیتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اتر گئی۔ میں نے پیٹرول لیا اور ایک جانب کار پارک کر کے اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہاں رش خاصا کم تھا۔ شاید رات کا پہلا پہر تھا۔ اس لئے ٹرک اور دوسری گاڑیاں نہیں رک رہی تھیں۔ ہم نے بڑے سکون سے کھانا کھایا۔ اس وقت چائے پیتے ہوئے بائیتا کور خاموش تھی کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ کی۔ اسی لباس کا فون تھا۔ میں کال رسپنڈ کر لی۔

”ہیلو۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا

”کہاں ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو مجھے اچانک اس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ اس کا تو یہ دعویٰ تھا

کہ وہ ہر وقت میرے قریب ہے، یہ اب کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے ایک لمحہ میں سوچا اور جواب دیا

تسلی دی۔ پھر کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ فون رکھ کر میں نے بائیتا کور کو اس جوگی اور ملک کا قصہ سنانے لگا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ پھر ایک دم سے بولی

”چل یار۔! ادھر تیرے نورنگر ہی چلتے ہیں۔ ایک دو دن ادھر گزار کے آتے ہیں۔ تب تک کوئی بات سمجھ میں آ جائے گی، اس لباس کے حوالے سے۔“ بائیتا کور نے یاد دلایا تو مجھے کچھ گھنٹے پہلے کا منظر یاد آ گیا جو میں نے مراقبہ کی سی کیفیت میں دیکھا تھا۔ ایک بار تو میرا دل کیا کہ میں وہ منظر بائیتا کور کے ساتھ شیئر کروں، پھر ایک دم سے ارادہ بدل دیا۔ جب مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تو پھر اس کے ساتھ دماغ ہی کھپاتا ہے۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا

”چل اٹھ پھر تیار ہو جا، چلیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ گئی۔

میں نے اپنے ساتھ دارے کو بھی تیار کر لیا۔ نجانے کب کا وہ نورنگر نہیں گیا تھا۔ میں نے دارے کو چلنے کا کہہ دیا تو وہ دوسرے ملازم بھی چل گئے، وہ میاں بیوی، کب کے یہاں آئے ہوئے تھے۔

”اچھا، پھر تم لوگ ایسا کرو۔ ان دونوں بزرگوں کو بھی ساتھ لے لو، انہیں بھی اپنے ساتھ نورنگر لے جاؤ۔ جتنے دن رہنا ہوگا، رہو۔ ان بزرگوں کو چاہے حویلی میں چھوڑ دینا۔ ایک ہفتہ تک تم لوگ خوب گھوم پھرو۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو سبھی خوش ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ ایک دو دن نورنگر رہ آؤں گا پھر اماں کے ساتھ وقت گزاروں گا۔ بائیتا کور بھی ساتھ آ جائے گی۔

”ٹھیک ہے، ہم پھر وہ فور وائل گاڑی لے جاتے ہیں۔“ دارے نے تیزی سے اجازت چاہی۔

”چل لے جا۔ ہم آ جائیں گے۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جب میں تیار ہو کر واپس آیا تو بائیتا کور بالکل بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور بالکل کوئی پنجاب کی مٹار دکھائی دے رہی تھی

”یہ کپڑے کہاں سے لئے؟“

”میں نے اور گیت نے خریدے تھے۔ باقی میں نے کافی کپڑے رکھ لئے ہیں۔ کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے میری طرف دیکھ کر مصنوعی شرمائش سے کہا تو میری ہنسی نکل گئی۔

”اچھا چلو، کھلو، مجھے چوہدری اشفاق کے لئے کچھ چیزیں بھی خریدنی ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے قریب پڑے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

”وہ دیکھو! میں تیار ہوں، چلو۔“ اس نے کہا تو میں نکل پڑا۔ میرا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

”کیا خریدنا ہے اس کے لئے؟“ بائیتا کور نے یونہی پوچھ لیا تو میں نے ہنستے ہوئے بتایا

”کچھ بار جب میں نورنگر گیا تھا تو چوہدری اشفاق نے بڑے مان سے ایک بات کہی تھی۔“

”کیا؟“ اس نے پوچھا

”کہنے لگا کہ جھاکے سے مجھے چوہدری اشفاق تو بنا دیا ہے۔ اب میرا رکھ رکھاؤ بھی ایسا ہونا چاہئے۔ اب آؤ تو شہر سے کپڑے، پر فوم، اور وہ ساری چیزیں لے کر آنا جس سے بندے کی شہور شہور بنے۔ بس اس کی شہور شہور کا سامان لینا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا۔ تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

”یار یہ تعلق، یہ رشتے یہ ناٹے، جن پر مان ہوتا ہے، جنہیں ہم اپنا کہہ سکتے ہیں، ان کے لئے کچھ کرتے

”اپنے گھر میں ہوں۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے پوری طرح یہ احساس کر لیا کہ اس کے لہجے میں وہ پہلے والی خوشگواریت نہیں تھی۔

”تم یقین نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔“ میں نے گول مول جواب دیا

”میں اس لئے یقین نہیں کر سکتا کہ ابھی چند منٹ پہلے میرے لوگوں نے تمہارے ٹاؤن والے گھر کو لاجروں سے اڑایا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم وہاں ہو اور بچ گئے ہو۔“

وہ تیزی سے بولا تو میں نے مزید اسے تپاتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے تم نے ہوں سے گھر کو اڑا دیا ہوگا۔ لیکن میں تو گھر میں ہوں۔ اور تم سے بات کر رہا ہوں۔ اور پھر میرے مرنے کی خبر مجھے سنا رہے ہو، حیرت ہے۔ ابھی تو ہم کافی لمبی انگڑ کھینچی تھی۔ اپنے وعدے سے بھی مکر گئے ہو۔ مجھے مار کر۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔

”تم اپنے گھر میں نہیں ہو۔“ اس نے غصے میں کہا تو اس کے لہجے میں بے بسی صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔

”میں اپنے گھر میں ہوں۔ اگر تم میں ہمت ہے تو میرے سامنے آ جاؤ۔ اور پھر تمہارا دعویٰ کدھر گیا کہ تم ہر وقت مجھ تک پہنچ سکتے ہو، میرے قریب ہو اور.....“ میں نے اسے مزید غصہ دلاتے ہوئے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ باغیتا کو میری باتوں سے اندازہ لگا چکی تھی کہ فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے انتہائی اختصار سے اسے بتایا تو وہ بولی

”پہلے پتہ تو کر لو، گھر کا؟“

ارد گرد کے کسی بندے کا فون میرے پاس نہیں تھا۔ میرے پاس اس سیکورٹی گارڈ کا نمبر بھی نہیں تھا۔ وہ دارے کے پاس تھا۔ میں نے دارے کو فون کرنے کا سوچا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

”او بھال، جس گھر سے ہم آئے ہیں، کسی نے وہاں راکٹ لاچر اور بم مار کر پورے گھر کو اڑا دیا ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا

”اپنے پولیس والوں نے۔“ اس نے تیزی سے بتایا

”سیکورٹی گارڈ کہاں تھا؟ وہ وہاں پر اس لئے کھڑا رہا کہ لوگ آئیں اور بم مار کر چلے جائیں؟“

میں نے پوچھا

”میں نے بھی پوچھا تھا پولیس والوں سے، انہوں نے بتایا کہ وہ شدید زخمی ہے اور ہسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے، انہوں نے آتے ہی اسے گولیاں ماری تھیں۔“ اس نے تیزی سے بتایا

”تم کہاں پر ہو؟ اور پولیس والوں کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ میں نے پوچھا

”میں ابھی نورنگر پہنچا ہی ہوں اور انہیں بھی یہی بتایا ہے۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے میں کرتا ہوں کچھ۔“ میں نے کہا اور چند لمحے سوچ کر طارق نذیر کو فون کر دیا۔ اسے ساری صورتحال بتا کر کہا، ”اسے دیکھ لینا، اب ہم نے وہاں واپس نہیں جانا، سیکورٹی گارڈ کو ہر ممکن خیال کرنا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے کہا تو مجھے خیال آیا۔

”اور ہاں! وہ نمبر کے بیٹے بارے کچھ پتہ چلا؟“

”آپ نے درست ٹریک دیا تھا۔ مجھے تھوڑا پتہ چلا ہے، تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔“ اس نے تیزی سے کہا

”او کے۔“ میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ ہم نے کپ وہیں رکھے۔ بل دیا اور کار میں آ بیٹھے۔

میرے سامنے سوالیہ نشان تھا۔ اس پاس کا دعویٰ بالکل غلط تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اصل میں وہ مجھ تک نہیں پہنچ پاتا تھا صرف اپنی ذہانت سے مجھے چکر دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اگر وہ درست تھا تو اس بار وہ دھوکا کیسے کھا گیا؟ میں اور باغیتا اسی بارے باتیں کرتے سفر کرتے چلے گئے۔ یہ معاملہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ نورنگر آ گیا۔

ہم نورنگر پہنچ گئے۔ تمام راستے میرا طارق سے رابطہ رہا۔ وہ مجھے وہاں کے بارے میں بتاتا رہا۔ باغیتا کو پہلی بار یہاں آئی تھی۔ جیسے ہی ہم حویلی کے گیٹ پر آئے، چوہدری اشفاق سامنے آ گیا۔ گیٹ کھل گیا۔ میں نے جب تک کار پورچ میں روکی تب تک چوہدری اشفاق ہمارے قریب آ گیا۔

”جی آیاں لوں باغیتا۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا

”بہت مہربانی چوہدری اشفاق، لو میں تمہارے لئے کچھ لائی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کار سے شاہنگ بیک نکالنے لگی۔ تبھی چوہدری اشفاق نے پوچھا

”یار اتنا تیز پرفیوم، تو نے پہلے کبھی نہیں لگایا تھا، یہ کیوں؟“

”یہ تیرے لئے لائی ہوئی ایک پرفیوم کی شیشی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ مجھ پر گر گئی۔ ابھی کپڑے بدلتا ہوں۔ یہ مہک چلی جائے گی۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھا۔

تبھی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، اب یہاں نہ ماں تھی اور نہ سوتلی۔ مجھے یوں لگا جیسے ساری حویلی ہی ویران ہو۔ میں چلتے ہوئے ڈرائینگ روم میں جا بیٹھا پیچھے ہی وہ دونوں آ گئے۔ حویلی کے ملازمین کو پتہ چل گیا تھا کہ میں آ گیا ہوں۔ وہ آنے لگے۔ چوہدری اشفاق نے کھانا لگانے کا کہا تو باغیتا کو نے بتایا کہ ہم ایک ڈھابہ ہوٹل سے کھا آئے ہیں، چائے وغیرہ پی جاسکتی ہے۔ وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ باس کی کال آ گئی۔

”تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم بچ گئے ہو، ورنہ آج تمہارا کام ختم ہو جانے والا تھا۔“ اس نے غصے اور مایوسی طے لہجے میں یوں کہا جیسے اسے بری قسمت ہو چکی ہو۔

”دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، اپنی بات پر قائم رہنے والے نہیں ہو۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو کافی بے غیرت قسم کے ہوں۔ چھپ کر دار کرنے والا بے غیرت ہی تو ہوتا ہے، جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، لہذا، اگر مجھ سے دشمنی لینی ہی ہے تو مردانگی دکھاؤ، فوجیوں سے میں نہیں لڑتا۔“ میں نے انتہائی طنز یہ لہجے میں کہا۔

”تم مجھے ایسے اشتعال نہیں دلا سکتے ہو، میں چاہوں تو ابھی تمہیں ختم کر سکتا ہوں، لیکن میں تم سے کھیل.....“

اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا

”بکو اس بند کرو، اور اگر ہمت ہے تو میں لاہور کے مال روڈ پر، ایک ریسٹوران میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میں دیکھ ہی لوں تمہیں۔ ایک گھنٹے تک تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ مجھے تلاش کر لو، میرا وعدہ ہے میں خود کو تیرے حوالے کر دوں گا اور نہ تلاش کر سکے، تو تم اپنی قسمت مانتے ہوئے خود اپنے آپ کو میرے حوالے کر دینا، کیسا ہے یہ کھیل؟ آؤ، اب میں تمہارے ساتھ کھیلتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو، تم زیادہ دیر تک میری نگاہوں سے ادھل نہیں رہ سکتے ہو۔“ اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں چونک گیا۔ کیا اس وقت میں اس کی نگاہوں سے ادھل ہوں؟ جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا تو میں چونک گیا۔

”اب بھاگو مت، آؤ، مجھے پکڑو، تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کس جگہ پر ہوں؟“ میں نے کہا تو وہ خاموش رہا تب میں بولا، ”حملہ کر کے بھاگ جانے والوں کے باپ کا پتہ نہیں ہوتا، دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، بے غیرت اور منافق، اور یہ اپنے باپ کے نہیں ہوتے، ہار جانے کا اعلان کرو، اور اپنا آپ میرے حوالے کرو، یا پھر مجھے آکر پکڑ لو، مزاحمت نہیں کروں گا۔“ کہو منظور ہے؟“

اس نے جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے تھوڑا بہت سمجھ آنے لگی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک خاص دوست کو فون کیا اور اسے سمجھاتے ہوئے اس ریسٹوران کے بارے میں بتایا۔ اور اسے سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں بعد رابطہ کروں گا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کے بعد ہی کا وقت تھا جب نوتن کور اور جہاں کھیتوں کی طرف نکل گئے تھے۔ سامنے سرسبز و شاداب فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ صاف اور شفاف ہوا، جسے سینے میں اتارتے ہوئے بھی سکون ملتا تھا۔ اصل میں وہ اسی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔

”نوتن کور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ جرم کس نے کیا ہے؟“ اس نے بات بدھائی

”جہاں تک میں نے اب تک سنی ہوئی بات پر تجزیہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ فقط لڑکی ہی اغوا کرنے آئے تھے۔ درمیان میں بھائی آیا تو وہ قتل ہو گیا۔ اگر ہم دونوں جرائم کو ساتھ ملا کر سوچیں گے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ صرف لڑکی کے اغوا کو سامنے رکھیں گے تو کوئی سراغ ہاتھ لگنے کا امکان ہو سکتا ہے۔“ نوتن نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی رائے دی تو اس نے پوچھا

”تمہاری اس رائے دینے کی وجہ یا بنیاد کیا ہے؟“

”کیونکہ اغوا ایک سنگین جرم تو ہے ہی، اس پر قتل ہو جانا سنگین تر ہو گیا۔ اب مجرموں کے لئے اغوا کا معاملہ بہت چھوٹا ہو گیا۔ وہ اصل میں قتل کو چھپائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکی کو بھی.....“ یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ پھر دکی لہجے میں بولی، ”سوان وجوہات پر نگاہ رکھی جائے، جن کی وجہ سے وہ لڑکی اغوا ہو سکتی ہے یا ہوئی ہے، قاتل خود بخود واضح ہو جائیں گے۔“ اس نے اپنی بات کہہ دی۔

”تو یہ ابتدا کہاں سے کریں؟“ جہاں نے پوچھا

”دو جگہ ہیں، ایک تھانہ اور دوسرا اسی لڑکی کی کوئی سہیلی، ان سے بات آگے بڑھے گی۔“

”جہاں تک تھانے کا معاملہ ہے اگر انسپکٹر نے بات چھپانا چاہی تو وہ کبھی بھی ہمیں اصل بات نہیں بتائے گا۔ اور اگر.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو نوتن بولی

”پریشان مت ہو، ابھی کچھ دیر میں پتہ چل جائے گا۔ میں نے گرلین کور سے کہا ہے۔ وہ اسی انسپکٹر کے سیل فون کو ٹریس کر رہی ہے۔ ان دونوں میں اس کا جس سے سب سے زیادہ رابطہ ہوا ہے، وہ سامنے آجائے گا، اسے دیکھ لیتے ہیں۔“

”اور وہ سہیلی والا معاملہ؟“ جہاں نے پوچھا

”وہ دوسرا آپشن ہے، وہ میں اور ہر پریت دیکھ لیں گے۔“ اس نے سکون سے کہا اور دور کہیں دیکھنے لگی۔

”میں کروں اس سے بات؟“ جہاں نے بے تابی سے کہا

”کر لو، مگر وہ ذمہ دار لڑکی ہے، اپنا کام کر رہی ہوگی، مطمئن ہو کر ہی فون کرے گی۔“ نوتن نے کہا

”ویسے یہ سلمان نے ہمیں جو سیل فون دے دیئے ہیں نا، یہ بھی کمال کی چیز ہے، کہیں ٹریس نہیں ہوتا۔ ورنہ ہم ابھی تک پکڑے گئے ہوتے۔“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا

”ہیں تو سہی، لیکن کب تک، میں سوچ رہی تھی جس دن اس سے بھی بڑھ کر کوئی ٹیکنالوجی آگئی، یا سوفٹ ویئر مارکیٹ میں آگیا، تب کیا ہوگا، ہمیں شاید پتہ بھی نہ چلے۔“ نوتن کور نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور یہی باتیں تھوڑے سے فاصلے پر موجود ٹیوب ویل کی جانب بڑھ گئی۔ جہاں بھی اس کے ساتھ چل دیا۔

انہیں وہاں کھڑے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گرلین کور کا فون آگیا۔ اس نے بات کی تو اس نے فون جہاں کی جانب بڑھا دیا۔ جہاں نے فون پکڑا اور کان سے لگاتے ہوئے کہا

”ہاں گرلین کور۔! کیا بتا پھر؟“

”جہاں دیرے ایک ہی نمبر ہے، وہ بھی نکودر سے ہے۔ ان پر باتیں ہوئیں ہیں۔ اس بارے جتنی بھی تفصیلات مجھے ملی ہیں، وہ میں نے میل کر دی ہیں۔ وہ دیکھ لیں، اگر وہ آپ کے کام کی ہوئیں تو۔“ وہ چپکی

”ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ جہاں نے کہا اور چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ کھیتوں میں نہ ٹھہر سکے فوراً ہی واپس گھر پلٹ آئے۔ اس نے راستے ہی میں ہر پریت سے کہہ دیا تھا کہ لیپ ٹاپ کھول لے۔ دس منٹ میں جب وہ ڈرائیونگ روم میں آئے تو وہ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ جہاں نے اپنا ای میل بکس کھولا اور گرلین کی میل دیکھی۔ اس میں دیئے گئے نمبر کے آگے گنبد رنگہ لکھا ہوا تھا۔ کس وقت کتنی دیر کی کال ہوئی، یہ بھی درج تھا۔

”وہ لڑکی کتنے بچے اغوا ہوئی تھی؟“ نوتن نے پوچھا تو ہر پریت تیزی سے بولی

”یہی کوئی رات کے دو بجے ہوں گے، یہی وقت بتایا تھا انہوں نے۔“

اور یہ دیکھو جہاں۔“ نوتن نے ایک وقت کے دوران پرانگی رکھتے ہوئے کہا ”یہ، ایک گھنٹے بعد کال ہوئی ہے، اور پھر مسلسل صبح تک وقفے وقفے سے کال ہوتی رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ گنبد رنگہ کون ہے؟ یہ ساتھ میں اس کا پتہ بھی ہے۔“

”نام تو سنا سنا سا لگ رہا ہے۔“ ہر پریت نے کہا پھر ایک دم چونک کر بولی، ”ارے یہ وہی تو نہیں ہماری مخالف پارٹی کا سیاست دان۔ میرا خیال ہے یہ انکیشن بھی لڑ رہا ہے؟“

”اگر وہی ہے تو، بہت مشکل درپیش ہو سکتی ہے۔“ نوتن کور نے مایوسی سے کہا اور اٹھ کر دوسرے صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”کیا مشکل ہوگی؟“ جہاں نے پوچھا

”اب اس میں پارٹیاں آجائیں گی، جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں رہے گی، میں کہتی ہوں کہ یہ نہ ہو۔“ وہ پھر مایو سا نہ لہجے میں بولی

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ جہاں نے کہا اور انوجیت کا فون ملانے لگا، کچھ ہی دیر بعد مل گیا تو اس نے اسپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا

”کہاں ہو؟“

”میں ادھر ہوں میلان پور میں، ادھر ایک جلسہ ہے اور کچھ لوگوں سے ملنا بھی ہے۔“ اس نے تفصیل بتا دی

”مجھے یہ بتاؤ، نکودر میں گنبد رنگہ کون ہے؟“ جہاں نے پوچھا

الوجیت نے بتایا ہے کہ بگھر رکون ہے؟ اس سے لگتا نہیں کہ وہ کیسا بندہ ہوگا۔ اور تمہارا دوسرا مخالف بندہ، ان سیاست دانوں میں کتنے ایسے ہیں، جو صاف سھرے ہیں۔ سو یہاں الیکشن جیتا تو دونوں سے جاتا ہے لیکن وہ ووٹ حاصل کیسے کئے جاتے ہیں، یہ ایک آرٹ ہے، ہر ہے میری جان، جسے ابھی تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ آخری لفظ ہر پریت نے سن لئے تھے۔ اس لئے بیٹھے ہوئے بولی

”ٹھیک کہہ رہی ہے نوتن، یہاں الیکشن جیتنا ایک آرٹ ہی ہے۔ بہت ظلم ہوتا ہے لوگوں کے ساتھ۔ ان کی امیدوں کے ساتھ کھیلتے ہیں یہ لوگ۔“

”اچھا چلو یہ ختم کرو، اب یہ سوچو، کیا کرتا ہے۔ نوتن تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ جہاں نے جان بوجھ کر پوچھا

”میں تو ابھی واپس جاندھر جاؤں گی وہاں کچھ کام ہیں، کل اگر وقت ملا تو آؤں گی، آخر ہم بھی تو ملازم ہیں رتن دیپ سنگھ جی کے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی

”یار نوتن، ابھی تو اتنا کام نہیں، لیکن الیکشن کے دنوں میں تو کام بہت بڑھ جائے گا۔ تم وہ چند دن ہمارے ساتھ آ جاؤ۔“ ہر پریت نے اس سے کہا

”میں رتن دیپ سنگھ سے اجازت لے کر آ جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو ہر پریت تیزی سے بولی

”تم نوکری چھوڑ دینا، الوجیت اگر ممبر بن گیا تو بہت کام ہوگا، وہ سبھی سنبھال لیتا۔“

”دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں چائے پی کر نکل رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

چائے پینے کے بعد نوتن کو اپنی کار میں نکل گئی اور ہر پریت کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایسے میں جہاں نے صوفے پر بیٹھ کر بلدیو سنگھ کو فون ملایا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا

”نوتن نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام اسی بگھر سنگھ ہی کا ہے۔ اسی کی ایک کڑی مجھے ملی ہے۔“

”وہ کیا؟“ جہاں نے تیزی سے پوچھا

”میرے ایک بندے نے بتایا ہے کہ وہ لڑکا، جس کے ساتھ لڑکی کی بات طے ہو رہی تھی، وہ بگھر سنگھ کے ہاں کام کر رہا ہے۔ اس کا ذاتی ملازم ہے۔“ بلدیو نے پرسکون لہجے میں کہا

”کہیں یہ کام.....“ جہاں نے یہ کہنا چاہا تھا کہ بلدیو نے اسے روکتے ہوئے کہا

”وجہ کچھ بھی رہی ہو، یہ ایک کڑی بنتی ہے، رستہ ہے، ممکن ہے، اسی لڑکے نے بگھر سنگھ سے کہہ کر پولیس آفیسر سے سفارش کروائی ہو۔ لیکن ایک بات طے ہے، اتنی رات کو، اتنی جلدی یہ ہوتا نہیں۔ خیر، تم پتہ کراؤ، کہ لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان کو اختلافی بات تو نہیں چل رہی تھی۔“

”تھا، یہی جہیز کم زیادہ کا چکر تھا۔ تم ایسے کرو، سیدھا اسی لڑکے کو.....“ جہاں نے غصے میں کہا

”نہیں، پھر بھی تم پتہ کرو، کوئی بڑا معاملہ تو نہیں چل رہا تھا۔“ بلدیو نے شندے لہجے میں کہا

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ہر پریت کے ذمے لگائے گا۔ وہ ہی کسی بات کا پتہ لگا پائے گی اگر کوئی ہوئی تو۔ اس نے کچن میں جا کر ہر پریت کو سمجھایا اور اوپر چھت پر جا پہنچا۔ اس نے وہاں جاتے ہی خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا ہو سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود کو دور جائے اور صبح ہونے سے پہلے لڑکی کو واپس لے آئے۔ وہ چھت پر کھڑا ڈوبتے ہوئے

”وہی، جو ہمارے مخالف الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہا ہے، وہ ہماری تیسری بڑی مخالف پارٹی ہے۔ اگر ہم نہ ہوں تو وہ الیکشن جیت سکتا ہے۔“

”کیسا بندہ ہے وہ؟“ اس نے پوچھا

”اچھا نہیں ہے، جرائم پیشہ ہے، لوگ اس کے شر سے اس کی عزت کرتے ہیں، کیوں کیا ہوا؟“ الوجیت نے پوچھا تو اس نے کہا

”مجھے شک ہے کہ وہ اغوا ہونے والی لڑکی، اس ہی کی کارستانی ہے۔“

”ممکن ہے، لیکن اسے ثابت کرنا، اور ثابت ہو جانے پر لڑکی کا برآمد کرنا بہت ہی مشکل ہے، یوں کہہ لیں شیر کے منہ سے نوالا کھینچنا، کیونکہ وہ ایک قتل بھی اس کے ساتھ کروا چکا ہے۔ اگر یہ سب ہو بھی جائے تو وہ کون سا اس نے کیا ہوگا۔ ایسے.....“ اس نے مزید کہنا چاہا تو جہاں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

”میں دیکھ لوں گا، تم اپنا کام جاری رکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر ہر پریت کی طرف دیکھ کر بولا، ”جوتی سے کہو، چائے ہی پلا دے۔“

”میں کہتی ہوں۔“ ہر پریت نے کہا اور اٹھ گئی۔

وہ چند قدم دور گئی ہوگی کہ نوتن نے جہاں کی طرف دیکھ کر پوچھا

”کیا ہر پریت کو روک اپنے نئے گردپ کے بارے میں نہیں پتہ یا.....؟“

”نہیں، اور اس بارے میں ابھی اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، راز جس قدر اپنے درمیان میں رہے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اسی لئے محتاط تھا۔“ جہاں نے اسے سمجھایا

”تو پھر تمہیں کسی طور بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لیتی ہوں سب، شام تک اس بارے پتہ چل جائے گا کہ وہ لڑکی اس بگھر کے پاس ہے کہ نہیں۔“ نوتن نے حوصلہ افزاء لہجے میں کہا

”کیا کرو گی، انہیں بتاؤ گی۔ کیا وہ سب اتنی جلدی آ جائیں گے؟“ جہاں نے پوچھا

”اوئے میں نے اسی وقت ان سب کو بتا دیا تھا، جب یہاں میں نے یہ بات سنی تھی۔ دراصل رات میری بلدیو سنگھ سے بات ہوئی تھی۔ بچن کو تو بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔“

”بچن کو، وہ کیوں..... مطلب؟“ میں نے پوچھا

”یہ تو ان کے پاس جا کر پتہ چلے گا نا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو روکری، پھر کہتی چلی گئی، ”میں نے الوجیت کے الیکشن بارے بلدیو سنگھ بتایا تو وہ بہت زیادہ پر جوش ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا ہے، ہمارا کوئی بندہ تو ہوگا پارلیمنٹ میں۔ وہ یہی پلان کر رہا تھا کہ اسے جوتنا کیسے ہے۔ اسی لئے وہ آج دوپہر سے پہلے ہی نکودر میں آ گئے ہوئے ہیں۔ ابھی میں انہی کے پاس پہنچی جاؤں گی۔ میرے خیال میں اب تک وہ کوئی نہ کوئی کام تو کر ہی چکے ہوں گے۔“ نوتن نے بتایا تو جہاں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

”وہ کیا کریں گے یہاں؟“

”تجھے یہاں بھارت میں الیکشن اور سیاست دانوں کا نہیں پتہ۔ یہاں جمہوریت کم اور ڈرامے بازی زیادہ ہے۔ ساری پارلیمنٹ کو دیکھ لو، اس میں کتنے لوگ ہیں جو صاف سھرے ہوں گے، ان میں زیادہ تر لوگ اپنے اپنے علاقے کے غنڈے اور بد معاش ہیں۔ جرائم پیشہ ہیں، اپنے کالے دھندوں کو تحفظ دینے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے الیکشن جیتنا اور ہر حال میں جیتنا زندگی اور موت سے بڑھ کر کھیل ہوتا ہے۔ جس طرح

سورج کو دیکھ رہا تھا کہ بلد یوسنگھ کا فون آگیا۔

”جہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جہاں، ابھی نو تن کور نے مجھے بتایا ہے۔ تم جاؤ، لوگوں میں مگھلو، دس بجے تک تم نے وہیں رہنا ہے، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے سمجھ آگئی ہے میں نے کیا کرتا ہے۔“

”کوئی کسی قسم کی مدد؟“ جہاں نے پوچھا

”ہوگی تو بتا دوں گا۔ یہ کفرم ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی انہی کے پاس ہے۔ اسے وہیں کہیں رکھا ہوا ہے۔ مل جائے گی۔ میں پھر فون کرتا ہوں۔“ بلد یوسنگھ نے کہا تو وہ بہت حد تک پرسکون ہو گیا۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ ہر پریت ابھی نکل نہیں تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ اب وہ مختلف لوگوں کے گھروں میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے ہر پریت کو سمجھا دی۔ لیکن اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس وقت کی آوارہ گردی کیوں ضروری ہے؟

وہ دونوں ہی مختلف گھروں میں جاتے رہے۔ ان کے پاس الوجیت کے لئے دوٹ ماکٹنا کا، ایک معقول بہانہ تھا۔ ہر جگہ سے یہی کہا گیا کہ وہ لوگ دوٹ انہی کو دیں گے۔ جہاں اور ہر پریت دونوں ہی سمجھ رہے تھے کہ ووٹر بڑا سیانا ہو گیا ہے۔ کوئی ایک فیصد لوگ ہی انکار کرتے ہیں، اور وہ لوگ نظریاتی قسم کے ہوتے ہیں جو بہت کم قسم کے ہوں۔ ورنہ کوئی بھی نہیں کہتا۔ جہاں نے وقت گزارنا تھا۔ وہ گزار لیا۔ دس بج گئے تھے۔ اسے بلد یوسنگھ کے فون کا انتظار تھا۔

اس وقت وہ ایک گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، جب بلد یو کا فون آگیا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس دوران وہ اس سے عام سی باتیں کرتا رہا۔ جیسے ہی وہ اکیلا ہوا تو بولا

”اب بتاؤ، کیا بتاؤ؟“

”تم نے کبھی کہانی سنی ہے کہ کسی جن کی کسی طوطے میں جان ہوتی ہے۔“

”ہاں سنی ہے؟“ اس نے سمجھتے ہوئے جواب دیا

”تو بس پھر، وہ طوطا ہمارے پاس ہے۔ صبح تک سارے معاملات حل ہو جائیں گے۔“ اس نے کہا

”اوکے، پھر صبح ہی دیکھیں گے۔“ جہاں نے جواب دیا تو بلد یوسنگھ نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہر پریت کے ساتھ واپس گھر آگیا۔

انہیں گھر آئے کچھ ہی وقت گزرا ہوگا۔ کہ اوگی پنڈ سے کچھ لوگ ان کے ہاں آ گئے۔ وہ لوگ ان کے ساتھ تھے، جن کی لڑکی اغوا ہوئی تھی اور ان کا بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ وہ سبھی پاپر لان میں بٹھا دیئے گئے۔ وہ ابھی بیٹھ ہی رہے تھے کہ جہاں کے ساتھ ہر پریت بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ سبھی ان میں سے ایک بزرگ نے بات کی۔

”جہاں پتر! ہم سب تیرے پاس آئے ہیں تاکہ تو ہماری مدد کرے۔ ہماری تو کوئی بھی بات نہیں سنتا۔“

”بزرگوں بتائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑے سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

”ہمیں اب تک یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ وہ لوگ کون تھے۔ کس نے کیا ہے سب۔ لیکن یہ کیسا ظلم ہے کہ

تھانیدار بھی ہماری کوئی بات نہیں سنتا ہے۔ اس نے ایک درخواست لکھ لی ہے اور ایف آئی آر کاٹ کر ہمارے

ہاتھ میں تھما دی ہے۔ دو دن ہو گئے، وہ ہمیں ملتا ہی نہیں ہے، چند بار فون کیا ہے، اب تو وہ گالیاں دینے لگا ہے

کہ فون کیوں کرتے ہو۔ کہاں جائیں، کس کے پاس فریاد کریں۔“ لڑکی کا باپ کہتے کہتے ہوئے رو دیا

”چلیں بات کرتے ہیں اس سے،“ جہاں نے کہا

”رب تمہارا بھلا کرے، اگر تمہاری وجہ سے ہمیں اپنی بیٹی مل جائے۔“ لڑکی کا باپ بولا

”اس کا فون نمبر دو، میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے۔“ جہاں نے کہا تو ایک نوجوان نے تھانیدار کا نمبر دے دیا۔ جہاں نے کال ملائی، تو کچھ دیر بعد اس نے فون رسپو کر لیا۔ جہاں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا

”جی، حکم،“ اس کے لہجے میں طنز آ گیا تھا۔

”وہ لڑکی، جو اغوا ہوئی اور اس کے بھائی کا قاتل بارے کچھ پتہ چلا؟ کوئی تفتیش میں پیش رفت، کوئی شک میں پکڑا؟“

”اُو کہاں کی تفتیش جی، آج کل تو آپ سیاست دانوں کے معاملات ہی نہیں سانس لینے دیتے، کبھی کسی کی سیکورٹی، کبھی کسی وی آئی پی کا استقبال، پروٹوکول، یہ ایکشن بھی تو بھگتتے ہیں۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا

”اور اگر وہ لڑکی قتل ہوگئی، تو کیا ہوگا؟ وہ کس کے ذمے ہوگی؟“ جہاں نے سنجیدہ لہجے میں کہا

”یہ تو جی، قتل کرنے والے جانیں، یا پھر آپ مجھے کے کسی بڑے سے کہیں، اب مجھے جو حکم ملتا ہے، میں تو وہی کروں گا نا۔“ اس نے پھر اسی انداز میں کہا

”یہ حکم آتے کہاں سے ہیں، جن کی وجہ سے بے چارے عوام کو انصاف نہیں ملتا؟“ وہ طنزیہ لہجے میں پوچھا

”میں نے بحث نہیں کرنی، مجھ سے تو جو ہو سکتا ہے کر رہا ہوں، دن رات عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔“ اس نے ہلکا سا تھقے لگاتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے، لیکن ان لوگوں کا قصور، انہیں کچھ نہ کچھ تو.....“ جہاں نے کہنا چاہا مگر وہ تیزی سے بات کا ٹٹا

ہوا بولا

”اوجی، اب میں کیا کروں، اندھی تفتیش ہے، کوئی سراپتہ وہ دیں تو میں اسے ابھی اٹھوا لیتا ہوں۔ پھر بعد میں آپ لوگوں نے ہی ان کی سفارش کرنی ہے کہ یہ بے گناہ ہیں، انہیں چھوڑ دیں۔“

”چلو، ٹھیک ہے، ہم بھی کوشش کرتے ہیں، آپ بھی کرو، جیسے ہی کوئی سراپتہ ملا، بتاتے ہیں۔“ جہاں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے فون جیب میں رکھا اور تھانیدار سے ہونے والی بات انہیں بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ ساری بات سن کے وہی بزرگ بولا

”سردار جی، یہ تو اس کی کچھ بھی نہ کرنے والی باتیں ہیں نا۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اب یہ تو بات کچی ہوگئی ہے کہ اس واردات میں کوئی ایسا بندہ ملوث ہے، جو اس تھانیدار پر بھی اپنا حکم چلا سکتا ہے۔“ اس بزرگ نے کہا تو جہاں نے اس لڑکی کے باپ سے پوچھا

”وہ جو لڑکا ہے، جس سے لڑکی کی بات چل رہی تھی، ان سے کوئی اختلاف ہوا، یا کوئی بات؟“

”ہماری تو ان سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، یہی جھنجھکی بات تھی، اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بس طے ہو رہی تھی بات۔“ باپ نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ غودر شہر میں جا کر بڑے آفیسر سے ملا جائے۔ کل صبح جانے کا فیصلہ ہوا۔ جہاں نے ان کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی اور انہیں یہ حوصلہ دیا کہ اب یہ ان کا مسئلہ

خوش قسمتی سے بچ گئے؟ باس میرے لئے ایک معمر بڑا چلا جا رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ خود مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا یا قسمت مجھ پر مہربان تھی؟ میں یہی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

یہ ساری باتیں ہمارے درمیان زیر بحث آچکی تھیں، لیکن کوئی سراپہ ہمیں مجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اشفاق چوہدری نے کہا

”یہ مجھے سمجھانے کی باتیں تو چلتی رہیں گیں، ان دونوں کا کیا کرتا ہے، میری بہت زیادہ توجہ ان کی طرف رہتی ہے۔“

”کیا تم نے ان کی کوئی ایسی سرگرمی دیکھی ہے یا معمول سے ہٹ کچھ ہوا ہے، جس کی وجہ سے تمہیں کوئی شک محسوس ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا

”ان دونوں کو کچھ اجنبیوں کے ساتھ ملتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ ایسے لوگ تھے، جو نہ تو اس علاقے کے ہیں اور نہ ہی دوبارہ دیکھے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے وہ باہر کے لوگ تھے۔“ اشفاق چوہدری نے تفصیل سے بتایا

”اس کے بعد انہوں نے کچھ کیا، کوئی مشکوک.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا

”نہیں، انہوں نے کچھ نہیں کیا، ان کا ایک اپنا معمول ہے اور وہ اس طرح اپنے دن گزار رہے ہیں۔ ثانی جب تھی، وہ سیکورٹی کی لگا میں کھینچے رکھتی تھی، علاقے میں کوئی پرندہ بھی سرمارتا تھا تو اس بارے بھی پوچھنا چھ کرتی تھی۔ وہ باخبر رہتی تھی۔ مجھے علاقے میں پھرنا پڑتا ہے۔ اس طرف زیادہ دھیان نہیں رکھ پاتا۔“

”تم چاہتے کیا ہو۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا؟“ میں نے اس کی بات سننا چاہی۔

”میں چاہتا ہوں کہ یہ خطرناک لوگ ہیں، دشمن پھر دشمن ہوتا ہے، اس کا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں چلنا کرو یا ان کے بارے میں جو فیصلہ ہے کرنا، وہ کرو، کیونکہ دو دن سے ان کے پاس ایک شخص آیا ہوا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ وہ کب آیا، کہاں سے آیا، اس بارے وہ مطمئن نہیں کر سکا۔ میں نے جب سے اس کو دیکھا ہے، وہ میرے دماغ کو کھٹک رہا ہے۔“ اس نے اپنا خیال واضح کر دیا۔

”تو ابھی چلو، ان کے پاس چلتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے یہی خیال آیا تھا کہ اس کا ایک ہی بیٹا اس سے دور تھا جو ممبئی میں رہتا تھا۔ اگر وہی ہے تو اسے ممبئی میں تلاش نہیں کرنا پڑا، وہ یہیں آ گیا ہے۔ میں اسے فوری طور پر ملنا چاہتا تھا۔ کبھی میں نے پلان کیا تھا کہ اسے ممبئی میں سے تلاش کیا جائے۔ اب وہ ویسے ہی یہیں آ گیا تھا۔

”چلو۔“ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔

”بائیٹا! اگر تم چاہو تو آرام کرو۔“ میں نے کہا تو وہ بنا کوئی بات کہنے اٹھ کر باہر چل دی۔ اسے میرا یوں کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ پورچ میں کھڑی کار کی پچھلی نشست پر جا بیٹھی تھی۔ اسے مزید کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ سو میں خاموش سے پنجرہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اشفاق چوہدری نے اسٹیرنگ سنبھالا اور چل دیا۔

ہم مسافر شاہ کے ٹھرنے کے پاس پہنچے تو اس کے ساتھ بنے ہوئی کڑوں میں گھپ اندھیرا تھا۔ کسی کمرے میں کوئی ذرا سی بھی روشنی نہیں تھا۔ اماؤس کی اس رات میں بس تارے چمک رہے تھے۔ ٹھرنے کے ارد گرد صرف وہی منظر دکھائی دے رہا تھا، جہاں ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ان کڑوں کے پاس کار جارکی۔ کار رکتے ہی ایک نوجوان جوگی کمرے سے باہر آیا۔ اسے شاید ہم دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس لئے پوری طرح سامنے آ گیا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا اور اونچی آواز میں کہا

نہیں اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہ لڑکی بازیاب کروانے میں پوری طرح ساتھ دے گا۔ اور جو انہوں نے قتل کیا ہے، اس کا حساب بھی لیں گے۔ وہ کافی حد تک مطمئن ہو کر چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ نوتن کور کا فون آ گیا۔ وہ اسی فون سے کال کر رہی تھی، جو ٹریس نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا۔

”لڑکی اسی گنجر سنگھ کی شہ پر اغوا ہوئی ہے، یہ معلوم ہو گیا ہے۔ اس کے قریبی دو بندے پکڑ لئے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی اٹھالی ہے۔“

”کیا، اس کی بیٹی۔ مطلب.....“ جہاں نے حیرت سے کہا تو نوتن کور بولی

”بلدیو سنگھ اس معاملے میں بڑا سخت ہے۔ وہ لڑکی بھی تو کسی کی بیٹی ہے، کیا کسی امیر اور طاقت ور کی بیٹی میں سرخاب کے پڑ گئے ہیں کہ وہ اغوا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بلدیو سنگھ نے تو اس لڑکی کو بتا دیا کہ تمہارے باپ کے گناہ کے بدلے اسے اغوا کیا گیا ہے۔“

”تو کیا بنا، گنجر کو پتہ چلا؟“ اس نے پوچھا

”بتا دیا اُسے اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑکی واپس گاؤں نہ پہنچی تو وہ اس لڑکی کو کہیں دور لے جائیں گے۔“ نوتن نے بتایا

”اغوا کرنے کی وجہ کیا تھی؟“

”وہی لڑکا، جن سے لڑکی والوں کی بات چل رہی تھی۔ اسے پکڑ لیا ہے، اسی نے بتایا۔ اب اصل بات کیا ہے، یہ ابھی پوری طرح پتہ نہیں چلا۔ تفصیل معلوم ہو جائے گی۔“ نوتن کور نے بتایا تو جہاں اندر سے کھول اٹھا۔

”یار میں آتا ہوں وہاں، دیکھی جائے گی، اسے تو میں سبق.....“

”سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ صبح تک انتظار کرو، پھر تم ہی اس سے سیدھے ہو جانا۔ یہ لوگ درمیان سے نکل جائیں گے۔“ نوتن نے کہا

”چلو دیکھتے ہیں۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ جہاں نے کہا

”تم آرام کرو، یہ دیکھ لیں گے سب۔“ نوتن کور نے اعتماد سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

جہاں کا دوران خون تیز ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں، بائٹا کور اور اشفاق چوہدری، بہت دیر تک اسی موضوع پر سوچتے رہے کہ باس یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ میں اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔ اور یہ دعویٰ کسی حد تک تسلیم بھی کیا جاسکتا تھا کہ اس نے دو بار مجھ پر حملہ کیا اور دونوں بار محض خوش قسمتی کے ساتھ رب کی رضا کے باعث بچ گیا تھا۔ پہلی بار ریسٹوران میں اس نے حملہ کروایا، اسے کیسے پتہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہاں مجھے ایک شک تھا کہ جو لوگ حملہ کرنے والے تھے، انہیں میرے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ مطلب انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی ٹریک پر چلتے ہوئے سیدھے ہمارے سر پر آن پہنچے۔

دوسری بار بھی ایسا ہوا تھا۔ میں نے ٹاؤن میں جو گھر لیا تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے لئے میں بہت راز داری برتی تھی لیکن اس نے وہاں بھی حملہ کر دیا۔

یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا، جب وہاں کوئی بھی نہیں تھا، کیا اس نے اسی تاک میں وہاں حملہ کیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا، صرف ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے، یا پھر اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہاں پر کوئی نہیں ہے، اور سب

”رام لعل کو بلاؤ۔“

وہ میری آواز سن کر چونکا اور پھر مجھے پہچان کر ٹھٹک گیا۔ پھر فوراً اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جوگی رام لعل باہر آ گیا اور سیدھا میری جانب بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا، میرے اور جوگی رال لعل کے درمیان بائیتا کور آگئی۔

”ہو گیا۔“ بائیتا کور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دور رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو وہ رُک گیا۔ اس نے اپنی چند حیاتی آنکھوں سے ہماری جانب دیکھا اور بولا

”مہاراج! اس سے، کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟“

”اونہیں رام لعل، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے بولا

”آئیں آجائیں اندر۔“ وہ اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو بائیتا کور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اشفاق چوہدری اس کے پیچھے بڑھا، پھر رام لعل اور میں اندر کمرے میں چلے گئے۔

اندر فرش پر دردی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر دیواروں کے ساتھ تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لگے بستر پر ایک سنجیدہ سا جوان بیٹھا ہوا تھا۔ جو مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ باقی دو بستر خالی تھے۔ میں ایک بستر پر بیٹھ گیا تو وہ جوان میری جانب بڑھ آیا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔

”یہ میرا بیٹا ہے جی سندر لعل۔ ممی میں رہتا ہے، مجھے ملنے کے لئے آیا ہوا ہے۔“

”یہی ہے وہ، جو ہر بارے اتھارٹی رکھتا ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ ذرا سا مسکرا دیا

”جی، یہی ہے۔“ رام لعل نے کہا

”یہاں کیسے آیا، قانونی طریقے سے یا غیر قانونی؟“

”قانونی لوگوں نے غیر قانونی طور پر بھیجا ہے۔“ رام لعل کی بجائے وہ بولا

”کیسے؟“ میں نے سکون سے پوچھا

”انہی لوگوں نے، جنہوں نے میرے باپ کو یہاں بھیجا ہوا ہے۔“

”تمہیں ہی کیوں بھیجا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا

”کچھ عرصہ سے یہاں کے بارے میں انہیں کوئی معلومات نہیں ملی۔ وہ مجھ تک پہنچے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں یہاں آؤں اور پتہ کروں کہ بات کیا ہے۔ کیونکہ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ باپ زندہ ہیں اور آزاد زندگی گزار رہے ہیں، لیکن وجہ کیا بنی کہ وہ جو معلومات درکار تھیں وہ نہیں مل رہی ہیں۔“ سندر لعل نے بڑے اعتماد سے کہا

”اب تم رام لعل کو لینے آئے ہو؟“ میں نے پوچھا

”یہ تو باپ کی مرضی ہے، یہ کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے جوگی کی طرف دیکھ کر کہا تو میں نے اس سے پوچھا

”ہاں بولو رام لعل، کیا چاہتے ہو؟“

”میں سچی اور دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں، اسی جگہ، میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ نہ واپس اپنے گاؤں مناسکر اور نہ کہیں دوسری جگہ۔ میرا پر یوار جاتا ہے تو جائے۔ میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی پورے دل سے۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی لچالت سے کہا

”اور وہ ملنگ، کیا بتا اس کا، نشہ چھوڑا کہ نہیں اس نے؟“ میں نے جان بوجھ اس کے بارے میں پوچھا

”بس ایک ہفتہ لگا اسے خود پر قابو پانے میں۔ اب ٹھیک ہے۔ روزانہ صبح تھڑے پر جھاڑو لگاتا ہے، اسی طرح شام کو بھی اپنی ڈیوٹی دیتا ہے جو آپ اس کے ذمے لگا گئے ہیں۔“ وہ اسی لہجے میں بولا، ہاتھ اس کے جڑے رہے۔

”دیکھو بھی رام لعل، مجھے یا میرے کسی بندے کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور اس دوران میرا سلوک بھی تم نے دیکھ لیا، تمہیں تنگ نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تم یہاں رہنا چاہتے ہو، اب پتہ نہیں تم رہ پاتے ہو یا نہیں۔ یہ الگ بحث ہے، لیکن اگر تم واپس جاتے ہو تو وہ لوگ ساری زندگی تمہیں مشکوک سمجھتے رہیں گے۔ وہ تم پر یقین نہیں کریں گے، کیا کہتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا

”یہ تو ہے، وہ مجھے مشکوک ہی سمجھیں گے۔“ جوگی نے جواب دیا تو سندر لعل نے تیزی سے بولا

”نہیں باپو جی، میں ان سے بات کر کے آیا ہوں، وہ بھی جانتے ہیں کہ آپ مجبوری میں کہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تو کوئی بھی کہانی انہیں سنا دی جاسکتی ہے۔ میں تب سے یہی پوچھ رہا ہوں، اور ابھی یہ مہاراج آ بھی گئے ہیں، ان کے سامنے بھی پوچھتا ہوں کہ یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں؟“

”دیکھ بیٹا! میں ساری زندگی اس دشت کی سیاحی میں رہا ہوں، صحرا کی خاک چھانی ہے، ہر طرح کے بندے سے ملا ہوں، لیکن جو شانتی یہاں ہے، مجھے کہیں سے نہیں ملی۔ یہاں کہیں زیادہ گیان ہے، جو میں نے نہیں دیکھا، پر نہیں عمر کتنی ہے۔ تم آگئے ہو، اپنے سارے پر یوار کو لے جاؤ۔ میں شانتی سے یہاں مرنا چاہتا ہوں۔“ رام لعل نے کھڑے ہوئے لہجے میں کہا

”اس بار تو چلو، پھر چاہے ادھر آ جانا۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے۔“ اس کے بیٹے نے کہا تب میں نے پوچھا

”جن لوگوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے، کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ تم یہاں پکڑے جاسکتے ہو؟“

”مجھے یہ کہانی سنانے کو کہی گئی ہے کہ میں اندرون سندھ سے یہاں آیا ہوں۔ وہی جو کہانی باپو سناتے ہیں۔ یہ تو باپو جی نے مجھے یہاں کے بارے میں بتا دیا ورنہ تو میں یہی کہانی سنانے والا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آپ سے بات کروں کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔“

”ظاہر ہے اب اگر تم رام لعل کو نہ لے کر گئے تو تم بھی ممی میں چین سے نہیں رہ پاؤ گے۔ ٹھیک ہے لے جاؤ اپنے باپ کو، اور اس ملنگ کو بھی۔ اور انہیں یہ باور کرا دینا کہ اب کوئی بندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔“ میں نے ایک دم سے فیصلہ سنا دیا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔

”بہت دھن دھن واد مہاراج۔“ سندر لعل نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو رام لعل کا چہرہ مرجھا گیا تب میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”کوئی بات نہیں، میں تمہیں مناسکر سے واپس منگوا لوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔“

”سچی مہاراج۔“ وہ ایک دم سے کھل گیا۔

”ابھی جاؤ گے یا.....“ میں نے جان بوجھ کراہنا فخرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”جی ابھی، آج رات ہی، یہاں بھی بندے ہیں، جن کی نگاہ مجھ پر ہے، آپ یہاں ہوئے اور.....“ اس نے بھی اپنی بات روک کر کہا تو میں ساری بات سمجھ گیا۔

”اس کا مطلب ہے یہاں پر کام ہو رہا ہے؟“ میں نے تلخی سے کہا

”جاتے سے سب کے بارے میں بتا جاؤں گا اور ایک تحفہ بھی دے جاؤں گا۔“ وہ خوشی سے بولا

”تھو، وہ کیا؟“ میں نے پوچھا

”میں بنیادی طور پر ایک کیسٹ ہوں، میں نے زہر پر بہت تجربات کئے ہیں۔ جس طرح قدرتی شہد کے اپنے اثرات ہوتے ہیں اور ان جیسے اثرات انسانی کوشش پیدا نہیں کر سکتی، اسی طرح سانپ کے منہ میں بنا ہوا زہر بھی اپنی خاصیت رکھتا ہے۔ اس طرح کے خواص کیمیکل سے نہیں بنائے جاسکتے۔ اگر کسی شے میں مہلک اثرات ہیں تو اسی میں زندگی بخش اثرات بھی ہیں۔ ضرورت صرف تلاش کرنے کی ہے۔ سانپ کے زہر کے انسانی بدن پر جو اثرات ہو سکتے ہیں، میں نے ان پر بہت کام کیا ہے۔ اب تک میرے دو تجربے بہت کامیاب ہوئے ہیں۔“ اس نے بتایا

”کون سے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

”میں نے ایک دوا ایسی تیار کی ہے، جو کسی انسان کو ایک خاص مقدار میں دی جائے تو اس کی سوچوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ کسی دور میں حشیش سے کام لیا جاتا تھا، وہ سب وقتی نشے ہیں، لیکن یہ ایسا ہے کہ چند دن تک ایک خاص مقدار بدن میں اتار دی جائے تو انسان کی سوچوں کو تبدیل کر دیا جائے۔ تب اس سے جو چاہے نتیجے لے سکتے ہیں اور یہ وقتی نہیں ہوتا۔“ اس نے تفصیل سے کہا

”اس کے اثر کو ختم کرنے کے لئے۔“ میں نے پوچھا

”اس کا توڑ ہے، لیکن میں یہی بتاتا ہوں کہ اس دوا کا اثر ختم نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ انہی لوگوں کو دی جاتی ہے، جنہیں صرف مرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ دوا عام استعمال میں نہیں لائی جاتی اور ایک خاص اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ میں اگر توڑ دے دوں، تب میری اہمیت تو ختم ہو گئی نا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

مجھے وہ بہت ہی تیز اور سمجھدار لگا تھا۔ اپنا بچاؤ پہلے سوچ کر رکھنے والا اکثر کامیاب ٹھہرتا ہے۔

”اور دوسرا؟“ میں نے پوچھا

”وہ تو عام سا ہے، وہ میں آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ چونکہ بہت تیز خوشبو لگانے کے عادی ہیں، اس لئے میں وہ آپ کو بتا رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں چونک گیا، کیا اسے بھی یہ بہت بری لگ رہی ہے؟ لیکن میں خاموش رہا تا کہ اس کی بات سن سکوں، وہ کہہ رہا تھا، ”باجھنگ ٹب میں فقط ایک قطرہ ڈال دیا جائے، اس میں نہائیں، آپ کے بدن سے ایسی بھنی بھنی خوشبو پھوٹنے لگے گی کہ دوسری صنف مدہوش ہو جائے گی۔ یہ چھوٹا سا چٹکارا میں نے پیسے بنانے کے لئے کیا ہوا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا

”کیا یہ چیزیں تم ساتھ میں اٹھائے پھر رہے ہو؟“ بائیکا کورنے پہلی بار بات کی

”بھیس جو بدل کر آتا تھا یہاں اور بھی بہت کچھ ہے جوگی کی پوٹلی میں۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

”پہلی والی کا تو ٹھیک ہے، دوسری والی کا کوئی سائیڈ مل افیکٹ؟“ میں نے پوچھا

”کوئی نہیں، یہ میرے امیر ترین کلائنٹس کے لئے ہے، لوگ ان سے پوچھتے ہیں یہ پرفوم دنیا کے کس مقام سے ملتا ہے، مگر وہ نہیں بتاتے۔“ اس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی

”اس کا تجربہ کروانے کے لئے تمہیں ایک دن رکتا پڑے گا۔“ میں نے اسے کہا تو وہ بولا

”جیسے آپ کی مرضی، میں ایک ہفتہ بھی رک جاؤں گا، پہلے دوا کا تجربہ کر لیں۔“

”ٹھیک ہے، تم ابھی رہو یہاں پر، بلکہ پورا پر یوار رہے، صبح سے تجربات کریں گے اور دوسری اگر کوئی چیز ہوئی تو اس پر بھی بات ہو جائے گی۔“ میں نے کہا

”اور اگر تمہاری باتیں غلط اور تمہارے دعوے جھوٹے ہیں تو ابھی راتوں رات نکل جانا، یہ نہ ہو کہ صبح میرا ارادہ بدل جائے۔“ بائیکا کور نے کہا تو اس پر سندر لعل کیسٹ نے گھوم کر اسے دیکھا، پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے سر کو ہلانے لگا تھا۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اٹھ گیا۔ میں ملنگ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے پوچھا

”اب کیسے ہو؟“

”آپ نے ڈیوٹی لگا دی، جو مزہ اس ڈیوٹی میں شاید ہی کسی اور شے میں ہو۔“ وہ تشکر بھرے لہجے میں بولا

”چلو باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ میں نے کہا تو کار میں جا بیٹھا۔ اتنے میں وہی سندر لعل تیزی سے میری طرف آیا۔ اس نے ایک کاغذ میری جانب بڑھا کر کہا

”یہ میں نے وہ دوسری دوا کا پورا فارمولا لکھ دیا ہے۔ یہ کسی بھی ماہر کیسٹ کو دیکھا دیں، وہ یہ دوا تیار کر دے گا۔ اس سے یہ بھی پوچھ لیں کہ انسانی بدن پر اس کے کیا اثرات ہوں گے اور یہ دوا، اس کا تجزیہ کر والیں۔“

میں نے کاغذ کا وہ پرچہ اور دوا پکڑ لی۔ مجھے لگا کہ بائیکا کور کی بات اسے کھانگی تھی۔ یہ ایک فطری سی بات ہے، کسی کی ذات اور کام کو جب نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا رد عمل ضرور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سندر لعل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ورنہ اس کی موت اس کے سامنے تھی۔ اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کو ختم کر کے ہمیں مار دینا چاہتا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔

حویلی واپس ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ راستے میں اشفاق چوہدری یہی کہتا رہا کہ انہیں جس قدر جلدی ہو سکے یہاں سے روانہ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ ہم بھی اس کی وجہ سے لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ میں بیڈ پر آن لیٹا۔ تبھی مجھے خیال آیا، میں نے اپنے دوست کو فون کیا اور حالات پوچھے۔ اس نے کہا

”وہاں کوئی بندہ نہیں آیا، جسے مشکوک کہا جاسکے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ بائیکا کور میرے ساتھ بیڈ پر تھی وہ بھی لیٹنے ہی سو گئی۔ رات کافی ہو گئی تھی۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو سورج مشرقی افق سے نہیں نکلتا تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لیتا ہوا حویلی کی چھت پر جانے لگا تو حویلی ہی کے ایک ملازم نے مجھے کہا

”باہر ایک جوگی آیا کھڑا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے، سندر لعل نام بتایا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”میں نے لان میں بٹھایا ہے۔“ اس نے جواب دیا

”اچھا، میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ پلٹ گیا۔ میں تھوڑی دیر کا ریڈور میں ٹھہتا رہا پھر نیچے چلا گیا۔ وہ لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیسے آئے صبح، خیریت؟ میں نے پوچھا

”جی، رات وہ آپ کی سیکورٹی گارڈ نے جو بات کہی وہ مجھے بہت کھلی ہے۔ میں صرف اس لئے آیا ہوں کہ خود اپنے سامنے تجربہ کر داسکوں۔ اگر کچھ ہو تو مجھے وہ فوراً شوٹ کر دے۔“ اس کے لہجے میں دکھ سے زیادہ اٹکا بول رہی تھی۔

”وہ میری دوست ہے یا۔ تم اس کی بات کا برا نہ مناؤ۔ اس نے جو کہا.....“ میں نے کہا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے

”آپ نے جو میرے باپ پر دیتا کی ہے، میں اس کا احسان بھی نہیں دے سکتا۔ آپ چاہتے تو انہیں قتل کر سکتے تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، وہ آپ کے دشمن تھے۔ میں یہ ثابت کر کے جانا چاہتا ہوں کہ میں دشمنی نہیں کر رہا، میں یہاں سے جاؤں گا تو آپ کا احسان مند ہو کر۔ اور جب یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ میرے احسان مند ہوں گے۔ میں آئندہ بھی دوست ہی ثابت ہوں گا۔ آپ نہیں اس سے، میں ہوں ادھر۔“ اس نے ضدی سے لہجہ میں کہا تو میں اس کی ذہنی حالت کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ وہاں کا مانا ہوا کیسٹ اپنے باپ کو بچانے اور ’را‘ کے کہنے پر یہاں آیا تھا۔ اپنی اتار پر ہلکی سی ضرب بھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔

”اچھا، ٹھیک ہے، آؤ اندر بیٹھتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ کر میرے ساتھ اندر آ گیا۔ باغیچہ کو مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس کے سامنے ایک قطرہ ٹب میں ڈالا تو خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ وہ باہر انتظار کرنے لگا۔ میں خوب نہایا۔ یہاں تک کہ میں پرسکون ہو گیا۔ وہ جو تیز خوشبو، میرے ساتھ چٹنی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی۔ ایک بھینی بھینی خوشبو نے مجھے حصار میں لے لیا۔ جو بہر حال مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

”واقعی مست کر دینے والی خوشبو ہے۔“ باغیچہ کو نے غماز آلود آواز میں کہا تو سند رعل ایک دم سے خوش ہو گیا۔ میں نے ناشہ لگوانے کا کہہ دیا۔

ناشتے کے دوران وہ بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ جن میں سے کچھ کی مجھے سمجھ آئی اور کچھ کی نہیں۔ جس وقت وہ جانے لگا تو اس نے دو چھوٹی چھوٹی بوتلیں میری جانب بڑھائیں۔ وہ دو مختلف رنگ کی تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ آپ بعد میں سکون سے بیٹھ کر سمجھیں۔ میں نے اس کے ساتھ سب کچھ لکھ کر اس لفافے میں ڈال دیا ہے۔ اب مجھے آگیا دیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چلا گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ جب میں باغیچہ کو حویلی سے نکل پڑے۔ اشفاق چوہدری نے وہاں کے ایک ایک معاملے کے بارے میں مجھے بتایا۔ ایکشن کے لئے ماحول تیار ہو رہا تھا۔ علاقے میں سیاسی پارٹیوں کا رندے اپنے اپنے طور پر سرگرم تھے۔ ہم نے ہر موضوع پر بہت دیر تک بات کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اشفاق چوہدری کے پاس ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ اس کی تان یہیں پر آ کر ٹوٹی کہ انہیں یہاں سے بھیج دیا جائے۔ کیونکہ اگر کسی بھی ادارے کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں اور انہیں یہاں ہم نے رکھا ہے تو خواہ مخواہ کی مصیبت آ جائے گی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ اور کچھ دیر بعد مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف چل دیئے تھے۔ تاکہ ان کے پاس جا کر انہیں وہاں سے چلے جانے کا کہہ دیا جائے۔ ابھی تک میرے بدن سے جو بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی، اس نے مجھے مدہوش سا کر دیا تھا۔

اشفاق چوہدری دوسری کار میں تھا۔ اس کے ساتھ دو لوگ تھے۔ ہم وہاں جا کر رہے تو دیکھا، جوگی رام رعل، سند رعل اور ملنگ باہر ہی زمین پر گدڑی بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور کچھ دیر باتوں کے بعد انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا

”دیکھیں! میں یہاں نہیں رہا اور نہ ہی مجھے رہنا ہے لیکن آپ لوگوں کے باعث ہمارے دوست کو پریشانی

ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ ہم آج ہی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ آپ سے رابطہ رہے گا۔“

جوگی رام رعل نے کہا تو میں نے اسے سمجھایا

”ہمیں آپ لوگوں کے بارے بالکل پتہ نہیں ہے کہ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو، یہاں کس لئے تھے۔ ہم نے آپ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک صرف اس لئے کیا کہ آپ فقیر لوگ ہیں۔ یہی بیان ہر جگہ دینا، ہم آپ کو یہاں سے اب بھی نہیں جانے دینا چاہتے تھے کہ آپ لوگ خود یہاں سے چلے گئے۔“

”جی میں سمجھ گیا مجھے کیا کرنا ہے۔“ اس نے کہا تو میں وہاں سے اٹھ گیا۔ پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ اشفاق چوہدری ہمیں نورنگر سے بہت دور تک چھوڑنے آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ جہاں اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا، یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اب تک بلدیو سنگھ کا فون نہیں آیا اور نہ ہی فون کو رنے اطلاع دی۔ وہ یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ انہوں نے مجھے بائندھ کر رکھ دیا ہے۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اب تک بہت کچھ کر چکا ہوتا۔ اسے خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی اس نے فون کو روکال کر دی۔ اس کی آواز سنتے ہی بولا

”اب تک کیا.....؟“

”گنبد رنگھ سے بات چل رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی دے دی جائے اور وہ لڑکی لے لی جائے۔“

”اور جو اس کا بھائی قتل ہو گیا، وہ کس کھاتے میں جائے گا، ان کی جو گاؤں میں بے عزتی ہوئی، وہ کدھر جائے گی۔ نہیں کوئی ایسا.....“ جہاں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو فون نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”تم سنو گے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کور کی اور پھر کہتی چلی گئی۔ ”بلدیو سنگھ بالکل نہیں مان رہا ہے۔ وہ اسی بات پڑا ہوا ہے کہ لڑکی کو لو اور سیدھے تھانے چلے جاؤ، وہاں جا کر اپنے جرائم کا اعتراف کرو، جیسے ہی تم یہ کر دو گے، لڑکی گھر بھیج دی جائے گی۔ اگر پھر بھی نہیں مانے تو وہ لڑکی لینے خود اس کے ہاں آ رہے ہیں۔ جتنی سیکورٹی لگانی ہے لگا لے۔“

”تو پھر میری ضرورت ہوگی، میں آ رہا ہوں۔“ جہاں نے تیزی سے کہا

”لڑکی، ہم نے بازیاں کر لی ہے۔ وہ بھی ہمارے پاس ہے۔“ اس نے بتایا تو جہاں بولا

”پھر وہ لڑکی کیسے لائے گا۔ یہ عجیب بات کی؟“

”دراصل اس نے لڑکی جہاں رکھی ہوئی تھی، وہیں پران کے بندے قابو کئے ہوئے ہیں۔ اسے یہی پتہ ہے کہ لڑکی اس کے قبضے میں ہے۔ گنبد راب تک اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ معاملہ کچھ دوسرا ہے، وہ میں صبح آ کر بتاتی ہوں۔ وہ لڑکی نہ لائے تو اچھا ہے، اس کی بیٹی بھی تو ہمارے پاس ہے۔ بلدیو سنگھ صرف اس سے قتل کا اعتراف کرنا چاہتا ہے۔“ فون کو نے کہا

”اوکے، لڑکی مل گئی۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب مجھے کچھ سکون ہوا ہے۔ اب میں سونے لگا ہوں، صبح ہی ملاقات ہوگی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر وہ یہی معاملہ سوچتا رہا، پھر اس کی آنکھ کھلی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی سے فریش ہو کر تیار ہوا اور نیچے ڈرائنگ روم میں آ

”یہ آپ جیسے عوامی نمائندوں کو ہر جگہ اپنے نمبر بنانے کی کیوں پڑی رہتی ہے۔ کہا نا دیکھتے ہیں، تو دیکھتے ہیں۔ اب تم لوگ جاؤ۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو لڑکی کا باپ پہلے ہی اٹھ گیا۔ بلیمہ سنگھ بچہ اٹھا اور پھر جہاں اٹھ گیا۔ اسے اسی پی کی سردمہری بہت بری لگی تھی۔ وہ باہر آ گئے۔

”جیسا سانسے کافی ساری کاریں آ کر رکیں۔ اس میں سے کئی سارے لوگ باہر آئے۔ ان کے درمیان ایک لمبے قد کا آدمی نمایاں تھا۔ جہاں کو اس کا چہرہ کافی حد تک جانا پہچانا لگا تھا۔ وہ ایک جتنے کی صورت میں آئے۔ ان کے آگے ایک بندہ سانسے کھڑے لوگوں کی جانب بڑھا اور ان سے پوچھا ”یہ ادگی سے کون لوگ یہاں آئے ہیں؟“

”ہم ہیں۔“ ایک شخص نے جواب دیا تو وہی شخص بولا ”سردار گنبد رنگہ جی آئے ہیں۔ انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ وہاں سے آئے ہو یہاں، تو یہ تم لوگوں کی سہاتا (ہمدردی) میں آ گئے ہیں۔“

اتنی دیر تک وہ ان کے قریب آ گئے۔ سردار دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے ان کے قریب آ گیا اور آتے ہی زور دار انداز میں فتح بلائی

”ست سری اکال۔“ لوگوں نے اس کی فتح کا جواب دیا۔ تو وہ بولا، ”مجھے بہت دکھ ہوا ہے، میں نے ساری جانکاری لے لی ہے۔ اور آؤ کرتے ہیں اے سی پی سے ذرا بات۔“ اس نے سب کو لے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو لوگوں نے جہاں کی طرف دیکھا۔ تب بلیمہ سنگھ بولا

”ہم ان کے پاس سے ہو آئے ہیں۔“

”کیا کہتا ہے وہ؟“ اس نے پوچھا

”وہی دلاسہ دیا کہ کرتے ہیں کچھ؟“ بلیمہ سنگھ نے جواب دیا تو بہت دھونس سے بولا

”میں کرتا ہوں بات۔“ یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ جہاں نے سردے لہجے میں کہا ”گنبد رنگہ! اسے سی پی کو یہاں بلاؤ۔“

اس کا بولنا گنبد رہی کو نہیں وہاں ہر بندے نے محسوس کیا۔ تبھی اس نے چونک کر پوچھا

”کون ہو تم؟“

”جو کہا ہے وہ کرو۔“

جہاں نے اسی لہجے میں کہا تو ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا پھر بولا

”ہم اندر جا کر بات کرتے ہیں۔ آؤ تم بھی آؤ؟“ اس نے کہا تو جہاں نے ضدی لہجے میں کہا

”اسے یہاں بلاؤ۔“

”اے تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ سردار جی کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کے ایک مصاحب نے تیزی سے کہا تو جہاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دور جانے کو کہا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر پیچھے ہٹ گیا۔ تب وہ گنبد رنگہ کے پاس آیا اور دھیمی سی آواز میں کہا

”تم وہی کرو، جس کے کرنے کے لئے تمہیں بھیجا گیا ہے۔ اب میں آ گیا ہوں یہاں، تمہاری بیٹی بھی بچ جائے گی۔ جہاں سنگھ ہے میرا نام۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ گنبد رنگہ نے متحوش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پھر اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا

گیا۔ اسے ہر پریت تیار ملی۔ دونوں نے ناشتہ کیا اور تو وہ نکودر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جہاں لاشوری طور پر نون کور کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی تک وہاں نہ پہنچ پائی تھی۔ ہر پریت کو الوداع کہہ کر اس نے پورچ میں جا کر فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے نون کور سے پوچھا

”ابھی تک پہنچی کیوں نہیں ہو؟“

”بس یہاں معاملہ قریب ترین پہنچنے والا ہے۔“ اس نے تیزی سے بتایا

”مگر مجھے تو یہاں کے لوگوں کے ساتھ اے سی پی کے پاس آنا ہے۔ اور میں آ رہا ہوں۔“ وہ بولا

”لوگوں کے ساتھ ہی آ رہے ہونا تو آ جاؤ، یہ تو بہت اچھا ہے۔ یہی تو انتظار ہے۔ باقی باتیں یہاں آؤ گے تو ہو جائیں گیں۔“ نون نے کہا

”اوکے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر اس نے سردار بلیمہ سنگھ بچہ کو اپنے ساتھ لیا اور پچاس گھنٹہ گمراہ کیا۔ وہاں نکودر کے لئے جانے والے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ انہیں لیتے ہوئے نکودر کے لئے چل پڑے۔

پنجاب کا یہ المیہ ایک ثقافت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ انصاف کے لئے بھی ان لوگوں کو ”بڑے لوگوں“ کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ عوام ان بیوروکریٹس کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جو کہنے کو عوام کے خادم ہیں۔ اور یہی عوام کے خادم خواص کی خدمت میں دن رات صرف کر کے عوام ہی کو محکوم بنائے ہوئے ہیں۔ یہ صرف اور صرف تعلیم کی کمی کے باعث ہے۔ جو انہیں یہ شعور ہی نہیں دیتی کہ وہ ایک ہو جائیں اور ان خواص اور بیوروکریٹس کو اپنا خادم بنالیں۔ اس طرح قافلے بنانا انصاف کی بھیک مانگنے نہ جانا پڑے۔

وہ نکودر شہر میں اے سی پی آفس کے سامنے جا کر کے۔ جہاں کا دماغ اس وقت بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ پرسکون تھا۔ اسے ان مراحل سے بھی الجھن نہیں ہوئی، جو اس عوام کے خادم تک پہنچنے کے رکاوٹوں کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ تین لوگوں کا اذن باریابی ملا کہ وہ اندر آ کر بات کریں۔ جہاں، بلیمہ سنگھ اور لڑکی کا باپ اندر چلے گئے۔ اے سی پی اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے تینوں کو دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو بلیمہ سنگھ نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اور ادگی کے تھانیدار کے بارے میں بتا دیا کہ وہ تعاون کرنے کی بجائے بہانے بنا رہا ہے۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا

”میں دیکھتا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں بلواتا ہوں اس تھانیدار کو۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کور کا اور پھر بولا، ”اور کوئی حکم ہے میرے لئے۔“

ان آخری لفظوں کے کہنے کا مطلب اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا کہ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ تبھی جہاں نے سکون سے پوچھا

”یہ آپ کا دیکھنا، کتنے دنوں تک چلے گا؟“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اے سی پی نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اس کی بدتمیزی پر اسے غصہ آ گیا ہو۔ پھر بھی اس نے نرم لہجے میں کہا ”کیا کہہ سکتے ہیں، ہمارے پاس کوئی ایسا چسکار تو ہے نہیں کہ ایک دم سے ڈھونڈ نکالیں۔ کرتے ہیں اس پر کام۔ آپ دھیرج رکھیں۔“

”دیکھیں، یہ ہمارے علاقے کے لوگ ہیں۔ ان کا مسئلہ دنوں میں نہیں گھنٹوں میں ہونا چاہئے۔“ جہاں نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا

”چلیں۔“ بلہہ سنگھ نے پوچھا تو جہاں نے اے سی پی کی طرف دیکھ کر کہا
 ”ہاں، اب کچھ اور ہی کرنا ہوگا۔ یہاں کے لوگ بھی کر پٹ نکلے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی کو کس نے اغوا
 کرایا ہے۔ چلو۔“ یہ کہہ کر جہاں جانے لگا تو اے سی پی نے پریس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا
 ”اؤ لو جوان! رو، یوں بیان دے کر نہیں جاسکتے ہو، بتاؤ کون ہے وہ؟ رو۔“

”تم مجھے روک بھی نہیں سکتے ہو۔“ جہاں نے کہا
 ”میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔“ اے سی پی نے کہا
 ”تم مجھے گرفتار بھی نہیں کر سکتے، کیوں گنبد رستگہ بولتے کیوں نہیں ہو؟“ وہ غصے سے بولا تو سبھی گنبد رستگہ
 کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ ابھی گرفتاری دینے لگا
 ہو۔ وہاں کھڑا ہر بندہ حیران تھا کہ گنبد رستگہ جیسا شخص اس کے سامنے خاموش کیوں ہے؟ کافی دیر تک جب کوئی
 نہیں بولا تو گنبد رستگہ آگے بڑھا اور اس نے اے سی پی سے کہا

”جہاں ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ اغوا اور قتل میرے ایک بندے سے ہوا۔ میں اسے آج ہی پیش کر دیتا ہوں۔“
 یہ کہنا ہی تھا کہ وہاں موجود ہر بندہ چونک گیا۔ پریس نے جلدی سے تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ ایک ہلچل
 سی مچ گئی۔ اے سی پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”لڑکی لاؤ کہاں ہے؟“ اس بار بلہہ سنگھ پتھ نے تیزی سے کہا
 ”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں پیش کر دوں گا۔“ اس نے کہا تو جہاں نے اے سی پی سے کہا
 ”اب اگر تم نے کچھ نہ کیا تو تیرے لئے بہت برا ہوگا۔ میں تمہیں صرف دو گھنٹے دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور
 اپنے لوگوں کو چلنے کا اشارہ کر کے کار کی جانب بڑھا تو اے سی پی نے کہا
 ”زکو جہاں،“ یہ کہہ کر وہ گنبد رستگہ کی طرف دیکھ کر بولا، ”آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”ہاں۔! مجھے پتہ ہے۔ آپ مجھے گرفتار کرو۔ وہ بندہ بھی یہیں ہے، وہ بھی گرفتاری دے گا۔“ اس نے کہا تو
 پیچھے سے ایک شخص آگے آ گیا۔

اسی وقت ارد گرد کھڑے پولیس والوں نے اسے جھکڑی لگا دی۔ یہ سب کچھ پریس کے سامنے ہوا۔
 تصویریں بن گئیں۔ ایسے میں گنبد رستگہ کا فون بج اٹھا۔ اس کا ایک مصاحب آگے بڑھا اور فون اسے دے دیا۔
 ایسے میں جہاں کا بھی فون بج اٹھا۔ فون کور نے بتایا کہ اس وقت لڑکی گنبد رستگہ کی ہی اک فیکٹری میں موجود
 ہے۔ پولیس سے کہا جائے کہ وہ اسے وہاں سے بازیاب کرے۔ پورے پریس کے ساتھ۔ جہاں نے یہی
 بات اے سی پی سے کہی تو پریس سن رہا تھا۔ وہ سب لوگ اس جانب بھاگے۔ پولیس کو بھی وہاں جانا پڑا۔ جہاں
 بھی وہاں جا پہنچا۔ سبھی ہوئی لڑکی کو وہاں سے بازیاب کرایا گیا۔ وہیں سے جس وقت سب واپس نکودر تھانے آ
 ئے تب لڑکی کا بیان لکھا گیا۔ جس وقت وہ اوگی واپس آ رہے تھے، اس وقت فون نے بتایا کہ گنبد رستگہ کی بیٹی کو
 چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔

راستے میں لڑکی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی بات چل رہی تھی۔ اس نے ملنے کو کہا۔ اس نے انکار کر
 دیا۔ جس پر اس لڑکے نے ضد بنائی کہ وہ اسے اٹھالے گا۔ وہ لڑکا گنبد رستگہ کے پاس کام کرتا تھا اور اسی
 دھندے میں ملوث تھا۔ دراصل وہ لڑکیوں کو آگے سہل کرتے تھے۔ یہی اس کا بڑا دھندہ تھا۔ اس نے اپنے
 ساتھیوں سے اور اپنے پاس سے بات کی۔ اس نے لڑکی اٹھانے کو کہہ دیا کہ چند دن اسے اپنے پاس رکھنا، پھر

”اس اے سی پی کو ادھر ہی بلاؤ، سب کے سامنے بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے جہاں کا ہاتھ تھاما اور ایک
 جانب لے جا کر بولا، ”تم کیا جانتے ہو کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔“

”اگر میں تمہاری بیٹی بارے جان سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں جانتا کہ تمہیں یہاں کیا کرنے بھیجا گیا ہے؟“
 ”وہ سب غلط فہمی میں ہو گیا۔ اب میں طریقے سے کسی سب ٹھیک کر رہا ہوں۔ میں نے انکیشن.....“ اس نے
 کہنا چاہا تو جہاں بولا

”اونٹیں، جو کہا گیا ہے وہی کرو۔“ یہ کہہ کر جہاں وہاں سے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی اندر گیا ہوا تھا کہ اس
 دوران پریس کی کئی گاڑیاں وہاں آن رکیں۔ گنبد رستگہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا
 کہ جیسے یہاں سہتا کرتے کرتے وہ خود بھنس گیا ہے۔ تبھی اے سی پی باہر آ گیا۔ ان سب کو دیکھ کر بولا
 ”جی سردار جی آپ، یہاں کیسے؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، جہاں نے انتہائی غصے میں کہا
 ”اصل میں تم جیسے کر پٹ بیورو کریٹس نے ان عوامی نمائندوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ تم لوگ خوشامد کرنے کا
 کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اتنے لوگ آئے، مگر تم نے ان کی ایک نہیں سنی اور محض دلا سہ دے کر
 انہیں اس آفس سے نکال باہر کیا، جو اسی عوام کے پیسے سے بنا ہے اور اس کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس
 گنبد رستگہ نے بھی وہی کہنا ہے جو ہم تمہیں کہہ کر آئے ہیں۔ اب تم باہر کیا سننے آئے ہو؟“
 اے سی پی نے باہر کھڑے تمام لوگوں کی طرف دیکھا، اس نے اپنی بے عزتی قطعاً محسوس نہ کی اور جہاں کو
 نظر انداز کرتے ہوئے گنبد رستگہ کی طرف دیکھ کر سکون سے بولا
 ”آئیں اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

اس پر گنبد رستگہ نے جہاں کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے اپنی بات منوانا چاہتا تھا، جس طرح وہ سوچ
 کر آیا تھا۔ جب جہاں نے ذرا سا بھی ریسپانس نہیں دیا تو وہ بڑھ کر جہاں کے پاس آیا اور منت بھرے لہجے میں بولا
 ”تم اگر چاہو تو ہم ابھی سکون سے کوئی معاملہ طے کر لیتے ہیں۔“

”لڑکی تو واپس کرنی ہے وہ بات تو ہوگی۔ میں صرف اس شرط پر تم سے سارا معاملہ طے کر لیتا ہوں۔“ جہاں
 نے کہا تو وہ تیزی سے بولا
 ”کہو، کیا کہتے ہو؟“

”اس کے بیٹے کو تو تم واپس نہیں کر سکتے ہو، ہاں اس کے بدلے اپنی بیٹی دے دو۔“ جہاں نے سکون سے کہا
 تو گنبد رستگہ کا چہرہ یک بارگی سرخ ہو گیا جیسے کسی اسے گالی دے دی ہو۔

”جہاں! میں اگر سکون سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی کمزور ہوں۔ میں معاملے
 کو حل کرنا چاہتا ہوں، وہ کرلو۔“ اس نے غصے میں کہا

”تو پھر کیا کرو گے؟“ جہاں نے طعنے لہجے میں کہا
 ”میں، تم سب کو دیکھ لوں ابھی اور اسی وقت؟“ اس نے غصے میں کہا تو اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی۔ جو
 وہاں کھڑے لوگوں اور پریس تک جا پہنچی۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اب تمہیں ختم ہونا ہے۔“ جہاں نے کہا اور اس کی کوئی بات سننے بغیر بلہہ سنگھ
 کے پاس آ گیا۔

وہ اس لڑکی کی آگے بات نہیں کر پائے۔ لڑکا اسے رام کرتا رہا، لیکن جس کا بھائی اس کے لئے قتل ہو چکا ہو، اسے کہاں ہوش تھا۔ وہ تو اپنے بھائی کے قاتلوں کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ گجدر اور اس کے لوگ لڑکی کا قتل بھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس کی بیٹی اغوا ہو گئی۔ گجدر کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا سر بھرا بھی ہوگا جو اس کے گھرنیک جا پہنچے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ بات بہت بڑھ جا رہی گی، وہ اس معاملے کو اپنے طریقے ہی سے حل کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پولیس کے سامنے اقرار کرنا پڑا۔ حالات ہی ایسے بن گئے۔ اس کے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔

جس طرح یہ سب ہو گیا تھا، جہاں کا دماغ نہیں مان رہا تھا کہ بات ابھی ختم ہوئی ہے۔ یہ اتنا سادہ اور سیدھا معاملہ نہیں تھا کہ وہ ختم ہو جاتا، وہ بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بھی خیال تھا کہ کاش اس کے دوست بھی یہی سوچ رہے ہوں۔

وہ لوگ اوگی پنڈ پٹھ گئے۔ وہ لڑکی اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ سہ پہر تک وہ اوگی پنڈ ہی میں رہا۔ وہیں لوگوں کے درمیان اس کا سارا وقت گزر گیا۔ بہت سارے سوال اٹھے، جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کے والدین ہی لوگوں کو مطمئن کرتے رہے۔ سہ پہر کے بعد جس وقت جہاں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ رستے میں نوتن کا فون آ گیا۔

”دبی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گجدر سنگھ نے بیٹی کے گھر پہنچنے ہی اہنا بیان بدل دیا ہے۔ اس نے پولیس کو یہی بیان دیا کہ یہ سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ اس کے وکیلوں نے اس کی ضمانت کروالی ہے۔ اور اب وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ پولیس کانفرنس اس نے اپنے گھر کی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہی کرے گا۔ اس نے گجدر سے کہا بھی تھا۔ وہ.....“ نوتن کو رنے کہنا چاہا تو جہاں نے بات کا نٹے ہوئے کہا

”بلد یو اتنا ہی نا سمجھ ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اب اسے میں دیکھوں گا، ان لوگوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اب تک اسے شوٹ ہو جانا چاہئے تھا۔“ جہاں نے غصے اور مایوسی میں کہا

”وہ شوٹ ہو گیا ہے۔“ نوتن نے کہا

”کیا.....؟“ اس نے تیزی سے پوچھا

”اس کے دو خاص بندے ہم نے پکڑے ہیں۔ انہیں لے کر جالندھر فارم ہاؤس پر جا رہے ہیں۔ رات تک وہیں آ جانا۔ میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جہاں کو کافی حد تک سکون مل گیا تھا، لیکن ایک بے چینی اس کے اندر بڑھ گئی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ رات ہی کو پتہ چلنا تھا، جب وہ ان لوگوں کو ملتا۔ اس نے اہنا سر جھٹکا اور گھر کی جانب جانے کے لئے رفتار تیز کر دی۔

اس وقت سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا، جب وہ اوگی پنڈ سے نکل کر جالندھر کی جانب رواں تھا۔ اس کے ذہن پر وہی وی رپورٹ چھائی ہوئی تھی، جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھی۔ وہ اسے بہت بڑا سوشل ورکر قرار دے رہے تھے۔ وہ یہ واقعہ تخریب کاری اور سیاسی مخالفت سے بھی سے جوڑ رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اسے

سیاسی رنگ دے کر وہ الوجیت یا خود جہاں کی راہ کو روکا جاتا۔ سیاست کے اس کھیل میں اس بندے کا زیادہ فائدہ ہونے والا تھا، جو اس کی جگہ پارٹی ٹکٹ لے کر الیکشن کے میدان میں اترتا۔ اس کا پہلا ہدف الوجیت سنگھ ہوتا۔ وہ اس سارے کھیل کو سمجھ رہا تھا اور اس کا توڑ بھی کرنا چاہتا تھا۔ انہی سوچوں میں الجھا وہ فارم ہاؤس جا

پہنچا۔ وہاں سب آچکے تھے۔ وہ ان سے بڑے بھرپور انداز میں ملا

”بلد یو، تم نے تو اس کا قصہ ہی ختم کر دیا۔ کہو کیسے ہوا یہ سب“ جہاں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا

”اصل میں جس وقت ہمیں پتہ چلا تو کچھ ہی دیر بعد بچن کو رنے مجھے بتایا کہ یہ اغوا وغیرہ کی واردات کیسے ہو رہی ہے، اس کی تفصیل تمہیں یہ بچن کو ر ہی بتا سکے گی۔“ یہ کہہ کر وہ لحد بھر کے لئے رکا، پھر کہتا چلا گیا، ”خیر ہم وہاں سب نکودر پہنچے۔ ہمارے وہاں پہلے ہی کافی سارے سوس تھے۔ ایک گھنٹے میں ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ کس کا کام ہے اور وہ کیوں کر رہا ہے۔ پھر اس کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔ جیسے ہی کنفرم ہوا میں نے سوچ لیا کہ اس کا علاج کیا ہونا ہے۔ اور وہ ہو گیا۔“

”وہ تو وہاں بڑا طاقتور سمجھا جا رہا تھا۔“ جہاں نے پوچھا تو دکر م سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا

”ان کی اولاد اتنی ہی سر پھری ہوئی ہے۔ اس کی بیٹی کو پتہ ہے کہاں سے اٹھایا، ایک کلب سے جہاں وہ ناچ گانے میں مصروف تھی۔ ان لوگوں کا خواہ خواہ کا وہم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر پر راج کر رہے ہیں۔“

”ہمیں پتہ تھا کہ اس نے پھر جانا ہے، اسی لئے اس کے بارے میں پوری طرح جان لیا۔ یہ اپنی کرن کو ر اور سر جیت بڑے سکون سے گئے، وہ پولیس کانفرنس کے بعد آرام کرنے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ انہوں نے وہیں اس کا کام کیا اور سکون سے باہر آ گئے۔ اس وقت وہاں رش لگا ہوا تھا، کون کس کو جانتا تھا۔ یہ جس وقت وہاں سے آ گئے تو انہیں پتہ چلا، ہم اس وقت تیرے پنڈ کے قریب تھے۔ سوچا ادھر چلیں، پھر جالندھر کی طرف نکل گئے۔“ بلد یو نے سکون سے کہا

”یہ سب ہوا کیوں، وہ اغوا کیوں کرتا تھا؟“

”اسی بات کا تو تمہیں پتہ نہیں۔ میں بتاتی ہوں۔“ بچن کو ر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ کہتی رہی اور وہ سنتا رہا۔

بچن کو ر کی ایک بچپن کی سہیلی اس کے ساتھ کالج تک پڑھتی رہی۔ دونوں کی آپس میں بہت محبت تھی۔ گہری سہیلی ہونے کے باعث ان کا آپس میں کوئی راز نہ رہا تھا۔ وہ کالج ہی میں تھی کہ اس کی ایک لڑکے سے کافی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ یہ تعلق پروان چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لڑکے والوں نے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ یہ رشتہ کسی وجہ سے آگے نہ چل پایا۔ پھر ایک دن وہ لڑکی گھر سے غائب ہو گئی۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ فطری طور پر پہلا شک اسی لڑکے پر گیا۔ وہ دوسرے ہی میں موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کے گھر والے۔ لڑکی کے گھر والوں نے لڑکی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک بچن کو ر بھی مزید پڑھنے کے لئے امرتسر آچکی تھی۔

یہ کوئی دو ماہ پہلے کی بات تھی۔ وہیں ایک دن اس کا آتنا سامنا اس لڑکی سے ہو گیا۔ وہ بہت با اعتماد تھی اور خوش تھی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکی نے بچن کو ر کو بتایا کہ اس نے فورس جوائن کر لی ہے۔ اور لیونگ سے گزرنے کے بعد اس کی پوسٹنگ ہونے والی ہے۔ یہ پوسٹنگ کسی بارڈر پر ہوگی۔ بچن کو ر نے اسی وقت پوچھ لیا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور واپس کیوں نہیں گئی وغیرہ۔ لڑکی نے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا اور اس کا فون نمبر لے لیا کہ وہ اس کا ل کرے گی۔ چند دن بعد اس لڑکی نے بچن کو ر کو کال کی اور اسے اپنے اٹیلیوٹ میں بلا لیا۔ جہاں وہ لڑکی ٹریننگ لے رہی تھی۔

”تمہاری اس کہانی کا ہمارے گاؤں کی لڑکی سے کیا تعلق؟“ جہاں نے اکتاتے ہوئے کہا

”ہے، بہت گہرا تعلق ہے، تم صبر سے سنو۔“ بچن کو ر نے سختی سے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگا۔“ میں ایک ماہ

وہ ایک ٹھنڈی شام تھی۔ جس وقت ہم لاہور پہنچے۔ اس وقت تک مجھے یہ شدت سے احساس ہوا کہ اب سارے لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اگرچہ ایسے ہی کسی وقت کے لئے میں نے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ لیکن جس طرح ایک جھکے سے یہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، اس نے مجھے بنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں ولید کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہوگا؟ میں نے اسے فون ملایا تو اس نے رسیو کر لیا۔

”جی، بہت دنوں بعد آپ نے مجھے یاد کیا۔“

”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا

”اپنے آبائی گاؤں۔ آپ فرمائیں، میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”کب تک پہنچو گے؟“ میں نے پوچھا

زیادہ سے زیادہ دو، اڑھائی گھنٹے لگیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے کل آنے کے لئے کہہ دیا۔

کوئی آدمی گھنٹے بعد ہم ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں جا پہنچے۔ پھر اگلے چند منٹ میں ہم اسی سیف ہاؤس میں آ چکے تھے، جو چار کنال کی کوشی میں تھا۔ یہاں پر کبھی گیت نے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانا تھا۔ وہاں پر چند لوگ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کار گیران میں کھڑی نہیں کی بلکہ اسے یوں پورچ میں کھڑی کی کہ اگر ایک دم سے بھی لکنا پڑے تو نکل جائیں۔ ہم اوپر ایک لکڑی قسم کے کمرے میں چلے گئے، جہاں ہر طرح کی سہولت تھی۔ میں یہاں خود کو خاصا محفوظ سمجھ رہا تھا۔

اگرچہ بانیٹا کور میرے ساتھ سارے راستے باتیں کرتی ہوئی آئی تھی۔ لیکن وہ ساری باتیں ہمارے اپنے متعلق تھیں۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور میں اپنے بارے میں کہتا رہا۔ وہ بیڈ پر پھیل کر لیٹ چکی تھی۔ اور میں اس کے پاس ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ تبھی اس نے گہرے لہجے میں پوچھا

”جمال، یہ اچانک تمہارے ہاتھ سے سب کچھ کیسے نکل رہا ہے، وہ سب لوگ جو تمہارے ارد گرد تھے چلے گئے۔ اب کیا کرو گے؟“

”وہی جو میرا دل چاہئے گا۔ جو میں نے سوچ لیا ہے اور اس کی گواہی میرے دل نے دے دی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ خاموش رہی، تب میں کہنا چلا گیا، ”وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئے، بلکہ میں نے انہیں خود سے الگ کیا ہے۔ کیونکہ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ حالات بدلنے لگے ہیں۔ تعمیر کے لئے ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ میں شاید اب کسی دوسری دائرے میں جا رہا ہوں۔“

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا

”دیکھو! سب لوگ جو یہاں سے چلے گئے، کیا تم نہیں سمجھتی ہو کہ میرا دائرہ پھیل گیا؟“ میں نے کہا تو وہ

سوچتے ہوئے بولی

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اور دیکھو! وہ باس جو ایک نادیہ قوت کی طرح ہے، وہ آیا اور تو یکسر حالات بدل گئے۔ وہ نادیہ قوت جو ہمیں ختم کرنے کے درپے تھی، وہ نہیں توڑ پائی، بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ رتب کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کر پائے۔ سبھی اپنی اپنی جگہ محفوظ ہو گئے۔ ہوتا یوں کہ انسان اپنے سوچنے، فیصلہ کرنے اور عمل میں آزاد ہونے کے باوجود جب رتب تعالیٰ کے نظام میں داخل ہوتا ہے، اس کی منشاء اور مرضی کے خلاف جاتا ہے تو پھر بے بس ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا تو وہ سوچتے ہوئے بولی

اس کے پاس جاتی رہی۔ اس سے ملتی رہی۔ میری سبیلی وہ نہیں رہی تھی۔ وہ مصمصیت ختم ہو چکی تھی اس میں، اس کی جگہ ایک پختہ کار ایجنٹ بن گئی تھی۔ کوئی عام ہوتا تو شاید اندازہ نہ کر پاتا۔ مگر میں بھانپ گئی۔ وہاں بہت ہی خاص قسم کی ٹرنگ دی جا رہی ہے۔ میں نے اس میں دل چسپی لی اور پتہ چلا کہ یہ کوئی معمولی تربیت نہیں ہے۔

”کیا ہے وہ، کیا اب بھی جاری ہے؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولی

”ہاں اب بھی جاری ہے اور اس کی پہلی کھپ، جس میں میری سبیلی شامل ہے وہ مختلف ملکوں میں پہنچا دی گئی ہیں۔ اگلی کھپ تیار ہو رہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لئے رکی پھر تیزی سے بولی، ”اس تربیت کے لئے لڑکی کا خوبصورت ہونا لازمی ہے، باقی کی وہ پوری کر لیتے ہیں۔ اب تم جانتے ہو کہ تمہارے گاؤں کی لڑکی کچھ نہیں بہت خوبصورت ہے۔ پنجاب میں بہت سارے ایسے دلال ہیں جو ایسی لڑکیاں اس ادارے کے لئے تلاش کرتے ہیں۔ شادی کا بہانہ بنا کر یا بھگا کر یہاں پہنچا دیتے اور وہ یہاں باہر کے ملکوں کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ ان دلالوں میں یہ ایک گنبد رنگہ بھی تھا۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا تو میں نے بلد یو کو ساری بات بتا دی۔ میں نے ایسے ہی دو دلال پہلے ہی پھڑکا دیئے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے یہ بھی اسی ادارے میں جانے والی تھی؟“ جہاں نے پوچھا

”ہاں یہ وہیں جانے والی تھی۔ اگر اس کا بھائی قتل نہ ہوتا تو یہ اب تک وہاں جا چکی ہوتی۔“ بچن کور نے بتایا

”کیا وہ کوئی ذہنی تبدیلی کرتے ہیں جس سے.....“ جہاں نے پوچھا چاہا تو بچن کور بولی

”وہ کچھ بھی کرتے ہیں، لیکن لڑکی پوری کی پوری بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں یہ تو وہی لڑکی بتا سکتی ہے، جس نے تربیت لی ہو یا پھر وہ تربیت دینے والے۔ مگر یہ ایک بہت بڑا پلان ہے۔ اب وہ ادارہ، گنبد ر کے معاملے میں ذرا بھی دل چسپی نہیں لے گا۔ پہلے دو کے بارے میں بھی نہیں لی۔ لیکن جس ادارے کے تحت یہ سب چل رہا ہے، وہ دلچسپی ضرور لے گا۔“

”چلو، وہ جو ہوگا سو ہوگا۔ اب کیا کرتا ہے۔“ جہاں نے پوچھا تو بلد یو نے کہا

”کوئی نہیں، ادھر ہی ہیں۔ جو بھی سر اٹھائے گا، اسے دیکھ لیں گے۔ اور ہاں، تیرے پنڈ والا تھا نیدار، اسے کچھ سبق دیں گے۔ تاکہ وہ تمہیں ہی پروڈکٹول دے۔“

اس پر سب نے ہنسنے لگا دیا۔ پھر باتیں کرنے لگے۔ تب جہاں نے ایسے ہی بچن کور سے پوچھا

”تمہاری وہ سبیلی کہاں ہے اس وقت؟“

”پاکستان میں، شاید لاہور میں۔“ بچن کور نے بتایا تو نون کور نے کہا

”اس بارے تفصیل معلوم ہو تو بتاؤ، پتہ کر لیں گے۔“

اس پر بچن کور نے سر ہلاتے ہوئے کہنا چاہا تو جہاں نے پوچھا

”نکوور سے دونوں بندے لائے ہو یا ابھی وہیں ہیں؟“

”ہیں، ادھر سرورنٹ کوارٹر میں، ان سے بہت کچھ اگواتا ہے، وہ ذرا ٹھیک ہو جائیں بتانے کے لئے۔“ کرن کور بولی تو نون نے پھر یاد دلایا

”بچن کور، تم اس لڑکی کے بارے میں بتا رہی تھی، میرا مطلب سندھپ کے بارے میں۔“

تبھی وہ اس کے بارے میں بتانے لگی۔

”اس نے اتنے اچکے کئے، اور تم بچ گئے۔ اب وہ تم تک نہیں پہنچ پایا اور نہ ہی تم اس تک پہنچ سکے ہو، ایسا کیا ہے، کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں، اور کچھ ہونہ ہو، یہ جو کل پر نفوس کی شیشی ٹوٹی ہے، اس خوشبو کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ وہ کل سے مجھے ٹریس نہیں کر پایا۔ یہ بات مجھے اُس وقت سمجھ میں آئی ہے جب سندرلعل نے اس مہک کا تحفہ دیا۔ یقین جانو، یہ بھی رتب کی طرف سے ہے۔ میں باس کی لگا ہوں سے چھپ گیا، اس کا تعلق اس خوشبو سے ضرور ہے۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟“ میں نے کہا بانیٹا کو ایک دم سے مسکرا دی پھر بولی

”یقین جانو جمال، آج صبح سے میرے دماغ میں یہ خیال کئی بار آیا ہے۔ لیکن میں تم سے اس لئے نہیں کہہ پائی کہ شاید تم میرا مذاق اڑاؤ۔ چل اب کچھ نہیں ہوتا۔ رتب ہمارے ساتھ ہے تو پھر کیا پرواہ۔ اب یہ دیکھ کہ اس باس کے بچے کو تلاش کیسے کرتا ہے؟“

”وہ بھی ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور ونڈ کو فون ملایا۔ اس نے چند تیل بعد فون رسیو کر لیا۔ تو میں نے پوچھا، ”ہاں سنا، کچھ پتہ چلا؟“

”ہم نے سوفٹ ویئر بنا لیا ہے۔ اس کا تجربہ جاری ہے۔ یہ نمبر کبھی ایسٹرنڈم میں ملتا ہے اور کبھی دوسری میں۔ اس کی لوکیشن مختلف جگہوں سے مل رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف ایک دو دن میں اسے تلاش کر لوں گا۔“

اور ونڈ نے کسی حد تک شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا

”چلو کوئی بات نہیں، تم کوشش تو کر رہے ہو نا، سلمان کو کسی بلیک مارکیٹ سے بھی نہیں ملا؟“ میں نے پوچھا

”وہ تو بہت کوشش کر رہا ہے، لیکن نہیں ملا۔ بہر حال اگر ہم خود کوئی سوفٹ ویئر بنا لیں گے تو اس کا توڑ بہت مشکل ہوگا، یہ ہمارے ہی کام آئے گا۔ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوگا۔“ اس نے امید افزا انداز میں کہا تو کچھ دیر یونہی گپ شپ لگانے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے فون بند ہی یا تھا کہ اشفاق چوہدری کا فون آگیا۔ میں نے کال رسیو کی تو اس نے بتایا

”یار وہ سارے لوگ مسافر شاہ کے قہرے سے چلے گئے ہیں، وہ ملنگ بھی انہی کے ساتھ چلا گیا ہے۔“

”چلو اچھا ہوا۔ اب ان کی طرف سے کوئی ٹینشن نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا

”میں نے ان کے پاس بندے چھوڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت تک وہیں رہے جب تک وہ چلے نہیں گئے۔ جس وقت وہ چل دیئے تھے، اس وقت سندرلعل نے ایک خط دیا ہے تمہارے نام، جاتے ہوئے انہی دو بندوں کو تھما گئے تھے۔ وہ ابھی لائے ہیں میرے پاس۔“

”تو پڑھ کے سنا دو۔“ میں نے کہا

”کاش میں اتنا پڑھا لکھا ہوتا۔ یہ انگریزی میں ہے۔ میں ایسے کرتا ہوں، اس خط کی تصویریں تمہیں ابھی بھیج دیتا ہوں، تم اسے پڑھ لو۔“ اس نے کہا

”چلو بھیج دو۔“ میں بولا تو اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے وہ خط تصویروں میں بھیج دیا۔

”کیا لکھا ہے۔“ بانیٹا کو اٹھ کر بیٹھ گئی تو میں پڑھا

”محترم جمال! میں نے کہا تھا نہ میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر میں اس احسان کا بدلہ دوں گا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میرے جانے کے بعد آپ میرے احسان مند ہوں گے تو میں ایک اہم بات بتا رہا ہوں، جس سے انسانیت کا بہت بھلا ہونے والا ہے۔ میں نے جو پہلی دوا تیار کی تھی، اس وقت

میرے ذہن میں یہ تھا کہ وہ لوگ جو عادی مجرم ہیں اور انسانیت کے لئے قاتل ثابت ہو رہے ہیں، ان کا ذہن بدلنے کے یہ دوا استعمال کرانی جائے۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے ذہن لوگوں کو اور زیادہ ذہین بنایا جائے۔ لیکن ہوا کیا اس کے الٹ۔ میری اس دوا کے بل بوتے پر ایک ایسی فورس تیار کی جا رہی ہے، جو دوسرے ملکوں میں جا کر تخریب کاری کریں۔ میرے ملک میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور اس فورس کی تیار کردہ کچھ لڑکیاں تمہارے ملک میں بھی آچکی ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ مقامی بندہ کون ہے۔ لیکن یہ تو کر سکتا ہوں کہ تمہیں آگاہ کر دوں۔ میں نے جو دوشیشیوں کے ساتھ خط تمہیں دیا ہے، اس میں ان دواؤں کا فارمولا تمہیں لکھ کر دے دیا ہے۔ یہ فارمولا پہلی دوا کے ساتھ ہی دوسری دوا کا بھی لکھا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں تفصیل بھی درج ہے کہ یہ کیسے استعمال کرنا ہوگا۔ اگر ضرورت پڑے تو مزید بنا سکتے ہیں۔ ورنہ میں تو حاضر ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امن، صرف طاقت کے توازن ہی میں پوشیدہ ہے۔ امید ہے میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا یہ اچھا بدلہ ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ خط اس لئے دیر سے دیا ہے کہ تم مجھے اب روک نہ سکو۔ بھگوان کے لئے روکنا بھی نہیں۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ رابطہ کروں گا۔“

میں خط پڑھ چکا تو کچھ دیر تک اس کے اثر میں رہا۔ پھر بانیٹا کو رکی آواز پر چونکا

”کافی پر اسرار آدمی تھا۔“

”ہوں، دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ مجھے اب کسی کیسٹ کو تلاش کرنا تھا جو بہت زیادہ تجربے کا رہا اور وہ اس فارمولے کے مطابق کام کر سکتا ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں دور تک کوئی ایسا بندہ نہیں تھا۔ میں نے صبح اس بارے معلومات کا سوچا اور سونے کی تیاری کرنے کے لئے اٹھ گیا۔ اسی وقت جہاں کا فون آگیا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا

”یار، تمہارے لاہور میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ یہاں تو اس کا نام سندپ کور تھا، اسے پکڑنا ہے، اس کے پیچھے لوگوں کا پکڑنا ہے، میں اس کا پتہ اور تصویر بھیج رہا ہوں، وہ ہماری ایک بہت اچھی دوست کی سہیلی ہے۔“

”تمہاری دوست کی سہیلی، ویسے کون ہیں وہ لوگ؟“ میں نے پوچھا تو اس نے اختصار کے ساتھ وہ ساری کہانی سنا دی۔ پھر کہا

”یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں، اس کی آڑ میں کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں دیکھ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون سے تصویر دیکھنے والا آپشن کھولتے ہوئے کہا۔ اس پر بانیٹا کو رنے

میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا

”لگتا ہے کوئی کام نکل ہی آیا۔“

”ہاں لگتا تو ایسے ہی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے اسے وہ سب بتا دیا جو جہاں سنگھ نے مجھے بتایا تھا۔ اس

نے بیڑ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا

”امر تر، وہاں کہاں؟ میری نگاہ میں تو ایسا کوئی ادارہ نہیں، کہاں ہو سکتا ہے؟“

”یہ تم جانو اور تمہاری یادداشت۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ اس نے لا پرواہی کے سے انداز میں کہا اور اس لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی۔ سندپ کور اچھی خاصی حسین لڑکی تھی۔ بھرا بھرا جسم، گول چہرہ، موٹی نیلی آنکھیں، نکوار ناک اور پتلے پتلے ریلے لب۔ چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے طارق نذیر کو فون کیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں تھا۔

میں داخلی دروازے پر پہنچا اور اسے کھولا، وہ کھل گیا۔ اندر سامنے صوفے پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت تھی، دوسرا مرد تھا جو سامنے دیوار پر لگے ٹی وی میں کھوئے ہوئے تھے۔ جہاں کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ میں اور باغیا کور دے قدموں ان کے سر پر جا پہنچے اور پسل کی نال ان کے سروں پر رکھ دی۔ وہ ایک دم ہی سے سہم گئے۔ عورت کی تو کھکی بندھ گئی۔ وہ دونوں گھر کے مالک نہیں لگ رہے تھے۔

”جی جی، خدا کے لئے ہمیں کچھ نہ کہیں۔“ مرد ہمت کر کے بولا

”گھر میں اور کون کون ہیں؟“ باغیا کور نے پوچھا

”کک..... کک..... کوئی نہیں، صاحب اور بیگم پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔“ مرد نے کہا

”کب آئیں گے؟“ میں نے پوچھا

”پتہ نہیں جی، کب آتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا تو میرے ساتھ کھڑے ایک بندے نے میرا اشارہ پا کر انہیں باندھنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں کمرے میں لے گئے۔ طارق سمیت اب انفارم ہو گئے کہ اندر کیا ہوا۔ میں جلدی سے بیڈروم میں گیا۔ وہاں سامنے دیوار پر شادی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ سندپ کور عروسی جوڑے میں غضب ڈھا رہی تھی۔ باغیا کور کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں نے فوراً طارق کو بتایا اور نئی ہدایت دے دیں۔ جس سے ان کی آمد کو بالکل فطری کر دیا گیا تھا۔ جیسے انہیں احساس ہی نہ ہو کہ اندر کوئی ہیں۔ یہ سب کرنے کے بعد گھر کی تلاشی لی جانے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بھرپور تلاشی کے بعد ایک کمرے سے کچھ اسلحہ ملا، اچھا خاصا زپور، بڑی تعداد میں نوٹ، ایک ڈائری، لیپ ٹاپ، اسکے علاوہ دوسرا ایسا کوئی سامان نہیں ملا جس سے وہ مشتبہ ثابت ہو سکیں۔ جہاں نوٹ تھے، وہاں سے دو پاسپورٹ بھی ملے، سندپ کور کا نام اس پاسپورٹ پر سائرہ تھا، اور اس کے شوہر کا نام خرم اقبال تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ادھر ہی ہے۔

رات کے دو بجنے کو آگئے لیکن ان کا پتہ نہ تھا۔ تقریباً سوا دو بجے کے قریب باہر سے اشارہ مل گیا کہ وہ آگئے ہیں۔ سبھی الرٹ ہو گئے۔ گھر کے اس ملازم کو بتا دیا تھا کہ اگر اس نے ہمارے کہنے کا ذرا سا بھی انکار کیا تو موت کے حوالے ہوگا۔ اس کی بیوی ہمارے پاس تھی۔ باہر اس نے کاررو کی اور ہارن دینے لگا۔ تبھی اسی ملازم نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ تو وہ اپنی گاڑی سمیت اندر آ گیا۔ اس وقت تک ہم داخلی دروازے کے پیچھے آ گئے تھے۔ وہ نشتے میں تھا۔ اس لئے جلدی سے اندر آنا چاہتا تھا۔

سندپ کور تصویر سے زیادہ حسین تھی۔ اس نے جو لباس پہنا ہوا تھا، اس میں وہ آدمی سے زیادہ برہنہ تھی۔ بلاشبہ اس نے بھی پی رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی جھوٹی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ اندر آئی، ان کی کپٹی پر پسل رکھ دیا گیا۔ ان کے لئے یہ اچانک تھا، خرم تو کوئی مزاحمت نہ کر سکا لیکن سندپ نے اضراوی طور پر اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے وہ تربیت یافتہ تھی۔ لیکن باغیا کور نے اسے گردن سے پکڑا اور زور سے قالین پر پھینک دیا، پھر پسل اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

”اب کوئی حرکت مت کرنا سندپ کور۔ ورنہ تیرا بدن چھلنی کر دوں گی۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ حیران لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ تب تک دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ انہوں نے تیزی سے دونوں کو باندھا اور خرم کو باہر کھڑی ہائی ایس وین میں ڈال دیا۔ جبکہ سندپ کور کو ہم لے گئے۔ بعد والوں نے ان دونوں ملازمین کو بھی اٹھالیا۔ وہ اسی کاروائی میں تھے کہ ہم وہاں سے نکل پڑے۔ آدھے گھنٹے میں ہم اسی سیف ہاؤس میں آ چکے تھے۔ سندپ کور کو ایک کمرے میں لے جا کر ایک کرسی پر

”وہ ٹاؤن میں جو حادثہ ہوا، اس بارے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا؟“ میں نے اس سے پوچھا

”صرف اتنا کہ چند لوگ آئے اور حملہ کر کے غائب ہو گئے۔“

”چلو، اب تم ایسا کرو، اپنے چند لوگ ساتھ لو، جب تیار ہو جاؤ تو مجھے بتانا، بہت ہی اہم مشن تمہارے ذمے لگا رہا ہوں۔“

”جی میں تیار ہوں جہاں کہیں گے پہنچ جائیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے پتہ بتاتے ہوئے کہا

”میں وہیں تمہیں ملوں گا۔ میرے ساتھ میری ایک ساتھی بھی ہوگی، ہوگی کا مطلب ہوگی۔“

”جی میں سمجھ گیا، میں نکل رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ ہمیں وہاں سے نکلنے میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔

نمبر کا پل پار کرتے ہی میں نے طارق کو فون کیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں نے ایک پوائنٹ پر اسے ڈک جانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم آپس میں جا ملے۔ اس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ وہیں ساتھ میں ایک مارکیٹ تھی۔ وہاں موجود ایک ریسٹوران میں ہم جا بیٹھے۔ دو بندے اس گھر کی جانب بھیج دیئے تاکہ ایک چکر لگا آئیں۔ طارق بار بار باغیا کور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس پر وہ محض ہنس کر رہ گئی۔

”میں اصل میں یہاں اس لئے رکا ہوں کہ پلان کے بارے میں بات کر کے کلیئر ہو جائیں۔“ یہ کہہ کر میں ان کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”اس علاقے میں تم لوگ گھروں کے بارے میں جانتے ہو، سیکورٹی بھی ہوگی اور اندر سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔“

”اس کا میں نے بندوبست کیا ہے۔ پولیس فورس کی مدد لی ہے، اگر آپ کہیں تو انہیں بلوالیں۔“ طارق نے پوچھا تو میں نے کہا

”اگر اندر سے مزاحمت ہوئی تو، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہوگا۔“

”میں کہتا ہوں، آخر اس آپریشن کے بارے جواب بھی تو دینا ہوگا۔“ اس نے فون سیدھا کرتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے لیکن یہ لڑکی ہر حال میں زندہ چاہئے۔“ میں نے سیل فون پر اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ سب نے تصویر دیکھ لی۔ ایسے میں ان دو بندوں کی طرف سے کال آ گئی، جنہیں گھر دیکھنے کو بھیجا تھا۔ طارق نے وہ کال سنی، پھر بتایا

”وہاں مکمل خاموشی ہے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں، ممکن ہے اندر ہو۔ وہ کوئی صرف سامنے سے کھلی ہے، باقی تین اطراف میں گھر ہیں۔“

”چلو نکلیں۔“ میں نے کہا تو ہم سب وہاں سے نکلنے چلے گئے۔

وہ سڑک مین روڈ سے دائیں جانب نکلتی تھی۔ دور تک جانی ہوئی اس سڑک پر سٹریٹ لائٹ کی ملجلی روشنی تھی۔ وہ کوٹھی آگے جا کر دائیں جانب آٹھواں تھا۔ وہ ایک کنال پر تھی، جس کے وسط میں رہائشی عمارت تھی۔ میں نے اس کوٹھی کے عین سامنے جا کر کاررو کی۔ تب تک ہم دونوں اسلحہ سے لیس ہو چکے تھے۔ ہم نے جو جیکٹیں پہنی تھیں۔ اس میں سب کچھ تھا۔ ہم دونوں نکلے اور گیٹ پر چلے گئے۔ اس دوران ایک لڑکا باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ اس نے اندر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ باغیا کور نے اسے اشارہ کیا کہ اندر سے جا کر گیٹ کھول دے۔ وہ اندر کود گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ باقی میرے پیچھے آ گئے، دو بندے گیٹ کے پاس رک گئے۔

بٹھا دیا۔ وہ ہمارے سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں رتی بھر خوف نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ مجھے انتہائی نفرت سے دیکھ رہی ہو۔ مجھے اس کی آنکھیں دیکھ کر وہ لوگ یاد آنے لگے، جنہوں نے رستوران میں مجھ پر حملہ کیا تھا اور وہ میری طرف یوں دیکھتے رہے تھے۔ میں نے بائیتا کو رکھ دیا تھا کہ سندپ کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔

”کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“ وہ نفرت سے بولی

”کچھ نہیں، ہم نے تو تجھے بچایا ہے۔“ بائیتا کو نے کہا

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ سرمارتے ہوئے بولی

”کیوں، ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟“ بائیتا کو نے کہا۔

”پھر مجھے اس طرح باندھا کیوں ہوا ہے، اگر تم لوگ میرے ہمدرد ہو تو مجھے کھول دو۔“ وہ طنز پر لہجے میں بولی

”کھول دو۔“ میں نے کہا تو بائیتا کو نے ایک نگاہ میری طرف دیکھا اور پھر برا سامنہ بنا کر اسے کھولنے لگی۔

اسے کھولنے کی دیر تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے یوں نکلی جیسے بجلی کو نہ گنی ہو۔ اس نے ایک ہاتھ بائیتا کو کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر رکھا اور اسے پرے دھکیل دیا۔ بائیتا لڑکھڑائی، اس نے اسی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور اپنا گھٹنا

اس کے پیٹ میں مارا، وہ دہری ہو گئی، سندپ نے لپٹی کہنی اس کے سر پر ماری اور اسے گرا دیا۔ بائیتا کو کو امید

نہیں تھی کہ وہ ایسا کرے گی یا کر سکتی ہے۔ اسی لمحے سندپ نے چلائنگ لگائی اور دروازے کی جانب بڑھنا

چاہا۔ جب تک بائیتا کو اٹھ گئی تھی اور وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس پر جھپٹی، میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سندپ یوں

اس کی پہنچ سے نکلی کہ وہ اس جھو بھی نہ سکی۔ بائیتا کو غصے میں آ گئی تھی اور یہی غصہ ایک فائبر کے لئے جان لیوا

ہوتا ہے۔ بائیتا کو نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اجازت طلب کر رہی کہ کہو تو اسے سیدھا کر دوں۔ جب تک

سندپ گھومی اور اس نے بائیتا کا بڑھا ہوا بازو پکڑ لیا۔ پھر ایک جھٹکا دیا، وہ پھر لڑھک گئی۔ اس بار سندپ نے

حملہ نہیں کیا بلکہ مجھے نگاہ میں رکھتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے میرے اور دروازے کے فاصلے کا

تعیین کر لیا تھا۔ اسی مناسبت سے وہ آگے بڑھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ باہر نکل جائے گی، میں اسے پکڑنے کے لئے آ

گے بڑھا۔ اس نے مجھے دذر رکھنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو یوں بڑھایا کہ جیسے وہ مجھ پر حمہ کرے گی۔ میں جیسے

ہی اس کے قریب گیا اس نے پوری قوت سے کھڑی ہتھیلی میرے منہ پر مارنا چاہی، میں اسے جھکائی دے

گیا۔ لیکن اس کی انگلیاں میرے چہرے کو چھو گئیں۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی

گردن پکڑ لی۔ وہ پیچھے کی طرف زور لگانے لگی تو میں نے اس کو چھوڑ دیا وہ لڑھک کر فرش پر گری، پھر جیسے ہی

جھپ لگا کر اٹھی اور باہر کی طرف کودتے ہوئے پوری قوت سے بچ میرے منہ پر مارا۔ تبھی میں نے اسے دونوں

ہاتھوں سے پکڑ کر گرفت میں لے لیا۔ یہ سب کچھ انتہائی تیزی سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا۔ میں نے

محسوس کیا جیسے سندپ کی جان ہی نکل گئی ہو۔ اس کا جسم ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یوں میرے ساتھ لگ گئی

جیسے میرے بدن میں گھس جانا چاہتی ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ یوں

خمار آلود انداز میں میرے ساتھ چٹ گئی جیسے وہ بھرپور نشے میں ہو۔ میں چونک گیا کہ اسے کیا ہوا۔ اس وقت

تک بائیتا کو اٹھ گئی تھی اور تیزی سے سندپ کی طرف آئی، اس نے آتے ہی اسے گردن سے پکڑا اور کھینچ کر

پیچھے کی طرف لے گئی، سندپ نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، بائیتا کو بھی اس کے ڈھیلے اور بے جان جسم کو

محسوس کر کے حیران ہو گئی۔ اس نے سندپ کو مارا نہیں بلکہ اسے چھوڑ دیا۔ وہ ایک لمحہ کو یونہی بیٹھی رہی، پھر یوں

اٹھی جیسے نشے میں ہو۔ اس نے میری جانب دیکھا اور میری طرف آئی۔ میں کھڑا رہا۔ وہ میرے ساتھ لگ

گئی۔ پھر اپنا چہرہ آہستہ آہستہ میرے سینے سے رگڑنے لگی۔ کچھ ہی لمحوں بعد اس کے منہ سے سسکاریاں نکلنے لگیں جیسے وہ بے تحاشا لذت محسوس کر رہی ہو۔ میں اس کی یہ حرکت قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اس دونوں کا نہ دھوکے سے پکڑا اور اسے لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ یوں میری جانب دیکھنے لگی، جیسے کسی پیاسے کے منہ سے پانی کا پیالہ ہٹا لیا جائے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی بجائے ایسی قربان ہونے والی چاہت جھانک رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لئے چکر اگیا۔ اسے ہوا کیا ہے؟ یہی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ تبھی بائیتا کو نے اس کے منہ پر زناٹے دار ٹھپڑ مارتے ہوئے پوچھا

”کیا ہوا تجھے؟“

”کچھ نہیں، اب جو چاہو کرو، میرا بدن حاضر ہے۔“ سندپ نے میری طرف یوں دیکھ کر کہا جیسے اس نے

اپنا آپ مجھے سوپ دیا ہو۔ بائیتا کو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس سے پھر پوچھا لیکن میری سمجھ میں سندر لعل کی

بات کو کچھ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مہک صنف نازک کو پاگل کر دینے والی ہے۔ کیا سندپ اس قدر پاگل

ہو گئی ہے؟ بائیتا کو بھی تو صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے، اس کچھ کیوں نہیں ہوا؟ میں نے بائیتا کو کو اشارہ کیا،

وہ باہر نکل گئی۔ میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے محبت پاش لگا ہوا۔ سے میری طرف دیکھا اور بولی

”کوئی اتنی جلدی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا، میرا اپنا ہی کوئی مجھے پہچان سکتا ہے۔“

”میں تو تمہارا اپنا نہیں ہوں، تم نے کیسے جان لیا کہ میں تمہارا اپنا ہوں۔“ میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ

پھیرتے ہوئے کہا

”یہ مہک دنیا میں کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ یہ صرف ہمارے ہی لوگ لگاتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں سندر لعل

اور جہاں سنگھ کی باتیں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ میں نے اسی لمحے پینتر ابدلتے ہوئے کہا

”تو پھر یہ بہت بڑی کمزوری ہوئی۔ کیا اتنا اثر لیتے ہو تم لوگ؟ باقی لڑکیاں بھی اسی طرح مدھوش ہو جاتی

ہیں؟“

”نہیں، ایسا نہیں ہے، شاید دوسری ایسی مدھوش نہ ہوتی ہوں لیکن میں ہو جاتی ہوں۔ یہ مہک میرے تن بدن

میں رچ چکی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی مہک لگاتا ہے۔ جس نے مجھے اک نئے جہان سے آشنا کیا۔ یہی مہک میرا

بدن مہکا دیتی ہے، آگ لگ جاتی ہے مجھے، آؤ اب دیر مت کرو، مجھے جھنجھوڑ ڈالو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے

اپنے بدن پر پہنی ہوئی مختصری شرٹ زور سے پکڑ کر پھاڑ دی۔ وہ پورے سینے سے برہنہ ہو گئی۔ میں نے اس کی

آنکھوں میں دیکھا اور نرمی سے کہا

”ابھی وقت نہیں،“ پھر باہر کی جانب اشارہ کر کے کہا، ”میں اسے بھیج دوں، اتنے میں تم فریش ہو جاؤ۔ پھر

بیڈ روم میں چلتے ہیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے مان گئی۔ وہ اٹھی اور کسی رپورٹ کی طرح ہاتھ روم کی جانب چل دی۔

اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا۔ اتنے میں بائیتا کو نے جھانک کر دیکھا تو میں نے اشارے سے اسے بلایا اور اس

کی جانب اشارہ کر کے چپ چاپ نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پورا لباس پہنے آ گئی۔ وہ کافی حد تک ہوش میں تھی۔ میں نے اسے خود سے پرے

رکھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کو کچھ کھانے کے لئے کہا تھا، وہ کافی کچھ چل بسکت اور کیک کے ساتھ چائے دے

میں۔ ہم ڈانگ ٹیبل کے اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے میری جانب دیکھا اور شرمندہ سے انداز میں کہا

”سوری، میں پاگل ہو گئی تھی۔“

”دیکھو! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، بلکہ تمہارے دوست ہیں۔ ہم تمہیں قطعاً نقصان نہیں پہنچانے والے بلکہ ہم تو بچن کور کے.....“

”بچن کور، تم جانتے ہو اسے؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا

”ہاں، میں جانتا ہوں اور اسی کے کہنے پر یہاں آئے ہیں، اور اب تمہیں واپس لے کر جانا ہے، تم غلط باتوں میں پھنس چکی ہو، یہی تمہیں بتانا تھا، غصہ برد، تمہاری بچن کور سے بات کراتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیل فون پر فون کور کے نمبر ملائے۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ وہ ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہیلو! کیا ہوا، وہ ٹھیک تو ہے۔“

”اب قدرے نارمل ہے۔ بچن کور سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولی

”یہ ساتھ ہی بیٹھی ہے۔“ اس نے کہا تو بلاشبہ اس نے فون بچن کی جانب بڑھا دیا۔ تبھی اس نے ہیلو کہا تو میں نے فون سندھپ کور کی جانب بڑھا دیا۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ سندھپ کور رونے لگی۔ آخر میں اس نے یہی کہا

”ٹھیک ہے جیسے تم کہو، میں وہی کروں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے بات کر کے فون بند کر دیا۔ اس نے مجھے یہی بتایا کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور اسے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھانے لگی اور اس دوران روتی رہی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ پھر پلٹتے ہوئے

”پوچھیں، کیا پوچھنا ہے آپ لوگوں نے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ تم کھانا کھاؤ بس۔“

وہ سکون سے کھانے لگی۔ پھر خود ہی بتانے لگی۔

”میں امرتسر سے ہوں۔ اور وہیں سے آئی ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہارا وہ انٹینیٹیوٹ کہاں ہے امرتسر میں؟“ بانیٹا کور نے پوچھا تو وہ بتانے لگی۔ سندھپ کور ہر وہ بات بتاتی چلی گئی جو بھی اس سے پوچھا گیا۔ میں نے پہلی بار کسی کو ایسے دیکھا تھا، جس نے اتنی نفرت دکھائی اور پھر اس قدر تابعداری سے سب کچھ بتائے چلی جا رہی تھی۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ جب بانیٹا کور اسے ایک کمرے میں چھوڑ آئی۔

میں اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس پر اعتبار کروں یا نہ کروں اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خوشبو نے مجھے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کا آپس میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ اور وہ باس بھی اس سے کہیں الگ نہیں تھا۔ یہ راز کب کھلے گا، مجھ اسی کا انتظار تھا۔ میں جلد از جلد باس تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں سویا نہیں، بلکہ میں نے سب سے پہلے اردن سے رابطہ کیا۔ اسے ایسے ہی ادارے کے بارے میں بتایا۔ اردن نے اسی وقت کراچی سے فہیم کو آن لائن لے لیا۔ وہ سبھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے تھوڑی سی نیند لینے کے بارے میں کہا اور اپنے کمرے میں آکر سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں بیڈ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ مجھے سندھپ کور کے خط کا خیال آیا۔ میں اٹھا اور اپنے سامان کی طرف گیا۔ وہاں سے وہ پیکٹ لیا جس میں دو انیاں اور لفافہ تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں دو پرچے تھے۔ ایک پر فارمولے کی زبان تھی اور دوسرے میں ان دونوں دوائیوں کے بارے میں درج تھا۔ وہ دوا جو پہلی دوائی کا اثر توڑنے والی تھی۔ سندھپ کور کے

بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے درج ہدایات کے مطابق وہ دوائی اور سندھپ کے کے میں چلا گیا۔ وہ ایک گلاس پانی میں ایک قطرہ دیتا تھا۔ وہ میں پانی کے گلاس میں ڈالا اور اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سونے کی کوشش میں تھی۔ میں وہ پانی اسے دے کر پینے کو کہا۔ وہ پانی پی گئی۔ میں وہاں سے آگیا۔ سونے سے پہلے میں اس سیف ہاؤس کے ہیڈ کوارٹر کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر نیند لے لوں۔

☆.....☆.....☆

جہاں اس وقت واپس اوگی کی جانب چل پڑا تھا، جب باقی سب میں سے آدھے جالندھر کی جانب چلے گئے اور آدھے واپس نکودر چلے گئے۔ نوتن کور کو فارم ہاؤس پر ہی رہنے کو کہا گیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ دن تک اس انٹینیٹیوٹ کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے، پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔ اس دوران ایکشن مہم میں کسی کو بھی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں مدد کی جائے گی۔ جہاں کو ہم تیز کرنے کے بارے میں کہہ دیا گیا تھا۔ اسی لئے وہ اوگی پنڈ کی طرف چل پڑا تھا۔

جہاں اس وقت اوگی پنڈ سے تھوڑی ہی فاصلے پر تھا جب اسے ہر پریت کی کال ملی۔

”وہ کہاں ہے؟“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ لیکن لہجہ کسی پریشانی کی چٹکی کھا رہا تھا۔

”خیریت تو ہے نا پریت؟“ اس نے خوشگوار انداز میں کہا، جس پر وہ قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی

”اوگی تمہانے سے پولیس آئی ہے، ان کے ساتھ نکودر کی بھی پولیس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اور.....“ اس کے ساتھ ہی ہر پریت کی آواز آنا بند ہو گئی لیکن فون کال نہیں لی تھی ۱۰ گھنٹے ہی لے کر کسی بھاری آواز والے نے طنزیہ انداز میں کہا

”اور اگر تم نہیں آئے تو ظاہر ہے ہمیں یہیں سے کسی کو لے کر جانا ہوگا۔ تم کب تک پہنچ رہے ہو۔“

”دیکھو! گھر کی کسی عورت سے بدتمیزی نہ ہو۔ اور تم لوگ گھر سے باہر نکل کر میرا انتظار کرو، میں دس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔ میں گھر کے قریب ہی ہوں۔“

”ارے، تم بھاگ کیوں نہیں جاتے، ہم تمہیں ہار پہناتے نہیں، گرفتار کرنے آئے ہیں، اور ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ دس منٹ ہی ہیں تمہارے پاس۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

جہاں نے وقت دیکھا اور سب سے پہلے نوتن کور کو فون کر کے انتہائی اختصار سے ساری بات بتادی، پھر فون بند کر کے انوجیت سے رابطہ کیا، اس نے فون رسپونڈ کیا تو پتہ چلا کہ اسے ابھی پتہ چلا ہے اور وہ گھر کی طرف آرہا ہے۔ جہاں نے بلیمہ سنگھ پنڈ کو فون کرنے کا کہا اور فون بند کر کے جیب میں رکھنے کی بجائے ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی پنڈلی کے ساتھ رکھا ہوا پستل نکال کر وہیں رکھ دیا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔

اس نے دور ہی دیکھ لیا۔ اس کے گھر کے سامنے کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جہاں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ یونہی نہیں آئے ہیں، بلکہ کوئی پکا کاغذ لے کر ہی آئے ہوں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس لئے اس نے کار لے جا کر گیٹ پر روک دی۔ پھر بڑے سکون سے اتر کر اندر چل دیا۔ راستے میں جا بجا پولیس والے کھڑے تھے۔ تبھی پورچ میں وہی اے سی بی دکھائی دیا۔ جہاں چلتا ہوا اس کے پاس جٹاٹھرا۔

”ویل کم، جہاں سنگھ ویل کم، دیکھو، میں تمہیں تمہارے گھر پر ہی تمہیں ویل کم کہہ رہا ہوں۔ خیر! میں تمہیں

مجید سنگھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک ذمہ دار آفسر ہیں، بنا کسی گیدڑ چھٹی کے آپ نہیں آئے ہوں گے۔ دکھائیں گے مجھے وہ گیدڑ چھٹی؟“ جہاں نے کہا تو اے سی پی نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اور طنزیہ لہجے میں کہا ”یہ لو۔“

جہاں نے ایک نگاہ اے دیکھا۔ اسے شک میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس نے وہ کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے کہا

”میں نے کہا تھا کہ گھر سے باہر رہنا، مگر تم پھر بھی اندر آ کر بیٹھ گئے۔ کس کی اجازت سے؟“

”بہت ہوگئی اخلاقی گفتگو، اب چلو۔“ پھر اپنے کسی ماتحت کی طرف دیکھ کر کہا، ”گرفتار کر لو اسے؟“

اگلے ہی لمحے ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس کے ہتھ کڑی لگا دی گئی۔ جہاں نے دیکھا، دروازے کی اوٹ میں سے ہر پریت اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھایا اور پلٹ پڑا۔ انہی لمحات میں انوجیت کی کار اندر داخل ہوئی۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور تیزی سے بولا

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ لوگوں کو خبر نہیں کہ.....“

تیجی اے سی پی نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا

”تم اگر انکیشن میں امیدوار ہو تو صرف امید اور ہی رہو، قانون کے راستے میں مت آؤ۔ ہم نے اسے ہر قیمت پر لے کر جانا ہے سچے، اس لئے خاموش ہو جاؤ۔“

”تم غلط کر رہے ہو، میں جانتا ہوں.....“

”تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو۔ پرے ہٹ جاؤ۔“ اے سی پی نے حقارت سے کہا تو جہاں نے سر دلچے میں کہا ”اے سی پی، اپنی بکواس بند رکھو، اور کتے کی طرح بھونکنا بند کرو۔“

اس پر اے سی پی نے حیرت اور غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا، ”شٹ اپ۔! جب میں تیرے ساتھ جا رہا ہوں تو جا رہا ہوں، کسی بھول میں مت رہنا کہ تم مجھے گرفتار کر کے لے جا رہے ہو۔ میں چاہوں تو اب بھی تیرے ساتھ جانے سے انکار کر سکتا ہوں۔ جانا ہے یا ادھر ہی رہنا ہے۔“

غصے میں اے سی پی سے بولا نہیں گیا۔ اس نے گھور کر دیکھا اور اپنے لوگوں کا اشارہ کیا۔ وہ اسے لے کر چل دیئے۔ جہاں چلتا ہوا پولیس وین میں جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی وین چل دی۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر ہوگئی تھی۔ میں نہایا تو وہی بھینی بھینی مہک پھر سے تازہ ہوگئی۔ بھوک کا احساس ہونے کے باوجود میرا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں لان میں چلا گیا۔ وہیں مجھے چائے دے دی گئی۔ میرا ذہن باس میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی فون کال نہیں آئی تھی۔ اردوند اور فیہم بھی اسے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ تھوڑا بہت اگر کامیابی لی بھی تھی تو پھر بھی کفر نہیں کر پائے تھے۔ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ میں اب اردوند یا فیہم کو بار بار فون کر کے تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چائے پی رہا تھا کہ ولید کی کال آگئی۔ میں رسیو کرتے ہوئے کہا

”سوری۔! میں دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا، میں.....“

”سر، آپ معروف ہوں گے، تیجی رابطہ نہیں کیا، میں اب بھی نہ کرتا اگر مجھے آپ سے ایک اہم کام نہ ہوتا۔“

اس نے کافی حد تک الجھے ہوئے لہجے میں کہا

”ولید۔! خیر تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا

”خیر ہی ہے، آپ سے ملاقات ہوتی ہے تو بتاتا ہوں ناجی میں۔“ وہ اسی لہجے میں ہی بولا ”کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا

”میں کل سے یہیں لاہور ہی میں ہوں۔ آپ کی فون کال کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا

میں نے ایک دم ہی اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں فون بند کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس وقت سندھپ کور اپنے کمرے میں تھی اور بائیکاٹ کور جاگ گئی تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر باہر جانے کے لئے کہا اور کارلے کر نکل گیا۔ میرا رخ علامہ اقبال ٹاؤن کی جانب تھا، جہاں ولید میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں جس وقت میں نہر کے پل پر پہنچا اس وقت مغرب ہو چکی تھی۔ میں نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسی وقت میرے من میں نجانے کیوں شاہ جمال کے مزار پر ملنے والے وہی سفید ریش بزرگ مجھے یاد آنے لگے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ یاد یونہی نہیں ہے۔ اس لئے جیسے میں فیروز پور روڈ پر چڑھا تو پھر چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ بابا شاہ جمال کے مزار تک جا پہنچا۔ میں نے کار پارک کی اور اندر چلا گیا۔ میں نے دیکھا وہی بزرگ انہی قبروں کے درمیان سفید کپڑا بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں مسکراتے ہوئے ان کے پاس چلا گیا، انہوں نے میری طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا ”آؤ بیٹھو۔“

میں ان کے سامنے جا بیٹھا۔

”کیا میں نے تمہیں دیکھا تھا، اس کے بارے میں بتاؤ، کیا تم اسے نہیں سمجھتے ہو؟“

”حضور، اگر میں نہیں سمجھا تو آپ پھر سے مجھے سمجھا دیں۔“ میں نے عاجزی سے کہا تو چند لمحے میری

طرف دیکھتے رہے، پھر بولے

”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کثرت جو ہے یہ وحدت سے ہے اور وحدت ہی سے ساری کثرت ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی تم سے جڑا ہے تو کیوں نہیں تم اس سے جڑ جاتے ہو۔ بس ذرا سا دھیان دو۔“

”کیسے؟ کیسے دھیان دوں باباجی؟“ میں نے تجسس سے پوچھا

”اچھا تمہیں پھر ایک اور بات بتاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے، ”تمہارے خیال

میں دینے کی حقیقت کیا ہے؟“

”حضور آپ بہتر سمجھتے ہیں۔“ میں دھیمے لہجے میں کہا

”دینے کی حقیقت روشنی ہے۔ روشنی نہ ہو تو دنیا بھی نظر نہیں آتا۔ میں تمہیں کھول کر ہی بیان کر دوں، دینے کو روشنی نے وجود دیا ہوا ہے۔ دینے کو جسم سمجھ لو اور جسم میں روشنی نہ ہو تو کسی کی بھی پہچان ممکن نہیں ہے۔ روشنی کی حقیقت سمجھ میں آگئی تو سمجھ لو کوئی بھی تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا

”روشنی کی حقیقت کیا ہے؟“ میں نے بات بڑھانے کے لئے پوچھا تو بولے

”جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اس کے سامنے زمان و مکاں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دن، رات اور دن رات کے اندر انقلابات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور جو حقیقی زمانہ ہے وہ اس کے اندر ہے اور یہ اس کی ایک جھلک ہے۔ یہ سلسلہ روز و شب ہی ہے جس میں زندگی اور موت دیکھی جا رہی ہے۔ مطلب پیدا ہونا اور مرجانا۔ یہ تغیرات کی

”عشق کی اس منزل خودی تک فوری طور پر رسائی کیسے ممکن ہے۔“ میں نے تیزی سے پوچھا
 ”خودی ایک آنکھ سے اپنی خلوت کا مشاہدہ کرتی ہے اور دوسری آنکھ سے جلوت یعنی کائنات کا تماشا
 کرتی ہے۔ اگر ایک بند ہو جائے تو گمناہ ہے اگر دونوں آنکھوں سے دیکھتی ہے تو عین راہ سلوک ہے، یہی
 طریق قلندر ہے۔“

”کیسے باباجی،“ میں انتہائی تجسس سے پوچھا
 ”وہی..... جیسے دپتے کو روشن ہونے کے لئے اپنے وجود یعنی تیل کو جلانا پڑتا ہے ویسے ہی قلندر اپنے محبوب
 سے عشق کی آگ میں جلتا ہے تو خودی کی روشنی حاصل کرتا ہے۔ یہ وہی روشنی ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کو
 دی اور انہوں پوری کائنات میں تقسیم فرمادی۔ سن لو! خودی کیا ہے، غلامی محبوب ﷺ اور عشق رسول ﷺ
 ہے۔“ انہوں نے کہا اور جذب سے شعر پڑھنے لگے۔

مقام مصطفیٰ در دل مسلمان است
 آبروئے ما از نام مصطفیٰ است
 موت و حیات نہیں التفات کے لائق
 فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
 پسند روح و بدن کی ہے و افسوس اس کو
 کہ نہایت مومن ہے خودی کی مرانی
 ازل اس کے ہیچے اب سامنے
 نہ حد اس کی ہیچے نہ حد سامنے
 خودی کی خلوتوں میں کبریا کی
 خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
 زمین و آسمانوں و کرسی و عرش
 خودی کی زد میں ہے ساری خدا کی

”واہ! قلندر لاہوری نے خودی کو کیسے بیان کیا۔“ میں نے جذب میں کہا

”بس اتنا سمجھ لو، اٹا، جب حضرت اقبالؒ کے ہاتھوں میں آئی تو خودی بنی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اٹھے، سفید کپڑا سمیٹا اور ایک جانب چل دیئے۔

میں نے غور کیا، میرے سامنے سب کچھ کھل گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں ہاتھ بڑھاؤں گا اور خودی کا جوہر میرے
 ہاتھ میں ہوگا۔ مجھے خود پر رشک اور اپنے دشمنوں پر پیار آ رہا تھا۔ جن کی کوششوں سے آج میں اس عالی قدر راز
 تک رسائی حاصل کر گیا تھا۔

میں اٹھا اور چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں یہ کائنات تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔
 میرے سامنے ایک نئی دنیا طلوع ہو رہی تھی۔ ”پیام دے گئی ہے مجھے باوجود گاہی..... کہ خودی کے عارفوں کا ہے
 مقام پادشاهی۔“

(انشاء اللہ۔ باقی واقعات حصہ 4 میں)

نشانی ہے۔ تعمیرات اور انقلابات اسی زمانہ کی مسلسل حرکت سے پیدا ہو رہا ہے۔ چونکہ ذات تعمیرات اور
 انقلابات سے منزہ ہے، اس لئے وہ زماں و مکاں سے بالاتر ہے۔ یہ سلسلہ دروز و شب اس کی تخلیق ہے، سمجھو کہ
 فیکون کا تسلسل ہے۔ ازل کے ساز سے ایک نغمہ نکل رہا ہے یعنی زمانہ ذات کی تخلیقی فعالیت کا مظہر ہے اور بقید
 زمان و مکان میں عالم وجود میں چلی آ رہی ہیں۔ زمانہ بلاشبہ کائنات میں سب سے بڑا کھرا کھوٹے کا پرکھنے
 والا ہے، چنانچہ جو افراد اور معاملات ناقص ہوتے ہیں۔ زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔ سلسلہ دروز و شب کی اصل
 حقیقت یا اصل زمانہ جس میں نہ دن ہے نہ رات محض حال ہی حال ہے، نہ ماضی ہے اور نہ مستقبل۔ یہ زمانہ
 خالص ایک زد ہے، جس میں مسلسل حرکت ہے۔ زمانہ زندگی ہے اور زندگی زمانہ ہے۔ اگر زمانے کی حقیقت
 سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو دل میں غوطہ لگاؤ، عشق اختیار کرو کہ عشق اصل حیات ہے اور زمانے کی دستبرد سے بالا
 تر ہے۔ عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام.....“

”عشق کا زماں کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے؟“ میں نے سمجھنے کے لئے پوچھا

”عشق، مومن کے اعمال میں رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ عشق اصل حیات ہے۔ اس پر فنا طاری نہیں
 ہوتی۔ اگرچہ زمانہ تیز تر، تند اور انتہائی رفتار رکھتا ہے۔ لیکن عشق اس سے بھی بڑھ کر سبک رفتار ہے۔ اس لئے وہ
 زمانے پر غالب آ جاتا ہے اور اس کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ عشق بڑی کامیابی سے زمانے کا مقابلہ کرتا
 ہے۔ زمانہ ہر شے کو فنا کر دیتا ہے مگر عشق کو فنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ زمانہ عشق کے سامنے بے بس ہے
 عشق کی تقویم میں عہد حاضر کے سوا..... اور زمانے بھی ہیں، جن کا نہیں کوئی نام۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا
 ”اب باباجی یہ بھی فرمادیں کہ روشنی اور عشق میں کیا تعلق ہے۔“ میں نے پوچھا

”وحدت کی روشنی عشق ہے۔ دپتے کی مثال سے اس کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ظاہری
 روشنی کے بغیر کچھ بھی دیکھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح عشق کی باطنی روشنی کے بغیر کسی شے کی حقیقت کو دیکھنا اور
 جاننا ممکن نہیں ہے۔ اور جان لو کہ روشنی روشنی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔“ انہوں نے خود لطف لیتے ہوئے کہا تو
 میں نے تجسس سے پوچھا

”باباجی یہ کیسے، اس بات کو کھولیں؟“

میرے پوچھنے پر وہ بے ساختہ بولے

”اتباع..... اتباع محبوب۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرائے پھر جھوم کر بولے: ”اللہ کا رنگ کیا ہے، صبغت

اللہ۔ اللہ کا رنگ، اتباع ہی سے چڑھتا ہے۔ یہ رنگ وہیں سے ملتا ہے۔ اب سنو۔! یہ کیسے چڑھتا ہے۔“

”حضور فرمائیں۔“ میں نے شوق سے کہا

”قطرہ آب نیساں جو صدف کی آغوش میں چھپ جاتا ہے۔ جب اس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے، پردہ
 میں چلا جاتا ہے خلوت میں گوہر بن کر جلوت یعنی عالم ظاہر میں ظہور پا جاتا ہے۔ جب پانی کی بوند خودی کا
 حرف یاد کر لیتی ہے، اس میں خودی کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بے حقیقت وجود کو موتی بنا لیتی ہے۔“

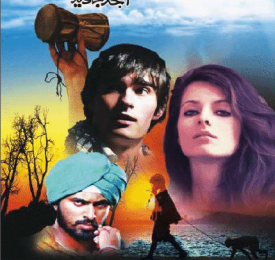
”واہ، سبحان اللہ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اور وہ جذب میں کہہ رہے تھے۔

”عشق و مستی سے، ہچی بے خودی سے، جسم و جان، موت و حیات، مکان و زمان سے گذر کر، دل میں ڈوب
 کر، خلوت میں، حق سے محکم ہو کر، اپنی خودی کو پا کر پھر کائنات میں ظاہر ہو کر، اپنے جان و جسم کو تسخیر کر کے
 کائنات کو مسخر کر لو۔“

PART 4

قلندر ذات

امجد جاوید



ازراہ نصیب

اُسی پہ عشق سجتا ہے

درویش صفت امجد جاوید کافی سفر ”عشق کا قاف“ تک پہنچا تو میرا ان سے تعارف ہوا۔ اُن کا قلم عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کی کہانیاں بہت مجھے ہوئے انداز میں بیان کر رہا تھا۔ وہ حاصل پور سے لاہور آئے تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی ہر آواز، ہر لفظ میں سادگی و عاجزی تھی۔ وہ ہنستے تھے لیکن ان کی آنکھیں اُداس رہتی تھیں۔ یہ عقدہ بھی جلد کھل گیا۔ دراصل وہ دو دنیاؤں کے باسی تھے۔ ایک مادی دنیا تھی، جسے تصوف میں عالم اسباب کہا جاتا ہے۔ وہ اس میں رہتے ہوئے اپنی اور اپنے سے منسوب ہر فرد کی زندگی کے خاکے میں دلکش رنگ بھرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے من کی دنیا میں جی رہے تھے۔ جہاں ان کی روح متلاشی تھی، ایک ایسے مردِ کامل کی جو ان کی انگلی تھام کر انہیں رُبِ اعلیٰ سے قریب کر دے۔ تصوف سے متعلق اُن کے اندر سر اٹھاتے بہت سے سوالوں کے تسلی بخش جواب دے دیتے۔ اُن کے من کی سر زمین پر چلنے والی بے چین ہواؤں کو ایک ایسا رُخ دے سکے جو انہیں سکون و اطمینان کی وادی میں لے جائے۔

مجھے یاد ہے امجد جاوید جب پہلی بار سرفراز اے شاہ صاحب کا لیکچر سننے آئے تھے تو اُن کے ذہن میں بہت سے سوالات تھے۔ وہ ”قلندر“ کے موضوع پر تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے۔ اور اس حوالے سے انہیں سرفراز اے شاہ صاحب سے راہنمائی درکار تھی۔ لیکچر سننے کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا۔ ”آپا! آج شاہ صاحب نے آتے ہی خود بخود میرے اُن سارے سوالوں کے جواب دے دیئے، جو میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔“

جب تو سچی تھی، سو آپ کی ملاقات سرفراز اے شاہ صاحب سے ہو گئی۔ زندگی بدلنے لگی، قلم نکھرنے لگا، انسان کی تاثیر بڑھنے لگی۔ اور اس کا یقین مجھے یوں ہوا کہ چند دن پہلے سرفراز اے شاہ صاحب کے دُعا گھر امام آباد سے مجھے جرنلسٹ صائمہ خان نے فون کر کے بتایا کہ ایک خاتون ”صبا“ نے ”قلندر ذات“ ناول مینٹ دے کر کہا کہ تصوف کا ذوق و شوق رکھنے والوں کو یہ ناول آگے بڑھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ امجد جاوید ایک مردِ کامل کی راہنمائی میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے عشق حقیقی ہمیشہ کے لئے اُن کی پہچان بن جائے۔

اُسی پہ عشق سجتا ہے
جو اندر سے قلندر ہو

انسان کے عمل سے اس کی سوچ کا اظہار ہوتا ہے۔ عمل اور فکر کا ہمیشہ سے دائمی رشتہ رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ یہ جو زندگی کے بیش بہا رنگ ہیں، ان میں مختلف قبیلے ہیں، قبیلوں سے عالمی سطح تک جو خیالات اور اعمال کا اختلاف اور اتحاد پایا جاتا ہے، عام انسان سے لیکر عالمی سوچ تک اور عالمی سطح سے لیکر ایک عام انسان تک جو پھیل اور فکر کو جدا کرے گا تو تب وہ اپنی حقیقت سے بچھڑ جائے گا، یہی تخریب ہے۔ اور جو فکر اور عمل کو ایک وحدت لے کر چلتا ہے وہی دراصل تعمیر ہے۔ یہی نسبت کا اظہار ہے۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانیت کی راہ پر ہے یا کسی دوسرے راستے پر۔

تاریخ کے دھارے پر ایک نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ انسان نے اپنے عمل ہی سے اس دنیا پر اپنا کردار ثبت کیا۔ اسی عمل ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کردار منفی تھا یا مثبت، اس نے انسانیت کی بھلائی میں تعمیری پہلو اپنایا یا پھر شیطانت کی راہ پر چلا اور تنگ انسانیت کھلایا۔ فکر اور عمل کو ایک ساتھ لے کر چلنے والی ہمیشہ نسبت سے جڑتے ہیں۔ جیسے انبیاء کی سنت ہے کہ وہ پہلے انبیاء کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں اور نبوت کی نسبت سے جڑ جاتے ہیں۔ اس سے ایک شے واضح ہو جاتی ہے کہ جو نسبت والے ہیں وہ سچے ہیں۔ نسبت کیا ہے؟ فلاح انسان کے لئے اعلیٰ سوچ کے ساتھ جڑ جانا۔ کون کتنا فلاح انسان کے لئے وقف ہے، یہی تعین اس کا کردار کرتا۔ جیسے مولا حسینؑ نے تاریخ پر اپنا کردار رقم کر دیا۔ اب انہی کے پیغام پر عمل کرنے والا ہی آپ کی نسبت والا کہلائے گا۔

الحمد للہ! میں آخر میں ان کا شکریہ ضرور کہنا چاہوں گا، جنہوں نے نہ صرف میری معاونت فرمائی بلکہ میری مدد کرتے رہے۔ سب سے پہلے میں اپنے محترم گل فراز صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد محترم عمران قریشی (نئے افق کراچی) کا۔ میرے دوست، بھائی اور محسن ملک محمد حسین، جناب ضیاء الرحمن ضیاء صاحب، جناب حکیم محمد اقبال۔ جناب حافظ محمد عباس (لعل بابا)۔ حافظ محمد اصغر اور وہ خاک نشین جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، اپنی شریک حیات کا، اپنے بچوں سمن فاطمہ، احمد بلال، احمد جمال، عائزہ فاطمہ کا جن کا وقت میں نے لیا۔

امجد جاوید

amjadhsp@yahoo.com

رونا لڈ وکٹر بورڈ لے یورپ کے مشہور یورپی مصنف اور سفر نامہ نگار تھے۔ بورڈ لے نے اپنی زندگی کا کافی عرصہ صحرا میں گزارا۔ اپنی ایک کتاب میں انہوں نے ایک بہت اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب صحرا میں شدید طوفان آیا، سخت گرمی کے دن تھے۔ آگ برساتی لو چلنے لگی یوں لگتا تھا جیسے کسی شیشے کے کمرے میں پوری شدت سے دیکھتے کسی آتش دان کے سامنے آدمی کھڑا ہو۔ جب دیواریں بھی آتش دان کی طرح دھکنے لگیں اور سانس لینا تک دشوار ہو جائے۔ بورڈ لے کو محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے سر کے بال لو کی حدت سے پکھل جائیں گے۔ تین دن تک شدید آندھی کا طوفان رہا۔ ایسی تباہ کن حالت میں جب بورڈ لے اپنے ہوش و حواس کھو رہا تھا، مقامی عرب مطمئن رہے۔ وہ ایک ہی لفظ دہراتے ”مکتوب“ (یہ لکھا ہوا ہے)

مجھے یہ واقعہ امجد جاوید صاحب کا ”قلندر ذات“ پڑھ کر یاد آیا۔ قسمت کا لکھا کس طرح ہو کر رہتا ہے۔ کس طرح تقدیر ہاتھ پکڑ کر ذات کے ایک قلندر کو مقام قلندر سے قریب کرنا چاہتی ہے۔ ڈیزائن آف نیچر کس طرح گھیر گھا کر انسان کو اس کی Destniy سے ملا دیتا ہے۔

ایسے ہی اچھوتے خیال، انہوں نے کرداروں اور حیران کن واقعات پر ”قلندر ذات“ مشتمل۔ جزئیات اور منظر نگاری کمال ہے تو کردار نگاری بے مثال۔ ”قلندر ذات“ میں سب کچھ اتنا حقیقی لگتا ہے جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ اور ہم خود بھی اس کا حصہ ہوں۔ کہانی کا باریکی سے بنا گیا تانا بانا مصنف کے علم کی وسعت اور گہرائی کا مظہر ہے۔ ”قلندر ذات“ حقیقت اور سچائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اندر کی آنکھ کھولتا ہے۔ بتاتا ہے کہ عشق حقیقی کو اپنی منزل سمجھنے والا ایک شخص کس طرح ملامت کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کی ساری رنگینیوں سے اپنے نفس کو بچاتے ہوئے منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ دعا ہے کہ درویش صفت امجد جاوید صاحب کی بندے کو اللہ سے جوڑنے والی ایسی تحریریں ان کے لئے وسیلہ قرب الہی، درجات کی بلندی اور زاوِ آخرت بن جائیں۔

رخسانہ بشیر
ریڈیو پاکستان لاہور

میں شاہ جمال کے علاقے سے نکل کر علامہ اقبال ٹاؤن کی جانب چل پڑا تھا۔ ٹریفک کا رش کافی زیادہ تھا۔ میرے اندر اضطراب نہیں تھا، اس لیے میں بڑے سکون سے ڈرائیونگ کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ پر ایک خاص طرح کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ میں اسی کیفیت کا مزہ لے رہا تھا۔ میں ولید کے گھر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کار روکتا، میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ اروند سنگھ کی کال تھی۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”جی، بولو، اروند کیسے ہو؟“ میں نے کہا ہی تھا کہ وہ پر جوش لہجے میں بولا۔

”میں نے اور فہیم نے اسے تلاش کر لیا ہے۔ وہ لاہور ہی میں کہیں ہے، وہیں ملے گا۔“

”کہاں ہے، کس جگہ پر؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہی اس کی تکنیک ہے، وہ حرکت میں رہتا ہے یا جو کچھ بھی وہ کرتا ہے۔ اس کا سیل فون حرکت میں ہے، اس کی جو لوکیشن دوسرے ملکوں سے ملتی تھی، سادہ سی بات ہے کہ وہ یہاں سے کال کرتا تھا اور کوئی دوسری جگہ سے اور اسی سافٹ ویئر سے کام لیتے تھے۔ بہر حال ذرا سی محنت سے وہ پکڑا جاسکتا ہے۔“ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا

”لیکن ایک بات ہے اروند، وہ مجھے کیسے تلاش کر لیا کرتا تھا، میری لوکیشن کے بارے میں وہ پوری طرح باخبر رہتا تھا۔ لیکن ایک خاص وقت سے وہ مجھے تلاش نہیں کر پا رہا ہے، یہ کیا راز ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ممکن ہے اسے پکڑنے کے بعد اسی سے پتہ چل جائے۔“ وہ قدرے مایوسانہ انداز میں بولا تو میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرو اروند۔! یہ راز بھی مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ لیکن اس وقت میں بتا نہیں پاؤں گا کیونکہ یہ سمجھانے والی بات ہے اور میں روڈ پر ہوں۔“

”کیا آپ اسے ابھی تلاش نہیں کریں گے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ابھی نہیں، میں ابھی اس کے ساتھ تھوڑا کھینا چاہتا ہوں۔ کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ تم پریشان نہیں ہونا، اس ہائیکٹ پر کام جاری رکھو، ممکن ہے اس سے بھی کسی مشکل اور جدید صورت حال سے ہمیں واسطہ پڑسکتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا

”یہ ہمارے ذہن میں پہلے ہی سے ہے، ہم اس پر کام کر رہے ہیں۔“ اس نے خوش کن لہجے میں کہا تو ہم نے چند الدوامی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

میں ولید کے گیٹ پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی۔ منٹوں میں گیٹ کھل گیا اور میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ ہمارے درمیان باتیں چلنے لگیں۔ وہ اپنی کوششوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ایسے ہی کافی وقت بیت گیا۔ اس دوران میں نے اس کے ذمے چند کام لگائے اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ میں کچھ اور ہی سوچ کر اس کے پاس گیا تھا لیکن مجھے وہ ساری باتیں بھول گئی تھیں۔ شاید میں وہ ساری باتیں کر لیتا اگر شاہ جمال میں مجھے وہ بابا جی نہ ملتے اور میں انکی باتیں نہ سن لیتا۔ اور دوسرا سندھپ وغیرہ کی وجہ سے اچانک حالات بدل گئے تھے۔ کیونکہ اب مجھے یقین تھا کہ کچھ بہت الگ سا ہونے والا ہے۔ میرا رخ واپس ماڈل ٹاؤن کی طرف تھا۔

☆.....☆.....☆

گھوڑ تھانے کی حوالات میں جہاں کو بند کر دیا گیا تھا۔ وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ کافی وقت گزر گیا لیکن دوبارہ کوئی اسے پوچھنے کے لیے بھی نہیں پلٹا تھا۔ وہ ایک چٹائی پر بڑے سکون سے لیٹ گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی گرفتاری کی خبر نون کوور کو ہو گئی ہوگی۔ باقی وہ سب دیکھ لے گی۔ اسے اے سی پی کا چہرہ یاد آ رہا تھا، جہاں غضب کا شہنشاہ تھا۔ جہاں کو صرف یہی دکھ تھا کہ وہ اسے خود گھوڑ تھانے میں بلا کر جو چاہے بات کرتا، لیکن یوں گھر پر چھاپ مار کر اسے اور انوجیت کو ذلیل کرنے کی جو اس نے کوشش کی تھی، وہ اسے بڑی کھل رہی تھی۔ وہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کرنا کیا ہے؟ اس کی سزا تو اسے ملنی ہی چاہئے تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد اسے لگا جیسے تھانے میں ایک دم سے کرفیو لگا دیا گیا ہو۔ سارے بیرونی دروازے بند کر دیئے گئے۔ جو جہاں تھا اسے وہیں روک دیا گیا۔ ایک ہلچل سی ہوئی اور پھر اسی ہلچل میں اے سی پی کے ساتھ چند لوگ حوالات کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اے سی پی کے چہرے پر اب تنہے سے زیادہ غصہ اور نفرت تھی۔ اس نے اشارہ کیا اور ایک بندے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دو بندے اندر گئے اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جہاں بڑے سکون سے اٹھ گیا۔

”چلو باہر۔“ ایک نے غراتے ہوئے کہا تو جہاں چل پڑا۔ وہ اسے حوالات سے نکال کر اندر کی جانب ایک کمرے میں لے گئے، جہاں ایک مدقوق سازد بلب روشن تھا۔ اے سی پی کے علاوہ وہاں پر چھ لوگ تھے۔ جیسے ہی وہ سارے اندر داخل ہوئے باہر کا دروازہ لگا دیا گیا۔ جہاں ان سب میں گھرا کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے اسے تولنے والی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر اے سی پی آگے بڑھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹک کی نوک سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی اور غضب ناک انداز میں بولا۔

”گنجد رسنگ ہمارا بہت اچھا دوست تھا۔ اسے چاہے جس نے بھی قتل کیا، لیکن اس کے قتل کے ذمے دار تم ہو، بولو، کیسے قتل کروایا اسے اور وہ لوگ کون تھے۔“

”میں نہیں جانتا وہ.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو اے سی پی نے اس کی بات کا نٹے ہوئے کہا۔

”مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں سننا، جو میں نے پوچھا ہے، ورنہ تم جانتے ہو کہ یہ لوگ یہاں پر کیوں کھڑے ہیں، دس منٹ بھی تم انہیں برداشت نہیں کر پاؤ گے۔ سمجھ تم؟“

”اے سی پی! وہی کہو، جو تم کہہ سکتے ہو، اپنے آپ سے زیادہ باتیں مت کرو۔ میں نے اگر گنجد رو قتل کیا ہوتا تو

صاف کہہ دیتا کہ میں نے ہی قتل کیا ہے اسے لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا تو نہیں کیا۔ تم دس منٹ کیا، دس دن بھی لگے رہو۔ تم وہ کچھ نہیں منوا سکتے جو تم چاہتے ہو۔“ جہاں نے بڑے سکون سے کہا۔

”تم ایسے نہیں مانو گے میں.....“ اس نے کہنا چاہا تو جہاں نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔

”اور ایک بات اور سن اے سی پی، مجھ پر اگر تم تشدد کرنا چاہتے ہو تو ایک بار پھر سوچ لینا، گنجد رے تمہاری دوستی تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں کتنی مہنگی پڑتی ہے۔“ اے سی پی نے کہا اور اپنے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ ایک دم اس پر ہل پڑے۔ فطری طور پر جہاں نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن وہ ایک تھا اور دوسری طرف چھ لوگ۔ انہوں نے چند منٹوں ہی میں اسے دھنک کر رکھ دیا۔ جہاں کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ گال کے قریب سے جلد بھی پھٹ گئی تھی۔ ایسے میں ایک گھونٹہ اس کے دائیں شانے کے پاس گردن کے قریب لگا۔ جس سے اسے یوں لگا جیسے سانس بند ہو رہا ہو۔ ایسے ہی وقت میں جہاں کا دماغ پھر گیا۔ اسے اپنے سامنے ایک گرائڈیل جوان دکھائی دیا جو اسے مارنے کو آگے بڑھا تھا، جہاں نے ذرا سا جھک کر پوری قوت سے پیچ اس کی ناک پر مارا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹک گیا، جب تک جہاں اچھلا اور ایک زوردار نگر اس کی ناک پر پھر ماری۔ وہ اپنی ناک پکڑ کر پلٹ گیا۔ اس وقت تک ایک شخص نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑا، پھر پوری قوت سے اپنی جانب کھینچا، فطری طور پر سامنے والے نے اپنی جانب زور لگایا۔ جہاں نے ذرا سی ڈھیل دی وہ پیچھے ہٹا، جہاں اپنے دونوں پاؤں پر اچھلا اور پاؤں اس کی چھاتی پر رکھ دیئے۔ یہ بڑا خطرناک داؤ تھا سامنے والا ایک دم سے چیخ اٹھا۔ اس کا بازو کل گیا تھا۔

”رک جاؤ۔“ ایک دم سے اے سی پی نے چیختے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنا ریوالور نکال لیا۔ اس کے مارے ماتحت ایک دم سے یوں رک گئے جیسے مشین کا بٹن دبایا گیا ہو۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے تو اس پر جہاں مسکرا دیا۔ پھر انتہائی طنزیہ لہجے میں بولا۔

”ابھی سے بس ہو گئی تمہاری۔“

”نیچے بیٹھو، فوراً، ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ سمجھ گیا ہو کہ یہ چھ بندے اس کے لیے ناکافی ہیں۔ جہاں نے اے سی پی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یوں جھکا جیسے بیٹھے لگا ہو، لیکن وہ بیٹھا نہیں بلکہ آنا فانا اس لے اوپر جا پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ریوالور پر ہی ڈالا تھا۔ پھر لڑھکتا ہوا دور جا کھڑا ہوا۔ اس نے انتہائی سرعت سے میگزین دیکھا۔ اس میں گولیاں تھیں۔

”اب بولو، کس نے پہلے مرنا ہے؟“ جہاں نے غراتے ہوئے پوچھا تو اے سی پی نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

”تم اس سروں ریوالور کو اپنے ہاتھ.....“

”بکواس بند کرو اے سی پی۔ میں نے تمہیں شرافت کی زبان سمجھانا چاہا تھا لیکن تم نہیں سمجھو۔ اب میں تمہیں نانا ہوں کہ بد معاشی کیا ہوتی ہے۔“ جہاں نے کہا ہی تھا کہ اے سی پی کی فون بج اٹھا۔ اس نے جیب سے فون نکالنا چاہا مگر جہاں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ رک گیا۔ جہاں آگے بڑھا۔ اس نے جیب سے فون نکالا اور فال ریسیو کرتے ہوئے اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ پھر اے سی پی کو بولنے کا اشارہ کیا۔

”بولو۔ کیا بات ہے۔“

”سر جلدی سے آفس میں آجائیں۔“ دوسری طرف اس کا کوئی ماتحت انتہائی گھبرائے انداز میں بولا تھا۔
 ”ہوا کیا ہے اور تو ایسے کیوں بول رہا ہے؟“ اے سی پی نے جلدی سے پوچھا۔
 ”سر! باہر سے خبر آئی ہے کہ ایک بڑا جلوس تھانے کی طرف آرہا ہے لوگ بھرے ہوئے ہیں، سراتنا عملہ نہیں ہے کہ ہم انہیں روک سکیں یا پھر جو کرنا ہے، بتائیں ہمیں۔“ ماتحت نے تیزی سے کہا۔
 ”کون لوگ ہیں؟“ اے سی پی نے پوچھا۔
 ”وہ بی امیدوار انوجیت ہے، جس کا بندہ ہم پکڑ کر لائے ہیں، اس کی پارٹی کے لوگ ہیں۔“ ماتحت نے مشینی انداز میں کہا۔

”اوہ! دروازے مت کھولنا۔ میں آتا ہوں۔“ اے سی پی نے کہا۔ جہاں نے فون بند کر دیا۔ اے سی پی نے بے چارگی سے اسے دیکھا اور پھر بولا۔
 ”جو ہوتا تھا سو ہو گیا، میں اب.....“
 ”تم نے کچھ بھی نہیں کرنا، جو کرنا ہے، وہ اب میں ہی کروں گا۔ کھولو دروازہ، چلو باہر۔“ جہاں نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔ اے سی پی نے اپنے ایک ماتحت کو دروازہ کھولنے کا کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اس نے کہا۔

”اے سی پی! میں یہیں ہوں۔ تم اپنے لوگوں کو لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ۔“
 ”دیکھو، جب میں نے کہہ دیا ہے کہ جو تم کو گت کرے وہی کروں گا تو پھر اب تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔“ اے سی پی نے صلح جو انداز میں کہا۔

”نہیں اب جو کرنا ہے، وہ میں نے ہی کرنا ہے۔ میں جیسا کہوں، ویسا کرو۔“ جہاں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ریوالور تان لیا۔ اے سی پی نے سب کو باہر آ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سب چلے گئے۔ آخر میں وہ نکلا، جس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، جہاں نے اسے قریب بلایا اور اس سے کہا۔
 ”اپنا منہ میرے کپڑوں سے پونچھو، تاکہ تیرا سارا خون میرے کپڑوں کو لگ جائے۔ جلدی کرو،“
 اگلے چند لمحوں میں جہاں کے کپڑوں پر تازہ خون کے بڑے بڑے دھبے لگ گئے۔ جہاں نے ریوالور کی پھر کی سے گولیاں نکالیں اور خالی ریوالور تھماتے ہوئے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ ریوالور لے کر باہر چلا گیا۔
 جہاں نے گولیاں ایک کونے میں پھینک دیں اور وہیں رک کر ان سب کو دیکھنے لگا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ باہر کہیں شور ہونے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد مین گیٹ بجایا جانے لگا، جو اس سے کافی دور تھا۔ باہر دھا چو کڑی مچ چکی تھی۔ لوگوں کا شور، نعرہ بازی، ڈنڈوں اور پتھروں سے گیٹ کو بجایا جا رہا تھا۔ باہر ہنگامہ بڑھنے لگا تھا۔ جہاں کو پوری طرح احساس تھا کہ اگر اے سی پی رد عمل کے طور پر کوئی کارروائی کرے گا تو معاملہ بڑھ جائے گا اور قوی سطح پر بات جائے گی۔ ایکشن کے ان دنوں میں بات ویسے ہی بڑھ جاتی ہے۔ اگر حکمت عملی سے کام لے گا تو ممکن ہے اس کی بچت ہو جائے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اے سی پی دوسرے آپشن ہی کو لے۔

کافی دیر تک یہی ہنگامہ چلتا رہا۔ پھر ایک دم سے سکون ہو گیا۔ اس نے دروازے کی جھری میں سے باہر دیکھا، کارڈرو میں چند آدمی تیزی سے اندر کی جانب آرہے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس کے لوگ تھے۔ جیسے ہی وہ قریب آئے، جہاں ادھ موا سا ہو کر فرش پر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے اس پر بے پناہ تشدد ہوا ہو۔ چند ہی لمحوں میں لوگ اس تک پہنچ گئے۔ ان میں سب سے آگے بلدیو سنگھ تھا۔ باقی لوگ اسے جلدی

ہلدی اٹھانے لگے۔ پولیس اس کی تصویریں بنانے لگا۔ وہ سب اسے اے سی پی کے آفس کے سامنے لے گئے۔
 وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ تھانے کا عملہ کسی چور دروازہ سے فرار ہو چکا ہے۔ چند سپاہی وہیں موجود تھے، جو بلاشبہ بہے ہوئے تھے۔

”وہ آپ پر تشدد کر کے کیا منوانا چاہ رہے تھے؟“ کسی صحافی نے جہاں سے سوال کیا تو وہ کراہتے ہوئے بولا۔
 ”وہ مجھ سے منوارہے تھے کہ میں نے مجبور سنگھ کا قتل کیا ہے، حالانکہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ تھا۔
 میرا مجبور سنگھ کے ساتھ کوئی ذاتی اختلاف تک نہیں تھا، وہ براہ راست میرے گاؤں کی ایک لڑکی کے اغوا کا ذمے دار تھا۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ پولیس ایسا کیوں کر رہی ہے؟“ کسی دوسرے صحافی نے سوال کیا تو وہ بولا۔
 ”ظاہر ہے، ہم یہ ایکشن لڑ رہے ہیں، کچھ قوتیں چاہتی ہیں کہ ایکشن سے پہلے ہی ہمیں ان الجھنوں میں ڈال دیں تاکہ ہم ایکشن نہ جیت سکیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مخالفین ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم ایکشن لڑیں گے، غریبوں کا اسی طرح ساتھ دیتے رہیں گے اور دابگردی مہر کے ساتھ یہ ایکشن جیتیں گے۔“
 ”آپ کے وہ مخالفین کون ہو سکتے ہیں؟ کیا بتا سکیں گے؟“ ایک خاتون صحافی نے معلومات چاہی، جس پر اس نے اپنا سرٹفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میں ایسا کوئی نام ابھی نہیں لوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ مخالفین اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ سب کچھ حوام کے سامنے آ جائے گا۔“
 ”آپ کی حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ پولیس نے آپ پر بہت زیادہ تشدد کیا ہے؟“ پولیس کی طرف سے ایک صحافی نے پوچھا۔

”آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں، مجھے میرے گھر سے یوں اٹھایا گیا، جیسے مجھے اغوا کیا جا رہا ہو اور یہاں لا کر تشدد کیا گیا۔ آپ سب لوگ نہ آتے تو نجانبے یہ میری کیا حالت کرتے۔“ جہاں نے کہا ہی تھا کہ جلوس میں کھڑے لوگوں نے شدت سے نعرہ بازی شروع کر دی۔ بلدیو سنگھ سب سے آگے تھا۔ وہ بالکل وہی کردار ادا کر رہا تھا جو غصہ والے کرتے ہیں۔ یعنی کسی بھی جلوس کو ہنگامے پر اکسانا، اپنی مرضی سے موڑنا، اور منتشر کرنے میں اپنے خاص ہتھکنڈے آزمانا، وغیرہ۔ جہاں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تھانے میں مزید ہنگامہ آرائی ہو۔ اس نے نگاہوں ہی لگا ہوں میں بلدیو سنگھ اور کرن کوڑ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب بس کریں۔ لیکن وہ سمجھے نہیں یا جان بوجھ کر ایسا کرتے گئے۔ انہوں نے اے ایس پی کے آفس پر دھاوا بول دیا۔ یہ ایسا وقت تھا، جس میں لوگوں کے جذبات کو کنٹرول کرنا بہت ضروری تھا۔ اگر چہ بھڑکے ہوئے ہجوم کو قابو کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن یہی وہ وقت ہوتا ہے، جب کسی کی قائدانہ صلاحیتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ یا تو لیڈر کمزور ہوتا ہے یا پھر وہ بذات خود ایسی ہنگامہ آرائی چاہ رہا ہوتا ہے۔ جہاں حیران تھا کہ بلدیو سنگھ اچھا بھلا سمجھ دار ہے، ایسا کیوں کر رہا ہے۔ تبھی اسے انوجیت دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے۔ اس نے آتے ہی ہنگامہ کرنے والوں کو رک جانے کا کہا۔ وہ سبھی ایک دم سے رک گئے۔ جہاں سمجھ گیا کہ پلان کیا بنا تھا۔ انوجیت ان لوگوں سے مخاطب ہو کر نہایت جذباتی تقریر کرنے لگا۔ اہلہ ایسے وقت میں بلدیو سنگھ اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جہاں کے پاس آ کر یوں سہارا دیا جیسے وہ بہت زیادہ زخمی ہے۔ اس نے زور زور سے ہنسی کا نعرہ لگایا۔

”ہرے ہو جاؤ، جلدی ہو، جہاں جی کو اسپتال لے کر جانا ہے، جلدی سے ہٹ جاؤ۔“

لوگ پرے پرے ہونے لگے۔ کچھ اسے کارٹک لے جانے میں مدد دینے لگے۔ یوں چند منٹوں میں وہ ایک کار کی پچھلی نشست پر تھا۔ وہ اسے لے کر جلدی سے چل دیے۔ جہاں نے ایک نگاہ دیکھا، انوجیت اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ککودر اسپتال میں تھے۔ جلد ہی وہاں کے عملے کو پتہ چل گیا کہ مریض کون ہے۔ ڈاکٹر ز سے لے کر وارڈ بوائے تک اس کے آگے پیچھے ہو گئے۔ وہ اسے فوراً امیر جنسی میں لے گئے۔ ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر اسے دیکھنے لگا۔ چیک اپ کے بعد اس نے کہا۔
”انہیں زیادہ چوبیس نہیں.....“

”انہیں بہت زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔“ بلدیوسنگھ نے اس ڈاکٹر کی بات قطع کرتے ہوئے پھل بھی نکال لیا۔ ڈاکٹر نے ایک نگاہ اسے، پھر پھل اور اس کے بعد جہاں کو دیکھ کر طویل سانس لی اور بولا۔
”ٹھیک، یہ بہت زیادہ زخمی ہے۔ انہیں ابھی انڈر آبزوریشن رہنے دیں۔ میں پوری طرح چیک اپ کے بعد کوئی رائے دوں گا۔“

”جی، یہ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، ہم آپ کے بہت زیادہ شکر گزار ہیں۔“ بلدیوسنگھ نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ جہاں کو سمجھ آ رہی تھی کہ وہ کیا ڈرامہ کرنے جا رہا تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اسپتال کے باہر شور مچ گیا۔ بیورو کرہی کے کئی لوگ وہاں آ گئے تھے۔ پولیس کمشنر انہیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ انہوں نے آتے ہی ڈاکٹر سے مریض کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر نے گول مول سا جواب دے دیا۔ جیسے ہی وہ سب لوگ جہاں کی طرف آئے، بلدیوسنگھ راستے میں کھڑا ہو گیا۔

”کیا چاہتے ہیں آپ، اب کیا دیکھنے آئے ہیں آپ کہ یہ مرا نہیں، ابھی زندہ ہے۔ آپ لوگ ہماری پارٹی کے لوگوں کو ایسے ختم نہیں کر سکتے۔ یہ پولیس گردی کب تک ہمارے سروں پر مسلط رہے گی؟“
”دیکھیں۔! آپ شانت رہیں، ہم اس سارے معاملے کو دیکھ رہے ہیں، جو بھی اس میں قصور وار ہوا، اسے ضرور سزا ملے گی۔“ ایک آفیسر نے بڑے ٹھنڈے انداز میں کسی بھی بات کا برا نہ مناتے ہوئے کہا۔

”مخالفین کیا سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ جیت جائیں گے، کیا انہوں نے پولیس کو خرید لیا ہے؟ ہم عوام کو تو یہی تاثر مل رہا ہے۔ کسی کو جس وقت چاہیں اس کے گھر سے اٹھالیا جائے۔ یہ کیا ہے؟“ بلدیوسنگھ کسی جذباتی سیاسی ورکر کی طرح انتہائی غصے میں بول رہا تھا۔

”دیکھیں، ہم کہہ رہے ہیں کہ ہم معاملے کی جانچ کر رہے ہیں اور.....“ اسی آفیسر نے کہنا چاہا تو وہ اس نے بات مکمل نہ ہونے دی اور کہا۔

”اب بھی جانچ کی ضرورت ہے، یہ سامنے پڑا ہے بندہ، کسی بھی وقت موت کے منہ میں جا سکتا ہے، اب تو ہمیں یہ ڈر ہے کہ یہ اسپتال والے آپ لوگوں کے ساتھ نڈل جائیں، ہم اپنے مریض کو یہاں رکھنا ہی نہیں چاہتے، ہم اسے ابھی لے جائیں گے۔“ بلدیوسنگھ نے کہا اور آفیسر کی بات سنے بغیر جہاں کو اٹھانے لگا۔ اس کے ساتھ کئی لوگ آگے بڑھے اور جہاں کو پھر سے اٹھا کر کار میں ڈال دیا گیا۔ بلدیوسنگھ کی جگہ اب کچھ دوسرے لوگ تھے جو ان آفیسروں کے ساتھ جھگڑ رہے تھے۔

”یار اب بس کرو، اب کیا کرنا ہے ہنگامہ کر کے۔“ جہاں نے آہستگی سے بلدیوسنگھ کو کہا۔

”ہمارا کام اب ختم ہے، ہم جا رہے ہیں گھر، ابھی انوجیت آکر ان پر احسان کرے گا، اور اس اے سی پی کے

اسے میں جانکاری چاہے گا، تو اب چل آرام کر، وہ دیکھ آگیا، انوجیت۔“ اس نے کہا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دور آ جانے کے بعد جہاں نے پوچھا۔

”یہ سب کیا تھا، اتنی جلدی؟“

”ابھی تو ٹیم شروع ہوا ہے پیارے، اسے سیاست کہتے ہیں۔ ڈرامہ، ڈرامہ کرنا ہوگا، ڈگڈگی نہیں بجے گی تو لوگ مایوس نہیں ہوں گے۔ پورے حلقے میں اب تیرے حوالے سے انوجیت کی بات ہوگی۔ تو اب سکون سے دودن آرام کر۔“

”اور تم؟“ جہاں نے پوچھا۔

”مجھے ابھی بہت کام ہیں ککودر میں۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور سے رکنے کو کہا اور رکتے رکتے بولا۔

”اور ہاں، گھر پہنچتے ہی تجھے ایک نئی خبر ملے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ سنے بغیر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دروازہ لے دیا۔ جہاں نے سکون سے ٹیک لگائی۔ کار اوگی پنڈ کی طرف دوڑے چلی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

میں ماڈل ٹاؤن پہنچا تو اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے گیٹ پر گاڑی روکی تو فوراً ہی ایک بندہ سامنے آگیا، مجھے پہچان کر گیٹ کھول دیا۔ جب تک میں نے پورچ میں کار لگائی، اس وقت تک دو بندے میرے سامنے آ گئے۔ انہی میں سے ان سے پوچھا۔

”خیر تو ہے؟“

”جی بالکل خیر ہے۔“ ایک نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں اندر کی جانب بڑھ گیا۔

رائٹنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ سامنے ہی بانٹیا کور کا کمرہ تھا۔ میں اس کے انٹرنے جا کھڑا ہوا تو اندر سے قہقہوں کی آوازیں آئیں۔ میں نے دروازہ ہلکا سا بجایا اور اس کے ساتھ ہی اندر چلا گیا۔ بانٹیا اور سندپ ایک ہی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کا موڈ انتہائی خوشگوار لگ رہا تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے میں نے کہا۔

”ہاں تم دونوں کو دیکھ کر مجھے اچھا لگا۔“

”میں نے سوچا لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے سکون سے رہنا ہی بہتر ہے۔“ بانٹیا کور نے ایک خاص ادا سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اتنی شانتی کس لیے دکھا رہی۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اندر آنے کے ساتھ ہی سندپ کور جو چہچہا رہی تھی، ایک دم سے خاموش ہو گئی تھی، جیسے اس پر نشہ چھا گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ایسا اسی مہک ہی کی وجہ سے ہے جو میرے بدن سے پھوٹ رہی تھی۔

”تو بڑی اچھی بات ہے۔ خیر کھانے کا کیا پروگرام ہے، کچھ بنوایا تم نے؟“ میں نے بانٹیا کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بولی۔

”نہیں، کچھ بھی نہیں۔ ابھی بنوا لیتے ہیں یا باہر سے منگوا لیتے ہیں۔“ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں نہیں باہر سے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”نہیں مجھے یہاں کے ریسٹوران راس نہیں ہیں، کوئی نہ کوئی پھنسا ہوا جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔ دراصل وہ سندپ پر اعتماد نہیں کر رہی تھی۔ اسے اگر باہر لے جاتے اور وہ کہیں

لگتی یا پھر ہماری دسترس سے نکل جاتی تو خواہ مخواہ تماشہ بننے والی بات تھی۔

”چلو پھر باہر ہی سے منگوا لیتے ہیں۔“ میں یہ کہہ کر اٹھنے لگا تھا کہ طارق نذیر کا فون آگیا۔

”سر، میں آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔“

”خیریت ہے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”مجھے آپ سے دو باتیں ڈکس کرنا ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے پوچھا۔

”بتاؤ، کہاں آتا ہے؟“

”آپ باہر نکلیں، میں روڈ پر ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

”خیریت ہے؟“ بانٹا کور نے پوچھا۔

”خیر ہی ہے۔“ میں نے کہا اور باہر کی سمت چلا گیا۔ میں نیچے آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی دو بندے سامنے آ گئے۔

میں باہر آگیا۔ انہیں کھانا لانے کا کہا اور باہر سڑک پر آگیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کار کھڑی تھی۔ میں محتاط انداز میں اس جانب بڑھ گیا۔ میں کار کے قریب گیا تو نذیر طارق سامنے آگیا۔ میں اس کے ساتھ کار میں جا بیٹھا تو میرے بیٹھے ہی وہ چل پڑا۔

”سر جی۔! آپ کا خیال ٹھیک تھا کہ میں نیجر کے بیٹے کو دوبارہ سے دیکھ لوں۔ وہ تو بڑی شے نکلا ہے۔“

”کیا شے نکلا ہے وہ؟“ میں تجسس سے پوچھا۔

”اس کا نام صفدر ہے۔ وہ یہاں پر موجود بھارتی نیٹ ورک کا ایک بہت ہی اہم رکن ہے۔ جتنی بھی کہانی نیجر

نے سنائی وہ سب جھوٹ تھا۔“ نذیر طارق نے کہا۔

”مجھے بھی یہی لگا تھا“ میں نے سکون سے کہا۔

”اصل میں جس وقت آپ لوگ فیکٹری میں آئے تھے، اس وقت یہ نیجر کا بیٹا وہیں اتفاق سے اپنے باپ کے پاس تھا۔ اسے اس وقت تھوڑا شک تو ہوا لیکن وہ اپنے باپ کے ساتھ چلا گیا۔ باپ کو گھر چھوڑ کر وہ واپس فیکٹری آ یا۔ اس وقت تک آپ جا چکے تھے۔ انہیں الطاف گجر سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں تک پہنچنا چاہتے تھے، جنہوں نے اسے اغوا کیا اور ان کا سارا سیٹ اپ توڑ دیا۔ اسی لڑکے نے آپ کے دونوں لڑکوں کا چھپا کیا اور گھر تک پہنچا۔ شاید آپ کو یاد ہو، جب آپ کے گھر پر حملہ ہوا تھا، اس سے ذرا دیر پہلے دو لوگ بائیک پر آئے، یہ ان میں سے ایک تھا۔ باقی جو بھی بیان دیا گیا، جو کچھ کہا گیا۔ وہ سارا ڈرامہ تھا۔“ وہ تفصیل بتا کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”اب کہاں ہے وہ؟“

”میں نے اسے پکڑ لیا ہے اور میرے پاس بند ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”اور دوسری بات تم نے کیا بتانا تھی؟“

”یہ جو سندھپ کے ساتھ لڑکا پکڑا گیا ہے یہ بھی اسی گروہ کا ہے۔ سندھپ کے سوا باقی سب مقامی ہیں۔“ اس نے کافی حد تک جوش سے کہا جیسے وہ کوئی بڑی اہم بات بتانے جا رہا ہو۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا۔“ میں نے کہا تو اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”شک..... کیسے اور کیوں؟“

”تم نے کبھی سمندر دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، کئی بار۔“ اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک لہر ساحل کی طرف آتی ہے، وہ ساحل سے ٹکرا کر ختم ہو جاتی ہے، پھر دوسری آتی ہے، اس دوران صرف والد ہوتا ہے۔ جب ایک لہر آتی ہے تو وہ ایک ہی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ جو دشمن کی لہر ہے نا، یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک لہر کی مانند ہیں، کچھ عرصہ بعد ان کا یہ پلان ختم ہو جائے گا، تب ایک نیا پلان ہوگا۔ اس وقت لاہور اور اس کے گرد و نواح میں یہ سب چل رہا ہے۔“ میں نے اسے تفصیل سے بتایا۔

”تو پھر اسے قابو کیسے کیا جائے گا؟“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اس وقت تک نہیں، جب تک اس کا سرغ نہ نہیں پکڑا جاتا، یا وہ مقامی بندہ جو انہیں پینڈل کر رہا ہے۔ صرف اے ہمارے ہاتھ لگنا ہے، تب یہ لہر بھی ختم ہو جائے گی اور سبھی ایک دم سے کھل جائیں گے۔“ میں نے ختمی انداز میں کہا تو وہ اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

”میں سمجھا تھا کہ.....“ اس نے کہنا چاہا، مگر اتنی ہی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ اس لیے تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے فوری طور پر پہلا کام یہ کرو۔ جتنے بندے پکڑے ہیں، انہیں کہیں ٹھکانے لگا دو، ختم کر دو یا پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دو۔ ان سب کے جان چھڑاؤ۔ اس کے بعد اپنے لوگوں کی ایک فورس بنا لو۔“

”فورس تو ہے سر میرے پاس، صرف چار لوگ ہیں، جان دارنے کی حد تک مخلص اور جانباز ہیں۔“ اس نے مان بے کہا۔

”بہت خوب۔“ میں نے اسے داد دیتے ہوئے کہا، پھر لہجہ بھر کر کہا۔

”جیسے ایک بھی اچھا دوست مل جائے وہ کبھی نہیں ہارتا۔“

”وہ میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں سر۔“ اس نے پھر اسی مان سے کہا تو مجھے اچھا لگا۔

”ہمارے پاس سندھپ کی صورت میں ایک بہت بڑا راز موجود ہے۔ اس کے بارے میں ڈیپارٹمنٹ کو صرف لاناؤ کہ اس سے تفتیش جاری ہے اور بس۔ تم نہیں جانتے وہ کیا چیز ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں کل صبح یہی کام کروں گا۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ہم یہی باتیں کرتے ہوئے ماڈل ان پارک کے پاس بے مختلف ریسٹوران کے پاس چلے گئے۔

”کھانا کھالیں سر، میرے خیال میں ابھی آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ دوسرا میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ سندھپ میں ایسی کیا بات ہے، آپ اس کے بارے میں کیا سمجھتے ہیں۔“ نذیر نے گھوم پھر کر اپنی ہی دلچسپی کی بات نہ تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”چلو، بیٹھو۔“ میں نے ایک ریسٹوران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے کار پارکنگ میں لگا دی۔ ہم اسے اتر کر اوپن ایریہ میں ایک کونے کی جانب بڑھ گئے۔ ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے میری طرف لہر دھیسے سے پوچھا۔

”سر وہ سندھپ؟“

”وہ بھارت کی تربیت یافتہ لڑکی ہے۔ اور اس جیسی کافی ساری لڑکیاں یہاں موجود ہیں۔ ممکن ہیں دوسرے شہر میں بھی ہوں یا اسی شہر میں۔ یہ ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے میری جان۔ انہیں تلاش کرنا ہوگا۔ کیونکہ سندھپ کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ اب اس کا نیٹ ورک کیا ہے، کیسے ہے، اصل میں ان کا ٹارگٹ کیا ہے، یہ مجھے اسی میں نہیں چلا، لیکن مجھے امید ہے کہ میں وہ کچھ حاصل کر لوں گا، کیونکہ میرے پاس بانٹا کور کی صورت میں ایک

بہت بڑا مدگار موجود ہے۔ وہ اس تلاش میں میری مدد کرے گی۔“

”کیا وہ معلوم کر پائے گی۔ اسے سچ اور جھوٹ.....“ اس نے شک کا اظہار کیا تو میں نے کہا۔

”جھوٹ سچ تو ہر ایک طرف، وہ پتہ چل جائے گا، سندھپ پر تشدد کسی بھی صورت میں کارگر نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

”اس لیے کہ اس کی تربیت ذرا مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ اور.....“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری طرف اردن سکھ تھا۔

”آپ کدھر ہو اس وقت؟“

”اے ہی باہر نکلا ہوں۔ ایک دوست کے ساتھ، خیر ہے؟“ میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ شخص، جسے ہم کئی دنوں سے تلاش کر رہے ہیں، وہ اس وقت آپ کے کہیں قریب ہے۔“ اس نے کہا تو میں نے سامنے بیٹھے ہوئے نذیر طارق کو دیکھا اور فوراً ہی بڑے محتاط انداز میں پوچھا۔

”کتنے قریب؟“

”میں حتیٰ نہیں کہہ سکتا لیکن وہ بیسے پچیس گز کی رینج میں ہے۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

”یہ تمہیں، کیسے.....“ میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”کئی دنوں سے ہم تین بندوں کی محنت ہے، یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا ہمارے لیے، آپ فون کریں اسے۔ جیسے ہی رابطہ ہوا وہ مزید کلیر ہو جائے گا۔ فوراً رابطہ کریں۔“ وہ تیزی سے بولا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون کان سے ہٹایا تو نذیر طارق نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”سرجی خیر تو ہے؟“

ایک لمحے کے لیے مجھے خود سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ مجھے یوں لگا تھا کہ جیسے یہ نذیر طارق ہی وہ شخص ہے۔ مگر جب فاصلہ میرے ذہن میں آیا تو سب صاف ہو گیا۔ میں نے ایک لمحے ہی میں خود پر قابو پایا اور اس سے پوچھا۔

”وہ جو تمہارے آدمی ہیں کہاں ہیں اس وقت؟“

”وہ پانچ منٹ کی دوری پر ہیں۔ میرے ارد گرد ہی ہیں اس وقت۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا

”انہیں بالکل قریب بلا لو۔ ممکن ہے ان کی ضرورت پڑے“ میں نے انتہائی سکون سے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور فون نکالنے لگا۔ اسی لمحے میں نے باس کے نمبر پر کال کر دی۔ ایک طرح سے رابطہ ہو گیا تھا۔ وہ فون نہیں رسیو کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ کال جاتے ہوئے ختم ہو گئی۔ میں نے پھر سے ٹرائی کیا۔ تب اس نے دوسری بیل پر فون رسیو کر لیا۔ میں اٹھا اور ایک خالی گوشے کی جانب بڑھ گیا۔

”ہیلو!“ میں نے انتہائی طنزیہ لہجے میں حان بوجھ کر کہا تا کہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

”کیسے یاد کر لیا تم نے؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ارے یار! میں نے سوچا تم نے مجھ تک کیا پہنچنا تھا، بات کرنے سے بھی گئے۔ کہاں ہو، میں تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔“ میرے یوں کہنے پر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔

”یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم بہت شارپ اور چالاک ہو، تم جس طرح مجھ سے اوجھل ہو گئے، اس کی میں داد دیتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم تک پہنچ نہیں پاؤں گا اب میں تم پر ہاتھ ڈال کر ہی میں تمہیں بتاؤں گا کہ

میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔“

”کاش تمہارا یہ خواب پورا ہو جائے۔“ میں نے اپنا طنزیہ لہجہ نہیں چھوڑا۔

”میرا یہ خواب بہت جلد حقیقت میں بدلنے والا ہے جمال، تم جتنا چاہے چھپ جاؤ، میں نے تمہیں پکڑ لینا۔“ اس نے پھر کہا۔

”ارے یہ تو مایوسی والی باتیں ہیں، خالی خولی دھمکیاں ہیں۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں تم سے خود ملنا چاہتا ہوں تو پھر عار کیوں، آؤ ملو، لیکن اب ہوگا پتہ کیا؟ تم میری بات کا جواب دینے کی بجائے یہ کہو گے کہ آواز نہیں اڑی یا فون بند کر دو گے۔“ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور خود فون بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اردن سکھ کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً ہی میری کال پک کی اور کہا۔

”میں نے آپ کو میسج بھیج دیا ہے، اس کی ڈائریکشن کیا ہے۔ وہ آپ کے پاس ہی کہیں ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا اور فوراً میسج بکس کھولا۔ اردن کا پیغام موجود تھا۔ میں نے اسے کاپی کیا اور نقشہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔

تقریباً آدھے منٹ بعد وہ جگہ میرے سامنے آ گئی۔ ایک خاص نقطے پر سرخ سپارک ہونے لگا۔ میں نے اپنے طور پر کھینے کی کوشش کی۔ وہ اسی مارکیٹ ہی کے کہیں آس پاس تھا۔ میں اس سمت بڑھنے لگا۔ اگر میں ذرا ادھر ادھر ہوتا تو وہ سپارک مدہم ہو جاتا اور سیدھ میں آ جاتا تو وہ تیز ہو جاتا۔ میں ریسٹوران سے نکل کر باہر روڑ پر آ گیا۔ اسی لمحے میرے پیچھے نذیر طارق آ گیا۔ میں ایک لمحے میں اسے بات سمجھائی تو وہ میرے ساتھ ہی اسی سمت کو سمجھنے لگا۔ میں بہت زیادہ دیر تک فون پر ٹکا ہوں جہاں کہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے فوراً گاڑی لانے کا کہا۔ وہ گاڑی لی جانب بھاگا۔ تین منٹ سے بھی کم وقت میں وہ کار لے کر میرے برابر آ گیا۔ میں پسینہ جھریٹ پر بیٹھ گیا۔ ام اس ریسٹوران سے بیس گز آگے نکلیں ہوں گے کہ سپارک تیز ہو گیا۔

اب میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کون ہوگا۔ میرے اندر دوران خون بڑھ گیا تھا۔ سنسنی میرے اندر پھیل کر اٹھ بے چین کئے ہوئے تھی۔ وہ بندہ میرے انتہائی قریب تھا اور میں اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میرا پہچان بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی، بہت سارے لوگ معصوف تھے۔ وہ ایک اوپن ایئر ریسٹوران ہی تھا۔ چھوٹے سے ہال کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں جالیاں تھیں۔ نذیر طارق اپنے لوگوں کو تیزی سے ہدایت دے رہا تھا کہ وہ کہاں پہنچیں اور انہیں کیا کرنا۔ جبکہ میری حالت بڑی عجیب رہی تھی۔ میں باس کے اتنے قریب ہو کر بھی اسے نہیں پکڑ پا رہا تھا۔ میں نے وہاں موجود ہر ایک چہرے کو دیکھنا شروع کیا، مگر مجھے کوئی بھی ایسا شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا، جس پر شک بھی کیا جاسکے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اسے دوبارہ فون کروں۔ کم از کم ان میں یہ تو تخصیص ہو جائے گی کہ جو بندہ اپنے کان کے ساتھ سیل فون لگائے ہوگا، اسے لگا ہوں گے سامنے رکھ لوں گا۔ میں نے نذیر کا فون بند کر دیا اور ہدایت دی کہ اسے کیا کرنا۔ اس نے اپنے لوگوں سے کہا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے باس کو دوبارہ کال ملائی۔ چند لمحے بعد ہی اس نے فون رسیو کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں نے لڑی سے کہا۔

”پھر فون بند کر دیا تم نے، یار اتنے ڈرپوک ہو تم؟ کیا میں فون میں سے ہاتھ باہر نکال کر تمہیں پکڑ لوں گا۔“

”فون تم نے بند کیا تھا۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”اب تم جھوٹ بھی بولو گے۔ کھیل میں جھوٹ بولنا غلط بات ہے نا۔“ میں جان بوجھ کر بات بڑھائی اور تیزی سے ہر طرف دیکھنے لگا۔ کوئی آدمی بھی مجھے ایسا دکھائی نہیں دیا، جس نے اپنے کان سے فون لگایا ہوا ہو۔ مجھے ایک دم سے حیرت ہوئی۔ میں نے نذیر طارق کو اشارہ کیا کہ وہ کار سے باہر نکلے اور ارد گرد دیکھے۔ وہ باہر نکل گیا۔ کیونکہ مجھے باہر کا شور سنائی دے رہا تھا۔ لیکن کار کے اندر بالکل خاموشی تھی۔

”کھیل تو میں میرے ساتھ کھیلوں گا، تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے اس بار غصے میں ہی کہا۔

”اب میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ آؤ، میرے ساتھ آنکھ چھوٹی نہیں سیدھے سیدھے ہاتھ میں ہاتھ ڈالو، پھر تم کیوں بھاگ رہے ہو؟“ میں نے کہا اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا میرے فون پر کال آنا شروع ہو گئی۔ وہ ارد گرد کی کال تھی۔ میں نے بجائے انتظار کروانے کے کال ہی کاٹ دی اور ارد گرد کی بات سننے لگا۔

”وہ آپ سے صرف ایک اور ڈیڑھ گز کے فاصلے پر ہے۔ آپ اسے پکڑتے کیوں نہیں؟“ اس نے جوش بھر انداز میں پوچھنے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔

”اتنے فاصلے کے درمیان آپ کے دائیں جانب۔“ اس نے اسی لمحے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ میں فون کا نقشہ نکالا۔ وہ انتہائی تیزی سے سپارک کر رہا تھا۔ میں نے فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ اور پورے غور سے اپنے ارد گرد دیکھا۔ مجھ سے تقریباً پانچ گز کے دوران نذیر طارق کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ کار کے آس پاس گنتی کے چھ آدمی تھے۔ ایک غبارے والا، دو سیورٹی گارڈ جو ریسٹوران کے میس گیٹ پر تھے۔ ایک ملنگ قسم کا نشئی سادیوار اور سڑک کے درمیان درخت کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ریزمی لگائے ناریل پانی بیچ رہا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر بچوں کے الیکٹرونک کھلونے اٹھائے بیچ رہا تھا۔ اس کے کھلونے رنگ برنگی روشنیاں نکال رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کسی کھلونے سے آوازیں بھی آنے لگیں۔ ارد گرد کے بتانے کے مطابق انہی میں سے کوئی بندہ ہو سکتا تھا۔ میں نے کال کرنے کے لیے فون اٹھایا ہی تھا کہ پھر رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ باہر کا شور میں نے کال میں سنا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تبھی میں نے باہر کا منظر اپنی آنکھوں میں جذب کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے باہر کے منظر کا تصور کیا تو چونک گیا۔

میں نے ایسا ہی منظر پہلے بھی دیکھا تھا۔ میں بادلوں میں سے ایک دم ایک شہر کی سڑک پر اترتا تھا۔ وہاں ہر شخص کا رنگ جدا تھا۔ وہ رنگ لہردی کی صورت میں اوپر کہیں جا کر تحلیل ہو جاتا تھا۔ میرے سامنے وہی چھ لوگ تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص میں سے لہریں اوپر کی جانب اٹھ رہی تھیں اور وہ تھا کھلونے بیچنے والا۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اسے دیکھا۔ وہ بے نیاز سا آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاصا جوان اور گندی رنگ والا تھا۔ اس کے نین نقش واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ لمبے قد کا وہ کافی سخت جان نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا فون اٹھایا اور نذیر طارق کو کال کی۔

”جی سر۔“ وہ فوراً بولا۔

”ادھر ادھر مت دیکھنا۔ تمہارے دائیں جانب ایک کھلونے بیچنے والا ہے، بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ اسے پکڑنا ہے۔“ میں نے تیزی سے سمجھایا

”اوکے۔“ اس نے کہا تو میں نے فون وہیں ڈیش بورڈ پر رہنے دیا۔ اپنا ہاتھل کوٹھول کر نکالا، اس کا سیلفی کیچ ہٹایا اور کار سے نیچے اتر آیا۔

میں ایک دم اس کی طرف نہیں بڑھا تھا، میں کار سے نیچے اتر اور ایک لمحے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پھر ارد گرد دیکھنے لگا۔ مجھے کسی کا انتظار ہو۔ میں نے کن آنکھوں سے کھلونے بیچنے والے پر نگاہ رکھی۔ وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ نذیر طارق ایک جانب سے بڑھ رہا تھا اور دوسری جانب سے میں، ہم قدم قدم بڑی احتیاط سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ دو قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ میں اس کے دائیں جانب تھا اور نذیر طارق سامنے کی طرف سے بڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ مجھے ایک دم سے جھٹکا لگا۔ ہسے میں نے بجلی کے شنگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھلونے پھینکے نہیں بلکہ اسی طرح سامنے سڑک کی جانب بھاگا۔ اس کے سامنے نذیر طارق آ گیا۔ اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اسے بھی جھٹکا لگا تھا۔ کیونکہ وہ بھی ایک دم سے حیرت زدہ ہو کر ساکت ہو گیا تھا۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ کھلونے بیچنے والا لڑکھڑا گیا تھا۔ میرے پاس یہی وقت تھا کہ وہ لڑکھڑا کر سیدھا ہوتا۔ یہی دوران میرے پاس تھا، ورنہ جس طرح وہ تیزی سے اٹھتا تھا، مجھے وہ چھلاوے کی طرح لگا تھا، جیسے ہی وہ سیدھا ہوتا، اس کے بعد میں شاید ہی اسے پکڑ سکتا تھا۔ میں اپنا ہاتھل نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیے۔ دونوں ہی اس کی پنڈلیوں میں لگے تھے۔ اس کی لڑکھڑاہٹ اٹھ ہو گئی، وہ جھومو اور سڑک پر جا گرا۔ میں انتہائی سرعت سے اس کے پاس جا پہنچا، مجھے یہ ڈرتھا کہ کہیں کوئی گاڑی اسے نہ پکڑ دے۔ میں نے اسے پھر ہاتھ لگایا، اس بار مجھے کرنٹ نہیں لگا تھا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑا اور اس کا سر سڑک پر دے مارا۔ شاید چوٹ زیادہ لگی تھی، وہ آدھ مٹا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔

نذیر طارق ٹائیلوں کی رسی لے آیا۔ وہ اسے باندھنے لگا۔ فائرنگ کی آواز سے بہت سارے لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔ انہی کے ساتھ نذیر طارق کے ماتحت بھی وہیں پہنچ گئے تھے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اسے لے لیا۔ ہاتھ لگا اشارہ کیا۔ اس کے دو ماتحت آگے بڑھے۔ ان دونوں نے اسے سر اور پیروں کی طرف سے پکڑا اور کار تک لے گئے۔ وہ دونوں بھی ساتھ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے اسے سیٹوں کے درمیان دالیا تھا۔ نذیر طارق ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو میں ساتھ میں بیٹھنے لگا تب میری نگاہ ان کھلونوں پر پڑی جو اب بھی سڑک میں پڑے تھے۔ میں نے ایک ماتحت کو وہ کھلونے ساتھ میں لانے کا اشارہ کیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ہمارا رخ ماڈل ٹاؤن والے گھر کی جانب تھا۔

انتہائی تیز رفتاری سے ہم ماڈل ٹاؤن جا رہے تھے۔ ہمیں گھر پہنچنے تک زیادہ سے زیادہ پانچ سے سات منٹ لگنا تھا۔ اس دوران نذیر طارق نے اپنے آفسرز کو اپنی کاروائی کے بارے میں مطلع کر دیا اور جو ضروری امداد سمجھ میں آئی وہ مانگ لی۔ ان میں ایک الیکٹرونکس انجینئر بھی تھا۔ انہیں وہاں تک پہنچنے میں کچھ وقت لگنا تھا، جبکہ اس کی پنڈلیوں پر کافی زیادہ خون بہہ رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ارد گرد کو کال کی۔

”میں اسے پکڑ کر لے جا رہا ہوں۔“ میں نے اسے اطلاع دے کر انتہائی اختصار سے باقی بھی بتا دیا۔

”جی ہاں، میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ جا رہا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ سب سے پہلے اس کا ہاتھ کاٹ لیں اور اس کی بیٹری نکال کر اسے آف کر دیں۔ وہ فون کسی صورت میں بھی کسی کو نہیں دینا۔ ہم اسے گھانا چاہیں گے۔ فہیم اور سلمان صبح ہونے سے پہلے آپ کے پاس پہنچ جائیں گے اور دوسرا اس کی تصویر ہمیں ملے گی۔“ میں سمجھ دیا، ممکن ہے اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات مل جائیں۔“ اس نے مجھے تفصیل سے

”اوکے باقی باتیں بعد میں ہم گھر پہنچ چکے ہیں۔“ میں نے اسے بتایا۔

گاڑی پوریچ میں نہیں رکی، بلکہ اسی پیچے کی طرف لے گئے جہاں سے سیدھا راستہ تہہ خانے میں جاتا تھا۔ وہی دونوں ماتحت اسے نیچے لے گئے۔ جیسے ہی اسے لٹایا گیا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا سیل فون نٹولا۔ اس نے صدری نما جیکٹ پہن رکھی تھی، جس کی اندرونی جیب میں وہ فون تھا۔ اس کے ساتھ مہین سی تاریں تھیں، جو اس کے کانوں کے ساتھ منسلک تھیں۔ بالکل کبھی کے ساز کی مانند دو نئے اسپیکر تھے۔ میں نے تاروں سمیت وہ فون اپنے قبضے میں لے لیا۔ نذیر طارق اس کے دغم دیکھنے لگا تھا۔ وہ خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ مزید گذریں ہوں گے کہ باہر کافی سارے لوگ آگئے۔ ان میں ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے آتے ہی اس کا معائنہ شروع کر دیا۔

”یہ معین صاحب ہیں، الیکٹروکلس انجینئر۔“ ایک ادیب عمرخص سے تعارف کرایا گیا۔ وہ پتلا سا تھا۔ اس نے نظر کی عینک لگائی ہوئی تھی۔ وہ میری جانب متوجہ ہوا تو میں نے اسے تفصیل بتادی۔ ساری بات سن لینے کے بعد اس نے کہا۔

”یہ جو کچھ بھی تھا، انہی کھلونوں کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔ جو بھی ہوا میں آپ کو بتا دوں گا۔“

”دھیان یہ رکھئے گا کہ بندہ جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کر رہا تھا۔ کیا کر رہا ہے، وہ ہمیں پتہ چلنا چاہئے۔“ میں نے کہا تو اس نے سر ہلایا اور کھلونوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

ہر بندہ اپنے کام کی طرف متوجہ تھا۔ میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے میں نے نذیر طارق کو بتایا اور اوپری منزل کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

جس وقت جہاں اوگی پنڈ کے نزدیک پہنچا، اس وقت سورج غروب ہو گیا تھا۔ اس نے ہر پریت کو ساری روداد فون پر بتا دی تھی۔ ایسا اس نے اس لیے کیا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ اوگی پنڈ کے لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ کھوردی کی طرف سے آ رہا ہے۔ لوگوں کا ایک جھوم اس کے راستے میں کھڑا تھا جو اس نے کافی دور سے دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی اسے فون پر معلوم ہو گیا تھا۔ وہ ان کے پاس آن رکا۔ لوگوں نے جذباتی ہو کر نعرہ بازی شروع کر دی۔ وہ کچھ دیر ان کا جوش دیکھتا رہا، پھر کار میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے مائیک پر لوگوں سے کہا۔

”مجھے اگر پکڑ کر لے گئے تھے تو اس کی صرف اور صرف یہی وجہ تھی کہ میں اپنے گاؤں کے ایک غریب بندے کے لیے لڑا، اس کے لیے آواز اٹھائی۔ یہی میرا جرم تھا۔ یہ اگر اس ملک میں جرم ہے تو میں جرم کرتا ہوں گا۔ میں نے اپنی زندگی غریبوں کے نام لگا دی ہے۔ اب دیکھو آپ لوگ اپنی طاقت، جیسے ہی سب لوگ اکٹھے ہو کر تھانے کی طرف گئے، وہ سارے پولیس والے وہاں سے بھاگ گئے۔ یاد رکھو، عوام کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا، یہ سارے افسر جو عوام پر حکم چلا رہے ہیں، یہ عوام کے ملازم ہیں، ہماری اور تم سب کے ملازم ہیں۔ یہ اگر کسی پر بھی ظلم کرتے ہیں تو انہیں پکڑو، انہیں بتاؤ کہ تم حاکم نہیں ہمارے ملازم ہو۔ آج تک جو یہاں سے اسمبلی کے رکن بنے رہے ہیں، انہوں نے عوام کو یہ سب بتایا ہی نہیں، وہ صرف اپنے مفاد کی خاطر لوگوں سے ووٹ لیتے رہے ہیں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، میں آج ہی سے بتا رہا ہوں کہ ہم نے ان حاکموں کو اپنا ملازم بنا کر رکھنا ہے۔ یہ لوگ ہماری خدمت کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ اب فیصلہ آپ لوگوں کے ہاتھ میں کہ کسے ووٹ دینا ہے اور کسے نہیں۔“ جہاں

لہ اتالی کہا اور مائیک واپس کر دیا۔ ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔

وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو وہاں بھی لوگوں کا جھوم تھا۔ وہ گیٹ کے پاس کار کو اکر کار سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے پلڑے اور چہرہ ابھی تک خون آلود تھا۔ لوگوں کی نظریں اسے تحسین سے دیکھ رہی تھیں۔ جہاں نے وہی اسے یہاں بھی کیں تو ایک بندہ بڑا جذباتی ہو کر بولا۔

”ہا ہے کچھ ہو جائے، اس بار انکیشن ہم نے جیتنا ہے۔ ہم لڑیں گے، ہم مریں گے۔ تمہارا شکر یہ جہاں کہ تو لہ امارے پنڈ کی لاج رکھی۔“

”شکر یہ میرا نہیں انوجیت سنگھ کا ادا کرو، جس نے آپ لوگوں کے لیے دن رات ایک کر دیا ہوا ہے۔ یہ تو انکیشن لہ دن پتہ چلے گا کہ تم لوگ اس کی محنتوں کا نتیجہ کیا دیتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے کار میں بیٹھ گیا۔ کار سیدھی ہا میں جا رہی۔ جہاں ہر پریت اس کے انتظار میں تھی۔

گھر کو ڈرائنگ روم میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھ کر رونے لگی۔ اس نے ہر پریت کی طرف دیکھا۔ ہر پریت نے آنکھوں سے یہی اشارہ کیا کہ بے کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ اس سے الگ ہو کر بولا۔

”پھر پوچی، میں اپنے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔“

”لہیک ہے پتر جا، پھر جلدی آ، میں نے تیرے ساتھ بیٹھ کر پرشادے شکستے ہیں۔“

پتر نے ہی جہاں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

میں ہاتھ روم سے نہا کر باہر آیا تو کمرے میں وہ مخصوص مہک پھیل گئی جو سندرلعل نے مجھے تھوڑی سی۔ اگرچہ اس نے ہاس کو پکڑ لیا تھا اور شاید اب اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن نہانے کے دوران مجھے ایک دم سے خیال آیا، کہ پھر کور سے میں نے اب تک کوئی معلومات لی ہی نہیں تھی۔ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ فقط تصدیق تھی۔ ابھی ہاتھ روم سے اٹھوانا تھا اور اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے اسے کچھ وقت دینا تھا، باقی سارا کام یہ تھا۔ لہ دیتی۔ میں اچھی طرح تیار ہوا اور پھر اپنے بیڈ پر بیٹھ کر بانٹا کور کو فون کر دیا۔

”ہا ہاتھ کھانے پینے کو ہے، کوئی بھوکا بندہ فریاد کر رہا ہے۔“ میں خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

”ہم نے تو کھانا کھا لیا ہے، باقی اٹھا کر نیچے دے دیا۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ تم اب تک بھوکے پھر رہے ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہلو، اب کچھ کرو۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”اچھا میں کچھ کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیا۔ پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولی۔

”ارے واہ، بڑے بن ٹھن کے بیٹھے ہو، کوئی خاص بات؟“

”آؤ، میرے پاس بیٹھو۔“ میں نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے ایک دم سے بڑی توجہ سے میری جانب دیکھا، پھر آنکھوں تک مسکراتے ہوئے بولی۔

”ایسا ممکن تو نہیں ہے، یقین نہیں آ رہا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آ گئی۔ تبھی میں نے کہا۔

”سندھ پ کور سے کیا کچھ پوچھا؟“ میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی، پھر ایک دم سے ہنستے ہوئے

ہلی۔

”مہرے ہارے میں کیا سوچ رہے تھے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے ناز سے پوچھا۔
 ”ایلموسندپ، میں نے جب تمہیں پہلی نگاہ میں دیکھا تھا تو یقین کرو، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی حسین لہوئیں کی سی لڑکی، کیوں اس دنیا میں چلی آئی تم، جہاں ایک معمولی سی بلی اتنے بے مثال حسن کو ختم کر کے رکھ

”ہاں، کیوں نہیں۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا اور میرے ساتھ مزید چمٹ گئی۔

دے۔ تمہارا مقام تو شہزادوں جیسا ہے، کوئی محل ہو، اور اس میں تم راج کرو۔“ میں نے از حد جذباتی لہجے میں کہا جیسے مجھے بڑا افسوس ہو رہا ہو۔

”آپ بھی خواب دیکھنے لگے ہو، دوسرے مردوں کی طرح۔“ اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مرد ہوں، ایک حسین لڑکی جو اپنے حسن میں یکتا ہو، اسے دیکھ کر کوئی خواب نہ دیکھے تو یہ حسن کی توہین ہے سندھپ۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ صرف خواب ہی نہیں ہیں میری جان، تمہیں دیکھ کر پہلی بار احساس ہوا ہے کہ تمہیں دور کہیں وادیوں میں لے جا کر چھپ جاؤں، دنیا کی نگاہوں سے دور پرے۔ جہاں صرف تم اور میں ہوں۔ اور بس۔“ میں نے کہا تو اس نے اپنا سر میرے کان دھسے پر رکھ دیا۔

”کاش میں سے پہلے مل لیتی۔ تمہیں دیکھ کر لگ رہا تھا کہ شاید تم موسم نہیں کوئی پتھر ہو، مگر تمہارا دل تو ششے کے جیسا ہے۔ میں اب سوچ رہی ہوں کاش میں اس دنیا میں نہ آتی، پھر سوچو جمال، ہم ملتے کیسے؟“ اس نے دھیمے لہجے میں سکون سے کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔“ میں نے کہا اور سامنے مجھے ایک رستوران دکھائی دے رہا تھا۔ سو میں نے فوراً میل و ہیں پارک کر دی۔ مجھے وہاں سے نکلنے کے لیے کم از کم ایک گھنٹہ درکار تھا۔ وہ وقت میں نے وہیں بتانا تھا۔

ہم سکون سے ایک میز پر جا بیٹھے تو ویٹر آگیا۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا اور سندھپ کے ساتھ باتوں میں کھو گیا۔ وہ اپنے بارے میں وہی کچھ بتانے لگی جو وہ بائیکاٹ کو پہلے بتا چکی تھی۔ میں کھانے کے دوران اس کی باتیں سنتا رہا۔ یوں میں نے وہاں ایک گھنٹہ بتا دیا۔ کھانے کے بعد ہم وہاں سے نکلے اور بظاہر یونہی آوارہ گردی پر نکلے تھے۔ لیکن میں اس طرف جارہا تھا، جہاں نذیر طارق پہنچ چکا تھا۔

وہ شہر قصور کے پاس ایک جگہ تھی۔ شہر سے پہلے ہی دائیں جانب ایک سولنگ نکلتا تھا۔ اس سے آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر ایک فارم ہاؤس قسم کا ڈیرہ تھا۔ فون وہیں رکھ دیا گیا تھا۔ میں اس سے ذرا فاصلے پر فوراً ڈیل روک کر اتر گیا۔ سامنے ایک کنواں تھا۔ اس پر ایک زرد بلب روشن تھا۔ کنواں اب ختم ہو چکا تھا لیکن وہاں بیٹھنے کو بڑی اچھی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ سندھپ بھی اتر آئی۔ ہم دونوں چلتے ہوئے اس کنواں پر چلے گئے۔ وہاں چار پائیاں اور کرسیاں دھری ہوئی تھیں۔ میں ایک چار پائی پر جا کر لیٹ گیا تو سندھپ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”تم کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے جان بوجھ کر بات چھیڑ دی۔

”بہی کہ بندہ سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ میں اس زندگی میں نہیں آتا چاہ رہی تھی، مگر آگئی۔ کیا کرتی مر جاتی۔ میں ادارے میں بھی آگئی، وہاں جو اس بھی کر لیا، لیکن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں اپنی سابقہ زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہلکان ہو رہی تھی۔ لیکن جس دن مجھے کیپٹن شرما ملا، اس دن کے بعد میں نے اپنی سابقہ زندگی کا بوجھ اتار پھینکا، اس نے مجھے ایک نئی زندگی سے آشنا کیا۔“ وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے خواب میں بات کر رہی ہو۔ وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے پوچھا۔

”ایسا کیا تھا اس میں جو ایک ملاقات میں.....“

”نہیں نہیں ایسا نہیں کہ وہ مجھے پہلے دن ملا اور میں اس پر مر مٹی اور سب بھول گئی۔ وہ میرا انسٹرکٹر تھا۔ یہی خوشبو جو تم میں سے آرہی ہے، وہ لگا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ بھی مجھے بڑے غور سے دیکھتا۔ دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ دیرے دیرے ہماری دوستی ہو گئی۔ وہ مجھے کبھی فلم دکھانے لے جاتا، کبھی کسی رستوران میں، اور کبھی ویسے ہی لاگ ڈرائیو پر۔ ایک دن اس نے مجھے زندگی کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ اس نے بتایا کہ یہ جذبے کچھ

لوں ہوتے ہیں، صرف مقصد ہوتا ہے۔ چھوٹا مقصد یا پھر کوئی بڑا مقصد۔ اس دن وہ میرے دماغ پر چھا گیا، میں اس کی ہر بات کو قبول کیا اور کرتی چلی گئی۔ میں بدن کی لذت سے آشنا تھی لیکن جودت اور سرور اس نے دیا، اس لی وہ سے میں سب کچھ بھول گئی۔ مجھے لگا زندگی ہی یہی ہے۔ ہم ایک دن اور ایک رات دونوں تنہا ایک مل ہاٹ پر رہے۔ اور میری زندگی بدل گئی۔ واپس جب انیشیوٹ میں آئے تو میں ایک نئی سندھپ تھی۔ زندگی سے ہمارے۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا اور میرے ساتھ لپٹتی چلی گئی۔ اس کی گرم سانسوں کی حدت میں اپنے سینے کو دھس کر رہا تھا۔

”اس انیشیوٹ میں کیا سکھایا جاتا تھا۔ کیا مقصد دیا پھر انہوں نے تمہیں، کیا کرنا تھا تم نے یہاں۔“ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”وہاں صرف یہ بتایا جاتا تھا کہ دوسرے کو ٹریپ کس طرح کرنا ہے۔ دوسرے کا مقصد کس طرح بھلانا ہے اور اپنی راہ پر کیسے لگنا ہے۔ تم اسے یوں سمجھ سکتے ہو، جیسے کوئی جانا باز سپاہی اپنی جان دینے کے لیے اپنی منزل کی طرف ہار رہا ہو۔ میرا کام یہ ہے کہ میں اسے اپنی جانب کیسے متوجہ کرتی ہوں اور اسے اپنا مقصد بھلا کر کس طرح اپنی راہ پر لاتی ہوں۔“ اس نے اپنی انگلیاں میری گالوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

”تم تو بہت اچھی فائیرٹر ہو، پھر یہ کیوں؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”ہمیں کہیں بھی کسی فن کی ضرورت پڑ سکتی ہے، ہمیں اداکاری بھی سکھائی گئی۔ میک اپ کرنے سے لے کر جدید ترین اسلحہ چلانے تک سب کچھ سکھایا گیا ہے۔“

”کیوں، کس مقصد کے لئے؟“

”کہنا سوچ تبدیل کرنے کے لئے۔ مطلب ایک ڈی وی ڈی ہے۔ اس میں ایک سی ڈی چل رہی ہے۔ ڈی وی ڈی وہی دکھائے گا جو اس سی ڈی پر ہے۔ ڈی وی ڈی بے چاری کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سی ڈی نکال کر دوسری لگا دو، اسکرین پر وہی ہوگا، جو ایک سی ڈی میں ہے۔ انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو وہی عمل کرے گا جو اس میں سوچ ہے۔ کہہ لو کہ اس کے اعمال اس کی سوچ کو ظاہر کر رہے ہیں یا سوچ کا مظہر اس کے اعمال ہیں۔ میرا کام صرف سی ڈی تبدیل کرنا ہے۔“ وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے کسی ٹرانس میں ہو۔ جب میں نے پوچھا۔

”یہاں کیا مقصد دے کر بھیجا گیا ہے تمہیں؟“

”بہی کہ یہاں آ کر شادی کروں۔ بچے پیدا کروں، پہلے اپنے شوہر کو اپنے خاص ٹریک پر لاؤں، پھر اپنے بچوں کو، جتنے بچے ہوں گے، کل وہ ماں باپ بنیں گے۔ میرے ارد گرد جو لوگ ہیں، عورتوں مردوں کو اپنی سوچ پر لاؤں۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ میں نے لوگوں کی سوچ بدلنی ہے۔ اس کے لیے، میں، میرا جسم کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اپنے شوہر کے علاوہ کسی ایک بندے کو جال میں پھنسا کر اس سے جو مرضی کروا سکتی ہوں۔“

”کیا تمہیں اس میں کوئی کامیابی ملی؟“ میں نے پوچھا۔ تو وہ بولی۔

”ہاں! میرا پہلا تجربہ۔ دہلی میں موجود ایک مسلمان لڑکا تھا، فرید الدین اس کا نام تھا، وہ مجھ پر عاشق ہو گیا۔ میں نے اسے یوں بدلا کہ اب وہ نہ ہندو ہے اور نہ مسلم۔“

”ایسا کیوں کیا جا رہا ہے سندھپ کیا تم نے کبھی سوچا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جسمانی لذت، پیسہ، اچھی زندگی، جب مل رہی ہے تو مجھے سوچنے کی ذرا برابر ہی ضرورت نہیں۔ مجھے سسک سسک کر جینے، دوسروں کی بے وفائی پر ماتم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ یہ کہتے

ہوئے اس نے اپنے نرم ہونٹ میری گردن پر رکھ دیئے۔ میں چند لمحے ساکت رہا۔ میں اس کا خوفناک منصوبہ سمجھ گیا تھا۔ اس کا بدن گرم ہو رہا تھا جبکہ میرا دماغ تپنے لگا تھا۔ تب اچانک میں نے اسے خود سے الگ کر دیا اور اٹھ بیٹھا۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہوا؟“

”کیا مجھے بھی تم ٹریپ کر رہی ہو؟“ میں نے اسے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

”نہیں، بالکل نہیں، میں تو تم میں اسی کو دیکھ رہی ہوں، میں تو ذل سے تمہاری ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میرے اپنے ہو۔“ اس نے منتشر لہجے میں یوں کہا جیسے کسی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا گیا ہو۔

”سندپ کور، مجھے تم سے انتہائی ہمدردی ہے۔ کیونکہ تم خود ٹریپ ہو چکی ہو، جنہوں نے تمہیں اس طرح کا بنا دیا ہے، انہوں نے پہلا تجربہ تم پر کیا ہے۔ پتہ ہے انہوں نے تمہیں کیا بنا دیا ہے، ایک کتیا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ یوں بولی جیسے اسے مجھ سے ایسی بات کی توقع نہ ہو۔ میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”یورپ، امریکہ یا ایسے ہی ملکوں کے کلچر میں لڑکیوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خود کو بچ یعنی کتیا کہلانے میں اور کتیا جیسا طرز عمل اپنانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ جنسی مہک چھوڑتی ہیں اور اپنے پیچھے ہر وقت لڑکے لگائے رکھتی ہیں۔ جس کے پیچھے جتنے لڑکے ہوں گے، اتنی ہی ”قابل فخر“ سمجھی جاتی ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟“

”ہاں میں جانتی ہوں۔ مگر اس میں ان لڑکیوں کا کیا قصور، ان کا معاشرہ انہیں اجازت دیتا ہے۔“ وہ احتجاجاً بولی۔

”مان لیا، لیکن یہ بھی تو دیکھو، وہ معاشرہ انہیں بنا کیا رہا ہے، ایک کتیا، مطلب اسے انسان نہیں ایک حیوان بنانا چاہتا ہے۔ جو دوسروں کی سوچوں کو بنا سوچے سمجھے قبول کر کے حیوانی زندگی گزارے چلے جا رہے ہیں۔ انسان ایسا نہیں اور تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ میرے ساتھ کچھ ہوا ہے؟“ وہ تنک کر بولی۔

”تم کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں سکھنی ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”تو کیا تم سکھنی رہی ہو؟ کیا تم جانتی ہو کہ سکھ روایات کیا ہیں؟ کور کیا ہوتی ہے؟ انہوں نے ایک دشمن قوم کا ذہن بدلنے کے لیے اپنی ہی دوسری دشمن قوم کو استعمال کیا ہے۔ کوئی سکھ بھی چوراسی کا سانحہ نہیں بھول سکتا، مگر وہ تمہیں بھلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں کور سے ایک کتیا بنا دیا۔ کیا ہو تم؟ ایک کور ہو یا کتیا؟“

میں نے کہا تو وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ پھر کافی دیر بعد مردہ لہجے میں بولی۔

”میں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔“

”سوچو۔! اور خوب سوچو، جتنا سوچو گی، تمہیں اپنا آپ نظر آئے گا۔ آخر میں میں تمہیں یہی لگے گا کہ تمہیں ایک انسان سے جانور بنا دیا گیا ہے۔ میں اس موضوع پر تم سے جتنی چاہو بات کر سکتا ہوں۔ کیونکہ یہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔ دنیا میں جمونے آدی عورت ہی کو استعمال کرتے ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو ہم میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد سندپ کور کے سکھنے کی آواز آئی، میں نے اسے رونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خوب جی بھر کے رو لے۔

کنواں اور ذریعہ نما فارم ہاؤس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ کنواں پر مدہم روشنی تھی، جبکہ ذریعے پر دو بلب روشن

میں رستہ واضح دیکھی، رات کے ایک بجے سے زیادہ وقت ہو گیا ہوا تھا۔ لیکن ذرا سی بھی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔ اسے پاس راجیلے کے لیے فون نہیں تھا۔ اس لیے میں صرف فائرنگ کی ہی آواز کا منتظر تھا۔ جیسے ہی فائرنگ ہوئی، اچانک فارم ہاؤس تک جانا تھا۔ میں اس منظر میں کھویا ہوا تھا، جبکہ سندپ روتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک وہ ایک خاموش ہو گئی۔ پھر بولی۔

”واپس چلیں۔“

”اگلی نہیں، مجھے کسی کا انتظار ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”اپنے دشمن کا۔“ میں سکون سے کہا۔

”کون ہے تمہارا دشمن؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”تم، تم ہو میری دشمن، تم کب اپنا رنگ دکھاتی ہو، یہ بالکل نہیں کہا جاسکتا۔ تمہارے دل میں کیا ہے، میں نہیں جانتا۔ تم صرف جسم کی پکار پر میری جانب بڑھی ہو، اور ایسا نہیں ہو سکا، اب میں تمہارے لیے بے فائدہ ہوں، تم کسی کی بات کچھ بھی کر سکتی ہو۔“ میں نے جان بوجھ کر اس پر طنز کیا

”میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔“ اس نے جواب دیا تو میں نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”میں اس پر بھی کچھ نہیں کہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ چار پائی سے اٹھ گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ تقریباً دو بجے کے بعد ایک ہائیک کو فارم ہاؤس سے نکلے ہوئے دیکھا، وہ کنواں کے ٹریک پر نظر آیا اور پھر ہمارے قریب آتا چلا گیا۔ سندپ ایک دم سے الٹ ہو گئی۔

”یہ وہی لوگ ہیں، جن کے کنویں پر ہم بیٹھے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ کافی حد تک ری لکس ہو گئی۔ چند لمحے بعد ہر طارق کے ساتھ اس کا ماتحت سامنے آ گیا۔ اس نے پہلے سندپ کی طرف دیکھا، پھر اسی کی طرف توجہ کئے بغیر اس کی طرف آ گیا اور سیل فون مجھے دیتے ہوئے بولا۔

”آپ کی ایک کال بار بار آرہی ہے، نمبر بھی کوئی نہیں، میں نے کہا ضروری ہی نہ ہو۔“

”غصہ نہ کرو! مجھے رابطہ کرنے دو۔“ میں نے اسکرین پر دیکھا، وہ ارونڈ کال کر رہا تھا۔ میں نے کال کی تو اس نے ان پک کرتے ہوئے کہا۔

”شاید وہ لوگ آپ کی چال کو سمجھ گئے ہیں مجھے نہیں لگتا اب کچھ ہونے والا ہے؟“ اس نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے فون ٹریس ہی نہیں کیا۔ میرا خیال ہے آپ وقت ضائع نہ کریں۔“ اس نے کہا، پھر اس سے پہلے میں کچھ کہتا ہوا بولا۔ ”وہ جو باس ہے، اس کے بارے میں کافی معلومات ملی ہیں۔ وہ میں نے آپ کو میل کر دی

”او کے میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر کے جیب میں ڈالا اور نذر طارق کو نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ مارا پلٹ گیا۔ میں نے سندپ کور کی طرف دیکھا اور چل پڑا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ سندپ آہستہ

”اں سے چلتی ہوئی میرے ساتھ والی سیٹ پر آن بیٹھی۔ میں نے واپس جانے کے لیے گیزر لگا دیا۔

میں نے صرف دو گھنٹوں کے لیے آنکھ لگائی تھی۔ سونے سے پہلے میں نے بائیں کور کو مختصر بتا کر الٹ کر دیا تھا

کہ اب سندھپ کو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ سلمان اور فہیم آچکے تھے اور کمرے میں موجود فون کا ”آپریشن“ کرنے میں مصروف تھے۔ میں بیدار ہوا تو ملبغا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور نیچے جانے لگا۔ میڑھیاں اترتے ہوئے میں نے ارون کو فون کیا تو دوسری جانب رویت کور تھی۔ میری کئی دنوں بعد اس سے بات ہوئی تھی۔ حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔

”کیا حال ہے، کیسے گزر رہی ہے؟“

”بہت اچھا، یہاں بہت سکون ہے اور مجھے سیکھنے کو بہت کچھ مل رہا ہے، مطلب وہ سب جو اس وقت دنیا میں سب سے ٹاپ پر ہے، جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہوں۔ بھارت میں تو کنویں کا مینڈک تھی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو، ٹھیک ہے، ارون بڑی ہے کیا؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

”وہ سو رہا ہے۔ آپ نے جو معلومات اس کے ذمے لگائیں تھیں۔ وہ میرے پاس ہیں۔“

”بتاؤ۔“ میں نے آخری میڑھی اترتے ہوئے کہا اور رک کر رویت کور کی بات سننے لگا۔

”وہ تصویر ایک آرمی آفیسر کی ہے۔ بنیادی طور پر وہ ہندو ہے اور صورت گڑھ کے قریب ایک گاؤں شیو نگر کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام سنیل ورما ہے۔ تقریباً گیارہ برس پہلے اس نے آرمی جوائن کی تھی۔ اس کے پروفائل میں لکھا ہوا ہے کہ وہ کافی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ صلاحیتیں کیا ہیں، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملی۔ باقی اس کی ڈگریاں ہیں، اور اس کے اعزازات وغیرہ ہیں۔“

”اوکے رویت، میں بعد میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں محوم کر اس جگہ آ گیا جہاں سے تہہ خانے کے لیے راستہ اترتا تھا۔ اور پھر تہہ خانے میں اتر گیا۔

وہاں سکون تھا۔ نذیر طارق ایک طرف پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ڈاکٹر سویا ہوا تھا۔ چار گارڈ ہر کونے میں موجود تھے اور سنیل ورما بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نذیر طارق اٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کافی تھک گئے ہو؟“

”نہیں تھکا نہیں، بس انتظار کی کوفت تھی۔“ اس نے مستعد ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ بے ہوش ہے یا۔۔۔۔۔“ یہ پوچھتے ہوئے میں جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”دوا کے زیر اثر ہے۔ ابھی جگا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے اٹھانے کا اشارہ کیا۔ نذیر طارق اس کے پاس گیا اور اسے اٹھا دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ میں چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر بولا۔

”کیسے ہو ہاس؟“ میں نے کہا تو وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔ وہ اٹھ کر میری طرف ہونٹوں کی مانند دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تب میں نے کہا۔ ”باس تم تو مجھ تک نہیں پہنچ پائے، لیکن میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ اتنے بڑے دعوے کرنے والا، ایک حقیر جو ہے کی طرح پھنس گیا۔“

اس نے میری بات سنی اور چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

”صرف دو چیزیں۔۔۔۔۔ صرف دو چیزوں نے تمہارا ساتھ دیا ہے تو تم مجھے پکڑ پائے ہو ورنہ تیرے فرشتے بھی مجھ تک نہ پہنچ سکتے، اور وہ ہیں، قدرت اور اتفاق، قدرت نے تیرا ساتھ دیا، اور اتفاق ایسا بن گیا کہ تم مجھ تک پہنچ گئے ورنہ، میں جانتا ہوں کہ تیری اتنی اوقات نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں وہی نفرت عود کر آئی تھی، جو میں اس سے پہلے

لائے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھی تھیں۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سنیل ورما کوئی ماہ نہیں دیا بلکہ نذیر طارق کو ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے ساتھ ذرا سا الگ ہوا تو میں نے اس سے کہا۔

”پتہ کرو، جو لوگ ہم نے پکڑے تھے، وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ فوراً۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں واپس پلٹ کر اس کے پاس آ گیا اور اس کے ماتھے پر انگلی لٹے ہوئے بولا۔

”میری اوقات کیا ہے اور کیا نہیں، یہ تو رتب جانے، لیکن تو اپنی اوقات دیکھ کہ تو اس وقت کس حالت میں ہے سنیل ورما۔ ایک لمحہ ہے میرے پاس اور ایک چھوٹی سی بلٹ تیرے سر میں اتار دوں۔ یہ ہے تیری اوقات؟“

میں نے کہا تا تیری قسمت اچھی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں یہ جو تو کھڑا بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے، تیرا وقت ہے تو کر سکتا ہے، گولی مار دو یا نہ مارو، مجھ پر تیرا کوئی احسان نہیں ہے۔“ اس نے اسی نفرت سے کہا۔

”میں بھی تم پر کوئی احسان نہیں کرنا چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ جتنے بڑے تیرے دعوے تھے، اور جتنی بڑی باتیں تو اب کر رہا ہے، اتنے دلیر بھی ہو؟ مجھے ذرا سی خوشی تو ہو کہ میرا دشمن کوئی دلیر آدمی ہے، کوئی ہیرو نہیں، جواب اپنا بچوں کی طرح پڑا ہے، جسے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟“

”باتیں ہی کرو گے یا مجھے گولی بھی مارو گے؟“ اس نے کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

”خودکشی کرنا چاہتے ہو، یہ تو بزدل لوگ کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا اور کہا۔

”تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ، تندرست، اس کے بعد میں تم سے پوچھو گا کہ تم آخر مجھ سے چاہتے کیا تھے؟ کیوں میری طرف متوجہ۔۔۔۔۔“

”اتنے لمبے وقت کی ضرورت نہیں ہے، ابھی کہہ دیتا ہوں، تم نے میرے ملک میں بڑے ہنگامے کئے ہیں اور میں تمہیں پکڑنے کا ٹارگٹ لے کر یہاں آیا تھا، میں نے تجھے واپس لے جانا ہے، اب بھی میرا دعویٰ ہے۔“ اس نے ایک دم سے غراتے ہوئے کہا۔

”اپنے انہی چند کرتبوں سے، جس کی وجہ سے تم مجھے پکڑ نہ سکے؟“ یہ کہہ کر میں جان بوجھ کر ہنس دیا، حالانکہ مجھے

اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ ”خیر! تم ذرا آرام کرو، ٹھیک ہو جاؤ، پھر تیرے ساتھ بات کروں گا۔“

ہماری انہی باتوں کے دوران ڈاکٹر اٹھ گیا تھا۔ وہ ہمارے قریب آن کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں ڈاکٹر سے کچھ پوچھتا، میری نگاہ تہہ خانے کے دروازے پر پڑی، وہاں سندھپ کور کھڑی تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا اس کے پاس جا کر کہا۔

”کیا بات ہے، تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

اس نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ہونٹوں کی مانند پوچھا۔

”یہاں کوئی بھارتی رکھا ہوا ہے، کوئی قیدی۔۔۔۔۔؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ میں نے اس کے بدلے ہوئے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ایک بار اسے دیکھنا چاہتی ہوں، پلیز، مجھ پر یقین کرو، میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گی جس سے تمہیں کوئی انسان ہو، پلیز۔“ اس نے یوں لالچ اور منت بھرے لہجے میں کہا کہ مجھے خود بخود محسوس ہونے لگا۔ یہ کیا چاہتی ہے ایسا اس نے کیسے سمجھا کہ یہاں کوئی قیدی ہے اور وہ بھی بھارتی؟

”میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔“ میں نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں نے ان سب کو وہیں رہنے دیا۔ بہت بڑا رسک لیا تھا۔ یہ رسک میں نے سندھپ کور کے لیے لیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتی۔ اس وقت وہ کیا کرتی ہے، اس کے اسی عمل پر میں اس کے بارے میں فیصلہ کرنے والا تھا۔ میں جونہی تہہ خانے - باہر اٹھا، اندر طارق تقریباً بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر تیزی سے بولا۔

”آپ نے کیا فیصلہ کر دیا، انہیں جانے کا کہہ دیا۔“

”میں نے کہہ دیا نا، اب تم جو چاہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سمجھ گیا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ اس نے لمبائی کی طویل سانس لی۔ وہ تہہ خانے میں ہونے والی باتیں وہیں کہیں لگے ہوئے مائیک سے سن رہا تھا۔ یہ ہاں! مجھے خود اطمینان ہو گیا

”میں نے کچھ پوچھا تھا؟“

”وہ چھ بندے ہیں، ان میں دو ہندو ہیں اور باقی چار سکھ ہیں۔“

”لکھ ہو گیا۔ اب تک میں تمہیں بتاؤں گا کہ ان کے ساتھ کیا کرنا ہے، تم، تمہارا حکمہ اور تمہاری وزارت ایک سے کارنامے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور تیزی سے اوپر کی جانب چلا گیا۔

وہ دونوں میرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھا تو سلمان نے باس کا سیل فون میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک عام سے فون میں ایسا پروگرام ہوتا ہے کہ آپ اس میں بولو تو وہ سامنے سے لفظ اسکرین پر دکھا دیتا ہے۔ ہاں اس فون میں ایک سپر سائیک تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ یہ بھی اسی بنیاد پر ہے، اس کا تعلق انسان سے جوڑا گیا ہے۔“

”کیسے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”دیکھیں، ہر انسان کے بدن سے جہاں حرارت خارج ہوتی ہے، وہاں اس کی اپنی مخصوص لہریں بھی نکلتی ہیں، ہر انسان میں انفرادی ہوتی ہیں۔ ہر انسان کی لہریں دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جیسے ہر سیل فون کا الگ سے ہوتا ہے، یا پھر انسانی جسم میں اس کے ہاتھ کی لکیریں یا آنکھوں کے نشان۔ ہر انسان ایک دوسری انسان سے مختلف ساری باتوں میں منفرد ہے۔ تو انہوں نے اپنی تکنیک کو انسانی جسم سے خارج ہونے والی لہروں پر رکھا ہو ہے۔ انہوں نے تمہارے جسم کی لہروں کو کھوجا ہے۔ اور پھر اسے اس میں فیڈ لیا۔ تم جہاں بھی ہوں گے، اس اسکرین پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اسکرین کو روشن کیا۔ اس پر تین لہریں بہت سڑنگ تھیں۔ لیکن ان لہروں میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ فہم اٹھ کر ذرا دور ہوا تو وہ لہر حرکت کرنے لگی۔ سلمان نے اسے محفوظ کر لیا۔

”اب یہ جہاں بھی ہوگا، اس کے بارے میں نشاندہی ہوتی رہے گی۔“ سلمان نے حتی انداز میں بتایا۔

”تو یہ بھی وہ تکنیک۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سب سمجھ گیا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرتا رہا ہے۔ تبھی اس نے کہا۔

”اب دیکھو، میں اس سے کیسے بچ گیا۔“ میں نے کہا تو وہ دونوں میری طرف تجسس سے دیکھنے لگے۔ میں نے لمبیل بتائی تو انہوں نے خاموشی سے سنا۔ تبھی فہم اٹھا اور کمرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے بیک تک گیا، اس سے اس نے پرفیوم کی بوتل لی اور خود پر چھڑکنے لگا۔ تبھی وہ لہر معدوم ہو گئی۔

”پہلے یہ بتاؤ، تمہیں پتہ کیسے چلا؟“

”ایک مہک ہے، جو مجھے اس کی جانب کھینچ رہی ہے۔ ممکن ہے وہ وہی ہو۔“ وہ ٹرانس میں بول رہی تھی۔

”آؤ۔“ تب میں نے ایک دم سے رسک لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑی، میں اس کے ساتھ یوں محتاط ہو کر چل رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اگر کچھ کرنے کی کوشش کرے تو میں کچھ نہ کچھ تو کر سکوں۔ وہ نرم قدموں سے چلتی ہوئی نیچے پہنچ گئی۔ پھر جیسے ہی اس نے سنیل درما کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے سسکار نکلا حیرت سے نکلا

”کیپٹن شرما تم؟“

وہ ایک لمحے کے لیے حیران ہوا، پھر ایک دم سے یوں تارل ہو گیا جیسے اسے قطعاً حیرت نہ ہوئی ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ تبھی میں نے کہا۔

”یہ تو سنیل درما ہے؟“

”اب سمجھی ہوں، اس کے کئی نام ہو سکتے ہیں، جمال، یہ وہی ہے، میں نے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔ یہی ہے، جو تیرے جیسے خوشبو لگاتا تھا۔“ وہ چیختے ہوئے بولی تو سنیل درما اثرات کے منہ سے بے ساختہ نکلا

”اچھا، تو تمہیں وہ خوشبو بچا گئی، میں بھی کہوں، میرا شکار کبھی بھاگ نہیں سکتا، یہ چسکار کیسے ہو گیا؟“ پھر لمحہ بھر رک کر بولا۔

”کہانا قدرت اور اتفاق ہی تجھے بچا پائیں ہے اور سندھپ کور کا یہاں ہونا میری اس بات کا ثبوت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پاگلوں کی مانند ہنس دیا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“ میں نے سکون سے پوچھا۔

”نہیں، مر جاؤں گا، تیرے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاؤں گا، مجھے آزاد کرو یا مجھے مار دو، بس۔“ اس نے نفرت سے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

”جا، تجھے آزاد کیا۔ تم جا سکتے ہو۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے گارڈز کو کچھ بھی نہ کرنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ یوں ہو گئے جیسے اسے جانے پر کچھ بھی نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ پھر میں اسے اشارہ کیا کہ وہ جا سکتا ہے۔ وہ بیٹھا سوچتا رہا، پھر ایک دم سے بیڈ پر ڈھ گیا۔ تبھی سندھپ آگے بڑھی اور اسے بالوں سے پکڑ کر بولی۔

”مرد بن، بیچو انہ بن، اس نے تجھے جانے کا کہہ دیا ہے تو اب جاتا کیوں نہیں، نکلو اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے روز دار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔ وہ ٹرپ کر رہ گیا۔ ”یا پھر بکو، جو کچھ یہ جمال پوچھ رہا ہے۔“

”مجھے اس سے کچھ نہیں پوچھنا، اور یہ اپنے بے وقوفی کی وجہ سے اپنا راستہ خود کھوتا کر بیٹھا ہے۔ اب بھی وقت ہے جا سکتے ہو۔“ میں نے باہر کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ وہیں پڑا رہا۔ تبھی میرا فون بج اٹھا۔ وہ سلمان کا فون تھا

”ہیلو، کہاں ہو؟“

”بولو بات کیا ہے؟“

”ہم نے وہ فون دیکھ لیا، اسی کے بارے میں بتانا تھا، خاصی جدید تکنیک ہے، اتنی ایڈوانس کہ کوئی عام آدمی اس

”ظاہر ہے، وقتی طور پر یہ انسانی جسم کی لہریں ڈسٹرب تو کرتی ہے۔ جیسے کتابھی اسی تکنیک پر بھونکتا ہے۔ اصل میں کتے کو دیکھ کر انسانی جسم سے ایسی شعاعیں خارج ہوتی ہیں کہ کتا ڈر جاتا ہے اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے یہ سب کرتا ہے۔ خیر یہ ابھی تکنیک ابھی عام نہیں ہوئی۔ میں ارون کو بتا دوں، یہ جہاں کے پاس بھی ہونی چاہئے۔“

مسلمان نے کہا تو میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”مزرہ تو تب ہے اگر، اس کا توڑ بھی تلاش کر لو۔“

”اب ہو جائے گا۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”اچھا اب نیچے ایک قیدی پڑا ہوا ہے، اسے پتہ نہیں چلنا چاہئے، اس کی لہریں لے لو کیونکہ یہ تکنیک اسی کے سیل فون سے تھی۔“ میں نے بتایا تو وہ ہر بات سمجھ گئے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ اٹھ گئے۔ تب میں نے تون کو رپورٹ تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اس سے پوچھا کہ اب سندیپ کا کیا کرنا، بچن کور سے پوچھ کر بتاؤ۔ اس نے کچھ دیر ٹھہر کر جواب دینے کو کہا تو میں اٹھ کر بائیکا کور کے پاس چلا گیا۔ مجھے ابھی الیکٹرونکس انجینئر کی رپورٹ کا بھی انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ لیکن طلوع سحر کے باعث روشنی پھیل رہی تھی۔ جہاں اپنے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کھڑکی میں سے دیکھ تو باہر رہا تھا لیکن اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ بلد یو سنگھ نے آتے ہوئے ایک خوشخبری کے بارے میں کہا تھا۔ وہ یہی تھی کہ لوگوں میں ایک دم سے ان کے لیے ہمدردی کی لہر اٹھ گئی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسا اشارہ نہیں تھا کہ وہ ایکشن جیت جانے کی وجہ بن سکتی تھی۔ اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ابھی بہت کچھ کرنے کو ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات گونج رہی تھی کہ بھارت میں ایکشن لڑنا اور بات ہے اور ایکشن جیتنا دوسری بات۔ یہ ایک آرٹ ہے وہی استعمال کرتا ہے جسے یہ آرٹ آتا ہو۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آرٹ ہے تو کیسے ہے؟ اس آرٹ کو کیسے سیکھا جاسکتا ہے، اس کس طرح اپنے لیے استعمال کرے؟ وہ انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ہر پریٹ کور اس کے لیے گلاس میں دودھ لے کر آگئی۔ اس نے دودھ کا گلاس اسے تھمتاے ہوئے کہا۔

”لو یہ پی لو، پھر جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔“

”جلدی سے کیوں، آرام سے کیوں نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور گلاس میں سے سب لے کر پار دھری میز پر رکھ دی۔ ہر پریٹ کور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”جلدی سے اس لیے کہ تمہیں ملنے کے لیے تھانے دار نیچے لان میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔“

”وہ! وہ اتنی سویرے سویرے۔“ جہاں نے حیرت سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔“

”اچھا میں آتا ہوں۔ تم اسے کوئی ناشتہ بھجوا دو۔“ جہاں نے کہا اور گلاس اٹھا لیا۔ ہر پریٹ اٹھ کر چلی گئی۔ وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو ناشتے کی میز پر ہر پریٹ کے ساتھ کرن کور، تون کور اور بلد یو سنگھ بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ ان سے ملا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہر پریٹ تم تو تھانیدار کا کہہ رہی تھی؟“

”وہ بیٹھا ہے باہر۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اور تم لوگ کب آئے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”رات دو بجے کے قریب، الوجیت ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ وہ صبح صبح کہیں کھل گیا ہے۔“ بلد یو نے

ہال اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں ذرا تھانے دار.....“

”تم ناشتہ کرو، بیٹھا رہنے دو اسے۔“ ہر پریٹ نے کہا اور پلیٹ اس کی جانب سرکا دی۔ ناشتے کے دوران وہ نکور رہا۔ والے معاملے کی روداد سناتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ انتظامیہ اور سیاست دانوں کے لیے اک بڑا سوال چھوڑ دئے تھے۔ خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم کر لینے کے بعد بلد یو نے کہا۔

”اے جلدی فارغ کر کے آؤ۔ میں نے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے۔“

”اوکے۔“ جہاں نے کہا اور اٹھ گیا۔

تھانے دار لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ پورچ میں آیا، اسے دیکھتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جہاں اس کے پاس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”گڈ مارنگ سر۔“

”گڈ مارنگ، بولو کیسے آئے ہو؟“

”میں نے جی آپ کو سلام کرنا تھا اور صاحب کا ایک چھوٹا سا پیغام آپ تک پہنچانا تھا۔“ اس نے شرمندگی اور اذیت سے کہا۔

”اچھا، میرے پاس وقت نہیں ہے، جو کہنا ہے جلدی سے کہو۔“ جہاں نے سر دلچے میں کہا۔

”بس جی غلطی ہوئی، صاحب کہتے ہیں کہ معاف کر دیں، میں اس لئے.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے یہ سب کیا کیوں، جبکہ تم لوگوں کا پتہ تھا کہ گنبد رنگھ کو میں نے نہیں مارا، میں اس وقت کہاں تھا، وہ بس مرا اور.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”سر معذرت خواہ ہوں کہ آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو یا انوجیت جی کو ابھی ان زندگی کا تجربہ نہیں ہے۔ ان سیاسی لوگوں کے ساتھ ہماری کیا مجبوری ہوتی ہے، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔“

”میں بحث نہیں چاہتا، مجھے وہی کرنا ہے جو قانون اور انصاف چاہتا ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔

”جو میں نے کہا۔“ یہ کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔ تھانیدار چند لمحے کھڑا دیکھتا رہا پھر وہ بھی واپس چلا۔ جہاں حائل اندر گیا، جہاں جونی نے بتایا کہ وہ سب اوپر آپ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

بلد یو سنگھ، تون کور، کرن کور کے ساتھ ہر پریٹ بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی جہاں سنگھ ان کے پاس بیٹھا تو انے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں سنگھ جی، یہ جانتے ہو کہ مافیا کیا ہوتا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود اپنے لگا، ”خیر۔“ جو بھی کہتے ہیں، تم نے اس کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ چند لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک خاص مقصد کے لیے لوگوں کا اشتراک ہوتا ہے۔ جو ہر طرح کا ہتھکنڈہ استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ تم نے کرنا جو اہم تو سنا ہوگا، بظاہر کوئی بندہ سامنے دکھائی نہیں دیتا، لیکن پوری دنیا میں یہ جوا کھیلایا جاتا ہے، آخر کون لوگ اسے منظم کرنے والے، کوئی قوت تو ہوگی؟ اسی طرح اب ہر معاملے میں مافیا کام کر رہا ہے۔ معیشت پر مافیا،

مافیا، یہاں تک کہ سیاست پر بھی مافیا ہی کام کر رہا ہے۔ اس کا کسی پارٹی، کسی گروہ یا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس معاملے کی خبر ہے؟“

”نہیں، میرے لیے ایک نئی بات ہے، لیکن سمجھ میں آتی ہے۔“ جہاں نے جواب دیا
 ”میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا، صرف اتنا کہوں گا کہ جس طرح لینڈ مافیا میں دلال ہوتے ہیں، معاشی
 معاملات میں دلالی چلتی ہے، بالکل اسی طرح عالمی سطح پر سیاست مافیا میں بھی دلال موجود ہیں اور یہ ہر ملک
 میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھارت میں بھی۔“ بلدیو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔
 ”کیا یہ کسی آرٹ کے ساتھ ایکشن میں امیدوار جتواتے ہیں؟“ جہاں نے پوچھا۔
 ”ہاں! نچلے درجے کا سیاسی ورکر بھی اس میں شامل ہے، جسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس کے لیے کیا کام کر رہا
 ہے۔ اور اوپر تک وہ سارے لوگ شامل ہوتے ہیں، جنہوں نے حکومت بنائی ہوتی ہے۔“

”تو، ہمیں کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے ایسا ہی ایک دلال تلاش کر لیا ہے۔“

”یہاں، اس حلقے کے لئے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، انوجیت کی جیت سو فیصد ہوگی۔ رقم انہیں ملنی چاہئے۔ کیونکہ انہوں نے کسی ایک کے ساتھ تو سودا طے کرنا
 ہے۔“ بلدیو نے پر یقین لہجے میں کہا تو جہاں چند لمحے سوچتا رہا، پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
 ”تم اگر سمجھتے ہو کہ انہیں رقم دے دی جائے تو دے دو۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ.....“

”ضمانت ہے، پوری ضمانت ہے۔ انہوں نے دس کروڑ مانگے ہیں، جن میں سے میں نے پانچ انہیں دے دیے
 ہیں۔“ اس نے پرسکون انداز میں کہا۔

”دے دیئے؟“ جہاں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اور میں اس کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا، باقی ایکشن جیتنے کے بعد، اور اگر وزیر بنانا ہے، وہ بعد میں ڈیل
 ہوگی۔ سمجھ لو کہ یہ انوسٹمنٹ ہے۔“ اس نے جہاں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ڈن ہو گیا۔“ جہاں نے کہا۔

”اب ہمیں چتا کی ضرورت نہیں۔ اب جو کرنا ہے انہوں نے ہی کرنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جلسے بھی اریج کریں
 گے اور ووٹر کو گھر سے بھی لائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ کرن کور نے پوچھا۔

”انجوائے کرو، باقی سب ایکشن کے بعد ہوگا۔“ اس نے کہا اور کرسی پر مطمئن انداز میں براجمان ہو گیا۔ انہی
 لمحات میں نوتن کور کا فون بج اٹھا۔ وہ جمال کا فون تھا۔ اس نے ساری بات سن کر فون بند کیا اور سب کو بتا دیا۔
 ”اب کیا کریں؟“ نوتن نے پوچھا۔

”بچن کور سے پوچھ لیں۔ وہ جیسے کہے، اسے مجبوری بھی بتا دینا کہ اس وقت وہ کن لوگوں کے پاس ہے۔“ جہاں
 نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ باقی سب نے بھی اس کی تائید کر دی۔

☆.....☆.....☆

شام ہونے کو تھی۔ الیکٹرونکس انجینئر نے بھی رپورٹ دے دی تھی کہ جو کچھ بھی تھا، اس کے کھلونوں میں چھپا ہوا
 تھا۔ عام آدمی کی نگاہ اس کے خفیہ فون پر نہیں پڑتی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح کے کھلونے نیچے والا
 آدمی کوئی خفیہ ایجنٹ بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ہوتا ایسا ہی ہے۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے چھوٹی موٹی بیڑیاں اس
 میں چھپائی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی ساری سمجھ آگئی تھی۔ دوپہر سے لیکر شام تک سندھپ نے مجھے ان کے پاکستان

اور خاص طور پر لاہور میں موجود نیٹ ورک کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ چند اہم بندے نذیر طارق کے
 ڈیپارٹمنٹ نے پکڑ بھی لیے تھے۔ شام ہونے تک وہ بہت ساری کامیابیاں حاصل کر چکے تھے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ نوتن کور نے بچن کور کا پیغام مجھے دے دیا تھا۔ وہ اسے زندہ سلامت چاہتی تھی۔ اب
 میں سوچ رہا تھا کہ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد میں اب سندھپ کور کو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے قانون نافذ کرنے والے
 ادارے کو دینا تھا یا پھر میں اپنے ہاتھوں سے اسے گوئی مار دوں۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اسی سوچ میں گم تھا کہ
 ہلکے سے دروازہ بجا اور سندھپ کور میرے سامنے آگئی۔ وہ میرے سامنے چند لمحے کھڑی رہی، پھر دونوں ہاتھ جوڑ
 کر بولی۔

”میں تم سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم منع نہیں کرو گے۔“

”بولو۔!“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولی۔

”اس سٹیل درما کو مارنے کی اجازت دے دو۔“

”تم مارو گی اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں اپنے ہاتھوں سے ماروں گی یا خود اس کے ہاتھوں سے مر جاؤں گی۔“ اس نے انتہائی نفرت سے
 کہا۔

”اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں۔ اور دوسرا بچن کور تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہے، اب فیصلہ تمہارے ہاتھ
 میں ہے، کیا کرنا چاہتی ہو۔“

”میں بچن کور کے خلوص کی قدر کرتی ہوں۔ میں مرگئی تو اس تک میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ میرے اندر کی سکھنی
 بیدار ہوگئی ہے۔ وہ سب سمجھ جائے گی۔“

”سندھپ۔!“ میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو۔ یوں اپنی جان گنوانے کا فائدہ تو بتاؤ۔“ میں نے پھر اسے
 یہ احساس دلایا تو وہ چونکتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر چند لمحے سوچتی رہی پھر اچانک اس نے سر اٹھایا اور
 بڑے پر اعتماد لہجے میں بولی۔

”تو پھر تمہیں ایک بہت بڑا جوا کھیلنا ہوگا، بہت بڑا، بڑا رسک ہوگا اس میں، اگر ایسا کر سکتے ہو تو بتاؤ، تمہاری
 بات بھی رہ جائے گی اور میرا مان بھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی
 کہ وہ کوئی بہت ہی بڑا فیصلہ کر چکی ہے۔

میں سندھپ کور کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ہنسیوں تک یوں تن گئی
 تھیں جیسے کوئی شیرنی بھر گئی ہو۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔ وہ یوں
 میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میرا فیصلہ سننے کے بعد وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہے۔ میں نے چند لمحے اس کی
 طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

”کیسا بھوا، کیسا رسک؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، میری ذات پر اعتماد ہی رسک ہے، یہی بھوا ہوگا۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنی بات مجھ
 سے منوانا چاہتی ہو۔

”چلو، مان لیا، تم جو چاہے کرو، لیکن بتاؤ، کرو گی کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ پاؤں گی، بس سٹیل درما کو میرے حوالے کر دو اور وہ لوگ بھی جو تم نے پکڑ کر

جیل میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ انہی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکی ہے۔ تبھی میں نے ایک لمحہ کی بھی تاخیر کیے بنا کہا۔

”ٹھیک ہے، سنیل درماتیرے حوالے، تم جو چاہو سو کرو اور وہ قیدی بھی میں تیرے حوالے کرتا ہوں۔“

”بس! میں یہی چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیزی سے بولی۔

میں جو کرنا چاہتی ہوں، کیا اس کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو؟“

”اگر تم دکھانا چاہو تو؟“ میں نے اس کے سراپا پر نگاہ ڈال کر کہا تو وہ بولی۔

”تیار ہو جاؤ، میں سنیل درما اور ان قیدیوں کو لے کر بارڈر کی جانب جاؤں گی اور جو تماشا بھی ہوگا، وہیں بارڈر کے قریب ہوگا اور تم میرے ساتھ میرے ہی قیدی بن کر جاؤ گے، بے منظور؟“ اس نے یوں کہا جیسے مجھے اشارہ دے رہی ہو یا پھر مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ ایک بات تو یہ تھی کہ وہ مجھے بے وقوف بنا کر اپنے بندے لے کر نکل جائے گی۔ اور دوسرا وہ وہیں کچھ ایسا کرنے والی تھی، جس سے اس کی نیت کے بارے میں پتہ چل جاتا۔ یہ واقعتاً میرے لیے چیلنج تھا کہ میں ایک ایسے بندے کو اس کے ساتھ جانے دوں، جو صرف میرا ہی نہیں میرے وطن کا بھی دشمن تھا۔

”منظور ہے؟“ میں نے کہا تو اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔ وہ سوچ رہی ہوگی کہ یہ کتنا بے وقوف بندہ ہے جو میری ساری باتیں مان گیا ہے۔

”تو پھر منگاؤ ان قیدیوں کو۔“ اس نے حتیٰ لچے میں کہا اور باہر کی طرف چلی گئی۔

وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتی تھی، یہ تو وہی جانتی تھی لیکن میرے ذہن میں ایک پورا پلان تیار ہو گیا تھا کہ وہ جو بھی کرتی، مجھے اپنا کام کرنا تھا۔ میں نے اسی لمحے نذیر طارق کو بلا لیا، اس کے ساتھ ہی سلمان اور بانیتا کو کور کو بھی کال کر دی۔ پانچ منٹ کے اندر وہ میرے پاس تھے۔ میں نے انتہائی احتیاط سے سندپ کور کی بات بتا کر انہیں اپنا پلان بتا دیا۔ وہ تیار ہو گئے۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزرا ہوگا، وہ چھ کے چھ قیدی وہیں آ گئے۔ سلمان نے مجھے ساری تیاری کا اشارہ کر دیا تو میں نیچے تہ خانے کی طرف چل پڑا۔ میرے ساتھ سندپ کور بھی تھی۔ میں جیسے ہی تہ خانے میں گیا، وہ چھ فرش پر پڑے تھے اور سنیل درما ابھی تک بستر پر تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر طنز یہ لچے میں پوچھا۔

”میں نے تو تمہیں جانے کے لیے کہہ دیا تھا، تم ابھی تک گئے نہیں؟“

”میں جانتا ہوں جمال، میرے یہاں سے جانے کا مطلب ہوگا کہ میں اپنی موت پر خود ہی مہر لگا دوں۔ تم خود کو آزماؤ، مجھے خود گولی مار دو، یہ الگ بات ہے؟“

”انہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟“ سندپ کور نے قیدیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”قیدی کو کیوں بلایا جاتا ہے، ان سے پوچھنا چاہئے کہ لیے یا پھر انہیں اگلے جہان پہنچانے کے لیے۔“ میں نے کہا تو اسی لمحے سندپ کور نے انتہائی سرعت کے ساتھ پہل نکال لیا۔ اور اتنی ہی تیزی سے میری کنپٹی پر رکھتے ہوئے بولی۔

”یہ تمہارا خواب ہے جمال، جو پورا نہیں ہونے والا، اب تم ہمیں یہاں سے باہر لے کر جاؤ گے نہیں بلکہ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے، جہاں ہم لے جانا چاہیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا، ان میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہاں موجود گاڑا انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ سنیل درما تیزی سے بند پر سے اٹھ گیا۔ وہ تیزی سے نیچے اترتے ہوئے بولا۔

”واہ سندپ واہ، یہ ہوتی ہے تربیت، چلو ان گاڑز سے اسلحہ چھین لو۔“ اس نے کہا تو ان قیدیوں میں حرکت آ گئی۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ کھولنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ کھول کر گاڑز سے اسلحہ چھینتے، تہ خانے کے سرے پر کئی گاڑز آ گئے۔ ان میں سب سے آگے سلمان تھا۔

”خبردار، کسی نے ہلنے کی کوشش کی تو؟“ سلمان نے بارعب لچے میں کہا تو سبھی اپنی جگہ ٹھک گئے۔

”تم جو کوئی بھی ہو، اگر ایک گولی بھی چلائی تو یہ جمال نہیں بچے گا، ہمیں نکلنے کا راستہ دے دو تو اچھا ہے ورنہ میں اسے مار دوں گی۔“ سندپ کور نے پھرے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ تمہاری بھول ہے کہ تم یہاں سے نکل سکتی ہو۔“ سلمان نے جوابا کہا تو سندپ کور نے اُن سب کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ تبھی میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلمان کو روک دیا۔ وہ سب افراد تفری میں تہ خانے سے باہر نکل گئے۔ آخر میں سندپ کور اور میں نکلے۔ سامنے ہی ہائی ایس دین کھڑی تھی، جس میں ان قیدیوں کو لایا گیا تھا۔ وہ سب اس میں بیٹھ گئے۔ مجھے سندپ کور نے انہی کے ساتھ بٹھایا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ دین چل پڑی۔ انہی قیدیوں میں سے ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ سنیل درما اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پچھلی نشست پر

میں اور سندپ کور اور باقی سب بیٹھے تھے۔ جیسے ہی ماڈل ٹاؤن سے باہر نکلے، سنیل درما بولا

”یاد تم اس قدر چو ہے ثابت ہو گے، میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا، ایویں تمہیں پکڑنے کے لیے اتنا پلان بنایا، بے چارہ کتنے آرام سے ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔ خیر! سندپ کور اس کا فون نکال کر تو دو مجھے، دیکھوں تو سہی ہمارے کام آ سکتا ہے یا نہیں؟“

”اس کا فون، وہ کیا کرنا ہے؟“ سندپ کور نے میری جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ارے راستہ دیکھنا ہے، دوسری طرف بی ایس ایف والوں سے رابطہ کرنا ہے، جہاں ہمارے یار جمال کا سواگت ہوگا، اور بڑا اچھا ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ سندپ نے میری تلاشی لی اور فون نکال کر اسے دے دیا۔ وہ فون کے ساتھ کیا کرنے لگا، یہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن چند لمحوں کے بعد ہی اس نے کال ملا لی۔ کچھ دیر بعد ہی اس کا رابطہ ہو گیا۔ وہ کوڈ ورڈز میں اپنی شناخت کرا رہا تھا، جیسے ہی اس کی شناخت مکمل ہوئی، اس نے فون بند کر دیا۔ دو منٹ بعد اسے کال آ گئی۔ جسے وہ رسیو کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ان سب کو لے کر آ رہا ہوں جو پکڑے گئے تھے۔ یہ سب سندپ کور کی بہادری کی وجہ سے ہوا، اسی نے ہمارے ٹارگٹ کو پکڑا بھی ہے اور اسے قیدی بنایا ہے۔“ پھر دوسری طرف سنتے رہنے کے بعد بولا۔ ”ہمیں بتایا جائے کہ ہم کہاں آئیں، تاکہ وہاں سے محفوظ طریقے سے سرحد پار کر سکیں۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ خاموش ہو گیا، چند لمحے بعد ٹھیک ہے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”کیا آگے بندوبست ہو گیا؟“ سندپ کور نے پوچھا تو وہ بولا۔

”ہو گیا، ہمیں یہاں اتاری سے جنوب کی طرف جانا ہوگا، اس کی ڈائریکشن ابھی مل جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی خاموشی میں گزر گئی تو ایک قیدی نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”سنیل جی، ذرا اس سورے کو تھوڑا سبق نہ دے دیں، میرا ہاتھ بھی کھل جائے گا اور یہ بھی ڈرائنگ (ڈھیل) ہو جائے گا۔“

”اوئے چپ کر کے بیٹھ، سرحد کے اس طرف ابھی کوئی ہنگامہ نہیں کرنا، ادھر جا کر جو مرضی کرنا اس کے ساتھ۔“ سندپ کور نے جبکہ آ میزا انداز میں کہا تو پھر سے خاموشی چھا گئی۔ اس دوران سنیل درما کو ڈائریکشن مل گئی تھی۔ وہ ڈرائیونگ کو بتانے لگا کہ کدھر جانا ہے۔ تبھی میں نے کہا۔

”ہمیں روک دو، یہاں سے پیدل چلتے ہیں، کہیں رہنجرز کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔“
 ”ادھر ہی روک دوں یا.....“ ڈرائیور نے پوچھنا چاہا تو سندپ کور نے تیزی سے کہا۔
 ”ادھر اندھیرے میں روکنا، اس طرف۔“

درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس ڈرائیور نے وین روک دی۔ سندپ کور مجھے لے کر پہلے ہی اتر گئی۔ تو باقی اترے۔ سنیل درما میرے فون پر سمت دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس طرف سے سیدھے جانا ہے۔“

”چلو۔“ ایک قیدی نے کہا تو سندپ کور نے میرے چہرے پر دیکھا، میں نے کاندھے اچکا دیئے، تبھی وہ بولی۔

”نہیں، ابھی ٹھہرو! میں نے تم لوگوں سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”کیا بات کرنی ہے تمہیں۔“ سنیل درما نے حیرت سے پوچھا تو سندپ کور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہاسٹل اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا
 ”اس کا میگزین دیکھو، اس میں کوئی بلٹ نہیں ہے۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے؟“ اس نے اس نے حیرت سے سرسراتے ہوئے لہجے میں پہلے مجھے اور پھر سندپ کور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا میگزین دیکھو۔ کہیں بھول میں نہ رہنا۔“ سندپ کور نے بارعب لہجے میں کہا۔ اس نے جلدی سے میگزین دیکھا، وہ خالی تھا۔

”یہ کیا؟“ اس نے پوچھا تو سندپ نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

”وہاں ہوتے تو جمال تم لوگوں کو کسی نہ کسی ادارے کے حوالے کر دیتا، میرے کہنے پر یہ تم لوگوں کو یہاں تک لایا ہے، تاکہ میں تم لوگوں سے بات کر سکوں۔“

وہ یوں بول رہی تھی جیسے خود پر بے بہا قابور کھے ہوئے ہو اور اتنا کچھ کہتے ہوئے اسے خود پر بہت زیادہ جبر کرنا پڑ رہا ہو۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم اور کیا بات.....؟“ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ اس نے نیچے اڑسا ہوا ایک ہاسٹل نکالا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے پکڑ لیا، اور اس کا میگزین دیکھا جو بھرا ہوا تھا۔ سامنے کھڑے سارے لوگوں کے چہرے ایک دم بدل گئے۔ تبھی سندپ کور نے اس کی طرف دیکھ کر نفرت سے کہا۔

”بات یہ ہے سنیل، اس بندے نے مجھے یہ باور کرا دیا کہ میں ایک سکھنی ہوں اور تم نے اور تمہارے آقاؤں نے اپنی غلط سوچ کی وجہ سے مجھے ایک کتیا بنا کر رکھ دیا، ایسا ہی ہے نا؟“ وہ کچھ نہیں بولا تو وہ چیختے ہوئے ہڈیانی لہجے میں بولی۔ ”بولتے کیوں نہیں ہو، تم نے میرا بدن فوج فوج مجھے غلط کیا ہے کہ نہیں، مجھے کتیا بنایا ہے کہ نہیں؟“

”یہ ایسی باتیں کرنا کا وقت نہیں۔“ اس نے ہراساں ہوتے ہوئے کہا تو سندپ کور کا رخ ذرا فاصلے پر کھڑے قیدیوں کی طرف ہو گیا۔ وہ ان کے سامنے گئی اور اپنے بازو پھیلاتے ہوئے بولی۔

”سرحد کے اس طرف تھی تو یہ لوگ مجھے نوچتے رہے، جسم پیش کرنے کے طریقے بتاتے رہے۔ سرحد کے اس طرف بھیج دیا کہ اپنا بدن لوگوں کو پیش کروں اور ان کے ”ہند تو“ کا ایندھن بنوں۔ نگھوں سوچو، گرو کی ایک کور کو ان

”سنیل، اب جبکہ میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں اور تم جو چاہو میرے ساتھ سلوک کرو، میں رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا، تم چاہے مجھے ابھی گولی مار دو، لیکن اتنا بتا دو کہ تمہارے یہاں آنے کا، اتنا پلان بنانے کا مقصد کیا تھا۔“
 میرے یوں کہنے پر اس نے قہقہہ لگایا اور پھر بولا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے بھولے ہو، یا پھر احمق ہو، خیر جو بھی ہو، تمہارے بارے میں ہمارے اداروں نے بہت غلط اندازہ لگایا ہے، تم ایک کبھی ہو اور ہمارے اداروں میں ہاتھی بنے ہوئے ہو۔ خیر، ان کی غلط فہمی تو اب دور ہو ہی جائے گی۔ میں تمہیں بتا دوں کہ ہمارا پلان کیا ہے۔“

”میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”دشمن کو دو طرح سے زیر کیا جاتا ہے، طاقت سے یا عقل سے، تم چاہو تو اسے سازش کہہ سکتے ہو۔ ہم نے پہلا نہیں دوسرا طریقہ استعمال کیا ہے۔“

”پہلا اس لیے نہیں کہ تم ڈر پوک ہو؟“ میں نے جان بوجھ کر اسے چڑانے کے لیے کہا تو بھڑک کر بولا۔

”اوائے ڈر پوک ہوتے تو تیرے دیش میں گھس کر تجھے اپنے ساتھ نہ لے جا رہے ہوتے۔ خیر! طاقت سے اس لیے نہیں کہ اب دونوں دیشوں کے پاس ایسی طاقت ہے، طاقت کا توازن ہے۔ اب طاقت کا استعمال کرنے کے لیے نجانے کتنی بار سوچنا پڑے گا۔ ظاہر ہے ہر دیش اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے اپنا پورا زور لگا دے گا، سو دوسرا رستہ ہے عقل۔ اور عقل یہ کہتی ہے تم لوگوں میں سے وہ سوچ ہی چھین لی جائے، جس سے تم لوگوں میں وہ خوں ہی نہ رہے جس کے بل بوتے پر تم لڑتے ہو۔ ہم نے پلان کیا کہ تمہارے جہاد کا رخ تمہاری طرف ہی موڑ دیا جائے اور تم اپنے گلے خود ہی کاٹتے رہو۔ کبھی علاقائی بنیاد پر، کبھی زبان کی بنیاد پر، کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی کلچر کے نام پر۔ فرقہ واریت تمہاری جڑوں میں ہے۔ تم اپنے آپ کو تلف کرنے کا نام جہاد رکھ دو، یہ ہمارا مقصد ہے۔ تمہاری نسل کھوکھلی اور کمزور کرنا ہمارا مقصد ہے۔ تمہارے اندر خلفشار پیدا کرنا ہمارا مقصد ہے۔ ہمارا ٹارگٹ تمہاری نئی نسل ہے۔ ذرا سوچو، تمہاری قوم کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت ڈال دینا، فساد برپا کر دینا ایسی تباہ کاری سے بھی زیادہ تباہی ہے۔ تم خود ہی ایک دوسرے کی حق تلفی کرتے رہو، کسی دشمن کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی تم میں ہمت ہی نہ ہو۔“

”یہ تو تمہارے بڑے کب سے کرتے چلے آ رہے ہیں، اس سے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔

”ہوگا، کیوں نہیں، ہو رہا ہے۔ خیر! ذرا سوچو، جب بھارت میں اسلام نہیں آیا تھا تو کیا تھا؟ یہی نا کہ کلمہ آ گیا، مطلب اسلام آ گیا۔ اور جب کلمہ ہی نہیں رہے گا، وہ روح محمدی، جس کے بل بوتے پر تمہاری قوم کھڑی ہے، وہ کلمہ ہی نکل جائے گا تو ویسا ہی ماحول ہوگا، جیسا اسلام آنے سے پہلے تھا، یہی ”ہند تو“ کا خواب ہے۔ اور ہم اپنا خواب پورا کر کے رہیں گے۔ اس لیے ہم نے ادارہ بنایا، تربیت دی اور سندپ کور کی طرح تمہاری قوم کی رگوں میں زہر گھول دیا ہے۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لفظ نفرت میں لتھڑے ہوئے تھے۔ شاید وہ مزید بات کرتا لیکن اسی وقت اس کا فون بج اٹھا تھا۔ وہ فون سننے لگا۔ سرحد پار رابطہ ہو گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک کچی سڑک پر چلتے رہنے کے بعد سرحد پر لگی باڑی روشنی واضح دکھائی دینے لگی تھی۔ میری خیال میں سرحد کا ابھی ایک کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ تھا۔ تبھی سنیل درما نے ڈرائیور کو رُک جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لوگوں نے کیا بتایا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ ایسا تمہاری کسی بہن کے ساتھ ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں تو تم لوگوں کو دعوت دیتی ہوں آؤ! تم لوگ بھی آؤ، سکھنی سے بنی ہوئی کتیا کا بدن نوچو، کیونکہ میرے سامنے سنگھ کھڑے ہیں، جنہیں گردوں نے تو شیر بنایا تھا اور یہ کہتے بنے اپنی بہن کو کتیا بنا دیکھ رہے ہیں، میں آرام سے مر سکوں گی کہ صرف کور ہی نہیں، سنگھ بھی کہتے بن گئے تھے۔ آؤ سردار آؤ۔“ وہ انتہائی جذباتی انداز میں کہتے ہوئے اپنی شرٹ اتارنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کا سینہ برہنہ ہو گیا۔

”بس کر بہن، ہوش آ گیا، تو کپڑے مت اتار۔“ ان میں سے ایک قیدی نے آگے بڑھ کر غصے میں کہا تو وہ نفرت سے چنگھاڑتے ہوئے بولی۔

”یہ تو مسلمانوں کو ان کا کلمہ بھلا رہے ہیں، ان کی اتنی جرات ہو گئی، یہ ہمیں چور اسی بھلا رہے ہیں، دربار صاحب کی تذلیل بھلا رہے ہیں سنگھوں کے بچوں کا قتل بھلا رہے ہیں۔ اوئے سنگھوں، کہتے بننا ہے یا سنگھ؟“

”میں سمجھ گیا تو کیا چاہتی ہے؟“ اسی سنگھ قیدی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ سندپ کور نے کھلی ہوئی شرٹ کے بٹن بند کرنا شروع کر دیئے۔ تبھی اس قیدی سنگھ نے زوردار نعرہ لگایا

”جو بولے سونہال.....“

باقی تین کے ساتھ سندپ کور نے بھی نعرہ لگایا

”ست سری اکال آؤ۔“

یہ کہتے ہی وہ قریب کھڑے دونوں قیدیوں پر ٹوٹ پڑے۔ دو نے ایک کو پکڑ لیا تھا۔ اسی لمحے سنیل درما بھاگا۔ تو سندپ کور اس کے پیچھے لپکی۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا، اس نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا تڑپ کر لڑھکا اور زمین پر گر گیا۔ سندپ کور اس پر جھگی اور اسے جا کر پکڑ لیا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے سر پر ٹھوکر ماری۔ اب وہ اٹھ کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ سندپ نے اسے قابو کر لیا تھا۔

دوسری طرف وہ چاروں سکھ ان دونوں ہندو قیدیوں کو مار رہے تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر ان سے معافی مانگ رہے تھے لیکن سکھوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دو سکھوں نے ایک قیدی کی ایک ایک ٹانگ پکڑ لی، اسے گھمانے لگے، تیز تیز گھماتے ہوئے اسے ایک درخت میں دے مارا۔ اس کا سر چمچ گیا۔ اس کی چیخ بھی نہ لگی اور وہ مر گیا۔ دوسروں نے دیکھا تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا اور دوسرے کو بھی مار دیا۔ وہ دونوں ہندو قیدی قریب پڑے ساکت ہو چکے تھے۔

سنیل درما زمین پر پڑا ہوا بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کے قریب پڑا فون بج اٹھا۔ سندپ نے ایک سنگھ کو اشارہ کیا کہ وہ سنیل کو پکڑے اور فوراً فون کی طرف لپکی اسے اٹھایا اور ذرا دور ہو گئی۔ اس نے فون رسبو کیا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

”کہاں تک پہنچے؟“

”ہم پھنس گئے ہیں۔ شاید ریجنر زکو پڑ چل گیا ہے، اب تک ہمارے دو بندے مارے جا چکے ہیں اور سنیل کو گولی لگ گئی ہے۔ وہ زخمی ہے، میں اسے لے کر چھپی ہوئی ہوں۔“

”کیا تم باؤ تک پہنچ سکتی ہو؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”میں کوشش کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ کی ضرورت پڑے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا جیسے وہ بھی شدید زخمی ہو۔

”تم ٹھیک ہو؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”نہیں، میں زخمی ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”دیکھو! ابھی میں ایک شعلہ فائر کرتا ہوں۔ تم غور سے دیکھ کر بتانا کہ کتنی دور ہو، تمہیں بھی ہماری سمت کا اندازہ ہو جائے گا۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”اوکے۔“ اس نے جواب دیا تو اسی لمحے کافی دور ایک شعلہ آسمان کی طرف لپکا۔ اسے دیکھ کر وہ بولی۔ ”ٹھیک، میں اسی جانب ہی بڑھتی ہوں۔“

تبھی فون بند ہو گیا۔ اس نے فون مجھے دے دیا اور سنیل کو اٹھا لیا۔ وہ اس پر تشدد کرنا چاہتی تھی۔ تبھی میں نے کہا۔

”سندپ۔! کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”اے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتی ہوں، اس کے کھڑے کھڑے کر کے یہاں چھوڑ دینا چاہتی ہوں تاکہ جانور اسے کھالیں۔“ اس نے انتہائی نفرت سے کہا۔

”اور پھر.....؟“ میں نے پوچھا۔

”میں واپس اسی ادارے میں جاؤں گی۔“ اس نے اپنا ارادہ بتایا۔

”نہیں، اسے ساتھ لے کر جاؤ۔ یہ تمہاری وفاداری کا ثبوت ہوگا۔“ میں نے کہا تو ایک دم سے سمجھ گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہسٹل لیا اور اس کی پشت پر دل کے قریب فائر کر دیا۔ وہ ایک لمحہ کو تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔ سندپ نے میری طرف دیکھا، پھر ایک دم سے پلٹ کر باڑ کی سمت چل پڑی۔ ان چاروں قیدیوں نے سنیل کی لاش کو اٹھایا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب وہ کافی دور چلے گئے تو میں ان پر گولیاں چلانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں پلٹا تو میرے پیچھے فورسز کے کئی جوان کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ نذیر طارق اور سلمان کھڑے تھے۔ فورسز نے لاشوں کو قبضے میں لے لیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور پلٹ کر کار میں جا بیٹھا۔ سبھی سمجھ رہے تھے کہ اس آپریشن میں گنوا یا کچھ نہیں تھا۔ لیکن پا بہت کچھ لیا تھا۔ ہم واپس کے لیے چل دیئے۔ اس وقت رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے سندپ کور بہت یاد آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اوگی پنڈ پر سورج نے ابھی کرنیں نہچا اور نہیں کی تھیں۔ جہاں سنگھ چھت پر ٹیس کے ساتھ کھڑا مشرق کی طرف اس تاریخی روشنی کو دیکھ رہا تھا، جہاں سے سورج ابھرنے والا تھا۔ اس کے سامنے فصیلیں اور دائیں جانب تارکول کی سڑک تھی، پیچھے اوگی پنڈ تھا۔ وہ کافی حد تک ٹینس تھا۔ اس کے دماغ میں انوجیت کا الیکشن تھا۔ اسے یہ نہیں تھا کہ اگر انوجیت سنگھ جیت گیا تو کیا ہوگا، بلکہ وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اگر ہار گئے تو پھر کیا ہوگا۔ اس الیکشن مہم میں کتنے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔ کس کس کے ساتھ کیسے منٹنا ہوگا۔ پہلی بار وہ پورا علاقہ پھرا تھا۔ اس نے پنجاب کے اس خطے کو دیکھا، جو آبادی کے لحاظ سے گھنا تھا لیکن اس میں وہ بنیادی سہولتیں ابھی تک میسر نہیں تھیں، جوان لوگوں کو ملنی چاہئے تھیں۔ ہارنے کے بعد پھر کیا ہوگا، کیا وہ ان لوگوں کے لیے آواز اٹھا سکے گا۔ وہ یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اس نے اپنے کاندھے پر نرم سا ہاتھ محسوس کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ سوائے ہر پریت کے دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ دھیسے سے پلٹا تو وہ گہرے سبز شلوار سوٹ میں اس کے سامنے تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔ جس میں چائے کے دو گگ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ٹرے جہاں کی جانب بڑھایا۔ جہاں نے خاموشی سگ اٹھایا اور مشرق کی جانب

دیکھنے لگا۔ تبھی ہر پریت اس کے ساتھ ٹیس پر آکر کھڑی ہوگئی۔ اس رنگ سے سب لیا اور بولی۔
”میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ ہمارے سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو رتب چاہے گا وہی ہوگا۔“

”ہوگا تو وہی جو رتب چاہے گا۔ بس ایویں خیال آ رہا ہے کہ اگر انوجیت یہ ایکشن نہ جیتا تو پھر.....“
اس نے کہنا چاہا لیکن ہر پریت نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے لیے زیادہ مشکلات ہو جائیں گی، تو کوئی بات نہیں، وہ بھی دیکھ لیں گے، جو مرضی ہو وہاں گرو کی۔“
”کل دوٹ ڈالے جانے ہیں اور شام تک پہنچ جائے گا کہ ہمارے لیے مستقبل میں کیا ہے۔ خیر، آج کیا کر رہی ہو؟“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ویسے تو آج رسول پور کلاں جانا ہے، وہاں پورے علاقے سے لڑکیاں اور عورتیں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ ایکشن کیپ کے لیے۔ اس کے بعد شام کے وقت کھور میں امر داس کالونی میں بابا مراد شاہ کے دربار پر حاضری دینا ہے۔ ممکن ہے سائیں لاڈی شاہ سے بھی ملاقات ہو جائے۔ اس کے بعد فراغت ہے، باقی جو تم کہو۔“

”ٹھیک ہے، تم کرو اپنا کام، کل شام کے بعد ہم ملیں گے۔“ جہاں نے سنجیدگی سے کہا اورنگ سے بڑا ساراسپ لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ بس اس کے ساتھ کھڑی چائے پیتی رہی۔ اسی خاموشی میں اس کا سیل فون بجا تو جہاں نے اسکرین پر دیکھا۔ نوٹن کور کا فون تھا۔

”ہاں، نوٹن کیسی ہو اور کہاں ہو؟“

”میں جانندھر میں ہوں فارم ہاؤس پر۔ وہ بات کرنی تھی، جس کا مشورہ رات ہوا تھا۔ وہ ہوگئی ہے۔ ڈن ہو گیا ہے معاملہ، میں نے یہی بتانا تھا۔ اور دوسرا سندھپ کور آگئی ہے، امر تر کے فوجی ہسپتال میں ہے اس وقت۔“ نوٹن نے کہا۔

”اب ملاقات کب تک ہو سکے گی اس سے؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”ابھی تو وہ سخت نگرانی میں ہوگی۔ پتہ نہیں کب اسے آزادی ملے گی۔ کتنی تفتیش سے گزرنا پڑے گا اس کو۔ ابھی اس کے بارے میں مت سوچو۔“

”اوکے۔“ اس نے ایک دم سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ تبھی ہر پریت بولی۔

”میرے ساتھ چلو، سارا دن اکٹھے گذاریں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں تیار ہو کر آتا ہوں، تم ناشتہ لگاؤ۔“ جہاں نے ایک دم سے کہا تو ہر پریت مسکراتے ہوئے خالی گک لے کر واپس پلٹ گئی۔ جہاں پھر سے مشرق کی طرف دیکھنے لگا جہاں سورج نے سر اٹھایا تھا۔

رسول پور کلاں سے واپسی پر جب ہر پریت کور کے ساتھ جہاں بابا مراد شاہ دربار کی جانب چلے تو ان کے ساتھ لوگوں کا ایک جم غیر تھا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ایک بڑے جلوس کی شکل میں جا رہے ہیں۔ اس طرح کی کسی بھی سرگرمی پر حکومت کی طرف سے پابندی تھی۔ کل ایکشن ہوتا تھے۔ سو وہیں لوگوں کو سمجھا بھجا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جلوس منتشر ہو گیا۔ جس وقت وہ کھور امر داس کالونی میں دربار پر پہنچے، اس وقت چند لوگ ہی ان کے ساتھ تھے۔

☆.....☆.....☆

دن کا پہلا پھر گزر چکا تھا، جب بائیتا کور تیار ہو کر میرے کمرے میں آگئی۔ رات وہ میرے انتظار میں تھی اور میرے واپس آ جانے تک جاگتی رہی تھی۔ میں نے اسے ساری رواد سنا دی تھی۔ اس وقت وہ فریش تھی۔ میں نے

اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”فہیم اور سلمان کہاں ہیں؟ ناشتہ کر لیا انہوں نے؟“

”وہ تو لچ کے چکر میں ہوں گے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔“

”اچھا انہیں بلاؤ اور میرے لیے ناشتہ لگواؤ، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میرے ذہن میں اس وقت ولید کا خیال تھا۔ میں نے آج اسے یہاں آنے کا کہا تھا۔ اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔

اس وقت میں ناشتہ کر چکا تھا۔ میں سلمان اور فہیم کو ولید کی سوچ کے بارے میں بتایا۔ ہم چاروں اس کمرے میں چلے گئے، جہاں سب سے رابطے کا انتظام تھا۔ سبھی آن لائن تھے۔ تبھی میں نے ولید کا پلان ان کے سامنے رکھا۔ سارے ملک سے تین سو تیرہ بندے تلاش کرنے ہیں اور باقی سب کچھ انہیں سمجھا دیا۔ وہ سب بحث کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دو گھنٹے کے بعد ان میں سب طے ہو گیا۔ اس کا انچارج فہیم قرار پایا۔ اس کا پراجیکٹ دو ماہ کا تھا، اس کے بعد کہیں جا کر ان کا کام شروع ہوتا تھا۔ بہر حال ان سب نے اس کام کی ہامی بھری اور اسی دن کام کرنے کا کہہ دیا۔ اس دن سلمان نے واپس چلے جانا تھا اور وہاں سے جنید نے آ جانا تھا۔ میں حیران تھا کہ ولید اب تک پہنچا کیوں نہیں۔ اسے تو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔

میں وہاں سے اٹھا تو بائیتا کور بھی میرے ساتھ ہی باہر آگئی۔ میں نے فون پر ولید کے نمبر ملائے۔ کچھ دیر بعد اس نے کال رسیو کی۔

”تم آئے کیوں نہیں اب، تک؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں، میں یہاں پولیس اسٹیشن میں ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں حیرت سے پوچھا۔

”کس پولیس اسٹیشن میں اور کیوں؟“

”ہوں تو ادھر لاہور ہی میں۔ لیکن پولیس میرے آبائی علاقے سے آئی ہے، وہاں مجھے قتل کیس میں پھنسا یا جا رہا ہے۔“ اس نے تھانے کا نام لے کر کہا۔

”میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا تو تیزی سے بولا۔

”نہیں نہیں، آپ مت آئیں، میں بات کر رہا ہوں ان سے، اگر کوئی بات بن گئی تو ٹھیک درنہ پھر میں آپ سے کہوں گا۔“

”اچھا، جیسے ہی کوئی نتیجہ نکلے مجھے بتانا، بلکہ جو بھی ہو مجھ سے رابطہ ضرور کرنا۔“ میں نے کہا اور پھر چند الوداعی باتوں کے بعد میں فون بند کر دیا۔

میں سوچنے لگا پولیس چاہے مشرقی پنجاب کی ہو یا مغربی پنجاب کی، اس کا رویہ اور دتیرہ ایک ہی ہے۔ انگریز نے یہاں کے لوگوں کو غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے ان لوگوں کو ایک ایسا نظام دیا، جس نے ان کی ذہنیت ہی بدل دی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی جو کالے انگریز ہم پر مسلط ہوئے، انہوں نے اس نظام کو تبدیل نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے بھی پولیس کو اپنے ذاتی مفاد میں استعمال کیا اور کر رہے ہیں۔ پولیس جرم ختم کرنے میں تو بالکل ناکام رہی ہے۔ اس نے جرم کم تو کیا کرنا تھا، جرم کے پیدا ہونے کی بہت بڑی وجہ بن گئے ہیں۔ میں بہت دیر اس پر سوچتا رہا اور جتنی دیر سوچتا رہا، اتنا ہی بے چین رہا۔ فہیم اور سلمان اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ میں اٹھا اور بائیتا کور کے پاس جا پہنچا۔

وہ صوفے پر نیم دار تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہلکے سے مسکرا دی۔ وہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس میں جان نہیں ہوتی۔ میں جان بوجھ کر اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ ذرا سی سٹ گئی تو میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے سوہنیو! کوئی پریشانی ہے کیا؟“

وہ چند لمحوں میری طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

”میں امرتسر جانا چاہتی ہوں۔ وہ بھی آج ہی۔“

”ہوا کیا ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”کل انکیشن ہونے کو ہیں، میرا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ باپو کو اس بار کافی حد تک خطرہ ہے۔“ اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”کیوں کیا ہوا؟ وہاں لوگ ہیں اور.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”نہیں، وہ اسے سنبھال نہیں پائیں گے۔ کوئی واضح دھمکی نہیں ہے، لیکن خطرہ ہے، اس خبر کو میں نظر انداز نہیں کر سکتی ہوں۔“ اس نے کافی حد تک سیدھا ہوتے ہوئے کہا تو میں اس کے لہجے میں چھپی ہوئی وہ گھبرتا کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ تبھی میں نے اچانک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں کرتا ہوں کچھ۔“

”تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں، میں کر لں صاحب سے کہہ دیا ہے، میں پہلے مبینی ہی جاؤں گی۔ پھر وہیں سے امرتسر جانا ہوگا۔ سارے کاغذات تیار ہیں۔ بس ابھی ذرا سی دیر میں نکلنا ہے۔“ اس نے دھکی لہجے میں کہا اور ایک دم سے میرے گلے لگ گئی۔ نجانے کیوں وہ ایک دم سسک پڑی تھی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ وہ کافی دیر تک میرے ساتھ یونہی لگی رہی۔ وہ الگ اس وقت ہوئی، جب اس کا فون بجا۔ اس نے خود کو سمیٹ کر فون رسیو کیا۔ وہ فون کال کر لں صاحب ہی کی تھی۔ اسے لینے کے لیے نیچے کار آگئی تھی۔ اس نے فون بند کیا۔ اور میری طرف دیکھ کر بتایا۔

”وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کو بتا دوں، ولید کے بارے میں فکر نہ کرو۔ وہ اس کا معاملہ دیکھ لیں گے۔“

”مطلب۔!“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا مطلب وہی جانیں۔ چلو اٹھو۔“ بانیتا کور نے کہا اور صوفے سے اتر کر جوتا پہننے لگی۔ میں بھی اٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ہی اٹھ کر نیچے آ گیا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیاں اتری ایک بار پھر وہ میرے گلے لگ گئی۔ میں نے اسے الگ نہیں کیا۔ چند لمحوں بعد وہ خود ہی الگ ہوئی۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے انتہائی قریب تھا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی پھر ایک دم ہنستے ہوئے بولی۔

”چل اب بھی رہنے دے۔ اگلی ملاقات پر سہی۔“ اس نے کہا اور تیزی سے باہر کی طرف چلی گئی۔ تبھی میں نے تیزی سے کہا۔

”میں تمہیں ایئر پورٹ تو چھوڑ دوں یار۔“

”وہاں کیا یہ جدائی کا لمحہ نہیں آئے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے داخلی دروازے سے باہر چلی گئی۔ میں جس وقت پورچ میں پہنچا، وہ گیٹ پار کر رہے تھے۔ میں انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ میں نے انہی لمحوں میں اچانک خود کو بے چین محسوس کیا۔ جسے کوئی بہت اہم شے گم ہو گئی ہو۔ میں کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر پلٹ

کر اندر آ گیا۔

دوپہر ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں پڑا بانیتا کور کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا تعلق ہے، کیا ناظر ہے اس کے ساتھ، بس یہی سوچتا رہا۔ مجھ پر افسردگی طاری ہونے لگی۔ لاشعوری طور پر میں ولید کے بارے میں بھی سوچتا رہا کہ اس کا کیا بنا ہوگا؟ اسی نے مجھے فون کرنا تھا۔ ان لمحات میں مجھے یوں لگا کہ جیسے میری زندگی میں در آنے والے سارے ہنگامے ایک دم سے غائب ہو گئے ہیں اور ایک ایسا سکوت آ گیا ہے، جس نے مجھے خلاؤں میں لاپتہ کر دیا تھا۔ ایک دم سے میرے ارد گرد لوگ یوں کہیں دور چلے گئے تھے، جیسے وہ میرے پاس تھے ہی نہیں۔ تبھی میں نے سوچا، ممکن ہے یہ کوئی نیا امتحان ہو۔ یہ خیال آتے ہی میری ساری افسردگی، اداسی اور بے چینی ایک دم سے ختم ہو گئی۔ میں اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ نیچے پورچ میں میری کار کھڑی تھی، میں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ٹھہلتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے اپنا فون رات ہی کو طارق نذیر کے حوالے کر دیا تھا تا کہ مجھے نیا فون دیا جاسکے۔ وہ ابھی تک انہوں نے مجھے نہیں دیا تھا۔ اس وقت میں فون لینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں پیدل چلتا ہوا بہت دور تک آ گیا۔ اس دروان میں نے ٹھہر ٹھہر کر یہ یقین کر لیا کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں چلتا ہوا ایک مارکیٹ میں آیا، وہاں سے میں نے رکشہ لیا اور چل پڑا۔

میں نے فارم ہاؤس سے کافی دور ہی رکشہ چھوڑ دیا۔ وہاں سے پیدل ہی چل پڑا۔ یہاں تک کہ فارم ہاؤس جا پہنچا۔ جیسے ہی میں نے گیٹ کر اس کر لیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میری جنت، میری ماں میری راہ تک رہی تھیں۔ اگرچہ وہ گیٹ سے کافی دور بنے ایک لان میں بیٹھی ہوئی تھیں، لیکن ان کا رخ گیٹ کی جانب تھا۔ انداز ایسے تھا کہ جیسے وہ میرے انتظار میں ہوں۔ میں اسی ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ یہ سارے حالات کیوں بنے ہیں اور میں یہاں پر کیوں ہوں؟

میں ٹرانس میں آ گیا اور ان کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ مامتا سے لبریز نگاہوں سے مجھے دیکھتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے ان کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور فون میں جا بیٹھا۔ میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھا تو وہ میرا سر سہلانے لگیں۔

”کیسا ہے تو چتر؟“ انہوں نے نرم سی آواز میں پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے ویسے ہی گود میں سر رکھے کہا۔

”رَب تجھے ہمیشہ ٹھیک ہی رکھے۔“ انہوں نے مجھے دعا دی تو میں پرسکون ہو گیا۔ یہ ماں کا سایہ بھی کتنا قوت بخش ہوتا ہے۔ انسان زمانے کی جتنی مرضی کڑی دھوپ میں ہو، ماں کی چھاؤں میں آ کر کتنا پرسکون ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت سکون کی انتہاؤں پر تھا۔

”یہ لیں۔“ اچانک سوئی کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں نے سر اٹھایا۔ وہ ہاتھ میں ٹرے پکڑے کھڑی میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں اٹھ گیا۔ وہ میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر کے ہلکے سے اشارے کے ساتھ سلام کہا اور پھر ٹرے رکھ کر ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے پانی کا گلاس مجھے دیا، پھر چائے بنانے لگی۔ میں نے کپ دیکھے تو وہ تین تھے۔

”یہ کپ تو ایسے لے کر آئی ہو، جیسے تجھے میرے آنے کا پہلے ہی سے معلوم تھا؟“ میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا تو وہ مسکاتے ہوئے بولی۔

”ہاں، مجھے پتہ تھا کہ تم آرہے ہو۔“

”کیسے؟“ میں نے چوتھے ہوئے پوچھا۔

”یہ پھر کبھی سہی، ابھی تم چائے پیو۔“ اس نے کہا اور کپ میری جانب بڑھا دیا۔ وہ بات میرے ذہن میں رہ گئی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ بات کچھ اور ہی ہے۔ میں خاموش رہا۔ پھر کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

رات کے کھانے پر ہم تینوں ہی تھے۔ کھانے کے بعد اماں نے مجھے اپنے ساتھ کمرے میں چلنے کو کہا۔ میں ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گئیں، مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد بولیں تو ان کا لہجہ بڑا نرم تھا

”بیٹا! ایک بات کہوں؟“

”اماں، کیا کوئی ایسی بات ہے، جس کے لیے آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ بات کیا ہے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولیں

”بیٹا! جو انسان اس دنیا میں آیا ہے، اس نے لازماً واپس لوٹ کر بھی جانا ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ رتبہ تعالیٰ کا نظام ہے، جس میں انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ وہی زندگی دینے والا بھی اور لینے والا بھی، اور ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

”اماں یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ میں نے بات کو سمجھتے ہوئے تقریباً زود دینے والے لہجے میں پوچھا۔

”موت سے خوف زدہ نہیں ہوتے بیٹا، یہ بھی زندگی ہی کا ایک حصہ ہے۔ ڈرتے وہی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی دنیا ہی کی ہے، حالانکہ زندگی تو نجانے کب کی شروع ہو چکی ہے۔ زندہ وہی ہوتا ہے جو زندگی اور موت دونوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔“ وہ بڑے سکون سے کہہ رہی تھیں۔ میں خاموش رہا تو وہ بولیں، ”خیر! دنیا کی اس زندگی میں کامیاب وہ ہے جو خوشی اور غمی دونوں پر قابو پا لیتا ہے۔“

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ایک ماں کا جو فرض ہے، وہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”شادی تو خوشی کی بات ہوتی ہے لیکن آپ اتنی افسردگی میں یہ بات کیوں بتا رہی ہیں۔“ میں نے ایک خاص خیال کے تحت پوچھا تو وہ پھر سے مسکرا دیں۔

”پتر! ہر کام کے لیے رتبہ تعالیٰ نے وقت مقرر کر رکھا ہے، وہ اسی پر ہونا ہے۔ کیا یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہاری شادی کس سے کر رہی ہوں؟“

”جی، آپ بتا دیں۔“ میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

”دیکھ پتر، میں جو بھی نام لوں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حتیٰ ہے اور اسی کے ساتھ تجھے شادی کرنا ہوگی، ایسا نہیں ہے، اگر تمہیں پسند ہو تو ٹھیک، ورنہ نہیں۔ میں تمہاری پسند کے مطابق ہی تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا حکم سر آٹکھوں پر اماں، لیکن کیا اس سے پوچھ لیا کہ وہ میرے ساتھ شادی پر تیار ہے۔“ میں نے دھیمے سے کہا تو وہ پیار سے بولیں۔

”میں تیری شادی سوئی کے ساتھ کر رہی ہوں اور وہ تو نجانے کب سے اس انتظار میں ہے۔“

”ٹھیک ہے اماں۔“ میں نے پورے دل سے کہا تو ایک دم سے خوش ہو گئیں۔ وہ بڑا ہی سنہرا لمحہ تھا۔ میں نے اپنی ماں کے چہرے پر ایسی خوشی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”اور ہم شادی کریں گے، نورنگر جا کر۔“ اماں نے ایک دم سے حکم دے دیا۔

”کب جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پتر یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کب نورنگر جانا چاہو، کب شادی کرنا چاہو۔ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ کل نہیں تو آج، آج نہیں تو ابھی۔“ اماں نے کہا اور بیڈ پر لیٹ گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید بات نہیں کریں گیں۔

”اچھا اماں، آپ آرام کرو، باتیں ہوتی رہیں گئی۔“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھا۔ لائٹ آف کر کے دھیمی لائٹ جلائی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو میری نگاہ کاریڈور کے سرے پر کھڑی سوئی پر پڑی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ وہاں پر مدہم روشنی تھی۔ سوئی نے سفید براق لباس پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں جیسے ہی اس کے پاس پہنچا، اس نے دھیرے سے رخ موڑا۔ اس وقت مجھے وہ انتہائی حسین لگی۔ اس کا چہرہ سفید آنچل کے حصار میں تھا۔ اس کے بدن کا کوئی خال و خد مجھے دکھائی نہیں دیا۔ میک اپ کے لوازمات سے بے نیاز چہرہ، دکھ رہا تھا۔ اس کی شرمیلی آنکھوں میں دور دور تک کہیں ایسا نہیں تھا کہ وہ کیا تھی، اور اب کیا ہے۔ مجھے وہ سوئی یاد آنے لگی جو مسافر شاہ کے میلے پر بے خود ہو کر تاج رہی تھی۔ میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔ تب سے میں بھی ایک ایسے دائرے میں آ گیا، جہاں سے اب تک نہیں نکل پایا تھا، اور اس کی زندگی بھی ایک نئی ساخت اختیار کر گئی تھی،

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے سر جھٹکتے ہوئے اس کا گلابی ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”یہی نا کہ وہ پہلے دن ملنے والی سوئی کدھر گئی اور اب یہ کون ہے؟ یہی نا۔“ اس نے کہا تو میں ایک لمحے کے لیے چونک گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے پوری سچائی سے بولا۔

”بالکل، ایک لمحے کے لیے مجھے وہ یاد آگئی تھی۔“

میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر مجھے لے کر میرے کمرے کی جانب چل پڑی۔ میں آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ ہم کمرے میں آ گئے۔ اس نے مجھے بیڈ پر بٹھایا اور پھر وہ خود بھی بیڈ پر آ گئی۔ اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور پھر میرے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”تمہیں شاید یاد ہو کہ نہ ہو، مگر میں وہ لمحہ نہیں بھول سکتی، جب تم نے میرا تعارف اماں سے کرایا تھا۔ اور اماں نے جو میرے ساتھ سلوک کیا، اسی رویے نے گردیدہ کر لیا۔ زندگی میں دولت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میری سگی ماں نے مجھے پڑھایا لکھایا، میری ایک خاص طرح سے تربیت کی، کس لیے۔ دولت کے لیے نا؟ آج میرے پاس اس کے تصور سے بھی زیادہ دولت ہے۔ خیر! میرا یہ کہنے کا مطلب نہیں تھا، میں بتانا یہ چاہتی ہوں کہ تم نے اسی رات میرا دل لوٹ لیا تھا۔“

”اس سوئی اور اس سوئی تک کا جو سفر ہے، وہ میرے لیے ہی تھا؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا

”نہیں، بالکل نہیں۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا پھر ثانیہ بھر توقف کے بعد بولی۔ ”پہلے پہل تھا، لیکن بعد میں نہیں۔ مجھے یہ زعم تھا کہ دنیا کا کوئی بھی مرد ہو، میں اسے کھلا سکتی ہوں۔ میری تربیت ہی یہی تھی۔ مگر وہ تربیت انتہائی جھوٹی تھی۔ تیرے جیسے بندے کو اپنی مرضی سے میں چھو بھی نہ سکی۔ مجھے وہ ساری تربیت بے کار لگی۔ پھر اماں

نے بتایا کہ میں اپنے آپ کو آزماؤں۔ میں نے آزما یا اور آج تم میرے پاس ہو، اتنے قریب۔“
”کیا وجہ ہے اس کی؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”عشق، تیرا عشق، جس سے مجھے اتنا کچھ ملا کہ کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ تمہارا ہونا، تم سے عشق تو بس ایویں ٹانوی ساتھ، ایک راستہ، ایک نشان، میری منزل تو کہیں اور ہے، میں تو کسی دوسرے راستے کی مسافر تھی اور ہوں، یا شاید تمہارا وجود میری قوت تھی، تم سے ہو کر ہی میری تکمیل ہے۔ میں تمہارے بنا ادھوری ہوں۔“ وہ جذب میں بول رہی تھی۔

”اگر میں نہ ہوں تو.....“

”مجھے فرق نہیں پڑتا اب، میں آنکھیں کھول دوں یا بند کر لوں، اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میرے اندر ہو۔ میرے من میں۔ جہاں صرف میری مرضی چلتی ہے۔ اور یہ جان لو، میرے من میں جو ہوتا ہے، وہی تم کرتے ہو، آزمانا چاہو تو آزما دیکھو۔“ اس نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

”یہ ساری باتیں تم نے کہاں سے سیکھ لیں، میری اماں کو تو ایسی باتیں نہیں آتیں۔“ میں نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جب من کی آنکھ کھلتی ہے نا جمال، تو سب روشن ہو جاتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ عشق سارے نفس و خا شاک جلا دیتا ہے اور اپنی ساخت پر لے آتا ہے۔ میرا عشق نہ صرف مجھے اپنی ساخت پر لے آیا ہے بلکہ اتنی قوت دے دی ہے کہ تمہیں بھی اپنی ساخت پر لے آؤں۔ اسے تم چاہے، رنگ میں رنگنا کہہ دو، یا آپے را بٹھا ہوئی کہہ لو، میں ان دونوں کیفیات سے آگے نکل چکی ہوں۔ میں نے عشق کی اس آگ کو خود تک محدود رکھا، تم تک نہیں پہنچنے دیا۔ اب اسی عشق کا آزمانا ہے۔“ وہ اب بھی جذب میں کہہ رہی تھی۔

”یار، میں اتنی عورتوں.....“ میں نے کہنا چاہا تو میری بات اچک کر بولی۔

”تم جہاں بھی رہو، وہاں پر بھی میرے ہو۔ کہ اب تمہارا مرکز میں ہوں۔ تم کہیں بھی، کسی کے ساتھ بھی رہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہاں اب سوال جسم کا نہیں رہا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیسے، کیا تم مجھے سمجھا پاؤ گی۔“ میں نے پوچھا تو وہ چنانچہ کو کسی نامعلوم نکتے کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

”انسانی جسم کی شعاعوں سے تو تم واقف ہو ہی چکے ہو۔ ان کی دریافت کے بعد انہیں اتنی طاقت ور بنا لینا کہ وہ دوسرے کی شعاعوں پر اثر انداز ہو جائے، یہ تو خود انسان کے اپنے اختیار میں ہے نا۔ شعاعیں سے دینا رتب کی رضا ہے، ان کا استعمال بندے کا اختیار ہے۔ تم دنیا میں جہاں بھی ہو، مجھے اب تیرے باری پتہ ہوتا ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ کوئی عام سی بات کر رہی ہے۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی ”ایسے مت دیکھو، جوڑی اسے ہی کہتے ہیں جو برابر کی ہو۔“

اس کے یوں کہنے پر میں نے غور کیا تو ایک دم سے صدیوں کا فاصلہ طے کر گیا۔ اب مزید سوال کریدنے کے ضمن میں آ جاتا تھے۔ میں نے موضوع ہی بدل دیا

”کیا تم میرے ساتھ شادی پر خوش ہو۔“

”اگر تم دو جسموں کے ملاپ کو شادی کا نام دو گے تو یہ لا حاصل ہوگا۔ اگر اپنی ذات کی تکمیل چاہو گے تو یہ انتہائی ضروری ہے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ مقام میسر آ جاتا ہے۔ تب میں خوش ہوں گی کہ اس راستے میں تمہارا ساتھ ہوگا۔ میں اس وادی سے گزر کر آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ یہی وہ منزل ہے، جہاں شجر نے آگے بچ

دے کر فطرت کی تکمیل کرنا ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ وہی رہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں تک جا پہنچی ہے۔
”رات بہت ہو گئی ہے۔ اب سوئیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، اب سو جاؤ۔“ اس نے کہا، دھیرے سے میرا سر تکیے پر رکھا اور اٹھ گئی۔

وہ چلی گئی لیکن میں ایک نئی دنیا میں آ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا اپنا پن بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔ مجھے لگا میں یہاں پر ہوں ہی نہیں، اس کے ساتھ ہی کہیں چلا گیا ہوں۔ شاید اب اس عشق نے مجھے آزمانا تھا یا میں عشق کو آزمانا۔ اس کا نتیجہ کیا ہونا تھا، یہ رتب سوہنا ہی جانے۔ میں نے یہ سوچا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆.....☆.....☆

جسپال کو سونے تھوڑا سا وقت ہی ہوا تھا۔ رات کا آخری پہر چل رہا تھا، ایک دو گھنٹوں میں صبح ہو جانے والی تھی۔ کمرے میں مدہم روشنی تھی۔ تبھی سائینڈ ٹیبل پر دھرا ہوا سیل فون بج اٹھا۔ جسپال جاگ گیا۔ اس نے فون اٹھایا اور اس کی اسکرین پر دیکھا۔ وہاں اجنبی نمبر تھے۔ اس نے کال رسیو کی اور پوچھا۔
”ہیلو، کون؟“

”میں بات کر رہی ہوں۔“ باغیتا کور کی آواز ابھری

”ہیلو۔! کہاں ہو؟“ اس نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔

”میں ممبئی میں ہوں اور یہاں سے بائی ایئر امرتسر نکلنے والی ہوں۔ تم ایسا کرو، ابھی اسی وقت نکلو امرتسر کے لیے۔ میں وہیں گھر پر ملتی ہوں۔“

”باغیتا کوئی خاص بات؟“ اس نے تشویش سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

”میں وہیں آ کر بتاتی ہوں نا۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ جسپال نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور فوراً ہی بیڈ سے اٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ اوگی سے نکل پڑا تھا۔ اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا، ورنہ اسے ان سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا، جس کے جواب اسے بھی نہیں معلوم تھے۔ اس وقت بھوتی ہی اسے جاگتی دکھائی دی، اس نے اختصار سے اسے بتایا اور چل پڑا تھا۔ جالندھر تک اس کے ذہن میں کئی ساری باتیں آتی رہیں، لیکن اس نے پھر اپنا سر جھٹک کر سارے خیال نکال دیے۔

ابھی دن کا پہلا پہر ہی تھا، جب وہ امرتسر پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی پورچ میں روکی اور اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم بالکل خالی تھا۔ وہیں موجود ملازم سے پتہ چلا کہ باغیتا کور ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ جبکہ اس کے آنے کی اطلاع آ چکی ہے۔ ملازم اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”رتن دیپ سنگھ جی کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ تو صبح ہی صبح پارٹی آفس چلے گئے ہیں۔ وہیں ہیں وہ تو۔“

”اور باغیتا نے کیا کہا تھا کہ وہ.....“ اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جی انہوں نے تو یہی کہا تھا کہ وہ ایئر پورٹ آ جائیں گی، وہیں گاڑی بھیج دیں، وہ تو ڈرائیور گاڑی لے گیا ہے۔ دوسرا آپ کے بارے میں بتایا۔ آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے ناشتہ لے کر آتا ہوں۔“ ملازم نے کہا۔

”پہلے میری ڈرائیور سے بات کراؤ، یا اس کا نمبر دو مجھے، جلدی۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”جی بہتر۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور اس میں سے ڈرائیور کا نمبر تلاش کر کے کال ملا دی۔ چند لمحے

بعد رابطہ ہو گیا۔ بائیتا کو اتر پورٹ کی عمارت کے اندر ہی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی بائیتا سے بات ہونے لگی۔
”خیر تو ہے تا بائیتا؟“ جہاں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، خیر نہیں ہے، اسی لیے میں لاہور سے انتہائی افراتفری میں نکلی ہوں۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔
”بات کیا ہے، کچھ بتاؤ گی بھی؟“ اس نے اُلجھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

”باپو کی جان خطرے میں ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باپو کو مارنا چاہتے ہیں، بلکہ ان کا اصل مقصد ہے، آج ہونے والے الیکشن کو ڈسٹرب کیا جائے، وہ یہاں کی سیٹ سے ہی نہیں، پنجاب کی کئی دوسری نشستیں صاف طور پر ہار رہے ہیں، ایک بڑا اپ سیٹ ہونے جا رہا ہے، جسے وہ وقتی طور پر ٹالنا چاہتے ہیں۔“ وہ انتہائی سنجیدگی سے بولی تب جہاں نے ایک گہرا سانس لیا اور سکون سے کہا۔

”ابھی تم نے ادھر گھر میں نہیں آتا اور نہ ابھی یہاں قدم رکھنا، کہیں ایسی جگہ ٹھہرو، جہاں ہم پہلے بات کر سکیں۔ میں آتا ہوں۔ ممکن ہے اس ڈرائیور کو نگاہ میں رکھا گیا ہو۔ اسے بھیج دو اور اس کا فون لے لو۔“

”اوکے۔“ اس نے ایک دم سے کہا اور فون بند کر دیا۔ جہاں نے وہ نمبر لیا اور وہاں سے چل پڑا۔
اتر پورٹ سے شہر کی طرف آنے والے اجتالہ روڈ پر ہی گرو ایونیو کے ایک ریسٹوران میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں یہ خبر کس نے دی ہے؟“

”حکومتی پارٹی کے اندر کے بندے سے یہ بات.....“ اس نے کہنا چاہا تو جہاں بولا۔

”بائیتا کوری۔! تم سے ایک بات کہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو وہ تجسس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”کہو۔“

”کچھ عرصہ پہلے تمہیں ایسی ہی خبر ملی تھی اور ہم سیدھے جال میں جا پھنسے تھے۔ مطلب دشمنوں نے تجھے خود ایسی خبر دے کر جال میں پھنسا لیا ہے۔ دوسری بات انہیں کیسے پتہ کہ تم کہاں ہو؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ معلوم نہ کر سکے ہوں کہ تم پاکستان میں ہو اور تم بے وقوفوں کی طرح فوراً یہاں آ چکے ہو اور اوپر سے مجھے بھی یہاں بلا لیا، تم نے ذرا بھی نہیں سوچا؟“ وہ تیزی سے کہتا چلا گیا۔ تب وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یار جس نے یہ خبر دی ہے وہ اپنا بندہ ہے۔ اس نے پہلے کبھی غلط خبر نہیں دی۔“

”بائیتا۔! یہ جان لو کہ اس خبر کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد چھپا ہوا ہے۔ وہ کیا ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس نازک وقت میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“ جہاں نے حتمی لہجے میں کہا۔

”تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“ اس نے جہاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

”دو باتیں ہیں، یا تو ہم اس خبر کو سچ مان کر رتن دیپ سنگھ جی کی حفاظت میں لگ جائیں، پھر جو سامنے آئے گا، دیکھا جائے گا۔ دوسرا اس خبر کو شک کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کے پیچھے جو مقصد ہے اسے جاننے کی کوشش کریں۔“ جہاں نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ مقصد کیسے جان پائیں گے، اس دوران اگر انہوں نے باپو کو.....“ وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

”کچھ نہیں ہوگا تمہارے باپو کو، جہاں تک مجھے شک ہے، وہ تمہیں اپنے جال میں پھانسا چاہتے ہیں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ وہ تجسس ملی حیرت سے بولی تو جہاں نے اسے سمجھایا

”یہ تو کنفرم ہے کہ انہوں نے تمہارے پاکستان میں ہونے کے بارے میں جان لیا ہے، تم وہاں کیسے کیوں اور کب گئی، یہ ریکارڈ ان کے پاس نہیں ہے۔ وہ تمہیں قابو کر کے تمہارے اس طرح وہاں ہونے کے بارے میں ضرور جاننا چاہیں گے۔“

جہاں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولی۔

”تو پھر، کیا کرنا چاہئے؟“

”ہم دونوں ہی آپشن لیتے ہیں، تم فوراً وہاں جاؤ، جہاں رتن دیپ سنگھ جی ہیں۔ فون پر پہلے بتا دو کہ وہ قطعاً حیرت کا اظہار نہ کریں، کیونکہ تم تو کئی دنوں سے جالندھر فارم ہاؤس پر ہو۔“

”اور دوسرا؟“ اس نے پوچھا۔

”دوسرا یہ کہ جس نے یہ خبر دی ہے، اسے اٹھالیں اور پھر بس، بات نکل آئے گی۔“ جہاں نے کہا تو بائیتا کو رکی آ نکھیں چمک اٹھیں، وہ سمجھ گئی کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

”ٹھیک ہے، میں ابھی باپو جی کے پاس جاتی ہوں اور تم اسے اٹھاؤ مت، دیکھیں کیا کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس پر ابھی ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ ممکن ہے جیسا ہم سوچ رہے ہیں ویسا نہ ہو، یہ خبر سچ ہو۔ ایسے میں تو ہم اس کے احسان مند ہوئے نا؟“ بائیتا کو رنے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا پھر چند لمحے سوچ کر بولا۔ ”آؤ! نکلتے ہیں، اس بندے کے بارے میں تفصیل تو بتاؤ۔“ جہاں اٹھتے ہوئے بولا تو وہ اسے بتانے لگی۔

انہی باتوں میں وہ کارٹیک آگئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بائیتا کو ر اور پینچر پر جہاں بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی پینچر کو ر کو فون کر دیا۔ وہ، سرجیت سنگھ اور وکرم سنگھ امرتسر میں تھے۔ انہیں فوراً ہی کورٹ روڈ پر پارٹی آفس کے پاس پہنچنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔

قریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد وہ پارٹی دفتر سے کچھ فاصلے پر جا کر کے۔ بائیتا کو ر نے اپنے باپو سے فون پر بات کر لی تھی اور اسے سمجھ دیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ ان سے ذرا سے فاصلے پر پینچر کو ر کے ساتھ دونوں کار میں موجود تھے۔ ان کا آپس میں رابطہ ہو گیا تھا۔ بائیتا کو ر نے جہاں کو وہیں اتارا اور چل دی۔ جہاں نے پینچر کو ر کو اشارہ کیا اور اس عمارت کی جانب چل دیا۔

وہ پرانے زمانے کی عمارت تھی۔ اس کے طرز تعمیر سے لگتا تھا کہ وہ انگریزوں کے دھدکی ہے۔ باقی سب باہر رہ گئے صرف پینچر کو ر اندر آ گئی۔ وہ جہاں سے ملی تو اس نے ساری بات اسے بتادی۔ وہ سمجھ گئی کہ کیا کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ سب کچھ طے کر کے واپس چل دی، جبکہ جہاں اندر کی جانب بڑھ گیا۔ نجانے کیوں جہاں کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ بھی سامنے ہے ویسا نہیں ہوگا۔

ہال کمرے میں کافی سارے لوگ موجود تھے۔ ایک جانب رتن دیپ سنگھ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر بائیتا کو ر موجود تھی، اس کے ساتھ کچھ دوسری خواتین بھی موجود تھیں۔ مختلف جگہوں سے الیکشن کے بارے میں اطلاعات آرہی تھیں۔ ماحول میں خاصی گرمی تھی۔ ایک طرح سے افراتفری کا عالم تھا۔ جہاں نے وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لے لیا تھا لیکن اسے کوئی ایسا بندہ دکھائی نہیں دیا، جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ کچھ کر سکتا ہے۔ وہ ایسے رُخ پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے داخلی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر آنے جانے والا اس کی نگاہ میں

تھا۔ اس دوران وہ کئی بار اپنے باپو سے ملی، اسے ساری صورت حال کے بارے میں بتایا۔ وہ بالکل بھی پریشان نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ دوپہر کا وقت ہو گیا۔

ایسے ہی وقت جب بہت سارے لوگوں کے ساتھ رتن دیپ سنگھ حویلی جانے کے لیے اٹھ گیا تھا۔ ہال میں چند لوگ ہی تھے۔ بانیتا کور اور جہاں کے درمیان اشاروں میں وہاں سے اٹھ جانے کی بابت طے ہو گیا۔ وہ آگے پیچھے اٹھے اور ہال سے باہر نکل گئے۔

بانیتا کور پیدل ہی چل پڑی تھی۔ اس نے فون پر جہاں کو بتا دیا کہ وہ سڑک کے دوسری طرف دس بیس قدم کے فاصلے پر موجود ایک ریسٹوران میں جا رہی ہے۔ باقی سب کو بھی وہیں بلا لوتا کہ کھانا تو کھائیں۔ دونوں اس عمارت سے باہر آ گئے اور ان کا زرخ اسی ریسٹوران کی جانب تھا۔ جہاں نے بچن کور کا نمبر پیش کر دیا۔ کال ملتے ہی اسے بتا دیا کہ وہ بھی آ جائیں۔

دونوں ہی ریسٹوران میں داخل ہو کر ایک دوسرے سے الگ الگ میز پر بیٹھ گئے۔ ہال میں اتنے لوگ نہیں تھے۔ شاید یہاں لوگ لُچ کے لیے کم آتے تھے یا ایکشن کی چھٹی انجوائے کر رہے تھے۔ باقی ابھی آئے نہیں تھے۔ ایسے میں دولڑکیاں ہال کے داخلی دروازے سے اندر آ گئیں۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور غیر محسوس انداز میں بانیتا کور کی جانب بڑھیں۔ بانیتا کور اپنے دھیان میں باہر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی ایک لڑکی اس کے قریب گئی اور بالکل اس کے ساتھ لگ گئی۔ بیٹھی ہوئی بانیتا کور کو ایک جھٹکا لگا۔ لڑکی کے لب تیزی سے ملے تو جہاں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ جہاں نے پھر بچن کور کا نمبر پیش کیا۔ دوسری طرف سے جب تک فون اٹھایا گیا، وہ لڑکی بانیتا کور کو اٹھا کر داخلی دروازہ پار کر گئی تھی۔ جہاں اس کے پیچھے تھا اور چاروں طرف نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ دوسری لڑکی یوں جا رہی تھی جیسے پہلی کو کور دے رہی ہو۔ جہاں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ہال کے باہر ان کے ساتھ تین بندے ہیں۔ جو اس وقت حرکت میں آ چکے تھے۔ انہی لمحات میں جہاں اور بانیتا کور کی نگاہیں ملیں۔ جہاں نے اشارے سے پوچھا تو بانیتا کور نے ہال کے باہر دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ تینوں ایک کار میں باہر رک چکے تھے۔ بانیتا کور کو جیسے ہی باہر لایا گیا، جہاں بھی باہر آ چکا تھا۔ ایک جوان سا لڑکا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ لڑکی بانیتا کور کو دھکیل کر اسی کار کی جانب لے جا رہی تھی۔ ساری صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ جیسے ہی وہ کار کے قریب گئی تو کار کا پچھلا دروازہ کھل گیا۔ لڑکی نے بانیتا کور کو دھکا دیا تا کہ اسے اندر بٹھایا جا سکے، مگر اسی لمحے بانیتا کور پلٹتے ہوئے ایک دم سے نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لڑکی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اس کی ٹانگوں کے درمیان اپنا گھٹنا دے مارا۔ لڑکی اپنی قوت میں آدمی سے زیادہ کار کے اندر جا گری۔

اس دوران کور دینے والی لڑکی نے اپنا ہاتھ نکل کر سیدھا کرنا چاہا، اس سے پہلے کہ وہ سیدھا کر تی، جہاں نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی کو پکڑ کر جھٹک دیا اور دوسری اس کی گردن کے گرد حائل کر کے جکڑ لیا۔ تبھی ان کے ساتھ آئے دولڑکوں نے اپنا ہاتھ نکل کر بانیتا کور پر تان لیا۔ ایک لمبے قد والے نوجوان نے بھاری اور رعب دار آواز میں حکم دیتے ہوئے کہا۔

”ہلنا مت ورنہ گولی مار دوں گا، بیٹھو گاڑی میں۔“

بانیتا کور نے ایک ثانیہ کو حالات کا جائزہ لیا اور اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”اور اگر تم نے گولی چلائی تو میں اس لڑکی کو مار دوں گا۔“ جہاں نے اونچی آواز میں کہا تو اسی لڑکے نے بے پروائی سے کہا۔

”مار دو۔“ پھر بانیتا کور کی طرف پستل کی نال کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا ہے گاڑی میں بیٹھو۔“ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھا کہ فائر ہوا اور اس کے ہاتھ سے پستل کہیں دور جا پڑا، اسی لمحے دوسرے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چاروں باہر آ گئے۔ جہاں کی نگاہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان پر تھی۔ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس اسلحہ نہ ہو۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی جہاں نے قابو کی ہوئی لڑکی کی گردن پر جھٹکا دیا وہ نیچے جا گری۔ جہاں چشم زدن میں پنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر اس ڈرائیور پر پستل تان چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ باہر نکل گیا اور اس کی جگہ جہاں بیٹھ چکا تھا۔

”دیر مت کرو، انہیں قابو کر کے نکلو۔“ سرجیت سنگھ نے اونچی آواز میں کہا تو جیسے ہوش آیا۔ بانیتا کور میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا، اس نے پستل ہاتھ میں لیا اور اس کا دستہ لڑکی کے سر پر مارا۔ پھر دوسری کو لاکر پچھلی نشست پر لا پھینکا۔ اسی دوران باقی سب نے بھی یہی کیا اور دو منٹ میں یہ سب کر کے چل دیئے۔

بانیتا کور تیزی سے اپنے لوگوں کو کال کر کے اپنی صورت حال کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ راستے میں ان پر کوئی بھاری حملہ ہو، اس کے بچاؤ کی تدبیر بھی تھی اور ٹھکانے تک بھی پہنچنا تھا، جہاں ان پانچوں سے پوچھا تھا ہو سکتی تھی۔ اس ریسٹوران سے مغرب کی جانب گی ٹی روڈ پر گھمان پورہ کے قریب فارم ہاؤس تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہی جگہ بانیتا کور کا سیف ہاؤس یا پناہ گاہ تھا۔ وہ اس جانب تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ جہاں کار چلا رہا تھا، بچن کور ساتھ میں بیٹھی ہوئی تھی اور بانیتا کور ان لڑکیوں کو سیٹ میں دبائے ان کے اوپر بیٹھی ہوئی تھی۔

ان پانچوں کو لے جا کر ایک کمرے میں فرش پر پھینک دیا گیا۔ بچن کے ساتھ سرجیت اور وکرم نے ان کی تلاشی لے کر ہر شے اپنے قبضے میں کر لی ہوئی تھی۔ لمبے قد کا نوجوان بہت زیادہ بے چین تھا، اس کے ہاتھ سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ سب کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ بانیتا کور انہیں دیکھتے ہوئے ٹہل رہی تھی۔ وہ اس وقت ہوش میں تھے۔ ”جی وہ اپنی گونج دار آواز میں بولی۔

”کون ہو تم لوگ اور مجھے کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا میں صرف سچ سننا چاہوں گی، ورنہ یہیں مار کر زمین میں گاڑ دوں گی۔“

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا۔ ان میں سے کسی کا وہ سیل فون بج اٹھا جو قبضے میں لیا ہوا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بچن کور نے وہ سیل فون اٹھایا اور کال رسیور کے اسپیکر آن کر دیا۔

”ہیلو! ہیلو!.....“ ایک مردانہ آواز ابھری تو بانیتا کور کے اشارے پر ایک لڑکی جوابا کہا۔

”ہیلو!“

”میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا، میری بانیتا کور سے بات کراؤ۔“

”ہاں میں بات کر رہی ہوں، بولو۔“ بانیتا کور نے کہا تو دوسری طرف سے ایک زوردار قہقہہ سننے کو ملا، پھر کہا گیا۔

”بھئی مان گئے بانیتا کور تمہیں، واقعی تم چھلاوا ہو۔ کل پاکستان میں تھی اور آج بھارت میں۔ دیکھو، ہم نے بھی تمہیں بل سے نکال لیا۔“

”کون ہو تم؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”اب یہ دھمکی مت دینا کہ اگر میں نے نہ بتایا تو تم ان پانچوں کو مار دو گی، تو مار دو شہزادی، میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ اب تک ان کے اغوا کا پرچہ بھی تم پر ہو گیا ہوگا۔ بہت سارے گواہ موجود ہیں جنہوں نے تمہیں

ان کو.....

”بکواس بند کرو اور کام کی بات کرو۔“ بانیتا کور نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا تو پھر قہقہہ سنائی دینے لگا۔ پھر وہ طنز یہ لہجے میں بولا۔

”اوشنہادی! ذرا دھرج رکھو اور سنو، مجھے بڑا مزہ آ رہا ہے بات کرنے میں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، یہ بے چارے کرائے کے ٹٹو ہیں، جنہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ کس بلا کے منہ لگنے جا رہے ہیں۔ میں نے بھیجا ہی اس لیے تھا کہ وہ تم تک پہنچ جائیں اور مجھے تم سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔“

”میں کہہ رہی ہوں کام کی بات کرو۔“

”تو پھر سنو۔!“ اس بار دوسری طرف سے سنجیدگی کے ساتھ کہا گیا۔ ”ایک ہی دن میں پاکستان سے بھارت پہنچ جانا، بہت ساری گھٹیاں سلجھا رہا ہے۔ میں جس ٹریک پر سوچ رہا تھا، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان بچوں کو چھوڑ دو، ورنہ ان کے انگوٹے جرم میں تمہیں پکڑا جاسکتا ہے۔ نہیں یقین آتا تو جتنی بھی تم نے مار دھاڑ کی ہے۔ اس کی تصویریں تمہارے گھر پہنچ چکی ہیں۔ فون کر کے پتہ کرلو، میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔“

”میں کبھی نہیں تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ بانیتا کور نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”ارے شہزادی! یہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے، ابھی تو اتنا بڑا ڈرامہ کیا ہے۔ مجھے ملو، مجھ سے بات کرو، بس میں یہی چاہتا ہوں۔“

”اور اگر میں نہ ملنا چاہوں؟“ اس نے کہا تو دوسری طرف سے کسی نے غراتے ہوئے کہا۔

”وہ تو اب تم نگاہوں میں آگئی ہو، اب میں تمہیں اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اب تیری روح بھی مجھ سے ملنا چاہے گی۔ دیکھ لو ایک ہی جھکے میں کتنے لوگوں کو بے نقاب کر چکا ہوں میں۔ یہ جو تیرے ساتھ ہیں، انہیں بھی اب جاننا ضروری ہے۔“

”اوئے! اگر مرد کا بچہ ہے تو.....“

”فضول باتیں مت کرو بانیتا کور جی، چل تو اب چھپ کے دکھا، میں تمہیں تلاش کرتا ہوں، آکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ میں تجھے یہاں تک دیکھ سکتا ہوں کہ اس وقت رتن دیپ سنگھ جی لٹچ لے رہے ہیں اور میرے نشانے کی زد میں ہیں۔ فون کر کے پوچھو تو سہی۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے پوچھا تو وہ طنز یہ لہجے میں بولا۔

”تم سے ملاقات۔“

”اچھا مل لیں گے۔“ بانیتا کور نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر واپس بچن کور کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ فون دوبارہ بج اٹھا۔ اس نے رسیو نہ کرنے کا اشارہ کیا اور ان بندھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر ایک نوجوان کو ٹھوکر مارتے ہوئے پوچھا۔

”بولو، اسی نے بھیجا ہے تم لوگوں کو، کون ہے یہ؟“

”یہ نہیں، ہمیں تو میڈم کیسری نے یہ کام دیا تھا۔“ اس لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ کون ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”وہ پولیس والی ہے جی، ادھر رام باغ تھانے میں۔ ہمارا کیس پھنسا ہوا ہے ادھر، اس کام کے عوض اس نے سب صاف کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اگر یہ غلط ہوا تو؟“ اس نے لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”پھر جو آپ کی مرضی جی، ہمیں تو یوں کہا گیا تھا کہ ایک لڑکی اٹھانی ہے، ہمیں کیا پتہ تھا کہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ابھی اچانک جہاں کے ذہن میں کچھ روز پہلے جہاں کے ساتھ ہونے والی صورت حال یاد آگئی۔ اس نے بانیتا کور کو اشارہ کیا اور باہر چلا گیا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے باہر آ کر اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو جہاں نے اسے اپنی سوچ کے بارے میں بتاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہیں یہ ایک جیسی بات نہیں لگتی، تم تو وہاں تھی، ایسا ہی کچھ وہاں نہیں ہوا؟“

یہ بات سن کر اس نے چہرے لمحے اس پر غور کیا، پھر الجھتے ہوئے بولی۔

”مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ کیا ہے؟“

”ظاہر ہے کوئی ہمیں الجھا کر سامنے لانا چاہتا ہے، یا تو کوئی بہت طاقت ور ہے یا بالکل بزدل،“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ہمیں سامنے لا چکا۔“ وہ بولی۔

”سامنے لا چکا ہے تو اب ہم ہی نے اسے سنبھالنا ہے۔ کون ہے یہ بھی دیکھ لیں گے۔ بس یہ میڈم کیسری کو دیکھ لیں ذرا۔“ جہاں نے کہا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دونوں ایک ساتھ اندر گئے۔ تو وہ پانچوں دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بانیتا کور نے اندر جاتے ہوئے پوچھا۔

”تم سب کو جانے دیا جاسکتا ہے، مگر ایک شرط پر؟“

”وہ کیا؟“ ایک لڑکی نے پوچھا۔

”میں کیسے مان لوں کہ تم لوگ سچ کہہ رہے ہو؟“ اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”ہم کیا کریں؟“ اسی لڑکی نے زود دینے والے لہجے میں پوچھا۔

”میڈم کیسری نے ہی تم لوگوں کو ہمارے پیچھے لگایا ہے نا، اسی نے کام دیا ہے تم لوگوں کو، تو بس اس کے منہ سے سناؤ کہ ایسا ہی ہے تو تم لوگ ابھی جاسکتے ہیں، پھر ہم جانیں اور وہ۔“ بانیتا کور نے مفاہمت والے لہجے میں کہا تو وہی لڑکی ایک نوجوان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”لگاؤ اسے فون اور بات کرو اس سے کہ ہم پھنس گئے ہیں، ہمیں یہاں سے.....“

”یہ جان لو کہ وہ بالکل مکر جائے گی، وہ پہچانے گی بھی نہیں تم لوگوں کو، اس طرح کہو کہ تم لوگوں نے ہمیں قابو کر لیا ہے، وہ آجائیں، یا کہاں لے کر آئیں۔“ بانیتا کور کی بات وہ سمجھ گیا اور فون کے لیے دیکھنے لگا۔ اسے اسی کا فون دیا گیا۔ اس نے نمبر پیش کیے اور رابطہ ہوتے ہی پر جوش لہجے میں بولا۔

”میڈم! جلدی آجائیں، ہم نے انہیں قابو کر لیا ہے، ایک بندہ انتہائی زخمی ہے۔“

”وہ مرنے نہیں جائے گا؟“ دوسری طرف سے بھاری نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔

”پتہ نہیں، دو گولیاں لگی ہیں، میں نے ماری ہیں۔ آپ لوگ کتنی جلدی آئیں گے؟“ اس نے رعب دار لہجے میں کہا۔

”اوئے ماں کے..... آنا کہاں ہے؟“ دوسری طرف سے حقارت بھرے لہجے میں گالی دے کر پوچھا گیا تو اس نے یونہی ایک روڈ کا نام لے کر ایک جگہ کی نشاندہی کر دی۔ اس نے جلدی آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

ہوئی ہیں۔ میں ان کی جانب بڑھا تو سوئی اٹھ گئی۔ وہ میرے قریب آ کر مسکراتے ہوئے بولی۔
”ناشتہ کریں گے یا نہ؟“

”جو تمہارا دل چاہے۔“ میں نے دھیمے سے کہا تو میرا ہاتھ پکڑ کر واپس چل دی۔

”وہ اماں!“ میرے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا تو وہ بولی۔

”انہوں نے ہی کہا ہے۔ آؤ۔“

مجھے ڈانگ ٹیبل پر بٹھانے کے بعد وہ کچن کی جانب چلی گئی، پھر کچھ ہی دیر بعد میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ لمحے میرے چہرے پر دیکھتی رہی پھر بولی۔

”گلتا ہے ساری رات نہیں سوئے ہو، آنکھوں میں اب بھی نیند بھری ہے۔“

”یہ تمہارے ساتھ کا خمار ہے۔“ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی، تبھی وہ بولی۔

”کس قدر عام سا تبصرہ کیا، تم کیا سمجھتے ہو، یہ میری تعریف ہے، میں خوش ہو جاؤں گی اس سے؟“

”میں نے تو یہی سمجھا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں ایسے تبصروں یا تعریف سے خوش ہونے والی نہیں، بلکہ ایسا بہت کچھ ہے کرنے کو، جس میں میری خوشی ہے۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔

”ایسا کیا ہے کرنے کو؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ میں تب بتاؤں گی، جب تمہاری اور میری شادی ہو جائے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا میں پہلے نہیں جان سکتا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، کیونکہ میں ایسا نہیں چاہوں گی، یہ تب کی باتیں ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی کہ ملازمہ ٹرائی میں ناشتہ سجائے وہاں آ گئی۔ وہ میز پر ہر شے رکھ کر پلٹ گئی تو سوئی اپنے ہاتھوں سے ہر شے میرے سامنے کرنے لگی اور اصرار کر کے کھلانے لگی۔ میں کھا تا رہا۔

میں اس وقت چائے پی رہا تھا، جب اماں اندر آ گئیں۔ وہ ہمارے پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تب میں نے پوچھا۔

”اماں کب جانا ہے نورنگر؟“

”بیٹا! میں نے کون سا سامان باندھنا ہے، میری طرف سے ابھی چلو۔“

”تو چلیں پھر۔“ میں نے کہا تو سوئی بولی۔

”بس پانچ منٹ دو مجھے، پھر نکلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد ہم نورنگر کے لیے ایک فورڈ ٹیل میں نکل پڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

سورج مغرب کی اوٹ میں چلا گیا۔ تھا۔ اوگی پنڈ کے باہر بنے ہوئے ایکشن کیمپ میں کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ جہاں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں گہما گہما بڑھ گئی تھی۔ انوجیت اس وقت کدو شہر میں تھا۔ جہاں پارٹی کا بہت بڑا کیمپ تھا۔ وہیں بلدیہ اور کرن کور اس کے ساتھ تھے۔ کسی پولنگ اسٹیشن پر ابھی تک پولنگ جاری تھی اور کہیں سے رزلٹ آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت بڑا سنسنی خیز ماحول تھا۔ جہاں یہ سب دیکھ رہا تھا، بین اس کی دلچسپی اس ایکشن میں ختم ہو چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سیٹ وہی نکالیں گے لیکن یہ بائیکاٹ کور والا معاملہ کیا بنا، وہ یہی سوچے چلا جا

”تم لوگ جاؤ۔“ ایک دم سے بائیکاٹ کور نے کہا وہ پہلے انہوں نے حیرت سے دیکھا اور پھر بے یقینی کے سے انداز میں اٹھ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ باہر جانے لگے تو وکرم سنگھ نے کہا۔

”یہ یہاں کی جگہ کی دیکھیں گے انہیں۔۔۔۔۔۔“

”جانے دو۔“ بائیکاٹ کور نے سوچنے والے انداز میں کہا تو وہ سب باہر چلے گئے۔ وہ جب چلے گئے تو وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ”اب دیکھتی ہوں میں انہیں۔“

”کن کو دیکھو گی؟“

”چھوڑو، بس نکلو یہاں سے، شہر میں ابھی ہماری ضرورت پڑ سکتی ہے، آؤ۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور باہر کی سمت چل دی، جہاں اس نے دیکھا، وہ پانچوں بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر چل دیئے۔ انہیں اپنے پیچھے یوں آتا دیکھ کر وہ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔

جہاں سنگھ سمیت سبھی حویلی پہنچ چکے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ کچھ دوسرا ہے۔ وہ نہیں جو سامنے نظر آ رہا ہے۔ بائیکاٹ کور تو اسی وقت میڈم کیسری تک پہنچ جانا چاہتی تھی لیکن جہاں نے اسے روک دیا تھا۔ اس نے یہی سمجھایا کہ یہ ایک دن کسی نہ کسی طرح نکال لو، رات تک ایکشن کا فیصلہ سامنے آ جائے گا، اس کے بعد ساری توجہ اس پر لگا دیں گے کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ نجانے کیوں اس کے ذہن میں یہی بات جم گئی تھی کہ یہ ویسا ہی ہے جیسا جمال کے ساتھ ہوا تھا اور اس کے ڈانڈے اسی انشٹیوٹ سے جاملیں گے، جہاں سے سندھ پ کور کو پاکستان بھیجا گیا تھا، وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی دشمن تھا، اس کی نگاہ ان دونوں ملکوں پر ہے۔ ورنہ اتنے اعتماد سے وہ ایسی بات نہ کرتا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے میں اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ کون تھا، اور کیا چاہتا تھا، اسی کا کھوج لگانا تھا۔

”ٹھیک ہے جہاں، جیسا تم کہو، میں ابھی کچھ نہیں کروں گی، ایک دو دن بعد دیکھ لیں گے۔“ بائیکاٹ کور نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”یہ بچن کور، سرجیت اور وکرم ہیں تیرے پاس، میں چلتا ہوں اوگی پنڈ۔“ جہاں سنگھ نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں! تمہیں اس وقت انوجیت کے پاس ہونا چاہئے، تم ایسے کرو، وکرم سنگھ کو ساتھ لے جاؤ۔“

”اوکے، میں اب نکلتا ہوں۔“ جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے تیزی سے کہا۔

”اوئے پنچ تو کر کے جا۔“

”راستے میں دیکھ لیں گے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور چل دیا۔

اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی، جب وہ امرتسر سے نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں اس دن جی بھر کے سویا تھا۔ مجھے رات بہت دیر بعد نیند آئی تھی۔ میں سوئی کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ اس کے ہونے سے یوں لگا تھا جیسے خوشبوؤں سے ماحول بھر گیا۔ ہو۔ دمکتا ہوا چہرہ، اور شرکیں آنکھوں میں سپردگی کا جو احساس تھا، اس نے تو جیسے مجھے لوٹ ہی لیا تھا۔ میں بیدار ہوا تو پہلا خیال ہی سوئی کا آیا۔ وقت دیکھا تو دن کا پہلا پھر ختم ہونے کا تھا۔ میں اتنی ہی دیر کسلندی سے بیڈ پر لیٹا رہا۔ پھر اٹھا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ تازہ دم ہو کر میں باہر نکلا تو جیسے ہی میں کاریڈور کے سرے پر گیا۔ میں نے دیکھا، اماں اور سوئی لان میں بیٹھی

رہا تھا۔ وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ وہ کل پاکستان میں تھی اور آج یہاں بھارت میں ہے، وہ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ یا تو بہت دور تک نگاہ رکھنے اور بڑے وسائل والا بندہ ہو سکتا ہے یا پھر یہ کوئی نہ کوئی فورس ان کے پیچھے لگ چکی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جس شے کی سمجھ نہ آ رہی ہو اور اس کی طرف سے کسی بھی قسم کی پریشانی لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو ذہن اسی شے یا معاملے کو سوچتا چلا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا ہے، جب تک اس بارے میں پوری جانکاری نہیں مل جاتی۔ جہاں سنگھ بھی اسی ادھیڑ بن میں تھا۔ وہ اسے فوری طور پر سمجھنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ وقت اسی کشمکش میں گذرتا چلا گیا۔ زلزلہ آتے گئے۔

رات تقریباً دس بجے کے قریب انوجیت کی کامیابی کی خبر آ گئی۔ غیر حتمی نتیجہ آ گیا۔ تو وہ اٹھ کر حویلی کی طرف چل دیا۔ اس کے حامی اور پارٹی لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ یہاں تک کہ باغیا اور رتن دیپ نے بھی اسے مبارک باد دے دی۔ جیسے ہی اس نے حویلی کے پورچ میں کاررو کی۔ اس کا سیل فون بج اٹھا۔

”جہاں سنگھ جی، بہت بہت بدھائی ہو جی، تم لوگ جیت گئے یہ سیٹ۔“ ایک مردانہ اجنبی آواز میں خوشگوار انداز میں کہا گیا۔

”جی بڑی مہربانی۔“ اس نے حتی الامکان خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”کیا یہ جاننے کی کوشش نہیں کرو گے کہ میں کون ہو جو اس طرح انہوں کی مانند بدھائی دے رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا تو جہاں چوٹ گیا۔ یہ تو وہی آواز لگ رہی تھی، جس نے باغیا کو اسے بات کی تھی۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”چلو کروادو اپنا تعارف۔“

”یار ابھی چند گھنٹے پہلے ہمارا تعارف ہوا ہے۔ ہاں اگر تعارف کی تفصیلات جاننا چاہتے ہو تو مجھ سے ملو یا مجھے ملنے کا موقع دو۔“ اس نے اپنا لہجہ ویسا ہی خوشگوار رکھا۔

”کہاں ملتا ہے؟“ جہاں نے ایک لمحہ سوچے بغیر فوراً ہی کہہ دیا تو دوسری طرف سے انتہائی خوشی سے کہا گیا۔

”یہ ہوئی نا بات، میں خود طوں کا تم سے۔“

”چلو، جب چاہے مل لیتا، اب فون رکھوں یا کوئی اور بات کرنی ہے۔“ جہاں نے جان بوجھ کر کہا۔

”صرف ایک بات، اس کے علاوہ ساری باتیں ملاقات پر ہوں گی۔“ اس نے کہا۔

”وہ کون سی ایک بات؟“ جہاں نے پوچھا۔

”باغیا کو فون کر کے کہو کہ وہ میڈم کیسری کو چھوڑ دے، وہ بے چاری تو ایک مہرہ ہے، چند ہزار روپے دیئے تھے اسے، اس بے چاری کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کام کس کے لیے کر رہی ہے۔“

”میں اپنی ذات کا کہہ سکتا ہوں، کسی کو کیا کہوں؟“ جہاں نے کہا تو دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔

جہاں سنگھ سمجھ گیا تھا کہ باغیا کو اس میڈم کیسری تک پہنچ گئی۔ اس سے کیا نکلتا ہے، وہ خود ہی بتا دے گی۔

انوجیت سنگھ کی کامیابی کی اطلاع گھر تک پہنچ چکی تھی۔ کلجیت کو اسے ساتھ ہوئی ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔ ایک طرف میز پر مٹھائیاں دھری ہوئی تھیں۔ وہ جاتے ہی کلجیت کو کھانے کے گئے ملا، اس نے والہانہ انداز میں جہاں کو گلے لگاتے ہوئے انتہائی جذباتی انداز میں کہتی چلی گئی۔

”جنگ جنگ جیئے میرا پتر، آج وہ انتقام پورا ہوا ہے، آج اگر تیری سکھ جیت کر زندہ ہوتی نا، تو اس کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ خاندان کیا پورا رتبہ بھی چھین لیا ہے دشمنوں سے میرے پتر نے۔“

”جی جہاں اس سے الگ ہوتے ہوئے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے بولا۔

”پھو پھو۔! یہ تو ہم ابھی اپنوں کے خلاف ہی لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ کامیابی تو اس دن ہوگی جس دن گرو کا خالصہ بن جائے گا اور ہم آزادی حاصل کر لیں گے۔ ابھی تو بڑی لڑائی پڑی ہے پھو پھو۔“

”چل کوئی نہیں پتر، آج گرو کی مہر سے یہ کامیابی ملی ہے تو کل وہ بھی مل جائے، وہ گرو جانے اور اس کا خالصہ، اس نے جس سے جو کام لیتا ہے، وہ لے لیتا ہے۔ چل آ تو منہ میٹھا کر۔“ کلجیت کو اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے اس میز تک لے گئی جہاں مٹھائی پڑی ہوئی تھی۔ جہاں نے ایک کٹوا لیا، آدھا خود کھایا اور آدھا کلجیت کو کور کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔

”یہ ہر پریت کدھر ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”یہیں بھی ابھی۔“ کلجیت کو اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”اچھا، میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔“

”اچھا پتر۔“ کلجیت کو اس نے کہا تو وہ اوپر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

جہاں جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوا، سامنے بیڈ پر ہر پریت نیم دراز تھی۔ اس نے ہلکے موتی رنگ کا شلوار قمیص پہنا ہوا تھا۔ اس نے کس کر چوٹی باندھی ہوئی تھی۔ سائینڈ ٹیبل پر مٹھائی کی پلیٹ تھی اور اس کے ساتھ دودھ کا بھر ہوا جگ رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے لیٹے ہوئے دیکھتی رہی۔ جہاں اسے دیکھتے ہوئے اس کے قریب چلا گیا اور پھر حیرت سے بولا۔

”اوئے پرتو۔! خیر تو ہے نا، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ برا سامنے بنا کر اٹھ گئی، پھر سر پر ہاتھ رکھ کر اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ہائے، میں کیا کروں تمہارا، اتارو مانگ موڈ بنا کر بیٹھی ہوئی ہوئی اور تجھے نظر ہی نہیں آتا، میری طبیعت پوچھا رہا ہے۔ او یا تم میں یہ سینس نہیں ہے؟“

”اوہ اچھا، تم اس وقت رومانگ موڈ میں ہو، اچھا یونہی پڑی رہو، میں ابھی آتا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو ہر پریت

نے اسے گھور کر دیکھا۔ تبھی جہاں ہنستے ہوئے بیڈ پر آیا اور اس کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس زور سے ہنسنے لپنے کے بعد اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”کامیابی مبارک ہو تمہیں۔“

”یہ میری نہیں، تمہاری کامیابی ہے جہاں اور مجھے اس پر فخر ہے کہ تو میرا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جہاں

کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ پھر یونہی بڑے بڑے بولی۔ ”میں بہت خوف زدہ تھی، لیکن اب کوئی ڈر نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ ہو جہاں۔ کوئی بھی سمیٹا ہوگی، ہم اسے حل کر سکتے ہیں۔“

”ہاں ہر پریت۔! ایسا ہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اس سے الگ ہوا اور ساتھ ہی لیٹے لیٹے کہا۔ ”جس طرح ہر کامیابی

اپنا خراج ضرور لیتی ہے، اسی طرح، اب ہمیں بھی اس کا خراج تو دینا ہوگا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی تو جہاں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”دیکھ ہر پریت۔! میری زندگی تمہارے سامنے ہے، اب اس گھر میں اور انوجیت کے آس پاس مختلف طرح کی

فورسز جمع رہیں گی۔ وہ جہاں اس کی حفاظت کریں گی، وہاں ان کی ہم پر بھی نگاہ ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی

ان کے سامنے کھل جائے، تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟“

”ہاں جیسی! میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں، پر وہ جب ہوگا سو ہوگا، لیکن اس وقت ایسی باتیں کر کے تو میرا موڈ خراب مت کر۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا دیا۔

☆.....☆.....☆

اس وقت نورنگر کی حویلی روشن تھی۔ رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک حویلی میں بڑی چہل پہل تھی۔ جس نے بھی ان کے آنے کی خبر سنی، وہ ملنے چلا آیا۔ چند لمحے پہلے چوہدری اشفاق اٹھ کر گیا تھا۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوا تھا کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کار خیر صبح ہی ہو جائے۔ لیکن میں نے اسے خود روک دیا تھا۔ کیونکہ ابھی تک میں یہ خود فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ شادی دھوم دھام سے ہو، یا پھر بہت سادگی سے انتہائی قریبی لوگوں کے ساتھ ہو۔ میں ایزی ہو کر اپنے بیڈ پر آچکا تھا۔ تبھی دروازہ کھلا اور سوئی اندر آگئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم اپنی ایک عادت بھول رہے ہو۔“

”کون سی؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہم چھت پر کھلی فضا میں ڈھیر ساری باتیں کیا کرتے تھے، ایک مدت ہو گئی، ایسا نہیں ہوا۔“ وہ لمبوں پر مسکان لیے بولی۔

”تو اب چلتے ہیں۔ ہم پر کون سا پابندی ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”اس حویلی کی چھت پر نہیں، وہ پرانے والے گھر میں جہاں سکون ہی سکون ہے اور بہت ساری یادیں بکھری ہوئی ہیں۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، لیکن آج اماں ادھر ہے، کل وہ ادھر جائیں گی تو ہم بھی چلے جائیں گے۔ آج ادھر ہی چھت پر چلے جاتے ہیں۔“ میں نے اسے صلاح دی تو وہ ایک دم سے مان گئی۔

ہم دونوں چھت پر آگئے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حویلی کے ارد گرد اندھیرا تھا لیکن حویلی سے چھن کر جانے والی روشنی میں کچھ فاصلے تک مدہم روشنی تھی۔ دور نورنگر گاؤں میں کہیں کہیں روشنی ٹٹم رہی تھی۔ میرے دائیں جانب سوئی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ تبھی میں نے اس سے وہ سوال پوچھ لیا کہ شادی سادگی سے ہو یا دھوم دھام سے۔

”بجال! نکاح میں لوگوں کو شریک کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے، یہی نا کہ اعلان ہو جائے۔ اس بات کا اعلان کہ یہ جوڑا شریعت کے مطابق اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کر رہا ہے؟“ اس نے سکون سے کہا۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر ہمیں اپنی حیثیت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو بلانا چاہئے، یہ ضروری ہے۔ پورے علاقے کو یہ معلوم ہو کہ ہم رشتہ ازدواج میں بندھ چکے ہیں۔ جس قدر خبر خیرات ہو سکتی ہے وہ کریں۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ ہم دونوں چلتے ہوئے منڈھیر تک جا پہنچے۔ تبھی سوئی سامنے دیکھتے ہوئے بڑے جذب سے بولی۔

”سارا کئے ہوتے ہوئے کتنا سہارا تھا، وہ یہاں پر لوگوں کو تعلیم دے رہی تھی۔ لیکن اب کوئی حال نہیں رہا۔ تانی تھی تو کتنا سکون تھا، اس نے ارد گرد نگاہ اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ اب جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔“

اس کے یوں کہنے پر مجھے لگا، وہ شاید یہی کچھ کہنے مجھے یہاں تک لائی ہے۔ اس لیے میں نے پوچھا۔

”لیکن ہم ان کی زندگی اپنے مفاد کے لیے خرچ نہیں کر سکتے، ان کی اپنی زندگی بھی تو ہے؟“

”ہاں، اسی لیے تو، اب میں نے خود سوچا ہے، یہاں جو کچھ بھی کرنا ہے میں نے ہی کرنا ہے، میں یہاں لوگوں کا معیار زندگی ہی نہیں، ان کی سوچ تک بدل دوں گی۔“ اس نے جذب سے کہا۔ میں اس کے ارادے بھانپ گیا تھا۔ مجھے پہلے بھی علم تھا۔ وہ جو کچھ بھی کرتی، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ انسانیت کا درس لے کر چلی ہے۔ اب اسے وہی کرنا ہے جو اس کی سوچ ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”سوئی! تم جو چاہو، سو کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہم اتنے عرصے بعد یوں ملے ہیں کہ.....“

میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات ٹوکتے ہوئے بولی۔

”میں کون سا تمہاری دسترس سے دور ہوں، قریب ہوں اور بجال، عورت جتنا مرضی کوئی فیصلہ کر لے، جب تک مرد کا حوصلہ اس میں نہیں ہوتا، وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی، یہ حقیقت ہے۔“

اس نے یہ بات بڑے مان سے کہی تھی۔

ہم کافی دیر تک چھت پر رہے۔ زمانے بھر کی باتیں کیں۔ آئندہ کیا ہوگا، اس بارے میں اپنے خیالات بتاتی رہی۔ یہاں تک کہ رات کا آخری پہر شروع ہو گیا اور ہم نیچے آکر اپنے پنے کمرے میں چلے۔

اگلی صبح ناشتے کے وقت میں اور چوہدری اشفاق ہی تھے۔ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر باہر لان میں آگئے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک چکر مسافر شاہ کے تھڑے پر لگاؤں اور پھر نورنگر گاؤں جاؤں۔ میں نے چوہدری اشفاق کو ساتھ لیا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر جا پہنچے۔

وہاں اب کافی رونق ہو گئی ہوئی تھی۔ لوگوں کے بیٹھنے اور آرام کرنے کی جگہ کے ساتھ پینے کا پانی تھا، کمرے تھے۔ جوئی چیز مجھے دیکھنے کو ملی وہ کمروں سے کافی ہٹ کر ایک اکھاڑا تھا۔ گول دائرے میں نرم مٹی سے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی صبح ہی کسی نے زور کیا ہو۔ میں نے اُسے دیکھ کر چوہدری اشفاق سے پوچھا۔

”یہ کیا ہے، کون کرتا ہے اکھاڑا؟“

”فرید نام کا ایک لڑکا ہے نورنگر کا، اسے شوق ہے پہلوانی کا، وہ یہاں آتا ہے۔“ اس نے مجھے بتایا، اسی لمحے ایک لمبے سے قد کا نوجوان، جس کا جسم کافی بھاری لگ رہا تھا، وہ ایک کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

”کیا یہی لڑکا فرید ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یہی ہے۔“ چوہدری اشفاق نے جواب دیا تو میں اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے بالکل پاس آکر انتہائی عقیدت بھرے انداز میں جھک کر سلام کیا، پھر ہاتھ ملا کر ایک طرف مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا تم جانتے ہو مجھے؟“

”جی کیوں نہیں، اس علاقے کا کون بندہ ہے جو آپ کو نہیں جانتا۔“ اس نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا

”یہیں رہتے ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، لیکن صبح اور شام یہاں آتا ہوں، زور کرتا ہوں، یہاں پھولوں کو پانی دیتا ہوں اور چلا جاتا ہوں۔“

”کوئی کام دھندہ کرتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے دس ایکڑ ہیں جی، اسی پر کاشتکاری کرتے ہیں اور پانچ جماعتیں پڑھی ہیں جی۔“ اس نے نرم سے انداز میں کہا تو مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگا، تبھی میں پوچھا۔

”یہ اکھاڑا تم نے بنایا، یہ کیوں؟“

”جی مجھے پہلوان بننے کا بہت شوق ہے۔“ اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”مجھے پہلوان اچھے لگتے ہیں، میں بھی ان کی طرح شہ زور بننا چاہتا ہوں۔“ اس نے شوق سے جواب دیا

”کسی پہلوان کو دیکھا؟“ میں نے ایک خیال کے تحت اس سے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”جی بہت سارے، پورے علاقے میں کہیں بھی کشتی ہو، میں وہاں ضرور جاتا ہوں اور کئی پہلوان میں نے تصویروں میں دیکھے ہیں۔“ اس نے اسی شوق سے بتایا تو میں اس کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ تم پہلوان ہی کیوں بننا چاہتے ہو؟ کیا وجہ ہے یہ؟“

”جی بس مجھے شوق ہے، مجھے اچھا لگتا ہے۔“ اس نے مصومیت سے کہا۔

”اچھا میں تمہیں بتاتا ہوں، تم اسے سمجھنے کی کوشش کرنا۔“ یہ کہہ کر میں ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوا، پھر اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک وقت تھا، جب تمہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ پہلوان اور پہلوانی کیا ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہے نا۔“

”جی ایسا ہی ہے۔“ اس نے سمجھتے ہوئے کہا۔

”پھر یوں ہوا کہ تمہارے سامنے پہلوان آگیا۔ اصل میں پہلوان تمہارے اندر موجود تھا، جس کے بارے میں تمہیں پتہ نہیں تھا۔ پھر جیسے ہی پہلوان تمہارے سامنے آیا، تمہارے اندر کا پہلوان بیدار ہو گیا۔ جسے تم شوق، لگن اور جو مرضی کہتے ہو۔ یہ کسی پہلوان کے سامنے آنے ہی سے ممکن ہوا۔“

”جی یہ تو سچ ہے۔“

”اب تم نے کئی پہلوان دیکھے ہوں گے، ان میں کوئی ایک تو مثالی پہلوان ہوگا، جس کے جیسا تم بن جانا چاہتے ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی، میں ویسا ہی بننا چاہتا ہوں۔“ اس نے پر شوق لگا ہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس وقت تک نہیں بن پاؤ گے جب تم اس عمل سے نہیں گذرو گے، جیسا اس جیسے پہلوان بننے کے لیے ضروری ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ اس نے الجھتے ہوئے تیزی سے کہا تو میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”تم اپنے اندر کے پہلوان کو دیکھنا چاہو گے؟“

”جی، یہی تو لگن ہے۔“ تیزی سے کہا۔

”تیرا شوق سلامت رہے بنا، اپنے اندر کے پہلوان کو اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے ہو، جب تک پہلوان بننے کی ریاضت سے نہیں گزر گے، وہ عمل نہیں کرو گے جو ایک شہ زور پہلوان بننے کے لیے ضروری ہیں۔ وہی کرو گے تو پہلوان بنو گے۔ صرف شوق اور لگن تمہیں وہ پہلوان نہیں بنا سکتی، جبکہ عمل تمہیں وہی بنا دے گا، جو تم چاہتے ہو۔“ میں نے اسے سمجھایا تو وہ میری بات سمجھ کر بولا۔

”میں تو تیار ہوں، یہ اکھاڑا بھی اسی لیے بنایا ہے، اب یہاں پہلوان آئیں تو میں ان سے زور کروں۔“

”اگر تو اپنی طرف، اپنے آپ کو پہلوان ماننا چاہتا ہے، دیکھنا چاہتا ہے تو کسی پہلوان کو مان، کسی کا پٹھا بن پھر یہ اس ریاضت کا عمل شروع ہوگا۔ پھر تیرے اندر سے وہی داؤ ابھریں گے جو اس پہلوان کے اندر ہیں، وہی پہلوان ظاہر ہو جائے گا۔ اور وہ جو تمہارا خلیفہ استاد اپنی نگاہ اور عمل سے تمہیں پہلوان بنا دے گا۔“

”پھر میں اچھا پہلوان بن جاؤں گا۔“ اس نے پر شوق انداز میں کہا۔

”بالکل، پھر تم دوسرے پہلوانوں میں ہی اپنی شہ زوری دیکھ پاؤ گے۔ ایک پہلوان پر بھاری ہو گئے، پھر دو پر بھاری ہو گئے، تمہیں پتہ چلتا جائے گا کہ تم کتنے شہ زور ہو، یہی تسخیر تمہیں آگے بڑھاتی جائے گی۔ اور تم اپنے آپ کو دیکھتے جاؤ گے۔“

”جی۔“ اس نے استعجاب میں کہا۔

”اس کے علاوہ تمہاری بیٹھک ان پہلوانوں میں ہوگی جہاں فن پہلوانی کا ذکر ہوگا، اس فن کے بارے میں فکر کی جائے گی، یعنی تم اس ذکر اور فکر میں آ جاؤ، یہی یہ صرف تمہارے عمل سہل کر دے گی۔ بلکہ اس عمل کو جاری رکھنے کا شوق بھی بیدار رکھے گی۔“ میں نے اس سے کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔

”صاحب۔! کوئی اور بات جو میرے لیے جاننا ضروری ہو، مجھے ضرور بتائیں۔“

”باتیں تو بہت ساری ہیں نوجوان، ایک تو یہ ہے کہ کسی بھی کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح پہلوانی کے لیے بھی بنیادی شرط یہی ہے کہ پہلوانی کے قواعد و ضوابط کا پابند ہوا جائے۔ مثلاً جیسے لنگوٹ کا پکا ہونا، نگاہ کی پاکیزگی، خوراک کا متوازن استعمال وغیرہ اصل میں یہی پہلوانی ہے۔“ تب میں نے چوہدری اشفاق سے کہا۔ ”اس بچے کو پہلوان بننے کے لیے جیسی اور جس قدر سہولت چاہئے تم دو گے۔“

”بالکل، میں پہلے ہی اس کا بہت خیال رکھتا ہوں، اسی لیے اسے جگہ دی ہے۔“ چوہدری اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا تو فرید خوشی خوشی اندر کی کی جانب چلا گیا اور وہاں سے چار پائیاں نکال کر باہر رکھنے لگا۔ اب اس بچے کو کیا پتہ تھا کہ اپنے آپ کو منوانے کے لیے، دوسرے کو ماننا پڑتا ہے۔ جس طرح پہلوان ہی پہلوان کو پہچان سکتا ہے، اسی طرح انسان ہی انسان کو پہچان سکتا ہے۔ کیونکہ انسان ہی انسان کا آئینہ ہے۔ اسی میں سے ہی انسان دیکھا جاتا ہے اور اسی میں ہی رجن دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ فطری سے بات ہے کہ انجینئر بننے کے لیے انجینئر ہی سے سیکھا جائے گا، اسے سامنے لینا پڑے گا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے ڈاکٹر، استاد کے لیے استاد وہ سامنے لینا پڑے گا۔ اصل میں انسانی آرزو اس کی کند ہے جو وہ اپنے عشق کے ساتھ اپنے ہدف پر پھینکتا ہے اب آرزو کوئی مقام ہو، کوئی شخصیت ہو یا کوئی صورت وہ اندر کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ جذب ہونے کے بعد اس میں ظہور پاتی ہے۔ میں نے اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ فرید کی نگرانی بذات خود کروں گا۔ میرے اندر بھی یہ آرزو اچانک بیدار ہو گئی تھی۔ ہم وہاں کافی دیر تک بیٹھنے اور پورا میدان دیکھتے رہنے کے بعد واپس آ گئے۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر تک جہاں بہت ہی مصروف رہا۔ پورے علاقے سے لوگ بدھائی دینے آتے رہے۔ انوجیت سنگھ صبح کے وقت آیا تھا اور آتے ہی سو گیا۔ سہ پہر کو تیار ہو کر جب لوگوں میں آیا تو جہاں کو فرصت ملی۔ اس سارے دن میں باغیا کور کا فون اسے نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہاں پر سب کچھ شانتی ہے۔ اس وقت جہاں کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ ہر پریت کو اپنے ساتھ لے اور دور کسی دیرانے میں نکل جائے۔ جہاں صرف وہ دو ہوں اور دور دور تک کوئی نہ ہو۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور سکون کے لیے تھوڑی دیر لیٹ گیا۔

اسے یوں سکون سے لیٹے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بائیتا کور کا فون آگیا۔
 ”ہاں! بد حال! ہوتھیں انوجیت کی کامیابی کی۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔
 ”تمہیں بھی ہو، رتن دیپ جی کا سارا گروپ کامیاب ہو گیا ہے۔“ جہاں نے کہا تو وہ بولی۔
 ”اچھا، میں کچھ دیر میں جالندھر فارم ہاؤس پر پہنچ رہی ہوں، تم بھی ادھر ہی آ جاؤ۔ کافی ساری باتیں ہیں کرنے کے لیے۔“

”اوکے، میں آ جاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اب آ جاؤ، کہیں رات نہ کر دینا، میں چندہ میں منٹ بعد وہاں پہنچ جاؤں گی۔“ وہ زور دیتے ہوئے بولی۔

”اچھا آ رہا ہوں یار، میں ساتھ میں ہر پریت کو بھی لے کر آتا ہوں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ تو اچھی بات، اب بس آ جاؤ۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگلے ایک گھنٹے میں وہ دونوں جالندھر کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت سورج غروب ہو گیا تھا، جب وہ فارم ہاؤس پہنچ گئے۔

وہاں پر سبھی تھے اور وہ سب ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں کے پہنچنے ہی بائیتا کور نے کہا۔

”کل جو کچھ بھی ہوا، وہ سب کچھ لو کہ ایک اشارہ تھا۔ وہ میڈم کیسری تو واقعتاً ایک مہرہ تھی۔ ایک لیڈی انٹیکٹر جو رشوت کے معاملے میں بڑی مشہور ہے۔ خیر چھوڑو اسے۔ یہ جو ہمیں اشارہ دیا گیا ہے، یہ فورسز کی طرف سے ہے خاص طور پر راک کی جانب سے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“ بلدیو سنگھ نے پوچھا۔

”میرا تو خیال ہے کہ چند دن تک اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر سکون کیا جائے۔ حکومت کے حالات کسی کروش بیٹھ جائیں تو پھر دیکھتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمارا سارا مقصد ختم ہو جائے گا۔ ہم تو دب جائیں گے۔“ سرجیت سنگھ نے کہا۔

”معاملہ صرف یہیں تک نہیں ہے۔“ بائیتا کور نے گھیس لہجے میں کہا اور لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی، پھر بولی۔

”سندھپ کور والے معاملے کو تو تم لوگ پوری طرح سمجھتے ہو۔ میں نے اس انسٹیٹیوٹ کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کی ہے۔ وہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اپنی جگہ، لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ادارہ ہندو اور یہودی لابی کے اشتراک میں چل رہا ہے۔ سمجھو، وہاں پر را اور موساد ہے۔ ان کا اصل مشن یہاں بھارت میں یہ ہے کہ یہاں امرت داری سکھوں کی خالصہ سوچ ختم کرنا اور نرنگاری سکھوں کو پروموٹ کرنا ہے۔ ادھر پاکستان میں جہادی سوچ کو تباہ کرنا اور فرقہ بازی کو ہوا دینا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جتنے مرضی جفاوری ہوں۔ جتنا مرضی حوصلہ رکھتے ہوں، ان جیسی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہ دو ادارے نہیں دو حکومتیں ہیں۔ یہاں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیر نہیں لینا چاہئے۔“ بلدیو سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اوئے، تم ڈر گئے ہو۔ بڑے دعوے کرتا تھا خالصہ کے، ہوا سرک گئی۔“ سرجیت سنگھ نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”ہوا سرک نہیں میرے دیر، ہوا کا رخ دیکھا ہے۔ جو اس وقت ہمارے خلاف جا رہا ہے۔“ بلدیو سنگھ نے قہقہے سے جواب دیا تو بائیتا کور بولی۔

”میری پوری رات اس پر لگی ہے، میں نے اس ادارے کے بڑوں تک جانکاری لی ہے، لیکن اس کے ساتھ

ساتھ میں خالصہ تحریک کے بڑوں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہو جائے گا۔ لیکن میرا ایک سوال ہے سب سے؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور اس نے سب کی طرف دیکھا۔

”کیا سوال ہے؟“ بلدیو سنگھ نے ہی پوچھا۔

”یہ کہ ہم کیا کر رہے ہیں، اپنے طور پر کسی کو مار دیا، یا پھر اپنے ہتھ کی جنگ لڑتے جا رہے ہیں، کس لیے؟ کوئی ہے جواب؟“

”کیا رتن سنگھ جی نے تمہیں نہیں بتایا، یہ بحث بنا کس لیے ہے، اب اسے بڑھانا ہمارا ہی کام ہے۔“ بچن کور نے تیزی سے کہا۔

”لیکن ہماری کہیں بھی جڑیں نہیں ہیں۔ ان سیاست دانوں کو دیکھو، کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں، اتنی اتنی بڑی کرپشن کر رہے ہیں لیکن کوئی پوچھتا نہیں، ان کی جڑیں ہیں کوئی انہیں ہلا نہیں سکتا۔ ہمیں تو ایک ہلے میں صاف کیا جاسکتا ہے۔ کل ہی کی بات لے لو، اگر وہ دس پندرہ بندے بھیج دیتے، جو ہمیں دیکھتے ہی شوٹ کر دیتے تو ہم کیا کر سکتے تھے؟“

”اس کا کیا صلہ ہے؟“ وکرمل سنگھ نے پوچھا۔

”یہی کہ ہمیں بہت سوچ کر اب کوئی قدم اٹھانا چاہئے، جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔ کسی طرف سے کوئی معاملہ سیدھا ہوتا ہے تو پھر.....“ اس نے کہنا چاہا تو اچانک کرن کور بولی۔

”میں ایک صلاح دوں۔“

”ہاں دو۔“ بائیتا کور نے کہا۔

”ہم بزنس کی بنیاد پر ایک این جی او بناتے ہیں۔ اداروں میں دخل اندازی آرام سے ہو سکے گی۔ کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ سیاست کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو سکا، لوگوں کو پالیں گے اور اپنا مقصد نکالیں گے، یہ خالصہ والے بھی ہمارے پاس خود چل کر آئیں گے۔“

”تمہاری بات قابل غور ہے، لیکن ابھی ہم اس پر چل نہیں سکتے۔“ بائیتا کور نے کہا تو جہاں بولا۔

”کیوں نہیں قابل عمل، یہ بنائیں، یہ کیسے ہوگا، اس پر سوچ بچار کر لیں۔“

”ٹھیک ہے پھر کریں سوچ بچار کل تک، ہم دوبارہ بات کر لیں گے۔“ بائیتا کور نے حتی انداز میں یوں کہا جیسے اب اس نے بات کر دی ہو۔ ان سب کے ذہن میں یہ بات آگئی تھی کہ اب انہیں کیا کرنا ہوگا۔ وہ سب اسی پر بحث کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کی چلنب بڑھ گئے۔ جہاں ان کے لیے ڈرنجن دیا گیا تھا۔

اس وقت وہ سب کھانا کھا رہے تھے۔ جب اچانک باہر کہیں فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ بڑی شدید فائرنگ تھی۔ ایک لمحے کے لیے یہ سمجھ نہیں آ سکا کہ یہ کس طرف سے ہے اور کہاں فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہ سبھی کھانا چھوڑ کر باہر کی سمت بڑھے۔ اس وقت کسی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ جیسے ہی باہر آئی صورت حال سامنے آئی۔ فارم ہاؤس کے ہی سیکورٹی والے اس اچانک ہونے والے حملے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن فائرنگ کی سمت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ آور سامنے اور دائیں جانب کے رخ پر ہیں۔ انہیں یہ سمجھنے میں لمحہ بھی نہ لگا کہ کسی نے حملہ بہت شدید نوعیت کیا ہے۔

”لکھو، اسلحہ، جلدی۔“ بائیتا کور کی آواز گونجی تو سبھی اس کمرے کی جانب بھاگے، جہاں اسلحہ تھا۔ جس کے ہاتھ میں جو بھی آیا، اس نے وہی اٹھالیا۔

جہاں اس وقت مسکرا دیا، جب ہر پریت کور نے ایک گن اٹھائی اور اس کا میگزین چڑھانے لگی۔ اندر کی طرف سے مزاحمت شروع ہو گئی تھی۔ ڈر صرف یہ تھا کہ درمیان میں سیکورٹی والے ہیں۔ اس پر بانیتا نے سیکورٹی کے انچارج کو فون کیا۔

”باہر کتنے لوگ ہیں؟“

”پتہ نہیں کتنے ہیں لیکن حملہ شدید ہے۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا

”تم ایسا کرو، اپنے بندوں کو اکٹھا کر کے بائیں جانب برجی والے کمرے میں چلے جاؤ، جو کچھ کرنا ہوگا وہیں سے کرنا، ہم ہیں، ہم دیکھتے ہیں۔“

”جی میڈم۔“ اس نے کہا تو بانیتا کور نے فون بند کر دیا۔ جہاں اس وقت قریب ہی کھڑا تھا۔ بانیتا کور نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زور سے بولی۔

”جو بولے سو نہال“

”ست سری اکال او۔“

اس کے ساتھ ہی اندر سے بے دریغ فائرنگ ہونے لگی۔ سامنے سے اچانک فائر بند ہو گیا۔ جہاں آگے بڑھا۔ اس کے دائیں جانب ہر پریت اور بائیں جانب سر جیت سنگھ تھا، بانیتا کور ان سے آگے بڑھ گئی۔ بھی سامنے سے ایک دم فائرنگ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی بانیتا کور کی چیخ بلند ہوئی۔ جہاں تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ خون میں لت پت تھی۔ سامنے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بانیتا کور کو اٹھائے، اسے سنبھالے یا پھر سامنے ہونے والی فائرنگ کا مقابلہ کرے۔ پھر ایک دم اس نے فیصلہ کر لیا۔ اسے بانیتا کور کو بچانا چاہئے لیکن وہ جائے گا کدھر سے؟ جب تک فائرنگ نہ رکتی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی گن سیدھی کی ہی تھی کہ اسی وقت اسے جمال کی آواز سنائی دی۔

”جہاں جلدی کر بانیتا کور کو اٹھا اور ہسپتال لے جا میں اسے سنبھالتا ہوں۔“ جہاں نے آواز کی سمت دیکھا، جمال کے ہاتھوں میں گن تھی اور وہ بے دریغ سامنے سے فائر کرتا چلا جا رہا تھا۔ جہاں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جمال یہاں آ سکتا ہے؟ یہ اس کا وہم تو نہیں؟ وہ حیرت سے گنگ تھا۔ جہاں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور پھر گن سیدھی کی تو جمال نے فائرنگ کرتے ہوئے زور سے کہا۔ ”اوئے تمہیں سنتا نہیں، سب لڑکیوں کو لے کر نکل جا، فوراً جلدی کر، وقت ضائع نہ کر۔“

آواز صاف تھی، وہ سب سمجھ بھی رہا تھا کہ اس نے کیا کہا ہے، لیکن وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

جہاں حیرت سے بُت بنا جمال کو دیکھ رہا تھا جو ایک اوٹ میں کھڑا سامنے کی سمت فائرنگ کرتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں بانیتا کور کی کراہ ابھری تو اسے ہوش آیا۔ جب تک ہر پریت اس کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اس نے بانیتا کور کو سنبھالا۔ بھی نوتن کور نے تیزی سے چیخے ہوئے کہا۔

”جہاں۔! وہ سامنے کھڑی سیاہ کار بلٹ پروف میں ہم بانیتا کو ہسپتال لے جا سکتے ہیں۔“

جہاں نے لمحے کا کوئی حصہ بھی سوچنے میں ضائع نہیں کیا اور فوراً اس جانب بڑھ گیا۔ جو اس سے تقریباً بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھی۔ نجانے کیوں جمال کے وہاں ہونے کی سمجھ نہ آنے کے باوجود وہ حوصلہ مند ہو گیا تھا۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس افتاد سے پوری طرح منٹ لے گا۔ چابی ڈیش بورڈ ہی میں تھی۔ اس نے کار

اسٹارٹ کی اور بانیتا کور کی جانب لپکا۔ نوتن کور کے ساتھ ہر پریت اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ جبکہ کور کور اور بچن کور ہاتھوں میں گتیں لیے فائرنگ کر رہی تھی۔ انہوں نے لمحہ بھر کو انہیں دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے فائرنگ کی بوچھاڑ کر دی۔ جہاں نے گیٹ کی سیدھ میں کار نکالی اور پھر نکلتا چلا گیا۔

گیٹ کے باہر کا منظر ہی عجیب تھا، یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے انہیں ختم کرنے کو پوری فوج ہی اتری ہوئی ہو۔ سامنے کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ بہت سارے لوگ تھے۔ ایک بار تو جہاں کا دل کیا کہ یہیں پر اتر کر وہ ان پر گولیاں برسانا شروع کر دے لیکن کار کے اندر بانیتا کور کی ابھرتی ہوئی کراہوں نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ گیٹ سے نکلتے ہی کئی گنوں کا رخ کار کی جانب ہوا۔ انہوں نے شعلے اگلے، مگر جہاں زن سے گذر گیا۔ وہ اس قدر تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا، جس قدر کار اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے ٹریفک کی پروا نہیں کی۔ اسے اندازہ تھا کہ ہسپتال کس طرف ہو سکتا ہے، تبھی ہر پریت اس کی رہنمائی کرنے لگی۔ اس دوران نوتن نے رتن دیپ سنگھ کو اس حملے کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کے اندر اسے جالندھر ہی سے پوری طرح مدد مل جائے گی۔ رتن دیپ سنگھ نے اسے ایک نئی ہسپتال کے بارے میں بتایا جہاں بانیتا کو لے جایا سکتا تھا۔ نوتن اس کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ وہاں پہنچ گئے۔ کئی سارے لوگ ان کے انتظار میں ہسپتال کے باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے ہی کار رکی، انہوں نے بانیتا کور کو سنبھال لیا۔ وہ اسے سیدھا آپریشن تھیٹر لے گئے۔ کچھ لوگ تو اس کی حفاظت کے لیے وہاں آ گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں ایسے ہی لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر سے نکلنے والے ڈاکٹرز میں سے ایک نے انہیں بتایا کہ بانیتا کور اب خطرے سے باہر ہے، لیکن ابھی اُسے ہوش نہیں، صبح تک اسے ہوش آ جائے گا۔

جیسے ہی جہاں کو یہ اطمینان ہوا، اس نے پاس کھڑی ہر پریت سے کہا۔

”ہر پریت۔! تم انوجیت سے کہہ کر گھر سے گاڑی منگوا لو اور اس میں چلی جانا، میں فارم ہاؤس جا رہا ہوں۔ یہ بات نوتن کو بتا دینا۔“

یہ کہہ کر وہ واپس فارم ہاؤس کی طرف جانے کے لیے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت ہسپتال کے گیٹ کے پاس پارکنگ میں کار رکی اور اس میں سے بلدیو سنگھ، بچن کور اور جمال باہر نکلے۔ جہاں تیر کی سی تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھا۔ اس نے جمال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور باقیوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو جہاں کا جمال سے پہلا سوال یہی تھا کہ تم یہاں کیسے؟

”دیکھو۔! یہ تو جیہات نہ تمہاری سمجھ میں آئیں گی اور نہ میں تمہیں سمجھا پاؤں گا۔ اس وقت تم پر آج آئی تو میں یہاں پر ہوں۔ جیسے ہی تم پر خطرہ ٹل گیا، میں یہاں رہ ہی نہیں پاؤں گا۔“

”مطلب تم بتاؤ گے نہیں؟“

”نہ بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ عشقِ زمان و مکان کی قید سے آزاد کر دیتا۔ یہی وہ قوت ہے جو زمان و مکان پر تخیل کی قوت رکھتی ہے۔ یہی تخیل انسان کی خودی ہے۔ ابھی اس کی وضاحت کا موقع نہیں، وقت آنے پر پوری طرح سمجھا دوں گا، یہ وعدہ رہا۔“ جمال نے جواب دیا تو جہاں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”اچھا ہمارے بعد کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، تم نے فارم ہاؤس کے تہہ خانے میں اسلحہ نہیں دیکھا۔ وہاں سب کچھ موجود ہے۔ بس اسے استعمال کیا اور عقل سے کیا۔ انہیں کچھ دیر تک روکا، پھر باہر سے بھی مدد آگئی۔ بس وہ لوگ بھاگ گئے، کچھ زخمی ہوئے، جو مر گئے، وہ ساتھ لے گئے، تین بندے ہم نے ان کے پکڑ لیے ہیں۔“ جمال نے بتایا

”گڈ۔! بندے کہاں ہیں؟“ جہاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا

”وہ رتن دیپ سنگھ کے بندے لے گئے ہیں۔“ جمال نے کہا پھر بولا۔ ”سناؤ، اب یہاں سنگھ شانتی ہے نا۔“

جہاں نے پوچھا۔

”لگتا تو یہی ہے۔“ جمال نے جواب دیا

”اب سنبھال لو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”اب تو میں سب سنبھال لوں گا۔“ جہاں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا

”آؤ، ایک نگاہ بائیکاٹ کو دیکھ لیں۔“ جمال نے کہا اور اسپتال کے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے کارڈور میں چلتے ہوئے آئی سی یونٹ جا پہنچے۔ شیشے کی دیوار میں وہ کچھ دیر تک بائیکاٹ کو دیکھتا رہا۔ جہاں بھی اسے پوری توجہ اور گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ساتھ کھڑے جمال سے جب بات کرنے کے لیے رخ موڑا تو وہ وہاں پر نہیں تھا۔ دور دور تک اس کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ اس بار جہاں کو حیرت محسوس نہیں ہوئی بلکہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بائیکاٹ کو روکا بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے اس کے بھائی اور بہت سارے لوگ وہاں موجود تھے۔ اس لیے جہاں سنگھ فارم ہاؤس جا پہنچا، جہاں باقی سب موجود تھے۔ کچھلی شام جو فائرنگ کے آثار تھے ابھی تک ویسے ہی موجود تھے۔ اگرچہ پولیس نے اپنی کارروائی کر لی تھی، لیکن وہ سب دکھاوا تھا، یہ شاید ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ فارم ہاؤس پر سوائے اسلحہ کے کوئی ایسی غیر قانونی چیز نہیں تھی۔ وہ اندر لاؤنچ میں چلا گیا۔ ایک صوفے پر بچن کور، کرن کور اور نوتن کور بیٹھی ہوئی تھیں، جبکہ دوسری طرف بلدیو سنگھ، وکرم سنگھ، اور سرجیت سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے درمیان جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ماحول میں سوگواریت پھیلی ہوئی تھی۔

”کچھ پتہ چلا؟“ اس نے بیٹھے ہی سب کی طرف دیکھ کر پوچھا تو نوتن نے دھیمے سے بتایا

”میری ابھی کچھ دیر پہلے رتن دیپ سنگھ جی سے بات ہوئی ہے، اسی بارے میں، انہوں نے کہا ہے کہ ایک بندہ ابھی توڑی دیر میں دہلی سے یہاں پہنچنے والا ہے، اس کے پاس کافی معلومات ہیں، وہی بریف کرے گا۔“

”کب تک آجائے گا وہ؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”حتیٰ تو کہا نہیں جاسکتا کب آئے گا، لیکن آج ہی ایک دو گھنٹوں سے پہلے آجائے گا، وہ وہاں سے نکل پڑا ہے، اسی کام کے لیے۔“ وہ اسی دھیمے لہجے میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے، انتظار۔“ جہاں نے مضطرب انداز میں کہا تو وکرم سنگھ بولا۔

”میرا خیال ہے کہ.....“

بلدیو سنگھ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

”خیال، اندازہ کچھ نہیں، حقائق ہونے چاہئیں بس، یہ جو کچھ ہم نے شروع کیا ہے، اس میں اندازے کی ذرا سی غلطی سب کچھ ختم کر دے گی۔ اب بہت زیادہ محتاط ہو جانے کا وقت آ گیا ہے۔“

”چلیں انتظار کرتے ہیں اس کا۔“ نوتن کور نے کہا تو ایک طویل خاموشی ان میں در آئی۔ جیسے ہر بندہ اپنے آپ میں سوچ رہا ہو۔ انہیں کل شام ابھی تک یاد تھی، جب موت انہیں چھو کر گزری تھی۔

اس وقت روشن دن کا پہلا پھر ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص آگیا، جس کے بارے میں رتن دیپ سنگھ نے انہیں بتایا تھا۔ وہ لمبے قد کا مضبوط جوان تھا۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی فلمی ہیرو ہی لگتا تھا۔ وہ ان کے درمیان آ بیٹھا تو اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”میرا نام کیا ہے اور میں کون ہوں، اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہماری شاید ہی کہیں ملاقات ہو۔ یہ ساری باتیں میں فون پر بھی بتا سکتا تھا لیکن میں آپ سب لوگوں کے ہر سوال کا جواب دینے آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا اور پھر کہتا چلا گیا، ”یہ جو تم لوگوں پر حملہ ہوا ہے، اس میں ایجنسیاں پوری طرح ملوث ہیں۔ ان کا مقصد تم لوگوں کو بے نقاب کرنا تھا، وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟“ بلدیو سنگھ نے سوال کیا۔

”پوری طرح، یہ ایک باری کی کوشش نہیں تھی، تین بار انہوں نے ایسا کیا ہے اور تینوں باری ہی وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اب ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ تم سب کو پکڑ لیں، مقدمہ بتائیں اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑنے، مرنے کے لیے پھینک دیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

”ہاں یہ سوال بنتا ہے؟“ جہاں سنگھ نے تیزی سے کہا۔

”وہ ایسا اس لیے نہیں کر سکے کہ انہیں اب بھی شدید الجھنیں ہیں۔ وہ اپنے بڑوں کو حتیٰ جواب نہیں دے پائے، اسی لیے.....“

اس نے کہنا چاہا کہ سرجیت سنگھ نے کہا۔

”یار آپ کہاں کی مت سناؤ، سیدھی بات کرو۔“

اس پر وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر بولا۔

”سیدھی بات یہ ہے کہ ان کی پہلی الجھن بائیکاٹ کور ہے، ایک شام پہلے وہ پاکستان میں دیکھی گئی لیکن اگلے دن وہ ممبئی سے امرتسر آگئی۔ پوری فورس واہدہ اور اس کے آگے پیچھے لگی رہی تھی۔ انہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملا، اور نہ کوئی ایسا شک بھی ایسا ملا کہ وہ سندھپ کور اور اس کے درمیان کوئی کڑی تلاش کر سکیں۔ اس کا ایک دم سے ممبئی میں ظاہر ہونا ان کے لیے حیرت انگیز ہے۔ لاہور سے ممبئی کی کڑیاں نہیں مل رہی ہیں۔“

”بس یہی یا کچھ اور.....“ سرجیت نے پوچھا تو وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”دوسرے وہ لوگ جو چند دن پہلے کورڈ میں ہنگامہ کیے ہوئے تھے، وہاں ایک بڑا سیاست دان قتل ہو گیا، وہ لوگ ایک دم سے بائیکاٹ کور کے ساتھ کیسے آ گئے، اتنے شارٹ وقت پر؟ اس کے پیچھے وہ کسی بڑے نیٹ ورک کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ سامنے آنے والے یہ چند لوگ مہرے ہیں، اصل لوگوں تک رسائی کی جائے یا انہیں ہی پکڑ لیا جائے۔“

”یہ تو وہ کسی حد تک درست سوچ رہے ہیں۔“ بلدیو نے مسکراتے ہوئے کہا تو ماحول ایک دم سے نرم ہو گیا

”اور اب یہ جو بات میں بتانے جا رہا ہوں یہ بالکل نہ سمجھ میں آنے والی ہے، جہاں اور بائیکاٹ کا مشترکہ دوست جمال، ایک ہی وقت میں یہاں بھی ہے اور پاکستان میں بھی۔ جس وقت یہاں فائرنگ ہونے کی ویڈیو دکھائی گئی تھی، تو اس میں جمال کو دیکھا گیا۔ اس کی یہاں موجودگی نے سب کو الارٹ کر دیا کہ یہ یہاں کیسے پہنچا، لیکن اسی وقت

پاکستان سے تصدیق آگئی کہ وہ اپنے گاؤں میں ہے۔ دراصل وہ اس کے گاؤں نورنگر پر حملہ کروانے کی پوری تیاری کر چکے تھے۔

”تو پھر حملہ.....“ جیپال نے تیزی سے پوچھا۔

”نہیں ہوا، اس کی بیٹی وجہ ہے کہ وہ ہے کہاں؟“ وہ سکون سے بولا پھر لمحہ بھر رک کر کہنے لگا: ”وہ اس اسپتال میں بھی دیکھا گیا، جہاں اب باغیا کور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے اپنی تصدیق کرنا چاہ رہے ہیں، اور یہ بھی تلاش کر رہے ہیں کہ سندھ پ کور سے ان کا ان سے کہیں کوئی تعلق تو ہے؟“

ایک دم سے ان میں خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی کافی دیر تک رہی۔ نون کور جانتی تھی کہ سندھ پ کور پر کیا گزری، اس کے ساتھ کیا ہوا، وہ کیسے بھارت واپس آئی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ یہ تفصیلات بتانے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہر بندہ اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے بھی ایک شخص کو یہاں فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ اور اونچی اونچی آواز میں جیپال سے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ یہ خاموشی پھر اسی نے ہی توڑی۔

”سوال یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں کوئی بندہ دو جگہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا جمال یہاں ہے؟ یا اس کا کوئی ڈپلی کیٹ یہاں پر ہے؟“

”آپ تصدیق کرنے آئے ہو یا بتانے؟“ جیپال سنگھ نے پوچھا۔

”میں صرف بتانے آیا ہوں، تاکہ اسی مناسبت سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ ورنہ وہ تو ہمیں گھیر چکے ہیں، وہ کسی وقت بھی ہمیں پکڑ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا تو بلدیو سنگھ نے پورے سکون سے کہا۔

”دیکھو مسٹر! اس کی کسی کو کوئی سمجھ نہیں ہے، ممکن ہے یہ کوئی چیتکار ہو، اس بارے میں اگر باغیا کور کچھ بتا سکے تو ممکن ہے یہ سچی کھل جائے، ورنہ ہم سب کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آ رہی ہے۔ مگر یہ ہکی بات ہے کہ وہ یہاں ہو بھی تو ہمارا اس سے کوئی لینا دینا نہیں، اس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔“

”چلیں، اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ ہے تو بھی اور اگر نہیں تو بھی، ایجنسیوں کا تو یہ یقین ہو جانا چاہئے کہ وہ یہاں ہے اور کسی وقت بھی اپنی کارروائی کر سکتا ہے؟“ وہ ان سب کی طرف دیکھ کر یوں بولا جیسے پوچھ رہا ہو۔ تبھی بلدیو بولا۔

”اس طرح تو وہ ہمارے پیچھے ہی لگے رہیں گے، اکتا جائیں گے تو ہمیں پکڑ لیں گے، یہ کوئی بات نہیں، وہ بات کرو جو کرنے والی ہے۔“

”تو سنو پھر! اب تم لوگ نگاہوں میں آ چکے ہو اور پوری طرح ان کے سامنے ہو۔ اب آپ لوگوں کو دو دو میں سے ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ یا تو اپنی کارروائی جاری رکھو اور پکڑے جاؤ، کسی گولی کا نشانہ بنو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زیر زمین چلے جاؤ، ملک سے باہر بھاگ جاؤ۔“ ان نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہم نے ایسا کچھ بھی نہیں کرنا، جو ظلم ہوگا، اس کے خلاف آواز بلند کریں گے، جیسا بھی ہو۔ موت سے ہمیں کوئی ڈرا نہیں سکتا۔ اب اگر کوئی کام کی بات ہے تو بتاؤ، ورنہ.....“ بلدیو نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تب وہ دھیمے سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

”دیکھو دیر جی! سارے بھارت کو ایک طرف رکھو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں، ہمیں اپنے پنجاب سے مطلب ہے اور وہ بھی خالصہ پنجاب کی۔ اس وقت ہندو راج کے خلاف جس قوم میں سب سے زیادہ نفرت ہے، وہ سکھ قوم ہے۔ ہندو بھی اسے جانتے ہیں، ان کے بڑے مسلمان، سکھ اور عیسائی کو کیسے ختم کرنا چاہتے ہیں، یہ روزانہ

نت نئے منصوبے بناتے ہیں۔ جہاں وہ نسل کشی کا سوچتے ہیں، وہاں وہ ان میں پائی جانے والی سوچ کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اب تک پوری قوت سے کچھ نہیں کر سکے سوائے سازشوں کے، لیکن اب وہ کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ اور انہیں طاقت دی ہے، یہودی لابی نے، انہوں نے اس مقصد کے لیے باقاعدہ ادارے بنا لیے ہیں، جن کی پوری تفصیلات میرے اس بریف کیس میں ہے، وہ میں تم لوگوں کو ابھی دے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے سانس لیا، بریف کیس کھولا، اس میں سے ایک نارنجی رنگ کی فائل نکال کر بلدیو سنگھ کی طرف بڑھا دی۔ اس نے پکڑ لی تو وہ بولا۔ ”اس میں اس پورے میٹ ورک کے بارے میں تفصیل ہے، یا تو اسے ختم کرنے کا ٹاسک لو، اور سکھی پر احسان کرو، یا پھر زیر زمین چلے جاؤ، کہیں دوسرے ملک جانا ہے تو بتاؤ، وہاں بھیج دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لی جیسے اپنی بات کہہ چکا ہو۔ تب بلدیو سنگھ نے پوچھا۔

”بس یا کوئی اور بات؟“

”میں دو گھنٹے مزید یہاں ہوں۔ آپ اس رپورٹ کو دیکھ لیں، کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لیں۔“ اس نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”دکرم سنگھ، انہیں کمرہ دکھاؤ، جہاں یہ آرام کر لیں، ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم بات کرتے ہیں۔“ بلدیو سنگھ نے کہا تو وہ اٹھ گیا، دکرم سنگھ اسے لے کر اندر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

شام ہونے سے پہلے ہی ہم واپس گھر آ گئے تھے۔ اماں لان میں بیٹھی ہوئی میری منتظر تھی۔ نورنگر کی حویلی میں آنے کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ میں کار سے اتر کر سیدھا ان کی طرف چلا گیا۔ وہ مسلسل مجھ پر نگاہیں نکالتے ہوئے تھیں۔ میں نے ان کے پاس دھری ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

”اماں، خیریت ہے آپ یوں یہاں پر بیٹھی ہیں؟“

”تمہیں بتایا تو تھا کہ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے پرسکون لہجے میں بتایا

”تو پھر آپ گئے نہیں، یہاں.....“ میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ٹو آتا تو میں جاتی، تجھے ساتھ لے کر ہی جانا تھا۔ نجائے کہاں کہاں کی سیریں کرتا پھرتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئیں۔

”چلیں اب؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، وہ ابھی سوئی آتی ہے تو چلتے ہیں۔“ اماں نے پوریج کے داخلی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اماں کے کہے ہوئے لفظوں میں گم تھا۔ لیکن اظہار نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد سوئی ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ باہر آ کر کار کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اماں اور میں اس طرف بڑھ گئے۔

بہت عرصے بعد میں اپنی اس گلی میں گیا تھا جہاں میرا بچپن بیتا تھا۔ پرانے سگی ساتھی اور نجائے کیسا کیسا وقت یاد آتا چلا گیا۔ غربت کے وہ دن بھی مجھے یاد آ گئے، جب زندگی بڑی مشکل دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان حالات میں وہ بڑی آزادی کے دن تھے۔ نہ کوئی فکر اور نہ کوئی پریشانی۔ میں انہی یادوں میں کھویا ہوا اپنے گھر کے پھانک تک جا پہنچا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ سوئی نے وہاں کی صفائی سہرائی کے لیے ایک ملازمہ رکھ چھوڑی ہوئی تھی۔ اس دن وہاں آنے کا پیغام بھیج دیا۔ وہ منتظر تھی۔ صحن میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں کبھی یہاں سے گیا ہی نہیں تھا۔ نیم کا درخت اب گھٹا ہو چکا تھا۔ اس کے نیچے چار پانی دھری ہوئی تھی میں وہیں پر جا کر لیٹ گیا۔ ایک سکون میرے اندر یوں

پھیلا جیسے کبھی کسی قسم کی کوئی فکر مجھے تھی ہی نہیں۔ اماں اور سوئی اندر چلی گئیں۔ اور میں وہیں چار پائی پر پڑا اپنے آپ کو محسوس کرتا رہا۔

شام ڈھلے میں میں اٹھا اور گاؤں کے چوک میں جا بیٹھا۔ وہاں بہت سارے لوگ ملے باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے دکھ درد اب بھی وہی تھے۔ لیکن ایک احساس مجھے ضرور ہوا تھا کہ وہ غلامی کی فضا میں سانس لے رہے تھے، اس سے نجات ملنے کے بعد وہ آرزو سے سوچ سکتے تھے۔ انہیں مجھ سے بہت ساری امیدیں بندھ گئیں تھیں، جنہیں پورا کرنے کا میں نے ارادہ کر لیا تھا۔

رات ہو گئی تھی، جب میں لوٹ کر واپس گھر آیا۔ مہن میں اماں کے پاس دوسری چار پائی پر سوئی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کھانا لے آئی۔ ہم تینوں نے مل کر کھایا۔ اس دوران میں گاؤں کے لوگوں کی باتیں کرتا رہا۔ سوئی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی تو اماں نے بڑے سکون کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

”ہتر! میری خواہش ایک طرف، وہ جو ہے سو ہے۔ لیکن تُو نے مجھے ایک بات بتانی ہے، وہی بات جو تمہارے دل میں ہے۔“

”جی، اماں پوچھیں۔“ میں نے کسی وضاحت کے بغیر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوئی کے ساتھ تمہاری شادی کی جو میں نے خواہش کی ہے، کیا تو نے اسے دل سے قبول کیا ہے؟“ انہوں نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں اماں، میں نے اسے دل سے قبول کیا ہے۔“ میں صاف طور پر کہہ دیا۔

”یہ دل سے قبول کرنے کی وجہ؟“ انہوں نے پوچھا تو مجھے لگا کہ اصل میں یہی بات ہے جو وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے بھی سوچا کہ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں؟ کیا مجھے سوئی سے شدید محبت ہو گئی ہے جسے عشق کہا جاتا ہے؟ یا اماں کی خواہش؟ میں کچھ دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

”اماں، یہ ایسی بات ہے، جس کے بارے میں ابھی تک میں بھی فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ ایسا کیوں ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اگر شادی کروں گا تو سوئی ہی سے؟“ میں نے تذبذب سے کہا۔

”وہی تو پوچھ رہی ہوں، کہ ایسا کیوں؟“ انہوں نے پھر وہی سوال کر دیا تو میں نے پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

”میں کوئی ایک وجہ نہیں بتا پاؤں گا۔“

”اچھا۔!“ یہ کہہ کر وہ بھی چند لمحے سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ”کسی ایک کے ساتھ شادی کر لینے کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اور شادی کے بعد بھی بہت سارے منصوبے ہوتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کو اپنے اعزاز سے سوچتا ہے لیکن ہم جس راہ پر چل نکلے ہو، میں نہیں سمجھتی کہ اس کا کہیں انت ہوگا۔ کیا ایسے میں تم یہ شادی یا ازدواجی زندگی بھاپاؤ گے؟“

”شاید نہیں، یا شاید ہاں؟“ میں نے کہا۔

”میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو، سوئی بھی اسے سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد اس کی ازدواجی زندگی کیسی ہوگی۔ کہنا میں یہ چاہتی ہوں پھر کہ آخر شادی کی وجہ کیا ممکن ہو سکتی ہے؟“ انہوں نے اسی طرح مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو میں خاموش رہا۔ بھی انہوں نے کہا۔ ”دیکھ پتر، جو کام رُبِ تعالیٰ کے کرنے کے ہوتے ہیں، اگر اس کی فکر ہم کرنے لگیں تو رُبِ تعالیٰ اس کی فکر نہیں کرتا۔ وہ کام انسان کو کرنے دیتا ہے۔ ہمیں سے انسان اپنی آزمائش خود

اپنے سر لے لیتا ہے۔ ظاہر ہے انسان کی کیا اوقات کہ وہ ایسے کام کر سکے۔ سو ہمیں وہ کام جو رُبِ تعالیٰ کے کرنے کے ہیں، ان کاموں کی فکر چھوڑ کر، ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ رُبِ تعالیٰ ہمارے کاموں کی ذمہ داری بھی لے لے؟“

”ایسا کیا ہے اماں۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہے رُبِ تعالیٰ کی رضا، تسلیم و رضا، اپنا آپ رُبِ تعالیٰ کی رضا میں پیش کر دے اور اس پر ڈٹ جائے۔ یہی بندگی ہے اور یہی بندگی کی انتہا۔ یہاں پھر من و ٹوک کیا، وہ بہت کچھ جو انسان کی بقا سے تعلق ہی نہیں رکھتا، ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں انسان کا تعلق ایک نئی نوعیت اختیار کرتا ہے اور وہ تعلق صرف اور صرف رُبِ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ کیونکہ رُبِ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ انسان کی دوستی اور دشمنی صرف اسی کے لیے ہو۔“

اماں کہہ رہی تھیں اور میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ گاؤں کی ان پڑھ خاتون کیسی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں نے یہی سوال کر دیا۔

”اماں یہ باتیں.....“

”مجھے کسی نے نہیں رُبِ تعالیٰ نے سکھائی ہیں۔ میں پڑھ تو نہیں سکتی لیکن کلام پاک کا ترجمہ سن تو سکتی ہوں۔ میں یہ تو جان سکتی ہوں کہ میرے رُبِ تعالیٰ نے مجھ سے کیا بات کی ہے۔ وہی بات میں کہہ رہی ہوں۔ میں نے خود سے کوئی تھوڑی بات کی ہے۔“

”اماں، آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔“ میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا تو وہ بولیں۔

”دیکھ پتر! رُبِ تعالیٰ نے پاک مثال دی ہے اور وہ یہ کہ ایک دانہ زمین میں بویا جاتا ہے، اس سے بالیاں پھوٹتی ہیں اور ان میں دانے بھرتے ہیں۔ مطلب دانہ اپنا آپ فنا کرتا ہے تو اس میں بالیاں آتی ہیں، اور اسی میں دانے بھرتے ہیں۔ دراصل فنا ہی میں بقا ہے۔ اب فنا ہونے کی اصل حکمت یہ ہے کہ جیسی شے کے لیے فنا ہوں گے، ویسا ہی ہوگا۔ مردہ کے لیے فنا ہوں گے تو موت۔ زندہ کے لیے فنا ہوں تو زندہ، ہمیشہ زندہ رہنے والے کے لیے فنا ہوں گے تو ہمیشہ کی زندگی۔ اور صرف اور صرف تسلیم و رضا کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مطلب ہمیشہ رہنے والے کی رضا میں فنا ہو جانے کا نام ہی ہمیشہ کی زندگی ہے، یہی عبادت ہے، یہی بندگی ہے اور یہی انسان کی کامیابی ہے۔“ اماں نے کہا تو میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

”اماں! آپ نے بھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں لیں، یہ آج ایسے کیوں؟“

”اس لیے کہ اب تو ایسی باتیں سمجھنے کے لائق ہو گیا ہے اور اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔ سوئی سے تیری شادی صرف اس نیت سے ہو کہ تمہیں اس میں بھی رُبِ تعالیٰ کی رضا چاہئے اور بس، یہی بات میں نے اسے سمجھا دی ہے۔ وہ سمجھتی ہے اس بات کو۔“

”تو بس ٹھیک ہے اماں۔“ میں نے ماں کی بات کو رُبِ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر قبول کر لیا۔

”جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔“ اماں نے کہا تو میں اٹھ گیا۔ باہر مہن میں آکر میں نے وقت دیکھا تو رات کا پہلا پھر ختم ہونے والا تھا۔ نجائے کیوں میرا من چل رہا تھا کہ سوئی اندر سے آجائے اور ہم چھت پر چلے جائیں۔ میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی قربت، اس کا لمس اور اس کا احساس چاہتا تھا۔ میں نے مہن میں کھڑے ہو کر ایک طویل سانس لی۔ مجھے پتہ تھا کہ ابھی اسے باہر آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اسے اماں کو دوا دینا تھی، انہیں سلاتا تھا، پھر کہیں اس نے فری ہونا تھا۔ نیم کے درخت تلے چار پائی پڑی تھی، میں اس پر جا لیٹا۔ مجھے وہاں پڑے چند

منٹ ہی ہوئے تھے کہ اروند سنگھ کا فون آ گیا۔ اس کا نمبر دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھکا۔ میں کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

”سردار جی خیریت ہی ہے نا؟“

تبھی اروند سنگھ کی بجائے جہاں سنگھ نے تیزی سے یوں پوچھا جیسے وہ سب کچھ ایک بار ہی جاننا چاہتا ہو۔
”مجھے نہیں لگتا کہ خیریت ہو سکتی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے مجھے پتہ چلا ہے کہ نورنگر میں کوئی خطرہ ہے، تم سب لوگ ٹھیک تو ہونا؟“

”نہیں ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔ بات کیا ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے کچھ دیر پہلے فارم ہاؤس پر ہونے والی میٹنگ کے بارے میں اختصار سے بتاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، اگر نورنگر میں کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو پھر وہ ٹھیک کہتا ہے، میں نے فون بھی اس لیے کیا کہ تم محتاط ہو جاؤ۔“

”اس کا مطلب ہے کہ سندھپ کور والا معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا، اس طرح تو وہ سندھپ کور پر بھی اعتماد نہیں کریں گے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ اپنے باپ پر اعتماد نہیں کرتے اور پھر جو بندہ ایک بار دشمن کا قیدی ہو جائے اور پھر وہ بچ کر بھی آجائے تو اسے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ وہ بچے تھوڑی ہیں، ظالمانہ ایجنسیاں چلا رہے ہیں۔“ جہاں نے نفرت سے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔ محتاط ہو جانا اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چوہدری اشفاق کو فون کیا، وہ اس وقت حویلی ہی میں تھا۔ میں نے اسے ساری تفصیل بتائی تو وہ بولا۔

”سیکوری کا معاملہ تو ٹھیک ہے، کوئی بھی نگاہ سے بچ نہیں سکتا، لیکن پھر بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ ساری رات سو نہیں پائے گا۔ میرے اندر بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ کئی سوچیں آتی چلی گئیں۔ تبھی اندر سے سوئی آگئی، مجھے اس کی آمد کا پتہ ہی اس وقت چلا، جب وہ میرے قریب آکھڑی ہوئی۔

”کیا بات ہے، کوئی کسی قسم کا خطرہ تو نہیں؟“

”ممکن ہے، نہیں بھی ہے، کچھ کہہ نہیں سکتا، ابھی جہاں کا فون آیا تھا۔“ میں نے اسے بتایا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”تو چلو، چلیں حویلی۔“

”تم یہاں اماں کے پاس رہو، میں نکلتا ہوں۔“

”نہیں، میں، تمہارے ساتھ جاتی ہوں، اماں کے پاس وہ مفید ہے، ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔ اسے واپسی میں چند منٹ لگے، اس وقت تک میں کار گیٹ سے باہر نکال چکا تھا۔ وہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں کار کا گیٹ کھول کر اس میں بیٹھ گئی۔

”کیا کر کے آئی ہو؟“ میں نے گہرے لگاتے ہوئے پوچھا تو بولی۔

”سب ٹھیک ہے، یہاں کی فکر نہ کرو، یہاں سب ٹھیک ہے۔“ وہ اضطرابی لہجے میں بولی تو میں نے اپنی ساری توجہ سڑک پر لگا دی۔

پہلے میں سیدھا حویلی کی طرف گیا، وہاں کافی ہلچل تھی۔ چوہدری اشفاق نے سب کو ارٹ کر دیا تھا۔ جیسے ہی

میں گیٹ پر پہنچا، اسی لمحے مجھے خیال آیا۔ جس طرح میں اس ہلچل کو دیکھ رہا ہوں، وہ نگاہیں جو یہاں کسی کی جانب سے متعین ہو سکتی ہیں، وہ بھی تو دیکھ رہی ہوں گی؟ ممکن ہے کہ چوہدری اشفاق کا بھی یہی خیال ہو کہ دشمن ان کی تیاری دیکھ کر ہی دل جائے اور حوصلہ کھو بیٹھے۔ مگر میں چاہتا تھا کہ اگر کوئی دشمن تاک میں ہے تو حملہ کرے تاکہ مجھے احساس ہو جائے کہ وہ کون ہے؟ اس بار میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جہاں تک بھی جا سکا، اپنے دشمن کا پیچھا ضرور کروں گا۔

میں نے فون نکالا اور چوہدری اشفاق کو ہدایات دیں، پھر وہیں سے کار موڑ لی۔ میں واپس پلٹ پڑا۔ اب اگر متوقع دشمن آ بھی جاتا تو مجھے فوراً اطلاع ہو جانی تھی۔ میں اس سڑک پر آ کر رک گیا، جہاں سے ایک طرف نور پور گاؤں اور دوسری طرف حویلی تھی۔ اس کے درمیان بنی سڑک شہر کو جاتی تھی۔

”یہاں کیوں رُک گئے؟“ سوئی نے دھیمے سے پوچھا تو میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

”تم سے باتیں کرنے کے لیے۔“

”کیا کار میں اتنا اسلحہ ہے کہ تم اس سے دشمن کا مقابلہ کر سکو؟“ وہ میری بات نظر انداز کر کے بولی۔

”ہاں ہے؟“ میں نے اطمینان سے کہا تو وہ بھی مطمئن سی ہو گئی۔ میں نے کار بڑھا دی اور یونہی پھرتا رہا۔ ہم ساری رات یونہی سڑکوں پر پھرتے رہے۔ جی بھر کے باتیں کیں۔ نجانے کن کن راستوں پر کار لیے گھومتا رہا، یہ مجھے بھی یاد نہ رہا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نہر کے پل پر کار کھڑی کر کے نیچے اتر آیا، صبح کی مست ہوانے مجھے مدھوش سا کر دیا۔ میں نے لمبی لمبی سانس لیں اور سوئی کو بھی باہر آ جانے کو کہا۔ وہ بھی باہر آگئی۔ بہت خوشگوار موسم تھا۔ جس طرف سے پانی آ رہا تھا، ہم ادھر نیچے کی جانب بڑھ گئے۔ ہم وہاں سے زیادہ دو سو قدم کے فاصلے تک گئے ہوں گے۔ دل چاہ رہا تھا، ہم ادھر نیچے کی جانب بڑھ جائے۔ انہی لمحات میں اچانک پل پر ٹائزوں کی چرچاہٹ کی تیز آواز کانوں میں پڑی، جس نے ماحول کو بھی جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ فطری طور پر میں نے اس جانب دیکھا، دو سیاہ فوڈیل گاڑیوں کے درمیان ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی۔ ان کا رخ نورنگر سے شہر کی جانب تھا۔ جس کار میں ہم تھے وہ کراس کر گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں سے کئی لوگ جھانک رہے تھے۔ تبھی وہ تینوں گاڑیاں ریورس میں واپس ہوئیں اور کار کے پاس رک گئیں۔ بلاشبہ وہ قریب سے گزر رہے تھے۔ میری کار پہچان کر انہوں نے اپنی گاڑیاں روک لیں تھیں۔ اب لازماً وہ مجھے تلاش کریں گے۔

میں سوئی کو لے کر فوراً چھپ گیا۔ میں نے لاشعوری طور پر پستل کے ساتھ انتہائی تیزی سے سیل فون نکالا اور چوہدری اشفاق کا نمبر پیش کر کے اسٹیکر آن کر دیا۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

”خیریت ہے نا؟“

”ہاں بالکل، کوئی نہیں آیا؟“ اس نے بتایا

”لیکن دشمن ساری رات چھپا رہا ہے،“ پھر میں نے موجودہ صورت حال بتا کر تیزی سے کہا۔ کہا۔ ”فوراً نکلو، انہیں پکڑنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون جیب میں ڈالا اور سوئی کو لیتا ہوا درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ میں انہیں غور سے دیکھنے لگا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دس سے بارہ آدمی ضرور تھے۔

”میرے پاس بھی پستل ہے، یہ دیکھو۔“ مجھے درخت کی اوٹ میں ہوتا دیکھ کر سوئی نے سرگوشی میں کہا۔

”تو پھر تم ایسا کرو، پیچھے کسی درخت کی اوٹ میں ہو جاؤ، اس وقت گولی نہ چلانا، جب تک انتہائی ضروری نہ ہو، یہاں میں دیکھتا ہوں۔“

وہ میرے پاس سے اٹھی اور پیچھے چلی گئی۔ تب تک ان میں سے ایک فور و ہیل کا سن روف کھول کر دو بندے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ میں انہیں اپنا احساس نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے چوہدری اشفاق کا انتظار تھا، انہیں یہاں آتے ہوئے کم از کم دس سے پندرہ منٹ تو ضرور لگتے تھے۔ جن میں سے ابھی چار یا پانچ منٹ گزرے ہوں گے۔ تبھی انہی دو لوگوں نے گتیں نکالیں اور سامنے کھڑی کار پر فائرنگ کرنے لگے۔ چند منٹ غصہ نکالنے کے بعد ایک نے راکٹ لاچر سمیت سر نکالا اور راکٹ داغ دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی کار کے پرچے اڑ گئے۔ کار کے ساتھ اسلحہ بھی ختم ہو گیا تھا، اب میرے پاس ایک اگلوٹا پسل بچا تھا۔

اگرچہ چند گولیوں کے ساتھ میں انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی میں انہیں چھیڑنا نہیں چاہتا تھا، وہ اگر ادھر ادھر پھیل گئے تو مجھے انہیں اکٹھا کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں مبر سے سر چمپائے بیٹھا رہا۔ میں یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے چل نہ پڑیں۔ دس منٹ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ میرے اندر سسنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ لوگ گتیں لیے گاڑیوں سے اتر چکے تھے۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، میں وہاں سے کسی دوسری جگہ چھپ بھی نہیں سکتا تھا، پیچھے سوئی تھی، میں اسے بھی دیکھ سکتا تھا، میں آنکھیں جھپکے بغیر سامنے کھڑے دشمنوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے سیل فون نکالا اور چوہدری اشفاق سے رابطہ کیا

”بس ہیل کے پاس آگئے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے وہاں کی صورت حال بتاتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو وہ کھڑے ہیں، اگر چل پڑے تو مشکل ہو جائے گی۔“

”کوئی بات نہیں سامنے سے بھی بندے آ رہے ہیں اور نہر کی طرف سے بھی، چاروں طرف سے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون آن ہی رکھا اور سامنے دیکھنے لگا۔ وہی ہوا، جس بارے میں ابھی ظاہر کیا تھا، وہ واپس گاڑیوں میں بیٹھنے لگے تھے۔ تبھی میں نے تاک کر نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو بندے گر گئے۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں اپنی جگہ بدل لی تھی۔ ایک طرح سے اعلان جنگ ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم سے الٹ ہو کر انہوں نے پوزیشن لے لی اور فائر کھول دیا۔ میں نے پھر نشانہ لیا اور پہلی فور و ہیل کا ٹائر برست کر دیا۔ میری توقع کے مطابق انہوں نے فائر کی آواز والی سمت پر بے دریغ فائرنگ کرنا شروع کر دی۔

میں کچھ دیر مبر کیے چھپا رہا، تبھی میری نگاہ نہر کی دوسری جانب پڑی جہاں کافی فاصلے پر کاریں تیزی سے آ رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ اپنے ہی بندے تھے۔ تب میں باقی گاڑیوں کے ٹائر بھی برست کر دیے۔ اس وقت انہوں نے گاڑیوں سے چھلانگیں لگا دیں۔ ایسے وقت میں ان کی پچھلی طرف سے چوہدری اشفاق آن پہنچا۔

”جمال! نہر کے ساتھ چکی سڑک پر دو کاریں آ رہی ہیں۔“ سوئی کی آواز عقب سے سنائی دی

”تم چھپی رہنا، ممکن ہے وہ اپنے لوگ نہ ہوں۔“ میں نے اسے کہا اور خود کو مزید چھپا لیا۔ کچھ لمحے بعد کاریں زن سے ہمارے قریب سے آگے گزر گئیں۔ تبھی میں فون پر چوہدری اشفاق سے کہا۔

”کوشش کرو، یہ زندہ پکڑیں جائیں۔“

”بہتر۔“ اس نے جواب میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

وہ چاروں طرف سے گھیرے جا چکے تھے۔ تبھی کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

”تم لوگ گھیرے جا چکے ہو، اپنے ہتھیار پھینک کر، سروں پہ ہاتھ رکھ کر ہیل پر اٹنے لیٹ جاؤ۔“

اس وارننگ کے جواب میں انہوں نے ایک دم سے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بات نہیں مانیں گے۔ یہ ان کی غلطی تھی، مگر انہیں کیا احساس تھا کہ ان کے چاروں طرف لوگ ہیں۔ جواباً سامنے سے بھی

اس سے کہیں شدت سے فائرنگ ہوئی۔ جو بھی سر اٹھاتا اس کے فائرنگ جاتا۔ میری ریخ میں جو بھی آتا، میں اس کا نشانہ لیتا اور فائر کر دیتا۔

دس پندرہ منٹ اسی فائرنگ میں گزر گئے، یہاں تک کہ سامنے سے فائر ہونا بند ہو گئے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتا تھا کہ ان میں لوگ زندہ نہ ہوں، وہ چھپ گئے تھے۔ میں نے یہ بات فون پر چوہدری اشفاق سے کہہ دی۔ وہ سمجھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

”ہمیں پتہ ہے کہ کتنے لوگ اب بھی زندہ ہیں، میرے دس گتے تک جو بھی ہیل پر جا کر لیٹ گیا، اسے کچھ نہیں کہا جائے گا، ورنہ کتنی کے بعد ہینڈ گرنیڈ سے گاڑیوں کے ساتھ انہیں بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ ایک دو.....“ ابھی کتنی پانچ تک پہنچی تھی کہ دو نوجوان نکلے اور ہیل کی طرف بڑھے، وہ جا کر لیٹ گئے۔ جب دیکھا کہ انہیں کچھ نہیں ہوا، تین مزید نکلے اور انہوں نے بھی ایسا کیا۔ دس تک کتنی پوری ہو گئی تھی، تب چوہدری اشفاق نے پھر کہا۔ ”جتنے لیٹے ہوئے ہیں، وہ اٹھ کر ہاتھ سر پر رکھ کے، سڑک پر چلاؤ، گاڑیوں پر گرنیڈ پھینکنے ہیں۔“ اسی لمحے ایک نوجوان نکلا اور تیزی سے ہیل کی جانب بڑھا۔ اب ان گاڑیوں کو دھماکے سے اڑانا بننا تھا، لیکن میں نے روک دیا۔ وہ چھتے اور ہیل سے نیچے اتر کر سڑک پر جا رہے تھے۔ میں نے انہیں قابو کرنے کو کہا۔

اگلے دس منٹ میں انہیں قابو کر لیا گیا، میرا اندازہ بہت قریب تھا، وہ گیارہ لوگ تھے۔ ان تینوں گاڑیوں میں کافی اسلحہ تھا۔ جو قابو کر لیا۔

”انہیں مسافر شاہ کے قہرے پر لے کر آؤ۔“ میں نے کہا اور ایک کار میں جا بیٹھا۔ سوئی بھی میرے ساتھ بیٹھنے لگی تو میں نے اسے روک دیا کہ وہ دوسری ایک کار میں گھر اماں کے پاس جائے وہ پریشان ہوگی۔ میں کار میں بیٹھا اور مسافر شاہ کے قہرے پر جا پہنچا۔ جہاں سنگھ کی بات درست تھی، سو میں نے اردو سنگھ کو کال کی، وہ سمجھ گیا اس نے کال جہاں کو ملا دی، تب میں نے اسے ساری صورت حال کے بارے میں بتا دیا۔

☆.....☆.....☆

جہاں فارم ہاؤس کے لاق میں جمال سے فون پر بات کر کے ایک کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اسے یہ خیال تو تھا کہ بھارتی سرکار کی ایجنسیاں انہیں کسی بھی وقت اپنی نگاہوں میں لے سکتی تھیں، لیکن یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح ایک دم سے گھیرے میں آجائیں گے۔ وہ جو کوئی بھی دشمن تھا، اس کی نگاہ ان سب پر تھی، جتنا اسے نظر میں رکھا ہوا تھا، اسی قدر جمال کو بھی گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ حالات جیسے بھی ہوں گے، اسی میں سے رستہ نکٹنے والا تھا۔ وہ افکار مرآت کے پہلے پہر ہی ان کے پاس سے چاچکا تھا۔ اس نے جو رپورٹ بلد یوسنگھ کو دی تھی، وہ ساری رات اسی پر کام کرتا رہا۔ کچھ دیر پہلے اس نے بلد یوسنگھ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا، وہ سو رہا تھا۔ اس لیے وہ بھی اطمینان سے باہر لان میں آ گیا تھا۔ لازماً اس نے کچھ طے کر لیا ہوگا، اسے بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا جو وہ یوں گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں تھا کہ اس کا سیل فون بجا۔ وہ فون کی کال تھی۔ اس نے اندر بلا لیا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لارنج میں ناشتہ لگا ہوا تھا۔ سبھی وہیں تھے۔ وہ بھی جا کر بیٹھ گیا۔ بڑے اطمینان سے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ چائے کنگ لیے صوفوں پر آن بیٹھے۔ ہر ایک کے دماغ میں تھا کہ دیکھیں بلد یوسنگھ کیا کہتا ہے۔ تبھی اس نے یہ تجسس ختم کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں اب ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ کیم جو اس رپورٹ میں دکھائی دے رہی ہے، بہت بڑی ہے، اس میں ہم یا تو سبھی یوں فنا ہو جائیں گے جیسے تھے ہی نہیں، یا پھر ان میں ہمارا شمار ہو جائے گا، جو کیم کھلانے والے

ہوتے ہیں۔“

”اوائے پہلیاں نہ ڈالو، سیدھی بات کرو۔“ وکرم سنگھ نے اکتائے ہوئے لہجے میں تیزی سے کہا۔

”تو سیدھی بات یہ ہے پیارے، یہ ایجنسیاں تو ہمیں چھوڑنے والی نہیں ہیں، انہوں نے ہمیں ہر حال میں گھیرنا ہے اور مارتا ہے۔ ابھی تک انہیں حتمی ثبوت نہیں ملے جس کی بنیاد پر وہ ہاتھ ڈال سکیں ہم پر، کیونکہ ابھی الیکشن ختم ہوا ہے اور رتن دیپ سنگھ جی کی پارٹی اکثریت میں ہے۔ ہمیں اس کا سہارا کہہ لو، یا مہلت۔ ہماری گیم ختم ہے۔ آج نہیں تو کل۔“

”تو پھر ہم مرجائیں؟“ وکرم سنگھ نے غصے میں کہا۔

”مریں تیرے دشمن یار۔“ یہ کہہ کر اس نے سانس لیا اور بولا۔ ”ہمیں ایک بار گم ہوا ہے، ایسے کہ جیسے ہم یہاں تھے ہی نہیں۔ اس وقت ہی سامنے آئیں جب ہم اس پوزیشن میں ہوں کہ ان ایجنسیوں کا سامنا کر سکیں۔“ اس نے قدرے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”مطلب میدان چھوڑ دیں۔“ سرجیت سنگھ نے کہا۔

”اس کے سوا صرف ایک آپشن ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا.....“ اسی نے پوچھا۔

”ہمیں اس کا سہارا لیتا پڑے گا، جو ان ایجنسیوں کو بھی آنکھیں دکھا سکے، اتنا طاقتور بندہ ہی ہمیں پناہ میں لے تو، ہم اپنی کاروائیاں جاری رکھ سکتے ہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے بتایا

”ایسا کون ہے؟“ سرجیت سنگھ نے پوچھا۔

”وہی جو یہاں پر موجود یہودی کا مخالف ہے۔ اب تک نجانے کیا سے کیا ہو جاتا اگر اس خطے میں طاقت کا توازن نہ ہوتا۔ یہ رب تعالیٰ کا بھی نظام ہے کہ اگر ایک طاقت سرائی ہو تو دوسری اس کے ساتھ ہی اٹھ جاتی ہے۔ یہی طاقت کا توازن ہے۔ اگر کوئی ایک طاقت بھی زیادہ یا کم ہوئی تو اسی سے بگاڑ یا اچھائی پیدا ہوتی ہے۔“ بلدیو سنگھ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”یار تو یہ لیکچر بازی چھوڑ اور سیدھے بتا کہ اب کرنا کیا ہے بس۔“ وکرم سنگھ نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”اچھا چلو تم لوگ نہیں سمجھنا چاہتے تو میں سیدھے یہ بتاتا ہوں کہ ہندو اور یہودی گٹھ جوڑ سے جوئی قوت سامنے آئی ہے، اس کے برابر ایک نئی قوت بھی جنم لے چکی ہے۔ وہ کون ہیں؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن وہ ہیں۔ ان کی رسائی کہاں تک ہے یہ بھی نہیں معلوم مگر جو لوگ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں، وہ اپنی کچھ تو حیثیت رکھتے ہوں گے۔ ہم اگر انہیں جوائن کر لیں تو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سب کی طرف دیکھا۔ تبھی جہاں سنگھ نے پوچھا۔

”ان کا کوئی اشارہ، کوئی ان کا اتہ پتہ؟“

”یہ رپورٹ سب کے سامنے ہے، جہاں تک میں سمجھا ہوں، اس رپورٹ میں ان کا تو کوئی ذکر نہیں ہے لیکن، ہندو یہودی لابی کے وہ لوگ ہیں جو ان کی ہٹ لسٹ پر ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم انہیں ختم کریں تو ہم ان تک پہنچ سکتے ہیں۔“ بلدیو سنگھ نے کہا۔

”انہیں کیسے پتہ ہوگا کہ یہ ہم نے ہی مارا ہے؟“ سرجیت سنگھ نے پوچھا تو وہ بولا۔

”میرے ذہن میں تو یہی ہے، اگر تم لوگوں کے دماغ میں کچھ مرید آئے تو ہم اس پر بھی بات کر سکتے ہیں۔“

”اوکے، ٹارگٹ کون کون ہیں؟“

”ایک بندہ تو یہیں جالندھر کا ہی ہے، ابھی ابھی ایم ایل اے بنا ہے، مزید یہ پڑھ لیں۔“ اس نے بتایا

”یہ تو شاخیں کاٹنے والی بات.....“ بچن کور نے کہنا چاہا تو وکرم سنگھ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”شاخیں ہی سہی، جڑ خود بخود دل جائیں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے رپورٹ پکڑ لی۔ تبھی جہاں سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں اوگی پنڈ جارا ہوں، جو بھی سمجھ میں آئے مجھے بتا دینا، میں آ جاؤں گا۔“

”اوکے۔“ بلدیو سنگھ نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا تھا جب تک بائیتا کور ٹھیک نہیں ہو جاتی، ان کے درمیان رہنا وقت کا ضیاع ہے۔ بلدیو سنگھ صرف ٹامک ٹونیاں مار رہا ہے۔ اسے کوئی راستہ سمجھائی نہیں دے رہا ہے۔ وہ اوگی پنڈ کی جانب چل دیا۔

☆.....☆.....☆

میں جس وقت مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس بنے ہوئے کمروں کے آگے پہنچا تو فرید بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے چار پائی بچھا دی تھی اور ان کے قریب ہی وہ چھ لوگ کھڑے تھے۔ میں کار سے اتر کر وہیں جا بیٹھا اور ان کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بھی میری طرف اسی نفرت سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے پکڑے ہوئے لوگ یاد آ گئے۔ میں نے دھیسے سے لہجے میں پوچھا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”سردار زریاب خان نے۔“ خلاف توقع ایک نوجوان نے طنزیہ لہجے میں بتایا

”کون ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”حیرت ہے، تم اسے نہیں جانتے ہو، پورا ملک انہیں جانتا ہے ان سے ڈرتا بھی ہے۔“ وہی نوجوان یوں بولا جیسے وہ میری عقل پر ماتم کر رہا ہو۔

”اس کا کوئی رابطہ نمبر ہے تمہارے پاس یا پھر مجھے تلاش کرنا پڑے گا؟“ میں نے اسی سکون سے پوچھا۔

”ہاں ہے، کرو رابطہ ان سے۔“ اس نے کہا اور فوراً ہی فون نمبر بتا دیا۔ چوہدری اشفاق اس کا نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ تصدیق کے بعد اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”جمال بات کر رہے ہو؟ اس نے تصدیق چاہی تو میں نے ہنکارا بھرا، تب وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”تم شاید مجھے نہیں جانتے، لیکن میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے تم اس زمین پر نہ رہو، بہت اودھم مچا لیا تم نے یہاں۔“

”اس زمین پر ہمیشہ کسی نے بھی نہیں رہنا، ہاں البتہ کوئی پہلے چلے جاتا اور کوئی بعد میں۔ اب پتہ نہیں تم پہلے جاؤ گے یا میں، یہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بولو، ان بے چاروں کو کیوں بھیجا تھا، خود کیوں نہیں آ گئے؟“

”ارے، تمہارے لیے یہی بہت ہے کیونکہ تمہارے لیے صرف دو ہی آپشن ہیں، یا تو اس ملک کی زمین کے نیچے دفن ہو جاؤ یا پھر یہ ملک چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ، میں تمہیں زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے دے سکتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں۔“ وہ انتہائی غرور سے بولا۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، لیکن تم نے اپنی موت پر خود ہی مہر لگا دی ہے۔ یا پھر کسی

نے تمہیں موت کی طرف دھکیل دیا ہے۔ چلو ان چوبیس گھنٹوں میں اگر تم ان چھ لوگوں کو واپس لے جا کر دکھا دو، تو میں اپنا آپ تمہارے حوالے کر دوں گا۔ ورنہ میں نے تمہیں تلاش تو کر ہی لیتا ہے۔“ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”ڈن ہو گیا۔ انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے چند لمحے فون کو دیکھا اور چوہدری اشفاق سے ارد گرد نگاہیں گھمائیں تاکہ اس کے بارے میں معلومات مل سکیں۔

دو تالی کے تربیت یافتہ لڑکے وہاں موجود تھے۔ وہ ان چھ کے بارے میں بے تاب تھے۔ تب میں نے ایک سے پوچھا۔

”کیا کریں ان کا، انہیں اب واپس لے کر جانا ہے انہوں نے، جنہوں نے ان لوگوں کو یہاں بھیجا تھا؟“

”اچھی بات ہے کہ وہ خود آجائیں۔“ وہ نوجوان بولا۔

”فی الحال ایسا کرو، ان کے ہاتھوں کو باندھ کر سیڑیوں سے باغیچہ دو، پھر بھاگتے ہوئے دو تین چکر اس میدان کے لگواؤں۔ چوبیس گھنٹے انہیں یہیں رکھنا ہے، میدان میں، میں بھی یہیں ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ ویسا ہی کرنے لگے۔ جو کوئی بھی ذرا سی مزاحمت کرتا، وہ لڑکے اسے سیدھا کر دیتے، یہاں تک کہ انہوں نے ان کو آگے لگا لیا۔ خود ایک کھلی جیب میں بیٹھ گئے اور انہیں بھگانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہی ان کا دم اکھڑنے لگا۔ ان میں جو پہلا گرا تو لڑکوں نے اسے اٹھا کر پھر آگے لگا لیا۔

میرے سامنے فرید کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اُویار فرید! ایسے کر یہاں پر جتنے لوگ ہیں، ان کے لنگر پانی کا بندوبست تم نے کرتا ہے۔ ہم سب کے اب ڈیرے یہیں پر ہیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے مودبانہ لہجے میں کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ ایسے میں چوہدری اشفاق کا فون بجنا تو اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ ارد گرد نگاہیں بولا۔

”یہ لاہور ہی کے نواحی علاقے سے کوئی کال کر رہا تھا۔ اس کی لوکیشن ابھی بھیج دیتا ہوں۔“

”مطلب وہ ہمیں خود دعوت دے رہا ہے کہ ہم اس تک پہنچیں۔“ میں خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوئی مہرہ ہی ہے، اس کے پیچھے کوئی ہے۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کر کے غائب ہو جانا چاہتا ہے۔“ اس نے اپنی رائے دی تو میں نے پوچھا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

میرے یوں پوچھنے پر اس نے اس رپورٹ کے بارے میں بتایا جو بلدیہی سٹنگ وغیرہ کے پاس تھی اور وہ اس پر بات کر چکے تھے۔

”مطلب کوئی قوت.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے تیزی سے کہا۔

”بہت احتیاط سے جمال، منظر کچھ اور ہے اور پس منظر کچھ اور ابھی کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ ہم سب اسی پر کام کر رہے ہیں۔ دو چار گھنٹے دو، ہم سب بات کریں، پھر کوئی حتمی نتیجہ نکالتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے ہاں کہہ دی، تب اس نے فون بند کر دیا۔

وہ میدان کا ابھی پورا چکر نہیں لگا پائے تھے۔ لیکن آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کیا تھا۔ کافی دور وہ مجھے نقطوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی ایک دم سے میرے دماغ میں خیال آیا، کہیں ان کے لوگ وہاں موجود نہ ہوں؟

ممکن ہے ان کے علاوہ بھی حملہ آوروں کا کوئی گروپ موجود ہو، ابھی کون سا پورا علاقہ چھان مارا ہے؟ یا یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ علاقے میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا حملہ آور موجود نہیں ہے۔ میں نے غور کیا اور پھر چوہدری اشفاق کو اس خدشے سے آگاہ کیا؟

”یہ میرے ذہن میں پہلے ہی سے تھا، میں نے پورے علاقے میں بندے پھیلادئیے ہیں۔ ہر جگہ یہ بات پہنچ گئی ہے کہ کوئی اجنبی آدمی دکھائی دے تو فوراً پتہ دیں۔ اگر کوئی ہوا تو سامنے آ جائے گا۔“

اس نے مجھے تفصیل بتائی تو میں مطمئن ہو گیا۔ میں چار پائی پر لیٹ کر ان حالات کو سوچنے لگا۔ خیال سنگھ اور ارد گرد سنگھ نے اب تک جو مجھے تفصیل بتائی تھی۔ میں نے اس پر غور کیا تو مجھے یہی لگا کہ اب تک وہ معاملہ اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچا، جو سندھپ کور اور سنیل ورما کے ساتھ چلا تھا۔ میرے خیال میں ابھی تک شاخص ہی کئی تھیں۔ وہ پودا جڑ سے نہیں اکھڑا تھا۔ یہ سارے لوگ مجھے ایک ہی طرح کی تربیت والے لگتے تھے۔ میں نے سوچ لیا کہ اب ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

میں سامنے سے آتے ہوئے ان بھاگتے ہوئے لوگوں دیکھتا رہا۔ ان کی بری حالت تھی۔ ان کا سانس اکھڑا ہوا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے یوں آ کر گرے جیسے ان میں جان ہی نہ رہی ہو۔ لڑکوں نے انہیں باندھ کر ایک کمرے میں دھکیل دیا۔ دو پہر ہو گئی تھی۔ میں وہیں درختوں کے نیچے چار پائی پر لیٹا ہوا تھا، وہیں میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ کھلی تو شام اتر رہی تھی۔ دن ابھی کھڑا تھا۔ وہاں فرید کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس سے وہاں کی دیرانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

”چوہدری اشفاق، سب کو لے کر خاموشی سے چلا گیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم اپنا خیال رکھنا۔ ہو سکے تو آج جلدی گاؤں چلے جانا۔“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھا اور حویلی کی طرف چل دیا۔

شام ہونے کو تھی جب میں حویلی پہنچا۔ میں لائن میں آ گیا۔ وہاں اماں نورنگر کی کچھ خواتین کے ساتھ موجود تھی۔ میرے بیٹھے ہی اماں نے کہا۔

”پتر! تیرے ساتھ جو حالات لگے ہوئے ہیں، وہ کب ختم ہوں، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں نے اپنا فرض نبھانا ہے۔“

”یہ کیا بات کر رہی ہیں اماں، میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”تمہاری اور سوئی کی شادی ابھی اور اسی وقت ہوگی، جاؤ نہا دو کر تیار ہو جاؤ۔ میں نے مولوی صاحب کو بلوایا ہے، ابھی نورنگر کے کچھ بزرگ بھی آجائیں گے۔ دیر مت کرو جاؤ۔“ اماں نے حکم دیا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب چلا گیا۔

مغرب کے بعد حویلی کافی زیادہ روشن تھی۔ لان میں نورنگر کے لوگ موجود تھے۔ اماں نے اپنے طور پر سارے انتظامات کروا لیے تھے۔ میں وہاں ان کے درمیان جا بیٹھا۔ میرے بیٹھے ہی مولوی صاحب نکاح پڑھانے لگے۔ خطبے کے بعد دعا مانگی گئی اور کھانا سرود کیا جانے لگا۔ وہاں ہر بندہ مصروف تھا سوائے میرے۔ اچانک مجھے فرید دکھائی دیا۔ میں نے اسے قریب بلا کر ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے بتا دیا کہ وہ کہاں پر ہیں۔ میں ان تک بھی کھانا پہنچانے کے بارے میں کہا۔

عشاء سے کافی بعد تک کہیں جا کر حویلی میں سناٹا چھا گیا۔ ایسے میں چوہدری اشفاق میرے پاس آ گیا۔ میرا فون

اس کے پاس تھا۔

”میں جان بوجھ کر اٹھا لایا تھا، تم ڈسٹرب نہ ہو۔“

”کوئی کال آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، سوائے اردن کے۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔“ اس نے دھمے سے لہجے میں بتایا

”کیا کہہ رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ وہ صبح بات کرے گا۔“ وہ اسی لہجے میں بولا۔

”اور وہ.....“ میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں دیکھ لوں گا۔ جاؤ بھابھی انتظار کر رہی ہوگی۔“

میں حویلی میں آیا تو اماں لاؤنچ میں ہی تھیں۔ ان کے دامن میں ایک سرخ رنگ کا ڈبہ تھا، جو عموماً زیور رکھنے کے کام آتا ہے۔ وہ بڑا پرانا تھا۔ انہوں نے وہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! یہ تیرے باپ نے کبھی مجھے دیا تھا۔ میں نے تو پہنا نہیں، ویسے کا دیا پڑا ہوا تھا۔ یہ لو اور اپنی بیوی کو تحفے میں دے دینا۔“ میں نے وہ ڈبہ پکڑ لیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”جاؤ، میں اب سونے جا رہی ہوں۔“

میرے لیے مخصوص کمرے میں بیڈ پر سوئی سرخ جوڑا پہنے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آہٹ پا کر وہ اٹھ گئی۔ مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ میں بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا تو سوئی جھکی اور میرے پاؤں سے جوتا اتارنے لگی۔ میں جھجکا تو وہ بولی۔

”مجھے خدمت سے مت روکیں، اب آپ میرے مجازی خدا ہو، اور آپ کو پتہ ہے کہ یہ شادی ہم نے محض رب کی رضا کے لیے کی ہے۔“ اس کے یوں کہنے پر میں رُک گیا۔ جب وہ بولی۔ ”آپ وضو کر لیں۔ ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز نفل پڑھ کر کریں گے۔ کیا خیال ہے۔“

”بہت نیک خیال ہے۔“ میں نے کہا اور وضو کرنے کے لیے اٹھ گیا۔

میری زندگی کی وہ اہم رات بیت گئی۔ صبح صادق سے پہلے ہم نہا چکے تھے۔ سوئی تہجد پڑھنے لگی اور میں اٹھ کر بالکنی میں آ گیا۔ میرے ذہن میں نورنگر کے حالات تھے۔ میں چوہدری اشفاق سے رابطہ چاہتا تھا تاکہ مجھے معلومات مل سکیں۔ میں بالکنی سے پلٹ کر کمرے میں چند لمحوں کا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

میں نیچے لاؤنچ میں آیا تو ٹھنک گیا۔ میرے سامنے چوہدری اشفاق کے ساتھ کرل سرفراز بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئے اور بازو پھیلاتے ہوئے خوشی سے بھرے لہجے میں بولے

”شادی مبارک ہو جمال۔“

”جی خیر مبارک۔“ میں بھی خوشگوار انداز میں بولا۔

”میں نے سر شام فون کیا تو چوہدری اشفاق نے فون رسبو کیا، تب مجھے پتہ چلا کہ تمہاری آج شادی ہے۔“ انہوں نے صوفی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”وہ دراصل اماں نے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے

”مجھے سب بتا دیا ہے چوہدری اشفاق نے۔“ انہوں نے کہا، تب تک میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”آپ نے فون کیا؟“ میں نے انہیں یاد دلایا تو وہ پرسکون سے لہجے میں بولے

”یہ تو تم پر اٹیک ہوا ہے، اور جن کے بندے اب تمہارے پاس ہیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بندے

تمہیں مارنے آئے تھے، یا جو بھی ان کے ہاتھ چڑھ جاتا، لیکن ایسا نہ ہو سکا، اس سے بھی انہیں فائدہ ملا ہے، وہ جان گئے ہیں کہ یہاں پر وہ اگر کارروائی کرنا بھی چاہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا۔“

”کیا انہیں ہمارے بارے میں پہلے نہیں پتہ تھا؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولے

”بالکل بھی نہیں، وہ محض تمہاری طاقت کا اندازہ ہی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خوف بھی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس گیم کے پیچھے جو بھی ماسٹر مائنڈ ہے، وہ بہت چالاک اور انتہائی اذیت پسند لگتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

”یہ حقیقت ہے کہ اس کا کوئی سراپہ ہمارے پاس نہیں ہے اب تک۔ اصل میں وہ کون ہے؟ اس بارے میں بھی ہم نہیں جانتے ہیں۔ یہ اگر چند اتفاقات نہ ہوتے تو شاید ہم اس کی درست سمت کا بھی اندازہ نہ لگا سکتے، میں نے لفظ اندازہ استعمال کیا ہے۔ اب یہی دیکھو، یہاں جو اس نے حملہ کر دیا ہے، وہ یہیں کے بندے استعمال کر کے، وہ مر بھی جاتے ہیں تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ بے چارے اس کے بارے میں جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہاں کا جو اس کا مقامی ایجنٹ ہے وہ بھی اس کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتا۔“

”مقامی ایجنٹ، مطلب، سردار زریاب خان؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ بولے

”ہاں وہی، اس نے یہ ذمہ داری لی تھی، اسے ہم نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ یہ ایک گروپ کے پیچھے تین مزید گروپ تھے اور انہوں نے حملہ کرنا تھا۔ سب کچھ ختم کرنے کے لیے، یہاں سے لوگوں کو قید کرنے کے لیے تاکہ بعد میں یہ دیکھ سکیں کہ تم کہاں پر ہو؟ یہ ان کی غلطی تھی یا انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا کہ انہوں نے جالندھر میں فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا، جس میں باغیتا کور زخمی ہو گئی۔ وہاں تمہارے شاہد ملے، تو یہ حیرت اور اس کی بازگشت مجھ تک پہنچ گئی، ہمارے ذرائع نے یہاں پر حملے کے بارے میں پورا پلان بتا دیا تو بچت ہو گئی ورنہ وہ اپنا کام کر چکے تھے، خیر! کیا تم وہاں پر گئے تھے، کیسے؟“

”انہیں، دھوکا ہوا ہے، یہ ان کی کوئی کارروائی ہوگی۔“ میں کرل سرفراز کے سامنے بالکل پہلو بچا گیا۔ وہ چند لمحوں کی طرف دیکھتے رہے، پھر بولے

”خیر! اب تک کے شاہد جو ہمیں ملے ہیں، ان سے یہی اندازہ ہے کہ یہ بھارتی اور یہودی گٹھ جوڑ ہے۔ صرف تصدیق باقی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی جڑیں بہت دور تک جائیں گی۔“

”ہمیں کرنا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہ صرف ان کا مقابلہ کرنا ہے، بلکہ خود کو محفوظ بھی کرنا ہے۔ میں صرف اس لیے یہاں تک آیا ہوں کہ تم تیار ہو یا ابھی چند دن.....“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے فوراً کہا۔

”دیکھو اگر تم چند دن یا جب تک تم چاہو اس گیم سے دور رہنا چاہتے ہو تو میں تمہارے لندن جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں، کینیڈا، جہاں بھی تم چاہو۔ تمہیں محفوظ کرنے کے بعد ہی ہم.....“ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے تیزی سے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میری بیوی میری راہ میں حائل نہیں ہے، بلکہ وہ میرے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے تیار ہے۔“

”یہ اچھی بات ہے،“ انہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا، پھر لمحہ بھر رُک کر بولے، ”یہ نورنگر، اب ایک مرکز ہوگا،

اس کی سیکورٹی کیسے اور کس حد تک ہوگی یہ تمہیں بعد میں پتہ چل جائے گا۔ یہاں سے تم نے اس ٹاسک کو پورا کرنا ہے۔ یہ تمہارے ذمے ہے۔“ انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔“ میں نے بلا تامل اسی ٹاسک کو قبول کر لیا۔ وہ چند لمحے بیٹھے کچھ سوچتے رہے، پھر اٹھتے ہوئے بولے

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی، میری طرف سے سوئی کو مبارک باد دے دیتا۔“

”آپ بیٹھیں، کم از کم ناشتہ تو کرتے جائیں۔“ میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولے

”وہ پتہ نہیں کہاں نصیب ہوگا۔ اللہ حافظ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیئے۔ میں ان کے ساتھ پورچ تک گیا، جہاں ان کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اگلے چند منٹ میں ان کی گاڑی گیٹ پار کر گئی تھی۔

اس وقت سورج نکل رہا تھا، جب بڑے میدان میں دیکیں پکنا شروع ہو گئی تھیں۔ چوہدری اشفاق نے یہی سوچا تھا کہ بجائے پورے علاقے کو یہاں بلانے کے علاقے میں ہر گاؤں اور بستی تک کھانا پہنچایا جائے، یہاں تک کہ ہر گھر میں کھانا پہنچ جائے۔

☆.....☆.....☆

جہاں سنگھ اپنے کمرے میں پڑا سو رہا تھا۔ صبح کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ ایسے میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری رنگ پر اس کی آنکھ کھل گئی اور تیسری پر اس نے فون سائیڈ ٹیبل سے اٹھالیا۔ وہ ارون سنگھ کی کال تھی۔

”ہاں بول ارون۔“ اس نے خمدار آواز دے کر کہا۔

”تم آج ہی کینیڈا کے لیے نکل آؤ۔ تمہارے لیے بھارت میں خطرہ ہے۔“ اس نے بتایا

”مطلب، کیسا خطرہ؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں نے نوٹن کور کو ابھی بتایا ہے، کچھ دیر بعد ان پر ایک بڑا چھاپہ پڑنے والا ہے، بھارتی ایجنسی ”را“ انہیں گرفتار کرنے والی ہے۔ ظاہر ہے وہ تم تک بھی پہنچیں گے یا پہنچ جانے والے ہوں گے۔“ اس نے بتایا

”اگر وہ پکڑنے والے ہیں تو وہ مجھے فلائی بھی نہیں کرنے دیں گے، ایئر پورٹ پر ہی دھر لیں گے۔“ جہاں سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اب وہاں سے کیسے نکلتا ہے، یہ سوچا جاسکتا ہے، لیکن اب نکلتا ہے، کوئی راستہ نہیں ہے۔ جمال پر حملہ ہوا تھا، اس نے حملہ آوروں کو گھر لیا ہے۔ وہ شک ان کا دور ہو گیا ہے کہ جمال بھارت میں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اب یہ ہوگا، کیسے نکلوں گا؟“ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب یہ مقامی حالات کو دیکھو کیا کرنا ہے۔ وہی کرو جو فوری طور پر ہو سکتا ہے۔“ اس نے بھی نہ سمجھ آنے والے انداز میں کہا۔

”وہ لوگ کہاں جائیں گے، مطلب بلد یوسنگھ وغیرہ۔“ اس نے پوچھا۔

”وہ رات کے نکل گئے ہیں، ان کے پاس ایسے ہی کسی وقت کے لیے تھائی لینڈ جانے کا آپشن موجود ہے۔ یہاں بس نوٹن کور ہے۔“ اس نے بتایا

”تو پھر میں کہیں نہیں جاؤں گا، میں یہ چند دن رتن دیپ سنگھ کی حویلی میں گزاروں گا۔ پھر دیکھتے ہیں۔“ جہاں سنگھ نے تیزی سے کہا اور بیڈ سے اٹھ گیا۔

”اوکے، جیسے تم مناسب سمجھو۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جہاں سنگھ نے تیزی سے الماری کھول کر اپنا بیگ اٹھایا، کار کی چابی لی اور نیچے ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر پریت کور کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ سامنے بیڈ پر وہ سوئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اسے اٹھانا چاہا، لیکن رک گیا۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔ سوتے ہوئے وہ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ بھاری پلکیں، تھکی چتون، نازک ہونٹ، اور..... تبھی ایک دم اسے حالات کی نزاکت کا احساس ہوا تو اس نے ہولے سے اس کا بازو ہلایا۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔ اسے یوں اپنے سامنے کھڑے پا کر حیرت سے بولی۔

”جی، خیر تو ہے نا؟“

”نہیں خیر نہیں ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ بولی۔

”مجھے فوری یہاں سے نکلتا ہے۔“ اس نے جواب دیا

”تو پھر.....“ وہ کہتے ہوئے رک گئی

”میں نکل رہا ہوں۔ جہاں بھی پہنچا تمہیں بتا دوں گا، میرا شام تک پتہ نہ چلے تو سمجھو ”را“ کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ پھر جو ہو سکے۔“ یہ کہتے ہوئے دھیرے سے پلٹنے لگا تو ہر پریت اسے اداس نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس نے مزید نہیں دیکھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

وہ سلطان پورہ روڈ پار کر کے سنگھیا ننگا دل سے ہوتا ہوتا ہوا دریائے ستلج پر پہنچا۔ وہاں سے سیدھا منڈی گوئند وال جا پہنچا۔ یہی روڈ سیدھا لے کر اس وقت وہ ترن تارن کے قریب تھا، جب سورج نمودار ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ قریب ہی کہیں سے ناشتہ کر لے۔ اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ شہر سے باہر ہی ایک ڈھابے پر اس نے کار روک دی۔ وہاں کافی سارے لوگ کھلے میں دھری چار پائیوں پر ہی بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ وہ بھی ان میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ناشتے کا آرڈر دیا اور ہر پریت کو فون کر دیا۔

”سناؤ، کوئی خیر خبر۔“

”اور تو کچھ نہیں انوجیت دیر کے پاس صبح سے چند لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہیں وہ وہی ہوں۔“ اس نے بتایا تو جہاں سنگھ نے تیزی سے کہا۔

”کوئی پتہ نہیں چلا۔“

”ابھی تک تو نہیں۔ وہ وہاں سے اٹھ کر ہی نہیں آیا۔“ اس نے بتایا تو اس نے کہا۔

”اچھا، چلو جیسے ہی کچھ پتہ چلے، مجھے بتانا، بلکہ انوجیت ہی سے کہنا کہ مجھے کال کر لے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ چار پائی پر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ وہ بڑے سکون سے کھا پی رہا تھا کہ انوجیت کا فون آ گیا۔

”اچھا ہوا تو نکل گیا، وہ لوگ تیرے لیے ہی آئے تھے، اسمبلی ممبر ہونے کی وجہ سے وہ گھر پر سیدھے چھاپے نہیں مار سکے، میں تو سمجھا تھا کہ تو اب تک گھر میں ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“ جہاں سنگھ نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ تو مجھے ہر پریت نے فون کر کے بتایا تو مجھے پتہ چلا، میں نے خود انہیں آفری کی کہ وہ پورا گھر دیکھ لیں، وہ کل کچھ دیر کے لیے آئے تھے، پھر کہیں چلے گئے ہیں۔“ انوجیت نے بتایا تو جہاں سنگھ نے کہا۔

”مگر وہ نہیں مانیں ہوں گے۔“

”اب مجھے نہیں پتہ، مگر کی تلاشی تو نہیں لی انہوں نے لیکن چلے گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا۔ تبھی اس کی نگاہ اس کی کار کی اوٹ میں کھڑے تین آدمیوں پر پڑی، جو وہاں پر کام کرنے والے ایک لڑکے سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ مسلسل نہ میں سر ہلا رہا تھا۔ جہاں فوراً سمجھ گیا کہ لوگ اس تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ بظاہر سکون سے اٹھا اور ہاتھ دھونے والے بین کی جانب بڑھا۔ وہ لڑکا، اس لڑکے کے پاس پہنچ چکا تھا، جس نے آرڈر سرور کیا تھا۔ اسی لمحے جہاں نے اپنی کمر کے ساتھ بندھے پہل کو محسوس کیا اور تیزی کے ساتھ ڈھابے کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہ وہاں سے نکلنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ دو لوگ اس کی طرف تیزی سے آ رہے تھے۔ جہاں کے پاس بھاگنے کا وقت نہیں تھا اور نہ ہی وہ پہل نکال پایا تھا کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ وہ دونوں کے قابو میں آچکا تھا، انہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑا تھا۔ تبھی اس نے پوری قوت سے زمین پر بیٹھے ہوئے جھٹکا دیا۔ ان کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ قلابازی کھانے والے انداز میں زمین پر لوٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ان کی گرفت سے آزاد تھا۔ تبھی وہ اس کی طرف بڑھے تو جہاں ان کی طرف بڑھ آیا، انہیں اپنے اندازے کی غلطی کا احساس تب ہوا، جب جہاں نے اپنی کہنیاں دونوں کے سینوں پر ماریں۔ وہ ایک دم سے اکٹھے ہی کو جھک گئے۔ جس طرح کہنیاں نیچے نکلیں اسی طرح اس نے منٹھیاں بھیج کر ان کے منہ پر پینچ مارے۔ اگرچہ وہ اتنے زور سے نہیں پڑے تھے لیکن اسی لمحے جہاں اگلے قدموں پیچھے ہٹا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اوٹ میں ہونے کی وجہ سے وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں چلا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا وہاں سے پارک کی ہوئی گاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ تبھی اس کے پیچھے سے فائر ہوا۔ جہاں چھپ چکا تھا، اس نے اپنا پہل نکال ہی لیا تھا لیکن اس نے فائر کرنے کی غلطی نہیں کی۔ وہاں ڈھابے پر ایک دم سے ہینکل بچ گئی تھی۔ اچانک تیسری طرف سے بھی فائر ہوا تو جہاں چوکتا ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نکلا جائے۔

سامنے سڑک رواں دواں تھی، اس کے سامنے ڈھابہ تھا، اس کے دائیں اور بائیں جانب خالی جگہ تھی۔ ڈھابے سے کافی پیچھے فصلیں تھیں۔ سڑک پر اس کے لیے کسی گاڑی سے کیا رکنا تھا، تب تک اس تک وہ لوگ پہنچ جاتے، ڈھابے کے پیچھے فصلوں تک جایا جاسکتا تھا، لیکن یہ کافی رسک والی بات تھی۔ لیکن وہاں سے بچ جانے کے کافی چانس تھے۔ اگر مقابلہ کرنے کی بھی کوئی صورت بنتی تو وہاں ہو سکتا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا اور تیزی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے دائیں جانب ایک ٹرک سٹارٹ ہوا۔ اس نے اُچھل کر دیکھا وہ خالی تھا، بلاشبہ وہ وہاں کی فائرنگ سے ڈر کر نکل رہا تھا۔ جہاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بھاگ کر اس میں جا بیٹھا۔ اس ٹرک والے نے بھی کافی تیزی دکھائی، اگلے چند منٹوں میں وہ سڑک پر تھا۔ وہ ٹرک بھاگا چلا جا رہا تھا۔

جہاں کے لیے یہ غنیمت تھا کہ اس کے پاس جو فون تھا وہ اسی خصوصی نوعیت کا تھا۔ اس نے فوراً ہی فون کو روک فون کیا، رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنی صورت حال کے بارے میں بتایا۔

”تم اسے کرو، جہاں بھی تم روکو، کوشش کرو کہ ترن تارن ہیں میں کہیں روکو، بلکہ یہیں رک جاؤ۔“ اس نے ابھتے ہوئے کہا۔

”وہ تو میں رک جاؤں گا، جہاں مجھے چھلانگ نہ لگانی پڑے۔“ جہاں نے کہا۔

”اس کے بعد مجھے کال کر کے بتانا کہ کہاں پر کھڑے ہو، مطلب لوکیشن، میں سنبھال لوں گی۔“ اس نے کہا تو

جہاں نے فون بند کر دیا۔

وہ ٹرک کے اندر ہی لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ شہر کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ ترن تارن بائی پاس پار کرتے ہی ذرا آگے جا کر ریلوے پھانک تھا۔ ٹرک وہاں رک گیا۔ وہ انتہائی تیزی سے کود گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا پھر ذرا آگے بڑھ کر اس نے فون کو فون کر دیا۔ اس نے اپنی لوکیشن بتائی۔ تبھی اس نے راہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ یہیں سے دائیں جانب ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس کے پاس پہنچو، وہاں سے تمہیں لے لیں گے۔ اس نے ایک نمبر بھی بھیج دینے کو کہا، جس پر رابطہ کرنا تھا۔ وہ دائیں جانب نیچے اتر کر ریلوے اسٹیشن کی جانب چل پڑا۔ وہ ابھی سو قدم بھی نہیں چلا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ ایک بھاری آواز نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

دس منٹ نہیں گزرے ہوں گے۔ وہ ابھی اسٹیشن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کا فون دوبارہ بجا۔ وہ لوگ اسے ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ چلنے والے ٹریک کی جانب بلا رہے تھے۔ وہ اس طرف چلا گیا۔ اسے ایک چمچاتی کار دکھائی دی۔ فون پر رابطے کی وجہ سے وہ جیسے ہی وہ کار کے قریب پہنچا، پچھلا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ آرام سے اس میں پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی کار چل دی۔

کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک ہی آدمی تھا جو اس کے ساتھ ہی پینجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ جہاں سگھ کے بیٹھے ہی وہ نرم سے لہجے میں بولا۔

”جہاں سگھ جی، کچھ دیر آرام کرنا چاہیں گے یا ہمیں بتائیں کہاں جانا ہے۔“

”دیکھو، میں تم لوگوں کی صوابدید پر ہوں، جو چاہیں اور جیسا چاہیں۔“ اس نے گول مول سا جواب دے دیا میری ابھی فون کوور سے بات ہوئی ہے، کہہ رہی تھی کہ ابھی میں تمہیں ادھر ہی رکھوں، شانتی ہوتے ہی پھر کچھ سوچنا ہوگا۔“ اس نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو ڈرائیور نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ آگے جا کر شہر کی طرف مڑ گئے۔ وہاں سے مختلف موڈ مڑتے ہوئے پرتاپ سینما کے پاس آ کر رک گئے۔

”لو جی بائی جی، آپ یہاں اتر جائیں۔ وہ سامنے اڈا بازار ہے، اس کی ٹکڑ پر ایک بندہ بیٹھا ہوا ہے، اس نے کیسری پکڑی اور نیلی شرٹ پہنی ہوئی ہے۔ وہ خود ہی پہچان لے گا۔ آ جاؤ ادھر۔“ اس نے کہا تو جہاں نے ایک لمحہ بھی تامل نہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ اس نے پلٹ کر بھی نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ اڈا بازار میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب پھلوں کی دوکان کے باہر بیچ پر ایک جوان سال لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جیسے اس کے ہی انتظار میں تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس سے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”ست سری اکال سردار جہاں سگھ جی۔“

”ست سراکال۔“

”مجھے نکا سگھ کہتے ہیں۔ آئیں پہلے گرد ترن تارن سگھ جی مہاراج کے گرد دروازہ چلیں، پھر باقی باتیں پھر کرتے ہیں۔“ اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے قدم بڑھا دیے۔

گرد دروازہ ترن تارن جی خاصہ بڑا اور ہر مندر صاحب کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ اس کا سرور بہت بڑا تھا۔ ایک طرف بڑا سارا مینار تھا۔ انہوں نے جاتے ہی ماتھا ٹکا، پھر کچھ دیر وہیں رہنے کے بعد برآمدے میں آ گئے۔

”نکا سگھ جی، نگر خانے چلو، بڑی بھوک لگی ہے۔“ جہاں نے بے تکلفانہ انداز میں کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”آؤ جی آؤ۔“

وہ دونوں لنگر خانے کی جانب بڑھ گئے۔

وہ پرشارے شکھ کے واپس برآمدے میں آگئے تھے۔ جہاں کا خیال تھا کہ یہاں بیٹھ کر نکا سنگھ سے باتیں کرے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا نکا سنگھ خود ہی بولا۔

”پہلے گھر چلتے ہیں جی، پھر وہیں باتیں ہوں گیں۔ آپ ادھر آرام بھی کر لیتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا تو دونوں گردوارہ سے باہر نکلتے چلے گئے۔ وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے مغربی جانب نیا بازار سے ذرا آگے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے آ کرے۔ وہ مکان کیا تھا، پرانے زمانے کی حویلی تھی۔ گہروے اور سفید رنگ سے سچی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چھوٹی ڈیوڑھی پار کر کے جب وہ اندر گئے تو صحن میں کافی فاصلے پر دو تین مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک لمحہ کو ان کی طرف متوجہ ہوئے پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ نکا سنگھ اسے لیے دوسری منزل پر آ گیا۔ باوجود حویلی پرانی ہونے کے وہاں پرائیر کنڈیشنڈ سے اس نے اعزازہ لگا لیا کہ وہاں جدید سہولتیں بھی میسر ہیں۔ بالکل سامنے کے کمرے میں جس کے ساتھ چھت پر میڑھیاں جاری تھیں، نکا سنگھ نے وہ دروازہ دھکیلا اور اندر چلا گیا۔ سامنے فرش پر نون کور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے سیلوئس شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ کمرہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ جاتے ہی گلے پر لیٹ گیا۔ نکا سنگھ واپس چلا گیا۔

”مجھے امید تھی کہ تم یہاں ہی ہوگی۔“ جہاں نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”آخر میں بھی تو تم لوگوں کے ساتھ ہوں، کیا وہ مجھے چھوڑ دیتے، پورے امرتسر میں وہ کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور سر ہانے پر کبھی رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔

”یہ اچانک ہو کیسے گیا؟“ جہاں نے پوچھا۔

”یہ اچانک نہیں جہاں، وہ کم از کم دو تین ماہ سے ہمارے پیچھے ہیں۔ وہ رامیش ورما کا، ڈیوڈ رامیشز کا قتل نہیں بھول پائے ہیں۔ ان کا بہت بڑا پلان ہم نے ختم کیا، اسے دنیا کے سامنے لے کر آئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تیار ہونے والی قوت کو وقت مل گیا۔“ نون کور نے بڑے سکون سے اسے بتایا تو اس نے پوچھا۔

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ خیر اب کیا کرتا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں، صرف انتظار۔ وہ سامنے فرج ہے، جو دل کرتا ہے کھاؤ پیو اور سو جاؤ۔ شام تک کوئی صورت حال واضح ہو جائے گی۔“ نون کور نے کہا اور سیدھی ہو کر یوں لیٹ گئی، جیسے اب وہ بات نہیں کرنا چاہتی ہو۔ جہاں اٹھا، اس نے فرج میں سے پانی پیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اسے ابھی اوگی پنڈ فون کرنا تھا۔ اس نے جگہ بتائے بغیر اپنے محفوظ ہونے کے بارے میں بتا دیا۔

☆.....☆.....☆

پورے علاقے میں کھانا پہنچانے کا ذمہ چوہدری اشفاق نے لیا تھا۔ دوپہر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں یہی سوچتا رہوں کہ اب آگے کرنا کیا ہے۔ اگر کرل سرفراز خود نہ آئے ہوتے تو شاید میں اس میں اتنی دلچسپی نہ لیتا۔ یہ معاملہ گہمیر تھا، اسی لیے وہ خود چل کر آئے۔ دوپہر کے بعد میں نے چوہدری اشفاق کو بتایا کہ میں مسافر شاہ کے کھڑے پر جانا چاہتا ہوں۔ وہ مصروف تھا، لہذا میں اکیلا ہی اس طرف کار لے کر نکل گیا۔

میں مسافر شاہ پہنچا تو وہاں خاموشی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہاں پر فرید بھی نہیں ہے۔ میں نے کار روکی اور نیچے اتار آیا۔ کمرے کے پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے چار پائی پڑی ہوئی تھی، میں اس پر جا کر لیٹ گیا۔ دور دور تک ہو کا عالم تھا۔ میں وہاں کافی دیر بیٹھا رہا۔ اچانک میری آنکھیں بند ہونے لگیں، جیسے مجھ پر غنودگی چھاری ہو۔ میں اپنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس لیے خود کو اس غنودگی کے سپرد کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد اندھیرا پھیل گیا۔ اس اندھیرے میں سے ایک منظر ابھر آیا۔

مجھے لگا میں ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے دائیں طرف کھڑکی ہے۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا باہر جھانک رہا ہوں۔ باہر دور تا حد نگاہ نیلا آسمان ہے۔ سفید بادل نیچے کہیں کہیں دکھائی دے رہے ہیں۔ دھوپ پھیلی ہوئی ہوئی ہے۔ دن خوب چمک رہا ہے۔ تھا لیکن سورج کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک جہاز یوں ڈولنے لگا جیسے اسے خود پر قابو نہ رہا ہو۔ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جانے لگا۔ میرے ارد گرد جیج پکارنے لگی۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ جہاز نیچے کیوں جا رہا ہے اسے نہیں جانا چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جہاز نیچے جا رہا تھا۔ مجھے یہ قطعاً خوف نہیں تھا کہ میں مارا جاؤں گا۔ مجھے بس جہاز گرنے کا دکھ ہو رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر جیسے ہی وہ زمین کے قریب آیا تو مجھے درختوں کے پتے کھڑکی میں دکھائی دیے۔ سرسبز و شاداب درختوں کے پتے۔ مجھے لگا جہاز جنگل میں گر رہا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے کھڑکی کے باہر نیلا رنگ چھا گیا۔ ویسا ہی نیلا رنگ جیسا پانی کا ہوتا ہے۔ مجھے سمجھ آ گیا کہ جہاز کسی سمندر میں گر رہی ہے اور ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے جہاز نیچے جا رہا تھا جہاز گھٹا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا وجود بالکل ختم ہو گیا اور میں کھلے سمندر میں آن پڑا۔ اس وقت مجھے دباؤ محسوس ہونے لگا۔ لیکن میں اوپر کی جانب اٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب میں نے پانی کی سطح پر آ کر سر نکالا تو وہ ایک چھوٹی سی نہر تھی۔ میرے ارد گرد لوگ خوف سے جیج رہے تھے، میں جلدی سے باہر نکلا، اور لوگوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر انہیں باہر نکالنے لگا۔ جو بھی نکلتا وہ کنارے پر لیٹ جاتا۔ یہاں تک کہ کوئی آدمی بھی نہیں رہا۔ سورج کی پش بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے جاہا کہ سب کو کنارے پر لے جاؤں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آندھی کے جیسی ہوا چلی۔ وہ مجھے اڑا کر ایک بڑے سارے میدان میں لگئی۔ میں نے جب سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے سامنے معبد نما ایک عمارت تھی۔ وہ کس مذہب کے لوگوں کا عبادت خانہ تھا، یہ مجھے نہیں پتہ تھا۔ بس مجھے لگا کہ یہ کسی کا معبد خانہ ہے۔ وہ لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ اس پر دیگر رنگوں کے علاوہ سرخ رنگ حاوی تھا۔ میں جیسے ٹرانس میں آ گیا۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ ہوا مجھے اس طرف دھکیلنے لگی۔ یہاں تک کہ میں اس عبادت خانے کے کاریڈور میں جا پہنچا۔ میں نے جیسے ہی وہاں قدم رکھے، ایک دم سے سرخ کی روشنی تھر تھرانے لگی، گر گڑا ہٹ ہوئی، دن میں بجلی چمکی اور شور ہونے لگا۔ اندر سے تیز آوازیں آنے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے یہ عبادت خانہ پھٹ جائے گا۔ میرے قدم اکھڑنے لگے تھے۔ میں مضبوطی سے کھڑا رہا۔ تبھی وہاں سکون ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری کیفیت بدلنے لگی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

میرے چاروں سناٹا تھا۔ مجھے وہ خواب پوری طرح یاد تھا۔ اس میں دیکھی جانے والی ہر شے یاد تھی۔ فطری طور پر میں اسے سمجھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ مجھے احساس تھا کہ دماغ کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں، وقت اور حالات ساری بات خود سمجھا دیں گے۔ میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو فرید کھڑا دکھائی دیا اور اس کے پاس ایک لمبے قد کا ادھیڑ عمر درویش کھڑا تھا۔ بھاری بھرکم وجود، سیاہ شلوار قمیص، پاؤں میں کھڑاویں، لمبے لمبے گیسو، تراشی ہوئی خوبصورت داڑھی، بھاری مونچھیں، سر پر دریشوں والی ٹوپی، کاندھے پر سفید چادر اور گلے میں مونکیے رنگ کا کینٹھا پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو فرید کہنے لگا۔

”آپ یہاں لینے ہوئے سو رہے تھے کہ یہ بابا یہاں آگیا۔ آپ سے ملنا چاہتا تھا، میں نے روک لیا۔“
میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لیوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس سے پہلے کہ میں پوچھتا کہ تم کون ہو، اس نے اپنے کاندھے سے سفید چادر اتاری اور اسے بچھانے کے انداز میں پھیلا لیا۔ ابھی اس سفید چادر میں مجھے روئی والے بابا جی کی چہرہ دکھائی دیا۔ یوں جیسے پردہ اسکرین پر کو فلم چل رہی ہو۔ وہ چادر چند لمحے ہی تکی تھی، پھر اس نے وہ چادر پلیٹ کر اپنے کاندھے پر رکھ لی۔ اب مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ تب میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہوئے، اسے چار پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ فرید سے پوچھا۔

”کھانا آیا ہے تمہارے پاس۔“

”جی، وافر مقدار میں، تاکہ یہاں آنے والا کوئی مسافر بھی کھا سکے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”تو لاؤ نا پھر یار، ہم کھائیں۔ ہم بھی مسافر ہی ہیں۔“ میں نے کہا تو فرید کمرؤں کی جانب پلٹ گیا۔ تب میں نے اس درویش کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کیسے؟“

”رات ڈیوٹی لگ گئی۔ اب پڑے ہیں یہاں جب تک کوئی نئی ڈیوٹی نہیں لگ جاتی۔“ وہ یوں بولا۔ جیسے وہ بہت خفت ہے۔

”بہت دیرانہ ہے یہاں۔“ میں نے کہا۔

”ہر دیرانہ آباد ہوتا ہے سائیں۔ اور آبادیاں ہی دیرانوں میں بدلتی ہیں۔ یہ سب انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہی ہیں نا۔“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا پھر خاموش ہو گیا۔ یہ خاموشی اس وقت تک رہی جب تک فرید کھانا نہیں لے آیا۔ اس نے درخت کے نیچے زمین پر کپڑا بچھا دیا تھا۔ ہم تینوں وہاں جا بیٹھے۔ کھانا کھا کر جب میں چار پائی کی جانب بڑھا تو وہی درویش اٹھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”اب تو جا۔ وہاں بڑے کام ہیں۔ ہمیں بھی تو اپنی ڈیوٹی کرنے دو۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ ذرا دور کھڑی کار کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے اب انہو نیاں حیرت زدہ نہیں کرتی تھیں۔

سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں نورنگر کے راستے پر آگیا۔ نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک چکر گاؤں کا لگا کر آؤں لیکن اس دن مناسب نہیں تھا۔ میں حویلی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے پورچ میں کار روکی تو لان میں مجھے پورا ٹولہ نظر آیا۔ گیت، سلمان، علی نواز، زویا، جنید، اکبر، مہوش اور فہیم ایک دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت خوشگوار احساس میرے اندر سرایت کر گیا، جب میں نے رونیت اور اردن سنگھ کو بھی ان کے ساتھ دیکھا۔ میں والہانہ انداز میں ان کی جانب بڑھا تو وہ سبھی اٹھ کر مجھ سے یوں چٹ گئے جیسے کرکٹ میں کسی کھلاڑی کو آؤٹ کرنے پر یا فٹ بال میں گول کرنے والے کھلاڑی کو چٹ جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک یہ جذبہ رہا، پھر باری باری سبھی مجھے ملے۔ تو میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

”یہ تم سب اچانک، بنا بتائے یہاں؟“ میں نے پوچھا تو گیت بولی۔

”تمہیں یقین ہوتا چاہئے تھا کہ ہم ایسے ہی آتے، یہ کیسے سمجھ لیا کہ کاسکیلے اکیلے شادی رچا کر بیٹھ جاؤ گے۔“
”میں نے اکیلے کہاں شادی کی ہے، سوئی کے ساتھ کی ہے۔“ میں نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

”بس بائیکاٹ کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔“ مہوش نے کہا تو حیدر بولا۔

”اے موٹا دماغ۔ اس خوشی کے موقع پر کسی پرانی فلم کی جذباتی ماں کی طرح عین خوشی کے موقع پر ایسے افسردہ ڈائلاگ مار کے ماحول خراب مت کرو۔“

”تم تو بہت باریک دماغ ہونا۔“ مہوش نے چوٹ کی تو میں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔

”یہ رونیت کور اور اردن سنگھ جی کب پہنچے ہیں؟“

”آج ہی۔ بہت دنوں سے نکلنے کو جی چاہ رہا تھا۔ سمجھ لیں تھک گئے تھے، تمہاری شادی ایک بہانہ بن گئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ ان سب کا ایک ہی جگہ ہونا، اور یوں اچانک آ جانا کسی مقصد کے بغیر نہیں تھا۔

”آؤ پھر اندر چلتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ایسے نہیں۔ ہم نے اماں جی کو بتا دیا ہے، سوئی کو دوبارہ دلہن بنائیں، آج رات ہلا گلا ہو گا۔ ڈھولک بجائی جائے گی۔ پھر کھانا ہو گا۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، انہیں نے تومان لیا ہے، اب تم بتاؤ۔“ زویا نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا

”یار جو مرضی کر لینا، مگر اندر تو چلو۔“ میرے کہنے پر وہ سبھی اٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

سورج غروب ہو چکا تھا۔ نو تن کور اور جہاں سنگھ باہر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ انہیں امر تر پہنچنا تھا۔ لیکن انہیں راستے میں پہلے ہی اتر جانا تھا۔ وہ بہت حد تک اپنا حلیہ بدل چکے تھے۔ ان کا لباس یوں تھا جیسے اکثر غیر ملکی بھارتیوں جیسا تھا۔ انہیں ایک گروپ کے ساتھ جانا تھا، انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ اس وقت انہیں نکا سنگھ کا انتظار تھا۔ جیسے ہی وہ آیا وہ چل پڑے۔ وہ نیا بازار سے سیدھے سرکلر روڈ تک پیدل ہی چلتے چلے گئے۔ جہاں ایک جگہ وہ رک گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ہائی ایس دین آگئی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ترن تارن کہیں بعد پیچھے رہ گیا۔ وہاں سے امر تر کا فاصلہ چالیس منٹ کا تھا۔ لیکن وٹکن والوں نے دربار صاحب جانا تھا جو وہاں سے تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وٹکن گل والی جانے والی ذیلی سڑک تک پہنچ گئی۔ وہ وہیں اتر گئے۔ چند قدم کے بعد انہیں ایک سیاہ رنگ کی کار دکھائی دی۔ وہی نمبر تھا جو انہیں بتایا گیا تھا۔ وہ اس میں بلا جھجک جا کر بیٹھ گئے۔ صرف ذرا نیور تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد ہی انہیں ڈیرہ بھگت جی گرو والی سے ذرا آگے ایک ڈیرے پر لے گیا۔

اس ڈیرے کے تین حصے تھے۔ سامنے دائیں اور بائیں۔ کار دائیں جانب والے پورشن میں جا رہی۔ وہ اترے تو ایک نوجوان آگے بڑھا اور انہیں لے کر اندر چلا گیا، جیسے ہی وہ اندر لاؤنچ میں پہنچے انہیں خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔ بلد یو، سر جیت اور وکرم کے ساتھ بچن کور اور کرن بھی وہیں موجود تھیں۔ انہیں یوں لگا جیسے پہلی بار مل رہے ہوں۔ ابھی وہ یہ پوچھ بھی نہیں پائے تھے کہ وہ یہاں کیسے پہنچے ہیں کہ وہی نوجوان آیا اور انہیں کھانے کے بارے میں بتا دیا کہ میز پر لگ چکا ہے۔

وہ سب کھانے کی میز تک پہنچے۔ سب بیٹھ گئے تھے کہ سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک بڑے ڈیل ڈول والا شخص اس میں سے برآمد ہوا اور ان کے قریب آ کر بولا۔

”ست سری اکال سب کو۔“

سبھی نے اس کے جواب میں فتح بلائی۔ تو وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں چن سنگھ، آپ سب کا میزبان۔ آپ سب پر شادے شکو جی، ساتھ ساتھ میں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ سب کھانا کھانے لگے وہ کہتا چلا گیا۔ ”کبھی میں بھی آپ لوگوں کی طرح میدان میں تھا۔ اب نہیں اس طرح میدان میں نہیں ہوں مگر اپنے دھرم کے لیے شہید ہونا تو ہر سکھ کا کام ہے ناجی۔“

”بالکل۔ یہ تو ہے۔“ بلد یو سنگھ نے کہا۔

”میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں۔ یہ جو سندھپ کور والا معاملہ بنا ہے، اس نے ہماری تو آنکھیں کھول دی ہیں۔ سکھی کو یہ لوگ دیمک کی طرح چاٹ جاتا چاہتے ہیں، لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ ان کی ہمت دیکھو، یہ سکھ سوچ ختم کرنے کے لیے جان لڑا رہے ہیں۔ خیر ایسا ہو تو نہیں سکتا اور نہ ہونے دیں گئے۔ تم سب کو یہاں اکٹھا کیوں کیا گیا؟ میں یہ بتانا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے، اگر کوئی کام تھا تو وہ وہیں جالندھر ہی میں بتا دیتے۔“ بلد یو سنگھ ہی نے کہا۔

”نہیں بائی جی، یہ بات نہیں، جیسے ہی سندھپ کور والا معاملہ سامنے آیا ہے، اسی وقت سکھ بڑوں میں باقاعدہ طے ہو گیا ہے کہ اب کرنا کیا ہے۔ اس کے لیے جتنے تیار ہو گئے ہیں۔ اب ہوا یہ ہے کہ جیسے ہی بڑوں میں طے ہوا، انہیں معلوم ہوا کہ یہ جو ٹانگ ہندو اور یہودی نے لیا ہوا ہے اس کے خلاف بھی قوت تیار ہے۔ تب یہ جتنے داری انہی کے ساتھ شامل ہو گئی ہے۔ اب جو بھی کرنا ہوتا ہے، وہیں سے حکم ملتا ہے۔ کس جتنے کے ذمے کیا ہے، یہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے آج صبح یہ ٹانگ دیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے، ہم نے سندھپ کور کو اسپتال میں سے نکال کر لانا ہے۔ وہ اب کافی حد تک ٹھیک ہے، لیکن اس کی بیماری کے نام پر تفتیش جاری ہے۔ وہ لوگ اس پر اعتبار کر ہی نہیں رہے ہیں۔ باقی چار سکھ، وہ ایک دوسرے جتنے کے ذمے ہے۔“ وہ انہیں سمجھانے والے انداز میں کہتا ہوا خاموش ہو گیا۔

”کب جانا ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”آج رات، جیسے ہی اسپتال کے اندر سے ہمیں اشارہ مل گیا، باقی ہم ابھی کچھ دیر بعد امر تر چلے جائیں گے۔“ چن سنگھ نے کہا۔

”اوکے، پلان کیا ہے۔“ جہاں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو وہ انہیں بتانے لگا۔

وہاں سے اسپتال زیادہ سے زیادہ بیس کلومیٹر تک تھا۔ ڈیرے کے باہر مختلف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جہاں سنگھ ایک بہوی بانیک پر بیٹھ گیا تو اس کے پیچھے بچن کور آن بیٹھی۔ وہ وہاں سے سیدھے گیٹ کی طرف نکلا اور پھر چلتا چلا گیا۔ باقی سب پلان کے مطابق آرہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ اسپتال کی پارکنگ تک جا پہنچے۔ اس نے بانیک پارکنگ میں نہیں لگائی، بلکہ کچھ دور ایک طرف لگا دی۔ بچن کور بانیک کے قریب ہی رک گئی۔ جہاں نے چابی اسے تھمائی اور خود اندر کی جانب بڑھ گیا۔

رات ہونے کی وجہ سے اسپتال میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکاؤنٹنگ آ جا رہے تھے۔ روشنی بھی کم تھی، زائد لائٹیں بجھا دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر اپنے اسٹاف سمیت راولڈ لگا چکا تھا۔ ایک طرح سے سکون تھا۔ سندھپ کور دودن تک انتہائی نگہداشت وارڈ میں رہی تھی۔ اس کے بعد اسے ایک پرائیوٹ کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا، جہاں اس کی نگرانی ہو رہی تھی۔ اس کے پاس کافی لوگ ہوتے تھے، لیکن اس وقت کمرے کے باہر دو گاڑی تھیں۔ اندر دو خواتین تھیں، جو نرس کے روپ میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھیں۔

وہ پرائیوٹ کمرے ”یو“ کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ سندھپ کور کو بائیں جانب والے دوسرے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ جہاں انٹرنس سے اندر داخل ہوا تو اسے وہ دونوں گاڑی دکھائی دیئے۔ وہ ایک بیچ پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے وکرم اور سرجیت کھڑے تھے۔ اور کرن کور جہاں کے پیچھے تھی۔ ان چاروں کا آپس میں جیسے ہی ”نائی اپ“ ہوا، وہ تینوں مختلف سمتوں سے غیر محسوس انداز میں آگے بڑھے۔ جہاں کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ وہ دونوں کاریڈور میں دائیں بائیں سے آرہے تھے۔ جس وقت ان دونوں نے اچانک ان گاڑیوں پر وار کیا، اسی لمحے وہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی کرن کور بھی اندر چلی گئی۔

سندھپ کور اسپتال کے لباس میں سامنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک نرس نما گاڑی اس کے دائیں جانب اور دوسری بائیں طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تینوں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے ہی جہاں کو انہوں نے دیکھا وہ چونکتے ہوئے ایک ساتھ تیزی سے بولیں۔

”کون ہو تم؟“

جہاں نے جواب نہیں دیا، بلکہ بڑھ کر ایک زوردار چھڑا اس کے منہ پر مار دیا، اسی لمحے کرن کور نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پمپل نکال لیے۔

”دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ۔ سر پہ ہاتھ رکھو۔ ذرا بھی حرکت کی تو گولی پیچھے میں اتر جائے گی۔“ جہاں نے یوں سرد لہجے میں کہا کہ وہ گاڑی فوراً ہی مڑ گئی۔ کرن کور بھی دوسری کو دیوار کے ساتھ لگا چکی تھی۔ جی جہاں نے سندھپ کور کہا۔

”چلو، اپنے پاؤں پر جاؤ گی یا تمہیں اٹھالیں۔“

”کون ہو تم لوگ؟“ اس نے سختی سے پوچھا۔

”میجر رائٹور، فرام را۔ اتنا کافی ہے یا مزید بتاؤں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھ دبا دی، سندھپ نے ایک بار اسے حیرت سے دیکھا اور پھر اس کا تپا ہوا چہرہ اڑھیل پڑ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”مجھے دیے ہی بلو الیا جاتا، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔“ سندھپ کور نے پھر سختی سے کہا تو کرن کور بولی۔

”اے لڑکی زیادہ بکواس نہ کر، ساری باتیں اوپر جا کر بتانا، ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا۔ چلیں سر۔“

اس کے یوں کہتے ہی جہاں نے سندھپ کو اٹھالیا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی۔ جہاں کی گرفت ایسی تھی کہ وہ خود کو اس سے چھڑانہ سکی۔ وہ اسے لے کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔ تھیں اسے پیچھے سے کرن کور کی آواز آئی۔

”کون یہاں آیا تھا، کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ صرف اپنے انچارج کو بتانا۔ ورنہ تم خود ذمہ دار ہوگی۔“

کمرے سے باہر والے گاڑی بے ہوش تھے۔ وکرم انٹرنس کے پاس تھا، سرجیت اور کرن نے کور لیا۔ جہاں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس دوران اس نے سندھپ کور کے کان میں کہا۔

”جمال! ہم اس کے ساتھی ہیں۔“ یہ سنتے ہی اس کا بدن ڈھیل پڑ گیا۔ اس نے سامنے کھڑی گاڑی میں سندھپ کور کو ڈال دیا۔ تب تک باقی بیٹھ گئے۔ اور گاڑی چل دی۔ وہاں جہاں اکیلارہ گیا۔ وہ تیزی سے اپنی بانیک کی طرف جا رہا تھا کہ بچن کور بانیک پر بیٹھ گئی اور اس نے اشارت کر لی۔ جب تک وہ پیچھے آ کر بیٹھا اس نے گھیر لگا دیا۔ گاڑی گیٹ کے پاس پہنچ گئی۔ اسی لمحے ایک فائر ہوا جو گاڑی میں لگا، اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے۔ جہاں نے مڑ کر دیکھا دو آدمی ہاتھوں میں پمپل لیے کار کو نشانہ بنا رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے کفرم کر لیا کہ گاڑی گیٹ پار کر گئی ہے وہ تیزی سے ایک کاری جانب بڑھے تاکہ اس کا پیچھا کیا جاسکے۔

”بچن، گیٹ سے باہر نکل کر رکتا۔“ جہاں نے تیزی سے کہا تو وہ بولی۔
”اوکے۔“

جیسے ہی وہ کاران کے قریب سے گذری، اس نے بچن سے کہا کہ ڈرائیور کے قریب لے جاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ بچن نے بایک ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب لگا دی۔ دوسرا اس کے ساتھ پنجر سیٹ پر تھا۔ دونوں کی پوری توجہ سامنے گاڑی کی طرف تھی۔ جہاں نے پہلا فائر ساتھ بیٹھے بندے پر، دوسرا ڈرائیور پر کیا۔ انکی کار لہرائی، تب تک جہاں نے ٹائر میں فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا

”بچن اب نکلو۔“ جہاں نے تیزی سے کہا تو بچن نے بایک کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی۔ ایک طے شدہ موڑ پر فلنک اسٹیشن کے پاس کار لیے فوٹن کو کھڑکی تھی۔ انہوں بایک وہیں چھوڑی اور کار میں جا بیٹھے۔ ان کے بیٹھے ہی فوٹن کو کور نے کہا۔

”اب ہم نے واپس گل والی نہیں جانا۔“

”کہاں جاتا ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”جیسے ہی وہ لوگ کسی ٹھکانے پر پہنچیں گے ہمیں پتہ چل جائے گا، تب تک ہمیں کچھ وقت گزارنا ہے۔“ وہ سکون سے بولی تو بچن کو کور نے کہا۔

”کسی جگہ رُک جایا جائے۔“

”بات تمہاری ٹھیک ہے۔“ فوٹن نے کہا اور سڑک کنارے جوس کے ٹھیلے کے پاس کار روک دی۔

جوس پیٹے ہوئے چندہ منٹ لگ گئے تھے، جب انہیں فون ملا۔ فوٹن کو پوری لوکیشن سمجھا دی گئی۔ وہ چل دی۔ وہ امرتسر کا نو تعمیر شدہ پوش علاقہ تھا۔ کافی خوبصورت بنگلے تھے۔ ایک بنگلے پر جا کر اس نے کال ملائی، اندر سے وکرم سنگھ باہر آیا۔ وہ پوریج تک کار لے گئے۔ تبھی سر جیت سنگھ بھی باہر آ گیا۔ اس نے فوٹن کو کور سے کہا۔

”لو جی، ہم سب جا رہے ہیں گل والی۔ وہیں رہیں گے۔ یہاں جہاں اور تم رہو گی۔ اب سنبھال لو سب۔“

وہ سب چلے گئے تو جہاں کے ساتھ فوٹن کو کور اس کمرے میں چلے گئے جہاں سندھپ کور پڑی ہوئی تھی۔ وہ جہاں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں جمال نے کیسے؟“

”ابھی تمہاری اس سے بات کرتا ہوں۔“ جہاں نے کہا اور اس کے قریب فون لے کر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں بعد فون لگ گیا تو جمال کی آواز ابھری، اس نے فون سندھپ کو تھما دیا۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ چند منٹ بعد اس نے فون واپس دے دیا۔ وہ جہاں کو گہری نگاہوں سے یوں دیکھ رہی تھی، جیسے وہ اس کا مسیحا ہو۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”پہلے تو مجھے یہ لگا تھا کہ ایک جگہ سے نکل کر کسی دوسری جگہ پھنس گئی ہوں لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں آزاد ہوں۔“ اس نے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

”اب تم آزاد ہی ہو۔“ فوٹن نے کہا۔

”سب سے پہلے تو میرے یہ کپڑے، ان سے نجات دلاؤ مجھے۔“ سندھپ کو کور نے کہا۔

”ٹھیک ہے، کچھ کرتے ہیں۔“ فوٹن کو کور نے کہا تو جہاں وہاں سے اٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

آدھی رات کے بعد جا کر کہیں سب کا ہلکا ختم ہوا۔ میں انہی کے ساتھ ان کی خوشی میں مصروف رہا۔ سوئی بھی وہیں رہی۔ جب سارے تھک گئے تو دوسروں کی طرح وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ایسے ہی وقت میں جہاں نے میری بات سندھپ کو کور سے کروائی۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب وہ محفوظ ہے۔ میں نے پھر بات کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں جب کمرے میں گیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ ہم سوئے نہیں یہاں تک کہ صبح صادق کا وقت ہو گیا۔ ہم نہا چکے تو سوئی اپنے معمولات میں مشغول ہو گئی اور میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ سلمان کا فون آ گیا۔ میں نے تیزی سے فون رسیو کیا

”خیر ہے سلمان؟“

”خیر ہی ہے۔ تم ایسے کرو، لاؤنچ میں آؤ۔ کسی سے ملنا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں تیزی سے لاؤنچ میں پہنچا تو وہاں پر اکیلا سلمان ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی باہر کی جانب لپکا۔ میں بھی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ کار میں بیٹھ چکا تھا، میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو وہ گیٹ کی جانب چل دیا۔

”کس سے ملنا ہے؟“ جیسے ہی اس نے گیٹ پار کیا تو میں نے پوچھا تب وہ اٹھتے ہوئے گہرے لہجے میں بولا۔

”جمال! یہ بندہ جو ابھی تمہیں ملنے آ رہا ہے، یہ اس پورے ریجن کا ہی نہیں پورے جنوبی ایشیا میں بہت اہم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ تم سے ایک دم کیوں ملنے آ رہا ہے۔ مجھے ابھی کرٹل سرفراز کا فون ملا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ آ رہا ہے۔“

”کہاں ملنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ نورنگر کے پاس جو کھلا میدان ہے نا، وہاں۔“ اس نے جواب دیا

”مطلب مسافر شاہ کے قہرے کے پاس۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”میں نہیں جانتا کہ وہ جگہ کون سی ہے، لیکن یہ دیکھو یہ نقشہ مجھے وہاں لے جائے گا۔“ اس نے کار کے ڈیش بورڈ کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں سرخ بتی جل بجھ رہی تھی اور پیلے رنگ کے نقشے پر نیلی لیکر بنی ہوئی تھی۔ جو سفر طے کر لیتے وہ سبز ہو جاتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔

وہ درست سمت پر جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم مسافر شاہ کے قہرے پر پہنچ گئے۔ جہاں مکمل اندھیرا تھا۔ لیکن درختوں اور کمرے کے پاس چوہدری اشفاق سمیت سارے کھڑے تھے۔ میں انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ فضا میں ہیلی کاپٹر کا شور ہونے لگا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ میدان میں کسی نے تیز روشنی سے اشارہ دینا شروع کر دیا۔ اس جگہ گرتی ہوئی روشنی میں مجھے یوں لگا جیسے وہاں پر بہت سارے لوگ کھڑے ہیں۔ ہیلی کاپٹر کی روشنی روشن ہو گئی۔ تب نیچے کئی سارے لوگ دکھائی دیے۔ وہ سب سیکورٹی پر تھے۔ ہیلی کاپٹر روشنی کی لکیر پر ہی اترنے لگا۔ وہ ہم سے کافی فاصلے پر اتر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ زمین کے ساتھ آ لگا۔ چند منٹ بعد ایک کار کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں اور وہ ہماری جانب بڑھنے لگیں۔ اسی وقت سلمان میرے قریب آیا اور ایک کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”مہمان کو اس طرف لے کر جانا ہے، وہیں بات کرنی ہے۔“

ایسے میں کار ہمارے پاس آ گئی۔ وہ اس میں سے نکلا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سارے سیکورٹی کے لوگ اس کے ارد گرد ہو گئے۔ وہ ایک بوڑھا سا آدمی تھا، لیکن اس کی گردن تہی ہوئی تھی اور وہ سیدھا یوں بڑھ رہا تھا جیسے کوئی پرانا

فوجی ہو۔ اس نے بلیک پتلون پر سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی، جس پر بلیک ٹوگی ہوئی تھی۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھ سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
”میں ہوں جمال۔“ میں نے کہا۔

”جانتا ہوں اور میں سکندر حیات، آئیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہم اس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ کمرے میں دو صوفے رکھے ہوئے تھے۔ یہ کسی نے رکھوا دیے ہوں گے۔ ہم دونوں آنے سے پہلے بیٹھ گئے۔ دھیمی روشنی ہونے کے باوجود اس کا چہرہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ سفید رنگ، لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ گہری چمکتی ہوئیں۔ بال سفید، کلین شیو۔ پہلی نگاہ میں لگا جیسے وہ کوئی بیوروکریٹ سفارت کار ہو۔
”مسٹر جمال۔! میں جو باتیں کرنے جا رہا ہوں، وہ فون پر بھی کہہ سکتا تھا، لیکن مجھے تم سے ملنے، تمہیں دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ میں تجھے بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ لیکن اس وقت میری توجہ تم پر زیادہ ہو گئی جب تم نے ممبئی میں اپنا وقت گزارا۔“

”جی۔“ میں اس سے زیادہ نہ کہہ پایا
”میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں جو بھی ٹاسک دیا جائے تم پورا کر لو گے۔ لیکن ہوا یہ کہ اب تک تمہیں کوئی بڑا ٹاسک دیا ہی نہیں گیا۔ خیر! اب وقت آ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں ٹاسک دوں، کچھ باتیں کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔“
یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”دیکھو۔! یہ جو ہمارا جنوبی ایشیا ہے، اس میں چند چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے پورے علاقے اور اس کے عوام کو اپنا مطمحہ بنایا ہوا ہے۔ وہ چند بڑے لوگوں کا مافیا ہے، جن کا مذہب اور ملت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کا مقصد صرف اور صرف طاقت ہے۔ جس سے وہ ہر شے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے جو بڑی بڑی خرابیاں جنم لے چلی ہیں، ان میں سب سے بڑی موروثی سیاست ہے۔ اگر اس خاندان کا کوئی بندہ نہیں ہے تو ان کی کٹھ پتلی ہوگی۔ اسی سے جرائم کی بھرمار ہے۔ اسی سے طبقاتی نظام ہے، غربت ہے۔ جہالت ہے، بیماری ہے۔ ان چند لوگوں نے اگر ضرورت محسوس کی ہے تو غیر ملک سے بھی مدد لے لیتے ہیں۔ وہ جو پرانا تقسیم کرو اور حکومت کرو والا فارمولا تھا، وہ اب نہیں، اب تو خوف پیدا کرو اور من مانی کرو والی صورت حال ہے۔ المیہ یہ ہے کہ خوف پیدا کرنے والی جس قوت کو انہوں نے استعمال کیا ہے وہ مذہب ہے اور مذہبی لوگ۔ جنوبی ایشیا کے کسی خطے کو اٹھا کر دیکھ لو، سب سے زیادہ خوف مذہب کی طرف سے ہے۔“

”جی یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے۔“ میں نے کہا۔
”کیسا المیہ ہے کہ اس خطے کے ہر ملک کے عوام اپنے ہی لوگوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس لڑائی میں اتنی توانائی خرچ ہو رہی ہے کہ اگر پانچ برس یہ لڑائی بند کر دی جائے تو ہر بندے کو زندگی گزارنے کی بہترین سہولیات میسر آ جائیں۔ خیر! ہم اپنے طور پر یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ ورنہ اب تک نجانے کیا سے کیا ہو جاتا۔“ اس نے اپنے لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

”جی، میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔“
”اب میں تمہیں بتاؤں۔ اس خطے میں ایسی توانائی آ جانے کے بعد طاقت کا توازن ہوا تو جنگ ہونا ناممکن ہو گیا۔ جو بھی لڑے گا، فنا سب نے ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں ان چند لوگوں کے مافیائے نئے نئے راستے نکال لیے ہیں۔ اسلحہ کی دوڑ لگا دی۔ کیوں نہیں معاہدہ کر لیتے کہ دس برس تک جنگ نہیں ہوگی بلکہ غربت کا خاتمہ کرنا ہے۔ نہیں کریں گے کیونکہ ان کی طاقت کم پڑ جائے گی۔ خیر اسے تم بہتر طور پر سمجھ لو گے۔ اس وقت تمہارے سامنے

پاک و ہند دو بڑے ملک ہیں۔ انہیں دیکھو۔ جیسی طاقت تم چاہو گے تمہیں ملتی رہے گی۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم نے طاقت کیسے حاصل کرنی ہے اور اس طاقت کو خرچ کہاں کرنا، مجھے پوری امید ہے کہ تم انسانیت کے لیے ہی کام کرو گے اور شیطانیات کو مات دو گے۔“ اس نے کہا۔

”انشا اللہ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا
”اوکے۔! اس وقت ہمارے اس خطے کو بہت بڑے خطرے نے آن گھیرا ہے۔ وہ خطرہ کیا ہے، کیا ہے؟ اس بارے میں صبح تمہیں ایک پولیس انسپکٹر ملے گا وہ بتائے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں بھی اٹھ گیا۔

”میں شاید تمہیں دوبارہ نہ ملوں لیکن اتنی طاقت مل جانے کے بعد تمہیں اس کا پاس کرنا، اسے استعمال کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کرنا ہوگا۔ اللہ حافظ۔“ اس نے کہا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکلا چلا گیا۔ وہ چند قدم پھلانگ کر کار میں جا بیٹھا۔ وہ کار سیدھ میں چل نکلی۔ پہلی کا پٹر شارٹ ہی تھا۔ کچھ ہی منٹ بعد وہ فلائی کرتے ہوئے نکلا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ایک دم۔ سے خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ پراسرار بندہ اپنا اثر چھوڑ گیا تھا۔ سلمان کان سے فون لگائے کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں پلٹا اور کار میں جا بیٹھا۔ میں اپنے بدن میں سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ اب شاید مجھے بہت کم وقت ملے۔ سلمان میرے ساتھ آ بیٹھا اور کار چلاتے ہوئے واپس حویلی چل دیا۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔
کچھ دیر بعد سبھی حویلی میں پہنچ گئے۔ ہر کوئی اس پر بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے کہا۔
”سب سو جاؤ۔ کچھ دیر آرام کرو۔ صبح بات ہوگی۔“

”اوکے۔“ سلمان نے کہا اور سبھی اٹھ گئے۔ میں حیران تھا کہ وہ سب اس قدر موذب کیسے ہو گئے ہیں۔ اس وقت سورج نکل آیا تھا، جب ہم سبھی ناشتے سے فارغ ہو گئے تھے۔ ناشتے پر ہی سلمان نے کہا۔
”ہم نے ایک کمرہ دیکھا ہے، اسے ہم کنٹرول روم بنائیں گے۔ آج ہم سب یہی کام کریں گے کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے سامان یہاں پہنچ گیا ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور ایک آدمی آپ سے ملنے کے لیے بیٹھا ہے۔ اسے ناشتہ کروا دیا ہے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ چوہدری اشفاق نے کہا تو مجھے یاد آیا، سکندر حیات نے کسی انسپکٹر سے ملنے کو کہا تھا۔

”بلاؤ اسے۔“ یہ کہہ کر میں سب کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم سب بھی بیٹھو اور اس کی بات سنو۔“
کچھ دیر بعد ایک خوب رو جوان بہترین سوٹ میں ملبوس اندر آیا اور بڑے اعتماد سے سلام کرتے ہوئے بولا۔
”جی میں مسٹر جمال سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“
”میں ہوں جمال بولو، کیا بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”سر! میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ مجھے اُس کی سمجھ نہیں آ رہی۔ مجھے کرنا کیا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ پھر مجھے یہ کہا گیا کہ میں آپ سے ملوں، یہ آپ سمجھ جائیں گے کہ مجھے آپ تک کس نے بھیجا ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد اور سکون سے کہا۔

”بات کیا ہے؟“ میں نے پھر پوچھا۔
”میں شروع سے اب تک کی تفصیل آپ کو سناؤں گا، اختصار میں شاید میں اپنی بات نہ کہہ پاؤں، اس کے لیے

تھوڑا وقت لگے گا۔“

ٹھیک ہے آپ کہیں، جتنا بھی وقت لگے۔“ میں نے کہا تو بتانے لگا۔

☆.....☆.....☆

سنسناتی ہوئی گولی میرے قریب سے گذر کر میرے پیچھے کھڑی کار میں جا گئی۔ اس سے جو آواز پیدا ہوئی، اس نے میرے اندر خطرناک صورت حال کا یقین بھر دیا۔ میں اگر وہیں کھڑا رہتا تو اگلے لمحے میرا بدن ان برقی ہوئی گولیوں سے چھلکتا ہو جانے والا تھا۔ یہ بہادری نہیں سراسر خودکشی تھی۔ میں نے یلکھت پیٹیرا بدلا اور کار کے پیچھے جا چھپا۔ اسی لمحے کئی گولیاں کار میں ٹھک ٹھک کے ساتھ پیوست ہو گئیں۔ میرے ساتھ میرا جونیئر پولیس آفیسر عدنان اپنا سروں رپو اور تانے ہوئے فائر کرنے کے لیے میرے حکم کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ تین کانشیل تھے جو اپنی گتیں تانے ہوئے تھے۔

میرے سامنے قدی شہر کی بل کھاتی ہوئی گلی تھی۔ دن کا پہلا پھر گذر چکا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ میں گلی کی کٹڑ پر کھڑا یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ فائر کہاں سے ہو رہے ہیں؟ گلی میں سارے ہی گھر پرانی طرز کے اور دو منزلہ تھے۔ کس کھڑکی یا دروازے سے یہ فائر ہوئے تھے، میں ایک دم سے کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کیونکہ میرے چھپتے ہی سامنے سے ہونے والی فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مجرم فظ میرا راستہ روکنا چاہتے ہیں۔ اسی لمحے میں نے ایک فائر کیا تو سامنے سے ایک دم کئی فائر ہوئے۔ جو کہ کار ہی میں لگے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر کوئی فائر ایسا لگ گیا، جس سے پٹرول کو آگ لگ گئی تو یہی کار بم کی مانند پھٹ جائے گی۔ صورت حال خاصی گھمبیر ہو گئی تھی اور میں ان مجرموں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دفعتاً عدنان کی سرسراہتی ہوئی آواز میرے عقب سے ابھری۔

”سر! یہ علاقہ خطرناک ہے، یہاں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ ہمیں مزید نفری چاہئے ہوگی۔“

عدنان نے تشویش بھرے لہجے میں مجھے مشورہ دیا تھا لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا، میں نے اس کا جواب دینے کی بجائے تیزی سے پوچھا۔

”اس گلی کی دوسری طرف کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں کھلتی بھی ہے یا بند ہے؟“

”کھلتی ہے، دوسری طرف ایک مصروف روڈ ہے۔ درمیان میں بھی کئی گلیاں ہیں اور.....“

وہ بتا رہا تھا مگر میں نے اس کی پوری بات نہیں سنی۔ میں نے تیزی سے کار کے اندر ہاتھ ڈالا اور وائر لیس پر صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ جلد ہی مجھے یہ کہا گیا کہ مزید نفری بھیجی جا رہی ہے، ڈٹے رہیں اور کسی بھی صورت میں مجرم وہاں سے بھاگنے نہ پائیں۔ جس طرح مجرم مجھے وہاں روکنا چاہتے تھے، میں بھی انہیں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ جس کے جواب میں بھی فائرنگ ہونے لگی۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ ہم زیادہ دیر تک یہ چاند ماری نہیں کر سکتے۔ سو ہم بڑی احتیاط سے اسلحہ خرچ کر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹہ پہلے میں اپنے تھانے میں تھا، جب مجھے وائر لیس پر اطلاع دی گئی کہ ہمارے علاقے میں سیاہ فور وکیل جیپ میں مجرم فرار ہو رہے ہیں، انہیں ہر حال میں روکنا ہے۔ فور وکیل کا نمبر اور لوکیشن بھی بتا دی گئی کہ وہ کہاں پر ہے۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تھانے سے اپنی کار ہی میں اپنے جونیئر آفیسر اور کانشیل کے ساتھ نکل پڑا تھا۔ سڑک تک آتے ہی وائر لیس کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ سیاہ فور وکیل کس طرف سے آرہی ہے۔ میں نے ایک مخصوص جگہ پر ٹاکا لگانے کا سوچا اور اس طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے کسی صورت بھی وہ فور وکیل نہیں نکل سکتی تھی۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا اور ٹاکا لگانے ہی والا تھا کہ وہ فور وکیل آتی ہوئی دکھائی دی۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ ہم

اسے ٹاکا لگا کر نہیں روک سکتے تھے۔ میں نے اپنی کار سڑک کے درمیان کر کے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ہمیں دیر ہو گئی تھی۔ وہ سپیڈ میں تھی اس لیے ہمارے قریب سے نکل گئی۔ اب سوائے تعاقب کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔ بیس پچیس منٹ کے تعاقب کے بعد وہ قدی شہر کی انجی گلیوں میں گھس گئی۔ میں ان کے پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس گلی میں گھس گئے۔ میں جیسے گلی میں داخل ہوا، وہاں پر سیاہ فور وکیل نہیں تھی۔ یوں جیسے وہ گلی اس فور وکیل کو نکل گئی ہو۔ اتنی جلدی وہ فور وکیل گلی پار نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسی گلی میں گھسے ہوئے ہیں۔ ہم وہاں گلی کی کٹڑ پر رک گئے۔ اس وقت میں کار سے اتر کر اطراف کا جائزہ لینے لگا تھا کہ ایک دم سے فائرنگ ہونے لگی اور مجھے وہاں چھپنا پڑا تھا۔ تبھی مجھے یقین ہو گیا کہ مجرم یہیں کہیں ہیں۔ میں اگر کوشش کروں تو انہیں پکڑ سکتا ہوں۔

میں نفری کا انتظار کر رہا تھا، پندرہ منٹ کے اندر اندر اس پورے علاقے کو گھیر لیا گیا۔ اس گلی کی دوسری جانب انسپٹر دلشاد آگیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بھاری نفری تھی۔ ہم دونوں کے درمیان رابطہ ہو گیا تھا۔ اس وقت وائر لیس اور انسپٹر دلشاد سے جو معلومات ملیں، اس کے مطابق ہمارے مطلوبہ مجرم کسی اہم شخص کو ایئر پورٹ سے اغوا کر کے بھاگے تھے۔ ایک طرح سے اس علاقے میں کر فیو لگا دیا گیا۔ گھر گھر تلاشی شروع ہو گئی۔ اسی دوران پتہ چلا کہ اس گلی ہی میں ایک ذیلی گلی تھی، جو دائیں طرف کھلتی تھی۔ ایک فور وکیل اس میں سے آسانی کے ساتھ جا سکتی تھی۔ میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ اسی گلی میں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

”لیکن، جمال یہ سوچو کہ مجرموں نے کہاں سے فائر کیا اور کیوں کیا؟ وہ جیپ یہاں سے نکل کر کہاں گئی؟“ انسپٹر دلشاد بھی وہی سوچ رہا تھا، جو سوچ مجھے جھین دے رہی تھی۔ تبھی میں کہا۔

”ان سوالوں کے جواب تو وہی دے سکتے ہیں یا پھر یہاں سے تلاشی کے دوران کوئی اشارہ مل جائے۔“

”ٹھیک ہے یہاں کی تلاشی کے بعد ہم بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور پوری نفری لگا دی۔ ہم نے اندازے کے مطابق تلاشی شروع کر دی۔

میں ایک گھر میں گھسا تو ڈیوڑھی کے بعد چھوٹا سامن تھا۔ سامنے تخت پر ایک ادیز عمر خاتون اور اسی کی جتنی عمر والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ انہی کے پاس تخت پوش پر ایک ادیز عمر شخص آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ جس کے پاس ایک نوجوان لڑکی پریشانی کے عالم میں بھی ہمیں دیکھتی اور کبھی اس بوڑھے شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی بات کرتا۔ میرے ساتھ آئے لوگ بیڑھیوں سے اوپر چلے گئے۔ میرے سامنے موجود وہ بوڑھے اور نوجوان لڑکی مجھے خوف زدہ انداز میں میری طرف دیکھے چلے جا رہے تھے۔ چند لوگ اندرونی کمروں میں گھس گئے۔ تبھی اس نوجوان لڑکی نے بڑی لجالت سے کہا۔

”انسپٹر پلیز، میرے نانا کو اس وقت اسپتال پہنچانا بہت ضروری ہے۔ میں انہیں لے کر نکل رہی تھی کہ ہماری چھت پر فائرنگ ہونے لگی۔ ان کی حالت مزید خراب ہو گئی ہے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچانا بہت ضروری ہے، ورنہ.....“

بوڑھے کا رنگ تانے کے جیسا تھا، جیسا اکثر ان یورپین کا ہوتا ہے جو گرم ممالک میں زیادہ رہے ہوں۔ اس بوڑھے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی سوال کرتا، میرا ایک ماتحت تیزی سے نیچے آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ اوپر کے ایک کمرے میں گولیوں کے خول ملے ہیں۔ بلاشبہ فائرنگ یہاں سے کی گئی تھی۔ میں تیزی سے اوپر گیا۔ وہاں کافی سارے خول پڑے تھے۔ انہیں قبضے میں لے لیا گیا۔ میں

نے انسپکٹر دلشاد کو فون کر کے بتایا تو اس نے کہا۔

”میں بالکل تمہارے سامنے والے گھر میں ہوں۔ یہاں بھی ایک کمرے میں سے اسی طرح خول پڑے ہوئے ملے ہیں۔ یہاں سے بھی فائرنگ کی گئی ہے۔“

میں نے آئے تو وہ لڑکی اضطرابی انداز میں میری طرف لپکی اور پھر سے کہا۔

”انسپکٹر، میرے نانا کو اسپتال لے جانا ہے۔ پلیز.....“

”ٹھیک ہے لے جاؤ۔ مگر لے جاؤ گی کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی ٹیکسی لے کر آتی ہوں۔“ اس نے گھبراتے ہوئے کہا تو میں نے اس کے ساتھ ایک کانشیل کو بھیج دیا۔

میں اس گھر سے باہر نکل کر سامنے کا گھر دیکھنے نکلا تھا کہ دائرے میں پر یہ اطلاع سننے کو ملی کہ شہر کے دوسرے علاقے میں ایک سیاہ فور و ہیل جیپ ملی ہے، جس میں ایک بوڑھا بے ہوش ملا ہے۔

”شاید وہی ہو؟ مجرم اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں؟“ انسپکٹر دلشاد نے اپنی رائے دی۔

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے کہا تو اسی وقت ایک دوسری اطلاع سننے کو ملی کہ جس علاقے میں ہم گھرے

تھے، وہیں قریب ہی ایک سیاہ رنگ کی فور و ہیل جیپ دھماکے سے بعد جل رہی تھی۔ ہمیں فوراً وہاں پہنچنے کو کہا گیا۔

میں اپنے ساتھ نفری کو لے کر تیزی سے اپنی زخم خوردہ کار میں اس جانب بڑھا تا کہ موقع پر جا سکوں۔

میں موقع پر پہنچا تو وہ جیپ جل چکی تھی۔ سڑک کے ایک طرف خالی جگہ پر وہ پارک کی گئی تھی۔ اس کے آس

پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اسے جلانے کے لیے ہلکا بم استعمال کیا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مجرموں نے جان

بوجھ کر اس فور و ہیل کو جلایا ہے۔ میں نے کوشش کر کے اس کا نمبر پڑھ لیا۔ یہ وہی فور و ہیل تھی، جس کا تعاقب کرتے

ہوئے ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں ابھی اس جیپ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسی طرح کی اطلاع سننے کو ملی کہ ایک سیاہ رنگ کی

فور و ہیل جیپ شہر کے تیسرے کونے میں جل کر خاکستر ہو گئی ہے۔ اس اطلاع نے ایک دم سے سنسنی پھیلا دی۔ کوئی

پولیس سے کھیل رہا تھا۔ ایسا کر کے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟ یہی وہ سوال تھا جو میرے ذہن میں نہیں آیا،

بلکہ سبھی ایسا سوچ رہے تھے۔

اس وقت میں اپنے تھانے کی جانب لوٹ رہا تھا۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ ناکامی اور لا حاصل مشقت نے مجھے توڑ کر

رکھ دیا تھا۔ میں اپنے اندر اٹھتے ہوئے غصے کو محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے اس وقت تک مجھے پوری واردات کا بھی علم

نہیں تھا۔ میں ابھی راستے ہی تھا کہ مجھے کال موصول ہوئی کہ میں فوری طور پر ایس پی صاحب کے آفس پہنچوں،

وہاں ایک ہنگامی میٹنگ ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں کیا کہا جائے گا۔ ہماری ناکامی پر لمبی جھجھائی پلائی جائے گی، فوری

مجرم پیش کرنے کا حکم ہوگا اور ہو سکتا ہے کوئی ایک آدھ معطل بھی ہو جائے۔ نا چاہتے ہوئے بھی مجھے وہاں جانا تھا۔

آخر میں پولیس کا ملازم تھا۔

ایس پی آفس کے میٹنگ ہال میں ڈی ایس پی سمیت میری طرح دو انسپکٹر کھڑے تھے۔ ایس پی صاحب نے

سب کی کاروائی سن کر ہماری طرف دیکھا اور پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔

”یہ اغوا، کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ جو شخص اغوا ہوا ہے، وہ عالمی سطح کا ایک پاکستانی سائنسدان ہے۔ اس کا نام

حسن رضوی ہے۔ وہ بہت عرصہ پہلے لندن چلا گیا تھا اور وہیں رہائش پذیر تھا۔ آج صبح نو بجے کے بعد جب وہ

برطانیہ سے یہاں پہنچا تو ائر پورٹ کے پارکنگ ایریا سے چند نامعلوم افراد نے اسے اغوا کر لیا۔ حسن رضوی نے کافی

مذاہمت کی، اس پر وہاں کی سیکورٹی والوں نے اس اغوا کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن اغوا کرنے والے پوری

پلاننگ کے ساتھ آئے تھے۔ وہ ٹین گروپ میں تھے۔ انہوں نے ایک چھٹی ریاہ فور و ہیل جیپ میں استعمال کی ہیں۔ ائر

پورٹ ہی سے انہوں نے تینوں جیپوں کو مختلف راستے پر ڈال دیا۔ اس وقت چھٹی ریاہ چل سکا کہ حسن رضوی کو کس

جیپ میں لے جایا جا رہا تھا۔ اسی دوران پولیس کو اطلاع دی گئی۔ ان تینوں کا تعاقب کیا گیا۔ آخر کار دو جیپیں جل کر

خاکستر ہو گئیں اور تیسری میں ایک بوڑھا پایا گیا۔ جو ہر حال حسن رضوی نہیں تھا، وہ انہوں نے دھوکا دینے کے لیے

اسے اغوا کیا ہوا تھا۔“

”سر ہم نے پوری کوشش کی، لیکن ہم بہت جلد انہیں پکڑ لیں گے۔“ ڈی ایس پی نے مودب لہجے میں رٹا لٹایا

بیان دے دیا۔

”نہیں شعیب، یہ ایسے نہیں چلے گا۔ یہ معاملہ بڑا گھمبیر ہے“ ایس پی نے یوں کہا، جیسے وہ خود بھی خوف زدہ ہو

گیا ہو۔

”ایسی کیا بات ہے سر؟“ ڈی ایس پی شعیب نے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو ایس پی تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”یہ خبر میڈیا کے ہاتھ لگ گئی ہے اور ہم نے اسی بوڑھے کی وجہ سے میڈیا سے یہ کہا ہے کہ ہم نے حسن رضوی کو

بازیاب کر لیا ہے اور وہ ہماری حفاظت میں ہے۔ جب تک مجرم نہیں پکڑے جاتے ہم انہیں منظر عام پر نہیں لائیں

گے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ حسن رضوی ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور اگر یہ خبر میڈیا کے ہاتھ لگ گئی تو یہ معاملہ یہاں تک

نہیں رہے گا، عالمی سطح پر پہنچ جائے گا۔ اگر تم لوگ یہی چاہتے ہو کہ ہماری نوکریاں داؤ پر نہ لگیں، اسے ہر حال میں

بازیاب کرنا ہوگا۔“

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں سر۔“ ڈی ایس پی نے پھر یقین دلایا

”چوتیس گھنٹے ہیں تمہارے پاس، اس کے لیے تمہیں جیسے بھی کرنا پڑے، کرو، اسے بازیاب کرو۔“ ایس پی نے

کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

”یہ ذمہ داری اب تم تینوں پر ہے، ہمارے پاس حسن رضوی کی اس تصویر کے علاوہ کوئی سراغ نہیں ہے۔“ یہ کہہ

کر ڈی ایس پی شعیب نے ہمارے سامنے ایک تصویر رکھ دی۔ وہ تصویر پہلے انسپکٹر دلشاد نے غور سے دیکھی، پھر

انسپکٹر ظفر نے اور آخر میں جب وہ میری نگاہوں کے سامنے آئی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

یہ تو وہی بوڑھا تھا، جسے وہ نوجوان لڑکی اسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ تصویر اور اس بوڑھے میں فرق اتنا تھا کہ جس

بیابوڑھے کو میں نے دیکھا تھا، وہ کافی حد تک کم لایا ہوا اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ یک بارگی میں نے یہ بات ان

سب سے شیئر کرنا چاہی، پھر اگلی ہی لمحے مجھے عقل آ گئی۔ یہ بات میری شرمندگی کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ مجھ

پر لعنت ملامت کی وجہ بھی بن سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے دھوکا ہو رہا ہو۔ میں وہ بات ہی پی گیا۔ مجھے اپنے بے

وقوف بن جانے پر دکھ کے ساتھ صدمہ بھی ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں، انسپکٹر دلشاد اور انسپکٹر ظفر، تینوں پلان کے لیے ایک کمرے میں جا بیٹھے۔ پھر اس کے بعد

ہمیں ڈی ایس پی سے ملنا تھا۔

میں نے اپنی کارگیرانہ میں بھیج کر اپنے ایک دوست کی کار مستعار مانگ لی۔ اس میں اپنے جونیئر اور دو کانشیل

کو ساتھ لے کر پھر سے قدیمی شہر کی اسی گلی میں جا پہنچا۔ میری توقع کے مطابق قدیمی شہر کی اس میڑھی میڑھی گلی کے

اسی پرانے مکان میں کوئی نہیں تھا۔ اسے تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس پر بس نہیں کیا۔ ایک دوسرے گھر سے اُس گھر

میں اتر کر کونہ کونہ چھان مارا۔ گھر میں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ میں نے وہاں سامان کی تلاشی بھی لی، دو گھنٹے تک

ٹامک ٹوئیاں مارتے رہنے کے بعد کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا تو میں نے واپسی کا قصد کیا۔ بلاشبہ وہ اتنے وقت تک کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔

اس وقت دن کے تین بج چکے تھے۔ بھوک سے برا حال ہو رہا تھا، میں نے ناشتے میں چائے کا کپ لیا تھا۔ سوچا تھا کہ تھانے جا کر ڈٹ کے ناشتہ کروں گا مگر میری سوچ دھری رہ گئی اور یہ معاملہ گلے پڑ گیا۔ میں نے ایک ریستوران کے پارکنگ میں کار روکی اور اس کے ہال میں داخل ہو گیا تاکہ کچھ کھا پی کر دوبارہ سوچنے کے قابل ہو سکوں۔ میں نے ایک پرسکون گوشے کا انتخاب کیا اور اس کی جانب بڑھ گیا۔ میں وہاں بیٹھا ہی تھا کہ ویٹر آ گیا۔ میں نے کھانے کا آرڈر دیا اور اسی کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی دوران میرا سیل فون بج اٹھا۔ ابجی نمبر میرے فون کی اسکرین پر روشن تھے۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے نسوانی آواز میں بڑی تمیز سے میرے بارے میں پوچھا گیا۔

”آپ انسپٹر جمال بات کر رہے ہیں؟“

”میں ہی ہوں، آپ کون؟“ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”دبی، جس نے اپنے نانا کو اسپتال لے جانے کی اجازت مانگی تھی۔ سوری، میں نے آپ کو دھوکا دیا۔“ اس نے دبے ہوئے لہجے میں بات کی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔

”دھوکا تو خیر دیا، لیکن اب مجھے کال کیوں کی؟“

”دیکھیں، آپ نے جو مجھے نانا سمیت جانے کی اجازت دی، میں جانتی ہوں کہ وہ آپ کی خالص ہمدردی کی وجہ سے تھا اور میری مجبوری تھی کہ مجھے وہاں سے نکلنا تھا۔ آپ سختی کر سکتے تھے۔ مجھے روک سکتے تھے۔ میں آپ سے سوری کرنا چاہتی تھی، اس لیے کال کی اور.....“ اس نے کہتے ہوئے یوں بات روکی جیسے وہ مزید کچھ کہنا چاہتی ہو۔

”سوری، کیا ضرورت تھی؟“ میں نے طنزیہ لہجے کو باوجود کوشش کے نہ روک پایا

”میں نہیں چاہتی کہ آپ کا یہ اچھا پن ختم ہو جائے اور میرا دھوکہ کسی ضرورت مند کے آڑے آ جائے۔“ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

”کوئی مجرم اتنا شریف بھی ہوگا، یہ میں نے پہلی بار دیکھا ہے، اوہ نہیں سوری، سنا ہے۔“ میں نے پھر اسی طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں مجرم نہیں ہوں مسٹر جمال۔“ اس نے ایک دم سختی سے کہا، پھر چند لمحے ٹھہر کر نرم لہجے میں بولی۔ ”یہ وقت آنے پر پتہ چل جائے گا۔ اور دوسری بات غور سے سن لو، تم لوگ جتنی بھی کوشش کر لو، جب تک ہم نہیں چاہیں گے، تم لوگ ہم تک نہیں پہنچ سکتے ہو۔ کم از کم دو دن سے پہلے تک تو نہیں۔ اس کے بعد ہم منظر عام پر آ جائیں گے۔“

”یا تو تم بہت بھولی ہو یا پھر بہت احمق، میں تمہیں کل اس وقت سے پہلے تک اپنے سامنے لے آؤں گا۔“ میں نے اسے چیلنج دیتے ہوئے کہا

”بھول ہے تمہاری انسپکٹر اور میں تمہارے وقت دینے پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ تمہیں پولیس میں نہیں، کسی این جی او میں کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت تم مجھے بھولے اور احمق لگ رہے ہو۔ یہ یاد رکھنا۔“ اس نے کہا اور کال ڈراپ ہو گئی۔

میں سیل فون کو گھورنے لگا۔ اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ جسے میں نے بڑے تحمل سے سن لیا۔ غصہ کرنے کا یا جھنجھلائے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں سیل فون ایک جانب رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا وہ چاہتی ہے؟ یہ کہ ہم اس کے

پیچھے آئیں، یا وہ اس لیے اتنی با اعتماد ہے کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یا وہ ہمیں اپنے مطلب کے کسی ٹریک پر ڈالنا چاہ رہی تھی؟ میں ایک دم سے کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ میں اس وقت تک سیل فون کو گھورتا رہا، جب تک ویٹر نے میرے سامنے کھانا نہیں لا کر رکھ دیا۔ ویٹر کھانا رکھ گیا تھا۔ اس سے پہلے میں کھانا شروع کرتا، میں نے اپنے ایک دوست کو اس لڑکی کا فون نمبر دے دیا تھا کہ وہ لوکیشن کے ساتھ دوسری معلومات لے سکے۔ وہ کتنی رسائی رکھتی تھی، کچھ دیر میں پتہ چل جاتا۔ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں اس وقت ریستوران سے نکل کر باہر آ گیا تھا، جب میرے اس دوست کا فون ملا جسے میں نے معلومات لینے کے بارے میں کہا تھا۔

”جمال، یہ جو نمبر تم نے مجھے دیا ہے، یہ کہیں بھی ظاہر نہیں ہو رہا ہے، نہ اس کا کوئی ڈیٹا ہے اور نہ یہ کہیں رجسٹرڈ ہے۔ ظاہر ہے پھر لوکیشن کے بارے میں کیا پتہ چلنا ہے۔“ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ہی مجھے سمجھ آ گئی یہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ وہ اتنے اعتماد سے بات کیوں کر رہی تھی۔ وہ خاصی جدید رسائی رکھنے والوں میں سے تھی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ کافی مشکل ثابت ہوگی۔ تبھی میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

”اس نے ابھی مجھے اسی نمبر سے کال کی تھی۔ تم کوشش کرتے رہنا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمبر.....“

”میں سمجھ گیا۔ اس کے لیے تھوڑا محنت کرنا پڑے گی۔ یہ نمبر کیوں نہیں مل رہا، اس کا پتہ کرتا ہوں، لگتا ہے کوئی اپنی برادری کی ہے۔“ اس نے تیزی سے کہتے ہوئے قہقہہ لگا دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب یہ نمبر اس کے لیے بھی چیلنج بن گیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ یہ نمبر تلاش کر لے گا۔

”تھینک یو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جدید دنیا میں جرم کافی تیز جا رہا ہے۔ مجرم کمپیوٹر دور کی سہولیات سے بہت زیادہ فائدہ اٹھانے لگا ہے۔ نت نئے سوفٹ ویئر سامنے آنے لگے تھے، جس کی مدد سے وہ ایسے ”چپکار“ دکھاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ سوفٹ ویئر کسی جگہ بہت کام آ سکتے ہیں، اگر انہیں مثبت سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ لیکن چور بازار میں یہ سوفٹ ویئر بہت کم قیمت پر مل جاتے ہیں۔ اب چھری کا قصور نہیں کہ اس سے پھل کاٹا جائے یا کسی کا پیٹ۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر نکلنے ہی والا تھا کہ مجھے اسی نمبر سے پھر کال آ گئی۔ میں نے رسیو کر لی تو دوسری طرف سے اسی لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ نے جو مجھ تک پہنچنے کا وقت دیا تھا وہ ابھی واپس لے لیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں خود آپ سے ضرور ملوں گی۔“

”تم کون؟“ میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ وہ فون بند کر گئی۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور سوچنے لگا کہ یہ کیس کوئی معمولی نوعیت کا نہیں لگتا۔ یہ بہت پھیلا ہوا ہو سکتا ہے۔

میں تھانے میں آ گیا۔ اس وقت دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنے سرکاری گھر میں جاؤں اور جا کر اپنے بیڈ پر لیٹ جاؤں۔ میں چاہ رہا تھا کہ چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر ہی تھانے جایا جائے۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد اتنا تو حق بنتا تھا لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ ہم نے جو اپنے طور پر پلان کیا تھا، اس کے فیڈ بیک کے بعد ہمیں ایکشن میں آنا تھا۔ تھکا ہوا ہونے کے باوجود میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچ رہا تھا۔ میں تھانے میں اپنے آفس کی کرسی پر بیٹھا یہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجرم میرے سامنے سے گزر جائے، پھر اتنے اعتماد سے مجھے چیلنج کر رہا ہو کہ میں اس تک پہنچ نہیں سکتا اور پھر خود ملنے کی بات بھی کر رہا ہو، یہ نہ صرف میری انا پر کاری ضرب تھی بلکہ میری پیشہ دارانہ مہارت کو بھی آزمانے والی بات تھی۔ یہی سوچتے ہوئے مجھے ایک دم سے

خیال آیا، وہ سائنسدان حسن رضوی اس لڑکی کے ساتھ یوں تھا جیسے اس لڑکی نے اسے انہیں کیا بلکہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ ہو۔ وہ خود وہاں سے لگتا چاہ رہا تھا۔ کیا اس کا یہ انہیں ڈرامہ تھا؟ کیا وہ خود انہیں ہوا تھا؟ اسے ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ میں چونک گیا۔ پہلے میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ جیسے ہی میری توجہ اس طرف گئی، کئی سوال خود روپوں کی مانند میرے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ اس میں جو سوال زیادہ مجھے چسپے لگا وہ یہی تھا کہ اگر حسن رضوی خود انہیں ہونا چاہتا تھا تو کیوں؟ میں اسی ٹریک پر سوچتا چلا رہا کہ ڈی ایس پی صاحب کا بلاوا آگیا۔ شام ہونے سے ذرا پہلے میں ان کے آفس پہنچا تو انسپکٹر دلشاد اور انسپکٹر ظفر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے بیٹھے ہی انسپکٹر دلشاد بولا۔

”کچھ پتہ چلا، کوئی سراغ، کوئی راستہ ملا؟“

”کچھ نہیں ملا، آئے اس کے کہ یہ انہیں، بہت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا تو اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ پھر خود ہی سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”وہ تو ہے، میں نے ائر پورٹ اور اس کی پارکنگ ایریا کے سارے سی سی کیمرے چھان مارے ہیں، ان کا کوئی سراغ نہیں ملا،“ یہ کہہ کر وہ رکا پھر چوکتے ہوئے بولا۔ ”حیرت یہ ہے کہ اس واقعہ کی ریکارڈنگ تک نہیں ہوئی۔ صرف اس سائنس دان کی ائر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے کی ایک ذرا سی ریکارڈنگ ملی ہے۔“

”کیا تم وہ مجھے دکھا سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، یو۔“ اس نے کہا اور اپنے سیل فون میں موجود وہ چھوٹا سا کلپ نکال کر مجھے دکھایا۔

وہ بیس سے پچیس سیکنڈ کا کلپ تھا۔ جس میں حسن رضوی کا ڈیوٹر سے باہر کی جانب آ رہا تھا۔ یہ وہی بوڑھا تھا۔ اس بار مجھے پورا یقین ہو گیا۔ کیونکہ اس کلپ میں بوڑھے نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے، جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں نے سیل فون واپس ہی کیا تھا کہ ڈی ایس پی صاحب آگئے۔ ان کے ساتھ مقامی آپریشنل سیل کے تین آدمی تھے۔ وہ سب بیٹھ گئے تو ڈی ایس پی نے اب تک کی رپورٹ لی، جس میں سوائے چند باتوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ انہیں کیسے ہوا؟ اور دوسری یہ کہ اس میں استعمال ہونے والی فورڈ ہیل جیپیں چوری کی تھیں۔ اور تیسری بات یہ تھی کہ مقامی جرائم پیشہ لوگوں سے پوچھنا چھ شروع ہوگئی تھی۔ خفیہ کے لوگوں کا بہت زیادہ چوکس ہونے کے باوجود ابھی تک کوئی سراپہ نہیں ملا تھا۔

”سر! یہ پلاننگ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن سائنس دان کے انہیں کا مقصد ابھی تک سامنے نہیں آیا۔“ انسپکٹر دلشاد نے کہا۔

”اور نہ ہی کسی مجرم کا سراغ مل سکا ہے، جس سے کم از کم یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اس کا انہیں کون کر سکتے ہیں؟“ انسپکٹر ظفر نے اپنا خیال بتایا تو ڈی ایس پی نے ہماری طرف دیکھا پھر آپریشنل برانچ کے ایک بندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ صاحب اس وقت ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے برطانیہ سے یہاں معلومات پہنچی ہیں۔ ان معلومات کے مطابق، حسن رضوی اچانک گھر سے نکلے اور ائیر پورٹ جا پہنچے۔ وہاں سے وہ یہاں پاکستان آگئے۔ یہ میڈیا پر جب شور ہوا تب ان برطانیہ والوں کو پتہ چلا کہ وہ سائنس دان انہیں ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے حسن رضوی کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی، نہ کسی کی دھمکی، نہ کوئی ایسی بات۔“ ڈی ایس پی نے کہا تو سب پر خاموش طاری ہوگئی۔ تب میں نے کہا۔

”سر! میری ایک سوچ ہے، ممکن ہے وہ بعد میں غلط ثابت ہو جائے، لیکن مجھے وہ بہت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔“

”کیا ہے وہ سوچ؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

”ممکن ہے حسن رضوی نے اپنے انہیں کا ڈرامہ خود ہی رچایا ہو؟ پوری پلاننگ کی ہو اس کے لیے اور وہ کسی کی بھی نگاہوں سے اوچھل ہونا چاہ رہے ہو؟“ میں نے اعتماد سے کہا تو خصوصی سیل والے نے پوچھا۔

”آپ کی سوچ کو رد نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس سوچ کی بنیاد کیا ہے؟“

”دوسری بات یہ کہ وہ اپنے آپ کو کیوں انہیں کرائے گا، اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

”میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتا۔ اس کا پتہ تو ان کے پچھلے دنوں سے لگ سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا

”انسپکٹر جمال کا خیال ٹھیک لگ رہا ہے۔“ اس خصوصی سیل والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا، جب کوئی نہ بولا وہ کہتا چلا گیا، ”پتہ چلا ہے کہ تقریباً دو ماہ سے وہ اپنے گھر میں بند تھا اور یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ سائنسدان ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن گھر میں بند ہونے سے پہلے اس نے اس انسٹی ٹیوٹ کو چھوڑ دیا تھا، جس میں وہ پچھلے کئی برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کا مالک ڈاکٹر الیکس تھا، وہ حسن رضوی کا دوست تھا اور اس کے مرجانے کے بعد بہت ادا اس تھا۔ وہاں دوسرے کارکن یہی سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر الیکس کے بعد اس کا دل یہاں نہیں لگتا تھا، اس لیے حسن رضوی نے وہ انسٹی ٹیوٹ چھوڑا۔“

”تو پھر وہ وجہ اسی انسٹی ٹیوٹ سے ہی ملے گی۔ جس کے باعث یہ انہیں ڈرامہ یا جو بھی ہوا۔“ میں نے کہا تو وہ خصوصی سیل والا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”برطانیہ میں اس پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ ایک ٹیم اسی پر کام کر رہی ہے۔ میں انہیں یہ بات بھی بتا دیتا ہوں، ممکن ہے کوئی معلومات سامنے آجائیں۔ ویسے ان کے دو آدمی کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے آپ لوگ کریں کام، اور جلد از جلد مجرموں تک پہنچنے کی کوشش کریں، ہم نے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہوا ہے، جس میں سے چھ گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا ہے۔“ ڈی ایس پی نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں ڈی ایس پی کے دفتر سے نکل رہا تھا کہ میرے دوست کا فون آگیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس پاس بلایا تھا۔ اسے کافی حد تک کامیابی ملی تھی۔ میں بیس منٹ کے اندر اس کے پاس پہنچ گیا۔

”ہاں جلدی متاؤ، کیا بنا؟“ میں نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے کہا۔

”وہ نمبر ٹریس نہیں ہوا، بلکہ لگتا ہے وہ مجھ سے بھی مہاجر ہے، میں جب اس نمبر تک پہنچا ہوں تو اس نے میرے کمپیوٹر کو ہیک کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ بہت مشکل سے بچا ہوں۔“ اس نے تیز تیز انداز میں کہا۔

”مطلب، میں یہ سمجھوں کہ تم اس کا نمبر نہیں تلاش.....“ میں نے کہا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں تلاش تو ضرور کروں گا، لیکن یہ کس وقت ہو سکے گا، یہ میں خود بھی نہیں جانتا، میری اور اس کی جنگ جاری ہے۔“ اس نے کھردرے سے لہجے میں کہا جیسے وہ شکست کے بعد بھی اپنی ہار کو ذہنی طور پر تسلیم نہ کر رہا ہو۔

”ٹھیک ہے، تم اپنی کوشش جاری رکھو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ شہر بھر کی روشنیاں جگمگا چکی تھیں۔ حسن رضوی کو انہیں کیسات گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تک کسی کو بھی کو سراغ نہیں ملا تھا کہ وہاں کہاں گیا؟ میں سمجھتا تھا کہ ایک مجھے ہی علم ہے کہ وہ لڑکی اور

حسن رضوی دلوں میرے ہی پاس سے نکل کر گئے تھے۔ اگرچہ وہاں دوسرے اہلکار بھی تھے لیکن کسی کو اس بارے میں ابھی احساس نہیں تھا۔ انہوں نے کون سا تصویر دیکھی تھی، مگر مجھے اتنا ضرور احساس تھا کہ جیسے ہی ان لوگوں میں سے کسی کو یہ پتہ چل گیا، تو اعلیٰ آفیسرز مجھ سے پوچھنا شروع کر دیں گے کہ میں نے ان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ مجھے ایک دم سے بے چینی ہونے لگی۔ میں جلد از جلد ان تک پہنچ جانا چاہ رہا تھا لیکن میرے پاس اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ میں نے سب کچھ اپنے ذہن سے نکالا اور اپنے سرکاری گھر کی طرف چل پڑا۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور ایزی ہو گیا لیکن میں آرام نہ کر سکا۔ مجھے چین نہیں آیا اور میں اپنے دوست سے ملنے چل پڑا۔

جب میں اس کی طرف جانے لگا تو اسے اپنی آمد کے بارے میں فون کیا تھا، اس نے مجھے کہا کہ میں آتے ہوئے مارکیٹ سے کچھ کھانے پینے کو لیتا آؤں۔ میں مارکیٹ پہنچا، کار پارک کی اور ایک اسٹور کی جانب بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی اسٹور میں داخل ہوا تو مجھے لگا کہ وہی لڑکی سامنے کاؤنٹر کے پاس کھڑی خریداری کر رہی ہے۔ پہلے تو میں نے اپنا وہم ہی سمجھا۔ مگر جلد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ وہی لڑکی ہے۔ ایک بہت بڑی کامیابی میرے ہاتھ لگ چلی تھی۔ مزید فورس بلوانے میں دیر ہو جانا یقینی تھا۔ میں نے خود اسے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں گیٹ کے پاس رکنے کی بجائے اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا پمفل نکالا اور اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

”لو جی ہم پہنچ گئے ہیں۔“

وہ مڑی نہیں۔ بلکہ بڑے سکون سے بولی۔

”میں تو چاہتی تھی کہ تم مصیبت میں نہ پڑو لیکن اب کیا کیا جائے۔ ٹھیک ہے۔ کر لو گرفتار۔“ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میرے لاشعور میں تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ کوئی انتہائی چالاک لڑکی ہے۔ ایک بار دھوکا دے چکی ہے۔ میں قطعاً رسک نہیں لیا اور بڑی بے دردی سے اسے پکڑ کر باندھ لیا۔ مارکیٹ والوں نے ذرا بھی دخل اندازی نہیں کی۔ کرتے بھی تو میں اپنا آپ دکھا دیتا کہ میں کون ہوں، اس لیے کسی نے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی اور نہ کسی نے مزاحمت کی۔ جیسے ہی میں نے اسے کار کی اگلی نشست پر بٹھایا وہ بولی۔

”دیکھو! تم نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ ظاہر ہے اب تم اب مجھ پر تشدد کرو گے کہ نانا جی کہاں ہیں؟ میں بتا دوں گی لیکن تھانے لے جانے سے پہلے تم کہیں بھی میری بات سن لو، پھر جو جی چاہے کرنا۔ چاہے یہیں کار میں بیٹھ کر میری بات سن لو۔“

”اوکے، میں سنتا ہوں تمہاری بات۔“

میں اسے تھانے لے جانے کی بجائے اپنے دوست کے گھر ہی لے گیا۔ وہ ایک لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ میں اسے اسی کمرے میں بٹھالیا۔

☆.....☆.....☆

”کیا کہا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی یہ اس کی ویڈیو ہے، آپ خود اس کی بات سن لیں۔“ اس نے سیل فون میں ویڈیو لگا کر مجھے دے دی۔ اس ویڈیو میں ایک نوخیز لڑکی، جس نے جین اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی فرش پر بندھی ہوئی بیٹھی کہہ رہی تھی۔

”میرے نانا حسن رضوی عالمی ریک کے سائنس دان ہیں، انہوں نے بہت عرصہ ایلکس لیبارٹریز لندن میں کام کیا ہے۔ وہ اب وہاں سے بھاگ کر اپنے ملک آ گئے ہیں، کیونکہ ایلکس کی موت کے بعد موجودہ سربراہ

نام سے اس کی نہیں بنی۔ وجہ تنازعہ ایک بہت پرانا تجربہ، جسے نام غلط استعمال کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کی تفصیلات نہیں بتا سکتی۔ اگر یہ تجربہ روکا نہ گیا تو ایک بہت بڑی آفت دنیا میں پیدا ہو جائے گی۔ وہ تجربہ کسی جگہ پر ہو رہا ہے جس کا ایک حصہ صرف میرے نانا کو معلوم ہے۔ نام اور اس کے ارد گرد لوگ اسے منفی طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں، میرے نانا صرف اسی لیے چھپ گئے ہیں۔ تاکہ وہ تجربہ کسی طرح ناکام ہو جائے۔“

”اس تجربے کی تفصیلات کیا ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”مجھے معلوم نہیں اور اگر معلوم بھی ہوتا تو میں نہ بتاتی۔ کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ تجربہ کہاں ہو رہا ہے۔ میرے نانا بھی فقط اتنا جانتے ہیں کہ وہ کسی جزیرے میں ہو رہا ہے۔ انہوں نے اگر وہ آفت دنیا کے سامنے آگئی تو ملک ہمارا بدنام ہوگا۔“ اس لڑکی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”تو پھر اسے روکا کیسے جائے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”چند دن تک خود ہی پتہ چل جائے گا۔“ لڑکی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد وہ ویڈیو ختم ہو گئی۔

”وہ لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کراچی میں، ابھی میرے دوست کے گھر ہے۔ یہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔“

”تم اس لڑکی کی گرفتاری کے بارے میں اپنے بڑوں کو نہیں بتا سکتے۔“ میں نے پوچھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”صرف اس لیے نہیں کہ میری نوکری چلے جائے گی۔ بلکہ اس لیے کہ اگر یہ سچ ہے تو وہ آفت کیا ہے کہاں ہے،

کیسی ہے؟ اگر ہے تو اس سے مخلوق خدا کو بچایا جائے۔ پتہ تو چلے کہ یہ آخر ہے کیا؟“

”پھر تو ڈاکٹر حسن رضوی سے ملنا بہت ضروری ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا۔

”لیکن ایک بات ہے۔“ فہیم نے تیزی سے کہا۔

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”لڑکی نے کہا کہ وہ کسی جزیرے پر ہو رہا ہے۔ جب تک آپ حسن رضوی سے ملتے ہیں، تب تک ہم کوشش کریں کہ بحیرہ عرب میں کہیں وہ جزیرہ ہو۔“

”تم کیسے تلاش کر لو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے پاس ایسا کچھ نظام ہے، کہ یہیں بیٹھ کر پورا بحیرہ عرب چھان ماریں گے۔“ فہیم نے تیزی سے کہا تو انسپکٹر فوراً بول اٹھا

”یہ تو مجھے بھی یقین ہے کہ وہ بحیرہ عرب ہی میں ہوگا۔ میں نے کل ایسے ہی کسی جزیرے کے بارے میں چھان بین کی تھی۔ ایک جزیرے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ چندہ سال سے اس پر کسی ایسی مخلوق کا سایہ ہے کہ جو بھی

ان کے نزدیک جاتا ہے، وہ جل جاتا ہے۔ اس کے بارے میں بہت ساری کہانیاں سننے کو ملی ہیں۔ ممکن ہے وہی ہو۔“

”بالکل، وہی ہوگا۔“ فہیم نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”میں اس کی کیمسٹری سمجھ گیا ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تلاش کرو۔ ہم وہاں تک پہنچتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا ہم پہنچ جائیں گے؟“ انپکٹر نے جوش میں آتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں پہنچ جائیں گے، تم ایسا کرو، اس لڑکی سے بات کراؤ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا سیل فون تو میرے پاس ہے۔“ انپکٹر نے جواب دیا، پھر ایک دم سے سوچتے ہوئے بولا۔ ”اپنے دوست کے ذریعے بات کروا سکتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پیش کرتے ہوئے رابطہ کیا۔ پھر اس نے تعارف کرا کر اس لڑکی سے بات کروانے کے بارے میں کہا۔ رابطہ ہو گیا

”دیکھو! تمہارا نام کچھ بھی ہے، لیکن وہ آؤت کیا ہے، یا جو بھی ہے، ہم تمہارے نانا کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں۔ ہمیں بتاؤ۔ یا ڈاکٹر سے بات کرا دو۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں میں کیسے یقین کر لوں کہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ یہ تجربہ بحیرہ عرب کے کسی جزیرے پر ہو رہا ہے۔ تم کیا چاہتی ہو، تمہارا نانا کیا چاہتے ہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتا، زیادہ سے زیادہ ہم ایک گھنٹے تک اس جزیرے کو تلاش کر لیں گے۔ اس تک پہنچنے میں بھی اتنا وقت نہیں لگے گا۔ تو پھر کیا ہوگا، تم لوگ مشکوک ہو جاؤ گے۔“ میں نے سمجھایا

”دیکھیں! جہاں تک میری معلومات ہیں، اس جزیرے پر ایک بہت بڑا طوفان آچکا ہے۔ وہاں پر بہت سارے بہت گناہ معصوم لوگ ہیں، کیا تم انہیں بچاؤ گے؟“ اس نے روپاٹا ہوتے ہوئے کہا

”اب جبکہ تم لوگ کچھ بتائیں رہے تو ہم کیا کر پائیں گے، جو ہوسکا وہی کریں گے نا۔“ میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”شاید میں نہ بتاتی لیکن وہ آؤت سر اٹھا چکی ہے۔ میں آپ کو تفصیل سے بتا دیتی ہوں۔ پھر آپ کی مرضی کہ آپ اسے روک سکتے ہیں یا نہیں۔“ اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

”بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے انپکٹر آن کر دیا تا کہ سب سن سکیں۔“ وہ کبھی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

تاجہ نگاہ نیلگوں سمندر، دن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ساحل سے کئی سونا ٹیکل میل دور وہ جزیرہ انتہائی سرسبز تھا۔ پندرہ برس سے پہلے کسی نے وہ جزیرہ دیکھا ہو، یا اس پر کوئی گیا ہو، تو اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ لیکن تقریباً پندرہ برس سے اس جزیرے کے بارے میں عجیب و غریب باتیں پھیل گئی ہوئی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اس پر روجوں کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس پر جنوں کا قبضہ ہے۔ کوئی یہ قصہ سناتا کہ اس پر آسمانی مخلوق آن آباد ہوئی ہے۔ وہ مخلوق کسی کو جزیرے کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی۔ یہ باتیں اس وقت پھیلیں، جب کوئی بھولے بھٹکے ماہی گیر اس جزیرے کی جانب گئے تو ان کی کشتی اچانک ٹوٹ پھوٹ گئی، یا اس میں آگ لگ گئی۔ اوپر تلے کئی لوگوں کے ساتھ ایسا واقعہ ہوا تو ایک دم سے لوگ خوف زدہ ہو کر سہم گئے۔ کچھ یار لوگ یہ تجربہ کرنے بھی گئے، ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تو لوگوں نے ادھر جانا ہی چھوڑ دیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس جزیرے کی طرف جانا ہی بھول گئے۔ کسی بھولے بھٹکے کے ساتھ کیا ہوا، یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس سرسبز و شاداب جزیرے پر انسانی زندگی تھی، جس کے بارے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وہ جزیرہ تقریباً چھ کلومیٹر لمبا، اور پانچ کلومیٹر چوڑا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ گھنا جنگل تھا۔ جس میں پام اور دوسرے کئی قسموں کے درخت ہوا

میں جھومتے رہتے تھے۔ جھاڑیاں، جنگلی بوٹیاں اور پھول دار پودوں کی بہتات تھی۔ پہاڑیوں کے جیسے بڑے بڑے مٹی کے ڈھیر، کہیں گڑھے اور شمال مشرق کی طرف اونچی زمین سے پھوٹا چشمہ، جس کا پانی جزیرے کے بالکل درمیان میں کافی ساری خالی جگہ سے ہوتا ہوا جنوب مغرب کی طرف سے سمندر میں گر جاتا تھا۔

اسی بہتے ہوئے پانی کے پاس لکڑی کا گھر بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک مضبوط قد کاٹھ کی لمبی سی خوبصورت خاتون رہتی تھی۔ اس کا گورا رنگ اور نقوش ہی بتاتے تھے کہ وہ یورپی ملک سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شہریت برطانیہ کی تھی اور اس کا نام ایملی تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ برطانیہ کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔ اس کے پاس پانچ بچے تھے۔ ایک تیرہ سال چند ماہ کا لڑکا، ہیری، پھر دو لڑکیاں بارہ اور گیارہ سال کی لورین اور جوزفین، پھر دس اور نو سال کے لڑکے جیشوا اور جیکب تھے۔ اس کا شوہر وائسن بھی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن اس کا زیادہ وقت اپنی لیبارٹری میں گزر جاتا جو ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی تھی۔ وہ بیٹے کے اعتبار سے الیکٹرونکس انجینئر تھا۔ وہ اپنی لیبارٹری میں تجربات کرتا رہتا تھا۔ ان پانچ بچوں میں سے چار بچے ان کی اولاد نہیں تھے لیکن وہ انہیں اولاد ہی کی مانند سمجھتے تھے۔ جب وہ جزیرے پر آئے تھے تو ان کے ساتھ ہیری تھا۔ یہی ان کا سگا بیٹا تھا۔ اس کے بعد ان تک بچے پہنچائے جاتے رہے۔ ان بچوں کو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سب آپس میں بہن یا بھائی ہیں۔

وہ بالکل نارل زندگی گزار رہے تھے۔ ہر پندرہ دن بعد ایک ہیملی کا پٹر آتا اور ان کی مطلوبہ ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچا جاتا۔ وہ ہیملی کا پٹر کبھی ٹھہر جاتا اور کبھی نہیں، کبھی ان کی چیزیں پھینک کر چلا جاتا یا پھر رکتا بھی تو بہت کم وقت کے لیے۔ پہلی بات تھی کہ ان میں سے کوئی بہت کم بیمار ہوا تھا۔ اگر کوئی معمولی بیمار ہو جاتا تو اس کے لیے دوائیں موجود تھیں۔ وائسن کبھی کسی کے ساتھ براہ راست نہیں ملا تھا۔ اسے جو چیز چاہئے ہوتی، وہ فون پر کہہ دیتا۔ بہت ضروری ہوتا تو ہیملی کا پٹر پندرہ دن سے پہلے بھی آ جاتا۔ انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ سکون سے وہاں آباد تھے۔ ایملی اپنے گھر کے سارے کام ختم کر کے بچوں کو پڑھانے لگ جاتی۔ جب تک جی چاہتا وہ پڑھتے اور پھر کھیلتے کودتے رہتے۔ پچھلے پندرہ برس سے یہی معمول چلا آ رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ان میں سے نہ کبھی کوئی جزیرے سے گیا تھا اور نہ ہی انہیں باہر کی خبر تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اگر کوئی معلومات ہوتی تھیں تو وہ وائسن ہی جانتا تھا۔

قدرتی طور پر وہ اس پرسکون ماحول کے عادی ہو چکے تھے۔ بچے کھیلنے کے لیے دور نکل جاتے، انہیں وہاں کوئی ڈر نہیں تھا۔ وائسن نے انہیں اجازت دے رکھی تھی۔ وہ کبھی مٹی کے گھر بناتے، کبھی بہتے ہوئے پانی پر پل بنانے لگتے، انہوں نے ایک کشتی بھی بنانی شروع کر دی تھی۔ جب انہیں کچھ سمجھ نہ آتا تو وہ کبھی وائسن سے مدد لیتے اور کبھی ایملی سے۔ یہی ان کا کھیل تھا۔ وائسن انہیں ایسے کھیل کھیلنے کو کہتا تھا، جس سے وہ سکھ سکیں۔ انہوں نے ان بچوں میں سیکھنے کا جذبہ اور شوق بھر دیا تھا۔

وہ یہاں آئے کیسے؟ اس پر ایملی کبھی کبھی سوچتی تو حیران رہ جاتی۔ اگرچہ وہ یہاں اپنی مرضی سے آئی تھی، لیکن یہاں آ کر وہ ایسی زندگی گزارے گی، اس بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لندن کی شور شرابے والی تیز زندگی سے نکل کر پرسکون ماحول میں آنا اسے اچھا لگا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اکتا ہٹ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر وائسن اور بیٹا ہیری تھا۔ وہ ان میں کھو کر رہ گئی، پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ لگ بھگ چودہ سال کا عرصہ کیسے گزر گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی۔

ایملی کی وائسن کے ساتھ شادی ہوئے چھ برس سے بھی زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ دونوں ہی کو اپنی اولاد کی بہت چاہت تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا جس سے ان کی کوئی امید برآتی۔ دونوں ہی اپنی معروف زندگی میں

کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن شام سے صبح ہونے تک، دونوں ہی اپنے گھر کا سناٹا محسوس کرتے اور سرد آہ بھر کر رہ جاتے۔ فطری طور انہوں نے اولاد کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کیا، اپنا چیک اپ کروایا۔ سال بھر بعد انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ایملی میں ماں بننے کی صلاحیت بہت کم ہے، اور وائسن سے تو اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اس خبر نے ان کی زندگی کو ڈسٹر ب کر کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اس حقیقت کا بہت اثر لیا۔

وائسن نے بہت سوچ کر ایملی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا، تاکہ وہ اپنی اولاد کی خواہش کو پورا کر سکے۔ لیکن ایملی ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مزید ڈاکٹر کو دکھانے اور ان سے مشورہ کرنے کی بات کہا۔ اسی کوشش میں وہ ایک دن ڈاکٹر ایملکس سے جا ملے۔ وہ گانا کالو جسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ جینک انجینئر بھی تھا۔ چند ملاقاتوں اور بہت سارے ٹیسٹ کے بعد ایک دن ڈاکٹر ایملکس نے دونوں کو اپنے گھر ڈنر پر مدعو کر لیا۔

”میں نے تم دونوں کو اس لیے ڈنر پر بلایا کہ میں تفصیل سے بات کر سکوں۔ کیونکہ آخر کار فیصلہ تم دونوں نے کرنا ہے۔“ ڈاکٹر ایملکس نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا تو وائسن نے پوچھا۔

”کیسی بات اور کیا فیصلہ ڈاکٹر؟“

اس پر ڈاکٹر ایملکس نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر بڑے سنجی خیز انداز میں ان سے کہا۔

”تم دونوں ماں باپ بن سکتے ہو مگر...“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جس پر ایملی نے بے مبری سے پوچھا۔

”میں ماں بن سکتی ہوں، وائسن باپ بن سکتا ہے، مگر کیسے؟“

”وہی بتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے تم دونوں کے ہاں جو بچہ ہو سکتا ہے، وہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی ہی ہوگا۔ مجھے امید ہی نہیں پورا یقین بھی ہے کہ تم صاحب اولاد ہو جاؤ گے اور اس کے بعد بھی تمہارے بچے ہوں یہ بھی ممکن ہے۔ مگر، میں اور میری ٹیم ایک تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم لوگ تعاون کرو تو ہم دونوں کا کام ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر ایملکس نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ کیسا تجربہ ہے اور ہمارا تعاون کیا ہوگا؟“ وائسن نے پوچھا۔

”دیکھو، ہم یہ تجربہ کرنا چاہتے ہیں کہ چند بچوں کو ایسے ماحول میں رکھا جائے اور وہاں ان کی پرورش کی جائے جو ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہو۔ بالکل فطری ماحول ہو۔ ایک خاص عرصہ تک انہیں ایسے ماحول میں رکھنے کے بعد انہیں جانچا جائے، ان کا مشاہدہ کیا جائے کہ ان میں کس قسم کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جو یہاں کے ماحول میں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری اسٹڈی ہے، جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔“ ڈاکٹر ایملکس نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ ایملی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ایملی کے بطن سے جو وائسن کا بچہ ہوگا، اسے آپ ساتھ رکھیں۔ آپ دونوں کو مزید بچے دیئے جائیں گے۔ انہیں بھی آپ کو پالنا ہوگا۔ جس کا آپ کو باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا اور سہولیات بھی دی جائیں گی۔ لیکن آپ کو دنیا سے کٹ کر ایک بے آباد جزیرے میں تیرہ سے چودہ برس تک کے درمیان رہنا ہوگا۔“ ڈاکٹر ایملکس نے تفصیل سے انہیں بتا دیا۔

”اور ہم دونوں کا کیریئر؟“ وائسن نے پوچھا۔

”ظاہر ہے اس کی قربانی دینا ہوگی۔ وائسن اس دوران اپنا کام کرتا رہے۔ پھر وہ برس بعد جب وہ یہاں واپس آئے تو پھر سے اپنے کام کا آغاز کر سکتا ہے۔ ممکن ہے تمہیں کام کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے، ہم معاوضہ ہی اتنا

دیں گے کہ بعد میں کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ایملی تو اپنا کام کرتی رہے گی، آخر اس نے بچوں کو پڑھانا بھی تو ہوگا، جو بعد میں یہاں کی معمول کی زندگی اپنا سکیں۔“ ڈاکٹر ایملکس نے حتی انداز میں کہا اور دونوں کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈنر کے بعد انہیں سوچنے کا وقت دے دیا گیا کہ وہ ایک ہفتے میں سوچ کر بتا دیں۔

وہ دونوں ہی انتہائی جذباتی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ہفتے بھر بعد انہوں نے ان تحقیقات میں شامل ہونے کا فیصلہ کر کے ڈاکٹر ایملکس کو بتا دیا کہ وہ راضی ہیں۔ اگلے ہفتے میں وائسن اور ایملی کو ڈاکٹر ایملکس کے تحقیقی ادارے کے اسپتال میں رکھا گیا۔ ان کے مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ ڈاکٹر زکی پوری ایک ٹیم ان کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ کوئی نرس بھی ان کے قریب نہیں جانے دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایملی امید سے ہو گئی۔ وائسن کام پر جانے لگا اور ایملی کو ایک الگ گھر میں رکھا گیا۔ جہاں ہر وقت اس کی نگرانی کی جاتی۔ اس کے کھانے پینے سے لیکر اس کی صحت تک۔ اٹھنے بیٹھنے سے لیکر ورزش تک۔ ہر گھنٹے کی رپورٹ ڈاکٹر ایملکس کو جاتی تھی، چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوتا۔ نو ماہ بعد اس کے ہاں ہیری پیدا ہوا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ایک خواب پورا ہو گیا تھا۔ جس کے عوض انہیں چودہ برس تک جلا وطنی اختیار کرنا تھی۔ جس کے لیے وہ پوری طرح تیار ہو گئی تھی۔

تین ماہ بعد وہ دن بھی آ گیا، جب انہیں ایک چارٹرڈ طیارے میں بٹھایا گیا اور غیر معروف ایر پورٹ تک لایا گیا۔ پھر اس کے بعد انہیں ہیلی کاپٹر میں بٹھایا گیا اور اس جزیرے پر لا کے انہیں ایک لکڑی سے بنے شاندار گھر میں چھوڑ دیا گیا۔ وائسن کو کام کرنے کے لیے ایک لیبارٹری مل گئی۔ انہیں وہاں زندگی کی ضروریات کے ساتھ سہولیات بھی دے دی گئیں۔ وہ دونوں ہیری کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنے لگے۔ دو برس بعد ان کے پاس دو بچیاں لائی گئیں، اس طرح پھر دو بچے لائے گئے۔ اور ان کے پاس رونق بڑھ گئی۔ ہیری کے بعد ان کے اپنے بچے نہ ہو سکے تھے۔

اس رات جب وائسن گھر واپس آیا تو ایملی نے ڈنر کے لیے میز سجایا ہوا تھا۔ ہیری اپنی ماں کی پوری طرح مدد کر رہا تھا۔ چھوٹی بچیاں بھی جہاں تک ہو سکتا تھا ان کے ساتھ مصروف تھیں۔ پورا گھر روشن تھا۔ ایملی کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ بہت خوشگوار ماحول میں ڈنر کر لیا گیا تو بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تبھی ایملی کافی کاگ لاکر وائسن کے پاس بیٹھ گئی۔

”آج بہت خوش ہو؟“ اس نے کافی کا سپ لے کر پوچھا۔

”کیا تمہیں واقعی نہیں معلوم، کہ میں خوش کیوں ہوں؟“ ایملی نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ مجھے پتہ ہوگا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ خوشی سے لرزتے ہوئے بولی۔

”وائسن، جانتے ہو، ٹھیک آج رات کے بعد کل تک ہمارے یہاں رہنے کے چودہ سال پورے ہو جائیں گے۔“

”ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ہنکارا بھرا، پھر اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ لیکن ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا کہ ان بچوں کو خود سے کیسے علیحدہ کر پائیں گے؟ انہیں برطانیہ کے ماحول میں ایڈجسٹ کیسے کر پائیں گے۔ تم پر بہت زیادہ بوجھ ہوگا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی، یہ بچے ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ تم نے ڈاکٹر ایملکس کو پیغام دیا کہ وہ ہمیں واپس لے جانے کا بندوبست کرے۔“

”ہاں میں نے پیغام دے دیا ہے، وہ اس ہفتے میں کسی وقت آئیں گے۔ بس ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

ہوئے آگے بڑھی تو وہاں موجود حملہ آوروں نے اسے قابو میں کر لیا۔ وہ بن پانی کے مچھلی کی مانند تڑپنے لگی تھی۔ وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔

والسن صورت حال کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اگر مزاحمت کرتے تو فائرنگ سے وہیں مر جاتے۔ بہری کو انہوں نے پھر بھی لے جانا تھا۔ جس وقت حملہ آور بہری کو ایلی کا پٹر کے قریب لے کر پہنچے اور اس کا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھانے لگے۔ تب ایلی ایک دم سے یوں چیخی جیسے ذبح کر دی گئی ہو۔

”بہری ی ی ی ی ی.....“

ہیری واپس پلٹ پڑا تو کئی سارے لوگ اس کی بڑھے۔ وہ ایک گرائڈیل شخص تھا، جس نے ہیری کو پکڑا اور اسے قابو کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ہیری نے ایک گھونسلہ اس کے منہ پر مارا تو اس شخص کا چہرہ پھٹ گیا۔ وہ چکرایا اور زمین پر جا رہا۔ دو اس کے قریب آ چکے تھے۔ ایک کو اس نے کمر سے اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ وہ دوبارہ نہیں اٹھ سکا۔ دوسرے کو اس نے نیچے رکھا، اس کی ٹانگ پر اپنی ٹانگ رکھی اور اسے چیر دیا۔ سامنے چند لوگ کھڑے تھے۔ جیسے ہی ہیری ان کی جانب بڑھا انہوں نے گتیں تان لیں اور فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اس وقت وہاں پر ہر شخص پاگل کر دینے والی حیرت سے ہیری کو دیکھنے لگا، گولیاں اس پر اثر نہیں کر رہیں تھیں۔ پلٹ اس کے ساتھ جا کر لگ رہی تھیں۔ لیکن اس کے جسم میں پوست ہو جاتی ہیں اور وہاں سے ایک قطرہ خون بھی نہیں بہا۔ وہ ان کی طرف بڑھتا گیا جو اس پر فائرنگ کر رہے تھے۔ لمحے سے بھی کم وقت میں وہ ان کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے ایک بندے کی دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑ لی۔ اسے اوپر اٹھایا اور گھما کر دوسروں پر مارنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر کوئی اس سے بھی کئی گنا طاقت اس میں آگئی ہو۔

وہ ہیری کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ کوئی مادرائی مخلوق ہو۔ جبکہ ہیری یوں معصومانہ انداز میں کھڑا تھا جیسے اسے

”اگر تم ایک منٹ سے پہلے باہر نہ آئی تو میں تمہارے اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔ پھر تو باہر نکلو گی؟“
 ”تم ایسا نہیں کر سکتے ہو۔ جب تک ڈاکٹر ایکس نہیں کہے گا، ہم باہر نہیں جائیں گے۔“ ایملی نے کہا۔
 ”تو پھر تیار ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازے میں ایک برسٹ مارا۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکیاں ٹوٹنے لگیں۔
 دروازے کو دھکا دیا جانے لگا۔ کچھ لمحے بعد دروازہ ٹوٹ گیا۔ ایملی اپنے بچوں کے ساتھ سہی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔
 حملہ آور آگے بڑھے اور انہوں نے سب کو پکڑا اور دھکے دے کر گھر سے باہر نکال لیا۔ وہ انہیں میدان کی طرف لے
 جا رہے تھے۔ ایملی چیخ رہی تھی، چھوٹے چاروں بچے سہمے ہوئے خوف زدہ رو رہے تھے۔ جبکہ ہمیری خاموش تھا اور
 سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیسے حالات بن گئے ہیں؟ وہ ان سب کو اس میدان میں لے آئے جہاں کچھ فاصلے
 پر پہلی کا پڑ کھڑے تھے۔ تبھی ایک شخص آگے بڑھا اور اُس کی طرف دیکھ کر ڈرامائی انداز میں بولا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے، ہمیں یہیں رہنے دو۔ پلیز میرا بیٹا مجھ سے نہ چھینو۔“ ایملی نے مامتا بھری دردناک صدا لگاتے ہوئے کہا تو اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے بندوں سے کہا۔

”لے جاؤ، ہیری کو، دوسرا پہلی کا پڑا نہیں بعد میں لے جائے گا۔“

ہیری کو تین لوگوں نے پکڑا ہوا تھا۔ دو آدمیوں نے اس کے بازو قابو کیے ہوئے تھے۔ تیسرا اس کے پیچھے تھا۔ انہوں نے ہیری کو دھکا دیا۔ وہ ایک بار لڑکھڑایا اور چل پڑا۔ اہیلی کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ زور زور سے چیخنے

یہ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ سب اسے یوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟

ایملی کی آنکھوں میں حیرت جم کر رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اتنے بندے مرجائیں گے۔ وہ سبہ ہوئے چھوٹے بچوں کو لے کر دوبارہ گھر میں آگئی تھی۔ ہیری کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

ڈرے ہوئے بچے اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہے تھے۔ وہ مسلسل ہیری کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ ایسا کیسے ہو گیا ہے؟ وہ تو اب تک ایک ناول بچہ تھا؟ کیا دوسرے بچے بھی ایسے ہی ہوں گے؟ کیا وہ کسی سازش کا شکار ہو گئی ہے؟ وہ انہیں واپس برطانیہ لے جانے کی بجائے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرنا چاہتے تھے؟ سوالوں کا ایک لانتنا ہی سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر ہونے کو تھی۔ واٹسن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ایملی کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ لیبارٹری کے اندر تھا۔ اسے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ اس کے گھر سے تھوڑا ہی دور کئی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ہیری گھر میں آ گیا۔ ایک دم اسے ہیری سے خوف آیا لیکن اگلے ہی لمحے مانتا سب کچھ بھول گئی۔ وہ سکون سے آکر بیٹھ گیا تو ایملی نے پیار سے پوچھا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“

”ہاں، مجھے بھوک لگی ہے۔“ اس نے ماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو ایملی چکن کی جانب مڑ گئی۔ اسے ہیری کے چہرے پر کچھ تبدیلی دکھائی دی تھی، وہ کیا تھی؟ کھانا لے کر جاتے ہوئے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ اس نے ہیری کے سامنے میز پر کھانا رکھ دیا۔ ہیری سکون سے کھانے لگا۔ تبھی ایملی نے غور سے اسے دیکھا۔ ہیری کے چہرے پر سکون تھا، لیکن اس کی آنکھیں تیز چمک رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کوئی تبدیلی دکھائی نہ دیکھی۔ اس نے سکون سے کھانا کھایا اور اپنی ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ماما! کیا آپ پریشان ہو؟“

”ہاں، بہت زیادہ۔ یہ سب کیا ہے، انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ہمارے لیے خطرہ بہت بڑھ گیا ہے، وہ ہمیں مار دیں گے اور میں تم لوگوں کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی ہوں۔“ ایملی نہ چاہتے ہوئے بھی جذباتی ہو گئی۔ اس کا لہجہ بھگ گیا تھا۔ اس پر ہیری نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”ماما! کوئی ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پاپا کو شش کر رہے ہیں کہ کسی سے ہمیں مدد مل جائے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”وہ کیسے؟“ ایک دم سے اس نے پوچھا۔

”آپ کو پتہ ہے کہ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر ایک کشتی بنائی ہوئی ہے۔ وہی ہمارے کام آئے گی۔ ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”ہم یہاں سے چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے ہیں۔“ واٹسن نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو ہیری نے اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ ایملی اور ہیری کی آنکھوں میں سوال تھا، جس کا اس نے واٹسن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اصل میں اس جزیرے کے ارد گرد ایک ٹائٹل میل دور تک اور گنبد کی صورت میں ایک ان دیکھا حفاظتی حصار ہے۔ جو الیکٹریک شاک دیتا ہے۔ اس کے ساتھ جو بھی ٹکراتا ہے، وہ یا تو جل جاتا ہے یا شاک سے مر جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی نہیں آ سکتا اور نہ باہر جاسکتا ہے۔“

”وہ ہیلی کاپٹر کیسے آ جاتے ہیں؟“ ایملی نے تیزی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ جس وقت یہاں آتے ہیں، وقتی طور پر وہ حصار بند یا ختم کر دیتے ہیں۔ جب فضا میں واپس

جاتے ہیں تو پھر دوبارہ آن کر دیتے ہیں۔ یہ دو طرح کے مقصد کے لیے تھا، ایک یہ کہ ہم باہر نہ جاسکیں اور دوسرا باہر سے کوئی اندر نہ آ سکے۔“

”ہم نے یہاں سے جانے کی کوشش نہیں کی اور باہر سے یہاں کوئی نہیں آیا، مگر یہ سب کیوں؟“ ایملی نے لاشعوری طور پر کہا اور پھر ہیری کی طرف دیکھ کر ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ پھر جلدی سے بات بتاتے ہوئے بولی۔

”کیا وہ پھر آئیں گے؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سوائے اس کے کہ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اب باہر سے کھانے پینے سے لے کر کسی بھی قسم کی کوئی مدد نہیں آئے گی۔ میں وہ الیکٹرک حصار توڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم اندازہ لگاؤ کہ ہم کتنے دن تک یہاں رہ سکتے ہیں۔“ واٹسن نے کہا اور فریج کی جانب بڑھا۔ ہیری خاموشی سے یہ سب سن رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر باہر کی طرف جانے لگا تو واٹسن نے اس سے کہا۔

”ہیری تمہارے بدن میں گولیاں لگی تھیں، کیا وہ ابھی تک.....“

”وہ نکل گئی ہیں، انہوں نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ تبھی واٹسن نے بے یقینی کے سے انداز میں پوچھا۔

”مگر کیسے؟ تمہیں درد بھی نہیں ہوا؟“

”درد تو ہوا، جیسے کوئی بہت زور سے چیر لگتی ہے، لیکن وہ میری جلد ہی میں اٹک گئیں، یوں جس طرح کانٹا چبھتا ہے، میں نے وہ سب نکال دیں تو سکون ہو گیا۔“ اس نے یوں جواب دیا جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہو، جس پر وہ کچھ نہیں بولا تو ہیری باہر کی جانب چلا گیا۔ وہ دور ندی کنارے جا کھڑا ہوا۔ واٹسن اور ایملی اسے دیکھ رہے تھے۔ تبھی ایملی نے کہا۔

”تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں؟“

”ہاں! اور میں سمجھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر ایکس نے اس پر ہی کوئی تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔“ واٹسن نے ڈکھ بھرے لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کا رخ اپنی لیبارٹری کی طرف تھا۔ اس کی چال میں ایک عجیب طرح کی تحکک کا احساس تھا۔ ایملی سوچوں میں گم ہو گئی۔ اسے ہیری کے بارے میں اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں؟“ میں نے اس لڑکی المانیہ سے پوچھا، جب وہ اپنی بات ختم کر چکی۔

”ہمارا برطانیہ میں موجود ٹام کی لیبارٹری کے کچھ لوگوں سے رابطہ ہے۔ انہیں وہ سب پتہ ہے، جو وہاں جزیرے پر ہو رہا ہے یا ہو گیا ہے۔ یہ کل شام تک کی بات ہے، اس کے بعد کیا ہوا، میں نہیں جانتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب سوال یہ ہے کہ جب تم لوگوں کو جزیرے کے بارے میں پتہ ہے تو پھر تم لوگ یہاں کیوں چھپ رہے ہو، برطانیہ کی حکومت کو کیوں نہیں بتا دیتے ہو کہ ایسا سب کچھ ہو رہا ہے؟“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں جزیرے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، وہ کہاں پر ہے، اگر پتہ ہوتا تو کچھ کرتے، دوسرا جب تک ہم حکومت کو بتاتے، وہ ہماری بات پر یقین کرتی، تب تک وہ سب ہو جاتا جو، اب ہو گیا ہوا ہے، ہمارے پاس نہ تو کوئی وسائل ہیں کہ وہاں تک پہنچ سکیں اور نہ طاقت کہ ٹام وغیرہ سے لڑ سکیں، اس کے پیچھے ایک بہت بڑی مافیا ہے۔ اس جزیرے کا پورا کنٹرول انہی کے ہاتھ میں ہے ان کی مرضی کے بغیر وہاں نہ کوئی آ سکتا ہے

اور نہ جاسکتا ہے۔ سو ڈاکٹر حسن رضوی نے چھپ جانا ہی مناسب سمجھا۔“ اس نے تیزی سے بتایا
”بات اب بھی عقل میں نہیں آ رہی ہے، چھپ جانا تھا تو پھر اغوا کا اتنا بڑا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“
میں نے اُس سے پوچھا۔

”اس لیے کہ کوئی بھی ہم سے رابطہ نہ کر سکے، ہم اپنے پلان کے مطابق چھپ گئے تھے، لیکن یہ پولیس آفیسر ہم
تک آپہنچا، اس سے بھی جان چھڑائی تو یہ پھر آن نکرایا۔ اب ہم منظر عام پر آ بھی جائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔“ المانیہ
مایوسانہ لہجے میں بولی۔

”کیوں فائدہ کیوں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھیں جب یہ تجربہ شروع کیا گیا تھا تو اسے تین مختلف لوگوں میں بانٹ دیا گیا تھا، ہر بندہ اپنے حصے کا کام
کرتا تھا۔ ڈاکٹر حسن رضوی کے پاس وہ کوڑ ہیں، جن سے اس لڑکے ہیری کو اپنی مرضی سے چلایا جاسکتا ہے۔ ٹام وہ
کوڑ مانگ رہا ہے، جبکہ ڈاکٹر اسے ڈی کوڑ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ نارل بچہ ہی رہے۔ یا کم از کم ایسا بچہ بن جائے
جو انسانیت کے کام آئے، تباہی کا باعث نہ بنے۔“

”کیا اب بھی وقت ہے کہ اسے ڈی کوڑ کیا جاسکتا ہے، اسے اپنی.....“ میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

”وقت گزر گیا ہے یا نہیں یہ تو ڈاکٹر ہی بتائیں گے۔ لیکن تب تک باقی لوگ معصوم بچے، وہ سب بے گناہ
مارے جائیں گے، ہیری کی وحشت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے یا پھر باہر سے آنے والے لوگ انہیں مار دیں گے۔
ایک پوری رات گزر چکی ہے، اب تک پتہ نہیں کیا ہو گیا ہوگا۔ افسوس اسی بات کا ہے۔“

”اچھا تم ایسا کرو، ڈاکٹر کا نمبر دو، ہم اس سے بات کرتے ہیں، جزیرے کے بارے میں بھی جان لیتے ہیں
ہیری اب۔“ میں نے کہا تو اس نے بتایا

”میرے اسی سیل فون میں ہے۔ نانو کے نام سے، لیکن آپ مجھے کانفرنس میں لے لیں گے تو وہ اعتماد کریں گے
، ورنہ شاید وہ بات بھی نہ کریں۔“

اوکے۔“ میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔ میں نے سب کی طرف دیکھا اور وہ پوری طرح متوجہ تھے۔ میں نے نمبر
دیکھا اور کال ملا دی۔ کال ملتے ہی چند لمحوں بعد ایک ٹھٹھرتی ہوئی آواز سنائی دی
”کہاں ہو میری بچی، کس نے.....“

”المانیہ محفوظ ہے ڈاکٹر اور بہت آرام سے ہے۔ میں ابھی ان سے آپ کی بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور
کانفرنس میں المانیہ کو لے لیا۔“

”نانو میں ہر طرح سے ٹھیک ہوں، آپ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔“ اس لڑکی نے تیزی سے کہا۔

”اگر آپ تعاون کریں تو ہم اس جزیرے تک پہنچ سکتے ہیں، اب آپ پتہ نہیں ہم پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں؟“
میں نے کہا تو وہ بولا۔

”میری بیٹی مجھے واپس کر دو، میں ہر طرح سے تعاون کروں گا۔“ اس نے اسی ٹھٹھری ہوئی آواز میں کہا۔

”نانو میں کبہر رہی ہوں کہ آپ ان پر اعتماد کریں۔ میں کچھ دیر بعد آپ کے پاس ہوں گی۔“ اس نے زور دیتے
ہوئے کہا تو میں نے کہا۔

”ڈاکٹر اگر آپ ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں معلومات دیں تو ممکن ہے ہم ان معصوم لوگوں کو بچا پائیں۔“

”غلطی میری ہے کہ میں برطانیہ سے بھاگ آیا، مجھے سب کچھ بتا دینا چاہئے تھا، لیکن جب تک مجھے بھی نہیں پتہ

تھا کہ وہ جزیرہ کہاں ہے؟ اب وہاں کے حالات معلوم ہوئے ہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ تم یا کوئی دوسرا، اُن معصوم جانوں
کو بچا پائے گا، وہ ہیری ورنہ بن چکا ہوگا اور اب تک ان کو مار چکا ہوگا۔“ ڈاکٹر نے افسوس سے کہا۔

”ہیری کو مارا جاسکتا ہے اب یا وہ نارل لڑکا بن سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے یہ فکر نہیں ہے کہ اسے مارا جاسکتا ہے یا نہیں، مجھے کچھ اور ڈر ہے؟“ ڈاکٹر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”دراصل، یہ سارا کھیل ہی غلط تھا، ہم نے جنیک انجینئرنگ کا غلط استعمال کیا۔ کیا تم سمجھتے ہو تو ہوا بہت جنیک
انجینئرنگ کے بارے میں؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ بتا دو۔“ میں نے کہا۔

”جنیک انجینئرنگ ایک جادو کی چھڑی ہے، جس سے جو چاہو، وہ ہو تو جاتا ہے، لیکن اگر اخلاقی حدود میں
رہے تو انسانیت کی بھلائی، ورنہ تباہی ہے۔ ہم نے تو بھلا ہی سوچا تھا لیکن ٹام اسے تباہی کی طرف لے جانے کا
منصوبہ رکھتا ہے۔ جنیک انجینئرنگ عام ہو چکی ہے، اس سے بنیادی سیل میں تبدیلی لائی جاتی ہے اور جسم کے
حالات، ساخت اور ہیئت کو بدلا جاسکتا ہے۔ جیسے کسی کی نسل میں نیلی آنکھیں ہوں اور جنیک انجینئرنگ کے بعد
اگلی نسل میں کالی آنکھیں ممکن ہیں۔ پودوں پر، پھلوں پھولوں پر تو بے شمار تجربات ہو چکے ہیں۔ ہم نے ایک ایسا بچہ
بنانے کی کوشش کی جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے غیر معمولی ہو۔ میں نے، ڈاکٹر ایکس اور روبن اسمتھ نے یہ تجربہ کیا۔
پندرہ برس وقت تھا۔ وہ دونوں مر گئے، اب کوڑ میں جانتا ہوں، اسی سے ہیری کو ایسا غیر معمولی ذہن بنانا تھا کہ کمپیوٹر
اس کے سامنے معمولی چیز رہ جاتی، لیکن ٹام نے اپنی احمقانہ حرکتوں سے اس کے اندر منفی ڈی کوڈنگ کر دی ہے۔
اب وہ ظالم، وحشی اور ورنہ بن جائے گا۔ بن کیا جائے گا، بن گیا ہے۔“

”اگر کسی طرح سے ان لوگوں کو وہاں سے نکال لیا جائے اور ہیری کو وہیں رہنے دیا جائے تو؟“ میں نے ایک
خیال کے تحت پوچھا۔

”مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ وہ لوگ وہاں مرجائیں گے، لیکن ان کے مرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا، ہیری اگر
مر جاتا ہے تو ڈر کا امکان تب بھی ہے۔ اس کے ڈی این اے سے وہ کلوننگ کر لیں گے، اس سے تو وہ اگلے پندرہ
برس میں ایک فوج کھڑی کر سکتے ہیں۔ اصل یہ ڈر ہے۔ وہ بھی یہی چاہتے ہیں، یہی ان کا منصوبہ ہے۔“

”اوہ۔! یہ تو بڑا خطرناک منصوبہ ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا کیونکہ یہ دنیا پر بہت بڑی آفت ٹوٹنے والی تھی۔
میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”اوکے، ڈاکٹر میں کچھ کرتا ہوں۔ کیا اسے زندہ لایا جائے تو ممکن ہے کہ وہ نارل ہو جائے؟“

”مجھے نہیں لگتا کہ تم اسے لاسکو یا کوئی بھی اسے لاسکتا ہے، اس کے اندر جو اچانک حالات بدلنے سے ڈی
کوڈنگ ہو گئی ہے، اس کا کوئی حل نہیں ہے۔“ اس نے مایوسانہ جواب دیا۔

”اوکے، میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور سب کی طرف
دیکھا۔ وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔

”پہلے جزیرہ تو دیکھ لیں۔ وہ کہاں پر ہے۔“ فہیم نے تیزی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

”کتنا وقت لگے گا؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

”تم جاؤ اور تلاش کرو، جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ رویت اور ارون بھی چلے گئے۔

”پلان کیا ہے؟“ سلمان سارہ بات کو سمجھتا ہوا بولا تو میں نے انہی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم کب تک کراچی پہنچ سکتے ہو جلد از جلد؟“

اس نے رسٹ واپس دیکھ کر ایک لمحے کو سوچا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

”اگر، میں یہاں سے ابھی چلوں اور مجھے ایک گھنٹے بعد جہاز مل جائے تو اگلے دو گھنٹے بعد میں وہاں ہوں گا۔“

”چلو ہم نکلتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو سلمان تیزی سے بولا۔

”آپ رہیں ادھر، آپ لمحہ بہ لمحہ ہمارے ساتھ ہوں گے، ہم بات بھی کر سکیں گے۔ بہت زبردست نظام فٹ کر دیا ہے یہاں۔ گیت کو ادھر رکھیں، باقی ہم سب جاتے ہیں، تین گھنٹے بعد رابطہ ہوتا ہے۔“

”اوکے، دس یو گنڈ لک۔“ میں نے کہا تو اٹھتے چلے گئے۔ میں انہیں پورچ تک چھوڑ کے آیا اور واپس آتے ہی فہیم کے پاس چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اس وقت جہاں سوکر اٹھا تھا۔ اسے تیار ہونے میں ذرا وقت لگ گیا۔ وہ لاؤنج میں آیا تو نوٹن کور کے ساتھ سندھپ کور بڑے فریش موڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ وہ ان کے پاس دھرے ایک صوفے پر آن بیٹھا۔

”کوئی خبر باہر کی؟“ اس نے بیٹھ کر پوچھا۔

”وہی، پولیس اور ایجنسیاں تلاش کر رہی ہیں۔“ نوٹن کور نے بتایا۔

”باقی سب؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ چن سگھ کے پاس ہیں۔ ادھر وہ محفوظ ہیں۔ ادھر بھی کوئی خطرہ تو نہیں، محتاط تو ہونا ہی ہے۔“ اس نے عام سے لہجے میں صورت حال بتائی۔

”اب پروگرام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پہلا تو یہی تھا کہ سندھپ کور کو وہاں سے نکال لیا جائے۔ دوسرا میرے ذمے یہ تھا کہ جہاں یہ سندھپ رہی ہے، اس ادارے کی پوری جانکاری لی جائے، وہ میں نے لے کر بھیج دی ہے۔ تیسرا یہ کہ احکام آنے تک ہم یہیں ہیں۔“ اس نے تفصیل بتادی۔

”اور بے کار رہنے سے بندے کو بھوک بھی لگتی ہے۔ اس کا کچھ بندوبست ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”بالکل ہے، ابھی ناشتہ آ جاتا ہے۔“ نوٹن نے کہا اور اٹھ گئی۔ سندھپ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اور جمال بہت گہرے اور جگری دوست ہو۔“

”ہاں یہ تو ہے، تم نے کیسا پایا؟“ جہاں نے پوچھا۔

”بہت اچھا ہے، اس کے ساتھ رہنے میں مزہ آیا، اس میں اعتماد بلا کا ہے، شاید یہی چیز اسے نڈر بنائے ہوئے ہے۔“ اس نے اپنے طور پر رائے دی۔

”اور بائیتا؟“ جہاں نے یونہی پوچھا۔

”اس کے بارے میں سن کر بڑا افسوس ہوا، بہت جان دار لڑکی ہے، مجھے اس نے صرف جمال کی وجہ سے کچھ نہیں کہا۔ ورنہ اس کی فائٹ، کیا بات تھی۔“ وہ تعریف کئے بنا نہیں رہ سکی۔

”ہاں، یہ ایک قرض ہے مجھ پر، جسے بہت جلد چکانا ہے۔“ وہ خود گلانی کے سے انداز میں بولا۔

”تو دیر کس بات کی ہے، پتہ ہے کس نے کیا یہ سب؟“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہی تو پتہ نہیں ہے، ورنہ اب تک اس کا کام نہ کر چکا ہوتا۔“ جہاں نے بے بسی سے کہا۔ اس وقت تک نوٹن کور بھی وہیں آگئی۔ وہ بیٹھ گئی تو سندھپ کور نے کہا۔

”یہ کون سا بڑی بات ہے، میں نہیں بتاتی ہوں۔“

”بولو۔“ وہ پوری توجہ سے بولا۔

”یہاں امرتسر میں باقاعدہ ایک منصوبے کے ساتھ نرکاری سکھوں کو پرموٹ کیا جاتا رہا ہے، اور انہیں ہر طرح کا تحفظ بھی دیا جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہ امرت دھاری سکھوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہ تو مجھے معلوم ہے۔“ جہاں نے کہا۔

”انہی نرکاریوں میں سے سردار ہرنیت سگھ ہے، وہی اس انسٹیٹیوٹ کا انچارج بھی ہے، جہاں میں رہی ہوں۔ اگر تو ”را“ اور ایجنسیاں اس میں ملوث ہیں تو اس کی اجازت کے بغیر یہاں کارروائی نہیں ہوتی۔ اب یہ دیکھ لو، جس قدر وہ مہمان بندہ ہے، اس کی سیکورٹی اور معاملات کیسے ہوں گے، یہ دیکھتے ہوئے تو پورا ایک مہینہ لگ جائے گا۔“

”یہ پکا ہے کہ وہی بائیتا کور پر حملے کا ذمہ دار ہے۔“ جہاں نے پوچھا تو نوٹن کور بولی۔

”وہ صرف بائیتا کور کو نشانہ بنانے نہیں آئے تھے، انہیں اس پورے جھٹے پر شک تھا۔ شک کیا، یقین ہے انہیں۔“

”را“ کے تحت ہونے والے معاملات ایک بندہ ہی دیکھتا ہے اور یہ کچی بات ہے وہ نرکاریوں میں سے ہی ہوتا ہے، باقی رہی پکا کرنے کی بات، وہ ابھی کچھ دیر میں ہو جائے گی۔“

”اسے پکا کرو، جلدی۔“ جہاں نے کہا اور مضطرب ہو کر صوفے پر پہلو بدلنے لگا۔ اتنے میں وہاں کی ایک ملازمہ نے ناشتہ لگا دینے کی بابت بتایا تو وہ اٹھ گیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ نوٹن کور فون پر مصروف رہی۔ اس دوران سندھپ آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ ایسے میں نوٹن کور پلٹ کے ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”وہی ہے، میرے ذرائع بے پرکی نہیں اڑاتے۔“

”اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے۔“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا، تبھی سندھپ اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں گھاس ڈالتی ہوں۔“

”گھاس مطلب؟“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”انسٹیٹیوٹ میں سینٹرل درما کی طرح ایک دوسرا بندہ بھی تھا، جو میرے بدن کا خواہشمند تھا اور اب بھی ہے۔۔۔ نند ہائیل نام ہے اس کا۔ ادھر گردناک پورہ میں رہتا ہے۔ تم مجھے کور دینا، میں اس سے رابطہ کرتی ہوں۔“

”وہ کیا.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

”کہہ رہی ہوں نا، وہ اس بندے کے بہت قریب ہے، یہ انفارمیشن میں نکال دوں گی کہ ہرنیت سگھ کب کہاں ہے۔“

”او کے، جو کرتا ہے کرو۔“ جہاں نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا تو سندپ کور نے اپنی پتلون کی جیب سے سیل فون نکالا تو جہاں نے پوچھا۔

”یہ فون.....؟“

”میں نے منگوایا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سوچ سوچ کر نمبر ملانے لگی تبھی فون کور نے تیزی سے کہا۔

”ٹھہرو ٹھہرو، یونہی اسے کال نہ کرو، پہلے پوری طرح سوچ لو، ہم سے ڈسکس کر لیں، پھر کوئی قدم اٹھانا۔“

”ہاں، سندپ، اس وقت تمہاری صورت حال بھی یہی ہے کہ تم اغوا ہو، پھر دوبارہ ان کے چنگل میں پھنس گئی تو۔“ جہاں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں اسے پھنسانے کی کوشش کروں گی اور مجھے اُمید ہے کہ وہ میرے بدن کے لالچ میں پھنس جائے گا۔ میں اس سے معلومات نکلوا لوں گی۔“

”تمہیں اغوا کیا گیا ہے، کس نے کیا، ان کے چنگل سے کیسے نکلی وغیرہ وغیرہ.....“ فون نے کہا۔

”سیدھی سی بات ہے کہ پتہ نہیں وہ کون تھے، وہ کیا چاہتے تھے، وہ مجھے ایک جگہ لے گئے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے، میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اتنی سی کہانی سنانی ہے۔“

”اور اگر اس نے.....“ فون کور نے پوچھنا چاہا تو سندپ کور اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

”تم بھی ایک عورت ہو، کیوں نہیں سمجھ رہی ہو کہ بھوکے کتے کے آگے اگر ہڈی ڈال دی جائے، یا گرم گرم گوشت رکھ دیا جائے تو اس کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا تا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں نفرت کی انتہا تھی۔ جہاں کچھ نہیں بولا تو فون کور نے کہا۔

”اچھا ذرا ٹھہرو۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر کچھ دور پڑے ایک بیک کے پاس گئی، اس میں سے ایک فون سیٹ نکالا اور واپس آ کر اسے دیتے ہوئے بولی۔

”وہ فون، عام سا ہے، تم یہ فون رکھو، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسا مانک بھی ہے، جو ہمارے ساتھ جڑا ہوا ہے، یہ قریب ہوگا تو ہر آواز، ہم تک پہنچ جائے گی۔“

”ہاں یہ کام کی چیز ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی، پھر اس کی آپریٹنگ سمجھ کر اپنے پاس والے فون سے سم نکال کر اس میں ڈالی اور اس سے رابطہ کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اسپیکر آن کر دیا۔ اپنا تعارف کرا کے بولی۔

”بہت مصیبت میں ہوں اس وقت، میرا کوئی حال نہیں ہے، میرے پاس تو رہنے کا بھی ٹھکانہ نہیں، آپ کو تو پتہ ہے سرکہ تفتیش کے نام پر مجھے کس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے۔ مجھے بس ٹھکانہ چاہئے۔“

”میری یاد تمہیں کیسے آئی، وہ بھی میری یاد ہے؟“ اس نے طنز یہ لہجہ میں پوچھا تو وہ ڈھیلے سے لہجے میں بولی۔

”سر میں اور کس کے پاس جاؤں، میرے ادارے ہی کے لوگ میری مدد کریں گے، سینٹل ورما کے بعد ایک آپ ہی تو ہیں، جنہیں میں یاد کر سکتی ہوں۔“

”تم تو اغوا ہو گئی تھیں۔“ اس نے پوچھا۔

”سر میں ساری تفصیل مل کر بتا دوں گی نا، اگر آپ مجھے چند دن تحفظ دے سکتے ہیں تو پلیز میری مدد کریں۔“

”کیوں نہیں، لیکن میرا جو مطالبہ پہلے تھا، اب بھی وہی ہوگا، تب تم ہاتھ نہیں آئیں، اب اگر.....“

”میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں، ویسے بھی سینٹل ورما کے بعد کوئی مرد ہیں تو آپ، میں خود بہت خواہش مند ہوں، کوئی دوسرا ملا ہی نہیں، اور میں خود.....“ وہ کہتے کہتے جان بوجھ کر رک گئی

”اوہو، تو اصل بات یہ ہے، بولو کہاں ہو، میں تمہیں پک کر لیتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”لیکن سر مجھے چند دن رہنا ہے، یوں ایک دن یا رات نہیں، مجھے کم از کم اتنے دن کہ میں کوئی اپنا ٹھکانہ.....“ اس نے اپنی بات کہنا چاہی تو وہ بولا۔

”اوکم آن، اس شہر میں میرے کئی فلیٹ ہیں، ایک میں تم رہ لینا، جب تک رہنا چاہو۔“ اس نے کہا تو سندپ نے اسے وہ لوکیشن بتا دی، جو وہ جہاں اور فون سے ملے کر چکی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ نکل پڑے۔ فون کور اور جہاں اپنی کار میں تھے، جبکہ سندپ کور نے آٹو رکشہ لے لیا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے سندھو پارک میں آ گئے۔ وہ ایک دوسرے سے یوں لائق تھے، جیسے ان میں شناسائی ہی نہ ہو۔ جہاں اور فون ٹہلتے ہوئے ایک بیچ پر جا بیٹھے اور سندپ ان سے ذرا فاصلے پر ایک بچ پر بیٹھ گئی۔ تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے، ایک لمبے قد اور پکی عمر کا شخص ادھر ادھر دیکھتا ہوا، سندپ کور کے پاس جا پہنچا۔ سندپ کور کچھ زیادہ ہی والہانہ انداز سے ملی۔ وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ سندپ کور نے ایک کہانی گھڑی کہ وہ کس طرح ان اغوا کاروں کے چنگل سے آزاد ہوئی اور صبح سے دھکے کھا رہی ہے۔ وہ اب کچھ دن چھپ کر رہنا چاہتی ہے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس دوران جہاں اور فون ارد گرد کی ایسے بندے یا بندوں کو پچاننے کی کوشش کرتے رہے، جن پر یہ شک ہو کہ وہ نند پائیل کے ساتھ آئے ہوں یا ان کی نگرانی کر رہے ہو۔ انہیں ایسا کوئی شخص دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کسی پر شک ہوا۔ وہ دونوں اٹھ گئے تو جہاں کے ساتھ فون بھی اٹھ گئی۔ اس نے احتیاط چن سکھ کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اس لیے کسی بھی وقت ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔

پارک کے باہر ایک نئے ماڈل کی کار میں بیٹھ رہے تھے، یہ دونوں بھی اپنی کار میں جا بیٹھے۔ اگلے لمحوں میں وہ ان کے پیچھے تھے۔ وہ گردناک پورہ کے علاقے میں کھیم کرن روڈ کے اندر ایک گلی میں جاؤ گے۔ وہ ایک درمیانے درجے کا گھر تھا۔ وہ اپنی کار پورچ میں لے گیا اور یہ آگے بڑھ گئے۔ سفر کے دوران نند پائیل اور سندپ باتیں کرتے رہے۔ انہوں واضح طور پر محسوس کیا کہ سندپ کی بات درست تھی۔ نند پائیل کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا، بلکہ وہ جلد از جلد اس جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا کہ جو بڑی اس کے سامنے آگئی ہے اسے جھنجھوڑ سکے۔

سندپ اس کی بے چینی کا بھرپور فائدہ اٹھا چاہ رہی تھی۔ وہ دونوں اس گھر کے قریب ہی کار میں بیٹھے ان کی آوازیں سن رہے تھے۔ وہ نند پائیل سے یہ منوانا چاہ رہی تھی کہ پائیل اس کی ملاقات ہر نیت سکھ سے کروادے تاکہ وہ اس سے مل کر اپنی بے گناہی ثابت کر سکے۔ یا کم از کم یہ اجازت لے سکے کہ اسے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے دی جائے۔ یہ جو تفتیش کے نام پر اسے ذلیل کیا جا رہا ہے یہ بند ہونا چاہئے۔ یا پھر سیدھے جیل ہی میں ڈال دیں۔ کچھ تو ہو۔

”دیکھ میں جاتا ہوں اس کے پاس، بات کروں گا اس سے پہلے اسے تیری ساری اسٹوری سناؤں گا، اگر اس نے ملنے کو بولا تو میں تجھے لے جاؤں گا۔ اب یہ ایک دم کا معاملہ تو نہیں ہے نا۔“ وہ شاطرانہ لہجہ میں بولا۔

دو گھنٹے سے زیادہ وہ اس کے ساتھ مغز ماری کرتی رہی لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا، اس دوران انہوں نے شراب پی کھانا کھایا، وہ اسے فوراً بیڈ تک لے جانا چاہتا تھا۔ آخر سندپ نے باتوں ہی باتوں میں پوچھ لیا کہ اس گھر میں

کون کون ہیں۔ وہاں تین ملازم تھے۔ ایک چوکیدار، دو گھر کے اندر میاں بیوی تھے۔ سندپ نے اشارہ دے دیا کہ انہیں اب مداخلت کر دینی چاہئے کیونکہ وہ ایسے نہیں ماننے والا۔

مگر وہ سندپ سے زیادہ شاطر نکلا تھا۔ وہ جیسے ہی سندپ کو اپنے گھر لایا، اس نے یہ خبر ہر نیت سنگھ کو دے دی کہ وہ اغوا ہونے والی لڑکی اس کے پاس ہے۔ اگرچہ اس بات کی خبر جہاں اور نوتن کو نہیں تھی لیکن انہوں نے گھر کے باہر کچھ ہی دیر بعد غیر معمولی ہچکل دیکھ لی تھی۔ سبھی اس نے دوبارہ چن سنگھ سے رابطہ کیا تو اس نے یہی بتایا کہ وہ بالکل قریب ہیں۔ جیسے ہی وہ کہے گی، پہنچ جائیں گے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ کافی گاڑیاں بھی آگئی تھیں۔ اندر دونوں کی بحث جاری تھی۔ یہاں تک کہ پائیل نے سندپ سے کہا کہ تم منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ، میں ہر نیت سے رابطہ کرتا ہوں۔ پھر اس کے پاس چلتے ہیں۔ سندپ اپنا فون وہیں چھوڑ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ تبھی جہاں اور نوتن حیران رہ گئے کہ ہر نیت کی وہاں آمد ہونے والی تھی۔ اسی لیے معمولی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ جہاں کے من میں سنسنی پھیل گئی۔ نوتن کو ر نے جلدی سے چن سنگھ کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

دوپہر ہونے کو تھی کہ ہر نیت سنگھ فور ڈیل میں وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ چار گاڑیاں تھیں، جن میں اس کے گاڑی موجود تھے۔ اس کی گاڑی سیدھی اندر چلی گئی۔ نوتن کے فون سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔

”اچھا تو یہ ہے وہ حسینہ، جس کے بڑے چرچے سنے تھے ہم نے، واقعی، جتنا خوبصورت سنا تھا، ارے یار یہ تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ یار اسے کچھ نہیں کہنا، بس اس سے یہ پوچھ لو کہ اس کے ساتھی کہاں ہیں، آرام سے بتا دے تو انعام کے طور پر میں اسے اپنی رکھیل رکھ لوں گا، عیش کرے گی ماں کی.....“ اس نے اپنی بات ایک غلیظ گالی پر ختم کی تو سندپ کو پر بھنا کر بولی۔

”اوائے دیکھ ہر نیت! میں نے جو تربیت لی ہے نا، وہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے کے لیے لی ہے، بھارت ماتا پر مرنے کے لیے لی ہے۔ میں ایک سپاہی ہوں، اب تم لوگ مجھے صرف ایک عورت سمجھ رہے ہو اور غلطی کر رہے ہو۔ اس لیے پائیل نے تم لوگوں کو جس مقصد کے لیے بھی بلایا ہے، میں مرتو جاؤں گی.....“

”اوائے بھاشن نہ دے، تو غدار ہے، تیرے ساتھ تو یہ سلوک ہونا چاہئے کہ تجھے چور ہے میں کھڑا کر کے آگ لگا دینی چاہئے۔ لیکن میں تو پھر تجھے اپنی رکھیل رکھنے کو راضی ہوں۔ بس اتنا بتا دے کہ تیرے ساتھی کہاں ہیں، جنہوں نے اسپتال سے تیرے اغوا کا ڈرامہ کیا اور اب مجھ تک پہنچنے کو پائیل کے پاس بھیج دیا۔ بول۔“ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”تم لوگ بہت غلط سمجھ رہے ہو، اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔ جو کرنا ہے کرو۔“ سندپ نے کہا تو چٹاخ کی آواز ابھری۔ جہاں انتہائی مضطرب ہو گیا۔ اس کے سامنے وہ گھر تھا۔ جس کے ایک طرف سڑک تھی، دائیں اور بائیں گھر تھے اور پچھلی طرف بھی گھر کی دیوار تھی۔ اس گھر کے سامنے گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن کے اندر اور باہر کئی لوگ تھے۔ کچھ گھر کے اندر تھے۔ انہوں نے یہ غلطی کر لی تھی کہ چھت پر کوئی نہیں چڑھا تھا۔ چن سنگھ کی طرف سے جہاں بلند پوسٹنگ وغیرہ آگئے تھے، وہیں، کافی سارے مزید لوگ بھی تھے۔ جہاں نے نوتن سے کہا کہ وہ سب کو بتا دے اور کار چلا دی۔ وہ پچھلی گلی میں چلا گیا۔ جب تک نوتن سب کو صورت حال سے آگاہ کر چکی تھی۔ اندازے کے مطابق گھر کے سامنے جیسے ہی جہاں نے کار روکی، نوتن نے اسے اسلحہ تھما دیا۔ اس کے پاس دو پستل، ایک لائچر اور چند دستی بم تھے۔ وہ اب رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ جہاں نے گیٹ کو دھکیلا، وہ بند تھا، اس نے بیل دینا مناسب

نہیں سمجھا، باؤنڈری وال سے اندر کود گیا۔ سامنے ہی لاؤنچ تھا، اس میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چیخنے لگی تو جہاں نے پستل اس کی طرف کر کے کہا۔

”پولیس! مجھے صرف چھت پر جانا ہے، ورنہ باہر سے کوئی آدمی اندر آ کر تجھے مار دے، سمجھی۔“ یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ سرعت سے اوپر پہنچا، تو وہ گھر کی دائیں جانب والی چھت پر تھا۔ دوسری چھت پر جانے کے لیے ایک چھوٹی سے دیوار تھی۔ وہ لمحوں میں کود گیا۔ اوپر سے اس نے دیکھ لیا کہ ان سیکورٹی والوں کے گرد بھی گھبراہٹ تھی۔ بلند پوسٹنگ پہنچ چکا تھا۔ وہ دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور فون پر بلند پوسٹ سے رابطہ کیا۔

”ہاں! مجھے نوتن نے بتا دیا ہے، کیا تم اوپر پہنچ چکے ہو؟“ اس نے تیزی سے پوچھا تو وہ بولا۔

”ہاں، اور میں دیکھ رہا ہوں کہ.....“

”وقت کم ہے، ٹو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔ تبھی اس نے دو ہینڈ گرنیڈ نکالے، یکے بعد دیگرے ان کی پٹنیں نکالیں اور ایک باہر کی جانب اچھال دیا اور ایک گھر کے اندر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی جہاں چھت پر لیٹ گیا۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ جس کے ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی شدید فائرنگ ہونے لگی۔ جہاں نے لیٹے لیٹے لائچر سیدھا کیا، اس میں راکٹ ڈالا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے سامنے کھڑی گاڑیوں کا نشانہ لیا اور اس ترتیب سے فائر کر دیا کہ زیادہ سے زیادہ گاڑیاں تباہ ہوں۔ دھماکے کے ساتھ لائچر پھٹا اور اس کے ساتھ ہی وہاں آگ لگ گئی۔ جہاں وہاں کھڑا نہیں رہا۔ وہ انہیں جبرود پر پلٹ کر اس جگہ آ گیا، جہاں سے نیچے جانے کا راستہ تھا۔ وہیں سے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔

توقع کے مطابق اسے سیڑھیوں پر لوگوں کے اوپر آنے کی دھمک سنائی دی، وہ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا، جیسے ہی اس نے ایک شخص کو باہر آتے ہوئے دیکھا، اس نے سر کا نشانہ لے کر فائر جھونک دیا۔ تب تک دوسرا پہنچ چکا تھا، جہاں نے اسے بھی نشانہ پر رکھ کر فائر کر دیا۔ سیڑھیاں صاف تھیں۔ وہ محتاط انداز میں نیچے کی طرف چلا گیا۔

وہ سیڑھیاں لاؤنچ ہی میں کھلتی تھیں۔ سامنے سندپ کو فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس پر پائیل کا پاؤں تھا، جبکہ ہر نیت سنگھ باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں کی آہٹ پا کر جیسے ہی پائیل مڑا، جہاں نے اس پر فائر جھونک دیا۔ اسی لمحے ہر نیت سنگھ پلٹا تو جہاں نے کہا۔

”اب رک جاؤ، ہلنا مت۔“

تبھی ہر نیت سنگھ دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے تیزی سے بولا۔

”دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، ہم بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں، جو بھی تم چاہو، ہم اس پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ تم فائر مت کرنا، آؤ۔“

”نہیں ہر نیت سنگھ، اب نہیں۔“ جہاں نے غصے میں کہا۔ اس دوران سندپ کو اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولی۔

”یہ سکھ تو م کی ہر بیٹی کی طرف سے ہے تمہارے منہ پر، جنہیں تو نے اس راہ پر لگایا۔ چل نکل باہر۔“ سندپ کو ر نے اسے گردن سے پکڑا اور باہر دھکیلنے لگی۔ باہر کا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں لاشیں پڑی ہوئیں تھیں۔

”سندپ چھوڑ دو اسے، ہم نکلیں۔“ جہاں نے کہا۔ تو وہ انتہائی نفرت سے بولی۔

”جب تک یہ ہے، ہم نکل سکیں گے، ورنہ.....“

”کچھ نہیں ہوگا، نکل۔“ جہاں نے ہر نیت سنگھ کو بازو پکڑتے ہوئے کہا، سندھپ نے اسے چھوڑا تو جہاں نے اس کے ماتھے پر پستل کی نال رکھتے ہوئے کہا۔

”بایں کور پر گولی چلانے والا، زندہ کیسے بچ جائے، یہ ممکن نہیں ہے میری جان۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اس کے ماتھے میں سوراخ کر دیا۔ وہ ایک لمحے کو اس کے ہاتھوں میں تڑپا تو اس نے ہر نیت کو چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر جا پڑا اور تڑپنے لگا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، وہ باہر نکل گئے۔ سامنے بچن کور کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ وہ جس وقت وہاں سے نکلے، وہاں سے باہر ابھی کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ چند منٹوں میں حکیم کرن روڈ پر سیدھے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

انسپکٹر، سلمان، زویا، علی نواز کے ساتھ المانیہ اس چھوٹے جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے، جو انہیں لمحہ بہ لمحہ ساحل سمندر سے بہت دور جزیرے کے پاس لے جا رہا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ گہرے نیلے پانی پر سورج کی کرنیں یوں چمک رہی تھیں، کہ ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ چور پر فورسز کو مطلع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حسن رضوی خود انسپکٹر کے ساتھ پولیس کے پاس چلا گیا تھا۔ انہیں وزارت داخلہ سے اجازت لینے میں اتنی دشواری نہیں ہوئی۔ سو وہ فورسز کے لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ میں کنٹرول روم میں بیٹھا ان کی کاروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ ہر بندے کے پاس کیمرا تھا، جس سے میں وہاں کے مناظر سمجھ سکتا تھا۔ وہ جزیرہ ساحل سے کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہ اب بالکل قریب پہنچنے والے تھے اور بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہوئے تھے۔ انہیں صرف یہی ڈر تھا کہ وہ کہیں انجانے میں اس حد تک نہ چلے جائیں، جہاں پر کشتی یا جو بھی اس کی رینج میں آتا تباہ ہو جاتا۔ اسی دوران ایک ہیلی کاپٹر فضا میں چکرانے لگا۔

فہیم اور اردو نے جو اندازہ لگایا تھا کہ یہ الیکٹرونک ریز کی ایک نا دیدہ دیوار ہے۔ جسے کہیں سے بھی کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ اس کی تصدیق حسن رضوی نے کر دی کہ ایسا ممکن ہے اور اس نے اس کا توڑ بھی دیا تھا۔ وہ ایک خاص فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے انہوں نے ہوا میں دور مار قسم کے راکٹ چلانا شروع کر دیے تاکہ جہاں الیکٹرونک دیوار ہو تو اس کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ انہیں زیادہ وقت انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی ایک راکٹ چلا گیا، وہ کچھ فاصلے پر جا کر ہوا ہی میں یوں جل گیا، جیسے کسی نے اسے آگ لگا دی ہو۔ وہ ایک دم سے بھسم ہو گیا۔ وہ سارے ایک دم سے ٹھنک گئے۔ جہاز کو فوری طور پر روک دیا گیا، جو پہلے ہی آہستہ چل رہا تھا۔ وہ رک چکے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ جب انہوں نے اس الیکٹرونک وال کا توڑ کرنا تھا۔

ایک خیال یہ تھا کہ بغیر اس دیوار کو چھیننے اس قدر گہرائی میں جایا جائے جہاں اس کے اثرات نہ ہوں اور نیچے سے دیوار پار کر لی جائے۔ اس طرح جہاں سے بھی اسے کنٹرول کیا جا رہا تھا، انہیں پتہ نہ چلتا۔ یہ ایک رسک تھا۔ انہیں پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ گہرائی میں اس دیوار کے اثرات ہیں بھی کہ نہیں؟ لیکن یہ بڑا دقت طلب تھا، واپسی پر نجانے کیا صورت حال ہوتی، اس لیے انہوں نے اس دیوار ہی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ فورسز کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے کہ اگر انہیں معلوم ہو جاتا ہے، اور وہ یہاں تک پہنچتے ہیں تو انہیں پکڑا جاسکتا ہے۔

ان سب کا فیصلہ یہی تھا کہ بعد میں جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا، لیکن اس وقت جزیرے تک پہنچنا ضروری ہے اور اس سے پہلے اس الیکٹرونک دیوار کو ختم کر کے ہی پہنچا جاسکتا تھا۔ عرشہ پر ایک بڑی ساری بیم نما سرچ لائٹ لائی گئی، اسے آن کرنے کے لیے ایک طاقت ور جنریٹر رکھا گیا تھا۔ اسے آن کیا گیا تو اس میں سے پہلی لیزر نکلیں۔

سامنے جہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہاں گلابی رنگ کی دیوار سی نظر آئی۔ اس بیم کا رخ جس طرف بھی کیا جاتا، وہاں ایسی ہی دیوار نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک جگہ اس کی شعاعیں ٹکا دی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد اسی بیم نما سرچ لائٹ سے گلابی شعاع نکلنے لگی۔ وہ شعاع جہاں پڑتی وہیں چنگاریں نکلتیں دھواں سا اٹھتا اور پھر ختم، اچانک دھواں فضا میں پھیل گیا۔ بیم نما سرچ لائٹ کی روشنی پہلی ہوئی اور پھر کچھ دیر بعد وہ بجھ گئی۔

ماہرین نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ الیکٹرونک دیوار ختم ہو گئی ہے۔ جس طرح پہلے راکٹ مار کر جانچا گیا تھا، انہوں نے دوبارہ جانچا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جہاز آہستہ آہستہ چل پڑا۔ سبھی لوگ کسی بھی متوقع صورت حال کے لیے تیار تھے۔ جہاز اس جگہ سے گذر گیا۔ دیوار ختم ہو گئی تھی۔ اس پہلی کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ وہ سبھی خوش تھے۔ کافی دور انہیں ایک سرسبز جزیرہ دکھائی دینے لگا تھا۔

اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی، جب وہ جزیرے سے کچھ دور آئے۔ وہ سبھی اسلحہ سے لیس کشتیوں پر بیٹھ کر کنارے تک جا پہنچے۔ انسپکٹر، سلمان، زویا، علی نواز، اور المانیہ کے ساتھ فورسز کے لوگ تھے۔ ان کے سامنے سرسبز و شاداب درختوں، پودوں جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ وہ اس میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ جزیرے پر آئے اور جنگل میں گھستے ہی پھیلنے چلے گئے۔ وہ ایک قطار میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے جس طرح جنگل کی مخصوص آواز ہوتی ہے، وہ آواز اس لیے بھی ہیبت ناک لگ رہی تھی کہ وہاں ہوا بہت تیز تھی۔ پرندوں کے بولنے کی آوازوں کے علاوہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گہرا سناٹا، روح تک میں اتر رہا ہو۔ وہ انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھتے گئے۔

تقریباً آدھا کلومیٹر جنگل عبور کر لینے کے بعد وہ کھلے میں آ گئے۔ وہاں سے آگے میدان تھا، کافی دور تک پھیلے ہوئے اس میدان کے ایک جانب انہیں پانی کی نہر بہتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ انہیں لکڑی کا ایک کانچ دکھائی دیا۔ اس کے باہر لان تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر شیڈ بنا ہوا تھا، جس کے نیچے ایک کمرہ تھا۔ اس کے ارد گرد لکڑی ہی سے باڑ لگی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے گئے۔

وہ لکڑی کے کانچ کے قریب پہنچے۔ وہاں بھی انہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔

”کیا انہیں یہاں سے اٹھا لیا گیا ہے؟“ ایک دم سے المانیہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”اس بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔“ اس کے قریب کھڑے انسپکٹر نے جواب دیا تو اسے اپنے سوال پر احساس ہوا کہ جس طرح اسے کچھ نہیں پتہ تو دوسروں کا کیا معلوم ہوگا۔ تب وہ بولی۔

”دیکھو! میں آواز لگاتی ہوں۔ تم سب لوگ ادھر ادھر خیال کرنا۔“ یہ کہہ کر کسی جواب کا انتظار کئے بنا وہ قریب ہی ایک نیلے پر چڑھ گئی اور زور زور سے پکارنے لگی۔ ”ایلی! ہیری! واٹسن! کہاں ہو! ہم تمہارے دوست ہیں۔ پلیز سامنے آؤ۔“

اس کی آواز کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔ کوئی ان کے سامنے نہیں آیا۔ المانیہ نے پھر آواز لگائی اور خاموش ہو کر کسی رد عمل کا انتظار کرنے لگی۔ کتنے ہی منٹ یونہی گذر گئے۔ اچانک نہر اور شیڈ کے درمیان سے ایک لڑکا برآمد ہوا۔ وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یوں ان کی طرف بڑھنے لگا، جیسے وہ انہیں جانتا ہو۔ اس کے اعزاز سے یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ گمان بھی نہ ہو کہ خوف نام کی کوئی شے بھی ہو سکتی ہے۔

”ضرور یہ ہیری ہے۔“ سلمان نے دھیرے سے کہا۔

”کم آن ہیری۔“ المانیہ نے اس کی طرف دیکھ کر زور سے کہا اور ہاتھ ہلانے لگی۔

وہ ہیری ہی تھا جو ان سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ ان کی طرف یوں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کوئی دوسری مخلوق ہوں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی، جس میں شک، بے اعتمادی اور غصہ چمک رہا تھا۔ وہ ایک نلک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے المانیہ ہی آگے بڑھی۔

”ہیری، میں المانیہ، میں تمہاری اور تمہاری فیملی کو بچانے آئی ہوں۔ واٹسن.....“

”وہیں رُک جاؤ۔“ ہیری نے تیزی سے کہا تو المانیہ یکدم وہیں رک گئی۔ تب سلمان آگے بڑھا اور بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم اپنی ماما یا باپا کو بلاؤ، ہم تم سب کے لیے آئے ہیں، وہ ہماری بات سمجھیں گے۔“

”جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”دیکھو! ہم وہ نہیں ہیں، جنہوں نے تم لوگوں پر حملہ کیا تھا۔ وہ دوبارہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ تم ہماری بات نہیں سمجھ پاؤ گے، وہ اگر یہاں نہیں آسکتے تو مجھے ان کے پاس لے چلو، میں انہیں سمجھاتا ہوں۔“ سلمان نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے آؤ، باقی سب ادھر رہیں۔“ اس نے ایک دم سے کہا تو المانیہ کے ساتھ سلمان آگے بڑھ گئے۔

وہ تینوں کا بیچ اور نہر کے درمیان جگہ پر جا پہنچے، جہاں وہ سب یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے چھپ گئے ہوں۔ وہ انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے ان کے آپس میں تعارف میں گزر گئے۔ تب المانیہ نے اپنی جیب سے ایک پرانی تصویر نکالی اور واٹسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیا لندن میں تجربے سے گزرنے کے دوران کبھی اس بندے کو آپ نے دیکھا۔“

واٹسن اس تصویر کو چند لمحے گھورتا رہا، پھر ایملی کی جانب بڑھادی اس نے فوراً ہی پر جوش لہجے میں کہا۔

”ہاں، کیوں نہیں، یہ وہاں ڈاکٹر تھا، اور اکثر میرے ٹیٹ کیا کرتا تھا۔“

”وہ تھا نہیں ہے۔“ المانیہ نے تیزی سے کہا۔

”وہ میرے نانا ہیں اور اس وقت پاکستان میں ہیں۔ یہ سب انہی کی وجہ سے ممکن ہو پایا ہے کہ ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر آپ لوگ سکون سے ہماری بات سن لیں تو ہم ہی وہ لوگ ہیں جو سب کو محفوظ ٹھکانے تک لے جاسکتے ہیں۔“

”آپ بچوں سے کہیں کہ وہ کانچ میں چلے جائیں، انہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ سلمان نے کہا تو واٹسن نے ہیری کو اشارہ کیا کہ وہ سب کو لے جائیں۔ وہ چلے گئے تو المانیہ نے انتہائی اختصار سے ساری بات ان دونوں کو بتا دی۔

”کیا ہیری ٹھیک ہو جائے گا۔“ ایملی نے پوچھا۔

”نانا کہتے ہیں کہ اسے لندن لے جانا ہوگا، وہاں اس کی دوبارہ سے ٹریٹمنٹ ہوگی، سو فیصد امکان تو نہیں ہے، ممکن ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”ایک سادہ سا سوال ہے کہ ہم تم پر کیسے یقین کر لیں کہ تم انہی کے ساتھ نہیں ہو جنہوں نے یہاں حملہ کیا تھا۔“ واٹسن نے سکون سے کہا۔

”یہ تم بتا دو۔ تم کیسے یقین کر سکتے ہو؟“ سلمان نے کہا تو وہ بے یقینی کے انداز میں بولا۔

”لندن میں میری بات ہو سکتی ہے؟“

”کس سے کرنی ہے بات؟“ المانیہ نے بڑے قہر سے پوچھا تو اس نے کہا۔

”میرا دوست تھا، جارج پال، کیا اس سے بات ہو سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر اس نے بتایا کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ المانیہ نے ہائی بھری اور سلائیٹ فون سے رابطہ کرنے کا کہا۔ اس دوران واٹسن ان سے الیکٹریک دیوار کے بارے میں پوچھتا رہا کہ وہ کیسے ختم کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ انہی باتوں کے دوران اس نے کہا۔

”جیسے ہی تم لوگوں نے وہ دیوار ختم کی ہوگی، اسی وقت انہیں پتہ چل گیا ہوگا جہاں سے بھی یہ آپریٹ کی جاتی تھی۔“

”وہی تو ہمارا خیال ہے کہ تم جلدی کرو، کہیں وہ دوبارہ یہاں نہ پہنچ جائیں۔“

”لیکن میں کیسے.....“ یہ کہتے ہوئے واٹسن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”نہیں، جب تک تمہیں یقین نہیں ہو جاتا۔“ سلمان نے حتیٰ لہجے میں کہا اور فون کو دیکھنے لگا۔ بلاشبہ اس کے دوست کو تلاش کیا جا رہا ہوگا۔

سہ پہر سے شام ہو رہی تھی، جب واٹسن کی بات جارج پال سے کروا دی۔ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ ایملی پر جوش تھی کہ وہ اس ویران جزیرے سے جا رہی ہے۔ وہ بچوں کو تیار کر رہی تھی۔ واٹسن اپنی لیب سے چیزیں اٹھا کر ان کے پاس آ گیا۔ وہ سارے ان کے ساتھ وہاں تک چل دیے، جہاں دوسرے لوگ ایک ممبر آزما وقت گزار رہے تھے۔ وہ سب انہیں دیکھ رہے تھے، لیکن کوئی بھی ان کے قریب نہیں گیا تھا کہ کہیں انہیں بدگمانی نہ ہو جائے۔ انہوں نے مبر تو کیا لیکن اس کا نتیجہ اچھا نکلا، ایملی اور واٹسن اپنے بچوں کے ساتھ ان کے ساتھ ساحل کی طرف چل پڑے تھے۔

جزیرے سے نکلنے کی خبر سب کو ہو گئی تھی۔ حکومت اور اس کی خفیہ فورسز کے لوگ الرٹ ہو گئے تھے۔ درمیان میں جنگل کا ہی راستہ تھا۔ جو عبور کر کے انہوں نے ساحل پر پہنچ جانا تھا۔ سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ ایسے میں شمال کی جانب سے دو ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے۔ انہوں نے فوراً اپنے لوگوں سے رابطہ کیا، جن سے یہ پتہ چلا کہ وہ ہیلی کاپٹر ان کے نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کہیں محفوظ مقام کی جانب بڑھتے، ان ہیلی کاپٹرز کی طرف سے ایک دم سے ہینگ ہونے لگی۔ وہ سب درختوں کی سمت بھاگے۔ یہاں تک کہ وہ درختوں کے نیچے آچھے۔

”سلمان، تم ان سب کو اپنے ساتھ لے کر نکل جاؤ، ہم انہیں دیکھتے ہیں۔“ فورسز کے ایک اعلیٰ آفیسر نے کہا۔

”میں بھی بیٹیں ہوں اور ہم سب یہاں سے نکلتے ہیں، فکر نہ کریں ہم ان پر قابو پالیں گے۔“ سلمان نے کہا اور زویا کے ساتھ طے کئے ہوئے پلان کے بارے میں اُس سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور ایملی کے ساتھ بچوں کو لے کر چل دی۔ واٹسن ان کے ساتھ تھا۔ اسی لمحے ایک جوان نے راکٹ لائچر سے فائر کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ بے کار کا فائر ہے۔ لیکن دشمن کو یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ بھی اسلحہ سے لیس ہیں۔ وہ فائر کافی دور جا کر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ ایسے میں ہیری اپنے خاندان کے ساتھ جاتے ہوئے نجانے کیا سوچ کر پلٹ آیا۔ وہ آتے ہی اپنے باپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”ہیری، تم جاؤ، اپنے بہن بھائیوں کا اور ماں کا خیال کرو، ہم آرہے ہیں۔“ واٹسن نے کہا۔

”مجھے گن دیں، مجھے گن چلانا آتی ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا تمہیں گن چلانا آتی ہے، تم نے تو کبھی نہیں چلائی۔“ واٹسن نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے آتی ہے۔“ اس نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا جس میں کافی حد تک اصرار تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، دیتے ہیں۔“ وائسن نے اس سے کہا اور اسے لے کر ساحل کی طرف جانے لگا۔ ہیلی کا پٹر میدان میں اتر رہے تھے۔ وہ تیزی سے ساحل کی جانب بھاگنے لگے۔ اس وقت اندھیرا چھا گیا رہا تھا جب وہ ساحل پر آگئے۔ ان سب کو فوری طور پر کشتیوں میں بٹھا دیا گیا۔ جو انہیں لے کے جہاز کی طرف جانے لگیں۔

اس وقت ساحل پر وائسن، ہیری، سلمان اور فورسز کے چند سپاہی کشتیوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ باقی سب کو جہاز پر چھوڑ کر واپس آ رہی تھی۔ اسی وقت ان سے کچھ فاصلے پر ایک بم نما گولا پھٹا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی پھٹتے چلے گئے۔ وہ سب ساحل کی ریت پر لیٹ گئے۔ وہ اس سمت کا تعین کرنا چاہتے تھے کہ یہ فائر کس طرف سے ہوئے ہیں۔ وہ کچھ دیر اسی میں الجھے رہے۔ لیکن جونہی کشتیاں کنارے پر آئیں، وہ بھاگ کر اس میں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہیری بھی تھا۔

وہ لمحہ بہ لمحہ جہاز کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ جس وقت وہ جہاز کے قریب پہنچے، اس وقت تک وہ ہیلی کا پٹر دوبارہ فضا میں اڑ چکے تھے۔ چونکہ فورسز کو ان ہیلی کا پٹرز کے بارے میں اطلاع ہو چکی تھی، اس لیے کراچی سے فائٹر طیارے اڑ پڑے تھے۔ ان کی آواز فضا میں گونج اٹھی تھی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا کہ اب محفوظ ہیں۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔

فہیم اور اروند کو جب اس الیکٹرک دیوار کے بارے میں معلوم ہوا تھا، اسی وقت وہ اس تلاش میں لگ گئے تھے کہ یہ کہاں سے آپریٹ ہو رہی ہے۔ وہ دیوار کراچی سے ہی آپریٹ ہو رہی تھی۔ اس کا محل وقوع کلفٹن ہی کے پاس تھا۔ یہ ہیلی کا پٹر بظاہر ایک نجی کمپنی کے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ جس طرح بھی اسے آپریٹ کرتے رہے، لیکن اس وقت وہ انتہائی جدید انداز میں سب کر رہے تھے۔ یہاں نہ صرف وہ کاروبار کر رہے تھے، بلکہ یہاں سے انفارمیشن بھی لیتے تھے۔ انفارمیشن اکٹھی کرنے کا جو طریقہ تھا، وہ اسی میں پھنس گئے۔ اروند اور فہیم نے ان کے کمپیوٹرز تک رسائی لے لی۔ یہیں سے وہ خوف ناک انکشاف ہوا۔ جسے دیکھتے ہی اروند چیخ اٹھا۔

”سب کو جہاز سے اتار لو فوراً۔“

میں اس کے پاس ہی بیٹھا تھا، لیکن جس طرح وہ چیخا تھا اور جس طرح اس کے لہجے میں خوف بولا تھا، اس پر میں نے پوچھا۔

”بات کیا ہے۔“

”فوراً رابطہ کرو سلمان سے۔“ اس نے کہا۔

”میں رابطے میں ہوں اروند، بولو کیا بات ہے۔“ سلمان کی آواز ابھری۔ جبکہ مینا سے ویڈیو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جہاز میں سوار ہیں۔

”جس وقت تم لوگوں کو ہیلی کا پٹر میں الجھایا ہوا تھا، اسی وقت جہاز کے نیچے طاقتور بم لگا دیئے گئے ہیں۔ جس وقت جہاز چلا، اس کے ساتھ ہی وہ پھٹ جائیں گے، یا کچھ دیر بعد، واپس ساحل پر آ جائیں۔“ اروند نے تفصیل بتائی۔ یہ ساری بات وہیں پر موجود لوگوں نے سن لی تھی۔ وہ گھبرا گئے۔ تبھی سلمان نے کہا

”جلدی نہیں کرنی اور نہ ہی کسی کو بتانا ہے، گھبراہٹ میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے.....“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہم کشتیوں میں اترتے ہیں۔“ وائسن نے کہا اور پلٹنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ جہاز کے کمرے میں موجود اپنے خاندان کے لوگوں کو واپس ساحل کی طرف لے جانے کے

لیے بلاتا، ہیری پاس کھڑا تھا، اس نے وائسن سے کہا۔

”کتنے بم ہیں، یہ پتہ ہے؟“ اچانک ہیری نے پوچھا تو سلمان نے ارد گرد سے پوچھا۔

”دو ہیں، ایک اگلی طرف اور ایک پچھلی جانب۔“

”اوکے۔“ ہیری نے کہا اور سوچنے لگا جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔

”تم نے کیوں پوچھا، بات کیا ہے؟“ وائسن نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”پاپا! سوری، سب میری وجہ سے ہو رہا ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں، اب میں ہی اسے ٹھیک کروں گا۔ میں بم نکالتا ہوں، اور میں نکالوں گا، مجھے تین منٹ دیں۔ ماما کو سنبھال لینا، گڈ بائے۔“ اس نے کہا اور ایک دم سے سمندر میں چھلانگ ماری۔ وہ کسی وہیل پچھلی کی مانند ہلکا سا ابھرا اور پھر دکھائی نہیں دیا۔

وہ سب عرشے پر جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کی نگاہیں وہاں تھیں جہاں پر ہیری کودا تھا۔ ایسلی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ رو رہی تھی۔ باقی بچے سہمے ہوئے تھے۔ تین منٹ کا وقت گزر گیا تھا کہ اچانک کافی دور ہیری نے سر اٹھایا، سرچ لائٹ اس پر پڑ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلائے، ان میں جیسے کچھ تھا۔ وہ ڈبکی لگا گیا۔

”اوہ! کہیں.....“ سلمان نے سرسراتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے۔“ وائسن بڑبڑایا

اگلے دو منٹ میں جہاز سے کافی دور کیے بعد دیگرے دو زوردار دھماکے ہوئے۔ پانی میں زوردار ہلچل ہوئی، جس سے ایک بار تو جہاز ڈول گیا۔ اس کا ارتعاش ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ جہاز کا کپتان عرشے پر آ گیا۔

”سب سن لو، جہاز کلیئر ہے، میں نے اپنے آلات سے دیکھ لیا ہے، وہ دو بم ہی تھے۔“

”اوکے۔“ وائسن نے افسردگی سے کہا۔

”اب ہم نکل رہے ہیں۔“ کپتان نے کہا اور پلٹ گیا۔ ایسلی وہیں عرشے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وائسن اس کے پاس چلا گیا۔ جہاز چل پڑا تھا۔ جبکہ رات اتر رہی تھی۔ انسپکٹر اپنے حکام کو اطلاع دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جسپال، سندھپ اور نوتن گلاب سنگھ کالونی میں پہنچ کر ایک گھر میں سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ رات ڈھل گئی تھی۔ ٹی وی کی رپورٹ میں ہر نیت سنگھ پر قاتلانہ حملہ اور اس کے قتل کی رپورٹ نجانے کتنی مرتبہ دکھائی جا چکی تھی۔ جبکہ پائیل کی موت کو چھپایا گیا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ اس بارے میں یہی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ چونکہ خفیہ سے تھا، اس لیے اس کا قتل منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ وہ سبھی بکھر گئے تھے، کسی کو کسی کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ نوتن کور نے جان بوجھ کر چھن سنگھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تب وہ خود رابطہ کر لیں گے۔

جسپال سنگھ ٹی وی کے سامنے بیٹھا اکتا گیا تھا۔ وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ باہر چھوٹا سالان تھا۔ وہ اس کی سیڑھیوں پر آن بیٹھا، ٹھنڈی اور ہلکی ہلکی چلنے والی ہوانے اسے خاصا سکون دیا تھا۔ اسے یہ اچھی طرح احساس تھا کہ ہر نیت سنگھ کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک طرح سے راکو چیخ تھا کہ وہ مقامی سربراہ کو قتل کر کے انہیں یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ ان کے خلاف کوئی تحریک ہے۔ اگر چہ ان کا یہ کوئی بہت بڑا نقصان نہیں تھا۔ ایک مہرہ پٹ جانے سے وہاں نیا مہرہ رکھ دیا جاتا۔ لیکن ان کے لیے یہ بڑی چنوتی تھی کہ کوئی ان کی طاقت کو نہیں مان رہا۔ ان سے خوف

زادہ نہیں ہے۔ یہی چنوتی، انہیں بڑے پیمانے پر تلاش کرنے کا سبب تھی۔ اب ان کے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ وہ یہاں سے کہیں دور نکل جائیں اور ان کے ہاتھ نہ آئیں۔ دوسرا، ان پر اس قدر بھرپور وار کرتے چلے جائیں کہ را کو ان کی طاقت تسلیم کرنا پڑے۔ پہلا راستہ جتنا آسان تھا۔ لیکن دوسرا راستہ اتنا ہی مشکل تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اندر سے فتن کو باہر آگئی، اسے یوں بیٹھا دیکھ کر بالکل اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور دھیرے سے بولی۔

”جسپال کیا سوچ رہے ہو؟“

اس پر جسپال نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سوچوں کے بارے میں بتاتے ہوئے یوں بولا جیسے اسے بڑی حسرت ہو۔

”میں مانتا ہوں کہ ہماری جد جہد ختم ہونے والی نہیں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب تک ہم کوئی ایسا کام نہیں کر پائے، جس سے ہماری قوم کو ایسا فائدہ ملے، جو کم از کم اتنی اہمیت رکھتا ہو، جس سے وہ کوئی اپنی بات منوائیں، کوئی تو ٹرن پوائنٹ ہو، قوم جاگ اٹھے۔“

یہ سن کر فتن کتنے ہی لمحے خاموش رہی، پھر جب بولی تو اس کے لہجے میں دکھ اتر ا ہوا تھا۔

”جسپال، جب کوئی بھی قوم زوال کا شکار ہو، تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہوتی ہے کہ اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے ان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ وہ قوم کئی حصوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ان میں صرف اور صرف اتحاد کی کمی ہوتی ہے۔ یہ مختلف حصے اپنی سوچ اور فکر کے باعث ہی الگ الگ ہوتے ہیں۔ جو صاحب فکر ہوتے ہیں، جن کے ضمیر زندہ ہوتے ہیں، وہ اپنی جان کی نہیں، قوم کے اعلیٰ مقصد پر نگاہ رکھتے۔ جو مردہ ضمیر ہوتے ہیں، وہ اپنی قوم سے غداری کرنا کوئی عیب خیال نہیں کرتے۔ ان مردہ ضمیروں میں ایک ٹولہ ایسا بھی ہوتا ہے، جنہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے۔ میں سکھوں میں ہی ایک ایسے ٹولے کو بھی جانتی ہوں، جو اپنی ہی قوم کی ہڈیاں چھوڑ رہے ہیں۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ جسپال نے پوچھا۔

”شاید پہلے بھی یہ بات ہو چکی ہے کہ عالمی سطح پر ایک مفاد پرست بھی ہیں، جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ کوئی قوم، وہ صرف طاقت چاہتے ہیں۔ وہ اسلحہ فروخت کرنے کے لیے قوموں کو لڑواتے ہیں۔ منشیات بیچنے کے لیے انسانیت کا خیال تک نہیں آتا انہیں۔ اب یہی دیکھو، سکھ قوم کو ختم کرنے کے لیے ایک بڑا وار بڑی خاموشی سے کیا جا رہا ہے کہ ان میں منشیات اور خاص طور پر شراب کی رسائی اتنی آسان بنادی گئی ہے کہ کوئی بچہ بھی اسے استعمال کر سکتا ہے، اس پر گیتوں میں، فلموں میں ایسا ماحول انہیں دکھایا جاتا ہے کہ وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مطلب جس طرح بھی ہو سکے، اپنا فائدہ سامنے رکھتے ہیں، انسان یا انسانیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“ فتن کور نے دکھے ہوئے دل سے کہا۔

”فتن، جو باضمیر ہیں، وہ تو لڑ رہے ہیں، انہیں تو یکجا ہونا چاہئے نا؟“ جسپال نے کہا۔

”رتن دیپ سنگھ کا یہی خیال تھا، اور ان سب کو اکٹھا بھی اسی لیے کیا گیا کہ ان سے ایسے کام لیے جائیں کہ سکھ قوم ان کی طرف ایسے دیکھے جیسے یہی ان کے نجات دہندہ ہیں۔ لیکن ہوا کیا۔ انکیشن، بانٹیا کور کا زخمی ہونا اور خاص طور پر اب اس وقت سیاست میں عہدے کی بندر بانٹ نے سب کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ میری ان سے بات ہوئی تھی، وہ بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں کہ جوان کی دسترس میں لوگ ہیں، وہ اکٹھے ہو جائیں اور تم دیکھنا کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے۔“ فتن کور نے پر جوش انداز میں کہا تو جسپال بولا۔

”ایسا ہونا چاہئے اور بہت جلد ہونا چاہئے۔“

”ہاں، رتن دیپ جی صرف یہی چاہتے تھے کہ جو گرو زیادہ دلیری اور حوصلے سے کوئی بڑا کام کرے، باقی سارے انہیں کے ساتھ کام کریں۔ دیر صرف اسی بات کی تھی، جو میرا خیال ہے کہ اب دیر نہیں ہوگی۔“ وہ کافی حوصلہ افزا لہجے میں بولی تو جسپال نے پوچھا۔

”تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”جسپال، یہ جو ہر نیت سنگھ کو ہم نے مارا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ تو اس کی قسمت ہار گئی ہوئی تھی کہ خود مرنے چلا آیا ورنہ ہمیں نجانے کتنے دن لگ جاتے اسے مارنے کے لیے، بہت سارے لوگوں نے کوشش کی ہے، اسے قتل کرنے کی۔“ وہ یوں بولی جیسے انجانے میں ان سے بہت بڑا کام ہو گیا ہے۔ تبھی ان کی پشت سے سندپ کور کی آواز ابھری

”فتن ٹھیک کہہ رہی ہے جسپال۔“

”میں نے مان لیا، اب اس کا کوئی رد عمل بھی تو سامنے آئے۔“ جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اس کے دوسری جانب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اویئے یار، ہمیں جلدی کس بات کی ہے، سکون سے پڑے ہیں ادھر، چند دن مزید پڑے رہیں گے۔ پھر کوئی نہ کوئی کام نکل آئے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فتن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کپڑوں کا کوئی بندوبست ہوا، دیکھو، ہم سب کے کپڑے خراب ہو رہے ہیں۔“

”کہا ہے میں نے، ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔“ فتن نے کہا تو ان میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی بیٹھے رہے، جیسے اپنے اپنے طور پر سوچ رہے ہوں۔ ان میں کوئی بات نہ ہوئی۔ ان کی خاموشی کو فتن کور کے سیل فون کی کھنٹی نے توڑا، ”ارے، یہ تو چھن سنگھ کا فون ہے، رب خیر کرے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اسپیکر آن کر دیا۔

”گاڑی ہے تم لوگوں کے پاس؟“

”ہاں ہے؟“ فتن نے جواب دیا۔

”اسے باہر نہ نکالنا، اسے وہیں کھڑے رہنے دینا، وہاں سے نکلو اور کسی طرح پرتاپ پیلس تک پہنچو، وہاں سے ایک فور وکیل جیپ ملے گی، وہ لے آئے گی۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ابھی نکلتا ہے یا.....“ فتن نے پوچھا۔

”ابھی۔“ اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیئے۔

دو چار گلیاں پار کر کے انہیں ٹیکسی مل گئی۔ فتن پورے امرتسر کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے ٹیکسی والے کو بتایا اور اس میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پرتاپ پیلس کے پاس تھے۔ یہ ایک شادی ہال تھا، جو کافی بڑا تھا، اس لیے مشہور تھا۔ وہ اس سے ذرا پہلے ہی اتر گئے پھر پیدل ہی اس طرف چل پڑے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی وہ شادی ہال کے سامنے آئے۔ ایک فور وکیل ان کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں چھن سنگھ خود بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بڑے آرام سے اس میں بیٹھ گئے۔

”شہر میں ہر نیت سنگھ کے قاتلوں کی وجہ سے خاصا ہنگامہ ہے، وہ بہت شور مچا رہے ہیں۔“ اس نے سامنے سڑک

پردیکھتے ہوئے بتایا

”اب کیا کرتا ہے؟“ سندپ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، مزے کرو، پھر دیکھتے ہیں۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”چلو، دیکھتے ہیں کہ مزے کیسے ہوتے ہیں۔“ سندپ بھی اس کی بات سمجھتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی۔

”اب صورت حال کیا ہے؟“ نوتن نے پوچھا۔

اس پر چن سنگھ اسے حالات کے بارے میں بتانے لگا کہ کیا ہو گیا ہے اور اب کیا کیا ممکن ہو سکتا ہے۔ انہیں باتوں میں وہ کوئی بہرام پور جا پہنچے۔ وہ شہر سے باہر نو تعمیر پوش علاقہ تھا۔ وہ ایک جنگلے میں آگئے۔ جہاں انتہائی خاموشی تھی۔ وہ پوریج سے ہوتے ہوئے لاؤنج میں جا پہنچے۔ وہاں سامنے صوفے پر بیٹھی بانیتا کور کو دیکھ کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”دیکم دیکم.....“ اس نے انہیں دیکھ کر دھیمے سے کہا تو اسے یوں دیکھ کر ان میں خوشی کے ساتھ جوش بھی بڑھ گیا۔ وہ اس کے ارد گرد جا بیٹھے۔ تبھی نوتن نے پوچھا۔

”تم یہاں، ابھی تو.....“

”اسپتال میں سیکورٹی تو نہیں ہے نا اور پھر کئی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اب تو زخم ہی بھرتا ہے نا، یہاں پڑی رہوں گی۔“ اس نے وجہ بتائی

”اچھا ہے۔“ جہال نے کہا۔

”تم لوگ اچھی طرح فریش ہو جاؤ، پھر ڈنر کرتے ہیں، رات اپنی ہے، باتیں بھی چلتی رہیں گی۔“ بانیتا کور نے کہا تو وہ اٹھ گئے۔ انہیں الگ الگ کمرے دے دیئے گئے تھے، جہاں ضرورت کا ہر سامان پڑا ہوا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ سب بانیتا کور ہی سے کمرے میں اس کے بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے کا دور چل چکا تھا۔ چن سنگھ کب کا چلا گیا تھا۔ وہاں ان دیکھی سیکورٹی موجود تھی۔ وہ یہاں سکون سے رہ سکتے تھے۔ ان باتوں کے ساتھ ہی اچانک بانیتا کور نے کہا۔

”نوتن! جمال کو فون لگاؤ اور میری بات کراؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور سیل فون نکال کر نمبر ملانے لگی۔ کچھ ہی دیر میں رابطہ ہو گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے انتہائی گہری سنجیدگی سے کہا

”جمال۔! اب میں چاہتی ہوں کہ ہم اپنے ہونے کا احساس دلائیں، ہر نیت سنگھ جیسا مہرہ مار لینا کوئی بڑی بات نہیں، اس کے لیے بڑا سرمایہ بھی چاہئے۔“

”لیکن، اس سے پہلے تمہارا ٹھیک ہو جانا بہت ضروری ہے۔“ جمال نے کہا۔

”میں سمجھو ٹھیک ہوں، کسی بھی بڑے کام کے لیے وقت تو چاہیے ہوتا ہے نا۔ تب تک میں ٹھیک ہو جاؤں گی، تم اس کی فکر نہ کرو۔“ اس نے کہا۔

”اچھا تم ایسے کرو، مجھے آج کی رات دو، میں کل تمہیں کسی وقت بتاؤں گا کہ کیا کرتا ہے۔“ جمال کی آواز ابھری تو اس نے کہا۔

”میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔“

”مجھے یہ بتاؤ، کیا تم ہوائی سفر کر پاؤ گی، نکل سکتی ہو بھارت سے، اور تمہارے ساتھ یہ لوگ بھی۔“ جمال نے

اچانک پوچھا۔

”کیوں، تمہارا کیا پلان ہے، اگر بہت ضروری ہے تو میں سفر کر لوں گی۔“ بانیتا کور نے کہا۔

”نہیں ابھی تم ٹھیک ہو جاؤ، باقی میں سب دیکھ لیتا ہوں، تم کل تک میرا انتظار کرو۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر یونہی باتیں کرتے رہے پھر سو جانے کے لیے اٹھ گئے۔ رات کافی ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

برطانیہ سے حکومتی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے نمائندگان کراچی پہنچ چکے تھے۔ انسپٹر اور المانیہ ہی ان سے ملے، باقی سامنے ہی نہیں آئے۔ یوں سارا کریڈٹ اسی انسپٹر کو چلا گیا۔ ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ علی نواز وہیں رہ گیا، جبکہ زویا اور سلمان رات کے پچھلے پہر واپس لاہور آ گئے تھے۔

میں ساری رات جاگتا رہا تھا۔ بانیتا کور نے جو مجھے فون کیا تھا، یہ میرے لیے تائید غیبی ہی تھی۔ میرے ذہن میں کہیں تھا کہ میں بھارت میں اپنے انہی دوستوں سے کہوں گا۔ مجھے کہنا نہیں پڑا تھا، اس نے خود ہی کہہ دیا تھا۔ دراصل عالمی سطح پر جو تنظیمیں کام کر رہی تھیں، ان کی دلچسپی بھارت اور پاکستان کے لیے ایک ہی نکتہ نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور پھر اسی تناظر کو سامنے رکھ کر کوئی پلان بناتے تھے۔ انہی دونوں ملکوں کو روایتی حریف سمجھا جاتا رہا ہے۔ درہ خیر سے لے کر کنیا کماری تک عالمی قوتوں کی آجگاہ یہ ملک اسی لیے ترقی نہیں کر پارہے کہ یہاں پر ایسے فردی اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے، جس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، نہ اس کا انسانیت کو فائدہ ہوتا ہے اور نہ انسان کا۔ ایک ایسا جنون پیدا کیا ہوا ہے، جس میں سوائے نفرت کے کچھ اور نہیں ہے۔ اس کی ایک واضح مثال دُنیا کے سامنے ہے کہ کراچی میں بھی ممبئی جیسا ماحول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اصل میں وہ چند ایسے لوگ جو طاقت کے خواہاں ہوتے ہیں اور اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتے ہیں، وہی بساط بچھاتے ہیں، وہی مہرے رکھتے ہیں، اور پھر خود ہی مہروں کو ہٹا دیتے ہیں۔

اس کے بارے میں کئی دن پہلے مجھے اردن نے اشارہ دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ کچھ سیاسی دلال ہوتے ہیں، جو اپنی طاقت کا استعمال کر کے سیٹیں جتواتے ہیں اور پھر انہی سے حکومتوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کا تجربہ انوجیت والی سیٹ کے بارے میں ہو چکا تھا۔ اس نے اسی دلال کو بنیاد بنالیا۔ انہی دنوں میں نے اردن کو اس پر تحقیق جاری رکھنے کا کہا۔ وہ تو اس پر اتنا وقت نہ دے سکا لیکن مہوٹر، اس بارے میں لگی رہی۔ اس دوران دو تین لوگ سامنے آئے۔ وہ ان پر کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دلچسپ انکشاف ہوا۔

میں ساری رات ایک ایسے شخص کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا، جو شہری تو بھارت کا تھا، لیکن اس وقت اس کا ٹھکانہ برطانیہ کے شہر لندن کے کسی علاقے میں تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو وہیں سے آپریٹ کر رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ وہیں ہوتا، کسی دوسرے ملک میں بھی ہو سکتا تھا۔ وہ کون تھا، اس کے بارے میں کوئی پتہ نہیں تھا، بس اس کے وجود کا احساس تھا کہ کوئی ہے۔ اس کا نیٹ ورک پاکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ دلچسپ انکشاف یہ تھا کہ وہ کسی گارڈ فادر کی طرح تھا۔ اس کی اتنی طاقت تھی کہ کہیں بھی کسی بھی سیاسی حلقے میں مداخلت کر سکتا تھا۔ کسی کو رکن رکھنا یا اس کی رکنیت ختم کروانا ہی اس کا کھیل تھا۔ اس وقت تک تو مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔ وہ یہ سب کیسے کرتا ہے، اس بارے میں پوری معلومات نہیں تھیں، لیکن ایک احساس تھا کہ وہ انہی بندوں سے کام لیتا ہوگا، جو اس کے وفادار ہیں۔

اس رات دو لوگ میرے سامنے آئے۔ ایک لبرل پارٹی کا اشوک مہرہ اور دوسرا ہندو شدت پسند تنظیم کا رکن

پنڈت رام داس۔ مجھے یہیں سے دل چسپی ہوئی تھی کہ دو مخالف دھڑوں کے آدمی کس طرح ایک بندے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ اتنی حیران کن بات نہیں تھی۔ ایسا ہوتا ہی ہے۔ تاہم یہ دونوں ایسے حریف خیال کئے جاتے تھے، جن کے کارکن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور ان کا آپس میں دشمنی تصور کی جاتی تھی۔

ان میں ایک تیسرا بھی تھا، جس کا نام اشوک سنگھ تھا۔ وہ پیدا ہندو گھرانے میں ہوا تھا۔ اس کے دوسرے بہن بھائی خالص ہندو تھے، ہندوانہ رہن بہن تھیں، ہندو طرز پر ہی اپنی پوجا کرتے تھے، لیکن یہ اشوک سنگھ ان سب سے الگ تھا۔ اس نے سکھوں کی طرح کیس رکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح کرپان پہنتا تھا، خود کو امرت دھاری سکھ کہتا تھا اور اپنی عبادت کے لیے مندر کی بجائے گرو دارے جاتا تھا۔ وہ پنڈت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ پنڈت گھرانوں میں ایک آدھ لڑکا اسی طرح سکھ بنا کر رکھا جاتا رہا ہے۔ اس میں ان کی سب سے بڑی سیاسی ضرورت ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سکھ مذہب ان سے الگ نہیں، ہندو ہی کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا سکھ کیونٹی کو اپنے قریب لانا مقصد تھا۔ وہ لمبے قد کا نیم شیم، بڑے ذیل ڈول والا بھی ہندو، سکھ کے روپ میں بڑا گیانی سمجھا جاتا تھا۔

ان تینوں میں ایک شے مشترک تھی۔ یہ تینوں پنجاب سے تھے۔ تینوں اگرچہ مختلف شہروں سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس وقت امرتسر میں موجود تھے اور پنجاب کی سیاست پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ یعنی اپنے مختلف سماجی رتبے میں وہ جو بھی تھے، لیکن ان تینوں کی تان ایک سیاست پر آ کر ختم ہو جاتی تھی۔

میری ان تینوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی لیکن یہ لوگ اس وجہ سے میرے سامنے آئے تھے کہ انہوں نے اُس انشٹیٹیوٹ کو پوری طرح تحفظ دیا ہوا تھا۔ جس میں سندھپ کوڑھی۔ وہ وہاں سے کس طرح کے لوگ پیدا کر رہے تھے اور اس کے ساتھ اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کا کس حد تک سوچ رہے تھے۔ وہ خطرناک ہی نہیں بلکہ کثرت خیز بھی تھا۔ وہ اپنے گھر کی آگ دوسروں کے گھروں میں پھینک رہے تھے۔ یہ لوگ تو میرے سامنے آ گئے، لیکن جیسے ہی ان کی پشت پر میں نے کسی نادیدہ بندے کو محسوس کیا تو ان سے دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی۔ میں یہی سوچتا رہا کہ ان کے ذریعے میں اس بندے کو کیسے بے نقاب کر سکتا ہوں؟ وہ کیسا شخص ہے کہ جو خود پردے کے پیچھے ہے اور پوری طرح حکومت کر رہا ہے؟ آخر کیوں اور کیسے ہے اس طرح؟ کیسی طاقت ہے اس کے پاس؟ میں اس تک کیسے پہنچوں؟ یہی اک سوال تھا۔ بہت دیر تک سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہی تینوں کو چھیڑوں، ظاہر ہے جب اس کے مہروں کو میں ہٹاؤں گا، تب وہ کسی نہ کسی صورت میں سامنے آئے گا۔

لہذا جس وقت سورج مشرق سے نکل آیا تھا، اس وقت تک میں نے بھارتی پنجاب سے چند لوگوں کا ایک گروہ تیار کر لیا تھا، جن کی اپنی ایک طاقت تھی اور اپنی اپنی جگہ وہ کوئی نہ کوئی اہمیت رکھتے تھے۔ سکندر حیات کی طرف سے مجھے بھارت اور اس کے علاوہ دیگر ممالک میں سے لوگوں کی ایک فہرست دے دی گئی تھی، جن سے جب چاہے میں کوئی بھی کام لے سکتا تھا۔ یہ سارا کام فہیم اور اردن نے کیا تھا، انہوں نے ہی مختلف لوگوں کے پروفائل دیکھے تھے کہ کون بندہ کس کام آ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ممبئی سے ایک ایسا بندہ وہاں بلوایا تھا، جس کے پاس جدید ترین الیکٹرونکس آلات تھے۔ وہ سب امرتسر پہنچ رہے تھے۔

صبح کے نو بجے تھے، جب میں باغیا کور کو کال کی۔ وہ، ہسپتال اور نو تین تینوں ہی ناشتے کی میز پر تھے۔ تبھی میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”اوسوہو۔! پرشادے گلھ رہے او۔“

”ہاں، بس تیرے انتظار میں تھے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے دماغ میں اس وقت سوائے انتقام لینے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

”دیکھ! میں نے تمہاری مدد کے لیے۔“ میں نے کہتا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

”مجھے مدد نہیں معلومات چاہئے۔“

”باغیا کور، تم جذباتی ہو رہی ہو اور ایسے کام میں جذبات نہیں چلتے، ان میں ہوش درکار ہوتا ہے۔ اگر تم میری بات مانو گی تو میں آگے کہوں گا۔“ میں نے تھوڑا سخت لہجے میں کہا تو وہ چند لمبے خاموش رہی پھر بولی۔

”اچھا کہو، جو کہو گے مانوں گی۔“

”یہ جو بھی ناسک ہوگا، اس کا انچارج ہسپتال ہوگا، تم نہیں، کیا تمہیں یہ بات منظور ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، وہی ہوگا، میں بھی ابھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوں، فکر نہ کرو۔“ وہ میری بات سمجھ گئی تھی اس لیے نارل لہجے میں بولی۔

”تو پھر میری ہسپتال سے بات کراؤ۔“ میں نے کہا تو اس کے ساتھ ہی آواز ابھری۔

”میں سن رہا ہوں جمال، تم کہو۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ اسپیکر آن کر کے بیٹھے تھے۔ میں اسے اُن لوگوں کے ہالے میں بتایا جو امرتسر میں آچکے تھے۔ کچھ دیر وہ سبھی اس سے رابطہ کرنے والے تھے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ کرنا کیا ہے۔ باقی ساری معلومات وہ فہیم اور اردن سے لے سکتا تھا۔ میں کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا اور پھر فون بند کر دیا۔

میں چند لمبے سوچتا رہا، پھر میں نے تانی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت عرصے بعد میں اس سے بات کرنے والا تھا۔ ان چند لمحوں میں وہ گزرا ہوا وقت آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ایک لمحے کے لیے دل بھر آیا۔ وہ مہ جیوں، مجسمہ حسن، اندر سے کس قدر سخت تھی۔ کوئی پہلی نگاہ میں یہ اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انتہائی نرم و نازک دکھائی دینے والی وہ تانی، جب دھشت پہ اترتی تھی تو حیران کر دیتی تھی۔ وہ لندن میں اپنا بہت اچھا بزنس چلا رہی تھی۔ اس نے ایک ریسٹوران بنالیا تھا اور اس کے ساتھ گروسری کی دوکان بنالی ہوئی تھی۔ جہاں لوگ کام کرتے تھے اور وہ گھر میں رہتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ برطانیہ میں اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ اس لیے اس سے بات کرنا ذرا موخر کیا اور سلمان سے کپ شپ کرنے کے لیے لاؤنچ میں آ گیا۔ جہاں وہ فریش ہو کر آچکا تھا۔

ہم کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران مہوش، فہیم اور اردن کے ساتھ رویت بھی آ گئی۔ جنید ایک طرف خاموش بیٹھا رہا۔ ہمارے درمیان وہی نادیدہ شخص تھا، جو ایک گاڑ فادر کی طرح ان دو بلکوں میں اپنی ہی حکومت بنائے ہوئے تھا۔

”آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ کہاں تک رسائی رکھتا ہے، اس کا پتہ تو اس وقت چلتا ہے جب کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی گہری نگاہ رکھنے والا ہی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ کس سلسلے کی کڑی ہے، ورنہ پتہ ہی نہیں چلتا۔“ فہیم نے اپنی رائے دی

”مثلاً، کیسے؟“ سلمان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہی تینوں بندے، جب ان کے بارے میں تجزیہ کیا گیا تو ان کے ساتھ جڑے ہوئے واقعات کہیں ایک جگہ جا کر ایک خاص مقصد میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایسا ہی میں نے پاکستان میں دیکھا ہے۔ یہاں چند لوگ ہیں، بالکل اسی طرح کام کرتے ہیں۔ یہ اس وقت پتہ چلتا ہے جب دونوں ممالک کے میڈیا پیچھے اٹھتے ہیں اور وہاں پر ایک

جنگ برپا ہو جاتی ہے۔“ فہیم نے کہا تو اردوند نے بڑے سکون سے کہا۔
”میں بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر بولا۔

”اب دیکھیں، یوں لگتا ہے کہ جیسے دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف میڈیا پر محاذ آرا ہیں۔ کسی بھی واقعے کو بنیاد بنا کر وہ ایک دوسرے پر تباہ توڑ حملے کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی نے یہ تنقید کی کہ عوام کی بھوک ختم کرنے کے لیے وہ اقدامات کریں، یہ سوچ ابھرنے ہی نہیں دیتے، پاکستان میں ڈیم بنانے کی بات ہوتی ہے، لا محالہ جس کا فائدہ عوام کو ہے، اس پر سیاست دان ہی چیخنے لگتے ہیں۔ کیا وہ لوگ واویلا کرنے کی بجائے، سر جوڑ کر نہیں بیٹھ سکتے کہ اس کا حل کیا ہے؟ مطلب ہر طرف کنفیوژن پھیلایا ہوا ہے۔“

”دیکھیں، اگر یہ جمہوری ملک ہیں، تو جمہوریت کا مطلب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام پر، لیکن کیا ان دونوں ملکوں کے سیاست دانوں کا رویہ عوامی خدمت یا اس کی فلاح ہے؟ نہیں بالکل نہیں، یہ رویہ کون بنائے گا؟ یا کون نہیں بننے دے رہا ہے؟ یہ وہ نکتہ ہے، جہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔“ فہیم نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”اب کرنا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا تو ایک بحث چھڑ گئی، کچھ دیر بعد یہ طے ہو گیا کہ ابھی پاکستان اور بھارت میں مبینہ گاؤں فادر کے جوہرے ہیں، انہیں ہٹایا جائے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ طے کر لینے کے بعد میں نے تانی کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی فون پک کر لیا۔

”بہت عرصے بعد میری یاد آئی، اپنی شادی پر بھی نہیں بلایا۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں شکوہ کیا
”تمہیں پتہ ہی ہے کہ حالات کیسے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“ اس نے مختصر سا کہا تو میں نے بھی اختصار سے اسے بات بتائی

”ٹھیک ہے، میں اردوند اور فہیم سے رابطہ رکھتی ہوں، انہی کے مطابق یہاں پر بھی نگاہ رکھوں گی، میری سمجھ میں آیا تو میں ضرور بتاؤں گی، لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایسا کچھ ہوگا نہیں، کیونکہ میں بھی نگاہ رکھتی ہوں، مجھے اس کام کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔“

”اوکے دیکھنا، اور نظر رکھنا، میں دوبارہ رابطہ کروں گا۔“ میں نے الوداعی بات کی تو وہ بولا تو وہ حسرت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

”ایک بات مانو گے۔“

”بولو۔“ میں نے کہا۔

”ایک بار یہاں چکر لگا جاؤ، اماں اور سوئی کے ساتھ۔“ اس نے بڑے مان سے کہا۔

”میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ وہ کچھ دیر میرے ساتھ باتیں کرتی رہی، پھر اس نے فون بند کر دیا۔ میں کافی دیر تک اس کے خیالوں میں کھویا رہا۔

☆.....☆.....☆

جسپال اور نوتن کے سامنے امرتسر کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ بائیتا کور کے ہاتھ میں مار کر تھا، جہاں پر وہ نشان لگا چکی تھی کہ کون کہاں پر ہے۔ وہ کل دس لوگ تھے جو پنجاب ہی کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔

”یہ سب یہاں پر تو آ گئے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو پائیں گے، جب تک ان تینوں کے بارے میں پوری طرح معلومات نہیں مل جاتیں۔“ بائیتا کور نے کہا تو جسپال ہنس دیا پھر بولا۔

”یار تجھے اتنا عرصہ ہو گیا جمال کے ساتھ، تجھے اس کے کام کرنے کا انداز سمجھ میں نہیں آیا۔“
”تم سمجھا دو، وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”کتنے دن ریکی کرو گی، اتنے دنوں میں ریکی کرنے والے نگاہوں میں آ جاتے ہیں۔ یہ اچانک حملہ ہوتا ہے، جیسے آسمان سے کوئی شاہین، اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور پھر اسی طرح پرواز کر جاتا ہے۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”مگر اس پرواز میں ان تینوں کے بارے میں معلومات کہاں ہیں، کہاں پر جا کر جھپٹیں گے۔“

”وہ سب پتہ ہے، جب ان کے بارے میں معلومات لی جاتی رہی تھی، اس وقت ان کا پتہ بھی چل گیا تھا کہ کون کیا کرتا ہے، مگر نہ کرو، بس پلان کرو، کرنا کیا ہے؟“

”اچھا تو بات یہ ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا اور نقشے پر دیکھنے لگی۔ تبھی نوتن کور بولی۔
”اگر چاہو تو میں بلد پوسنگھ کو بلا لوں۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا۔ کیا وہ بندہ آگیا، جس نے ممبئی سے آنا تھا۔“
”ہاں، آگیا ہے۔“ نوتن نے بتایا تو وہ بولی۔

”ٹھیک ہے، ان سب کو ایک بار یہاں بلا لو، ایک پلان کرتے ہیں، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ یوں بولی جیسے ٹرانس میں ہو۔

”نہیں، مجھے تم سے اختلاف ہے بائیتا، میں ایسا نہیں چاہوں گا۔“ ایک دم سے جسپال نے اس کی مخالفت کر دی تو بائیتا کور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”کیوں؟“

”وہ میں کروں گا، جو مجھے کرنا ہے، تم آرام کرو۔“ جسپال نے کہا اور اٹھ گیا۔ بائیتا اس کی طرف دیکھتی رہی، منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ وہ باہر نکل گیا۔

ممبئی سے آنے والا شخص شکتی مگر علاقے کے ایک گھر میں موجود تھا۔ جسپال سنگھ ایک ایسے نوجوان کے ساتھ اس کے پاس گیا، جو الیکٹرانکس کی چیزوں کا ماہر تھا۔ اس شخص نے وہ تمام سامان، جس میں خصوصی سیل فون سے لے کر بڑی اہم ڈیوائس تھیں۔ جن سے وہ ایسے رابطے میں منسلک ہو جاتے، جو کہیں ٹریس بھی نہیں ہو سکتے تھے اور ان کے درمیان ہر وقت رابطہ رہتا۔

سہ پہر تک وہ تمام سیل فون ان لوگوں تک پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت جسپال واپس آچکا تھا۔ وہیں پر بیٹھ کر اس نے سب سے رابطہ کیا۔ یہاں تک کہ معلومات کی بنیاد پر وہ پلان کرتے رہے، ان کا ارادہ تھا کہ یہ ایکشن ایک ہی وقت میں ہو۔ تاکہ وہ جو کوئی بھی ہے اسے پتہ چلے کہ یہ خاص انہی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

وہ تینوں امرتسر کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے۔ ان میں اشوک مہرہ شہر کے شمال مغرب کے علاقے رنجیت ایونو میں رہتا تھا۔ پنڈت رام داس مشرقی علاقے اندرا کالونی میں اور اشوک سنگھ جنوبی علاقے گردنام مگر میں رہائش پذیر تھا۔ ان کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ یہ تینوں سیاست سے متعلق تھے۔ ان کی مصروفیت کے بارے میں پوری جانکاری مل گئی تھی کہ وہ آج شام سے لے کر رات گئے تک کیا کرنے والے تھے۔

جس طرح انہوں نے یہ سوچا تھا کہ ایک ہی وقت میں یہ ایکشن ہو، وہ رات کا دوسرا پہر بننا تھا۔ اس وقت اشوک مہرہ اور اشوک سنگھ نے حکومت بنانے کی ایک سیاسی میٹنگ سے واپس آنا تھا اور اسی وقت کے پنڈت رام داس کی

ایک مذہبی میٹنگ تھی، وہاں سے اس نے واپس آنا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ انہیں میٹنگ اور گھر کے درمیان راستے میں کہیں پکڑا جائے، وہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے، یہ انہوں نے طے کرنا تھا۔ جس وقت شام ڈھل رہی تھی، تب تک یہ فیصلہ بھی کر لیا گیا۔ ان تینوں نے کورٹ روڈ اور کوئٹہ روڈ کے کراس پر سے ہو کر جانا تھا۔ وہی جگہ انہوں نے منتخب کر لی تھی۔ ہر بندے کے ذمے ایک کی نگرانی تھی۔ وہ اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جہاں سنگھ کے ساتھ نوتن کور ایک کار میں نکل پڑے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کار میں بم لگا دیا تھا، جسے ریموٹ سے ہی آپریٹ کیا جاسکتا تھا۔ جہاں کا نوتن اور بانیا سمیت سب سے رابطہ تھا۔ وہ سب ہی ایک دوسرے کی گفتگو سن سکتے تھے۔ وہ بھی شہر میں موجود اپنے ٹھکانوں سے نکل پڑے تھے۔ وہ تیزی سے اسی کراس کی جانب جا رہے تھے۔ انہیں ہر پل کی خبر مل رہی تھی کہ کون کہاں پر ہے۔ اشوک مہرہ اور اشوک سنگھ دونوں میٹنگ میں تھے۔ ان کی گاڑیاں اور گاڑی باہر موجود تھیں۔ جبکہ پنڈت رام داس جس مذہبی میٹنگ میں تھا، وہاں وہ تقریر کر رہا تھا۔ جہاں اور نوتن اس کراس کے نزدیک ایک ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں چلے گئے۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا، جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔

سب سے پہلے اشوک سنگھ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ میٹنگ سے باہر آ گیا ہے۔ وہ الٹ ہو گئے اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ انہیں تھوڑا گھوم کر واپس اس کراس پر آنا تھا۔ اسی دوران پتہ چلا کہ اشوک مہرہ بھی وہاں سے نکل پڑا ہے۔ وہ دونوں ذرا سے فاصلے سے آگے پیچھے اسی کراس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسی لمحے انہیں پتہ چلا کہ پنڈت رام داس بھی اپنی میٹنگ ختم کر کے وہاں سے نکل پڑا ہے۔ اب ان میں منٹوں کا فرق تھا۔ انہوں نے اسی کراس سے گزرتا تھا۔

اس کراس پر روڈ لائٹ کی زردی کافی روشنی تھی۔ جہاں سنگھ وہاں پہنچا تو کراس کی مشرق سائیڈ پر مختلف ریک کے چھ سات پولیس والے کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک بیریر لگایا ہوا تھا اور ہر آنے والی گاڑی کو روک رہے تھے۔ اس کے آگے چار پانچ کاریں تھیں، جنہیں وہ بڑی تیزی سے منہ سے منہ رہے تھے۔ ان کے پیچھے لائن کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ جہاں کے اندر سنسنی اتر آئی تھی۔ اس کے کان میں یہ صدا آ رہی تھی کہ اشوک سنگھ کی گاڑی اسی لائن میں آگئی ہے۔ اس کا ایک گاڑی اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسی اثناء میں اشوک مہرہ کی کار بھی وہیں آن لگی۔ اس کا بھی گاڑی اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں کی کار کے آگے دو کاریں رہ گئی تھیں۔ پولیس والے انہیں منہ سے منہ رہے تھے۔ وہ دونوں گاڑی پولیس والوں سے کہہ رہے تھے کہ کون آ دی ہیں، جنہیں تم لوگوں نے روکا ہوا ہے، انہیں جانے کی اجازت دو، جبکہ پولیس آفیسر ان کی بات ہی نہیں سن رہا تھا۔ اسی دوران یہ پتہ چل گیا کہ پنڈت رام داس بھی اس لائن میں آ کر لگ گیا ہے۔ اسی وقت جہاں سنگھ کار سے اترا، اس کے ساتھ ہی نوتن کور بھی اتر گئی۔ وہ دونوں مخالف سمتوں سے پولیس والوں کے پاس جا پہنچے۔ نوتن کور نے پولیس آفیسر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں اگر وہ وی آئی چیز ہیں تو انہیں جانے دیا جائے، آپ جا کر کنفرم کر لیں کہ وہ کون ہیں۔“

”دیکھیں اگر ہم وی آئی چیز کو نہ روکیں تو عام آدمی کا کیا قصور ہے، انہیں بھی جانے دیتے ہیں۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔

”چلیں آپ جا کر کنفرم تو کر لیں اور جانے دیں کیوں اپنی نوکری کے پیچھے پڑے ہیں۔“ نوتن کور کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ تبھی آفیسر نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ جاؤ جا کر کنفرم کر لو، اور انہیں جانے دو۔

آفیسر وہیں کھڑا رہا اور چھ کے چھ پولیس والے تصدیق کرنے ان کی گاڑیوں کی جانب چلے گئے۔ آفیسر نے لائن میں لگی پہلی دونوں گاڑیوں کو چلے جانے کا اشارہ دے دیا۔ وہ نکل گئے۔ وہ پیچھے کی جانب چل پڑا، جہاں اور نوتن وہیں کھڑے رہے۔ آفیسر نے غصے میں ان لوگوں کی کاریں نکال دیں، جو عام لوگ ان تینوں کی گاڑیوں کے درمیان تھے۔ جیسے ہی ان تینوں کی گاڑیاں سڑک پر رہ گئیں۔ جہاں اپنی کار کی جانب بڑھا، اس نے کار سڑک میں یوں ٹیڑھی کھڑی کی جس سے سڑک بلاک ہو گئی۔ وہ بھی نکل کر اس پولیس آفیسر کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اس پولیس آفیسر کو یہ تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ تینوں وی آئی پی ہیں۔

”تمہیں یہاں ناکہ لگانا ہی نہیں چاہئے تھا۔“ اشوک مہرہ کے ایک گاڑی نے آگے بڑھ کر کہا۔

”آپ جا سکتے ہیں، اب تو میں نے نہیں روکا۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔ تب تک ان تینوں گاڑیوں کے ارد گرد پولیس والے اکٹھے ہو چکے تھے۔

”تم روک بھی نہیں سکتے۔“ گاڑی نے کہا اور پلٹ کر گاڑی کی طرف جانے لگا۔ تبھی پولیس والے کو غصہ آ گیا اس نے آگے بڑھ کر اس گاڑی کو کالر سے پکڑا اور گھما کر سڑک پر پھینک دیا۔ اس کے گماں میں بھی نہیں تھا کہ کوئی پولیس والا ایسا کرنے کی جرات کر سکتا ہے۔ اسی لمحے تینوں گاڑیوں کے دروازے کھلے اور سب اس میں سے باہر آ گئے۔

جہاں کو یہ آواز ہر طرف سے آگئی تھی کہ کسی بھی گاڑی میں کوئی نہیں ہے۔ اب انہیں زیادہ وقت دینا بے وقوفی تھا۔ اس لیے جہاں نے ایکشن کا اشارہ دے دیا۔ وہ سبھی گھیرے میں کھڑے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ جیسے ہی اشارہ ملا۔ ہر طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ اگرچہ مزاحمتی فائرنگ بھی ہونے لگی تھی لیکن پولیس والوں کی طرف سے فائرنگ ہی اتنی شدت کی گئی تھی کہ ان سے کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کے بچاؤ کے لیے صرف وہی راستہ کھلا ہوا تھا، جہاں جہاں کی کار کھڑی تھی۔ فطری طور پر سب اسی کی آڑ لینے کو بھاگے۔ وہاں تک چند لوگ ہی پہنچے، باقی سڑک پر تر پنے لگے۔ ان میں وہ تینوں کون تھے، یہ دیکھنے کی نہ انہوں نے زحمت کی اور نہ ہی اتنا وقت تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کوئی بھی نہیں جاسکا تھا۔ جو بھی ادھر بڑھتا، فائرنگ کی زد میں آ جاتا، تبھی جہاں نے دیکھا سارے لوگ کار کی آڑ میں آ چکے ہیں اور وہیں سے فائرنگ بھی کر رہے ہیں۔ اس نے سب کو پلٹنے کا اشارہ دے دیا۔ وہ سب پیچھے پلٹنے لگے۔ جیسے ہی وہ رنچ سے باہر آئے، نوتن نے ریموٹ کا بٹن دبائے کہہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ روشنی سے ہر شے چمک اٹھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں بچا تھا۔ سڑک پر آگ ہی آگ تھی۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی وردیاں اتاریں اور آگ میں پھینک دیں۔ یہ ان لوگوں کے نڈر پن کی انتہا تھی۔ ان وردیوں کے نیچے عام لباس تھا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس جا رہے ہیں۔ وہ نگاہوں سے غائب ہو گئے لیکن ان کے ساتھ رابطہ تھا۔ نوتن کور اور جہاں پیدل ہی ایک طرف چل پڑے۔ کافی آگے جا کر انہیں ایک گلی دکھائی دی وہ اس میں گھس گئے۔ بانیا کور سے ان کا رابطہ تھا ہی، اس نے لوکیشن پوچھ لی تھی۔ اس نے کار بھیج دی تھی جو اسی گلی سے نکلے ہی مارکیٹ میں کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔ ان کا رخ اب اس گھر کی طرف تھا، جہاں بانیا کور پہنچنے والی تھی۔ اس نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سجاد فصیح، ایک بیوروکریٹ تھا۔ وہ ایک ایسی پوسٹ پر تھا، جہاں تمام حکومتی معاملات اس کی نگاہوں سے ہو کر گزرتے تھے۔ ظہیر بابر ایک سیاست دان تھا، جو اپوزیشن لیڈر کے طور پر مانا جاتا تھا۔ اس پر نجانے کتنے کرپشن کے الزامات تھے لیکن کوئی بھی ثابت نہیں ہو پایا تھا۔ اخباری بیانات میں وہ ایسا لیڈر مانا جاتا تھا، جو بڑا شعلہ بیاں تھا۔ وہ

اس وقت بہت سارے رکن اسمبلی کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ تیسرا بندہ فخر الدین تھا۔ وہ ایک ایسا کاروباری شخص تھا، جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ پاکستان کے ہر بڑے کاروبار میں تھوڑا یا زیادہ اس کا شیر ضرور ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک پراڈکٹ کو جب چاہے خرید کر اسے منہنگی کر دیتا تھا۔ اس کے بارے میں دوسری بات یہ مشہور تھی کہ وہ رکن اسمبلی پالتا ہے۔ وہ کئی عوامی نمائندوں پر انوسٹمنٹ کرتا تھا اور پھر حکومتوں سے اپنے کام نکھواتا تھا۔

اس رات یہی تین بندے ٹریس ہوئے۔ ان کے ٹریس ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دنیا میں چاہے کہیں بھی ہوں، ایک رات کا کچھ حصہ وہ ساتھ میں گزارتے تھے۔ اس میں وہ کیا باتیں کرتے یا کیا پلان ہوتا یا نہیں ہوتا، یہ تو وہی جانتے تھے۔ لیکن یہی تین لوگ سیاست میں جو کھیل ہوتا تھا وہ کھیلتے تھے۔ بہت غور کرنے پر پتہ چلا کہ یہی وہ لوگ ہیں، ہمیشہ گیم کسی ایک کے حق میں رہتی ہے۔ ان سے باہر جاتی ہی نہیں تھی۔ ملک میں کئی جگہ قتل ہوئے کہیں بھی سراغ نہیں ملا۔ وہ قتل جن کا سراغ نہیں ملا تھا، اس کے ڈاٹے کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ جا کر ضرور ملتے تھے۔ اس کا فائدہ انہی میں سے ایک کو ہوتا تھا۔ بظاہر ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اندر کھاتے وہ یہی کھیل کھیل رہے تھے۔ رات کے پہلے پہر ہی اروند سنگھ نے مجھے ان کے بارے میں تفصیل بتا دی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ جو ایک رات ملتے ہیں، کیا یہ دن مخصوص ہے یا پھر آگے پیچھے بھی ملتے ہیں؟“

”نہیں، آگے پیچھے بھی ملتے ہیں۔“ اس نے بتایا

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے تصدیق چاہی

”دیکھیں، یہ ایک تفصیل طلب معاملہ ہے، لیکن آپ اتنا سمجھ لو کہ ان کے سیل فون سے جو کالیں جاتی ہیں یا آتی

ہیں، وہ ایک ہی نمبر سے ہوتی ہیں اور جگہ جو ہم نے تلاش کی ہے، وہ اسی علاقے میں ہے۔“ اس نے مجھے سمجھایا تو میں نے پوچھا۔

”وہ کیسی جگہ ہے اور کہاں ہے؟“

تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور سے جنوب کی جانب تقریباً سولہ کلومیٹر پر ایک جدید ٹاؤن میں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے میں بھی وہیں رہا تھا۔ جہاں راکٹ لانچروں سے اس گھر کو اڑا دیا گیا تھا، یہ اسی ٹاؤن میں تھا۔

”اس وقت وہ لوگ کہاں ہیں۔“

”تینوں الگ الگ جگہوں پر ہیں۔ لیکن میں انہیں اس جگہ پر لاسکتا ہوں۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تو میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کیسے اروند؟“

”وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ براہ راست ایک دوسرے کو کال کریں۔ اس طرح تو کوئی بھی ان کے تعلق کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ ان تینوں کے آگے فرنٹ مین ہیں۔ ان کا ایک بندے سے رابطہ ہے۔ یہ سب میں نے ان کے فون کا لٹرا سٹرا پکڑ کر معلومات لی ہیں۔ ایک دوسرے تک معلومات پہنچنے میں اگرچہ چند منٹ لگتے ہیں، لیکن یہ بہت محفوظ ہے۔“

”لیکن تم پہنچ گئے ہو۔“ میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”اس لیے کہ میں ذرا ہٹ کر سوچتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔ اس کے ساتھ میں بھی مسکرا دیا۔ پھر وہ میرے سامنے ایک کاغذ رکھ کر بولا۔

”یہ ہے وہ جگہ، اگر کہیں تو ایک گھنٹے بعد انہیں اس مقام پر جمع کر لوں۔“

”ہاں، یہ ممکن ہے انتہائی احتیاط کے ساتھ کہ انہیں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔“

”ممکن ہے، صرف اس بندے کو پکڑنا ہوگا، جو ان کے فرنٹ مین کے درمیان مجبور ہے اور وہ وہیں رہتا ہے۔“ اروند نے بتایا تو میں نے چند لمحے سوچا اور ڈن کر دیا۔

”اس ٹاسک کو جلد پورا کرے گا۔ کیونکہ وہ اس وقت لاہور میں ہے۔ وہاں کے بندوں سمیت سب کو رابطے میں لو اور پلان کرو۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

یہ ساری باتیں سرشام ہوئی تھیں۔ یہ وہی وقت تھا، جب امرتسر میں جہاں اور باقی لوگ پلان کر رہے تھے۔ ادھر انہوں نے بھی پلان ترتیب دے لیا۔

اصل میں جب بھی کوئی پلان بناتا ہے تو وہ بڑا آئیدیل ہوتا ہے۔ سوچا جاتا ہے کہ اگر یوں ہوگا تو ایسے ہوگا۔ یوں ہوگا تو ایسے ہو جائے گا۔ آئیدیل حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس لیے پلان ”اے“ ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔ پلان ”بی“ میں وہی حالات سامنے آتے ہیں، جو کچھ سوچے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی کے بارے میں گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہاں وہی کامیاب ہوتا ہے، جو حالات کو اپنے قابو میں کر لے۔ تیسرا درجہ ہوتا ہے پلان ”سی“، یہ ایسے حالات ہوتے ہیں، جن کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا اور یہ قسمت ہی سے اپنی دسترس میں لائے جاتے ہیں۔

یہی بات ہے کہ جو حاسد سازش کرتے ہیں، وہ پوری طرح اس وقت بے نقاب ہوتے ہیں، جب وہ حالات کو پوری طرح اپنی دسترس میں کر لیتے ہیں اور پھر وار کرتے ہیں۔ جبکہ منافق انتظار کرتا ہے کہ جب اسے پوری تسلی ہوتی کہ شکار اس کے قابو میں آ گیا ہے، تب وہ وار کرتا ہے۔ حاسد اور منافق میں فرق یہ ہوتا ہے کہ حاسد کے اندر غصہ ہوتا ہے، وہ مجبور ہو جاتا ہے، چاہے اس کا تعلق ہو نہ ہو۔ جبکہ منافق دوست بن کر ڈستا ہے۔ پہلے وہ کتے کی سطح پر اترتا ہے اور اپنا آپ وفاداری کی صورت میں ظاہر کرتا ہے، پھر وہ سانپ بن جاتا ہے۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا، جب وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ چار کنال کے اس جنگلے میں چند سیکورٹی والے موجود تھے۔ یہ لگ بھگ پندرہ لوگ تھے۔ جو وقفے وقفے سے اس جنگلے میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ایک گھنٹے میں وہ سب اندر تھے۔ اس دوران جو بھی سیکورٹی والا دکھائی دیتا، اسے پکڑ لیتے۔ وہ انہیں پکڑتے اور وہاں موجود سرونٹ کوارٹر میں لے جاتے۔ ہر ایک سے الگ الگ پوچھتا چھ کرتے۔ جس سے مجموعی طور پر انہیں اندر کے سارے حالات کا پتہ چل گیا۔ یہاں تک کہ وہاں کے سارے لوگ سرونٹ کوارٹر میں بند کر دیے گئے۔

”دیکھو! داری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ سکون سے یہاں رہو گے تو کچھ نہیں کہا جائے گا، ورنہ جس نے بھی عقل مندی دکھانے کی کوشش کی وہ اپنی جان سے جائے گا۔“

اس دھمکی کے بعد باہر سے آئے لوگوں میں سے ایک نے اپنے بیگ سے ایک اسپرے بوتل نکالی اور سب کے چہروں پر اسپرے کر دی۔ جس کے چند منٹ بعد وہ سب بے ہوش ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے ان سب لوگوں کو باندھ دیا۔ اس کے بعد دو لوگ وہاں چھوڑ کر وہ سارے عمارت کی جانب چلے گئے۔ دو بندے سیکورٹی والوں کی جگہ گیٹ پر چلے گئے۔

جنید داغی دروازے سے اندر نہیں گیا بلکہ اس نے عمارت کی بغل میں پکچن سے اندر جانے کا راستہ تلاش کر لیا۔ وہ کبھی اندر چلے گئے۔ لاؤنچ سے ہوتے ہوئے وہ دوسری عمارت کے اس کمرے تک جا پہنچے جہاں سے ہلکی ہلکی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ جنید نے دروازے کو کھولا، جو کھلتا ہی چلا گیا۔ سامنے جہازی سائز کے بیڈ پر ایک نوجوان

لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں برہنہ تھے۔ جنید کی آمد کا احساس پہلے لڑکی کو ہوا، وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ لاشعوری طور پر اس نے اپنی لباس کی جانب ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ اپنی کپڑوں تک نہ پہنچ سکی بیڈ کے ساتھ ہی گر پڑی۔ وہ نشے میں تھی۔ اس کے ساتھ پڑے ادھیڑ عمر شخص کو جب یہ احساس ہوا کہ بیڈروم میں کوئی ہے تو آنکھیں پھاڑے جنید کی جانب دیکھنے لگا۔

”کون ہو تم، اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟“

”میں تمہارا باپ ہوں اور اڑ کر یہاں آیا ہوں۔“ جنید نے طنز یہ لہجے میں کہا اور گھما کر ایک ٹھوکرا اس کے سینے پر دے ماری۔ وہ آؤخ کی آواز کے ساتھ دوہرا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے لڑکی کے لمبوں سے سسکاری نکل گئی۔

”تم کپڑے پہن کر ادھر کونے میں بیٹھ جاؤ، اگر کوئی حرکت کی تو اپنی جان سے جاؤ گی۔“ جنید نے کہا تو وہ ادھیڑ عمر بولا۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”تمہارا سیل فون کہاں ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں، سیل فون کہیں دکھائی نہیں دیا۔ تبھی اس ادھیڑ عمر شخص نے سر ہانے کے نیچے پڑا ہوا سیل فون نکال کر اسے دے دیا۔

”یہ لو۔“

جنید نے سیل فون پکڑا اور اس میں سے ان تینوں کے نمبروں کی تصدیق کی۔ اس میں کالیں بھی تھیں اور پیغام بھی تھے۔ تصدیق کے بعد جنید نے اس سے پوچھا۔

”زندگی چاہتے ہو یا موت۔“

”زندگی۔“ ادھیڑ عمر شخص نے احساس سے عاری لہجے میں یوں کہا جیسے اسے موت کا پورا یقین ہو گیا ہو۔

”تو ان تینوں کو یہاں بلاؤ۔ میں تم دونوں کو کچھ نہیں کہوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“

”کیسے بلاؤں، کیا کہوں؟“ ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔

”یہ تم جانتے ہو۔“ جنید نے کہا اور اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے سیدھا ہوتے ہوئے اپنے اوپر چادر لینے کی اجازت چاہی، جس پر جنید نے سر ہلا دیا۔ اس نے اپنے اوپر چادر لی اور سیل فون پر نمبر پیش کرنے لگا۔ اس نے سب کو یہی پیغام دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے پہنچیں، ایمر جنسی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد ان تینوں ہی کی طرف سے یہ پیغام مل گیا کہ وہ آرہے ہیں۔

تقریباً آدھا گھنٹہ اسی سنسنی خیزی میں گزر گیا۔ یہ وہ لمحات تھے، جب جہاں روڈ پر آچکا تھا۔ جنید کو اس بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد سب سے پہلے فخر الدین آ گیا۔ اس کے ساتھ گارڈز تھے۔ وہ لاؤنج سے باہر ہی رہ گئے۔ جبکہ وہ خود اکیلا اندر لاؤنج میں آ گیا۔ جیسے ہی وہ اندر آیا، اسے ایک بندہ ملا، ہاتھ ملاتے ہی فخر الدین نے پوچھا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”وہ مصروف ہے، آپ تشریف رکھیں۔“

فخر الدین بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی اپنا سگارسلا لیا۔ اگلے دو منٹ میں ظہیر باہر اور اس کے بعد سجاد فصیح آ گیا۔ وہ جیسے ہی آمنے سامنے ہوئے تو پہلا سوال یہی تھا کہ بات کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟ یہ وہ وقت تھا، جب جہاں اپنا کام کر

کے جاچکا تھا اور میں نے یہ خبر جنید کو بتادی تھی۔

”اس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔“ اچانک جنید سامنے آ کر بولا تو وہ چونک گئے۔

”تم کون ہو؟“

”سمجھ لو کہ موت کا فرشتہ ہوں۔ اپنے گارڈ فادر کو اطلاع دے دو کہ اس کی سلطنت اب ختم ہونے کو ہے۔“ جنید نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”اسے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، لیکن تمہارا کام ابھی کر دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے باہر لوگوں کو آواز دینا چاہی۔ فطری طور پر اس کا منہ باہر کی جانب ہوا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ آواز نکالتا، سائیکلنر لگے پستل سے ایک بار ٹھک ہوئی اور اس کے ماتھے میں سوراخ ہو گیا۔ وہ کوئی لفظ منہ سے نکالے بغیر لڑھکتا ہوا قالین پر گر کر رہ پڑا۔

”اب تم میں سے کون بتائے گا اپنے گاؤ فادر کو؟“ جنید نے انتہائی وحشت سے کہا۔

کوئی بھی نہیں۔“ سجاد فصیح نے اٹھتے ہوئے کہا تو جنید نے اس پر پستل تان لیا اسی لمحے وہ تیزی سے بولا، ہمیں صرف حکم ملتا ہے، ہم کوئی بات نہیں بتا سکتے، یہ ہماری مجبوری ہے۔“

”دونوں کو مار دو۔“ میں نے جنید سے کہا تو اس نے پہلے سجاد فصیح کو اور پھر ظہیر باہر کے دل پر نشانہ لگایا۔ تینوں ختم ہو چکے تھے۔ باہران کے گارڈز انتظار کر رہے تھے۔ چاہے تو یہ تھا کہ انہیں بھی ختم کیا جاتا لیکن جنید نے ایسا نہیں کیا۔ سب ایک دوسرے کے رابطے میں تھے، انہیں باہر نکلنے کو کہا۔ جنید کچن سے باہر آ گیا اور اگلے ہی لمحے لان میں داخل ہو کر باؤنڈری وال کی طرف چلا گیا۔ ان سب نے ایک ہی جگہ نہیں جانا تھا۔ ہر کوئی اپنے ٹھکانے کی جانب چلا گیا، جبکہ جنید اپنے ٹھکانے تک جانے کے لیے ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔

اروند سنگھ میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ذریعے یہ خبر بانٹنا کو ترک پہنچا دی۔ نوتن اور جہاں ابھی اس کے پاس نہیں پہنچے تھے۔ بانٹنا کور نے مجھ سے پوچھا۔

”یار یہ کیا ہے، کیسی جادو کی چھڑی ہے، جسے تم استعمال کرتے ہو؟“

”یہ کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ انفارمیشن کا دور ہے، جس کے پاس جتنی زیادہ اور تیز ترین معلومات ہوں گی، وہ چھا جائے گا اور دوسری بات یہ ہے بانٹنا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اتنی تیزی سے آگئی ہے کہ لوگ اسے سمجھ ہی نہیں پا رہے ہیں۔ اس کا استعمال وہیں تک ہے جتنا اسے سمجھتے ہیں۔ جو بہتر انداز میں استعمال کر گیا، وہی کامیاب ٹھہرا۔ یہی جادو ہے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر لینے کو کہا تا کہ وہ اُن دونوں سے رابطہ رکھ سکے۔

اروند سنگھ کافی پینا چاہتا تھا۔ ایسے میں مہوش آگئی تو مجھے وہاں دیکھ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی تو میں نے کہا۔

”مہوش تم بیٹھو، میں اروند کے لیے کافی بنا کر لاتا ہوں، تم پیو گی؟“

”ارے نہیں، آپ بیٹھو میں لے آتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولی تو دروازے میں رونیت کور نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں چائنگ رکھے ہوئے تھے۔

”آپ کوئی بھی نہ جاؤ، میں لے آئی ہوں۔“

”یہ تو تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ اور کافی کا گک پکڑ لیا۔

”لیکن آپ نے یہ کرنا ہے کہ کافی پیئیں اور جائیں سوئی بھابی کے پاس، آپ صبح سے مصروف ہیں، کچھ آرام کر

لیں۔“رونیت نے کہا اور میرے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اور یہ چوتھا کس کے لیے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”فہیم آ رہا ہے، اس کے لیے۔“ اس نے سکون سے کہا اور ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔

”وہ آرام نہیں کر رہا، میرا مطلب ہے تم سارے.....“ میں بات سمجھنے کے لیے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو رونیت بولی۔

”ابھی جواتنے بڑے ہنگامے ہو گئے ہیں، یہی موقعہ جب ان کی کالیں پکڑی جائیں گی۔ اسی افراتفری میں ہی کوئی آگے کا سراغ ملے گا۔ یہی ایک دو گھنٹے ہیں بس۔“ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں کافی پینے تک ان سے باتیں کرتا رہا، پھر اٹھ کر بیڈ روم میں آ گیا۔ جہاں سوئی میری آمد کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جسپال صبح سویرے ہی اٹھ گیا۔ رات کا ہنگامہ اس کے ذہن سے نہیں نکلا تھا۔ وہ اٹھ کر کچن میں گیا، اپنے لیے چائے بنائی اور چمچت پر چلا گیا۔ یہ بالکل ہی نیا علاقہ تھا۔ جیسے شہر کا کوئی مضافاتی علاقہ ہو۔ وہ رات واپس اسی جگہ نہیں گئے تھے، جہاں سے وہ چلے تھے۔ اس دوران بائیتا کور نے ٹھکانہ بدل لیا تھا۔ بائیتا اور نوتن اپنے کمروں میں سوئی ہوئی تھیں۔ وہ چائے کا گامگ لیے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک دم سے ہی اوگی پنڈ یاد آ گیا۔ وہ بھی یونہی تھا۔ ایک طرف اوگی پنڈ کی آبادی اور دوسری طرف کھیت ہی کھیت۔ وہاں کی بھی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ بس اتنا پتہ چلا تھا کہ الوجیت سنگھ رکن بننے کے بعد چند گز چلا گیا تھا۔ اگر وہ حکومت میں آ گیا تو اس کی وزارت کبھی تھی۔ وہ کچھ دیر ہر پریت کو سوچتا رہا، لیکن لاشعور میں رات والا ہنگامہ کہیں گونج رہا تھا۔ اس کے اثرات ابھی تک اس پر تھے۔ بار بار ایک ہی سوال اس کے ذہن میں ٹھوکریں مار رہا تھا کہ اس کا رد عمل کیا ہو سکتا تھا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پنجاب پولیس اس واقعے کے ذمے داروں کو پکڑنے میں سردھڑکی بازی نہ لگا دے۔ یہاں تک کہ بھارت کے سارے خفیہ ادارے انہیں پکڑنے کے لیے بے تاب ہو جانے والے تھے۔ وہ لوگ جو حکومتوں میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے، جو یہ سمجھتے تھے کہ انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، یوں چیونٹی کی مانند مسل دیئے جائیں، ایسا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے تو ایسا ہو کیسے گیا؟ وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اسے سیڑھیوں پر آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں نوتن کور تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”کوئی خیر کی خبر سنانا نوتن۔“ اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تب وہ ہلکھلا کر ہنس دی۔

”پتہ ہے آج ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”مجھے تو نہیں معلوم۔“ وہ اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہمیں چند دن کی چھٹیاں مل گئی ہیں اور ہم کہیں بھی جاسکتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو جسپال بھی ہنس دیا، پھر اس نے پوچھا۔

”کس نے دی ہیں یہ چھٹیاں؟“

”تمہارے جمال نے، ابھی کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا ہے، اس نے کہا ہے کہ چند دن باہر گھوم پھر آؤ، بائیتا کور کی صحت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے خیال میں نہیں ہے۔ ورنہ وہ ہمیں بتا دیتا۔ کوئی اور ہی بات ہوگی، جس بارے میں کم از کم مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے کہا اورنگ سے چسکی لے لی۔

”ہم نکل جائیں گے یہاں سے؟“ اس نے پوچھا۔

”سارا ہندو بست ہو سکتا ہے اگر تم رضا مند ہو جاؤ۔“ اس نے کہا اور پھر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ جسپال چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

”اور وہ لوگ جو پورے پنجاب سے آئے ہوئے ہیں، ان کا کیا بنے گا؟“

”ارے وہ لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ اگر ہم ملک سے باہر جائیں گے تو بلد بوسنگھ کا ان سے رابطہ رہے گا۔ وہ سب تھوڑا عرصہ تک بالکل کچھ نہیں کریں گے۔ اپنی دنیا میں جیسے نارل زندگی گزار رہے تھے، ویسے رہیں گے۔ جب ان کی ضرورت ہوگی، انہیں کال کر لیا جائے گا۔“ اس نے بتایا تو جسپال نے تشویش سے کہا۔

”اگر کوئی کہیں پھنس گیا تو، وہ کہیں بک ہی نہ دے۔“

”اصل میں وہ لوگ جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ صرف سکھی کی خاطر انہوں نے تربیت لی ہوئی ہے، وہ اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور ایک نارل زندگی گزارتے ہیں۔ ان پر کوئی شک بھی نہیں کر سکتا۔ خیر تم ان کی فکر چھوڑو۔ اور چلو تیار ہو جاؤ، ہمیں نکلنا بھی ہے۔“ نوتن نے تیزی سے کہا۔

”اوکے تم چلو میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور چائے کا ایک بڑا گھونٹ لیا۔ اس کے دل میں ایک خواہش ابھری، کاش اس سفر میں ہر پریت بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ یہ خواہش اس کے دل میں تھی اور نیچے آ گیا جہاں بائیتا کور بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”کہیں بھی نہیں، کم از کم ملک سے باہر نہیں جانا۔“ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ایک تو میں ابھی جسمانی طور پر ٹھیک نہیں ہوں، دوسرا، یہاں حکومت بن رہی ہے، اس کا بھی خیال کرنا ہے، میں باپو جی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس نے حتمی لہجے میں کہا تو جسپال نے پوچھا۔

”جمال نے جو کہا وہ کس.....“

”وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم چند دن منظر پر نہ آئیں، یہ جواتنا بڑا کام کر دیا ہے، اس نے بہت سوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، ان کے صرف پاؤں نہیں اکھڑے، دماغ بھی پھاڑ دیئے ہیں۔“ اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

”تو پھر کیا خیال ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”کم از کم باہر نہیں جانا، یہ شہر امرتسر خطرناک ہے اس وقت، اس کے علاوہ کہیں بھی چلو۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو جسپال بولا۔

”تو پھر اوگی چلتے ہیں۔ یہی ہے، گھر میں رہیں گے، باہر نہیں نکلیں گے، وہاں سیکورٹی کے علاوہ، یہ پتہ رہے گا کہ ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”چلو، وہیں چلتے ہیں، لیکن بہت احتیاط کے ساتھ۔“ بائیتا نے کہا تو وہ تیاری کرنے لگے۔

دو پہر سے ذرا پہلے وہ امرتسر سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ وہ تینوں فورڈ جیل جیب میں تھے۔ جمال نے بائیتا کور کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا، اس لیے جسپال نے مزید کوئی کرید نہیں کی تھی۔ اس وقت اس کا سارا دھیان یہاں سے نکل جانے کی طرف ہی تھا۔ وہ شہر کے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ترن تارن ہائی وے کی طرف آچکے تھے۔ کچھ

ہی دیر بعد انہیں شہر سے نکل جانا تھا۔ وہ تینوں خاموش تھے۔ وہ کسی نادیہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے پوری طرح محتاط تھے۔ یہاں تک کہ وہ شہر سے نکل گئے۔ اگرچہ خطرہ بہت حد تک کم ہو گیا تھا لیکن تھا۔ وہ ڈہنی طور پر دباؤ کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ وہ اوگی کے لیے ترن تارن سے بھی نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

ہیتھروائیئر پورٹ قریب آ رہا تھا۔ میں ڈہنی طور پر تیار ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جہاز لینڈ کر جانے والا تھا۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر ختم ہونے کا تھا۔ جس رات جہاں اور جنید نے بڑے آپریشن کئے تھے۔ اس رات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے یوں برطانیہ کا سفر کرنا پڑے گا۔ اس رات کی صبح جب میں بیدار ہوا تو مجھے مجھے اردن نے ایک چونکا دینے والی خبر بتائی۔ وہ ساری رات یہی دیکھتے رہے تھے، وہ ان دیکھا گاڈ فادر کہاں ہو سکتا ہے؟ اس کا کہیں کھوج لگ سکتا ہے؟ یا اس کے نقش قدم کہاں تک جاتے ہیں، جہاں سے مزید سراغ مل سکے؟ انہیں ایسا کچھ نہیں ملا۔ سوائے اس کے کہ تمام تر کالیں جب کی جاتی ہیں تو نمبر برطانیہ کا ملایا جاتا ہے، لیکن آگے انہیں ریسیو کن کرتا ہے، سامنے سے یہی پتہ ملتا ہے کہ یہ نمبر استعمال ہی میں نہیں ہے۔ یوں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا، وہ بالکل وہی ٹیکنالوجی استعمال کر رہا تھا، جو ہم کر رہے تھے۔ جس طرح ہمارے نمبر کسی جگہ ٹریس نہیں ہوتے تھے، اس طرح وہ نمبر بھی پردہ غائب میں تھا۔

کچھ عرصہ پہلے اردن نے ایک ایسا سوفٹ ویئر بنایا تھا، جس سے کال ٹریس ہو جاتی تھی، لیکن بہر حال، وہ ہم سے بھی آگے تھا۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا نمبر مل جائے، کئی مزید کام کرتا ہوں۔“ اردن نے اپنی طرف سے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم کرو کوشش، ہم کامیاب ہو ہی جائیں گے۔“ میں نے بھی اس کے کام کو سراہتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

”لیکن ایک چیز ہمیں ملی ہے، اب پتہ نہیں وہ اس کا سرا ہو سکتا ہے کہ نہیں، سمجھیں ایویں شک والی بات ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”لندن شہر کے مشرقی علاقے ’اورسیٹ‘ میں، ممکن ہے یہ جگہ کہیں مضافات میں ہو، ایک نمبر جال میں آیا ہے اور وہ کسی کیسینو کا ہے۔ وہاں پر بھی چند اہم لوگوں نے فون کیا ہے۔ اس سے اتنا شک کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی ہوا تو اسی علاقے میں ہوگا۔ کیونکہ ان سارے نمبروں سے ایک جگہ کال ہوئی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے ’اورسیٹ‘ میں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی وہ جوا خانہ ہے، وہاں بھارت سے زیادہ کالیں گئی ہیں۔“ اس نے بتایا

”یہ ’اورسیٹ‘ والے جوئے خانے والا نمبر بولتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں نے اس پر بات کی ہے۔ تب تک وہ بند ہو رہا تھا۔ کوئی بہت بد مزاج بندہ تھا، پھر میں نے نہیں کیا۔“ اردن نے بتایا

”اور وہ نمبر ٹریس نہیں ہو رہا ہے، وہ؟“ میں نے پوچھا تو اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ نمبر تو ہے، لیکن وہاں سے یہی ریپانس ملتا ہے کہ وہ نمبر کسی کے استعمال ہی میں نہیں ہے۔“

”اوکے، ناشتے کی میز پر ہم اس بارے میں مزید بات کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

ناشتے کی میز پر سب ہی تھے۔ وہاں اس بارے میں کافی بات ہوئی رہی۔ ایک خیال یہ تھا کہ اس ان دیکھے گاڈ فادر کو ہم تک پہنچ جانے دیا جائے۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دوسرا خیال یہ تھا، وہ جب سامنے آئے گا، سو آئے گا، کیوں نہ ہم پہلے اس تک پہنچ جائیں۔ کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں، انتظار تو کرنا ہی، ممکن ہے وہ اس خاموشی میں اس قدر طاقت سے آئے کہ ہم اس کا حملہ ہی برداشت نہ کر پائیں۔ کچھ دیر بعد یہ فیصلہ ہو گیا کہ لندن جایا جائے۔ ممکن ہے اس آوارہ گردی میں کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔ میں نے اسی وقت بائیتا کور کو فون کر دیا کہ وہ لوگ کہیں باہر کے ملک چلے جائیں۔ اور میں نے اپنے ساتھ جنید اور مہوش کو لے کر لندن جانے کی تیاری کر لی۔ بائیتا کور نے باہر نہ جانے کا فیصلہ کیا اور اوگی چلی گئی۔ وہ دو دن سے وہیں تھی اور سکون سے تھی، جبکہ ہمارے کاغذات کی تکمیل میں وقت لگا اور ہم بھی فلائی کر گئے۔ جنید اور مہوش میرے اسٹنٹ کی صورت میں میرے ساتھ تھے۔ میں برنس ٹور پر تھا۔ ہم نے تانی کے پاس ہی ٹھہرنا تھا۔

ہیتھروائیئر پورٹ کے مراحل طے کر لینے کے بعد جب میں باہر آیا تو تانی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے وقار سے آگے بڑھی اور کسی برنس دویمین کی طرح اس نے ہاتھ ملایا۔ میں اس کے ہاتھ کی گرفت سے اس کے جذبات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جوت بتا رہی تھی کہ اس کے اندر کیا کچھ چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا۔ ان سب نے باری باری ہاتھ ملایا۔ اسی دوران مہوش اور جنید بھی آگئے۔ وہ ان سے ملنے لگی۔ ان کا تعارف اس نے اپنے دوستوں کی حیثیت سے کرایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب کاروں کے ایک قافلے کی صورت میں چل پڑے۔ ہمارے سفر کا اختتام روم فورڈ کے علاقے میں ہوا۔ جہاں پرانے وقت کا ایک بڑا سارا گھر تانی کی ملکیت میں آیا تھا۔ باقی سب لوگ چلے گئے اور ہم گھر کے اندر آ گئے۔ ابھی ہم بیٹھے بھی نہیں تھے کہ تانی تیزی سے اندر آئی اور سیدھے میرے گلے لگ گئی۔

”یہ دنیا داری بھی نا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ہینچ لیا۔ چند منٹ میرے ساتھ لگے رہنے کے بعد وہ مہوش اور جنید سے بھی یونی ملی۔ پھر بیٹھے ہوئے بولی۔

”کیا کروں یار، یہاں قدم قدم پر کچھ ایسا ہے کہ بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ آزادی جو ہے سو ہے، لیکن ذرا سی بے احتیاطی شک میں مبتلا کر دیتی ہے اور پھر اس پر نگاہ رکھنے لگتے ہیں۔ خیر چھوڑو، ان باتوں کو، فریش ہو جاؤ، باتیں تو چلتی رہیں گی۔“

وہ کہتی چلی جا رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا تھا، وہ ذرا سی بھی نہیں بدلی تھی بلکہ کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔ اس رات کھانے کے بعد میں دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے وہاں کے ماحول کے بارے میں بتاتی رہی۔ پھر جو میں سویا تو اگلے دن کی خبر لایا۔

اگلا سارا دن یونہی ایک فرضی کارروائی میں گذر گیا۔ میں ایک برنس مین تھا اور تانی کی کمپنی کے ساتھ کاروبار کا خواہش مند تھا۔ اس کے منیجر طارق نے جو پاکستانی نژاد تھا، مجھے بہت سارے آپشن دیئے۔ جن پر ہماری بات چیت ہوتی رہی۔ میں یہ وقت اس لیے بھی لے رہا تھا کہ جن چند لوگوں کو میں نے اپنے بارے میں بتا دیا تھا، وہ مختلف علاقوں سے لندن پہنچ رہے تھے۔

میں نے طارق سے اچھی خاصی دوستی کر لی۔ سہ پہر کے وقت جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے پوچھا۔

”سراگر آپ لندن کی سیر کرنا چاہیں، یا کوئی دوسری انٹرٹینمنٹ تو مجھے بتائیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، آپ کو گائیڈ بھی کر دوں گا اور ہمیں بھی کمپنی سے کچھ اچھا وقت گزارنے کو مل جائے گا۔“

”کمپنی کو چھوڑو، یہاں سے چھٹی کے بعد تم میرے ساتھ رہو، ایک دوست کی حیثیت سے، چلو ہماری دوستی کا آغاز ہمیں سے ہو جائے۔“ میں نے اس سے کہا تو وہ پھینکی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

”سر میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ.....“

”اوہ چھوڑو، اور یہ سر کہنا بھی، سیدھے جمال کہو اور اب بتاؤ، ہمیں آج کی شام کہاں گزارنی چاہئے۔“

میرے یوں کہنے پر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر مختلف ڈانس کلب، ہوٹل، اور کئی جگہوں کے نام لیتا رہا، یہاں تک کہ اس نے جب کیسینو گنوائے تو میں نے کہا۔

”کوئی خاص کیسینو ہے تو چلتے ہیں۔“

”اس میں خاص یہ ہے کہ وہ ایک لارڈ کے محل میں بنا ہوا ہے، وہ یہاں کے دارالامرا کا رکن رہا ہے۔ اس کے بیٹے نے اسے پرانے لندن کی ایک جھلک کے طور پر بنایا ہے، عام آدمی وہاں جا ہی نہیں سکتا، بہت امیر کبیر لوگ جاتے ہیں، وہ لوگ جن کے پاس دولت کا شمار نہیں۔ بہت بڑی سطح پر ہوا ہوتا ہے وہاں اور خرچ بہت زیادہ ہے۔“ اس نے مجھے بتایا تو میں ہنس دیا۔

”وہیں چلتے ہیں۔ منفرد تو ہے نا۔“ میں نے کہا تو اسے خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

”اوکے، آپ کو میڈم کے گھر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں ٹھیک تین گھنٹے بعد آپ کو وہیں سے لے لیتا ہوں۔“

”اوکے، میں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ مجھے کارستانی کے گھر تک لے گئی۔

نو بجے کے بعد کا وقت تھا جب ہم اس کیسینو تک جا پہنچے۔ ہماری کار ایک پارکنگ میں لگوانے کے بعد ہمیں ایک راستے سے آگے بھجوا دیا گیا۔ وہ پودوں کی بڑی ساری باڑھی، اس کے دوسری طرف پہنچتے ہی یوں لگا جیسے ہم اٹھارویں صدی کے لندن میں آگئے ہوں۔ ہمارے بالکل سامنے ایک کبھی کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے پاس پرانی وضع کا لباس پہنے ایک انگریز کھڑا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ہماری جانب بڑھا۔ اس نے آکر ہاتھ ملایا اور بڑے اسٹائل سے پوچھا کہ ہم نئے آئے ہیں۔ طارق کے بتانے پر اس نے ہمیں ایک سمت کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ پہلے وہاں سے ٹکٹ لیا جائے۔ میں نے طارق کو اسی وقت پاؤنڈ کی ایک گڈی تھما دی، جسے اس انگریز نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ طارق ٹکٹ لے کر آگیا تو وہ انگریز یوں پچھنے لگا جیسے ہم ہی اس کے لارڈ ہوں۔ وہ ہمیں اس پرانی وضع کی کبھی تک لے گیا۔ جلدی سے پائیدان لگایا، ہم اس میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک لائٹن روشن تھی جو تیل کے بغیر تھی۔ وہ کبھی چند منٹ چلی اور پھر ایک پورچ میں جا کر۔ سامنے بٹرلر قسم کے چند لوگ کھڑے تھے۔ انہوں نے پرانے انگریزوں والی وضع ڈاری نبھائی اور ہمیں راستہ دکھا کر اندر لے گئے۔

”سر کس سمت جانا پسند کریں گے، ڈاننگ ہال کی جانب یا کیسینو؟“ ایک انگریز نے قدرے جھک کر پوچھا۔

”ڈاننگ ہال۔“ میں نے فوراً کہا تو اس نے اس جانب ہماری رہنمائی کر دی۔

ہال میں پرانی موسیقی بج رہی تھی۔ سامنے کئی سازندے مختلف ساز بجا رہے تھے۔ ایک لڑکی جو آدھے سے زیادہ برہنہ تھی، وہ کبھی ہنستی اور کبھی گاتی پھر رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر پوچھا۔

”یار طارق، یہاں حلال فوڈ تو ملنے سے رہا، کیا کریں کھانے کے بارے میں؟“

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، ایک اٹھارویں صدی کا لباس پہنے سفید بالوں والی انگریز لڑکی مسکراتی ہوئی

ہمارے پاس آگئی۔ اس نے آرڈر کے لیے پوچھا تو طارق نے وہی سوال اس سے کہہ دیا۔ اس نے اطمینان دلایا۔ اس نے بتایا کہ ان کے پاس ایک مسلم شیف بھی ہے، جو ایشیائی کھانے بناتا ہے۔ اگر کوئی پرانی ڈش چاہے تو وہ بھی مل جائے گی۔ بہر حال طارق نے آرڈر کر دیا۔ اور ہم ماحول سے لطف اندوز ہونے لگے۔

جس وقت ہم کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے۔ اس وقت ایک لڑکی ہمارے پاس آکر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ اس نے کافی مختصر لباس پہنا ہوا تھا، جس میں پرانے زمانے کی جھلک تھی۔ اس کے بال سفید رنگ کے تھے، جسے اس نے کہیں کہیں سے رنگا ہوا تھا۔ ان بالوں میں پیلے رنگ کا پھول سجایا ہوا تھا۔ بھاری میک اپ، پپٹوں پر نیلا رنگ تھا، گہری لپ اسٹک، گلی میں نقلی موتیوں کا ہار تھا اور کانوں میں اسی رنگ کے بندے تھے۔ وہ ہمارے قریب پڑی کرسی پر آن بیٹھی اور غماز آلود لہجے میں بڑے غرے سے پوچھا۔

”کیا آپ لوگ انجوائے کرنا چاہیں گے؟“

”مثلاً یہاں انجوائے کے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس معاملے میں طارق کوئی بات کرے۔

”بہت کچھ، میں ہوں، اگر میں پسند نہیں تو میرے جیسی مزید بہت ساری ہیں۔ جو رات پھر آپ کو سونے نہیں دیں گی اور اس دنیا میں لے جائیں گی جہاں مزہ اور.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے علاوہ کیا ہے؟“

”قسمت آزمائے کے بہت سارے سنسنی خیز مواقع، جن میں ڈھیروں دولت کمائی بھی جاسکتی ہے اور آپ کی دولت جا بھی سکتی ہے۔ ہر طرح کا کھیل اور کھلاڑی یہاں موجود ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یوں کہا جیسے مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ یہ اس کا کاروباری طریقہ تھا۔ میں سمجھ رہا تھا اور جان بوجھ کر اس کی باتوں میں آکر بڑے غور سے کہا۔

”یہ تو بہت اچھا ہے، کیا تم مجھے کسی ایسے کھلاڑی سے ملوا سکتی ہو، جو کبھی نہ ہارا ہو۔“

میرے یوں کہنے پر وہ ایک لمحے کے لیے چونکی، پھر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا تمہارا ہار جانے کا ارادہ ہے۔“

”دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے، قسمت ہی آزمائے تا تو کسی ایسی جگہ آزمائیں جو بہت مشکل ہو۔“ میں نے یوں کہا جیسے مجھے خود پر حد سے زیادہ اعتماد ہو۔ تبھی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی ادا سے بولی۔

”آؤ، تمہیں ایک حسین کھلاڑی سے ملانی ہوں۔“

میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ وہ مجھے لے کر ہال سے باہر آگئی۔ طارق میرے پیچھے تھا۔ ایک لمبی راہداری کے بعد وہ مجھے ایک اور ہال میں لے گئی، جہاں بہت سارے لوگ مختلف میزوں پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہاں شور نہیں تھا، مجھے ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا جیسے میں کسی لائبریری میں آگیا ہوں۔ وہ مجھے لیتے ہوئے سامنے بنے کاؤنٹر تک گئی۔ وہاں پر موجود لوگ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ لازمی بات ہے، اس وقت میری حیثیت ایک ”بکرے“ کی سی تھی، جسے وہ ذبح کرنے والے تھے۔ وہ مجھے لے کر ایک ایسی میز کی جانب بڑھ گئی جہاں پر ایک اداس سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہولڈر تھا، جس کے آگے سگریٹ سلگ رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر شیشے کا ایک گلاس دھرا ہوا تھا، جس میں سرخ رنگ کی شراب تھی۔ اس نے درزیدہ نگاہوں سے میری طرف

دیکھا اور گلاس اٹھا کر اس میں سے گھونٹ لے لیا۔ وہ یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی شہزادی ہو، یا کم از کم کسی لارڈ کی بیٹی سے کم تو دکھائی نہیں دے رہی تھی، جس کے پاس بے انتہا دولت ہو۔

”یہاں بیٹھیں۔“ میرے ساتھ آئی لڑکی نے کہا، میں بیٹھ گیا تو مجھ سے ذرا فاصلے پر طارق بھی ایک کرسی پر جم گیا۔ تجبی ایک گرائڈیل شخص وہاں آ گیا۔ اس کے پاس ٹوکن سے بھری نوکری تھی اور اس کے ساتھ تاش کے بالکل نئے پکٹ۔ میرے ساتھ لڑکی نے کہا۔

”رقم دو، تمہیں ٹوکن ملیں۔“

طارق نے ٹوکن نکال کر دے دیئے، تب تک سامنے بیٹھی لڑکی نے اپنے پرس میں سے کافی ساری رقم نکال کر دے دی تھی۔ ٹوکن سامنے آ گئے تو اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کوئی سا بھی تاش کا پکٹ لے لوں، میں اسے اٹھا لینے کا اشارہ کیا۔ اس نے بے دھیانی سے ایک پکٹ اٹھایا اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے ہتھوں کو پھینکا اور اس کے سامنے رکھ دیئے۔ اس نے پتے اپنے ہاتھوں میں لے کر دوبارہ شیفٹل کئے۔ اس دوران اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں سیاہ نہیں ہیں، بلکہ لیزر لگائے ہوئے ہیں۔ میں ہتھوں پر کم اور اس کی طرف توجہ زیادہ دے رہا تھا۔ اس نے پتے بانٹ دیئے۔

میں پہلے راؤنڈ میں ہار گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے گلاس سے سب لیتی رہی۔ لیکن اگلے راؤنڈ میں گڑ بڑ ہو گئی۔ وہ میں جیت گیا۔ اور پھر مسلسل میں جیتنے لگا۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ اس نے پریشان ہونا تھا، میں نے ان کیسینو والوں کا وہ کمال پکڑ لیا تھا، جس کی وجہ سے وہ کبھی نہیں ہاری تھی۔ میں اچھی خاصی رقم جیت گیا تھا۔ دو گھنٹے مسلسل کھیلنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا تم مزید کھیلنا چاہو گی یا تمہارے پاس رقم ختم ہو گئی ہے۔“

”آج میں جتنے لائی تھی، کھیل چکی ہوں۔ اب مجھے اُدھار لینا ہوگا، جو مجھے پسند نہیں۔“ اس نے شان بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ اسی لمحے وہ بھی اٹھ گئی پھر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔

”میں آج تک نہیں ہاری ہوں، لیکن آج ہار گئی ہوں، کیا میں نام پوچھ سکتی ہوں تمہارا؟“

”میرے بارے میں ان سے پوچھ لو۔“ میں نے طارق کی طرف اشارہ کیا اور وہاں سے پلٹ کر باہر کی جانب جانے لگا۔

میں کھلے میں آ گیا۔ وہاں آ کر چند منٹ لمبے لمبے سانس لیے۔ اندر تمباکو کا دھواں بہت زیادہ تھا۔ اتنے میں طارق آ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔

”آپ نے بہت پونڈ جیتے ہیں۔“

”اس کے پاس تھے ہی اتنے، اس کے بھی کیا، چھوڑو، آؤ صبح وہ ہم سے ملے گی۔“ میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تب طارق بھی میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔

”ہاں وہ ڈنر کی آفر کر رہی تھی۔“

”بڑی بات ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا اور سامنے کھڑی بکھی کو دیکھنے لگا۔ ہم اس میں سوار ہوئے، وہ ہمیں لے کر پارکنگ تک آ گئی۔

گھر آ کر ہم بہت دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ تانی کی تان یہی ٹوٹی تھی کہ تم جس شخص کو تلاش کرنے آئے

ہو، وہ تمہیں ملے گا کیسے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سورات گئے، ہم سو گئے۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے تک مہوش، جنید، تانی اور میں باتیں کرتے رہے۔ میرا اروند کے ساتھ رابطہ تھا۔ وہ پوری طرح تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی ساری توجہ اسی جانب تھی۔ میں نے انہیں رات ہی کیسینو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لیکن انہیں وہاں سے کچھ بھی ایسا نہیں ملا تھا، جس سے پیش رفت ہوتی۔

میں تانی کے ساتھ اس کے آفس چلا گیا۔ میں جیسے ہی وہاں پہنچا طارق نے مجھے بتایا

”وہ رات والی لڑکی کا دو بار فون آچکا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“

”چلو اب فون کرے گی تو اسے یہیں بلا لینا۔“ میں نے کہا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ تب اس نے کہا۔

”سردہ اب فون نہیں کرے گی، میں نے اس سے کہا تھا کہ ہم خود فون کریں گے۔ میں نے سوچا شاید آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں یا نہیں۔“

”لاؤ دو مجھے نمبر میں کال کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو طارق نے لکھا ہوا نمبر مجھے دے دیا۔ میں نے کال ملائی تو دوسری طرف سے فوراً فون رسیو کر لیا گیا۔

”ڈیور بات کر رہی ہوں۔“ وہ اسی خمار آلود لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

”میں وہی جس نے رات کا کچھ حصہ تمہارے ساتھ گزارا تھا اور تم مجھے ملنا چاہتی ہو۔“

”ہاں میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم کہاں ملو گے۔“ اس نے ملائمت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جہاں تم چاہو۔“ میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

”کیا آپ میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کریں گے۔“

”کیا یہ ڈنر ضروری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، بہت ضروری۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے گھر۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں اپنا شیڈول دیکھ لوں، میں کچھ دیر بعد آپ کو کنفرم کر دیتا ہوں۔“ میں نے اسے کہا تو چند منٹ باتیں کرتے رہنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے وہ نمبر اروند کو دے دیا کہ وہ اس پر بھی توجہ کرے۔ مجھے نمبر دیئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اروند کا فون آ گیا۔

”یہ تو وہی نمبر ہے، جس کی وجہ سے آپ اُس کیسینو میں گئے تھے۔“

”بہت خوب۔! اس کا مطلب ہے ہم درست سمت میں جا رہے ہیں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”لیکن بہت احتیاط سے کہیں یہ جال ہی ثابت نہ ہو۔“ اس نے مجھے محتاط ہونے کا مشورہ دیا۔

”وہ میں دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں دن کا کچھ حصہ تانی کے آفس میں رہا۔ پھر اس کے بعد میں کچھ لوگوں سے ملنے ساؤتھ ہال چلا گیا۔ وہاں سے میری واپسی شام کو ہوئی۔ اس دوران میں نے فون کر کے ڈیورا کو بتا دیا کہ میں ڈنر اس کے ساتھ لوں گا۔ اس نے اپنے گھر کے بارے میں بتا دیا۔

میں اس کے گھر تنہا جانا چاہتا تھا، لیکن جنید نہیں مانا، وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ تانی نے ایک بندہ ڈرائیور کے طور پر ساتھ میں کر دیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ کے سفر کے بعد ہم کالوائے آئیر لینڈ میں جا پہنچے جو بالکل ساحل سمندر پر تھا۔ میرے سامنے ایک محل نما گھر تھا۔ پورچ میں کارر کی تو بلڈز نے ہمارا استقبال کیا۔ ایک راہداری کے

بعد ہال میں آئے تو ڈیورا سامنے کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ اپریس ڈنرسوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ میرے گلے لگی۔ اس نے بڑی خوشگوار خوشبو لگائی ہوئی تھی، جس نے مجھے معطر کر دیا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایسے کمرے میں آ گئے جہاں دھیمی روشنی تھی، اور شیشے کی ایک دیوار تھی، جس کے پار سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ جہاں تک روشنی جا رہی تھی، سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ گرم کمرے کے خواب ناک ماحول میں باہر کا منظر بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سیاہ صوفے پڑے ہوئے تھے۔ جیسے یہ کمرہ صرف گفتگو کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔

”خوش آمدید، مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ یوں میری دعوت پر آ جائیں گے، لیکن میں اسے اپنی خوش نصیبی خیال کرتی ہوں۔“

”میں نے بھی سوچا، اتنی حسین لڑکی، مجھے بلا رہی تو نہ جانا اچھا نہیں ہوگا، میری یادیں ہی خوشگوار رہیں گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو چند لمحوں کے لیے ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔

”اچھا، تم اس کیسینو میں کیسے آئے؟“ اس نے اچانک پوچھا تو میں مسکرا دیا۔ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ میں نے اپنے طور پر یہ طے کیا ہوا تھا کہ اگر وہ سوال کرے گی تو اس کا مطلب ہے اس کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی ہے۔ سو میں نے اس کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ لیکن سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”دراصل جب مجھے یہ بتایا گیا کہ یہاں پرانے لندن کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے تو مجھے یہ دیکھنے کا شوق ہوا کہ پرانا لندن جسے ہم نے صرف پرانی فلموں میں دیکھا ہے، یا کتابوں میں پڑھا ہے وہ دیکھنے میں کیسا ہوگا۔ شاید میں ڈنر کے بعد وہاں سے لوٹ آتا۔ مگر وہ کیسینو کی ملازمت لڑکی مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔“

”ہاں، گا کہوں کو گھیرنے کے لیے وہاں کئی لڑکیاں ہیں۔“ اس نے کہا تو ہمارے درمیان پھر خاموشی در آئی یوں لگا جیسے باتیں ختم ہو گئی ہوں۔ تبھی وہ انہی اور میرے قریب آن بیٹھی۔ خوشگوار خوشبو کا جھونکا مجھے سرور کر گیا۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ اس کی سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔ میں خاموش رہا اور اس کی پیش رفت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ مجھے گرم کر دینا چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے میرے اوپر ی بدن پر سے لباس اتار دیا۔ اس کا سیاہ اپریس بھی اتر چکا تھا۔ اس کے بدن پر صرف سفید انڈر گارمنٹس ہی تھے۔ وہ آدھے کھٹے تک اپنی کوشش کرتی رہی لیکن میرا وجود ٹھنڈا رہا۔ اس میں ذرا بھی حرارت نہ ہوئی تو وہ تھک کر الگ ہو گئی۔

”تم میں جذبات نہیں ہیں۔“ اس نے غصے اور شرمندگی بھرے لہجے میں پوچھا، بلاشبہ وہ جذبات میں بہہ کر اس سطح پر تھی جہاں جنون سرچڑھ جاتا ہے۔ حیوانی جذبے اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

”ہیں، کیوں نہیں ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میں نہیں مانتی کہ تم مرد ہو سکتے ہو، ورنہ ایک صحت مند نارمل آدمی، اس قدر ٹھنڈا رہے، تم مرد نہیں ہو۔“ اس نے پاگلوں کی طرح دائیں بائیں سر مارتے ہوئے کہا۔

”تم صحت مند ہو، نارمل ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بے شک میں ہوں۔“ اس نے غصے میں کہا تو میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”آؤ، اب کوشش کرو۔“

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ جس سطح پر پہنچ چکی تھی، اس کا بدن چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ وہ مجھے منع کر رہی

نہیں سکتی تھی، میں نہ بھی کہتا تو وہ مجبور تھی۔ ایک دم اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دوبارہ میرے قریب ہوئی، جیسے ہی اس نے میرے بدن کو ہاتھ لگایا، وہ ٹھنک گئی۔ چند لمحے کسی جسم کی مانند رہی پھر پیچھے ہٹ گئی۔

”کیا ہوا؟“

”پتہ نہیں، مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے میں برف ہو گئی ہوں۔ چند لمحے پہلے والے جذبات ہی نہیں ہیں۔“ وہ حیرت زدہ انداز میں بولی۔

”تم تو نارمل ہو صحت مند ہو؟“ میں نے اسے یاد دلایا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر یوں اس نے طویل سانس لیا جیسے ہار گئی ہو۔ جیسے اسے سمجھ میں آ گیا ہو کہ برف بدن کیسے ہوتے ہیں۔ وہ اٹھ گئی۔ اس نے اپنا لباس پہنا اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کئی سوال تھے۔ میں خاموش رہا تو اس نے پوچھا۔

”اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے۔“ اس نے پوچھا تو میں نے یوں ہی جھوٹ بچ اسے سنا دیا کہ میں اپنے ملک میں ایک بزنس مین ہوں اور کاروبار کے سلسلے ہی میں یہاں آیا ہوں۔ اسی طرح میں نے اس کے بارے میں پوچھ لیا تو وہ بولی۔

”میں ڈیورا، ایک یہودی ہوں، ایک بد قسمت عورت، تمہیں یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں اور پھر تم سے ایک استدعا کروں۔“

”مقصد، استدعا؟ میں سمجھا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دنیا کے بیشتر لوگوں کی مانند شاید تم بھی نہیں جانتے ہو کہ یہودیوں میں شادی تو ہو جاتی ہے لیکن طلاق لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہم ایسی عورتوں کو ”اگوتا“ کہتے ہیں، مطلب زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت، میں طلاق چاہتی ہوں، لیکن جب تک میرا شوہر اپنی مرضی سے مجھے طلاق نہیں دے گا، میں آزاد نہیں ہو سکتی۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا ہی ہے، یہودی معاشرے میں اگر کسی بیوی کا شوہر طلاق دینے پر رضامند نہ ہو تو پھر وہ جبر بھری زندگی گزارتی ہے۔ سمجھو قید تہائی ہے۔“

”یہ اصول ہے یا.....“

”دراصل پرانے زمانے میں جنگ پر چلے جانے والے مردوں کی ان بیویوں کو ”اگوتا“ قرار دے دیا جاتا تھا، جو مرد واپس نہیں آتے تھے یا لاپتہ ہو جاتے تھے۔ وہ عورتیں دوسری شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ اصول جدید صورت میں اس طرح لاگو ہے۔ میں قید تہائی اور جبر کی زندگی گزار رہی ہوں۔ میرا شوہر مجھے طلاق نہیں دے رہا اور میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔“ اس نے غم ناک لہجے میں بتایا تو میں نے پوچھا۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ڈیورا؟“

”یہی کہ تم میری معاشی حالت کو برقرار رکھ سکتے ہو۔“ اس نے واضح لفظوں میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

”یہ جو تم ٹھاٹھ بھاٹ دیکھ رہے ہو، یہ شاہانہ زندگی، یہ محل، یہ میرا نہیں، میرے مالک کا ہے، جس کے پاس میں نوکری کرتی ہوں اور اس سے اپنی ضروریات زندگی چلاتی ہوں۔ یہ اس نے مجھے رہنے کے لیے دیا ہوا ہے۔ کل رات جب تم جیت گئے تو میرے مالک نے مجھے بلا کر وارننگ دی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”کیسی وارننگ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ میں پہلی بار اس طرح کیوں ہاری ہوں۔ اس کی وجہ پتہ نہ کرو یا پھر نوکری چھوڑ دو۔“
”تو یہ سب کچھ تم نے اس لیے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، میں نے اپنا بدن استعمال کرنا چاہا مگر تم وہ نہیں ہو جو دکھائی دے رہے ہو۔ تم یہ جانتے ہو کہ میرے ہارنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، میں نے جیتنا ہی تھا تو پھر.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

میں اس کی بات سمجھ چکا تھا۔ اس کا ایسا کرنا اس کی سمجھ کے مطابق درست تھا۔ دراصل کیسینو والے ہر طرح سے دولت اکٹھی کرنے کے تمام حربے آزما رہے تھے۔ ایک حسین لڑکی کو شوچیں کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جو تاش وہاں دیتے تھے، وہ ایسی تھی کہ ان پتوں کے بارے میں پتہ چل جاتا تھا۔ وہ ایسے لینز پہنتی تھی۔ جن سے ان پتوں کی دوسری طرف کا پتہ چل جاتا تھا۔ اس طرح اس کے ہارنے کا کوئی جواز تھا نہ کوئی وجہ۔ میں جان گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میرے ہاتھوں پر لگے کیمیکل سے ان پتوں میں وہ وصف ہی نہ رہا۔ وہ عام پتے بن گئے۔ لینز سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ سب کیا تھا اور میں نے کیا کیا؟

”کیا چاہتی ہو، نوکری کرنا یا نہیں؟“

میرے اس سوال پر وہ میری طرف دیکھتی رہی اور پھر دیکھتے ہوئے لہجے میں بولی۔
”ظاہر ہے میں نوکری چاہتی ہوں۔“

”اپنے مالکان کو بتا دینا کہ جس طرح کے تم نے لینز پہنے ہوئے تھے۔ میں تمہارے ان لینز کے بارے میں پہلے ہی سے معلومات رکھتا تھا۔ میں ایسے موقع کے لیے کیمیکل رکھتا ہوں۔ وہ لگا دیا، تیرے مالکان جانتے ہیں کہ وہ کیا ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا

”کہاں جا رہے ہو، ابھی بیٹھو، وہ کیمیکل نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں بولا۔
”تمہارا کام ہو گیا، اب کیا ہے؟“

”نہیں تم ڈنر تو کر کے جاؤ گے اور پھر مجھے یہ بتاؤ گے کہ ایسا کیا کیا کہ پتے مجھے.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں اب نہیں، پھر سہی۔“

”میں مانتی ہوں کہ یہ سب بعد میں.....“ وہ تیزی سے کہنے لگی تو میں نے اشارے سے روک دیا۔

”تمہیں اپنی نوکری بچانا ہے، وہ بچاؤ بس۔“ میں نے کہا اور اس کے گال یوں تھپتھا دیئے، جیسے چھوٹے بچے کو منایا جاتا ہے۔ میں نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ وہ میرے ساتھ باہر تک آئی، جنید ہال ہی میں تھا۔ میں پورچ میں گیا اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس ان دیکھے گاؤ فادر کے کہیں قریب ہی ہوں۔

☆.....☆.....☆

مجھے لندن آئے وہ تیسرا دن تھا۔ میرا روند سے پورا رابطہ تھا۔ اس دن چھٹی تھی۔ تانی اس دن میرے ساتھ وقت گزارنا چاہ رہی تھی۔ اپنے ساتھ مجھے لندن گھمانے کی خواہش تھی اُسے۔

”دیکھ تانی، مجھے یہاں کی تاریخ جغرافیہ یا نظاروں سے کوئی رغبت نہیں، مجھے جو کام کرنا ہے، میری ساری توجہ اس طرف ہے۔ کیونکہ میں سیر کے لیے نہیں آیا۔“ میں نے اسے صاف لفظوں میں بتا دیا تو وہ بولی۔

”میں تمہارے ساتھ دریائے ٹیمز کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا۔

”چلو۔! وہیں چلتے ہیں۔“ میں نے ایک دم سے کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔
”کہیں تم ناراض تو نہیں ہو؟“

”اُونہیں تانی، میں نے اصل میں کچھ لوگوں کے ذمے کام لگایا ہے، میرا رابطہ انہی کے ساتھ ہے۔ میں اگر ایک دم کہیں چلا گیا، یا فون کا لڑا آتی رہیں تو.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اویار، کیا میں نہیں سمجھتی ہوں، مجھے گاؤ کے طور پر ہی ساتھ لے لو۔“ اس نے کہا اور ایک دم سے ہنس دی۔ کچھ دیر بعد ہم پیدل ہی گھر سے نکل پڑے۔ موسم ابر آلود تھا اور سردی کافی تھی، لیکن اتنی نہیں تھی کہ برداشت سے باہر ہوتی۔ ہم چلتے چلے گئے۔

”کیا پیدل ہی جانا ہے دریائے ٹیمز تک۔“ میں نے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”نہیں یہیں نزدیک ہی ٹیوب ہے، اس سے جائیں گے، بس یہ ذرا سا آگے۔“ اس نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس جانب بڑھ گئے۔

ہم ٹیوب میں جا پہنچے، گیٹ کے بالکل سامنے سیٹیں خالی تھیں۔ جہاں تانی میرے دائیں جانب بیٹھ گئی اور بائیں جانب ایک شخص آکر بیٹھ گیا جس پر میں نے فطری طور پر توجہ نہیں دی۔ اس نے بیٹھتے ہی اخبار اپنے سامنے پھیلا لی۔ کچھ دیر گزری تھی کہ اس کی کہنی میرے پہلو میں زور سے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتا یا اسے احساس دلاتا، میرے کانوں میں آواز آئی

”ڈیورا سے ملاقات کیسی رہی؟“

بلاشبہ آواز اسی شخص کی تھی۔ جس نے اپنے سامنے اخبار پھیلا یا ہوا تھا۔ اس نے اخبار اسی طرح اپنے سامنے پھیلائے رکھا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اسی طرح دھیمے لہجے میں پوچھا تو اس نے اخبار ہٹائے بغیر کہا۔

”اس نے ٹھیک کہا ہے کہ تم وہ نہیں ہو، جو دکھائی دیتے ہو اور ہاں میری طرف دیکھنے کی بجائے صرف میری بات سنو۔“

میں نے اپنا چہرہ سامنے کر لیا تاکہ اس کی بات سن سکوں کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ تبھی میں نے کہا۔
”بولو۔“

”سنو۔! ایک گریٹ آفر ہے تمہارے لیے۔ جتنا تم نے ایک رات میں کمایا ہے، ہر رات کماسکتے ہو، آفر پر اگر بات کرنا چاہو تو ڈیورا کو فون کر کے جگہ بتا دینا، میں آ جاؤں گا۔“ اس کے لفظ ابھی منہ ہی میں تھے کہ ٹرین رک گئی۔ وہ اٹھا اور انتہائی تیزی سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کی طرف تیزی سے لگا، لیکن اس وقت سامنے سے کسی لوگ اندر آ گئے۔ میں باہر نہ نکل سکا۔ میں نے باہر دیکھنا چاہا، لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اور ٹرین چل پڑی۔ میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سیٹ پر آ بیٹھا۔

”کیا بات تھی، یہ تم اچانک.....؟“ فطری طور پر تانی نے مجھے سے پوچھا تو میں نے دھیمے سے لہجے میں اسے بتا دیا کہ ہوا کیا تھا۔ تبھی وہ بولی۔

”پھر کیا سوچا تم نے؟“

”ابھی سوچنے کا وقت ہی کہاں سے ملا ہے، لیکن میں اس سے دوبارہ ضرور ملنا چاہوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن

انداز میں کہا۔

”لیکن سوچ لو، یہاں کچھ بھی ممکن ہے؟“

تانی نے کہا تو میں خاموش رہا۔ سوچ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

ہم دریائے ٹیگز کے کنارے جا پہنچے تھے۔ یہاں سے لندن کے نظارے سامنے تھے لیکن میرے ذہن پر وہی اجنبی سوار تھا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر میں نے ڈیورا کو فون کرنے کے لیے کال ملا دی۔

”مجھے تمہارے فون کا انتظار تھا۔“ اس نے خوش کن لہجے میں کہا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں جو آفر ہوگی سو ہوگی۔ لیکن میں خود تم سے ملنا چاہتی ہو۔“ اس نے یوں کہا جیسے مجھ سے بات کر کے اسے خوش مل رہی ہو

”میں پھر پوچھوں گا کہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے میری زندگی آسان کر دی ہے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یہ سکون ملا ہے کہ زندگی کسی مرد کے بنا بھی گذاری جاسکتی ہے۔ بدن کی آگ اس طرح ٹھنڈی ہو جائے گی، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں برف کی سل بن گئی ہوں۔“

”جبکہ تم نارمل ہو۔“ میں نے اسے یاد دلایا

”مجھے اب پتہ چلا ہے، اسے ہی نارمل زندگی کہتے ہیں جب آپ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھتے ہوں۔ ایب نارمل تو وہ ہوتے ہیں جو اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ جو اپنے بدن پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا، وہ کیا کرے گا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں لمحہ بھر خاموش رہا، پھر پوچھا۔

”وہ کون ہے جو آفر دینے آیا تھا اور غائب ہو گیا؟“

”میں خود اس کے بارے میں نہیں جانتی ہوں۔“ اس کے کہ وہ کیسینو کے مالک سے بہت قریب ہے۔ یہاں محل میں کبھی کبھار مالک کے ساتھ آتا ہے۔ کبھی کئی دن تک یہاں رہتا ہے۔ آج صبح وہ آیا، مجھ سے تمہاری باتیں کرتا رہا اور چلا گیا۔“

”تم نے کیا بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”میری کہ شعلے سے برف بن جانے کی کہانی۔ تمہاری اور میری ملاقات کی روداد۔“ اس نے کہا۔

”اچھا، اس سے کہو کہ مجھ سے ملے، مگر اس طرح کہ میٹھے ساتھ جوڑ لکی ہے، اسے پتہ نہ چلے۔“

”ٹھیک ہے، میں کہہ دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

ایک بوجھ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ وہ جو میں پریشان تھا کہ وہ شخص جو اچانک میرے سامنے غائب ہو گیا، اس کے بارے میں اطمینان ہو گیا کہ وہ کہیں نہیں گیا، وہ خود مجھ سے ملنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ وہ مجھے ملے گا۔

تانی سامنے ایستادہ عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی تحویت کو دیکھتا رہا، پھر پوچھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”یہ جو سامنے عمارتیں ہیں، میں انہیں دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ ان عمارتوں کو کھڑا کرنے میں کتنے انسانوں کا خون بہا ہے۔ ان انگریزوں نے دنیا کے بیشتر سے زیادہ حصے پر حکومت کی ہے، وہاں کی دولت لوٹ کر انہوں نے

اپنا ملک بنایا ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ اس میں ان انگریزوں کا کوئی قصور ہے، کیونکہ جو قومیں اپنی آزادی کی قدر نہیں کرتیں، اپنے قومی مفادات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جلد یا بدیر ایسا لمحہ آتا ہے کہ وہ قوم مردہ قوم بن جاتی ہے۔ اس کا لہو بہہ جائے تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ قربانی نہیں ہوتی۔ قربانی ہمیشہ زندہ کی ہوتی ہے مردہ کی قربانی نہیں ہوتی۔ زندہ قومیں ہی اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتی ہیں۔“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ پھر میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”چھوڑو، ان باتوں کو کوئی اور بات کریں۔“

ہم یوں ہی ماضی میں کھو گئے۔ وہ روہی کی باتیں کرتی رہی۔ روہی میں گزرا ہوا وقت یاد کرتی رہی۔ میں جب وہاں گیا تو انہوں نے کیا ہنسا۔ انہی باتوں کے دوران اس نے یہ انکشاف کر دیا۔

”کیا کبھی تم نے محسوس کیا کہ تم کہیں بھی ہو، روہی کا تم سے رابطہ رہتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ روہی والوں کو تمہارے بارے میں خبر ہوتی ہے کہ تم کہاں ہو؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ہاں میں نے محسوس کیا ہے۔ بلکہ جہاں نے تو کئی بار مجھ سے باقاعدہ یہ سوال بھی کیا ہے، چونکہ میرے پاس جواب نہیں تھا، اس لیے میں نے یہی کہا کہ جب روہی جائیں گے تو پوچھ لینا۔ کیا تم جانتی ہو کہ ایسا کیسے ہے؟“

”ہاں! میری طرح تم اور جہاں دونوں میں بھی ایک چپ لگی ہوئی ہے۔ یہ کسی وقت انہوں نے ہم میں لگا دی تھی، جس کا ہمیں نہیں پتہ تھا۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”انہوں نے مجھے بتا دیا تھا، یہ چپ کہاں لگی ہے، مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے پتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں یہ ہمارے فائدے کے لیے ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے۔“ وہ بتا چکی تو میں بولا۔

”ہاں میں نے کئی بار محسوس کیا ہے، یہ ہمارے فائدے ہی کے لیے ہے۔ خیر، میں یہ بات جہاں کو بتا دوں۔“

یہ کہہ کر میں نے فون نکالا ہی تھا کہ مجھے سامنے سے ڈیورا اور وہی شخص آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس شخص کا چہرہ

آدھے سے زیادہ ڈھکا ہوا تھا۔ سر پر بڑی سی ٹوپی تھی۔ جس میں سے ڈیورا کی طرح اس کے بھی لمبے بال دکھائی

دے رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ انہوں نے لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ

ہمارے پاس آ کر رک گئے۔ ڈیورا نے مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر تانی سے، وہ شخص ویسے ہی کھڑا رہا۔ بھی ڈیورا نے مجھ سے کہا۔

”کیا تمہارے پاس چند منٹ ہوں گے، میرے اس ساتھی کی بات سن لو۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں اتنا وقت تمہاری ساتھی کو وقت دیتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے ساتھ بیچ پر بیٹھ گئی۔ وہ

سامنے رینگ کی جانب بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا، اس لیے میری بات غور سے سننا، میں جو بھی کہوں اس پر رد عمل نہ دکھانا، تم

جانتے ہو کہ میری ایک ساتھی تمہاری ساتھی کے ساتھ بیٹھی ہے اور اسے نہیں معلوم کہ ہم کیا بات کر رہے ہیں۔“

”ہلو۔“ میں نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے، تھوڑا بہت پتہ چلا ہے، خیر! کیا تم جاننے ہو کہ اس وقت دنیا میں افراتفری ہے، جنگیں ہیں، قوموں کے درمیان کشمکش ہے یہ کیوں ہے؟ یہ صرف طاقت کے لیے ہے۔ بڑا طاقتور چھوٹے کو نگل رہا ہے اور بے وقوف قومیں اپنے ہی لوگوں کا گلا کاٹ رہی ہیں۔ مجھے اس پر بحث نہیں کرنی، میں تمہیں ایک بزنس ڈیل دینا چاہتا ہوں، اگر تم مان لو۔“

”کون سی بزنس ڈیل؟“

”دیکھو! ہم ایک کمپنی چلاتے ہیں۔ اس کے لیے ملازمین رکھتے ہیں۔ منیجر سے لے کر شو فر تک کتنے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ ہم دولت کما سکیں۔ بزنس کی دنیا میں نام بنائیں، ایک ایسا پاز کھڑی کر سکیں۔ دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو بھی ملازم بھرتی کریں، وہ ایماندار ہو، اپنے کام کا ماہر ہو، ہم اس کی مہارت کے بدلے میں اسے اس کا معاوضہ دیتے ہیں۔“

”یہ تمہید ہے یا تم کوئی معلومات دے رہے ہو۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس نے برا منائے بغیر کہا۔

”میری بھی ایک کمپنی ہے۔ میں نے اس میں اتنے لوگ بھرتی کئے ہیں کہ مجھے خود نہیں معلوم، لیکن اتنا پتہ ہے کہ وہ لوگ کیسے ہیں۔ ان میں سیاست دان ہیں، مذہبی لیڈر ہیں، قانون دان ہیں، اداکار ہیں، غنڈے ہیں۔ یہ سب میرے اشاروں پر وہی کچھ کرتے ہیں، جو میں چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں ہائیر کیا ہوا ہے۔ جس معاشرے میں جو چاہوں، وہی کروا لیتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں چونک گیا، کہیں یہ وہی گارڈ فادر تو نہیں جس کے پیچھے میں یہاں تک آپہنچا ہوں؟ میں نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے چہرے پر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں عجیب طرح کی سرمستی کے علاوہ گہرائی تھی۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی، اس کی بھونکیں ہلکی ہلکی کانپ رہی تھیں۔

”یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ کمپنی ابھی میں ختم نہیں کرنا چاہتا، ابھی بہت سارا کام پڑا ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود گلامی کر رہا ہو۔

”کیا وہ کمپنی ختم ہونے جا رہی ہے؟“ میں نے پھر پوچھا تو وہ سختی سے بولا۔

”ابھی تک کوئی ایسا پیدا نہیں ہو سکا جو اسے ختم کر سکے اور نہ ہی میں پیدا ہونے دوں گا۔“

”تو پھر تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

”بات یہ ہے جمال کہ.....“

”تم میرے نام سے واقف ہو؟“ میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

”ہاں، جب تم برطانیہ پہنچے تھے، میں تب سے جانتا ہوں کہ تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا، ”ہاں تو جمال، میں تمہیں آخر دے رہا ہوں، تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ، اس کمپنی کا کوئی دفتر نہیں، کہیں آنا جانا نہیں، کوئی عہدہ نہیں، سیلری تم جتنی چاہو، اتنی ملتی رہے گی۔“

”یہ پہلی ہے، بھارت ہے یا.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات ٹوک کر بولا۔

”وارننگ بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”اور تمہیں پتہ ہوگا کہ میں وارننگ دینے والوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”جانتا ہوں، لیکن مدی نالوں میں شکار پکڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی کامیابی کا مطلب یہ نہیں کہ تم

سندر میں شکار کرو اور تم کچھ حاصل کر لو، ایسا نہیں ہے، سندر میں وہیل، شارک اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے، نجانے تم کب شکار ہو جاؤ، تمہیں خود بھی پتہ نہ چلے۔“ اس بار وہ غراتے ہوئے بولا تھا۔

”سوچنے پر یا خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے مسٹر.....“ اتنا کہہ کر میں جان بوجھ کر رک گیا۔

”تم مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”اور میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ تم مجھے آخر کیوں دے رہے ہو؟“

”ہاں، یہ کام کی بات کی ہے تم نے، انڈر ورلڈ میں تمہارا نام بہت سنا ہے خاص طور پر بھارت میں، یہ میں جانتا ہوں کہ تم کام کے بندے ہو، کام کرو۔“ اس نے بڑے سکون سے کیا۔

”کیسا کام؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”وہی جو تم نے اپنے ملک میں کیا اور بھارت میں جہاں نے، ویسا ہی؟“ اس نے کہا تو میں سمجھ گیا یہ بندہ کون ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولا۔

”میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں، اس لیے میں تم تک پہنچا ہوں، میں یہاں تمہارے سامنے ہوں، اس سے اندازہ لگا لو کہ میں تمہیں کتنی اہمیت دیتا ہوں۔ ورنہ تم جتنا وقت بھی لگے رہتے مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے، یہاں تک کہ تمہاری موت کہیں ہو جاتی۔“

”جاؤ، اب گم ہو جاؤ، میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ میں تمہیں آخر کرتا ہوں کہ تم جب چاہے مجھے موت کے گھاٹ اتار دو۔“ میں نے اسے چیلنج دے دیا

”تم بہت پچھتاؤ گے۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

”ابھی تم بچو، تم نشانے پر ہو، جہاں کہو، وہیں گولی لگ جائے گی، بولو۔“ میں نے کہا تو اس نے گھوم کر دیکھا، ڈیورا، بیٹنج پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے سورہی ہو۔ تانی کے ہاتھ میں بسٹل تھا جو اس نے گود میں رکھ کر نال اس شخص کی طرف کی ہوئی تھی، جو میرے پاس کھڑا تھا۔

”بہت اچھا، مجھے تمہارا انداز پسند آیا، لیکن تم نہیں جانتے کہ اس کے گرد ایک مزید گھیرا بھی ہے، جو میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تب تک تم ختم ہو چکے ہو گے، جب تک وہ گھیرا تنگ ہوگا، اس گھیرے کا بندوبست بھی ہے میرے پاس، اب کیا خیال ہے؟“

”میری آفر اب بھی وہی ہے؟“ اس نے کسی خوف کے بغیر کہا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔

”مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری آفر قبول کرو گے۔“

”تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم میرے سامنے ہو اور میں تمہیں ابھی ختم کر سکتا ہوں، لیکن جاؤ، میں نے تمہیں چھوڑا تاکہ پھر تلاش کر سکوں، اگر میں نے تمہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تلاش کر لیا تو پھر تم میری مانو گے، نہ کہ سکا تو میں تمہاری مانوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اسے فیصلہ کرنے میں چند لمحے لگ گئے۔ پھر اس نے ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کے ساتھ گلے ملا۔ یہی وقت تھا، جب میں نے اپنا کام کر دیا۔ میں اس سے الگ ہوا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چند لمحے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھتا رہا، پھر چل دیا۔ ڈیورا ویسے ہی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا تو تانی نے اسے ایک طرف جانے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ

کافی دور چلا گیا تو ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ڈیورا وہیں بیٹھ پر بیٹھی رہی۔
”مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ جو ڈیورا کو ساتھ لایا ہے، اس میں ضرور کوئی بات ہے۔“ تانی نے تیز تیز چلتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔
”یہ پہل کہاں سے آیا۔“

”ڈیورا کا تھا۔ سالی پوری تیاری سے آئی تھی، میں نے بھی صرف ایک سوئی سے کام لیا۔ اب سوئے گی شام تک گہری نیند۔“ اس نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ میں سوچنے لگا، اگر اس وقت میرے ساتھ ایک عام سی لڑکی ہوتی، جس نے تربیت نہ لی ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ ہم دونوں وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح ناشتے کے بعد سے ہر پریت کور کے کمرے میں محفل لگی ہوئی تھی۔ بانیتا کور بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، نوتن کور اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، سندھپ کور ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور جہاں ایک کرسی پر بیٹھا ان سب کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس وقت موضوع یہی تھا کہ وہ ہر پریت کے ساتھ کتنی محبت کرتا ہے۔
”میں اس کا کیا جواب دوں، یہ سوال ہی غلط ہے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔
”لیکن سوال تو ہے نا؟ جو بھی جواب بنے وہ دو۔“ بانیتا کور نے ہنستے ہوئے کہا۔
”دیکھو، تم لوگوں نے جو کچھ کھانا پینا ہے، میں وہ لا دیتا ہوں، اس کے علاوہ جو چاہتی ہو، وہ کر دیتا ہوں لیکن.....“ اس نے کہنا چاہا تو بانیتا تیزی سے بولی۔
”دیکھا ہر پریت، میں نے کہا تھا تا کہ یہ اس سوال کا جواب نہیں دے گا، اب خود ہی دیکھ لو۔ میری بات بالکل ٹھیک ہے کہ یہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔“

”بانیتا، یہ مذاق نہیں بدگمانی ہوگی، ایسا مذاق.....“ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہنا چاہا تو ہر پریت بولی۔
”جیسی! اسے کہنے دو، میں تو جانتی ہوں تا تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔“

”اُوئے جاؤئے، سارے سسپنس کا بیڑا غرق کر دیا ہے تو نے۔ میں تو.....“ بانیتا نے کہنا چاہا تو ہر پریت کور تیزی سے بولی۔

”دیکھتی نہیں ہو جیسی کا چہرہ کیسا ہو گیا ہے۔“

”چل کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یا زاب تو موضوع ہی ختم ہو گئے ہیں، ایک ہفتہ ہو گیا، گھر میں پڑے باتیں ہی کر رہے ہیں۔“ بانیتا نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔
”پھر چونک کر بولی۔

”وہ انوجیت آگیا ہے کہ نہیں؟“

”بتایا تو ہے کہ وہ آگیا ہے اور اپنے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔“ ہر پریت کور نے بتایا۔

”وہ کب جاگے گا یا ر؟“ وہ پھر اُکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

”آجائے گا ابھی کچھ دیر میں۔“ جہاں نے کہا۔

”اچھا، اسے بتا دیتا، وہ کسی سے نہ ملے، جب تک میں اس سے جی بھر کے باتیں نہ کر لوں۔“ بانیتا کور نے کہا۔

”وہ میں نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپنی آمد کے بارے میں ابھی نہ بتائے، اس کا فون بند ہے اور ایک بات اور ہے۔“ ہر پریت کور نے کہا پھر لمحہ بھر رک کر بولی۔

”تیری شادی نہ کرادوں انوجیت کے ساتھ؟“

اس پر سبھی ایک دم سے ہنس دیئے۔ تبھی بانیتا کور بولی۔

”بس پھر جہیز میں کیا آئے گا، یہ تم جانتی ہو۔“

وہ اسی بات پر ہنسنے لگے۔ ایسے میں انوجیت وہاں آگیا۔ جسے دیکھ کر سبھی خوش ہو گئے۔ وہ سب کو یوں بے تکلفانہ انداز میں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”یہاں تو اتنی اچھی محفل لگی ہوئی ہے، میں ایویں خواہ مخواہ سوتا رہا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تبھی بانیتا کور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”انوجیت! یہ تو بس دل بہلانے کے بہانے ہیں، اس کے علاوہ اور کریں بھی کیا؟ تم ساؤ، کیا ہو رہا ہے چندی گڑھ میں۔“

”بس حکومت بن گئی ہے اور ہم حکومت میں آگئے ہیں۔ اب وزیر مشیر بننے کے لیے جوڑ توڑ عروج پر ہے۔ بڑی مشکل سے یہ دو دن نکال کر آیا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو ہم پوچھنا چاہ رہے ہیں، اس کے بارے میں بتاؤ، کیا سوچا جا رہا ہے؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔

”اگر تم لوگ یہ سوچو کہ کوئی پکڑ دھکڑ ہوگی، اسے بھول جاؤ، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ اگر وہ تم لوگوں کو ماریں گے تو انہیں بھی مرنا ہوگا۔“ انوجیت نے کہا تو بانیتا کور نے پوچھا۔

”کیا تمہاری بات ہوئی ہے؟“

”ہاں، میرے سمیت چند لوگوں کی۔ رتن دیپ سنگھ بھی تھے اس میٹنگ میں اور ”را“ والے بھی۔ کون کس خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتا تھا، میں نہیں جانتا لیکن بات ہو گئی اور انہیں باور کرا دیا کہ اب نہیں۔“ انوجیت کے اپنے لہجے میں کافی حد تک گرمی آگئی تھی۔

”کیا تم اس ملاقات کی روداد بتا سکتے ہو؟“ اچانک جہاں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کور کا اور پھر کہتا ہی چلا گیا، ”انہوں نے تم لوگوں پر الزام لگایا، میں الزام کی بات کر رہا ہوں، تصدیق نہیں کہ اشوک مہرہ، ہر نیت سنگھ وغیرہ کو تم لوگوں نے مارا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پرانی باتیں کرتے رہے۔ وہ شک اس لیے کر رہے تھے کہ امرتسر میں تم لوگوں کی ہوٹل کے باہر تصویریں بن گئی تھیں۔ یہی جو ہماری کمزوری تھی، اسے ہی رتن دیپ سنگھ نے پکڑ لیا۔ آخر اتنا اہتمام کیوں، مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اس کا ذمے دار کون؟ پھر جالندھر فارم پر قاتلانہ حملہ کیوں؟ کیا ہم غدار ہیں؟ بہر حال چار پانچ گھنٹوں کی طویل بحث کے بعد اس کا نتیجہ نکل آیا۔“

”کیسا نتیجہ؟“ بانیتا کور نے پوچھا۔

”یہی کہ تم لوگوں نے بھی زیادتی کی۔ دوسری جانب سے بھی ہوئی۔ طے یہ پایا کہ اب اگر کوئی معاملہ ہو، ثابت ہو تو پھر کوئی کارروائی کی جائے۔ ورنہ اب ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ کمیشن بن جائیں گے، پھر جو سزاوار ہوگا، اسے سزا دی جائے گی۔“

”مطلب معاملہ رفع دفع ہو گیا۔“ جہاں نے سکون سے کہا تو انوجیت بولا۔

”ہاں ہو تو گیا ہے فی الحال، لیکن تمہیں پتہ ہے یہ خفیہ ایجنسیوں والے موقعہ کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اب

انہیں ثبوت اکٹھا کرنا ہوں گے۔ اگر آئندہ آنے والے دنوں میں کوئی ثبوت نہ ملے تو کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی گرفتاری ہوگی۔“

”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ بائیتا کور نے پوچھا۔

”کچھ عرصہ انتظار، تم لوگ جہاں رہو۔ بلد پوسنگھ اور اس کے ساتھی اپنے اپنے گھروں میں جائیں۔ کچھ عرصہ تک ان سے رابطہ بالکل نہ رہے اور وہ بھی محتاط رہیں کہ ان کی نگرانی بہر حال ہوگی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی بولی تو چند لمحوں کے لیے ان میں خاموشی چھا گئی۔ تبھی انوجیت سنگھ نے کہا۔
”ممبر بننے کے بعد پہلی دفعہ اوگی پنڈ آیا ہوں۔ میرے یہ دودن تو لوگوں سے ملنے ملائے میں گزر جائیں گے۔ اب شاید میں آپ کو وقت نہ دے سکوں۔“

”ہاں ایسا ہوتا ہے۔ میں بہر حال آج ہی واپس امرتسر چلی جاؤں گی۔ میرے ساتھ تو تن کور بھی جائے گی۔“ بائیتا کور نے سوچتے ہوئے کہا، یوں وہ مختلف باتوں میں کھو گئے کہ آئندہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

لندن کی وہ صبح کھر میں لپٹی ہوئی تھی۔ کب بارش آجائے، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ موسمی حالات بتانے والوں نے بارش کی پیش گوئی کی تھی۔ اس وقت میں اور جنید لندن کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ لندن کا پرانا علاقہ تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ”گاڈ فادر“ اسی علاقے میں موجود ہے، کس گھر میں ہے اس کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ اصل میں جب ہم لاہور سے نکلنے لگے تھے تو یہ طے تھا کہ لندن اور اس کے علاقے میرے لیے اجنبی ہیں۔ زمینی حقائق کے بارے میں جانتا، آدمی جنگ جیت جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اردو سنگھ نے چلتے وقت مجھے ایک ایسی ڈیوٹس دی تھی، جو دیکھنے میں ذرا سی تھی لیکن اسے کسی بھی انسانی جسم سے چپکا دیا جائے تو یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے تل ہو۔ ایک بار چپک جانے کے بعد وہ اترتی نہیں تھی۔ اس نے میرے، جنید اور مہوش کے وہ لگا دی تاکہ ہم کہیں آگے پیچھے بھی ہو جائیں تو کم نہیں ہو سکتے تھے۔ حالات کے بارے میں پتہ نہیں تھا اور ہم ایسے دشمن کی تلاش میں نکلے تھے، جس کے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک فون نمبر تھا۔ میں نے وہ ڈیوٹس ڈیوٹس کے ساتھ بھی لگا دی۔ اس کے بارے میں پتہ چلتا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ میرے لیے بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک خود میرے سامنے آجائے گا، یہ اس کی خود اعتمادی کی انتہا تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی میں پوری طرح کنفرم نہیں تھا، دوسرا میں اس کے کام کے طریقے کار کے بارے میں جانتا چاہتا تھا اور تیسرا وہ جو خود میرے پاس آفر لے کر آ گیا تھا، اس نے ایسا کیوں کیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کا دشمن ہوں، اسے نقصان پہنچا چکا ہوں۔ اس کے پیچھے ضرور کچھ تھا، یہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر یہ سب میرے ذہن میں تھا، اس وقت میرا رویہ ایسا کیوں ہو گیا تھا، مجھے خود نہیں احساس تھا۔ دوسرا مجھے یہ زعم تھا کہ لندن میں جو میرے رابطے تھے، جنہوں نے مجھے اپنی نگاہوں میں رکھا ہوا تھا اور وہ میری سیکورٹی پر مامور ہو چکے تھے، انہی میں سے کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اسی بنا پر میں نے اُسے پہنچ دے دیا کہ اسے جوئیں گھنٹوں میں تلاش کر لوں گا۔ میری سیکورٹی پر مامور لوگ ناکام ہو گئے تھے۔ ڈیوٹس وہیں پہنچ پریشانی رہی تھی۔ اسے اسپتال والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ جبکہ وہ انہیں جیل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جہاں جہاں پھرتا رہا، اس کے بارے میں اردو سنگھ مجھے بتاتا رہا۔ صبح ہوتے ہی میں نے سب کو وارنٹ کر دیا اور اس وقت ہم اس کے گھر کے قریب ایک ریسٹوران میں جا بیٹھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس طرح وہ کل سے اپنی جگہ

تبدیل کر رہا ہے، وہ ضرور یہاں سے بھی نکلے گا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ لندن میں بھی طبقاتی درجہ بندی ہے۔ گورے ایک ہی علاقے میں رہنا پسند کرتے تھے اور ان میں خال ہی کوئی غیر گورا ہوتا اور ایسے علاقے جہاں ایشیائی لوگ رہتے تھے وہاں خال ہی کوئی گورا دکھائی دیتا تھا۔ اس ریسٹوران میں بھی مجھے کوئی ایشیائی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہم وہاں بیٹھے بالکل الگ سے دکھائی دے رہے تھے، یہ خطرناک بات تھی۔ ہمیں وہاں ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنا پڑا۔ تبھی مجھے پتہ چلا کہ وہاں اس گھر سے ایک ایسا شخص پیدل نکلا ہے۔ جیسا میں نے انہیں بتایا ہوا تھا۔ میں بھی ریسٹوران سے باہر آ گیا۔ میرے ساتھ جنید تھا۔ میں نے دیکھا وہ سڑک کے پار گئی کے سرے پر تھا۔ وہ دائیں طرف سڑک کے فٹ پاتھ پر مڑ گیا اور چلنے لگا۔ میں نے سڑک پار کی اور کچھ ہی دیر بعد اس کے قریب جا پہنچا۔ جیسے ہی میں اس کے برابر چڑھا، اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر کہا۔
”میں جانتا تھا کہ تُو مجھے تلاش کر لے گا۔ میں نے چھپنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے، اس لیے سکون سے رہو۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے چلتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
”تو پھر کہاں باتیں کریں۔“ میں نے پوچھا۔

”جہاں تم چاہو۔“ اس نے جواب دیا

”میرے ساتھ چلو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔

”آؤ پھر۔“ میں نے کہا اور رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔ میں نے جنید کو اشارہ کیا۔ وہ کار قریب لے آیا، جس کی ڈرائیونگ وہاں کا ایک مقامی پاکستانی نژاد کر رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور ہم چل پڑے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے، وہاں کے لوگوں نے ایک جگہ بنائی ہوئی تھی۔ جہاں کسی کو بھی لے جا کر پوچھنا چاہا جاسکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں آ گئے جہاں بہت کم آبادی تھی۔ اس دوران ہم یوں خاموش رہے، جیسے ہمارے درمیان اعصابی جنگ چل رہی ہو۔

وہ کسی لاڈ کا قلعہ نما گھر تھا۔ جہاں سوائے چند لوگوں کے کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ لاڈلہ نجانے کب کا اسے بیچ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں، کسی کو معلوم نہیں تھا۔ پورچ میں کار سے اترے تو داخلی دروازے کے پاس چند لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گاڈ فادر داخلی دروازے کے باہر ہی کھڑا ہو گیا اور بازو اٹھا دیے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اپنی تلاشی دینا چاہتا تھا۔ وہ لوگ آگے بڑھے، انہوں نے تلاشی لی اور وہ راہداری میں چلا گیا۔ میں اس کی اس قدر تابعداری کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک جنٹلمین کی طرح اپنا کوٹ اتار دیا۔ پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے سامنے بیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا۔ جو کافی بڑی تھیں۔ ہم اس پر چڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ایسے کمرے میں آ گئے، جس کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا اور اسی کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم صوفوں پر آئے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور بہری طرف دیکھ کر بولا۔

”جمال! میں تم پر یہ رعب جھاڑنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ میں کتنا طاقت ور ہوں اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں، میں اب بھی چاہوں تو میں یہاں سے بڑے آرام کے ساتھ جاسکتا ہوں۔ مجھے یہ باتیں نہیں کرنی۔ میں کچھ اور ہی باتیں کرنا چاہ رہا ہوں۔“

”کہو، میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جہاں، میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ میں تمہیں خود یہاں تک لے کر آیا ہوں۔ الیکس کا بیٹا نام ابھی اتنی حیثیت نہیں رکھتا کہ وہ کوئی عالمی گیم کر سکے۔ اس کے پیچھے کچھ دوسرے لوگ ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا تجربہ کامیاب ہو۔ وہ اب بھی کام کر رہے ہیں لیکن بہت جلد ختم ہو جائیں گے، میں تمہیں اس سے پہلے کا جانتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہ تعلق داری کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟“ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے، یہ سوال تو بنتا ہے۔“ میں بولا۔

”اس سوال کا جواب دینے سے پہلے، میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میری سرگزشت میں تمہیں جواب مل گیا تو ٹھیک، ورنہ میں صاف انداز میں بتا دوں گا۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں سن رہا ہوں۔“ میں نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا تو وہ بھی ایزی ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میرا نام راشد محمود ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں۔ میرے ایک تایا تھے، جن کی اولاد میں تین بیٹیاں اور بیٹا صرف ایک ہی تھا۔ دو بڑی خیمیں اور زینت مجھے سے چھوٹی تھی۔ میرا تایا صفدر علی، مجھے سے بڑا پیار کرتا تھا۔ چونکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے، اس لیے بچپن ہی سے میں اپنی کزن کو بہنیں ہی تصور کرتا تھا۔ بڑے ہی خوشگوار ماحول میں زندگی گزر رہی تھی۔ لاڈ پیار اور محبت میں ہماری پرورش ہوتی رہی اور ہم سکون سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے بڑھتے گئے۔

ہوا یوں کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں اپنی مستی میں رہنے والا بندہ تھا۔ میں اپنی موج میں رہتا تھا۔ نہ مجھے طلبہ سیاست سے کوئی غرض تھی اور نہ مذہبی طلبہ تنظیموں سے کوئی مطلب۔ ہاسٹل میں میرے چند ہی کلاس فیلو دوست تھے۔ میں انہی کے ساتھ خوش تھا۔ میری پڑھائی کا ایک برس گزر گیا۔ اس دوران صرف ایک واقعہ ہوا۔ وہ یہ تھا کہ طلبہ تنظیم جو خود کو مذہبی تنظیم بھی گردانتی تھی، ان کے چند لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے چندہ مانگا۔ مجھے یہ تو پوری طرح پتہ تھا کہ یہ چندے کے نام پر پستہ ہے جو ہر طالب علم سے وصول کیا جاتا ہے۔ میں نے چند روپے انہیں دے دیے۔ انہوں نے اپنے پاس لسٹ دیکھی، میں جو چندہ دے رہا تھا، وہ اس لسٹ میں درج رقم سے کہیں کم تھا۔ مجھے اتنے ہی دینے کے لیے کہا گیا تو میں نے دینے سے یکسر انکار کر دیا۔ انہوں نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ واپس چلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے برس میری کزن زینت نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو اس کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی۔ جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔

یونیورسٹی میں وہ میرے دوسرے برس کے آخری ایام تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہاسٹل میں اسی طلبہ تنظیم کا جو پہلے والا عہدیدار تھا، وہ بدل گیا، اس کی جگہ نیا آ گیا تھا۔ وہی نیا عہدیدار اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر آ گیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے مجھے کہا کہ تمہاری طرف اتنا چندہ بنتا ہے جو تم نے دو برس میں ادا نہیں کیا۔ اس لیے دو دنوں میں وہ چندہ دے دو، ورنہ تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، تمہارے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔ میں نے ان کی دھمکی نظر انداز کر دی۔ اگلے دن میں نے زینت کو ساتھ لیا اور گھر چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد ہم واپس لوٹنے لگے تو زینت نے مجھ سے مشورہ مانگا۔

”بھائی! میں نے تمہیں بتایا نہیں لیکن میری کلاس کا ایک لڑکا ہے، وہ مجھ سے محبت کے دعوے کر کے مجھے بدنام

کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”مجھے بتایا نہیں تم نے، خاموش کیوں رہی ہو؟“ میں نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا

”میں خاموش اس لیے ہوں کہ جب میں اسے کوئی رہنمائی نہیں دے رہی تو چند دن بھوک کر خاموش ہو جائے گا۔ دوسرا وہ طلبہ تنظیم کا ایک بڑا عہدیدار بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسی دیکسی بات ہو جائے۔“ اس نے روٹا ہوا منہ کر کے کہا۔

”اب کیوں بتا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں جاؤں ہی نہ یونیورسٹی، ابا کو بتاؤں ہی نہ، یا سب کچھ بتا دوں، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

”تم چلو یونیورسٹی، وہاں چلتے ہیں، دیکھا جائے گا۔ میں ٹھیک کر لوں گا سب۔“ میں نے اسے تسلی دلا رہا تھا اور اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گیا۔ میں نے زینت کو ہاسٹل چھوڑا اور خود اس طلبہ تنظیم کے بڑے کے پاس چلا گیا۔ اسے ساری صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے سکون سے سنی۔ پھر مجھے اطمینان رکھنے کا کہہ کر واپس بھیج دیا۔

تین دن گزرے تھے۔ اس صبح زینت نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اسے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے وہ لا دوں۔ میں مارکیٹ گیا اور چیزیں لے آیا۔ اس کی کلاس ساڑھے دس بجے کے قریب تھی۔ اس نے دس بجے ہاسٹل سے نکلتا تھا۔ میں کچھ منٹ پہلے اس کے ہاسٹل جا پہنچا۔ وہ ہاسٹل سے نکلی تو میں اس کے لیے لائی ہوئی چیزیں اسے دے دیں۔ اس وقت جب میں وہ چیزیں اسے دے رہا تھا، اسی وقت اسی طلبہ تنظیم کے کافی سارے غنڈے وہاں آ دھمکے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے پوچھا نہیں اور نہ کوئی بات کی، یک لخت مجھے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ میں ان کے منہ سے یہی نکل رہا تھا کہ فاشی پھیلا رہے ہو، ڈیٹ لگا رہے ہو، بتاتے ہیں تم دونوں کو بہرہ رانچھا، انہوں نے زینت کو کچھ نہیں کہا۔ اُن کے ساتھ آئی لڑکیاں اُسے ہاسٹل میں دھکیل کر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے یہاں تک مارا کہ میں ادھ موا ہو گیا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد جو انہوں نے مجھ پر جو ظلم کیا، اس نے میری زندگی بدل دی۔

انہوں نے ایک گدھے کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اس پر بٹھا دیا۔ ایک تار میں پرانے جوتے پروئے ہوئے تھے، وہ میرے گلے میں ڈال دیے۔ موٹر سائیکل کے سائیکلر سے کالک لی اور میرے منہ پر لگا دی۔ ہاسٹل کی طرف والی جو سڑک تھی اس پر مجھے ڈال دیا گیا۔ وہ لمحہ ایسا تھا کہ میں موت کی دعا مانگ رہا تھا، لیکن مجھے موت نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس وقت مر گیا تھا۔ مجھے نہیں ہوش تھا کہ میرے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ بس یہ آواز میرے دماغ کو پھاڑ دیتی تھی کہ جب لوگ پوچھتے کہ اسے گدھے پر کیوں بٹھایا ہے، تو جواب دیتے کہ یہ لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ وہ میرے مرنے کا مقام تھا۔ میرا وجود تو زندہ تھا، لیکن میں مر گیا۔

نہر کے پل پر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں گدھے پر ہی تھا کہ گدھا مجھے نشیب کی جانب لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کیسے گرا ہوں، میں بے ہوش تھا، یہ کچھ دیر کی بے ہوشی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں وہیں نہر کنارے پڑا تھا اور لوگ میرے ارد گرد تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی فیصلہ تھا کہ مجھے مر جانا چاہیے۔ اس زندگی سے اب موت بہتر ہے۔ میں اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ وہاں ٹریفک رواں تھی۔ میں نے چلاٹنگ لگائی اور ایک کار کے سامنے آ گیا۔ مجھے بریک لگنے کی تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس کے بعد درد کی ایک

تیز لہر میرے اندر سرایت کر گئی اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں نے خود کو کنفرم کر دیا کہ میں مر گیا ہوں۔ میری آنکھ کھلی تو میں بیڈ پر تھا۔ کافی ساری پٹیاں مجھے باندھی گئی تھیں۔ میں حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بولنا چاہا تو نہیں بول سکا۔ بلاشبہ میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی کہ ایک دم سے کئی لوگ آگئے، ان میں ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ مجھے دیکھنے لگے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں وہاں صرف ایک دن اور ایک رات رہا ہوں۔ اگلے ہی دن میں ایک بنگلے پر تھا، جہاں میرا باقاعدہ علاج ہونے لگا۔

وہ سکندر خان کا بنگلہ تھا۔ میں جس کار سے نکریا تھا، وہ نجانے کون تھا۔ لیکن اس وقت یہی سکندر خان مجھے وہاں سے اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔

”کیوں لائے مجھے؟ مرنے دیا ہوتا؟“ میرا اس سے پہلا سوال ہی یہی تھا۔

”جس وقت تم گدھے پر تھے تو میں تمہارے قریب سے اپنی کار پر گزرا تھا۔ میں اس وقت کار بیک نہیں کر سکا، میں اوپر سے گھوم کر آیا تو تم سڑک پر خون میں لت پت تھے۔ مجھے اسی وقت تمہاری بے گناہی کا یقین ہو گیا تھا۔ لہذا میں نے تمہیں اٹھایا اور تمہاری دیکھ بھال کی۔“ اس نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

”آپ کی ہمدردی نے.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”بالکل نہیں، مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ایک ذرہ برابر بھی نہیں۔ میرا وجدان تھا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، وہی ہوا، میں نے جب تصدیق کی تو مجھے ساری بات پتہ چل گئی۔ وہ چند لوگ کون تھے، جو ہاسٹل گئے، کہاں اور کیسے پلان بنا، ہاسٹل میں کس لڑکی نے انہیں بتایا کہ تم وہاں آنے والے ہو۔ سب مجھے پتہ چل گیا۔“ اس نے پھر اسی عام سے لہجے میں جواب دیا

”مگر مجھے زندگی نہیں چاہیے، میں مرنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس ظالم معاشرے میں نہیں جی سکتا۔“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہاں سے جانے کے بعد مر جانا۔ لیکن اگر تم ان لوگوں سے انتقام لے کر مرنا چاہو تو میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”کیا تمہاری بھی ان سے دشمنی ہے؟“ میں نے پوچھا تو ایک دم سے ہنس دیا، پھر بولا۔

”میری نہ کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی، میرے اپنے کام ہیں، میرے ساتھ کام کرو، اس کے عوض میں تمہیں ہر طرح کی مدد دوں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ میرے سارے دھندے کالے ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جو میں معاشرے کے سامنے فخر سے بتا سکوں۔ صاف کہوں تو بات یہ ہے کہ تم میرے اچھے ساتھی بن سکتے ہو، میرے ساتھ بڑا جاؤ گے تو طاقت، دولت اور حکومت تیرے قدموں کے نیچے ہوگی اور اگر بنا انتقام لیے مرنا چاہتے ہو تو کل ہی چلے جانا، میں نہیں روکوں گا، یہاں سے جاتے ہی مر جانا، یا کہیں ڈوب مرنا۔“ سکندر خان نے جتنی انداز میں کہا اور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرے ذہن میں صرف انتقام تھا۔ میری اب تک کی تحقیق ہے کہ غنڈہ ہو یا جرائم پیشہ، وہ حوصلے والا تو ہوتا ہے لیکن دل والا نہیں، اندر سے وہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ کمزور پر ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن طاقت ور کے آگے فوراً جھک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے ایک شرابی اپنے دوستوں میں یا کمزور لوگوں میں بڑی بڑکیں مارے گا، غل غپاڑہ کرے گا لیکن پولیس کے چھوٹے سے اہلکار کو دیکھ کر خاموش ہو جائے گا۔

مجھے بالکل تندرست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ میں نے سکندر خان کو بتا دیا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے مر

چکا ہوں۔ اب جو کہو میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔

”ہاں، تمہیں تھوڑا سا کچھ کرنا ہوگا، اس کے بعد تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا، سوائے اس کے کہ تم طاقت ور بنو۔“

”وہ جو تھوڑا سا ہے، وہ کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”جن لوگوں نے تمہیں ہاسٹل کے باہر مارا ہے، انہیں قتل کرنا ہے بس، ذرا سا کام ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ذرا سا کام.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تمہیں بس گولی چلانی ہے۔ باقی سب کام ہو جائے گا۔ اب جاؤ۔“ اس نے کہا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی رات، دس بجے کے بعد کا وقت ہوگا، مجھے بلایا گیا۔ میں ایک جیب میں بیٹھا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ ایک باغ تھا، پیچی اور امرود کے پودے تھے وہاں۔ باغ کے باہر جیب روک کر جب ہم اندر گئے تو وہ چند لڑکے بندھے ہوئے وہاں پڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے پہلی بار پہل چلایا۔ نجانے کیسے اور کہاں گولیاں پڑتی رہیں، لیکن میں نے ہی ان سب کو مارا۔ اسی رات جب میں واپس سکندر خان کے پاس آیا تو میرے طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں ایک ایسی جگہ بھجوا رہا ہوں، جو دنیا سے الگ ہے، لیکن دنیا سے جڑی ہوئی ہے۔ وہاں دو برس رہو۔ ہر طرح کا اسلحہ چلانا سیکھو، پھر واپس آؤ۔ اس دوران اگر میں مر بھی گیا تو کچھ لوگ ہیں جو تمہیں سنبھال لیں گے۔ جاؤ، عیش کرو۔“

میں چلا گیا۔ وہ پاکستان ہی کا ایک علاقہ تھا۔ وہاں میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جدید ترین اسلحہ وہاں موجود ہے۔ ایک طرح سے وہاں پوری فوجی تربیت دے رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتابوں اور جدید ریسرچ مہیا کی جاتی تھی۔ روزانہ اخبار وہاں پہنچتا تھا۔

دو برس گزر جانے کے بعد میں لاہور واپس آ گیا۔ ان دنوں انٹرنیٹ نیا نیا آیا تھا۔ مجھے رہنے کو ایک جگہ دے دی گئی۔ جہاں میں سوائے کھانے پینے، ورزش کرنے سونے اور نیٹ پر نت نئی تحقیق کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایک برس میں یہاں رہا۔ میرے رابطے بڑھنے لگے۔ انہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ سکندر خان کیا چیز ہے۔ وہ مٹی لاٹریٹنگ کا بادشاہ تھا۔ سوئی سے لے کر جہاز تک جو بھی شے بکنے والی ہوتی تھی اس کا تاجر تھا، اس کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ جو تھا۔ اسے ڈینی طور پر شارپ لوگ چاہتے تھے۔ اس کا نیٹ ورک بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وہاں تک رسائی لے جا چکا تھا، جہاں میری سوچ بھی نہیں جاسکتی تھی لیکن میں اس دنیا سے متعارف ہو گیا۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ دنیا کو جس طرح چاہئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایک دن سکندر خان نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا۔

”تمہیں اپنے دشمن یاد ہیں؟“

”کیوں نہیں، میں انہیں بھولا ہوں اور نہ ہی انہیں بھول سکتا ہوں۔ وہ مجھے ہر پہل یاد رہتے ہیں۔“

”دیکھو، دشمن کو کئی طرح سے مارتے ہیں۔ سازش کر کے یا سامنے آ کر لٹاکر۔ وقتی طور پر سبق دے کر تھوڑا بہت، یا پھر ایسے کہ دشمن تو زعمہ رہے، لیکن وہ مرا ہوا ہو، اسے ہر پہل اپنی بے بسی کا احساس ہو۔ یہ سب سے بڑا اور سیانک انتقام ہوتا ہے۔ دشمن کو وقت دینے کے لیے تین برس بہت ہوتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں ابھی نہیں، صرف ان کے بارے میں جانو، معلومات رکھو اور ایسی ضرب لگاؤ کہ وہ ہمیشہ کے لیے تڑپتا رہے کہ اس نے ایسا ظلم کیا ہی

کیوں تھا۔

”میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”انتقام کی آگ کو اپنی جدو جہد کا ایندھن بناؤ۔“ اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

”مجھے کیا کرنا ہے وہ میں سمجھ گیا، آپ کیا کہتے ہو؟“

”دریا بہہ رہا ہے، اس میں ہاتھ ہی نہیں دھونے، بلکہ پوری طرح نہالو۔“

ان دنوں ہیر ورن کا ایسا نشہ سامنے آیا تھا، جس نے انسانی زندگی تو تباہ کرنی ہی تھی، عالمی طاقت کا یہ ہتھیار بھی بن گیا۔ جعلی ڈالر، ہیر ورن کی پیداوار میں سرمایہ اور اس کی حفاظت، اسلحہ کی خرید و فروخت، ہیر ورن کے ساتھ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی ہتھکنڈوں میں بھی یہی زہر استعمال ہونے لگا۔ اسی کے بل بوتے پر اندھی قوتوں کو فروغ دیا جانے لگا۔ جس سے مٹی لاڈلرنگ کا بزنس کا پھیلنے لگا۔ پرائز بانڈ سے لے کر کرکٹ تک کا جو عروج پکڑنے لگا اور اس نے ایک زمانے کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ ریس کے ٹھوڑے کی جگہ کرکٹ نے لے لی۔ اس کے ساتھ ساتھ اندھی قوتیں اس طرح پروان چڑھیں کہ دہشت گردی بڑھنے لگی۔ جرم کی دنیا میں ان حالات کو اچھا خیال کیا جانے لگا تو پھر جرم بڑھتا ہی چلا گیا۔ انسانیت تڑپنے لگی اور موت کے سوداگر زندگیوں کا سودا کرنے لگے۔

جرم کے اس پھیلاؤ میں جدید آلات نے بڑی معاونت کی۔ انڈر ورلڈ نے اسے خوب استعمال کیا۔ ایک عام فون سے لے کر کمپیوٹر اور سٹلائٹ سسٹم سے استفادہ کیا گیا۔ سامراجی نظام نے ایک نیا نقاب اوڑھ لیا۔

میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اگلے تیرہ برس میں نے پوری دنیا گھومی۔ انڈر ورلڈ کا جو عالمی نیٹ ورک ہے نہ صرف اس کا حصہ بن گیا بلکہ اس میں ایک اہم طاقت مانا جانے لگا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں اتنا طاقتور ہو جاؤں گا۔ پندرہ برس سے زیادہ اس دنیا میں گزر گئے۔ میں کڑھتا تھا۔ ظلم کے اس نظام نے بے گناہوں کے لیے یہ زمین تنگ کر دی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ اندر سے کس قدر گھناؤنے ہوں گے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ایک بات سمجھ لی کہ ہر بندہ بکاؤ ہے۔ نہ بکتے والے چند ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کہ دولت سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے۔ دولت کے بغیر لوگ محبت میں بھی بک جاتے ہیں، اپنا آپ وار دیتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی کسی ایسے بندہ کو نہیں آزمایا۔ میں نے ہمیشہ انہی لوگوں پر سرمایہ کاری کی جو اندر سے غلیظ ہوں۔ پیسے کے لیے اپنی غیرت تک بیچ دیں۔ اس دوران میں نے اپنی الگ سے دنیا بنانا شروع کر دی تھی۔ لوگوں کا پیسہ لوگوں پر ہی خرچ ہوتا تھا۔ سکندر خان اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں اس دنیا ہی سے غائب ہو گیا، اپنی دنیا تخلیق کرنے کے لیے۔

میں برس بعد جب میں لاہور میں واپس گیا تو میں ایک نئی دنیا تخلیق کر چکا تھا۔ میں اپنے خاندان کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ میں نے ان سے ناٹھ ہی نہیں رکھا۔ میں ان کے لیے مر چکا تھا۔ میرے والدین اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ تباہی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ کزن تھے۔ لیکن زینت نہیں تھی، وہ میرے دکھ میں اپنی سانس کھو بیٹھی تھی۔ اسے یہی غم لے بیٹھا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا۔ حالانکہ بہت بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ دشمن تو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن رب تعالیٰ ایسے حالات بنا دیتا ہے کہ وہ وقتی طور پر بڑی ذلت آمیز شکست لگتی ہے، مگر وہ بہت بڑی فتح کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جو بعد میں زندگی سنوار دیتی ہے۔

میرے تین دشمن تھے اور تینوں لاہور میں موجود تھے۔ بہتے مانگنے والا عہدیدار جو اب ایک بڑا بزنس مین تھا، یونیورسٹی میں تنظیم کا بڑا سرغنہ جو ایک سیاست دان بن چکا تھا، زینت کو تنگ کرنے والا عہدیدار اسی سیاسی جماعت کی ایک ذیلی تنظیم کا سربراہ تھا اور اسکالر بن گیا تھا۔ میں چاہتا تو تینوں کو ایک وقت میں گولیوں سے چھلنی کروا دیتا لیکن

یہ کوئی انتقام نہیں تھا۔ وہ لوگ جو یونیورسٹی میں میرے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کے اندر داخل ہو کر ان کی تنظیم کو دیمک لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنا دتیرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ خیر یہ باتیں کسی دوسرے رُخ کی ہیں۔ میں انہیں نہیں بھولا، شروع ہی سے انہیں اپنی نگاہ میں رکھا۔

انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو تو اسے کسی قسم کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ میرے دشمن تھے اور میں انہیں کبھی نہیں بھولا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں ان پر نگاہ نہ رکھتا۔ ان تینوں کے بے شمار بیرون ملک ٹور گئے۔ وہاں ان کی بے غیرتیاں بھی عروج پر تھیں۔ دلالوں سے ساز باز کر کے بہت کچھ اکٹھا کر لیا گیا۔ وہ سب کچھ آہستہ آہستہ جمع ہوتا گیا۔ سکندر خان مر گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی۔ میرا شمار ان کے با اعتماد لوگوں میں ہوتا تھا۔ میں جو اپنے کالے دھندوں کا پھیلاؤ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی مرتا ہوا دیکھ رہا تھا، جو غداری کرتے تھے، یا وہ مقابلے میں مارے جاتے، وہ مقابلہ پولیس سے ہوتا، فورسز سے یا پھر دوسری کسی پارٹی سے۔ دھندے کے پھیلاؤ میں مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنے اور زیادہ سے زیادہ خفیہ نیٹ ورک بنانے کا جنون سوار ہو گیا، جو میرے بڑے کام آیا۔

میرے تینوں دشمنوں کے بچے مختلف اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ بزنس مین کی بیٹی، سیاست دان کا بیٹا اور اسکالر کی بیٹی۔ یہ تینوں نئے دور کی پیداوار تھے۔ ان تینوں کے عشق چل رہے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ ایک ایک بندہ لگا دیا گیا۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ”تخلیہ“ کا حصول تھا۔ جو انہیں مہیا کر دیا گیا۔ لوگوں کے عیبوں پر نگاہ رکھنے والے اپنے بچوں کی تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں، یہی ان کا حال تھا۔ وہ دنیا کے سامنے بڑے مقدس تھے۔ لیکن ان کی اپنی اولاد کیا کر رہی ہے انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی۔ اس تخلیہ میں انہوں نے کیا کیا کھل کھلائے، یہ وہی جانتا تھا، جس نے ان کی ریکارڈنگ کی۔ تخلیہ کی ملاقاتیں رنگ لے آئیں۔ انہی دنوں میں وہاں پہنچ گیا۔ میرے سامنے تین سی ڈیز رکھ دی گئیں۔

میں نے سب سے پہلے بزنس مین کو اس کی بیٹی والی سی ڈی بھیجی۔ دو گھنٹے میں جب اس کے پاس وہ سی ڈی پہنچ گئی تو میں نے اسے فون کیا۔

”سی ڈی دیکھ لی تم نے؟“

”ہاں آئی تو ہے، کون ہونم اور کیا ہے اس میں تم ہی بتا دو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”میں ایک گھنٹے بعد فون کرتا ہوں۔ اب میں نہیں بتاؤں گا، تم خود بتاؤ گے یا پھر شہر بھر کے لوگ۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس دوران میں نے دوسروں تک بھی سی ڈیز پہنچا دی۔ آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا کہ بزنس مین کا فون آ گیا۔ اس سے بات نہیں ہو پار ہی تھی۔

”میری بیٹی کو بچالو، میری عزت داؤ پر لگ گئی ہے، جتنی رقم چاہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”مجھے رقم نہیں چاہئے، صرف خود کشی چاہئے، تم کر لو یا تمہاری اولاد کر لے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے سیاست دان کو فون کیا۔ اس نے اپنے کیریئر کا، اپنے بچے کے کیریئر کا رونا رویا۔ میری مرضی کا پیسہ دینے کو تیار تھے۔ میں نے اسے بھی خود کشی کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ تیسرے کے ساتھ بھی ہی کیا۔ تینوں دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک جگہ بلوایا۔ تینوں کو معلوم نہیں تھا میں کون ہوں، ہر ایک کو یہی پتہ تھا کہ وہ مجھے اکیلا ہی ملنے جا رہا ہے۔ وہ سب پہنچ گئے۔ ان تینوں کو الگ الگ بٹھایا گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد تینوں کو بلوایا۔ وہ میرے سامنے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔

”تم تینوں میں مشترک کیا ہے؟“

”طلبہ تنظیم۔“ ان کا یہی جواب تھا۔

”مجھے کیوں نہیں پہچان پارہے ہو؟“

”کچھ دیر بعد وہ سمجھ گئے کہ میں کون ہوں۔“

”ہمیں معاف کر دو۔“ ان کا یہی کہنا تھا۔

”تم لوگوں سے انتقام لینے کی وجہ سے میری زندگی خرچ ہو گئی۔ تم لوگوں نے ظلم کیا، مجھے تو مارا ہی، ذلیل کیا، میں ذلت کیسے بھول جاؤں اور وہ بھی میری ہی بہن پر الزام، صرف اسی لیے کہ تم لوگوں کی غنڈہ گردی قائم رہے۔ معافی تو ہے نہیں، بولو تم تینوں خودکشی کرو گے یا تمہارے بچے؟ کل تک فیصلہ بتا دیتا۔ چلے جاؤ۔“

یہی وہ وقت تھا جب میں کسی دوسرے ہی دشت کی سیاحی میں نکل کھڑا ہوا۔

ان لوگوں نے اپنی ہٹا کی جنگ لڑنا تھی۔ ان سے جو ہوسکا، انہوں نے اپنے وسائل اور تعلقات استعمال کیے کہ مجھے مار ڈالا جائے۔ اگلے دن کی شام تک انہوں نے مجھے مارنے کے لیے کئی لوگ تیار کر لیے۔ میں ہی نہیں رہوں گا تو باقی کیا بچے گا۔ مجھے ان کی جو مصروفیات تھیں پتہ چلتی رہیں۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میرے پاس وسائل اور طاقت نہ ہوتی تو یہ مجھے اب تک مار چکے ہوتے؟ نجائے کیوں مجھے احساس ہوا کہ ہمارے درمیان بساط بھیجی ہوئی ہے۔ وہ تینوں ایک طرف ہو گئے ہیں اور اپنے مہرے کی چال دے رہے ہیں۔ اور میں اپنے مہرے چلا رہا ہوں۔ اسی دن مجھے خیال آیا کہ اگر میں مہرے ہی خرید لوں تو بساط پر اپنی مرضی سے کھیل کھیل سکتا ہوں۔ میری طاقت صرف اور صرف انفارمیشن تھی۔ بروقت معلومات، جیسے اگر ان کی سازش کے بارے میں مجھے پتہ نہ چلتا کہ انہوں نے وار کیسے کرنا ہے تو میں ان کے چنگل میں پھنس جاتا۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ میں نے خود سامنے آئے بغیر ان تک رسائی کی، انہیں کہا کہ اگر ہم انہیں راستے سے ہٹا دیں تو..... جواب مثبت آیا۔ اسی رات انہیں پار کر دیا گیا۔ وہی لوگ جن سے وہ مجھے مروانا چاہتے تھے، انہوں نے ہی انہیں مار دیا۔ ان کے بچے ہمیشہ کے لیے میرے قابو میں آ گئے۔

میں ہمیشہ کے لیے لندن آ گیا۔ میرے قریب ترین دو لوگ تھے، جو میرے بارے میں سب جانتے تھے۔ میں نے انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی اور ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ میں نے جدید ترین آلات کا استعمال کیا۔ اپنے گرد ایک حلقہ بنایا۔ میں صرف انہیں ہی کہتا ہوں۔ وہ آگے کوڑ اور ڈی کوڑ میں بات کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے پاکستان میں لوگوں کو تلاش کیا۔ انہیں طاقت اور رقم فراہم کی انہوں نے ہمارے لیے کام کیا اور خوب کیا۔ اپنے مخصوص مطالبات منوانے کے لیے کیا حربے استعمال کیے، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر بھارت میں یہی کیا۔ وہاں بہت زیادہ بکاؤ مال ہیں۔ خاص طور پر دھرم کے نام پر بلیک میل کرنے والے بہت ہیں۔

جس طرح حکومت کوئی ہل یا عمارت خود تعمیر نہیں کرتی، بلکہ کسی ٹھیکے دار کو اس کا ٹھیکہ دیتی ہے۔ اسے کام چاہئے ہوتا ہے، اسی طرح کالے دھندے کے لوگ ٹھیکہ دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔

ایک بالکل سامنے کی بات ہے۔ غریب خواب بہت دیکھتا ہے، کیونکہ اس کے پاس خوابوں کے علاوہ ہوتا کچھ نہیں۔ یہی خواب اپنے اندر بہت بڑے بڑے آئیڈیا چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے، ان خوابوں کی تعبیر کے لیے سرمایہ دار دولت خرچ کرتا ہے اور انہی خوابوں کو اپنی دولت میں اضافے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں نے بھی غریبوں کے خواب خریدے ہیں اور اس سے دولت نہیں بڑھائی بلکہ صرف طاقت حاصل کی۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں، کمزور کو رگید دیتے ہیں۔

ایک انسانی نفسیات اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنے دل میں ایک خواہش رکھتا ہوں، مثلاً ایک ہندو، مسلمان کو مارنا چاہتا ہے، یا مسلمان ایک ہندو کو ختم کرنا چاہتا ہے، ایک فرقہ یا مسلک کے لوگ دوسرے کو ختم کرنا چاہتے ہیں، میں صرف ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے سہولیات دیتا ہوں، وہ خواہش بھی پوری کر لیتے ہیں اور انہیں دولت بھی مل جاتی ہے۔

میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس دنیا میں نجائے کتنی قوتیں ہیں جو اپنا اپنا مفاد حاصل کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی دشمن ہوتا ہے اور کہیں کوئی دوست بنتا ہے، نہ دشمنی پائیدار نہ دوستی۔ مفاد لیا اور الگ ہو گئے۔ لڑائی وہاں بنتی ہے جب ایک ہڈی پر دوسرے جھپٹ پڑیں۔ میں ہڈی پر نہیں جھپٹتا، بلکہ ہڈی رکھتا تھا۔ یہی میری کامیابی تھی۔“

”اسی تلاش میں تم میری نگاہوں میں آ گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب باغیا کو تمہارے پاس پاکستان آئی تھی، کیوں آئی تھی، مجھے پتہ ہے، پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ سارے میرے مہرے تھے۔“ اس نے طویل بات کے بعد لمبی سانس لی

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تھک گیا ہوں۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا۔ میں نارمل زندگی نہیں گزار سکتا، میرے بچے نہیں ہیں۔ کیا پایا میں نے اتنا سب کچھ کر کے؟“

”ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی ایک نظریہ کے لیے لڑتے رہتے ہیں، منافقت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، حتیٰ کہ رشتے ناطے اور تعلق کی بھی پروا نہیں کرتے، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ جب تمہارے جیسی سوچ پیدا ہو جاتی ہے۔ باطل نظریہ کی پہچان ہی یہی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں یہاں تک کیوں لایا ہوں؟“

”تم خود ہی بتا دو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”میں یہ سب تمہارے حوالے کر کے ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تم میں اور مجھ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جمال، تم کسی مقصد کے لڑ رہے ہو یا نہیں، لیکن تیرے ارد گرد جو لوگ ہیں بغیر کسی لالچ کے تم پر اپنی جان وار دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تم کیا ہو مجھے اس کی سمجھ نہیں آ سکتی، تم پاکستان میں تھے لیکن جب باغیا کو پر حملہ ہوا، تم وہاں بھی تھے۔ میں بڑے بڑے شعبہ بازوں کا جانتا ہوں، کئی ایسوں کو میں نے ہائیر کیا ہوا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عام آدمی ایسی صورت حال سے نہیں نکل سکتا، جیسے تم نکل آئے تھے تمہارے ساتھ کوئی دوسری قوت ضرور ہے، جو تمہاری مدد کر رہی ہے۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا اور ساری بات کہہ کر یوں ہو گیا جیسے اس پر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا مگر میں نے پہلو بدل کر کہا۔

”اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم جتنی بھی طاقت حاصل کر لو، اس کا انجام کیا ہے؟ موت نا، کیا ساری دنیا کی طاقت تمہیں موت سے بچالے گی؟ نہیں نا؟ تم اور مجھ میں فرق صرف یہی ہے کہ تم زندگی کے تعاقب میں ہو، زندگی چاہتے ہو، لیکن میں موت کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تمہیں یہ پتہ ہے کہ موت آگئی تو سب ختم، میں جانتا ہوں کہ موت ہے ہی نہیں، مٹی کا وجود ختم ہے تو اگلا دور شروع ہو جائیگا۔“

”یہ صرف طفل تسلیم ہیں۔ جنگجوؤں نے یہ سب گھڑا ہوا ہے، آخر لوگ جنگ کیوں لڑتے، انہیں ایسی سوچ دے دی گئی، جس کے بل بوتے پر وہ لڑتے تھے، آج بھی دیکھ لو، دنیا بھر میں جتنے نام نہاد مذہبی لوگ ہیں، وہ سب یہی کر رہے ہیں۔ جنت کے۔ سورگ کے، نروان کے ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ یہ سوچ ہی ہے نا جو جنگ پر آمادہ کرتی ہے اور لوگ لڑ رہے ہیں۔“ اس نے کافی حد تک اکتاہٹ سے کہا تو میں نے بڑے نرم لہجے میں اس سمجھایا۔

”دیکھو اگر تم قتل سے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو تو میں تمہیں یہ فرق واضح کر دیتا ہوں کہ جنگ کیا ہے اور جہاد کیا ہے۔“

”بولو، میں سن رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”جتنو، تلاش، کوشش، جدوجہد میں زندگی پڑی ہے۔ یہ زندگی ظاہر ہو رہی ہے اعمال سے، جو عمل کیا جاتا ہے۔ اب یہ زندگی ہے نا، یہ ہے تو اس میں آرزو پڑی ہے۔ آرزو اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، جب تک مقصد نہ ہو۔ مقصد ہوتا ہے مقصود کا اور مقصود ہوتا ہے دل میں۔ دل ہوتا ہے انسان کے اندر۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہ دل میں آرزو کیسی ہے؟ اسی طرح کے اعمال ظاہر ہوں گے اور وہ آرزو کس کے لیے ہے؟“

”تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ انسانی خواہشات ہی اسے جدوجہد میں لگا دیتی ہیں۔“ وہ بولا۔

”ابھی تم سنو، فیصلہ بعد میں دیتا۔“ میں نے کہا، ایک لمحہ رکا اور پھر بولا۔

”انسان کو سب ہی اشرف المخلوقات مانتے ہیں تو اس کی عقل بھی اشرف ہونی چاہئے۔ اور بلاشبہ اس کی عقل اشرف ہے۔ عقل کے ساتھ ہر شے کو زیر کر لیا اور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ عقل تو ہر شے تسخیر کر رہی ہے، کیا یہ اس کے اشرف ہونے کا ثبوت ہے؟ کیا اس کے اعمال ثابت کر رہے ہیں کہ وہ اشرف عقل والا ہے؟ اب اشرف عقل ہے کیا؟ دوسرے انسانوں کا قتل یا انسانیت کی حفاظت؟ اس کے اعمال بتا رہے ہیں کہ اس کی آرزو کیا ہے اور اس کے دل میں کون ہے؟ اب سنو میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک کلاس روم میں جتنے بھی طالب علم ہیں، بظاہر وہ سب وہیں حاضر ہیں، سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن حاضر اسے ہی تسلیم کیا جائے گا، جو استاد کے ساتھ جتنی تعلق جوڑے بیٹھا ہے۔ وہ حاضر نہیں مانا جائے گا، جو کلاس میں تو موجود ہے لیکن اس کا ذہن کہیں دوسری جگہ بھٹک رہا ہے۔“

”تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟“ وہ تیزی سے یوں بولا، جیسے اگلی بات وہ سمجھنا چاہتا ہو۔

”اعمال بتاتے ہیں کہ میں حاضر ہوں یا نہیں۔ سنو یہودی، عیسائی، یا جو بھی غیر مسلم ہیں، اپنا حاضر ہونا ثابت کر رہے ہیں۔ جس طرح وہ حاضر ہونا ثابت کر رہے ہیں، اس طرح حاضر ہونا ممکن نہیں، چاہے انہوں نے اپنا آئین و قانون بنا لیا ہے۔ ہم مسلمانوں کا جو نظام ہے وہ کہاں ہے، ہم کہاں حاضر ہیں؟ میں پاکستان کی بات کرتا ہوں، ہم اگر مسلمان ہیں تو ہمارا نظام عشق اور محبت ہے، انسان اور انسانیت سے محبت والا نظام۔ رحمت اللعالمین ﷺ نے فرمایا ہے نا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، اگر ہمارے دل میں اللہ مقصود ہے، ہماری آرزو کا محور رحمت اللعالمین ﷺ ہے تو پھر یہاں وہ نظام ظاہر کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ اگر یہی معیار بنا لیا جائے تو کیا پاکستان میں مسلمانی ہے؟ ہم خود فیصلہ کر لیں کہ ہم حاضر ہیں یا غیر حاضر؟ ہمارے کردار سے ہمارا ہونا ظاہر ہو رہا ہے؟ کیا دوسروں کے لیے سلامتی ہے؟ اگر ہم مقام مسلمانی پر حاضر نہیں تو پھر ہم میں کون حاضر ہے؟ بلاشبہ وہ شیطان ہی ہو سکتا ہے۔ جو کسی بھی دوسرے مسلمان کے قتل کی آرزو رکھتا ہو۔ عشق و محبت والا آئین جو نبی رحمت اللعالمین ﷺ نے دیا وہ سلامتی ہے۔ وہ کیوں ظاہر نہیں ہو رہا؟ ہم اپنا جائزہ لیں، ہم

”میں کون حاضر ہے؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر میں مسلمان ہوں تو دوسروں کو مجھ سے سلامتی ملنی چاہئے۔ میں اپنے انتقام کے چکر میں کہاں سے کہاں تک بھٹک گیا؟“ اس نے افسوس سے کہا۔

”جب تک تیری مسلمانی یا میری مسلمانی مجھ میں حاضر نہیں تو میں اور تم غائب ہیں۔ مسجد میں میری مسلمانی حاضر ہے، لیکن جب دوکان پر ملاوٹ والی شے بیچ رہا ہوں تو اس وقت مسلمانی کہاں ہے؟“ میں نے سمجھایا

”بلاشبہ غائب ہے؟“ وہ بولا۔

”اب تم خود سوچ لو، تجھ میں کیا حاضر ہے۔ کہیں تم اپنی مسلمانی سے غائب تو نہیں ہو؟ مسلمانی غائب ہے تو شیطانی ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ہمہ وقت حاضر رہوں۔“ اس نے پوچھا۔

”اپنے دل کے ساتھ جڑو۔ اہل دل کے ساتھ جڑو، تاکہ تمہیں دل کی معرفت ملے، یہ دیکھو کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”یار، یہ کیا بات کر رہے ہو، خود کش بم لے کر خود کو پھاڑ دینے والا بھی دل کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔“ وہ تیزی سے یوں بولا جیسے اکتایا ہوا ہو۔

”میں نے پہلے ہی تمہیں سمجھا دیا ہے کہ دل میں مقصود کون ہے اور تمہارے اعمال کیا بتا رہے ہیں، انسان اور انسانیت کا قتل کرنے والے کے دل میں شیطان بیٹھا ہوا ہے اور اگر اس کے اعمال انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں تو اس کے دل میں رحمان ہے۔ فیصلہ تم خود کر لو۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے، کیا میں نے جو اتنا بڑا نیٹ ورک بنا لیا اور جو چاہتا ہوں وہ کر رہا ہوں کیا دل سے نہیں ہوا؟ اب تک تم نے جو کہا، کیا میں شیطانی کی راہ پر ہوں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ اس نے تیز لہجے میں الجھتے ہوئے کہا۔

”یہ تم خود دیکھ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اور کیا کر رہے ہو۔ ہامان، قارون، شداد اور نمرود میں سے کس کی راہ پر ہو۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ جنگجو لوگوں کا وہ بیٹھا نشہ ہے جو وہ لوگوں کو دیتے آئے ہیں، اور اب تک دے رہے ہیں، اسی کے زیر اثر لوگ لڑتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ خود مخلوق میں رہتے ہیں اور لوگوں کو قناعت کا درس دیتے ہیں۔ دنیا میں چند لوگ عام لوگوں کو لڑاتے چلے جا رہے ہیں، کون ماننا ہے خدا کو سب طاقت کی ہوس میں لگے ہوئے ہیں، جس کا بس چلتا ہے وہ دوسرے کو مار دیتا ہے، یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے نا۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں پھر کہوں گا کہ دل کے ساتھ جڑو۔ کیونکہ یقین دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر یقین نہیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”بہت بحث ہو چکی یار، اب کام کی بات کر لیں۔“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مطلب تھا کہ اب تک جو باتیں ہوئیں ہیں وہ کام کی نہیں ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تمہارا فلسفہ ہے، تم جانو، یا جو سمجھنا چاہے وہ سمجھے، میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ جو میں نے نیٹ ورک بنا دیا ہے، اس میں لیمپائر کھڑی کر دی ہے، اسے سنبھالو اور مجھے.....“

”نہیں، مجھے نہیں چاہئے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے بزرگوں نے کہا ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے اور تم جانتے ہو کہ میں اپنی دنیا آپ پیدا کر چکا ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجھے یہ آفر کیوں دے رہے ہو، کیونکہ میں جانتا ہوں۔“

”کیا جانتے ہو تم؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”یہی کہ میں آج نہیں تو کل تمہاری یہ لیمپا ختم کر دینے والا ہوں۔ یہی جنگ اور جہاد میں فرق ہے۔ جہاد فتنے کو ختم کرتا ہے اور جنگ طاقت کے لیے لڑی جاتی ہے۔ میں تمہیں اتنا کہتا ہوں کہ اپنی یہ شیطانیت چھوڑ کر غائب ہو جاؤ یا توبہ کرلو، ورنہ میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ اب بھی تمہیں موقعہ دے رہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نہیں مانو گے۔“ اس نے خرخراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں کہتا ہوں کہ اٹھ کر چل جاؤ اور سدھر جاؤ۔ میں تمہیں ایک موقعہ دے چکا ہوں۔ جاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”میری مرضی کے بغیر تم لندن سے باہر نہیں جاسکتے ہو، میری بات مانو گے یا زندگی کے آخری سانس یہیں گزار دو گے، یہ میرا چیلنج ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ میں نے اسے وہ سمجھایا تھا، جس سے اس کی زندگی سنور جاتی، لیکن وہ ایسا پتھر تھا، جو خود کو دوزخ کا ایندھن بنانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے مجھے لندن سے باہر جانے پر روکا تو میں اس کی ساری طاقت سلب کر لوں گا۔

☆.....☆.....☆

صبح کی ابھرتی ہوئی کرنیں دربار صاحب پر پڑ رہی تھیں۔ دربار صاحب کا سنہری کلس، سرد صاحب میں دکھائی دے رہا تھا، جس کے ساتھ صبح کی سنہری کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سرد صاحب کے ارد گرد بنے پرکرا پرکھڑے جہاں سنگھ اور باغیا کور نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے گیان میں مگن تھے۔ وہ دونوں رات ہی سندھپ کور اور نوتن کور کے ساتھ امرتسر آ گئے تھے۔ وہ رات سکون سے سوئے اور صبح ہوتے ہی وہ دونوں دربار صاحب آ گئے۔ انہیں رات وہاں جانے کے لیے خود سردار رتن دیپ سنگھ نے کہا تھا۔ انہیں وہاں کسی کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر اپنے دھیان میں رہے۔ پھر لنگر خانے کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ لنگر خانے کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ ایک نو عمر سالز کا ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ہلکی ہلکی داڑھی اور مونچھ، بڑی بڑی آنکھیں، اس نے سفید گرتا پہنا ہوا تھا۔ سر پر بنستی چوڑی بانڈی ہوئی تھی۔ وہ وہاں کا کوئی طالب علم لگ رہا تھا۔

”ست سری اکال سردار جہاں سنگھ ڈھلوں جی۔“ اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر بڑے نرم لہجے میں فتح بلائی اور پورا نام دہرایا تو ایک بار جہاں چوک گیا۔

”ست سری اکال، واہگرجی کی فتح۔“ اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر فتح بلائی تو اس لڑکے نے کہا۔

”سردار جی، میرے ساتھ آئیں، آپ جی سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔“

”چلو، جی۔“ اس نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ کسی نے اس نو عمر لڑکے کو بھیجا تھا تو صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہ انہیں لے کر کمپلیکس کی جانب چل پڑا۔ وہ چند قدم آگے تھا۔ چند راہداریاں پار کرنے کے بعد وہ اسے کھلے میں موجود ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے دروازے تک آ گئے۔ جیسی دروازہ کھل گیا۔ ایک کمرے کے بعد اگلے کمرے میں ایک بوڑھا سنگھ زمین پر پٹھی ہوئی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انہی

کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آؤ جہاں اور باغیا پتر، میں کھڑا نہیں ہو سکتا، ورنہ میں.....“ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں سردار جی آپ تشریف رکھیں۔“ جہاں نے تیزی سے کہا۔

”آؤ بیٹھو۔“ اس نے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا سنگھ چند لمحے تک یوں آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا جیسے مراقبے میں ہو۔ پھر ان کی جانب دیکھ کر بولا۔

”میرا نام سر جیت سنگھ بندیاں ہے۔ میں سنت جرنل سنگھ بھنڈرا نوالے کا وہ سیوک ہوں، جو ان کے ساتھ شہید نہ ہو سکا، سا کا چوراسی کے وقت میں یہاں تھا ہی نہیں، میری ڈیوٹی کسی اور جگہ تھی۔ میں وہیں رہا، اس مہان پرش پر قربان نہیں ہو سکا۔ پر اب لگتا ہے، بہت سارا وقت گزر جانے کے بعد بھنڈرا والے کا ویزن کیا تھا۔ اگلی نسل کو کس نے بتانا تھا کہ سکھی کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو۔ پھر بولا۔

”رتن دیپ سنگھ جی نے بہت کام کر لیا۔ دشمن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک ایک لفظ کو وہ سن رہے ہیں۔ وہ بے بس ہو گیا ہے۔ وہ ایسا شیر ہے، جسے بنجرے میں بند ہونا پڑا ہے۔ اور میں اب موت کے دہانے پر ہوں، میرے جیسے کئی سیوک میری طرح کی حالت میں ہیں، اس لیے میں نے سب سے صلاح لی ہے کہ اب یہ کام اگلی پیدھی کو دے دیا جائے، تم سمجھ رہے ہو نا؟“ اس نے جہاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جی میں سن رہا ہوں۔“ اس نے تیزی سے لیکن دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”ہم پچھلے دو ماہ سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تیرے بارے میں بہت باتیں بھی سنی ہیں۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ تم اب سکھی کا وہ کام سنبھالو، جواب تک ہم کرتے آئے ہیں۔“ اس نے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔

”سردار جی، مجھے سکھی کی کوئی بھی سیوا کرنے میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ لیکن میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں بھاسکتا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟“ سردار نے قحط سے پوچھا۔

”نہ تو میں کوئی گیانی ہوں اور نہ ہی میرا سکھی کے بارے میں اتنا علم ہے، جو جس نے بتایا، مجھے اتنا ہی پتہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس رستے کے راہی ہیں، جس کا گزر ائمہ حیردوں میں سے ہے۔ کب کہاں اور کیسے موت آ جائے، اس کا کوئی پتہ نہیں۔ اس وقت سکھی کو اس نوجوان لیڈر کی ضرورت ہے جو کہہ دے تو وہ ہو جائے۔ ایسے کردار والا جس پر کوئی اٹکی نہ اٹھا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ یہاں اسی سکھوں کے مقدس مقام پر شہیدوں کا نشان بنانا چاہتے ہیں تو وہ نہیں بن پارہا۔ وہ لیڈر چاہئے جو منافقوں کو اپنے قبیلے سے نکالے۔“ جہاں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

”تو پھر بتاؤ کون ہے وہ؟“ سردار نے اسی قحط سے کہا۔

”یہ تو آپ بڑے ہیں، آپ کی نگاہ اور مشاہدہ ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“ جہاں سنگھ نے سکون سے کہا۔

”سیاسی طور پر جو بندہ بھی ہم چن لیں، تو کیا تم اس کی جیروی کرو گے۔“ اس نے پوچھا۔

”بالکل، جب تک وہ سکھی کے لیے کام کرے گا، ادھر ادھر ہوا تو نہیں۔“ جہاں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تو

سردار چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

”دیکھو، جہاں سنگھ، سکھی کو اس وقت غیروں سے اتنا خطرہ نہیں، جتنا اپنوں سے ہے۔ بڑی بڑی سازشیں تیار ہو

چکی ہیں اور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ میں پچھلے دو مہینے سے پنجاب میں پھر رہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا ہے۔ میں وہ تمہیں بتاتا ہوں۔“

”جی میں سن رہا ہوں۔“ جہاں نے مودب لہجے میں کہا تو بوڑھا سردار گونج دار آواز میں بولا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ بچائے انسانیت اعتدال پر قائم ہے۔ جب بھی انسانی معاشرے سے اعتدال نکلتا ہے، اسی وقت تنزلی شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس نے موت خود پر وارد کر لی جو دوسرے کو شکار بنانے کے لیے جو موت بناتا ہے، پہلے وہ موت اسی پر وارد ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔“ اس نے کہا تو جہاں خاموش رہا، جب وہ کہتا چلا گیا، ”سا کا خوراسی کے بعد کئی برس تک سکھ نوجوان ہندو کی بھیٹ چڑھتے رہے۔ اس سے سکھی کمزور نہیں ہوئی بلکہ زیادہ مضبوط ہوئی ہے۔ بہت سارے نوجوان بھارت سے نکل گئے، انہوں نے دوسرے ملکوں میں اپنے آپ کو آزمایا، دولت کے انبار جمع کئے۔ لیکن اندر کا انتقام ختم نہیں ہوا۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں یہ انتقام منتقل ہو گیا۔ بھارت سے باہر بیٹھے سکھ آج بھی تڑپ رہے ہیں۔ وہ رقم سے ان نوجوانوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ مگر ان کی رقم ضائع جا رہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ یہاں کی سکھ تنظیمیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو باہر کا مال لے کر صرف کاغذی کارروائی کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسے نوجوان ہیں جو نہ صرف سکھی کو سمجھتے ہیں بلکہ اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ وہ ”اکھ“ والے ہیں۔ وہ اپنی آنا رکھتے ہیں۔ رقم کے حوالے سے کمزور ہیں لیکن سکھی کے لیے یہی کارآمد ہیں۔ ایک تیسری قسم ہے جو یہاں کے سکھ تو ہیں لیکن سازشوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ نشوں نے ان کو مار دیا، عیاشی اور سکھی سے دوری نے انہیں کسی ”جوگا“ نہیں چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان نوجوان میں جو کمزوری ہے، وہ ختم ہو جائے اور وہ سکھ پنہ کے لیے کام کرنے لگیں۔“

”آپ کے دوچار بہت اچھے ہیں لیکن اس کے لیے وہ لیڈر.....“ جہاں نے کہا چاہا تو بوڑھا سردار بولا۔

”میں نے تمہیں لیڈر جن لیا ہے۔ جب تک میری سانس ہے، مجھ سے جو چاہو ملے گا، لیکن انہیں ایک رستہ دے دو۔ مجھے یقین ہے تو اپنی نئی دنیا بنا لے گا۔“

”ٹھیک ہے سردار جی، میں کوشش کروں گا کہ آپ سے کچھ نہ مانگوں، ایک نئی دنیا بنانے کا خواب میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ جہاں نے کہا تو بوڑھے سردار سر جیت سنگھ بندیال کے چہرے پر سرنخی پھیل گئی۔ اس نے پاس پڑے بیگ میں سے ایک ڈی وی ڈی نکالی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”پورے پنجاب سے وہ سکھ اور کوریں جنہیں میں نے اس کام کے لیے تیار کیا ہے، ان کے بارے میں ساری پوری معلومات اس میں ہے۔ یہ جتنے لوگ بھی ہیں، میں انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گا اور.....“

”نہیں سردار جی، اب مجھے اپنے طریقے سے کام کرنے دیں۔ میں ایک لیڈر دوں گا آپ کو، وہ سامنے ہوگا۔ وہی حکم جاری کرے گا۔“ جہاں نے کہا تو بوڑھے سردار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ان کے درمیان بات ختم ہو چکی تھی۔ تبھی ان کے سامنے لنگر جن دیا گیا۔ انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ پوری گفتگو میں بائیکاٹ اور ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

دوپہر سے کافی پہلے وہ واپس حویلی آ گئے تھے۔ ان کے پاس سردار رتن دیپ سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری بات سنی اور پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

”جو کہا ہے اب اس پر پورا اثر کر دکھانا۔ بائیکاٹ ہڑت میں نے تمہیں سکھی کے لیے دان کیا۔“

”دھن بھاگ میرے ہاپو کے۔ میں مایوس نہیں کروں گی۔ جان وار دوں گی۔“ اس نے بھی کہا۔

”بس جو کرو سو بھلا، اس پر مزید بات کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ تبھی بائیکاٹ کرنے جہاں کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جہاں! اب تک جو بھی ہوا، وہ ایک یارانہ تھا، اب صرف سکھی کے لیے لڑنا ہے۔ ہمارے گرد ہمیں موقعہ دے رہے ہیں۔“

جہاں نے بائیکاٹ کرنے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سر سے نیچے کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

”جو بولے سو نہال او۔“

”ست سری اکال او۔“ بائیکاٹ کرنے اس کے نعرے کا جواب دیا اور اس کے گلے لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

میں اور جنید انیر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ ہیتمرو انیر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوخی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل رواں گئی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم چلی آنا، تم پر پابندی توڑا ہے۔“

”ہاں، میں یہاں اکیلی رہ کر اکتا چکی ہوں۔“ اس نے کہا تو جنید نے اعلان کی طرف توجہ دلائی۔ ہم انیر پورٹ کے مراحل کے لیے چل پڑے۔

ہم جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ بالکل ایسے وقت میں جہاز کی فنی خرابی کے بارے میں بتایا گیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا گیا کہ کچھ دیر بعد روانگی ہوگی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ مسافروں کو اترنے کا کب کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جہاز کے اندر چند لوگ آ گئے جو دیکھنے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بزنس مین ہوں، لیکن نگاہ رکھنے والے تاڑ گئے کہ وہ خفیہ کے لوگ ہیں۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک گئے وہ واپس پلٹ پڑے۔ اگلے چند منٹوں میں جہاز خالی کرنے کا کہہ دیا گیا۔ مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر کی بات یاد آ گئی کہ وہ مجھے لندن سے نہیں نکلنے دے گا۔ میں پرسکون تھا۔ میں نے ان سب متوقع صورت حال کا بندوبست کر رکھا تھا، جو وہ ان حالات میں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی ہم لاؤنج میں واپس آئے تو وہاں پتہ چلا کہ جہاز میں بم کی افواہ ہے۔ لیکن یہ صرف مسافروں کے ”بہلانے“ کی ایک کوشش تھی۔ اس گیم کے پیچھے بہت کچھ چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب گاڈ فادر اپنا کام دکھا رہا ہے۔“

”میں تو اسے بہت ذہن آدی سمجھتا تھا، لیکن وہ نرا بے وقوف قسم کا مہرہ نکلا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایسا کر کے اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔ وہ پھر فوج جائے گا، جو اس کے پیچھے ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ اس نے کافی حد تک تشویش سے پوچھا۔

”چائے، گرم گرم چائے پی جانی چاہئے۔“ میرے یوں کہنے پر جنید نے میری طرف دیکھا، پھر بات کو سمجھتے

ہوئے ہنس کر پوچھا۔

”اس سے پہلے کہ ہم سے پوچھنا شروع ہو، چائے پی لی جائے۔“

”ہاں، یہ کی ہے تاسیائوں والی بات۔“ میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں وہاں اکیلا ہی بیٹھا رہا۔ میں نے فون نکالا اور تانی کو کال ملا دی۔ وہ ابھی تک انر پورٹ پر ہی تھی۔ اس نے میری بات سنی اور فون بند کر دیا۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، اسی نے کرنا تھا۔ یہاں تک کہ جنید چائے لیکر واپس آ گیا۔

ہم چائے پی رہے تھے۔ جنید کو پتہ تھا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ پرسکون تھا۔ ہمارے چائے پینے کے دوران بہترین سیاہ سوٹ پہنے چند گورے ہماری جانب بڑھے۔ ان میں سے ایک ہماری جانب آیا، باقی ذرا پیچھے ہی کھڑے رہے۔ وہ کافی فربہ مائل تھا، اس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا موٹے موٹے نین نقش والی کی آنکھیں یوں ٹھٹھیں جیسے سوچی ہوئی ہوں۔ اس نے میرے قریب آ کر بڑے اچھے انداز میں ”گڈ ایوننگ“ کہتے ہوئے اپنا تعارف کرایا

”میرا نام سٹیورٹ جان ہے، میں یہاں کی سیکورٹی میں ایک آفیسر ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کیا آپ میرے ساتھ میرے آفس میں چلیں گے، جہاں ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں۔“

”بالکل، کیوں نہیں چلیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر ڈسپوزیبل کپ ایک طرف رکھا اور اشارے سے پوچھا کس طرف جانا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جنید کو بھی لے کر جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک سادہ سے آفس میں آ گیا۔ سٹیورٹ نے ایک کرسی کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مسٹر جمال! تم لندن کیوں آئے تھے؟“

”بزنس ٹور کے لئے؟“ میں نے جواب دیا

”کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم جتنے دن یہاں رہے اس کی تفصیلات کیا ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل، میں بتا سکتا ہوں لیکن آفیسر! مجھے یہ کنفرم کر دیں کہ کیا میں حراست میں ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے؟ مجھ سے تم تفتیش کر رہے ہو؟“ میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

”نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ معمول کی کارروائی ہے۔ کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوئی دہشت گرد اسی جہاز سے واپس جا رہا ہے، جس نے کوئی یہاں پلان کیا ہے اور جو لندن کے لیے بہت خطرناک ہے۔“ سٹیورٹ نے صاف لفظوں میں کہا۔

”اوکے“ تم جو چاہو سوال کر سکتے ہو۔ ایک دن، چند دن، مہینہ یا جتنے بھی دن تم چاہو، تمہارے مطمئن ہو جانے تک یہیں ہوں۔ تم اپنا اطمینان کرو۔“ میں نے سکون سے کہا اور کرسی سے ٹپک لگالی۔

”تم اتنے بااعتماد کیوں ہو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا

”اس لیے کہ میں نے کوئی غیر قانونی کارروائی نہیں کی، نہ تمہارے ملک کا قانون توڑا اور نہ ہی کسی پلان میں شامل ہوں۔ بلکہ تم کہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”میری مدد؟ وہ کیسے؟“ سٹیورٹ نے پوچھا۔

”سنو کیا تم لوگوں نے اطلاع دینے والے کے بارے میں جان لیا ہے کہ وہ کون ہے؟ یہ اطلاع کس نے دی؟ اسے کیسے پتہ کہ کوئی دہشت گرد اس جہاز سے جا رہا ہے؟ اسے اس تفتیش میں لائے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں! اس کے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے، بہت جلد اس کا پتہ چل جائے گا۔“ اس نے بتایا

”مطلب آپ کے یعنی سیکورٹی کے کسی بندے نے اطلاع نہیں دی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، کسی شہری نے یہ اطلاع دی ہے۔“ اس نے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب آپ جتنے چاہیں سوال کریں۔ اگر میں پاکستان پہنچ بھی گیا تو تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔“ میں نے کہا اور سکون سے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے مختلف سوال کرتا رہا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے مجھے جانے کا کہہ دیا۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔

میں دوبارہ تانی کو کال ملائی اور اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس گفتگو میں ایسا کوئی لفظ بھی نہیں تھا، جو شک کے زمرے میں آ جاتا۔ ممکن ہے میری کال بھی کہیں سنی جا رہی ہو۔ کیونکہ اس وقت میرے پاس ایک عام سیل فون تھا۔ اس نے اشارے میں بتا دیا کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ہمیں واپس جہاز میں جانے کو کہہ دیا گیا۔ ہم جہاز میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد جہاز ٹیک آف کر گیا۔

مجھے راشد محمود عرف گاؤ فادر یاد آ گیا۔ اس سے ملنے کے بعد مجھے اس کے بارے میں سب پتہ چل گیا۔ میرے سمجھانے کے باوجود بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہوتا بھی ایسے ہی ہے۔ انسان کی اپنی عقل پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا ہوتا۔

کوئی بندہ خدا کا انکار کر دے، یا خدا کو تسلیم کر لے اس سے خدا کی ذات کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ خود خدا کی دعویٰ کرتا ہے تو وہ ویسے ہی انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اس سے بھی خدا کو فرق نہیں پڑتا۔ خدا کا انکار یا خدا کی دعویٰ، فرعونیت سے بندہ اپنے مقام بندگی کا انکار کر دیتا ہے۔

یہ انسان ہی کے لیے ہے کہ وہ بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اس کی بندگی اس کے اعمال سے ظاہر ہوتی ہے۔ انکار خدا کرنے والا، تسلیم کرنے والا، خدا کی دعویٰ کرنے والا، انسان ہی ہے، دوسری کسی مخلوق سے یہ عمل سرزد نہیں ہو رہا ہے۔ انسان ہی یہ کر رہا ہے۔ اسی سے ہی عمل ظاہر ہو رہا ہے۔ اب بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کا ”ہونا“ اگر یہ ہے تو اعمال ظاہر ہو رہے ہیں اگر انسان ہی نہیں تو پھر کوئی بحث ہی نہیں۔ انکار یا تسلیم کرنے کے جو بھی اثرات ہیں وہ انسان پر ہی ہیں۔ اپنے آپ کو غلام مانے گا تو آقا ظاہر ہوگا۔ اگر بندگی والے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ بندے کے اعمال اسے بندگی پر فائز کریں گے، یہی بندے کی بلندی ہے۔ جب وہ مقام بندگی کا محرم ہو جاتا ہے تو وہ ذات کبریا کے مقام کو مان لیتا ہے۔ یہی بندگی اسے رب تعالیٰ سے جوڑ دیتی ہے۔ یہ ہی وہ رستہ ہے جو رب تک جاتا ہے۔ یہی انسان کا ارتقاء ہے۔ اور انسان کے ارتقاء کا جو راستہ نبی رحمت ﷺ نے عطا کر دیا، وہ اصل راستہ، وہی صراطِ مستقیم ہے۔

یہ بندگی خدا کی، وہ بندگی گدائی

یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ

جب انسان بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو بھرباتی سب غیر پر تکیا بھر جاتی ہے۔

اصل بات ہے اپنے آپ کو ماننے کی، خود کو بندہ ماننے کی۔ اپنی فطرت کو ماننے کی۔ وہ تخلیق ہے اور اس کا کوئی خالق ہے۔ اپنے آپ کو مان لینے کا مطلب ہے کہ میں بندہ ہوں تو اس نے اپنے رب کو تسلیم کر لیا۔ جب وہ بندگی کے مقام پر فائز ہو گیا۔ اس نے اس ذات کی فلاحی تسلیم کر لی، جس میں شہنشاہی ہے۔ مقام بندگی پر حاضر ہونے کا مطلب ہے کہ وہ رب کے حضور حاضر ہو گیا۔ یہ یقین کے رب اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ انسان پر پردے پڑے ہوئے

ہیں کہ وہ رب کی جلوہ افروزیاں نہیں دیکھ پا رہا ہے۔ یہ حجاب صرف خودی سے اٹھتے ہیں۔

خودی دل کی غیرت ہے۔ جو کسی غیر کو دل میں نہیں آنے دیتی۔ غرور و تکبر، ہوائی دھوس، فتنہ، تفرقہ، دوئی، شرک، غیر، ضد، ظلم، گمراہی، یہی خش و خاشاک ہیں اور آتش عشق کا شعلہ تند و سرکش و بے باک، اس خش و خاشاک کو جلا کر خاکستر دینے والا قوت ہی خودی ہے۔ یہ سارے مراحل بے شک عشق ہی طے کرتا ہے۔ جب بندے کا رخ خدا کی طرف ہوتا ہے تو اس کا سفر بلندی کی طرف ہو جاتا ہے پستی سے ناتھ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ غلامی آزاد کر دیتی ہے، حرص، ہوس اور لالچ سے۔ کیونکہ بندگی کا عرفان ہونے ہی سے بندے کو اپنی ذات کا عرفان ملتا ہے۔ یہ دل کے زندہ کر لینے سے ہوتی ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ خودی سے اس ظلم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں..... یہی توحید تھی جسے نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا۔

لاہور کا موسم بہت خوشگوار تھا، جب ہم اتر پورٹ سے نکلے۔ راستے میں مجھے جنید نے بتایا تھا کہ وہ اس سے کیا پوچھتے رہے تھے۔ اس سے یہی ظاہر تھا کہ کہیں ہم دونوں کی باتوں میں تضاد ہو اور ہم دھر لیے جائیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہم کار میں بیٹھ کر جب اتر پورٹ کی حدود سے باہر نکلے تو میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ گاڑ فادر کا فون تھا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم نکل جاؤ گے، لیکن پاکستان کی زمین تم پر تنگ کر دی جائے گی۔ تم سمجھتے ہو نا کہ پاکستان ایک جنگل ہے، جس کے پاس جتنا پیسہ ہے وہ اتنا ہی قانون کو اپنی لونڈی سمجھتا ہے، وہ قانون بھی خرید سکتا ہے، اپنی مرضی سے جو چاہے وہ ہوتا ہے۔“

”جس طرح تمہارے دعویٰ کے باوجود میں یہاں آ گیا ہوں، اسی طرح میرا رب میری حفاظت کرنے والا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ابھی کچھ دیر میں تمہارے ساتھ کیا ہوگا، تم نہیں جانتے ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا، دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور ہتھکڑی لگا دیا

”اور یہ بھی جان لو کہ تم سوائے ایک مہرے کے کچھ بھی نہیں ہو، مہرہ وہ بھی پیادہ، گھوڑا بھی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا تو اس نے کہا۔

”تم بھی تو مہرے ہو؟“

”یہ وقت بتائے گا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوئی والے گھر میں جا پہنچا۔ طارق نذر نے اسے دوبارہ بہترین انداز میں سجا دیا تھا۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر لیٹا ہی تھا کہ ارد گرد کا فون آ گیا۔

”پاکستان واپسی پر خوش آمدید۔ پاکستان میں گاڑ فادر کے جو چند لوگ تھے، وہ سب حراست میں لے لیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ عالمی دہشت گرد تنظیم کا نام جوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ایک نوجوان ہے، جو سارے پیغام ڈی کوڈ کر کے آگے دیتا تھا۔ مطلب، احکام دینے اور لینے والے، جو یہاں کے ہائر کیے ہوئے لوگوں کے درمیان تھے، وہ ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی وقت لگے گا، نئے لوگ بنانے میں، لیکن ابھی ان میں ان دیکھی دیوار بن چکی ہے، ان میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔“

”باقی بھی چند دن میں صاف ہو جائیں گے، تم نے وہ کام کیا جو میں نے بتایا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو آج صبح ہی ہو گیا تھا۔“

”کوئی مشکل؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے بتایا۔

دراصل یہی انہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے گاڑ فادر والے جتنے بھی اکاؤنٹ تھے، ان میں جس طرح پونڈ آگے پیچھے جاتے تھے، ان سب کو سمجھا۔ لندن کے لوگوں نے ان کے منی لانڈرنگ والے دھندے کو سمجھ کر مدد کی اور ان کا جو سرمایہ تھا، وہ سب نکال لیا اور ایسی کمپنیوں کو ادائیگی کر دی جو صرف نام کی تھیں۔ کروڑوں پاؤنڈ ان کے ہاتھ لگے تھے۔ جو نہ صرف انہوں نے سنبھال لیا، بلکہ ٹھکانے بھی لگا دیا تھا۔

”اب یہ جو درمیان میں خلا ہے، اس کے کوڑ اور ڈی کوڑ سمجھے ہیں کہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”سمجھ لیے ہیں؟“ اس نے بتایا

”تو پھر ان سب کو یہ حکم جاری کر دو کہ شام تک کوئی بندہ کسی سے بات نہ کرے۔ شام کے بعد بات کی جائے گی۔ سکون کریں۔“ میں نے کہا۔

”ہو گیا۔“ اس نے کہا تو میں نے اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر سبھی خیالوں کو ذہن سے نکالا اور سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو میں فریش تھا۔ میں نے جنید کو وہیں لاہور میں چھوڑا اور نورنگر کے لیے چل دیا۔ مجھے شام سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

☆.....☆.....☆

جسپال اور بانیتا کو رحویلی کی سرنگ کے راستے سے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ دونوں کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اس وقت یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے کوئی دیہاتی جوڑا ہو۔ وہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ انہوں نے نہ تو سندھ پ کوڑ کو بتایا اور نہ نوتن کوڑ کو۔ وہ ایک آٹو رکشے پر بیٹھے اور بس اسٹینڈ کی جانب چل دیے۔ وہ دونوں ایک عام سی بس میں بیٹھ گئے جو بنالہ کی طرف جانے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں بس لوگوں سے بھر گئی تو چل پڑی۔ بس مختلف جگہوں پر اسٹاپ کرتی چلتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ’چوگوان‘ کا اسٹاپ آ گیا۔ وہ دونوں وہیں اتر گئے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ کوئی ان کی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔ اسٹاپ پر وہی دونوں اترے تھے۔ سڑک پر دور دور تک دونوں طرف کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ ’چوگوان‘ کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑے۔ کوئی سو قدم چلنے کے بعد انہیں سامنے سے ایک فور وئیل آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ان کے پاس آ کر رک گئی۔ ایک نوجوان اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور پھر سے اسٹاپ کی جانب چل پڑے۔ واپس سڑک پر آ کر وہ اسی طرف چل دیے جس طرف سے بس آئی تھی۔ اس دوران انہوں نے کپڑے بدل لیے۔ دونوں جینز اور شرٹ میں تھے۔ آنکھوں پر سیاہ گاگنز، انہوں نے اپنا روپ ہی بدل لیا تھا۔ تھوڑا سفر کرنے کے بعد وہ سڑک سے دائیں جانب مڑ گئے۔ جس کے اختتام پر اکال گڑھ گاؤں تھا۔

انہیں اکال گڑھ گاؤں میں نہیں جانا تھا بلکہ گاؤں کے باہر مغربی طرف سے سڑک جنوب کی طرف جاتی تھی۔ وہ کچھ آگے جا کر دائیں جانب مڑتی تھی۔ اسی پر وہ فارم ہاؤس تھا۔ جو کسی زمانے میں رتن دیپ سنگھ نے خریدا تھا۔ تب سے وہیں گورننگ سنگھ اور اس کی بیوی ملکیت کو رہتے آئے تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی روپ کو تھی جو بیہ کرکینڈا شفٹ ہو گئی تھی۔ ان دنوں وہ وہیں آئی ہوئی تھی۔

فارم ہاؤس پر ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ گورننگ سنگھ، ملکیت کوڑ اور روپ کوڑ، ان کے وہاں پہنچنے ہی پورچ میں آ گئے۔ وہی تینوں جانتے تھے کہ یہ کون ہیں لیکن اپنے نوکروں کو دکھاوے کے لیے یہ بتایا گیا کہ یہ کینڈا سے آئے ہیں۔ روپ کوڑ کے دوست کینڈا سے آ رہے ہیں۔ وہ کچھ دن یہاں رہیں گے۔ یہ کچھ دن کتنے ہونے تھے، یہ انہیں

بھی معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پنجاب پر ریسرچ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ فارم ہاؤس کے اندر کافی بڑی ساری رہائش گاہ تھی۔ جس کا ایک مخصوص حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ بیڈروم میں جا پہنچے۔ وہاں جاتے ہی اپنی عادت کے مطابق بائیکاٹ کور بستر پر جا گری۔ چہال سنگھ ملازمین کا لایا ہوا سامان ٹھکانے لگوا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لچ کے بعد وہ دونوں ہی سو گئے۔

شام کے وقت جب وہ بیدار ہوئے تو فریش ہو کر وہ چھت پر آ گئے۔ ارد گرد وہی گاؤں کا ماحول تھا۔ چاروں طرف کھیت تھیں۔ ان میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ شمال کی جانب کافی فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ جس کے ارد گرد کافی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر کرسیوں پر آن بیٹھے۔ شام اتر چکی تھی۔ چہال نے اپنا فون نکالا اور اروند سنگھ کے نمبر ملا دیئے۔ کچھ دیر بعد ہی کال رسیو کر لی گئی۔

”میری میل پڑھ لی تھی۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، پڑھ لی تھی۔ اس ڈی وی ڈی کی کاپی بھی مل گئی ہے، جس میں لوگوں کے ایڈریس ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے سردار سر جیت سنگھ بنڈیال کی وہ تحریر بھی پڑھ لی ہے۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ میں اور فہیم نے ان سے رابطے کا ایک طریقہ کار بنا لیا ہے، جو میں تمہیں تفصیل سے بھیج رہا ہوں۔ یہ سب نیٹ ورک میں جیسے ہی آتے ہیں، کوئی پلان کر لیں گے۔“ اس نے پوری تفصیل سے بتایا۔

”جمال کدھر ہے، اس نے دیکھا؟“ چہال نے پوچھا۔

”وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا، لیکن کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔ وہ کہیں قریب ہی ہے۔ وہ جیسے ہی آتا ہے، میں اس سے شیئر کر لیتا ہوں۔“ اروند نے جواب دیا۔

”اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔؟“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ دونوں بیچے اپنے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے وہ سامان کھولا۔ اس میں بڑے سمارٹ قسم کے آلات تھے۔ وہ ان سے یہاں بیٹھ کر کسی سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔ اس کی یہی خصوصیت تھی کہ اس کوئی نیٹ ورک پکڑ نہیں سکتا تھا۔

رات گئے جمال کا فون آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”تمہیں فی الحال کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سکون کرو۔ ایک دو دن میں وہ سب نیٹ ورک میں آ جائیں گے۔ پھر ہم پلان کر لیں گے کہ کرنا کیا ہے۔“

”ہم ادھر آرام سے پڑے رہیں، امرتسر سے یہاں آنے کا فائدہ؟“ چہال نے پوچھا۔

”یہ میرا فیصلہ نہیں تھا سوچئے، تم جب اپنی من مانی کرو گے تو یہی ہوگا۔ یہ سیٹ اپ تم اوگی میں بھی بنا سکتے تھے۔ یہاں تم جلدی نگاہوں میں آ جاؤ گے۔“

”میں نے کون سا یہاں ہمیشہ رہتا ہے، زیادہ سے زیادہ سے دو ہفتے اور بس؟“ چہال نے پوچھا۔

”تم اپنا سیٹ اپ سیدھا کرو اور اس کے بعد چپ چاپ چند ہی گزھ نکل جاؤ، فون اور سنڈیپ کو بھی ساتھ لو۔ بلکہ انہیں اب پہلے بھیج دو، بعد میں تم چلے جانا۔ وہیں سے آپریٹ کرو۔ روایت اور گرلین بھی تمہیں جوائن کر لیں گی، میں انہیں یہاں سے بھیج دیتا ہوں۔ انہیں آنے میں وقت لگے گا، وہ ذرا گھوم کے آئیں گیں۔“

”کیا یہ تم نے پہلے ہی سوچا ہوا ہے؟“ چہال نے پوچھا۔ تو جمال بولا۔

”ہاں، رات میں جب سفر کر رہا تھا، اس وقت سوچا۔ میں مانتا ہوں کہ تم پر بھاری وقت ہے، لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ اس سے کہیں زیادہ بھاری وقت آنے والا ہے اور یہ سب حالات ہم نے مل کر دیکھئے ہیں۔ گھبراتا نہیں،

”اوکے۔“ چہال نے کہا اور پھر کچھ دوسری باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ میں، اروند اور فہیم کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں مہوش اور باقی سب تھے۔ میں لندن ٹور کے بارے میں انہیں پہلے ہی سے معلوم تھا، اس لیے زیادہ بات نہیں ہوئی۔

”اروند! یہ جوسٹ تمہیں یہاں کے لوگوں کی ملی ہے اور اس سے پہلے بھی ہمیں ان دلالوں کی ملی تھی، کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”زیادہ تر ان میں وہی لوگ ہیں، تھوڑا سا کچھ فرق ہے، چند لوگ نئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا تو میں نے فہیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”فہیم، تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں کس طرح استعمال کر سکتے ہو یا وہ ہمارے کسی کام آ سکتے ہیں۔“

”میرے خیال میں انہیں مارنے سے کچھ نہیں ہوگا، وہ انتقاماً مزید لوگ لے آئیں گے۔ مطلب پلان وہی رہے گا، بس اس میں لوگ آگے پیچھے ہوتے رہیں گے۔ اصل بات ہے کہ دشمن جو پلان لے کر آتا ہے، وہ اس میں پوری طرح شکست کھائے۔ اس سے ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ انہیں لگے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ شیطان کا جو ایجنڈا ہے، اس کا قلع قمع کیا جائے۔“ فہیم نے اپنی سوچ سے آگاہ کیا تو کراچی میں بیٹھا ہوا سلمان فوری طور پر بولا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ جب تک یہاں کے سہولت کار شیطان کو راستہ نہیں دیں گے، اس وقت تک آپ کا پلان بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دونوں طرف سے کوشش کرنا ہوگی، یہ ضروری ہے۔“

”تم دونوں ایک ہی بات کر رہے ہو۔ جب سہولت کار ہی نہیں ہوگا تو وہ اپنا پلان ہوا میں رکھیں گے۔ لیکن ہم ایسے بھی نہیں کریں گے کہ جس پر شک ہوا اسے ختم کرتے چلے جائیں۔ اصل میں دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کون سا پلان لا رہے ہیں، اسے ختم کرنے میں جو بھی کرنا پڑے، بہر حال ختم کریں گے۔ بس کوئی بھی پلان کامیاب نہ ہونے دیں۔“ میں نے اپنی رائے دی تو مہوش بولی۔

”کوئی بھی پلان جب بنتا ہے نا، وہ نہ صرف حالات کو دیکھ کر بنتا ہے، بلکہ وہاں دستیاب سہولت کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے ہم نے کہیں جانا ہے تو ہم وہاں کے موسم کے مطابق کپڑے رکھتے ہیں، وہاں کی کنوئیں کو ذہن میں رکھتے ہیں، رہنے یا دیگر سہولیات ہمارے دماغ میں ہوتی ہیں۔ یہاں کا ماحول ایسا ہو کہ کوئی پلان بناتے وقت لاکھ مرتبہ سوچے۔ آج اگر ملک کے حالات درست نہیں ہیں، قانون شکن زیادہ طاقتور ہیں تو اس کا یہاں ایسا ماحول بنایا گیا ہے۔“

”تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ ابھی تھوڑا سوچ بچار کریں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سٹے ہے یہ جو ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ”حرم“ ہے، ہمارا گھر، اسے ہم نے بچانا ہے، اس کی حفاظت ہمارے ذمے ہے۔“ میں نے کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔ میں نے تو سوچا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس لیے میں سیدھا اماں کی طرف چلا گیا۔ جہاں سوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں اماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سوئی آ گئی۔ وہ اماں کو دوا کی دینے لگی تو میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں کاریڈور میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ آ گئی۔

”یہاں کیوں کھڑے ہیں؟“ اس نے ہولے سے پوچھا تو میں نے کہا۔

”میرا انتظار مت کرنا، سو جانا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔“

”کہیں جا رہے ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”میں چھت پر ہوں۔ مجھے کچھ لوگوں سے رابطہ کرنے ہیں، تم ڈسٹرب ہوگی۔“ میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ہوں گی میں ڈسٹرب، بیڈ روم میں چلیں، یا میں بھی آپ کے ساتھ چھت پر آتی ہوں۔“ اس نے شوخی سے کہا تو میں ہنس دیا۔

”ٹھیک ہے آ جانا۔“ میں نے کہا اور چھت پر چلا گیا۔

موسم کافی خوشگوار تھا۔ میں نے جاتے ہی اروند سے رابطہ کیا، وہ ابھی تک اپنے کمپیوٹر کے سامنے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا جنید نے مقامی نیٹ ورک کو الٹ کر دیا ہے؟“

”جی وہ انتظار میں ہیں۔“ اس نے جواب دیا

”کیا تم، میں اور جنید ایک ساتھ رابطے میں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی وہ آپ کی بات سن رہا ہے۔“ اروند نے کہا تو جنید تصدیق کرتا ہوا بولا۔

”میں سن رہا ہوں۔“

”تو سنو خورشید خان ہے ایک بزنس مین ہے، اس کا بانیو ڈیٹا ابھی تمہیں اروند دے دیتا ہے۔ اسے بڑے سکون سے پکڑنا ہے اور ماڈل ٹاؤن والے سیف ہاؤس میں لے جانا ہے۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“

”میں نے تمہیں میل کر دیا ہے جنید۔“ فہیم کی آواز آئی تو جنید بولا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“

”وہ بعد میں دیکھنا، پہلے سن لو۔ اس وقت وہ مال روڈ پر موجود جیم خانہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لڑا رہا ہے۔ وہاں چند غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ غیر ملکی ایک خاص پلان کے تحت وہاں پر موجود ہیں لیکن ابھی انہیں چھیڑے بغیر صرف خورشید خان کو اٹھانا ہے، میں لمحہ بہ لمحہ تمہارے ساتھ ہوں۔“ فہیم نے اسے بریف کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے، میں نکلتا ہوں۔“ جنید تیزی سے بولا۔

”اوکے تم نکلو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ فہیم نے کہا تو جنید کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔

آدھے گھنٹے میں وہ جیم خانہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے آس پاس مقامی نیٹ ورک کے لوگ تھے، جن سے اس کا رابطہ ہو چکا تھا۔ خورشید خان اس وقت ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے باہر نکلنے تک اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ باہر رہا اور اس کے ساتھ مقامی نیٹ ورک بھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ سبھی وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک غیر ملکی لڑکی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں تھی اور خورشید خان نے اسے تھما ہوا تھا۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار لے آیا۔ خورشید خان نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس غیر ملکی لڑکی کو پچھلی نشست پر پہلے بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اس کا ایک گارڈ بیٹھ گیا تو کار چل دی۔ اس کے پیچھے ہی اس کی سیکورٹی والی کار بھی نکل پڑی۔ دونوں میں فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

جنید الرٹ ہو گیا تھا۔ جیسے ہی جیم خانے سے وہ دونوں کاریں نکلیں، جنید بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس کے ساتھ

تین کاریں تھیں۔ چھ کاروں کا یہ قافلہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ جنید اور مقامی لوگوں میں سب طے تھا کہ کرنا کیا ہے۔ جیسے ہی وہ نمبر پر چڑھے، جنید اور اس کے ساتھیوں نے کوشش کی کہ کسی طرح سیکورٹی کار اور خورشید خان والی کار کے درمیان آیا جائے۔ ٹرن لیتے ہوئے ایک کاران کے درمیان آ گئی۔ تب جنید نے بھرپور رسک لیا اور کار خورشید خان کے ساتھ لگا دی۔ پچھلی کار اس سے بھی آگے نکل گئی۔ انہوں نے گھیرے میں لے لیا۔

پلان یہ تھا کہ کسی طرح چند لمحوں کے لیے اس کی کار کو روکا جائے۔ ان تینوں کاروں نے آخر کار اس کی کار کو روک تو نہیں پائے لیکن رک جانے کی حد تک آہستہ کر ہی لیا۔ جیسے ہی خورشید خان کی کار آہستہ ہوئی، جنید نے اعتدائی پھرتی سے اپنی کار کا دروازہ ذرا سا کھولا اور نیچے کی طرف کر کے سائیکلسر لگے پستل سے ٹائر پر فائر کر دیا۔ جیسے ہی ٹائر پھٹنے کی آواز آئی، اس وقت تک جنید نے پستل اندر کر کے دروازہ بند کر لیا تھا۔ جیسے ہی خورشید خان کے ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی تو اسے پتہ چل گیا کہ ٹائر مسئلہ کر گیا ہے۔ اس کی کار ذرا سی لہرائی پھر کار سڑک میں رک گئی۔ اس سے ٹریفک بلاک ہو گئی۔ ان کی تینوں کاریں خورشید خان کی کار کے ارد گرد ہو گئیں۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار سے اتر آیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب جنید حرکت میں آ گیا۔ سبھی اپنی اپنی کاروں سے اتر آئے تھے۔ جنید نے جیسے ہی پچھلا دروازہ کھولا، وہ سبھی اس طرف دیکھنے لگے۔ جنید نے پستل خورشید خان کی کینٹی پر رکھتے ہوئے سکون سے کہا۔

”میرے ساتھ آتے ہو یا یہیں مار دوں؟“

”ک..... کک..... کہاں؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیکورٹی گارڈ نے مڑ کر گن سیدی تھی دوسری طرف سے اس کے سر پر پستل رکھ دیا گیا تو جنید نے کہا۔

”یار کسی اچھی جگہ چلیں گے، چلو، ایک، دو.....“

”چلو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا۔ جنید نے اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنی کار میں آ بیٹھا۔ تین تک اس کا ڈرائیور لڑکا گنیر لگا چکا تھا۔ سائیڈ سے کاریں نکل رہی تھیں، اس نے زگ زیک کار یوں نکالی کہ کمال کر دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس کی سیکورٹی کاران کے پیچھے ضرور آئے گی۔ انہوں نے نہر سے اندر کی جانب ٹرن لیا اور تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ انہیں پتہ چل گیا کہ وہ ان کے پیچھے ہیں۔ سبھی فہیم کی آواز اسے سنائی دی

”جنید! ان سے مارا ماری مت کرنا، فائر تو بالکل نہیں، یہ اس لیے کہ یہ علاقہ ایسا ہے تم پھنس جاؤ گے۔ انہیں جل دے کر نکلنے کی کوشش کرو۔“

”اوکے۔“ جنید نے کہا تو اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے کار بھاگا دی۔ اسے پتہ تھا کہ سب نے اس کی بات سن لی ہے۔ ایک دم ساری کاریں اکٹھی ہوئیں اور پھر الگ الگ ہو گئیں۔ سیکورٹی والی کار ایک دوسری کار کے پیچھے لگ گئی۔

جنید کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ماڈل ٹاؤن کے سیف ہاؤس میں پہنچ گیا۔

خورشید خان کو جب ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا تو وہیں کمرے کے ذریعے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے جنید کے ذریعے اس سے سوال کیا۔ میں کہتا جا رہا تھا اور جنید اسے دہرا رہا تھا۔ وہ بات سننے کو بیتاب تھا۔

”سکندر خان کے دست راست راشد محمود سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

میرے سوال پر وہ بری طرح چونک گیا۔ مگر لمحہ بھر میں خود پر قابو پا گیا۔ اس نے جنید کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون سکندر خان اور کون راشد محمود؟“

”جنید اس کی پٹائی کرو اور اس وقت تک کرتے رہو، جب تک یہ اس تعلق کے بارے میں نہ مان جائے، باقی

باتیں صبح ہوں گی۔“ میں نے کہا اور جنید سے رابطہ منقطع کر کے گھومتے ہوئے دیکھا تو سوئی میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ملجی روشنی میں اس کا سفید رنگ دمک رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بھئی فہیم، اب باقی لوگوں کے بارے میں بتاؤ، کیا وہاں لوگ پہنچ گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب اس آپریشن میں لگ گئے ہیں، چونکہ ہمارا ان سے رابطہ نہیں، اس لیے رپورٹ دیر بعد ملے گی۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا تو فہیم نے میری توجہ چاہنے کے لیے پوچھا۔

”آپ کے پاس کوئی ہے؟“

”تمہیں کیسے پتہ؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”پہلے آپ کفرم کریں، تو.....“ وہ کہتے ہوئے رُک گیا تو میں نے اسے سوئی کی موجودگی کے بارے میں بتا دیا، تب وہ بولا۔

”یہ میں آپ کو ایسے نہیں بتا پاؤں گا۔ آپ کو میرے پاس آنا ہوگا۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھئی، میں اتنے دنوں بعد اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوں اور تم رقیبوں کی طرح درمیان میں خلل ڈال رہے ہو۔“ میں ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ میری ایک بڑی کامیابی ہے، جو میں سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔ چلیں صبح تک انتظار کر لیتا ہوں۔“ اس نے یوں کہا جیسے مایوس ہو گیا ہو۔ سو میرے کہنے سے پہلے ہی سوئی نے کہا۔

”فہیم! اس وقت تمہارے پاس کون کون ہے؟“

”میں، اردند اور مہوش۔“ اس نے کہا۔

”اوکے، ہم دس یا پندرہ منٹ تک تمہارے پاس آرہے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں نے سوئی کی جانب دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور ایک ملازمہ سے بہترین چائے بنانے کو کہا۔

جب تک ہم کچن کے پاس پہنچے، چائے تیار تھی۔ سوئی نے فریق میں سے مٹھائی نکالی اور وہ ٹرے میں رکھتے ہوئے ملازمہ سے چائے رکھنے کو کہا۔ اگلے چند منٹ میں ہم ان کے پاس تھے۔

”ہاں بولو کیا کامیابی ہے۔“ سوئی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی، اردند اور مہوش بھی متوجہ ہو گئے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بتانے لگا۔

”آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت میں کسی نے بدن کی گرمی اور ان دیکھی شعاعوں کو ایک ٹریکر کے طور پر استعمال کرنے کا سوٹف ویئر بنایا تھا، پھر ہم نے اسی سے اُن لوگوں کو پکڑا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”یہ دیکھیں، میں نے ایک سوٹف ویئر بنایا ہے، اس کی بنیادی تھیوری یہ کہ جس طرح بظاہر انسان ایک جیسا ہی ہے، لیکن قدرت نے اسے انفرادیت بھی دی ہے۔ جیسے انگوٹھے کا نشان، جسم کی شعاعیں وغیرہ۔ ہر انسانی جسم کی یکسوئی الگ ہے۔ اس طرح اگر اس سوٹف ویئر میں کسی بھی شخص کی آواز داخل کر دی جائے تو پھر وہ آواز جب تک دنیا سے ختم نہیں ہو جاتی، اس وقت تک وہ آواز والا بندہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔“

”اے فہیم تیری..... مجھے بتایا ہی نہیں۔“ اردند سنگھ نے چونکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

”اس لیے کہ تو اسے چیک کر، اب اسے اپ ڈیٹ کر، اگر ہو سکے تو۔“ فہیم نے فخریہ انداز میں کہا۔

”پر تجھے میرے چھت پر ہونے کا اندازہ کیسے ہو گیا، میں تو بولی ہی نہیں وہاں پر؟“ سوئی نے الجھتے ہوئے کہا۔

”میں نے یہاں جتنے فرد ہیں ان سب کی آوازوں پر ہی تو تجربہ کیا ہے، آپ کی آواز بھی اسی میں ہے، سو، مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کہاں ہو۔“

”بے شک یہ تمہاری بڑی کامیابی ہے۔“ مہوش نے اس کے پاس آ کر بال بگاڑ دیئے۔ یہ اس کا خلوص بھرا انداز تھا۔ تبھی اس نے کہا۔

”کاش یہاں گرلین اور رونیت ہوتیں، انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ انہیں بھی بتائیں۔“

”انہیں بھی معلوم ہو جائے گا، کل تک وہ بھارت پہنچ جائیں گی، اس وقت وہ جہاز میں ہوں گی۔“ میں نے کہا تو وہ سمجھ گئی کہ انہیں تو چلے جانا تھا۔

”اوہ! کل بتا دیں گے۔“ مہوش نے کہا۔

”مبارک ہو فہیم، رُت تجھے بہت ترقی دے۔ کل تمہارے اعزاز میں پارٹی ہوگی، یہیں پر۔“ میں نے کہا تو وہ سب خوش ہو گئے۔ ابھی وہ سارے اس سوٹف ویئر کو سمجھ رہے تھے کہ میں نے اردند کی توجہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”یار، جن لوگوں کی میں نے تمہیں لسٹ دی تھی، وہ سب.....“

”ان کا آپریشن مختلف جگہ پر ہو رہا ہے، میں ان کے ساتھ ہوں۔ مجھے اطلاع مل رہی ہے۔ چاہے چھ سات بندے ہی ہیں، لیکن سب مہان قسم کے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے مجھے یقین دلایا تو میں ان کے پاس سے اٹھ کر بیڈروم کی طرف چل دیا۔ میں نے ان سب سے صبح بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ملجکا اندھیرا تھا۔ میں فریش ہو کر جب واپس بیڈ پر آیا تو سوئی میرے لیے چائے بنا کر لا چکی تھی۔

”سوئی۔! اب مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا، میں ذرا بڑی ہوں۔“ میں چائے کی چسکی لے کر کہا تو وہ میری بات سمجھتے ہوئے مسکرا کر چلی گئی۔ جب تک چائے کی پیالی ختم ہوئی اس وقت تک میں میں سب سے رابطہ کر چکا تھا۔ جنید نے رات خورشید خان کی کافی دھنائی کی تھی۔ صبح سے پہلے وہ سب مان گیا تھا۔

”تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تمہیں راشد نے نہیں بتایا؟“ میں نے سوال کیا۔

”تین دن سے اس کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”وہ نورنگر بندے تم نے بھیجے تھے، راشد کے کہنے پر یا تمہاری اپنی کوئی دلچسپی تھی؟“

”راشد کے کہنے پر، وہ وہاں کچھ لوگ مروانا چاہتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ وہی جانتا ہے، مجھے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ یہ بندہ ہمارے نیٹ ورک کے لیے خطرناک ہے۔“ اس نے صاف بتا دیا۔

”اب سمجھ گئے ہو کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے کہا تو روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

”میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، میں تو اس نیٹ ورک کا حصہ ہوں، مجھے وہ سب کرنا پڑتا ہے، مجھے معاف کر دیں آپ جو کہیں گے میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔“

”وہ نیٹ ورک اب ختم ہو چکا ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ سے جتنا پیسہ تھا، وہ نکال لیا گیا ہے۔ تمہیں صرف اتنا کہا

جارہا ہے کہ ملک دشمنی میں اگر تم نے کوئی بھی کام کیا تو پھر بھینٹے نہیں جاؤ گے۔ بلکہ کوئی بھی ایسا کام ہو، تو اطلاع دینی ہے۔“

”جی میں ایسا ہی کروں گا، بس مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے کہا تو میں نے جنید کو اسے آزاد کرنے کو کہا۔ میں جانتا تھا کہ جنید اسے ایسے نہیں چھوڑنے والا، وہ اسے اس طرح وہاں سے بھیجتا کہ اسے پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے فردا فردا سب سے یہی بات کی انہیں آزاد کر دیا۔

میں نے ایک دفعہ سب کو معاف کر دیا۔ ان میں جو بھی سانپ فطرت والا ہوگا، اس نے ڈنک ضرور مارنا تھا، اس کے لیے بھر معافی نہیں تھی۔ اسی لمحے میں نے راشد عرف گارڈ فادر کو فون کیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے بولا۔

”مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ جب میں تمہیں اپنا سارا نیٹ ورک دے رہا تھا، تم نے نہیں لیا۔ اب انہیں لوٹ رہے ہو، اور نیٹ ورک تباہ کر رہے ہو، اس سے تمہیں کیا فائدہ ہے میری جان؟“

”تم لوگ انسانیت کے لیے کام نہیں کر رہے ہو، تم لوگوں کا مقصد شیطانت ہے، جو مجھے قبول نہیں۔ جو بھی میرے ملک کے لیے غلط کرے گا، میں اسے حرف غلط کی طرح مٹا دوں گا۔“

”جو کچھ تم ختم کر چکے ہو، یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے، تمہارے حکمرانوں نے، سیاست دانوں، مذہبی لیڈروں، سوشل ورکروں نے تمہارے ملک کو تماشہ گاہ بنا دیا ہے۔ کیا کرو گے، بہت وقت چاہئے اور بہت بڑی قوت، اور تم ایسے بھی نہیں ہو کہ بقول تمہارے، میرے جیسے مہرے کو بھی ختم نہیں کر پائے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد پھر نمودار ہو جاؤں گا۔ پوری دنیا تک رسائی ہے میری۔“ اس کا لہجہ مضحکہ خیز تھا۔

”تو پھر تم نے میری رسائی دیکھنی ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اچانک اس کا قہقہہ بند ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، ”یہ کیا ہے ڈیورا؟“

”تمہاری موت۔“ اس نے کہا اور فائر کر دیا۔ گارڈ فادر کے منہ سے بھیانک آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گر گیا تھا کیونکہ فون کرنے کی آواز آئی تھی۔ اس کے کچھ ہی لمحوں بعد ڈیورا نے کہا۔

”یہ ختم ہو چکا ہے۔“

”تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ یہاں سے نکلو گی تو سرخ مرسیڈز میں میری وہی ساتھی بیٹھی ہوئی ہوگی، جس سے تم ملی تھی۔ وہ تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گی۔“ میں نے اسے سمجھایا

”اوکے، میری اس کے ساتھ ڈیل ہو چکی ہے۔ مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں تانی کی سوچ کو داد دینے بنا نہیں رہ سکا اس نے کس خوبصورتی سے راشد کو ڈیورا کے ہاتھوں ہی ختم کرا دیا۔ ایک بڑی ڈیل اور کسی بھی دوسرے ملک میں رہنے کا وعدہ ڈیورا کے لیے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور فون بند کر دیا۔ میں چند منٹ بیڈ پر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھڑکی میں آ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔

شام ہونے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ میرا دل کیا کہ میں کہیں باہر نکلوں۔ میں نے کار نکالی اور مسافر شاہ کے تھڑے کی جانب چل پڑا۔

تھڑے پر درختوں کے نیچے پانی کا جھڑکا ڈکھایا ہوا تھا۔ رنگین پانیوں والی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کار روکی اور اتر کر کمرے کے پیچھے دیکھا تو اکھاڑے میں فرید اور درویش دونوں زور کر رہے

تھے۔ ان کے ساتھ دو اور پہلوان بھی زور آزمائی کر رہے تھے۔ انہیں دیکھنے کو کچھ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے رک گئے۔ میں نے انہیں اپنا کام جاری رکھنے کو کہا اور وہاں سے پلٹ کر مسافر شاہ کے تھڑے پر چلا گیا۔ میں اس وقت واپس لوٹا، جب شام ہو رہی تھی اور وہ زور آزمائی ختم کر کے سردائی رگڑنے لگے تھے۔ اس وقت میں ان کے پاس چار پائی پر جا بیٹھا۔ پہلوان مٹی کے بڑے بڑے پیالوں میں سردائی پی رہے تھے۔ ایک پیالہ مجھے بھی دیا۔ میں نے سردائی پینے کے بعد اس درویش سے فرید کے بارے میں پوچھا۔

”سناؤ کیا حال ہے اس کا؟“

”اب یہ فتح کی راہ پر آیا ہے، سمجھ لو کہ برتن کو آگ میں رکھ دیا ہے، اب اس نے پختہ ہونا ہے۔“ اس نے مزید انداز میں کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کھل کر کہو بابا، اصل بات کیا ہے؟“ میں نے جان بوجھ کر اس سے فرید کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

”اصل بات تو شوق ہی ناسرکار۔ اس کا شوق اسے پہلوانی کی طرف لے تو آیا لیکن یہ انتہائی کچا تھا۔ یہ کچھ نہیں جانتا تھا، اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ اس نے خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خیر اسی سے پوچھو، یہ کن مرحلوں سے گزرا ہے۔“ اس نے فرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں نے فرید کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ پہلوانی اتنی مشکل ہوتی ہے۔ میں اکیلا ہی یہاں اکھاڑا کھو لیتا زور کر لیتا اور بس۔ پھر جب یہ درویش یہاں آئے تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خود بھی اپنے دور کے بڑے پہلوان رہے ہیں۔ ان کے یہاں آتے ہی یہ پہلوان یہاں آ گئے۔ دو دن ہی میں مجھے پتہ چل گیا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، انہوں نے میرا بدن توڑ کر رکھ دیا۔ میرے اندر یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ میں کس کام میں آ پڑا ہوں۔ میں ٹوٹ گیا تھا، میری ہمت ہی جواب دے گئی تھی۔ ایک شام میں دل برداشتہ ہو کر اکھاڑے سے آیا۔ لیکن میرا شوق مجھے اس راہ سے ہٹنے نہیں دے رہا تھا، ساری رات میں اسی کشمکش میں رہا، صبح میں پھر اکھاڑے جا پہنچا۔ تب انہوں نے مجھے داؤ سکھانا شروع کر دیئے اور اب میں ان سب پہلوانوں پر بھاری ہوں۔ بڑے آرام سے انہیں زیر کر لیتا ہوں۔“

”شوق سب سے اہم شوق ہے۔ اس کے شکستہ بدن نے اس کے اندر یہ سوچ پیدا کی کہ میں کس کام میں پڑ گیا ہوں، یہ پستی کی دلیل ہے۔ یہ گرا تو اس کے شوق نے اس کے اندر بلندی پیدا کر دی۔ اصل میں پستی اور بلندی سے گزر جانے کے بعد ہی مقام فتح نصیب ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گرتا نہیں ہے، اسے بلندی کی سمجھ نہیں آتی۔ شوق ہی کمزوری کی دلیل کو اڑاتا ہے اور تسخیر کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ جس نے خود اٹھنے کا راز پالیا وہی ساری قوتوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شکستہ ہونا، گرنا، اٹھنا، عمل میں آنا، داؤ دیکھنا، شہ زور بننا، تسخیر کرنا یہ سب شوق ہی کے مراہل ہیں۔“ درویش نے بڑے سکون سے مجھے فرید کے بارے میں سب بتا دیا۔ میں مسکرا دیا۔ تبھی میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر انہیں وہ بات سمجھائی جو بہت ضروری تھی۔

جب بیج زمین کی تاریکی میں چلا جاتا ہے تو تنہائی میں اس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ کائنات سے اس نے آنکھ بند کر لی اور وہ آنکھ اس نے اپنے آپ پر کھول لی۔ وہ اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ اسے اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی خلوت میں جا کر اس نے خود پر نگاہ کی۔ اس وقت بیج کو اپنے بارے میں پتہ چلا کہ اس کے اندر کیا کچھ پڑا ہے، وہ کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ جب وہ خود کو سمجھتا ہے تو اس کے اندر

قوت پیدا ہوتی ہے۔ اب سچ کے پاس دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک مٹی، دوسرا نمی۔ دوسرے لفظوں میں اسے صحبت اور نگاہ بھی کہہ سکتے ہیں جب خود پر نگاہ مرکوز ہوئی، اسے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تب یہی صلاحیتیں اس کے اندر قوت بیدار کر دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود کو چیر دیتا ہے، زمین کی تاریکی کو بھی پھاڑ دیتا ہے اور غلوت سے جلوت میں آجاتا ہے۔

اصل میں جب اس نے خود پر آنکھ کھولی تھی، اسی وقت ایک تناور شجر بننے کا عمل اس میں شروع ہو گیا تھا۔ جب تک اس کی خود پر نگاہ نہیں گئی تھی، وہ اس عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے اندر کی قوت ہی تھی جو بیدار ہوئی تھی۔ صحبت کے شر سے دل سراپا نور ہوتا ہے..... ذرا سے سچ سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے۔

یہ ذرا سا ذرہ ایٹم، جب ایٹم بم کی صورت میں پھٹتا ہے تو اس کے اندر کس قدر قوت بیدار ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ انرجی ثابت کرتی ہے کہ اس کے پھٹنے سے کتنی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور جس نے اس ایٹم کو پھاڑا، اس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے؟ وہ انسان، جس نے اتنا کچھ کر لیا، اور نجانے اس سے کیا کچھ ظہور ہوتا ہے، وہ اپنی جانب دیکھ ہی نہیں رہا۔ جس نے اپنے اندر دیکھ لیا، اس نے قوتوں کا منبع سر کر لیا۔ طریقہ یہی ہے کہ اسے غلوت میں جانا پڑے گا۔

انسان ایک جسم ہے، جو مٹی سے بنا ہے اور اس کا تعلق کائنات سے ہے۔ اس کا وجود مٹی اور کل کائنات اس کا وجود ہے۔ اس کائنات میں جو سوچ اور فکر ظاہر ہو رہی ہے وہ انسان ہی کی تو ہے کہ کس طرح وہ اپنے پروردگار کی دی ہوئی نعمتوں کو تعارف میں لا رہا ہے، کیسے کیسے تغیر کر رہا ہے۔ انسان کے اس وجود میں دل بڑا ہوا ہے جو تمام قوتوں کا منبع ہے۔

انسان کے ظاہری جسم کا تعلق اس کائنات سے ہے۔ جہاں سے وہ اپنی تمام ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے تحت ہر شے نکال رہا ہے۔ وجود کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ ایک علم اس کے دل میں پڑا ہے اس کا دل جو ہے وہی دین ہے۔ علم دو ہی ہیں، ایک علم دین ہے اور ایک علم ابدان۔

یہ انسان ہی کا ظہور ہے جو اس کائنات میں ترقی ہو رہی ہے۔ مالک کائنات نے تو اسے پورا بنا دیا، ترقی کا مطلب، انسان کی اپنی ترقی۔ جو دل ہے وہ ہماری غیرت ہے، وہی ہمارا دین ہے۔ اگر یہ نہ رہا تو پھر کچھ بھی نہ رہا۔ کیونکہ دل میں سے جا کر ظاہر ہونے والا ہی مومن ہے۔ دین اور دنیا، ظاہر اور باطن ایک نظام میں لائیں گے تو وہ دل کے تابع ہوگی عقل اگر دل کے تابع ہے تو وہ یزدانی اگر نہیں تو نری شیطانی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل کے ساتھ جڑا کیسے جائے، تو سیدھی سی بات ہے کوئی نہ کوئی معیار لینا پڑے گا، کوئی صورت لینا ہوگی جو دل کے بھید سے واقف ہے جب سامنے مومن ہوگا تو حقیقت کھل جائے گی۔ باطن کا مطلب فقر ہے۔ اصل میں دل کا راز ہے غیرت والا فقر، سامنے فقر لینا ہوگا، کوئی ہدف کوئی نشانہ تو لینا ہوگا۔ پھر تغیر کا مقام خود بخود ہاتھ میں آجاتا ہے۔ کیونکہ دل کی سوچ ہی مومن سے پیدا ہوتی ہے۔ مومن ہی محرم راز دل ہے۔ سوچ فقر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

رات کا اندھیرا کچھ چکا تھا۔ پہلوانوں نے کھانا بنایا ہوا تھا، میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر واپس حویلی کی جانب چل پڑا۔ میں بہت مسرور تھا۔ مسافر شاہ کے قہرے پر رونق لگ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

جہاں سنگھ کو چند گز گھنٹے ہوئے تین دن لگ گئے۔ سردار سرجیت سنگھ ہندیاں کی دی ہوئی معلومات اور نیٹ

ورک کے ساتھ رابطہ مکمل کر لیا۔ بھارتی پنجاب کے ہر بڑے شہر میں ایک ایسا بندہ موجود تھا، جس کا پورے علاقے میں نیٹ ورک تھا۔ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ فہم اور ارون سنگھ کے ساتھ مل کر ایسا مربوط رابطہ بنایا تھا کہ انہیں جو کام بھی کرنا تھا، اس سے ہر بندہ باخبر رہتا۔ اس دوران اس نے گاڈ فادر کے اس پورے نیٹ ورک کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر لی تھی جو بھارت میں پھیلا ہوا تھا۔ مگر اسے دلچسپی بھارتی پنجاب سے تھی، اس لیے اس کا کام جلدی سٹ گیا۔ اس کے ساتھ بانیٹا کور تھی۔ دونوں سیکورٹائیس میں ایک جگہ نما گھر میں جا پہنچے جہاں سندھپ کور اور نون کور پہلے ہی سے موجود تھیں۔ رونیت اور گرلین ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اس دن وہ تھائی لینڈ میں تھیں، جہاں سے انہیں بھارت آنا تھا۔

چندی گڑھ میں انسانی حقوق کی ایک تنظیم موجود تھی، یہ سارا نیٹ ورک اسی کے گرد گھومتا تھا۔ چند گز ہی میں موجود ایک نوجوان رکن اسمبلی جگتا سنگھ اس تنظیم کو چلا رہا تھا۔ یہ تنظیم اس وقت سے قائم تھی، جب اس نے سیاست میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، طلبہ سیاست اور تنظیموں میں اس نے اپنا آپ منوایا۔ پڑھائی کے بعد اس نے کسی سیاسی جماعت کو جوائن نہیں کیا بلکہ انسانی حقوق کی تنظیم بنالی۔ بنیادی طور پر وہ انسانی حقوق کی ہی تنظیم تھی لیکن اس کی تمام تر قوت خالصہ تحریک تھی۔ وہ خالصہ حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کے لیے جگتا سنگھ نے کئی بار بھارتی پنجاب کا دورہ کیا تھا۔ تقریباً آٹھ برس کی محنت کے بعد اسے سیاسی طور پر استحکام ملا اور وہ اسمبلی میں پہنچ گیا۔ اسے اس مقام تک لانے میں انتہائی خفیہ طور پر سردار سرجیت سنگھ ہندیال نے ہی مدد دی تھی۔ جس وقت سردار سرجیت سنگھ ہندیال نے جہاں سنگھ پر تمام تر ذمہ داری ڈال دی، تبھی اس نے ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی کہ جو سامنے آ سکے۔ جب وہ رابطہ کاری پر کام کر رہا تھا، اس وقت اس کے سامنے سردار جگتا سنگھ ہی کا نام ہی آیا۔ جہاں کا اس سے رابطہ ہو چکا تھا اور اس دو پہر اسی جگتا سنگھ سے ملاقات طے تھی۔

وہ چند گز ہی سیکٹر چونتیس میں پانچ منزلہ بلڈنگ تھی۔ جس کی پانچویں منزل پر جگتا سنگھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جہاں جیسے ہی لفٹ سے نکلا، اسے راہداری سنسان دکھائی دی۔ وہ مطلوبہ دروازے پر پہنچا ہی تھا اور ابھی دستک نہیں دی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس عمارت میں خصوصی آلات لگے ہوئے ہیں، ظاہر ہے جو تحفظ ہی کی خاطر ہو سکتے ہیں۔ اس کے سامنے ایک روایتی سکھ جوان کھڑا تھا، جس نے سنہری فریم والی عینک لگائی ہوئی تھی۔ میردن رنگ کی پگڑی اور سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ست سری اکال جہاں سنگھ جی، میں جگتا سنگھ۔“

”ست سری اکال۔“ جہاں نے دھیمے سے کہا۔

”آئیے۔“ اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا تو جہاں آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ وہ کافی کشادہ فلیٹ تھا۔ وہ کمرے میں سامنے پڑے ایک صوفے پر جا بیٹھا تو جگتا سنگھ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد جگتا ہی نے کہا۔

”سردار سرجیت سنگھ ہندیال جی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے اس تنظیم میں اک نئی روح پھونک دی۔ میں جانتا ہوں کہ میں صرف دکھاوے کے لیے سامنے ہوں گا، اصل کام تو آپ نے کرنا ہے۔ آپ جو بھی میرے ذمے لگائیں گے، میں حاضر ہوں گا۔“

”جگتا سنگھ جی! آپ یہ ذہن میں بات بٹھالیں کہ ہم میں نہ کوئی جھوٹا ہے نہ بدعہ، یہ گرو مہاراج جانتے ہیں کہ کون سیسی کے ساتھ کتنا غلط ہے۔ میں نے نہ آپ کے لیے کچھ کرنا ہے اور نہ آپ نے میرے لیے، اس لیے کسی کا

کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔ کوئی بھی تحریک لبو مانگتی ہے، اور سکھ ہمیشہ لبو دینے کو بے تاب ہوتا ہے۔ کس نے کہاں کون سا کام کرنا ہے، اصل بات یہی ہے۔“ جہاں نے بڑے قتل سے کہا۔

”میں اصل میں کہنا یہی چاہ رہا تھا کہ جو آپ فیصلہ کر کے مجھے بتائیں گے میں پوری تندی سے کروں گا۔“ جگتا نے پھر سے یقین دہانی کرا دی۔

”چلو کام کی ہی بات کرتے ہیں۔“ جہاں نے کہا۔ تو جگتا ہمدن گوش ہو کر بولا۔

”جی ضرور۔“

”تم جانتے ہو کہ سا کا چوراہی کے بعد اور اندرا گاندھی قتل کے بعد سکھ نوجوانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔“ جہاں نے یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں اسے درد محسوس ہوا۔

”ہاں فوج اور ہندو گماشتے راتوں کو گاؤں میں داخل ہو جاتے اور جن جن کرنوجوانوں کو نکالتے اور انہیں گولیوں سے مار دیتے۔“ جگتا نے نفرت سے کہا۔

”اسی تناظر میں سکھ نوجوانوں ایک بہت بڑی تعداد دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ گئی۔ جہاں ان کی ایک عمر گزر گئی، ان کی نئی نسل جوان ہو گئی۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کے اندر اپنی تذلیل، سکھ قوم کا قتل اور جلا وطنی کا انتقام بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ لوگ واپس نہیں آ سکتے، ان کی نسل نے وہ ظلم نہیں دیکھا، لیکن وہ بھارت میں موجود سکھوں سے یہ امید ضرور کر رہے ہیں کہ وہ سکھی کے لیے وہ سب کریں جو کرنا چاہئے، اس کے لیے انہوں نے دولت کا رخ اس طرف کر دیا ہے، مگر افسوس، کئی ایک سکھ تنظیمیں، اس دولت کا ناجائز استعمال کر رہی ہیں۔ ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایسی تنظیموں کو تلاش کیا جائے اور انہیں ختم کیا جائے۔“ جہاں نے اسے سمجھایا۔

”جی، یہ میں نے بھی محسوس کیا ہے، آج سے یہ کام شروع سمجھیں۔“ جگتا سکھ نے کہا۔

”دوسری بات یہ ہے کہ سکھی پنجاب سے جڑی ہوئی ہے، پنجاب کی ثقافت کو کسی دوسرے رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے، یوں جیسے سکھ صرف گانے بجانے والے لوگ ہی ہیں، ایک فلم پروڈکشن بنائی ہوگی جو پنجاب کو اس کا اصل رنگ دے کر پیش کرے۔“ جہاں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

”بہت عرصے سے میرے ذہن میں یہی خیال تھا، میں تو اس حد تک سوچ رہا ہوں کہ صرف فلم ہی نہ بنائی جائے، اس کا اصل کام وہ ڈاکو میوزک ہوں جس میں ایک طرف سکھوں کو ابھارا جائے تو دوسری طرف ان پر ہونے والے ظلم دکھائے جائیں۔“

”یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔“ یہ کہہ کر جہاں چند لمحوں کیلئے خاموش ہوا پھر بولا۔

”تیسرا کام یہ کہ وہ لوگ جو سکھ تو ہیں لیکن غدار ہیں، وہ زندہ نہیں رہنے چاہئیں۔“

”ہاں میں کئی ایک ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو سکھی کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”مثلاً.....؟“ جہاں نے پوچھا۔

”مثلاً بٹالہ میں ایک ایڈووکیٹ ہے متدر سکھ، اس نے پورے علاقے کو اس طرح قابو کیا ہوا ہے کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ یہ صرف سیاسی طور پر مستحکم ہونے اور پورے علاقے کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ ”را“ کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے اس نے اپنا نیٹ ورک بھی بنالیا ہوتا کہ مزید پھیلے۔“ جگتا نے بتایا تو جہاں خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اب میں چلتا ہوں۔ چند دنوں میں کوئی ثقافتی پروگرام رکھو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ جہاں کو لفٹ تک چھوڑنے آیا۔

وہ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور سب سے پہلے اس نے بٹالہ میں موجود ہندو کو اس ایڈووکیٹ کے بارے میں پوچھا تو اس کے بارے میں اسے پوری معلومات تھی، جو اس نے اسی وقت بتا دی۔ متدر سکھ ایڈووکیٹ شہر کا مشہور وکیل تھا۔ وہ لوگ تقسیم ہند سے پہلے کے وہاں آباد تھے۔ ان کا خاندان کافی اثر و رسوخ والا تھا۔ وہ جھنڈاری گیٹ کے قریب ایک حویلی میں رہتا تھا، جو ان کی آبائی حویلی تھی۔ متدر سکھ سے پہلے وہ لوگ سیاست میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ مگر متدر سکھ نے دلچسپی لی اور اپنے آپ کو منوالیا۔ دراصل وہ کالج دور میں غنڈہ گردی کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ اس کی سرشت میں یہ شامل تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبا کر رکھے اور ان پر حکومت کرے۔ وہ مقامی سطح پر اس لیے بھی کامیاب تھا کہ ”را“ اسے اس طرح سپورٹ کرتی تھی۔ وہ سکھ تھا لیکن اس کا دراصل کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس کا مذہب فقط دولت تھا۔ اس نے مقامی سکھوں کے بارے میں ”را“ کو پوری جانکاری دینے سے سکھ وہاں کبھی نہیں اٹھ سکے تھے۔ لہذا اس کا پتہ صاف کرنا بہت ضروری تھا۔

جہاں نے اس مقصد کے لیے ایک ٹیم بنائی ہوئی تھی۔ جو فقط ایسے ہی کام کرتے تھے۔ یہ ان کا پہلا امتحان تھا۔ وہ لوگ مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں فوری طور پر صبح تک بٹالہ میں گرو دوارہ کندھ صاحب پہنچ جانے کو کہہ دیا۔ مقامی طور پر اس کی رہنمائی پر چند لوگوں کو لگا دیا۔

رات گئے تک دونوں اطراف سے خبریں پہنچتی رہیں۔ وہ لوگ بھی جو کندھ صاحب پہنچ رہے تھے اور وہ بھی کہ متدر سکھ کے معمولات کیا ہیں۔

بٹالہ شہر میں کندھ صاحب وہ گرو دوارہ ہے جہاں گروناک مہاراج شادی کرنے کے لیے بارات کے ساتھ گئے۔ وہ ایک کندھ (دیوار) کے ساتھ بیٹھ گئے جو کچی تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت نے گروناک مہاراج کو بتایا بھی کہ یہاں مت ٹیمو، یہ دیوار کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ تاکہ دیوار مہاراج نے جواب دیا کہ یہ نہیں گرے گی کیونکہ یہ ہماری شادی کی گواہ ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ دیوار نہیں گری، یہاں تک کہ بہت سارا عرصہ گزر گیا۔ اس کی یاد میں یہ گرو دوارہ بنایا گیا، جہاں اب ہر سال میلہ لگتا ہے۔ وہ دو لوگ وہاں پہنچ گئے، جنہوں نے متدر سکھ کا شکار کرنا تھا۔

رات کے آخری پہر جب گرو دوارہ سے گیانی بولنے لگا، لوگوں کو اٹھ جانے کی تلقین کرنے لگا، ایسے میں وہ دونوں گرو دوارہ سے باہر نکل آئے، انہوں نے چادریں لی ہوئی تھیں اور کافی حد تک منہ بھی ڈھانپ لیا ہوا تھا۔ ان کا رخ جھنڈاری گیٹ کی اس حویلی کی جانب تھا جہاں متدر سکھ رہتا تھا۔

وہ حویلی پرانے طرز کی تھی اور ایک چھوٹی گلی میں تھی۔ وہی بڑا سارا سیاہ گیٹ اور دو منزلہ حویلی، جس کا طرز تعمیر تو پرانا ہی تھا لیکن اس پر رنگ و روغن اور دیکھ بھال کی وجہ سے کافی بہتر حالت میں تھی۔ گلی میں ہلکی روشنی تھی۔ وہ دونوں ایک موٹر سائیکل پر گلی کی کٹڑ پر آن رکے۔ انہوں نے موٹر سائیکل ایک طرف لگایا اور آگے پیچھے چلتے ہوئے اس حویلی کے پاس جا پہنچے، جس کے آگے ایک مدقوق سابلب روشن تھا۔ ان میں سے ایک نے چلتے ہوئے ایک پتھر اس بلب پر مارا تو بلب ٹوٹ گیا۔ روشنی بہت حد تک ختم ہو گئی، دور گئے ایک بلب کی ہلکی سی روشنی آنے لگی۔ گیٹ کافی مضبوط تھا لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ الماریوں، درجوں اور ان کے بنے ہوئے ڈائزینوں پر اپنے قدم جماتے ہوئے دیوار پر چڑھنے لگے۔ یہ ایک خاص طرح کی تربیت ہوتی ہے، جس کی مدد سے بڑی بڑی بلڈنگوں پر چڑھا جاسکتا ہے۔ تقریباً ایک منٹ میں وہ چھت پر بنی چار دیواری تک پہنچ گئے۔ اگلے چند لمحوں

میں وہ چھت پر تھے۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ گردوارہ کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آرہی تھی۔ وہ اس دروازہ کی جانب بڑھے جہاں سے سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔

وہ پہلی بار اس حویلی میں ہی نہیں اس شہر میں آئے تھے۔ انہیں صرف بتایا گیا تھا کہ معتدر سنگھ کا کمرہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ سیڑھیاں پہلی منزل کی چھت پر اتریں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے کمرے تھے۔ لیکن ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس جانب بڑھ گئے۔ اس کمرے میں ایک بوڑھا سا شخص پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگیں ہوئی تھیں، یوں لگ رہا تھا کہ یہ مر گیا ہے یا پھر بس مرنے ہی والا ہے۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر تیزی سے نیچے کی طرف چلے گئے۔ سیڑھیاں کھلے صحن میں اتریں۔ جس کے تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ سامنے کے دروازوں میں سے جو دائیں جانب والا ہے، اس کے اندر جا کر معتدر سنگھ کا کمرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر چلے گئے۔ ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی سو رہا تھا۔ معتدر سنگھ کی تصویر انہوں نے دیکھی تھی۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی مونچھیں نوکیلی اور اوپر کو اٹھی ہوئیں تھیں۔ بیڈ پر لیٹا ہوا وہی تھا۔ ہلکی روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں دبے پاؤں اس کے سر ہانے جا کھڑے ہوئے۔ ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ جاگ گیا۔ اس نے صورت حال سمجھی تو ہڑ بڑا گیا۔ تبھی ایک نے اس کے کان میں ہولے سے کہا۔

”چپ چاپ تجوری کی چابیاں دے دو، تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ.....“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو دوسرے نے ایک لمبی کرپان اس کی گردن پر رکھ دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں اٹل کر باہر آ گئیں۔ اس نے سائید ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے نے دراز کھوئی، اس میں چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔

”تجوری والی چابی نکالو۔“ دوسرے نے بڑے سکون سے کہا تو وہ چابی تلاش کرنے لگا۔ اس نے ایک چابی نکالی اور گچھا ان کے حوالے کر دیا۔ پہلے نے کرپان اس کی گردن پر رکھی اور دوسرے نے تجوری کھول لی۔ اس کے ہاتھ میں جتنا مال آیا اس نے لیا اور ایک تھیلی میں ڈال لیا۔

”تیری بیوی کہاں ہے؟“ پہلے نے پوچھا۔ اس نے باہر کی جانب اشارہ کیا تو پہلا ہی بولا۔

”چلو پھر ہمیں باہر تک چھوڑ کر آؤ۔ اس وقت تک نہیں ماریں گے جب تک تم.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کی بیوی اندر آ گئی۔ پہلے تو اسے پتہ نہ چلا کہ اندر دو لوگ بھی ہیں، اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی، دوسرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی بیوی پر جا پڑا اور اس کی گردن دبوچ کر بولا۔

”خاموش، آواز نہیں نکالنی۔“

”چلو دونوں باہر۔“ پہلے نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

وہ چاروں بڑی خاموشی سے حویلی کے گیٹ پر آئے۔ انہوں نے گیٹ کا تالا کھولا، تبھی پہلے نے کرپان سے ایک زور دار وار کیا اور معتدر سنگھ کی گردن اتر گئی۔ اس کی بیوی کے منہ سے چیخ نکلی۔ تب تک دوسرے نے اُس کا سر زور سے گیٹ میں مارا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ انہوں نے باہر لگی میں جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے نکلے اور موٹر سائیکل تک جا پہنچے۔ انہوں نے وہ اٹھائی اور وہاں سے نکلے چلے گئے۔ ان کا رخ شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔

جسپال سنگھ کو رپورٹ مل گئی تھی کہ کام ہو گیا ہے۔ وہ دونوں ابھی تک بٹالہ کے مضافات میں موجود ایک گاؤں میں تھے۔ وہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دو دن بعد وہاں سے جائیں گے۔ جس کے پاس وہ ٹھہرے تھے، وہ بھی خالصہ کا سرگرم رکن تھا۔ وہ دونوں سو گئے تھے، لیکن ٹی وی چیخ رہا تھا۔ اس پر بھی بات

سب سے اہم بتائی جا رہی تھی کہ معتدر سنگھ کی بیوی کے مطابق وہ دونوں ڈکیت سکھ تھے، ان کا مقصد ڈکیتی نہیں تھا، کرپان سے قتل کرنے کا مطلب یہ بتا دینا تھا کہ وہ شدت پسند سکھ ہیں۔ ان کا کوئی دوسرا مقصد تھا۔ جسپال مسکرا دیا۔ اس کا پیغام ”را“ تک پہنچ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بڑی روشن صبح تھی۔ میں حویلی سے نکلا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر آ گیا۔ اس دن مجھے اروند نے فرمائش کی کہ وہ بھی وہاں جانا چاہتا ہے۔ میں نے فہیم اور مہوش کو بھی ساتھ لیا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر جا پہنچے۔ بڑے دنوں بعد وہ کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ میں درختوں کی چھاؤں میں چار پائی پر جا بیٹھا تو وہ تینوں ادھر ادھر سیر کرنے کے لیے نکل پڑے۔ درویش اور فرید ان کی ضیافت کے اہتمام میں لگ گئے اور چار پائی پر لیٹ گیا۔

گاؤ فادر کے ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ ایک باب ختم ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کا پھیلا ہوا گند ویسا ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد جو چند لوگوں کا حصار بنایا ہوا تھا، وہ اس وقت میرے قبضے میں تھے۔ جب تک وہ ختم نہ ہوتے، اس وقت تک یہ باب بند ہونے والا نہیں تھا۔ وہ سب جنید کے پاس سیف ہاؤس میں تھے۔ اس نے ان تین دنوں میں ان کے سارے اکاؤنٹ خالی کر لیے تھے۔ اب ان کے رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔ یہی بات کہنے کے لیے میں نے جنید کو فون کیا۔ وہ وہیں سیف ہاؤس ہی میں تھا۔

”ان سب لوگوں کو طارق نذیر کے حوالے کرو، وہ ان سے مزید تقیتش کر لیں گے، تم چاہو تو نورنگر آ جاؤ۔“

”وہ تو ہو جائے گا، اب ان کے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن ان سے ایک بات پتہ چلی ہے، وہ بہت زیادہ خطرناک ہے۔“ جنید نے تشویش سے بتایا۔

”وہ کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے پوری بات کا نہیں پتہ، لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہاں کا ایک سیاست دان ہے، اس کے ذریعے ”را“ پاکستان میں دہشت گردی کے لیے ایک گروپ تیار کر رہا ہے، اب وہ سیاست دان مہرہ ہے یا وہی اسے منظم کرے گا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن انہوں نے پبلک مقامات کو نشانہ بنانا ہے، ظاہر ہے اس کا نشانہ بننے والے بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان سبھی ہوں گے۔“ جنید نے کہا تو میں نے پوچھا۔

”اس سیاست دان کے نام کا کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں، ظاہر ہے وہ کوئی دوسرے درجے کا سیاست دان ہوگا، کوئی ناکام سیاست دان یا پھر.....“ وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”تمہیں یہ بات کس انداز میں بتانی گئی ہے؟“

”میں نے ان کی باتوں سے اخذ کیا ہے۔“ وہ بولا۔

”ممکن ہے کوئی غلط ٹریک دے رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات سچ ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے تم نے اس کے بارے میں بہت کرید کی ہوگی۔ خیر، تم اسے چھوڑو اور یہ سب لوگ ان کے حوالے کرو، وہ بھی تلاش کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچنے لگا، ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ ملک کی سیکورٹی اداروں سے یہ راز چھپ سکے۔ اتنا ہی اہم پلان تھا تو اس قدر لوگوں کو نہیں بتایا جاسکتا تھا۔ یہ ایک پوری تنظیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی تنظیم ان سیکورٹی اداروں کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ ایسے لوگ اتنے کل کر سامنے نہیں آ سکتے، ان کے پیچھے تو بہت خفیہ ہاتھ ہوتے ہیں۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے میرا نام تصدیق کرنے کے بعد کہا گیا

”راشد کو تو نے مروادیا، میں تمہاری ہمت اور رسائی کی داد دیتا ہوں، ڈیورایے چاری اب زندہ نہیں ہے، وہ اپنے ہاتھ روم میں مردہ پائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس نے کہیں بھی جانا تھا، چلی گئی اس دنیا سے۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے احمق بھی ہو سکتے ہو، تم نے راشد کو مار دیا تو سمجھا کہ ہم ختم ہو جائیں گے، نہیں ایسا نہیں ہے، ہم خود اسے مروانا چاہتے تھے، وہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا تھا، اس پر پرسکون زندگی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔“ اس نے اسی سکون سے کہا تو میں نے پھر پوچھا۔

”میں پھر پوچھتا ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”دیکھو پرندے ہوا میں اڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، وہ جہاں دانہ دیکھتے ہیں، وہیں بیٹھ کر چک لیتے ہیں، پھر فضا میں اڑ جاتے ہیں۔ انہیں بنجرے میں قید نہیں کرتے۔“ اس نے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”یہی کہ پرندے آزاد کر دو۔ میں اسے تمہاری دوستی تصور کروں گا، اپنا راستہ ہمیشہ الگ رکھوں گا۔ ورنہ پھر میرا پہلا ٹاسک تمہی ہو۔“ اس کے لہجے میں کافی حد تک تکبر چھلک رہا تھا۔

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو.....“ میں نے کہا۔

”تو میں سمجھوں گا کہ تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو، جسے دوستی کرنا نہیں آتی۔“ اس نے کافی حد تک چڑتے ہوئے کہا تو میں استہزاء لہجے میں بولا۔

”میں خوب جانتا ہوں کہ دوستی اور دشمنی کیا ہوتی ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوست اور دشمن کون ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے سبق مت پڑھاؤ، کام کی بات کرو۔“

”میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی مجھے آنا چاہئے، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پرندے اڑا دو، یہی خیر سگالی کا پیغام ہوگا، اور بس۔“ اس نے کافی حد تک نرم لہجے میں کہا تو میں افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”تم نے ذرا سی ویر کر دی، میں ان کے لیے فیصلہ کر چکا ہوں، اب میں فیصلہ واپس نہیں لوں گا۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے فون کو دیکھتا رہا، پھر واپس جیب میں رکھ لیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ سب مہرے ہی ہیں۔ انہیں چھوڑ دینے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑنے والا تھا اور اب اس سے زیادہ ان سے کوئی اہم بات بھی نہیں نکلی تھی لیکن وہ سب شیطانی ٹولہ کے افراد تھے، ان کا زندہ رہنا ہی نہیں بنتا تھا۔ میں ان کے بارے میں اس وقت تک سوچتا رہا، جب تک مہوش، ارد گرد اور فہم واپس نہیں آ گئے۔

”یہاں میلہ لگتا تھا؟“ مہوش نے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، ہر سال لگتا ہے، بس دو تین برس درمیان میں نہیں لگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں ابھی دو چار مہینے رہتے ہیں۔“ میں نے اسے جواب دیا

”پتہ نہیں جب تک ہم یہاں ہوں گے کہ نہیں۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”ہوں گے تو دیکھ لینا، نہیں ہوں گے تو نہ سہی۔“ فہم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ تبھی درویش

نے دور ہی سے اونچی آواز میں کہا

”اوغم کیوں کرتی ہے بیٹی، ہم آج رات ہی میلہ لگا دیتے ہیں، آپ آ جاؤ رات کو۔“

”وہ کیسے؟“ مہوش نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ گانے بجانے والے بلا لیں گے، کچھ کھیل تماشے والے، کھانا پینا ہم تیار کر لیں گے۔“ اس نے سادگی سے کہا تو سبھی ہنس دیے۔ جبکہ درویش ایک طرف نکل گیا، وہ ابھی کھانا بنانے میں مصروف تھا۔

”نہیں بھابھی اصل مزہ تو اسی میلے کا آئے گا نا جو اصل میں لگتا ہے۔“ اس نے کہا تو میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”چل وعدہ رہا، اگر یہاں ہوئے تو ٹھیک، تم دنیا کے جس کو نے میں بھی ہوئی، تجھے یہاں بلا لیں گے۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ایک دم سے ارد گرد سکھ بولا۔

”وہ رام لعل جوگی اور اس کا کیسٹ بیٹا، ادھر ہی ملا تھا نا، یہیں رہتے رہے ہیں؟“

”ہاں، لیکن وہ دونوں تمہیں اچانک کیوں یاد آ گئے؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ سندھپ کور والا انشٹیٹیوٹ ابھی تک ختم نہیں ہوا، وہ ویسے کا ویسا چل رہا ہے۔“

”ہاں اسے ختم تو کرتا ہے، لیکن حالات ایسے بنتے گئے کہ اس طرف سوچ ہی نہ سکے۔“ میں نے اعتراف کیا تو وہ بولا۔

”دراصل جہاں سکھ کے ارد گرد عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، میرے خیال میں اسے کوئی سدھ بدھ نہیں آرہی ہے۔“

خیر میں نے ایک پلان کیا ہے، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت شاندار نکلے گا۔“

”بولو، کیا پلان ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”امر تر میں تین بندے ہیں، جو اصل میں اس انشٹیٹیوٹ کو چلا رہے ہیں۔ اصل میں وہ بندے نہیں، تین عہدے ہیں، ان پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، جیسے کہ کچھ عرصہ پہلے ہرنیت سکھ کو جہاں نے مارا تھا، اب اس کی جگہ نیا بندہ آ گیا ہے؟“ ارد گرد سکھ کہتے ہوئے سانس لینے کو زکا تو فہم تیزی سے غصے میں بولا۔

”یہ تیری بڑی گندی عادت ہے۔ کہانی گھڑنے بیٹھ جاتا ہے، سیدھی بات بتا۔“

”میں بات ختم کر لوں، پھر کہنا، ابھی خاموش بیٹھ۔“ ارد گرد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے میری طرف دیکھا تو اپنے میں مہوش بولی۔

”نہیں تم کہو، ہم شام تک یہیں بیٹھے ہیں۔“

وہ اس طنز کو سمجھ تو گیا لیکن کوئی تبصرہ کیے بنا بولا۔

”انشٹیٹیوٹ تباہ ہوتا ہے یا نہیں، ہم اس پر حملہ کرتے ہیں، وہ ختم ہو جاتا ہے، وہ اسے دوبارہ بنا لیں گے لیکن ہم اسے مستقل بند کروانا چاہتے ہیں تو میرے پلان کے مطابق دو فائدے ہوں گے۔“

”کون سے؟“ میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

”ایک تو یہ کہ ”را“ پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی، انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ یہ انشٹیٹیوٹ بند کر دیں۔“

”یہ دھاک کس طرح بٹھائی ہے؟“ مہوش نے ہاتھ کو گھماتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

”یہی میرا پلان ہے۔“

”بولو۔“ میں نے کہا۔

”وہ تینوں عہدوں پر مامور لوگ ایک ساتھ ختم کیے جائیں اور باہر کے دو تین لوگ جو انتہائی اہم ہیں را کے انہیں ختم کر دیا جائے تو ہم اپنی بات منوا سکتے ہیں، پچھلے تین بندے بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔“ اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”اس سب کو آرگنائز کرنے میں تو وقت لگے گا نا؟ تم اسے دیکھو، اور پھر جیسے ہی وقت آئے مجھے بتا دینا۔“

”یہی تو بتا رہا ہوں، میں نے ایک نیٹ کی دنیا میں ایک جعلی تنظیم بنائی ہوئی ہے۔ اس سے میں کچھ لوگوں کو دھمکیاں دیتا ہوں۔ وہی جو غلط قسم کے سرمایہ دار، دولت والے ہیں۔“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے بتایا تو فہیم نے ہنستے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”کیا دھمکیاں دیتے ہو؟“

”یہی کہ میرے لیے چاکلیٹ بھیجو، میری شرٹ پھٹ گئی ہے، وہ لے دو ورنہ میں تمہارا پاجامہ پھاڑ دوں گا۔ یہ کہ.....“ مہوش نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا تو وہ غصہ کیے بغیر بولا۔

”یہ کہ کوئی بیمار ہے، اس تک دم پہنچا دو، یتیم خانوں کو، اسپتالوں کو، بے گھر عورتوں کو مطلب جو بھی مجھے ضرورت مند ملا نیٹ پر میں نے اس کی مدد کروادی۔“

”یہ تو شاندار بات ہے یار۔“ مہوش نے تالی بجاتے ہوئے کہا تو فہیم بھی اس کی طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”اچھا اب کہو، ہم نہیں بولیں گے۔“

”میں جھانکتا رہتا ہوں نیٹ پر مختلف لوگوں کے اکاؤنٹ وغیرہ۔ جب سندھپ کور کے انشٹیٹیوٹ کی بابت سنا اور پھر اس پر کچھ نہیں ہوا تو میں نے اسے بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ ان کی ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ وہاں موجود لڑکیوں کا جنسی استعمال بھی کرتے ہیں۔ کل شام ان کی ایک پارٹی ہے اور یہ پارٹی انہوں نے اس انشٹیٹیوٹ سے دور رکھی ہے، یہ ان تینوں کو پتہ ہے، یا مجھے معلوم ہے۔ کیونکہ میں ان کی باتیں پڑھ چکا ہوں۔ وہ اپنے ساتھ لڑکیاں لیں گے، جنہیں بالکل پتہ نہیں ہوگا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ وہاں جائیں گے اور.....“ وہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا

”یہ تم نے بڑی خبر دی ہے اروند سنگھ۔“ میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کل شام، ابھی کافی وقت پڑا ہے۔“ اروند نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر یہ کام کرنا ہے تو ہو سکتا ہے۔

”اس سے بھی اہم بات میرے ذہن میں آئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”یار کیوں نہ ہم اسے ایک تنظیم ہی بنا دیں۔ جس کا تہلکہ مچ جائے۔“ میں نے کہا۔

”یہ ممکن ہے اور اسے ہم اس نچ پر چلا سکتے ہیں لیکن اس میں ایک بات بہر حال سامنے آئے گی اور وہ یہ ہے کہ سب لوگ صرف مذہب کے لیے کام نہیں کرتے، بہت کم ہوتے ہیں سر پھرے، اس کے لیے فنڈ اور دولت چاہئے ہوگی اور.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے سمجھایا

”دولت کی فکر مت کرو، تمہیں پتہ ہے کہ اس وقت ملین ڈالر ہمارے پاس ہیں، ہاں یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ ان لوگوں کو بھی استعمال کیا جائے، جو بہر حال دولت کے لیے سب کرتے ہیں۔ خیر یہ انشٹیٹیوٹ والا معاملہ

دیکھو، پھر اسے پوری طرح منظم کرتے ہیں۔“

”اوکے ڈن ہو گیا، ہم اس پر آج ہی سے کام کرتے ہیں۔“ اروند سنگھ نے کہا۔

”اچھا، یہ درویش کا کھانا کھاتے ہیں تو اسی پر کام کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پھر اسی موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ بہت کچھ ہم نے وہیں بیٹھے طے کر لیا۔

☆.....☆.....☆

امرتسر سے شمال مشرق کی جانب تقریباً چہرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شاندار فارم ہاؤس تھا۔ سورج مغرب میں ڈوب چکا تھا۔ ابھی تک وہاں پر مہمان تو کیا میزبان بھی نہیں آیا تھا۔ وہاں سیکورٹی کے چند لوگ تھے۔ یا پھر وہ لوگ جو کھانا وغیرہ تیار کر رہے تھے اور اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر وہاں سے جانے والے تھے۔ دو تین لوگ وہاں رہ گئے تھے۔ جنہوں نے کھانا وغیرہ سرو کرنا تھا۔ یہ اسی فارم ہاؤس کے ہی ملازم تھے۔ وہ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہیں بالکل بھی یہ خبر نہیں تھی کہ سہ پہر سے ان کی ریکی ہو رہی ہے۔ چند لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں، فارم ہاؤس کی لوکیشن سمجھ چکے ہیں۔ وہ چھ تھے اور اسلحہ کے ساتھ پوری طرح لیس تھے۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ وہ کب آتے ہیں اور یہ اپنا کام کر کے وہاں سے نکل جائیں۔ انہوں نے وہاں سے نکلنے کے لیے پورا بندوبست کر لیا ہوا تھا۔

اس وقت جہاں سنگھ ان سے پوری طرح رابطے میں تھا۔ اس نے سردار رتن دیپ سے مدد تو کیا انہیں بتایا تک نہیں تھا کہ امرتسر کے نواح میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ چھ لوگ پنجاب کے مختلف شہروں سے جمع ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ دربار صاحب پر ایک دوسرے سے ملے اور انہوں نے اس کا پلان کر لیا تھا۔

پارٹی کا بندوبست فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت سے ذرا فاصلے پر ایک لان میں کیا تھا۔ وہاں میزیں لگا دیں گئی تھیں۔ ضروری سامان رکھ دیا گیا تھا۔ ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ دھیمی روشنی تھی۔ کافی حد تک کیف آور ماحول بنا دیا گیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی سب سے پہلے میزبان ہی کی گاڑی اس فارم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلا ہی تھا اور وہ آتے ہی سارے انتظامات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں وہاں دو گاڑیاں آ گئیں، اس میں سے تین مرد اور چار نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں۔ ان لڑکیوں نے بہت شوخ، مختصر اور بھڑکیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ وہ ہنستے، قہقہے لگاتے ہوئے رہائشی عمارت کے اندر چلے گئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر کبھی باہر آ گئے۔ ان کا رخ اسی لان کی طرف تھا، جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ ان کے بیٹھے ہی میوزک کی آواز کچھ زیادہ ہو گئی۔ وہ سیدھے اس میز کی جناب بڑھے جہاں شراب کی مختلف برانڈ کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں جام دھرے ہوئے تھے۔ ہر کسی نے اپنی پسند کی شراب سے جام بھرا اور ٹہلنے والے انداز میں بکھر گئے۔ یہ بڑے صبر آزمائیاں تھیں۔

ان کی نگرانی کرنے والے چھ لوگ فارم ہاؤس کے اندر آ چکے تھے۔ یہاں پر ان کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا تھا۔ ان کے گمان میں تھا کہ وہ سب ایک جگہ بیٹھ جائیں گے تو ان پر حملہ کیا جائے گا لیکن وہ جوڑے جوڑے کی صورت میں بکھر گئے تھے۔ اب انتظار کے سوا چارہ نہیں تھا۔ سو وہ اپنی اپنی جگہ دب کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لان میں پھرتے ہوئے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ موت ان کے کس قدر قریب پہنچ چکی ہے۔

آدھا گھنٹہ اسی انتظار میں گزر گیا۔ وہ لوگ سرد میں آ چکے تھے۔ ممکن ہے وہ ٹہلے ہوئے تھک بھی گئے ہوں، اس لیے ایک کے بعد ایک جوڑا آ کر اس میز کے گرد بیٹھنے لگا۔ جیسے ہی سب بیٹھ گئے۔ میزبان نے کھانا لگانے کا اشارہ

کر دیا۔ ملازم شاید اسی انتظار میں تھے۔ وہ کھانا لگانے لگے۔ دس منٹ کے اندر کھانا لگ گیا۔ جیسے ہی انہوں نے کھانا شروع کیا۔ ملازم وہاں سے ہٹ گئے۔ ایسے میں وہ چھ کے چھ اچانک نکلے۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب وہ ان کے سر پر پہنچ گئے۔ تبھی انہیں میں سے ایک نے اٹھ کر اونچی آواز میں لکارتے ہوئے کہا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، ایک برسٹ اس پر پڑا، جو اس کے سینے سے لے کر اس کے چہرے تک میں سوراخ کر گیا۔ فائرنگ کی آواز نے ماحول کو ہلا کر رکھ دیا تھا، چیخوں کی آوازوں سے وہاں ہلچل مچ گئی۔ چیخوں سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ موت جب سامنے ہوتی ہے تو انسان اس سے بچنے کے لئے کیا کچھ کرتا ہے، یہی سب وہاں ہو رہا تھا۔ انہیں اپنا آپ بچانے، اپنی بقا کے لئے حملہ آوروں سے بھڑ جانا چاہئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا، وہ سب کے سب کہیں نہ کہیں چھپ جانے کو ترجیح دے رہے تھے۔ حملہ آوروں کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لئے وہ پوری یکسوئی سے فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ چھ کے چھ وہیں ڈھیر ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ملازم بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس ساری کاروائی میں دو سے تین منٹ لگے۔ جیسے ہی انہیں یقین ہو گیا کہ وہ سب ختم ہو چکے ہیں۔ وہ وہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رُکے، یکے بعد دیگرے پلٹے اور اندھیرے میں گم ہو گئے۔ وہ وہاں سے کیسے نکلے؟ یہ کہانی انہی کے ساتھ وقت کے اندھیرے میں دفن ہو گئی تھی۔ اس فارم ہاؤس میں موت رقص کر رہی تھی۔ کتنی دیر تک کوئی ان تک نہیں پہنچا تھا۔ یہی وہ غنیمت وقت تھا جس میں حملہ آور وہاں سے نکلے تھے۔

☆.....☆.....☆

”مشن مکمل ہو گیا ہے۔“ اروند سنگھ نے مجھے بتایا تو میں بیڈ پر پڑا اٹھ گیا۔

”اس کے بعد جو کرتا ہے کرو۔“ میں نے اسے اجازت دے دی تو وہ سنجیدگی سے بولا

”مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی، اب تک اپنی خفیہ تنظیم کا نام ہی نہیں رکھا، کیا ہونا چاہئے نام؟“

”ایسا نام ہو جس میں ہندو انداز جھلکتا ہو۔“ میں نے اسے مشورہ دیا تو اس نے چند لفظ مجھے بتائے، اس کے ساتھ ساتھ ان کے مطلب بھی تھے۔ مجھے ان میں سے ایک نام پسند آیا۔ وہ نام تھا، ”دیرتا“۔ اس لفظ کا مطلب تھا ایسا دلیر اور بہادر جسے اپنی دھرتی سے محبت ہو۔ اس نے یہی نام رکھا اور ایک ای میل چلا دی، جس میں ان تینوں کا قتل ذمے لے لیا۔ اس سے پہلے معتد رسنگھ، اشوک متہرہ اور ہرنیت سنگھ کو بھی انہوں نے ہی مارا ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی کہ یہ لوگ ہندو مفادات کے لئے کام کر رہے تھے، لیکن اب انہوں نے غداری کی تھی سوان کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اس کے ساتھ دھمکی دے دی کی اب ان ہندوؤں کی باری ہے جو دھرتی ماتا سے غداری کر رہے ہیں۔ اب انہیں چھوڑا نہیں جائے گا۔ اروند نے اپنی ساری کردوائی مجھے بتائی اور خاموش ہو گیا۔ میں بیڈ سے اٹھا اور اس کے پاس جانے کو تیار ہو گیا۔

دو گھنٹے گزر جانے کے باوجود کسی بھی بھارتی چینل پر یہ خبر نشر نہیں ہوئی۔ میں اسی انتظار میں اروند سنگھ اور فہیم کے ساتھ بیٹھا اس کے پلان کو سمجھتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک چینل نے خبر نشر کر دی۔ اس میں ان اہم لوگوں کے قتل بارے اطلاع تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ نامعلوم قاتل فرار ہو چکے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لئے ہائی پروفائل پلان بنالیا گیا ہے۔ کچھ ہی گھنٹوں میں وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔ وہی باتیں جو ایسے وقت میں تسلی اور دلا سے کے لئے کہی جاتی ہیں، وہی دہرائی جا رہی تھی۔

”یہ چینل ”را“ کا ہے اور یہ لوگ یہیں سے دھمکیاں دے رہے ہیں۔“ اروند سنگھ نے اسکرین پر نگاہیں جمائے

ہوئے کہا تو میں نے پوچھا

”باقی چینل یہ خبر کیوں نہیں دے رہے ہیں؟“

”ممکن ہے وہ لوگ اس کی پس پردہ کہانی نہ بتانا چاہ رہے ہوں، ابھی تھوڑی دیر میں معاملہ سامنے آ جائے گا۔“

مجھے بس اتنا انتظار ہے کہ وہ لوگ محفوظ جگہ پہنچ جائیں۔“ اروند نے کافی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا

”اگر وہ یہاں نہیں پکڑے گئے تو نکل جائیں گے۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو ہماری درمیان

خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں تیزی سے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کام کر رہے تھے۔ اچانک فہیم بولا

”اروند! یہ لو، اجلاس شروع ہو گیا ہے۔“

”سنو، اسے ریکارڈ کر لینا، ہم دیکھتے ہیں ان کی اب۔“ اروند نے تیزی سے کہا اور کال ملانے لگا، جیسے ہی کال

ملی اس نے پوچھا

”مال پہنچا کر نہیں ابھی تک؟“ پھر چند لمحے سنتے رہنے کے بعد بولا، ”ٹھیک ہے، بتانا تھا نا۔ اوکے۔“ اس سے

پہلے کہ میں پوچھتا اس نے خود ہی بتا دیا، ”عین وقت پر انہوں نے اپنا پلان بدل لیا، انہوں نے جہاں جانا تھا، وہاں نہیں گئے، بلکہ کسی دوسری جگہ تھپارکھ کر اپنے اپنے علاقوں کو نکل گئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے وہ خاصے سیانے لوگ ہیں۔“ فہیم نے تبصرہ کیا جس پر اروند نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا

”میں ایک بہت بڑا دھماکہ کرنے جا رہا ہوں، مجھے آپ کی اور جہاں سنگھ کی مدد چاہئے؟“

”بولو، میں نے اس کی طرف دیکھ کر دیوانہ وار کہا

”میرا پلان یہ ہے کہ یہ جو اجلاس کرنے والے آفیسر ہیں، امرتسر میں، انہیں اڑا دیا جائے، ابھی۔“

”ظاہر ہے انہوں نے یہاں کوئی فیصلہ کرنا ہے، یہ پانچ چھ لوگ ہیں، ان کا فیصلہ آنے سے پہلے۔۔۔۔۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں، ہاں مگر ایک کام کا فائدہ ہو سکتا ہے، اگر وہ ہو جائے تو؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے خاموش رہا تو میں بولا، ”وہ آفیسر جو انہیں احکام دے گا، وہ اڑا دیا جائے، اور اس اجلاس میں وہ جن لوگوں کا نام ڈن کریں، مرنے والوں کی جگہ انہیں اڑا دیا جائے تو پھر اس معاملے میں اگلا اجلاس بہت سوچ سمجھ کر ہوگا۔“

”ڈن۔“ اس نے انگوٹھا دکھا کر میری بات کی تائید کر دی۔ تو فہیم بولا

”اب جہاں جی سے بات ہو؟“ اس نے کہا

”نہیں اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لیتا ہوں سب۔“ اروند سنگھ نے کہا اور رونیت سے رابطہ کیا، وہ اس وقت تہا بیٹھی اسی معاملے کو دیکھ رہی تھی۔ اسی کے پاس جہاں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی انہیں پلان بتایا گیا تو انہوں نے بھی ڈن کر دیا۔ اس پر رونیت کو اور فہیم کے ساتھ اروند اس کام پر لگ گیا۔ میں انہی کے پاس بیٹھا رہا، میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

اجلاس اسی انشٹیٹیوٹ میں ہو رہا تھا۔ جہاں اس وقت سیکورٹی بہت زیادہ تھی۔ رات کا دوسرا پہر ختم ہو جانے کو تھا۔ اس اجلاس میں قتل ہونے کی وجہ اور اس کی دیگر تفصیلات کے علاوہ یہ بھی جائزہ لیا گیا کہ فوری طور پر کون لوگوں کو تعینات کیا جائے۔ مجرم پکڑنے کی ذمہ داری کس کی ہوگی اور سب سے اہم یہ سوال تھا کہ یہ کس نے کیا ہے، ابھی تک سیکورٹی والوں کی طرف سے ایسا کچھ نہیں بتایا گیا تھا، یہ کون ہیں؟ اس پر سب سے زیادہ بحث ہوئی تھی۔ بہت

سوں کے ذمے بہت سارے کام لگ گئے۔ لیکن اس دوران جہاں نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ امرتسر کے قریب و جوار ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہ پہنچ چکے تھے۔ انہیں اچھی طرح پتہ چل گیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

اجلاس کی صدارت کرنے والا ایک ہندو ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھا، جواب ”را“ کے لئے اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ وہ انشٹیٹیوٹ سے نکلا تو اس کے ساتھ ایک گاڑی سیکورٹی کی تھی۔ اسے اپنے فارم ہاؤس نما جنگل میں جانا تھا، جہاں اس کے انتظار میں دو ”را“ والے بیٹھے ہوئے تھے۔ چند منٹوں میں ان لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ ایکشن کی جگہ کون سی ہوگی اور کس نے کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی وہ اپنی اور سیکورٹی والی گاڑی میں انشٹیٹیوٹ سے نکلا، ہر طرف خبر مل گئی۔ انشٹیٹیوٹ اور اس کے جنگلے کار درمیانی فاصلہ کوئی چھ کلومیٹر کے لگ بھگ تھا، اور ایکشن والی جگہ تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

ان کی گاڑیاں تیزی سے اس جگہ تک پہنچ رہی تھیں۔ جسے ہی ان گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں وہ لوگ الرٹ ہو گئے۔ ان کا جو ہیڈ تھا، اس کے کان کے ساتھ فون لگا ہوا تھا، انہیں بتایا جا رہا تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر آ گئے ہیں۔ جیسے ہی وہ گاڑیاں ان کی ریخ میں آئیں، انہوں نے راکٹ لانچر داغ دیئے، ایک دم سے تین اطراف سے ایک ساتھ راکٹ لانچر داغے گئے۔ اگلے لمحات میں وہاں خوف ناک دھماکے ہوئے، انکی گاڑیاں پھٹ گئیں، جیسے ہی انہوں نے راکٹ لانچر داغے، وہ وہاں نہیں نکلے، لمحوں میں نکل گئے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہاں پر کیا ہوا؟

انہی لمحات میں امرتسر کے پوش علاقے کے مین روڈ پر موجود ایک جنگلے میں سردار نہال سنگھ اروڑہ اپنے بیڈروم میں پڑا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فون سنا تھا جس میں اسے اس انشٹیٹیوٹ کا انچارج بنانے کی نوید سنائی گئی تھی۔ وہ بھی ایک آرمی آفیسر تھا اور ”را“ کے لئے خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ اس کی بھی دیرینہ خواہش تھی کہ اس انشٹیٹیوٹ پر راج کرے، وہاں کیا کچھ نہیں تھا، عورت، شراب، دولت اور حاکمیت سب کچھ تھا۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں پڑا ہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اب اس نے کرنا کیا ہے۔ ایسے میں اسے باہر سے اطلاع ملی کہ چار بندے آئے اور فوری طور پر آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔

”یہ پوچھا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنے چاہتے ہیں اور اس وقت ہی کیوں؟“ اس نے اپنے سیکورٹی انچارج سے پوچھا تو سیکورٹی انچارج نے کہا

”سربجی وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”اچھا کراؤ بات۔“

چند لمحوں بعد ایک بھاری آواز فون میں گونجی

”سربجی انشٹیٹیوٹ سے ہیں اور ہمیں آپ کی سیکورٹی پر کے فرائض سونپے گئے ہیں۔“

”اُو اچھا، ٹھیک ہے، آپ اسی انچارج سے ملیں، وہ آپ کو رہنے کے لئے جگہ دکھا دیتا ہے۔“

”سر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن ہمارا آپ سے ملنا بہت ضروری ہے، پھر آپ کا جو حکم ہوگا۔“ اس نے فون پر سنا تو چند لمحے سوچ کر بولا

”ٹھیک ہے، فون سیکورٹی انچارج کو دو۔“

چند لمحے بعد سیکورٹی انچارج بولا

”جی سر۔“

”انہیں لان ہی میں بیٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے فون بند کیا اور باہر جانے کیلئے اٹھ گیا۔

وہ لان میں آیا تو چار نو جوان بہترین تراش کے سوٹ پہنے الرٹ کھڑے تھے۔ وہ ان کے پاس آیا تو چاروں نے فوجی انداز میں سلیوٹ کیا، نہال سنگھ نے ان سے ہاتھ ملائے تو ایک نو جوان بولا

”سر! ہم حکم ملا ہے کہ اگر آپ ابھی انشٹیٹیوٹ کا چارج لینا چاہیں تو چلیں، وہاں لوگ آپ کے منتظر ہیں۔“

”یاراتی جلدی کس لئے، میں صبح آ جاؤں گا۔“ اس نے حاکمانہ لہجے میں کہا

”سر! وہ آپ کی مرضی، لیکن وہاں کچھ ضروری معاملات ہیں، جن کے لئے آرڈرز چاہئیں۔ دوسرا اب آپ کی سیکورٹی ہمارے ذمے ہے، چاہیں تو اپنی نجی سیکورٹی بھی رکھ سکتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ آپ لوگ یہاں آرام کرنا چاہو یا جانا چاہو.....“

”نوسر! ہم ادھر ہی رہیں گے، ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔“ اس نو جوان نے فوجی انداز میں کہا تو نہال سنگھ زیر لب مسکرا دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہی پرانے حاکمیت کے دن لوٹ آئے ہیں۔ اس نے ان چاروں کی

طرف دیکھا اور پھر حاکمانہ لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے آپ اپنی ڈیوٹی کرو۔“

”یس سر۔“ جیسے ہی نو جوان نے کہا تو ان چاروں نے اپنی پشت ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ لی، جس وقت وہ

ایک دوسرے کے ساتھ پشت جوڑ رہے تھے، اسی دوران انتہائی سرعت سے انہوں نے اپنے پٹکل نکالے، جو

نو جوان بات کر رہا تھا، اس نے نہال سنگھ کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ سیکورٹی پر مامور لوگوں کا جائزہ لے

چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے، انہوں نے فائر کھول دیا۔ نہال سنگھ لان میں گر کر تڑپ رہا تھا، ایک گولی

نے ہی اس کی کھوپڑی میں سوراخ بنا دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ ان کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔

جب تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا تھا، وہ گیٹ پار گئے۔ ان کی گاڑی باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس میں بیٹھے اور انتہائی

سرعت کے ساتھ وہاں سے نکل گئے۔ جس وقت وہ وہاں سے نکل رہے تھے، اسی نو جوان نے فون کر کے بتا دیا کہ

مشن پورا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دور جا کر انہوں نے وہ گاڑی چھوڑی اور دو دو میں بٹ کر پیدل چل پڑے، وہ سڑک

سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئے تھے۔

”اب میں انہیں دوں گا دھمکی؟“ اروند نے پورے جوش سے کہا

”کسے دو گے دھمکی اور کیا دو گے؟“ فہیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا

”دیریتا کی طرف سے ”را“ کے لوگوں کو دھمکی ہوگی کہ ہم اس وقت میدان میں ہیں، اگر ہمارے مطالبات نہ

مانے گئے تو ہم اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس سے بھی زیادہ لوگ ماریں گے۔“ اس نے کہا اور پہلے سے لکھی ہوئی ای

میل کر دی۔

”لیکن مطالبات کیا ہوں گے؟“ رونیت کی آواز ابھری، جس میں تجسس کے ساتھ طنز بھی تھا۔

”وہ بھی سوچ لیتے ہیں۔ دیکھ لینا ابھی ان کے ساتھ مذاکرات ہوں گے۔“

”چلو دیکھتے ہیں۔“ اس نے قہقہہ لگا کر کہا

”اوسے فہیم یہ خبر سارے چھٹلو کو بھیج دی ہے؟“ اروند نے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

”لو بھیجی تم لوگ کرو کام، میں سونے کے لئے جا رہا ہوں، اگر ضرورت ہو تو مجھے جگا لینا۔“ میں نے کہا اور ان کے

پاس سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

دن نکلنے سے پہلے کی نیلگوں روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ جہاں سنگھ کمرے سے اٹھ کر باہر لان میں آ گیا تھا۔ لان میں ایک کرسی پر جگتا سنگھ بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

”بیٹھو، بیٹھو، کھڑے کیوں ہو گئے ہو؟“ جہاں نے اسے یوں تعظیم میں کھڑے دیکھ کر جلدی سے کہا تو وہ دونوں ہاتھ باندھ کر بولا

”مان گئے بائی جی، سردار سر جیت سنگھ بندیاں جی نے آپ پر جو اعتماد کیا ہے، وہ ٹھیک کیا ہے۔ اتنی تیزی اور اتنی شدت۔“

”میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟“ جہاں سنگھ نے بیٹھے ہی پوچھا

”سردار سر جیت سنگھ بندیاں جی نے ہی مجھے آپ کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا ہے۔ چینل سب کچھ نہیں بتائیں گے، لیکن جن تک بات پہنچی تھی پہنچ گئی ہے۔“ اس نے جوش بھرے لہجے میں بتایا

”دیکھ جگتا سنگھ! ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں ہوا، تم ایک سیاست دان اور لیڈر ہو، کچھ بھی ہو جائے، ٹو اور میں ایک ساتھ نظر نہیں آنے چاہئیں۔ یہ تیری غلطی ہے کہ تو اس وقت یہاں میرے گھر میں ہے۔ کیونکہ مجھے اپنا کام کرنا ہے اور تجھے اپنا کام، ہمارا ایک دوسرے سے کوئی لینا دینا نہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں ہونا چاہئے، جس سے یہ لوگ تجھ پر انگلی اٹھا سکیں، کیا تجھے یہ پتہ ہے کہ خفیہ والے تیرے پیچھے بھی ہو سکتے ہیں اس وقت؟“

”کسی کو نہیں پتہ کہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو جہاں نے اُٹل کی بات کاٹ کر کہا

”کچھ بھی ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے بائی جی۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اٹھنے لگا تو جہاں نے قہقہے سے کہا

”ابھی بیٹھ، کچھ کھا پی لے، پھر جانا، میں نے تم سے ایک بات بھی کرنی ہے۔“

یہ سنتے ہی جگتا سنگھ بیٹھ گیا۔ اتنے میں اندر سے کھانے پینے کا سا ان گرلین کور لے کر آ گئی۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر انہی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بیٹوں کھانے پینے لگے۔ ان کے درمیان خاموشی تھی۔ تبھی جہاں نے جگتا کی طرف دیکھ کر کہا

”سنگھ قوم کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں جو لوگ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں بھارت میں آئے تو اسی وقت سے ہی انہیں ”مجرم قبیلہ“ کہا جانے لگا۔ یہ سازش اسی وقت سے تھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل نے اس وقت کے گورنر پنجاب سی ایم تیواڑی نے مل کر کی۔ تب سے لیکر اب تک ان بے غیرت ہندوؤں نے سکھوں کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا۔ خیر! جو بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ غور سے سنو۔“

”جی پولیس بائی جی۔“ جگتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اقوام متحدہ کے قوانین کے مطابق ایسی کوئی قوم خود ارادیت کا حق رکھتی ہے، جس کی اپنی کوئی تاریخ ہو یا جس کی اپنی کوئی مملکت قائم رہی ہو، اس کی اپنی سرزمین ہو، ان کی اپنی الگ سے ثقافت ہو، جن میں اپنی مملکت چلانے کی صلاحیت ہو۔ خالصتان تحریک چلانے والوں کا یہ دعویٰ ہے اور ہم اس دعویٰ میں حق بجانب ہیں کہ ہم دنیا کا پانچواں بڑا مذہب رکھتے ہیں۔ ہم دنیا میں تین کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ بھارتی پنجاب میں ہماری سب سے زیادہ تعداد ہے۔ ان باتوں کو بنیاد بنا کر خالصتان تحریک کا پھر سے مطالعہ کرو اور لفظوں کے ہتھیار لے کر نکل پڑو۔ پوری

دنیا کے سکھوں تک یہ پیغام پہنچا دو۔ ہمیں اب خالصتان حاصل کرنا ہے۔“

”بائی جی میں سمجھ گیا، سیاسی اور سفارتی سطح اب میرے ذمے رہی۔ میں آپ کا وٹن سمجھ گیا ہوں۔ مجھے راستہ مل گیا۔ اب اجازت دیں بائی جی۔ واہ گرو دا خالصہ، واہ گرو جی دی فتح۔“ ہاتھ جوڑ کر یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی قیمتی گاڑی کی جانب بڑھا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس سارے معاملے میں گرلین خاموش رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی بولی

”کیا یہ کر لے گا؟“

”ہاں، یہ اسلحہ نہیں اٹھا سکتا لیکن لفظوں کی جنگ خوب لڑ سکتا ہے۔“ جہاں نے سوچتے ہوئے کہا پھر چونک کر بولا، ”اروند کی طرف سے کوئی خبر؟“

”ابھی تک تو نہیں۔ ادھر ”را“ کی طرف سے بھی گہری خاموشی ہے۔“ گرلین نے کہا تو جہاں اٹھتے ہوئے بولا

”گہری خاموشی میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ آؤ اندر چلیں، یہ وقت بڑا قیمتی ہے۔“

جہاں اندر چلا گیا اور گرلین برتن سینے لگی۔

☆.....☆.....☆

میں حویلی کی چھت پر کھڑا در تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے پار نور گراب بھی ویسا ہی تھا جیسے میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا، کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، لیکن میں بہت حد تک بدل گیا تھا۔ انتقام کی آگ سے میرے سفر کی ابتدا ہوئی تھی جو نجانے کہاں کہاں سے ہو کر یہاں تک آن پہنچا تھا۔ اس دوران مجھے آگئی اور شعور نہ ملتا تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ میں انہی بھل بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ اروند سنگھ کا فون ملا، وہ مجھے نیچے بلا رہا تھا۔ میں چند منٹوں میں اس کے پاس جا پہنچا

”اروند! خیریت ہے؟“ میں نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے پوچھا

”کل سے لے کر آج صبح تک جو کچھ بھی ہوا، اس نے ایک بار تو ”را“ کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ وہ کیا کریں۔ پورا زور لگا کر انہوں نے خبریں روکی ہوئی ہیں۔“

”کیا تم نے ان چینلوں کو خبریں نہیں بھیجیں تھیں؟“ میں نے اس سے پوچھا

”قتل ہو جانے کی خبریں تو آگئی ہیں لیکن یہ قتل کیوں ہوئے، اس بارے میں بتا رہے ہیں۔ خیر! یہ دیکھیں۔“

اس نے مجھے اسکرین کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا

”کیا ہے یہ؟“ میں نے پوچھا

”یہ اک لمبی ای میل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ یعنی ”را“ والے ”دیریتا“ والوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ اس نے بتایا تو میں نے کہا

”تو کر لو بات، کہہ دیتا کہ ابھی اک لمبی فہرست ہے، انہیں ختم کر لیں تو مطالبات بھی بتا دیں گے۔“

”مطلب ابھی انہیں کوئی واضح بات نہیں بتائی؟“ اس نے میری بات سمجھتے ہوئے پوچھا

”بالکل، ابھی دیریتا کی دہشت بن جانے دو۔ یہ دیکھو، وہ دیریتا کو تلاش کرنے کے لئے کس حد تک جاتے ہیں، پھر بات بھی ہو جائے گی۔“ میرے کہنے پر وہ سمجھ گیا اور کمپیوٹر پر مصروف ہو گیا۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر چل دیا۔

میں حویلی کے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا، جہاں اماں اور سوہنی پہلے ہی سے بیٹھی ہوئیں تھیں۔ میں ابھی ان سے کوئی بات بھی نہیں کر پایا تھا کہ چوہدری اشفاق آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا

”اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ، یہ باہر کے معاملات ہیں، ان کے بارے میں آپ کو کیا پتہ؟“ میں نے کافی حیرت سے پوچھا کیونکہ اماں نے پہلے کبھی باہر کے معاملات میں مداخلت نہیں کی تھی، ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔

”یہ اشفاق یہاں ہوگا تو انکیشن لڑے گا۔ میں اسے لندن بھیج رہی ہوں تانی کے پاس۔“ اماں نے پرسکون لہجے میں کہا

”کیا، یہ فیصلہ کب ہوا؟ مجھے بتایا ہی نہیں۔“ میں نے پھر پوچھا تو اماں نے اٹھتے ہوئے پوچھا

”کیا تجھے ہر بات بتانا ضروری ہے؟“

”نہیں مگر، یہ بات.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کا نئے ہوئے سوئی سے بولیں

”سوئی پتر، بتا دے اسے۔“

یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چلی گئیں۔ اس کے پیچھے ہی چوہدری اشفاق اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ تب سوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے لیوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی فٹیلی آنکھوں سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے کہا

”تمہیں نہیں پتہ، یہ اشفاق بہت پہلے سے تانی کے ساتھ عشق کی حد تک پیار کرتا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے خوشگوار حیرت سے کہا

”جی ہاں، یہ اپنے دل ہی دل میں اس سے پیار کرتا رہا، لیکن اظہار اس لئے نہیں کیا کہ شاید تم اس سے بہت محبت کرتے ہو اور ممکن ہے اس سے شادی بھی کر لو۔ اسی لئے اپنی خواہش زبان پر نہیں لایا، یہاں تک کہ وہ لندن چلی گئی۔ اب جبکہ تمہاری اور میری شادی ہو گئی ہے تو ایک دن ایسے ہی اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ اس کے خیال میں یہی ہے کہ اب تانی واپس کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ اس پر اماں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ چوہدری اشفاق اور تانی کی شادی کر دیں۔“

”کیا تانی اس پر راضی ہے؟“ میں نے پوچھا

”ہاں، وہ راضی ہے، اماں نے اس سے تفصیلی بات کر لی ہے، وہ ایک دو دن میں یہاں آ رہی ہے۔ اس کی شادی یہیں ہوگی اور آگے کا سارا جو پر اس ہے وہ تم دیکھ لینا یا پھر تانی خود دیکھ لے گی۔“ سوئی نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا

”چلو، یہ تو خوشی کی بات ہے، اس کی زندگی میں بھی بہار آ جائے گی، سوئی شاید تم نہیں جانتی ہو، وہ ایک سپاٹ اور تہا زندگی گزار رہی ہے، جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے، کوئی بھی تو نہیں۔“ میں کافی حد تک جذباتی ہو گیا تھا

”ایک بات کہوں؟“ سوئی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

”بولو۔“ میں نے یونہی کہا

”اگر تم تانی سے شادی کر لیتے نا، تو مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوتی، میں مانتی ہوں، وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ وہ تم سے عشق کرتی تھی، میں جانتی ہوں کہ عشق کرنے والے ہی جان دیا کرتے ہیں، اس نے تم پر اپنی جان وار دی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اماں اسی لئے اسے اپنے خاندان کا حصہ بنا لینا چاہتی ہے۔“ وہ انتہائی جذباتی انداز میں اعتراف کرتی تھی تو میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی لٹ کو درست کیا اور بولا

”تم، تم، تم ہو سوئی۔“

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے مسکرا دی پھر اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سیدھی اماں

”وہ یار، کچھ بندے ملنے آئے ہیں تمہیں، افضل رندھاوا بھی ان کے ساتھ ہے۔“

”خیر تو ہے نا، کس لئے آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا

”میں نے پوچھا تھا، وہ کوئی سیاسی لوگ ہیں۔“ اس نے بتایا تو میں اٹھ گیا۔

باہر لان میں تین بندوں کے ساتھ رندھاوا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ تب اچانک مجھے وہ دور یاد آ گیا، جب میں تھک کر تھانے لے جایا گیا تھا۔ میں ان سے ملا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ چوہدری اشفاق نے ان کی خاطر تواضع کے لئے جائے کے ساتھ لوازمات بھیجوا دیئے تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ حکومتی پارٹی کے لوگ ہیں اور آئندہ آنے والے انکیشن کے بارے میں بات کرنے آئے تھے۔ ان میں ایک بزرگ نما بندہ ظہور مرزا تھا، جس نے ساری بات کی تھی۔

”آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا

”ظاہر ہے ہم آپ کی سپورٹ ہی چاہیں گے۔ اس وقت اس علاقے میں آپ ہی کا اثر دوسرا ہے۔ ہم اپنے امیدوار کے لئے ووٹ چاہیں گے۔“ اس نے ملائمت سے کہا، تب میں چوہدری اشفاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”لیکن میں تو اسے ایم این اے کا انکیشن لڑانا چاہتا ہوں۔ ہم امیدوار ہیں۔“

اس پر ظہور مرزا کچھ کہنے لگا تو افضل رندھاوا نے اسے روکتے ہوئے کہا

”نہیں جمال!۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ پس پردہ کھیل کچھ دوسرا ہے، سامنے کچھ اور ہے۔ مرے خیال میں تم اسے انکیشن ہی سے باہر کر دو پھر کم از کم ایم پی اے تک محدود کر دو۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”اتنا سمجھ لو کہ اس بار یہ پارلیمانی آداب سیکھ جائے، اگلی بار جیسے آپ چاہو۔“

”کسی قسم کی کوئی گزبوند ہونے کی ضمانت دیتے ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

”ہر طرح کی ضمانت ہے۔“ اس نے اعتماد سے کہا

”ٹھیک ہے، جیسے تم چاہو۔“ میں نے کہا تو انہوں نے خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے اتنی جلدی فیصلہ دینے کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی نہ ہو۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے۔ جاتے ہوئے افضل رندھاوا نے دوبارہ آنے کا کہا اور وہ لوگ چلے گئے۔

میں واپس اندر گیا تو اماں اور سوئی وہیں لاؤنج ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے پیچھے ہی چوہدری اشفاق آ گیا۔

میں نے اسے اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

”تمہیں سمجھ آئی ہے یہ لوگ یہاں کیوں آئے تھے، اس قسم کی بات کرنے؟“

”رندھاوا تو مجھے کئی دنوں سے کہہ رہا تھا، لیکن میں نے اسے ایک ہی بات کہی کہ وہ تم سے بات کر لے، میں اپنے طور پر کوئی بات نہیں کروں گا، میں نے انکیشن لڑنا ہے، نہیں لڑنا ہے اس کا فیصلہ جمال ہی نے کرنا ہے۔“

چوہدری اشفاق نے بڑے سکون سے کہا

”کون لڑ رہا ہے انکیشن؟“ اچانک اماں نے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا تو میں نے باہر لوگوں کے آنے کے

بارے میں میں اختصار سے بتا دیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہیں، پھر بولیں۔

”یہ اشفاق نے کوئی انکیشن نہیں لڑنا، انہیں کہو، وہ جسے چاہیں اپنا امیدوار بنالیں۔“

کے پاس ہی جا کر رکے گی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری اشفاق کو تانی سے محبت ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس میں جذبات نہیں تھے۔ سوچ اس لئے سکتا تھا کہ کبھی بھی اس نے اشارے کئے سے بھی اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تانی کی خوبصورتی پر کوئی بھی فدا ہو سکتا ہے۔ پہلی نگاہ میں کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اندر سے اتنی سخت ہے، جتنی وہ نازک دکھائی دیتی تھی۔ اب جبکہ میں نے اسے کافی حد تک دیکھ لیا تھا، اس کے ساتھ نے تانی بارے بہت کچھ سمجھا دیا تھا، کبھی کبھی مجھے لگتا کہ وہ جو قلو پٹھرہ کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح قلو پٹھرہ کے چھوٹے چھوٹے بال، لمبی ناک، گول چہرہ کھا جانے والی پرکشش آنکھیں، اس کا تراشیدہ بدن، دیکھنے میں ایک حسین ترین عورت لیکن اندر سے وحشی، درندہ صفت، ویسے ہی تانی دیکھنے میں قلو پٹھرہ جیسی، فرق رنگ کا تھا، تانی بہت سفید تھی۔ گلابی سینڈور ملی رنگت والی، اور دوسری بات اسے خود پر مکمل قابو تھا، میں نے اسے کبھی ہلکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اماں کی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔ لیکن اصل سوال یہ تھا کہ کیا وہ بھی چوہدری اشفاق کا قبول کر سکتی ہے دل سے؟ یہی ایک ایسی بات تھی، جو میں ہی ٹٹول سکتا تھا، ورنہ کوئی دوسرا اس کے دل کی بات نہیں جان سکتا تھا۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ تانی بارے مزید سوچ میرے ذہن میں نہ آئی تو میرا ذہن ”ویرتا“ کی طرف چلا گیا۔ میں اس کا انجام سوچ لگا، یہ بالکل پانی کے بلبلے کی مانند بات تھی۔ اگر بات جم جاتی تو پھر ایسی جتنے والی تھی کہ اس کا اس کا اثر تادیر رہنے والا تھا۔ اور اگر سامنے والے اس کھیل کو سمجھ گئے تو محض ایک پھونک ہی کافی تھی۔ مجھے ارون سنگھ کی ذہانت پر شک نہیں تھا لیکن اس کی پورے کامیابیوں کے پیچھے صرف ایک بات تھی۔ اس نے بھارتی اداروں سے سیکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیسے کام کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس کے خلاف بھی جاسکتی تھی لیکن اس نے وہ طریقہ کار بدل لیا، اور میکنگ کی دنیا میں اپنا گروپ بنا کر تہلکہ مچائے ہوئے تھا۔ وہ دوسروں کے لئے کام کرتا تھا اور ان سے کام بھی لیتا تھا۔ وہ میرے ساتھ صرف ایک مقصد کے لئے وفادار تھا کہ میں نے اسے تحفظ دیا ہوا تھا اور کبھی کے لئے اس نے اپنا آپ وقف کر دیا ہوا تھا۔ اب تک ایک بھی ایسا عمل سامنے سے نہیں گزرا تھا جس سے کوئی شک بھی پیدا ہوتا۔ اس نے ویرتا بنا کر ایک بڑا کام کر دیا تھا، جس کے پیچھے بہت کچھ چھپ سکتا تھا۔

جس دن سردار سر جیت سنگھ بندیال نے جہاں سنگھ کو اپنے ہاں بلا کر اسے خالصہ کی ذمہ داری سونپ دی تھی، اسی دن سے میرے ذہن میں بھی وہ خیال واضح ہو گیا، جو نجانے کب سے میرے ذہن میں تھا۔ میں چاہتا تو کرل سرفراز اور روہی والوں کے ساتھ مل کر ایسا ہی کوئی گروپ بنا سکتا تھا، لیکن اُن کے پاس تو اپنا سارا سیٹ اپ تھا۔ پھر میں نے کیا کیا؟ میں اس معاملے میں ارون اور فہیم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ویرتا کا حالیہ معاملہ ختم ہو جائے تو پھر ان سے بات کروں۔ میں یہ باتیں سوچ رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا، کوئی اجنبی نمبر ہی تھا۔ میں کال رسیو کی تو دوسری جانب سے جو بولا میں اسے پہچان گیا۔

”تم نے ہمارے پرندے آزاد نہیں کئے، اس لئے اب ہماری دشمنی تو بن گئی نا۔“ اس نے دھمکی آمیز طرز سے کہا تو میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

”دشمنی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم اپنی کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”تو پھر سنو! تمہارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں، ہمارے پرندے آزاد کرو۔ ورنہ میں اتنے ہی دھماکے کروں گا، جتنے میرے پرندے ہیں۔ پھر مجھ سے شکوہ نہیں کرنا کہ یہ میں نے کیا کر دیا ہے۔“ اس بار اس کے لہجے میں غصہ آ گیا تھا

”یار مجھے ایک بات بتاؤ، تم تو کہتے ہو کہ تمہاری پہنچ بہت دور تک ہے، تم اپنے پرندے آزاد کرالو۔“ میں نے بھی اس پر طنز کیا

”وہ اگر قید میں مر بھی جائیں تو مجھے کچھ نہیں ہوگا، کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن میں صرف تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو کیا کرتا ہے۔“ اس نے کہا

”مجھے دیکھنے کا مطلب ہے تمہاری موت، اپنی دنیا تک محدود رہو یہی اچھی بات ہے۔“ میں نے اسے کہا ”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ میں اپنی موت کا سامنا کروں، میں موت کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ میرا آئنا سامنا چاہتا ہے۔ میں نے فون بند کر دیا۔ میں اس کی آواز ریکارڈ کر چکا تھا۔ میں اٹھا اور ارون کے پاس چلا گیا۔

وہ کبھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ میں ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا تو ارون نے میری طرف دیکھے بغیر کہا

”را کے بڑوں کا اجلاس ہو چکا ہے۔ ایک طرف وہ ویرتا کے مطالبات ماننے کو تیار ہیں اور دوسری طرف اپنے ہیکرز لگا کر ویرتا کو تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے بھی یہی بہانہ بنا کر انہیں جواب نہیں دیا۔“

”بالکل ٹھیک کیا، اگر ہو سکے تو جب تک انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے، کرو۔ جہاں سے کہو، تھوڑا مزید دباؤ ڈالے، پھر دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ پھر چند لمحوں بعد بولا

”میں میل کر دی ہے۔ رویت اسے بتا دے گی۔“

”اوکے، اب یہ ایک آواز ہے، اسے دیکھو، یہ بندہ چند دنوں سے دھمکیاں دے رہا ہے۔ ابھی اپنا کام کرو۔ جس وقت فری ہونا تو اسے تلاش کر لینا۔“ میں نے اسے اپنا سیل فون دیتے ہوئے کہا۔ اس نے وہ آواز اپنے کمپیوٹر میں ڈال لی تو اپنی کرسی گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا

”میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں، اس پر ذرا غور بھی کریں اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ بھی سوچنا ہے۔“

”بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا

”اس وقت آگرہ بھارت کے ایک ہسپتال سے فارغ ہونے والے دو بھائی شمس الدین اور قمر الدین انتہائی کمپری کی حالت میں پڑے ہیں۔ ان کے ارد گرد سخت پہرہ ہے۔ میرا خیال ہے انہیں مار دیا جائے گا، یا پھر انہیں کسی غلط مقصد کے لئے استعمال ہوں گے۔“

”یہ یہاں کیوں اور یہ سب.....“ میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں بتا رہا ہوں نا۔“ اس نے تیزی سے کہا اور ایک لمحہ سانس لیکر کہتا ہی چلا گیا، ”دراصل یہ دونوں بھارتی مسلمان ہیں، اور آگرہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ تقریباً دس برس پہلے یہ پڑھنے کے لئے امریکہ کے شہر ہوسٹن چلے گئے تھے۔ کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ بہت بڑے ہیکرز بھی بن گئے۔ یہ اس قدر شارپ مائنڈ تھے کہ پچھلے تین برس سے انہیں پکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی، لیکن یہ ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ ان کا اصل خواب تھا کہ یہ چین چلیں جائیں، جس کے لئے یہ بھرپور کوششیں بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ لیکن صرف دولت کے لئے، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں نے ایک دو کام ان سے لئے ہیں۔ اور یہ جو آواز والا سافٹ ویئر بنایا ہے، یہ انہی کی مدد سے بنایا تھا۔ ابتدائی کام انہی نے شہر کیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے انہیں یقین ہو گیا کہ یہ پکڑے جاسکتے ہیں۔ انہیں پکڑوانے میں ایک بھارتی لڑکی کا ہاتھ تھا، جو خود بھی ہیکر تھی اور نئی نئی ”را“ کے

لئے کام کرنے لگی تھی۔ امریکن کو ان پر پہلے ہی شک تھا، انہوں نے ان دونوں کو گھیر لیا۔ دو ہفتے تک یہ امریکن تشدد کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مرنے والے ہو گئے ہیں۔ ان دونوں نے تشدد تو برداشت کر لیا لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

”بڑی بات ہے جو انہوں نے منہ سے کچھ نہیں نکالا؟“ فہیم نے حیرت سے تبصرہ کیا

”الزام کیا لگایا تھا ان پر؟“ میں نے پوچھا

”الزام ان پر یہ لگایا گیا تھا کہ یہ دونوں چونکہ مسلمان ہیں اور دہشت گردوں کی مدد کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے یہ تفتیش کی۔ چونکہ انہیں نے کبھی بھی ایسا نہیں کیا تھا، کسی دہشت گرد کی کبھی مدد نہیں کی تھی، سو ان پر یہ الزام ثابت نہیں ہو سکا تو انہیں چھوڑ دیا گیا۔ اور پھر الزام ایک بھارتی لڑکی نے لگایا تھا جو خود سامنے نہیں تھی۔“ پھر فہیم کی طرف دیکھ کر بولا، ”وہ بولے اس لئے نہیں کہ انہوں نے سوچ لیا تھا اگر انہوں نے جھوٹ میں اقرار کر لیا کہ ان کا دہشت گردوں سے تعلق ہے تو پھر ساری زندگی یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ انہیں مرنے ہی پڑے گا، ان دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر زندگی چاہئے تو منہ بند رکھنا ہوگا۔“

”یار ان کا تشدد، بڑی بات ہے۔“ فہیم نے انسا ئیر ہوتے ہوئے کہا

”اور بات بتاؤں کہ انہیں الگ الگ رکھ کر بھی تفتیش کی گئی تھی۔“ ارون سنگھ نے بتایا

”واہ! تو پھر وہ بھارت کیسے واپس آ گئے؟ وہاں کسی ہسپتال میں انہیں کیوں نہیں رکھا گیا؟“ پاس بیٹھے ہوئے فہیم نے تیزی سے پوچھا

”ایک تو وہاں پر ان دونوں بھائیوں کے دوستوں نے انسانی حقوق کی تنظیموں سے رابطہ کیا۔ ان سے مدد لی، دوسرا وہیں پر موجود بھارتی لابی نے ان کے لئے کوششیں کیں۔ الزام ثابت نہیں تھا، سو امریکن نے تو چھوڑ دیا لیکن بھارتی ”را“ نے ان دونوں کا اپنے استمال کے لئے منتخب کر لیا۔ وہ دونوں بھائی انتہائی خستہ حالت میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر مریں بھی تو کم از کم انہوں کے درمیان مریں، سو انہوں نے واپس بھارت آنا ہی پسند کیا۔ جس پر ”را“ نے پوری دلچسپی لی اور انہیں آگرہ لے آئے ہیں۔ اب وہ وہاں کے ایک بڑے نجی ہسپتال سے کل ہی فارغ ہوئے ہیں، ان پر سارا خرچ بھی وہ ”را“ کے ایجنٹ کر رہے تھے، جو بظاہر اس کے ہمدرد ہیں۔“

”یہ جو تم نے پوری کہانی سنائی اس کا مقصد کیا ہے؟“ اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھی مہوش نے پوچھا

”کسی بھی طرح ان دونوں کو بھارت سے نکال کر یہاں لایا جائے۔ یا ایسی کسی بھی جگہ پر جہاں وہ محفوظ ہو جائیں۔ اگر وہ ہمارے لئے کام نہ بھی کریں تو کم از کم ”را“ کیلئے نہ کریں۔ وہ بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں، اگر ان سے کام لیا جائے تو۔ لیکن اس سے بھی ہٹ کر وہ میرے دوست ہیں۔ میں ان کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ لفظ کہتے ہوئے ارون سنگھ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ تبھی میں نے کہا

”کیا تمہارا رابطہ ہے ان کے ساتھ۔“ فہیم نے پوچھا تو وہ بولا

”یار رابطہ ہے نا تو مجھے پتہ ہے نا، وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ وہاں سے نکل آئیں۔“

”اوکے، تم ایک کام کرو۔ ان کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہیں، کوئی کوڑا ان کے ساتھ طے کر۔ انہیں بتاؤ کہ ہم ان کے لئے کچھ کرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ان کے پاس سے اٹھ کر آیا گیا۔

☆.....☆.....☆

رونیت کو راور جہاں سنگھ آنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ارون سنگھ کا پیغام دے چکی تھی۔ دونوں کے درمیان

خاموشی تھی اور وہ دونوں ہی اس پر سوچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بائیتا کو بھی ان کے پاس آگئی تو رونیت نے اسے بھی بتا دیا تو وہ تبصرہ کرتے ہوئے

”دیکھو! اگر ہم یہ سمجھیں کہ ہم ”را“ کو ختم کر دیں گے تو یہ ابھی ناممکن ہے۔ اس وقت ہمارا ان سے مقابلہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک حکومت ہے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان سے ڈر جائیں، بلکہ ہم نے اسے ڈرانا ہے، فی الحال ہمیں انہیں یہی تاثر دینا ہے کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے ہیں اور ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔“

”اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ انہیں یہ تاثر بالکل بھی نہیں ملنا چاہئے کہ یہ خالصتائی لوگ ہیں۔ پھر وہ اپنی توجہ اسی پر مرکوز کر لیں گے۔“ رونیت کو نے اپنا خیال دیا تو جہاں سنگھ مسکراتے ہوئے بولا

”یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، کچھ کریں گے تو ہی ہوگا۔“

”ہونا تو کرنے سے ہی ہے، میں صرف اپنا کہنا چاہتی ہوں کہ جس قدر محتاط ہو جاسکتا ہے، احتیاط رہیں تاکہ ہم نے ٹارگٹ لینا ہے، اسے پورا کر سکیں۔“ بائیتا کو نے اپنی رائے دی

”اصل مسئلہ تو یہی ہے نا کہ ہمارا ٹارگٹ کیا ہے؟ فی الحال تو اتنا ہی ہے نا کہ ”را“ کو ڈرایا جائے، انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہم ان کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں۔“ رونیت کو نے سمجھانے والے انداز میں کہا

”تو پھر سیدھی سی بات ہے، ”را“ کے لوگوں کو نشانہ بنایا جائے، وہ پنجاب میں جہاں بھی ہوں۔ ایک دم سے انہیں طاقت کا احساس دلایا جائے، تو میرا خیال ہے ہم انہیں اپنی ہر بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ بائیتا کو نے پر جوش لہجے میں کہا

”ایسا ہی کرنا ہے اور یہ کوئی ایک دن کی بات تو نہیں ہے، اس میں وقت لگنا ہے۔“ جہاں نے کہا تو اسی وقت

نوتن کو ران کے پاس آ کر بیٹھے ہوئے بولی

”سنو! جمال نے ایک کام کرنے کا کہا، جو فوری ہو جانا چاہئے۔“

”کیسا کام؟“ جہاں نے پوچھا

”دو لڑکوں کو کسی محفوظ مقام پر رکھنا ہے، پھر انہیں جمال کے پاس پہنچانا ہے۔“ نوتن نے تفصیل بتائی

”وہ بندے رکھیں گے کہاں، پنجاب میں ہوتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“ جہاں نے کہا تو بائیتا کو نے کہا

”ہو جائے گا۔ تم پلان کرو، کرنا کیا ہے۔“

”پھر تم ہی کر لو پلان۔“ جہاں نے کہا

”اوکے میں دیکھتی ہوں، تم اپنا کام دیکھو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اس نے اپنے ساتھ نوتن کو بھی اٹھا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی سرخی مغربی افق پر چھائی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں اگرہ شہر کی سڑک گلاب نگر روڈ پر بے تحاشا رش تھا۔ اسی رش میں ایک سیاہ جدید ماڈل کی فورڈ ہیل بھی پھنسی ہوئی تھی۔ اس میں دو سکھ نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں جدید پسٹل پڑے تھے۔ ایک ڈرائیونگ کر رہا تھا اور دوسرا سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے دائیں جانب مہاتما گاندھی لنک روڈ دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے مڑنے کے بعد انہیں آگرہ کے مشہور جی کے ہسپتال جانے لئے ایک چھوٹی سڑک پر مڑنا تھا۔ ان کا رابطہ شمس الدین اور قمر الدین سے ہو چکا تھا۔ درمیان میں صرف پانچ منٹ کا وقفہ تھا۔

شمس الدین اور قمر الدین نے چیک اپ کے ہسپتال آنا تھا۔ ابھی ان کا چیک اپ ہوا نہیں تھا۔ ان کے ساتھ

بھارتی انسانی حقوق کی تنظیم کے دو لوگ تھے، جو اصل میں ”را“ کے ایجنٹ تھے۔ ممکن ہے ان کے ارد گرد بھی لوگ ہوں۔ یہ ساری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے پلان بنایا تھا۔

جیسے ہی ان کا چیک اپ کے لئے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو ان کے ساتھ وہ لوگ نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں دیکھا اور تسلی بخش قرار دے دیا۔ تاہم انہوں نے ایک ڈاکٹر سے درخواست کی شٹ لکھ دیں تاکہ کوئی شک نہ رہے۔ ڈاکٹر نے وہ شٹ لکھ دیا۔ ان دونوں بھائیوں کو پتہ تھا کہ لیبارٹری کس طرف ہے، انہیں وہاں تک جانا تھا۔ ظاہر ہے ان کے ساتھ لوگ بھی تھے۔ اس لیبارٹری سے ذرا فاصلے پر ایک چھوٹا گیٹ تھا جو مہاتما گاندھی لنک روڈ پر کھلتا تھا۔ یہی وہ نزدیک ترین جگہ تھی جہاں سے وہ انتہائی کم وقت میں باہر نکل سکتے تھے۔ اگر انہیں ایک سے دو منٹ مل جاتے تو وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ یہ سب کچھ کمپیوٹر پر طے ہوا تھا۔ ان کے پاس سیل فون نہیں تھے، جن سے وہ باہر کسی سے رابطہ کر سکتے۔ ان کے ساتھ والے اس لئے اتنے محتاط نہیں تھے۔

وہ دونوں بھائی لیبارٹری کے پاس پہنچ گئے تھے۔ بلاشبہ ٹیسٹ کیلئے انہیں ہی اندر جانا تھا، اور اس کے بعد رپورٹ کا انتظار بھی کرنا تھا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ انہوں نے ٹیسٹ کرنے والے شخص کو بتایا ہی نہیں کہ وہ وہاں پر کیوں ہیں۔ اگر کوئی پوچھتا کہ وہ کیوں کھڑے ہیں تو وہ بتا دیتے، قمر الدین باہر دیکھنے لگا۔ ان کے ساتھ آئے دونوں بندے باہر ہی کھڑے تھے۔ کچھ دیر گزری تو وہ ساتھ میں پڑے ہوئے شیخ پر بیٹھ گئے۔ اسی دوران انہوں نے دروازے کی اوٹ سے باہر دیکھا، پھر کارڈور میں آگئے۔ وہاں سے انہیں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلے اور گیٹ تک جا پہنچے۔ سامنے ہی ایک سیاہ فور و ہیل کھڑی تھی۔ انہوں نے نشانی یہ طے کی ہوئی تھی کہ ڈرائیور سائیڈ کے شیشے کے ساتھ سبز رنگ کی دھجی بندھی ہوئی ہوگی۔ وہ کوئی بھی گاڑی ہو اس میں بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں تیزی سے اس فور و ہیل کی جانب بڑھے۔ ان دونوں بھائیوں کی تصویریں، ان سکھ نوجوانوں نے دیکھ لی ہوئیں تھیں۔ انہوں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ان کے بیٹھے ہی فور و ہیل چل دی۔ انہوں نے تو نہیں دیکھا، لیکن ڈرائیور نے یہ دیکھ لیا کہ وہ بندے ہونفوں کی طرح تیزی سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ انہیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ دونوں بھائی بھاگ چکے ہیں۔

”ہمیں شہر سے باہر جانا ہے یا یہیں شہر میں رہنا ہے؟“ شمش الدین نے پوچھا

”دیکھو! ہمیں انہوں نے دیکھا تو نہیں لیکن انہیں پتہ چل گیا ہے کہ تم لوگ فرار ہو چکے ہو۔“ سکھ ڈرائیور نے بتایا تو شمش الدین فوراً بولا

”اب کیا ہوگا؟“

”میرے ذہن میں دو طرح کے پلان تھے، تم دونوں فکر نہ کرو، اب تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھو۔“ ڈرائیور نے کہا اور پوری توجہ سامنے دیکھ کر ڈرائیونگ پر لگا دی۔ وہ مہاتما گاندھی روڈ پر آ گیا تھا۔ اور یہی سڑک انہیں آگرہ شہر سے انتہائی تیزی کے ساتھ شہر سے باہر لے جانے والی تھی۔ لیکن اسی سڑک پر اتنا ہی خطرہ تھا۔ یہاں ان کے پکڑے جانے کے زیادہ امکانات تھے۔ وہ تھوڑا سا آگے جا کر سڑک کے بائیں جانب اتر گیا۔ اگرچہ شہر کی بھل بھلیوں والی گلیوں اور سڑکوں سے نکلنا مشکل اور وقت طلب تھا، مگر محفوظ تھا۔ رات کے پہلے پہر وہ شہر سے باہر نکل چکے تھے۔ انہیں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہرنا تھا، جہاں اپنا گٹ اپ تبدیل کر کے وہ پنجاب کا رخ کر سکتے تھے۔ اگرچہ یہ تقریباً سات گھنٹے کا راستہ تھا تاہم وہ محفوظ جگہ پہنچ جانے والے تھے۔

☆.....☆.....☆

اس وقت میں ناشتہ کر چکا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ حویلی سے نکلوں اور مسافر شاہ کے تھڑے تک جاؤں۔ درویش کی باتیں سنوں، فرید سے گپ شپ کروں اور کھلی فضا میں وقت گزاروں۔ میں باہر نکلنے کے لئے پر تول رہا تھا کہ اردن سنگھ نے فون کر کے میرے بارے میں پوچھا، پھر خود ہی آنے کا کہہ دیا۔ میں لاؤنج ہی بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد وہ بھی میرے سامنے آکر بیٹھتے ہوئے بولا

”آپ نے جورات مجھے نمبر دیا تھا، اس کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ میں نے پوچھا

”تقریباً بارہ بجے تک تو وہ سیالکوٹ سے کچھ فاصلے پر تھا شمال کی جانب، میں اس کے بعد سو گیا تھا۔ اب بیدار ہو کر میں نے دیکھا تو وہ لاہور کے مضافات میں ہے۔“

”گویا کہ وہ وہاں سے لاہور آ گیا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے تم اس کی حرکت پر نگاہ رکھو، اسے بھی دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے ہنستے ہوئے پوچھا

”لاہور نہیں جائیں گے آپ؟“

”مطلب؟ میں لاہور کیوں؟“ میں نے اس سے پوچھا تو وہ بولا

”کل صبح تانی کی فلائٹ ہے، وہ آ رہی ہے یہاں۔ آپ کو نہیں بتایا؟“

”ارے یار جب اس کے چاہنے والا اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے تو ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

”بات تو ٹھیک ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تو مجھے اچانک یاد آیا تو پوچھا

”ارے ہاں سنا، وہ تیرے دوست شمس الدین اور قمر الدین خیریت سے پہنچ گئے کسی محفوظ ٹھکانے پر یا کہ ابھی نہیں؟“

”پہنچ گئے ہیں جالندھر فارم ہاؤس پر۔ سارا انتظام بانٹیا کور نے کیا ہے۔ امید ہے وہ اب یہاں تک پہنچ ہی جائیں گے۔“ اردن سنگھ نے سکون سے کہا

”میرا خیال ہے کہ ابھی انہیں یہاں لانے کی جلدی نہ کی جائے۔ حالات سازگار ہونے کا انتظار کیا جائے۔ جہاں تک کام کا معاملہ وہ لوگ وہاں بیٹھ کر بھی کر سکتے ہیں۔“ میں نے اسے صلاح دی

”میں نے انہیں کہہ دیا ہے، اور میرے ساتھ ہی رابطے میں ہیں۔ انہیں وہاں سب سہولت دے دی جائے گی، جیسے ہی حالات بنے وہ وہاں سے نکل آئیں گے۔“ اردن نے بتایا۔ ہم ابھی باتیں کر رہی رہے تھے کہ رندھاوا کے آ جانے کی اطلاع ملی۔ میں نے اردن سنگھ کو اندر بھیج دیا اور خود باہر اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ملنے ملانے کے بعد بیٹھے ہی اس نے کہا

”جمال! کل تم نے بہت اچھا کیا کہ کسی بحث وغیرہ کے بغیر انہیں ایم این اے کی سیٹ دے دی۔“

”میں یہ نہیں سمجھا کہ تم ان کے ساتھ کیوں آئے تھے اور تمہارا کیا فائدہ ہے اس میں؟“ میں نے اسے ٹوٹتے ہوئے پوچھا

”دیکھو جمال! جہاں تم رہتے ہو، میں رہتا ہوں یہ اپنا علاقہ ہے، ہمارا مقصد سیاست ہرگز نہیں ہے، جب ہم نے سیاست کرنی ہی نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ دشمن پالنے کا فائدہ۔ گھر کا دشمن زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اب تمہارے دشمن نہیں، دوست ہیں۔ اگر وہ تمہارا فائدہ نہ کر سکے تو نقصان بھی نہیں کریں گے۔ تم جو ہو، انہیں یہ احساس

ہی نہیں کہ تمہاری طاقت کیا ہے اور جہاں تک میرے فائدے کی بات ہے۔ میں نے یہ پورا علاقہ چلانا ہے۔ تم جانتے ہو میں یہاں پر ایک انسپکٹر کے طور پر تعینات تھا، آج ڈی ایس پی ہوں۔ میں مانتا ہوں، تمہاری وجہ سے یہ سب ہوا۔ اب مجھے اگر رہنا ہے تو اس علاقے میں امن رہنا چاہئے۔“ اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا ”رندھاوا۔ اگر ہم سیاست کریں ہی نہ، الیکشن ہی نہ لڑیں تو؟“ میں نے پوچھا

”پھر اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہوگی؟ دونوں متحارب گروپ آپ میں لڑتے رہیں گے اور تمہیں دوست بنا کر رکھنا ان کی مجبوری ہوگا۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔“ اس نے جواب دیا

”تو پھر کہہ دینا ان سے کہ اشفاق چوہدری الیکشن نہیں لڑ رہا ہے۔ کسی بھی سیٹ پر نہیں۔“ میں نے کہا تو رندھاوا ہونے سے مسکرا دیا پھر بولا

”میں جانتا تھا کہ تم یہی کرو گے، خیر، میں ضمانت دیتا ہوں کہ اس علاقے میں تیرا کوئی دشمن نہیں ہوگا۔“

”میں کسی کو بھی دشمن نہیں رکھتا، یہاں تک کہ وہ خود میرا دشمن نہ بن جائے۔“ میں نے کہا

”میں نے تو سمجھا تھا کہ تم کوئی اپنی شرائط رکھو گے، لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا ہے۔ میرا خیال ہے اب مزید کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا

”ہاں، ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا اور پھر کافی دیر تک ادھر ادھر کی علاقے بارے باتیں کرنے کے بعد اٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

چندی گڑھ میں شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ وہ گھر میں بڑا اکتا گیا تھا۔ یہی حال رونیت کا تھا۔ وہ اپنی اکتاہٹ کا اظہار کر چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے انہیں نے باہر گھوم پھر کر آنے کا پروگرام بنایا۔ ان کے پاس نئے ماڈل کی کار تھی۔ انہوں نے دوسروں کو بھی آفر کی لیکن کوئی بھی باہر جانے کو نہیں مانا، سو وہ دونوں باہر جانے کے لئے نکل پڑے۔ وہ گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر آئے تو جہاں نے رونیت کو رے سے پوچھا

”بولو، کہاں چلیں؟“

”کہیں بھی کھلی فضا میں، کسی باغ میں چلو، جہاں تھوڑی دیر بیٹھیں۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا

”مجھے تو آئیڈیا نہیں ہے یہاں کسی باغ کا، تم بتاؤ۔“ جہاں نے کہا

”ارے بیٹیں نزدیک ہی تو ہے سیکٹر سولہ میں روز گارڈن، وہیں چلتے ہیں۔“ رونیت کو رے نے کہا اور اسے راستہ سمجھانے لگی۔ تقریباً چندرہ منٹ کے بعد وہ باغ میں پہنچ گئے۔ کار پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ چھل قدمی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد رونیت ہی بولی، ”جہاں! ہم پر جو اکتاہٹ طاری ہوئی ہے، تم اس کی وجہ جانتے ہو؟“

”مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا، اگر تم بتا سکو؟“ اس نے عام سے انداز میں پوچھا تو چند لمحے خاموشی سے چلتی رہی، پھر بڑے گہرے لہجے میں بولی

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اپنے دھرم کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ دھرم ہی کے نام پر ہو رہا، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، کہیں ہم استعمال تو نہیں ہو رہے، ہم ٹشو پیپر کی طرح ہیں۔“

”یہ ٹشو پیپر والی سوچ تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟“ جہاں نے عام سے لہجے میں پوچھا

”دیکھو، ہم اندھیری رات کے مسافر ہیں۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا، اس کا کوئی کریڈٹ نہیں، لینا بھی چاہیں تو نہیں لے سکتے۔ ہم کبھی سامنے نہیں آ سکتے۔ اس راہ میں مر گئے تو کسی کو کوئی پتہ نہیں کہ ہم نے کس کے لئے کچھ کیا۔

اس کا بھی کوئی کریڈٹ نہیں۔“ وہ یوں بولی جیسے اس کی لہجے میں کہیں احتجاج ہو

”مطلب تم اس کا کریڈٹ چاہتی ہو؟“ جہاں نے اس کی بات سن کر سکون سے پوچھا

”اب تم اس پر یہ کہہ دو گے کہ گرو مہاراج تو جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور پھر سکھی میں پایا لہنا سے لے کر جھنڈا والا تک کی مثالیں دو گے کہ انہوں نے پران دے دیئے لیکن سیس نہیں نیوایا۔“ رونیت کو رے پھر اسی احتجاجی لہجے میں بولی

”میں بحث نہیں کروں گا رونیت، میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو؟“ جہاں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا

”میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم اس تحریک سے چاہیں بھی تو فرار نہیں لے سکتے۔ اپنے مار دیں گے یا ہمارے دشمن، کوئی اعتبار کرنے والا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں خالصتان تحریک کی زبردست حامی ہوں، مگر یار اتنی جد جہد کے بعد بھی کوئی آؤٹ پٹ نہیں، کہیں سے تو کوئی ایسا اشارہ ملے گا سیالی کا، ہمیں بھی حوصلہ ہو، میں بھی یہ سمجھ سکوں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہے، غلط نہیں۔ دولت بہت کمالی، کسی بھی ملک میں خوبصورت ولا لے کر باقی زندگی آرام سے گزار سکتی ہوں۔ دراصل میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب میں کینیڈا میں تھی تو کم از کم وہاں پر خوف نہیں تھا۔“

”میں سمجھا نہیں، خوف کیسا؟“ جہاں نے پوچھا

”تم اور میں یہاں ہیں نا، لیکن ہمارے ساتھ ایک اچانا خوف بھی ہے کہ کسی وقت کوئی ہمیں پکڑ سکتا ہے، کہیں سے کوئی گولی ہمیں چھید سکتی ہے، ہماری نگرانی ہو رہی ہوگی، ایسا ہی بہت کچھ۔ لیکن یہ خوف کینیڈا میں نہیں تھا۔ وہاں صرف کام تھا، دن رات کام، لیکن خوف نہیں تھا جو یہاں ہے۔“ رونیت نے صاف لفظوں میں کہا تو جہاں نے پوچھا

”رونیت، تم کینیڈا جانا چاہتی ہو یا اس کام سے بالکل اکتا گئی ہو۔ سکون سے کہیں زندگی گزارنا چاہتی ہو؟“

”میری زندگی میں شاید ہی خالصتان بنے۔ میں نے اپنے حصے کا بہت کام کر لیا۔ مجھے اب آزادی چاہئے، چاہے تم مجھے گولی مار دو۔ یا پھر مجھے اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق دیا جانا چاہئے۔“ اس بار اس کے لہجے میں احتجاج کی جگہ اکتاہٹ تھی۔

”اور اگر میں تمہیں یہ یقین دلا دوں کہ خالصتان کا کام بہت ہی منظم انداز میں شروع ہونے جا رہا ہے تو؟“ جہاں نے نرم لہجے میں کہا

”جہاں میں تم سے زیادہ معلومات رکھتی ہوں۔ اس وقت سکھ دنیا میں تین طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو تلوار کے زور پر خالصتان بنانا چاہتے ہیں، دوسرے وہ جو بات چیت اور دلائل کیساتھ اپنی آواز اٹھانا چاہتے ہیں، اور تیسرے وہ جو اس تحریک کی بہتی لگنا میں ہاتھ دھو رہے ہیں، انہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہے۔ میں اُن لوگوں کا ذکر نہیں کر رہی ہوں جو خالصتان تحریک کے حامی بھی نہیں ہیں۔“

”ناپوس ہو گئی ہو رونیت، کوئی بات نہیں۔ تم جو چاہو، وہی ہوگا۔ اور دوسری بات یہ ذہن میں رکھو کہ ہم کوئی جرائم پیشہ افراد کی گینگ نہیں ہیں جہاں آنے کا راستہ تو ہے لیکن واپس جانے کا نہیں۔ تم جب چاہو، جہاں چاہو، اور جس وقت چاہو جا سکتی ہو۔ کینیڈا جانا چاہتی ہو تو وہاں چلی جاؤ۔ میں تمہارے وہاں جانے کے انتظام کر دوں گا۔“ جہاں نے بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھانے والے انداز میں کہا

”کیا کروں گی وہاں جا کر؟“ اس نے اچانک کہا

”اب یہ ایک نیا موضوع؟ میں تمہاری ذہنی حالت سمجھ رہا ہوں رونیت، میں جانتا ہوں اس وقت تمہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ایسی حالت میں کیا کیا کوئی بھی فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ میں تمہارے بارے میں سمجھ گیا ہوں۔ سب کچھ ذہن سے نکال دو۔ ان لمحات کو پوری طرح انجوائے کرو۔ وہ دیکھو سامنے کتنے گلاب کے پھول کھلے ہیں، ان کے پاس چلتے ہیں۔“ جہاں نے اسے یوں کہا جیسے کسی بچے کو پتہ چلتے ہیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت کیا ہو گئی ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دونوں باغ سے نکل کر ایک شاپنگ سینٹر میں آ گئے۔ وہاں کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے۔ انہوں نے سب کے لئے کپڑے اور دیگر چیزیں خریدیں۔ جہاں کو اس وقت حیرت ہوئی جب رونیت کور نے اعلیٰ شراب کی دو بوتلیں رکھ لیں۔ جہاں نے دیکھا، مگر خاموش رہا۔ وہ پلٹ کر گھر واپس آ گئے۔ جہاں سوچ رہا تھا کہ اب رونیت کور اگر ان کے لئے نقصان دہ نہ بھی ہوئی تو فائدہ مند نہیں ہوگی۔ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ پتہ کرنا بہت ضروری تھا۔

جہاں اپنے کمرے میں تھا کہ باغیا کور اس کے پاس آ گئی۔ اس کا چہرہ کافی حد تک سرخ تھا۔ وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی

”یہ شراب تم نے رونیت کو خرید کر دی ہے؟“

”نہیں اس نے خود خریدی ہے، کیوں کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا تو باغیا کور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی

”میں اسے کھانے کا کہنے لگی تو وہ بیٹھی پی رہی تھی۔ یہ حرکت اس نے پہلی بار کی ہے، کیا ہوا ہے اسے؟“

”یہ تجھے پتہ ہونا چاہیے تھا، اسکے اندر کی تبدیلی کا تمہیں احساس کرنا چاہیے تھا۔“ جہاں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی

”میں گرلین کور سے پوچھتی ہوں، اسے ہوا کیا ہے، اسے شاید پتہ ہو۔“

”ہاں اس سے پوچھو۔“ جہاں نے کہا تو وہ فکر مندی میں ہی اٹھ کر چلی گئی۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہوگا۔ جہاں مختلف لوگوں کو فون کر کے حال احوال پوچھ رہا تھا۔ ایسے میں باغیا کور نے اسے چھت پر بلایا۔ وہ پرسکون سے انداز میں اٹھ کر چھت پر جا پہنچا۔ وہاں دھیمی دھیمی روشنی تھی تو سٹریٹ لائٹ سے آ رہی تھی۔ ٹیرس کے پاس گرلین کور کے ساتھ باغیا کور کھڑی تھیں۔ وہ ان کے پاس چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی باغیا کور نے کہا

”جہاں، ہم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جانے والے ہیں۔“

”زب خیر کرے، ایسی کیا بات ہو گئی۔“ جہاں نے کافی حد تک سکون سے کہا تو وہ بولی

”اپنی رونیت کور کا پرانا عشق جاگ گیا ہے۔“

”اس میں برائی کیا ہے اور اس کا ہماری مصیبت سے کیا تعلق؟“ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اسے سمجھانے والے لہجے میں بولی

”برائی عشق کرنے میں نہیں، لیکن جس سے وہ عشق کر رہی ہے، وہ مصیبت ہے۔“

”مجھے صاف بتاؤ، بات کیا ہے۔“ اس نے پوچھا تو گرلین کور نے ایک طویل سانس لیا پھر بولی

”رونیت کور کے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا تھا، امیت سنگھ۔ اچھا تھا جیسے عام سے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ پروفیسر کے ساتھ رہا، پھر چھوڑ گیا۔ انہی دونوں رونیت اور امیت کا عشق زوروں پر تھا۔ امیت کے چلے جانے کے

بعد تھوڑا عرصہ رونیت نے اسے یاد رکھا۔ پھر یہ در پہ مصیبتیں پڑنے لگیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کا دوبارہ امیت سے رابطہ ہوا۔ چند دن پہلے پتہ چلا کہ وہ ایک آری آفیسر ہے۔“

”اوہ! تو اس کا آری آفیسر ہونا ہی سب سے غلط بات ہے۔ رونیت تو ہمارے بارے میں سب جانتی ہے۔ اگر انہیں جھٹک بھی مل گئی تو ہمارا سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔“ جہاں نے تشویش سے کہا

”جہاں، یہ بھی ممکن ہے کہ امیت ”را“ کا ایجنٹ ہو اور اُسے رونیت کے پیچھے لگایا گیا ہو۔ کیونکہ امیت یہ جانتا ہے کہ رونیت کیا چیز ہے۔ ایسے ہی کسی شک کی بنا پر وہ اسے ٹول لینا چاہتا ہو؟“ باغیا نے کہا

”یہ تو بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ رونیت تو سب کچھ جانتی ہے۔ اسے منع نہیں کر سکتے، امیت کو ختم کرتے ہیں تو بھی معاملہ خراب ہو جائے گا۔ اس کیا حل کا ہوگا؟“ جہاں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ پھر گرلین کور کی طرف دیکھ کر بولا، ”کیا تمہیں شک ہے کہ امیت کوئی ایسا دیا بندہ ہو سکتا ہے؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ تو اس کے بارے جانکاری حاصل کی جائے تو پتہ چلے۔“

”اس کے بارے میں تم سے بات تو کرتی ہوگی؟“ جہاں نے پوچھا

”نہیں، چند دن پہلے مجھے تھوڑا بہت بتایا تھا، وہی جو میں نے تم سب کو بتا دیا، اس کے علاوہ نہ اس نے بات کی اور نہ ہی میں پوچھا۔“ گرلین نے جواب دیا

”دیکھو۔ رونیت ہماری بہترین ساتھی ہے، ہم اسے ضائع نہیں کر سکتے اور نہ ہی اتنے ظالم ہیں کہ اسے ختم کرنے کا سوچیں۔ اس مسئلے کو بہت سکون سے حل کرنا ہوگا۔ اب کہاں ہے وہ؟“

”وہ آدھی سے زیادہ بوتل پی کر بالکل بے ہوش پڑی ہے۔ اس پتہ ہی نہیں وہ کہاں ہے۔“ گرلین نے بتایا تو جہاں نے سمجھایا

”دیکھو، ہماری بقا اسی میں ہے کہ وہ اب امیت سے رابطہ نہ کرے۔ اسے صبح ہوش میں آنے دو، میں اس سے بات کروں گا، تب تک فون، کمپیوٹر یا کوئی بھی رابطہ کرنے والی شے اس کے پاس نہ ہو، گرلین تم نے اس کا خاص خیال رکھنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں اس کے پاس ہی ہوں۔“ اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر اسی موضوع پر وہ باتیں کرتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کی تازہ کرنیں لاہور پر پھیل گئی ہوئیں تھیں۔ روشن لاہور میں زندگی رواں دواں تھی۔ ایسے میں لاہور ایئر پورٹ پر کافی گہما گہمی تھی۔ چوہدری اشفاق نے بھی سیاہ فودیل ایئر پورٹ کے سامنے لگا دی۔ اس کے ساتھ جنید تھا۔ چوہدری اشفاق رات ہی لاہور پہنچ گیا تھا۔ اب وہ دونوں تانی کو لینے وہاں پر تھے۔ فلائیٹ آچکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایئر پورٹ کے مراحل کے بعد باہر نکلنے والی تھی۔ وہ مسافروں کے باہر آنے والے راستے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ تانی باہر آ گئی۔ اس نے اپنا وہی مخصوص عبا یہ پہنا ہوا تھا۔ وہ جنید سے ملی، پھر چوہدری اشفاق سے ملتے ہوئے ذرا سا جھجکی، جنید اس سے باتیں کرنے لگا، جبکہ چوہدری اشفاق نے اس کا مختصر سا سامان لیا اور وہ ایئر پورٹ سے باہر آ گئے۔ پھر اگلے چند منٹ میں وہ چل دیئے۔

ایئر پورٹ کی حدود سے باہر آ کر وہ بائی پاس پر تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اگرچہ فون پر روزانہ ہی رابطہ رہتا تھا لیکن تانی پھر بھی نورنگر میں موجود ہر ایک کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور چوہدری اشفاق بتاتا چلا جا رہا

تھا۔ انہیں لاہور میں رکنا نہیں تھا، سیدھے نورنگری آنا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ لاہور کے مضافات میں آ گئے۔ ایسے میں اچانک ان کے ساتھ ایک فورڈ ہیل جیب چڑھی، اور آگے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسری جیب ان کے برابر چڑھ گئی۔ جنید ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا۔ اسے اپنے گرد خطرے کا احساس ہو گیا۔ تانی اور چوہدری اشفاق بھی تازہ گئے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ تبھی تانی نے پوچھا

”جنید! کوئی ہتھیار ہے۔“

”تمہاری سیٹ کے نیچے ہسٹل اور میگزین پڑے ہیں، چوہدری اشفاق کو بھی دے دو۔“

”میرے پاس ہے۔“ اس نے جواب دیا پھر باہر کی جانب دیکھتا ہوا بولا، ”کون ہو سکتے ہیں؟“

”کوئی بھی ہوں، اگر ہمیں کچھ کہا تو معاف نہیں کرنا۔“ جنید نے کہا اور توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ اس کے پیچھے بھی ویسی ہی ایک سیاہ فورڈ ہیل جیب آگئی تو صورت حال خاصی خطرناک ہو گئی تھی۔ انہیں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان تین گاڑیوں میں لوگ کتنے ہو سکتے ہیں۔ تانی نے ہسٹل اپنے ہاتھ میں کر لیا اور میگزین سنبھال لئے۔ ایسے ہی وقت میں جنید کا فون مجھے ملا۔ اس نے صورت حال بتائی تو میں نے اس سے کہا

”فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ مجھے احساس تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ تم نے ان سے الجھنا نہیں۔“

”یہ کیسے ہوگا، ان کی ایک گاڑی میرے آگے ہے، ایک پیچھے اور ایک بالکل برابر چڑھی ہوئی ہے۔“ جنید نے مزید وضاحت کی

”پھر تم ایسے کرو، راستے میں ڈھابے ہوٹل، یا فلنگ اسٹیشن، جو بھی اس پر رک جاؤ، ایک دم سے نکلوان کے درمیان سے۔“ میں نے اسے سمجھایا

”میں سمجھ گیا۔“ اس نے کہا

اس نے فون آن ہی رکھا لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک اس نے کٹ مارا اور ایک ڈھابے ہوٹل کی جانب مڑ گیا۔ پچھلی جیب کے تازہ چڑھنے والے، اگلی کافی آگے نکل گئی، برابر والی ایک دم سے ڈول گئی۔ ڈھابے ہوٹل پر رکتے ہی جنید نے اپنا ہسٹل نکال لیا، تانی نے بھی سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ وہ تینوں الٹ ہو گئے۔

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ تینوں فورڈ ہیل ان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ اب ایک طرح سے اعصاب کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ کون کیا کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے وہ رکے ہوئے تھے۔ تین سے چار منٹ تک وہ پونہی آمنے سامنے ڈٹے رہے۔ تبھی ان تینوں فورڈ ہیل سے دو دو بندے نکلے۔ ان سب نے جین اور شرٹ پہنی ہوئیں تھیں۔ سبھی پچیس سے تیس برس کے درمیان کے تھے۔ وہ شکل ہی سے جرائم پیشہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر پھیل گئے اور ان کی طرف بڑھے۔ ان میں نے دو بالکل سامنے آ گئے۔ وہ جنید کی فورڈ ہیل سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے جنید کو ہسٹل کی ٹال کے اشارے سے نیچے اترنے کو کہا۔ یہ بات مجھے جنید نے بتا دی۔

”اترنا نہیں، وہ تمہارے قریب آئے گا۔“ میں نے اسے سمجھایا

وہ چھ لوگ تھے اور آہستہ آہستہ گھیرا رنگ کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایک بندہ مزید اتر آیا۔ بلاشبہ وہ تینوں ان کے کور پر تھے۔ انہی لمحات میں اچانک ہی وہاں پر ایسی ہی چھ فورڈ ہیل ایک دم سے آن رکیں۔ جیسے ان گاڑیوں کے بریک لگے، ان میں سے کئی لوگ مختلف ہتھیار لے کر باہر نکلتے چلے۔ یہ ان لوگوں کے لئے

اچانک افتاد تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھتے، انہوں نے لمحوں میں ان سب کو گھیر لیا۔ انہی میں سے ایک نے ان سے کہا

”اوائے، تم جو کوئی بھی ہو، اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر زمین پر لیٹ جاؤ۔“

”کون ہو تم لوگ اور یوں.....“ ان میں سے ایک نے کہا چاہا تو کہنے والے نے ہسٹل سیدھا کیا اور فائر اس کے گھٹنے پر دے مارا۔ دلدوز چیخ کی آواز فضا میں بکھری تو اس کے ساتھ ہی باقیوں نے بھی یہی کیا۔ وہ لوگ جنہوں نے جنید کو گھیرا ہوا تھا سبھی فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا وہ مارنا نہیں چاہتے لیکن اگر انکی بات نہ مانی گئی تو یہ مارنے سے دریغ بھی نہیں کریں گے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ ان تک جا پہنچے۔ تین سے چار منٹ انہیں باندھنے میں لگے۔ وہ سارے باندھ لئے گئے تو جنید گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اترتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا

”کون لوگ ہیں یہ اور.....“

”ان میں سے دو طارق نذیر کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ ہیں اور باقی اپنے قبیلے کے لوگ ہیں۔ اب پتہ کرو، حملہ آور کون ہیں۔“

”کرتا ہوں پتہ؟“ یہ کہتا ہوا وہ اس تک جا پہنچا، جس نے جنید کو گاڑی سے اترنے کے لئے ہسٹل کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا اور اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر غصے میں پوچھا

”کون ہو تم لوگ، اور کس بے غیرت نے بھیجا ہے؟“

”ہمیں شک پڑا تھا کہ تم لوگ کوئی غیر قانونی کام کر رہے ہو، اس لئے بس چیک کرنا تھا۔“ اس نے کہا

”کیا تم پولیس والے ہو؟“ جنید نے پوچھا

”میرا تعلق خفیہ سے ہے۔“ اس نے اعتماد سے کہا

”اور یہ جو تمہارے مامے آئے ہیں، یہ خفیہ والے ہیں، جلدی بکو، ورنہ تیری لاش بھی بولے گی۔“ جنید نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا تھا۔ تو کئی ساری ٹھوکریں اسے پڑ گئیں۔ طارق نذیر کے اہلکار نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر مار کر کہا

”اگلے چند سیکنڈ میں نہیں بولانا تو تیری گاڑی کے پیچھے باندھ کر واپس لاہور لے جاؤں گا۔“

”مم..... ملک حیات..... ملک حیات نے..... بھیجا ہے ہمیں۔ انہیں ان تک لے جانا تھا۔“ وہ تیزی سے بولا

”ملک حیات، ٹرانسپورٹر؟“ اہلکار نے پوچھا

”جی ویسی۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا

”اوکے۔“ اس نے کہا اور طارق نذیر کو رپورٹ کرنے لگا۔ پھر جنید سے بولا

”کچھ لوگ آپ کے ساتھ جائیں گے نورنگری تک، باقیوں کے ساتھ مجھے واپس لاہور جانا ہوگا، ان میں کافی زخمی ہیں، انہیں یہیں ہسپتال میں.....“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر جنید واپس اپنی گاڑی میں چلا گیا۔ اس نے سٹارٹ کھڑی گاری کو گھیر لگایا اور چل دیا۔

اس کے ساتھ دو گاڑیاں چل پڑیں۔ کافی آگے آ کر اس نے مجھ سے کہا

”تانی سے بات کرو وہ بات کرنا چاہتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون تانی کو دے دیا۔

”کیا مسئلہ تھا یہ؟“ اس نے پوچھا

”وہی لندن والے معاملے کی ایکسٹینشن ہے۔“ میں نے کہا

”کیسے، یہ تھا کیا؟“ اس نے پوچھا

”مجھے ایویں شک تھا۔ کیونکہ اس نے چوبیس گھنٹوں کی ورائنگ دی تھی۔ ان چوبیس گھنٹوں میں صرف تم نے آنا تھا۔ اس دوران یہ بھی کل سے یہاں لاہور میں تھا۔“

”تمہیں اس کی مودنگ کے بارے میں پتہ ہے۔“ اس نے تیزی سے پوچھا

”ہاں، پتہ ہے۔ اب تصدیق ہوگئی ہے۔ خیر یہاں آؤ گی تو تمہیں مزید پتہ چل جائے گا۔“

”اوکے، وہیں بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون جنید کو واپس کر دیا۔ میں نے جنید کو سمجھا کر اس سے رابطہ ختم کیا ہی تھا کہ اسی اجنبی کا فون آگیا۔

”مان گئے، ایویں ہی تمہارا نام ایوانوں اور جرم کی دنیا نہیں گونج رہا ہے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا

”اب جان گئے تو دوبارہ میرے بارے میں سوچنا بھی مت، ورنہ تمہاری سوچیں ہی تمہیں مار دیں گیں۔“ میں نے سکون سے کہا

”نہیں، میں نے تجھے نہیں چھوڑا، تجھے تو ختم کرنا ہے، یہی میرا ناسک،، بہت عرصے بعد کوئی ایسا دشمن ملا ہے، جس سے لڑنے کا مزہ آئے گا۔ اب تک تو میں صرف تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم کیا کچھ کر سکتے ہو۔“

”جب میری سمجھ آجائے تو بتا دینا۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ اب مجھے اس وقت تک الرٹ رہنا تھا، جب تک وہ تینوں نور مگر تک نہ پہنچ جاتے۔

☆.....☆.....☆

جسپال کی ساری رات آنکھ نہیں لگی تھی۔ کچھ دیر پہلے جب نوتن اسے بلانے آئی تو وہ اوٹھ رہا تھا۔ ان تینوں نے ناشتہ کر لیا تھا۔ جبکہ رونیت ابھی تک سو رہی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے جسپال کی آنکھ کھلی تب تک رونیت بھی جاگ گئی تھی۔ ان دونوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ نوتن برتن سمیٹ گئی تو جسپال نے اس کی جڑی اجڑی حالت کو دیکھا اور کہا

”رونیت ایک بات کہوں۔“

”بولو۔“ اس نے سر جھکائے ہنکارے کے سے انداز میں کہا تو وہ بولا

”تم ایسا کرو، نہا کر خوب فریش ہو جاؤ۔ جو کل تم نے ڈریس خریدی تھی، وہ پہنو، پھر میں تمہیں بتاتا ہوں۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“ اس نے پوچھا

”ہاں بہت ضروری۔“ اس نے کہا تو وہ مزید کوئی بات کہنے بغیر اٹھ گئی۔

اس وقت جسپال اپنے کمرے میں تھا جب وہ تیار ہو کر اس کے پاس آگئی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ جسپال بھی تیار تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ راک گارڈن جا پہنچے۔ دن کے وقت اتنے زیادہ لوگ نہیں تھے۔ بہت کم خال خال لوگ تھے جو پھر رہے تھے یا پھر جوڑے پرسکون گوشوں میں راز و نیاز میں مشغول تھے۔ کچھ دیر سیر کے بعد رونیت نے کہا

”جسپال! آؤ بیٹھیں، تم نے جو مجھ سے بات کرنی ہے وہ کہو۔“

یہ کہہ کر وہ پتھروں سے بنی ایک کونٹھری کے والاں میں ستون کے ساتھ بیٹھ گئی۔ جسپال بھی اس کے قریب بیٹھ گیا پھر چند لمحے بعد پوچھا

”تمہیں پتہ ہے کہ میں تمہیں اس مقصد کے لئے یہاں لیکر آیا ہوں۔“

”میں نے کل شراب بھی اسی لئے خریدی اور پھر پنی بھی کہ تم لوگ مجھ سے بات تو کرو، میں تم لوگوں کو احساس تو

دلاؤں کہ ہم کہاں بھاگے جا رہے ہیں، ایک چھت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے احساس سے عاری ہیں۔“ وہ درد مند لہجے میں بولی

”رونیت، تم کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتی ہو، تم مجھے اپنا بہترین دوست پاؤ گی۔“ جسپال نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا

”مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔“ اس نے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا

”کہاں؟“ جسپال نے پوچھا

”کہیں بھی، جہاں کوئی مجھے تلاش نہ کر سکے، اور یہی بات میں نے کل تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی، تم نہیں سمجھے، پھر میرے ذہن میں یہی بات آئی میں کچھ ایسا کروں جس سے کم از کم تم لوگ مجھے توجہ دو، میں شراب لی اور.....“

”ایسا کیا ہو گیا ہے رونیت؟“ اس نے پوچھا

”یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اُمیت کو ریسپانس کیا۔ تم شاید اُمیت کو نہیں جانتے ہو۔ وہ میرا کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ میرا بہترین دوست بھی تھا۔ میں اس سے محبت کرنے لگی۔ ہمارے درمیان شادی کے وعدے بھی ہوئے لیکن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا میں ایک کرب کے دور سے گزری۔ ایک عرصے بعد جب میں یہاں آئی ہوں تو مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔“

”یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ جسپال نے پوچھا

”میں نے ایک دو لوگوں سے رابطے کئے، جو یہاں میرے دوست ہیں۔ ان سے پتہ چلا۔ اور میں اُمیت سے ملی۔“ رونیت نے بڑے اعتماد سے کہا

”تو پھر؟“ اس نے سکون سے پوچھا، جبکہ اس کے اندر بہت سارے سوال ابل پڑے تھے۔

”اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ فوج میں چلا گیا ہے۔ خصوصی اسکاؤڈ میں ہے۔ وہ ایک شاندار زندگی گزار رہا ہے۔ اور مجھے وہ اب بھی چاہتا ہے۔ اسی لئے اب تک اس نے شادی نہیں کی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سسک پڑی،

پھر خود پر قابو پا کر بولی، ”میں اس سے دو بار مل چکی، وہ مجھے اپنا نا چاہتا ہے۔“

”پھر تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“ جسپال نے نخل سے پوچھا

”تم بتاؤ۔ جسپال کیا میں اس سے شادی کر سکتی ہوں؟“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا

”میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا، یہ تو تمہارا اور اس کا فیصلہ ہے، جو سے میں ابھی تک ملا نہیں اسے دیکھا تک نہیں، میں اس کے بارے میں اپنی رائے کیا دے سکتا ہوں۔“ جسپال نے کہا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولی

”ذرا سوچ کے بتاؤ۔“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ اس کے سیل فون پر ایک پیغام آگیا۔ اس نے پڑھا تو ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ وہ بے چین ہوتا ہوا بولا

”ٹھیک ہے سوچتے ہیں۔ آؤ، پہلے تھوڑا کچھ کھا پی لیں۔“ جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گئی وہ دونوں چلنے لگے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک ہٹ سی بنی ہوئی تھی، جسپال اور رونیت وہاں جہاں پہنچے۔

”کیا پسند کرو گے؟“ رونیت نے پوچھا

”جو تمہارا دل چاہے۔“ جسپال نے کہا اور چھل قدمی کے سے انداز میں ذرا فاصلے پر جا کر بائیکاٹ کو فون ملانے

”ہاں بولو جیال۔“

”ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یہاں سے سب کو لے کر نکل جاؤ۔ خاص طور پر لپ ٹاپ اور اس سے متعلق کوئی شے بھی نہیں چھوڑنا۔ رونیت کا فون کہاں ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا

”اسی کے پاس ہے؟“ بانیتا نے کہا

”فوراً نکلو۔“ جیال نے کہا

”اوکے۔“ اس نے کوئی تفصیل پوچھے بنا کہا اور فون بند کر دیا۔ رونیت کو تب تک آچکی تھی۔

”کچھ سوچ تم نے جیال؟“ وہ اسے کولڈ ڈنک دیتے ہوئے بولی

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“

”آنا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میرے ذہن میں بھی اب تک کچھ نہیں آیا ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو جیال نے اس سے دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی

”رونیت۔! تم انجانے میں ایک زہریلے ناگ کو اپنے ہاتھ میں لے بیٹھی ہو۔ وہ تم سے کبھی بھی شادی نہیں کرے گا، بلکہ وہ تمہیں اپنا سوسر بنا کر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کے خلاف جانے والا ہے۔ وہ ”را“ کا ایجنٹ ہے۔“ جیال نے ایک ایک لفظ جبا کر کہا

”مجھے بھی پتہ ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ بچے نہیں ہیں ابھی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی

”کیا؟“ اس نے چونکتے ہوئے کہا

”ہاں، مجھے پتہ چل گیا تھا۔ دکھ اس بات کا ہوا کہ میرا ہی محبوب مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے میں یہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں۔ دور ایسی جگہ جہاں مجھے کوئی بھی تلاش نہ کر سکے۔“

”تم جذباتی طور پر اس قدر کمزور ہو سکتی ہو، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تمہیں پتہ ہے وہ کتنا نقصان کر سکتے ہیں ہمارا۔ ہم سب کو مار سکتے ہیں۔ وہ بھی سسکا سسکا کر، تم جانتی ہو کہ تم نے کیا کیا؟“

”تم نہیں سمجھ سکو گے جیال۔“ اس نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا

”اب اور کیا سمجھنا ہے رونیت؟“ وہ تلخ لہجے میں بولا

”چلو چلیں۔“ اس نے ایک دم سے کہا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے مشروب کی آدھی سے زیادہ بوتل ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

انہیں لمحوں میں جیال نے فیصلہ کر لیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ جس وقت وہ پارکنگ سے نکل رہے تھے۔ تب اچانک رونیت کو رنے کہا

”جیال، گاڑی روکو، اور میرا انتظار کرو، اگر مرگئی تو میری لاش اٹھانے کی کوشش بھی نہ کرنا اور اگر نکل سکی تو یہیں ملتے ہیں۔“ رونیت نے کہا اور سنی ان سنی کرتے ہوئے فوراً نیچے اتر گئی۔ جیال چاہتا تو اسی وقت اسے گولی مار سکتا تھا۔ لیکن اس کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ اپنی ایک ساتھی کو یونہی مار دے۔ عقل اسے کہہ رہی تھی کہ مار دے، ختم کر دے۔ لیکن دل کہہ رہا تھا کہ نہیں ابھی نہیں، مزید دیکھ لے۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ رونیت تیزی سے چلتی چلی جا رہی ہے۔ وہ سو میٹر سے بھی زیادہ سفر کر گئی۔ تبھی اس نے ایک نوجوان کے کاہٹے پر جا کر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نوجوان نے چونک کر

اسے دیکھا اور پھر اُسے گلے لگا لیا۔ وہ دونوں ذرا سی دیرو ہیں کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک شیخ پر آن بیٹھے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب جیال نے اپنے فیصلے پر عمل کرنے کا سوچ لیا۔ وہ آگے بڑھا اور ایسی جگہ تاکنے لگا، جہاں سے وہ ان دونوں کے سر کا نشانہ لے سکے۔ وہ انہیں باتیں کرنے کا کم سے کم وقت دے سکے۔

اس وقت جیال نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس سے بھاگنے کا راستہ منتخب کیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کتنے وقت میں اپنی گاڑی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے بسٹل نکالا ہی تھا کہ سامنے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رونیت نے اپنا بسٹل نکال کے اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ رونیت نے ادھر ادھر دیکھا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ انہیں لمحات میں دو بندے رونیت کی طرف لپکے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُمت کے ساتھ تھے۔ جیال نے ان کا نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے فائر کر دیا۔ رونیت گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔ جیال بھی سرعت کے ساتھ وہاں تک پہنچا۔ اگلے دو منٹ میں وہ وہاں سے بھاگ چکے تھے۔ رونیت نے اپنا سیل فون وہیں پھینک دیا تھا۔

جیال نے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی کوئی بات کرنے کا وقت تھا۔ وہ وہاں سے کافی آگے نکل آئے تو ایک جگہ گاڑی کھڑی کی اور پیدل چل پڑے۔ ذرا سا آگے جا کر انہوں نے آٹو رکشہ لیا اور اسے اسٹیشن کی طرف جانے کا کہہ دیا۔ اسٹیشن کے قریب جا کر وہ رکشے سے اتر گئے۔ وہاں پہنچ کر جیال نے بانیتا کو فون کیا۔

”کہاں ہو؟“

”پتہ نہیں یہ کون سی جگہ ہے، ہم کار میں ہیں اور بس چلتے چلے جا رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا

”وہاں سے.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی

”پتہ نہیں وہاں کیا ہوا ہوگا، ہم تو نکل آئے ہیں۔“

”اوکے ملتے ہیں۔“ جیال نے کہا اور جگتا رکھ کوفون ملانے لگا۔ جیال اپنے ساتھیوں کے بارے میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ صرف ایک رونیت کو رنے کے رویے نے پورے میٹ ورک کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب تانی، جنید اور چوہدری اشفاق نور مگر پہنچ گئے۔ جیسے ہی وہ لوگ نور مگر کے علاقے میں پہنچے، ان کے ساتھ سیکورٹی کے طور پر آنے والے لوگ وہیں سے واپس پلٹ گئے۔ انہیں بہت کہا گیا کہ وہ نور مگر تک آئیں لیکن انہوں نے آنے انکار کر دیا کہ ہمیں حکم ہی یہی ہے۔ تانی کے آنے سے یوں لگا جیسے حویلی میں رونق آگئی ہے۔ وہ جتنے بھی اس کے شاگرد تھے، سبھی وہاں موجود تھے۔ ان میں بیشتر لڑکیاں تھیں۔ میں ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اماں نے ان سب کو کھانے تک وہیں روکے رکھا۔ اور جب شام ڈھلی تو وہ تب گئے۔

رات کے کھانے پر سب اکٹھے تھے۔ میں سب کو کھانے کی میز پر دیکھ رہا تھا تو میرے جذبات بڑے عجیب سے ہو رہے تھے۔ ایک وقت تھا، جب میں اور میری ماں تھے۔ ہمیں نور پور سے آگے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایک غریب ماں کے بیٹے کو اس کی وہی حیثیت دی جاتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری نشانہ بازی کی شہرت کے ساتھ لوگ مجھے پوچھنے لگے تھے۔ سوال یہ ہے کہ تم میں نہیں میری نشانہ بازی کی اہمیت تھی۔ آج یہ بھرا ہوا میز، جس پر اتنے لوگ تھے۔ بلاشبہ یہ سب لوگ مجھ پر جان دار دینے والے تھے، یہ سب کیسے ہوا؟

”ارے بھائی کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“ اردو سنگھ میرے قریب بیٹھے ہوئے بولا

”کہیں نہیں، بس یونہی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

”میں سمجھا شاید آپ بھی عشق نادان کی کرشمہ سازی پر سوچ بچار کر رہے ہیں۔“

”اوائے ارونڈ! لگتا ہے تو یہاں نورنگر آکر کچھ زیادہ ہی شرارتی ہو گیا ہے۔ اصل بات بول کیا کہہ رہا ہے۔“ جنید نے خوشگوار لہجے میں کہا تو اس نے رونیت کی ساری بات بتادی۔ اگرچہ اس نے یہ سب مذاق میں کہا تھا لیکن میں چونک گیا۔ اتنا بڑا نیٹ ورک رونیت کور کے پاگل پن کی بھینٹ چڑھنے والا تھا۔ اب اسے سنجیدگی سے دیکھنا اور اسے سنبھالنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

”اب کہاں ہیں وہ؟“ میں نے پوچھا

”چندی گڑھ ہی میں کہیں ہیں۔ ابھی ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ انہوں نے اپنے فون بھی ضائع کر دیئے ہیں۔“ ارونڈ نے اس بار سنجیدگی سے بتایا۔

”یار، اس کا کوئی حل کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا

”کرنا تو پڑے گا۔ اور وہ دونوں فمش الدین اور قمر الدین بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی یہاں لانا ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ وہ قانونی طور پر کہیں جائیں گے تو یہ ناممکن ہے۔“ اس نے اپنا خوف کہہ دیا۔ تبھی اماں نے کہا ”اس وقت صرف کھانا کھاؤ، بعد میں باتیں کرتے رہنا، رزق تم لوگوں کے سامنے ہے۔“

باتیں وہیں ٹھپ ہو گئیں اور ہم سب کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد سبھی لاؤنج میں آ بیٹھے۔ مہوش اماں کے قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی

”اماں جی! شادی آپ جب بھی رکھیں۔ ڈھولک آج ہی سے بجے گی۔ ڈھولک کا انتظام کیا جائے۔“

”یہ نہ ہو کہ اماں تجھے ہی بجانا شروع کر دیں، تمہاری تو سادہ آواز ہی ڈھول کی طرح لگتی ہے، روتے ہوئے تو مزید بری لگے گی۔“ فہیم نے ہنستے ہوئے کہا تو ایک دم سے قہقہہ لگ گیا، تب اماں نے فہیم کو گھورتے ہوئے نرمی سے کہا ”نہ پتہ! یہ بھی میری بیٹی ہے۔ ایسا نہیں کہتے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ ہمیں اپنا بیٹا نہیں مانتی۔“ فہیم نے مصنوعی بے چارگی سے کہا

”اب تیرے ایک دو لگ گئی نا تو پھر خود ہی کہہ گا کہ ہاں اماں میں تیرا بیٹا ہی ہوں۔“ اماں نے کہا تو مہوش تیزی سے بولی

”اماں! خدا کی قسم اس کے دو تین لگا دے، بہت ستاتا ہے۔“

”مجھے پتہ ہے تم دونوں کا ہی بندوبست کرنا پڑے گا۔“ اماں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تو ارونڈ ایک دم سے بول اٹھا

”یہ کی ہے نا اماں جی حق کی بات، میں تو کہتا ہوں، تانی کے ساتھ اس کا گھونٹ بھریں۔“

”لگتا تو ایسے ہی ہے۔“ اماں نے کہا تو فہیم جلدی سے مہوش کی طرف دیکھ کر بولا

”اب بجا ڈھولک۔“

اس پر مہوش شرما کر رہ گئی۔ ایک لفظ بھی نہیں بولی تو میں نے ماحول بدلنے کے لئے کہا

”اماں جو کرنا ہے، وہ بتاؤ۔ میں تو کہتا ہوں کل ہی یہ سب ہو جائے۔“

”نا، ایسے نہیں۔ مجھے سکون سے ان کی شادیاں کرنے دو۔“

”جیسے اور جب کرنا ہے وہ تو بتا دو؟“ میں نے پوچھا

میں دو دن بعد بتاؤں گی۔“ اماں نے کہا اور اٹھ گئی۔ ہم کافی دیر تک بیٹھے یونہی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران

سوئی ہمارے لئے دو بار چائے بنا کر لے آئی تھی۔

اس رات کا دوسرا پہر ختم ہو گیا تھا۔ میں، جنید، ارونڈ اور فہیم ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے فمش اور قمر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ کافی دیر بحث کے بعد یہی نتیجہ نکلا کہ انہیں سرحد ہی پار کرنا پڑے گی۔ ورنہ وہ جس طرح بھی نکلے پھڑے جانے کا زیادہ امکان ہے۔

”تو پھر کہاں سے لائیں؟“ میں نے کہا

”ہم یہاں بیٹھے جتنا مرضی سوچ لیں، کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں سرحد پار لوگوں پر ہی انحصار کرنا پڑے گا۔“ جنید نے بہت سوچنے کے بعد ایک دم سے کہا

”یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔“ ارونڈ نے کہا

”مان لیا کہ ہم تم پر چھوڑ دیں تو پھر کر گے کیا؟“ جنید نے پوچھا

”یار یہ جو جہاں نے نیٹ ورک بنا لیا ہے، یہ کام دے گا۔ انہیں دن تو لگ جائیں گے یہاں آتے ہوئے لیکن وہ پہنچ جائیں گے، فکر نہ کریں۔“

اس نے تسلی دی تو سبھی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں سونے کے چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

چندی گڑھ کے سیکڑاٹھائیس میں ایک بڑا بنگلہ خالی تھا۔ جگتا سنگھ نے اپنے کاموں کے لئے ایسے کئی ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ اس وقت جہاں سنگھ ایک ہال میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ نوٹن کور، باغیا کور، رونیت کور، سندپ کور اور گرلین کور بیٹھی ہوئیں تھیں۔ رونیت کور پوری تفصیل سے انہیں اپنی روداد سنا چکی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اُمیت سنگھ اسی کی پہلی محبت تھا۔ لیکن جب وہ دوبارہ ملا اور اس نے کئی پیغامات چھوڑے تو اسے تجسس ہوا کہ وہ کیوں اس سے ملنا چاہتا ہے۔ فون کالز، کمپیوٹر چیٹ اور دونوں ملاقاتوں میں اس کا یہی رویہ تھا کہ ان دنوں وہ کیا کر رہی ہے۔ اسے جب یقین ہو گیا کہ وہ اس کی کھوج میں ہے تو رونیت نے اسے قتل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ سب کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن پھر یہاں رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ نگاہوں میں آ چکی ہے اس لئے دوستوں سے الگ ہو جانا ہی اس کے دوستوں کی سلامتی ہے۔

روز گارڈن میں بھی وہ اُمیت ہی سے ملنے گئی تھی جو اسے نہیں ملا۔ اس دن وہ اسے اس کے قتل کے ہی ارادے سے گئی تھی۔ وہ کینیڈا چلے جانا چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ جہاں کو ڈھنی طور پر تیار کر رہی تھی کہ وہ اسے جس طرح بھی چاہئے کینیڈا بھیج دے۔ اچانک حالات بدل گئے اور راک گارڈن میں اُمیت کو قتل کرنا پڑا۔ جہاں کا یہ شک غلط نکلا کہ وہ ان کے ٹھکانے تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ رونیت کوئی پاگل یا لاابالی لڑکی نہیں تھی کہ اپنے بارے میں بتا دیتی۔ مگر کہا کچھ بھی نہیں جاسکتا تھا۔ چونکہ وہ اس کی کھوج میں تھے، ممکن ہے وہ ان کی لاعلمی میں ان کے ٹھکانے تک پہنچ جاتے۔ اگرچہ ایسا کچھ نہ ہوا لیکن یہ واقعہ جو بھی تھا اور جیسے بھی پیش آیا، وہ اپنے ساتھ کئی سوال چھوڑ گیا تھا۔

جہاں سنگھ ساری رات سوچتا رہا۔ اس وقت وہ ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ پورے پنجاب میں اس کا نیٹ ورک تھا۔ اس کے تحت انہوں نے کاروائیاں بھی کر لیں تھیں۔ جس کے رد عمل کے طور پر ”را“ میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اتنا بڑا نیٹ ورک، جسے بنانے میں برسوں لگے تھے، ایک ہی دن میں ختم ہو کر رہ جاتا۔ جہاں نے سوچ کر لیا تھا کہ وہ رونیت کور کو اب کینیڈا بھجوا دے گا، وہ کیسے جا پائے گی، یہ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ بھارت میں محدود ہو گئی تھی۔

وہ اپنی سوچ سے چونکا اس وقت جب دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی رویت کور اندر آگئی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا ٹرے تھا، جس میں چائے کے دھگ رکھے ہوئے تھے اور دائیں بغل میں کچھ کاغذ دبے ہوئے تھے۔ اس نے آکر ٹرے بیڈ پر رکھا، خود بیٹھ کر بغل میں دبے کاغذ نکال کر ایک طرف رکھے، پھر جہال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا

”تم رات سے میرے بارے میں بہت کچھ سوچ رہے ہو گے؟“

”ہاں، تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ اس نے کسی تردد کے بغیر کہہ دیا

”میں جانتی ہوں، تم نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا ہوگا، یہاں تک کہ مجھے ختم کر دینے کا بھی خیال آیا ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کیا سوچا جاسکتا ہے۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے یوں کہا جیسے وہ سب جانتی ہو، جہال کی سوچوں تک سے واقف ہو۔

”ہاں، میں نے یہ بھی سوچا۔“ جہال سٹکھ نے اعتراف کیا

”لیکن تم مجھے قتل نہیں کر پا رہے ہو، میں یہ بھی جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش رہی پھر بولی، ”جانتے ہو ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

”ہاں، یاد ہے۔ وہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ سکھنا جمیل کے پاس موجود گردودارہ ساگر صاحب میں، ایک سیوک سٹکھ نامی لڑکے نے ملوایا تھا۔“ جہال نے انتہائی سنجیدگی سے کہا، وہ چاہتا تھا کہ رویت کور وہ کچھ کہے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔

”بالکل، تم ٹھیک کہتے ہو۔ تب سے لے کے اب تک، میں نے سکھی کی کتنی سیوا کی ہے۔ یہ تم جانتے ہو۔ ہم سب اپنی جان بھری پر رکھے ہوئے ہیں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے، پتا سان گرو، پروفیسر دیویندر سٹکھ کو بھول جاؤ گی، ایک ایسے لڑکے کے لئے، جس نے پروفیسر دیویندر سٹکھ کو قتل کیا تھا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ جہال نے حیرت سے کہا

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ پچھلے دو سال سے میں اس قاتل کو تلاش کر رہی تھی، جس نے میرے پتا سان گرو کو قتل کیا۔ یہ اُمت سٹکھ، اس وقت بھی آری میں تھا۔ اس نے پیار کا ناکہ مجھ سے کیا۔ اور پھر موقع ملے ہی اس نے پروفیسر کو مار دیا۔ ان دو برسوں میں مجھے یہی پتہ چلا۔ میں اس انتظار میں تھی کہ کب چندی گڑھ جانا ہوتا ہے۔ رتب نے مجھے موقع دیا اور میں یہاں آگئی اور میں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔“

”ہمیں کیوں نہیں بتایا؟“ جہال نے کہا

”معاف کرنا جہال، یہ فقط میرا انتقام تھا۔ میں تم لوگوں کو اس میں شامل کر کے تم لوگوں کو سامنے نہیں لانا چاہتی تھی۔ جہال جتنی بھاری ذمہ داری اس وقت تم پر ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ میں تم لوگوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جب میں دوبارہ اُمت سے ملی ہوں تو مجھ پر ایک بڑا انکشاف ہوا ہے۔“ رویت نے بتایا

”کیسا انکشاف؟“ جہال نے پوچھا

”اُمت راء کے اس شعبے میں آگیا تھا، جہاں ایک ایسی فورس ترتیب دی جا رہی تھی، جو کمانڈوز سے بھی آگے کی تربیت ہے۔ اسے انہوں نے ”سوٹ“ کا نام دیا ہے۔ پیشل وینچن اینڈ ٹیکس کے نام سے۔ یہ ان میں سے ایک تھا۔ صرف میرا اُمت کے سامنے آنے کا مطلب تھا کہ میں ہی ہوں، اکیلی۔ میرے ساتھ کوئی نہیں۔ وہ مجھے اپنی فورس کے لئے تیار کرنے لگا۔ اور میں تیار ہو گئی۔ میرے جیسے ہیکرز کی انہیں بہت ضرورت ہے۔ میں نے اس کے

کمپیوٹر سے جو ڈیٹا لیا، اس سے مجھے کافی معلومات ملی ہیں۔ جس سے میں نے بہت کچھ تلاش کیا۔“ یہ کہہ کر اس نے کاغذ اٹھا کر جہال کے سامنے رکھ دیئے۔ یہ دیکھو! یہ فورس اور اس کے بارے میں معلومات صرف پہلے صفحے پر ہیں، باقی جو صفحات ہیں، وہ آئندہ کیا کرنے والے ہیں۔“

جہال نے وہ کاغذ پکڑ لئے۔ اس نے گنگ اٹھایا اور چائے پینے لگا۔ وہ پڑھتا جا رہا تھا، اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ سارے صفحات پڑھ کر بولا

”یار یہ تو ان کے وہ پلان ہیں، جب میں اس فورس نے ان کی مدد کرنی ہے۔ یہ پلان تو بہت خطرناک ہیں؟ اس سے ہمارا سارا نیٹ ورک برباد ہو جائے گا۔“

”یہ مت سوچو، تمہارا نیٹ ورک ان کی نگاہوں میں آنے والا نہیں ہے۔ انہیں بس یہ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ ’دیرتا‘ ہے کون؟ اس لئے بہت محتاط ہونا ہوگا، یا پھر ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ ایک دم سے وہ یہ سب بھول جائیں۔“ رویت کور نے کہا

”کیا یہ جو سب تمہیں تھا دیا گیا ہے، کہیں یہ ہم لوگوں کو گمراہ کرنے ہی کے لئے نہ ہو؟ یہ درست ہے، اسکی کیا تصدیق ہے۔“ جہال نے کہا

”شک اس رپورٹ میں نہیں ہے جہال، شک میری ذات میں ہے۔ اور یہ شک میں بہت جلد دور کر دینے والی ہوں۔“ اس نے گہرے لہجے میں کہا

”کیسے؟“ جہال نے تیزی سے پوچھا

”یہ وقت آنے پر بتا دوں گی۔“ اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ جہال اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بائیتا کور سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے رویت پر شک پڑ گیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ان کے خلاف جاسکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

حویلی میں پہلے دن سے ہی تانی اور چوہدری اشفاق کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں تھیں۔ ہر فرد اس شادی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد ہی امی موضوع پر باتیں کرنے لگے تھے۔ صرف ایک اروند سٹکھ تھا، جو بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلتا تھا۔ میں نے اس کی کمی محسوس کی تو اس کے پاس چلا گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین میں جیسے ٹھویا ہوا تھا۔ میری آمد پر چونکا۔ اس کے چہرے پر بہت حد تک پریشانی تھی۔

”کیا بات اروند، پریشان لگ رہے ہو؟“ میں نے اس کے پاس ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

”وہی رویت کا رونا ہے، چندی گڑھ سے کوئی اچھی خبر نہیں آ رہی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جہال اور رویت کے

بارے میں ساری بات بتادی۔ جس پر میں چند لمحے سوچتا رہا، پھر کہا

”اروند! میرا دل نہیں مانتا کہ رویت کسی طرح بھی ہمارے خلاف جاسکتی ہے۔“

”دل تو نہیں مانتا لیکن وہ اس معاملے میں بہت آگے تک جا چکی ہے۔ وہ ایسے ایسے انکشاف کر رہی ہے جو عام ہیکر کی بھی رسائی میں نہیں ہیں۔“

”مثلاً، کچھ مجھے بھی بتاؤ۔“ میں نے کہا

”اس وقت چندی گڑھ میں فقط چھ سوٹ ہیں۔ ان کے بارے میں ساری معلومات اس کے پاس ہے۔ چلو یہ تو مان لیا، لیکن ان کے پاس جو پلان ہیں، وہ اس قدر تفصیل سے ہیں کہ خفیہ ادارے بھی ایسی معلومات نہیں رکھتے ہیں۔ یہ بہت ہائی پروفائل میں ہوتے ہیں۔ انہیں میں جہال کے نیٹ ورک بارے میں صرف اتنا ہے کہ کوئی دیرتا کے

نام سے تنظیم بنا چکا ہے، کون ہے، یہ کیسے لوگ ہیں، اس بارے ابھی کچھ نہیں پتہ، ایک بات تو یہ ہے، دوسری ایک اہم بات یہ ہے کہ چند بڑے جرائم پیشہ بھی انہیں تلاش کر رہے ہیں تاکہ وہ ان کے ساتھ کوئی ڈیل کر سکیں۔ رویت کا اس حد تک رسائی حاصل کر جانا غیر معمولی بات ہے۔ جہاں لوگ لگتا ہے کہ یہ ساری معلومات جملی ہیں اور وہ ان سب کو پھنسانے کے لئے کر رہی ہے۔“ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اروند نے جلدی سے اسکرین پر دیکھا، پھر تیزی سے بولا، ”رویت آن لائن ہے۔“

”اروند کیسے ہو؟“ رویت نے کہا

”میں ٹھیک ہوں، یہ تمہارے بارے.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولی

”وقت نہیں ہے فضول بات کے لئے، میں تمہیں لنک دے رہی ہوں، فوری طور پر وہاں سے جتنا ڈیٹا ہے نکال لو، میں اب شاید آن لائن نہ ہو سکوں۔ لیکن دھیان رکھنا۔ اس ڈیٹا سے سب کچھ جاؤ گے۔“ یہ کہہ کر وہ آف لائن ہو گئی۔ اگلے آدھے منٹ میں اس نے لنک دے دیا۔ اروند بری طرح مصروف ہو گیا، تقریباً دس منٹ بعد اروند کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ وہ زور سے بولا

”اوہ واہ اوئے رویت واہ۔“ پھر میری جانب دیکھ کر بولا، ”بہت بڑا کام ڈال دیا اس نے، وہ چھ کے چھ سویت تین مختلف جگہوں پر پہنچا دیئے ہیں، اور ان کے پیچھے جرائم پیشہ لگ گئے ہیں اور ان کا تعاقب شہر میں موجود مختلف فورسز کر رہی ہیں۔“

”یہ کیا کھیل ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔“ میں نے الجھتے ہوئے پوچھا

”یہ سارا کھیل غلط انفارمیشن کا ہے۔ اس نے پہلے سویت کو یہ پیغام دیا کہ تین مختلف جگہیں ہیں جن میں سے صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں اسلحہ کی ڈیل ہونے والی ہے۔ وہاں صرف خطرناک ہتھیار دکھایا جائے گا اور ڈن ہوگا۔ جرائم پیشہ کو ان سویت کے پیچھے لگا دیا اور ان کے پلان کے بارے میں فورسز کو آگاہ کر دیا۔ اب دیکھیں وہ سب سمجھتے ہیں یا اس کھیل میں استعمال ہو جاتے ہیں۔“ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا

”تمہیں کیسے پتہ چلے گا یہ نتیجہ کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا

”فورسز کی ہر ٹیم کو یہ ہدایت ہے کہ جیسے ہی مجرموں کو پکڑ لیا جائے فوراً رپورٹ کریں۔ اور یہ سب مجھ تک اور رویت تک آ رہا ہوگا، اب جو بھی ہدایت دینی ہے، ہم نے ہی دینی ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے شروع ہو جاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے میں اس کے ساتھ بیڈ پر آ گیا۔ اروند نے رویت کو بتا دیا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ تب اس نے پیغام دیا کہ جہاں کو فون کر کے کہہ دیں کہ دو گھنٹے تک مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

میں نے جہاں کو کال ملا دی۔

”وہ اپنے کمرے میں بند ہے نجانے کیا کر رہی ہے، ہمیں اس کے بارے میں بہت پریشانی ہے۔“ جہاں نے فوری طور پر کہا

”فی الحال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ رہا ہوں، دو گھنٹے تک اسے ڈسٹرب نہیں کرنا، بعد میں بات کرتے ہیں۔“ میں نے اسے کہا تو اس نے تفصیل جانا چاہی۔ میں نے اسے مطمئن کر کے فون بند کر دیا۔

ہم کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ کوئی پونے گھنٹے بعد ایک طرف سے اطلاع آ گئی۔ سیکرٹتیس کے ایک ریسٹوران میں دو سویت موجود تھے۔ وہاں آنا تو کسی نے نہیں تھا۔ ان کے بیٹھے ہی ان کی قریبی میز سے دو جرائم پیشہ اٹھے اور انہوں نے دونوں سویت پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ سویت کوئی تفریح کے لئے وہاں نہیں آئے تھے، انہوں نے

بھی جوانی فائرنگ شروع کر دی۔ وہ تربیت یافتہ تھے اور انہوں نے بلٹ پروف جیکٹ پہنی ہوئی تھی، اس لئے ان میں اعتماد تھا۔ لحوں میں انہوں نے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ پھر انہیں خبر نہ ہوئی کہ کس کس طرف سے گولیاں برسنے لگی ہیں، اگلے دو منٹ میں ان کا منہ ہی اڑ گیا۔ یہ فائرنگ ابھی ہو رہی تھی کہ پولیس کا خصوصی اسکوڈ وہاں آن پہنچا۔ اس میں زخمی تو کئی ہوئے لیکن بھگدڑ میں دو بندے مارے گئے۔

بالکل اسی وقت میں چند گڑھ سے باہر جانے والی سڑک پر سیکٹر انچاس میں انڈسٹریل ایریا کے قریب دائیں جانب ایک فلنگ اسٹیشن تھا۔ دونوں سویت سڑک کے بائیں جانب کار میں انتظار کر رہے تھے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک ماروتی آئے گی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر بندہ نکلے گا۔ جیسے ہی وہ کار کھڑی کر کے ٹک شاپ کی جانب جائے تو سمجھ لیں کہ اسی بندے سے ملے وہاں پر اسلحہ ڈیلر آنے والی ہیں۔ یہی نشانی بتائی گئی تھی۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ کوئی ادھیڑ عمر ماروتی کار میں آئے گا۔ اچانک کے ساتھ دو بھاری گاڑیاں آ کر رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں کچھ سمجھتے، وہاں سے فائرنگ ہونے لگی۔ اچانک حملہ آوروں کی طرف سے دو ہینڈ گرنیڈ اچھالے گئے۔ اور بھاری گاڑیاں چل دیں، وہ چند گز ہی بڑھیں ہوگی کہ دو دھماکے ہوئے اور ماروتی اڑ گئی۔ اچانک ان بھاری گاڑیوں کو پولیس اسکوڈ نے گھیر لیا۔ سڑک پر فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ گاڑی میں موجود چار لوگ مارے گئے تھے۔ اور سویت ختم ہو گئے۔

ایسے ہی وقت میں چند گڑھ کے سیکٹر ایک سو تیرہ ختم ہوتے ہی تھنڈر زون سے شمال کی جانب ذرا آگے دو سڑکوں کے درمیان کافی ساری جگہ تھی۔ وہیں ایک بڑا موڑ تھا، جس کے ساتھ کافی ساری کھلی جگہ تھی۔ وہاں ایک کونے میں چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ جس کے آگے اس پوری کھلی جگہ پر لوگ مختلف بیچوں پر جا بیٹھے اور گپ شپ کے ساتھ چائے پیتے تھے۔ اسے ویرانہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن وہ تھی ویرانے جیسی جگہ۔ لوگ ارد گرد کی بھاگتی گاڑیوں سے بے نیاز وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ دونوں سویت بھی اسی جگہ پر موجود چائے خانے سے دور ایک بیچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جیسے ہی ایک اکیلے آدمی کے پاس کوئی بریف کیس لے کر آئے، دراصل وہی مجرم ہیں، انہیں زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ انہیں انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ تبھی ایک نوجوان وہاں آیا اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ وہ دونوں سویت الٹ ہو گئے۔ انہیں پتہ تھا کہ فورسز ان کے ارد گرد ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھے اور ان میں ایک نے بریف کیس پر ہاتھ ڈال دیا، جبکہ دوسرے نے وہاں بیٹھے ہوئے شخص کی کپٹی پر پھسل کی نال رکھ دی۔ اسی لمحے نجانے زمین میں سے لوگ اُگ آئے تھے۔ انہوں نے سویت پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ سویت کے لئے راہ فرار نہیں تھی۔ وہ اتنے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر پائے تھے، اگلے دو منٹ میں وہ وہیں ڈھیر ہو چکے تھے۔ حملہ آوروں کو یقین جیسے ہی یقین ہوا کہ وہ مر گئے ہیں، وہ سب نکل پڑے۔ فورسز نے انہیں گھیر لیا، کچھ مر گئے، کچھ زخمی ہوئے اور باقی فرار ہو گئے۔

وہاں کی ساری رپورٹ اور تصویریں آنے لگیں۔ اروند انہیں محفوظ کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ لنک غائب ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ رویت نے جو کام لینا تھا وہ لے لیا تھا۔

”یار یہ رویت نے تو کمال کر دیا، اس کا دماغ.....“ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

”اس نے جو کہا تھا کہ میں یہ ثابت کر دوں گی تو اس نے کر دیا۔“ میں نے کہا

”بالکل، اس نے ثابت کیا۔“ یہ لفظ ابھی اروند کے منہ ہی میں تھے کہ اس کے ساتھ ہی رویت آن لائن ہو گئی

اس کے لیوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس کے سامنے تھا۔ اس لئے مجھے ہی مخاطب کر کے بولی۔
”آپ نے ساری کاروائی سمجھ لی، جو بھی ہوا، اب اسے میں کیسے سمجھاتی ان سب کو۔ یہ سارا رسک پر تھا۔
ناکامی کی صورت میں تو یہ مجھے قتل کرنے کی درپے تھے۔“

”نہیں کوئی تمہیں قتل نہیں کر سکتا۔ صرف غلط فہمی.....“ میں نے اسے کہا
”ہماری دنیا میں غلط فہمی ہی تو مار جاتی ہے۔ خیر میں اسی لئے یہاں سے کینیڈا جانا چاہتی تھی، وہیں پر رہ کر میں
یہ سب کرنا چاہتی تھی۔ میرے یہاں ہونے اور میرے ہاتھوں امیت کا قتل، مجھے یہاں بھارت میں محدود کر چکا ہے
اب میں کھل نہیں سکتی۔“

”تمہیں کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں، میرے خیال میں ابھی بہت سارا کام پڑا ہے؟“ میں نے کہا
”کیسا کام؟“ اس نے پوچھا

”یہ جو جرائم پیشہ تم نے استعمال کئے ہیں، یہ بہت بڑا کام کیا ہے۔ فورسسر کی ساری توجہ اب انہی کی طرف ہو
گی، انہیں کس طرح قابو میں کیا تو نے؟“

”دولت سے، شہر میں تین بڑے ہیں جو خود کو دان سمجھتے ہیں۔ میں نے کسی کے پیسے اٹھا کے ان کے اکاؤنٹ
میں ڈال دیئے اور انہیں ایک کہانی سنائی کہ یہ ایک کام کرو، اس کے بعد نئی ڈیل کریں گے۔“
”بس یہی، اسی بات کو آگے بڑھانا ہے اور ان سے کام لینا ہے۔ بہت کام لینا ہے۔“
”وہ تو اب جیسا کہیں گے کر دوں گی۔ لیکن یہ لوگ مجھ پر دھواں نہیں کریں گے۔“

”تم سنو۔ میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے جہاں کو فون ملایا۔ جلد ہی اس نے کال پک کر لی، ”رونیت
بارے کوئی منفی نہیں سوچے گا، وہ ہماری وفادار ساتھی ہے، اور اب تو بہت زیادہ محترم بھی ہو گئی ہے۔ اس لئے کوئی
شک نہیں کرنا ہے۔“

”کیا تم نے.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں بولا
”اس پر ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں، اس نے جو کر دکھایا ہے، اس کے بڑے دور رس اثرات ہیں۔ میں
تمہیں سمجھاؤں گا کہ اس کا کتنا فائدہ لینا ہے۔“
”اوکے۔“ جہاں نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ رونیت نے میری بات سن لی تھی۔ وہ خوش ہو
گئی۔ اگلے لمحے وہ آف لائن ہو گئی۔

میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ رونیت بارے جان کر میرے اعصاب پر ایک بڑا بوجھ تھا جو ایک دم ختم ہو کر
رہ گیا تھا۔ میں اٹھتے ہوئے اردو سنگھ سے کہا
”چل آ ذرا باہر گھوم پھر آئیں، مسافر شاہ کے قہڑے پر چلتے ہیں، ذرا درویش کی باتیں سن آئیں، تھوڑا تازہ ہوا
کھا آئیں۔“

میرے کہنے پر وہ فوراً تیار ہو گیا تاہم معذرت خواہانہ لہجے میں بولا
”مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں، یہ سب سمیٹ لوں، پھر چلتے ہیں، میرا بھی دل چاہ رہا ہے۔“
”اوکے، میں نیچے ہوں، بالکل فراغت سے آ جانا۔“ میں نے کہا اور وہاں سے نیچے آ گیا۔
لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک صوفے پر آ کر بیٹھا تو سوئی آ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے انتظار میں
تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے جو سوچا تھا وہی کہہ دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی

”یہ تو ٹھیک ہے کہ میں آپ کے انتظار میں تھی، میں نے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“
”ہاں بولو۔“ میں نے کہا

”آپ، اس شادی میں دلچسپی ذرا کم نہیں لے رہے ہیں؟“

”نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں، پر میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی جتنی جلدی ہو جائے اتنا زیادہ اچھا ہے، اس شادی
کو اتنی دھوم دھام سے نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا
”اس کی کوئی خاص وجہ؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو میں نے کہا

”حالات، اس وقت حالات ایسے ہیں۔ ایک تو اماں نے مجھے بتائے بنا تانی کو یہاں بلا لیا، دوسرا اگر شادی پر لبا
چوڑا اہتمام کیا گیا تو ممکن ہے کوئی ہنگامہ ہو جائے، جیسے کہ ہماری شادی سے پہلے ہو گیا تھا، یہ تم جانتی ہو اور اماں کو
بھی پتہ ہے۔“

”تو آپ نے اماں سے بات کیوں نہیں کی۔“ سوئی نے پوچھا

”یار وہ ماں ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں ان کے اشفاق بارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ میں انہیں کچھ نہیں کہہ
سکتا۔ اب جوان کی مرضی۔“ میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولی
”میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ حالات کیا ہیں، لیکن اگر آپ کہیں تو میں اماں سے بات کر لیتی ہوں۔ میرا نہیں خیال
کہ وہ اس پر ضد کریں گیں۔“

”اچھا تم بات کر کے دیکھ لو۔ اگر وہ مان جائیں تو ہم ان کی شادی کر دیتے ہیں۔ تانی دو مہینے ابھی ادھر ہی ہے نا،
پھر بعد میں جو دل چاہئے۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں کرتی ہوں بات۔“ سوئی نے سوچتے ہوئے کہا۔ اتنے میں اردو سنگھ آ گیا۔ میں اسے دیکھتے
ہی اٹھ گیا۔

ہم پورچ میں آئے وہاں سے کار نکالی اور مسافر شاہ کی جانب چل پڑے۔
موسم ابر آلود تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، بڑا پرسکون ماحول تھا۔ ہم دونوں
رونیت ہی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے مسافر شاہ کے قہڑے پر پہنچ گئے۔ ابھی میں نے وہاں جا کر کار ہی
روکی تھی کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں اسکرین پر دیکھا، وہ افضل رندھاوا کا نمبر تھا۔ میں نے اس کی کال ریسو کرتے
ہوئے کہا

”خیر تو ہے نارندھاوا صاحب؟“

”بس خیر ہو ہی گئی ہے۔ تم یہاں آتے نہیں تھوڑی دیر کے لئے؟“

”بات کیا ہے؟“ میں تشویش سے پوچھا

”یہاں سے دو لوگ پکڑے ہیں۔ پکڑے کیا، پکڑاؤئے ہیں۔ وہی جو میرے ساتھ آیا تھا نا ظہور مرزا، اس نے۔
میں نے کہا تھا نا انکیشن نہ لڑنے سے تمہارا کوئی دشمن نہیں رہے گا، وہ کہتا چلا جا رہا تھا مگر مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔“

”یار، یہ کہانی مجھے بعد میں سنالینا، ان پکڑے ہوئے لوگوں سے میرا کیا تعلق؟“

”وہ تمہیں قتل کرنے آئے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا

”مجھے قتل کرنے آئے ہیں؟ کون ہیں وہ؟“

”کوئی ملک حیات ہے، اس کا نام لے رہے ہیں، میں تمہیں اس لئے بلا رہا ہوں کہ کوئی بات سامنے آ

جائے، مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے بڑے آرام سے اقرار کر لیا۔

”چلو میں آجاتا ہوں، لیکن ظہور مرزا کو کیسے پتہ چلا کہ وہ مجھے مارنے کے لئے آئے اور اس نے پکڑا دیا ان کو؟“ میں نے پوچھا

”سچ پوچھو تو یہ لڑکے ان کے مخالف امیدوار کے پاس آکر ٹھہرے تھے۔ وہاں سے بخبری ہوئی تھی کہ وہ کون ہیں اور کس مقصد کے لئے یہاں تک آئے ہیں، ہیں تو دونوں ہی جرائم پیشہ، اگر تم ان کے مخالف امیدوار ہوتے تو ظہور مرزا خاموش رہ جاتا، اب اسے موقع ملا تمہارے ساتھ دوستی کا تو احسان کرنے کے چکر میں ہے۔“ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا

”رندھاوا! میں آنے کو ابھی آجاتا ہوں، لیکن میرے آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم ایسے کرو، ان سے ذرا مزید بات کرو، دیکھو کیا کہتے ہیں، پھر کوئی کام کی بات ملی تو میں آجاؤں گا۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا اور چند مزید باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ اجنبی یونہی فون نہیں کرتا رہا تھا۔ اور پھر جنید اور تانی پر حملہ کے بعد اس کا کارندہ ملک حیات یونہی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا کہ پہلے میں اسی ملک حیات کو دیکھ لوں، اب اس اجنبی فون کرنے والے کو زیادہ وقت نہیں دینا۔ وہ میرے ساتھ کھینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز اس لئے کیا تھا کہ یہ تانی والا معاملہ پیچھے رہ جائے تو پھر اسے پوری توجہ سے دیکھو، لیکن لگتا یہی تھا کہ اب مجھے اس کا کچھ نہ کچھ ضرور کرنا تھا۔ میں نے سیل فون پر طارق نذیر کا نمبر ملایا۔ دو چار تیل جانے کے بعد دوسری طرف سے طارق نذیر کی بجائے کوئی بھاری آواز میں بولا

”ہاں بھئی جمال! میں ملک حیات بات کر رہا ہوں، طارق کی بجائے تو مجھ سے بات کر سکتا ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر میں چونک گیا۔ میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔

”تم! ملک حیات تم، طارق کہاں ہے؟“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا

”تم نے جو بات بھی کرنی ہے، مجھ سے کرو، وہ اس وقت میرے سامنے بندھا ہوا پڑا ہے۔“ اس نے طنز یہ لہجہ

میں کہا تو میرے بدن میں سنسنی تیز ہونے لگی۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پھر کہا

”ملک حیات! میں کہہ رہا ہوں میری اس سے بات کراؤ۔“

”نہ کراؤ تو پھر کیا کرو گے؟“ اس نے مجھے اشتعال دلانے والے لہجے میں تحارت سے کہا

”تو پھر تمہیں نہیں پتہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر طارق نذیر کو ایک خراش بھی آئی تو سمجھ تو نے اپنی

زندگی پر لیکر پھیر دی ہے۔“ میں اسی کے لہجے میں جواب دیا تو وہ تپ گیا۔ اس کے ساتھ ہی چٹاٹ سے ایک تھپڑ کی آواز گونجی۔

”لو، نکال دیا اس کی ناک سے خون، کیا اکھاڑ لو گے میرا۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

”سنو! کسی کو گھیر کر تھپڑ مار لیا بہت آسان ہوتا ہے، بیچوے کرتے ہیں ایسا، لیکن سن لو، میں تجھے ماروں گا

نہیں، لیکن تو اس دھڑکی پر سیدھا چل بھی نہیں سکے گا، اور تجھے پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تیرے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔“

”تجھے مجھ تک پہنچنے میں پتہ نہیں کتنا وقت لگے گا، لیکن تب تک پتہ نہیں کیا کچھ ہو جانے والا ہے، تجھے اس کی سمجھ

بھی نہیں آئے گی۔“

”چل پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟“ میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ اردو سنگھ میری بات سن کر بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ

تیزی سے کار کی طرف بڑھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں نے پنجر سیٹ پر بیٹھنے تک کال ملائی تھی۔ کال ملنے ہی میں نے کہا

”تم لوگوں کو پتہ ہے کہ تمہارا پاس کہاں ہے؟“ میں نے طارق نذیر کے ایک جونیئر سے پوچھا

”ہمیں تو وہ گھر جانے کا پتہ نہ ملے گا۔“ اس نے جواب دیا تو میں نے اسے صورت حال بتادی اور اسے سمجھا

دیا کہ ان لوگوں نے کرنا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سرمد کو کال کی۔ وہی سرمد جو روہی میں تھا اور پچھلے ایک

برس سے اپنے نیٹ ورک کے ساتھ لاہور میں رہ رہا تھا۔ وہاں لاہور میں قدم جمانے کے لئے شروع شروع میں اس

کی میں نے مدد کی تھی۔ پھر وہ خود ایک کامیاب ٹیم بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں یہ بانٹا تھا کہ وہ جس تیزی اور

صفائی سے کام کرتے تھے میں خود حیران تھا۔ ان کے پاس معلومات حیران کن حد تک تھیں۔ وہ گاہے بگاہے مجھے کسی

نہ کسی کام کے لئے کہتا رہتا تھا لیکن اس سے متعلق کوئی ایسا کام نکلا ہی نہیں تھا۔ جب سے اجنبی کا فون مجھے ملا تھا،

اور اردو نے مجھے بتایا کہ وہ اجنبی لاہور میں ہے تب میرے ذہن میں فوراً آگیا تھا کہ تانی پر حملہ ضرور ہوگا۔ جس

کا بندوبست میں نے بروقت کر دیا تھا۔ تانی کسی ضرر کے بغیر لوٹ کر پہنچ گئی تھی۔ اس حملے میں ملک حیات کا نام

سامنے آیا تو میں نے سرمد کو اسی کام پر لگا دیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ملک حیات اتنی تیزی سے ری ایکشن دکھائے

گا۔ اس کے دو بندے افضل رندھاوا نے پکڑ لئے تھے۔ ان کی یہاں موجودگی ہی مجھے کھٹک گئی تھی۔

”ہاں سرمد! اس نے طارق نذیر کو پکڑ لیا ہے، یہ کیسے ہوا؟“ میں نے اسے بتایا۔

”اس نے نہیں پکڑا، وہ میرے پلان کے مطابق وہاں گیا ہے۔ اس نے وہاں یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک کرپٹ

آفیسر ہے۔ دولت کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ آپ کے گھیرنے کا پلان کر رہا ہے۔ میں ان کی باتیں سن رہا

ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں کچھ دیر بعد آپ کو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔“ اس نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو میری

پریشانی کافی حد تک ختم ہو گئی۔ میں نے اس کے بھیجے ہوئے بندوں کے بارے میں اسے بتایا اور فون بند کر دیا۔

اردو سنگھ گھر کی طرف تیزی سے کار بھگائے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے سرمد سے ہونے والی بات کے بارے

میں بتایا لیکن اس نے کار کی رفتار کم نہیں کی۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا اضطراب کم نہیں ہوا بلکہ بڑھتا

جا رہا ہے۔ اس نے کار پورچ میں روکی اور مجھے آنے کا کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ اس نے

جاتے ہی اپنا لیپ ٹاپ اٹھالیا۔

”اردو! تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“ میں نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے پوچھا تو اس نے اسکرین پر

نگاہیں جمائے ہوئے جواب دیا

”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اجنبی اس کے آس پاس ہے یا نہیں؟“

”وہ اس کے پاس نہیں ہوگا۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ میری جانب دیکھ کر بولا

”آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”اس لئے کہ وہ سامنے نہیں آئے گا۔ ویسے تم دیکھ لو، اور ہاں میں شہر جا رہا ہوں۔ مجھے جو بھی اپ ڈیٹ ہو

بتاتے رہنا۔“ میں نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بولا

”اوکے، میں بتاتا رہوں گا۔“

میں نے جنید کو کال کی اور پورچ تک آگیا۔ وہ پہلے ہی وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس کے پاس چوہدری اشفاق بھی کھڑا

تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھی کار میں بیٹھنے لگا تو میں نے کہا

”اشفاق! یہاں رہو اور اپنے بندوں کو بھی الٹ رکھنا، نجانے کیوں مجھے یہاں پر حملے کا احساس ہو رہا ہے۔“
 ”بات اس حد تک ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو میں نے سر ہلادیا۔ میں نے اسے سمجھادیا کہ اسے فوری طور پر کرنا کیا ہے۔ وہ اتر گیا تو جنید نے کار بڑھادی۔ میں اور جنید اسی پر بات کر رہے تھے کہ اس دوران سرد کا فون آگیا۔

”جمال جی! یہاں کی فکر نہیں کرو، بلکہ اپنے علاقے کو سنبھالو، وہاں آپ لئے زیادہ خطرہ ہے۔ صرف ملک حیات ہی کے بندے وہاں پر نہیں، کچھ دوسرے بھی ہیں۔“

”یہ کیسے پتہ چلا؟“ میں نے پوچھا
 ”ملک حیات نے بتایا ہے طارق نذیر کو۔ اور میں سن رہا ہوں۔ معاہدے کے مطابق یہ بات وہ آپ کو نہیں بتائے گا، بلکہ وہیں بیٹھا پلان بنا رہا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔“
 ”کیا اسے نہیں پتہ کہ اس کے دو بندے پکڑے گئے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے پتہ نہ ہو؟“ میں نے تیزی سے پوچھا

”یہی تو بات ہے۔ وہ پکڑے ہی اسی لئے گئے ہیں کہ دھوکا ہو جائے۔ آپ وہاں دیکھیں، میں یہاں دیکھتا ہوں، شام تک ان کا بندوبست کر لیتے ہیں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں افضل رندھاوے کے سرکاری گھر جا پہنچا۔ جنید مجھے اتار کر چلا گیا تھا۔ اسے میں نے ایک اہم کام کے لئے بھیج دیا تھا۔ وہیں پر ظہور مرزا بھی آچکا ہوا تھا۔ میرے بیٹھے ہی رندھاوا خوشی سے کہنے لگا
 ”وہ دولڑکے میں نے.....“

”مجھے ان کی ضرورت نہیں، ان جیسے کئی اس علاقے میں موجود ہیں، مجھے وہ سب چاہئیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”کیا مطلب، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“
 ”وہی جو تم سن رہے ہو۔ اور جس کے پاس سے تم نے یہ لڑکے پکڑے ہیں، اسے بھی یہاں بلاؤ۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھ کر کہا

”یار، وہ اس وقت ایم این اے، یہ تو جب میں نے جا کر کہا کہ مجھے فلاں لڑکے.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا
 ”کیا اب مجھے اس کے گھر بھی جانا پڑے گا؟“

”میں کہہ رہا ہوں نا، میں اس سے بات کرتا ہوں، پھر جانا پڑا تو چلیں جائیں گے۔“ وہ تیزی سے بولا اور اپنا سیل ملا کر نمبر پش کرنے لگا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ظہور مرزا بڑے اعتماد کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا تھا۔
 ”کال مل گئی، جس پر رندھاوے نے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سلیم خان نے ساری بات سن کر کہا
 ”دیکھو رندھاوا صاحب، مجھے وہاں آپ کے پاس آنے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر جمال صاحب میرے پاس آتے ہیں تو بھی مجھے خوشی ہوگی۔ عرض میری یہ ہے کہ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ دونوں لڑکے کس نیت سے یہاں پر ہیں، میں نے فوراً آپ کے حوالے کر دیئے۔“

”یہاں ظہور مرزا صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں، اگر آپ آجائیں تو میرا خیال ہے بیٹھ کر جو بات ہو جائے وہ زیادہ بہتر ہے۔“

”جی میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور کال بند کر دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ وہاں پر تھا۔ وہ ہماری تن و توش کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت ہی سے لگتا تھا کہ وہ دولت مند اور حوصلے والا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے ملا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا
 ”یوں تو بہت ساری باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک بات کہوں گا۔“ میں نے سلیم خان اور ظہور مرزا کی جانب دیکھ کر کہا

”بولیں۔“ ظہور مرزا نے جواب دینے میں پہل کی تو میں نے کسی تردد کے بغیر کہا
 ”یہ جو دولڑکے پکڑے گئے ہیں، یہ شخص دھوکا ہیں، انہیں آپ چھوڑ بھی دیں تو وہ مجھے نقصان پہنچانے والے نہیں، مجھے وہ لوگ چاہئیں، جو ان کے علاوہ یہاں اس علاقے میں موجود ہیں اور وہ بھی دو گھنٹے میں مل جانے چاہئیں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ اتنے شارٹ وقت میں ایسا ممکن نہیں، دوسرا، ہمیں نہیں علم کوئی اور لوگ بھی ہیں یہاں۔“
 سلیم خان نے بڑے اعتماد سے کہا

”ظہور مرزا صاحب کیا کہتے ہیں آپ؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا
 ”وہی جو سلیم خان کہہ چکے ہیں۔ اور پھر یہ آپ ہمیں ہی کیوں کہہ رہے ہیں، ایسے جرائم پیشہ لوگوں کا تلاش کرنے کے لئے آپ پولیس کو کہیں۔“

”آپ دونوں سے میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ دونوں کے بارے میں بہت اچھی طرح جان گیا ہوں۔ اس علاقے میں کوئی بھی جرم ہوتا ہے، اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں جا کر آپ لوگوں سے ضرور ملتے ہیں۔ میرے قتل کے لئے یہاں آنے والے، دو گھنٹے میں یہاں ہوں۔ آپ لوگ ہی انہیں تلاش کر کے لے آئیں، اس سے پہلے کہ میرے لوگ انہیں یہاں تک لے آئیں۔“

”آپ کے لوگ اگر لاسکتے ہیں تو پھر ہمیں کیوں کہہ رہے ہیں؟ یہ میں نہیں سمجھا“ سلیم خان نے ناراض لہجے میں پوچھا
 ”اس لئے کہ میں ابھی وقت دینا چاہ رہا ہوں۔ میں یہاں کسی بھی قسم کی کوئی دشمنی پالنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ لیکن اگر اب کوئی دشمنی پالنا چاہتا ہے، تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ دوسرا یہ میرا خیر سگالی کا پیغام ہوگا، آپ دونوں کے لئے۔ صرف دو گھنٹے۔“ میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ کیونکہ جنید باہر آچکا تھا اور اس نے مجھے کام ہو جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔

”یہ تو آپ ہمیں سیدھے سیدھے الزام دے رہے ہیں کہ وہ لوگ ہمارے پاس ہیں اور ہم دے نہیں رہے۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ.....“ سلیم خان نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں کہا تو میں اس کی سنی ان سنی کرتا ہوا ہر آ گیا۔

میں جنید کے ساتھ نورنگر کی طرف جانے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ اس نے مجھے ان دونوں لڑکوں کا سیل فون لے آنے کے بارے میں بتایا جو وہاں کے نشی کے پاس جمع تھے۔ اس نے ان لڑکوں کے ساتھ بات کر کے ان کی آواز ریکارڈ کر لی تھی۔ رندھاوا کے پاس سلیم خان اور ظہور مرزا سے ہونے والی ساری باتیں میرے سیل فون میں محفوظ ہو گئی تھیں۔ وہ میں نے جنید کے فون میں منتقل کر دی۔

نورنگر پہنچتے ہی جنید سیدھا رندھ سنگھ کے پاس چلا گیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے سرد سے رابطہ کرنا تھا۔ میں کمرے میں گیا تو سوئی بیڈ پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ میرے چہرے پر دیکھ کر اس نے پوچھا

”خیر ہے، آپ یوں؟“

”میرے ساتھ خیر ہی ہے، بس کچھ مسئلے ہیں، تم ایسا کرو میرے لئے چائے لے کر آؤ۔“ میرے یوں کہنے پر وہ سمجھ گئی کہ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہی سرمد کو کال ملائی۔ وہ جیسے میرے ہی انتظار میں تھا۔

”میں نے ملک حیات کو گھیر لیا ہے۔ اس کے ارد گرد سیکورٹی بہت زیادہ ہے۔ میں اگلے دو منٹ میں اسے مار سکتا ہوں.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا

”نہیں اسے زندہ پکڑنا ہے۔“

”مجھے بھی احساس ہے کہ اسے زندہ پکڑنا ہے۔ مجھے پانچ سے دس منٹ مزید دیں، وہ جیسے ہی باہر نکلتا ہے، میں اسے قابو کر لیتا ہوں۔“

”اوکے میں انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ دو منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ ارد گرد کی کال مجھے آگئی۔

”ان لوگوں کے سیل فون بالکل بے کار ہیں۔ چند لوگوں کے سوا ان میں کسی کا رابطہ نمبر نہیں جو ہمارے کام کا ہو۔“ یہ ممکن نہیں ہے، وہ سارے نمبر ہی کام کے ہیں۔ انہیں نظر انداز مت کرو۔ انہی سے ہی باقی لوگوں کے بارے میں پتہ چلنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں آیا، ”وہ اجنبی اس وقت کہاں ہے؟“

”وہ لاہور ہی میں ہے، جو ہر ٹاؤن کے علاقے میں صبح سے وہیں ہے، ایک ہی جگہ پر۔“

”گاہے بگائے اسے دیکھتے رہنا۔“ میں نے اسے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی چوہدری اشفاق کا فون آگیا۔

”ہاں بولو، کوئی.....“

”دو مشکوک بندے ملے ہیں، نورنگر سے باہر نہر کے پاس ڈیرے پر موجود تھے۔ وہ مہمان ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اس بندے کے بارے میں بتایا، جن کے وہ مہمان تھے اور وہ ان کے کزن تھے۔ وہ دونوں ہی سیالکوٹ کے قریب شمال کی جانب کسی گاؤں سے آئے تھے۔ انہیں تقریباً دس دن ہو چلے تھے یہاں آئے ہوئے۔ وہ زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہتے تھے۔ بہت کم گاؤں میں آتے تھے۔“

”انہیں چیک کیا؟“ میں نے پوچھا

”ہاں۔ ڈیرے سے دو جدید اے کے فورٹی سیون ملی ہیں۔ میں انہیں اور ان کے کزن سمیت لے کر آ رہا ہوں، تھوڑے اکھڑ لگتے ہیں۔“

”ان کے پاس سیل فون ہوں گے، وہ حویلی بھیج دو۔ انہیں یہاں حویلی میں مت لانا، بلکہ مسافر شاہ کے قہڑے پر لے چلو، وہیں بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے کچھ کچھ سمجھ آگئی تھی کہ یہ معاملہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ایسے میں سوئی چائے لے کر آگئی۔ وہ دو کپ بنا کر لائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھے گی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتی، میں نے اسے بتا دیا کہ معاملہ کیا ہے۔ تبھی وہ تشویش سے بولی

”ان کا فوراً پتہ کریں، کہیں وہ حویلی پر حملہ.....“

”اب حویلی پر حملہ کرنے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا، یہاں ان کے لئے موت کے سوا کچھ نہیں، اگر ایسا کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے، اتنا وقت نہ لگاتے، مطمئن رہو۔“

”ایسا کیا ہے یہاں پر؟“ اس نے پوچھا

”یہاں کافی دور تک سیکورٹی کا بندوبست ہے، وہ بھی جدید الیکٹرونکس آلات کا۔ اگر اس کی تفصیل پوچھنی ہو تو مہوش سے پوچھ لیتا۔ میں نے اب تک بتایا اس لئے نہیں کہ یہ بات عام نہیں ہونی چاہئے، اگر کوئی بری نیت رکھتا بھی ہے تو پتہ چل جائے گا۔ اس نظام کے بارے میں یہاں کے سیکورٹی والوں کو بھی نہیں پتہ، ورنہ وہ، اسی نظام پر بھروسہ کرنے لگیں گے۔“ میں نے اسے سمجھایا اور خالی کپ رکھ کر اٹھ گیا۔ سرمد نے جو وقت دیا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں اس کی کال کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گذرا، اس کی کال آگئی۔

”سوری بھائی میں تین منٹ لیٹ ہو گیا۔“

”ہوا کیا؟“ میں نے پوچھا

”میرے پاس ہے، اور میں اسے اپنے سیف ہاؤس کی طرف لے جا رہا ہوں۔ وہیں جا کے اس سے گپ شپ کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، یہاں بھی کچھ مشکوک لوگ پکڑے گئے ہیں، میں انہیں دیکھ لوں، پھر بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں جنید کے ساتھ مسافر شاہ کے قہڑے تک جا پہنچا۔ تمام راستے ہم دونوں بالکل الٹ رہے۔ کسی طرف سے بھی کوئی حملہ ہو سکتا تھا۔ پندرہ منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی چوہدری اشفاق ان دو لوگوں کو لے کر وہاں پہنچا ہوا تھا۔ درختوں کے نیچے، بھی چار پائیوں کے پاس وہ کھڑے تھے۔ ان کے کزن بھی قریب ہی کھڑا کیا ہوا تھا۔ فرید اور درویش کے ساتھ چند پہلوان اور بھی تھے۔ میں جا کر بیٹھا تو ان لوگوں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر سامنے کی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ تبھی میں ان میں سے نسبتاً بڑے کی جانب دیکھ کر پوچھا

”اگر ساری بات سچ بتا دو گے تو وعدہ رہا کہ تم لوگوں کو کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ ابھی اور اسی وقت جانے دوں گا۔ لیکن اگر جھوٹ بولا تو پھر معافی نہیں ہوگی۔ ایک اذیت ناک موت ہوگی۔ اب فیصلہ تم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔“

”ہم یہاں اپنے کزن سے ملنے کے لئے آئے ہیں، اس کے علاوہ ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ اسلحہ ہم ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ کہیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ اس نے ذرا ٹیکھے لہجے میں کہا تو میں نے غور سے دیکھا، وہ نگاہیں چرا گیا۔ میں نے چھوٹے کی طرف دیکھ کر یہی سوال کیا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ ہمارے پاس فرید اور درویش بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے فرید سے کہا

”یار انہیں پانی یا شربت پلاؤ۔ جب تک ان کے بارے میں تصدیق نہیں ہو جاتی، یہ ہمارے مہمان ہیں۔“ میں نے کہا تو فرید فوراً اٹھ گیا۔

”تصدیق، کیسی تصدیق؟“ وہ کزن بولا

”دیکھ میں تیرا لحاظ اس لئے کر رہا ہوں کہ تو میرے علاقے کا ہے، میرا اپنا ہے۔ ان پر شک ہے، تصدیق تو بنتی ہے نا؟“ میں نے کہا

”بالکل، بنتی ہے۔“ اس نے جواب دیا

”ان سے پوچھ لو، تصدیق ہو جانے تک ان کے پاس وقت ہے، پھر نہیں ہوگا۔“ میں نے پھر انہیں وقت دے دیا۔ وہ ذرا سا کسمسائے لیکن بات کوئی نہیں کی۔ میں نے وقت دیکھا، دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ فرید شربت بنا کر لے

آیا۔ جو ابھی پی رہے تھے کہ اردو کا فون آگیا۔

”ان دونوں کے ظہور مرزا اور سیالکوٹ کے پاس کسی بندے کے ساتھ رابطہ ہے۔ ابھی ذرا دیر پہلے ظہور مرزا نے اسی نمبر پر کال کی تھی۔ کچھ نمبر ایسے ہیں، جو ہمیں اسی علاقے کے آس پاس کے ہیں۔“

”کتنے ہیں؟“

”ابھی تک تو تین ہیں۔“ اس نے بتایا

”تو پھر ایسے کرو، وہ سب چوہدری اشفاق کو بتادو، انہیں اٹھانا ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ چوہدری اشفاق نے میری بات سن لی تھی۔ وہ اٹھ کر کار کی جانب چل دیا۔ تبھی میں نے ان دونوں لڑکوں سے کہا، ”گلاس رکھ دو اور کھڑے ہو جاؤ۔“

”کیا..... یہ.....“ کزن ہکا بکا رہ گیا۔

”ہاں ان سے پوچھو، ظہور مرزا کو جانتے ہو؟“ وہ خاموش رہے۔ تبھی میں نے فرید سے کہا، ”انہیں درخت سے الٹا لٹکا دو اور بڑا سارا ڈھالے آؤ، انہیں شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔“

”جی ہم جانتے ہیں، ہم بتاتے ہیں پوری بات؟“ ان میں سے چھوٹا تیزی سے بولا

”اب مجھے نہیں سننی، کیونکہ میں جان گیا ہوں۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس مقصد کے لئے یہاں آئے ہیں۔ جمال بھائی جو ہو سکتا ہے، ان کے ساتھ کریں، میرے لئے جو حکم ہو، میں ویسے ہی حاضر ہوں۔ انہیں چھوڑنا نہیں، یہ تو مجھ پر اور میرے بچوں پر ظلم کرنے آئے تھے۔“

”تم ادھر ہو کر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا اور انہیں دیکھنے لگا۔ فرید نے بڑے کواٹھایا اور اوپر اچھال کر زمین پر بیٹھ دیا۔ پھر چند ٹھڈے اس کے سر میں مارے تو کھل گیا۔ باقی پہلوانوں نے اسے باندھ دیا، دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ چند منٹ بعد وہ درختوں کے ساتھ اُلٹے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ چیخنے چلانے لگے۔ میں نے افضل رندھاوا کو فون ملایا

”یہ آوازین سن رہے ہو؟“

”کون ہیں یہ، تو وہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تو میں نے کہا۔

”ہاں۔! یہ سب تیرے ظہور مرزا کی سازش ہے، وہ ان لوگوں سے ملا ہوا ہے اور دھوکا دے رہا ہے۔ اسے پکڑو، دیر کی تو وہ بھاگ جائے گا۔“

”میں پکڑتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی اس نے فون رکھ دیا۔ میں اس وقت سلیم خان کو فون کرنا چاہتا تھا، لیکن کچھ دیر کے لئے رُک گیا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے، جس سے اس کی نیت کا پتہ چل جاتا۔

وہ دونوں لٹکے ہوئے بے حال چکے تھے۔ ان کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ تب میں نے فرید کو اشارہ کیا کہ انہیں اتارو، پہلوانوں نے انہیں اتارا تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکے، گر گئے۔

”بولو! صرف بچ بولنا ہے۔“

”بتاتا ہوں۔“ بڑے نے کہا اور بتانے لگا۔

وہ دونوں بھائی سیالکوٹ کے قریب ”لوہاراں دی کوٹی“ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ اگرچہ وہ وہاں کا شکاری کرتے تھے لیکن ان کا زیادہ تر کام اسلنگنگ تھا۔ یہ حوصلہ انہیں غنڈہ گردی سے ملا۔ وہ اپنے علاقے کے بد معاشوں میں شمار ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے انہی کے علاقے کے ایک سیاست دان نے کچھ زیادہ ہی نوازشیں

شروع کر دیں۔ ادھر ادھر مال لے جانا، انہیں کھانا اور اشتہاری مجرموں کو پناہ دینا ان کا کام تھا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے ایک ڈیرہ بنایا ہوا تھا، جو سیکورٹی کے اعتبار سے کافی مضبوط تھا۔ تقریباً پندرہ دن پہلے ایک بھاری رقم کے عوض انہیں نے میرے قتل کا ٹاسک دے دیا۔ انہیں ٹاسک دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں بھائیوں کے رشتے دار نور مگر میں رہتے تھے۔ وہ یہاں آگئے۔ تب سے لے کر اب تک انہیں موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ وہ ابھی اسی تازہ میں تھے کہ پکڑے گئے۔

”اگر یہی بات پہلے بتا دیتے تو اتنی اذیت نہ سہنی پڑتی، لیکن اب معافی نہیں ہے، انہیں دوبارہ الٹا لٹکا دو۔“ میں نے کہا تو منت کرنے لگے۔ جس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے باقی تین لوگوں کا انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

جسپال کے ساتھ وہ سبھی ایک کمرے میں بیٹھے ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان چائے کے گم پڑے تھے۔ وہ سبھی خوش تھے۔ انہوں نے پوری طرح رویت کور کے معاملے پر بات کر لی تھی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟ یہ سارا معاملہ اصل میں تھا کیا۔

”یار رویت کور۔! یہ جو سب ہوا، اور تو نے کیا، ایک بہت بڑے طوفان سے ہم بچ گئے، جس سے کسی صورت نکلا نہیں جاسکتا تھا، اگر ہم چھن جاتے، تم نے یہ کیا کیسے؟ یہ کچھ باروائی سانس لگتا، جیسے ہم کوئی جادوئی کہانی سن رہے ہوں؟“ باغیتا کو اب تک مطمئن نہیں ہو پائی تھی، اس کے دماغ میں کچھ تھا۔

”دیکھ باغیتا! انہیں سمجھ اس لئے نہیں آ رہی کہ یہ سب تم پر نہیں گذرا۔ اسی لئے میں نے تم سب سے الگ یہ کام کیا تھا، مجھے تم لوگوں کو سمجھانے میں بہت وقت لگ جاتا۔ اب جبکہ یہ ہو گیا ہے تو تمہیں ماورائی لگ رہا ہے۔“ رویت نے کہا

”پھر بھی کچھ پتہ تو چلے؟“ باغیتا کور نے اصرار کیا

”تو سنو۔! یہ جو کمپیوٹر کی دنیا ہے نا، بہت زیادہ ہی ایڈوانس ہو چکی ہے، اور ابھی پتہ نہیں اس نے کیا کیا کرنا ہے۔ ہم جو میکرز ہوتے ہیں، یہ دنیا کی ایڈوانس ترین ٹیکنالوجی کے لئے مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں، ہر وقت یہی چیز ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ اسی کا استعمال کرتے ہیں۔“

”تم نے کیا کیسے؟“ باغیتا کور آرام سے بولی

”ہم یہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اس کی بنیاد دو وجوہات ہیں۔ ایک اپنی بقا، ہمیں زندہ رہنا ہے۔ ہم خود اور اپنی قوم کے ساتھ۔ دوسرا انتقام، جو ہم نے ان سے لینا ہے، جنہوں نے ہم پر ظلم کیا۔ مجھے فوج سے اس لئے نفرت ہے کہ انہوں نے میرے ماں اور باپ کو میرے سامنے زندہ جلایا۔ اندرا گاندھی مر گئی، لیکن میرے باپ نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے کیوں زندہ جلایا گیا۔ میں بے غیرت نہیں جو خاموش ہو جاؤں، میں سکھنی ہوں اور میں نے انتقام لینا ہے، جب تک میری سانس ہے۔ پھر میرے پتا سمان پروفیسر دیوندر سنگھ کو مارا۔ تب سے میں انہیں تلاش کر رہی تھی۔ میرے لئے سب سے بڑا ذریعہ یہی تھا کہ میں ان کے کمپیوٹر کھنگالتی رہوں۔ میں وائرس کی طرح چھٹی رہی اور مجھے پتہ چل گیا کہ دیوندر سنگھ کا ہی چیلہ، اس کی موت کا ذمہ دار ہے۔ اب میں نے اسے مارنا تھا، تم لوگ اپنا نیٹ ورک داؤ پر لگا کر مجھے کبھی بھی یہ سب نہ کرنے دیتے، جبکہ میری راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ میں نے کرنا تھا، چاہے میری جان چلی جاتی۔ صرف اردو سنگھ اس سے واقف تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں، اس سے میں نے مدد لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ سب کر کے کینیڈا بھاگ جاؤں، لیکن حالات کچھ دوسرے بن گئے۔ یہ تھی بات ساری۔“ اس نے تفصیل سنا دی۔

”یاد راقی یہ ماروائی لگ رہا ہے۔“ سندپ ہولے سے بولی تو رونیت نے ہنستے ہوئے کہا
”تمہیں یا کسی بھی آدمی کو یہ ماروائی لگنا ہی ہے۔ اس کی وجہ میں بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی
پھر کہتی چلی گئی۔ ”صدیوں سے یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ انسان اسی سے خوف کھاتا ہے، جسے وہ سمجھ نہیں سکتا۔
یہاں تک کہ انسان نے ستاروں کی پوجا کی، چاند سورج، زمین، جنگہ تم دیکھتی نہیں ہو، ہندو لوگ، چوہے، اور سانپوں
کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ لیکن جسے سمجھ آتی گئی، اس نے پوجا چھوڑ دی۔ دنیا ہر لمحے ایڈوانس ہو رہی ہے۔ پچھلے
پچاس برسوں میں ٹیکنالوجی اتنی ایڈوانس ہوئی ہے کہ آج سے سو برس پہلے والا انسان خوف ہی سے مر جائے کہ یہ کیا
ہو رہا ہے۔ جنہیں سمجھ نہیں آتی وہ آج بھی یہ نہیں مانتے کہ ریڈیو سے آواز کیسے نکل سکتی ہے۔ لیکن اب بات تو اس
سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ یہ بڑی معمولی سی مثالیں ہیں۔ اب دنیا میں وہ کچھ ہو رہا ہے کہ آج کے عام آدمی کو پتہ
چلے تو وہ بھی نہ مانے۔ کیونکہ اسے سمجھ نہیں۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ یار یہ اتنی تیزی سے ہو کیسے رہا ہے۔“ سندپ نے پوچھا

”خیال، سوچ۔ ایک خیال ہی تا جو انسان کے دماغ میں آتا ہے۔ وہی حقیقت کا روپ دھارتا چلا جا رہا ہے
کمپیوٹر کی دنیا میں جا کر مجھے اپنی ضرورت کے مطابق خیال آتا ہے، میں اسے حقیقت کا روپ دینا چاہوں گی، وہ ہو
جاتا ہے۔ جسے سمجھ نہیں ہے وہ اسے ماروائی خیال کرتا ہے۔“ رونیت نے جواب دیا
”ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر حقیقت کے پیچھے ایک سوچ موجود ہوتی ہے؟“ سندپ نے پوچھا
”بالکل، جیسے یہ مکان، کسی کی سوچ ہی تھی، یہ دنیا، یہ کائنات رب کا خیال ہی تو ہے۔“ رونیت کو نے جواب دیا
تو گرلین بولی

”یہ سوچو۔ اس وقت دنیا بھر کے انسانوں کے دماغوں میں جو سوچیں ہوں گی، اس سے دنیا کتنی ایڈوانس ہو سکتی
ہے۔ اگر وہی سب انسانوں پر ظاہر ہو جائے تو.....“

”یہ ہو رہا ہے، دنیا ایک صفحے پر آ رہی ہے اپنی سوچیں لے کر، کیا کمپیوٹر پر ساری دنیا کے لوگ اپنا اپنا حصہ
نہیں ڈال رہے ہیں؟ وہاں سے ان کی سوچ کا پتہ نہیں چل رہا ہے؟ ہم سوچ دے بھی رہے ہیں اور وہاں سے لے
بھی رہے ہیں۔ ایسے ہی ہمارے گرو مہاراج نے کہا کہ اک اونکار۔ (رب ایک ہے) اس کی ایکٹا سے ساری
کثرت ہے اور اسی کثرت میں میرے رب کا ایک ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ ماروائی کچھ نہیں، جو سوچ ہے وہی حقیقت
ہے، دیکھو، اب جو تم سوچ رہی ہو، وہ ہو رہا ہے، کوئی بھی سوچ ہے، وہ حقیقت کا روپ دھارتی ہے، جسے ادراک،
سمجھ نہیں، یا جسے علم نہیں، وہ اسے جھوٹ اور ماروائی سمجھتا ہے۔“ رونیت نے کسی جذب سے کہا تو جہاں نے کہا
”اچھا بس کرو گرو مہاراج، اب میری بات سنو۔“

”سناؤ جی، ہم سن رہی ہیں۔“ باغیا کو نے کہا

”میں نے ایک پلان کیا ہے اگر تم لوگوں کو پسند ہو تو؟“ جہاں بولا

”وہ کیا؟“ سندپ کو نے چونک کر کہا

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چند گز چھوڑ دینا چاہئے، چاہے کچھ عرصے کے لئے سہی۔“ اس نے گہری
سنجیدگی سے کہا

”میرے خیال میں ہمارے لئے ابھی یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے، سوائے رونیت کے، وہ اگر باہر کہیں لٹکے گی تو ہی
لگا ہوں میں آئے گی۔“ باغیا کو نے کہا تو تین کو نے پر سوچ لےجے میں کہا

”جہاں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں غیر محتاط ہو جانا ہی ہوتا ہے۔ اس کی تلاش تو ہوگی اور بھر پور طریقے سے
ہوگی۔“

”وہی تو کہہ رہی ہوں کہ فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا وقت گزار لیں، پھر نکل
جائیں گے۔“ باغیا کو اپنی بات پر آڑی ہوئی تھی

”چلو ٹھیک ہے، جیسے تم کہو، لیکن مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔“ جہاں نے کہا

”کیوں، تمہیں یہاں سے کیوں جانا ہے، یار ہم لڑکیاں اسکی رہ جائیں گی، تو ہی تو ایک کھلونا ہے ہمارے پاس،
ہمارا جی کیسے لگے گا۔“ باغیا کو نے جان بوجھ کر بچوں کی مانند کہا تو جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا
”فضول بکواس مت کرو، یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے سے.....“

”نہیں، ہم فضول نہیں بیٹھے، میرے پاس ایک بہت بڑا کام ہے، وہ اگر سن لو تو؟“ رونیت کو نے انتہائی سنجیدگی
سے کہا

”اچھا سناؤ۔“ باغیا کو نے تحمل سے کہا تو رونیت اسے سمجھاتے ہوئے بولی

”جہاں سنگھ ٹھیک کہہ رہا ہے کہ اسے یہاں سے جانا ہوگا، شمس الدین اور قمر الدین کو بچانا بہت ضروری ہے، وہ
بہت حساس ہیں، وہ پتہ نہیں کیا کیا چسکار دکھا سکتے ہیں۔ تم چاروں ادھر رہو، یا بعد میں جالندھر آ جاؤ، یا جہاں بھی،
وہیں سے بیٹھے سب آپریٹ ہو جائے گا، بس ان دونوں کو بچانا ہوگا۔“

”اوکے ڈن، تو پھر تم دونوں نکلو یہاں سے۔“ باغیا کو نے فیصلہ کرنے میں لمحہ لگایا۔ تبھی وہ دونوں اٹھے اور نکلنے
کے لئے تیاری کرنے لگے۔

☆.....☆.....☆

وہ تینوں میرے سامنے تھے۔ انہوں نے ان دونوں بھائیوں کو درخت سے بندھے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ
ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ان میں سے دو بالکل نوجوان تھے۔ ان کی نستیں بھیگ رہی تھیں۔ ایک قدرے
اُدھیڑ عمر تھا۔ میں نے ان کا جائزہ لیا اور فرید کو اشارہ کر دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی پہلوان آگے بڑھے، انہوں نے
گڈی سے پکڑ کر آگے لانا چاہا تو وہ نو عمر لڑکے مزاحمت کرنے لگے۔ پہلوانوں نے انہیں پکڑ لیا۔ انہیں اٹھایا، سر پر
سے گھمایا اور زمین پر دے مارا۔ یکے بعد گرے تو ان کے حواس ہی تھل تھل ہو گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر ادھیڑ عمر نے کہا
”ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

اُس کے اس طرح پوچھنے پر فرید نے پوری قوت سے سے گھونسا اس کی گردن پر مارا وہ چکرا گیا۔ تبھی پاس
کھڑے جنید نے پوچھا

”تم بتاؤ، تم اس علاقے میں کیوں ہو؟“

”ابھی نہیں پوچھنا، فرید کو تھوڑا ان کی مالش کر لینے دو، پھر یہ بات کرنے کے قابل ہوں گے۔“ میں نے کہا تو
ان پہلوانوں نے ان تینوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کے چند منٹوں ہی میں وہ اُدھ موئے ہو گئے، شاید
ابھی تک وہ اس لئے نہیں بول رہے تھے کہ انہوں نے باقی دو کو درختوں سے لٹکتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ ان کے گمان میں تھا
کہ انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہوگا تو وہ بھی پکے ہو جائیں۔ میں نے درختوں سے لٹکتے ہوئے دونوں لڑکوں کو
اتر دیا۔ وہ زمین پر گر گئے۔

”تم لوگوں کو یہ ٹاسک کس نے دیا؟“

”ہمارے سردار صاحب ہی ہمارے لئے سب کچھ ہیں، انہوں نے ہمارے ذمے کام لگایا اور ہم یہاں آگئے۔“
”کتنی دولت ملتی تھی؟“

”کام کے ہو جانے کے بعد جتنی مانگ لیتے، دس سے پندرہ لاکھ۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ رقم اس کے لئے بہت بڑی ہو۔ تب میں نے پوچھا

”اگر اس سے دو گنا رقم میں دوں تو کیا تم اپنے اس سردار صاحب کو مار دو گے؟“

”وہ تو ہمارے مائی باپ ہیں ناجی، ہمارا سب کچھ انہی کی وجہ سے تو چل رہا ہے ناجی۔“

”ٹھیک ہے، کرتے ہیں اس سے بھی بات۔“ میں نے کہا اور پھر ان تینوں ٹٹکتے ہوئے بندوں کو اتارنے کا اشارہ کیا۔ پہلوانوں نے انہیں اتار لیا۔ ان کی حالت بری ہو رہی تھی۔

”تم دونوں بھی اس ان کے ساتھی ہو یا تمہیں کسی دوسرے نے بھیجا ہے؟“

”ہم تو یونہی سیر کرنے آئے تھے ادھر؟“ ادھیڑ عمر اب بھی اڑا ہوا تھا۔ جنید نے اس کی گردن پر گھونسا مارتے ہوئے کہا

”گلتا ہے تمہیں اپنی زندگی نہیں چاہئے۔“

”ٹھیک ہے، یہ اگر اس طرح نہیں مانتے تو انہیں پورا ثبوت دو، ان کے جرم کا، یہ ثابت کر دو کہ یہ یہاں کس کام کے لئے آئے ہیں۔ پھر اس کے کٹوے کٹوے کر کے پھینک دینا۔“ میں نے جنید کی طرف دیکھ کر کہا اور اٹھ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر ذرا وقت لے گا، باقی وہ نئے لڑکے جلدی بول پڑیں گے۔ میں اکیلا ہی کار میں بیٹھا اور حویلی کی طرف چل پڑا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور وہ ہو کر رہے گا، کیا ہو سکتا ہے، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں حویلی پہنچ گیا۔ میں اس وقت لاؤنج ہی میں تھا کہ مجھے چوہدری اشفاق کا فون ملا۔

”وہ تینوں بول پڑے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ ان نوجوانوں کا تعلق پسرور سے ہے اور وہ ادھیڑ عمر لاہور کے نواح کا ہے۔ تینوں ہی تمہیں قتل کرنے کی غرض سے اس علاقے میں آئے تھے۔“

”یہ پوچھا، انہیں کس نے بھیجا ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا

”ہاں پوچھا لاہور میں ایک بزنس مین ہے، چوہدری رفاقت اس نے انہیں یہ ٹاسک دیا تھا۔“

”وہ کوئی سیاست دان ہے؟“ میں نے پوچھا

”جی، اسمبلی کا رکن ہے۔ پارٹی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے کہا

”ٹھیک ہے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

میں ایک لمحہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ اچانک سیاست دان میرا گھیراؤ کیوں کر رہے ہیں۔ یہ تین لوگ تو میرے سامنے آگئے تھے۔ ممکن ہے اب بھی علاقے کوئی ایسے لوگ ہوں، جن کے بارے میں ابھی پتہ نہ لگا ہو۔ ملک حیات، سردار صاحب اور چوہدری رفاقت۔ تینوں ہی میں مشترک بات یہ تھی کہ وہ سیاست دان تھے، ایک ہی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور تینوں کا ریکارڈ کرپشن کے حوالے سے خراب ہی تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ان کا کردار اپنی جگہ، لیکن میری اُن سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے، وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟ اسی سوال کے پردے میں سب چھپا ہوا تھا۔ اور اسے میں نے ہی تلاش کرنا تھا۔

میں حویلی پہنچا ہی تھا کہ سلیم خان کے آنے کی اطلاع ملی۔ میں نے اسے اندر ہی بلا لیا۔ وہ میرے سامنے

صوفے پر آن بیٹھا اور بڑی حیرت اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت میں بولا۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ کے بارے میں کوئی اتنا برا پلان کرے گا۔ میں اب تک اسے یونہی سمجھ رہا تھا، اگر آپ چوکنانہ ہوتے تو اب تک یہ لوگ اپنا کام کر جاتے۔“

”آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا

”یہی کہ اس کے پیچھے کوئی بڑا پلان ہے، خطرہ ابھی ختم نہیں ہوا، میرے خیال میں ابھی تو یہ شروعات لگتی ہیں۔ اگر ظہور مرزا انہیں راہ نہ دیتا تو شاید وہ اس علاقے میں آنے کی جرات بھی نہ کرتے۔“ وہ اپنی رُو میں کہتے ہوئے ایک دم سے چونک گیا، پھر صفائی دینے والے لہجے میں بولا، ”دیکھیں، میری ظہور مرزا سے سیاسی مخالفت اپنی جگہ۔ لیکن ہم علاقے کے لوگ ہی ایک دوسرے کو مروانے لگے تو یہاں کیا بچے گا، میں یہاں کوئی صفائی دینے یا ظہور مرزا کی مخالفت میں نہیں آیا، میں اس لئے آیا ہوں کہ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہئے، میں آپ کے ساتھ ہوں، میرے لائق جو بھی خدمت ہو میں حاضر ہوں۔“

”بہت شکریہ سلیم خان، اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں ضرور کہوں گا۔“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے اس کا چہرہ افسوس زدہ سا لگا۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھا رہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا

”میں اجازت چاہتا ہوں، میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔“

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو وہ چلا گیا۔ میں اٹھا اور اونٹنگھ کے پاس جا بیٹھا

سرمہ نے ملک حیات کو پکڑ لیا تھا اور وہ اس کے سیف ہاؤس میں تھا۔ اس نے کسی خوف کے بغیر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس نے مجھے قتل کروانے کے لئے بندے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر آدھے کھٹنے میں اسے نہ چھوڑا گیا تو سرمہ پکڑا جاسکتا ہے۔ سرمہ بھی اور میں بھی یہ بات سمجھ رہے تھے کہ ہوا یا کیوں کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان، دونوں طرف کی صورت حال واضح تھی۔ وہ ملک حیات کی ساری دھمکیاں بڑے سکون سے سن رہا تھا۔ وہ صرف میری اجازت کے انتظار میں تھا کہ میں اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہوں۔

یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ وہ تینوں ہی کسی کے مہرے تھے۔ بات میرے قتل کی بھی نہیں تھی۔ انہیں مجھے قتل کروانا ہوتا تو اب تک کوئی بھی اندھی گولی مجھے چاٹ چکی ہوتی۔ وہ کرنا کیا چاہتے ہیں، یہی بات سمجھنا تھی۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔ افضل رند حاد نے ظہور مرزا کو گرفتار تو نہیں کیا، ویسے ہی تھانے میں پابند کر لیا تھا۔ مسافر شاہ کے تھڑے پر موجود پکڑے ہوئے لوگوں نے اقرار کر لیا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لئے ہیں۔ ان کا یہاں پر سہولت کار کون تھا۔ ساری تفصیل جان لینے کے بعد جنید اور چوہدری اشفاق انہیں شہر افضل رند حاد کے پاس لے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے اقرار کیا، ان کے خلاف ایف آئی آر درج ہو گئی اور انہیں حوالات سے جیل بھیج دیا گیا۔ میں نے جان بوجھ کر انہیں پولیس کے حوالے کیا تھا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حاکم وقت اس سازش میں کس حد تک شریک ہیں۔ شام ہونے تک ایسا سکون چھا گیا، جس کے پیچھے ایک طوفان چھپا ہوا ہوتا ہے۔

شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میں نے سب کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ کچھ دیر تک ان کے ساتھ گپ شپ لگائی اور کمرے میں آ گیا۔ میرے پیچھے ہی سوئی آ گئی۔ اس نے آتے ہی پوچھا

”کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہے ہیں، خیر تو ہے نا، کوئی.....“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، ایک سازش بنی جا رہی ہے، بس اسے ختم کرنا ہے۔“

”سازش، کیسی سازش؟“ سوئی نے پوچھا

”مجھے لگ رہا ہے، اس کے پیچھے کچھ ہے، وہ سامنے آ جانے پر ہی پتہ چلے گا۔“ میں نے کہا
”کیسے پتہ چلے گا؟“ اس نے پوچھا

”میں ابھی نکل رہا ہوں، دیکھتے ہیں۔“ میں سکون سے کہا تو وہ حیرت سے بولی
”یہ کیا بات ہوئی، ابھی تانی کی شادی ہے، آپ نے خود کہا کہ سادگی سے شادی کر دی جائے، دو دن بعد اس کی
شادی ہے، سب لوگ آرہے ہیں، یہاں تک کہ مہر خدا بخش بھی، اب.....“
”میرا جانا ضروری ہوگا، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اتنے سارے لوگ یہاں ہو گئے، میں اگر یہاں نہ ہوا تو یہ اچھا
ہوگا، دشمنوں کو میری ضرورت ہے، وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں، سو تانی کی شادی آرام سے ہو جائے گی، میں دشمنوں
کو دوسری طرف مصروف.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولی

”نہیں، میں نہیں جانے دوں گی، یہ وقت نہیں ہے، آپ کو ادھر ہی رہنا ہوگا۔ میں اماں سے کہتی ہوں۔“ اس
نے اپنی بات منوانے کے لئے مجھے دھمکی تک دے ڈالی۔ میں خاموش ہو گیا۔ مجھے راہ سمجھائی نہیں دے رہی تھی کہ
مجھے کرنا کیا ہے۔ میں نے سوئی کی طرف دیکھا، پھر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ میرے قریب ہو کر بیٹھ
گئی۔ اس نے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد بولی
”سوری میں کچھ زیادہ ہی بول گئی ہوں۔“

میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلے گئی۔

☆.....☆.....☆

جگمگ سنگھ کی کار پورے پرنٹو کول کے ساتھ چند گڑھ سے نکل رہی تھی۔ جہاں سنگھ اور رونیت کور اسی
کار میں تھے۔ آگے اور پیچھے پولیس سیکورٹی تھی۔ رونیت کور نے اپنے آپ کو کافی حد تک بدل لیا ہوا تھا۔ اس نے
بہترین تراش کا سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس سے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ ان کیساتھ ہی کی کوئی اسمبلی رکن ہو۔ وہ
موہالی انڈسٹریل ایریا سے کھرا جا رہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک قصبہ نما جگہ تھی
۔ آبادی بے پہلے ہی سڑک سے اتر کر وہ ایک حویلی میں چلے گئے۔ جہاں کچھ دیر بیٹھ کر جگمگ سنگھ تو واپس چلا گیا،
جبکہ انہیں وہاں سے جدید ماڈل کی ایک کار مل گئی۔ کھراہ سے جالندھر کا راستہ تقریباً تین گھنٹے کا تھا، سہ پہر ہونے
سے پہلے ہی وہ وہاں پہنچ گئے۔

فارم ہاؤس دیکھنے میں یوں لگ رہا تھا، جیسے وہاں پر کوئی ہو ہی نہیں۔ چند ملازم وہاں تھے۔ وہاں پر موجود منیجر کو
پتہ تھا کہ وہ آرہے ہیں۔ وہ ان کے انتظار ہی میں تھا۔ پورچ میں وہ کار کھڑی کر کے اندر ڈرائنگ روم میں چلے گئے
۔ ابھی جہاں سنگھ نے منیجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”ہم نے یہاں رہنا نہیں ہے، ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔ یہ کار واپس جائے گی، لیکن انہیں یہ نہیں بتانا
کہ یہ جالندھر سے واپس آئی ہے، کسی بھی شہر کا نام لے دینا، دوسرا ایک مضبوط کار ہمیں چاہئے ہوگی، جو اپنی نہ ہو،
اس کا بندوبست کرو۔ شمس اور قمر کو تیار کر کے لے آؤ، کہنا ابھی جانا ہے اور سورج ڈھلنے سے پہلے پہنچنا ہے۔“

”مجھے صرف دس منٹ دیں، میں سب کر دیتا ہوں، ایک کار ہے ہمارے پاس ایسی، جو کچھ دن پہلی ہی ہمارے
پاس آئی تھی۔“ منیجر نے کہا اور اگلے قدموں واپس چلا گیا تو رونیت کور نے پوچھا

”جہاں، یار انہوں نے سرحد پار کرنی ہے، کچھ بندوبست بھی ہے یا یونہی چل رہے ہو؟“

”سب ہو گیا ہے، اب بس انہیں یہاں سے خیریت کے ساتھ نکالنا ہے۔“ اس نے جواب دیا تو رونیت

کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

دس منٹ کے بعد دو لمبے قد کے کسرتی جسم والے نوجوان ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ان دونوں کے نین نقش کافی
حد تک ملتے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ ان کا تعارف کمپیوٹر کے ذریعے ہو چکا تھا

”ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہئے، جہاں ہم نے جانا ہے وہاں تک کا راستہ بھی ڈھائی گھنٹے کا ہے۔“

”ٹھیک ہے نکلیں۔“ شمس الدین نے کہا تو وہ چاروں باہر پورچ تک آئے جہاں ایک نئی کار کھڑی تھی۔ جہاں
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو باقی تینوں بھی بیٹھ گئے اور کار چل دی۔ ان کا سفر جالندھر کے جنوب مشرق کی طرف تھا۔
راستے میں انہوں نے سینٹوں کے نیچے بڑا ہوا اسلحہ دیکھ لیا تھا۔ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ جسے بہر حال نبھانا تھا۔

سوادو گھنٹے کے لگ بھگ وہ ایک بڑے سارے گاؤں ڈھال میں جا پہنچے۔ ابھی سورج ڈھلا نہیں تھا۔ لیکن مغرب
کے قریب تھا۔ کافی سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ آبادی پار کرنے کے بعد انہیں وہاں سکھی رام حوالدار سے ملنا تھا۔ جہاں
اور اس کے درمیان فون پر بات ہو چکی تھی اور وہ اب تک دونوں ہی لائن پر تھے۔ تقریباً ایک کلومیٹر فاصلہ طے
کرنے کے بعد انہیں ایک شخص کس اوڑھے دکھائی دیا، جس نے لاٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تارچ تھی۔
یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چوکیدار ہو اور اپنے علاقے کی طرف جا رہا ہو۔ وہ سکھی رام حوالدار ہی تھا۔ اس نے پہلے ارد
گرد غیر محسوس انداز میں دیکھا، اپنی لاٹھی اندر کی، پھر خود شمس اور قمر کے ساتھ آ بیٹھا۔ اس نے بیٹھتے ہی پوچھا
”کتنے لوگوں نے جانا ہے؟“

”تین نے۔“ ایک دم سے رونیت کور بولی جہاں نے حیرت سے رونیت کور کی طرف دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ
کچھ پوچھتا سکھی رام حوالدار بولا
”نولا لکھ لگیں گے؟“

”ابھی دوں یا واپسی پر؟“ جہاں نے پوچھا

”ابھی، ابھی دو گے تو میں اس طرف لے کر جاؤں گا نا، یہ رقم زیادہ نہیں ہے، دوسروں کو بھی دینا ہے۔ اور ہاں
ایک بات سن لو، یہاں سے گیٹ پار کرنے کے ایک قدم بعد کچھ بھی ہو جائے، ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔“
”ٹھیک ہے۔“ جہاں نے کہا تو ڈیش بورڈ میں رکھی ہوئی رقم نکال کر اس میں سے نو گڈیاں سکھی رام حوالدار
کو تھما دیں۔ اس نے ایک نگاہ انہیں دیکھا اور انہیں اندر کسی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے فون پر رابطہ کرنا
شروع کر دیا۔

اس وقت وہ باڑ سے چوتھائی کلومیٹر کے فاصلے پر درختوں میں کھڑے تھے۔ باڑ پر لگی ہوئی روشنیاں ابھی روشن
نہیں ہوئیں تھیں۔ سامنے چوکی پر چند لوگ تھے، جو ایک جیب نما گاڑی پر بیٹھ رہے تھے۔ ابھی سکھی رام حوالدار نے کہا
”اس وقت چوکی پر صرف ایک آدمی ہے۔ نئے لوگوں کو آنے میں دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔ وہ جان
بو جھ کر لیٹ آئیں گے۔ یہ تینوں یہاں سے فوراً جائیں۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا

”اور تم؟“ جہاں نے پوچھا

”میں تمہارے ساتھ واپس جاؤں گا، ڈھال تک۔“ اس نے اعتماد سے کہا

”ٹھیک ہے؟“ جہاں نے کہا تو رونیت کور نے حسرت بھری نگاہ سے جہاں کو دیکھا، پھر اس کے گلے لگ کر رو
دی۔ اُن دونوں بھائیوں نے قدم بڑھا دیئے تو جہاں نے اسے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

”فون ہے نا تمہارا پاس؟“

”ہاں ہے۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ان کے ساتھ چل پڑی۔

سکھی رام حوالدار بتانے لگا کہ باڑ کے پار کام کرنے والے لوگ آدھا گھنٹہ پہلے یہاں سے چلے گئے ہیں۔ گیٹ کی چابی اسی بندے کے پاس ہے۔ وہ نئے آنے والوں کو دے کر چلا جائے گا۔ جبکہ جہاں اس کی بات کم سن رہا تھا اور ان تینوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ سکھی رام حوالدار سے پوری طرح چوکنا تھا۔

وہ تینوں تیزی سے بڑھتے ہوئے چوکی کے پاس چلے گئے۔ وہ انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک باوردی شخص نکلا، اس نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خود وہیں کھڑا رہا، وہ تینوں آگے بڑھے، اور جیسے ہی گیٹ کے پاس پہنچے، چوکی ہی کی عمارت میں سے چند لوگ نکلے اور انہوں نے ان تینوں کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی لمحے جہاں سنگھ کا دماغ گھوم گیا۔

”سکھی رام! یہ کیا؟“

”پتہ نہیں، پھنس گئے وہ لوگ؟“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا تو جہاں نے پٹل کی نال اس کے سر پر رکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا

”وہ ہی نہیں تم بھی، چل، انہیں چھڑاؤ، ورنہ تو بھی مارا جائے گا۔“

”مم..... میں نہیں جاسکتا، وہاں دھوکا.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ جہاں نے پوری قوت سے اس کی گردن پر کھرا ہاتھ مارا، وہ سیدھا زمین بوس ہو گیا۔ جہاں نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور چلنے کو کہا، وہ سمجھ گیا کہ یہاں تو موت ہے، ممکن ہے آگے بچت ہو جائے۔ وہ اس کے آگے لگ کر چلنے لگا۔ جیسے ہی اس کے قدم نرم پڑتے، وہ اس کی پسلی میں زور سے گھونسا ماردیتا۔ اس نے پٹل واپس رکھ لیا۔ چند منٹوں وہ چوکی کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں دو سکھ اور دو ہندو فوجی موجود تھے۔ پانچواں وہ تھا، جو برجی سے اتر کر ان کے پاس آ گیا تھا۔ انہیں یوں آتا دیکھ کر ان میں سے سینئر نے آگے بڑھ کر کہا

”ابے اوسکھی رام! کتنی رقم لی ہے ان سے؟“

”نولاکھ۔“ اس نے تیزی سے کہا

”بات تو دو بندوں کی ہوئی تھی، یہ تیسری کون ہے، چھمک چھلو۔“ اس نے رونیت کور کی طرف دیکھ کر ہوس بھرے لہجے میں کہا

”صاحب جانے دیں انہیں، رقم میرے پاس ہے، دوسرے آتے ہوں گے۔“ سکھی رام نے غصا لہجے میں کہا

”یہ سکھی رام، ہمیشہ دوسروں کو پیسے دیتا ہے اور ہمارے ساتھ بات ہی نہیں کرتا، جتنی رقم میرے حصے میں آتی ہے، اتنی تو سرکار بھی دے دے گی۔ ترقی الگ، سیدھے ہو جاؤ، فائر ماروں گا۔“ اس نے سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے کہا

”زیادہ رقم چاہتے ہو تو میں ابھی دے دیتا ہوں، انہیں جانے دو۔“

”یہ دونوں چلے جائیں، یہ لڑکی رات ادھر رہے، صبح اسے جانے دیں گے، کہو سودا منظور ہے؟“ اسی سینئر نے کہا

تو جہاں کا دماغ کھول اٹھا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور بڑے سکون سے کہا

”دیکھ! رقم میری کار میں پڑی ہے، تین چار لاکھ تو ہوں گے، اپنے کسی بندے کو ابھی بھیج دے، وہ لے آتے ہیں، انہیں پار جانے دو، اگر نہیں قبول تو یہ رقم بھی رکھو اور ہمیں واپس جانے دو، کہو کیا کہتے ہو۔“ جہاں نے پھر کہا

”یہ رقم والی بات ٹھیک لگتی ہے، چل ٹھیک ہے، لے آتا ہے۔“ اس نے اپنے ایک بندے کو اشارہ کیا تو ساتھ میں ایک دوسرا بندہ بھی چل پڑا۔ جہاں نے کار کی چابی اسے تھما دی۔ وہ دونوں چابی لے کر تیزی سے کار کی جانب

جانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا، جب سکھی رام نے سامنے کھڑے سینئر کو مخصوص اشارہ کیا۔ جہاں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے، انہوں نے رقم بھی لے لینی ہے اور سب کو مار بھی دیں گے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ وہ الٹ ہو گیا۔ جیسے ہی چابی ان کے ہاتھ میں آئی، انہوں نے گتیں تان لیں۔

”بات یہ بھائی! ہم یہاں اتنی دور بیٹھے ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں ارد گرد کی کوئی خبر نہیں، یہاں سے وہی جاتا ہے، جو سیدھے راستے سے نہیں جاسکتا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ جاؤ۔ چلو۔“ سینئر نے حقارت سے کہا

”میں کہتا ہوں ہمیں جانے دو۔“ جہاں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر غضب ناک لہجے میں بولا

”جو کہا ہے وہ کرو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے زمین پر فائر کر دیا، جہاں نے بے بسی سے رونیت کور کی جانب دیکھا، دونوں کی نگاہیں ملی، جس میں انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ جہاں نے آگے بڑھ کر منت کرنے والے انداز میں کہا

”یار ایک بار پھر سوچ لو، ہم پار نہیں جاتے، یہیں سے واپس لوٹ جاتے ہیں، رقم بھی رکھ لو۔“

”چار دہشت گرد مریں گے تو ہم کو ترقی ملے گی، لاشیں کون سا بولتی ہیں۔“ سینئر نے حقارت سے قہقہہ لگایا، مگر اس کا قہقہہ اس کے لبوں ہی میں رہ گیا۔ انتہائی سرعت سے اس نے پٹل نکالا اور فائر کر دیا جو اس کے کانڈھے پر لگا۔ یہی کچھ رونیت کور نے کیا، ایک لمحے میں دو ڈھیر ہو گئے۔ اسی لمحے قمر اور شمس آگے بڑھے اور دو کو لے کر زمین بوس ہو گئے۔ جہاں نے فائر کرنے کے بعد جگہ چھوڑ دی تھی، جہاں پر فائر آگاہ۔ تب تک رونیت کور اس پر فائر کر چکی تھی۔ سکھی رام حیرت سے کھڑا، چشم زدن میں ہونے والا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ جہاں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہیں دیا۔ اس نے جا کر اس کی گردن ٹاپ لی۔

فائرنگ سے اس وقت تک مرا کوئی نہیں تھا، سینئر شدید زخمی تھا۔ دوسرے کے ہاتھ پر فائر لگا تھا۔ جہاں سینئر کے پاس جا کر بولا

”مرنا ہے یا گیٹ کھولتے ہو؟“

”مگ..... گیٹ۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا

”چلو پھر،“ اس نے اشارہ کیا، ”تم بھی ہمارے ساتھ پار جاؤ گے، چل سکھی رام۔“

دونوں نے انہیں پٹل پوائنٹ پر رکھ لیا۔ زخمی وہیں پڑا تڑپ رہا تھا۔ جہاں کے ذہن میں تھا کہ باڑ کی ان تاروں میں کرنٹ ہوتا ہے۔ اگر اس وقت ہوا تو سینئر ہاتھ لگانے والا نہیں تھا۔ اگلے منٹ میں وہ باڑ کے پار تھے۔ جس کے آگے کافی دور تک بھارت ہی کا علاقہ تھا۔ وہ سکھی رام اور سینئر کو لے کر جا رہے تھے۔ انہیں یہ ڈر بھی تھا کہ عقب سے فائر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ سینئر چیخ اٹھا

”آگے نہیں جاسکتے ہم، شوٹ ہو جائیں گے۔“

”تو جاؤ، پھر پلٹ جاؤ۔“ جہاں نے کہا تو وہ دونوں پلٹے اور تیزی سے جانے لگے۔ تبھی اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا، ”جتنی جلدی ہو آگے بڑھ کر چھپ جاؤ، کہیں سے بھی فائر ہو سکتا ہے۔“

سامنے پاکستان کی سر زمین تھی۔ ناچاہتے ہوئے بھی جہاں کو سرحد پار کرنا پڑی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر جا کر ایک ٹیکری کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ بھارتی چوکی سے چند فائر ہوئے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ رونیت نے اپنی صورت مال بارے باغیا کو کو بتا دیا۔ وہ ساری باتیں سن چکی تو اس نے دوبارہ فون کرنے کا کہا۔ کچھ دیر بعد اس کا فون آ گیا۔

”وہ لوگ رشوت خور تھے، اور لالچ میں آگئے تھے، اچھا ہوا کہ تم لوگ نکل گئے، ورنہ ان کا ارادہ مارنے ہی کا تھا، یہ چوکی بدنام ہو چکی ہے۔ غلطی کی جو یہاں کے لوگوں کے ساتھ بات کی۔ اب تو وہ بھکتیں گے۔“ اس نے غصے میں کہا تو حپال بولا

”وہ جو بھی ہوگا، بعد کی بات ہے، ابھی کیا کرتا ہے، یہاں تو رنج و دیکھتے ہی گولی مار دے گی۔“

”تم لوگ اس وقت تک چھپے رہو جب تک میں نہ کہوں، میں رابطہ کر رہی ہوں۔ ذرا سا انتظار، دوسری طرف خبر ہے دو بندوں کی، چار کی نہیں تھی، اس لئے شک پڑ سکتا ہے، پھر.....“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہاں سے کافی دور گاڑیوں کی لائٹس دکھائی دیتیں اور پھر غائب ہو جاتیں تھیں، وہ چاروں دیکھے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ تب کہیں جا کر بانٹیا کور کا انیس فون ملا۔ اس نے بتایا ”میری جمال سے بات ہو گئی ہے، تم لوگوں کو یہاں سے پیدل نکلتا ہوگا۔ سمت میں تمہیں بتا دیتی ہوں، یہیں قریب ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں پہنچ جانا۔ وہاں سے کوئی نہ کوئی بندو بست ہو جائے گا۔ اس سے آگے جگہ ہے جاہن، وہیں گردودارہ روڑی صاحب ہے، وہاں پہنچنا ہے۔ اس کے گیانی سے ملنا۔ وہاں سے آگے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر کوئی رستے میں مل جائے تو اسے یہی بتانا ہے کہ گردودارہ روڑی صاحب جا رہے ہیں، آسانی ہو جائے گی۔ یہ علاقہ محفوظ ہو گا تم لوگوں کے لئے۔“

وہ پیدل ہی چل پڑے تھے۔ تقریباً دو کلومیٹر آنے کے بعد انہیں ایک گاؤں دکھائی دیا۔ وہ اس کے قریب جا پہنچے۔ گاؤں کے باہر ہی ایک گھاس پھوس اور مٹی سے بنی ایک کٹیا تھی۔ وہ اس کے پاس پہنچے ہی تھے کہ ایک کتا زور سے بھونکا۔ وہ ٹھٹھک گئے۔ سبھی ایک ادھیر عمر شخص باہر نکلا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ اس نے نرم سے لہجے میں پوچھا

”مسافر ہیں، آگے جانا ہے، ہم سے کسی نے گاڑی چھین لی ہے۔“ حپال تیزی سے بولا

”کہاں جانا ہے۔“ اس نے پوچھا

”جاہن۔“ حپال ہی نے جواب دیا

”میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا

”کوئی گاڑی، یا.....“

”کوئی کار تو یہاں نہیں ہے، ٹریکٹر ٹرائی ہے، وہ مٹی لینے جاتے ہیں اس طرف، کہو تو ان سے کہہ دیتا ہوں، وہ لے جائیں گے۔“ اس نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے۔“ حپال نے فوری ہاں کر دی۔

”تو پھر بیٹھ جاؤ، پانی پیو، وہ ادھر سے گذریں گے تو، میں کہہ دوں گا۔“ اس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور کٹیا میں چلا گیا۔

کافی دیر بعد ایک ٹریکٹر ٹرائی نکلی، اس ادھیر عمر شخص نے اسے کہا تو وہ انہیں لے کر چل دیے۔ رات گئے وہ گردودارہ روڑی صاحب پہنچ گئے، گیانی نے ان کے لئے پہلے ہی سے کار کا بندو بست کیا ہوا تھا۔ وہ اس میں بیٹھے اور چل دیے۔ اس وقت پوہ پھوٹ رہی تھی جب وہ لاہور میں داخل ہو گئے۔ انہیں بتائے گئے گاؤں ٹاؤن محفوظ گھر تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ جاتے ہی سو گئے۔

اس وقت دن روشن ہو رہا تھا، جب میں لاہور میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ جنید تھا، جو کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے فوراً گھر سے نکلنے میں صرف یہی مشکل تھی کہ اماں مجھے نہ روک دے۔ یہ نوبت ہی نہیں آئی تھی اور میں نے سوئی کو سمجھا لیا تھا کہ میرا جانا کتنا ضروری ہے۔ جب اسے پتہ چلا کہ حپال کے ساتھ رونیت کور بھی پاکستان میں آ چکی ہے تو اس نے پھر تردد نہیں کیا۔ میں جنید کے ساتھ لے کر نکل آیا تھا۔

مجھے ماڈل ٹاؤن تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں جب وہاں پہنچا تو چاروں سو چکے تھے۔ ملازمین میرے انتظار میں تھے۔ میں سونہیں سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں گیا، فریش ہونے تک چائے آگئی۔ تبھی میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہی سرمد سے رابطہ کیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ میں نے اپنے پہنچ جانے کی اطلاع دی تو وہ بولا

”گیم کچھ میری کچھ میں آ رہی ہے۔ یہ جو آپ نے تینوں نام بتائے ہیں، یہ مہرے ہی ہیں، ان کے پیچھے کوئی دوسرا ہی ہے۔“

”ملک حیات، سردار صاحب اور چوہدری رفاقت، یہ تینوں ایک ہی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، تینوں مختلف پارٹیوں سے ہیں، لیکن ان کا ایک ہی جگہ متفق ہو جانا، کچھ اور ہی بتاتا ہے، تم ایسا کرو، ملک حیات کو ٹٹولنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا

”وہ میں کر چکا ہوں۔ وہ کچھ نہیں بتا رہا، میرا خیال بھی یہی ہے کہ اسے زیادہ نہیں پتہ۔ اسے بس یہی ٹاسک دیا گیا کہ فلاں کو قتل کر دو۔ میں نے ابھی اس پر تشدد نہیں کیا، آپ کا انتظار تھا۔“ سرمد نے بتایا

”ٹھیک ہے پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر کے چائے پینے لگا۔ میرے ذہن میں کئی خیال آ رہے تھے۔ لیکن دو خیال ایسے تھے، جن پر میں سوچنا چاہتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہی اجنبی، جو سیالکوٹ کے شمال میں کہیں ہے، یہ ساری اس کی چال ہو، اس نے مجھے اگر قتل کرنا ہوتا تو اس طرح مجھے الجھن میں نہ ڈالتا، اب تک مجھ پر حملہ ہو چکا ہوتا۔ اب تک تو اس کا یہی ارادہ لگ رہا تھا کہ وہ مجھے گھیر کر مجھے الجھتا چاہتا ہے، اس کا اصل مقصد کیا ہے، یہ اسی کو پتہ ہو سکتا تھا۔ دوسرا یہ ممکن تھا کہ گیم کچھ دوسری ہی ہو جس کا مجھے ابھی تک گمان بھی نہ ہو۔

میں مانتا ہوں کہ مجھے اپنی صلاحیتوں کا ادراک نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے یہ پتہ تھا کہ میں اندر سے کیا ہوں۔ لیکن انتہائی مشکل وقت میں میری کہیں نہ کہیں سے مدد ہو جاتی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور اگر ہے بھی تو وہ میری ریاضت یا محنت کا نتیجہ نہیں، کسی کی بھی عنایت ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات مجھے خود حیرت ہوتی تھی کہ یہ سب ہو کیسے گیا؟ لیکن میں ایک بات جانتا ہوں، جو ادارک انسانی سوچ میں آ سکتا ہے، وہ حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے، اس پر انسانی تاریخ گواہ ہے۔ مجھے الحقول واقعات سے انسانی تاریخ بھری پڑی ہے، دراصل، آج کا دور مادی ہے اور انسان نے مادی ترقی کیسے اور اس کی عقل میں بھی وہی شے سما سکتی ہے، جس کی کوئی نہ کوئی مادی بنیاد ہو۔ لیکن ماضی میں دور مادی نہیں تھا۔ ایک وقت تھا کہ یہ سوچ دی گئی کہ ششے میں دنیا کو دیکھا جاسکتا ہے۔ آج حقیقت ہے۔ اب اصل معاملہ کیا ہے، جو کچھ بھی ظاہر ہو رہا ہے، وہ انسانی صورت میں سے ہی ہو رہا ہے۔

میں نے یہی سوچتے ہوئے چائے ختم کی اور اٹھ گیا۔ میں سرمد کی طرف جانا چاہتا تھا۔ میں اٹھا ہی تھا کہ طارق نذیر کا فون آ گیا۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے کہا

”سر جی آپ کے ساتھ حکومتی پارٹی کے ایک وزیر ملنا چاہتے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا

”اصل میں یہ بات سامنے آگئی ہے کہ ظہور مرزا سے لے کر ملک حیات، سردار صاحب اور چوہدری رفاقت ان کی کارکردگی ان کے سامنے آگئی ہے۔ انہیں چوہدری رفاقت نہیں مل سکا، میں نے بھی رپورٹ کر دی ہے، معاملہ اوپر تک چلا گیا ہے۔ میرے خیال میں معاملہ رفع دفع کرنے کے لئے کوئی بات چیت ہو سکتی ہے۔“ اس نے بتایا تو میں نے کہا

”لیکن میں ابھی ان سے ملنا نہیں چاہتا۔“

”سرجی وہ کیوں؟“ وہ حیرت سے بولا

”ابھی وقت نہیں۔“ میں نے کہا

”میں سمجھا نہیں؟“ اس نے دوسری طرح سے پوچھنے کی کوشش کی تو میں نے پوچھا

”کیا انہوں نے یہ بتایا کہ وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟“

”یہ تو نہیں بتایا۔“ وہ دھیمے سے بولا

”تو پھر پتہ کرو۔ جب پتہ چل جائے تو مجھے بتانا، پھر بات بھی کر لیں گے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اب طارق نذیر پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ میں ساری سوچیں جھٹکیں اور اوندھنگے کو فون کیا۔ اس سے اجنبی کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

”وہ لاہور چھوڑ چکا ہے۔ اب وہ وہیں پر ہے جہاں وہ پہلے تھا۔ میرا مطلب سیالکوٹ کے شمالی علاقے میں۔“

”ٹھیک ہے رابطے میں رہنا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے اس سارے معاملے کے پیچھے وہی لگ رہا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ جہاں اور رویت ابھی جاگنے والے نہیں ہیں۔ میں انہیں بتائے بنا ہی نکلتا چاہتا تھا، مگر ان سے ملے بغیر جانے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اسی کشمکش میں بیٹھا تھا کہ طارق نذیر کا پھر سے فون آ گیا۔ اس کا وہی پیغام تھا۔ میں نے پھر وہی جواب دے کر فون بند کر دیا۔ مجھے اب طارق نذیر پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں سرد کی طرف جانے کے لئے اٹھ گیا۔

وہ اس وقت مغل پورہ سے کافی آگے ایک نئے ٹاؤن میں نو تعمیر شدہ بنگلے میں تھا۔ وہیں اس نے ملک حیات کو وہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ میرے انتظار ہی میں تھا۔ ہم بہت عرصے بعد ملے تھے۔ وہ کافی صحت مند ہو گیا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط لگ رہا تھا۔ وہ انتہائی خوشی سے مجھے ملا۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے پوچھا

”کہاں ہے وہ ملک حیات؟“

”تہہ خانے میں رکھا ہوا ہے۔“ اس نے کہا

”کچھ بتایا، کوئی اہم بات؟“ میں نے پوچھا

”مجھے تو کچھ نہیں بتایا، آپ دیکھ لیں اسے۔“ وہ بولا تو میں اٹھ گیا۔ ایک کمرے میں سے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتی تھیں۔

ملک حیات دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک لوہے کی چار پائی پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور کافی حد تک نڈھال لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھالیں اور یوں دیکھنے لگا جیسے اسے بہت زیادہ غصے میں ہو۔ میں اس کے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا، پھر بڑے طنزیہ لہجے میں پوچھا

”ابھی تک کوئی حکومتی بندہ تجھے چھڑانے نہیں آیا، بڑے دعوے کر رہے تھے تم؟“

”تم کون ہو؟“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا

”وہی جو تیرے سارے کالے دھندوں سے واقف ہے، بول، میرے سوال کا جواب دے۔“ میں نے اس کی ٹھوڑی کو انگلیوں کی پور سے اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ نہ بولا تو سرمد نے کہا

”یہ سمجھتا ہے کچھ نہیں بولے گا لیکن اب بولے گا، کیونکہ میں نے ابھی تک اسے کچھ نہیں کہا۔“

”یہ چیخ چیخ کر بولے گا۔“ میں نے کہا اور ایک زوردار گھونسا اس کے سینے پر مارا، وہ کھانسا ہوا دہرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی سانس بند ہونے لگی ہے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے پوچھا: ”بول، جمال کو مارنے کے لئے کس نے کہا تھا؟“

”بب..... بتا..... بتاتا ہوں۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا

”بولو۔“ میں نے پوچھا تو وہ کچھ دیر تک سانس بحال کر کے بولا

”میرا کچھ باہر کے لوگوں کے ساتھ رابطہ ہے، انہوں نے آفر کی تھی۔“

”جانتے ہو وہ کون ہے؟“

”بس فون پر رابطہ ہے، ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، ہم کون سا ان سے ملتے ہیں۔“

”بات کرا سکتے ہو؟“ میں نے کہا

”میرا فون دو، میں بات کرتا ہوں۔“ اس نے سرمد کی طرف دیکھ کر کہا تو سرمد نے اپنی جیب سے اس کا جدید فون نکالا اور اسے دے دیا۔ اس نے جلدی سے فون پکڑا، نمبر تلاش کیا اور پیش کر دیا۔ میں نے فون اس سے لے کر اس کا آپٹیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر بعد نمبر ملا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا کاروائی ہے۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے کسی نے ہیلو کہا تو

ملک حیات بولا

”میں تمہاری وجہ سے پھنس گیا ہوں اور مجھ.....“

”تو پھر میں کیا کروں؟ تم پھنسیا نکلو، تم نے رقم لی ہے کام کی، یا تو کام کرو ورنہ میری رقم مجھے واپس دے دو۔“

صاف اردو میں پوچھا گیا تو اس نے حیرت سے کہا

”یہ کیا بات کر رہے ہو تم؟“

”وہی جو تمہیں سمجھ جانا چاہئے۔ میری رقم واپس نہ کی تو میں واپس لینا جانتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم کام نہیں کر سکتے ہو، وہ جمال تم تک پہنچ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارے پاس بیٹھا، یہ بات سن رہا ہو۔ اب مجھے فون کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

ملک حیات کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ میں گیم سمجھ رہا تھا۔ اس لئے میں نے سرمد سے کہا

”اسے واپس بھیج دو۔ اب اسے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا اور واپس چل دیا، تبھی ملک

حیات کے منہ سے نکلا

”تو..... تم جمال ہو؟“

میں نے اس کی بات کو جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور سیڑھیاں چڑھ کر لاؤنج میں آ گیا۔ میں کچھ دیر سرمد کے ساتھ رہا اور اسے تیار رہنے کا کہہ کر ماڈل ٹاؤن چل دیا۔

میرے دہاں پہنچنے تک دوپہر ہو گئی تھی۔ لاؤنج میں جہاں کے ساتھ شمس اور قمر دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان سے ملا اور کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں رویت بھی آگئی۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں میرے گلے لگ گئی

”دیرے، میں نے تمہیں بہت مس کیا۔“

”چکی بات تو یہ ہے کہ میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا، خیر اچھا ہوا، تم آگئی ہو، اب ان دونوں بھائیوں کو لے کر نکلو نورنگر، ہمیں کچھ کام ہے، وہ کر کے آتے ہیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جہاں نے نہیں پوچھا کہ کدھر جانا ہے۔ وہ خاموش رہا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں، جہاں اور جنید چل پڑے۔ جس وقت ہم نے فورہیل میں دریائے راوی کا بل پار کیا تو جہاں نے پوچھا

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”سیالکوٹ۔“ میں نے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

ہم سیالکوٹ شہر سے نکل کر دریائے چناب پر موجود ہیڈ مرالہ تک جا پہنچے تو شام اتر رہی تھی۔ ہم وہاں رک گئے۔ پانی میں خاصی طغیانی تھی۔ پانی کا رنگ اتنا نیلا نہیں تھا لیکن ڈھلتے ہوئے سورج میں پانی پر سنہرا پن اتر آیا تھا۔ دریا کنارے بیٹھنے کے لئے شیخ رکھے ہوئے تھے۔ میں فورہیل سے اتر آیا اور دریا کنارے جا کھڑا ہوا۔ میرے سامنے ایک دلکش منظر تھا۔ میں کچھ دیر محویت سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ میرے پاس جنید اور جہاں بھی آکھڑے ہوئے۔

”یہاں کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟“ جہاں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا تو میں نے کہا

”ابھی یہاں ایک نوجوان آنے والا ہے، ہمیں اس کا انتظار ہے۔“

”اس کے بعد کیا کرنا ہے، کوئی.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”سکون سے بیٹھیں تو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔“ میں یہ لفظ ابھی کہہ رہی رہا تھا کہ فورہیل سے چند قدم کے فاصلے پر سفید کار میں ایک درمیانے قد کا وجہہ اور صحت مند نوجوان اتر آیا۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا تو ہمارے قریب آگیا۔ وہ سیدھا میری جانب آیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھاتے ہوئے پوچھا

”آپ جمال صاحب ہیں۔“

”نہیں صرف جمال ہوں وسیم کھوکھر صاحب۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ پھر پر جوش لہجے میں بولا

”تو چلیں پھر میرے گاؤں۔“

”چلو۔“ میں نے کہا اور فورہیل کی جانب بڑھا۔ کچھ دیر بعد ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے دھلے وال تک جا پہنچے۔ وہیں گاؤں سے ہٹ کر اس کا ڈیرہ تھا۔ جہاں معمول سے ہٹ کر انتظام تھا۔ بڑے سارے صحن میں چار پائیاں چھٹی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھے ہی مہمان داری شروع ہو گئی۔ یہ سلسلہ ذرا تھا تو میں نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”یار، ہم جس مقصد کے لئے آئے ہیں، کیوں نا اس پر بات کر لیں۔“

”جی بسم اللہ، ضرور کریں بات۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں موجود ملازمین کو ہٹا دیا۔ ہم چاروں ہی تھے۔ میں نے اس سمیت سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

”اس علاقے میں ایک شخص ہے، جسے مجھے پکڑنا ہے۔ وہ انتہائی چالاک، ذہین اور زیرک ہے۔ اس نے مجھے سمجھا کر رکھ دیا ہے، لیکن کیوں وہ ایسا کر رہا ہے، اس کی مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔ اب تک ملکی سطح کے تین سیاست دانوں کو اس نے سمجھو خرید لیا ہے، ان سے کام لے رہا ہے۔ وہ بھی انتہائی معمولی نوعیت کا کام، جو وہ خود بہت آسانی سے کروا سکتا ہے۔ وہ اسی علاقے میں ہے۔“

”کوئی نشانی، کوئی نام پتہ.....“ وسیم کھوکھر نے پوچھا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا

”نام پتہ ہوتا تو میں اب تک جا کر اسے گردن سے نہ پکڑ لیتا۔“

”تو پھر کیسے تلاش کریں گے؟“ اس نے پوچھا

”میں یہ تو بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے، یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن! میں اس تک پہنچ جاؤں گا، تمہاری مدد سے یہ مجھے یقین ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”میں کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا

”تم اپنے علاقے بارے جانتے ہو، میری ٹانگ ٹوٹیوں پر بتاتے جانا۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ پھر کچھ دیر تک اسی موضوع پر بات ہوتی رہی۔ ہم چاروں پلان کرتے رہے کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔

رات کا کھانا کھا کر ہم فورہیل پر نکل پڑے۔ ارد گرد سنگھ نے مجھے گائیڈ کیا تھا کہ دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر موجود گاؤں میں وہ شخص موجود ہے۔ میں حیران تھا کہ جس لوکیشن پر اس نے مجھے اس اجنبی کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ جگہ گنگوال گاؤں بنتی تھی۔ وہاں اور اس کے ارد گرد مختلف فورسز ہمہ وقت رہتی تھیں۔ ایسے میں کسی کا نیٹ درک چلانا، گویا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ اس علاقے میں ایسا کون ہو سکتا ہے جو یہ نیٹ درک چلا رہا تھا۔ وسیم کھوکھر نے ایک بات مزید کہی تھی کہ ایسا کئی بھی نیٹ درک ان فورسز کی نگاہوں میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یا تو یہ بہت جدید قسم کا ہوگا، جو رینج میں نہیں آ رہا، لیکن ایسا کیا جدید ترین نظام فورسز کے پاس نہیں، جو وہ اسے پکڑ نہ سکیں۔ مجھے بھی یہی الجھن تھی، مگر میں رکا نہیں، میں ایک بار اسے دیکھنا چاہتا تھا جو یہ جدید ترین نیٹ درک پر کام کر رہا تھا، ممکن ہے ابھی فورسز میں انفرادی طور پر کوئی اس سطح پر پہنچا ہو، لیکن اسفیشلی ایسا نہ ہوا ہو۔ کئی خیال ذہن میں آتے چلے گئے۔

ہم دریا کنارے چلتے چلے جا رہے تھے۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جس سے دریا کا پانی چاندی جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ ارد گرد سنگھ مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم وہاں کے مقامی لوگوں سے بھی بچنا چاہتے تھے اور اس اجنبی کو تلاش بھی کرنا تھا۔ اس لئے آبادی سے دور دور چل رہے تھے۔ ہمیں یہ خطرہ بھی تھا کہ یہاں موجود کسی بھی فورس کے ہتھے چڑھے تو بہت سارا وقت ضائع ہوگا۔ دوسرا بہت دور تک جائے گی۔ جبکہ میں ایک اہم وزیر سے ملاقات کرنے سے انکار کر کے آیا تھا۔

ہم چاروں گنگوال کے قریب پہنچ گئے۔ وہیں سے ارد گرد سنگھ نے مجھے بتایا کہ اس کی نشاندہی جنوب کی طرف ہو رہی ہے۔ ہم اس طرف چل پڑے۔ وسیم کو اس علاقے سے پوری طرح واقفیت تھی۔ وہ پوری طرح راہنمائی کر رہا تھا۔ ہم گنگوال سے باہر کی طرف سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ گنگوال پار کر گئے۔

”بھاء جی، آگے صدر پور ہے، اس کے درمیان جنگل ہے۔ دیکھیں وہ کہیں یہاں نہ ہو؟“ وسیم نے بتایا۔ لیکن ارد گرد کے مطابق وہ آگے آنے والی آبادی سے بھی آگے تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ سمت کا اندازہ تھا، لیکن وہ بالکل دیرانے میں پڑتا تھا۔ ہم صدر پور کی آبادی بھی پار گئے تھے۔

”وہ یہیں کہیں ہو سکتا ہے۔“ میں نے دیرانے میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا، چاہے چاندنی تھی لیکن رات ہونے کی وجہ سے زیادہ دور تک نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

”میری معلومات کے مطابق یہاں آگے غازی پور کی تھوڑی سی آبادی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دو یا چار لوگوں کے کھیتوں میں ڈیرے ہیں۔ کوئی مکان نہیں، کوئی عمارت نہیں۔“ وسیم نے بتایا

”لیکن نشاندہی ادھر کھیتوں ہی میں ہو رہی ہے۔“ میں نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا

”پھر تو کوئی، تہہ خانہ بنا کر ہی کام کر رہا ہوگا۔“ وسیم کھوکھر نے ہنستے ہوئے کہا
”ممکن ہے۔“ میں نے کہا

”تو پھر ایسا کریں، یہ گاڑی یہیں روک دیں۔ ادھر نکلتے ہیں، ممکن ہے کوئی ڈیرے میں اپنا سیٹ اپ جما کر بیٹھا ہو۔“ جہاں ہنستے ہوئے بولا

”چلو۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔“ میں نے کہا تو جنید نے گاڑی روک دی۔ ہم اترے اور اسی سمت چل پڑے۔
اروند سنگھ کا اصرار تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے یہیں ہے، یہاں سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ ہم چاروں آگے پیچھے قطار میں
چل پڑے۔ میں حیران تھا کہ دور دور تک کوئی ڈیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی گھرنیک نہیں تھا۔ ایسے میں کیا وہ
کہیں کھیتوں میں بیٹھ کر اپنا نیٹ ورک چلا رہا ہوگا۔ وہاں سامنے دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اروند سنگھ کو کوئی
شدید غلط فہمی ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے، ورنہ سامنے کی صورت حال کچھ اور ہی کہہ رہی
تھی۔ ہم چلتے چلتے جا رہے تھے۔ میرا رابطہ اروند سنگھ کے ساتھ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کہتا کہ تمہارا اندازہ غلط
ہو گیا ہے، وہ تیزی سے بولا

”بالکل قریب ہو آپ، سمجھو، چند گز پر۔“

میں نے اس کی بات تو سن لی لیکن مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ میرے چاروں طرف کھیت تھے۔ ایک کھیت
میں بھوسہ جمع کیا ہوا ”ٹٹپٹا“ تھا۔ اس کے ارد گرد کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ٹھٹک گیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سب
کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور دھیسے سے لہجے میں پوچھا

”اروند! جس طرف میں چلوں، مجھے بتانا میں درست جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں چل پڑا تو وہ تیزی سے بولا
”بالکل ٹھیک، آپ بالکل قریب ہیں۔“

مجھے شک پڑ گیا کہ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے تو اسی بھوسے کے ڈھیر میں ہے، وہ جو مذاق کر رہے تھے کہ ممکن ہے کوئی
تہہ خانہ ہو، وہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں مختار انداز میں بھوسے کے اس پٹے کے پاس پہنچ گیا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی
تھی۔ میں اس کے ارد گرد پھرتا ہوا وہ جگہ تلاش کرنے لگا، جس سے بھوسہ نکالا جا سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے وہ جگہ مل
گئی۔ میں نے اسے آہستگی سے کھولا تو ایک دم سے حیرت ہوئی۔ وہاں بیٹھنے کے لئے چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی۔
اندر اندر اچھا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی کو ایک کپڑے میں کچھ لپٹا ہوا پڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو حیرت دو چند
ہو گئی۔ اس میں ایک لیپ ٹاپ پڑا تھا، جس کے ساتھ ایک سیل فون دھرا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی اسے ہلایا، وہ سیل
فون بج پڑا۔ میں نے اسے دیسے ہی چھوڑ دیا۔ میں نے پلٹ کر جہاں کو بلایا اور اسے دکھایا۔

”یہاں کوئی آدمی آ کر بیٹھتا ہے اور وہی نیٹ ورک چلاتا ہے۔“ وہ تیزی سے بولا

”تو اب کیا کیا جائے، یہ سیل فون کیوں بجایا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے سوال کیا تو وہ بولا
”سیل فون کا تو مجھے پتہ نہیں کہ کیوں بجایا، لیکن یہ ضرور یقین ہے کہ کھوج یہیں سے لگے گا۔“ لفظ ابھی اس کے
منہ ہی میں تھے کہ ایک دم سے ہم روشنیوں میں نہا گئے۔ روشنیاں سامنے کی طرف تھیں۔ اس میں چاندنی بھی
دب گئی، کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی کسی نے کڑک دار آواز میں کہا۔

”خبردار! کوئی بھی ہلنے کی ہمت نہ کرے، ورنہ گولی مار دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ زکا پھر بولا، ”اپنے ہاتھ
سر پر رکھ لو۔“

ہم چاروں نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لئے۔ ہمیں روشنیوں کے پار اندھیرے میں سے چند لوگ سامنے آ گئے۔ ان

کے ہاتھوں میں پسل تھے۔ ایک بندے نے آگے بڑھ کر مجھے بانہ منا چاہا تو میں نے اس سے کہا
”کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو۔“

میرے سوال کے جواب میں ایک فائر میرے قدموں کے پاس آ لگا۔ تجھی سامنے کھڑے بندے نے میرے
ہاتھ سے سیل فون لے لیا۔ اس نے اروند کی کال بند کی تو سیل فون بج اٹھا اس نے کال ریسپونڈ کی اور فون مجھے واپس
دے دیا۔

”آخر وہیں پر آن پہنچے ہو، جہاں میں تمہیں لے کر آنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں تمہاری اوقات بتانا چاہتا ہوں کہ تم
کتنے ذہین اور کتنے طاقتور ہو۔ ایک چوٹی کی مانند ہو تم میرے سامنے۔ اب فضول بکواس مت کرنا کہ سامنے آؤ،
اور جذباتی باتیں۔ چاہو تو ابھی ایک گولی تمہارے پیچھے میں اتار دوں۔ صرف ایک گولی تمہاری قیمت ہے۔“ اجنبی
نے نہایت نفرت سے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا
”کیا چاہتے ہو؟“

”میں تو بہت کچھ چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آرام سے میری بات سننے کے قابل رہ سکو تو جو یہ لوگ کرتے
ہیں انہیں کرنے دو، ان کے ساتھ چلو۔ ورنہ اسی جگہ تمہاری موت ہوگی۔“ اجنبی نے انتہائی غرور اور تکبر سے کہا
”ٹھیک ہے جیسے تم چاہو۔“ میں نے کسی بھی جذبے کے بغیر کہا تو وہ ایک دم سے بولا
”یہ ہوئی نابات۔ چلو ان کے ساتھ۔“

میں نے اپنے سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا اور سر سے ہاتھ نیچے کرتے ہوئے، بڑے نرم لہجے میں اسے کہا
”چھوڑو، یہ رسی، چلو کہاں جانا ہے۔“

”بانہ مننے کے بغیر تو ہم نہیں لے کر جائیں گے۔“ سامنے کھڑے شخص نے کہا تو میں بولا
”چلو بانہ لو، اگر بانہہ سکتے ہو تو۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے۔ جہاں اور جنید میرے ہی انتظار میں تھے۔ وہ بجلی کی طرح
لپکے اور اپنی جگہ چھوڑ گئے۔ جس وقت وہ اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے، اسی دوران انہیں نے اپنے پسل نکال لئے تھے۔ وہ
مخفی چاندنی میں دکھائی دے رہے تھے، لیکن زمین پر پڑتے ہی انہوں نے فائر کر دیئے، اس کے ساتھ ہی دو چیخیں بلند
ہوئیں۔ تن تک میں سامنے والی کی گردن توڑ چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی ڈھال بنایا اور اپنا پسل نکال کر سامنے فائر
کرنے لگا۔ اس طرف کی کئی روشنیاں گر چکی تھیں، میں نے دیکھا، دو لوگ بھاگ رہے تھے، میں تاک کر ان کے پاؤں
میں نشانہ لگایا۔ وہ گر گئے۔ یہ سب ایک منٹ کے اندر اندر ہو گیا۔ شاید انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ سامنے سے اس شدت
کے ساتھ بھی فائرنگ ہو سکتی ہے۔ جس نے بھی ان لوگوں کو بھیجا تھا، وہ کوئی تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے۔

میں ایک ٹارچ اٹھائی اور وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب زخمی حالت میں پڑے تھے۔ ایک شخص اپنی
ٹانگ پر ہاتھ رکھے بلبل رہا تھا، وہاں سے خون نکل رہا تھا، میں نے اس کے سر پر جا کر پسل کی ٹال رکھ دی۔
”کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟“

”سعید مار کرنے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا

”کون ہے وہ؟“

”گنگوال میں رہتا ہے۔“ اس نے بتایا

”بات ہو سکتی ہے اس سے؟“ میں نے پوچھا

”ہوسکتی ہے؟“ وہ بولا اور اپنی جیب سے فون نکالنے لگا، تبھی وسیم کھوکھر نے کہا
”میں جانتا ہوں اس کو، زمانے کا ڈکیت اور غنڈہ ہے، میں جانتا ہوں اسے۔“

”مجھے وہ چاہئے۔“ میں نے غصے میں کہا

”آئیں پھر۔“ اس نے کہا اور تیزی سے فور وہیلن کی جانب چل پڑا۔ اس دوران جنید نے وہ لپ ٹاپ اور فون اٹھا لیا تھا۔ ہم جیسے ہی وہاں سے چلے وسیم کھوکھر نے کسی کو فون کر دیا کہ سعید مارکر چاہئے۔

گنگوٹال پہنچتے تک ہمیں آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت لگا۔ وہ گاؤں دریائے چناب کے بالکل اوپر ہے۔ پرانی طرز کے گھر تھے۔ بالکل دریا کنارے ایک پرانی حویلی سامنے وسیم کھوکھر ہمیں لے گیا۔ اس حویلی کے سامنے چند لوگ کھڑے تھے۔ ہمارے اترتے ہی اوہ ہمارے پاس آگئے۔

”کہاں ہے سعید مارکر؟“ وسیم کھوکھر نے پوچھا

”اندر ہے۔“ ایک بندے نے جواب دیا

”پکا پتہ ہے؟“ اس نے تصدیق چاہی

”وہ اپنے گھر سے ادھر ہی آیا ہے ابھی ابھی۔ میرے سامنے اندر گیا ہے، میں نے بندے بلوائے ہیں اسے اٹھانے کے لئے، بس وہ آتے ہی ہوں گے۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے، یہاں انتظار کرو۔“ اس نے کہا اور میری جانب دیکھا۔ جنید اندر جا چکا تھا۔ بڑے دروازے کے ساتھ ہی ایک شخص ڈھیر کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا، اسکے پیچھے جہال تھا، اس کے بعد میں اور میرے پیچھے وسیم کھوکھر تھا۔ سامنے دالان میں چار بندے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، وہ ہمیں دیکھ کر تیزی سے اٹھے ہی تھے کہ جہال اور جنید نے انہیں وہیں ڈھیر کر دیا۔ فائرنگ کی آواز سے ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ چانک اوپر سے فائر ہو نے لگے۔ ہمیں آڑ لیتا پڑی۔

میں نے اشارے سے جنید کو بتایا کہ میں اوپر جا رہا ہوں، تم یہیں پر دیکھو۔ اور پرانی طرز کی چھوٹی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ان سیڑھیوں میں اندر ہوا تھا۔ میں محتاط انداز میں چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرے سامنے کمروں کی ایک لمبی راہداری آگئی۔ میں ٹھنک کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک آدمی نکلا، وہ محتاط انداز میں جالیوں کے پاس آیا اور نیچے دیکھ کر فائر کرنے لگا تو میں نے اس پر فائر کر دیا۔ تب تک چھت پر سے ایک فائر نیچے ہوا۔ ایک لمحہ کو فائر کرنے والے کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ تبھی میرے پیچھے سے وسیم کھوکھر کی آواز ابھری۔

”وہ ہے سعید مارکر۔“

”چل پھر اوپر چلتے ہیں۔“ میں نے ہولے سے کہا اور اوپر کی جانب چل پڑا۔ میں نے سیڑھیوں کے آخر میں جا کر احتیاط سے سر اٹھایا۔ سامنے لمبی چوڑی چھت کے کنارے پر دو لوگ کھڑے تھے۔ ان دونوں کا دھیان نیچے تھا۔ وہ دکھائی دینے والے حملہ آور پر فائر کرنے کے لئے پوری طرح تیار کھڑے تھے۔ میرا اور ان کا فاصلہ اتنا تھا کہ اگر میں بھاگ کر انہیں پکڑتا چاہتا تو وہ مجھ پر فائر کر سکتے تھے۔ میرے پاس فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو میں نے میگزین دیکھا۔ اس میں ابھی گولیاں تھیں۔ میں نے فون نکالا اور جنید کو کال کر کے اسے اوپر آنے کو کہا۔ دو منٹ کے دوران وہ اوپر آ گیا۔ میں نے اسے سمجھایا اور ایک دم سے فائر کر دیے۔ فائر ان کے ہاتھوں پر لگے تھے، جس سے ان کے ہاتھ میں پکڑے بسٹل نجانے کہاں اڑ گئے تھے۔ دونوں ایک ساتھ چیخے۔ ان کے منہ سے بے اختیار مغلظات برآمد ہونے لگیں۔ تب میں ایک دم سے ہنس دیا۔ میں اجنبی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ابھی انتہائی تکلیف

کے ساتھ بلبلا تے ہوئے حیران ہو رہے تھے کہ ہم ان تک پہنچ گئے۔ ان میں تو ایک مقامی لگ رہا تھا جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ یہ سعید مارکر ہے، دوسرے نے جین کے ساتھ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، وہ اپنا ہاتھ پکڑے ہوئے اب بھی گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کے منہ پر زور دار گونسہ مارا، وہ پیچھے ہٹ دہرا ہوا اور مجھ پر پل پڑا۔ میں نے بسٹل جنید کی طرف اچھالا اور اس کے وار کو کلائی پر روک لیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بغل میں ہاتھ دے کر فرش پر دے مارا، وہ گرتے ہی اسپرنگ کی مانند اچھلا اور میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں سمجھ چکے تھے کہ ہم کون ہیں۔

وہ واقعی ہی فائبر تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کی تکلیف نظر انداز کر کے میرے مقابلے پر اتر آیا تھا۔ وہ طوفانی انداز میں میری جانب بڑھا، مگر میں اسے زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے میری جانب بڑھا تھا، میں گھوما اور پوری قوت نے کہنی اس کے سر پر دے ماری، وہ چکرا گیا تو میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر اسکی گردن پر مارے۔ وہ چھت پر چت ہو گیا۔ اسی لمحے جہال چھت پر آ گیا۔ وہ سیدھا سعید مارکر کی جانب بڑھا تو اس نے سامنے سے ہاتھ نہیں اٹھایا، وہ سمجھ گیا تھا۔

میں نے اس اجنبی کو اٹھایا، وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ نیچے حویلی میں جو لوگ تھے وہ پکڑے جا چکے تھے۔ انہیں مقامی پولیس کا انتظار تھا، اصل میں وسیم کھوکھر کے بہت قریبی رانا عارف اقبال ایک محبت وطن سیاست دان تھا۔ یہ ساری مدد انہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ کچھ انسانیت کے دشمن پکڑے گئے ہیں۔ وہ خود بخود مدد کو آن پہنچے۔ میں نے اس اجنبی کو ہوش میں لانے کے لئے اس کا سانس بند کیا تو وہ ہڑبڑا کر ہوش میں آ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ تب میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا، جن میں کوئی خوف نہیں تھا۔

”یہ چونے لمبی کا کھیل کیوں کھیل رہے تھے؟“

”مزہ آیا نا کھیل میں؟“ اس نے کہا اور منہ میں بھر جانے والا خون تھوک دیا

”کیوں کھیل رہے تھے؟“ میں نے پوچھا

”ایویں ہی، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کتنے پانی میں ہو؟“ اس نے طعنے لہجے میں کہا

”تو دیکھ لیا؟“ میں نے پوچھا

”کسی ٹی وی سنٹر کی طرح سوال ہی کرتے رہو گے یا کام کی بات بھی کرو گے۔“ اس نے میری آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے پوچھا

”پہلے یہ بتاؤ.....“ میں نے کہا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولا

”اسی میں تیرے سوال کا جواب ہے۔“

”بولو۔“ میں نے کہا

”ہمارے راستے میں مت آؤ۔ ہم جو بھی اس ملک میں کرنے جا رہے ہیں، وہ کرنے دو۔ تمہیں وہ سب ملے گا

جو تم چاہو۔“ وہ بولا

”میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ مجھے کوئی اپنی راہ پر نہیں لگا سکتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”اسی لئے تو اب تک تمہیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ تمہیں احساس دلایا ہے ہماری رسائی کہاں تک

ہے۔ میں جب چاہتا تمہیں مروا سکتا تھا لیکن ابھی صرف سمجھایا ہے۔ اور یہ جان لو، تم اپنی مرضی کے مالک نہیں ہو۔“

”اور تم!“ میں نے پوچھا

”میں آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام ہوں، جس سسٹم میں ہوں، وہاں سے بھاگ نہیں سکتا، مرکز ہی آزاد ہوں گا، جیسے تم، تم بھی غلام ہو، چند گھڑی ہوئی بنیاد پرست خیالات کی فرسودہ عمارت بنا رکھی ہے تم نے۔ تم بھی غلام ہو۔“ اس نے آخری لفظ بڑی نفرت سے کہے تو میں نے پرسکون لہجے میں کہا

”یہ باتیں چھوڑو، اور میری بات کا جواب دو، یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟“

”بتایا تو ہے، رستے سے ہٹ جاؤ، یا پھر ہمارا ساتھ دو، ورنہ ہم تمہیں ہٹا دیں گے۔“ اس نے کسی خوف کے بغیر کہا تو میں نے اس کے ماتھے پر انگلی رکھتے ہوئے دباؤ دے کر کہا

”تمہیں ڈر نہیں لگا کہ میں تمہیں ختم کر سکتا ہوں۔ تمہیں اور ان کو جنہوں نے تمہیں بھیجا ہے۔“

”تم مجھے مار سکتے ہو، جس طرح تم نے راشد کو مارا، اس کی جگہ میں آ گیا ہوں اور میری جگہ کوئی بھی آ سکتا ہے۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا، ہم ختم ہو جائیں گے۔ اس لئے میری بات مانو اور.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میں نے ہاتھ کی پوروں سے اس کا چہرہ پکڑ لیا۔

”ایک ہی سانس میں بتا دو کہ کس کے غلام ہو۔“

”مجھے مار کر میری ہڈیوں سے پوچھ لو، میرے گوشت کے ریزے ریزے سے پوچھ لو، میں بتا نہیں سکتا، کیونکہ مجھے پتہ ہی نہیں۔“ اس نے یہ کہا تو میں نے اسے جنید کے حوالے کر دیا۔ اس نے اسے پکڑ لیا۔ وہ بے حال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس نے آگے سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا مار کھاتا رہا، یہاں تک کہ وہ چھت کے کنارے تک جا پہنچا۔ جیسے ہی چھت کے کنارے پہنچا، وہ ایک دم سے یوں ہو گیا جیسے اس پر ہلکا سا بھی تشدد نہیں ہوا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے چھت کے کنارے بنی جالیوں پر چڑھا اور وہاں سے کود گیا۔

وہ یونہی نہیں کودا تھا۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ دوسری طرف دریائے چناب بہہ رہا ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ سے لکھا تو پھر ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ میں اسے یوں کیسے جانے دے سکتا تھا۔ میں بھی جالیوں پر چڑھا اور کود گیا۔ چند لمحوں میں بدن بے وزن ہوا، پھر جہاں پر چھپاک کی زور دار آواز آئی تھی، وہاں سے چند فٹ کے فاصلے پر میں دریا میں جا پہنچا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے میں دریا کی تہ میں اتر جاؤں گا۔ لیکن جلد ہی میں نے تیرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ میں سطح آب پر آ گیا اور تیرنے کی کوشش میں اس اجنبی کو دیکھنے لگا کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا اور میری طرح ہی لہروں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ پانی کی روانی میں تیزی تھی۔ وہ پانی کے بہاؤ میں بہہ رہا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ اس وقت مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ میں اتنا ماہر تیراک نہیں ہوں، جتنا وہ تیراک تھا۔ میں نے اپنی ہمت جمع کی اور اس کو پکڑنے کے لئے زور لگا دیا۔ ہم آگے پیچھے تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک بار تو مجھے لگا جیسے میں اسے پکڑ نہیں پاؤں گا۔ اس وقت مجھے حوصلہ ہونے لگا جب وہ تھک گیا اور اس کے ہاتھ غلط سسلط پڑنے لگے۔ مجھے اس کا فائدہ مل گیا۔ میرا بھی سانس نہیں اکھڑا تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بے دم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے جالیا اور اسے گردن سے پکڑا ہی تھا کہ وہ یوں ہو گیا جیسے اس میں جان ہی نہیں رہی۔ میں نے اسے قابو میں کر لیا۔

اب میرے لئے مصیبت یہ تھی کہ مجھے خود کو سنبھالتے ہوئے، اُسے بھی قابو میں رکھنا تھا۔ اس ساری کشمکش میں مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ جنید بھی میرے پیچھے دریا میں کود چکا ہے۔ مجھے اس وقت پتہ چلا جب اس نے مجھے آ کر چھوا۔ اس نے ہمیں سہارا دے دیا۔ ہم لہروں پر بہہ رہے تھے۔ میری کوشش تھی، ہم جلد از جلد کنارے تک جا

لگیں۔ پانی پر بہتے ہوئے ہم کنارے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

دریا کے کنارے تک پہنچتے ہوئے میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ میں کچھ دیر تک اپنی سانس بحال کرتا رہا۔ ہم سے پہلے ہی وسیم کھوکھر کے ساتھ جہاں وہاں پہنچ گیا تھا۔

”انہیں جلدی اٹھاؤ، قریب ہی ریست ہاؤس ہے، وہاں چلتے ہیں۔“ وسیم کھوکھر کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اٹھنے میں پتہ نہیں کس نے مدد دی۔ جلد ہی میں پانی میں بھیگا ہوا گاڑی کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگائی تو گاڑی چل پڑی۔

ریست ہاؤس میں کپڑے بدلنے کے بعد میں اور جہاں لاؤنج میں گئے تو رانا عارف اقبال وہیں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اجنبی کو بھی وہیں لے آیا گیا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے بھی بدلوادے گئے ہوئے تھے۔ اسے قالین پر بٹھا دیا گیا اور اس کے پاس جنید بیٹھ گیا۔

”مان لیا کہ ٹو بہادر ہے، جی دار ہے اور اپنی جان پر کھیل سکتا ہے۔ لیکن تمہیں شاید نہیں پتہ تھا کہ تمہارا واسطہ کن لوگوں سے پڑنے والا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے پھر سے پوچھا، ”ہاں تو پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟“

”کسی بھی نام سے پکار لو، نام میں کیا رکھا ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں مسکرا دیا، تبھی جنید نے اس کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”نہیں جنید، اسے، اس وقت کچھ نہیں کہنا۔ جب تک یہ ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دیتا۔ ہاں اگر ہٹ دھری کی تو پھر یہ نہیں، اس کی روح تک بولے گی ہمارے سامنے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے نگاہیں چرائیں۔ جیسے مجھے کہہ رہا ہو کہ تم جو چاہو کرو۔ تب میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا ”چلو، تمہارا کوئی نام بھی ہے، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں، مگر یہ تو بتا سکتے ہو تمہیں کس نے ہمارے پیچھے لگایا؟“

”میں یہاں کے کام کا خود ذمے دار ہوں۔ میں جو چاہوں سو کروں۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں بتایا تو میں نے پوچھا

”ہم نے تمہیں کیا نقصان.....“

”نہیں، تم ہمارے راہ کی رکاوٹ ہو، میں نے تمہیں بتایا بھی ہے۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا

”کیسی رکاوٹ؟“ میں نے پوچھا

”تم مجھے مار بھی دو نا تو میں نہیں بتاؤں گا۔ ہاں، ہمارے لئے کام کرو، جو چاہو، وہی ہوگا۔“

”تمہاری یہ بکواس تو میں نے پہلے بھی سنی ہے، کیا کام لینا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”انقلاب۔! ہم اس ملک میں ایسا انقلاب لانا چاہتے ہیں، جس میں ہر انسان کو اس کا بنیادی حق ملے، کسی بھی قسم کا کوئی جبر نہ ہو،“ اس نے انتہائی دردمندی سے کہا

”کیوں؟ تم ہی ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا تو طنزیہ انداز میں بولا

”یہی سوال اگر میں تم سے کروں کہ تم کیوں یہ سب کر رہے ہو، کس لئے؟“

”میری یہ مٹی ہے، میں اس وطن کا باسی ہوں، میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں اس میں وہی نظام لاؤں، جو اس وطن کو بنانے کی وجہ ہے۔“ میں نے کہا

”کس نے دی ہے ذمہ داری تمہیں؟“ اس نے پھر اسی لہجے میں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور مجھے

کس ٹریک پر لے کر آنا چاہتا ہے۔

”میرے وطن نے۔“ میں نے کہا

”تو میں بھی اسی مٹی سے ہوں، یہ بھی میرا وطن ہے، میرا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ میں یہاں کہ انسانوں کے لئے کام کروں۔ بتاؤ مجھے، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو، اپنے ضمیر کو حاضر ناظر جان کر کہو، کیا یہاں کی انسانیت سسک نہیں رہی، کیا یہاں پر انصاف ہے، کیا یہاں کے سیاست دان کرپٹ نہیں ہیں۔ کیا یہاں کے عوام کو بنیادی سہولیات میسر ہیں۔ جس عوام سے جتنا ٹیکس لیا جاتا ہے، اتنا اسے سہولت دی جاتی ہے، کیا ٹیکس لیتے ہوئے یہاں کے حکمرانوں کو شرم نہیں آتی، کیا جاگیر داری نظام نے اس پارلیمنٹ کو پرغال نہیں بنا رکھا۔ ایک فہرست ہے، جسے گناتے میں تھک جاؤں گا مگر کسی بندے کو شرم نہیں آئے گی کہ وہ اسی ملک میں رہتے ہوئے، یہیں کا کھاتے ہوئے، اسی عوام کے ساتھ ظلم کرتا چلا جا رہا، اور ایسا ہونا چاہئے۔ جس ملک کی عوام کو شعور نہیں، جو اپنا برا بھلا خود نہیں جانتے، جو ظلم سہتے ہیں، لیکن آواز بلند نہیں کرتے ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اور تیرے جیسے وطن پرست آنکھیں بند کر کے، غیر ملکی قوتوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ اپنی عوام پر ظلم کر کے اس ملک کو مضبوط کرتے چلے جا رہے ہیں، تم ملک کو نہیں یہاں کے حکمرانوں کو مضبوط کر رہے ہو، ان کی دولت میں اضافہ کا باعث بن رہے ہو۔“ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو ایک لمحے کو میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

”کیا یہ سب تم اکیلے کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا

”نہیں، میرے ساتھ پوری دنیا کے لوگ ہیں، ہر ملک میں کام ہو رہا، یہاں بھی ہو رہا ہے۔ جس دن اس عوام کو شعور مل گیا، یہ تیرے ہمارے حکمران نہیں رہے گے، عوام کی حکومت ہوگی، جمہوریت ہوگی صحیح معنوں میں، جسے جمہوریت کہتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں ہنس دیا اور اسے کہا

”بہت جذباتی باتیں کر لیں تو نے بیٹا، اب اگر سچ نہیں بتاؤ گے تو میں خود پتہ کر لوں گا۔“

”یہی سچ ہے۔“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو میں نے جنید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”اسے فورسز کے حوالے کر دو، اس سے اب لاہور ہی میں باتیں ہوں گیں۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا جمال۔ میری جگہ اور آجائے گا۔“ اس نے اونچی آواز میں کہا

”اور میں جڑ ہی ختم کروں گا۔ اب باتیں وہیں ہوں گیں۔ چلو۔“ یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا تو رانا عارف نے کہا

”یہ میری ذمہ داری ہے کہ اسے وہاں تک پہنچا دوں، اب یہاں بھی سب دیکھنا ہوگا۔“

جنید اسے لے کے باہر چلا گیا، جہاں اسے وصول کرنے کے لئے لوگ آچکے تھے۔

چائے پینے کے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا جب ہم ہیڈ مرالہ کا پل پار کر رہے تھے۔ میں ان مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا۔ اس لئے جنید کو گاڑی آہستہ چلانے کو کہا۔ وہ دھیمی رفتار سے جا رہا تھا، پل ختم ہو گیا تو میں دیکھا۔ سفید کرتے اور تہبند میں ایک بزرگ سا بندہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا راعصا تھا۔ اس نے سفید چادر سے اپنے چہرے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ ہمیں رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں جنید کو گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ رک گیا۔ میں نیچے اترا تو اس نے مصافحہ کے لئے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے کہا

”جی بزرگو، فرمائیں۔“

”یار، ہمارے علاقے میں آئے ہو اور ہمیں ملے بنا ہی جا رہے ہو۔ آؤ، ادھر بیٹھیں۔“ انہوں نے دریا کنارے

پڑے بیچ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں اس جانب بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ چل پڑے۔ ان کے بدن سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ہم دونوں بیچ پر بیٹھ گئے تو انہوں نے اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دی تب میں حیران رہ گیا۔ یہ وہی بزرگ تھے، جن سے میں شاہ جمال لاہور میں ملا تھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرانے لگے تو میں نے بے ساختہ کہا

”باباجی آپ؟“

”یار۔! اگر پھر سے ملاقات ہوگئی ہے تو اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔“

”نہیں نہیں، یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ مل گئے۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو بولے

”کچھ باتیں ہیں جو تم سے کہنا تھیں، وہ لے لو، سمجھ لو۔ تیری امانت ہے میرے پاس۔“

”جی فرمائیں۔“ میں ہمدن گوش ہوتے ہوئے بولا تو میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولے

”انسان عشق سے آگاہی کے بعد جب اپنے باطن میں اترتا ہے تو جان بھی شکستہ ہو جاتی ہے۔ جس سے دل

ظاہر ہوتا ہے۔ جو جان سے انتہائی اعلیٰ و بلند ہے جو جان کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ پھر جب دل شکستہ ہوتا ہے

تو اندر کے نور و انوار سے محکم ہو کر فحش نور سے جان و جسم کو تسخیر کر کے جان و جسم کو حق سے بناتا ہے۔ عالم کو اپنی مرضی

سے تعمیر کرتا ہے۔ جس سے ایک مومن کی صورت جنم لیتی ہے۔ مومن کائنات میں رب تعالیٰ کی مرضی ہوتا ہے، اس

میں سے رب تعالیٰ کی مرضی نظر آتی ہے، اور اس کی مرضی رب تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے۔“

”شکستگی کے بعد تعمیر تو ہے، اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔“ میں نے پوچھا تو وہ اسی جذب سے کہنے لگے

”وہ چار عناصر جن سے زندگی کا مادی وجود ظاہر ہوا ہے، وہی چار عناصر اس کی مخالف قوتیں تھیں، وہی قبضہ میں

آ کر کارآمد ہو جاتی ہیں۔ آگ جو دشمن تھی، اسے قبضے میں کر کے اس سے فوائد حاصل کئے جا رہے ہیں۔“

”جی بجا فرمایا یعنی آگ گلزار بن جاتی ہے۔ تیل اور گیس اس کی واضح مثال ہے۔“ میں نے اپنے طور پر کہا تو

سر ہلاتے ہوئے بولے

”جب مادی سوچ اس کی اندرونی انسانی سوچ کو بند کر دیتی ہے، تو درد مندی، سوز و گداز، نری کی جگہ سختی آ جاتی

ہے۔ جبکہ انسانی فکر و سوچ ان بندشوں کو توڑ کر اس میں احساس، ہمدردی اور ہمت پیدا کر دیتی ہے۔ مادی جسم شکستہ

ہوگا تو عالم صورت ظاہر ہوگی۔ عالم صورت شکستہ ہوگی تو دل ظاہر ہوگا۔ دل کے شکستہ ہونے سے عالم دل ظاہر ہوتا

ہے، تبھی دل کے اندر دیدار ہوتا ہے۔“

”مادی جسم کی شکستگی سے زندگی برقرار رہتی ہے؟“ میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا

”مادی جسم ظاہر ہے جو چار عناصر ہیں اس کو تصور زندگی نے محیط کیا ہوا ہے۔ ان چار عناصر کو اپنے قبضے

میں لے رکھا ہے۔ جب بڑی قوت ظاہر ہوتی ہے تو چھوٹی قوت شکستہ ہو جاتی ہے اور اسے اپنے قبضے میں لے لیتی

ہے۔ مادی وجود ظاہر اور زندگی اس میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کا عکس جسم سے ظاہر ہے۔ جو دھڑکن اور رگوں کی حرکت

و عمل سے ظاہر ہے۔ جسم اپنے آپ کو زندگی میں سے دیکھ رہا ہے۔ زندگی اپنے مادی جسم سے اپنے اعمال کو دیکھ رہی

ہے۔ کیونکہ زندگی، زندگی میں فکر و نظر میں مادی جسم ظاہر ہے۔ جسم ظاہر ہے اور جسمانی اعمال و سوچ ظاہر ہو رہے

ہیں۔ زندگی چونکہ خود کو نہیں دیکھ رہی ہے۔ اپنی قوتوں کا ادراک نہیں ہے۔ اس لئے خود کو جسم کی قید میں دیکھ رہی ہے

۔ اس نے مادی جسم کو ہی اپنا ہونا سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ مادی جسم کی حرکت زندگی سے ہے۔ کیونکہ بوقت موت جسم

مادی بے حس و حرکت پڑا ہوا ہوتا ہے۔ جب جسم کا تعلق جان سے ہوتا ہے تو جسم بھی زندہ ہوتا ہے۔ مردہ دل کی

نسبت جب زندہ دل سے ہو جاتی ہے وہ بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ یوں جو حرکت ہے وہ خود کو مجبور سمجھ رہی ہے اور جو بے حرکت ہے اسے خود پر مسلط کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اس کی خود اپنے آپ پر نظر نہیں ہے۔ جسم اس کے لئے کوہ گراں نظر آ رہا ہے۔ حالانکہ زندگی کی قوت کے آگے مادی جسم کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

”اور یہ زندگی.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے

”زندگی کائنات کو دیکھ رہی ہے، اسے سمجھ رہی ہے۔ زندگی جو خود مادی وجود کا باطن ہے، اپنے آپ کو نہیں دیکھ رہی۔ حالانکہ ذات پاک نے انسان کو اندر دیکھنے کا صلاحیتوں سے بھی نوازا ہوا ہے۔ ظاہر کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور مادی جسم سے آگے باطن میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس سے عام انسان بے خبر ہے۔ اس کی خبر کسی خبردار سے لے۔ زندگی کو دیکھتا ہے تو وہ تیرے اندر ہے۔ اندر دیکھ، جب انسان کی نظر اپنی زندگی پر جاتی ہے، تو پھر یہ انسان سمجھتا ہے کہ کائنات جسم مادی اس کا ایک جز ہے۔ زندگی کی قوت، اعمال و فکر ظاہر ہوتے ہیں۔ جب اس کی نگاہ زندگی پر پڑتی ہے تو اس کا مادی جسم شکستہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جان، صورت ہے جس میں تمام عالم کی صورتیں پڑی ہیں۔ اس نقش سے تمام نقوش ظاہر ہو رہے ہیں اور چھپ رہے ہیں۔ ظاہر میں حرکت کرتا ہوا مادی جسم نظر آتا ہے۔ جب زندگی پہ نگاہ جاتی ہے تو پھر زندگی حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ وہ جیسے قلندر لاہوری نے کہا ہے کہ چوں حس در شدا میں عالم در گردش..... سکون و سیر و کیف و کم در گردش۔“

(ترجمہ۔ جب حس بدل گئی تو یہ جہاں بھی بدل گیا۔ سکون، حرکت، کیفیت اور کیت (کس طرح اور کیسے) بھی بدل گئی۔)

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، پھر اسی جہاں میں یہ شعر پڑھنے لگے۔

حدیث دل کسی درویش بے حکیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ
گردش ماہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقش بند
پردش دل کی اگر مد نظر ہے تجھ کو
مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

”اور سن! دل کے رستے سے روکنے والا کون ہے اسے پہچان، بدل کے بھیس آ جاتے ہیں ہر زمانے میں..... اگرچہ ہمہ آدم، جواں ہیں لات و منات۔۔۔ وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے..... ہزار سجدوں سے آدمی کو دیتا ہے نجات۔ سنو! انسان خدا کا بھید ہے۔ اشرف المخلوقات ہے۔ خود کو دیکھ، خود کو دیکھ لے، خود کو پہچان لے اور خود کو پالے۔ خود سے بیگانہ نہ ہو، خود کا محرم ہو خود کا انکار نہ کر خود کو مان لے۔ توجہ ہے، سچ کو ظاہر کر دے۔ کائنات کا وجود، وجود انسان ہے، اور کائنات کی جان انسان کی جان ہے۔ کائنات کی جان انسان ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے اٹھ گئے۔ یوں جیسے مجھے پہچانتے نہ ہوں۔ وہ ہل کی جانب بڑھ گئے۔ میں انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا، جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ میں آہستہ قدموں سے گاڑی میں جا بیٹھا تو جنید نے کبیر لگا دیا۔ ہم لاہور کی طرف جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

میں اور جہاں ماڈل ٹاؤن والے گھر کی چھت پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کافی دیر تک اس اجنبی کے بارے

میں باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ اپنی باتیں کرتا رہا۔ ہم دیر تک دونوں ملکوں میں ہونے والی زیر زمین کاروائیوں پر بات کرتے رہے۔ اس نے جس حد تک سمجھا، وہ کہتا رہا۔ وہ کافی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ اس کا خالصتان والا وہ خواب کہیں بہت دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سکھ کیونٹی واضح طور پر دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ عام سکھ ڈرا اور سہا ہوا ہے۔ نوجوان نسل کو کہیں کا کہیں بھٹکا دیا گیا ہے۔ مگر میرا اسے یہ کہنا تھا کہ نہیں، آگ چاہے بجھ جائے، اگر دھواں اٹھ رہا ہے تو اس میں چنگاری ضرور موجود ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد بھڑکنے والی ہے۔ ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ جنید میرا نیا فون لے کر آ گیا۔ پہلا فون دریاے چناب کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ فون بج رہا تھا۔ میں اسکرین پر نگاہ ڈالی، سوئی کا فون تھا۔

”میں اسی لئے فون لے کر بھاگا آیا ہوں کہ آپ کی حکومت کا فون ہے۔“ جنید نے شرارت سے کہا میں مسکرا دیا۔ میں نے کال ریسیو کی

”فون کیوں بند تھا؟“ سوئی نے غصے اور تشویش سے پوچھا تو میں نے کہا

”یہ ایک لمبی کہانی ہے آ کر سناؤں گا۔“

”کب آتا ہے اور بتانے سے پہلے سوچ لینا کہ تانی کی شادی ہے۔“ وہ تیزی سے بولی

”میں نے کب انکار کیا ہے۔ بس یہ جہاں سے باتیں کر رہا تھا، بس نکلتے ہیں کچھ دیر بعد فوراً مگر کے لئے۔“ میں نے کہا

”یہ باتیں یہاں آ کر بھی ہو سکتی ہیں۔“ اس نے غصے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ جہاں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تبھی میں نے بتایا

”وہ بلا رہی ہے۔“

”چلو پھر چلتے ہیں۔“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو میں نے جنید سے چلنے کو کہا۔ وہ پلٹ گیا تو ہم بھی چھت سے لاؤنچ میں آ گئے۔ انہی لمحات میں طارق نذیر کا فون آ گیا۔

”کہاں ہیں آپ، مجھے آپ سے بہت ضروری ملنا ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“ میں نے پوچھا

”میں آپ سے مل کر بتاتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے اسے آنے کا کہہ دیا۔ اب مجھے اس کا انتظار کرنا تھا۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ آن پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک فریہ مائل، نفیس شخصیت والا ایک ادیب عمر شخص تھا۔ وہ بڑی متانت کے ساتھ مجھے ملا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو طارق نذیر نے کہا

”میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے فرزند علی صاحب کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان سے ایک بار ملنے سے منع کر چکے ہیں۔ چونکہ ملنا ضروری تھا اس لئے مجھے یوں.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”تو کیا یہ وہ وزیر ہیں جن سے ملنے کی بابت کہا تھا۔“ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

”جی میں وہی ہوں۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ نے انکار کیوں کیا تھا، وہ ضروری تھا، مجھے رانا عارف اقبال نے بتا دیا ہے۔ اسی لئے میں خود چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے بڑے دھیمے لہجے میں یوں کہا جیسے وہ شرمندہ ہو، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تبھی میں نے کہا

”جی آپ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”آپ جو ملک و قوم کے لئے کر رہے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے، آپ وہ کچھ کر رہے ہیں، جو ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ لہذا ہم آپ سے مدد ہی مانگ سکتے ہیں۔“ اس نے پھر اسی لہجے ہی میں کہا

”جی فرمائیں۔“ میں قحط سے کہا

”پہلی بات تو یہ ہے کہ سارے ہی سیاست دان کرپٹ نہیں ہیں، بہت سارے ایسے بھی ہیں جو ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ سسٹم انہیں کچھ بھی نہیں کرنے دے رہا ہے اصل میں جب میں نے آپ سے ملنا چاہا تھا، اس وقت میرے ذہن میں صرف شک تھا، مجھے ایسی اطلاعات مل رہی تھیں کہ خاص طور پر پنجاب میں بہت ساری جگہوں پر ایسے ناسور پھوٹ رہے ہیں، جن کا کوئی علاج نہیں ہے۔ کوئی ایسی بیرونی طاقت ہے جو یہاں کے لوگوں کو شک میں مبتلا کر رہی ہے۔“

”شک میں مبتلا، مطلب میں سمجھا نہیں؟“ میں نے وضاحت کے لئے پوچھا

”میں سمجھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو سانس لینے کا اور پھر کہتا چلا گیا، ”کوئی بیرونی طاقت، ہمارے وطن میں ایسا کھیل کھیل رہی ہے، جس سے لوگ اپنے نظریات اور افکار میں شک و شبہ محسوس کرنے لگیں۔ یہ جو شہرئج کی نئی بساط بچھائی گئی ہے، یہ کئی پہلو رکھتی ہے۔ مہرے اس بساط پر پھیلا دیئے گئے ہوئے ہیں۔ یہ جو آپ نے بندہ پکڑا ہے، میرے خیال میں ایک معمولی پیادے جیسا ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ میں نے پوچھا

”پچھلے دو مہینے سے میرے پاس جو اطلاعات آرہی ہیں وہ یہ ہیں کہ جہاں بھی انہیں کوئی محبت و وطن ملتا ہے یا اس وطن سے اسے کوئی گلہ شکوہ ہے، انہیں لوگ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کوئی واضح بات نہیں تھی۔ مگر ہمیں یہی سمجھ آرہی تھی کہ کوئی نیا گروہ بن رہا ہے، اس کا طریقہ کار اس لئے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی ایک پیغام نہیں رکھتے۔ وہ لوگوں کی نفسیات سے کھیل رہے ہیں۔ کسی کو ڈرا دھما کر، کسی کے کام آ کر، روپے پیسے کا لالچ دیکر، جسے بھی۔ وہ صرف نظریات پر وار کر رہے ہیں۔“ اس نے اس بار پورے جوش سے کہا تھا

”نظریات پر وار؟“ میں نے بات مزید سمجھنا چاہی تو اس نے میرے طرف دیکھا تو اس نے پہلے سے زیادہ جوش سے کہا

”اگر کوئی یہ کہے کہ محمود غزنوی نے سومات پر قبضہ کب کیا؟ تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر اسے یوں کہا جائے کہ محمود غزنوی نے سومات کب فتح کیا تو اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔“

”بالکل میں سمجھ گیا، قبضہ اور فتح کا فرق۔“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا

”ان دو لفظوں سے پوری تاریخ کی انیت تک بدل جاتی ہے۔ بات وہاں جا پہنچتی ہے کہ جب رسالت مآب ﷺ نے مکہ فتح کیا۔ ذرا سوچیں، بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔“ اس نے قحط سے کہا

”دماغ میں شک کا کیڑا داخل ہو جائے تو وہ بنیادی نظریات کو چاٹ جاتا ہے۔ پھر درست اور غلط کی تمیز نہیں رہتی اور یہیں سے تعصب پھوٹتا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا

”یہی! یہی کچھ وہ کر رہے ہیں۔ پنجاب میں کئی جگہوں پر یہی چل رہا ہے، جو جرائم پیشہ ہیں، وہ زیادہ نزدیک آ رہے ہیں۔ کوئی دوسرا بس نہیں چلا تو پاکستان اور پاکستانیت پر اوجھے طریقے سے وار کیا جا رہا ہے۔“ اس نے کہا

”ایسا تو فقط بھارت ہی کر سکتا ہے۔“ خاموش بیٹھا ہوا جہاں بولا

”بالکل! وہاں کے پنجاب میں بھی کچھ ایسا ہی چل رہا ہے، سکھ مت کے بارے میں شکوک ڈالنے کیلئے، اسے بالکل ایک نیامت بن کر پیش کرنے کے لئے انہوں نے ادارے بنا دیئے ہیں۔ انہیں صرف خالصتان تحریک سے خوف ہے۔“ وہ وزیر بولا

”میں ایسا ہی ایک ادارہ تیار کر چکا ہوں۔“ جہاں نے سکون سے کہا تو وہ چونک گیا

”بس تو پھر، وہ لوگ اسی لئے آپ لوگوں کو اپنی راہ کی رکاوٹ خیال کر رہے ہیں۔“ وزیر نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا، ”اسے ختم کرنا ہوگا۔ یہ تو ایک نسل کو تباہ کر دیں گے۔“

”لیکن اس سے بھی پہلے یہ افراق فری بھی چائیں گے۔ تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ کام کر رہے ہیں۔“ جہاں نے جواب دیا تو میں نے کہا

”ہم ہی انہیں ختم کریں گے۔ میں ان کی جڑ تک پہنچوں گا۔ مجھے آپ تھوڑا سا وقت دیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے آپ مجھے ملیں۔ پھر اس پر کام کا آغاز کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں نے انہیں رکنے کو نہیں کہا۔ ہم! کھٹے پورچ تک آئے۔ وہ اپنی راہ ہو گئے اور ہم نورنگر چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

آدمی رات ہو چکی تھی، جب ہم نورنگر حویلی پہنچے۔ جیسے ہی پورچ میں گاڑی رکی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ گھر میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔ ہم لاؤنج میں آئے تو سوئی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔ وہ جہاں سے ملی اس کا حال احوال پوچھا پھر میری طرف دیکھ کر بولی

”فریش ہو کر آجائیں ٹیبل پر، میں کھانا لگاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ لاؤنج سے نکل گئی۔

ہم تینوں فریش ہو کر ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ رونیت کور کے ساتھ ٹمٹس اور قمر بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ ہی اردو سنگھ بھی سیڑھیاں اترتا ہوا دکھائی دیا۔

”اؤتم سب لوگ بھوکے ہو؟“ جہاں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا تو رونیت نے کہا

”سوئی بھائی نے کھانا کہ تم لوگ آرہے ہو، تو ہم نے کہا کھٹے ہی کھانا کھائیں گے۔ اردو کے پاس بیٹھے پتہ ہی نہیں چلا، اتنا وقت گزر گیا۔“

”ہاں، بہت دنوں بعد یہ ملے ہیں نانتیوں۔“ میں ان کی طرف دیکھ کر کہا

”ویسے جمال ویرے! جوان کے بارے میں سنا تھا، یہ ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ابھی یہی باتیں چل رہیں تھیں۔“ رونیت کور نے ان دونوں کی تعریف کی تو سوئی کے ساتھ ملازم کھانا لے آئے۔ کھانے کے دوران باتیں چلتی رہیں۔ ہم کہاں گئے تھے۔ یہ بتاتے رہے۔ دل نہیں کر رہا سونے کو۔ اس لئے چائے لے کر لاؤنج ہی میں بیٹھ گئے۔ تبھی سوئی نے سب کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا

”میں تم سب کو صبح ایک سر پائیز دینے جا رہی ہوں مگر رونیت کور کو اس پر اعتراض نہ ہو تو۔“ اس پر رونیت کور خاموش رہی تو سوئی نے دبے دبے جوش سے کہا، ”صبح تانی کے ساتھ رونیت کور اور اردو سنگھ کی شادی بھی ہو رہی ہے۔“

”واؤ! یہ تو کمال ہو گیا۔“ جہاں نے حیرت سے کہا

”دونوں راضی ہیں نا۔“ میں نے اتمام حجت کیلئے پوچھا، ویسے میں سمجھ گیا تھا۔

”یہ بہت راضی ہیں، ہمیں پتہ ہی نہیں چلا اور ان دونوں کے درمیان جکر چل گیا۔“ سوئی نے کہا

”ایک اور کام بھی کر دیں گے ہاتھوں۔“ اردو سنگھ نے سب کی طرف دیکھ کر سوئی سے کہا

”وہ کیا؟“ سوئی نے پوچھا

”یہ جو اپنی مہوش ہے نا، اس کی شادی اپنی فہیم سے کروادیں، میں گواہ ہوں۔“ اس نے اس قدر بے چارگی سے کہا کہ سبھی ہنس دیئے۔

”چل صبح ان کا کام بھی کر دیتے ہیں۔“ جہاں نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔

”اچھا اب سب سو جائیں، صبح بہت سارے کام کرنے والے ہیں۔“

”نہ بھالی۔! نہ ہمارے دیر کو لے جانا چاہو تو لے جاؤ، ہم تو ابھی جاگیں گے۔“ رونیت کور نے کہا تو سوئی کچھ بولے بغیر ہونٹوں میں ہنسی دبائے اٹھ گئی۔ وہ لاؤنج سے چلی گئی تو میں بھی اٹھ گیا۔ جاہوئے جہاں کو کہہ گیا کہ خیال رکھنا۔

میں اپنے بیڈروم میں گیا تو سوئی الماری میں سے کپڑے نکال رہی تھی۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آگئی۔ تب میں نے پوچھا

”رونیت اور مہوش کی شادی بارے بات تو ہوگئی، ان کے بارے میں کوئی تیاری کی تم نے۔“

”میں نے سب تیار کیا ہوا ہے۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا

”چلو اچھی بات ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا

”اگر آپ آرام کرنا چاہو تو سو جائیں۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا

”تم اگر پاس ہو تو پھر نیند کا کیا سوال۔“ میرے یوں کہنے پر وہ زیر لب مسکرا دی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھے نیند آگئی۔

سیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ سوئی جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا انداز بالکل اماں کی طرح تھا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر اٹھ کر اماں کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ وہ ابھی تک جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا، جیسے بچپن میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان چند لمحوں میں میرا سار بچپن میری آنکھوں سے سامنے گذر گیا۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ اماں میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ہمارے درمیان بات نہیں ہو رہی تھی لیکن ان کے ہاتھ کالس مجھے بتا رہا تھا کہ وہ کای باتیں کر رہی ہیں۔ ایک نئی توانائی میرے اندر آگئی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ ابھی ان کے مزید معمولات ہیں، اس لئے میں وہاں سے اٹھ گیا۔

سورج نکلنے ہی حویلی میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے میں نے سیکورٹی بارے دھیان دیا تھا۔ جہاں نے سب دیکھ لیا تو مطمئن ہو گیا۔ دوپہر سے ذرا پہلے مہر خدا بخش آگئے۔ ان کے ساتھ چند لوگ تھے۔ وہ ملے تو روی کا سارا زمانہ یاد آ گیا۔ تانی ان کے گلے لگ کر بڑی دیر تک روتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ ان سے الگ ہوئی تو سوئی اسے تیار کرنے کے لئے لے گئی۔ شادی کی تقریب کا اہتمام لان میں کیا ہوا تھا۔ جہاں ایک بڑی ساری اسکرین لگی ہوئی تھی۔ اس کا اہتمام اکبر اور زویا نے کیا تھا۔ وہ علی الصبح کراچی سے آگئے تھے۔

تقریباً گیارہ بجے کے قریب جو ہدری اشفاق دولہا بنا پنڈال میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ یہ تقریب ہر اس جگہ دیکھی جا رہی تھی، جو ہم سے متعلق تھا۔ ان کے ساتھ ہی مہوش اور فہیم کو بٹھا دیا گیا۔ تانی اور مہوش کی طرف سے مہر خدا بخش ولی بنا تو مولانا صاحب نے باری باری ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ مبارک سلامت کا شور مٹا۔ وہ شور ذرا کم ہوا تو اردو سنگھ اور رونیت کور کی باری آئی تو ان کا رخ اس بڑی ساری اسکرین کی طرف کر دیا جو خاص اسی مقصد کے لئے لگائی گئی تھی۔ اس پر سب سے پہلے ہر پریت کور نمودار ہوئی۔ وہ کیمرے کی

طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

”ست سری اکال، اسلام علیکم، سب کو دھن داد۔ میری طرف سے اشفاق، تانی، مہوش اور فہیم کو مبارک باد۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اردو دیر کی شادی ہو رہی ہے۔ رونیت کور، بڑا دل کر رہا ہے تو میرے پاس ہوتی، میں تجھے دلہن بناتی، پر میں خوش ہوں، میری بہن سوئی وہاں موجود ہے کوئی کمی نہیں ہوگی، جمال ویرا وہاں پر ہے۔ میں اس وقت اوگی گردو دار بیس ہوں اور میرے ساتھ گیانی ہیں اور اوگی کے دوست۔ تم دونوں کی شادی گیانی کروائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس کا کیمرہ رخ بدل گیا۔ اسکرین پر ایک گیانی بیٹھا ہوا تھا، اس کے آگے گرنٹھ صاحب تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ رسم کے مطابق رونیت اور اردو آگے آگئے۔ وہ گرنٹھ صاحب کے آگے جھک گئے۔ تب گیانی نے شادی والے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ وہ دونوں سمجھ رہے تھے۔ جہاں سنگھ ان کے ساتھ تھا۔ اس نے اردو کی چکری کا پلو، رونیت کے آچھل کے ساتھ پاندھ دیا۔ وہ پھیرے لینے لگے۔ گیانی پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد ان کی شادی کا بھی اعلان ہو گیا۔ سوئی نے ساری رسمیں سمجھی ہوئیں تھیں۔ وہ ان کے ساتھ رسمیں نبھانے لگی۔ اس کی صرف یہی نیت تھی کہ انہیں یہاں اکیلا پن محسوس نہ ہو۔ اسکرین پر ہر پریت کور کے ساتھ پھو پھو کلجیت کور بھی تھی۔ کچھ دیر بعد اسکرین بھی صاف ہوگئی۔ نورنگر والوں نے ایسی شادی پہلی بار دیکھی تھی۔ گھر میں رسمیں ہوتی رہیں اور میں مہر خدا بخش کے پاس جا بیٹھا۔ انکے ساتھ بہت ساری باتیں چلتی رہیں۔ کچھ دیر بعد جہاں بھی آکر بیٹھ گیا۔ سہ پہر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس کے بعد مہمان جانے لگے، مہر خدا بخش بھی چلے گئے۔ جب شام اتری تو حویلی میں وہی مخصوص افراد تھے۔

☆.....☆.....☆

تیسرے دن، تینوں بیاہے ہوئے جوڑے، ایبٹ آباد جا رہے تھے۔ میں نے ہی انہیں چند دن سیر کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہیں سے اسلام آباد آکر تانی نے اکیلے لندن چلے جانا تھا۔ ان کی فلائیٹ رات کی تھی۔ رات گئے وہ لاہور پہنچ گئے تھے۔ اگلے دن انہوں نے آگے جانا تھا۔ اس وقت رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ میں اور جہاں چھت پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”اب تم بھی شادی کر لو جہاں۔“ میں نے یونہی اس سے کہا تو جذباتی ہو گیا

”نہیں! میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا، جب تک خالصتان نہیں بن جاتا۔“

”اس کے لئے ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ ابھی سنگھ اور کور، خوف کے تلے دبے ہوئے ہیں، وہ ابھی تحریک چلانے کے قابل نہیں ہیں۔“ میں نے اپنا خیال کہا تو وہ بولا

”یہی تو بات ہے، اس خوف کو تو ان سے دور کرنا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ یہ کیسے کرنا۔ مجھے اس نیت ورک پر اعتماد آ جائے جو مجھے سردار سر جیت سنگھ بندیال نے دیا تھا۔ اصل میں پروفیسر دیونیدر سنگھ کے بھی وہی وچار تھے، جو سردار سر جیت سنگھ بندیال کے ہیں۔ مجھے انہیں جیسے چند مزید لوگوں سے ملنا ہے۔ میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔ ان لوگوں سے مل کر ان سے مشورہ کر کے پھر آگے چلوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ میں بہت محتاط ہوں۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے یوں کہا جیسے شادی اس کے لئے منع ہو چکی ہے اور یہ اس کے بارے دلائل دے رہا ہے۔

”لیکن اس سارے کام میں شادی رکاوٹ نہیں ہے، یقین مانو۔“ میں نے کہا تو سمجھ گیا کہ میں اسے کیا منوانا چاہتا ہوں۔ سو وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی خاموشی رہی تو اس نے کہا

”چل آ، ذرا وہ شمس اور قمر الدین کو دیکھیں۔ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان سے بھی گپ شپ کر کے دیکھ لیں۔“

ہمارے ہی علاقے میں لسانی تعصب کو اس طرح ابھارا گیا تھا کہ نوجوان نسل میں پاکستان کے وجود پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا۔ چند حکمرانوں کی بے وقوفی اور احقانہ حرکتوں نے اس تعصب کو مزید ہوا دی تھی۔ وقت کے ساتھ یہ دب گیا، لیکن چنگاریاں اب بھی موجود ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ کون قیام پاکستان کا مخالف تھا یا کون نہیں، پاکستان بن جانے کے بعد، پاکستان میں رہ کر، یہیں کا کھاکرا سی کی مخالفت کرنا، غداری کے مترادف ہے۔

اصل میں مضبوط قوم کو کوئی دشمن نہیں بچھا سکتا۔ وار وہیں پر ہوتا ہے جہاں خامی ہو۔ اگر مفاد پرستی پاکستانی قوم میں ہے تو یہ بھارتی لوگوں میں کہیں زیادہ ہے۔ پاکستانی قوم کو یہ کریڈٹ بہر حال جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وقت پڑا اس نے اپنے آپ کو قوم ثابت کیا ہے، ایسا بھارت میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ حکمرانوں کی مفاد پرستانہ پالیسیاں اپنی جگہ، ان دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ ایک قوم بن کا مضبوط تصور راسخ کریں۔

انہیں باتوں میں رات کا دوسرا پہر بھی گزر گیا۔ جہاں سنگھ بھی اپنے بارے باتیں کرتا رہا۔ اسے جن حالات کا سامنا تھا وہ کہتا رہا۔ وہیں بیٹھے اچانک یہ پروگرام بن گیا کہ یہاں سے انہیں اور لاہور چلیں۔ میں نے سوئی کو بتایا اور وہاں سے نکل پڑے۔ سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا کہ ہم لاہور ماڈل ٹاؤن پہنچ گئے۔ اس وقت طارق نذر صبح کی سیر کے بعد اپنے گھر آ چکا تھا۔ اسے سیف ہاؤس تک پہنچنے کو کہا۔ فریش ہو کر ناشتہ کرتے ہی ہم اس کی طرف چل دیے۔

وہ ابھی ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ٹھنڈے فرش پر ایک دری پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ زنجیر سے باندھے ہوئے تھے۔ وہ الٹا پڑا ہوا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ سن کر ایک بار اس نے ہماری طرف دیکھا، پھر یوں لیٹ گیا جیسے ہمیں نظر انداز کر رہا ہو۔ میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا

”یہ اسے باندھا کیوں ہے؟“

”اس نے دوبار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی ہے، ہمارے بندوں کو بھی زخمی کیا ہے۔“ طارق زبیر نے بتایا تو میں نے کہا

”کھول دوا سے۔“

میرے کہنے پر ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے اسے کھول دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے میری بات کہنے کا منتظر ہو۔ تبھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”میں مانتا ہوں کہ تم جو کر رہے، اپنے کسی بھی مفاد میں کر رہے ہو، وہ چاہے تمہارا ذاتی ہے یا ملکی یا جو بھی، میں ایسے لوگوں کی قدر کرتا ہوں کہ اندھیروں میں مارے جانے والے لوگ بہر حال قابل تعریف ہوتے ہیں، وہ اپنی قوم کے لئے لڑتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تم پر تشدد کروں۔ تمہیں اذیت دے کو تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں۔ کیوں تاہم اچھے ماحول میں، بات کریں۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ مگر اس کی آنکھیں مجھے بتا گئی تھیں کہ اسے میری بات اچھی لگی تھی۔ شاید ان آنکھوں پر اسے قابو نہیں تھا کہ لاشعور کی جھلک اس میں آگئی تھی۔ پھر بولا

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”میں پوچھوں گا تم سے، لیکن اچھے ماحول میں، اگر تم چاہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنی کلائیوں پر زنجیر سے بن جانے والے زخموں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں طارق

”چلو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور نیچے ان کے پاس آگئے۔ وہ دونوں ہی اکبر کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں وہاں آتا دیکھ کر اکبر بولا

”ان بندوں کو تو کراچی میں ہونا چاہئے۔“

”اس کی وجہ؟“ جہاں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا

”سمجھ لو کہ جس طرح ایک کارملینک کوئی نیا ماڈل متعارف کراتا ہے تو اسے نئے پرزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں نورنگر میں بیٹھ کر یہ مارکیٹ سے بچ تو ہیں، لیکن مارکیٹ تک وہ رسائی نہیں جو ہونی چاہئے۔“

”کیا یہ وہاں جانا ضروری سمجھتے ہیں۔“ میں نے اکبر کی طرف دیکھ کر پوچھا

”نہیں بھائی، اب ہم کہیں نہیں جانے کے، بہت مشکل سے یہاں سکون ملا ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر بھی مارکیٹ سے بچ ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ شمس الدین نے تیزی سے اپنے دل کی بات کہہ دی

”آج کل ہو کیا رہا ہے؟“ میں نے پوچھا

”میرا پہلا ٹارگٹ یہی ہے کہ میں جس حد تک ’را‘ کو نقصان پہنچا سکوں۔ میرے ذہن میں وہ بھی ہے جو آپ کو یہاں کے وزیر نے بتایا۔ یہی ذہن میں رکھ کر میں ہر ممکن حد تک تلاش میں ہوں، تاکہ مجھے کہیں سے بھی کوئی سراپتہ مل جائے۔“ شمس الدین نے بتایا تو قمر الدین بولا

”اروند سنگھ نے جواب تک کام کیا ہے، اس کا ٹریک درست ہے، اس نے ہمیں بھی بہت حد تک رسائی دی ہے۔ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے، یہ منصوبہ ہم آپ کو نکال دیں گے۔ کیونکہ اب یہ راز نہیں رہا۔“

”یہ خیال رکھنا، مجھے بھارت سے نہیں، یہاں سے وہ لوگ چاہئیں جو ان سب کو چلا رہے ہیں۔ خطرے کی اس بازی پر وہ بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔“

”سب مل جائیں گے۔ ایک بھی ہاتھ آگیا تو.....“ شمس الدین نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تو مجھے ایک دم سے یاد آ

یا۔ تب میں نے جمال سے پوچھا

”اُویار۔! وہ جو لیپ ٹاپ اور سیل فون ملا تھا، ڈھاری سے، وہ کدھر ہے؟“

”اوئے۔! وہ تو میرا خیال ہے جنید نے سنبھالا تھا، اسی کے پاس ہوگا۔“ جہاں نے یاد کرتے ہوئے اپنا سیل فون نکال لیا تو شمس الدین نے چمکتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ تیزی سے پوچھا

”ایسا کوئی کچھ ملا ہے؟“

”ہاں، ملا ہے۔“ جہاں نے کہا اور جنید کے نمبر پر کال کر دیے۔ کچھ ہی لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ میں شمس الدین اور قمر الدین کو سمجھانے لگا کہ انہوں نے ہمارا ہی طریقہ ہم پر آزمایا تھا۔ ہم نے انہیں سیل فون کے ذریعے تلاش کیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے ہمیں گھیرنے کے لئے بھی سیل فون ہی کا سہارا لیا۔ انہی باتوں کے دوران جنید وہ لیپ ٹاپ اور سیل فون لے آیا۔ شمس الدین اور قمر الدین دونوں اسے کھول کر دیکھنے لگے۔

میں نے انہیں کام کرنا دیا اور ان کے پاس سے اٹھ کر لان میں آگئے۔ میں، اکبر، جہاں اور جنید وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے درمیان وہی ابھی موضوع تھا۔ جہاں سنگھ کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وزیر نے جو وجہ بیان کی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بھارت ہر محاذ پر پاکستان کے ساتھ حالت جنگ میں ہے۔ اس نے ثقافتی جنگ بہت پہلے کی شروع کر رکھی ہے۔ میڈیا اور خاص طور پر نیٹ کے آجانے سے اس نے یہ

جنگ بہت تیز کر دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اثرات پاکستانی قوم میں دکھائی بھی دے رہے ہیں۔

”میں اس کے نہانے کا بندوبست کرو، اس کے لئے صاف کپڑے لاؤ۔ میں یہیں ہوں، باقی سب جاؤ۔ ناشتے بھی۔“

میرے کہنے پر سب چلے گئے۔ فوراً ہی پانی اور باقی چیزیں آگئیں، وہ نہانے لگا۔ وہ خوب نہایا تھا۔ اس دوران کپڑے بھی آگئے۔ اس نے وہ پہنے اور تیار ہو گیا۔ میں اسے کمرے سے باہر لے آیا۔ دوسری کمرے میں فرش چٹائی پھیلتی تھی۔ وہاں ناشتہ لگا ہوا تھا۔ وہ بیٹھ گیا اور ناشتہ کرنے لگا، میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اطمینان سے کھاپی کر کہا ”بولو! کیا پوچھتے ہو؟“

”مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے تھے؟“

”تم اور تمہارا میٹ درک بھارت میں ہمیں ڈسٹرب کر رہا ہے۔“ اس نے سکون سے کہا

”تو تم بھارتی ہو؟“ میں نے پوچھا

”ہاں، میں بھارتی ہوں۔“ اس نے اعتراف کیا

”ٹھیک ہے، تم لوگوں کو یہ وہم کیوں ہو گیا کہ میرا وہاں میٹ درک ہے؟“ میں نے پوچھا

”اگر آپ سچ نہیں بولیں گے تو میں بھی خاموش ہو جاؤں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

”میں سچ کہہ رہا ہوں، میرا کوئی میٹ درک نہیں ہے۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا

”دیریتا، کس کی تنظیم ہے، جو بھارت میں کام کر رہی ہے؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

”تم ٹانک ٹوئیاں مار رہے ہو یا پھر غلط فہمی میں مجھ تک آپہنچے ہو۔ مجھے تمہاری تلاش پر کوئی اعتراض نہیں، مجھ تک

آنے پر بھی غصہ نہیں لیکن.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا

”میں غلط نہیں پہنچا ہوں اور نہ ہی مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، میرا ڈیپارٹمنٹ دھوکا نہیں کھا سکتا۔“

”اوکے! تم ثابت کر دو، میرا وعدہ رہا کہ نہ صرف میں تجھے جانے دوں گا، بلکہ میں تمہاری بات بھی مان لوں

گا۔“ میں نے پورے اعتماد سے کہا تو اس کی بھنوں تن گئیں۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرے

سامنے کوئی معمولی آدمی نہیں بیٹھا، بلکہ ایک تربیت یافتہ جاسوس بیٹھا ہے۔ اسے مطمئن کرنا بہت مشکل ہے۔ میں

دل ہی دل میں اسے داد دے رہا تھا کہ وہ ”دیریتا“ تک پہنچ گیا تھا۔

”ایسا ہو نہیں سکتا۔“ وہ تذبذب میں بولا

”دیکھو! میں تمہیں وقت دیتا ہوں، جو چاہو، وہ سہولت بھی دیتا ہوں۔ ثابت کرو، اگر نہ کر پائے تو پھر.....“

میں جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ یہ ایک طرح سے اس پر میرا نفسیاتی وار تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا

”میں اس وقت تمہیں کوئی دلیل نہیں دے سکتا، لیکن میرا ڈیپارٹمنٹ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ تم ہو، لوکیشن

وہی تمہارے نورمگر کی ہے اور چند ہی گڑھ سے تمہارا رابطہ ہے۔ ہم تمہیں اب سے نہیں، پچھلے ماہ سے واپس کر رہے

ہیں۔ اسی سے تمہارا طریقہ سمجھ میں آیا کہ تم کیسے یہ سب کر رہے ہو۔“ اس نے بھی پورے اعتماد سے بتایا

”میں پھر کہتا ہوں کہ تمہارا ڈیپارٹمنٹ ٹانک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ سندھپ کوڑ کو جب سے جانے دیا گیا ہے، تم

لوگ اسی تناظر میں دیکھ رہے ہو۔ وہ لڑکی تو مظلوم تھی، جسے تم لوگوں نے استعمال کیا تھا، اس کے اندر کی سیکھنی کو چگا

دیا تو اس نے وہاں جا کر آگ لگا دی۔ اس نے اپنا انتقام لیا ہے۔ اب فائلوں کو بھرنے کے لئے، انہوں نے

تمہاری لمبی چڑھا دی۔ خیر، میں تمہیں ایک دو دن مزید دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ رابطہ کر لو۔ فیصلہ

تمہارے ہاتھ میں مسٹر.....“

”جے کشمن۔“ اس نے اپنا نام بتا دیا۔

”اوکے، بھانگنا نہیں، سکون سے رہو۔“ میں اٹھا تو طارق نذیر کے لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

جہاں میرے ساتھ بیٹھا ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ اٹھ گیا۔ میں نے طارق نذیر کو اس کے بارے

میں چند خصوصی قسم کی ہدایات دیں اور وزیر سے ملنے چل پڑا۔ جسے میری آمد کے بارے میں طارق نذیر نے بتا دیا

ہوا تھا۔ میں نے جہاں سنگھ کو جے کشمن کے پاس چھوڑ دیا کہ اسے مزید کرید سکے۔ ممکن ہو تو کوئی بات نکال سکے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے اروند سنگھ کو فون کر دیا۔ جب میں نے اروند سے اسی حوالے سے بات کی تو وہ بھی

ایک دم سے پریشان ہو گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد فون کرنے کو کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔

وزیر اپنے گھر ہمارے انتظار میں تھا۔ وہ صوبائی سطح کا وزیر تھا، سو اس کے پاس اسی سطح کی فورسز کے کچھ آفیسر

بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے جاتے ہی بات شروع ہو گئی۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ سبھی وہی باتیں، جو اس نے

پہلے ہی بتا دیں تھیں۔ مجھے لگا کہ یہ ملاقات بس نشستیں برخواستن ہی ہے۔ مجھے برا تعجب ہوا کہ ایسا کیوں ہوا۔ کوئی دو

گھنٹے ضائع کرنے کے بعد جب ہم وہاں سے نکلے تو مجھے وقت ضائع ہو جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن

کی طرف جا رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ اجنبی نمبر تھا، میں کال ریسیو کر لی۔

”میں صفدر اسماعیل بات کر رہا ہوں، ابھی ہم ایک میٹنگ میں تھے۔“ دوسری طرف سے بھاری آواز میں کہا گیا

”جی صفدر صاحب فرمائیں۔“ میں نے محتاط انداز میں کہا تو وہ بولا

”میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں، مجھے آپ سے ابھی ملنا ہے۔ چاہیں تو یہاں کسی ریسٹوران میں گاری روک

لیں، یا پھر ماڈل ٹاؤن میں ملاقات ہو جائے گی۔“

”کیا ایسی کوئی بات ہے کہ جو وہاں میٹنگ میں نہیں ہو سکی؟“ میں نے پوچھا

”جی ایسا ہی ہے کچھ۔“ اس نے کہا تو میں نے اس کے ساتھ مال روڈ پر موجود ایک فورسٹار ہوٹل کا طے کر کے

اسی طرف جنید کو جانے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے سامنے تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور سامنے میز پر بیٹھ گیا۔ پھر اپنا

فون نکال کر اس نے کال ملائی اور فون مجھے تھما دیا۔ دوسری طرف رنگ جاری تھی۔

”ہیلو، جمال کیسے ہو؟“ کرٹل سرفراز کی بات سنی تو مجھے ایک دم سے خوشگوار حیرت ہوئی

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا

”یہ صفدر بہت اچھا جوان ہے، ہمارا ساتھی ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔“ انہوں نے تعریف کر کے گویا

مجھے اس پر اعتماد کرنے کا کہہ دیا

”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا

”اچھا ہوگی ملاقات کچھ دنوں تک۔“ انہوں نے یہ کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون اسے واپس تھماتے ہوئے کہا

”جو بھی کہنا ہے بلا تمہید کہہ دو۔“

”ان سیاست دانوں کی بات پر نہیں جانا۔ یہ انتقام کے چکر میں ہیں۔ یہ آپ کو کہیں غلط جگہ پھنسانے جا رہے

ہیں۔ یہ جو وزیر نے بریفنگ دی ہے، یہ ان کا مفروضہ ہے۔“

”یہ مجھ سے کیوں انتقام لیں گے؟“ میں نے پوچھا تو مسکراتے ہوئے بولا

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا

”وہ تو لوکیشن پر یہاں آیا ہے نا، بالکل ایسے کہ جیسے کوئی کھوجی کتا، سوگتھتے ہوئے کسی جگہ پر چلا جائے، اسے تو یہ خبر نہیں ہوتی تا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اس مقام کا نام کیا ہے، میں اسے بدل کر بھارت ہی میں کوئی جگہ بتا دوں گا۔“

”خیر، جو کتا ہے کرو، ممکن ہے مجھے اسے کمپیوٹر کی سہولت دینا پڑے، میں ابھی نہیں مان رہا، اسے ہی غلط کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اسے سمجھایا

”بس آپ ڈٹے رہو، باقی میرا کام ہے، میراٹس اور قمر کے ساتھ رابطہ ہے، ابھی کچھ بتاتے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کچھ دیر خود کو سکون دینے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں دو طرف سے گھر رہا ہوں۔ اپنوں کی طرف سے بھی اور غیروں کی طرف سے بھی ایک نامعلوم حصار میرے گرد بنا جا رہا ہے، یہ حصار کون بنا رہا ہے، مجھے اس کی ذرا بھی سمجھ نہیں آرہی تھی، جب کافی تک مجھے کچھ نہیں سوچا تو میں نے سب کچھ دماغ سے نکال دیا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ بیڈروم میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے جہال کو فون کیا۔ وہ سرد ہی کے پاس تھا۔ کچھ دیر بعد میں فریش ہو کر نیچے لاؤنج میں آیا تو جینیٹی دی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک سختی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹی دی بند کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”کدھر ہیں سب؟“ میں نے پوچھا

”نیچے ہیں اب۔“ اس نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔ میں بھی اس کے ساتھ چلتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہاں ایک ہال تھا۔ ایک طرف جہال سنگھ کے ساتھ سرد بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے آگے بے لکشمین کے ساتھ اکبر نے اسکرین پر نگاہیں گاڑیں ہوئی تھیں۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے جاتے ہی کہا تو سرد نے اٹھتے ہوئے کہا

”اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ کی سہولت دی ہے، دیکھیں کیا کرتا ہے۔“

میں آگے بڑھا اور بے لکشمین کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا

”رابطہ ہوا تمہارا اپنے لوگوں سے یا ابھی تک ہمیں ہی الجھا رہے ہو؟“

”آپ لوگ چاہو تو مجھے ابھی قتل کر دو، لیکن آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، کوئی ایسا نہیں کر سکتا، میرا ایک اہم بندے کے ساتھ رابطہ ہو چکا ہے، وہ اپنی تحقیق کر رہے ہیں، جیسے ہی کوئی نتیجہ آتا ہے، میں آپکو بتا دیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کرسی گھمائی اور اسکرین پر دیکھنے لگا۔ تبھی اس کی نگاہیں یوں ہو گئیں جیسے حیرت سے پھٹنے لگی ہیں۔ وہ بت بنا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

میں بے لکشمین کا چہرہ دیکھ رہا تھا، جہاں پر حیرت جم کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک تنگی کی کیفیت میں رہا اور پھر اس نے خود کو یوں ڈھیلا چھوڑ دیا، جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ سرد کی نگاہیں بھی اسی کے چہرے پر تھیں۔ جہال سنگھ اور اکبر بھی اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ ہونٹوں کی طرح ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے نرم لہجے میں پوچھا

”کیا بات ہے لکشمین۔! تم ٹھیک تو ہو؟“

”بہت بڑی بھول ہو گئی۔“ اس نے گہرا سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر دے ہوئے لہجے میں کہا

”ہوا کیا ہے، کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے؟“ میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا

”آپ ان کے بندوں کو جب چاہئے اٹھا لیتے ہیں، انہیں ذلیل کر دیتے ہیں، وہ یہ بھی، اگر انہیں ہمارا خوف نہ ہو تو یہ کب کے نورنگر پر بم چلوا چکے ہوتے۔ اور دوسری بات، جو بندہ آپ کے ہاتھ لگ چکا ہے، وہ اس سے بالکل الگ ہے، جو یہ کہانی سن رہے ہیں۔“

”مطلب ان کی کہانی اور وہ بندہ دو الگ الگ سمیتیں ہیں۔“ میں نے سمجھتے ہوئے کہا

”بالکل! جیسے ہی وہ پکڑا گیا، یہاں ایک دوسری کہانی بیان کی جانے لگی۔ تاکہ آپ ان کی بات مان کر چل پڑیں اور یہ کسی بھی جگہ.....“ اس نے باقی بات ادھوری چھوڑ دی، جس میں میں سمجھ گیا

”ان تین سیاست دانوں کا، میرے علاقے کے ظہور مرزا کا، یہ سب کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا

”دبی، جو یہ سیاست دان کرتے ہیں۔ باہر کے ممالک میں، غنڈوں میں، عالمی تنظیموں سے بنا کر رکھتے ہیں، کسی بھی وقت کوئی کام آ سکتا ہے، روپیہ پیسہ الگ ملتا ہے، کاروبار اور دوسری مراعات الگ ملتی ہیں۔ جیسے کوئی کسی کوئی دانہ ڈالتا ہے، ویسے یہ چمک لیتے ہیں۔“ اس نے چند لفظوں میں مجھے سمجھایا

”ہاں اگر ان کی توجہ اپنا مال بنانے کی طرف نہ ہو تو یہ عوام خوشحال نہ ہو جائے۔ پتہ ہے کہ ہر سال سیلاب آتا ہے، اس کا سد باب نہیں کر سکے، خیر! آپ کے خیال میں ایسا کیوں؟“ میں نے پوچھا

”یہ جو ماردارئے عدالت قتل ہوتے ہیں نا، یہ مجرم بھلے ہوں یا نہ ہوں، بحث اس سے نہیں، لیکن یہ کہیں نہ کہیں ان سیاست دانوں کے ساتھ رہے ہوتے ہیں، ان کی پشت پناہی کر چکے ہوتے ہیں، ان کے لئے معمولی غنڈہ گردی سے قتل تک کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ ان کے اور وہ ان کے راز جانتے ہیں، ایسے لوگ جب بھی بیکار تصور کئے جانے لگے، انہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ فورسز تک میں یہ بات ہے، خیر اسے چھوڑیں یہ لمبی کہانیاں ہیں۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ ذکر اسے دکھ دے رہا ہے۔

”آپ بتائیں اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ میں نے اس سے مشورہ لیا

”آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے، میں نے آپ کو بتانا تھا، باقی آپ میرا نمبر محفوظ کر لیں، یہ ایک محفوظ نمبر ہے، جب چاہئے بات کر سکتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اٹھنے کے لئے پرتو لے لگا تو میں بھی اٹھ گیا۔ اب وہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہم اٹھے اور وہاں سے چل دیئے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی جہال کو فون کیا۔ اسے کہا کہ میں سرد کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ بے لکشمین کو لے کر آ جاؤ، وہیں اس سے بات کریں گے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ کافی الجھ گیا ہے۔

میں سرد کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنا ٹھکانہ شاندار بنایا ہوا تھا، سیکورٹی کے اعتبار سے وہ کافی مضبوط تھا۔ دو کتال میں دو منزلہ گھر تھا، جس کے نیچے تہہ خانہ تھا۔ دوسری منزل پر وہ مجھے ایک شاندار بیڈروم میں چھوڑ کر خود جہال کو لینے چلا گیا۔ میں جہازی ساز کے بیڈ پر پڑا سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ ایسے میں ارون سنگھ کا فون آ گیا۔

”وہ شخص درست کہہ رہا ہے۔ اس کا ڈیپارٹمنٹ ہماری غلطی کی وجہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ غلطی چند ہی گڑھ سے ہوئی ہے۔ اور وہ رویت کور سے انجانے میں ہوئی۔ اس نے امیت سنگھ کو پکڑنے کے چکر میں، اس کے ساتھ کھیل کھیلے ہوئے، خود بھی ہیک کروا بیٹھی ہے۔ وہیں سے ویرتا کا پتہ چلا ہے۔“

”مطلب، ایک معمولی سی غلطی نے ہمارے بارے میں سب کچھ کھول کے رکھ دیا۔“

”سب کچھ نہیں، صرف ان کا اندازہ ہے۔ اور اس اندازے کو بالکل پلٹ کر رکھ دینے کی صلاحیت ہے ہم میں۔“ اس نے تیزی سے کہا

بھیجیں، میں اس سے بات کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، میں کر لیتا ہوں بات۔“ اس نے بے یقینی سے کہا اور پھر سے کمپیوٹر سے کے سامنے بیٹھ گیا۔ سرد اس کی ساری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اکبر کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جہاں سگھ کے ساتھ میں وہاں سے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے بیٹھتے ہی اپنا سیل فون نکالا اور اردو کو فون ملایا۔ اس نے فوراً کال وصول کر لی تو میں نے اسے جے کشمن کی ساری روداد بتا کر پوچھا ”یہ سب کیسے کیا؟“

”یہ بات یوں ہے کہ ہر کمپیوٹر جاننے والا، اور کمپیوٹر پر کام کرنے والا، اپنا ایک بیک اپ رکھتا ہے۔ میں نے بھی ہمیشہ یہ کیا ہے۔ چاہے جو کوئی کام بھی ہو۔ جب میں نے یہ تنظیم بنائی تھی تو ایک بیک اپ رکھا تھا۔ ذہن میں یہی تھا کہ جب کبھی یہ تنظیم پکڑی گئی تو بچاؤ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری یہ احتیاط کام آگئی۔ ہندو فوجیوں کی ایک شدت پسند تنظیم ہے۔ یہ صرف چند گڑھ میں نہیں دکھائی گئی۔ پنجاب کے ہر بڑے شہر میں، ہندوؤں کی اس شدت پسند تنظیم کی شاخیں ہیں۔ بس اسے استعمال کیا۔ جب تنظیم متعارف کرائی گئی، تب سے میں ان کی بھی مدد کرتا رہا، آج وہ کام آگئے۔“ اس نے تفصیل سے بتایا تو میرے ذہن میں ایک نیا خیال رینگ گیا۔

”بلاشبہ تم نے ذہانت سے یہ معاملہ سنبھال لیا۔ لیکن میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ پوری طرح یقین ہے کہ ہم انہیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟“

”بالکل!“ اس نے تیزی سے کہا

”ہو سکتا ہے جس طرح تم نے بیک اپ رکھا ہوا تھا، اسی طرح ان کے بیک اپ میں کوئی دوسری ہی بات ہو اور یہ سب کر کے وہ ہمیں دھوکا دے رہے ہوں۔ اس دوران وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کوشش کر سکتا ہوں۔“ اس نے کہا

”ٹھیک ہے تم کرو کوشش، میں بعد میں فون کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں کئی خیال کلبلا رہے تھے۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا جو سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے جے کشمن کے اعتماد پر حیرت نہیں تھی۔ بہادر اور جان واد دینے والے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ اور جب موت کا یقین ہو جائے تو صرف بہادر لوگ ہی اس کا سامنا کر پاتے ہیں۔ یہ اس کا حوصلہ ہی تھا کہ وہ اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں کاروائیاں کر رہا تھا۔ بزدل لوگ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ ساری لڑائی کمپیوٹر اسکرین پر لڑی جا رہی تھی۔ حقیقت کیا تھی، یہی سمجھنا تھا۔

یہ بات ماننے والی ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بھارت آگے ہے۔ یہ دور ایسا ہے کہ جہاں آلات کو بھی اسلحہ کی طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمیشہ دشمن نت نئے ہتھیاروں کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے انہی ہتھیاروں سے دفاع کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا، ایسا دور آنے والا ہے، جب گولی نہیں چلائی جائے گی، تو میں ایک دوسرے کو مفتوح کرنے کے لئے کئی دوسرے ہتھیار استعمال کریں گی۔ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمیں یہ سوچنا ہوگا۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سرد کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی کال رسیو کی تو اس نے بتایا

”یہ جے کشمن اب ناکارہ ہے۔ اسے جواب مل گیا ہے کہ بھارت ماتا پر قربان ہو جاؤ۔ ہائی کمشنر نہیں ملنے آئے گا۔“

”اوکے۔ اب اس کا بندوبست کرتے ہیں، اب اسے کمپیوٹر کے سامنے سے ہٹا دو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر

”میرا ڈیپارٹمنٹ دھوکا کھا گیا۔ وہ بہت چالاک نکلی، جس نے ہمیں اس راہ پر ڈال دیا۔“

”مطلب، تم نے جو کچھ کیا.....“ میں نے کہنا چاہا، لیکن وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولا

”وہ سب غلط فہمی میں کیا۔“ یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بولا، ”میں نے جو کیا، اپنے ڈیپارٹمنٹ کے حکم پر کیا۔ اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں، میں ہر طرح کی سزا کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، غلط فہمی میں کیا۔ شکر کرو، اس میں کسی کی جان نہیں گئی۔ ورنہ مجھے تمہارے ملک بھی جانا پڑتا تو میں تم سے بدلہ لینے وہاں ضرور جاتا۔ خیر۔! یہ سب کیا تھا، کیسے ہوا؟“

”مجھے میرے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے حکم ملا کہ نورنگر میں جمال رہتا ہے، اس کے سارے نیٹ ورک کا پتہ کروں۔ یہ ویرتا نامی تنظیم وہیں کی پیداوار ہے۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس تنظیم کی بنیاد میں کون ہے، کوئی دہشت گرد تنظیم یا پھر کوئی ریاست کی بنائی ہوئی فورس۔ میں نے تصدیق کرنے کے بعد اپنے ڈیپارٹمنٹ کو بتا دینا تھا۔ اس کے بعد جو بھی وہ کرتے۔“

”اب تمہارا ڈیپارٹمنٹ کیا کہتا ہے؟“

”انہوں نے کیا کہا، اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا۔ میں نے تم لوگوں کو نکال لیا۔ اب میں نے رابطہ کیا تو وہاں صورت حال کی بدلی ہوئی تھی۔ ویرتا تنظیم کے پیچھے چند ہندو لیڈروں کا نام ہے اور یہ تنظیم چند گڑھ کے ہندو

نوجوان لڑکے لڑکیوں نے بنائی ہوئی ہے۔ اب تک انہوں نے دو لوگوں کو پکڑ بھی لیا ہے۔ انہوں نے ویرتا کے نام پر رقم لوٹی تھی۔ ان سے مزید تفتیش جاری ہے۔“ جے کشمن نے یوں بتایا جیسے وہ اپنے کسی کو لیگ سے بات کر رہا ہو۔

میں کچھ لمحے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ بلاشبہ یہ اردو سگھ اور رویت کور کا کیا ہوا تھا کہ یہ سب بدل کر رکھ دیا لیکن یہ کیسے کیا، اس کا جواب تو وہی دونوں دے سکتے تھے۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا، سرد نے پوچھا

”مجھے یہ بتاؤ، یہ تم بھگت اور ہیڈمرالہ ہی پر جا کر کیوں بیٹھے، تم ادھر کہیں قریب بھی بیٹھ سکتے تھے، اس کی کیا وجہ ہے؟“

”سچ بتاؤں، وہاں ہمارا پہلے ہی نیٹ ورک تھا، وہ حویلی میرے پرکھوں کی تھی جہاں میں رہا۔ میں کام تو سارا فون سے لیتا تھا، لے لیا، یہ حقیقت ہے کہ تم کھیلے ہو میرے ہاتھوں۔“ اس نے سرد کی طرف دیکھ کر بے باکی سے کہا

”راشد کا تمہیں کیسے پتہ؟“ جہاں نے ایک دم سے سوال کیا تو گڑبڑا گیا

”اصل میں وہ ہمارا پلانٹ کیا ہوا بندہ تھا، بہت عرصے بعد وہ اس کام سے نکل جانا چاہتا تھا، لیکن نہیں نکل سکا۔ اسی سے تو پتہ چلا کہ تم لوگ کیسے کام کرتے ہو۔ وہ عالمی نیٹ کی کہانی اگرچہ درست تھی، لیکن وہ محدود تھا، صرف پاکستان اور لندن کی حد تک۔ اس نے ہمارے لئے بہت کام کیا۔“ وہ سکون سے بولا تو میں نے نرم لہجے میں کہا

”اب کیا چاہتے ہو؟“

”معافی، مجھے امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔ تمہارا جو نقصان ہوا، وہ تو سود سمیت دوں گا، مزید جو بھی ہو سکا، وہ بھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میں تمہیں معاف کر بھی دوں لیکن! تمہارا ڈیپارٹمنٹ، تمہیں قبول نہیں کرے گا۔ پاکستان سے بہ حفاظت واپس چلے جانے والا ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تجھے مرنا ہوگا۔“ میں نے کہا

”نہیں بھگوان کے لئے نہیں، میرے ساتھ وہاں جا کر جو مرضی ہو، وہ میں بھگت لوں گا۔“ اس نے اعتماد دکھاتے ہوئے ہونے تیزی سے کہا تو میں نے سکون سے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”تو ابھی کرو اپنے لوگوں سے بات، اگر وہ لوگ تمہیں واپس لینا چاہتے ہیں تو اپنے ہائی کمشنر کو میرے پاس

کے اٹھ گیا۔ تب جہاں نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا
'اب کیا کرو گے اس کا؟'

"ابھی کچھ دیر میں دیکھو، کیا ہوتا ہے۔" میں نے اسے جواب دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ ہال میں اب اسے ایک جانب بٹھایا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس کی آنکھوں میں ایسی یاسیت بھری ہوئی تھی، جو موت کا حکم سننے کے بعد انسان پر مسلط ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا
"میں مانتا ہوں کہ تم بہادر ہو حوصلہ مند نو جوان ہو، مگر تیرے لوگوں نے تیری قدر نہیں کی۔ اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔"

"میں مانتا ہوں۔" اس نے سر جھکا کر دھیسے لہجے میں کہا۔ ایسے میں کرنل وقار عظیم ہال کے دروازے میں داخل ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر ہماری جانب بڑھ آئے۔ انہوں نے آتے ہی مصافحہ کے ہاتھ بڑھایا۔ پھر بے لکشمی کی طرف دیکھ کر بولے

"اچھا تو یہ تھا۔" انہوں نے کہا اور اشارہ کیا۔ اگلے چند لمحوں میں چند جوان آگے بڑھے اور اسے اٹھا کر باہر کی جانب چلے گئے۔ جیسے ہی وہ ہال سے باہر گیا، کرنل نے میری جانب دیکھا اور کہا، "جمال! آج ڈنر ہم اکٹھے کریں گے۔ میں آپ کا منظر کروں گا۔ کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں گے۔"
"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔" میں نے اسے دوبارہ مصافحہ کیا اور پلٹ گیا۔

میں، سرد، جہاں نگہ اور جنید وقت پر کرنل وقار عظیم کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے ہمارا استقبال پوری ہی میں کیا اور اپنے ساتھ اس کمرے میں لے گیا، جہاں پہلے ہی سے تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب آپس میں ملے، اور تعارف کا مرحلہ بھی ہو گیا تو پتہ چلا کہ وہ کرنل کے ریک کے بھی اوپر کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا تھا جو اپنے ہیڈ کا نمبر ٹو تھا۔ تعارف کے ساتھ ہی احساس ہو گیا کہ یہ ملاقات کوئی معمولی ملاقات نہیں ہے۔ بات کا آغاز کرنل وقار ہی نے کیا

"یہ جو بندہ آج پکڑا گیا ہے، یہ ہماری نگاہ میں تھا، یہ کیا کرتا ہے یہ بھی پتہ تھا۔ لیکن یہاں کس نیٹ ورک کے ساتھ کام کر رہا ہے، اسے دیکھ رہے تھے۔"

"اصل میں جب تک مقامی لوگ انہیں سہولت نہیں دیتے، تب تک کوئی دشمن بھی یہاں کوئی بھی کاروائی نہیں کر سکتا۔ ہمارے وطن کے اصل دشمن یہاں کے سہولت کار ہیں۔" ایک آفیسر نے کہا تو سرد نے جوش سے کہا
"وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں، پکڑتے کیوں نہیں؟"

"پلان بن گیا ہے۔ اب صرف دیکھا یہ جا رہا ہے کہ کون سا نیٹ ورک کن سہولت کاروں کے تحت چل رہا ہے۔ ایک دوسرے آفیسر نے کہا

"یہ ایک عام آدمی کو پتہ ہے کون کیا کر رہا ہے، مثلاً جیسے کراچی میں ایک شخص جب بھی دوپٹی سے کراچی آتا ہے، ایئر پورٹ سے لے کر اس کے گھر تک تمام راستے سیل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اس قدر ظالم ہیں کہ ایک رپورٹر نے اس کی تصویر بنا کر اس سوال کے ساتھ آن ایئر کروادی کہ یہ کون ہے، کیا کراچی کا نیا ڈان ہے؟ کسی بھی سرکاری حیثیت کے بغیر سرکاری پروڈکٹ لیتا ہے۔ کون ہے؟ جواب میں اس رپورٹر کو گولی چاٹ گئی اور کسی نے پوچھا تک نہیں، جب تک ایسا ظلم ہوتا رہے گا، کیا ہوگا؟ دوپٹی میں بیٹھ کر یہاں حکومت کرنے والے کون لوگ ہیں، کیا یہ ماورائی لوگ ہیں؟" جنید نے درومندی سے کہا

"میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں۔ آکٹوپس کی طرح چند لوگوں نے مافیا کی صورت اس ملک کو اپنے گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ان کی گرفت ختم کر دی جائے گی۔" پہلے آفیسر نے کہا تو نمبر ٹو نے پہلو بدلا اور میری طرف دیکھ کر مخاطب ہوا

"یہ جو حالات ہیں وہ ہماری نگاہ میں ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں ایک دوسری بات کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ دشمن کی گرفت کمزور کرنے کے لئے، پہلے دشمن پر ضرب لگائی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں، ملک کے اندر مصفاہی سے پہلے دشمن کو ہٹا دیا جائے کہ اب اس کا وقت ختم ہے۔ اس نے اگر اب اس نے کوئی سازش کی تو اسے ہماری نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"بولیں، کیا کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا
"ساری تفصیلات آپ کو کرنل وقار بتا دیں گے۔ اور جو کچھ کرتا ہے وہ آپ نے کرنا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ دشمن کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔"

"ہو جائے گا۔" میں نے کہا تو نمبر ٹو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا تو باقی بھی کھڑے ہو گئے۔

ڈنر کے دوران بہت ساری باتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرح سے وہ ساری تفصیلات ہی تھی۔ انہوں نے جو بتایا، میرے ذہن میں اپنا ہی ایک پلان بنا چلا گیا۔ جس وقت ہم ڈنر سے واپس آ رہے تھے۔ مجھ پر ہر شے روشن ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کچھلی رات کا چاند نکلنے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ جہاں نگہ ایک سدھائے ہوئے اونٹ پر سوار تھا۔ اس کا رخ سرد پر لگی باڑی کی طرف تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ باڑے کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ باڑ پر لگی ہوئی تیز پہلی روشنی سے وہ ابھی دور تھا۔ اونٹ اس جگہ رک گیا جہاں تک روشنی آ رہی تھی۔ جہاں نگہ نے پہلے سیل فون پر وقت دیکھا پھر بیروں کی مدد سے اونٹ کو ٹھوکا دیا تو اونٹ بیٹھ گیا۔ جہاں نگہ اترا تو اونٹ اٹھ کر واپسی کے لئے مڑ گیا۔ سامنے کچھ دور باڑی تھی، جس کی دوسری جانب کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سامنے ایک بڑا سارا سیاہ گیٹ تھا۔ جہاں نگہ کھڑا نہیں رہا، بلکہ لیٹ گیا۔ اس نے پھر وقت دیکھا اور اطمینان سے سامنے دیکھنے لگا۔ باڑے کے ساتھ اس جانب فورسز کا ایک چھوٹا سا دستہ دائیں جانب سے سامنے آیا اور بائیں طرف چلا گیا۔ اب یہ ایک خاص وقت کے مطابق واپس آنا تھا۔ جہاں نگہ آگے بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ باڑے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ دوسری جانب کوئی نہیں تھا۔ وہ چند منٹ تک دیکھتا رہا۔ اسے دوسری طرف سے کال کا انتظار تھا۔ وقت لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کا فون بجا۔ اور پھر بند ہو گیا۔ کال دوسری جانب ہی سے تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں گیٹ کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا اور تین اونٹ گیٹ سے باہر آ گئے۔ جیسے ہی تیسرا اونٹ نکلا، جہاں نگہ گیٹ کے اندر تھا۔ سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ باڑے کوئی سو میٹر تک گیا ہوگا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال رسیو کر لی۔

"کہاں پر ہو؟" ایک اجنبی نسوانی آواز میں پوچھا گیا تو جہاں نگہ نے ارد گرد دیکھ کر اپنی لوکیشن بتا کر کہا۔
"بولو کیا بات ہے؟"

"اسی ڈائریکشن میں آگے بڑھتے جاؤ۔ ایک پکا کھال دکھائی دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ تو نہر پر آن پہنچو گے۔ جس طرف سے پانی آ رہا ہے، اس جانب بڑھ جانا۔ تمہیں دو کلومیٹر چلنا پڑے گا۔ نہر کے بائیں جانب

بستی ہے۔ وہیں تمہیں تمہارے دوست مل جائیں گے۔ نمسکار۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جہاں سنگھ نے طویل سانس لی اور چل پڑا۔

دو کلو میٹر سفر کر لینے کے بعد اسے بستی دکھائی دی۔ تب تک بچھلی رات کا مدقوق چاند بھی نکل آیا تھا۔ جس کی دھیمی روشنی میں وہ ارد گرد دیکھ سکتا تھا۔ نہر پر پل تھا۔ جس کے ساتھ ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ اگلی ہی لمحے اس میں سے باغیا کور نکلی اور اس کے ساتھ آ لپٹی۔ باغیا کور کی گرفت میں کیا تھا، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اس قدر غلوص اس نے پہلے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ جیسے کوئی بہن اپنے بھائی سے مل رہی ہو یا کچھ بھی وہ بڑا انہوتا جذبہ تھا۔ تبھی اس نے گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا

”چلو آؤ، جلدی نکلیں۔“

وہ تیزی سے کار میں آ بیٹھے۔ ایک لڑکا ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، ساتھ میں سندپ کور تھی، وہ بھی ملی، تب تک کار چل پڑی۔ جب تک وہ بڑی سڑک تک نہ پہنچ گئے، تب تک ان میں خاموشی رہی۔ تب پہلا سوال جہاں ہی نے کیا۔

”باغیا! یہ بارڈر پر کیا سینک ہے؟ بچھلی بار اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو گئے تھے کام سے، اس بار تو آرام سے آ گیا ہوں۔“

”پہلے بچھلی باریک بات سن لو، عین وقت پر سب بدل گیا تھا، جن کے ساتھ سینک تھی، انہیں بدل دیا گیا۔ خیر ان سب سے بدلے تو لے لیا، کوئی بھی نہیں بچا۔“

”کسی قسم کی کوئی انکوائیری.....“

”بالکل نہیں ہوئی۔ سارے چور ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہوتا یہاں اور پھر مجبوریاں کیا کچھ نہیں کروا دیتی ہیں۔ سب چلتا ہے۔“ باغیا کور نے تلخ لہجے میں کہا

”مجبوریاں، کیسی مجبوریاں؟“ جہاں نے پوچھا

”اب دیکھو! ایک لڑکی جو اپنے گھر جانے اور اسے بسانے کا خواب رکھتی ہے۔ انہیں کوئی مجبوری ہی ان ویرانوں میں نوکری کے لئے لاتی ہے، اب دیکھو یہ بی ایس ایف نے لڑکیوں کو بھرتی کیا ہے سرحدوں کی حفاظت کے لئے، کیا مرد سارے مر گئے ہیں؟ یا بچھوے ہو گئے ہیں کہ وہ فورسز میں نہیں آتے، لڑکیوں کو کیوں بھرتی کیا گیا ہے، صرف مجبور لڑکیوں کو اپنی عیاشی کے لئے۔ ان میں ننانوے فیصد غریب گھر کی ہیں۔ کیا ان کا حق نہیں کہ وہ اپنا گھر بسائیں؟ وہ اپنے گھر کا خواب لے کر ان سرحدوں کی حفاظت پر مامور کر دی گئی ہیں۔ لیکن ان سے کوئی خواب نہیں چھین سکتا۔ وہ اگر آفیسروں کے پہلو گرم کرتی ہیں تو دوسری طرف پیسہ بنا رہی ہیں۔ اب جس لڑکی سے تمہاری بارت ہوئی، اسے چھ لاکھ دیئے ہیں، ایک ہی رات میں اس نے اتنا کما لیا۔“ باغیا کور کا لہجہ ویسا ہی تلخ رہا تھا۔ تبھی سندپ کور بولی

”ایک بات اور ہی میری جان۔! پرانے زمانے میں جب لوگ سفر کرتے تھے تو عورت کو بوجھ اٹھوا کر آگے آگے چلاتے تھے۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو پہلے اس کا شکار یہی عورت بنتی تھی۔ یہ یہاں کے ہندو کی ذہنیت ہے کہ وہ خطرے کے وقت عورت کو آگے کر دیتا ہے۔ اور خود پیچھے رہ کر وار کرتا ہے۔“

”خیر کچھ بھی ہے، کرپشن ہر جگہ ہے اور یہ نا انصافی کی پیداوار ہے، جہاں نا انصافی ہوگی، وہیں کرپشن بھی ہوگی۔ جب تک کوئی بڑا نہیں کرتا، تب تک چھوٹے کی ہمت نہیں پڑتی، بڑا لوٹتا ہے تو چھوٹے اس میں حصے دار بن جاتے ہیں۔ جیسے شیر کی درندگی کے بعد گیدڑ، لکڑ بگڑ، کتے اس درندگی کو چاٹتے ہیں۔“ باغیا کور نے کہا تو جہاں نے پوچھا

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں، کیا روٹ ہے؟“

”ہمیں بے پور کے قریب جانا ہے۔ اور اس کے بعد وہاں سے امرتسر کے لئے نکلیں گے۔“ باغیا کور نے یوں کہا جیسے وہ پکنک پر جا رہی ہو۔ جہاں نے سیٹ کے ساتھ سر نکال لیا۔ کار تیز رفتاری سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ تیسرے دن کی اُجلی صبح تھی۔ ماڈل ٹاؤن والے گھر کے ایک کمرے میں میرے ساتھ، سرد اور جنید بیٹھے ہوئے تھے۔ نورنگر میں فہیم اور اردن پہنچ گئے ہوئے تھے اور وہ ہمارے ساتھ آن لائن تھے۔ ان کے قریب ہی رونیت کور اور مہوش موجود تھیں۔ وہ سب سمجھ چکے تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں نے ان تین دنوں میں پلان تیار کر کے اس کی جزئیات بھی سمجھ لی تھیں۔

ملک میں چند لوگ تھے جو انتہائی طاقت ور تھے۔ انہوں نے خود کو مضبوط رکھنے کے لئے اور عالمی سطح کی شخصیت بننے کے لئے مختلف خفیہ تنظیموں سے رابطہ کر رکھا تھا۔ ایسے لوگ صرف ہونٹ بلاتے ہیں اور ان کا کام ہونے لگتا ہے۔ کارندوں کا ایک جال انہوں نے پھیلا دیا ہوا ہوتا ہے جو یہ سب کام کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ کسی بھی جرم میں سامنے نہیں آتے اور نہ ہی ان کا کہیں ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہی وہ انسانیت دشمن لوگ ہوتے ہیں جن کا شمار اصل مجرموں میں ہوتا ہے۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ان کے بارے میں علم تو ہوتا ہے کہ جرم کے ڈانڈے کہاں مل رہے ہیں، لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے، اگر کسی طرح سے ایسے لوگوں کو پکڑ بھی لیا جائے تو کرپشن کے اس نظام میں وہ آسانی سے نکل جاتے ہیں۔ بعض اداروں میں تو ان کے اپنے لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں جو انہیں پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں۔ ایسے حالات سے یہ لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں اپنی نیک نامی کا یوں ڈھندورا پیٹتے ہیں کہ عوام یہی سمجھتی ہے کہ ان سے بڑا کوئی نیک نام ہے ہی نہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کی نشاندہی کرتے ہیں، انہیں پکڑتے ہیں، کسی بھی حوالے سے ان کے نقصان کا باعث بنتے ہیں، جلد یا بدیر غیر طبعی موت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہ کرپٹ نظام کا سب سے بڑا ظلم نہیں ہے کہ جج حضرات ایسے لوگوں کا مقدمہ سننے سے معذرت کر لیتے ہیں۔ جب عدالتیں ہی خوف کا شکار ہیں تو انصاف کہاں؟

ان میں وہ لوگ جن کا کہیں نہ کہیں سے ”را“ کے ساتھ رابطہ تھا، وہ ہمارا ٹارگٹ تھے۔ سب سے پہلا ٹارگٹ ہمیں مل چکا تھا۔ اور یہ ٹارگٹ کہیں آسان تھا۔

بنیادی طور پر وہ فیصل آباد کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ زمیندار گھرانے سے تعلق تھا۔ دور طالب علمی ہی سے وہ طلبہ سیاست میں حصہ لینے لگا تھا۔ غنڈہ گردی سے فرصت ملتی تو پڑھتا بھی۔ غنڈہ گردی ہی کو کام میں لا کر وکالت کی ڈگری حاصل کر لی اور وکیل بن گیا۔ یہیں سے اس نے سیاست کا آغاز کیا۔ پہلی بار وہ مقامی سطح پر کونسلر بنا، پھر اس کے بعد اچانک ہی سیاست کا پھیلاؤ ہوا اور وہ صوبائی سطح کا لیڈر کھلوانے لگا۔ اس کے دو نمبر دھندوں میں سب سے بڑا دھندہ رتنہ گیری تھا۔ چوری، ڈکیتی اور اجرتی قتل کروانا اس کا گویا پیشہ بن گیا۔ اس کے ارد گرد اشتہاری اکٹھے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ رکن اسمبلی بھی بن گیا۔ اس کے ان دھندوں کو دیکھتے ہوئے بہت سارے ایسے لوگ بھی اس کے ساتھ جڑ گئے، جن کا اپنا پیشہ کچھ ایسا ہی تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، وہ طاقت ور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے دھندے کا پھیلاؤ پورے پنجاب میں ہو گیا۔ اس نے کچھ ایسی تنظیموں پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا، جو

کسی نہ کسی حوالے سے شدت پسند تھیں۔ یہ اسے دہرا فائدہ دینے لگیں۔ ایک تو اس علاقے میں اس کی دھاک بیٹھ گئی کہ کوئی بھی اس کے مقابلے میں ایکشن نہیں لڑتا تھا۔ دوسرے جب بھی کوئی اس کے مخالف کوئی آواز بلند ہوتی اسے یہی لوگ دباتے تھے۔

دولت جب ہاتھ میں آتی ہے تو اس کا نشہ بڑھنے لگتا ہے۔ اس نشے میں نہ اسے دین کی خبر رہتی ہے نہ دنیا اور انسانیت کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو عالمی طاقت کا ایندھن بننے ہیں۔ انہیں ملک و ملت سے غرض نہیں رہتی۔ کسی بھی تنظیم کی آنکھ اور کان ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو قوم سے غداری کرتے ہیں۔ وہ ”را“ مخبر بن گیا تھا۔ وہ ”را“ کا مخبر ہی کیوں بنا؟ اس میں اس کی ”را“ سے ہمدردی نہیں، اس فائدے سے دلچسپی زیادہ تھی جو اسے ملنے لگا تھا۔ فاران اکاونٹ سے لے کر دوسرے ممالک میں کاروبار اور جائیداد میں اضافہ اسے ہوش ہی نہیں لینے دے رہا تھا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کتنا دولت مند ہے، میری دشمنی کے لئے فقط اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میرے وطن کا دشمن ہے۔ محبت وطن کا لبادہ پہننے وہ چوہا، اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔

ان تین دنوں میں اس کے بارے میں معلومات جمع ہوتی رہیں۔ یہ ساری باتیں کسی ثبوت کے بغیر صرف لوگوں کی بتائی ہوئی باتیں ہی تھیں۔ کہیں بھی کسی تھانے میں ریکارڈ تو کیا ایک درخواست تک نہیں تھی۔ یہ ساری معلومات ایسی تھیں کہ فورسز کسی طرح بھی ایکشن نہیں لے سکتی تھیں۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتہ نہ چلتا تو میں بھی شک و شبہ میں پڑ جاتا۔ کوئی سراہا تھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ فیصل آباد میں موجود سرد کے ایک بندے نے اطلاع دی کہ وہ ایک شخص کو لے کر آ رہا ہے اس سے جتنی معلومات مل سکتی ہیں، وہ بہت کچھ بتانے پر راضی ہے لیکن کچھ شرائط کے ساتھ۔ ہم اسی کا انتظار کر رہے تھے جو تھوڑی دیر قبل ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ سرد کے لوگ اسے کھلا پلا کر اور فریش کر کے لانے والے تھے۔ اور میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے تھا۔ اویڑ عمری اور بڑھاپے کر درمیان تھا یا شاید مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا جسم لاغر تھا، آغا بٹا رہے تھے کہ وہ کبھی بہت صحت مند جسم کا مالک رہا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ مجھے دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہا ”تمہیں اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہنا ہے کہہ دو، کوئی سوال ہوا تو میں پوچھ لوں گا۔“

اس نے اپنا سر ہلایا اور ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اپنے بارے میں بتاتا چلا گیا۔

”میں اس کے پاس ملازم تھا۔ ان دنوں شہر میں میرا بھی طوطی بولتا تھا۔ میں پہلوان تھا اور اکھاڑا کرتا تھا۔ ہر جمعہ کے دن دھل ہوتا تھا۔ ارد گرد علاقے کے تقریباً سبھی پہلوان گرا چکا تھا۔ میری اپنی بیوی بچے تھے۔ اپنا گھر تھا۔ بڑا بیٹا پڑھ رہا تھا۔ خرچ اخراجات بڑھ رہے تھے۔ انہیں دنوں میں اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کئی دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے اپنے پاس بطور بد معاش رکھ لیا۔ یہ ایک طرح سے لوگوں پر دہشت ڈالنے کے تھا کہ فلاں پہلوان بھی اس کے ساتھ ہے۔ تقریباً آٹھ سال میں اس کے پاس کام کیا، اکھاڑا ختم ہو گیا اور مجھے بھی حرام کی کمائی کی لت پڑ گئی۔ میرا کام زمینوں پر قبضے کرنا، غنڈہ گردی اور ایسے کئی کام تھے۔ فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل میں سالانہ فیکشن ہوا کرتا تھا، وہیں پر ایک طوائف یہاں لاہور سے گئی، جس نے اور لوگوں کے ساتھ میرا بھی دل لوٹ لیا۔ میں اس کا ہو گیا۔ میں اس کے چکر میں پڑ گیا، جس پر اس نے مجھے اس طوائف کو اٹھا لانے کو کہا۔ میں لے آیا۔ مگر اس مارا ماری میں مجھ سے ایک بندہ قتل ہو گیا۔ اس نے مجھے پولیس سے تو بچا لیا، مگر میں اس کے جال میں پھنس گیا۔ دو چار برس کے بعد وہ طوائف تو اپنے ٹھکانے پلٹ گئی، لیکن میری زندگی اجیرن ہو گئی۔ وہ مجھ سے منشیات کا دھندا کروانے لگا۔

انہیں دنوں اس سے بہت سارے لوگ بھی آکر ملنے لگے۔ ایک دن میرے سامنے ایک نشئی مر گیا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے لگا۔ اس کے خاندان میں دو بچے اور ایک بیوی تھی جو لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ اس دن مجھے اپنے دھندے سے نفرت ہو گئی۔ میں نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میں یہ کام اب نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ میں اب یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ میں مسلسل انکار کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے مجھے منشیات ہی کے کیس میں اندر کروا دیا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ لیکن اس دوران اس نے میرے گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ میرے بیٹے کو بھڑکایا گیا۔ اس نے جذبات میں آکر انہی کا ایک بندہ مار دیا۔ میری بیوی اور میری بیٹی اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے میری بیوی کو قتل کر دیا اور میری بیٹی کو اٹھالیا۔ جو آج تک مجھے نہیں ملی۔“

”تم جیل سے کب رہا ہوئے۔“

”ایک سال پہلے۔“ اس نے جواب دیا

”اور تمہاری بیٹی.....“ میں نے بات اٹھوری چھوڑ دی۔

”دو سال پہلے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے سر جھکا لیا۔

”بیٹا، جیل میں ہے۔ اس سے ملے؟“ میں نے پوچھا تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا

”میں نہیں ملا اور نہ ہی میری ہمت پڑی ہے۔ وہ کہاں ہے میں نے یہ بھی پتہ نہیں کیا؟“

”اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”بہت کچھ، میرا ایک منہ بولا بیٹا بنا ہوا ہے، وہ اب بھی اسی کے پاس ہے۔ اسے اندر کی ساری باتیں پتہ ہیں۔ وہ مجھ سے اب تک دوبار ملا ہے اور وہ بھی خفیہ اس نے مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ پتہ لگا رہا ہے کہ میری بیٹی کہاں ہے، پتہ لگتے ہیں ہم نے اسے مارنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا اور پھر وہ سب بتاتا چلا گیا جو اسے اس کے منہ بولے بیٹے نے بتایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے لاہور والے گھر میں ایک عورت ہے جو یہاں کی نہیں ہے، بلکہ کسی دوسرے ملک کی ہے۔ سب کچھ سن لینے کے بعد میں نے اس کے منہ بولے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو سرد نے کہا

”اسے بھی دیکھ لیا ہے۔ اسی نے تو اس بوڑھے اچھے پہلوان کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا ہے بالکل درست ہے۔“

”تو پھر دیکھتے کیا ہو، چلو نکلتے ہیں، وہ ابھی اپنے گھر ہی میں ہے نا۔“ میں نے ایک دم سے پوچھا

”جی، ابھی تک وہ اپنے فارم ہاؤس ہی میں ہے۔ ابھی تو اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔“ سرد نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا

”پلان کیا ہے؟“ میں نے پوچھا

”سب تیار ہے، بس نکلتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں اٹھ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم اس فارم ہاؤس میں جا پہنچے۔ ہم لوگ ایک فورڈ جیل میں تھے۔ لیکن ہمارے پیچھے اور پہلے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ ہمیں داخلی گیٹ پر ہی روک لیا گیا۔ میں نے ڈیش بوڑ پر پڑا بسٹل اٹھالیا۔ اس کا میگزین دیکھا اور سیٹھی گینج ہٹا دیا۔ ایک باوردی سیکورٹی گارڈ نے قریب آکر پوچھا

”کون لوگ ہیں آپ اور کس سے ملنا ہے؟“

”مٹاؤ اسے؟“ سرد نے اپنے ایک لڑکے سے کہا۔ وہ نیچے اترا اور جاتے ہی اس کی گن پر ہاتھ مارا، گن کھینچ کر

اپنے ہاتھ میں کرتا ہوا بولا۔

”ہم کون ہیں یہ تو تیرے صاحب کو بھی نہیں پتہ۔“ اتنا کہہ کر اس نے گھما کر گمن اس کے سر پر ماری۔ قریب کھڑے چند سیکورٹی والے اس کی طرف بڑھے۔ تب تک سرد نے فورڈ ہیل آگے بڑھادی۔ ہمارے پیچھے ہی ایک فورڈ ہیل اور آن رکی تھی۔ اس میں سے کئی لڑکے نکل آئے تھے۔ انہوں نے گیٹ والی سیکورٹی کو فوراً قابو کیا۔ تو تیسری فورڈ ہیل ہمارے پیچھے آنے لگی۔ سرد نے سارا پلان کر رکھا تھا۔ مجھے اس پر رشک آنے لگا۔

”بڑا زبردست پلان کیا ہے؟“ میں نے کہا

”تین دن سے یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ میں نے یہاں دو بندے بنا لئے ہوئے ہیں جو سب بتا رہے ہیں۔ بس چند منٹ مزید۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پورچ کی طرف سے فورڈ ہیل رہائشی عمارت کے ساتھ دائیں جانب موڑ لی۔ تب تک سامنے سے کئی سیکورٹی والے آ گئے، انہوں نے گتیں سیدھی کی ہوئی تھیں۔ لیکن ہائی روف سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ وہ ایک کے بعد کر کے گرنے لگے۔ سرد نے فورڈ ہیل نے روکی، انہیں روندتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ سامنے بڑے بڑے گھرے سبز لان تھے، جن میں فورے چل رہے تھے۔ ایک سفید فوارے کے پاس کافی سیکورٹی گاڑ تھے۔ ان کا رخ بھی ہماری طرف ہو گیا۔ وہ جو تیسری فورڈ ہیل تھی، وہ رہائشی عمارت کے بائیں جانب سے پچھلی جانب گئی تھی۔ وہ لوگ دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ شدید فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا تھا۔

”وہ سامنے کھڑا ہے۔“ سرد نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔ اسے میں نے کئی بار اخباروں میں اور ٹی وی پر دیکھا تھا۔ وہ دو سو میٹر سے زیادہ فاصلے پر موجود سبز لان میں سفید فوارے کے پاس سفید کرتے اور شلوار میں لمبوس کھڑا ہے اور اس کے ساتھ چمکی ہوئی گلابی لباس میں کوئی خاتون تھی۔ ان کا رخ ہماری طرف ہی تھا۔

”دیں چلو ان کے پاس۔“ میں نے سرد سے کہا

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ فورڈ ہیل بڑھاتا چلا گیا۔ وہاں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سیکورٹی والے نہیں بچے تھے۔ میں نیچے اترا اور ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مجھے یوں اپنے قریب آتا دیکھ کر وہ تیزی سے بولا

”کون ہو تم؟“

”بتاتا ہوں اتنی جلدی کیا ہے؟“ میں نے کہا اور انہیں مزید دہشت زدہ کرنے کے لئے ان کے پیروں میں دو فائر کر دیئے۔ وہ سہم گئے۔ میں پہل سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”چلو، اس بیچ پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں بیچ پر جا بیٹھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے اپنے لہجے کو رعب دار بناتے ہوئے پوچھا، حالانکہ اس میں کھوکھلا پن صاف پتہ چل رہا تھا۔ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا

”اچھے پہلوان کی بیٹی کہاں ہے؟“

”کون اچھا اور کس کی بیٹی؟“ اس نے حیرت سے کہا تو میں اٹھا اور ایک زناٹے کا پتھر اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے پیچھے چھٹی ہوئی عورت چیخ پڑی۔ تبھی سرد آگے بڑھا اور اس نے اس عورت کا بازو پکڑ کر کہا

”اس سے ملو۔“ یہ ہے رنجنا عرف پروین جو ہمدی۔ بھارت سے تعلق ہے اور اس بے غیرت کی عیاشی کا سامان ہے۔“

”اسے سائیڈ پر لے جاؤ، اس سے بعد میں پوچھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس سے پوچھا، ”بول، اچھے پہلوان کی بیٹی کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں پتہ کہاں ہے؟“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے، تمہیں ایسے یاد نہیں آئے گی، اندر چل، وہاں پوچھتا ہوں۔“ میں نے اسے گردن سے پکڑا اور اندر کی جانب لے کر چل پڑا۔ سرد باہر سیکورٹی والوں اور عملے کے لوگوں کو قابو میں کر کے تلاشی لینے لگا تھا۔ وہ چھ فورڈ ہیل پر تھے۔ انہوں نے چند منٹوں میں وہاں پر قابو پا لیا تھا۔ یہ کسی کو ڈر نہیں تھا کہ وہاں پولیس یا کوئی دوسری فورس آتی۔ انہوں نے تب ہی آنا تھا، جب ہم وہاں سے نکل جاتے۔

میں انہیں لاؤنچ میں لے آیا۔ وہ دونوں سامنے کھڑے تھے۔ میں نے رنجنا کو گردن سے پکڑ کر کہا

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس لئے جتنی جلدی بولو گی، اتنا کم تشدد ہوگا، بولو کب سے یہاں پر ہو؟“

”ایک سال سے“ اس نے تیزی سے جواب دیا

”راے تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا

”ہاں۔“ اس نے اسی لہجے میں کہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا، پھر پہل اس کی گردن پر رکھ کر پوچھا

”کب سے“ اس نے ”را“ کے لئے کام کر رہے ہو؟“

”میرا ان سے کوئی تعلق نہیں میں.....“ لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ میں نے تیزی سے پہل نیچے کیا اور

اس کی ٹانگ پر فائر کر دیا۔ وہ ایک دم سے چیخ اٹھا۔ وہ تڑپنے لگا تھا

”اچھے پہلوان کی بیٹی کہاں ہے۔“ میں نے پوچھا تو پھر سے حیرت کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا کہ میں ہل پھر میں

بات بدل دیتا ہوں، وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ آخر میں اس سے پوچھنا کیا چاہتا ہوں۔

”میرے پاس ہے۔“ اس نے تڑپتے ہوئے تیزی سے بتایا

”اور کب سے ملک دشمنی کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا تو بولا

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا، میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”یہ کاغذات ملے ہیں اور یہ دو لیپ، ٹاپ، اس کا ڈیٹا سب بتا دے گا۔“ ایک لڑکے نے آکر بتایا۔ اگرچہ یہ اس کی بات درست تھی لیکن یہ ایک نفسیاتی حربہ بھی تھا کہ ثبوت پکڑے جا رہے ہیں۔

”کون ہو تم؟“ اس نے پوچھا

”خدائی فوجدار سمجھ لو۔ اگر تعاون کرو گے تو بہت کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ میں نے ایک نیا پانسہ پھینکا۔

”میں تعاون پر تیار ہوں۔“

”تو پھر چلو ہمارے ساتھ۔“ میں نے کہا تو وہ درد کی شدت سے سسکتے ہوئے بولا

”جو بات کرنی ہے یہیں کر لیں۔“

”یہاں دشمن ملک کے لئے کیا کام کرتے ہو؟“

”میں نے کوئی راز نہیں دیا، نہ کبھی غداری کی ہے، بس یہی شراب کا دھندہ اور.....“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر گھونسہ مارا، پھر دو لڑکوں کو اشارہ کیا کہ اسے اٹھا کر گاڑی میں پھینکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اگلے پانچ منٹ میں ہم چند لوگوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل پڑے تھے۔ سرد نے تلاشی سے کافی کارآمد چیزیں لے لیں تھیں۔ میرا اس پر تشدد کرنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔

سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں سیف ہاؤس کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ دونوں تھے۔ رنجنا فرش پر پڑی ہوئی تھی اور وہ

بھی اس کے پاس پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں موت کا خوف پھیلا

ہوا تھا۔ میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے رنجنا کی طرف دیکھ کر پوچھا

”تمہارے بارے میں تو سنا ہے کہ تم بڑی ظالم قسم کی فائٹرز رہی ہو۔ یہاں کتنا چھوٹی موٹی بنی ہوئی ہو۔ ذرا بھی شک نہیں ہوتا۔“

اس نے میری طرف دیکھا اور درد مندی والی مسکراہٹ میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا
”کیوں مذاق کرتے ہو، کہاں سے پتہ چل گیا ایسی جھوٹی بات کا۔“

”انبالہ میں سیوا داس عرف ہر دیال سنگھ مارا جا چکا ہے۔ تم دونوں کو صرف ایک شرط پر چھوڑ سکتا ہوں، سب کچھ سچ سچ بتا دو، ورنہ یہی کمرہ تمہاری قبر بن جائے گا۔“ میں نے یہ کہا ہی تھا کہ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پوری قوت سے گھونسنے میرے پیٹ میں مارا۔ میں اگر اس کی طرف سے محتاط نہ ہوتا تو وہیں ڈھیر ہو جاتا، لیکن میں ذرا سا ٹیڑھا ہوا تھا کہ وہ مجھ پر آن پڑی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت چمکنے لگی تھی۔ اس نے سرد لہجے میں کہا

”ہماری نہیں تمہاری قبر بنتی ہے، ہماری تو چتا جلتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے زور لگایا۔ وہ صرف زور نہیں لگا رہی تھی، اس کے علاوہ وہ میری گردن پر کچھ ٹول رہی تھی۔ میں ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ میں نے پوری قوت لگا کر اسے خود سے پرے کیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت نرم ہوئی تو میں نے خود کو آزاد کروالیا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اسے یوں گھمایا کہ وہ دہری ہوتی چلی گئی۔ میں نے دونوں پاؤں اس کی بغل میں رکھے اور بازو کھینچ لیا۔ اس کی ٹانگ چٹ چٹ ٹپکی، جس کے ساتھ ہی تڑپنے لگی۔ اس کا بازو جڑ سے نکل چکا تھا۔ میں اٹھا اور دروازے کے ساتھ کھڑے ہوئے لڑکے سے کہا

”پیٹرول لاؤ، اس کی چتا جلا دی جائے۔“

وہ لڑکا فوراً باہر نکل گیا۔ میری لفظ سننے کے ساتھ ہی گھٹکھ یائے ہوئے انداز میں بولی

”میں سب بتا دوں گا، پلیز مجھے بچاؤ۔“

”اب وقت گزر چکا ہے رنجنا۔“ میں نے کہا

”پلیز معاف کر دو۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ لیکن مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ وہ چیختی رہی چلاتی رہی، میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا، میں اس کی جانب بڑھ گیا۔

”کیا تم بھی اس کے ساتھ مرنا چاہتے ہو؟“

”نہیں میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔“ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا

”لگتا تو یہی ہے، لڑکے پچھلے آٹھ گھنٹوں سے پوچھ رہے ہیں اور تم کچھ بھی نہیں بتا رہے ہو۔ چلو اس کے ساتھ مر جاؤ۔ ہندو عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ سٹی ہوتی ہیں، یہاں تم اس عورت کے ساتھ سٹی ہو جاؤ۔ اچھا لگے گا نا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔ وہ لڑکا پیٹرول ایک بڑا کین لے آیا تھا۔ میں نے وہ کین کھولا اور رنجنا پر پیٹرول چھڑکنے لگا۔ وہ زور زور سے چلانے لگی۔ میں نہیں رکا۔ جب وہ اچھی طرح بھیگ گئی تو میں نے کین میں بچا پیٹرول اسی پر چھڑکنا شروع کر دیا۔ وہ بھی چلانے لگا۔

”سب بتاتا ہوں۔ سب بتاتا ہوں۔“

میں جانتا تھا کہ دوسری طرف بیٹھے کچھ لوگ یہ سب دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں سنانے کے لئے ہی اونچی آواز میں کہا

”میں جا رہا ہوں۔ یہ اگر شام تک سب کچھ سچ بتا دیں تو ٹھیک، ورنہ انہیں جلا دینا، میری طرف سے اجازت

ہے، صرف ماچس کی ایک تیلی ضائع کرنا ان پر۔“ یہ کہہ کر میں اس کمرے سے نکل آیا۔
مجھے پوری طرح احساس تھا کہ اب وہ سب کچھ اگل دیں گے۔ میں کمرے سے باہر آ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اب مجھے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُوگی پنڈ کے مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ سرخ حویلی کی چھت پر منڈیر کے پاس جہاں سنگھ کے ساتھ ہر پریت کھڑی تھی۔ ان دونوں کا رخ ڈھلتے ہوئے سورج کی طرف تھا۔ ان کے چہرے یوں روشن تھے جیسے سونے سے بنے بت چمک رہے ہوں۔ ہر پریت کور کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں اداسی بکھری ہوئی تھی۔
”جہاں! اب تو یوں لگتا ہے کہ نہ تمہارے جانے کا غم ہوتا ہے اور نہ آنے کی خوشی، جیسے یہ سب ایک روٹین بن گئی ہو۔ کیا تمہیں لگتا ہے یہاں آنے پر خوشی ہوتی اور یہاں سے جانے کا دکھ بھی محسوس کرتے ہو؟“

جہاں سنگھ نے ایک گہری سانس لی اور اس سوال میں چپے ہوئی خواہش کو بچھتے ہوئے کہا
”ہم جہاں بھی ہیں، ایک دوسرے کے ہی ہیں، کیا ملن پھیرے لے لینے ہی کا نام نہیں؟ کیا محبت کی ڈور صرف شادی کر لینے ہی سے مضبوط ہوتی ہے؟ ایسا نہیں ہے میری جان، میں دنیا میں جہاں بھی ہوتا ہوں، یہاں تیرے لئے ہی تو آتا ہوں۔ یہ کیا ہے؟ مجھ سے زیادہ تم بہتر جانتی ہو۔“

”لیکن اگر ہم مل جاتے ہیں، ہماری شادی ہو جاتی ہے تو پھر کیا ہے؟“ ہر پریت نے کھل کر کہہ دیا۔

”جب فرض زیادہ اہم ہو جائے تو مزید ذمہ داریاں بوجھ بن جاتی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں کس راستے کا راہی ہوں۔ نجانے کب کوئی.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن ہر پریت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند لمحے یونہی رہنے کے بعد وہ بولی

”رہ نہ کرے کچھ ایسا ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے طویل سانس لی، پھر بولی، ”میں بوجھ نہیں ہوں، تیری ذمہ داریوں کے حصہ دار بن جاؤں گی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن میں.....“ اس نے کہنا چاہا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ جمال کا فون تھا اس نے تیزی سے رسبو کیا۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا

”ہر دیال سنگھ باجوہ، یہ نام ہے اس بندے کا، جس کا اصل نام سیوا داس ہے۔ ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ ذات کا چمار ہے، پڑھ لکھ گیا اور اب ’را‘ کے لئے کام کر رہا ہے۔ اس وقت انبالہ میں ہے۔ میں نے جو فیصل آباد میں بندہ پکڑا ہے، یہ اس کا سوسر تھا۔ یہی اسے فیڈ کر رہا ہے۔ رات کا پہلا پہر ختم ہونے سے پہلے اسے ختم کرنا ہے۔“
”میں دیکھتا ہوں۔“ اس نے انتہائی اختصار سے جواب دیا تو جمال نے فون بند کر دیا۔

”کوئی نیا کام؟“ ہر پریت نے یوں پوچھا جیسے یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ اب بس، ہماری باتیں ختم؟

”ہاں! لیکن کوئی بات نہیں، میں کن سا کہیں، جا رہا ہوں۔ تم ایسے کرو، اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چھت سے نیچے جانے والی بیڑیوں کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ہر پریت بھی اس کے ساتھ چل دی۔

جہاں اپنے کمرے میں آ گیا تو ہر پریت نیچے جانے والی بیڑیوں کی جانب بڑھ گئی۔ جہاں نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور بیڈ پر آن بیٹھا۔ پھر اس نے فون اٹھا لیا۔ جلد ہی انبالہ میں موجود بندے سے رابطہ ہو گیا۔ اسے ساری بات سمجھا کر وہ انتظار کرنے لگا کہ وہ کب آپریشن کا آغاز کرتے ہیں۔

انبالہ شہر کے درمیان سے گذرنے والی مین سڑک جس طرف سے آتی اور آگے جا کر سادھو پور سے آنے والی

سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی میں روڈ پر دائیں ہاتھ پر ایک بڑی سڑک نکلتی ہے۔ اسی سڑک پر کافی آگے جا کر ایک منوا چوک آتا ہے۔ یہ ”پتی کلاں“ کا علاقہ ہے۔ منوا چوک سے کچھ آگے سونیا کالونی ہے۔ یہ کچھ پرانی اور کافی گنجان آباد کالونی ہے۔ سونیا کالونی کا ایک راستہ رام باغ کی طرف سے بھی آتا ہے۔ رام باغ اور منوا چوک پر ہائی ایس وین موجود تھیں۔ ان دونوں کے ڈرائیور نے آپس میں وقت کا تعین کر لیا ہوا تھا۔ اور ان کے پاس سیل فون آن تھے۔ ان کے پیچھے تین تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو اسلحہ سے پوری طرح ایس تھے۔ دونوں طرف سے وہ اس لئے آ کر کھڑے تھے کہ ہر دیال سنگھ عرف سیوا داس نے گھونٹک سپورٹس کلب سے لان ٹینس کھیل کر واپس آتا تھا۔ وہ ان دونوں راستوں ہی کو استعمال کرتا تھا۔ ان میں سے کسی راستے سے ہوتا ہوا وہ لکشمی نرائن مندر کے پاس سے ہوتا ہوا اس کے عقب میں موجود چوک میں جاتا، جس سے اگلی گلی میں اس کا دو منزلہ گھر تھا۔ یہ اس نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ لیکن گھر میں ایک رکھیل رکھ چھوڑی تھی، وہ ایسی رکھیل، ہر دوسرے تیسرے برس بدل لیتا تھا۔ بچوں کا جھنجھٹ اس نے پالا ہی نہیں تھا۔ اس نے را کے لئے بہت سارے کام کئے تھے۔ اس کی انہیں خدمات کو مد نظر رکھ کر انہوں نے ملک سے باہر کے ٹاسک بھی اسے دینا شروع کر دیئے تھے۔ وہاں سب کی نظر میں وہ ایک بزنس مین تھا، جس کا گھونٹک کمپلیکس ہی میں آفس تھا۔ دراصل یہ اس کا آپریشن روم تھا، جہاں سے وہ اپنے سروس کے ساتھ رابطے میں رہتا تھا۔

اس وقت ساڑھے سات ہو چکے تھے، جب منوا چوک کی طرف سے اس کی سیاہ ہنڈائی نمودار ہوئی۔ اس کا ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ رام باغ کے لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔ وہ طوفانی رفتار سے اس کے گھر کی جانب چل پڑے۔ وہ اس سے پہلے پہنچ جانا چاہتے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کے ارد گرد اگر سیکورٹی ہے تو کتنی اور کیسی ہے؟

جیسے ہی سیاہ ہنڈائی منوا چوک والوں کے پاس سے گذری تھی، وہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ یہاں تک کہ وہ لکشمی نرائن مندر کے پاس جا پہنچے۔ وہاں تک انہیں سب کیئر ملا تھا۔ کسی بھی قسم کی کوئی چھپی ہوئی سیکورٹی کا شائبہ تک نہیں ملا۔ جیسے ہی اس سیاہ ہنڈائی چوک کر اس کے گلی میں داخل ہوئی، تو دوسری جانب سے وین بھی اندر آگئی۔ اسی کے ساتھ ہی پیچھے منوا چوک سے آنے والوں کی وین رک گئی۔ ہر دیال سنگھ عرف سیوا داس جیسے ہی اپنی کار سے نکلا ہروین سے دو آدمی نکل کر انتہائی تیزی سے اس کے پاس آ گئے۔ ہر دیال سنگھ عرف سیوا داس چالاک اور کانیاں شخص تھا، وہ سمجھ گیا کہ یہ سب اتفاق نہیں ہے۔ وہ واپس کار میں بیٹھنے لگا تو ایک بندے نے بھاگ کر اپنی ٹانگ دروازے میں اڑا دی۔ تب تک وہ واپس کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن بندہ نہ کر پایا۔ دوسرے نے اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ آدھا باہر آیا تھا کہ ایک بندے نے اس کے سر پر پھٹل رکھ کر فائر کر دیا۔ پھٹل پر سائیکلنر تھا۔ زیادہ آواز نہیں ابھری۔ ڈرائیور کو اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سہا ہوا، اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی ایک بندے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

”تمہارے بڑے پوچھیں گے کہ اسے کس نے مارا، کہہ دینا“ دیرتا“ نے مارا ہے۔ وہ سب سمجھ جائیں گے۔ کہنا، اب دوبارہ غلطی نہ کریں۔“ یہ کہتے ہی وہ پلٹا اور وین کی جانب بڑھا۔ دونوں وین بیک ہوئیں اور گلی کی ٹکڑ تک جا کر جدھر سیدھی ہوئیں، اسی جانب چل پڑیں۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے، جب جہاں سنگھ کو خبر مل گئی کہ ہر دیال سنگھ عرف سیوا داس کو مار دیا گیا ہے۔ وہ بیڈ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ بھارتی نشریاتی ادارے اس قتل کو کیا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ

رات گئے تک یہی دیکھتا رہا۔

اس وقت جہاں سنگھ سو رہا تھا، جب ہر پریت نے لیپ ٹاپ پر اخبار پڑھ لیا تھا۔ اسی وقت انوجیت سنگھ گھر میں داخل ہوا۔ لاؤنج میں کلجیت سنگھ بیٹھی ہوئی ہاتھ کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ”جپ جی“ پکڑی ہوئی تھی، جسے وہ پورے دھیان سے پڑھ رہی تھی۔ کلجیت کور کی اس پر نگاہ پڑی تو اس نے ”جپ جی“ کو بند کیا اور اسے ملنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پاؤں پڑتا ہوں ماں جی۔“ انوجیت نے کہا تو ساتھ کمرے میں بیٹھی ہر پریت کور نے بھی سن لیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلی اور اپنے بھائی سے آ ملی۔

”اچھا میں فریش ہوتا ہوں، تم جہاں کو جگا لاؤ، اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں، مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔“ انوجیت نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تو ہر پریت نے پوچھا

”آپ کو پتہ ہے ویر، جہاں ادھر ہی ہے؟“

”ہاں مجھے پتہ، میں اسی لئے راتوں رات چندی گڑھ سے یہاں آیا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کبھی ہر پریت کور نے پریشان لہجے میں پوچھا

”ویر جی، خیر تو ہے نا؟“

”ہاں، ہاں خیر ہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ ہر پریت چند لمحے وہاں کھڑی رہی، پھر اوپر جہاں کے کمرے کی جانب چل دی۔

ناشتے سبکی نے بڑے خوشگوار ماحول میں کیا۔ تبھی انوجیت سنگھ نے جہاں کو ساتھ لیا اور ٹیبلنے والے انداز میں باہر لان کی طرف نکل پڑا۔ وہاں سفید پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد انوجیت سنگھ نے کہا

”جہاں ویرے۔ اکل دو پہر کے وقت میرے پاس ایک پارٹی لیڈر آیا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے آپ کے بارے میں بات کرنا شروع کر دی۔ میں اسے وہی کچھ بتایا، جو ہم سب کو بتاتے ہیں۔ وہ میری بات سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ ساری بات سن کر اس نے بڑی عجیب سی بات کہی۔“

”کیسی عجیب بات؟“ جہاں سنگھ نے سکون سے پوچھا تو وہ الجھتے ہوئے بولا

”ملک میں ہونے والے چند پراسرار قتل میں آپ بھی شک کے دائرے میں ہیں۔ آپ کی بھی تفتیش ہو رہی ہے بڑے پیمانے پر۔“

”اسے کس نے بتایا؟“ جہاں نے کسی تردد کے بغیر اسی سکون سے پوچھا

”میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ اس نے تو بہت گھما پھرا کر بات کی تھی، اس کا لب لباب یہ تھا کہ سیاست کوئی ایسا کھیل نہیں ہے، جسے بس یونہی کھیلا جاتا ہے۔ یہ طاقت کی گیم ہے اور طاقت ہی سے حاصل کی جاتی ہے۔

خفیہ والے چاہے جو بھی ہوں لیکن ہیں تو انسان۔ اگر وہ اتنے ہی محبت وطن ہوں تو ملک سے کرپشن اور جرم ختم نہ ہو جائیں۔ یہ جو سیاست دان اتنے بڑے بڑے کھیلے کر کے بھی دندناتے پھر رہے ہیں، انکا خاتمہ نہ ہو جائے۔ خفیہ والوں کی بھی خواہشیں اور خواب ہیں۔ یہ سارا کھیل انہی کے ساتھ مل کر کھیلا جاتا ہے۔ یہیں سے کرپشن کی شروعات ہوتی ہیں۔“ انوجیت سنگھ نے الجھتے ہوئے بتایا تو جہاں بولا

”اصل میں وہ چاہتا کیا ہے؟“

”مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کھیل کی وزارت مل رہی ہے۔ بلاشبہ اس میں پارٹی کا بہت ہاتھ ہے، خاص

طور پر تن دیپ سنگھ جی کا۔ انہیں میرے بارے کوئی کمزوری دکھائی نہیں دی تو پرانی فائلیں نکال کر اور آپ کی ذات کو ٹارگٹ بنا کر مجھ سے یہ کہا جا رہا کہ میں یہ وزارت نہ لوں اور خاموش ہو جاؤں۔ وہ کوئی اپنا بندہ لا رہے ہیں۔“ اس نے صاف انداز میں اصل بات کہہ دی۔

”کیا اس نے یہ بتایا کہ تفتیش کہاں تک پہنچ گئی ہے اور وہ میرے بارے کیا جانتے ہیں؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولا ”یہ بات تو میں تب پوچھتا تھا جب میں دلچسپی لیتا۔ اس طرح پوچھنے کا مطلب تھا کہ میں ڈر گیا ہوں، خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ یا واقعی آپ ایسے ہیں، جیسا وہ کہہ رہے ہیں۔“

”تو پھر تم فکر مت کرو۔ میں دیکھ لوں گا۔ نام کیا ہے اس پارٹی لیڈر کا؟“

”نہیں! اسے کچھ نہیں کہنا، وہ بھی اسی تاڑ میں ہوں گے کہ.....“ انوجیت نے جلدی سے کہا ”اوکے، تم فکر نہ کرو۔“ جہاں نے اس سے کہا اور بات بدل دی۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اٹھ گئے۔ انوجیت کی اس بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اس صحافی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو پاکستانی ہو کر بھی غیر ملکی ایجنٹ بنا ہوا تھا۔ وہ ایک مشہور چینل کا اینکر پرسن تھا۔ اس نے اپنی صحافت کا آغاز دیے ہی ایک رپورٹر کی حیثیت سے کیا تھا، جیسے کوئی نیا بندہ صحافت میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت ملک میں کوئی چینل نہیں تھا۔ ابتدا میں جب وہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو اسے ادب ہی سے لگاؤ تھا لیکن لکھنا اسے نہیں آتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ لکھنے لکھانے کی کوشش ضرور کرتا رہتا تھا۔ اس کی تحریر میں اس کے ذہن کی عکاسی جھلکتی رہتی تھی۔ اس کی تحریر پڑھ لگا کرتا تھا کہ جیسے وہ کوئی جنسی مریض ہے۔ ایک خاص طبقے میں شمار ہو جانے کی دھن میں وہ بہت کچھ ایسا بھی لکھتا جسے ہمارا معاشرہ قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی تحریر کی اتنی رسائی نہیں ہوتی تھی اس لئے وہ محدود رہا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد اس نے ایک اخبار جوائین کیا۔ بے جان تحریروں اور بوسیدہ خیالات کی پیشکش اسے اچھا صحافی ثابت نہ کر سکی۔ کئی برس کی محنت کے بعد بھی وہ نہ تو مشہور ہو سکا اور نہ ہی اس کی کوئی خاص تحریر سامنے آ سکی۔ وہ مایوسی کی حدود کو چھونے لگا۔

وہ صحافت چھوڑ کر کسی نوکری کی تلاش میں تھا کہ اس لاہوری کے باغ جناح میں ایک آدمی ملا۔ اس نے فلسفیانہ انداز میں دولت کی اہمیت بتانی شروع کر دی۔ اس کے ذہن میں یہی ڈالا گیا کہ اگر وہ دولت مند صحافی ہوگا تو شہرت خود بخود گھنٹی چلی آئے گی۔ صحافی اس شخص سے باقاعدہ ملنے لگا تا کہ شہرت حاصل کرنے کے گریکھ سکے اور وہ اسے اپنی لائین پر لانا چلا گیا۔ ایک طرح سے وہ اس کا استاد بن گیا اور وہ اس کا شاگرد۔ یوں محض ایک برس کی محنت سے اس نے صحافی کے دماغ میں ایسے خیالات بھر دیئے، جس سے ملک ملت بارے جذبات سرد پڑ گئے اور اس کی جگہ صرف دولت نے لے لی۔

ایک برس میں اس نے تیزی سے دو اخبار بدل لئے۔ وہ کالم نگاری کرنے لگا۔ اسے لکھے لکھائے کالم ملنے لگے، جسے عوام پسند کرنے لگی۔ اس کے گرد ایک ٹیم بنادی گئی، جو اس کے لئے لکھنے لگی۔ یہاں تک کہ ٹی وی چینل آ گئے۔ وہ ایک چینل کا اینکر پرسن بن گیا۔ اس کی ٹیم اس کے لئے کام کرنے لگی اور وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے لگا، دولت اس کے گھر کی باندی بن گئی۔ لیکن! وہ ملک و ملت کا سب سے بڑا دشمن بن گیا۔ وہ تازہ ترین معلومات، دہشت گردوں کو دینے لگا۔ ایک خاص طبقے کی وکالت کرتے ہوئے، ان کے پروپیگنڈا اخباروں میں نام بدل کر لکھنے لگا۔

کئی ملکوں کے ٹور لگنے لگے۔ وہ قوم کا مورال گرانے کی انتھک کوشش کرنے لگا۔ چونکہ ان کی رسائی ان ذرائع تک بھی ہو جاتی ہے جہاں معلومات بہت محدود طبقے تک ہوتی ہے تو دشمن دہشت گرد اپنے پلان بنانے میں اس کا تعاون حاصل کرنے لگے۔ وہ اس کے ذریعے معلومات لیتے اور فول پروف پلان بنالیتے۔ یہ سارا کوڑ اور ڈی کوڑ کا کھیل تھا۔ جو وہ کھیل رہا تھا۔ عالمی سطح پر خود کو سیکور ثابت کر کے ایک خاص عالمی طاقت کی ہمدردیاں حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط صحافی بن گیا جس کے پیچھے عسکری اور خفیہ تنظیمیں موجود تھیں۔

کچھ عرصے سے اس کے ٹی وی پروگراموں کا موڈ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ ایسے پروگرام ترتیب دینے لگا تھا، جس میں غیر محسوس انداز سے دہشت گردوں کی ہمت افزائی اور ملکی فورسز کو مذاق کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ حالات کو ایسی نہج پر لایا جائے کہ عوام اپنی فورسز کو ٹکمی اور بزدل سمجھنا شروع کر دے۔ اور فورسز کا مورال بھی گر جائے۔

سرمد اور اس کی ٹیم اس صحافی کے بارے میں کام کر رہی تھی۔ میں کسی اپ ڈیٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسے میں میرا میل فون بجا۔

نورنگر سے اردن سنگھ کا فون تھا کہ شمس الدین اور قمر الدین کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد شمس الدین پر تھا۔ میں نے اس کی آواز سن کر کہا

”ہاں بولو شمس؟“

”سر! جس صحافی کے بارے میں آپ نے بتایا تھا، میں اس کے پیچھے پیچھے تھا کہ میں ”را“ کے ایک ایسے بندے کے کمپیوٹر تک رسائی کر گیا ہوں جہاں ایک بڑا منصوبہ بن گیا ہے اور وہ ایک دو دن میں یہاں پر اہلائی ہونے والا ہے۔“

”اس منصوبے کی تفصیلات کیا ہیں؟“

شمس نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی۔ اس صحافی کے بارے انکشاف ہوا کہ وہ ”را“ کو چند ایسے لوگوں کے بارے میں رپورٹ دے چکا ہے جو محبت وطن تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ”را“ کے ایک مخصوص ایجنڈے کو پھیلانے میں رکاوٹ تھے۔ اس رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب تک یہ بندے ختم نہیں ہو جاتے ہیں، ان کا ایجنڈا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ”را“ کے بڑوں نے انہیں ختم کرنے کا منصوبہ ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے لئے ایک ٹیم بھی تیار کر لی تھی۔ جن چند لوگوں کو انہوں نے ختم کرنا تھا، ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔

”سراسر کے علاوہ بھی ایک بات سمجھ میں آ رہی ہے؟“ شمس بتایا۔

”وہ کیا؟“

”یہ لوگ اپنا یہ منصوبہ اس طرح رکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ عوام میں بھی دہشت پھیل جائے۔ اس کے لئے یہاں پر جو انہوں نے تنظیم پالی ہوئی ہے، وہ اس سے بھی کام لیں گے۔“ اس نے بتایا تو میں چند لمحے خاموش رہا، وہ بہت بڑی بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا

”شمس! ایک بار پھر سے اس ساری رپورٹ کو غور سے پڑھو، ممکن ہے کہیں ڈی کوڑ ہونے میں غلطی لگ گئی ہو۔ اس سے یہ بھی ہوگا کہ ممکنہ جگہوں کو حفاظت میں لیا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں دوبارہ دیکھ لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔ ملک میں آگ لگانے کا منصوبہ طے پا گیا تھا۔ کسی بھی تنظیم یا سیاسی پارٹی کا بندہ

مارا جاتا ہے تو اس تنظیم یا پارٹی کے لوگ احتجاج کے نام پر ایسی افراقی مچاتے ہیں کہ اس میں نجانے کتنوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ جگہ جگہ آگ لگانا، لوٹ کھسوٹ اور نجانے کیا کچھ۔ یہی وقت ہوتا ہے جبکہ ابن الوقت قسم کے سیاست دان اپنی سیاسی دوکان چمکاتے ہیں۔ مجھے اس منصوبے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا، اس لئے میں اسے ہر حال میں روکنا چاہتا تھا۔

مشرقی افق پر سورج نکلنے کی سرخی پھیل گئی ہوئی تھی۔ میں لاؤنج سے نکل کر لان میں آ گیا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا مجھے سکون دے رہی تھی۔ ایسے میں وہاں موجود باورچی مجھے ایک کپ چائے تھما گیا۔ میں اس کے سب لے رہا تھا کہ سرد آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تب وہ چند منٹ بعد بولا ”وہ صحافی، ابھی تھوڑی دیر بعد انیر پورٹ پہنچنے والا ہے، وہاں سے اس نے کراچی جانا ہے، شام تک واپس لوٹے گا۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا

”اگر اسے ابھی اٹھالیا تو اس کا نفرس سے اس کے انخوا کا چرچا پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔“ اس نے کہا تو

میں نے پوچھا

”تو پھر کیا کہتے ہو؟“

”اس کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔“ سرد نے الجھتے ہوئے کہا تو میں نے کہا

”ہم اسے کچھ نہیں کہتے، اُسے جانے دو۔“

”ہاں، ایسا ہی کرنا ہوگا۔“ وہ بولا

”لیکن تم اپنی پوری ٹیم کو الٹ کر دو، وہ ہمیں فالو کرے۔ تم اور میں کہیں جا رہے ہیں، آؤ۔“ میں نے اٹھتے ہوئے

کپ وہیں چھوڑ دیا۔ وہ نا سمجھتے ہوئے بھی میرے ساتھ اٹھ گیا۔

ابھی سورج نکلا نہیں تھا کہ میں اور سرد ماڈل ٹاؤن والے گھر سے نکل پڑے۔ اس دوران میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ ہمارا رخ باغ جناح کی طرف تھا۔

ایوان تجارت روڈ کی طرف سے گیٹ میں داخل ہوئے اور وہیں کار پارک کر دی۔ میں کار سے باہر نکل کر وہ بندے کی کار کو دیکھنے لگا، وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ یہاں آ گیا ہوگا؟“ سرد نے یونہی مجھ سے پوچھا

”اس کا معمول ہے۔ پچھلے ہفتے سے ہمارا ایک بندہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ بندہ سمجھو، اس صحافی کی ماں ہے۔ یہ بھی ایک چھوٹے اخبار کا مالک ہے۔ نام نہاد اخبار، جس پر وہ بلیک میل کرتا ہے۔ اصل میں تو یہ ایجنٹ ہے۔ یہاں اس لئے آتا ہے کہ خفیہ پیغام یا کوئی ہدایت اپنے چیلے چانٹوں کو دے سکے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک پرانی سی پچٹر کار وہیں آن رکی۔ میں نے سرد کو اشارہ کر دیا۔ جس وقت وہ باہر نکلا، ہم اس کے پاس چلے گئے۔ میں نے اپنے بازو پھیلا لئے، جیسے مدتوں بعد اس سے ملا ہوں اور اس سے گلے ملنا چاہتا ہوں۔

”ارے رضوانی صاحب! کیسے ہیں آپ؟“ یہ کہتے ہوئے میں اس کے گلے لگ گیا۔ وہ مجھے ذرا سا اپنے ساتھ لگا کر پیچھے دھکیلتے ہوئے شک بھرے لہجے یوں بولا، جیسے اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

”ہم نے آپ کو پہچانا نہیں میاں، کون ہیں آپ، پہلے تو دیکھنا نہیں آپ کو؟“

”مجھے یہ اندازہ تھا کہ آپ مجھے پہچان نہیں پائیں گے۔ اسی لئے ساتھ میں جان پہچان لایا ہوں۔“

”جان پہچان اپنے ساتھ لائے ہیں، میاں میں اب بھی نہیں سمجھا؟“ اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا ”ارے رضوانی صاحب آپ کو بھلا سمجھنے کی کیا ضرورت ہے، آپ تو خود ایک عالم کو سمجھاتے ہیں، آئیں یہاں میں آپ کو دکھاؤں۔“ میں نے کہا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کار کی طرف چل پڑا۔ چار قدموں پر کار کھڑی تھی۔ اس وقت تک سرد نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے اندر کچھ دیکھنا چاہا، میں نے اسے دھکا دیا تو وہ سیدھا سیٹ پر جا پڑا، اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

وہ میرے نیچے تڑپنے اور پھلنے لگا تو میں نے اسے قابو کر لیا۔ پھر بڑے آرام سے اسے کہا

”سکون سے لیٹے رہو میاں، زیادہ پچھلے تو کچھ ٹوٹ جائے گا، پھر مت دوش دینا، ہمیں۔“

وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ سرد اسے اپنے ہی سیف ہاؤس میں لے گیا۔ اسے لے جا کر ایک کمرے کے ننگے فرش پر بٹھایا تو اس نے رعب دار آواز میں پوچھا

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

”دیکھو، تم لوگوں کو بلیک میل کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ظاہر ہے بندہ وہی بلیک میل ہوتا ہے جو غلط کام کر رہا ہو۔ تم کسی کی پکڑی اچھالو، مجھے کوئی سروکار نہیں، کیونکہ شریف آدمی بے چارہ کیا بولے گا۔ حکومتوں سے مراعات لو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن میرے وطن سے غداری کرو، یہ برداشت نہیں ہے میاں۔“ میں اس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے سیری طرف دیکھا اور بولا

”خفیہ سے ہو؟“

”نہیں، خدائی فوجدار ہوں۔“ میں نے جواب دیا

”کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا

”یہی کہ اب تک تو نے جو بے غیرتی کی ہے، وہ بیان کر دو لیکن جو کہنا، وہ سچ ہو۔“ میں نے سرد سے لہجے میں کہا ”دیکھو تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے، میں ایک محبت وطن صحافی ہوں اور.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا

”تو ایسے نہیں مانے گا۔ تیرا سارا کچا چٹھا میرے پاس آ گیا ہے، وہ دکھا دیا تو پھر تیرا ریشہ الگ ہونا فرض ہو جائے گا۔“ میں نے کہا تو اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر بولا

”یار میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ایسا کچھ نہیں ہے، غلط فہمی ہو سکتی ہے، اسے دور کیا جاسکتا ہے۔“

”سرد! اسے دکھاؤ کہ اس نے اور اس کے چیلے چانٹوں نے کیا رپورٹ بھیجی ہیں اور اس کے نتیجے میں کیا ہونے والا ہے؟ تو اسے دکھا، میں اس کے پوتے پوتیوں کو لے آؤں۔“ میں نے کہا تو وہ تڑپ کر بولا

”خدا کے لئے انہیں مت لانا، انہیں کچھ مت کہنا، میں بتا دیتا ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے، اس میں میرا کتنا قصور ہے۔“

”تیری ان رپورٹس پر کتنے لوگ مرنے تھے۔ تجھے پتہ ہے؟ کوئی اندازہ، کتنے بچے اس میں مرنے تھے، کتنے لوگوں کی گود سونی ہو جاتی تھی، کتنے یتیم ہو جانے والے تھے۔“ میں ایک دم سے جذباتی ہو گیا اور میں نے سمجھا کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

”میں نے ایسے تو نہیں چاہا تھا، میں تو جمہوریت کے لئے یہ سب.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اسے گردن سے پکڑ کر فرش پر پھینک دیا

”جمہوریت کا انسانوں کے قتل سے کیا تعلق بے غیرت، وہ جمہوریت جو یہاں کے جاگیرداروں و ڈیروں اور

سرمایہ داروں کی لونڈی ہے، جہاں انسان سسک رہے ہیں، اور تیرے جیسے بے غیرت اس ملک فروخت کر رہے ہیں۔ آج تیرے سامنے تیرا بیٹا یا پوتا مارا جائے، اسے زندہ جلا دیا جائے۔ ہاں۔! جلا یا جائے لاؤ اس کے بیٹے کو اسے زندہ جلا کر دکھائیں اسے، پھر اسے پتہ چلے گا کہ کیسے اور کس جمہوریت کے لئے کام کر رہا ہے۔ کتنے انسانوں کا لہو پئے گی تیری یہ نام نہاد جمہوریت؟ جمہوریت کے نام پر تم لوگ جو کھیل کھیل رہے ہو، اب وہ ختم، تیرا بیٹا جلا گا تو اس کے خون کی بو سے تجھے پتہ چلے گا کہ ملک کیا ہوتا ہے، آزادی کیا ہوتی ہے؟“ میں بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ سرمہ میری حالت سمجھ گیا اس نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر بٹھایا اور اس سے کہا

”جو کہتا ہے کہو، ورنہ تیرا بیٹا لینے جا رہا ہوں۔“

”میں سب بتا دیتا ہوں۔“ اس نے دھیسے سے لہجے میں کہا تو میں نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ کہتا چلا گیا اور میں غور سے سنتا رہا۔ دوپہر ہونے تک اس نے سب کچھ اگل دیا۔

سب کچھ سن لینے کے بعد میں نے صفدر اسماعیل کو کال کی۔ وہ جیسے میرے ہی انتظار میں تھا۔ میں نے اسے فوراً ماڈل ٹاؤن والے گھر میں پہنچ جانے کو کہا۔ اس نے پندرہ منٹ بعد آ جانے کا کہا۔ میں وہاں سے نکل پڑا۔ سرمہ نے مجھے وہ ساری رپورٹس دے دیں تھیں جو میرے ہاتھ میں تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے شیطان مجھ پر قبضہ لگا رہا ہے۔ کتنے لوگوں کا خون رائیگاں جانے والا تھا۔

میرے وہاں پہنچ جانے سے پہلے صفدر اسماعیل پہنچ گیا ہوا تھا۔ میں نے رپورٹس اسے تھما کر کہا

”یہ لے جاؤ، اور شام تک ان سب لوگوں کی گرفتاری ہو جانی چاہئے۔“

”یہ یہاں کے سہولت کار ہیں؟“ اس نے پوچھا

”ہاں۔! انہی سے پتہ چلے گا کہ کتنے لوگ آچکے ہیں اور کتنے آنے والے ہیں۔ تین لوگ آج کل میں آنے والے ہیں، انہیں میں خوش آمدید کہوں گا۔“ میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رپورٹس دیکھتا رہا، پھر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

انوجیت سنگھ اوگی پنڈ سے آئے ہوئے لوگوں سے مل کر لاؤنج آگیا تھا۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ابھی یہاں سے چند ہی گڑھ کے لئے نکلے گا تو رات تک امرتسر پہنچے گا۔ وہاں سے وہ جہاز پر جا سکتا تھا۔ وہ اپنے کسی ملازم کو فون کر رہا تھا جو اس وقت امرتسر میں تھا۔ ایسے میں ہر پریت کور اندر سے لاؤنج میں آگئی۔ انوجیت فون پر بات کر رہا تھا جس کے باعث وہ سمجھ گئی کہ وہ جانا چاہتا ہے۔ اس نے فون بند کیا تو وہ بولی

”پتہ ہے، بے جی کہہ رہی ہیں کہ ابھی نہیں جانا، وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔“

”اُو بات تو خیر کی ہے نا؟“ انوجیت نے پوچھا

”مجھے نہیں پتہ، یہ تو وہی بتائیں گیں۔“

”اچھا بتاؤ بے جی ہیں کہاں؟“ اس نے پوچھا تو وہ بولی

”اوگی پنڈ گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔“

”اوکے، جب آجائیں تو بتانا، میں تہہ تک جہاں کے پاس ہوں، اوپر ہی ہے نا وہ۔“ انوجیت نے پوچھا تو ہر پریت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جہاں سنگھ ابھی اپنے اوپر والے کمرے میں تھا اور لیپ ٹاپ میں کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ انوجیت اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تو اس نے اسکرین سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا

”وہ تیرا بلیک میل کرنے والا بندہ اب نہیں رہا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ انوجیت بری طرح چونک گیا۔ اس کی آواز اس قدر اونچی ہو گئی کہ وہ خود سہم گیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ دروازے میں کھڑی ہوئی ہر پریت پر پڑی، جس کے چہرے پر بھی کافی حد تک حیرت تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ یوں ہو گئی جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے کہا

”بے جی آگئی ہیں، لاؤنج میں تم دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے آتے ہیں۔“ انوجیت نے کہا تو وہ چلی گئی، تب چند لمحوں بعد جہاں نے کہا

”اس کی موت ایک حادثہ کی صورت میں ہوئی ہے، وہ اپنی کار میں تھا کہ ایک تیز رفتار ٹرک نے اسے ٹکرا دی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔“

”لیکن۔! ان کا مقصد تو نہیں مرنا، اس کی جگہ کسی دوسرے کو.....“ انوجیت نے کہنا چاہا تب جہاں نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا

”وہ کسی دوسرے طریقے سے مر جائے گا۔“

”اوہ۔!“ انوجیت صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”جاؤ سنو، پھوپھو کیا کہہ رہی ہیں۔“ جہاں نے کہا اور اپنا لیپ ٹاپ بند کرنے لگا۔ تبھی اس کی نگاہ ایک خبر پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ اس کے امرتسری کے کیس بندے نے اطلاع دی تھی کہ ہر مندر صاحب میں کسی بھی وقت لڑائی کا اندیشہ ہے۔ دو دھڑے آپس میں الجھ رہے ہیں۔ صبح ان کی میٹنگ ہے۔ وہیں پر ہو سکتا ہے ان میں کوئی تصادم ہو جائے۔ یہ ایک ایسی خبر تھی، جو ہر طرح سے تنہی کے اتحاد کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ وہ چونک گیا۔ اس نے اسی وقت بائیتا کور کو فون کیا جو اس وقت امرتسری میں تھی۔ اس کے ساتھ نوتن کور، سندپ کور اور گرلین کور تھیں۔

”ہاں بول دیرے، کیا بات ہے؟“

تب جہاں سنگھ نے اپنی بات بتاتے ہوئے کہا

”یہ نہیں ہونا چاہئے، اس سے پوری دنیا میں بدنامی ہوگی۔ اسے روکنا ہوگا۔“

”یہ بڑا سیریس معاملہ ہو گیا ہے۔ چند ماہ پہلے بھی اسی مسئلے پر ٹکراویں اور کرپا میں نکل آئی تھیں۔ کافی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ اصل میں حکومت اس کے پیچھے ہے اور وہی انگریز والا حربہ آزماری ہے کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔“

”کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ اس کا اصل ذمے دار کون ہے؟“ اس نے پوچھا

”میں پتہ کر کے بتاتی ہوں، ویسے اندازہ ہے مجھے، وہی لوگ ہیں جو اس وقت حکومت کر رہے ہیں، ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا

”کنفرم، کسی ایک بندے کا نام پتہ کرو، میں بھی پتہ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ تبھی اس کے سیل فون پر انوجیت کی کال آگئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے بلایا جا رہا ہے۔ اس نے فون بند کیا اور نیچے جانے کے لئے اٹھ گیا۔ لاؤنج میں کلجیت کور کے پاس انوجیت بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے صوفے پر ہر پریت تھی۔ چائے لگ چکی تھی۔ وہ ایک تیسرے صوفے پر بیٹھ گیا تو ہر پریت چائے بنانے لگی۔ جب وہ چائے سرو کر چکی اور صوفے پر بیٹھ گئی تب کلجیت کور نے جہاں سنگھ کی طرف دیکھ کر دردمند سے لہجے میں کہا

”پتر۔! اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میری تم لوگوں سے بنتی ہے۔“

”ایسی کیا بات ہے پھوپھو۔“ اس نے تیزی سے پوچھا حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ جب مائیں ایسی جذباتی شروعات کریں تو اصل میں مدعا کیا ہوتا ہے۔

”میں نے زندگی میں دکھ بھی بہت دیکھے اور رت جی نے گرد مہاراج کی کرپا سے سکھ بھی بہت دیئے ہیں۔ بس اب تو فرض بھانا رہ گیا ہے۔ اب تم سب کو شادی کر لینی چاہئے بس۔“

”تو کر دیں، اس میں پوچھنے والی بات کون سی ہے، ان دونوں کے لئے کوئی لڑکی اور لڑکا دیکھا؟“ جہاں نے پوچھا

”میں نے انوجیت کے لئے لڑکی دیکھ لی ہے، بڑی سندھ ہے۔ اور ہر پریت کور کے لئے بھی ایک لڑکا ہے نظر میں۔“ یہ کہہ کر اس نے جہاں کا چہرہ دیکھا تا کہ اس کا رد عمل جان سکے، کوئی رد عمل نہ دیکھ کر وہ بولی، ”اگر تمہاری کوئی مرضی ہے تو مجھے بتاؤ.....“ کلجیت کور نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ تبھی انوجیت بولا

”جیسے آپ کی مرضی ہے بے جی، جب دل چاہے دن رکھ لیں۔“

”اور تم کیا کہتے ہو پتر؟“ کلجیت کور نے جہاں سنگھ کی طرف دیکھ کر پوچھا

”جو انوجیت نے کہا، لیکن ابھی میں امرتسر جا رہا ہوں، واپسی پہ.....“ وہ بولا تو ہر پریت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”بالکل نہیں! دونوں ادھر رہیں گے۔ نہ وہ چند ہی گزھ جائے گا اور نہ تم امرتسر۔ یہ کام ختم کر کے ہی جائیں گے۔“

”جیسے تمہارا حکم۔“ جہاں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی

”میں ذرا نئی کوڈنر بارے بتا دوں۔“

ہر پریت کور اٹھ کر اندر چلی گئی تو کلجیت کور نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا

”دیئے تو تمہارے بارے کون نہیں جانتا، کل وہ لڑکی کے ساتھ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو، بھوپندر سنگھ برار کی بیٹی ہے۔ وہ کل ڈنر ہمارے ساتھ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے بے جی، جیسے آپ چاہیں۔“ انوجیت نے کہا اور اٹھ گیا۔

بھوپندر سنگھ برار ساتھ ہی کے گاؤں رسول پور کلاں کا ایک بڑا زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ انڈسٹریسٹ بھی تھا۔ پورے پنجاب کے علاوہ لندن میں بھی اس کا کاروبار تھا۔ وہ سب انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

جہاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے۔ وہ اپنا فیصلہ تو ہر پریت کو سنا چکا تھا۔ اس نے بھی کوئی رد عمل نہیں دکھایا تھا۔ سو وہ بھی خاموش رہا۔

جہاں سنگھ دوبارہ اوپر والے کمرے کے باہر بنے شیڈ پر پڑی کرسی پر آن بیٹھا۔ شام ہونے کو تھی۔ اس کا ذہن کل ہر مندر میں ہونے والے دن کے کی طرف تھا۔ وہ کسی صورت بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ اس نے امرتسر میں موجود اپنے لوگوں کو اس بارے الرٹ کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک کسی کا جواب نہیں آیا تھا اور نہ ہی بائیتا کور نے کسی سے متعلق کوئی بات کی تھی۔ اک خاموشی تھی، جس کی وجہ سے جہاں پریشان ہو رہا تھا۔ وہ خود رابطہ کر کے کسی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہاتھ میں سیل فون پکڑے، سوچوں میں گم تھا۔ ایسے میں جمال کا فون آ گیا۔ اس نے کوڈورڈ میں یہی بتایا کہ اپنی میل دیکھو۔ وہ اٹھا اور اپنے لیپ ٹاپ تک جا پہنچا۔

اس میل میں پوری تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ وٹی ہیڈ کوارٹر سے ”را“ کے تین ایجنٹ امرتسر پہنچ جانے والے تھے۔ انہوں نے پاکستان آنا تھا۔ وہ تینوں ہی سکھوں کا روپ دھارے ہوئے تھے اور ٹرین کے ذریعے ننگانہ صاحب جانا تھا۔ ان میں ایک کا اصل نام، روہن کمار، جو کرناٹک سے تھا، دوسرا بنگا کر جو مدھیہ پردیش کا رہنے والا تھا، تیسرا اویناش چوپڑہ جو جودھ پور سے تعلق رکھتا تھا۔ ان تینوں کو میجر کنور راٹھور نامی آفیسر نے سرحد پار کا ٹاسک دیا تھا۔

خاص طور پر انہیں اس لئے چنا گیا تھا کہ یہ تینوں پہلے بھی سکھوں کے خلاف کام کر چکے تھے۔ انہوں نے سکھوں کا روپ دھارنا ہی اسی لئے تھا کہ وہ انہیں میں سے بن کر نہ صرف اندر کی باتیں معلوم کریں بلکہ جہاں کہیں بھی انہیں یہ شک پڑے کہ کوئی خالصتان کے لئے جدوجہد کرنے والا سنگھ موجود ہے، اس کا خاتمہ کرنا ہی ان کی ذمہ داری تھی۔ اور انہوں نے یہ کیا۔ انہوں نے کل کا ایک دن ہر مندر صاحب میں گزارنا تھا، اور کل شام ہی اٹاری سے نکلتا تھا۔ انہوں نے ننگانہ صاحب جانا تھا۔ اس کے بعد ننگانہ رہنے کی بجائے لاہور میں آ کر گم ہو جانا تھا۔ یہاں انہوں نے مختلف مقامات پر بم دھماکے کروانے تھے۔ اگر کوئی پکڑا جاتا، تو اس نے خودکشی کرنا تھی، ورنہ اسی طرح سکھ یا تری بن کر واپس بھارت لوٹ جانا تھا۔ ان تینوں کی تصویریں دستیاب نہیں ہو پائی تھیں۔ لیکن مل جانے کی امید تھی۔

سب کچھ پڑھنے کے بعد جہاں سنگھ چونک گیا۔ کل ہر مندر صاحب میں خصوصی طور پر رکھا گیا ارداس اور ان تینوں کی وہاں پر آمد یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بڑی سازش تھی، جو یہاں کے کسی طاقت ور بندے کی مدد ہی سے ہو سکتا تھا۔ دوسری حکومت ہی ہو سکتی تھی۔

جہاں سنگھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ انہیں ہر حال میں پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اس نے بائیتا کور سے رابطہ کیا۔ اسے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے امرتسر آنے کا کہا اور اٹھ کر تیار ہونے لگا۔ اس دوران اس نے امرتسر کے ہیڈ کوارٹر اطلاع دے دی کہ وہی پہنچ رہا ہے۔

اس وقت سورج مغربی افق میں ڈوبنے کو تھا، جب جہاں سنگھ تیار ہو کر لاؤنج میں آیا۔ سامنے ہی صوفے پر انوجیت سنگھ اور کلجیت کور بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سکون کا سانس لیا کہ اس کا سامنا ہر پریت کور سے نہیں ہوا۔ وہ کلجیت کور کے پاس جا بیٹھا اور سکون سے کہا

”پھوپھو جی، میں ذرا امرتسر تک جا رہا ہوں، میں کل تک واپس آ جاؤں گا۔“

اس کے یوں کہنے پر انوجیت سمیت کلجیت کور نے چونک کر دیکھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی

”ٹھیک ہے پتر، جیسے تم چاہو۔“

”ٹھیک ہے پھر، میں چلتا ہوں، ست سری اکال۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر فتح بلاتے ہوئے بولا

”ست سری اکال پتر۔ واہگرو کا خالصہ، واہگرو جی کی فتح۔“ کلجیت کور نے کہا تو انوجیت خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں نے جب باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے تو وہ لپک کر اس کے پیچھے گیا اور پوچھا

”بائی جی یہ اچانک.....“

”اچانک نہیں ہے چھوٹے، تو فکر نہ کر میں کل اپنی بھابی یہاں آ کر ضرور دیکھوں گا۔“ اس نے انوجیت کا کاغذ ہاتھ پتہ چھایا اور پورچ میں کھڑی فورڈیل میں جا بیٹھا۔

آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ جالندھر شہر جا پہنچا۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ یہاں نکلتے ہی اس کی نگرانی شروع ہو گئی ہوگی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ انوجیت کا یہاں ہونا تھا۔ خفیہ والے کبھی بھی اسے یوں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جہاں سنگھ سیدھا میں روڈ جا نکلا۔ وہاں اس نے فورڈیل پارک کی اور پڑے اطمینان سے مال میں چلا گیا۔ وہاں وہ خریداری کے بہانے داخل ہوا، اور چیزیں دیکھنے لگا۔ جیسے ہی اس کے سیل پر باہر کھڑی کار کا نمبر آیا وہ دوسری جانب سے نکل گیا۔ سامنے سیاہ رنگ کی ہنڈائی کھڑی تھی۔ وہ اس میں جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھے ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔ وہ جالندھر سے نکلتا چلا گیا۔

جس وقت وہ امرتسر کے مضافات میں پہنچا تو رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ اس دوران اسے ان تینوں کی اصل تصویریں ان تک پہنچ گئی تھیں جو اس نے آگے بھیج دی تھیں۔ وہ سلطان وند بانی سے گذر کر دائیں ہاتھ پر موجود راجندر کالونی کی جانب مڑ گیا۔ وہیں ایک گھر میں اس کے نیٹ ورک کا ہیڈ انتظار کر رہا تھا۔ اگلے دس منٹ میں وہ وہاں جا پہنچا۔

وہاں ہیڈ کے ساتھ دو لوگ مزید تھے۔ وہ اسی نیٹ ورک کا حصہ تھے۔ انہوں نے میز پر کاغذ پھیلانے ہوئے تھے۔ جس پر ایک سکھ لڑکا مینسل سے تیزی کے ساتھ تصویر بنارہا تھا۔

”کسی حد تک ان کی تصویر یوں بنائی ہیں۔“ ہیڈ نے ایک تصویر اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ پہلے ان کی اصل تصویر دیکھ چکا تھا۔ اب ان میں روہن کمار سکھ کے روپ میں تھا۔

”ہاں اس سے کچھ اندازہ تو ہو جائے گا، لیکن وہ کس طرح کے ہوں گے یہ حتمی نہیں کہا جاسکتا۔ ہمیں صرف ان تصویروں پر انحصار نہیں کرنا ہے۔“ جہاں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا

”ہاں یہ تو ہے۔ خیر یہ صبح تک مختلف پوز بنا دیں گے۔ جس سے سمجھنے میں آسانی ہوگی، اب ہمیں اجیت مگر چلنا ہے، وہیں باقی دوست بھی ہیں۔“ ہیڈ نے کہا تو وہ وہاں سے ہیڈ کے ساتھ نکل پڑا۔

اجیت مگر ہرمندر صاحب کے شمال میں تھا۔ وہی پرانی گلیاں، چھوٹی چھوٹی سی بل دار، جو کسی پلاننگ کے تحت نہیں بنائی گئی تھیں۔ ان گلیوں میں بے شکل چھوٹی گاڑی جاسکتی تھی۔ اس نے اپنی فور ویمیل ان گلیوں کے باہر ہی روک دی۔ تبھی ایک نوجوان آگے بڑھا تو ہیڈ نے جہاں نے پوچھا

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“ جہاں نے پوچھا

”اس لئے کہ یہاں ارد گرد سے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں، آپ انہیں بریف کر دیں۔ ظاہر ہے انہیں بتانا تو ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔“ ہیڈ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”ٹھیک ہے۔“ جہاں سمجھ گیا۔

”چالی انکیشن میں رہنے دیں، یہ لڑکا سنبھال لے گا۔“ ہیڈ نے کہا تو وہ دونوں چلتے ہوئے ان ٹیزی میٹھی گلیوں میں گھس گئے۔ وہ ایک پرانی طرز کے مکان میں داخل ہو گئے۔ جو اندر سے کافی جھنجک تھا۔ کافی ساری کمروں

میں سے وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے، جو کافی کشادہ تھا، وہاں قالین بچھا ہوا تھا اور ان پر میٹرز پڑے تھے۔ پانچ سکھ نوجوان وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہیں دیکھتے ہی کھڑے گئے اور ساتھ ہی میں فتح بلا دی۔

”واہ گرو جی کا خالصہ، واہ گرو جی کی فتح۔“

”بھائیو! میں یہاں بیٹھے نہیں آیا، ہم ابھی یہاں سے نکلیں گے۔ میری اب تک کی رپورٹ کے مطابق وہ تینوں یہاں امرتسر میں پہنچ چکے ہیں۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہے، جب تک پوری تسلی نہیں ہو جاتی، جب تک ان پر ہاتھ نہیں ڈالنا ہے۔ دوسری بات پوری تسلی کرنے کے بعد بھی یہ حتی الامکان کوشش کرنی ہے کہ زندہ ہی رہیں۔ ان کے اندر سے بہت کچھ نکلے گا۔ کیونکہ یہ سکھی کا روپ دھار کر آنے والے ہندو بائیسے کتنا سکھی کو نقصان پہنچا چکے ہیں،

کم از کم اس کا اندازہ تو ہو۔“ جہاں نے کھڑے کھڑے کہا

”اس کے علاوہ کوئی مزید بات؟“ اُن میں سے ایک نے کہا

”ساری بات آپ کے یہ جتنے دار ہی آپ کو بتائیں گے، یہی آپ کو حکم دیں گے، آپ کے سب کچھ یہی ہیں۔“

جہاں نے کہا اور پلٹ کر ہیڈ سے کہا

”میرا خیال ہے کہ اب میں چلوں، ہمارا رابطہ رہے گا۔“

”جی بالکل۔“ ہیڈ نے کہا تو وہ دونوں اس کمرے سے نکلے اور پھر باہر کی جانب چل پڑے۔ گلیوں سے نکل کر گاڑی تک آئے۔ وہیں سے ان کے راستے جدا ہو گئے۔

جہاں سنگھ کا رخ خولی کی طرف جانے کی بجائے اس پوائنٹ کی طرف تھا، جہاں بائیتا کور اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ امرتسر کے مہنگے ریسٹوران میں سے ایک تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور اندر چلا گیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی

میں ہلکی روشنی میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ٹیبل پر اسے بائیتا کور کے ساتھ نوتن کور اور گرلین کور دکھائی دیں۔ وہ اس طرف چلا گیا۔ اس نے جاتے ہی فتح بلائی، پھر مسکراتے ہوئے پوچھا

”تم لوگوں کا سیٹ پورا نہیں ہے؟“

”تم سندھپ کی بات کر رہے ہو؟“ نوتن نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جس پر وہ بولی، ”وہ جانندھر میں ہے۔“

”کیا کرنے؟“ اس نے پوچھا

”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں ایک اسی طرز کا ادارہ بنائیں، جیسا وہ سندھپ کور کا تھا۔ صرف لڑکیوں کے لئے۔ ظاہر ہے وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں بہت کچھ سکھایا جائے گا۔ وہ جو فارم ہاؤس ہے وہاں، اب اس کا ٹاسک

اسے دے دیا ہے، اب وہ وہیں رہے گی۔ وہیں کام کرے گی۔“

”چلو یہ اچھا ہوا۔ اب جو منگوانا ہے، جلدی سے منگوا لو، مجھے کام سے جانا ہے۔“ جہاں نے آہستگی سے کہا تو بائیتا کور بولی

”وہ میں نے تمہارے فون کال کے بعد ہی کہہ دیا تھا۔ اب بتاؤ کرنا کیا ہے؟“

”پہلے تو انہیں تلاش کرنا ہے، اور پھر جو بھی ان کے ساتھ ہو سکا۔“ اس نے اختصار سے کہا

”ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ اس نے پوچھا

”بس میرے فون کا انتظار۔ اس سے پہلے اپنے کچھ آدمی الرٹ رکھو، باقی میں دیکھ لوں گا۔“ اس نے جواب دیا تو سر ہلا کر رہ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ سب وہاں سے نکلے۔ ریسٹوران ہی سے ان کے راستے جدا ہو گئے۔ ان کا انداز ایسے ہی تھا، جیسے وہ سب ملنے ملانے اور کھانا کھانے اکٹھے ہوئے تھے۔ جہاں سنگھ وہاں سے سیدھا ہرمندر صاحب

چلا گیا۔ اس نے پارکنگ میں گاڑی پارک کی اور سیدھا ہرمندر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہاں پر ہاتھ ٹپکنے اور کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہ کمپلیکس کی جانب چلا گیا۔ وہ مین گیٹ پر ہی ایک نوجوان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس سے

بڑے تپاک سے ملا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ہاسٹل کے اسی کمرے میں آ گئے، جہاں اس کی ملاقات سردار سرجیت سنگھ بندیاں سے ہوئی تھی۔ اس کمرے میں بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہاں پر موجود نیٹ ورک الرٹ ہو گیا تھا۔

”بائی جی، کیا لاؤں کھانے پینے کو؟“

”کچھ نہیں تو بیٹھ میرے پاس۔“

”جی بائی جی۔“ وہ یوں اس کے سامنے دوڑا تو ہو گیا جیسے وہ کوئی اس کا بزرگ ہو۔

”میں نے تمہیں جو تصویریں بھیجی تھیں ان.....“ وہ کہہ رہا تھا کہ ہونو جوان جلدی سے بولا

”اب تک کوئی نہیں آیا یہاں پر، چند لوگ پورے ہرمندر صاحب میں پھر رہے ہیں، انہیں بھی معلوم ہے۔ کل

کے بارے بھی بڑی ٹینشن ہے۔ اب دیکھتے ہیں۔“

”کل کے بارے جو ٹینشن ہے نا، امید ہے وہ نہیں ہوگی، بس تھوڑی دیر ٹھہر جا، پھر اس کے بعد بات کرتے ہیں اس بارے۔“ جہاں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے تجسس سے پوچھا

”کوئی حل نکل آیا ہے اس کا؟“

”نہیں ابھی تک تو نہیں، ابھی تو سیاسی طور پر اسے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خالصہ کے لوگ ہیں درمیان میں، وہ میٹنگ جیسے ہی ختم ہوئی، اس کے بعد فون آئے گا۔“ جہاں نے اسے سمجھایا تو وہ تیزی سے بولا

”میری اطلاع کے مطابق، سورن سنگھ ہی اس ساری گھنٹا کا ذمے دار ہے اور اسے وزیر اعلیٰ کی پوری آشریاد حاصل ہے۔“

”بظاہر ایسا ہی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے بہت بڑی سازش ہے، تم اسے چھوڑو، یہ میری سروردی ہے، تم نے یہ دیکھنا ہے کہ ان تینوں میں سے جو بھی یہاں داخل ہو، مجھے اطلاع دے دیں۔“

”ٹھیک ہے بائی جی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔

اس نے فیلڈنگ پوری کر لی تھی۔ اب حالات کیا بننے، اس بارے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ رات اس کے لئے اس قدر بھاری تھی، جس طرح زندگی اور موت کے درمیان کوئی بہت بڑی آزمائش تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ میں جنید کے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تیزی سے پیچھے ہٹتی ہوئی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے کار بھگائے چلا جا رہا تھا۔ ہمارا رخ لاہور کے پوش علاقے کی طرف تھا، جہاں وہ صحافی رہتا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق وہ چند منٹ پہلے ہی گھر میں آیا تھا۔ سرد وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس وقت وہ گھر کے اندر داخل ہو کر اسے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمیں ان تک پہنچنے اتنا زیادہ وقت نہیں لگا۔ انتہائی خاموشی سے سرد کے لوگوں نے گھر کو اپنے قبضے میں لے لیا ہوا تھا۔ میں جب اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ دونوں آنے سامنے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے آتے ہی سرد اٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا

”کچھ بتایا اس نے؟“

”میں نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ بولا تو میں اس صحافی کی طرف چند لمحے دیکھتا رہا پھر کہا

”زندگی چاہتے ہو یا موت؟“

”کون ہو تم لوگ اور میرے گھر میں گھسنے کی ہمت کیسے ہوئی تم لوگوں کو؟“ اس نے انتہائی غصے میں کہا

”جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ میں نے اسے کار سے پکڑ کر اٹھالیا۔ اس نے جھٹکے سے میرا ہاتھ ہٹانا چاہا تو میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی اور اسے دیوار کی جانب اچھال دیا۔ وہ دھپ سے دیوار میں لگا، اور دہرا ہو کر وہیں گر گیا۔ میں نے اسے اٹھا اور گھما کر پھر زور سے ڈانگ ٹیبل کی طرف اچھال دیا۔ وہ ایک کرسی پر گرا، جو ٹوٹ گئی۔ اس کا سر ٹیبل میں لگا، جہاں سے خون بہنے لگا۔ میں نے اسے پھر جا پکڑا اور تیسری طرف دیوار میں مارا تو وہ شکست میں جا لگا، جس کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ وہ چیخنے لگا تھا۔ بھی میں نے اس کو پکڑا اور زور سے تھپڑ مارے ہوئے کہا

”خاموش!“

”تمہیں نہیں پتہ میں کیا کر سکتا ہوں، تم مجھے مار.....“

”میں تمہیں مارنے نہیں آیا، لیکن مارنے سے دریغ بھی نہیں کروں گا، جب تم ہی نہیں رہو گے تو کرو گے کیا؟“ میں نے کہا اور ایک گھونٹہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ پر جا گرا۔ تبھی وہ بولا

”کیا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔! یہ بات ہوئی نا، بولو، آگے کا پلان کیا ہے، بتا دو گے تو فوج جاؤ گے۔“ میں نے سکون سے کہا

”کون سا پلان، کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے یہ کہا ہی تھا کہ مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے اس کی دھنکی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ سرد جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے کچھ دیر کی کوشش کے بعد اسے ہوش دلایا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں جنونی انداز میں کہتا چلا گیا

”وہ تین بندے، جولاہور میں آ رہے ہیں، اور جس کو تم گائیڈ کر رہے ہو، کیا تمہیں نہیں پتہ وہ کیا کرنے آرہے ہیں؟ انہوں نے جو بم بلاسٹ کرنے ہیں، اُن میں کتنے باپ مر جائیں گے، کتنے بچے یتیم ہوں گے، کتنی مائیں نہیں رہیں گی، میں ابھی تمہارا بیٹا تمہارے سامنے جلاتا ہوں، پھر تم ان کا درد محسوس کرنا اور بتانا کہ تمنا شدہ دیکھنا کیسا لگتا ہے؟ جاؤ لاؤ اس کا ایک بیٹا، اور کچن میں گیس کھول دو۔“

”نہیں، تم کچھ نہیں کرو گے، جو کہو گے وہی کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تڑپ اٹھا تھا۔

”تو بولو۔“ میں نے کہا تو تیزی سے کہنے لگا۔

”تمہیں پتہ ہے یہاں کیسی لڑائی ہے۔ یہاں ایسے لوگ تیار کر دیئے گئے ہیں جو یہاں پر دونوں دھڑوں کے لوگوں کو قتل کریں گے اور ہم نام ان دونوں دھڑوں کا لگا کر فساد کو مزید بڑھائیں گے۔“

”یہ مجھے معلوم ہے کوئی نئی بات۔“ میں نے سکون سے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا

”میرے ذمے تو اتنا ہی ہے، اُسے کچھ لوگ ہیں جو یہ سب دیکھتے ہیں۔“

”نام بتاؤ۔“

”وہ سب ڈنڈا، میرے لیپ ٹاپ میں ہے، میں وہ نکال کر دے سکتا ہوں۔“ اس نے کہا تب میرے سامنے

جنید آ گیا۔ اس کے پاس کافی کچھ تھا۔ بھی میں نے اس صحافی سے کہا

”تو چلو پھر ہمارے ساتھ۔“

میں سرد کو اشارہ کیا، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب تک میں باہر نکلا، وہ اسے اٹھا کر کار میں ڈال چکے تھے۔ ہمیں سیف ہاؤس تک پہنچنے میں منٹ سے زیادہ وقت لگ گیا۔ سرد تو جاتے ہی کام سے لگ گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کھول کر ٹیکس اور قمر کے ساتھ رابطے میں ہو گیا۔ وہیں ارد گرد اور فہم تھے۔ جنید اپنے ساتھ ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔ اگلے دس منٹ میں چند اہم نام سامنے آ گئے جو یہاں سہولت کار ہی نہیں بہت بڑی سازش تیار کر چکے تھے۔

ان میں دو نام بہت اہم تھے۔ ایک بہت بڑا بزنس مین تھا اور دوسری سوشل ورکر خاتون تھی، یہ اس سازش میں بہت فعال تھے۔ میں نے انہیں اٹھالانے کو کہہ دیا۔ بزنس مین لاہور قریب ہی ٹاؤن کا تھا، جبکہ سوشل ورکر خاتون ابھی تک علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن والے کو تو ابھی لایا جا سکتا تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن والی عورت کو لانے میں وقت لگتا۔ صحافی کو صرف اتنی معلومات تھی کہ ایسا ہونے جا رہا ہے۔ یہ سب کیسے ہوگا اور وہ لوگ کہاں پر ہیں، یہ اسے بالکل نہیں پتہ تھا۔ جیسے ہی مجھے اس سازش کا پتہ چلا، میری نیند اڑ چکی تھی۔ شاید اس بارے پتہ نہ چلتا، اگر اس صحافی کو نہ ٹولا جاتا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور صفدر اسماعیل کو فون کر دیا۔ وہ رات کے دوسرے پہر بھی جاگ رہا تھا۔

”جی فرمائیں۔“

”مجھے فوری طور پر دو بندے چاہئیں۔“ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا تو اس نے تیزی سے جواب دیا
”نام بتائیں۔“

میں نے نام بتائے تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا،

”میں ابھی آپ کو دوبارہ کال کرتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ وہ نام ہی ایسے تھے کہ جن پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس کا فون آیا تو وہ بولا، ”انہیں لانے کے لئے کچھ بندے چلے گئے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں وہ بہت جلد آ جائیں گے۔“

”او کے میں انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے اب ان کا انتظار تھا۔

رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جب اس بزنس مین کو لایا گیا۔ وہ فریبہ بدن اور نانے قد کا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خشکی داڑھی تھی۔ نین نقش موٹے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی سختی تھی۔ وہ مجھے گھورتا ہوا میرے سامنے آ بیٹھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بڑے سکون سے پوچھا
”تمہیں کیا دلچسپی ہے کہ تم اپنے ملک کے خلاف ہو رہے ہو؟“

”کون بہن..... کہتا ہے؟“ اس نے بھاری آواز میں انتہائی غرور سے گالی دیتے ہوئے پوچھا

”میں پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

”تم کون ہو یہ بات پوچھنے والے؟“ اس نے مجھے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے حقارت سے پوچھا

”جو بات پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ زیادہ بکواس نہیں کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو اس نے مجھے حیرت سے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

”کیا کہا تم نے، اب تک کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ مجھ سے یوں بات کر سکے، تم.....“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ میں اٹھا اور ایک زوردار تمپٹر اس کے منہ پر مار دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ خون کی ایک دار اس کے منہ سے نکلی۔ وہ ابھی سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری وہ فرش پر لیٹ گیا۔ پھر میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ اس کے منہ سے چیخ نکلتی، کچھ دیر بعد وہ بے دم ہو گیا۔ میں اشارہ کیا تو جنید کے ساتھ ایک دوسرے لڑکے نے اسے کھڑا کیا۔ میں نے اسے ٹھوڑی سے پکڑ کر کہا

”اب پتہ چلا کون ہوں میں، لیکن چھوڑو، جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔“

”میں نے..... کچھ نہیں کیا،..... میں..... کیوں ملک دشمنی..... کروں گا۔“

”اس لئے کہ تیرا بزنس، دوسروں ملکوں کے ساتھ بھارت سے بھی ہو۔ کرو بزنس، کس نے روکا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ملک دشمنی اس حد تک کرو کہ اسے ختم کرنے کی سوچو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے جنید سے کہا ”ایک چھری اور ماچس لاؤ۔“

وہ بزنس مین میری جانب ہونفوں کی طرح دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں میرے چہرے پر کیا کراہٹ تھی، یا کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف پھیلنے لگا تھا۔ چند لمحوں میں میرے سامنے چھری آ گئی۔ میں نے اسے لیا اور اس کی ہتھیلی کھول کر درمیان سے گہرا زخم لگا دیا۔ وہ ٹرپتے ہوئے چیخنے لگا۔ پھر میں نے ماچس سے تیلی رگڑی۔ شعلہ جل اٹھا۔ میں اس کی ہتھیلی کو الٹا تو خون ٹپکنے لگا۔ اسی زخم پر میں وہ شعلہ لگایا تو وہ مچھلی کی مانند ترپنے لگا۔

”چھوڑ دو، خدا کے لئے چھوڑ دو، میں بے گناہ ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ چیخنے لگا تھا، تیلی بجھ گئی۔ تو

میں نے دوسری جلائی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ میں نے جلتی ہوئی تیلی اس کے سامنے کی اور کہا

”جب بم پھٹتا ہے تو لوگوں کے جسم کٹتے ہیں، جلتے ہیں۔ میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی بدن پر کیا اثر ہوتا ہے کٹنے کا اور جلنے کا۔ یہ دیکھو۔“ میں نے دوبار تیلی کے شعلے سے اس کی ہتھیلی کو جلانے لگا۔ وہ ترپنے لگا۔

”میں بتاتا ہوں، میں بتاتا ہوں۔“

”بکو۔“ میں نے ختم ہوئی تیلی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا

”میرے ساتھ صرف اتنی ڈیل ہوئی ہے کہ چند غیر ملکی میرے پاس رہیں گے۔ اس کے عوض میری تجارت کسی روک ٹوک کے بغیر ہوتی رہے گی۔ مجھے نہیں پتہ کہ وہ ادھر کیا کر رہے ہیں۔ مجھے تو اپنے بزنس سے غرض ہے۔ میں نے کوئی ملک دشمنی نہیں کی۔“ اس نے روتے ہوئے کہا

”ابھی تو تم بہت کچھ مانو گے۔ بتاؤ وہ لوگ کہاں کہاں پر ہیں۔“ میں نے پوچھا

”وہ لوگ تین دن پہلے چلے گئے ہیں۔ اب ان میں سے کوئی بھی ادھر نہیں ہے۔ میرا یقین کریں آپ۔ میں ان کے بارے میں ہر ایک تفصیل بتانے کو تیار ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”تجھے پتہ ہے انہوں نے یہاں بم دھماکے کرنے ہیں۔ بے گناہ انسان کو مارنے والے ہیں وہ لوگ۔ اس قتل عام میں تم بھی شامل ہو۔“ میں نے کہا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا
”میں نہیں جانتا۔“

”تم بہت کچھ جانتے ہو۔ سب بولو گے۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے پاس کھڑے سرد سے کہا، ”اسے ان لوگوں کے حوالے کرو، جو اس کا ریشہ ریشہ الگ کر کے ہر ریشے سے پوچھیں۔ جب تک اس کے بدن کا ہر عضو نہ بولے، اس وقت تک اسے نہ چھوڑیں۔ اسے مرنے بھی نہ دینا اور یہ زندہ بھی نہ رہے۔“

جس وقت میں یہ لفظ کہہ رہا تھا، بالکل اسی وقت ایک دراز قد حسینہ کو کمرے میں لایا گیا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ سفید رنگ، سیاہ گھٹے گیسو، مناسب جسم، بھاری سینہ، تھیکے نین نقش، لمبی گردن، کھلے گلے کا لباس پہنے، اسے نائیکی بی میں اٹھالائے تھے۔ جس میں اس کی پنڈلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے فرش پر پڑے بزنس مین کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ بندہ بھی اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ لڑکے اس کے سامنے چیختے چلاتے، منٹیں کرتے ہوئے بزنس میں کوٹھیت کر لے گئے۔ تبھی میں اس سوشل ورکر عورت سے کہا
”بیٹھو بی بی۔ جو پوچھا جائے، اس کا جواب دو، نہیں دو گی تو..... میں نہیں چاہتا کہ تمہارا حال بھی اس بزنس مین جیسا ہو۔“

”میں اب تک نہیں سمجھی کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو۔ میں قوم کی خدمت کر رہی ہوں، جس کا صلہ یوں بد تیزی سے دیا گیا ہے۔ مجھے سلپر تک نہیں پہننے دیئے گئے اور اٹھا کے یہاں لے آئیں ہیں۔ آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہو؟“ اس نے تیزی سے چیخنے والے احتجاجی لہجے میں کہا تو میں بولا

”یہ آخری بات تم نے ٹھیک کی، کیا چاہتے ہیں ہم۔ تو سنو۔! کب سے ملک دشمنی کر رہی ہو؟“

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا، کیوں کروں گی ملک دشمنی، یہ میرا وطن ہے اور میں.....“

”بکو اس بندہ کرو۔ اور یہ بتاؤ، کتنے غیر ملکی ہیں جن کے ساتھ تمہاری ڈیل ہے۔“

”ڈیل کیا مطلب؟ میری این جی او کا معاہدہ ہے کچھ عالمی تنظیموں کے ساتھ، وہ لوگ یہاں کے کلچر، ثقافت اور

دکھائی دی رہی تھیں یا جیسے مختلف سرچ لائٹس کی روشنیاں گھوم کر ایک دوسرے میں پیوست ہوئے بنا آسمان کی جانب لکیر بناتی ہیں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کئی روشنی کی لکیریں جاری تھیں اور کئی آری تھیں۔ مجھے ان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ دو کھڑکیوں ہی سے کیوں؟ اچانک مجھے لگا، جیسے ان لکیروں کے ساتھ کوئی اوپر چڑھ رہا ہے، اور کوئی اتر رہا ہے۔ میں نے مزید غور کیا تو وہ بھیا نک شکلوں والے جانور تھے۔

”یہ چائے.....“

اس آواز سے میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے جنید کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا گتہ تھا۔ اس کے پیچھے سرمد تھا جو چھت پر پڑی پلاسٹک کی کرسیاں قریب کر رہا تھا۔ ہم تینوں بیٹھ گئے تو چائے پینے کے دوران انہوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ بات صرف دھماکوں تک محدود نہیں پس منظر میں کچھ اور بھی ہے۔

”پھر کیا کیا اب تک تم لوگوں نے؟“ میں نے پوچھا تو جنید بولا

”ہم جب انہیں اٹھا کر لائے تھے تو آتے ہوئے ان کا بہت کچھ اٹھالائے ہیں، خاص طور پر لیپ ٹاپ اور ایسی کئی چیزیں، جن سے کچھ پتہ چلے۔ اب تک ان دونوں کے قریب ترین لوگ بھی اٹھالے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سیف ہاؤس میں رکھا ہوا ہے۔ اب دیکھتے ہیں، کیا نکلتا ہے۔“

”یا اب تم لوگ درست سمت میں سوچ رہے ہو، سامنے کا منظر کچھ اور ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، پتہ لگائیں۔“ میں نے کہا اور چائے کا آخری سب لے کر گنگ جنید کو واپس کر دیا۔ وہ اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے دوبارہ آسن جمایا۔ لیکن بند آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی رہا۔ میں چند منٹ یونہی بیٹھا رہا۔ جب کچھ نہ دکھائی دیا تو اٹھ گیا۔

اس وقت مشرق میں پوہ پھٹ رہی تھی۔ جب سرمد نے فون کر کے مجھے نیچے بلایا۔ میں تیزی سے نیچے گیا۔ جنید اور سرمد دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر انتہائی گہری سنجیدگی تھی۔ میں نے ا کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے تفصیل بتانی شروع کر دی جو انہیں اب تک کی محنت کے بعد پتہ چلا تھا۔ میں نے سنا تو چونک گیا۔

وہ ایک خوف ناک سازش تھی۔ ”را“ نے انتہائی بڑے پیمانے پر سرمایہ خرچ کر کے دنیا بھر سے چند ذہین ترین مجرم اکٹھے کر لئے تھے۔ ان کی باقاعدہ تربیت کی گئی تھی۔ انہیں پاکستان میں صرف اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ ایٹمی مرکز تک رسائی کا ذریعہ تلاش کریں۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے، اسے ختم کرنے کے لئے معلومات اکٹھی کریں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ملک بھر میں افراتفری کا ماحول بنانے، سیکورٹی قوتوں کو ایک طرف توجہ رکھنے پر مجبور کرنے کے لئے بم دھماکوں کا سلسلہ شروع کروانے جارہے تھے۔ وہ کئی ماہ سے یہاں موجود تھے۔ ثقافت، غربت اور نجانے کس کس نام سے کام کرنے کی آڑ میں انہوں نے اب تک یہی رسائی حاصل کی تھی۔

”وہ لوگ اب کہاں ہو سکتے ہیں؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا تو مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

”اب تک یہی پتہ چلا ہے کہ وہ ان کے پاس سے جا چکے ہیں؟“ جنید نے تیزی سے کہا

”پتہ کرو، کہاں ہیں، وہ ابھی ملک سے باہر نہیں جا سکتے، ان کا کام ابھی ادھورا ہوگا۔ وہ یہیں ہوں گے۔“ میں نے کچھ ایسے اعتماد سے کہا کہ انہوں نے مزید سوال نہیں کیا۔ وہ پلٹ گئے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ان سب غیر ملکیوں کو تلاش کرنے میں سارے ذرائع استعمال کریں گے۔

☆.....☆.....☆

سورج کی روشنی سے امرتسر روشن ہو گیا ہوا تھا۔ ہر مندر صاحب کے سرور میں صبح کی کرنیں اتری ہوئی تھیں۔ یاتری اپنے اپنے انداز میں اپنی عبادت میں مصروف تھے۔ حکم نامہ جاری ہو چکا تھا۔ ایک ٹھہراؤ سا آچکا تھا۔ ایسے

غربت پر کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگ یہاں آتے ہیں، میں انہیں ہر طرح کی سہولت فراہم کرتی ہوں۔ اسکے عوض وہ ہمیں ادا نیکی کرتے ہیں۔“

”کتنے ملکوں سے ہیں؟“

”کئی ملکوں کے نمائندے ہیں۔“ اس نے لا پرواہی دکھاتے ہوئے جواب دیا تو میں چونک گیا

”تم جانتی ہو کہ جب بم پھٹتا ہے تو جلتے بھی ہیں اور انہیں زخم بھی آتے ہیں۔ مر جاتے ہیں بے گناہ لوگ، جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے چھری اٹھالی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولی

”کیا مطلب؟“

”میں سمجھتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کلائی سے ایک گہر زخم لگا دیا۔ وہ بے تحاشا چیختی۔ گلا لیاں بکنے لگی۔ میں نے اس پر دھیان دیئے بغیر ماچس سے تیلی جلائی اور اس زخم والی جگہ کو شعلے سے جلائے لگا۔ وہ مامی بے آب کی مانند تر پنے لگی۔ وہ گالیاں بھول گئی تھی۔ اس کی چیخوں سے کمرہ جیسے بھر گیا۔ تیلی بجھ گئی تو میں نے نئی جلائی۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

”ان سب کی تفصیلات، جنہیں تم سہولت فراہم کرتی رہی ہو“ میں نے کہا

”میں بتاتی ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے جنید کو اشارہ کیا کہ اسے لے جائیں۔ وہ اسے وہاں سے لے گئے۔

اس وقت میرا دوران خون تیز ہو گیا تھا۔ میں کھلی فضا میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک کپ چائے کا کہا اور چھت پر آ گیا۔ اس وقت پوہ پھٹ رہی تھی۔ میں نے چھت پر آ کر گہری گہری سانسیں لیں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو پانا تھا۔ چند لمحے ٹھیلے رہنے کے بعد میں چھت کے فرش پر بیٹھ گیا۔

اس وقت میرے دماغ میں یہی چل رہا تھا کہ پتہ نہیں کتنے غیر ملکی لوگ ہیں جو یہاں آ چکے ہیں۔ اتنے لوگ کیوں ہیں یہاں پر؟ اگر یہ لوگ دشمن ملک سے ہیں تو وہ کئی ملکوں کے لوگ یہاں کیوں اکٹھا کریں گے؟ کیا یہ صرف بم دھماکے چاہتے ہیں تو ان کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے اس دہشت گردی سے جو دشمن فائدہ اٹھائے گا، لیکن کیا اتنے ساری ملک پاکستان کے خلاف ایسا کر چکے ہیں؟ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ ممکن ہے یہ بم دھماکے والی بات سامنے کی ہو لیکن اس کے پیچھے کچھ دوسرا ہی چل رہا ہو۔ انہیں لمحات میں جب کہ میں انتہائی الجھن میں تھا۔ میں چھت کے فرش بیٹھا ہوا تھا۔ میری دونوں ہتھیلیاں بندھیں۔ میری کلائیوں میں میرے گھٹنوں پر تھیں، بالکل ایسے جیسے کوئی یوگا کا آسن لگا کر بیٹھا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے سامنے کا اندھیرا چھٹ گیا۔ یوں جیسے اسکرین روشن ہو جاتی ہے۔

میرے سامنے رات کا منظر تھا۔ درختوں میں گہری ایک عمارت تھی، جس کے پس منظر میں سیاہ آسمان تھا۔ وہ عمارت روشن تھی۔ اس عمارت کی کئی کھڑکیاں تھیں، جن میں سے پہلی روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اسی روشنی میں درختوں کے گہرے سبز پتے تھوڑے تھوڑے روشن تھے۔ ان کئی ساری کھڑکیوں میں دو کھڑکیوں کے اوپر کئی رنگوں کی روشنیاں تھیں۔ نیلی، پیلی، نارنجی، سبز، جامنی نجانے کتنی لکیریں، یوں جیسے کوئی آسمان کی طرف تارچ کرے تو ایک حد تک جا کر روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف رنگوں کی روشنی کی لکیریں غائب نہیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ تاحد نگاہ

میں جہاں سنگھ ہوٹل کی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

ساری رات نگرانی کرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک ان تینوں کے بارے میں معلوم نہیں کر پائے تھے۔ جہاں سنگھ کو ان کے بارے میں اندازہ ہو گیا تھی کہ وہ اب یہاں نہیں آنے والے۔ جس تصادم کی اطلاع تھی، وہ ٹل گیا تھا۔ سیاسی طور پر بات چیت کے ذریعے اس تصادم کو روک لیا گیا تھا۔ جس بات پر نزاع تھی۔ اسے بعد میں حل کرنے کا وعدہ کر لیا گیا تھا۔ جس طرح انہیں تصادم کی خبر ملی تھی، اسی طرح تمام خفیہ لوگوں تک یہ اطلاع آنا فانا پھیل گئی تھی۔ دونوں طرف سے لوگ پوری تیاری کے ساتھ ہی رات سے امرتسر میں موجود تھے۔ یہ تصادم حکومتی سطح پر حکمرانوں کے خلاف جانے والا تھا۔ انہوں نے ساری مطالبات مان لئے اور وقت طور پر یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

ارد گرد سے آئی ہوئی جتنی قوتیں تھیں۔ اب ان کا کام نہیں رہا تھا مگر جہاں سنگھ کے لئے وہ تین لوگ سب سے بڑا مسئلہ تھے۔ اگرچہ ان تین لوگوں کا کام ہر مندر صاحب میں نہیں تھا، انہیں سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے پاکستان جانا تھا۔ انہوں نے اٹاری پہنچنا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ امرتسر میں آئے ہی نہ ہوں۔ وہ اب تک شہر ہی سے کہیں باہر ہوں۔ بہت کچھ سوچتے رہنے کے بعد جہاں سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں تلاش کیسے کرے۔ اردوند اور فہیم کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ ابھی تک پاکستان پار نہیں کر سکے۔ لہذا اٹاری اور اس کے گرد و نواح کو دیکھا جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنی بڑی آبادی والے شہر اور پھر امرتسر سے اٹاری تک وہ انہیں کیسے تلاش کر سکتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ہاسٹل والے کمرے تک گیا۔ وہاں وہی نوجوان اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”وہ لوگ اٹاری پر ہی ظاہر ہوں گے۔“ اس نوجوان نے کہا تو جہاں سنگھ نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا

”یار، وہ عام باتریوں کی طرح ہی یہاں سے نکلیں گے۔ وہ کسی نہ کسی جھتے کے ساتھ ہوں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یہاں کے ٹریول ایجنٹس سے ان کے بارے میں کچھ پوچھ سکیں۔“

”یوں تو یہ کام کرنے والے بہت سارے لوگ ہیں لیکن یہاں چند گنتی کے لوگ ہیں جو ٹاپ کے ہیں، ان سے افر پوچھنا چھ کی بھی گئی تو وہ تینوں الرٹ ہو جائیں گے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ اٹاری پر جا کر ہی ڈیرے لگائے جائیں۔“ جہاں نے سوچنے والے انداز میں کہا ”وہیں انہیں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ امیگریشن ہو گئے تو ہم ان تک نہیں پہنچ پائیں گے۔“ نوجوان نے تیزی سے کہا تو جہاں اٹھتے ہوئے بولا

”لو پھر میں جا رہا ہوں۔ کچھ کرتے ہیں ان کا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا اور ہوٹل سے نکلتا چلا گیا۔

اس وقت وہ رتن دیپ سنگھ کی حویلی پہنچا تھا۔ جہاں بانٹیا کور موجود تھی۔ وہ اس کے ساتھ اسی کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس دوران وہ اسے اپ ڈیٹ دے چکا تھا۔ تب بانٹیا کور نے کہا

”اؤ جہاں تو ان کے لئے اتنا پریشان نہ ہو۔ وہ اگر پاکستان چلے گئے تو وہاں انہیں.....“

”بے وقوف والی بات مت کر، انہیں یہیں ختم کرنا ہے، اگر ہم انہیں یہاں ختم نہ کر سکتے تو پھر ہمارا ہونا تو نہ ہونا ہے۔“ جہاں نے غصے میں کہا

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔“ جہاں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی

”کیا ہے؟“

”اردوند اور فہیم سے بات کرو، لیپ ٹاپ لاؤ۔“ جہاں نے تیزی سے کہا تو بانٹیا کور سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا لیپ ٹاپ اٹھا لائی۔ کچھ دیر بعد ان سے رابطہ ہو گیا۔ اس وقت انکے پاس ٹمبس و قمر بھی تھے۔

”یار مجھے یہ بتا، اگر تم لوگ امیگریشن پر کلیئر لوگوں کا ڈیٹا، ان کے کمپیوٹر سے دیکھ سکتے ہو۔“

”ہاں ممکن ہے، وہاں کئی ساری جگہوں سے لوگوں کو کلیئر کرتے ہیں، جو سب ایک مین کمپیوٹر میں جاتا ہے، یہ ممکن ہے۔“ اردوند نے جواب دیا۔

”تو پھر ان تینوں کو تلاش کرنے میں مدد دو۔“ جہاں نے کہا تو اردوند بولا

”کیا کرتے ہو یار، ان کی تصویریں تک نکال کر دے دی ہیں اب.....“ یہ کہتے ہوئے وہ اچانک رک گیا، پھر تیزی سے بولا، ”مطلب تم انہیں کلیئر ہو جانے کے بعد پکڑنا چاہتے ہو۔“

”بالکل۔! یہ جو تم نے تصویریں بھیجی ہیں بے کار ہیں۔ انہوں نے تو ہمیں بدلا ہوگا اور نہ ہی ان کا یہ نام ہے کہ جن سے وہ نکانہ صاحب جا رہے ہیں، نام بھی جلی ہوں گے۔“ جہاں نے کہا تو ٹمبس بولا

”جہاں بھائی تم اگلا کام بتاؤ، یہ میری ذمہ داری کہ میں ان تینوں کو کلیئر ہوتے ہی آپ کو بتا دوں۔“

”اگلا کام میں خود کر لوں گا، تم بس اس وقت مجھے بتا دو، جیسے ہی وہ کلیئر ہوگا میں بتا دوں گا کس گیٹ سے کون جا رہا ہے۔ یہ کر لو گے؟“ جہاں نے پوچھا

”ہو جائے گا۔“ ٹمبس نے کہا

”کیسے؟“ جہاں نے پھر پوچھا

”دیکھو، اس کی تصویر کے ساتھ جس بندہ بھی بیچ ہوا، وہ وہی ہوگا۔ وہ جس روپ میں بھی ہوا۔“ ٹمبس نے بتایا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

”ٹھیک ہے میں کچھ دیر بعد رابطہ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر جہاں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”یہ کیسے، جب وہ لوگ امیگریشن کے بعد اندر چلے گئے تو تم لوگ کیسے جاسکو گے؟“

”تم دیکھنا، کیا کرتا ہوں میں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے نیٹ ورک میں وہ بندے تلاش کرنے شروع کر دیئے جو کسی نہ کسی حوالے سے اٹاری پر کام کرتے تھے۔ وہ اس وقت خوشی سے مہر گیا جب اسے وہیں اسٹیشن پر کام کرنے والے دو بندے مل گئے۔ وہیں قریب کے گاؤں کے کچھ لوگ تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قریب ترین لوگوں کو ایک خفیہ بیچ دے دیا کہ ان میں سے کون کون نکانہ صاحب جا رہا ہے۔ ان میں سے چند لوگ تھے جو اس وقت پورے خاندان یا پھر اکیلے جا رہے تھے۔ اگلے دس منٹ میں اس نے تین نوجوان جن لئے جو اس وقت امرتسر ہی میں تھے۔ انہیں کچھ دیر بعد اٹاری چلے جانا تھا، وہ اس وقت ایک ہر مندر صاحب میں، دوسرا قریب کے بازار میں اور تیسرا ایک ہوٹل پر کھانا کھا رہا تھا۔ ان تینوں کو ہر مندر صاحب میں موجود ایک مخصوص جگہ بلا لیا گیا۔

وہ تینوں جہاں سنگھ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کو اکٹھے ہونے میں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ وہ اس وقت کس سے بات کر رہے ہیں۔ وہ سب خالصتاً پر اپنی جان وار دینے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ جہاں سنگھ نے ایک چھوٹی سی بات کے بعد انہیں سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ یہاں پر بیٹھ کر کھائی جانے والی قسم سے کوئی بھی سکھ نہیں پھر سکتا تھا۔ جی جہاں سنگھ نے غیر محسوس انداز میں انہیں تین سیل فون دیئے اور سمجھاتے ہوئے کہا

”ہرفون میں صرف میرا نمبر محفوظ ہے۔ اس پر میری ہی کال آئے گی۔ میں جو کہوں، اس کے مطابق پھر جو سمجھ میں آئے کرنا۔ جو نئی کام ختم ہو، مجھے اطلاع کر کے فون پھینک دینا۔ اب ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔“

یہ کہتے ہی جہاں وہاں سے اٹھ گیا۔ دوسرے بھی ایک ایک کر کے وہاں سے نکل گئے۔

یہ سارے انتظامات کرتے ہوئے دوپہر ہو گئی۔ اٹاری اسٹیشن کے ارد گرد کئی سارے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب براہ راست امرتسر کے ہیڈ جتے دار سے رابطہ میں تھے۔ جہاں سنگھ نے پارکنگ سے اپنی فور ویکل لی اور پارکنگ سے نکلتے ہوئے ہائیڈ کور کو فون کر دیا۔ وہ اسی کے انتظار میں تھی۔

”میں ہر مندر صاحب سے نکل رہا ہوں۔ مجھے.....“ اس نے کہنا چاہا لیکن ہائیڈ کور نے بات کاٹ کر پوچھا ”کام ہو گیا؟ میں آؤں؟“

”ہاں فیلڈنگ ساری لگ گئی ہوئی ہے۔ تم فوراً وہ ’ہتھیار‘ لے کر آ جاؤ، ہیڈ جتے دار تک پہنچانے ہیں۔ فوراً آ جاؤ، وقت کم ہے۔“

”میں آ رہی ہوں۔“

”تم سیدھی اٹاری روڈ کے پہلے فلنگ اسٹیشن پر انتظار کرو۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اٹاری روڈ پر پہلے ہی دائیں جانب ایک فلنگ اسٹیشن تھا۔ ہائیڈ کور کی کار وہیں کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ گرلین کور اور نوٹن کور بھی تھیں۔ وہ جہاں سنگھ کے ساتھ آ بیٹھیں تو ڈرائیور کار کو واپس لے گیا۔ یہ اٹاری کی جانب چل پڑے۔ چند منٹوں میں اس نے ساری صورت حال اسے بتا دی۔

”وہ سب سنبھال لیں گے نا؟“ ہائیڈ کور نے پوچھا تو اس نے جواب دیا

”اب دیکھیں کیا کرتے ہیں وہ، لیکن اتنی دیر ہم یہیں امرتسر کے آس پاس رہیں گے اور ہمیں فوری طور پر ہتھیار پہنچانے ہیں۔“

اس پر وہ خاموش ہو گئی۔

اس وقت دن کے دو بجے ہوئے تھے۔ ٹرین کب چلتی اس بارے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن چار بجے تک ساری امیگریشن ہو جانا تھی۔ وہ بیس منٹ میں اٹاری پہنچ گئے۔ انہیں جتے دار سے ملنے میں وقت نہیں لگا۔ وہ ”ہتھیار“ انہیں دے دیئے تو ہائیڈ کور نے اسے اٹاری روڈ پر اپنے فارم ہاؤس پر چلنے کو کہا۔ وہ کچھ دیر بعد وہاں پہنچ گئے۔

ابھی وہ جا کر بیٹھے ہی تھے ارد گرد کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ وقت رہ گیا ہے ان سب کو کانفرنس کال میں لے لو، جیسے ہی کوئی امیگریشن سے فارغ ہوا اس کے بارے میں پتہ چل جائے گا۔ جہاں سنگھ نے سب کو کانفرنس میں لے لیا۔ وہ تین نوجوان امیگریشن کے بعد ریلوے اسٹیشن پلیٹ فارم پر تھے۔ وہ وہاں کی صورت حال بتاتے رہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک ارد گرد سنگھ نے بتایا

”وہ لوہیٹاں چڑھا، اس وقت گیٹ نمبر تین پر موجود ہے، اسے کلیر کیا جا رہا ہے، میں نے اس کی تصویر بھیج کر لی ہے۔“

”کون ہے تین نمبر گیٹ کے پاس؟“ جہاں نے پوچھا تو ایک نوجوان نے بتایا

”ہاں میں دیکھ رہا ہوں جی، جیسے نقوش والا گویا سنگھ وہاں کھڑا ہے۔“

”بس وہی ہے، تم اسے لگاؤں میں کر لو۔ وہ ارد گرد سنگھ کے نام سے ہے۔“ جہاں نے بتایا

”ہو گیا جی، اب وہ ہماری نگاہوں سے نہیں ہٹ سکتا، وہ کب تک.....“ اس نے ہتھیار کے بارے میں پوچھا تو

جہاں نے کہا

”ابھی پہنچ جائے گا۔“

اسی لمحے روہن کمار بھی گیٹ نمبر تین ہی سے کلیر ہو رہا تھا۔ وہ روہیت سنگھ کے نام سے تھا۔ اسے دوسرے نوجوان نے اپنی نگاہوں میں کر لیا۔ گیٹ نمبر دو سے بنگا لکھ آیا۔ وہ بھی سنبھال لیا گیا۔

وہ تینوں اسے پل پل کی خبر دے رہے تھے۔ کانفرنس میں امرتسر کا ہیڈ جتے دار بھی تھا۔ وہ خاموش تھا۔ اسے اندر کی صورت حال بارے پتہ چل گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر ہی ایک کھانے پینے کی شاپ تھی۔ وہ تینوں ہی ہر اس بوگی کی جانب بڑھ گئے تھے، جہاں روہن، بنگا لکھ اور اوہناش جا کر اپنی اپنی بوگی میں بیٹھے تھے۔ وہ تینوں الگ الگ بوگی میں تھے۔ وہ یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے ایک دوسرے کو جاننے تک نہیں ہیں۔ ہیڈ جتے دار نے انہیں سمجھا دیا ہوا تھا کہ وہاں جا کر جو چیز بھی خریدیں، انہیں آدھا تقسیم ہوا پھینا لوٹ دینا ہے۔ پہلے ٹیپ مانگنی ہے، پھر وہ لوٹ انہیں دے دینا ہے اور واپس آ جانا ہے۔

دی گئی ہدایت کے مطابق ان میں سے ایک نوجوان اس شاپ پر چلا گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر سنگھ کھڑا تھا۔ اس نے ویسا ہی کیا، جیسے کہا تھا۔ اس نے وہ لوٹ رکھ کر چیزیں دے دیں۔ وہ نوجوان واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزری تھی ایک لڑکا اس کے پاس آ کر باہر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک چھوٹا بیک اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے لے کر رکھ لیا۔ وہ لڑکا چند لمحوں ہی میں غائب ہو گیا۔

وہ نوجوان سنگھ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بیک کھول کر دیکھا۔ اس میں تین چھوٹی چھوٹی ڈبیہ بڑی ہوئیں تھیں۔ کانفرنس میں موجود سب کو پتہ چل گیا کہ ان تک وہ ”ہتھیار“ پہنچ گئے ہیں۔ جن سے انہوں نے نکل کرنا تھا۔ اس نے بیک سے ایک ڈبیہ اٹھائی اور سنبھال لی۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان آیا۔ اس نے وہ بیک اسے دیدیا۔ یوں تیسرے تک بھی وہ ”ہتھیار“ پہنچ گیا تھا۔

وہ ہتھیار اصل میں ایک زہر آلود سوئی تھی۔ اس سے بندہ ایک دم نہیں مرتا تھا، بلکہ اسے گہری نیند آتی تھی اور پھر وہ نیند ہی کی حالت میں موت کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ زہر آلود سوئیاں رام لعل جوگی کے بیٹے نے انہیں دیں تھیں۔ وہ تب سے ان کے پاس پڑی تھیں۔ اس نے یہ نوٹن کو دی تھیں، جب وہ اس سے ممبئی میں ملی تھی۔ اس نے ایک طرح سے جہاں سنگھ کو تھم دیا تھا، جو ہائیڈ کور کے پاس امرتسر ہی میں بڑا رہا جواب کام آنے والا تھا۔

سہ پہر ہو جانے کو بھی جب ٹرین چلنے کو تھی۔ ایسے میں ایک بالکل سی عجیب تھی۔ جہاں سنگھ سن رہا تھا۔ وہ تینوں نوجوان اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ گئے تھے اور وہ ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ جیسے ہی ٹرین چلنے لگی۔ وہ ایک ہلکا سا جھٹکا تھا، لیکن تینوں نے وہ جھٹکا کچھ زیادہ ہی محسوس کیا۔ وہ ان کے اوپر گر گئے۔ کسی نے گالی بکی، کسی نے برا بھلا کہا، کوئی خاموش رہا۔ وہ اپنا کام کر کے واش روم میں گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے سیل فون پھینک دیئے، جو نیچے سرک گئے۔ وہ خاموش کے ساتھ واپس اپنی اپنی سیٹوں پر واپس آ کر بیٹھ چکے تھے۔ انہوں نے کام کر دیا تھا۔ وہ اٹاری روڈ والے فارم ہاؤس سے نکل آئے تھے۔ مین روڈ پر آتے ہی جہاں سنگھ نے وہ فون سرک کے ایک جانب پھینک دیا۔ تب ہائیڈ کور نے خاموشی توڑی۔

”جہاں! ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ مر گئے ہیں، یا زعمہ ہیں؟ اگر ان میں ایک بھی زندہ رہا تو.....“ اس نے گہری تشویش کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ دی۔ جب جہاں مسکراتے ہوئے بولا

”ارد گرد نے مجھے ایک بات سمجھائی ہے کہ ہم آپ رکھتے ہیں۔ ان تین نوجوانوں کی گمرانی پر تین نوجوان اور

ہیں۔ وہ ہمیں بتائیں گے۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال میں وہ ہمیں اپ ڈیٹ کریں گے۔ ہیڈ جتھے دار کے الگ بندے جارہے ہیں اسی ٹرین میں۔ ڈونٹ وری۔“

”رُت کرے ویسا ہی ہو جیسا تم نے سوچا ہے۔“ بانیتا کو نے کہا تو اس نے پوچھا

”اب میں نے اوگی جانا ہے۔ چلوگی؟“

”ہاں ضرور، میں چلوگی۔“

تب جہاں سنگھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ وہ امرتسر سے نکل کر سلطان وند بائی پاس سے جالندھر کی جانب مڑ گیا، تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد جب شام کے سائے پھیل گئے وہ جالندھر پہنچ گیا۔ اوگی کی جانب مڑتے ہی اس نے فور وئیل روک دی اور بانیتا کو ڈرائیونگ کے لئے کہا۔ وہ اسٹیرنگ پر آ بیٹھی۔ جہاں سنگھ نے جیسے دار کو فون ملایا۔

”ہاں، کیا ہوا؟“

”ہو گیا کام، گاڑی نہیں روکی گئی، اب تو وہ واہدہ ہی جا کر رُکے گی۔ ان کے مرنے کا پتہ اس وقت چلا جب وہ پاکستان کی حدود میں پہنچ چکے تھے۔“

”یہ بہت اچھا ہوا۔ چلیں اب سنبھال لیں آپ۔“ جہاں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسی وقت اس نے اپنے خاص فون سے اروند سنگھ سے رابطہ کیا اور اسے بتاتے ہوئے سمجھایا

”اس میجر کنور راٹھور تک بات پہنچ جائے کہ ویرتانی نے اس کا پلان تباہ کر دیا ہے۔“

”ابھی کچھ دیر میں پہنچ جاتا ہے۔“ اروند نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شام کے سائے پھیل گئے تھے، جب وہ اوگی پنڈ پہنچ گیا۔ حویلی کے پورچ میں دو قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے پورچ کی بجائے فور وئیل دوسری جانب لگائی اور اندر چلا گیا۔ اسے لگا جیسے لاؤنچ بھرا ہوا ہے۔ بھوپندر سنگھ برار اپنی پوری فیملی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ سب سے ملا، انہیں فتح بلائی اور واپس آنے کا کہا۔ ہر پریت کو ر جلدی سے اٹھی اور بانیتا کو رو اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔

☆.....☆.....☆

کسی بھی بڑے منصوبے کی تکمیل مختلف حصوں میں کی جاتی ہے۔ ہر حصے والے کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کہیں کوئی دوسرا حصہ بھی ہے۔ وہ اپنے حصے کو ہی حتیٰ سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ منصوبہ کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ بزنس مین اور سوشل ورکر خاتون، صرف اپنے مالی فائدے کے لئے ان کے سہولت کار بن گئے تھے۔ انہیں اصل منصوبے کے بارے میں گمان تک نہیں تھا۔ ان کی یہ سچائی اس بات سے ثابت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی کہ انہوں نے وہ سب بتا دیا جو ان کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے وہ سارے لوگ بتا دیئے جو اس کے ساتھ منسلک تھے۔ اس ساری پکڑ دھکڑ میں صرف یہی خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ الرٹ ہو کر زیر زمین نہ چلے جائیں جو اس منصوبے کے بالکل آخری مرحلے میں پہنچے ہوئے ہیں۔

سہ پہر تک یہ تصدیق تو ہو گئی تھی کہ یہ کتنا خوفناک منصوبہ تھا لیکن یہ نشاندہی نہیں ہو پائی تھی کہ اب وہ لوگ کہاں پر ہیں؟ پچھلے دو گھنٹے سے کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

میرے دماغ میں وہ منظر تھا جو مجھے دکھایا گیا تھا۔ ایک ذرا سی نشاندہی مجھے تھی کہ وہ لوگ ایسی جگہ ہو سکتے ہیں جہاں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں ہیں اور ان میں سے دو کھڑکیاں ایسی ہیں جہاں وہ موجود ہو سکتے ہیں۔ میں کسی کو بھی

اپنے اس دیکھے گئے منظر کے بارے میں بتا نہیں سکتا تھا، لیکن اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ میرا گمان ہے کہ وہ ایسے ہی طرز کی کسی عمارت میں ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک رسک تھا۔ چونکہ معاملہ ایسی تجربہ گاہ کا تھا، اس لئے وہ اسی رداس میں ہونے کا امکان رکھتے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کہیں دور ہوں۔ اس ساری تلاش میں سب سے پہلے بڑے بڑے ہوٹل دیکھے گئے۔ گیسٹ ہاؤس اور ایسی نجائے کتنی عمارتیں۔ یہاں تک کہ شام کے سائے پھیل گئے۔

اسی تلاش میں خبر یہ ملی کہ ایک بڑا ہوٹل، جس کی چھ منزلیں ہیں، اس میں سب سے اوپر والی منزل ایک غیر ملکی نے پچھلے دو ماہ سے بک کی ہوئی ہے۔ وہ سرمایہ دار ہے اور یہاں کاروبار کے مواقع دیکھنے کے لئے موجود تھا۔ وہ کبھی یہاں ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ اس کے ذاتی نوعیت کے تعلقات ملک کے بڑوں سے تھے۔ اس لئے اسے کافی مراعات مل چکی تھیں۔ اس کی اپنی سیکورٹی تھی۔ جیسے ہی میں نے اس بارے سنا، میں نے اس ہوٹل کی تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چند لمحوں بعد لیپ ٹاپ پر مجھے اس کی تصویر دکھائی تو میں چونک گیا۔ وہ منظر بالکل اسی کے جیسا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے ڈن کر دیا کہ دشمن یہیں ہے، اسی فوری طور پر پکڑنا ہوگا۔

جو میرے لوگ تھے، وہ فوراً منصوبہ بندی کرنے لگے کہ کس طرح وہاں حملہ کرنا ہے، لیکن فورسز کے لوگ ہچکچانے لگے۔ میں نے سفدر اسماعیل سے کہا

”مجھے فوری طور پر اپنے بڑے سے ملو۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

چونکہ مجھے یقین تھا، اس لئے، میں نے پوری تیاری کر لی ہوئی تھی۔ سرد اور میں نے اس پر پوری بات کر لی تھی۔ وہ بالکل تیار تھا۔ اس نے فورس بھی تیار کر لی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد سفدر اسماعیل مجھے لینے خود آ گیا۔ میں نے جنید کو ساتھ لیا اور اس کیساتھ چل پڑا۔ اس کا رخ ایئر پورٹ کی طرف تھا۔

ہمارے پہنچنے ہی کچھ لوگ ہمیں دیکھ کر آگے بڑھے۔ درمیان میں کسی رکاوٹ کے بغیر ہم کار کے ذریعے وہاں تک جا پہنچے، جہاں پر ایک ٹیلی کا پٹر موجود تھا۔ جیسے ہی ہم تینوں اس میں بیٹھے، وہ اشارت ہوا اور اگلے چند منٹوں میں محو پرواز تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں ہم ایک ایسی جگہ اتارے جہاں دور دور تک ویرانی تھی۔ وہیں ایک جگہ کمپ لگا ہوا تھا۔ ہم اس جانب بڑھ گئے۔ چیف سامنے تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو سلام کے بعد اس نے پوچھا

”مجھے خبر مل چکی ہے کہ وہاں پر کچھ ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مکمل طور پر تصدیق کر لی جائے، لیکن آپ آج ہی ایک چاہتے ہیں کیوں؟“

”مجھے پورا یقین ہے، کہ وہ وہی لوگ ہیں۔“ میں نے اعتماد سے کہا

”میں نہیں پوچھوں گا کہ یہ اعتماد کیوں ہے لیکن اتنا ضرور جاننا چاہوں گا کہ جس طرح یہ منصوبہ مختلف جگہوں پر پھیلا ہوا ہے، یہ اس کا محض حصہ نہ ہو اور باقی زیر زمین چلے جائیں۔“ چیف نے کہا

”یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں اسے پورا ختم کروں، آپ بس میری مدد کریں، جہاں ممکن ہے۔“ میں نے اسی اعتماد سے کہا تو چیف نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر مجھے انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا

”ڈن۔!“

”شکریہ۔“ میں نے کہا اور پلٹ پڑا۔ میں کمپ سے باہر نکلا تو ایک وجیہہ جوان آگے بڑھا، اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا

”میں آفتاب کرمانی، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ اس نے کہا اور میرے ساتھ چل پڑا۔

اس وقت سرد لوگ اس ہوٹل سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر تھے۔ میں نے ارد گرد کو فون کیا تو ٹکس لائین پر تھا۔ میری آواز سنتے ہی بولا

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ سارا کام کس طرح ہوگا، بس مجھے ان کے کسی سیل فون یا لیپ ٹاپ تک رسائی دیں، باقی سب دیکھ لوں گا۔“

”اوکے رابلے میں رہنا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہم اسی طرح واپس ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور شہر کی ایک ایسی عمارت کی چھت پر آگئے جہاں ہیلی پیڈ تھا۔ ہم ہیلی کاپٹر سے اتر کر اسی عمارت کے ایک ایسے کمرے میں آگئے، جہاں جدید ترین آلات نصب تھے۔ درمیان میں ایک میز تھی، جس پر بڑے بڑے دو کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک پر اس ہوٹل کا پورا نقشہ تھا۔ دوسرے کاغذ پر اسی منزل کے بارے میں نقشے کے ساتھ تفصیل درج تھی۔ میں، آفتاب کرمانی، جنید اور اس پر بات کرنے لگے۔ اس وقت سرد کو میں نے فون لائین پر لے لیا ہوا تھا۔ پندرہ منٹ میں ہم نے ایک کی پوری تفصیل طے کر کے نکلنے کو تیار ہو گئے۔ ہم نے اس ایک کا پورا دورانیہ صرف پانچ منٹ رکھا تھا۔ جسمیں ایک ایک لمحہ طے کر لیا گیا تھا۔

رات کا دوسرا پہر ختم ہونے کو تھا۔ ہم چاروں کے ساتھ صرف چھ جوان تھے، جو ایسے کماؤ و ایک کے لئے بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے کاموں پر بیک تھے۔ وہ ہوٹل کی مختلف سطحوں میں پہنچ گئے تھے۔ ہم دس لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا، ایک بولتا تو باقی دس سن سکتے تھے۔ اسی طرح یہ آواز ان بہت ساری جگہوں پر سنی جاسکتی تھی، جو ہمارے ساتھ رابلے میں تھے۔

میں اور جنید بیک پر تھے۔ ہمارے پیچھے سرد تھا، لیکن ہمارے آگے آفتاب کرمانی تھا۔ وہ سیدھا، ہوٹل کے میجر کے کمرے میں گیا۔ اسے اپنے ساتھ لیا اور اوپری منزل کی جانب بڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اور مجھے کور دینے والا سرد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ تھا۔ جس وقت آفتاب کرمانی لفٹ کے ذریعے اس آخری منزل تک پہنچا، میں دوسری طرف کی لفٹ سے اوپر پہنچ گیا۔ اس دوران وہ چھ جوان کسی چھپکلی کی طرح اوپر چڑھ رہے تھے۔ میں جیسے ہی اوپر پہنچا۔ سامنے ایک کھلی سی لابی میں دو سیکورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ لفٹ سے نکلنے ہوئے دیکھ کر میری جانب بڑھے۔ میں لفٹ سے نکل کر ان کی جانب بڑھ گیا۔ وہ الجھ گئے کہ لفٹ تک روکیں یا مجھ سے بات کریں۔ اسی لمحے کی سوئیں جھکے کا فائدہ اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے، سرد اور جنید نے میرے پیچھے سے فائر کر دیئے۔ ان کے پاس خاموش بم تھے، میں جانتا تھا کہ ہماری یہ کاروائی، کہیں نہ کہیں کیمرے میں دیکھی جا رہی ہوگی۔ اس لئے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر میں اسی کمرے کی کی جانب بڑھا جہاں وہ لوگ ممکن ہو سکتے تھے۔ سامنے سے آفتاب کرمانی آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا۔ میں دروازہ کھولا تو وہاں کا منظر یوں تھا جیسے دفتر سجا ہوا ہو۔ میرے ساتھ جنید اندر داخل ہوا تھا۔ باقی سب باہر کی سیکورٹی سے نپٹنے کے لئے باہر ہی موجود تھے۔ آفتاب کرمانی اس سب کو دیکھ رہا تھا۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو۔“ میں نے انگریزی میں کہا تو وہ لوگ اک دم ساکت ہو گئے۔ تبھی میں نے دوسرا حکم دیا، ”سب کچھ یوں چھوڑ کر اپنے ہاتھ سر رکھو اور یہاں آ کر لیٹ جاؤ۔ فوراً“ میری آواز کے پھیلتے ہی ایک لڑکی، اس کے ساتھ ایک نوجوان، ایک ابھی بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا مگر اس کا رد عمل یہ آیا کہ وہ سبھی انتہائی تیزی سے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے وہیں فرش پر لیٹ گئے۔ جنید آگے بڑھا

، اس نے انتہائی تیزی سے انہیں ایک ہی رسی سے باندھ دیا۔ سرد ان کے کمپیوٹر اور سیل فون کی جانب بڑھا۔ اس ساری کاروائی میں اب تک تین منٹ خرچ ہو گئے تھے۔ ایسے میں باہر فائر ہوا اور ایک شخص اونچی اونچی آواز میں چیخنے لگا۔ میں نے رابلے ہی میں آفتاب کرمانی سے پوچھا

”یہ یہاں کا ہیڈ ہے اور وہ مسکایاں دے رہا تھا، میں نے مار دیا۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ ان چھ کماؤ و کے ہیڈ نے کہا۔

”اوپر والی منزل ہمارے کنٹرول میں ہے، پولیس۔“

”اوکے، سنہالو اور الارٹ رہو۔“ آفتاب کرمانی نے انہیں حکم دیا۔ میں نے سرد کی طرف دیکھا۔ وہ ٹکس اور قمر کو لیپ ٹاپ کے لنک دے چکا تھا۔ اس وقت لمحہ قیمتی تھا۔ اگلے دو منٹ بہت بھاری تھے۔ اگر وہ سب کچھ نہ ہوا تو میری جان جاسکتی تھی اور میں ایک مجرم کے طور پر وہیں مارا جاسکتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ منٹ گزر گیا تبھی سرد کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری

”وہی سب کچھ..... جس کا ڈر تھا..... خوفناک منصوبہ..... یہ لوگ انتہائی قریب..... رسائی کر گئے ہیں۔“

ایک دم سے یوں ہو گیا جیسے ساری دنیا ہی دم سادھ گئی ہو۔ جس طرح انہونی ہو گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آواز کہاں تک جا پہنچی تھی۔ جس وقت ہم ایک پر بات کر رہے تھے۔ ہاں اور نہیں کے بعد کی صورت حال پر بھی طے کر چکے تھے۔ صورت حال ”ہاں“ تھی۔ اب وہی ہوتا تھا جو ہاں کے بعد ہونا طے تھا۔ اوپر والی منزل کو پوری طرح سیل کر دیا گیا۔ مزید چھ لوگ چھپکلیوں کی طرح اوپر آگئے تھے۔ سیکورٹی والے کئی مر گئے تھے اور کئی بے ہوش تھے۔ انہیں قابو کر لیا گیا ہوا تھا۔ وہیں پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ سب غیر ملکی سیکورٹی گارڈ تھے۔ آفتاب کرمانی نے انہیں مار دینے کا حکم دے دیا۔

میرے سامنے آٹھ لوگ تھے، جن میں سے ایک مردہ ہو چکا تھا۔ وہ چھ جوان اعدا آگئے۔ انہوں نے وہاں سب کو کور میں لے لیا۔

”تم میں سے یہاں لیڈ کون کر رہا تھا؟“ میں نے ایک سے پوچھا تو اس نے ایک ادیبز عمر شخص کی طرف اشارہ کیا جو فرش پر پڑا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور اسے کھولنے کا کہا۔ اسے کھول دیا گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”کون کر رہا ہے یہ سب، کس کا حکم آتا ہے؟“

”میرا سیل فون، اس میں آتے ہیں حکم۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارا یہاں کیا کام تھا؟“ میں نے پوچھا

”میں معلومات جمع کر رہا تھا، اور آگے دے رہا تھا، میرا اتنا ہی کام ہے۔“ اس نے بتایا

”کون دے رہا ہے معلومات؟“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا

”مختلف لوگ؟“ اس نے مختصر آ کہا

”کہاں ہیں وہ؟“ میں نے تیزی سے پوچھا

”مختلف جگہوں پر۔“ اس نے بتایا تو ایک کمپیوٹر کے سامنے کھڑا سرد بول اٹھا۔

”یہ میرے پاس ہیں ان کی نشان دہی، اس سے پوچھو کتنے لوگ ہیں، میں دیکھ رہا ہوں۔“

”سات لوگ ہیں۔“ اس نے بتایا

”اوکے۔“ انہیں فوراً یہاں پہنچنے کا کہو۔“ میں نے اس ادیبز عمر بندے سے کہا تو ٹکس چیخ اٹھا۔

”نہیں اسے مت کہنا، یہ انہیں اشارہ دے سکتا ہے۔ میں نے ان کا سب کچھ ہینڈ اوور کر لیا ہے۔ سوائے سیل فون کے۔ اس کے سیل فون سے ایک پیغام لکھ دو کہ جو جہاں ہے، فوراً پلٹ آئے اور اپنا یہ سیل فون ضائع کر دیں۔“

”اوکے۔“ سرمد نے تیزی سے کہا اور اس کا سیل فون دیکھ کر اس میں پیغام لکھ دیا۔

”اس وقت کوئی دس منٹ کی دوری پر ہے اور کوئی آدھے گھنٹے کی دوری پر..... انہیں پہنچنے میں وقت لگ سکتا ہے۔ انہیں سمیٹو۔“ آفتاب کرمانی نے حکم دیا تو وہ سب ان لوگوں کو لے کر چھت کی جانب بڑھ گئے۔ جو سیکورٹی گارڈز مر چکے تھے۔ انہیں ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ اس نے سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ میرے دماغ میں ایک ہی بات کھٹک رہی تھی کہ آیا یہ ساری معلومات کہیں پہنچ چکی ہیں؟ اگر پہنچ چکی ہیں تو کہاں پر؟ اس ادھیڑ عمر کو چھت پر لے جایا جا چکا تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بھاگا۔ وہ چھت پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا

”بولو! یہ معلومات کہاں تک گئی ہیں، کس کے پاس پہنچی ہیں، کسے دے رہے ہو؟“

”میں نے سچ بتایا ہے، میں صرف اسی سیل فون پر اطلاعات دے رہا ہوں۔ جو بھی نقشہ، یا جو کچھ بھی اسے دے رہا ہوں۔“

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے کھرکراتے ہوئے کہا تو مجھے سرمد کی آواز سنائی دی۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟ میں نے تلاش کر لیا ہے کہ وہ کہاں ہے، اس کی نشاندہی یہاں سے جنوب مغرب کی جانب ہو رہی ہے۔ اگر اسے پکڑا نہ گیا تو ممکن ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔“

”اتنی جلدی اس تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے، میں تو اس علاقے سے بھی واقف نہیں ہوں اور اس کے.....؟“

میں نے پوچھا

”بیلی کا پٹر سے، بندہ بھی مل جاتا ہے۔“ آفتاب کرمانی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں چونک گیا۔

”کب تک آئے گا؟“ میں نے پوچھا

”ابھی پانچ منٹ میں۔“ اس نے جواب دیا تو میں نے ٹمس سے پوچھا

”بولو کیا کہتے ہو؟“

”میں دو منٹ بعد بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموش طویل ہو گئی۔ صرف کی پیڑ کی ٹک ٹک مجھے سن رہی تھی جن میں دوسری آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ جس وقت، بیلی کا پٹر فضا میں نمودار ہوا، اس وقت ٹمس بولا، ”سرمد نے سمت درست بتائی ہے۔ وہ ابھی تک وہیں ہے۔ آپ چلو، میں ساتھ ہوں۔“

مجھے بہت زیادہ اعتماد مل گیا۔ جیسے ہی اس ہوٹل کی چھت پر بیلی کا پٹر بکا، میں بھاگ کر اس میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھے ہی وہ دوبارہ اڑ گیا۔ میرے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا

”میں فرخ اقبال، آپ سمت بتائیں۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہی میں نے وہ پیغام کھولا جس میں تکنیکی زبان میں وہ سمت درج تھی۔ اس نے پڑھ کر پائلٹ کو بتائی۔

”یہ تو بہت نزدیک ہے، چند منٹ بعد ہم وہاں ہوں گے۔“ پائلٹ نے بتایا

”لیکن وہاں نزدیک تک نہیں، ہم پہلے ہی ڈراپ ہو جائیں گے۔ انہیں شک نہیں ہونا چاہئے۔“ فرخ اقبال نے تیزی سے کہا اور مجھے پیرا شوٹ پہنانے لگا، اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد وہ مجھے بتانے لگا کہ چھلانگ لگانے کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک ٹرانسمیٹر مجھے دے دیا تاکہ رابطہ رہے۔

دو منٹ بعد ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔“ پائلٹ نے ہمیں الرٹ کر دیا۔

”اوکے ڈن۔“ فرخ نے کہا اور الٹی کنتی گمنے لگا۔ جیسے ہی اس نے زبرد کہا میں نے چھلانگ لگا دی۔ ایک جھٹکا لگا، پھر میں تیرنے لگا۔ میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ بالکل زمین کے قریب جا کر میں نے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن گر گیا۔ وہ سخت اور پتھریلی زمین تھی، مجھے کافی چوٹیں آئیں۔ میں کبھی پیرا شوٹ سے نہیں کودا تھا۔ اس لئے نا تجربہ کاری میں کوئی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں ایک آدھ منٹ بعد سنبھل گیا۔ لیکن نجانے کیوں مجھے اس زمین سے ٹکراتے ہی عجیب سا محسوس ہوا جیسے میں ایک دم سے پھیل گیا ہوں۔ یا پھر جیسے کہیں بم دھماکا ہوتا ہے تو اس کے اثرات ہوا میں پھیل جاتے ہیں، یہاں تک کہ آواز بھی دور دور تک جاتی ہے، ایسی ہی صورت حال میں محسوس کر رہا تھا۔ جس کی مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ پہلی آواز فرخ کی گونگی۔

”کہاں ہو؟“

”مجھے کیا پتہ ہے کہاں ہوں، لیکن یہ پکا ہے کہ ابھی جنت میں نہیں اس دنیا ہی میں ہوں۔“ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا تو اس کا ہلکا سا تھقہ گونجا۔

”اپنے ارد گرد بتاؤ، تاکہ میں تم تک پہنچ سکوں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا

”میں سیل فون کی ٹارچ جلاتا ہوں، دیکھ لو۔“ میں نے کہا اور ٹارچ جلا دی۔ اگلے ہی لمحے بولا

”اوکے اوکے، میں پہنچ رہا ہوں۔“

تقریباً دس منٹ بعد وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ وہ کافی حد تک ہانپ رہا تھا۔ میں نے پوچھا

”ایسا کیا ہے، تم ہانپ کیوں رہے ہو؟“

”تم نہیں جانتے ہو کہ ہم کہاں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے کہا

”اچھا میں تجھے بتاتا ہوں۔ یہ بہت تاریخی جگہ ہے۔“ اس نے اپنا سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔

ہم اس وقت نلہ جوگیاں کی مشہور اور تاریخی جگہ پر تھے۔ یہ جگہ سکندر اعظم سے بھی پہلے کی آباد تھی۔ باکمال جوگیوں کا وہ تاریخی استھان تھا، جہاں پر سکندر اعظم بھی آیا اور شیر شاہ سوری بھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہندوؤں کی مقدس کتاب ”رگ وید“ کا بیشتر سے زیادہ کا حصہ یہاں لکھا گیا۔ اس وقت یہ لوگ سورج پرست تھے۔ یونانی بھی اس دور میں سورج کو خدا مانتے تھے۔ جہلم سے جنوب مغرب کی جانب ایک جگہ ہے دینہ، اس سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور سطح زمین سے بیس سو فٹ بلندی پر وہ استھان ہے۔ سکندر اعظم نے ہاتھی کے ساتھ چڑھنے کی کوشش کی تھی کہ ہاتھی مر گیا۔ وہ نہ چڑھ سکا۔ یہاں سینکڑوں جوگی اپنی ”الکھ“ جگانے یہاں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ آئین اکبری میں یہاں پر ایک باقاعدہ نظام تھا۔ اور اس جگہ کو ایک عبادت گاہ (معبد) کی حیثیت حاصل تھی۔ اس نظام کو چلانے والے کو ”مہنت“ کہتے تھے۔ اس قدر چڑھاوے چڑھتے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہوتا۔ مہنت ہی اپنا الگ شعبہ بنا کر اس جگہ کو منظم کئے ہوئے رکھتا۔ بہلول لودھی کے دور میں مشہور زمانہ عاشق صادق رانچھا یہاں جوگی ”بالا تھ“ کے پاس آیا تھا۔ یہیں پر اس نے کان چھدوائے تھے۔ یہاں کان چھدے جوگی ہوتے تھے۔ جن کی کرامتیں بہت دور

دور تک مشہور تھیں۔ ہر دور میں ایک جوگی یہاں کا مہان جوگی رہا تھا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں جودھ ناتھ تھا۔ اس کے قریب ہی قلعہ روہتاس واقع ہے۔ یہاں بیساکھ کے مہینے میں بڑا بھاری میلہ لگا کرتا تھا۔ انگریز دور میں یہ جگہ پر رونق رہی لیکن حیرت انگیز طور پر پاکستان بننے ہی تلّہ کی رونقیں ختم ہو گئیں۔ یہاں خاموشی کا راج ہو گیا۔ ہر طرف ایک سناٹا پھیل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے جوگیوں کی روٹیں بھی یہاں سے چلی گئی ہیں۔ قتلِ مسیح سے آبار و پر رونق جگہ پاکستان بننے ہی کیوں بے رونق ہو گئی یہ سوال اپنی جگہ لیکن ہم یہاں پر تھے، اس کی سمجھ مجھے آنے لگی تھی۔ میں یہاں پر یونہی نہیں تھا۔ کوئی بہت بڑا درجہ پر کھلنے والا تھا۔

اندھیر ہر جانب پھیلا ہوا تھا۔ فرخ مجھے اس جگہ کے بارے میں بتا چکا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟ لیکن میرے اندر اک سنسنی پھیل چکی تھی۔ جس طرح کسی حکیم کو کسی بھی علاقے میں کسی خاص بوٹی کی مہک آ جاتی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی اس جگہ کی پراسراریت نے جکڑ لیا ہوا تھا۔ میں اٹھ گیا۔

میں نے کھڑے ہو کر اپنے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس حقیقت کا مجھے علم تھا کہ انسانی جسم سے نکلنے والی شعاعیں نہ صرف اپنا اثر رکھتی ہیں، بلکہ وہ عمل اور رد عمل کا بھی احساس دیتی ہیں۔ ایک بار مجھے ارد گرد سنگھ یونہی معلومات کے لئے بتا رہا تھا کہ یورپ اور امریکہ میں غیر مرئی مخلوق پر باقاعدہ تحقیق ہو رہی ہے۔ کسی ایسی مخلوق کے بارے میں شواہد اور حقائق جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو مخلوق دکھائی تو نہیں دیتی لیکن اس کے بارے میں شواہد موجود ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں بھوت پریت، ارواح، کے بارے میں بڑی کہانیاں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ دیو مالائی کہانیوں اور بعض مذاہب میں اس کا پورا وجود تسلیم کرایا گیا ہے۔ جوگی ہو یا یوگی، ان کا نظریہ جو بھی ہو، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان صوفیاء نے مشاہدات کئے ہیں۔ وہ ان مشاہدات میں کیا دیکھتے ہیں، انہیں کون سا اور کیسا جہان دکھائی دیتا ہے، وہ کہاں کا مشاہدہ کرتے ہیں؟ ان سب باتوں سے قطع نظر، یہ حقیقت ہے کہ یہ مشاہدہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وہ جو دکھایا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یوں کی جاسکتی ہے کہ دیکھنے والا یہ خواہش کرتا ہے کہ اس نے مشاہدہ کرنا ہے، اب اسے کیا دکھایا جائے، یہ دیکھنے والے کی حیثیت اور مقام کے مطابق اسے دکھایا جاتا ہے۔ اسے کس جہان کی سیر ہوتی ہے، یہ مالک کی مرضی۔ دوسرا یہ کہ اچانک رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی منظر یا کوئی حقیقت بندے پر کھول دی جاتی ہے۔ شاید، مشاہدہ کرتا ہے اور شہادت دیتا ہے کہ انسان ہی ہے جو یہ سب دیکھ رہا ہے اور یہ انسانوں پر ہی راز کھل رہے ہیں۔

مشاہدات کی اس ساری حقیقت میں ایک بات بالکل واضح ہے کہ انسان کا تعلق اس زمین ہی سے نہیں بلکہ اس پوری کائنات سے جڑا ہوا ہے۔ جیسے معمولی سی مثال کہ چاندنی انسان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی کے ساتھ انسان کا پورا پورا تعلق ہے۔ پوری کائنات ایک قوت کی مانند ہے، جس سے انسان جب چاہے، مرئی اور غیر مرئی دونوں طرح سے فائدہ اٹھائے۔ یہ انسان پر منحصر ہے۔

ایک بات اور، جیسے انسان دھوپ میں رہے یا چھاؤں میں آجائے یہ اس کا اختیار ہے۔ دھوپ سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، یہ انسان کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح کوئی مرئی یا غیر مرئی قوتوں کے ساتھ جڑ جائے انہیں تسخیر کرے یا انہیں تسخیر کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے یا دلچسپی ہی نہ لے، یہ انسان پر منحصر ہے۔ لیکن ربط اور تعلق ہونا، یہ حقیقت ہے۔

میں جس وقت تلّہ جوگیاں پر موجود تھا، اس وقت میرے اندر کی ہلچل نے مجھے اپنے اندر کسی قوت کا احساس دلا دیا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ القا ہو گئی کہ یہاں کچھ ہے۔ وہ قوت کیا ہے؟ اس کا مجھے

ادراک نہیں تھا، لیکن کسی قوت کا پورا یقین مجھے ہو چکا تھا۔ میں اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں کسی حد تک اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہوں۔ دور کہیں وادی میں بڑی محدود سی روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ بلاشبہ وہاں زندگی کے آثار تھے۔ تبھی فرخ نے کہا ”وہ کدھر ہو سکتا ہے؟“

”میں تو وہی جانتا ہوں نا جو تم جانتے ہو؟ یہاں کے بارے میں تمہیں ہی پتہ ہے۔“ میں نے جواب میں کہا تو وہ بولا ”یہاں قریب ہی ایک ریست ہاؤس ہے وہاں چلتے ہیں، لیکن انتہائی احتیاط کے ساتھ، ممکن ہے انکے ساتھ کوئی سیکورٹی.....“

”بس تم چلے آؤ۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

ہمارا رخ اسی ریست ہاؤس کی جانب تھا، جس کے بارے میں فرخ نے بتایا تھا۔ ہم محتاط قدموں سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ فرخ میرے آگے تھا اور ہم چڑھائی چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ کھردری سی زمین والی پہاڑی پر آگئے۔ فرخ نے نارنج کی روشنی سامنے کی جانب لہرائی تو سامنے ریست ہاؤس تھا۔ ٹکونی چھت اور کم اونچائی کی یہ ہال نما عمارت تھی۔ ہم اس کے دروازے پر آن پہنچے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے ایک دم سے اندر چلے گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہاں روشنی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ نارنج کی روشنی میں سارے کمرے کو دیکھا۔ پھر اگلے کمرے میں گئے تو بیڈ کے پاس ایک نیا لیپ ٹاپ دکھائی دیا۔ وہ بند تھا۔ اس کے پاس ایک بیگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی فرخ نے سرسراتے ہوئے کہا ”یہ پوری طرح یقین ہو گیا ہے کہ کوئی یہاں پر ہے یا کچھ دیر پہلے تک تھا۔“

”ایسا ہی ہے۔“ میں نے جواب دیا اور پوری طرح چوکنا ہو کر کسی بھی متوقع آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ہو کا عالم تھا۔ کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دی، جس سے کسی کے ہونے کا اندازہ ہو سکے۔ فرخ نے کمرے میں ہر جگہ یہاں تک کہ بیڈ کے نیچے بھی دیکھ لیا۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔

”باہر۔؟“ فرخ نے آہستہ آواز میں کہا

”آؤ۔“ یہ کہہ کر میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے ہی آ گیا۔ میں لیپ ٹاپ بیگ میں ڈال رہا تھا کہ اس نے پوچھا

”باہر کیوں آگئے؟“

”یہاں کوئی نہیں ہے۔“ میں نے کہا

”ہو سکتا ہے، کوئی ہماری آمد کا احساس کر کے چھپ گیا ہو۔“ اس نے رائے دی تو میں نے پوچھا

”لیپ ٹاپ کو ہاتھ لگا کر دیکھا تم نے؟“

”نہیں تو.....“ اس نے تیزی سے جواب دیا

”وہ بالکل شٹڈ ہے۔ اگر کوئی وہاں ہوتا اور ہمیں دیکھ کر یہاں سے جاتا تو یہ ضرور ساتھ لے کر جاتا۔ اتنی دیر بھی نہیں ہوتی کہ ہم اس کی سرسراہٹ بھی نہ سن سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی یہاں پر ہے اور وہ اس وقت ریست ہاؤس میں نہیں ہے۔“

”تو پھر ہمیں محتاط ہو جانا چاہئے۔“ اس نے تیزی سے کہا اور ارد گرد دیکھنے لگا۔ تب میں نے خود میں بے چینی محسوس کی۔ میں بھی ارد گرد دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ بے چینی کی یہ لہر ایک طرف سے آرہی ہے۔ میں نے اس طرف

دیں۔ وہ یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ وہ چند لمبے میری طرف دیکھتا رہا، پھر نہایت غصے میں بولا
 ”وہیں رک جا، کون ہوتا ہے؟“

”یہی سوال میں نے تم سے کرتا ہے، کون ہوتا ہے؟“ میں نے کہا اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”پلٹ جاؤ، اور میری تپسیا بھنگ مت کرو، ورنہ تمہارے لئے برا ہوگا۔“ اس نے غضب ناک لہجے میں کہا تو
 میں نے سکون سے کہا

”بتا دو کہ کون ہو، ورنہ اس سے بھی بدتر حال تیرا ہو جائے گا۔“

”تو اس طرح نہیں مانے گا؟“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا

”نہیں، میں نہیں.....“ لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے آگ والا برتن مجھ پر اچھال دیا۔ میں چونکہ چنی
 طور پر ہر طرح کے حالات کے لئے تیار تھا، اس لئے جھکاؤ دے گیا۔ اسی دوران اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور
 مجھے لیتا ہوا فرش پر آن گرا۔ میرے سنبھلنے تک اس نے میرے سر اور گردن کے درمیان جو گھونٹہ مارا، اس سے میری آنکھوں
 کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اسی لمحے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس بندے کو زیادہ آسان لینے کی ضرورت
 نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید ضرب لگاتا، میں نے اس کی گردن پکڑی اور خود سے الگ کر دیا۔ میں فرش سے
 اٹھا تو اس نے مجھے کمر سے پکڑ کر اوپر اچھالا، میں واپس فرش پر گرنے سے پہلے ہی سنبھل گیا اور پوری قوت سے
 لات اس کے منہ پر ماری۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اب وہ میرے سامنے تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا
 تھا کہ وہ حد درجہ سنجیدہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر اس پر حملہ کرتا، وہ گھوما اور باہر نکل گیا۔

فرخ نے اس کے آگے ٹانگ اڑائی تو ہوا میں اچھلتا ہوا چند فٹ کے فاصلے پر جا رہا۔ مجھے لگا کہ وہ دوبارہ
 نہیں اٹھ پائے گا مگر میں اگلے ہی لمحے حیران رہ گیا، جب وہ کسی کھلونے کی مانند اچھلا اور تن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔
 میں اس کی جانب بڑھنے ہی والا کہ وہ زور زور سے بڑبڑاتے ہوئے ہوا میں ہاتھ لہرانے لگا۔ اسی وقت میرے اور اس
 کے درمیان آگ کی دیوار بن گئی۔ وہ دوسری طرف کھڑا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کیا ہے، وہ فائبر تو تھا، اس کے
 ساتھ جادو گر بھی تھا۔ میں نے اس آگ کی دیوار کی بالکل بھی پرواہ نہیں کی اور اس کی جانب بڑھا۔ وہ کھڑا رہا۔
 میں نے ایک ہی جست میں دیوار پار کی اور اس تک جا پہنچا۔ وہ پلٹ کر بھاگا اور چند قدم کے فاصلے جا کر پلٹا۔ اس
 نے پھر ہوا میں ہاتھ لہرایا اور آگ مجھ پر پھینکی۔ میں نے اس آگ کی بالکل پرواہ نہیں کی اور اسے جا لیا۔ میں نے
 اسے گردن سے پکڑا تھا۔ لیکن اس نے ایک ہی جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ وہ میرے سامنے تن گیا۔ میں آگے بڑھ کر
 اسے پکڑنا چاہتا تھا کہ اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ مجھے ایک جھٹکا دیا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں اس داؤ کو سمجھتا تھا،
 اس سے پہلے کہ وہ داؤ آزماتا، میں پوری قوت سے گھٹنا اس کی ٹانگوں کے درمیان میں دے مارا۔ وہ ڈکارتا ہوا مجھے
 چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب میں اس پر قابو پاسکتا تھا، میں نے پھر اس کی گردن پکڑنا چاہی، اس نے پھر کلائی
 پکڑنے کی کوشش کی لیکن یہ جھکاؤ تھی، میں نے پھر پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوکروں میں لگائی۔ وہ دہرا ہو گیا۔ میں
 نے گھٹنا اس کے منہ پر مارا۔ وہ زمین بوس ہو گیا۔ میں نے تین چار ٹھوکریں اس کی پسلیوں میں ماریں۔ تب وہ
 ساکت ہو گیا۔

”فرخ ری لاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ ری پہلے ہی بیگ سے نکلا رہا تھا۔ وہ تیزی سے اسے باندھنے لگا۔ جب وہ
 باندھ چکا تو میں نے پانی کی بوتل اس کے منہ پر انڈیل دی۔ وہ ہوش میں آ گیا۔ وہ دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔

میں نے اس کا منہ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلاتے ہوئے پوچھا

اشارہ کر کے پوچھا

”اس طرف کیا ہے؟“

”ادھر وہی ہندوؤں کے پرانے مندر، جواب کھنڈر بن چکے ہیں۔“ فرخ نے بتایا

”اس طرف چلو۔“ میں نے کہہ کر قدم بڑھا دیے۔ مجھے نہیں پتہ اندھیرے میں فرخ کے چہرے کے تاثرات
 کیا ہوں گے۔

بلکہ جو گیمیاں پر یہ مندر کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوں گے۔ ان کا احاطہ کتنا ہوگا، میں نہیں جانتا تھا لیکن ٹارچ کی
 محدود روشنی میں ہمارے سامنے چھوٹے چھوٹے سے مینار تھے، جن کے درمیان میں سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔
 جیسے ہی میں نے اس سیڑھی پر قدم رکھا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے جھٹکا سا لگا، جیسے کوئی دھکا دے۔ میں ٹھٹک گیا۔
 بلاشبہ وہاں ان دیکھا حصار تھا۔ یہ کیوں تھا اور کس نے لگایا تھا، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں فرخ کو اپنی
 کیفیت بتا کر خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے خاموش رہا۔ میں سمجھنے لگا کہ یہاں کس طرح کے معاملات سے
 واسطہ پڑ سکتا ہے۔ میں نے اپنے حواس جمع کئے اور سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ میرے سامنے ایک تالاب تھا جو اس
 وقت خشک ہو چکا تھا۔ اس میں سیڑھیاں تھیں جو اب بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اس تالاب کے پار ایک مندر تھا۔ وہاں اور
 بھی برجیاں بنی ہوئیں تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں جو دکھائی دیا ہم اسی منظر میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ وہ مندر
 فرش سے ذرا اوپر تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں انتہائی محتاط انداز میں اندر چلا گیا۔ اس بوسیدہ، ویران اور
 ٹوٹے ہوئے مندر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک خاص قسم کی بساوندہاں سے آ رہی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ مگر میری بے
 چینی کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس مندر کے ارد گرد چکر لگا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں
 دائیں جانب مڑا تو اسی کی سیدھ میں تھوڑا آگے مجھے یوں لگا جیسے کسی کمرے میں آگ جل رہی ہو۔ مجھے تاریخی روشنی
 کی ایک کبیر دکھائی دی۔ میں اس جانب بڑھ گیا۔

وہ بھی ایک مندر نما جگہ تھی۔ شاید کسی جوگی کا استھان تھا۔ میں اندھیرے میں ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔
 لیکن مجھے اسے غرض نہیں تھی کہ وہ جگہ کون سی تھی مجھے تو اس سے دلچسپی تھی جو اس کے اندر تھا۔ کون ہے جو اس کمرے
 میں آگ جلائے بیٹھا ہے؟ میں نے ایک طرف سے اندر جھانکا، اندر کا منظر میرے لئے کافی دلچسپ تھا۔ میری بے
 چینی کو سکون آ گیا، جیسے لاشعوری طور پر میں ایسا ہی کوئی منظر دیکھنا چاہتا تھا، یا ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ کمرے کے
 بالکل درمیان میں ایک مٹی کے برتن میں آگ روشن تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک سفید اور سرخی مائل رنگت والا
 شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سارا بدن ننگا تھا۔ صرف ایک تاریخی رنگ کی لنگوٹ اس نے باندھی ہوئی تھی۔ اس کے گلے
 میں ایک سیاہ رنگ کی مالا تھی۔ وہ کلین شیو تھا۔ لیکن اس کے سر کے بال دراز تھے۔ اس کی کلائیوں پر سرخ دھاگا باندھا
 ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بڑبڑانے الے انداز میں کچھ پڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بالکل
 ایسے ہی تھا جیسے کوئی یوگا کا آسن کر جاکر بیٹھا ہو۔ وہ پوری طرح منہمک تھا۔ اس کے سوا وہاں پر کوئی نہیں تھا۔

”یہ جوگی.....“ فرخ نے کہنا چاہا تو میں نے مڑ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ جوگی
 کرتا کیا ہے۔ چند منٹ یونہی گذر گئے تب مجھے خیال آیا کہ میں یہاں تفریح کے لئے نہیں آیا ہوا ہوں۔ وقت بہت
 کم ہے۔

”تم باہر کا خیال رکھنا، ممکن ہے کوئی اس کا ساتھی ہو یا یہ سب ڈھونگ دکھاوا ہو، کچھ بھی ممکن ہے، میں اندر جا رہا
 ہوں۔“ میں نے سرسراتے ہوئے کہا اور اندر چلا گیا۔ میرے پاؤں کی آہٹ ہوئی تو اس جوگی نے اپنی آنکھیں کھول

”کون ہو؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو“

”میں..... جوگی ہوں..... اور یہاں..... ایک خاص..... تپیا کر رہا ہوں..... بالنا تھ ہوں۔“ اس نے اکتکتے ہوئے کہا

”کہاں کے ہو؟“

”نواب شاہ سے.....“ اس نے بہ مشکل کہا تو مجھے اس کے کراہنے کا انداز مصنوعی لگا۔ میں نے یونہی اس کے ہاتھ دیکھے، وہ رسیوں سے آزاد ہو چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں میرے سوالوں کے جواب سکون سے دے رہا ہے۔ وہ کوئی اپنا منتر چلا چکا تھا۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے پوچھا

”یہاں کب سے ہو؟“

اس نے جواب دینے کی بجائے، پوری قوت سے اپنی کلائی میرے منہ پر مارنا چاہی، جسے میں نے پکڑ لیا، اور اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر کھینچا، میں اس کا بازو نکال دینا چاہتا تھا لیکن وہ انتہائی سخت جان تھا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ میں بھی سمجھا کہ اس کا بازو کھل چکا ہے۔ میں نے دوسری ٹھوکرا اس کی کٹھنی پر ماری۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

”مر گیا یہ؟“ فرخ نے پوچھا

”نہیں صرف بے ہوش ہوا ہے۔ لگتا ہے کافی سخت جان ہے۔“

”ہیلی کاپٹر بلاؤں۔“ اس نے کہا

”بلاؤ اور یہاں سرچ آپریشن ہونا چاہئے۔“ میں نے کہا اور اس جوگی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مجھے وہ کافی پراسرار لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈنر پر انتہائی پر تکلف اہتمام تھا۔ بھوپندر سنگھ برادر اور اپنے خاندان ساتھ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا، جس میں اس کی بچی، بیٹا اور بیٹی تھیں۔ یہی بیٹی سرن کور کے ساتھ انوجیت سنگھ کی بات چل رہی تھی۔ وہ کافی حد تک پر اعتماد تھی۔ اس کے بالکل سامنے ہر پریت کور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بائیتا کور اور جہاں سنگھ۔ ڈنر کے دوران انہی دو خاندانوں کے بارے میں باتیں چلتی رہیں۔ مختلف سوال جواب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ڈنر خوشگوار ماحول میں ہو گیا۔ نوجوان سبھی باہر لان میں جا بیٹھے۔ کلجیت کور کے پاس جہاں سنگھ، بھوپندر سنگھ برادر اور اس کی بیوی رہ گئے۔ چائے پیتے ہوئے بھوپندر سنگھ برادر نے کہا

”لو جی بہن کلجیت کور! ہمیں تو لڑکا پہلے بھی پسند تھا اور اب بھی ہے۔ اب آپ بتادیں کہ کب آپ ہمارے پاس آرہے ہیں اور آپ کی کیا رائے ہے۔“

”مجھے بھی سب پسند ہے۔ بس لڑکا اور لڑکی آپس میں جو طے کرنا ہو کر لیں۔“ کلجیت کور نے کہا

”چلیں جی، انہیں ملنے کا موقعہ دے دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، زندگی انہوں نے گزارنی ہے۔“ بھوپندر سنگھ برادر

نے کہا اور پیالی رکھ کر بولا، ”لو بہن جی ہم چلتے ہیں، ہمیں فون کر دیں آپ کب آرہے ہیں۔“

کچھ دیر بعد وہ لان میں ایک دوسری کوالو ادھر کہہ رہے تھے۔ وہ چلے گئے تو کچھ دیر کے لئے وہ لاؤنج میں آ بیٹھے۔ یونہی تھمرہ ہوتا رہا۔ پھر جہاں سنگھ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے جانتے ہی ارد گرد سنگھ سے بات کی تو اسے معلوم ہوا کہ پھر راتوں تک بات چلی مٹی ہے۔ اس کا رد عمل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ اس نے رد عمل معلوم کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس وقت وہ بھال کے ساتھ مصروف تھے۔ جہاں

نے فون بند کیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بائیتا کور کے ساتھ ہر پریت کور بھی آگئی۔ وہ دونوں اس کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

”اب بتاؤ، کس طرح کی لگی تمہیں وہ لڑکی؟“ ہر پریت کور نے بڑے پیار سے پوچھا تو جہاں سنگھ کر بیٹھے ہوئے بولا

”بہت اچھی اور بہت پیاری ہے۔ مجھے تو پسند ہے لیکن بات انوجیت کی ہے، اسے اگر پسند.....“

”اُسے تو پسند ہے، یہ اظہار کر دیا اس نے۔“ ہر پریت بولی تو بائیتا کور نے کہا

”لڑکی تو پہلے ہی انوجیت کو چاہتی ہے۔“

”پھر تو معاملہ سیٹ ہے جی، اتنے تکلفات کی کیا ضرورت تھی، آج بات پکی کر دیتے۔“ جہاں سنگھ نے خوش ہوئے ہوئے کہا

”اسی ہفتے میں ہو جانی ہے بات پکی۔“ ہر پریت کور نے کہا اور ہنس دی۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ دونوں اٹھ کر چلی گئیں۔ جہاں سنگھ بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

ہم اسی عمارت میں واپس آ چکے تھے جہاں ہم نے پلان کیا تھا۔ اس جوگی کو ہم اپنے ساتھ ہی لے آئے تھے۔ میں نے آتے ہی وہ لیپ ٹاپ سرمد کو دے دیا تھا۔ اس وقت وہ جوگی ایک کمرے میں بندھا ہوا بے ہوش پڑا تھا اور میں ایک اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا، جہاں پر ہوٹل میں ہونے والے آپریشن کو دکھایا جا رہا تھا۔ اس آپریشن کا انچارج آفتاب کرمانی لائین پر تھا۔ اس نے مجھے وہاں کی صورت حال بتاتے ہوئے کہا

”ہوٹل کی پوری اوپری منزل کو پوری طرح سیل کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ اب تک ان کے رابطے میں تھے وہ سبھی آ گئے ہوئے ہیں، ان میں سے صرف ایک رہتا ہے، اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ان سے کچھ معلومات ملیں؟“ میں نے پوچھا

”بہت زیادہ، لیکن ابھی یہ سب ابتدائی ہے، یہ کیئر کہاں کہاں تک پھیلا ہوا ہے، اسے جاننے کیلئے تو ابھی وقت لگے گا۔“ اس نے بتایا

”ٹھیک ہے، میرا کام ختم ہوا، آپ کا شروع ہو گیا، اب یہ سب آپ دیکھیں۔“ میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ سب سنبھال لیں گے۔ میں اسی وقت سرمد کے پاس گیا۔ وہ اس جوگی کا لیپ ٹاپ کھول چکا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں کے ماہرین بھی تھے۔ اس وقت وہ اسے کھنگال رہے تھے۔ جیسے ہی میں ان کے قریب گیا تو سرمد نے کہا

”یہ شک بالکل درست تھا کہ معلومات کہاں جا رہی ہیں، یہ سب یہاں ہیں، اس بندے کے پاس آرہی تھیں۔ اس نے آگے ٹرانسفر ابھی کیوں نہیں کیں ابھی، شاید وہاں اسے کھولنے کا موقعہ نہیں ملا، یا پھر ابھی.....؟“ اس نے مزید کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

”تم نے دیکھ لیا، ہمارا کام ختم ہوا، یہ سب یہاں پر ہیں، اسے دیکھ لیں گے، ہمیں اب چلنا ہے۔“

”بس دو منٹ، ابھی چلتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اسکرین کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی عیڑی سے میری طرف آیا۔ چند قریب سے ہی عیڑی سے بولا

”سر! آپ فوراً آئیں میرے ساتھ۔“

”چلو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا، ”او! آخر تو ہے نا؟“

”وہ جوگی، وہ بندھا ہوا تھا، جیسے ہی اسے ہوش آیا، اس کی رسیاں خود بخود ٹوٹ گئیں ہیں۔ اس نے سرفرخ کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔“ وہ میرے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے بولا تو میں مزید تیز رفتار سے اس کمرے تک پہنچا جہاں کا منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ وہ جوگی ایک جانب بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ روشنی میں اس کے سبھی خدو خال نظر آرہے تھے، یہاں تک کہ اس کے چہرے کا وحشی پن بھی۔ لیکن اس کے ساتھ جو وہاں وحشی پن دکھائی دے رہا تھا، دو سیکورٹی گارڈز فرخ پر بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان کے بدن سے لہو نکل کر پھیل رہا تھا۔ فرخ ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا بے ہوش تھا۔ ایک گارڈ کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ ساکت تھا۔ میں نے اس جوگی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ میں نے اشارے سے سب کو وہاں سے لے جانے کے لئے کہا۔ کئی سیکورٹی گارڈ آگے بڑھے اور انہوں نے سب کو اٹھا لیا۔ کمرے میں صرف میں اور وہ جوگی رہ گئے۔ میں نے اس جوگی کی طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا

”اوتے اٹھ کر کھڑا ہو جا اور بتا کون ہے تو؟“

میرے یوں کہنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں، پھر زیر لب مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا

”ہمت ہے تو پوچھ لے؟“

”سن! میں نے تیرے جیسے کئی بندروں، کتوں اور ریچھوں کو اپنی انگلی پر نچایا ہے، میری ہمت مت دیکھ، ورنہ میں تمہارا نام نہیں پوچھوں گا اور تو اپنے بارے بتانے کو ترسے گا۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھایا، جیسے ہی اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا، آگ کا ایک گولا میرے طرف آیا، یہ ایسا ایک ٹانے سے بھی کم وقت میں ہوا، میں نے اپنی ہتھیلی کھڑی کر دی۔ وہ آگ کا گولا، میری ہتھیلی سے ٹکرایا اور ہوا میں پھیل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وہ ایک لمحے کو گھبرا گیا، پھر اضطرابی انداز میں اٹھ بیٹھا۔ میں اس کی نگاہوں میں دیکھ رہا تھا، جہاں حیرت سٹ آئی تھی۔ وہ جادو جانتا تھا اور اپنے عمل کو بے اثر جانا دیکھ کر اسے حیرت ہونا ہی تھی۔ میں اس بات کو سمجھتا تھا۔

دراصل شیطانی قوتیں ایسے بندے کی مدد کو آ جاتی ہیں۔ لفظ جادو ہی میں جادو ہے، ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ ایک دھوکے کا نام ہے، جو اس سے ڈر گیا، وہ فنا ہو گیا، کیونکہ وہ شیطانی عمل کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور وہ جو اسے دھوکا سمجھتا ہے، اور ہے بھی ایسا ہی تو اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کے لئے یہ ماورائی عمل ہوتا ہے لیکن یہ ان لوگوں کے لئے ماورائی ہے جو اس کی حقیقت نہیں جانتے۔ جن لوگوں کو رب تعالیٰ پر بھروسہ اور کامل یقین ہوتا ہے، وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بس بندے کو بھروسہ اور یقین بارے پتہ ہونا چاہئے۔

میرے ذہن میں تھا کہ اس کا بازو نکل چکا ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا خود پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

”تو اپنی ساری شعبہ بازیاں دکھا لے، میں اس کے بعد ہی تم سے پوچھتا ہوں۔“

”ابھی تو نے کیا دیکھا۔ لے اب دیکھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پھر سے ہاتھ لہرایا تو ایک سانپ اس کے ہاتھ میں تھا، جو اس نے لہرا کر میری جانب پھینک دیا۔ میں نے اسے دیوچا اور ایک ہی جھٹکے میں دو ٹکڑے کر دیئے۔ جیسے ہی وہ سانپ دو ٹکڑے ہوا، میرے ہاتھوں میں وہ راکھ بن گیا، میں نے اسے پھینکا اور آگے بڑھا۔ وہ لاشعوری طور پر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میں اس کے بالکل قریب چلا گیا اور اس کی گردن سے پکڑ لیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے والا حربہ مجھ پر آزمایا، چاہا، اس نے اپنا گھٹنا میری ٹانگوں کے درمیان مانا چاہا، لیکن میں اس کا یہ وار خالی کیا۔ میں نے اسے گردن سے دیوچ کر اسے سامنے والی دیوار میں مارا لیکن بالکل دیوار کے پاس ہو کر اور انتہائی سرعت کے ساتھ اس

نے اپنی ٹانگ گھمائی۔ میں ذرا سا پیچھے نہ ہٹا تو اس کی ٹھوک میرے منہ پر لگتی تھی۔ میں نے اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ کو پکڑا اور اپنی طرف کھنچا۔ وہ لڑکھڑایا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ فرخ پر گرا۔ میں نے پوری قوت سے ٹھوک اس کے منہ پر ماری۔ پھر اسے گردن سے دیوچ لیا۔ میں نے اس کا سر دیوار میں مارا تو وہ بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ میں نے پانی کی بوتل پھر اس کے منہ پر اڑھیلی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں مانتا ہوں کہ اس میں ہلاکی برداشت تھی۔ اب میں اسے کوئی وقت نہیں دیتا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے لت پت تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اپنی ران پر رکھا اور پوری قوت سے کھڑی ہتھیلی اس کی کلائی پر ماری۔ ایک جھج اس کے حلق سے بلند ہوئی۔ اس کی کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے اس کا دوسرا بازو پکڑا، اب اس میں اتنی مزاحمت نہیں تھی۔ میں نے اس کا دوسری کلائی بھی توڑ دی۔ وہ بے جان سا ہوفرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا، جیسے سانپ کو مارا جائے تو ایک دم سکڑ سا جاتا ہے۔

میں ایک سٹول پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی پڑا رہا، پھر اس نے ہولے سے میری طرف دیکھا، وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل پارہی تھی۔ میں اٹھا اور جا کر اس کی گردن پھر سے دیوچ لی۔

”بول، دکھا چسکار۔“ میں نے انتہائی غصے میں کہا

”تو..... پہلا ہے..... جس نے م..... میری بیس سال..... کی تپ..... تپیا..... کا سامنا..... کیا کک..... کوئی نہیں..... ٹھہر سکا..... آج تک۔“ وہ بہ مشکل ہولے ہولے کہہ رہا تھا

”تجھے کہا تا تیرے جیسے بندر، کتے اور ریچھ نچانا مجھے آتا ہے۔ چل اب بک دے کیا کر رہا تھا تو وہاں؟“ میں نے اس کے ماتھے پر دباؤ بڑھا کر پوچھا

”آج رات..... تو نہ آتا تو..... میں تیرا..... ایٹمی راز..... لے جاتا..... میں مہان ہتھی لینے..... مندر چلا گیا۔ آج کی صبح..... میں نے سب لے کر..... نکل جانا تھا۔ میں برج ناتھ..... ایک چور ہوں..... تیرے ایٹمی راز کا..... سب لے جاتا..... سب.....“ یہ کہہ کر اس نے گردن ایک جانب ڈال دی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں اٹھا اور باہر چل دیا۔ اب وہ بے کار ہو چکا تھا۔ میں باہر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب اس کمرے میں ہونے والی ایک حرکت دیکھ چکے تھے۔ تھی ایک آفیسر میرے قریب آیا اور اس نے پوچھا

”آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں اور اب جانا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ انہیں سنبھال لیں گے۔“

”ہاں! سب ٹھیک ہے۔ وہ ہوئے اور اس میں سب کچھ جلا دیا ہے۔ تاکہ سب ایک راز بن کر دفن ہو جائیں۔“

”اوہ! میرے منہ سے نکلا اور میں اٹھ گیا۔“

میں اس عمارت کے لاؤنج میں آیا تو وہیں مجھے سرمد اور جنید مل گئے۔ ہم باہر نکلے تو پورچ میں فور وینل کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ کر چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کی روشنی کرنیں اوگی پنڈ کو روشن کرنے کو بے تاب تھیں۔ جہاں سنگھ چھت پر کھڑا اور پھیلے ہوئے گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر واضح تھے لیکن وہ اپنی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ یہ جو سردار سر جیت سنگھ بندیال نے اس پر ذمہ داری ڈال تھی، اسے وہ کب تک نبھائے گا۔ وہ خالصتان کے دشمنوں کو ختم کرتا ہوا خود بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن پتہ نہیں وہ اپنی آنکھوں سے خالصتان کا خواب پورا ہوتا ہوا دیکھ بھی پائے گا کہ نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ مرنا ہر انسان نے ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن مرنے مرنے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس فلسفہ کو بخوبی

جانتا تھا۔ لیکن انسان بڑا بے مبرا ہے، وہ اپنے خواب اپنی آنکھوں سے پورا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ ان خوابوں کو بھی جنہوں نے صدیوں بعد پورا ہوتا ہوا ہے۔ وہ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنے کاندھے پر جانا پچھاناس محسوس ہوا۔ اس نے مڑے بغیر کہا

”ہر پریت! تمہیں احساس ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے خالصتان بنتا ہوا دیکھ لو گی؟“

اس کے یوں پوچھنے پر ہر پریت کور نے اس کا بازو پکڑا اور انتہائی نرمی سے اپنی جانب موڑتے ہوئے ملائمت سے کہا

”بات یہ نہیں ہے کہ خواب پورا ہو جائے، بات یہ ہے کہ میری آنکھوں میں اک خواب تو ہے، قسم ہے واہ گرو کی، میں اس خواب کو حقیقت بننا دیکھ چکی ہوں، ایک بار نہیں کئی بار۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو پریتو، خواب ہی نہیں ہوگی تو تعبیر کہاں سے آئے گی۔“ جہاں سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا، پھر تیزی سے پر جوش لہجے میں بولا ”تو نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی ہے پریتو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہر پریت کو اپنے ساتھ لگانا چاہا تو اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا گچ اچھل گیا۔ اصل میں ہر پریت بھی ایک دم سے نشے میں آگئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس کے منہ سے پریتو نکلا تھا

”اوائے فک!“ ہر پریت تیزی سے بولی۔ چائے فرش پر گر گئی تھی مگ میں تھوڑی سے بچی۔ جہاں نے وہ گچ پکڑتے ہوئے کہا

”بہت بڑی بات کہہ دی ہے یار تو نے۔“

”ایسی کیا بات کہہ دی میں نے؟“ اس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا

”میں لاکھ دن سے سوچ رہا تھا کہ کیا سردار سر جیت سنگھ بندیاں نے جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے، اسے کیسے پورا کر سکوں گا۔ میں کچھ اور بھی چاہتا تھا۔ وہ کیا ہو؟ یہ مجھے سمجھ میں آ رہا تھا۔ ابھی سمجھ میں آ گیا۔“ یہ کہتے ہوئے جہاں نے چائے کا سپ لیا تو وہ بولی

”وہ کیا؟“

”وہ یہ ہے پریتو کہ جس طرح تیری آنکھوں میں خواب ہیں، اسی طرح یہ خواب ہر سکھ کی آنکھ میں ہونا چاہئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک جو بھی سنگھ خالصتان کے لئے نبرد آزما ہے، وہ انتقام کے جذبے میں ہے۔ وہ ہندو سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ اکال تخت کے لئے نہیں اپنے بڑوں کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے انتقام کی پٹی اتاری جائے اور اس کی آنکھوں میں اکال تخت کا خواب بھر دیا جائے۔“ اس نے گہرے ہوتے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا

”تم ٹھیک کہتے ہو، ہمیں اس پر بھی عزت کرنا ہوگی، ہمیں وہ پڑھے لکھے لوگ تلاش کرنا ہوں جو اس خواب کو حقیقت بنا کر دکھائیں۔“ ہر پریت کور نے بھی پورے جوش سے کہا، پھر ایک دم سے یوں جیسے بھگ گئی ہو۔ تب جہاں نے کہا

”میں نے سوچا ہے کہ خالصتان کے لئے ساری زندگی بھی لڑتے رہے تو ہندو کی سازش کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے پہلے اگر سولوگ خالصتان کی حمایت میں تھے تو اب پچاس ہیں۔ لوگ شدت پسند تحریکوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ زمانہ دلیل کا زمانہ ہے۔ ہندو یہ چاہتا ہے ہم لڑتے رہیں اور اس تحریک کے ساتھ لوگ کم ہوتے چلے جائیں لوگوں میں مایوسی بڑھ جائے۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”یہی کہ سنگھ اور کور دونوں کو مشہور دوں، اپنے خالصتان کی تحریک کو دلائل کے ساتھ اقوام متحدہ میں رکھوں۔ برطانیہ میں اپنے حق کے لئے انکیشن ہو سکتا ہے تو بھارت میں کیوں نہیں۔ اسی کو بنیاد بنا کر میں پوری دنیا میں سکھوں کو اکٹھا کروں گا۔“ وہ جوش میں کہتا چلا جا رہا تھا۔ جبکہ ہر پریت سختی چلی جا رہی تھی۔ جہاں یہ سن کہہ کر یوں جیسے خوابوں میں کھو گیا وہ چند لمحے یونہی کھڑی رہی پھر پلٹ کر تیز قدموں سے چلتی گئی۔ جہاں نے اسے سیزرھیاں اترتے دیکھا مگر اسے روکا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دکھ کیا ہے۔ وہ بھی ہولے ہولے نیچے چلا گیا۔

ناشتے کر لینے کے بعد کلجیت کور ان سب کو لے کر لاؤنج ہی میں بیٹھ گئی۔ اس نے سب سے مخاطب ہو کر پوچھا

”اب بتاؤ۔! ہمارا صاحب کے ساتھ کیا بات کرنی ہے۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟“

اس پر سبھی خاموش رہے۔ سبھی جہاں ہی بولا

”پھوپھو۔! آپ کا کیا خیال ہے؟“

”دیکھو بیٹا، میں نے تو بہت دیکھ بھال کے، ادھر ادھر سے سن سنا کر یہ رشتہ طے کرنے کی بابت سوچا ہے۔ دوسرا ہمارے خاندان کا ان کے ساتھ پرانا تعلق بھی ہے۔ انہیں ہمارے بارے میں بھی سب پتہ ہے۔ یہ پرانا تعلق ہی تو ہے جو وہ ہمارے ساتھ رشتہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ کہاں وہ زمین جائیداد والے، جن کا باہر برس ہے۔ وہ تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ ساری زمین جائیداد، ہماری نہیں جہاں کی ہے اور ہم اس پر.....؟“ کلجیت کور نے کہنا چاہا تو جہاں نے ٹوک دیا

”نہیں پھوپھو، یہ ایسا نہیں ہے، زمین اور جائیداد میں نے سب انوجیت کو دے دی ہے، اس کے نام ہو گئی ہے، دوسرا ہمارا انوجیت سنگھ لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ایک ہے۔ ایسی کئی لڑکیاں.....“ اس نے کہنا چاہا تو کلجیت کور نے کہا

”مجھے نہیں پتہ تو نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں لیکن، وہ تو تب سے میرے ساتھ بات کر رہے ہیں، جب یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ انوجیت ممبر بنے گا۔ خیر! جو بھی ہے، میں تم لوگوں کی رائے کے بغیر کچھ نہیں کرنے والی۔“ کلجیت کور نے صاف لفظوں میں کہا

”پھر تو یہ انوجیت ہی بتائے نا؟“ ہر پریت کور نے کہا تو وہ کسمسا کر رہ گیا پھر دھیرے سے بولا

”ٹھیک ہے بے بے، جیسا آپ کہیں، میری بھی مرضی ہے۔“

”اوکے ڈن ہو گیا۔“ جہاں نے حتمی لہجے میں کہا

”اب بتاؤ، شادی کب کریں، مجھے ہمارا صاحب نے کہا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ باہر چلے جانا چاہتے ہیں۔“

”میری طرف سے تو صبح ہی رکھ لیں۔“ جہاں نے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔ اس پر بانیٹا کور بولی

”تیری کون سی ہو رہی ہے، تو ایویں ای۔“

”اس سے پوچھ، جس کی ہونی ہے، اس کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں نا، وہ تو آج ہی چاہ رہا ہوگا۔ کیوں انوجیت دیرے؟“

”بھائی جی آپ بھی نا، بس جو کرنا ہے وہ کر دیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چل دیا۔ باقی بٹنے لگے۔

”ٹھیک ہے پتر۔! اب تم لوگ پلان کر کے دو، آج شام ہی براڑ صاحب کی طرف ہو آتے ہیں۔ میرے خیال میں بھی یہ شادی جلدی ہو جائے تو اچھا ہی ہے۔“ کلجیت کور نے اٹھتے ہوئے کہا، پھر ایک دم رک کر بولی،

ہاں پتر بائیتا، اب تو نے کہیں نہیں جانا، اس وقت تک تم نے یہیں رہنا ہے، جب تک یہ شادی نہیں ہو جاتی۔ سارا انتظام تم نے کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

”بس پھر ہو گئی شادی۔“ جہاں نے آہستہ سے کہا تو بائیتا تنک کر بولی

”کیا مطلب، کیا میں شادی کا انتظام نہیں کر سکتی؟“

”کر سکتی ہو، پناخوں کی جگہ گولیاں چلیں گئیں۔ اصلی بم پھوڑے جائیں گے۔“ وہ کہنے لگا تو بائیتا کو ایک دم سے اس پر جا پڑی۔ اسے صوفے ہی میں دبوچ لیا۔ وہ ہنسنے ہوئے بولی

”اب بتا، کیا ہوگا؟“

”او، معافی، میں نے کس کو چھیڑ لیا۔“ جہاں نے کہا تو وہ ایک طرف ہو کر بولی

”ہر پریت، ہم دونوں اس شادی کا انتظام کریں گی، دکھا دیتے ہیں انہیں۔“ بائیتا کو نے کہا

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بھی ہنس دی۔ پھر بولی، ”میں ابھی کاغذ مینسل لے کر آتی ہوں، پہلے پھر ورک کر لیں، آخر ہم نے کرنا کیا ہے۔“

”ہاں بلڈنگ کھڑی کرنی ہے نا۔“ جہاں نے کہا تو بائیتا کو نے گھور کر دیکھا تو وہ اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

اس وقت رات کا دوسرا پہر تھا، جب وہ لاہور پہنچ گئے۔ وہ ماڈل ٹاؤن والے گھر نہیں گئے، بلکہ سیدھا طارق نذیر کے سیف ہاؤس جا پہنچے، جہاں پر وہ بندہ لا کر رکھا گیا تھا، جس کے بارے میں اس نے ہدایت دی ہوئی تھیں۔ وہ شخص بظاہر ایک عام سائبرنس مین تھا، اس کا اخبار اور ساتھ ایک چینل بھی تھا۔ کچھ پراپرٹی کا کام بھی کرتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایک شریف انفس اور بے ضرر دکھائی دیتا تھا۔ بڑا خدا ترس مشہور تھا۔ لیکن اندر سے وہ بہت ظالم انسان تھا۔ اس کی پہلی اور آخری ترجیح فقط دولت تھی۔ اس کے لئے وہ کیا کچھ کرتا تھا، اس کی ذرا سی جھلک یہی بتائی جاسکتی ہے کہ وہ لوگوں کی ڈیل کراتا تھا۔ سامنے خدا ترس دکھائی دینے والا جرائم کی دنیا میں ڈیل کروانے والا تھا۔ کون کیا کر رہا ہے، کس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، کسے کیا چاہئے، اسے سب پتہ ہوتا تھا۔ اصل میں وہ پولیس کا سب سے بڑا انفارمر بھی تھا۔ اس نے اپنا کھیل کچھ اس طرح بجایا ہوا تھا کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ یہاں تک رہتا تو معاملہ دوسرا تھا۔ یہی ڈیل اب وہ ایسے لوگوں سے بھی کرنے لگا جو ملک دشمن عناصر تھے۔

وہ تقریباً ڈیڑھ برس پہلے لندن گیا تھا، جہاں اس کی ملاقات ایک انگریز نے ایک بھارتی سے کروائی۔ یہ انگریز پہلے بھی اس سے کام لیتا رہا تھا۔ بھارتی نے اس کو ایک بڑی ڈیل کی آفر کی۔ کرنا اسے یہ تھا کہ جنوبی افریقہ، اور ایسے ہی ممالک سے آنے والے لوگوں کو ایسے لوگوں سے ملوانا تھا جو انہیں اپنے پاس رکھ سکیں اور انہیں یہاں جو بھی کرنا ہو اس پر پورا پورا تحفظ فراہم کریں۔ بظاہر یہ ڈیل بڑی آسان تھی لیکن اس کے مقابلے میں دولت کی آفر بہت زیادہ تھی۔ اس لئے یہ سب مان گیا۔ اس کے واپس پاکستان آتے ہی ایک ایک کر کے لوگ آنا شروع ہو گئے۔

روہن، بنگاکر اور ویناش اسی کے پاس آ رہے تھے۔ اس نے ہی آگے ان لوگوں کا بندوبست کیا تھا، جن کے ذریعے انہوں نے یہاں بم دھماکے کروانا تھے۔ یہ انسانیت پر ظلم کی انتہا تھی۔

وہ نانے قد کا گول منول سانسفید رنگ کا تھا۔ اس کی داڑھی بخشی ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی مونچھیں اور سر سے کافی حد تک مچھا تھا۔ وہ فرش پر پڑا تھا۔ میں جس وقت کمرے میں گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے دوبارہ دیکھا تو میں نے پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوک اس کے ماتھے پر ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے دوسری ٹھوک اس کی پسلیوں میں ماری تو وہ فرش پر دو ہراتہرا ہونے لگا، جیسے یہ ابھی مرجانے والا ہے۔ میں نے پھر اس کے سینے پر لات رسید کی تو وہ تڑپنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور لائٹروں سے نکلا، جو میں اسی مقصد کے لئے باہر ہی سے لایا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ میں کیا کرنے لگا ہوں، جیسے ہی میں نے لائٹروں کی روشنی دکھائی، وہ سمجھ گیا۔ وہ اپنا ہاتھ چمڑاتے ہوئے زور زور سے چیخنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور آگ کی کو سے اس کی ہتھیلی جلانے لگا۔ وہ تڑپتے ہوئے ڈکارنے لگا۔ میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولا۔ تب وہ چیختے ہوئے کہنے لگا

”خدا کے لئے بتاؤ کیا چاہتے ہو؟“

”ان سب لوگوں کا پتہ، جنہیں یہاں پناہ دی ہوئی ہے۔“ میں نے سکون سے کہا وہ تڑپتے ہوئے زور سے بولا

”میرے پاس کوئی نہیں ہے، سب مر گئے ہیں، کچھ دیر پہلے میں نے سنا۔“

”ایک ایک کا حساب دو۔“

”بتاتا ہوں، سب بتاتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے ہاتھ چمڑانے کی خاطر کہا، لیکن میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، لائٹروں سے ویسے ہی جلتا رہا۔

”اگر ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو سیدھے پہلے تیری آنکھیں جلاؤں گا،“ یہ کہتے ہوئے میں نے لائٹروں کی کو اس کی آنکھوں کے پاس کی تو ایک دم سے پیچھے ہٹ کر خوفزدہ انداز میں دیکھنے لگا۔ میں نے لائٹروں بند کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ سامنے ہی طارق نذیر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کہا

”ڈر گیا ہے۔ لیکن جھوٹ پھر بھی بولے گا۔ ایک دو دن اسے دیکھو، پھر میں آ کر اسے دیکھتا ہوں۔ اس کے پیچھے بہت سارے لوگ ہیں۔“

”جی بالکل، اس وقت یہ جرم بغیر جبین کے ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس میں بہت سارے لوگ ملے ہوئے ہیں۔ یہ تو اس کا حصہ ہی لگتا ہے۔“

”اب انہی کا صفایا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو سیاسی لبادے میں، مذہبی چولا پہن کر یا این جی او کے بھیس میں ملک دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اب ان کا خاتمہ میں نے ہی کرنا ہے۔ اب بات اسی سے شروع کر کریں گے، دیکھیں کہاں جا کر ختم ہوتی ہے یا پھر ہم ختم ہو جاتے ہیں۔“ میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ میرا رخ نورنگر کی طرف تھا۔

نورنگر پہنچنے تک دن نکل آیا تھا۔ سرد لاہور ہی میں رہ گیا اور جنید میرے ساتھ تھا۔ پورچ میں فور و ہیل رکی تو میں اتر کر اندر جانے لگا۔ تبھی مہوش تیزی سے دروازے تک آ گئی۔

”زکو، زکو، جمال بھائی وہیں زکو۔“

”خیر ہے، کیا ہو گیا۔“ میں نے ایک دم سے گھبرا کر پوچھا، میرا دل ایک دم سے دھڑک اٹھا تھا۔

”خیر ہے، زکو آپ، جب تک میں نہ کہوں، آپ نے اندر نہیں آنا۔“ مہوش نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے تیزی سے کہا۔ میں وہیں پورچ میں داخلی دروازے کے باہر رک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی سر پرانی ہی ہو سکتا ہے۔ میں رک گیا۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ مہوش کے ساتھ رونیت کو آتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کے ہاتھوں میں پیتل کی کنوریاں تھیں۔ پہلے مہوش نے دروازے کے دائیں بائیں فرش کے کونوں پر تیل ڈالا، اسی طرح

رونیت کور نے بھی کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ میں اندر لاؤنج میں جا بیٹھا تو وہ دونوں میرے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھیں۔

”یہ کیا تھا بھی؟“

”پانی پی لیں، پھر یہ بھی پینا یا نہیں رہے گا۔“ مہوش نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے کہا۔ میں ان کے چہرے پر پھوٹی ہوئی خوشیاں دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا، اس لئے کاندھے اچکا کر کہا

”چلو، ایسا کر لیتے ہیں۔“

اتنے میں ایک لڑکی پانی لے کر آ گئی۔ اس دوران جنید بھی میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب ہم پانی پی چکے تو مہوش بولی

”مجھے پہلے یہ بتائیں کہ میرا اور آپ کا تعلق کیا ہے، بھابی کا یا بہن کا؟“

”آف کورس بہن کا، تم میری اتنی ہی پیاری بہن ہو جتنی یہ رونیت کور، اب بتاؤ بات کیا ہے۔“ میں نے کہا تو مہوش ایک لمحے کے لئے جذباتی ہو گئی، ایسا ہی کچھ حال رونیت کور کا بھی تھا۔ ان کے چہرے پر پل پل بدلتے رنگ اور میرے لئے عقیدت مجھے خود سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تبھی مہوش نے خود پر قابو پاتے ہوئے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا

”بھائی! میں پوچھ بھی بننے والی ہوں۔“

”اور میں بھی۔“ رونیت کور کہتے ہوئے رو دی۔ یہ خبر خود مجھے سر سے پاؤں تک خوشی سے بھر دینے والی تھی۔ میں اٹھا اور بازو بچھلا دیئے۔ دونوں میری بانہوں میں سمٹ آئیں۔ میں نے ان کا سر تھکتے ہوئے پیار سے پوچھا

”بولو۔! مانگو کیا مانگتی ہو؟“

”جو ہم مانگتی ہیں وہ آپ نہیں دے سکتے، ہم تو اپنے بھائی کی زندگی کی دعا مانگتی ہیں، سلامتی کی دعا مانگتی ہیں۔ جو آپ نے اب تک دیا، وہ کم ہے کیا؟“

میرے سینے سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ میں ان سے الگ ہوا تو جنید میرے گلے لگ گیا۔

”میں بھی تو چاچا بن گیا ہوں نا۔“

”ابھی وہ آنے والا آیا نہیں اور تم ابھی سے اپنے رشتے جوڑ رہے ہو۔“ اماں بھی وہیں آ گئیں تو میں ان کے ساتھ گلے لگ کر ملا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور بولیں

”جاسوئی کے پاس، وہ اپنے کمرے میں ہے۔“

میں نے انہیں دیکھا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

سوئی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آہٹ سن کر وہ شرما لجا گئی، جیسے پہلے دن کی ڈہن حیا سے دہری ہو جاتی ہے۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ یونہی بیٹھی رہی۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ سسکتی ہوئی میرے ساتھ آ گئی تو میں نے کہا

”اتنا قیمتی تحفہ دینے کا بہت شکریہ۔“

”تم آپ نے اپنا آپ مجھے سوپ کر جوتا قیمتی تحفہ دیا، اس سے تو بہت کم ہے۔“ وہ منمناتے ہوئے بولی۔ میں نے اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا

”پتہ نہیں ہماری قسمت میں کیا ہے، بیٹا یا بیٹی، لیکن جو بھی ہے، وہ میرے رب تعالیٰ کی رضا ہے۔ بیٹی رحمت ہے اور بیٹا نعمت۔ بس اپنا خیال رکھنا۔“

”جی، ضرور۔“ اس نے نگاہیں جھکائے کہا تو میں نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر چہرہ اور پر کیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر ایک الوبی نور پھیلا ہوا تھا۔ اس دن مجھے وہ بہت ہی پیاری لگی۔ یوں جیسے آج مجھے اس سے محبت ہو گئی ہو۔ میں اس سے الگ ہو بیٹھا اور مہوش اور رونیت کور کی بات بتانے لگا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ مجھے لگا زندگی کتنی خوبصورت ہے۔

”جسپال سنگھ کو بتایا؟“ ایک دم سے سوئی نے پوچھا تو میں نے کہا

”اُویو، مجھے خود ابھی پتہ چل رہا ہے، اور میں کیسے بتا سکتا ہوں اسے۔“ یہ کہہ کر میں نے پوچھا، ”کیا بتا دوں اسے؟“

”ہاں، پھر مجھے اس سے بات بھی کرنی ہے۔“

”کیا بات کرنی ہے۔“ میں نے یونہی سرسری سے لہجے میں پوچھا تو وہ بولی

”یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔“

”چلو، تمہاری مرضی۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

دو چہرے کے کھانے کے بعد، کبھی لاؤنج میں تھے۔ یہاں تک کہ ٹمس اور قمر بھی ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ اشفاق چوہدری نے لندن میں تانی کو بتا دیا تھا۔ اروند نے ایک بڑی اسکرین لگا دی تھی۔ جس پر اس سے باقی ہوتی رہی تھیں۔ وہ افسوس کر رہی تھی کہ میں یونہی لندن چلی آئی۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں نے جانا ہی نہیں تھا۔ اس نے بہت جلد آنے کا کہا تھا۔ اس سے بات ہو چکی تو اروند سنگھ اوگی سے رابطہ کرنے لگا۔ کچھ دیر وہاں رابطہ ہو گیا تو اسکرین پر سب سے پہلے کجیت کور دکھائی دی۔

”بہت بہت دودھائی ہو سب کو، خاص طور پر دمی سوئی کو۔ بہت دل کر رہا ہے کہ اڈ کر تم سب لوگوں کے پاس آ جاؤں، پر اب انوجیت کی شادی کر کے ہی آؤں گی، نکانہ صاحب متھانکینے اور نورنگر تم سب سے ملے۔“

”جم جم آئیں گی، ہم انتظار کر رہے ہیں۔“ سوئی نے کہا اور پھر پوچھا، ”کوئی بات ہوئی دن رکھنے کی؟“

”نہیں ابھی تو ان سب سے بات ہوئی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ میں اسی ہفتے ہی ان کی شادی کروا دوں گی۔“

برار صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔“

”پھر اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگ اگلے مہینے میں آرہے ہیں؟“ سوئی نے پوچھا

”رب خیر سکھ رکھے، اگلے ہفتے میں آرہے ہیں۔ ہمارے کاغذات چلے گئے ہیں۔“

”کبھی آرہے ہیں نا؟“ رونیت کور نے پوچھا تو جسپال نے سامنے آ کر کہا

”ہاں کبھی آئیں گے، میں بھی آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ رکاوٹوں ہاتھ جوڑ کر بولا، ”سوئی بہن، بہت بہت مبارک ہو، سب چاچا بنے ہیں، میں مانا ہوں گا۔“ اس نے انتہائی پیار سے کہا تو سوئی ایک دم سے کرخت لہجے میں بولی

”خبردار، اگر مجھے بہن کہا اور ہمارے گھر میں قدم رکھا تو، تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے یہاں آنے کی۔“

یہ سن کر جسپال سنگھ ہونٹوں کی مانند اسے دیکھنے لگا، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے سمجھ نہیں آئی کہ یہ ہو گیا گیا ہے؟ وہ حیرت زدہ سا اسکرین پر جاملہ کھڑا تھا۔ باقی سب بھی اس کے اس رویے پر حیران تھے۔ چند لمحے یونہی گذر گئے۔ تبھی جسپال رو ہانسا ہوتے ہوئے بولا

”ایسی کیا غلطی ہو گئی میری بہن، مجھے بتاؤ تو سہی، ایسا کیا ہو گیا؟“

”تمہیں ہر پریت کا احساس تک نہیں ہے۔ میں نے تم سے اکیلے میں بات کرنا تھی، لیکن اب سب کے سامنے

کر رہی ہوں۔ اگر تم ہر پریت کو بیاہ کر لائے تو یہاں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اگر تم پر بوجھ ہوگی تو یہ بوجھ تیری یہ بہن برداشت کرے گی، بتا۔ دنیا کے کس کو نے میں رکھنا ہے اُسے؟“

”یہ..... تم.....“ جہاں نے کہنا چاہا تو سوئی نے تنک کر کہا

”میں تمہاری ساری دلیلیں اور فلسفے جانتی ہوں۔ دنیا میں تحریک چلانے والے لوگ کیا شادی نہیں کرتے، انہوں کو چھوڑ دیتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ تم اس کی محبت کو نظر انداز کر رہے ہو۔“ سوئی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے میری بہن، جیسے تم کہو۔“ جہاں نے کہا اور اسکرین سے ہٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے ہر پریت اسکرین کے سامنے تھی۔

”سوئی! میں مانگے کی محبت نہیں.....“

”مجھے فلسفے نہ سمجھاؤ۔ جو کہا ہے وہی کرو۔“ سوئی کچھ اس طرح کہا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ اس نے پہلے کبھی ایسے بات نہیں کی تھی۔ اس کے اس انداز میں کتنی محبت تھی، یہ وہی سمجھ سکتا تھا، جس نے ایسا تعلق دیکھا ہو اور برتا ہو۔ ہم کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سلسلہ ختم ہو گیا۔

میرادل چاہ رہا تھا کہ میں مسافر شاہ کے تھڑے پر جاؤں۔ وہاں جا کر دیکھوں، اس ماحول میں جاؤں۔ میں وہاں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک مجھے مہوش سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس سال میلہ ضرور لگے گا۔ میں نے مسافر شاہ کے تھڑے پر جانے کی بجائے اشفاق چوہدری کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ باہر گیا ہوا، اسے آنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میں کافی دیر تک اس سے میلے کے بارے میں بات کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ اس بار میلہ ضرور لگے گا۔ وہ اس کی تیاریوں میں تھا۔ وہ صرف تاریخ کے تعین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تب میں نے اس سے کہا

”یار! ایسا کرتے ہیں، پورے علاقے کا ایک چکر لگاتے ہیں، علاقے کے شہزادوں کو ایک بار پھر سے تیار کرتے ہیں، اسی بہانے لوگوں سے بھی مل لیں گے۔“

”کیا تمہارا الیکشن لڑنے کا ارادہ بن گیا ہے؟“ اشفاق چوہدری نے مسکراتے ہوئے پوچھا

”نہیں! ویسے ہی، ایک بار تو سب سے مل لیا جائے، میں بھول ہی گیا ہوں اپنے علاقے کو۔“ میں نے کہا تو

وہ بولا

”یہ نہ ہو کہ یہیں کوئی نیا فساد نکل آئے؟“

”کیا مطلب، کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”کوٹ سلطان کے چوہدری دین محمد کا بیٹا شہزاد اب اپنے باپ کا وارث بن گیا ہے۔ دین محمد تو بہت اچھا اور بیابندہ تھا، لیکن یہ شہزاد اب پر پرزے نکال رہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس میلے میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا کرے گا، جس سے وہ علاقے کو بتا سکے کہ وہ بھی چوہدری ہے۔“

”چل دیکھ لیں گے، اگر وہ چار بوریاں لوٹ لائے گا تو ہم چھ لٹا دیں گے، بھلا تو عوام کا ہی ہو گا۔ طاقت دکھائے گا تو پتہ چل جائے گا اسے کہ آئندہ کچھ نہیں کرنا۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”بات یہ نہیں، میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں کہ اچھا بھلا امن ہے، پورے علاقے کے لوگ سکون سے جی رہے ہیں، یہ کہیں.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات ٹوکتے ہوئے کہا

”دیکھ لیں گے۔“

میری بات سن کر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اسے مسافر شاہ کے تھڑے پر چلنے کو کہا تو وہ اٹھ گیا۔

مسافر شاہ کے تھڑے پر جس وقت ہم پہنچے، سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ فرید اکھاڑے میں زور کر رہا تھا۔ کئی سارے پہلوان تھے۔ وہاں پر لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی درویش بیٹھا ہوئی ٹھنڈائی کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بھی جا کر ان لوگوں میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں پر لوگوں کا جوش ہی اتنا تھا اور وہ اس قدر متوجہ تھے کہ کسی نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ میں تھوڑی دیر تک ان کے داؤ بیچ دیکھتا رہا پھر پلٹ کر تھڑے پر آن بیٹھا۔ میرے سامنے ڈھلتا ہوا سورج تھا۔ جس نے مغربی افق کو سارا نارنجی کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا۔ جہاں اپنے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگا باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل سوئی کی باتوں پر سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ کس قدر سخت تھا۔ اس سخت لہجے میں جو مان چھپا ہوا تھا، وہ اس سے لگا نہیں نہیں چرا سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے اسی وقت سوئی کے کہنے پر اپنا فیصلہ دے دیا تھا لیکن وہ تب سے یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ کیا واقعی وہ ہر پریت کے ساتھ زیادتی کرتا چلا آیا ہے۔ اس کی محبت کی وجہ سے اسے نظر انداز کرتا رہا ہے۔ اسے خود محسوس ہونے لگا تھا، اس نے ہر پریت کو نظر انداز کیا۔ اگر وہ اپنی محبت میں مخلص نہ ہوتی تو کیا وہ اس کا انتظار کرتی؟ اس پر جان تک وارد دینے کا حوصلہ رکھنے والی ہر پریت نے کبھی شکوہ تک نہیں کیا تھا۔ وہ اسی بارے سوچ رہا تھا کہ جمال کا فون آ گیا۔

”مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اپنے کمرے ہی سے باہر نہیں نکل رہے ہو؟“

”کس نے بتایا؟“ یہ کہہ کر اس نے خود ہی جلدی سے کہا، ”خیر! پتہ لگنا کون سا بڑی بات ہے۔“ جہاں نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو جمال نے انتہائی سنجیدگی سے کہا

”دیکھو جہاں، اگر تمہیں سوئی کی کسی بھی بات سے دکھ پہنچا ہو تو میں اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں، اس نے تو.....“ اس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کا نٹے ہوئے بولا

”تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ میں نے سوئی کی بات کا برا منایا ہے، ارے اس نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں کمرے میں پڑا تب سے اب تک یہی تو سوچتا چلا جا رہا ہوں کہ اسے کس طرح یقین دلا سکوں گا کہ یہ سب کچھ میں جان بوجھ کر نہیں کیا، مجھ پر ذمے داریاں ہی ایسی تھیں۔“

”اچھا اب بات سن، شاید سوئی اس قدر سخت لہجے میں نہ کہتی اگر ہر پریت کی ساری روداد یہ تمہاری بانیٹا کو رنہ بتاتی۔ یہ دودن سے سوئی کے ساتھ رابطے میں ہے اور اس نے ساری باتیں کی ہیں۔ میں نے سب پڑھ لی ہیں۔“ جمال نے خوشگوار لہجے میں کہا

”چلو اچھا ہو گیا۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا

”اب تم ایسے کرو، جلد از جلد شادی کرو اور یہاں کا چکر لگا لو، شاید تمہیں پتہ ہے کہ نہیں، میلہ لگوار ہے ہیں۔ اگر آسکو تو؟“ جمال نے کہا

”میں کوشش کروں گا کہ ایک ہفتے میں ہی یہ شادی بھی ہو جائے اور میں نکاح صاحب سے ہو آؤں۔“ اس نے تیزی سے کہا

”مجھے بتاتے رہنا، کاش میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکتا۔“ جمال حسرت سے بولا تو جہاں نے ہنستے ہوئے کہا

”کوئی بات نہیں، تمہارے پاس آ کر دوبارہ شادی کر لیں گے۔“

اس کے بعد وہ کچھ دیر یونہی باتیں کرتے رہے پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ جہاں نے گہری سانس لی اور پلٹ کر نیچے جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ ابھی وہ باہر جانا ہی چاہ رہا تھا کہ ہر پریت آگئی۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ تب جہاں نے مسکراتے ہوئے پاس پڑی کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا ”بیٹھو۔“

وہ بیٹھ گئی، پھر چند لمحوں بعد بولی

”یہ بائیتا بھی نابلس اس نے.....“

”بہت اچھا کیا۔ میرے خیال میں ہمیں اب وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔“ جہاں نے کیسے ہی کہا تو ایک لمے کو اسے یقین نہیں آیا۔ جب وہ خود پر قابو پا چلی تو بولی

”پتہ ہے، آج بے بے اسی لئے برابر صاحب کی طرف نہیں گئیں۔ اسی بائیتا نے روکا ہوا تھا۔“

”تو اب چلے جاتے ہیں۔“ جہاں نے کہا

”نہیں، بے بے نے شام ہوتے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ آج ہم نہیں آرہے ہیں، صبح آئیں گے۔“ ہر پریت نے

کہا تو وہ بولا

”آج اور ابھی جائیں گے، چل اٹھ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہر پریت کا ہاتھ پکڑا تو وہ سمٹ کر اس کے سینے سے آگئی۔ چند لمحوں تک جہاں اسے اپنے ساتھ لگائے رہا، پھر اسے الگ کرتے ہوئے اس نے اپنا سر ہلایا اور اسے لے کر نیچے کی جانب چل پڑا۔ وہ بھی اسی کے ساتھ تیزی سے چلتی گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلی شام تک میلے کا اعلان پورے علاقے میں ہو چکا تھا۔ چوہدری اشفاق نے مسافر شاہ کے قہرے پر اعلان کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے علاقے کے چند سرکردہ بندوں سے بات کی تھی۔ سیل فون کے ذریعے یہ خبر راتوں رات پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ خبر صرف یہیں تک محدود نہیں رہتی، اس خبر نے کئی سرحدیں پار کر جانی ہیں۔ یہ خبر جتنا پھیلاؤ رکھے گی، ہمیں اتنا ہی محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کون، کس طرح ہم تک پہنچتا ہے، پھر اسی طرح اس کا مقابلہ کیا جائے۔ میں نے بھی پوری تیاری کا سوچ رکھا تھا۔ دوپہر ہونے کو آگئی تھی۔ اس دوران مجھے جانے کتنے فون آ گئے۔ میں فون سے اکتا گیا تو اسے جنید کے حوالے کر دیا۔ میں سکون لینا چاہتا تھا۔ اس لئے اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو گیا۔ پھر جب اٹھا تو شام ہونے کو تھی۔ میں فریش ہو کر باہر لان میں آ گیا، جہاں جنید اور اشفاق چوہدری باتوں میں مشغول تھے۔ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ چوہدری اشفاق نے کہا

”وہی ہونا جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا

”شہزاد کا یہ پیغام آیا ہے کہ تم لوگوں کوئی ضرورت نہیں ہے میلہ کروانے کی، جب ہم چاہیں گے میلہ خود کروالیں گے۔“

”تو اس کا مطلب ہے اس کے دماغ میں کیڑا ہے۔“ میں نے کہا

”وہ نیا نیا چوہدری بنا ہے اس لئے.....“ جنید نے کہنا چاہا تو میں نے کہا

”او نہیں میرے بھائی، ایسا نہیں ہے۔ اسکے دماغ میں یہ کیڑا ڈالا گیا ہے۔ ورنہ جو سمجھ دار بندہ ہے، جس نے

اس علاقے میں حالات دیکھے ہیں اور انہیں جانتا ہے، اب وہ ہمت نہیں کر سکتا، ایسی بات کہنے کی۔ ہر بندے کو

پتہ ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر اس نے ایسا کہنے کی جرات کیوں کی؟“

”دیکھو! ہمارا جو دشمن ہے نا، وہ نزدیک کی نہیں سوچتا، وہ سیندھ لگانے کے لئے گھر کا بھیدی تلاش کرتا ہے،

جب اسے اپنے مطلب کا بندہ مل جاتا ہے تو اس پر سرمایہ کاری کرتا ہے۔ اسے اپنے معیار پر لاتا ہے اور پھر اپنوں کے خلاف لڑا دیتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”تو آپ کا مطلب ہے کہ یہ شہزاد بھی؟“ جنید نے حیرت سے کہا

”اؤ میرے بھائی، بے غیرت لوگوں کا کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچ ہی ہوتی ہے نا جو بندے کو غیرت مند بنا دے یا پھر

بے غیرتہ زندگی دے دے۔ نہایت خاموشی اور تحمل سے اس کی تفتیش کرو، میں دعوے سے کہتا ہوں، اس کے پیچھے

ضرور کوئی نہ کوئی سازش نکلے گی۔“ میں نے اعتماد سے کہا

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ جنید شاید میرا امتحان لینے پر تھلا ہوا تھا۔

”اصل میں بات یہ ہے میرے بھائی کہ اب مجھے ان دشمنوں سے لڑنے کے اندازہ ہو گیا ہے کہ کون کہاں سے

بول رہا ہے۔ دوسرا اس لئے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ان مجھے بندر، کتے اور ریچھ بچانا آ گیا ہے، انسان تو احسن تقویم

پیدا کیا گیا ہے۔ جب تک یہ احسن تقویم پر رہتا ہے، اس وقت تو وہ اشرف المخلوق کے مقام پر فائز رہتا ہے، لیکن

جیسے ہی اس مقام سے گرتا ہے، اسفل سافلین کی طرف جاتا ہے تو اس کی سوچ وہی بندر، کتے اور ریچھ والی ہوتی

ہے، وہ جانور کے مقام پر ہوتا ہے، کئی منافقین تو سانپ جیسے ہوتے ہیں۔ وہ تو کتے کے مقام سے بھی گر جاتے

ہیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

”جانور تو سبھی ہوئے، پھر یہ کتا اور سانپ؟“ جنید نے ہنستے ہوئے پوچھا

”کتا جیسا بھی ہے، اس میں مالک سے وفاداری کی خوش رہتی ہے۔ وہ ایک جگہ سے کھالے تو وہاں کا خیال رکھتا

ہے۔ لیکن سانپ سے جتنا بھی اچھا سلوک کر لیا جائے، آخر اس نے ڈنگ مارنا ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کسی بندے

کی بڑی عزت کرتے ہیں، اُسے مان دیتے ہیں، سب سے مقدم جانتے ہیں۔ اگر وہ انسان والی سوچ رکھتا ہے تو

حیا کرے گا۔ اگر جانور کی سوچ پر آ جائے گا تو وہ کتے سے بھی بدتر ہوگا۔ اس کی خصلت سانپ جیسی ہوگی۔“

میں نے کہا تو وہ ہنس دیا، پھر ہنستے ہوئے بولا

”مجھے تو لگتا ہے آپ سلوتری ہو گئے ہیں۔“

اس پر چوہدری اشفاق بھی کھل کر ہنس دیا۔ پھر ایک دم سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا

”تو پھر کیا کرنا ہے شہزاد کا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ وہ خود باؤلے کتے کا طرح ہم پر چڑھ دوڑے گا اور میں جانتا ہوں کس کتے کو کس طرح بھگانا

ہے۔ تم اپنا کام کرو۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر چوہدری اشفاق مجھے اس دن کی روداد سنانے لگا، ہم رات گئے تک یہی باتیں کرتے رہے۔

وہ صبح بڑی روشن تھی۔ میں ناشتہ کر چکا تو دل چاہا کہ اپنے گاؤں جاؤں وہاں کے لوگوں سے ملوں۔ ان سے باتیں

کروں۔ اپنے پرانے گھر میں جاؤں، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اروند سنگھ میرے پاس آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا

”آپ کا فون کہاں ہے؟“

”میں نے جنید کو دیا تھا، اسی کے پاس ہوگا۔“ میں نے اسے بتایا۔

لیں۔“ اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا

”جیسا تم بہتر سمجھو، آجکل تو شادیاں ہو رہی ہیں، ان کی بھی کروادو، یہ بچارے ایسے کیوں رہیں۔“

اس پر ارونڈ ہنسنے لگا پھر بولا

”آپ کو مزے کی ایک بات بتاؤں، ان دونوں کی محبوبائیں بھی ہیں۔ ادھر آگرہ میں رہتی تھیں، آج کل امریکہ میں ہیں۔ یہ ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں، ایک دن مجھے کہہ رہے تھے کہ اگر یہاں کچھ سکون ہوتا ہے تو وہ آپ سے اس سلسلہ میں بات کریں۔“

”اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو ہم انہیں یہاں.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا

”یہی تو بات ہے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے ہیں۔، تبھی تو لیب کا کہہ رہا ہوں۔ وہ ان دونوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ اگر پاکستان میں آسکتی ہو تو ٹھیک ورنہ بائے بائے، وہ دونوں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔“

”میں نے ان دونوں کے بارے میں سوچا ہے۔ وہ یہاں پر قانونی حیثیت اختیار کر لیں گے تو پھر ان کا سب کچھ بنا دیں گے۔ ہم نے کسی کو مجبوراً نہیں رکھنا، باقی تم جیسا چاہو، تم بھائی ہو، تمہیں بھی فیصلے کا اختیار ہے، میں کب تک؟“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا

”بھائی آپ کے ساتھ ہی تو یہ ساری بہاریں ہیں۔ اتنا پیار ہمیں مل گیا۔“

”ٹھیک ہے ابھی چلو میرے ساتھ، گاؤں گھوم کے آتے ہیں، پھر آکر ٹرس قمر سے باتیں کریں گے۔“ میں یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تو وہ بھی میرے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔

راستے میں ارونڈ سنگھ نے بتایا کہ اُدگی پنڈ میں انوجیت سنگھ اور جہاں سنگھ کی شادی کے چھ مہینے ہوئے تھے۔ بائیتا کور نے سارا انتظام سنبھال لیا ہوا تھا۔ سندپ کور بھی جالندھر سے آگئی تھی۔ اس کے ساتھ نوتن کور بھی آگئی۔ کلجیت کور نے سارے انتظامات بلیمبر سنگھ پنچ کے سپرد کر دیئے تھے۔ یہ ہونہیں سکتا تھا کہ جہاں کی شادی ہو اس کی سیکورٹی نہ ہو۔ ایک ان دیکھا حصار اُدگی پنڈ میں بن چکا تھا۔ ساری شاپنگ ہو چکی تھی۔ دودن بعد ان کی شادی ہونا طے پا چکی تھی۔ اس کا رابطہ تھا۔ یہ سب سن کر میں بڑی دیر تک مسکراتا رہا۔

اس وقت میں نورنگراؤں میں اپنے پرانے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ چوہدری اشفاق بھی آگیا ہوا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے گاؤں کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ میری آمد کے بارے میں سن کر عبیدہ بھی آگیا تھا۔ اماں نے اسے زمین دلا دی تھی اور اب وہ ڈیرے پر چارا ڈالنے والا ملازم نہیں رہا تھا، اچھا بھلا کاشت کار تھا۔ بندہ خوشحال ہو تو اس کے طور طریقے ہی بدل جاتے ہیں۔ وہاں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ گاؤں ہی کے ایک بندے نے بتایا ”وہ چوہدری شہزاد گل سے علاقے کے معتبر لوگوں کے پاس جا رہا ہے۔ لیکن وہ وہاں جا کر میلہ روکنے کی بات نہیں کر رہا ہے، وہ اپنی ہی کہانی سن رہا ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

”وہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو مسافر شاہ کے ٹھڑے کے ساتھ زمین پڑی ہے۔ اتنی ساری زمین، جس پر کبھی کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔ یہ علاقے کے لوگوں کے کام آتی چاہئے۔ جمال یہ میلے کا ڈھونگ رچا کر اس زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے پہلے ہی وہاں پہلوانوں کی صورت میں بد معاش بٹھار کھے ہیں۔ یہ ایک طرح سے قبضہ ہی ہے۔“

”کیا یہ بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے؟ میرا مطلب ہے وہ ایسا ہی کہہ رہا ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا

”بالکل، ایسے ہی کہہ رہا ہے۔ بلکہ میں سچ بتاؤں تو مجھے لالے اکبر علی نے کہا بھی تھا کہ ہم ان معتبر لوگوں کے

”وہ بند جا رہا ہے۔ خیر! میں آپ کو بتانا چاہ رہا ہوں کہ وہ زخم جو ”دیرتا“ نے میجر راٹھور کو لگایا ہے، اس پر وہ باؤلا ہو گیا ہے۔ اسے یہ پتہ چل چکا ہے کہ یہ سب ”دیرتا“ ہی نے کیا ہے۔“ وہ سکون سے بولا

”وہ کیسے؟“ میں نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا

”وہ ایسے کہ جو بندہ طارق نذیر نے پکڑا تھا، جس سے آپ نے یہاں سے پہلے پوچھنا چھ کی تھی، اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس کی وجہ سے جتنے بھی بندے تھے اس سارے پراجیکٹ میں وہ سبھی پکڑے گئے ہیں۔ ان تینوں نے انہی لوگوں کے پاس آنا تھا۔ یہیں سے اپنا ٹاسک پورا کرنے والے تھے۔ اسے سمجھ یہ نہیں آ رہی ہے کہ ”دیرتا“ انہی کے ملک میں ہے یا پورے برصغیر میں۔ ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔“ اس نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”اس نے ایک طویل ایک میل کی ہے اپنے ڈیپارٹمنٹ کو۔ یہ ساری تفصیلات لکھ کر اس نے پوچھا ہے کہ کیا ہمارے خفیہ ادارے ناکام ہو چکے ہیں؟ وہ اب تک ”دیرتا“ کا سراغ نہیں لگا پائے ہیں۔“ وہ خوش ہوتا ہوا بولا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا

”کیا خیال ہے تمہارا، انہیں پتہ چل جائے گا، اس کا کتنا امکان ہے؟“

”چاہے تو آج ہی پتہ چل جائے یا پھر کئی مہینے لگ جائیں۔ میں نے ”دیرتا“ کی جو بنیاد رکھی ہے، وہ ساری کی ساری ہوا میں ہے۔ کسی کا بھی کیا دھرا اسی پر ڈالا جاسکتا ہے۔ یا پھر گمراہ کرنے کے لئے تردید بھی کی جاسکتی ہے۔ مطلب کوئی بھی کھیل کھیل جاسکتا ہے۔ پکڑے جانے کا امکان تبھی پیدا ہوگا، جب کوئی کمپیوٹر کی اس دنیا میں ہم سے بھی آگے جا رہا ہوگا اور اسے یہ سمجھ آ جائے کہ یہ سب ہیکنگ کا کمال ہے۔“ اس نے پھر مجھے اس کی تفصیل بتائی

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ”دیرتا“ ایک بلبلے کی مانند ہے، جب چاہے پھٹ جائے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ تیزی سے بولا

”ایسا تو ہے، لیکن اس وقت جب تک ہم اسے توڑ نہ دیں گے، ورنہ اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ اصل میں جہاں سنگھ کا نیٹ ورک اسے حقیقت میں تبدیل کر رہا ہے۔ میں چاہوں تو اسے مستقل بنیادوں پر بھی بنا سکتا ہوں۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا تو میں نے سنجیدگی سے کہا

”تم اسی مستقل بنیادوں پر کام کرنے والا ”دیرتا“ ہی بناؤ۔ کہیں بھی اور کسی بھی جگہ اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر بولا، ”وہ بات تو رہ ہی گئی کہ کیا کرنا ہے میجر راٹھور کا، اس کے ساتھ کھیلوں یا چھوڑ دوں؟“

”جیسا تم چاہو۔ کب تک ہر کام پوچھ پوچھ کر کرتے رہیں گے۔ اور ہاں ٹرس اور قمر کو کیسے پایا تم نے، کیسے لوگ ہیں؟“ میں نے اس سے پوچھا

”بہت غصہ ہے جی ان میں، انہیں بھارت میں ذلیل ہی بہت کیا گیا تھا۔ ویسے وہ حویلی میں تھوڑا مشکل محسوس کرتے ہیں۔“ ارونڈ نے بتایا تو میں چونک گیا پھر پوچھا

”ایسا کیوں؟“

”اصل میں یہاں گھر کا ماحول ہے، ایسے میں کام ہونا، آزادانہ پھرنا وہ سب.....“ وہ کہتے کہتے رُک گیا پھر بولا، ”میں اس پر سوچ رہا تھا کہ کیوں نا ہم اپنی ایک لیب بنالیں۔ حویلی سے نکل کر ادھر شفٹ ہو جائیں۔ ہم اپنا ماحول بنا

پاس جائیں اور چوہدری شہزاد کا کوئی حل نکالیں، اسے کیا پتہ کہ جمال ہمارے لئے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے۔“
”اوائے، ہمیں اس مقصد کے لئے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس علاقے کے لیے کیا کچھ کیا اور کیا کرنا چاہتا ہوں، یہ تو میں ہی اور میرا رب جانتا ہے۔ باقی رہی مسافر شاہ کے ٹھڑے پر میلے کی بات تو وہاں میلہ لگے گا۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“ اس نے کہا تو بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بات عوام میں آگئی ہے۔
انہیں کچھ کہنے کا حوصلہ مل گیا ہے۔ میں وہاں دوپہر تک رہا، پھر حویلی واپس پلٹ گیا۔

شام تک مجھے مختلف ذرائع سے یہ خبر مل گئی کہ چوہدری شہزاد کیا کچھ کر رہا ہے۔ وہ لوگوں کو یہی تاثر دے رہا تھا کہ میں مسافر شاہ کے ٹھڑے کی زمین پر قابض ہونا چاہتا ہوں۔ وہ علاقے کے لوگوں کو ساتھ ملانا چاہتا تھا کہ مجھے اس ”حرکت“ سے روکا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک ہچکات بلائی جائے اور اس میں مجھے اس سے روکا جائے۔

اگلے دن کی صبح میں حویلی ہی میں تھا کہ علاقے کے ایک بڑے معتبر بزرگ سردار فیاض نے مجھے فون کیا۔ وہ مجھے اپنے ہاں بلانا چاہتے تھے۔ وہ کوئی بڑے زمیندار نہیں تھے۔ لیکن اپنی شرافت کی وجہ سے پورے علاقے میں ان کی عزت تھی۔ انہوں نے مجھے بتا دیا کہ علاقے کے دوسرے لوگ بھی وہیں ان کے پاس آنے والے ہیں۔ میں ان کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

میرے ساتھ جنید اور چوہدری اشفاق ہی تھے۔ وہاں سردار فیاض کے ڈیرے پر پورے علاقے کے معززین جمع تھے۔ ان میں ایم این اے سلیم خان بھی تھا۔ میرے پہنچنے ہی بات شروع ہو گئی۔

”بیٹا جمال! ہم میں سے بہت سارے لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ تم مسافر شاہ کے ٹھڑے پر میلہ کروا رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک پرانی روایت ہے اور پتہ نہیں کب سے چل رہی ہے۔ لیکن! ہمارے دوست دین محمد کے بیٹے چوہدری شہزاد کو تحفظ ہے کہ تم وہاں کی زمین کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے ہو۔ کیا ایسا ہے؟“
سردار فیاض نے بڑے گل سے بات کا آغاز کیا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور اسی محل سے بولا
”آپ میرے بزرگ ہیں اور سارے لوگ میرے لئے انتہائی محترم ہیں۔ میں مسافر شاہ کے ٹھڑے کی زمین پر قطعاً قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔“

میرے یوں کہنے پر سردار فیاض نے چوہدری شہزاد کی طرف دیکھ کر کہا
”لیکن اس کے پاس کیا جواب ہے کہ وہاں اس نے پہلوان بٹھا رکھے ہیں۔ وہاں کمرے تعمیر کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہاں لے جا کر لوگوں کا مارتا پیٹتا ہے۔“

”ہاں میں نے ایسا کیا، اور مزید بھی کرتا رہوں گا۔ اس نے آدمی بات بتائی ہے کہ کمرے کیوں تعمیر کئے، وہاں پر آنے جانے والے لوگوں کی خدمت کے لئے، وہاں لوگ بھی اسی مقصد کے لئے بیٹھے ہیں۔ رہا مار پیٹ کا سوال۔ میں یہ صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ جو بھی اس علاقے میں غلط کام کرے گا، چاہے وہ چوہدری شہزاد بھی ہو، میں اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کروں گا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں کا کیوں پیٹا گیا؟“

”ہاں بتاؤ بھئی؟“ سردار فیاض نے کہا تو وہ تنک کر بولا
”یہ غنڈہ گردی کا صاف اعتراف کر رہا ہے، اب بھی مجھ سے پوچھتے ہیں۔“

اس پر ایم این اے سلیم خان بولا
”میں اس ساری صورت حال کو جانتا ہوں۔ میرے ہاں سے ہی دو بندے پکڑے گئے تھے جو جمال کو قتل کرنے

آئے تھے۔ یہ بہر حال لمبی کہانی ہے، مجھے لگتا ہے کہ چوہدری شہزاد خواہ مخواہ کی مخالفت کر رہا ہے۔“
”نہیں میں خواہ مخواہ کی بات نہیں کر رہا ہوں، مجھے پتہ کہ یہ ایسا کر رہا ہے، یہی کیوں میلہ کروا رہا ہے، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سب علاقے کے لوگ مل کر میلہ لگاتے تھے۔“ اس نے زوردار انداز میں کہا تو میں نے انتہائی تحمل سے جواب دیا

”اس لئے کہ میں اکیلا اس پر خرچ کر سکتا ہوں اور اس سارے انتظام کو سنبھال بھی سکتا ہوں۔ میں نے وہاں کی خدمت کا ذمہ لیا، آپ لے لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں۔“ چوہدری شہزاد تیزی سے بولا
”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں سوائیز زمین دیتا ہوں، چوہدری اس پر غریب لوگوں کو گھر بنادے، سکول اور ہسپتال بنوادے۔ یہاں کے لوگوں کے روزگار کے لئے کوئی ٹیکو یاں لگوادے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر خدمت کرنی ہے تو کریں۔“

”یہ کیا بات ہوئی، میں تمہاری زمین پر.....“
”میری نہیں عوام کے نام، ان غریب لوگوں کے لئے میں ان لوگوں کو دے دوں گا۔“ میں نے کہا
”میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے جواب دیا

”دیکھو! حضرت آدم سے لے کر آج تک کی زمین اتنی ہی ہے۔ اتنے لوگ آکر چلے گئے۔ کبھی کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین ہماری ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ یہ زمین ہر چالیس سال بعد اپنا مالک بدل لیتی ہے۔ جو چیز میری نہیں، میں اس کا رکھ کر کیا کروں گا۔ اسے لوگوں کے کام آنا چاہئے۔ یہ میرا خیال ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں زمین پر قبضہ کرنے جا رہا ہوں تو میں نے آج سے مسافر شاہ کے ٹھڑے کے ساتھ والی زمین کو لوگوں کی خدمت کے لئے وقف کیا، اب جس کی ہمت ہے وہ مجھے روک کے دکھائے۔“ میں نے کہا اور سب کی جانب دیکھا وہ کبھی ایک دم سے ہکا بکا رہ گئے۔ کوئی نہیں بولا تو میں نے کہا، ”اب اس علاقے میں سکول، ہسپتال اور غریبوں کے گھر بنے گے۔ ان کے روزگار کا بندوبست ہوگا۔ آؤ، جتنا میں کرتا ہوں، اتنا کوئی دوسرا کرے۔ ہے کوئی؟“

میرے یوں کہنے پر کوئی نہیں بولا۔ کوئی بھی اپنی زمین سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ان میں سے چند ایسے تھے جو جاگیر دارانہ سوچ رکھنے والے۔ وہ تو یہ بھی نہیں دیکھنا کہ لوگوں کو اس قدر سہولت مل جائے۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو سلیم خان بولا

”جمال! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھ سے جتنا ہو سکا، میں اب عوام کے لئے کبروں گا، جو بھی مخالفت کرے گا، میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔“

”میں آپ سب سے درخواست کروں گا، جس طرح آج تک میلے کے لئے اکٹھے ہوتے آئے ہیں، اسی طرح لوگوں کی خدمت کے لئے اکٹھے ہو جائیں۔ ہمارے ساتھ رہنے والے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ وہ ساری زندگی سکتے رہیں۔ زمین اللہ کی وسائل اللہ کے، ہم قبضہ بنا کر بیٹھنے والے کون ہیں۔ آؤ اللہ کے بندوں کی خدمت کریں۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں پتر۔“ سردار فیاض نے کہا تو چوہدری شہزاد غصے میں اٹھ کر چل دیا۔ اب وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دن اوگی پنڈ پر بہار ہی کچھ دوسری طرح کی تھی۔ انوجیت سنگھ چونکہ اسمبلی کا ممبر تھا۔ اس لئے اس کی شادی پر

کئی سارے ممبر آنے والے تھے۔ اوگی کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا ہوا تھا۔ نکودر اور جالندھر کی ساری انتظامیہ وہاں موجود تھی۔ جگتا سنگھ اور اس سے تعلق رکھنے والے بھی لوگ، ایک دن پہلے ہی جالندھر میں آ موجود ہوا تھا۔ بھوپندر سنگھ برار نے اپنے گاؤں میں بڑے پیمانے پر انتظام کیا ہوا تھا۔ گرلین کور کے ساتھ آنجنائی پر فیس دیویندر سنگھ کے سارے لوگ آچکے تھے۔ انوجیت سنگھ کی بارات بڑی شان سے بھوپندر سنگھ برار کے گاؤں پہنچی۔ وہ سیدھے ہی گردوارے گئے تھے۔ ان کے پیچھے کے کچھ دیر بعد ہی دلہن کو لے آیا گیا۔ ارادوں اور پھیروں میں انہیں دو گھنٹے لگ گئے۔ وہیں سے بارات بھوپندر سنگھ کی حویلی میں آئی، وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ دوپہر ہوتے ہی وہ واپسی کے لئے چل پڑے۔ ایسا عموماً ہوتا نہیں تھا لیکن اسی دن جہاں سنگھ اور ہر پریت کی شادی اوگی پنڈ کے گردوارے میں تھی۔ وہ سبھی سیدھے وہیں پہنچے۔ جہاں سنگھ اور ہر پریت کور دونوں گردوارے جا پہنچے۔ سہ پہر تک ان کی شادی ہو گئی۔ وہیں سے مہمان واپس جانے لگے۔ جس وقت وہ گھر پہنچے وہ بس وہی لوگ تھے، جو ایک طرح سے گھر کے افراد تھے۔ جہاں سنگھ کی بھی شادی ہو گئی۔ اسی شام اس کے ٹریول ایجنٹ نے بتایا کہ ٹھیک تین دن بعد آپ لوگ نکانہ صاحب روانہ ہو سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

میلے کے سارے انتظامات ہو چکے تھے۔ دو دن کے بعد میلہ تھا۔ اس دن میں نے علاقے کے معززین کو حویلی میں دعوت دی تھی کہ انہیں میلے کے بارے میں تفصیلی بتا دوں۔ میں اس موقع پر اہم اعلان بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چوہدری شہزاد بھی بھی خصوصی دعوت دی تھی۔ دوپہر سے ذرا پہلے بلائے گئے کئی مہمان آ گئے۔ کئی باتوں میں مصروف تھے کہ سردار فیاض نے کہا

”یار جمال باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے وہ بات کر لیں، جس کے لئے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔“

اس پر وہاں موجود سب لوگ متوجہ ہو گئے تو میں نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”یہ میلہ نجانے کب سے لگتا چلا آ رہا ہے۔ مسافر شاہ کبھی یہاں آئے تھے یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ یہاں کوئی بزرگ آئے تھے۔ سو ہم مان لیتے ہیں۔ میلے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ ہم اپنے علاقے کے لوگوں کو تفریح فراہم کریں، اپنے شہر زوروں کے بارے میں جانیں۔ ہمارے پاس کیسے کیسے لوگ ہیں، ان کے بارے میں جانیں۔ وہ لوگ جو سارا سال کمائی کی آس لگا کر بیٹھے رہتے ہیں، وہ کچھ کھا کمالیں۔ میں اگر کچھ بھول رہا ہوں تو وہ آپ بتا دیں۔“

”نہیں تم اپنی بات جاری رکھو، ہم بات کر لیں گے۔“ سردار فیاض نے کہا

”دیکھیں۔! میں بھی اسی علاقے سے ہوں، آپ سب میں سے ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں، میں نے بھی غربت دیکھی ہے۔ مجھے ان لوگوں کا احساس ہے جو آج بھی میری طرح غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ان کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جو یہ زمین حاصل کی ہے میری نہیں، میری بیوی کی ہے۔ جس میں سے اسی نے سوا یکڑ زمین وقف کر دی ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے مسافر شاہ کی زمین سے کوئی غرض نہیں۔ نا مجھے کسی دوسری زمین سے۔ کوئی اگر میرے ساتھ شامل ہوتا چاہتا ہے تو بسم اللہ، نہیں تو اُسے تنقید، سازش یا منفی پراپیگنڈا کرنے کی میں بالکل بھی اجازت نہیں دوں گا۔“

”یہ تو تمہاری اپنی بات ہے ہم تو میلے کی بات کرنے یہاں آئے ہیں۔“ سردار فیاض نے کہا

”میں اسی طرف آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں ایک لمحہ کور کا اور پھر کہتا چلا گیا، ”اس میلے میں جو بھی مقابلے ہوں گے،

ان کے منصف آپ ہیں۔ جس بھی علاقے کا جو مقابلہ ہوگا، اسے جیتنے والے کو جو انعام ملے گا وہ میں دوں گا۔ وہ انعام ہوگا، اس گاؤں میں سکول، ہسپتال، ڈسپنسری یا کسی بھی شے کی فیکٹری۔ اب یہ آپ پر ہے کہ کس مقابلے کا کیا انعام رکھتے ہیں۔ ہر شہر زور کو اس کے علاوہ نقد انعام بھی میں ہی دوں گا۔“

”یہ تو بہت بڑی بات کہی تم نے، اتنا کر لو گے؟“ سردار فیاض نے خوش ہوتے ہوئے کہا

”میں کر لوں گا آپ سنبھالنے والے بنیں، مجھے یہ ڈر ہے کہ آپ لوگوں انہیں چلانے پائیں۔“

”ممکن ہے، ایسا ہو، پھر تمہارا کیا تو ضائع گیا۔“ ایک معزز نے کہا

”میں سوا یکڑ اسی لئے وقف کر رہا ہوں۔ اس پر کاروبار ہوگا، یہاں کے لوگوں کو روزگار ملے گا، وہ خوشحال ہوں گے۔ مجھے صرف ایک ڈر ہے؟“ میں نے کہا تو سب نے میری جانب دیکھا

”وہ کیا؟“ دوسرے معزز نے پوچھا

”یہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں سے۔ جاگیر داری زمین کے ساتھ منسوب نہیں، یہ ایک سوچ کا نام ہے۔ دوسرے کو کمتر خیال کرنا۔ میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ آپ اپنے لئے جو چاہیں کریں۔ لیکن کسی کو دکھ دے کر نہیں اور نہ ہی کسی سے جھین کر اپنا بنائیں۔ میں نے بس یہی کہنا ہے، اب آپ جو بھی اور جیسا بھی انتظام کریں، میرے ذمے جو خدمت لگائیں میں تیار ہوں۔“

”اور اگر اس سارے کام میں کسی نے مداخلت کی تو.....“ سردار فیاض نے کہا

”میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گا، جس طرح روک سکا، اسے روکوں گا۔“ میں گھمبیر لہجے میں کہا تو سردار فیاض انتہائی سنجیدگی سے بولا

”تو پھر سنو! میں اور میری نسل تیرے ساتھ ہے۔ میں اپنی نسل کو وصیت کر دوں گا کہ وہ تیری تابع رہے۔ تم سے پہلے ہم اس کا سر کچل دیں گے۔“

اس کے یوں کہنے پر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر سردار فیاض نے ہی میلے کے انتظامات کی بات چھیڑ دی۔ دوپہر تک سارے معاملات طے پا گئے۔ وہ سب کھانا کھا کر چلے گئے۔ اس دن چوہدری شہزاد نے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ امن رہے۔

سہ پہر کے وقت میں اور سونی لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی چکے تھے۔ اماں اپنے کمرے میں تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جہاں سنگھ کی اورد سنگھ اور فہیم سے بات ہوئی ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر بعد کسی وقت واکہ سے پاکستان آ جائیں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ پہلے جنم استھان جائیں گے، اس کے بعد پنچ صاحب سے ہو کر ہی لاہور واپس آئیں گے۔ پھر جو بھی پروگرام بنا۔

میں نے لاہور میں سرمد کو فون کیا۔ وہ اس وقت واکہ پر ہی کھڑا تھا۔

”ابھی تک پہنچے نہیں ہیں، ویسے دوسری طرف آ گئے ہیں۔“

”کوئی پرابلم تو نہیں؟“ میں نے پوچھا

”نہیں، کوئی نہیں، ابھی تک تو کوئی نہیں۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا۔

”پروگرام بتایا انہوں نے؟“ میں نے پوچھا

”جی، یہاں سے سیدھے نکانہ صاحب جائیں گے، وہیں سے حسن ابدال، مطلب کل شام تک ہم واپس لاہور آئیں گے۔“

”چلو مجھے بتاتے رہنا۔“ میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں اور سونی اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ دوسری جانب صفدر اسماعیل تھا۔ کچھ تمہیدی باتوں کے بعد اس نے بتایا

”آپ کے ہاں جو میلہ لگنے جا رہا ہے، اس کے بارے اعلیٰ سطح پر بات ہو رہی ہے۔“

”وہ کیوں بھائی؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا

”اصل میں یہاں سے جو بھی خفیہ رپورٹس آئیں ہیں، اور ادھر ادھر سے جو پتہ چلا ہے۔ آپ کو اندرونی طور پر بھی خطرہ ہے اور بیرونی عناصر بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”اگر اس کی وضاحت کر دو تو ممکن ہے میں ان خطرات پر قابو پا لوں۔“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا

”دراصل باہر کئی طرف سے یہ عندیہ مل رہا ہے کہ وہ یہاں کوئی نہ ہنگامہ تو کریں گے۔ وہ لوگ جو آپ کے ہاتھوں پر باد ہو گئے ہیں، وہ کہاں سکون سے بیٹھیں گے۔“ اس نے بتایا

”یہ کوئی نئی بات نہیں، ایک بار ایسا ہی میلہ تھا اور مجھے یہاں سے اٹھالیا گیا تھا۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔ یہ میرے ذہن میں ہے۔“ میں نے کہا

”آپ کے اسی علاقے میں کچھ لوگوں نے اپنے لوگ بنا لئے ہوئے ہیں، وہی یہ چاہیں گے کہ آپ کو نقصان پہنچایا جائے، زیادہ ضرورت یہیں کے لوگوں پر نگاہ رکھنے کی ہے۔“ اس نے صلاح دی تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

”یہاں کی چھان پھان کر کے بتاؤ کہ کون لوگ ہیں، میں انہیں دیکھ لوں گا۔“ میں نے کہا تو وہ بولا

”مجھے اطلاع یہ ہے کہ آج رات ہی کچھ لوگ یہاں آپ کے علاقے میں آنے والے ہیں، وہ جہان بھی جائیں گے، وہی آپ کا ٹارگٹ ہوگا۔“ اس نے وضاحت نہیں کی پوری بات بتا دی۔ میں سمجھ گیا اس لئے میں نے کہا

”اس بارے کوئی بھی نئی اطلاع ملے مجھے دینا، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔“

چند باتوں کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا یہاں کا نیٹ ورک اتنا ہی کمزور ہے کہ یہ اطلاع مجھے باہر سے مل رہی ہے۔ میں نے اسی وقت چوہدری اشفاق کا بلا لیا۔ سونی نے نہیں پوچھا کہ بات کیا ہے وہ سمجھ چکی تھی کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔

مغرب تک چوہدری اشفاق میرے پاس نہیں آ سکا۔ اس لئے مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں نے دوبارہ فون کیا تو وہ حویلی آچکا تھا۔ لاؤنچ تک آتے اسے کچھ وقت لگ گیا۔ تب وہ میرے پاس صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا

”یہاں سیکورٹی کے بہت سارے معاملات ایسے تھے، جنہیں دیکھتے ہوئے.....“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا

”آج رات یا کل کسی وقت یہاں اس علاقے میں کچھ بندے آنے والے ہیں، تم ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو، پھر وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا

”کس نے بتایا تمہیں؟“

”میں نے جو پوچھا ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

”مجھے پتہ ہے اور میں نے بندے بھی لگا دیئے ہوئے ہیں۔ تمہیں دراصل اس لئے نہیں بتایا کہ تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاؤ گے۔ میں جب دیکھ رہا ہوں سب کچھ تو تم.....“

”نہیں۔! وہ سب ٹھیک ہے لیکن مجھے بتاؤ، تاکہ میرے علم میں رہے۔“ یہ کہہ کر میں رکا اور پھر پوچھا، ”پتہ چلا کس کے پاس آنے والے ہیں؟“

”دو تین جگہیں ہیں ایسی، وہاں پر میری پوری نگاہ ہے، جیسے ہی انہوں اس طرف منہ کیا، وہ میرے پاس ہوں گے، فکر کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اسے آج معززین سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتانے لگا۔ یہاں تک کہ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔

کھانے کے بعد میں حویلی کی چھت پر چلا گیا۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسے ماحول میں اپنے ہی علاقے کے کسی بندے پر چڑھائی ہو جائے۔ وہ لاکھ غلط سہی لیکن تھا تو میرے علاقے کا۔ میں ان دنوں میں کسی بھی نزاعی کیفیت سے بچنا چاہ رہا تھا۔ میں ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا کہ میرے اندر سے آواز آئی، یہ تو ایسا کب سے ہو گیا۔ جو تیرا دشمن ہے تو بس دشمن ہے۔ سانپ پالنا بے وقوفی ہے۔ جو بھی سانپ پالتا ہے، انہی سانپوں سے ڈسا جاتا ہے۔ یا تو بندہ انسان ہوتا ہے یا پھر منافق ہوتا ہے۔ منافق کسی طرح کی ہمدردی کے لائق نہیں ہے۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ مجھے چوہدری اشفاق کا فون ملا۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ چند مشکوک لوگ نورنگر سے قریب ہی ایک گاؤں عزیز آباد میں آگئے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں نے اس سے کہا

”میں آ رہا ہوں۔“

”میں اسی لئے تمہیں نہیں بتا رہا تھا۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا

”اب مجھ سے رہا نہیں جائے گا۔“ میں نے کہا

”چلو تم اپنی ضد پوری کر لو۔ میں نہیں جاتا کہیں۔ مجھے پتہ ہے تم میری تو مانو گے نہیں۔“ اس نے غصے میں کہا تو میں نے کہا

”ٹھیک ہے نہیں آتا، لیکن جب بندے پکڑ لو تو مجھے بتا دینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے یوں پوچھنے پر وہ برا محسوس کر رہا تھا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ میں اس وقت چھت پر ہی تھا۔ تبھی مجھے چوہدری اشفاق کا فون آیا کہ اس نے وہ تین بندے پکڑ لئے ہیں۔ تبھی میں نے تیزی سے پوچھا

”کون ہیں اور کس کے پاس آئے تھے؟“

”ابھی تک وہ مان نہیں رہے ہیں کہ وہ کون ہیں، لیکن وہ جس بندے کے پاس آئے ہیں، وہ کوئی اور نہیں چوہدری شہزاد ہی ہے۔“

”مجھے پہلے ہی سے یہی شک تھا۔“ میں نے اطمینان سے کہا

”اس نے عقل مندی یہ کی ہے کہ انہیں اپنے پاس نہیں، بلکہ اپنے کزن کے ڈیرے پر بلایا ہے۔ اس کے کزن کو صرف اتنا پتہ ہے کہ یہ اشتہاری ہیں اور پناہ لینے آئے ہیں۔“ اس نے بتایا

”اس وقت کہاں ہیں؟“

”اسی کے ڈیرے پر، شہزاد کا کزن کہہ رہا ہے کہ اگر یہ غلط بندے ہوئے تو میں خود انہیں گولی ماروں گا۔ وہ.....“

”وہ تمہیں دھوکا دے رہے ہیں اشفاق۔ خیر، دیکھتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں، تم اس کے کزن کی بات مان لو۔“ میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ میلے کا پہلا دن تھا۔ میں صبح ہی سے مسافر شاہ کے تھڑے پر کئی چکر لگا چکا تھا۔ میں بار بار اس لئے باہر جا رہا تھا

کہ جو کوئی بھی مجھے نقصان پہنچانے کے لئے یہاں آچکے ہیں۔ مجھ پر حملہ آوار ہوں، ان کا پتہ چلے۔ لیکن ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ میں چوہدری شہزاد کو اس وقت تک ڈھیل دینا چاہ رہا تھا، جب تک وہ خود حملہ کے لئے سامنے نہیں آجاتا تھا۔

جس طرح میلے کی پرانی روایت تھی۔ دودن پہلے ہی سے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خیمے لگ گئے تھے۔ دوکانیں سج گئیں تھیں۔ دور و نزدیک سے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے فنکار جمع ہو چکے تھے۔ تھیمز موت کا کنواں بازی گزٹ باز بہرہ پیسے، جادوگری اور شعبہ بازی کے کمالات دکھانے والے سنیا سائی، حکیم، پتھر بیچنے والے عورتوں کے ہار سنگھار اور بچوں کے کھلونے فروخت کرنے والے اور نجانے کون کون سے طوائف آچکے تھے۔ ہر کوئی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور داد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی رقم کمانے کے لئے بے تاب تھا۔ سردار فیاض اس میلے کی نگرانی کر رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت ہو چکا تھا۔ کئی مقابلے ہو چکے تھے۔

اس وقت کشتی کا مقابلہ تھا۔ آج جو پہلوان جیت جاتے ان کا کل مقابلہ ہوتا تھا۔ اور پرسوں شام ان کا فائنل ہوتا جس میں ایک پہلوان وہ میلہ جیت جاتا۔ میں وہ مقابلہ دیکھنے کے لئے ننگے لگا تھا کہ حویلی کے گیٹ سے کئی کاریں اندر آگئیں۔ پورچ میں رکستے ہی پہلی کار سے سرمہ نکلا۔ میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو اماں سمیت سبھی لوگ بڑے دروازے پر آچکے تھے۔ میں سمجھ گیا اور ایک طرف ہو گیا۔

اسی سرمہ کی کار سے پہلے جہاں سنگھ اترا، اس کے ساتھ ہر پریت کور باہر آئی۔ پچھلی کار سے کلجیت کور، انوجیت اور اس کی بیوی سرن کور باہر آ گئی۔ ہر پریت سیدھی میرے پاس آئی میرے پاؤں چھوئے اور میرے گلے لگ کر بے تحاشا رودی۔ تب میں نے اسے دلا سہ دیتے ہوئے کہا

”پاگل! کیوں روتی ہے، تُو اپنے بھائی کے گھر آئی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔“

”نہیں یہ ساس کے گھر آئی ہے، اس لئے رو رہی ہے۔“ اماں نے کہا تو ایک دم بھی ہنس دیئے۔ تیسری کار سے بانیا کور اور تانی لگی۔ چوتھی کار میں سے گیت، زویا، علی نواز، سلمان برآمد ہوئے۔ ایک دم سے حویلی میں گویا میلہ لگ گیا۔ میں ان سب کو دیکھ کر ایک دم سے خوش ہو گیا۔

سوئی نے پنجابی روایت کے مطابق پہلے دروازے پر تیل گرایا۔ پھر باری باری وہ سب سے ملنے لگیں۔ کچھ دیر بعد لاؤنچ میں سماں بندھ گیا۔ کلجیت کور اماں کے ساتھ بیٹھی حیران تھی کہ نورنگراں کی سوچ سے بڑھ کر تھا۔ سب سے زیادہ حیرت تانی پر تھی کہ اس نے اپنے آنے کے بارے میں خبر نہیں دی۔ وہ اماں کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔

”مجھے تو ان سب کی آمد کے بارے میں پتہ تھا۔ چتراروند اور فہیم مجھے بتاتے رہے ہیں وہ سب ان کے ساتھ رابطے میں تھے۔“ اماں نے گویا انکشاف کیا۔

ان سب سے باتیں کرتے ہوئے مجھے وہیں پر شام ہو گئی۔ یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔ میں اور جہاں سنگھ باہر لان میں آگئے۔ اسے سب باتوں کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان تین لوگوں کے بارے میں تو پتہ ہے، مزید کے بارے میں ابھی کھوج نہیں لگا تھا۔ ممکن تھا ہوں، ممکن ہے نہ ہوں۔ چوہدری اشفاق نے مجھے بتا دیا کہ کشتی کا مقابلہ کس کس نے جیتا ہے۔ ان جیتنے والوں میں فرید بھی تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ میلے کا آخری دن تھا۔ سارے مقابلے ہو چکے تھے۔ صرف ایک کشتی کا مقابلہ رہ گیا تھا۔ وہ فرید اور علاقے کے نامی گرامی پہلوان ”دونا“ کے درمیان تھا۔ سارے علاقے میں خبر پھیل چکی تھی۔ علاقے کے عوام اس کانٹے کے

مقابلے کو دیکھنے کے بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ایک طرف میں یہ مقابلہ دیکھنا چاہتا تھا، اور دوسری طرف یہی وہ لمحات تھے، جس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

بظاہر پورے میلے پر کنٹرول تھا، ہر جگہ لوگ تھے۔ بہت زیادہ خفیہ والے بھی، وجود تھے۔ افضل رندھاوا پوری طرح مستعد تھا۔ بقول اس کے کوئی چڑیا بھی نہیں پھڑک سکتی تھی لیکن نجانے کیوں میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایسا کچھ جس سے شاید میں نہ رہوں۔

فرید میدان میں اُتر آیا تھا۔ اس کے سامنے والا دونات پہلوان اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ گرائڈیل اور اس سے زیادہ پھرتیلا۔ لوگوں کو چپ لگ گئی تھی۔ میں سردار فیاض کے ساتھ شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی سے ان دونوں پہلوانوں کے بدن چمک رہے تھے۔ کشتی کے منصف نے دونوں کو اکھاڑے میں اتارا اور خود باہر نکل آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹے۔ نادو نے پڑتے ہی داؤ مارا، جسے کمال مہارت سے فرید بچا گیا۔ اس نے فرید کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں وہ طریقہ سوچ لیا تھا کہ کس طرح فرید کو پھجھاڑتا ہے۔ تقریباً دو منٹ تک وہ ایک دوسرے پر داؤ آزماتے رہے۔ جم غفیر پریوں خاموشی طاری تھی، جیسے یہاں کوئی بھی نہ ہو۔ ایسے میں میرا فون بج اٹھا۔ وہ فون چوہدری اشفاق کا تھا۔

”ہاں بولو،“

”تمہارے بالکل دائیں جانب دو بندے کھڑے ہیں ناسیہ لباس والے؟“

”ہاں میں نے دیکھا ہے، ان کو۔“

”یہ وہی ہیں، ان کے پاس پستل بھی ہیں، یہ وار کریں گے۔“ اس نے تیزی سے کہا

”انہیں پکڑا۔۔۔۔۔“ میں نے کہا جاپا تو وہ بولا

”وہ میں سنبھال لوں گا، بس تمہیں محتاط کرنا تھا۔“

میں پوری طرح مستعد ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے حملہ کس وقت کرنا ہے۔ میں اب فرید کی کشتی کی جانب متوجہ نہیں تھا بلکہ وہ لوگ میری نگاہوں میں تھے۔ میں نے اپنے پستل کو ٹٹولا اور پوری طرح تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میں اپنا دفاع تو بخوبی کر سکتا تھا لیکن اگر ان کے فائر سے میرے ساتھ بیٹھے کسی بندے کا نقصان ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ فرید اکھاڑے میں زور آزمائی کر رہا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر درویش بیٹھا ہوا، فرید پر پوری توجہ لگائے بیٹھا تھا۔

اچانک فرید نے دو نے پہلوان کے دائیں پیرو کو پکڑا، اس کے بائیں گھٹنے پر اپنے گھٹنے کا دباؤ بڑھایا، ہاتھ سے اس کی گردن کو جھٹکا دیا، دونات لڑکھڑا گیا، یہی وہ لمحہ تھا جب فرید نے اسے باہوں پر سنبھالا اور زور سے زمین پر دے مارا۔ اس سے آگے میں نہیں دیکھ سکا۔ میری نگاہ ان دونوں پر گئی، وہ انتہائی سرعت سے اپنے اپنے پستل نکال چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے، ان کے پیچھے کھڑے لوگوں نے انہیں دبوچ لیا۔ چوہدری اشفاق نے ان کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ انہیں گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا لیکن مطمئن پھر بھی نہ ہوا۔ نجانے کس بل میں کون سا سانپ موجود ہے؟

شور سے کانوں میں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لوگ نعرہ بازی کر رہے تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کشتی جیت لینے کے بعد پہلوان انعام کے لئے پورے دائرے کا چکر لگاتا ہے اور لوگ اسے انعام دیتے ہیں۔ لیکن فرید نے ایسا نہیں کیا، وہ سیدھا ہماری طرف چلا آیا، جہاں سردار فیاض اور اس کے ساتھ علاقے کے معززین بیٹھے

ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب آگیا۔

”فرید پتر، وہیں پنڈال کے درمیان میں چلو، میں تمہیں وہیں انعام دینے آتا ہوں۔“ سردار فیاض نے کہا تو وہ بولا ”میں یہاں موجود ہر بندے سے بات کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو؟“ اس نے کہا تو سردار فیاض نے اسپیکر والے کو اشارہ کر دیا۔ اس نے مائیک اسے دیا تو وہ کہنے لگا۔

”میرے علاقے کے لوگو سنو!“ اس نے کہا تو سب ٹھٹک گئے۔ وہ کہنے لگا، ”سنو، یہ کشتی جیت کر میں اپنے علاقے میں ہسپتال جیت گیا ہوں۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں وہ ہسپتال چلے گا کیسے؟ یہاں کے عوام کو اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ ایک پہلوان کو پالنا ایک ہاتھی کو پالنے کے برابر ہوتا ہے، اور یہ ہسپتال؟“

اس پر سردار فیاض اٹھا، مائیک اسے دے دیا تو اس نے کہا

”جمال نے اعلان کیا ہے ہسپتال بنوا کر دینے کا، لیکن اسے چلانے کے لئے میں ایک فیکٹری لگا رہا ہوں۔ اس کی ساری آمدنی اس ہسپتال کی ہوگی۔ جتنا یہ جمال کرے گا، اتنا ہم علاقے والے کریں گے، مت گھبراؤ میرے پتر،“ یہ کہہ کر سردار نے انعام کی رقم اسے دے دی۔ اس کے ساتھ ہی میلہ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب چل پڑے تھے۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے نکلا تو سیدھا مسافر شاہ کے تھڑے پر گیا۔ وہاں حچال سنگھ کے سامنے، وہ دونوں سامنے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ چوہدری شہزاد مجرموں کی مانند کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ دو اور لوگ بھی تھے۔ میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو چوہدری اشفاق نے بتایا

”ایک تو ان کے ساتھ کا ہے، یہ تینوں یہاں آئے تھے، اس نے بھی دوسری طرف سے پھسل نکال لیا تھا فار کے لئے۔ اس کے ساتھ والا ”را“ کا ایجنٹ ہے، جو اس شہزاد کو اپنا سوسر بنا کر یہاں اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں، یہ شہزاد غدار ہے، اور غدار کی سزا کیا ہوتی ہے؟“

وہ ایک دم سے جذباتی ہو گیا تھا۔ میں اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اچانک میرے دل میں آئی کہ انہیں معاف کر دوں۔ سچی اس کے ساتھ ہی دوسرا خیال آیا تو میں بولا

”اشفاق! اب یہ ہمارے مجرم نہیں، ہمارے وطن کے مجرم ہیں۔ انہیں وہی سزا ملے گی جو وطن دشمنوں کو ملتی ہے، اس لئے انہیں صفدر اسماعیل کے حوالے کر دو، وہی ان کا فیصلہ کریں گے۔“

”میں انہیں یہیں.....“ چوہدری اشفاق نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ انہیں لے کر چل دیئے۔ میں نے سب کو جانے کا کہہ دیا اور تھڑے کے پاس بنے کمروں کے آگے پچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حچال بھی میرے سامنے والی چارپائی پر آ کر بیٹھا تو میں نے درویش سے کہا

”یار چائے ہی پلا دو، ہو جائے گا بندوبست؟“

”کیوں نہیں سرکار، ابھی بن جاتی ہے۔“ اس نے خوشی سے کہا اور اندر کی جانب چل پڑا۔

”یہ میلہ ختم ہوا ہے تو اب سکون ہے۔ اب ایک دن آرام کے بعد ہم نکلیں گے، ساری.....“

”نہیں جمال، میں کل ہی واپسی کے لئے نکلوں گا۔ اور پھر ایک دو دن بعد میں واپس کینیڈا چلا جاؤں گا۔ مجھے

اب وہاں بہت کام ہیں۔“ اس نے سکون سے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

ابھی وہ لمحے تھے، جب مجھے لگا کہ ایک دم سے خوشبو پھیل گئی ہو۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مسافر شاہ کے تھڑے پر روئی والے بابا جی کھڑے ہیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں انتہائی تیزی سے اٹھا، ابھی حال حچال

کا تھا۔ درویش بھی ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگا۔ میں ان کی طرف بڑھا۔ وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ میں بالکل ان کے پاس چلا گیا تو انہوں نے پیار سے مجھے اپنے گلے لگالیا۔

”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا کہ تم سے ملوں گا، لو آج میں تم سے ملنے آگیا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئے پھر بولے، ”تم تو میرے سامنے رہے ہو۔ تمہیں لگا ہوگا کہ میں تمہیں کئی بار ملا ہوں۔ حقیقت میں آج تمہیں دوسری بار ہی مل رہا ہوں۔ باقی سب میرے ٹکس تھے۔“

”میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ میں نے بہ مشکل کہا تو وہ مسکرا دیئے اور بولے

”آج تجھے ملنا تھا، بہت ضروری تھا ملنا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کیلئے خاموش ہوئے اور پھر بولے۔ ”بیٹھو۔“

میں ان کے ساتھ ہی کھڑے پر بیٹھ گیا۔ جب ہم بیٹھ چکے تو وہ بولے

”جمال! یہ جو مرد مومن ہوتا نا، اس میں دو خوبیاں ایک ہی وقت میں ہونا لازمی ہیں، ایک جلال اور دوسری جمال۔ دونوں لازم ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ جیسے شیشہ..... جمال اس کی خوبصورتی ہے لیکن اس کی تختی اس کا جلال ہے۔ لوہے کا ٹکڑا ایک عام سی شے ہوگا، یہ محض جلال ہے، لیکن اگر اسے جمال نہیں دیں گے تب تک اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ لوہے کا ٹکڑا، تلوار کے روپ میں آجاتا ہے تو یہ اس کا جمال ہے، اس پر سونا بھی لگایا جاتا ہے، ہیرے جواہرات سے بھی مزین کیا جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کوڑکے پھر بولے، ”دیکھو، حق و باطل کی نگہ کش ازل سے چل رہی ہے اور ابد تک رہے گی۔ جس کا جتنا حصہ ہے، جتنا کام ہے وہ کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مرد مومن کسی بھی وقت جمال اور جلال سے آزاد ہو جائے۔ اگر وہ جمال سے آزاد ہوتا ہے تو اس کا کام، تبلیغ یا مقصد بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ جلال کو چھوڑ دیتا ہے تو اس پر کفر حاوی ہو جائے گا۔ دراصل جمال اور جلال کا آپس میں ایسا تعلق ہے کہ ان سے زندگی کے مثبت اور منفی وہ پہلو سامنے آتے ہیں جن سے انسان کی بقا ضروری ہے۔ میدان جنگ میں ہے، تو قوت بازو اور خانقاہ میں ہے، تو برداشت، حوصلہ اور تحمل۔ سننے کا حوصلہ جو منبر کا تقاضہ ہے۔ جس نے بھی زیادتی کی ہو، حق پر ہوتے ہوئے بھی صبر اور برداشت کرنا۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے کیا اور کر کے دکھایا۔“

وہ پھر خاموش ہو گئے۔ میں چپ رہا، بولنے کا یا رابری نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد فرمانے لگے۔

”مومن کی غیرت کا تقاضہ ہے کہ اس میں جلال اور جمال برابر ہوں۔ جس حسن میں قوت نہیں وہ بے کار ہے۔ کوئی جتنی بھی خوبصورتی ہو وہ اپنی بقا کو قائم نہیں رکھ سکتی ہے۔ جمال ایسی چیز ہے جو دراصل اس قوت کی محافظ ہے۔ اگر جمال نکال دیا جائے تو محض قوت رہ جائے گی، جیسے شیر کی درندگی۔ محض درندگی کو انسان نے کس سے تسخیر کیا؟ یہ وہ قوت ہی نہیں جو شیر استعمال کرتا ہے۔ یعنی جمال ایک ایسی چیز ہے جو جلال والی قوتوں کو ایسا روپ دیتا ہے جس سے اس کی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے انسان دوسری مخلوقات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جب تک جمال کی لہر انسان پر نہیں چڑھتی اس وقت تک اس کے جلال کی قوت نہیں بنتی۔ جلال نے جب جمال کو حاصل کرنا ہے تو صبر اور برداشت سے حاصل کرنا ہے، حق پر ہوتے ہوئے برداشت کرنا اصل حق ہے، یہی اصل طاقت ہے۔“

یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئے۔ جیسے مراقبے میں ہوں۔

”انسان نے سوچا میں چاند پر چلا جاؤں، آخر وہ کیا قوت تھی جو اسے چاند پر جانے کے لئے اکساتی تھی؟ اگر وہ

انسان میں تھی ہی نہیں تو کہاں سے آگئی؟ اصل میں وہ اس کے باطن میں پڑی تھی۔ ایک انسان نے سوچا کہ وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں بات کرے گا، اس نے کیا اور ہو رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے یہ اس

خواہش کو کس روپ میں سامنے لے کر آیا۔ یہ اس کے باطن کی طاقت پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیا روپ دیتا ہے، اگر یہ دلیل سمجھ میں آگئی تو کچھ بھی ماورائی نہیں رہتا۔ پھر یہ عشق بن جاتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی دلیل ہے، اپنا ارادہ ہے اور خواہش ہے کہ وہ تار کے ساتھ بات کرے یا بے تار کے بات کرے۔ تم پھول کو پکڑ سکتے ہو کیا خوشبو کو چھو سکتے ہو؟ خوشبو کی بھی ایک ماہیت ہے۔ ہاں خوشبو کو بھی پکڑا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کو پکڑنے کے لئے اتنا ہی لطیف ہونا پڑے گا۔ اس طاقت کو وہی پکڑ سکتا ہے، جو اتنا ہی لطیف ہوگا، پھر خوشبو کا جوہر ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ ایک پھیلاؤ ہے۔ ازل سے ابد تک ظاہر اور باطن نے ساتھ ساتھ رہنا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے، میں بھی اٹھ گیا۔ تب انہوں نے مجھے سینے سے لگایا، مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو پہلی بار ان سے ملنے پر ہوئی تھی۔ پھر میرے چہرے پر نگاہیں لگا کر بولے۔

”اب ہم شاید نہ مل سکیں، میرا وقت پورا ہو گیا، اب تیرا وقت ہے۔ خود کو سنبھال لینا۔ ظاہر کا سفر ہو گیا، اب باطن کے سفر پر جانا ہے۔ تم پر ایک نئی دنیا کھل رہی ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت احتیاط سے کرنا، یہ ریاضت ہے۔ روحانیت پوری سائنس ہے اور انسان کا لطیف ہونا ایک آرٹ ہے۔ فتاویٰ اللہ وہی سمجھ سکے گا جو اس سائنس کو سمجھتا ہو اور اس کے مطابق اس ریاضت سے گذرا ہو۔“

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹے اور تھڑے سے اترتے چلے گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہل سکا۔ میں انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے خود پر غور کیا۔ مجھ میں ایک نئی طرح کی قوت آگئی تھی۔ مجھے لگا میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔

میں نے دیکھا، دور تک روشنی پھیل گئی ہے۔ اس میں وہ سب لوگ موجود ہیں جو میرے ساتھ چلے تھے۔ ایک طرف اگر ولید اپنے تین سوتیرہ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے تو دوسری جانب جہاں سنگھ کے پیچھے جم غیر تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

(مقام حیرت سے شروع ہونے والے اس سفر میں جلال کی تابانیاں اس راہ پر آچکی ہیں جہاں جمال کی دل آویزیاں رونما ہوتی ہیں۔ جلال و جمال کی رعنائیاں حصہ پنجم میں ملاحظہ فرمائیں۔)